www.iqbalkalmati.blogspot.com
ایک جن زادی کی پراسرار داستان
دینار
شمیم نوید

ایک جن زادی کی پراسرار داستان

دینار

شمیم نوید

ناشر:۔
مکتبہ القریش ◎ سرکلر روڈ
اردو بازار، لاہور۲۔ فون:7668958
E.mail: al_quraish@hotmail.com

بھارت کے دارالحکومت دہلی میں واقع حضرت بختیار کاکیؒ کی درگاہ کے احاطہ ہی میں کچھ اور برگزیدہ بندوں کے مزار بھی ہیں۔ انہی میں حافظ رحمت علی شہید کا مزار ہے۔ جب ہم 1992ء میں دہلی گئے تو وہاں قیام کے دوران ہمارے ایک سسرالی عزیز سلیمان صابر نے ایک دفعہ بتایا کہ حافظ رحمت علی شہید کے قبضے میں کئی جن تھے جنہیں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں آزاد کر دیا تھا۔

انہی جنات میں سے ایک جن نے ان کی جان لے لی۔ دراصل وہ ایک کافر جن تھا جو بظاہر حافظ رحمت علی مرحوم کے ہاتھ پر بیعت ہو کر مسلمان ہو گیا تھا مگر اندر سے بدلا نہیں تھا۔ جن زادوں کے علاوہ حافظ صاحب کے قبضے میں جن زادیاں بھی تھیں۔ انہیں بھی حافظ صاحب نے آزادی عطا کر دی تھی۔ حافظ صاحب بڑے عالم اور بزرگ تھے۔ ان کے پاس بڑی نایاب کتب کا ذخیرہ تھا جو ان کے عزیزوں نے کوڑیوں کے مول بیچ دیا۔ پھر بھی کچھ کتابیں اور قلمی نسخے خراب وخستہ حالت میں موجود ہیں جنہیں ان کے عزیزوں نے گھر کی ایک کوٹھری میں ڈال رکھا ہے۔

ہم نے اپنی شریک حیات کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ محترم سلیمان صابر کے ساتھ بلی مارا جا کر ان کتابوں اور قلمی نسخوں کا جائزہ لے آئیں۔ شاید کہ کوئی نایاب کتاب مل جائے۔

ہماری شریک حیات بلی مارا سے لوٹیں تو بہت خوش تھیں۔ وہ دیمک زدہ دو قلمی نسخے تھے جو وہ لے کر آئی تھیں۔ ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتایا "یہ دونوں قلمی نسخے ایک جن زاد اور ایک جن زادی کی سرگزشتیں ہیں جو انہوں نے مرحوم حافظ رحمت علی سے بیان کی تھیں۔ خود حافظ صاحب نے انہیں خط شکستہ میں لکھا ہے۔"

پاکستان آ کر وقت ملنے پر ہم نے ان قلمی نسخوں کا مطالعہ کیا تو حیران رہ گئے۔ وہ دونوں بے مثل سرگزشتیں تھیں البتہ زبان و بیان، اسلوب تحریر وغیرہ خاصا قدیم اور معرب و مرصع تھا۔ اس کے علاوہ جہاں جہاں مسودوں کو دیمک چاٹ گئی تھی، عبارت بھی بے ربط تھی۔

ان میں سے ایک سرگزشت "جن زادی" بغداد قدیم سے شروع ہوتی ہے۔ حافظ رحمت علی مرحوم ہی کے عزیزوں سے یہ معلوم ہوا تھا کہ حافظ صاحب کی زندگی کا کچھ حصہ بغداد میں بھی گزرا۔ وہاں ان کا قیام حضرت عبدالقادر جیلانیؒ (غوث پاک) کے مقبرے کی حدود ہی میں تھا۔ اس

پراسرار سرگزشت کے مرکزی کردار جن زادی سے حافظ صاحب کی ملاقات بغداد ہی میں ہوئی تھی۔ یہ نایاب سرگزشت ہم ازسرنو کہانی کی صورت میں ترتیب دے کر اپنے اسلوب اور زبان و بیان میں تحریر کر رہے ہیں' مگر اس سے پہلے ہم چند ضروری باتیں عرض کر دینا چاہتے ہیں۔ جنات سے متعلق مندرجہ ذیل مطالعہ اور تحقیق میں ہماری شریک حیات کی تلاش و کاوش کو بھی بڑا دخل ہے۔

ملائکہ اور جنات کا ذکر قرآن حکیم میں ایک سو اٹھارہ (118) جگہ موجود ہے۔ سورۂ جن اور قرآن کی دیگر سورتوں کے علاوہ سورۂ حجر' سورۂ صفات اور سورۂ ملک کی مختلف آیات میں بھی جنات کا ذکر یوں کیا گیا ہے کہ جن اگرچہ عالم بالا کی طرف پرواز کر سکتے ہیں مگر ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اس سے اوپر جانے کی کوشش کریں تو انہیں روک دیا جاتا ہے۔

اصطلاح کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی اس مخلوق کا نام جن ہے' جسے آگ کے شعلوں سے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اپنے مادے کی لطافت کے سبب ایسی قوت اختیار کرتے ہیں کہ حسب منشا ہر صورت میں متشکل ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے نار سموم کو پیدا کیا۔ یہ وہ آگ تھی جس میں دھواں نہ تھا۔ اسی آگ سے اللہ نے جنات کو پیدا کیا۔ جنات کا ظاہری جسم انسان کی روح ہوائی کی طرح لطیف ہے۔ روح کے ساتھ اختلاط سے اس کی لطافت اور بڑھ جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جنات کا ظاہری جسم مختلف شکلیں یا قالب اختیار کر سکتا ہے۔ یہ مخلوق کبھی اصل صورت پر باقی رہ کر مسامات اور رگوں کے ذریعے جسم انسانی میں داخل ہو کر تغیرات کا باعث ہوتی ہے اور کبھی کوئی کثیف جسم اختیار کر کے اچھی بری یا ہولناک شکل و صورت میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔

انہی حقائق کی آڑ میں پیشہ ور پیروں اور فقیروں نے مختلف ذہنی عوارض میں مبتلا مریضوں کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے' جنات سے انسان بہرحال افضل ہے' نہ تو جنات کے وجود سے انکار ممکن ہے' نہ انہیں انسان سے برتر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ ایسی مثالیں خال خال ہیں کہ کوئی انسان' جن کے زیر اثر آ گیا ہو ورنہ تو اکثر توہمات اور ذہنی بیماریوں ہی کو جنات کا اثر سمجھ لیا جاتا ہے جس کی وجہ ناخواندگی ہے۔

سائنس اور جدید علوم نہ تو جن کی تائید کرتے ہیں نہ تردید۔ سائنس کا یہ دائرہ عمل ہی نہیں۔ سائنسی تجربات سے جہاں اور بہت سے حقائق ثابت کرنا ممکن نہیں' جن کے وجود کو بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا' لیکن اگر خوردبین سے بھی کوئی شے نظر نہ آ سکے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ جنات کا تعلق کرۂ ارض کے کسی خاص حصے ہی سے نہیں' یہ ہر جگہ اور ہر خطہ زمین پر پائے جاتے ہیں۔ مغرب میں بھی ویمپائر' ڈریکولا وغیرہ جنات ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ جنات کے بارے میں حافظ رحمت علی مرحوم کا تحریر کردہ مسودہ پڑھ کر متعدد باتیں منکشف ہوئیں جن کا علم ہمیں پہلے نہیں تھا۔ ہم اس پراسرار سرگزشت کے ذریعے آپ کو بھی ان انکشافات میں شریک کر رہے ہیں۔

شمیم نوید۔ کراچی

ان دنوں عراق کے صحراؤں میں یہ خبر گرم تھی کہ آدم زاد کسی نئے شہر کی بنیاد رکھنے والے ہیں۔ ابھی تک یہ تصدیق نہیں ہو سکی تھی کہ نیا شہر کہاں بسایا جائے گا۔ جب بھی کوئی ایسا واقعہ پیش آتا جنات میں کھلبلی مچ جاتی۔ قبیلوں کے سردار سر جوڑ کر بیٹھ جاتے اور ایک دوسرے سے مشورے کرتے' سوچتے کہ کیا تدبیر ہو جو آدم زاد کوئی نئی بستی نہ بنا سکیں۔

اس وقت میرا لڑکپن تھا اور میری عمر زیادہ نہیں صرف سو سال تھی' مگر تمام واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ ایک شام کا ذکر ہے جب میری ماں سہلوبہ گھبرائی ہوئی سی کھنڈرات میں داخل ہوئی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''اے دینار! کیا تو نے اپنے باپ اخضم کو کہیں دیکھا ہے؟''

''نہیں اے میری ماں!'' میں نے جواب دیا' پھر دریافت کیا۔ ''تو مجھے کچھ پریشان سی لگتی ہے' کیا بات ہے؟''

''تو نے ٹھیک سمجھا اے دینار!'' میری ماں نے تصدیق کی اور کہنے لگی۔ ''ابھی تو بچی ہے اس لئے شاید میری پریشانی کی وجہ نہ سمجھ سکے۔ اپنے باپ اخضم اور بھائی یوسف کو آ جانے دے پھر بتاؤں گی کہ میں نے انبار میں کیا دیکھا اور سنا ہے۔''

''تو وہاں انبار کیوں گئی تھی اے میری ماں؟...... میں نے تو سنا ہے کہ وہاں مسلمان آدم زادوں کا خلیفہ رہتا ہے۔'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں انبار ہی خلیفہ ابو جعفر عبداللہ المنصور کا شہر ہے۔ تجھے یقیناً معلوم نہیں ہو گا اے دینار کہ اب سے بارہ برس پہلے ابو العباس سفاح' حرہ سے انبار چلا گیا تھا اور پھر اس نے انبار ہی کو دارالخلافہ بنا لیا تھا۔ تبھی سے اسے خلیفہ کا شہر کہا جاتا ہے۔ میں وہاں یہ سن گن لینے گئی تھی کہ خلیفہ کے حکم پر نیا شہر کہاں بسایا جانے والا ہے۔'' ابھی میری ماں اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ مزید کچھ کہنے سے رک گئی۔

''کیا ہوا اے میری ماں! تو چپ کیوں ہوگئی؟'' میں نے معلوم کیا۔

''مجھے تیرے باپ اخضم کی خوشبو آ رہی ہے۔'' میری ماں نے بتایا۔'' وہ اسی طرف آ رہا ہے۔ کیا تجھے اس کی خوشبو نہیں آئی؟''

اپنی ماں کے توجہ دلانے پر میں نے اس طرف دھیان دیا اور بولی۔'' ہاں مجھے بھی اس کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔''

جس طرح آدم زادوں کے چہرے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں' اسی طرح ان کے جسموں کی بو بھی جدا جدا ہوتی ہے۔ ایسا ہی ہم جنات کے ساتھ بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عام آدم زاد مختلف جسموں کی بو کو الگ الگ شناخت نہیں کر سکتے' لیکن جنات ایک دوسرے کے وجود کی بو بآسانی پہچان سکتے ہیں۔ میری ماں نے اسی لئے میرے باپ اخضم کی خوشبو کو پہچان لیا تھا۔ ایک جن زادی ہونے کے سبب یہ صفت میرے اندر بھی تھی۔

میرا باپ آ گیا تو اس نے میری ماں سے سوال کیا۔'' اے دینار کی ماں! تجھے میں نے انبار بھیجا تھا' وہاں سے تو کیا خبر لائی؟''

''اے اخضم! میں جو خبر لے کر آئی ہوں' وہ ہمارے پورے قبیلے کیلئے دکھ دینے والی ہے۔'' میری ماں نے پرتاسف آواز میں کہا۔

''تو نے مجھے یہ بتا کر فکرمند کر دیا۔''

''ہاں اے میرے بچوں کے باپ اخضم! بات فکر ہی کی ہے۔ شاید ہمارے قبیلے کو بابل کے ان قدیم کھنڈرات سے کہیں اور کوچ کر جانا پڑے۔''

''خدا نہ کرے۔'' میرے باپ نے بہ عجلت کہا۔'' ایسی بات زبان پر نہ لا اور مجھے یہ بتا کہ انبار میں تجھے کیا معلوم ہوا؟''

''میں تجھے وہی تو بتانے والی ہوں اے اخضم! تیری یہ اطلاع درست نکلی ہے۔ نئے شہر کی بنیاد رکھنے کیلئے خلیفہ کے ایک معتمد خالد بن برمک نے بڑا خطرناک مشورہ دیا ہے۔ خالد بن برمک دیوان الخراج یعنی محکمہ مال کا منتظم اعلیٰ ہے۔ خلیفہ اس کے مشوروں کو بڑے دھیان سے سنتا ہے۔ یہاں سے تقریباً پانچ فرسخ (پندرہ میل) پر دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پر خالد نے نیا شہر بسانے کا مشورہ دیا ہے۔'' میری ماں تفصیل بتانے لگی۔

اسی وقت میرا بھائی یوسف بھی وہاں آ گیا تو میرے باپ نے اسے مخاطب کیا۔

''آرام سے بیٹھ اور دھیان سے اپنی ماں کی باتیں سن! یہ انبار میں خلیفہ المنصور کے محل سے ہو

کر آئی ہے۔'' یہ کہہ کر میرے باپ نے میری ماں سے کہا:'' مجھے اس بات میں زیادہ وزن معلوم نہیں ہوتا۔ دریا کے دونوں کناروں پر شہر بسانے کا مطلب تو گویا یہ ہوا کہ دریا نئے شہر کے درمیان سے گزرے گا۔''

''ہاں اخضم! خلیفہ نے جب خالد سے وضاحت طلب کی تھی تو اس نے بھی یہی کہا تھا۔'' میری ماں بولی۔'' دریا نئے شہر کے درمیان ہی سے گزرے گا۔ خدانخواستہ اگر کل کے اجلاس میں خلیفہ نے خالد کی تجویز کو قبول کر لیا تو ظاہر ہے ہمارا قبیلہ ان کھنڈرات میں آباد نہیں رہ سکے گا۔ ہم آدم زادوں کی کسی بستی کے اتنے قریب رہے تو ہر وقت خطرے کی زد میں رہیں گے۔''

میں تو خیر ابھی چھوٹی تھی اور نوجوانی کی حدود میں قدم رکھ رہی تھی مگر میرا بھائی یوسف جوان اور باشعور تھا۔ اس کی عمر مجھ سے ڈیڑھ سو سال زیادہ تھی۔ اسے بھی کسی نئے شہر کے بسنے کا علم تھا۔ میری ماں کی بات ختم ہوتے ہی وہ بول اٹھا۔

''اے میری ماں! اب تک ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ وہ یہ کہ آخر خلیفہ المنصور کس لئے کوئی نیا شہر بسانا چاہتا ہے؟''

''اے میرے بچے یوسف! تیرے سوال کا جواب میں دوں گا۔'' میرے باپ نے کہا۔'' انبار پر راوندیہ آئے دن یورش کرتے رہتے ہیں۔ یہ خراسان کے رہنے والے بدعقیدہ لوگ ہیں۔ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ ذات برحق' فرشتوں اور پیغمبروں کی ارواح کسی بھی آدم زاد کے اندر حلول کر سکتی ہیں۔ یہ بھٹکے ہوئے لوگ تناسخ اور حلول کے قائل ہیں۔ نیا شہر بسا کر اور وہاں منتقل ہو کر ایک تو راوندیوں کے فتنے سے خلیفہ بچنا چاہتا ہے' دوسرا یہ کہ انبار میں اسے ہر وقت اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے۔ حفاظتی نقطہ نظر سے انبار مناسب جگہ نہیں۔''

''مگر خلیفہ کیلئے کوفہ کیا برا ہے؟'' یوسف بول اٹھا۔'' جغرافیائی اور حفاظتی اعتبار سے اس شہر کو دارالخلافہ بنایا جا سکتا ہے۔ اے میرے باپ!

''یقیناً تو نے درست کہا اے میرے بیٹے یوسف! لیکن تجھے شاید یہ معلوم نہیں کہ اہل کوفہ کو وہاں خلیفہ کی سکونت ناگوار ہے۔'' میرا باپ بولا۔ پھر وہ میری ماں سے مخاطب ہوا۔

''اے سہلوبہ! کل خلیفہ نے جو اجلاس طلب کیا ہے' اس میں حتمی فیصلہ ہونا ہے اس لئے تجھے کل بھی انبار جانا ہے۔ تو نے جن خدشات کا اظہار کیا ہے' اللہ ان سے ہمیں بچانے والا ہے' لیکن جو تقدیر کر دیا گیا اسے بدلنا ممکن نہیں۔''

یہ بھی اسی رات کا ذکر ہے کہ میں نے اپنی ماں سے اس کے ساتھ انبار چلنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

"کیا......؟ تو ہوش میں تو ہے اے دینار! میں تجھے اپنے ساتھ آدم زادوں کی بستی میں لے جاؤں...... ناممکن۔"

"لیکن کیوں اے میری ماں!" میں ضد کرنے لگی۔ "میں نے آج تک کوئی محل نہیں دیکھا۔"

"کچھ چیزوں کو نہ دیکھنا ہی بہتر ہوتا ہے۔" میری ماں نے کہا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولی۔ "اے دینار! کیا تو وہ ساری باتیں بھول گئی جو میں نے تجھے آدم زادوں کے بارے میں اب تک بتائی ہیں؟ یہ آدم زاد بہت خطرناک ہوتے ہیں اور موقع ملنے پر ہم جنات کو اپنے قبضے میں بھی کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہمارے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ آدم زادوں کی بستیوں میں داخل ہونے کے بعد ہم جنات کیلئے ہر طرف خطرہ ہوتا ہے۔ تو پھر میں تجھے خطرے میں کیوں ڈالوں۔"

"مگر اے میری ماں! جو خطرہ وہاں میرے لیے ہے تو بھی تو اس سے بچی نہ رہ سکے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"میری بات اور ہے میری بچی! تیری اور میری عمروں میں صدیوں کا فرق ہے۔ ابھی تجھے وہ تجربات نہیں ہوئے جن سے میں گزر چکی ہوں۔ انہی تجربوں کی بنا پر میں آدم زادوں سے نمٹنا اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں ان کے چنگل میں نہیں پھنس سکتی' لیکن تیری بات اور ہے' تجھے فریب دیا جا سکتا ہے۔ سو اے دینار! ضد نہ کر...... میں تجھے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گی۔"

میں سمجھ گئی کہ میرا اصرار بیکار ہے' میری ماں مجھے اپنے ساتھ انبار نہیں لے جائے گی۔ پھر میں نے مزید ضد نہیں کی۔

یہ بات غالباً آدم زادوں اور جنات دونوں کی سرشت میں شامل ہے کہ انہیں جس کام سے روکا جائے اس کی طرف ضرور مائل ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ بچپن سے میری ماں یہ تاکید کرتی رہی تھی کہ آدم زادوں کی بستیوں میں نہ جاؤ' ان سے کوئی تعلق نہ رکھو' مجھ پر اس تاکید کا الٹا اثر ہوا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی میں نے آدم زادوں کی بستیوں میں آنا جانا شروع کر دیا تھا' مگر چوری چھپے اس کا علم نہ میرے والدین کو تھا' نہ بھائی

یوسف کو۔ آدم زادوں کو حیران کر دینے میں مجھے بڑا مزہ آتا تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر میری سرگزشت میں آگے آئے گا۔ فی الحال تو میں نے انبار جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے اپنی ماں سے یہ غلط نہیں کہا تھا کہ میں نے کوئی محل نہیں دیکھا تھا۔ چوری چھپے خلیفہ کے محل میں داخل ہونے پر مجھے یہ اطمینان بھی تھا کہ میری ماں بھی وہاں ہو گی اور کسی بھی ممکنہ خطرے سے میں اس کی موجودگی میں بچی رہوں گی۔ آدم خطرناک ہرگز نہیں ہیں جتنا انہیں جنات نے بدنام کر رکھا ہے۔ یہ تاثر میرے لڑکپن کا ہے' بعد میں مجھ پر کیا گزری' یہ بعد ہی میں بتاؤں گی۔

دوسرے دن شام ہونے سے پہلے ہی میں فضا میں پرواز کر گئی۔ اس وقت تک میری ماں انبار جانے کیلئے کھنڈرات سے روانہ نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ابھی فضا میں منڈلاتے رہنا تھا تاکہ ماں کا تعاقب کر سکوں۔ اس کیلئے مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اپنی ماں سے کتنے فاصلے پر رہ کر اس کا تعاقب کرنا ہے۔ اس احتیاط کی وجہ میرے وجود کی مخصوص خوشبو تھی جسے محسوس کر کے وہ میری موجودگی سے باخبر ہو سکتی تھی۔ اپنی ماں کے تعاقب کا ایک سبب یہ تھا کہ میں پہلے کبھی انبار نہیں گئی تھی۔

اپنی ماں کے پیچھے کچھ فاصلے سے میں فضا میں تیرتی ہوئی انبار پہنچ گئی۔ دور ہی سے مجھے خلیفہ کے محل کے گنبد و مینار نظر آ گئے۔ میری ماں اسی طرف بڑھ رہی تھی۔ چند لمحے بعد ہی میں محل کے اندر تھی۔ پرتعیش زندگی گزارنے والے خلیفہ المنصور کا محل دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔ غریب آدم زادوں کی بستیوں اور اس محل میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ محل میں ہر طرف جیسے رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا سبب مختلف رنگوں کے ریشمی پردے تھے جنہوں نے در و دیوار کو ڈھانپ رکھا تھا۔ میں محل کے سحر میں ایسی گم ہوئی کہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اس وقت میں چونک اٹھی جب ایک آشنا آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "مجھے معلوم تھا اے دینار کہ تو باز نہیں آئے گی۔" یہ میری ماں سہلوبہ کی آواز تھی۔

"م...... ماں!" میں ہکلا کے رہ گئی۔

"میرے ساتھ ساتھ رہ!" میری ماں نے کہا۔ "تو جو کچھ دیکھے اور سنے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔"

"میں ایسا ہی کروں گی۔" میں نے یقین دہانی کرائی۔

"کاش تو مجھے ادھر آتے ہوئے راستے میں نظر آ جاتی تو میں تجھے وہیں سے واپس

کر دیتی مگر اب...... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" میری ماں کے لہجے میں تاسف تھا...... میں کچھ نہیں بولی اور خاموشی سے اس کے ساتھ محل کے دیوان خاص میں پہنچ گئی۔

خلیفہ المنصور آ چکا تھا اور اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ میں نے پہلی بار مسلمانوں کے خلیفہ کو دیکھا تھا۔ اس کا رنگ گندم گوں تھا اور قد لمبا، دونوں رخسار قدرے نحیف تھے۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت متاثر کن نہیں تھی، لیکن جب وہ کچھ دیر بعد بولا تو میری رائے بدل گئی۔ اس کی بھاری گونجدار سی آواز میں بڑا رعب و دبدبہ تھا، یوں جیسے اسے خلیفہ ہونے کا پوری طرح احساس ہو۔

اسی اجلاس میں مجھے معلوم ہوا کہ خالد بن برمک ہی کی تجویز پر خلیفہ نے اس کے بتائے ہوئے مقام کا جائزہ لینے کچھ لوگوں کو بھیجا تھا۔ وہ بھی اس اہم اجلاس میں موجود تھے۔ جو وفد بھیجا گیا تھا اس کے نگران موسیٰ بن کعب نے خلیفہ المنصور کے پوچھنے پر بتایا۔ "وہ ایک ایسا مقام ہے جہاں پر کشتیوں کے ذریعے شام، رقہ، مصر اور مغرب کے مختلف شہروں سے رسد آ سکتی ہے نیز چین، ہند، بصرہ، واسط، دیار بکر، روم اور موصل سے دریا کے رستے ارمینیہ اور اس کے ملحقات سے غلہ بخوبی پہنچ سکتا ہے۔"

"ہمیں یہ بتا اے موسیٰ کہ اگر اس جگہ شہر بسایا جائے تو کیا وہ دشمن کے حملے سے محفوظ رہ سکے گا؟" خلیفہ المنصور نے سوال کیا۔

"اے امیر المومنین! یقیناً!" موسیٰ بن کعب نے جواب میں کہا۔

"اپنے یقین کی وضاحت کر۔" خلیفہ المنصور نے حکم دیا۔

"جسور (پل) اور قناطیر (جو چیز پانی پر اترنے کی غرض سے بنائی جائے مثلاً پل باندھنا وغیرہ) کے سوا اس مقام کو کسی ذریعے سے عبور نہیں کر سکتے اے امیر المومنین!" موسیٰ بتانے لگا۔ "جب آپ ان کو منقطع کر دیں گے تو دشمن بے بس ہو جائے گا۔ آپ بصرہ و کوفہ اور واسط و موصل کے درمیان میں دریا، خشکی اور پہاڑ کے قریب مقیم رہیں گے۔"

"ہمیں یوں لگتا ہے کہ اس جگہ ایک ایسا شہر تعمیر ہونے والا ہے جو صدیوں قائم رہے گا۔ دنیا جب بھی اس شہر کا ذکر کرے گی تو اسے تعمیر کرانے والے کا نام بھی ساتھ میں لے گی۔" خلیفہ منصور کی رعب دار آواز دیوان خاص میں گونجی۔ "کل ہم بہ نفس نفیس اس مقام کا معائنہ کر کے اپنا فیصلہ سنائیں گے۔ اگر ہمارا فیصلہ وہاں شہر بسانے کے حق میں ہوا تو کل ہی موقع پر سب کو آگاہ کر دیا جائے گا۔"

پھر خلیفہ المنصور نے اجلاس برخاست کر دیا۔

میری ماں نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا اور میں اس کے ساتھ محل سے باہر آ گئی۔

"فیصلہ تو آج بھی نہیں ہوا اے میری ماں!" میں نے اپنی ماں کے ساتھ ساتھ انبار سے بابل کی طرف پرواز کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں اے دینار!...... لیکن مجھے خلیفہ کی باتوں سے ایسا لگتا ہے کہ اسے تجویز کردہ مقام پر نیا شہر بسانے میں دلچسپی ہے۔" میری ماں بولی۔ "تو نے دیکھا نہیں کہ وہ کس طرح شہر بسانے پر خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ خلیفہ اس جگہ نیا شہر بسانے کا حکم صادر کر دے، ہمیں اپنے تحفظ اور مستقبل کے بارے میں کچھ نہ کچھ سوچنا پڑے گا۔ ہمارے قبیلے کی نئی نسل کو آدم زادوں کی کسی بستی سے اس قدر قریب نہیں رہنا چاہیے۔"

مجھے معلوم ہے کہ میری عمر کے جن زادوں اور جن زادیوں کو جنات کی نئی نسل میں شمار کیا جاتا تھا۔ اپنی ماں کے خیالات اور آدم زادوں کے متعلق خدشات سے ہر چند مجھے اتفاق نہیں تھا، اس کے باوجود میں نے اپنے اختلاف کے اظہار سے گریز کیا۔ اس کا سبب اپنی ماں کی خوشنودی حاصل کرنا بھی تھا تاکہ وہ میرے باپ اخضم سے میری حالیہ نافرمانی کا تذکرہ نہ کرے۔ پھر یہی بات میں نے اپنی ماں سے کہہ بھی دی۔

"اے دینار! اگر تجھے اپنے باپ کی عزت کا اتنا ہی خیال ہے اور تو اس سے ڈرتی ہے کہ اسے تیری نافرمانی کا پتہ نہ چل جائے تو پھر آئندہ ایسا کبھی نہ کیجیو! تجھے میں جو نصیحت کرتی ہوں تو وہ تیری بھلائی کیلئے ہے۔ کیا تجھے اس بات پر فخر محسوس نہیں ہوتا کہ تیرا باپ اخضم ان سات جنات میں سے ایک ہے جو سب سے پہلے ایمان لائے۔"

"کیوں نہیں اے میری ماں!...... میں اپنے نیک باپ پر فخر کرتی ہوں اور جانتی ہوں کہ ہمارے قبیلے والوں نے اسی وجہ سے اسے اپنا سردار بنایا ہے۔" میرا جواب سن کر میری ماں خوش ہو گئی اور کہنے لگی۔ "یہ بات تیرے میرے درمیان ہی رہے گی کہ تو بھی انبار گئی تھی۔"

"تو کتنی اچھی ہے اے میری ماں!" میں یہ کہہ کر غیر ارادی طور پر اس سے لپٹ گئی اور پھر فوراً ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اسے چھوڑ دیا۔ چند ہی لمحوں میں ہم نسبی بلندی سے بہت نیچے آ گئے تھے...... میں یہ بھول گئی تھی کہ فضا میں پرواز کرتے ہوئے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

اسی رات میرے باپ نے بعد نماز عشاء قبیلے کے سرکردہ جنات پر مشتمل اجلاس بلا

لیا۔

مقررہ وقت پر میرے باپ کی صدارت میں وہ اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس میں جنات کی نئی نسل کو مدعو نہیں کیا گیا تھا' پھر بھی میں نے اپنے تجسس کے تحت اس کی پوری کارروائی دیکھی اور سنی' میں ایک شکستہ دیوار کے پیچھے چھپ گئی تھی۔

آدم زاد صحرا میں کوئی نیا شہر بسانے والے ہیں' اس کا علم اجلاس میں شریک تمام ہی جنات کو تھا۔ میرے باپ نے اجلاس بلانے کی غرض و غایت بیان کی اور خلیفہ المنصور کے عزائم سے جنات کو آگاہ کیا۔

''بہت ہو گیا اے سردار اعظم!'' ایک جن زاد کہنے لگا۔

''ہم نے آدم زادوں کو بہت ڈھیل دے دی' اب سختی کرنی پڑے گی۔''

''آدم زادوں کو شاید یاد نہیں رہا کہ زمین پر پہلا حق ہمارا ہے۔'' دوسرا جن زاد بولا۔

''یقیناً آدم زاد ہم سے ہمارا یہ شرف نہیں چھین سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہمیں خلق کیا' پھر انہیں۔ وہ اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جبکہ ان سے اشرف ہم ہیں۔''

تیسرا جن زاد کہنے لگا۔ ''ان آدم زادوں نے رفتہ رفتہ ساری ہی زمین پر قبضہ کر لیا ہے اور ہمیں بے دخل کرتے جا رہے ہیں۔ ان خالات میں ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ آدم زادوں کو یہاں سے بھگا دیں' اگر وہ بابل کے قریب کوئی شہر بسانا چاہیں!''

''لیکن کیا یہ اپنی حدود سے تجاوز کرنا نہیں ہوتا؟'' میرے باپ اعظم نے وہاں موجود جنات سے سوال کیا۔

''نہیں اے سردار اعظم!'' ایک ساتھ کئی جن زادوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔

''میرا خیال یہ ہے کہ آدم زادوں کو نئے شہر اور بستیاں آباد کرنے سے روکنے کے بجائے ہمیں اپنے تحفظ کی فکر کرنی چاہئے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں جن پر ہم غور کر سکتے ہیں۔ اگر وہ دریا کے دونوں کناروں پر کوئی شہر بسا بھی لیتے ہیں تو کیا ضروری ہے کہ ہم بابل چھوڑ کر چلے جائیں! پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے کہ ہم اپنی حفاظت کی خاطر آدم زادوں کی بستیوں میں نہیں گئے۔''

میرا باپ اعظم بولتا رہا اور جنات خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ آخر میں اس نے کہا۔ ''ہم اپنے بزرگوں کے تعلیم کردہ عملیات کا سہارا بھی لے سکتے ہیں۔ ان عملیات کا

توڑ آدم زاد نہیں کر پائیں گے۔ بابل کے ان کھنڈرات کے گرد اگرد ایسا حصار کھینچا جا سکتا ہے جسے کوئی آدم زاد عبور نہ کر سکے۔ ہمیں اپنی حفاظت ہی تو کرنی ہے۔''

''ہم جان گئے اے سردار اعظم کہ تو آدم زادوں سے جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا...... اور اگر تو ایسا چاہتا ہے تو لازماً اس میں بھی ہماری کوئی بھلائی ہو گی۔'' ایک عمر رسیدہ جن نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''یوں بھی ابھی یہ ایک مفروضہ ہے کہ تجویز کردہ جگہ ہی کوئی نیا شہر تعمیر ہو گا۔ پہلے خلیفہ المنصور خود تو کسی نتیجے پر پہنچ جائے' پھر سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے!'' ایک اور بزرگ جن نے کہا۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' تجویز کردہ جگہ کا نام باغ داد ہے۔'' ایک بوڑھا جن کہنے لگا۔ ''اور اس سلسلے میں ایک روایت بھی مشہور ہے۔''

''ہاں وہ روایت مجھ تک بھی پہنچی ہے۔'' میرے باپ نے تصدیق کی۔ ''دریا کے کنارے کبھی اس جگہ ایک باغ تھا۔ اس جگہ ہر ہفتے ایک خوش خو اور عادل بادشاہ کہ نام جس کا نوشیرواں سنا گیا ہے' مظلوموں کی دادرسی کرنے آتا تھا۔ سو اس بنا پر یہ جگہ باغ داد کہلانے لگی اور پھر کثرت استعمال سے الف ساقط ہو گیا۔ اب اس مقام کا نام باغ داد نہیں' بغداد ہے۔ کیا خبر خلیفہ المنصور تک بھی یہ روایت پہنچی ہو۔''

جنات کا وہ اجلاس جو تند و تیز تقریروں سے شروع ہوا تھا' نرم خوئی اور مصالحت پر ختم ہوا۔ طے پایا کہ آئندہ روز خلیفہ المنصور جو فیصلہ کرے گا اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے جنات اپنے لئے لائحہ عمل مرتب کریں گے۔

ہر چند کہ ہمارے قبیلے میں زیادہ تعداد اہل ایمان جنات کی تھی' مگر دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے کافر جن بھی تھے۔ جنات کے اجلاس میں سخت تقریریں کرنے والے یہی کافر جن تھے' اس کا سبب مسلمان آدم زاد خلیفہ تھا۔ اہل ایمان کے خلاف اپنے اندر چھپی ہوئی نفرت کو وہ دبا نہیں سکے تھے۔ انہیں نفرت کے اظہار کا موقع مل گیا تھا۔ دراصل انہیں آدم زادوں سے نہیں' مسلمانوں سے نفرت تھی۔ اس کے باوجود کافر جن میرے باپ کی بہت عزت کرتے تھے۔ رواداری' اخوت و مساوات کے اصولوں پر عمل نے سارے قبیلے میں میرے باپ کو مقبول بنایا ہوا تھا۔

پھر اگلے روز وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ خلیفہ المنصور نے مجوزہ مقام کا جائزہ لیا اور

وہاں اپنا دارالخلافہ بنانے کے عزم کا اظہار کر دیا۔ سو نئے بسائے جانے والے شہر کا نام خلیفہ نے بغداد ہی رکھا۔

بغداد شہر کے سنگ بنیاد رکھے کی تقریب میں کسی جن کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ حکم میرے باپ اور سردار قبیلہ اعضم ہی کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ اس حکم کا مقصد یہ تھا کہ آدم زادوں اور جنات کے درمیان معرکہ آرائی کی نوبت نہ آئے۔ کوئی بھی شرپسند و کافر جن اس تقریب میں ہنگامہ کر سکتا تھا۔ میرے قبیلے کے اکثر جنات بغداد کی تعمیر سے خوش نہیں تھے مگر میرے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ اپنی مستقل سکونت بابل سے کچھ ہی فاصلے پر آدم زادوں کی ایک نئی بستی بسنے سے میں ذاتی طور پر بہت خوش تھی۔ مجھے آدم زادوں کو دوست بنانا پسند تھا۔ کوفہ، موصل، نجف، بصرہ وغیرہ میں کئی آدم زادوں سے میری دوستی تھی۔ انہیں دانستہ میں نے اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے کوئی پراسرار وجود سمجھتے تھے۔ میرے والدین میری نقل و حرکت پر حتی الامکان نظر رکھتے تھے، پھر بھی میں انہیں جل دے جاتی تھی۔

نئے شہر کا سنگ بنیاد رکھے جانے کی تقریب میں بھی میں ممانعت کے باوجود شریک ہوئی۔ ابھی آدم زادوں کا وہ شہر نہیں بسا تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے اس سے ایک قرب کا سا احساس ہو رہا تھا۔ اس وقت میں خلیفہ منصور کے قریب ہی تھی جب وہ سنگ بنیاد رکھ رہا تھا۔ عمال حکومت کے علاوہ خلیفہ کے ساتھ اس کے کچھ اہل خاندان بھی تھے۔ عباسی شہزادے اپنے حلیوں، لباسوں اور رکھ رکھاؤ سے الگ ہی نظر آ رہے تھے۔ ان میں المہدی، محمد، صالح، سلیمان وغیرہ بھی شامل تھے۔ خلیفہ المنصور کے دس بیٹے تھے۔ وہ سب اس وقت اپنے باپ کے ساتھ تھے۔ بیٹوں کے علاوہ خلیفہ کی ایک بیٹی عالیہ بھی ہے، اس کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ کیوں کہ اس تقریب سے قبل ہی جنات کو خلیفہ کے فیصلے کا پتا چل گیا تھا اس لئے انہوں نے مستقبل کا لائحہ عمل طے کر لیا تھا۔ بابل کے کھنڈرات میں آباد جنات نے فی الحال وہیں سکونت پذیر رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وقتی طور پر حفاظت کی خاطر کھنڈرات کے گرد ایک حصار کھینچ دیا گیا تھا۔ اس حصار کی موجودگی میں کوئی آدم زادہ ان کھنڈرات میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ حصار کی معیاد چالیس دن تھی۔ چالیس دن گزرنے کے بعد حصار دوبارہ قائم کرنا پڑتا۔ میرے باپ اعضم کے اس فیصلے سے سارے ہی قبیلے والے خوش تھے کہ بابل میں سکونت برقرار رکھی جائے گی۔

☆.....☆.....☆

وہ لمحات مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہیں کہ شہر کا سنگ بنیاد رکھتے ہی خوفزدہ کر

دینے والی ایک دہشت ناک آواز سنائی دی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ تقریب افراتفری کا شکار ہو گئی تھی۔ پھر خلیفہ المنصور اپنے عمال اور اہل خاندان کے ساتھ وہاں رکا نہیں تھا۔ اس نے موسیٰ بن کعب کو اس واقعے کی تحقیقات کا حکم دیا تھا۔ ممکن ہے آدم زادوں کے لئے وہ دہشت ناک آواز کوئی راز ہی ہو، لیکن میرے لئے راز نہیں تھی۔ کوئی بھی جن زاد ایسی دہشت ناک آواز نکال کر آدم زادوں کو خوفزدہ کر سکتا تھا۔ مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ یہ کارستانی کسی جن کی تھی۔ جس طرح میں نے اپنے باپ کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی اسی طرح وہ کافر جن بھی اس تقریب میں شرکت کر سکتا تھا۔

پھر میرا خیال درست ہی نکلا۔ میں نے ایک کافر جن صخرہ کو بابل کی طرف فرار ہوتے دیکھ لیا تھا۔

''صخرہ!'' میں اسے آواز دیتے ہوئے اس کی طرف لپکی۔

''کیا ہے اے سردار زادی! تو نے مجھے کیوں پکارا ہے؟'' صخرہ نے بدستور پرواز کرتے ہوئے مڑ کر مجھ سے پوچھا۔

''تو نے تقریب میں شرکت کر کے پہلا قصور کیا اے صخرہ......اور......''

''تقریب میں شریک ہونا قصور ہے اے دینار تو یہ قصور تم نے بھی کیا ہے۔'' صخرہ نے میری بات کاٹ دی۔

''مگر تو تو صخرہ، حد سے گزر گیا۔ تو نے وہ دہشت ناک آواز کیوں نکالی؟'' میری آواز میں تلخی آ گئی۔

''اے دینار! تجھے مجھ سے جواب طلبی کا حق کس نے دیا؟ پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ دہشت ناک آواز میری ہی تھی؟'' صخرہ بلا جھجک بولا۔

''دیکھ اے صخرہ! تو یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ میرا باپ سردار اعضم، آدم زادوں سے معرکہ آرائی نہیں چاہتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تو اس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے آدم زادوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔ تجھے خبر ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا! اگر آدم زاد ہمارے درپے ہو گئے تو ہمیں بابل سے نکلنا پڑے گا۔ پھر دوسرے ہی نہیں خود تو بھی گھر سے بے گھر ہو جائے گا۔'' میرا انداز سمجھانے والا تھا۔

''مجھے تیری نصیحتوں کی ضرورت نہیں اے دینار!'' صخرہ نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''اگر تو نے سردار سے میری شکایت کی تو میں بھی اسے تقریب میں تیری شرکت سے آگاہ کر دوں

گا۔ تجھے شاید خبر نہ ہو کہ میں آدم زادوں سے نفرت کرتا ہوں۔"

"جانتی ہوں میں کہ تو اے صحرہ! صرف ان آدم زادوں سے نفرت کرتا ہے جن کا شمار اہل ایمان میں ہے۔" میں نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا۔

صحرہ بے حیائی سے ہنستا ہوا کھنڈرات کے اس حصے میں چلا گیا جہاں اس کے اہل خاندان کی سکونت تھی۔

ادھر تو صحرہ رخصت ہوا ادھر کھنڈرات میں داخل ہوتے ہی اپنی ماں سہلوبہ سے میری مڈبھیڑ ہو گئی۔

"کہاں سے آرہی ہے اے دینار!" میری ماں نے مجھ سے دریافت کیا۔

اسی وقت میں نے سوچا کہ اپنی ماں کو اعتماد میں لے کر صحرہ کی حرکت سے آگاہ کر دوں تو بہتر ہے۔ وہ میرے باپ کو اس سے مطلع کر دے گی۔ یوں آئندہ جنات اور آدم زادوں کے درمیان ممکنہ کسی تصادم کو روکا جا سکے گا۔

"اے میری ماں! میں نئے شہر بغداد کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں شرکت کرنے گئی تھی۔" میں نے سچ بیان کر دیا۔

"اس کے باوجود کہ تیرے باپ کی طرف سے تقریب میں کسی جن زاد کی شرکت پر پابندی تھی؟" میری ماں حیرت سے بولی۔

"میرا وہاں جانا اچھا ہوا اے ماں!" میں نے کہا۔ "اگر میں نہ جاتی تو صحرہ کی ناشائستہ حرکت کے بارے میں نہ جان پاتی۔"

"صحرہ؟ کیا وہ بھی تقریب میں موجود تھا؟" میری ماں نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا' پھر ساری بات بتا دی۔

"پھر تو یہ بات تیرے باپ کو بتانی پڑے گی اے دینار!...... شہر کی تعمیر کے دوران میں اس طرح تو آدم زادوں سے تصادم کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔"

"میں یہی تو چاہتی ہوں اے میری ماں کہ میرے باپ کو اس واقعے کا علم ہو جائے اور وہ آئندہ کیلئے ایسے واقعات کو روکنے کی غرض سے ضروری اقدامات کر سکے۔ اگر میری یہ مرضی نہ ہوتی تو تقریب میں اپنی شرکت کا راز فاش نہ کرتی۔" میں بولی۔

پھر مجھے اپنے باپ کی ڈانٹ تو سننی پڑی لیکن میرا مقصد پورا ہو گیا۔ بغداد شہر کی تعمیر میں کوئی شر پسند جن زاد رکاوٹ نہ ڈال سکے' اس کی خاطر پہریدار جنات مقرر کر دیئے

گئے۔ ان پہریداروں کو باری باری شب و روز اپنے فرائض ادا کرنے تھے۔ میں کیوں کہ ایک خطرے کے تدارک کا ذریعہ بنی تھی اس لئے مجھے بھی بغداد جانے کی اجازت دے دی گئی' مگر اس تاکید کے ساتھ کہ میں کسی آدم زاد کے قریب نہیں جاؤں گی۔

خلیفہ المنصور نے شام' کوفہ' واسط' بصرہ وغیرہ سے صناع و معمار بلوائے کہ وہ بغداد شہر تعمیر کر سکیں۔ اس کے علاوہ جن لوگوں کو فضل' عدالت' عفت' امانت اور علوم ہندسہ سے واقفیت تھی' خلیفہ نے انہیں بھی طلب کر لیا۔ امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ اور حجاج بن ارطاۃ انہی اہم شخصیات میں سے تھے۔ تعمیر شہر سے قبل حسب الحکم خلیفہ المنصور' شہر بغداد کی حدود متعین کی گئیں۔ طاقیں اور صحنچیاں قائم کی گئیں۔ شہر کی حدود کا تعین کوئلوں سے کیا گیا تھا۔ کوئلوں سے کھینچے گئے خط پر تیل ڈال کر آگ روشن کی گئی۔ تب خلیفہ المنصور نے شہر کی ان حدود کا جائزہ لیا۔ پھر خلیفہ نے اس خط پر بنیاد کھودنے کا حکم دیا۔ چار سرداران لشکر ہر چہار طرف شہر کی تعمیر پر مقرر کیے گئے۔

وہ آدم زاد جو بغداد شہر کی تعمیر میں مصروف تھے' ان سے کوئی سوال کئے بغیر مجھے بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔ ایک مرتبہ میں نے دو آدم زادوں کو باتیں کرتے سنا۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔ "اے ہاشم!" وہ اپنے ساتھی سے مخاطب تھا۔ "تجھے معلوم ہے کہ امام اعظمؒ کو چونا نیز اینٹوں کے شمار و انتظام کے کام پر کیوں مامور کیا گیا ہے؟ ان جیسے عالم و فاضل اور فقیہہ سے یہ معمولی کام کیوں لیا جا رہا ہے؟"

"مجھے اس پر حیرت تو ضرور ہے' مگر میں جانتا نہیں کہ ایسا کیوں ہے!" دوسرا آدم زاد جواب میں بولا۔

"میں تجھے بتاتا ہوں۔ اس کی وجہ خلیفہ کی مختم المزاجی ہے۔" چہرہ پر خوف کے آثار تھے۔ اسے غالباً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ خلیفہ وقت کے بارے میں اس کی راست گوئی اسے قید زندگی سے رہائی بھی دلا سکتی تھی۔

"خلیفہ کی مختم المزاجی؟ یہ تو کیا کہہ رہا ہے اے میرے دوست؟" میں تو خیر تیرا دوست ہوں' کسی اور نے تیری یہ بات سن لی تو خبر ہے تجھے کہ تجھ پر کیا گزرے گی...... خیر اب تو نے بات چھیڑ ہی دی ہے تو پوری کر!" ہاشم نامی آدم زاد کہنے لگا۔

"بات یہ تھی کہ خلیفہ نے امام اعظم ابو حنیفہؒ کو عہدۂ قضا کی پیشکش کی تھی۔" پہلے آدم زاد نے پست آواز میں بتایا۔ "امام اعظمؒ نے خلیفہ کی اس پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ ان کا

سبب یہ تھا کہ انہیں خلیفہ سے بعض معاملات میں اختلاف تھا۔ حکومت وقت کے ایک اہم عہدے کو قبول نہ کرنا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا جسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ سو خلیفہ نے قسم کھائی کہ امام اعظمؒ سے کبھی نہ کبھی کوئی ایسا غیر اہم اور معمولی کام لے گا جو ان کے شایان شان نہ ہو۔ اب تیری سمجھ میں بات آ گئی...... میں جب حضرت کو اینٹیں اٹھواتے دیکھتا ہوں تو بڑا ملال ہوتا ہے۔"

اس پر دوسرے آدم زاد نے ٹھنڈا سانس بھرا اور پھر وہ دونوں اپنے کام میں لگ گئے۔ انہوں نے ایک چابک بدست شرطے (سپاہی) کو اس طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ ہاتھوں میں چمڑے کا چابک تھامے یہ شرطے کسی کو خالی نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ کسی کو بیکار بیٹھے دیکھتے تو اسے چابک سے مارنے لگتے۔ صناع' معمار اور مزدور سبھی شرطوں سے ڈرتے تھے۔

شہر بغداد کی بنیاد رکھنے کے کچھ ہی روز بعد خلیفہ منصور نے اپنے قصر کی بنیاد رکھی۔ اس نے قصر کی بنیاد نیچے پچاس گز اور اوپر بیس گز رکھوائی۔ جب خلیفہ بنیاد کی پہلی اینٹ رکھ رہا تھا تو میں نے اسے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھتے دیکھا۔ شاید وہ کوئی قرآنی آیت یا دعا ہو گی جسے میں سن نہیں سکتی تھی۔ چند ہی روز میں دیکھتے ہی دیکھتے دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پر چھوٹی بڑی عمارتیں تعمیر ہونے لگیں۔

خلیفہ نے خالد بن برمک سے مداین اور ایوان کسریٰ کو توڑ کر بغداد میں ان کا اسباب لانے کے متعلق مشورہ طلب کیا۔

خالد بن برمک نے عرض کیا۔ "اے امیر المومنین! میرے نزدیک یہ امر غیر مناسب ہے کیوں کہ یہ آثار اسلام اور فتوحات عرب کی نشانی ہیں۔"

المنصور نے اسے محبت عجم پر محمول کر کے قصر ابیض کے توڑے جانے کا حکم دے دیا۔ لیکن چونکہ اسے توڑ کر لانے میں بہ نسبت جدید اسباب کے خرچ زیادہ پڑتا تھا' اس وجہ سے خلیفہ اس کو تڑوانے اور اسباب لانے سے رک گیا۔

یہ صورتحال دیکھ کر خالد نے خلیفہ سے کہا۔ "اب قصر ابیض کا توڑنا موقوف کرنا خلاف مصلحت ہے اے امیر المومنین!"

"وہ کیوں؟" خلیفہ نے تیوریوں پر بل ڈال کر سوال کیا۔

"اے امیر المومنین! اس سے عجمیوں کو خیال ہو گا کہ مسلمان ایسے کمزور ہیں کہ جن عمارات کو عجمیوں نے بنایا تھا' انہیں توڑ بھی نہ سکے۔" خالد نے جواب دیا۔ المنصور نے خالد

کی بات سنی ان سنی کر دی۔ اس نے قصر ابیض کو منہدم کرانا موقوف کر دیا مگر واسط' شام اور کوفہ سے دروازے اکھڑوا کر بغداد میں لایا اور شہر کو ان سے مزین کیا۔ وسط میں محل سرائے شاہی کی تعمیر عمل میں آئی تاکہ ہر طرف سے لوگوں کا بعد و قرب ایک حد معین پر رہے۔ جامع مسجد' قصر کی جانب بنوائی گئی۔ شہر پناہ دو بنوائیں۔

اندر والی پناہ' باہر کی شہر پناہ سے بلند تھی۔ مسجد کی سمت حاج بن ارطاۃ نے درست کی تھی۔ اینٹیں جن سے شہر پناہ بنائی گئی تھی ہر ایک وزن میں ایک سو رطل تھی۔

پہلے منشیوں اور سپہ سالاروں کے مکانات رحبہ سے جامع مسجد تک بنائے گئے تھے۔ بازار شہر کے اندر تھا لیکن جب خلیفہ کا قصر اور جامع مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی تو بازار کا رخ کرخ کی جانب کر دیا گیا۔ رحبہ اور کرخ بغداد کے دو محلوں کے نام رکھے گئے تھے۔ بازار کا رخ محلہ کرخ کی طرف اس لئے کیا گیا کہ مسافر بازار میں وقت بے وقت چلا کرتے تھے اور راتوں کو وہیں رہا کرتے تھے۔ مرکزی بازار میں مسافروں کے قیام کی خاطر سرائیں بنوائی گئی تھیں۔ شہر کی سڑکیں چالیس گز چوڑی تھیں۔ آدم زادوں کے کسی شہر کو تعمیر ہوتے دیکھنا میرے لئے نیا اور انوکھا دلچسپ تجربہ تھا۔

شہر' بازار' مسجد' قصر خلافت' فصیلوں' خندقوں اور دروازوں کی تعمیر میں چار کروڑ آٹھ لاکھ 33 ہزار درہم صرف ہوئے تھے۔ معماروں کو ایک قیراط یومیہ اور مزدوروں کو دو حبہ دیا جاتا تھا۔

اختتام تعمیر کے بعد سپہ سالاروں سے حساب لیا گیا جو کچھ جس کے پاس باقی نکلا خلیفہ نے واپس لے لیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ایک نیا شہر عدم سے وجود میں آ گیا۔ اب مجھے آدم زادوں سے دوستی کرنے کیلئے بصرہ و نجف یا آدم زادوں کے کسی اور شہر جانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میرے لئے بغداد ہی کافی تھا۔ اس کے باوجود میں بصرہ کے ناصر کو نہ بھول سکی۔ وہ میرے عشق میں دیوانہ تھا۔ بغداد کی تعمیر کے دوران مجھے کسی اور شہر جانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ یہ خاصا طویل عرصہ تھا۔

ایک شب جب مجھے ناصر بہت یاد آیا تو میں نے بصرہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

پہلی بار ناصر سے میری ملاقات ایک صحرا میں ہوئی تھی۔ وہ ایک کارواں کے ساتھ بصرہ جا رہا تھا کہ اس سے بچھڑ گیا۔ میں نے ایک شام اسے تنہا صحرا میں سفر کرتے دیکھا تو اس

کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔ ’’اے مسافر! کدھر کا قصد ہے؟‘‘

میری آواز سن کر وہ تقریباً اچھل پڑا‘ پھر خوفزدہ سی آواز میں کہنے لگا۔ ’’کون ہو تم......؟ اور نظر کیوں نہیں آ تیں؟‘‘

’’مجھے تم اس صحرا کی روح کہہ سکتے ہو اور روحیں نظر نہیں آ تیں۔‘‘ میں بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں والے اس نوجوان سے بولی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ’’میں بھٹک جانے والوں کو راستہ دکھاتی ہوں۔‘‘

’’تمہیں میں کس نام سے پکاروں اے صحرا کی روح؟‘‘ اس نے سوال کیا۔

’’میرا نام دینار ہے اور تمہارا؟‘‘

’’اے دینار! میں ناصر ہوں اور بصرہ میں میرے کھجور کے باغ ہیں۔‘‘ اس نوجوان نے اپنے بارے میں بتایا۔ ’’میں بھٹک گیا ہوں کیا تم مجھے راستہ دکھاؤ گی۔؟‘‘

’’میرا تو کام ہی یہ ہے‘ مگر اس کے عوض اے ناصر‘ کیا تم مجھے اپنے باغ کی کھجور کھلاؤ گے؟‘‘

’’کیوں نہیں!‘‘ اس نے فوراً جواب دیا۔ ’’میں اسے اپنے لئے باعث عزت سمجھوں گا۔‘‘

بصرہ شہر میرے لئے نیا نہیں تھا۔ میں پہلے بھی وہاں کے پھیرے لگا چکی تھی۔ صحرا میں جس جگہ ناصر مجھے ملا تھا وہاں سے بصرہ زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ میں اسے ساتھ لے کر چل دی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں سورج غروب ہو گیا اور پھر چاند نکل آیا۔

’’اے ناصر! اگر میں تمہیں نظر بھی آنے لگوں تو؟‘‘ میں نے اس سے رسم و راہ بڑھانے کی خاطر کہا۔

’’مگر اے دینار تمہی نے تو کہا تھا کہ تم ایک روح ہو اور روحیں......‘‘

’’یہ ضروری نہیں۔‘‘ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

’’اگر ایسا ہے تو پھر میں تمہیں ضرور دیکھنا چاہوں گا اے دینار!‘‘ وہ پرشوق آواز میں بولا۔ ’’مجھے یقین ہے کہ تم اپنی آواز کی طرح حسین ہو گی۔‘‘

’’اور بدشکل ہوئی تو؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ایسا ممکن ہی نہیں۔‘‘ اس نے پریقین آواز میں کہا۔

ہم جن زادوں اور جن زادیوں کیلئے کوئی بھی انسانی پیکر اپنا لینا یا کسی آدم زاد کے جسم میں داخل ہو جانا مشکل نہیں ہوتا۔ سو میں نے انسانی پیکر میں ناصر کے سامنے آنے کا فیصلہ کر لیا اور اسے مخاطب کر کے کہا۔ ’’اچھا تو پھر اپنی آنکھیں بند کر لو اے ناصر! جب میں کہوں تو آنکھیں کھولنا۔‘‘

چلتے چلتے ناصر رک گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ آنکھیں بند کر چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ایک حسین ترین انسانی پیکر اختیار کر لیا اور ناصر سے آنکھیں کھولنے کو کہا۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو میرا حسن دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ وہ جیسے پلکیں جھپکانا بھول گیا تھا‘ پھر میں نے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ چونک اٹھا۔

’’تت......تم دی......دینار......دینار ہو؟‘‘ وہ ہکلانے لگا۔

’’ہاں اے ناصر! میں تمہاری دینار ہوں۔‘‘ میں اس سے مزید بے تکلف ہو گئی۔

اس روز کے بعد ناصر سے میری ملاقاتیں جاری رہیں۔ وہ میرے عشق میں اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ ایک رات کہنے لگا۔ ’’اے دینار! میں اب تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’تم مجھ سے شادی کرو گے!‘‘ مجھے ہنسی آ گئی۔

’’کیوں‘ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟‘‘ وہ میرا ہاتھ تھام کر بولا۔ اس وقت بھی میں اسی انسانی پیکر میں تھی جسے پہلی ملاقات کے دوران اختیار کیا تھا۔

’’میں اس لئے ہنس رہی ہوں کہ تمہیں میری حقیقت کا علم ہے‘ پھر بھی مجھے پا لینے کی آرزو کر رہے ہو...... میرے خیال میں یہ نادانی ہے۔‘‘

پھر میں نے اسے کہا۔ ’’اے ناصر! تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ میری عمر کیا ہو گی؟‘‘

’’تمہاری عمر......؟ یہی کوئی سولہ سترہ سال ہو گی اور کیا!‘‘ اس نے خمار آلود سی آواز میں کہا۔

’’میں نہیں چاہتی اے ناصر کہ میری عمر کے بارے میں تم کسی غلط فہمی کا شکار رہو۔‘‘ میں بولی۔ ’’یہ میں تمہیں اس لئے بھی بتا رہی ہوں کہ تم مجھ سے شادی کرنے کو بھی کہہ چکے ہو۔‘‘ پھر میں نے اسے اپنی اصل عمر بتا دی۔ اس وقت میں اٹھانوے برس کی تھی‘ مگر مجھے یہ معلوم تھا کہ اس عمر تک پہنچتے پہنچتے اکثر آدم زادوں کی زندگی کے چراغ گل ہو جاتے ہیں۔

ناصر بے یقینی سے میری طرف دیکھنے لگا اور پھر اس نے انکار میں سر ہلایا۔
''نن.....نہیں' میں..... میں نہیں مان سکتا!''

عین اسی لمحے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی' اس کے ساتھ ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''ناصر! دروازہ کھولو۔ تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟ کون ہے تمہارے کمرے میں؟'' میں اس آواز کو پہچانتی تھی۔

''اچھا ناصر! میں چلی۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''تمہاری والدہ کو آج رات پھر شک ہو گیا ہے۔'' دوسرے ہی لمحے میں انسانی قالب سے نکل آئی۔

گھر میں ناصر کے علاوہ صرف اس کی بوڑھی ماں تھی جو پہلے بھی دو ایک بار اپنے شک کا اظہار کر چکی تھی کہ ناصر کے کمرے سے کسی لڑکی کی آوازیں آتی ہیں۔ ناصر کے پاس جھوٹ بولنے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کا باپ سال بھر پہلے مر چکا تھا اور صرف ماں زندہ تھی۔ آمدنی کا ذریعہ کھجور کے باغات تھے۔ یوں ناصر ایک خوشحال گھرانے کا فرد تھا۔ ناصر نے بتایا تھا کہ اس کی ماں چاہتی تھی کہ وہ شادی کر لے۔ اس کا لالچی چچا غفار بھی اس فکر میں تھا کہ بھتیجے کے ساتھ ساتھ اسے اپنا داماد بھی بنا لے۔ غفار اس طرح اپنے بڑے بھائی کے باغات پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ناصر ہی نے مجھے یہ ساری باتیں بتائی تھیں۔ وہ اپنے چچا کی بیٹی لیلیٰ کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اگر میں اس کی زندگی میں نہ بھی آتی تو وہ لیلیٰ سے شادی پر آمادہ نہ ہوتا۔ لیلیٰ کے ظاہر و باطن دونوں ہی ناصر کی نظر میں قابل اعتراض تھے۔ نہ اس کی صورت اچھی تھی' نہ سیرت! آخری بار ناصر سے میں اس وقت ملی جب صحراؤں میں ایک نئے شہر کی بنیاد رکھے جانے کی خبر گرم تھی۔ یہ ملاقات ایک دوپہر کو کھجور کے باغ میں ہوئی تھی۔ ناصر نے مجھ سے گلہ کیا کہ اب میں خاصے دنوں کے بعد اس سے ملنے آئی ہوں۔

''اے دینار! مجھ سے اب زیادہ عرصے تک تمہاری جدائی برداشت نہیں ہوتی۔'' ناصر کہنے لگا۔

اس روز ناصر کے چہرے سے غیر معمولی فکرمندی کا اظہار ہوا تھا۔ سو میں نے اس کی وجہ پوچھی۔

''وہی چچا غفار پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ ہر قیمت پر اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر

کے رہیں گے۔'' ناصر نے بتایا۔ ''اب تو امی بھی چچا کی ہاں میں ہاں ملانے لگی ہیں۔ اس پر تم ہو کہ غائب ہونے کے بعد پلٹ کر خبر نہیں لیتیں۔ ذرا سوچو اے دینار کہ لیلیٰ سے اگر میری شادی ہو گئی تو کیا ہو گا!''

''ہونا کیا ہے تمہارا گھر بس جائے گا۔'' میں مسکرا کر بولی۔

''تمہیں شاید اندازہ نہیں اے دینار! کہ تم اس طرح دانستہ یا نادانستگی میں میرے زخموں پر نمک چھڑک رہی ہو۔'' ناصر دکھی سی آواز میں کہنے لگا۔ اس کے چہرے سے دلی جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ مجھے اس پر رحم آنے لگا۔

''تم بھی تو چاہتے ہو اے ناصر کہ لیلیٰ سے تمہاری شادی نہ ہو!'' میں نے اس کی دل جوئی کیلئے کہا۔

''صرف یہی نہیں بلکہ لیلیٰ کے بجائے تمہیں.....''

''بس اے ناصر!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''آگے کچھ اور نہ کہنا..... میں تمہاری صرف یہی خواہش پوری کر سکتی ہوں کہ لیلیٰ سے تمہاری شادی نہ ہو۔''

''لیکن تم..... میری کیوں نہیں بن سکتیں اے دینار..... اگر اس کی وجہ میری اور تمہاری عمروں کا فرق ہے تو میں اسے نہیں مانتا۔ تمہاری عمر اگر سو برس بھی ہے تو تم مجھے قبول ہو۔ اب اس معاملے میں مزید نہ الجھاؤ ورنہ چچا غفار کا داؤ چل جائے گا۔'' ناصر نے کہا۔

''کیسا داؤ؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

''میں نے سنا ہے کہ چچا غفار ان دنوں ایک عامل سے ربط بڑھا رہے ہیں کہ میں' ان کی بدصورت اور پھوہڑ بیٹی لیلیٰ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جاؤں۔ امی کو تو وہ شیشے میں اتار ہی چکے ہیں۔''

''اے ناصر! فکر نہ کرو' کچھ بھی نہیں ہو گا۔ تمہارا لالچی چچا غفار اپنے ارادوں کی تکمیل نہ کر سکے گا۔'' میں نے اسے دلاسا دیا۔

''مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے اے دینار!'' ناصر جذباتی ہو گیا تو میں غائب ہو گئی۔
''دینار! اے دینار!'' وہ مجھے پکارتا رہا' مگر میں نے اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اس شب عرصہ دراز کے بعد جب میں بصرہ کیلئے روانہ ہوئی تو ہرگز مجھے غیر معمولی حالات کا اندازہ نہیں تھا۔ ابھی رات کا نصف پہر ہی گزرا تھا کہ میں بصرہ میں ناصر کے گھر پہنچ گئی۔
یہ دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا کہ ناصر اپنے کمرے میں تنہا نہیں تھا۔ اس کے کمرے میں

مجھے دوسرے بستر پر سوئی اور بھدے نقوش والی ایک آدم زادی بھی دکھائی دی۔ اس کے چچا کی بیٹی لیلیٰ کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اسی لئے خیال آیا کہ وہ موٹی آدم زادی کہیں لیلیٰ ہی نہ ہو! اس امکان کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ناصر کے لالچی چچا کو اپنے مقصد میں کامیابی مل گئی ہو۔ اگر میرا یہ سوچنا درست تھا تو غفار کو اسی گھر میں ہونا چاہئے تھا۔ اسے تلاش کرنے سے پہلے میں نے ناصر کو جگانا ضروری سمجھا۔ وہی بتا سکتا تھا کہ اس عرصے میں اس پر کیا گزری تھی۔

ناصر کے قریب پہنچ کر میں نے اسے دھیمی آواز میں پکارا۔ ہم جنات کیلئے اندھیرا بھی بے معنی ہے۔ اندھیرے میں بھی ہمیں سب کچھ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ کئی آوازیں دینے کے باوجود جب ناصر بیدار نہ ہوا تو میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔

''کک.....کون ہے؟'' ناصر کی ڈری ڈری سی آواز آئی۔

''میں تمہاری دینار ہوں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''دینار؟'' ناصر کے لہجے میں اجنبیت تھی۔ ''میں تو کسی دینار کو نہیں جانتا۔''

ناصر سے یہ سن کر مجھے دھچکا سا لگا۔ پھر نتائج سے بے پروا ہو کر اور یہ جاننے کے باوجود کہ ناصر وہاں اکیلا نہیں' میں نے کمرے کے ایک کونے میں رکھے ہوئے چراغ کی لو تیز کر دی۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ انسانی پیکر اختیار کر چکی تھی جس میں ناصر مجھے دیکھنے کا عادی تھا۔

''میں دینار ہوں' کیا اب بھی تم نہیں پہچانے ناصر؟'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

ناصر مجھے حیران حیران نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے قطعی یہ نہیں پتا چل رہا تھا کہ وہ مجھے جانتا پہچانتا ہے۔ اب تک میں نے یہ اندازہ تو لگا لیا تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے' لیکن اس کی نوعیت میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

میں ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ اپنے عقب میں ایک بھاری آواز سنائی دی۔ کہنے والا کہہ رہا تھا۔ ''ناصر تو اب کبھی تجھے پہچان نہیں سکے گا' ہاں میں تجھ کو پہچان گیا ہوں اے جن زادی! مجھے یقین تھا کہ تو ایک نہ ایک روز یہاں آئے گی۔''

میرے سارے وجود میں ان الفاظ کے ساتھ سنسنی سی دوڑ گئی۔ مجھے شدید خطرہ محسوس ہوا اور میں نے تیزی کے ساتھ پلٹ کر اپنی حقیقت منکشف کرنے والے کو دیکھا۔ وہ

ایک پستہ قد آدم زاد تھا۔ اس کا جسم فربہی مائل اور آنکھیں گول اور چھوٹی چمکیلی تھیں۔ یوں جیسے اندھیرے میں دو چراغ جل رہے ہوں۔ میں نے ہمت کر کے اس سے سوال کیا۔

''کون ہے تو؟''

''تیری موت اے دینا!'' اس پستہ قد آدم زاد نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ اس کے بھدے موٹے ہونٹ تیزی سے حرکت کرنے لگے۔

اب میں یہ تو پوری طرح سمجھ چکی تھی کہ وہ پراسرار آدم زاد میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ اسے نہ صرف یہ معلوم تھا کہ میں جن زادی ہوں بلکہ وہ میرے نام تک سے واقف تھا۔ مجھے موت کی دھمکی دے کر یقیناً وہ کوئی عمل پڑھنے میں مصروف تھا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل کی تکمیل میرے لئے خطرناک ہی ثابت ہوتی۔ وہ مجھے کیسے جانتا تھا اور میرا دشمن کیوں بن گیا تھا' یہ بعد کی باتیں تھیں' فوری طور پر تو میں نے اپنی جان بچانے کے بارے میں سوچا۔

یہ بات میرے علم میں تھی کہ خطرے کے وقت جنات کو انسانی پیکر ترک کر دینا چاہئے۔ سو میں نے اسی پر عمل کیا اور اس آدم زاد کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اب اس کے سامنے کوئی ہدف نہیں رہا تھا اس لئے حملہ کرنا بھی دشوار تھا۔ انسانی پیکر سے باہر نکل آنے کے بعد میری تمام جناتی صفات بیدار ہو گئی تھیں۔ مجھے ایک جانی پہچانی بدبو محسوس ہوئی اور میں چیخ اٹھی۔ ''اے صخرہ تو!''

اس آدم زاد کے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے ہونٹ ساکت ہو گئے دوسرے ہی لمحے وہ لہرا کر زمین پر آ رہا۔

☆......☆......☆

کافر جن زاد صحرہ اس آدم زاد کے قالب سے نکل کر فرار ہو رہا تھا۔ میں تذبذب کا شکار ہو گئی کہ صحرہ کا تعاقب کروں یا حقیقت حال کا پتا چلانے کیلئے وہیں رکی رہوں! گومگو کی میری اس کیفیت سے فائدہ اٹھا کر صحرہ فرار ہو گیا۔ ناصر کے گھر سے نکل کر میں نے کچھ دور تک صحرہ کا پیچھا کیا اور پھر لوٹ آئی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ صحرہ کی شکایت کرنے پر وہ دشمنی پر اتر آئے گا۔ آج رات جو کچھ ہوا تھا' اس سے تو یہی ظاہر تھا اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ صحرہ کی نظر میری نقل و حرکت پر ہو اور وہ میرا تعاقب کرتا بصرہ تک پہنچا لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں تھی۔

جس آدم زاد کے جسم میں صحرہ داخل ہوا تھا' ناصر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران میں اس نے خوابیدہ آدم زادی کو پکارا۔ ''لیلیٰ...... لیلیٰ...... ذرا پانی لاؤ۔'' میں چونک اٹھی میرا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا۔ موٹی اور بھدے نقوش والی وہ آدم زادی لیلیٰ ہی تھی۔ میں نے کچھ دیر کسی قسم کی مداخلت نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ خاموش تماشائی بنے رہنے سے بھی بہت سی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ کئی بار مزید آوازیں دینے پر لیلیٰ بیدار ہوئی۔ پھر اس کی نگاہ بے ہوش آدم زاد پر پڑی تو بستر سے اٹھی اور اپنا بھاری جسم سنبھالے آگے بڑھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''ابا...... یہ ابا کو کیا ہو گیا ناصر......؟ یہ یہاں کیسے آ گئے؟''

''بے ہوش معلوم ہوتے ہیں۔'' ناصر نے بتایا۔ ''اپنے کمرے سے یہ یہاں کس طرح آ گئے' میں نہیں جانتا۔''

پھر ناصر کے کہنے پر لیلیٰ کمرے میں موجود ایک صراحی سے کٹورے میں پانی لے آئی۔

ناصر نے بے ہوش آدم زاد کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ جلد ہی وہ ہوش میں

آ گیا اور حیران حیران سی نظروں سے ناصر اور لیلیٰ کو دیکھنے لگا جو اس پر جھکے ہوئے تھے۔ ''مجھے کیا...... کیا ہوا؟ اور...... اور میں اپنے کمرے...... میں تو وہاں...... وہاں سویا تھا۔'' وہ بڑبڑانے لگا۔

''کچھ مجھے بھی تو بتاؤ ناصر کہ یہ سب کیا ہے؟'' لیلیٰ چیخنائی۔ اس کی آواز بھی اسی کی طرح بھدی اور بے سری تھی۔

بے ہوش آدم زاد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سوالیہ نظریں بھی ناصر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''میں گہری نیند سو رہا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے کوئی مجھے آواز دے رہا ہو۔'' ناصر بتانے لگا۔ ''وہ کسی عورت کی آواز تھی جو مجھے میرا نام لے کر پکار رہی تھی۔

میں اسے کوئی خواب سمجھا اور سوتا رہا۔ کچھ ہی دیر میں کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ میں نے دیکھا کہ کمرے میں کوئی نہیں تو ڈر گیا۔ میرے پوچھنے پر کہ کون ہے؟ وہی نسوانی آواز دوبارہ سنائی دی۔ اس نے مجھے اپنا کوئی نام بتایا تھا جو اس وقت یاد نہیں آ رہا۔ بہر حال وہ نام میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ اسے نہیں جانتا۔ چند لمحے بعد ہی چراغ کی لو خود بخود تیز ہو گئی۔ اسی کے ساتھ میں نے ایک بہت حسین عورت کو اچانک کمرے میں دیکھا۔ کمرے کا دروازہ تو کھلا ہوا تھا' مگر میں نے اسے دروازے سے اندر آتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

''ناصر!'' لیلیٰ بول اٹھی۔ ''یہ تم حقیقت بیان کر رہے ہو یا اپنے کسی خواب کی روداد سنا رہے ہو!'' لیلیٰ نے برا سا منہ بنایا۔

''یقین کرو لیلیٰ! میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا ہے وہی بیان کر رہا ہوں۔ تم کہو تو میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔'' ناصر کی آواز میں بے بسی تھی۔

''قسمیں جھوٹے لوگ کھاتے ہیں۔'' لیلیٰ ناگواری سے بولی۔

''اسے پوری بات تو بتانے دو لیلیٰ بیٹی!'' ہوش میں آنے والے آدم زاد نے کہا۔

مجھے اب تک اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پستہ قد آدم زاد ناصر کا لالچی چچا اور لیلیٰ کا باپ غفار ہی ہو سکتا ہے۔ بعد میں میرا اندازہ درست نکلا۔

''ہاں تو ناصر بیٹے! تم کسی عورت کے بارے میں بتا رہے تھے جو اچانک کہیں سے کمرے کے اندر آ گئی تھی۔'' غفار نے لیلیٰ کو چپ کرا کر ناصر کو مخاطب کیا۔

"جی...... جی ہاں!...... نہ جانے اسے میرا نام کیسے معلوم تھا...... اس نے میرا نام لے کر خود کو پہچاننے کیلئے کہا تھا' مگر......" ناصر پھر شروع ہو گیا۔ "مگر میں اسے جانتا تو پہچانتا ناں!...... میں نے تو اس عورت کو زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ میں ابھی اسی عورت کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ...... کہ چچا...... میں آپ کی بھاری آواز سن کر اچھل پڑا۔ آپ اس حسین عورت سے کہہ رہے تھے کہ اسے پہچان گئے ہیں اور......"

"کیا؟" غفار کے چہرے سے شدید حیرت کا اظہار ہونے لگا' "میں...... میں نے تو اس کمرے میں تم دونوں کے سوا کسی کو دیکھا تک نہیں۔"

"پہلے آپ میری پوری بات سن لیجئے چچا!" ناصر عاجزی سے بولا۔

"اچھا' کہو! پھر تم نے کیا دیکھا اور کیا سنا' لیکن میں تمہیں ایک بات بتا دوں ناصر بیٹے! میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا اور جب میری آنکھ کھلی تو خود کو یہاں دیکھا۔ تم اور لیلیٰ مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔" غفار نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔

لیلیٰ شک بھری نظروں سے ناصر کو دیکھنے لگی' پھر بولی۔ "بابا! مجھے یہ سب ناصر کے دماغ کا فتور لگتا ہے۔"

"اگر یہ سب میرے ہی دماغ کا فتور ہے تو یہ بتاؤ چچا یہاں کہاں سے آ گئے؟" ناصر نے دلیل دی۔

"ہاں لیلیٰ بیٹی! یہ بات تو سوچنے والی ہے۔" غفار نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا' پھر ناصر سے مخاطب ہوا۔ "تو تم نے مجھے اس پراسرار عورت سے بات کرتے ہوئے دیکھا...... تمہارا کہنا ہے کہ میں اسے پہچان گیا تھا؟"

"جی ہاں چچا...... اور ہاں یاد آیا' آپ نے اسے جن زادی کہا تھا اور کوئی نام بھی لیا تھا اس کا!" ناصر اپنی پیشانی پر اس طرح ہاتھ پھیرنے لگا جیسے کچھ یاد کر رہا ہو۔ "کیا نام لیا تھا آپ نے......؟"

"جن زادی!" غفار کی آواز سے خوف جھلکنے لگا۔ "میں...... میں نے اسے جن زادی کہا تھا؟"

"کہا تو یہی تھا آپ نے چچا...... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" ناصر نے جواب دیا۔

"ناصر بیٹے! تم بڑی حیران کن باتیں کر رہے ہو۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔" غفار نے بدستور خوفزدہ آواز میں کہا۔

"آپ تو اسے پہچان گئے تھے چچا' مگر وہ...... اس نے آپ سے پوچھا تھا' کون ہے تو......؟ جواب میں آپ نے کہا تھا تیری موت...... اس کے بعد خدا جانے کیا ہوا کہ وہ خوبصورت عورت دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئی۔ آپ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ اسی حسین عورت کی تیز و بلند آواز پھر سنائی دی۔ اس نے چیخ کر کچھ کہا تھا۔ اسی کے بعد آپ لہرا کر زمین پر گر گئے تھے۔ آپ کو بے ہوش دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ لیلیٰ اب تک سو رہی تھی۔ میں نے اسے آوازیں دے کر جگایا اور آپ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ ہے پورا واقعہ جو پیش آیا۔"

غفار کے چہرے پر فکر و پریشانی کا اظہار ہونے لگا۔ لیلیٰ بیزار بیزار سی اور جھنجلائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"بابا!" لیلیٰ نے غفار کو مخاطب کیا۔ "آپ ناصر کی بے تکی باتیں سنتے رہیں مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"لیلیٰ بیٹی! تمہیں ان حالات میں نیند آ جائے گی؟" غفار تعجب سے بولا۔

"اگر آپ بھی ناصر کی باتوں کو خواب یا کوئی کہانی سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیں تو آپ بھی آرام سے سو جائیں گے بابا!" لیلیٰ نے کہا اور اپنے بستر کی طرف بڑھ گئی۔ چلتے چلتے وہ رکی اور پلٹ کر اپنے باپ سے کہنے لگی۔ "بابا! اگر آپ میری بات مانیں تو ناصر کو حضرت جی کے پاس لے جائیں' دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

"نہیں!" ناصر کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح ہاتھ اٹھا کر کہنے لگا۔ "میں...... میں حضرت جی کے پاس نہیں جاؤں گا وہ...... وہ کانٹوں بھری شاخوں سے مارتے ہیں۔"

"اگر تم حضرت جی کے پاس نہیں جانا چاہتے تو سچ سچ بتا دو' جھوٹ بول رہے تھے نا؟" لیلیٰ واپس ناصر کے پاس آ گئی۔

"ہاں...... ہاں' میں جھوٹ بول رہا تھا...... وہ خواب تھا جو میں نے بیان کیا...... اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی...... یہاں...... اس...... اس کمرے میں کوئی بھی حسین عورت نہیں آئی...... نہ چچا نے اس سے بات کی۔ اب...... اب تو تم...... تم مجھے حضرت جی کے پاس نہیں بھجواؤ گی؟" ناصر گڑگڑانے لگا۔

"دیکھ لیا بابا۔" لیلیٰ نے اپنے باپ غفار سے کہا۔ "کھل گیا نا سارا جھوٹ!" پھر وہ بڑے کریہہ انداز میں ہنسی۔

"مگر اب بھی ایک بات میرے ذہن کو الجھا رہی ہے' مجھے میرے کمرے سے یہاں کون لے کر آیا!" غفار خود کلامی میں مبتلا تھا۔ اس کی آواز لیلیٰ کی ہنسی میں دب گئی۔

"آپ جا کر سوئیں بابا!..... اور ناصر! تم چراغ کی لو دھیمی کر دو۔" لیلیٰ سلطین آواز میں بولی۔

پھر غفار تو اس کمرے سے چلا گیا اور ناصر نے چراغ کی لو دھیمی کر دی۔

آج رات جو واقعہ رونما ہوا' اس میں کئی باتیں میرے لئے حیران کن تھیں۔ ان میں سرفہرست یہ سوال تھا کہ ناصر نے میری آواز سن کر' پھر انسانی پیکر میں دیکھنے کے باوجود اور میرا نام جان کر بھی مجھے کیوں نہیں پہچانا؟ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ مجھے بھول جاتا۔

غفار کیلئے جو بات معمہ بنی ہوئی تھی' میں اس کا سبب سمجھ گئی تھی۔ اس کے جسم میں صخرہ داخل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ بھی غفار نے کیا' وہ دراصل اس کا نہیں کافر جن زاد صخرہ کا فعل تھا۔ صخرہ مجھ سے ماضی کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اسی غرض سے وہ اپنے کمرے میں سوتے ہوئے غفار کے جسم میں داخل ہوا اور ناصر کے کمرے میں عین اس وقت آ گیا جب میں انسانی پیکر اختیار کر کے ناصر سے مخاطب تھی۔ صخرہ نے مجھے اور میں نے صخرہ کو پہچان لیا تو وہ غفار کے جسم سے نکل کر فرار ہو گیا۔ اسی کے نتیجے میں غفار ہوش کھو بیٹھا۔

یہ سب کچھ حقیقت تھا کوئی خواب نہیں' تو پھر ناصر نے اسے جھوٹ کیوں مان لیا؟

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لیلیٰ نے ناصر کے بارے میں اپنے باپ کو مشورہ دیا تھا کہ اسے کسی "حضرت جی" کے پاس لے جائے۔ اسی کے بعد ناصر خوفزدہ نظر آنے لگا تھا اور اس نے اپنا بیان بدل دیا تھا۔ ناصر کی باتوں سے میں "حضرت جی" کے بارے میں یہی اندازہ لگا سکی کہ وہ کوئی ایسا آدم زاد ہے جس سے ناصر بے انتہا ڈرتا ہے۔

اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کیلئے میرے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ غفار یا لیلیٰ دونوں میں سے کسی ایک کو اپنی جناتی صفات کے اثر میں لے لوں۔ اس کے بعد میرے لئے کچھ بھی معلوم کرنا مشکل نہ ہوتا۔ اس سلسلے میں ناصر کو چھیڑنا مجھے مناسب معلوم نہ ہوا۔

بستر پر دراز ہو کر لیلیٰ کچھ ہی دیر میں خراٹے لینے لگی تھی البتہ ناصر ابھی تک کروٹیں بدل رہا تھا۔

میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے لیلیٰ کی طرف بڑھی ہی تھی کہ چونک اٹھی۔

اتنے گھر کے در و دیوار اس طرح ہلنے اور لرزنے لگے تھے جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ چند لمحوں کو میں بھی دھوکا کھا گئی' مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ کافر جن زاد صخرہ پھر لوٹ آئے گا۔ یہ صخرہ کی ہی کارستانی تھی۔ اسی نے میرے حواس کو فریب دیا تھا۔ وہ اندھیرے کی چادر اوڑھے ہوئے تھا تاکہ میں اسے نہ دیکھ سکوں' لیکن اس کے وجود کی بدبو نے سارا بھید کھول دیا۔

"تو پھر آ گیا صخرہ!" میں چیخی۔ "میں تجھے آگ کے کوڑوں سے ماروں گی۔"

"یہ نہ بھول اے دینار کہ تیری طرح میں بھی آگ سے بنا ہوں۔" صخرہ نے مجھے چڑایا۔

میں نے جھپٹ کر اس پر وار کرنا چاہا مگر اسی لمحے وہ کمرے کے دروازے سے نکل گیا۔ باہر صحن تھا صخرہ کو میں نے فضا میں تیرتے دیکھا۔ میں اس کے پیچھے لپکی وہ مجھے اپنے پیچھے لگائے ہوئے بصرہ سے بغداد تک لے آیا۔ اس کا مقصد غالباً یہی تھا کہ میں بصرہ میں مزید نہ ٹھہر سکوں۔ میں تو اس رات بغداد سے کچھ فاصلے پر واقع بابل کے کھنڈرات میں داخل ہو گئی' مگر صخرہ آگے نکل گیا۔ یقیناً وہ مجھ سے بھڑنا نہیں چاہتا تھا۔

فوری طور پر بصرہ جانا مجھے لاحاصل معلوم ہوا۔ صخرہ میری ٹوہ میں تھا۔ وہ مجھے وہاں ٹکنے نہ دیتا۔ میں نے سوچا کہ کسی اور شب بصرے کا رخ کروں گی۔ میرے قیاس کے مطابق ناصر کسی مشکل میں گرفتار تھا۔ میں نے نہ سہی مگر اس نے میرے عشق کا دعویٰ ضرور کیا تھا۔ آدم زادوں سے میری دوستی اور خلوص و محبت کا یہ تقاضا تھا کہ میں ناصر کی مدد کرتی۔

دانستہ میں نے کئی دن تک صبر کیا۔ بصرہ جانے سے پہلے مجھے صخرہ کی تلاش تھی۔ کھنڈرات میں وہ مجھے نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور آخرکار ایک شام اسے ڈھونڈ ہی لیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی رفوچکر ہونے والا تھا کہ میں نے بلند آواز میں کہا۔

"اے صخرہ! تجھے تیرے دیوتاؤں کی قسم رک جا! میں تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔"

قسم دینے پر صخرہ کو رکنا ہی پڑا۔ ہم دونوں بابل و بغداد کے درمیان دریائے دجلہ کے کنارے اتر گئے۔

"ہاں بول دینار' تو نے مجھے کیوں روکا ہے؟" صخرہ نے مجھ سے سوال کیا۔

"صخرہ! کیا تو اتنا ہی بھولا ہے کہ تجھے اپنے اور میرے درمیان کشاکش کا علم

نہیں!" میں بولی تو کوشش کے باوجود اپنا لہجہ نرم نہ رکھ سکی۔

"مجھ پر طنز نہ کر دینار! مطلب کی بات کر کہ تو کیا چاہتی ہے!" صحرہ نے کہا۔

"تو اچھی طرح جانتا ہے صحرہ کہ میں اپنے بڑے بھائی یوسف سے تیری شکایت کر دوں تو وہ تجھے زندہ نہ چھوڑے گا' یہ خبر تجھے بھی ہوگی کہ میرا بھائی غصہ ور ہونے کے ساتھ بہت قوی ہے' اس کے مقابلے پر تو ٹھہر نہ پائے گا......"

"دینار! کیا تو نے مجھے یہی دھمکی دینے کیلئے روکا ہے؟" صحرہ نے میری بات کاٹ دی۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں بات بڑھانا نہیں چاہتی صحرہ! تیرے لئے بہتر یہ ہوگا کہ میری ٹوہ میں رہنا چھوڑ دے۔"

"میں تیری ٹوہ میں کیوں رہنے لگا!" صحرہ بولا۔

"اگر تو میری ٹوہ میں نہ رہتا تو بصرہ نہ پہنچ جاتا...... میں جانتی ہوں کہ تو کیوں اور کب سے میرے خلاف ہو گیا ہے...... ہم دونوں ہی کیلئے مناسب یہ ہے کہ ماضی کی تلخیوں کو بھلا دیں اور مصالحت کر لیں۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے مصلحتاً پیشکش کی۔

"دیکھ دینار! تلخی کی ابتداء تو نے کی تھی۔" صحرہ نے شکوہ کیا۔ "بغداد شہر کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں تیری ہی وجہ سے مجھ پر افراتفری پھیلانے کا الزام لگا۔ تیرے باپ سردار قبیلہ اعظم نے مجھے چھ ماہ جلاوطنی کی سزا دی۔ اس وجہ سے میں چھ مہینے تک اپنے اہل خاندان سے دور رہا اور بابل کے کھنڈرات کا رخ نہیں کیا۔ میں اس عرصے میں دربدر بھٹکتا پھرا۔"

"مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے صحرہ!" میں نے دانستہ نرمی اختیار کی۔ "چھ ماہ تک تجھ پر جو گزری مجھے اس پر افسوس ہے۔ اپنے زخموں کو نہ کرید کہ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ مجھے تجھ سے اپنی پیشکش کا جواب مطلوب ہے۔"

"تو اگر مجھ سے مصالحت چاہتی ہے تو اے دینار! مجھے تیری پیشکش منظور ہے۔" صحرہ آخر مان ہی گیا۔

"صحرہ! میں امید رکھوں گی کہ تو اب میرے راستے میں نہیں آئے گا۔" میں نے مزید تصدیق چاہی۔

"اور دینار! مجھے بھی تجھ سے یہ توقع ہے کہ آئندہ کبھی میری غیبت نہ کرے گی۔"

ہم دونوں نے ایک دوسرے سے وعدے وعید کر لئے۔ یہ سودا مجھے مہنگا نہ لگا۔ میں نے بہرحال ایک دشمن کو اپنے خلاف قدم اٹھانے سے روک دیا تھا۔

اب مجھے بصرہ جانے میں کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ سو میں وقت ضائع کیے بغیر اسی شام بصرہ پہنچ گئی۔ خلاف توقع ناصر گھر پر نہیں ملا۔ غفار بھی نہ تھا۔ گھر میں صرف لیلیٰ تھی۔ مجھے یاد آیا کہ ناصر کی ایک بوڑھی ماں بھی تھی' وہ کہاں گئی؟

لیلیٰ کو بہت جلد میں اپنی جناتی صفات کے زیر اثر لے آئی۔ اب وہ میرے ہر سوال کا جواب دینے کی پابند تھی۔ پہلا سوال میں نے ناصر کی بوڑھی ماں کے بارے ہی میں کیا۔ لیلیٰ نے جواب دیا۔ "ان کے انتقال کو تو سال بھر سے زیادہ ہو گیا۔"

"تمہاری شادی ناصر سے کب ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"تقریباً دو سال ہونے والے ہیں۔" لیلیٰ نے بتایا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ جب ناصر سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی اور میں نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا تو چند ہی روز بعد غفار اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس سے قبل ناصر نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا لالچی چچا غفار ان دنوں ایک عامل سے ربط ضبط بڑھا رہا تھا۔ اس عامل کے ذریعے غفار' ناصر پر کوئی ایسا عمل کرا سکتا تھا کہ وہ لیلیٰ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ ایک ایک کر کے مجھے ساری باتیں یاد آ گئیں۔

"ناصر کو تم سے شادی کرنے پر کس نے مجبور کیا تھا؟" میں نے اپنی معلومات کی روشنی میں ایک اہم بات دریافت کی۔

"میرے بابا نے حضرت جی سے ناصر پر ایک عمل کرایا تھا۔ اس کے بعد ہی ناصر نے مجھ سے شادی نہ کرنے کی ضد چھوڑ دی تھی۔" لیلیٰ نے جواب دیا۔ اس کے بدلے میں میرے بابا نے حضرت جی کو کھجور کا ایک باغ دیا تھا۔"

"اور وہ باغ ناصر کے باغوں میں سے ایک ہوگا۔" میں نے تصدیق چاہی۔

لیلیٰ نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ میں سمجھ گئی کہ "حضرت جی" وہی عامل ہوگا جس کا ذکر ناصر نے مجھ سے کیا تھا۔ مجھے لیلیٰ سے یہ پوچھنا غیر ضروری معلوم ہوا کہ کیا ناصر کے سارے باغوں پر اس کے باپ غفار نے قبضہ کر لیا ہے۔ یہ بات تو مجھے خود ناصر بھی بتا چکا تھا کہ اس کا لالچی چچا' اپنی بیٹی کے ساتھ اس کی شادی کیوں کرنا چاہتا ہے۔ غفار کا اصل مقصد کھجور کے باغوں پر قبضہ کرنا تھا۔

"اس وقت ناصر کہاں گیا ہے؟" میں نے لیلیٰ سے معلوم کیا۔

"اسے بابا حضرت جی کے پاس لے گئے ہیں۔" لیلیٰ نے جواب دیا۔

"کس لئے؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔ "کانٹوں بھری شاخوں سے پٹوانے کی غرض سے؟" میری آواز میں چبھن تھی۔

"حضرت جی، ناصر کو اسی وقت مارتے ہیں جب وہ ان کی کوئی بات نہ مانے ورنہ نہیں۔" لیلیٰ میرے والوں کے جواب میں بتانے لگی۔ "دراصل ہر چالیس روز کے بعد ناصر کو حضرت جی کے پاس لے جانا پڑتا ہے تاکہ عمل کا تسلسل برقرار رہے۔ حضرت جی کا کہنا ہے کہ ناصر کو قابو میں رکھنے کیلئے عمل ضروری ہے ورنہ تو خدانہ کرے وہ مجھے چھوڑ بھی سکتا ہے۔"

اب میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ ناصر مجھے کیوں نہیں پہچان سکا تھا۔ اس پر "حضرت جی" کے عمل کا اثر تھا۔ اس عمل کے زیر اثر رہ کر ناصر شاید اپنے ماضی کو بھولا ہوا تھا۔

ان دونوں باپ بیٹی غفار اور لیلیٰ نے ایک خود غرض عامل کے ذریعے ناصر کو گویا اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ میرے نزدیک یہ سراسر ظلم تھا۔ میں نے سوچا مجھے ناصر کو اس ظلم سے بچانا چاہئے خواہ اس کے لئے "حضرت جی" ہی سے کیوں نہ ٹکرانا پڑے۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ سوچتے ہوئے میں وہ ساری باتیں بھول گئی تھی جو بچپن سے خطرناک آدم زادوں کے بارے میں بتائی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ مجھے "حضرت جی" کے متعلق یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ حیرت انگیز پراسرار قوتوں کا مالک ہوگا۔

اسے میں اپنی عجلت ہی کا نام دوں گی کہ مزید غور و فکر کے بجائے فوری طور پر اس عامل سے نمٹنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں اسے ناصر کے ذریعے بہ آسانی تلاش کرسکتی تھی۔ ناصر کے جسم کی مخصوص بو مجھے یاد تھی۔ وہ بو مجھے ناصر تک فوراً پہنچا دیتی۔

میں ابھی ناصر کے گھر سے چلنے کا قصد کر ہی رہی تھی کہ دور سے دستک کی آواز آئی۔ میں یہ دیکھنے کیلئے رک گئی کہ آنے والا کون ہے۔

لیلیٰ گھر کا دروازہ کھولنے جا رہی تھی تو میں نے لیلیٰ کے اور اپنے درمیان ہونے والی ساری گفتگو اس کے ذہن سے محو کردی اب اس بارے میں کوئی لیلیٰ سے پوچھتا بھی تو وہ کچھ نہ بتا پاتی۔ میں نے بطور احتیاط ہی ایسا کیا تھا ورنہ مجھے لیلیٰ کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا۔

کچھ ہی دیر میں جب میں نے غفار اور لیلیٰ کے ساتھ ناصر کو گھر کے اندر آتے دیکھا تو چونک اٹھی۔ ناصر کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا اور جسم کے کھلے حصوں پر خراشیں نظر آ رہی تھیں۔

غفار اسے سہارا دیئے اسی طرح آگے بڑھا رہا تھا جیسے اس سے چلا نہ جا رہا ہو۔ ناصر کی یہ حالت دیکھ کر میرے وجود میں کھولن سی ہونے لگی۔ اسے یقیناً تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا ورنہ وہ یوں نڈھال نظر نہ آتا۔

غفار اور لیلیٰ نے ناصر کو کمرے میں لاکر اس کے بستر پر لٹا دیا۔

"وہ تمہاری بات غلط نکلی لیلیٰ!" غفار نے اپنی بیٹی کو مخاطب کیا۔

"کون سی بات بابا؟" لیلیٰ نے پوچھا۔

"یہی کہ اس رات ناصر نے کوئی خواب دیکھا تھا اور ایک حسین عورت کے قالب میں کوئی جن زادی اس سے ملنے نہیں آئی تھی۔" غفار بتانے لگا۔ "دراصل اس رات کو جس طرح میں پراسرار طور پر اپنے کمرے کے بجائے اس کمرے میں بے حالت بیہوشی پایا گیا، وہ بات مجھے کھٹک رہی تھی۔ میں نے اس کا ذکر آج حضرت جی سے کیا تو انہوں نے تفصیل معلوم کی۔ اس سلسلے میں حضرت جی نے ناصر سے استفسار کیا۔ ناصر کبھی کچھ کہتا اور کبھی کچھ، اسی وجہ سے حضرت جی کو اس پر غصہ آ گیا۔ انہوں نے کانٹوں بھری شاخ اٹھائی، پھر اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور ناصر کو پیٹنا شروع کر دیا۔ ناصر سے انہوں نے جو کچھ معلوم کیا، اس کی تصدیق مجھ سے بھی کی۔ اس رات ناصر نے مجھے جو کچھ بتایا تھا، میں نے بیان کر دیا۔ پورا واقعہ سن کر حضرت جی فکرمند ہو گئے وہ بار بار ناصر سے اس جن زادی کا نام پوچھنے لگے جو اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ آخر حضرت جی نے کوئی عمل پڑھ کر ناصر پر دم کیا اور پھر اس کے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ ناصر اس طرح چیخنے لگا جیسے اس کا سر کسی آہنی شکنجے میں کس دیا گیا ہو۔ حضرت جی بس ایک ہی سوال کئے جا رہے تھے کہ بتا جن زادی کا نام کیا ہے؟ آخرکار حضرت جی کو کامیابی ہوئی۔ ناصر نے اس جن زادی کا نام بتا دیا۔"

"واقعی بابا؟" لیلیٰ بول اٹھی۔ "اس جن زادی کا کیا نام تھا؟"

"دینار۔" غفار نے جواب دیا۔

"حضرت جی اس جن زادی کا نام کیوں معلوم کرنا چاہتے تھے؟" لیلیٰ نے دریافت کیا۔

"مجھے کیا خبر! ہوگی کوئی وجہ۔" غفار بولا پھر بتانے لگا۔ "حضرت جی نے مجھے فکر نہ کرنے کو کہا ہے۔ وہ اب یہ معاملہ سنبھال لیں گے۔"

"اصل بات تو رہ ہی گئی بابا!" لیلیٰ بولی۔

"کیا؟" غفار نے متلوم کیا۔

"یہ کہ آپ سوئے تو اپنے کمرے میں تھے، پھر یہاں کس طرح پہنچ گئے؟" لیلیٰ نے یاد دہانی کرائی۔

"اس بارے میں ابھی حضرت جی نے کچھ نہیں بتایا۔ البتہ انہوں نے اسے پراسرار واقعہ قرار دیا۔ ابھی انہوں نے محض اس قیاس کا اظہار کیا ہے کہ شاید اس معاملے کا تعلق جن زادی سے ہو۔ حتمی طور پر انہوں نے فی الحال کچھ کہنے سے گریز کیا ہے۔" غفار نے تفصیل بتائی۔

"حضرت جی" تک پہنچنے کیلئے میں غفار کو بھی اپنا آلہ کار بنا سکتی تھی۔ لیلیٰ اور غفار کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتے ہوئے میں نے اور بہت کچھ سوچا تھا جس کا تعلق میرے مستقبل کے لائحہ عمل سے تھا۔ میں ہر قیمت پر ناصر کو ظلم سے نجات دلانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس خودغرض و ظالم عامل کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اسے ایک نظر دیکھ لینا چاہتی تھی کہ آخر وہ چیز کیا ہے! اس کے باوجود میری ترجیح ناصر تھا۔ ناصر جس عمل کے زیر اثر تھا اس کا توڑ ضروری تھا۔ میں نے اس کے لئے ایک راہ نکال لی تھی، مگر اس کا انحصار میرے قبیلے کے ایک عالم جن زاد سوما پر تھا۔

غفار اپنی بیٹی کی کسی بات کا جواب دینے والا تھا کہ اسے میں نے اپنی جناتی صفات کے زیر اثر لے لیا۔ اسی کے تحت اس نے لیلیٰ سے کہا۔ "میں یہ تو بھول ہی گیا لیلیٰ بیٹی کہ حضرت جی نے مجھ سے کہا تھا، ناصر کو گھر چھوڑ کر واپس آ جاؤں۔"

"کس لئے بابا؟" لیلیٰ نے پوچھا۔

"انہیں خلوت میں مجھ سے کچھ بات کرنی تھی۔" غفار یہ کہہ کر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے مزید بولا۔ "فکر نہ کرنا بیٹی، مجھے دیر بھی ہو سکتی ہے۔" غفار کا تعاقب کرتے ہوئے جب میں "حضرت جی" کے "آستانے" تک پہنچ گئی تو اسے واپسی کا حکم دے دیا۔

اس وقت تک سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ میں جس عمارت کے سامنے کھڑی تھی، اس میں مجھے روشنی نظر آ رہی تھی۔

اس پرشکوہ عمارت کا بڑا محرابی دروازہ کھلا ہوا تھا اور مختلف لوگ وہاں آ جا رہے تھے۔ ان میں عورتیں اور مرد بھی شامل تھے۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں شور سنائی دیا تو میں چونک اٹھی اور پلٹ کر دیکھا۔ وہ منظر میرے لئے حیران کن ہونے کے ساتھ ساتھ تکلیف دہ بھی تھا۔ کئی آدم زاد ایک آدم زادی کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے عمارت کی طرف لا رہے تھے۔ وہ آدم زادی نوجوان اور خوبصورت تھی۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا اور وہ دراز قد تھی۔ سر کے بڑے بڑے بال چہرے کے گرد یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے کالی گھٹاؤں نے چاند کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہو۔ آدم زادی کے چہرے سے دہشت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں غیر معمولی سرخی تھی۔ اس آدم زادی سے میری ہمدردی کا سبب غالباً یہ تھا کہ وہ میری ہی صنف سے تعلق رکھتی تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس آدم زادی کو اس کے لواحقین عامل "حضرت جی" کو دکھانے لائے ہیں۔ کچھ سوچ کر میں بھی ان کے ساتھ ہو لی۔

محرابی دروازے سے گزر کر سامنے ہی کچھ سیڑھیاں دکھائی دیں۔ سیڑھیوں کو عبور کر کے وہ آدم زاد ایک چوڑی راہداری میں پہنچ گئے۔ وہاں دائیں جانب ایک اور کھلا ہوا دروازہ نظر آیا۔ دروازے کے دائیں بائیں جانب دو مسلح پہریدار کھڑے تھے۔ انہوں نے نوجوان آدم زادی اور اس کے لواحقین کو اندر جانے سے نہیں روکا۔ وہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا جس میں خاصے لوگ فرش پر بیٹھے تھے۔ سامنے دیوار سے لگا ہوا ایک بڑا تخت بچھا تھا۔ اس تخت پر قالین بچھے تھے۔ ایک قالین پر دیوار کے سہارے رکھے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ایک باریش آدم زاد بیٹھا تھا۔

اس کمرے کا منظر بالکل ایسا تھا جیسے کسی بڑے حاکم کا دربار لگا ہو۔ تخت کے سامنے دائیں بائیں جو لوگ بیٹھے تھے انہوں نے درمیان میں خالی جگہ چھوڑ رکھی تھی۔ اس خالی جگہ سے گزر کر لوگ لکڑی کی بنی ان سیڑھیوں تک جاتے تھے جن پر چڑھ کر تخت پہ پہنچنا ممکن تھا۔ ان سیڑھیوں کے دونوں طرف بھی مسلح پہریدار مستعد کھڑے تھے۔ پہریداروں سے اجازت ملنے پر ہی کسی کو اس تخت نشین آدم زاد تک رسائی حاصل ہو سکتی تھی۔

کسی خاموش تماشائی کی طرح میں یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ تخت کے اوپر سیڑھیوں کی دائیں جانب ایک صندوق رکھا تھا۔ جسے بھی تخت نشین سے ملنے کی اجازت ہوتی، وہ اس صندوق میں کچھ درہم ضرور ڈالتا۔

وہاں موجود پہریدار فوری نوعیت کے "مریضوں" کو پہلے تخت نشین سے ملنے دیتے اور بقیہ کو اپنی باری کا انتظار کرنے کیلئے دائیں یا بائیں بٹھا دیتے۔ دہشت زدہ آدم زادی کا

معاملہ کیونکہ فوری توجہ کا طالب تھا اس لئے پہریداروں نے دوسروں کو روک کر اسے تخت نشین کے روبرو پیش ہونے کی اجازت دے دی۔

پابہ زنجیر آدم زادی کو سنبھالے ہوئے اس کے لواحقین بمشکل تخت پر چڑھے۔

''نذرانہ!'' ایک پہریدار نے لواحقین کو یاد دہانی کرائی۔ لواحقین میں سے ایک نے صندوق میں کچھ درہم ڈال دیئے۔ وحشت زدہ آدم زادی کو جب اس کے لواحقین کشاں کشاں عامل ''حضرت جی'' کی طرف لے جا رہے تھے تو میں نے بغور اس کے چہرے اور حلیے کا جائزہ لیا۔ ''حضرت جی'' کہلائے جانے والے کا چہرہ لمبوترا اور رخسار قدرے اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ سر پر اس نے ریشمی سرخ پگڑی باندھ رکھی تھی اور جسم پر عبا تھی۔

نوجوان آدمی زادی کو عامل کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ اسی لمحے آدم زادی پوری قوت سے چیخ اٹھی اور پھر سر کو دائیں اور بائیں تیزی سے حرکت دے کر جھومنے لگی۔ لواحقین میں سے ایک نے عامل کو مخاطب کیا۔ ''یا حضرت جی! ایک مدت سے اس کا یہی حال ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد یہ اسی طرح زور سے چیختی ہے اور پھر جھومنے لگتی ہے۔ آپ کی شہرت سن کر ہم بہت دور سے یہاں آئے ہیں۔''

''اسے اسی طرح کھیلنے دو اور روکو مت!'' عامل نے لواحقین کو تاکید کی۔ ''اس کے جسم میں ایک جن داخل ہو گیا ہے جب تک اس جن کو اس کے جسم سے نہیں نکالا جائے گا اس کی حالت یہی رہے گی۔ اگر تم لوگ کسی اور شہر سے اسے لے کر یہاں آئے ہو تو تمہیں یہاں چالیس دن رکنا پڑے گا۔''

''ہم رک جائیں گے حضرت جی!'' لواحقین میں سے ایک بولا۔

اس وحشت زدہ آدم زادی کے جسم میں کوئی جن داخل ہو گیا ہے میں یہ سن کر چونکی۔ اگر واقعی ایسا ہی تھا تو میرے لئے اس کا سراغ لگانا بہت آسان تھا۔ اب عامل اس آدمی زادی کے لواحقین سے کہہ رہا تھا۔ ''چالیس روز تک تم اسے لے کر آؤ گے۔ ہم دم کیا ہوا پانی اس کے اوپر چھڑکیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ چالیس دن تک مسلسل اس عمل کے بعد جن اس کا جسم چھوڑ کر چلا جائے گا۔''

اس عرصے میں اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لا کر مجھے پتا چلا کہ اس عامل نے جو ''تشخیص'' کی ہے قطعی غلط ہے۔ اس آدم زادی کے جسم پر کوئی جن قابض نہیں تھا۔ اسے کسی عامل کی نہیں' ایک اچھے طبیب کی ضرورت تھی۔ وہ کسی دماغی عارضے میں مبتلا تھی۔ عامل کے

پاس آدم زادی کا علاج نہیں تھا۔

میں جس مقصد سے وہاں آئی تھی' وہ پورا ہو چکا تھا اب وہاں مزید رکنا لاحاصل ہوتا۔ مجھے وہ آدم زاد عامل ایک بیوپاری معلوم ہوا جو مال و زر کے حصول کی خاطر کم علم لوگوں کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ دکھی آدم زادوں کے استحصال سے اس عامل کو روکنا خلق خدا کی خدمت ہوتی' مگر ابھی تو میں' ناصر ہی کو ظلم سے نہیں بچا سکی تھی۔ وحشت زدہ آدم زادی کے ساتھ میں بھی اس پرشکوہ عمارت سے باہر نکل آئی۔ عامل نے اس آدم زادی پر پانی کا بس ایک چھینٹا مارا تھا اور یوں گویا اس کے ''علاج'' کا آغاز ہو گیا تھا۔ پانی کا وہ ایک چھینٹا وحشت زدہ آدم زادی کے لواحقین کو کئی درہم کا پڑا تھا۔

میرے بس میں اس آدم زادی کا علاج کرنا تو نہیں تھا البتہ میں اس کے لواحقین کو صحیح مشورہ ضرور دے سکتی تھی۔ میں نے انہیں اپنے زیر اثر لا کر ان کے دماغوں میں یہ بات بٹھا دی کہ آدم زادی کو کوئی دماغی بیماری ہے اس کے جسم پر کسی جن کا قبضہ نہیں۔ اسے کسی عامل کے بجائے طبیب کو دکھایا جائے۔ میں نے ان آدم زادوں کو جو مشورہ دیا میرے نزدیک وہی بہتر تھا۔

بصرہ سے بابل کے کھنڈرات میں پہنچ کر میں اسی رات اپنے قبیلے کے عالم سوما سے ملی۔ وہ بزرگ' مہربان اور بہت شفقت والا تھا جیسے کہ عالم ہوتے ہیں۔ سوما اس وقت عشاء کی نماز پڑھ کے اٹھا تھا۔

''اے دینار! اے سردار زادی! تو خوش تو ہے؟'' سوما نے مجھے بڑی محبت سے مخاطب کیا۔

''ہاں عالم سوما! میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پہلے کبھی کبھار جمعے کی نماز کے بعد میرا وعظ سننے اپنی ماں سہلوبہ کے ساتھ آ جایا کرتی تھی' مگر اب نہیں آتی' کیا بات ہے؟''

''آؤں گی سوما!'' میں بولی۔ اپنے وعظ کا ذکر کر کے سوما نے مجھے خود ہی مطلب کی بات کہنے کا موقع دے دیا تھا۔ سو میں نے بلا تاخیر کہا۔ ''اے سوما! تو نے اپنے ایک وعظ میں کہا تھا خلق خدا کی خدمت سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔''

''ہاں میں نے کہا تھا!'' سوما نے تصدیق کی۔ ''میں اب بھی اکثر اس حقیقت کو دہراتا رہتا ہوں' مگر تجھے اس وقت یہ بات کیوں یاد آئی؟''

"جانتی ہوں...... سوما...... تو تو مجھ سے بہتر طور پر یہ بات جانتا ہے کہ ہم جنات کی طرح آدم زاد بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ سو اس اعتبار سے دکھ درد میں آدم زادوں کی مدد اور خدمت کرنا بھی عبادت ٹھہرا ناں؟" میں نے اصل بات کہنے کیلئے تمہید باندھی۔

قدرے توقف کے بعد سوما نے کہا۔ "تو ٹھیک کہتی ہے دینار! مگر ہمارے بزرگوں نے ہمیں آدم زادوں کے معاملات میں بے جا مداخلت سے منع کیا ہے۔"

"اے سوما! میں بے جا مداخلت کو ہرگز نہیں کہتی۔ مجھے تو یہ بتا کہ اگر کوئی مصیبت میں گرفتار ہے تو کیا اس کی مدد کرنی چاہیے؟"

"بالکل مدد کرنی چاہیے۔!" سوما نے اس بار جواب دینے میں دیر نہیں کی۔

"خواہ وہ کوئی آدم زاد ہی کیوں نہ ہو؟" میں نے مزید وضاحت چاہی۔

"مصیبت میں گرفتار آدم زاد ہو یا کوئی جن زاد اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' مدد کے حقدار دونوں ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آدم زادوں کی مدد کرنا ہم جنات کو کبھی کبھی بہت مہنگا پڑ جاتا ہے۔ اسی بنا پر ہم اپنے تحفظ کی خاطر آدم زادوں سے دور رہتے ہیں۔" سوما نے کہا۔

پھر اس سے پہلے کہ سوما استفسار کرتا کہ میں کس آدم زاد کی مدد کرنا چاہتی ہوں' میں نے اسے ناصر کی دکھ بھری کہانی انتہائی پُراثر آواز میں سنا دی۔ میں نے ناصر سے اپنے ذاتی تعلق کو ظاہر نہیں کیا تھا' نہ یہ بتایا تھا کہ وہ میرا دیوانہ ہو گیا تھا۔ ناصر سے اپنی ملاقات کے بارے میں سوما کو میں نے صرف یہ بتایا تھا کہ وہ اپنے قافلے سے بچھڑ کر صحراؤں میں بھٹک رہا تھا تو اسے بصرہ پہنچا دیا تھا جس سے اس کے ساتھ میرے روابط ہو گئے۔

مجھ سے ناصر کی پوری روداد سن کر سوما بولا۔ "یقیناً وہ نوجوان آدم زاد ہماری ہمدردی اور مدد کا مستحق ہے' اے دینار! تو نے مجھ سے اس کا جو احوال بیان کیا ہے' وہ ایک ہی بات کی نشاندہی کرتا ہے اس پر سحر کیا گیا ہے۔"

"سحر" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں دینار! تو نے مجھ سے جس عامل کا ذکر کیا ہے' اس نے سحر ہی کیا ہو گا۔"

"اس پر یقین کی کیا صورت ہے اے سوما؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس کی ایک ہی صورت ہے کہ میں اس نوجوان آدم زاد کی کیفیت کو قریب سے دیکھوں تبھی حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن ہو گا۔" سوما بولا۔

"تو اے سوما! کیا تو اسے کار خیر جان کر اس نوجوان آدم زاد کو میرے ساتھ چل کر نہیں دیکھ سکتا؟"

"ٹھیک ہے' میں کل عصر کی نماز کے بعد تیرے ساتھ چلوں گا۔" سوما نے وعدہ کر لیا۔

"تجھ سے ایک بات اور پوچھنی ہے سوما!" میں نے کہا۔

"وہ بھی پوچھ لے۔"

"مجھے بتا! اگر ناصر نامی اس آدم زاد پر سحر کیا گیا ہے تو کیا اس کا توڑ ممکن ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل ممکن ہے۔ اس عامل نے گنڈے پڑھ کر نوجوان آدم زاد کے چچا کو دیئے ہوں گے کہ انہیں کہیں دبا آئے۔ گرہیں ڈال کر ان گنڈوں کو جہاں بھی چھپایا گیا ہو گا' پتا چل جائے گا تو تو گنڈے چھپانے والے کو اپنے اثر میں لے کر بآسانی سب کچھ معلوم کر سکے گی۔" سوما نے بتایا۔ "پھر جب تجھے چھپائے جانے والے گنڈے مل جائیں تو سورۃ فلق پڑھتے ہوئے ایک ایک کر کے گنڈے کی ساری گرہیں کھولنی ہوں گی ان گرہوں کے کھلتے ہی آدم زاد نوجوان سحر سے آزاد ہو جائے گا۔"

سوما کا شکریہ ادا کر کے میں چلی آئی اور بے چینی سے اگلے روز کا انتظار کرنے لگی۔ مجھے اس پر خوشی تھی کہ میں نے سوما کو اپنے ساتھ بصرے چلنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ میرے نزدیک یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس رات میں دیر تک ناصر ہی کے بارے میں سوچتی رہی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ سحر سے آزاد ہونے کے بعد ناصر مجھے پہچان جائے گا۔ اس بات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اپنے لالچی چچا اور خود غرض بیوی سے بعد میں ناصر کیا سلوک کرتا ہے۔

☆......☆......☆

دوسرے دن عصر کی نماز کے فوراً بعد میں عالم سوما کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے دعا مانگ کر مجھ پر دم کیا اور پھر وعدے کے مطابق میرے ساتھ چلنے کو راضی ہو گیا۔

بابل کے کھنڈرات سے بصرہ سینکڑوں فرسخ (ایک فرسخ تقریباً تین میل) کے فاصلے پر ہے' مگر ہم جنات کیلئے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ میں اور سوما اسی لئے جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ گھر میں اس وقت لیلیٰ اور ناصر ہی تھے۔ غفار عالی کھجور کے باغوں سے ابھی لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ لیلیٰ گھر کے کام کاج میں لگی ہوئی تھی اور ناصر اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ اس کی حالت مریضوں جیسی تھی اور وہ بستر پر دراز تھا۔

ہم جنات اگر خود چاہیں تو آدم زاد ہماری آواز سن سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ میں نے اسی لئے بلاتامل عالم سوما کو مخاطب کیا۔ ''یہ ہے وہ مطلوب نوجوان آدم زاد ناصر جسے اس کے چچا اور بیوی نے اپنا غلام بنا رکھا ہے۔'' میں نے ناصر کی طرف اشارہ کیا اور اس کے بستر کی طرف بڑھی۔

''میں نے یہاں آتے ہی اندازہ لگا لیا تھا اے دینار کہ تو نے مجھ سے جس نوجوان آدم زاد کا ذکر کیا تھا' وہ یہی ہے۔'' سوما یہ کہتے ہوئے میرے قریب آ گیا۔

سوما نے ناصر کا تفصیلی جائزہ لیا۔ وہ کچھ دیر تک ناصر کی آنکھوں میں جانے کیا دیکھتا رہا' پھر ہاتھوں اور پیروں کے ناخن دیکھے۔ ''میرا کہا درست نکلا دینار!'' سوما مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''اس آدم زاد پر یقیناً سحر ہی کیا گیا ہے۔''

سوما سے مجھے اسی تصدیق کی ضرورت تھی۔' اگلے مراحل کے بارے میں وہ مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا۔

''اے دینار! اگر تو میری ضرورت محسوس کرے تو یہاں رکوں ورنہ چلا جاؤں!'' سوما بولا۔

''تو میرے کہنے پر یہاں تک آیا اے سوما! میں تیری شکر گزار ہوں۔ اب جو اقدامات کرنے ہیں میں تنہا بھی کر سکتی ہوں۔ تو ان کے بارے میں پہلے ہی میری رہنمائی کر چکا ہے کہیں کسی مرحلے پر مجھے دشواری پیش آئی تو تجھ سے مشورہ ضرور کروں گی۔'' میں نے کہا۔

سوما رخصت ہو گیا تو میں نے ناصر کے باغات کا رخ کیا جہاں پہلے بھی کئی بار جا چکی تھی۔ ناصر کے چچا غفار کو وہاں پہنچ کے تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہ لگی۔ ایک باغ میں وہ اپنے ملازم باغباں کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ باغباں چلا گیا تو میں نے غفار کو اپنے قابو میں کر لیا۔

''غفار! جو گنڈے پڑھ کر حضرت جی نے تجھے دیئے تھے وہ تو نے کہاں دبائے ہیں؟'' میں نے معلوم کیا۔

''وہ برابر والے باغ کی کوٹھری کا فرش کھود کر نصف نیزے کے برابر گہرائی میں دبائے ہیں۔'' غفار نے جواب دینے میں لحہ بھر تاخیر بھی نہ کی۔

''تو پھر میرے ساتھ برابر والے باغ کی اس کوٹھری میں چل!'' میں نے غفار کو حکم دیا۔

تعمیل حکم کی خاطر غفار برابر والے باغ کی طرف چل دیا۔ جب وہ اس باغ کی کوٹھری میں داخل ہوا تو وہاں بھی ایک باغباں موجود تھا۔

''باغباں سے کہو کہ یہ اس باغ کی دیکھ بھال کے بجائے قریبی باغ میں چلا جائے اور تاحکم ثانی وہیں رہے۔'' میں نے غفار سے سرگوشی کی۔

غفار نے میرے اس حکم کی بھی تعمیل کر دی تو میں نے اس کوٹھری کا جائزہ لیا۔ وہاں ایک کونے میں کدال' پھاوڑا اور لوہے کی پرات موجود تھی۔ کوٹھری کا فرش پختہ نہیں تھا۔ میرے حکم پر غفار فرش کھودنے لگا مگر جلد ہی ہانپ گیا۔ اگر وہ میرے زیر اثر نہ ہوتا تو شاید نصف نیزے کے برابر گڑھا نہ کھود پاتا۔

ابھی غفار گڑھا کھود ہی رہا تھا کہ پھاوڑا کسی سخت شے سے ٹکرایا۔

''کیا ہے؟'' میں نے غفار سے پوچھا۔

''پتھر ہے۔'' غفار جواب میں کہنے لگا۔ ''اسی پتھر کے نیچے وہ گنڈا دبا ہوا ہے جس میں گرہیں پڑی ہوئی ہیں۔''

''تم پیچھے ہٹ جاؤ!'' میں یہ کہہ کر آگے بڑھی اور گڑھے میں موجود پتھر اکھاڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔

اسی لمحے مجھے گنڈا نظر آ گیا۔ اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے واقعی گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اس گنڈے کو گڑھے سے نکال لیا اور سوما کی ہدایت کے مطابق سورۂ فلق پڑھتے ہوئے ایک ایک کر کے گرہیں کھولنے لگی۔ گرہیں کھول کر اس گنڈے کا کیا کرنا ہے' سوما سے میں یہ پوچھنا بھول گئی تھی۔ اسی وجہ سے میں نے گرہیں کھولنے کے بعد اس گنڈے کو اپنے پاس ہی رکھا۔

''اس گڑھے کو مٹی سے بھر دو۔'' میں نے غفار کو مخاطب کیا۔ پھر تاکید کی کہ ''تم یہ سب کچھ بھول جاؤ گے کہ گڑھا کھودا تھا یا گنڈے کے بارے میں کسی کو کچھ بتایا تھا۔''

''میں سب...... سب کچھ بھول جاؤں گا۔'' غفار بڑبڑانے لگا' پھر گڑھے میں مٹی ڈالنے لگا۔

اب میرا وہاں رکنا فضول تھا' سو میں باغ سے نکل آئی۔ مجھے یقین تھا کہ ناصر کو سحر سے آزادی مل گئی ہوگی' مگر میں اس کے گھر بوجوہ نہ گئی۔ پہلے مجھے اس گنڈے کی فکر تھی کہ

اسے کس طرح ٹھکانے لگانا ہے؟ اسی سبب میں نے بابل کے کھنڈرات کا رخ کیا۔

سوما نے مجھے دیکھا تو فکرمند سا ہو کر بولا۔ ''خیریت تو ہے دینار؟''

''ہاں سوما! میں فوری طور پر اس لئے تیرے پاس آئی ہوں کہ تجھ سے ایک اہم بات پوچھنا بھول گئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں بول!''

''اس گنڈے کا کیا کرنا ہے؟'' میں نے وہ گنڈا اسے دکھایا جس کی گرہیں کھولی جا چکی تھیں۔

''اب یہ بالکل بیکار ہے' اسے کہیں بھی پھینک دو یا جلا دو' کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' سوما نے بتایا۔

میں مطمئن ہو کر سوما کے پاس سے چلی آئی۔ بصرہ واپس جاتے ہوئے میں نے اس گنڈے کو صحرا میں پھینک دیا۔ میری بصرہ واپسی کی وجہ ناصر تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ سحر کا اثر ختم ہونے کے بعد وہ کس حال میں ہے۔ مجھے یہ توقع تھی کہ ناصر کے گھر میں غیر معمولی صورت حال ہوگی' مگر وہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ لیلیٰ بدستور گھر کے کاموں میں لگی تھی اور ناصر اپنے کمرے میں تھا۔ میں وہاں پہنچی تو ناصر کو گہری نیند سوتے دیکھا۔ میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ طویل عرصے تک سحر کے زیر اثر رہ کر ناصر کے کشیدہ اعصاب پرسکون ہوئے ہیں وہ اسی لئے گہری نیند سو رہا ہے۔ اس وقت ناصر کو جگانا مجھے خود غرضی معلوم ہوئی' میں صرف یہی تو دیکھنا چاہتی تھی کہ دینار کی حیثیت سے اب وہ مجھے پہچانتا ہے یا نہیں! یہ پھر کسی روز بصرہ آ کر بھی معلوم کیا جا سکتا تھا۔ اپنے لالچی چچا اور خود غرض بیوی سے ناصر جو سلوک بھی کرتا' اس میں حق بجانب ہوتا۔ بہرحال مجھے ان دونوں کے بارے میں تجسس ضرور تھا کہ دیکھوں ان ظالموں پر کیا گزرتی ہے۔ میرے نزدیک وہ دونوں کسی رعایت کے مستحق نہیں تھے۔

بصرہ سے میں دوبارہ بابل کے کھنڈرات میں پہنچ گئی۔ سونے سے پہلے مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ رات میرے لئے کتنی بلاخیز ثابت ہوگی۔

معلوم نہیں وہ رات کا کونسا پہر تھا جب اچانک ہی سوتے سوتے جاگ اٹھی اپنے وجود پر مجھے شدید دباؤ محسوس ہوا تھا۔ غالباً اسی سبب مجھے نیند نہ آ سکی تھی۔ آج رات سے پہلے کبھی مجھے اس طرح کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میرے وجود میں

چنگاریاں سی بھڑکنے لگیں۔ اذیت اتنی شدید تھی کہ میری چیخیں نکل گئیں۔ میرے ماں باپ اور بھائی بھی بیدار ہو گئے' میری ماں نے میرا حال دیکھا اور کیفیت معلوم کی تو خوفزدہ سی آواز میں میرے باپ سے کہنے لگی۔ ''اے اعظم! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی آدم زاد نے میری بیٹی دینار کو اپنے قبضے میں کرنے کیلئے عمل شروع کر دیا ہے۔''

ان لمحات کی اذیت لفظوں میں بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔ اپنی ماں سہلوبہ کو بھی میں نے بڑی مشکل سے رک رک کر اپنی کیفیت بتائی تھی۔ اس نے مجھ سے متعلق جس خدشے کا اظہار کیا تھا' میرے لئے نیا نہ تھا۔ جنات سے میں نے متعدد بار یہ بات سنی تھی کہ بعض خطرناک آدم زاد ہم جن زادوں اور جن زادیوں کو اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں۔ اس کے لئے وہ عملیات کا سہارا لیتے ہیں۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں تو پھر ہم جنات ان کا ہر حکم ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ آدم زادوں کے نزدیک ہماری حیثیت غلاموں اور کنیزوں جیسی ہو جاتی ہے۔ میرے لئے یہ تصور ہی بہت ہولناک تھا کہ کوئی آدم زاد مجھے اپنے قبضے میں کر لے۔ میری تکلیف میں اس خیال نے مزید اضافہ کر دیا۔

میری ماں کی بات سن کر میرے باپ اعظم نے بھی کہا۔ ''اس کی حالت تو یہی بتاتی ہے لیکن بہتر یہ ہوگا کہ ہم عالم سوما کو بلا کر اسے دکھا دیں۔ وہ یقیناً بتا سکے گا کہ ہمارے اندیشے درست ہیں یا نہیں؟ اس کے علاوہ سوما کوئی ایسی راہ بھی نکال لے گا کہ دینار کو اذیت سے نجات مل جائے۔'' یہ کہہ کر وہ میرے بھائی یوسف سے مخاطب ہوا۔ ''جا اور سوما کو بلا کے لے آ!''

''وہ سو نہ رہا ہو۔'' یوسف بولا۔

''نہیں' وہ تہجد گزار ہے' جاگ رہا ہوگا۔'' میرے باپ نے کہا۔

میرا بھائی سوما کو بلانے چلا گیا تو میری ماں مجھ سے پوچھنے لگی۔ ''دینار! کہیں تو آدم زادوں کی کسی بستی میں تو نہیں گئی تھی؟''

تکلیف و اذیت کی وجہ سے میرے لئے بولنا مشکل ہو رہا تھا' یہ تو خیر حقیقت تھی مگر اپنی ماں کے سوال کا جواب دینا بھی آسان نہ تھا۔ اس ایک سوال کا صحیح جواب متعدد نئے سوالوں کی بنیاد بن جاتا' سو میں خاموش رہی۔

اس پر میرا باپ کہنے لگا۔ ''سہلوبہ! یہ تو دیکھ کہ دینار سخت تکلیف میں ہے اور اس کیلئے بولنا محال ہے۔ تو اس سے پوچھ گچھ نہ کر! جو بھی معلوم کرنا ہوگا عالم سوما معلوم کر لے گا۔

ممکن ہے ہمارے سامنے کچھ بتاتے اور کہتے ہوئے دینار کو جھجک محسوس ہو اس لئے جب عالم سوما آ جائے گا تو ہم یہاں سے ہٹ جائیں گے۔ تو بھی جانتی ہے کہ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اولاد اپنے ماں باپ کے سامنے نہیں کر پاتی۔''

میرے باپ اخضم نے مجھے بہت بڑی آزمائش سے بچا لیا تھا ورنہ میں عالم سوما کی آمد سے پریشان ہو گئی تھی۔ یہ میرے لئے ایک طرح سے دہرا عذاب ہوتا اگر میرے ماں باپ کو پتا چل جاتا کہ ان کی نصیحتوں اور تاکید کا مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ انہوں نے آدم زادوں سے روابط و مراسم رکھنا تو الگ ان کی بستیوں تک میں جانے سے مجھے منع کر رکھا تھا۔ انہیں حقیقت جان کر لازماً دکھ ہوتا۔

کچھ دیر میں میرے بھائی یوسف کے ساتھ عالم سوما آ گیا اور میرے باپ سے مخاطب ہوا۔ ''سردار اخضم! مجھے فوراً آنے میں اس لئے تاخیر ہوئی کہ جب تیرا بیٹا یوسف میرے پاس پہنچا تو میں نفل پڑھنے کی غرض سے نیت باندھ چکا تھا اسی سبب اسے میرے سلام پھیرنے کا انتظار کرنا پڑا۔''

''کوئی بات نہیں سوما...! تو دینار کو دیکھ کر بتا کہ اسے کیا ہوا ہے؟'' میرے باپ نے کہا۔

عالم سوما میری طرف متوجہ ہو گیا۔ میں اپنی سی پوری کوشش کر رہی تھی کہ میری چیخیں اور کراہیں نہ نکلیں۔ سوما نے دھیمی اور پرسکون آواز میں مجھ سے معلوم کیا۔ ''اے دینار! کیا تجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تیرے اندر آگ سی بھڑک رہی ہے...! تجھے کوئی اندر سے جلائے ڈال رہا ہے؟''

میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے تصدیق کر دی۔ ''عالم سوما!...... تو نے میری صحیح کیفیت بیان کی۔''

پھر سوما نے مجھ سے چند سوالات اور کئے ان سوالوں کا تعلق بھی میرے محسوسات سے تھا۔

اس موقع پر میرے باپ نے عالم سوما کو خاموش اور فکر مند دیکھ کر بتایا۔ ''میرا اور دینار کی ماں کا خیال یہ ہے کہ دینار کسی آدم زاد کے ظلم کا نشانہ بن رہی ہے جو اسے اپنے قابو میں کرنا چاہتا ہے۔ دینار پہلی مرتبہ اس صورتحال سے دوچار ہوئی ہے میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ظالم آدم زاد نے آج ہی رات سے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر عمل

شروع کیا ہے۔''

''میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں اے سردار اخضم!'' عالم سوما بولا۔ ''میں معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں' مگر پہلے یہ ضروری ہے کہ دینار کیلئے تکلیف و اذیت قابل برداشت ہو جائے۔ دینار کی طبیعت کچھ سنبھل جائے گی تو پھر میں خلوت میں اس سے کچھ باتیں معلوم کروں گا۔ اس کے بعد اس آدم زاد کا پتا چلایا جا سکتا ہے جو ہمارے اندازے کے مطابق کوئی عمل شروع کر چکا ہے۔''

''پھر تو ہمیں ہر قیمت پر اس آدم زاد کو عمل کرنے سے روکنا ہو گا سوما!'' میری ماں کے لہجے میں تشویش تھی۔

''پہلے اس کا سراغ تو مل جائے اے سہلوبہ!'' عالم سوما بولا۔ پھر کہنے لگا۔ ''اس آدم زاد کو روکنے کا کام بھی ہم میں سے کسی کو نہیں' دینار ہی کو کرنا پڑے گا۔ کسی آدم زاد کو عمل کرنے سے وہی جن یا جنیہ روک سکتی ہے جس پر قبضے کیلئے عمل کیا جا رہا ہو۔''

اسی لمحے میں تکلیف سے چیخ اٹھی۔

''سہلوبہ! اب خاموش رہ۔'' میرے باپ نے تاکید کی۔ ''عالم سوما کو اپنا کام کرنے دے تاکہ تیری بیٹی کو قرار آ سکے۔''

ان الفاظ کی ادائیگی سے پہلے ہی میں نے سوما کو کچھ پڑھتے دیکھ لیا تھا۔ چند لمحے بعد ہی اس نے مجھ پر دم کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے اندر بھڑکتے ہوئے شعلوں کی تپش کم پڑنے لگی ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے سوما نے اسی طرح تین بار دم کیا تو میرے لئے وہ اذیت برداشت کے قابل ہو گئی۔

''تجھے کچھ سکون ملا دینار؟'' عالم سوما نے سوال کیا۔

''ہاں عالم سوما! اب وہ پہلی سی جلن نہیں رہی۔'' میں نے جواب دیا۔

''اللہ کا شکر ہے۔'' سوما نے کہا۔ ''دینار! اب یقیناً تو میرے مزید سوالوں کے جواب دے سکے گی تاکہ میں اس عامل آدم زاد کا پتا چلا سکوں۔''

عامل آدم زاد! یہ الفاظ سن کر میرے وجود میں چھناکا سا ہوا۔ ایک بار پھر آدم زاد کا لمبوترا چہرہ میری چشم تصور میں گھوم گیا تھا۔

سوما پہلے ہی میری والدین سے خلوت میں پوچھ گچھ کے لئے کہہ چکا تھا۔ سو وہ میرے بھائی یوسف کو ساتھ لے کر وہاں سے چلے گئے۔

تنہائی ملتے ہی سوما نے مجھے مخاطب کیا۔ "اے دینار! میں کچھ پوچھنے سے پہلے تجھے یہ بتا دوں کہ تیرا کوئی بھی غلط جواب خود تیرے ہی لئے نقصان کا باعث ہوگا۔ سو بہتر ہے کہ تو سچ بول!..... میرا پہلا سوال یہ ہے کہ کیا کبھی تو نے کسی آدم زاد کو اپنا نام بتایا ہے؟"

"سوما! میں تیرے اس سوال کا مطلب نہیں سمجھی۔ نام بتانے سے میری تکلیف و اذیت کا کیا تعلق ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"تعلق ہے دینار!" سوما نے بتایا۔ "میں نے اسی لئے تو یہ سوال کیا ہے۔"

"پھر تو اے سوما! تجھے سب کچھ بتانا ہی پڑے گا۔" میں بولی۔

"ہاں دینار!" سوما نے میری حوصلہ افزائی کی۔ "یاد رکھ کہ تو مجھے جو کچھ بتائے گی وہ تیرے اور میرے درمیان ہی رہے گا۔"

"تو سن سوما! نجف، کربلا، بصرہ، موصل، سلیمانیہ وغیرہ میں ایسے متعدد آدم زاد ہیں جو مجھے میرے نام سے جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔

میری بات سن کر عالم سوما چند لمحے چپ رہا۔ پھر پوچھا۔ "تجھے ان آدم زادوں کو اپنا نام بتانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"تاکہ وہ مجھے میرا نام لے کر پکار سکیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو ان کیلئے نادیدہ نہ ہوگی!" سوما نے مجھ سے اپنے خیال کی تصدیق چاہی۔

"ہاں میں ان سے ملنے کی خاطر انسانی پیکر اختیار کر لیتی تھی۔"

"تیرے بارے میں انہیں نام کے علاوہ اور کیا کیا معلوم تھا؟" سوما نے سوال کیا۔

"صرف یہ کہ میں ایک روح ہوں..... ایک پراسرار وجود ہوں۔"

"کسی کو تو نے اپنے بارے میں یہ تو نہیں بتایا کہ تو ایک جن زادی ہے؟" سوما نے دریافت کیا۔

"نہیں..... میں نے تو نہیں بتایا مگر....." میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ مجھے چند روز قبل بصرہ میں پیش آنے والا واقعہ یاد آ گیا تھا جب کافر جن زاد صحرہ نے مجھے جن زادی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس وقت وہ غفار کے جسم پر قابض تھا۔ کمرے میں ناصر بھی موجود تھا۔ صحرہ نے یہی ظاہر کیا تھا کہ میں ایک جن زادی ہوں۔ ناصر یہ بتانے کے باوجود مجھے نہیں پہچان سکا تھا کہ میں دینار ہوں۔ پھر مجھ کو صحرہ نے جن زادی کہنے کے علاوہ میرے نام سے بھی پکارا

تھا۔ یوں ناصر کو پہلی بار اس حقیقت کا علم ہوا تھا کہ میں ایک جن زادی ہوں۔ ناصر نے عامل "حضرت جی" کے اصرار پر یہی پورا واقعہ اس سے بیان کر دیا تھا۔

"تو کیا سوچنے لگی دینار! کہاں گم ہو گئی؟ مجھے بھی تو کچھ بتا!" عالم سوما نے مجھے ٹوکا۔

"صرف وہ...... ہاں صرف اسی کو خبر ہے دینار ایک جن زادی ہے۔" میرا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"کون ہے وہ اے دینار؟" عالم سوما پوچھنے لگا۔

"ایک آدم زاد عامل۔" میں نے بتایا۔ "اسے لوگ حضرت جی کہتے ہیں۔"

"عامل حضرت جی ہی وہ آدم زاد ہے، تجھے اس بات کا یقین کیوں ہے؟"

"ناصر کے متعلق تو تجھے میں بتا ہی چکی ہوں سوما!" میں نے بات شروع کی۔ "عرصہ دراز کے بعد ایک شب جب میں اس سے ملنے گئی تو وہ سحر کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے مجھے انسانی پیکر اختیار کرنے کے باوجود نہ پہچان سکا۔" میں نے یہ کہہ کر سوما کو صحرہ سے اپنی دشمنی، اس کے سبب اور پھر بصرہ تک اپنے تعاقب و مداخلت کی روداد سنا دی۔ اسی کے ساتھ میں نے سوما سے یہ بھی بیان کر دیا کہ ناصر پر سحر کرنے والا عامل "حضرت جی" ہی تھا۔

تمام واقعات سننے کے بعد کڑی سے کڑی ملانا عالم سوما کیلئے کون سا مشکل تھا۔ اس نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا کہ مجھے اپنے قبضے میں کرنے کیلئے عامل "حضرت جی" ہی نے عمل شروع کیا ہے۔ سوما نے اپنے اس خیال کا اظہار بھی کر دیا، پھر کہنے لگا۔ "اس کے باوجود دینار! تصدیق بہرحال ضروری ہے۔ یہ زیادہ مشکل کام نہیں۔ تو اگر ہمت کرے تو آج ہی رات یہ تصدیق ہو سکتی ہے۔"

"وہ کس طرح سوما؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھ دینار! ہم جنات کو قبضے میں کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔" سوما بتانے لگا۔ "اس حسرت میں اب تک نہ جانے کتنے آدم زاد اپنی جانیں گنوا چکے ہیں۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا بھروسہ ہے کہ حضرت جی نامی عامل بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ سن! کسی جن زاد یا جن زادی کو قابو میں کرنے کیلئے عامل کو پورے چالیس دن تک پابند رہنا پڑتا ہے۔ عمل کی پہلی شرط مقام ہے یعنی وہ جس جگہ پہلے روز عمل شروع کرے وہیں چالیس روز تک عمل کی خاطر بیٹھے۔ دوسری شرط وقت کی پابندی ہے۔ عموماً نصف شب کے بعد یہ عمل کیا

جاتا ہے جو فجر کے وقت تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصے میں عامل اپنی جگہ نہیں چھوڑ سکتا' نہ عمل پڑھتے وقت اس کیلئے وقفہ ممکن ہے۔ اگر کسی بھی سبب عامل' عمل کی جگہ چھوڑ دے یا کسی صورت اسے عمل پڑھنے سے روک دیا جائے تو عمل ساقط ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں اسے از سر نو عمل شروع کرنا پڑتا ہے لیکن اس وقت جب وہ زندہ بچ جائے۔ میں تجھے تو ایسا کرنے کو نہیں کہوں گا اے دینار' لیکن ہوتا یہی ہے کہ عامل جس جن زاد یا جن زادی کو اپنا مطیع بنانے کیلئے عمل کرتا ہے' وہی عامل کی جان لے لیتا ہے۔ کبھی کبھار تصادم کی صورت میں بھی حادثاتی طور پر عامل مارا جاتا ہے۔"

"اے سوما! مجھے صاف صاف بتا کہ کسی ایسے آدم زاد عامل کا قتل جنات کیلئے جائز ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"کچھ علمائے جنات اسے جائز اور کچھ ناجائز قرار دیتے ہیں۔" سوما بتانے لگا۔ "جنات کے جو عالم ایسے آدم زاد عاملوں کو واجب قتل قرار دیتے ہیں' ان کا استدلال یہ ہے کہ اللہ نے جسے آزاد پیدا کیا' کسی کو حق نہیں اسے اپنا غلام بنا لے۔ غلامی کو وہ کسی کی زندگی چھین لینے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر کوئی کسی کی زندگی ختم کرنا چاہے تو اس سے اپنی جان بچانے کیلئے جوابا قتل جائز ہے۔ ایسے آدم زاد عاملوں کے قتل کو ناجائز بتانے والے عاملوں کا کہنا یہ ہے کہ آدم زاد اشرف المخلوقات ہیں اور انہیں جنات پر فضیلت حاصل ہے۔ جنات کو یہ زیب نہیں کہ آدم زادوں کی برابری کریں۔ اپنی جان بچانے کی خاطر جوابا کسی آدم زاد کا قتل برابری کے زمرے میں ہی آتا ہے سو جنات کو یہ حق نہیں۔"

"بہ الفاظ دیگر ان عاملوں کے نزدیک جنات کو آدم زادوں سے اپنی جان بچانے کا حق نہیں؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"ہاں دینار! یہ علماء اسے آدم زادوں کی برابری کا نام دیتے ہیں۔" سوما نے بتایا۔

"مجھے تو سوما' ان علمائے جنات کا استدلال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے جو اپنی جان بچانے کیلئے جوابا قتل کو جائز تصور کرتے ہیں۔"

"دینار! تجھے اس بحث میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے!" سوما کا انداز سمجھانے والا تھا۔

"مجھے بھی تو اپنی جان بچانی ہے نا سوما!" میں نے دلیل دی۔

"اس کیلئے عامل آدم زاد کو قتل کرنا ضروری نہیں۔" سوما بولا۔ "تجھے تو کسی نہ کسی

طرح اسے بس عمل پڑھنے سے روک دینا ہے۔ دینار! میں تجھے ایک بات اور بتا دوں کہ ایسے آدم زاد بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ کسی جن زاد کیلئے ان کے قریب جانا بھی بعض صورتوں میں ممکن نہیں ہوتا۔ تو فی الحال باقی باتوں کو چھوڑ اور بصرہ جا کے یہ تصدیق کر کہ مذکورہ عامل وہی حضرت جی ہے یا کوئی اور..... اگر وہ حضرت جی ہوا تو اس وقت بھی عمل میں مصروف ہو گا۔ آج رات کو تجھے صرف یہی تصدیق کرنی ہے۔ اس کے بعد ہی تجھے بتاؤں گا' کیا کرنا ہے۔"

سوما کو یقینا میری حفاظت کا خیال تھا ورنہ تو کوئی ایسی بات نہیں تھی جو اس نے مجھ سے چھپائی ہو۔ میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ سوما نہیں چاہتا کہ میں اس آدم زاد عامل "حضرت جی" سے ٹکرا جاؤں۔ ممکن ہے' وہ کسی اور راہ کی تلاش میں ہو' گویا سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

میری نظر میں یہ معاملہ صاف اور سیدھا تھا۔ عامل "حضرت جی" مجھے اپنا مطیع بنانے کیلئے جو عمل کر رہا تھا' اسے روکنا تھا۔

"اچھا تو پھر اے سوما' میں بصرہ جاؤں؟" میں بولی۔

"ہاں جا..... میں تیرے باپ اخضم کو بتا دوں گا کہ تو میرے کہنے پر بصرہ گئی ہے۔" سوما نے کہا۔

میں مزید وقت ضائع کئے بغیر اسی وقت بصرہ روانہ ہو گئی۔ ابھی میرے وجود میں بھڑکتی ہوئی آگ بالکل ٹھنڈی تو نہیں ہوئی تھی لیکن میں اس کی تپش برداشت کر سکتی تھی البتہ جب میں بصرہ شہر کی حدود میں داخل ہوئی تو تپش کسی قدر بڑھ گئی۔

وہ پرشکوہ عمارت جہاں میں نے عامل حضرت جی کو دیکھا تھا اس وقت سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ عمارت کا بڑا محرابی دروازہ بھی بند تھا۔ ہم جنات کیلئے بند دروازوں یا دیواروں کی کوئی اہمیت نہیں ہم ان میں سے بہ آسانی گزر سکتے ہیں سو میں اس عمارت میں داخل ہو گئی۔ نچلی منزل میں مجھے صرف چند مسلح پہریدار محو خواب نظر آئے۔ میں نے جس بڑے کمرے میں آدم زادوں کی بھیڑ دیکھی تھی' اس کا دروازہ بھی مجھے بند ملا۔ میں بند دروازے سے گزر گئی۔ نچلی منزل کا اچھی طرح جائزہ لے کر میں نے اوپری منزل کا رخ کیا۔ "حضرت جی" مجھے اب تک دکھائی نہیں دیا تھا۔ مجھے اسی کی تلاش تھی۔

اوپری منزل کے ایک کمرے میں مجھے دو آدم زادیاں سوتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ

الگ الگ بستروں پر دراز تھیں۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر اور ایک نوجوان تھی۔ یہ دونوں "حضرت جی" کی بیوی اور بیٹی ہو سکتی ہیں میں نے سوچا۔ اسی کے ساتھ مجھے خیال آیا' اگر یہ دونوں چیخنے لگیں تو آدم زاد عامل جہاں بھی اور اس عمارت کی اوپری منزل میں جس جگہ ہوا دوڑا چلا آئے گا۔ ان آدم زادیوں کو چیخ اٹھنے پر مجبور کرنا میرے لئے مشکل نہ ہوتا' مگر میں نے فی الحال اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ یوں بھی عالم سوما نے مجھے آج رات وہاں صرف اس تصدیق کیلئے بھیجا تھا کہ عامل وہی ہے یا کوئی اور!

میں اس کمرے سے نکلی تو ایک طرف سے لوبان کی خوشبو آئی۔ اسی جانب کچھ فاصلے پر ہلکی سی روشنی نظر آ رہی تھی میں ادھر بڑھ گئی۔ ایک راہداری کے اختتام پر وہ کمرہ تھا جس کے اندر ایک چوکی پر عامل "حضرت جی" اپنے مخصوص حلیے میں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ چوکی ہی پر ایک رکابی میں لوبان سلگ رہا تھا اور اسی کے قریب چراغ روشن تھا۔

لمبوترے چہرے والے اس عامل کو میں نے دور سے بغور دیکھا۔ اس کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہل رہے تھے ظاہر ہے وہ کوئی عمل ہی پڑھ رہا تھا۔

یقیناً یہ کمینہ آدم زاد مجھی پر قبضہ کرنے کیلئے وظیفہ پڑھنے میں مصروف ہے۔ اس خیال نے میرے احساس کے لئے تازیانے کا کام کیا۔ میں جیسے اپنے بس میں نہ رہی۔ غصے اور نفرت کی شدید لہر مجھے اپنے ساتھ بہا لے گئی۔ میں اس کی طرف جھپٹی شاید میرا ارادہ اسے چوکی سے نیچے گھسیٹ لینے کا تھا۔ مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں کہ اس جنونی کیفیت میں کیا اقدام میرے پیش نظر تھا۔ میں البتہ یہ نہیں بھول سکی کہ مجھے وہ جسارت بہت مہنگی پڑی جیسے ہی میں چوکی کے قریب پہنچی تو میرے وجود کو شدید جھٹکا لگا۔ مجھے یوں لگا کہ میں کسی آہنی دیوار سے ٹکرا کر پیچھے گر پڑی ہوں۔ بظاہر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے سوما کے الفاظ یاد آنے لگے۔ اس نے مجھے آج ہی رات تو یہ سمجھایا تھا۔ "ایسے آدم زاد بہت خطرناک ہوتے ہیں کسی جن زاد کیلئے ان کے قریب جانا بھی بعض صورتوں میں ممکن نہیں ہوتا۔" ان الفاظ کی حقیقت اب مجھ پر پوری طرح عیاں ہو چکی تھی' سوما نے واقعی غلط نہیں کہا تھا۔

اب اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ مجھے قبضے میں کرنے کیلئے اسی عامل نے آج رات سے عمل شروع کیا ہے۔ اس وقت بابل کے کھنڈرات سے میرے بصرہ آنے کا مقصد یہی تھا۔ تصدیق ہو چکی تھی' میں نے اسی لئے واپسی کا قصد کیا۔

دن کا وقت ہوتا تو میں ناصر سے ملے بغیر واپس نہ جاتی۔ مجھے بہر حال یہ جاننے کی

جستجو تھی کہ سحر سے آزاد ہونے کے بعد اس نے غفار اور لیلیٰ کے ساتھ کیا سلوک کیا! بصرہ شہر پر پرواز کرتے ہوئے میں نے اگلے روز دن میں وہاں آنے کا فیصلہ کر لیا۔

بابل کے کھنڈرات میں واپس پہنچ کر میں عالم سوما سے ملی اور اسے بتایا۔ "تصدیق ہو گئی اے سوما! ..... وہی حضرت جی نامی عامل مجھے اپنے قابو میں کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے عمل پڑھتے دیکھ لیا ہے۔ واقعی وہ ایک خطرناک آدم زاد ہے' مجھے یہ تجربہ بھی ہو گیا۔"

"وہ کیسے دینار .....؟ کیا تجھے اسی وجہ سے واپسی میں دیر ہو گئی؟" سوما پوچھنے لگا۔ اس کے لہجے میں فکر مندی جھلک رہی تھی۔

میں نے از اول تا آخر سوما کو ساری بات بتا دی۔

"دینار! تجھے اپنے اوپر قابو رکھنا چاہئے تھا۔" سوما نے مجھے سمجھایا۔ "خیر گزری کہ معاملہ صرف جھٹکے تک رہا ورنہ وہ کوئی اور خطرناک حصار کھینچ کر بیٹھا ہوتا تو خدانخواستہ تیری جان کے لالے پڑ جاتے۔ اس نے یقیناً کوئی ایسا حصار کھینچا ہو گا جو ہم جنات کو بھی نظر نہ آ سکے۔"

"نظر نہ آنے والا حصار!" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ "مگر کیوں .....؟ کیا اسے کسی کی طرف سے خطرہ رہا ہو گا؟"

"کیوں نہیں!" سوما بولا۔ "اس نے تجھے قابو میں کرنے کیلئے عمل شروع کیا ہے تو اسے تیری طرف سے کسی ردعمل کی توقع نہ ہو گی!"

سوما کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میں نے کہا۔ "اب یہ بتا سوما کہ اسے عمل سے کیسے روکا جا سکتا ہے۔"

"اس پر غور و فکر کی ضرورت ہے اے دینار۔" سوما کہنے لگا۔ "ایسا کر کہ کل عصر سے کچھ پہلے میرے پاس آ جا..... ظہر پڑھ کر دوپہر کو میں سو جاتا ہوں' پھر عصر سے قبل اٹھ جاتا ہوں۔ فی الحال تو یہ جان لے کہ میں جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔ عجلت کا نتیجہ تو نے دیکھ ہی لیا۔ اس پر جھپٹ کر تجھے کیا ملا..... ہاں اس طرح وہ چوکنا ہو گیا۔ اب اس پر خوب سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا ہو گا۔"

تو کیا اسے پتا چل گیا ہو گا اے سوما کہ میں....."

"بالکل!" سوما میری بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھا۔ "خیر..... تو فکر نہ کر دینار! انشاء اللہ کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔ جا کر آرام کر!"

"سوما! تیرے دم کرنے کے بعد میرے وجود کی جلن بڑی حد تک کم تو ہو گئی ہے' مگر ختم نہیں ہوئی اس حالت میں شاید ہی مجھے نیند آ سکے۔"

"مجبوری ہے اے دینار!" سوما کے لہجے میں بے بسی تھی۔ "جب تک وہ آدم زاد عمل کرتا رہے گا' تکلیف قطعی طور پر ختم نہیں ہوگی' نیند نہ آئے تو سورۃ ناس کا ورد کرتی رہنا...... اس سے تمہیں سکون ملے گا۔" سوما نے مشورہ دیا۔

"میں ایسا ہی کروں گی اے سوما!" میں یہ کہہ کر اس کے پاس سے چلی آئی۔

کھنڈرات کے جس حصے میں ہماری سکونت تھی' میں وہاں پہنچی تو اپنے ماں باپ کو جاگتے پایا' بڑا بھائی یوسف البتہ سو گیا تھا۔

"اب تیری تکلیف کیسی ہے دینار؟" میری ماں سہلوبہ نے پوچھا۔

"پہلے سے بہت بہتر ہوں ماں!" میں نے جواب دیا۔

"عالم سوما نے ہم سے کہا ہے دینار کہ تجھ سے کچھ نہ پوچھا جائے۔" میرے باپ نضم نے بتایا۔ "سو میں کچھ نہیں پوچھوں گا ہاں تجھ سے سوما کی نصیحتوں پر عمل کرنے کو ضرور کہوں گا۔"

میں نے اپنے باپ کو یقین دہانی کرادی کہ سوما کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گی۔ وہ مطمئن ہو گیا اور مجھے سونے کی تاکید کی۔

عالم سوما کی ہدایت کے مطابق جب میں سونے لیٹی تو سورۃ ناس کا ورد شروع کر دیا۔ خلاف توقع تکلیف کا احساس کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا اور مجھے نیند آ گئی۔ دوسرے دن صبح میں دیر سے سو کر اٹھی۔ میں نے خود کو پہلے سے زیادہ تر و تازہ اور توانا محسوس کیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گزشتہ رات کو میں کسی اذیت سے گزری ہی نہ ہوں۔ سوما سے میری ملاقات قبل از عصر ہوئی تھی۔ ابھی سارا دن باقی تھا۔ گزشتہ رات کو میں نے دن کے وقت بصرہ جانے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ ناصر کا حال احوال معلوم کر سکوں۔ میں نے اسی فیصلہ پر عمل کیا اور بصرہ روانہ ہو گئی۔

ابھی دن کا پہلا ہی پہر تھا کہ میں بصرہ میں ناصر کے گھر پہنچ گئی مگر خود کو ظاہر نہ کیا۔ ناصر اور لیلیٰ کے درمیان میں نے سخت کلامی ہوتے دیکھی۔ لیلیٰ کا باپ غفار بھی وہاں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

"یہ تم نے کیا بکواس شروع کر دی ہے ناصر کہ میں نے زبردستی تمہارے ساتھ

شادی کی ہے!" لیلیٰ تیز آواز میں کہہ رہی تھی۔

"لیلیٰ! اسے بکواس نہ کہہ کر یہی حقیقت ہے۔" ناصر نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں نے تمہیں قبول کرنے کی حامی بھر لی!" ناصر کے ان الفاظ سے واضح ہوتا تھا کہ اسے اپنے اوپر سحر کرائے جانے کا علم نہیں تھا۔

"اب یہ گڑے مردے اکھاڑنے سے تمہارا کیا مقصد ہے؟ مت بھولو کہ میں تمہیں حضرت جی کے پاس بھی بھیج سکتی ہوں۔" لیلیٰ نے گویا دھمکی دی۔

"کون حضرت جی؟" ناصر نے سوال کیا۔ سوال کرتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا جیسے اسے کچھ یاد آ رہا ہو۔

"لیکن یہ بتاؤ کہ یہ تم مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہی ہو۔" ناصر کو غصہ آ گیا۔ "تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ گھر میرا ہے اور میں تم کو یہاں سے نکال بھی سکتا ہوں۔"

"تم...... تم نکالو گے مجھے اس گھر سے؟ ہوش میں تو ہو تم!" لیلیٰ کی آواز بلند ہو گئی۔

ناصر نے اس وقت جو باتیں کیں ان سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جتنے عرصے وہ سحر کے زیر اثر رہا' اس عرصے کی بہت سی باتیں اس کے حافظے میں نہیں رہیں۔ جو باتیں اسے یاد بھی ہیں تو ان کی حیثیت پرچھائیوں جیسی ہے۔

لیلیٰ اور ناصر کے درمیان ہونے والے جھگڑے کو غفار نے ختم کرانا چاہا مگر اسے ناکامی ہوئی۔ پھر جب ناصر نے کھجور کے باغوں سے ہونے والی آمدنی کا غفار سے حساب مانگا تو وہ اور بھی سٹپٹا گیا اور کہنے لگا۔ "آج یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ناصر بیٹے! پہلے تو کبھی تم نے مجھ پر اس طرح بے اعتمادی کا اظہار نہیں کیا۔"

"اس میں بے اعتمادی کی کوئی بات نہیں چچا!" ناصر نے کہا۔ "رشتے ناطے اپنی جگہ حساب اپنی جگہ۔"

"میں نے تو کوئی حساب نہیں رکھا۔" غفار کسی قدر ناگواری سے بولا۔

"تو غلطی کی آپ نے...... اب آپ باغوں کا رخ نہیں کریں گے' خود میں پہلے کی طرح......"

"یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔" غفار نے ناصر کی بات کاٹ دی۔ "وہ باغات میرے بڑے بھائی مرحوم جبار کی ملکیت ہیں۔ بھائی جبار کی وفات کے بعد تم خود بھی ان باغات پر

میرا حق تسلیم کر چکے ہو۔ اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں تو اپنی بیوی سے اس کی تصدیق کر لو۔"

"اپنی بیوی سے یا آپ کی بیٹی سے؟" ناصر چیختی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "چچا! آپ کو گواہی کیلئے اپنی بیٹی کے سوا کوئی اور نہیں ملا۔ خیر میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب کھیل ختم ہو چکا ہے۔ میں کسی بھی وقت لیلیٰ اور آپ کو اپنے گھر سے چلتا کر سکتا ہوں۔"

"کیا تمہیں یہ خیال بھی نہیں کہ لیلیٰ تمہاری بیوی ہے؟" غفار نے کہا۔

"صرف اس وقت تک یہ میری بیوی ہے جب تک میں اسے طلاق نہیں دیتا' طلاق دینے کے بعد اس سے میرا کوئی رشتہ باقی نہیں رہے گا۔" ناصر نے جواب دیا۔

"بابا!" لیلیٰ بول اٹھی۔ "آپ آخر میری بات کیوں نہیں مانتے!...... ناصر کو فوراً حضرت جی کے پاس لے جائیں' وہ کانٹوں بھری شاخوں سے پٹائی کریں گے تو دماغ کے سارے کیڑے جھڑ جائیں گے' خودسری کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔"

"میں بتاتا ہوں تجھے خودسری کسے کہتے ہیں؟" ناصر یہ کہہ کر لیلیٰ پر ہاتھ چھوڑنے والا تھا کہ غفار درمیان میں آ گیا۔

"میرے جیتے جی تم میری بیٹی پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔" غفار بولا۔

پھر جو کچھ ہوا وہ میرے لئے زیادہ خلاف توقع نہیں تھا۔ ناصر نے غفار اور لیلیٰ کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اس معرکہ آرائی میں کب دوپہر ہو گئی مجھے پتا ہی نہ چلا۔

"تو فکر نہ کر لیلیٰ!" ناصر کے گھر سے نکلتے ہوئے غفار اپنی بیٹی کو تسلی دینے لگا۔ "میں ابھی جا کر حضرت جی سے ملتا ہوں۔"

غفار کی بات سن کر مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ شیطان عامل "حضرت جی" دوبارہ ناصر پر سحر نہ کر دے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ غفار اور لیلیٰ چلے جائیں گے تو میں خود کو ناصر پر ظاہر کر دوں گی' لیکن اب اپنا ارادہ بدل دیا۔

اسی محلے میں ناصر کے گھر سے کچھ دور واقع ایک مکان غفار کا تھا۔ ناصر کے ساتھ لیلیٰ کی شادی ہونے سے پہلے غفار کی سکونت اسی مکان میں تھی۔ فی الحال ناصر کے گھر سے نکلنے کے بعد غفار نے اسی مکان میں لیلیٰ کو چھوڑا اور "حضرت جی" سے ملنے چلا گیا۔

اس عامل کے "آستانے" پر خلق خدا کا وہی ہجوم تھا جس کا نظارہ پہلے بھی ایک دفعہ کر چکی تھی۔

غفار کے ساتھ ساتھ ہی میں اس پرشکوہ عمارت میں داخل ہو گئی۔ آج میں نے وہاں پہلے سے زیادہ بھیڑ دیکھی۔ توقع کے خلاف "حضرت جی" اپنے مخصوص کمرے میں مجھے تخت پر دکھائی نہ دیا۔ وہاں موجود مسلح پہریدار لوگوں کو بتا رہے تھے کہ آج سے حضرت جی ظہر کے بعد حاجت مندوں سے ملا کریں گے۔ وہاں موجود افراد میں سے یقیناً کوئی بھی اس تبدیلی کی وجہ نہیں جانتا ہوگا' مگر میں بے خبر نہیں تھی۔ ظاہر ہے عمل کی خاطر نصف شب سے صبح فجر کے وقت تک جاگ کر وہ عامل دن بھر حاجت مندوں کے درمیان موجود نہیں رہ سکتا تھا۔

ظہر کا وقت ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی اس لئے غفار دوسرے لوگوں کی طرح "حضرت جی" کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ اس سے قبل غفار نے یہ بندوبست کر لیا تھا کہ جیسے ہی عامل اپنے تخت پر آ کر بیٹھے پہریدار اسے ملنے کا موقع دے دیں۔ اس کیلئے غفار کو تخت کے سامنے کھڑے ہوئے پہریداروں کی منت سماجت کے علاوہ مٹھی بھی گرم کرنا پڑی تھی۔

☆......☆......☆

ناصر کو میں نے زیر اثر لے کر باغبانوں کو مزید کہلوایا۔ "ممکن ہے آج چچا غفار اس باغ میں داخل ہونے کی کوشش کریں۔ انہیں کسی قیمت پر باغ میں داخل نہ ہونے دینا...... تم لوگ محتاط و چوکنا رہو اور اس باغ کی نگرانی کرتے رہو!"

باغباں اقرار میں سر ہلا کر وہاں سے چلے گئے تو میں ناصر کو باغ کی کوٹھڑی کے اندر لے آئی۔ غفار نے اس کا فرش ہموار کر کے ایک چٹائی بچھا دی تھی میرے ایما پر ناصر اس چٹائی پر بیٹھ گیا تو میں نے اسے اپنے اثر سے آزاد کر دیا۔

ناصر کو یقیناً ٹھیک طرح اندازہ نہیں تھا کہ طویل عرصے تک اس کی حالت غلاموں جیسی رہی ہے۔ میں نے ایک پراسرار وجود دینار کی حیثیت سے ایک مدت کے بعد اسے مخاطب کیا تو مجھے صورتحال کا پوری طرح اندازہ تھا۔

اس نے میری آواز سنی تو تقریباً اچھل پڑا اور حیرت زدہ آواز میں بولا۔ "تم دینار تم!"

"ہاں میں۔" مجھے خوشی ہوئی کہ وہ اس بار پہچان گیا تھا۔ حیرت کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں گرم جوشی تھی۔

"تم...... تم میرے سامنے...... مجھے نظر تو آؤ!" ناصر مجھے دیکھنے کو بے چین ہو گیا۔

"اس سے پہلے مجھے چند ضروری باتیں کرنی ہیں جن کا تمہیں معلوم ہونا لازمی

ہے۔" میں نے کہا۔

"پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ اتنے دن کہاں تھیں؟ اور مجھ سے کیوں نہیں ملیں؟" اس کا انداز ضدی اور لاڈلے بچوں جیسا تھا۔

"مجھے افسوس ہے ناصر کہ میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا' بہ وجوہ اسے پورا نہ کر سکی۔" میں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ "وہ دن مجھے آج بھی یاد ہے ناصر! جب تم نے اپنے لالچی چچا غفار کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ایک عامل سے ربط ضبط بڑھا رہا ہے۔ اس عامل کے ذریعے وہ تم پر کوئی ایسا عمل بھی کرا سکتا ہے کہ تم اس کی بیٹی لیلیٰ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جاؤ۔ بہر حال...... وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ عامل سے تم پر سحر کرا کے تمہارے چچا اور لیلیٰ نے تمہیں اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ اس کے عوض حضرت جی نامی اس عامل کو تمہارے چچا نے کھجور کا ایک باغ دے دیا جو دراصل تمہاری ملکیت......"

"ہاں مجھے آج ہی اس بارے میں باغبانوں نے بتایا ہے۔" ناصر بول اٹھا۔ "پتا چلا ہے کہ حضرت جی نے اس باغ کی نگہبانی پر اپنے آدمی مقرر کر رکھے ہیں' چچا غفار نے یہ اچھا نہیں کیا۔" پھر یوں لگا جیسے ناصر کو کچھ یاد آ گیا ہو وہ پوچھنے لگا۔ "سحر سے مجھے کیسے آزادی ملی؟ ...... کیا تم......"

ناصر نے جو جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا' اسے میں نے پورا کیا۔ "ہاں ناصر! مجھ سے تمہاری حالت دیکھی نہ گئی۔ سحر کے زیر اثر آ کر تم نے مجھے بھی پہچاننے سے انکار کر دیا تھا خیر...... میں نے اپنی پراسرار قوتوں سے کام لے کر پہلے تو یہ معلوم کیا کہ تم پر سحر کیا گیا ہے' پھر سحر کرانے والے کا پتا لگایا اور......" پھر ناصر کو میں نے گرہیں لگے ہوئے گنڈے اور اس کی تلاش نیز اسے بیکار بنا دینے کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ ناصر حیران حیران سا میری باتیں سنتا رہا۔ میں نے آخر میں ناصر کو متوقع خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "غفار کو یہ پتا نہیں لگنا چاہئے کہ اس نے جہاں گنڈا دبایا تھا وہاں سے اسے نکالا جا چکا ہے۔ اس کی یہی ایک صورت ہے کہ وہ یہاں اس کوٹھری تک نہ پہنچ سکے...... تم غالباً میری بات سمجھ رہے ہو...... میں نہیں چاہتی کہ تم پر دوبارہ سحر کر دیا جائے۔"

ناصر کے چہرے سے فکر مندی کا اظہار ہونے لگا۔ وہ مجھے کسی سوچ میں کھویا ہوا لگا۔ میں نے اسے دانستہ نہیں ٹوکا۔

"دینار!" آخر ناصر نے مجھے مخاطب کیا۔ "تم میری آواز سن رہی ہو؟"

"ہاں کہو اے ناصر! میں تمہاری ہی طرف متوجہ ہوں۔" میں بولی۔

"اگر میں اس کوٹھری کو مستقل طور پر بند کر دوں اور یہاں نگہبان کو بھی نگرانی پر مقرر کر دوں کہ کوئی اس کوٹھری کو کھول کے اندر نہ جا سکے تو یہ تدبیر کیسی رہے گی اے دینار؟" ناصر نے مجھ سے سوال کیا۔

میں ابھی کوئی جواب نہ دے پائی تھی کہ کسی کے قدموں کی چاپ ابھری۔ آنے والا ایک باغباں تھا۔ اس نے بتایا "آپ کے چچا ملنے آئے ہیں۔"

"کہہ دو کہ میں ان سے نہیں ملنا چاہتا!" ناصر ناگواری سے بولا۔

باغباں چلا گیا تو میں' ناصر سے مخاطب ہوئی۔ "ایک تدبیر یہ بھی ممکن ہے کہ اس کوٹھری کی دیواریں ہی ڈھا دو اس طرح کوٹھری کا وجود ہی نہیں رہے گا۔ جس جگہ تم چٹائی پر بیٹھے ہو پختہ کرا دو۔"

"لیکن دینار! اس میں تو وقت لگے گا۔" ناصر کہنے لگا۔..

"اس دوران میں کہیں کسی طرح چچا یہاں نہ پہنچ جائیں۔"

"یہ بندوبست میں کر دوں گی ناصر کہ تمہارا چچا غفار کم از کم دو روز تک یہاں نہ پہنچ سکے۔" میں نے کہا۔

"اس کیلئے تم کیا کرو گی اے دینار؟" ناصر نے پوچھا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو ...... اب میں چلتی ہوں تاکہ غفار کی شکل میں جو خطرہ تمہارے گرد منڈلا رہا ہے اسے یہاں سے دور لے جاؤں۔" یہ کہہ کر میں رخصت ہو گئی۔

غفار ابھی تک وہاں سے گیا نہیں تھا' باغبانوں سے وہ اصرار کیے جا رہا تھا کہ اسے ناصر سے ملنے دیں۔

میں نے غفار کو اپنی جناتی صفات کے اثر میں لے کر وہاں سے واپس شہر جانے پر مجبور کر دیا۔

"غفار! اب تم دو دن تک ان باغوں کی طرف نہیں آؤ گے۔" میں نے اسے حکم دیا۔

"نہیں...... نہیں آؤں گا......" غفار بڑبڑانے لگا۔

غفار کو اپنے اثر سے آزاد کر کے میں نے بابل کے کھنڈرات کا رخ کیا۔ ہم جنات کی بھی کچھ حدود مقرر ہیں جن سے تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں غفار کو کوئی اور حکم

بھی دے سکتی تھی۔ مثلاً یہ کہ وہ ''حضرت جی'' سے نہ ملے' یوں ناصر ایک ممکنہ خطرے سے محفوظ ہو جاتا۔ فی الحال تو خود میری زندگی بھی خطرے میں تھی۔ شیطان عامل مجھے اپنے قبضے میں کرنے کیلئے عمل شروع کر چکا تھا اور اسے روکنا تھا۔

مقررہ وقت پر میں بابل کے کھنڈرات میں عالم سوما سے ملی وہ کہنے لگا۔ ''دینار! میں خاصے غور فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے کہ تجھے عامل کے قریب نہ جانا پڑے اور بغیر قریب جائے تیرا مقصد پورا ہو جائے یعنی وہ عمل پڑھنا چھوڑ دے۔''

''اے سوما! ہے ایک ایسی تدبیر!'' میری آواز پر جوش تھی' پھر میں نے سوما کے پوچھے بغیر وہ تدبیر بیان کر دی جو گزشتہ رات میں نے سوچی تھی۔

سوما نے میری تدبیر سے اتفاق کیا اور بولا۔ ''آج بھی جب وہ آدم زاد عامل نصف شب کے بعد عمل شروع کرے گا تو کل رات ہی کی طرح دینار' تو اذیت میں مبتلا ہو جائے گی تیرے لئے بہتر یہ ہے کہ وقت سے پہلے میرے پاس پہنچ جا! میں تجھ پر دم کر دوں گا تو وہ تکلیف تیرے لئے قابل برداشت ہو جائے گی۔ کل رات جیسا ہوا تھا پھر تو بصرہ جا سکے گی۔'' سوما مجھے کچھ دیر ان خطرات کے بارے میں بتاتا رہا جو بصرہ میں پیش آ سکتے تھے۔

پھر سب کچھ وہی ہوا جو پہلے سے طے شدہ تھا۔ میں نصف شب کو اذیت سے گزری' سوما نے مجھ پر دم کیا پھر تکلیف کم ہو گئی تو بصرہ روانہ ہو گئی۔

بصرہ پہنچ کر میں عامل حضرت جی کے گھر میں داخل ہوئی اوپری منزل پر گزشتہ شب کی طرح میں نے عامل حضرت جی کی نوجوان بیٹی کو بے خبر سوتے ہوئے دیکھا اور خاموشی کے ساتھ اس آدم زادی کے جسم میں داخل ہو گئی۔

اس سے قبل میں کبھی کسی آدم زاد کے جسم میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ میرے لئے یہ پہلا تجربہ تھا اسی سبب میں گھبرا گئی۔ اس آدم زادی کے جسم میں گھپ اندھیرا اور انتہائی گھٹن تھی۔ مجھے قید کا احساس ہوا۔ میں اسی بنا پر خوفزدہ ہو کر اس کے جسم سے نکل آئی۔ پھر مجھے کافر جن زاد صحرہ یاد آیا جو ناصر کے چچا غفار کے جسم میں داخل ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب صحرہ ایسا کر سکتا ہے تو مجھ پر خوف کیوں غالب ہے؟ ایک بار عامل حضرت جی کی بیٹی کے جسم میں گھس کر باہر نکل آنے سے بھی میری ہمت بندھی سو میں دوسری مرتبہ گویا خود ہی اس آدم زادی کے جسم میں داخل ہو کر ''قیدی'' بن گئی۔ دونوں دفعہ ایسا کرتے ہوئے آدم زادی کے

جسم کو میں نے خفیف سا جھٹکا کھاتے دیکھا تھا۔ مجھے اب اس کے جسم میں قرار آ گیا تھا۔

اس آدم زادی کے جسم پر قبضہ کر کے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرا مقصد عامل کو عمل پڑھنے سے کسی بھی طرح روکنا تھا تاکہ وہ مجھے اپنے قابو میں نہ کر سکے۔ اس کیلئے پہلے یہ تصدیق ضروری تھی کہ گزشتہ شب کی طرح عامل نے عمل شروع کر دیا ہے۔

دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی میں اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کی کنڈی اندر سے بند تھی جسے میں نے آہستگی سے کھول دیا۔ میری اس احتیاط کی وجہ ادھیڑ عمر آدم زادی تھی جو اسی کمرے میں دوسرے بستر پر محو خواب تھی۔ ابھی اس کا جاگ جانا میرے لئے سودمند ثابت نہ ہوتا۔ اس پرشکوہ عمارت کی نچلی اور اوپری منزلوں کے ایک ایک گوشے کو تکتی میں اس کمرے کے کھلے ہوئے دروازے تک پہنچ گئی' مگر اندر داخل نہ ہوئی۔

چند لمحے بعد میں نے کمرے میں جھانک کر دیکھا اور تقریباً اچھل پڑی۔ عامل کی نظریں دروازے ہی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور ہونٹ حرکت میں تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے عامل میری ہی آمد کا منتظر تھا اور اس کی نظر مجھ پر پڑ چکی ہے۔ میں اس وقت یہ حقیقت نظر انداز ہی کر بیٹھی تھی کہ وہ عامل مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا اگر اس نے دیکھا بھی ہو گا تو مجھے نہیں اپنی بیٹی کو دیکھا ہو گا۔ ممکن ہے کہ یہ میرا محض وہم ہو کہ مجھے دیکھ لیا گیا ہے' میں نے سوچا۔

گزشتہ شب کی طرح کمرے میں اور باہر تک لوبان کی بو آ رہی تھی' اس کے علاوہ دھیمی روشنی بھی تھی۔

عامل کے عمل پڑھنے کی تصدیق کر کے میں الٹے قدموں وہاں سے لوٹ آئی۔ جس کمرے میں ادھیڑ عمر آدم زادی محو خواب تھی مجھے دوبارہ وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ دانستہ میں نے کمرے کا دروازہ کھلا رہنے دیا اور خالی بستر پر آ کر لیٹ گئی تھی۔

اپنی سوچی سمجھی تدبیر پر عمل کرنے میں اب مجھے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ مجھے اپنی تدبیر کی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ اسی یقین کے سہارے اچانک میں نے پوری قوت سے چیخنا شروع کر دیا۔ ''بچاؤ!...... بچاؤ......''

عمارت پر مسلط سناٹا میری چیخوں سے ختم ہو گیا۔ ادھیڑ عمر آدم زادی۔ ''یا اللہ خیر......'' کہتی ہوئی اٹھی اور میری طرف لپکی۔

میں نے پہلے سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اور مزید بلند آواز میں چیخنا جاری رکھا۔

" کیا ہوا ساجدہ بیٹی تجھے کیا ہوا؟ ادھیڑ عمر آدم زادی نے قریب آ کر مجھے گھبرائی ہوئی آواز میں مخاطب کیا۔ یوں پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ اس عامل کی بیٹی کا نام ساجدہ ہے اور یہ کہ ان دونوں آدم زادیوں کے بارے میں میرا قیاس درست تھا کہ عامل سے ان کا کیا رشتہ ہے۔

میں نے ساجدہ کی ماں کو مزید خوفزدہ کرنے کی خاطر مصلحتاً کہا۔" ماں میرے..... میرے جسم میں ایک جن ...... جن زادی گھس گئی ہے اور . . . اور وہ مجھے مار ڈالنا چاہتی ہے۔ میں..... میں زندہ...... رہنا چاہتی ہوں ماں...... زندہ!" یہ کہہ کر میں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا اور پھر خود ہی اپنی گردن دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے بتانے لگی۔" وہ مجھے ... مجھے مار ڈالے گی... بچاؤ ..... مجھے بچالو ماں!"

ادھیڑ عمر آدم زادی نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور پر جوش آواز میں بولی۔

" میری بچی! میں تجھے مرنے نہیں دوں گی۔"

دانستہ میں نے اپنے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کر دی اور دوبارہ زور زور سے چیخنے لگی۔

جس وحشت زدہ نوجوان آدم زادی کو پابہ زنجیر اس عامل کے پاس لایا گیا تھا' جو کسی ذہنی عارضے میں مبتلا تھی' میں نے اسی کی طرح جھومنا اور چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس چیخ و پکار اور ہنگامے کا مقصد ایک طرف تو عامل کی ادھیڑ عمر بیوی کو ہراساں و فکرمند کرنا تھا' دوسری جانب اس کا اصل مقصد عامل کو ادھر متوجہ کرنا تھا۔ خلاف توقع عامل سے پہلے نچلی منزل پر موجود مسلح پہریداروں نے اس دروازے کو دھڑ دھڑا دیا جسے کھول دیا جاتا تو وہ اوپری منزل پر آ جاتے۔ وہ اونچی آوازوں میں ہنگامے اور چیخ و پکار کی وجہ پوچھ رہے تھے۔

" جاؤ..... جاؤ ماں' انہیں بھی بتا دو کہ ساجدہ مرنے والی ہے۔" میں یہ کہہ کر زور سے چیخی۔

" مریں تیرے دشمن!" ادھیڑ عمر عورت نے کہا۔" میں ابھی تیرے بابا کو ان کے کمرے سے بلا کر لاتی ہوں۔"

پھر ادھر تو عامل کی بیوی نے اس کمرے سے باہر قدم رکھا' ادھر میں ساجدہ کے جسم سے نکلی اور وہ دروازہ کھول آئی جس پر پہریدار دستکیں دے رہے تھے۔ وہ اس قدر بدحواس تھے کہ ان کے ذہنوں میں یہ سوال بھی نہ ابھرا کہ دروازہ کس نے کھولا۔ اوپری منزل تک پہنچنے

کیلئے وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

اس سے پہلے کہ پہریدار اوپری منزل پر پہنچتے میں دوبارہ ساجدہ کے جسم میں گھس کر چیخنے لگی۔

ذرا ہی دیر میں مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔

" ساجدہ..... میں آ رہا ہوں میری بچی!" عامل کی آواز سنائی دی۔

میرے وجود میں ٹھنڈک سی اترنے لگی۔ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ یہ بہرحال میرے نزدیک کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔

میں اگر چاہتی تو فوری طور پر عامل کی نوجوان بیٹی کے جسم سے نکل کر چلی آتی مگر دانستہ ایسا نہیں کیا۔

جب عامل تقریباً دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ ادھیڑ عمر عورت بھی تھی۔ میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوا کہ اس وقت عامل کے گرد حصار نہیں ہے۔

" بابا!" میں عامل کو دیکھ کر چیخی۔" یہ جن زادی میرا کلیجہ نوچ رہی ہے..... مجھے مار دے گی یہ!"

عامل ابھی کوئی جواب نہ دے پایا تھا کہ مسلح پہریدار بھاگتے ہوئے کمرے میں گھس آئے۔ انہیں دیکھ کر عامل آگ بگولہ ہو گیا۔" تم یہاں؟"

پہریداروں کو فوراً ہی اپنی بدحواسی کا احساس ہو گیا۔ وہ معافی مانگتے ہوئے الٹے قدموں لوٹ گئے۔ میرے لئے یہ لمحات غنیمت تھے ان سے فائدہ اٹھا کر یہ ممکن تھا کہ میں عامل کو قتل کر دیتی لیکن یہ انتہائی قدم نہیں اٹھایا۔ اس کا بڑا سبب عالم سوما تھا۔ سوما کی رضامندی کے بغیر میں نے اس عامل کی زندگی کا چراغ گل کرنے سے گریز کیا۔ پھر بھی عامل کو تھوڑا بہت سبق دینے سے باز نہ رہ سکی۔

چند لمحوں کو عامل کی توجہ میری طرف سے ہٹی تھی' اس کی وجہ پہریداروں کی آمد تھی۔ جیسے ہی پہریداروں نے کمرے سے باہر قدم رکھا' میں نے عامل پر چھلانگ لگا دی۔ میرا حملہ یقیناً اس کیلئے غیر متوقع ہی تھا وہ فرش پر آ رہا اور میں اسے مارنے لگی۔ اس کی سرخ پگڑی اتار کر میں نے دور پھینک دی اور لمبوترے چہرے پر ناخنوں سے نقش و نگار بنانے لگی۔

"تو مجھے اپنے قبضے میں کرے گا کمینے!" میں نے اس کے منہ پر زور دار طمانچہ

جڑتے ہوئے کہا۔ میں نے دانستہ اپنا نام لینے سے گریز کیا تھا کیونکہ وہاں پر ایک ایسی آدم زادی بھی یعنی عامل کی بیوی موجود تھی جو میرے نام سے واقف نہیں تھی۔

''ارے ارے! یہ تو کیا کر رہی ہے ساجدہ بیٹی!'' ادھیڑ عمر عورت نے مجھے مار پیٹ سے روکنا چاہا۔

عامل کی بیوی کو میں نے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ کچھ فاصلے پر جا کے گری۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔

''اے ساجدہ کی ماں!'' عامل چیخا کہ اب اس کی باری تھی۔ ''یہ تیری بیٹی ساجدہ نہیں جن زادی......''

اپنی بات عامل پوری نہیں کر سکا کیونکہ اس کے منہ پر میرا زوردار مکا پڑا تھا۔ ''بول مجھے قابو میں کرنے کیلئے عمل پڑھے گا؟'' میں نے یہ کہتے ہوئے اس کی گردن دبوچ لی۔ ذرا سا دباؤ ڈالنے پر اس کی آنکھیں ابلنے لگیں تو میں نے گردن چھوڑ دی۔

''اے دینار...... ! اے جن زادی! مجھے معاف کر دے۔'' وہ خود پر قابو پا کر گڑگڑانے لگا۔

''اپنی ناپاک زبان پر اگر اب تو میرا نام لایا تو حلق سے تیری زبان کھینچ لوں گی!'' میں نے گھونسا مار کر اس کے زخمی ہونٹوں کو مزید زخمی کر دیا۔ وہ ''ہائے ہائے'' کرتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگا۔ اب وہ رو بھی رہا تھا۔ عامل کی بیوی دور کھڑی حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

''آج تو میں تجھے زندہ چھوڑے جا رہی ہوں لیکن تو اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا اور دوبارہ عمل پڑھنا شروع کیا تو میرے ہاتھوں مارا جائے گا' صاف صاف سن لے کہ میں تجھے قتل کر دوں گی!'' میں اس کے اوپر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نہیں اے جن زادی!'' عامل نے سسکیاں بھرتے ہوئے مجھے یقین دلایا۔ ''میں اب کبھی تجھے پا لینے کی آرزو نہیں کروں گا۔ مجھ سے واقعی سخت غلطی ہوئی...... دراصل میں خلق خدا کی خدمت کیلئے تجھ سے مدد لینا چاہتا تھا۔''

''مجھ سے مکر نہ کر!'' میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''جھوٹ نہ بول! خلق خدا کا نام لے کر اپنے گھناؤنے عزائم پر پردہ نہ ڈال! مجھے کچھ ہی دن میں تیری رگ رگ سے واقفیت حاصل ہو چکی ہے تو مجھے دھوکا نہیں دے سکتا!''

وہ ابھی تک کمرے کے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے حقارت سے اس کے جسم کو ٹھوکر ماری۔ میری ٹھوکر اس کی پسلی پر پڑی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں دوسرے ہی لمحے میں اس کی نوجوان بیٹی ساجدہ کے جسم سے باہر نکل آئی۔ ساجدہ کا جسم جھٹکا کھا کر زمین پر آ رہا۔

عامل کی بیوی ''ہائے میری بیٹی'' کہتی ہوئی ساجدہ کے بے سدھ جسم کی طرف لپکی۔

''گھبراؤ مت ساجدہ کی ماں!'' عامل کی آواز آئی۔ ''ساجدہ صرف بے ہوش ہے اور جلد ہی ہوش میں آ جائے گی۔'' عامل کو میں نے فرش سے اٹھتے دیکھا۔

اب وہاں میرا مزید رکے رہنا لاحاصل تھا میرے نزدیک یہ بہت بڑی کامیابی تھی کہ میں نے آدم زاد عامل کو عمل پڑھنے سے روک دیا تھا۔ میں یہ خوشخبری جلد از جلد اپنے قبیلے کے عالم سوما کو دینا چاہتی تھی۔ سوما کو میں نے اپنا روحانی استاد تسلیم کر لیا تھا۔

بصرہ شہر اس وقت اندھیرے اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا جب میں اس کے اوپر پرواز کر رہی تھی۔ اس وقت میں نے سوچا کہ عامل نے مجبور اور زیر ہو کر کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ اب کبھی مجھے پا لینے کی آرزو نہیں کرے گا' مگر کیا اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ میں نے تو بچپن سے یہی سنا تھا کہ آدم زادوں پر بھروسا نہیں کرنا چاہئے۔ وہ قابل اعتماد نہیں ہوتے۔ اگر حضرت جی نامی وہ آدم زاد عامل بھی ایسا ہی ہوا تو کیا ہو گا؟ اگر اس نے کل ہی رات سے دوبارہ عمل پڑھنا شروع کر دیا تو اسے کیسے روکا جا سکے گا؟ مجھے اعتراف ہے کہ اس وقت تک اس سلسلے میں میری معلومات ناکافی تھیں۔

وہ رات بڑی حسین تھی یا شاید میرے اس احساس کی وجہ میری کامیابی تھی۔ میں نے بھرپور چاند کی طرف دیکھا۔ اس کی چاندنی میں دور تک پھیلے ہوئے صحرا کی ریت چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ غالباً اسی منظر نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ فضا کے حسن کو اپنی روح میں سمیٹتی ہوئی دھیمی رفتار سے میں اپنی منزل کی جانب رواں تھی کہ ٹھٹک گئی۔ مجھے ایک ایسا ہی منظر دکھائی دیا تھا۔

یقیناً وہ کوئی آدم زادی ہی تھی جو گھوڑا دوڑاتی ہوئی ایک طرف اڑی جا رہی تھی۔ وہ چادر اوڑھے ہوئے تھی جس میں اس کا جسم لپٹا ہوا تھا۔ اس کے تعاقب میں مجھے دو گھوڑ سوار نظر آئے۔ میں سمجھ گئی کہ وہ آدم زادی کسی سبب کہیں سے فرار ہوئی ہے اور اس کا تعاقب کرنے والے اسے روکنا چاہتے ہیں' مگر کیوں؟ اس سوال نے میرے جذبہ تجسس کو بیدار کر

دیا۔ میں نے سوچا' اگر وہ آدم زادی ان دونوں آدم زادوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوتی تو اسے بھاگنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کمزور کی مدد کرنی چاہئے۔ اس خیال سے میں نے ایک حسین انسانی پیکر اختیار کیا اور گھڑ سوار آدم زادوں کے سامنے آ گئی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی انہوں نے اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں مجھے ان سے یہی توقع تھی۔

''یہ تو فائقہ سے بھی زیادہ حسین ہے اے خالد!'' ان گھڑ سواروں میں سے ایک نے اپنے دوسرے ساتھی کو مخاطب کیا۔

''ہاں اے عمار! دوسرا خراب ناک کی آواز میں بولا۔ ''یہ تو کوئی آسمانی مخلوق معلوم ہوتی ہے آ اس سے پوچھتے ہیں کہ یہ کون ہے؟''

''مگر وہ...... وہ فائقہ تو نکل گئی خالد! میر کارواں کو ہم کیا جواب دیں گے!'' پہلا گھڑ سوار فکر مند نظر آنے لگا۔

''چھوڑ بھی عمار! اس میں آخر ہمارا کیا قصور...... ہم نے تو فائقہ کو فرار نہیں کرایا' کہہ دیں گے کہ وہ دھوکا دے کر بھاگ گئی۔'' خالد نامی گھڑ سوار نے کہا اور اپنا گھوڑا آگے بڑھایا۔ ''فائقہ پر خاک ڈال! وہ بس نام کی فائقہ تھی' ورنہ ہمیں تو اس نے کوئی فیض نہیں پہنچایا۔ اس جنت کی حور کو دیکھ جو ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ میں نے تو ایسی حسین دوشیزہ پہلے کبھی نہیں دیکھی۔''

''تو بھی خوب ہے خالد!'' عمار ہنس دیا۔ ''تو نے صرف دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ یہ دوشیزہ ہے! کیا خبر یہ کسی کی بیوی ہو!''

''حسین عورتیں بیویاں بننے کیلئے نہیں ہوتیں۔'' خالد نے کہا۔ اس دوران میں وہ میرے قریب آ چکا تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔ ''اے عمار! دیکھ تو سہی' چاند صحرا میں اتر آیا ہے۔''

''ہاں دیکھ رہا ہوں۔'' عمار بھی قریب آ گیا۔

ان دونوں کے گھوڑے میرے دائیں بائیں تھے انہیں دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہوش کھو بیٹھے ہوں۔ وہ مجھے ایک ٹک دیکھے جا رہے تھے۔ میرا مقصد فائقہ نامی آدم زادی کو ان کی دسترس سے بچانا تھا جو پورا ہو چکا تھا۔ ان کی خود فراموشی کا سبب وہ حسین انسانی پیکر تھا' میں جس میں انہیں نظر آ رہی تھی۔ اب تک ان دونوں نوجوان آدم زادوں کی گفتگو سے مجھے صرف چند باتوں کا اندازہ ہو سکا تھا' وہ یہ کہ صحرا میں کہیں قریب ہی کوئی کارواں پڑاؤ ڈالے

ہوئے تھا۔ فائقہ غالباً موقع پا کر اسی کارواں سے فرار ہوئی تھی۔ کسی سبب اسے وہاں جانا قبول نہ ہوگا جہاں وہ کارواں جا رہا تھا۔ خالد اور عمار کی حیثیت اس کارواں کے محافظوں کی ہو گی وہ اسی لئے فائقہ کا تعاقب کر رہے تھے۔

میں ابھی انہی خیالوں میں گم تھی کہ خالد بول اٹھا وہ مجھ سے مخاطب تھا۔ ''تو کون ہے؟'' اب وہ اپنے گھوڑے سے اتر گیا تھا۔

''اے خالد! تو مجھے ان صحراؤں کی روح سمجھ سکتا ہے۔'' اپنے بارے میں یہی کہانی میں بصرہ کے ناصر اور دیگر آدم زادوں کو بھی سنا چکی تھی۔

''تجھے میرا نام...... نام بھی معلوم ہے؟'' اس نے حیرانی کا اظہار کیا۔

''صورت سے تو تم دونوں مجھے زیادہ بے وقوف نہیں لگتے' پھر احمقانہ باتوں کا کیا مطلب ہے! تم ابھی ایک دوسرے کو نام لے کر مخاطب کر چکے ہو' پھر میں تمہارے نام لوں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے...... مجھے تو اس کا نام بھی معلوم ہے جس کا تم پیچھا کر رہے تھے۔'' میں نے کہا۔

''جب تجھے ہمارے نام پتا چل گئے ہیں تو پھر ہمیں بھی اپنا نام بتا دے۔'' خالد کا ساتھی بول اٹھا' وہ ابھی تک گھوڑے پر ہی سوار تھا۔

پہلے مجھے کسی آدم زاد کو اپنا نام بتاتے ہوئے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی' لیکن اب ایک تلخ تجربہ ہو چکا تھا میں نے اسی کے پیش نظر محتاط لہجے میں عمار سے کہا۔ ''روح بس روح ہوتی ہے' اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔''

میری بات پوری ہوئی تھی کہ ایک اور گھڑ سوار تیزی سے ادھر آتا دکھائی دیا کسی ممکنہ خطرے سے بچنے کی خاطر میں نے دوسرے ہی لمحے انسانی پیکر ترک کر دیا۔ میں جیسے ہی ان نوجوانوں کے درمیان سے غائب ہوئی وہ اچھل پڑے۔ اب ان کے چہروں سے خوف جھلک رہا تھا۔

''وہ...... وہ اے خالد...... کہاں...... کہاں چلی گئی؟'' عمار نے اپنے ساتھی سے ڈری ڈری آواز میں سوال کیا۔

''آئی بھی اسی طرح اچانک اور گئی بھی ایسے...... ہی! وہ...... روح...... روح ہی ہو سکتی ہے ورنہ دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔'' خالد بولا۔

اسی وقت ان نوجوان کی نظر نو وارد گھڑ سوار پر پڑ گئی جو قریب آ گیا تھا۔

"اے عمار! مجھے تو یہ بوڑھا سلیمان لگتا ہے۔" خالد نے کہا۔

"ہاں وہی ہے یہ!" عمار نے تصدیق کی۔

میں وہاں سے ابھی گئی نہیں تھی' چاندنی رات میں وہ عباپوش بوڑھا سلیمان مجھے عجیب سا معلوم ہوا۔ اس کے استخوانی چہرے پر جیسے کھال منڈھ دی گئی تھی۔ اس نے نوجوان آدم زادوں کے قریب پہنچ کر اپنا گھوڑا روک لیا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے بوڑھا سلیمان خطرناک لگا۔

"میر کارواں اسمٰعیل نے مجھے تمہاری تلاش میں بھیجا ہے۔" بوڑھا سلیمان ان نوجوانوں سے مخاطب ہوا تو میں نے محسوس کیا جیسے کسی گہرے کنویں سے اس کی آواز آ رہی ہو۔ خالد اور عمار نے کچھ نہ کہا تھا کہ بوڑھا سلیمان گہرے گہرے سانس لے کر پوچھنے لگا۔

"ابھی یہاں کون تھا؟"

"اے سلیمان! تجھے تو خود یہ دعویٰ ہے کہ تو وہ بھی دیکھ لیتا ہے جو دوسروں کو نظر نہیں آتا' پھر ہم سے کیا پوچھ رہا ہے؟" خالد کہنے لگا۔

اس پر بوڑھے سلیمان نے پھر گہرے سانس لئے اور بولا۔ "تفصیل تو میں تمہیں بغداد چل کر ہی بتاؤں گا' فی الحال اتنا جان لو کہ یہاں اب بھی کوئی پراسرار وجود موجود ہے' میرا علم مجھے غلط راہ پر نہیں ڈال سکتا۔"

اس بوڑھے آدم زاد نے صرف سونگھ کر وہاں میری موجودگی کا سراغ لگا لیا تھا۔ میرے نزدیک یہ خطرناک بات تھی۔ تجسس کے جذبے پر سنسنی غالب آ گئی۔ یہ سنسنی میرے پورے وجود میں دوڑ رہی تھی۔ میں پھر کبھی خالد یا عمار سے مل کر اور انہیں اپنی جناتی صفات کے زیر اثر لے کر اس معمے کی گتھیاں سلجھا سکتی تھی۔ میں باآسانی یہ پتا چلا لیتی کہ میری مدد سے بچ کر فرار ہو جانے والی آدم زادی فاطمہ کون تھی؟ اس سے بھی زیادہ اب میں بوڑھے سلیمان کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ خالد اور عمار جہاں بھی ہوتے میں ان کے جسموں کی مخصوص خوشبو کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچ جاتی۔ فی الحال اپنے تحفظ کی خاطر میں نے اس جگہ سے فرار ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ یوں بھی مجھے اس بات کا احساس تھا کہ عالم سوما میری طرف سے فکر مند ہو گا۔ اب تک مجھے اس کے پاس پہنچ جانا چاہئے تھا۔ مجھے عامل "حضرت جی" کی طرف سے جو اندیشے اور خطرات تھے' ان کا بھی سوما سے اظہار کرنا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں بابل کے کھنڈرات کی طرف پرواز کرنے لگی جو اب زیادہ دور نہیں تھے۔

جب میں کھنڈرات میں پہنچی جہاں عالم سوما کی سکونت تھی تو اسے دست بہ دعا پایا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے وہ میرے لئے ہی دعا کر رہا ہو۔ دعا مانگ کر سوما نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "اے دینار! خدا کا شکر ہے تو بخیر و عافیت لوٹ آئی۔" اس کی آواز میں اطمینان جھلک رہا تھا۔

"کیوں عالم سوما' کیا میری جانب سے تجھے کچھ اندیشہ تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں دینار!" سوما نے اقرار کیا' پھر بتانے لگا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے مجھ پر کشف ہوا کہ تو کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے والی ہے۔ سو میں نے دو نفل حاجات کے پڑھے اور پھر تیرے لئے بارگاہ خداوندی میں دعا کرنے لگا۔ میں نے قصد کیا تھا کہ اس وقت تک رب العزت کے حضور دست دعا بلند کئے رہوں گا جب تک اے دینار تو لوٹ نہ آئے گی۔" سوما نے یہ کہہ کر سوال کیا۔ "کیا بصرہ یا وہاں سے واپس ہوتے وقت راستے میں تجھے کسی خطرے کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟ میں تجھ سے ہر بات جاننا چاہوں گا پہلے تو مجھے بصرہ کے اس عامل کے بارے میں بتا جو تجھے اپنی کنیز بنا لینے کا خواب دیکھ رہا تھا۔"

"میں نے اس کا بڑا برا حشر کیا سوما! تجھ سے میں نے جو تدبیر بیان کی تھی اس عامل کو اس طرح عمل پڑھنے سے روکا جا سکتا ہے' وہ تدبیر کامیاب رہی۔" میں یہ کہنے کے بعد اس واقعے کی تفصیل بیان کرنے لگی جو بصرہ میں پیش آیا تھا۔ آخر میں سوما سے میں نے یہ بھی صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس سے عامل کو قتل کرنے کی اجازت لے چکی ہوتی تو اسے زندہ نہ چھوڑتی۔

"اللہ تجھے اس کا اجر دے گا دینار کہ تو اس آدم زاد عامل کے قتل سے باز رہی۔" سوما نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اس کی باتوں سے مجھے اپنے باپ اخضم کی خوشبو آتی تھی۔ سوما کا سلوک میرے ساتھ بیٹی جیسا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ بے اولاد تھا۔

"اے سوما! میں بچپن سے یہی سنتی آئی ہوں کہ آدم زاد قابل اعتبار نہیں ہوتے۔ ایسی صورت میں عامل حضرت جی کی اس بات پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ از سر نو مجھے قابو میں کرنے کیلئے عمل نہیں پڑھے گا۔ تجھ سے میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اگر اس نے آئندہ رات ہی سے دوبارہ عمل کا آغاز کر دیا تو کیا پھر اسے روکنے کی تدبیر کرنی ہو گی؟...... اگر کل رات کو نہیں تو دو ایک روز بعد وہ اپنے قول سے پھر سکتا ہے۔" میں نے اپنے خدشات کا اظہار کر دیا۔

"دینار! اگر وہ آدم زاد عامل تیرے حصول کی خاطر عمل پڑھنے سے باز نہ آیا تو بھی فی الحال تجھے کوئی خطرہ نہیں۔" سوما مطمئن آواز میں بولا۔

"وہ کیسے اے سوما؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"جب کوئی آدم زاد کسی جن زاد یا جن زادی پر قبضے کیلئے عمل کرتا ہے اور کسی بھی سبب عمل پورا نہیں ہوتا تو دوبارہ عمل کرنے کی غرض سے اسے پورے چالیس دن تک انتظار کرنا پڑتا ہے اگر وہ اس سے پہلے دوبارہ عمل کرنے لگے تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔" عالم سوما مجھے بتانے لگا۔ "اے دینار! یہ بات اتنی عام ہے کہ ہر عامل جانتا ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں چالیس دن تک اس عامل آدم زاد کے شر سے محفوظ ہوں۔" میری آواز میں اداسی تھی۔

"افسردہ نہ ہو اے دینار!" عالم سوما نے مجھے تسلی دی۔ "اس عامل کے شر سے بچنے کا ایک اور بھی راستہ ہے' لیکن ابھی تو نے میری تشویش دور نہیں کی۔"

"کیسی تشویش؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہی جس کا تعلق مجھے ہونے والے کشف سے ہے۔" سوما نے جواب دیا۔

"بصرہ میں تو تجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی' پھر کیا وہاں سے واپسی کے وقت کوئی ......"

"ہاں اے سوما! میں اسے خطرہ ہی قرار دوں گی۔" میں بول اٹھی۔ پھر میں نے سوما کو خالد' عماد' فائضہ اور پراسرار بوڑھے سلیمان کے بارے میں سب کچھ بتاتے ہوئے کہا۔

"اس بوڑھے کا چہرہ غیر انسانی سا تھا۔"

"اے دینار! تجھے شاید یہ بات معلوم ہو کہ بہت سے جنات آدم زادوں ہی کے درمیان... مستقل طور پر انہی کے ساتھ رہنے لگتے ہیں مگر ان جنات میں کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات ضرور ہوتی ہے۔ تو اسے ان جنات کی پہچان بھی کہہ سکتی ہے۔ اس میں سے بیشتر وہ ہیں جو ذات برحق پر ایمان نہیں لائے یعنی وہ اپنے کفر ہی پر قائم رہے۔ بوڑھا سلیمان بھی مجھے ایسے ہی کافر جنات میں سے معلوم ہوتا ہے۔ تو نے اس کا جو حلیہ بیان کیا' یقیناً وہ غیر معمولی ہے۔ چہرے کی ہڈیوں پر کھال کا منڈھا ہونا اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔"

ممکن ہے عالم سوما کچھ اور بھی کہتا کہ میں نے سوال کر دیا۔ "لیکن سوما! اگر وہ انسانی پیکر میں کوئی کافر جن ہی تھا تو مجھے اس کی بد بو کیوں محسوس نہیں ہوئی؟ میں اس سے اتنی دور بھی نہیں تھی کہ مجھے بد بو نہ آتی۔"

"تو نے درست کہا دینار! نیک جنات کی خوشبو اور بد کی بد بو محسوس ہوتی ہے۔ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے لیکن اہل ایمان کی طرح کافر جنات بھی عملیات و وظائف کرتے ہیں۔ یہ عمل رحمانی اور شیطانی دونوں ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ انہی عملیات کے ذریعے اہل ایمان اور کافر جنات کو کچھ ایسی پراسرار قوتیں حاصل ہو جاتی ہیں جو عام جنات میں نہیں ہوتیں۔ عین ممکن ہے اور اگر میرا شک غلط نہیں تو جسے تو نے بوڑھے سلیمان کے پیکر میں دیکھا' اس نے کسی شیطانی عمل کے ذریعے اپنے وجود کی بد بو کو دبا دیا ہوتا کہ کوئی اسے پہچان نہ سکے۔ مجھے جو یہ کشف ہوا اے دینار کہ تو کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے والی ہے' اس کا تعلق یقیناً اسی واقعے سے ہے۔" عالم سوما نے تفصیل کے ساتھ میرے سوال کا جواب دیا۔

اس سے جنات کے بارے میں مجھے کچھ نئی باتوں کا علم ہوا۔ میں نے اس کے باوجود اپنے اس ارادے کو تبدیل نہیں کیا کہ فائضہ کے فرار کی وجہ ضرور معلوم کروں گی۔ میرے اس ارادے یا فیصلے کا تعلق مستقبل سے تھا لیکن ابھی تو میں اپنے زمانہ حال ہی سے نامطمئن تھی۔

معاً مجھے یاد آیا کہ عالم سوما نے آدم زاد عامل کے شر سے بچنے کیلئے ایک اور راستے کا ذکر بھی کیا تھا۔ میری نظر میں سب سے زیادہ ترجیح طلب یہی مسئلہ تھا۔ چالیس دن پلک جھپکتے گزر جاتے اور وہ شیطان عامل دوبارہ عمل کرنے بیٹھ جاتا۔

عالم سوما کو میں نے یاد دہانی کرائی تو کہنے لگا۔ "اے دینار! تجھے اس عامل کے شر سے بچنے کی خاطر کل ہی سے ایک عمل شروع کرنا پڑے گا۔ یہ عمل بھی چالیس روز کا ہے وقت اور جگہ کی پابندی تجھے بھی کرنی ہوگی۔ اگر تو کامیاب رہی تو پھر اس عامل کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ اس نے تجھے قبضے میں کرنے کیلئے دوبارہ عمل کیا بھی تو اس کا عمل باطل ہو جائے گا۔"

"سوما! کل ہی سے میں تیرا تجویز کردہ عمل کرنے پر راضی ہوں۔" میں پرجوش آواز میں بولی۔ "مجھے عمل کی شرائط اور الفاظ بتا!"

"مجھے تجھ سے یہی توقع تھی دینار!" سوما نے کہا۔ "عمل کی شرائط وہی ہیں جن کو آدم زاد عامل پورا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا' مگر تو نے اسے ناکام بنا دیا۔ تجھے ایک مقررہ جگہ پر نصف شب سے صبح فجر کے وقت تک چالیس روز تک عمل پڑھنا ہوگا۔ اس آدم زاد عامل پر تجھے کئی طرح سے فوقیت حاصل ہوگی۔" سوما تفصیل بیان کرنے لگا۔ میں پوری توجہ سے اس

کی باتیں سن رہی تھی۔ ''پہلی بات تو یہ ہے دینار کہ تیرا عمل کسی کے خلاف نہیں ہوگا ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ کوئی بھی تجھے عمل پڑھنے سے نہیں روکے گا۔ دوسرے یہ کہ عمل کے وقت میں تجھ سے زیادہ دور نہیں رہوں گا۔ اس کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ تو کھنڈرات کے اسی حصے میں عمل پڑھنے کیلئے کوئی جگہ دیکھ لے۔ ان کھنڈرات میں کیوں کہ عرصہ دراز سے ہم جنات کا قبیلہ آباد ہے اس لئے یہ جگہ آدم زادوں کی دسترس میں نہیں۔ تو یہاں پوری طرح محفوظ رہے گی۔''

عمل کیلئے جگہ مقرر کرنے سے متعلق میں نے عالم سوما کی رائے سے اتفاق کیا' پھر عمل کے الفاظ معلوم کئے۔

''اے دینار! تجھے عمل کے دوران میں سورۂ ناس کا ورد کرتے رہنا ہے۔'' سوما نے یہ کہہ کر اس قرآنی سورۂ کے اوصاف بیان کئے۔ مجھے سورۂ ناس یاد تھی' پھر بھی سوما کو سنا دی کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو۔

اب مزید کوئی بات وضاحت طلب نہیں رہی تھی' میں اس لئے سوما کے پاس سے چلی آئی۔

وہ جگہ بابل کے کھنڈرات سے زیادہ دور نہیں تھی' جہاں گزشتہ رات مجھے فائضہ' خالد' عمار وغیرہ ملے تھے۔ میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ فائضہ کا انجام کیا ہوا؟ اگر استخوانی چہرے والا بوڑھا سلیمان واقعی آدم زادوں کے ساتھ انسانی پیکر میں رہنے والا کوئی کافر جن ہی تھا تو پھر یہ بہت مشکل تھا کہ فائضہ اس کے چنگل سے بچ کر نکل جاتی۔ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ اور کارواں سے کیوں فرار ہوئی تھی؟ دوسرے دن بھی ان سوالات نے مجھے بے چین کئے رکھا۔ اس آدم زادی کو میں نے دور سے دیکھا تھا۔ اس کے جسم کی مخصوص خوشبو فاصلے کی بنا پر مجھے محسوس نہیں ہو سکی تھی۔

☆......☆.....☆

کچھ یہی معاملہ بوڑھے سلیمان کے ساتھ تھا۔ سلیمان اور میرے درمیان زیادہ فاصلہ نہ ہونے پر بھی اس کے وجود کی خوشبو سے میں ناآشنا رہی تھی۔ عالم سوما نے اس کی وجہ مجھے بتا دی تھی۔ خالد اور عمار کے جسموں کی مخصوص خوشبو البتہ میرے حواس میں محفوظ تھی۔ ان دونوں کے ذریعے حقیقت تک پہنچنا میرے لئے خطرناک نہ ہوتا۔ میرے اندازے کے مطابق مذکورہ کارواں اب تک اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا کیوں کہ جو واقعہ پیش آیا تھا' اسے کئی پہر گزر

چکے تھے۔ اس کارواں کی منزل سے بھی میں واقف تھی۔ مجھے یاد تھا کہ بوڑھے سلیمان نے بغداد کا نام لیا تھا۔

یہ بڑی عجیب سی بات تھی کہ جو شہر میرے سامنے تعمیر ہوا تھا مجھے اس کی سیر کا اب تک کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ اس کی وجہ اچانک میرا دوسرے معاملات میں ملوث ہو جانا تھا جن کا تعلق بغداد سے نہیں بصرہ سے تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس عہد کے اعتبار سے بغداد شہر انتہائی جدید اور بے حد خوبصورت تھا۔ اسے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ بسایا گیا تھا۔ اس شہر کی عظمت و بزرگی کی علامت قصر خلافت تھا جس کی حدود میں بڑے بڑے سبزہ زار تھے۔ قصر خلافت ہی سے کچھ فاصلے پر محلہ کرخ سے ملی ہوئی وہ بڑی سرائے تھی جہاں قریب و دور سے آنے والے بھی مسافروں کو تمام بنیادی سہولتیں حاصل تھیں۔ قصر خلافت کی دوسری جانب ارکان حکومت کی قیام گاہیں تھیں۔ اس علاقے کو قراذ کہا جاتا تھا۔ یہ بغداد شہر کا سب سے بڑا محلہ تھا۔ اسی محلے کے قریب دریائے دجلہ پر ایک پل تھا جس کے ذریعے شہر کے غربی حصے میں جانا ممکن تھا۔ پل کے علاوہ دریا کو عبور کرنے کیلئے چھوٹی بڑی خوبصورت کشتیاں بھی پانی میں ہچکولے کھاتی رہتی تھیں۔ حکومت وقت کی طرف سے ان کشتیوں کو دریا میں چلانے کیلئے ملاح مقرر تھے۔ یہ ملاح لوگوں سے دریا عبور کرانے کا معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ شام کے وقت جب سورج ڈوب رہا ہوتا تو لوگ عموماً پل کے بجائے ان کشتیوں میں بیٹھ کر ہی دریا عبور کرنے کو ترجیح دیتے۔ دریا پر آمدورفت کی کثرت کے سبب دو پل بنائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک پل خلیفہ المنصور کے قصر کے قریب تھا دوسرا پل کچھ فاصلے پر تھا۔ قصر خلافت سے متصل پل صرف خلیفہ اور اعلیٰ ترین ارکان حکومت کیلئے مخصوص تھا۔ حفاظتی نقطہ نگاہ سے وہاں شرطے (محافظ سرکار) مقرر تھے۔ یہ محافظ عام لوگوں کو اس پل کے قریب نہیں آنے دیتے تھے نہ پل کے اوپر سے گزر کر ادھر سے ادھر آنے جانے دیتے تھے۔

بغداد شہر دریائے دجلہ کے دونوں طرف شرقی اور غربی حصے میں آباد تھا۔ غربی حصے کی نسبت شرقی حصہ زیادہ آباد اور پرکشش تھا۔ شہر کے اسی حصے میں قصر خلافت تھا۔ اس شرقی حصے میں سترہ محلے آباد تھے اور ہر محلہ بجائے خود ایک شہر تھا۔

میں اس شام بغداد پہنچی تو موسم بہت خوشگوار تھا۔ مجھے خالد اور عمار کی تلاش تھی۔ وہ دونوں مجھے دریا کے کنارے ایک آبادی باب الطاق میں ملے۔ (باب الطاق ہی بغداد شہر کی وہ

قدیم آبادی ہے جو اب اعظمیہ کہلاتی ہے۔ اسی آبادی میں حضرت امام احمد بن ابو حنیفہ کا مقبرہ ہے اسی سے کچھ فاصلے پر حضرت امام حنبلؒ کا مزار مبارک ہے۔ اعظمیہ سے پہلے اب ایک قدیم قبرستان پڑتا ہے۔ اس مشہور قدیم قبرستان میں حضرت معروف کرخیؒ، بہلول دانا اور زبیدہ بیگم کے مزارات ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں دیگر مشہور بزرگوں کے مزارات بھی ہیں۔ اسی قبرستان سے ایک سڑک کاظمیہ کی طرف جاتی ہے جہاں امام کاظمؒ کا مقبرہ ہے۔ مصنف)

وہ دونوں مجھے دریا کے کنارے چہل قدمی کرتے ہوئے مل گئے۔ ان کے ساتھ کوئی تیسرا فرد نہیں تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی وہاں آس پاس کوئی اور نہ تھا۔ میں نے ان دونوں آدم زادوں کو اپنی جناتی صفات کے زیر اثر لینے میں دیر نہیں کی۔

"اے خالد! مجھے بتا کہ کل رات فائضہ پر کیا گزری؟" میں نے سوال کیا۔

"بوڑھے سلیمان نے مجھے اور عمار کو کارواں کے پڑاؤ کی طرف واپس بھیج دیا اور ہم سے کہا کہ وہ خود فائضہ کو پکڑ کر لے آئے گا۔" خالد میرے زیر اثر خواب ناک سی آواز میں بتانے لگا۔ "اور پھر وہی ہوا ہم پڑاؤ پر پہنچے ہی تھے کہ دیکھا بوڑھا سلیمان اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑائے چلا آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہم نے فائضہ کو بھی گھوڑے کی پشت پر بیٹھے دیکھا۔ ہمیں اس پر بڑی حیرت ہوئی۔ ہم دونوں کو اول تو یہی توقع نہیں تھی کہ بوڑھا سلیمان فرار ہو جانے والی فائضہ کو صحرا میں تلاش کر لے گا کیوں کہ اسے فرار ہوئے کچھ وقت گزر چکا تھا، پھر یہ تو ہرگز امید نہ تھی کہ تلاش میں بوڑھے سلیمان کو وقت ہی نہیں لگے گا، وہ اتنی جلد فائضہ کو پکڑ کر لے آئے گا۔"

خالد کے اس بیان سے میرا یہ شک یقین میں بدلنے لگا کہ بوڑھا سلیمان لازمی طور پر کوئی آدم زاد نہیں بلکہ اس کا تعلق کافر جنات سے ہے۔

میں خالد کی بات غور سے سننے لگی۔ وہ اب کہہ رہا تھا۔ "بوڑھا سلیمان اسی وقت میر کارواں اسمٰعیل کی خدمت میں حاضر ہو گیا جو سلیمان ہی کا منتظر تھا۔ میر کارواں اسمٰعیل نے سلیمان کی اس کارگزاری کو سراہا، اسے انعام سے نوازا اور فائضہ کو محافظوں کی کڑی نگرانی میں دے دیا۔"

"یہ بیان کر خالد کہ میر کارواں اسمٰعیل کس لئے فائضہ کو اپنے ہمراہ بغداد لے جا رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میر کارواں اسمٰعیل کو یہ ذمے داری عامل کوفہ عیسیٰ بن موسیٰ نے سونپی تھی کہ وہ

فائضہ کو موسیٰ بن کعب کے پاس باحفاظت پہنچا دے۔" خالد نے بتایا۔

"موسیٰ بن کعب کون ہے؟" میں نے معلوم کیا۔

"وہ قصر خلافت کے محکمہ نظارت (نگہبانی) کا نگران اعلیٰ ہے۔" خالد نے جواب دیا۔

"کیا تجھے فائضہ کے بارے میں کچھ علم ہے کہ وہ کون ہے؟" میں اصل موضوع پر آ گئی۔

"فائضہ کی بابت مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ بوڑھا سلیمان اس بدنصیب کو کہیں سے اغوا کر کے لایا تھا۔ شاید نجف سے!" خالد نے جواب دیا۔

"مگر فائضہ، عامل کوفہ عیسیٰ کے پاس کس طرح پہنچی کہ اس نے میر کارواں اسمٰعیل کے حوالے کیا؟"

"میرا اور عمار دونوں ہی کا آبائی شہر کوفہ ہے۔ بوڑھا سلیمان پورے کوفہ شہر میں کسی شیطان کی طرح مشہور ہے۔ اسے عامل کوفہ عیسیٰ کا دست راست سمجھا جاتا ہے۔ اہل کوفہ کو جب عامل کوفہ سے کوئی کام نکلوانا ہوتا ہے تو وہ بوڑھے سلیمان کو ذریعہ بناتے ہیں۔"

اپنے سوالوں کے جواب میں خالد سے مجھے جو مزید باتیں پتا چلیں وہ میرے لئے نئی ہی تھیں۔ دراصل عیسیٰ بن موسیٰ، خلیفہ المنصور کا چچا تھا۔ عیسیٰ کو کوفہ کا عامل (گورنر) مقرر کرنے والا خلیفہ المنصور کا بھائی خلیفہ ابوالعباس سفاح تھا۔ سفاح مرحوم کے عہد خلافت سے عیسیٰ ہی شہر کوفہ کا عامل چلا آتا تھا۔ کچھ دن قبل کوفہ میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ خلیفہ المنصور انتظامی معاملات میں کچھ تبدیلیاں کرنے والا ہے۔ ان تبدیلیوں کے تحت جو عامل، مرحوم خلیفہ سفاح کے عہد سے اپنے عہدوں پر فائز ہیں ان سب کو ہٹا دیا جائے گا۔ سفاح ہی نے عیسیٰ کو عامل کوفہ کے علاوہ ولی عہد بھی مقرر کیا تھا۔

دارالخلافہ بغداد میں عیسیٰ کا بہترین دوست اور خیر خواہ موسیٰ بن کعب تھا۔ قصر خلافت میں ایک اہم عہدے پر ہونے کے علاوہ موسیٰ خلیفہ وقت کی نظروں میں بھی چڑھا ہوا تھا۔ اسی دوستی اور تعلق کو مزید مضبوط و مستحکم کرنے کی خاطر عیسیٰ نے فائضہ کو بہ حیثیت کنیز موسیٰ کے پاس بھیجا تھا۔ اسے یہ مشورہ بوڑھے سلیمان ہی نے دیا تھا کہ کوئی خوبصورت کنیز موسیٰ کی نذر کی جائے۔ کسی حسین کنیز کے انتخاب و فراہمی کی ذمہ داری عیسیٰ نے بوڑھے سلیمان پر ڈال دی۔ پھر ایک روز اہل کوفہ نے اس حسین کنیز کو عامل کوفہ کے قصر میں دیکھا۔ وہ کنیز فائضہ اتنی

ہی خوبصورت تھی کہ سارے شہر میں اس کے حسن کا چرچا ہو گیا۔ بوڑھے سلیمان نے دربار عام میں فائقہ کو پیش کیا تھا اس لئے جو سرکاری درباری افراد اس وقت وہاں موجود تھے سبھی کی نظریں فائقہ پر پڑیں۔

کچھ ہی دن بعد بغداد کیلئے ایک کارواں روانہ ہونے والا تھا۔ میر کارواں اسمٰعیل بھی اراکین سلطنت میں سے ایک اور عامل کوفہ عیسیٰ کا دوست تھا۔ سو عیسیٰ نے فائقہ کو بغداد میں موسیٰ کے پاس پہنچانے کی خاطر اسمٰعیل کے حوالے کر دیا۔ بطور احتیاط عیسیٰ نے بوڑھے سلیمان کو بھی فائقہ کے ساتھ بغداد روانہ کر دیا۔ اگر عامل کوفہ ایسا نہ کرتا تو شاید فائقہ فرار ہو جاتی۔

خالد اور عمار کو بھی بغداد آنا تھا۔ انہوں نے جب بغداد جانے والے کارواں کے بارے میں سنا تو میر کارواں اسمٰعیل سے ملے۔ اسمٰعیل نے انہیں اس شرط پر ساتھ لے چلنے کی ہامی بھر لی کہ وہ کارواں کے محافظوں میں شامل ہو جائیں۔ دونوں دوست روزگار کی تلاش میں کوفہ سے بغداد آئے تھے۔

محلہ باب الطاق میں خالد کا ایک عزیز رہتا تھا۔ دونوں دوست اسی کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ بغداد پہنچ کر وہ کارواں سے الگ ہو گئے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ میر کارواں اسمٰعیل نے کب اس کنیز فائقہ کو موسیٰ کے حوالے کیا لیکن انہیں یقین تھا اب تک اسمٰعیل نے اپنا فرض ادا کر دیا ہو گا۔

مجھے ان آدم زادوں سے نفرت محسوس ہوئی جو صنف نازک کو اپنی مقصد براری کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ میں نے اپنے باپ اخضم سے سنا تھا کہ اللہ نے اپنے ہر بندے کو آزاد پیدا کیا ہے یہ ہم ہی ہیں جو اس کے بندوں کو غلام بنا لیتے ہیں۔ فائقہ بھی یقیناً کنیز پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ اسے شیطان صفت ایک کافر جن زاد نے کنیز بنا دیا تھا۔ معلوم نہیں فائقہ کی طرح کتنی مجبور و بے بس آدم زادیوں کو کنیز بنا لیا گیا ہو گا۔ یہ دکھ بھرا احساس لئے میں اس رات بغداد سے واپس بابل کے کھنڈرات پہنچ گئی۔ اسی رات مجھے اپنی حفاظت کی خاطر سوما کا تعلیم کردہ عمل شروع کرنا تھا۔

نصف شب سے کچھ پہلے ہی میں عالم سوما کے پاس جا پہنچی۔ اس نے مجھے دیکھ کر دعا دی پھر اس جگہ کے انتخاب میں میری مدد کی جہاں عمل شروع کرنا تھا۔ وہ ایک نیم شکستہ دالان تھا جس کا فرش صاف کر کے میں نے اپنی نشست بنا لی۔ دالان کے باہر دائیں جانب

عالم سوما موجود تھا۔

پھر مسلسل چالیس راتوں تک میں وقت اور جگہ کی پابندی کے ساتھ وہ عمل پڑھتی رہی اور مجھے کوئی قباحت نہ ہوئی۔ عمل پورا ہونے پر عالم سوما نے مجھے مبارک باد دی اور کہا۔

"اے دینار! اب تو اس آدم زاد عامل کے شر سے تاحیات محفوظ ہو گئی۔"

"صرف اسی عامل کے شر سے یا ہر اس عامل کے شر سے جو مجھے اپنے قبضے میں کرنا چاہے؟" میں نے سوما سے وضاحت چاہی۔

"محض اس عامل کی طرف سے تجھے نجات ملی ہے جو تیرے حصول کی خاطر دوبارہ عمل شروع کر سکتا تھا۔" سوما نے مجھے بتایا پھر بولا۔ "دینار! تو اسے بھی کم نہ جان کہ آدم زادوں کے چنگل میں ایک بار پھنس جانے کے بعد نکلنا بہت دشوار ہوتا ہے۔"

"سوما! مجھے تجھ سے ایک اور معاملے میں رہنمائی چاہئے۔" میں نے موقع غنیمت جان کر کہا۔

"ہاں بول تجھے کیا کہنا ہے دینار!" سوما بولا۔

"میں شاید پہلے بھی تجھ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر چکی ہوں سوما کہ خلق خدا کی خدمت کو اپنا مقصد حیات بنانا چاہتی ہوں۔"

"دینار! اس سے بڑی نیکی اور کیا ہو گی مگر جان لے کہ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ تو نے کبھی مجھ سے دکھی اور ستم رسیدہ آدم زادوں کی مدد کرنے کو کہا تھا۔ بول تیرے میرے درمیان کچھ ایسی بات ہوئی تھی نا؟" سوما نے آخر میں مجھ سے سوال کیا۔

"ہاں سوما! تو نے محتاط الفاظ میں آدم زادوں کو خطرناک قرار دیتے ہوئے ان سے حتی الامکان دور ہی رہنے کو کہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "میں تسلیم کرتی ہوں کہ آدم زاد واقعی خطرناک ہوتے ہیں مجھے عامل حضرت جی کی صورت میں اس کا عملی تجربہ بھی ہو چکا ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ سب آدم زاد خطرناک نہیں ہوتے۔ ان کی اکثریت مدد و تعاون کی مستحق ہے۔ کیا ہم جنات ان کے کام نہیں آ سکتے؟"

"یقیناً کام آ سکتے ہیں دینار!" عالم سوما نے اعتراف کیا پھر کہنے لگا۔ "اس کے باوجود میں کسی جن زاد یا جن زادی کے اس فعل کو آگ سے کھیلنے کے مترادف ہی قرار دوں گا۔ تجھے میں اب بھی ایسا نہ کرنے کی نصیحت کروں گا۔"

اس وقت تو میں خاموش ہو گئی لیکن آنے والے دنوں میں سوما سے میری گفتگو کا یہی موضوع رہا۔ میں اس عرصے میں بصرہ کے ناصر کی طرف سے بھی غافل نہ رہی۔ قضائے الٰہی سے اس کا لالچی چچا غفار دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ لیلیٰ بہرحال ناصر کی بیوی تھی۔ ناصر نے اسے طلاق نہیں دی تھی۔ غفار کی موت کے بعد بھی لیلیٰ کو ناصر نے اپنے گھر میں نہ رکھا البتہ اس کے اخراجات اٹھانے سے گریز نہ کیا۔

میں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ سوما میری نقل و حرکت پر نظر رکھتا ہے۔ مجھے اس کی وجہ بھی معلوم تھی۔ اسے میری طرف سے یہ اندیشہ تھا کہ میں آدم زادوں کے دکھ بانٹنے کی غرض سے کہیں خود کوئی دکھ نہ پال بیٹھوں۔ ہر چند کہ میں نے ابھی اس سمت میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا تھا مگر سوما میری جانب سے محتاط و چوکنا ہو گیا تھا۔ کافی غور و فکر کے بعد میں نے اس سلسلے میں ایک روز پہلا قدم اٹھا ہی لیا۔

میں اپنے قبیلے کے سب سے بڑے طبیب ہامہ بن ہیم سے ملی۔ بوڑھے ہامہ کی عمر کم سے کم بھی دو ہزار سال ضرور ہو گی اس کے باوجود وہ بڑا خوش مزاج و خوش گفتار تھا۔ وہ میری بات سن کر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ ”اے سردار اخضم کی بیٹی دینار! تو علم طب میں مہارت حاصل کرنا چاہتی ہے؟“ کیا سبب ہوا جو تو اس طرف مائل ہوئی کسی جن زادی کو آج تک میں نے طبابت کرتے دیکھا نہ سنا۔“

”اے میرے باپ کے دوست ہامہ! کیا ضروری ہے کہ صرف جن زاد ہی طبیب ہوں اور کوئی جن زادی اس میں کامل نہ ہو۔“ میں بے جھجک بولی۔

”تیرا کہنا ٹھیک ہے دینار! اگر علم طب آسان نہیں کسی جن زادی کو اس میں ماہر بنانے کی بابت تو خیر میں نے سوچا بھی نہیں البتہ کوشش ضرور کی کہ کوئی جن زاد میری نیابت کر سکے۔ میرا عقیدہ ہے کہ کسی بھی علم کی ترویج و اشاعت نیکی ہے۔“ ہامہ کہنے لگا۔ ”کئی سو برس کی تلاش و کاوش کے بعد ایک ہی نوجوان جن زاد عارج میری توقعات پر پورا اترا ہے۔ وہ تیری ہی عمر کا ہے اور بڑی لگن کے ساتھ علم طب حاصل کر رہا ہے۔“

”طبیب ہامہ! تو میری محنت اور لگن میں بھی کمی نہ پائے گا۔“ میں نے یقین دہانی کرائی۔

ہامہ نے مجھے آئندہ روز صبح سے اپنے مطب میں آنے کی اجازت دے دی۔

کچھ عرصہ پہلے ہی میرے اندر یہ سوال ابھرا تھا اے دینار! کیا تو دکھی آدم زادوں

کے کام نہیں آ سکتی؟ میں اسی سوال کا عملی جواب دینے کی تیاری شروع کر رہی تھی اس کا پہلا مرحلہ علم طب کا حصول تھا اور دوسرا مرحلہ عملیات و وظائف سے آگہی تھی۔ ان دونوں علوم کیلئے میں پہلے ہی طبیب ہامہ اور عالم سوما کا انتخاب کر چکی تھی۔ ان علوم میں کامل ہو کر ہی میں آدم زادوں کے درمیان جانے کی آرزو مند تھی کہ ان کے دکھوں کا مداوا کر سکوں۔ میں نے عالم سوما سے غلط نہیں کہا تھا کہ میرا مقصد حیات خلق خدا کی خدمت ہے۔ جنات بھی کیوں کہ اللہ کی مخلوق ہیں اس لئے مجھے ان کی مدد سے بھی عار نہیں تھی مگر یہ واقعہ ہے کہ میں نے جنات کے مقابلے میں آدم زادوں کو مدد و تعاون کا زیادہ مستحق پایا۔ مطلوبہ علوم میں مہارت کے بعد میں شہر بغداد میں سکونت اختیار کرنا چاہتی تھی۔

دوسرے دن جب طبیب ہامہ کے مطب میں میری ملاقات جن زاد عارج سے ہوئی تو مجھے پہلی بار زندگی کے فطری تقاضوں کی تکمیل کا احساس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے اب تک میں ادھوری تھی اور عارج سے مل کر پوری ہو گئی۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ مجھے عارج سے اور اسے مجھ سے محبت ہو گئی۔ آدم زادوں سے چھیڑ چھاڑ اور شوخیاں اپنی جگہ مگر عارج ہی میری پہلی محبت ثابت ہوا۔ طبیب ہامہ اور عارج کی کوشش کے نتیجے میں مجھے علم طب پر عبور حاصل ہو گیا۔

اس دوران میں وقت کتنی تیزی سے آگے بڑھ چکا ہے مجھے احساس ہی نہ ہوا۔ تاریخ نے کیا نئی کروٹ لی؟ میرے نزدیک اس کا مختصر ابیان بھی ضروری ہے۔

عباسی خلیفہ ابوجعفر عبداللہ المنصور کہ جس نے شہر بغداد کا سنگ بنیاد رکھا 158ھ میں انتقال کر چکا تھا۔ اس نے 22 سال حکومت کی اور 136ھ میں خلیفہ بنا تھا۔ مرحوم خلیفہ ابوالعباس سفاح کیوں کہ اپنے بھائی المنصور کا ولی عہد اپنے چچا عیسیٰ بن موسیٰ کو مقرر کر چکا تھا سو اصولاً اسی کو المنصور کے بعد خلیفہ بننا تھا مگر ایسا نہ ہوا۔ خلیفہ المنصور کا بیٹا محمد بن عبداللہ المہدی جب بڑا ہوا تو المنصور نے فیصلہ کیا کہ عیسیٰ کی ولی عہدی پر المہدی کو مقدم کر دے۔ دستور یہ تھا کہ بہ نظر تکریم جب عیسیٰ بغداد آتا تو ہمیشہ خلیفہ المنصور کے دائیں جانب بیٹھتا اور المہدی بائیں جانب۔ ایک روز المنصور نے عیسیٰ سے المہدی کی ولی عہدی کے متعلق کچھ گفتگو کی۔ اس پر عیسیٰ نے عرض کیا۔ ”اے امیر المومنین! میری ولی عہدی کی بیعت سے بغاوت کیوں کر ممکن ہے؟ اس میں میری اور سارے مسلمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں۔ میں اس عہد سے انحراف کو منظور نہ کروں گا۔“

خلیفہ المنصور کو اپنے چچا عیسیٰ کا انکار ناگوارا گزرا۔ اس دن کے بعد سے خلیفہ نے حکم دیا کہ جب عیسیٰ دارالخلافہ بغداد میں آئے تو اسے المہدی سے پہلے دربار میں حاضر نہ ہونے دیا جائے۔ حکم کے مطابق عیسیٰ سے پہلے المہدی کو دربار خلافت میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ جب المہدی اپنے باپ المنصور کے دائیں جانب آ کر بیٹھ جاتا تو عیسیٰ کو دربار میں آنے دیا جاتا۔ ایک مدت تک المنصور عیسیٰ سے کبیدہ خاطر رہا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خلیفہ نے اسے عامل کوفہ بھی نہ رہنے دیا۔ بددل ہو کر عیسیٰ کوفہ سے مکہ معظمہ چلا گیا۔

عیسیٰ اس وقت مکہ میں ہی تھا کہ بغداد سے مرحوم خلیفہ المنصور کی لاش وہاں پہنچی۔ جو تعزیتی شامیانہ لگایا گیا' اس کی چوبوں کے پاس موسیٰ بن المہدی کھڑا تھا اور دوسری جانب قاسم بن المنصور تھا۔ ذرا دیر گزری تھی کہ شامیانے میں ماتم گساروں کی جگہ نہ رہی۔ خلیفہ المنصور کے جنازے کو مکہ لانے والوں میں اس کا خادم ابوالغفر بھی تھا۔ وہ خادم خاص اپنی قبا پھاڑے' سر پر مٹی ڈالے' "وا امیرالمومنین' وا امیرالمومنین" کہتا ہوا نکلا۔ قاسم نے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ ربیع ایک کاغذ ہاتھ میں لئے باہر آیا اور لوگوں کو مخاطب کر کے پڑھنے لگا۔ بسم اللہ کے بعد لکھا تھا۔ "از بندہ خدا المنصور امیرالمومنین بہ جانب پسماندگان بنی ہاشم و ہواخواہان خراسان و عامہ المسلمین۔ امابعد میں نے یہ عہد نامہ تحریر کیا ہے اور میں زندہ ہوں' دنیا کے دنوں میں سے آخری دن میں اور آخرت کے دنوں میں سے پہلے دن میں۔ میرا تم کو سلام پہنچے۔ میں اللہ تعالیٰ سے یہ چاہتا ہوں کہ میرے بعد تم کو فتنے میں نہ ڈالے اور نہ تم فرقوں میں بٹ کر منتشر ہو جاؤ اور نہ تم میں سے بعض کو بعض کا مزہ چکھائے۔"

اس کے بعد خلیفہ مرحوم نے لوگوں کو المہدی کے حق میں وصیت کی تھی اور انہیں ایفائے عہد پر آمادہ کیا تھا۔

ربیع نے عہد نامہ تمام کر کے حسن بن زید کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ "اٹھو بیعت کرو!"

حسن بن زید نے اٹھ کر موسیٰ المہدی کے ہاتھ پر نئے خلیفہ عبداللہ المہدی کی خلافت تسلیم کرنے کیلئے بیعت کی۔ بعد ازاں حاضرین یکے بعد دیگرے بیعت کرتے گئے۔ پھر بنو ہاشم بلائے گئے۔ اس وقت المنصور اپنے کفن میں لپٹا پڑا تھا۔ اس کا سر کھلا ہوا تھا۔

جس وقت لوگ نئے خلیفہ کی بیعت کر رہے تھے' المنصور کا چچا سابق عامل کوفہ اور نامزد ولی عہد عیسیٰ بن موسیٰ بھی اپنے بہی خواہوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس نے بیعت سے انکار کر دیا۔ اس انکار کے ساتھ ہی دونوں طرف سے تلواریں کھنچ گئیں۔

علی بن عیسیٰ بن ہامان تیز اور بلند آواز میں بولا۔ "اے عیسیٰ اگر تم بیعت نہ کرو گے تو میں تمہاری گردن مار دوں گا۔"

نئے خلیفہ المہدی کے حاشیہ برداروں کی طرف سے یہ گویا کھلا اعلان جنگ تھا۔ تعزیتی شامیانے میں سناٹا چھا گیا۔

اب مجھے اس کا اندازہ ہوتا جا رہا تھا کہ اقتدار کی خاطر کس طرح آدم زاد ایک دوسرے کا خون بہانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ وہ خلیفہ المنصور کا چچا اور سابق عامل کوفہ عیسیٰ ہی تھا جس نے اپنے عہدے پر قائم رہنے کی خاطر بطور رشوت محکمہ نظارت کے نگران اعلیٰ موسیٰ بن کعب کو ایک حسین کنیز فائقہ بھیجی تھی۔ اس کے باوجود بھی بات بنی نہیں تھی اور آخر کار عیسیٰ کو کوفہ چھوڑ کر مکہ جانا پڑا تھا۔ عیسیٰ بن موسیٰ کو خلیفہ العباس سفاح نے ولی عہد مقرر کیا تھا مگر المنصور نے اس پر عمل نہ کیا۔ اس نے اپنے بیٹے المہدی کو ولی عہد بنا دیا۔ عیسیٰ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا جب اپنا حق تسلیم کرا سکے۔ یہ موقع اس کی دانست میں اب آ گیا تھا۔ خلیفہ المنصور کے بعد اسی کو نیا خلیفہ ہونا چاہئے تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب عیسیٰ کو المنصور کے انتقال کی خبر ملی تو اس نے اپنے بہی خواہوں کو جمع کیا۔ اسے علم تھا کہ خلیفہ المنصور کے بعد المہدی کی بیعت لی جائے گی۔ اس نے اپنے بہی خواہوں کو مخاطب کیا۔ "تمہیں معلوم ہے اور میں بھی اس حقیقت سے باخبر ہوں کہ خلیفہ المنصور کے بھائی ابوالعباس سفاح نے مجھی کو المنصور کا ولی عہد مقرر کیا تھا تو کیا اب مجھے اپنے اس حق کا دعویٰ نہیں کرنا چاہئے؟"

"بالکل کرنا چاہئے۔" کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ "ہم تمہارے ساتھ ہیں اے عیسیٰ!"

اس کے بعد عیسیٰ پوری تیاری کے ساتھ تعزیتی شامیانے پر پہنچا تھا۔ اسے یہ خبر نہیں تھی کہ خلیفہ المنصور کا آزاد کردہ غلام ربیع پہلے ہی سے ہوشیار ہو گا۔ جب عیسیٰ اپنے بہی خواہوں کے ہمراہ وہاں پہنچا تھا تو اسی وقت اسے اور اس کے حمایتوں کو نرغے میں لے لیا گیا تھا۔

پھر نئے خلیفہ کیلئے بیعت شروع ہوئی اور عیسیٰ کے انکار پر دونوں طرف سے تلواریں کھنچ گئیں تو سناٹا چھا گیا۔

عیسیٰ کو اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ جب اسے حقیقت حال کا پتا چلا کہ وہ

گھیرا جا چکا ہے۔ اس نے ایک دنیا دیکھی تھی اور جانتا تھا کہ ذرا سی غلطی جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کی گردن ماری جائے گی۔ اس نے فوراً موسیٰ بن المہدی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

تکمیل بیعت کے بعد خلیفہ المنصور کا جنازہ اٹھایا گیا۔ مکہ شہر سے تقریباً ایک فرسخ (تین میل) کے فاصلے پر المنصور کی تدفین عمل میں آئی۔

جب یہ خبر نئے خلیفہ المہدی کے پاس پہنچی تو اہل بغداد نے بھی حاضر ہو کر بیعت کر لی۔

یہ واقعہ 158ھ ہی کا ہے کہ جب خلیفہ المنصور بغداد سے بہ غرض حج روانہ ہوا تھا المنصور نے رخصتی سے قبل المہدی کو طلب کیا۔

المہدی کو اپنے باپ کی روانگی کا علم تھا اس لئے فوراً حاضر خدمت ہو گیا۔ المنصور نے اسے جو وصیت کی وہ یہ تھی۔

عزیز من! میں نے کوئی ایسا امر نہیں باقی چھوڑا مگر یہ کہ میں نے اس میں تم سے سبقت نہ کی ہو۔ میں تمہیں چند باتوں کی وصیت کرتا ہوں گو میرا ایمان یہ ہے کہ ان میں سے تم ایک کی بھی تکمیل نہ کرو گے۔

المنصور کے پاس ایک صندوقچہ تھا جس میں اس کے علوم کے دفاتر رہا کرتے تھے۔ یہ صندوقچہ ہمیشہ مقفل رہتا تھا۔ سوائے المنصور کے کوئی شخص اس کو نہیں کھولتا تھا۔ المنصور نے اس صندوقچے کی طرف اشارہ کر کے المہدی سے کہا' دیکھو اس صندوقچے کی کامل حفاظت کرنا۔ اس میں تمہارے آباؤ اجداد کے علوم ہیں۔ اگر تم کو کسی امر کا خطرہ پیش آئے تو تم دفتر کبیر کو دیکھنا۔ اگر ان میں بھی تم اپنا مقصود نہ پاؤ تو مجموعہ صغیر دیکھنا اس میں ضرور تم جو چاہو گے پاؤ گے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تم اس کی تعمیل نہیں کرو گے اور دیکھو اس شہر (بغداد) کی پوری حفاظت کرنا! خبردار کبھی اس کی حیثیت تبدیل نہ کرنا! یہاں سے دارالخلافہ کہیں اور نہ لے جانا۔ میں نے یہاں اس قدر مال جمع کر دیا ہے کہ اگر دس برس تک خراج کا ایک حبہ وصول نہ ہو تو بھی یہ لشکریوں کے روزینے' مصارف' خاندان والوں کے خرچ اور روانگی فوج کیلئے کافی ہو گا۔ تم ہمیشہ اس کی نگرانی کرتے رہنا کیوں کہ جب خزانہ معمور ہو گا تو تم دشمنوں پر غالب رہو گے' مگر میرا خیال ہے کہ تم اس کی تعمیل نہ کرو گے۔

میں تم کو تمہارے خاندان والوں کی بابت بھی وصیت کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ بہ حسن سلوک پیش آنا اور ان کے ساتھ نیکی کرنا۔ ہمیشہ ان کو ہر کام کا پیشوا بنانا' ان کے ساتھ

نرمی کرنا' انہیں اچھے عہدوں پر فائز کرنا کیوں کہ تمہاری عزت ان کی عزت ہے اور ان کے نمایاں کام تمہارے ہیں' مگر میرا خیال ہے کہ تم اس کی تعمیل نہ کرو گے۔

میں تم کو اہل خراسان کے ساتھ بھی نیکی کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ اس وجہ سے کہ وہ تمہارے قوت بازو ہیں اور ایسے بہی خواہ ہیں جنہوں نے اپنے جان و مال کو تمہاری سلطنت قائم کرنے میں خرچ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری محبت ان کے دلوں سے کبھی نہیں نکلے گی۔ تم ہمیشہ ان کے ساتھ نیک سلوک کرنا' ان کی لغزشوں سے درگزر کرنا۔ ان سے جو نمایاں کام سرزد ہوں' ان کا معقول صلہ دینا۔ ان میں سے جو مر جائے' اس کے اہل و عیال میں تم اس کی نیابت کرنا' مگر میرا خیال ہے کہ تم اس کی تکمیل نہ کرو گے۔

میں ذی الحجہ میں پیدا ہوا' ذی الحجہ ہی میں خلیفہ بنایا گیا۔ میرے دل میں یہ خطرہ پیدا ہو رہا کہ میں اسی سال ذی الحجہ میں مر بھی جاؤں گا۔ مجھ کو اسی خیال نے حج کرنے کی توفیق دی ہے۔ میرے بعد اس معاملے میں جس کا میں امور مسلمین کے متعلق تم سے اقرار لیتا ہوں' اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا۔ جس معاملے میں تم کو حزن و کرب پیدا ہو گا' اس کی آسانی کا اللہ تعالیٰ راستہ پیدا کر دے گا۔ اے صاحبزادے امت رسولؐ کی حفاظت کرنا' اللہ تعالیٰ تمہاری اور تمہارے کاموں کی حفاظت کرے گا۔ خبردار! خوں ریزی کے قریب نہ جانا کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ گناہ عظیم ہے اور دنیا میں ہمیشہ کیلئے باعث ننگ و ناموس ہے۔ حدود اللہ کی پورے طور سے پابندی کرنا' اس سے تمہارے جان و مال کی بہتری ہے۔ ان حدود میں افراط و تفریط نہ کرنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ خبردار! عورتوں کو اپنے کاموں میں دخیل نہ بنانا مگر میرا خیال ہے تم ایسا ہی کرو گے۔"

خلیفہ المنصور کی مذکورہ وصیت کے متعلق بغداد میں اور بھی بہت سی روایتیں زبان زد عوام و خواص تھیں۔ ان روایتوں میں سے بیشتر کا مقصد خلیفہ کو بزادین دار اور رعایا کا خیر خواہ ثابت کرنا تھا۔ سو میں ان سے درگزر کرتی ہوں۔

ذیقعدہ کے ابتدائی ایام میں المنصور بغداد سے کوفہ کی طرف روانہ ہوا۔ کوفہ پہنچ کر اس نے حج کا احرام باندھا اور قربانی کے جانوروں پر نشان بنا کر آگے روانہ کیا۔ جب المنصور کوفہ سے دو منزل آگے مقام بیر میمون پہنچا تو اسے اپنے سینے میں شدید درد محسوس ہوا جو رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ 6 ذی الحجہ 158ھ کی فجر کو تریسٹھ برس کی عمر میں المنصور نے اسی جگہ وفات پائی۔ وفات کے وقت المنصور کے خدام اور آزاد کردہ غلام ربیع کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔

ربیع ہی کا بیان ہے' خلیفہ المنصور نے ہدایت کی تھی کہ اسے سرزمین مکہ میں دفن کیا جائے۔ اسی کے ساتھ وہ عبارت بھی حوالے کی تھی جو ربیع نے شہر مکہ میں پڑھ کر سنائی۔ المنصور کی میت خدام پہلے بغداد لے گئے اور پھر مکہ بھیجی گئی۔

اقتدار کی دھوپ چھاؤں میں آدم زاد پہچانی ہوئی صورتوں کو بھی نہیں پہچانتے۔ رشتے ناتے ان کے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ غالباً اسی سبب سے خلیفہ المہدی نے دارالخلافہ بغداد کو نہیں چھوڑا اور اپنے باپ المنصور کی میت کے ساتھ مکہ نہیں گیا۔

خلیفہ المنصور کے انتقال کو چند ہی روز گزرے تھے کہ بغداد کے کوچہ و بازار میں پہلی جیسی چہل پہل اور رونق لوٹ آئی۔ میں اسی رونق کا نظارہ کر کے ایک شام عارج کے ساتھ بابل کے کھنڈرات کی طرف آ رہی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ اب انسانی پیکر اختیار کر کے بغداد ہی میں رہنے لگوں۔ عارج کو بھی میں اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتی تھی۔ بغداد میں اپنی سکونت کیلئے ہمیں شہر کا غربی حصہ پسند آیا تھا مگر ابھی متعدد مرحلے باقی تھے۔

ہماری منزل قریب آنے والی تھی کہ عارج نے مجھے مخاطب کیا۔ ''اے دینار! تو نے اب علم طب پر بھی عبور حاصل کر لیا' تیری جو مرضی تھی وہ پوری ہو گئی۔۔۔۔ بول اب۔۔۔۔ اب کیا ارادہ ہے؟'' آخری الفاظ اس نے معنی خیز لہجے میں ادا کئے۔

میں اس کی بات سمجھ گئی۔ پہلے بھی وہ اس طرح کے اشارے کر چکا تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ مجھے ہمیشہ کیلئے اپنا لے۔ میں اس سے اپنا مقصد حیات بیان کر چکی تھی اس لئے بولی۔ ''تو جانتا ہے اے عارج کہ مجھے محض علم طب ہی تو نہیں سیکھنا تھا کیا تو عملیات کو بھول گیا؟''

''مگر اس کیلئے یہ تو ضروری نہیں اے دینار کہ ہم ایک دوسرے سے جدا رہیں!'' عارج کہنے لگا۔

''ہم ساتھ ہی تو ہیں' جدا کب ہیں!'' میں نے بات بنا دی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا' میں بول اٹھی۔ ''اور ہاں اے عارج! اب ہمیں ساتھ ہی رہنا ہے۔ میں نے عالم سوما سے بات کر لی ہے آج رات اس نے ہمیں بعد نماز عشاء بلایا ہے۔''

میری کسی بات سے انکار کرنا عارج نے جیسے سیکھا ہی نہ تھا۔ عشق میں وہ مکمل سپردگی کا قائل تھا۔ میری مرضی کے خلاف وہ کبھی کچھ نہ کرتا اور میں اس سے جو کہتی مان لیتا۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی ہی سمجھتی تھی۔ اس رات بھی عارج میرے ساتھ سوما کے پاس چلنے کو

راضی ہو گیا۔

ہم مقررہ وقت پر سوما کے پاس پہنچ گئے۔ سوما ہمیں دیکھ کر خوش ہوا اور بولا۔ ''عشاء کی نماز کے بعد نصف شب تک میں نے تمہاری تعلیم کا وقت رکھا ہے۔ آج رات میں تم کو تمہاری ہی تاریخ بیان کروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ رکا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''مجھے خبر ہے اے دینار کہ تو عملیات و وظائف سیکھنا چاہتی ہے کہ خلق خدا کی خدمت کر سکے۔ میں تجھے بتاتا ہوں کہ تمام عملیات کی بنیاد علم ہے اور علم کا مطلب جاننا ہے۔ اس کے بغیر عملیات و وظائف کی تعلیم بے سود ثابت ہو گی۔''

مجھے تو راضی ہونا ہی تھا عارج نے بھی حامی بھر لی۔

''تو سنو! یہ جنات کی تاریخ بھی ہے اور اس زمین کی تاریخ بھی کہ جس پر ہم آدم زادوں سے پہلے آباد ہیں۔''

میں اور عارج پوری توجہ سے سوما کا بیان سننے لگے۔

''زمین سنسان اور ویران تھی یہاں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا پھر روشنی تخلیق کی گئی اور اندھیرے کو اس سے جدا کر دیا گیا۔ یوں دن اور رات پیدا ہوئے' شام اور صبح ہوئی۔ اس کے بعد فضا کے نیچے کا پانی' فضا کے اوپر والے پانی سے الگ کر دیا گیا اور خلاق نے فضا کو آسمان کہا۔ آسمان کے نیچے کا پانی خالق کے حکم سے ایک جگہ جمع ہو گیا اور اس طرح خشکی نظر آنے لگی۔ خشکی کو زمین کہا گیا اور جو پانی جمع ہو گیا تھا اسے سمندر' زمانوں' دنوں اور برسوں کے امتیاز کی خاطر نیر تخلیق کئے گئے۔ ان میں سے ایک نیر اکبر تھا کہ دن پر حکم کرے اور ایک نیر اصغر کہ رات پر حکم کرے پھر اسی زمین پر جلتی ہوئی ہوا کی گرمی سے ایک مخلوق جن پیدا کی گئی۔ ابوالجن کا نام طارنوش تھا اس کا لقب جان بھی بتایا جاتا ہے۔ جب زمین پر طارنوش کی اولاد بکثرت ہو گئی تو خدا نے اس کیلئے شریعت بھیجی۔

ابوالجن طارنوش اور اس کی اولاد نے احکام شریعت قبول کئے۔ اولاد طارنوش چھتیس ہزار سال پابند شریعت رہی اور یوں ایک دور ثوابت اپنی تکمیل کو پہنچا' مگر پھر وہ گناہ و سرکشی پر آمادہ ہو گئے اور سزاوار عذاب ٹھہرے۔ ان میں جو راہ راست پر قائم تھے عذاب الٰہی سے بچے رہے' انہی میں سے ایک علیالیش تھا جسے جنات کا ولی بنایا گیا اور نئی شریعت عطا کی گئی۔

جب دوسرا دور ثوابت گزر گیا تو جنات نے ایک بار پھر نافرمانی کا راستہ اختیار کر لیا۔ سو یوں ان پر فنا کا عذاب بھیجا گیا' مگر اس عذاب فنا سے اطاعت گزار بچے رہے۔ ان کا

حاکم ملیقا کو بنایا گیا۔ تیسرے دور ثوابت کے بعد ان میں پھر سرکشی پھیلی اور عذاب الٰہی نازل ہوا۔ اس بار زندہ بچ جانے والوں میں سے ہاموس حاکم مقرر ہوا جو فضل و دانش کے زیور سے آراستہ تھا۔

وفات ہاموس کے بعد جنات پھر گمراہ ہو گئے۔ خدا نے ان کی ہدایت کیلئے رسول بھیجے، مگر وہ نہ مانے اور یوں چوتھا دور ثوابت بھی ختم ہوا۔

پانچویں دور ثوابت کی ابتداء میں ملائکہ کا ایک گروہ کثیر زمین پر بھیجا گیا کہ وہ نافرمان جنات کے وجود سے زمین کو پاک کر دے۔

گمراہ جنات نے ملائکہ سے جنگ کی اور ہلاک ہوئے۔ انہی میں سے کچھ دوران جنگ فرار ہو گئے۔ جنگ ختم ہوئی تو ان میں سے جو سن شعور کو نہیں پہنچے تھے انہیں فرشتوں نے اسیر کرلیا۔ انہی اسیروں میں سے ایک بہت عبادت گزار نکلا۔ اس نے آسمان اول پر ہزار برس تک خدائے بزرگ و برتر کو سجدہ کیا، تب اس کا نام خاشع ہوا یعنی عاجزی کرنے والا۔ وہاں سے وہ دوسرے آسمان پر گیا اور مزید ایک ہزار برس خدا کی حمد و ثنا کی۔ وہاں رہنے والوں نے اس کا نام عابد رکھا۔ پھر اس نے تیسرے آسمان کی سمت پرواز کی۔ تیسرے آسمان پر بھی اس نے ہزار سال تک رب العالمین کی عبادت کی وہاں اس کا نام صالح ہوا۔ اس نے چوتھے آسمان پر اتنے ہی عرصے عبادت گزاری کی اور ولی کہلایا۔ پھر پانچویں آسمان تک پہنچنے کے بعد اس کا نام عزازیل ہو گیا۔ اس نے جستجوئے حق میں چھٹے اور ساتویں آسمان پر بھی سجدے گزارے۔

سات آسمانوں پر گزر کر یہی جن زاد عزازیل عرش معلیٰ تک پہنچ گیا۔ پھر اس کے منصب میں اضافہ کر دیا گیا۔ وہ ملائکہ کو درس دینے اور وعظ و نصیحت کرنے لگا۔ اس کی مجلس وعظ، عرش کے نیچے منعقد ہوتی تھی، وہ یاقوت کے منبر پر بیٹھ کر وعظ کہتا تھا۔ اس کے سر پر نور کا ایک علم لہراتا تھا۔ اس کی مجلس وعظ میں لاتعداد فرشتے ہوتے تھے۔

وہ جن زاد فرشتوں کے ساتھ مصروف عبادت رہتا۔ فرشتوں سے اس کی دوستی اور اختلاط بہت زیادہ تھا۔ علم و عبادت میں اس جن زاد کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ اب وہ معلم الملکوت کہلانے لگا تھا۔ ظاہری حالت اس کی بہت اچھی تھی، مگر وہ اپنے دل میں خلافت ارض کی آرزو چھپائے ہوئے تھا۔ یہی آرزو اسے لے ڈوبی۔ تخلیق آدم کے بعد اس نے اللہ کے حکم پر آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا۔ یوں قیامت تک کیلئے مردود ٹھہرا۔

خدا نے اسے ابلیس کہا اور اس کا یہی نام پڑ گیا۔ ابلیس کا مادہ ابلاس ہے جس کے معنی انتہائی مایوسی کے ہیں۔ اسی کو خدا نے شیطان بھی کہا ہے۔ جو چیز نیکی اور اطاعت کی حریف اور اس کے مدمقابل بطور تصادم کام کرتی ہے اس کا نام ابلیس ہے اور پھر یہ تصادم جن صورتوں میں ظاہر ہو کر سامنے آتا ہے اس کا نام شیطان ہے۔ ابلیس و شیطان جدا نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔"

عالم سوما کا بیان بلاشبہ بڑا پر مغز اور وقیع تھا۔ میں اور عارج بڑی محویت کے عالم میں سب کچھ سنتے رہے۔ سوما نے جیسے ہمیں کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ اس نے ہم سے سوالات کرنے کو کہا اور بولا۔ "سوال ہی سے علم کے راستے کھلتے ہیں۔"

میں نے اس سے کئی سوالات کئے اور تسلی بخش جواب پائے۔ میری دیکھا دیکھی عارج کا بھی حوصلہ بڑھا اور وہ بھی گفتگو میں حصہ لینے لگا۔ اسی میں وقت گزر گیا اور آدھی رات ہو گئی۔ ہم سوما کے پاس سے اٹھ آئے۔

دوسرے دن میں نے ماں سے بغداد میں سکونت کے متعلق بات کی۔ ماں مجھے حیرت سے دیکھنے لگی اور بولی۔ "اے دینار! تجھے کیا ہو گیا ہے۔ تو آدم زادوں کے درمیان رہے گی؟ لگتا ہے تیرے باپ اور اس کے دوستوں نے تجھے بگاڑ دیا ہے۔"

"ایسی بات نہیں اے میری ماں!" میں نے اسے سمجھایا۔ "نہ مجھے کسی نے بگاڑا ہے، نہ خود بگڑی ہوں۔ طبیب ہامہ اور عالم سوما دونوں ہی قابل عزت ہیں۔"

"تو پھر تجھے بگاڑنے والا وہ عارج ہو گا جس کے ساتھ تو اکثر سیر سپاٹے کرتی پھرتی ہے۔" میری ماں سہلوب اس بات پر بضد تھی کہ میں بگڑ گئی ہوں۔

میری مرضی یہ تھی کہ اپنے والدین کی اجازت سے بغداد جاؤں۔ اس طرح وہ رنجیدہ نہ ہوتے میرے پیش نظر کیونکہ ایک نیک مقصد تھا اور نیکی خود ایک بڑی قوت ہوتی ہے اس لئے راہ مل گئی۔ عالم سوما نے مجھ سے وعدہ کر لیا کہ مجھے بغداد جانے کی اجازت دلا دے گا۔ اس نے میرے باپ اخضم سے بات کرنے کو کہا تھا۔ بیٹیاں آدم زادوں کی ہوں یا جنات کی باپ کی لاڈلی ہوتی ہیں۔ یہی صورت میرے ساتھ تھی۔

چند روز بعد ہی میرے باپ اخضم نے خلوت میں مجھ سے بات کی۔ "کیا وہ بات سچ ہے جو مجھے سوما سے معلوم ہوئی ہے اے دینار؟"

میں نے اقرار کرلیا۔

''اگر تیرا مقصد خیر ہے' نیکی ہے' جیسا کہ مجھے بتایا گیا ہے تو میں تجھے ہرگز نہیں روکوں گا' لیکن اے دینار! تجھے یہ نصیحت ضرور کروں گا کہ اپنی جان کی پروا کرنا' اسے بلا ضرورت خطرے میں نہ ڈالنا۔ اللہ نے ہر حال میں جان کی حفاظت کا حکم دیا ہے۔'' میرے باپ اعصم نے کہا۔

وہ دن میرے لئے انتہائی خوشی کا تھا اور خوشی کے وقت کوئی اپنا ہی یاد آتا ہے۔ مجھے عارج تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

میں جانتی تھی کہ اس وقت عارج کہاں ملے گا۔ وہ طبیب ہامہ کے مطب سے نکل رہا تھا۔ عارج کو میں نے صحرائی طرف چلنے کی دعوت دی اور ہم دونوں پرواز کرتے ہوئے دور نکل گئے۔ صحرا کی شام کا اپنا ایک الگ حسن ہوتا ہے جو میں نے اپنی روح میں اترتا محسوس کیا۔ وہاں میرے اور عارج کے سوا دور دور تک کوئی نہیں تھا ہم ایک ٹیلے کی آڑ میں بیٹھ گئے۔ صحرا میں ریت کے ایسے ٹیلے روز بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔

''دینار! آج تو بہت خوش نظر آ رہی ہے' کیا بات ہے؟'' عارج نے پوچھ ہی لیا۔

''میرے بابا نے مجھے بغداد جانے کی اجازت دے دی ہے۔'' میں نے عارج کو بتایا۔ ''ہم اسی علاقے میں رہیں گے جو پچھلے دنوں دیکھ کر آئے تھے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے اے دینار! لیکن پہلے تو تیرا ارادہ کچھ اور تھا۔'' عارج بولا۔ ''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تو نے کہا تھا کہ علم طب اور عملیات و وظائف میں مہارت حاصل کرنے کے بعد ہی شہر بغداد میں سکونت اختیار کرے گی ابھی تو عالم سوما کی تعلیم جاری ہے۔''

''عارج! پہلی بات تو یہ کہ ارادہ بدل بھی سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جہاں تک عملیات کا تعلق ہے تو ان کے حصول سے ہمیں کون روک رہا ہے۔ مقررہ وقت پر ہم سوما کے پاس آ جایا کریں گے۔ تجھے سچ بتاؤں عارج کھنڈرات میں رہتے رہتے اب میرا جی اوب گیا ہے۔''

''لیکن میں نے تو ابھی طبیب ہامہ سے کچھ بھی نہیں کہا۔'' عارج فکر مند سا نظر آنے لگا۔

''تو اب کہہ دیجو۔'' میں بولی۔

''ہاں کہنا تو پڑے گا۔'' عارج کا لہجہ خود کلامی کا سا تھا۔

اس وقت مجھے طبیب ہامہ کے الفاظ یاد آ رہے تھے جو اس نے برسوں پہلے عارج

کے بارے میں مجھ سے کہے تھے۔ ''کئی سو برس کی تلاش و کاوش کے بعد ایک ہی نوجوان جن زاد عارج میری توقعات پر پورا اترا ہے وہ بڑی لگن کے ساتھ علم طب حاصل کر رہا ہے۔''

میں اب اسی عارج کو اپنے ساتھ بغداد لے جا رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ بوڑھے طبیب ہامہ کو جب یہ بات پتا چلے گی تو اسے رنج ہو گا میں نے اسی سبب عارج کی دل جوئی کیلئے کہا۔ ''اگر تو کہے تو میں طبیب ہامہ سے بات کر لوں؟''

''نہیں دینار! اس کی ضرورت نہیں ہے میں خود ہی کوئی موقع دیکھ کر اسے بتا دوں گا۔'' عارج نے جواب دیا۔

''لیکن اس میں اب دیر نہ کرنا عارج!'' میں نے اسے تاکید کی۔ عارج سے میرا اتنا ہی کہنا کافی تھا۔

اگلے ہی دن عارج نے بھی مجھے خوشخبری سنا دی۔ طبیب ہامہ کو اس نے راضی کر لیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ میں تھی۔ میں نے بھی کئی برس اس کی خدمت میں گزارے تھے۔ اب کوئی بات بغداد جانے اور وہاں بسنے میں مانع نہیں رہی تھی۔

عارج کو ساتھ لے کر دوپہر ہونے سے کچھ پہلے ہی میں بغداد پہنچ گئی۔ غربی حصے کے اس محلے کا نام حربیہ تھا جسے میں نے سکونت کیلئے منتخب کیا تھا۔ وہ بڑا پرسکون علاقہ تھا۔ جو مکان مجھے پسند آیا اس کے قریب ہی ایک باغ تھا۔ شہر کے اس حصے میں باغات اور نخلستان کی بہتات تھی۔ یہیں سے ہر قسم کا میوہ شہر کے شرقی حصے میں جاتا تھا۔ وہ مکان پسند آنے کی دیگر وجوہ میں ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اسے میں نے خالی پایا تھا۔ یوں تو جنات کیلئے آدم زادوں سے کوئی مکان خالی کرا لینا ایسا مشکل کام نہیں' لیکن میں یہاں آدم زادوں کو تنگ کرنے نہیں آئی تھی۔

ابھی تک مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس وسیع و عریض مکان کا مالک کون ہے' باغوں سے گزر کر اب ہم مطلوبہ مکان تک پہنچ گئے تھے۔

''اے عارج! اب ہمیں انسانی پیکر میں آ جانا چاہئے۔'' میں نے عارج کو مخاطب کیا۔

''جلدی نہ کر اے دینار!'' عارج نے مشورہ دیا۔ ''پہلے مکان تو مل جائے رہنے کو!''

''یہ تو ٹھیک کہتا ہے۔'' میں نے اس سے اتفاق کیا۔ ''چل پتا لگاتے ہیں کہ یہ

مکان کس کا ہے۔''

''کیا خبر وہ آدم زاد ہمارے ہاتھ اس مکان کو فروخت کرے نہ کرے۔''

''دیکھ عارج' بہت زیادہ نیک اور پارسا بننے سے بھی کام نہیں چلے گا۔'' میں بولی۔ ''ضرورت پڑنے پر ہمیں تھوڑی بہت تو زور زبردستی کرنی پڑے گی۔''

''تو جان تیرا ہی کہنا تھا کہ ہم یہاں آدم زادوں کی مدد کرنے آئے ہیں۔''

''مگر صرف ان کی جو مدد کے واقعی مستحق ہوں۔'' میں بول اٹھی۔ ''مقصد کے حصول کا تعین تو آسان ہے' لیکن اس کیلئے کیا ذریعہ اختیار کیا جائے یہی دراصل مشکل ہوتا ہے۔ اے عارج! تجھے کیوں کہ آدم زادوں سے زیادہ واسطہ نہیں پڑا' اس لئے انہیں بھولا سمجھ رہا ہے۔''

''اب تو واسطہ پڑنا ہی ہے دینار! فکر نہ کر تو مجھے غافل نہ پائے گی۔'' عارج نے کہا۔

''معلوم نہیں عارج! اس محلے کا نام حربیہ کس نے اور کیوں رکھا ہے؟'' میں نے موضوع گفتگو بدل دیا۔

''بہ ظاہر تو یہاں رزم و پیکار کے آثار نظر نہیں آتے۔'' یہ کہتے ہوئے میں آگے بڑھی۔ سامنے سے مجھے ایک آدم زاد آتا دکھائی دیا۔ اسے میں نے اپنے زیر اثر لینے میں دیر نہ کی۔

''وہ مکان موسیٰ بن کعب کی ملکیت ہے۔'' آدم زاد نے میرے سوال کا جواب دیا۔ ''پیچھے جو تفاح (سیب) کا باغ ہے وہ بھی اسی کا ہے۔''

موسیٰ بن کعب! میرے وجود میں چھناکا سا ہوا۔ اسی کے ساتھ میں نے اس آدم زاد کو اپنے اثر سے آزاد کر دیا۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

ہر چند کہ کبھی اس آدم زاد موسیٰ سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی مگر میں اس کا نام جانتی تھی۔ یہ وہی تھا کہ جسے عامل کوفہ اور ولی عہد سلطنت عیسیٰ نے ایک کنیز بھیجی تھی۔ میں اپنی سرگزشت میں اس کا ذکر کر چکی ہوں۔

عارج کیوں کہ اس سے واقف نہیں تھا اس لئے پوچھنے لگا۔ ''کون ہے یہ اے دینار کہ جس کا نام سن کر تو گم صم ہو گئی؟''

''موسیٰ بن کعب' خلیفہ المنصور کے محکمہ نظارت (نگہبانی) کا نگران اعلیٰ تھا۔'' میں

نے بتایا۔ ''توقع ہے کہ نئے خلیفہ المہدی نے بھی اسے اسی عہدے پر رکھا ہو گا۔ آدم زادوں میں وفادار بھی ہوتے ہیں اگر کسی حکمران کے ساتھ وفاداروں کا ٹولا نہ ہو تو وہ بے اثر ہو کر رہ جائے۔'' پھر میں نے عارج کو موسیٰ کے بارے میں بقیہ تفصیل سے بھی آگاہ کر دیا۔ اس تفصیل میں حسین و مجبور کنیز فاطمہ کا بھی ذکر تھا' اسے نجف سے اغوا کیا گیا تھا۔

''تو پھر اب تیرا کیا ارادہ ہے اے دینار؟'' عارج نے سوال کیا۔

''اسے چل کر ڈھونڈتے ہیں وہ مشہور آدمی ہے جلد مل جائے گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بغداد کا سب سے بڑا محلہ قرافہ ہے۔ ارکان حکومت کی قیام گاہیں وہیں ہیں۔ موسیٰ بھی ہمیں وہیں ملے گا کسی بڑے اور عالی شان مکان میں!''

''تجھے تو دینار اس شہر کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔'' عارج نے میری تعریف کی۔ ''گلی محلوں تک کی خبر ہے۔''

''نہیں عارج!'' میں بولی۔ ''ابھی تو ابتداء ہے دراصل بغداد کی بنیاد ہی میرے سامنے رکھی گئی تھی اس لئے تھوڑی بہت خبر ہے ورنہ تو ابھی میں نے قصر خلافت بھی نہیں دیکھا۔ سنا ضرور ہے کہ اندر سے بہت خوب صورت اور وسیع و عریض ہے قصر خلافت۔''

''اب یہاں آ ہی گئے ہیں تو قصر خلافت بھی دیکھ ہی لیں گے۔'' عارج کے لہجے میں بھی اشتیاق محسوس ہوا۔

''ایک بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی عارج!'' میں نے کہا۔ ''یہ آدم زاد اتنے بڑے بڑے اور عالی شان مکانوں میں کیوں رہتے ہیں؟ خلیفہ ہو یا کوئی غریب آدم زاد سوئے گا تو وہ ایک ہی جگہ۔ پورے قصر یا محل میں ہر جگہ تو نہیں سو سکتا یہی معاملہ پوشاک کا ہے۔ مقصد تن ڈھانپنا ہے۔ وہ اطلس و ریشم ہو کہ معمولی کپڑا' اس سے کیا فرق پڑتا ہے' پیٹ بھر خوراک ایک عام آدمی اور خلیفہ وقت دونوں ہی کو چاہئے' کیا کوئی اپنی خوراک سے زیادہ کھا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں پھر یہ آدم زاد ایک دوسرے کے نوالے کیوں چھینتے ہیں؟''

''ہاں دینار! یہ سارے سوال تو یقیناً سوچنے کے ہیں۔'' عارج بولا۔ ''اچھا اب چل نا! دیر ہو رہی ہے۔''

میں نے وہاں سے عارج کے ساتھ پرواز کی اور بغداد کے محلے قرافہ پہنچ گئی۔ اہل ایمان ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ خوشی بہرحال تھی کہ یہ شہر مسلمانوں کا

دارالحکومت ہے۔

موسیٰ بن کعب کا مکان تلاش کرنے میں ہمیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی' مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک دربار خلافت سے نہیں لوٹا۔

قصر خلافت کی عظیم الشان عمارت سامنے ہی نظر آ رہی تھی۔ اسی عمارت نے بغداد شہر کے تقریباً چوتھائی حصے کو گھیر رکھا تھا۔ اسی عمارت کی حدود میں مختلف محکموں کے دفاتر تھے۔ ان دفاتر کے درمیان سبزہ زار نظر آئے کہیں حوض تھے تو کہیں ایسے نظارے کہ یوں لگے کہ دامن کوہ سے چشمے ابل رہے ہوں۔ ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے! کچھ دیر کو میں ان مناظر میں کھو گئی۔ مجھے یاد ہی نہ رہا کہ وہاں کیوں آئی تھی۔ قدم قدم پر میں نے وہاں مسلح محافظوں کو چوکنا اور مستعد پایا۔ وہ محافظ بھی انہی منظروں کا حصہ لگتے تھے۔ عمارت میں داخلے کا بڑا اگر ایک دروازہ ہمارے مقابل میں تھا۔

آدم زادوں کو وہاں آتے جاتے میں نے اس طرح دیکھا جیسے وہ اپنے سائے سے بھی ہو سکے ہوں۔ یقیناً یہ اس قصر خلافت کا رعب دبدبہ تھا۔ جن کی امان کے بغیر نہیں ہوتی۔ اسی قصر میں خلیفہ محمد بن عبداللہ المہدی رہتا تھا۔ اس کے باپ خلیفہ ابوجعفر عبداللہ المنصور کو میں بہت پہلے سابق دارالخلافہ انبار میں دیکھ چکی تھی۔ وقت بھی مسلمانوں کا تھا اور تخت و بخت بھی! بغداد آ کر ان کی شکوہ و عظمت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

اپنے عہد کی یہ سب سے بڑی سلطنت تھی۔ قصر خلافت کی دیواروں' ستونوں' محرابوں' طاقوں اور وسیع راہداریوں کی عظمت زبان حال سے جیسے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں نے خاموشی کی وہ زبان سنی اور عارج کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔

ہم دربار میں پہنچے تو ایک پابہ زنجیر قیدی کو خلیفہ المہدی کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔ شیخ صورت خلیفہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اپنی مسند پر اس طرح بیٹھا تھا جس طرح اسے اپنے سامنے کھڑے ہوئے آدم زاد بونے لگ رہے ہوں۔ اس کی عمر تیس برس کے قریب لگتی تھی۔

''قیدی حسن بن ابراہیم کو سخت پہرے اور نگرانی میں بغداد سے موصل بھیج دیا جائے۔'' خلیفہ المہدی کی آواز سنائی دی اور میں چونک اٹھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ المنصور بول رہا ہو۔ المہدی کی گونج دار آواز اپنے باپ سے بہت ملتی تھی۔ ''ہم موسیٰ بن کعب کو ذمے دار ٹھہراتے ہیں کہ وہ ہمارے حکم کی تعمیل کرے۔'' پھر المہدی قیدی حسن بن ابراہیم

سے مخاطب ہوا۔ ''تمہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟''

''اے امیر المومنین! میں اپنی صفائی قاضی علاشہ کی عدالت میں پیش کر چکا ہوں۔'' قیدی حسن نے کہا۔ اس لیے وہ مجھے مظلوم دکھائی دیا۔

''تو کیا تم پر یہ الزام غلط ہے کہ اپنی رہائی کیلئے قید خانے تک سرنگ کھدوائی؟'' خلیفہ المہدی بارعب آواز میں بولا۔

''مجھے اس سے انکار نہیں کہ میں نے یہ کوشش کی۔ میری نظر میں یہ حق ہر آزاد بندے کو حاصل ہے کہ وہ ''

خلیفہ المہدی نے قیدی کی بات پوری نہ ہونے دی اور کہا۔ ''بس تم نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا' ہمیں کچھ اور نہیں سننا۔''

یہی وہ لمحہ تھا کہ جب میری نظر موسیٰ بن کعب پر پڑی۔ وہ درباریوں کی ایک صف سے نکلا اور خلیفہ المہدی کی مسند کے سامنے پہنچ کر پست آواز میں کہنے لگا۔ ''غلام موسیٰ بن کعب کو اجازت ہو کہ وہ قیدی کو امیر المومنین کے حکم پر موصل لے جانے کا بندوبست کرے۔''

''اجازت ہے۔'' خلیفہ المہدی نے دایاں ہاتھ بلند کیا۔

موسیٰ بن کعب کے سپاہی آگے بڑھے اور انہوں نے قیدی کو نرغے میں لے لیا۔

میں قیدی کی طرف متوجہ تھی کہ ایک آدم زاد نے بلند آواز میں اعلان کیا۔ ''امیر المومنین کے حکم پر دربار برخاست کیا جاتا ہے۔''

عارج اور میں نے یہ سب کارروائی خاموشی سے دیکھی اور بیچ میں کچھ نہ بولے۔

خلیفہ المہدی اپنی مسند سے اٹھا تو اس کے محافظ دستے کے سپاہی ان پردوں کے پیچھے سے نکل آئے جو دائیں بائیں نظر آ رہے تھے۔ میں انہیں پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔

''اے دینار! موسیٰ تو اس قیدی کو لے کر موصل جا رہا ہے' اب؟'' عارج مجھ سے کہنے لگا۔

''میرا خیال ہے اے عارج کہ فوری طور پر موسیٰ وہاں نہ جا سکے گا۔'' میں بولی۔

''ہم نے اس کا گھر تو دیکھ ہی لیا ہے' ادھر چلتے ہیں۔''

''میں سمجھ گیا دینار کہ تو اس کنیز فاطمہ کا حال معلوم کرنا چاہتی ہے۔'' عارج نے کہا مگر یہ نہ بھولیو کہ بوڑھا کافر بھی کہیں آس پاس ہو سکتا ہے۔'' عارج کا اشارہ استخوانی چہرے والے کافر جن زاد سلیمان کی طرف تھا۔

''عارج! تو نے اچھا کیا جو مجھے خطرے سے آگاہ کر دیا میں ہوشیار رہوں گی۔''

''یہ قیدی حسن بن ابراہیم کون ہے دینار کہ جسے بغداد سے موصل بھیجا جا رہا ہے؟''
عارج نے معلوم کیا۔

''میں نے بھی اسے تیری طرح پہلی بار ہی دیکھا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر ایک اندازہ ضرور لگا لیا ہے کہ آدم زاد خلیفہ کے خلاف ہوگا' حکمران کوئی بھی ہو اپنے مخالفوں کو برداشت نہیں کرتا۔ تو نے ایک بات شاید محسوس نہ کی ہو عارج! کہ تمام ترسختی کے باوجود قیدی کیلئے خلیفہ کی آواز میں نرمی تھی۔ تجسس تو مجھے بھی ہے کہ یہ کیا معاملہ ہے لیکن پہلے مکان کا بندوبست ہو جائے۔''

قصر خلافت سے نکل کر ہم فرازہ پہنچ گئے۔ میں نے موسیٰ کے حرم میں کنیز فائضہ کو تلاش کر لیا۔ اس کے حسن کا چاند ہر چند کہ ڈھل گیا تھا لیکن خزاؤں کا سکوت' خشک پتوں کے ساز پر اب بھی گویا نغمہ بہار سنا رہا تھا۔

فائضہ کو اپنے اثر میں لے کر میں حرم کے ایک ایسے حصے کی طرف بڑھی جہاں کوئی نہیں تھا۔

''کیا تیرا تعلق نجف ہی سے ہے اے فائضہ؟'' میں نے اس سے دریافت کیا۔

''ہاں میں وہیں کی ہوں۔'' فائضہ نے جواب دیا۔

''تجھے اپنے گھر والے یاد ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یاد تو ہیں مگر اب میں انہیں بھول جانا چاہتی ہوں۔'' فائضہ کی آواز میں گہری اداسی تھی۔

''کیوں؟ تو ایسا کیوں چاہتی ہے؟''

''اس...... اس لئے کہ......'' وہ سسک اٹھی۔ ''میں انہیں بے عزت ہوتے کیسے دیکھ سکوں گی......! اب تک ان کے زخم بھر چکے ہوں گے' انہوں نے مجھے صبر کر لیا ہوگا' میں ان کے زخموں کو ہرا کیوں کروں؟...... کیا ایک بیٹی اپنے ماں باپ کو عزت بھی نہیں دے سکتی؟''

سعا میں نے ایک ادھیڑ عمر آدم زادی کو ادھر آتے دیکھا۔ وہ فائضہ سے کہنے لگی تجھے کیا ہوا؟ یہاں کونے میں بیٹھ کر کیوں رو رہی ہے؟''

''نن...... نہیں تو...... میں رو تو نہیں رہی۔'' فائضہ چونک کر بولی۔ اسے میں نے اپنے اثر سے آزاد کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

''اے عارج! چل' مجھے یہاں وحشت ہو رہی ہے۔'' میں نے عارج کو مخاطب کیا جو میرے ساتھ ساتھ تھا۔ ہم جنات چاہیں تو آدم زاد ہماری آوازیں سن سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ اس آدم زادی فائضہ کا دکھ مجھے بھی محسوس ہوا تھا مگر میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

''ابھی موسیٰ سے بھی تو ملنا ہے اے دینار!'' عارج نے یاد دہانی کرائی۔ ''اصل کام تو رہ گیا۔''

موسیٰ مجھے اسی مکان کی نشست گاہ میں مل گیا۔ وہ وہاں تنہا نہیں تھا۔ اس کے دو نائبین بھی ساتھ تھے۔ چہرے سے وہ مجھے فکرمند دکھائی دیا۔ پھر وہ اپنے ایک نائب سے بولا۔ ''دیکھو یہ معاملہ بڑی اہمیت کا ہے اگر ہم سے ذرا سی بھی چوک ہوگئی تو امیر المومنین ہمیں ہرگز معاف نہ کریں گے۔''

جس قیدی حسن بن ابراہیم کو میں نے دربار میں دیکھا تھا موسیٰ اپنے نائبوں سے اسی کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ میں توجہ سے سننے لگی۔ اس کا سبب اس قیدی کے بارے میں میرا تجسس تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ خلیفہ المنصور کی وفات کے بعد نئے خلیفہ المہدی نے قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا۔ جس قدر قیدیٔ المنصور کے قید خانوں میں تھے ان سب کو رہا کر دیا گیا۔ صرف ان قیدیوں کی رہائی عمل میں نہ آئی جو خونی' غاصب' بدعقیدہ یا باغی تھے۔

خلیفہ المنصور کے دور حکومت ہی میں حسن بن ابراہیم کو گرفتار کیا گیا تھا۔ اسی کے ساتھ قید ہونے والوں میں یعقوب بن داؤد بھی تھا۔ حسن پر یہ الزام تھا کہ وہ لوگوں کو خلیفہ کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ عراق سے شام تک حسن کی شہرت تھی۔ کچھ آدم زادوں کے لئے شہرت و مقبولیت بھی وبال بن جاتی ہے۔ حسن بھی ایسوں ہی میں سے تھا۔ حکومت وقت تو اسے اپنے لئے خطرہ سمجھتی مگر رعایا اس پر جان چھڑکتی تھی۔

قید خانے ہی میں حسن کی ملاقات یعقوب سے ہوئی۔ یعقوب کو اس بنا پر حراست میں لیا گیا تھا کہ خلیفہ المنصور اسے بدعقیدہ سمجھتا تھا۔ حسن سے اس نے یوں میل جول بڑھایا کہ وقت پڑنے پر کوئی فائدہ اٹھا سکے۔ اس کا موقع یعقوب کو جلد ہی مل گیا۔ حسن نے اس پر اعتماد کر کے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی اس نے یعقوب کو بتایا کہ میں اب زیادہ عرصے قید میں نہیں رہوں گا۔

''تو پھر؟'' یعقوب نے حیرت کا اظہار کیا' پھر قیاسا بولا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ

تمہارے پرستار تمہیں اس قید خانے سے نکال کر لے جائیں گے؟"

"ہاں، بات کچھ ایسی ہی ہے۔" حسن مسکرا کر کہنے لگا۔ اس کی آواز دھیمی تھی۔

"مگر اے دوست! مجھے بھی تو بتاؤ کہ یہاں سے رہائی کس طرح ممکن ہے؟" یعقوب نے سرگوشی کی۔

"وہ جو مجھے چاہتے ہیں، بغداد کے اس قید خانے میں نہ رہنے دیں گے۔ طے یہ پایا ہے کہ بغداد سے فرار کرا کے مجھے شام کے شہر دمشق پہنچا دیا جائے گا پھر تو یہ تم بھی جانتے ہو گے کہ خدا نے مجھے وہ زورِ خطابت عطا کیا ہے جو دلوں کو فتح کر لیتا ہے اور دلوں کو فتح کرنے والے ہی فاتحِ زمانہ کہلاتے ہیں۔"

"اے حسن! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا کہ اس قید خانے سے تمہارا فرار کیسے ممکن ہو گا؟" یعقوب کسی چالاک لومڑی کی طرح حسن کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوستی میں آدمی بڑی جلدی فریب کھا جاتا ہے۔

میں جو کچھ بیان کر رہی ہوں اس کا ذریعہ موسیٰ بن کعب ہی تھا وہ جو گفتگو کر رہا تھا اور جو کچھ حسن کے متعلق پہلے سے جانتا تھا، میں نے اس سے پتا کر لیا اور اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ یعقوب کے اصرار پر حسن نے آخر بتا ہی دیا کہ اس کے پرستار قید خانے تک ایک سرنگ کھودنے والے ہیں۔

پھر کیا تھا، یعقوب کھل اٹھا۔ اس نے اپنے ایک شناسا قیدی کے ذریعے جسے رہائی ملنے والی تھی، یہ خبر قاضی علاثہ تک بھجوا دی۔ قاضی سے اس کی پرانی یاد اللہ تھی۔ قاضی علاثہ خلیفہ المہدی کے وزیرِ مملکت ابوعبداللہ سے ملا۔

"اے ابوعبداللہ! میں ایک ایسی خبر لایا ہوں کہ امیر المومنین تمہارے درجات مزید بلند کر دیں گے۔" قاضی علاثہ نے اپنی بزرگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وزیرِ مملکت کو یہ بات بغیر کسی لاگ لپیٹ کے بتائی۔

توقع کے مطابق ابوعبداللہ متجسس ہو گیا۔ اس نے قاضی علاثہ سے خبر کی تفصیل بیان کرنے کو کہا۔

"اس کی ایک شرط ہے کہ تمہیں خبر رساں کو رہائی دلانی ہو گی۔"

"کہیں وہ حسن بن ابراہیم تو نہیں کہ تم جسے رہا کرانا چاہتے ہو۔" ابوعبداللہ نے چونک کر پوچھا۔

"نہیں وہ نہیں ہے۔" قاضی علاثہ نے جواب دیا۔

"اگر وہ حسن نہیں تو پھر میرا وعدہ رہا کہ اسے رہائی مل جائے گی۔" ابوعبداللہ نے وعدہ کر لیا تو قاضی علاثہ نے اسے ساری بات بتا دی۔

پھر یہ ہوا کہ اسی رات یعقوب بن داؤد کو رہائی مل گئی۔ وزیرِ مملکت ابوعبداللہ اور قاضی علاثہ خلوت میں خلیفہ المہدی سے ملے۔ ان کے ساتھ یعقوب بھی تھا جو حسن بن ابراہیم سے اپنی دوستی کی قیمت وصول کرنے آیا تھا۔ خلیفہ المہدی کو یہ علم ہوا تو اس نے حکم دیا کہ حسن کو قاضی علاثہ کی عدالت میں پیش کیا جائے۔ حسن پر فردِ جرم عائد کی گئی اور قاضی علاثہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

سو یوں اب حسن بن ابراہیم کو بغداد سے موصل بھیجا جا رہا تھا۔

اپنے نائبوں کو مختلف ہدایات دینے اور انہیں رخصت کرنے کے بعد موسیٰ اٹھا ہی تھا کہ اسے میں نے ڈرا دیا۔ میں ایک بھیانک شکل میں اس کے سامنے ظاہر ہو گئی تھی۔ وہ آدم زاد جو کہ محکمہ نظارت کا نگران اعلیٰ تھا اس کے بدن پر کپکپی طاری تھی۔

"کون...... کون ہے تو؟" موسیٰ دہشت زدہ آواز میں بولا۔

"میں وہ ہوں کہ جس نے تجھے کانپنے پر مجبور کر دیا۔" میں نے کہا۔ "تجھ سے میں ایک سودا کرنے آئی ہوں۔ بول حربیہ والے مکان اور باغ کی کیا قیمت لے گا میرے حساب سے سو قیراط کافی ہوں گے۔"

"صرف سو قیراط؟" سودے بازی میں وہ یہ بھول ہی گیا کہ کس سے سودا کر رہا ہے۔ لالچ اس کے خوف پر غالب آ گیا تھا۔ "میں اس مکان اور باغ کے دو سو درہم سے ایک حبہ کم نہیں لوں گا۔ اگر سودا کرنا ہے تو....."

"چل منظور!" میں بول اٹھی۔ "اس مکان اور باغ کی ملکیت طبیب صارم کے نام لکھ دے۔"

سو میں نے رقم ادا کر کے دستاویز لکھوا لی۔ موسیٰ کو گمان بھی نہ ہوا کہ رقم کی ادائیگی خود اسی کی جیب سے ہوئی ہے۔

میرے ساتھ عارج بغداد کے اس محلے قرافہ سے لوٹ رہا تھا تو بولا۔ "اے دینار! تو نے میرا نام بھی رکھ دیا؟"

"یہ ضروری ہے اے عارج کہ آدم زاد ہمیں ہمارے اصل ناموں سے نہ جانیں۔

تجھے میں نے بصرہ کے ایک عامل کا واقعہ سنایا تو تھا...... وہ جس نے مجھے اپنے قبضے میں کرنا چاہا تھا... یاد آیا تجھے؟" میں نے آخر میں عارج سے سوال کیا۔

"بات تو خیر برسوں پہلے کی ہے مگر مجھے یاد ہے دینار!" عارج نے جواب دیا' پھر پوچھا۔ "تو اپنا نام کیا رکھے گی؟"

"تو ہی کوئی اچھا سا نام رکھ دے۔"

عارج کو نہ جانے میرے لہجے میں ایسی کیا بات محسوس ہوئی کہ اس پر جذبات محبت غالب آ گئے۔ کانپتی سی آواز میں کہنے لگا۔ "اے دی...... دینار! میں تیرا نام کیسے بدل دوں' یہ نام تو میری زندگی بن گیا ہے۔"

"سمجھنے کی کوشش کر اے عارج! میں آدم زادوں کو نام بتانے کی بات کر رہی تھی۔ آخر کار ہمیں انسانی پیکر ہی اختیار کرنا ہے سو نام پوچھنے پر کچھ تو بتانا پڑے گا......" پھر میں سوچنے لگی اور ایک نام سمجھ میں آ گیا اطردیہ...... اطردیہ کا مطلب خوش کرنے والی شے ہے' ایسی شے کہ جسے دیکھ کر انسان خوش ہو۔ یہی میرا مقصود بھی تھا کہ آدم زاد مجھ سے خوش ہوں۔

میں نے یہی سب عارج کو بتا دیا۔

"صارم اور اطردیہ!"

عارج بڑبڑایا۔ یوں جیسے نام یاد کر رہا ہو۔ ذرا توقف سے اس نے کہا "مگر اے دینار! میں تو تجھے دینار ہی کہوں گا۔"

"تو میں تجھے کب منع کرتی ہوں...... یہ نام تو صرف آدم زادوں کو بتانے کیلئے ہے تاکہ ہم ان کے شر سے بچے رہیں۔ ابھی تو ہمیں جانے کتنے نام بدلنے پڑیں گے......" یہ کہتے ہوئے میں نے نیچے دیکھا۔ ہم حربیہ پہنچ گئے تھے' اسی وقت یہ عقدہ کھلا کہ اس علاقے کا نام حربیہ بلا سبب نہیں رکھا گیا۔ وہاں ایک ممنوعہ علاقہ بھی تھا مگر ہمارے لئے نہیں اس علاقے میں سپاہیوں کو فن حرب و ضرب کی تربیت دی جاتی تھی۔ ہمیں کیونکہ اس مکان تک پہنچنے کی جلدی تھی جو موسیٰ سے خریدا تھا' اس وجہ سے ہم اس فوجی تربیت گاہ کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئے۔

وہ سارا دن میں نے بغداد میں گزارا' خریدے ہوئے مکان کی تعمیر کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اس کی حالت سے میں نے یہی اندازہ لگایا۔ پھر بھی عارج کے ساتھ مل کر میں نے پورے مکان کو صاف کیا۔ ابھی تک انسانی پیکر اختیار کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ عارج

اور مجھے دونوں ہی کو معلوم تھا کہ ہمیں مطب قائم کرنے کی خاطر کن کن چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔ ہمارے لئے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ مکان کے بیرونی حصے کو مطب اور اندر کے حصے کو ہم نے سکونت کی غرض سے ترتیب دیا۔ اس مکان کا ایک عقبی دروازہ بھی تھا۔ سیبوں کے باغ اور عقبی دروازے کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ میں پہلے ہی دن تمام تیاری کر لینا چاہتی تھی۔ اس عرصے میں بہت سی باتیں میں نے سوچیں اور ان کے متعلق عارج سے مشورہ کیا۔ ان باتوں کا تعلق مطب کے قیام اور اسے چلانے سے تھا۔

میں جانتی تھی کہ یہ بابل کے کھنڈرات نہیں' آدم زادوں کا عظیم شہر بغداد ہے۔ یہاں ہمیں ہر قدم پھونک پھونک کے رکھنا ہوگا۔ ہم پر کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے تھا کہ آدم زاد نہیں ہیں۔ جب ہم بغداد سے اپنے مسکن کی طرف لوٹ رہے تھے تو مغرب کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ موذن اگر خوش الحان ہو تو اپنی آواز کے سحر میں لے لیتا ہے۔ بغداد میں جگہ جگہ مسجدیں تھیں اور جامع مسجد' قصر خلافت کے قریب تھی۔ کہتے ہیں کہ مغرب کے وقت بہتے دریا رک جاتے ہیں' سو ہم بھی ایک جگہ ٹھہر گئے۔

کھنڈرات کا رخ ہم نے بلاوجہ نہیں کیا تھا۔ میں اور عارج مغرب سے عشاء تک بھاگ دوڑ میں لگے رہے۔

جنات میرے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں عالم سوما کے پاس پہنچ گئی۔ میری تعلیم کا وقت ہو گیا تھا۔

"اے دینار! تو نے اور اے عارج تو نے بھی ذہین طلبہ ہونے کا ثبوت دیا ہے۔" عالم سوما کہنے لگا۔ "آج میں تمہیں ایک ایسے عمل کے بارے میں بتاؤں گا جو مختلف زبانوں اور نئے جہانوں کی سیر کرا سکتا ہے۔ یہ گزرے ہوئے زمانے بھی ہو سکتے ہیں اور آنے والے زمانے بھی! تم نے اگر اس عمل پر عبور حاصل کر لیا تو تمہارے علم کی وسعت کا اندازہ لگانا آسان نہ ہوگا۔ یہ عمل صرف جنات ہی کر سکتے ہیں اور یہ انہی کیلئے مخصوص ہے۔ اسی عمل کے ذریعے دنیا میں بولی جانے والی مختلف زبانوں کی آگہی بھی تمہارے لئے دشوار نہ ہوگی کہ اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے ہاں یہ طاقت خیر ہی کی خاطر استعمال ہونی چاہئے۔" سوما کا لہجہ تاکیدی تھا۔

تعلیم کے درمیان سوال کی اہمیت خود سوما ہی واضح کر چکا تھا' سو میں اپنی حیرت پر قابو پا کر بولی۔ "فرض کر اے سوما کہ میں آنے والے کسی زمانے میں جانا چاہوں تو اس غرض

سے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"اے دینار! تیرا سوال قبل از وقت ہے کہ تو نے ابھی نہ تو عمل کے بارے میں جانا اور نہ اس پر عبور حاصل کیا۔" سوما نے جواب دیا۔ "اس پر بھی میں تجھے بتادوں کہ کسی زمانے میں جانے کی خاطر تیرا ارادہ کافی ہوگا۔"

"یعنی اے سوما! میں نے سوچ لیا اور اس زمانے میں پہنچ گئی......؟ مگر مجھے کیا خبر کہ آنے والے زمانے کیسے ہوں گے؟...... کسی خواہش کو بھی تو کوئی بنیاد چاہئے' میں کوئی ایسی آرزو کس طرح کرسکتی ہوں جو کبھی میرے اندر جاگی ہی نہ ہو؟ مثلاً اب سے ہزار برس یا اس سے بھی زیادہ کسی زمانے میں کوئی واقعہ ہونے والا ہے یا ہوگا تو مجھے اس کی کیا خبر؟"

"تیرا ذہن اس وقت سوالوں میں الجھا ہوا ہے اے دینار!" سوما بولا۔ "جو کچھ میں نے کہا تو بڑی حد تک سمجھ چکی ہے۔ گزرے ہوئے زمانوں یا آنے والے زمانوں میں کہیں ٹھہرنے کیلئے تجھے پہلے ان کی سیر کرنی ہوگی' تب تو جان لے گی کہ تیری آرزو کیا ہے۔ یا یہ کہ تجھے کہاں رکنا اور کہاں سے رکے بغیر گزر جانا ہے...... سمجھ لے اے دینار کہ علم کی کوئی تھاہ نہیں۔ میرا مشورہ مان اور اپنے سوالوں کو اس دن کیلئے اٹھا رکھ جب تو عمل کر چکے۔ اس کے بعد بہت سے سوالوں کے جواب تجھے خود ہی مل جائیں گے۔"

میں نے سوما کا مشورہ مان لیا اور اس سلسلے میں مزید کوئی سوال نہ کیا۔

وہ رات میں نے کھنڈرات میں گزاری۔ اس پر میری ماں سہلوبہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے کہا۔ "تو اگر اسی طرح آتی جاتی رہی اے دینار! تو مجھے تجھ سے کوئی شکوہ نہ ہوگا۔ بول اب کب آئے گی؟"

"یہ پہلے یہاں سے چلی تو جائے تبھی تو آئے گی۔" غصے میں ڈوبی ہوئی وہ آواز میرے وجود کو جھنجھوڑ گئی اور میں تیزی سے پلٹی۔

اپنے بھائی یوسف کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑا ضرور تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس طرح کی بات کرتا۔

"کیا مطلب ہے تیرا اے یوسف! تجھے یقیناً کسی نے میری طرف سے بہکایا ہے۔" میں بولی۔ "تو مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دے رہا ہے۔"

"بکواس نہ کر اے دینار!" یوسف نے کہا۔ "سب کہہ رہے ہیں کہ تو بغداد میں عارج کے ساتھ رہے گی۔"

"تو پھر؟" مجھے بھی غصہ آ گیا۔

میری ماں ہم دونوں کے درمیان میں آ گئی۔ اس نے مجھے پیچھے ہٹا دیا اور یوسف سے کہنے لگی۔ "ابھی میں زندہ ہوں یوسف...... اور تیرا باپ اضم بھی مرا نہیں۔ تو نے پہلے معلوم تو کیا ہوتا کہ دینار کس کی اجازت اور مرضی سے بغداد گئی ہے...... تیرے باپ اضم نے اسے اجازت دی ہے کہ یہ بغداد میں رہے۔"

"یہ خوب رہی ماں...... ہم پر تو پابندی ہے کہ آدم زادوں کی بستیوں میں نہ جائیں اور اسے کھلی چھوٹ ہے...... کیوں؟"

"تو مجھ سے جواب طلب کرے گا؟ مجھے جانتا نہیں کہ......" میری ماں کو بھی طیش آنے لگا۔

"مجھے تو عارج کے ساتھ رہنے پر اعتراض ہے۔" یوسف کچھ نرم پڑا۔

"تجھے کہیں کافر جنات نے تو نہیں بہکایا؟ کس سے مل کر آ رہا ہے تو؟" میری ماں نے پوچھا۔ یوسف چپ رہا۔

"اے میری ماں...... یقیناً اسے صخرہ نے بہکایا ہے۔ میرا باپ غلط نہیں کہتا' کفار بے اعتبار ہیں!" میں بولی۔

یوسف کی خاموشی اسی کا پتا دے رہی تھی۔ ہم بھائی بہن میں کچھ دیر تند و تیز مکالموں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ پھر ماں نے ہماری صلح کرا دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ یوسف مجھ سے اس قدر ناراض ہوا تھا۔

جب میرے باپ نے عارج کے ساتھ رہنے پر کچھ نہیں کہا تو یوسف کو بھی اپنی حد میں رہنا چاہئے تھا۔

"دیکھ اے یوسف' اگر تو اپنی بہن دینار سے اسی طرح لڑتا رہا تو......" ماں کی آواز بھاری ہوگئی۔ "یہ پھر یہاں نہیں آئے گی۔"

یوسف بہر حال میرا بڑا بھائی تھا' میں نے اس کی وقتی خفگی کو نظر انداز کر دیا۔

عارج میرے انتظار میں کھنڈرات سے کچھ فاصلے پر موجود تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر بولا۔ "دینار! تو نے آنے میں بڑی دیر کر دی۔"

"ہاں۔" میں ٹال گئی۔ اسے میں نے یوسف کے بارے میں کچھ بتانا بہتر نہ جانا اور کہا۔ "بغداد چلنا ہے تجھے اپنا نام تو یاد ہے؟"

"طبیب صارم۔" عارج نے جواب دیا۔

"اور میں؟"

"اطرد بہ ہے تو!"

اس نے سبق سا سنا دیا اور مجھے ہنسی آ گئی۔ بغداد کے محلے حربیہ پہنچنے سے پہلے ہم صحرا میں اتر گئے اور اپنی تجسیم کر لی۔ اپنے جسم کو میں نے آدم زادیوں کی طرح ایک چادر سے ڈھانپ لیا تھا۔

"اے طبیب صارم! بتا کہ اب کدھر چلنا ہے؟" میں نے عارج کو چھیڑا۔

"سیبوں کے باغ کی طرف۔" وہ بولا۔ "مجھے ٹھیک یاد ہے نا!"

کچھ ہی دیر میں جب ہم باغ سے گزر کر اپنے مکان تک پہنچے وہاں "مریض" پہلے سے موجود تھے۔ یہ وہ جنات تھے کہ جنہوں نے گزشتہ روز ہم سے تعاون کا وعدہ کیا تھا۔ مطب چلانے اور آدم زادوں کو اس طرف متوجہ کرنے کا یہی ذریعہ میری سمجھ میں آیا تھا۔

اس زمانے میں کسی طبیبہ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ آدم زادیاں گھریلو ٹوٹکوں ہی پر گزارا کرتی تھیں۔ یوں وہ جلد موت کے منہ میں پہنچ جاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ جن زادیوں کی مسلسل آمدورفت نے میری مشکل آسان کر دی۔ اس بہانے آدم زادیاں بھی آنے لگیں۔

مکان کا عقبی دروازہ میں نے عورتوں کی آمدورفت کے لئے مخصوص کر دیا۔ آدم زادیاں اب مجھ سے مانوس ہوتی جا رہی تھیں۔ انہیں میرا نام بھی یاد ہو گیا۔ یوں اس مکان کے دو حصے ہو گئے۔ عارج مردوں کو اور میں عورتوں کو بھگتاتی۔ ہمارے نظام الاوقات صبح فجر کے بعد سے ایک گھڑی تک تھے' مگر مریضوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے اتنی ہو گئی کہ ہمیں ظہر کا وقت ہو جاتا۔

"مطب کا وقت ختم ہو گیا ہے۔" ہمارا ایک خادم اعلان کرتا۔ "اب آپ لوگ بعد نماز عصر آیئے گا۔"

جنات کی جگہ دھیرے دھیرے آدمیوں نے لے لی۔ میری شہرت اب بغداد کے مغربی حصے تک محدود نہیں تھی۔ قصر خلافت کے اہم عہدے داروں کی بیگمات بھی اپنے علاج کی غرض سے میرے پاس آنے لگی تھیں۔ انہی عورتوں کی زبانی مجھے بہت سی ضروری اور غیر ضروری باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ آدم زادیوں کی زبانیں بڑی لمبی ہوتی ہیں اور ان کے پاس بیکار باتوں کیلئے وقت بھی بہت ہوتا ہے۔ میں کام کی باتیں ذہن میں رکھتی اور بقیہ

"فضولیات" کو بھلا دیتی۔

کوئی طبیب دوا کے دام کم یا برائے نام لے تو لوگ اسے سانس لینے کی مہلت نہیں دیتے۔ یہی حال ہمارا تھا۔ معلوم ہوتا کہ ہمارے مطب میں دوا مفت بٹ رہی ہے جب کہ ایسا نہیں تھا۔ ہم ہر مریض سے ایک حبہ ضرور لیتے تھے۔

مطب میں روز بروز بڑھتی ہوئی بھیڑ دیکھ کر میں نے ایک دن عارج سے کہا۔ "اے طبیب! لگتا ہے ہم آدم زادوں کو دوا بانٹتے بانٹتے خرچ ہو جائیں گے اس کا بھی کچھ علاج بتا!"

"اے طبیبہ! مجھے تو تو نے ہی یہاں لا کر پھنسا دیا ہے۔ میں کیا علاج بتاؤں۔"

عارج بھی اب میرے ساتھ رہتے رہتے شوخی "فرمانے" لگا تھا۔ میری چھیڑ چھاڑ کام آئی۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ میں نے اپنے مطب میں عیسیٰ کا نام سنا۔

"مگر عیسیٰ تو مکے میں تھا اور اس نے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی!" میں بولی۔

قصر خلافت سے آنے والی وہ آدم زادی مجھے اس طرح دیکھنے لگی جیسے میرے سر پہ سینگ اُگ آئے ہوں وہ کہنے لگی۔ "آپ کو شاید پتا نہیں کہ عیسیٰ بن موسیٰ کے ٹھکانے کہاں کہاں ہیں......؟ ان دنوں وہ رحبہ میں ہے۔"

"رحبہ؟"

"یہ کوفہ کا مضافاتی علاقہ ہے۔"

"اچھا!" میں نے اس طرح لمبا سانس لیا جیسے مجھے کچھ خبر نہ ہو۔

اس آدم زادی کی عمر تقریباً پچاس برس ہو گی۔ یہ عمر بڑھاپے کی کہلاتی ہے۔ اکثر آدم زاد اس عمر میں سنجیدہ و رنجیدہ نظر آنے لگتے ہیں مگر جب روزی روٹی کی فکر نہ ہو تو دور کی سوجھتی ہے۔ اس بڑھیا کو دیکھ کر کوئی بھی جوان ماننے کو تیار نہ ہوتا' لیکن وہ تھی کہ یوں بن سنور کر نکلی تھی جیسے شادی کو زیادہ دن نہیں ہوئے۔

میں نے اسے باتوں میں لگا کر ساری کتھا کہانی جان لی۔ اسے اگر میری عمر معلوم ہو جاتی تو پچھاڑ کھا کے گر پڑتی۔

"میری کمر میں بہت درد رہتا ہے۔" اس نے کہا۔ "میں نے سنا تھا کہ آپ......"

میں بول اٹھی۔ "ٹھیک ہے دوا مل جائے گی...... خدا حافظ!"

اسے بھی مجبوراً "خدا حافظ" کہنا پڑا۔ نسخہ میں نے اسی کو تھما دیا تھا۔ اس کے ساتھ

جو کنیزیں اور خادمائیں تھیں' اسے ہاتھوں ہاتھ لے گئیں۔ میں نے سوچا' چلو بلا ٹلی۔ مجھے اب یہ انتظار تھا کہ بھیڑ کب چھٹے گی۔

مطب کا وقت ختم ہوتے ہی ہمارے خدام بھی رخصت ہو جاتے تھے کہ ان کیلئے بھی یہی حکم تھا۔

عیسیٰ بن موسیٰ کا ذکر پہلے بھی میری اس داستان میں آ چکا ہے۔ وہ خلافت کا دعوے دار تھا۔

ایک مدت سے بنو ہاشم کی ایک جماعت اور خلیفہ المہدی کے ساتھی عیسیٰ کے پیچھے لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح رفع شر کر سکیں۔ کئی بار کی کوششوں کے باوجود عیسیٰ زیر دام نہیں آ رہا تھا معاملہ بالکل سیدھا سادا تھا کہ المہدی کے بڑے بیٹے موسیٰ بن المہدی کو ولی عہد بنا دیا جائے۔ یہی المہدی کا بیٹا الہادی بھی کہلایا۔ عربوں میں ایک ہی نام کے کئی کئی فرد ہوتے ہیں حالانکہ عربی زبان میں ناموں کی کوئی کمی نہیں۔ مثال کے طور پر موسیٰ بن کعب کہ جو محکمہ نظارت کا نگران اعلیٰ تھا اور المہدی کا بیٹا موسیٰ بن المہدی' دونوں ہی موسیٰ تھے۔ یہ وضاحت میں نے اس لئے کی کہ تاریخ لکھنے والوں نے بڑے غوطے کھائے ہیں یا یوں سمجھ لیں کہ غوطے دیئے ہیں۔ میں اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتی۔

اللہ اللہ کر کے مریض رخصت ہوئے اور میں لپک کر عارج کے پاس پہنچ گئی۔ مجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا اسے بتا دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا کہتا ہے' چلیں کوفہ؟'' میں نے عارج سے پوچھا۔

''تیری مرضی ہو تو چل!'' عارج راضی ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ہم دونوں انسانی پیکروں سے نکل آئے۔

جب ہم کوفہ کے مضافاتی علاقہ رحبہ پہنچے تو وہاں ہمیں غیر معمولی سرگرمی نظر آئی۔ پتا چلا کہ خلیفہ المہدی نے بغداد سے اپنے سپاہیوں کا ایک دستہ وہاں بھیجا تھا۔ رحبہ میں عیسیٰ بااثر تھا اس پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہ ہوا۔ اس نے دربار میں حاضری سے انکار کر دیا۔

''یہ تو بڑا ہی گھاگ آدم زاد ہے اے دینار!'' عارج بولا۔

میں کچھ سوچتے ہوئے چونکی اور سوال کیا۔ ''آج دن کیا ہے؟''

''جمعہ' عارج نے جواب دیا۔

''ہمیں اس مضافاتی بستی میں آنے سے پہلے کوفہ چلنا چاہئے تھا...... مگر خیر......''

میں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اے دینار! تو اس طرح نامکمل باتیں کر کے مجھے الجھا دیتی ہے۔'' عارج نے شکوہ کیا۔

میں نے کہا۔ ''تجھے اسی وقت تو کچھ بتاؤں گی جب خود کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں۔''

عارج نے مجھے عجیب انداز میں دیکھا۔

''کیا دیکھ رہا ہے؟'' میں نے اسے ٹوکا۔

''تیرے سوا دنیا میں دیکھنے کو اور ہے بھی کیا!'' عارج کی رگ عشق پھڑک اٹھی۔

''بس...... بس!'' میں بولی۔ ''تو آدمیوں کی سی باتیں نہ کیا کر۔''

''میں جن زاد تھا تو مجھے تو نے وہ نہیں رہنے دیا اور...... آدمیوں کے اس جنگل میں لے آئی...... چل مان گیا' تیری خاطر! یہ تو سوچ کہ صحبت کا اثر ہوتا ہے روز آدم زادوں سے واسطہ......''

''اور آدم زادیوں پر تو کیوں نگاہ رکھتا ہے؟...... وہ آدم زادیاں جو میرے پاس آتی ہیں۔'' میں نے باتوں باتوں میں چٹکی لی۔

وہ مجھے اپنی وفا کا یقین دلانے لگا۔ ''قسم لے لے چاہے جیسی جو تیرے سوا کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھا ہو اے دینار!''

''ان باتوں کو چھوڑ...... میں تجھے بتاتی ہوں کہ کوفے چلنے کی بات کیوں کر رہی تھی۔''

''ہاں بتا!'' میری توقع کے عین مطابق وہ فوراً ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''دیکھ اے عارج! بات یہ ہے کہ خلیفہ المہدی سے عیسیٰ ڈرا ہوا ہے وہ اسی لئے کوفے کم ہی جاتا ہے۔ ایک تو وہ جمعے کو وہاں جاتا ہے یا پھر عید پر...... اس کی وجہ میں تجھے بتا ہی چکی ہوں۔'' میں نے عارج کو باتوں میں لگا لیا کہ دیار عشق میں قدم رکھنے کے بعد آبلہ پائی کا گلہ نہ کرنے لگے۔ آبلہ پایان محبت کو ''مظلوم کبوتر'' بننے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ وہ خود ہی عشق کے صحرا میں بھٹکتے ہیں اور دوسروں سے کہتے پھرتے ہیں کہ ہمیں دیکھو اور عبرت پکڑو! عارج کیوں کہ اب گھاٹ پر آ گیا تھا اس لئے میں اسے لے کر کوفے پہنچ گئی۔

اس دور میں کوفے کا عامل (گورنر) روح بن حاتم تھا۔ میں اس کے قصر میں داخل ہوئی تو حقیقت کا پتا چلا۔ عامل کوفہ کو خلیفہ المہدی کی طرف سے درپردہ کچھ احکام ملے تھے ان

احکام کا تعلق عیسٰی ہی سے تھا۔

یہ دوپہر کا وقت تھا نماز جمعہ پڑھ کر عامل کوفہ آرام کر رہا تھا۔ میں اس کی خواب گاہ میں گھس گئی گہری نیند سے اسے میں نے بیدار کیا تو وہ ہونقوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ محافظوں کی نظروں سے بچ کر وہاں جا سکتا۔ اسی سبب عامل کوفہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ میں اس کے سامنے کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔

''عیسٰی کے بارے میں تجھے کیا احکام ملے ہیں؟'' میں اچانک اس سے مخاطب ہوئی تو وہ اچھل پڑا۔ دانستہ اسے ابھی میں نے اپنی جناتی صفات کے زیر اثر نہیں لیا تھا جو کام ذرا سی چپت لگانے سے نکل جائے اس کیلئے طمانچے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سو آدم زادوں کے ساتھ میرا ابھی اب یہی رویہ تھا۔ لگے ہاتھوں میں ایک وضاحت اور کرتی چلوں کہ لفظ عامل کا مطلب عمل کرنے والا ہے۔ عربی زبان بڑی مالدار ہے ایک ہی لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں۔ اس لفظ کے معنی کاریگر بھی ہیں پس ابہام دور کرنے کیلئے یہ بہتر ہوگا میں روح بن حاتم کو حاکم لکھوں۔ غرض کہ اس وقت حاکم صاحب'' چکر یدن'' بنے ہوئے تھے کہ آواز آئی تو کہاں سے؟

حاکم کوفہ ابھی تک بے حرکت بستر پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے صرف دیدے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ دور تک سناٹا تھا۔ محافظ اگر وہاں تھے بھی تو پردوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہوں گے۔ اول تو ایک غیر انسانی آواز سن کر کون ٹک سکتا ہے! جان تو سبھی کو پیاری ہوتی ہے' وہ جنات ہوں یا آدم زاد!

''بتا... اے روح بن حاتم' میں نے تجھ سے کچھ پوچھا ہے۔'' میں پھر بولی۔

حاکم ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور تیزی کے ساتھ اس کا ہاتھ سرہانے رکھی تلوار تک پہنچا' اسے میں نے تلوار بے نیام کرتے دیکھا۔ یہ الگ بات کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''تلوار ہاتھ سے رکھ دے!'' میری آواز میں حکم تھا۔

حاکم' حکم دیتے ہیں مانتے نہیں اور یوں بھی آدم زادوں کو اشرف المخلوقات' یعنی تمام مخلوق میں اشرف (بہت بڑا شریف' بڑا بزرگ' بھلا مانس) بنایا گیا ہے اسی سے لفظ شرف بنا ہے وہ جسے بزرگی یا بڑائی دی گئی ہو۔

سب کچھ من جانب اللہ ہے' مگر آدم زاد نہیں سمجھتا اور زمین پر اکڑ کر چلتا ہے' اس

زمین پر کہ جس کی آغوش میں ایک دن اسے جانا ہے۔ روح بن حاتم بھی مجھے انہی آدم زادوں میں سے لگا جو اکڑ کر چلتے ہیں' میرا حکم ماننے کے بجائے وہ تلوار ہاتھ میں لئے بستر سے نیچے اتر آیا۔ یہی وہ لمحہ تھا کہ عارج نے اس کے ہاتھ سے شمشیر برہنہ چھین لی۔

''تجھے میرے سوال کا جواب دینا ہی پڑے گا اے روح بن حاتم!'' میں نے کہا۔

''تو ہے کون؟'' وہ غرایا۔

''روح کو یہ سوال زیب نہیں دیتا!''

میں نے محسوس کیا کہ'' حاکم صاحب'' کے اعصاب جواب دینے لگے ہیں۔

''عیسٰی سے تمہارا کیا تعلق ہے اے نادیدہ مخلوق؟''

''اپنے نفس کو قابو میں رکھ! بے لگام نہ ہو۔'' میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

''تت... تم آ... آ خر چاہتی... کک... کیا ہو؟ بتاؤ تو سہی!'' وہ ہکلانے لگا۔ اس کی نظریں فضا میں معلق تلوار پر جمی ہوئی تھیں۔

میں نے عارج کو اشارہ کیا۔ تلوار زمین پر گری۔

''نہیں اے روح بن حاتم! تلوار کی طرف نہ جھپٹ۔ جو پوچھا ہے بتا دے۔''

اس نے خوفزدہ نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔

''میرے سوا یہاں کوئی تیری بات سننے والا نہیں۔ کہہ دے جو تجھے کہنا ہے۔''

میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔'' اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں تو کہیں کھلی فضا میں چل... جہاں تو دور تک دیکھ سکے کہ تجھ پر نگاہ رکھنے والا کوئی نہیں۔''

''ہاں... یہ... ٹھیک... یہ ٹھیک ہے۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

میں نے فوراً کہا بالکل ٹھیک نہیں' تو کسی کھلی جگہ پر جا کے ایسی حرکت کرے گا تو لوگ تجھے دیوانہ سمجھیں گے۔ اور یہ خبر بغداد تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ پھر تجھے خلیفہ المہدی معزول بھی کر سکتا ہے۔''

''یہ... ہاں یہ تو ہے۔''

''تو بڑبڑا رہا ہے اور میں تیری ہر بات سن رہی ہوں' کیا یہ کافی نہیں؟''

''یقیناً... کا... کافی ہے۔'' وہ خود ہی میرے اثر میں آتا جا رہا تھا۔

میں اس کے قریب ہوگئی۔'' تو بتا دے!''

''مم... مگر یہ خوشبو......''

''میری خوشبو ہے یہ... خوفزدہ نہ ہو۔''

''میں ڈر تو نہیں رہا..... ہاں اور کیا۔''

''میں نے کب کہا کہ تو کسی سے ڈرتا ہے..... ہاں اللہ سے ضرور ڈر!''

''وہ تو میں..... ڈرتا ہوں..... نماز پڑھ کر آ رہا ہوں۔''

''معلوم ہے مجھے اے روح بن حاتم..... میرے سامنے پارسا نہ بن!'' مجھے اس کی ڈھٹائی پر غصہ آنے لگا۔ ''بول جلدی ورنہ.....'' میں نے جان بوجھ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور اسے واپس بستر پر لا کے پٹخ دیا۔

وہ ہانپنے لگا میں نے اس کے سر کو گرفت میں لے لیا۔ ''تیرا کاسہ سر چٹخا دوں گی ابھی۔''

''خوشبو... چھوڑ دے مجھے ... میں ...''

''میرا نام خوشبو نہیں ہے۔'' میں نے گرفت قدرے ڈھیلی کی۔

''تو پھر کیا نام ہے تیرا؟'' وہ اعتدال پر آنے لگا۔

''مجھ سے سوال نہ کر۔ زیادہ چالاکی دکھائی تو گھاٹے میں رہے گا۔'' میں بولی اور عارج کی طرف دیکھا۔

عارج سمجھ گیا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ ادھر عارج نے روح بن حاتم کے پہلو میں ضرب لگائی ادھر میں نے اسے چیخنے نہ دیا۔

''بتا..... بتاتا ہوں کہ..... کہ..... در پردہ مجھے..... بغداد سے حکم ملا ہے' عیسیٰ کو ایذا پہنچاؤں۔'' وہ آدم زاد آخر کھل ہی گیا۔

''اسے ایذا پہنچانا کیا تیرے بس میں ہے؟''

''ہاں وہ..... وہ کوفے آتا ہی نہیں..... اور جب آتا ہے تو اس کے محافظ..... اسے گھیرے میں لئے رہتے ہیں۔'' وہ بڑبڑا رہا تھا۔

مجھے جو معلوم کرنا تھا' وہ معلوم ہو گیا تو وہاں مزید رکنا عبث لگا۔ روح بن حاتم پر میں نے گہری نیند طاری کر دی۔ اب وہ سو کر اٹھتا تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ کوئی خواب دیکھا ہے' عارج کو میں نے چلنے کا اشارہ کیا۔

ہم کوفے سے نکل آئے تو عارج بولا۔ ''اب کدھر کا ارادہ ہے اے دینار؟''

''ہم بغداد سے آئے تھے نا! سو بغداد ہی واپس چلیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

''مگر مطلب کا وقت......''

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تجھے ہر وقت مطلب ہی کیوں یاد آتا رہتا ہے؟''

''تو پھر مجھ پر شک کر رہی ہے۔''

''نہیں نا!'' میں بولی۔ ''وہ بات تو کبھی کی ختم ہو گئی۔''

''اب کون سی بات شروع ہوئی ہے؟''

''تجھے تو میں ذہین سمجھتی تھی اے عارج!''

''تھی سے کیا مطلب اے دینار..... ؟ کیا اب میں غبی ہو گیا؟''

''ذہین اور غبی ہونے میں بس بال برابر فرق ہے۔''

میں بتاتی رہی اور اسے اپنے ساتھ بغداد لے آئی۔ عارج بھی اب میرے مزاج سے واقف ہوتا جا رہا تھا اس نے کچھ نہ کہا۔ اب ہم قصر خلافت کے سامنے کھڑے تھے۔ ہمیں خلیفہ المہدی تک پہنچنا تھا۔ اسے میں نے بیدار مگر مضطرب پایا۔ وہ دیوان خاص میں تھا۔

''لکھو..... لکھو جو تم سے کہا جا رہا ہے۔'' خلیفہ میر منشی پر برس پڑا۔

وہ مجھے چہرے سے جھلایا ہوا سا لگا۔ میر منشی کا چہرہ فق پڑ گیا۔ اس نے اپنی چوکی ذرا سی آگے کھسکائی' ہرچند کہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ بے دھیانی میں آدم زاد جو حرکتیں کرتے ہیں' اگر انہیں کسی طرح محفوظ کر لیا جائے تو عجب مضحکہ خیز صورتحال ہو گی۔ میر منشی کے معاملہ میں بھی یہی تھا۔ عیسیٰ کو عتاب آمیز خط لکھوایا جا رہا تھا۔

اقتدار عمر نہیں دیکھتا۔ عیسیٰ اور المہدی کی عمروں میں بڑا فرق تھا' مگر ان میں سے ایک آدم زاد' بغداد کے قصر خلافت میں تھا اور دوسرا چھپا پھر رہا تھا۔ خط سے زیادہ وہ حکم نامہ تھا جو عیسیٰ کو لکھا گیا۔ خلیفہ کے مزاج میں نرمی بھی تھی اور سختی بھی۔ آدم زاد ایک ہی وقت میں نرم خو بھی ہوتے ہیں اور گرم مزاج بھی۔ موقع محل دیکھ کر خود کو حالات کے سانچے میں ڈھال لینا' آدم زادوں ہی کو آتا ہے' ہم جن زادوں کو نہیں۔

عیسیٰ کو لکھے جانے والے خط کی عبارت کا جو حصہ میں نے سنا' وہ یہ ہے۔ ''آپ نے جب بیعت کر لی تھی تو پھر اب دنیا کو ہنسنے کا موقع کیوں دیتے ہیں..... یقین کریں کہ میں خاندان والوں میں آپ ہی کو بڑا جانتا اور مانتا ہوں..... آنے والا وقت میری بات کو سچ ثابت کر دکھائے گا.....'' خلیفہ اس کے بعد میر منشی سے کچھ نہ بولا۔ اس نے صرف ایک لفظ

کہا۔ ''برخاست!'' پھر وہ اٹھا اور قصر کے اندرونی حصے کی طرف چل دیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھی' مگر اتنے فاصلے سے کہ اسے میرے وجود کی مخصوص خوشبو محسوس نہ ہو۔

مجھے فی الحال کہیں نہیں جانا تھا اور بغداد ہی میں رہنا تھا' سو اسی بنا پر عارج کو ساتھ لئے قصر خلافت میں گھومتی پھرتی رہی۔ وہاں میری وہ پچاس سالہ ''مریضہ'' بھی تھی جس کی کمر میں درد رہتا تھا۔ اسی سے مجھے عیسیٰ کے بارے میں معلوم ہوا۔

''چل نا اے دینار! عصر کا وقت ہو رہا ہے۔'' عارج نے مجھے ٹوکا۔

''چلتے ہیں۔'' میں بولی۔ اس وقت ہم انسانی قالب میں تو ہیں نہیں جو تو جلدی کر رہا ہے۔ بھولا نہ کر کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔''

''دوسروں کو تو بڑی جلدی شیطان بنا دیتی ہے دینار!''

''کون دوسرا....؟ میں ہی میں تو ہوں۔''

''تجھے میرا وجود بھی تسلیم نہیں۔''

''پہلے یہ طے کر لے اے عارج کہ تو دوسرا ہے۔ میں تو تجھے دوسرا نہیں سمجھتی۔''

''اپنا سمجھتی ہے؟ بول چپ کیوں ہے؟''

''تو بس ہر پھر کے اپنے مطلب کی بات پر آ جاتا ہے..... بڑا ہی مطلبی ہے تو!''

میں یہ کہتی ہوئی قصر خلافت سے نکل آئی۔

''الزام نہ لگایا کر مجھ پر..... بات بات پہ کیوں لڑنے لگتی ہے؟''

اسی نوک جھونک میں ہم بغداد کے شرقی حصے سے نکل کر مغربی حصے تک پہنچ گئے۔ سیبوں کے باغ میں اترتے ہی انسانی پیکر اختیار کر کے ہم اپنے مطب میں داخل ہوئے' میں عقبی دروازے سے اور عارج بیرونی دروازے سے۔

''جگہ دیں..... اٹھیں!'' میری ایک خادمہ نے صدا لگائی۔

میں اپنی چادر سنبھالتی ہوئی قدم قدم آگے بڑھی۔ اندر والے دالان میں حیثیت والی آدم زادیاں قبضہ جمائے ہوئے تھیں۔ آنگن غریب آدم زادیوں سے بھرا پڑا تھا۔ ان میں سے اکثر وہ تھیں جن کے پاس درہم یا قیراط تو کیا ایک حبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔

اس روز میرے جی میں آئی کہ بااثر و باحیثیت آدم زادیوں سے زبردستی اندر والا دالان خالی کرا لوں۔ یہی سوچتی ہوئی میں اپنی چوکی پر آ بیٹھی۔ غالباً اسی وقت ایک آدم زادی نے مجھے مخاطب کیا۔ ''میں آپ کیلئے پرتقال (موسمی) لے کر آئی ہوں۔''

''پرتقال؟'' میں دانستہ انجان بن گئی۔

''میں نے سنا تھا کہ موسم کے پھل آپ کو پسند ہیں۔''

''غلط سنا تھا آپ نے... تشریف لے جایئے۔'' یہ کہتے ہی میں نے اپنی خادماؤں کو آوازیں دیں۔

''آج ایسا کرو کہ دالان والیوں کو آنگن میں اور آنگن والیوں کو دالان میں بٹھا دو؟'' میں نے اس دروازے کی طرف دیکھا جو اندر والے دالان کی طرف کھلتا تھا۔ آدم زادیوں سے خلوت میں باتیں ''کھیولنے'' کیلئے میں نے الگ ایک دالان مخصوص کر رکھا تھا۔

''آپ تو بڑی ہی عجیب خاتون ہیں۔'' وہ صاحب حیثیت آدم زادی مجھ پر گرم ہو گئی۔

میں نے آپ سے کچھ عرض کیا محترمہ...... ایک دن غریبوں کیلئے بھی سہی...... جن کے پاس دوا دارو کیلئے پھوٹی کوڑی نہیں ہوتی۔''

''تو آپ کو اس کا اعلان کرنا چاہیے تھا۔'' وہ آدم زادی بکنے لگی۔

''مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں' یہ بتانا آپ کی ذمے داری نہیں ہے محترمہ!''

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔

''شاید آپ مجھے نہیں جانتیں کہ میں.....''

''میں جاننا بھی نہیں چاہتی۔'' میں نے اسے تپا دیا۔

وہ غصے سے بل کھاتی ہوئی دروازے سے نکل گئی۔ میری خادماؤں نے اس روز وہی کیا جو میرا حکم تھا۔

بس پھر کیا تھا۔ ''ٹوٹ پڑو۔'' کہا تو کسی نے نہیں لیکن دھکم پیل شروع ہو گئی۔

''پہلے میں اندر جاؤں گی۔''

''نہیں' میری باری ہے۔''

خادماؤں نے بڑی مشکل سے انہیں سمجھا بجھا کر ایک ایک کو اندر بھیجنا شروع کیا۔

تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ایک شور سا اٹھا اور میرے کان کھڑے ہو گئے' مریضائیں سہم گئیں۔

میں نے کسی آدم زادی کی تیز آواز سنی وہ کہہ رہی تھی۔ ''مطب کو خلیفہ کے محافظ دستے نے گھیرے میں لے لیا ہے۔''

ظاہر ہے کہ میرے لئے یہ ایک غیر متوقع صورتحال تھی۔ میں نے سوچا کہ آج میں پھنس گئی۔ مجھے اپنے ماں اور باپ کی نصیحتیں یاد آنے لگیں پھر بھی میں نے ہار نہ مانی۔ اسی لمحے مجھے عارج کا خیال آیا کہ اس پر کیا گزر رہی ہوگی۔ میرے ذہن پر سوالوں نے جیسے یلغار کر دی۔ میں سوچنے لگی' یہ اس باحیثیت آدم زادی کا پھیلایا ہوا فساد تو نہیں جس کی رشوت قبول نہیں کی گئی...... کیا ہوگا اب...... فرار کی راہ ملے گی یا نہیں؟ مجھے بتایا گیا تھا کہ جنات اگر آدم زادوں کے جسموں میں ہوں تو انہیں آدم زاد بڑی آسانی سے مار ڈالتے ہیں۔ میں واقعی ڈر گئی۔ میں نے مریضاؤں کو دالان سے باہر نکلوا دیا خادماؤں سے کہہ دیا کسی کو ابھی اندر نہ بھیجیں۔

ابھی میں اپنے خیالوں میں گم تھی کہ اس دریچے پر دستک ہوئی جو مکان کے بیرونی اور اندرونی حصوں کے درمیان تھا۔ قریب ہی ایک دروازہ بھی تھا مگر اس پر کھٹکا نہیں ہوا میں نے دھیرے سے دریچے کا تھوڑا سا پٹ کھولا۔ ''کیا ہوا اے طبیب صارم؟'' میں نے عارج سے پوچھا۔

''فی الحال تو ہم گھیرے گئے ہیں۔... کیوں......؟ ابھی معلوم نہیں ہوا'' عارج نے سرگوشی کی۔

''تجھے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں دھیمی آواز میں بولی۔ ''میں یہاں موجود ہوں۔''

''دریچہ کھلا...... کھلا رکھوں کہ بند کر دوں؟'' عارج نے پوچھا۔

''تھوڑا سا کھلا رہنے دو...... آنے والے آدم زاد کوئی شیر نہیں کہ ہمیں کھا جائیں گے۔'' عارج سے یہ کہتے ہوئے وقتی طور پر جو گھبراہٹ مجھ پر طاری ہوگئی تھی اس کا نام ونشان نہ رہا۔ یہ نسخہ اچھا ہاتھ آ گیا کہ برا وقت پڑے تو دوسرے کو سمجھانے لگو خودبخود ہمت پیدا ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وقت نہیں' ہم خود برے ہوتے ہیں۔

سعا میری ایک خادمہ نے مجھے آکر بتایا۔ ''وہ آپ کو بلا رہے ہیں...... محافظ...... دس......''

''کون بلا رہا ہے؟'' میں نے خادمہ کی بات کاٹ دی۔

''ان...... ان سے نام...... پوچھ کر آؤں؟'' خادمہ گھبرائی ہوئی بولی تھی۔

''نہیں!'' میں اپنی چوکی سے اٹھ کھڑی ہوئی اس دوران میں مجھے اپنے خوف کی

وجہ معلوم ہوگئی تھی۔ قصہ صرف یہ تھا کہ کسی آدم زاد کو میری حقیقت معلوم نہ ہو جائے میں نے تین بار ''لاحول'' پڑھی اور اپنے دالان سے باہر آگئی۔ چادر کو میں نے اچھی طرح اپنے جسم پر لپیٹ لیا تھا۔ آدم زادوں کے درمیان رہ کر میں نے ان کے طور طریقے سیکھ لئے تھے۔

خادماؤں نے میری خاطر راستہ بنایا اور میں گھر کے عقبی دروازے تک پہنچ گئی۔

باہر نکلتے ہی میں نے بلا جھجک ایک گھڑسوار کو مخاطب کیا۔ ''کس لئے تم لوگوں نے مطب کو گھیرا ہے؟''

میں نے اس گھڑسوار آدم زاد کے چہرے پر گھبراہٹ دیکھی۔

یہ تو مجھے معلوم ہو ہی گیا تھا کہ وہ خلیفہ کا محافظ دستہ ہے اسی سبب اس گھڑسوار سے بولی۔ ''تمہارے دستے کا سالار کون ہے؟''

''ابھی...... میں ابھی انہیں لے کر آتا ہوں۔'' گھڑسوار یہ کہتے ہی دوڑ لیا۔

اس عرصے میں میری خادمائیں بھی باہر آگئی تھیں۔

''تم اندر ہی رہو! مجھے فی الحال تمہاری ضرورت نہیں۔''

''جی بہتر ہے۔'' ان میں سے کوئی ایک بولی۔

فرار کا راستہ کھلا تھا میں اگر چاہتی تو وہاں سے رفو چکر ہو جاتی اور عارج کو بھی نکال کر لے جاتی لیکن یہی کرنا ہوتا تو بغداد کیوں آتی۔ ذرا دیر ہوئی تھی کہ میں نے زمین میں دھمک محسوس کی۔ کچھ گھڑسوار اس طرف لپکے چلے آرہے تھے۔ ان میں سے ایک آگے آگے تھا۔ قریب آنے سے پہلے ہی وہ اپنی سواریوں سے اتر گئے۔ میں ان آدم زادوں کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔

اپنے گھوڑے کی لگام تھامے اور سر جھکائے وہ آدم زاد میرے سامنے آکر رک گیا۔

''جی؟ بولیں کیا بات ہے......؟ کیوں آپ نے یہاں سنسنی پھیلائی ہے؟'' میرے لہجے میں جواب طلبی تھی۔

''غلام معافی کا خواستگار ہے۔'' وہ میرے سامنے تھوڑا سا جھکا۔

میری نظر اس آدم زاد کے چہرے پر تھی اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

''غلام نے معافی......''

میں نے اس کی بات کاٹ دی اور ''آپ'' سے ''تم'' پر آگئی۔ ''تم نے کیا غلام

غلام کی رٹ لگا رکھی ہے! جو کہنا ہے صاف کہو۔"

"عرض کرتا ہوں غل...." اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

معلوم نہیں آدم زادانی "چک پھیریاں" کیوں دیتے ہیں سیدھی طرح بھی تو بات کی جا سکتی ہے۔

محافظ دستے کے سالار نے آخر کار بتا ہی دیا کہ مجھے خلیفہ المہدی کی بیوی خیزران نے بلایا ہے۔ میرے لئے اس کی وجہ سمجھنا مشکل نہیں تھا' میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ آدم زادوں نے شاید ایسے ہی موقعوں کیلئے کہا ہے کہ کھودا پہاڑ نکلا چوہا!

آدم زادیوں کو دوائیں دیتے ہوئے مجھے خاصے دن ہو گئے تھے۔ قصر خلافت سے بھی یہ آدم زادیاں میرے مکان پر آتی جاتی رہتی تھیں۔

موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے میں نے محافظ دستے کے سالار سے کہا۔ "ملکہ محترمہ کی خدمت میں ہمارا سلام عرض کر دیں۔ انہیں بتا دیں کہ ہمارے مطب کا وقت ظہر کے وقت تک ہے اور یہاں.... آپ دیکھ ہی رہے ہیں کتنی خلقت جمع ہے! ملکہ عالیہ کی خدمت میں ہم خود بعد ظہر حاضر ہو جائیں گے.... ٹھیک ہے....؟ آپ ہماری بات سمجھ گئے؟"

"بہتر ہے۔" یہ کہہ کر سالار میرے سامنے ادب سے جھکا اور پھر رخصت کی اجازت چاہی۔

"اجازت ہے۔" غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا۔ محافظ دستے کے سپاہی چلے گئے تو میں واپس اپنے دالان میں آ گئی۔ ایک معمولی سی غلط فہمی نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ وہ آدم زادی جس نے مجھے موسی بطور تحفہ یا رشوت دینی چاہی تھی اور جسے میں نے قبول نہیں کیا تھا۔

اسی کے دھوکے میں بات کا بتنگڑ بن گیا تھا۔

مکان کے بیرونی حصے میں موجود عارج کو صورتحال سے مطلع کرنے کے لئے میں نے درمیانی دریچے پر ہلکی سی دستک دی۔

"جی؟" اس نے دریچہ تھوڑا اور کھول دیا۔

میں نے اس سے کچھ کہے بغیر دریچے کو پہلے سے زیادہ بھیڑ دیا۔ وہ بہر حال ایک جن زاد تھا اور میں بھی! مگر ہم دونوں میں فرق تھا سرگوشیوں اور مختصر الفاظ میں عارج کو میں نے ساری بات بتا دی۔ وہ مطمئن ہو گیا اس پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اسے اطمینان تو

ہوا۔

عارج میری وجہ سے بغداد آیا تھا۔ یوں وہ میری ذمے داری بن گیا تھا یا پھر یہ کہہ لیں میں نے اسے اپنی ذمے داری بنا لیا تھا۔

اس روز پہلے ان آدم زادیوں کو میں نے دیکھا جو مدد کی مستحق تھیں' امیر زادیوں کی باری بعد میں آئی۔

ظہر کے وقت حسب معمول خادموں نے مطب بند ہونے کا اعلان کر دیا۔ جو مریضائیں باقی رہ گئی تھیں ان سے اگلے روز آنے کے لئے کہہ دیا گیا۔ مکان میں اب عارج اور میں اکیلے تھے۔

"کیسے چلنا ہے قصر خلافت اے دینار؟" عارج نے سوال کیا۔

"آدم زادوں کی طرح۔" میں نے جواب دیا۔

پھر دو گھوڑوں کا بندوبست کیا گیا۔ سو اس طرح طبیب اور طبیبہ کی سواری قصر خلافت کی طرف روانہ ہوئی۔

بغداد کا کوئی گلی محلہ ہی شاید ایسا ہوگا جو میں نے نہ دیکھا ہو۔

شہر کے مغربی حصے سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے ہم جلد ہی مشرقی حصے میں پہنچ گئے۔ قصر کے دروازے پر ہمارا استقبال کرنے والا محافظ دستے کا سالار موجود تھا۔ یہ آدم زاد اور آدم زادیاں بھی خوب ہیں! ذرا سی چھینک آ جائے تو طبیب کے پاس دوڑ لیتے ہیں' خواہ اس کی ضرورت نہ ہو! طبقہ امرا میں تو یہ "مرض" عام ہے۔

ملکہ خیزران کو ہلکی سی حرارت ہو گئی تھی' سو کسی نے اس سے میرا ذکر کر دیا۔ اس نے کہا' بلوا لو بس آ گئی مصیبت!" دوڑیو' لپکیو" ہونے لگی۔ عارج کو مردانے حصے ہی میں روک لیا گیا تھا۔

میں نے نسخہ لکھ دیا۔

ملکہ کے حکم پر قصر کا ایک خادم ہمارے ساتھ ہو لیا کہ دوا لے آئے۔ اسے عارج نے دوا بنا کر دے دی۔

قصر خلافت میں جاتے اور آتے ہوئے میں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھی تھیں وہاں خلافت کے دعویدار عیسیٰ کا ذکر بھی میں نے سنا اسی دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ خلیفہ نے اپنے دو سالاروں کو رحبہ بھیجا ہے۔

خلیفہ المہدی اس جھگڑے کو نمٹانا چاہتا تھا۔ اس نے اور اس کے بہی خواہوں نے فیصلہ کیا کہ الہادی کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا جائے۔ اس میں عیسیٰ رکاوٹیں ڈال رہا تھا۔ وہ اگر ولی عہدی کے دعوے سے مستقلاً دستبردار ہو جاتا تو خلیفہ کے لئے کوئی مسئلہ نہ رہتا۔

المہدی کے دو بیٹے تھے' ایک الہادی اور دوسرا ہارون' اسی ہارون کو بعد میں الرشید کا لقب ملا اور یہ ہارون الرشید کہلایا۔

قصہ مختصر یہ کہ عیسیٰ کو کوفے سے آنا ہی پڑا۔ اس نے بڑے ہاتھ پاؤں مارے کہ کسی طور الہادی کے ہاتھ پر بیعت کی نوبت نہ آئے مگر ناکام رہا۔ اس نے حالات سے صلح کر لی اور آدم زاد ایسا ہی کرتے ہیں۔

بغداد والوں نے دیکھا خلیفہ المہدی' عیسیٰ کے ساتھ جامع مسجد کی طرف آ رہا ہے اسے خلیفہ کی معاملہ فہمی ہی کہا جائے گا۔ عیسیٰ کا ذکر کیوں کہ بہت طول کھینچ گیا تھا' سو میں نے اسے یہیں ختم کر دیا۔

☆.....☆.....☆

اس روز دوپہر کو جب قصر کا خادم دوا لے کر چلا گیا تو عارج مجھ سے بولا۔ "اے دینار! کیا تجھے انسانی قالب میں تنگی محسوس نہیں ہوتی؟" میں نے بغور اسے دیکھا۔

"کیا تو ابھی سے تنگ آ گیا اے عارج؟..... ابھی تو ہمیں زمانوں زمانوں اور جہانوں جہانوں کا سفر کرنا ہے..... میں بھی تیری ہی طرح جن زاد ہوں.....یا جن زادی کہہ لے....." میں اسے سمجھانے لگی۔

پھر بھی اس وقت عارج کی کیفیت ایسی تھی کہ میں وقتی طور پر انسانی قالب سے نکل آئی۔ عارج نے بھی ایسا ہی کیا۔

"چل اے عارج' صحرا کی طرف چلتے ہیں۔"

عارج فوراً راضی ہو گیا۔ سیر سپاٹے کا تو وہ پہلے ہی سے عادی تھا۔ اسے یہ خبر نہیں تھی کہ یہ سیر سپاٹا بھی بے مقصد نہیں۔

ہم صحرا میں ایک نخلستان دیکھ کر وہاں اتر گئے۔

"اے دینار! زندگی کتنی خوبصورت ہے۔" عارج چہکنے لگا۔

"ہاں ہے تو سہی' میں بولی۔" پر اسی وقت تک جب خوابوں کی تتلیاں ہاتھ آ جائیں۔"

"لگتا ہے' تجھے شاعری بھی آتی ہے اے دینار!"

"یہاں سے کہیں اور چلتے ہیں۔"

"کہاں اے دینار؟"

"موصل۔" میں نے بتایا۔

"وہاں کیا ہے؟"

"اسی پابہ زنجیر قیدی کا حال معلوم کرنا ہے جسے موصل بھیجا گیا تھا۔ یاد آیا تجھے حسن

بن ابراہیم؟'' میں نے کہا۔

''تو بھی عجب ہے اے دینار!...... میں تو سمجھ رہا تھا کہ گھوم پھر کر ہم واپس بغداد پہنچ جائیں گے۔''

''واپس تو خیر دہیں چلنا ہے لیکن کچھ دیر موصل میں......''

عارج بول اٹھا۔ ''اچھا چل!...... ورنہ پھر شام کو مطب کھولنے میں دیر ہو جائے گی۔''

اس نخلستان سے میں نے موصل کا رخ کیا اور وہاں پہنچتے ہی مجھے ایک سنسنی خیز خبر ملی۔

حسن بن ابراہیم قید خانے سے فرار ہو چکا ہے۔

یہی وہ حسن تھا کہ خطابت میں جس کی بڑی شہرت تھی۔ میں نے اسے قصر خلافت میں دیکھا تھا۔ یعقوب' حسن کے ساتھ قید تھا' اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ خلیفہ کی نظروں میں وہ چڑھ گیا۔ دوسری جانب وہ حسن سے بھی ملا ہوا تھا۔ خلیفہ سے ایک ملاقات میں یعقوب نے کہا کہ حسن کو امان مل جائے تو وہ اسے خلیفہ کے حضور پیش کر سکتا ہے۔ خلیفہ المہدی نے یعقوب کی بات مان لی۔

حسن کی ذہانت سے خلیفہ بڑا متاثر ہوا اور اسے وقت بے وقت حاضری کی اجازت دے دی وہ اسی لائق تھا اور حسب لیاقت خلیفہ نے اسے اپنا مشیر بنا لیا۔ وہ دربار خلافت میں حاضر ہو کر سرحدی امور' عساکر اسلامیہ' تعمیرات قلعات' قیدیوں کی رہائی اور معافی' زر جرمانہ اور مستحقین کو صدقات دینے کی بابت مشورے دیتا تھا۔ خلیفہ نے اس آدم زاد حسن کو اس کی خدمت کے صلے میں ایک لاکھ درہم بھی عطا کیے یوں خلیفہ نے اپنے ایک بڑے مخالف کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔

یہ اس آدم زاد حسن کا قصہ ہے جس کے پرستار اب خلیفہ کا دم بھرنے لگے۔ آدم زادوں میں وفاداریاں تبدیل کر لینا ایک عام سی بات ہے۔ میں نے ان آدم زادوں کے بڑے رنگ دیکھے ہیں اور ان کے سنگ رہی ہوں۔

بلاشبہ یہ مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا اس حقیقت کو بھلا کون بدل سکتا ہے! وہ جنہوں نے بوجوہ ایسی کوششیں کیں ہم میں سے نہ تھے وہ مسلمانوں سے جلتے اور الزام تراشیاں شروع کر دیتے۔ انہیں حسد تھا اور وہ آدم زادوں کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے درپے

تھے۔ میں جس زمانے کی بات کر رہی ہوں' وہ زمانہ اور تھا۔ یہ زمانہ اور ہے' زمان و مکان کی تبدیلی چہروں اور منظروں کو دھندلا دیتی ہے سو یہ منظر اس دور کے بغداد کا ہے جو ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ اسی لئے تو جس کے جی میں جو آتا ہے' بک دیتا ہے' کوئی کہتا ہے کہ ڈینگیں ماری جا رہی ہیں' کسی کا فرمانا ہے کہ اپنے ماضی کو بھول جاؤ اور اپنے حال کو دیکھو' کس حالت میں ہو! تو کیا ہم اپنے اجداد پر فخر کرنا چھوڑ دیں اور انہیں برا کہیں' مگر کیوں؟ مسلمان بہت برے ہیں تو پھر اچھا کون ہے یہ کوئی بتائے!

میں شاید جذباتی ہو کر وعظ کرنے لگی ہوں' وعظ کہنے پر مجھے اپنے قبیلے کا عالم سوما یاد آ رہا ہے اب تک میری تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ عارج کو ساتھ لے کر میں مقررہ وقت پر بلاناغہ سوما کے پاس پہنچ جاتی۔ اسی کی وجہ سے مجھے بغداد میں مطب کھولنے کی اجازت ملی تھی ورنہ میرا باپ اخشم شاید اس پر آمادہ نہ ہوتا۔

بغداد کے سیاسی حالات' نفاق دور ہونے سے بڑی حد تک پرسکون ہو گئے تھے۔ خلیفہ المہدی کے چہرے پر اب فکر و پریشانی نظر نہ آتی تھی۔ اب اس نے اپنے گرد ذہین آدم زادوں کو جمع کر لیا تھا جو اسے بہتر مشورے دیتے۔ ان میں سے اہم عہدوں پر متعین جو آدم زاد بہتر کام نہ کرتے اور ان کی کارکردگی مناسب نہ ہوتی' المہدی انہیں بدل دیتا۔ اس کی واضح مثال المہدی کا وزیر ابوعبداللہ ہے۔

ہوا کیا کہ ابوعبداللہ ہی نے یعقوب کو المہدی تک پہنچنے کا راستہ دیا اور یعقوب نے اسی کی کاٹ شروع کر دی۔ ابوعبداللہ اگر واقعی لائق ہوتا تو اسے اپنے منصب سے کون ہٹاتا!

ابوعبداللہ عہد حکومت المنصور میں المہدی سے ملا تھا۔ المہدی نے اس کی بے حد عزت کی تھی اور اسے اپنے ساتھ خراسان لے گیا تھا کیونکہ ابوعبداللہ کے کاموں پر المہدی کو پورا پورا اعتماد ہو گیا تھا۔ اس لئے لوگوں نے اس کی چغلی شروع کر دی۔

المنصور کے آزاد کردہ غلام ربیع کا ذکر میری داستان میں پہلے بھی آ چکا ہے سو وہ اپنے آقا المنصور کی حکومت کو پھولتے پھلتے دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ اسے چغل خوری پسند نہ تھی مگر چغل خور کب کسی کی پسند ناپسند دیکھتے ہیں! اس فضا کو بدلنے اور ابوعبداللہ کا دفاع کرنے میں ربیع مستعد رہتا۔ ربیع گویا ابوعبداللہ کی ڈھال بن گیا۔ اسی وجہ سے المنصور نے اپنے بیٹے المہدی کے نام اس وقت ایک پیغام بھیجا تھا جب وہ خراسان میں تھا۔ پیغام کے الفاظ یہ تھے ''ابوعبداللہ کے متعلق کسی کے کہنے سننے کا کچھ خیال نہ کرنا!''

اپنے باپ کی یہ تاکید المہدی کو یاد تھی۔ ربیع بھی ابوعبداللہ کو بھولا نہ تھا۔ المہدی خلیفہ بن گیا تو ربیع' ابوعبداللہ کے مکان پر اس سے ملنے گیا۔ ربیع کے بیٹے فضل نے باپ سے اختلاف کیا۔ اس پر ربیع بولا۔ ''تم ابھی بچے ہو' ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ وزیر ہے اس کے ساتھ اب عہدے کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ دیکھو جو برتاؤ ہم اس کے ساتھ کریں' اس میں تم مداخلت نہ کرنا اور نہ کسی سے اس کا تذکرہ کرنا۔''

ابوعبداللہ ان آدم زادوں میں سے تھا جو زمین پر اکڑ کر چلتے ہیں۔ اسے وزیر ہونے کا غرور تھا۔ اسی سبب اس نے ربیع کو فوراً حاضری کی اجازت نہ دی۔ وہ مغرب کے وقت سے ابوعبداللہ کی ڈیوڑھی پر ٹھہرا رہا۔ جب نماز عشاء پڑھ لی گئی تو حاضری کی اجازت ملی۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ابوعبداللہ' ربیع کا پرجوش استقبال کرتا مگر وہ مسند بچھائے تکیہ لگائے بیٹھا رہا' اٹھ کر بھی نہیں بیٹھا۔

ربیع نے مکے میں سابق خلیفہ المنصور کی تدفین کا تفصیل سے ذکر کیا۔ اسے مکے سے آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔

درمیان ہی میں ابوعبداللہ بول اٹھا۔ ''ہاں ہم کو تمہاری کارگزاریوں کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر ابوعبداللہ نے خاموشی اختیار کر لی۔

اس طرح بات کا نا ربیع کو کھل گیا۔ وہ کوئی کم رتبہ شخص نہ تھا۔ کچھ دیر وہ چپ بیٹھا رہا کہ وزیر ابوعبداللہ کچھ کہے مگر ایسا نہ ہوا۔ مجبوراً ربیع وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ فضل نے پھر اپنے باپ ربیع سے کہا۔ ''آپ نے یہ کام غیر مناسب کیا۔''

ربیع نے جواب دیا۔ ''نہیں!...... جو میں نے کیا' وہی مناسب تھا...... مگر اب...... اب میں اپنی بے عزتی کا بدلا ضرور لوں گا!'' ربیع جذباتی ہو کر مزید کہنے لگا۔ ''یاد رکھنا تم فضل کہ میں اپنی عزت' آبرو اور مال اس کی تذلیل میں مٹا دوں گا!''

''اب اس سے کیا حاصل!'' فضل برا سا منہ بنا کر بولا۔ ''جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔''

اس واقعے کے بعد ربیع' ابوعبداللہ کے عیبوں کو تلاش کرنے لگا۔ یہ خبر ابوعبداللہ کو بھی ہو گئی' لیکن غرور کم نہ ہوا البتہ احتیاط کرنے لگا کہ ربیع اسے نیچا نہ دکھا سکے۔ اسے حرف گیری کا موقع نہ ملے۔

ربیع نے بات بنتے نہ دیکھی تو وہی راستہ اختیار کیا' پہلے جس کے خلاف تھا۔ اس نے ایک روز موقع محل دیکھ کر اپنے آقا زادے المہدی سے ابوعبداللہ کی چغلی کھائی۔ ربیع نے

المہدی سے کہا۔ ''اے امیر المومنین ابوعبداللہ کا بیٹا محمد مرتد ہو گیا ہے۔'' پھر ایسی باتیں کیں جن سے ظاہر ہے المہدی بھڑک اٹھا۔

کوئی سچی بات بھی کہے تو یہ آدم زاد اسی طرح بھڑک اٹھتے ہیں۔ المہدی بھی آدمی تھا سو اس نے الزام لگائے جانے کا پورا پورا اثر لیا۔ ایک دن جب ابوعبداللہ دربار میں نہ تھا تو اس کے بیٹے محمد کو دربار میں اس کی جگہ ربیع نے بھجوا دیا وہ بہر حال بااثر شخص تھا۔ عموماً وزیر ابوعبداللہ دربار میں دیر سے آتا تھا سو اسے المہدی نے طلب کیا۔

جب ابوعبداللہ آ گیا تو المہدی' محمد سے مخاطب ہوا۔ ''کوئی سورۃ' کوئی آیت سناؤ!''

محمد غالباً گھبراہٹ میں فوری طور پر کوئی آیت نہ پڑھ سکا۔

اس پر المہدی نے ابوعبداللہ سے کہا۔ ''تم تو کہتے تھے میرا بیٹا پڑھا لکھا ہے!''

''دو برس ہو گئے کہ یہ مجھ سے الگ ہے۔'' وزیر ابوعبداللہ نے اپنی صفائی پیش کی۔ ''امیر المومنین! شاید یہ بھول گیا ہے۔''

اقتدار کی دھوپ چھاؤں میں کچھ خونی منظر بھی ہوتے ہیں' انہی میں سے ایک منظر یہ تھا۔

المہدی نے ابوعبداللہ کو حکم دیا کہ وہ اپنے بیٹے کو قتل کر دے۔

ابوعبداللہ حکم کی تعمیل کے لئے اٹھا' اس کا سر پر غرور چکرا گیا اور وہ غش کھا کے گر پڑا۔

آدم زاد حکمرانوں کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ قانون کا درجہ رکھتے تھے۔ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ جو کہہ دیں اس پر عمل نہ ہو کسی حد تک دوسرے زمانوں میں بھی یہی ہوا۔

ایک حکمراں کے حکم پر وزیر کے بیٹے کا سر کاٹ دیا گیا' سر کاٹنے والا کوئی اور درباری تھا۔

بیٹے کی جان گئی سو گئی' ابوعبداللہ کو اب اپنی جان کی فکر ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے المہدی کے رویے میں اپنے لئے نفرت محسوس کر لی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ نفرت بڑھتی گئی۔ دیوان انشا' یعنی خط و کتابت کا محکمہ بھی ابوعبداللہ کے پاس تھا۔ یہ محکمہ اس لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا کہ خلیفہ کے احکام اسی کے ذریعے بھیجے جاتے تھے۔ سب سے پہلے ابوعبداللہ سے یہی محکمہ واپس لیا گیا۔ اسے معزول کر کے ربیع کو مقرر کر دیا گیا۔ اقتدار کے ایوانوں میں یہ اکھاڑ پچھاڑ

ہر زمانے میں ہوتی آئی ہے۔ "سہاگن وہی' جو پیا من بھائے" والی بات تھی۔

آدم زاد اگر محبت کرتے ہیں تو نفرت میں بھی ان کا کوئی جواب نہیں۔ کسی پر مہربان ہوں گے تو سب کچھ اسے سونپ دیں گے' نفرت پر اتر آئیں تو جان لے لیں گے۔ یہ باتیں میں اس لئے نہیں کہہ رہی کہ جن زادی ہوں اور اپنے گریبان میں نہیں جھانکتی۔ گریبان گیر زبیع ہو کر خلیفہ وقت' غرور کا سر نیچا ضرور ہوتا ہے۔ سو ابو عبداللہ نے اس کا نتیجہ بھگتا۔ اگر وہ ربیع کے ساتھ شرافت سے پیش آتا تو اسے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

یعقوب کی عزت المہدی کی نظروں میں بڑھتی گئی۔ اس کی توقیر اتنی بڑھی کہ تمام ممالک محروسہ میں اسی کے مقرر کئے ہوئے امین نظر آتے تھے۔ المہدی جو حکم صادر کرتا' اس کا نفاذ بغیر دستخط یعقوب نہ ہوتا۔ تمام احکام وزیر یعقوب ہی کے امینوں کے ہاتھوں انجام پاتے۔ خلیفہ کے بعد اب یعقوب ہی کا درجہ تھا۔ وقت بھی کتنا ستم ظریف ہے! یہی یعقوب اپنے غلط عقائد کی بنا پر کبھی قید تھا اور اب ساری سلطنت جیسے اسی کی تھی جو چاہتا کرتا' مگر خلیفہ کا دم بھرتا۔ اس کا انجام آگے آئے گا۔ خلیفہ المنصور نے اسے بلاوجہ قید میں نہیں ڈالا تھا۔

میں انسانی قالب میں رہوں نہ رہوں' قصر خلافت میں میری آمد و رفت رہتی۔

اس پر ایک دن عارج نے مجھ سے سوال کیا۔ "اے دینار! تو ان دنوں کچھ زیادہ ہی قصر خلافت میں آنے جانے لگی ہے' کیوں؟"

"پہلے تو یہ بتا اے عارج! تجھے مجھ پر بھروسا ہے کہ نہیں؟"

"تو نے یہ کیا بات کر دی! ... میرا کہنا تو یہ ہے کہ کوئی بھی آدم زاد حکمرانی کرے' ہمیں کیا؟..... ہم تو یہاں غریب آدم زادوں کی مدد کرنے آئے ہیں۔"

"تو کر رہے ہیں مدد!..... لیکن انہی مجبوروں اور لاچاروں کی قسمت حکمرانوں کے ہاتھ میں ہے۔ تو نے کبھی سوچا اے عارج! کہ ان آدم زادوں کے منہ سے نوالہ کس نے چھینا ہے جنہیں ہم مدد کا مستحق کہتے ہیں!..... قصر خلافت میں وہ فیصلے کئے جاتے ہیں جن کا اثر امیر غریب سب پر پڑتا ہے۔ تو پھر تو مجھے غافل رہنے کی تلقین کیوں کر رہا ہے؟"

"تو خواہ مخواہ بھڑک رہی ہے دینار! میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

"بس بس رہنے دے' میں تجھے خوب سمجھتی ہوں!"

"حد ہو گئی اے دینار!..... کہیں قصر خلافت میں کسی آدم زاد سے تیرا جھگڑا تو نہیں ہوا....."

"آ گیا نا اصل بات پر!..... تو مجھ پر شک کرتا ہے کہ میں..... میرے تعلقات ہیں آدم زادوں سے!"

"اگر شک کرتا تجھ پر تو تیرے ساتھ لگا ہوا یہاں بغداد نہ آتا دینار!..... بات بے بات کیوں جھگڑنے لگتی ہے مجھ سے!"

"مزہ آتا ہے تجھ سے لڑنے میں!"

"تو اپنے مزے کی خاطر مجھے بے مزہ کر دیتی ہے۔"

اس روز جمعہ تھا مطب کی چھٹی تھی۔ عارج کو ساتھ لے کر میں بغداد کی سیر کو نکلی تھی۔ ہم دونوں انسانی قالبوں میں تھے۔ میں نے حسب معمول چادر اوڑھ رکھی تھی۔ شہر کے لوگ ہمیں جاننے پہچاننے لگے تھے۔

"وہ جا رہے ہیں محترم طبیب اور طبیبہ۔" کوئی اشارہ کرتے ہوئے کہتا۔

"یہ لوگ دوا کے دام نہ ہونے کے برابر لیتے ہیں' بھلا ایک حبہ کی بھی کوئی حیثیت ہے۔"

"اللہ انہیں اس کی جزا دے گا۔"

"غریبوں پر یہ دونوں ہی بہت مہربان ہیں۔"

لوگوں کے مختلف تبصرے اپنے بارے میں سن کر سچ بات یہ ہے کہ مجھے بڑی خوشی ہوتی۔

"چل اے عارج! ادھر بازار کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں ایک سرائے میں کوئی نیا قصہ گو آیا ہے۔"

"تجھے کیسے معلوم ہوا اے دینار؟" عارج نے پوچھا۔

میں نے چڑ کر کہا۔ "خود قصہ گو نے مجھے آ کر بتایا تھا کہ میں آ گیا ہوں بغداد' اب تم بھی چلی آؤ!"

"لاحول ولا..... پھر مجھ سے جھگڑنے لگی تو!..... یہ تو خیال کر کہ ہم انسانی قالب میں ہیں!" عارج کہنے لگا۔ "اور یہ شہر ہے' ہمارے اریب قریب سے آدم زاد گزر رہے ہیں۔ کیا سوچیں گے یہ؟" اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"سب کچھ میں ہی خیال کئے جاؤں!" میں منہ بنا کر بولی۔ "تو کچھ نہ سمجھ۔"

"مجھ سے کیا چاہتی ہے؟ بول تو سہی' کبھی اے دینار!"

''کچھ نہیں۔'' میں نے عارج سے بحث نہ کی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا آدم زاد ہماری طرف متوجہ ہونے لگے تھے۔

شام کے وقت بغداد کے اس مرکزی بازار میں یوں بھی بڑی بھیڑ رہتی تھی میں اس بھیڑ سے بچتی بچاتی بازار کی مطلوبہ سرائے میں پہنچ گئی۔ بغداد والوں کو قصے سننے اور سنانے کا بہت شوق تھا۔ سرائے والے گرہ سے دام خرچ کر کے اچھے سے اچھے قصہ گو کو بلاتے کہ مسافر انہی کی سرائے میں آئیں خود قصہ کہنے والے بھی بغداد ہی کا رخ کرتے۔ عارج کو ساتھ لئے میں جب اس سرائے میں داخل ہوئی تو ہمیں سرائے کا مالک کشاں کشاں اپنے دالان میں لے آیا۔

''اے طبیب صارم! خادم اس عزت افزائی پر تہ دل سے آپ کا ممنون ہے کہ یہاں قدم رنجہ فرمایا۔'' وہ عارج سے مخاطب تھا۔

''شکریہ! دراصل ہمیں پتا چلا تھا کہ آپ کی سرائے میں کوئی قصہ گو......''

''جی...... جی ہاں' قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں۔'' سرائے کا مالک بول اٹھا۔

''کیا اس قصہ گو سے ہم مل سکتے ہیں!'' میں دھیمی آواز میں بولی' ساتھ ہی سر پر چادر درست کی جو پھسل رہی تھی۔

''کیوں نہیں محترمہ!......اگر حکم ہو تو ابھی......''

اس بار میں نے سرائے کے مالک کی بات کاٹ دی۔ ''ہم نے ابھی آپ کو کوئی حکم تو نہیں دیا۔''

''آپ کا ہر لفظ میرے لئے حکم ہی کا درجہ رکھتا ہے۔'' سرائے کا مالک ''کمبل'' ہو گیا۔

''کیا کہہ رہے تھے آپ...... اپنی بات پوری کریں۔'' میں نے جان چھڑانی چاہی۔

''قصہ گو بعد نماز عشاء قصہ کہتا ہے مگر......''

مختصر یہ کہ سرائے کے مالک نے ہمارے لئے اپنے مکان پر قصہ سنانے کا بندوبست کر دیا۔ اس رات سے قبل میں نے عالم سوما سے بھی چھٹی لے لی تھی جمعے کے روز میں سیر سپاٹے کے لئے پہلے ہی سوچ چکی تھی۔

قصہ گو کو ہماری اہمیت کا اندازہ تھا' وہ اسی سبب بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اس کے

چہرے پر حواس باختگی کے آثار تھے۔

''اے قصہ گو! تو اسی طرح گھبرایا رہا تو قصہ نہ کہہ سکے گا۔'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ یہ میرا مخصوص لہجہ تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ جھجکے نہیں۔

عارج نے بھی شمع دان قصہ گو کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''اب دیر نہ کر' ہمیں جانا بھی ہے۔''

''اگر حضور کو جانا ہی تھا تو آنا نہ تھا۔'' قصہ گو ادب سے بولا۔ ''قصہ کہنا ہی میرا فن ہے...... خلوت ہو کہ جلوت......''

''معلوم ہے' تو آگے کہہ!''

''رات بھر بھی گزر سکتی ہے۔'' اس نے دیگر قصہ گویوں کی طرح نخرا کیا۔ ''تمہید نہ باندھ! قصہ سنا۔ میں بولی تیرا قصہ دلچسپ ہوا تو ہم خود ہی نہ اٹھ سکیں گے۔''

قصہ گو کے لئے یہ گویا اشارہ تھا' کہنے لگا۔ ''کہاں کا قصہ بیان کروں؟''

''اسی سرزمین عرب کا کوئی قصہ سنا۔'' میں نے فرمائش کی۔

''ہوں!'' اس نے ہنکارا بھرا۔

وہ مزید کچھ کہنے والا تھا کہ میں نے اسے ٹوک دیا۔ ''تمہید نہیں' قصہ!''

پھر اس نے وہ سماں باندھا کہ میں دنگ رہ گئی یونان سے قصے کا آغاز ہوا جو کبھی علم و فضل کا مرکز تھا میں غور سے سننے لگی۔

☆......☆......☆

سوداگروں کا ایک قافلہ رومی سلطنت کے مشرقی علاقے سے ایتھنز پہنچا۔ ہر سوداگر مال تجارت کے انبار اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی بیشتر تاجروں نے شہر کے مرکزی بازار کا رخ کیا مگر بعض کمزور اور بوڑھے لوگ تھکن سے چور تھے۔ وہ تازہ دم ہونے کے لئے قریبی سرائے میں جا ٹھہرے۔ صرف ایک مسافر ایسا تھا جو نہ بازار گیا' نہ سرائے۔ اس کے پاس سامان بھی برائے نام تھا بس ضرورت کے مطابق اس کی عمر ابھی جوانی کی سرحدوں میں تھی۔

وہ لمبے قد والا خوب رو نوجوان تھا' اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا اور آنکھیں ویران تھیں' لباس قیمتی ہونے کے باوجود شکن شکن تھا اور سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اسے اپنی کچھ خبر نہ تھی۔ اس کی حالت کسی ایسے مسافر جیسی تھی جسے کسی ویرانے میں لوٹ لیا گیا ہو۔ قافلے سے الگ ہو کر تھکے تھکے بوجھل قدموں سے وہ ایک طرف چل دیا۔ چلتے چلتے وہ ایک

ایک آبادی میں پہنچ گیا جہاں ایتھنز کے امراء رہتے تھے۔ اس پر فضا آبادی میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے سرخ اینٹوں کے کشادہ مکان بنے ہوتے تھے۔

مکانات کے اردگرد پیڑوں کی کثرت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ بستی ایک وسیع و عریض باغ میں بسائی گئی ہو۔

مسافر ایک مکان کے سامنے رک گیا۔ مکان کے دروازے پر ایک دربان کھڑا تھا۔

"کیا تمہارے آقا لونگی نوس گھر پر موجود ہیں؟"

دربان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مسافر بولا۔ "انہیں جا کر بتاؤ کہ ان کا ایک دوست بہت دور سے آیا ہے۔"

بطور تعظیم دربان تھوڑا سا جھکا اور پلٹ کر اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد اس کے ساتھ ایک شگفتہ رو آدمی دروازے پر نمودار ہوا۔ وہ آدمی مسافر کا ہم پلہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عمر چالیس بیالیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ نیلے ریشمی لبادے پر اس کا چہرا ایسا لگ رہا تھا جیسے الماری پر کوئی مرمریں مجسمہ رکھا ہو۔ اس کے چوڑے شانوں پر پھیلے ہوئے سیاہ اور معطر گیسو دھوپ میں چمک رہے تھے۔

مسافر کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں ستارے روشن ہو گئے۔

"طالیس تم؟" وہ بازو پھیلا کے مسافر سے لپٹ گیا۔ "اندر کیوں نہ چلے آئے بھلے آدمی!"

وہ طالیس کا بازو تھامے اسے گھر میں لے گیا۔ دربان نے باہر سے دروازہ بھیڑ دیا۔

نشست گاہ میں تمام ضروری اور خوبصورت چیزیں موجود تھیں۔ سفید براق چاندنی پر دبیز ایرانی قالین بچھا تھا۔ دونوں دوست قالین پر گاؤ تکیوں سے ٹک کر بیٹھ گئے۔ ان کے درمیان چاندی کی طشتریوں میں تازہ پھل اور خشک میوے رکھے تھے اور ایک بلوریں صراحی میں سرخ رنگ کا کوئی مشروب بھرا تھا۔ اس مشروب سے بڑی اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔

لونگی نوس نے ایک جام میں مشروب انڈیل کر طالیس کی طرف بڑھایا۔

طالیس نے گردن ہلا کر انکار کر دیا۔ "شکریہ میرے دوست! مجھے خواہش نہیں ہے۔ میری بھوک پیاس تو تدمر میں اڑ گئی تھی۔ اس شہر نے مجھے لوٹ لیا۔"

"حیرت ہے۔" لونگی نوس نے جام آہستگی سے اس کے سامنے رکھ دیا، پھر بولا۔

"تدمر تو سوداگروں کی جنت ہے تم اس سونے کی کان سے کچھ نہیں لائے؟"

طالیس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "لایا ہوں..... بہت نادر شے لایا ہوں، مگر اس کے بدلے خود کو وہیں چھوڑ آیا ہوں۔ جو طالیس اس وقت تمہارے سامنے ہے، یہ طالیس نہیں اس کا سایہ ہے..... ایک بے روح پتلا..... ایک خالی خالی سینہ۔"

لونگی نوس کچھ دیر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا پھر کہا۔ "تو یہ بات ہے۔" وہ پرخیال انداز میں مسکرایا۔ "مگر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ ..... کہاں تم اور کہاں یہ ماجرا۔ دل کے معاملے کو تو تم ہمیشہ خرافات کہتے رہے ہو۔ اب کیا ہو گیا ہے تمہیں.....؟ کس کی نظر تمہیں کھا گئی؟"

طالیس کی پتلیاں ساکت ہو گئیں جیسے تصور میں کسی نقطے پر جم گئی ہوں۔

"کیا بتاؤں وہ ایک دیوی ہے۔" آخر طالیس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ "بنانے والے نے اسے منفرد بنایا ہے۔ وہ کسی مغنی کا لحن ہے، کسی شاعر کا شعر ہے۔ تم ایک جہاں دیدہ آدمی ہو۔ میرے دوست! شرق و مغرب کے اسرار تم پر آئینہ ہیں۔ تمہارا سینہ علوم و فنون کا خزینہ ہے۔ یقین کرو ایسی شے تم نے کبھی دیکھی تو کیا ہو گی، کتابوں میں بھی نہ پڑھی ہو گی۔"

لونگی نوس بولا۔ "میں تمہاری خوش نگاہی کا قائل ہوں۔ مجھے خبر ہے، کوئی ایسی ویسی شے تمہارا پتھر نہیں پگھلا سکتی۔ کون ہے وہ، میں بھی تو سنوں۔"

"اس کا نام زنوبیا ہے۔ ملکہ زنوبیا۔ وہ تدمر کے حاکم اذینہ کی بیوی ہے۔ میں نے اسے دیکھا تو اپنے سفر کا مقصد فراموش کر بیٹھا..... کسی غیر کو اس نظر سے دیکھنا برا ہے.....سو مجھے یہی رنج ہے کہ میں نے کسی اور کی زوجہ کو یوں کیوں دیکھا!.....اس بار میں نے نہ کچھ بیچا نہ خریدا، خالی ہاتھ لوٹا ہوں..... پھر بھی بہت بھاری، بہت بوجھل۔" پھر وہ خواب ناک سی آواز میں آہستہ آہستہ زنوبیا کے حسن و جمال کا نقشہ کھینچنے لگا۔

لونگی نوس، ملکہ زنوبیا کی دل فریبی کے قصے سن چکا تھا اور اسے دیکھنے کی آرزو رکھتا تھا۔ طالیس کی والہانہ باتوں نے اسے اور بے چین کر دیا۔ اس کا رنگ بدلنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے خوابوں نے رنگوں اور روشنیوں کے جس پیکر کی برسوں آبیاری کی تھی، وہ طالیس کے ہونٹوں پر ایک گلاب کی طرح کھل اٹھا ہے۔ لونگی نوس کو اپنا سینہ تھامنا پڑا۔

ایک عرصے تک لونگی نوس کوشش کرتا رہا کہ زنوبیا کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔ وہ اپنے دوست طالیس کی اس بات سے متفق تھا کہ پرائی عورت پر نظر نہیں ڈالنی

چاہیئے۔ وہ پہروں خود کو سمجھاتا رہا کہ زنوبیا کسی اور کی ہے' میری نہیں۔ مجھے اس کی تمنا نہیں کرنی' مگر زنوبیا اس کے خیالوں میں خوشبو کی طرح بستی چلی گئی۔ وہ بے بس ہو گیا دماغ میں کسی کا خیال آنے سے کون روک سکا ہے جو لونگی نوس کامیاب ہو جاتا۔

کبھی وہ تصور کی آنکھ سے دیکھتا کہ زینوبیا اپنا چار گھوڑوں کا رتھ روک کر اسے قریب آنے کا اشارہ کر رہی ہے اور کبھی اسے یہ نظر آتا کہ وہ زنوبیا کے ارغوانی لباس کا دامن تھامے ہوئے ہے۔

ان خیالات نے رفتہ رفتہ اس کا جی ہر شے سے اچاٹ کر دیا۔ زنوبیا اس کے دل و دماغ پر چھا گئی۔

وہ تدمر کبھی نہیں گیا تھا لیکن وہاں کے بارے میں اسے پوری معلومات حاصل تھیں کیوں نہ حاصل ہوتیں' آخر وہ زنوبیا کا شہر تھا' زنوبیا کا عظیم الشان شہر' تدمر دو عظیم سلطنتوں کے بیچ میں واقع تھا اور صحرا کے قلب میں ہر طرف سے کٹا ہوا تھا۔ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں یہ ایک اہم تجارتی منڈی تھی۔ اس کے ایک طرف پارتھی سلطنت تھی اور دوسری طرف رومی سلطنت۔

اس صورتحال سے تدمر کے تاجر خوب فائدہ اٹھاتے۔ تجارتی قافلے قبائلی سرداروں سے سلامتی کے ساتھ گزر جانے کے عہد نامے حاصل کرتے۔ سنسان علاقوں کے لئے رہبروں کے علاوہ تیر انداز بھی ساتھ رکھے جاتے تھے تاکہ بدوؤں کے ناگہانی حملوں کا دفاع ہو سکے۔ مال و اسباب پر بھاری محصول وصول کیا جاتا تھا۔ بحیرہ روم کے وسیع حصے سے جو سامان ایران' ہندوستان اور چین بھیجا جاتا وہ سب تدمریوں کے ہاتھوں سے گزرتا۔ رومیوں نے اس علاقے میں کئی شاہرائیں بنا دی تھیں۔ ان کے باعث تدمر ایک طرف وادی فرات کے ساتھ جاملتا تھا' دوسری طرف دمشق سے۔

245 عیسوی میں لونگی نوس دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایتھنز سے تدمر کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ زمانہ اسلام آنے سے پہلے کا ہے تدمر میں پرانے پارتھی حکمرانوں کی جگہ ایک نیا اور سرگرم خاندان برسر اقتدار آ چکا تھا۔ یہ ایران کا ساسانی خاندان تھا۔ لونگی نوس اپنے دور کا ایک نامور فلسفی تھا۔

تدمر کے حاکم اذینہ نے اسی لئے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے مشیروں میں شامل کر لیا' خاص مشیروں میں۔

ان دنوں اذینہ کا ستارہ عروج پر تھا۔ لیکن لونگی نوس وہاں اذینہ کے لئے نہیں آیا تھا اس کے لئے زنوبیا اہمیت رکھتی تھی۔ دربار میں پہنچ کر اسے جلد ہی زنوبیا کا دیدار نصیب ہو گیا۔ اس نے زنوبیا کو دیکھا تو اپنے آپ کو بھول گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہو۔ زنوبیا اس کے تصور سے زیادہ حسین نکلی۔

شکار اور شہسواری کا زنوبیا کو بہت شوق تھا۔ وہ ہر شام بڑے ستونوں والے عالی شان قصر کے سامنے کھلے میدان میں گھڑ سواری کرنے آتی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ قصر کے ایک ادھ کھلے دریچے سے دو آنکھیں اس پر جمی رہتی ہیں۔ وہ جب تک میدان میں رہتی' آنکھیں دریچے سے نہ ہٹتیں۔ اذینہ نے یہ قصر اپنے امرائے دربار کے لئے تعمیر کرایا تھا۔

اسی قصر میں لونگی نوس کا قیام بھی تھا۔ قصر کے دریچے سے وہ زنوبیا کو دیکھ تو لیتا لیکن ابھی اس سے ہم کلامی کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایک شام وہ محویت کے عالم میں دریچے سے میدان کا نظارہ کر رہا تھا کہ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ وہ چونک کر پلٹا تو اسے حرمان نظر آیا۔

جواں سال حرمان' اذینہ کا قریبی رشتے دار تھا۔ رشتے میں اذینہ اس کا چچا لگتا تھا۔ وہ لونگی نوس سے یونانی ادب کا درس لیتا تھا۔ وہی نہیں حکمران خاندان کے اور افراد بھی اس سے درس لیتے تھے' مگر یہ درس کا وقت نہیں تھا۔

لونگی نوس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "شہزادے! آپ یہاں؟ ...... اس وقت کیسے آنا ہوا؟"

"استاد مکرم ہمیں ایک خاص معاملے میں آپ کی صلاح درکار ہے۔" حرمان ادب سے اس کے سامنے جھکا۔

لونگی نوس کو اس کی بے وقت مداخلت گراں گزری تھی' مگر اس نے احساس نہ ہونے دیا۔ وہ دریچے سے ہٹ آیا اور حرمان کو اپنے پاس بٹھا کے دریافت کیا۔ "کیا بات ہے شہزادے؟"

حرمان دبی آواز میں بولا۔ "جناب! آج تدمر کی بوڑھی کاہنہ نے ہمارے کان میں ایک سرگوشی کی ہے' سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمیں اس کی بات دہرانی چاہیے یا نہیں!

"اس نے کیا کہا ہے شہزادے؟ میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

حرمان جھجکا' پھر اس نے ادھر ادھر دیکھ کے احتیاط سے کہا۔ "کاہنہ کا کہنا ہے کہ

ہمارے عم محترم اذینہ کا آخری وقت قریب ہے...... اور ہمارے منہ میں خاک وہ...... وہ اس دنیا میں نہیں رہیں گے۔"

لونگی کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں اور بولا۔ "حاکم اذینہ تمہارے سگے چچا تو نہیں ہیں!"

"رشتے کے چچا ہیں' مگر ہیں تو سہی!"

"پھر؟" لونگی نوس کے منہ سے نکلا۔

"ہم سخت تشویش میں مبتلا ہیں استاد مکرم!" حرمان کا لہجہ غم آلود ہوگیا۔ "آپ جانتے ہیں ہمارے چچا کے بیٹے ابھی بلوغ کے زینے تک نہیں پہنچے ہیں...... کیا چچا نہ رہے تو ان کی ذمے داری ہمیں اپنے ناتواں کندھوں پر سنبھالنی ہوگی؟...... کیا ہمیں اس کے لئے تیار رہنا چاہئے؟"

"کاہنہ بکواس کرتی ہے۔" لونگی نوس مشتعل ہوگیا۔ "آپ اس کی بات پر کان نہ دھریں اور اپنے شفیق چچا کا برا نہ سوچیں۔ یہ بات بالکل بھلا دیجئے میں بھی دوبارہ اسے یاد نہیں کروں گا۔"

"لیکن...... لیکن......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"کہئے شہزادے' آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں...... کھل کر کہئے آپ کو ہم پر اعتماد ہونا چاہئے۔"

"اعتماد ہی تو اس گفتگو کا محرک ہے استاد محترم!" حرمان کی آنکھیں جلنے بجھنے لگیں۔

"ہم یہ...... یہ سوچ رہے ہیں کہ نصیب دشمناں اگر...... کاہنہ کی بات سچ ثابت ہوگئی تو ہماری...... رشتے ہی کی سہی...... چچی کا...... زنوبیا کا کیا ہوگا؟" وہ خود کلامی میں بڑبڑا رہا تھا۔ "کیا زنوبیا کا پھول سا بوجھ بھی ہمیں کو اٹھانا ہوگا؟"

لونگی نوس حیران رہ گیا کہ گویا حرمان بھی اس کا رقیب ہے!

اس نے اپنا اضطراب چھپاتے ہوئے حرمان کو سمجھایا۔ "وہ آپ سے عمر میں بہت بڑی ہیں حرمان!...... اور کوئی دوشیزہ بھی نہیں بلکہ دور کے رشتے سے وہ آپ کی چچی ہیں۔ آپ کو ان کے متعلق ایسا نہیں سوچنا چاہئے۔ آپ......"

حرمان نے سرد آہ بھری اور بولا۔ "استاد! آپ نے زنوبیا کو کبھی نظر بھر کے نہیں دیکھا...... ان پر ہزاروں دوشیزائیں قربان کی جاسکتی ہیں۔"

لونگی نوس نے کہا۔ "میں آپ کو اس برے خیال سے باز رہنے کا مشورہ دوں گا...... کسی کو خبر ہوگئی تو آپ کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔"

حرمان کا چہرہ اتر گیا وہ اداس لہجے میں بولا۔ "ہم تو تدمر کے سپہ سالار زبدہ کو بات چیت کی دعوت بھی دے چکے ہیں تاکہ اگر واقعی کوئی ناخوش گوار صورتحال پیش آ جائے تو اس سے نمٹنے کے لئے ہمارے پاس کوئی طریقہ کار موجود ہو۔"

"شہزادے! یہ آپ نے کیا کیا؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ زبدہ' حاکم وقت اذینہ کا وفادار ہے؟"

حرمان نے کوئی جواب نہ دیا تاہم لونگی نوس کو توقع تھی کہ وہ عاقبت نااندیشی کا ثبوت نہیں دے گا اور اذینہ کے خلاف کسی سازش سے گریز کرے گا۔

دوسرے دن اچانک زنوبیا کی ایک کنیز نے لونگی نوس کو اطلاع دی۔ "ملکہ زنوبیا نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔"

لونگی نوس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ جب بہ عجلت اپنے قصر سے نکل کر شاہی محل کی طرف چلا تو اس پر نشہ سا طاری تھا' قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ ایسی ہیجانی کیفیت اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اسے زنوبیا کی طرف سے بلائے جانے پر خوشی تھی لیکن بلاوے کا مقصد اس کی فہم سے بالاتر تھا۔

وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا ملکہ کے حضور میں پہنچا تو تعظیماً اس کے سامنے اتنا جھکا کہ گر گیا۔

اتنا احترام صرف تدمر کے حاکم اذینہ کے لئے مخصوص تھا۔ تدمر کے باشندے اذینہ کو اسی طرح سجدہ کرتے تھے جیسے ایرانی بادشاہوں کو سجدہ کیا جاتا تھا۔ اسے سجدہ تعظیمی کہا جاتا تھا مگر یہ کھلا کفر تھا۔

اس پر زنوبیا کو سخت حیرت ہوئی۔ لونگی نوس پہلا شخص تھا جس نے کافر ہونے کو اعزاز جانا۔ اسے کیا خبر تھی کہ لونگی نوس نے اس کے اقتدار کو نہیں اس کے حسن کو تعظیم دی تھی۔

زنوبیا نے باوقار لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "اے ایتھنز کے دانا! تم خود تعظیم کے لائق ہو۔ علم سے بڑی بادشاہت اور کیا ہوسکتی ہے۔ تمہارے سامنے تو ہمیں سر جھکانا چاہئے۔"

زنوبیا کی آواز نے فضا میں جل ترنگ سے بجا دیئے۔

لونگی نوس نے اسے سر اٹھا کر دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ راستے میں وہ بہت کچھ سوچتا

ہوا آیا تھا کہ ملکہ سے یہ کہنا ہے' وہ کہنا ہے مگر اب ہر بات ذہن سے نکل چکی تھی۔ زنوبیا کو اتنے قریب سے اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس زمین کی کوئی عورت ہے یا حسن کی دیوی انسانی پیکر میں آسمان سے اتری ہے۔

زنوبیا کی تعریف میں اس نے جو کچھ سنا تھا' وہ بہت کم تھا۔ اسے زنوبیا سے پوچھنا چاہئے تھا کہ مجھے کیوں طلب کیا گیا ہے' لیکن اس کی زبان گنگ رہی۔

آخر زنوبیا ہی نے خاموشی توڑی "لونگی نوس!" اس کی آواز لونگی نوس کو بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ "تم ایک دانش مند انسان ہو تمہارے بارے میں ہمیں بہت کچھ بتایا گیا ہے اور ہم بہت مسرور ہیں کہ تم نے تدمر کی سرزمین کو میزبانی کا شرف بخشا۔ ہم تم سے یونانی زبان اور ادب کی تحصیل کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اسی سلسلے میں آج تمہیں زحمت دی گئی ہے۔"

"غلام اس بندہ پروری اور عزت افزائی پر ملکہ عالیہ کا ممنون ہے۔" لونگی نوس اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"ہم بھی تمہارے انتہائی ممنون ہوں گے۔"

پھر زنوبیا نے درس کے اوقات کا تعین کیا اور ملاقات ختم ہوگئی۔

لونگی نوس روزانہ زنوبیا کو پڑھانے جانے لگا۔ زنوبیا اس کی بہترین متعلم ثابت ہوئی۔ فطرت نے اسے حسن اور دل کشی کے علاوہ غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں سے بھی نوازا تھا۔ جتنی اچھی اس کی صورت تھی' اتنا ہی اچھا اس کا دماغ تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ صورت اور دماغ دونوں سے زیادہ اس کا دل اچھا تھا۔

وہ لونگی نوس کو بہت عزت دیتی تھی اور اس کے سکھائے ہوئے نکات بڑی خوبی سے ذہن نشین کرتی تھی۔ لونگی نوس نے بھی اس کی ذہانت وفطرت اور فطانت کا پورا حق ادا کیا۔ زنوبیا پر اس نے غیر معمولی محنت اور توجہ صرف کی۔ درس کے بعد بھی دونوں دیر تک علمی مباحث میں مصروف رہتے۔ ان کی قربت روز بہ روز بڑھتی گئی۔

تدمر کے باشندے نسلاً عرب تھے۔ گفتگو اور تہذیب میں وہ آرامی زبان کا استعمال کرتے تھے لیکن انہیں یونانی زبان سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ خاص طور پر حکمران طبقے میں یونانی زبان بے حد مقبول تھی ملکی۔ قوانین یونانی اور آرامی دونوں زبانوں میں لکھے جاتے تھے۔ تدمر کا معاشرہ شامی' یونانی اور ایرانی ثقافت کا امتزاج تھا۔

زنوبیا عرب تھی اور آرامی زبان بولتی تھی۔ لونگی نوس نے جلد ہی اسے یونانی زبان

میں بھی طاق کر دیا۔

اذینہ کے ناخلف بھتیجے حرمان کو زنوبیا اور لونگی نوس کی قربت ایک آنکھ نہ بھاتی۔ اگرچہ لونگی نوس نے اپنے سینے کا راز سینے ہی دبائے رکھا لیکن حرمان کو اس پر شک ہو گیا۔ زنوبیا کے خصوصی التفات نے اس کے شک کو ہوا دی۔ یہ التفات لونگی نوس کے لئے تھا' اسے یہ معاملہ محض درس و تدریس تک محدود نہ لگا۔

ایک روز حرمان نے اپنا شبہ زنوبیا کے شوہر اذینہ کے کانوں میں منتقل کر دیا۔

اذینہ' لونگی نوس کا بہت احترام کرتا تھا مگر حرمان کی شکایت پر وہ چونک اٹھا۔ زنوبیا اس کی آبرو' اس کی ناموس تھی۔ بھلا ناموس کی بے حرمتی کون برداشت کر سکتا ہے' وہ بھی ایک حاکم؟

اذینہ مشتعل ہوگیا۔ اس نے کسی تحقیق کے بغیر فی الفور حکم جاری کر دیا' ایتھنز کے استاد لونگی نوس کو زنداں میں ڈال دیا جائے۔

زنوبیا کو معلوم ہوا تو وہ بے قرار ہوگئی۔ اس نے اذینہ کو سمجھانا چاہا اور اصرار کیا کہ وہ اپنا ارادہ بدل دے' مگر اذینہ نے اس کی بات نہ مانی۔ لونگی نوس بڑے ستونوں والے قصر سے اونچی دیواروں کے زندان میں پہنچا دیا گیا۔ زندان میں اسے کتابیں ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں ملی تھی' لیکن زنوبیا کا کتابی چہرہ ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہتا۔

ایک رات لونگی نوس بہت بے چین تھا' جیسے کچھ ہونے والا ہے قید خانے میں رات کا اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا۔ وہ تنگ کوٹھری میں چکر لگانے لگا' لیکن بے چینی کم نہ ہوئی۔ طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں آرہے تھے۔ وہ دیر تک ٹہلتا رہا یہاں تک کہ عاجز آ گیا اور ایک کونے میں گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھ گیا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کیا قسمت اسے اسی قید خانے کے لئے تدمر لائی تھی؟

یکا یک اس نے ایک آہٹ سنی لیکن سر نہیں اٹھایا کیوں کہ کوٹھری کے باہر پہریدار عموماً گشت پر رہتے تھے۔ وہ سمجھا کوئی پہریدار ہوگا مگر آہٹ کے ساتھ ہی اسے ایک آواز بھی سنائی دی۔ "لونگی نوس!"

وہ ہڑبڑا کے کھڑا ہوگیا۔ اسے ایسا لگا جیسے زنداں کا اندھیرا ایک دم اجالے میں بدل گیا ہو۔ لپک کر وہ سلاخوں کے پاس پہنچا وہاں سیاہ لبادے میں ایک عورت کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر نقاب پڑی ہوئی تھی۔ لونگی نوس نے سلاخیں مٹھیوں میں بھینچ لیں اور تڑپ

آواز میں بولا۔ ''زنوبیا! آپ؟ اتنی رات کو یہاں؟''

''ہاں لونگی نوس ہم۔'' زنوبیا نے سرگوشی کی۔ ''جب سے تم یہاں ہو' ہمیں شاہی محل ایک قید خانہ معلوم ہوتا ہے' ہماری حالت بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔'' وہ چند ثانیوں تک پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتی رہی' پھر غم اور ندامت سے بولی۔ ''ہماری روح پر بڑا بوجھ ہے لونگی نوس! تمہیں یہ دن محض ہماری وجہ سے دیکھنا پڑا۔ اس پورے عرصے میں ہم نے ایک لمحہ بھی چین سے نہیں گزارا۔ ہم تو بس تمہاری رہائی کی تدبیریں سوچتے رہے۔''

لونگی نوس کو رات کے اندھیرے میں اس کا چہرہ چاند کی طرح چمکتا معلوم ہو رہا تھا۔

زنوبیا کہہ رہی تھی'' ..... آخر ہم نے تمہاری نجات کا بندوبست کر لیا۔ غور سے سنو! آج رات تدمری فوج کا سالار اعلیٰ زبدہ تمہیں یہاں سے بحفاظت نکال لے گا اور گجر بجنے سے پہلے سرحد پار کرا دے گا۔''

''نہیں زنوبیا نہیں۔'' لونگی نوس پریشان ہو گیا۔ ''میں یہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتا۔''

''کیوں؟'' زنوبیا سراپا حیرت بن گئی۔

''وجہ مجھے خود نہیں معلوم۔'' لونگی نوس کی پلکیں جھک گئیں۔

''کیا زندگی بھر یہیں پڑے رہو گے؟''

''مجھے خود سے دور رکھنا چاہتی ہیں آپ؟'' یہ نہ معلوم کیسے اس کے منہ سے نکل گیا۔ زنوبیا کی بڑی بڑی آنکھیں اور پھیل گئیں۔ لونگی نوس کو فوراً اپنے الفاظ کا احساس ہو گیا مگر اس نے بات بدلنے کی کوشش نہیں کی' کہنے لگا۔ ''آپ جانتی ہیں میں نے کوئی جرم نہیں کیا' لیکن اگر میں فرار ہو گیا تو یہ ضرور ایک جرم ہو گا۔ اس طرح میری بہت رسوائی ہو گی' نہ صرف میری ..... بلکہ آپ کا دامن بھی آلودہ سمجھا جائے گا' یہ میں گوارا نہیں کر سکتا۔''

''تو کیا ہم محض اپنی نیک نامی کے لئے تمہیں یہاں پڑا رہنے دیں؟ کیا اس میں ہماری سب کی بدنامی نہیں ہے؟ فرض کر لو' لوگ کچھ نہ کہیں' ہمارا ضمیر تو ہمیں ملامت کرے گا۔''

اس نے کچھ توقف کیا۔ ''بہتر یہی ہے لونگی نوس کہ تم زبدہ کے سپاہیوں کے ساتھ راتوں رات تدمر کی سرحد سے دور نکل جاؤ۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ملکہ؟ ..... میں بے وسیلہ آدمی ہوں اور اذینہ حاکم ہیں' ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ میں یہاں سے کہیں بھی چلا جاؤں وہ مجھے دوبارہ گرفتار کر ڈالیں

گے۔ اگر ایسا ہو گیا' جو یقیناً ہو گا تو اب کے مجھے صرف قید کی سزا نہیں ہو گی' موت کی .....''

''نہیں نہیں!'' زنوبیا نے سلاخوں کے بیچ سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

لونگی نوس نے ہتھیلی نرمی سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''آپ فی الحال مجھے یہیں رہنے دیجئے میں یہاں ناخوش نہیں ہوں۔ آپ کی خاطر میں زنداں میں تو کیا..... جہنم میں ..... بھی رہ سکتا ہوں۔'' اس نے زنوبیا کو سمجھایا۔ ''اب آپ چلی جائیے یہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔ واپس جا کے آپ ..... حاکم ..... ذی قدر حاکم تدمر کو میری بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کیجئے۔ یہ بات کیونکہ سچ ہے اس لئے اب نہ سہی کبھی نہ کبھی باور کی جائے گی۔''

زنوبیا اور لونگی نوس ابھی باتیں کر رہے تھے کہ دور سے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دونوں چپ ہو گئے' پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں الوداعی جملوں کا تبادلہ ہوا اور زنوبیا چلی گئی۔

انہی دنوں ایک بری خبر تدمر پہنچی۔ شاپور اول کی سرکردگی میں ایرانی فوج نے رومی لشکر پر حملہ کر دیا تھا۔ روم کا شہنشاہ ولیرین بڑی مشکل میں گرفتار تھا۔ ایرانی' شام تک آ پہنچے تھے۔ شمالی شام' رومی سلطنت کا حصہ تھا۔ یہ خبریں بھی آ رہی تھیں۔ کہ اب ایرانی' انطاکیہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

یہ صورتحال اذینہ کے لئے سخت تشویشناک تھی۔ وہ تدمر میں رومی شہنشاہ کا نائب تھا۔ شام پر ایرانی حملے سے اس کے لئے بھی خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس کے درباریوں نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ بالا ہی بالا ایران سے مصالحت کر لی جائے تاکہ تدمر جنگ کی آگ سے بچا رہے۔ اذینہ نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا' کیوں کہ تدمر ایک مدت سے رومی سلطنت کا وفادار تھا۔ ایران سے جنگ کرنے کا مطلب بھی وہ خوب سمجھتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے!

اس نے ملکہ زنوبیا سے مشورہ کیا۔ زنوبیا چھوٹتے ہی بولی۔ ''اپنے مشیروں سے پوچھو۔''

''پوچھ چکا ہوں۔'' اذینہ نے بتایا۔

زنوبیا نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''سب مشیروں سے پوچھ چکے ہو؟''

☆.....☆.....☆

اس سے پہلے کہ قصہ گو مزید کچھ کہتا' میں ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''ٹھہر جا!... آنے

والے جمعے کو تجھ سے ملاقات ہوگی۔"

عارج نے مجھے حیرت سے دیکھا' مگر بولا کچھ نہیں۔ میں نے اسے ٹہوکا دیا تو وہ چونکا۔ اسے ساتھ لئے میں سرائے کے مالک کے مکان سے نکل آئی۔ باہر آتے ہی عارج نے پوچھا۔ "یہ اچانک تجھے کیا ہوا اے دینار؟"

"قصے میں کھو کر تو شاید بھول گیا ہے کہ ہم کون ہیں؟" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

☆......☆......☆

آنے والے جمعے کو ہم پھر سرائے کے مالک سے ملے اور اس نے اپنے مکان پر قصہ سننے کا بندوبست کر دیا۔

یاد دہانی کے لئے عرض کر دوں کہ یہ قصہ بھی سرزمین عرب کا ہے۔ قصہ گو نے جہاں سے ملکہ زنوبیا کا قصہ چھوڑا تھا وہیں سے پھر سنانے لگا۔ اسی لمحے عارج نے سرگوشی کی۔ "دینار! آج قصہ گو کچھ پریشان لگتا ہے۔"

"ہوگا' ہمیں کیا......؟ ہم کوئی بھی سہی' اللہ کی مخلوق ہیں......تو قصہ سن عارج!" یہ کہہ کر میں سنبھل کے بیٹھ گئی۔

قصہ گو نے پہلو بدلا اور ہماری سرگوشیوں کے باوجود اس کا قصہ جاری رہا۔ یہ قصہ 245 عیسوی کا ہے۔

☆......☆......☆

زنوبیا کے سوال کرنے پر حاکم تدمر اذینہ بولا۔ "ہاں میں سب مشیروں سے پوچھ چکا ہوں۔"

"ابھی ایک مشیر باقی ہے' اس سے تم نے بات نہیں کی حالانکہ اس نے ہر موقع پر تمہیں نہایت مفید مشورے دیئے ہیں۔" زنوبیا نے کہا۔ اذینہ سمجھ گیا کہ زنوبیا کس کا ذکر کر رہی ہے۔ وہ خاموش ہو گیا۔ زنوبیا نے محسوس کیا کہ اذینہ آج لونگی نوس کے ذکر پر برہم نہیں ہوا۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور دوبارہ یونان کے فلسفی کا ذکر چھیڑ دیا۔ لونگی نوس کے بارے میں وہ اذینہ کی غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ آج اذینہ کو لونگی نوس کی ضرورت تھی اس لئے اسے ناموس کا خیال نہ آیا۔ اس نے زنوبیا کی باتوں پر صاد کیا اور لونگی نوس کی رہائی کا فیصلہ کر لیا۔

اس کا فیصلہ سنتے ہی زنوبیا نے کہا۔ "لونگی نوس ہمارے استاد ہیں' انہیں لینے کے

لئے ہم خود زنداں کے در تک جائیں گے۔"

پھر زنوبیا چار گھوڑوں والے رتھ میں محل سے نکلی۔ رتھ کے ساتھ حاکم تدمر اذینہ کے محافظوں کا خصوصی دستہ تھا۔

راستے میں ایک عظیم الشان سنگی محراب نظر آئی۔ یہ بعل دیوتا کے معبد کی محراب تھی۔ بعل کا معبد ایک اونچے چبوترے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ محراب سے آگے ستونوں والا بازار تھا۔ یہ بازار ایک ہزار دو سو چالیس گز لمبا تھا' گویا پورے شہر کا مرکز تھا۔ یہاں سے مختلف چھوٹی چھوٹی گلیاں آبادیوں میں داخل ہوتی تھیں۔ اس حصے میں 375 سے زیادہ ستون تھے اور ہر ستون پچپن ہاتھ سے زیادہ بلند تھا۔ زیادہ تر ستون گلابی پتھر کے تھے اور چند ستون سنگ خارا کے۔ ان میں نیلے نیلے دھبے پڑے تھے۔ یہ پتھر مصر کے شہر اسوان سے منگائے گئے تھے۔ کہیں کہیں تدمری سنگ تراشوں کے شاہکار مجسمے بھی نصب تھے۔ مجسموں کا چہرہ پورا نظر آتا تھا اور کندھوں پر کتبے لگے ہوئے تھے۔ ان میں تدمر کے سلاطین اور امرا کو یونانی لباس پہنے دکھایا گیا تھا۔ ایک مجسمے کے قدموں میں دو ساقی بیٹھے نظر آتے تھے ایک ساقی پارتھی لباس پہنے تھا اور دوسرا رومی لباس میں تھا۔ زنوبیا نے بعل دیوتا کے معبد کے پاس رتھ رکوا لیا۔ رتھ سے اتر کر وہ بعل دیوتا کا شکرانہ ادا کرنے گئی۔ اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے معبد کے باہر لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ سپاہیوں نے بڑی مشکل سے راستہ صاف کیا تو زنوبیا معبد سے رتھ تک پہنچی۔ لوگ محافظوں کے کوڑے کھانے کے باوجود ملکہ کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہوئے جا رہے تھے۔

شاہی رتھ تدمر کے بڑے قید خانے پہنچ گیا۔ محافظ دستے کے سالار نے قید خانے کے نگران کو لونگی نوس کا رہائی نامہ دکھایا۔ پھر زنوبیا بہ نفس نفیس لونگی نوس کی کوٹھری میں پہنچی۔ لونگی نوس کے چہرے پر حیرت پھیل گئی اور دوسرے ہی لمحے حیرت میں مسرت کا رنگ بھی شامل ہو گیا۔ زنوبیا کے اشارے پر زنداں کے لوہار نے قیدی کی زنجیریں کاٹ دیں۔ لونگی نوس جیسے کسی خواب کے عالم میں زنوبیا کے ساتھ قید خانے سے نکلا۔ محافظ دستے کے ایک سپاہی نے اسے سواری کے لئے اپنا گھوڑا پیش کرنا چاہا لیکن زنوبیا نے اسے روک دیا اور لونگی نوس کو اپنے ساتھ رتھ میں بٹھا لیا۔

اذینہ نے لونگی کو جنگی حالات سے تفصیلی طور پر آگاہ کیا اور کہا۔ "ہمارا خیال ہے کہ آزمائش کی اس گھڑی میں روم کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہئے' یہ غداری ہو گی کیونکہ سر دست تدمر کو روم سے کوئی شکایت نہیں ہے نیز اگر مصلحتاً ایران سے وقتی مفاہمت کر بھی لی جائے تو اس کی کیا

ضمانت ہے کہ ایران آئندہ تدمر کی آزاد و خود مختار حیثیت برقرار رہنے دے گا۔"

"یقیناً۔" لونگی نوس نے کہا۔ "ایران سے یہ توقع فضول ہو گی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ روم کی حمایت میں ایران سے جنگ کی جائے کیوں؟" اذینہ کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

"جی ہاں' اس کے سوا کوئی چارہ نہیں اور پھر قومی حمیت کا تقاضا بھی یہی ہے۔" لونگی نوس نے رائے ظاہر کی۔

"لیکن لونگی نوس! ہمارے پاس فوج بہت کم ہے' ہم ایران کے لشکر کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ ہمارا یہ اقدام خودکشی کے مترادف ہو گا۔"

"تسلیم کہ تدمر کے پاس سپاہیوں کی کمی ہے لیکن کیا آدمیوں کی بھی کمی ہے؟"

"نہیں' آدمی صرف آدمی ہوتا ہے اور سپاہی ایک ہتھیار بھی ہوتا ہے۔"

"کیا آدمیوں کو سپاہیوں میں نہیں بدلا جا سکتا؟"

"اس کے لئے خاصا وقت درکار ہو گا۔"

"موت سر پر کھڑی ہو تو آدمی کو سپاہی بننے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔"

"یعنی ہنگامی حالت کا اعلان کر کے ریاست میں جبری بھرتی کا آغاز کر دیا جائے؟ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟"

"جی ہاں آقا' غلام یہی کہنا چاہتا ہے' لڑنے والوں کی مطلوبہ تعداد اسی طرح فراہم ہو سکتی ہے۔"

"تم بھول رہے ہو لونگی نوس! جنگیں تعداد سے نہیں' ہمت اور منصوبہ بندی سے جیتی جاتی ہیں۔"

یہ سن کر لونگی نوس نے اطمینان دلایا۔ "منصوبہ سازی کے لئے ریاست کے پاس اعلیٰ دماغوں کی کمی نہیں' رہی فوج کی قلت' تو میں عرض کروں گا کہ یہ خدمت میرے سپرد کر دی جائے۔ میں بستی بستی' گھر گھر جاؤں گا اور ریاست کے تمام باشندوں کو غفلت کے خواب سے جگاؤں گا۔ میں ان سے کہوں گا کہ ہم وطنو! اپنی سرزمین کو دشمن کے ناپاک قدموں سے بچاؤ۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ جو قومیں غلام بنا لی جاتی ہیں' ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔" لونگی نوس کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔ "میں لوگوں سے کہوں گا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے بازار' تمہارے محلے اور تمہارے گھر اسی طرح ہنستے بستے رہیں تو اٹھو میدان جنگ میں

چلو۔ امن کی خاطر ہمیں جنگ کرنی ہوگی۔''

زنوبیا خاموشی سے سب کچھ سن رہی تھی۔ لونگی نوس چپ ہوا تو اذینہ نے رائے طلب نظروں سے اسے دیکھا۔ زنوبیا بولی۔ ''لونگی نوس کی آواز وقت کی آواز ہے۔ اس آواز پر سب سے پہلے ہم لبیک کہتے ہیں۔ اس مہم میں ہم بھی ان کے ساتھ ایک سپاہی بن کے جائیں گے۔ وطن کی حفاظت ہر فرد بشر کا فرض ہے۔''

''تم؟'' اذینہ اپنی شریک حیات کے جذبے سے خاصا متاثر معلوم ہوتا تھا۔ پھر بھی استعجاب سے بولا۔ ''زنوبیا تم؟''

''ہاں ہم!'' زنوبیا نے عزم سے کہا۔ ''لوگ جب ہمیں دیکھیں گے کہ ان کی ملکہ خود ان کے دروازے تک آئی ہے تو وہ گھروں سے نکل آئیں گے۔''

اذینہ گہری سوچ میں ڈوب گیا چند لمحوں بعد اس نے سر اٹھایا اور بولا۔ ''تم دونوں روانگی کی تیاری کر سکتے ہو۔''

☆......☆......☆

دوسرے دن لونگی نوس اور زنوبیا ملک کے آزمائے ہوئے شہسواروں کے ساتھ محل کے احاطے سے نکلے۔ اذینہ اور ریاست کے دیگر عمائد انہیں شہر سے باہر تک رخصت کرنے آئے۔ الوداع کہنے والوں میں اذینہ کا برادر زادہ حرمان بھی تھا۔ لونگی نوس اور زنوبیا ایک ہی رتھ میں سوار تھے۔ انہیں دیکھ کر حرمان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کے دل کی حالت لونگی نوس کے سوا کوئی نہ جان سکا۔ رتھ کے گھوڑے بدل دیئے گئے تھے اور ان کی تعداد بھی بڑھا دی گئی تھی۔ اب چار کے بجائے اعلیٰ نسل کے چھ گھوڑے رتھ کھینچ رہے تھے۔ رتھ کے اطراف جنگ جو گھڑ سواروں کا ہالہ تھا۔ یہ پر شکوہ قافلہ دور پولس نام کے شہر کی سمت روانہ ہوگیا۔ قافلے کو راستے کی ہر بستی میں رکتے ہوئے آگے نکلنا تھا۔ زنوبیا کا چہرہ کھلا جا رہا تھا جیسے وہ کسی خطرناک مہم پر نہیں تفریحی سفر پر نکلی ہو۔ اس کے برعکس لونگی نوس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

قافلہ شہر سے دور آچکا تھا۔ لونگی نوس نے زنوبیا کو مخاطب کیا ''ملکہ!......''

اس سے پہلے وہ کچھ اور کہتا' زنوبیا نے ایک ادا سے پوچھا۔ ''تم ہمیں ملکہ کیوں کہتے ہو لونگی نوس؟''

''اس لئے کہ آپ ملکہ ہیں۔''

''درست' مگر ہم زنوبیا بھی تو ہیں۔''

لونگی نوس کے ہونٹوں پر لرزش ہوئی لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ تیز رفتاری کے سبب رتھ ہچکولے کھا رہا تھا۔ زنوبیا ہچکولوں کے ساتھ ڈولتے ہوئے ہنس پڑی۔ لونگی نوس کو ایسا محسوس ہوا جیسے گھوڑوں کی ٹاپیں اس کی کھنک دار ہنسی کے ساتھ تال دے رہی ہوں وہ از خود رفتہ ہوگیا اس کی آنکھیں مچ گئیں۔ اسے وجد سا آنے لگا۔ نہ جانے کتنا وقت اور کتنا سفر اسی طرح گزر گیا۔

''لونگی نوس! تم کچھ کہہ رہے تھے؟ ہم منتظر ہیں۔''

لونگی نوس سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''پہلی منزل آنے والی ہے۔ اس اثنا میں آپ اپنے خطاب کی تیاری کر لیجئے۔ میں آپ کو ایک نکتہ خاص طور پر ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں'' زنوبیا پوری طرح متوجہ ہوگئی تو لونگی نوس نے کہا۔ ''لوگوں کے سامنے آپ کو جس بات پر زور دینا ہے' وہ یہ ہے کہ ہم عرب ہیں اور ایک غیر عرب قوم نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔''

''ہم سمجھ گئے'' زنوبیا نے اس سے اتفاق کیا۔ ''واقعی' تدمر کے باشندوں کے سامنے یہ بات زیادہ کارگر نہیں ہوگی کہ ایران نے روم پر چڑھائی کر دی ہے اور ہمیں روم کے دفاع میں لڑنا ہے۔''

''جی ہاں' گویا یہ جنگ ایرانیوں اور رومیوں کی نہیں بلکہ عرب اور عجم کی جنگ ہے۔''

''حقیقت بھی یہی ہے۔ تم نے نبض پر صحیح ہاتھ رکھا ہے۔'' زنوبیا کے اندر کا عرب جاگ اٹھا۔ ''سارے عرب ایک ہیں' کاش سب ایک ہو جائیں۔ یہ قوم کب تک غیروں کے زیر نگیں رہے گی!''

''زیادہ دیر نہیں۔'' لونگی نوس نے وثوق سے کہا۔ ''اب رات ڈھل رہی ہے اور صبح طلوع ہونے والی ہے۔ میں اپنے تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ یہ جنگ غلام عربوں کی آزادی کا نقطہ آغاز ہوگی۔''

☆......☆......☆

زنوبیا کی للکار تاریخ میں عرب قومیت کے لئے بلند ہونے والی پہلی آواز ثابت ہوئی۔ عرب کا صحرا آزادی کے نعروں سے گونجنے لگا۔ زنوبیا کی شخصیت اور خطابوں نے ملک

بھر میں آگ لگا دی۔ بوڑھے بھی جوان ہو کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لوگ قریے قریے اور شہر شہر سے تدمر جانے لگے۔

زنوبیا کا کارواں دورا یورد یلس' رصافہ اور دوسرے مقامات سے گزرتا ہوا واپس آیا تو ہزاروں جان نثار اس کے ساتھ تھے۔

اذینہ نے محل کے بڑے پھاٹک پر قافلے کا استقبال کیا۔ سپہ سالار زبدہ اور شاہی قصر کا نگران اعلیٰ زبائی بھی ہمراہ تھے۔ زنوبیا اور لونگی نوس کامیاب و کامراں لوٹے تھے' مگر میدان جنگ کا نقشہ اب کچھ اور تھا۔ رومی فوج ہر محاذ پر ایرانیوں سے پسپا ہو رہی تھی۔ رومی شہنشاہ ویرین نے اذینہ کو کمک لے کر فوراً محاذ پر پہنچنے کا پیغام بھیجا تھا۔ اذینہ روانگی کے لئے تیار تھا اس کی خواہش تھی کہ زنوبیا اب تدمر میں آرام کرے۔ وہ ایک طویل دورے سے لوٹی تھی۔ لونگی نوس نے اس کی تجویز قبول نہیں کی۔ اس کا کہنا تھا کہ نئے بھرتی ہونے والے سپاہی زنوبیا کی ساحرانہ شخصیت کے زیر اثر ہیں اس لئے زنوبیا کو بھی محاذ پر موجود رہنا چاہئے۔ اذینہ نے یہ بات مان لی۔ زنوبیا دوبارہ سفر پر آمادہ ہو گئی۔ اس نے لونگی نوس کو بھی اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆......☆......☆

جنگ ادیسا کے مقام پر ہو رہی تھی۔ تدمر کے جیالے رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ''ہم عرب ہیں' دشمن کا وار پشت پر نہیں سینے پر روکیں گے۔''

لشکر کا ولولہ نا قابل تسخیر معلوم ہوتا تھا' مگر جب تک یہ لشکر ادیسا پہنچا جنگ کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ ایران نے روم کو بدترین شکست دی تھی۔ روم کا شہنشاہ ویرین قیدی بنا لیا گیا تھا۔

اس خبر نے تدمری فوج کا حوصلہ پست نہیں کیا' کیوں کہ یہ فوج روم کے لئے نہیں' عرب کے لئے لڑنے آئی تھی۔ اذینہ تذبذب کا شکار تھا۔ لونگی نوس نے آگے بڑھ کے حملہ کرنے کا مشورہ دیا۔ زنوبیا اور زبدہ نے بھی لونگی نوس سے اتفاق کیا۔ زبائی حملے کے حق میں نہیں تھا۔

لونگی نوس نے اس سے کہا۔ ''اگر ہم اس وقت پیٹھ دکھاتے ہیں تو ہمیں ابھی سے شکست کے لئے تیار رہنا ہو گا۔''

زبائی کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ اس نے بھی تلوار سونت لی' بولا۔ ''ہم شہنشاہ روم کو

دشمن کی قید سے نکال کر دم لیں گے۔''

لشکر جوش میں آگے بڑھا۔

ایرانی مطمئن تھے کہ شہنشاہ روم کی شکست کے بعد کوئی ان کا مقابلہ نہیں کرے گا۔ ایران کے شہنشاہ شاپور کو جب خبر ملی کہ تدمر کے صحرائی پیش قدمی کر رہے ہیں تو اسے یقین نہیں آیا۔ ایرانی ادیسا سے آگے بڑھ آئے تھے اور فتح کا جشن منا رہے تھے۔ انہوں نے جشن کی بساط لپیٹی اور صف بندی کرنے لگے۔ اسی اثنا میں عرب کے تازہ دم جوان بھوکے بھیڑیوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے۔ اذینہ عربوں کی قیادت کر رہا تھا۔ زنوبیا کا رتھ قلب لشکر میں موجود تھا۔ رتھ کے ساتھ ساتھ لونگی نوس کا گھوڑا چل رہا تھا۔

ایرانیوں پر عربوں کا حملہ بپھرے ہوئے شیروں کے مانند تھا۔ وہ جس صف میں گھس جاتے کہرام مچ جاتا۔ رومی سپاہ ایک فرد کے لئے لڑی تھی لیکن عرب پوری قوم کی خاطر لڑ رہے تھے۔ پہلے ہی ہلے میں ایرانیوں کے قدم اکھڑ گئے۔ انہیں شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔ صحرائی ان کے پیچھے جھپٹے۔ ایرانی فوج جس نے رومیوں کو شکست دی تھی' بھاگ رہی تھی' جیسے موت اس کے تعاقب میں ہو۔ ایران کے دار الحکومت پرسی پولس تک اس کا تعاقب کیا گیا۔

ہزاروں ایرانی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے مگر روم کے شہنشاہ کو ان کی قید سے نہ چھڑایا جا سکا۔ دراصل شاپور کو احساس ہو گیا تھا کہ یہ بپھری ہوئی فوج روم کے شہنشاہ کو اس کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس نے اسی لئے قیدی شہنشاہ کو عجلت میں قتل کرا دیا تھا۔

اذینہ کو پرسی پولس کے قریب ایک معبد کے کاہن سے شہنشاہ روم کے قتل کی اطلاع ملی تھی۔ وہ بہ صد رنج واندوہ معبد میں گیا۔ ایرانیوں نے ویرین کی کھال اتار کر اس میں بھس بھر دیا تھا اور اسے ایک نمایاں جگہ لٹکا گئے تھے۔ اس کے قتل پر اذینہ نے اپنی فوج میں ذرا بھی جوش نہیں دیکھا۔

روم میں نئے شہنشاہ کی تاج پوشی ہو گئی۔ نئے شہنشاہ نے اذینہ سے وفاداری کی تجدید کے لئے اپنا ایک با اختیار سفیر تدمر روانہ کیا۔ اذینہ نے بھرے دربار میں اسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور اعلان کیا کہ تدمر بدستور رومی سلطنت کے زیر سایہ رہے گا۔ تدمر کے تمام ارکان دولت نے اپنے سربراہ اذینہ کا فیصلہ دل سے قبول کر لیا' لیکن شہزادہ حرمان کینہ

توڑی سے باز نہ آیا۔ اس نے رومی سفیر سے خفیہ ملاقات کی اور اسے اذینہ کے خلاف بھڑکایا۔

"ہم دربار روم کے معزز سفیر کی خدمت میں ایک اہم اطلاع لے کر حاضر ہوئے ہیں۔" اس نے سفیر کو اعتماد میں لے کر رازدارانہ سرگوشی کی۔ "اگر ہمارے رشتے کے چچا محترم اذینہ کو بدستور تدمر کا حاکم رکھا گیا تو تدمر بہت جلد خود مختاری کا دعویٰ کر دے گا اور پھر یہ علاقہ رومی سلطنت کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

سفیر کے کان کھڑے ہو گئے کہنے لگا۔ "میں اس اطلاع کے لئے شہزادے کا شکر گزار ہوں لیکن اس بات کا ثبوت؟"

"ثبوت صاف ہے جناب والا!" حرمان نے کہا۔ "آپ کے علم میں ہوگا' حالیہ جنگ میں تدمر کی سپاہ نے روم کی خاطر پیش قدمی نہیں کی تھی۔ اس کے پیش نظر محض اپنے علاقے کا دفاع تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شہنشاہ ویرین کے بے رحمانہ قتل کے بعد جنگ فوراً بند کر دی گئی اور ایرانیوں سے انتقام نہیں لیا گیا۔"

حرمان شاہی قصر کے نگران اعلیٰ زبائی کو سبز باغ دکھا کے اپنا ہم نوا بنا چکا تھا۔ دوسرے دن اس نے زبائی کو چوری چھپے رومی سفیر سے ملوا دیا۔ رومی سفیر نے زبائی سے تفصیلی بات چیت کی اور مشورہ لیا کہ اگر اذینہ کو معزول کر دیا جائے تو اس کا عہدہ سنبھالنے کے لئے کس کا تقرر ہو! زبائی نے شہزادہ حرمان کا نام پیش کر دیا اور اس کی انتقامی فطرت کو بے حد سراہا۔ زبائی نے یہ بھی کہا۔ "اذینہ کو صرف معزول کرنا کافی نہ ہوگا حضور عالی! وہ اپنے بڑے بیٹے کو ولی عہد نامزد کر چکے ہیں چنانچہ یہ ضروری ہے کہ انہی کے ساتھ ان کے ولی عہد کو بھی راستے سے ہٹا دیا جائے تاکہ شہزادہ حرمان کے لئے کوئی فتنہ نہ کھڑا ہو سکے۔"

ولی عہد کے علاوہ اذینہ کے دو بیٹے اور تھے لیکن ان کی عمریں ابھی کم تھیں۔ اذینہ اس سازش سے قطعی بے خبر تھا۔ اس کے درباری ایرانی سپاہ پر غلبے کی خوشی میں جشن منانے کی تیاریوں میں حصہ لے رہے تھے۔ لونگی نوس نے درخواست کی کہ جشن اس کے شہر حمص میں منایا جائے۔ اس کی خدمت کے اعتراف میں اذینہ نے یہ تجویز منظور کر لی۔

جشن کے روز شہر حمص دلہن کی طرح سجایا گیا اور رنگا رنگ تقریبات کا اہتمام ہوا۔ زنوبیا' لونگی نوس اور زبدہ سمیت دارالحکومت کے تمام اکابر حمص میں موجود تھے۔ جشن کی سب سے بڑی تقریب کے موقع پر تدمر کی تاریخ کا سب سے بڑا اجتماع ہوا۔ اذینہ اپنے ولی عہد

کے ساتھ ایک زرنگار تخت پر رونق افروز ہوا۔ محافظ دستے کے سپاہی تخت کے ارد گرد تلواریں سونتے کھڑے تھے۔ اس محافظ دستے کا نگراں' حرمان کا آدمی تھا۔ جلسے کی کارروائی جب شباب پر پہنچی تو اچانک فضا میں دو چیخیں بلند ہوئیں۔ شاہی تخت اذینہ اور ولی عہد کے خون سے رنگین ہو گیا۔ سب کچھ آناً فاناً ہوا۔ کسی کو کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اذینہ اور ولی عہد کے ساتھ ہی وہ دو سپاہی بھی دیکھتے دیکھتے ہلاک کر دیئے گئے جن سے ان دونوں کو قتل کرایا گیا تھا۔ ہر طرف افراتفری پھیل گئی اور کہرام برپا ہو گیا۔ بیٹے اور شوہر کے سفاکانہ قتل پر زنوبیا دہشت سے بے ہوش ہو گئی۔ لونگی نوس اسے سنبھالنے کے لئے لپکا مگر وہ زمین پر گر چکی تھی۔

منصوبے کے مطابق تھوڑی ہی دیر میں شاہی قصر کے نگران اعلیٰ نے نئے حکمراں کے لئے شہزادہ حرمان کے نام کا اعلان کر دیا۔ زبائی نے مجمع کو یقین دلایا کہ دربار روم جلد ہی اس اعلان کی توثیق کر دے گا۔ لونگی نوس کسی تاخیر کے بغیر زنوبیا کو وہاں سے لے جا چکا تھا۔ جلسہ گاہ میں نفسانفسی کی کیفیت تھی۔

سپہ سالار زبدہ کو یہ غیر متوقع اعلان سخت ناگوار گزرا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ وہاں سے نکل آیا۔ باہر آ کے اسے معلوم ہوا کہ لونگی نوس' زنوبیا کے ساتھ تدمر جانے والے راستے پر گیا ہے۔ زبدہ بھی انتہائی تیز رفتاری سے اسی طرف روانہ ہو گیا۔ لونگی نوس ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ زنوبیا کی بے ہوشی کے خیال سے اس نے گھوڑے کی رفتار زیادہ نہیں بڑھائی تھی۔ زبدہ نے انہیں راستے ہی میں جا لیا۔

تدمر پہنچتے ہی سپہ سالار نے منادی کرا دی کہ مقتول اذینہ کے چھوٹے بیٹے شہزادہ وہب اللات کو تخت نشین کر دیا گیا ہے' شہزادے کے بالغ ہونے تک ملکہ زنوبیا امور مملکت کی نگراں قرار پائی ہیں۔ حمص میں ہونے والی ساری کارروائی منسوخ کر دی گئی۔ زبائی کو اس امر کا کوئی اختیار نہیں تھا کہ تاج و تخت کے لئے وہ شہزادے حرمان کے نام کا اعلان کرے۔

ملک بھر میں سپہ سالار کی منادی کا خیر مقدم کیا گیا اور حمص کے سوا تمام شہروں نے شہزادہ وہب اللات کی حکمرانی تسلیم کر لی' البتہ حمص پر حرمان اپنی گرفت مضبوط کر چکا تھا۔ رومی سلطنت کی جانب سے اس کی تائید بھی ہو گئی تھی۔

سپہ سالار زبدہ حمص پر بھی حرمان کا قبضہ نہیں چاہتا تھا۔ لونگی نوس کے مشورے سے اس نے حمص پر لشکر کشی کی تیاری شروع کر دی۔ حرمان ہر سازشی کی طرح ایک بزدل آدمی تھا۔

اسے جب یہ معلوم ہوا کہ سپہ سالار زبدہ بھاری لشکر لے کر حمص کی طرف آ رہا ہے تو وہ راتوں رات وہاں سے فرار ہوگیا۔ اس نے روم کی راہ لی کیونکہ وہی اس کے لئے جائے پناہ ہوسکتا تھا۔

غدار زبائی نہایت قلیل فوج کے ساتھ حمص میں تنہا رہ گیا تھا۔ حرمان کے فرار سے اس کی ہمت بھی جواب دے گئی جلد ہی وہ بھی ایک رات کو روم بھاگ گیا۔ زبدہ جب حمص پہنچا تو کسی مزاحمت کے بغیر حمص اس کے حوالے کر دیا گیا۔

مقتول اذینہ کے محافظ دستے کا سالار اب تک حمص ہی میں تھا۔ وہ فرار ہونے کی کوشش میں پکڑا گیا۔ اس نے سازش کی تمام تفصیلات بیان کر دیں اور زبدہ سے جان کی امان طلب کی مگر زبدہ نے اسے معاف نہیں کیا۔ اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

سابق حکمران اذینہ اور اس کا بیٹا حمص میں مدفون تھے۔ لیکن ان کی قبروں کی حالت بہت ابتر تھی۔ زبدہ کے حکم پر دو شاندار مقبرے تعمیر کئے گئے۔ دونوں عمارتیں زبدہ نے اپنی نگرانی میں تعمیر کرائیں۔ ان عمارتوں کے کئی درجے تھے۔ اندر خوب رنگ کیا گیا تھا پتھروں پر تصویریں کندہ کی گئی تھیں اس کے علاوہ اونچے اونچے برج تیار کئے گئے تھے۔ یہ دونوں عمارتیں شہر سے باہر ایک کشادہ مقام پر تعمیر کی گئی تھیں۔

زبدہ کو حرمان اور زبائی کے بچ نکلنے کا بہت رنج تھا۔ وہ کچھ روز حمص میں رہ کر دارالحکومت لوٹ آیا۔ یہاں شہر کے وسط میں دو عالی شان مجسمے نصب کئے گئے۔ ایک مجسمہ زنوبیا کا تھا۔ اس کے نیچے یہ عبارت لکھی گئی۔ ''یہ مجسمہ اسپٹمیا زنوبیا کا ہے جو شہرت اور پارسائی میں سب سے بڑھی ہوئی ہے۔ اسے سپہ سالار زبدہ نے نصب کیا ہے۔'' دوسرا مجسمہ اذینہ کا تھا اس کے نیچے تدمری زبان میں لکھا گیا تھا۔ ''یہ مجسمہ اسٹیمیس اذینہ ملک الملک اور مجد دشان مشرق کا ہے۔ اسے ممتاز سالار افواج نے نصب کیا ہے۔''

اب تدمر پر زنوبیا بلا شرکت غیرے حکمراں تھی مگر اس کی حکومت کو رومی شہنشاہ نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ایک روز روم سے ایک ایلچی شہنشاہ روم کا حکم نامہ لے کر زنوبیا کے دربار میں آیا۔ ملکہ زنوبیا کو فی الفور تخت سے دست بردار ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ نئے بادشاہ اوریلیاں نے لکھا تھا کہ ہم تمہیں حکومت کا اہل تصور نہیں کرتے بلکہ شہزادہ حرمان کو تدمر کا عامل مانتے ہیں۔ تم پر لازم ہے کہ اطاعت کرو اور حکومت اس کے حوالے کر دو۔ اگر تعمیل حکم سے

گریز کیا گیا تو تمہیں باغی سمجھا جائے گا۔ ہمیں فوراً اپنی رضامندی سے آگاہ کرو تاکہ شہزادہ حرمان کو تدمر روانہ کیا جا سکے۔ زنوبیا نے لونگی نوس سے مشورہ کیا کہ کیا جواب دیا جائے؟

لونگی نوس نے کہا۔ ''تدمر اب عملاً رومی سلطنت کے زیر نگین نہیں رہا۔ یہ ایک بااختیار حکومت ہے جس طرح عربوں پر ایرانیوں کی برتری تسلیم نہیں کی گئی۔ اسی طرح رومیوں کی برتری بھی ہمیں تسلیم نہیں۔''

سپہ سالار زبدہ بھی موجود تھا۔ وہ بولا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہمیں رومیوں سے برسرپیکار ہونا پڑے گا۔ رومی آسانی سے یہ علاقہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''جنگ تو ناگزیر ہے۔'' لونگی نوس نے کہا۔ ''بہتر یہ ہوگا کہ ہم حملے میں پہل کریں نیز تدمر کے علاوہ شام پر بھی ہمارا ہی حق ہے۔ سارا عرب ہمارا ہے اور سارے عرب ایک ہیں۔ ہم انہیں علاقوں سے پہل کریں گے اور ہر عرب ہمارا ساتھ دے گا۔''

زنوبیا اور زبدہ نے لونگی نوس سے اتفاق کیا۔

اسی روز ایک بڑی جنگ کی تیاری شروع کر دی گئی۔

روم کے ایلچی کو یہ دوٹوک جواب لکھ کر دے دیا گیا۔ ''عرب ایک الگ قوم ہے اور وہ کسی کا غلبہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں، تدمر ایک آزاد علاقہ ہے اس پر رومیوں کا دعویٰ ناجائز ہے۔ رومی شہنشاہ آئندہ کوئی فرمان بھیجنے کی زحمت نہ کریں۔ ہم ان کے نامزد کئے ہوئے بھگوڑے حرمان کو حکمران نہیں مانتے۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ روم ہم سے برابری کے تعلقات قائم کرے اور تدمر کے بھگوڑے کو تدمر کے حوالے کر دے۔ اسی صورت میں ہم یہ سمجھیں گے کہ روم ہم سے دوستی کرنے پر رضامند ہے ورنہ نہیں۔''

روم کی جوابی کارروائی کا مقابلہ کرنے کے لئے لونگی نوس نے نوجوانوں کا ایک گروہ ترتیب دیا۔ اس گروہ کے ہر فرد کو ملکہ زنوبیا کا خفیہ پیغام لے کر پورے عرب میں پھیل جانا تھا۔ اس زمانے میں شام کے علاوہ مصر پر بھی روم ہی کی حکومت تھی۔ دونوں ملکوں میں رومی سپاہ رہتی تھی مگر اس کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ اس سے نمٹنا ایسا مشکل نہیں تھا۔

ایک رات لونگی نوس نے زنوبیا سے کہا۔ ''زنوبیا مجھے کچھ دن کے لئے تم سے جدا ہونا پڑے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ خود شام جا کر عرب سرداروں کو تمہارے حق میں ہموار کروں۔''

''لونگی نوس!'' زنوبیا افسردگی سے بولی۔ ''تم ہی میری شمشیر ہو اور تم ہی میری سپر۔

تمہارے بغیر میں غیر مسلح ہو جاؤں گی۔ مجھ سے تمہاری جدائی کیسے برداشت ہو سکتی ہے۔ تم تو مجھے حکومت اور اقتدار سے زیادہ عزیز ہو۔ کیا تمہارے تربیت یافتہ نوجوانوں میں سے کوئی ایسا نہیں جو شامی سرداروں سے بات کر سکے؟''

''میں خود جانا چاہتا ہوں' خود جانے کی بات اور ہے۔''

''بہتر ہے جاؤ'' زنوبیا مان گئی۔ ''تم کہیں بھی چلے جاؤ ہر وقت میری نگاہ میں رہو گے' اب ہمیں فاصلے دور نہیں کر سکتے۔''

لونگی نوس تدمر سے دمشق روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنے حلیے میں تبدیلی کر لی تھی' کسی کے لئے اسے پہچاننا آسان نہیں تھا۔ اس کے پاس شامی سرداروں کے نام ملکہ زنوبیا کا ایک پیغام تھا۔ دمشق پہنچ کر لونگی نوس نے ایک سرائے میں قیام کیا اور چند روز تک وہاں کے حالات کا مشاہدہ کرتا رہا۔ وہاں ایک عام بے چینی پائی جاتی تھی کیونکہ شام سے رومی فوج کا سلوک اچھا نہیں تھا۔ لونگی نوس ایک دن دمشق کے بازار سے گزر رہا تھا کہ بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ معلوم ہوا کہ یہاں سے کسی رومی سردار کی سواری گزرنے والی ہے۔ لونگی نوس نے ایک راہگیر سے پوچھا۔ ''ارے بھائی اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟''

راہ گیر نے اسے حیرت سے دیکھا اور بولا۔ ''کیا تم کہیں اور سے آئے ہو؟''

''ہاں' مصری عرب ہوں۔''

راہگیر ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔ ''رومی سردار جس شامی نوجوان کو چاہتے ہیں غلام بنا لیتے ہیں اور جو شامی دوشیزہ نظر آ جائے یعنی انہیں پسند آ جائے اسے زبردستی اٹھا لے جاتے ہیں۔ خود میری بہن اٹھائی جا چکی ہے۔ اب کوئی باعزت لڑکی اپنے گھر سے نہیں نکلتی۔''

لونگی نوس نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو عربوں کی غیرت پر ایک تازیانہ ہے' پہلے تو ہم ایسے نہیں تھے۔''

''سچ کہا تم نے۔ اب یہاں بے غیرت ہی رہتے ہیں اور میں بھی انہی میں سے ایک ہوں۔''

اسی وقت لونگی نوس نے ایک رومی سردار کو دیکھا جو چار گھوڑوں والے رتھ میں سوار تھا اور اس کی گردن تنی ہوئی تھی۔ اس کے پہلو میں ایک دوشیزہ سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

شام کے حالات پر لونگی نوس کا دل تڑپ اٹھا۔ اس نے سوچا کہ اس علاقے کو ان مصائب سے نجات دلانا انسانی فرض ہے۔ اس کے فرستادہ مخبروں میں سے ایک دمشق کے قلعے میں ایک عرب سردار کے خادموں میں شامل ہو گیا تھا۔ لونگی نوس نے اس کے ذریعے عرب سردار کو ایک خفیہ پیغام بھیجا کہ تدمر کی ملکہ زنوبیا کا سفیر ملاقات کا متمنی ہے۔ سردار بہت حیران ہوا کہ آخر اس کی خواب گاہ میں یہ خفیہ پیغام کیسے پہنچا؟ اس نے اپنے خادموں سے پوچھ گچھ کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بہر حال کچھ سوچ کر اس نے ملاقات کا ارادہ کر لیا۔ مقررہ وقت پر وہ قلعے کی مشرقی دیوار کے باہر پہنچ گیا۔

آدھی رات ہو چکی تھی' لونگی نوس کسی طرف سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔ وہ جیسے ہی سردار کے قریب پہنچا' سردار نے زور سے تالی بجائی۔ تالی بجتے ہی چھپے ہوئے مسلح افراد سامنے آ گئے اور انہوں نے لونگی نوس کو حراست میں لے لیا۔ اس پر لونگی نوس کو بڑی حیرت ہوئی۔ سردار کے حکم پر اس کی تلاشی لی گئی۔ اس کے پاس سے ملکہ زنوبیا کا پیغام برآمد ہوا۔ پیغام پر ملکہ کی مہر تھی مہر دیکھ کر سردار مطمئن ہو گیا۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''انہیں عزت کے ساتھ قلعے میں لے چلو۔''

پیغام میں سردار کو وطن کی آزادی کے لئے کام کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ اسے شدت سے یہ احساس دلایا گیا تھا کہ وہ عرب ہے۔ سردار پر پیغام کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ لونگی نوس کی توقع کے مطابق وہ ہر قربانی دینے کو تیار ہو گیا۔

سردار نے لونگی نوس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا اور کہا۔ ''یہ میرے لئے نہایت فخر کا مقام ہے کہ ملک کا ایک مشہور دانش مند' ایک جری رہنما ملکہ عالیہ کا پیغام لے کر میرے پاس آیا ہے۔''

وہ ایک بااثر و بارسوخ سردار تھا۔ اس نے ملکہ زنوبیا کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے بہت کام کیا اور دوسرے بہت سے برداروں کا تعاون بھی حاصل کر لیا۔ راہیں ہموار ہوتی گئیں۔ صرف چند ضمیر فروشوں نے رومی آقاؤں کے ساتھ حق نمک کی ادائیگی کا مظاہرہ کیا' لیکن زیادہ تر لوگ قوم و وطن کے وفادار ثابت ہوئے۔ ملکہ زنوبیا کے حضور لونگی نوس سرخرو لوٹا۔ وہ چند روز کے لئے تدمر آیا تھا مگر زنوبیا نے اسے بہت دنوں تک روک کے رکھا۔

ایک شام کا ذکر ہے وہ دونوں محل کے باغ میں ایک گل پوش روش پر ٹہل رہے تھے

زنوبیا کا ہاتھ لونگی نوس کے ہاتھ میں تھا۔ چلتے چلتے زنوبیا ٹھہر گئی بولی۔ ''لونگی نوس!'' اس کی آواز میں بے تابی تھی۔ ''چلو بعل دیوتا کے معبد میں چلو! وہاں ہم کوئی فیصلہ کر لیں۔ اب یہ جدائی ہم سے برداشت نہیں ہوتی۔''

''ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔'' لونگی نوس نے محبت سے اسے سمجھایا۔ ''ابھی ہمارا یہ اقدام مصلحت کے خلاف ہوگا۔ میں ماں کی طرف سے ضرور عرب ہوں لیکن تم جانتی ہو میرا باپ ایک یونانی تھا۔ تدمر کے باشندے موجودہ فضا میں یہ پسند نہیں کریں گے کہ ان کی ملکہ کا نام ایک نیم عرب شخص کے ساتھ لیا جائے۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو لونگی نوس!'' زنوبیا نے اس کے شانے پر سر رکھ دیا۔ ''شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ تدمر والے تم پر کتنا فخر کرتے ہیں۔''

''مجھے اندازہ ہے میری ملکہ!'' لونگی نوس نے اس کا بازو تھپ تھپایا۔ ''مگر تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ ملک میں ہمارے مخالفین اور حاسدوں کی کمی نہیں ہے۔ وہ موقع کی تاک میں ہیں۔ ہم انہیں ذرا سا بھی موقع کیوں دیں۔ اس خارزار میں سر دست ہمیں سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا ہے۔ ہماری معمولی سی بے احتیاطی بھی ہمیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ہوا کا رخ بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ ویسے بھی کسی رسمی اقدام کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا ہم ایک دوسرے سے الگ ہیں؟''

یہ سن کر زنوبیا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔

چند روز بعد لونگی نوس نے تمام حالات زنوبیا اور سپہ سالار زبدہ کے گوش گزار کئے۔ زبدہ جنگ کی تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ تینوں کی باہمی صلاح سے جلد ہی کوچ کا بگل بجا دیا گیا۔ ان کا پہلا ہدف شام تھا' فوجوں کے جھرمٹ میں ملکہ زنوبیا بھی لونگی نوس کے ساتھ موجود تھی۔ شام کی طرف نہایت تیزی کے ساتھ پیش قدمی کی گئی تاکہ رومی فوجیں مزاحمت کے لئے بروقت نہ پہنچ سکیں۔ اعتماد والے شامی سرداروں کو مطلع کیا جا چکا تھا۔ کہ تدمر کے لشکر کی آمد آمد ہے۔ آخر تدمر کی فوجیں شام میں داخل ہو گئیں۔ شہریوں کو احساس تک نہ ہوا کہ کیا ہونے والا ہے۔

حملے کی بو سونگھتے ہی رومی سپاہیوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اپنے غلام ملک شام میں ان کے مزے تھے۔ آسائشوں نے انہیں تعیش پرست بنا دیا تھا اور ان کی مستعدی رخصت

رکھ لی تھی۔ وہ تدمر کی پرعزم اور تازہ دم سپاہ کے سامنے نہ ٹک سکے۔ ان کے مجبروں نے روم جانا چاہا مگر اڑنے سے پہلے ان کے پر کاٹ دیئے گئے' سر کاٹ دیئے گئے۔ وہ معدودے چند شامی زعما جو اب تک روم سے ملے ہوئے تھے' انہوں نے بھی پسپائی اختیار کر لی صحرا رومی فوجوں کے خون سے سیراب ہو گیا۔

آخر میں رومی افسروں کے حرم کی تلاشی لی گئی۔ حرم سے زیادہ تر عرب عورتیں برآمد ہوئیں۔ رومی عورتیں بہت کم تھیں رومیوں سے گلوخلاصی ہونے پر دمشق میں یوم نجات منایا گیا۔ دو شہروں انطاکیہ اور سلیوکیہ میں رومی باشندوں کی کثرت تھی۔ ان پر کڑی نظر رکھی گئی۔ اب وہ حاکم نہیں محکوم تھے آقا نہیں غلام تھے۔

لونگی نوس کے مشورے پر ملکہ زنوبیا نے اپنی افواج کو حکم جاری کیا کہ اب رومی باشندے ہماری حفاظت میں ہیں۔ ہم ان کی سلامتی کے ذمہ دار ہیں ان پر کوئی زیادتی نہ کی جائے نیز وہ عربوں کے انتقام کا نشانہ نہ بننے پائیں۔ لونگی نوس جانتا تھا کہ اگر یہ حکم جاری نہ ہوتا تو انطاکیہ اور سلیوکیہ میں خون کی ندیاں بہہ جاتیں۔

شام کی فتح پر تدمری فوج کا حوصلہ بہت بلند ہو گیا۔ شامی باشندے بڑے پیمانے پر تدمری فوج میں بھرتی کئے گئے افواج کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی۔ زبدہ نے یہ خوش خبری لونگی نوس کو سنائی۔

لونگی نوس بولا۔ ''اب ہم مصر بھی فتح کر سکتے ہیں' اٹھو زبدہ' اسکندریہ ہمارا منتظر ہے۔''

☆......☆......☆

مصر پر لشکر کے لئے ستر ہزار بہترین سپاہی چنے گئے۔ ان میں صحرائیوں کے علاوہ شامی عرب بھی شامل تھے۔ ملکہ زنوبیا کے جلو میں یہ فوج آندھی اور طوفان کی طرح مصر پہنچی اور جہاں گئی وہاں فتح و نصرت کے چراغ جل اٹھے۔ بڑے بڑے جنگ جو مصریوں نے ملکہ زنوبیا سے مفاہمت کر لی اور غاصب رومیوں کو اسکندریہ سے بھی نکال دیا گیا۔ نئے سکے ڈھالے گئے ان پر شہنشاہ روم اور یلیاں کی تصویر نہیں تھی ملکہ زنوبیا کے بیٹے وہب اللات کو آگسٹس اور زنوبیا کو آگسٹا کہا جانے لگا۔

رفتہ رفتہ شام' شمالی عرب اور مصر کے بعد ایشیائے کوچک کا ایک حصہ بھی ملکہ زنوبیا

کے زیرنگیں آ گیا۔ ایشیائے کوچک میں انقرہ تک جابجا چوکیاں قائم کر دی گئیں۔ تدمری حملوں کی شدت کیلیڈون تک محسوس کی گئی۔ اس طرح صحرا کی ملکہ زنوبیا نے رومی سلطنت میں اپنے لئے ایک نئی عظیم الشان سلطنت پیدا کر لی۔ تدمری لوگ ملکہ زنوبیا کو بنت زابائی یعنی جنت عطیہ کہنے لگے۔ شامی اور مصری عربوں نے اسے الزبا کا نام دیا۔

سپہ سالار زبدہ نے ملکہ سے ایشیائے کوچک میں مزید پیش قدمی کی اجازت مانگی۔ ملکہ نے لونگی نوس سے مشورہ طلب کیا لونگی نوس نے کہا۔ ''مزید پیش قدمی مناسب نہیں۔''

ملکہ بولی۔ ''لیکن زبدہ نہایت جوش میں ہے۔ فتح پر فتح حاصل کر رہا ہے اسے روکا گیا تو وہ دل برداشتہ ہو سکتا ہے۔''

لونگی نوس خاموش ہو گیا پھر چند لمحوں کے بعد اس نے کہا۔ ''رومی شہنشاہ اور یلیان اپنا بگڑا ہوا نظام درست کر چکا ہے اب وہ یقیناً ایشیائے کوچک پر توجہ دے گا اور پوری طاقت کے ساتھ سے نبرد آزما ہوگا۔''

لونگی نوس کی پیش گوئی درست نکلی۔ روم نے ایشیائے کوچک کے اس علاقے پر حملہ کر دیا جسے تدمر فتح کر چکا تھا۔ حملہ بہت زوردار اور اچانک تھا۔ زبدہ کی فوجیں بکھری ہوئی تھیں ان کی یک جائی سے پہلے ہی رومی لشکر نے جنگ کا فیصلہ کر دیا۔ زبدہ کے لئے کمک لے جانے والوں میں ملکہ زنوبیا اور لونگی نوس بھی شامل تھے۔ وہ جس وقت محاذ پر پہنچے ان کی فوجیں بڑی بے سروسامانی میں بھاگ رہی تھیں۔ انہیں بھی لوٹنا پڑا۔

اب رومی لشکر شام کی طرف بڑھا۔ انطاکیہ اور سلیوکیہ رومیوں کے شہر تھے۔ سو لشکر کی آمد پر شہریوں نے خانہ جنگی شروع کر دی اور موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ رومیوں کو برائے نام مزاحمت کا سابقہ پڑا۔ تدمری سپاہ بھاری سامان سے لیس تھی۔ رومیوں کے سبک رفتار رسالوں اور پیادہ فوج نے اسے مات دے دی۔ ملکہ زنوبیا اور زبدہ پیچھے ہٹتے ہٹتے تدمر پہنچ گئے اب تدمری دارالحکومت کا صحرائی راستہ حملہ آور دشمن کے لئے کھلا تھا۔

حمص بھی رومیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس پر لونگی نوس کو دلی صدمہ ہوا۔ روم کا شہنشاہ کچھ عرصے حمص میں ٹھہرا رہا تاکہ سورج دیوتا کے نئے معبد مکمل ہو جائیں۔ حران اور زبائی رومیوں کے ساتھ تھے اور اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔

چند روز بعد خبر ملی کہ شہنشاہ روم تدمر کی طرف بڑھ رہا ہے ملکہ زنوبیا کو کمزور پا کر

مصری سالاروں نے رومیوں سے ساز باز کر لی تھی۔ ان سے بھی رومیوں کو فوجی امداد مل گئی۔ لونگی نوس نے اس موقع پر روم کے دشمن ایران کو دوست بنانا چاہا۔ ایران سے فوجی امداد حاصل کرنے کے لئے ایک ایلچی بھیجا گیا مگر ایران نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ وہ خاموش تماشائی بنا رہا۔ اسے وہ دن یاد تھا جب ملکہ زنوبیا کے شوہر اذینہ نے روم کی حمایت میں ایران سے جنگ کی تھی وہ گویا خاموشی سے اپنے دوشمنوں کی تباہی کا تماشا دیکھنا چاہتا تھا۔

شہر تدمر رومی لشکر کے محاصرہ میں تھا۔ لونگی نوس نے ملکہ زنوبیا کو صلح کا مشورہ دیا مگر زبدہ نے پرزور الفاظ میں صلح کی مخالفت کی۔ اس نے لونگی نوس سے کہا۔ ''مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی آپ ہمیں ذلیل و رسوا ہو کر زندہ رہنے کا مشورہ دے رہے ہیں؟ آپ نے غور نہیں کیا کہ ہم اس طرح ایک بار پھر رومیوں کے غلام بن جائیں گے؟

لونگی نوس نے تحمل سے وضاحت کی۔ ''زبدہ' میرے بھائی! اس وقت جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے۔ حکومت بالکل کھو دینے سے کہیں بہتر ہے کہ ہم وقتی طور پر ان کی برتری تسلیم کر لیں۔ مصلحت اسی میں ہے ورنہ میرے منہ میں خاک' ہمیں بہت برا وقت دیکھنا پڑے گا۔ ہم نے اگر صلح میں پہل کی تو ممکن ہے رومی شہنشاہ اس علاقے پر ملکہ زنوبیا کو اپنی نائب مان لے۔''

زبدہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ زنوبیا بھی خاموش رہی۔ شاید اسے بھی زبدہ سے اتفاق تھا۔ لونگی نوس نے ہونٹ سی لئے۔ خلاف توقع خود روم کی طرف سے چند شرائط کے ساتھ صلح کی پیشکش کر دی گئی۔ روم نے پورے تدمر کو دو حصوں میں بانٹنے کی تجویز دی تھی۔ ایک حصے پر حرمان کی حکمرانی ہوتی' دوسرے پر زنوبیا کی۔ ساتھ ہی روم نے شہر حوالے کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

یہ شرائط روم کی کمزوری پر محمول کی گئیں۔ زنوبیا کا بیٹا وہب اللات اٹھارہ انیس برس کا ہو چکا تھا۔ وہ ایک پرجوش نوجوان تھا اور اپنے باپ کی طرح بہادر۔ اس نے کبھی لونگی نوس کے متعلق زبان نہیں کھولی تھی مگر دل سے اسے ناپسند کرتا تھا۔

ایک روز وہب اللات نے ملکہ زنوبیا کے سامنے برسر دربار بلند آواز میں کہا۔ ''ہم اپنے دلاور باپ اذینہ کے فرزند ہیں اور بالغ ہو چکے ہیں۔ ہمیں جنگ کی اجازت دی جائے ہم اپنے باپ کی طرح میدان میں بہادری کے جوہر دکھانے کے منتظر ہیں۔''

دربار میں داد و ستائش کا غلغلہ بلند ہوا۔ سب نے یک زبان ہو کر وہب اللات کی تائید کی مگر لونگی نوس نے اس بابت کہا۔ ''تدمر کے جیالو! یقین کرو' ہمارے لئے یہ ایک سنہری موقع ہے۔ روم خود صلح کا ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ ملکہ عالیہ بھی میری بات سے اتفاق فرمائیں گی ہمیں روم کی پیشکش کسی لیت و لعل اور کسی حیل و حجت کے بغیر قبول کر لینی چاہئے۔ نوشتہ دیوار یہی ہے۔''

وہب اللات نے سوال کیا۔ ''کیا محترم لونگی نوس یہ چاہتے ہیں کہ تدمر دو ٹکڑے ہو جائے؟''

''جناب والا! اس شہر کے سوا اب ہمارا قبضہ کس شہر پر ہے۔'' لونگی نوس نے برجستہ کہا۔ ''وقت آیا تو ہم پہلے کی طرح پھر خود کو مضبوط کر لیں گے اور روم کی غلامی کا طوق اتار دیں گے۔''

''جو خود اپنے ہاتھ سے طوق پہن لے' وہ پھر کبھی آزاد نہیں ہوتا۔'' زبدہ بول اٹھا۔ ''مجھے عالی مقام شہزادے کی تجویز سے پورا اتفاق ہے۔ ہمیں شہر سے نکل کر دشمنوں پر بھرپور حملہ کرنا چاہئے۔''

شہنشاہ روم کی شرائط ٹھکرا دی گئیں۔ وہب اللات اور زبدہ فوجیں لے کر نکلے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ شاہی قصر کا سابق سالار زبائی نوجوان وہب اللات کے ہاتھوں مارا گیا۔ وہب اللات بڑی بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ اس نے طے کر رکھا تھا کہ غداروں کو اپنے ہاتھ سے ٹھکانے لگاؤں گا۔ اس کی پوری توجہ حرمان اور زبائی کی طرف تھی۔ زبائی مرا تو اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے حرمان کی طرف گھوڑا دوڑا دیا۔ اب وہب اللات کے ساتھ گنتی کے چند سرفروش رہ گئے تھے۔ وہ لڑتے لڑتے دشمنوں کی صفوں میں گھس گیا۔ زبدہ دوسری طرف شہنشاہ روم کا مدمقابل تھا مگر اسے جب خبر ملی کہ وہب اللات کے ساتھ صرف چند سپاہی ہیں تو وہ فکرمند ہو گیا۔ محاذ سے ہٹنا اس کے لئے مشکل تھا' لڑائی کا نقشہ بدل جاتا۔ پھر بھی زبدہ نے یہی فیصلہ کیا کہ اسے شہزادے کی کمک کو پہنچنا چاہئے۔ زبدہ اپنے مقام سے ہٹ کر شہزادے کی جانب بڑھا۔

شہنشاہ روم نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے عقب سے تدمری فوجوں کی واپسی کا دروازہ بند کر دیا۔ تدمری فوجیں دونوں طرف سے رومیوں میں گھر گئیں۔

حرمان دانستہ وہب اللات کو اپنے پیچھے لگا کر بہت اندر تک لے گیا۔ وہب اللات کو اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا جب وقت گزر چکا تھا۔ اس نے خود کو دشمنوں کے نرغے میں دیکھا۔ مگر فرار ہونے کے بجائے لڑتے ہوئے مر جانے کو ترجیح دی۔ اس نے بڑھ کر حملہ کیا۔ اس کے سپاہیوں کو دم زدن میں دشمن نے کاٹ ڈالا۔ ان کی تعداد ہی کتنی تھی!

وہب اللات کا جسم زخموں سے چور تھا مگر ابھی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی جب اس کا گھوڑا بہت زخمی ہو گیا تو وہ نیچے کود گیا۔

☆......☆......☆

''پھر اسے قصہ گو' شہزادہ مارا گیا ہوگا۔'' عارج قصے کے درمیان بول اٹھا۔

قصہ گو اچانک یوں چونک اٹھا جیسے خیال و خواب کی دنیا سے واپس آنے میں اسے دیر لگ رہی ہو۔

میں نے عارج کو مخاطب کیا۔ ''اے طبیب! قصہ ابھی ختم نہیں ہوا۔''

قصہ گو اب اپنے حواس میں لوٹ آیا تھا' کہنے لگا۔ ''قصہ ختم تو نہیں ہوا...... لیکن......''

''لیکن کیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''ملکہ زنوبیا کا قصہ اب ختم ہونے والا ہے مگر میں بہت تھک گیا ہوں' اجازت ہو تو آئندہ جمعے کو......''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے قصہ گو کی بات کاٹ دی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہب اللات نے اپنے مدمقابل کو بھی گھوڑے سے گرا لیا۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا اور سوار نیچے آ رہا۔ سوار کے ساتھ گھوڑا بھی گرا تھا۔ گرنے کے بعد گھوڑا اٹھنے کی کوشش میں تھا کہ وہب اللات اچھل کر اس پر سوار ہو گیا۔ اس کی تلوار دشمنوں کے خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ دیر تک دشمنوں سے اکیلا لڑتا رہا۔ زبدہ اب تک دشمنوں کا حصار توڑ کر اس تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ خود وہ اور اس کے ساتھی چاروں طرف سے گھیر لئے گئے تھے۔

حرمان اب تک وہب اللات سے دور دور تھا۔ وہب اللات نے ایک رومی سپاہی کے سینے میں تلوار اتارتے ہوئے حرمان کو دیکھا اور لمحہ بھر کو ادھر متوجہ ہو گیا۔ رومی سپاہیوں کو موقع مل گیا۔ انہوں نے وہب اللات پر حملہ کرتے ہوئے زور کا نعرہ لگایا۔ دوسرے ہی لمحے

بیک وقت کئی تلواریں وہب اللات کے جسم میں پیوست ہوگئیں۔ وہ منہ کے بل گھوڑے سے گرا۔ اس کا جسم رومی سپاہیوں کے گھوڑوں نے روند ڈالا۔

زبدہ نے لڑتے لڑتے دشمن کے پرجوش نعرے سنے۔ پھر وہب اللات کے قتل کی خبر ایک دم ہر طرف پھیل گئی۔ تدمری سپاہی مایوس ہو کر بھاگنے لگے۔ ایک سپاہی نہایت زخمی حالت میں بہت مشکل سے جان بچا کر ملکہ زنوبیا تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ زنوبیا پر یہ خبر بجلی کی طرح گری۔ زخمی سپاہی نے بتایا کہ زبدہ بھی دشمنوں کے گھیرے میں ہے۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ زنوبیا اپنے حواس برقرار نہ رکھ سکی مگر لونگی نوس اسے سنبھالے رہا۔

اسی روز آدھی رات کے قریب لونگی نوس نے غم زدہ ملکہ کو ایک سانڈنی پر سوار کیا اور تن تنہا اسے محل سے نکال لے گیا۔ بدقسمتی سے دشمن کو بروقت سن گن ہوگئی۔ رومی سواروں کا ایک مشعل بردار دستہ تعاقب میں دوڑا۔ ملکہ زنوبیا اور لونگی نوس دریائے فرات عبور کرنے سے پہلے گرفتار کر لئے گئے۔

روم جنگ جیت چکا تھا۔ زنوبیا اور لونگی نوس زنداں میں پہنچ چکے تھے۔ باہر کی دنیا سے ان کا تعلق بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ وہ دونوں شکست پر نہایت شرمسار اور ملول تھے' لیکن انہیں خوشی تھی کہ دونوں ساتھ ہیں۔

ایک روز زنوبیا نے لونگی نوس سے کہا۔ ''تعجب ہے کہ ہم اور تم اب تک زندہ کیسے ہیں مگر شاید ہمیں زیادہ دن تک زندہ نہ رہنے دیا جائے۔''

''تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' لونگی نوس مضمحل آواز میں بولا۔ ''حرمان تمہیں شہنشاہ روم سے مانگ لے گا۔''

زنوبیا کا چہرہ دہک اٹھا' کہنے لگی۔ ''اگر ایسا ہوا تو یقین کرو وہ ہمیں ہاتھ لگانے سے پہلے ہی موت کی نیند سو جائے گا۔''

لونگی نوس کی بات صحیح ثابت ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ایک دن ملکہ زنوبیا اور لونگی نوس کو زنداں سے نکالا گیا۔ دونوں کے پیروں میں زنجیریں پڑی تھیں۔ انہیں تدمر کے نئے حاکم حرمان کے دربار میں لے جایا گیا جس مسند پر کبھی زنوبیا بیٹھتی تھی' آج اس پر حرمان بیٹھا تھا۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر ان دونوں کے سر زبردستی حرمان کے سامنے جھکا دیئے۔ لونگی نوس نے گردن اٹھا کے قہر آلود نظروں سے حرمان کو دیکھا' پھر بلند آواز میں بولا۔

''بدبخت! گستاخ! کیا تو بھول گیا کہ میں تیرا استاد ہوں اور یہ خاتون تدمر کی ملکہ زنوبیا ہیں' جو تیرے لئے ہمیشہ قابل تعظیم رہی ہیں۔ سو ہمیں زنجیروں میں جکڑے دیکھ کر تجھے شرم نہیں آتی؟''

''ہم نے تم دونوں کی زندگی بچائی ہے' عالی مرتبت شہنشاہ روم تم دونوں کو قتل کر دینا چاہتے تھے۔ صرف ہماری گزارش پر انہوں نے تمہاری جاں بخشی کی ہے۔'' حرمان نے چند لمحے توقف کیا پھر بولا۔ ''لونگی نوس' میرے استاد! تمہیں یونان واپس جانے کی اجازت ہے...... اور جہاں تک ملکہ عالیہ کا تعلق ہے تو یہ بدستور ملکہ عالیہ رہیں گی۔'' زنوبیا کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ حرمان نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''ان دونوں کی زنجیریں کاٹ دی جائیں۔''

زنوبیا اور لونگی نوس کی زنجیریں کاٹ دی گئیں۔ زنجیریں کٹتے ہی زنوبیا نے تیزی کے ساتھ ایک سپاہی کی پیٹی سے خنجر کھینچ لیا اور بپھری ہوئی شیرنی کی طرح حرمان پر جھپٹی' اس سے پہلے کہ حرمان کے محافظ تلواریں کھینچتے' زنوبیا نے حرمان کو تخت سے گھسیٹ لیا اور پے در پے وار کرنے لگی۔ حرمان نے دیکھتے ہی دیکھتے دم توڑ دیا۔

تدمری درباریوں نے نعرہ بلند کیا۔ ''بنت زبائی زندہ باد!''

دربار میں جو رومی سردار موجود تھے' انہوں نے تلواریں اٹھائیں مگر ان کی تعداد کم تھی۔ تدمر کے لوگوں نے انہیں لمحوں میں ٹھکانے لگا دیا۔ دربار میں خون ہی خون پھیل گیا۔ مقابلہ سخت تھا۔ ایک تاج کے لئے کئی سر قلم ہو چکے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد دوبارہ ملکہ زنوبیا کی حکمرانی کا اعلان کر دیا گیا' مگر لونگی نوس مطمئن نہیں تھا۔ اس نے تخلیہ ہوتے ہی زنوبیا سے کہا جن سرداروں کی مدد سے تخت دوبارہ ملا ہے وہ ابن الوقت ہیں' سخت مطلبی ہیں' ان پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ ہم یہاں بدستور خطرے میں ہیں' ہمیں یہاں سے چپ چاپ نکل جانا چاہئے۔

زنوبیا بولی۔ ''نہیں لونگی نوس! ان میں سے بیشتر افراد ہمارے وفادار ہیں' حرمان کا فتنہ ختم ہو چکا ہے' اب کوئی تدمر کا دعوے دار نہیں' شہنشاہ روم بھی واپس جا چکا ہے اغلب ہے کہ وہ اب یہاں نہیں آئے گا۔''

''اور اگر آ گیا؟''

''تو ہم اس سے لڑیں گے۔'' زنوبیا پرعزم آواز میں بولی۔

لونگی نوس نے اسے اونچ نیچ سے آگاہ کیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اس کی ہمت دیکھ کر لونگی نوس خاموش ہو گیا۔

☆......☆......☆

شہنشاہ روم اور یلیاں ابھی سہلیس پانٹ نہیں پہنچا تھا کہ اسے خبر ملی تدمر میں بساط الٹ گئی ہے۔ لونگی نوس کی شخصیت اور سرگرمیوں کے بارے میں بھی اسے تفصیل سے بتایا گیا۔ وہ پہلے بھی لونگی نوس کا نام سن چکا تھا۔

''اس دو غلے عرب کو ہم زندہ نہیں چھوڑیں گے!'' اور یلیاں غصے سے بولا' پھر اپنی فوجوں کو حکم دیا۔ ''پلٹ کر تدمر پر حملہ کر دیا جائے۔''

تدمری افواج کو سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ وہ بہت بہادری سے لڑیں مگر شکست کھا گئیں۔ لونگی نوس ایک بار پھر زنوبیا کو لے کر فرار ہو گیا اور یلیاں تلملا کے رہ گیا۔ تدمر کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی ایسی تباہی پہلے کبھی تدمر پر نہیں آئی تھی۔

لونگی نوس اپنے شہر حمص پہنچ چکا تھا۔ زنوبیا اس کے ساتھ تھی۔ حمص والوں نے لونگی نوس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا کیونکہ انہیں تدمر کے قتل عام کی خبریں مل چکی تھیں۔ وہ بے حد ڈرے ہوئے تھے اور یلیاں کو لونگی نوس اور زنوبیا کی گرفتاری میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

لونگی نوس کو بھاری زنجیروں میں شہنشاہ روم کے حضور پیش کیا گیا۔ شہنشاہ اسے دیکھتے ہی آگ بگولہ ہو گیا۔ ''بدنصیب تو ایک عالم فاضل انسان ہے' لیکن افسوس کہ تو نوشتہ دیوار نہ پڑھ سکا۔''

''بادشاہ سلامت بھی اپنا نوشتہ دیوار نہیں پڑھ سکے ہیں۔'' لونگی نوس نے سکون سے کہا۔ ''روم زیادہ عرصے عربوں کو غلام نہیں رکھ سکتا۔ یہ قوم اب جاگ اٹھی ہے۔''

اور یلیاں بگڑ کر بولا۔ ''مگر تو عرب کب ہے؟''

''میری ماں شامی تھی لہٰذا میں عرب ہوں اور اپنے عرب ہونے پر مجھے فخر ہے۔''

اور یلیاں نے طیش میں حکم دیا کہ تدمر کی باغی عورت کو لایا جائے اور اس کے سامنے اس بدزبان کو قتل کر دیا جائے۔

زنوبیا کو لایا گیا اس کا چاند اب تک ماند نہیں پڑا تھا۔

شہنشاہ روم نے زنوبیا کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ زنوبیا پابہ زنجیر تھی اور اس کا حال

خراب تھا۔ پھر بھی وہ ایک ملکہ معلوم ہو رہی تھی۔ اور یلیاں اب سمجھا کہ زنوبیا کی کس خوبی نے عربوں میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ زنوبیا کو دیکھ کر لونگی نوس کے چہرے پر شادابی آ گئی۔ جب تک اس کی گردن تن سے جدا نہ کر دی گئی اس کی نظریں زنوبیا کی طرف اٹھی رہیں۔ ادھر لونگی نوس کا سر کٹ کے گرا' ادھر زنوبیا غش کھا کے گر پڑی۔

☆......☆......☆

زنوبیا کو ہوش آیا تو شہنشاہ روم اسے اپنے ہمراہ روم لے جا رہا تھا۔ بے ہوشی ہی میں اسے زیورات اور جواہر پہنا دیئے گئے تھے۔ شہنشاہ کے جلوس میں زنوبیا کی سواری سب سے نمایاں تھی۔ اسے ایک رتھ میں بٹھایا گیا تھا۔ رتھ کے چاروں طرف مسلح رومی سوار تھے۔ شہنشاہ اسی شان سے روم کے دارالحکومت میں داخل ہوا۔

اور یلیاں نے زنوبیا کی جان بخش دی اور تودلی کے مقام پر اسے ایک عالی شان قصر سکونت کے لئے دے دیا۔ قصر میں زنوبیا کے واسطے زندگی کی تمام آسائشیں فراہم کی گئیں' مگر اس نے موقع ملتے ہی زہر کھا لیا۔ یہ زہر ایک انگوٹھی میں تھا جو تدمر کی نامور ملکہ زنوبیا کی انگلی میں ہمیشہ جگمگاتی رہتی تھی۔

☆......☆......☆

حقیقت یہ ہے کہ قصہ گو نے سماں باندھ دیا تھا۔ تدمر کی زنوبیا کا چہرہ مہرہ یوں میری آنکھوں میں گھوم گیا جیسے میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ اسے بہرحال قصہ گو کا کمال ہی کہا جائے گا کہ اس نے اپنے ہنر سے ایک مردہ زمانے کو زندہ کر دیا تھا۔ سو میں نے اس کی تعریف میں کہا۔ ''تو نے ہمیں خوش کر دیا سو اب ہم پر بھی لازم ہے کہ تجھے خوش کر دیں۔''

قصہ گو میرا اشارہ سمجھ گیا اور بولا۔ ''مگر سرائے کے مالک......''

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''فکر نہ کر' تجھ سے جواب طلبی نہیں ہو گی ہم اپنی مرضی سے تجھے انعام دے رہے ہیں۔''

دینار میرا نام بھی تھا اور اس قیمتی سکے کا نام بھی جو ساری مملکت میں چلتا تھا۔ دینار سرخ سونے کے سکے کو کہتے تھے۔ میرے ماں باپ نے مجھے بہت قیمتی جان کر ہی شاید میرا نام دینار رکھا تھا۔

قصہ گو کو میں نے دس دینار سرخ دیئے تو اس نے اٹھ کر فرشی سلام کیا۔ اس عرصے میں عارج کے ساتھ میں اس مکان سے نکل آئی۔ پھر ہم واپس حربیہ آ گئے۔ بغداد میں اب میری توقیر پہلے کی نسبت خاصی بڑھ گئی تھی۔

عالم سوما سے میرا رابطہ اب تک بحال تھا۔ تعلیم جاری تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اپنے آخری مراحل میں تھی۔ سوما سے میں بہت کچھ سیکھ چکی تھی اگلے روز وقت مقررہ پر جب میں اس کے پاس پہنچی تو بولی۔ ''اے سوما! تو نے مجھ سے ایک ایسے عمل کا ذکر کیا تھا جو مختلف زمانوں اور نئے جہانوں کی سیر کرا سکتا ہے وہ گزرے ہوئے زمانے بھی ہو سکتے ہیں اور آنے والے زمانے بھی! تو نے بتایا تھا کہ وہ عمل صرف جنات کر سکتے ہیں اسی عمل کے ذریعے دنیا میں بولی جانے والی مختلف زبانوں کی آگہی بھی میرے لئے دشوار نہ ہوگی...... تجھے یاد آیا؟''

''ہاں' کیوں نہیں اے دینار! مجھے سب یاد ہے تو بتا کہ تیرا ارادہ کیا ہے؟''

''میں وہ عمل کرنا چاہتی ہوں اے سوما!''

سوما کچھ دیر چپ رہا' پھر بولا۔ ''اچھا تو عمل شروع کر' باقی باتیں ہوتی رہیں گی۔''

''تو پھر کل رات......''

میری بات پوری نہ ہوئی تھی کہ عارج بول اٹھا۔ ''اے سوما! ہم تجھے کل سوچ کر بتا دیں گے۔''

سوما کو اس پر کیا اعتراض ہوتا البتہ مجھے عارج کی مداخلت اچھی نہ لگی۔ اس وجہ سے جب تعلیم کا وقت ختم ہوا اور میں کھنڈرات سے نکل کر عارج کے ساتھ صحرا میں پہنچی تو اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ''تجھے آخر میری بات کاٹنے کی کیا پڑی تھی؟'' میں بولی۔

''کیوں' کیا مجھے تجھ پر کوئی حق نہیں اے دینار؟''

''ابھی میں نے تجھے یہ حق دیا کب ہے!'' میں نے اسے جان بوجھ کر چڑایا۔

''تو مجھے...... ٹھیک ہے' اب میں تیرے بیچ میں نہیں بولوں گا۔ تو جانے اور سوما' مجھے کیا!''

''ناراض ہو گیا کیا؟''

''دینار! تو بات ہی ایسی کرتی ہے کہ دوسرا چڑ جائے۔''

''دوسرا کون؟...... یہاں تو بس میں ہی میں ہوں تو مجھ سے الگ ہے کیا اے عارج؟''

''پہلے بھی تیری اس طرح کی باتیں سن چکا ہوں میں! پاگل نہ بنایا کر!''

''بنانے سے تیرا مطلب کیا ہے اے عارج؟ بنایا تو اسے جاتا ہے جو پہلے سے بنا نہ ہو!''

''یعنی تو مجھے پاگل سمجھتی ہے؟''

''تو یہ کیا کوئی پوچھنے کی بات ہے!'' میں ہنس پڑی۔ عارج کو بھی مجبوراً میرا ساتھ دینا پڑا۔

اس رات خاصے بحث مباحثے کے بعد یہ طے ہوا کہ آئندہ رات سے مجھے وہ عمل شروع کر دینا ہے' جس کی تکمیل کے بعد صرف اپنے ارادے کے بل پر میں ماضی یا مستقبل میں سفر کر سکتی تھی۔ عارج فوری طور پر اس عمل کے لئے تیار نہ ہو سکا۔

وہ عمل بھی چالیس دن کا تھا اور یہ اس طرح گزر گئے کہ پتا ہی نہ چلا۔

عالم سوما نے میرے ایک سوال کے جواب میں وضاحت کی۔ ''اے دینار! وقت کے جس لمحے سے تو ماضی یا مستقبل میں جائے گی' اسی میں لوٹ کر آئے گی۔''

اس پر عارج خوش ہو گیا اور روٹھی آواز میں مجھ سے کہنے لگا ''یہ تو بہت ہی اچھا ہوا' مجھے تجھ سے جدا نہیں رہنا پڑے گا۔''

قصہ گو مجھے ماضی کے ایک عہد کی سیر گویا کرا ہی چکا تھا۔ سو مجھے تجسس تھا تو آنے والے زمانوں کا۔ اس کے لئے مجھے مستقبل کی سیر کرنی تھی کہ فی الوقت کہاں ٹھہروں؟ میں نے اس میں بھی دیر نہ لگائی۔ مجھے جہاں تجسس محسوس ہوا' وہاں رک گئی۔

میں نے جو کچھ دیکھا اور میرے علم میں آیا' بیان کرتی ہوں۔

☆......☆......☆

الودھیا اب صرف چھ کوس کی مسافت پر رہ گیا تھا۔ اس لئے شاہی قاصد نے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کر دی۔ دائیں بائیں چلنے والے گھڑسواروں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ان کے چہروں سے اب اطمینان جھلک رہا تھا۔ سورج طلوع ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ سردی کا زمانہ تھا' دھوپ انہیں بھلی سی لگ رہی ہوگی۔

شاہی قاصد ہندوستان کے فرماں روا ظہیر الدین بابر کا ایک اہم فرمان لے کر اودھ کے مغل حاکم محمد سلطان مرزا کے پاس جارہا تھا۔ حاکم اودھ ان دنوں ایودھیا آیا ہوا تھا۔ محمد سلطان مرزا' بابر کے اہل خاندان میں تھا۔ بابر اسے اپنے بیٹوں کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ رشتے میں وہ بابر کا بھتیجا اور ہمایوں کا چچازاد لگتا تھا' ہمایوں کا ہم عمر ہونے کے باوجود محمد سلطان مرزا عالم جوانی میں بھی بڑی سوجھ بوجھ کا مالک تھا۔ شجاعت اسے ورثے میں ملی تھی۔ پانی پت کے میدان میں جب بابر کا مقابلہ ابراہیم لودھی سے ہوا تھا تب بھی محمد سلطان مرزا ساتھ تھا۔ دائیں جانب میمنے پر بابر کا فرزند ہمایوں تھا اور بائیں جانب میسرے پر محمد سلطان مرزا تھا۔

اس جنگ میں بابر کی بارہ ہزار فوج کے مقابل تقریباً ایک لاکھ کا لشکر تھا۔ اس ایک لاکھ کے لشکر میں لڑاکا راجپوت بھی شامل تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ گوالیار کا راجا بکرماجیت بھی ابراہیم لودھی کا ساتھ دے رہا تھا۔

لودھی فوج کی زبردست بالادستی کو غیر موثر بنا دینے کی صرف یہی صورت تھی کہ کسی ایسے مقام پر جنگ لڑی جائے جو اپنے جائے وقوع کے اعتبار سے مغل فوج کے لئے مناسب ہو۔ بابر نے اسی لئے براہ راست دہلی کا رخ نہیں کیا اور پانی پت کو منتخب کیا۔ ابراہیم لودھی کی فوج پانی پت کے جنوب میں تھی۔ بابر کی فوج آسانی کے ساتھ دو منزل طے کر کے پانی پت کی آبادی میں داخل ہوسکتی تھی۔ یوں وہ پانی پت کے گھروں اور عمارتوں کو اپنے داہنے بازو کے لئے بطور پناہ استعمال میں لاسکتی تھی۔

بابر نے احتیاط کے ساتھ اپنی فوج کی ترتیب کا منصوبہ بنایا۔ خام چمڑے کی رسیوں سے بندھے ہوئے سات سو چھکڑوں کو کام میں لا کر اس نے اپنے کمزور محاذ کو کثرت تعداد سے بچایا۔ ہر چھ یا سات چھکڑوں کے بعد ایک دفاعی پشتہ تھا جہاں توپچیوں اور بندوقچیوں کو متعین کیا گیا تھا۔ یہ تمام تیاریاں کرنے کے بعد بابر دو منزل آگے بڑھا اور 12 اپریل 1526ء کو پانی پت پہنچ گیا۔

شہر پانی پت نے اس کے داہنے بازو کو حفاظت مہیا کی اور بائیں بازو کی حفاظت ایک خندق کھود کر اور کٹے ہوئے درختوں کی مورچہ بندی کے ذریعے کی گئی۔ دفاعی پشتوں اور چھکڑوں کی ایک قطار کے ذریعے قلب لشکر کو تقویت پہنچائی گئی' لیکن صفوں میں کچھ کچھ دوری پر خالی جگہیں چھوڑ دی گئیں جو اتنی چوڑی تھیں کہ پچاس یا سو گھڑسوار اس میں سے نکل کر حملہ آور

ہوسکیں۔ یہ قطار دفاعی سے زیادہ ایک جارحانہ تدبیر تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دشمن کی صفوں کو ایک لمبے محاذ پر الجھائے رکھا جائے تاکہ اس کی فوج کے دونوں کناروں پر بہ آسانی حملہ کیا جا سکے۔

12 اپریل کے بعد تقریباً ایک ہفتے تک ابراہیم لودھی کی فوج جنگ کا آغاز کئے بغیر میدان میں کھڑی رہی۔ باہمت باپ کا بزدل بیٹا خود آگے بڑھ کر حملہ آور ہونے کا حوصلہ نہ کر پایا۔ 19 اپریل کو خود بابر نے پیش قدمی کی مگر یہ پیش قدمی محض دکھاوا تھی۔ بہرحال چند دنوں بعد جنگ شروع ہوگئی۔

بالکل گھٹی ہوئی ایک جماعت میں جکڑے ہونے کے باعث ابراہیم لودھی کی فوج نہ آگے بڑھ سکتی تھی نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی۔

صبح چھ بجے جنگ شروع ہوئی اور دوپہر تک ابراہیم لودھی کی فوج حوصلہ ہار گئی۔ میدان جنگ لاشوں سے ڈھک گیا۔ انہی لاشوں میں ابراہیم لودھی کی لاش بھی تھی اور گوالیار کے راجہ بکرماجیت کی لاش بھی۔ ابراہیم لودھی کے سوا ہندوستان کا کوئی مسلمان فرمانروا میدان جنگ میں نہیں مارا گیا۔ سلطنت دہلی کی پیدائش 1192ء میں ہوئی تھی' مقام ترائن کا میدان تھا۔ اسی سلطنت نے 1526ء میں چند میل دور پانی پت کے میدان میں آخری سانس لیا۔

بابر کی شہ سوار' مغلوب لودھی فوج اور حواس باختہ راجپوتوں کے تعاقب میں پیام اجل بنے ہوئے اپنے گھوڑوں کو دوڑا رہے تھے۔ اسی تگ و دو میں بابر کی نظر ابراہیم لودھی کی لاش پر پڑی اور اس کا دایاں ہاتھ بلند ہوگیا۔ بہادر لشکریوں نے اپنی باگیں کھینچ لیں۔ فتح کے اعلان کے ساتھ ہی امرانے تہنیت و مبارکباد دی۔ بابر نے اسی روز آگرے کی تسخیر اور دہلی کے خزانہ و جواہر کی ضبطی کے لئے احکام جاری کئے۔ وہیں سے اس نے ہمایوں کو تو آگرے کے لئے روانہ کیا اور خود محمد سلطان مرزا نیز دیگر امراء لشکر کے ساتھ دہلی کی طرف کوچ کر گیا۔ آگرے کے قلعے پر اس وقت تک گوالیار کے راجہ بکرماجیت کے آدمی قابض تھے حالانکہ راجہ مارا جاچکا تھا۔

بابر کے ساتھ شیخ زین الدین بھی تھے جن کا شمار بڑے علماء و مشائخ میں ہوتا تھا۔

جب وہ دہلی پہنچے تو خطبے میں شیخ نے اس کا نام پڑھا۔

دوسرے دن بابر نے دہلی کے قدیم قلعے شاہی محلات اور باغات کی سیر کی۔ اس

کے بعد وہ حضرت نظام الدین اولیاؒ حضرت بختیار کا کیؒ اور دیگر مشائخ کرام کے مزاروں کی زیارت کرنے گیا۔ وہاں سے وہ لوٹا تو اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ شیخ زین الدین بھانپ گئے کہ ان کی محنت رنگ لے آئی ہے۔ بابر نے اسی کیفیت میں میر ساغر کو طلب کیا۔ اس کے اردگرد جو لوگ موجود تھے انہوں نے سمجھا کہ فتح کی خوشی میں اب دور ساغر چلے گا' مگر جب میر ساغر بابر کے حضور پیش ہوا تو شیخ زین الدین کے سوا سبھی دنگ رہ گئے۔ بابر کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

''سونے چاندی کی صراحیاں' جام اور دیگر مینا کار ظروف مے نوشی حاضر کئے جائیں!'' بابر نے حکم دیا۔

اس کے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں کی گئی۔

بابر بولا۔ ''انہیں توڑ کر فقیروں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا جائے ہم آج سے ترک مے نوشی کا اعلان کرتے ہیں۔''

اسی وقت کئی امراء نے بابر کی تقلید میں ترک مے نوشی کا عہد کیا۔ شیخ زین الدین کے ہونٹوں پر بڑی آسودہ مسکراہٹ تھی۔ جس دن بابر نے شراب سے توبہ کی' اس روز اور دوسرے دن کی رات تک قریب تین سو امیروں اور عمال و دیگر افراد نے مے خوری سے توبہ کی۔ اس موقع پر شیخ زین الدین نے بابر کو اس کا ایک عہد بھی یاد دلایا۔

''اے شیخ! آپ نے اچھا یاد دلایا۔ ہاں ہم اپنے وعدے کو پورا کرتے ہیں۔ محصول مسلمانوں کو معاف کیا جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر بابر نے کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے میر منشی کو مخاطب کیا جو بابر کے احکام لکھ رہا تھا۔ ''ہماری جانب سے ایک فرمان لکھو! اس فرمان میں ہم ان ہر دو واقعات کا اعلان کرنا چاہتے ہیں۔''

کچھ ہی دیر میں میر منشی وہ فرمان لکھ رہا تھا جس میں شراب بندی کے اعلان کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے لئے محصول معاف ہونے کی نوید تھی۔ یہ فرمان ان تمام علاقوں کے لئے تھا جو بابر کے زیر نگیں آ چکے تھے۔ کابل' بدخشاں و قندھار اور لاہور و ملتان سے لے کر اب دہلی نیز وہ سارے علاقے بابر کی حدود مملکت میں شامل تھے جن پر ابراہیم لودھی کی حکومت تھی۔

''فرمان بادشاہ'' لکھوا کر بابر نے چند لمحے توقف کیا اور پھر روانی سے بولنے لگا۔

میر منشی کا قلم بابر کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کو کاغذ پر رقم کرتا جا رہا تھا وہ فرمان بہ اختصار یہ تھا۔

''شکر ہے اس کا جس کی ذات غفور الرحیم ہے اور جو توبہ کرنے والوں کو اپنا دوست رکھتا ہے' اور وہ لوگ جو اپنے تئیں کثافت گناہ سے دور رہتے ہیں' انہیں عزیز رکھتا ہے۔ شکر ہے اس ذات پاک کا جو گمراہوں کو راہ راست دکھلاتا ہے اور ان لوگوں پر جو اس کے طالب ہوتے ہیں' اپنا فضل و کرم کرتا ہے۔

انسان کی خواہشات نفسی' برائی سے بالکل مبرا اور معرا نہیں ہوتیں۔ اسی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے خیالات بھی پاک و صاف نہیں ہیں کیونکہ برائی سے بچایا توبہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں بلکہ یہ خدا کی رحمت پر منحصر ہے۔ اگر وہ چاہے تو انسان بدخوئی دور کر سکتا ہے۔

میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ وصف اسی ذات خدا میں ہے کہ جو کوئی اس سے کسی بات کا طالب ہوتا ہے' وہ اس کو دیتا ہے اور حقیقت میں وہ بڑا رحیم و کریم ہے۔

بوجہ طریق و رسم رائج شاہی اور طرز معاشرت رعیت کی ضرور ہے کہ بہت سے افعال اور حرکات غیر مشروع ابتدا سے شاہ اور اس کی فوج میں ہوتے آئے ہیں۔ اب ایک عرصے کے بعد تاسف اور توبہ کی کنجی سے ان کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کئے جاتے ہیں۔ وہ افعال ناجائز اب بالکل ترک کئے جاتے ہیں۔

رسم مے نوشی جس کی اصلاح لازمی ہی نہیں بلکہ فرض عین ہے' اب تک پردے میں نہاں تھی اور شاید اس کے ترک کی ہم کو بہت ضرورت تھی' الحمدللہ کہ اب عیاں ہوئی۔ میں نہ صرف اپنے بلکہ تمام اہل اسلام کے اعتقاد سے کہہ سکتا ہوں کہ شاید وہ گھڑی اور ساعت مبارک تھی جب اس متروکی اور ممانعت کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا اور شاید ایسا ہی منظور خدا تھا۔

میں نے حتی الوسع برائیوں کی بیخ کنی میں کوشش کی اور در توبہ پر پوری گریہ وزاری کی۔ میری التجا قبول ہوگئی اور اس نے مجھ پر از راہ کرم راہ راست کھول دی۔ میں بھی خواہشات نفسانی کے مقابل پوری جنگ کرنے کو آمادہ ہوگیا۔ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے نیک اور پاک خیالات کی قوی تر فوج' کے ذریعے نفس کو شکست فاش دی۔ میں نے بالکل

صادق عہد کیا ہے کیونکہ توبہ کے بعد ہی خود کو اہل اسلام میں شمار کیا ہے۔ بہ مصداق اس مثل کے وزیر چنیں شہر یار چناں' بہت سے میرے ہم نشیں اور اصحاب نے مے نوشی سے توبہ کی۔ اسی پر بس اور خاتمہ نہ تھا بلکہ ہر طرف سے یہی صدائے مسرت افزا آ رہی تھی کہ میری رعیت شراب سے توبہ کر رہی ہے۔ واقعی اس وقت چاروں طرف سے نفس کو شکست ہو رہی ہے' ایمان غالب آ رہا ہے' میرا بھی یہی خیال ہے کہ میں اور میری رعیت اگر افعال غیر شروع سے اجتناب کرے گی تو اس کا نتیجہ میری فتح ونصرت ہوگا۔

اغلب ہے کہ میری تمام قلمرو میں جس کا نگہبان خدائے مطلق ہے اور جو اسے تمام آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رکھے' اگر فرمان پر پورے طور پر عمل درآمد ہوا تو شاید نہ کوئی شراب پینے والا ہوگا' نہ بنانے والا' نہ بیچنے والا' نہ خریدار' نہ لے جانے والا' نہ رکھنے والا' نہ لانے والا۔ دیکھو اس مردار سے تنفر کرو اور بچو! تمہیں اس کا نیک ثمر ملے گا کیونکہ اس قسم کی نفس کشی کا بدلہ خدا کے گھر نیک ہے۔ اس وقت جب کہ نیک مصالح درپیش ہیں' میں حسب نیت اپنی' بہ وجہ اس کے کہ دل میں بہت جوش وخروش ہے اور نیز یہ خیال بھی ہے کہ رعیت چو بیخ است سلطان درخت' یہ فرمان بھی جاری کرتا ہوں کہ کل مسلمانوں کو جو میری قلمرو میں آباد ہیں' محصول معاف کرتا ہوں۔ احکام جاری کئے جاتے ہیں کہ کسی شہر' قصبے' سڑک' گلی' راہ یا بندرگاہ میں جہاں تک میری عملداری کا شمارا ہے ہرگز ہرگز نہ کوئی محصول لے اور نہ کوئی دے۔ ان احکام پر فوری عملدرآمد کیا جائے۔

اگر کوئی شخص ان راست احکام کے خلاف عمل کرے گا تو اس پر یہ جرم عائد ہوگا کہ اس نے ترمیم احکام کا عہد کیا۔ سپاہان نامدار' فتح نصیب وصف شکن جو اس دولت کے زیر سایہ ہیں' کیا عربی' ترکی یا غیر ترکی' ہندی یا فارسی اور کل ملازمان صیغہ جات دیوانی اور فوج داری اور ہر ایک قوم کے پیرو' انہیں لازم ہے کہ خدا کی رحمت پر بھروسا کریں' اس کی شکر گزاری اور اطاعت وعبادت میں تغافل نہ کریں' اور ان احکام کی پابندی سے ہرگز گریز و دریغ نہ کریں بلکہ فرمان کے احکام کو فرض عین سمجھ کر بہ دل و جان اس کی تعمیل کریں۔ اس کا ثمر نہ صرف دنیا بلکہ عقبیٰ میں بہتر اور برتر ہوگا۔ جس وقت فرمان مع مہر و دستخط سلطان مرتب ہو جائے' اس وقت کل امرائے دولت و اراکین سلطنت اور جملہ خرد و کلاں اس پر عملدرآمد کریں۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی بابر خاموش ہوگیا۔ میر منشی نے بہ عجلت اٹھ کر تحریر کردہ فرمان

ملاحظے کے لئے پیش کیا۔ بابر نے اسے پڑھ کر دستخط کر دیئے۔ پھر اسی کے سامنے شاہی مہر فرمان پر لگائی گئی۔ محمد سلطان مرزا کو بابر نے حکم دیا کہ وہ اپنی نگرانی میں اس فرمان کی نقلیں کروائے' بابر سے دستخط کروا کر مہر لگوائے اور فرمان کو تمام مملکت میں بھجوائے۔ اس کے بعد بابر عصر کی نماز ادا کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ اذان کا وقت قریب تھا۔

بابر نے دہلی میں دس روز قیام کیا۔ اس عرصے میں اس نے تباہ شدہ ملک کے نظم ونسق کی طرف توجہ کی اور جہاں جہاں فتنہ وفساد کی خبریں مل رہی تھیں' وہاں وہاں فوجیں بھیجتا رہا' مگر یہ صرف وہ علاقے تھے جو دہلی سے زیادہ مسافت پر نہیں تھے۔ اس کے علاوہ روانہ کی جانے والی فوجی ٹکریوں کی تعداد بھی کم تھی۔ اس دوران میں دہلی سے فوج میں نئی بھرتی بھی کی گئی۔

دہلی سے بابر نے آگرے کی طرف کوچ کیا۔ بابر جب وہاں پہنچا تو ہمایوں قلعہ آگرہ پر قبضہ کر چکا تھا۔ اسی قلعے میں ہمایوں کو وہ الماس بھی ملا تھا جسے سلطان علاؤالدین خلجی دکن پر حملہ کر کے لایا تھا۔ ہمایوں نے یہ الماس بابر کو بطور نذر اس وقت پیش کیا جب وہ قلعہ آگرہ میں آیا۔ بابر نے بیٹے کی نذر قبول کر لی اور جوہریوں سے اس کے وزن و قیمت کی تشخیص کرائی' لیکن وہ الماس اتنا انمول تھا کہ اس کی صحیح قیمت کا تعین نہیں ہو سکا۔ بعد میں یہ الماس' تین لاکھ پچاس ہزار نقرئی تنکہ (چاندی کے روپے) اور سر بمہر ایک خزانہ جو ابھی شمار نہیں کیا گیا تھا بابر نے ہمایوں کو دے دیا۔ محمد سلطان مرزا کو دو لاکھ نقرئی تنکہ' جواہر اور دوسرے نفیس آلات بخشے گئے۔

جب آگرے کا کل خزانہ بابر کے حضور پیش ہوا تو اس نے حکم دیا کہ اس میں سے مکہ' مدینہ' کربلا' نجف اشرف' مشہد مقدس کے سادات اور علماء کو نیز دیگر ممالک کے بزرگوں کو بھی حصہ رسدی روانہ کیا جائے۔ آگرے کے دوران قیام میں بھی بابر مختلف دور دراز علاقوں میں فوج بھیجنے اور نئی بھرتی کرنے سے غافل نہیں رہا۔

☆......☆......☆

کچھ ہی عرصہ بخیریت گزرا تھا کہ بابر سے ایک شب شہباز خان اندجانی کی ملاقات ہوئی۔ شہباز خان بھیس بدلنے میں ماہر تھا اس لئے کوئی اسے نہ پہچان سکا۔ اس نے خود کو دہلی سے آنے والا ایک قاصد ظاہر کیا۔

بابر عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تھا کہ اسے قاصد کی آمد سے مطلع کیا گیا۔ بابر نے قاصد کو فوراً طلب کر لیا۔ تسلیمات کے بعد قاصد نے تخلیے کی درخواست کی تو بابر چونک اٹھا۔ اس نے قاصد کی طرف غور سے دیکھا۔ قاصد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''تخلیہ!'' بابر بہ آواز بلند بولا۔

حریری پردوں اور ستونوں کی آڑ میں چھپے ہوئے مسلح محافظ آہستگی کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گئے۔

''قریب آ جاؤ!'' بابر نے مسکراتے ہوئے شہباز خان کو مخاطب کیا۔

شہباز خان بلا جھجک بابر کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

''ایسی آخر کیا افتاد پڑ گئی شہباز خان کہ آج تمہیں خود آنا پڑ گیا؟ کہو ہم ہمہ تن گوش ہیں۔''

''اے میرے شاہ! ابھی عرض کرتا ہوں۔''

یہ کہہ کر شہباز خان نے سربمہر پیغام ایک طرف رکھ دیا۔ یہ پیغام تو صرف بابر تک پہنچنے کا ایک ذریعہ تھا۔ شہباز خان یہ نہیں چاہتا تھا کہ بابر سے اس کی ملاقات کا کسی کو علم ہو۔ بابر کے اردگرد بہت سے امراء ایسے تھے جو اسے پہچان سکتے تھے۔ ہمایوں اور محمد سلطان مرزا کیلئے بھی وہ اجنبی نہیں تھا۔ اسی سبب اس نے قاصد کا بہروپ بھرا تھا کہ کسی شناسا کی نظر پڑ جائے تو اسے شناخت نہ کر سکے۔ بابر نے بھی سربمہر پیغام کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ بھی معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا اور اب اس کی سوالیہ نظریں شہباز خان کی طرف اٹھی ہوئی

تھیں۔ شہباز خان نے کسی تمہید کے بغیر اصل گفتگو شروع کر دی۔ ''ہندوستان والے گھبرا گئے ہیں کہ سرزمین مغلوں کے زیر اقتدار آ گئی تو تمام افغان سرداروں اور ہندو راجاؤں پر زندگی تنگ ہو جائے گی۔ راجہ یہ تشہیر کر رہے ہیں کہ ہندو مذہب خطرے میں ہے۔ اطراف و اکناف کے راجاؤں' مشرقی پنجاب کے لودھی سرداروں' میواتیوں اور سرکش زمینداروں نے آپس میں مراسلت کے بعد اتفاق رائے کر لیا ہے۔ وہ سب ایک وفد کی صورت میں رانا سانگا اور رانا چتوڑ کے پاس فریاد لے کر جانے والے ہیں کہ یہ ملک امیر تیمور کی اولاد کے قبضے میں آ گیا تو وہ پھر یہاں سے نہیں نکلے گی۔ اسی ملک کو ٹھکانا بنا لے گی۔ وہ ہماری قومی بنیادوں کو ڈھا دے گی۔ یہ بھوکے مغل اپنے وطن والوں کے پاس ہمارے ملک کا جو تحفہ روانہ کریں گے وہ ہماری بہو بیٹیاں اور ہمارے بیوی بچے ہوں گے۔ ہماری قومی غیرت و حمیت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے نفاق کو اتفاق میں تبدیل کر لیں اور ہمت سے کام لے کر اپنے جان و مال' عزت و آبرو پر نثار کر دیں۔ ایک خبر یہ بھی ملی ہے کہ رانا سانگا خود ملک کے عالی خاندان راجاؤں اور بادشاہ زادوں سے ربط ضبط قائم کر رہا ہے۔ اس نے تقریباً دو لاکھ راجپوت اور پٹھان سواروں کو جمع کر لیا ہے۔ دو ہزار جنگی ہاتھی' توپ خانہ اور دوسرا تمام سامان جنگ بھی اس کے پاس ہے۔''

شہباز خان نے دھیمی آواز میں اپنی بات ختم کی تو بابر نے پہلو بدلا اور بولا۔ ''ہمیں اندازہ تھا شہباز خان کہ تم بلا سبب خود نہیں آئے ہو گے یقیناً تم ہمارے لئے اہم خبریں لے کر آئے ہو۔ اللہ پر بھروسا رکھو وہ ہمیں کفار کے سامنے شرمندہ نہیں کرے گا۔''

پھر مزید کچھ دیر بابر اور شہباز خان کے درمیان دھیمی آواز میں گفتگو ہوتی رہی۔ بابر نے جب اسے رخصت کی اجازت دیدی تو وہ تسلیمات بجا لا کر خلوت خانے سے باہر نکل آیا۔ اٹھنے سے پہلے سربمہر سادہ پیغام اس نے اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس میں چھپا لیا تھا۔

بابر کو جو اطلاعات شہباز خان کے ذریعے ملی تھیں چند ہی روز بعد ان کی تصدیق ہو گئی۔ رانا سانگا آگرے کی طرف کوچ کر چکا تھا۔ اس کے کوچ کی خبر آگرے پہنچی تو ہر بزم' ہر محفل میں تذکرے ہونے لگے۔ اس خبر کے آگرے پہنچنے سے پہلے تبدیلی آب و ہوا کی وجہ سے بیشتر مغل سپاہی اور اکثر امرا طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ منہ لگے امیروں نے خلوت میں بابر کو واپسی کیلئے آمادہ کرنا چاہا کہ حسب سابق وہ کابل لوٹ چلے۔ بابر ان کی باتیں سنتا تھا مگر سنی ان سنی کر کے ٹال دیتا تھا۔ اسی دوران میں بابر کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے عمال میں سے ایک نے کسی سے یہ کہا ہے کہ اگر میں بخیریت سندھ سے پار چلا

جاؤں تو لعنت ہے جو پھر ہندوستان کا رخ کروں۔ بابر نے اسے طلب کرلیا مگر وہ اپنی بات سے مکر گیا۔

"جس کا جی چاہے چلا جائے ہم منع نہیں کرتے۔" بابر نے اس عامل سے کہا اور دوسروں نے بھی یہ سنا۔

پھر نہ وہ عامل' بابر کو چھوڑ کر گیا نہ کسی امیر نے دوبارہ کابل واپس چلنے کی رٹ لگائی۔

بابر نے جو کہ شاعر بھی تھا اس واقعہ سے متاثر ہوکر کچھ اشعار لکھے جن کا مطلب یہ تھا۔ "اے بابر' خدا کا شکر ہے کہ جس نے تجھ پر فضل و کرم فرمایا۔ سندھ اور ہند کی حکومت تجھ کو عطا کی۔ اگر ہندوستان کی گرمی تجھے کوہستانوں کی یاد دلاتی ہے تو یہ بھی یاد کر کہ برف باری اور آوارہ گردی اس سے بھی بدتر ہے۔"

اسی اثنا میں بعض قابو چی افغان اور میواتی سردار جو مصلحت وقت کے سبب بابر سے آملے تھے خاموشی کے ساتھ راتوں رات آگرے سے نکل گئے۔ وہ اپنے اپنے علاقوں کی طرف چلے گئے۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ گوالیار کی وراثت کے دعوے دار منکت رائے نے خان جہاں بندیلہ کے ساتھ گوالیار پر فوج کشی کردی۔ تاتار خان قلعہ دار نے مدافعت کی وہ ابراہیم لودھی کا ملازم تھا۔ اس نے خود کو مجبور پاکر بابر کے پاس عرض داشت بھیجی کہ اگر بادشاہ سلامت اپنے کسی بھی آدمی کو بھیج دیں تو قلعہ اس کے سپرد کردیا جائے۔

اس درخواست پر بابر نے اپنے ایک امیر رحمٰن داد خان کو اس مہم پر جانے کا حکم دیا۔ راجہ منکت رائے کو چغتائی کمک کی اطلاع ملی تو اس نے محاصرہ اٹھالیا۔ منکت رائے کے جاتے ہی تاتار خان اپنے عہد سے پھر گیا۔ اس نے قلعہ سپرد کرنے سے انکار کردیا۔ پھر گوالیار ہی کے ایک حقیقت آگاہ بزرگ شیخ محمد غوث کے مشورے اور مدد سے رحمٰن داد خان نے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ مجبوراً تاتار خان نے جان و آبرو بچانے کی خاطر تمام خزانوں اور ذخیروں کی چابیاں رحمٰن داد خان کے حوالے کردیں اور اپنی بدعہدی کی معذرت کرنے لگا۔ رحمٰن داد خان نے اسے معاف کردیا۔ وہ رحمٰن داد خان کو واسطہ بنا کر فتح نامہ اور راضی نامہ لے کر بابر کے حضور حاضری کیلئے روانہ ہوگیا۔

ادھر آگرے پہنچ کر تاتار خان' بابر سے ملا ادھر چتوڑ کے رانا کے قریب پہنچنے کی خبریں آنے لگیں۔ پھر اودے پور کا رانا سانگا بھی اپنی کثیر فوج لے کر وہاں پہنچ گیا۔ دشمنوں

کی پیش قدمی اور ہجوم و غلبے کی پے درپے اطلاعات نے قدیم دکھن سال بہادروں کے دل بھی ڈانواڈول کردیئے لیکن بابر کے چہرے پر بلا کا سکون و اطمینان تھا۔ اس نے دشمن سے مقابلے کی تیاریاں شروع کردیں۔ اس کے حکم پر جاسوسوں کو دشمن کی خبریں لانے کیلئے روانہ کردیا گیا۔ اسی کے ساتھ بیانہ پر بادشاہی پیش خیمہ قائم کرکے پڑاؤ ڈال دیا گیا۔ اب غنیم کے لشکر کی کمان رانا سانگا کے ہاتھ میں تھی۔

ایک مغل سردار عبدالعزیز ایک جماعت کو ساتھ لے کر "قراولی" پر گیا تھا' زخمی ہوکر واپس آیا۔ اس کی جماعت کے بہت سے سپاہی مارے گئے۔ قراولی اس جماعت کو کہتے ہیں جو اصل فوج سے آگے دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے بھیجی جاتی ہے۔ اس جماعت کے صرف چند سوار لٹے پٹے واپس آئے۔ ان لوگوں نے آکر کافروں کی کثرت اور غلبے کا ایسا ڈھنڈورا پیٹا کہ خوف و ہراس پھیل گیا۔ بابر نے لشکر کے تمام سرداروں اور امرا کو جمع کرکے مجلس مشاورت منعقد کی اور ہر ایک کے ظرف و حوصلے کا اندازہ کرنے کیلئے رائے طلب کی۔ اکثر کی رائے یہی تھی کہ پنجاب اور کابل کی طرف کوچ کردیا جائے۔ انہوں نے اپنی اس رائے کے حق میں دلیلیں بھی دیں۔ بابر نے سب کچھ بڑے صبر و سکون کے ساتھ سنا مگر اس کے چہرے کی سرخی بڑھتی گئی۔ پھر جب وہ بولا تو سننے والوں کو یوں لگا جیسے اس کی آواز میں شعلے لپک رہے ہیں۔ اس کے الفاظ بڑے ولولہ انگیز تھے۔ اس نے کہا۔ "کیا یہی تمہاری دینی غیرت اور اسلامی حمیت ہے کہ جو ملک تم نے کوشش اور محنت کے بعد حاصل کیا' اسے کافروں کے خوف سے چھوڑ کر بھاگ جاؤ؟ کیا تمہارے دلوں سے شہادت کا جذبہ مفقود ہوگیا ہے۔؟" بابر کی آواز بلند ہوتی گئی۔ "یاد رکھو' اگر ہم کافروں پر غالب آگئے تو غازی ہوں گے ورنہ ہمیں شہادت کا درجہ ملے گا۔ ہمارا نام شہیدوں میں شمار ہوگا۔ کیا یہ بات اس سے بہتر نہیں کہ ہمارا نام صرف بادشاہوں کی تاریخ میں آئے وہ بھی کفار کے بھگوڑوں والے لقب کے ساتھ۔"

بابر کے ان الفاظ نے ایران و توران (ترکی) سے آئے ہوئے بہادروں کے دل گرما دیئے وہ کافروں کے مقابلے میں جان لینے اور جان دینے پر آمادہ ہوگئے۔ انہوں نے قرآن پاک کو ضامن بنا کر قسمیں کھائیں اور شیخ زین الدین کے سامنے توبہ کی' تمام گناہوں سے توبہ۔

غنیم تین کوس پر پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔ بابری فوج نے آبادی سے نکل کر اور ایک کوس آگے بڑھ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ پہلے ہی دن سیر و تفریح کے طور پر بہادر نوجوانوں نے مخالفوں کے

لشکر کا گشت لگایا اور چند سپاہیوں کو قتل کر کے ان کے سر بطور تحفہ کاٹ لائے۔

دوسرے دن جیسے ہی سورج طلوع ہوا بابری فوج نے مزید ایک کوس تک پیش قدمی کی۔ ابھی لشکر ٹھیک سے قیام نہ کر پایا تھا کہ غنیم کی فوج کے دل بادل افق صحرا پر نمودار ہوئے اور ہاتھیوں کی عماریاں دور سے چمکنے لگیں۔

بابر نے دشمن کے مقابل میسرے پر سید خواجہ کو رکھا' میمنے پر ہمایوں کو مقرر کیا۔ ہمایوں کے زیر کمان بہادر اور تجربہ کار صف آراؤں کی ایک بڑی جماعت تھی۔ سید خواجہ کے ماتحت وہ سارے بہادر تھے جو محمد سلطان مرزا کے زیر کمان متعدد معرکے سر کر چکے تھے۔ چند ہزار سوار محفوظ فوج میں رکھے گئے تھے کہ جہاں ضرورت پڑے مدد کیلئے پہنچ جائیں۔ خود بابر نے قلب لشکر کی کمان سنبھال لی۔ قلب لشکر ہی میں اس نے محمد سلطان مرزا کو رکھا۔ ہر طرف جاں نثاروں نے پرے باندھ لئے بقیہ فوج بھی حسب ضرورت جا بجا مقرر کر دی گئی۔

چار گھڑی گزرنے پر بابر نے اپنی فوج کو حرکت دی۔ تھوڑی ہی دیر میں دشمن کی اگلی صفیں راہ فرار اختیار کرتی نظر آئیں۔ راجپوت سپاہی پسپا ہو کر رانا کے گرد جمع ہو گئے۔ رانا نے میدان جنگ کی صورتحال دیکھی تو اپنی جان بچا کر نرغے سے باہر آیا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا سلامت نکل گیا۔ مغلوب فوجی لاشوں کے ڈھیر میں چھپنے لگے اور قیدی بنا لئے گئے۔ اس فتح کی تاریخ "فتح بادشاہ اسلام" سے نکالی گئی۔ بابر نے خطبے میں اپنے نام کے ساتھ "غازی" کا اضافہ کر دیا۔

بابر نے میدان جنگ سے جلد کوچ کا حکم دیدیا تا کہ لاشوں کے تعفن سے مغل لشکر مکدر نہ ہو۔ وہاں سے بابر شکار کھیلتا ہوا میوات پہنچا جہاں اسے میواتیوں نے نذرانے پیش کئے۔ اس علاقے کا انتظام بھی بابر نے اپنے ایک سردار کے حوالے کر دیا۔ میوات ہی میں اس نے شہزادہ ہمایوں کو کابل روانہ کر دیا۔ اس علاقے کے کچھ سردار جو آئے دن فتنے برپا کرتے رہتے تھے بابر نے انہیں ان کے قصوروں کی پاداش میں قتل کرا دیا۔ محمد سلطان مرزا کو اس نے کچھ خصوصی ہدایات دے کر اودھ کے بندوبست کیلئے رخصت کیا اودھ ہی کے علاقے میں لکھنو بھی تھا جو اس وقت لکھنوتی کہلاتا تھا۔ بابر کے زمانے میں اودھ کے عامل (گورنر) یا حاکم کی بڑی اہمیت تھی۔ اودھ کی حیثیت ایک الگ صوبے کی تھی۔ بابر نے اسی لئے محمد سلطان مرزا کو یہاں کا حاکم مقرر کیا تھا۔ یہ واقعہ 1527ء کا ہے۔

(صوبہ اودھ میں تقریباً وہ سارا علاقہ شامل تھا جو اب اتر پردیش مشرقی صوبہ یو پی

اور اترانچل پردیش کہلاتا ہے پہلے اترانچل پردیش بھی یو پی ہی کا حصہ تھا۔)

محمد سلطان مرزا نے اودھ پہنچ کر وہاں کا دورہ کیا۔ دوسری جانب بابر نے میوات سے آگرہ پہنچنے کے فوراً بعد چندیری کا رخ کیا۔ چندیری کی فتح کے بعد اس علاقے کے تمام زمیندار' رائے اور راجہ بابر کے مطیع ہو گئے۔ ان کافروں نے مسجدوں اور خانقاہوں میں گھوڑے اور مویشی باندھ رکھے تھے۔ بابر کے حکم پر انہیں صاف کرا کے مرمت کرائی گئی۔ موذن اور خادم مقرر ہوئے۔ چندیری' ایتھوا' سارنگ پور' اور رائے سین میں خدا ترس حکام اور قلعہ داروں کو متعین کیا گیا۔ چندیری سے گوالیار اور پھر آگرہ واپس آنے کے بعد بابر کی ایک اور خفیہ ملاقات شہباز خان سے ہوئی۔

شہباز خان سے بابر کی ان ملاقاتوں کا آغاز برسوں پہلے کابل میں ہوا تھا۔ اس وقت تک بابر نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم نہیں رکھا تھا۔ بابر اور شہباز خان کی پہلی خفیہ ملاقات مرغزار قورغان میں ہوئی تھی۔ یہ مرغزار قلعہ کابل کی جنوبی سمت میں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان ملاقاتوں کا علم بابر کے سوا کسی کو نہیں تھا۔

حالیہ ملاقات بھی ایسی ہی ملاقات تھی بابر اور شہباز خان کے درمیان خلوت میں کیا گفتگو ہوئی کسی کے علم میں نہیں آسکی۔ اہل قلعہ کو تو یہ علم بھی نہیں تھا کہ گجرات کے ایک قصبے چپانیر سے آنے والا وہ سیاہ فام شخص دراصل کون تھا جس نے اپنا نام قمرالدین بتایا تھا اور جسے بابر نے فوراً اذان باریابی دے دیا تھا۔

یہ بات بھی کسی نے محسوس نہیں کی کہ اس ملاقات کے اگلے ہی روز بابر نے خود اپنے ہاتھ سے ایک فرمان لکھ کر دستخط و مہر کے بعد اودھ کے حاکم محمد سلطان مرزا کی طرف روانہ کیا تھا۔ شاہی قاصد دو سپاہیوں کے ساتھ اسی روز اودھ روانہ ہو گیا تھا اس دوران میں محمد سلطان مرزا دورہ کرتا ہوا ایودھیا پہنچ چکا تھا۔ شاہی قاصد کو یہ بات خود بابر نے بتائی تھی۔

ایودھیا اب صرف چند کوس کی مسافت پر تھا۔

اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جب شاہی قاصد آبادی کے قریب پہنچا تو اسے دور ہی سے حاکم اودھ کی خیمہ گاہ نظر آ گئی۔ جب وہ قریب پہنچا تو اس نے خیمہ گاہ سے "پریوں" کے ایک جھنڈ کو نکلتے دیکھا۔ حسین و متناسب جسموں کی ایک بہار اسے نظر آئی۔ دھانی اور اودی ساریوں میں حسینوں کا وہ غول "پریوں کا جھنڈ" ہی نظر آ رہا تھا۔ اس نے ان غزالان خوش خرام کے ساتھ ایک مہنت بھی دیکھا جس کا سر گھٹا ہوا اور آدھا جسم ننگا تھا۔ کان پر جنیو لپٹا ہوا

تھا۔ گھٹے ہوئے سر پر موٹی سی چوٹی تھی اور توند باہر کو نکلی ہوئی تھی رنگ کالا تھا۔ حوروں کے پہلو میں اس لنگور کو دیکھ کر شاہی قاصد نے برا سا منہ بنایا۔ ماہ وشوں کا وہ ہجوم آبادی کی طرف بڑھ گیا۔

خیمہ گاہ آبادی سے باہر لگائی گئی تھی۔ وسط میں محمد سلطان مرزا کا خیمہ تھا اور اردگرد اسکے متعلقین کے خیمے تھے۔ حاکم وقت سے جو شعبے متعلق ہوتے تھے ان کے ارکان بھی یہیں قیام کرتے تھے۔ قاصدوں کی آمدورفت کا شعبہ بھی الگ تھا۔ اسی سے متعلق منشی ہوتے تھے۔ اس شعبے کی اہمیت خصوصی تھی۔ اسلئے ان کے ارکان کی سکونت حاکم کے قریب ہی ہوتی تھی کہ جانے کب عجلت میں طلب کرلیا جائے۔

خیمہ گاہ کے دائیں جانب وسیع و عریض ایودھیا شہر تھا۔ یہاں بلند و بالا عمارتیں بھی تھیں اور چھوٹے چھوٹے گھر بھی۔ مسجدیں بھی تھیں، مندر بھی، بودھوں (بدھ مذہب کے پیرو) کے استوپ بھی تھے اور جینیوں کے مندر بھی۔ یہ شہر ہندوستان کے قدیم شہروں میں سے ایک تھا۔ کبھی یہ بڑا ہنستا بستا شہر ہوتا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملوں کا آغاز کیا تھا۔ محمود غزنوی تو غزنی لوٹ گیا مگر اس کا ایک سردار فوج یہیں ہندوستان میں رہ گیا۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ یہ محمود غزنوی کے رشتے میں بھائی ہوتے تھے اور ان کا نام سالار محمد مسعود تھا۔ محمود کے ساتھ جنگ و جدال میں انہوں نے بڑے کارنامے دکھائے تھے۔ سو نام کے ساتھ غازی کا اضافہ بھی ہوگیا تھا۔ 999ء سے 1031ء تک محمود غزنوی ہندوستان پر حملے کرتا رہا اور بت شکن کہلایا، لیکن غازی مسعود کا مزاج اور طبیعت محمود سے ذرا مختلف تھی۔ ہندوستان ہی میں رہ جانے کے سبب ان کے رویے میں مزید تبدیلی آگئی۔ محمود کی کمان میں اودھ کا کچھ علاقہ مسعود ہی نے فتح کیا تھا۔ محمود نے یہ علاقہ انہیں دیدیا۔ اسی علاقے میں ایودھیا بھی تھا، مگر یہاں بہت تھوڑی آبادی تھی۔ غازی مسعود ہی نے دراصل اس چھوٹی سی بستی کو شہر بنایا۔ سالار غازی مسعود جب اس علاقے میں آئے تو ایک آدھ مندر تھا۔ پھر انکی تعداد بڑھتی گئی۔ ایودھیا کی حیثیت جب ایک شہر کی ہوگئی تو یہاں ہندو بھی آبسے۔ علاقے کا حکمران صوفی منش تھا۔ اس نے رواداری اور اسلام کی بنیادی تعلیم کی روشنی میں وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا۔ اسی کے نتیجے میں یہاں مسلمان، ہندو، بودھ، جینی سبھی مل جل کر رہنے لگے۔ یوں ایودھیا ایک مثالی شہر بن گیا جہاں مختلف مذاہب کے لوگ موجود تھے مگر رفتہ رفتہ مذہبی رواداری کی بنا پر یہاں ہندوؤں کی اکثریت ہوگئی اور انھوں نے پر پرزے نکالنے شروع کردیے۔ اس

کا انجام سالار محمد مسعود غازی کی شہادت تھا۔ ہندوؤں نے انہیں شہید کردیا۔ ان کا مزار اسی علاقے کی بستی بہرائچ میں بنایا گیا کیونکہ سالار مسعود ایک نیک آدمی اور غریبوں کے خیر خواہ تھے۔ پھر یہ کہ انہیں شہید کیا گیا اس لئے مسلمان ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ سالار غازی سے مسلمانوں کی اسی عقیدت نے ان کے مزار کو مرجع خلائق بنادیا۔ وہاں ہر سال عرس ہونے لگا اور درگاہ قائم ہوگئی۔ سال کے سال جلوس بھی نکالا جانے لگا۔ سالار صاحب کو بالے میاں کے لقب سے بھی یاد کیا جانے لگا۔

محمود غزنوی کے بعد سلطان شہاب الدین غوری ہندو راجاؤں سے پنجہ آزمائی کرتا رہا۔ پھر 1192ء میں دہلی سلطنت کی باقاعدہ بنیاد پڑی اور قطب الدین ایبک ہندوستان کا فرماں روا ہوا۔ (قطب الدین ایبک کا انتقال لاہور میں ہوا اور یہیں اس کی تدفین عمل میں آئی۔ پرانی انارکلی سے اخبار مارکیٹ جاتے ہوئے ایک گلی میں قطب الدین ایبک کا مقبرہ ہے۔ مصنف) مسلمانوں کا یہ دور حکومت خلجی عہد اقتدار اور پھر تغلق، سید اور لودھی خاندانوں کے بعد مغلوں کے عہد تک پہنچا۔

تغلق خاندان کا آخری تاجدار فیروز شاہ تغلق تھا۔ 1375ء کا واقعہ ہے کہ وہ سالار غازی مسعود کے مزار کی زیارت کیلئے بہرائچ پہنچا۔ اس نے خواب میں سالار صاحب کو دیکھا تھا۔ وہاں اسے کچھ ایسی رسوم نظر آئیں جنہیں وہ خلاف شرع سمجھتا تھا۔ دہلی آکر اس نے فرمان جاری کردیا کہ آئندہ یہ رسوم ادا نہ کی جائیں۔ فیروز شاہ تغلق کا انتقال ہوگیا تو پھر یہ رسوم جاری ہوگئیں۔

ابراہیم لودھی کے باپ سکندر لودھی کے زمانے تک ایسا ہی رہا۔ ہر سال مئی یا جون کے مہینے میں سالار صاحب کی یاد میں جلوس نکلتا تھا۔ سکندر لودھی نے مختلف رسوم اور بہرائچ کے جلوس کو غیر اخلاقی افعال میں شمار کیا اور اسکی ممانعت کردی۔ اسی کے ساتھ بزرگان دین کے مزاروں پر عورتوں کے جانے پر بھی پابندی لگادی۔ اس کا بیٹا ابراہیم لودھی حکومت کے چکروں ہی میں اتنا پھنسا ہوا تھا کہ اسے اس طرف دھیان دینے کی مہلت نہ ملی۔

اس سے علاقے میں بسنے والے ہندوؤں نے فائدہ اٹھایا۔ جو مساجد و خانقاہیں خراب و خستہ حالت میں تھیں ان پر متعصب ہندوؤں نے ڈھیرے ڈھیرے قبضہ جمالیا اور پھر وہاں بودوباش اختیار کرلی۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی ویسے بھی خاصی گھٹ گئی تھی۔ جو تھے انہوں نے شور شرابا کیا بھی مگر سنتا کون! جو سننے والے تھے اقتدار کی بندر بانٹ میں لگے ہوئے

چکے تھے۔ ان کے نزدیک اہم معاملات کچھ اور تھے۔

یہاں مسلمانوں کے دورِ عروج کی کچھ دیگر تاریخی یادگاریں اور مزارات بھی تھے وہ بھی وقت کی گرد میں دب کر رہ گئے۔ ایودھیا کو برہمن نے اپنی سیاست کا مرکز بنالیا۔ وہ نصیحت آمیز کہانیاں جو صدیوں سے بلاتصدیق تھیں انہیں برہمنوں نے مذہبی رنگ دے دیا اور انہیں بڑھا چڑھا کر بیان کرنے لگے۔ افسانے حقیقت کہے جانے لگے۔

ہزاروں سال کے عرصے میں آبادیاں کہیں کی کہیں ہوجاتی ہیں۔ بستیاں اور شہر اجڑتے بستے رہتے ہیں۔ کسی مکان کی تعمیر کیلئے ایک جگہ کھدائی ہوئی تو کچھ پتھر دھڑ بھی نکل آئے۔ برہمنوں کو موقع مل گیا۔ انہوں نے کہانیوں کے کرداروں کی جائے پیدائش اسی جگہ کو بتا دیا۔ یہ ایک ایسا شوشہ تھا کہ کم از کم ہندو تو اس پر آنکھ بند کرکے یقین لے آئے۔ رامائن پہلے ہی موجود تھی۔ اس کی نئی نئی تشریحات ہونے لگیں اس میں اضافے بھی کرلئے گئے۔

ایودھیا شہر میں برہمنوں نے باقاعدہ ایک جگہ کو رام کوٹ یا رام درگ کہنا شروع کردیا۔ یہ سارا معاملہ اس زمانے میں صرف اس خوف کی پیداوار تھا کہ حکومت بہرحال مسلمانوں کی ہے۔ کہیں کوئی مسلمان حکمران انہیں اس علاقے سے نکال نہ دے۔

گھاگھرہ ندی کے سامنے ایک اونچی پہاڑی تھی۔ وہاں پتھر بھی بکثرت تھے۔ بدھ مذہب کے ماننے والوں نے وہاں کبھی اپنا استوپ (بدھوں کی عبادت گاہ) بنایا ہوگا۔ اس کے کچھ آثار وہاں تھے۔ اسی کے ایک سرے پر ان برہمنوں نے رفتہ رفتہ ایک مندر بنا ڈالا۔ اس مندر کے باہر والے حصے میں تھوڑی سی جگہ ہموار ملی تو وہاں ایک چبوترا بنا دیا۔ انہوں نے "ہنر" یہ دکھایا کہ مندر کی تعمیر ٹوٹے پھوٹے پتھروں سے کی اور یہ تعمیر بھی ادھوری چھوڑ دی۔ چبوترے کے قریب ہی ایسا ہی ایک اور شکستہ مندر بنا دیا۔ اس چبوترے کو انہوں نے بھگوان (جو پہلے صرف راجہ تھے) رام چندر جی کی جائے پیدائش کہنا شروع کردیا۔ قریب ہی جو دوسرا مندر ادھورا چھوڑا تھا اسے سیتا مائی کی رسوئی (باورچی خانہ) بتانے لگے۔

ابراہیم لودھی کے اقتدار کا سورج غروب ہوا اور بابر نے ہندوستان میں مغل حکومت کی بنیاد رکھی تو "رام جنم بھومی" کے قصے کو ایک عرصہ ہوچکا تھا۔ اس عرصے میں برہمنوں نے ہندوؤں کے ذہنوں میں اس خیال کو پختہ کردیا تھا کہ ایودھیا رام چندر جی کی جائے پیدائش ہے۔ ایودھیا میں تین مقبرے ایسے رہ گئے تھے جو ہندوؤں کی دست برد سے بچے رہے کیونکہ

اس وقت تک ان کی دیکھ بھال کرنے والے موجود تھے۔ انہی مقبروں کے طفیل ایودھیا شہر مسلمانوں کیلئے بھی زیارت کا سبب رہا۔ ان مقبروں میں سے ایک کی بابت یہ روایت چلی آرہی تھی کہ وہ "حضرت نوحؑ" کا مقبرہ ہے۔

بابر کے دور میں ایک بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی بھی تھے۔ بابر کی ان سے ملاقات ہوئی تو شیخ نے ان معاملات کی طرف اس کی توجہ مبذول کرائی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سکندر لودھی کے زمانے میں جو انتہا پسندانہ رویہ اپنایا گیا تھا اس سے شیخ خوش نہیں تھے۔ خود بابر بزرگانِ دین کی بڑی عزت و تکریم کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ مذہبی رواداری کا بھی قائل تھا۔ اس نے دیگر مذاہب کا احترام کرنا سیکھا تھا۔ وہ اسلام کی اصل روح سے آگاہ تھا۔ اس لئے متعصب نہیں تھا۔ اودھ کے معاملات خصوصاً ایودھیا ضلع پر اس کی نظر مرکوز تھی۔

اپنے مخبروں سے بابر کو یہ اطلاعات مل چکی تھیں کہ ہندوستان بھر کے بڑے بڑے شاطر ہندوؤں کا گڑھ ایودھیا شہر ہی بنا ہوا ہے۔ ایودھیا کو ہندو سیاست کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور اس سیاست کی باگ ڈور برہمنوں کے ہاتھ میں تھی۔ بابر ایک مطلق العنان حکمران تھا۔ وہ سیاہ و سفید کا مالک تھا، گر وہ چاہتا تو اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا اور ہندو برہمن سیاست کے اس گڑھ کو نیست و نابود کردیتا مگر وہ تاریخ میں اپنا نام جابر و قاہر حکمرانوں میں شامل کرانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مغل سلطنت کا بانی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شاعر بھی تھا جس کا دل گداز ہوتا ہے۔ وہ اعلیٰ ظرف اور انسان دوست شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے اسی لئے صبر و تحمل کا ثبوت دیا۔ یوں بھی وہ میدانِ جنگ میں اپنی برتری ثابت کرچکا تھا۔

اودھ کے حاکم محمد سلطان مرزا نے ایودھیا پہنچتے ہی بابر کو ایک پیغام بھیجا تھا۔ یہ پیغام ایودھیا میں ایک مسجد کی تعمیر کے متعلق تھا۔ وسط شہر میں ایک میدان تھا جو عموماً میلوں ٹھیلوں کے موقعوں پر ہی شہر والوں کے کام آتا تھا۔ ورنہ خالی پڑا رہتا تھا۔ حاکم اودھ کی تجویز یہ تھی کہ میلوں کیلئے شہر سے باہر کوئی جگہ مخصوص کردی جائے اور اس میدان میں مسجد بنا دی جائے۔ میدان کے آس پاس مسلمانوں کے خاصے گھر تھے جنہیں نماز پڑھنے کیلئے بہت دور جانا پڑتا تھا۔

محمد سلطان مرزا کے نزدیک یہ کوئی ایسا اہم معاملہ نہیں تھا کہ بابر سے اس کی اجازت لی جاتی مگر جب اسے بابر نے اودھ کا حاکم بنا کر بھیجا تھا تو بطورِ خاص یہ ہدایت کی تھی کہ مذہبی امور میں کوئی قدم بھی اس کی اجازت کے بغیر نہ اٹھایا جائے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی

کہ بابر نہیں چاہتا تھا کہ حکمرانوں کے مذہب کو جبر کے طور پر نافذ کیا جائے۔ دوم یہ کہ رواداری اور میل ملاپ اس کے مزاج کا خاصہ تھا۔ وہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے دلوں میں اسلام کی بابت غلط فہمی پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مزید برآں یہ کہ محمد سلطان مرزا مرد میدان ضرور تھا لیکن سیاسی اور مذہبی امور میں بابر کے نزدیک اسے تجربے اور تربیت کی ضرورت تھی۔

ایک نئی مسجد کی تعمیر وہ بھی ایسی جگہ جو عیار ہندوؤں کا مرکز بن گئی تھی کسی عجلت کی متقاضی نہیں تھی۔ بابر کے مخبر پہلے ہی سے اس علاقے میں سرگرم تھے جنہوں نے بابر کو علاقے کی پوری صورتحال سے آگاہ کردیا تھا۔ ان سے بابر نے کچھ استفسار بھی کئے تھے۔ ابھی تحقیق حال جاری تھی۔ بابر یہ سب کچھ محض اس لئے کررہا تھا کہ کسی جھگڑے کی بنیاد نہ پڑے۔

ایودھیا کو برہمن' رام چندر جی کی جنم بھومی کہتے آئے ہیں' یہ بات بابر کے علم میں آچکی تھی۔ اب وہ محل وقوع کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ شہر ایودھیا میں برہمنوں نے کس جگہ کو اپنے اوتار کی جائے پیدائش مشہور کررکھا ہے! مسلمان بھی اس کی رعایا تھے اور ہندو بھی۔ ان دونوں کے درمیان وہ کوئی ناچاقی نہیں چاہتا تھا۔ ایودھیا میں کسی نئی مسجد کی تعمیر سے پہلے بابر کے خیال میں یہ ضروری تھا کہ جہاں مسجد تعمیر ہونے والی ہے اس جگہ پر ہندوؤں کا کوئی دعویٰ تو نہیں! برہمنوں کی کسی متوقع سازش کو بابر کس طرح کامیاب ہونے دیتا!

بابر کے کچھ قریبی امرا سے سلطان مرزا کے مراسم بھی تھے۔ جب مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں بابر کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تو سلطان مرزا نے ان امرا کو پیغامات بھیجے کہ موقع محل دیکھ کر بابر سے اس کا ذکر کریں اور یاددہانی کرادیں۔

ایک روز موقع پاکر ان امرا نے بابر سے ایودھیا میں مسجد کی تعمیر کا ذکر چھیڑ دیا۔ انہی میں سے ایک امیر نے یہ تجویز پیش کی کہ تعمیر ہونے والی مسجد بابر کے نام سے موسوم کی جائے۔

''اس کا نام بابری مسجد ہونا چاہیے۔'' دوسرے امیر نے کہا۔

''ناموں میں کیا رکھا ہے! ہاں یہ ضرور ہے کہ شناخت کے لئے ایسا ہو۔ خلق خدا کو معلوم ہو کہ ہمارے عہد میں یہ مسجد تعمیر ہوئی' ورنہ خانہ خدا تو خانہ خدا ہی ہوتا ہے۔ بندے کو یہ زیب نہیں کہ وہ اپنے نفس کی تسکین کیلئے خانہ خدا پر بھی اپنا نام کندہ کرائے۔'' بابر اپنے مزاج کے مطابق بولا' پھر کہنے لگا۔ ''ابھی یہ باتیں قبل از وقت ہیں۔''

بابر کا اتنا کہنا کافی تھا پھر کسی امیر کی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس باب میں مزید کچھ کہہ

سکتا یا بابر سے سوال کرتا کہ یہ باتیں قبل از وقت کیوں ہیں؟ ان میں سے کسی کو بھی یہ خبر نہیں تھی کہ بابر کا ''خفیہ محکمہ'' ایودھیا میں ہندو روایات کی تحقیق کررہا ہے اور اس تحقیق و جستجو کے کیا دور رس نتائج برآمد ہوں گے!

کچھ ہی روز بعد بابر نے اپنے قاصد کے ذریعے بہ دست خود ایک فرمان سلطان مرزا کی طرف روانہ کیا تھا۔ اس کا مقصد بھی محض رازداری تھا ورنہ یہ کام وہ میر منشی سے بھی لے سکتا تھا۔ اس عرصے میں بابر کا خفیہ محکمہ تحقیق کے گوہر رولتا رہا۔

☆......☆......☆

''بول بجرنگ بلی کی جے...... بول شری رام چندر جی کی جے!'' یاتریوں (زائرین) کی جے جے کار سے پہاڑی گونج رہی تھی۔ ایک دبلا پتلا پنڈت نسبتاً ایک بلند جگہ پر کھڑا ہوا یہ نعرے لگوا رہا تھا۔ یہ جگہ اس شکستہ مندر کے قریب تھی جسے سیتامائی کی رسوئی کہا جاتا تھا۔ یاتریوں میں زیادہ تعداد سادھوؤں کی تھی جن کے سر اور داڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ مندر کے درشن کرکے یاتری کہیں بھجن گا رہے تھے' کہیں نعرے لگا رہے تھے اور کہیں پوجا پاٹ میں مصروف تھے۔ زیادہ ہجوم اس چبوترے کے گرد تھا جسے رام چندر جی کی جائے پیدائش بتایا جاتا تھا۔

انہی یاتریوں میں مختلف عمر کی عورتیں اور نوجوان دوشیزائیں بھی تھیں۔ ایک سادھو جانے کیوں ان عورتوں اور دوشیزاؤں میں دلچسپی لے رہا تھا۔ جدھر بھی اسے عورتیں نظر آتیں کسی چھلاوے کی طرح وہاں پہنچ جاتا۔ دراز قد سادھو کے ہاتھ میں چمٹا تھا جسے بجا بجا کر وہ عورتوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیتا تھا۔ مگر اسکی بے چین و بے قرار نظریں کسی ایک چہرے پر زیادہ دیر نہیں ٹکتی تھیں۔

یہ پہاڑی جو رام کوٹ کہلاتی تھی اس سے اترنے کیلئے پتھروں کو کاٹ کر سیڑھیاں بنادی گئی تھیں دراز قد سادھو اب انہی سیڑھیوں کی طرف آرہا تھا۔ اس سے آگے کچھ فاصلے پر دو نوجوان لڑکیاں اور ایک متوسط عمر کی عورت جارہی تھی۔ وہ عورت ان لڑکیوں ہی کے ساتھ تھی۔

دونوں لڑکیاں خوب صورت تھیں مگر عورت ان دونوں سے کہیں زیادہ حسین تھی لڑکیوں کا حسن اس کے سامنے ماند پڑ گیا تھا۔ سانولی رنگت میں عجیب سی کشش تھی۔ وہ سفید ساڑھی باندھے ہوئے تھی اور جوڑے میں بیلے کے پھولوں کا ہار لپٹا ہوا تھا قد لمبا اور جسم اکہرا

تھا۔

وہ اپنے ساتھ چلنے والی دوشیزاؤں سے آہستہ آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''دیکھو لو وہ آج بھی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔''

لڑکیوں نے مڑ کر سادھو کو نہیں دیکھا اور ان میں سے ایک نے عورت کو مخاطب کیا ''تو کیا ہوا رادھا جی ہم آج بھی اسے جل دے کر نکل جائیں گے۔''

''پر یہ جھنجھٹ ہی کیوں پالا جائے؟'' عورت کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ''کیا کھبر وہ کون ہو؟ جرور کوئی گڑ بڑ جان پڑتی ہے۔ میں آج بات کروں گی آچاریہ جی سے۔''

دراز قد سادھو کچھ فاصلے سے ان تینوں کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اترنے لگا۔ درمیانی فاصلہ اتنا تھا کہ وہ اپنے بارے میں ہونے والی گفتگو سن نہیں سکا تھا۔ ابھی اس نے نصف سیڑھیاں طے کی ہوں گی کہ نیچے سے ایک جوگی اوپر چڑھتا نظر آیا۔ سادھو اسے دیکھ کر چونک اٹھا۔ جوگی سانولی عورت کے قریب سے بے نیازانہ گزرتا ہوا سادھو تک پہنچ گیا۔

سادھو کے پاس سے جب اس کا گزر ہوا تو وہ بڑبڑایا۔

''ان کے پیچھے نہ جا تجھے دیکھ لیا گیا ہے۔'' پھر ''جوگی'' اوم ہری ہر کا جاپ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

سیڑھیاں اترتے اترتے رک کر سادھو نے زور سے چمٹا بجایا اور وہیں سیڑھیوں سے ذرا ہٹ کر ایک پتھر پر آسن جما کے بیٹھ گیا۔ اس بار سانولی عورت رادھا نے اسے مڑ کر ضرور دیکھا تھا اور اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

اسی شام وہ جوگی آبادی سے دور ایک کھنڈر میں کسی کی آمد کا منتظر تھا۔ جب شام کے سائے پھیل کر رات کی تاریکی میں مدغم ہونے لگے تو اس نے کھنڈر میں کسی کے قدموں کی چاپ سنی اور چوکنا ہو گیا۔ اس نے اپنے کاندھے پر پڑی ہوئی جھولی آہستگی سے اتار لی تھی۔ اور پھر جھولی میں موجود خنجر کے دستے تک اس کا ہاتھ پہنچ گیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ آنے والا وہی ہوتا جس کا اسے انتظار تھا۔

''تم آ گئے؟'' قریب ہی سے ایک بھاری آواز آئی۔

''جی'' جوگی نے اس آواز کو پہچان کر فوراً جواب دیا اور اپنا ہاتھ جھولی کے اندر سے کھینچ لیا۔

''کارگزاری بیان کرو!'' اندھیرے میں وہی بھاری آواز پھر گونجی۔

''ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔ جو حلیہ اور خد و خال بتائے گئے تھے اس پر بڑی حد تک ایک سانولی عورت رادھا پوری اترتی ہے۔'' سادھو بتانے لگا۔ ''مگر وہ بہت چالاک معلوم ہوتی ہے۔ میں نے اس کے پیچھے اپنا ایک بندہ لگایا ہے لیکن وہ کھسک جاتی ہے۔ آج صبح رام کوٹ میں بھی ایسا ہی ہوا اور میں نے اس کا تعاقب رکوا دیا۔ ایک تو یہ کہ وہ کئی دن غائب رہ کر کہیں نظر آتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ اس کا نام بھی رادھا ہے۔''

''وہ نام بدل بھی سکتی ہے کوئی اور خاص بات؟''

''آج اس کے ساتھ جو دو دوشیزائیں نظر آئی تھیں ان میں سے ایک کچھ دن پہلے اس وفد میں شامل تھی جو آچاریہ ہرگوپال' حاکم اودھ کے پاس لے کر گیا تھا۔''

''اب ان تینوں میں سے جو بھی جہاں دکھائی دے اس کی کڑی نگرانی کرو! تعاقب کیلئے آدمی اور حلیے بدلتے رہو! آچاریہ ہرگوپال پر بھی نظر رکھو! ان دونوں لڑکیوں اور رادھا کے بارے میں تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ ان کی زبانیں کھلوانے کیلئے ان پر ہاتھ بھی ڈال سکتے ہو' مگر اس طرح کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ اس کیلئے تم کیا طریقہ وضع کرو گے۔ یہ تم پر چھوڑا جاتا ہے اور یہ بھی کہ ان سے کیا معلوم کرو گے! ضروری ہوا تو بقیہ ہدایات تم تک پہنچ جائیں گی۔ خدا حافظ۔'' اس کے ساتھ قدموں کی دور ہوتی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ جو کوئی بھی تھا واپس جا رہا تھا۔

جوگی وہیں بیٹھا رہا اور پھر خاصی دیر کے بعد اس کھنڈر سے نکلا۔

آج بھی حاکم اودھ محمد سلطان مرزا خلوت میں آچاریہ ہرگوپال سے گفتگو کر رہا تھا۔ آچاریہ ہرگوپال کی شخصیت نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ یہ سن کر بہت متاثر ہوا تھا کہ آچاریہ ہرگوپال عربی' فارسی اور سنسکرت تینوں ہی زبانوں پر عبور رکھنے کے علاوہ ترکی زبان بھی جانتا تھا۔

سلطان مرزا کی تعلیم بس واجبی ہی سی تھی نہ اسے میدان جنگ سے کم ہی فرصت ملی تھی۔ یوں بھی اسے مطالعے کا شوق نہیں تھا۔ وہ قلم کا نہیں تلوار کا دھنی تھا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ پڑھا لکھا دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ آچاریہ ہرگوپال نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہندو دھرم دراصل اسلام ہی کی بنیادی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ جو عہد قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ اس رات دیر ہو چکی تھی اور سلطان مرزا کو نیند آنے لگی تھی۔ اس لئے اس نے آچاریہ سے کہا تھا کہ اس موضوع پر اگلی صحبت میں گفتگو ہوگی۔ چلتے چلتے آچاریہ نے کہا تھا کہ رام اور رحیم سب ایک

ہیں۔ ہر مذہب کی بنیادی روح ایک ہے۔

سلطان مرزا اتنا تو بہر حال سمجھتا تھا کہ ہر مذہب ایک نہیں ہوسکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو روئے زمین پر بسنے والے سارے انسان ایک مذہب کے ماننے والے ہوتے۔ بچپن سے اسے جو تعلیم دی گئی تھی اس کی روشنی میں اسے یہ علم بھی تھا کہ آسمانی کتابوں میں قرآن حکیم کے سوا سب میں تحریف کی گئی ہے۔ قرآن کے سوا کوئی اور آسمانی کتاب مستند و معتبر نہیں۔ اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات سے وہ آگاہ تھا۔ اسی وجہ سے آچاریہ کی بات اور دعویٰ اسے کھٹکا۔ اسی بنا پر آچاریہ سے متاثر ہونے کے باوجود وہ اس کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کرسکا تھا۔ آچاریہ سے آج اسی کی وضاحت اسے مطلوب تھی۔ اس وقت آچاریہ ہرگوپال' سلطان مرزا کے اس سوال کا جواب دے رہا تھا کہ بت پرستی کیسے شروع ہوئی اور کب سے؟ نیز یہ کہ اگر ہندو دھرم اسلام کی بنیادی تعلیمات کا نتیجہ ہے تو پھر بت پرستی کیوں کی جاتی ہے؟

آپ نے بڑا مشکل سوال کردیا ہے پر میں اس کا جواب ضرور دوں گا۔ اس کیلئے مجھے بہت دور تک جانا پڑے گا۔'' آچاریہ ہرگوپال کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی۔

سلطان مرزا اسکی طرف متوجہ تھا۔

آچاریہ ذرا توقف سے کہنے لگا'' حضرت آدمؑ کے بعد حضرت شیثؑ نبی ہوئے اور انہوں نے اپنی عمر کے آخری دور میں اخنوخ کو درس دیا۔ اخنوخ عربی نام ہے۔ اخنوخ ہی کو عبرانی زبان میں خنوخ یونانی زبان میں طرمیس اور قرآن عزیز میں ادریسؑ کہا گیا ہے۔ حضرت ادریسؑ جب اس دنیا سے چلے گئے تو ان کے سب فرزند باپ کے غم میں گریہ وزاری کرنے لگے۔ بہت سے دن اور برس یوں ہی گزرنے۔ حضرت ادریسؑ کے پانچوں بیٹے بڑے حسین و جمیل اور عابد و صالح تھے۔ ساری قوم کو ان پانچوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ساری قوم ان کے دکھ میں برابر کی شریک تھی کہ ان کا باپ اٹھ گیا تھا۔ لوگ ان پانچوں کی مجلس سے اٹھ کر آتے تھے دیر تک انہی کی باتیں کرتے کہ ان کی باتوں میں بڑی تاثیر تھی۔ ان میں سے بڑے کا نام وُد تھا' اس سے چھوٹے کا سواع' تیسرے کا یغوث' پھر یعوق اور پانچویں کا نام نسر تھا۔ وہ پانچوں کافی دن جئے اور پھر باری باری وفات پا گئے۔ قوم کو ان سے بڑی محبت تھی۔ نبی کے بیٹوں کی جو محبت اور عزت لوگوں کے دلوں میں تھی اسی کے زیر اثر انہوں نے بڑی بڑی چٹانیں کاٹ کر انہیں مختلف شکلیں دیں بہت دن بڑے زور و شور سے یہ کام ہوتا رہا۔ پتھروں سے ابھرنے والی پہلی صورت کا نام نبی کے بڑے بیٹے کے نام پر وُد رکھا گیا۔ یہ صورت ایک

مرد کی تھی مگر حضرت ادریسؑ کے بڑے بیٹے سے اس کا چہرہ نہیں ملتا تھا۔ اس صورت میں خدا کی محبت کا نشان ٹھہرایا گیا اور پھر اسی کو دنیا کی پیدائش کا سبب بھی قرار دیا گیا۔ اس قوم نے یوں اپنے خیال میں خدا کی محبت کو دنیا کی پیدائش کا سبب سمجھا تھا۔ وُدکیوں کہ خود بھی خدا کی محبت میں سرشار رہتے تھے۔ اس لئے ان کی یہ صنعت اس صورت سے منسوب کردی گئی جو ان کی یاد میں چٹانیں کاٹ کر بنائی گئی تھی دنیا میں یہ پہلی صورت یا شبیہ تھی۔''

''اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں یہ پہلا بت تھا' صورت یا شبیہ کا یہی مطلب تو ہوا نا!'' سلطان مرزا مرعوب ہونے کے باوجود بولے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بہر حال اتنا صاحب علم نہیں تھا کہ آچاریہ ہرگوپال نے سچ کے ساتھ بناتھ جہاں جھوٹ کی ملاوٹ کی تھی اسے گرفت میں لے سکتا۔

اب تک آچاریہ نے جو کچھ بیان کیا تھا اس میں بڑی ہوشیاری سے دو جگہ ڈنڈی ماری تھی۔ نبی کے بیٹوں سے قوم کی محبت تو درست تھی مگر اس محبت کو شیطان نے جو رنگ دیدیا لوگوں کو جو راہ سجھائی اور لوگ جس پر چل پڑے وہ راہ بدی کی تھی۔ آچاریہ کے بیان میں دوسری جگہ وہاں ڈنڈی ماری گئی تھی جہاں ایک بت کو خدا کی محبت کا نشان ٹھہرایا گیا خدا کے لئے کوئی نشانی ٹھہرانا اور اس کے آگے جھکنا یہ سب شیطان کی کارستانی تھی۔

سلطان مرزا کی بات سن کر آچاریہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا' یوں جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ پھر بھی وہ مسکرایا اور کہنے لگا'' صورت یا شبیہ کو آپ بت بھی کہہ سکتے ہیں بات ایک ہی ہے۔

سلطان مرزا نے نہایت فراست سے کہا'' یہ ایک بات نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ صورت یا شبیہ نہیں اسے بت ہی کہا جائے گا آچاریہ جی! اب آپ آگے بیان جاری رکھیں۔''

آچاریہ مزید بحث میں پڑے بغیر اپنا گنجا سر ہلا کر پھر بولنے لگا'' چٹانوں سے تراشی جانیوالی دوسری شکل عورت کی تھی۔ عورت کی اس شکل کو خدا کے ثبات و قرار کیلئے ضروری گردانا گیا۔ اس کا نام دوسرے بیٹے سواع کے نام پر سواع ہی رکھا گیا۔ یہاں ایک بات اور بتاتا چلوں کہ وہ لوگ بعد کے لوگوں کی طرح ماہر سنگ تراش نہیں تھے۔ انہیں تو بس اپنے پیاروں کی یادگاریں بنانی تھیں سو بنادیں۔ سواع کیونکہ اپنے بھائی وُد کا دایاں بازو سمجھے جاتے تھے تو یوں سواع کی یادگار کو وُد کیلئے لازم قرار دیا گیا۔''

یہاں بھی آچاریہ درمیان میں ایک بات حذف کر گیا کہ ہندوؤں نے بعد میں اسی بت کو برہما کہا۔ سلطان مرزا تحقیق کے دریا کا شناور نہ تھا۔ لہٰذا تمکنت کے ساتھ خاموش رہا۔

آچاریہ کا بیان جاری تھا۔ اب وہ تیسرے بت کی تخلیق کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ”تیسری شکل یا یادگار گھوڑے کی صورت پر بنی۔ اس کا چہرہ گھوڑے کا بقیہ جسم آدمی کا تھا۔ اس کا نام تیسرے بیٹے کے نام پر یغوث پڑا۔ اسے فریادیں سننے والا اور مشکل وقت میں کام بنانے والا خیال کیا گیا۔ یغوث اپنی زندگی میں لوگوں کے آڑے وقت پر کام آتے تھے اور ان کے دکھ درد سنتے تھے۔ سو یوں اس یادگار کے ساتھ یہی صفات لازم آ گئیں۔ حضرت ادریسؑ کے چوتھے بیٹے یعوق جب زندہ تھے تو لوگوں کو جو نقصان کسی عمل سے پہنچنے والا تھا اس سے انہیں قبل از وقت روک دیتے تھے کہ اے لوگو! یہ عمل نہ کرو اس سے تمہیں نقصان ہوگا۔ وہ بہت بہادر تھے اور لوگوں کو مختلف بلاؤں سے دور رکھتے تھے۔ بلائیں جو زمین کے بسنے پر ہیبت ناک جانوروں اور مختلف شکلوں میں رینگتی تھیں تو جب یعوق کی یادگار بنائی گئی اس کی صورت شیر کی تھی۔ اسے نقصان سے دور رکھنے والا اور بلاؤں سے بچانے والا سمجھا گیا۔ پتھروں کو کاٹ کر بنائی جانے والی آخری اور پانچویں شکل سب سے چھوٹے مگر سب سے طاقتور بیٹے نسر کے نام پر رکھی گئی۔ کچھ کہتے ہیں یہ شکل کرگس کی جیسی تھی اور کچھ نے لکھا ہے بندر جیسی تھی۔ بندر سے اس کے چہرے کی مشابہت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ بعد میں اسی شکل کو ہم نے ہنومان جی بھی کہا۔ اس آخری شکل کو خدا کی طاقت و قوت کا مظہر جانا گیا۔“

اس کے بعد آچاریہ ہرگوپال اپنے علم کے زور پر سلطان مرزا کو مرعوب کرتا رہا۔

اب وہ روحانیت پر بول رہا تھا اور روحانیت کا وہ تصور پیش کر رہا تھا جو ویدوں سے اخذ کیا گیا تھا۔ آچاریہ کا خلاصہ کلام یہ تھا کہ اسلام حضرت آدمؑ سے چلا۔ دوم ہندو دھرم اور ہندو قوم اسلام کو سچا مذہب جانتی اور سمجھتی ہے۔ سوم یہ کہ ہندو مسلم سب ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں۔ اصل ایک ہے نام ڈھنگ الگ ہیں وغیرہ۔ بت پرستی کے آغاز کے بارے میں اس نے بتا دیا مگر بعد میں اصل واقعات سے یا تو دانستہ گریز کیا یا پھر اسے معلوم ہی نہیں تھے۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ بت پرستی کا آغاز ہوتے ہی شیطان کی بن آئی۔ ان بتوں کو سجدے گزارے جانے لگے۔ برس پر برس بیتے پر ان کے طور نہ بدلے۔ سامان عیش بھی تھا اور وہ خوش بھی تھے۔ پھر خدا سے غافل کیوں نہ ہو جاتے ایسی دنیا میں وہ آخرت کو ایسے بھولے کہ کوئی نیک بات ماننا تو الگ سننے کو تیار نہ ہوتے۔ بے خبروں کا وہ گروہ اپنے حال میں خوش اور اپنی کھال

میں مست اپنے اپنے بتوں کے متعلق فسانے گھڑتا اور ایک دوسرے کو سناتا۔ باپ مرتا تو بیٹے کے دل میں سیاہی بھر جاتا اور جب بیٹے کا وقت آتا تو وہ اپنے بعد آنے والوں کو تاکید کر جاتا کہ بتوں کی تعظیم میں کمی نہ آئے ورنہ بڑی تباہی آئے گی۔

سو یوں ہی ہوتا رہا۔ پھر وہ یہ بھی بھول گئے کہ ابتداء کہاں سے ہوئی تھی۔ انہیں بس یہ یاد رہ گیا کہ یہ تو ان کے پچھلوں کا وہی دین تھا جو ان کا ہے اور یہ کہ ساری خدائی انہی پانچ بتوں کی ہے۔

پھر وہ دن بھی آ گیا کہ انہی میں سے ایک نے کہا۔ ”نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے اور میں اللہ کا رسولؐ ہوں۔“ یہ یشکر تھے۔ روشن آنکھوں اور نورانی چہرے کے مالک یشکر نے اپنی قوم پر اتنی بار نوحہ کیا کہ انکا نام ہی نوح پڑ گیا۔ سو یہ حضرت نوحؑ تھے جنہوں نے پہلی بار بت پرستی کو باطل قرار دیا اور اسے کفر کہا۔

کفر کا مطلب چھپانا اور کافر کا مطلب چھپانے والا ہے۔ یعنی جو حقیقت کو چھپائے سچ پر پردہ ڈالے۔ آچاریہ ہرگوپال بھی صاحب علم ہونے کے باوجود بہرحال کافر تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ سلطان مرزا اس کے علم سے مرعوب تو ہے لیکن اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہو رہا تو اس نے سلطان مرزا پر ایک اور حربہ آزمایا۔

وہ ایودھیا کی حسین ترین دوشیزاؤں کو ایک بہانے سے وفد کی صورت میں سلطان مرزا کے پاس لے گیا۔ بہانہ ہندوؤں کی ایک مذہبی رسم تھی۔ آچاریہ ہرگوپال نے کہا تھا کہ حاکم ہمارے دھرم (مذہب) میں دیوتا سمان (کی طرح) مانا جاتا ہے۔ بن بیاہی کنیائیں (لڑکیاں) رام کوٹ لے جا کر اس کی آرتی اتارتی ہیں (آرتی اتارنا پرستش ہی کا ایک حصہ ہے) سو یہ سب میری رہنمائی میں اس لئے آپ کو رام کوٹ لے جانے آئی ہیں اس پوتر (پاک) جگہ جہاں ہمارے اوتار (پیغمبر) کا جنم ہوا تھا۔ اس دوران میں آچاریہ کن انکھیوں سے سلطان مرزا کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا تھا اور اپنی دانست میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ اس کا حربہ کامیاب رہا ہے۔ سلطان مرزا نے آچاریہ ہرگوپال کی یہ پیشکش ٹھکرا دی تھی کہ وہ رام کوٹ جا کر کنواری کنیاؤں سے آرتی اتروائے گا۔ اس نے جواباً کہا تھا۔ ”ہمارے مذہب میں کوئی بھی اوتار کی طرح نہیں ہوتا۔ میں اسی لئے آپ لوگوں کی اس رسم میں شرکت نہیں کر سکتا۔“

آچاریہ ہرگوپال بلا کا گھاگ تھا۔ اس نے بددل ہونے کے بجائے ایک نیا پینترا

بدلا اور سلطان مرزا سے کرشن جی اور ان کی گوپیوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ گوپیوں کے ذکر سے اس نے تخلیق کا قصہ اور پھر شیو جی کا بیان شروع کر دیا۔ مزید بے حجابی اور بے تکلفی کی خاطر اس نے ہندو دیو مالا کے اس تخلیق والے حصے کو تفصیل سے بیان کیا جس سے سلطان مرزا کے جذبات برانگیختہ ہوں۔

سلطان مرزا کی کیفیت دیکھ کر آچاریہ نے ایک اور وار کیا۔

"یہی تو ہمارا دھرم ہے۔"

سلطان مرزا حیران تھا کہ آچاریہ یہ کیا کہہ رہا ہے اسے ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا کہ بات اس حد تک آگے بڑھ جائے گی مگر ابھی تو اسے مزید حیران ہونا تھا۔

"ہمارے دھرم کے مطابق کرشن مہاراج اوتار تھے اور بھگوان کے اوتار اس جگ (دنیا) کی ہر چیز پر اپنا حق رکھتے ہیں۔ داس (خدمت گار) ہوں کہ داسیاں' مرد ہوں کہ عورتیں' بیاہی ہوں کہ بن بیاہی سب پر ان کا ادھیکار (اختیار) ہے سو اوتار ہونے کے ناطے برج کی گوپیوں پر بھی کرشن مہاراج کا ادھیکار تھا۔ گوپیاں انکی مرلی (بانسری) پر ناچتی تھیں اور اپنا سب کچھ ان پر ارپن (ارپن' نثار) کر دیتی تھیں۔ آچاریہ' حاکم اودھ کو پرچار رہا تھا۔" "کسی راج کا راجہ یا حاکم ہمارے دھرم میں اوتار ہی جانا اور مانا جاتا تھا۔ سو اس کو بھی اپنی رعایا پر اوتار ہونے کے ناطے ایسا ہی ادھیکار ہے۔"

"یعنی اگر وہ چاہے تو اپنی رعایا میں سے کسی کو بھی اپنے تصرف میں لا سکتا ہے؟"

سلطان مرزا نے بظاہر انجان بنتے ہوئے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

آچاریہ کی آنکھوں میں فتح کی چمک لہرانے لگی۔ مغلوں نے تو اودھ کو فتح کیا تھا' آچاریہ ہرگوپال نے حاکم اودھ کو فتح کر لیا تھا' پھر اسی رات آچاریہ نے اس فتح کا جشن منایا تھا۔ اس نے دیا (چراغ) بجھایا تو چونک اٹھا۔ "ہرگوپال! تو دیئے کی جوت بجھا سکتا ہے پر میری آنکھوں کی جوت نہیں' جو اندھیرے میں بھی دیکھ لیتی ہے۔ اندھیرے میں جیسے کسی ناگن کی پھنکار سنائی دی۔

"دیوی!" آچاریہ کے منہ سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

"تو یہاں عیش کر رہا ہے اور تجھے نہیں معلوم کہ دشمن تیرا پیچھا کرتے ہوئے اس مندر تک بھی آ پہنچے ہیں۔ شاید تجھے یہ گھمنڈ ہے کہ وہ مندر کے اس تہہ خانے تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

آچاریہ آج واقعی اپنی فتح پر اتنا ہی خوش تھا کہ اس نے تعاقب کا خیال نہیں کیا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے شک تو اسے بھی تھا کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ یہ شک آج یقین میں بدل گیا تھا جسے اس نے "دیوی" کہا تھا' وہ غلط نہیں کہہ سکتی تھی۔ آچاریہ ہرگوپال نے بس ایک بار اس "دیوی" کی ہلکی سی جھلک دیکھی تھی یا پھر خود "دیوی" ہی نے اسے اپنا دیوانہ بنانے کیلئے جھلک دکھلائی تھی۔ آچاریہ تبھی سے اس کا دیوانہ ہو گیا تھا' مگر دیوانگی کے اظہار کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ وہ "دیوی" کی طاقت سے واقف تھا۔ سارے ایودھیا پر اسی کی حکومت چلتی تھی۔

آچاریہ ہرگوپال کو بنارس سے یہاں بھیجا گیا تھا۔ پھر اسے اسی نظام کا ایک حصہ بنا لیا گیا تھا جو ایودھیا کا زیر زمین نظام کہلاتا تھا۔ موجودہ "دیوی" ساتویں تھی۔ اس سے پہلے چھ اور "دیویاں" ایودھیا کی اس زیر زمین دنیا پر حکمرانی کر چکی تھیں۔

"دیوی" کے مخبر ہندوستان بھر کے راجاؤں کے دربار میں تھے۔ ایودھیا ہی ایک ایسا مرکز تھا جو ہندو ریاستوں کو ایک دھاگے میں باندھے ہوئے تھا۔ راجاؤں کیلئے وہیں سے احکام جاری ہوتے تھے۔

اس شہر میں ہندوؤں کے بڑے بڑے "دماغ" جمع تھے اور ان دماغوں پر دیوی کی حکومت تھی۔ ایک دیوی اگر مر جاتی تھی یا اپنے دشمنوں کے ہتھے چڑھ کر ہلاک ہو جاتی تھی تو اس کی جگہ دوسری دیوی لے لیتی تھی جو پہلے ہی زیر تربیت ہوتی تھی اور دیوی کی نیابت کرتی تھی۔ دیوی یا اس کی نائبہ کا انتخاب بھی "بڑے دماغ" کرتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے رشی منی ہوتے تھے۔

دیوی کو مذہبی درجہ حاصل تھا۔ اسے دنیا کے قدیم ترین بت سواع کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ چٹانیں کاٹ کر بنائی جانے والی کسی عورت کی یہ پہلی مورتی تھی۔ ہندو عقائد کے مطابق سواع ہی کو برہما کہا جاتا تھا اور برہما ہی کو ہندو دنیا کا پہلا آدمی کہتے ہیں۔ عورت کی مورتی کو کب مرد کے بت میں تبدیل کر دیا گیا اس کا سراغ ہندو دیو مالا میں بھی نہیں ملتا۔

اس مذہبی حیثیت نے دیوی کے مقام کو بہت بلند کر دیا تھا۔ وہ کم ہی کسی کے سامنے آتی تھی اور اگر آتی بھی تھی تو اس کا چہرہ نقاب میں چھپا رہتا تھا۔ دیوی اگر مصلحتاً کسی کو اپنی جھلک دکھا دیتی تو وہ خود کو خوش قسمت سمجھتا۔ ہرگوپال بھی ایسے ہی خوش قسمتوں میں سے ایک تھا۔ دیوی کے حکم ہی پر وہ سلطان مرزا کے پیچھے لگا تھا اور اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ اب

اسے یہ اسید تھی کہ اس کا درجہ بڑھا دیا جائے گا اور وہ بھی ''بڑا دماغ'' کہلائے گا مگر ذرا سی غلطی نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ ابھی وہ دیوی سے اپنے ''کارنامے'' کی داد بھی نہیں لے پایا تھا کہ یہ افتاد پڑ گئی۔ ایسے میں اسے یہی سوجھا کہ دیوی سے اپنے قصور کی معافی مانگ لے اور اس نے ایسا ہی کیا۔

ایودھیا سے کوئی پچاس میل شمال مغرب میں ایک قدیم شہر سیت سہیت کے کھنڈرات تھے۔ یہ کھنڈرات راپتی ندی کے جنوب میں واقع ٹیلوں پر تھے اور یہ نیلے جنگلوں میں گھرے ہوئے تھے اس قدیم شہر کو گیارہویں صدی عیسوی میں سوم ونشی خاندان کے آخری راجہ سوہل دیو نے اپنا مستقر بنایا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دو چینی سیاحوں ہوان سیانگ اور پھر فاہیان نے بھی یہ کھنڈرات دیکھے تھے۔ اور مگدھ کے گپت سامراج میں یہ شہر پھلا پھولا تھا۔ گپت خاندان کے زوال کے ساتھ ساتھ 319 ء میں اس شہر کا بھی زوال ہو گیا تھا۔

اس قدیم شہر کے کھنڈرات اور اس کے قریبی جنگلوں میں اس وقت بڑی سرگرمی نظر آ رہی تھی یہاں دو لاشیں ملی تھیں ایک لاش اس سادھو کی جس نے رام کوٹ میں سانولی رادھا اور دو دوشیزاؤں کا تعاقب کیا تھا۔ دوسری لاش اس جوگی کی تھی جسے ایودھیا شہر کے ایک قریبی کھنڈر میں آ چار یہ ہرگوپال کی نگرانی کا حکم ملا تھا۔ جنگل میں مناسب جگہ ان دونوں لاشوں کی تدفین کر دی گئی تھی۔ اب کھنڈرات اور قریبی جنگلوں کا گوشہ گوشہ چھانا جا رہا تھا۔

وہ دونوں جن میں سے ایک سادھو اور جوگی بنا ہوا تھا ہفتے بھر سے غائب تھے۔ ایودھیا اور اس کے نواحی علاقوں میں ایک ہفتے سے ان دونوں کو تلاش کیا جا رہا تھا۔ تلاش بسیار کے بعد آج ان کی لاشیں ملی تھیں جن سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ شناخت کے بعد فوری طور پر انہیں دفنا دیا گیا تھا۔ لاشوں سے جو تعفن اٹھ رہا تھا اسی نے لاشوں تک پہنچنے میں مدد دی تھی۔

دوپہر کے وقت وہ گروہ لاشیں تلاش کرنے میں کامیاب ہوا تھا اور اب شام ہو رہی تھی۔ ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ گروہ کے نگران نے مشعلیں جلانے کا حکم دیدیا تھا۔ وہ سر سے پیر تک سیاہ لبادے میں چھپا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بھی سیاہ نقاب ہی میں تھا۔ نگران نے اپنے ماتحتوں کو جو احکام دیئے تھے انہی کی روشنی میں سراغ لگانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

رات ہو گئی تو اس نے اپنے ماتحتوں کو روانگی کا حکم دیدیا مگر خود وہاں سے نہیں گیا۔ ان میں سے کسی کو علم نہیں تھا کہ ان کا نگران کہاں رہتا ہے۔ نگران کے احکام انہیں مختلف ذرائع سے مل جاتے تھے اور کبھی براہ راست بھی وہ ان تک پہنچ جاتا تھا۔ انہیں صرف یہ علم تھا

کہ کوئی طاقتور خفیہ ہندو تنظیم ایودھیا میں سرگرم عمل ہے اور ان کا نگران اس تنظیم کے گرد جالا بن رہا ہے! انہیں یہ بھی خبر نہیں تھی کہ مختلف افراد سے کیا کام لے رہا ہے۔ سیاہ لبادے میں ملبوس شخص کے ماتحت وہاں سے چلے گئے اور ہر طرف خاموشی پھیل گئی تو اس نے سیاہ لبادہ اتار دیا۔ نقاب بھی چہرے سے ہٹا دی۔ جلتی ہوئی مشعل کو اس نے ایک درخت کے دوشاخے میں پھنسا دیا۔ سانولی رنگت کا وہ شخص ہندوستانی ہی معلوم ہو رہا تھا اس کی کمر سے چمڑے کی جو پیٹی بندھی ہوئی تھی اس میں خنجر، جدھر، تلوار اور اسی وضع کے دیگر ہتھیار لگے ہوئے تھے۔ چھوٹا سا ایک ہتھیار جسے بندوق کی مختصر شکل کہا جا سکتا ہے خود اسی کی اختراع تھی اس میں بارود اور لوہے کی چھوٹی چھوٹی گولیاں تھیں اس کے چلنے سے دھماکہ بھی ہوتا تھا۔ یہ خطرناک ہتھیار بھی اس کے پاس تھا جسے اس زمانے کا جدید ترین ہتھیار کہہ سکتے ہیں۔ تیر اور کمان بھی اس کے پاس تھے۔ وہ اس طرح ہتھیاروں سے مزین تھا جیسے اسے کوئی معرکہ درپیش ہو۔ اس کے سینے اور پشت پر چہار آئینہ بندھا ہوا تھا۔ چمڑا لگے ہوئے یہ چار آہنی ٹکڑے تھے جن سے اس کے سینے اور کمر کی حفاظت ہو گئی تھی۔ پیروں میں ''موزہ آہنی'' تھا جن سے پیروں کی حفاظت مقصود تھی۔ اسی طرح ہاتھوں کی حفاظت کیلئے دستانہ آہنی تھا۔ سر پر دبلغہ بھی لوہے کا ہوتا تھا۔ اس سے چہرے، سر اور ناک کی حفاظت ہوتی تھی۔ اس کے گرد خوبصورتی کیلئے ایک بڑا رومال بندھا ہوا تھا جس کا کچھ حصہ شانے کی پشت پر لٹک رہا تھا۔ سیاہ لبادے کے نیچے بھی وہ جو لباس پہنے ہوئے تھا۔ سیاہ ہی تھا، شاید اس لئے کہ دور سے دیکھنے پر وہ تاریکی کا ایک حصہ معلوم ہو۔ آج کی شب اس کیلئے خوش بختی کی شب تھی کیونکہ وہ اپنے دشمن پر ہاتھ ڈالنے والا تھا۔ وہ لوگ جو ابھی یہاں سے لوٹے تھے ان کے علاوہ بھی کچھ لوگوں کو وہ مختلف فرائض سونپ کر آیا تھا۔ اس نے اپنے دشمنوں کا سراغ لگا لیا تھا۔ بس ''ہانکنے'' کی دیر تھی۔ محض اپنے اطمینان کی خاطر اس نے اپنے ماتحتوں سے جنگل کا گوشہ گوشہ دکھوایا تھا کہ کہیں یہاں پہلے سے تو وہ لوگ موجود نہیں جن کا اسے ''شکار'' کرنا تھا ورنہ تو وہ پہلے ہی ایک نتیجہ اخذ کر چکا تھا۔ گزشتہ ایک ہفتہ اس نے محض اپنے گمشدہ افراد کی تلاش میں نہیں گزارا تھا۔ اسی ایک ہفتے کے دوران میں اس نے دشمن کے گرد بنے ہوئے جال کی ڈوریاں کھینچنا شروع کر دی تھیں اور اب نتیجے کا منتظر تھا۔

وہ اپنے خیالوں میں غرق ایک پیڑ کے نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ اس کا مشکی گھوڑا ہنہنایا جسے اس نے قریبی درخت سے باندھ دیا تھا۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ قدموں کی چاپ اس نے سن لی تھی اور اس سے اندازہ لگایا تھا کہ آنے والا کوئی ایک فرد نہیں۔ اپنی جگہ سے اٹھ

کر وہ ایک پیڑ کی آڑ میں ہو گیا۔ اس پیڑ تک مشعل کی روشنی نہیں پہنچ رہی تھی۔

ذرا ہی دیر بعد اسے معلوم ہو گیا کہ آنے والے اسی کے آدمی تھے جو اسی کی طرح مسلح تھے۔ ان کی تعداد بارہ تھی۔ اس نے جہاں دوشاخے میں مشعل نکالی تھی وہ سب وہیں جمع ہو گئے تھے۔ یہ نووارد وہ نہیں تھے جو یہاں سے اس کے حکم پر رات ہوتے ہی چلے گئے تھے۔

نوواردوں کو اس نے پیڑ کی آڑ ہی میں رہ کر ہدایات دیں اور وہ سب ایک سمت جنگل میں روانہ ہو گئے۔ مشعل اس نے وہیں دوشاخے میں اٹکی رہنے دی اور خود کچھ فاصلے پر اندھیرے میں روپوش ہو گیا۔

بہت دیر تک جنگل میں سناٹا رہا اور پھر اچانک ہی کہیں دور سے ملی جلی ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کچھ لوگ آہستہ قدمی سے چل رہے ہوں۔ سیاہ پوش نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ اب اس کا رخ اسی سمت تھا جدھر پہلے ہی وہ اپنے آدمیوں کو روانہ کر چکا تھا۔ وہ جگہ زیادہ دور نہیں تھی۔ سیاہ پوش جلد ہی وہاں پہنچ گیا۔ جہاں زمین آدمیوں کو اگل رہی تھی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ آٹھ مرد تھے' دو عورتیں تھیں جن کے آگے اور پیچھے چار چار مسلح افراد تھے۔ یوں ان کی کل تعداد اٹھارہ تھی۔ وہ سبھی گھوڑوں کی لگامیں تھامے ہوئے تھے۔ وہ ایک بڑی سی سرنگ کا دہانہ تھا جس سے نکل کر انہوں نے جنگل کی ایک سمت میں چلنا شروع کیا تھا۔ جلتی ہوئی مشعلیں ان کے ساتھ تھیں۔

آگے آگے جو حسین عورت چل رہی تھی اس کے چہرے پر نقاب تھی۔ اس کے دائیں اور بائیں اور آگے مسلح محافظ تھے۔ سب سے آگے جو محافظ تھا اس نے مشعل بھی اٹھا رکھی تھی۔ اسی طرح سب سے پیچھے آنے والے ایک محافظ کے ہاتھ میں بھی مشعل تھی۔ درمیان میں چلنے والے آٹھ افراد میں سے بھی ایک مشعل اٹھائے ہوا تھا۔

سرنگ سے نکل کر ابھی انہوں نے چند قدم کا فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ اچانک فضا میں سیاہ پوش کی آواز گونجی "بڑھو!"

اسی کے ساتھ پیڑوں کی آڑ سے نکل کر آنے والوں نے اس مختصر سے قافلے کو گھیر لیا گھیرنے والے سیاہ پوش کے ساتھی تھے۔ "دیوی!" کوئی گھبرا کر چیخا۔

"مشعلیں پھینک دو!" نقاب پوش عورت کی پرسکون آواز آئی۔ "بکھر جاؤ!" یہی وہ تھی جسے دیوی کہہ کر پکارا گیا تھا۔

وہ "شکار کا حلقہ" تھا۔ اسے توڑ کر نکل جانا آسان نہیں تھا۔ مسلح افراد نے اس حلقے

کو توڑنے کیلئے نبرد آزمائی شروع کر دی۔

☆......☆......☆

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دیوی اچھلی اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ عین اس وقت ایک سنسناتا ہوا تیر اس کے گھوڑے کی پچھلی ٹانگ میں پیوست ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک دھماکہ ہوا اور دیوی کا گھوڑا زخمی ہو کر زمین پر گرا۔ گھوڑے پر سوار دیوی لمحے بھر کو فضا میں نظر آئی اور پھر حیرت انگیز تیزی سے کسی ناگن کی طرح اندھیرے میں رینگ گئی۔

ہتھیاروں سے ہتھیاروں کے ٹکرانے کی جھنکار پیچھے رہ گئی۔ دیوی شکار کے حلقے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

ابھی وہ سرنگ کے دہانے تک پہنچی تھی کہ سیاہ پوش کی آواز گونجی۔ "رک جا چھپا دیوی! آج فیصلے کی شب ہے تو بچ کر نہیں نکل سکتی۔"

دیوی نے کوئی جواب دیئے بغیر سرنگ کے دہانے میں چھلانگ لگا دی۔ اندھیرے کے باوجود اس کا ہیولہ سیاہ پوش کو صاف نظر آ گیا تھا۔ کافی دیر اندھیرے میں رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں۔

سیاہ پوش نے بھی دیوی کے تعاقب میں جست بھری اور پھر سرنگ میں پہنچ گیا۔ سرنگ کافی دور تک ڈھلوان تھی۔ اس نے دیوی کو ڈھلان کے آخری سرے پر لڑھکتے ہوئے دیکھا۔ یہ امر اس کیلئے باعث حیرت تھا کہ سرنگ میں تاریکی نہیں تھی۔ جب تک وہ ڈھلان کے اختتام تک پہنچا دیوی اٹھ کر بھاگتی ہوئی خاصی دور نکل چکی تھی۔ سرنگ میں موجود متحرک روشنی کے ساتھ ہی گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی قریب آتی جا رہی تھی۔

اٹھ کر کھڑے ہوتے ہی سیاہ پوش نے دیوی کو ایک بار پھر للکارا اور رکنے کو کہا۔ اسی کے ساتھ اس کی نظر ان چار مسلح گھڑ سواروں پر پڑی جو آگے پیچھے گھوڑے دوڑاتے ہوئے تیزی سے دیوی کے قریب آتے جا رہے تھے۔

سیاہ پوش کی للکار کے جواب میں دیوی کا وحشیانہ قہقہہ بلند ہوا پھر اسکی آواز سرنگ میں گونجی۔ "شہباز خان! یہ مالوہ نہیں ایودھیا ہے یہاں میری حکومت ہے۔" لمحہ بھر خاموشی کے بعد دیوی کے منہ سے کسی انجانی زبان میں کچھ الفاظ نکلے مگر یہ الفاظ سیاہ پوش کیلئے نہیں تھے۔

یہ سمجھنے میں سیاہ پوش کو دیر نہ لگی کہ حفظ ماتقدم کے طور پر دیوی اپنے ان چاروں مسلح گھڑ سواروں کو سرنگ ہی میں چھوڑ گئی ہو گی۔ وہ اکیلا تھا اور گھوڑا بھی اس کے پاس نہیں تھا۔

سرنگ کی چوڑائی بس اتنی تھی کہ دو گھوڑے برابر برابر دوڑ سکتے تھے۔

دیوی کے قریب ایک گھڑ سوار رکا اور اس نے اپنا گھوڑا دیوی کے حوالے کردیا۔ مشعل بھی اس نے دیوی کو دیدی اور اپنے دوسرے ساتھی کے گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ دو گھڑ سوار نہیں رکے تھے وہ لحہ بہ لحہ سیاہ پوش کے قریب تر آتے جارہے تھے۔ انہیں صورتحال سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ انہوں نے دیوی کے الفاظ سن لئے تھے۔ دیوی نے انہیں جو حکم دیا تھا وہ ہر حال میں اس کی تعمیل کرنا چاہتے تھے۔ یہ حکم سیاہ پوش کی موت تھا۔

گھڑ سواروں نے قریب آتے آتے سیاہ پوش پر تیروں کی بوچھاڑ کردی۔ اگر وہ سرتاپا لوہے میں ڈوبا نہ ہوتا تو اس کا جسم تیروں سے چھلنی ہو جاتا۔ اس نے صرف اپنے چہرے کے کھلے حصے اور کلائیوں کو بچایا تھا۔ اس کیلئے سیاہ پوش نے اپنا رخ پھیر لیا تھا۔ اسی اثنا میں اس کے دشمن سر پر آ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا آہنی دستانے پر تلوار کی ضرب لگی وہ غالباً اپنی بہادری کے زعم میں اور اسے تنہا پا کر گھوڑوں سے کود گئے تھے۔

اس دوران میں سیاہ پوش کو صرف اپنی تلوار نکالنے کا موقع مل سکا تھا اور یہ بھی اس کیلئے بہت تھا۔ وہ اچھل کر پیچھے ہوا اور پھر ان دونوں پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں کو جہنم رسید کرنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ اس عرصے میں بقیہ دو بھی وہاں پہنچ گئے۔ جو تیسرے گھوڑے پر سوار تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کا انجام دیکھ کر فرار نہیں ہوئے بلکہ "جے بجرنگ بلی" کا نعرہ لگا کر سیاہ پوش پر حملہ آور ہو گئے۔ انہوں نے بھی گھوڑے سے کودنے کی حماقت دہرائی تھی اور اس کے نتیجے میں اپنے اپنے سینے تھامے منہ کے بل گر پڑے تھے۔ ایک لحہ بھی ضائع کئے بغیر سیاہ پوش ایک گھوڑے پر سوار ہوا اور گھوڑے کو سرپٹ سرنگ میں دوڑا دیا۔ گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے اس نے جلتی ہوئی ایک مشعل بھی زمین پر سے اٹھالی تھی۔

سیاہ پوش کو علم تھا کہ وہ سرنگ ایودھیا تک جاتی ہے۔ دیوی اگر ایودھیا تک پہنچ گئی تو پھر اس کا ہاتھ لگنا آسان نہیں ہوگا۔ وہ اسی لئے گھوڑے کی پسلیوں پر اپنے گھٹنوں کا دباؤ برقرار رکھے ہوئے تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ جس گھوڑے پر وہ سوار ہوا تھا اچھی نسل کا تھا اس لئے رفتار لحہ بہ لحہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔

اس سرنگ کا دوسرا دہانہ ایودھیا میں گپتا گھاٹ کے قریب تھا۔ ہندوؤں کے نزدیک اس گھاٹ کی مذہبی حیثیت تھی۔ ہندو کہاوتوں کے مطابق یہیں پر سرجو ندی میں ڈوب کر رام چندر جی نے خودکشی کی تھی۔ اس کے نزدیک ایک استوپ تھا جس پر ہندوؤں نے

قبضہ کرلیا تھا اور وہاں سے گوتم بدھ کی مورتیاں ہٹادی تھیں۔ ہندوؤں نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں رام چندر جی کے زمانے میں رام کوٹ کی تعمیر کرتے ہوئے مزدور اور راج آرام کرتے تھے اور یہ دراصل رام کوٹ ہی کا حصہ ہے رام کوٹ کی تعمیر کرنے والے مزدور یہاں اپنی ٹوکریاں اور اوزار بھی رکھتے تھے۔

اسی استوپ کے بڑے تہ خانے میں دیوی اور اس کی نائبہ کا قیام رہتا تھا۔ صرف آٹھ بڑے گیانیوں کو اس کا علم تھا۔ کیونکہ وہ خود بھی یہیں رہتے تھے۔ یہ استوپ یا مندر دراصل ہندوؤں کی زیرزمین تنظیم کا مرکز تھا۔ اس کی ظاہری شکل استوپ ہی کی برقرار رکھی گئی تھی۔ اس کا مقصد دیکھنے والوں کو یہ دھوکا دینا تھا کہ یہ بودھوں کی عبادت گاہ ہے۔ سیاہ پوش کو دیوی کی تلاش میں اسی لئے اتنا طویل عرصہ لگا تھا۔ اس کے آدمیوں نے اس استوپ کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کیا تھا۔ مگر دیوی ایک خفیہ راستے کے ذریعے استوپ سے نکل کر سرنگ کے دہانے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ استوپ ہی کے اندر وہ مسلح گھڑ سوار تھے جو دیوی کا "محافظ دستہ" کہلاتے تھے۔ آٹھ بڑے گیانیوں اور اپنی نائبہ سمیت دیوی محافظ دستے کے ساتھ ایودھیا سے فرار ہوئی تھی۔ قدیم شہر سیت مہیت کے کھنڈرات سے ملحق جنگلوں میں پہنچ کر دیوی خود کو محفوظ کرنے کے علاوہ نئی مدافعتی حکمت عملی بھی مرتب کرنا چاہتی تھی۔ آچاریہ ہرگوپال کے ذریعے حاکم اودھ محمد سلطان مرزا کو تو اس نے قابو میں کرلیا تھا مگر اپنے دیرینہ دشمن شہباز خان ابدجانی پر قابو نہیں پاسکی تھی۔ شہباز خان طویل عرصے سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔

شہباز خان سے دیوی کا پہلا معرکہ مالوہ میں ہوا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب بابر نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم نہیں رکھا تھا۔ مالوہ پر سلطان محمود خلجی کی حکومت تھی۔ ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تبدیل ہوگیا تھا۔ گجرات کا فرماں روا سلطان مظفر شاہ تھا۔ شمالی ہند پر ابراہیم لودھی کی حکومت تھی۔ اور یہی حکومت دراصل سب سے بڑی تھی۔ راجپوتانہ میں مختلف ہندو راجہ حکمراں تھے۔

ساتویں دیوی جس کا نام چمپا تھا۔ ایودھیا سے بذات خود مالوہ گئی تھی اور وہاں اس نے مقامی راجپوتوں سے مل کر ایسے حالات پیدا کردیے تھے کہ دو مسلم ریاستیں گجرات اور مالوہ آپس میں ٹکرا جائیں۔ خلجی خاندان سے تعلق رکھنے والا سلطان محمود خلجی عضو معطل ہو کے رہ گیا تھا کیونکہ اصل اقتدار وزیر مملکت کے ہاتھ میں آ گیا تھا جو ہندو تھا۔ مالوہ کی فوج کی اصل

طاقت بھی راجپوت ہی تھے۔

چمپا جو مقصد لے کر مالوہ گئی تھی اس میں کامیابی کے قریب تھی کہ شہباز خان مالوہ پہنچ گیا۔ چمپا نے خود کو گجرات کی ایک مظلوم شہزادی ظاہر کیا تھا جس کے باپ کو مظفر شاہ نے مروا دیا تھا۔

اس کہانی میں اتنی حقیقت ضرور تھی کہ سلطان مظفر شاہ نے اپنے ہی خاندان کے جس شخص کو قتل کرا دیا تھا اس کی بیٹی کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ یوں چمپا ایک مظلوم مسلمان شہزادی قمرالنسا بن کر سلطان محمود خلجی کے محل میں داخل ہو گئی تھی اور اس نے سلطان کی بیٹی کو شیشے میں اتار لیا تھا۔ سلطان کے محل میں پہنچ کر چمپا کو سازش کا جال بننے میں بڑی آسانی ہو گئی تھی۔ جب شہباز خان چمپا کی حقیقت سے واقف ہو گیا تھا تو وہ مالوہ سے اس کی محبوبہ زہرہ کو قتل کر کے فرار ہو گئی تھی۔

یہی وہ وقت تھا جب شہباز خان کو واپس کابل پہنچنا تھا۔ بابر نے اسے فوراً طلب کر لیا تھا کیونکہ اس بار وہ ہندوستان پر فیصلہ کن حملہ کرنا چاہتا تھا۔

اس حملے سے پہلے بابر ہندوستان کے متعلق شہباز خان سے تفصیلی گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ بابر ہی کے ایما پر شہباز خان طویل عرصے سے ہندوستان میں تھا۔

ہندوستان میں کتنی خودمختار ریاستیں ہیں؟ ان ریاستوں کی فوجی قوت کتنی ہے؟ وہاں کے سیاسی حالات کیا ہیں؟ ہندوستان کی سب سے بڑی حکومت لودھی خاندان کے فرماں روا ابراہیم لودھی کے تعلقات دوسری خودمختار حکومتوں سے کیسے ہیں؟ خود فرماں روا کس قدر سیاسی بصیرت کا مالک ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب ہی کی خاطر بابر نے شہباز خان کو ہندوستان روانہ کیا تھا اور اس سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھا۔

شہباز خان اندجان کا رہنے والا تھا جو بابر کے وطن فرغانہ کے قریب تھا۔ وہ بابر کے ان رفیقوں میں سے ایک تھا جنہوں نے آخر وقت تک اس کا ساتھ دیا تھا۔ برے وقت میں جب بابر کے ہمراہ گنتی کے چند ساتھی رہ گئے تھے اور وہ اپنی جان بچانے کی خاطر کوہستانوں میں آوارہ گردی پر مجبور ہو گیا تھا تو ان میں شہباز خان اندجانی کا نام بھی شامل تھا۔

بے مثل ذہانت اور بہادری کے علاوہ شہباز خان حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک تھا۔ فن حرب میں تو وہ طاق تھا ہی مگر دیگر فنون میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔ ایک ہنر اسکا یہ بھی تھا کہ وہ اپنے جسم کی رنگت تبدیل کر لیتا تھا۔ اس کیلئے وہ مختلف جڑی بوٹیوں سے غسل کرتا

تھا اور اسکا سرخ و سفید رنگ حسب ضرورت سانولا یا کالا ہو جاتا تھا۔ سراغ رسانی میں تو وہ حرف آخر تھا۔ بابر نے اسی لئے یہ محکمہ اس کے سپرد کر دیا تھا۔ ہندوستان بھر میں بابر کے جتنے مخبر پھیلے ہوئے تھے۔ انکا نگران اعلیٰ یہی شہباز خان تھا۔ بابر کو شہباز خان ہی کے ذریعے ہندوؤں کی زیر زمین تنظیم کے بارے میں معلوم ہوا تھا جس کا مرکز ایودھیا تھا۔ شہباز خان اسی لئے بابر کی اجازت سے اس خفیہ تنظیم کی بیخ کنی کی خاطر ایودھیا آیا تھا۔ چمپا دیوی سے اپنی محبوبہ کے قتل کا بدلہ لینا ایک ضمنی معاملہ تھا۔

شہباز خان نے اپنے محکمے کے بہترین افراد کو ایودھیا میں جمع کر لیا تھا۔ اس کی اطلاعات کے مطابق مالوہ سے فرار ہو کر چمپا اپنی محفوظ پناہ گاہ یعنی ایودھیا پہنچ گئی تھی۔

ایودھیا آ کر ہی شہباز خان کو "دیوی" کی اصل قوت و طاقت کا اندازہ ہوا تھا۔ اسی دوران میں محمد سلطان مرزا حاکم اودھ بنا دیا گیا اور اودھ کا دورہ کرتا ہوا ایودھیا پہنچ گیا۔ پھر اس نے یہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں آ کر اس نے مسجد کی تعمیر کے بارے میں بابر سے اجازت طلب کی۔ بابر نے شہباز خان سے رابطہ قائم کیا۔ شہباز خان نے پیغام بھجوایا کہ یہ معاملہ تحقیق طلب ہے۔ اس کا سبب وہ ہندو روایات تھیں جو ایودھیا آ کر شہباز خان کے علم میں آئی تھیں۔

ان روایات کے تحت ایودھیا' ہندوؤں کے اوتار رام چندر جی کا جائے پیدائش تھا۔ تحقیق و جستجو کا کام بابر نے شہباز خان کے سپرد کر دیا۔ تبھی شہباز خان' رام کوٹ تک پہنچا۔ اس دوران وہ خود بھی ایک بار بابر سے ملا۔ اس ملاقات میں یہ طے پایا تھا کہ فوری طور پر مسجد کی تعمیر ضروری نہیں جب تک کہ تمام حقائق سامنے نہ آ جائیں اور ہندوؤں کی خفیہ تنظیم پر ہاتھ نہ ڈال دیا جائے۔ شہباز خان نے بابر کو بتایا تھا کہ سازشی ٹولا صرف برہمنوں کا ہے ہندو عوام کا اس تنظیم سے کوئی تعلق نہیں۔

خود ایودھیا میں بسنے والے ہندو عوام برہمنوں کی سازش سے بے خبر ہیں وہ قصوروار نہیں ہیں۔

اسی ملاقات کے بعد بابر نے حاکم اودھ محمد سلطان مرزا کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر یہ فرمان بھیجا تھا کہ تاحکم ثانی نئی مسجد کی تعمیر نہ کی جائے۔ اسی فرمان کو پڑھ کر سلطان مرزا کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نمایاں ہو گئے تھے۔ پھر جب آچاریہ ہرگوپال نے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کئے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو شہباز خان نے دانستہ چشم پوشی سے کام لیا تاکہ سلطان مرزا کو بطور چارہ استعمال کیا جا سکے۔ شہباز خان اس میں کامیاب رہا

اور ''دیوی'' کے گرد جال بننے میں اسے وقت نہیں ہوئی۔ وہی دیوی اسے پھر جل دے کر نکل جانا چاہتی تھی۔ شہباز خان اسی لئے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا رہا تھا کہ دیوی کے دوبارہ ایودھیا پہنچنے سے پہلے اسے زیر دام لے آئے۔ یہ وہی تھی جس نے اس کی محبوبہ کو بھی قتل کیا تھا۔ بالآخر طویل سفر کے بعد اسے دیوی کی ایک جھلک نظر آ ہی گئی۔ پھر تو وہ عقاب کی طرح جھپٹا۔ دیوی جس گھوڑے پر سوار تھی وہ شاید تھک گیا تھا اور تیز رفتاری کا ثبوت نہیں دے رہا تھا۔

دیوی نے ایک بار مڑ کر اپنے تعاقب میں آتے ہوئے شہباز خان کی طرف دیکھا اور پہلی بار اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں ناچنے لگیں۔ ہنگامے کے دوران اس کے چہرے کی نقاب نہ جانے کہاں گر گئی تھی۔ اجلے چہرے پر تاریکی سی چھا گئی تھی۔ وہ غالباً سمجھ چکی تھی کہ بازی ہار چکی ہے۔

شہباز خان جب اس کے قریب پہنچا تو وہ اپنے گھوڑے کو روک چکی تھی اور مشعل ہاتھ سے پھینک دی تھی۔

''تم مجھے زندہ گرفتار نہیں کر سکو گے۔ شہباز خان!'' دیوی نے مڑ کر عجیب سے لہجے میں کہا۔ وہ زہر کھا چکی تھی مگر شہباز خان اس سے بے خبر تھا۔

''او رائے بدروح! میں تجھے زندہ دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔'' شہباز خان نے یہ کہتے ہی تلوار نکال لی اور دیوی کی تنی ہوئی گردن پر بھرپور وار کیا۔

دیوی کی گردن کٹ کر دور جا گری اور کٹی ہوئی گردن سے خون کا فوارہ اچھلنے لگا۔

☆......☆......☆

ایودھیا میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ اس سے ہندو عوام ہراساں تھے۔ ایودھیا کے بڑے بڑے دماغ جنگی تعداد آٹھ تھی یہاں سے پچاس میل دور ایک قدیم شہر کے کھنڈرات میں موت کی نیند سلا دیئے گئے تھے۔ دیوی کی نائبہ بھی قتل کر دی گئی تھی اور دیوی کے محافظ دستے کا ایک فرد بھی زندہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ عیار برہمنوں کی خفیہ زیر زمین تنظیم جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دی گئی تھی۔

آچاریہ ہرگوپال' ساتوں رادھا اور ہر وہ مرد و زن بس دیوار زنداں تھا جس کا خفیہ تنظیم سے تعلق تھا اور خود حاکم اودھ محمد سلطان مرزا خوفزدہ تھا۔ مگر شہباز خان سے ملاقات کے بعد اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ معطل نہیں کیا جائے گا۔ شہباز خان ہی کے ایما پر اس نے ایودھیا

کے نمائندہ ہندوؤں کا ایک اجلاس طلب کیا تھا اور انہیں تسلی دی تھی کہ بے گناہ و بے قصور ہندو رعایا کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ اجلاس میں موجود خود ہندوؤں نے ہندو مسلم اتحاد کے دعوے کئے تھے اور حکومت وقت کو اپنی وفاداریوں کا یقین دلایا تھا۔

جس روز ایودھیا میں یہ اجلاس ہو رہا تھا اس سے ایک دن پہلے ہی شہباز خان آگرے کیلئے روانہ ہو چکا تھا۔ وہ بابر کو بذات خود ایودھیا میں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ بابر کو اپنی تحقیق و جستجو سے بھی مطلع کرتا کہ وسط شہر میں جہاں نئی مسجد تعمیر ہونے کی تجویز ہے اس جگہ سے خود ہندوؤں کی روایات کے مطابق رام چندر جی کی جائے پیدائش ''رام کوٹ'' خاصی دور ہے۔

شہباز خان تک یہ اطلاع بھی پہنچ گئی تھی کہ اس نئی مسجد کو بابر کے نام سے موسوم کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ وہ اس تجویز کے حق میں تھا کہ نئی مسجد ''بابری مسجد'' کہلائے۔

جس وقت شہباز خان آگرے کی حدود میں داخل ہوا تو شام ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ حاکم اودھ کے قاصد کا بہروپ بھرے ہوئے تھا۔ قلعے میں پہنچتے ہی اس کے عملے کے افراد نے اسے تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کیا اور وہ فکرمند ہو گیا۔ شہزادہ ہمایوں مرزا اس کی اولاد ہی کی طرح تھا۔

بابر کے حکم پر ہمایوں کچھ عرصہ پہلے کابل سے واپس آ گیا تھا اور مراد آباد کے ایک قصبے سنبھل میں تھا۔ قصبہ سنبھل میں ہمایوں شدید بیمار ہو گیا تھا اور بابر نے اسے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ ہمایوں کی بیماری کے ساتھ ہی شہباز خان نے جو دلدوز خبر سنی تھی وہ بابر کے متعلق تھی۔

اس خبر کی تفصیل یہ تھی کہ جب ہمایوں حالت مرض میں سنبھل سے آگرے کے نواح میں پہنچا تو اس کی بیماری نے شدت اختیار کر لی اسے قلعے میں لایا گیا۔ طبیبوں نے بہت علاج معالجہ کیا۔ اپنی سی ہر کوشش کر لی مگر ہمایوں کو افاقہ نہ ہوا۔

ایک روز اس زمانے کے ایک فاضل آدمی امیر ابوالبقا نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے شہزادے کی زندگی کسی صدقے کی طالب ہے جس کے بغیر موت ٹل نہ سکے گی۔ اگر بادشاہ سلامت ایسی کوئی چیز کہ اس سے زیادہ عزیز کوئی اور چیز نہ ہو بیٹے پر قربان کر دیں تو امید ہے اللہ تعالیٰ شفا عطا فرما دے۔

اس پر ایک امیر نے تجویز پیش کی کہ وہ قیمتی الماس جو سلطان علاؤالدین خلجی کے جواہر خانے میں تھا اور جو آگرے کی فتح پر بابر کے ہاتھ آیا تھا' اسے صدقے میں دیدیا جائے

کہ کارگزار اسے فروخت کر کے اس کی قیمت مستحقوں میں تقسیم کر دیں۔

بابر نے جو یہ سنا تو بولا وہ پتھر کا ٹکڑا میری اور میرے بیٹے کی جان سے زیادہ عزیز اور قیمتی نہیں ہے۔ ہمایوں کے بعد اگر مجھے کچھ عزیز ہے تو وہ میری اپنی جان ہے اس لئے میں اس پتھر کے بجائے اپنے بیٹے پر اپنی جان ہی کو صدقہ کئے دیتا ہوں شاید اللہ تعالیٰ اس نذرانے کو قبول فرمالے۔"

پھر بابر خلوت میں گیا اور اللہ کے حضور صدق دل سے دعا مانگی۔

اس نے دعا سے فارغ ہو کر تین مرتبہ بیٹے کے اطراف چکر لگایا۔ اس دوران وہ "برداشتم، برداشتم، برداشتم" کہہ رہا تھا مراد اس سے یہ تھی کہ میں نے اس کی بیماری اپنے سر لے لی۔

اسی دن کے بعد ہمایوں کی صحت کے آثار پیدا ہو گئے تھے اور بابر بیمار پڑ گیا تھا۔

شہباز خان کیلئے یہ خبر بڑی روح فرسا تھی۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ بابر سے اگلے روز ملے گا۔ رات کو آرام کرلے گا کیونکہ اس نے طویل سفر کیا تھا مگر اب اسے آرام کہاں تھا! اس کی روح بابر سے ملنے کیلئے بے چین ہو گئی تھی۔ اب اس نے سارا روپ بہروپ ختم کر دیا تھا اور پھر سے وہی شہباز خان بن گیا جو اپنی نوجوانی کے زمانے میں بابر کا دوست اور رفیق تھا۔

اس شب جب وہ بابر سے ملا تو آب دیدہ تھا۔ بابر اس وقت بستر پر تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا اور ہمایوں کیلئے وصیت لکھوا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ جب وہ وصیت نامے کا آخری جملہ ادا کر چکا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر میر منشی کو قریب بلا کر وصیت نامے پر دستخط کر دیئے۔ اس سے پہلے بابر نے حسب عادت تحریر پر ایک نظر ڈال لی تھی پھر بابر ہی کے سامنے وصیت نامے پر اس کے نام کی مہر لگائی گئی۔ شہباز خان اس دوران میں دانستہ ایسی جگہ جا کر کھڑا ہو گیا تھا کہ فوری طور پر بابر کی نظر اس پر نہ پڑ سکے۔ شہباز خان وہ واحد شخص تھا جسے حضور شاہ میں باریابی کیلئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔ اس وقت وہ کسی بہروپ میں نہیں تھا اس لئے اسے بادشاہ کی خلوت میں آنے سے نہیں روکا گیا تھا۔ بابر کو اس لئے علم نہ ہو سکا کہ اس کے بستر کے دائیں جانب سرہانے دبے قدموں سے آ کر کون کھڑا ہو گیا ہے! اس نے شہباز خان کا مقصد محض یہ تھا کہ بابر وصیت نامہ مکمل کرالے۔ آنسو بھری آنکھوں سے وہ بابر کے مضمحل اور بیمار چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

جب میر منشی کو بابر نے اشارے سے جانے کی اجازت دیدی اور طویل سانس لیا تو اس کی نظر اچانک شہباز خان پر پڑی۔ اسی کے ساتھ اس کے منہ سے نکلا۔ "تخلیہ!" اس حکم کے بعد محافظ اور وہاں موجود دیگر افراد رخصت ہو گئے۔

اب شہباز خان ضبط نہ کر سکا اور "اے میرے شاہ!" کہتا ہوا بابر کے قریب آ گیا۔ اس کے رخساروں پر آنسو ڈھلک آئے تھے۔

"یہ کیا شہباز خان؟ ہم زندگی میں پہلی بار تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے شدت جذبات سے بابر کی آواز بھرا گئی تھی۔

دیر تک شہباز خان بابر کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے خاموش بیٹھا رہا۔ بابر بھی اس دوران میں مزید کچھ نہ بولا وہ اپنے دیرینہ رفیق کے جذبات سے اچھی طرح واقف تھا۔ پھر جب خود ہی شہباز خان نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ لئے تو بابر نے گفتگو شروع کی۔

بابر کے استفسار پر مختصراً شہباز خان نے ایودھیا کے واقعات بیان کر دیئے پھر بولا۔ "اے میرے شاہ! اپنے خادم کی ایک خواہش پوری کر دیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی دلی خواہش بیان کر دی۔

"اگر تمہاری بھی یہی خواہش ہے کہ ایودھیا میں تعمیر ہونے والی مسجد ہمارے نام سے موسوم ہو اور بابری مسجد کہلائے تو ہماری طرف سے اجازت ہے۔ کاش ہم اس قابل ہوتے کہ خود اس مسجد کا سنگ بنیاد اپنے ہاتھوں سے رکھتے جو ہمارے نام سے موسوم ہو رہی ہے۔" بابر کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔ ذرا توقف سے وہ پھر بولا "سنو شہباز خان! ہماری بھی ایک خواہش ہے کہ ہم نہ سہی تو ہمارا رفیق خاص مسجد کی تعمیر کے وقت وہاں ضرور موجود ہو۔"

"حکم کی تعمیل ہو گی اے میرے شاہ!"

☆.....☆.....☆

ایودھیا شہر کے وسط میں رام کوٹ سے خاصے فاصلے پر بابری مسجد کی تعمیر ہو رہی تھی اس مسجد کی تعمیر میں ہندو اور مسلمان بھی حصہ لے رہے تھے۔ [illegible]م اودھ محمد سلطان مرزا روزانہ ہی مسجد کا معائنہ کرنے آتا تھا۔ اسے علم ہو چکا تھا کہ بابر [illegible] علیل ہے۔ اس کے ساتھ اسے بابر کا یہ حکم بھی مل چکا تھا کہ بابری مسجد کی تعمیر جلد از جلد مکمل کی جائے۔ اسے مطلع کر دیا گیا تھا کہ شہباز خان بھی ایودھیا پہنچ چکا ہے وہ مسجد کی تعمیر کے وقت وہیں ہو گا۔

بابری مسجد کی تعمیر کے روزانہ معائنے کا ایک سبب یہ بھی تھا' مگر اب تک نہ شہباز خان اس سے ملا تھا نہ مسجد کے قریب اسے نظر آیا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ محکمہ سراغ رسانی کا نگران اعلیٰ بابر کا رفیق خاص اور بہروپیا شہباز خان ان مزدوروں میں شامل ہوگا جو بابری مسجد کی تعمیر میں مصروف تھے۔ سلطان مرزا کے تو وہم وگمان میں یہ بات نہیں آسکتی تھی۔

جس روز 1531ء میں بابری مسجد کی تعمیر مکمل ہوئی اور اس میں پہلی بار "اللہ اکبر" کی صدا گونجی تو آخری مرتبہ بابر نے اس عالم رنگ و بو کو دیکھا اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ اپنی ایک یادگار بابری مسجد کی صورت میں صفحۂ ہستی پر چھوڑ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

مستقبل سے لوٹ کر جب میں زمانہ حال میں پہنچی تو عارج کو بدستور دوائیں کوٹتے دیکھا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا اور بغداد کے گلی کوچوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"اے دینار! تو آخر اتنی گم صم کیوں ہے۔" عارج نے مجھے مخاطب کیا۔ "تو نے بھلا ایسا کیا دیکھا؟"

"میں نے اے عارج آنے والا ایک ایسا زمانہ دیکھا کہ جب ایک مسجد کی تعمیر کیلئے ایک مسلمان بادشاہ کو طویل عرصے انتظار کرنا پڑا۔ ہے نا حیرت کی بات!..... مگر شاید تو اس بات کو نہ سمجھ سکے۔" میں بولی۔

"بس رہنے دے اے دینار! کچھ باتوں کا نہ سمجھنا ہی اچھا ہوتا ہے مجھے بیٹھے بٹھائے تیری طرح دکھ پالنے کا کوئی شوق نہیں۔" عارج نے کہا۔

"ٹھیک ہے نہ پال دکھ اور لاعلم رہنے پر فخر کر مجھے کیا!"

"تجھے کسی طرح چین بھی ہے دینار! تیری ہاں میں ہاں ملاؤ تو ناخوش' اختلاف کرو تو تیرا منہ بن جائے' میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تجھے کس طرح خوش رکھوں!"

"بڑا ہی مظلوم ہے تو!" میں نے اظہار افسوس کیا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "نہ کوئی وعدہ' نہ امید پھر بھی....."

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کس بات کا وعدہ اور کیسی امید؟"

عارج نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولا۔ "کاش میں تیرے سوال کا جواب دے سکتا دینار!"

"کیا تجھے جواب دینے سے کسی نے روکا ہے؟"

"روکا تو نہیں..... لیکن....." عارج اپنی بات پوری نہ کرسکا۔

ہمارے درمیان اس طرح کی نوک جھونک ہوتی رہی۔ اسی دوران میں خلیفہ المہدی اور اسکے وزیر یعقوب بن داؤد کا ذکر نکل آیا۔

"تو بتا دینار! کیا یعقوب اس کا اہل ہے کہ خلیفہ کا وزیر یعنی عہدۂ وزارت پر رہے؟ خلیفہ کے بعد وزیر ہی کا حکم چلتا ہے اور وہی مملکت کے سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے..... سوچنے کی بات یہ ہے کہ....."

"عارج! میں تجھے بتا نہیں سکتی کہ اس وقت مجھے تیرے منہ سے سوچنے سمجھنے کی بات سنکر کس قدر خوشی ہورہی ہے!"

میں نے عارج کی بات کاٹ کر مزید کہا۔ "یہ بھی بڑی عجیب سی بات ہے میرے لئے کہ تو اقتدار کے ایوانوں میں مسند نشین آدم زادوں کے بارے میں بھی اہل اور نااہل ہونے کا سوال اٹھانے لگا ہے۔"

"تو کیا میں سوچنا چھوڑ دوں دینار؟" وہ میرے لہجے کی شوخی بھانپ کر تپ گیا۔

"سوچنے ہی سے تو تیرا وجود قائم ہے۔"

"یعنی اگر میں نہ سوچوں تو نہ رہوں؟" عارج چڑ کر بولا۔

"ہاں عارج!..... تو سوچتا ہے اس لئے تو ہے۔"

"پتا نہیں تو کیا انٹ شنٹ باتیں کرنے لگی اور وزیر یعقوب کی بات بیچ میں ہی رہ گئی۔"

"تو بتا کیا چاہتا ہے؟..... تجھے اس آدم زاد سے کیوں نفرت ہوگئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ وہ نفرت ہی کے قابل ہے..... منحوس کہیں کا!"

"تجھ پر بھی آخر یہ راز کھل ہی گیا کہ خلیفہ وقت کا وزیر بدعقیدہ ہے!" میں نے ہنس کر کہا۔ "لگتا ہے کہ تو اب اپنے کان کھڑے رکھتا ہے اور مطب میں آنے والے مریضوں کی باتیں دھیان سے سنتا ہے۔"

"دینار! لوگ کیا کہتے ہیں' ہم تو سنتے ہیں مگر اہل اقتدار نہیں سنتے!"

"بہت خوب عارج! تجھے تو اچھا خاصا بولنا آگیا ہے۔"

"تو کیا تو مجھے بھی سمجھ رہی تھی' یعنی گونگا اور بے زبان!..... میں عرب ہوں....."

زبان رکھنے والا۔''

''عرب ہونے پر نہ اترا کہ یہ تعریف بہت پہلے مٹائی جا چکی ہے..... سن کہ ہمارے پیغمبر آخرؐ نے کیا فرمایا تھا!..... کسی عجمی کو عربی پر اور کسی عربی کو عجمی پر فوقیت یا برتری حاصل نہیں۔ تو جانتا ہے کہ میرا تعلق بھی عرب کی سرزمین سے ہے لیکن مجھے اس پر غیر ضروری فخر نہیں ہے۔'' میں نے عارج کو نرمی سے اپنا نقطۂ نظر سمجھایا۔

''یہ تو خیر ٹھیک ہے مگر..... وزیر یعقوب کی بات کو تو پھر باتوں میں اڑا گئی۔''

''اچھا یہ بتا کہ تجھے وزیر یعقوب کے متعلق کیا معلوم ہے؟'' میں نے عارج سے سوال کیا۔

''موجودہ خلیفہ المہدی کے باپ المنصور نے وزیر یعقوب کو قید میں ڈال دیا تھا پھر وہ کیسے رہا ہوا تجھے خبر ہے تو یہ بھی یقیناً جانتی ہوگی کہ اس آدم زاد یعقوب نے کس طرح خلیفہ کو شیشے میں اتار رکھا ہے!''

''مجھے کیا معلوم ہے' کیا نہیں اسے چھوڑ اے عارج! اپنی کہہ!'' میں کہنے لگی۔

''میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ اگر یعقوب اس عہدے پر برقرار ہا تو مسلمانوں کی اس مملکت کیلئے اچھا نہ ہوگا۔''

''تیری اگر یہی مرضی ہے اے عارج تو پھر مجھے کوئی کرتب دکھانا ہی پڑے گا۔'' میں مسکرائی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مطلبی' عیار' بدکردار وزیر یعقوب کا اثر ورسوخ مجھے بھی گراں گزرتا تھا۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتیاں کر رہا تھا۔ خلیفہ المنصور نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی یعقوب کو پابند سلاسل کیا تھا۔ موجودہ خلیفہ المہدی کو اس بات پر غور کرنا چاہئے تھا مگر اس نے یہ ضرورت محسوس نہ کی۔

آدم زادوں کے درمیان رہ کر میں نے ایک اور بات شدت سے محسوس کی تھی کہ انہیں کچھ سے کچھ بنانے میں وقت اور حالات کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اسے تاریخ کا جبر بھی کہا جا سکتا ہے۔ عارج نے اہل و نااہل کا جو قصہ چھیڑا تھا تو ایک وزیر یعقوب ہی کیا' بہت سے صاحبان اقتدار اس پر پورے نہیں اترتے۔ خود خلیفہ المہدی' المنصور کا بیٹا نہ ہوتا تو اقتدار میں نہ آتا۔ اس میں المہدی کی اہلیت یا نااہلیت کو کوئی دخل نہ تھا۔ یہی تاریخ کا جبر ہے جو آدم زادوں اور کسی حد تک ہم جن زادوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اس جبر کو رضائے الٰہی کا نام

دینا بھی مناسب ہے۔

یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو حکمرانی کر رہا ہو اس پر انگلی نہ اٹھائی جائے۔ انگلی اٹھانا تو الگ آدم زادوں کی تاریخ تو ہاتھ اٹھانے کے قصے بھی بیان کرتی ہے' سر قلم کئے جانے اور مسند نشین ہونے کا ذکر بھی اس میں آتا ہے۔

عموماً اقتدار کے نشے میں آدم زادوں کو منظر واضح نظر نہیں آتے اور وہ اپنے انجام کو بھول جاتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ وزیر یعقوب کے ساتھ بھی ہوا۔ اس کے زوال کا ایک سبب میری ایک شرارت بھی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ وزیر یعقوب کی حرکات قبیحہ سے عام لوگ ہی نہیں خاص لوگ بھی تنگ تھے' مگر اس ڈھیٹ پر کوئی اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ یعقوب نے خلیفہ کی کچھ کمزوریوں اور دلچسپیوں کا سراغ لگا لیا تھا۔ مثلاً حسین و خوبصورت خواتین کے ذکر میں خلیفہ کو خصوصی دلچسپی تھی۔ خلیفہ سے خلوت میں یعقوب کا موضوع گفتگو عموماً یہی ہوتا تھا۔ ودم شکار کے قصوں اور شکار کھیلنے سے خلیفہ المہدی کو بڑی رغبت تھی۔

جب یعقوب نے سلطنت کے اہم عہدوں پر اپنے ہم خیالوں کو مقرر کر دیا تو خلیفہ کے خادمان قدیم اور آزاد غلاموں کو یہ امر شاق گزرا۔ وہ خلیفہ سے یعقوب کی شکایتیں کرنے لگے۔

خلیفہ مہدی ان کی شکایتوں کو اس طرح بظاہر توجہ سے سنتا کہ گویا ابھی ان کا ازالہ کر دے گا۔ شکایتیں کرنے والوں کو پکا یقین ہو جاتا کہ ان کی شکایتوں نے خلیفہ کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ وہ اسی لئے آپس میں کہا کرتے کہ دیکھنا کل صبح کو ضرور یعقوب گرفتار ہو جائے گا مگر ایسا نہ ہوتا۔ صبح ہوتی اور یعقوب دربار خلافت میں حاضر ہوتا تو خلیفہ مہدی اس سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتا۔ چند آدم زاد ایسے بھی تھے جو اپنی خلوتوں میں اسے منافقت کا نام بھی دیتے۔ ان میں اتنی ہمت بہر حال نہ ہوتی کہ جان کی پروا نہ کرکے کھلے عام سچ بولنے کا خطرہ مول لیتے۔ آدم زادوں کی اکثریت مرنے سے ڈرتی ہے۔ موت کے اسی خوف سے ہر زمانے کے صاحبان اقتدار فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک دن انہیں بھی موت آ دبوچتی ہے۔ یعقوب کے دشمن اب رفتہ رفتہ خلیفہ مہدی کے سامنے آتے جا رہے تھے۔ اس عرصے میں خلیفہ مہدی نے ایک باغی کو قتل کرنے کی غرض سے یعقوب کے حوالے کیا۔ یعقوب نے دانستہ رشوت کھا کر اسے رہا کر دیا۔ کسی نے خلیفہ تک یہ خبر پہنچا دی۔ خلیفہ مہدی کو

اس پر یقین نہ آیا اور بولا۔ ''ہم نہیں مان سکتے!''

''اگر امیر المومنین کی اجازت ہو تو اس شخص کو خدمت میں پیش کیا جائے۔'' مخبر نے کہا۔

''اجازت ہے۔'' خلیفہ بہ جبر و اکراہ بولا۔

پھر خلیفہ مہدی اس وقت حیران رہ گیا جب مذکورہ شخص کو اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

''وزیر یعقوب کو اسی وقت حاضر کیا جائے!'' خلیفہ نے حکم دیا۔

خلیفہ کا محافظ دستہ آناً فاناً گیا اور یعقوب کو کشاں کشاں لے کر آ گیا۔

اس بات پر یعقوب گھبرایا تو بہت کہ صبح ہی صبح یہ کیا افتاد آن پڑی اور اس فوری طلبی کی وجہ کیا ہے مگر خلیفہ سے بے تکلفانہ مراسم کے سبب وہ ہمت نہ ہارا اور سوچا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں نے اس کی بے پروائی سے یہی نتیجہ اخذ کیا۔ خلیفہ نے یعقوب سے اس علوی کا حال دریافت کیا اور کہا۔ ''اسے تو تم نے قتل کر دیا ہوگا!''

''امیر المومنین کے حکم سے میں نے اسے قتل کر ڈالا۔'' یعقوب نے بے دھڑک جھوٹ بول دیا۔

خلیفہ مہدی کے حکم پر مذکورہ شخص کو ایک پردے کے پیچھے چھپا دیا گیا تھا۔ یعقوب کی دیدہ دلیری پر خلیفہ نے مخصوص اشارہ کیا۔

محافظ اس شخص کو پردے کے پیچھے سے نکال کر سامنے لے آئے۔

اب تو یعقوب کی حالت غیر ہوگئی مگر جلد ہی اس نے خود پر قابو پا کر اپنے قصور کی معافی چاہی اور بولا ''اے امیر المومنین! مجھے اس پر یوں ترس آ گیا تھا کہ اس کے بیوی بچوں کی کفالت کرنے والا کوئی نہیں...... لیکن امیر المومنین کے حکم کی تعمیل نہ ہونے پر یہ غلام انتہائی شرمندہ ہے اور اجازت طلب ہے کہ غلطی کے ازالے کا موقع عنایت فرمایا جائے۔''

خلیفہ مہدی نے یعقوب کو ''موقع'' دیدیا۔ اس نے نیام سے تلوار نکالی اور مذکورہ شخص کی گردن اڑا دی۔

''بہت خوب!'' خلیفہ نے اس پر اظہار پسندیدگی کیا۔

یوں یعقوب تعمیل حکم نہ کرنے پر بھی زندہ بچ گیا۔ میں تلملا کے رہ گئی۔ سبب یہ کہ یعقوب کو میں نے ہی اپنے اثر میں لے کر رشوت کے عوض اس علوی کو زندہ چھوڑنے پر اکسایا

تھا۔ میرا مقصد اس سے محض یہ تھا کہ یعقوب جیسے بدعنوان وزیر سے بغداد والوں ہی کی نہیں سب مسلمانوں کی جان چھوٹ جائے۔

مجھے اعتراف ہے کہ میرا یہ حربہ ناکام رہا۔ میرے ایما پر عارج نے ''مخبر'' کا کردار ادا کیا تھا۔ اس کے لئے اسے خلیفہ کے ایک مصاحب کے جسم پر قبضہ کرنا پڑا تھا۔ اس روز کہ جب یعقوب صاف بچ گیا' میں سخت جھنجلائی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے میں عارج کی ایک بات پر گرم ہو گئی اور بولی۔ ''عارج! تو مجھے عقل کل کیوں سمجھتا ہے اور اس حقیقت کو کیوں نہیں مان لیتا کہ ہم جن زادوں کے مقابلے میں آدم زاد بہت چالاک ہیں۔ اس کے باوجود تو دیکھ' میں اس آدم زاد یعقوب کو چھوڑوں گی نہیں اور اسے قصر خلافت سے نکلوا کر دم لوں گی۔''

''دینار! تو اس طرح یہ بات کہہ رہی ہے جیسے یعقوب سے میری رشتے داری ہو!'' عارج جواباً کہنے لگا۔ ''تو جو چاہے اس کا حشر کر۔''

''اس معاملے میں اب میں تجھ سے مدد نہیں لوں گی اے عارج...... میں تن تنہا بھی اس آدم زاد یعقوب کے لئے کافی ہوں۔''

مجھے غصے میں دیکھ کر عارج نے چپ سادھ لی۔ ہر چند کہ میرا غصہ مصنوعی تھا مگر عارج رعب میں آ گیا۔ صنف مخالف آدم زادوں کی ہو کہ جنات کی صنف نازک پر اپنی برتری ضرور جتاتی ہے' خواہ یہ برتری تسلیم کی جائے یا نہیں۔ اپنی صنف والیوں کو اسی لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ محبت اپنی جگہ لیکن بے وجہ دبنے کی ضرورت نہیں۔ اس ''حق'' بات کے بعد میں اصل قصے کی طرف آتی ہوں۔

☆......☆......☆

ہوا یہ کہ حسب سابق یعقوب نے خلیفہ کی خلوتیں آباد کرنی شروع کیں۔ رات کو وہ دیر تک قصر خلافت میں رہتا۔ اسے خلیفہ مہدی کا مکمل اعتماد حاصل تھا۔ میں اس کی نگرانی کرتی رہی کہ وہ کب آتا ہے اور کب جاتا ہے اس کے لئے مجھے انسانی پیکر چھوڑنا پڑتا۔

ایک رات یعقوب دیر تک شکار کے قصے کہتا رہا۔ یہ قصے نصف شب تک چلے اور اس نے خلیفہ سے رخصت کی اجازت لی۔ خلیفہ کو بھی قصوں میں دلچسپی کے باوجود نیند آنے لگی تھی۔ وہ اپنی خواب گاہ میں جانے کو اٹھ کھڑا ہوا۔

یعقوب قصر خلافت کے اس حصے کی ایک عمارت سے باہر نکلا جو حصہ خلیفہ اور اسکے خاندان والوں کے لئے مخصوص تھا۔ میں نے اس عرصے میں یعقوب کے غلام پر نیند طاری کردی جو گھوڑے کے پاس مستعد کھڑا تھا۔ یعقوب آیا تو میں اس کے قریب موجود تھی لیکن وہ مجھے دیکھنے سے قاصر تھا۔ یعقوب کے معاملے میں اتنے عرصہ تک میں نے اس لئے انتظار کیا تھا کہ اسے جو ''حادثہ'' پیش آئے' غیر فطری معلوم نہ ہو۔ غلام جاگتا ہوتا تو گھوڑے پر چڑھنے میں یعقوب کی مدد کرتا' سو اسے میں نے سلا دیا۔ آدھی رات تک انتظار کرتے کرتے غلام کو بھی نیند آ سکتی ہے!..... غرض کہ غلام کی مدد کے بغیر یعقوب گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ میں نے یعقوب کے ذہن سے وہاں غلام کی موجودگی کو محو کر دیا۔ یعقوب ایک قیمتی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ گھوڑے پر چڑھ کر وہ چادر سنبھالنے لگا۔

یہی وہ لمحہ تھا کہ جب میں نے اس کے گھوڑے کو بدکا دیا۔ نتیجہ یہ کہ یعقوب زمین پر آ رہا۔ اس کے ایک پیر کی پنڈلی ٹوٹ گئی۔

میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ اس قصر خلافت سے نکل کر بغداد کے مغربی حصے کی طرف پرواز کر گئی۔ یہ بغداد کا وہی محلہ حربیہ تھا جہاں میری سکونت تھی۔ بابل کے کھنڈرات کی طرف بھی ہمارا آنا جانا لگا رہتا تھا اور ہم صحراؤں کی خاک بھی چھانتے رہتے تھے۔ اس رات عارج

اسی مکان میں میرا منتظر تھا جو میں نے موسیٰ بن کعب سے خریدا تھا اور جہاں دن کے وقت صبح سے دوپہر' پھر شام سے رات گئے تک مریضوں کا ہجوم رہتا تھا۔ میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو آدم زادیاں عشاء کے وقت تک مطب کی حدود میں داخل ہو جائیں انہیں ضرور دیکھ لوں ایسا ہی مردانے میں عارج کرتا تھا۔

بغداد کے علاوہ بھی اب ہماری شہرت کوفے' نجف' کربلا یہاں تک کہ موصل تک پھیل گئی تھی۔ مریض کو تو شفا سے مطلب ہوتا ہے' خواہ اس کے لئے اسے دور دراز ہی کا سفر کیوں نہ کرنا پڑے۔ ملوجیہ کی آبادی بغداد سے زیادہ دور نہیں تھی' سو وہاں سے بھی بڑی تعداد میں مریض آنے لگے تھے۔ میں آدم زادوں کی خدمت کر کے خوش تھی' مگر یعقوب جیسے عیاروں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتی تھی۔

''کیا ہوا اے دینار تجھے واپسی میں آج بڑی دیر ہوگئی؟''

عارج مجھ سے مخاطب ہوا۔

''یہ نہیں پوچھے گا کہ کام ہوا یا نہیں!'' یہ کہتے ہوئے میں نے طبیبہ اطروبہ کا انسانی پیکر اختیار کر لیا۔ انسانی پیکر اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عارج بھی ''آدمی'' بنا ہوا تھا۔ آدمی بننے کے الگ مزے ہیں جو مجھ سے زیادہ بہتر آدم زاد جان سکتے ہیں۔

مکان کے جس دالان میں ہماری سکونت تھی اس میں چراغ روشن تھا۔ دو بستر' دو بڑی چوکیوں پر بچھے تھے۔ انہی میں سے ایک پر عارج ''المعروف'' طبیب صارم بیٹھا تھا' آدمی بنا ہوا! میری بات کے جواب میں وہ کہنے لگا لگتا ہے کام ہوگیا ورنہ تو اس قدر خوش نظر نہ آتی کیا تو نے وزیر یعقوب کو مار ڈالا؟''

''نہیں'' میں نے انکار میں سر ہلایا' پھر بولی ''تم اسے مردہ ہی سمجھو!'' میں نے یعقوب کے گھوڑے کو بدکا کر پنڈلی ٹوٹنے کی بابت عارج کو بتا دیا۔

''مگر صرف پنڈلی ٹوٹنے سے کیا ہوگا اے دینار؟''

''یہی ذرا ذرا سی باتیں تو تیری سمجھ میں نہیں آتیں عارج!'' میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

''یہاں میرے بستر پر آجا دینار! تاکہ تجھے زور زور سے نہ بولنا پڑے۔ تجھے یہ بھی خبر ہے کہ رات کے وقت سناٹے کی وجہ سے آواز دور دور تک سنائی دیتی ہے۔''

میں اس کی بات سن کر مسکرا دی اور اپنے بستر سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اپنے

پاس بلانے کیلئے تو اتنی لمبی کہانی کیوں سنا رہا ہے کہ رات کے وقت آواز دور دور تک جاتی ہے۔" میں اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"تو کچھ کہہ رہی تھی اے دینار!"

"تو کہنے دے جب نا!......ادھر میں نے کچھ کہا' ادھر تو بول اٹھا۔" "کبھی کبھی تو اپنی ایسی باتوں سے مجھے بالکل بچہ معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ تو میں ہوں' بچے سے زیادہ معصوم اور کون ہو سکتا ہے!"

"تو صارم کے بجائے تیرا نام معصوم علی کیوں نہ رکھ دیا جائے!"

"اب تو میرا مذاق ہی اڑاتی رہے گی کہ وزیر یعقوب کی پنڈلی توڑنے کا عقدہ حل کرے گی!"

"دیکھ پنڈلی میں نے نہیں توڑی بلکہ......"

"گھوڑا بدکنے اور اس کے زمین پر گرنے سے ٹوٹی ہے تو یہی کہنا چاہتی ہے نا!......کم سے کم مجھے تو جھانسا نہ دیا کر!"

"تو سن اے عارج! کہ یعقوب کی ٹوٹی ہوئی پنڈلی کیا گل کھلائے گی۔" میں بتانے لگی۔ "چوٹ آجانے کی وجہ سے وزیر یعقوب' خلیفہ کے دربار میں حاضر نہ ہو سکے گا' نہ خلوت میں اسے خلیفہ کے پاس جانے کا موقع ملے گا پھر ہوگا یہ کہ وہ درباری جو یعقوب سے نالاں ہیں' ان کی بن آئے گی۔ خلیفہ کے بارے میں یہ بھی سنا گیا ہے کہ وہ کانوں کا کچا ہے' دوسرے یہ کہ اس کا مزاج گرم ہے وہ جلد برہم ہو جاتا ہے۔ ان تمام باتوں سے نتیجہ نکال اے عارج کہ وزیر یعقوب پر کیا گزرنے والی ہے!"

"یہ تو سیدھی سی بات ہے اے دینار کہ اچھی نہیں گزرے گی۔"

عارج کی بات ابھی پوری ہوئی تھی کہ مکان کے دروازے پر زوردار دستکیں سنائی دینے لگیں۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے!......کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی! یوں آدھی رات کے بعد دروازے پر کون دستکیں دے سکتا ہے!" میں بڑبڑائی' پھر عارج سے کہا۔ "تو جا کر دیکھ! میں بھی آتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

اس سے پہلے کہ عارج یہ دیکھ کر آتا' آدھی رات کو دروازے پر دستک دینے والا کون ہے' خود میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی میں چند قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ کسی عورت کے

رونے کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں چونک اٹھی اور میرے قدم تیزی سے دروازے کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ جو کوئی بھی تھی میرے خیال میں مدد کی مستحق تھی۔ اور اس نے یہ مجبوری ہی میرے مکان کے دروازے پر دستک دی تھی۔

عارج جب واپس آیا تو میں دھیمی آواز میں اس سے مخاطب ہوئی: "تو دروازہ کھلا کیوں چھوڑ آیا اے عارج؟......نصف شب گزر چکی اور ایسے میں کوئی لٹیرا بھی ہمارے گھر میں داخل ہو سکتا ہے۔"

"وہ کوئی لٹیرا نہیں' ایک آدم زادی ہے دینار!" عارج بھی آہستہ آواز میں بولا۔ "وہ میری بچی کہہ کہہ کر روئے جا رہی ہے!"

"لگتا ہے کہ اس کی بچی شدید بیمار ہے۔" میں نے کہا۔ "دیکھتی ہوں میں!......تو یہیں ٹھہر!"

"یہ شمع دان تو لے لے۔" عارج بولا۔

"لا!" میں نے ہاتھ بڑھا کر اس سے شمع دان لے لیا۔ پھر عارج تو وہیں کھڑا رہا اور میں چادر سنبھالتی ہوئی مکان کے دروازے پر پہنچ گئی۔ وہ عورت بھی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ میں نے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ اس نے اپنا چہرہ بھی خاصی حد تک چادر میں چھپا رکھا تھا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے اس وقت خطرے کا احساس ہوا جب کہ بظاہر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

"کون ہو تم؟" میں نے اس عورت کو مخاطب کیا۔

"میں......میں یہیں اسی محلے میں رہتی ہوں اور"......وہ سسک اٹھی۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنی بچی کے بارے میں کچھ فکرمند ہو" میں نے کہا۔ "کیا تمہاری بچی بیمار ہے؟"

"ج......جی ہاں......اسے جانے کیا ہو گیا ہے۔ آنکھیں ٹھہر گئی ہیں اور ......اور سر پیچھے کی طرف ڈھلک گیا ہے۔" اس عورت نے روتے ہوئے رک رک کر بتایا۔

میرے سوالوں کے جواب میں اس نے اپنی بیمار بچی کی بیماری کے متعلق جو کچھ بتایا اس سے میں ایک ہی نتیجے پر پہنچی۔

"تمہاری بچی کو دماغی بخار لگتا ہے۔" میں دھیرے سے بولی: "فکر نہ کرو ٹھیک ہو جائے گی وہ میں اسے چل کر دیکھ لیتی ہوں۔"

’’بچی کے پاس کون ہے؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’اس کے بڑے بھائی کو چھوڑ کر آئی ہوں۔‘‘ عورت نے جواب دیا۔

’’تم اسی کو بھیج دیتیں یا بچی کو یہاں لے آتیں۔‘‘

’’دراصل بچی کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر میں گھبرا گئی تھی۔‘‘ عورت نے بتایا۔ ’’اگر میں گھبرا نہ جاتی تو اتنی رات کو یہاں دوڑی نہ آتی۔ ناوقت آپ کو زحمت دی‘ اس پر معافی چاہتی ہوں..... میرا بیٹا صرف دس برس کا ہے ورنہ اسی کو.....‘‘ میں بول اٹھی..... ’’کیا گھر میں کوئی مرد نہیں؟‘‘

’’کوئی ہوتا تو..... تو پھر مجھے آنے کی کیا ضرورت تھی!

میں بیوہ ہوں‘‘ عورت دوبارہ رونے لگی۔

’’رو مت!..... میں دواؤں کی صندوقچی لے کر آتی ہوں۔‘‘ میں نے اسے تسلی دی۔

یہ حقیقت ہے کہ اس آدم زادی پر مجھے ترس آ گیا تھا۔ مجھے خطرے کا احساس اب بھی تھا مگر اس پر ہمدردی کا جذبہ غالب آ گیا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ وہ قابل رحم آدم زادی بھلا مجھے کیا نقصان پہنچا سکتی ہے۔

کوئی بھی مرض رات اور دن کا پابند نہیں‘ ایک طبیبہ کی حیثیت سے مجھے اس کا تجربہ تھا۔ رات کے وقت کسی کی طبیعت خراب ہو جائے تو وہ کہاں جائے! ظاہر ہے کہ طبیب ہی کے پاس دوڑے گا یا تیماردار اسے طبیب کے پاس لے جائیں گے۔

کچھ ہی فاصلے پر عارج موجود تھا۔ میں اس تک پہنچی اور اسے حقیقت احوال سے آگاہ کیا۔

’’تو اکیلی جائے گی اس آدم زادی کے ساتھ؟‘‘ عارج کے لہجے میں قدرے فکرمندی جھلکنے لگی۔ اس کی آواز پست ہی تھی۔

’’کیوں‘ کیا ہوا؟..... تو مجھے جانتا نہیں۔ میرا نام دینار ہے۔ میں کسی آدم زاد کے لیے لقمہ تر نہیں ہوں۔‘‘ میں دھیمی مگر سخت آواز میں بولی۔ ’’تو جا اور جلدی سے میری دواؤں کی صندوقچی لے آ۔‘‘ پھر میں نے چند دواؤں کے نام جو دماغی بخار میں سودمند ثابت ہوتی ہیں۔ بتا کر اس سے کہا۔ ’’ان دواؤں کو بھی صندوقچی میں رکھ دیجیو۔‘‘

جلد ہی عارج لوٹ آیا۔ دواؤں کی صندوقچی اس کے ہاتھ میں تھی۔

’’جلدی آ جائیو اے دینار!‘‘ عارج مجھ سے بولا۔

’’میں گھومنے پھرنے نہیں جا رہی‘ آ جاؤں گی مریضہ بچی کو دیکھ کر!‘‘ میں نے کہا۔ ’’ممکن ہے کہ اس کی طبیعت سنبھلنے تک مجھے وہاں رکنا پڑے‘ تجھے ہولنے کی ضرورت نہیں۔ یہ لے شمع دان اور دروازہ اندر سے بند کر لے۔‘‘ میں دروازے کی طرف بڑھی۔

دواؤں کی صندوقچی اٹھائے کچھ ہی دیر بعد میں نے اپنے گھر سے باہر قدم رکھا۔

’’خدا حافظ!‘‘ عقب سے عارج کی آواز آئی۔

اس لمحے بھی مجھے خوف سا لگا۔ کوئی جیسے میرے اندر سے کہہ رہا تھا۔ نہ جا اے دینار!..... لوٹ جا اپنے گھر کی طرف۔ اسی خوف کی وجہ سے جواباً عارج کو ’’خدا حافظ‘‘ نہ کہہ سکی۔

میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سن لی تھی۔

’’ذرا تیز چلئے!‘‘ عورت مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ’’کہیں میری بچی کو کچھ نہ ہو جائے!‘‘

اس آدم زادی کو تو اپنی بچی کی پڑی تھی اور مجھے یہ خیال آ رہا تھا کہ میں بلاوجہ کیوں خوف زدہ ہوں! ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس کے بات کرنے سے میرا دھیان بٹ گیا۔ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ ’’کتنی دور ہے تمہارا گھر؟‘‘

’’بس یہیں قریب ہی ہے۔‘‘ عورت نے جواب دیا۔ آپ کے سیبوں کا باغ جہاں ہے اسی کے پیچھے ہے میرا گھر۔‘‘

میں اس پر چونک اٹھی اور بولی۔ ’’مگر تم تو اس طرف نہیں جا رہیں!‘‘

’’ممکن ہے رات کے وقت مجھے راستہ یاد نہ رہا ہو..... آپ بتائیں‘ کدھر چلنا ہے!‘‘

’’یہ تم کیسی فضول باتیں کر رہی ہو کہ تمہیں اپنا گھر ہی یاد نہیں!‘‘ میری آواز میں قدرے تختی آ گئی اور یہ بتاؤ تمہیں میرے سیبوں کے باغ کا کس طرح پتا چلا؟‘‘

’’سبھی کو خبر ہے کہ وہ باغ آپ کا ہے۔ مجھے آپ کے ایک خادم سے یہ بات معلوم ہوئی تھی۔‘‘ اس عورت نے مجھے گویا مطمئن کر دیا۔

’’تو کیا تم میری ثوہ میں رہتی ہو؟‘‘

’’نہیں!..... آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ پورے بغداد میں آپ کس قدر مشہور

ہیں! شہرت یافتہ لوگوں کے بارے میں بھی جاننا چاہتے ہیں.....آپ میری طرف سے بدگمان نہ ہوں طبیبہ صاحبہ!"

"چلو مان لیتی ہوں تمہاری بات.....لیکن میرے باغ کے پیچھے تو کوئی عمارت نہیں۔" میں نے بحث کی۔

"تو نہ ہوگی۔ میں کیا کروں!" اچانک اس عورت کا لہجہ بدل گیا۔

"کیا مطلب؟" مجھے غصہ آ گیا۔ "تم کیا مجھے بے وقوف سمجھ رہی ہو؟"

"تو کیا تم خود کو عقل مند سمجھتی ہو اے دینار؟"

"دینار!" میں چکرا کر رہ گئی۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

فوری طور پر مجھے یہی سوجھی کہ فرار ہو جاؤں۔ اس کے لئے مجھے انسانی پیکر چھوڑنا پڑتا۔ خطرہ میرے سامنے آ چکا تھا۔ اپنی پوری شدت کے ساتھ! "کیوں' کیا تم میری زبان سے اپنا نام سن کر ڈر گئیں؟" وہ خطرناک عورت مجھ سے کہنے لگی۔

خوف کی شدید لہر میرے پورے وجود کو لرزا کر گزر چکی تھی اور اب میری فطری قوت مدافعت جاگ اٹھی تھی۔ خطرے کے وقت وہ آدم زاد ہوں کہ جن زاد غیر ارادی طور پر اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی عموماً دو صورتیں ہوتی ہیں' پہلی یہ کہ راہ فرار اختیار کرلی جائے' دوسری صورت یہ کہ خطرے کا جم کر مقابلہ کیا جائے۔

میں نے یکے بعد دیگرے ان دونوں ہی تدبیروں پر عمل کیا۔ جب میں نے انسانی پیکر سے باہر نکلنا چاہا تو وہ خطرناک و پراسرار عورت زور سے ہنس پڑی۔ "سن اے دینار!.....اے سردار اعظم کی بے وقوف بیٹی!.....میں نے تجھے اس انسانی پیکر میں قید کر دیا ہے تو لاکھ کوشش کرے اس قالب سے نہیں نکل سکتی!"

اس پراسرار عورت نے جو کچھ کہا' درست ثابت ہوا۔ اب یہ واضح ہو چکا تھا کہ مجھے میرے گھر سے باہر نکالنے کیلئے اس عورت نے اپنی بچی کی بیماری کا ڈھونگ رچایا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے عارج کی مدد حاصل نہ رہے۔ میرے لئے سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ وہ پراسرار عورت وہ آدم زادی میری جان کے درپے ہو گئی تھی۔ لیکن اس وقت میں غلط خطوط پر سوچ رہی تھی۔ حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ میرے تصور سے بھی زیادہ ہولناک! مجھے کچھ ہی دیر بعد اس کا علم ہو گیا۔ اس وقت میں خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہو چکی تھی۔

"مجھے میرا نام لے کر پکارنے والی اے آدم زادی! تو آخر مجھ سے کیا چاہتی ہے؟" میں پرعزم آواز میں بولی۔ اس سوال سے میرا مقصد یہ تھا کہ اس کے ارادے واضح ہو جائیں۔ عموماً جنات کو آدم زاد مال و متاع حاصل کرنے کے لئے زیر دام لاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم جن زادوں کو اس لئے بھی غلام یا کنیز بنایا جاتا ہے کہ آدم زادوں کی بے جا نمود و نمائش کا شوق بھی پورا ہو جائے۔ وہ دوسرے اپنے ہی جیسے آدم زادوں کو رعب میں لے سکیں۔ اپنے متعلق یہ مشہور کر سکیں کہ ان کے قبضے میں کوئی جن زاد یا جن زادی ہے۔ یہ "شوق" عام طور پر آدم زادوں کو ہوتا ہے۔ میں اسی لئے حیران تھی کہ یہ آدم زادی کیوں اسی "شوق فضول" میں مبتلا ہو گئی۔

میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے وہ آدم زادی دھیرے سے ہنسی۔ اس کی ہنسی بڑی چڑا دینے والی تھی۔ میرا بس چلتا تو اس کے ٹکڑے کر دیتی۔ کہنے لگی۔ "تو پورا کر دے گی جو میں چاہوں؟"

"کوشش کروں گی۔" میں نے محتاط الفاظ میں جواب دیا۔

"ایک جن زادی کوشش کرے گی!" اس کی آواز میں طنز تھا۔ "کیا جنات اتنے ہی بے بس ہوتے ہیں؟"

"ہاں جب انہیں کسی انسانی قالب میں قید کر کے نکلنے نہ دیا جائے۔" میں جرأت سے بولی۔

میں اب اس کے ساتھ چلتی ہوئی اپنے باغ کے عقب میں آ چکی تھی۔

"تو نے کہا تھا دینار کہ یہاں کوئی عمارت نہیں۔ چاندنی رات میں تجھے وہ.....وسیع و عریض عمارت نظر آ رہی ہے؟"

میں جواب میں کچھ نہ بولی۔ میں حیرت سے اس عمارت کو دیکھ رہی تھی جسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"یہ تو طے ہے اے آدم زادی کہ تو نے مجھ جن زادی کو دھوکا دیا ہے اور تیری کوئی بچی بیمار نہیں۔ اب یہ بتا کہ تو پھر مجھے یہاں کس غرض سے لائی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"تیرا اچار ڈالوں گی۔" ایک بار پھر وہ زہریلی ہنسی میرے تن بدن میں آگ لگا گئی جو اس پراسرار عورت کی شاید عادت تھی۔

میں بڑی دیر تک اپنا غصہ ضبط کرتی رہی تھی اس نے جو "اچار ڈالنے" کو کہا تو خود پر

قابو نہ رکھ سکی۔ آخر میں جن زادی تھی! آگ سے میرے وجود کو تخلیق کیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ میرے ہاتھ میں جو دواؤں کی بھاری صندوقچی تھی' اسے میں نے فضا میں گھمایا اور اس شیطان صفت عورت کے سر پر دے مارا' پھر اسے سخت سست کہنے لگی۔

حملہ غیر متوقع تھا اس لئے سنبھلتے سنبھلتے وہ صندوقچی کی زد میں آ گئی۔ معلوم نہیں عین وقت پر کس طرح اسے میرے ارادے کا پتا چل گیا تھا۔ صندوقچی کی اچٹتی ہوئی ضرب نے بھی اسے چیخنے پر مجبور کر دیا۔

اب تک مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آیا تھا۔ اس کی بدحواسی سے میں نے فائدہ اٹھایا اور سر سے چادر گھسیٹ لی۔

بڑی ہی کریہہ الصورت تھی وہ۔ رنگ بھی گہرا سیاہ تھا۔

اپنے سر سے چادر گھسیٹے جانے پر اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکلنے لگیں' بولی۔ ''اے دینار! میرے ساتھ گستاخی سے پیش آ کے تو نے اپنے حق میں اچھا نہیں کیا۔ سارہ ایسے لوگوں کو انتہائی سخت سزائیں دیتی ہے۔''

''کون سارہ؟..... کیا تیرا نام ہے سارہ؟''

''ہاں میں ہی سارہ ہوں اور تاریک براعظم سے یہاں آئی ہوں۔'' اس کا اشارہ افریقہ کی طرف تھا۔ حیرت انگیز طور پر چوٹ کھانے کے باوجود اس افریقی آدم زادی نے کسی فوری ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس نے بس اتنا کیا کہ دواؤں کی صندوقچی میرے ہاتھ سے چھین کر پھینک دی اور کہنے لگی۔ ''تو ابھی سارہ کو نہیں جانتی۔''

''اور جاننا بھی نہیں چاہتی۔'' میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔

''وہ تو اے دینار تجھے جاننا ہی پڑے گا!''

''کوئی زبردستی ہے؟''

''ہاں..... کیوں کہ تو اس وقت زیردست ہے۔''

اب میں اس کے ہمراہ ایک مکان کے دروازے تک پہنچ گئی تھی۔

اس مکان کے دروازے پر کھڑے ابھی مجھے چند لمحے ہوئے تھے کہ دروازہ خود بخود کھل گیا۔

''آ جاؤ اے سارہ اور اے دینار!'' اندر سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ ''میں تم دونوں ہی کا منتظر تھا۔''

وہ آواز میرے لئے قطعی اجنبی تھی۔ معلوم نہیں وہ کون تھا اور مجھے کیسے جانتا تھا۔ میں نے کھلے ہوئے دروازے میں ہلکی سی روشنی دیکھی اس روشنی کا مخرج بھی میری آنکھوں سے پوشیدہ تھا۔

''چل اے دینار!'' سارہ نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔

میں نے جھٹکے سے بازو چھڑانا چاہا مگر ناکام رہی۔

''تو نے دھوکے سے بس ایک بار ہلکی سی ضرب لگا دی' لیکن میں تیری طرف سے چوکنا ہو گئی ہوں۔ سیدھی طرح اندر چل ورنہ.....''

''ورنہ تو کیا کر لے گی؟'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

میری بات پوری ہوئی تھی کہ سارہ نے میرے انسانی قالب کو کسی ہلکے پھلکے کھلونے کی طرح اٹھا کر اس مکان کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر پھینک دیا۔ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

سارہ نے میری بے بسی پر قہقہہ لگایا۔ اسی وقت پھر مردانہ آواز آئی۔ ''سارہ اس خوب صورت کھلونے کو یوں زمین پر نہ پھینک! یہ تو آنکھوں سے لگانے کے قابل ہے' سنبھال کے رکھنے کی چیز ہے۔''

ان الفاظ میں چھپی ہوئی طلب و خواہش کو میرے لئے سمجھ لینا دشوار نہ تھا۔

''سارہ! اسے ہمارے مہمان خانے میں پہنچا دے۔ اس کے آرام و آسائش کا تجھے پوری طرح خیال رکھنا ہے۔ تو جانتی ہے کہ دینار کو ہم نے اپنے لئے پسند کر لیا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے اے وہموش!..... تجھے شکایت نہ ہوگی۔'' سارہ بولی تو پہلی دفعہ مجھے اس بھاری آواز والے کا نام معلوم ہوا۔ میں اس عرصے میں اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔

''تو خود اپنے قدموں سے چل کر وہموش..... میرے آقا وہموش کے مہمان خانے تک چلے گی یا.....'' سارہ نے معنی خیز انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ میری ہی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اپنی مدافعت کرنا بہرحال میرا حق تھا۔ میں یوں آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اس لئے میں نے نتیجے سے بے پروا ہو کر سارہ پر چھلانگ لگا دی۔ میں سمجھ چکی تھی کہ اچانک ہی کوئی قدم اٹھا کر سارہ سے نمٹا جا سکتا ہے۔ میرا کوئی ایسا فعل جو اس کیلئے غیر متوقع ہو' اسے نہ صرف حیرت زدہ کر سکتا ہو بلکہ اسکا شکست سے دوچار ہونا بھی ممکن ہو۔

وہ آدم زادی نہ رہتی تو اس کا سحر بھی ٹوٹ جاتا۔ میں اسے مار ڈالتی تو میرا فرار ہو جانا یقینی تھا۔ اس مکان کا دروازہ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ پھر یہ کہ انسانی قالب سے آزاد ہو کر دوبارہ مجھے زیر دام لانا ہنسی کھیل نہیں تھا۔ یہ ساری باتیں بڑی تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں آئیں۔ اسی تیزی کے ساتھ ایک نتیجے پر پہنچ کر میں نے اس ''کلموہی'' یا کلو پری پر حملہ کر دیا۔ اس مرتبہ وہ دھوکا کھا گئی۔ میں اس کی پشت پر سوار تھی اور ''کلو'' کی گردن میرے ہاتھوں کی گرفت میں تھی۔

''نہیں اے دینار! اسے نہ مار! یہ میری بڑی خدمت گزار اور فرماں بردار کنیز ہے۔'' دہموش کی آواز سنائی دی۔ ''مگر اے چوہے! تو کس بل میں چھپا ہوا ہے!'' میں چیخ اٹھی۔

''تو ہمارے حضور میں گستاخی کی مرتکب ہو رہی ہے' دینار!'' دہموش اپنی بھاری آواز میں بولا۔ ''تیری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو مار دیا جاتا۔ ہم اسے زندہ نہ چھوڑتے..... تو سارہ کی گردن نہیں چھوڑ رہی تو پھر مجبوراً ہمیں دوسرا قدم اٹھانا پڑے گا۔''

دوسرے ہی لمحے میرے دماغ پر تاریک غبار سا چھا گیا اور پھر مجھے یاد نہیں کیا ہوا!

میں جب ہوش میں آئی تو خود کو ایک غار میں پایا۔ غار کے دہانے پر ایک مشعل روشن تھی۔ میرے سوا اس غار میں کوئی اور نہیں تھا۔ میں نے ذرا اور غور سے غار کا جائزہ لیا تو وہاں کسی آدم زادی یا آدم زادی کی ضروریات پوری کرنے کی تمام اشیاء موجود تھیں..... یہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟ میں نے خود سے سوال کیا اور جواب مل گیا۔

بغداد شہر کے ایک جانب پہاڑ بھی تھا مجھے جس غار میں رکھا گیا تھا' انہی میں سے کسی پہاڑ کے اندر تھا۔

اس غار کا ایک حصہ ایسا تھا جہاں زمین ہموار تھی۔ اسی جگہ میرے لئے نرم و آرام دہ بستر بچھایا گیا تھا اور میں اسی بستر پر دراز تھی۔

نصف شب سے اب تک میرے ساتھ جو کچھ گزرا حیران کن ہی تھا۔ میرے ساتھ اب تک جو پراسرار واقعات پیش آئے تھے' یہ واقعہ ان سب سے مختلف تھا۔ آدھی رات کو میرے مکان کے دروازے پر دستک ہونا' ایک آدم زادی کا آنا اور اپنی بیمار بچی کو دکھانے کے بہانے مجھے اپنے ساتھ لے جانا اور پھر یہ سب جھوٹ ثابت ہونا۔ اس کے بعد پراسرار آدم زادی سارہ کا عجیب و غریب سلوک۔ وہ کسی دہموش کی کنیز تھی۔ مجھے زبردستی دہموش کا مہمان

بنایا جانا' یہ تمام باتیں مجھ جن زادی کیلئے حیرت ناک تھیں۔

اب یہ خیال میرے لئے سوہان روح بنا ہوا تھا کہ عارج بھی کہیں اس پراسرار جال میں نہ آ پھنسے۔

ظاہر ہے کہ میں واپس نہ پہنچی تو عارج میری تلاش میں نکل کھڑا ہوگا۔ پراسرار دہموش لازماً عارج سے واقف ہوگا کہ وہ میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔ جس طرح اس نے سارہ کے ذریعے مجھے اغوا کیا تھا اس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ عارج کو چھیڑنے سے گریز کر رہا ہے۔ اس کی طلب عارج نہیں' میں تھی۔ اس طلب کی راہ میں اگر عارج دیوار بننا چاہتا تو اسے نقصان اٹھانا پڑتا۔ یوں عارج کی طرف سے میرا فکرمند ہونا فطری امر تھا۔ میں نے سوچا' خدا کرے عارج مجھے نہ ڈھونڈے۔

اچانک غار کے دہانے کی طرف سے شیر کی دھاڑ سنائی دی تو میں اچھل پڑی۔ میں نے دہانے کی طرف دیکھا تو شیر نظر آ گیا۔ اسے غالباً میری حفاظت کیلئے رکھا گیا تھا۔

دہموش نام عموماً جنات میں کم ہی رکھا جاتا ہے مگر یہ بات میرے علم میں تھی کہ جنات کے ایک سربراہ کا نام دہموش تھا۔ یہ بادشاہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا کوئی تعلق لفظ ''وہم'' سے نہیں ہے۔ یہ حقیقت بھی میرے لئے فکر انگیز تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ میرے اغوا میں ایک پراسرار آدم زادی تو ضرور ملوث ہے لیکن اغوا کرانے والا ایک جن زاد ہے۔ یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں تھی کہ افریقہ نژاد سارہ' دہموش کی کنیز تھی۔ جنات آدم زادیوں کو اپنی کنیز بنا سکتے ہیں۔

بہت سی آدم زادیاں خود یہ تمنا کرتی ہیں کہ کوئی جن ان پر عاشق ہو جائے۔ اس طرح وہ خود کو دوسری آدم زادیوں سے ممتاز و منفرد ثابت کر دیتی ہیں۔ اپنے عاشق جن کے ذریعے بے موسم کا پھل منگوا دینا' مال و زر کے ڈھیر لگوا دینا' نیز دولت مند بن جانا وغیرہ۔ خاص طور پر وہ آدم زادیاں جن کا تعلق پسماندہ غریب طبقے سے ہوتا ہے' ایسے خواب ضرور دیکھتی ہیں۔ انکی محرومیاں ہی انہیں ایسے خواب دکھاتی ہیں۔ سارہ کا تعلق کس طبقے سے تھا' میں بے خبر تھی۔ مجھے اپنے سلسلے میں فکر لاحق تھی کیونکہ میں کوئی آدم زادی نہیں جن زادی تھی۔ میں جان دے دیتی لیکن دہموش کی کنیز بننے پر آمادہ نہ ہوتی۔

بستر سے اٹھ کر میں نے اس غار کا جائزہ لیا تو مجھ پر ایک اور حقیقت منکشف ہوئی۔ مجھے ایک جانب دراڑ دکھائی دی۔ وہ دراڑ اتنی چوڑی تھی کہ آسانی کے ساتھ اس

سے گزرا جاسکتا تھا۔ میں اس میں داخل ہوکرایک اور غار میں پہنچ گئی۔ غاروں کا وہ ایک سلسلہ تھا۔ مگر چوتھے غار میں گھستے ہی میرے قدم رک گئے۔ وہاں میں نے مسند پر قدیم عربی لباس زیب تن کئے متوسط عمر کے ایک فرد کو دیکھا۔

"دینار! مجھے یقین تھا کہ تو چین سے نہیں بیٹھے گی۔" وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "یہاں اس غار تک تیرا پہنچ جانا میرے لئے غیر متوقع نہیں ہے۔ دیکھ لے تیری خاطر دہموش نے بھی انسانی قالب اپنالیا......"

"تو... تو......ہی دہموش ہے؟......میری ہی طرح تیرا تعلق بھی جنات سے ہے؟" میں بول اٹھی۔

"ہاں میں بھی جنات میں سے ہوں ......مگر تجھ میں اور مجھ میں فرق ہے اور......خیر چھوڑ! یہ بتا کہ تیرے عشق میں مبتلا وہ نوجوان جن زاد عارج تو تیرا پیچھا نہیں کرے گا؟" اس نے اپنی مخصوص بھاری آواز میں پوچھا۔

"تو عارج کو کیسے جانتا ہے؟" میں نے معلوم کیا۔

"عارج پر خاک ڈال دینار! یہ پوچھ میں تجھے کس طرح اور کب سے جانتا ہوں!" اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ ناچنے لگی۔ اس کا چہرہ گول اور آنکھیں بڑی تھیں۔ رنگ سرخ و سفید تھا۔ چہرہ بالکل گول ہونا غیر فطری بات تھی۔ اسی سے میں نے قیاس کیا کہ وہ اہل ایمان میں سے نہیں۔ عالم سوما نے مجھے یہ بات بتائی تھی کہ ایسے جنات جو راہ راست پر نہ ہوں' جب انسانی پیکر اپناتے ہیں تو اس میں کوئی نہ کوئی غیر فطری بات آجاتی ہے۔ پھر اس سے قبل کہ میں کوئی سوال کرتی' وہ کہنے لگا۔ "دینار! مجھے تیرے بارے میں کیا کیا خبر ہے' یہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ تو فی الحال یہ بتا کہ مجھ سے نکاح کرے گی؟"

دہموش کے اس سوال پر میرا پورا وجود جھنجھنا اٹھا۔ میرے دماغ میں چھناکے سے ہونے لگے۔

"میں تجھے اپنے متعلق دھوکے میں نہیں رکھوں گا دینار!" وہ پھر بولنے لگا۔ "میں مسلمان نہ سہی' اہل کتاب میں سے ضرور ہوں۔ تجھے بھی یقینا خبر ہوگی کہ اہل کتاب سے نکاح جائز ہے۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے تو؟" میں بگڑ گئی۔

"اس میں بکواس کی کیا بات ہے اے دینار! ایک جن کا کسی جنیہ سے نکاح کرنا

کوئی عیب تو نہیں" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "یوں بھی میری عمر زیادہ نہیں' صرف دو ہزار سال ہے۔"

"شرم کر کہ تجھے میرے مقابلے میں بوڑھا ہی کہا جائے گا۔ تیری عمر میرے سے دگنی ہے!" میں نے کہا۔

"تو کیا ہوا! عمروں کا فرق نکاح میں حارج نہیں ہوتا۔" وہ بدستور شیطنت پر آمادہ رہا' کچھ توقف سے کہنے لگا۔ "میں یہودی ہوں' اس رسول کا ماننے والا کہ جس سے خداوند ہمکلام ہوا تھا۔ وہ رسول کہ جس کی پرورش فرعون کے گھر میں ہوئی اور وہ موسیٰ کہ جس نے دنیا کو نیکی اور بھلائی کا پیغام دیا۔"

"مگر کیا تیرے مذہب میں کسی کے ساتھ زبردستی نکاح کر لینے کو بھی جائز سمجھا جاتا ہے؟" میں نے بحث کی۔

"میں نے ابھی تک تجھ سے زبردستی تو نہیں کی حالانکہ میں ایسا کرسکتا تھا۔"

"کسی کو اغوا کرلینا' کیا زبردستی نہیں؟" میری آواز میں چبھن تھی۔

"لیکن یہ دیکھ کہ میں نے تیری رضامندی چاہی۔ میں اس لئے تو تجھ سے کہہ رہا ہوں' مجھ سے نکاح کرلے اے دینار!"

"نکاح کرنا تو بہت دور کی بات ہے' میں تیرے منہ پر تھوکوں گی بھی نہیں۔"

"پھر پچھتائے گی۔"

"یہ تو تجھے آنے والا وقت بتائے گا کہ کون پچھتاتا ہے! تو یا میں!" میں بولی۔

"اس غلط فہمی میں نہ رہنا دینار کہ تو یہاں سے فرار ہوسکتی ہے یا وہ تیرا عاشق عارج تجھے یہاں سے نکال کر لیجاسکتا ہے۔ سن! یہاں آنے کا راستہ تو ہے' جانے کا نہیں۔ سارہ تجھ سے ملتی رہے گی جب بھی تو نکاح پر راضی ہوجائے اس سے کہہ دینا۔ شادی کے معاملے میں ہر دو فریق کی رضامندی کا میں قائل نہیں۔ تیرے ساتھ تو میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر رعایت کر رہا ہوں۔ چاندنی رات میں جب پہلی بار میں نے صحرا کی وسعتوں میں تیرے وجود کی خوشبو کو محسوس کیا تھا......تیری خوشبو سے میں مہک اٹھا تھا تو......اب تجھے کیا بتاؤں اے دینار!......یہ باتیں اس وقت اچھی معلوم ہوں گی جب تو میری بیوی بن جائے گی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی مسند خالی ہوگئی۔ دہموش انسانی قالب ترک کرکے غائب ہوچکا تھا اور میں وہاں حیران پریشان کھڑی رہ گئی تھی۔

پھر غاروں کے اس سلسلے میں بہت دیر تک بھٹک کر اسی پہلے غار میں واپس آ گئی جہاں ہوش آیا تھا۔ میں بستر پر بیٹھ کر خبیث دہوش کی باتوں پر غور کرتے کرتے چونک اٹھی۔ اس نے کہا تھا کہ پہلی بار مجھے چاندنی رات میں محسوس کیا تھا۔ صحرا اور چاندنی رات..... میں سوچنے لگی۔ بصرے سے بغداد کی طرف لوٹتے ہوئے برسوں پہلے ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ خلیفہ المنصور کا عہد تھا اور اس کے چچا عیسیٰ بن موسیٰ نے ایک خوب صورت کنیز فائضہ۔ محکمہ نظارت کے نگراں موسیٰ بن کعب کے تحفے میں بھیجی تھی۔ یہ وہی عیسیٰ ہے جو خلیفہ المنصور کا چچا اور خلافت کا دعویدار تھا۔ اس کا ذکر میری سرگزشت میں تفصیل کے ساتھ آ چکا ہے۔ عیسیٰ ان دنوں حاکم کوفہ تھا اور استخوانی چہرے والا بوڑھا سلیمان اس کا دست راست تھا۔ فائضہ کو نجف سے اسی نے اغوا کرایا تھا۔ اسی بوڑھے سلیمان کے متعلق عالم سوما نے کافر ہونے کا شبہ ظاہر کیا تھا۔ میں نے سوچا' دہوش اس کا اصل نام بھی ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ وہ بہرحال اہل ایمان میں سے نہ تھا اس لئے انسانی قالب اختیار کرتے ہوئے اس کی شکل بگڑ گئی۔ استخوانی چہرہ' گول چہرے میں کیسے بدل گیا؟ یہ سوال آدم زادوں کے ذہنوں میں تو آ سکتا ہے ہم جن زادوں کے ذہنوں میں نہیں۔ ہم کوئی بھی انسانی قالب اپنا سکتے ہیں۔ وقت اور موقع محل کی مناسبت سے ہم اپنے انسانی چہرے بدلنے پر قادر ہیں۔ سو اگر بوڑھے سلیمان نے بھی ایسا کیا ہو تو باعث حیرت نہیں۔

''استخوانی چہرے والا بوڑھا سلیمان!'' سوچتے سوچتے میں بڑبڑانے لگی۔

''تو نے آخر مجھے پہچان ہی لیا اے دینار! میں وہی بوڑھا سلیمان ہوں۔ دیکھ وہ انسانی قالب!'' یہ کہتے ہی بوڑھا سلیمان انسانی قالب میں ظاہر ہو گیا۔ یقیناً وہ میری نظروں سے اوجھل ہو کر میری نقل و حرکت کی نگرانی کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''دینار! تیری ذہانت ہی نے تو مجھے تیرا گرویدہ بنا دیا ہے۔ میں اسی وجہ سے تو تجھے ہمیشہ کیلئے اپنا لینا چاہتا ہوں۔ میری اور بیویاں بھی ہیں مگر یقین کر کہ اگر تو بھی میری بیوی بن گئی تو سکہ تیرا ہی چلے گا۔ تو ہی میری سب سے لاڈلی بیوی ہو گی۔ سن اے دینار! میں نے برسوں یہ کوشش کی کہ تجھے بھلا دوں مگر ناکام رہا۔ تیرے وجود کی خوشبو ہی ایسی ہے جو دیوانہ بنا دے۔ میں تجھے بھول جانے ہی کی خاطر بغداد سے قاہرہ چلا گیا۔ فراعین کے وطن مصر میں بھی میرا جی نہ لگا اور دوبارہ عراق لوٹ آیا۔

کیا تجھے اب بھی میرے عشق کی صداقت کا یقین نہیں آیا دینار؟..... بول ناں خاموش کیوں بیٹھی ہے! دینار' تو میرا ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر میں ضرور حاصل کرونگا!''

''اے خبیث ملعون بوڑھے! تیری یہ ناپاک خواہش کبھی پوری نہیں ہو گی۔ میں کوئی آدم زادی نہیں جن زادی ہوں..... میں فائضہ نہیں دینار ہوں!''

''جانتا ہوں میں کہ تو بڑی قیمتی ہے' اسی لئے تو تیری آرزو کی ہے۔'' وہ بے حیائی سے ہنس دیا۔ اس نے خبیث اور ملعون کہے جانے کا قطعی برا نہیں مانا تھا اور نہ غصے میں آیا تھا۔

''تو بڑا ہی بے غیرت ہے اے دہوش!'' میں نے اسے مزید برا بھلا کہا۔

''تجھ جیسی جن زادی کو اپنی بیوی بنانے کی خاطر اگر گالیاں بھی کھانی پڑیں تو مجھے منظور ہے یہ سودا!''

میرا پارا چڑھنے لگا۔ غالباً اس نے بھی یہ بات محسوس کر لی اور میرے پاس سے چلا گیا۔

کسی آدم زاد کیلئے تو کسی جن زاد یا جنیہ کا نام معلوم کرنا مشکل ہو سکتا ہے مگر ہم جنات کے ساتھ ایسا نہیں۔ سو اگر دہوش نے میرا نام جان لیا تو اس پر مجھے حیرت نہ تھی۔ میرے لئے تو حیرت کا مقام یہ تھا کہ عرصہ دراز گزر جانے کے باوجود استخوانی چہرے والا بوڑھا سلیمان یا دہوش مجھے بھولا نہیں تھا۔

اس نے مجھ سے اپنے عشق کی جو کہانی بیان کی تھی مجھے اس پر بھی اعتماد نہ تھا۔ وہ میرے حصول کی خاطر کوئی بھی کہانی سنا سکتا تھا۔

اس کے بارے میں ایک بات البتہ طے تھی کہ وہ عام جنات سے کہیں زیادہ پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ دراصل جنات بھی سب ایک سے نہیں ہوتے۔ ان کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ اکثر روایات میں ہم جنات کی دس قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ مردہ' عفریت' اعوان' توابع' قرنا' عمار وغیرہ۔ بعض جنات فضا میں اور بعض صرف پانی میں رہتے ہیں۔ انہیں بھی جنات کی قسموں ہی میں شمار کیا جائے گا۔ ان کے علاوہ دو قسمیں شیاطین و ابلیس کی ہیں۔ اولاد ابلیس نہ صرف آدم زادوں کو نقصان پہنچاتی ہے بلکہ اہل ایمان جن زادوں کے لئے بھی خطرہ ہے۔ جنات کی قسمیں پراسرار قوتوں کے اعتبار سے یکساں نہیں مثلاً ایک عفریت کسی قردہ پر آسانی سے حاوی آ سکتا ہے۔

یہ ذکر میں نے اس لئے چھیڑا کہ ملعون دہوش مجھے کوئی عفریت ہی لگتا تھا۔ ورنہ

میری قوتوں کو اس قدر آسانی کے ساتھ سلب نہ کر لیتا۔ جب میں اس نتیجے پر پہنچی تو ایک طرف شدید غصہ آیا' دوسری جانب اپنی بے بسی پر ملال ہوا۔

ذہنی تھکن سی محسوس ہوئی تو میں بستر پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔

''سو جا اے دینار!.....سو جا!.....اس طرح تیرے اعصاب کو سکون ملے گا۔'' یہ نسوانی آواز سارہ کی تھی۔

وہ منحوس سیاہ فام آدم زادی نہ جانے کب میرے غار میں آ مری تھی۔

''تو کون ہوتی ہے مجھے مشورے دینے والی! دفع ہو جا یہاں سے!'' میں نے سارہ کو کھری کھری سنا دی۔

اس کی چڑانے والی ہنسی غار میں گونجنے لگی۔

''تجھے بچا لیا تیرے آقا رہوش نے ورنہ تو میں تیری گردن دبا دیتی۔'' یہ حسرت لے کر جانے کتنی آدم زادیاں اور جن زادیاں موت کی نیند سو چکی ہیں۔ ممکن ہے تو بھی میرے ہاتھوں ماری جائے۔ میں تجھ پر اس لئے ہرگز رحم نہیں کروں گی کہ تو میرے آقا کی پسند ہے۔'' سارہ سخت آواز میں بولی۔

''اور اگر اس پر تیرے آقا نے تجھے الٹا لٹکا دیا پھر؟'' میں نے بھی اسے چڑایا۔

''پاگل ہے تو!'' وہ ہنس دی۔ ''میرے آقا نے تجھ پر مجھے پورا اختیار دیدیا ہے کہ تجھے سیدھی راہ پر لانے کیلئے تیرے ساتھ جو چاہے سلوک کروں۔''

''تو شاید اس طرح مجھ سے گلا دبانے کا انتقام لینا چاہتی ہے۔''

''چاہتی ہے سے تیرا کیا مطلب ہے اے دینار' میں تو جب چاہوں تیرے انسانی قالب کی دھجیاں بکھیر سکتی ہوں۔''

اے سارہ! برا بول نہ بول اور نہ میری باری آ گئی تو تجھے کہیں امان نہیں ملے گی!''

''میں نے شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے تجھے سو جانے کا مشورہ دیا تھا مگر تو اینٹھ گئی تو نتیجہ بھگت!''

سارہ کے بھدے سیاہ ہونٹوں کو میں نے تیزی سے حرکت کرتے دیکھا۔ یقیناً مجھے تکلیف پہنچانے کی غرض سے وہ کوئی شیطانی عمل پڑھنے میں مصروف تھی۔ میرے لئے اسے روکنا ممکن نہ تھا۔ میں نے اپنے دل کو تسلی دی اللہ مالک ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اگر تکلیف اٹھانا ہی بتقدیر کر دیا گیا ہے تو پھر کون روک سکتا ہے۔ میں بدستور بستر پر دراز رہی۔ ہاں اس عرصے میں ایک بار پھر یہ کوشش میں نے ضرور کی کہ انسانی قالب سے نکل سکوں لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا۔

نامعلوم شیطانی عمل کے خاتمے پر سارہ نے میرے بستر کا چکر لگایا اور پھر مجھ پر زور زور سے پھونکیں ماریں۔ اس کے بعد وہ دور جا کر کھڑی ہو گئی۔ چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ میں اچھل کر بیٹھ گئی۔ میرے بستر پر اور اس کے اردگرد بڑے بڑے پہاڑی بچھو رینگ رہے تھے۔ یہ بچھو اسی شیطانی عمل کا نتیجہ معلوم ہوتے تھے جو سارہ نے کچھ لمحے پہلے تک پڑھا تھا۔

میں ان بچھوؤں سے بچنے کی خاطر بستر پر سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئی' مگر کب تک بچتی! ایک بچھو نے ڈنک مار ہی دیا اور میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ پھر بچھو میرے جسم پر ڈنک مارتے رہے اور میں چیختی رہی۔ سارہ مجھے اس روح فرسا عذاب میں مبتلا دیکھ کر زور زور سے ہنس رہی تھی۔

اس طرح چیختے چیختے نڈھال ہو کر جانے کب میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔

میں ہوش میں آئی تو اس بھیانک رات کی صبح ہو چکی تھی۔ لیکن یہ صبح بھی میرے لئے نجات کا ذریعہ نہیں بن سکی تھی۔ غار کے دہانے کے ایک حصے میں روشن مشعل بجھ گئی تھی۔ یا بجھا دی گئی تھی۔ دہانے سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔

میرے جسم کے مختلف حصے نیلے پڑنے کے ساتھ ساتھ سوئے ہوئے تھے۔ اذیت اب بھی اتنی تھی کہ میں کراہنے لگی۔ میرے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ کبھی کوئی انسانی قالب یوں مجھے کرب و تکلیف میں مبتلا کر دے گا۔

میں غار میں اکیلی تھی اور میرے اطراف پہاڑی بچھوؤں کا گھیرا ابھی نہیں تھا۔

انسانی قالب اختیار کرنے کے بعد ہم جن زادوں کی ضروریات بھی وہی ہو جاتی ہیں جو آدم زادوں کی ہوتی ہیں۔ اس دن پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ بھوک کیا ہوتی ہے! آدم زادوں پر اس وقت کیا گزرتی ہے جب وہ خالی پیٹ ہوتے ہیں اور انہیں روٹی نہیں ملتی۔ ہاں اس دن ظالم آدم زادی سارہ نے مجھے بھوکا پیاسا رکھا۔ مجھے جلانے کڑھانے کی غرض سے اس نے میرے ہی سامنے کھانا کھایا اور پانی پیا' بھوک اور پیاس کی شدت کے باوجود میری غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ سارہ سے کھانا یا پانی مانگتی۔

''اے دینار! تو واقعی بڑے صبر اور ہمت والی ہے کہ ایک لقمے کی خیرات بھی نہیں

مانگ رہی۔" سارہ مجھے چڑانے لگی۔

"ہاں میں تیری طرح کسی کی کنیز نہیں۔ تیرا آقا چاہے تو صبح شام تیری چاند پر جوتے مارے اور تو سر جھکائے کھڑی رہے۔ کنیزوں کو سر اٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی۔" میں نے بھی اسے تپایا۔

"معلوم ہوتا ہے ابھی تیرا جی نہیں بھرا تکلیف اٹھا کے!.....کوئی بات نہیں" سارہ بولی۔ پھر اس نے کچھ بڑھ کر غار کے دہانے کی طرف ہاتھ پھیلا دیا۔ چمڑے کا ایک کوڑا فضا میں تیرتا ہوا آیا۔ اسے سارہ نے پکڑ لیا اور میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "دینار! تو نے لازماً کسی افریقی سے مار نہیں کھائی ہوگی۔ اس کا لطف ہی الگ ہے۔"

قریب آتے ہی سارہ نے میرے جسم پر کوڑے برسانے شروع کر دیئے۔ وہ میرے جسم کو روئی کی طرح دھن رہی تھی۔ میں بھلا کب تک برداشت کرتی' ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگئی۔

اجالے کے بعد پھر اندھیرا ہوگیا۔ مشعل جلنے لگی۔ مجھے کچھ ہی دیر پہلے ہوش آیا تھا۔ میرا سارا جسم پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ میں اب اس قابل بھی نہیں رہی تھی کہ اٹھ کر بیٹھ سکوں۔

اس رات ہوش اور بے ہوشی کی درمیانی کیفیت میں مجھے ایک چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ سن کر میرا دل ڈوبنے لگا۔

"عارج" میری زبان سے بس اتنا ہی نکل سکا۔ وہ دل دوز چیخ عارج ہی کی تھی۔

اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ عارج بھی پراسرار دہموش کی گرفت میں آ چکا ہے۔ اس احساس نے میری تکلیف و اذیت دگنی کر دی۔ میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوا کہ عارج کس طرح زیر دام آ گیا۔ مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ میں عارج سے کتنی شدید محبت کرتی ہوں۔ ایک تڑپ ایک اضطراب نے میرے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

پھر پے در پے عارج کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ اس پر یقیناً تشدد کیا جا رہا تھا اور اسکا سبب مجھ سے اس کا تعلق ہی ہو سکتا تھا۔ دہموش رقابت میں اس کی جان بھی لے سکتا ہے۔ اس خیال نے مجھے اور بے چین کر دیا۔ عارج کو دہموش نے پہلے نظر انداز کر دیا تھا لیکن اب معاملہ مختلف نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ ایسی صورت میں کہ جب عارج میرے وجود کی خوشبو کا تعاقب کرتا ہوا اس جگہ پہنچ جاتا' اسے قید کیا جانا کوئی حیران کن بات نہ تھی۔ میرا قیاس یہی تھا

کہ پہلے تو عارج نے میری واپسی کا انتظار کیا ہوگا اسکے بعد میری تلاش میں نکل پڑا ہوگا۔ فوری طور پر وہ مجھ تک پہنچنے میں کیوں کامیاب نہیں ہوا تھا؟ اس سوال کا جواب سارہ اور دہموش کی پراسرار قوتیں تھیں۔ ان کی مرضی کیخلاف عارج بھلا مجھ تک کیسے پہنچ جاتا!

میری حالت اس قابل نہیں تھی کہ بستر سے اٹھ بھی سکتی۔ یہ سب ملعونہ سارہ کی کارستانی تھی۔ کچھ بعید نہیں تھا۔ کہ وہ ذلیل آدم زادی جس نے مجھ پر انتہائی تشدد کیا تھا خود بھی یہودی ہوتی۔ دہموش تو اپنے بارے میں بتا ہی چکا تھا کہ یہودی ہے۔ میں مسلمان تھی اس لئے وہ مذہبی تعصب کی بنیاد پر بھی مجھ سے انتقام لے سکتا تھا۔

معاً میں نے دہموش کی مخصوص بھاری آواز سنی اور چونک اٹھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "سن رہی ہے دینار" اس احمق عارج کی چیخیں' جسے تیری خاطر اپنی جان کی پروا بھی نہیں۔ وہ چاہتا تو تھوڑی بہت پٹائی کے بعد بھاگ جاتا مگر نہیں بھاگا۔ میری مرضی نہیں تھی کہ اسے قید کر لیتا لیکن کیا کرتا!.....اب تو ہی اسے سمجھا کہ یہاں سے فرار ہو جائے وہ برابر والے غار میں ہے۔" دہموش' بوڑھے سلیمان کے قالب میں تھا۔

"کس طرح؟..... میں تو اٹھ بھی نہیں سکتی۔" میں بولی' پھر شکایت کی۔ "تیری لعنتی کنیز سارہ بڑی ظالم ہے جس نے میری یہ حالت بنا دی..... جب کہ تو..... تجھے میرے عشق کا دعویٰ ہے!" میں نے اس کے استخوانی چہرے پر نگاہ ڈالی۔

"عشق اپنی جگہ' نافرمانی کی سزا الگ۔" دہموش نے کہا اور دھیرے سے ہنسا' پھر کہنے لگا۔ "سارہ نے میرے ایما ہی پر تیری دھنائی کی تھی۔"

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اصل کمینہ تو ہے!"

"میں نے بھلا اپنے کمینے پن سے کب انکار کیا ہے!" یہ کہتے ہوئے وہ میرے قریب آ کے بولا۔ "تو واقعی بڑی اذیت میں لگتی ہے۔ میں ابھی تجھے اس اذیت سے نجات دلاتا ہوں تو پھر اسی طرح ہو جائے گی اے دینار جیسی کہ اس وقت تھی جب سارہ کے ساتھ اپنے مکان سے چلی تھی ..... ٹھیک ہے نا!" اس کے استخوانی چہرے پر موجود پتلے پتلے سفاک ہونٹوں پر عجب سا غیر فطری تبسم رقص کرنے لگا۔

چند ہی لمحوں بعد مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی سبز غبار نے میرے وجود کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرا انسانی قالب اپنی پہلی حالت پر آنے لگا۔ دہموش غائب ہو گیا۔

جب میری جسمانی اذیت ختم ہوگئی تو میں اٹھی اور برابر والے غار میں پہنچ گئی۔ وہاں سارہ کو دیکھ کر مجھے غصہ آیا۔ عارج بھی اس وقت میری طرح انسانی قالب میں تھا۔ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے میں نے سارہ کو مخاطب کیا۔ ''رک جا اے آدم زادی!''

وہ عارج پر کوڑے برسا رہی تھی۔ اس کا ہاتھ میری بات سن کر رک گیا' کہنے لگی میرا آقا تجھے بتا چکا ہے کہ کیا چاہتا ہے۔ تو اسے سمجھا دے اے دینار کہ یہ آئندہ ادھر کا رخ نہ کرے ورنہ..... اس نے دھمکی دی اسے مار ڈالوں گی۔''

مصلحت کے تحت میں نے ضبط سے کام لیا اور بولی۔ ''اس کی نوبت نہیں آئے گی سارہ..... عارج یہاں سے چلا جائے گا مگر غار کے دہانے پر تو پہرا ہے!؟''

''وہ پہرا اب صرف تیرے لئے ہے عارج کیلئے نہیں' سارہ نے کہا' تجھے میں صبح ہونے تک کی مہلت دیتی ہوں۔''

''عارج کو سمجھانے کی خاطر؟'' میں نے وضاحت چاہی۔ ''اسے سمجھانے اور میرے آقا سے نکاح کرنے پر رضامندی کیلئے۔'' میں خاموش رہی۔

''تیری خاموشی کو میں رضامندی تصور کرتی ہوں۔'' سارہ کہنے لگی۔ پھر وہ مجھے اور عارج کو اسی غار میں چھوڑ کر چلی گئی۔ عارج اور میں طویل عرصے تک ایک دوسرے کے ساتھ رہ چکے تھے۔ جب ہمارے درمیان رشتہ محبت استوار ہوا تو طبیب ہامہ بن ہیم کی موجودگی ہمیں اکثر گراں گزرتی۔ اس کے موجود ہوتے ہم جو کہنا چاہتے ایک دوسرے سے نہ کہہ پاتے۔ پھر یہ کہ کوئی اور ہماری باتیں نہ سمجھ سکے' ہم نے اشاروں کی ایک ایسی زبان ایجاد کر لی تھی جسے ہم دونوں کے سوا جن زاد نہ سمجھ پاتا۔ اب جب سے ہم بابل کے کھنڈرات کو چھوڑ کر بغداد میں آ بسے تھے تو اشاروں کی اس زبان کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

سارہ کے وہاں سے جاتے ہی عارج نے مخصوص اشارہ کیا تو میں چونک اٹھی۔

''اے دینار! میری بات دھیان سے سن!'' اس نے مجھ سے اشارے کی زبان میں کہا۔

''تو کہہ اے عارج! میں سن رہی ہوں۔'' میں بھی اشاروں میں بولی۔

''میں جان بوجھ کر یہاں پھنسا ہوں۔ مجھے اس کی تاکید عالم سوما نے کی تھی۔'' عارج نے خاموشی کی زبان میں بتایا۔

''عالم سوما!.....'' میں حیران رہ گئی۔ ''اسے کس طرح پتا چلا کہ میں.....''

''اسے کشف ہوا تھا کہ تو کسی خطرے میں ہے۔''

''پھر؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ خود میرے پاس آیا اور ..... فی الحال تفصیل چھوڑ اور اس نے جو عمل بتایا ہے جان لے۔''

''اس عمل کے پڑھنے سے کیا ہوگا اے عارج؟''

''تو اس انسانی قالب سے نکل سکے گی۔'' عارج نے جواب دیا۔ ''عالم سوما نے یہ ہدایت بھی کی ہے کہ ہم یہاں سے فرار ہو کر سیدھے اس کے پاس بابل کے کھنڈرات میں پہنچیں۔''

''جلدی سے اس عمل کے الفاظ بتا!..... میں بولی۔

اشاروں کی زبان ہمارے کام آئی۔ عارج نے دیر نہیں کی میں نے عمل کے الفاظ عارج کے ساتھ پڑھے اور پھر ہم دونوں ہی انسانی قالبوں سے نکل آئے۔

مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ میں اس طرح غاروں کے اس سلسلے سے نکل کر بھاگی تھی جیسے موت میرا پیچھا کر رہی ہو۔

لمحوں میں ہم بغداد سے بابل کے کھنڈرات تک پہنچ گئے۔

عالم سوما ہمیں وہاں اپنا منتظر ملا۔

''آؤ تم دونوں ادھر!'' عالم سوما نے ہمیں ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے پاس بٹھا دیا۔ ''اے دینار!'' عالم سوما مجھ سے مخاطب ہوا۔

''فوری طور پر یہ ضروری ہے کہ تجھے اس عفریت کی نظروں سے چھپا دیا جائے۔ عارج کو بھی اب اس کے سامنے نہیں آنا چاہئے۔''

عالم سوما نے یہ کہہ کر ہمارے گرد ایک حصار کھینچ دیا۔

نصف شب سے زیادہ دیر ہو چکی تھی۔ عالم سوما تہجد کی نماز پڑھنے لگا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تہجد کے نفل پڑھ کر ہی تفصیلی گفتگو کرے گا۔ میں اس سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتی تھی میں نے اس کا اظہار بھی کیا تھا۔

''سوما تو تہجد پڑھنے لگا اے عارج! تو بتا کہ جب میں واپس نہیں آئی تو کیا کیا تو نے؟'' میں عارج سے مخاطب ہوئی۔

''جب تو نہ لوٹی تو میں نے بغداد کا ایک ایک گوشہ چھان مارا مگر ناکامی ہوئی۔

دوسرے روز بعد نماز مغرب عالم سوما میرے پاس آیا اور جیسا کہ میں تجھے بتا بھی چکا ہوں اسے کشف ہوا تھا کہ تو خطرے میں ہے۔" عارج نے تفصیل سے میری بات کا جواب دیا۔

"سوما ہی نے مجھے بتایا کہ تو کہاں ہے! اس نے اپنے علم کے ذریعے تیرا پتہ چلا لیا تھا۔ اس کی تاکید پر میں غاروں کے اس سلسلے میں داخل ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ سوما اس سے قبل مجھے عمل کے الفاظ بتا چکا تھا۔ غاروں کے باہر موجود پہریدار جنات نے کئی بار مجھے مار بھگا دیا مگر میں نہ مانا......"

"اور آخر کار تجھے قید کر لیا گیا۔" میں نے عارج کی بات پوری کر دی۔

"ہاں...... میں یہی چاہتا تھا تا کہ تو ملے تو تجھے علم کے الفاظ بتا سکوں۔"

"لیکن تیری میری ملاقات نہ ہوتی تو؟" میں نے سوال کیا۔

"اس عفریت نے جب تجھے سارہ کے ذریعے اغوا کرایا تو اسے تیرے بارے میں سب کچھ پتہ ہوگا۔ یہ بھی کہ...... کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں تجھ سے ملاقات تو ہونی ہی تھی...... مجھے قید کر کے تجھے ضرور آگاہ کیا جاتا...... اور یہی ہوا نا؟"

عارج سے میں اس وقت تک باتیں کرتی رہی جب تک سوما نے تہجد کے نفل نہ پڑھ لئے۔

"مجھے جس بات کا خوف تھا وہی ہوا دینار!" عالم سوما مجھ سے کہنے لگا۔

"کیسا خوف؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہ کہ بغداد میں کہیں وہ عفریت تیرے پیچھے نہ لگ جائے جسے تو نے بصرہ سے واپسی میں دیکھا تھا۔ میں نے پہلے یہ سوچا تھا کہ وہ کافر جن زادہ ہوگا۔ مگر جب کشف ہوا تو اس کی حقیقت کھل گئی۔" سوما نے بتایا۔ "مجھے ڈر ہے کہ وہ تجھے آسانی سے برداشت نہیں کرے گا۔"

عالم سوما کو فکر مند دیکھ کر میں بھی تشویش میں مبتلا ہوگئی۔ میں وہ تکلیف و اذیت نہیں بھولی تھی جس سے مجھے گزرنا پڑا تھا۔ اسی بنا پر میں نے سوما سے معلوم کیا۔ "تو ہی بتا کہ ہم کیا کریں اے سوما؟"

"کچھ عرصے کیلئے اس عفریت کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤ تم دونوں۔" عالم سوما بولا...... یہاں ان کھنڈرات میں تمہیں اس وقت تک کوئی خطرہ نہیں جب تک حفاظتی حصار میں ہو۔"

"لیکن...... یہ تو...... یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ ہم یہاں قید ہو کے رہ جائیں" میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ ایک اور بھی صورت ہے مگر...... عارج کو بھی چالیس دن تک وہی عمل کرنا پڑے گا جو تو کر چکی ہے اے دینار! دوسرے زمانوں اور جہانوں میں جانے کا عمل!"

"مگر اس سے کیا حاصل؟ ہم جس لمحے ماضی یا مستقبل کے سفر پر روانہ ہوں گے، واپسی اسی لمحے میں ہوگی۔" میں نے اعتراض کیا۔ "ہم تیرے کہنے کے مطابق طویل عرصے اس عفریت کی نظروں سے کس طرح اوجھل رہیں گے؟"

اس مسئلے کا بھی ایک حل ہے۔" عالم سوما نے میری آس بندھائی۔

میں اسی لمحے میں واپس نہ آؤں بلکہ اپنی مرضی کے مطابق زمانے اور وقت کا تعین کر سکوں اس کیلئے مجھے گیارہ روز تک ایک عمل کرنا تھا۔ اس عمل سے متعلق سوما نے یہ بھی بتایا کہ میں خاموش تماشائی کے بجائے کسی بھی عہد میں فعال کردار ادا کر سکوں گی۔" میں یہ سن کر فوراً وہ گیارہ روزہ عمل کرنے پر آمادہ ہوگئی۔

"پھر بھی اے دینار! تجھے انتظار کرنا پڑے گا" سوما نے کہا۔

"کس کا انتظار؟"

"وقت گزرنے کا" سوما نے جواب دیا۔ "عارج کو بھی تو یہاں خطرے کا سامنا ہے۔ سو یوں اکیاون روز ہوئے۔ یعنی یوں سمجھ کہ ایک ماہ اور اکیس روز! گیارہ روز والا عمل بھی عارج کو کرنا پڑے گا۔"

طے پایا کہ آئندہ شب سے عارج پہلے چالیس روز پھر گیارہ روز والا عمل کرے گا۔ اس عرصے میں ہم دونوں کو حفاظتی حصار میں رہنا تھا۔ عالم سوما نے اگلے دن صبح یہ بندوبست کر دیا کہ بغداد سے ہماری غیر حاضری کے سبب خلق خدا کو پریشانی نہ ہو۔ دو جنات انسانی قالب میں میرے مطب پہنچے۔ انہوں نے میرا اور عارج کا روپ اختیار کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک طبیب صارم اور دوسرا طبیبہ اطردبہ بن گیا۔ یہاں میں یہ بتاتی چلوں کہ جنوں کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ عورت بن سکتے ہیں۔

غرض کہ ان دونوں جن زادوں نے خدام کا حساب کرنے کے ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا کہ طبیب و طبیبہ کچھ عرصے کیلئے مصر جا رہے ہیں' اب مصر سے ان کی واپسی ہی پر مطب کھلے گا۔

کبھی کبھی وقت بڑی تیزی سے گزرتا محسوس ہوتا ہے اور بعض مرتبہ تو یوں لگتا ہے جیسے وقت رک سا گیا ہو۔ سو وہ ایام بھی ایسے ہی تھے۔ اکیاون دن گزر گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

''عارج! اگر تو نے بھی میری طرح چالیس روز والا عمل میرے ساتھ پہلے کرلیا ہوتا تو اتنا وقت نہ لگتا۔'' میں نے کہا۔

''چل اب چھوڑ اے دینار! جو ہوا سو ہوا۔ مجھے تو یہ خوشی ہے کہ ہم کسی اور زمانے میں بھی ساتھ رہیں گے۔'' عارج بولا' پھر پوچھا۔

''مستقبل میں چلنے کا ارادہ ہے یا ماضی میں؟''

''میں نے مستقبل کے ایک تاجدار بابر کو اپنے بیٹے ہمایوں کیلئے جان دیتے دیکھا تھا۔ عارج! چل ہم ہمایوں کے زمانے میں چلتے ہیں' میں دیکھوں تو سہی کہ اس نے اپنے عظیم باپ کا نام روشن کیا یا ڈبو دیا!......اور سن! تم اس زمانے کے کسی نوجوان کے جسم میں داخل ہو جاؤ اور میں کوئی نوجوان آدم زادی تلاش کرلوں گی۔ میں اس آدم زادی کے جسم میں رہوں گی۔''

''مگر دینار' یہ خیال رکھیو کہ انسانی قالب اختیار کرلینے پر بھی ہم آدم زادوں کی طرح ایک دوسرے سے مل سکیں۔''

ہم نے پوری طرح مستقبل کی منصوبہ بندی کرلی اور مغل تاجدار ہمایوں کے عہد میں پہنچ گئے۔ وہ رات کا وقت تھا۔

پھر عارج نے پہل کی۔ اس نے ایک نوجوان کے جسم پر قبضہ کرلیا میں ایک کنیز دل آرام کے جسم میں داخل ہوگئی جو مغل دربار کے ایک اہم عہدیدار خان زماں کے حرم میں تھی۔ اس کا سبب وہ نوجوان شاہم بیگ تھا' عارج نے جس کے جسم کو رہنے کیلئے پسند کیا تھا۔ یہ تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ واقعات کے تسلسل کی خاطر میں پہلے شاہم بیگ کا ذکر کروں گی۔

عارج کو ساتھ لے کر میں 164 ہجری کے عراق سے چلی اور 943 ہجری کے ہندوستان میں پہنچ گئی۔ یہ سینکڑوں صدیوں یعنی 779 سال کا سفر تھا جو ایک لمحے میں طے ہوگیا۔ پہلے بھی ایک بار مجھے یہ تجربہ ہو چکا تھا تب میں اور اب میں فرق صرف یہ تھا کہ اس وقت میں محض خاموش تماشائی تھی اور تنہا یہ سفر کیا تھا' اب صورتحال مختلف تھی۔ اس کا ایک سبب تو عارج تھا اور دوسری بڑی وجہ وہ گیارہ روز کا عمل تھا جس کی وجہ سے مجھے مزید پراسرار قوتیں

حاصل ہوگئی تھیں۔

مجھے عارج انتہائی خوفزدہ سا معلوم ہوا۔

''تمہارے وجود میں سنسناہٹ ہو رہی ہے نا؟'' میں نے عارج سے کہا۔

''ہاں دینار!...... پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔'' عارج ڈری ہوئی آواز میں بولا۔

''پہلے کبھی تو نے اتنا طویل سفر بھی نہیں کیا۔ چند لمحے بعد یہ کیفیت ختم ہو جائے گی۔ میں نے عارج کو سمجھایا۔

عارج نے خود پر قابو پالیا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ سفر شروع کیا تھا اس لئے یکساں کیفیت سے ہمکنار تھے۔ میرے وجود کی سنسناہٹ تھمی تو میں نے عارج کی طرف دیکھا۔ ہم جنات اس وقت تک ایک دوسرے کو دیکھنے پر قادر ہوتے ہیں جب تک کوئی اندھیرے کی چادر نہ اوڑھ لے۔ عارج میری سوال طلب نظروں کے جواب میں بولا۔ ''اب میں ٹھیک ہوں......لیکن یہ جگہ تو عجب ہے یہاں کیا صحرا نہیں ہیں؟''

''پہلی بات تو اپنے دماغ میں یہ بٹھا لے عارج کہ یہ عراق نہیں ہندوستان ہے۔ ہم جس زمانے سے یہاں آئے ہیں وہ صدیوں پیچھے رہ گیا ہے۔ یہ وہ دوسری بات ہے جو تجھے یاد رکھنی ہے۔ تیسری بات یہ سن کہ اس ملک میں بھی صحرا ہیں مگر ان کا رقبہ عرب کے مقابلے میں بہت کم ہے میری باتیں تیری سمجھ میں آئیں؟''

''ہاں آگئیں تیری باتیں سمجھ میں۔'' عارج نے کہا۔ ''یہ بتا کہ جس طرح ہم یہاں آگئے ہیں تو کیا وہ عفریت اس جگہ نہیں پہنچ سکتا جس کی نظروں سے اوجھل ہونا ہمارا مقصد ہے؟''

''نہیں وہ عفریت یہاں تک ہمارے تعاقب میں نہیں آسکے گا۔'' میں بولی۔ ''ہمارے سوا کسے خبر ہے کہ ہم کہاں ہیں۔''

''اور اگر اپنی پراسرار قوتوں کو کام میں لا کر اس نے ہمارا سراغ لگا لیا تو!۔''

''تو دیکھا جائے گا۔'' میں نے کہہ دیا۔

''مزید احتیاط بھی تو برتی جاسکتی ہے دینار!۔''

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کسی آدم زاد کے جسم میں گھس جاؤں اور تو......''

''کسی آدم زادی کا جسم اپنے لئے منتخب کرلوں یہی کہنا چاہتا ہے تو اے عارج؟''

''ہاں اے دینار!'' اس نے اقرار کیا۔

''ایسا کرتے ہیں اے عارج کہ پہلے ہم اس مغل باشاہ ہمایوں کو تلاش کرتے ہیں' وہ کہاں ہے! اس کے بعد تو کسی آدم زاد کے جسم میں گھس جائیو۔ رہا میرا معاملہ تو ضروری نہیں کہ فوری طور پر میں بھی ایسا ہی کروں۔''

''تو پھر دینار! تو...... تو کہاں رہے گی۔''

''گھبرا مت عارج! تو مجھے اپنے آس پاس ہی پائے گا لیکن یہ جان لے کہ بغیر اشد ضرورت کے میں مداخلت نہیں کروں گی اور نہ ہی تو مجھ سے یہ امید رکھیو کہ میں ہر وقت تیرے قریب رہوں...... یہ بتا اے عارج کہ تو بڑا کب ہوگا؟''

میں نے اسے چھیڑا تو اس کا منہ بن گیا۔ میں یہی چاہتی تھی کہ وہ اعتدال پر آ جائے۔ اس کے ذہن سے عفریت وہوش کا خوف نکل جائے' دوسرے یہ کہ نئے زمانے اور ایک نئی سرزمین پر آ کر اسے اجنبیت محسوس نہ ہو۔

''چل دینار تو کہاں چل رہی تھی؟...... کون خلیفہ تھا وہ۔''

''خلیفہ نہیں بادشاہ۔'' میں نے تصحیح کی۔'' اس زمانے میں اور اس سرزمین پر خلیفہ نہیں بادشاہ ہوتے ہیں۔''

''ایک ہی بات ہے۔'' اس نے اپنی خجالت چھپانے کی خاطر کہا۔

''ایک بات نہیں۔ خلیفہ اور بادشاہ میں فرق ہوتا ہے اے عارج!''

''اچھا چل مان لیا ہوگا فرق!'' وہ بیزار آواز میں کہنے لگا۔'' اب چلنا ہے اس بادشاہ کے پاس؟''

''تو تو اس طرح کہہ رہا ہے جیسے اس بادشاہ سے میری رشتہ داری ہے!'' میں ہنسی۔'' ضروری نہیں کہ بادشاہ سے ملا ہی جائے۔''

''تو جان دینار!'' عارج نے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑالی۔ میں اپنے ساتھ عارج کو لئے بہت جلد ہندوستان کے اس علاقے میں پہنچ گئی جو احمد آباد کہلاتا ہے۔ (یہ وہی احمد آباد ہے جہاں پچھلے دنوں مسلم کش فسادات ہوئے ہیں۔ مصنف)

مغل بادشاہ بابر کے بیٹے محمد ہمایوں کے زمانے کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً میں ہمایوں کی سوانح بیان کردوں اس کے ساتھ یہ بھی کہ میں جب عراق سے ہندوستان پہنچی تو ہمایوں کن حالات سے نبرد آزما تھا۔

ہمایوں ایک نیک نفس اور عالی ہمت مغل بادشاہ تھا۔ اس کا آغاز مایوس کن لیکن انجام شاندار تھا۔ ہمایوں نے ہمیشہ پھول بکھیرے اور کانٹے چنے۔ مگر اس کی بہار خزاں کی آغوش ہی میں پروان چڑھتی رہی۔ وہ بار بار ناکامیوں کے دریا میں ڈوبا مگر ہر بار اپنے زور بازو سے سطح پر ابھر آیا۔

ہمایوں کی ولادت کابل میں 914 ہجری کو ہوئی۔ 937 ہجری میں بمقام آگرہ وہ اپنے باپ بابر کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا۔ وہ بڑا با اخلاق اور باذوق بادشاہ تھا۔ البتہ عیش ونشاط سے اسے خاص شغف رہتا تھا۔ غلام اور کنیزیں خریدنا اوران کی ذہانت ولیاقت کے مطابق سلوک کرنا بھی ہمایوں کا ایک وصف تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے خادموں کو بھی ان کی خدمت کا صلہ دینے میں بخل سے کام نہیں لیتا تھا۔ کسی بادشاہ کا خادم خاص ہونا بڑے مرتبے کی بات سمجھی جاتی تھی۔ امرائے دربار بھی ان خادموں کی بڑی عزت کرتے اور کام نکالتے تھے۔ جو بادشاہ کے قریب ہوتے تھے۔ عارج نے جس نوجوان آدم زاد شاہم بیگ کے جسم پر تصرف حاصل کیا دراصل وہ ہمایوں کا خادم خاص ہی بنا' مگر خاص جدوجہد کے بعد! یہ ذکر آگے آئے گا۔ میں نے عارج کو یہ تاکید کردی تھی کہ وہ خود کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دے' بحیثیت شاہم بیگ!

تخت نشینی کے بعد ہمایوں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ بڑا عادلانہ سلوک کیا۔ پورے ملک ہندوستان کو اس نے تمام بھائیوں میں تقسیم کردیا۔ پنجاب کیونکہ کابل کے قریب تھا اس لئے وہ مرزا کامران کو دیدیا۔ مرزا ہندال کیونکہ ہمایوں کے ساتھ ہی رہتا تھا اس لئے اسے میوات کا علاقہ دیا۔ سنبھل اور اس کے توابعات مرزا عسکری کے نام واگزار کر دیئے۔ ہمایوں نے تو بھائیوں کے ساتھ یہ سلوک کیا مگر انہوں نے خانوادہ تیموری کے دامن پر داغ لگا دیا۔ مغلوں کا جد امجد تیمور لنگ ہی تھا۔ اسی سبب یہ خانوادہ تیموری کہلاتا تھا۔

ابتدائے حکومت ہی سے ان بھائیوں نے اپنے بڑے بھائی ہمایوں کی مخالفت شروع کردی اور شیر شاہ کے ساتھ ربط ضبط بڑھانے لگے جو بعد میں شیر شاہ سوری کے نام سے جانا پہچانا گیا۔ شیر شاہ نے بابر کے زمانے ہی سے بنگال میں بغاوت کردی تھی حالانکہ خود وہ بہار کے ایک علاقے سہرام کا رہنے والا تھا۔ مرزا کامران کو بابر کے زمانے ہی سے سرہند' قندھار اور اسکے توابعات (ملحقہ چھوٹے دیہات' قصبات اور آبادیاں) کی حکومت مل گئی تھی۔ ہمایوں نے ان میں پشاور اور لغمان کا بھی اضافہ کردیا۔ اس ضمن میں ابھی فرمان واحکام تیار

ہوتی رہے تھے کہ معلوم ہوا مرزا کامران باپ کی تعزیت اور بھائی کی تخت نشینی کی مبارکباد دینے کا بہانہ کرکے کابل سے نکل گیا ہے اور پنجاب و دہلی کا ارادہ رکھے ہوئے ہے۔ اس پر بھی ہمایوں نے مرزا کامران کی جسارت کو نظر انداز کر دیا اور مذکورہ علاقوں کے پروانے روانہ کر دیئے۔ ناچار مرزا کامران واپس ہو گیا مگر بعد میں بھی اس نے کسی موقع پر بھائی کی مخالفت ترک نہ کی۔

سلطان حسین مرزا کا پوتا محمد زمان مرزا' ہمایوں کا چچازاد تھا۔ بعض چغتائی امیروں کی مدد سے اس نے بھی شورش برپا کر دی مگر اسے جلد ہی گرفتار کر لیا گیا۔ محمد زمان مرزا کلام پاک پر قسم کھانے کے باوجود اپنی شرپسندیوں سے باز نہیں آیا تھا اس لئے اسے اور سلطان حسین مرزا کے نواسے محمد سلطان کو بھی قید میں ڈلوا دیا گیا۔ محمد سلطان بھی محمد زمان مرزا کے ساتھ ہمایوں کے خلاف سازش میں شریک تھا۔ ہمایوں نے ان دونوں کو اندھا کر دینے کا حکم دیدیا۔

میں نے اس بات کا کھوج بھی لگایا کہ آخر آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر مغل بادشاہ اپنے عزیزوں کو اندھا کیوں کرا دیتے تھے؟ پہلے مغل فرماں روا نے اپنی ہی سلطنت کیلئے جو نظام حکومت وضع کیا تھا اور جسے زبانی احکام کی روشنی میں مرتب کیا گیا تھا اس میں یہ قانون بڑی اہمیت کا حامل تھا کہ کوئی بھی معذور شخص خواہ اس کا تعلق شاہی خاندان ہی سے کیوں نہ ہو' حکمران نہیں بن سکتا۔ اسی وجہ سے آنکھوں میں سلائیاں پھروانے کی سزا مغلوں میں عام ہوئی۔ یوں گویا مغل حکمران اپنے عزیزوں کے قاتل نہیں کہلاتے تھے۔ یہ الگ بات کہ کسی سے اس کی بصارت چھین لینا بھی درندگی ہے۔

ذکر تھا ہمایوں کے باغیوں کا! یہ باغی ہمایوں کے خاندان ہی سے تھے۔ ان لوگوں کے خیر خواہ وفادار ہر جگہ ہوتے تھے جو ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے تھے کہ شاہی خاندان کے کسی فرد سے مراسم پیدا کر سکیں تاکہ وقت پڑنے پر وہ فرد ان کے کام آ سکے۔ محمد سلطان اور محمد زمان مرزا کے بہی خواہ پس دیوار زنداں بھی موجود تھے۔

☆......☆......☆

قلعہ بیانہ میں نواز خان شاہی خاندان کے افراد کو سزائیں دینے پر مقرر تھا۔ نواز خان کو جب پتہ چلا کہ اسے کن دو افراد کی آنکھوں میں سلائیاں پھیرنی ہیں تو وہ دو دلا ہو گیا۔

ایک طرف حکمران وقت مغل تاجدار ہمایوں کا حکم تھا' دوسری جانب یہ لالچ کہ ہر دو افراد میں سے اگر کوئی ہمایوں کی جگہ تخت نشین ہو گیا تو عیش ہو جائیں گے۔ آئندہ اس کے گھرانے کی کئی نسلیں فکر معاش سے آزاد ہو جائیں گی۔ زندگی بچانے یا معذوری سے بچا لینے والوں کو شاہی خاندان والے اتنا ہی نوازتے تھے۔ سو نواز خان کو بھی یہی امید بندھ گئی۔ اس نے محمد سلطان اور محمد زمان مرزا کی آنکھوں میں اس طرح سلائیاں پھیریں کہ پردہ بصارت محفوظ رہا۔ بہرحال یہ دونوں بیانہ کے قلعے میں محبوس رہے۔ بعد میں ان دونوں نے قلعے والوں کو ہموار کر لیا اور سازباز کر کے قلعے سے نکل آئے۔ محمد زمان مرزا تو احمد آباد اور گجرات (ہندوستان) کی طرف چلا گیا اور محمد سلطان نے قنوج کی راہ لی۔ قنوج میں اس نے ایک لشکر جمع کیا اور ہمایوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ ان باغیوں نے مل کر شرقی حدود میں کچھ علاقے پر اور احمد آباد پر قبضہ کر لیا۔ ان اطلاعات کی بنا پر ہمایوں کیلئے گجرات کی طرف فوج کشی ناگزیر ہو گئی۔

ہمایوں دونوں باغیوں کو نیچا دکھانے میں کامیاب رہا۔ جب وہ احمد آباد سے اپنے دارالحکومت آگرہ کی طرف لوٹ رہا تھا تو اسے تخت نشیں ہوئے چھ سال گزر چکے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ میں عارج کے ہمراہ عراق سے ہندوستان پہنچی۔

اس وقت ہمایوں کا لشکر احمد آباد سے آگرہ کی جانب کوچ کر رہا تھا کہ عارج نے ایک نوجوان آدم زاد کو دیکھ کر مجھ سے کہا۔ "دینارا! میں تو اس نوجوان کے جسم میں پناہ لے لیتا ہوں۔ کیا خبر عفریت داموش سے اس طرح نجات مل جائے!"

عارج اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ میں نے اسے ایسا کرنے سے نہیں روکا۔ عارج کو میں نے اس نوجوان آدم زاد کے جسم میں داخل ہوتے دیکھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد عارج اس انسانی قالب میں مجھے مضطرب نظر آیا۔ سپاہیوں نے اسے لشکر گاہ کے اطراف منڈلاتے ہوئے پایا تو پکڑ لیا۔ عارج نے جلد بازی کی تھی مگر خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ اس نوجوان آدم زاد کے جسم سے نکل آتا۔ اس نوجوان آدم زاد کے بارے میں گمان کیا گیا کہ وہ ہمایوں کے بھائی مرزا عسکری کا کوئی مخبر ہے۔

صبح دم مغل فوج اس منزل سے پھر آگرے کی طرف کوچ کرنے والی تھی۔ ہمایوں جلد از جلد آگرے پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اسے مرزا عسکری کی منافقت کا علم ہو چکا تھا۔ میں اپنی

پراسرار قوتوں کو بروئے کار لا کر بہت سی باتیں معلوم کر چکی تھی۔

اس وقت حالات کچھ ایسے ہی تھے کہ ہر شخص کو شک و شبے کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ ایسے حالات میں وہ بھی ایک پہر رات گزر جانے کے بعد اس نوجوان آدم زاد کا لشکر گاہ کے قریب پایا جانا شکوک و شبہات کا سبب ہوا۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ وہ غلطی اس نوجوان آدم زاد کی نہیں بلکہ گھبرائے ہوئے ایک جن زاد عارج کی حماقت کا نتیجہ تھی۔ اگر ان مغل سپاہیوں کو پتا چل جاتا کہ جس نوجوان کو انہوں نے مخبر کے شبے میں پکڑا ہے اس کے اندر ایک جن چھپا ہوا ہے تو غش کھا جاتے۔

جو دستے رات کے وقت لشکر گاہ کی نگرانی پر مامور تھے انہی میں سے ایک دستے کے سپاہیوں نے نوجوان کو پکڑا تھا۔ اب وہ باندھ کر اس نوجوان کو بہادر خان کے خیمے کی طرف لے جا رہے تھے۔ میری ہدایت کے مطابق عارج نے بحیثیت شاہم بیگ خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ورنہ کسی ایسے آدم زاد کو باندھ لینا آسان نہیں جس کے جسم پر ایک جن زاد نے قبضہ کر لیا ہو۔ عارج نے کسی طرح کی مزاحمت نہیں کی میں اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھی۔

بہادر خان تمام حفاظتی دستوں کا سربراہ تھا۔ اس کا حکم تھا کہ کوئی بھی مشتبہ فرد پکڑا جائے تو اسے فی الفور اور براہ راست اس کے سامنے پیش کیا جائے۔

بہادر خان کا خیمہ کیونکہ شاہی خیمہ گاہ سے متصل تھا اور رات کے وقت بغیر اجازت اس طرف کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا اس لیے کئی جگہ پوچھ گچھ ہوئی۔ حقیقت حال جاننے کے بعد حفاظتی دستے کے سپاہیوں کو آگے جانے کی اجازت مل گئی۔

لشکر گاہ میں ہر طرف مشعلیں روشن تھیں۔ جو سپاہی پہرے پر متعین تھے انہیں نزاکت وقت کا پورا احساس تھا۔ ان میں سے کوئی اپنی جگہ سے غیر حاضر نہیں تھا۔

قیدی نوجوان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے پشت پر! اس کے علاوہ ایک رسی اس کی کمر میں بھی پڑی تھی۔ نوجوان کا چہرہ فق تھا اور آنکھوں میں حلقے پڑے تھے۔ آنکھیں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی نشہ کرتا ہو۔ بالوں میں گرد، لباس بوسیدہ اور پابرہنہ وہ نوجوان قابل رحم نظر آ رہا تھا مگر مغل سپاہی جانتے تھے کہ ایسے ہی مظلوم نظر آنے والے خطرناک بھی ہوتے ہیں۔ مخبر کسی بھیس اور کسی حال میں بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ اسی لئے اس نوجوان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برت رہے تھے۔ یہ تھا اس انسانی قالب کا حلیہ جس میں عارج نے عفریت دہموش سے خوف کھا کر پناہ لی تھی۔

عارج پر بھی خوب گزری تھی۔ عالم جنات میں اسے ایک عفریت نے قیدی بنا لیا تھا اور اب سینکڑوں صدیوں کا سفر کر کے وہ پھر پکڑا گیا تھا۔ اس مرتبہ وہ نادانستگی میں پھنسا تھا۔

نقاہت کی وجہ سے وہ نوجوان آدم زاد چلتے چلتے لڑکھڑا جاتا تو سپاہی اسے دھکے دے دے کر آگے بڑھنے پر مجبور کر دیتے۔ نوجوان کا بایاں رخسار قدرے سوجا ہوا تھا اور نچلا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ میں اس سے بے خبر نہیں تھی۔ یہ اس تفتیش کا نتیجہ تھا جو لا حاصل رہی۔ غلطی دراصل سپاہیوں کی تھی کہ انہوں نے نوجوان کی حالت پر غور کیے بغیر اسے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ عارج نے بڑے صبر و تحمل کا ثبوت دیا۔ انسانی قالب پر ہونے والا تشدد عارج ہی کو برداشت کرنا پڑا تھا۔ عارج نے اپنے یعنی اس انسانی قالب کے متعلق بڑی مشکل سے صرف یہ بتایا کہ وہ کوئی چور اچکا یا اٹھائی گیرا نہیں ہے۔

"میں بھوکا پیاسا ہوں اور...... اور میں اس قابل نہیں کہ زیادہ دیر گفتگو کر سکوں۔"

سپاہیوں نے اسے حیلہ سمجھا۔ انہوں نے نوجوان کو مزید زدوکوب کیا۔ سپاہی اور بھی بدگمان ہو گئے۔ اب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ ضرور کوئی مخبر ہے ورنہ اپنی بیگناہی میں کچھ تو کہتا۔ آخر وہ کہتا بھی کیا! عجلت میں وہ اس نوجوان کا صرف نام معلوم کر سکا تھا۔

پھر سپاہیوں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس نوجوان کو بہادر خان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ بہادر خان بہت سخت گیر مشہور تھا۔ خان زماں کا بھائی ہونے کی وجہ سے فوج میں اس کا بڑا دبدبہ تھا۔ میں معلومات حاصل کرتی جا رہی تھی۔

سپاہی جب مشتبہ نوجوان کو لیے بہادر خان کے خیمے تک پہنچے تو پہریداروں نے انہیں روک لیا۔ بڑی مشکل سے وہ اس پر راضی ہوئے کہ بہادر خان تک ان سپاہیوں کا پیغام پہنچا دیں کیونکہ خیمے کے اندرونی حصے میں محفل ناؤنوش جمی ہوئی تھی۔

لشکر صبح کوچ کرنے والا تھا اور کوئی بھی خبر نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی تھی۔ بہادر خان اسی لیے نشے کی ترنگ کے باوجود مشتبہ نوجوان کے بارے میں سن کر فوراً کھڑا ہو گیا۔ حاضر باشوں میں سے کسی نے یہ مشورہ بھی دیا کہ مشتبہ نوجوان کو فی الحال سپاہیوں کی تحویل ہی میں رہنے دیا جائے اور صبح اس معاملے کی تفتیش کی جائے مگر بہادر خان نے اس مشورے کو قبول نہ کیا۔

مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ عارج کو انسانی قالب میں بہادر خان کے سامنے پیش کیا جائے گا تو اس کے خیمے میں پہنچ گئی تھی۔

رنگ میں بھنگ پڑ جانے سے بہادر خان کچھ جز بز تو ہوا تھا اور اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے' لیکن اس موقع کو وہ ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میری توجہ اس کے ذہن پر تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر مشتبہ نوجوان واقعی مرزا عسکری کا مخبر ہے تو اس سے بہت کچھ پتا کیا جا سکتا ہے۔ یوں بہادر خان اپنی کارکردگی دکھا کر اپنے بھائی خان زمان کی نظر میں سرخروئی کے خواب دیکھنے لگا' جاگتی آنکھوں کے خواب!

خان زمان ہمیشہ اسے لتاڑتا رہتا تھا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے اور کوئی ایسا کام نہیں کرتا کہ خان زمان کی عزت اور وقار میں اضافہ ہو۔

میں جو باتیں بیان کر رہی ہوں' مجھے بہادر خان کے ذہن پر توجہ دینے سے معلوم ہوئیں۔

خان زمان کی خواہش تھی کہ وہ خود جس طرح ترقی کرتا ہوا اعلیٰ منصب تک پہنچ گیا ہے' اس کا بھائی بہادر خان بھی اسی طرح شاہی تقرب حاصل کرے مگر بہادر خان کو عیش و نشاط ہی سے فرصت نہ تھی۔

مغل افواج کی سپہ سالاری خان زماں کیلئے قابل فخر تھی' لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پانسا پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ یہی بات وہ کئی مواقع پر بہادر خان سے بھی کہہ چکا تھا۔ وہ کہتا' اگر ایسے میں سگا بھائی بھی کسی بڑے منصب پر ہو تو پلا بھاری رہتا ہے۔ بہادر خان نے اپنی دانست میں کئی بار یہ کوشش کی تھی کہ کچھ کر گزرے لیکن اس کی قسمت ہی ساتھ نہیں دیتی تھی۔

مشتبہ نوجوان کے متعلق جان کر جانے کیوں اسے یہ محسوس ہوا کہ شاید اس بار تقدیر اس پر مہربان ہو گئی ہے۔ وہ اس لیے خیمے کے بیرونی حصے میں پہنچ گیا اور پہریداروں کو حکم دیا کہ سپاہیوں کو حاضر کیا جائے۔

سپاہی اس بے حال نوجوان آدم زاد کو لے کر خیمے میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے نوجوان کو دھکا دے کر آگے بڑھا دیا اور خود مؤدب پیچھے کھڑے ہو گئے۔ بہادر خان نے نوجوان کو بغور دیکھا' پھر سپاہیوں سے بولا۔ ''تم لوگ جا سکتے ہو' اسے یہیں چھوڑ جاؤ!''

بہادر خان کے حکم پر سپاہی الٹے قدموں خیمے سے باہر نکل گئے۔ اب خیمے کے بیرونی حصے میں بہادر خان اور اس نوجوان کے سوا کوئی نہیں تھا۔ خیمے کے اندرونی حصے میں بھی خاموشی چھا گئی تھی۔ غالباً حاضر باشوں نے معاملے کی نوعیت کا اندازا کر لیا تھا۔ خیمے کے در پر جو مسلح پہریدار متعین تھے' وہ بھی ایک جگہ کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے قدموں کی چاپ سنائی

نہیں دے رہی تھی۔ خیمے کا پردہ گرا ہوا تھا۔ جو لوگ خیمے کے اندرونی حصے میں تھے' ان کی حیثیت بہادر خان کے مصاحبوں کی سی تھی۔ بہادر خان کو ان کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ تھا کہ نوجوان سے اگر کوئی کام کی بات معلوم ہوئی تو غیروں کے کان تک پہنچ جائے گی۔ وہ اسی لیے مطمئن نظر آ رہا تھا۔

انسانی قالب میں عارج سر جھکائے بہادر خان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ میں چاہتی تو بہادر خان کی بہادری کا بھرم لمحے بھرم میں توڑ دیتی' اس کا نشہ ہرن کرنا بھی میرے لیے معمولی بات تھی' مگر میں نے صبر کیا کہ مصلحت وقت کا یہی تقاضا تھا۔

بہادر خان' عارج کے قریب پہنچ گیا' پھر بھی عارج کی حالت میں کوئی تغیر نہ ہوا۔ عارج نے جو انسانی قالب اپنایا تھا' انتہائی خراب و خستہ حالت میں تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اب زیادہ دیر اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکے گا۔

بہادر خان' نوجوان آدم زاد کی کیفیت بھانپ گیا۔ یہ جاننے کیلئے کہ اس نے صحیح قیاس کیا ہے اور یہ کہ نوجوان مکر نہیں کر رہا' وہ آگے بڑھا۔ دوسرے ہی لمحے نوجوان کے سر کے بال بہادر خان کی مٹھی میں آ گئے۔ نوجوان کا چہرہ اوپر اٹھ گیا۔ گرفت سخت تھی۔ نوجوان کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے ہونٹ لرزے مگر وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

بہادر خان سمجھ گیا کہ اس کا اندازہ غلط نہیں ہے۔ اس نے سر کے بال چھوڑ دیئے۔ نوجوان کا سر پھر جھک گیا۔ بہادر خان نے پہریداروں کو آواز دی۔ دو پہریدار فوراً ہی خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گئے۔

''اسے برابر والے خیمے میں لے جا کر ملازمین کے سپرد کر دو۔'' بہادر خان پہریداروں سے مخاطب ہوا۔ ''یہ بھوکا پیاسا ہے۔ اسے صرف اتنا ہی کھانا دیا جائے کہ یہ بولنے کے قابل ہو سکے ورنہ سو جائے گا۔ جب یہ اپنے حواس میں آ جائے تو اسے دوبارہ ہمارے حضور میں پیش کیا جائے۔'' یہ کہہ کر بہادر خان خیمے کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

دونوں پہریداروں نے نوجوان کو سنبھال لیا جو اب گرنے کے قریب تھا۔

بہادر خان خیمے کے اندرونی حصے میں پہنچا تو حاضر باشوں نے اسے گھیر لیا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

''حضور فکر مند نظر آتے ہیں۔'' ان میں سے ایک بولا۔

''ہاں۔'' بہادر خان نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا اور اس نوجوان خدمتگار

کو قریب آنے کا اشارہ کیا جو ساقی بنا ہوا تھا۔ خدمتگار نوجوان اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ اس نے خیمے کے پردے سے لگی ہوئی ایک خوبصورت چوکی سے صراحی اٹھائی اور بہادر خان کے سامنے رکھا ہوا خالی ساغر بھر دیا۔ بہادر خان نے اس نوجوان خدمتگار کی طرف نظر بھی نہ اٹھائی۔

دو نوجوان خدمتگار پھر مودب اپنی جگہ جا کھڑا ہوا۔

بہادر خان نے ساغر اٹھایا اور ہلکا سا گھونٹ لے کر اسے قالین پر رکھ دیا۔

حاضر باشوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ وہ صرف تین افراد تھے۔ ان کے ساغر بھی خالی ہو چکے تھے مگر وہ موقع شناس اور بہادر خان کے مزاج آشنا تھے۔ انہوں نے بہادر خان کو خاموش دیکھ کر خود بھی سکوت اختیار کر لیا۔

بہادر خان کی شکن آلود پیشانی سے ظاہر تھا کہ وہ کسی مسئلے پر غور کر رہا ہے۔ ایسے میں وہ کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ تینوں اسی لیے باری باری اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ نوجوان خدمتگار اب بھی اسی طرح اپنی جگہ کھڑا تھا جیسے پتھر کا بت ہو۔ کافی دیر بعد بہادر خان نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی اور مخصوص انداز میں ہاتھ بلند کیا۔ اس کے تمام خدمت گار اور ملازمین اشاروں پر چلتے تھے۔ نوجوان خدمتگار نے صراحی اٹھا کر ایک نقشیں طشت میں رکھی، پھر ساغر اٹھائے اور انہیں بھی سلیقے کے ساتھ طشت میں رکھ دیا۔ پھر وہ طشت اٹھائے خیمے سے نکل گیا۔

میں اب تک اس لیے بہادر خان کے خیمے ہی میں تھی کہ عارج کے انسانی قالب کو آخر کار وہیں آنا تھا۔ اس کیلئے مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ نوجوان ساقی خیمے سے نکلا ہی تھا کہ ایک پہریدار اندر آ گیا۔ اس نے آ کر بتایا کہ مشتبہ نوجوان اپنے حواس میں آ چکا ہے، حکم ہو تو اسے حاضر کیا جائے۔

بہادر خان ایک دم پہلو بدل کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''ہاں! اسے لے آؤ۔''

پہریدار واپس ہو گیا۔ جب وہ پلٹا تو اس کے ساتھ مشتبہ نوجوان بھی تھا۔

میں یہ دیکھنے کی متمنی تھی کہ اس انسانی قالب میں عارج کو قرار آ جائے۔

عارج جس نوجوان کے جسم میں تھا، اس کے ہاتھ اب بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کی حیثیت بہرحال ایک مجرم کی سی تھی۔

بہادر خان نے پہریدار کو جانے کا اشارہ کیا۔ پہریدار چلا گیا تو بہادر خان نے اس نوجوان کا بغور جائزہ لیا۔ نوجوان کے چہرے پر اب بھی دہشت برس رہی تھی۔ اس کی عمر بیس

برس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے سرخ و سفید رنگ اور چہرے کے نقوش سے ظاہر تھا کہ وہ کشمیری ہے۔

یہی وہ لمحہ تھا کہ جب مجھے خطرہ محسوس ہوا۔ بہادر خان کا ہاتھ اپنی کمر سے بندھی ہوئی تلوار کے دستے پر تھا۔ میں نے سوچا کہ سوال کرنے کی صورت میں عارج اس انسانی قالب کے متعلق کچھ نہ بتا پائے گا۔ اس بنا پر بہادر خان کا غصے میں آ جانا یقینی امر تھا۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اچانک وہ اس نوجوان کی گردن اڑا دیتا۔ اس انسانی قالب میں ہونے کی وجہ سے عارج بھی مارا جاتا اور میں دیکھتی رہ جاتی۔ اسی خطرے کے پیش نظر میں نے عارج کو مخاطب کیا۔ ''اے عارج! اس قالب سے باہر آ جا۔''

میری آواز صرف عارج کیلئے تھی۔ کوئی آدم زاد اسے سننے کا اہل نہیں تھا۔

''مگر کیوں دینار؟'' عارج نے اشاروں کی زبان میں پوچھا۔

''بحث نہ کر! تیری زندگی خطرے میں ہے۔ اس انسانی قالب کو فی الحال چھوڑ دے۔'' میں نے جواب دیا۔

عارج اس انسانی پیکر سے نکل آیا۔ اسی کے ساتھ وہ نوجوان آدم زاد بے ہوش ہو گیا۔ بہادر خان نے پہریداروں کو پکارا جو جلد ہی بے ہوش نوجوان کو ہوش میں لے آئے۔ وہ کھوئی کھوئی سی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

بہادر خان کے مختلف سوالوں کے جواب میں نوجوان نے جو روداد بیان کی وہ بڑی دردناک تھی، لیکن اس روداد کا بہادر خان پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ اس کے برعکس وہ کچھ جھنجلا سا گیا۔ اسے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ اس بار بھی قسمت اسے دغا دے گئی تھی۔ اسی جھنجلاہٹ میں وہ بولا۔ ''ضروری تو نہیں کہ تو سچا ہو!''

نوجوان اس کے قدموں میں گر پڑا اور رونے لگا۔

بہادر خان اپنے دل کو جھوٹی تسلیاں دے رہا تھا کہ یہ فریب بھی ہو سکتا ہے۔ کیا خبر یہ نوجوان جھوٹا ہو اور میری ہمدردیاں حاصل کرنے کیلئے ڈھونگ رچا رہا ہو۔ اس کے باوجود بہادر خان کا ذہن نوجوان کی داستان پر یقین کر چکا تھا۔ قلب و ذہن کے اسی تضاد کی وجہ اس نے نوجوان کو پہریداروں کے حوالے کر دیا اور حکم دیا کہ نوجوان کو نگرانی میں رکھا جائے۔ آگرہ پہنچ کر اس کے بیان کی تصدیق کر لی جائے گی۔

معاً عارج مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''اے دینار! تو نے تو کہا تھا میری زندگی کو خطرہ ہے،

مگر......"

"اب خطرہ ٹل چکا ہے۔" میں بول اٹھی۔ "تو چاہے تو دوبارہ اس کے جسم میں داخل ہو جا۔" میں نے یہ بات اس لیے بھی کہہ دی کہ کہیں عارج پر دوبارہ اس عفریت کا خوف غالب نہ آ جائے جس کی نظروں سے اوجھل ہونے کی خاطر ہم عراق کے شہر بغداد سے ہندوستان آئے تھے۔

عارج فوراً راضی ہو گیا کہ اس نوجوان آدم زاد کے جسم میں دوبارہ پناہ حاصل کر لے جس کی داستان الم وہ بھی جان چکا تھا۔

"دینار! تو بھی کسی آدم زادی کو ڈھونڈ لے اپنے لیے۔" عارج نے مشورہ دیا۔

"ابھی مجھے یہ ضرورت محسوس نہیں ہوئی عارج!" میں نے کہا۔ "تو میری فکر نہ کر۔"

"تو پھر تیری فکر کون کرے گا؟" عارج کہنے لگا اور میں اس کی بات سنی ان سنی کر گئی۔

دوسرے دن صبح ہمایوں کے لشکر نے اس منزل سے کوچ کیا تو وہ نوجوان بھی ساتھ تھا جس نے بہادر خان کو اپنا نام شاہم بیگ بتایا تھا۔ عارج نے دوبارہ اس کے جسم میں پناہ لے لی تھی۔

شاہم بیگ کو فکر تھی کہ کہیں وہ زندگی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے اس لیے اپنے بارے میں بہادر خان سے کچھ نہیں چھپایا تھا صرف اس خیال سے کہ اس کی گلو خلاصی ہو جائے۔ میں اس کی روداد حیات سن کر بہت متاثر ہوئی۔

شاہم بیگ دس سال کی عمر سے اب تک در بدر بھٹک رہا تھا۔ اس عرصے میں اس کی زندگی کئی بار خطرے میں پڑی مگر وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل گیا۔ ممکن ہے اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوتا اگر عارج نے اس کے جسم میں پناہ نہ لی ہوتی۔ بھاگتے بھاگتے وہ بھوک سے بے حال نہ ہو جاتا تو کبھی لشکر کا رخ نہ کرتا۔ اس غریب آدم زاد نوجوان کو کیا خبر تھی کہ ایک جن زاد اس کے جسم میں داخل ہو جائے گا۔ حالات و وقت کا جبر ہم جن زادوں اور آدم زادوں کیلئے یکساں ہے۔

بہادر خان کے ذہن پر توجہ دینے کے علاوہ شاہم بیگ کے حالات زندگی جاننے کی خاطر میں نے ایک اور ذریعہ بھی استعمال کیا تھا۔ یہ ذریعہ خود شاہم بیگ ہی تھا۔ جب میں نے عارج کی زندگی کو خطرے میں محسوس کیا تھا تو اس سے شاہم بیگ کا انسانی قالب چھوڑ

دینے پر اصرار کیا تھا۔ عارج' شاہم بیگ کے جسم سے نکل آیا تھا۔ اسی کے بعد مجھے شاہم بیگ کا ذہن پڑھ کر بہت سی باتوں کا علم ہو گیا تھا۔ شاہم بیگ کے بارے میں یہ سب معلوم کرنے کا سبب عارج تھا۔ آئندہ وہ انسانی قالب عارج کے استعمال میں رہنا تھا۔ اب بھی شاہم بیگ کو وہ رات یاد تھی جب وہ اپنے گھر سے بھاگا تھا۔ اگر وہ نہ بھاگتا تو قتل کر دیا جاتا کیونکہ اس نے اپنے باپ کے قاتلوں کو دیکھ لیا تھا جن میں اس کی ماں بھی شامل تھی۔ اس رات ایک گھٹی گھٹی سی چیخ سن کر شاہم بیگ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آنکھ کھلتے ہی جو کچھ دیکھا۔ ایک خواب سا معلوم ہوا۔ اس کی پہلی نظر اپنی ماں پر پڑی جو اس کے باپ کے منہ میں کپڑا ٹھونس رہی تھی۔ ماں کے قریب ہی وہ شخص کھڑا تھا جسے شاہم بیگ چچا کہتا تھا۔ اس شخص کے ہاتھ میں کھلا خنجر دیکھ کر شاہم بیگ اور بھی سہم گیا۔ اس کا خوف کچھ کم ہوا تو دیکھا اس کے باپ کو چارپائی سے باندھ دیا گیا ہے۔ شاہم بیگ کو چارپائی کے دوسری جانب بھی ایک شخص کھڑا نظر آیا جو اجنبی تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی خنجر تھا۔

شاہم بیگ خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا لیکن جب دو کھلے خنجر باپ کے سینے میں اترے تو وہ چیخ اٹھا۔ قاتل اس کی طرف جھپٹے۔ اس کی ماں نے قاتلوں کو روکنا چاہا مگر وہ نہ رکے۔ شاہم بیگ کی چارپائی دریچے کے قریب بچھی تھی۔ وہ دریچے سے کود کر چیختا ہوا بھاگا۔ اسے بس اتنا ہوش تھا کہ اگر قاتلوں کے ہاتھ آ گیا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

جب تک اس میں بھاگنے کی طاقت رہی وہ بھاگتا رہا اور پھر نڈھال ہو کر گر پڑا۔ اس کے اندر اور باہر ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔ ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک چشمے کے کنارے پڑے دیکھا۔ سورج کی کرنیں اس کے جسم میں نیزوں کی طرح اتر رہی تھیں۔

گزری ہوئی شب کا ہولناک واقعہ یاد آتے ہی وہ پھر بھاگ اٹھا۔ وہ اتنا نا سمجھ نہیں تھا کہ اپنی ماں کو بے گناہ تصور کرتا۔ باپ کے قتل میں اس کی ماں کی منشا بھی تھی ورنہ وہ قاتلوں کا ساتھ نہ دیتی۔

اس وقت شاہم بیگ بچہ تھا۔ وہ قتل کی وجہ نہیں سمجھ سکا' لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ جسے اس کے باپ نے دوستی میں اپنے گھر پناہ دی تھی' وہ دوست' دشمن ثابت ہوا تھا۔ قصور اس کی ماں کا بھی ہوگا جس نے اپنے شوہر کے دوست کو اتنی ڈھیل دی کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔

جب شاہم بیگ اسے چچا کہتا تو وہ بہت خوش ہوتا اور اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر تاؤ دے کر عجیب سے انداز میں مسکراتا۔ دس سال پہلے کی یہ بات شاہم بیگ کو کل کی سی لگتی تھی۔

قریہ قریہ بستی بستی وہ بھاگتا ہی رہا۔ وقت کی بے رحم ساعتوں کا سفر جاری رہا اور وہ کشمیر کے مرغزاروں سے نکل کر شمالی ہندوستان پہنچ گیا۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کیلئے اس نے کہیں بھیک مانگی' کہیں محنت مزدوری کی اور کہیں اسے اپنا ضمیر بھی سستے داموں بیچنا پڑا۔

شاہم بیگ نے اس جانکاہ سفر میں زندگی کے وہ وہ روپ دیکھے کہ حیران رہ گیا۔ وہ رشتوں کو محترم سمجھتا تھا مگر اب اس کی رائے بدل گئی تھی۔ کسی نے اسے اپنا بیٹا بنایا' کسی نے بھائی' کسی نے اسے بے سہارا سمجھ کر سہارا دیا' مگر ہر جگہ اور ہر بار کسی بھی شکل میں رشتوں کی قیمت وصول کی گئی۔

مجبوراً شاہم بیگ بھی انہی جیسا ہو گیا۔ درندوں کے درمیان جینے کیلئے اسے بھی درندہ بننا پڑا۔ اب وہ بھی رشتوں کی قیمت وصول کرتا اور لوگوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا۔ گزشتہ سال بھر سے وہ ایک زمیندار کے گھر میں سکون و آرام سے رہ رہا تھا۔ تقدیر کی گردش ہی تھی کہ زمیندار نے اسے اپنے بہنوئی کی حیثیت سے قبول نہیں کیا۔ یہ اتنی بڑی جسارت تھی کہ زمیندار نے اپنی بہن کی گردن اڑا دی مگر شاہم بیگ بچ کر بھاگ نکلا۔

زمیندار کے آدمیوں نے شاہم بیگ کا پیچھا کیا اور اس کیلئے وہ موت کے فرشتے بن گئے۔ اگر شاہم بیگ جنگل میں نہ گھس جاتا تو اس کا بچنا محال تھا۔ شاہم بیگ ایک رات زمیندار کے آدمیوں کو غچہ دے کر جنگل سے بھی نکل بھاگا۔ بھوک پیاس سے اس کا برا حال تھا۔ اسی عالم میں وہ اس طرف نکل آیا جہاں مغل لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ یوں وہ ایک پھندے سے نکل کر دوسرے پھندے میں پھنس گیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اسے پتہ بھی نہ تھا کہ اسے پھنسانے والا اب کے ایک جن زاد ہے۔

مغل لشکر کے ساتھ ساتھ میں بھی آگرہ پہنچ گئی۔

''اے دینار! اب کیا ہوگا؟'' خلوت میسر آتے ہی عارج مجھ سے کہنے لگا۔ ''اس کم بخت بہادر خان کے حکم پر مجھے یہاں ڈال دیا گیا ہے۔ معلوم نہیں اس کا مقصد کیا ہے۔''

''تو اس طرح یہ بات کہہ رہا ہے عارج کہ جیسے مجھے کوئی اطلاع دے رہا ہو۔'' میں بولی۔ ''زنداں ہی میں ایسے آدم زادوں کو ڈالا جاتا ہے جن پر کوئی الزام ہو۔ یہاں آرام سے رہ! تجھے اور کیا چاہئے' الگ کوٹھڑی ملی تو ہوئی ہے۔ رہی مقصد کی بات تو جو آدم زاد صاحب اقتدار ہوتے ہیں' ان کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے ..... کسی طور بڑے سے بڑے عہدے پر پہنچنا۔

اقتدار کے بھی مختلف درجے ہیں۔ تجھے بھی یہ باتیں معلوم ہیں۔ پھر بھی یاد دہانی کرا دیتی ہوں مثلاً ہم جس زمانے سے آئے ہیں' وہاں اقتدار اعلیٰ خلیفہ المہدی کے پاس ہے۔ اس کا حکم عراق ہی میں نہیں پوری عرب دنیا میں چلتا ہے۔ وہ بغداد میں بیٹھ کر لوگوں کی قسمتوں کے فیصلے کرتا ہے' خلیفہ کے بعد اس کے وزیر کا حکم چلتا ہے' پھر درجہ بدرجہ یہی اقتدار شہر کے کوتوال تک پہنچ جاتا ہے۔ کوتوال اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے غریب آدم زادوں..... اپنے ہی جیسوں کو الٹا لٹکوا دیتا ہے..... اور.....''

''بات ہو رہی تھی بدبخت بہادر خان کی تو نہ جانے کیا قصہ سنانے لگی!'' عارج بول اٹھا۔ ''تو جو باتیں کر رہی ہے' ان سے تو ایسا لگ رہا ہے کہ مجھے کم عقل سمجھتی ہے۔''

''وہ تو خیر تو ہے عارج۔'' میں نے اسے بتایا۔

''میں کم عقل ہوں؟'' غصے میں اس کی آواز تیز ہو گئی۔

''یہ تو نہ بھول کہ تو اس کوٹھڑی میں اکیلا ہے۔ کسی پہریدار یا محافظ نے تجھے اس طرح باتیں کرتے سن لیا تو زنداں کے بجائے تیری جگہ کہیں اور ہوگی اس لیے اپنی آواز دھیمی رکھا کر!..... میں تو کسی کو نظر آؤں گی نہیں البتہ تجھے بڑبڑ کرتے دیکھا.....''

عارج نے منہ بناتے ہوئے میری بات کاٹ دی' بولا۔ ''زنداں کے بجائے تو مجھے اب اور کہاں بھجوائے گی؟''

''میں تجھے کہیں نہیں بھجوا رہی بلکہ تو خود اپنی حرکتوں کے نتیجے میں یہاں پہنچا ہے اور اب اگلی منزل..... چل چھوڑ تو برا مان جائے گا۔''

''کہہ دے..... کہہ دے نا کہ میری اگلی منزل پاگل خانہ ہے!'' عارج نے کسی چڑچڑے لڑاکا شوہر کی طرح کہا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔

''ہنس لے..... خوب ہنس لے میرے حال پر..... اچھا بھلا بابل کے کھنڈرات میں رہتا تھا..... نہ وہاں کوئی خوف تھا نہ خطرہ' مگر تیرے عشق میں پہلے بغداد جا کے رہنا پڑا اور اب صدیوں صدیوں بھٹکنا پڑ رہا ہے۔''

''تو نہ کرتا عشق!..... حکیم ہامہ نے تو تجھ سے نہیں کہا تھا کہ مجھ سے عشق لڑا۔''

''اے دینار! عشق لڑایا نہیں جاتا بلکہ خود سے خود لڑ جاتا ہے۔''

"اچھا بس کر! ... ہر وقت کتاب عشق کھول کر نہ بیٹھ جایا کر! ... میں چلی۔"

"کہاں؟ ... کیا مجھے یہاں اکیلا چھوڑ جائے گی؟۔"

"تو دودھ پیتا بچہ تو ہے نہیں کہ میرے بغیر نہ رہ سکے۔ مجھے ذرا آگرے کی سیر تو کرنے دے۔ گھوموں گی پھروں گی تبھی اس زمانے کے بارے میں کچھ معلوم ہوگا!۔"

"اچھا جا دینار!" عارج نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "میرا بھی اللہ مالک ہے..... لیکن جلد لوٹ آئیو!۔"

میں کچھ نہ بولی اور زنداں سے نکل آئی۔

چند ہی روز میں مجھے بہت کچھ پتہ چل گیا۔ کچھ باتیں میں نے عارج کے استفسار پر اسے بتا دیں، کچھ مصلحتاً گول کر گئی۔ مثال کے طور پر یہ بات میں نے عارج کو نہیں بتائی کہ بہادر خان اسے زنداں میں ڈلوا کر بھول گیا ہے۔

زنداں میں سبھی طرح کے قیدی تھے، چور اچکے، بدمعاش، لفنگے، قاتل، لٹیرے، باغی سرکش اور بیگناہ! اس سے قطع نظر کہ یہ آدم زاد سزا کے مستحق تھے یا نہیں، یہ بات بہرحال قابل غور تھی کہ انہیں ایسا کس نے بنایا؟ کوئی بدمعاش ہو کر باغی، بدمعاشی اور بغاوت پر کیوں آمادہ ہوتا ہے؟ ایک روز انہی سوالوں پر عارج سے میری گفتگو ہوئی۔

میں نے عارج سے کہا "اے میرے شاہم! تو یہاں اکیلا ..."

"میں شاہم نہیں عارج ہوں۔" وہ بول اٹھا۔

"تو جب تک اس جسم میں ہے عارج میں تجھے شاہم ہی کہوں گی..... مجھے شاہم کہنا اچھا لگتا ہے۔" میں نے کہہ دیا حالانکہ میرا ارادہ یہ نہیں تھا۔ "سچ؟" وہ خوش ہو گیا۔

آدم زاد ہوں کہ جن زاد صنف نازک بڑی آسانی سے انہیں شیشے میں اتار لیتی ہے۔ رہا عارج تو وہ پہلے ہی سے خاصا شیشے میں اترا ہوا تھا۔ اس کیلئے تو بس ذرا سا اشارہ کافی ہوتا تھا۔

عارج کو دراصل میں اس کوٹھڑی سے نکال کر عام قیدیوں کے درمیان پہنچانا چاہتی تھی تاکہ اس کا دل لگا رہے اور وہ ہر وقت میرے ہی لیے نہ ہمکتا رہے۔ اس کیلئے یہ ضروری تھا کہ وہ خود کو شاہم بیگ ہی سمجھنے لگے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ بغداد میں حکیم صارم بن گیا تھا۔ اس وقت بھی میں نے اس سے کہا تھا کہ ابھی تو تیرے نہ جانے کتنے نام بدلیں گے

عارج! اب وہ بات حقیقت بن گئی تھی۔ دو ایک دن میں اسے مشق کراتی رہی کہ وہ پوچھنے پر اپنا نام شاہم بیگ ہی بتائے۔

جب عارج گھاٹ پر آ گیا تو میں نے اس سے مطلب کی بات کہہ دی۔

"پھر میں تجھ سے کیسے باتیں کیا کروں گا اے دینار؟..... یہاں تو ہمارے سوا کوئی اور نہیں مگر میں عام قیدیوں کے ساتھ رہا تو ..."

"انسانی قالب میں رہ کر شاید تیری عقل خبط ہو گئی ہے۔ تو بار بار کیوں یہ بات بھول جاتا ہے کہ ہم جنات ہیں، آدم زاد نہیں! ہمیں بھلا باتیں کرنے سے کون روک سکتا ہے!... تیرے دماغ میں کیا ہے؟ میرے لیے کیا سمجھنا مشکل ہے؟ کبھی کبھی تو مجھے جن زاد کے بجائے کوئی غبی قسم کا آدم زاد معلوم ہونے لگتا ہے۔" میں بولی۔

"اس بہانے تو مجھے غبی کہہ رہی ہے؟"

"نہیں تو!..... تو تو بڑا عقل مند ہے۔ میرا شاہم ہے، بے وقوف کیسے ہوگا!۔"

پھر عارج اس کوٹھڑی سے نکلنے پر آمادہ ہو گیا۔ داروغہ زنداں کو الو بنانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ پہلے تو میں نے اس بھاری ڈیل ڈول والے محکم خان کو زنداں کے دورے پر راضی کیا، پھر اسے عارج کی طرف متوجہ کر دیا۔

"اس قیدی کا کیا نام ہے؟" محکم خان نے اپنے ماتحت سے پوچھا۔

اس کا ماتحت تھوڑا نہیں، اچھا خاصا باؤلا تھا، جواب میں بولا۔ "حضور اس کا کوئی نہ کوئی نام یقیناً ہوگا۔"

"یہ سیدھی سی بات تو مجھے بھی معلوم ہے بے وقوف آدمی!" داروغہ زنداں محکم خان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس کے چہرے سے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ قدرے توقف سے اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ وہ کوٹھڑی کے سلاخوں دار دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ نائب داروغہ زنداں نے جب "فرد زندانیاں۔" پاس نہ ہونے کا عذر کیا تو محکم خان نے غصہ ضبط کرتے ہوئے عارج کو مخاطب کیا۔ "کون ہو تم؟"

"آدمی ہوں جناب!" عارج نے جواب دینے میں دیر نہ کی۔

"وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں کہ تم آدمی ہو کوئی جن بھوت نہیں۔ میرا مقصد تمہارا نام پوچھنا تھا۔"

"تھا سے مراد ماضی ہے...... یعنی کہ اب آپ کا مقصد میرا نام پوچھنا نہیں!"

عارج بھی اسے گھسنے لگا۔

"نام بتا اپنا!" محکم خان کے صبر کا پیمانہ چھلک ہی اٹھا۔

"خادم کو شاہم بیگ کہتے ہیں۔"

"تجھے الگ کوٹھڑی میں نہیں رکھا جا سکتا اس لیے کہ تو کوئی خاص قیدی نہیں۔" محکم خان نے گویا حکم سنا دیا۔

"خاص قیدی کیسے ہوتے ہیں داروغہ جی؟..... کیا ان کے سینگ ہوتے ہیں؟"

عارج میری پڑھائی ہوئی پٹی پر عمل کر رہا تھا۔

"بکواس نہ کر ورنہ الٹا ٹانگ دوں گا ابھی!...... اب میں نے بڑے بڑے ٹیڑھے قیدیوں کو سیدھا کر دیا' تو کس گنتی شمار میں ہے!۔" یہ کہتے ہی محکم خان بلند آواز میں اپنے نائب سے بولا۔ "اس شاہم بیگ کے بچے کو ابھی اور اسی وقت سے نکال کر عام قیدیوں......"

"جناب! میرے بچے کو نہیں بلکہ مجھی کو وہاں بھیجا جائے۔" میری شہ پر عارج نے کہہ دیا۔

پھر کیا تھا' اللہ دے اور بندہ لے! عارج سے تو وہ کچھ نہ بولا کہ مزید بے عزتی نہ ہو البتہ اپنے ماتحت عملے پر برس پڑا۔

عارج کو اسی وقت کوٹھڑی سے نکالا گیا اور کشاں کشاں آدم زادوں کی بھیڑ میں پہنچا دیا گیا۔ عارج نے شاہم بیگ بن کر وہاں بہت کچھ دیکھا اور سنا۔ اسے زندگی کے کچھ نئے تجربے ہوئے۔ ان تجربوں میں مشاہدے کی حد تک میں بھی شامل رہی۔ جو باتیں عارج کو آدم زادوں کے بارے میں معلوم نہیں تھیں' ان کا علم بھی ہوا۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے سیاسی حالات بھی پتہ چلے۔ اقتدار کیلئے کس طرح ایک آدم زاد اپنے ہی بھائی کا دشمن بن جاتا ہے مجھے اس کی مزید آگہی ہوئی۔ رشتوں کا احترام یہاں بھی نہ تھا۔

مرزا کامران' مرزا عسکری اور مرزا ہندال' بادشاہ وقت کے سگے بھائی تھے پھر بھی بادشاہ کے خلاف سازشیں اور بغاوتیں کرتے رہتے تھے۔ میرے نزدیک ان آدم زادوں اور شاہم بیگ میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ ایسی صورت میں بھلا ان سرکشوں کے ذہنوں میں کسی صاحب اقتدار کی حیثیت کیا ہوتی جو پس دیوار زنداں تھے۔

میرے لیے حیران کن امر یہ تھا کہ عارج بھی ان "باغیوں" اور "گستاخوں" کے درمیان رہ کر خاصا بے باک ہو گیا تھا۔ ایک دن خلوت میں مجھ سے کہنے لگا۔ "بادشاہ کا جو بت میرے ذہن میں تھا' اب ٹوٹ چکا ہے۔"

"کیسے معلوم؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"اس میں معلوم ہونے کی کیا بات ہے۔ کیا بادشاہ' کیا فقیر سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کوئی عیب سے پاک نہیں۔"

وہ کہنے لگا۔ اس کی آواز میں تقریر کرنے یا وعظ کہنے والوں جیسا جوش تھا۔ "اب بھی دیکھ لو کہ مجھے مرزا عسکری کا مخبر سمجھ کر ہی پکڑا گیا تھا اور میں اسی الزام میں شاہم بیگ کا پیکر اپنا کر قید کاٹ رہا ہوں۔"

"اے عارج! تجھے اور اس زنداں میں رہنے والے تیرے ان 'باغی' ساتھیوں کو بہت سے حقائق کا علم نہیں۔" میں سنجیدگی سے اسے سمجھانے لگی۔ "مجھے جن باتوں کا پتا چلا ہے تو نہیں جانتا۔"

"تو بتائے گی دینار! تبھی تو جانوں گا۔"

"اس شرط پر بتاؤں گی کہ تو اپنے قیدی ساتھیوں سے یہ باتیں نہیں کرے گا۔"

"مجھے تیری شرط منظور ہے' بتا! میں اپنے ساتھی آدم زادوں کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔" عارج نے یقین دلایا۔

مغل تاجدار ہمایوں کے متعلق اس عرصے میں جو حقائق میرے علم میں اب تک آئے تھے' ان سے میں نے عارج کو آگاہ کر دیا۔ اس طرح عارج کو معلوم ہو گیا کہ وہ کیا حالات تھے جن کے سبب شاہم بیگ کو مرزا عسکری کا مخبر سمجھ لیا گیا۔ اس غلط فہمی کا پورا پس منظر میں نے بیان کر دیا۔

واقعہ یہ ہوا کہ چمپانیر کی فتح کے بعد گجرات کے چند اور سرکشوں کو مغلوب کر کے ہمایوں احمد آباد آ گیا۔ ہمایوں کی احمد آباد آمد کی وجہ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔

اپنے دشمنوں سے برسرپیکار ہوئے ہمایوں کو چھ سال گزر گئے تھے' لیکن ابھی تک اسے سکون کا سانس لینا نصیب نہیں ہوا تھا۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو اس کی عمر 23 سال تھی اور اب وہ 29 سال کا ہو چکا تھا۔ احمد آباد کو مرزا عسکری کے سپرد کر کے ہمایوں نے قلعہ آسیر

برہان پور کی تسخیر کا ارادہ کیا۔ ابھی اس نے تین چار منزل بھی کوچ نہیں کیا تھا کہ احمد آباد سے متعلق اسے تشویشناک خبریں ملیں۔ احمد آباد کے امیروں میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ دشمنوں کو احمد آباد پر حملے کا موقع مل گیا۔ مرزا عسکری نے بھی منافقت برتی۔ وہ خود احمد آباد میں بغاوت کی سازشیں کر رہا تھا۔

مرزا عسکری کے منصوبے جب پورے نہ ہوئے تو وہ احمد آباد کو دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آگرہ چلا گیا۔ یہ خبریں ملتے ہی ہمایوں نے برہان پور کے بجائے آگرہ کا رخ کیا۔ یہ تمام باتیں مجھے آگرہ آنے سے پہلے اتنی تفصیل کے ساتھ معلوم نہیں تھیں۔ قصہ مختصر یہ کہ ہمایوں کو علم تھا کہ مرزا عسکری اپنے مخبروں کے ذریعے اس کے لشکر کی نقل و حرکت پر نظر رکھتا تھا۔

ہمایوں یہ نہیں چاہتا تھا کہ مرزا عسکری کو اس کے ارادے کی تبدیلی کا پتہ چل جائے۔ وہ اسی لیے متواتر کوچ کر رہا تھا۔ ہمایوں اس بار مرزا عسکری کو معاف کرنے کے حق میں نہ تھا۔ جو علاقہ اس نے بڑی سعی و کاوش اور محنت کے بعد حاصل کیا تھا' مرزا عسکری کے سبب ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اسی بنا پر ہر طرف بڑا خلل و انتشار پھیل گیا۔ ہمایوں ہی کے حکم پر لشکر کے اطراف قیام کے دوران میں سخت حفاظتی انتظامات ہوتے تھے۔ اگر کسی طرح مرزا عسکری کو یہ معلوم ہو جاتا کہ ہمایوں آگرے آ رہا ہے تو وہ وہاں سے فرار ہو جاتا۔ قسمت کے مارے شاہم بیگ یعنی ''جناب عارج'' کو اسی لیے مرزا عسکری کا مخبر سمجھ لیا گیا۔

مجھ سے سب کچھ سننے کے بعد عارج منہ بنا کر کہنے لگا۔

''اور دینار تیرے چہیتے بادشاہ ہمایوں نے گھامڑ پن بھی تو دکھایا۔''

''باغیوں کے ساتھ رہ کر تو بھی تھوڑا تھوڑا باغی ہوتا جا رہا ہے عارج! حکمران وقت کی شان میں گستاخی!...... اگر کسی کو یہ ہوا لگ گئی کہ تیرے خیالات اس قدر باغیانہ ہیں تو بادشاہ تیرے انسانی پیکر کی لاش میں بھس بھروا دے گا۔''

''وہ کیوں!'' عارج کی تیوریوں پر بل نظر آنے لگے۔

''بس شوق ہے یہ حکمرانوں کا کہ وہ باغیوں کی کھالوں میں بھس بھروا دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ باغی بھی کبھی کبھی تخت و تاج کے مالک ہو جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''یہ کی نا تو نے بات!'' عارج نے خوشی کا اظہار کیا۔ ذرا دیر چپ رہ کر عارج پھر

بولا۔ ''جو اصل مجرم تھا' یعنی ہمایوں بادشاہ کا سگا بھائی مرزا عسکری' اسے تو معاف کر دیا گیا اور ہم جیسے بے گناہوں کو ناحق رگیدا جا رہا ہے۔ میں اسی کو تو گھامڑ پن کہہ رہا تھا۔ میں جس انسانی پیکر میں ہوں' یہ حالات کا ستایا ہوا ایک نوجوان ہے اور......''

''اور تو نے بھی اس نوجوان شاہم بیگ کے ساتھ کون سی بھلائی کی ہے!'' میں نے عارج کی بات کاٹ دی۔ ''بتا کیا یہ شرافت ہے کہ تو نے اس کے جسم پر قبضہ کر رکھا ہے؟''

''یہ مجبوری ہے۔''

''کس کی مجبوری؟ تیری یا شاہم بیگ کی؟'' میں نے گویا چٹکی لی۔

''چل اسے تو میری مجبوری سمجھ لے دینار!'' عارج نے سپر ڈال دی' پھر پرعزم آواز میں کہنے لگا۔ ''تو دیکھتی رہیو دینار' میں شاہم بیگ کو ترقی و عروج کی انتہائی منزلوں تک لے جاؤں گا۔ میں اس انسانی پیکر میں رہنے کا حق ادا کر دوں گا۔ تو مجھے شاہم کہہ رہی تھی نا تو...... تو مجھے بھی اچھا لگ رہا تھا۔''

''بہک مت!...... میری بات گرہ میں باندھ لے کہ ہر عروج کو ایک روز...... ایک نہ ایک روز زوال دیکھنا پڑتا ہے۔ پھر بھی اگر تو اس انسانی پیکر کو عروج تک لے بھی گیا تو شاہم بیگ کو اس کا فائدہ نہیں ہو گا۔ مزہ تو کرے گا' شاہم بیگ نہیں۔''

''دیکھ دینار! ہم ہمیشہ تو یہاں نہیں رہیں گے۔ ہمیں بغداد تو واپس جانا ہی ہو گا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مجھے یہ انسانی قالب چھوڑنا پڑے گا۔ اس وقت یہ آج کا بے بس و لاچار نوجوان خود کو کسی بڑے منصب پر پائے گا۔''

''تقدیر کے کھیل بڑے عجیب ہوتے ہیں عارج! کیا خبر اس وقت کیا ہو...... خیر میں کوشش کرتی ہوں کہ تیرے انسانی پیکر کو قید سے رہائی مل جائے۔ اس طرح تو نے جس عزم کا اظہار کیا ہے' شاید اس کی تکمیل ممکن ہو۔''

''ہاں دینار! مجھے شاہم بیگ کی حیثیت سے اس زنداں میں رہتے تین مہینے سے زیادہ ہو گئے۔ اب یہاں میرا جی گھبرانے لگا ہے۔'' عارج کہنے لگا۔

''عارج! اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تو اس قالب کو چھوڑ کر کہیں اور چمپت ہو جائے۔ یہ کچھ مناسب نہیں ہو گا۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' عارج نے صفائی پیش کی۔ ''میں تو اس کم ذات کی

شکایت کر رہا ہوں جس کا نام بہادر خان ہے۔"

"تو پھر باغیانہ باتیں کرنے لگا!"

"پھر تو ہی کہہ دینار کہ میں کس سے فریاد کروں۔" عارج بولا۔ "رہا یہ جسم تو مجھے اب اس سے محبت ہوتی جا رہی ہے۔ میں اسی کے اندر رہوں گا۔ تو کسی طرح مجھے...... یا یوں سمجھ کہ میرے انسانی پیکر شاہم بیگ کو یہاں سے نکال!"

"ٹھیک ہے...... اگر تیرا دل یہاں گھبرانے لگا ہے تو میں تجھے یہاں سے اسی قالب میں نکال لے جاؤں گی۔"

"کیا کرے گی تو دینار اس کیلئے!" عارج نے پوچھا۔

"تجھے یہ جلد ہی معلوم ہو جائے گا...... میں چلتی ہوں۔" میں یہ کہہ کر وہاں مزید نہیں رکی۔

جلد ہی میں نے یہ بندوبست کر دیا کہ عارج قید سے نکل آئے' مگر دانستہ اس سلسلے میں اسے کچھ نہ بتایا۔ یہ الگ بات کہ میں اس سے زیادہ دور نہیں تھی۔ بوجوہ میں نے عارج کی نظروں سے چھپے رہنے کی خاطر اندھیرے کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ میں نے عارج کے دماغ پر توجہ دی تو اندازہ ہوا' عارج وسوسوں اور اندیشوں میں گھرا ہے۔

عارج کو یہ نہیں بتایا گیا کہ قید خانے سے اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے اور کیوں؟ قید خانے سے نکلنے کے باوجود وہ مسلح سپاہیوں کے نرغے میں تھا۔ اس کی ہمت نہ ہوئی کہ سپاہیوں سے کچھ پوچھتا۔ وہ گھوڑے پر سوار شاہم بیگ کے انسانی قالب میں پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں مسلح گھڑسوار تھے۔ گھڑسواروں کو آتے دیکھ کر آنے جانے والے ایک طرف ہو جاتے۔

☆......☆......☆

عارج کیلئے آگرہ ایک نیا شہر تھا۔ بغداد اور آگرے میں صرف ایک قدر مشترک تھی۔ مقامات اور صدیوں کا فرق ہونے کے باوجود دونوں شہروں کی حیثیت دارالحکومت کی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ خلیفہ المہدی اور ہمایوں دونوں ہی مسلمان حکمران تھے۔ قید کے دوران میں عارج نے مجھ سے آگرہ شہر سے متعلق بہت سے قصے سن تھے۔ وہ شاہم بیگ کے انسانی پیکر ہی میں رہا تھا جبکہ میرا معاملہ مختلف تھا۔ میں سارے شہر میں منڈلاتی پھرتی

تھی۔

یہی وجہ تھی کہ عارج گھوڑے پر سوار ادھر ادھر نظر ڈالتا آگے بڑھتا رہا۔ اس کے ذہن میں بڑا تجسس تھا کہ دیکھو اب کیا گزرتی ہے؟

مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے گھڑسوار عارج کو لیے ایک بڑی سی حویلی کے پھاٹک میں داخل ہو گئے۔ حویلی کی شان و شوکت دیکھ کر عارج حیران سا ہوا۔ شام ہو چکی تھی اور حویلی میں فانوس روشن کیے جا رہے تھے۔ گھڑسوار اسے حویلی کے ایک حصے میں لے گئے۔ وہاں پہلے ہی سے زرق برق کپڑوں میں ملبوس خواصیں اور خدمتگار کھڑے تھے۔ انہی میں سے ایک خواجہ سرا آگے بڑھا اور اس نے عارج کے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ گھڑسوار واپس ہو گئے۔

پھر عارج کے ساتھ جو کچھ ہوا اسے حیرت زدہ کرنے کیلئے کافی تھا۔ اسے گلاب کی پتیاں ملے ہوئے پانی میں غسل کرایا گیا۔ پانی معطر تھا۔ عارج کے انسانی پیکر پر کئی روغن ملے گئے۔ حجام سر کے بالوں کی تراش خراش پہلے ہی کر چکا تھا۔ ایک مشاطہ نے اس کے بال سنوارے۔ اسے ریشمی لباس پہننے کو دیا گیا۔

جب آئینہ عارج کے روبرو لایا گیا تو خود اسے اپنی صورت اجنبی سی لگی۔ اس کے سامنے اب کوئی اور ہی شاہم بیگ کھڑا تھا۔ حیرت کے سبب وہ چپ تھا۔ اس عرصے میں اسے صرف اتنا ہی بتایا گیا تھا کہ وہ بہادر خان کے حضور میں پیش ہونے والا ہے۔ خواجہ سرا اسے بہت دیر تک ادب و آداب اور بہادر خان کے مزاج سے آگاہ کرتا رہا۔ جتنی کنیزیں' خواصیں' غلام اور خدمتگار تھے' سبھی میں عارج کا انسانی پیکر یکتا نظر آ رہا تھا۔ خواجہ سرا اس کی طرف سے مطمئن ہو گیا تو اسے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

میں یہاں ایک بات کی وضاحت کرتی چلوں کہ آدم زاد مسلمان حکمرانوں میں سے بہت سوں کو غلام خریدنے کا شوق رہا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں میں محمود غزنوی کے ساتھ اس کے ایک غلام ایاز کا نام کا بھی آتا ہے۔ اسی طرح ایک اور مسلمان فرمانروا شہاب الدین غوری کو بھی یہ شوق تھا۔ ہندوستان پر طویل عرصے تک انہی غلاموں کی حکومت رہی ہے۔ یہ الگ بات کہ انہیں ان کے آقاؤں نے آزاد بھی کر دیا تھا۔ خاندان غلاماں کی فہرست میں قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش بھی آتے ہیں۔ سو اسی روایت کو مغل

تاجداروں نے بھی برقرار رکھا۔

بلاشبہ مغلوں کا ذوق جمال اعلیٰ درجے کا تھا۔ کوئی بھی مغل حکمران اپنے آس پاس کسی بدصورت کنیز' خواص' غلام یا خدمتگار د خادم کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہی مزاج مغل امراء کا تھا۔

مسلمان فرمانرواؤں سے حسد رکھنے والوں' انہیں بدنام کرنے والے متعصب یہودیوں اور عیسائیوں نے اس غلام پسندی کو مختلف نام دیئے ہیں۔ مغلوں کے ذوق جمال کو بیمار ذہنیت قرار دیا ہے جبکہ حقیقت اور بے راہ روی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ میری اس وضاحت کی وجہ شاہم بیگ ہے جو بے حد خوبصورت تھا اور جس کے جسم میں عارج نے پناہ لی تھی۔ یہاں ایک اور بات بھی سمجھنے کی ہے کہ ہم جن زاد خواہ کسی بھی آدم زاد کے جسم پر قبضہ کر لیں' اس جسم کے فطری تقاضوں اور عادات و اطوار کو پوری طرح نہیں بدل سکتے۔

فطرت جو ہر شے میں اپنا ظہور کرتی ہے' اسے بدلنا ممکن نہیں۔ عارج اسی بنا پر پریشان تھا۔ سو شاہم بیگ کے جسم میں عارج نے پناہ تو لے رکھی تھی مگر اس سے غیر ارادی حرکات سرزد ہوتی رہتی تھیں۔

اس وقت بھی شاہم بیگ کے قالب میں اس کا قلب زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

عارج کو اس کے قلب و ذہن پر ایک حد تک ہی تصرف حاصل تھا۔

حویلی کے اس حصے سے نکلتے ہی عارج کو مزید حیرت ہوئی۔ وہ سنگ مرمر کے بے داغ فرش پر چل رہا تھا۔ خواجہ سرا کے ساتھ وہ ایک خواب کے سے عالم میں چلتا رہا اور چونکا اس وقت جب خواجہ سرا نے اسے ٹوکا۔ ایک محرابی دروازے میں داخل ہوتے وقت اس کا پاؤں حریری پردے میں الجھ گیا تھا۔

''ہوش نہ کھوؤ۔ حدود آداب شروع ہو گئی ہیں۔'' خواجہ سرا نے عارج کو شاہم بیگ سمجھ کر ڈانٹا۔

میں خاموشی سے یہ تماشا دیکھتی اور اپنی ہنسی ضبط کرتی رہی۔ عارج اتنا ہی ہونق نظر آ رہا تھا۔

خواجہ سرا کے ٹوکنے پر عارج سنبھل گیا اور آہستگی سے اپنا پیر حریری پردے سے نکال لیا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا جس میں اس کے پاؤں دھنستے جا رہے تھے۔ عارج

سے کچھ ہی فاصلے پر سامنے ایک اور دروازہ نظر آ رہا تھا۔ عارج نے اس طرف نگاہ اٹھائی۔ اس دروازے کے دائیں بائیں ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ وہ پردے اٹھے ہوئے تھے۔ دونوں طرف انہیں خوبصورت ڈوریوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ ان دونوں ہلال نما پردوں کے درمیان ایک اور پردہ پڑا تھا جس نے اندر کے منظر کو چھپا لیا تھا۔ خواجہ سرا اس دروازے پر عارج کو چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ ذرا توقف سے خواجہ سرا کی آواز آئی۔ ''وہ غلام در خدمت پر حاضر ہے۔ حکم ہو تو اسے پیش کیا جائے۔''

جواب میں ایک آشنا آواز ابھری۔ ''ہاں اسے لے آؤ۔''

خواجہ سرا باہر آیا اور عارج کا بازو تھام کر اسے اندر لے گیا۔ اندر پہنچ کر خواجہ سرا نے اسے آگے کر دیا اور خوب ادب سے ہاتھ باندھ کر چند قدم پیچھے کھڑا ہو گیا۔ خواجہ سرا کی ہدایت کے مطابق عارج تین بار جھک کر آداب بجا لایا۔ وہ شاہم بیگ کا کردار بڑی خوبصورتی سے ادا کر رہا تھا۔ کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ آدم زاد نوجوان شاہم بیگ نہیں ایک جن زاد عارج ہے۔ کسی جن سے عموماً یہ توقع نہیں کی جاتی کہ پراسرار قوتیں حاصل ہونے کے باوجود ایک آدم زاد کے سامنے آداب و تسلیمات کی بجا آوری کیلئے جھک جائے گا' مگر عارج مصلحتاً ایسا کر رہا تھا۔ اسے شاہم بیگ کے جسم میں ابھی مزید رہنا تھا۔

سامنے ہی مسند پر بہادر خان بیٹھا تھا۔ عارج کو قید خانے سے رہائی دلانے کیلئے میں نے اسی کو استعمال کیا تھا۔ اس کے ذہن میں' میں نے یہ بات بٹھا دی تھی کہ عارج کا انسانی پیکر یعنی شاہم بیگ ایسی صفات کا حامل ہے جو اعلیٰ درجے کے غلاموں اور خدمتگاروں میں ہوتی ہیں۔

بہادر خان سے ذرا فاصلے پر ایک اور شخص دوزانو بیٹھا نظر آ رہا تھا۔

''سبحان اللہ!'' معاً بہادر خان کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ شاہم بیگ کا بظاہر اس کے ذوق جمال پر پورا اترا تھا۔

ہر چند کہ خواجہ سرا نے نظر جھکائے رکھنے کو کہا تھا مگر عارج اس ہدایت پر عمل نہ کر سکا۔ کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ وہ براہ راست بہادر خان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بہادر خان کی نظریں بھی اس پر تھیں۔

عارج کے انسانی قالب شاہم بیگ کو دیکھ کر بہادر خان مبہوت سا دکھائی دے رہا

تھا۔

''سبحان اللہ!'' بہادر خان پھر بول اٹھا' یوں جیسے اسے ہوش آ گیا ہو۔ پھر بہادر خان نے اسے مخاطب کیا۔ ''کیا تو واقعی وہی پا برہنہ اور خاک بسر نوجوان ہے جس نے ہمیں اپنی داستان الم سنائی تھی؟''

''جی...... جی ہاں حضور! یہ وہی غلام ہے۔'' عارج نے خواجہ سرا کی ہدایات کو ذہن میں دہراتے ہوئے ادب سے جھک کر جواب دیا۔ میری توجہ عارج پر تھی کہ کہیں اس سے غلطی نہ ہو جائے۔ ذرا سی غلطی سے کھیل بگڑ جاتا اور عارج کو شاہم بیگ کا جسم چھوڑنا پڑتا۔ کسی اور آدم زاد کے جسم کو اپنا ''گھر'' بناتے ہوئے ہم جنات کو بھی بڑی مشکل ہوتی ہے۔ انسانی قالب میں گھٹن' حبس' اندھیرا اور گرمی ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ جنات طویل عرصے تک ایک ہی انسانی پیکر میں رہ سکیں۔

ایسی صورت میں اگر عارج کو شاہم بیگ کا جسم راس آ گیا تھا تو یہ اچھی بات تھی۔ کسی اور قالب میں وہ شاید اس قدر سکون و آرام سے نہ رہ پاتا۔

''تو نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟'' بہادر خان نے عارج کو مخاطب کیا۔

''شاہم بیگ حضور!'' عارج نے اطمینان سے جواب دیا۔

''شاہم!'' بہادر خان بڑبڑایا' پھر دائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص سے بولا۔ ''دیکھا احمد یار خان' ہم نہ کہتے تھے کہ وہ ایک ناتراشیدہ ہیرا ہے!''

یہ بات بہادر خان کے دماغ میں ڈالنے والی میں ہی تھی ورنہ تو وہ شاہم بیگ کو بھول بھال گیا تھا۔

دو زانو بیٹھے ہوئے شخص نے بہادر خان کی تائید میں کہا۔ ''حضور دیدہ ور ہیں' بجا ارشاد فرمایا تھا حضور نے! خادم کو تو اس کا پہلے ہی یقین تھا۔''

بہادر خان تاسف سے بولا۔ ''بس ہمیں مہلت ہی نہیں ملی کہ اس کا دھیان آتا۔ آج تم نے احمد آباد کا ذکر چھیڑ دیا تو خیال آ گیا۔''

احمد یار خان کو بھی میں نے ہی یہ ذکر چھیڑنے پر اکسایا تھا' مگر وہ اس حقیقت سے لاعلم تھا۔ اس رات جب عارج' شاہم بیگ کے جسم میں داخل ہونے کے بعد پکڑا گیا تھا تو احمد یار خان بھی انہی حاضر باشوں میں سے ایک تھا جو بہادر خان کے خیمے میں تھے۔ میں اسے

بھولی نہ تھی۔

مغل لشکر آگرہ کی طرف کوچ کرتے ہوئے ایک منزل پر ٹھہرا ہوا تھا۔
ذکر کرتے ہوئے بظاہر احمد یار خان کے منہ سے یوں ہی ایک مخبر کا نام نکل گیا تھا۔ احمد آباد کا
گردن ماردی گئی تھی۔ اس پر الزام ثابت ہو گیا تھا کہ وہ مرزا کامران کا مخبر ہے۔ اس مخبر کی
جس سے میں نے فائدہ اٹھایا اور بہادر خان کو یاد دہانی کرادی کہ مرزا عسکری کا مخبر ہونے کے
الزام میں ایک بے قصور نوجوان سزا بھگت رہا ہے۔ یہی موقع تھا

آگرہ آنے کے بعد بہادر خان واقعی یہ بھول گیا تھا کہ کسی بے گناہ کو اس نے قید میں ڈال رکھا ہے۔

احمد یار خان نے بہادر خان سے اپنی تعریف سنی تو پھول گیا' بولا۔ ''حضور کچھ بھولیں تو بھولیں مگر حضور کے خادم سب کچھ یاد رکھتے ہیں۔ اگر حضور کو خود اس کا دھیان نہ آ جاتا تو یہ خادم بس عرض ہی کرنے والا تھا۔''

بہادر خان اس چاپلوسی سے خوب واقف تھا اس لیے طرح دے گیا اور عارج کی طرف پھر نگاہ اٹھائی' کہنے لگا۔ ''ہم تجھے اپنی خدمت کا شرف بخشنا چاہتے ہیں' بول اس پر خوش ہوا!''

''یعنی بندہ...... حضور...... حضور کی خدمت میں......'' عارج نے ظاہر کیا کہ وہ مرعوب ہو گیا ہے' ہکلانے کا مقصد یہی تھا۔

''ہاں۔'' بہادر خان بولا اور پیچھے کھڑے ہوئے خواجہ سرا کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ جب خواجہ سرا قریب پہنچ کر ادب سے جھکا تو بہادر خان نے دھیمی آواز میں کچھ ہدایات دیں۔ ان ہدایات کا لب لباب عارج کی تربیت اور آرام و آسائش سے تھا۔

خواجہ سرا اقراری انداز میں سر ہلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اس نے بہادر خان کا دایاں ہاتھ بلند ہوتے دیکھ کر عارج کو چلنے کا اشارہ کیا۔ عارج واپسی کیلئے مڑنے ہی والا تھا کہ خواجہ سرا نے اس کا بازو تھام لیا اور سرگوشی کی۔ ''حد ادب!''

عارج کو خواجہ سرا نے ہدایت دی تھی کہ بہادر خان کے پاس سے اسے الٹے قدموں واپس جانا ہے۔

اس شب عارج کو بہادر خان کی محفل کا ساقی بنایا گیا۔ یاران محفل نے بہادر خان:

کے انتخاب کی خوب خوب داد دی۔

"یہ ہیرا تو تاج شاہی کی زینت بننے کے قابل ہے۔" کسی نے کہا۔

کوئی بولا کہ بہادر خان اسے اپنے بھائی خان زماں کی خدمت میں دے کر اس کا دل جیت سکتا ہے۔

عارج سب کچھ سنتا اور محسوس کرتا رہا۔ میں اسے پہلے ہی آگاہ کر چکی تھی کہ کس طرح بہادر خان کو ہموار کیا ہے! کبھی عارج نے سوچا بھی نہ تھا کہ آدم زادوں کے درمیان رہ کر ایسی صورتحال بھی پیش آ سکتی ہے۔

میں خلوت میں عارج سے ملتی رہی' اسے سمجھاتی رہی کہ شاہم بیگ کے جسم میں رہنا ہے تو وہ سب خدمت کے تقاضے پورے کرنے ہوں گے جن کی توقع شاہم بیگ سے اسی جیسے دوسرے آدم زاد کرتے ہیں۔

چند ہی روز میں عارج نے اپنی خدمت گزاری سے بہادر خان کو گویا اپنا مطیع بنا لیا۔ بہادر خان کی حویلی سے نکل کر اب عارج کی شہرت خان زماں کی حویلی تک پہنچ گئی تھی۔ عارج نے بھی نئے زمانے' نئے حالات اور ماحول کو بڑی خوبی و حسن سے اپنا لیا تھا۔ اس نے بہادر خان کے یہاں آنے جانے والوں سے بھی راہ و رسم بڑھا لی۔ ان میں چھوٹے بڑے سبھی تھے۔

تین ہی ماہ کے مختصر عرصے میں عارج نے اپنا رنگ جما لیا۔ اس میں شاہم بیگ کی فطری خصوصیات کو بھی دخل تھا۔ عارج اگر چاہتا بھی تو ان خصوصیات کو نہیں بدل سکتا تھا۔ یہ خصوصیات مثبت نہیں منفی تھیں۔

شاہم بیگ کو سارے ہتھکنڈے اور داؤ پیچ پہلے ہی آتے تھے کہ اپنے جیسے دوسرے لوگوں کو کس طرح بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔ یہ خصوصیات عارج کو بھی اس قالب کے توسط سے ملیں۔ شاہم بیگ کی روح پہلے ہی بیمار تھی' ضمیر پہلے ہی کچل دیا گیا تھا' پھر اسے منافقت' محسن کشی اور ساز باز سے کیا عار ہوتی۔

جلد ہی عارج کو شاہم بیگ کی ان منفی و ناگزیر خصوصیات کا پوری طرح علم ہو گیا۔ اس نے ایک شب مجھ سے گلہ کیا۔ "دینار! یہ آدم زاد نوجوان تو عجب نکلا۔ مجھے بتا میں اس کی فطری عادات پر کیسے قابو پاؤں؟"

"تجھے آخر قابو پانے کی تکلیف کیا ہے اے عارج! تو نے شاہم بیگ کے جسم کو اپنایا ہے تو اس کی فطری خصوصیات کو بھی قبول کر۔" میں اسے سمجھانے لگی۔ "سن! جس خاک سے شاہم بیگ کا خمیر اٹھا ہے' وہ خاک اب اس سے تقاضا طلب ہے کہ جو کچھ دنیا نے اسے دیا ہے' لوٹا دیا جائے۔ اے عارج! نہ گھبرا کہ میں تیرے ساتھ ہوں۔"

پھر عارج وہی کرتا رہا جو میں کہتی رہی۔ میں نے یہ بات بھی محسوس کر لی تھی کہ بہادر خان کی حویلی میں بھی اب عارج کا جی نہیں لگتا تھا۔ یکسانیت آدم زادوں ہی کو نہیں ہم جنات کو بھی گراں گزرتی ہے۔ بہادر خان اسے حویلی سے نکلنے نہیں دیتا تھا۔ اس کے باوجود حویلی سے باہر کی ایک ایک خبر اسے مل جاتی۔ حویلی میں اس کا سکہ چلتا تھا اور سارے ہی ملازمین اس کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگے رہتے تھے۔ اسے بادشاہ سے متعلق خبروں کی کھوج رہتی۔ بادشاہ کو کیا پسند ہے! کیا ناپسند؟ وہ کس بات پر خوش ہوتا ہے کس سے ناخوش؟ اس کے پسندیدہ رنگ کون سے ہیں' وہ کون سی خوشبو پسند کرتا ہے؟ وہ کس مزاج کا ہے اور اس کے کیا مشاغل ہیں؟ غرض کہ وہ ایک ایک بات کرید کرید کر پوچھتا اور اسے گرہ میں باندھ لیتا۔ وہ شاہم بیگ کو بادشاہ وقت تک پہنچانا چاہتا تھا۔

بادشاہ کی شخصیت میں عارج کی دلچسپی بہادر خان سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔ وہ ایک دن عارج پر خفا ہو گیا' غصے میں کہنے لگا۔ "شاہم! اپنی اوقات سے آگے نہ بڑھ ورنہ منہ کے بل گر پڑے گا۔"

میں وہیں موجود تھی۔ عارج کو میں نے زیر لب مسکراتے دیکھا' پھر اس نے پرسکون آواز میں کہا۔ "حضور کو اس نمک خوار کی طرف سے کسی نے ورغلایا ہے۔ ورنہ یہ در چھوڑ کر کہیں اور جانے سے حضور کا یہ غلام مر جانا بہتر سمجھتا ہے۔ حضور کے پیروں کی خاک خادم کیلئے آنکھوں کا سرمہ ہے۔"

بہادر خان کے چہرے کا تناؤ ختم ہو گیا اور وہ نرم لہجے میں بولا۔ "تو پھر کیا بات ہے جو تو ظل سبحانی کی جستجو میں لگا رہتا ہے؟"

"کیا حضور ظل سبحانی کے مزاج آشنا نہیں ہیں؟"

"ہاں ہیں! ہیں کیوں نہیں' ہم سے زیادہ ظل سبحانی کا مزاج داں کون ہو گا۔" بہادر خان کا سینہ فخر سے پھول گیا' بولا۔ "مگر تجھے اس سے کیا؟"

"اگر حضور کے غلام بھی اس سے آگاہ ہوں تو حضور کی عزت میں چار چاند لگیں گے۔ لوگ کہیں گے حضور کے غلام بھی ذہانت و فراست میں کسی امیر سے کم نہیں۔" عارج نے بہادر خان کو بے وقوف بنایا۔

"تو بہت ہوشیار ہو گیا ہے شاہم اور مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔" یہ کہہ کر بہادر خان اسے سمجھانے لگا کہ وہ ادھر ادھر کی باتوں پر کان نہ دھرا کرے۔

بہادر خان، عارج کو اپنی دانست میں سمجھا کر چلا گیا تو میں نے اپنے اوپر سے اندھیرے کی چادر اتار دی۔ میں ظاہر ہوئی تو عارج بولا۔ "دینار! میں اب اس حویلی میں نہیں رہوں گا بلکہ بہتر یہ ہے کہ میں بغداد لوٹ جاؤں۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہو گا کہ وہ عفریت مجھے مار ڈالے گا تو مار ڈالے!"

"ارے ارے، یہ تو کیا کہہ رہا ہے اے عارج؟" میں اس کی بات سن کر پریشان ہو گئی۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں میں اے دینار! مجھے مر جانے دے۔" عارج کے لہجے میں اداسی تھی۔

"اے عارج! مجھے بتا تو سہی کہ آخر تجھے ہوا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ حقیقت وہ نہیں جو عارج ظاہر کر رہا ہے۔

"ایسی زندگی کا بھلا کیا فائدہ جو تیرے بغیر گزرے دینار!" عارج نے سرد آہ بھری۔

"میں تجھ سے جدا کب ہوں" میں نے بھی اسے "غوطہ" دیا۔

"تیری انہی باتوں نے تو مجھے مار رکھا ہے۔" عارج کو عشق کا شدید دورہ پڑا تھا۔ ایسے عالم میں اداسی غالب آ ہی جاتی ہے۔ اس مسئلے کا مجھے ایک ہی حل سوجھا جو میں نے عارج پر ظاہر کر دیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ "مجھے منظور ہے۔ بتا بادشاہ وقت تک پہنچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟"

"مجھے لگتا ہے عارج کہ یہ تو نہیں شاہم بیگ بول رہا ہے۔"

"مجھ میں اور شاہم بیگ میں فرق بھی کیا ہے؟" عارج بولا۔

"تو پھر سن کہ بادشاہ ہمایوں تک پہنچنے کی راہ کس طرح تو ہموار کر سکتا ہے!" میں

نے کہا۔ "اس کیلئے تجھے ملا پیر محمد کو سیڑھی بنانا ہو گا۔" عارج میری بات توجہ سے سننے لگا۔

اسی رات میرے ایما پر عارج، احمد یار خان سے ملا جو دراصل بہادر خان کے مخالف گروہ کا آدمی تھا۔

بڑی مشکل سے عارج نے احمد یار خان کو رام کیا۔ وہ بڑا گھاگ، عیار اور منافق آدم زاد تھا۔ ایک طرف تو وہ بہادر خان سے ملتا رہتا، دوسری جانب اس کے مخالف گروہ سے ساز باز رکھتا۔ حقیقتاً وہ ملا پیر محمد کا آدمی تھا اور ملا پیر محمد کو دربار میں بڑی عزت حاصل تھی۔ میں نے عارج کو اسی لیے یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ہمایوں تک پہنچنے کی خاطر ملا پیر محمد پر جال پھینکے۔

بہادر خان اور سپہ سالار خان زماں دونوں بھائی، بادشاہ ہمایوں کے وزیر بیرم خان کے گروہ میں شمار ہوتے تھے۔ ملا پیر محمد بیرم خان کے مخالف گروہ کا سرغنہ سمجھا جاتا تھا۔ ملا نے دربار کے دوسرے بااثر امیروں کو اپنا ہم نوا بنا لیا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ ہمایوں امیروں کے درمیان نفاق نہیں چاہتا تھا۔

امیروں کے دونوں ہی گروہوں میں ایسے افراد تھے جنہوں نے ہمایوں کیلئے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ کسی گروہ کو بددل کرنا اسے مقصود نہ تھا۔ یوں بھی پے در پے تلخ واقعات اور ناموافق آب و ہوا نے ہمایوں کے مزاج پر برا اثر ڈالا تھا۔ اسے کابل کی آب و ہوا راس تھی۔ اسی سبب ہندوستان آ کر وہ بیمار رہنے لگا تھا۔ آگرہ آنے پر بھی وہ کچھ چڑچڑا رہتا تھا۔

ہمایوں کے مزاج کی تیزی و تلخی کو کم کرنے کی غرض سے اور خود اپنے مفادات کی تکمیل کیلئے بعض بدخواہوں نے اسے افیون کھانے کی سجھا دی۔ رفتہ رفتہ وہ افیون کا عادی ہو گیا۔ افیون کی پینک میں اس کے زیادہ تر اوقات خلوت میں گزرنے لگے اور دربار داری چھوٹ گئی۔ ظاہر ہے کاروبار حکومت پر اس کا اچھا اثر نہیں ہوا۔ ان حالات میں ہمایوں کے مخالفوں کو خوب کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔

یہ آدم زاد بھی خوب ہیں کہ اپنے ہی محسنوں کو اذیت پہنچانے اور ان کی مخالفت کرتے ہوئے انہیں ذرا شرم نہیں آتی۔ ملا پیر محمد بھی ایسے ہی بے شرموں میں سے تھا۔ خان خاناں بیرم خان کا وہ مخالف ملا پیر محمد خود خان خاناں ہی کا پروردہ تھا۔

دکن کا وہ بوڑھا عالم جلاوطن ہو کر بھٹکتا بھٹکتا خان خاناں بیرم خان کی خدمت میں آیا اور کتب خانے کا داروغہ مقرر ہو گیا۔ خان خاناں ہی کے ذریعے دربار میں اسے امارت کا

منصب مل گیا تھا۔ اب وہی ملا خان خاناں کے خلاف تھا۔ وہ اپنے محسن کے مخالفوں کا ہم پیالہ ہم نوالہ بنا ہوا تھا۔ وہ نا صرف خان خاناں کے خلاف بادشاہ کے کان بھرتا رہتا بلکہ اس کے حلیفوں کو بھی نیچا دکھانے کا کوئی موقع نہ چھوڑتا۔ شاہم بیگ کے بارے میں اس نے بھی سنا اور پھر ایک تیر سے دو شکار کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاہم بیگ کو اگر وہ اپنے توسط سے بادشاہ کی خدمت میں دے دیتا تو خوشنودی حاصل ہوتی اور دوسری طرف بہادر خان تلملا کر رہ جاتا۔

ابتدا میں مجھے یہ غلط فہمی تھی کہ میں نے عارج کے ذریعے اس محسن کش پر کمند پھینکی ہے' مگر پھر پتہ چلا کہ حقیقت اس کے برعکس ہے وہ تو خود شاہم بیگ کی فکر میں تھا۔ غلاموں' خدمت گاروں اور خوبصورت کنیزوں کو عہدوں اور مناصب کیلئے صدیوں پہلے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ سینکڑوں صدیاں آگے پہنچ جانے کے باوجود میں نے اسی سیاست کا مشاہدہ کیا اور مجھے اس پر دکھ ہوا۔

ملا پیر محمد کے اشارے پر احمد یار خان' شاہم بیگ (عارج) کو جان کر پر چار رہا تھا۔ جب اس نے عارج کی مرضی بھی پائی تو معاملہ گویا آسان ہو گیا۔ پھر بھی اس نے بڑے صبر اور احتیاط سے کام لیا کہ کہیں بہادر خان اس کی طرف سے بدک نہ جائے۔ ایک شب وہ شاہم بیگ کو حویلی کے عقبی دروازے سے نکال لے گیا اور ملا پیر محمد کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ جسے وہ شاہم بیگ سمجھ بیٹھا ہے وہ ایک جن ہے' عارج!۔

عالموں سے ہم جنات بھاگتے ہیں' لیکن انہی علماء سے جو باعمل ہوں' جن کے دل میں کوئی کھوٹ نہ ہو اور جو اپنے محسنوں کو دھوکا نہ دیں۔ ملا پیر محمد ان صفات کا حامل نہ تھا۔ مجھے اسی لئے اس سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔ ان عالموں کے علاوہ عاملوں یعنی کوئی عمل پڑھنے کا عمل بالکل الگ ہے۔ یہ فریبی' جھوٹے اور دغاباز بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کی ایک مثال بصرہ شہر کا ''حضرت جی'' ہے میں اس کا ذکر پہلے کر چکی ہوں' سو کھلا یہ کہ بچ کچ کے عالموں سے ہماری ہوا خراب ہوتی ہے اور جعلیوں کو ہم اپنی انگلیوں پر نچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ذکر تھا ملا پیر محمد کا جو جعلی ہونے کے باوجود بڑا ''کائیاں بالک'' تھا۔ اس کی عمر مشکل سے ساٹھ سال ہو گی۔ بالک ہندی زبان میں بچے کو اور کائیاں چالاک کو کہتے ہیں۔ ہم جنات کے نزدیک سو سال تک کی عمر کے آدم زاد اسی بنا پر بالک ہی کہلاتے ہیں۔ سو اس ''چالاک بچے'' ملا پیر محمد نے عارج کو دیکھ کر اپنی دستار درست کی' بولا۔ ''بہت خوب۔''

''خادم اپنی جان پر کھیل کر اسے بہادر خان کی حویلی سے نکال کر لایا ہے۔'' احمد یار خان نے اپنی کارکردگی کی داد چاہی۔

پیر محمد مسکرایا۔ ''ہم جانتے ہیں۔ تمہیں تمہاری خدمت کا صلہ ضرور ملے گا۔''

احمد یار خان نے جھک کر کہا۔ ''حضور کی نظر کرم ہی خادم کی محنت کا صلہ ہے۔''

ملا پیر محمد اس کی بات سنی ان سنی کر کے بولا۔ ''تم نے اس کے متعلق جو کچھ کہا تھا احمد یار خان' ہم نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اب یہ یہاں سے واپس نہیں جائے گا۔''

عارج اب تک خاموش کھڑا ہوا تھا' چند لمحے بعد بول اٹھا۔ ''یہ غلام بھی بارگاہ عزت مآب میں کچھ عرض کرنے کی اجازت کا خواستگار ہے۔''

ملا پیر محمد نے رعونت سے کہا۔ ''اجازت ہے۔''

عارج سنبھلا اور احتیاط سے بولا۔ ''یہ غلام بھی واپس جانے کا آرزومند نہیں بلکہ حضور کے در کی گدائی کا طالب ہے۔''

یہ فقرہ سن کر ملا پیر محمد نے عارج کے انسانی قالب شاہم بیگ کو غور سے دیکھا۔ اس وقت عارج پر شاہم بیگ کی منفی فطرت غالب تھی۔ ایک بے ضمیر کی نگاہیں دوسرے بے ضمیر سے ملیں۔ ایک محسن کش نے دوسرے محسن کش کو دیکھا اور پہچان لیا۔

کچھ توقف کے بعد ملا پیر محمد نے شاہم بیگ کو مخاطب کیا۔ ''ہم تمہاری لیاقت اور سوجھ بوجھ سے بہت خوش ہوئے۔ اگر تم ہمارے وفادار رہے تو اس کا صلہ پاؤ گے ورنہ پچھتاؤ گے۔ اس بات کو گرہ میں باندھ لینا کہ ہم قصورواروں کو معاف کر دینے کے عادی نہیں ہیں۔ ہماری وجہ سے تم جن بلند درجات پر پہنچنے والے ہو اسے ہمیشہ نظر میں رکھنا۔ جو چلنا سکھاتا ہے' جو بلندی تک پہنچاتا ہے' وہ راہ کھوٹی بھی کر سکتا ہے اور بلندی سے گرا بھی سکتا ہے۔ اسے ہماری دھمکی نہ جاننا' ہم نے جو کچھ کہا ہے حقیقت پر مبنی ہے اور وقت آنے پر تمہیں خود اس کا تجربہ ہو جائے گا۔''

میری پوری توجہ عارج پر تھی جسے شاہم بیگ کی منفی عادات نے مغلوب کر رکھا تھا۔ شاہم بیگ کے اندر ایک پیکار جاری تھی۔ اگر عارج کو اس قالب میں نہ رہنا ہوتا تو شاہم بیگ کے سارے کس بل میں چند لمحوں میں نکال دیتی۔ میری مجبوری عارج تھا' میری مجبوری اور شاید میری زندگی بھی۔

ملا پیر محمد کی بات کے جواب میں عارج نے انتہائی لجاجت اور خاکساری سے اپنی فرماں برداری کا اظہار کیا۔ آج تک اس سے ایسی باتیں بہادر خان نے کبھی نہیں کی تھیں۔ یہ بوڑھا گدھ' بہادر خان سے قطعی مختلف تھا۔

عارج کے اظہار فرماں برداری کے بعد ملا پیر محمد بولا۔ ''ہمیں بہادر خان جیسا نہ سمجھنا۔ ہم مطلوب تو ہو سکتے ہیں' طالب نہیں' ہمیں یقین ہے نوجوان کہ تم ہماری بات کی تہ تک پہنچ گئے ہو گے۔''

عارج واقعی ''بوڑھے'' کی بات تک پہنچ گیا۔ اس نے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ ملا پیر محمد زاہد خشک ہے۔

وہ شب عارج نے ملا پیر محمد کی حویلی میں بسر کی اور پھر صبح ہوتے ہی اس کا ''خواب'' پورا ہو گیا۔

میں نے اس رات عارج کو ہمایوں کے بارے میں بہت سی نئی باتیں بتائی تھیں۔ اس لئے وہ بہت خوش تھا۔

ہمایوں کو ستاروں کے علم سے بڑا گہرا شغف تھا اور یہ بات اب عارج کو بھی معلوم تھی۔ ہفتے کے ساتوں دن ہمایوں' اس کے امراء اور خاص متعلقین اسی رنگ کا لباس پہنتے جو رنگ اس دن سے منسوب ہونے والے ستارے کا ہوتا تھا۔ لباس کے انتخاب میں عارج نے میرے ایما پر اس کا خیال رکھا۔ اس نے اپنے انسانی قالب کو بھی اس خوشبو میں بسایا جو ہمایوں کو عزیز تھی۔ وہ اسی دن کیلئے کئی روز سے تیاری کر رہا تھا۔ جب وہ پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر ملا پیر محمد کے پاس پہنچا تو وہ آدم زاد بوڑھا اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

ملا پیر محمد نے عارج کی ذہانت کا اعتراف کرنے میں بخل میں کام نہ لیا' مگر اس اعتراف کا بھی ایک الگ انداز تھا۔

''اے شاہم بیگ!'' ملا پیر محمد' عارج سے مخاطب ہوا۔ ''تو وہ فتنہ ہے جس سے ظل سبحانی کا بچنا بھی محال ہے۔''

عارج یہ توصیفی کلمہ سن کر مسکرایا اور کہا۔ ''حضور یہ کہہ کر غلام کی عزت افزائی کر رہے ہیں۔''

ادھر تو ملا پیر محمد' عارج کو ساتھ لے کر شاہی محل کی طرف روانگی کی تیاریاں کر رہا تھا'

ادھر بہادر خان کا صدمے سے برا حال تھا' خود ملا پیر محمد کے کہنے پر احمد یار خان نے یہ اندوہ ناک خبر صبح ہی صبح اسے پہنچائی تھی۔ ملا پیر محمد بہادر خان کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا چاہتا تھا اور یہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔

بہادر خان کو ''شاہم بیگ'' کی بے وفائی پر تو ملال تھا ہی' مگر زیادہ صدمہ یہ تھا کہ خود اس نے ایک سنہری موقع گنوا دیا۔ وہ خود ''شاہم بیگ'' کو لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور یوں اس کا تقرب حاصل کر لیتا۔ یہ سوچتے ہوئے بہادر خان بھول گیا کہ وہ ملا پیر محمد نہیں ہے۔

بہادر خان تڑپا اور تلملاتا رہا۔ عارج سے متعلق میں ہر آدم زاد پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ ایک جن زادی کیلئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ لمحوں میں کہیں اور پہنچ جائے۔

بہادر خان چشم تصور سے ملا پیر محمد ''شاہم بیگ'' کو ہمایوں کے رو بہ رو دیکھتا رہا۔ حقیقتاً بھی عارج اور ملا پیر محمد دونوں اس وقت ہمایوں کے سامنے باادب کھڑے تھے۔

ہمایوں نے افیون کی پینک میں ہونے کے باوجود عارج کے انسانی پیکر کو نظر بھر کر دیکھا۔ ملا پیر محمد پہلے ہی ''شاہم بیگ'' کا قصیدہ پڑھ چکا تھا۔ ''ظل سبحانی! یہ بڑا باادب خدمتگار ہے۔ حضور اسے اپنی خلوت میں باریابی کی اجازت مرحمت فرمائیں گے تو ضرور اسے اپنے خادم خاص کا منصب عطا کر دیں گے۔''

''ہم اسے اپنی خدمت میں قبول کرتے ہیں۔'' ہمایوں نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی آواز نشے کے سبب بوجھل تھی۔

عارج کا دل مسرت و شادمانی سے دھڑکنے لگا۔ اسے منزل مل گئی تھی۔ وہ اپنے انسانی قالب کو اسی ''بلندی'' تک تو پہنچانا چاہتا تھا۔ دراصل بلندی و پستی کے معیار آدم زادوں کے نزدیک مختلف ہیں۔ ہم جنات کا ان سے متفق ہونا چنداں ضروری نہیں۔ عارج کی خوشی درحقیقت اس کی نہیں تھی۔ شاہم بیگ کی فطرت اس پر حاوی تھی۔ اس کے سامنے ہندوستان کا تاجدار آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ وہ جس کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ سینکڑوں صدیوں کا فرق اپنی جگہ مگر دنیائے عرب میں خلیفہ المہدی کا حکم بھی قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ بغداد کی ایک قریبی آبادی فلوجہ میں کچھ ''باغیوں'' نے شرارت کی۔ خلیفہ کے علم میں جب یہ بات آئی تو وزیر ابو عبداللہ ''باغیوں'' کی سرکوبی کے

احکام دے چکا تھا۔

خلیفہ المہدی جہاں بعض معاملات میں سخت گیر مشہور تھا' وہیں رحم دل بھی تھا۔ شرپسندوں کیلئے وہ سخت گیر اور بے گناہوں کیلئے سپر تھا۔ اپنے طور پر خلیفہ المہدی نے ان "باغیوں" کے متعلق تفتیش کرائی تو پتا چلا کہ وہ لوگ بے گناہ ہیں۔ ان کا قصور حاکم فلوجہ کی نظر میں یہ تھا کہ وہ اپنے بنیادی حقوق کیلئے صدائے احتجاج بلند کر رہے تھے۔

پھر اس سے پہلے کہ ان "باغیوں" کی سرکوبی کے وزارتی احکام پر عمل ہوتا' خلیفہ المہدی کا حکم فلوجہ پہنچ گیا۔ خلیفہ المہدی کے نزدیک وہ "باغی" حق پر تھے۔ سو انہیں سزا کے بجائے انعام و اکرام سے نوازا گیا۔

یہ واقعہ میں نے اس لیے بیان کیا کہ اس کی چشم دید گواہ ہوں۔ خلیفہ المہدی یا کسی بھی آدم زاد حکمران سے میری کوئی رشتہ داری نہیں رہی کہ میں ناحق اس کی رحم دلی کے قصے سناتی پھروں۔ مغل تاجدار ہمایوں کو بھی میں نے جس حال میں دیکھا' بیان کر دیا۔

ہندوستان کے فرماں روا ہمایوں نے "شاہم بیگ" کو شرف قبولیت بخش دیا' یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس پر میں نے عارج کو مبارکباد دی۔

"مگر دینار' تیرے بغیر تو شاہی محل میں بھی میرا دل نہیں لگے گا۔" عارج کہنے لگا۔

"کیا تیرے لیے شاہی محل میں کنیزیں' خواصیں اور خادمائیں نہیں؟" میں نے دانستہ چبھتی آواز میں کہا۔

"لیکن تجھ سا کوئی کہاں۔"

"کوئی بھی کسی جیسا نہیں ہوتا' پاگل نہ بنا مجھے اے عارج!..... شاہم بیگ کے جسم میں رہ کر تو بگڑتا جا رہا ہے۔"

"دینار! یہ ذمے داری بھی تو تجھی پر عائد ہوتی ہے۔"

"نہیں!" میں نے انکار کر دیا۔ "اس عفریت دہموش کے خوف سے تیری ہی تو عقل ماری گئی تھی تو ہی تو لپک کر شاہم بیگ کے جسم میں گھس گیا تھا۔"

"خیر اب جو ہو گیا' اسے بدلا تو نہیں جا سکتا۔" عارج نے کہا۔ "مجھے کسی آدم زاد کے اندر تو پناہ لینی تھی!۔"

"یہ کوئی ضروری نہیں تھا۔ اس کا ثبوت میں خود ہوں۔ ابھی تک میں کسی آدم زادی

کے جسم میں نہیں اتری' پھر بھی اللہ کے فضل سے آزاد گھوم رہی ہوں۔ اس عفریت نے اب تک میرا کچھ نہیں بگاڑا' جبکہ تو بھی جانتا ہے کہ اس کی اصل دشمنی مجھ سے ہے' تجھ سے نہیں۔"

"غلط!"

"وہ کس طرح اے عارج!"

"اس عفریت کی اصل دشمنی مجھ سے ہے..... تجھے تو وہ دل و جان سے چاہتا ہے۔" عارج نے بھی جوابی کارروائی کی۔ "اس کا رقیب میں ہوں..... میں!"

عارج نے یہ بات سینے پر ہاتھ مار کے اس طرح کہی میری ہنسی چھوٹ گئی۔

"کیوں ہنس رہی ہے تو؟"

"تیری حماقت پر!..... کیا رقیب ہونا بھی کوئی فخر کی بات ہے؟"

"میرے لیے ہے فخر کی بات!"

"پھر بول میں کیا کروں! اچھا اب تو سو جا! کیا خبر تیرا آقا ہمایوں صبح ہی صبح تجھے طلب کر لے!..... ایک بات تجھے بتاؤں اے عارج! حکمرانوں کے ساتھ رہنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ تجھے بے حد چوکنا رہنا ہوگا۔" میں اسے دیر تک سمجھاتی رہی۔

عارج کو سمجھانے بجھانے ہی کا یہ اثر تھا کہ ہمایوں جیسے متین اور سنجیدہ بادشاہ کا دل اس نے خدمت گزاری سے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کچھ عرصہ عارج شب و روز دل و جان سے ہمایوں کی خدمت کرتا رہا' مگر پھر آزمائش میں پڑ گیا۔ اس کے انسانی قالب میں دوبارہ ایک جنگ چھڑ گئی تھی۔ شاہم بیگ کی فطری کج روی نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے تھے۔ عارج بے بس نظر آنے لگا۔ شاہم بیگ کی سرشت رنگ لانے لگی۔

☆.....☆.....☆

اصل سے خطا نہیں' کم اصل سے وفا نہیں اور شاہم بیگ کم اصل تھا۔ اس نے جن امراء اور منصب داروں سے تعلقات بڑھائے ان میں بہادر خان کا بھائی اور مغل افواج کا سپہ سالار خان زمان پیش پیش تھا۔

ایک شاہم بیگ ہی کیا' اگر کوئی بلی کا بچہ بھی حکمران وقت ہمایوں کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تو یہ لالچی آدم زاد اس کے آگے پیچھے بھی اپنی اپنی دمیں ہلاتے نظر آتے۔ شاہم بیگ تو پھر آدم زاد تھا۔

امراء کو ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ''ہوس'' نے جیسے دیوانہ کر دیا۔ جسے دیکھو ''شاہم' شاہم'' کی رٹ لگاتا۔ اسی وجہ سے شاہم بیگ کا دماغ اور خراب ہو گیا۔ امراء کے درمیان اس ''مقابلے'' سے اس نے پورا فائدہ اٹھایا۔

ایک روز میں نے عارج سے بات کی۔ ''بہت ہو گیا اے عارج! تو نے اپنی بہت کر لی' بہتر ہے کہ اب تو شاہم بیگ کو حد سے تجاوز نہ کرنے دے۔'' میری آواز میں ناگواری تھی۔

''میں تو خود تنگ ہوں دینار! تو ہی کوئی ایسی تدبیر بتا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

عارج کی بات سن کر مجھے غصہ آنے لگا۔ میں نے سوال کیا۔ ''تو سانپ ہے یا لاٹھی؟''

''دونوں ہی سمجھ لے مجھے!'' عارج کی آواز اس لمحے مجھے بدلی بدلی سی لگی۔

مجھے گمان بھی نہ تھا کہ زندگی کبھی کوئی ایسا دن بھی دیکھنا پڑے گا جب عارج پر شیطان اس قدر غالب آ جائے گا۔ کہتے ہیں کہ غصہ اور عشق دونوں عقل خبط کر دیتے ہیں۔ سو میری عقل بھی کہیں گھاس چرنے چلی گئی۔ میں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ عارج پر وہ آدم زاد

بھاری پڑ رہا ہے جس کے جسم کو جن زاد عارج نے اپنا عارضی ٹھکانا بنا لیا ہے۔ اس کے بجائے عارج سے میں خفا ہو گئی۔

''اے عارج! تو جو چاہے کر' میری طرف سے تجھے پوری آزادی ہے۔'' میں اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''تو کتنی اچھی ہے دینار!'' عارج نے کہا۔

دوسرے لمحے میں نے اندھیرے کی چادر اوڑھ لی اور ہمایوں کے شاہی محل سے نکل آئی۔ میں خود کو بہت خالی خالی سا محسوس کر رہی تھی جانے کب میں رونے لگی۔

''وہ......وہ کیا......کیا سمجھتا ہے!......میں کیا اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی!'' میں بڑبڑائے جا رہی تھی۔

مجھے خبر نہیں کہ کب تک میری یہی کیفیت رہی۔ کئی روز تک میں نے عارج کو دیکھا تک نہیں۔ پھر مجھے خیال آیا' دیکھوں عارج کو بھی میری کمی کا احساس ہے یا نہیں۔ میں یہی دیکھنے کیلئے ہمایوں کے محل میں داخل ہوئی۔ اندھیرے کی چادر میں اب بھی میرا وجود عارج کی نظروں سے اوجھل رہا۔ ہمایوں کے حکم پر محل ہی کا ایک حصہ عارج کے انسانی قالب شاہم بیگ کی سکونت کیلئے وقف کر دیا گیا تھا۔

عارج کو اب شاہی مقربوں میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کی حیثیت کے پیش نظر بہادر خان نے تعلقات دیرینہ کا واسطہ دے کر عارج سے دوبارہ رسم و راہ پیدا کر لی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عتاب شاہی سے بچنا چاہتا تھا۔ عارج اس کیلئے کسی بھی بری گھڑی آنے کا سبب بن سکتا تھا۔

شاہم بیگ کو میں نے عارج پر غالب دیکھا۔ میرا عارج اپنے انسانی پیکر میں ایسا گم ہوا تھا کہ دل ہی نہیں رہا تھا۔ سو میں نے عارج کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ پھر بھی میں نے اس کے انسانی پیکر کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھی۔

☆......☆......☆

شاہم بیگ اپنے برے وقت کے دوستوں اور دشمنوں کو بالکل نہیں بھولا تھا مگر اس کے دوست کم اور دشمن زیادہ تھے۔ اس نے دوستوں کو خوب خوب نوازا اور دشمنوں سے بھرپور انتقام لیا۔ کسی کی کھال کھنچوا دی' کسی کو برسر عام کوڑے لگوائے' کسی کی گردن مروا دی' کسی کو قید کرا دیا اور کسی کو اتنا ذلیل و رسوا کیا کہ اس نے خودکشی کر لی۔ شاہم بیگ کے انہی نکاروں

میں وہ بوڑھا زمیندار بھی تھا جس کے ہاتھوں قتل ہوتے ہوتے وہ بچ کر بھاگا تھا' پھر بھوکا پیاسا مغل سپاہیوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

سنبھل کا عبدالرحمٰن بھی شاہم بیگ کو یاد تھا جو غریب ہونے کے باوجود دل کا غنی تھا۔ ایک موقع پر عبدالرحمٰن نے اس کی جان بچائی تھی اور اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ اس کے دوستوں میں بس ایک عبدالرحمٰن ہی رہ گیا تھا جس سے اب تک ملاقات نہ ہو سکی تھی۔

شاہم بیگ آج کل بہت مصروف شب و روز گزار رہا تھا۔ لگتا تھا کہ عارج کو اس نے مغلوب کرنے کے بعد اپنے قالب میں قیدی بنا لیا تھا یا اسے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ عارج سے اب میرا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ میں اس سے ناراض تھی اور اپنوں ہی سے ناراض ہوا جاتا ہے۔ مجھے ناراضی کا حق تھا۔

اپنے مصروف شب و روز کی وجہ سے نہ تو خود وہ سنبھل جا سکا نہ اپنا کوئی قاصد بھیج کر اسے آگرے بلوا پایا۔ جو لوگ شاہم بیگ کے انتقام کا شکار ہوئے۔ ان میں سے بالواسطہ کچھ کی پہنچ امراء تک بھی تھی۔ شاہم بیگ کی شکایتیں وہاں تک تو پہنچ گئیں مگر بادشاہ تک نہ پہنچیں۔ کوئی امیر' بادشاہ کے مزاج شناس خادم خاص کی دشمنی مول لینے پر آمادہ نہ ہوا۔

اس سے شاہم کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ وہ اب محل سے نکل کر بے روک ٹوک جہاں چاہتا آتا جاتا۔ وہ شہزادوں کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ اب اس کی آمدورفت سپہ سالار افواج خان زماں کی حویلی میں بھی پہلے کی نسبت بڑھ گئی تھی۔ خان زماں کا خیال تھا کہ بادشاہ ہمایوں تک کوئی بات پہنچانے یا خود پہنچنے کیلئے شاہم بیگ سے زیادہ کوئی اور ''مختصر راستہ'' نہیں۔

شاہم کی آمد کا بڑا سبب خان زماں کی ایک حسین کنیز دل آرام تھی۔ دل آرام نہایت خوبصورت' نوجوان و نوخیز کنیز تھی۔ اب تک شاہم بیگ صرف دو تین بار ہی اس کی جھلک دیکھ پایا تھا۔ اس حسین اور نازک اندام کنیز پر شاہم بیگ کا دل آ گیا تھا۔

یہ ایسا معاملہ تھا جو مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ آدم زادیاں بھی اپنی محبت میں کسی کو حصے دار بنانے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ میں نے بہرحال ایک فیصلہ کر لیا جبکہ یہ مشکل فیصلہ تھا۔

ہر چند کہ عارج سے میں انتہائی خفا تھی مگر یہ کس طرح گوارا کر لیتی کہ کوئی آدم زادی اسے اچک لے جائے اور میں جن زادی ہونے کے باوجود تلملاتی رہ جاؤں۔ میں نے سوچا' کچھ بھی سہی عارج تھا تو اسی انسانی قالب میں جسے دوسرے آدم زاد' بادشاہ ہمایوں کا خادم خاص شاہم بیگ کہتے تھے۔

مغل افواج کا سپہ سالار خان زماں بہادر اور شجاع آدمی تھا۔ اس کی مردانگی اور دلیری کے افسانے زبان زد خاص و عام تھے مگر اس کی زندگی کا ایک کمزور پہلو بھی تھا وہ بلا کا حسن پرست تھا۔ اس کی حسن پرستی مریضانہ حد تک جا پہنچی تھی۔ اس کا تصورِ حسن سب سے الگ اور عجیب تھا۔ وہ اپنی دانست میں بڑی بے لاگ اور کھری باتیں کرتا مگر یہ ساری باتیں اس کی مریضانہ ذہنیت کی غماز ہوتیں۔ وہ کھلتے پھولوں' دھنک اور دیگر مظاہر قدرت کی مثالیں دیتا' یہاں تک کہ یونانی عظیم فلسفی ارسطو کے تصورِ حسن پر بحث کرنے لگتا۔ خان زماں بہت پڑھا لکھا شخص تھا۔ اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ شاید ہی کوئی امیر دربار اس کی علمیت کے سامنے ٹک پاتا۔

شاہم بیگ اس کی صحبت میں یہ باتیں سنتا تو ان کی گہرائی پر غور کیے بغیر فوراً تائید کرتا۔ اہل محفل میں کسی کی مجال نہ ہوتی کہ شاہم بیگ کی تائید کے بعد کچھ کہتا۔

ہر اہل علم کی طرح خان زماں کو بھی علم کی ناقدری اور سامع نہ ہونے کا گلہ رہتا۔

بہ امر مجبوری ہی لوگ خان زماں کی باتیں سنتے' وہ بھی اس وقت جب خان زماں سے کوئی کام نکلوانا ہوتا۔ خان زماں کے پیچھے یہی لوگ کہتے' وہ بڑی ہی گاڑھی باتیں کرتے ہیں۔ ان سے تو اللہ ہی بچائے۔

کوئی کہتا۔ ''پیارے صاحب! اگر میرے بیٹے کی ترقی کا معاملہ نہ ہوتا تو حضور خان زماں کی محفل میں ایک پل نہ بیٹھتا۔''

''یہ آدمی اتنی باتیں کرتے کرتے تھکتا نہیں!'' کوئی حاسد امیر اپنی رائے دیتا۔

ان تمام افراد کے برعکس شاہم بیگ' خان زماں کا بہترین سامع ثابت ہوتا۔ دوسرے آدم زاد' خان زماں کی تقریر سنتے سنتے اونگھنے لگتے مگر کیا مجال جو شاہم بیگ پلک بھی جھپکا لیتا۔

اس پر خلوت میں خان زماں' شاہم بیگ سے کہتا۔ ''شاہم! ہمیں خبر ہے کہ تم سے اچھا کوئی اور سامع نہیں' تمہی..... صرف تمہی ہماری باتیں سمجھتے ہو۔ باقی جو لوگ یہاں آتے ہیں سب جاہل اور خود غرض ہیں۔ ہماری تعریف کر کے وہ ہم سے اپنے اپنے کام نکلوا لیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ہمیں ان کی خود غرضیوں کی پہچان ہے..... لیکن تم..... تم شاہم بے حد ذہین ہو..... اور کیوں ذہانت نہ ہو تم میں..... آخر ظل سبحانی کے چہیتے خادم ہو۔''

''سب غبی ہیں' تم ذہین ہو شاہم۔'' یہ الفاظ شاہم بیگ کی سماعت میں گونجے

رہتے۔ تبھی ہو کر ذہانت کی سنڈل جانا شاہم بیگ کیلئے سودمند ثابت ہوئی۔

ایک روز شاہم بیگ موقع پا کر ایسے وقت خان زماں کی حویلی میں گیا کہ خان زماں وہاں نہ ہو۔ خان زماں اس وقت بادشاہ کے پاس تھا' وہاں سے اس کی واپسی کا جلد امکان نہ تھا۔

میں سب کچھ معلوم کر چکی تھی۔ شاہم بیگ بھی باخبر تھا۔

خان زماں کے علاوہ دیگر امراء کو بھی بادشاہ نے طلب کر لیا تھا۔ جنید برلاس کے انتقال کی اطلاع ہمایوں کو آج ہی ملی تھی۔ وہ شرقی علاقے کے بندوبست پر مامور تھا۔ اس نے پٹھانوں کی ایسی سرکوبی کی تھی کہ اس کے ہوتے کسی پٹھان کو سر اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔

جنید برلاس کی موت کے بعد شیر شاہ فتنہ و فساد برپا کر سکتا تھا اور ہمایوں اسی کو روکنا چاہتا تھا۔ اس نے اسی لیے امیروں کو طلب کیا تھا کہ اس ضمن میں ان سے مشاورت کر سکے۔

ہمایوں کا خادم خاص ہونے کی وجہ سے شاہم بیگ تمام ملکی حالات سے واقف رہنے لگا تھا۔ اسے ایک ایک پل کی خبر رہتی تھی کہ ہمایوں کب اور کیوں کسی امیر سے ملا اور کب وہ کیا اقدام اٹھانے والا ہے۔ امراء کی ایسی مجالس میں حاضری سے شاہم بیگ کو مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا جن میں ملکی امور سیاست زیر بحث آئیں۔ خود امراء بھی ایسی مجلسوں میں شاہم بیگ کو دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے اور یہ بات ہمایوں سے چھپی نہ تھی۔ وہ ایسے مواقع پر خود شاہم بیگ کو ٹال دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ شاہم بیگ بڑے اطمینان سے خان زماں کی حویلی پہنچ گیا۔ وہ دل آرام سے کلام کرنے کا منتظر و آرزومند تھا۔ اس کیلئے یہ موقع بڑا غنیمت تھا۔

شاہم بیگ کو خبر نہ تھی کہ وہ مست ناز' عشوہ و ادا کے ہزار پیکاں لیے ایسے ہی موقع کی منتظر تھی۔

یہی وہ لمحہ تھا کہ جب میں دل آرام کے جسم میں اتر گئی۔ اول اول توقع کے مطابق مجھے گھٹن محسوس ہوئی مگر جلد ہی مجھے قرار آ گیا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ دل آرام کا جسم بڑا لطیف تھا۔

طویل عرصے کے بعد عارج اور میں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے' مگر اس طرح جیسے دو اجنبی ہوں۔ آشنائی کی خوشبو اجنبیت کے کرب کو ختم کر دیتی ہے لیکن اسی وقت جب دونوں طرف شعلۂ عشق لپک رہا ہو۔ عشق میں دوری نہیں ہوتی' مگر اب ہمارے درمیان شاہم بیگ اور دل آرام کے انسانی قالب تھے۔

شاہم بیگ کی آمد کے بارے میں جب مجھے خبر ہوئی تو میں نشست گاہ کی چلمن سے لگ کر کھڑی ہو گئی' نہ صاف چھپی تھی نہ سامنے آتی تھی۔ باریک چلمن کے پیچھے ایک شعلہ سا فروزاں تھا۔ شاہم بیگ نے چلمن پر نگاہ جما دی۔ وہ دیوانوں کی طرح ایک ٹک' ایک ہی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

پھر میں ہی عارج سے دل آرام بن کر مخاطب ہوئی۔ عارج نے جو آواز سنی وہ میری نہیں دل آرام کی ہی تھی۔ اسے گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ دل آرام کے بدن میں میں آرام کر رہی ہوں۔

''حضور! عزت مآب عالی مرتبت خان زمان اس وقت حویلی میں تشریف نہیں رکھتے۔'' میں نے نرم آواز میں بتایا۔

''ہمیں معلوم ہے۔'' عارج نے شاہم بیگ کی آواز میں کہا۔ ''مگر کیا ہماری پذیرائی خان زمان کی موجودگی سے مشروط ہے؟''

میں فوراً بولی۔ ''کنیز ہر خدمت کیلئے حاضر ہے۔''

میں نے محسوس کر لیا کہ دل آرام کی شیریں آواز سن کر عارج کی سماعت میں شہد سا گھل گیا ہو گا۔

''ہمیں پہلے ہی خبر تھی کہ اس وقت حضور خان زماں کہاں ہوں گے۔'' عارج سنبھل کر بولا۔ ''ہم اسی لیے اس وقت آئے تھے۔ ہمیں ان سے نہیں کسی اور سے ملنا ہے۔''

''تو حکم دیں' میں خبر کر دوں۔''

''جو خود ہماری خبر سے بے خبر ہے' اسے خبردار کرنے سے حاصل بھی کیا۔''

عارج کا معنی خیز جملہ سن کر میں سوچ میں پڑ گئی۔ کہیں اسے پتا تو نہیں چل گیا کہ دل آرام کے اندر کون بول رہا ہے۔

''اگر حضور اخفا ضروری نہ سمجھیں تو بتا دیں کہ وہ بے خبر کون ہے؟'' میں نے عارج سے دانستہ یہ سوال کیا۔

''وہ بے خبر......'' عارج نے سرد آہ کھینچی' یوں جیسے اس کے سینے میں کوئی تیر ترازو ہو۔ ''وہ......وہ بے خبر تم......تم ہو دل آرام!''

یہ سن کر میں نے سکون کا سانس لیا' وہ پہچان نہیں سکا تھا۔

ابھی میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ کسی کے قدموں کی چاپ ابھری۔

عارج بھی غالباً یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں خان زماں کو کچھ علم ہو۔

وہ ایک حبشی غلام تھا جو نشست گاہ کے دروازے کے سامنے سے گزرا تھا۔ ہوا سے نشست گاہ کے دروازے پر پڑا ہوا پردہ بار بار اٹھ رہا تھا۔

عارج نے پردہ اٹھنے کی وجہ ہی سے اس حبشی غلام کی جھلک دیکھ لی تھی۔

جب قدموں کی آواز بالکل معدوم ہو گئی تو میں بولی۔ ''کنیز اجازت چاہتی ہے مبادا کوئی کچھ سن لے۔''

یہ الفاظ ادا کرتے ہی میں نے عارج کے دماغ پر توجہ دی وہ سوچ رہا تھا۔ ''دل آرام صرف اخفائے راز چاہتی ہے۔''

''اگر تمہیں کسی کے کچھ سن لینے کا خوف ہے تو خلوت کا بندوبست بھی کیا جا سکتا ہے۔ بس ذرا تمہیں ہمت سے کام لینا پڑے گا۔'' وہ جلدی سے ترغیبی لہجے میں بولا۔

مجھے ناشائستگی محسوس ہوئی۔ میرا جی چاہا کہ اسے ڈانٹ دوں اس بدتمیزی پر۔ پھر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ چاہنے کے باوجود میں ایسا نہ کر سکی۔

یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ میں گھبرا گئی۔

وہی جو عارج کو ہو چکا ہے' کوئی جیسے میرے وجود میں سرگوشی کرنے لگا۔ تجھ پر اے دینار کنیز دل آرام کی جسمانی کمزوریاں غالب آ رہی ہیں' دل آرام کا انسانی قالب شاہم بیگ کے قالب پر فدا ہو چکا ہے۔

اس انکشاف نے مجھے لرزا دیا۔ میں بھی اس آزمائش سے دوچار ہو چکی تھی جس سے عارج گزر رہا تھا۔ پھر بھی میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے عارج کی بات کے جواب میں کہہ دیا ''نہیں!'' اسکے ساتھ ہی میرے انسانی قالب میں بھی معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ آدم زاد کو اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے' جنات کو نہیں۔ اسی سبب آدم زاد ہم جنات پر غالب آ جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ کنیز دل آرام کا جذبۂ عشق قوی تھا' سو میں بے بسی محسوس کرنے لگی۔ میں کہنا کچھ چاہتی' زبان سے کچھ نکلتا۔ اس پر بھی عارج کو بے راہ روی اور گناہوں کی دلدل میں دھنسنے سے بچانے کیلئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں دل آرام کے انسانی قالب کو نہ چھوڑتی۔ میں نے ایک فیصلہ کر لیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

خبر نہیں مجھے کیا کہنا تھا' جو الفاظ بے اختیار میری زبان پر آئے۔ یہ تھے۔
''آپ... آپ کو حضور... کنیز کی جانب سے شاید... شاید کوئی... کوئی غلط فہمی ہو گئی۔ نیز

یہ مقصد ہر... ہرگز نہیں تھا۔''

''اچھا تو پھر ہم چلتے ہیں۔'' عارج یہ کہتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں' خان زماں سے خوفزدہ ہوں۔

''کہیں حضور اس کنیز سے خفا تو نہیں ہو گئے؟'' میں بولی۔

عارج نے چلمن سے نظر ہٹا کر اپنی دانست میں پانسا پھینکا۔ ''ہاں ہم تم سے خفا تو ہیں۔''

''کنیز معافی کی خواستگار ہے۔''

''معافی کی صرف ایک صورت ہے۔'' عارج چلمن کی طرف دیکھ کر مسکرایا' پھر مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔ ''درمیان سے حجاب اٹھا دو۔''

وہ قدم قدم اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے لیے باعث مسرت یہ بات تھی کہ بہر صورت اب بھی میں ہی اس کی منزل تھی' خواہ ایک آدم زاد کنیز دل آرام کی صورت ہی میں سہی۔ عارج کو بھٹکنے سے بچانے کا بھی ایک راستہ تھا کہ میں دل آرام کے قالب میں رہ کر اسے الجھائے رکھوں۔

واقعہ دراصل یہ ہوا تھا کہ عارج اور میں' انسانی قالبوں کے جیسے اسیر ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک عفریت سے زندگی محفوظ رکھنے کیلئے ہم نے ان انسانی قالبوں میں روپوشی اختیار کر لی تھی ورنہ ان سے باہر نکل آنا ہمارے لیے دشوار نہ تھا۔ سو یوں گویا ہم حالات کے جبر کا شکار تھے۔ ان انسانی قالبوں کی منفی صفات و عادات کو بھی ہمیں برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔

عارج کی ترغیب کے باوجود میں بے حس و حرکت چلمن سے لگی کھڑی رہی تو اس کی ہمت اور بڑھ گئی۔ وہ تیز قدمی سے آگے بڑھا اور چلمن اٹھا دی۔

''یہ... یہ آپ... آپ حضور!'' میں ہکلا کے رہ گئی۔

عارج اب میرے بہت قریب تھا۔ میں تو اس کے وجود کی مخصوص خوشبو محسوس کر رہی تھی لیکن طویل عرصے تک شاہم بیگ کے انسانی قالب میں رہنے کے بعد عارج اس کا اہل بھی نہیں رہا تھا کہ میرے وجود کی خوشبو کو پہچان لے۔ کوئی دیوانہ یا مخبوط الحواس شخص رشتے میں کسی کا کچھ بھی لگتا ہو' مگر اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنی بیوی یا بیٹی کو پہچانے' زیادتی ہے۔ ایسے لوگ قابل نفرت نہیں' قابل رحم ہوتے ہیں۔

میں اس پر ندامت محسوس کرنے لگی کہ عارج سے خفا ہو گئی تھی۔

اس وقت عارج میرے سامنے ایک آدم زاد کنیز دل آرام کا عاشق بنا کھڑا تھا۔ میری پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔

"تم...... تم دل آرام، واقعی قرار دل و جاں ہو۔" عارج کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔ "کاش تم...... تم ہمارے لیے ہوتیں۔"

اب میں اسے کیسے بتاتی کہ اسی کیلئے تھی۔

وہ مجھے دل آرام جان کر کہے جا رہا تھا۔ "خان زمان یقیناً تمہارے قابل نہیں ہے۔" اگر میں نے عارج کو اپنے انداز و اطوار سے یہ یقین نہ دلا دیا ہوتا کہ اس پر ریجھ گئی ہوں تو خلوت کے باوجود وہ یہ بات نہ کہتا۔

میں نے عارج کی بات کے ردعمل میں خود کو خوفزدہ ہی ظاہر کیا۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگی جبکہ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔

"کیا بات ہے، تم بہت ہراساں نظر آ رہی ہو؟" عارج میرے چہرے پر نظر جمائے ہوئے بولا۔ "ذرا نگاہ تو اٹھاؤ! ایک بار ہی سہی، ہم تمہیں جی بھر کے دیکھ تو لیں کہ پھر کبھی یہ موقع نصیب ہو نہ ہو۔" یہ کہتے ہی عارج کا ہاتھ آگے بڑھا۔ وہ میرا ہاتھ تھامنا چاہتا تھا۔

میں تیزی سے پیچھے ہٹ گئی اور دانستہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ "کوئی کسی بھی لمحے یہاں آ سکتا ہے۔ خدا کیلئے آپ کنیز کا اتنا سخت امتحان نہ لیں۔"

عارج نے چلمن چھوڑ دی اور کہا "دل آرام! ہم اپنے دل سے مجبور ہو گئے تھے اور یہ ہماری عمر کا تقاضا بھی ہے۔ ہم نے پہلی بار اپنے اندر کسی کیلئے اتنی شدت محسوس کی تھی، اس لیے ہوش کھو بیٹھے تھے۔ تاب نظارہ ہوئی تو ہم بھی کوئی موقع نکال کر آئیں گے۔ خدا حافظ اے قرار شاہم۔" پھر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

میں نے بھی جواب میں اسے "خدا حافظ" کہا۔ عارج نے آواز سنی تو مڑ کر دیکھا۔ میں جان بوجھ کر چلمن کا پردہ اٹھائے کھڑی تھی۔ ہماری نگاہیں ملیں مگر ان میں فرق تھا ایک نگاہ ہوس تھی اور دوسری نگاہ عشق۔ میں تو اس کی نظریں پہچان گئی مگر وہ نہ جان سکا کہ اسے اس محبت سے پکارنے والا کون ہے۔

پھر میں نے چلمن گرا دی اور عارج نشست گاہ سے نکل گیا۔

میں کنیز دل آرام کے قالب سے نکل آئی۔ اب مجھے ہر وقت عارج پر نظر رکھنا تھی۔ دیوانہ دیوانہ ہی ہوتا ہے اور لاعلمی میں اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔ اپنے سینے میں خود

اپنے ہاتھوں سے خنجر بھی اتار سکتا ہے۔

میری ذمے داری اب پہلے کی نسبت بڑھ گئی تھی۔

میں خان زمان کی حویلی سے دل آرام کا قالب چھوڑ کر شاہی محل میں پہنچ گئی۔ عارج وہیں گیا تھا۔ اسے میں نے محل کے اسی حصے میں دیکھا جو اس کیلئے مخصوص تھا۔

عارج نے اپنے ایک خدمت گار کو طلب کر کے پوچھا۔ "امراء کا اجلاس ختم ہوا یا نہیں؟"

اس کے ایک خادم نے آ کر کچھ ہی دیر میں اطلاع دی۔ "اجلاس ابھی ختم ہوا ہے اور...... اور حضور......"

پھر خادم نے جو کچھ بتایا اسے سن کر عارج کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"ملا پیر محمد" وہ بڑبڑایا۔ "مگر کیوں؟...... وہ بوڑھا گھاگ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟"

یہ وہی ملا پیر محمد تھا جس نے عارج کو شاہی محل تک پہنچایا تھا۔ مجھے ملا پیر محمد کے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے جو اس نے کبھی عارج سے کہے تھے۔ "جو بلندی تک پہنچاتا ہے...... بلندی سے گرا بھی سکتا ہے۔"

اسی شب عارج کو ملا پیر محمد سے ملنا تھا۔ خادم نے یہی اطلاع دی تھی۔ یہ ملاقات بعد نماز عشا ملا پیر محمد کی حویلی میں ہوئی تھی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ عارج نے جب سے شاہم بیگ کا انسانی قالب اپنایا تھا اور اس کی آمد شاہی محل میں ہوئی تھی، وہ غروب آفتاب کے بعد طلوع جام کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے خدمت گاروں نے یہ بندوبست شروع کر دیا۔ ان میں کنیزیں بھی تھیں اور غلام بھی، مگر یہ سبھی زیادہ عمر کے نہیں تھے۔ جوان اور خوبصورت! بادشاہ نے اسے بڑی مراعات دے رکھی تھیں۔ وہ امراء سے زیادہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا تھا اور صرف اس بنا پر کہ بادشاہ کا خادم خاص اور مزاج داں تھا۔ ایک جن زاد ہونے کی حیثیت سے عارج میں فطری طور پر کچھ ایسی صلاحیتیں تھیں جو کسی آدم زاد میں ہونا ممکن نہیں تھا۔ شاہم بیگ کے جسم میں اگر عارج نے اپنا گھر نہ بنایا ہوتا تو یہ مشکل ہی ہوتا کہ شاہم بیگ بادشاہ کے اس قدر قریب پہنچ جاتا۔

عارج اور شاہم بیگ کی فطری صفات ایک دوسرے سے ٹکراؤ کے باوجود یکجا تھیں اور بلاشبہ یہ بڑی عجیب سی بات تھی۔ میرے خیال میں کہیں کوئی کمی ضرور تھی جو عارج اور میں

اس زمانے میں آ کر آدم زادوں کے جسموں پر مکمل قبضہ نہیں کر پا رہے تھے۔ اس کی وجہ عالم سو ماہی بتا سکتا تھا جو ہم سے سینکڑوں صدیوں پیچھے رہ گیا تھا۔ عرصۂ وقت اور مقام دونوں ہی بدل گئے تھے۔ میں اس لئے حیران تھی کہ ان کے ساتھ ہی عارج بھی بدل گیا تھا۔ مجھے اس کی مجبوری کا علم ہو گیا تو میرا رویہ رحمدلانہ ہونے کے ساتھ محتاط بھی ہو گیا۔ عارج پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت تھی۔

محل میں آنے کے بعد عارج کا مزاج بدل گیا تھا۔ اس کی خوش مزاجی جیسے کہیں کھو گئی تھی۔ ممکن ہے یہ بدمزاجی حالات کا تقاضا اور شاہم بیگ کی منفی صفات کا اثر ہو۔ بادشاہ سے قربت کے سبب وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا' ہاں بیر محمد سے اب بھی نظر بچا جاتا تھا۔ اس بوڑھے گھاگ آدم زاد نے عارج سے پہلی ملاقات میں جو کچھ کہا تھا' میں بھولی نہیں تھی۔

پیر محمد کے علاوہ خان خاناں بیرم خان کے سامنے بھی وہ زیادہ نہ پڑتا کیونکہ خود بادشاہ ہمایوں' بیرم خان کی بڑی قدر کرتا تھا۔ ملا پیر محمد اور خان خاناں کے سوا وہ اور کسی سے نہ دبتا تھا۔ سپہ سالار خان زماں سے مراسم کے بعد عارج اور بھی شیر ہو گیا۔ خان زماں بھی بیرم خان ہی کا پروردہ تھا۔ اس منصب تک اسے بیرم خان ہی نے پہنچایا تھا۔ یہ بات بھی عارج کو معلوم ہو چکی تھی۔ وزیر شاہ' بیرم خان کا چہیتا اور ہمایوں کا بااعتماد سپہ سالار پڑھا لکھا' سنجیدہ' بردبار اور متین خان زماں' عارج کے سامنے آ کر جیسے اپنی حیثیت بھول جاتا تھا۔ وہ اپنی عالمانہ گفتگو سننے والے عارج کی بڑی قدر کرتا۔ اس کے علاوہ اسے ہمیشہ یہ خیال بھی رہتا کہ براہ راست ہمایوں تک کوئی بات پہنچانے کا آسان ترین ذریعہ عارج ہی ہے۔ خان زمان اس انسانی کمزوری سے بھی آگاہ تھا کہ ادنیٰ و اعلیٰ سبھی لوگ اپنی خوشامد' تعریف اور چاپلوسی سے خوش ہوتے ہیں۔ عارج کو اپنے قابو میں رکھنے کیلئے اس نے یہی گر اپنایا۔ ایک طرف تو وہ مغل افواج کا سربراہ تھا' دوسری جانب ایک خادم کی قصیدہ خوانی کرتا تھا۔ خان زماں کے مزاج و طبیعت کی اس دورخی نے عارج کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا کہ خان زماں اس سے نہ ملتا۔

آج بھی عارج کو توقع تھی کہ اجلاس ختم ہوتے ہی خان زماں اس کے پاس دوڑا آئے گا۔ اسی کے ساتھ عارج کو ملا پیر محمد کی طرف سے بھی فکر تھی مگر اس فکر کو وقتی طور پر اس نے غرق مے ناب کر دیا۔

خان زماں کے بارے میں عارج کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ادھر عارج کو ملا پیر

محمد کا پیغام ملا ادھر ذرا ہی دیر بعد خان زماں آ گیا۔ عارج نے اسے مسند پر اپنے پہلو میں بٹھایا اور پھر اپنے ہاتھ سے اس کیلئے ساغر میں آتش سیال انڈیلی۔ اس وقت خان زماں کے چہرے پر تردد و فکر کے آثار تھے۔ عارج تاڑ گیا کہ امراء کے اجلاس میں کوئی ایسی بات ضرور ہوئی ہے جو خان زماں کیلئے فکرمندی کا سبب ہے۔ عارج یہ سبب معلوم کرنا تو چاہتا تھا لیکن احتیاط کے ساتھ۔ مجھے اس پر حیرت تھی کہ عارج رموز مملکت میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ بغداد کے قیام میں اس نے کبھی ان معاملات میں دلچسپی نہیں لی تھی۔

عارج مجھ سے کہتا' اے دینار! ہم جن زادوں کو اس سے کیا کہ آدم زادوں کا خلیفہ کون ہے اور کسے خلیفہ یا مسلمانوں کا حکمران ہونا چاہئے! مگر عراق سے ہندوستان آ کر اس کا رویہ ہی بدل گیا تھا اور اس کی وجہ میں جان چکی تھی۔ یہ سب عارج کے انسانی پیکر شاہم بیگ کی عادات و اطوار اور خصلت و فطرت کا اثر تھا۔

اب عارج اس قدر چالاک و ہوشیار ہو گیا تھا کہ رموز مملکت میں اپنی دلچسپی کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتا۔ وہ باتوں باتوں میں کام کی باتیں معلوم کر لیتا اور کسی کو گمان بھی نہ گزرتا کہ اس نے کتنی اہم باتیں ہمایوں کے خادم خاص کو بتا دی ہیں۔ خان زماں نے ساغر اٹھا کر ایک گھونٹ لے لیا تو عارج نے حقیقت حال معلوم کرنے کی غرض سے بات چھیڑی۔

''حضور کچھ فکرمند نظر آتے ہیں۔'' عارج نے خان زماں کو مخاطب کیا۔

''ہم تم سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکے ہیں شاہم کہ کم از کم تم ہمیں حضور نہ کہا کرو۔'' خان زماں لہر میں آ گیا۔ ''ہمیں صرف خان کہا کرو۔''

''حکم کی تعمیل غلام کا فرض ہے مگر کیا یہ حد ادب سے تجاوز نہ ہو گا؟''

''حد ادب!'' خان زماں آہستہ سے ہنسا۔ ''حد ادب اوروں کیلئے ہے شاہم' تمہارے لیے نہیں۔''

''غلام واقف ہے حضور..... خان سے قرب خاص کے سبب ہی روئے پرجلال پر فکرمندی دیکھ کر خود بھی یہ غلام فکرمند ہو گیا تھا۔''

''تم ہماری فکرمندی کی وجہ جان کر کیا کرو گے شاہم! یہ اور معاملات ہیں۔'' خان زمان نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''تمہیں خبر ہے کہ ظل سبحانی ان دنوں کتنے پریشان ہیں۔ ایک بار شیر خان ہاتھ آ جائے تو سکون کا سانس ملے۔ آج کل اس نے رہتاس گڑھ کے علاقے میں فتنہ و فساد مچا رکھا ہے۔ مخبروں سے خبر ملی ہے کہ وہ اب بنگال کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔''

خان زماں نے یہ کہہ کر ساغر اٹھالیا۔

عارج اپنی تمام تر جناتی صفات اور ذہانت کے باوجود ان باتوں پر تبصرہ کرنے کا اہل نہ تھا۔ اس لیے وہ دوبارہ خان زماں کے بولنے کا منتظر رہا۔ خان زماں نے ساغر خالی کر دیا تو عارج نے اسے پھر بھر دیا اور بولا۔ ''آپ نے بجا فرمایا خان کہ یہ اور معاملات ہیں مگر ظل سبحانی اور آپ سے لگاؤ کے سبب ان سے غلام کا بھی واسطہ ہے۔''

''اسی واسطے کے سبب تو ہم تمہیں بتانے آئے ہیں شاہم کہ ظل سبحانی نے آگرہ سے کوچ کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

''کہاں؟'' عارج بے چین ہو گیا۔

''ظل سبحانی اس وقت آگرہ سے کوچ کریں گے جب شیر خان بنگال کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ ظل سبحانی' شیر خان (شیر شاہ سوری) کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر قلعہ چنار پر قبضے کا قصد رکھتے ہیں اور یہ قدم نہایت دانشمندانہ ہے۔'' پھر خان زمان عارج کو شیر خان کے بارے میں بتانے لگا۔ عارج نے کوئی دلچسپی نہ لی وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

شیر خان جو بعد میں شیر شاہ سوری کہلایا' اس کے متعلق میں بتاتی چلوں۔ وہ ہندوستان کا حکمران بھی رہا۔ بہار کے ایک قدیم شہر سہسرام کا وہ جاگیردار تھا۔ اپنی قوت و لیاقت' ذہانت اور دلیری کی وجہ سے وہ رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا اور بالآخر مغلیہ حکومت کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن گیا۔ اس نے ہمایوں اور اس کے بھائیوں کے نفاق سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کے ساتھ غیور اور بہادر پٹھان تھے جو ہندوستان پر مغلوں کی حکومت کا حق تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مغل باہر سے آئے ہیں اور انہیں واپس اپنے وطن چلا جانا چاہئے۔ ہمایوں کے حوصلہ مند باپ اور پہلے مغلیہ تاجدار بابر نے جس مضبوط و مستحکم حکومت کی بنیاد ڈالی تھی' اس کے ستون لرزنے لگے تھے۔ شیر خان کی صورت میں ہمایوں نے ایک بڑے خطرے کو محسوس کر لیا تھا۔ خان زمان کا خیال درست تھا۔ حالات کے پیش نظر ہمایوں نے بالکل صحیح فیصلہ کیا تھا۔

خان زمان کو بھی جلد اندازہ ہو گیا کہ عارج' شیر خان کے ذکر میں دلچسپی نہیں لے رہا۔ تیسرا ساغر ختم کرنے کے بعد اسے اب ہلکا ہلکا نشہ ہونے لگا تھا۔

اسی وجہ سے جب عارج نے اس کے ساغر میں مزید شراب انڈیلنے کیلئے صراحی اٹھائی تو وہ بولا۔ ''شاہم! کاروان شوق و مستی کو ذرا آہستہ لے چلو' ایسا نہ ہو کہ ہمارے قدم

لڑکھڑا جائیں۔''

عارج اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ اس نے صراحی رکھ کر کہا۔ ''خان کا غلام بھی تو اس کارواں میں شامل ہے' وہ بھلا کب یہ گوارا کرے گا کہ خان کے قدموں میں لغزش آئے۔''

''خود کو غلام نہ کہا کرو شاہم! غلام تو ہم ہیں' اپنی خواہش کے غلام! تم تو بس شاہم ہو شاہم! ہاں وہ لغزش کے باب میں تم نے کیا کہا؟..... لغزش تو آدمی کی سرشت میں داخل ہے ورنہ جنت کیا بری تھی!''

میری توجہ خان زمان اور عارج دونوں کے ذہنوں پر تھی۔ عارج سمجھا کہ خان زمان بہکنے لگا ہے اس لئے بولا۔ ''خان کو آج بہت جلد سرور ہو گیا!''

خان زمان اس کی بات سن کر مسکرایا۔ ''ہاں شاہم! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کبھی تو بغیر پیئے ہی نشہ ہونے لگتا ہے۔ نشے کا تعلق دراصل آدمی کے مزاج سے ہے۔ شراب میں کیا رکھا ہے۔''

''خان کی باتوں سے دماغ میں روشنی سی ہونے لگتی ہے۔''

عارج نے اسے بانس پر چڑھایا۔ تعریف خان زمان کو بھی پسند تھی۔

''ممکن ہے ہماری باتیں تمہارے لیے روشنی ہوں شاہم' لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ان باتوں کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔'' خان زمان کے بعد شاہم بیگ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ خان زمان پھر بول اٹھا۔ ''ہاں ایک بات تو رہ گئی۔''

''ارشاد!'' عارج مؤدب آواز میں بولا۔

خان زمان نے پہلو بدل کر کہا۔ ''جہاں تک ہمارا خیال ہے ظل سبحانی تمہیں بھی ساتھ لے چلیں گے۔ جب سے تم آگرہ میں ہو' ایسا موقع نہیں آیا۔ تم گھبرا نہ جانا' تمہارا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ خود ہماری بھی یہی خواہش ہے کہ تم ساتھ چلو۔''

''اس بارے میں فیصلہ تو ظل سبحانی کریں گے' غلام تو حکم کا بندہ ہے۔'' عارج ہوشیاری سے بولا۔

''درست کہا تم نے۔'' خان زمان کہنے لگا اور پھر رخصت ہو گیا۔

اس عرصے میں عارج نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اسے ڈھونڈنے حویلی پہنچا تھا۔ امراء کے اجلاس سے عارج نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا تاکہ خان زمان کو کوئی اور شبہ نہ ہو۔

صنف نازک کے معاملے میں کیا آدم زاد اور کیا جنات' کیا غریب کیا امیر سبھی حساس ہوتے

وہ کوئی کنیز بھی ہو سکتی
ہیں۔ عارج بھی یہ بات جانتا تھا۔ صنف نازک کیلئے کوئی شرط نہیں۔
میں جس کے جسم میں اتر گئی تھی۔
ہے۔ دل آرام ایک کنیز ہی تو تھی' وہ عیب تو کرنا چاہتا تھا مگر ہنر کے
تجربات نے عارج کو بہت محتاط کر دیا تھا۔
ساتھ۔ اسے دل آرام کی خواہش تو ضرور تھی مگر اس قیمت پر نہیں کہ خان زمان سے بگاڑ ہو
جائے۔ اب وقت ہو گیا تھا کہ عارج شاہی محل سے چل دیتا۔ اس نے معلوم کرا لیا تھا کہ
ہمایوں خلوت میں ہے۔ ایسے میں اس کے پاس کوئی نہیں جا سکتا تھا' خواہ اس کے خاندان
والے ہی کیوں نہ ہوں۔ عموماً ایسا اس وقت ہوتا جب ہمایوں کسی معاملے پر غور و فکر کرتا اور
اسے کوئی فیصلہ کرنا مقصود ہوتا۔
شاہی محل سے نکل کر عارج' ملا پیر محمد کی حویلی پہنچا تو اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔
میں' عارج کے ساتھ ساتھ تھی۔
ملا پیر محمد نشست گاہ میں داخل ہوا تو عارج بطور احترام اٹھ کر آداب بجا لایا۔
"ادھر بیٹھ جاؤ!" ملا پیر محمد نے اپنی مسند کی طرف بڑھتے ہوئے عارج کو مخاطب
کیا۔
"جی حضور!" عارج بولا اور جب ملا پیر محمد مسند نشیں ہو گیا تو کچھ فاصلے پر جا بیٹھا۔
یہ وہی جگہ تھی جس کی طرف ملا پیر محمد نے اشارہ کیا تھا۔ مسند کے قریب نہ بٹھانے کا مطلب
اظہار خفگی ہی تھا۔
"ہم نے تمہیں صرف یہ کہنے کو بلایا ہے کہ تم اتنے اونچے نہ اڑو' جو تمہارے پر
کاٹنے پڑیں۔" ملا پیر محمد کے لہجے میں رعونت تھی۔
"غلام کچھ سمجھا نہیں حضور!" عارج نے نرمی سے کہا۔
"سمجھتے ہو! تم سب سمجھتے ہو! تمہیں خبر ہے کہ ہمارے بدخواہ کون ہیں! ایک حد میں
رہ کر ان سے رابطہ رکھو ورنہ...." ملا پیر محمد نے اپنی بات معنی خیز انداز میں ادھوری چھوڑ دی۔
پھر اس سے پہلے کہ عارج اپنی صفائی میں کچھ کہتا' ملا پیر محمد اپنی مسند سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔
"اب تم جا سکتے ہو۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ تمہیں اس ضمن میں تاکید کی ضرورت نہیں
پڑے گی۔ ہم یہ بھی واضح کر دینا بہتر سمجھتے ہیں کہ ہمارے آدمی شاہی محل میں بھی ہیں جو تمہاری
نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔"
عارج خاموش کھڑا رہا اور ملا پیر محمد نشست گاہ کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ

گیا۔ ملا پیر محمد کے مسند سے اٹھتے ہی عارج بھی احتراماً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

شاہی محل واپس آ کر کچھ دیر تو فکرمند رہا' پھر اس نے اپنے ذہن کو پرسکون رکھنے کی خاطر خان زمان کی خوبصورت کنیز دل آرام کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ میں اس کے قریب ہی تھی اور جو کچھ وہ سوچ رہا تھا' مجھے خبر تھی۔ ملا پیر محمد کے انتباہ نے اس پر اثر تو کیا تھا مگر خان زمان کی باتوں نے اسے زیادہ فکرمند کر دیا تھا۔

یقیناً عارج بزدل نہیں تھا مگر وہ رزم اور بزم کا فرق بخوبی جانتا تھا۔ وہ اسی وقت کھٹک گیا تھا جب خان زمان نے آگرہ سے کوچ کی خبر سنائی تھی اور اسے ہمایوں کے فیصلے سے آگاہ کیا تھا۔ وہ محض ذاتی مفاد کی خاطر رموز مملکت سے دلچسپی رکھتا تھا۔ ان معاملات کو وہ اپنے مفاد میں استعمال کرتا رہتا تھا' مغل لشکر شیر شاہ پر بھاری پڑتا یا شیر شاہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتا' عارج کو اس سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ کیا بہادر خان نے اسے زنداں سے نکالتے ہوئے اپنا مفاد نہیں سوچا۔ ہر چند کہ اس کیلئے میں نے راہ ہموار کی تھی لیکن بہادر خان کی غرض بھی اس میں تھی۔ ملا پیر محمد کون سا معصوم تھا؟ اس نے بھی تو خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر عارج کے انسانی پیکر شاہم بیگ کو بادشاہ کی خدمت میں دے دیا تھا اور بادشاہ؟ کیا وہ بے غرض تھا؟ کیا شیر شاہ اور ہمایوں کے اپنے اپنے مفادات نہیں تھے؟

ان حالات میں عارج نے بھی اپنے لیے ہی سوچا۔ اس کی نظر میں مغل لشکر کے ساتھ جانا بے سود تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر میں لشکر کے ساتھ کوچ نہ کروں تو اس دوران میں دل آرام کو رام کر سکتا ہوں۔ اسی نکتے پر وہ دیر تک سوچتا رہا۔ خان زمان لشکر کے ساتھ چلا جاتا اور یوں اس کا راستہ صاف ہو جاتا۔ پھر کوئی دھڑکا نہ رہتا مگر دل آرام کے حصول میں بادشاہ کا حکم رکاوٹ بن سکتا تھا۔ اسے خان زمان کی نہیں بادشاہ کی فکر تھی۔ اگر ہمایوں اسے ساتھ چلنے کا حکم دے دیتا تو پھر کچھ نہ ہوتا۔ دل آرام بھی نہ ملتی اور دربدر مغل لشکر کے ساتھ بھٹکنا پڑتا۔

بادشاہ درمیان میں نہ ہوتا تو وہ بہت جلد کوئی فیصلہ کر لیتا لیکن یہ معاملہ نازک تھا اور اسے نزاکت ہی سے نمٹایا جانا ضروری تھا۔ ہمایوں سے قریب ہونے کے سبب عارج اس کے مزاج سے آگاہ تھا۔ میں بھی جانتی تھی کہ ہمایوں حالات کا شکار ایک ایسا آدم زاد حکمران ہے جس نے بدخواہوں کے مشورے پر افیون کھانا تک قبول کر لیا تھا۔ وہ جھوٹے سہاروں کا عادی ہو گیا تھا۔ غلام' کنیزیں اور خدمتگار بھی جھوٹے سہارے ہی تھے۔ یہ بھی ہمایوں کی عادت بن

گئے تھے۔ خاص طور پر عارج کی خدمت گزاری سے ہمایوں بہت خوش تھا۔ وہ مجبوراً ہی ایسا کر سکتا تھا کہ عارج کو اپنے ساتھ نہ لے جاتا۔

حقائق کے اس صحیح تجزیے نے عارج کو پریشان تو کیا مگر اسے ایک نئی راہ بھی سجھا دی۔ اس نے فیصلہ کیا وہ ہمایوں کو اس پر مجبور کر دے گا کہ اسے آگرے میں چھوڑ جائے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کیلئے عارج نے ایسا سوچا مگر یہ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات ہے کہ اس نے ایسا کر دکھایا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ کوئی آدم زاد نہیں ایک جن زادہ تھا۔ اس کی اگر کوئی مجبوری تھی تو محض یہ کہ وہ اپنے انسانی پیکر سے باہر آنے میں خطرہ محسوس کرتا تھا۔ سو اس نے ایک ایسی تدبیر پر عمل کیا کہ اسے شاہم بیگ کا انسانی پیکر نہ چھوڑنا پڑے اور کام بھی نکل جائے۔

عارج کو خان زمان سے یہ تو معلوم ہو ہی چکا تھا کہ ہمایوں لازماً آگرے سے کوچ کرے گا لیکن وہ کب کوچ کا حکم صادر کرے گا اس کا انحصار شیر شاہ کی بنگال روانگی پر تھا۔ وہ وقت آنے سے پہلے ہی عارج مناسب بندوبست کر لینا چاہتا تھا تاکہ موقع پر پچھتانا نہ پڑے۔ وہ باخبر تھا کہ شاہی مقرب ایک دوسرے پر نظر رکھتے ہیں اور وہ بھی شاہی مقربوں میں سے تھا۔ اسے ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا پڑتا تھا تاکہ کسی کو بادشاہ کے کان بھرنے کا موقع نہ مل سکے۔

یہ بڑی ہی عجیب صورتحال تھی کہ جو عرصہ دراز تک حکیم رہ چکا تھا اور حکمت جس کی گھٹی میں پڑی تھی' وہ جو بغداد میں طبیب کی حیثیت سے بڑی شہرت رکھتا تھا' آج وہی کسی طبیب کی تلاش میں تھا۔ اگر وہ اپنے انسانی قالب سے نکلنے پر آمادہ ہو جاتا تو کوئی مشکل پیش نہ آتی۔

پہلے اسے شاہی طبیبوں کا خیال آیا مگر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ان میں کوئی اس قابل نہیں تھا کہ اسے رازدار بنایا جا سکتا۔ موقع سے فائدہ اٹھانے سے کوئی نہ چوکتا۔ اگر راز کھل جاتا تو بادشاہ کی خفگی لازمی تھی۔ یہ خفگی دراندازوں کی شہ پا کر کوئی بھی صورت اختیار کر سکتی تھی۔ عارج کے انسانی پیکر شاہم بیگ کی جان کے لالے بھی پڑ سکتے تھے۔ پھر عارج کو اس زمانے میں قیام کیلئے کوئی اور انسانی قالب تلاش کرنا پڑتا۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ کسی نئے انسانی قالب میں عارج کو قرار آ ہی جاتا۔

شاہم بیگ کی جان بچانے کی عارج کے پاس ایک ہی راہ تھی کہ اس نے بادشاہ کو

مجبور کرنے کیلئے جو کچھ سوچا تھا' اس کی کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دیتا۔ اس نے یہی کیا۔

ابھی زیادہ رات نہیں گزری تھی۔ اس کے خیال میں یہ بڑا مناسب وقت تھا۔ محل میں اس کی غیر موجودگی کو زیادہ محسوس نہ کیا جاتا۔ اسے جلد ہی لوٹ آنا تھا تاکہ ہمایوں اپنی خلوت سے باہر آنے کے بعد اسے طلب کرے تو وہ غیر حاضر نہ ہو۔ طلبی کے وقت کا بھی اسے علم تھا۔ ہمایوں عموماً اسے سونے سے پہلے طلب کرتا۔ وہ ہمایوں کے پیر دباتا رہتا' اس وقت تک کہ ہمایوں سو نہ جاتا۔ وہ اتنی احتیاط اور خاموشی کے ساتھ ہمایوں کی خواب گاہ سے باہر آتا کہ بعض اوقات تو محافظ دستے کے سپاہی بھی چونک اٹھتے۔

وہ کافی غور و خوض کر چکا تھا اور اب عمل کی ضرورت تھی' اسی لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ کسی کو اس نے کچھ نہ بتایا اور محل سے نکل آیا۔ دن کا وقت بھی اس کام کیلئے مناسب نہیں تھا۔ آگرہ شہر کے گلی کوچے اس کے دیکھے بھالے تھے۔ جلد ہی وہ شہر کے ایک مشہور طبیب کے گھر تک پہنچ گیا۔ اس نے گھوڑے کو تھپکی دی اور رکاب میں پیر رکھ کر نیچے اتر گیا۔

طبیب یہ سن کر گھبرا گیا کہ بادشاہ وقت ہمایوں کا خادم خاص خود آیا ہے۔ بادشاہ سے تقرب کے سبب وہ بہت مشہور ہو گیا تھا۔ اس کے مظالم کی داستانیں بھی لوگوں میں عام تھیں۔ ان داستانوں کا تعلق عارج کے انسانی پیکر شاہم بیگ سے تھا۔

بوڑھا طبیب اتنا بدحواس ہوا کہ ملازم سے یہ کہنے کے بجائے کہ بادشاہ کے خادم خاص کو نشست گاہ میں بٹھائے' خود باہر کی طرف ننگے پاؤں دوڑا۔ گھر کے دروازے پر بہترین پوشاک پہنے اور اپنے گھوڑے کی لگام تھامے عارج انسانی قالب میں بڑی تمکنت سے کھڑا تھا۔ طبیب تین بار اس کے سامنے جھک کر آرام بجا لایا اور پھر لپک کر گھوڑے کی لگام تھام لی۔ بوڑھے طبیب کی بدحواسی پر عارج مسکرایا اور بولا۔

''غالباً یہ فرض آپ کے ملازم کا ہے' وہ کہاں گیا؟'' عارج نے یہ کہتے ہوئے گھوڑے کی لگام چھوڑ دی۔

ملازم ڈر کے مارے اندر ہی رہ گیا تھا۔

بوڑھے طبیب نے عارج کی بات کے جواب میں کہا۔ ''بجا ارشاد فرمایا حضور نے!'' پھر وہ غصیلی آواز میں ملازم کو پکارنے لگا۔ ملازم دوڑتا ہوا گھر سے نکلا اور طبیب اس پر برس پڑا۔ ''خبیث! تو کہاں مر گیا تھا؟''

ملازم ہکلانے لگا۔

وقت کم تھا۔ عارج نے مداخلت کی اور ملازم سے کہا۔ ''پہلے اندر جا کے نشست گاہ کا دروازہ کھولو پھر یہاں ہمارے گھوڑے کی لگام تھام کر کھڑے ہو جاؤ کیونکہ ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رکیں گے اور فوراً ہی واپس جائیں گے۔''

ملازم نے حکم کی تعمیل میں دیر نہ کی۔ طبیب کے ہمراہ عارج نشست گاہ میں آ بیٹھا۔

''ہم نے آپ کی بڑی شہرت سنی ہے' اسی لیے خود چل کر آپ کے در تک آئے ہیں۔'' عارج نے گفتگو شروع کی۔

اظہار خاکساری میں بوڑھا باریش طبیب صرف دانتوں کی نمائش کر کے رہ گیا۔ کچھ نہ کچھ کہنے کی کوشش کے باوجود اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ وہ عزت دار آدمی تھا اور آج تک کسی ایسے امتحان میں نہ پڑا تھا۔

طبیب کو خوش دیکھ کر عارج پھر بولا ''اس وقت ہم آپ کے پاس ایک ضرورت سے آئے ہیں لیکن رازداری شرط ہے۔'' یہ کہتے ہوئے عارج نے طبیب کے چہرے پر نظر گاڑ دی۔

یہ سن کر کہ بادشاہ کا خادم خاص اس کے پاس کسی کام سے آیا ہے' طبیب کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور اس نے کہا۔ ''غلام رازداری کا وعدہ کرتا ہے۔''

عارج نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ جھجکتا ہوا قریب آ بیٹھا۔ پھر عارج نے دھیمی آواز میں اس سے اپنا مدعا بیان کیا۔ اس دوران میں طبیب احمق بنا بار بار اپنا سر ہلاتا رہا۔ خود ایک طبیب ہونے کے باوجود عارج نے دانستہ ان دواؤں کا نام نہیں لیا جو اسے مطلوب تھیں۔ مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اس نے بس اشارہ کر دیا کہ مقصد کیا ہے۔

''ہم نے آپ سے جو طلب کیا ہے' اس کی حاجت بذات خود ہمیں نہیں۔ ہمارا ایک رفیق مشکل میں ہے اور ہم اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں اتنی ہمت نہیں کہ خود یہ قدم اٹھا سکے مگر ہم اس معاملے میں اپنا نام آنا پسند نہیں کرتے۔ ہم نے اسی لیے آپ سے رازداری کا وعدہ لیا ہے۔ غالباً آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ افشائے راز کی صورت میں آپ کس مشکل سے دوچار ہو جائیں گے!'' عارج نے بڑے مہذب پیرائے میں طبیب کو دھمکی دی اور طبیب کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ یہ دیکھ کر عارج نے مزید کہا۔ ''اب یہ فرما دیں کہ ہمیں اپنے در سے مایوس لوٹائیں گے یا....'' عارج نے معنی خیز انداز میں اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

طبیب بہ دقت بولا۔ ''غلام ابھی نسخے لکھ کر حاضر ہوتا ہے۔'' پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کانپتے قدموں سے گھر کے اندر چلا گیا۔

میں نے اس معاملے میں مداخلت نہیں کی۔ عارج جو کچھ کر رہا تھا میری توقع کے مطابق ہی تھا۔ اگر اسے حصول مقصد میں کوئی دشواری پیش آتی تو میں اس کی مدد کرتی' مگر اسے بھی خبر نہ ہوتی کہ مدد کرنے والی میں ہوں۔ ہمایوں کے ساتھ میدان جنگ کا رخ کرنا عارج کیلئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میرے نزدیک عارج کا آگرے ہی میں رہنا بہتر تھا۔

ذرا دیر میں طبیب لوٹ آیا۔ اس نے دو نسخے عارج کی طرف بڑھا دیئے اور کہنے لگا۔ ''نشان زدہ نسخہ پہلے استعمال کرایئے گا اور دوسرا نسخہ کم از کم ایک ہفتے کے بعد۔''

عارج کی تیوریوں پر بل پڑ گئے' بولا۔ ''مگر ہم نے تم سے کاغذ کے یہ پرزے تو طلب نہ کیے تھے!''

طبیب نے سٹپٹا کر کہا۔ ''جی.... بجا ارشاد فرمایا۔''

''ابھی کسی عطار کے پاس جاؤ اور اپنی نگرانی میں دونوں نسخے بندھوا کر لاؤ۔ اس وقت تک ہم یہیں تمہاری نشست گاہ میں بیٹھے ہیں۔'' عارج کا لہجہ بدل گیا۔

بوڑھے طبیب نے اسی میں اپنی عافیت جانی کہ فوراً تعمیل حکم کرے۔ وہ عارج کی توقع سے پہلے ہی دونوں نسخے بندھوا کر لوٹ آیا۔ ان دونوں پڑیوں میں ایک پڑیا نشان زدہ تھی۔ دونوں پڑیاں عارج کے حوالے کر کے طبیب نے ترکیب استعمال بتائی اور خاموش ہو گیا۔

عارج نے چند طلائی سکے طبیب کی طرف اچھال دیئے اور اٹھتا ہوا بولا۔ ''یہ تمہارا معاوضہ نہیں انعام ہے۔''

''بڑا احسان' بڑی نوازش!'' طبیب کھڑا ہو کر عارج کے سامنے جھک گیا۔

یہ آدم زاد صاحب اقتدار اپنے ہی جیسوں کے آگے اسی طرح جھکتے ہیں اور اشرف المخلوقات ہونے پر بھی فخر کرتے ہیں۔ انتہائی عاجزی کے باوجود بوڑھا طبیب دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ بادشاہ کے خادم خاص کی صورت میں اس پر جو بلا نازل ہوئی ہے' جلد از جلد دفع ہو جائے۔ آخر اس کی دعا قبول ہوئی اور عارج تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا گلی سے نکل گیا۔ طبیب اس وقت زیر لب لاحول پڑھ رہا تھا۔

اس واقعے کے دوسرے ہی دن سے عارج' خان زمان کی حویلی میں زیادہ آنے

جانے لگا۔ اس نے ملا پیر محمد کی تاکید و نصیحت اور دھمکی کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ یوں بھی نشے میں بے خوفی ہوتی ہے' خواہ یہ نشہ شراب کا ہو یا عشق و ہوس کا۔ عارج کو بھی نشہ تھا' دل آرام کے حسن کا نشہ۔

☆......☆......☆

عارج نے خان زمان کو یہ لارا دیا کہ اب شاہی محل میں اس کا جی نہیں لگتا۔ مغل افواج کا سپہ سالار خان زمان یہ سمجھا کہ کسی وقتی جذبے کے تحت یہ بات کہی گئی ہے۔ اس پر خان زمان نے خوشی کا اظہار کیا اور بولا۔ "شاہم! تم شاہی محل میں رہو کہ ہماری حویلی میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ہم اس حویلی کا ایک حصہ تمہارے لیے مخصوص کر دیتے ہیں' تم جب چاہو یہاں آؤ جاؤ۔ آج سے یہ حویلی ہماری نہیں تمہاری ہے۔"

یوں تو خان زمان خود بھی بادشاہ کے خادم خاص سے مراسم رکھنا چاہتا تھا مگر بوجوہ میں نے بھی "کام" دکھایا تھا۔ میں نے خان زمان کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ جب تک بادشاہ کے خادم خاص سے اس کے اچھے تعلقات رہیں گے' مخالفین کی چالوں کا توڑ با آسانی ہوتا رہے گا۔ عارج یہی چاہتا تھا کہ خان زمان کی حویلی میں آمدورفت بلا روک ٹوک جاری رہے۔

اس دن کے بعد سے عارج کا یہ معمول ہو گیا کہ خان زمان حویلی میں ہوتا نہ ہوتا' وہ وہاں ضرور جاتا۔ دل آرام کے حصول کی خاطر وہ بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

اسی دوران میں ایک بار پھر مجھے دل آرام کے جسم میں اترنا پڑا۔ عارج کو خلوت میں دل آرام سے ملنے کا موقع مل گیا۔

عارج نے مجھے دل آرام سمجھ کر کہا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہم تم سے کتنی محبت کرتے ہیں؟"

"کنیز کو اندازا ہے۔" میں نظریں نیچی کر کے بولی' پھر جذباتی لہجے میں کہا۔ "کنیز بھی تو حضور کے عشق میں دیوانی ہے۔" یہ عین ممکن تھا کہ دینار کی حیثیت سے شاید میں کبھی عارج سے اظہار عشق نہ کر پاتی۔ ایک آدم زادی کے جسم میں داخل ہو کر البتہ میرے اندر اس قدر حوصلہ پیدا ہو گیا۔ اس کا بڑا سبب میرا انسانی پیکر بھی تھا۔

☆......☆......☆

دل آرام واقعی عارج کے عشق میں مبتلا ہو چکی تھی حالانکہ یہ بھی فریب نظر تھا۔ دل

آرام کے روبرو عارج نہیں بلکہ اس کا انسانی قالب شاہم بیگ ہوتا۔ سرخ و سفید رنگ والا وہ کشمیری نوجوان شاہم بیگ' دل آرام کو پسند آ گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ جس کیلئے پاگل ہوئی جا رہی ہے' کوئی آدم زاد نہیں ایک جن زاد ہے۔ جسم شاہم بیگ کا ضرور ہے مگر اس پر عارج کا قبضہ ہے۔

عموماً جب صنف نازک اپنی محبت کا اظہار کر دے تو آدم زاد ہوں کہ جن زاد "پگھلیا" جاتے ہیں' مگر موقع محل کی نزاکت کے سبب عارج نے خود پر قابو رکھا اور مجھ سے کہنے لگا۔ "دل آرام! فی الحال احتیاط برتو!"

دل آرام اور میں' ہم دونوں ہی اپنے عشق میں سچے تھے اس لیے اپنے محبوب کی ہدایت پر پورا عمل کیا۔ ہم دور ہی دور سے عارج کے انسانی پیکر کو دیکھ لیتے مگر حتی الامکان قریب آنے سے گریز کرتے۔ دل آرام کا جسم میرے لیے گویا ایک "عارضی گھر" تھا۔ میں جب چاہتی اس میں داخل ہو جاتی جب ضرورت نہ سمجھتی باہر نکل آتی۔ میرے لیے یہ تجربہ بڑا انوکھا اور دلچسپ تھا کہ عارج اور میں دونوں ہی آدم زادوں کے جسموں میں رہ کر ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ میں تو حقیقت سے واقف تھی' عارج بے خبر تھا کہ وہ دل آرام کو نہیں' مجھے "زیر دام" لانے کی کوشش کر رہا ہے' دینار کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔

☆......☆......☆

ہفتہ بھر نہ گزرا تھا کہ وہ خبر آ گئی جس کا ہمایوں کو بے چینی سے انتظار تھا۔ بااعتماد مخبروں نے اطلاع دی کہ شیر شاہ بنگال روانہ ہو چکا ہے۔ اسی دن کا عارج بھی منتظر تھا۔ وہی ہوا جس کا اسے یقین تھا۔ ہمایوں نے اسے خادم خاص کی حیثیت سے ساتھ چلنے کا حکم دیا اور اس نے سر تسلیم خم کر لیا۔ دو روز بعد جمعہ کے دن علی الصبح مغل لشکر کو آگرے سے کوچ کرنا تھا۔ جمعے کے دن کو مبارک جان کر ہمایوں نے کوچ کا حکم دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی عموماً مسلمان حکمران کسی مہم کا آغاز کرتے تو وہ جمعے ہی کا دن ہوتا۔ روایتاً لشکر کے کوچ کی خاطر اسی دن کو منتخب کیا جاتا تھا۔ یہ گویا عمل کا دن تھا۔

لشکر کے کوچ کی تمام تیاریاں ایک روز پہلے ہی مکمل ہو گئیں اور اسی دن ہمایوں کو اپنے خادم خاص کے متعلق ایک تشویشناک خبر ملی۔ ہمایوں کا خادم خاص شاہم بیگ خارش کے عارضے میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ہمایوں کے استفسار پر شاہی طبیبوں نے اسے بتایا کہ خادم خاص کو

صحت یاب ہونے میں کم از کم دو ہفتے لگ جائیں گے کیونکہ مرض شدید ہے۔ طبیبوں نے یہ بھی کہا کہ اس دوران میں اس کو اپنی خدمت میں نہیں رکھنا چاہئے' یہ بیماری اڑ کے لگتی ہے۔ یوں ہمایوں' عارج کو آگرے ہی میں چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ بوڑھے طبیب کا پہلا نشان زدہ نسخہ کارگر ثابت ہوا۔ بادشاہ تو نہیں خان زمان اس حالت میں بھی عارج کو دیکھنے آیا۔ طبیبوں کی ہدایت کے مطابق عارج کے دونوں ہاتھوں پر ریشمی کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ مقصود یہ کہ عارج خارش کی وجہ سے اپنا جسم نہ کھجائے' اس سے مرض بڑھنے کا اندیشہ تھا۔

عارج واقعی سخت اذیت میں تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اپنے انسانی قالب کو ادھیڑ کر رکھ دیتا۔ دوا استعمال کرنے سے پہلے اسے خبر نہ تھی کہ اتنی تکلیف ہو گی۔ دوسرا نسخہ بوڑھے طبیب کی ہدایت کے مطابق ایک ہفتے کے بعد استعمال کرنا تھا اور ابھی پہلا ہی دن تھا۔ عارج نے گزشتہ شب ہی دودھ سے وہ سفوف نگلا تھا۔ صبح وہ سو کر اٹھا تو اس کے جسم پر دودڑے پڑے ہوئے تھے اور ان میں خارش تھی۔ اس نے جسم کھجایا تو خارش اور بڑھ گئی۔ دوپہر ہوتے ہوتے اس کا برا حال ہو گیا۔

شاہی طبیبوں کو خبر ہوئی تو خود ہی دوڑے دوڑے آئے۔ انہوں نے جو دوائیں دیں' عارج نے استعمال نہیں کیں' ہاں جسم پر وہ مرہم مل لیا جس سے قدرے سکون ہو گیا تھا۔ طبیبوں نے پھر بھی ہدایت کی کہ وہ اپنے ہاتھوں پر ریشم کا کپڑا لپیٹ لے۔ اس کے خاص ملازمین کے سوا کسی کو ملنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ قدم احتیاطاً اٹھایا گیا تھا کہ کہیں سارے محل میں یہ بیماری نہ پھیل جائے۔

دوسرے دن صبح ہمایوں مغل لشکر کو ساتھ لے کر قلعہ چنار کی تسخیر کیلئے روانہ ہو گیا۔ خان خاناں بیرم خان' خان زمان ملا پیر محمد اور دیگر تمام اہم منصب رکھنے والے اس کے جلو میں تھے۔ آگرہ شہر کے بندوبست کی غرض سے اس نے صرف ایک بااعتماد مصاحب و مقرب شیخ بہلول کو چھوڑا تھا۔ اس کی انتظامی صلاحیتوں اور وفاداری پر ہمایوں کو یقین تھا۔ دارالحکومت میں کسی ایسے ہی فرد کی موجودگی ضروری تھی۔

وہ ایک ہفتہ عارج نے بڑی تکلیف میں گزارا۔ اسی عرصے میں' مجبور ہو کر عارج' شاہم بیگ کے جسم سے باہر نکل آیا۔ یہ رات کا وقت تھا اور محل میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں اس سے زیادہ دور نہیں تھی مگر اندھیرے کی چادر اوڑھ رکھی تھی کہ عارج مجھے نہ دیکھ سکے۔ عارج کو میں نے محل سے نکلتے دیکھا اور اس کے پیچھے ہو لی۔ عفریت دہموش کا

خطرہ بہر حال تھا جس کے خوف سے عارج اب تک شاہم بیگ کے انسانی قالب سے نہیں نکلا تھا۔

عرصہ دراز کے بعد عارج کو انسانی قالب کی ''قید'' سے نجات ملی تھی۔ وہ اسی لیے پرواز کرتا ہوا۔ شہر سے باہر آ گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا کہ میں اس کے قریب پہنچ گئی۔ مجھے شرارت سوجھی۔ میں' عفریت دہموش کی آدم زاد کنیز سارہ کی آواز میں اس سے مخاطب ہوئی۔ ''اے جن زاد عارج!! اے جن زادی دینار کے عاشق! تو اگر چاہے بھی تو مجھ سے نہیں بھاگ سکتا!''

میری توقع کے عین مطابق عارج ڈر گیا۔ اس نے کانپتی آواز میں کہا۔ ''اے سا...... سارہ! تو...... تو آدم زادی ہو کر بھی کس...... کس طرح میرے تعاقب میں یہاں...... یہاں تک آ گئی۔''

''یہ میں نہیں صرف میری آواز ہے۔'' میں بدستور سارہ کی آواز میں بولی۔ ''مجھے میں یہ بتانے اور جتانے کی خاطر سینکڑوں صدیوں کا سفر کر کے اس زمانے تک آئی ہوں مگر خود کو ظاہر نہیں کر سکتی کہ بہر حال آدم زادی ہوں۔''

''تو مجھ...... مجھ سے کیا...... کک...... کیا چاہتی ہے سارہ؟'' عارج بڑی مشکل سے بول رہا تھا' اس پر خوف غالب تھا۔

''یہ کہ تو اس جن زادی دینار کو بھول جا جسے میرے آقا نے اپنے لیے پسند کر لیا ہے۔''

اس پر عارج گم صم سا ہو گیا' پھر بڑبڑایا۔ ''دی...... دینار...... وہ تو نہ جانے کہاں گئی...... کہاں چلی گئی وہ؟''

''ایسا لگتا ہے کہ تجھے اس زمانے میں چھوڑ کر دینار کسی اور عہد میں چلی گئی ہے۔ وہ تیری وفادار نہیں۔''

''غلط!'' عارج پر یقین آواز میں کہنے لگا۔ ''دینار مجھ سے بے وفائی نہیں کر سکتی۔!''

''جب تو اس سے بے وفائی کر کے ایک خوبصورت کنیز دل آرام کی آرزو کر سکتا ہے تو دینار سے وفا کی امید کیوں رکھتا ہے؟''

عارج پھر خاموش ہو گیا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ ''اے سارہ! تجھے اگر یہ پتا ہے کہ...... کہ دل آرام کی تمنا مجھے ہے تو پھر یہ بھی جانتی ہو گی کہ میں نے جو انسانی قالب اپنایا تھا

وہ..... وہ اسے دل آرام کو پا لینے کی ہوس تھی، مجھے نہیں..... اور سن! تو نے جس طرح مجھے ڈھونڈ لیا، کیا دینار کو تلاش نہیں......“

میں نے عارج کی بات کاٹ دی۔ ”تجھے اس معاملے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ معاملہ میرے آقا اور دینار کا ہے۔“

”اے سارہ! تجھے تیرے آقا کی قسم! مجھے بتا دے کہ دینار کہاں ہے؟“

”یقین کر کہ مجھے نہیں معلوم۔ تو ایسا کر کہ اس زمانے میں رہ اور عیش کر! اگر تو نے یہاں سے کہیں اور جانا چاہا تو وہ تیری زندگی کا آخری دن ہو گا۔ میں چلی۔“

عارج خاصی بلندی پر ٹھہرا ہوا تھا۔ میں اگر چاہتی تو خود کو اس پر ظاہر کر دیتی، اپنے اوپر سے اندھیرے کی چادر اتار دیتی، لیکن ایسی صورت میں مجھے عارج کو سب کچھ بتانا پڑتا۔ وہ لطف جاتا رہتا جو اجنبی بن کر اس سے ملتے رہنے میں تھا۔ آدم زادی دل آرام کا جسم میرے لیے عارج سے نا صرف قریب رہنے کا ذریعہ تھا بلکہ اس میں اور بھی مصلحتیں کارفرما تھیں۔ میں جن کا ذکر پہلے کر چکی ہوں۔ ان میں عارج کو بے راہ روی سے بچانا سب سے بڑی مصلحت تھی۔

یہ جان لینے کے بعد کہ سارہ نے اس کا سراغ لگا لیا ہے، عارج اس نتیجے پر پہنچا کہ شاہم بیگ کے انسانی قالب سے باہر نہ آتا تو شاید ایسا نہ ہوتا۔ اسی بنا پر اس نے دوبارہ شاہم بیگ کے جسم میں پناہ لے لی۔

پہلے نسخے کا اثر ختم ہوا تو عارج کی طبیعت سنبھل گئی۔ اس نے ایک ہفتہ گزرتے ہی دوسرا نسخہ استعمال کر لیا تھا۔ تین دن کے اندر اندر وہ مکمل صحت یاب ہو گیا۔

غسل صحت کرتے ہی اس نے خان زمان کی حویلی کا رخ کیا۔ شاہم بیگ کی صفات بد اس پر دوبارہ غالب آ گئی تھیں۔ دل آرام کے حصول میں اب گویا کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

حویلی کا جو حصہ صرف اس کیلئے مخصوص تھا وہاں خدمتگاروں کا ہجوم ہو گیا۔ خان زمان انہیں شاہم بیگ کیلئے خصوصی ہدایات دے کر گیا تھا۔

عارج نے وہاں سے تمام خدمت گاروں کو رخصت کا حکم دیا اور بولا۔ ”فی الحال ہماری خدمت کیلئے صرف ایک کنیز کافی ہے۔“

اس ہجوم میں دل آرام بھی تھی جس کے جسم پر اب میرا قبضہ تھا۔ عارج نے مجھے

رک جانے کا اشارہ کیا۔ بقیہ غلام اور کنیزیں چلی گئیں۔ عارج کیلئے گویا آج فتح کا دن تھا۔ وہ اس فتح کے جوش میں میری طرف بڑھا۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔ عارج نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر مجھے مسند کی طرف کھینچتا ہوا لے گیا۔ میں اس کے ساتھ کھنچی چلی گئی۔

عارج کو انسانی قالب میں خود سے اتنے قریب دیکھ کر میں نے اپنی پلکوں کی چلمن گرا لی۔ پھر غالباً دل آرام کے انسانی قالب کا اثر تھا کہ معاً میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے خود بھی اس پر حیرانی ہوئی۔ آنکھوں کے آنسو رخساروں پر پھسل گئے۔

اس پر عارج بے قراری سے بولا۔ ”کیا ہوا تمہیں دل آرام؟ کیا ہماری جسارت نے تمہارے دل کو ٹھیس پہنچا دی؟ یقین کرو کہ ہم اس وقت اپنے قابو میں نہیں ہیں۔ تمہاری خاطر ہم نے بڑا دکھ جھیلا۔ یہ دن بڑی مشکل سے دیکھنا نصیب ہوا ہے۔“

میں نے آنکھیں کھول دیں اور بھاری آواز میں بولی۔ ”یہ خوشی کے آنسو ہیں حضور! کنیز کو خبر مل گئی تھی کہ حضور کس ابتلا میں مبتلا تھے۔ حضور کو صحت یاب دیکھ کر کنیز اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکی۔ کنیز حضور کی صحت یابی پر مبارکباد پیش کرتی ہے۔“

عارج نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں سمٹ کر ایک طرف ہو گئی۔

”کیا تم ہمارے جذبات عشق کا امتحان لے رہی ہو دل آرام؟“ عارج نے کہا۔

”معاف کیجیے گا حضور! عشق و ہوس میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔“

”مگر تم ہمیں عرض شوق سے کیوں روکنا چاہتی ہو؟“

”شوق بہر رنگ رقیب سر و ساماں ہوتا ہے حضور! اور کنیز یہ نہیں چاہتی۔“

”تم ہمیں باتوں میں نہ بہلاؤ دل آرام! صاف صاف کہو کیا تمہیں ہمارے عشق پر بھروسہ نہیں؟“

”اگر حضور اسی کو عشق کہتے ہیں تو گستاخی معاف، کنیز اس سے اتفاق نہیں کرتی۔ کنیز کی نظر میں تو یہ بڑا افضل جذبہ ہے، پستیوں سے بلندیوں کی طرف سفر! جسم کی آلودگی سے قطع نظر روحانی سکون کا ذریعہ! حیوان اور انسان کے درمیان واضح فرق! حیوان عشق نہیں کرتے۔“ میں کہتی رہی۔ دل آرام کے بارے میں اب تک مجھے بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ میں نے اسی کی روشنی میں اپنی بات جاری رکھی۔ مجھے ایک کنیز کی حیثیت اور مرتبے کا پوری طرح احساس تھا سو بولی۔ ”مجھے بھی حیوان بنا دیا گیا تھا۔ میں نے اس پر صبر کیا۔ کہتے ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور یہی ہوا۔ مجھ پر حضور کی نظر کرم اٹھی اور میں حیوان سے انسان بن

گئی۔ کابل سے آگرہ تک قدم قدم پر مجھے حیوان ملے جنہوں نے میرے اندر موجود حیوان کو بڑی غذا فراہم کی اور میرے انسان کو نیم جاں کر دیا۔"

"یہ تم کیا قصہ لے بیٹھیں دل آرام؟ ہم تمہاری باتوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔"

"یا حضور سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔"

"تم کچھ بھی کہو ہمارا تصور عشق خیالی نہیں ہے۔" عارج پھر بہکنے لگا۔

"حضور نے شاید عشق کی گہرائی کو سمجھنا نہیں چاہا۔ عشق تو وہ دولت ہے کہ پھر کسی دولت کی تمنا نہیں رہتی۔"

"ہوگا۔" عارج کی آواز میں بیزاری تھی۔ "ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ "

ابھی عارج کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ میں اچھل پڑی۔ یہی حال عارج کا بھی ہوا تھا۔

"قتل ہو گیا قتل ہو گیا۔" ایک تیز گھبرائی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی تھی۔

"کس کا قتل ہو گیا؟ کون قتل ہو گیا؟" عارج اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

مغلیہ افواج کے سپہ سالار خان زمان کی حویلی میں کسی کو قتل کر دیا جاتا یقیناً غیر معمولی بات تھی۔

ان لمحات کی سنسنی خیزی اپنی جگہ لیکن میں یہ نہیں بھولی کہ جن زادی ہوں اور ایک آدم زادی دل آرام کے قالب میں ہوں۔ مجھے عجلت سے کام نہیں لینا چاہئے اور میں نے یہی کیا۔ عارج نیام سے تلوار نکال کر دروازے کی طرف دوڑا۔ میں البتہ بظاہر خوفزدہ سی حویلی کے اس حصے سے نکل کر باہر آ گئی۔

کچھ ہی دیر میں یہ عقدہ کھل گیا کہ قتل ہونے والی ایک نوجوان کنیز تھی۔ اس کا قصور محض یہ تھا کہ وہ حویلی سے فرار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کوشش میں وہ ایک حبشی غلام کے ہاتھوں ماری گئی جو خان زمان کے حرم کی نگرانی پر مقرر تھا۔ مقتولہ کنیز کے بارے میں مزید یہ معلوم ہوا کہ اسے کہیں سے اغوا کیا گیا تھا۔ خان زمان کے ایک نائب فوجی افسر نے خوشنودی کی خاطر اسے خان زمان کو پیش کر دیا تھا۔ یہ تفصیلات جان کر مجھے بغداد کی فائقہ یاد آ گئی جس نے اپنی تقدیر سمجھ کر موسیٰ بن کعب کے حرم میں رہنا قبول کر لیا تھا۔ مقتولہ کنیز نے ایسا کیوں نہیں کیا' اس کی کئی وجوہ تھیں۔ ان میں سے بڑی وجہ اس کا نوجوان شوہر تھا جو مقتولہ سے محبت کرتا تھا۔ اس کی محبت میں اتنی شدت تھی کہ وہ ہر حال میں اپنی بیوی کو قبول کرنے پر

آمادہ تھا۔ اسی نے جان پر کھیل کر حویلی کے ایک خادم کو راضی کیا کہ وہ مقتولہ تک اس کا پیغام پہنچا دے۔ خادم کے ذریعے کچھ دنوں سے نامہ و پیام جاری تھے۔ اپنی بیوی کے عشق میں گرفتار اس نوجوان کو یاد نہ رہا کہ وہ ہاتھیوں سے گنے چھین رہا ہے۔ خادم ایک طرف تو اس نوجوان سے مال توڑتا رہا' دوسری جانب اپنی جان کے خوف سے حویلی کے نگران کو کنیز کے متوقع فرار سے آگاہ کر دیا۔ حویلی کے نگران نے ایک حبشی غلام کو حکم دے دیا کہ اگر مذکورہ کنیز فرار ہونا چاہے تو اس کی گردن مار دی جائے۔ کنیز کو فرار کرنے کی "سازش" میں ملوث نوجوان کے قتل کا بھی حکم ہوا۔

وہ دیوانہ عاشق جو اپنی بیوی کے انتظار میں حویلی کے اردگرد منڈلا رہا تھا' اس کے جسم کو بھی تیروں سے چھلنی کر دیا گیا۔

یہ واقعہ بڑی تیزی سے رونما ہوا۔ حصول معلومات کی خاطر میں دل آرام کے قالب سے نکل آئی تھی تاکہ اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لا سکوں۔ عارج کو قابو سے بے قابو ہوتے میں کیسے دیکھ لیتی اس لیے اسے گہری نیند سلا دیا۔

یوں تو جن زاد بھی جن زادیوں کیلئے پاگل ہو جاتے ہیں اور شر ان میں بھی ہے' مگر آدم زاد تو ہم جنات سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ کنیزوں' خواصوں' خادماؤں وغیرہ کی خرید و فروخت کا سبب یہی ہے۔

میں نے جس کنیز کے انسانی قالب کو اپنایا تھا' اس کی کہانی بھی بڑی دردناک تھی۔ اس کی داستان حیات بھی شاہم بیگ سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ دل آرام نے بھی بہت دھکے کھائے تھے۔ زندگی نے اس کے ساتھ بھی بڑا عجیب کھیل کھیلا تھا۔

دل آرام ایک عزت دار گھر کی بیٹی تھی۔ اس کی پیدائش ایک افغان گھرانے میں ہوئی۔ اس نے ٹھیک طرح ہوش بھی نہ سنبھالا تھا کہ یہ گھر اجاڑ دیا گیا اور اس کا گھر کیا' بستی کے تقریباً سارے ہی گھر اجڑ گئے۔ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب کابل پر بابر کا چچا زاد ناصر مرزا حکمرانی کر رہا تھا۔ بابر لڑتا بھڑتا کابل پہنچا تو سلطان ناصر مرزا نے اسے اپنے اخلاص و اطاعت کا یقین دلایا۔ اس کے بعد بابر نے یوسف زئی افغانوں کی سرکوبی کیلئے مختصر سی ایک جمعیت کے ساتھ ان کے علاقوں پر حملہ کیا۔ اس لڑائی میں تین ہزار افغان قتل ہوئے۔ اس کے علاوہ بکثرت عورتیں اور بچے پکڑ لیے گئے۔

قتل ہونے والوں میں دل آرام کے دو بھائی بھی تھے۔ لڑائی کے دوران میں اس

کی ماں یا تو ماری گئی یا بچ کر بھاگ گئی۔ اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ دل آرام دوسرے قیدی بچوں کے ساتھ زنداں میں ڈال دی گئی۔

بابر اس علاقے کو فتح کر کے اپنے ایک امیر خواجہ کلاں کے سپرد کر گیا تھا۔ خود بابر اب ہندوستان پر مسلنے کا قصد رکھتا تھا۔ ایک روز خواجہ کلاں نے زنداں کا معائنہ کیا تو ایک بھولی بھالی خوبصورت بچی اسے بہت پسند آئی۔ یہ دل آرام تھی۔ اس نے وہاں سے دل آرام کو کابل بھیج دیا۔ کابل میں اس کا ایک عزیز بے اولاد تھا۔ خواجہ کلاں نے سوچا کہ وہاں دل آرام کی پرورش بہتر طور پر ہو جائے گی۔ خواجہ کلاں کا خیال تھا کہ دل آرام جوان ہو جائے گی تو وہ اسے اپنے عزیز سے واپس لے لے گا' مگر ایسا نہ ہو سکا۔ نوجوانی ہی میں اس کے دامن پر داغ لگا دیا گیا۔ خواجہ کلاں کے عزیز نے اسے "مال غنیمت" جانا۔

دل آرام کو اسی دوران میں معلوم ہوا کہ اس کی ماں زندہ ہے اور وہ ہندوستان کی طرف بھاگ گئی ہے۔ وہ گھر سے فرار ہو گئی۔ پھر وہ مختلف لوگوں کے ہتھے چڑھتی رہی مگر اس نے ہندوستان پہنچنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس وقت دل آرام کو معلوم نہ تھا کہ ہندوستان کتنا بڑا ملک ہے۔ وہ ایک عرصے تک بھٹکتی رہی۔ ہندوستان اس وقت بابر کیلئے میدان جنگ بنا ہوا تھا اور وہ فتح پر فتح حاصل کر رہا تھا۔ 937 ہجری میں بابر نے وفات پائی اور ہمایوں تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اس وقت دل آرام دہلی کے نواح میں بھٹک رہی تھی۔ وہ قزاقوں کے پلے پڑ گئی۔ بلآخر قزاق پکڑے گئے۔ ان کے ساتھ ہی دل آرام بھی تھی۔

اس قدر مصائب و آلام سے گزرنے کے باوجود اس کا حسن ماند نہ پڑا تھا۔ سپاہیوں کے جس دستے نے قزاقوں کا قلع قمع کیا تھا اس نے دل آرام کو اپنے سالار کے سامنے پیش کیا۔ بوڑھا مغل سالار دل آرام کو دیکھ کر جیسے جوان ہو گیا۔ اس نے دل آرام کو حرم میں ڈال لیا۔ پھر کچھ دن بعد ہی جب وہ معتوب ہوا تو اس نے بطور رشوت مغل افواج کے سپہ سالار خان زمان کی خدمت میں دل آرام کو پیش کر دیا۔ اس کے قصور معاف کر دیئے گئے۔ دل آرام کو خان زمان نے اپنی کنیز بنا لیا۔ اس وقت سے اب تک دل آرام آگرے ہی میں تھی۔

خان زمان کو بھی دل آرام نے دل سے قبول نہ کیا تھا' ہاں اس نے اب زندگی سے مصالحت ضرور کر لی تھی۔ اسی دوران میں اس نے عارج کو شاہم بیگ کے انسانی پیکر میں دیکھا۔ عارج حویلی میں آتا جاتا رہتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنا دل ہار بیٹھی۔ عارج کے

انسانی قالب شاہم بیگ کیلئے دل آرام کے دل میں جو جذبات پیدا ہوئے وہ پہلے کسی مرد کی خاطر پیدا نہ ہوئے تھے۔ جلد ہی اس نے اپنی اس کیفیت کو سمجھ لیا۔ وہ عارج کو ہوس کی راہ پر چلانا نہیں چاہتی تھی۔ میں اسی عرصے میں دل آرام کے اندر پہلی بار داخل ہوئی۔ ہم جنات آدم زادوں کے جسموں میں اتر کر عموماً بے قراری محسوس کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ انسانی قالب عالم اضطراب میں بے مقصد جھومتا اور ہاتھ پیر چلاتا نظر آتا ہے' مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ جس قالب سے ہماری ہم آہنگی نہیں ہو پاتی' اسے چھوڑتے ہوئے قالب کو شدید جھٹکا بھی لگ سکتا ہے۔ کبھی کبھی اس انسانی قالب پر غشی بھی طاری ہو جاتی ہے۔ دل آرام کے پیکر سے میری ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اسی سبب اس وقت بھی ہوش نہ کھوتی جب میں اس کے جسم سے باہر آتی۔ اس کے جسم کو ہلکا سا قابل برداشت جھٹکا ضرور لگتا۔ سو جب میں چاہتی اس کے جسم پر قبضہ کر لیتی' جب مرضی ہوتی تو اسے چھوڑ کر چلی جاتی۔

میں نے ایک کام اور کیا کہ جب دل آرام کے جسم سے نکلتی وہ ساری باتیں اس کے ذہن میں بٹھا دیتی جو دینار کی حیثیت سے میں عارج سے کرتی۔ اس طرح یہ خطرہ ٹل گیا کہ اس وقت جب میں دل آرام کا انسانی پیکر نہ اپنائے ہوں تو وہ بے خبری میں عارج کی کسی بات پر حیران نہ ہو۔ دل آرام میری کی ہوئی باتوں کو اپنی باتیں سمجھتی۔

کچھ دن تو عارج محل کے بجائے خان زمان کی حویلی میں رہا' پھر محل میں اٹھ آیا۔ اس کے باوجود عارج کی اکثر راتیں اب بھی حویلی ہی میں گزرتیں۔ یہ الگ بات کہ جب وہ بہکنے لگتا تو میں اس پر نیند مسلط کر دیتی۔

دل آرام جیسی کوئی آدم زادی اب تک عارج کی زندگی میں نہ آئی تھی۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ جلد دل آرام سے جی بھر جائے گا' مگر یہ اندازہ غلط نکلا۔ دل آرام کا تو نشہ ہی مختلف تھا' دیرپا نشہ! یہ نشہ اترنے میں وقت لگتا۔ اس کی ایک وجہ دل آرام کی محبت بھی تھی۔ عشق و ہوس میں جنگ جاری تھی۔ دونوں ہی کو اپنی اپنی فتح کا یقین تھا۔

ادھر بساط سیاست پر ایک اور ہی نقشہ جما ہوا تھا۔ ہمایوں نے ایک بازی جیت لی مگر اس میں چھ ماہ لگ گئے۔ چنار کا قلعہ فتح ہو گیا۔ یہ خبر آگرے پہنچی تو بڑا جشن ہوا۔ ہمایوں نے دوسری بازی جمالی۔ اب اس کے مقابل شیر شاہ تھا۔ یہ بساط بنگال میں بچھی تھی۔ ہمایوں ہر قیمت پر یہ بازی بھی جیت لینا چاہتا تھا۔ وہ شیر شاہ کو شہ پر شہ دے رہا تھا۔ آخر شیر شاہ اپنے مہروں کو پیچھے ہٹانے پر مجبور ہو گیا۔ بنگال پر ہمایوں نے قبضہ کر لیا۔ بازی فیصلہ کن

مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔

ہماری ساری توجہ اسی بساط پر تھی کہ اس کے دونوں بھائیوں مرزا ہندال اور مرزا کامران نے نئی بساطیں بچھا لیں۔ ہمایوں کی توجہ بٹ گئی اور اس کا نتیجہ خراب نکلا۔ مرزا ہندال اور مرزا کامران نے ہمایوں کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا۔ پہلے ہندال نے اور گٹھ جوڑ کے بعد کامران نے باری باری اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ شیخ بہلول کو قتل کر دیا گیا۔ ہمایوں نے آگرہ اسی کے سپرد کیا تھا۔ ہندال اپنے بھائی کامران کو بادشاہ تسلیم کر کے الور چلا گیا۔ کامران نے آگرے میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوا دیا۔ اس پر سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ ہمایوں کے وفاداروں کو چن چن کر قتل کیا جا رہا تھا۔

عارج بھی ہمایوں کے وفاداروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس لیے اس پر بھی گویا برا وقت آ گیا۔ اس وقت اگر میں پس پردہ رہ کر عارج کی مدد نہ کرتی تو وہ مارا جاتا۔ اس کیلئے میں نے خان زمان کے خادم خاص برج علی کو استعمال کیا تھا۔ زلفوں کی گھنی چھاؤں سے اٹھ کر وہ ایک عرصے تک دھوپ کے صحرا میں بھٹکتا رہا۔ وہ اس حقیقت سے لاعلم ہی رہا کہ میں اس کے ساتھ ساتھ ہوں۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ شہرت کتنی خطرناک ہوتی ہے! عارج بھی اس سے بے خبر نہ رہا۔ وہ جو بھی سوچتا مجھ سے پوشیدہ نہ رہتا۔ عارج کا جی چاہتا کہ وہ شہر میں گھومے اور اس کے انسانی قالب شاہم بیگ کو کوئی نہ پہچانے۔

دل آرام خان زمان کی حویلی ہی میں رہی۔ میں اس کے جسم سے نکل آئی تھی۔ عارج کیلئے وہ دن رات تڑپتی مگر کسی سے کچھ نہ کہتی۔ کچھ باتیں بغیر کہے بھی سمجھ لی جاتی ہیں اس لیے اس کا عشق راز نہ رہ سکا۔

ہمایوں جو اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا بالآخر بے سروسامانی کے عالم میں آگرے پہنچ ہی گیا۔ ہمایوں کو اس کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ شیر شاہ اس پر حاوی آ گیا تھا اور یہی بڑی بات تھی کہ وہ جان بچا کر نکل آیا۔ شیر شاہ کے حصار سے نکلنے کیلئے ہمایوں کو ساتھ آٹھ ہزار مغل سپاہیوں کی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑا۔ یہ بات ممکن ہے آدم زادوں کو عجیب نہ لگتی ہو مگر مجھے اس پر ضرور حیرت ہوتی ہے کہ ایک آدم زاد کی زندگی کو ہزاروں آدم زادوں سے زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ میں جن زادی تو کیا بادشاہ اور کیا فقیر سب کی زندگی کو یکساں ہی تصور کرتی ہوں۔ قدرت نے شاہ و گدا سبھی کو پیدا کیا ہے پھر یہ فرق کیوں؟ لازماً یہ فرق آدم زادوں ہی کا پیدا کردہ ہے۔ آدم زاد جنہیں اشرف المخلوقات بنایا گیا۔ خوب ہے یہ اشرف المخلوقات بھی!

اقتدار کے حصول کی خاطر یہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اسی کی ایک مثال ہمایوں اور اس کے بھائی تھے۔

آگرے واپس آتے ہی ہمایوں کو اپنے بھائی کامران سے مقابلہ کرنا پڑا۔ بے سروسامانی کے باوجود کامران اس کے مقابلے پر نہ ٹھہر سکا اور ہزیمت اٹھا کر الور کی طرف بھاگ گیا۔

آگرہ شہر میں ہمایوں کی دوبارہ آمد سے عارج کی عید ہو گئی۔ وہ فوراً بادشاہ کے حضور پیش ہو گیا۔ ہمایوں نے اس پر التفات کیا اور دوبارہ اس کی سابقہ حیثیت بحال ہو گئی۔

دوسرے ہی دن خان زمان بھی اس سے ملنے آیا۔ خان زمان کے ساتھ دل آرام کو بھی دیکھ کر عارج کھٹک گیا۔ میں اب دل آرام کے جسم میں اتر چکی تھی۔ میں نے ہی یہ بندوبست کیا تھا کہ کسی خوف و خطر کے بغیر عارج کے ساتھ دل آرام کے انسانی قالب میں رہ سکوں۔ خان زمان کو میں نے اپنے اثر میں لے رکھا تھا۔ میں خان زمان کے عقب میں کھڑی تھی۔

خان زمان، عارج سے بغل گیر ہوا۔ عارج کے دل میں جو وسوسے پیدا ہو رہے تھے دور ہو گئے۔ اس نے بڑے عزت و احترام سے خان زمان کو اپنی مسند پر پہلو میں بٹھایا۔

میں ابھی تک دل آرام کے انسانی قالب میں اپنی جگہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ عارج کے وہم و گمان میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ وہ دینار جس سے اس نے عشق کیا ہے ایک کنیز دل آرام کے انسانی قالب میں چھپی ہو گی۔ مجھ پر اب تک یہ بات منکشف ہو چکی تھی کہ عارج اور میری پراسرار قوتوں میں خاصا فرق تھا۔ اس کی وجہ یہی ممکن تھی کہ میرا نے عارج سے پہلے مختلف عملیات کے ذریعے یہ قوتیں حاصل کر لی تھیں۔ اسی کے ساتھ یہ کہ تمام جنات آدم زادوں ہی کی طرح ایک سی اہلیت کے حامل نہیں ہوتے۔

معاً خان زمان نے مجھے مخاطب کیا۔ ''دل آرام تو اندر جا! جب ہم تیری ضرورت محسوس کریں گے تو تجھے طلب کر لیا جائے گا۔ ہم اس وقت خلوت چاہتے ہیں۔''

میں نے عارج کی طرف نگاہ اٹھائی۔ وہ بالکل اجنبی بنا بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ میں مصلحت وقت کے تقاضے کو سمجھ گئی اور خاموشی سے اندر والے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

یہ عارج کی نشست گاہ تھی جس کے بیرونی دروازے پر مسلح خدمت گار متعین تھے۔

دروازہ اتنی دور تھا کہ وہ خان زمان اور عارج کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سن سکتے تھے مگر میرے ساتھ ایسا نہ تھا۔ نشست گاہ سے نکلتے ہی میں نے اپنی سماعت کا دائرہ وسیع کر لیا تھا۔ اب میں دور رہ کر بھی عارج اور خان زمان کی آوازیں سن سکتی تھی۔ اپنے تصور کی قوت کو متحرک کر کے میرے لیے ان دونوں کو دیکھنا بھی ممکن تھا لیکن اس وقت میں نے یہ ضرورت محسوس نہیں کی' صرف آوازیں سننے پر اکتفا کیا۔

''شاہم!'' خان زمان کی آواز سنائی دی۔ ''آگرہ آ کر ہم نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا۔ چشم دید گواہ بھی ہمارے سامنے پیش ہوئے مگر ہم نے کسی کے کہے پر یقین نہیں کیا اور سیدھے تمہارے پاس چلے آئے۔ ہم تم سے تصدیق چاہتے تھے۔ دل آرام کو بھی ہم اسی لیے ساتھ لے کر آئے ہیں۔ ابھی ہم نے اس سے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ تم ہمیں بتاؤ شاہم کہ حقیقت کیا ہے؟ کیا واقعی تمہیں وہ کنیز پسند آ گئی ہے؟'' خان زمان کے لہجے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مصالحت چاہتا ہے۔ مبارزت نہیں۔

عارج نے اسی لیے فوراً اعتراف کر لیا۔

خان زمان نے عارج سے مجھے بلانے کیلئے کہا۔ میں حاضر ہو گئی تو خان زمان نے عارج کو مخاطب کیا۔ ''آج کے بعد دل آرام ہماری نہیں تمہاری ہے۔'' یہ کہہ کر خان زمان مجھ سے بولا۔ ''ہم تجھ پر اپنے حق سے دستبردار ہوتے ہیں۔ اب سے تیرا آقا و مولا شاہم ہے۔''

بطور شکریہ میں' خان زمان کے سامنے جھک گئی اور جب سیدھی کھڑی ہوئی تو اپنے محبوب پر نگاہ کی۔ عارج کی کیفیت سے اس کی خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ خان زمان اس پر اس حد تک مہربان ہو جائے گا۔

خان زمان نے پھر مجھے اندر جانے کا حکم دیا۔ میں جب نشست گاہ سے نکل گئی تو وہ عارج سے کہنے لگا۔ ''اگر تم براہ راست ہم سے عرض شوق کر دیتے تو مفسدوں کو لگائی بجھائی کا موقع نہ ملتا۔ خیر خاک ڈالو! ایک کنیز کیا تم پر تو ایسی ہزاروں کنیزیں ہم صدقہ کر سکتے ہیں۔''

اس کے بعد خان زمان وہاں زیادہ نہ رکا۔

شاہم بیگ کو خان زمان نے اپنی ایک کنیز پیش کر دی ہے' یہ بات ہمایوں سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔ ملا پیر محمد اور خان خاناں بیرم خان کے دوسرے مخالف امراء نے اس واقعے کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہا۔ پیش پیش ملا پیر محمد ہی تھا۔

خان زمان پر کوئی حرف آتا اس سے بیرم خان ہی متاثر ہوتا۔ ملا پیر محمد ذاتی طور پر بھی عارج سے خوش نہیں تھا۔ ملا کی تاکید کے باوجود اس نے خان زمان سے ملنا جلنا نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے خیال میں عارج مخالفوں کا آلہ کار بن گیا تھا۔ اس نے کئی بار عارج کی وفاداری آزمانے کیلئے کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ عارج ٹال مٹول کر جاتا۔ ملا پیر محمد نے عارج کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے جو سوچا تھا' وہ پورا نہ ہو سکا۔ عارج اس کا مہرہ نہیں بنا۔ ملا سے وہ کھنچا کھنچا سا رہتا۔ اس پر ملا بہت پچھتاتا۔ وہ عارج کے ذریعے بادشاہ کو اپنے حق میں استوار کرنے کا آرزومند تھا تاکہ خان خاناں اور اس کے حلیفوں پر بھرپور ضرب لگا سکے۔ ملا پیر محمد کا سوچا پورا نہ ہوا۔ سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنا اس کا شیوہ نہ تھا۔ وہ موقع کا منتظر رہا کہ عارج کو سبق سکھائے۔ عارج کے خلاف وہ اب تک اور بہت سی باتیں جمع کرتا رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً موقع دیکھ کر مختلف ذرائع سے ملانے یہ باتیں بادشاہ تک پہنچائی تھیں' مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ عارج کا طوطی اسی طرح بولتا رہا۔ ''دل آرام'' کے واقعے نے ایک بار پھر ملا پیر محمد کو اکسایا۔ اسے کچھ امید بندھی کہ شاید اس بار اس کا تیر خطا نہیں ہو گا۔ اس معاملے میں خان زمان بھی ملوث تھا اس لیے اسے دوسرا رنگ دیا جا سکتا تھا۔ انہی حالات کے پیش نظر ملا پیر محمد نے اس بار بادشاہ سے خود بات کی۔

ملا پیر محمد نے بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ خان زمان اور عارج کے باہمی ربط ضبط کسی گہری سازش کا شاخسانہ بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان سے بادشاہ کیلئے کوئی خطرہ ہو سکتا ہے۔

ہمایوں نے بڑے تحمل کیساتھ ملا پیر محمد کی باتیں سنیں اور پھر اسے دم دلاسا دے کر رخصت کر دیا۔ ہمایوں ذہن رسا کا مالک تھا' اسے بات کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ حقائق سے قطع نظر پیر محمد اس واقعے کو کیا رنگ دینا چاہتا ہے' وہ سمجھ گیا۔ اس کی نظر میں یہ خطرناک بات تھی۔ داخلی طور پر اس وقت انتشار اس کیلئے نئے مسائل پیدا کر سکتا تھا۔ اسے موجودہ حالات میں ملا پیر محمد جیسے سازشی ذہن رکھنے والوں کی بھی ضرورت تھی تیز خان خاناں جیسے وفاداروں اور جانثاروں کو بھی وہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ رہا عارج تو اس کی خدمت گزاری سے وہ خوش تھا۔ اسے اب تک کوئی ایسا خادم خاص نہیں مل سکا تھا جو اس کے مزاج و عادات اور پسند و ناپسند کا اتنا خیال رکھ سکے۔ یہ صرف اس کا معاملہ تھا جو کسی اور کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔ ہمایوں کو اس وقت تک صورتحال کا اندازہ نہیں تھا۔ عارج کے انسانی قالب شاہم بیگ کی بدمزاجی اور بدسیرتی سے وہ ناواقف تھا۔ اسی لیے اس نے اپنی افواج کے سپہ سالار اور اپنے

خادم خاص کے مراسم کو نظر انداز کر لیا اور اس معاملے کو دبا دیا۔

عارج کو بھی یہ خبر ہو گئی کہ بادشاہ تک اس کی شکایات پہنچی ہیں۔ پہلے وہ فکرمند ہوا لیکن جب بادشاہ نے اس سے کچھ نہ کہا تو الٹا اثر ہوا۔ وہ بے تکیل ہو گیا۔ اس کی بدمزاجی اور بدسیرتی پہلے کی نسبت اور بڑھ گئی۔ شاہم بیگ کی منفی صفات کا غلبہ زیادہ ہو گیا۔ میں حالات پر پوری نظر رکھے ہوئے تھی۔ وہ اب مجھے بھی منہ نہ لگاتا۔ چوری چھپے کی ملاقاتوں میں جو لطف تھا وہ عارج کے نزدیک جاتا رہا۔ وہ جب چاہتا کسی بھی بہانے مجھے ذلیل کر دیتا اور جب جی میں آتا مجھے خلوت میں آنے کی اجازت دے دیتا۔ میرے انسانی قالب دل آرام نے عارج کے انسانی پیکر شاہم بیگ سے عشق کیا تھا' اسے چاہا تھا' اسے روحانی آسودگی کی ضرورت تھی جو نہ مل سکی۔ اپنے انسانی قالب کے مزاج کا چڑچڑا پن مجھے بھی محسوس ہوا۔ یہی حال دوسری جانب تھا۔

☆.... ☆.... ☆

ایک دن کیا ہوا کہ عارج نے ذرا سی بات پر ساغر کھینچ مارا۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ حد سے زیادہ بے نوشی صحت کیلئے مضر ہے۔ عارج آپے سے باہر ہو گیا' بولا۔ "تو دو ٹکے کی لونڈی مجھے نصیحت کرے گی!"

بلوری ساغر میرے سر پر لگا اور کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔ میں اس صدمے سے چکرا کر فرش پر گر پڑی۔ عارج کے دوسرے خدمتگار مجھے وہاں سے اٹھا لائے۔ میں دل آرام کے قالب سے نکل آئی۔ مقصد اس تکلیف سے بچنا تھا جو سر پر چوٹ لگنے سے شروع ہوئی تھی۔

مجھے عارج پر ذرا بھی غصہ نہ آیا کیونکہ وہ اپنے قابو ہی میں کب تھا۔

اس واقعے کو ہفتہ بھر نہ گزرا تھا کہ ایک دن صبح عارج کو خبر ملی کہ عبدالرحمٰن نامی کوئی شخص اس سے ملنے آیا ہے۔ جب سے شاہم بیگ کی منفی صفات عارج پر حاوی ہوئی تھیں' اس میں ایک اور پراسرار تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ مجھے اس کا تجربہ نہیں ہوا۔ وہ عجیب تبدیلی شاہم بیگ سے متعلق تھی۔ شاہم بیگ کے حافظے میں جو کچھ بھی تھا' عارج کو معلوم ہو گیا تھا۔ اس کا سبب غالباً سینکڑوں صدیوں کا سفر تھا۔ ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں جا کر ممکن ہے کچھ حیران کن تبدیلیاں ناگزیر ہوں۔ میں نے یہ سوچ کر خود کو اطمینان دلایا' مگر حتمی طور پر کوئی رائے قائم کرنا میرے لئے بھی مشکل تھا۔

عارج اسی بنا پر عبدالرحمٰن کو پہچان گیا۔ اس نے خبر لانے والے خدمتگار سے کہا۔ "اگر وہ مفلوک الحال شخص اپنا نام عبدالرحمٰن ہی بتاتا ہے اور وہ سنبھل سے آیا ہے تو اسے فوراً ہمارے حضور میں پیش کیا جائے۔"

خدمتگار تعظیماً سر جھکا کر باہر چلا گیا۔

شاہم بیگ کے دوستوں اور محسنوں میں ایک عبدالرحمٰن ہی ایسا بچا تھا جس کا قرض

اس پر باقی تھا ورنہ تو عارج نے کبھی کے احسان اتار دیئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے سنبھل جانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اب خود عبدالرحمٰن شاہم بیگ کو تلاش کرتا ہوا آ گیا تھا۔ عبدالرحمٰن ایک معمولی لکڑہارا تھا جس نے برے وقت میں شاہم بیگ کی مدد کی تھی۔ عارج نے اسی لئے اسے فوراً بلوا لیا۔ ملاقات کی اجازت دینے کا ایک سبب نمود و نمائش بھی تھا۔ وہ عبدالرحمٰن کو مرعوب بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے یہ خیال بھی تھا کہ عبدالرحمٰن بہ مجبوری ہی اس کے پاس آیا ہوگا۔ ایک ہی جسم میں ایک جن زاد اور آدم زاد کی متصادم صفات اپنا اثر دکھا رہی تھیں۔ عارج اسی وجہ سے نہ تو محض جن رہا تھا' نہ آدمی بن پایا تھا۔ وہ اپنے اندر اور باہر سے خاصا بدل چکا تھا۔ عبدالرحمٰن سے وہ حقیقتاً مخلص نہ تھا۔ اس کے خیال میں عبدالرحمٰن کا قرض اس لئے اتارنا ضروری تھا کہ پھر کوئی شخص ایسا باقی نہ رہتا جس کے سامنے اس کی نظر نیچی ہوتی۔

جب عارج کے خدمتگاروں نے عبدالرحمٰن کو نشست گاہ میں لا کر بٹھا دیا تو اسے اطلاع دی۔ عارج سے میں زیادہ دور نہیں تھی مگر اس قدر قریب بھی نہیں کہ مجھے وہ دیکھ لے۔ میں اب دل آرام کے جسم میں تھی۔ دور رہ کر بھی میں اس پر قادر تھی کہ عارج پر نظر رکھ سکوں۔ میری توجہ عارج کے دماغ پر تھی۔ عبدالرحمٰن کی آمد کے بعد وہ کچھ سوچنے لگا۔ اسے وہ وقت یاد آ رہا تھا جب بہادر خاں کے سامنے اس کی پیشی ہوئی تھی۔ خدمتگار مودب کھڑا رہا اور وہ سوچتا رہا۔

ہر چند کہ عبدالرحمٰن اور اس کی حیثیت میں بڑا فرق تھا مگر اس نے خدمتگار کو وہی حکم دیا جو حکم اس کیلئے بہادر خاں نے دیا تھا۔ خادم حکم سن کر الٹے قدموں واپس چلا گیا۔

بہادر خاں نے اسے زنداں سے نکلوا کے اپنی حویلی میں بلایا تھا اور عبدالرحمٰن خود چل کر اس کے پاس پہنچا تھا۔ دونوں میں صرف ایک قدر مشترک تھی وہ یہ کہ اس وقت عارج بہادر خاں کے رحم و کرم پر تھا اور اس وقت عبدالرحمٰن اس کی عنایتوں کا متمنی!

عارج سوچنے لگا کہ جب عبدالرحمٰن کو گلاب کا عطر ملے ہوئے پانی میں نہلایا جائے گا' اس کے جسم پر مختلف روغنوں کی مالش ہوگی اور اسے بہترین پوشاک پہننے کو دی جائے گی تو اس کا کیا حال ہوگا!؟ اس معمولی لکڑہارے نے کبھی یہ سوچا ہوگا کہ شاہی محل میں اس کی یوں پذیرائی ہوگی؟

دن بھر عارج دانستہ عبدالرحمٰن سے نہ ملا اور روز کے معمولات میں مصروف رہا۔

اس کے حکم پر عبدالرحمٰن کو مہمان خانے میں ٹھہرا دیا گیا تھا۔ محل کا جو حصہ اس کے تصرف میں تھا' خاصا وسیع و عریض تھا۔ وہ چاہتا تو آگرہ شہر میں کوئی حویلی خرید سکتا تھا مگر نہ اس کی مرضی تھی' نہ اس کے فرائض اسے یہ اجازت دیتے تھے۔ بادشاہ کے خادم خاص کا محل میں رہنا ہی ضروری تھا۔ ہمایوں کسی بھی وقت اسے طلب کر لیتا تھا۔

شام ہوئی تو عارج نے کئی دن گزر جانے کے بعد مجھے اپنے پاس بلایا۔ "آرائش و زیبائش کے باوجود میں نے اپنے انسانی قالب کے چہرے پر جان بوجھ کر اداسی طاری کر لی۔ عارج کے سامنے میں نظر جھکائے کسی مجرم کی طرح کھڑی تھی۔ مجھ سے نہیں میرے انسانی پیکر دل آرام سے واقعی ایک جرم سرزد ہوا تھا۔ مجھے اس کا احساس تھا' دل آرام کا جرم محبت تھی۔ وہ بے خبر تھی کہ پتھر میں جونک نہیں لگتی۔ عارج نے میرے انسانی چہرے پر نظر جماتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ "بول تیرا دماغ ابھی درست ہوا یا نہیں؟"

میں نظر جھکائے رہی اور بولی۔ "کنیز اپنی حیثیت بھول گئی تھی' حضور سے اپنے قصوروں کی معافی چاہتی ہے' آئندہ کبھی حد ادب سے تجاوز نہیں کرے گی۔"

"سن! ہمارا ایک یار قدیم آیا ہے' ہم چاہتے ہیں کہ آج تو ساقی بنے' مہمان نوازی میں کسی کوتاہی کو ہم معاف نہیں کریں گے۔"

"کنیز! حضور کا حکم بجا لائے گی۔" میں بولی۔ مجھے احساس تھا کہ ایک کنیز کے انسانی قالب میں رہ کر کیا الفاظ استعمال کرنے ہیں۔

"اب تو جا سکتی ہے۔"

اجازت ملتے ہی میں الٹے قدموں دروازے تک پہنچی۔ جب میں دروازے سے نکلی تو دل آرام کا شاہم بیگ سے عشق مجھ پر گویا مسلط ہو گیا۔ اسی کے زیر اثر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اپنی کیفیت لفظوں میں منتقل کرنا میرے لئے پوری طرح ممکن نہیں۔ اگر عارج اپنے قابو میں نہیں تھا تو مجھ پر بھی دل آرام کے قالب کا اثر تھا۔ میں نے اسی حالت میں نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا اور تیز تیز قدموں سے ایک طرف بڑھ گئی۔ دل آرام محبوب سے دوبارہ کنیز بنا دی گئی تھی اور اس نے حالات کی اس نئی کروٹ کو قبول کر لیا تھا۔ آنسو اسی نئی کروٹ کو قبول کرنے کا اظہار تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کسی بھی حیثیت سے وہ اپنے محبوب کے قریب تو رہ سکے گی' اسے دیکھ تو سکے گی' میں نے اس کا جسم چھوڑ دیا تھا۔

عارج نے بھی دل آرام کی بدلی ہوئی کیفیت کو محسوس کر لیا۔ وہ اس سے یہی سمجھا

کہ دل آرام کے سہارے کس بل نکل گئے ہیں' اپنی "دانشمندی" پر وہ مسکرایا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اندھیرے کی چادر اوڑھے ہوئے اس کے قریب ہی تھی۔ عارج نشست گاہ میں پہنچا تو خادم اسے دیکھ کر مستعد ہو گئے۔ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق تھا۔ اس نے عبدالرحمٰن کے بارے میں دریافت کیا۔ اسے بتایا گیا کہ بار بار عبدالرحمٰن اسی کے متعلق پوچھ رہا ہے اور کہتا ہے کہ ملاقات کب ہوگی؟

یہ سن کر عارج مسکرایا اور مسند پر جا بیٹھا۔ اس نے نشست گاہ میں چاروں طرف نظر دوڑائی پھر بڑبڑایا۔ "بس اب دل آرام کی کمی ہے۔"

حقیقت یہی تھی کہ عارج کی آدم زاد کنیزوں میں دل آرام جیسی حسین کنیز کوئی نہ تھی۔ مگر عارج کے انسانی پیکر شاہم بیگ کا تصورِ حسن مختلف تھا۔ وہ حیا کے بجائے بے حیائی کو عورت کا حسن سمجھتا تھا۔ اس آدم زاد کا حیوان بہت قوی ہو گیا تھا اور عارج اسی کے اشاروں پر ناچنے کیلئے مجبور تھا۔ عارج کے حکم پر جب دل آرام بھی صراحی و ساغر کے قریب کھڑی ہوئی تو اس نے عبدالرحمٰن کو بلوایا۔

عبدالرحمٰن بہترین ریشمی پوشاک پہنے نشست گاہ میں پہنچا تو اس کی حالت نیم پاگلوں کی سی تھی۔ جس شے پر اس کی نظر پڑتی' اسے دیکھتا رہ جاتا۔ اسے دیکھ کر خدمت گاروں کے چہرے ہنسی روکنے کی کوشش میں سرخ ہو گئے۔ عارج نے صورتحال بھانپ لی اور اشارے سے خدمتگاروں کو رخصت کر دیا۔

یہ آدم زاد بھی خود کو جانے کیا سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ہم جنات میں اتنی اونچ نیچ نہیں' غریب اور امیر کا یہ تضاد مجھے آدم زادوں ہی میں نظر آیا۔ غالباً اس کی وجہ آدم زادوں میں مال و منال کا لالچ ہے۔

عارج کی مسند کے عین اوپر چھت سے فانوس لٹک رہا تھا۔ اب عبدالرحمٰن کی نگاہ اس فانوس پر تھی۔ فانوس کے شیشے رنگ برنگے تھے' ان کی وجہ سے روشنی مختلف رنگوں میں منعکس ہو رہی تھی۔

"عبدالرحمٰن! یہاں ہم بھی ہیں۔" عارج نے اسے مخاطب کیا تو وہ اچھل پڑا۔

"شاہم بیگ!" عبدالرحمٰن حیرت زدہ آواز میں بولا پھر مسند کی طرف دوڑا۔

دراصل عبدالرحمٰن کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے سامنے عارج کا انسانی قالب شاہم بیگ ہی ہے اور وہ کوئی حسین خواب نہیں دیکھ رہا۔ شاہم بیگ کو برسوں پہلے اس نے

جس حال میں دیکھا تھا اب وہ حال نہ تھا۔ عبدالرحمٰن کو حیرت زدہ و دہشت زدہ دیکھ کر عارج مسکرا رہا تھا۔

مسند کے قریب پہنچ کر عبدالرحمٰن رک گیا اور عارج کے انسانی چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔

"تم..... تمہی شاہم ہو..... شاہم ہو نا!" عبدالرحمٰن بے یقینی سے بولا۔

میری توجہ عبدالرحمٰن کے ذہن پر تھی۔ اس نے صرف یہ سنا تھا کہ شاہم بیگ بادشاہ ہمایوں کا خادم خاص بن گیا ہے۔ نہ اسے یہ خبر تھی کہ بادشاہ کس عیش میں زندگی بسر کرتا ہے اور نہ یہ معلوم تھا کہ جو لوگ بادشاہ کے مقرب و مصاحب ہوتے ہیں' ان کی شان و شوکت کیا ہوتی ہے۔ اس کی دہشت زدگی کا سبب یہی تھا۔

عارج کافی لطف لے چکا تھا اس لئے عبدالرحمٰن کو مزید نہیں ستایا اور اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ عارج سے گفتگو کر کے عبدالرحمٰن جلد ہی اپنے حواسوں میں آ گیا مگر دل آرام پر اس کی نظر پڑی تو پھر حواس کھو بیٹھا۔

دل آرام مسند سے دور ایک گوشے میں تصویر بنی کھڑی تھی۔ عبدالرحمٰن نے اٹک اٹک کر عارج سے کہا۔ "کیا..... وہ تمہاری ملکہ ہے؟"

عارج ہنس پڑا اور بولا۔ "وہ میری ملکہ نہیں کنیز ہے..... خادمہ..... نوکرانی۔" اس کا انداز سمجھانے کا سا تھا۔ "ایک اشارے میں کھنچی چلی آئے گی۔" عبدالرحمٰن نے دل آرام پر نظر جمائے ہوئے اشتیاق سے کہا۔ "تو پھر اشارہ کر دو اسے۔"

عارج نے دل آرام کو اشارہ کیا' وہ اشارے کی منتظر ہی کھڑی تھی۔ اس نے جھک کر قریب رکھا ہوا چاندی کا خوب صورت طشت اٹھایا۔ طشت میں صراحی' ساغر اور دیگر آلات مے نوشی رکھے تھے۔ وہ قدم قدم چلتی مسند تک پہنچی اور ادب و سلیقے سے طشت کو مسند پر رکھ دیا پھر خود بھی دو زانو بیٹھ گئی۔

عبدالرحمٰن کی نگاہ دل آرام ہی پر جمی رہی' وہ دو ساغروں میں شراب انڈیل کر انہیں باری باری عبدالرحمٰن اور عارج کو پیش کر کے اپنی جگہ جا کھڑی ہوئی۔ عبدالرحمٰن کی حیرت کچھ کم ہوئی تو اس نے ساغر سے پہلا گھونٹ لیا۔

مے نوشی کے دوران میں عارج نے عبدالرحمٰن سے اس کی آمد کا سبب دریافت کیا۔

عبدالرحمٰن نے مختصراً اپنی روداد بیان کر دی۔

معاشی طور پر عبدالرحمٰن اتنا تباہ ہو چکا تھا کہ فاقوں پر نوبت آ گئی تھی۔ اس نے اپنے بڑے بھائی سوید بیگ سے مدد چاہی۔ سوید بیگ لالچی آدمی تھا' اس نے بھائی کی مدد تو کر دی مگر شاہم بیگ کا طعنہ بھی دیا۔ سوید بیگ پہلے بھی کئی بار کہہ چکا تھا کہ وہ آگرے چلا جائے اور شاہم بیگ پر اپنا احسان جتائے۔ عبدالرحمٰن ہر چند کہ غریب اور ضرورت مند تھا مگر اس کی غیرت یہ گوارا نہ کرتی تھی۔

امیر آدم زادوں کے مقابلے میں' میں نے غریبوں کو زیادہ غیرت مند پایا۔

کہتے ہیں اور شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ غرض باؤلی ہوتی ہے' پیٹ روٹی مانگتا ہے' کسی خالی پیٹ آدم زاد کا پیٹ محض باتوں اور سنہرے خوابوں سے نہیں بھر سکتا۔ سو ایک دن عبدالرحمٰن بھی اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا۔ وہ خود بھوکا رہ سکتا تھا مگر اپنے گھر والوں کو بھوکا رکھنے پر آمادہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ کہ خالی پیٹ نے غیرت کو بھی اپنی خوراک بنا لیا اور وہ آگرے آ گیا۔

عارج نے اس کی روداد سن کر کہا۔ ''اچھا ہوا تم یہاں چلے آئے' میں تمہیں سنبھل کے قریب ہی کوئی جاگیر دلوا دوں گا۔''

''مجھے کوئی جاگیر نہیں چاہئے' میں تو یہیں تمہارے پاس رہوں گا۔''

وقت اور حالات آدمی کو سب کچھ سکھا دیتے ہیں' چند ہی راتوں میں عبدالرحمٰن کو معلوم ہو گیا کہ جاگیر کیا ہوتی ہے اور جاگیردار کسے کہتے ہیں؟ وہ راضی ہو گیا اسی کے ساتھ اس نے عارج سے عاجزانہ درخواست کی کہ دل آرام کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ عارج نے یہ بات اس لئے مان لی کہ دل آرام سے اب اس کا دل بھر گیا تھا' جذبات کا چڑھا ہوا دریا اب اتر چکا تھا۔

جس دن دل آرام کو یہ خبر ہوئی اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ اتنا روئی کہ بچپن میں باپ اور بھائیوں کے قتل اور ماں کے بچھڑ جانے پر بھی اس قدر نہ روئی تھی۔ افغانستان کے طور طریقے بھلا کر اب وہ ہندوستانی ہو گئی تھی لیکن اسے یہ سرزمین بھی راس نہیں آئی تھی۔

اب دل آرام کا سنگ دل محبوب اسے اپنے دیدار سے بھی محروم کرنے والا تھا۔ رونے سے اس کے دل کا غبار کچھ کم ہوا تو اسے عبدالرحمٰن پر غصہ آنے لگا۔ اسی غصے کا نتیجہ تھا کہ اس نے اپنے محبوب کا بھی خیال نہ کیا اور اس کے حضور بے ادبی کی مرتکب ٹھہری۔

دل آرام سے یہ بے ادبی ہوئی تھی کہ اس نے عبدالرحمٰن کے عقد میں جانے سے انکار کر دیا تھا۔

عارج اپنے انسانی قالب کے آگے بے بس تھا سو اس نے نشے میں وحشت ہو کر دل آرام کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور عبدالرحمٰن کے قدموں میں ڈال دیا۔ اسی شب زبردستی عبدالرحمٰن سے دل آرام کا نکاح ہو گیا' کچھ ہی روز میں عارج نے سفارش کر کے عبدالرحمٰن کو جاگیر دلا دی اور وہ دل آرام کو لے کر اپنی جاگیر میں چلا گیا۔

دل آرام کو آگرہ شہر سے گئے چھ ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ عارج نے اب اسے بالکل بھلا دیا تھا۔ عارج کسی کو بھولتا کہ یاد رکھتا لیکن ملا پیر محمد نے اسے نہیں بھلایا تھا۔ اس عرصے میں ملا پیر محمد نے عارج کو اتنا بدنام کرا دیا کہ ہمایوں بھی اس سے کھنچا کھنچا سا رہنے لگا۔ ہفتوں ہمایوں اسے اپنی خدمت میں طلب نہ کرتا۔ اس کے نتیجے میں عارج کا زیادہ جھکاؤ خان زمان کی طرف ہو گیا۔ خان زمان مغل افواج کے معاملات سلجھانے اور انہیں میدان جنگ میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھانے پر تو تیار کر سکتا تھا مگر سیاست اسے نہیں آتی تھی۔ صاحب علم ہونے کی بنا پر اس کے مزاج میں فقر بھی شامل تھا۔ فقر کی معراج بے نیازی ہے۔ سو خان زمان اس سے بے نیاز تھا کہ مخالفین اسے کیا نقصان پہنچا دیں گے وہ جس سے بھی ملتا' اس میں ریاکاری شامل نہ ہوتی اس کا یہی معاملہ عارج کے ساتھ تھا۔ بادشاہ تک اب کوئی بات پہنچانے کا ذریعہ عارج نہیں رہا یا بادشاہ ان دنوں عارج سے ناراض ہے اور ملا پیر محمد نے عارج کو کہیں کا نہیں رکھا' ان تمام باتوں سے خان زمان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنی بے نیازی کی بنا پر جس طرح پہلے عارج سے ملتا تھا اسی طرح کیا۔ اس سے زیادہ گرم جوشی کے ساتھ ملا۔ یوں گویا وہ اپنی دانست میں عارج کی محرومی اور دکھوں کا مداوا کر رہا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے خان زمان کی عقل ماری گئی ہو' وہ عارج کی دل دہی کی خاطر اس کے سامنے زمین پر بچھا جاتا جس طرح بادشاہوں کے سامنے تواضع اور خاکساری کا اظہار ہوتا ہے اس طرح خان زمان' عارج کی تعظیم کرتا اس کے دل میں بس ایک بات سما گئی تھی کہ عارج کو ملول نہیں ہونا چاہئے۔ اور یہ کہ ہمایوں کی عارج سے خفگی عارضی ہے۔ وہ اسی لئے خلوت میں ''شاہم بیگ'' کو مسند پر بٹھا کر خود دست بستہ اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور ''شاہم! شاہم!'' کہتا رہتا۔

ملا پیر محمد نے عارج کے لئے ہر طرف جال پھیلا رکھا تھا' اس غرض سے اس نے

خان زمان کے کچھ خدمتگاروں کو سانٹ لیا۔ گھر کے بھیدیوں نے ملا پیر محمد کے ایما پر اور جاں بخشی کا وعدہ لینے کے بعد ہمایوں کے سامنے ''چشم دید گواہی'' دی۔

ہمایوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ خان زمان اور عارج پر وہی پرانا الزام لگایا گیا کہ وہ بادشاہ کے خلاف سازش میں ملوث ہیں۔ بادشاہ کے خادم خاص کو خان زمان نے گویا اپنا خادم بنالیا ہے اور اس کے ذریعے دیگر امراء کو بھی اپنے حق میں استوار کر رہا ہے۔

ہمایوں ایک مطلق العنان حکمران ہونے کے ناتے ردعمل کے طور پر عارج کے انسانی قالب کی کھال بھی کھنچوا سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا اس کی بڑی وجہ میں تھی۔ ہمایوں نے اسی لئے ایک ''سازشی'' کے واسطے جو حکم دیا' قدرے نرم تھا۔ عارج کی جگہ کوئی اور ہوتا یا میں نے اس معاملے میں مداخلت نہ کی ہوتی تو فوراً عارج کے انسانی پیکر شاہم بیگ کی گردن مار دی جاتی۔ ہمایوں نے ''شاہم بیگ'' کے لئے صرف آگرے سے اخراج کا حکم دیا تھا۔ ہمایوں نے یہی حکم کیوں دیا' اس سے محض میں واقف تھی۔

میں تو اس قصے کو ختم کرانا چاہتی تھی مگر عارج کی حد سے بڑھی ہوئی نخوت آڑے آئی۔ اس نے سوچا مغلیہ افواج کے سربراہ کو ہمایوں ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے گا اسی بنا پر اس نے شاہی محل سے نکل کر خان زمان کی حویلی میں پناہ لے لی۔ میرے نزدیک بھی عارج کا آگرہ بدر ہونا مناسب نہیں تھا اس لئے مجھے خان زمان پر اثر انداز ہونا پڑا۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو یقیناً خان زمان کی آنکھیں کھل جاتیں اور وہ ایک معتوب کو پناہ نہ دیتا۔

عارج کو یہ غلط فہمی بھی تھی کہ ہمایوں وقتی طور پر اس سے ناراض ہوگیا ہے اور کچھ دن میں اس کا غصہ اتر جائے گا تو پھر محل میں بلوا لے گا۔ خان خاناں بیرم خاں نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ نہ سمجھا۔ جتنا بھی کہیئے میں اسے کس طرح بیرم خاں کی نصیحت ماننے دیتی۔

مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ ان بڑے عہدے والے آدم زادوں پر کیا گزرے گی' میں تو بہرصورت عارج کو بچانا چاہتی تھی۔ اگر میں اس کی زندگی کیلئے کوئی خطرہ محسوس کرتی تو اس پر ظاہر ہو جاتی پھر اسے اس زمانے سے فرار کرا کے کہیں اور لے جانا میرے لئے مشکل نہ ہوتا۔ میں عارج کی طرف سے پوری طرح چوکنا تو تھی مگر زیادہ فکرمند نہیں' اسے آگرہ شہر سے کسی دوسری جگہ بھی جانا پڑتا تو میں سایہ بن کر اس کے ساتھ رہتی۔

اس عرصے میں ملا پیر محمد کی تحریک پر ہمایوں نے اپنے حکم کی تعمیل کے لئے خان زمان پر ایک دستے کو متعین کر دیا۔ پانی سر سے اونچا ہوگیا تو خان خاناں بیرم خاں کو حرکت

میں آنا پڑا۔ وہ اب خاموش تماشائی بنا ہوا نہیں رہ سکتا تھا۔ بیرم خاں پہلے ہمایوں سے ملا اور اسے یقین دلایا کہ اس کے حکم کی تعمیل ہوگی۔ خان زمان کی حویلی پر جو دستہ مقرر کیا گیا ہے اسے ہٹالیا جائے۔

ہمایوں اپنے باپ بابر کے زمانے سے بیرم خاں کی بڑی عزت کرتا تھا۔ یقین دہانی پر یہ معاملہ اس کے سپرد کر دیا۔ اسی دن خان زمان کی حویلی کا گھیراؤ ختم ہوگیا۔ بادشاہ کی طرف سے متعین دستہ ہٹ گیا۔ اس کے بعد ہی بیرم خاں نے خان زمان کو طلب کیا۔ معاملہ یہ رنگ اختیار کر جائے گا' اس کا اندازہ خان زمان کو نہیں تھا۔ وہ تو اپنی زندگی سے اسی وقت مایوس ہو گیا تھا جب اس کی حویلی کو سپاہیوں نے بادشاہ کے حکم پر گھیر لیا تھا۔ حویلی سے سپاہیوں کو ہٹالیا گیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ اقتدار کے کھیل میں کسی بھی مرحلے پر کوئی بھی اپنی جان کی بازی کہیں بھی ہار سکتا ہے' یہ اسے پتہ تھا۔ اسے عقل آگئی کہ ذرا سی حماقت سے ساری عمر کی کارگزاریوں پر پانی پھرا جارہا ہے۔ اب اسے میں نے اپنے اثر سے آزاد کر دیا تھا کہ اس نے بہرحال ہر مرحلے پر عارج کا ساتھ دیا تھا۔

خان خاناں بیرم خاں' خان زمان کے لئے سپر بن گیا تھا جب خان زمان کو حقیقت کا علم ہوا تو وہ رو دیا۔ یہ وہی شخص تھا جس کی نصیحت قبول کرنے پر وہ راضی نہیں ہوا تھا اور یہ وہی تھا جسے وہ اپنے باپ کے برابر درجہ دیتا تھا۔ خان خاناں بیرم خاں! یہی وجہ تھی کہ بیرم خاں نے اسے طلب کر کے جو مشورہ دیا' اس نے فوراً مان لیا۔

رات کے وقت اپنے بااعتماد سپاہیوں کے ایک دستے کو خان زمان نے تیاری کا حکم دیا اور پھر اسی دستے کے ساتھ عارج کو روانہ کر دیا۔

خان زمان اپنے کیے پر اس قدر شرمندہ تھا کہ اس نے بادشاہ سے اپنے قصور کی معافی کیلئے بیرم خان کو ذریعہ بنایا۔ اسے اب اپنے اس قصور کا احساس ہوگیا کہ جس کو بادشاہ نے آگرہ بدر ہونے کا حکم دیا تھا اسے اپنی حویلی میں نہیں رکھنا چاہئے تھا اس آدم زاد کو یہ خبر نہیں تھی کہ وہ ایک جن زادی یعنی میرے اثر میں تھا۔

خان زمان نے ملا پیر محمد کے پاس بھی اپنے ایک مقرب ملازم برج علی کو بھیجا کہ ملاقات کر کے باہمی رنجش دور کر لی جائے۔ ملا پیر محمد ان آدم زادوں میں سے تھا جن کے دل کی جگہ پتھر ہوتے ہیں اس نے خان زمان کے پیغام مصالحت کا یہ عملی جواب دیا کہ برج علی کو بہت ذلیل کیا اور پھر اس غریب کو اپنی حویلی کے برج پر سے گرا کر مروا ڈالا۔ برج علی از برج

انتار!

☆......☆......☆

رات کا آخری پہر تھا' ایک صبا رفتار گھڑ سوار سنبھل کی طرف اڑا جارہا تھا۔ اس کی منزل شاہم بیگ کے محسن قدیم عبدالرحمٰن کی جاگیر تھی۔ گھڑ سوار کا چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن کی جاگیر میں داخل ہونے کے بعد اس گھڑ سوار نے ایک قلعہ نما حویلی کے سامنے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ حویلی کے پھاٹک پر متعین پہرے دار اس کی طرف بڑھے تو اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے کر دیا۔ شہادت کی انگلی میں ایک طلائی انگوٹھی تھی جس پر سانپ کا پھن بنا ہوا تھا۔ پہرے دار پیچھے ہٹ گیا اور حویلی کا پھاٹک اس پراسرار گھڑ سوار کیلئے کھول دیا گیا۔ پہرے داروں نے گزشتہ دو ہفتے کے دوران میں تیسری بار اس پراسرار گھڑ سوار کیلئے حویلی کا پھاٹک کھولا تھا۔ اس طلائی انگوٹھی کی شناخت حویلی کے مالک نے انہیں بتائی تھی۔ اس حویلی کا مالک ان کی نظر میں کوئی معمولی آدمی نہیں تھا' وہ جاگیردار عبدالرحمٰن کا بڑا بھائی سوید بیگ تھا۔

میں حالات پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے عارج مجھے اپنی مدد کیلئے آواز دے رہا ہو۔ اے دینار! مجھے مرنے سے بچا لے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عارج کے گرد گھیرا تنگ ہوتا جارہا تھا۔ سب عارج کا انسانی قالب ہی تھا۔ بہرحال جو واقعات پیش آئے انہیں میں تسلسل کے ساتھ ہی بیان کروں گی۔

سوید بیگ کے ملازموں نے اس گھڑ سوار کو اپنے مالک کے پاس پہنچا دیا۔ خود سوید بیگ کیلئے بھی وہ گھڑ سوار پراسرار ہی تھا۔ سوید بیگ نے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ سوید بیگ کو پہلے اس کا خط ملا۔ اس خط میں گھڑ سوار نے اس سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اسی کے ساتھ ایک بڑے انعام کا لالچ دیا تھا۔

خط میں ملاقات کا وقت اور مقام درج تھا۔ لالچی سوید بیگ نے سنبھل کی ایک سرائے میں اس سے تنہا ملاقات کی۔ یہ شرط بھی خط میں تحریر تھی اس پہلی ملاقات میں سوید بیگ اور اس گھڑ سوار کے درمیان چند معاملات طے ہوئے۔ اسی ملاقات میں شناخت کی خاطر سوید بیگ نے اس گھڑ سوار کو ایک طلائی انگوٹھی دی۔ سوید بیگ کے سپرد جو کام کیا گیا' وہ اس کی نظر میں معمولی تھا مگر بطور پیشگی اسے بڑی رقم ملی۔ اس کام سے وہ گھڑ سوار پہلے بھی دو مرتبہ آ چکا

تھا۔ دونوں بار اس نے لالچی سوید بیگ کو خوش کر دیا تھا۔ اب یہ اس کا تیسرا پھیرا تھا۔

سوید بیگ کو اس کے ملازمین نے سوتے سے جگایا اور پراسرار گھڑ سوار کے آنے کی اطلاع دی۔ سوید بیگ فوراً آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے گھڑ سوار کو اپنی خواب گاہ ہی میں بلا لیا۔

پراسرار گھڑ سوار نے اس ملاقات میں سوید بیگ سے جو بات کی' اسے سن کر سوید بیگ کے ہوش اڑ گئے۔

''ہم زور نہیں دیں گے کہ فوراً یہ کام ہو جائے' اس موقع کی تلاش میں رہو! تمہاری جاں بخشی کا بندوبست بھی کر دیا جائے گا۔'' یہ کہہ کر گھڑ سوار نے اپنی جیب سے ایک مہر بند خط نکالا اور سوید بیگ کی طرف بڑھا دیا۔ ''اسے اپنے پاس رکھ لو' یہ تمہاری جان کی سلامتی کا پروانہ ہے۔ کام ہو جانے کے بعد یہ مہر بند خط لے کر تمہیں دارالحکومت آگرہ پہنچنا ہوگا۔ آگرہ پہنچ کر تمہیں کس سے ملنا ہے؟ اس سوال کا جواب تمہیں کام ہونے پر ہی معلوم ہو سکے گا۔'' پھر اس گھڑ سوار نے سوید بیگ کو ایک تھیلی دی۔

سوید بیگ نے تھیلی کھولی تو اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ تھیلی میں ہیرے تھے۔

گھڑ سوار نے سوید بیگ کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ ''اتنے ہی ہیرے کام ہو جانے کے بعد دیے جائیں گے۔''

سوید بیگ بے اختیار بول اٹھا۔ ''مجھے منظور ہے۔''

واقعی آدم زادوں کی اکثریت بڑی ہی لالچی ہوتی ہے۔

گھڑ سوار مزید کچھ رکا اور سوید بیگ کو کچھ ہدایات دیتا رہا' پھر صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے ہی رخصت ہو گیا۔

میں سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ مجھے ہر حال میں عارج کی جان بچانی تھی' خواہ اس کیلئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑتا۔

☆......☆......☆

عارج کو عبدالرحمٰن کی جاگیر میں آئے دو ہفتے گزر چکے تھے۔ آگرے سے نکل کر اسے یہی جائے پناہ نظر آئی تھی۔ عبدالرحمٰن نے اس کی بڑی خاطر داری اور پذیرائی کی۔ خان زمان نے سپاہیوں کا جو دستہ اس کے ساتھ کیا تھا' اب بھی اس کی رکاب میں تھا۔ خان زمان نے سپاہیوں کو ہدایت کی تھی کہ جب تک ''شاہم بیگ'' خود انہیں واپسی کی اجازت نہ دے' وہ

اسی کے ساتھ رہیں اور ہر طرح اس کی حفاظت و خبر گیری کریں۔

عارج کے انسانی قالب شاہم بیگ کے آنے سے دل آرام کا زخم عشق پھر سے ہرا ہو گیا۔ چلمنوں کے پیچھے سے اور جھروکوں کی آڑ سے وہ اپنے محبوب کا دیدار کر لیتی۔ میں نے دانستہ دل آرام کے جسم میں اترنے سے گریز کیا کیوں کہ اب وہ عبدالرحمٰن کی بیوی بن چکی تھی، البتہ میں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ فیصلہ یہ تھا کہ عارج کو بہکنے نہیں دوں گی۔

آدم زادیاں ہوں کہ ہم جن زادیاں اپنی فطرت نہیں بدل سکتیں۔ وہ اپنے محبوب کے ساتھ کسی "دوسری" کو دیکھنا تو الگ، سوچ بھی نہیں سکتیں۔ عشق بڑا خود غرض ہوتا ہے۔ اس تعلق سے مجھے اپنی خود غرضی کا اعتراف ہے۔

دل آرام کی "نظر بازی" عارج سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔ ایک روز اس کی نگاہیں دل آرام سے مل ہی گئیں۔ میں نے اس کے اندر شیطان کو جاگتے محسوس کر لیا۔ اس نے آتے جاتے اشارے بازیاں شروع کر دیں اور اپنی دانست میں نامہ و پیام کے ذریعے دل آرام کو دیرینہ محبت کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے لگا۔

دل آرام اب عبدالرحمٰن کی بیوی ہونے کے سبب اس کی اجازت ہی سے عارج کے سامنے آ سکتی تھی۔ عارج نے اس کا حل بھی سوچ لیا۔ دل آرام تو اس کے عشق میں ان حالوں کو پہنچ ہی گئی تھی، اسے عارج کی تجویز سے اتفاق کرنا پڑا۔

☆......☆..... ☆

ایک شام کو ساغر گردش میں آئے تو عارج نے عبدالرحمٰن سے کہا: "دل آرام کو بھی یہیں بلوا لو۔ آج پرانی یادیں تازہ کریں گے۔ اسے ہم اپنا ساقی بنائیں گے۔"

ممکن ہے عبدالرحمٰن راضی ہو جاتا کیونکہ عارج ہی نے اسے ایک معمولی لکڑہارے سے جاگیردار بنایا تھا، لیکن میں آڑے آ گئی۔ میرے زیر اثر عبدالرحمٰن نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر عارج نے دوسرا حربہ آزمایا۔ وہ خوشامد پر اتر آیا۔ عبدالرحمٰن پھر بھی نہ پگھلا اور کہتا رہا کہ دل آرام اب میری منکوحہ ہے، میں اسے تمہارے سامنے نہیں لا سکتا!

دورِ مے تو چل ہی رہا تھا اس لیے جیسے جیسے نشہ چڑھتا گیا، ان دونوں کی گفتگو میں تندی و تیزی آتی گئی۔ وہ دونوں اپنے اپنے احسانات گنوانے لگے اور ایک دوسرے پر طنز کرنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں کے ہاتھوں میں تلواریں آ گئیں۔ عارج نشے اور

غصے میں مغلظات بک رہا تھا۔ وہ دونوں ہی اس قدر نشے میں تھے کہ آمنے سامنے تلواریں ہاتھوں میں لئے جھوم رہے تھے۔

عارج کے ساتھ جو سپاہی تھے، انہوں نے جو حویلی کی اوپری منزل سے عارج کی چیخ و پکار سنی تو فوراً اوپر پہنچ گئے۔

سپاہیوں کو عارج نے حکم دیا۔ "اس ...... گس...... گستاخ کو...... گر ...... گر...... گرفتار...... کر لو!" نشے کی زیادتی کے سبب اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور وہ بدستور جھوم رہا تھا۔

عبدالرحمٰن کو سپاہیوں نے عارج کے حکم پر گرفتار کر کے ہاتھ دیا۔

"اس......اس کے...... جوتے بھی لگاؤ!" عارج نے لہراتے ہوئے دوسرا حکم صادر کیا۔

عارج کے اس حکم کی بھی تعمیل ہوئی۔

عبدالرحمٰن کے بڑے بھائی موید بیگ کی قلعہ نما حویلی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ عبدالرحمٰن کا ایک خادم ادھر دوڑ گیا۔ چند ہی دن پہلے موید بیگ کی سفارش پر عبدالرحمٰن نے اسے ملازم رکھا تھا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ موید بیگ، اوباشوں کی ایک جماعت لے کر مقابلے پر آ گیا۔ عبدالرحمٰن کی حویلی کے سامنے جو میدان تھا، وہ مشعلوں کی روشنی سے جگمگانے لگا۔ اسی میدان میں دونوں گروہوں کے درمیان جم کر لڑائی ہوئی۔

نشے کی ترنگ میں عارج بھی لڑائی میں شامل ہو گیا۔

یہی وہ لمحات تھے کہ جب میں نے اندھیرے کی چادر اپنے اوپر سے ہٹالی۔ اب عارج مجھے دیکھ سکتا تھا۔

"اے عارج!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ عارج نشے کے باوجود میری آواز سن کر چونک اٹھا۔ میری آواز سننے کا اہل تھا۔ میں چوکنا تھی کہ کہیں کوئی حریف عارج کے انسانی قالب پر حملہ نہ کر دے۔ ایسی صورت میں اگر عارج اپنا انسانی قالب نہ چھوڑتا تو مارا جاتا۔ میں اسی بنا پر تیزی سے بولی: "جلدی سے یہ انسانی قالب چھوڑ دے اے عارج!"

"مم...... مگر وہ...... وہ یار تو......"

وہ مجھے پہچان گیا تو میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''یہ اگر مگر کا وقت نہیں عارج! تیری زندگی خطرے میں ہے۔''

''اے دینار! میں...... نکل...... نکلتا ہوں اس قا...... قالب سے!'' عارج رک رک کر بولا۔

چند لمحوں کے بعد عارج میرے پاس تھا۔ اسے میں نے خوفزدہ دیکھ کر تسلی دی۔

''ڈرمت عارج کہ میں تیرے ساتھ ہوں۔ وہ عفریت دہموش یہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ آ چلتے ہیں۔''

''ذرا ٹھہر جا اے دینار! ابھی تجھے کہیں جانے کی کیا جلدی ہے!'' عارج بولا۔

''تو شاید اپنے انسانی قالب شاہم بیگ کا انجام دیکھنا چاہتا ہے تو دیکھ! باقی باتیں پھر ہوں گی۔'' میں نے کہا۔

سعا میری نظر دل آرام پر پڑی۔ وہ آدم زادی حویلی کے ایک دریچے سے لڑائی کا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور خوبصورت ہونٹ حرکت میں تھے۔ یقیناً وہ شاہم بیگ کے لئے دعائیں مانگ رہی تھی۔

اسی وقت سوید بیگ نے شاہم بیگ کی طرف تیر چلایا۔ دل آرام کوشش کے باوجود اپنی چیخ نہ روک سکی۔ وہ تیر شاہم بیگ کے سینے میں ترازو ہوگیا۔ شاہم بیگ لہرا کر زمین پر گرا اور اسی دوران میں سوید بیگ لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

پھر دل آرام نے جو ہولناک منظر دیکھا' اس کے بعد کچھ نہ دیکھ سکی۔ اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ لیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتی چلی گئی۔ وہ زمین پر گر گئی اور اس کے دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا۔

''اے دینار! آخر یہ کیا معمہ ہے؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔'' عارج مجھ سے کہنے لگا۔

''سمجھنا چاہتا ہے تو میرے ساتھ رہ! اس پر بھی تو نہ سمجھا تو میں تجھے سمجھا دوں گی۔ فی الحال تو اس لالچی آدم زاد سوید بیگ کو دیکھ کہ یہ کدھر جا رہا ہے!'' میں نے پرسکون آواز میں عارج کی بات کا جواب دیا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ محو پرواز تھا۔

سوید بیگ تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا سنبھل کی طرف جا رہا تھا۔ عبدالرحمٰن کی حویلی

کے سامنے اب بھی خونریز لڑائی جاری تھی' لیکن سوید بیگ کو اب اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو اپنا کام انجام دے کر نکل آیا تھا۔ اسے پراسرار گھڑ سوار کی ہدایات یاد تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ کام ہو جائے تو سوید بیگ سیدھا سنبھل کی سرائے میں آ جائے۔ روز و شب کی اس میں کوئی تخصیص نہ تھی۔ گھڑ سوار نے اسے بتایا تھا کہ میں ایک ماہ تک سرائے میں قیام کروں گا۔ یہ گزشتہ شب ہی کی بات تھی۔ خوش قسمتی سے دوسری ہی شب سوید بیگ کو یہ موقع مل گیا کہ وہ پھر اپنی آنکھوں کو ہیروں کی چمک سے خیرہ کر سکے۔ گھڑ سوار نے کام ہو جانے کے بعد مزید انعام کا وعدہ کیا تھا۔

برق رفتاری سے اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا سوید بیگ' سنبھل کی سرائے تک پہنچ گیا۔ سوید بیگ سے اس پراسرار گھڑ سوار کی پہلی ملاقات سرائے کی جس کوٹھری میں ہوئی تھی' اسی کے دروازے پر اس نے مخصوص دستک دی۔

اندر سے پوچھا گیا۔ ''کون ہے؟''

سوید بیگ نے اپنا نام بتایا۔ ذرا دیر میں دروازہ کھل گیا۔ کوٹھری میں چراغ روشن تھا۔ سوید بیگ کے سامنے وہی گھڑ سوار کھڑا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر نقاب تھی۔

''کام ہوگیا؟'' اس نے سوید بیگ سے پرسکون آواز میں سوال کیا۔

''جی...... جی ہاں۔'' سوید بیگ نے جواب دیا اور ریشمی تھیلا گھڑ سوار کی طرف بڑھا دیا۔

تھیلا لے کر وہ گھڑ سوار چراغ کے قریب پہنچا اور تھیلے میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس کی پشت سوید بیگ کی طرف تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' سوید بیگ کی طرف پلٹ کر اس نے کہا اور تھیلا ایک طرف رکھ دیا۔ پھر اس نے حسب وعدہ ہیروں کی تھیلی سوید بیگ کے حوالے کردی۔ سوید بیگ نے اس کو یہ بھی بتا دیا کہ اسے اپنی جان بخشی کے لئے مہر بند خط لے کر آگرے میں کس سے ملنا ہے۔

ادھر سوید بیگ سرائے سے نکل کر واپس ہوا' ادھر وہ گھڑ سوار کچھ ہی دیر بعد آگرہ شہر کی طرف اپنا گھوڑا دوڑانے لگا۔

صبح ہوتے ہوتے وہ گھڑ سوار آگرے پہنچ گیا' مگر اب اس کے چہرے پر نقاب نہیں تھی۔ عارج اور میں اس کے ساتھ تھے۔ میں نے عارج سے کہہ دیا تھا کہ وہ خاموشی سے

سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہے۔

ذرا دن چڑھے پراسرار شخص شاہی محل کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ اب اس کے پیچھے پیچھے ایک غلام بھی چل رہا تھا۔ غلام کے ہاتھ میں ایک خوبصورت طلائی طشت' ایک ریشمی چادر اور وہی ریشمی تھیلا تھا جو اس پراسرار شخص کو ہیروں کے عوض سوید بیگ سے ملا تھا۔ غلام اور بقیہ سامان کو اس شخص نے اپنی حویلی سے ساتھ لے لیا تھا۔ محل میں پہنچ کر اس شخص نے بادشاہ کو اپنی آمد سے مطلع کرایا اور باریابی کی اجازت چاہی۔

ہمایوں کو بتایا گیا کہ اس کا ایک مصاحب شیر محمد خواجہ' حضور شاہی میں حاضری کی اجازت چاہتا ہے۔

ہمایوں نے باریابی کی اجازت دے دی۔

شیر محمد خواجہ' ہمایوں کے حضور تسلیمات بجا لایا' پھر اپنی کارگزاری کی تفصیل بیان کی۔ شیر محمد خواجہ کا غلام پردہ شاہی سے بہت دور کھڑا تھا۔ ہمایوں نے نگاہ اٹھائی تو شیر محمد خواجہ بولا۔ "ظل سبحانی اجازت مرحمت فرمائیں تو غلام اپنی کارگزاری کی سند پیش کرے۔"

"اجازت ہے۔" ہمایوں کی آواز قدرے بھاری تھی۔

شیر محمد خواجہ نے غلام کو اشارہ کیا جو طلائی طشت لئے کھڑا تھا۔ وہ قریب آ گیا تو شیر محمد خواجہ نے اس سے طشت لے لیا جس پر ریشمی چادر پڑی ہوئی تھی۔ شیر محمد خواجہ ادب سے آگے بڑھا اور ہمایوں کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر طشت سے چادر ہٹا دی۔ طشت میں شاہم بیگ کا کٹا ہوا سر رکھا تھا۔ اسی شاہم بیگ کا انسانی قالب عارج نے اپنایا تھا۔

ہمایوں نے اس پر ایک نظر ڈالی اور منہ پھیر لیا۔

اس موقع پر عارج خاموش نہ رہ سکا اور مجھ سے بولا۔ "دینار! کیا ان آدم زاد حکمرانوں کو اپنے ہی جیسوں کے کٹے ہوئے سر دیکھ کر خوشی ہوتی ہے؟...... کیسا ہولناک شوق ہے یہ!"

"آدم زاد اسے شوق نہیں ضرورت کا نام دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہو گی ضرورت' مجھے تو یہ خشونت لگتی ہے۔"

"عارج! تو غالباً اس لئے یہ بات کہہ رہا ہے کہ تجھے اپنے انسانی پیکر کی عادت ہو گئی تھی۔ تو اس جسم میں کافی عرصے رہا تھا کہ جس کا سر کاٹ دیا گیا۔"

"لیکن دینار! شاہم بیگ کا قصور کیا تھا؟"

"سن عارج! حکمران جب کسی کو سزا دیتے ہیں تو ضروری نہیں وہ قصوروار ہو۔ کسی قصور کے بغیر بھی لوگوں کی گردنیں اڑا دی جاتی ہیں۔ ویسے جہاں تک تیرے انسانی قالب کا تعلق ہے تو وہ چادر سے باہر پاؤں پھیلانے لگا تھا۔ تجھ پر اس کی بدصفات غالب آ گئی تھیں۔ میں تجھے اس قدر کمزور نہیں سمجھتی تھی۔" پھر میں نے عارج کو دانستہ چھیڑا۔ "وہ کنیز دل آرام کیا تجھے واقعی اچھی لگتی تھی؟"

"یہ تو کیسی باتیں کر رہی ہے دینار!...... تو مجھے ایسا سمجھتی ہے؟"

"بس زیادہ باتیں نہ بنا' بڑا ہی بے وفا ہے تو!" ہم شاہی محل سے نکل آئے تھے۔

"تو خود کہتی ہے کہ مجھ پر اس انسانی قالب کی فطری بدصفات غالب آ گئی تھیں' پھر بھی مجھے بے وفا کہہ رہی ہے۔"

"اچھا اس قصے کو چھوڑ اور یہ بتا بغداد واپس چلنے کا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بغداد؟" عارج کی آواز میں خوف کا عنصر شامل تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "دینار! کیا تو عفریت وہوش کو بھول گئی کہ جس سے ڈر کر ہم اس زمانے میں آئے ہیں؟"

"نہیں تو وہ عفریت مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس پر بھی تو بغداد واپس چلنا چاہتی ہے؟"

"کیا تجھے بابل کے کھنڈرات یاد نہیں آئے عارج؟" میں بولی۔ "اپنے در و دیوار خواہ شکستہ ہی کیوں نہ ہوں اپنے ہی ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں رہتے ہوئے ہمیں برسوں گزر گئے پھر یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم انہی ماہ و سال میں واپس ہوں جن سے چلے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازمی نہیں کہ ہم طبیب صارم اور طبیبہ اطربہ کے انسانی پیکر ہی اختیار کریں۔ ایک بات اور نہ بھول اے عارج کہ جب ہم بغداد سے چلے تھے تو یہ شہرت دی تھی کہ مصر جا رہے ہیں۔ عفریت وہوش ہماری تلاش میں وہیں گیا ہو گا۔ مختصر یہ کہ میرے خیال میں اب بغداد جانا زیادہ خطرناک نہیں۔ اگر وہاں خطرہ ہوا بھی تو ہم دوبارہ کسی اور زمانے میں چلے جائیں گے۔"

"لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہم اسی زمانے میں کیوں نہ رہیں۔ اگر شاہم

بیگ' مارا گیا تو کیا ہوا' دل آرام اس دنیا میں نہ رہی تو کیا فرق پڑ گیا' ہم دونوں دوسرے انسانی قالبوں میں بھی تو رہ سکتے ہیں!'' عارج نے بحث کی۔

''نہیں' اب ہم اس زمانے میں نہیں رہیں گے اور نہ دوسرے انسانی قالب اپنائیں گے۔''

''اس کی کوئی وجہ؟'' عارج نے سوال کیا۔

''وجہ یہ ہے کہ اس زمانے یا کسی بھی زمانے میں رہنے کیلئے پہلے عالم سوما سے ہمارا ملنا ضروری ہے۔'' میں نے جواب دیا' پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولی۔ ''تو نے ایک خرابی محسوس کی کہ ہم پر انسانی پیکروں کی فطری نیک یا بد صفات غالب آ جاتی ہیں یوں گویا ہم مجبور و بے بس ہو جاتے ہیں۔ یہ بے بسی کیوں؟ اس کا جواب تو عالم سوما ہی دے سکتا ہے۔ ہم کسی خطرے سے بھی تو دوچار ہو سکتے ہیں۔ ذرا سوچ عارج کہ جب تو شاہم بیگ کے انسانی قالب میں موید بیگ کے آدمیوں سے برسرپیکار تھا' اگر بروقت میں تجھے چوکنا نہ کر دیتی اور تو اس قالب کو نہ چھوڑ دیتا تو کیا ہوتا؟ شاہم بیگ کے ساتھ تو بھی مارا جاتا کہ نہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے اے دینار!'' عارج نے میری بات سے اتفاق کیا' پھر کہنے لگا۔

''حقیقت یہ ہے کہ مجھے بھی اپنے وسیع و عریض صحرا یاد آتے ہیں۔ عراق جیسا مزہ یہاں نہیں ہے۔ اس کے ساتھ یہ کہ تو کچھ بھی کہے وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔''

''سن! ہم یہاں سے سیدھے بابل کے کھنڈرات میں چلیں گے تاکہ فوری طور پر عالم سوما سے مل سکیں۔ اس کے علاوہ ہم خلیفہ المہدی کے آخری دور حکومت میں چلیں گے۔ بول اب؟''

''تیرے سامنے کبھی میں بولا ہوں جواب بولوں گا اے دینار!''

''بڑا نیک اور فرمانبردار بن رہا ہے جبکہ میں اپنی آنکھوں سے تیرے کچھن دیکھ چکی ہوں۔''

''اس کا سبب کچھ اور تھا ورنہ تو......''

''تو سو جان سے میرا اور صرف میرا ہے' یہی تو کہنا چاہتا ہے۔'' میں بول اٹھی۔

''اب تو مان نہ مان سچ یہی ہے۔'' عارج نے کہا پھر پوچھا۔ ''تو کب چلنا ہے؟''

''آج ہی رات عشاء کے بعد۔'' میں نے بتایا۔ ''عشاء کے بعد سے نصف شب

تک عالم سوما کے پاس وقت ہوگا' ہم تفصیل کے ساتھ اس سے بات کر سکیں گے۔''

''ابھی تو عشاء کا وقت ہونے میں بڑی دیر ہے' اس وقت تک کیا کریں؟'' عارج بولا۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔'' میں دھیرے سے ہنس دی۔ ''گھومتے پھرتے ہیں کہیں۔ میں نے تجھے بتایا تھا نا کہ ایسی جگہ صحرا میں چل کر بیٹھیں گے جہاں کوئی نہ ہو۔ بہت دن ہو گئے تجھ سے ایسی فضا میں بات کئے ہوئے۔''

پھر ہم راجستھان کی طرف نکل گئے اور ایک جگہ اتر گئے۔ وہاں دور دور تک کوئی آدم زاد نظر نہیں آ رہا تھا۔

''دینار! ہماری محبت بھی صحراؤں کی طرح عظیم ہے۔'' عارج اپنی عادت کے مطابق خلوت میسر آتے ہی چہکنے لگا۔

''یہ عظیم تو کسی آدم زاد کا نام معلوم ہوتا ہے بلکہ شاید عظیم اللہ' تیری ملاقات اس عظیم اللہ نامی آدم زاد سے کب اور کہاں ہوئی؟''

''دیکھ تو ہمیشہ میری محبت کا مذاق نہ اڑایا کر! کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کر دینار!''

''سنجیدہ ہونے کا مطلب میں خوب سمجھتی ہوں اس لئے رنجیدہ تو ہو سکتی ہوں سنجیدہ نہیں۔ مجھے خبر ہے کہ جب میں سنجیدہ ہوئی تو تو فی الفور مجھ سے نکاح کرنے کا مطالبہ دہرانے لگے گا۔ اس عفریت دہموش کو بھی یہی واہم ہے کہ میں کبھی نہ کبھی اس کی بیوی بننے پر راضی ہو جاؤں گی۔ کیا میں تجھے بے نکاح کے بری لگتی ہوں؟''

''میں نے یہ کب کہا...... اور تو نے دہموش کو اور مجھے ایک ہی لکڑی سے کیوں ہانک دیا؟''

''جانوروں کو ہانکا جاتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے تیرے بارے میں عارج کہ تو جانور ہے نہ آدم زاد بلکہ جن زاد ہے۔ اگر میں غلط خطوط پر سوچ رہی ہوں تو ٹوک دے مجھے' میں ہرگز برا نہیں مانوں گی۔''

اس روز عارج کے ساتھ میں اندھیرا پھیلنے تک اسی طرح نوک جھونک کرتی رہی۔ راجستھان کے صحرا سے ہم سندھ اور پھر پنجاب کی طرف نکل گئے۔ لاہور میں بھی کچھ دیر رک کر داتا صاحب کے مزار مبارک پر فاتحہ پڑھی۔

ہم لاہور ہی میں تھے کہ عشاء کے بعد میں نے عارج کو مخاطب کیا۔ ''چل اب عراق چلتے ہیں۔'' پھر میں نے اسے سمجھایا کہ 169 ہجری کے عراق میں واپس چلنا ہے۔ عراق میں ہماری منزل بغداد کا نواحی علاقہ تھا۔ جہاں بابل کے کھنڈرات واقع تھے۔

کھنڈرات میں فوری طور پر ہم اس حصے تک پہنچے جہاں عالم سوما کی سکونت تھی وہ ہمیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا اے دینار کہ تو برسوں بعد لوٹ کر آئے گی۔'' عالم سوما مجھ سے مخاطب تھا۔ ''تیرے باپ سردار اخشم اور تیری ماں سہلوبہ کو بڑی فکر تھی کہ تو کہاں چلی گئی۔'' پھر اس نے میری اور عارج کی خیریت دریافت کی۔

''ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں اے سوما!'' میں جواب میں بولی' پھر کہا۔ ''تو نے ہی تو ہم دونوں کو مشورہ دیا تھا کہ کچھ عرصے کیلئے عفریت وہوش کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔''

''مگر کچھ عرصے کا مطلب برسوں تو نہیں ہوتا میری بچی!'' اس نے اظہار شفقت کیا۔

''دراصل ہم بہت دور نکل گئے تھے..... صدیوں آگے چلے گئے تھے۔'' میں نے بتایا۔

''تمہارا جی لگ گیا تھا وہاں؟'' عالم سوما نے پوچھا۔ ''کیسے تھے اس زمانے کے آدم زاد؟''

''اے سوما! آدم زادوں کی وحشت و درندگی میں مجھے کوئی کمی نظر نہیں آئی۔'' میں بولی۔

''اللہ بہتر کرے۔'' عالم سوما نے کہا۔

''اے سوما! تجھ سے مجھے بہت سی باتیں معلوم کرنی ہیں۔''

''تو معلوم کر دینار!'' اس نے مجھے اجازت دی۔ عارج اس دوران میں میرے اشارے پر چپ ہی رہا۔

پھر میں نے پہلا سوال انسانی قالب کی فطری صفات کے متعلق کیا۔

''اے میری بچی' اے دینار! تو جانتی ہے کہ انسان کو اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے۔ سو کوئی جن زاد یا جن زادی کسی آدم زاد کے جسم پر قبضہ کر بھی لے تو اس کے قالب کی

فطری صفات کو نہیں بدل سکتا۔ ان صفات کے مثبت یا منفی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' عالم سوما نے سمجھایا۔

''پھر تو ہم جنات اپنی تمام تر پراسرار قوتوں کے باوجود آدم زادوں سے کمتر ہوئے؟''

''اس میں کمتر یا برتر ہونے کی کوئی بات نہیں۔ جو حقیقت تھی' وہ میں نے تجھے بتا دی۔ ایسا عموماً اس وقت ہوتا ہے کہ جب کوئی جن زاد بار بار ایک ہی انسانی قالب میں داخل ہو یا مستقل اسے اپنا ٹھکانا بنا لے۔'' عالم سوما نے وضاحت کی۔

''تجھ سے مجھے یہ بھی پوچھنا ہے سوما کہ عارج اور میرے لئے اب تو بغداد میں کوئی خطرہ نہیں؟''

''ہونا تو نہیں چاہئے لیکن حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ برسوں پہلے وہ عفریت تیرا دشمن بن گیا تھا' اب وہ کہاں ہوگا کیا خبر! البتہ قیاس یہ کہتا ہے کہ اس نے مصر ہی کی راہ لی ہو گی۔ تجھے وہاں نہ پا کر ممکن ہے اس نے صبر کر لیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور خطہ زمین پر تجھے ڈھونڈ رہا ہو۔''

''اگر وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا بغداد واپس آ گیا تو؟'' میں نے اپنے خدشے کا اظہار کر دیا۔

''پھر تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ تم دونوں مستقلاً حفاظتی حصار میں رہو۔'' عالم سوما بولا۔ ''یہ حصار صرف بد ارواح اور ان طاقتور جنات کیلئے ہوگا جو تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

''مثال کے طور پر عفریت وہوش بھی اس حفاظتی حصار میں داخل نہیں ہو سکے گا؟'' عارج بول ہی اٹھا۔ اس کی آواز پر جوش تھی۔ یقیناً خطرے سے بچنے کی ایک راہ نکل آنے پر وہ خوش تھا۔

''نہیں' کوئی عفریت بھی اس حصار کی موجودگی میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ پائے گا۔'' عالم سوما نے عارج کی بات کا جواب دیا۔

''اے سوما! یہ حفاظتی حصار تو نے اس وقت بھی ہمارے گرد کھینچا تھا جب ہمیں عفریت وہوش کی طرف سے خطرہ تھا۔'' میں نے یاد دہانی کرائی' پھر معلوم کیا۔ ''اس کے لئے

ہمارا کھنڈرات میں رہنا تو ضروری نہیں ہوگا؟''

''نہیں' مگر تو کسی آدم زادی کے قالب میں رہ کر زیادہ محفوظ ہوگی۔ اسی طرح عارج کو بھی کسی آدم زاد کے جسم میں رہنا پڑے گا۔ یوں وہ عفریت تمہیں تلاش کرنے میں بڑی حد تک ناکام رہ سکتا ہے۔ دراصل خیالی اور حقیقی پیکروں میں فرق ہوتا ہے۔ کسی آدم زاد یا آدم زادی کا خیالی پیکر آدمیوں کو تو فریب نظر' فریب سماعت' فریب لمس اور بقیہ حسیات کے فریب میں مبتلا کر سکتا ہے' جنات کو نہیں۔ مثلاً تم دونوں طبیب صارم اور طبیبہ اطروبہ کے انسانی پیکر اختیار کر کے بغداد میں رہے۔ وہ خیالی پیکر تھے۔ ان کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اسی بنا پر جنات وقتی طور پر تو ان خیالی پیکروں سے دھوکا کھا جاتے ہیں' مگر وہ معلوم کرنا چاہیں تو ان کی حقیقت جان سکتے ہیں۔ ایسا شک ہونے کی صورت میں ہوتا ہے' یعنی جو فرد سامنے نظر آ رہا ہے' وہ آدمی ہے یا جن؟ اغلب یہ ہے کہ اس عفریت کو بھی تم دونوں پر شک ہوا کہ تم آدمی نہیں' جنات ہو۔ اگر تمہارے خیالی پیکر نہ ہوتے یعنی تم آدم زادوں کے جسموں میں رہتے تو غالباً وہ تمہیں تلاش نہ کر پاتا۔'' عالم سوما بولتا رہا اور میں توجہ سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ ذرا توقف سے وہ دوبارہ بولا۔ ''اگر دینار! تو بغداد میں ہی رہنا چاہتی ہے تو اس کی پہلی صورت یہ ہے کہ کسی آدم زادی کے جسم میں اتر جا اور اپنے انسانی قالب کے گرد حفاظتی حصار کھینچ لے۔ عمل کے وہ الفاظ میں تجھے تعلیم کروں گا جن کے پڑھنے سے تیرے گرد حفاظتی نادیدہ حصار قائم ہو جائے گا۔ ہر مرتبہ اکیس دن گزرنے پر تجھے یہی عمل کرنا ہوگا' عمل نہ کرنے کی صورت میں اکیس دن کے بعد حفاظتی حصار خود بخود ختم ہو جائے گا۔''

''لیکن اے سوما' پہلے تو یہ حفاظتی حصار پورے اکیاون دن تک ہمیں اپنی پناہ میں لئے رہتا تھا!'' میں نے یاد دلایا۔

''مجھے خبر ہے۔'' عالم سوما نے کہا۔ ''تو اس وقت یہاں میری نگرانی میں تھی' دوم یہ کہ تو کسی آدم زادی کے قالب میں نہیں تھی۔''

''تیرا کہنا ٹھیک ہے اے سوما اب تو ہمیں... مجھے اور عارج کو اس عمل کے الفاظ تعلیم کر کہ جس سے ہمارے اطراف نادیدہ حفاظتی حصار قائم ہو جائے اور ہمیں کسی عفریت کی طرف سے خطرہ نہ رہے۔''

سوما نے ہمیں عمل کے الفاظ تعلیم کئے' پھر کہنے لگا۔ ''اے دینار! تو عارج کو ساتھ

لے کر بغداد میں ایسی جگہ رہ جہاں تیرے دشمن کا تصور بھی نہ پہنچ سکے۔''

''وہ تو بس ایک ہی جگہ ہے بغداد میں۔'' میں بولی۔

''کون سی جگہ اے دینار؟'' عالم سوما نے دریافت کیا۔

''قصر خلافت۔'' میں نے بتا دیا۔ کوئی اور اس بارے میں مجھ سے سوال کرتا تو یقیناً جواب نہ دیتی۔

''مگر وہ تو بڑی خطرناک جگہ ہے۔'' عالم سوما کی آواز سے فکر مندی جھلک رہی تھی۔ ''اقتدار کے ایوانوں سے دور ہی رہا کر اے دینار! یہ آدم زاد سروں کی فصل کاٹنے میں دیر نہیں لگاتے۔''

''اے میرے باپ کے دوست اے میرے بزرگ اور اے عالم سوما! میں مستقبل میں جا کے اقتدار کے ایوانوں کا نظارہ کر چکی ہوں... یہ عارج تو شاہی محل میں رہ چکا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ کسی حکمران کی تیوریوں پر پڑے ہوئے بل کسی بھی شخص کی زندگی کا چراغ گل کر سکتے ہیں یا اس کا ایک حکم ہزاروں انسانوں کی موت کا پیغام بن سکتا ہے۔

''تو اے دینار! تو قصر خلافت میں سکونت پذیر کسی آدم زادی کے جسم پر قبضہ کرے گی اور عارج؟''

''اسے بھی میں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی۔ یہ قصر میں آباد کسی آدم زاد کے جسم میں اتر جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''میں تم دونوں کیلئے دعا کروں گا کہ اللہ تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔'' عالم سوما نے ہمیں دعا دی' پھر مجھے والدین سے ملنے کیلئے تاکید کی۔ عارج اور میں' عالم سوما کے پاس سے اٹھ آئے۔

عالم سوما کی تاکید کے مطابق اسی شب کو میں اپنے والدین اور بڑے بھائی یوسف سے بھی ملی۔ میں انہی کی دعاؤں کے سائے میں عرصہ دراز کے بعد عارج کو ساتھ لئے بغداد پہنچ گئی۔ دانستہ ہم نے اپنی قدیم قیام گاہ کا رخ نہ کیا جو حربیہ میں تھی اور جہاں ہم نے مطب کھولا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جگہ ہمارے دشمن کی نظر میں آ چکی تھی۔

ہم سیدھے قصر خلافت میں پہنچے۔ رات اتنی گزر چکی تھی کہ قصر کے رہنے والے محو خواب تھے۔ وہاں صرف محافظ جاگ رہے تھے۔

اس خادم کا نام ایوب اور خادمہ کا نام جمیلہ تھا جو خلیفہ المہدی کی خدمت میں رہتے تھے۔ عارج اور میں نے انہی دونوں کے جسموں پر قبضہ کرلیا۔ اس قبضے کی ایک اور بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں میاں بیوی تھے اور ان کی عمریں زیادہ نہیں تھیں۔ پھر یہ کہ ان کے ساتھ کوئی اور جھنجھٹ نہیں تھا۔ نہ ایوب کے والدین زندہ تھے نہ وہ صاحب اولاد تھا۔ قصر خلافت ہی کا جو حصہ خادموں، خادماؤں، غلاموں اور کنیزوں کیلئے مخصوص تھا، وہیں ایوب اور جمیلہ رہتے تھے۔ مغلیہ تاجدار ہمایوں کے عہد میں جا کر مجھے جو تلخ تجربہ ہوا تھا اسی کے سبب ایوب اور جمیلہ کے بارے میں پہلے ہی سے میں بہت محتاط تھی۔ وہ دونوں محو خواب تھے کہ میں اور عارج ان کے جسموں میں اتر گئے۔ پھر ہم نے تعلیم کردہ عمل کے ذریعے اپنے گرد حفاظتی حصار کھینچ لئے۔

اب ہم پوری طرح محفوظ تھے اور ہمیں اپنے دشمن عفریت کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

وہ چھوٹے بڑے دو دالان تھے جہاں ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ اندر والے دالان میں دو بستر تھے۔ ان میں سے ایک پر ایوب اور دوسرے پر جمیلہ دراز تھی۔ دالان میں چھوٹا سا ایک شمع دان ایک طاق کے اندر رکھا تھا۔ شمع کی لو ان میں سے کسی نے سونے سے پہلے دھیمی کر دی تھی۔ میں نے جمیلہ کے جسم میں داخل ہو کر چند لمحے توقع کے مطابق گھٹن محسوس کی، پھر مجھے قرار آ گیا۔

''اے دینار! یہ قالب تو بہت تنگ...''

''دینار نہیں جمیلہ!'' میں نے دھیمی آواز میں عارج کی بات کاٹ دی، پھر اسے سمجھایا۔ ''بے صبری نہ دکھا، ابھی تجھے بھی قرار آ جائے گا۔''

اس کے بعد یہی ہوا، عارج کا اضطراب ختم ہو گیا۔

''اب سو جا کہ صبح ہوتے ہی کسی بھی وقت ہمیں طلب کیا جا سکتا ہے۔'' میں نے عارج کو تاکید کی۔

''مجھے تو خوشی میں نیند نہیں آ رہی۔'' عارج جذباتی لہجے میں بولا۔

''کس بات کی خوشی ہے تجھے؟'' میں نے دانستہ سخت آواز میں پوچھا۔

''کسی... کسی کی نہیں... تو... تو بس ذرا ذرا سی بات پر خفا ہونے لگتی ہے۔''

عارج کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

میں یہی چاہتی تھی۔ اسی رات میں نے اور بہت سی باتیں معلوم کیں۔ ان باتوں کا

تعلق ان برسوں سے تھا کہ جب میں بغداد میں نہیں تھی۔ دوسرے روز صبح قصر خلافت میں ہر طرف اس خواب کا چرچا تھا جو گزشتہ شب خلیفہ المہدی نے دیکھا تھا۔ المہدی نے ان الفاظ میں وہ عجیب خواب بیان کیا تھا۔ ''میں نے دو چھڑیاں اپنے دونوں بیٹوں ہادی اور ہارون کو دیں۔''

ہادی کی چھڑی اوپر کی جانب سے قدرے سرسبز ہوئی اور ہارون کی چھڑی پوری کی پوری شاداب و تر و تازہ ہو گئی۔''

خلیفہ کے اس خواب کی تعبیر یہ سمجھی گئی کہ ہادی کی مدت خلافت کوتاہ اور ہارون الرشید کی خلافت کا دور عمدگی و خوبی کے ساتھ طول و طویل ہوگا۔ خلیفہ کے اس خواب سے قطع نظر یہ حقیقت ہے کہ امور سلطنت کے انصرام کے لئے ہادی کی بہ نسبت ہارون الرشید میں زیادہ قابلیت تھی۔ یہ امر تجربے سے بھی ثابت ہو چکا تھا۔

یہ واقعہ 165 ہجری کا ہے کہ خلیفہ مہدی نے صائفہ کی سرداری پر ہارون الرشید کو مقرر کیا اور اپنے معتمد خاص ربیع کو اس کے ہمراہ کر دیا۔ ربیع کا ذکر پہلے بھی کئی بار میری سرگزشت میں آ چکا ہے۔ یہ مہدی کے باپ خلیفہ المنصور کا آزاد کردہ غلام تھا۔ ربیع کے مشورے ہارون نے توجہ سے نہ صرف سنے بلکہ ان پر عمل بھی کیا۔ اسی بناء پر ہارون نے روم میں پہنچ کر گویا قیامت برپا کر دی۔ بطریق نقیط کا لشکر مقابلے پر آیا۔ مسلمانوں کی فوج سے یزید بن مزید نے اپنے دستوں کے ساتھ نکل کر بطریق پر حملہ کیا۔ اس کا لشکر ہزیمت کھا کر میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ یزید کے ہمراہی اس کی لشکر گاہ کو لوٹ کر دمشق جا پہنچے۔ مسلمانوں کے اسلحہ خانوں کا افسر بہ لحاظ ضرورت جنگ دمشق ہی میں رہتا تھا۔ یزید نے اسے دو لاکھ دینار اور بائیس ہزار درہم دیئے۔ یہ رقم مزید اسلحہ سازی کے لئے ہارون الرشید کے حکم پر دی گئی تھی۔

ہارون کے ساتھ جو لشکر تھا، اس کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی۔ فتح و نصرت کے علم لہراتا ہوا یہ لشکر خلیج قسطنطنیہ تک پہنچ گیا۔ ان دنوں قسطنطنیہ کے تخت سلطنت پر ایک نابالغ لڑکا تھا اور اس کی ماں غطسہ بادشاہ الیوک کی بیگم حکومت کر رہی تھی۔ غطسہ نے ستر (70) ہزار دینار سالانہ جزیہ دے کر تین برس کے لئے اس شرط پر صلح کر لی کہ قسطنطنیہ کے بازاروں میں مسلمانوں کی آمد و رفت اور خرید و فروخت پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔

صلح سے قبل مسلمانوں کی افواج نے ان لڑائیوں میں پانچ ہزار چھ سو سرکش افراد کو گرفتار کیا تھا۔ انہی دلیر افواج نے چون (54) ہزار رومیوں کو میدان جنگ میں تہ تیغ کیا تھا۔ جن رومیوں کو قیدی بنا لیا گیا تھا' ان میں سے فسادیوں کو چن چن کے قتل کر دیا گیا۔ ان فسادیوں کی تعداد دو ہزار تھی۔

یہ واقعات بغداد میں میری دوبارہ آمد سے چار سال پہلے کے ہیں۔ اس وقت میں بغداد میں نہیں تھی۔ ان واقعات کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ ان کے بیان کرنے کا مقصد خلیفہ المہدی کے چھوٹے بیٹے کی عسکری لیاقت و ذہانت کا اظہار ہے۔ اسی وجہ سے خلیفہ نے اپنے گزشتہ فیصلہ پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی۔

پہلے خلیفہ المہدی نے اپنے بڑے بیٹے ابو محمد موسیٰ الہادی کی ولی عہدی کا اعلان کیا تھا' جب اس نے چھوٹے بیٹے ہارون الرشید میں زیادہ اہلیت محسوس کی تو فیصلہ کر لیا کہ موسیٰ الہادی کو ولی عہدی سے معزول کر کے ہارون کو ولی عہد بنا دیا جائے۔ طریقے کے مطابق خلیفہ نے حکم دیا کہ ہارون کی بیعت بہ حیثیت ولی عہد لے لی جائے اور ہارون کے بعد ہادی تخت خلافت کا مالک سمجھا جائے۔

ان دنوں ہادی جرجان میں مقیم تھا۔ خلیفہ المہدی نے ہادی کے پاس طلبی کا خط لکھا۔ ہادی نے خلاف توقع خلیفہ کے قاصد کو پٹوا کر نہایت ذلت کے ساتھ اپنے دربار سے نکلوا دیا اور اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

یہی وہ دن تھے کہ ایک رات عارج نے مجھے بتایا۔ ''اے میری بیوی جمیلہ! میں قصر خلافت میں ایک سازش کی بو محسوس کر رہا ہوں۔ اگر تو کہے تو موقع غنیمت دیکھ کر خلیفہ کے کان میں یہ بات ڈال دوں؟''

''پہلی بات تو یہ سن لے کہ تو مجھے ''اے میری بیوی جمیلہ'' کے بجائے صرف جمیلہ کہا کر!'' میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

''اور دوسری بات؟'' عارج شوخ لہجے میں مسکرا کر پوچھنے لگا۔

''پہلی بات تو مان لی نا تو نے؟'' میں نے اصرار کیا۔

''سوچوں گا اس لئے کہ دنیا والے ہمیں میاں بیوی ہی سمجھتے ہیں۔'' عارج کی آواز میں شرارت تھی۔

''سمجھتے ہوں گے۔'' میں بولی۔ ''اس بات کو اچھی طرح اپنے دماغ میں بٹھا لے کہ یہ آدم زاد سب سے پہلے اپنے محسنوں ہی کے گلوں پر چھری پھیرتے ہیں۔ تجھے خلیفہ کا زیادہ خیر خواہ بننے کی ضرورت نہیں۔ اگر اس کے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے تو کیا تو اپنے اس دعوے کو ثابت کر سکے گا؟.... میرا خیال ہے کہ ابھی تو شک کی منزل میں ہے۔ مجھے تفصیل بتا!''

''میں نے ایک ادھیڑ عمر کنیز رافعہ کو یہ کہتے سنا کہ موسیٰ الہادی بڑا منتقم المزاج ہے۔ یہ بات وہ ایک اور کنیز سعدیہ سے سرگوشی میں کہہ رہی تھی۔'' عارج بتانے لگا۔ ''ادھیڑ عمر رافعہ نے یہ بھی کہا کہ بچپن سے وہ ہادی کی خدمت کرتی آئی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ وہی ولی عہد رہے۔ رافعہ نے خبر نہیں کس کے ذریعے ہادی سے رابطہ بھی قائم کر رکھا ہے۔ کنیز سعدیہ کے استفسار کے باوجود رافعہ نے ذریعہ نہیں بتایا۔ مجھے یہ شک ہے کہ قصر خلافت میں موجود ہادی کے حامی خلیفہ المہدی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

''مجھے یہ بتا عارج! کیا خلیفہ وقت سے تیری کوئی قریبی رشتے داری ہے؟''

''ن.... نہیں تو۔''

''پھر تو کیوں اس غم میں گھلا جا رہا ہے کہ اسے کہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے؟''

''تجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ باصلاحیت فرد کو ولی عہد ہونا چاہئے؟... بتا اے دیتار! خلیفہ کے دونوں بیٹوں ہادی اور ہارون میں سے کون تیرے معیار پر پورا اترتا ہے؟ یہ نہ بھول کہ جن زاد ہونے کے باوجود ہم اہل ایمان میں سے ہیں۔ سو اس ناطے ہماری یہی خواہش ہونی چاہئے کہ مسلمانوں کی یہ حکومت خوب پھلے پھولے۔'' عارج سنجیدہ ہو گیا۔

''یہ ہونا چاہئے' وہ ہونا چاہئے' ان چکروں میں نہ پڑ! آدم زادوں کی اپنی ایک دنیا ہے' ہم جنات کا اپنا ایک جہان! ہمارے مفادات کم ہی ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تیرا پلہ ہارون الرشید کی طرف جھکا ہوا ہے اور ایسا غلط بھی نہیں۔ ہادی نے اپنے باپ کے ساتھ گستاخی کی ہے۔ خلیفہ کے قاصد سے اسے یہ سلوک نہیں کرنا تھا' مگر ہم کس لئے اس معاملے میں ٹانگ اڑائیں! ..... ہادی ولی عہد ہو کہ ہارون' ہمیں کیا! رہا ہمارا مسلمان ہونا تو وہ اس سے مشروط نہیں کہ حکمران وقت کی تائید و حمایت کریں یا اس کے خلاف ہونے والی کسی سازش کی نشاندہی کر کے خود پھنس جائیں۔'' میں عارج کو سمجھاتی رہی۔ ''ذرا یہ

سوچ کر ہم ہارون کی حمایت کرتے ہیں اور خلیفہ مہدی بھی یہی کر رہا ہے، اگر کل کلاں کو ہادی ہی خلیفہ بن گیا تو ہمیں قصر خلافت میں رہنے دے گا یا پہلی فرصت میں قتل کرا دے گا؟"

"تو پھر یہ بتا کیا ہو؟" عارج نے سوال کیا۔

"کیا ضروری ہے کہ کچھ ہو۔ اتنا یاد رکھ کہ ہم فی الحال اپنے دشمن سے چھپ کر قصر خلافت میں پناہ لئے ہوئے ہیں۔" میں بولی۔

"اور وہ خدمت خلق؟"

"جان ہے تو جہان ہے۔ پہلے جان بچنے کا یقین تو ہو جائے۔ جب تک وہ عفریت زندہ ہے، ہم خطرے میں ہیں۔ یہ حفاظتی حصار تو ہماری عارضی سپر ہے۔ جہاں تک خدمت خلق کا تعلق ہے تو محض دوا بانٹنا ہی خدمت خلق نہیں۔ اس کے اور بہت سے طریقے ہیں۔"

"مثلاً؟" عارج نے پوچھا۔

"وقت آنے پر بتاؤں گی، اب سونے دے مجھے!" میں نے یہ کہہ کر عارج کی طرف سے کروٹ لے لی۔

دوسرے دن صبح میں نے قصر خلافت میں جو خبر سنی میرے لئے حیران کن تھی لیکن خلیفہ وقت المہدی کے حکم کو کون ٹال سکتا تھا! سارے بغداد میں اس حکم سے کھلبلی مچ گئی کہ اب جانے کیا ہوگا۔

المہدی نے افواج کو بغداد سے جلد از جلد روانگی کا حکم دیا تھا۔ یہی وہ حکم تھا جس نے دارالحکومت بغداد کے باشندوں کو فکرمند کر دیا تھا۔ پہلے ایسا نہیں ہوا تھا کہ کسی حکمراں نے اپنی ہی اولاد کے خلاف فوجی قوت استعمال کی ہو۔ خلیفہ المہدی اپنے بڑے بیٹے الہادی کی سرکوبی اور اسے نافرمانی کی سزا دینے جرجان جانے کا قصد رکھتا تھا۔

خلیفہ کے دونوں بیٹوں ہادی اور ہارون کو برسوں پہلے اس وقت میں قصر خلافت میں دیکھ چکی تھی جب طبیبہ کی حیثیت سے میرا یہاں آنا جانا تھا۔ ملکہ خیزران کا جھکاؤ بھی چھوٹے بیٹے ہارون کی طرف تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہارون فرمانبردار اور ہادی خودسر تھا۔ ہارون کے مقابلے میں ہادی کی شخصیت بھی قطعی غیر موثر تھی۔ ہادی کے اوپر کا ہونٹ چھوٹا اور دانت بڑے بڑے تھے۔ اس کے سبب ہر وقت اور اکثر بات کرتے ہوئے اس کا منہ کھلا رہتا۔ خلیفہ مہدی نے ایک خادم کو متعین کر دیا تھا جو ہر وقت ہادی کو منہ بند کرنے کی ہدایت کرتا

رہتا تھا۔ جہاں ہادی کا منہ کھلا۔" خادم نے کہا۔ "یا ہادی اطبق۔" ہادی یہ سن کر منہ بند کر لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ ہادی اسی لقب سے مشہور ہو گیا۔ کم رو ہونے کے ساتھ ساتھ آزاد مزاج، غصہ ور، عشرت پسند اور لہو و لعب میں بھی زیادہ مصروف رہتا تھا۔ اب اس نے بغداد سے دور رہ کر اپنے باپ کی نافرمانی بھی شروع کر دی تھی۔ اپنی ناپسندیدہ صفات کے باوجود وہ خود کو ہارون سے برتر سمجھتا تھا۔

ان حالات میں مجھے خلیفہ المہدی کا فیصلہ درست ہی معلوم ہوا۔ خلیفہ کے ساتھ اس کی کنیزوں اور خادموں کو بھی جانا تھا۔ ایسے موقعوں پر خادموں اور کنیزوں کی تعداد زیادہ نہ ہوتی تھی۔ صرف انہی کو ساتھ رکھا جاتا جو خلیفہ کے زیادہ مزاج شناس اور بہتر خدمت گزار ہوتے۔ عارج اور میں نے جو انسانی قالب اپنائے تھے ان کا شمار بھی خلیفہ کے پسندیدہ خادموں اور کنیزوں میں ہوتا تھا۔ سو ہمیں بھی قصر خلافت کے نگران کا حکم مل گیا کہ خلیفہ کے ساتھ جانے کی تیاری کر لیں۔

اسی اثنا میں ایک روز عارج نے مجھے بتایا۔ "کنیز رافعہ بھی جرجان چل رہی ہے۔"

"تو چلا کرے ہمیں کیا!" میں بولی۔

مجھے پہلے بھی اس نے اس ادھیڑ عمر کنیز کے بارے میں بتایا تھا کہ خلیفہ کے نافرمان بیٹے ہادی کی حمایتی ہے۔ اس نے ہادی سے رابطہ قائم کر رکھا ہے۔ "کیا تیری نظر میں یہ کوئی خطرناک بات نہیں اے دینار؟" عارج کی آواز دھیمی تھی۔

"کیا تو یہ سمجھ رہا ہے کہ ہادی اس کنیز کے ذریعے خطرہ بن سکتا ہے؟" میں نے بھی سوال کے جواب میں سوال ہی کیا۔

"ممکن ہے۔" عارج محتاط لہجے میں بولا۔

"یہ جو کنیزیں، غلام اور خادم ہوتے ہیں کسی کے لئے بھی اپنی زندگی خطرے میں نہیں ڈالتے۔ ظاہر ہے اس کنیز نے خلیفہ کے خلاف کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو زندہ نہیں بچے گی۔ یہ بات وہ خود بھی خوب جانتی ہوگی۔ یہ آدم زادیاں بڑی چالاک ہوتی ہیں عارج! تو انہیں اتنی سیدھی نہ سمجھ!" میں نے کہا۔

"لیکن اقتدار کی ہوس میں مبتلا آدم زاد، کنیزوں، غلاموں اور خادموں کو اپنا مطلب نکالنے کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں، یہ تو بھی جانتی ہے دینار! تو کیا رافعہ کو مقصد براری

کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا؟"

"یعنی تیرا کہنا یہ ہے کہ خلیفہ کا بڑا بیٹا ہادی' رافعہ کے ذریعے اپنا کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے؟" میں نے وضاحت چاہی۔ "مگر وہ مقصد آخر کیا ہو سکتا ہے؟"

"یہ معلوم کرنا کون سا مشکل ہے! ہم دونوں میں سے کوئی بھی اس آدم زاد کنیز کو اپنے اثر میں لے کر آ سانی . . ."

"نہیں۔" میں نے عارج کی بات کاٹ دی۔ "ہمیں اس جھگڑے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔"

پھر عارج نے مزید بحث نہیں کی۔ دراصل اس معاملے میں پڑ کے میں اپنے یا عارج کے لئے کوئی نیا مسئلہ پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ہم نے قصر خلافت میں اس لئے سکونت اختیار نہیں کی تھی کہ ہمیں یہاں سے بھی فرار ہونا پڑے۔

میں برسوں مغلیہ تاجدار ہمایوں کے عہد میں رہنے کے بعد بغداد لوٹ کر آئی تھی۔ اس دوران میں یہاں کئی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ ان میں سب سے بڑی اور اہم تبدیلی خلیفہ کے وزیر یعقوب کی جگہ نئے وزیر فیض بن ابی صالح کا تقرر تھا۔

عارج سے میں نے یعقوب کے متعلق جو پیش گوئی کی تھی وہ درست ثابت ہوئی۔ میں نے صرف اتنا ہی کیا تھا کہ جب وزیر یعقوب ایک شب خلیفہ المہدی سے مل کر قصر خلافت سے واپس جا رہا تھا تو اس کے گھوڑے کو بدکا دیا۔ نتیجہ یہ کہ گھوڑے سے گر کر یعقوب کی پنڈلی ٹوٹ گئی۔ بظاہر یہ معمولی سا واقعہ معلوم ہوتا تھا' مگر واقعتاً ایسا نہیں تھا۔ میرے نزدیک اس کے دوررس نتائج نکلنے تھے۔ اس وقت صورتحال یہ تھی کہ وزیر یعقوب سے عوام نالاں تھے۔ دربار میں بھی امرا کا ایک گروپ یعقوب کے خلاف تھا۔ یہ امرا یعقوب کی مخالفت میں خلیفہ کے کان بھرتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود خلیفہ نے یعقوب کو اس کے عہدے سے نہیں ہٹایا۔ وہ کیا اسباب تھے ان سے میں واقف تھی۔ ان اسباب میں خلیفہ المہدی کے ذوق جمال کو بھی بڑا دخل تھا۔ خلیفہ سے قربت کی وجہ سے یعقوب ان "کمزوریوں" سے آگاہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ المہدی اپنے باپ کی طرح نہیں تھا بلکہ عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔ میں نے قصر خلافت میں یہ بھی سنا کہ خلیفہ کو عطر میں بسی ہوئی باندیوں سے بڑی

رغبت تھی۔ اس پر بھی وہ انتظام سلطنت کی طرف پوری توجہ کرتا تھا۔ وہ جنگوں میں شریک ہوتا اور رعایا کا خیال رکھتا تھا۔ مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے مہدی کی عشرت پسندی کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ دولت کی فراوانی اور بے اندازہ اختیارات آدم زادوں کو عیاشی کی طرف مائل کر دیتے ہیں۔ میں نے رعایتاً جس کمزوری کو "ذوق جمال" کا نام دیا ہے' یہ کمزوری حکمرانوں میں عموماً پائی جاتی ہے۔ مغل بادشاہ ہمایوں بھی بڑی حد تک اسی "بیماری" میں مبتلا تھا جس کا مشاہدہ میں خود کر چکی تھی۔ خلیفہ مہدی کی یہ عشرت پسندی اس کے بڑے بیٹے موسیٰ الہادی میں بھی منتقل ہوئی تھی۔ یہ بڑی عجیب اور حیران کن سی بات ہے کہ خلیفہ مہدی کی منفی عادات ہادی نے اپنائیں اور مثبت صفات چھوٹے بیٹے ہارون کے حصے میں آئیں۔

ہوتا یہ ہے کہ بدخواہ اور موقع پرست لوگ حکمرانوں کی کمزوریوں اور منفی عادات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسا ہی یعقوب نے کیا۔ میں اگر مداخلت نہ کرتی تو شاید صورتحال میں کوئی مثبت تبدیلی نہ آتی۔

میری توقع کے عین مطابق ہوا یہ کہ جب پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تو یعقوب معذور ہو گیا۔ اس حالت میں وہ نہ تو دربار خلافت میں حاضر ہو سکتا تھا' نہ خلوت میں خلیفہ مہدی سے ملاقاتیں ممکن تھیں۔ جو امرا یعقوب کو سخت ناپسند کرتے تھے' اس کی غیر حاضری سے انہوں نے فائدہ اٹھایا۔ ان امراء نے اس کے خلاف ایسے ناقابل تردید ثبوت پیش کئے کہ خلیفہ مہدی بھی قائل ہو گیا۔

یعقوب ابھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا تھا کہ خلیفہ مہدی نے اسے معزول کر دیا۔ اس پر بدعقیدہ ہونے کا الزام ثابت کر دیا گیا تھا۔ اس معزولی کے ساتھ ہی نئے وزیر فیض بن ابی صالح کا تقرر ہوا جو عوام کے لئے واقعی فیض رساں نکلا۔ جب خلیفہ مہدی نے جرجان پر فوج کشی کا حکم دیا تو وزیر فیض ہی تھا۔ یعقوب زنداں میں تھا اور اس کی جائیداد ضبط کر لی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

یعقوب کی وجہ سے چونکہ عوام تنگ تھے' میں نے اس لئے اسے وزارت سے ہٹانے کی راہ ہموار کی' لیکن خلیفہ مہدی کے خلاف کوئی ممکنہ سازش فرد واحد کا معاملہ تھا۔ اسی بنا پر میں نے عارج کو مداخلت سے روک دیا تھا۔ انفرادی اور اجتماعی مفاد کو میں بخوبی سمجھتی تھی۔ میری کوشش ہمیشہ اجتماعی مفاد کے حق میں ہوتی' البتہ کسی بے گناہ کی زندگی و موت کا مسئلہ ہوتا تو بھی میں ممکنہ حد تک اس کی مدد سے گریز نہ کرتی۔ میرے خیال میں یہ بھی خدمت خلق تھی۔

قصر خلافت میں ایک خادمہ جمیلہ کی حیثیت سے میں کوئی کم رتبہ نہیں تھی اور نہ عارج کو خادم ایوب جان کر کوئی بھی کمتر سمجھتا تھا۔ اس کا سبب ایوب و جمیلہ کی خدمت گزاری تھی جس سے خلیفہ مہدی خوش تھا اور خلیفہ کی خوشنودی حاصل ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ خلیفہ کی ملکہ خیزران بھی ایوب اور جمیلہ کو انعام و اکرام سے نوازتی رہتی تھی۔ میں نے اسی وجہ سے اپنے اور عارج کے لئے ان انسانی قالبوں کو منتخب کیا تھا۔

یہ واقعہ 18 محرم 169 ہجری کا ہے کہ جب خلیفہ مہدی دارالحکومت بغداد سے جرجان کے لئے روانہ ہوا۔ اس کے ہمراہ مسلح افواج کی خاصی بڑی تعداد تھی۔ دارالحکومت کے انتظام و انصرام کی ذمے داری مہدی نے ربیع کے سپرد کر دی تھی۔ ہر چند کہ خلیفہ منصور کا آزاد کردہ یہ غلام کافی بوڑھا ہو چکا تھا مگر بنو عباس کی وفاداری میں شاید ہی کوئی اس کا ثانی ہو۔ اس تقرر کی ایک وجہ یہ تھی کہ مہدی اپنے چھوٹے بیٹے ہارون کو بھی اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ وزیر فیض بھی خلیفہ کی رکاب میں تھا۔ مہدی نے یہ عزم کر رکھا تھا کہ ہر حال میں ہادی سے ہارون کی ولی عہدی کے لئے بیعت لے گا۔ وہ اس بات سے لاعلم تھا کہ تقدیر اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلنے والی ہے۔

بغداد سے روانگی کے دو روز بعد ماسندان کے مقام پر خلیفہ نے پڑاؤ کا حکم دیا۔ راستے میں اس نے برائے نام اور ضرورتاً ہی قیام کیا تھا۔ اس لئے ماسندان میں دو روزہ قیام کا

اعلان ہوا تاکہ سپاہیوں کو آرام کا موقع مل جائے۔ اس دوران میں خلیفہ شکار بھی کھیلنا چاہتا تھا۔

جس جگہ خلیفہ کا خیمہ نصب کیا گیا اس کے قریب دائیں جانب ہارون اور بائیں جانب وزیر فیض کے خیمے تھے۔ جو خیمہ خلیفہ کے لئے مخصوص تھا' وہ چار بڑے حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصہ خلیفہ کی خواب گاہ' دوسرا حصہ نشست گاہ' تیسرا حصہ محافظ دستے اور چوتھا حصہ خادموں اور کنیزوں کے لئے تھا۔ عارج اور میں اسی چوتھے حصے میں تھے۔ اس حصے میں وہ خاص مطبخ بھی تھا جس میں صرف خلیفہ اور اس کے اہل خاندان کے واسطے کھانا پکتا تھا۔ خیمے کے چوتھے حصے میں ہمارے علاوہ مطبخ کے دو ملازمین نیز مزید ایک خادم اور کنیز بھی تھی۔ یوں گویا چھ افراد کا قیام اس حصے میں تھا۔ کنیز رافعہ بھی ان میں شامل تھی۔

ماسندان میں قیام کے دوسرے روز صبح ناشتہ کرتے ہی خلیفہ مہدی شکار کھیلنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ میر شکار نے ایک دن پہلے ہی شکار کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔

پوری طرح اندھیرا پھیلنے سے پہلے خلیفہ شکار سے لوٹ آیا۔ مطبخ (باورچی خانہ) کے نگران کو خلیفہ نے حکم دیا کہ وہ جو ہرن شکار کر کے لایا ہے' رات کے کھانے میں اسی کے کباب بنائے جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں دیر لگتی اس لئے خلیفہ نے وقتی طور پر شکم سیری کی غرض سے پھل طلب کئے۔ میں تعمیل حکم کی خاطر اٹھنے ہی والی تھی کہ رافعہ نے مجھے یہ کہہ کر روک دیا۔ "ایوب اور تم نے ابھی پورے خیمے کی صفائی کی ہے' سو تھک گئے ہو گے۔ امیر المومنین کی خدمت میں پھل لے کر میں چلی جاتی ہوں۔"

رافعہ ایک قاب میں پھل لے کر چلی گئی تو میں نے عارج کو مخاطب کیا۔ "تو اس کنیز کی غیبت میں لگا رہتا ہے اور یہ ہم پر اس قدر مہربان ہے۔ اسے ہمارا کتنا احساس ہے!" خیمے کے اس گوشے میں ہم دونوں اکیلے تھے' پھر یہ کہ میری آواز دھیمی تھی۔

"اس مہربانی کی بھی کوئی وجہ ضرور ہو گی۔" عارج نے بدستور اپنے شک کا اظہار کیا۔

اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ عارج کا شک بے سبب نہیں۔

کنیز رافعہ خیمے کے اس حصے میں واپس آئی تو خلاف توقع مجھے کچھ گھبرائی ہوئی سی لگی۔ میں نے رافعہ سے اس کی وجہ پوچھی تو اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور

چادر اوڑھتے ہوئے بولی۔ "کوئی کوئی خاص بات نہیں۔"

"تم کہیں جا رہی ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں میرا ایک بھتیجا بھی فوج میں ہے۔ کل پتہ چلا تھا کہ وہ علیل ہو گیا ہے اسے دیکھنے جا رہی ہوں۔ بس ابھی آئی میں!" رافعہ یہ کہہ کر تیزی کے ساتھ خیمے سے نکل گئی۔

رافعہ کو گئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ پنچھی جیسی ایک چیخ سن کر میں تقریباً اچھل پڑی۔ یہ چیخ خلیفہ مہدی کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ چیخ کی آواز خیمے کے اس حصے کی طرف سے آئی تھی جو خلیفہ کے لئے مخصوص تھا۔ ہر چند کہ طلب کئے بغیر اس حصے میں جانا ممنوع تھا مگر یہ ہنگامی حالات تھے۔ سو عارج اور میں بے اختیار ادھر دوڑ پڑے۔

جیسے ہی ہم خیمے کے اس مخصوص حصے میں پہنچے دنگ رہ گئے۔ خلیفہ مہدی کو اس کے محافظ دستے کے سپاہی گھیرے میں لئے ہوئے تھے اور وہ بے سدھ سا اپنی مسند پر پڑا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی۔ قریب ہی پھلوں کی قاب رکھی تھی۔ امرود کی دو پھانکیں خلیفہ کے بے حرکت جسم کے قریب پڑی تھیں۔

"طبیب کو بلاؤ جلدی!" کوئی بلند آواز میں بولا۔

جب یہ سب چیخ پکار مچی ہوئی تھی میری سماعت میں عارج کے الفاظ گونج رہے تھے۔ "میں قصر خلافت میں ایک سازش کی بو محسوس کر رہا ہوں مجھے یہ شک ہے کہ باغی کے حامی خلیفہ المہدی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔" اس ضمن میں عارج نے کنیز رافعہ کو مشتبہ قرار دیا تھا۔ عارج کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میری چشم تصور میں ادھیڑ عمر کنیز رافعہ کا چہرہ گھوم گیا۔ کچھ ہی دیر پہلے جب وہ خیمے سے نکل رہی تھی تو اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔

کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ خلیفہ کے طبیب خاص نے تصدیق کر دی، خلیفہ کو کوئی سریع الاثر زہر دیا گیا ہے۔ اسی زہر خورانی کے سبب خلیفہ مہدی کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ 22 محرم 169 ہجری تھی۔

یہ اتنی بڑی خبر تھی کہ اول اول لوگوں کو یقین ہی نہ آیا کہ ایسا واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ خلیفہ کے چھوٹے بیٹے ہارون الرشید کے حکم پر خیمے کو مسلح محافظوں نے گھیرے میں لے لیا۔ اب کسی کو خلیفہ کے خیمے سے باہر جانے یا وہاں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ طبیب خاص اور اس کے نائبوں نے جلد ہی یہ پتہ لگا لیا کہ جو امرود خلیفہ نے کھایا ہوگا اور جس کی دو پھانکیں مسند پر ملی تھیں، وہ زہر آلود تھا۔ انہی زہر آلود دونوں پھانکوں میں سے ایک پھانک

کتے کو کھلائی گئی تو چند لمحوں میں تڑپ کر مر گیا۔ پھلوں کی اس پوری قاب میں کئی اور پھل بھی زہر آلود پائے گئے۔

ہارون الرشید کے حکم ہی پر دیوان الجند (فوج کا محکمہ) کے تفتیشی افسران کو طلب کیا گیا۔

ہم چار افراد خلیفہ کی خدمت پر مامور تھے جن میں سے رافعہ غائب تھی۔ سو ایسی صورت میں ان فوجی افسران کے سامنے ہماری ہی پیشی ہوئی۔ تفتیش کے وقت محافظ دستے کا سالار بھی موجود تھا۔ اس نے عارج سے پوچھا۔ "امیر المومنین کی خدمت میں ادھیڑ عمر کنیز رافعہ بھی مامور تھی، وہ کہاں ہے؟"

"وہ اپنے کسی بیمار بھتیجے کی عیادت کرنے گئی ہے جو فوج میں ملازم ہے۔" عارج نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، وہ آ جائے گی تو اس سے بھی پوچھ گچھ کر لیں گے۔" فوج کے ایک تفتیشی افسر نے کہا، پھر مجھے مخاطب کیا۔ "امیر المومنین کی خدمت میں پھل پیش کرنے کون گیا تھا؟"

"کنیز رافعہ۔" میں نے بتایا۔

تفتیشی افسر کو میں نے چونکتے دیکھا۔ پھر وہ بے اختیار بولا۔ "اور وہی موجود نہیں۔"

"جس وقت وہ کنیز، امیر المومنین کو پھل پیش کر کے لوٹی تھی، اس کے کتنی دیر بعد خیمے سے نکلی تھی۔" تفتیشی افسران کے نگران نے سوال کیا۔

جواب میں نے ہی دیا کیونکہ وہ مجھ ہی سے ہمکلام تھا۔ "کنیز رافعہ فوراً ہی چادر اوڑھ کر خیمے سے نکل گئی تھی۔ اسی دوران میں میرے پوچھنے پر اس نے یہ بتایا تھا کہ اپنے بیمار بھتیجے کو دیکھنے جا رہی ہے۔"

"اس کنیز کو فوری طور پر تلاش کیا جائے!" فوجی تفتیشی نگران نے حکم دیا۔

محافظ دستے کے تقریباً سبھی سپاہی کنیز رافعہ کو پہچانتے تھے۔ انہی میں سے چند کو اس "مہم" پر روانہ کر دیا۔ فوجیوں کے چار دستے بنائے گئے۔ ہر دستے کے ساتھ محافظ دستے کا ایک ایسا سپاہی تھا جو کنیز رافعہ کو پہچان سکے۔

چاروں فوجی دستے خیمہ گاہ کی چاروں سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ اب چونکہ سورج

غروب ہو چکا تھا اس لئے رافعہ کی تلاش میں روانہ ہونے والے فوجیوں کے ہاتھوں میں روشن مشعلیں تھیں۔ میں خیمے کے در سے انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

یہ تو خیر طے ہو چکا تھا کہ خلیفہ المہدی کو زہر دیا گیا ہے' مگر زہر کس نے اور کیوں دیا؟ یہ سوال ابھی جواب طلب تھا۔ بڑی حد تک اب مجھے عارج کا شبہ درست معلوم ہونے لگا تھا۔ اس شبے کی تصدیق کنیز رافعہ کی تلاش میں کامیابی کے بعد ہی ہو سکتی تھی۔

عشاء کا وقت ہونے والا تھا کہ جب فوجی دستے کنیز رافعہ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر یہ تلاش ایک اعتبار سے لاحاصل ہی رہی۔ تلاش کرنے والوں کو رافعہ کی لاش ملی تھی جس کے سینے میں دل کے مقام پر ایک خنجر پیوست تھا۔ رافعہ کے قاتل کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ رافعہ کے قتل سے یہ صاف ظاہر تھا کہ جس نے بھی اس کے ہاتھوں خلیفہ المہدی کو زہر دلوایا تھا' پس پردہ رہنا چاہتا تھا۔ اگر رافعہ زندہ بچ جاتی تو یقیناً یہ راز کھل جاتا۔ یہ آدم زاد بھی اقتدار کی خاطر کیا کیا سوانگ رچاتے اور کس کس طرح بے رحمی کا مظاہرہ کرتے ہیں! خلیفہ المہدی کی موت کا مطلب یہی تھا کہ کسی اور کو اقتدار کی طلب تھی۔

رافعہ کی یہ بات بھی غلط ثابت ہوئی کہ فوج میں اس کا کوئی بھتیجا ملازم ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ خلیفہ کو زہر آلود پھل دینے کے بعد وہ فرار ہونا چاہتی تھی۔ جن لوگوں یا جس شخص نے اسے فرار کرانے کی ذمے داری لی ہو گی' اسی نے رافعہ کو قتل کر کے اس کی لاش لشکر گاہ سے کچھ دور پھینک دی ہو گی۔ یہ کڑیاں جوڑنا میرے لئے مشکل نہ تھا۔

اب چونکہ تفتیش کا رخ بدل گیا تھا اس لئے ہارون الرشید کے حکم پر ہمیں ایک اور خیمے میں منتقل کر دیا گیا۔ اب ہم پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ مطبخ کے دونوں ملازمین کو مع ایک خادم کے ہارون الرشید کے خیمے میں بھیج دیا گیا۔ مجھے اور عارج کو جو خیمہ ملا وہ بھی ہارون کے خیمے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو گی کہ ہارون جب چاہے ہمیں اپنی خدمت کے لئے طلب کر لے۔ مرحوم خلیفہ کے خیمے میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے اطراف سخت پہرا تھا۔

عارج کو اور مجھے جب خلوت میسر آئی تو میں نے دھیمی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

'' اے عارج! تو نے جس سازش کی بو محسوس کر لی تھی' وہ سچ ثابت ہوئی' لیکن موجودہ حالات میں یہی مناسب ہے کہ ہم اپنی زبانیں بند رکھیں۔''

'' تیرا کہنا ٹھیک ہے اے دینار! ہمیں آدم زادوں کے اس جھگڑے سے دور ہی

رہنا چاہئے۔ بصورت دیگر قصر خلافت میں رہنا تو درکنار ہماری زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ان اقتدار کے دیوانوں کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب کسی کے قتل کا حکم دے دیں اور ہم بے خبری میں مارے جائیں۔ عالم سوما نے قصر خلافت کو خطرناک جگہ قرار دیا تھا' یاد ہے تجھے؟''

'' ہاں یاد ہے۔'' میں نے کہا۔ '' لیکن ہم اگر چوکنا اور محتاط رہیں تو ہماری زندگی کو وہاں کوئی خطرہ نہیں۔''

میرا خیال تھا کہ خلیفہ المہدی کی تدفین آئندہ روز صبح ہو گی مگر ہارون نے طبیبوں کے مشورے کو قبول کر لیا۔ جو زہر دیا گیا تھا اس کا اثر خلیفہ کی لاش پر ظاہر ہونے لگا تھا۔ زہر کے اثر سے جسم کی جلد کئی جگہ سے تڑخنے لگی تھی۔ طبیبوں نے خلیفہ کی لاش کو دیکھ کر یہ مشورہ دیا تھا کہ رات ہی کو اسے دفنا دیا جائے۔

نصف شب سے پہلے خلیفہ المہدی کی تدفین عمل میں آئی۔ اس کی نماز جنازہ ہارون نے پڑھائی۔

اس بات کا علم سبھی کو تھا کہ مرحوم خلیفہ اپنے بڑے بیٹے الہادی کے بجائے ہارون الرشید کو اپنا ولی عہد بنانا چاہتا تھا اسی سبب سارے لشکر میں یہ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ نیا خلیفہ کون بنے گا؟ عارج نے بھی اس رات سونے سے پہلے یہی سوال کیا۔

'' ابومحمد موسیٰ الہادی...... خلیفہ کا بڑا بیٹا! وہی کہ جس کے خلاف مرحوم خلیفہ فوج لے کر جا رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

'' مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ خلیفہ المہدی تو ہادی کے بجائے ہارون کو......''

'' معلوم ہے مجھے۔'' میں بول اٹھی۔ '' تیرا یہ کہنا بجا کہ خلیفہ مہدی' ہارون کو اپنا ولی عہد بنانا چاہتا تھا لیکن وہ ہارون کے لئے ولی عہدی کی بیعت تو نہیں لے سکا۔ بتا ایسا ہی ہوا ہے نا؟''

'' ہاں اے دینار! لیکن یہ تو ظلم ہو گا۔'' عارج کے لہجے میں تاسف تھا۔ '' وہ جس نے اپنے باپ کی نافرمانی کی' باپ کے قاصد کو پٹوا کر ذلیل کیا اور طلب کرنے پر بغداد نہ آیا' اسے مسلمانوں کا خلیفہ نہیں بننا چاہئے۔''

'' یقیناً تیرے جذبات غلط نہیں اے عارج' مگر یہ آدم زادوں کی دنیا ہے' عالم جنات نہیں جہاں صدیوں ایک ہی سردار قبیلہ رہے اور اقتدار و حکمرانی کی جنگ نہ چھڑے۔ جہاں تک ہادی کے خلیفہ بننے کا تعلق ہے تو مرحوم المہدی اس کے لئے ولی عہدی کی بیعت

لے چکا تھا جبکہ ہارون کے معاملے میں ایسا نہیں ہو سکا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہادی کی بابت سابق بیعت ساقط نہیں ہو پائی۔ تو دیکھ لیجو کہ امرا اور مفتی' ہادی ہی کے حق میں فیصلہ دیں گے۔"

"اور ہارون' کیا وہ اس فیصلے کو قبول کر لے گا؟" عارج نے دریافت کیا۔

"یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا مگر مجھے یوں لگ رہا ہے اے عارج کہ بغداد شہر کے دروازوں پر کوئی طوفان دستک دینے والا ہے۔"

"دینار! یہ بتا کہ اگر تیرے اندازے کے مطابق ہادی ہی نیا خلیفہ بنا تو کیا اپنے باپ کے ورثے میں ہم دونوں کو بھی قبول کر لے گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ہمیں معزول کر دے؟"

"دیکھ عارج' جو با اعتماد' آزمودہ اور وفادار ہوتے ہیں انہیں معزول نہیں کیا جاتا۔ خادم' خادمائیں' غلام اور کنیزیں ایک حکمران سے دوسرے کو بالکل اسی طرح منتقل ہوتے رہتے ہیں جس طرح اقتدار' خزانہ' باپ کا غلام وراثتاً بیٹے کا غلام بھی ہوتا ہے۔ کچھ یہی معاملہ خدام کا ہے۔ یوں سمجھ کہ ان کی حیثیت اثاثے جیسی ہے۔ یہ بے چارے ہر نئے آنے والے حکمران کے وفادار بن جاتے ہیں۔ حقیقتاً یہ اقتدار و حکومت کے وفادار ہوتے ہیں' جسے اقتدار مل گیا' بس یہ اسی کے ہو گئے۔ ہر نیا آنے والا حکمراں اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے۔ انہی میں سے کچھ بے وقوف بھی ہوتے ہیں یا بے وقوف بنا دیئے جاتے ہیں اور ان کا حشر کنیز رافعہ جیسا ہوتا ہے۔"

رات کو میں عارج سے دیر تک ایسی ہی باتیں کرتی رہی تاکہ اس کے اندیشے اور خدشات دور ہو سکیں۔

توقع کے مطابق دوسرے دن صبح ہارون نے عارج کو اور مجھے اپنی خدمت میں طلب کر لیا۔ ہم اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ وہاں منتقل ہو گئے۔

میں نے ہارون کے چہرے پر حزن و ملال کے ساتھ فکرمندی کے آثار بھی دیکھے۔ ہارون کا خیمہ بھی چار حصوں میں تقسیم تھا۔ ان میں سے جو حصہ نشست گاہ کے لئے مخصوص تھا' وہاں ہارون عالم اضطراب میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ مطبخ کے نگران سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ہارون نے اب تک ناشتہ بھی نہیں کیا۔ معلوم نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا! معاً اس نے ایک محافظ کو طلب کیا اور وزیر فیض بن ابی صالح کو فوری طور پر بلوایا۔

نشست گاہ اور خادموں کے حصے کو صرف ایک پردے سے جدا کیا گیا تھا۔ سو نشست گاہ میں ہونے والی گفتگو سن لینا میرے لئے آسان تھا۔ اس کے علاوہ میں دور رہ کر بھی سب کچھ سننے کی اہل تھی۔ مجھے اس غرض سے اپنی سماعت کا دائرہ وسیع کرنا پڑتا۔ اسی کے ساتھ اپنی چشم تصور کو متحرک کر کے میں اپنی آنکھوں سے اوجھل منظر بھی دیکھ سکتی تھی۔ یہ وضاحت غالباً پہلے بھی میں کر چکی ہوں۔ دوبارہ اس کی ضرورت یوں پیش آئی کہ میری باتوں کو سمجھنے میں کسی کو کوئی دشواری نہ ہو۔ تاکہ یہ امر واضح ہو جائے کہ جہاں میں کسی انسانی قالب میں موجود نہیں تھی' وہاں کی خبر مجھے کیسے ہو گئی! دراصل ہم جنات کی مختلف پر اسرار صفات کے بارے میں آدم زادوں کو علم نہیں اس لئے ان کے ذہنوں میں مختلف سوالات پیدا ہونا فطری سی بات تھی۔ جنات کے متعلق اب تک میں بہت کچھ بتا چکی ہوں' اس کے باوجود ابھی مزید ایسی حیران کن باتیں ہیں جن کا ذکر میری سرگزشت میں آگے آئے گا۔ آدم زادوں' خصوصاً قابل ذکر آدم زادوں کے درمیان رہ کر میں نے جو کچھ دیکھا' سنا' محسوس کیا اور جانا یہ بیان کی اعتبار سے اہم اور دلچسپ ہے۔ میں متعدد تاریخی واقعات کی عینی شاہد ہوں' خواہ ان واقعات پر آدم زاد یقین کریں نہ کریں۔ میرے نزدیک یقین نہ کرنے کی ایک وجہ تعصب بھی ہو سکتی ہے۔ جنات سے آدم زاد تعصب رکھتے ہیں اور انہیں خود سے کمتر جانتے ہیں۔ اہل ایمان ہونے کی بنا پر میں کم از کم آدم زادیوں اور آدم زادوں کو تمام مخلوقات میں اشرف ہی جانتی ہوں۔ یہ الگ بات کہ اس کے باوجود آدم زادوں کی اکثریت ہم جنات سے ڈرتی ہے۔

اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ اگر ہم جنات شرارت و فساد پر اتر آئیں تو آدم زادوں کا جینا حرام کر دیں' لیکن نیک و بد ہر مخلوق میں ہوتے ہیں۔ سو ہم بھی ہیں۔ وہ جو فسادی نہیں ہوتے اور آدم زادوں کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں رہتے ہیں۔ عموماً انہیں پریشان یا تنگ نہیں کرتے اور نہ ان کے معاملات میں حتی الامکان مداخلت کرتے ہیں۔ میں بھی اسی پر عمل پیرا تھی۔ اسی سبب عارج کو میں نے رافعہ کے بارے میں مداخلت سے روک دیا تھا۔ ممکن ہے جب خلیفہ کو کسی سازش کا پتہ چلتا تو صورتحال مختلف ہوتی' لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں ہو گا۔ وہ خلیفہ محمد بن عبداللہ المہدی جو 127 ہجری میں بمقام ایرج پیدا ہوا اور وہ کہ جس کی ماں کا نام ام موسیٰ بنت منصور حمیریہ تھا' اس کی زندگی اتنی ہی تھی۔

خلیفہ مہدی کی تدفین رات کو ہوئی تھی اور دوسرے دن صبح ہی سے افواج میں بے چینی پائی جاتی تھی۔ اس کی وجہ غیر یقینی حالات تھے۔ جب اچانک اور غیر متوقع طور پر کوئی

حکمران موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے تو ایسے ہی حالات پیش آتے ہیں۔ اسی فضا کو اعتدال میں لانے کی غرض سے ہارون نے وزیر فیض کو مشورے کے لئے اپنے خیمے میں طلب کیا۔ وہ بہر حال حکمران خاندان کا ایک اہم فرد اور حکم دینے کا اہل تھا۔ سو وزیر نے حاضر ہونے میں دیر نہ کی۔

"لشکریوں کے اضطراب پر فی الحال کس طرح قابو پایا جائے؟" ہارون نے وزیر سے سوال کیا۔

"غلام یہ سمجھتا ہے کہ سپاہیوں کی دلجوئی اور تالیف قلوب ضروری ہے۔" فیض نے جواب دیا۔

"اس کے لئے اب تک ایک ہی صورت قابل عمل رہی ہے۔" ہارون نے کہا۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ لشکریوں کو دو دو سو درہم دے دیئے جائیں۔ اسی کے ساتھ بغداد واپسی کی منادی کرادی جائے۔"

"حضور کے حکم کی تعمیل ہوگی۔" وزیر فیض سودبانہ لہجے میں بولا۔

ہارون نے اسے رخصت ہونے کا اشارہ کر دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ رعایا ہو یا لشکری وہ اسی صورت میں مطمئن رہتے ہیں جب ان کے گھروں میں چولہے جلتے رہیں، پیٹ بھرے ہوں، روٹی ملتی رہے اور ان کی ضروریات پوری کی جاتی رہیں۔ خوبصورت الفاظ سے بھوک نہیں مٹتی، اس کے لئے عملی اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ سو ہارون نے یہی راستہ اختیار کیا۔

لشکریوں کو دو دو سو درہم ملے تو وہ ہارون کا دم بھرنے لگے۔

بغداد کی طرف کوچ کرنے سے پہلے فضا کچھ ایسی بن گئی تھی جیسے خلیفہ مہدی کے بعد اب ہارون الرشید ہی نیا خلیفہ ہوگا، مگر راستے میں بغداد کی طرف جاتے ہوئے ایک اور خبر نے سنسنی پھیلا دی۔

خلیفہ مہدی کے انتقال کی اطلاع جرجان میں ہادی کو بھی مل گئی تھی۔ ظاہر ہے اسے یہ اطلاع فوراً پہنچانے والا اسی کا کوئی خیر خواہ یا نمک خوار ہوگا۔ یہ نمک خوار وہ شخص بھی ہو سکتا تھا جس کے ہاتھوں کنیز رافعہ قتل ہوئی تھی۔

ہارون کو ملنے والی سنسنی خیز خبر یہ تھی کہ اس کے بڑے بھائی موسیٰ الہادی نے جرجان میں خلافت کی بیعت لے لی ہے۔ اس کے لئے ہادی نے اپنے ولی عہد ہونے کی

دلیل دی تھی۔ ہادی کی اس دلیل کو ان امرا اور اراکین سلطنت نے تسلیم کر لیا تھا جو جرجان میں اس کے ساتھ تھے۔

ہادی کے ہم نوا و حمایتی بغداد میں بھی تھے۔ اس کی وجہ سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ دار الحکومت فتنہ و فساد کا شکار نہ ہو جائے۔ ربیع کو مرحوم خلیفہ مہدی نے گویا اپنی نیابت کی غرض سے بغداد میں چھوڑا تھا۔ سو ہادی کے حمایتی جو فوج میں تھے ربیع کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔ وہ بوڑھا خلیفہ منصور کے زمانے سے حکمران خاندان کا وفادار و بہی خواہ تھا، مگر ہوتا یہ ہے کہ حکمران بدلنے کے ساتھ ساتھ آدم زادوں کو وفاداریاں بھی بدلنی پڑتی ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ مسلمانوں کی طاقت منظم تھی۔ ان کے درمیان کسی نوع کی بھی تقسیم سلطنت کے لئے نقصان دہ ہوتی۔ اس تقسیم کی بنیاد ہادی اور ہارون کی حمایت تھی۔

پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ میں نے بغداد شہر میں جگہ جگہ آگ لگی دیکھی۔ ہر طرف لوٹ مار اور فتنہ و فساد کا بازار گرم تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں کسی کی حکومت ہی نہ ہو۔

قصر خلافت اور اس سے ملحق علاقوں کو مرحوم خلیفہ نے مدینتہ المہدی کا نام دے دیا تھا، شہر کا یہ اہم حصہ بھی محفوظ نہیں تھا۔ رصافہ محلے میں ربیع کے مکان سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔

بغداد میں داخل ہونے کے چار دروازے تھے۔ ان چاروں دروازوں تک فسادات کی آگ پھیلی ہوئی تھی۔

بہتر ہوگا کہ میں ان چاروں دروازوں کی تفصیل بیان کر دوں تا کہ اس عہد کے بغداد کا پورا نقشہ واضح ہو جائے۔

شہر کے چاروں دروازے مساوی فاصلے پر تھے۔ (ایک ایک عربی میل کے فاصلے پر) ہر دروازے سے ایک ایک شاہراہ نکلتی تھی۔ آئندہ زمانے میں انہی چاروں سڑکوں پر شہر کی بیرونی آبادی قائم ہوتی چلی گئی اور پھر یہ تمام آبادی بھی اس عظیم الشان دار الخلافہ کے وسیع حلقے میں آ گئی۔ ان چاروں دروازوں میں سے ایک کا نام باب بصرہ تھا۔ یہ جنوب مشرق میں تھا۔ یہ اس آبادی میں واقع تھا جو دریائے دجلہ کے کنارے اس جگہ پر تھی جہاں سے نہر عیسیٰ نکلتی تھی۔۔ دوسرا دروازہ جنوب مغرب میں باب کوفہ تھا۔ یہاں سے جنوب کی سمت ایک سڑک نکلتی تھی اور یہی سڑک مکہ معظمہ کو جاتی تھی۔ شمال مشرق میں تیسرا دروازہ باب الشام تھا جہاں

سے ایک شاہراہ بائیں طرف فرات کے کنارے آباد شہر انبار (خلیفہ منصور نے بغداد کی تعمیر سے پہلے اسی شہر کو اپنا دارالخلافہ بنا رکھا تھا) کو اور دائیں طرف دجلہ کے مغربی کنارے کے شہروں کو جاتی تھی جو بغداد کے شمال میں واقع تھے۔ شہر کا چوتھا دروازہ باب خراسان کہلاتا تھا۔ یہاں سے ہو کر کشتیوں کے بڑے پل کو ایک راستہ دریا اترنے کے لئے جاتا تھا۔ اسی پل سے مسافر مشرقی بغداد میں آتا تھا۔ مشرقی شہر تین حصوں میں تقسیم تھا۔ پل کے سرے کے قریب کا حصہ رصافہ کہلاتا تھا جس کا ذکر میں پہلے بھی کئی بار کر چکی ہوں۔ بیشتر اراکین سلطنت اور امرا اسی محلے میں آباد تھے۔ دوسرا حصہ شماسیہ تھا جو رصافہ کے شمال میں دریا کے کنارے تھا۔ تیسرا حصہ مخرّم رصافہ کے جنوب کی طرف تھا۔ مشرقی بغداد کے ان تینوں محلوں کے گرد نصف دائرے کے شکل جیسی ایک فصیل تھی۔ یہ فصیل دریا کنارے شماسیہ کے شمال سے شروع ہو کر مخرم کے جنوب میں دریا کے کنارے ختم ہو جاتی تھی۔

اسی مشرقی بغداد کے وسطی اور تنگ حصے سے خراسان والی بڑی سڑک کا ابتدائی حصہ گزرتا تھا۔ یہ سڑک باب خراسان سے شروع ہو کر دریا اترتی ہوئی مشرقی بغداد کے باب خراسان سے (جو اس نام کا دوسرا دروازہ تھا) گزرتی تھی۔ یہاں سے یہ بڑی سڑک اسلامی سلطنت کی انتہائی حدود تک پہنچتی تھی۔

بغداد کے باب کوفہ سے باہر کی آبادی جس کا پھیلاؤ کم و بیش ایک فرسخ (تقریباً تین میل) تھا' کرخ کہلاتی تھی۔ اس محلے کا بھی ذکر میری سرگزشت میں پہلے آ چکا ہے۔ باب محول کے باہر کی آبادی دارالخلافہ کے مغرب کی طرف واقع تھی۔ باب کوفہ اور باب الشام دونوں سے ہو کر اس کو راستہ جاتا تھا۔ ان دروازوں کی دونوں سڑکوں کے ملنے سے مغربی شاہراہ بن جاتی تھی جو محول کی بستی سے گزرتی ہوئی انبار کو جاتی تھی۔ باب الشام کے شمال میں حربیہ کی آبادی تھی۔ یہیں میں نے بابل کے کھنڈرات سے بغداد میں سکونت اختیار کرنے کے لئے مطب کھولا تھا اور یہیں سپاہیوں کی تربیت گاہ تھی جس کا تفصیلی ذکر پہلے آ چکا ہے۔ حربیہ سے گزر کر ہی مغربی بغداد کے شمالی قبرستان تھے۔ یہ قبرستان اس وقت دریا کے ایک خم کی وجہ سے دو طرف سے پانی میں گھرے ہوئے تھے۔

میں نے جن مشہور آبادیوں کا ذکر کیا ہے' ان کے علاوہ بھی بغداد میں مزید چھوٹی بڑی آبادیاں تھیں۔ ان کے نام اور محل وقوع ضرورت پڑنے پر میں بیان کر دوں گی۔ مندرجہ بالا دروازوں اور آبادیوں کا بیان میں نے اس لئے کیا کہ ان میں سے کچھ کے نام میری سر

گزشت میں آ چکے ہیں اور کچھ کے نام آئندہ آئیں گے بغداد دراصل شہروں کا شہر تھا۔ اس کی ہر بڑی آبادی کی حیثیت کسی شہر جیسی تھی۔ تقریباً ہر بڑی آبادی میں مسافروں کے لئے آرام دہ سرائیں تھیں۔ سلطنت جہاں جہاں تک پھیلی ہوئی تھی وہاں وہاں سے لوگ اس شہر بے مثال کا رخ کرتے تھے۔ سیاحت اور معاشی دونوں ہی اعتبار سے اس شہر کی شہرت تھی۔ دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے بھی یہاں ہمیشہ بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔ دور دراز سے آنے والوں کو کسی نہ کسی سرکاری محکمے سے کام پڑتا رہتا تھا۔ ان سارے محکموں کے مرکزی دفاتر وسیع و عریض قصر خلافت ہی کی حدود میں تھے۔ ان میں سے بنیادی محکمے یہ تھے: دیوان الخراج جس کے ذریعے محاصل (ٹیکس) وصول کئے جاتے تھے۔ دیوان الازمہ مرکزی اور صوبائی حسابات کی جانچ پڑتال کرتا تھا۔ دیوان الجند فوج کا محکمہ تھا۔ اسی سے متعلق دیگر چھوٹے بڑے شعبے تھے۔ دیوان الرسائل احکام اور فرامین کا محکمہ تھا۔ دیوان الخاتم' مہر شاہی کا محکمہ' دیوان البرید' ڈاک اور خبر رسانی کا محکمہ نیز دیوان القضاۃ محکمہ انصاف تھا۔ ان تمام محکموں کے علاوہ خلیفہ مہدی نے دیوان زندیقہ بھی قائم کیا تھا۔ اس محکمے کا کام زندیقی عقائد رکھنے والوں کو ختم کرنا تھا۔

یہ تمام باتیں بیان کرنے کا میرا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آدم زادوں کی یہ حکومت بڑی منظم و مضبوط تھی' مگر غیر متوقع حالات کے ایک ہی تند و تیز جھونکے نے بغداد کے بازاروں اور محلوں میں شعلے بھڑکا دیے تھے۔ انہی بھڑکتے شعلوں کے درمیان مرحوم خلیفہ مہدی کے چھوٹے بیٹے ہارون کے ہمراہ عارج اور میں بھی قصر خلافت میں داخل ہوئے۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ دیگر قریبی آبادیوں فلوجہ' نجف' کوفہ وغیرہ سے بھی شر پسند عناصر بغداد میں داخل نہ ہو جائیں۔ ایسی صورت میں نظم و نسق سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا۔

قصر خلافت میں جب عارج اور میں اپنے مخصوص اقامتی حصے میں پہنچے اور ہمیں خلوت میسر آئی تو عارج خاموش نہ رہ سکا۔ وہ بڑے جذباتی لہجے میں مجھ سے کہنے لگا۔ ''صد افسوس اے دینار کہ بغداد ہمارے سامنے جل رہا ہے اور ہم چپ ہیں۔ مجھے بتا کیا جلتے ہوئے گھروں کی آگ بجھانا خدمت خلق نہیں؟ لٹنے والوں کو لٹنے سے بچانا کیا کار خیر نہیں؟ اور کیا......''

''بس کر!'' میں نے ہاتھ اٹھا کر عارج کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا اور بولی۔ ''تو نے جو کچھ کہا اے عارج' مجھے کب اس سے انکار ہے!''

''تو پھر اے دینار تو کچھ کرتی کیوں نہیں! کیا ہم اس تباہی کو نہیں روک سکتے؟''

عارج کی آواز اب بھی پر جوش تھی۔

"تو نے کبھی سوچا اے عارج کہ ہمیں بغداد میں داخل ہوئے ابھی کتنی دیر ہوئی ہے! ابھی تو ہم نے اپنا گرد آلود لباس بھی تبدیل نہیں کیا۔ تو نے جو کچھ کہا' ضرور ہوگا مگر طریقے سے اور اس طرح کہ کسی کو ہم پر شک نہ ہو سکے' ہم جن زاد ہیں۔"

پھر میں نے نہا دھو کر لباس تبدیل کیا۔ عارج نے بھی میری تقلید کی۔ کسی بھی لمحے ہارون یا ملکہ خیزران ہم دونوں میں سے کسی کو طلب کر سکتی تھی۔ میں کسی ایسے ہی لمحے کی منتظر تھی۔ اسی ضمن میں عارج کو بھی میں نے بتایا کہ کیا کرنا ہے!

اپنی پر اسرار قوتوں کو بروئے کار لا کر میں نے شہر بغداد کے مزید حالات بھی معلوم کئے جو انتہائی تشویشناک تھے۔

بدخواہوں کے مخبروں نے بغداد میں ہماری آمد سے پہلے ہی یہ خبر پہنچا دی تھی کہ ہارون نے لشکریوں کو دو دو سو درہم دیئے ہیں۔ اس پر ہادی کے حامی فوجیوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ انہوں نے غیر جانبدار فوجیوں کو بھی بھڑکا کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ فوجیوں کے اس جم غفیر نے خلیفہ کے نائب ربیع کے گھر کو گھیر لیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ دار الخلافہ میں موجود فوجیوں کو بھی دو دو سو درہم بانٹے۔ ربیع نے معذوری ظاہر کر دی کہ اسے اتنے اختیارات حاصل نہیں۔

"اے آزاد کردہ بوڑھے غلام! جب تجھے اختیارات ہی حاصل نہیں تو پھر خلیفہ کی نیابت کا تجھے کیا حق ہے!" کسی بدتمیز فوجی نے آوازہ کسا اور اس کے ساتھی بے حیائی سے ہنسنے لگے۔

ایک اور بدزبان فوجی کہنے لگا۔ "وہاں دریچے میں کھڑا کیا بکواس کر رہا ہے! نیچے ہمارے درمیان آ تو تجھے ہم بتائیں خلیفہ کا نائب کتنا با اختیار ہوتا ہے۔ بہانے کرے گا بوڑھے تو ہم تجھے اور تیرے گھر والوں کو زندہ جلا دیں گے۔"

بوڑھے ربیع نے ایک دنیا دیکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ غصے میں بھرے ہوئے لوگ صرف اور صرف اپنے مطلب کی بات سنتے ہیں۔ وہ اسی لئے خود پر قابو پاتے ہوئے نرم آواز میں فوجیوں سے مخاطب ہوا۔ "تم لوگ ٹھیک کہتے ہو' انصاف کا تقاضا بھی ہے کہ ہر سپاہی کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔ مجھے تم سے صرف اتنا کہنا ہے کہ کسی فیصلے تک پہنچنے اور اپنا مطالبہ پورا کرانے کے لئے مجھے کچھ وقت تو دو۔ میں تم لوگوں سے بس آج سہ پہر تک کی مہلت چاہتا ہوں۔"

اس پر کسی نے مہلت نہ دینے کو کہا' کوئی بولا کہ مہلت نہ دینے سے کچھ بھی ہاتھ نہ آئے گا۔ غرض کہ اکثریت اس حق میں تھی کہ ربیع کو مہلت دے دی جائے۔ اس کے بعد بھی وہ اگر مطالبہ نہ مانے تو اس کے گھر بار کو آگ لگا دی جائے۔

میں نے یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے لئے مجھے ماضی قریب' محض چند روز پہلے کا سفر کرنا پڑا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کا کوئی فیصلہ جیسا کہ باسندان میں ہارون نے کیا اور جس کی رو سے ہر لشکری کو دو دو سو درہم ملے' ایسا فیصلہ خود خلیفہ' اس کا ولی عہد یا قریبی عزیز ہی کر سکتا ہے۔ ربیع جیسے وفادار آدم زادوں کی حیثیت تو بساط اقتدار پر معمولی مہروں جیسی ہوتی ہے جنہیں جب چاہے پٹوا دیا جاتا ہے' خواہ ان سے مخالف کی شہ دی گئی ہو یا نہیں۔ ربیع خود بھی اس حقیقت سے واقف تھا۔ وہ اسی لئے سہ پہر ہونے سے پہلے ہی اپنے گھر سے غائب ہو گیا۔ گھر والے بھی جان بچانے کے لئے ساتھ تھے۔ اس نے اپنے ایک غریب اور گمنام عزیز کے گھر میں پناہ لی تھی۔ ایسے وقت پر بڑے عہدوں پر فائز بڑے لوگوں کے کام غریب عزیز ہی آتے ہیں۔

سہ پہر ہوئی تو پھر فوجیوں کے غول رصافہ میں ربیع کے گھر کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ربیع کو بہت آوازیں دیں' لیکن ربیع وہاں ہوتا تو جواب دیتا۔ وہ تو اپنے غریب عزیز کے گھر محلہ کرخ میں پناہ لئے ہوئے تھا۔

درحقیقت ربیع کی طرف سے دم دلاسے اور پھر عین وقت پر غائب ہو جانے سے فوجی مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے ربیع کے گھر کو آگ لگا دی۔ اس کے بعد تو جیسے بغداد کا کوئی رکھوالا ہی نہ رہا۔ رکھوالے خود اپنے ہی شہر کو لوٹ رہے تھے' گھروں کو آگ لگا رہے تھے۔ لاقانونیت کی انتہا یہ ہوئی کہ فسادیوں نے قید خانوں پر حملہ کر کے قیدیوں کو وہاں سے نکال لیا۔

ہادی و ہارون کی ماں خیزران بغداد ہی میں تھی۔ اس نے ہارون کے مدار المہام یحییٰ بن خالد برمکی کو مشورے کی خاطر بلوایا مگر وہ دانستہ ہادی کے خوف سے نہ آیا کیونکہ ہادی اپنی خلافت کا اعلان کر چکا تھا اور یحییٰ برمکی کا شمار ہارون کے بہی خواہوں میں ہوتا تھا۔ وہ ہارون کا اتالیق بھی رہ چکا تھا۔ ملکہ خیزران نے ربیع کو بھی تلاش کرایا۔ بڑی تلاش کے بعد ملکہ خیزران کے خادموں نے ربیع کو محلہ کرخ میں تلاش کر لیا اور اسے کشاں کشاں قصر خلافت تک لے آئے۔ ربیع نے اس طرح اپنے جسم کو چھپا رکھا تھا کہ دیکھنے والوں کو اس کا چہرہ نظر نہ آ سکے۔

ملکہ خیرزان اس لئے تشویش میں مبتلا تھی کہ فسادی فوجی اب قصر خلافت کے سامنے جمع ہونے لگے تھے اور ان کا شور و غوغا بڑھتا جا رہا تھا۔ شہر میں کیا افراتفری مچی ہوئی ہے' ملکہ کو اپنے خادموں کے ذریعے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا۔

ربیع کو قصر کے عقبی دروازے سے ملکہ خیرزان کے سامنے پیش کیا گیا۔ درمیان میں ایک پردہ حائل تھا۔ ملکہ کے ایما اور حکم پر ربیع ایک بار پھر فوجیوں کی لعنت و ملامت کا نشانہ بنا مگر اس وقت وہ اپنے گھر پر نہیں' قصر خلافت میں تھا اور اس کی حیثیت ملکہ خیرزان کے نمائندے کی تھی اس لئے فوجیوں کا برپا کردہ ہنگامہ فرو ہو گیا۔ فوجی قصر خلافت کے سامنے سے منتشر ہو گئے۔

اس واقعے کے دوسرے ہی روز ہارون الرشید اپنے ہمراہ ایک بڑی فوج لے کر بغداد پہنچ گیا۔ اسی فوج کے ساتھ میں بھی تھی۔ ہارون کے ساتھ بغداد میں داخل ہونے والی فوج اس کی حامی تھی۔ جو فوج دارالخلافہ میں پہلے سے موجود تھی اس کی اکثریت مرحوم خلیفہ کے بڑے بیٹے ہادی کی حمایت کر رہی تھی۔

بغداد کے حالات انتہائی خراب تھے کہ اسی اثنا میں ہارون الرشید نے مجھے کھانے کے لئے دستر خوان کی خاطر طلب کر لیا۔ یہی وہ لمحہ تھا کہ میں نے ہارون کے ذہن کو اپنے اثر میں لے لیا۔ میرے خیال میں کشت و خون اور لوٹ مار روکنے کے لئے فوری اقدامات کی ضرورت تھی۔

اس وقت میری تمام تر توجہ ہارون الرشید کے ذہن پر تھی۔ بغداد میں امن و امان قائم کرنے کے لئے اس نے اب تک مناسب اقدامات کئے تھے۔ نجف' کوفہ اور دیگر قریبی علاقوں کے شرپسندوں کو بغداد میں داخل ہونے سے روکنے کی خاطر ہارون نے شہر کے چاروں مرکزی دروازے بند کرا دیئے تھے۔ فصیل شہر اور دروازوں کی حفاظت کی غرض سے اس نے اپنے وفادار فوجیوں کو تعینات کیا تھا۔ قصر خلافت کو بھی انہی فوجیوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ تاحکم ثانی کسی بھی فرد کو نہ تو قصر خلافت میں داخلے کی اجازت تھی نہ باہر نکلنے کی۔

ہارون الرشید کے ساتھ جو فوج بغداد واپس آئی تھی' اس سے خوش تھی۔ اس کے برعکس دارالخلافہ میں موجود فوجی آمادہ بغاوت تھے' ہارون کو اس کا علم بھی تھا۔ اس کے لئے ان فوجیوں نے مرحوم خلیفہ مہدی کے بڑے بیٹے ہادی کی حمایت کو آڑ بنایا ہوا تھا۔ اسی سبب بغداد میں ہارون کی واپسی پر بھی حالات اطمینان بخش نہیں تھے۔ مصلحت و ذہانت سے کام لیتے

ہوئے ہارون نے اپنی وفادار سپاہ کو حکم دیا تھا کہ شہر میں فساد کو روکنے کے لئے وہ حتی الامکان ہادی کے حمایتی فوجیوں کے ساتھ ٹکراؤ سے گریز کریں۔ بغیر مخالف فوجیوں سے معرکہ آرائی کے دارالخلافہ میں امن کا قیام مشکل تھا۔ اسی وجہ سے ہارون کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ میں نے کھانے کے لئے دستر خوان بچھا دیا اور پھر دستر خوان پر کھانے بھی چن دیئے گئے۔ ہارون کے ہاتھ دھلوائے گئے اور اس نے کھانا شروع کر دیا مگر اس کا ذہن بدستور سنگین حالات کا کوئی حل تلاش کرتا رہا۔

میرے سوا اب وہاں عارج اور دیگر خادم بھی موجود تھے۔ طعام گاہ میں ہارون اکیلا ہی تھا۔ اس کی ماں ملکہ خیرزان بھی وہاں نہیں تھی۔ خود ہارون ہی نے خلوت کا حکم دیا تھا تاکہ وہ پیش آنے والے واقعات پر غور و فکر کر سکے۔

کھانا کھاتے ہوئے ہارون یہ سوچ رہا تھا کہ اپنے مرحوم باپ مہدی کی خواہش کا احترام کرے یا دوسری راہ اپنائے۔ مہدی کی خواہش یہ تھی کہ اس کے بعد نیا خلیفہ ہارون بنے۔ اسی کی خاطر وہ ہادی کو نافرمانی کی سزا دینے بغداد سے چلا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ ہادی سے ہارون کی بیعت لے سکے' مگر یہ نہ ہو سکا اور مہدی کو راستے سے ہٹا دیا گیا۔ مہدی کو کس نے زہر دلوایا' یہ تو پتہ نہیں چل سکا لیکن ہارون کو بھی ہادی پر شبہ تھا۔ اس کی وجہ یہ کہ مہدی کی موت سے ہادی ہی کو فائدہ پہنچا تھا۔ ایک طرف تو ہادی اپنے باپ کے عتاب سے بچ گیا تھا' دوسری جانب اسے ہارون کے ہاتھ پر ولی عہدی کی بیعت نہیں کرنی پڑی تھی۔ یوں گویا خلیفہ مہدی کا پہلا حکم اور ولی عہدی کی بیعت ہی بحال رہی' یعنی مہدی کے بعد ہادی نیا خلیفہ بن گیا۔

بلاشبہ خلیفہ بننے یا بنانے میں عوام کی مرضی کو کوئی دخل نہیں تھا۔ عرصہ دراز سے یہی ہو رہا تھا۔ حکمرانوں نے زبردستی اپنے ہی جیسے عوام پر مسلط ہونے کے لئے قانون بنائے اور ان پر حکومت کرنے لگے۔ پھر قانون بھی کیا' آدم زاد حکمران طبقے نے جو کہہ دیا وہی قانون بن گیا۔ باپ مرا تو بیٹے کے لئے راہ ہموار کر گیا۔ اپنی ہی زندگی میں ولی عہدی کی بیعت لے لی۔ کبھی ایک حکمراں بھائی نے اپنے بھائی کو ولی عہد بنا دیا۔ ان آدم زاد حکمرانوں نے بہ جبر اپنے عوام سے یہ فیصلے منوائے۔ اس کے لئے انہوں نے اپنے مخالفوں سے جنگیں لڑیں اور عوام پر اپنی طاقت کی دھاک جمانے کی خاطر ان کا قتل عام بھی کرایا۔ اس مطلق العنانی کی اجازت ان آدم زادوں نے کسی سے نہیں لی۔ انہیں اس کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی۔ عوام کو

انہوں نے اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ وہ ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکیں۔ اس آمریت مطلق العنانی اور شخصی طرز حکومت کے خلاف آواز اٹھانا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ ذاتی طور پر میں نے کبھی اس طرز حکمرانی کو پسند نہیں کیا۔ اسی انفرادی و شخصی اجارہ داری کا یہ نتیجہ تھا کہ بیعت کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ بیعت جو کبھی عوام کی مرضی و منشا جاننے کا ایک ذریعہ تھی ان مطلق العنان حکمرانوں کی وجہ سے ایک مذاق بن کے رہ گئی۔ خلیفہ منصور کی موت کے بعد مہدی کی بیعت لینے کے لئے تلواریں نکل آئیں۔ اپنے باپ کی طرف سے شہر مکہ معظمہ میں بیعت لینے والا یہی موسیٰ الہادی تھا۔ اس نے زبردستی بیعت لی تھی اور اب گویا زبردستی نیا خلیفہ بن بیٹھا تھا۔ یہ سارا تماشا ایک ہی خاندان میں اقتدار و حکومت برقرار رکھنے کے لئے تھا۔ عوام کا اس سے کوئی تعلق و سروکار نہیں تھا۔ انہیں تو بس روزی روٹی سے مطلب تھا۔

وقت و حالات سے بھی آمروں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا تھا۔ ایسے ہی ہادی نے کیا۔ اپنے باپ کی خواہش کو پس پشت ڈال کر۔ ہارون کے سامنے دوسرا راستہ یہ تھا کہ اپنے بڑے بھائی ہادی کی خلافت کو تسلیم کر لیتا۔

ہارون ابھی کھانا کھا کے دستر خوان سے اٹھا نہیں تھا کہ چونک اٹھا۔ چونک اٹھنے کی وجہ میں تھی۔ میں نے اسے مخاطب کیا تھا۔ ''اے ہارون! تو اگر چاہتا ہے کہ بغداد میں کشت و خون رک جائے تو میں جو کہتی ہوں اس پر عمل کر!''

میرے لب ساکت تھے مگر میری آواز ہارون کے دماغ میں گونج رہی تھی۔

''کون...... کون ہے تو؟'' ہارون بڑبڑایا۔

''اپنی زبان اور ہونٹوں کو حرکت نہ دے اے ہارون!'' میں نے تاکید کی۔ ''تو جو سوچے گا تیرے بغیر زبان سے ادا کئے میں جان لوں گی۔''

''لیکن اب تک تو نے اپنے بارے میں بتایا نہیں کہ ہے کون!'' اس بار ہارون کے ہونٹ نہیں ہلے۔ اس نے میری تاکید پر عمل کیا تھا۔

''میں تیرے ہی اندر موجود تیری ہی اپنی روح کی آواز ہوں۔''

''روح کی آواز؟''

''ہاں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تجھے میری آواز سنائی نہ دیتی۔'' میں نے اسے دانستہ اور بوجوہ اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں کیا۔ اس سے دراصل میرا مقصد یہ تھا کہ ہارون میرے

مشورے کو اپنا ہی فیصلہ سمجھے۔

میری بات پر ہارون کی پیشانی شکن آلود ہوگئی پھر اس نے سوچا۔ ''تیری دلیل میں تو وزن ہے...... خیر بول کہ تیرے خیال میں کس طرح امن وامان قائم کیا جا سکتا ہے؟''

''اپنی اور ہادی کی حامی افواج کے درمیان معرکہ آرائی تو تجھے بھی پسند نہیں؟''

''ہاں۔''

''سو اگر تو نے اپنے باپ کی خواہش پوری کی اور خود بھی خلیفہ ہونے کے لئے بیعت لے لی تو افواج کے درمیان ٹکراؤ ناگزیر ہو جائے گا۔ ممکن ہے تجھے فتح نصیب ہو جائے یا نہ ہو مگر افواج میں تفریق پیدا ہو جائے گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ تیرے خاندان ہی میں حکومت رہنے کے لئے یہ کچھ بہتر نہیں ہوگا۔'' میں نے ہارون کو سمجھایا۔

''تو پھر بتا اے میری روح کی آواز میں کیا کروں؟''

''وہی جو وقت کا تقاضا اور اس مسئلے کا حل ہے۔''

''یعنی؟'' ہارون نے وضاحت چاہی۔

''اپنے بڑے بھائی ہادی کو نیا خلیفہ تسلیم کر لے اور بغداد میں اس کی طرف سے بیعت لینا شروع کر دے۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''مگر یہ...... یہ تو اس مسئلے کا حل نہیں...... اگر میں نے برادر بزرگ کو خلیفہ تسلیم کر بھی لیا اور تیرے مشورے پر عمل کیا تو...... تو مادر محترم اور امرائے سلطنت میرا یہ فیصلہ شاید قبول نہیں کریں گے۔''

''تو ان سے بات تو کر لے ہارون!''

ہارون اس پر راضی ہو گیا۔ میں نے اس کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ خود اس نے ہادی کو خلیفہ تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

کھانا کھا کے ہارون دستر خوان سے اٹھا اور مجھ سے بولا۔ ''اے جمیلہ! مادر محترم سے عرض کر کہ ہم ان سے ملنے کے آرزو مند ہیں۔ وہ اگر اجازت مرحمت فرمائیں تو ہم ان کی خدمت میں حاضر ہو جائیں!''

میں نے ادب سے سر جھکایا اور ہارون کی ماں ملکہ خیرزان سے ملنے چل دی۔ ہارون طعام گاہ سے اپنی اقامت گاہ میں چلا گیا۔ قصر خلافت کا وہ حصہ بھی خاصا بڑا تھا جہاں خلیفہ اور اس کے خاندان والے رہتے تھے۔ خاندان کے ہر فرد کی خاطر الگ الگ اقامت

گاہیں تھیں۔ ان میں بھی خواب گاہیں' نشست گاہیں اور خادموں کے رہنے کی جگہیں بنائی گئی تھیں۔ طعام گاہیں البتہ مشترک ہی تھیں لیکن ان میں خواتین کے لئے الگ بندوبست تھا۔ اس قصر کا ایک ایک گوشہ میرا دیکھا ہوا تھا۔

ملکہ خیرزان تک جب میں نے ہارون کا پیغام پہنچایا تو وہ بولی۔ "پسر خلیفہ مرحوم سے جا کر کہو کہ انہیں ہمارے حضور باریابی کی اجازت ہے۔"

☆......☆......☆

میں الٹے قدموں وہاں سے لوٹی اور سوچنے لگی کہ یہ آدم زادی کتنی حوصلے والی ہے! اس کے چہرے سے غم واندوہ صاف جھلک رہا تھا اور لباس سے بھی سوگواری ظاہر تھی' اس کے باوجود آواز کا رعب ودبدبہ اور وقار پہلے جیسا ہی تھا۔

ہارون کے پاس جا کر میں نے اسے بتایا کہ اس کی ماں نے ملنے کی اجازت دے دی ہے تو وہ اپنی مسند سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ادھر تو ہارون' ملکہ خیرزان سے ملنے روانہ ہوا' ادھر میں اپنے سکونتی حصے میں پہنچ گئی۔ میں نے اپنی سماعت کے دائرے کو وسیع کرنے کے ساتھ ساتھ چشم تصور کو بھی متحرک کر دیا۔ اب مجھے ملکہ خیرزان کی نشست گاہ کا منظر واضح نظر آ رہا تھا اور میں ہارون کی آواز بھی سن رہی تھی۔ وہ اپنی ماں سے کہہ رہا تھا۔ "اے مادر محترم! یقیناً آپ کے علم میں ہوگا کہ بغداد کے گلی کوچوں میں رقص وحشت جاری ہے۔ شہر کی متعدد عمارتوں سے شعلے اب بھی اٹھ رہے ہیں۔ کسی بھی صورت ہمیں یہ آگ بجھانی ہوگی۔"

"بے گناہوں کا مال واسباب لٹنے اور ناحق مارے جانے کا رنج تو ہمیں بھی ہے مگر اس ہنگامے کو فرد کرنے کی تدبیر کیا ہو' اب تک یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ اس ضمن میں تم نے کچھ سوچا؟" ملکہ خیرزان نے سوال کیا۔

"جی ہاں۔" ہارون نے جواب دیا۔ "فتنہ وفساد کو روکنے کی ایک ہی تدبیر ہے۔"

ہارون نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"وہ کیا؟"

جواباً ہارون نے وہی سب کچھ کہہ دیا جو میں نے اس کے دماغ میں بٹھایا تھا۔

"نہیں!" ملکہ خیرزان نے صاف انکار کر دیا۔ وہ تیوریوں پر بل ڈال کر بولی۔ "یہ کیسے ممکن ہے!...... اس نے خلیفہ مرحوم کی شان میں گستاخی کی...... وہ طلبی پر حاضر نہ ہوا اور

نافرمانی پر اتر آیا۔ وہ ایک خودسر اور بگڑا ہوا نوجوان ہے۔ اسے اپنے والدین کی عزت کرنی نہیں آتی۔ خلیفہ مرحوم کی طرح ہم بھی اسے سخت ناپسند کرتے ہیں۔ یہ مملکت کہ جو ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ اپنی وسعت وعظمت میں اضافہ کرتی چلی جا رہی ہے' اگر ایک غیر ذمے دار اور عاقبت نااندیش کے ہاتھ میں آ گئی تو وہ اسے تباہ کر دے گا۔ تم ہمت نہ ہارو ہارون' ہم تمہارے ساتھ ہیں۔"

کچھ دیر نشست گاہ میں خاموشی رہی۔ ہارون کچھ سوچ رہا تھا۔

"اے مادر محترم! اس طرح آگ بجھنے کے بجائے اور بھڑک اٹھے گی۔" چند لمحے بعد ہارون کی آواز آئی۔ "اگر ہم نے بھی اپنی خلافت کی بیعت لے لی تو یہ مملکت یکجا نہیں رہ سکے گی۔ جرجان اور جن دیگر علاقوں پر ہمارے برادر محترم کا اثر ہے' وہ الگ ہو جائیں گے۔ پھر یہ کہ سلح افواج میں بھی تفریق پیدا ہو جائے گی...... بلکہ یہ تفریق تو پیدا بھی ہو چکی ہے۔ ہمیں تو اس تفریق کو مٹانا ہے اور اس کی تدبیر یہی ہے کہ ہم اپنے برادر بزرگ کی خلافت کے لئے بیعت لیں اور پوری مملکت میں اس کا گشتی فرمان جاری کر دیں۔ اس گشتی فرمان میں پدر محترم کی ناگہانی موت کی خبر کے ساتھ یہ اطلاع بھی ہماری طرف سے ہو کہ برادر بزرگ ابو محمد موسیٰ الہادی نئے خلیفہ ہیں۔ ہر علاقے کا عامل ان کی طرف سے بیعت لے۔"

"خدا جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے اے ہارون!" ملکہ خیرزان کے لہجے میں تاسف تھا۔ "ہم اس گستاخ بیٹے کی ماں ہیں اور اسے تم سے زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں۔ وہ تمہاری تجویز کے مطابق اگر خلیفہ بن کر اس قصر میں داخل ہو گیا تو پھر ہمارا احترام بھی نہیں کرے گا۔ وہ بڑا بے ادب اور خود غرض ہے۔"

"آپ بجا فرماتی ہیں لیکن ہم نے برادر بزرگ کی خلافت کو تسلیم نہ کیا تو خلق خدا کا بہت خون بہے گا۔ جیسا کہ ہم نے ابھی آپ کی خدمت میں عرض کیا ہم دونوں بھائیوں کی حامی افواج ایک دوسرے سے بھڑ جائیں گی۔ ممکن ہے کہ ہم فتح یاب ٹھہریں مگر ہماری یہ فتح' شکست کے مترادف ہوگی۔ یہ مملکت اگر دو حصوں میں بٹ گئی تو اسے ہماری ہار ہی کہا جائے گا۔"

ہارون کے دلائل کو بھی ملکہ خیرزان نے رد کر دیا تو مجبوراً مجھے مداخلت کرنی پڑی۔ سو خیرزان نے میرے زیر اثر کسی قدر نرم پڑتے ہوئے امراء کے اجلاس کی تجویز دی اور بولی۔ "اگر تم امراء کو قائل کر سکے تو پھر ہم بھی مخالفت نہیں کریں گے۔"

اسی سہ پہر کو ہارون نے قصر خلافت کے دیوان خاص میں امراء کا اجلاس طلب کر لیا۔ ہارون نے حکم جاری کیا تھا کہ امرا اور وہ اراکین سلطنت جنہیں طلب کیا گیا ہے' اجلاس میں شریک نہ ہوئے تو ان کے اس فعل کو نافرمانی و بغاوت تصور کیا جائے گا۔ اس حکم کی ضرورت ہارون کو یوں پیش آئی کہ امراء میں ہادی کے طرفدار بھی تھے۔ وہ کسی بہانے اجلاس میں شرکت سے گریز کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں کوئی مشترکہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا اور ہارون اس سے بچنا چاہتا تھا۔ ہارون کا مزاج کسی قدر مصالحانہ اور مشاورت پسندانہ تھا۔

وہ اجلاس چوں کہ ہارون الرشید نے طلب کیا تھا اس لئے امراء کی اکثریت غلط فہمی کا شکار ہو گئی۔ انہوں نے خیال کیا کہ ہارون اپنے بڑے بھائی ہادی کی خلافت کو باطل قرار دیتے ہوئے خود اپنی خلافت پر اصرار کرے گا۔ اسی بناء پر انہوں نے ہارون پر زور دیا کہ وہ اپنی خلافت کی بیعت لے۔ اس میں پہل یحیٰی بن خالد برمکی نے کی۔ پھر دوسرے بھی اس کی تائید میں بولتے گئے۔ اس کے باوجود چند امرا نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ حیرت کی بات یہ کہ بوڑھے ربیع نے بھی اب تک اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ میں اس اجلاس میں شریک نہ ہونے کے باوجود اپنی پر اسرار قوتوں کے ذریعے سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ ربیع کے چہرے پر مجھے خوف کے آثار نظر آئے تو میں نے اس کے ذہن کو ٹٹولا۔

ربیع کو معلوم تھا کہ اس کے گھر اور مال و اسباب کو آگ لگانے والے فوجی' ہادی کے حامی تھے۔ اسی کے ساتھ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ہارون الرشید تو اپنے مخالفین کی بھی بات بڑے صبر و تحمل سے سن لیتا ہے اور اس کا مزاج منتقمانہ نہیں مگر ہادی ایسا نہیں۔ اگر اس اجلاس میں اس نے ہادی کے خلاف رائے دی تو اچھا نہیں ہوگا۔ ایک مرتبہ تو وہ ہادی کے حامیوں سے بچ گیا ہے' دوبارہ یقیناً اسے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔

جن امرا یا اراکین سلطنت نے اپنی رائے دینے سے گریز کیا تھا' ہارون نے انہیں بولنے پر مجبور نہیں کیا۔ اسے خود بھی پتہ تھا کہ نہ بولنے والے ہادی کے حامی ہیں۔ ان میں ربیع کو دیکھ کر ہارون کو بڑی حیرت ہوئی۔ بے اختیار اس کی سوالیہ نظریں ربیع کی طرف اٹھ گئیں۔ ربیع کچھ گھبرا سا گیا۔ پھر ربیع نے سنبھل کر ہادی کے حق میں جو دلیل دی' اس پر سبھی حیران رہ گئے۔

ربیع کے بارے میں عام تاثر یہی تھا کہ وہ مرحوم خلیفہ مہدی کا وفادار ہے۔ اسی سبب اس سے ہارون کی حمایت کرنے کی توقع تھی۔ مرحوم خلیفہ بھی چوں کہ ہارون ہی کو ولی

عہد بنانے والا تھا اور یہ حقیقت ربیع تو کیا کسی سے بھی پوشیدہ نہیں تھی۔ ایسی صورت میں ہارون کے بجائے ہادی کی حمایت حیران کن ہی تھی۔

ہارون نے بڑے سکون کے ساتھ ربیع کی رائے سنی۔ ربیع نے اپنی رائے کے حق میں یہ دلیل دی تھی کہ خلیفہ مہدی' ہارون کو اپنا ولی عہد بنانا تو چاہتا تھا لیکن اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ ہادی اپنے حق سے دستبردار ہو جاتا۔ اس کی وجہ یہ کہ مرحوم خلیفہ پہلے ہادی ہی کو اپنا ولی عہد بنا چکا تھا اور اس کی بیعت بھی لی جا چکی تھی۔ یہ بیعت اسی صورت میں ساقط ہوتی جب ہادی' ہارون کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا۔ اس کے بجائے ہادی نے نئے خلیفہ کی حیثیت سے جرجان میں بیعت لے لی ہے اس لئے ہارون کو بھی ہادی کی خلافت تسلیم کر لینی چاہیے۔ ربیع نے کم و بیش وہی باتیں کی تھیں جو میں باسندان میں عارج سے کر چکی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ کوئی ربیع کے خلاف بولتا' ہارون نے اس کی رائے سے مکمل اتفاق کیا اور بولا۔ ''اے لوگو! میں اپنے بڑے بھائی ابو محمد موسیٰ الہادی کی خلافت کے لئے بیعت لیتا ہوں۔''

ہارون کے ان الفاظ نے تمام ہی امرا اور اراکین سلطنت کو حیرت زدہ کر دیا۔ چند لمحوں کو دیوان خاص میں گہرا سکوت چھا گیا۔ جب میرے زیر اثر ہارون نے دوبارہ اپنے الفاظ دہرائے تو سب سے پہلے بوڑھے ربیع نے ہادی کے لئے ہارون کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد وہ امرا باری باری بیعت کرتے رہے جو پہلے ہی سے ہادی کے حق میں تھے۔

پانسا پلٹ چکا تھا۔ رنگ محفل دیکھ کر ہارون کے حمایتی امرا نے بھی بیعت کر کے ہادی کو خلیفہ تسلیم کر لیا۔

اسی اجلاس میں ہارون نے یہ اعلان بھی کیا کہ جو فوجی بغداد ہی میں رکے رہے اور خلیفہ مرحوم مہدی کے حکم پر اس کے ساتھ نہیں گئے' انہیں بھی دو دو سو درہم دیئے جائیں گے۔ یہ انعام انہیں خلیفہ کی بیعت لئے جانے کی خوشی میں دیا جا رہا ہے۔

اجلاس ختم ہوتے ہی جیسے جلتے ہوئے بغداد کے شعلے بجھنے لگے۔ دوسرے دن شام تک شہر میں امن و امان بحال ہو گیا۔ ہر فوجی کو بیعت کے بہانے دو سو درہم مل چکے تھے۔ یوں گویا ہارون نے ان کا مطالبہ پورا کر دیا تھا۔

بغداد میں موجود افواج جو دونوں بھائیوں کی وجہ سے غیر محسوس طور پر دو حصوں میں بٹ گئی تھیں' ایک ہو گئیں۔ اب کوئی احتجاج کرنے والا نہیں تھا۔ ملکہ خیزران البتہ خوش نہیں

تھی' اس نے بہ امر مجبوری اپنے چھوٹے بیٹے کا یہ فیصلہ قبول کیا تھا۔

دوسرے ہی دن تمام مملکت میں ایک گشتی مشعر خلافت ہادی اور انتقال مہدی کی بابت ہارون نے روانہ کر دیا۔ اس کے علاوہ اپنے دو خاص خبر رسالوں نصیر اور وصیف کو اس نے جرجان بھیج دیا تا کہ دونوں' ہادی کو بغداد میں پیش آنے والے حالات سے مطلع کر دیں۔ جرجان سے ہادی نے ہارون کے پاس ایک تیز رفتار قاصد بھیجا۔ وہ قاصد یہ پیغام لایا کہ ہادی جلد از جلد بغداد پہنچنے والا ہے۔ ملکہ خیزران کو میں نے یہ خبر سن کر پریشان و مضطرب دیکھا۔

صفر 169 ہجری کی وہ 27 تاریخ تھی کہ جب نئے خلیفہ ابو محمد موسیٰ الہادی نے بغداد کے قصر خلافت میں قدم رکھا۔ ہارون اور امراء و اراکین سلطنت نے اس کا بے مثال استقبال کیا۔ اس کی آمد پر سارے بغداد کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ اس پر بھی ہادی کی گردن اکڑی رہی۔ وہ بات کرنے کو منہ کھولتا تو اس کا چہرہ بگڑ جاتا اور بڑے بڑے اوپر کے دانت باہر آ جاتے۔ اب وہ خلیفہ تھا۔ اسے ''یا ہادی اطبق'' کہنے والا کوئی نہیں تھا جو وہ اپنا منہ بند کر لیتا۔

وہ قصر خلافت کے مرکزی حصے میں ٹھہرا جہاں کبھی اس کا باپ خلیفہ المہدی اور دادا خلیفہ المنصور کی سکونت تھی۔

ہادی کو معلوم تھا کہ بچپن ہی سے اس کے کردار کی کجی کے سبب مادر ملکہ خیزران اسے پسند نہیں کرتی۔ اس نے اسی لئے کم ظرفی کا مظاہرہ کیا اور مجھ سے بولا۔ ''جا اے خادمہ! ہماری مادر محترم سے جا کر یہ کہہ کہ ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں۔''

ان الفاظ کا مطلب یہی تھا کہ ہادی نے ملاقات کے لئے اپنی ماں کو طلب کیا تھا۔

میں نے ہادی کا پیغام ملکہ خیزران کو دیا تو اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نظر آنے لگے۔ پھر وہ قدرے سخت لہجے میں بولی۔ ''نئے خلیفہ سے کہو کہ ہم صرف ملکہ نہیں' ان کی ماں بھی ہیں۔ ہمیں نہیں بلکہ انہیں ہماری خدمت میں حاضر ہونا چاہیے!''

مجھے مجبوراً ہادی کے پاس واپس جانا پڑا۔ اب وہ تنہا نہیں تھا۔ ہارون بھی وہاں موجود تھا۔ ہادی نے میری طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں تو میں نے لفظ بہ لفظ وہ الفاظ دہرا دیئے جو ملکہ خیزران نے ادا کئے تھے۔

ہادی ان الفاظ کو سن کر ہارون سے مخاطب ہوا۔ ''ہم نہ کہتے تھے کہ مادر محترم کا دل ہماری طرف سے صاف نہیں اور وہ ہمیں خلیفہ تسلیم نہیں کرتیں۔'' پھر اس نے اپنی دانست میں

دلیل دی۔ ''یقیناً وہ ہماری ماں ہیں مگر اب ہم خلیفہ بھی ہیں۔ ہم نے اگر انہیں ملاقات کی غرض سے بلایا تھا تو ان پر لازم تھا کہ وہ آتیں جس طرح کہ تم آئے ہو۔''

''لیکن اے برادر بزرگ! مادر محترم اور ہماری حیثیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کا رتبہ.....''

ہارون کی بات ہادی نے کاٹ دی اور رعونت سے کہنے لگا۔ ''ہم سب جانتے ہیں اور تم سے بہر اعتبار بڑے ہیں۔ ہر چند کہ ہم تمہارے برادر بزرگ ہیں لیکن تمہیں یہ زیب دے گا کہ آئندہ ہمیں خلیفہ محترم کہو۔ اسے تم ہماری تاکید بھی سمجھ سکتے ہو۔''

ہادی نے تو نہیں مگر ہارون نے مجھے وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اسے یقیناً یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہاں میں بھی موجود ہوں اور ایک ''خادمہ'' کے سامنے اس طرح کی باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔ ہارون کو کیا خبر تھی کہ جسے وہ خادمہ سمجھ رہا ہے کوئی معمولی آدم زادی نہیں ایک جن زادی ہے۔ اس جن زادی کو وہ باتیں بھی معلوم ہیں جو نہ ہارون جانتا ہے نہ کوئی اور آدم زاد۔

میں وہاں سے لوٹ رہی تھی تو راستے میں مجھے عارج مل گیا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا اور ہم ایک ستون کی آڑ میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ ہر چند کہ ہماری آوازیں دھیمی ہی تھیں پھر بھی ہم احتیاطاً صدیوں بعد مستقبل میں بولی جانے والی ایک ایسی زبان کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے جسے سمجھنا اس عہد کے آدم زادوں کے لئے ناممکن تھا۔

''اے دینار! قصر میں ہادی کی آمد کے بعد بڑی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔'' عارج کہنے لگا۔

''مثلاً؟'' میں نے پوچھا۔

''سنا ہے کہ وزیر فیض بن ابی صالح کو معزول کیا جانے والا ہے۔''

''تو ہوا کرے وہ معزول!'' میں بیزاری سے بولی۔ ''ہمیں کیا؟''

''مجھے ڈر ہے کہ ان تبدیلیوں کی زد میں ہم بھی نہ آ جائیں؟'' عارج نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

''وزیروں اور امرا کی بات اور ہے۔ ہم محض خادم ہیں جن کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں ہوتی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ بات میں نے تجھے پہلے ہی سمجھائی تھی کہ خادم' غلام

خادمائیں اور کنیزیں افراد کی نہیں مملکت کی ملازم ہوتی ہیں۔ ان کی حیثیت ورثے جیسی ہوتی ہے۔ یہ بھی وراثت میں ہر نئے حکمراں کو ملتے رہتے ہیں۔ ہر نیا آنے والا صاحب اقتدار یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم جیسے ملازموں کے لئے وفاداریاں تبدیل کر لینا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ جو پیٹ بھرنے کو روٹی' تن ڈھانپنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو چھت فراہم کر دے وہی ان غریب آدم زادوں کا آقا و مالک ہوتا ہے۔ مالک و آقا تو بدلتے رہتے ہیں مگر خدام و غلام نہیں۔ نہ وہ بدلے جاتے ہیں نہ ان کی تقدیریں۔ تو اس ضمن میں شاید ربیع کی مثال دے تو ایسے غلام خال خال ہوتے ہیں جن کی خدمت سے خوش ہو کے ان کا آقا انہیں آزاد کر دے جیسا کہ خلیفہ منصور نے کیا۔ اس نے یہی نہیں بلکہ اپنے آزاد کردہ غلام کو اہم عہدوں پر بھی فائز کیا۔"

میرے چپ ہوتے ہی عارج نے سوال کیا۔ "اور رافعہ کے بارے میں تو کیا کہے گی؟"

"ہاں وہ بھی ایک کنیز ہی تھی لیکن یہ اس کی بدقسمتی ہی تھی کہ اس نے اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلانے چاہے اور ماری گئی۔ میرا خیال ہے' وہ خود شاید ایسی نہیں رہی ہو گی بلکہ اسے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر کسی نے استعمال کیا ہو گا۔ غریب کو جلد انعام و اکرام کے جال میں پھنسا لیا جاتا ہے۔" میں نے کہا اور پھر عارج کو مخصوص اشارہ کیا۔ کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ عارج اور میں ستون کی آڑ سے نکل کر مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔

عارج نے جو خبر دی تھی' دوسرے دن درست ثابت ہوئی۔ خلیفہ ہادی نے فیض بن ابی صالح کی جگہ ربیع کو اپنا وزیر بنا لیا۔ خلیفہ ہادی نے اس سلسلے میں جو فرمان جاری کیا' اس کے الفاظ یہ تھے۔ "ربیع بن یونس کو آج سے تا حکم ثانی وزارت کے عہدے پر تعینات اور فیض بن ابی صالح کو معزول کیا جاتا ہے۔ ربیع کی لیاقت' ذہانت' بردباری' وفاداری' بزرگی تجربے اور دور اندیشی واضح ہے۔" اوپر کی کہانی تو یہ تھی مگر اندر کی کہانی کچھ اور تھی۔

اس حقیقت کا علم سبھی کو تھا کہ ہادی کی بغداد آمد سے پہلے ہارون نے امرا اور اراکین سلطنت کا جو اجلاس مشاورت کے لئے طلب کیا تھا' اس میں ربیع کی آواز پہلی تھی جو ہادی کو نیا خلیفہ تسلیم کئے جانے کے لئے بلند ہوئی۔ یہ بات صرف مجھے معلوم تھی کہ ربیع نے محض اپنی جان کے خوف سے ایسا کیا تھا ورنہ تو وہ ہادی کو نااہل اور ناسمجھ خیال کرتا اور ہارون کو

خلافت کا اہل سمجھتا تھا۔ وقت اور حالات کا جبر آدم زادوں کو کچھ کا کچھ بنا دیتا ہے۔ بہر حال ربیع کو ہادی کی حمایت کرنے کا انعام مل گیا۔ اسی کے ساتھ جن لوگوں پر ہادی کو اپنی مخالفت کا شبہ تھا' وہ زیر عتاب آنے لگے۔ انہی زیر عتاب آنے والوں میں سے خلیفہ مہدی کا ایک نامور فوجی سردار عبداللہ بن مالک تھا۔ عبداللہ کو پہلے ہی سے کن گن ہو گئی تھی کہ اب اس کی باری آنے والی ہے۔

مجھے اس کا پتہ نہیں تھا کہ اسی فوجی سردار نے ایوب اور جمیلہ کو قصر خلافت تک پہنچایا تھا۔ یہ بات مجھے بعد میں قصر خلافت ہی کی ایک خادمہ انسہ سے معلوم ہوئی۔ انسہ' عمر میں جمیلہ سے بڑی تھی۔ جمیلہ کا انسانی قالب میں نے اور ایوب کا قالب عارج نے اپنایا تھا۔

انسہ نے ایک روز خلوت میں مجھ سے کہا۔ "اے جمیلہ! خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔ مجھے خبر لگی ہے کہ بھائی ایوب اور تمہارے محسن اور خلیفہ مرحوم کے نامی گرامی فوجی سردار عبداللہ بن مالک کو بھی شکنجے...... احتساب کے شکنجے میں کسا جانے والا ہے۔"

"مگر کیوں؟" میں نے سوال کیا اور اسی کے ساتھ انسہ کے ذہن پر توجہ دی کیونکہ عبداللہ بن مالک میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔ انسہ کا ذہن پڑھ کر ہی مجھے معلوم ہوا کہ ایوب اور جمیلہ قصر خلافت میں آنے سے قبل عبداللہ بن مالک ہی کے ملازمین میں شامل تھے۔ کچھ تو ان کی خدمت گزاری کے سبب' کچھ مہدی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے عبداللہ نے انہیں قصر خلافت تک پہنچا دیا تھا۔ ایوب و جمیلہ نے جلد ہی اپنی کارگزاری سے خلیفہ مہدی کو خوش کر دیا۔ اسی بنا پر وہ دونوں خاص خدام میں شمار ہونے لگے تھے۔

ادھر تو لمحوں میں مجھے اصل بات کا علم ہو گیا' ادھر انسہ نے عبداللہ بن مالک کے زیر عتاب آنے کی وجہ بتائی۔

"مرحوم خلیفہ محترم......" انسہ کی آواز دھیمی ہو گئی۔ "نئے خلیفہ کے ہم نشینوں' حاضر باشوں اور دوستوں سے خوش نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ہم نشیں بد کردار ہیں۔ ان کی صحبت بد کا اثر ان کے صاحبزادے...... معاف کرنا' خلیفہ زادے پر بھی پڑ سکتا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے عبداللہ بن مالک کو یہ ذمے داری سونپ دی کہ خلیفہ زادے کو صحبت بد سے بچائیں۔ عبداللہ بن مالک کو یہ اختیار بھی خلیفہ نے دے دیا کہ وہ خلیفہ زادے کے دوستوں کو گرفتار کر کے قید میں بھی ڈال سکتے ہیں۔ خلیفہ محترم کے حکم پر عبداللہ بن مالک نے اپنی ذمے

داری پوری کی۔ اس معاملے میں وہ خلیفہ زادے کی سفارش کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ تم بھی جانتی ہو جیلہ کہ اب زمانہ بدل چکا ہے اور...... اور عبداللہ بن مالک کے لئے خطرہ بڑھ گیا ہے کہ...... کہ......"

"میں سمجھ گئی اے انسہ!" میں بول اٹھی۔ "یقیناً عبداللہ بن مالک ہمارے محسن ہیں لیکن ہم...... یعنی میں اور میرے شوہر ان کے لئے کیا کر سکتے ہیں!...... ہماری حیثیت ہی کیا ہے۔"

"ہاں یہی تو مجبوری ہے ہماری!" انسہ نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بظاہر بات آئی گئی ہو گئی۔

جب عارج کو میں نے یہ بات بتائی تو وہ بھی میری طرح جذباتی ہو گیا۔ شاید یہ ان انسانی قالبوں کی فطری نیک صفات اور اپنے محسن سے محبت و وفاداری کا اثر تھا کہ عارج اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ عبداللہ بن مالک کو ہر قیمت پر خلیفہ ہادی کے عتاب سے بچائیں گے۔ عارج پر جوش آواز میں کہنے لگا "وہ خلیفہ ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ انتقام اسے اندھا کر دے۔ وہ جب چاہے جس بے گناہ کا سر قلم کرا دے...... یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

"اگر ہم واقعی آدم زاد ہوتے تو یقیناً عبداللہ کو زیر عتاب آنے سے نہ بچا پاتے۔" میں بولی...... "یوں تو خلیفہ ہادی اب تک نہ جانے کتنے بے قصوروں کو قصوروار ٹھہرا کر مروا چکا ہے لیکن اس معاملے میں اس کی مرضی نہیں چلنے دی جائے گی۔"

میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ زنادقہ یعنی بدعقیدہ ہونے کا الزام لگا کے اس نے اپنے متعدد مخالفین کو موت کے گھاٹ اتروا دیا تھا۔ ان میں اس دور کے بہت سے نامور افراد بھی شامل تھے۔ یہی طریقہ کار ہادی کے باپ مہدی کا بھی تھا' مگر اتنا تھا کہ وہ اپنے عہد سے نہیں پھرتا تھا' یہ الگ بات کہ اپنے حریفوں سے نمٹنے کی کوئی تدبیر نکال لے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ خلیفہ مہدی نے ہاشمیوں کو قتل نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ علی بن یقطین' عبدالمطلب کی اولاد سے تھا۔ اس پر بھی زندقہ کا الزام لگایا گیا۔ اپنی قسم کی وجہ سے خلیفہ مہدی نے اسے قتل کرانے کے بجائے قید میں ڈلوا دیا۔ اسی کے ساتھ مہدی نے ہادی کو وصیت کر دی کہ جب تم خلیفہ ہو تو علی بن یقطین اور یعقوب بن فضل کو قتل کر دینا۔ یہ دونوں ہی ہاشمی تھے۔ اسی طرح خلیفہ مہدی نے داؤد بن علی کی اولاد کے قتل کی وصیت کی تھی۔ ہادی کے مزاج میں تو یوں

بھی قتل و غارت گری کا عنصر شامل تھا' سو اس نے اپنے باپ مہدی کی وصیت پر عمل کے بہانے ان تمام لوگوں کو قتل کرا ڈالا۔

مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں بھی دشواری نہ ہوئی کہ اس قتل و غارت گری کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا' رعایا پر نئے خلیفہ کی دہشت بیٹھ جائے اور کوئی بھی جان جانے کے خوف سے اپنی زبان نہ ہلا سکے۔

میں کئی روز سے اس کھوج میں لگی ہوئی تھی کہ عبداللہ بن مالک کو خلیفہ ہادی کب طلب کرتا ہے! آخر ایک دوپہر کو میں نے قصر خلافت کے دیوان خاص میں غیر معمولی سرگرمی دیکھی۔ مجھے ایک غلام کاندھے پر نطع لاد کر دیوان خاص کی طرف جاتا ہوا نظر آیا۔ میں چونک اٹھی۔ نطع اس کو کہتے تھے جس پر کسی آدمی کو قتل کیا جاتا تھا۔ میں دبے قدموں کچھ فاصلے سے اس غلام کے پیچھے ہو لی۔ اس غلام نے نطع بچھایا اور ایک شمشیر برہنہ اس کے قریب رکھ دی اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔ دیوان خاص اس وقت خالی تھا۔ میں سمجھ گئی کہ خلیفہ ہادی کے حکم پر وہاں کسی کو بلا کر قتل کیا جانے والا ہے۔ پھر جب مجھے عارج سے یہ خبر ملی کہ خلیفہ ہادی نے عبداللہ بن مالک کو طلب کیا ہے تو میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ خلیفہ ہادی' عبداللہ کو بھی قتل کرا کے اپنے انتقام کی آگ بجھانا چاہتا ہے۔

اس موقع پر مجھے یا عارج کو دیوان خاص میں رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یوں بھی ہم طلب کئے جانے ہی پر وہاں جا سکتے تھے۔ اس پر بھی میں اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لا کر دیوان خاص میں ہونے والی کارروائی دیکھ سکتی تھی۔ اس کے لئے مجھے اپنے سکونتی حصے کا رخ کرنا پڑا۔ عارج سے میں نے کہہ دیا تھا کہ اس دوران میں کہیں سے بھی میری طلبی ہو تو کہہ دے' طبیعت ٹھیک نہیں' میں نے اندرونی دالان میں جا کر بستر پر دراز ہوتے ہی اپنی آنکھیں بند کر لیں' اسی کے ساتھ اپنے تصور کی قوت کو حرکت دی۔ اب دیوان خاص کا پورا منظر مجھے بند آنکھوں سے نظر آ رہا تھا۔

مسند پر مجھے خلیفہ ہادی گردن اکڑائے بیٹھا دکھائی دیا۔ کچھ ہی فاصلے پر جہاں نطع بچھا تھا' وہاں شمشیر برہنہ ہاتھ میں لئے ایک کریہہ صورت جلاد کھڑا تھا۔ چند لمحے گزرے ہوں گے کہ کچھ محافظ ایک ادھیڑ عمر شخص کو نرغے میں لئے دیوان خاص کے بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اس ادھیڑ عمر آدم زاد کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں اور وہ دہشت زدہ سا

لگ رہا تھا۔ محافظوں نے اسے خلیفہ ہادی کے سامنے پیش کیا اور پیچھے ہٹ گئے۔

ادھیڑ عمر شخص نے جھک کر سلام کیا۔ خلیفہ ہادی نے سلام کا جواب دیا اور پھر چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''اے عبداللہ بن مالک! تو نے مجھے پہچانا کہ میں کون ہوں؟...... ایسا تو نہیں کہ تیری بینائی ادھیڑ عمری کی وجہ سے جواب دے گئی ہو؟''

''اے امیرالمومنین! آپ خلیفہ ابن خلیفہ عالی جناب عزت مآب حضرت ابو محمد موسیٰ الہادی اور خاندان بنو عباسؓ کے چشم و چراغ ہیں۔'' عبداللہ بن مالک بڑے ادب اور عاجزی سے بولا۔

''نہیں اے عبداللہ بن مالک!'' خلیفہ ہادی نے انکار میں سر ہلایا۔ ''تو ہمیں نہیں پہچان سکا۔ لگتا ہے تیری بینائی واقعی کمزور ہو گئی ہے۔ تجھے غالباً اسی لئے شمشیر بکف جلاد بھی نطع کے قریب کھڑا دکھائی نہ دیا ہوگا۔ یاد کر میں وہ خلیفہ زادہ ہوں جس کے عزیز دوست ابراہیم حرانی اور دیگر ہم نشینوں کو تو گرفتار کر کے لے گیا تھا۔ پھر تو نے انہیں مارنے پیٹنے کے بعد زنداں میں ڈال تھا۔ اس واقعے کے بعد خود میں اپنے دوستوں کی سفارش لے کر تیرے پاس گیا۔ یاد ہے تجھے کہ تو نے میری سفارش نہیں مانی اور میرے دوستوں کو نہیں چھوڑا؟''

''اے امیرالمومنین! یاد ہے مجھے۔'' عبداللہ بن مالک لرزیدہ آواز میں بولا۔

''کیا تو اپنے اہل و عیال سے ہمیشہ کے لئے رخصت لے آیا ہے؟...... کہ اب تو لوٹ کر اپنے گھر نہ جا سکے گا؟'' ہادی نے خشونت سے کہا۔

''امیرالمومنین سے اس غلام کو رحم کی امید ہے۔''

''کس بناء پر؟''

''غلام کو کچھ گزارش کی اجازت ہو تو عرض کروں۔''

صاف پتہ چل رہا تھا کہ خلیفہ ہادی ایک بے گناہ شخص کی بے بسی سے لطف لے رہا تھا، عبداللہ کی التجا سن کر بولا۔ ''اجازت ہے، مگر یہ نہ بھول کہ ابھی چند لمحوں بعد تیری گردن کاٹ دی جائے گی اور تیری سر بریدہ لاش میرے سامنے تڑپ رہی ہوگی۔''

عبداللہ بن مالک ہی کیا، جس آدم زاد کو بھی اس طرح کے واقعے کا سامنا ہوتا اس کے حواس قابو میں نہیں رہیں گے۔ میں نے اس کے پیر کانپتے دیکھے۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے بھرائی سی آواز میں کہا۔ ''امیرالمومنین کو میں اللہ تعالیٰ کی قسم دلا کر کہتا ہوں کہ

اگر آپ مجھے اس عہدے پر بحال رکھیں جس پر خلیفہ مرحوم حضرت محمد بن عبداللہ المہدی نے مقرر کیا تھا اور ویسا ہی حکم صادر فرمائیں جیسا کہ خلیفہ مرحوم نے حکم دیا تھا اور اپنے کسی خلیفہ زادے کی طرف مجھے بھیجیں جو آپ کے حکم پر نہ چلتا ہو تو کیا میں آپ کی مخالفت اور اس خلیفہ زادے کی موافقت کروں گا؟''

خلیفہ ہادی کو کہنا پڑا۔ ''نہیں، تمہیں ہمارے حکم کی تعمیل کرنی ہوگی۔''

''سوائے امیرالمومنین! اس غلام نے بھی اس وقت ایسا ہی کیا۔ اگر یہ قصور ہے تو غلام......''

''قصور تو ہوا ہے تجھ سے!'' خلیفہ ہادی بولا۔ ''تو حیلے بہانے کر رہا ہے کہ ایک یقینی موت سے بچ جائے مگر......'' اسی وقت ہادی کو میں نے دور رہنے کے باوجود اپنے اثر میں لے لیا۔ دور رہ کر کسی آدم زاد کو اپنے اثر میں لینے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ یہ پراسرار تجربہ کامیاب رہا۔ اس کا اندازہ مجھے ہادی کے ادھورے جملے سے ہوا۔ وہ عبداللہ بن مالک کی گردن اڑا دینے کا حکم نہیں دے سکا تھا۔ اگر میرا یہ پراسرار تجربہ کامیاب نہ رہتا تو میں دوسرا راستہ اختیار کرتی اور بے گناہ عبداللہ بن مالک کو یوں بے بسی کی موت سے دوچار نہ ہونے دیتی۔ تجربے کی ناکامی پر مجھے جمیلہ کے انسانی قالب سے باہر نکلنا پڑتا۔ پھر ایک جن زادی جو بھی چاہتی کرتی اور ایک بے قصور آدم زاد پر ظلم نہ ہونے دیتی۔ اس کے لئے مجھے کیا تدبیر کرنی پڑتی یہ بعد کی بات تھی۔ بہر حال مجھے جمیلہ کے انسانی قالب سے باہر نکلنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

خلیفہ ہادی میرے زیر اثر بے اختیار ہنس دیا اور وہاں موجود محافظ، جلاد بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ ہادی کے چہرے کا تناؤ یکسر ختم ہو چکا تھا۔ اس نے اشارے سے عبداللہ بن مالک کو قریب بلایا اور بولا۔ ''ہم نے تیری جاں بخشی کی۔''

اس پر عبداللہ بن مالک نے دست بوسی کی۔

''جا خوش رہ!'' خلیفہ ہادی نے کہا اور خلعت و انعام دے کر عبداللہ بن مالک کو رخصت کیا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں کہ اب چشم تصور یا غیر معمولی قوت سماعت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ مجھے خوشی تھی کہ میں نے اس بے گناہ آدم زاد کی جان بچائی تھی جس نے

میرے اور عارج کے انسانی قالبوں پر احسان کیا تھا۔

احسان تو ہارون نے بھی اپنے بڑے بھائی ہادی پر کیا تھا' مگر آدم زاد احسان فراموش بھی ہوتے ہیں اور ہادی بھی ایسوں ہی میں سے تھا۔ اسے ذرا بھی یہ خیال نہ تھا کہ جب وہ جرجان میں تھا اور بغداد نہ پہنچا تھا تو ہارون اپنے باپ خلیفہ مہدی کی خواہش کے احترام کا سہارا لے کے اپنی خلافت کی بیعت لے سکتا تھا۔ تمام امرا اور اراکین سلطنت اس امر کے گواہ تھے کہ خلیفہ مہدی اپنے بڑے بیٹے ہادی کو معزول کر کے ہارون کو ولی عہد بنانا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں خلق خدا کا بہت خون بہتا' مگر حکومت و اقتدار کی خاطر تو آدم زاد ہمیشہ سے خون بہاتے آئے ہیں۔ بغداد کی اس وقت جو حالت تھی اسی کے پیش نظر میں نے ایک جن زادی ہو کر آدم زادوں کے اس معاملے میں مداخلت کی تھی۔ خلق خدا کا خون بہنے سے روک دینا میرے نزدیک بڑی خدمت تھی۔ میں آدم زادوں کے درمیان اسی لئے تو رہ رہی تھی ورنہ میرے لئے صحرا کی وسعتیں کیا کم تھیں۔

ہارون کی شرافت نفس کو میں نے تو محسوس کر لیا لیکن خود اس کے سگے بڑے بھائی کو یہ احساس نہ ہو سکا۔ وہ ہارون کے خلاف ہو گیا۔ اس کی بڑی وجہ مرحوم خلیفہ مہدی تھا جو اپنی زندگی کے آخری ایام میں ہادی کے بجائے ہارون کو اپنا ولی عہد بنانے کے حق میں تھا۔ ایسی صورت میں ہادی نے اپنے باپ کی وصیت کو بھی پس پشت ڈالنا چاہا۔

خلیفہ مہدی نے جب ہادی کو اپنا ولی عہد بنایا تھا تو اسے تاکید کی تھی کہ تم اپنا ولی عہد اپنے چھوٹے بھائی ہارون کو بنانا۔ اب جب کہ خلیفہ مہدی نہیں رہا تھا اور ہادی نیا خلیفہ بن چکا تھا تو وصیت و تاکید کے مطابق ہارون ہی ولی عہد تھا۔ ہادی کو یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ اس نے اپنے باپ کی وصیت کے خلاف ہارون الرشید کو محروم کر کے اپنے بیٹے جعفر کو ولی عہد بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہادی نے اراکین سلطنت سے بھی یہ خیال ظاہر کر دیا۔ اس پر ہادی کے ہم خیال امرا نے ہارون کے خلاف محاذ بنانا شروع کیا تو ملکہ خیزران خاموش نہ رہ سکی۔ وہ غصے کی حالت میں ہادی کے پاس پہنچی۔ میں حالات سے بے خبر نہیں تھی' دور رہ کر بھی سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔

''تشریف رکھئے اے مادر محترم!'' ہادی نے منافقت سے کام لیا جس کا اظہار اس کے لہجے سے بھی ہو رہا تھا۔

''ہم یہاں بیٹھنے نہیں آئے بلکہ تمہیں یہ بتانے آئے ہیں کہ تم ہماری زندگی میں اپنے چھوٹے بھائی کا حق نہیں مار سکتے!''

''آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' ہادی بدستور نرم آواز میں بولا۔ ''یہ فیصلہ امرا اور اراکین سلطنت نے مملکت کی بہتری کے لئے کیا ہے' ہم نے تو صرف ان کی تائید......''

ملکہ خیزران نے ہادی کی بات کاٹ دی۔ ''بات تو پھر وہی ہوئی کہ تم اپنے بھائی کا حق مارنے پر راضی ہو!''

''لیکن اے مادر محترم' آپ کے لئے تو ہم دونوں بھائی یکساں ہونے چاہئیں' پھر ہارون ہی کی حمایت کیوں؟ آئندہ اگر خلافت ہارون کی اولاد میں رہے یا میری اولاد میں' اس سے کیا فرق پڑ جائے گا!''

''پڑ جائے گا فرق!'' ملکہ خیزران زور دے کر بولی۔

''تو پھر مجھے سمجھانے کے بجائے آپ امرا اور اراکین سلطنت کو سمجھائیے۔'' ہادی کا لہجہ بدل گیا۔

''ہم انہیں سمجھائیں جو تمہاری ہی شہ پر اور دولت و منصب کی خاطر تمہارے کمسن بیٹے کو ولی عہد بنائے جانے کی راہ ہموار کر رہے ہیں!...... ہادی! تم ہمیں کمزور نہ سمجھنا! یہ ہارون بے اختیار ہے نہ ہم!'' یہ کہہ کر ملکہ خیزران وہاں نہیں رکی۔

''اے مادر محترم! تمہیں یہ دھمکی مہنگی پڑے گی۔'' ہادی بڑبڑایا۔

میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ ہادی اب فوری طور پر ہارون کے خلاف نہ سہی ملکہ خیزران کے خلاف ضرور کوئی خطرناک قدم اٹھائے گا۔ میں نے اسی لئے ہادی پر نظر رکھنا شروع کر دی۔

ایک دوپہر ہادی نے مجھے طعام گاہ میں طلب کیا تو اسے میں نے پلاؤ کھاتے دیکھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی ہاتھ کھینچ لیا اور بولا۔ ''اے جمیلہ! یہ پلاؤ بہت نفیس پکا ہوا ہے۔ ہماری مادر محترم سے کہنا کہ ہم نے اس طباق میں سے آدھا پلاؤ خود کھایا ہے اور آدھا پسندیدگی کی وجہ سے ان کے لئے بھیج رہے ہیں' وہ نوش فرمالیں گی تو ہمیں خوشی ہوگی۔''

میں کھٹک گئی اور میری سماعت میں وہ الفاظ گونجنے لگے جو چند روز پہلے ہی خلیفہ

ہادی نے اپنی ماں ملکہ خیرزان کے لئے ادا کئے تھے۔

''اے مادرِ محترم! تمہیں یہ دھمکی مہنگی پڑے گی۔''

آج ہادی کے دل میں ماں کی محبت کیسے جاگ اٹھی؟ میں نے سوچا۔ اسی سبب میں نے ہادی کی ہدایت پر دسترخوان سے طباق اٹھاتے ہوئے اس کی ذات پر توجہ دی۔ ہادی نے طباق کے نصف حصے میں زہر ملا دیا تھا۔ وہ پلاؤ زہر آلود تھا جو وہ میرے ہاتھوں اپنی ماں ملکہ خیرزان کو بھجوا رہا تھا۔ ملکہ خیرزان کو دھوکے سے زہر دے کر مارنے کے لئے ہادی نے طباق سے نصف پلاؤ کھانے کا سوانگ رچایا تھا۔ مقصد محض یہ تھا کہ اس کی ماں کو کسی طرح کا شک نہ ہو۔

میرے لئے تشویش کی بات یہ تھی کہ ہادی کا ارادہ مجھی کو موردِ الزام ٹھہرانے کا تھا۔ میں چکرا کے رہ گئی۔ بہ حیثیت ایک خادمہ ایک طرف یہ ضروری تھا کہ میں خلیفہ کے حکم کی تعمیل کرتی' دوسری جانب میرے لئے یہ ناممکن بات تھی کہ ملکہ خیرزان کو وہ زہر آلود پلاؤ جا کر کھلا آتی۔ میں کروں تو کیا کروں؟ طعام گاہ سے نکل کر اپنے قدم بڑھاتے ہوئے یہی ایک سوال میرے ذہن میں بار بار گردش کر رہا تھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ خلیفہ کا خادم خاص دبے قدموں میرے پیچھے آ رہا تھا۔ خلیفہ ہادی ہی نے اسے میری نگرانی کی تاکید کی ہوگی' میں سمجھ گئی اور میرا ذہن مزید الجھ گیا۔

☆.....☆.....☆

اب میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ طباق جس میں زہر آلود پلاؤ تھا اسے اٹھائے سیدھی چلتی رہتی۔ خلیفہ ہادی کا خادم خاص ستونوں کی آڑ لیتا ہوا کچھ فاصلے سے میرے تعاقب میں تھا۔ اس طرح ہادی غالباً یہ یقین دہانی چاہتا تھا کہ میں نے وہ زہر آلود پلاؤ اس کی ماں ملکہ خیرزان تک پہنچا دیا ہے۔ اگر اسے پتا ہوتا کہ یہ کام وہ ایک جن زادی سے لے رہا ہے تو یقیناً ایسی جرات نہ کرتا۔ میرے لئے اگر کوئی مشکل تھی تو محض یہ کہ میں آدم زادوں کے درمیان رہ کر ظاہر ہونے سے گریزاں تھی۔ یہ کسی بھی طرح میرے حق میں بہتر نہیں تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم جنات سے آدم زاد ڈرتے ہیں لیکن موقع لگ جائے تو وہ ہمیں اپنے قابو میں بھی کر لیتے ہیں۔ میں اسی لئے بہت محتاط رہتی تھی۔ اس وقت بھی میں قدم قدم آگے بڑھتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح ملکہ خیرزان کی جان بچاؤں کہ کسی کو مجھ پر شک نہ ہو۔ آخر میرے ذہن میں ایک تدبیر آ ہی گئی۔

میں جب ملکہ خیرزان کی اقامت گاہ میں داخل ہو گئی تو خلیفہ کے خادم خاص کو واپس جاتے دیکھا۔

ملکہ کی ایک خادمہ نے اسے میرے آنے کی اطلاع دی تو مجھے اندر بلوا لیا گیا۔ قصرِ خلافت میں میرا شمار خلیفہ کی خادماؤں میں ہوتا تھا۔ ملکہ خیرزان نے میرے ہاتھوں میں طباق دیکھا تو پوچھا۔ ''کیا تمہارے خلیفہ نے ہمارے لئے کچھ بھیجا ہے؟''

''جی ہاں ملکۂ عالیہ!'' میں نے جواب دیا اور پھر خلیفہ ہادی کی ہدایت کے مطابق بتانے لگی۔ ''اس طباق میں بہت عمدہ پکا ہوا پلاؤ ہے۔ خلیفۂ محترم نے اس طباق میں سے نصف پلاؤ خود تناول فرمایا ہے اور نصف پلاؤ پسندیدگی کے سبب آپ کے لئے بھیجا ہے۔ اگر آپ اسے نوش فرمالیں گی تو خلیفۂ محترم کو خوشی ہوگی۔''

''ہماری طرف سے اپنے خلیفہ کا شکریہ ادا کر دینا۔ طباق ہماری خادمہ کو دے دو۔''

ملکہ خیزران بولی۔

"بہتر ہے ملکۂ عالیہ!" میں نے یہ کہتے ہوئے ملکہ کی خادمہ کو طباق تھمادیا جو وہیں تھی۔

اسی لمحے میں نے ملکہ خیزران کو اپنے اثر میں لے لیا۔ ملکہ کے ذہن میں یہ شک پیدا کرنا کہ خلیفہ کا بھیجا ہوا پلاؤ زہر آلود بھی ہوسکتا ہے میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں دانستہ وہاں زیادہ دیر نہیں رکی۔۔ واپسی کے وقت ملکہ خیزران کے چہرے پر میں نے پریشانی کے آثار دیکھ لئے تھے۔ شک اور یقین میں فرق ہوتا ہے۔ ضروری یہ تھا کہ ملکہ خیزران کو یقین آ جاتا کہ پلاؤ واقعی زہر آلود ہے۔ اسی صورت میں وہ اسے کھانے سے گریز کرتی۔ ملکہ کے ذہن میں شک ڈالنا پہلا مرحلہ تھا تاکہ فوری طور پر وہ پلاؤ نہ کھائے دوسرے مرحلے پر میں نے کچھ دیر بعد عمل کیا جب اپنے سکونتی حصے میں پہنچ گئی۔

عارج بھی وہاں موجود تھا۔ وہ دھیمی آواز میں مجھ سے بولا "اے دینار! قصر کے مطبخ (باورچی خانہ) سے دوپہر کا کھانا آئے دیر ہوگئی۔ میں تیرے انتظار میں تھا کہ تو آجائے تو ساتھ کھانا کھائیں۔ تو کہاں چلی گئی تھی؟"

"ابھی بتاتی ہوں۔ پہلے تو مجھے ایک آدم زادی کی جان بچالینے دے۔"

"کون ہے وہ آدم زادی؟" عارج نے چونک کر پوچھا۔

"خلیفہ ہادی کی ماں ملکہ خیزران۔" میں نے جواب دیا پھر بولی۔ "اب کوئی سوال نہ کیجو!" یہ کہتے ہی میں نے اپنی جناتی و پراسرار صفات کو متحرک کرلیا۔ اپنی آنکھیں بند کر کے ملکہ خیزران کو دیکھا۔ دور رہ کر بھی کسی آدم زاد کو اپنے اثر میں لینے کا تجربہ میں نے پہلے بھی کیا تھا اور کامیاب رہی تھی۔ سو میں نے اسی تجربے پر عمل کرتے ہوئے ملکہ کے شک کو یقین میں بدلنے کے لئے اسے ایک راہ سجھائی۔

"ہاں اس طرح پتا چل سکتا ہے۔" ملکہ خیزران بڑبڑائی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ایک جن زادی اسے مرنے سے بچا رہی ہے۔ وہ جو کچھ سوچ رہی ہے اس کے دماغ میں ڈالا جارہا ہے۔

میری تجویز ہی کو اپنی سوچ سمجھتے ہوئے ملکہ نے اپنی خادمہ کو طلب کیا۔ زہر آلود پلاؤ کا طباق ابھی تک اس کے سامنے رکھا تھا۔

ملکہ خیزران کے حکم پر ذرا ہی دیر میں خادمہ ایک بلی کو گود میں اٹھالائی۔ خوان پوش

ہٹا کر ملکہ نے پلاؤ سے ایک بوٹی اٹھائی۔ اسی دوران میں خادمہ نے بلی کو فرش پر چھوڑ دیا تھا۔ ملکہ نے گوشت کی وہ بوٹی بلی کے آگے ڈال دی۔

یقیناً وہ کوئی سریع التاثیر زہر تھا جس نے چند لمحوں میں بلی کی جان لے لی۔ خادمہ جو ابھی تک وہیں موجود تھی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ملکہ خیزران مضبوط اعصاب کی مالک تھی اس نے اسی لئے جلد خود پر قابو پالیا۔

"ہمارا حکم ہے کہ اس واقعے کا ذکر کسی سے نہیں کرو گی!" ملکہ خیزران نے خادمہ کو مخاطب کیا' پھر اسے مزید ہدایت دے کر ہاتھ دھونے کے لئے اٹھ گئی۔ خادمہ نے مردہ بلی اٹھائی اور دوسرے ہاتھ میں طباق سنبھالے وہاں سے نکل گئی۔

میری توجہ ملکہ خیزران کے ذہن پر تھی۔ وہ سوچ رہی تھی' تو ہادی ہمیں بھی زہر دے کر موت کی نیند سلا دینا چاہتا ہے! اگر بروقت ہمیں شک نہ ہو جاتا تو لازماً اس وقت ہم زندہ نہ ہوتے۔ ملکہ کے دماغ میں طوفان سے اٹھ رہے تھے۔

ملکہ خیزران کی زندگی جس خطرے سے دوچار تھی' وہ دور ہو چکا تھا۔ میں نے اسی لئے آنکھیں کھول دیں۔ عارج اسی کا منتظر تھا۔ اسے میں نے قصر خلافت میں کھیلے جانے والے خطرناک کھیل کی تفصیل سے آگاہ کردیا۔

"یہ کیسے لوگ ہیں اے دینار!" عارج نے اظہار تاسف کیا۔ "ماں' باپ' بیٹا' بھائی......ان......اقتدار کے بھوکے ان آدم زادوں کے نزدیک تو کوئی بھی رشتہ محترم نہیں۔ ان میں اور درندوں میں فرق ہی کیا ہے!"

"آدم زادوں کے لئے اتنا جذباتی نہ ہوا کر اے عارج!.....چھوڑ اس غم کو! میں کھانا لے کر آتی ہوں۔"

پھر سمجھانے کے باوجود کھانا کھاتے ہوئے بھی عارج اسی طرح کی باتیں کرتا رہا۔

اسی شام خلیفہ ہادی نے مجھے خلوت میں طلب کیا۔ اس کی وجہ مجھے پہلے ہی معلوم تھی۔ وہ اپنی ماں کے مرنے کی خبر کا منتظر تھا۔ ہر طرح کی احتیاط اور بندوبست کے باوجود ناکامی اس کے لئے حیران کن تھی۔ وہ اسی جستجو میں تھا کہ کہاں غلطی ہوئی ہے! اس نے یہی جاننے کی غرض سے مجھے بلوایا تھا۔ اس کا ذہن پڑھ کر مجھے یہ ساری باتیں معلوم ہوئیں۔

"اے جمیلہ!" ہادی نے مجھے اس انسانی قالب کے نام سے مخاطب کیا جو میں نے اپنالیا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "تو جب پلاؤ کا طباق لے کر ہماری

مادر محترم کے حضور پہنچی تو انہوں نے کیا فرمایا؟''

جو کچھ ملکہ خیزران نے کہا تھا' میں نے بیان کر دیا۔ ہادی نے مزید سوالات کئے مثلاً میں وہاں کتنی دیر ٹھہری یا ملکہ کو کن الفاظ میں اس کا پیغام دیا' پھر ملکہ نے کس ردعمل کا اظہار کیا وغیرہ۔ بلا جھجک میں جوابات دیتی رہی۔ ہادی میری طرف سے مطمئن تو ہو گیا مگر بار بار اس کے ذہن میں یہی سوال گردش کر رہا تھا کہ ملکہ نے زہر آلود پلاؤ کیوں نہیں کھایا؟

''یہ بھی تو ممکن ہے ملکہ کھانا کھا چکی ہو اور اسے بھوک نہ ہو۔'' میں نے ہادی کے دماغ میں یہ بات ڈال دی۔

''ہاں یہی ہوگا۔'' اس نے سوچا اور مطمئن ہو گیا۔ مجھے اس نے ہاتھ کے اشارے سے رخصت کی اجازت دے دی۔ چلتے چلتے میں نے ہادی کے ذہن پر توجہ دی تو وہ سوچ رہا تھا کہ اب کسی صورت ملکہ خیزران کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

''بہت بڑی غلطی ہو گی یہ!'' میں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے اس کے دماغ میں سرگوشی کی۔ ''ہارون کو اگر کسی طرح معلوم ہو گیا تو پھر اقتدار خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس نے خلیفہ مہدی کی غیر فطری موت کو تو بہ امر مجبوری قبول کر لیا مگر ملکہ خیزران کی موت برداشت نہیں کر سکے گا۔'' خلیفہ ہادی کے اقامتی حصے سے نکل آنے کے باوجود اس سے میرا ذہنی رابطہ قائم رہا۔ آخر کار اسے میں نے ذرا دھمکا کر اور مختلف وسوسوں میں مبتلا کر کے اپنی ماں کے خون ناحق سے باز رکھا۔

کچھ دن سکون سے گزرے ہوں گے کہ ایک اور ایسا واقعہ رونما ہوا جو مستقبل پر اثر انداز ہوا۔ حکمران خاندان کا قدیم نمک خوار وفادار ربیع دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس تجربے کار بوڑھے کو بوجوہ ہادی نے مملکت کا وزیر بنایا تھا۔ ربیع نے اپنی زندگی میں کبھی ہادی کو اس قدر بے تکمیل نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی ہارون کے خلاف براہ راست کوئی کارروائی کرے۔ وہ خلیفہ ہادی کو ہمیشہ ایسے ہی مشورے دیتا کہ خاندان میں اختلافات پیدا نہ ہو سکیں۔ ربیع جیسا زیرک وزیر نہ رہا تو خلیفہ ہادی نے اپنے بچپن کے دوست ابراہیم حرانی کو وزارت کے عہدے پر متعین کر دیا۔ یہ وہی ابراہیم حرانی تھا جس کی صحبت بد سے بچانے کے لئے ہادی کے باپ مرحوم مہدی نے عبداللہ بن مالک کو مقرر کیا تھا۔ اپنے اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے عبداللہ بن مالک نے ابراہیم حرانی اور ہادی کے دوسرے اوباش و آوارہ دوستوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ ماضی کے اسی ''قصور'' پر خلیفہ ہادی عبداللہ کو قتل کر دیتا' اگر میں نے

مداخلت نہ کی ہوتی۔ میں تفصیل سے اس واقعے کا ذکر کر چکی ہوں۔ بہر حال ابراہیم حرانی وزیر بنا تو حکومت کے ایوانوں میں ایک بار پھر طوفان کے آثار نظر آنے لگے۔

قدیم دوستی کے ناطے ابراہیم حرانی کا کہنا بھی یہی تھا کہ ہارون کے بجائے ہادی اپنے کمسن بیٹے جعفر کو ولی عہد بنا دے۔ وقتی طور پر جو ہنگامہ ختم گیا تھا' گویا از سر نو شروع ہو گیا۔

ولی عہد ہونے کی بنا پر ہارون کو افواج کی طرف سے مختلف مواقع پر تعظیم دی جاتی تھی۔ ابراہیم حرانی نے خلیفہ ہادی کو ایک روز یہ مشورہ دیا کہ افواج کو ہارون کی تعظیم سے روک دیا جائے۔ اس نے دلیل دی۔ ''جب امیر المومنین اپنے پسر جعفر کو ولی عہد بنانے کا فیصلہ کر ہی چکے ہیں تو پھر ہارون کی تعظیم افواج کو نہیں کرنی چاہیے۔''

روز اول ہی سے جو امرا اپنے ذاتی مفادات کے حصول کی خاطر خلیفہ ہادی کی چاپلوسی پر مستعد رہتے تھے' انہیں بھی موقع مل گیا۔ وہ بھی ابراہیم حرانی کی آواز میں آواز ملانے لگے۔ ہادی نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔

ایک امیر یزید بن فرید کہنے لگا۔ ''ہارون تو خلیفہ زادے کے ہاتھ پر ولی عہدی کے لئے بیعت کرنے مگر اصل فتنے کی جڑ یحییٰ بن خالد برمکی ہے۔ وہی ہارون کو ایسا کرنے سے روکتا رہتا ہے۔''

خلیفہ ہادی اپنے مطلب کی بات فوراً سن لیتا تھا۔ یوں بھی اس میں سمجھ بوجھ کی کمی تھی۔ وہ بے حد جذباتی اور کانوں کا کچا تھا۔ اپنے اسی مزاج کے سبب ہادی نے اسی وقت افواج کے لئے حکم جاری کر دیا کہ وہ ولی عہد کی حیثیت سے ہارون الرشید کو تعظیمی سلام نہ کریں۔ اجرائے حکم کے بعد وہ کہنے لگا۔ ''مجھے تو یحییٰ بن خالد ہی فسادی لگتا ہے۔ وہی میرے بھائی کو بھڑکاتا ہوگا۔ میں ابھی اسے طلب کرتا ہوں۔ اسے بھی پتہ چلے کہ ذلت کسے کہتے ہیں اور لگائی بجھائی کا انجام کیا ہوتا ہے۔''

جب دیوان خاص میں ہادی کی چاپلوسی کرنے والے امرا ہارون کے اتالیق یحییٰ بن خالد کے خلاف ہادی کو بھڑکا رہے تھے تو ابراہیم حرانی نے ایک اور شوشہ چھوڑا' کہنے لگا۔ ''اے امیر المومنین! یہاں دیوان خاص میں بلا کر اس سازشی یحییٰ کو ذلیل کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔''

''تو پھر بولو اے ابراہیم تمہاری صلاح کیا ہے؟'' خلیفہ ہادی نے پوچھا۔

"یحییٰ کو دربار عام میں طلب کر کے ذلیل کیا جائے اے امیر المومنین! اس سے یہ ہوگا کہ حضور کے دوسرے مخالفین بھی عبرت پکڑیں گے۔ انہیں بھی خوف ہوگا کہ ہارون کے حامی یحییٰ کی طرح ذلیل و رسوا کیے جا سکتے ہیں۔" ابراہیم حرانی نے زہر اگلا۔

اس زہر کو ہادی نے امرت سمجھ کر فوری طور پر قبول کر لیا۔

دوسرے ہی دن صبح خلیفہ ہادی کے حکم پر یحییٰ بن خالد دربار عام میں حاضر ہوا۔ خیریت یہ گزری کہ ان دنوں ہارون الرشید نے خلیفہ ہادی کے دربار میں جانا ترک کر دیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صورتحال نہ جانے کیا ہوتی! ہادی اس پر بھی ناخوش تھا کہ ہارون اس کے دربار میں حاضر نہیں ہوتا۔ درحقیقت اب کھل کر یہ بات سامنے آ گئی تھی کہ ہادی اپنے بھائی ہارون کا حق مارنے کے درپے ہے تاکہ آئندہ خلافت اور حکومت و اقتدار اس کی نسل میں رہے۔ اسی بناء پر دونوں بھائیوں میں کشیدگی پیدا ہو گئی تھی جو کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ ہارون تو چپ رہتا مگر ہادی برسرعام اس کی مخالفت کا ذکر کرتا۔

ہادی اکثر کہتا۔ "مجھے ہارون پر ہر طرح سبقت حاصل ہے۔ میرے باپ نے ہارون کو نہیں' مجھے اپنا ولی بنایا ہے۔ دوم یہ کہ عمر اور رشتے میں بھی ہارون سے میں ہی بڑا ہوں۔ میں خلیفہ وقت ہوں اور مجھے جو مرتبہ و عزت حاصل ہے' ہارون کو نہیں' اسے چاہئے کہ وہ بہر اعتبار میری اس برتری کو دل سے تسلیم کر لے۔ میں جو فیصلے کروں' ہارون پر لازم ہے کہ انہیں مانے۔"

ہارون کی طرف سے مسلسل خاموشی نے ہادی کا حوصلہ اور بڑھا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس دن جب دربار عام میں یحییٰ بن خالد حاضر ہوا تو ہادی نے ذرا یہ خیال نہ کیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے' اس سے خود اس کے خاندان پر حرف آئے گا۔ اسی کے ساتھ یہ کہ ہارون کو جب ان باتوں کی خبر ہوگی تو اسے بھی رنج پہنچے گا۔

"بول اے یحییٰ کہ تو ہمارے خاندان کا نمک خوار ہے کہ نہیں؟" خلیفہ ہادی رعونت سے بولا۔ حالانکہ اس کے بڑے بڑے بالائی دانت بولنے کی وجہ سے نمایاں ہو گئے تھے اور مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔

یہ تماشا دیکھنے کے لئے اس وقت خود میں دربار میں موجود تھی۔ اس کے لئے مجھے جیلہ کے انسانی قالب سے باہر نکلنا پڑا تھا۔ میں نے دانستہ خلیفہ ہادی کو چھیڑنے کی خاطر اس سے سرگوشی کی۔ "یا ہادی اطبق!"

بڑی مشکل سے میں نے اپنی ہنسی ضبط کی جب خلیفہ ہادی کو نخوت سے ہونٹ بھینچے دیکھا۔ ایسا اس نے محض اپنی عادت کے مطابق کیا تھا۔ ایک عمر تک اس سے یہی کہا جاتا رہا تھا اور اب کافی عرصے کے بعد بھی یہ الفاظ سن کر اس پر حسب سابق ردعمل ہوا تھا۔ وہ یہ الفاظ سن کر چونکا تو ضرور مگر فطری "حمق" کی بناء پر اس نے غور نہ کیا کہ بولنے والا کون ہے! اس کی توجہ تو اپنی جھوٹی شان و شوکت دکھانے پر مرکوز تھی۔ وہ تو یحییٰ کو ہونٹ بھینچے گھور رہا تھا۔

"اے امیر المومنین! یہ غلام تو آپ ہی کے خاندان کا پروردہ ہے۔" یحییٰ بن خالد نے ادب سے جھک کر ہادی کی بات کا جواب دیا۔

"تو نے بالکل صحیح کہا اے بدبخت!" ہادی نے اکڑ کر کہا۔ "تو ہمارا نہیں ہمارے خاندان کا پروردہ ہے۔"

یحییٰ غریب کو گمان بھی نہ ہوگا کہ ہادی اس کی بات کو یہ معنی پہنا دے گا۔ پھر بھی وہ سنبھل کر کہنے لگا۔ "امیر المومنین بھی تو اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں غلام نے جس کی نمک خواری کا اظہار کیا ہے۔"

"تو جھوٹ بولتا ہے!" ہادی جان بوجھ کر یحییٰ کو بھرے دربار میں بے عزت کرتا رہا۔ "تو نے پروردہ کہا ہے' نمک خوار نہیں!"

"امیر المومنین نے بجا ارشاد فرمایا۔ غلام' حضور کے خاندان کا نمک خوار بھی ہے اور پروردہ بھی!" یحییٰ نے عاجزی کا اظہار کیا۔

"پھر وہی خاندان کی رٹ لگا رہا ہے تو اے بے خبر!..... خاندان میں تو ہم ہی کیا اور دوسرے بھی ہیں۔ تو کیا وہ سب ہمارے ہم رتبہ ہو گئے؟..... کہیں تو ہمارے چھوٹے بھائی ہارون کو بھی تو ہمارے برابر نہیں سمجھتا؟" پھر ہادی نے رکے بغیر مزید کہنا شروع کیا۔ "اچھی طرح سمجھ لے یحییٰ کہ ہم خلیفہ ہیں اور اسی وقت تیری کھال بھی کھنچوا سکتے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح اندازہ ہے کہ تو اندر ہی اندر کیا چالیں چل رہا ہے! ہم تجھ سے پھر کہتے ہیں کہ عیاری چھوڑ دے ہارون کی باتوں میں نہ آیا کر وہ نصیحت قبول کرنے والوں میں سے نہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہارون کو خود تو بھی ہمارے خلاف بھڑکاتا ہے۔"

"اے امیر المومنین! آپ ہی نے تو خلیفہ مرحوم اور اپنے والد بزرگوار کے بعد اپنے برادر خرد ہارون الرشید کی مدارالمہامی کی خدمت میرے سپرد کی ہے۔ اگر یہ امر حضور کی مرضی

کے خلاف ہو تو غلام و جانثار فوراً علیحدہ ہو جائے۔" یحییٰ نے کہا۔ میں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ موت کے خوف نیز بھرے دربار میں ذلت سے یحییٰ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

مجھے اس آدم زاد یحییٰ پر ترس آ گیا۔ میں نے ایک بار پھر ہادی سے سرگوشی کی۔

"ٹھیک تو کہہ رہا ہے یحییٰ! اسے یہ عہدہ تو نے ہی تو دیا ہے۔ اگر تو نے یحییٰ کو اس عہدے سے ہٹا لیا تو ہارون بالکل بے قابو ہو جائے گا..... چونکنے' بوکھلانے یا کوئی اونگی بونگی حرکت کرنے کی ضرورت نہیں کہ میں تیرے ضمیر کی آواز ہوں۔"

میری مداخلت کے بعد ہادی کے چہرے کا تناؤ ختم ہوتا گیا۔ اہل دربار بھی اس پر حیرت زدہ رہ گئے کہ خلیفہ کا غصہ ایک دم ٹھنڈا کیسے ہو گیا؟ ذرا دیر خاموش رہ کر ہادی نے وہی پرانا راگ شروع کر دیا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ اپنے بیٹے جعفر کو اپنا ولی عہد بنا دیں اور ہارون کو معزول کر دیں..... لیکن ایسا تبھی ممکن ہے کہ ہمارے کہنے پر ہارون اپنے بھتیجے کے ہاتھ پر بیعت کر لے" ہادی کہنے لگا۔ وہ یحییٰ سے مخاطب تھا مگر اب اس کے لہجے میں تلخی نہیں تھی۔

"یہ غلام بخوبی سمجھتا ہے کہ امیرالمومنین کا منشا کیا ہے۔" یحییٰ نے خلیفہ کی آواز میں نرمی دیکھی تو اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ واقعہ یہ ہے کہ یحییٰ بے وقوف نہیں تھا۔ اسے وقوف تھا کہ ہارون الرشید باصلاحیت و ذہین ہے۔ ولی عہد جعفر کو نہیں بلکہ ہارون ہی کو رہنا چاہیے۔ پھر بھی یحییٰ میں اتنا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ اپنے دل کی ساری باتیں کسی لاگ لپیٹ کے بغیر بیان کر دے۔

"اے یحییٰ! خوفزدہ نہ ہو۔ ڈر صرف اللہ سے' ہادی سے نہیں۔" میں نے یحییٰ کے دماغ میں یہ بات ڈال دی۔ ہادی کی طرح اسے بھی میں نے یہی باور کرایا تھا کہ اسی کے ضمیر کی آواز ہوں۔ اس کے لئے مجھے انہی دونوں آدم زادوں کی مردانہ آوازوں کی نقل کرنی پڑی تھی۔ ہم جنات ایسا کرنے پر بھی قادر ہوتے ہیں۔ آواز بدلنا تو الگ رہا' ہم جنات تو ظاہر ہونے کی صورت میں اپنی جنس بھی بدل سکتے ہیں۔ یعنی میں ایک جن زادی ہونے کے باوجود کسی مرد کی صورت میں بھی ظاہر ہو سکتی ہوں اور بالکل اسی طرح کوئی جن' عورت بن سکتا ہے۔ یہ پیکر خیالی بھی ہو سکتے ہیں اور اصلی بھی! اصلی اس صورت میں جب کہ میں دانستہ کسی مرد کے جسم میں اتر جاؤں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ میں دیکھنے والوں کو ایک آدم زاد مرد ہی نظر آؤں گی۔ پھر جب میں اس انسانی پیکر کی آواز میں بھی بولنے لگوں تو بھلا کون یقین

کرے گا کہ اس نے جو کچھ دیکھا' محسوس کیا یا سنا' سب کچھ غلط تھا۔ سو بعض اوقات آدم زاد جو کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں' حقیقت پر مبنی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے ہم جنات کو آدم زادوں کی نظروں سے اس لئے اوجھل رکھا ہے کہ ابوالجن (گویا جنات کے بابا آدم) نے یہ خواہش بارگاہ ایزدی میں کی تھی جسے شرف قبولیت عطا ہو گیا۔

ایک جن زادی ہونے کی بناء پر میں بھی خلیفہ ہادی کے دربار میں موجود تمام آدم زادوں کی نظروں سے چھپی ہوئی تھی اور اپنی جناتی صفات سے کام لے رہی تھی۔ میرے ہی زیر اثر یحییٰ بن خالد بھرے دربار میں سچ بولنے پر آمادہ ہو گیا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ یحییٰ کی راست گوئی پر اگر خلیفہ ہادی "بے سرا" ہو گیا تو اسے "سر" میں لے آؤں گی۔ اس کے لئے مجھے ہادی کو بھی اپنے اثر میں لینا پڑ رہا تھا۔

"اے امیرالمومنین! اگر آپ اعیان (امرا) سلطنت اور عوام کو بدعہدی و حلف شکنی پر مجبور کریں گے نیز اپنے پدر بزرگوار کی وصیت پر قائم نہیں رہیں گے تو یہ ہرگز مناسب نہ ہو گا۔" یحییٰ نے بلا جھجک کہنا شروع کر دیا۔ "اس کا سبب یہ کہ جس کو آپ اپنے بعد تخت حکومت کا مالک مقرر کر رہے ہیں' اس پر بھی ناگوار اثر مرتب ہو گا۔ اس فیصلے سے متعدد ایسی سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی جن کو سلجھانا دشوار ہو گا۔ اس کے برعکس اگر ہارون الرشید کے بعد جعفر کی ولی عہدی کی بیعت لی جائے گی تو ایسا کرنا مصلحت وقت کے عین مطابق ہو گا۔"

یہ الفاظ اس شخص یحییٰ نے ادا کئے تھے جسے کچھ ہی دیر پہلے خلیفہ ہادی نے کھال کھنچوانے کی دھمکی دی تھی۔ اس پر بھی جو سچ تھا' اس نے کہہ دیا۔ اسی سبب فوری طور پر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ اہل دربار کے چہروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یحییٰ کی سچی باتوں نے انہیں متاثر کیا تھا۔ جو صورتحال درپیش تھی' اس میں کلمہ حق وہی کہہ سکتا تھا جسے اپنی جان کی پرواہ نہ ہو۔ خلیفہ ہادی پر بھی اس کا اثر ہوا۔ مزید "کام" میں نے دکھا دیا۔

☆......☆......☆

"ٹھیک ہے اے یحییٰ! ہم تمہاری رائے پر غور کریں گے۔" خلیفہ ہادی نرم آواز میں بولا۔ "تم جا سکتے ہو۔"

یحییٰ نے اس پر خلیفہ کا شکریہ ادا کیا اور دربار سے رخصت ہو گیا۔

اب وہاں میری موجودگی کی ضرورت نہیں تھی۔ دربار عام یا دیوان خاص میں کسی اجلاس کے دوران میں خلیفہ وقت کے ذاتی خدام کی موجودگی طلب کئے بغیر ضروری نہیں تھی۔

یہ طلبی بھی اس وقت ہوتی جب خلیفہ کو کوئی ذاتی کام ہوتا ورنہ تو دربار عام اور دیوان خاص کے لئے علیحدہ غلام، کنیزیں وغیرہ تھیں۔ ان کے مقابلے میں ذاتی خدام کی زیادہ اہمیت تھی۔ یہ خدام قصر خلافت میں ہر جگہ آ اور جا سکتے تھے۔ جب خلیفہ دربار عام یا دیوان خاص میں ہوتا تو عموماً اس کے ذاتی خدام اپنی اپنی قیام گاہوں میں آرام کرتے۔ ابھی چوں کہ دربار ختم نہیں ہوا تھا اور میں جس مقصد سے وہاں گئی تھی، پورا ہو چکا تھا اسی سبب مجھے اپنی قیام گاہ تک پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ بمشکل لمحہ بھر میں وہاں پہنچ گئی۔ انسانی قالبوں سے باہر رہ کر جنات کے لئے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ یوں بھی، مجھے عارج کا خیال تھا۔ میں اسے جلدی میں یہ نہیں بتا سکی تھی کہ جیلہ کے قالب سے نکل کر جا رہی ہوں۔

میں نے از اول تا آخر ساری بات بتادی اور آخر میں عارج سے پوچھا۔ ''تیرا کیا خیال ہے خلیفہ ہادی، ہارون کو اس کا حق دے دے گا؟''

''ممکن ہے کہ ہادی تو اس پر آمادہ ہو جائے مگر شاید اس کے امرا، خاص طور پر وزیر ابراہیم حرانی، ہارون کو ولی عہد نہ رہنے دیں۔'' عارج سنجیدگی سے حالات کا جائزہ لینے لگا۔ ''دراصل یہ کچھ اور ہی کھیل معلوم ہوتا ہے۔ خود غرض امرا اور وزیر ابراہیم حرانی، خلیفہ زادے جعفر کی آڑ میں سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک بننا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے جعفر ابھی بچہ ہے۔ اگر اس کے لئے ولی عہدی کی بیعت لے لی جاتی ہے تو اقتدار کے بھوکوں کے لئے راستہ صاف ہو جائے گا۔ اگر ہارون کسی طرح اپنے حق سے دستبردار کر دیا جاتا ہے تو پھر جعفر ہی ولی عہد ہوگا۔ تب عین ممکن ہے کہ خود غرض و لالچی امرا وزیر ابراہیم حرانی کو ساتھ ملا کر ہادی ہی کو راستے سے ہٹا دیں۔ کمسن جعفر بھلا ان کا کیا بگاڑ لے گا!''

''بات تو تیری ٹھیک لگتی ہے اے عارج!'' میں نے اعتراف کیا پھر اسے چھیڑا۔ ''لگتا ہے کہ تو بھی اب عقل سے کام لینے لگا ہے۔''

عارج صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اس وقت شاید وہ مزید چھیڑ چھاڑ کا متحمل نہیں تھا۔ پھر وہی ہوا جو عارج نے کہا تھا۔ خلیفہ ہادی، چاپلوس امرا اور اپنے وزیر کی باتوں میں آ گیا۔ انہوں نے ایک بار پھر یحییٰ پر ہی الزامات لگائے تھے۔ اب انہوں نے صاف صاف الفاظ میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ ہارون کو جعفر کی بیعت سے یحییٰ روکتا ہے۔ اپنے الزامات کی دلیل میں وہ برسر دربار یحییٰ کی حق گوئی کو پیش کرتے۔

وزیر ابراہیم حرانی نے خلیفہ ہادی کو مشورہ دیا کہ یحییٰ کو زنداں میں ڈال دیا گیا تو

پھر ہارون کو بہکانے والا کوئی نہیں رہے گا۔ وہ اپنے بھتیجے کے حق میں ولی عہدی پر بضد نہ ہوگا۔

خلیفہ ہادی کے پاس عقل تو تھی نہیں، جو بھی جیسی بات سمجھا دیتا اور اس کے مفاد کی ہوتی فوراً بے سوچے سمجھے مان لیتا۔ وہ غیر ضروری طور پر جذباتی تھا۔ گھڑی میں ہنسنے لگتا، گھڑی میں کسی بات پر اسے طیش آ جاتا۔ اپنے وزیر اور یار قدیم کی بات سن کر ہادی شدید غصے میں آ کر کہنے لگا۔ ''اگر ایسا ہے تو ابھی اور اسی وقت ہم حکم دیتے ہیں کہ یحییٰ کو گرفتار کر کے زنداں میں ڈلوا دیا جائے۔ اے ابراہیم! یہ ذمے داری ہم تمہی کو سونپتے ہیں۔''

وزیر ابراہیم حرانی کو یحییٰ سے اس لئے کد تھی کہ ہادی کے دور آوارگی میں یحییٰ بھی ابراہیم کو اس کا ذمے دار کہتا تھا۔ یحییٰ میں بہر حال اتنی جرات نہیں تھی کہ خلیفہ زادے اور مملکت کے ولی عہد کو آوارہ کہہ سکتا۔ اگر وہ ایسا کہتا بھی تو غلط نہ ہوتا۔ ہادی واقعی بہت بگڑا ہوا تھا۔ اس نے خلیفہ بننے کے بعد بھی نبیذ پینا نہیں چھوڑی تھی۔ اس زمانے میں کھجور سے نبیذ بنائی جاتی تھی۔ شراب کے بجائے نبیذ کا استعمال عام تھا۔ ہادی کی صحت پر بھی نبیذ زیادہ پینے کے برے اثرات پڑے تھے، مگر وہ کسی کو خاطر ہی میں کب لاتا تھا جو طبیبوں کی باتوں پر دھیان دیتا۔

یحییٰ کو قید کرنے کے کچھ روز بعد ہادی نے خلوت میں ہارون کو طلب کیا، جیلہ کے انسانی قالب سے نکل کر میں بھی وہاں پہنچ گئی۔ وہ رات کا وقت تھا۔ مجھے جب اس طلبی کا علم ہوا تو چوکنا ہو گئی۔ ہادی سے کچھ بعید نہیں تھا۔ نبیذ کے زیر اثر وہ کوئی بھی خطرناک اور غیر ذمہ دارانہ قدم اٹھا سکتا تھا۔ مسلمانوں کی اس مملکت کو کسی غلط فیصلے سے ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا جس کا دائرہ روم تک پھیل چکا تھا۔ عیسائیوں پر مسلمانوں کی دھاک بٹھانے والا نوجوان ہارون ہی تھا جسے ہادی امور سلطنت سے عملاً قطعی الگ کر چکا تھا۔ مجھے ہادی جیسے متلون مزاج آدم زاد کی طرف سے یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر کہیں چھوٹے بھائی ہی کو راستے سے نہ ہٹا دے۔ اس کے لئے وہ کوئی بھی شاطرانہ چال چل سکتا تھا۔ جو شخص، جو بد قسمت آدم زاد اپنی ماں کو زہر دلوانے کی کوشش کرے، وہ بھلا بھائی کے ساتھ کیا رعایت کر سکتا ہے! اگر میں نے مداخلت نہ کی ہوتی، ہادی کے ذہن میں یہ بات نہ بٹھا دی ہوتی کہ ملکہ خیزران کا قتل اس کے اقتدار کو ختم کر سکتا ہے تو وہ ملکہ خیزران کو کسی صورت زندہ نہ چھوڑتا۔ ہادی کے عزائم مجھ سے چھپے نہ تھے اسی لئے مذکورہ شب میں اس حصے میں پہنچ گئی جو خلیفہ وقت کے لئے مخصوص تھا اور جس کی عالیشان نشست گاہ میں ہادی اور ہارون کے سوا اس

وقت کوئی نہ تھا۔

"اے عزیز از جان برادر!" ہادی نے ہارون کو مخاطب کیا تو اس کی آواز سے منافقت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "ہم نے تمہیں خلوت میں اسی لئے طلب کیا ہے کہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کوئی اور نہ سن سکے۔ ہم نے محسوس کیا ہے کہ کچھ اراکین سلطنت' امرا اور قریبی متعلقین تمہیں غلط صلاح و مشورے دیتے ہیں۔ ان کا مقصد ہمارے خاندان میں نفاق ڈال کر اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔" ہادی کہتا رہا اور ہارون خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ وہ اپنے بڑے بھائی کی مسند پر اس کے سامنے دوزانو بیٹھا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ بڑا بھائی ہونے سے قطع نظر بطور خلیفہ بھی وہ ہادی کو تعظیم دے رہا تھا۔

میں نے ہارون کے ذہن پر توجہ دی تو اطمینان ہوا۔ وہ اس ناوقت طلبی پر پوری طرح چوکنا اور محتاط تھا۔ اس کی کمر سے بندھی ہوئی چمڑے کی پیٹی میں تلوار اور خنجر موجود تھے۔ قصر خلافت میں رہنے کے باوجود وہ عموماً مسلح ہی رہتا تھا۔ مجھے اس انتہائی احتیاط کی وجہ بھی اس کا ذہن پڑھ کر معلوم ہو گئی۔ ملکہ خیزران کو جو واقعہ پیش آیا تھا' اس سے ہارون کو آگاہ کرتے ہوئے ملکہ نے تاکید کی تھی کہ ہادی کی طرف سے ہوشیار رہے۔ ہارون کی یہ اعلیٰ ظرفی تھی کہ وہ ملکہ خیزران کے سمجھانے بجھانے پر وہ اپنا غصہ پی گیا تھا۔ ملکہ خیزران نے اس موقع پر ہارون سے کہا تھا' ہادی کی یہ جسارت ہم پر قرض ہے اور ہم یہ قرض وقت آنے پر چکائیں گے! ان الفاظ کے معنی سمجھنا میرے لئے مشکل نہ تھا۔ گویا خود کو زہر دیئے جانے کی ناکام سازش کا جواب ملکہ خیزران خود ہی ہادی کو دینا چاہتی تھی۔ اس وقت ہارون کے ذہن کا مطالعہ کر کے مجھے اور بھی بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ اس کے باوجود میرے اندیشے کم نہ ہوئے۔

ہادی اب بھی ہارون سے ہم کلام تھا۔ "تو اے برادر! ہم نے انہی نفاق ڈالنے والوں میں سے ایک یحییٰ بن خالد کو گرفتار کرا کے قید میں ڈلوا دیا۔ ہمیں معتبر ذرائع سے یہ اطلاع ملی تھی کہ تمہیں جعفر کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ تمہارے حاضر باش مفسدی اس پر معترض ہیں۔ یہ اطلاع درست ہے نا؟" ہادی نے بڑی چالاکی سے ہارون کو گھیرنا چاہا۔

"گستاخی معاف اے امیر المومنین! جن لوگوں نے آپ کو اطلاع دی ہے' وہ دروغ گو ہیں۔" ہارون دھیمے اور پرسکون لہجے میں بول رہا تھا۔ "آپ ہرگز ان کی باتوں پر

کان نہ دھریں۔ ایک بات آپ سے اور عرض کرنی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اتنی عقل عطا کی ہے کہ ہم اپنے دوست اور دشمن کو پہچان سکیں۔ ہمیں کوئی یحییٰ نہیں بہکا سکتا۔ اگر آپ نے ہمارے بارے میں ایسا فرض کر لیا ہے تو ہمیں اس پر افسوس ہے۔ گویا آپ ہمیں اس قدر کم عقل تصور کرتے ہیں کہ ہم کسی کے بہکاوے میں آ سکتے ہیں۔"

ہارون کی بات سن کر ہادی کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ وہ کسی قدر سخت آواز میں بولا۔ "ہم زیادہ بات بڑھانے کے حق میں نہیں' تم بھی جانتے ہو کہ ہمارا منشا کیا ہے۔ تمہیں سوچنے کے لئے اور فیصلے کی خاطر ہم وقت دیتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ تم فہم و ادراک سے کام لو گے۔ ہارون! اس بات کو اپنی گرہ میں باندھ لو کہ تمہیں آخر کار اپنی ضد چھوڑنی پڑے گی!"

"اے امیر المومنین! مجھے رخصت کی اجازت ہے؟" ہارون نے ہادی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ہادی نے ناگواری کے ساتھ کہا۔ "اجازت ہے' مگر یہ بات ذہن میں رکھنا کہ سوچنے کے لئے تمہارے پاس وقت محدود ہے۔"

ہارون مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھ آیا۔ ہادی نے یقیناً اندازہ کر لیا تھا کہ ہارون بآسانی اپنا حق نہیں چھوڑے گا۔

اب میرے وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا' لیکن مجھے بے قصور یحییٰ بن خالد کا خیال آ گیا۔ وزیر ابراہیم حرانی کے کہنے پر خلیفہ ہادی نے اسے بلاوجہ زنداں میں ڈلوا دیا تھا۔ یہ محض انتقامی کارروائی تھی۔ ہادی کے عتاب سے برسر دربار تو میں نے یحییٰ کو بچا لیا تھا مگر ابراہیم حرانی اور اس کے ہم خیال امرا نے آخر کار یحییٰ کو زنداں کی ہوا کھلا ہی دی تھی۔ مغل تاجدار ہمایوں کے عہد میں جا کر مجھے یہ تجربہ بھی ہو چکا تھا کہ عموماً حکمران یا برسر اقتدار طبقے کے افراد کسی بھی شخص کو زنداں میں بھیج کر بھول جاتے ہیں۔ ایسا غریب یحییٰ کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ زنداں ہی میں اپنی عمر کا بقیہ حصہ گزار دیتا اور کسی کو اس کا خیال بھی نہ آتا۔

یہی سوچ کر میں ایک مرتبہ پھر گویا خلیفہ ہادی کے ضمیر کی آواز بن گیا۔

"اے ہادی! تو نے یحییٰ جیسے سچے اور اچھے آدمی کو زنداں میں ڈلوا کر اچھا نہیں کیا۔" میں نے ہادی سے سرگوشی کی تو وہ اچھل پڑا۔ ابھی تک وہ نشست گاہ سے اٹھا نہیں تھا۔

"یہ...... یہ تو میری...... میری ہی آواز ہے...... مجھے سنائی دے رہی ہے!" خلیفہ ہادی

ذری ذری آواز میں بڑبڑایا۔

"ہاں اے ہادی! یہ تیری ہی آواز ہے..... تیرے ضمیر کی آواز! اس پر دھیان دے!" میں نے تاکید کی۔

"تو..... تو میں کیا..... کیا کروں؟" ہادی نے کہا۔

"کرنا کیا ہے..... یحییٰ کی رہائی کا حکم جاری کر دے۔ تو خلیفہ وقت ہے تجھے آخر ایسا کرنے سے کون روک سکتا ہے! تو یحییٰ سے بات تو کر کے دیکھ! اس کی باتوں میں وزن ہوتا ہے۔ اس سے تو جلوت میں نہیں خلوت میں مل! تجھے وہ قائل کر دے گا کہ تیرے حق میں وہی بہتر ہے جو اس نے دربار عام میں بھی کہا ہے۔"

"ٹھی..... ٹھیک ہے..... میں اسے زنداں سے نکلوا کر خلوت میں بات کروں گا۔" ہادی کے لب ہلے۔

میں نے ہادی کا ذہن پڑھ کر جان لیا کہ اس وقت وہ سخت مضطرب ہے۔ اس کی وجہ ہارون الرشید سے گفتگو میں ناکامی تھی۔ ہادی پر اس کا بڑا اثر ہوا تھا۔ وہ شعر بھی کہتا تھا اور اس وقت اس پر یہی کیفیت طاری تھی۔ بعد میں ہادی نے یہ اشعار اپنے ہم نوا امرا کو بھی سنائے جو حقیقت حال تھے۔ ان عربی اشعار کا ترجمہ یہ تھا:

"میں نے ہارون کو نصیحت کی' مگر اس نے قبول نہ کی اور جو نصیحت قبول نہیں کرتا وہ نادم ہوتا ہے۔ میں ایسی باتیں کہتا ہوں جو ارتباط کا سبب ہیں اور وہ اس سے دور بھاگتا ہے' اور اس سلسلے میں وہ ظالم ہے۔ اگر مجھے امروز و فردا کا خیال نہ ہوتا تو چاروناچار میری بات اس کو ماننی ہی پڑتی۔"

میں اس رات خلیفہ ہادی کے پاس سے لوٹ کر آئی تو عارج بیدار تھا' مگر جیلہ محو خواب تھی۔ اس پر میں گہری نیند طاری کر گئی تھی کہ کہیں پہلے کی طرح عارج کو اپنا شوہر ایوب سمجھ کر "بے تکلفی" سے پیش نہ آنے لگے۔ معاملات عشق میں صرف آدم زادیاں ہی نہیں ہم جن زادیاں بھی بڑی "کائیاں" ہوتی ہیں اور اپنی جیسی کسی دوسری کو عشق میں حصے دار بنانے پر راضی نہیں ہوتیں۔ جب میں نے جیلہ کے جسم میں ظہور کیا تو مجھے بھی نیند آنے لگی۔

"اے دینارا!" عارج نے مجھے مخاطب کیا۔ "میں نے تجھے جیلہ کے جسم میں اترتے دیکھ لیا۔ یہاں تو میں تیرے انتظار میں سویا نہیں اور تو ہے کہ مجھے کچھ بتائے بغیر دوسری طرف کروٹ لے کر سونے لگی۔"

"اس وقت بہت زور کی نیند آ رہی ہے اے عارج!" میں خوابیدہ سی آواز میں بولی۔ "تو بہت اچھا ہے' میری ہر بات مان لیتا ہے۔ میں تجھے کل صبح تفصیل بتادوں گی کہ ہادی اور ہارون میں کیا بات ہوئی۔ خدا حافظ! شب بخیر!" یہ کہہ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

عارج کو بھی مجبوراً "شب بخیر" کہنا پڑا۔

معلوم نہیں وہ رات کا کون سا پہر تھا کہ چیخ و پکار' بھاگ دوڑ اور شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ عارج بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

دارالخلافہ بغداد کے قصر خلافت میں رات کے وقت یہ ہنگامہ میرے لئے انتہائی تعجب خیز تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میرے ذہن میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔

ایسا ممکن نہیں تھا کہ قصر خلافت میں ہونے والے خلاف توقع ہنگامے پر میں کوئی توجہ نہ دیتی۔ یقیناً کوئی بڑا واقعہ رونما ہوا تھا۔ عارج اور میں اگر اپنے انسانی پیکروں میں خدام کی حیثیت سے اس واقعے کا سبب معلوم کرنا چاہتے تو شاید ہمیں کامیابی نہ ہوتی۔ اس خیال سے میں نے جیلہ کے قالب سے نکل کر اسے گہری نیند سلا دیا۔ میری تقلید میں عارج نے بھی ایوب کے پیکر کو چھوڑ دیا اور اس پر نیند مسلط کر دی۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ وہ دونوں بیدار ہو کے میرے اور عارج کے واسطے کوئی مسئلہ پیدا نہ کریں۔ ہم جنات کے لئے آدم زادوں کے جسموں میں رہنا آسان نہیں ہوتا ہمیں بڑی احتیاطیں برتنی پڑتی ہیں۔ اس وقت بھی ہم نے ہنگامی صورتحال کے باوجود احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا۔ شور اس لمحے بھی سنائی دے رہا تھا جب میں' عارج کے ساتھ اپنے اقامتی حصے سے باہر آئی۔

قصر خلافت کے گوشے گوشے کو منور کرنے والے شمع دانوں کی روشنی نصف شب سے پہلے ہی دھیمی کر دی جاتی تھی۔ اس ہنگامے والی رات کو بھی ایسا ہی تھا۔ مدہم روشنی میں مجھے مسلح محافظ ادھر سے ادھر دوڑتے نظر آئے۔

جلد ہی میں عارج کو لیے اس جگہ پہنچ گئی جس کے گرداگرد شمشیر بکف محافظوں نے حلقہ سا بنا رکھا تھا۔ وہ کسی کو بھی اس طرف نہیں آنے دے رہے تھے' مگر ایک جن زادی کو بھلا کیسے روک لیتے۔

جس جگہ پر بھیڑ لگی ہوئی تھی وہیں سے کچھ فاصلے پر ہارون الرشید کی اقامت گاہ تھی۔ ہارون کا مخصوص محافظ دستہ شب و روز اس حصے کی نگرانی کرتا تھا۔ میں آگے بڑھ کر اس حلقے کے درمیان پہنچی تو دنگ رہ گئی وہاں ایک آدم زاد کی لاش پڑی تھی اور آس پاس خون پھیلا

ہوا تھا۔ لاش کا سر الگ کٹا ہوا پڑا تھا اور جسم کے بقیہ حصوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ لاش کس کی تھی اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے کون تھے' ان سوالوں کے جواب میں نے معلوم کر لئے۔

قتل ہونے والا آدم زاد خلیفہ ہادی کا ایک غلام تھا۔ اس نے نصف شب گزرنے کے بعد چوری چھپے قصر کے اس حصے میں داخل ہونا چاہا تھا جو ہارون الرشید کے تصرف میں تھا۔ نگرانی پر متعین ہارون کے محافظوں نے اس غلام کو دیکھ کر للکارا تو بھاگ اٹھا۔ محافظوں نے اس کا پیچھا کر کے اسے گھیر لیا۔ غلام نے گھیرا توڑنے کے لئے نیام سے تلوار نکالی اور محافظوں پر ٹوٹ پڑا۔ کچھ محافظ زخمی تو ہو گئے مگر انہوں نے غلام کے ٹکڑے کر دیے۔ عارج نے بھی اپنے طور پر یہ ساری باتیں معلوم کر لیں۔

"اے دینارا!" عارج مجھ سے کہنے لگا۔ "کیا اس واقعے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ہارون پر قاتلانہ حملے کے لئے خلیفہ ہادی نے اپنے ایک غلام کو بھیجا تھا؟...... یہ الگ بات کہ اسے ہارون کے محافظوں نے دیکھ لیا اور مار ڈالا۔"

"ہاں' میں نے عارج کے خیال سے اتفاق کا اظہار کیا۔ "بہ ظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے اس کی تصدیق ایک طرح ممکن ہے۔ آ اے عارج! میرے ساتھ چل! ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوا جاتا ہے۔"

ہر چند میرے اور عارج کے قریب محافظوں کی صورت میں آدم زاد بھی موجود تھے مگر وہ ہماری آوازیں سننے سے قاصر تھے۔ آدم زادوں کو ہم جنات کی آوازیں اسی صورت میں سنائی دیتی ہیں جب خود ہم یہ چاہیں۔

عارج کو میں قصر خلافت کے مرکزی حصے میں لے آئی۔ قصر کے جن حصوں میں حکمراں خاندان کے افراد کی سکونت تھی' ان سبھی حصوں کی حیثیت محلوں جیسی تھی مرکزی حصہ خلیفہ کے لئے مخصوص تھا۔ پہلے اسی حصے میں ملکہ خیزران کا قیام بھی تھا' لیکن ہادی جب سے خلیفہ بنا تھا' ملکہ قصر کے ایک اور حصے میں منتقل ہو گئی۔ قصر کا یہ حصہ ہارون کی اقامت گاہ کے قریب تھا۔

یوں تو قصر خلافت میں حفاظتی انتظامات عام دنوں میں بھی بہت سخت رہتے تھے لیکن ہنگامی حالات ہوتے تو اور بھی سختی برتی جاتی۔ خاص طور پر خلیفہ وقت کی قیام گاہ کی حفاظت اس طرح کی جاتی جیسے دشمن اسی پر حملہ کرنے والا ہو۔ خلیفہ کا محافظ دستہ منتخب سپاہیوں

پر مشتمل ہوتا۔ ان کے لئے خلیفہ سے وفاداری اور بہادری' دونوں ہی شرطیں تھیں۔

رات کے اس پہر بھی یہی "تماشا" دیکھنے کو ملا۔ محافظ دستے کے سپاہی اپنی اپنی تلواریں بے نیام کیے قدم قدم پر مستعد اور چوکنا کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے وہ بغداد کے قصر خلافت کے بجائے میدان کارزار میں ہوں۔

وہاں سے گزر کر میں سیدھی خلیفہ ہادی کی خواب گاہ میں پہنچی۔ عارج میرے پیچھے پیچھے تھا۔ ہادی مجھے اضطراب کے عالم میں ٹہلتا نظر آیا۔ اس کی آنکھیں بے خوابی کا پتا دے رہی تھیں جیسے وہ سویا نہ ہو۔ بے چینی کا اندازہ میں نے اس کے چہرے سے لگایا۔ اس کی خواب گاہ' اپنی ملکہ کی خواب گاہ سے الگ تھی۔ خواب گاہ کے باہر قدموں کی چاپ ابھری۔ ہادی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"کون ہے؟" ہادی بارعب آواز میں بولا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ رک گیا تھا۔

"حضور امیر المومنین کا ادنیٰ غلام سور۔" دروازے کی طرف سے آواز آئی۔ "غلام باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔"

"اجازت ہے۔" ہادی نے کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ سور' خلیفہ کے محافظ دستے کا نگراں تھا۔

اجازت ملنے پر وہ خواب گاہ میں داخل ہوا' پھر ہادی کی سوالیہ نظروں کے جواب میں بتانے لگا۔ "غلام سب کچھ معلوم کر کے آیا ہے کہ شور اور اچانک ہنگامے کی وجہ کیا ہے۔" اس کے بعد سور نے وہی سب بیان کر دیا جو میں پہلے ہی معلوم کر چکی تھی۔

"کیا تم نے ہمارے برادر خرد ہارون کو بھی وہاں دیکھا؟" ہادی نے سوال کیا۔

"جی نہیں اے امیر المومنین! جس جگہ اس غلام کو قتل کیا گیا وہاں سے حضور کے برادر خرد کی اقامت گاہ کچھ فاصلے پر تھی۔ ممکن ہے کہ انہوں نے اپنے کسی محافظ سے حقیقت معلوم کرائی ہو اور خود وہاں آنا بہتر نہ سمجھا ہو۔" سور نے جواب دیا۔

"تا حکم ثانی ہم کسی سے نہیں ملیں گے۔" ہادی نے کہا "اب تم جا سکتے ہو۔"

سور ادب سے جھکا اور الٹے قدموں خلیفہ کی خواب گاہ سے نکل گیا۔ شمع دان کی لو دھیمی نہیں تھی۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت تھا کہ ہادی نصف شب گزر جانے کے باوجود ابھی تک سویا نہیں تھا۔ سور کے جاتے ہی وہ پھر ٹہلنے لگا تو میں نے اس کے ذہن پر توجہ دی۔ ہادی سوچ رہا تھا کہ یہ بہت برا ہوا۔ مجھے ابراہیم حرانی کا مشورہ قبول نہیں کرنا چاہئے تھا۔ سب کو بھی

پر شک ہوگا کہ میں نے ہارون پر قاتلانہ حملہ کرایا ہے سب جانتے ہیں کہ اسحاق میرا ہی غلام تھا۔

میں نے ہادی کے ذہن کو مزید ٹٹولا تو تفصیل معلوم ہوئی۔ واقعہ یہ تھا کہ گزشتہ روز خلوت میں ہادی کے وزیر اور بچپن کے دوست ابراہیم حرانی نے اسے ہارون کو قتل کرا دینے کا مشورہ دیا تھا۔ تھوڑے سے قیل و قال کے بعد ہادی نے یہ ذمے داری ابراہیم حرانی ہی پر ڈال دی تھی۔ اس کے ساتھ ہادی نے اسے تاکید کی تھی کہ اس معاملے میں اس کا نام نہیں آنا چاہیے۔ اس پر ابراہیم حرانی نے یقین دہانی کرائی تھی' ہارون کو اس طرح قتل کرایا جائے گا کہ کسی کو حقیقت کا علم نہیں ہوگا۔ اس کی خاطر ابراہیم حرانی نے ہادی سے اس کے ایک غلام اسحاق کو اپنی غلامی میں لینے کے لئے درخواست کی۔ ایک غلام کی اوقات ہی کیا! ہادی فوراً راضی ہوگیا۔ یہ گفتگو یوں کہ کسی کے سامنے نہیں ہوئی اور نہ ہادی نے اسحاق کو اپنی غلامی سے آزاد کرنے کا اعلان کیا اس بنا پر اسی کو مورد الزام ٹھہرایا جانا فطری امر تھا۔ ہادی کو یہی تشویش تھی۔ ہارون پر قاتلانہ حملہ کرانے کا الزام ہادی کے اقتدار کو دھچکا پہنچا سکتا تھا۔

ہادی سے دوسری غلطی یہ ہوئی تھی کہ اس نے ہارون کو خلوت میں طلب کر کے اپنے بیٹے کی بیعت پر مجبور کیا تھا۔

اسحاق قصر خلافت ہی میں رہتا تھا' سو اسے ابراہیم حرانی کے حکم کی تعمیل میں دشواری نہ ہوئی۔ اسے ہارون کے قتل کا حکم اس کے نئے آقا ابراہیم حرانی نے دیا تھا۔ ہادی کو اسحاق کے مارے جانے کا بھی افسوس تھا اگر وہ زندہ بچ جاتا تو سارا الزام اس کے وزیر پر آتا۔ زندہ گرفتار ہونے اور تفتیش کی صورت میں اسحاق' ابراہیم حرانی ہی کا نام لیتا۔ یوں گویا ہادی اپنے چھوٹے بھائی ہارون پر قاتلانہ حملہ کرانے کے الزام سے بچ جاتا۔ امرا اور اراکین سلطنت میں اب تک ہارون کی حمایت کرنے والے موجود تھے۔ ہادی کو یہ اندیشہ تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ لوگ اس کے خلاف محاذ بنا سکتے تھے۔

اب یہ واضح ہو چکا تھا کہ ہارون کو راستے سے ہٹانے میں ہادی کی مرضی شامل تھی۔

میں اسی سبب وہاں مزید نہیں رکی۔ عارج بھی وہاں سے نکل آیا اور کہنے لگا "میں ٹھیک ہی کہہ رہا تھا نا اے دینار! ہارون پر قاتلانہ حملہ براہ راست ہادی کے حکم پر نہ سہی مگر اس میں ہادی نے اعانت تو کی! اپنا ایک غلام تو اس کے لئے وزیر ابراہیم حرانی کو دیا!"

"اے عارج! تو مجھ سے اس طرح یہ بات کر رہا ہے جیسے میں ہادی کو بے گناہ سمجھ

رہی ہوں۔" میں دھیرے سے ہنس دی۔

اس رات تو عارج اور میں اپنے اپنے انسانی قالبوں میں اتر کر سو گئے لیکن میری تشویش دوسرے دن صبح بھی برقرار تھی۔ اب میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ حکمراں خاندان کے اہم افراد پر پیش آنے والے غیر متوقع واقعے کا کیا ردعمل ہوا ہے۔ میرے نزدیک بغداد کے قصر خلافت میں تین اہم شخصیات تھیں' خلیفہ ہادی' اس کا چھوٹا بھائی ہارون اور ملکہ خیزران!

☆......☆......☆

میں یہ بھی نہیں بھولی تھی کہ ہادی کو گزشتہ رات یحییٰ بن خالد برمکی کی رہائی کے لئے ترغیب دی تھی مجھے امید تھی کہ موجودہ حالات میں خلیفہ ہادی میری ترغیب سے فائدہ اٹھائے گا۔ یحییٰ بن خالد برمکی کی رہائی سے یہ تاثر ابھرتا کہ ہادی اپنے بھائی ہارون کے خلاف نہیں ورنہ وہ اس کے اتالیق اور مدار المہام کو ہرگز رہا نہ کرتا۔ میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔

وہ صبح ہی کا وقت تھا کہ میں نے محافظ دستے کے نگران سور کے ہمراہ یحییٰ بن خالد کو دیکھا۔ وہ دونوں قصر خلافت کے مرکزی حصے کی طرف جا رہے تھے۔ خلیفہ ہادی سے خلوت میں ہونے والی یحییٰ کی یہ ملاقات میری سماعت و بصارت دونوں ہی سے پوشیدہ نہ رہ سکی ظاہر ہے اس کے لئے مجھے اپنی پر اسرار قوتوں کو حرکت میں لانا پڑا تھا۔ میں تیز قدمی سے اپنی قیام گاہ کی طرف لوٹی۔ عارج وہاں نہیں تھا۔ اندر والے دالان میں اپنے بستر پر دراز ہو کر میں نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ سب کچھ دیکھنے لگی جو دوسروں کے لئے ممکن نہیں تھا۔ میں چاہتی تو جیلے کے پیکر سے نکل کر بھی خلیفہ کی خلوت میں پہنچ سکتی تھی لیکن اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اپنے تصور کی قوت سے میں نے خلیفہ ہادی کو اس کی نشست گاہ میں مسند پر بیٹھے دیکھا۔ اس کے سامنے مسند ہی کے قریب یحییٰ دوزانو بیٹھا تھا۔ ان دونوں کے سوا وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ محافظ دستے کا نگران سور غالباً یحییٰ کو چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔

ہادی نے یحییٰ کو مخاطب کیا۔ ”کیا تم کوئی اندازہ لگا سکتے ہو اے یحییٰ کہ ہم نے تمہیں خلوت میں طلب کر کے یہ عزت کیوں بخشی ہے؟“

”اے امیر المومنین! غلام کوئی قیاس کرنے سے قاصر ہے۔ خلوت میں طلبی کی عزت بخشنے پر یہ غلام تہ دل سے حضور کا ممنون ہے۔“ یحییٰ بولا

”جو تم نہیں جانتے، وہ ہم تمہیں بتاتے ہیں یحییٰ!“ ہادی نے پہلو بدلا۔ ”اس روز

دربار عام میں تم نے جو باتیں کیں اور جس حوصلے کا ثبوت دیا، اکثر ہمیں یاد آتا رہا۔ تم جیسے لوگ کم ہوتے ہیں جو اپنی موت کو خاطر میں نہ لائیں اور جو ان کے دل میں ہو، بلا جھجک کہہ دیں۔ پھر بھی تمہاری کئی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آئیں، ہم ان کی وضاحت چاہتے ہیں۔“

”ارشاد ہو اے امیر المومنین!“ یحییٰ ادب سے بولا۔ ”غلام ہمہ تن گوش ہے۔“

”یہ بتاؤ کہ آخر خلیفہ زادے جعفر کو ولی عہد بنانے میں کیا قباحت ہے؟“ ہادی نے دریافت کیا۔ اس وقت ہادی کی آواز میں زیادہ رعونت نہیں تھی پھر بھی اس وقت گردن اکڑی ہوئی تھی۔ رعونت میں کمی کا سبب گزشتہ رات پیش آنے والا واقعہ ہی ہو سکتا تھا، دوم میری یہ ترغیب کہ یحییٰ کو رہا کر دیا جائے، اس جیسے راست گو کو زنداں میں ڈلوا کر ہادی نے اچھا نہیں کیا۔

اس وقت یحییٰ میرے اثر میں نہیں تھا اس لیے اس نے قدرے محتاط لہجے میں ہادی کے سوال کا جواب دیا۔ ”خلیفہ زادے کو ولی عہد بنانے میں بھلا اس غلام کو کیا اعتراض کی جسارت ہو سکتی ہے لیکن اس طرح......“ وہ جھجکنے لگا۔ بہ امر مجبوری مجھے مداخلت کرنی ہی پڑی کہ کہیں بات بگڑ نہ جائے۔ دوسرے ہی لمحے یحییٰ بڑی روانی سے بولنے لگا۔ اسے میں اپنے اثر میں لے چکی تھی۔ ”لیکن اس طرح اے امیر المومنین! کیا آپ کو گمان ہے کہ امراء و اراکین سلطنت خلیفہ زادے کو خلافت سپرد کر دیں گے حالانکہ ابھی وہ بالغ نہیں ہوئے۔ غلام یہ سمجھتا ہے کہ صلوٰۃ، حج اور غزوات میں امرائے حکومت ان کی امامت سے راضی نہ ہوں گے۔“

”مگر اے یحییٰ ابھی تو ان سب امور کی انجام دہی کی خاطر ہم زندہ ہیں۔“ ہادی نے بحث کی۔

”خاکم بدہن اے امیر المومنین! آپ کا سایہ عاطفت ہم پر نہ رہا اور خلیفہ زادے جعفر کو تخت نشین ہونا پڑا تو یقیناً خود حضور کے خاندان والے نچلے نہیں بیٹھیں گے۔ ایسی صورت میں کیا وہ خلیفہ زادے کو حکومت کرنے دیں گے؟“ یحییٰ نے کہا۔

”صاف صاف کہو کہ وہ کیا کریں گے؟ کیا انہیں ہمارے فیصلے سے روگردانی کی ہمت ہو گی؟“ ہادی نے پوچھا۔

”گستاخی معاف اے امیر المومنین!“ یحییٰ سنبھل کر بولا۔ ”جب حضور کی زندگی میں اس فیصلے کو قبول کرنے میں دشواریاں پیش آ رہی ہیں تو بعد کی کسے خبر!...... غلام کے نزدیک اس وقت حضور کے مخالفین خلیفہ زادے کو چین نہ لینے دیں گے۔“

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن ان دشواریوں پر قابو پانا مشکل نہیں ہے اگر ہمارے برادر خرد ہارون نے جعفر کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو پھر کسی کی مجال نہیں کہ مخالفت میں آواز بلند کر سکے۔" ہادی کی گردن کا تناؤ برقرار تھا۔

"امیر المومنین نے بجا فرمایا مگر یہی تو ممکن نہیں۔" یحییٰ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "حضور اگر اسے اپنے برادر خورد کی حمایت خیال نہ فرمائیں تو غلام کے نزدیک وہی بہتر ہے جو آپ کے پدر بزرگوار نے کیا۔ اگر خلیفہ مرحوم آپ کے برادر ہارون کو اپنا ولی عہد نہ بنا جاتے تو بہ لحاظ معاملات سلطنت و سیاست اور ضرورت وقت کسی ممکنہ خطرے سے بچنے کی خاطر آپ خود اپنے بھائی کو مقرر فرماتے۔ غلام آرزومند ہے کہ آپ کے پدر بزرگوار کی اولاد ہی عہدہ خلافت پر فائز رہے۔ مصلحت وقت یہی ہے اے امیر المومنین کہ آپ اپنے بھائی ہی کو ولی عہد بنائے رکھیے۔ حضور کا یہ غلام اقرار کرتا ہے کہ جب خلیفہ زادے جعفر جوان ہو جائیں گے تو ہارون کو اس پر آمادہ کر لوں گا کہ وہ خلافت سے دست کش ہو کے جعفر کی بیعت قبول کر لیں۔"

اس وقت حالات کا جبر یہ تھا کہ ہادی اپنے اوپر آنے والے الزام کے داغ کے دھونے کی غرض سے ہارون کے دست راست یحییٰ بن خالد کو رہا کر دے۔ سو وہ یحییٰ کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ "اے یحییٰ! ہم پہلے بھی تمہاری راست گوئی کے قائل تھے جس میں تم نے آج مزید اضافہ کر دیا۔ اس کے صلے میں ہم تمہیں آزادی عطا کرتے ہیں، مگر اس شرط پر کہ تم ہماری طرف سے ہارون کو مطمئن کر دو۔"

"غلام پوری طرح کوشش کرے گا اے امیر المومنین کہ حکم کی تعمیل کر سکے۔ اپنی رہائی پر یہ غلام حضور کا شکر گزار ہے۔" یحییٰ اپنی رہائی کا مژدہ سن کر خوش نظر آنے لگا۔ اس نے یہ وعدہ بھی ہادی سے کیا کہ آزادی سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھائے گا اور ہادی کا وفادار رہے گا۔ میں نے یحییٰ کی زبانی یہ باتیں سن کر آنکھیں کھول دیں کہ اب مزید کچھ سننا اور دیکھنا ضروری نہیں تھا۔

ہادی کے دل میں چور تھا اس لئے وہ منافقت بھی نہ کر سکا ورنہ اتنے بڑے واقعے کے بعد ہارون سے ضرور ملتا۔ اس کے برعکس ہادی نے یحییٰ کی رہائی کو بڑی شہرت دی۔ وہ عموماً دربار میں یہی کہتا سنائی دیتا۔ "راست گو لوگوں کی ہم بڑی قدر کرتے ہیں۔" مثال کے طور پر وہ یحییٰ کا نام لیتا۔ ہادی کے حاضر باشوں پر اس کا الٹا اثر ہوا۔ وہ یحییٰ سے حسد رکھنے

لگے۔ انہیں کسی ایسے موقع کی تلاش تھی کہ یحییٰ کو ایک بار پھر پابہ زنجیر کر سکیں۔ انہیں اس کا علم نہیں تھا کہ اندر ہی اندر ہادی کے خلاف کیا نیا طوفان کروٹیں لے رہا ہے!

ہارون پر ناکام قاتلانہ حملے کے بعد اس کی ماں ملکہ خیزران کچھ زیادہ ہی فعال و سرگرم ہوگئی۔ تمام ہی امرائے سلطنت اس کی عزت کرتے تھے۔ ملکہ نے پردے میں رہ کر ان سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ اراکین سلطنت نے امراء کی روش کو دیکھا تو وہ بھی ملکہ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان سبھی کو رفتہ رفتہ ملکہ خیزراں اپنے چھوٹے بیٹے ہارون کے حق میں استوار کر رہی تھی۔ دبی دبی زبان میں اب یہ لوگ کہنے لگے تھے کہ ہارون کو ہادی نے ہی قتل کرانا چاہا تھا۔ اس وجہ سے بھی ان کی ہمدردیاں ہارون کے ساتھ تھیں۔ ان کے علاوہ افواج میں بڑے عہدوں پر متمکن افراد ملکہ خیزران سے ملنے آتے۔ ایسے موقع پر اکثر ہارون بھی اپنی ماں کے ساتھ ہوتا۔ ہارون یہ محسوس کرتا تھا کہ بغداد میں اب زیادہ عرصے رہنا اس کے لئے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ میں کئی بار اس کے اور ملکہ خیزران کے ذہنوں کا مطالعہ کر چکی تھی۔ ان دونوں ہی کو پختہ یقین تھا کہ قاتلانہ حملے میں ہادی ہی کا ہاتھ تھا۔

میں حالات پر پوری نظر رکھے ہوئے تھی اور اس معاملے میں عارج بھی میری مدد کر رہا تھا۔ پھر بھی آدم زادوں کے اس جھگڑے سے اسے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ ایک روز عارج ہی نے مجھے بتایا۔ "اے دینار! تیرے ایما پر کل رات میں نے ہارون اور ملکہ کے درمیان خلوت میں ہونے والی بات سنی۔ میں ایوب کے انسانی پیکر کو وہیں گہری نیند سلا گیا تھا۔ پتا ہے تجھے وہ آدم زادی ملکہ کیا کہہ رہی تھی!"

"تو بتائے گا تو معلوم ہوگا نا!" میں بولی

"ملکہ اپنے بیٹے ہارون سے کہہ رہی تھی کہ بہت جلدی ہادی کا تختہ الٹ دے گی۔" عارج نے کہا۔ "اس کے ساتھ ملکہ نے کیا کوئی تدبیر نہیں بتائی کہ ایسا کیوں کر ممکن ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"ملکہ کا کہنا یہ ہے کہ اب امراء اراکین سلطنت اور سرداران فوج کی اکثریت اس کے ساتھ ہے۔" عارج نے جواب دیا۔

"تجھے احساس نہیں اے عارج یہ بڑی خطرناک بات ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو اس میں کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔ معلوم نہیں تو کیوں ان چکروں میں پڑ گئی ہے!...... اور بتاؤں جس دن سے تو نے ان آدم زادوں کے معاملات میں زیادہ دخل اندازی

شروع کی ہے' مجھے تو جیسے بھول ہی گئی ہے۔ بتا!...... تو ہی بتا اے دینار کہ ہم نے کتنے دن صحراؤں کا رخ نہیں کیا؟...... چاندنی راتوں میں صحراؤں کی سیر کو کیا اب تیرا دل نہیں چاہتا؟" عارج جذباتی ہو گیا۔

یہ رات کا وقت تھا اور ہم قصر کے کاموں سے فارغ ہو کر آرام کرنے اور پھر سونے کے لئے اپنے اپنے بستروں پر دراز ہوئے تھے۔ "تو نے یہ کیا فضول باتیں شروع کر دیں اے عارج!" میں نے آنکھیں نکالیں۔ "کیا تو بھول گیا ہم آدم زادوں کے درمیان کیوں رہتے آئے ہیں!...... کیا تجھے پھر یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ ہمارا مقصد اللہ کے بندوں کی خدمت ہے۔"

"اللہ کا بندہ تو میں بھی ہوں اے دینار!" عارج مظلوم سی آواز میں کہنے لگا۔ اس نے کچھ ایسے انداز میں بات کی کہ مجھے ہنسی آ گئی اور بولی۔ "تو مجھ سے اپنی خدمت کرائے گا تو؟"

"میں نے ایک عالم جن کی زبانی سنا ہے کہ وہ ساری بیویاں' خواہ وہ آدم زادی ہو یا جن زادی سیدھی جنت میں جائیں گی جو اپنے شوہروں کی خدمت گزاری کرتی ہیں۔ ایک اور عالم سے تو میں نے یہ بھی سنا تھا کہ شوہروں کی اجازت کے بغیر بیویاں جنت ہی میں داخل نہیں ہوں گی۔ سو اگر تجھے جنت میں جانا اور ثواب کمانا ہے تو ابھی سے میری خدمت کرنے لگ جا!...... کبھی نہ کبھی تو آخر مجھے تیرا شوہر بننا ہی ہے!...... آج نہ سہی تو کل سہی!" عارج پٹڑی سے اتر گیا۔

"سن! نہ میں تیری بیوی ہوں' نہ تو میرا شوہر! سو بہتر یہ ہے کہ کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "جو بات ہو رہی تھی' اسے سمجھنے کی کوشش کر!...... تجھے یاد ہے جب خلیفہ مہدی کا انتقال ہوا تھا تو پورے عراق میں عموماً اور بغداد میں خصوصاً حالات کتنے خراب ہو گئے تھے۔ اس وقت جب ہم ماسندان سے بغداد لوٹے تھے تو شہر کی کیا حالت تھی؟ یاد ہے تجھے! اگر اس وقت ہارون قربانی نہ دیتا تو مسلمان افواج دو حصوں میں تقسیم ہو جاتیں۔ پھر خلق خدا کا کس قدر خون بہتا تجھے اندازہ ہے!"

"لیکن ان دنوں تو بغداد میں امن ہے۔" عارج بھی سنجیدہ ہو گیا۔ "بہ ظاہر ایسے آثار بھی نظر نہیں آتے کہ خلق خدا کے خون بہنے کا اندیشہ ہو۔ خدا جانے تو کہاں سے خون کی بو سونگھ لیتی ہے!"

"حالات ایک بار پھر اسی سمت میں جا رہے ہیں۔ امراء ارا کین سلطنت اور سرداران فوج کے درمیان تفریق کا مطلب یہی ہے۔ یہی ہوگا نہ کہ کچھ ہارون اور کچھ ہادی کے ساتھ ہو جائیں گے۔ نتیجہ کیا نکلے گا سوچا!...... خون...... خلق خدا کا خون!"

"میں نے تو نہیں سوچا کچھ بھی!" عارج بولا۔ "مجھے واقعی اس خطرے کا اندازہ نہیں تھا۔ تو کہہ کہ یہ خطرہ کیسے ٹالا جائے؟"

"سوچنا پڑے گا کچھ نہ کچھ!...... کوئی تدبیر نکالنی ہوگی کہ مسلمان افواج دو حصوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نہ ہو جائیں۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم نے ایک بار پھر ایسا ہونے سے روک دیا تو اس سے بڑی خدمت خلق کوئی اور نہیں ہوگی۔"

عارج اور میں دیر تک اس رات اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ پھر میں نے عارج کا "شکوہ" دور کرنے کی تجویز رکھی تو وہ خوش ہو گیا۔ بہت دن ہو گئے تھے ہم قصر خلافت سے نہیں نکلے تھے۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے انسانی قالبوں کو گہری نیند سلا دیا اور قصر خلافت سے نکلتے ہی فضا میں پرواز کرنے لگے۔ رات کے وقت بھی بغداد اوپر سے بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ اس کے گلی کوچوں میں چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ کھلی فضا اور کسی انسانی قالب میں پابند نہ رہنے کا لطف ہی اور ہے۔ ہم جنات ہی اس احساس کو بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں' کوئی آدم زاد شاید اس شادمانی کو محسوس کر نہ سکے۔

"بول اے عارج! کدھر چلتا ہے؟ نجف' فلوجہ' کربلا' بصرہ' موصل بتا کس طرف چلیں؟" میں نے عارج سے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں۔" عارج نے جواب دیا۔ "آبادی میں نہیں صحرا میں چل!"

"جیسی تیری مرضی!" میں بولی۔ "ویسے بابل کے کھنڈرات میں گئے بھی ایک مدت ہو گئی۔"

"تو یوں کہہ کر تجھے اپنا میکہ یاد آ رہا ہے۔" عارج نے مجھے چھیڑا۔

"بغداد اگر میرا سسرال ہوتا تو بابل کو میکہ کہنا درست بھی ہوتا۔ تو بھی تو وہیں کا ہے۔"

"چل تو نے اس بہانے مجھ سے رشتہ تو تسلیم کر لیا جس کی حسرت نہ جانے کب پوری ہوگی!"

ایک دوسرے پر فقرے بازی کرتے ہوئے ہم بغداد کی آبادی سے دور نکل آئے۔ صحرا کا حسن ہمیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ ایسا نہیں کہ میرا وجود عشق سے خالی تھا اور صرف عارج کو میرے ساتھ چاندنی راتوں میں گھومنا اچھا لگتا تھا۔ بات صرف اتنی ہے کہ صنف مخالف میں برداشت کم ہوتی ہے۔ سو یہی معاملہ عارج کا تھا۔ اسے بس ذرا موقع ملنے کی دیر ہوتی کہ جذباتی مکالمے بولنے لگتا۔ کبھی کبھی میرا بھی جی چاہتا کہ اس سے اپنے جذبات کا اظہار کروں مگر رک جاتی۔ میں سوچتی کہ اظہار جذبات کا ذریعہ صرف الفاظ ہی تو نہیں۔ عشق کو تو یوں بھی محسوس کیا جاتا ہے' میرے نزدیک اس کا اظہار ضروری نہیں۔ اس رات ہم عرصہ دراز کے بعد صحرا میں اترے تو واپس جانے کو جی ہی نہ چاہا۔ پھر میں نے ہی عارج کو ٹوکا۔ ''اے عارج! تو اپنے وجود میں کتنی چاندنی سمیٹے گا!.....رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو رہی ہے واپس چل!''

مجبوراً عارج کو اٹھنا پڑا۔ ہم چند ہی لمحوں میں بغداد کے قصر خلافت پہنچ گئے۔ جمیلہ اور ایوب ابھی تک گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ میں تو جمیلہ کے جسم میں داخل ہو گئی اور عارج ایوب کے جسم میں اتر گیا۔ انسانی قالب میں داخل ہوتے ہی مجھ پر نیند کا غلبہ ہو گیا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح دروازے پر زوردار دستکیں سنائی دیں تو میری آنکھ کھل گئی۔ اٹھ کر میں بیرونی دالان اور صحن عبور کر کے دروازے تک پہنچی۔ اس مرتبہ دستک کے ساتھ مجھے آواز بھی دی گئی۔ وہ نسوانی آواز میرے لیے آشنا تھی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے خلیفہ ہادی کی ایک کنیز ہاجرہ کھڑی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ کہنے لگی۔ ''اے جمیلہ! تمہیں اور تمہارے شوہر ایوب کو کیا ہو گیا ہے؟ حیرت ہے کہ تم دونوں اتنی گہری نیند سوتے ہو کہ زور زور سے دروازے پر دستکیں دینے کے باوجود نہیں جاگے!''

''خیریت تو ہے ہاجرہ؟'' میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کچھ گھبرائی ہوئی سی لگتی ہو!''

''ہاں جمیلہ! گھبرانے کی بات تو ہے۔'' ادھیڑ عمر کنیز ہاجرہ بولی۔ ''اب تک صفیہ کی حالت ٹھیک نہیں۔ رات سے اسے جو دورہ پڑا ہے تو اب تک بال بکھرائے جھومے ہی چلی جا رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر پھر اس جن کا اثر ہو گیا ہے جسے پہلے بھائی ایوب نے کوئی عمل پڑھ کر بھگا دیا تھا اگر بھائی ایوب ابھی تک سو رہے ہیں تو انہیں جگا دو۔ انہوں نے ہی پہلے مجھے تاکید کی تھی کہ اب کبھی ایسا دورہ پڑے تو فوراً مجھے آ کر بتانا۔ میں اسی لیے تو رات کو

بھاگی بھاگی آئی تھی۔ تمہیں تو خبر ہے' طبیب کہتے ہیں کہ صفیہ کو کوئی بیماری نہیں۔''

کنیز ہاجرہ کی بات سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ ایک جن زادی سے اپنی بیٹی پر جن کا اثر ختم کرانے آئی تھی۔

''تم چلو' میں ابھی انہیں جگا کر اپنے ساتھ لاتی ہوں' فکر نہ کرو!'' میں نے ہاجرہ کو تسلی دی۔

''جلدی آنا جمیلہ!'' وہ واپس جاتے جاتے روہانسی آواز میں کہنے لگی۔ ''کہیں میری بچی کو کچھ ہو نہ جائے!''

☆.....☆.....☆

میرے وہم گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ جس آدم زاد ایوب کے جسم میں عارج نے پناہ لے رکھی ہے' اسے جن اتارنے کا بھی شوق ہو گا۔ میں اندرونی دالان کی طرف جاتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ اگر واقعی صفیہ کے جسم میں کوئی شریر جن گھس گیا ہے تو کیا ہو گا؟ تیز تیز قدم اٹھاتی میں اندرونی دالان میں پہنچی تو عارج انگڑائی لے کر بستر سے اٹھنے لگا۔

''کون تھا جس نے آ کر دروازہ پیٹ ڈالا؟'' عارج کی آواز سے بیزاری جھلک رہی تھی۔

''تو سے گا تو اپنا سر پیٹنے لگے گا' وہ غریب تو دروازہ ہی پیٹ رہی تھی۔'' میں بولی۔

عارج کے استفسار پر جب میں نے اسے صورتحال سے آگاہ کیا تو وہ بھی چکرا کے رہ گیا' کہنے لگا۔ ''یہ تو غضب ہو گیا اے دینار! ہمارے علاوہ بھی کوئی کم بخت جن زاد یہاں قصر خلافت میں آ گھسا!''

''ابھی کیا خبر وہ کوئی جن ہے بھی یا نہیں! بہت سی دماغی بیماریاں بھی تو ہوتی ہیں جنہیں آدم زاد ہمارے سر تھوپ دیتے ہیں۔''

''نہیں۔'' عارج نے انکار میں سر ہلایا اگر اس لڑکی کو کوئی بیماری ہوتی تو طبیب کیوں کہتے کہ اسے کوئی مرض نہیں۔''

''تیری دلیل بجا سہی مگر کیا کیا جائے؟ جانا تو پڑے گا' اس کنیز کی بیٹی کو دیکھنے۔'' میں نے عارج کو سمجھایا۔ اسی وقت اچانک میرے ذہن میں ایک تدبیر آ گئی اور میں نے عارج سے کہا۔ ''صفیہ پر پہلے جن آیا تھا تو کسی عمل کے ذریعے ایوب ہی نے بھگایا تھا۔ اب بھی ایوب ہی ایسا کرے گا۔ تو اس کے جسم سے باہر آ جا! میں اسے اپنے اثر میں لے کر

ساری بات اس کو بتا دیتی ہوں۔ یہ خود وہاں جائے گا اور ہم دور سے تماشا دیکھیں گے۔ کوئی خطرہ ہوا تو وہاں سے ہٹ جائیں گے۔ میں بھی جیلہ کا جسم چھوڑ کر باہر آ جاتی ہوں۔ ان دونوں میاں بیوی کو اس مسئلے سے نمٹنے دیتے ہیں۔ جیلہ کے دماغ میں بھی میں وہ باتیں ڈالے دیتی ہوں جو ابھی ہاجرہ سے ہوئی ہیں۔"

میری بات سن کر عارج کھل اٹھا' بولا۔ "اے دینارا! تیرا کوئی جواب نہیں۔"

پھر ہم دونوں ہی انسانی قالبوں سے باہر آ گئے۔ میں نے اسی پر عمل کیا جو عارج سے کہا تھا۔ جیلہ اور ایوب فوراً ہی کنیز ہاجرہ کی بیٹی کو دیکھنے روانہ ہو گئے۔ عارج اور میں ان سے کچھ فاصلے پر تھے۔ ہم چاہتے تو ان دونوں سے پہلے ہاجرہ کے یہاں پہنچ جاتے مگر دانستہ ایسا نہیں کیا۔ بھلا ہم کیوں کوئی خطرہ مول لیتے! میں نے اس عرصے میں ایوب کے ذہن پر توجہ دی۔ پتہ چلا کہ اسے واقعی کچھ ایسے عمل آتے ہیں جنہیں پڑھنے سے جنات بھاگ جاتے ہیں۔ یہ بڑی عجیب اور دلچسپ صورتحال تھی کہ خود اس کے جسم پر ایک جن قابض تھا اور اسے خبر تک نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عارج نے شریر جنات جیسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔

درحقیقت جنات ہی کی قسموں میں سے ایک قسم اولاد ابلیس کی ہے۔ یہ جنات چوں کہ روز اول سے آدم زادوں کے دشمن ہیں اس لیے انہیں دانستہ ایذا پہنچاتے ہیں۔ یہ کسی آدم زاد یا آدم زادی کی تخصیص تو نہیں کرتے البتہ عموماً یہ آدم زادیوں ہی کو اپنا شکار بناتے ہیں۔ اولاد ابلیس میں جن زاد اور جن زادیاں دونوں ہیں۔ زیادہ فتنہ پرور ابلیسی جن زاد ہوتے ہیں۔ جنات کی جس قسم سے میرا اور عارج کا تعلق ہے' میں پہلے بھی غالباً بتا چکی ہوں۔ ہم مروہ کہلاتے ہیں۔ جو ہم میں سے ایمان والے ہیں' انہیں یہ ابلیسی جنات نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ان کی قوت و طاقت ہم سے زیادہ اس لیے نہیں ہوتی کہ کلام الٰہی کے آگے یہ دم نہیں مارتے اور فوراً فرار کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ البتہ موقع پا کر آدم زادوں کے لئے ضرور مصیبت بن جاتے ہیں۔

اگر ہاجرہ کی بیٹی صفیہ کسی ذہنی بیماری کا شکار ہوتی تو ایوب کے کسی عمل سے صحت یاب نہ ہو جاتی۔ میں نے اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ صفیہ کے جسم میں کوئی شریر ابلیسی جن زاد گھس گیا ہے جو اسے ستا رہا ہے۔ واقعی ایسا ہی تھا تو پھر مجھے اور عارج کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے برعکس وہ کوئی عفریت تھا تو یقیناً ہمیں نقصان پہنچا سکتا تھا۔ عفریت بڑی مشکل سے آدم زادوں کے قبضے میں آتے ہیں۔ وہ عموماً ڈر کر نہیں بھاگتے۔ اس سے میں

نے قیاس کیا وہ کوئی عفریت نہیں ہوگا ورنہ ایوب اسے نہ بھگا سکتا۔

جمیلہ اور ایوب کے پیچھے ہم ہاجرہ کے یہاں پہنچے تو دور سے پہلے دالان میں فرش پر بچھی ایک دری پر ایک نوجوان آدم زادی کو جھومتے دیکھا۔ اس کی عمر سولہ سترہ سال معلوم ہوتی تھی۔ اس کا رنگ گورا' زلفیں دراز اور قد لمبا تھا۔ بلاشبہ وہ خوبصورت تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت سی رقص کر رہی تھی۔

ایوب اس کے قریب گیا تو وہ چیخ اٹھی۔ "ہٹ جا میرے پاس سے! ورنہ میں تجھے اٹھا کر پٹخ دوں گا!" یقیناً یہ آواز غیر انسانی ہی تھی۔ میں نے دالان کے اندر ہلکی سی بدبو بھی محسوس کر لی۔

اسی وقت حاجرہ' جمیلہ کو بتانے لگی۔ "یہ آواز صفیہ کی نہیں اسی جن کی ہے۔" کنیز کی آواز میں خوف تھا۔

"ذرا ایک پیالے میں پانی لا دیں۔" ایوب نے ہاجرہ کو مخاطب کیا۔

ہاجرہ نے لپک کر دالان میں موجود ایک صراحی سے پیالے میں پانی انڈیلا اور ایوب کے ہاتھ میں پیالہ دے دیا۔ ایوب نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھ کر پانی پر دم کیا اور اسی پانی کے چھینٹے صفیہ کے چہرے اور سر پر مارنے لگا۔ اس پر صفیہ پہلے جیسی غیر انسانی آواز میں چیخنے چلانے لگی۔

"تو مجھے نہیں جلا سکتا!" صفیہ چیخ رہی تھی۔ "میں پھر آؤں گا...... پھر آؤں گا۔ تو مجھے یہاں آنے سے نہیں روک سکتا!" ان الفاظ کے ساتھ ہی صفیہ کے جسم کو شدید جھٹکا لگا اور عین اسی لمحے میں چونک اٹھی۔

میں نے اندھیرے کی چادر اوڑھ لی اور عارج سے بھی ایسا ہی کرنے کو کہا۔ بھاگتے بھاگتے وہ ابلیسی جن زاد ہمیں وہاں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی نظر ہم پر پڑ جاتی تو اچھا نہ ہوتا۔ ہم جنات' آدم زادوں کو تو نظر نہیں آتے مگر ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں۔ دوسرے جنات کی نظر میں نہ آنے کی بس یہی صورت ہے جس پر میں نے عمل کیا۔ کسی انسانی قالب میں موجود جن زاد بھی دوسرے جنات کو دیکھنے کا اہل ہوتا ہے۔ پہلے یہ بات میرے دھیان میں نہیں آئی تھی ورنہ احتیاط سے کام لیتی۔ اس کے باوجود اطمینان تھا کہ صفیہ کے جسم میں موجود جن زاد نے ہمیں نہیں دیکھا ہوگا۔ اس وقت جب جنات انسانی پیکروں میں ہوتے ہیں تو وہ آدم زادوں ہی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ عارج اور میں' صفیہ سے دور ہی دور رہے' دوم ہم

نے اسے دیکھا' اس کی نگاہ ہماری جانب نہیں اٹھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جنات بلاوجہ بھی ایک دوسرے کی چغلی کھاتے ہیں۔ اولاد ابلیس میں تو یہ عیب عام ہے اگر وہ جن زاد ہمیں دیکھ لیتا تو جانے کہاں کہاں یہ کہتا پھرتا کہ بغداد کے قصر خلافت میں جنات کا ایک جوڑا رہتا ہے۔ اسی سے بچنے کے لئے میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ وہ جن زاد ہمیں نہ دیکھ لے۔ اس ابلیسی جن زاد کے وہاں سے جاتے ہی وہ بدبو ختم ہوگئی جو مجھے محسوس ہو رہی تھی۔

صفیہ کے جسم سے اس ملعون جن زاد نے نکلتے ہوئے اسے اذیت پہنچانے کی خاطر دانستہ شدید جھٹکا دیا تھا۔ اسی جھٹکے سے صفیہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ ہاجرہ ''میری بچی'' کہہ کر آگے بڑھی اور ایوب کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''بھائی ایوب! پہلے بھی تو ایسا ہی ہوا تھا اور آپ نے....''

''ہاں بہن! مجھے یاد ہے۔'' ایوب بول اٹھا' پھر صفیہ کے چھوٹے بھائی کو مخاطب کیا۔ ''لو میاں' یہ پیالہ اور اس میں پانی بھر لاؤ!'' صفیہ کا چھوٹا بھائی پیالہ لے کر صراحی کی طرف بڑھ گیا۔ ہاجرہ بیوہ تھی اور اس کے دو ہی بچے تھے۔

پیالہ پھر پانی سے بھر کر ایوب کو تھما دیا گیا تو اس نے کچھ پڑھا اور پانی پر دم کیا۔ ''لو ہاجرہ!'' ایوب نے پیالہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس پانی کے چھینٹے صفیہ کے چہرے پر مارو' اسے انشاء اللہ ابھی ہوش آجائے گا۔ جب یہ ہوش میں آجائے تو پیالے کا بچا ہوا پانی اسے پلا دینا۔ پانی پی کر یہ سو جائے گی' سو اسے سونے دینا۔ بیدار ہونے کے بعد یہ اعتدال پر آجائے گی۔''

''بھائی ایوب! اللہ ہی تمہیں اس نیکی کا اجر دے گا۔'' ہاجرہ دعائیں دینے لگی۔

جمیلہ اور ایوب واپسی کے لئے مڑے تو میں نے عارج کو بھی چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے شوخ آواز میں کہا۔ ''اے عارج! اب تو بھائی ایوب کے جسم میں گھس جا! کیسی مزے کی بات ہے کہ وہ جو دوسرے آدم زادوں کے جسموں میں گھسے ہوئے جنات کو بھگا دیتا ہے' خود اسی کے جسم کو ایک جن زاد نے اپنا مسکن بنا رکھا ہے!''

اس پر عارج بولا۔ ''پہلی بات تو یہ سن لے اے دینار کہ تو میرے انسانی قالب کو ہرگز بھائی ایوب نہیں کہے گی' وجہ تجھے خود معلوم ہے۔ آخر تو بھی جمیلہ کے جسم میں اترے گی۔ تو

جانتی ہے کہ جمیلہ اور ایوب کے درمیان کیا رشتہ ہے!''

''مگر تیرے اور میرے درمیان تو کوئی رشتہ نہیں۔''

''ہاں کر دے انکار!.... محبت کے رشتے کو بھی جھٹلا دے اے دینار!''

''اس رشتے کو میں نے کب جھٹلایا ہے' میں تو میاں اور بیوی کے رشتے کی بات کر رہی تھی۔''

''وہ تو خیر جمیلہ کے قالب میں اتر کر تو میری بیوی ہی کہلائے گی! تو مان یا نہ مان!'' عارج مجھے ستانے پر آمادہ تھا۔

''تیری تان اسی رشتے پر آکر کیوں ٹوٹتی ہے!''

''اے دینار! تجھے میری بیوی کہنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔'' عارج نے اس بھولپن سے یہ الفاظ ادا کیے کہ مجھے بھی اس پر پیار آنے لگا' مگر میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ میں ایسا کرتی تو وہ اور ''پھیلنے'' لگتا۔

''اے عارج! تیری پہلی بات تو میں نے سن لی۔ اب تو دوسری بات بتا جس کا تعلق ایوب کے جسم میں تیرے رہنے سے ہے۔''

''ایوب کی بے خبری اور اطمینان کا سبب یہ ہے کہ میں نے کبھی اسے کوئی تکلیف نہیں دی۔'' عارج کہنے لگا۔ ''میں بڑی آہستگی سے ایوب کے جسم میں داخل ہوتا اور اسی طرح نکل آتا ہوں۔ تو بھی یقینا جمیلہ کے ساتھ یہی رویہ رکھتی ہوگی۔''

''میری اور جمیلہ کی بات چھوڑ اور اپنے انسانی قالب کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچ! کہیں اسے کسی طرح یہ شبہ نہ ہو جائے کہ تو اس کے جسم میں گھسا رہتا ہے!.... اب ایوب کے متعلق یہ بات معلوم ہوگئی ہے تو ہمیں چوکنا و محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''تجھے موقع ملا اور تو نے مجھے کسی نہ کسی بہانے سے ڈرانا شروع کیا اے دینار!''

''تو نہ ڈر! کسی دن ایوب تجھے ایسا دوڑائے گا یہاں سے کہ تو بابل کے کھنڈرات میں جا کر ہی دم لے گا۔''

''اور تو میرے پیچھے دوڑی آئے گی' مجھے خبر ہے' میرے بغیر تیرا جی ہی نہیں لگے گا۔''

باتیں کرتے ہوئے ہم جمیلہ اور ایوب کے ساتھ ان کی قیام گاہ میں لوٹ آئے تھے جہاں عارضی طور پر ہماری سکونت بھی تھی۔ وہ دونوں ناشتہ کر کے اٹھنے ہی والے تھے کہ

دروازے پر دستک ہوئی۔ اب تک ہم ان کے انسانی قالبوں میں نہیں اترے تھے۔

جمیلہ چٹائی سے اٹھی اور بولی۔ ''میں دیکھتی ہوں جا کر اب کون آ گیا!''

میں جمیلہ سے پہلے ہی دروازے تک پہنچ گئی۔ دستک دینے والا خلیفہ ہادی کا خادم خاص تھا' میں یہ دیکھ کر چونک اٹھی۔ اس کے ذہن پر توجہ دیتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ جمیلہ کو خلیفہ نے طلب کیا ہے۔ اس طلبی کی وجہ سے خادم خاص لاعلم تھا۔ میں تیزی سے پلٹی اور عارج کو صورتحال سے آگاہ کر کے اسے ایوب کے جسم میں اتر جانے کا مشورہ دیا۔ پھر میں دروازے کی طرف لپکی۔ خلیفہ کا خادم خاص جمیلہ کو خلیفہ کی طرف سے فوری طلبی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اسی لمحے میں نے جمیلہ کے جسم میں پناہ لے لی۔

''میں ابھی امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر ہوں گی۔'' خادم خاص کو میں نے مخاطب کیا۔

اثبات میں گردن ہلا کر خادم خاص تو چلا گیا مگر مجھے فکر مند کر گیا۔ یہ بے وقت طلبی مجھے کسی نئی مصیبت کا پیش خیمہ معلوم ہو رہی تھی۔ مختصراً میں نے عارج کو کچھ ضروری مشورے دیے اور خلیفہ ہادی سے ملنے چل دی۔ عارج اب ایوب کے جسم میں تھا۔ پہلے میں نے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ عارج کا انسانی قالب ایوب کبھی خطرہ بھی بن سکتا ہے۔ وہ باقاعدہ قسم کا کوئی عامل نہیں تھا' نہ یہ اس کا پیشہ تھا۔ وہ کسی سے اس خدمت کا معاوضہ قبول نہیں کرتا تھا۔ اس کے متعلق کم ہی لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ کسی آدم زاد یا آدم زادی پر اگر کوئی جن آ جائے تو وہ اسے بھاگنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ یہ علم ایوب کو اس کے مرحوم والد سے حاصل ہوا تھا۔ یہ ساری باتیں ایوب کے ماضی سے متعلق تھیں جو مجھے اس کا ذہن پڑھ کر معلوم ہوئیں۔ فی الحال ایوب کی طرف سے کوئی فوری خطرہ نہیں تھا اس لیے میرا ذہن خلیفہ ہادی کی طرف منتقل ہو گیا۔ خلیفہ نے خلوت میں مجھ سے ملاقات کی اور پست آواز میں بولا۔ ''اے جمیلہ! ہم تجھے انعام و اکرام سے نوازنا چاہتے ہیں' مگر اس کے لئے تجھے ہماری خدمت انجام دینی ہو گی۔ اس قصر کے بوڑھے نگران اعلیٰ موسیٰ بن کعب کو تو جانتی ہے؟''

موسیٰ بن کعب کا نام سن کر میں کھٹکی۔ یہ وہی کھاگ تھا جسے اپنے حق میں کرنے کے لئے عامل کوذا اور خلافت کے دعویدار عیسیٰ نے ایک خوب صورت کنیز فائضہ بھیجی تھی۔ اس کنیز کا قصہ میں پہلے بیان کر چکی ہوں' یہاں صرف یاد دہانی مقصود ہے۔ اس موسیٰ بن کعب سے میں نے وہ مکان خرید اتھا جہاں جنوبی بغداد کے ایک علاقہ حربیہ میں مطب کھولا تھا۔ یہ برسوں پہلے

اس وقت کی بات تھی جب خلیفہ منصور حکمرانی کر رہا تھا۔ موسیٰ کے نام نے جیسے ماضی کے دریچے کھول دیے' مگر میں نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔

''جی ہاں اے امیرالمومنین! میں محترم موسیٰ بن کعب کو جانتی ہوں'' میں نے خلیفہ کے سوال کا جواب دیا۔

''تو سن! موسیٰ کو محکمہ نظارت (نگہبانی) کا نگراں ہونے کی بنا پر ہماری طرف سے یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی بھی خادم یا خادمہ کا تبادلہ کسی کے پاس بھی کر دے۔ سو وہ تمہارا تبادلہ ہماری مادر محترم کے پاس کرنے والا ہے اور ایسا ہمارے ہی ایما پر ہو رہا ہے۔'' ہادی کا انداز سمجھانے والا تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا ''مگر اس تبادلے سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ حسب سابق ہمارے دیگر خدام کی طرح تمہیں پانچ درہم ماہانہ تنخواہ دیگر مراعات کے علاوہ ملتی رہے گی۔ تم چاہو تو ہم سے اس خصوصی نوازش کی وجہ معلوم کر سکتی ہو۔''

خلیفہ ہادی جب خود ہی سب کچھ بتا رہا تھا تو میں نے اس کے ذہن پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ میں نے ہادی کی خواہش پر ''خصوصی نوازش'' کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا۔ ''تمہیں مادر محترم کی نقل و حرکت پر نظر رکھنی ہے۔ روز تمہیں خبر دینی ہے کہ ان سے کون کون ملا' لیکن اس کے لئے تم ہمارے پاس نہیں آؤ گی' نہ ہم تمہیں طلب کریں گے۔ روزانہ رات کو تم پوری روداد اپنے شوہر ایوب سے بیان کیا کرو گی۔ ایوب ہمیں یہ خبریں پہنچائے گا۔ تمہارے بعد ہم ایوب کو طلب کر کے اسے بھی اپنا حکم سنا دیتے ہیں۔ یہ ذہن میں رکھ لینا جمیلہ تم نے کسی پر اس خدمت کا اظہار کیا تو نہ صرف انعام و اکرام بلکہ اپنی جان سے بھی جاؤ گی!''

وہ مصلحت اندیش و زمانہ ساز ''تو'' سے مجھے ''تم'' کہنے لگا۔ یوں گویا اس نے مجھے عزت دی تھی' لیکن راز افشا ہونے کی صورت میں موت کی دھمکی بھی ساتھ تھی۔

مجھے اس عاقبت نا اندیش آدم زاد خلیفہ ہادی پر ہنسی آنے لگی جس نے نبیذ پی پی کر اپنی صحت تباہ کر لی تھی۔ وہ جوانی میں بھی بوڑھا معلوم ہونے لگا تھا۔ اعلیٰ درجے کی پوشاک پہن کر جب وہ چلتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے کسی بانس پر ریشمی لباس ٹانگ دیا گیا ہو۔ اس پر بھی اپنی طرف دبے پاؤں بڑھنے والی موت سے بے خبر وہ دوسروں کو موت کی دھمکیاں دیتا تھا۔ اس لاعلم آدم زاد کو علم ہی نہیں تھا کہ وہ کسی معمولی خادمہ سے نہیں ایک جن زادی سے ہم کلام ہے جو چاہے تو اسی وقت اسے الٹا لٹکا سکتی ہے۔

اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے میں نے اپنی ''عزت افزائی'' کا شکریہ ادا کیا۔

''آج موسیٰ کا دفتر کھلتے ہی تم اس سے مل لینا۔ اپنے تبادلے کا پروانہ تمہیں اس سے مل جائے گا جسے تم مادر محترم کی خدمت میں پیش کر سکو گی۔'' ہادی بتانے لگا ''ہم تمہیں ایک اطمینان اور دلا دیں کہ تمہارا تبادلہ مصلحتاً اور وقتی طور پر کیا جا رہا ہے۔ ہم تمہیں پھر اپنی خدمت میں بلا لیں گے۔ اچھا اب تو جاؤ اور اپنے شوہر ایوب کو ہمارے پاس بھیج دو!''

میں احتراماً خلیفہ ہادی کے سامنے تھوڑی سی جھکی اور پھر اس کی نشست گاہ سے نکل آئی۔

واقعی ہادی ایک بے وقوف آدم زاد تھا۔ ورنہ مجھے اپنی ماں کی سراغ رسانی پر متعین نہ کرتا۔ وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ میرے ہی ہاتھوں اس نے اپنی ماں کو زہر آلود پلاؤ بھیجا تھا۔ ایسی مشتبہ خادمہ کو کوئی کیسے قبول کر لیتا' خاص طور پر ملکہ خیرزان جیسی ذہین آدم زادی! اس نے اپنی فطری ذہانت ہی کو بروئے کار لا کر زہر آلود پلاؤ کے واقعے کو عام نہیں ہونے دیا تھا۔ خود ملکہ کی عزت نفس پر اس واقعے کے ظاہر ہونے سے ضرب پڑتی کہ اس کا بڑا بیٹا اسے زہر دلوا کر مار ڈالنا چاہتا ہے۔

اپنے بیٹے ہادی کی طرح ملکہ خیرزان بھی منتقم مزاج تھی' مگر وہ اپنے رویے سے یہ ظاہر نہ ہونے دیتی۔

خلیفہ ہادی کے پاس سے واپس آ کر عارج کو میں نے ساری بات بتا دی تو وہ بھی فکر مند ہو گیا اور بولا۔ ''آخر یہ ہادی چاہتا کیا ہے؟''

''چاہے گا کیا' ان لوگوں پر سختی کرے گا جو اس کی ماں سے ملتے ہیں۔ اس کے لئے وہ مجھے وہاں بھجوا رہا ہے تاکہ کوئی شک و شبہ نہ رہے۔'' میں نے کہا۔ ''تو جا عارج' خلیفہ تیرا منتظر ہو گا۔ میں جا کر دیکھتی ہوں' شاید موسیٰ کا دفتر کھل گیا ہو۔''

پھر عارج تو خلیفہ ہادی سے ملنے چلا گیا اور میں چادر میں اپنے انسانی قالب کو اچھی طرح لپیٹ کر محکمہ نظارت کے دفتر پہنچ گئی جو قصر خلافت ہی کی حدود میں تھا۔ عرصہ دراز کے بعد میں نے موسیٰ بن کعب کو دیکھا۔ اس کی تو صورت ہی بدل گئی تھی۔ گلے کی کھال مجھے لٹکی ہوئی دکھائی دی' اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے تھے۔ اقتدار اور مال و دولت کسی آدم زاد کو نہ تو بوڑھا ہونے سے روک سکتے ہیں نہ مرنے سے! میرے تبادلے کا پروانہ پہلے سے موسیٰ کے پاس لکھا رکھا تھا۔ میں نے وہ پروانہ وصول کیا اور چلی آئی۔ اب مجھے ملکہ خیرزان سے ملنا تھا۔ قصر خلافت کے اقامتی حصے میں داخل ہو کر جلد ہی میں ملکہ خیرزان کے روبرو پہنچ

گئی۔

''تم وہی ہو جو ہمارے لئے اپنے خلیفہ کی طرف سے بھیجا ہوا پلاؤ لے کر آئی تھیں؟'' ملکہ کی آواز میں چبھن نمایاں تھی۔ ''کیسے آئی ہو؟''

میں نے تبادلے کا پروانہ ملکہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ملکہ نے پروانے پر ایک نظر ڈالی اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ملکہ نے غصے سے تبادلے کا پروانہ میری طرف اچھال دیا اور سخت لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''اپنے خلیفہ سے جا کر کہہ دو کہ ہم تمہیں اپنی خدمت میں قبول نہیں کر رہے۔ ہم کسی حکم کے پابند نہیں...... جاؤ!'' ملکہ خیرزان غضب ناک نظر آنے لگی۔ کبھی پہلے میں نے ملکہ کو اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ یقیناً معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی تھی۔

اب صورت حال روز بہ روز کشیدہ ہوتی جا رہی تھی۔ ملکہ خیرزان کے سامنے میں کسی مجرم کی طرح کھڑی تھی۔ مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر میرے تبادلے کا پروانہ فرش پر پڑا تھا۔ میں نے جھک کر اسے اٹھایا' ادب سے ملکہ کے روبرو جھکی اور الٹے قدموں اس کی نشست گاہ سے باہر نکل آئی۔ بغداد کے قصر خلافت میں کیا کشمکش جاری ہے' عوام اس سے بے خبر تھے۔ اگر انہیں اس بارے میں کچھ سن گن لگ بھی جاتی تو وہ کچھ نہ کر پاتے۔ عوام کو تو ہر زمانے میں حکمرانوں نے اسی طرح بے بس و مجبور بنا کے رکھا ہے۔

ملکہ خیرزان نے مجھے اپنی خدمت میں قبول نہیں کیا تھا۔ یوں گویا اپنی دانست میں اس نے اپنے بڑے بیٹے خلیفہ وقت ہادی کی کسی ممکنہ سازش سے خود کو بچا لیا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک ذہین آدم زادی تھی۔ اس نے اپنی مختصر سی زندگی میں اچھے اور برے دونوں دور دیکھے تھے۔ کبھی جس قصر میں اس کا سکہ چلتا تھا اور اس کا شوہر خلیفہ مہدی زندہ تھا' آج اسی جگہ وہ بے بس تھی۔ اسے زہر دے کر مار ڈالنے کی کوشش کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس کے لئے ہادی نے مجھے آلہ کار بنایا مگر میں نے اس کے سازشی منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ ملکہ کا مجھے قبول کرنے سے انکار جہاں اس کے لئے سودمند ہو سکتا تھا وہیں میں بھی ایک امتحان میں پڑنے سے بچ گئی تھی۔

موجودہ حالات میں یہ ضروری تھا کہ میں فوری طور پر خلیفہ ہادی سے مل کر اسے اس کی ماں کے فیصلے سے آگاہ کر دیتی۔ اسی سبب میں نے قصر کے مرکزی حصے کی راہ لی۔ ہادی کے خادم خاص سے میں نے کہلوایا کہ اس سے ملنے کی اجازت چاہتی ہوں۔

جب خلیفہ نے مجھے اپنی خلوت میں بلوایا تو اس کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے۔

وہ سخت لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیوں آئی ہے تو ہمارے پاس جب کہ ہم نے تجھے طلب نہیں کیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

وہاں خلیفہ اور میرے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ میں نے حیرت انگیز پراسرار قوتوں کی مالک ایک جن زادی ہونے کے باوجود اب تک بڑے صبر و تحمل سے کام لیا تھا ورنہ اس شخص خورے آدم زاد کا گلا دبا دینا کون سا مشکل کام تھا! وہ چند لمحے بعد ہی کسی مردہ چوہے کی طرح اپنی مسند پر پڑا ہوتا۔ وہ اپنے باپ مہدی کا قاتل تھا یا نہیں لیکن اس کی گواہ تو میں خود تھی کہ اس نے اپنی ماں کو زہر دینا چاہا تھا۔ اس کی فرد عمل کو سیاہ کرنے کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ اس وقت مجھے خلیفہ ہادی کے سخت لہجے اور ناروا سلوک پر غصہ آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے دماغ پر میں نے قبضہ کر لیا اور اسے حکم دیا۔ "اے آدم زاد! میرے ساتھ گستاخی سے پیش آنے کی سزا میں اپنے منہ پر خود ہی طمانچے لگا!"

ہادی نے فوری طور پر میرے حکم کی تعمیل میں اپنے منہ پر طمانچے مارنے شروع کر دیئے۔ جب اس کے دونوں زردی مائل رخسار سرخ ہو گئے تو میں نے اسے روک دیا۔ فی الحال اس حکمران آدم زاد کے لئے اتنی ہی سزا کافی تھی۔ یہ لمحات میں نے اس کے ذہن سے محو کر دیئے۔

"تجھے اس معاملے میں جو کرنا ہے خود ہی کر!" میں اس کے دماغ میں بولی۔ "جمیلہ اور ایوب کو اس جھگڑے سے دور رکھ! تیرے حق میں یہی بہتر ہے۔" میں خود ہادی ہی کی آواز میں اسے تاکید کر رہی تھی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ وہ اسے اپنے ضمیر کی آواز خیال کرے۔

اس کے بعد میں نے ہادی کو کچھ مزید ہدایات دیں اور پھر اسے اپنے اثر سے آزاد کر دیا۔

"اے جمیلہ! تیرے تبادلے کا حکم آج ہی واپس لے لیا جائے گا۔ بھول جا وہ سب کچھ جو ہم نے تجھ سے اپنی مادر محترم کی نگرانی کے بارے میں کہا تھا۔ پھر بھی ہمیں بتا کہ تو نے جب اپنے تبادلے کا پروانہ ان کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے کیا فرمایا؟" ہادی نے پوچھا۔

ملکہ خیزران نے جو کچھ کہا تھا لفظ بہ لفظ میں نے بیان کر دیا۔

"جب ہمیں اطلاع دی گئی کہ تو باریابی کی اجازت چاہتی ہے تو ہم تبھی سمجھ گئے

تھے کہ مادر محترم نے تجھے اپنی خدمت میں قبول نہیں کیا ہوگا۔" ہادی بولا۔ "اپنے شوہر ایوب سے بھی تاکید کر دو کہ وہ کسی سے بھی اس معاملے کا ذکر نہ کرے۔ ہم ابھی خود مادر محترم سے مل کر تصدیق کئے لیتے ہیں کہ ہمیں ملنے والی اطلاعات درست ہیں یا نہیں! ...اور یہ کہ امراء و اراکین سلطنت میں سے کون کون ان سے ملنے آتا ہے۔ اسی کے بعد ہم آج دربار عام میں جائیں گے۔ تو اب خود کو اس خدمت سے آزاد سمجھ!"

"شکریہ اے امیر المومنین! ...کنیز رخصت کی اجازت چاہتی ہے۔" میں نے مودب لہجہ اختیار کیا کیوں کہ اب وہ میرے اثر میں نہیں تھا۔ ہادی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے رخصت کی اجازت دی اور اپنی مسند سے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں وہاں سے نکل کر تیز قدمی کے ساتھ اپنی قیام گاہ تک پہنچی۔ ایوب کے انسانی پیکر میں عارج وہاں نہیں تھا۔ خلیفہ ہادی خود اپنی ماں سے ملنے کا ارادہ ظاہر کر چکا تھا۔ میں اسی لئے اس موقع پر وہاں بہ ذات خود موجود رہنا چاہتی تھی تاکہ ہادی بے قابو ہو کر غصے میں کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھے۔ وہ ایسا کرتا تو میں اسے روک دیتی۔ میری اس تمام تگ و دو کا مقصد محض یہ تھا کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی مملکت کی طاقت دو حصوں میں تقسیم نہ ہو۔ اس طرح مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان ہوتا۔ میرے نزدیک ابھی گویا گھر کی بات گھر ہی میں تھی۔ یہ بات ابھی بغداد کی حدود سے باہر نہیں نکلی تھی کہ خلیفہ ہادی اور اس کے چھوٹے بھائی ہارون الرشید میں سخت اختلافات ہیں۔ مزید یہ کہ ہادی اسی سبب اپنی ماں ملکہ خیزران کا بھی دشمن بن چکا ہے کیونکہ وہ ہارون کی حمایتی ہے۔

جمیلہ کے جسم سے نکل کر میں نے اس پر نیند مسلط کر دی اور ایک مرتبہ پھر ملکہ خیزران کے پاس پہنچ گئی۔ اس بار وہ مجھے دیکھنے سے قاصر تھی۔ اسے میں نے نشست گاہ کی طرف قدم بڑھاتے دیکھا۔ ابھی ایک خادمہ اسے خلیفہ ہادی کے آنے کی اطلاع دے کر گئی تھی۔ ملکہ چاہتی تو ہادی کو اپنی عالی شان اقامت گاہ کے اندرونی حصے میں بھی بلوا سکتی تھی۔ ہادی بہر حال اس کا بیٹا تھا مگر اس نے دانستہ ایسا نہیں کیا۔ اس کا یہ سلوک ہارون کے ساتھ نہیں تھا۔ ملکہ اس طرح ہادی کو شاید یہ احساس دلانا چاہتی تھی کہ اسے اپنا نہیں غیر سمجھتی ہے۔ ہادی کو بھی ملکہ سے اس رویے کی یقیناً امید نہیں ہوگی کہ اسے بھی غیروں کی طرح ملاقات کی خاطر نشست گاہ میں بٹھا دیا جائے گا۔ اس کے چہرے پر اسی لئے ناگواری کے آثار تھے۔

پھر جب ملکہ خیزران اپنی نشست گاہ میں آئی تو بیٹے کی حیثیت سے اٹھ کر ہادی نے اسے تعظیم نہیں دی۔

ملکہ خیزران اپنی مسند پر بیٹھتے ہوئے قدرے بوجھل آواز میں کہنے لگی۔ ''اے ہادی! کاش تم ہمارے بیٹے نہ ہوتے اور اے کاش تمہیں بری صحبت نہ ملی ہوتی' کاش تمہیں والدین کا ادب کرنا آتا۔'' ملکہ کی آواز سے دکھ جھلک رہا تھا۔

''اور اے کاش! آپ نے بھی ہمیں اپنا بیٹا سمجھا ہوتا اور یوں غیروں کی طرح یہاں نشست گاہ میں نہ بٹھایا ہوتا۔'' ہادی نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا' پھر کہنے لگا۔ ''یوں بھی ہم اس وقت بہ حیثیت خلیفہ وقت آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

''کہو اے خلیفہ تمہیں ہم سے کیا کہنا ہے؟'' ملکہ خیزران کی آواز میں بڑی تمکنت اور وقار تھا۔

''ہمیں آپ سے چند باتوں کی وضاحت چاہیے!'' خلیفہ ہادی اپنی ماں کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''جواب دیجئے کہ سلطنت و حکومت آپ کا حصہ ہے یا ہمارا؟ اس مملکت کے حکمران ہم ہیں یا آپ؟''

''تم ہم سے ہماری حیثیت و مرتبے کو بھول کے بات کر رہے ہو!'' ملکہ نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اگر تم خلیفہ ہو تو ہم بھی خلیفہ مرحوم کی ملکہ ہیں۔ تمہیں ہم سے جواب طلبی کا اختیار نہیں۔ پھر تمہیں یہ شک کیوں ہے کہ تم حکمراں نہیں ہو؟''

''اس لئے کہ ہمیں معتبر اطلاعات ملی ہیں کہ آپ سلطنت کے معاملات میں بے جا مداخلت کر رہی ہیں۔'' ہادی بولا۔

''لیکن کس طرح؟ ہمارے پاس تو کسی کو کوئی حکم دینے کا اختیار ہی نہیں۔''

''ہم اسی پر تو آپ سے احتجاج کرنے آئے ہیں کہ بے اختیار ہونے کے باوجود اپنا حکم چلا رہی ہیں۔ سچ بتائیں امرائے دولت' اراکین سلطنت اور سرداران فوج آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتے؟'' ہادی نے منہ بنا کر پوچھا۔

''ہاں وہ مشاورت کی غرض سے ہمارے پاس آتے ہیں۔'' ملکہ خیزران نے اقرار کیا۔ ''یہ ان کی لائقی ہے کہ وہ ہمارے مشوروں کو حکم جان کے ان پر عمل کرتے ہیں۔ ہم ان کے لئے احکام صادر نہیں کرتے حالانکہ اس کے اہل ہیں!''

''تو کیا آپ ہمیں نااہل سمجھتی ہیں؟'' ہادی غصے میں آ گیا۔

''اگر تم اہل ہوتے تو عمالِ حکومت ہم سے مشورے کرنے نہ آتے۔'' ملکہ خیزران نے بلا جھجک کہہ دیا۔

''ہمارے بارے میں آپ کا خیال قطعی غلط ہے!'' ہادی کی آواز تیز اور بلند ہوگئی۔

''خلیفہ! اپنی آواز پست رکھو اور یہ نہ بھولو کہ ایک ملکہ سے ہم کلام ہو!''

''آپ کبھی ملکہ تھیں مگر اب نہیں ہیں!'' ہادی بہ دستور سخت لہجہ اختیار کئے رہا۔ ''آپ کا کام اس عمر میں اللہ کو یاد کرنا ہے نہ کہ امورِ مملکت میں رخنہ اندازی!..... حکمرانِ وقت ہم ہیں کوئی اور نہیں۔ اسے ہم ثابت کر دیں گے!..... ہم بہ خوبی واقف ہیں کہ آپ رفتہ رفتہ امراء و اراکین سلطنت اور سرداران فوج کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف محاذ بنا رہی ہیں۔ اب اگر ان میں سے کوئی بھی آپ سے ملا تو ہم اس کی گردن اڑوا دیں گے!..... ایسے کسی بھی شخص کا مال و اسباب ضبط کر لیا جائے گا۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہمارے خلیفہ ہونے کے باوجود سرداران لشکر اور عمال سلطنت صبح و شام آپ کے پاس آتے ہیں۔ کیا آپ کو کوئی اور کام نہیں؟..... عمر کا تقاضا ہے کہ آپ قرآن کریم کی تلاوت کریں اور اپنی آخرت سنواریں۔ خبردار! اگر کوئی عامل یا حکومتی عہدیدار آپ سے ملنے آئے تو اسے اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دیجئے گا ورنہ.....'' ہادی اپنی ماں کی مزید بے عزتی کرنے کے درپے تھا کہ اسے میں نے اپنے اثر میں لے کر وہاں سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا۔

''اپنی بات پوری کرو خلیفہ!'' ملکہ خیزران کا چہرہ بھی غیرت و غصے کے مارے سرخ ہوگیا۔ ''بتاؤ خلیفہ ورنہ تم کیا کر لو گے؟''

''یہ آنے والا وقت آپ کو بتائے گا۔'' ہادی یہ کہہ کر نشست گاہ کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

جو کچھ بھی ہوا' خاصی حد تک میری مرضی کے مطابق ہی ہوا تھا۔ ہادی نے میری ہدایات ہی پر عمل کیا تھا۔ میں البتہ ملکہ خیزران کی عزتِ نفس کو مجروح کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ ہادی کو میں نے بے قابو ہونے سے کئی بار روک لیا تھا ورنہ بیہودہ گوئی تو جیسے اس کی سرشت میں شامل تھی۔ اگر ملکہ خیزران پیچھے ہٹ جاتی تو محاذ آرائی کی نوبت نہ آتی۔ یہ تو

بہر حال ممکن نہیں تھا کہ ہادی خلافت سے دست بردار ہو جاتا۔ ایسی صورت میں ملکہ ہی کو امور سلطنت میں مداخلت سے روکنا ضروری تھا۔

اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے ملکہ خیزران کے دماغ میں بھی یہ بات بٹھا دی کہ دونوں بھائیوں ہادی اور ہارون کے درمیان معرکہ آرائی کسی بھی سطح پر مملکت کے لئے سودمند ثابت نہیں ہو گی۔ وہ ہادی کو خلافت کے عہدے سے ہٹانے کی کوشش نہ کرے۔

''تم آخر کون ہو جو ہمارے دماغ میں سرگوشیاں کر رہی ہو؟'' ملکہ خیزران بڑبڑانے لگی۔

''کیا تم خود اپنی آواز نہیں پہچانتیں!'' میں اسی کی آواز میں بولی کہ یہ میرا آزمودہ ''نسخہ'' تھا۔ ''میں تمہارے ضمیر کی آواز ہوں۔''

وہ کوئی اور نہیں' ذہین و بردبار ملکہ خیزران تھی۔ اس نے میری سرگوشی سن کر انکار میں سر ہلایا۔ ''یہ ناممکن ہے کہ بولے بغیر کوئی اپنی ہی آواز سن لے۔'' ملکہ نے زیر لب کہا۔ ''تم ہر گز ہمارے ضمیر کی آواز نہیں ہو سکتیں کیوں کہ ہمارا ضمیر ابھی مردہ نہیں ہوا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم یقیناً تمہاری بات مان لیتے۔ ہم سمجھ گئے ہیں کہ تم کوئی پراسرار وجود ہو۔ شاید ہمارے بیٹے ہادی نے کسی عمل کرنے والے کو اپنے اقتدار کے بل پر خرید لیا ہے اور وہ اسی عامل کے ذریعے......''

میں نے ملکہ کی بات کاٹ دی اور کہا۔ ''مجھے تم نے غلط سمجھا کہ میں کسی عامل کی آلہ کار ہوں اور تمہارے ضمیر کی آواز نہیں۔''

''تم اگر حقیقتاً ہمارے ضمیر کی آواز ہوتیں تو ہادی ہی کو خلیفہ تسلیم کرنے کے لئے نہ کہتیں۔''

ملکہ خیزران کی دلیل بڑی مضبوط تھی۔ اس کے معاملے میں میرا آزمودہ ''نسخہ'' کار گر ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس آدم زادی نے مجھ جن زادی کو لاجواب کر دیا تھا۔ اس پر بھی میں مایوس نہیں ہوئی۔ اپنی مزید پراسرار قوتوں کے ذریعے ملکہ کے دماغ کو قابو میں کر کے میں نے اپنا مقصد بہر حال حاصل کر لیا۔

میری پراسرار قوتوں کے زیر اثر ملکہ خیزران خوابیدہ اور دھیمی آواز میں بولنے لگی۔

''ہاں... دونوں بھائی لڑے تو اس سے مملکت کی قوت واقعی دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔

مجھے فوج کے سرداروں' امراء و اراکین سلطنت کو ہادی کے خلاف نہیں اکسانا چاہئے...... اس سے طاقت ٹوٹ جائے گی اور ہم دو حصوں میں بٹ جائیں گے...... ہم اپنا فیصلہ اپنے اللہ پر چھوڑتے ہیں کہ وہی سب سے بڑا انصاف کرنے والا ہے...... اللہ ہمیں صبر دے کہ ہم حالات سے مصالحت کر سکیں۔''

ہم جنات کے پاس اپنے کام نکالنے کے کئی راستے ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ آدم زادوں کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے مگر ہم انہیں بڑی آسانی سے قابو میں کر لیتے ہیں۔ اس کا سبب آدم زادوں کی وہ کمزوریاں ہوتی ہیں جن پر وہ قابو نہیں پاتے۔ اقتدار کی ہوس بھی میرے نزدیک ایک کمزوری ہے۔ خلیفہ ہادی بھی اس کمزوری میں مبتلا تھا۔ وہ نہ صرف خود اقتدار پر قابض رہنے کا خواہش مند تھا بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کے لئے بھی راہ ہموار کر دینا چاہتا تھا کہ اقتدار انہی کے پاس رہے۔ اگر وہ اس کمزوری میں مبتلا نہ ہوتا تو یقیناً بہت سے ناخوشگوار واقعات پیش نہ آتے۔ اس کے علاوہ اپنے چھوٹے بھائی ہارون کا حق مارنے کی خاطر وہ سرگرم نہ ہوتا' اپنے نوعمر بیٹے جعفر کو اپنا ولی عہد بنانے کی کوشش نہ کرتا اور اپنی ماں کی عزت نفس کو مجروح نہ کرتا۔

ہادی نے تو حد ہی کر دی۔ ملکہ خیزران کی قیام گاہ سے نکل کر جب میں دربار عام میں پہنچی تو ہادی کو اپنی ماں کی غیبت کرتے سنا۔ اس بے عقل آدم زاد نے ایسا کرتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کہ اپنی ماں کی برائی کر کے وہ اپنے ہی خاندان کو بے عزت کر رہا ہے۔ ہادی جس طرح غصے میں بھرا ہوا ملکہ خیزران کی نشست گاہ سے نکلا تھا' اسے پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے دربار عام کا رخ کیا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ ہادی ایسی ہی کوئی حماقت نہ کر بیٹھے۔ اس کے غلط اثرات بھی مرتب ہو سکتے تھے۔ حالانکہ ہارون اپنے بھائی کے دربار میں نہیں جاتا تھا مگر اسے دربار کی پوری روداد معلوم ہو جاتی تھی۔ ہارون کی معلومات کا ذریعہ وہ امرائے دربار تھے جنہوں نے ہمیشہ حق بات کی تھی۔ مصلحت وقت کے پیش نظر اور ہارون کی تاکید کے سبب انہوں نے ہادی کی حماقتوں اور غیر منصفانہ اقدامات پر خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ مجھے اندیشہ یہ تھا کہ ہارون کو جب اپنی ماں کے متعلق برسر دربار کی جانے والی گفتگو کا علم ہوا تو وہ انتہائی غصے میں بھی آ سکتا ہے۔ اس بدنصیب آدم زاد ہادی کے سوا بھلا کون اپنی ماں کی تذلیل برداشت کرتا۔ سو ہارون کی جانب سے میرا یہ خدشہ غلط نہ تھا۔ میرا یہ اندازہ بھی درست نکلا تھا

کہ ہادی دربار عام میں بھی اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ سکتا ہے۔

خلیفہ ہادی کو میں نے دربار عام میں امرائے سلطنت اور افسران فوج سے یہ دریافت کرتے سنا۔ "بولو تم میں سے کون اس بات کو پسند کرے گا کہ اس کی ماں مردوں سے باتیں کرے اور پھر وہی باتیں مردوں میں بیان کی جائیں؟"

"اے امیرالمومنین! ہم میں سے کوئی اس ناپسندیدہ عمل کو گوارہ نہیں کرے گا۔" کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

وزیر ابراہیم حرانی بھی دربار میں موجود تھا۔ وہ تو خود ہی ہادی کو ہارون اور خیزران کے بارے میں بھڑکاتا رہتا تھا۔ ہادی کی باتوں سے یقیناً اس نے اندازہ کر لیا کہ اشارہ کس طرف ہے اور اسی لئے بول اٹھا۔ "کوئی غیرت مند مرد اپنی ماں کا ذکر دوسرے مردوں کی زبان سے قطعی برداشت نہیں کرے گا۔ ماں اور بیٹے کا رشتہ بڑا محترم ہے مگر اسی وقت تک کہ ہر دو جانب سے اس کا احترام کیا جائے۔"

"تم نے حق بات کی ابراہیم! اصل بات یہی ہے۔" ہادی کہنے لگا۔ "تالی دونوں ہی ہاتھوں سے بجتی ہے۔ یک طرفہ کچھ نہیں ہوتا۔ اگر ایک بیٹے پر ماں کے حقوق کی ادائیگی فرض ہے تو ماں پر بھی بیٹے کے حقوق ادا کرنا لازم ہے۔" ہادی نے گویا اپنی ماں کے خلاف بہ طور تمہید یہ دلیل پیش کی' پھر اپنے اصل مقصد پر آ گیا' بولا۔ "شاید تم میں سے کچھ کو یا بہت سوں کو یہ غلط فہمی ہو کہ ہم قصر خلافت اور اس سے باہر بغداد شہر میں بلکہ نجف و کربلا و کوفہ نیز مملکت کے دیگر شہروں کے حالات کا علم نہیں رکھتے۔ سو ایسا نہیں۔ بغاوتیں عموماً اقتدار کے ایوانوں ہی میں جنم لیتی ہیں۔ ہم نے بھی قصر خلافت میں ایک بغاوت کی آہٹ محسوس کر لی ہے۔ تفصیل سے قطع نظر ہم تم سب کو نصیحت کرتے اور حکم دیتے ہیں کہ کسی کا آلہ کار نہ بنو! اپنی گردنوں کو تلواروں کی تیز دھار سے بچاؤ۔ ان الفاظ میں ہادی نے اپنے امرا کے ساتھ ساتھ افسران فوج کو بھی قتل کرانے کی دھمکی دی تھی۔ ہادی نے کچھ دیر توقف کیا۔ دربار میں سناٹا چھایا رہا۔ پھر یہ سناٹا ہادی ہی کی آواز سے ختم ہوا۔ اب وہ کہہ رہا تھا۔ "ہمارے علم میں ہے کہ تم لوگ ہماری مادر محترم کی خدمت میں ان سے امور مملکت پر مشورے کے لئے جاتے ہو۔ ہم چاہیں تو ہر ایک کا نام بیان کر سکتے ہیں۔ ہماری نظر میں یہ کوئی مناسب فعل نہیں۔ اس کے پس پردہ جو عوامل ہیں' وہ بھی ہماری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ لازماً تم نے سمجھ لیا ہو گا کہ ہم کیا

چاہتے ہیں! یقین کر لو کہ قصر خلافت میں کوئی بھی آنے جانے والا ہماری نظروں سے چھپا نہیں رہ سکتا!" خلیفہ ہادی یہ کہنے کے بعد اپنی ماں سے متعلق مزید بیہودہ گوئی کرنا چاہتا تھا' مگر میں نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔

اس روز کے بعد سے نہ تو ملکہ خیزران نے مملکت کے بااثر افراد سے کسی قسم کا رابطہ کیا' نہ کسی نے خود اس سے ملنے کی ہمت کا ثبوت دیا۔ جان کسے پیاری نہیں ہوتی! یوں گویا ایک بڑا خطرہ ٹل گیا۔ آدم زادوں کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کس طرح ایک جن زادی نے اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لا کر ان کے خون ناحق کو بہنے سے روک دیا! ورنہ تو جانے کتنے بچے تصادم کی صورت میں یتیم ہو جاتے' کتنی آدم زادیوں کے سہاگ اجڑتے اور کتنی بہنوں کے بھائیوں کو تہ تیغ کر دیا جاتا! جنگ بڑی ہولناک ہوتی ہے۔ وہ اپنے جلو میں ایسی تباہی و بربادی لاتی ہے کہ برسوں کھیتوں میں نئے بیج نہیں اگتے۔ زمین کی نمو پذیری کے ناز اٹھانے والے ہی نہیں رہتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملکہ خیزران اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتی تو بڑا خون بہتا۔ مجھے اس ممکنہ تصادم کو ٹال کر بڑی خوشی تھی جو عارج سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔ ایک رات وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "اے دینار! تو ان دنوں بڑی پر بہار و پر مسرت نظر آتی ہے!"

"یہ پر مسرت نظر آنا تو میری سمجھ میں آ گیا اے عارج مگر پر بہار سے کیا مطلب ہے تیرا؟" میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"ارے واہ! تجھے پر بہار کا مطلب معلوم نہیں!" وہ دھیرے سے ہنسا۔ "پر کا مطلب بھرا ہوا یا بھری ہوئی اور بہار اس موسم کو کہتے ہیں جس میں پھول کھلتے ہیں اور فضا خوشبو سے مہکنے لگتی ہے۔"

"آج کل تو بہت اونچا اڑنے لگا ہے اے عارج!" میں نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو مجھے کہاں اڑنے دیتی ہے!" عارج نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "یوں بھی مجھے تیرے بغیر تنہا اڑنا کب اچھا لگتا ہے! تیری خوشبو ساتھ نہ ہو تو میرے نزدیک اڑان ہی غلط ہے۔ ویسے تو ضرور اکیلی اڑتی پھر رہی ہے۔ تجھے شاید یہ گمان ہے کہ مجھے کچھ خبر نہیں۔"

"کیا خبر ہے تجھے بول جو میرے علم میں نہیں؟" میں لیٹے لیٹے اپنے بستر پہ اٹھ کر

بیٹھ گئی۔

"لڑنے پر کیوں اتر رہی ہو جبکہ ابھی تجھ سے میرا نکاح بھی نہیں ہوا! بیویاں ہی لڑتے ہوئے اچھی لگتی ہیں۔"

"تو میں تجھے بری لگتی ہوں؟" میں نے آنکھیں نکال کر اپنی مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔ خیر... چھوڑ اس بحث کو! میں تجھے دراصل یہ بتانا چاہتا تھا کہ میری معلومات کے مطابق تو نے ملکہ خیزران کو ہادی کے مقابلے میں پسپا ہونے پر تو مجبور کر دیا لیکن بات بنی نہیں۔" عارج سنجیدہ ہو گیا۔ "اس بنا پر ہادی کا حوصلہ اور بڑھ گیا ہے۔ اس نے ایک بار پھر ہارون پر اپنے نابالغ بیٹے کے ہاتھ پر بیعت کیلئے دباؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہادی اور اس کے فسادی وزیر ابراہیم حرانی کی باتیں میں نے سنی ہیں۔ بار بار یہ فتنہ اٹھتا ہی رہے گا اے دینار! اس مسئلے کا کوئی مستقل حل ہونا چاہئے۔ میں نے اس پر بہت غور کیا' میری سمجھ میں اس کی ایک ہی تدبیر آتی ہے کہ ہارون وقتی طور ہی پر ہی بغداد سے کہیں چلا جائے۔ نہ وہ یہاں ہوگا نہ ہادی کے سازشی امراء اسے ہارون پر دباؤ ڈالنے کو کہیں گے۔ اتنی بڑی سلطنت ہے' ہارون کہیں بھی جا سکتا ہے۔"

"اے عارج! کبھی کبھی تو بڑی عقل کی باتیں کر لیتا ہے تو!" میں ہنس دی' پھر عارج کی تجویز کو سراہا۔ "تیرا کہنا بالکل درست ہے مگر یہ نہ بھول کہ ہادی خلیفہ وقت ہے۔ ہارون کو ہادی سے اجازت لینی پڑے گی اور اسے بتانا ہوگا کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہا ہے؟!"

"سیر و شکار کا بہانہ بغداد سے نکلنے کیلئے کیسا رہے گا؟" عارج نے مشورہ دیا۔

"بہانہ تو ٹھیک ہے' اگر ہادی اسے قبول کر لے۔" میں بولی۔

"قبول کیسے نہیں کرے گا!......تو جب مجھ سے ہر بات منوا لیتی ہے تو ہادی کی کیا مجال ہے کہ......"

"کیا ضروری ہے کہ تو ہر معاملے میں اپنی مثال دے! کبھی سیدھی طرح بھی بات کیا کر!..." میں یہ کہہ کر اصل موضوع پر آ گئی۔ "ہارون کو بھی بغداد سے کہیں اور جانے کیلئے آمادہ کرنا ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ اسے مشورہ دینے والا یحییٰ بن خالد ہو۔ ہارون اس پر بہت بھروسہ کرتا ہے۔ میں براہ راست ہارون کے دماغ میں بھی یہ بات ڈال سکتی ہوں۔ میں ایسا

ہی کروں گی!......پھر جب یحییٰ بھی اسی پر صاد کرے گا تو ہارون کو اپنے لیے یہی راہ مناسب معلوم ہوگی۔ ٹھیک ہے نا؟" میں نے عارج سے تصدیق چاہی۔

"تو نے کبھی کوئی بات غلط کی ہے جو اب کرے گی!" عارج میری طرف دیکھ کر شرارتی انداز میں مسکرایا۔

میں سمجھ گئی کہ عارج کی سنجیدگی پھر رخصت ہو چکی ہے۔ اگر جواباً میں کچھ بولی تو وہ مجھے سونے نہیں دے گا۔ اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ مجھے ساتھ لے کر سیر پانے کیلئے صحراؤں کی طرف نکل جاتا۔ میں انکار کرتی تو اس کا منہ بن جاتا۔ اسی "خطرے" کے پیش نظر میں نے بستر پر دوبارہ لیٹ کر عارج کو مخاطب کیا۔ "نیند آ رہی ہے مجھے' تو بھی سو جا!"

توقع کے خلاف اس وقت عارج نے مجھے مزید ستائے بغیر سو جانے دیا۔ یہ الگ بات کہ کبھی کبھار میرا بھی جی چاہتا تھا کہ عارج مجھے ستائے۔ اس حقیقت سے عارج خود بھی واقف تھا۔ اسی لیے تکلف نہیں کرتا تھا۔ اسے صحرا نوردی کا شوق تھا اور اس شوق کی اصل وجہ بس یہی تھی۔ عارج کو میرے ساتھ تنہائی میں کچھ وقت گزارنے کا موقع مل جاتا تھا۔

دو روز ہی خیریت سے گزرے تھے کہ عارج نے مجھے اطلاع دی' خلیفہ ہادی اپنے چھوٹے بھائی ہارون سے ملنے گیا ہے۔ گویا کھیل شروع ہو گیا تھا۔ اس مرتبہ ہارون کو ہادی نے خلوت میں طلب کرنے کے بجائے بوجوہ اس کے پاس جانا بہتر سمجھا تھا۔ یہ عشا کے بعد کی بات ہے جب میں قصر کی طعام گاہ سے باہر نکل رہی تھی۔ ہارون سے خلوت میں ہادی کی پہلی ملاقات کے وقت بھی میں موجود تھی۔ سو اس بار بھی میں نے یہی کیا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اپنے انسانی قالب کو اپنی قیام گاہ تک پہنچا سکتی۔ میں نے اسی سبب دوسرا راستہ اختیار کیا۔ میں' جمیلہ کے جسم سے باہر آ گئی۔ پھر اسے اپنے اثر میں لے کر تاکید کی کہ وہ یہاں سے سیدھی اپنی قیام گاہ جائے اور سو جائے۔

جمیلہ کسی سحر زدہ کی طرح آگے بڑھ گئی اور میں نے قصر خلافت کے دائیں حصے کا رخ کیا۔

مجھے بہرحال دیر نہیں ہوئی۔ ہم جنات پلک جھپکتے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ میں وہاں پہنچی تو ہارون اپنی نشست گاہ کے دروازے پر خلیفہ ہادی کا استقبال کر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔

''اے امیر المومنین! تشریف لائیے۔ ہمیں حضور کی تشریف آوری کی خبر سویرے مل گئی تھی۔'' ہارون مؤدب انداز میں بولا۔

''ہاں ہم ہی نے اپنے محافظ دستے کے نگران سے تمہیں اپنی آمد کی خبر کرائی تھی۔'' ہادی آگے بڑھتے ہوئے کہنے لگا۔ پھر اس نے نشست گاہ میں موجود مسند پر بیٹھتے ہوئے ہارون کو مخاطب کیا۔ ''اے برادر خورد! آؤ ہمارے قریب بیٹھ جاؤ۔ اس وقت ہم امیر المومنین نہیں' تمہارے بڑے بھائی کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں' ورنہ بصورت دیگر تمہیں طلب کرتے۔'' ہادی کے لہجے میں نرمی تھی۔

''عزت افزائی کا شکریہ اے برادر بزرگ و محترم!'' ہارون یہ کہہ کر ہادی کے پاس بیٹھ گیا۔

''تم سے آج ہم دوٹوک بات کرنے آئے ہیں۔'' ہادی فوراً ہی مطلب کی بات پر آ گیا۔ ''ہمیں بتاؤ اے ہارون! کیا ہم بڑا بھائی ہونے کے ناطے تمہیں کوئی حکم دے سکتے ہیں؟'' ہادی کی آواز سے منافقت جھلکنے لگی اور اس نے پہلو بدلا۔

''یقیناً۔'' ہارون نے جواب دیا۔ ''شرط صرف یہ ہے کہ وہ حکم جائز ہو۔''

''حسب سابق تم نے پھر الجھی ہوئی باتیں شروع کر دیں۔'' ہادی کی آواز میں تلخی آ گئی اور وہ منافقت برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ ناگواری سے بولا۔ ''تم نے جائز و ناجائز کی کیا بحث چھیڑ دی۔'' ہادی پر اس کے مزاج کا تکبر غالب آ گیا۔ ''ہم جسے جائز کہہ دیں' وہی جائز ہے۔''

''اے برادر محترم! یہ آپ کا خیال ہو سکتا ہے مگر حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔'' ہارون نے جھجکے بغیر صاف گوئی سے کہا۔ ''کیا جائز ہے اور کیا ناجائز' اس کی حدود متعین ہیں۔ ہم ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتے۔''

''ہم تم سے بحث کرنے نہیں آئے۔ ہمیں سیدھے اور صاف الفاظ میں جواب دو کہ تم اپنے بھتیجے جعفر کے حق میں ولی عہدی سے دست بردار ہونے پر آمادہ ہو کہ نہیں؟ ہمارے خاندان میں یہ کوئی پہلی مثال نہیں ہو گی۔ عیسیٰ بن موسیٰ کو بھی ہمارے والد مرحوم کے حق میں آخرکار ولی عہدی سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ اگر تم اس واقعے سے واقف نہیں تو مادر محترم سے تصدیق کر سکتے ہو۔'' ہادی کہنے لگا۔

اس پر ہارون بولا۔ ''اپنے خاندان کی تاریخ ہمارے علم میں ہے۔ اس کیلئے تصدیق کی ضرورت نہیں۔''

''تو پھر کیا یہ مثال تمہیں قائل کرنے کیلئے کافی نہیں ہے؟ تم بھی اپنے بھتیجے کے ہاتھ پر بیعت کر لو!''

''ایسا کرنا ہمارے اختیار میں نہیں اے برادر محترم!'' ہارون نے جواب دیا۔

''لیکن کیوں؟ تم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟'' ہادی کی آواز تیز ہو گئی۔

''ہم خود ولی عہد نہیں بنے' نہ اس کا دعویٰ کیا۔'' ہارون پروقار انداز میں بولا۔ ''ہمیں والد مرحوم نے ولی عہد بنایا تھا اور انہی کو یہ اختیار حاصل تھا کہ ہمیں اس سے دست بردار ہونے کا حکم دے سکتے۔ ہم خود کو اسی لیے اس معاملے میں بے اختیار سمجھتے ہیں۔''

میری توجہ ہارون اور ہادی دونوں ہی کے ذہنوں پر تھی۔ ہارون کی دلیل سن کر ہادی طیش میں آ گیا۔ اس سے پہلے کہ بات بگڑ جاتی اور ہادی کوئی غلط قدم اٹھاتا' میں نے اسے بے قابو نہ ہونے دیا۔ لمحوں میں اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ اس نے سخت لہجہ اختیار کرنے کے بجائے شکست خوردہ سی آواز میں کہا۔ ''اے برادر خورد! ہمیں تم سے یہ امید نہ تھی کہ اپنے دروازے سے خالی ہاتھ لوٹاؤ گے۔'' یہ کہتے ہی وہ مسند سے اٹھ گیا۔ ہارون بھی اس کے احترام میں اٹھا مگر اسے روکا نہیں۔ ہادی تیزی کے ساتھ نشست گاہ کے دروازے سے نکل گیا۔

ایک طوفان اٹھا اور دب گیا۔ اب ہارون کا بغداد میں رہنا میرے نزدیک ٹھیک نہیں تھا۔ وہ جتنی جلد یہاں سے چلا جاتا بہتر ہوتا۔ اس سے قبل ہادی نے جب ہارون کو خلوت میں بلوا کر بات کی تھی' اسی رات اس پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ دوبارہ بھی ہارون پر حملہ ہو سکتا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ تقدیر ہمیشہ یاوری کرتی۔ خلیفہ مہدی بھی تو دیکھتے ہی دیکھتے اس دنیا سے کوچ کر گیا تھا۔ کسے خبر تھی کہ اسے زہر دلوا کر مار ڈالا جائے گا۔ خود خلیفہ مہدی کو بھی اس روز گمان نہ ہو گا کہ وہ اگلے دن کا سورج نہیں دیکھ سکے گا۔ آدم زادوں خصوصاً حکمرانوں کو اپنے بارے میں بڑی غلط فہمیاں ہوتی ہیں کہ وہ ناقابل شکست ہیں مگر جب برا وقت آتا ہے تو ریت کے گھروندوں کی طرح ڈھے جاتے ہیں۔ ہادی بھی اپنی تقدیر سے بے خبر تکبر کے ساتھ زمین پر اکڑ کر چلتا تھا۔ وہ کبھی نہ سوچتا ہو گا کہ اسے ایک دن اسی زمین کا رزق بن جانا ہے۔ اس کے برعکس ہارون کا رویہ مختلف تھا۔ وہ خلق خدا کا خیال رکھتا اور غرور نہ کرتا۔ سبھی کے ساتھ

وہ نرمی سے پیش آتا۔

میرے خیال میں ہارون کو بغداد چھوڑ دینا چاہئے تھا۔ یہاں وہ خطرے میں تھا۔ ماضی میں کوفہ، بصرہ اور واسط بغاوتوں کے مرکز رہ چکے تھے۔ انہی کو قابو میں رکھنے کیلئے خلیفہ منصور نے بغداد کو دارالحکومت بنایا تھا اور یہاں زبردست فوجی چھاؤنی قائم کر دی تھی۔ کوفیوں کے علاوہ کربلا کے باشندے بھی قابل اعتبار نہیں تھے۔ میری مرضی یہ تھی کہ ہارون ان شہروں کا رخ نہ کرے۔

آخر مجھے ایک شب موقع مل ہی گیا جب ہارون تنہا تھا۔ ہارون کے آس پاس کسی کی موجودگی سے دشواریاں پیدا ہوتیں۔

''اے ہارون!'' میں نے اسے اسی کی آواز میں مخاطب کیا۔ ''تمہیں تمہارا بڑا بھائی بغداد میں چین سے نہیں رہنے دے گا۔ سو تمہارے لیے یہ مناسب ہے سیر و شکار کے بہانے ایام گزاری کی خاطر یہاں سے نکل جاؤ!'' میں اس کے متغیر چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔

''لیکن کیا ہم اپنی مادر محترم کو بڑے بھائی کے رحم و کرم پر چھوڑ جائیں؟'' ہارون بڑبڑایا۔ وہ اپنی دانست میں خودکلامی کر رہا تھا۔

''ہادی تمہاری مادر محترم کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ تم جانتے ہو کہ پہلے بھی وہ اپنی اس کوشش میں ناکام ہو چکا ہے۔ ہادی کو اصل خطرہ تمہاری ماں سے نہیں، تم سے ہے۔ وہ تو تمہاری محبت کا قرض ادا کر رہی ہے اور ہادی کی نفرت کا نشانہ ہے۔ اس کے باوجود ہادی میں اب ملکہ کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا حوصلہ نہیں۔'' میں سرگوشیاں کرتی رہی۔ میرا مقصد ذہنی طور پر اسے مطمئن کرنا تھا۔

''مگر...... مگر ہم...... ہم بغداد چھوڑ کر کہاں جائیں؟'' ہارون نے زیرلب کہا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر شکنیں، فکر کا ثبوت تھیں۔

''موصل تمہارے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتا ہے۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''بغداد سے قریب کوئی اور شہر کیوں نہیں؟'' ہارون نے کہا۔ ''کوفہ یہاں سے دور نہیں۔ ہم بوقت ضرورت جب چاہیں گے تو وہاں سے بغداد آ سکیں گے۔'' مجھے معلوم تھا کہ ہارون کے ذہن میں یہ سوال ضرور آئے گا۔ میں درمیان میں نہیں بولی تاکہ وہ اپنی بات پوری کر لے۔ پھر اس نے نجف، کربلا وغیرہ کے نام لیے اور میں سنتی رہی۔ اس کی ''خودکلامی'' سے

میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ بغداد سے زیادہ دور جانا نہیں چاہتا۔

میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ آدم زادوں کو ترغیب دے کر کام چل جائے۔ میں انہیں مجبور نہ کروں لیکن بعض اوقات ترغیب لاحاصل ثابت ہوتی تھی۔ ایسی صورت میں مجھے ان سے اپنی بات منوانے کی غرض سے انہی کے مفاد کی خاطر جبر بھی کرنا پڑتا۔ یہ بھی ایک ایسا ہی موقع تھا۔ سو ہارون کو قائل ہونا ہی پڑا کہ بغداد سے قربت نقصان دہ اور دوری سودمند ہے، سے موصل ہی کو ترجیح دینی چاہئے۔

''جلد نہیں، جب تم مناسب خیال کرو ہادی سے اس کی اجازت لے لینا۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے اس کے دماغ کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔

ہارون سے تو میں نے اپنی بات منوالی کہ بغداد میں اس کیلئے خطرہ ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میرے گرد بھی خطرات منڈلانے والے ہیں۔

یہ ذکر دوسرے ہی دن صبح کا ہے کہ وزیر ابراہیم حرانی کے ساتھ میں نے قصر خلافت میں داخل ہوتے ایک ایسی ہستی کو دیکھا کہ میرے پورے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ میرے انسانی پیکر کے پیروں میں جیسے کسی نے زنجیریں ڈال دیں۔ میں جیسے پتھر کی ہو گئی، اس کے اور میرے درمیان خاصا فاصلہ تھا اور وہ میری طرف متوجہ بھی نہ تھا، پھر بھی اس استخوانی چہرے کو دیکھ کر میرے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے عفریت دموش کو میں نے بوڑھے سلیمان کے انسانی قالب ہی میں دیکھا تھا۔ معلوم نہیں اس بدذات عفریت کو یہی انسانی قالب کیوں پسند تھا! میں اپنی جگہ کھڑی اسے ابراہیم حرانی کے ہمراہ دیوان خاص کی طرف بڑھتے دیکھتی رہی۔

اس خبیث بوڑھے کو قصر خلافت میں دیکھ کر میرے دماغ میں خطرے کی لاتعداد گھنٹیاں بجنے لگیں۔ جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میرے حواس کچھ ٹھکانے آئے۔ مجھے فوری طور پر عارج کا خیال آیا۔ میں نے اسے تلاش کیا تو پتا چلا کہ وہ خلیفہ ہادی کی خدمت میں ہے۔ میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ مجھ پر یہ سوچ کر گھبراہٹ طاری ہو گئی کہ بوڑھے عفریت کو انسانی قالب میں دیکھ کر جب میرا یہ حال ہوا ہے تو اچانک اس پر نظر پڑتے ہی عارج پر کیا گزرے گی؟ یہ سامنے کی بات تھی کہ وزیر ابراہیم حرانی جب دیوان خاص کی طرف گیا تھا تو خلیفہ ہادی بھی وہیں تھا یا وہاں پہنچنے والا تھا۔ خلیفہ اگر عارج کو اپنی خدمت ہی

میں رکھتا تو بوڑھے عفریت اور عارج کا آمنا سامنا ناگزیر تھا۔

یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ میں اپنی جان کے خوف سے عارج کو شدید خطرے میں چھوڑ کر فرار ہو جاتی۔ یہ ساری باتیں بعد میں معلوم کرنے کی تھیں کہ بوڑھا عفریت قصر خلافت تک کس طرح پہنچ گیا۔ فی الحال تو میرے سامنے عارج اور اپنی جان بچانے کا مسئلہ تھا۔

قصر خلافت میں عارج کو ڈھونڈتی ہوئی میں مرکزی حصے تک آ گئی تھی جہاں خلیفہ ہادی کی سکونت تھی۔

میں وہیں گھبرائی گھبرائی سی ادھر سے ادھر آ جا رہی تھی کہ عارج مجھے سامنے سے آتا دکھائی دے گیا۔ میں اس کی طرف لپکی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر میں اسے تقریباً گھسیٹتی ہوئی ایک ستون کی آڑ میں لے آئی۔

"کیا ہوا تجھے؟ تو اتنی دہشت زدہ کیوں لگ رہی ہے؟" عارج دھیمی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

"یہ باتوں کا وقت نہیں اے عارج! یہاں سے فوراً بھاگ چل۔" میں تیزی سے بولی۔

"لیکن کچھ بتا تو سہی! کہاں بھاگنا ہے یہاں سے؟" عارج کو ابھی تک صورتحال کی سنگینی کا یقیناً احساس نہیں تھا ورنہ اس کی آواز پرسکون نہ ہوتی۔ مجھے پریشان دیکھ کر اس کے چہرے کا تاثر کسی قدر بدلا ضرور تھا۔

"ہمارے لیے اس وقت سب سے مناسب، وہ محفوظ جگہ بابل کے کھنڈرات ہیں۔ ہمیں وہیں چلنا ہے۔" میں نے عارج کے سوال کا جواب دیا۔

"بابل کے کھنڈرات؟..... یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟" عارج نے حیرت کا اظہار کیا۔

میں دانستہ عارج کو ابھی بوڑھے عفریت کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ وہ خوفزدہ نہ ہو جائے۔

"تجھ سے میں جو کہہ رہی ہوں وہ کر!..... اس انسانی قالب سے فوراً باہر آ جاؤ!"

یہ کہتے ہی میں نے بھی جمیلہ کے جسم کو چھوڑ دیا۔

عارج کو بھی کچھ جانے بوجھے بغیر میری تقلید کرنی پڑی۔ ادھر وہ ایوب کے قالب سے نکلا' ادھر میں نے قصر خلافت کے بیرونی صدر دروازے کا رخ کیا۔ میں فوراً خطرے کی

حدود سے باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ تیزی سے ہمارے نکلنے کے سبب ایوب اور جمیلہ کے جسموں کو جھٹکے ضرور لگے' مگر وہ سنبھل گئے۔

جب میں بابل کے کھنڈرات تک پہنچی تو عارج مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اے دینار! اب تو بغداد سے فرار کی وجہ بتا دے!"

"وجہ سنے گا تو تیرے ہوش گم ہو جائیں گے۔" میں نے یہ کہہ کر اسے بوڑھے عفریت کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔

"ن..... نہیں۔" عارج واقعی گھبرا گیا۔ "دیکھا اے..... دی..... دینار! اس نے ہمیں ڈھونڈ ہی لیا! اب..... اب کیا ہوگا!..... کک..... کیا ہمیں اس کی نظروں سے اوجھل ہونے کیلئے پھر..... پھر کسی اور..... اور زمانے میں جانا پڑے گا؟"

"حواس باختہ نہ ہو اے عارج!" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "اس وقت تو عالم سو رہا ہوگا۔ جب وہ دوپہر کو ظہر سے پہلے اٹھے گا تو ہم اسے تمام تر صورتحال سے آگاہ کر کے مشورہ لیں گے۔ وہی ہمیں یہ بتانے کا اہل ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے!"

"اے دینار! تیرا کہنا تو یہ تھا کہ ہم قصر خلافت میں پوری..... طرح سے محفوظ ہیں..... پھر..... پھر وہ خبیث عفریت کس طرح وہاں پہنچ گیا؟" عارج بولا۔

اب ہم دونوں کھنڈرات کے اس حصے میں پہنچ گئے تھے جہاں میرا مختصر خاندان آباد تھا۔ میں نے عارج کی بات کا کوئی جواب اس لیے بھی نہیں دیا کہ ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی اوٹ سے اپنے بڑے بھائی یوسف کو نکلتے دیکھ لیا تھا۔ اپنے اہل خاندان پر میں یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی کہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوں۔ خاص طور پر یوسف تو میرے بغداد میں رہنے کے سخت خلاف تھا۔ اسے پتا لگتا کہ آدم زادوں کے درمیان مجھے خطرہ درپیش ہے تو وہ اصرار کرتا کہ میں کھنڈرات میں لوٹ آؤں۔ عفریت کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہوں خود سے کم قوت و طاقت رکھنے والے جنات کی بستیوں میں نہیں گھستے۔ کم طاقت مخلوق متحد و یکجا ہو تو زیادہ قوت والا اس سے ڈرتا ہے۔ اس اعتبار سے بابل کے یہ کھنڈرات میرے لیے انتہائی محفوظ جگہ تھے۔ میرا بڑا بھائی مجھ سے بڑی محبت کے ساتھ پیش آیا۔

"تو بہت یاد آتی ہے اے دینار!" بھائی یوسف کے لہجے سے خلوص و محبت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ہاں اے میرے بھائی یوسف! تجھے بھی میں آدم زادوں میں رہ کر بھولی نہیں۔"
میں نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا۔

اپنے اگر کچھ عرصے کیلئے ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں تو دوبارہ ملنے پر ان کے جذبات محبت میں شدت آ جاتی ہے۔ ہر چند کہ یوسف، عارج کو پسند نہیں کرتا تھا مگر اس روز وہ عارج کے ساتھ بھی گرم جوشی سے ملا۔ دراصل یوسف کو یہ اعتراض تھا کہ میں نکاح کیے بغیر عارج کے ساتھ کیوں رہ رہی ہوں۔ اگر میرے اندر کوئی کھوٹ ہوتا، راہ راست سے بھٹک گئی ہوتی تو بھائی یوسف کا کہنا درست تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ میں عشق و ہوس کے فرق کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ میرے باپ اور سردار قبیلہ اخضم کو بھی مجھ پر پورا اعتماد تھا کہ میں بہک نہیں سکتی۔ اس نے اسی لیے ایک نیک مقصد کے حصول کی خاطر مجھے عارج کے ساتھ آدم زادوں کے درمیان رہنے کی اجازت دی تھی۔

اتنی مدت کے بعد مجھے دیکھ کر میری ماں طرطبہ مجھ سے لپٹ گئی اور میرے باپ اخضم نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "اے دینار، اے میری بچی! تو خوش تو ہے؟ تجھے آدم زادوں میں رہ کر کوئی پریشانی تو نہیں؟ اور تو کہیں خلق خدا کی خدمت سے غافل تو نہیں ہو گئی؟"

"اے میرے باپ! میں تیری دعاؤں کی پناہ میں ہوں۔ مجھے کوئی دشواری نہیں اور میں حتی الامکان خلق خدا کی خدمت کر رہی ہوں۔" میں نے جواب میں کہا، پھر مجھے خیال آیا کہ میرا باپ آمد کی وجہ نہ پوچھنے لگے۔ سو خود ہی میں نے بات بنا دی۔ "تجھے، ماں اور بھائی کو دیکھے بہت دن ہو گئے تھے اس لیے آج عارج کو ساتھ لے کر آ گئی۔"

"آ جایا کر!" میرا باپ اخضم بولا اور پھر عارج سے اس کی خیر خیریت معلوم کرنے لگا۔

عارج کے ساتھ دوپہر تک میں کھنڈرات کے اسی حصے میں رہی۔ پھر عارج نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ اپنے اہل خاندان سے رخصت ہو کر جب میں عالم سوما سے ملنے جا رہی تھی تو سعا مجھے ایک ایسی بات یاد آ گئی جس کی طرف پہلے حواس باختگی کے سبب میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

"اب مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے اے عارج کہ تو واقعی غبی ہے۔" میں بولی اور ایک

جگہ رک گئی۔ عارج کو بھی ٹھہرنا پڑا۔

"اچانک تجھ پر یہ حقیقت کیسے منکشف ہوئی! اور تو نے یہ بات کیوں بھلا دی کہ یہ سب تیری محبت کا اثر ہے ورنہ تو میں بہت ذہین تھا۔"

"یعنی تجھے اعتراف ہے کہ تو اب ذہین نہیں رہا؟" میں نے اس پر چوٹ کی۔

"اور سب باتیں تو چھوڑ، یہ بتا اے دینار کہ تو دوبارہ کیسے چہکنے لگی؟ اس میں کیا بھید ہے؟" عارج نے پوچھا۔

"بھید یہ ہے اے میرے غبی محبوب کہ اگر ہم بدحواس ہو کر فوری طور پر قصر خلافت سے نہ بھاگتے اور وہیں رہتے تو بھی بوڑھا عفریت ہمارا کچھ نہ بگاڑ پاتا۔ ہم دونوں کے گرد ایک نادیدہ حفاظتی حصار قائم ہے جسے کوئی بھی طاقتور سے طاقتور جن زار عبور نہیں کر سکتا۔ عالم سوما کی ہدایت کے مطابق ہم ہر اکیس دن کے بعد اب تک وہ عمل کرتے آئے ہیں جس کی بنا پر یہ حفاظتی حصار قائم ہے۔ پھر بتا کہ اس کے باوجود تیری ہوا کیوں سست ہو گئی تھی اور تو نے مجھے یہ بات کیوں یاد نہیں دلائی؟"

"واہ، یہ بھی خوب رہی! خود ہی تو کچھ بتائے بغیر مجھے وہاں سے ساتھ لے کر بھاگ لی اور اب مجھی کو مورد الزام ٹھہرا رہی ہو۔ وہاں مجھے تو بتاتی کہ تجھے خبیث عفریت، بوڑھے سلیمان کے انسانی قالب میں نظر آیا ہے تو میں یاد دہانی کراتا کہ میرے اور تیرے گرد حفاظتی..."

"رہنے دے بس!" میں نے عارج کی بات کاٹ دی۔ "زیادہ باتیں نہ بنا! میں تجھے خوب جانتی ہوں۔ تو اول درجے کا ڈرپوک ہے۔ جب میں نے تجھے عفریت دہموش کے بارے میں بتایا تھا تو کیوں ہکلانے لگا تھا! میں تجھے اس سے پہلے مغل بادشاہ ہمایوں کے زمانے میں بھی لے جا کر دیکھ چکی ہوں۔ صدیوں آگے جانے کے باوجود تجھ پر عفریت دہموش کا خوف غالب رہتا تھا اور تو اپنے انسانی قالب سے باہر آتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ بھول گیا کیا؟"

"لیکن اے دینار! میں لاکھ بہادر نہ سہی مگر تیری خاطر اپنی جان تو داؤ پر لگا سکتا ہوں! کہہ دے کہ یہ بھی جھوٹ ہے!"

"نہیں کہتی، بول اب؟" دراصل حفاظتی حصار کا دھیان آتے ہی میرے اعصاب

سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ میں اسی لیے دانستہ عارج کو چھیڑ رہی تھی۔ میرے نزدیک اب عالم سوما سے ملنا بھی ضروری نہیں رہا تھا' لیکن یہاں آنے کے بعد اسے نظر انداز کر کے چلا جانا اچھا نہیں تھا۔ پھر یہ کہ وہ بہر حال ایک عالم تھا۔ اس کی صحبت میں بیٹھ کر ہمیں کچھ حاصل ہی ہوتا۔

عارج کو ساتھ لیے میں عالم سوما کے پاس پہنچی تو حسب توقع وہ بڑی شفقت سے پیش آیا۔

''تم دونوں ٹھیک تو ہو میرے بچو!'' عالم سوما کہنے لگا۔

''ہاں اے سوما!'' میں بول اٹھی' پھر مجھے شرارت سوجھی اور عارج کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''آج یہ عفریت وہوش کو بوڑھے سلیمان کے انسانی قالب میں دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ وہ وزیر ابراہیم حرانی کے ہمراہ قصر خلافت کے دیوان خاص کی طرف جا رہا تھا کہ عارج کی نظر اس پر پڑ گئی۔ پھر تو خوف کے مارے اس کے ہوش اڑ گئے۔ میں نے اسے لاکھ سمجھایا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں' ہمارے گرد نادیدہ حفاظتی حصار قائم ہے مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔ یہ مجھے بھی اپنے ساتھ قصر خلافت سے بھگا لایا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ ہم بابل کے کھنڈرات ہی میں محفوظ رہ سکتے ہیں۔''

میں نے شرارتاً سارا الزام عارج کے سر تھوپ دیا۔ اس پر عالم سوما' عارج کو سمجھانے لگا۔ ''اے میرے بچے! اپنے دل میں زیادہ سے زیادہ خوف خدا پیدا کر! پھر تو کسی سے نہیں ڈرے گا۔ قدم قدم پر دینار تیرے ساتھ موجود تو ہے۔ اس کی باتوں پر دھیان دیا کر!''

''مجھے معلوم ہے اے سوما کہ دینار بڑی ہی بہادر اور عقل مند ہے۔'' عارج تپ کر بولا۔ ''ایک عفریت تو کیا' سو عفریت مل کر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

''خیر اب ایسا بھی نہیں اے عارج! سو عفریت بہت ہوتے ہیں' دو چار کی بات اور ہے۔ ان سے نمٹا جا سکتا ہے۔'' عارج کو میں نے مزید سلگایا۔ ''تیری طرح نہیں کہ ایک عفریت پر نظر پڑتے ہی سٹی گم ہو جائے۔''

اس سے قبل کہ عارج کچھ کہتا' عالم سوما بول اٹھا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں اے دینار کہ نادیدہ حفاظتی حصار جب تک تیرے اور عارج کے گرد قائم ہے

اس عفریت سے تم دونوں بچے رہو گے' لیکن عارج کا فیصلہ درست تھا۔ قصر خلافت میں اس عفریت کی آمد کئی طرح کے خطرات کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ جب تک تمام حالات کا علم نہ ہو جائے کہ وہ عفریت کس طرح' کیوں اور کس مقصد سے قصر خلافت تک پہنچا ہے' تم دونوں کا وہاں جانا قطعی مناسب نہیں۔''

عالم سوما کی بات میں وزن تھا۔ اس سے ملنا سود مند ثابت ہوا تھا۔

''اس خبیث عفریت کی وہاں آمد کا ایک سبب...... بلکہ بڑا سبب ہماری تلاش بھی تو ہو سکتی ہے!'' عارج نے عالم سوما سے کہا۔

''اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔'' عالم سوما نے عارج کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے مزید کہا۔ ''لیکن اس کیلئے انسانی قالب اختیار کرنا' خلیفہ کے وزیر ابراہیم حرانی سے ملنا اور پھر خلیفہ سے ملاقات کی خاطر دیوان خاص کی طرف جانا کچھ اور ہی ظاہر کرتا ہے۔ سن اے دینار! تیری وجہ سے میں قصر خلافت میں پیش آنے والے واقعات سے غافل نہیں رہا۔ مجھے پتا ہے کہ ان دنوں وہاں کیا چپقلش چل رہی ہے۔ ان حالات میں اس خبیث عفریت کا خلیفہ سے ملاقات کرنا بھی معنی خیز لگتا ہے۔ کیا خبر اس طرح ہارون کی جان کو مزید خطرات لاحق ہو جائیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ میرے خدشات غلط ہوں' اصل بات کچھ اور ہو۔''

پھر یہ طے ہوا کہ مجھے اور عارج کو فی الحال بغداد نہیں جانا اور بابل کے کھنڈرات ہی میں رہنا ہے۔ اس خبیث عفریت کے بارے میں مطلوبہ معلومات کس طرح حاصل کی جا سکتی ہیں' عالم سوما مجھے سمجھانے لگا۔

☆......☆......☆

ان تمام باتوں سے کسی قدر مجھے بھی آگہی تھی جو عالم سوما نے سمجھائیں۔ قصر خلافت میں عفریت وحوش کی آمد کے مختلف اسباب ممکن تھے۔ وہ عفریت اس وقت اپنے عقائد سے مجھے آگاہ کر چکا تھا جب میں اس کی قید میں تھی۔ ایسی صورت میں عالم سوما کے خدشات درست بھی ہو سکتے تھے۔ یہودی ہونے کے ناطے اس خبیث عفریت سے ایک مسلم مملکت کی خیرخواہی ناممکن تھی۔ خلیفہ ہادی سے مل کر وہ اسے ایسے مشورے دے سکتا تھا جو مملکت کیلئے نقصان دہ ثابت ہوتے۔ میں نے اپنے ان خیالات کا اظہار عالم سوما سے کیا تو وہ بولا" اے دینار! اگر واقعی ایسا ہی ہوا کہ جیسا تو کہتی ہے تو پھر ہمیں اس کا توڑ کرنا پڑے گا۔ پھر تیرا قصر خلافت میں رہنا ضروری ہو جائے گا' لیکن جب تک حقائق کا علم نہ ہو جائے کوئی اقدام مناسب نہ ہوگا۔ تو میری بات سمجھ رہی ہے نا!" عالم سوما نے جواب طلب انداز میں میری طرف دیکھا۔

"ہاں اے میرے باپ کے دوست' اے عالم سوما! میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے تیری ہی ہدایت پر عمل کروں گی۔" میں بولی۔

"اس عفریت کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہونے تک تم دونوں کھنڈرات کے اسی حصے میں قیام کرو گے تاکہ ضرورت پڑنے پر مجھ سے مشورے کر سکو اور میں بھی تمہیں کسی ممکنہ خطرے سے بچا سکوں۔" عالم سوما نے عارج اور میری طرف اشارہ کیا۔

میں نے رضامندی ظاہر کر دی تو بھلا عارج کو اس پر کیا اعتراض ہوتا! وہ تو اس عارضی حفاظتی بندوبست پر بہت مطمئن نظر آ رہا تھا۔

عالم سوما کے ایما پر عارج کو ساتھ لے کر میں اسی رات بغداد روانہ ہو گئی۔ اس مرتبہ ہماری منزل قصر خلافت نہیں تھی۔ رصافہ کے علاوہ قرافہ بھی بغداد کا ایک بڑا محلہ تھا۔ اس علاقے میں بھی ارکان حکومت کی قیام گاہیں تھیں۔ وزیر ابراہیم حرانی کا محل نما عالی شان مکان

اسی محلے میں تھا۔ خلیفہ ہادی کا وزیر بننے کے بعد اس کے طور طریقے ہی بدل گئے تھے۔ پہلے وہ محلہ کرخ کی متوسط آبادی میں رہتا تھا' لیکن اب وہاں قیام گویا اس کی شان کے خلاف تھا۔ ایک امیر پر دباؤ ڈال کر ابراہیم نے سستے داموں اس کا یہ مکان خرید لیا تھا۔

ہم نصف شب کے قریب وزیر ابراہیم حرانی کے مکان میں داخل ہو گئے۔ ہمیں بھلا کون روکتا! کسی آدم زاد کیلئے تو سخت حفاظتی پہرے کے باعث اس مکان میں گھسنا ممکن نہیں تھا' لیکن ہمارا معاملہ مختلف ہے۔ ہم جن زاد تھے۔

مجھے وزیر ابراہیم حرانی کی بابت سب کچھ معلوم تھا اسی لیے اسے شیطان صفت سمجھتی تھی۔ وہی خلیفہ ہادی کو غلط مشورے دیتا اور بھڑکاتا تھا۔ جن آدم زادوں کو دیکھ کر خود بخود نفرت ہونے لگے' ابراہیم حرانی انہی میں سے ایک تھا۔

میں اس کی خواب گاہ میں پہنچی تو اسے بستر پر اوندھا پڑے دیکھا۔ اس کی یہ حالت نشے کے سبب ہو سکتی تھی۔ روز ہی رات گئے تک وہ خلیفہ ہادی کے ساتھ نبیذ پیتا تھا۔ خواب گاہ میں شمع دان کی لو مدھم ہونے کے باوجود سب کچھ واضح تھا۔ پہلے میں نے اسے ہوش میں لانے کا بندوبست کیا۔ اس کیلئے مجھے ابراہیم کے دماغ سے نشے کا اثر ختم کرنا پڑا۔ اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لا کے میں ایسا نہ کرتی تو اس سے کچھ معلوم نہ ہو پاتا۔

ہوش میں آتے ہی ابراہیم نے کروٹ بدلی اور بستر پر سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔

"بتا اے ابراہیم کہ تو بوڑھے اور استخوانی چہرے والے سلیمان کو کیسے جانتا ہے؟" میں نے اس کے دماغ میں سرگوشی کی۔

میرے سوال پر وہ چونک اٹھا اور آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شاید اسے یہ گمان تھا کہ سوال کرنے والی یعنی میں اسے نظر آ جاؤں گی۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ ظاہر ہے اسے اپنے سوا خواب گاہ میں کوئی نظر نہیں آیا ہوگا۔

"تو نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اے ابراہیم؟" میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔

"مگر تو ہے کون؟ اور...... سامنے کیوں نہیں آتی؟" ابراہیم کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔

"میں کون ہوں' تجھے ابھی پتا چل جائے گا!" یہ کہتے ہی میں نے اسے ٹانگ پکڑ کر بستر سے گھسیٹ لیا۔

ابراہیم کے منہ سے چیخ نکلنے ہی والی تھی کہ عارج نے اس کا منہ دبالیا۔

''اسے مکان کی چھت پر لے چلتے ہیں۔'' میں نے عارج سے کہا۔ میری آواز صرف وہی سن سکتا تھا کوئی آدم زاد نہیں۔

''کیوں' یہاں کیا قباحت ہے؟'' عارج نے دریافت کیا۔ ''یہاں بھی تو ہم اس سے پوچھ گچھ کر سکتے ہیں۔''

''مار پیٹ کی آوازیں سن کر اس کا کوئی محافظ بھی ادھر آ سکتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ میرے لیے یہ کوئی مشکل نہیں تھا کہ اس آدم زاد ابراہیم خرانی کو کسی بھی طرح کی جسمانی اذیت دیے بغیر مطلوبہ معلومات حاصل کر لیتی۔ ایسا نہ کرنے کی وجہ اس سے نفرت ہی تھی۔ ایسے آدم زاد قابل نفرت ہی ہوتے ہیں جو زمین پر فساد پھیلا ئیں۔ عارج بھی میرا مقصد سمجھ گیا تھا۔ اس وجہ سے مزید کچھ نہ بولا۔ ابراہیم کو میں اسی کے مکان کی چھت پر خواب گاہ سے اٹھا کر لے آئی۔ اب اس کا چہرہ خوف و دہشت کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس نے غالباً یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ کوئی نادیدہ پراسرار وجود اسے اپنا ہدف بنائے ہوئے ہے۔ اس کے جسم میں نام کو بھی حرکت نہیں تھی۔

''تو مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں کون ہوں تو یہ دیکھ!'' میں ایک بھیانک انسانی قالب میں ظاہر ہو گئی۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی گھگی بندھ گئی۔ مجھے یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں انتہائی خوف کے عالم میں وہ ہوش نہ کھو بیٹھے۔ اسی خیال سے میں نے فوری طور پر اس کے ذہن کو گرفت میں لے لیا۔ مجھ سے چند لمحوں کی تاخیر بھی ہو جاتی تو وہ شاید حواس میں نہ رہتا۔

''تجھ سے جو پوچھا جائے بتا!'' میں نے اس کے کولہے پر لات ماری۔ وہ ابھی تک چھت پر بے سدھ پڑا تھا۔

''پو..... پوچھو..... بتا..... بتاؤں گا میں!'' ابراہیم خرانی کانپتی آواز میں کہنے لگا۔ کولہے پر پڑنے والی ضرب کے سبب وہ کراہ بھی رہا تھا۔ ضرب شدید ہی تھی۔ اگر عارج فوراً اس کا منہ بند نہ کر دیتا تو وہ چیخ پڑتا۔ اس کی طرف سے عارج چوکنا تھا۔

''اے دینار! اتنا کافی ہے'' عارج نے مجھے مخاطب کیا۔ ''اس سے مطلب کی بات کر اور واپس چل!''

میں نے عارج کا مشورہ مان لیا۔ اس آدم زاد کی تھوڑی بہت پٹائی کر کے میری تسلی

ہو گئی تھی۔

پھر میرے استفسار پر ابراہیم خرانی بتانے لگا۔ ''استخوانی چہرے والے اس بوڑھے سلیمان کو میرے بچپن کا ایک دوست بلال اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ بلال نے بتایا تھا کہ وہ بوڑھا حیرت انگیز پراسرار قوتوں کا مالک ہے۔ اس نے مجھے اپنے کچھ کمالات بھی دکھائے' پھر دعویٰ کیا کہ وہ ہارون الرشید کو ولی عہدی سے دستبردار کرا سکتا ہے۔ بوڑھے نے اس کیلئے یہ شرط رکھی کہ میں اسے خلیفہ محترم سے ملوا دوں۔ میں اس کے کمالات سے بہت متاثر ہو گیا تھا' سوچا کہ اس کا دعویٰ درست ثابت ہو گیا تو یہ بہت بڑا کام ہو گا۔ اسی وجہ سے میں صبح جب خلیفہ محترم کے طلب کرنے پر دیوان خاص میں گیا تو بوڑھے سلیمان کو بھی ساتھ لے گیا۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے حسب قاعدہ خلیفہ محترم کو آگاہ نہیں کیا کہ میرے ساتھ بوڑھا سلیمان بھی ہو گا۔ اس کیلئے مجھے پہلے سے اجازت لینی چاہیے تھی۔ نتیجہ یہ کہ مجھے خلیفہ محترم کی خفگی مول لینی پڑی۔ انہوں نے میرے ساتھ دیوان خاص میں ایک اجنبی کو دیکھا تو اس سے ملے بغیر اٹھ کر چلے گئے۔ شام کو میں جب ان سے خلوت میں ملا اور پوری بات بتائی نیز قبل از وقت اجازت نہ لینے پر معذرت چاہی تو وہ پگھل گئے۔ حقیقت حال جاننے کے بعد خلیفہ محترم نے بوڑھے سلیمان سے ملاقات کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ یہ ملاقات کل رات بعد نماز عشا خلوت میں ہو گی۔ میرے اور بوڑھے سلیمان کے سوا خلیفہ محترم کے پاس کوئی اور نہیں ہو گا۔ بوڑھے سلیمان نے اس خدمت کے عوض خود کو شہر کوفہ کا عامل بنانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔''

''تیرا کیا خیال ہے' خلیفہ ہادی اسے عامل کوفہ بنا دے گا؟'' میں نے سوال کیا۔

''اگر بوڑھے سلیمان نے اپنا دعویٰ سچ کر دکھایا اور ہارون الرشید نے ولی عہدی سے دست برداری کا اعلان کر دیا تو سلیمان کو عامل کوفہ بنا دینا خلیفہ محترم منظور کر لیں گے۔ ویسے بھی عامل کوفہ اسحٰق بن صباح کو اس منصب پر برسوں گزر چکے ہیں۔'' ابراہیم خرانی نے جواب دیا۔

''سن اے ابراہیم! تو نے آج رات جو کچھ دیکھا' سنا اور محسوس کیا' وہ سب ایک خواب تھا۔ کل صبح جب تو سو کر اٹھے گا تو تجھے کچھ بھی یاد نہیں ہو گا!'' میں نے تاکید کی اور پھر اس کے جسم کو اٹھا کے نیچے خواب گاہ میں لے آئی۔ اس سے پہلے میں نے انسانی قالب چھوڑ دیا تھا۔

ابراہیم خرانی کے دماغ کو میں نے سونے کی ترغیب دی۔ جب وہ گہری نیند سو گیا تو

میں نے عارج کو واپسی کا اشارہ کیا۔

ہم بغداد شہر کی حدود سے نکل آئے تو میں عارج سے مخاطب ہوئی۔ "لگتا ہے کہ بوڑھا خبیث عفریت ایک تیر سے دو شکار کر رہا ہے۔"

"باقی باتیں تو خیر اپنی جگہ ہیں لیکن مطلوبہ معلومات کا ایک اطمینان بخش پہلو بھی ہے اے دینار!" عارج معنی خیز لہجے میں بولا۔ اس سے پہلے کہ میں وضاحت طلب کرتی عارج نے بتایا۔ "بوڑھا عفریت کم سے کم ہماری تلاش میں بغداد نہیں آیا۔"

"یہ تجھ سے کس نے کہہ دیا؟..... کیا خبر اس کی بغداد آمد کا ایک مقصد ہماری تلاش بھی ہو!" میں نے کہا۔

"قرائن سے تو ایسا ظاہر نہیں ہوتا۔" عارج نے میرے خیال سے اختلاف کیا۔

"ابراہیم حرانی سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بوڑھے عفریت کے صرف دو مقصد سامنے آتے ہیں۔ اس کا پہلا مقصد مسلم مملکت کو نقصان پہنچانا ہے۔ اس خدشے کا اظہار خود تو بھی کر چکی ہے۔ ہارون کا ولی عہدی سے دست بردار ہو جانا مملکت کے مستقبل کو اندھیروں میں ڈبو دے گا۔ دوسرا مقصد عامل کو ذہ بن کرا کے اپنے لیے سامان عیش فراہم کرنا ہو سکتا ہے۔ یہ منصب حاصل کر کے وہ بڑی تعداد میں آدم زادیوں کو اپنے حرم کی زینت بنا سکے گا۔ تو بھی تو ایک تیر سے دو شکار کرنے ہی کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھی!..... یا تیری بات کا مطلب اور تھا؟" عارج نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے معلوم کیا۔

"مطلب تو خیر میرا بھی یہی تھا اے عارج!" میں نے اقرار کیا پھر اسے سمجھانے لگی۔ "بظاہر اس خبیث عفریت کی سرگرمیاں کچھ بھی ہوں مگر ہمیں اس کی طرف سے بہت محتاط رہنا ہوگا۔ وہ ہمیں اس طرح دھوکہ بھی دے سکتا ہے کہ کسی اور غرض سے بغداد آیا ہے۔"

"یہ کہہ کر کہیں تو مجھے ڈرا تو نہیں رہی اے دینار؟" عارج کہنے لگا۔ اس کی آواز میں شوخی تھی۔

"جو پہلے سے خوفزدہ ہو اسے ڈرانے سے کیا حاصل، میں کیا تجھے جانتی نہیں!" میں دھیرے سے ہنس دی۔

"چل تو بہادر سہی۔ میرے اطمینان کیلئے یہ بھی کافی ہے کہ اگر میں نہیں تو میری ہونے والی بیوی کسی سے نہیں ڈرتی۔"

"لے دے کے تیری تان بس مجھے بیوی بنانے پر ٹوٹتی ہے!" میں نے مصنوعی خفگی

کا اظہار کیا۔

"تو بن جا نہ میری بیوی! کب تک مستقبل کے سنہرے خواب دکھاتی رہے گی!" عارج کی عاشق مزاجی رنگ لانے لگی۔

"زندگی اگر خوابوں سے خالی ہو جائے عارج! تو پھر جینے میں کوئی مزا ہی نہ رہے۔"

"تو مجھے خواب دکھا کر تو مزے لوٹ رہی ہے!..... یہ بھی خوب رہی!" عارج نے اس طرح میرے مزے لوٹنے کا ذکر کیا کہ مجھے ہنسی آگئی۔

"ہم ستم زدوں پر ہنسنا ہی حسن والوں کا شیوہ ہے۔ تو بھی ہنس لے اے دینار!"

"نہ تو کوئی ستم زدہ ہے نہ میرا شمار اہل حسن میں ہوتا ہے۔" میں بولی۔ "ان بے سر و پا باتوں کو چھوڑ اور فضا میں فضول ادھر ادھر ٹاک ٹوئیاں مارنے کے بجائے بابل کے کھنڈرات کی طرف چل! عالم سوما تہجد کی نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا تو نفلوں کے دوران میں اس سے بات کرنا اچھا نہیں لگے گا۔ یوں بھی وہ ہماری واپسی کا منتظر ہوگا۔"

عارج نے میری بات مان لی۔ پھر ہمیں بابل کے کھنڈرات تک پہنچنے میں دیر نہ لگی۔

عالم سوما کو میں نے پوری روداد سنا دی تو اس نے کہا۔ "وہی ہوا کہ مجھے جس کا خدشہ تھا۔ اب یہ بندوبست ضروری ہو گیا ہے کہ وہ عفریت اپنی شیطانی قوتوں کو بروئے کار لا کے ہارون کو ولی عہدی سے دست بردار ہونے پر مجبور نہ کر سکے۔ خود مجھے بھی اس سلسلے میں کچھ کرنا پڑے گا کہ ہارون کو بوڑھا عفریت اپنے اثر میں نہ لے پائے۔ اس کے علاوہ اے دینار! تجھے اور عارج کو بھی قصر خلافت میں رہنا ہوگا۔ ابراہیم حرانی سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں وقت اور حالات کا اب یہی تقاضا ہے۔ اس میں تمہارے لیے خطرہ تو ہے مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ تم دونوں مطمئن رہنا، میں تمہاری طرف سے غافل نہیں رہوں گا۔"

یہ کہہ کر عالم سوما کچھ دیر مجھے مختلف ہدایات دیتا رہا۔ ان ہدایات کا تعلق قصر خلافت میں تحفظ کے علاوہ آئندہ کے لائحہ عمل سے بھی تھا۔

وہ رات ہم نے کھنڈرات ہی میں گزاری اور صبح کے آثار نمودار ہوتے ہی بغداد روانہ ہو گئے۔

قصر خلافت اس وقت سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب ہم اس کے مخصوص حصے میں

پہنچے۔ یہ حصہ قصر کے ملازمین کی سکونت کیلئے ہی تھا۔ یہاں ان کیلئے چھوٹی چھوٹی دو دالانوں پر مشتمل قیام گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ حصہ بھی چونکہ قصر کی حدود میں تھا' اس بنا پر طرز تعمیر خوبصورت ہی تھا۔ اس حصے میں خدام' خادماؤں' کنیزوں اور غلاموں سبھی کی قیام گاہیں تھیں۔

ایوب اور جمیلہ کے انسانی قالب ہمارے لیے آشنا تھے۔ ان قالبوں میں ہمیں گھٹن محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اسی سبب اس مرتبہ بھی ہم نے انہی کا انتخاب کیا۔ وہ دونوں ابھی سو کر نہیں اٹھے تھے کہ ہم ان کے جسموں میں اتر گئے۔

چند ہی لمحے بعد ایوب کے جسم میں قرار پا کر عارج اٹھ کے بیٹھ گیا اور مجھ سے بولا "اے دینار! کیا یہ ممکن نہیں کہ آج رات اس لعنتی عفریت اور خلیفہ ہادی کی ملاقات سے پہلے ہارون اس قصر میں نہ رہے۔ وہ آج ہی خلیفہ ہادی سے سیر و شکار کی اجازت حاصل کر لے۔"

"موجودہ حالات میں ایسا ممکن نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "خلیفہ ہادی کم از کم اس وقت ہارون کو کہیں بھی جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ یہ سوچ کہ بوڑھے عفریت نے جو دعویٰ کیا ہے' اسے آزمانے کا موقع ہادی کیسے کھو دے گا اور اس کیلئے ہارون کا بغداد میں ہونا ضروری ہے۔"

"قیاس پر نہ جا' کوشش کر اے دینار!" عارج بولا۔ "یہی تو ہو گا کہ ہادی انکار کر دے گا مگر ہارون کو اس سے بات تو کرنی چاہیے۔ تو اگر کہے تو میں ہارون کو اس پر آمادہ کروں۔ ہادی کو تو اپنے اثر میں لے کر اس سے اجازت دلوا سکتی ہے۔"

عارج کی بات سے امید بندھی۔ میں نے سوچا' شاید بات بن ہی جائے۔ اسی سبب راضی ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے' کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ تو ہارون کو سنبھال' میں ہادی کو دیکھتی ہوں۔"

میری اور عارج کی کوششوں سے اسی دن دربار عام کے انعقاد سے پہلے دونوں بھائیوں' ہادی اور ہارون کی ملاقات طے ہو گئی۔ یہ ملاقات خلوت میں ہونی تھی۔ ہارون کو تو عارج نے راضی کر لیا تھا مگر ہادی ملاقات پر آمادہ نہ تھا۔ سو اس غرض سے مجھے حرکت میں آنا پڑا۔ ایوب اور جمیلہ کے ذہنوں پر نیند مسلط کر کے ہم ان کی قیام گاہ سے نکل آئے تھے۔

ہارون و ہادی کی ملاقات کے وقت ضروری نہیں تھا کہ عارج بھی وہاں موجود ہوتا۔ اس کا اشتیاق دیکھ کر میں نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔ خلوت میں ملاقات کی درخواست ہارون کی طرف سے کی گئی تھی۔ ہادی نے اسی سبب اسے اپنی نشست گاہ میں خاصی دیر انتظار کرایا۔

اس سے ہادی کا مقصد محض اپنی برتری جتانا تھا۔ انتظار کی یہ ساعتیں ہارون کو ناگوار ہوئیں۔ اس کا پتہ ہارون کے ماتھے پر پڑی ہوئی شکنوں سے بخوبی ہوتا تھا۔ اگر عارج اسے اپنے اثر میں نہ لیے ہوتا تو شاید وہ غصے میں وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا۔

میں نے صورتحال کو کشیدہ ہوتے دیکھا تو ہادی کے پاس پہنچ گئی۔ پھر اسے نشست گاہ تک لانے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ انسانی پیکروں سے باہر نکل آنے کے بعد مجھے اور عارج کو کہیں بھی آنے جانے میں آسانی ہو گئی تھی۔

اپنی ناگواری پر قابو پاتے ہوئے ہارون نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ہادی کو تعظیم دی۔ ہادی نے سر کے خفیف سے اشارے کے ذریعے ہارون کی تعظیم کا جواب دیا اور اینٹھا ہوا سا اپنی مسند پر بیٹھ گیا۔ اخلاقاً اس نے اپنے چھوٹے بھائی سے خیر خیریت بھی نہ پوچھی اور کہا۔ "بولو تمہیں ہم سے کیا کہنا ہے؟"

"اے امیر المومنین! ہم عرصہ دراز سے بغداد میں ہیں۔" ہارون نے بات شروع کی۔ "ہمارا جی چاہتا ہے کہ بغداد سے باہر کہیں سیر و شکار کو نکل جائیں۔ ہمیں حضور سے اسی کی اجازت طلب کرنی تھی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ امیر المومنین مایوس نہیں کریں گے۔"

میری توجہ ہادی کے ذہن پر تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہارون اگر بغداد سے چلا گیا تو ولی عہدی کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔

"نہیں۔" میں ہادی کے دماغ میں بولی۔ "ہارون کو کہیں سے بھی بغداد طلب کیا جا سکتا ہے۔"

"ہاں کیوں نہیں!" ہادی میرے زیر اثر بڑبڑایا۔ پھر وہ بلند آواز میں ہارون سے مخاطب ہوا۔ "ہم تمہیں بغداد سے جانے کی اجازت تو دیتے ہیں' مگر ہمارے طلب کرنے پر بلا تاخیر یہاں آنا پڑے گا۔ یہ طلبی کسی بھی وقت ہو سکتی ہے۔"

"ہمیں منظور ہے۔ امیر المومنین کے حکم کی تعمیل ہر صورت میں کی جائے گی۔" ہارون نے یقین دہانی کرائی۔

"غالباً تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم ہمیں اپنی نقل و حرکت سے آگاہ رکھو گے۔" ہادی بولا' پھر پوچھا۔ "مزید اور کچھ؟"

"شکریہ اے امیر المومنین! ہمیں کچھ اور عرض نہیں کرنا۔ ہم اجازت چاہتے ہیں۔" ہارون نے کہا۔

ہادی نے زبان سے کچھ کہے بغیر دایاں ہاتھ بلند کر دیا۔ یہ سلوک عموماً ملازمین کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ ہاتھ کے اشارے سے جانے کی اجازت دی جائے۔ یہ دیکھ کر ہارون کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھرا مگر وہ کچھ بولا نہیں اور اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے عارج کو بھی اس کے پیچھے لپکتے دیکھا۔ عارج مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اگر خلیفہ ہادی نے اجازت دے دی تو وہ یہ کوشش کرے گا کہ ہارون اسی روز بغداد سے نکل جائے یوں گویا ہارون اس خبیث عفریت کی پہنچ سے دور ہو جاتا جس نے ولی عہدی سے ہارون کی دست برداری کا دعویٰ کیا تھا۔

خلیفہ ہادی نشست گاہ میں تنہا رہ گیا تو میں نے لمحہ بھر بھی ضائع کیے بغیر عالم سوما کی ہدایات پر عمل شروع کر دیا۔

''اے ہادی! کیا تجھے خبر ہے کہ تیرا وزیر ابراہیم حرانی آج رات خلوت میں تجھ سے جسے ملوانے لا رہا ہے' وہ کون ہے؟'' میں نے ہادی کے دماغ میں سرگوشی کی۔ اسے میں اپنے اثر میں لے چکی تھی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے ہادی سے مزید کہنا شروع کیا۔ ''تو یقیناً نہیں جانتا ہوگا کہ وہ بوڑھا کون ہے! میں تجھے اس کے بارے میں بتاتی ہوں کہ وہ کس قدر خطرناک ہے! اور تیری حکومت کیلئے کتنا بڑا خطرہ ثابت ہو سکتا ہے! تیرے لیے صرف اتنا جان لینا بھی کافی ہونا چاہئے کہ یہ بوڑھا' شہر کوفہ میں خلافت کے دعویدار عیسیٰ بن موسیٰ کا دست راست رہ چکا ہے۔ اس بوڑھے کا پورا نام سلیمان بن داؤد ہے۔ استخوانی چہرے والے اس بوڑھے کو اہل کوفہ آج بھی بھولے نہ ہوں گے۔ تجھے چاہئے کہ عامل کوفہ اسحٰق بن صباح کے پاس فوری طور پر کوئی تیز رفتار قاصد بھیج۔ اسے لکھ کہ دو تین ایسے افراد کو فوراً بغداد بھیج دے جو عیسیٰ کے اس دست راست کو پہچان سکیں۔''

جب میں یہ سرگوشیاں کر رہی تھی تو ہادی کے ذہن میں سوال پیدا ہوا۔ ''میں اس بوڑھے سے ملاقات نہ کرنے کا کیا سبب بتاؤں گا؟''

''تو خلیفہ ہے اور خلیفہ ہی بن کے رہ!'' میں نے اسے تاکید کی۔ ''وزیر ہو یا کوئی اور کسی کو اپنے اوپر اتنا حاوی نہ ہونے دے کہ وہ تجھ سے جواب طلبی کرنے لگے۔ ابراہیم حرانی تیرے بچپن کا دوست سہی مگر اسے یہ اختیار نہیں کہ تیری مرضی کے خلاف تجھ سے کسی کو ملوا سکے۔ اپنے وزیر کو طلب کرکے کہہ دے' تو آج رات اس بوڑھے سے نہیں ملے گا۔ جب تیری طرف سے باریابی کی اجازت مل جائے تو وہ بوڑھے کو بغرض ملاقات ساتھ لے آئے۔'' میں نے ہادی کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی کہ بوڑھا سلیمان اس کے خاندان کا دشمن ہے۔

ادھر میں نے ہادی کے ذہن کو اپنی گرفت سے آزاد کیا' ادھر اس نے اپنے خادم خاص کے ذریعے میر منشی کو طلب کر لیا۔

اب میرے وہاں رکے رہنے کی مزید ضرورت نہیں تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ہادی کو اپنے اثر میں لے کر میں نے جو احکام دیئے ہیں' ان پر وہ فوری عمل کرے گا۔ بوڑھے عیار عفریت کے کھیل کو میں نے ناکام بنانے کی ابتدا کر دی تھی۔ کوئی عیار اور انتہائی چالاک آدم زاد ہو کہ جن زاد' کبھی نہ کبھی اس سے حماقت سرزد ہو ہی جاتی ہے۔ ایسی ہی حماقت اس عفریت سے ہوئی تھی۔ اسے بوڑھے سلیمان کے انسانی قالب میں ظاہر نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس عرصے میں مجھے فائقہ کا خیال بھی آیا۔ وہ موسیٰ بن کعب کے حرم میں تھی۔ وہ بھی بوڑھے سلیمان کو پہچان سکتی تھی' مگر اس بدنصیب آدم زادی کو میں نے اس معاملے سے دور ہی رکھا۔ معلوم نہیں اس طرح فائقہ کیلئے کیا نئی الجھن پیدا ہو جاتی۔

اسی دن شام سے کچھ پہلے ہارون الرشید اپنی بیوی زبیدہ بیگم' کنیزوں' غلاموں اور محافظ دستے کو ساتھ لے کر بغداد سے نکل گیا۔ میری اور عارج کی یہ بڑی کامیابی تھی۔ ہماری کوششیں بارآور ثابت ہوئی تھیں۔ دوسری جانب ہادی نے میری ہدایت کے مطابق اپنے وزیر ابراہیم حرانی کو تاکید کر دی تھی کہ جب وہ باریابی کی اجازت دے تو بوڑھے سلیمان کو اس سے ملوایا جائے۔

ابراہیم نے تعلقات دیرینہ کی بنا پر وجہ پوچھی تو ہادی برہم ہو گیا' بولا۔ ''اے ابراہیم تجھے کس نے یہ اختیار دیا کہ ہم سے جواب طلبی کرے!''

''غلطی ہو گئی اے امیر المومنین!..... غلام کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ.....''

ہادی نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا۔ ''ہمیں تم سے مزید کلام نہیں کرنا! ..... تم جا سکتے ہو.....''

اپنا سا منہ لے کر ابراہیم قصر خلافت سے واپس آ گیا۔ خلیفہ کی تیوریوں پر بل پڑنے کا مطلب اس سے زیادہ بھلا اور کون سمجھتا۔ وہ اس مملکت کا وزیر تھا۔ خلیفہ کے مزاج کی اس تبدیلی کا سبب وہ بہر حال نہیں سمجھا ہوگا۔ ایک ابراہیم حرانی ہی کیا' خلیفہ ہادی کی چاپلوسی کرنے والے امراء اور حاضر باش سبھی اس پر حیران تھے کہ ہادی نے ہارون کو بغداد سے نکل جانے کی اجازت کیسے دے دی۔

دوسرے روز صبح کوفہ بھیجے جانے والا قاصد بغداد واپس آ گیا۔ اس کے ہمراہ تین

ایسے افراد تھے جو بوڑھے سلیمان کو پہچان سکتے تھے۔ عامل کوفہ نے جواب میں لکھا تھا کہ استخوانی چہرے والے بوڑھے سلیمان کو عیسیٰ بن موسیٰ کے دست راست کی حیثیت سے اہل کوفہ کی اکثریت خوب پہچانتی ہے۔ اس غرض سے تین افراد کو بھیجا جا رہا ہے۔ میں اس پورے معاملے پر نظر رکھے ہوئے تھی کہ دیکھوں' اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

ابراہیم حرانی کی اطلاع کے مطابق بوڑھا سلیمان محلہ کرخ کی ایک سرائے میں ٹھہرا ہوا تھا۔

"ان تینوں افراد کو اپنے ساتھ کرخ کی اس سرائے میں لے جاؤ جہاں وہ بوڑھا ٹھہرا ہوا ہے جس سے تم مجھے ملوانا چاہتے ہو۔" ہادی نے ابراہیم کو طلب کر کے حکم دیا۔ ابراہیم حیران حیران سا کوفہ سے آنے والوں اور ہادی کو دیکھتا رہا۔ اس پر ہادی ڈپٹ کر بولا۔ "جاؤ!"

وزیر ابراہیم ٹپٹا گیا اور فوراً ہی ان تینوں افراد کو اپنے ساتھ لے کر دیوان خاص سے نکل گیا۔

کوفہ سے آنے والوں کو ہادی نے پہلے ہی ہدایت کر دی تھی کہ بوڑھے سلیمان کی شناخت کے بعد انہیں قصر خلافت لوٹنا ہے۔

میرا جی تو بہت چاہا کہ میں بھی ان آدم زادوں کے پیچھے پیچھے یہ ماجرا دیکھنے جاؤں مگر خود پر قابو پا لیا۔ اس عفریت سے میں جس قدر دور رہتی اچھا تھا۔ دور دور رہ کر بھی تو سب کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ میں نے بطور احتیاط یہی کیا۔

کرخ سے اہل کوفہ کی واپسی ہوئی تو خلیفہ ہادی کو فوراً مطلع کر دیا گیا۔ ہادی نے دیوان خاص میں ان سے ملاقات کی۔ وزیر ابراہیم ان کے ساتھ نہیں تھا۔ ہادی کے استفسار پر ان میں سے ایک بولا۔ "اے امیر المومنین! ہم وزیر محترم کے ساتھ کرخ کی اس سرائے میں پہنچے تو پتا چلا' گزشتہ رات ہی بوڑھا سلیمان سرائے چھوڑ کر جا چکا ہے۔ سرائے کے مالک اور ملازمین سے ہم نے حلیے کی تصدیق کر لی۔ وہاں ہفتہ بھر سے قیام کرنے والا عیسیٰ ہی کا دست راست بوڑھا سلیمان ہی تھا۔ جو بھی ایک بار اس کا چہرہ دیکھ لے' اسے بھول نہیں سکتا۔"

ان تینوں کوفہ والوں کو رخصت کر کے ہادی نے اپنے وزیر ابراہیم حرانی کو طلب کیا۔

کچھ دیر میں جب وزیر ابراہیم حاضر ہو گیا تو ہادی نے اس سے پوچھا۔ "اس پراسرار بوڑھے سے تمہاری آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟"

"اے امیر المومنین! آپ کا یہ غلام کل بعد نماز مغرب اس سے ملا تھا۔" ابراہیم حرانی نے جواب دیا۔

"تم اس سے ملنے کیوں گئے تھے؟" خلیفہ ہادی کا لہجہ سخت تھا۔ یوں جیسے وہ جواب طلب کر رہا ہو۔

"اسے آگاہ کرنا مقصود تھا اے امیر المومنین کہ آپ نے اس سے ملاقات منسوخ کر دی......"

ہادی بول اٹھا۔ "کیا تمہارے دماغ سے یہ بات محو ہو گئی تھی اے ابراہیم کہ تم کوئی معمولی آدمی نہیں' ہمارے وزیر ہو۔ پھر تم خود کیوں دوڑے دوڑے کرخ کی اس سرائے تک گئے؟ تم نے اس بوڑھے کو طلب کیوں نہ کیا؟"

"اے امیر المومنین! دراصل یہ غلام' اس بوڑھے کے کمالات دیکھ کر بہت زیادہ متاثر ہو گیا تھا۔" ابراہیم حرانی کی آواز میں عاجزی تھی۔

"تم بے وقوف ہوا اے ابراہیم! اسی لیے اس عیار بوڑھے کی باتوں میں آ گئے۔"

"بجا ارشاد فرمایا اے امیر المومنین! اس غلام کو اپنی بے وقوفی کا اعتراف ہے۔"

ہادی جو اپنے وزیر سے اس کی حماقت کا اعتراف کرا رہا تھا' خود بھی کم بے وقوف نہیں تھا۔ اس نے بوڑھے سلیمان کے متعلق وہ سب کچھ ابراہیم کو بتا دیا جو میں نے اس کے دماغ میں ڈالا تھا۔ آخر میں اس نے کہا۔ "ہم یقیناً کسی سازش سے بچ گئے اے ابراہیم!"

"اس میں کیا شبہ ہے اے امیر المومنین!" ابراہیم نے فوراً اقرار میں سر ہلایا' پھر مشورہ دیا۔ "کیوں نہ اس عیار بوڑھے کی گرفتاری پر کوئی انعام مقرر کر دیا جائے۔ شناخت کی غرض سے پوری مملکت میں اس کے حلیے کی تشہیر کر دی جائے گی۔"

"نہیں۔" خلیفہ ہادی نے انکار کر دیا۔ "اس طرح ہم اسے شہرت کیوں دیں! خاک ڈالو اس پر!"

ہادی نے تو خبیث عفریت پر خاک ڈالنے کو کہہ دیا تھا مگر میرے یا عارج کیلئے یہ آسان نہیں تھا۔ اس طرح اچانک غائب ہو کر وہ ہماری نظر میں اور بھی زیادہ خطرناک ہو گیا تھا۔ دشمن آنکھوں سے اوجھل ہو تو خطرہ اور بڑھ جاتا ہے کہ نہ جانے کب اچانک وہ سامنے آ جائے۔

عارج نے مشورہ دیا کہ ان حالات میں ہمیں عالم سوما کی رہنمائی ضرور حاصل کرنی

چاہئے۔

ہم اسی شب عالم سوما سے ملے اور اسے تمام حالات بتا کر اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔

"میرے بچو! میں تمہاری طرف سے غافل نہ تھا۔ تم نے جو کچھ بتایا' مجھے معلوم تھا۔" عالم سوما کہنے لگا۔ "مجھے تو اس پر خوشی ہے کہ تم دونوں نے بروقت اور مناسب اقدامات کر کے اس عفریت کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ مجھے کسی بھی مرحلے پر مداخلت نہیں کرنی پڑی۔"

"تیری حوصلہ افزائی کا شکریہ اے سوما!" میں بولی۔ "یہ بتا کہ ہم اب بھی قصر خلافت میں رہیں یا نہ رہیں؟"

"کیوں' اب کیا ایسی بات ہوگئی اے دینار!" عالم سوما نے کہا۔ "تو نے تو اس عفریت کو انسانی قالب میں دیکھ لیا' مگر مجھے یقین ہے اس کی نظر تجھ پر نہیں پڑی۔ ایک تو یہ کہ تو جیلہ کے انسانی قالب میں تھی' دوسرے تیرے گرد نادیدہ حفاظتی حصار قائم تھا۔ یہی صورت عارج کے ساتھ رہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم دونوں جیسے پہلے وہاں رہ رہے تھے۔ ویسے ہی رہو! خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اگر خدانخواستہ کبھی وہاں تمہیں خطرہ محسوس ہو تو سیدھے ان کھنڈرات میں میرے پاس چلے آنا۔"

عالم سوما نے ہمیں مطمئن کر دیا تو ہم بغداد کے قصر خلافت میں واپس آ گئے۔

ہمارے شب و روز اطمینان و سکون سے گزر رہے تھے کہ خلیفہ ہادی کو اس کے حاضر باشوں نے ایک بار پھر ہارون کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ بغداد سے رخصت ہوئے ہارون کو چالیس روز گزر چکے تھے۔ اس کے بارے میں پتہ لگا لیا گیا تھا کہ وہ موصل میں ہے۔

"برادر خورد ہارون کو آخر ایسی کیا مشکل پیش آ گئی کہ بغداد سے اتنی دور رہنا پسند کیا!" خلیفہ ہادی نے بھرے دربار میں ہارون پر طنز کیا۔ پھر اس نے اسی وقت ہارون کی طلبی کا حکم دیا۔ اسی دن یہ حکم تحریری طور پر خلیفہ ہادی کے دستخط و مہر کے ساتھ ہارون کو موصل روانہ کر دیا گیا۔ ان دنوں موصل کا عامل عبدالملک بن صالح تھا۔ ہادی نے اس کے نام بھی حکم بھیجا کہ ہارون کو موصل میں نہ رہنے دیا جائے! ایک عامل کو اپنے ہی خاندان کے ایک اہم فرد کے بارے میں اس نوع کا حکم بھیجنا کوئی مناسب اقدام نہیں تھا۔ ایسی صورتحال میں عامل عموماً

طرح دے جاتے ہیں۔ انہیں یہ خیال ہوتا ہے کہ برسر اقتدار خاندان کے جس فرد کے خلاف وہ قدم اٹھا رہے ہیں' آئندہ وہی تخت و تاج کا مالک بنا تو ان کی جان آفت میں آ جائے گی۔ کچھ کم عقل ہی ایسے ہوتے ہیں جو ان نزاکتوں کو نہیں سمجھتے۔ عبدالملک بھی ایسے ہی آدم زادوں میں سے تھا۔ اس کا نتیجہ اسے آئندہ بھگتنا پڑا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ عبدالملک جیسے کم عقلوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

چند روز کے بعد موصل سے ہارون کا جواب آیا کہ وہ علیل ہے اور علالت کے سبب سفر کرنے سے قاصر ہے۔ اس موقع پر موصل کے عامل عبدالملک نے جو پیغام بھیجا' اسے پڑھ کر خلیفہ ہادی مشتعل ہو گیا۔ عبدالملک نے لکھا تھا کہ جب میں امیرالمومنین کا حکم نامہ آپ کے برادر خورد ہارون الرشید کے پاس لے کر گیا تو انہوں نے کہا' لکھ دو کہ ہم بیمار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پوری طرح صحت مند و تندرست ہیں۔ غلام کا خیال ہے کہ وہ علالت کے بہانے موصل میں مزید قیام کرنا چاہتے ہیں۔ امیرالمومنین کا حکم ہو تو ہارون الرشید کو بزور طاقت موصل سے نکال دیا جائے۔ پیغام کے الفاظ اشتعال دلانے والے ہی تھے۔

خلیفہ ہادی نے حاکم موصل عبدالملک کو لکھا' ہم خود موصل آ رہے ہیں۔ اس کے بعد ہادی نے فوج کو تیاری کیلئے دو ہفتے کا وقت دیا۔

دو ہفتے پلک جھپکتے گزر گئے۔ جس رات کی صبح مجھے اور عارج کو خلیفہ ہادی کے خدام کی حیثیت سے اس کے ساتھ موصل جانا تھا' عارج کہنے لگا۔ "تجھے یاد ہے اے دینار! ہم ہادی کے باپ مہدی کے حکم پر بھی بحیثیت خدام ساتھ گئے تھے۔"

"ہاں یاد ہے" میں بولی۔ "تو پھر؟...... کہنا کیا چاہتا ہے تو؟...... کچھ پتا تو چلے!"

"خلیفہ مہدی کو ہمیں اپنے ساتھ لے جانا راس نہیں آیا تھا۔" عارج نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ ہادی کو بھی یہ سفر بھاری پڑے گا۔"

"مجھے تو یہ سب تیری توہم پرستی لگتی ہے اے عارج!" جو بات میرے دل میں تھی' میں نے صاف صاف کہہ دی۔

"یہ میری توہم پرستی نہیں اے دینار!...... مہدی اور ہادی کے سفر میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ مہدی نے ہادی کو طلب کیا تھا جو بغداد نہیں آیا۔ گویا اس نے خلیفہ وقت کی نافرمانی کی۔ کم و بیش یہی صورتحال اب ہے۔ خلیفہ ہادی نے ہارون کو طلب کیا مگر وہ نہیں آیا' یعنی اس نے بھی خلیفہ وقت کا حکم نہیں مانا۔ مہدی نے ہادی کو اس کی نافرمانی پر سزا دینے کیلئے

فوج کشی کا فیصلہ کیا۔ اسی فیصلے کے تحت وہ بغداد سے فوج لے کر نکلا۔ اب ایسا ہی ہادی کر رہا ہے۔'' عارج کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''تیرا یہ کہنا درست ہے کہ واقعات میں مماثلت پائی جاتی ہے' لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ مہدی کی طرح ہادی بھی اپنی منزل تک نہ پہنچے۔ پھر یہ نہ بھول اے عارج کہ بغاوت اور مجبوری یا مصلحت وقت میں فرق ہوتا ہے۔ ہادی کا عمل اس وقت باغیانہ تھا جب کہ ہارون مصلحت وقت کے سبب بغداد نہیں آیا۔ بول کیا میرا خیال غلط ہے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے عارج کی طرف دیکھا۔

''میں کبھی تجھ سے بحث میں جیتا ہوں جو آج ایسا سوچوں۔'' عارج نے بات کا رخ ہی بدل دیا۔ ''ویسے میں تجھے آج راز کی ایک بات بتا ہی دوں اے دینار!...... تجھ سے ہار جانے ہی میں مجھے اپنی جیت نظر آتی ہے۔''

''تجھے تو بس موقع ملنا چاہئے فضول باتوں کا!...... سو جا! کل صبح ہی صبح لشکر کوچ کرنے والا ہے۔ تو جانتا ہی ہے کہ ہادی کا غصہ ناک پر کھڑا رہتا ہے۔ معافی اور درگزر تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہیں۔ ہمیں دیر نہیں ہونی چاہئے۔''

معلوم نہیں اس رات عارج کے دل میں کیا نیکی آ گئی کہ مزید مجھے تنگ کیے بغیر سونے پر آمادہ ہو گیا۔

دوسرے دن لشکر بغداد سے موصل کیلئے روانہ ہوا تو عارج اور میں' ہم دونوں بدستور خلیفہ ہادی کی خدمت میں تھے۔

منزل بہ منزل سفر کرتا ہوا یہ لشکر ایک روز شام کے وقت موصل کی حدود میں داخل ہوا۔ عامل موصل عبدالملک بن صالح' خلیفہ ہادی کا استقبال کرنے شہر سے باہر موجود تھا۔ اسی سے خلیفہ ہادی کو پتا چلا کہ ایک روز قبل ہی ہارون' موصل سے جا چکا ہے۔

''تو نے اسے روکا کیوں نہیں؟'' ہادی کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنے لگا۔ کھمبا گویا اس کے نزدیک عامل موصل تھا۔

''اے امیرالمومنین! آپ کا حکم یہ تھا کہ میں ہارون الرشید کو موصل میں نہ رہنے دوں۔ رفتہ رفتہ میں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ وہ خود ہی یہ شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ اگر حضور کا حکم یہ ہوتا کہ میں انہیں روک لوں تو......''

''مگر ہم نے تجھے یہ بھی تو لکھا تھا کہ خود موصل آ رہے ہیں۔'' ہادی نے عامل

موصل کی بات کاٹ دی۔ ''کیا یہ اس بات کا اشارہ نہیں تھا کہ ہماری آمد تک تجھے ہارون کو موصل ہی میں روکے رکھنا ہے۔ بتا کہ ہارون یہاں سے کہاں گیا ہے؟''

عامل موصل عبدالملک کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ بمشکل بولا۔ ''غلام کو اس کا علم نہیں اے امیرالمومنین!''

''تجھ پر خدا کی لعنت ہو اے بے خبر و بدبخت!'' ہادی غصے میں کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔

بغداد سے چلتے وقت طبیبوں نے ہادی کو اتنا طویل سفر نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ان کے خیال میں ہادی کی صحت طویل سفر کی متحمل نہیں تھی۔ موصل سے دو منزل پہلے ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ طبیبوں نے نبیذ پینے پر پابندی لگا دی' مگر ہادی نے ایک نہ سنی۔ غصہ نہ کرنا بھی طبیبوں کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں میں سے ایک پابندی تھی۔ ہادی نے غصہ کیا تو اس کا سانس پھولنے لگا۔ اسی کو دیکھ کر امراء اور سرداران فوج نے اسے سمجھایا۔ ہادی کو سمجھانے والوں میں اس کا وزیر ابراہیم حرانی بھی شامل تھا۔ وہ بڑبڑانے لگا۔

''اے امیرالمومنین! آپ فکر نہ کریں۔ ہارون الرشید کو ہم ڈھونڈ نکالیں گے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ انہیں ولی عہدی سے بہ جبر دست بردار ہونے پر مجبور کیا جا سکے۔ انہوں نے ہمارے صبر کا بہت امتحان لے لیا' اب مزید گنجائش نہیں۔''

اپنے ارکین سلطنت کے سمجھانے بجھانے پر ہادی کا غصہ کچھ کم ہوا اور مزید نہ بولا۔

عراق کے ہر بڑے شہر میں خلیفہ وقت کیلئے عالی شان محل بنے ہوئے تھے۔ موصل میں بھی ایسا ہی ایک محل تھا۔ اس محل کی زیب و زینت اور آرائش بے مثال تھی۔ ہادی نے وہیں قیام کیا۔

دوسرے ہی روز ہادی نے مخبروں کو مختلف سمتوں میں دوڑایا۔ انہیں یہ سراغ لگانا تھا کہ ہارون کہاں ہے؟ یا اگر سرگرم سفر ہے تو اس کا قصد کدھر کا ہے۔ اب ہادی پر یہ جنون سوار ہو گیا تھا کہ وہ زبردستی ہارون کو ولی عہدی سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دے گا۔ یہی سوچ کر ہادی نے اپنے ہم نوا امراء اور ارکین سلطنت سے نوعمر بیٹے جعفر کی بیعت لینا بھی شروع کر دی تھی۔

طبیب اپنی سی کوششیں کرتے رہے مگر ہادی کی طبیعت اور بگڑتی گئی۔ لاکھ سمجھانے

پر بھی وہ بد پرہیزی سے باز نہیں آتا تھا۔ اسی اثنا میں اسے ایک مخبر کے ذریعے یہ خبر لگی کہ ہارون بغداد پہنچنے والا ہے۔

"ہارون نے ہمارے ساتھ یہ فریب کیا۔" ہادی غصے سے چیخ اٹھا۔ "وہ یہاں موصل آیا اور جب ہم نے اسے بغداد طلب کیا تو اس نے علالت کا بہانہ کر دیا۔ اسے یقین ہو گا کہ ہم اس کے تعاقب میں موصل تک پہنچ جائیں گے۔ سو اس نے ہمیں یوں ہمارے دارالحکومت سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور ...... اور خود وہاں ...... دارالحکومت بغداد پہنچ گیا۔ ہم ...... ہم اسے وہاں چین سے نہیں رہنے دیں گے ...... بغداد ہمارا ہے۔" ہادی یہ کہتے ہوئے بے ہوش ہو گیا۔

طبیبوں نے ہادی کی حالت دیکھی تو ان کے چہروں سے فکرمندی کا اظہار ہونے لگا۔ ہادی کی تیمارداری کیلئے میں قریب ہی موجود تھی۔ آپس میں طبیب جو گفتگو کر رہے تھے میں بھی سن رہی تھی' مگر اس طرح جیسے میری توجہ ادھر نہ ہو۔

"اگر یہی حال رہا تو میرے منہ میں خاک امیرالمومنین کی زندگی کو خطرات بھی لاحق ہو سکتے ہیں۔" ایک طبیب کہنے لگا۔ "انہیں ہر حال میں فکر اور غصے سے بچانا ہے...... مگر اس کیلئے کیا تدبیر اختیار کی جائے؟"

"اس کی تو بس ایک ہی صورت ممکن ہے کہ امیرالمومنین جب تک بستر علالت پر ہیں' ان سے کسی کو بھی ملاقات نہ کرنے دی جائے۔" دوسرے طبیب نے تجویز پیش کی' پھر خود ہی بولا۔ "لیکن ملاقاتوں پر پابندی لگائے گا کون؟"

اس دوران میں وزیر ابراہیم حرانی بھی ہادی کی طبیعت خراب ہونے کے متعلق سن کر وہاں آ گیا' اس نے کہا۔ "امیرالمومنین کے سوا یہ اختیار کسی کو نہیں کہ وہ کسی کو بھی باریابی کی اجازت نہ دیں۔"

"تو پھر ہم امیرالمومنین ہی سے یہ گزارش کرتے ہیں۔" خلیفہ ہادی کا طبیب خاص کہنے لگا۔

طبیب خاص کے معاون اس عرصے میں ہادی کو دنیائے غفلت سے باہر لانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کیلئے انہوں نے ہادی کو کئی دوائیں سنگھائیں۔ آخرکار ہادی کو ہوش آ ہی گیا۔

"اے امیرالمومنین! طبیب خاص اور ان کے دیگر معاون طبیب آپ سے ایک

درخواست کرنا چاہتے ہیں۔" ابراہیم حرانی بولا۔

"یہ ہم سے خود ہم کلام ہو سکتے ہیں' اجازت ہے۔" ہادی کی آواز میں نقاہت تھی۔

طبیب خاص نے اپنی بات بڑی نرمی اور شائستگی سے کی۔ اس پر بھی ہادی کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"تو تم سب طبیبوں کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہم کاروبار حکومت سے لاتعلق ہو جائیں۔" ہادی کا لہجہ سخت تھا۔ "نہ ہم کچھ معلوم کریں' نہ ہمیں کوئی بات بتائی جائے ...... گویا ہم قطعی طور پر بے خبر و لاعلم رہیں کہ ہماری حدود سلطنت میں کہاں اور کیا ہو رہا ہے!"

"حکومت و سلطنت آپ کی جان سے زیادہ تو نہیں اے امیرالمومنین!" تجربے کار و ذہین طبیب خاص نے دل کو لگتی بات کی۔

چند لمحوں کو سکوت چھا گیا۔ ہادی کی تیوریوں پر پڑے ہوئے بل غائب ہونے لگے۔ پھر وہ ٹھنڈا سانس بھر کے بولا۔ "ہمیں اپنی جان کی سلامتی کے خیال سے طبیبوں کا مشورہ قبول ہے' مگر ہماری علالت کو شہرت نہ دی جائے۔ اس وقت تک کیلئے جب تک ہم صحت یاب نہ ہو جائیں' تمام اختیارات اپنے وزیر ابراہیم حرانی کو دیتے ہیں۔"

میں نے کن انکھیوں سے ابراہیم حرانی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بہار سی آ گئی تھی۔

"غلام پوری کوشش کرے گا کہ امیرالمومنین کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچے۔" ابراہیم حرانی ادب سے ہادی کے سامنے جھکا۔

جان کسے پیاری نہیں ہوتی! اس روز کے بعد سے خلیفہ ہادی نے خود کو جیسے طبیبوں کے حوالے کر دیا۔ صرف طبیب اور ذاتی خدام ہی ہادی سے مل سکتے تھے۔ ان کے سوا کسی کو بھی ملاقات کی اجازت نہیں تھی۔ طبیبوں کے مشورے پر ہی اسے خوراک دی جاتی۔ نبیذ پینے کی سختی سے ممانعت تھی۔ طبیب خاص کے معاونین ہمہ وقت ہادی کی نگرانی کرتے تھے۔ ہادی کو انہی کی مرضی کے مطابق کھانے اور پینے کو دیا جاتا۔ طبیب کھانے پینے کی ہر شے کا معائنہ کرتے۔ اس کا نتیجہ بہتر نکلا۔ چند ہی روز میں ہادی بستر سے اٹھ کر پہلے عارج کے انسانی قالب ایوب کے سہارے' پھر خود ہی چہل قدمی کرنے لگا۔ اب اس کے رخساروں کی زردی پہلے کی نسبت کم ہو گئی تھی۔

ایک روز شام کو اس نے گھڑسواری کی خواہش ظاہر کی۔ طبیبوں نے اسے بغور دیکھ

کر محل ہی کے سبزہ زار میں گھوڑے پر سوار ہو کر ایک چکر لگانے کی اجازت دے دی۔ ہادی کافی دن کے بعد گھوڑے پر سوار ہوا تو اس نے ایک چکر کے بجائے سبزہ زار کے کئی چکر لگا ڈالے۔ پھر وہ گھوڑے کی پشت سے کود کر اترا۔ غالباً اس طرح وہ اپنی جسمانی طاقت کو آزمانا چاہتا تھا۔

''ہم صحت یاب ہو گئے......علالت رخصت ہو گئی!'' ہادی جوش جذبات میں باآواز بلند کہنے لگا۔ ''ہم نے خود کو آزما کر دیکھ لیا اور ہم اس آزمائش پر پورے اترے۔ ہم ......اب ہم بغداد جا سکتے ہیں۔''

طبیب خاص نے اس وقت تو ہادی سے کچھ نہ کہا' مگر بعد میں سمجھایا۔ ''اے امیرالمومنین! سفر ابھی آپ کیلئے مناسب نہیں۔''

''جب ہم بغداد سے چلے تھے تو تم نے اس وقت بھی یہی کہا تھا۔'' ہادی نے کہا۔ ''مگر دیکھ لو کہ ہم بخیر و عافیت موصل پہنچ گئے اور تم دیکھو گے کہ اسی طرح ہمیں بغداد پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ تم نہیں جانتے کہ ہمارا جلد از جلد بغداد پہنچنا کس قدر ضروری ہے! ہم نے اب تک تمہارے مشوروں پر عمل کیا اور پھر اپنی قوت و طاقت کا اندازہ بھی کر لیا یقیناً ہم اس قابل ہیں کہ سفر کر سکیں۔''

یہ سن کر طبیب خاص نے محض ایک ماہ مزید علاج و آرام کیلئے کہا۔

''بہت ہو گیا۔ آرام!......اب ہم تمہاری کوئی بات نہیں مانیں گے! تم جا سکتے ہو۔''

ہادی نے یہ کہہ کر مجھے میرے انسانی قالب کے نام سے پکارا۔ ''اے جمیلہ! وزیر ابراہیم حرانی کو ہماری طرف سے اسی وقت طلبی کا حکم بھجوا دو۔'' اس دوران میں طبیب خاص دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں ادب سے ہادی کے سامنے جھکی اور اس کی خواب گاہ سے باہر آ گئی۔ دروازے پر محافظ دستے کا نگران سعد موجود تھا۔ میں نے وزیر کی طلبی سے اسے آگاہ کیا اور خواب گاہ میں لوٹ آئی۔ کچھ ہی دیر میں وزیر ابراہیم حرانی آ گیا۔

''اے ابراہیم! اب وہ وقت آ گیا ہے جس کا ہمیں ایک مدت سے انتظار تھا۔'' ہادی کہنے لگا۔ ''ہم بہ عجلت بغداد پہنچ کر بہ جبر ہارون کو ولی عہدی سے دست بردار کر دیں گے۔ ہمیں بتاؤ کہ لشکر موصل سے کب تک بغداد کیلئے کوچ کر سکتا ہے؟''

''اے امیرالمومنین! آپ کے اس غلام نے مصلحت وقت کے پیش نظر لشکر کو تیاری

کی حالت ہی میں رکھا ہے۔'' ابراہیم نے جواب دیا۔

''بہت خوب اے ابراہیم! تم نے ہمارا جی خوش کر دیا۔'' ہادی خوش ہو کر بولا۔ ''ہماری طرف سے اعلان کرا دو کہ کل صبح ہی لشکر کوچ کرے گا۔''

''جو حکم امیرالمومنین!'' ابراہیم نے کہا اور پھر ہادی کے ہاتھ کا اشارہ پا کر رخصت ہو گیا۔

''اب تو بھی جا اے جمیلہ!'' ہادی مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ہمیں فی الحال تیری خدمت کی ضرورت نہیں۔''

''بہتر ہے امیرالمومنین!'' میں اسے تعظیم دے کر اس کی خواب گاہ سے نکل آئی۔

وہ رات میں نے سکون سے سوتے ہوئے گزاری ورنہ جب سے ہادی بیمار پڑا تھا میری اکثر راتیں جاگتے گزری تھیں۔

ہادی کے حکم پر دوسرے روز صبح لشکر موصل سے بغداد کیلئے روانہ ہو گیا۔ ضدی و خودسر خلیفہ ہادی نے طبیبوں کے مشورے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راستے ہی میں ہادی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ وہ بیماری کے سبب خود گھڑسواری کے قابل نہ رہا تو اس نے ابراہیم حرانی کے گھوڑے پر بیٹھ کر بقیہ سفر کیا۔ لشکر بغداد پہنچا تو ہادی خود گھوڑے سے نہ اتر سکا۔ قصر خلافت کے صدر دروازے پر گھوڑا روک کر وزیر ابراہیم نے ہادی کو سہارا دے کے اتارا۔ سہارے کے بغیر ہادی چلنے سے بھی قاصر تھا۔ بمشکل اسے قصر خلافت کے مرکزی حصے تک پہنچایا گیا۔ چلتے ہوئے اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ اپنی نشست گاہ میں پہنچ کر ہادی نے ہارون کو طلب کر لیا۔ اس نے اپنی حالت کا خیال بھی نہ کیا۔ تکیوں کے سہارے وہ اپنی مسند پر نیم دراز تھا۔

''اے ہارون! تم نے شاید ہماری علالت کی خبر سن کر یہ سوچا ہو گا کہ......'' اتنا کہہ کر ہادی ہانپنے لگا۔ میں اس وقت خدمت میں تھی۔ اس نے پانی مانگا۔ صراحی سے نقشین کٹورے میں پانی نکال کر میں نے ہادی کو دیا تو چند گھونٹ پی کر وہ پھر ہارون سے مخاطب ہوا۔ ''دیکھ لو کہ ہم تمہارا پیچھا کرتے ہوئے بغداد تک پہنچ گئے۔ ہم تمہیں صرف کل صبح تک کی مہلت دیتے ہیں کہ ولی عہدی سے دست بردار ہو جاؤ ورنہ......'' ہادی نے دھمکی کے انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ہارون نے کچھ کہنا چاہا تو ہادی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ''اب ہمیں کچھ نہیں سننا! تم جا سکتے ہو۔''

لشکر سہ پہر کے بعد بغداد پہنچا تھا۔ عشا کے وقت تک عارج اور میں ہادی کی خدمت گزاری میں لگے رہے۔ پھر ہماری جگہ دوسرے خادموں نے لے لی۔ ہم اپنی قیام گاہ میں آ گئے۔ طویل سفر کی تھکن تھی، سو ہم رات کا کھانا کھاتے ہی بے خبر سو گئے۔

اچانک شور اٹھا اور میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے وہ رات یاد آ گئی جب ہادی نے ہارون پر قاتلانہ حملہ کرایا تھا۔ عارج بھی جاگ گیا اور میرے ساتھ باہر نکل آیا۔ قصر خلافت کے مرکزی حصے سے رونے پیٹنے کی آوازیں آ ئیں تو میں چونک اٹھی۔ اسی وقت میں نے سامنے والی راہداری میں ایک لونڈی کو بھاگتے دیکھا اور اسے پہچان گئی۔ اس کا نام لیلیٰ تھا اور وہ ملکہ خیزران کی لونڈی تھی۔

☆......☆......☆

علیم نوید کی "دینار" ابھی جاری ہے، بقیہ واقعات کیلئے حصہ دوئم ملاحظہ فرمائیں

دینار
(دوم)

ایک جن زادی کی پراسرار داستان
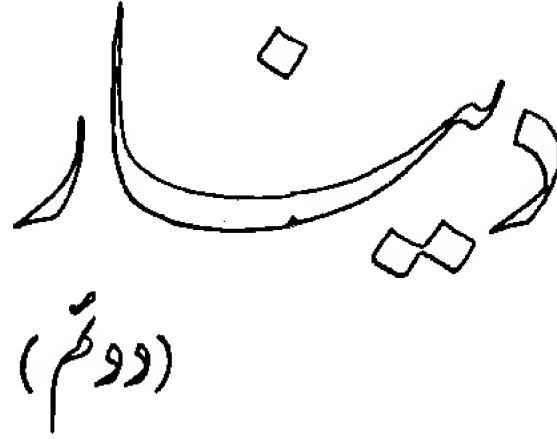
شمیم نوید

اسٹاکسٹ:-
مکتبہ القریش © سرکلر روڈ
اردو بازار، لاہور۲۔ فون:7668958
E.mail: al_quraish@hotmail.com

معیاری اور خوبصورت کتابیں

بااہتمام...... محمد علی قریشی

باراول ـــــــ جنوری 2005ء
مطبع ـــــــ نیر اسد پریس
سرورق ـــــــ ذاکر
کمپوزنگ ـــــــ وسیم احمد قریشی
قیمت ـــــــ -/250 روپے

اس طرح رات کے وقت اس لونڈی لیلیٰ کا بدحواس ہو کر بھاگنا میرے لئے انتہائی حیران کن تھا۔ دوسری جانب رونے پیٹنے کی آوازیں توجہ طلب تھیں۔ یہ آوازیں قصر کے اس مرکزی حصے کی طرف سے آ رہی تھیں جہاں خلیفہ ہادی کی سکونت تھی۔ مجھے اس نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ قصر خلافت میں کوئی بڑا واقعہ رونما ہوا ہے۔ آدم زادوں کے قالبوں میں رہ کر عارج اور میرے لئے حقیقت حال جاننا مشکل ہوتا ہے اسی سبب ہم دونوں ایوب اور جمیلہ کے جسموں سے باہر آ گئے۔

دوسرے ہی لمحے میں خلیفہ ہادی کی خواب گاہ میں تھی۔ اس کی خواب گاہ کو مسلح محافظوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ خواب گاہ کا منظر تعجب خیز تھا۔ خلیفہ ہادی اپنے بستر پر مردہ پڑا تھا۔ بستر کے قریب ہی موجود دریچہ کھلا ہوا تھا۔ جو دو خادم رات کے وقت خلیفہ کی خدمت پر مامور تھے انہیں میں نے فرش پر بے ہوش پڑے دیکھا۔ خواب گاہ کے باہر سے عورتوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ خلیفہ ہادی کے محافظ دستے کا نگراں سعد خواب گاہ کے دروازے پر اپنے عملے کے ساتھ موجود تھا۔

”حضور! مجھے شبہ ہے کہ وہ کوئی حبشی لونڈی تھی جسے میں نے دریچے سے کود کر بھاگتے دیکھا تھا۔“ محافظ دستے کا ایک سپاہی دھیمی آواز میں سعد سے مخاطب تھا۔ ”میں نے اسے للکارا بھی مگر وہ رکی نہیں اور آن کی آن میں نہ جانے کہاں غائب ہو گئی!“

”اے بے وقوف! اگر تو نے کسی کو بھاگتے دیکھا بھی ہے تو اس بات کو بھول جا ورنہ غفلت برتنے کی بنا پر نہ صرف تیری گردن مار دی جائے گی بلکہ بہ حیثیت نگراں میرے دامن تک بھی الزام اور تیرے لہو کے چھینٹے پہنچیں گے۔“ سعد نے اپنے ماتحت سپاہی کو نصیحت کی۔

خوف سے سپاہی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ ہکلایا۔ ”م...... میں...... میں نے کک...... کچھ نہیں دے...... دیکھا حضور...... کچھ نہیں!“

اسی وقت میں نے طبیب خاص اور اس کے معاونین کو آتے دیکھا۔ سعد اور محافظ

دستے کے عملے نے اُن کیلئے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ خلیفہ ہادی کی خواب گاہ میں داخل ہو گئے۔ انہیں سعد ہی نے خلیفہ کی موت کی تصدیق کیلئے بلوایا تھا۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔

طبیب خاص نے خلیفہ ہادی کے مردہ جسم کا جائزہ لیا۔ اس عرصے میں طبیب خاص کے معاون دونوں بے ہوش خادموں کو ہوش میں لے آئے۔ محافظ دستے کا نگراں سعد یہ دیکھ کر اندر آ گیا۔ اس نے خادموں سے بیہوشی کی وجہ پوچھی۔

''جب ایوب اور جمیلہ ہمیں یہاں چھوڑ کر گئے تھے تو ہم پوری طرح ہوش میں تھے۔'' ایک خادم بتانے لگا۔ ''بس کچھ ہی دیر کے بعد اچانک ذہن پر غنودگی چھانے لگی۔ میں نے اسے بھی اونگھتے دیکھا۔'' خادم نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ ''پھر مجھے نہیں معلوم کیا ہوا...... ابھی آنکھ کھلی ہے۔''

دوسرے خادم کا بیان بھی مختلف نہیں تھا۔ سعد نے ان دونوں خادموں کو اپنے سپاہیوں کی تحویل میں دے دیا۔

مجھے یہ سوال بار بار اضطراب میں مبتلا کر رہا تھا کہ خلیفہ ہادی کی خدمت پر مامور دونوں خادم جب بے ہوش تھے تو پھر یہ عقدہ کیسے کھلا' خلیفہ کا انتقال ہو چکا ہے؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کی غرض سے مجھے سعد کے ذہن پر توجہ دینی پڑی۔

کسی بھی فرد واحد کیلئے یہ ممکن نہیں کہ وہ شب و روز جاگ کر اپنے فرائض ادا کرتا رہے۔ یہی معاملہ سعد کے ساتھ تھا۔ عموماً رات کے وقت وہ سو جاتا تھا۔ اس کے ماتحت رات کو حفاظتی بندوبست سنبھالتے تھے۔

سعد گہری نیند میں تھا کہ اس کا ایک ماتحت دوڑتا ہوا آیا اور اسے جگا کر خبر دی کہ قصر کے مرکزی حصے سے کسی کو نکل کر بھاگتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ فوری طور پر سعد نے خلیفہ ہادی کی خواب گاہ کا رخ کیا۔ پھر اسی نے خلیفہ کے مردہ پائے جانے کی خبر اس کے لواحقین کو دی' اسی کے ساتھ طبیب خاص کو بلوا لیا۔ اپنے سوال کا جواب مل جانے پر میں نے سعد کے ذہن سے توجہ ہٹالی۔ اسی لمحے مجھے طبیب خاص کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے۔ سعد کے استفسار پر وہ کہنے لگا۔ ''اس میں تو کسی قسم کے شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ امیر المومنین ابو محمد موسیٰ الہادی کا انتقال ہو چکا ہے' لیکن مجھے شبہ ہے کہ ان کی موت طبعی نہیں بلکہ......''

طبیب خاص کچھ کہتے کہتے رک گیا تو سعد بول اٹھا۔ ''تو پھر؟...... امیر المومنین کے انتقال کی وجہ کیا ہے؟''

''حتمی طور پر کچھ کہنا تو مشکل ہے مگر...... مگر شاید امیر المومنین کا گلا گھونٹ کر مارا گیا

ہے۔ ان کی گردن دیکھ کر مجھے ایسا ہی لگا۔''

''لیکن کون؟...... امیر المومنین کو کون......'' سعد بوکھلا گیا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے جب کہ محافظ دستے کے سپاہی پوری طرح چوکنا تھے۔''

''مجھے جو شک تھا میں نے اس کا اظہار کر دیا' باقی آپ لوگ جانیں۔'' طبیب خاص کہنے لگا۔

میں نے بھی قریب جا کر خلیفہ ہادی کی لاش اور اس کے بستر کا جائزہ لیا تو طبیب خاص کا شک درست معلوم ہوا۔ خواہ کوئی آدم زاد کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو' وہ اپنا گلا دبائے جانے کی صورت میں کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں ضرور مارتا ہے۔ جگہ جگہ سے ہادی کے بستر کو سکڑے سمٹے دیکھ کر یہی پتا چلتا تھا کہ اس نے بھی موت سے بچنے کیلئے جدوجہد کی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ بے ہوش خادم' خواب گاہ کا کھلا دریچہ اور ایک حبشی لونڈی کو بھاگتے دیکھا جانا' تمام شواہد اسی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ خلیفہ ہادی کو قتل کیا گیا تھا۔ اسے قتل کرنے والی وہی سیاہ فام لونڈی لیلیٰ ہو سکتی تھی۔ جسے خود میں نے بھی بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔

میرے نزدیک خادموں کی بے ہوشی کا سبب ایک ہی ممکن تھا کہ ان دونوں کے کھانے میں بے ہوش کر دینے والی کوئی دوا ملا دی گئی ہو۔ مطبخ (باورچی خانہ) کے کسی ملازم یا ملازمہ کے ذریعے یہ کام بآسانی ہو سکتا تھا۔ ان دونوں کو رات بھر خلیفہ کی تیمارداری کرنی تھی' وہ اسی لئے اپنی قیام گاہوں سے رات کا کھانا کھا کر ہی چلے ہوں گے۔ خلیفہ کی خواب گاہ میں آنے کے کچھ دیر بعد بے ہوشی کی دوا اثر کرنے لگی ہو گی۔ یہی ان کے بیانات سے ظاہر تھا۔ اس پورے ہنگامے اور المیے کا مرکزی کردار میری نظر میں ملکہ خیزران کی حبشی لونڈی لیلیٰ ہی تھی۔ اس وقت میری سماعت میں ملکہ خیزران کے وہ الفاظ گونج رہے تھے' جب اسے خلیفہ ہادی نے زہر دلوانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ تب ملکہ خیزران نے ہارون سے کہا تھا' ہادی کی یہ جسارت ہم پر قرض ہے اور ہم یہ قرض وقت پر چکائیں گے۔ سو آج قرض چکانے ہی کی رات تھی۔

میرا اندازہ درست تھا یا محض واہمہ' یہ معلوم کرنے کی غرض سے میں حبشی لونڈی لیلیٰ کے پاس پہنچ گئی۔ لیلیٰ کا ذہن پڑھ کر مجھے سب پتا چل گیا ملکہ خیزران نے اپنی اسی وفادار لونڈی کے ذریعے اپنے نافرمان' خودسر اور ضدی بیٹے خلیفہ ہادی کو مروا دیا تھا۔ ملکہ نے لونڈی کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ اسے خلیفہ کی خواب گاہ میں خادم بے ہوش ملیں گے۔ ایسا ہی ہوا تھا۔

لیلیٰ جاتے ہوئے تو کسی طرح چھپ چھپا کر نکل گئی تھی' مگر واپسی میں محافظ دستے کے ایک سپاہی نے اسے دیکھ کر شور مچا دیا تھا۔ اس کے باوجود لیلیٰ بچ کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ لیلیٰ ہی نے خلیفہ ہادی کا گلا دبایا تھا جو بیماری اور کمزوری کے سبب اپنی حفاظت نہ کر سکا۔

یہ واقعہ ربیع الاول 170 ہجری کی سولھویں تاریخ کا ہے۔ یہ عجیب رات تھی۔ اسی رات کو خلیفہ ہادی کا انتقال ہوا اور ہارون الرشید تخت و تاج کا وارث ٹھہرا۔ وہ خلفائے عباسیہ کا پانچواں تاجدار تھا۔ اسی شب مستقبل کا ایک اور نامور خلیفہ مامون الرشید عالم وجود میں آیا۔ قصر خلافت کا شاید ہی کوئی رہنے والا ایسا ہو جو نہ جاگ اٹھا ہو۔ اراکین حکومت قصر میں آنے لگے تھے۔ خلیفہ ہادی کے انتقال کی خبر قصر خلافت تک محدود نہ رہ سکی تھی۔

اپنے انسانی قالب میں واپس جانے سے پہلے میں نے ہارون الرشید کا ردعمل جاننا ضروری سمجھا۔ میں یہ بھی پتا لگانا چاہتی تھی کہ ہارون بھی کیا اپنی ماں ملکہ خیزران کے قاتلانہ اقدام سے واقف تھا؟

میں جب ہارون کی اقامت گاہ میں داخل ہوئی تو یحییٰ بن خالد کو دیکھا۔ اس نے ہارون کی نشست گاہ میں قدم رکھا ہی تھا۔ ہارون کے خادم خاص مسرور نے یحییٰ سے بیٹھنے کو کہا اور پھر اندر چلا گیا۔

ذرا ہی دیر میں ہارون نشست گاہ کے اندرونی دروازے سے آیا تو چہرے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ابھی جاگا ہے۔

یحییٰ نے اٹھ کر اسے تعظیم دی اور ''امیر المومنین'' کہہ کر خلافت کی مبارکباد دی۔

''تم کب تک ہمیں اسی طرح خلافت کا مژدہ سناتے رہو گے!'' ہارون کے لہجے میں بیزاری جھلک رہی تھی۔ ''دیکھو یحییٰ' یہ مذاق اچھا نہیں ہے اگر برادر بزرگ ہادی کے کان تک یہ خبر پہنچ گئی تو یقیناً ہمارے حق میں بہتر نہ ہو گا۔ یہ فیصلہ آنے والے وقت پر چھوڑ دو کہ.....''

''غلام قطع کلامی کی معافی چاہتا ہے حضور!'' یحییٰ بول اٹھا۔ ''وقت نے یہ فیصلہ کر دیا ہے۔''

''کیسا فیصلہ؟.....ہم سمجھے نہیں۔'' ہارون کے لہجے میں حیرت تھی۔

میری توجہ اس وقت ہارون کے ذہن ہی پر تھی۔ اسے کچھ ہی دیر پہلے اٹھایا گیا تھا۔ واقعی وہ اپنے بڑے بھائی ہادی کے انتقال سے واقف نہ تھا۔ پہلی بار یہ خبر اس نے یحییٰ ہی سے سنی۔

ابھی یہ گفتگو تمام نہ ہونے پائی تھی کہ ایک خادمہ نے ہارون کو بیٹے کی پیدائش کا مژدہ

سنایا۔ ہارون نے اس کا نام عبداللہ رکھا اور پھر یہی عبداللہ مامون الرشید کہلایا۔ اس کا نام بھی تاریخ میں محفوظ ہو گیا۔

ہادی کے انتقال سے ہارون کی بے خبری کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ وسیع و عریض قصر خلافت کا مرکزی حصہ اس کی اقامت گاہ سے خاصا دور تھا۔ وہاں تک شور اور رونے پیٹنے کی آوازیں نہیں پہنچ سکی ہوں گی۔ جن افراد کو ہادی کی موت کا علم ہو چکا تھا ان میں سے کم ہی ایسے تھے جو ہارون کو جگا کر یہ اطلاع دینے کی جسارت کرتے۔ انہی کم افراد میں یحییٰ تھا۔

یحییٰ سے تمام احوال سن کر ہارون کہنے لگا۔ ''پھر تو ہمیں چل کر یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھنا چاہئے۔''

''بلاشبہ اے امیر المومنین!'' یحییٰ بولا۔ اس بار ہارون نے امیر المومنین کہنے پر اسے نہیں ٹوکا۔

خلیفہ ہادی نے نوجوانی میں موت پائی۔ اس نے اپنے مرنے پر نو اولادیں چھوڑیں۔ ان میں جعفر سمیت سات لڑکے تھے۔ جعفر ہی کو ہادی اپنا ولی عہد بنانا چاہتا تھا۔ سات لڑکوں کے علاوہ دو لڑکیاں تھیں۔

دوسرے روز بعد نماز فجر ہارون نے ہادی کی نماز جنازہ پڑھائی۔ قصر خلافت کے عقبی میدان میں ہادی کی تدفین ہوئی۔

امرائے سلطنت' میں ہرثمہ بن اعین بڑا باعزت و باوقار تصور کیا جاتا تھا۔ اس نے بقیہ امراء کی نمائندگی کرتے ہوئے ہارون الرشید کو دربار عام میں لا کر تخت خلافت پر بٹھا دیا۔ یہ منظر میرے لئے بڑا دل خوش کن تھا۔ اپنے باپ مہدی کے بعد میری نظر میں ہارون ہی خلافت کا اہل تھا' ہادی نہیں۔ ذہین و باحوصلہ ہارون جب خلیفہ بنا تو اس کی عمر 22 برس تھی۔ نوجوانی میں بھی اس کا ذہن تجربے کار بوڑھوں سے کہیں زیادہ تیز تھا۔ خلیفہ بنتے ہی ہارون نے یحییٰ بن خالد کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ یہ وہی یحییٰ بن خالد برمکی تھا جو ہارون کا اتالیق تھا اور جس نے ہارون کی حمایت کے سبب قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔

آدم زادوں کے نزدیک حکومت و اقتدار کی اہمیت کتنی ہے' میں ایک جن زادی ہو کر اس کا اندازہ بخوبی لگا سکتی تھی۔ منصب و جاہ کی خاطر آدم زاد خون کے رشتوں کو بھی پس پشت ڈال دیتے ہیں' مگر دنیا میں خالی ہاتھ آتے اور خالی ہاتھ ہی یہاں سے جاتے ہیں۔ ہادی نے اپنے باپ مہدی کا حکم نہ مانا' نافرمانی کی اور گمان غالب یہ ہے کہ اسی نے باپ کو زہر دلوایا۔ اس گمان کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ ہادی نے اپنی ماں ملکہ خیزران کو بھی چھوٹے بیٹے

ہارون کی حمایت کرنے پر راستے سے ہٹانا چاہا۔ قرائن و شواہد سے ظاہر ہے کہ ہارون پر قاتلانہ حملہ اسی کے ایما پر ہوا جو ناکام رہا۔ کسی کو خبر ہو نہ ہو مجھے معلوم ہے کہ ملکہ خیزران کے حکم پر ہی اس کی لونڈی لیلٰی نے ہادی کا گلا دبا کر مار ڈالا۔ گویا ایک آدم زادی نے اپنی ہی کوکھ سے جنم لینے والے کو قتل کرا دیا۔

ہم جنات کے مقابلے میں آدم زادوں کی عمریں بہت تھوڑی ہوتی ہیں مگر تھوڑی سی عمروں ہی میں یہ بڑے بڑے کام کر جاتے ہیں۔ سو ہارون الرشید بھی اپنی کم عمری کے باوجود بڑا لائق و فائق تھا۔ وہ اسی بنا پر لائق و نالائق اور دوست و دشمن کی تمیز کرنا اچھی طرح جانتا تھا۔ موصل کے عامل عبدالملک بن صالح کو ہارون بھولا نہیں تھا۔ یہ وہی تھا جس کی وجہ سے موصل میں رہنا اس کیلئے مشکل ہو گیا تھا۔ اس سے قطع نظر کہ بغداد آنا ہارون کیلئے بہتر ہوا عبدالملک کا سلوک اس کے ساتھ نامناسب تھا۔

خلیفہ مہدی کے زمانے سے عبدالملک اپنے خوشامدی مزاج کے سبب عامل موصل بنا ہوا تھا۔ یحیٰی بن خالد کو عہدہ وزارت دینے کے بعد ہارون نے جو پہلا حکم دیا وہ عبدالملک بن صالح کی معزولی ہی کے بارے میں تھا۔ ہارون نے عبدالملک کی جگہ اسحاق بن محمد کو موصل کا نیا عامل مقرر کیا۔ تخت خلافت پر متمکن ہونے کے بعد ہارون نے کچھ ہی روز میں انتقامی نقطہ نظر سے عمال کے تقرر و تبدیلی کے احکام صادر کئے۔ ہارون نے اس ضمن میں اپنے وزیر یحیٰی کے مشوروں کو بڑی اہمیت دی۔ یحیٰی کو وسیع تر اختیارات حاصل تھے۔ اس نے کسی ایسے عامل کو عہدے پر نہ رہنے دیا جو ماضی میں ہارون کے خلاف اور ہادی کا ہم نوا تھا۔

ہارون خلیفہ بن گیا تو قصر خلافت کے سکونتی حصے میں سوائے اس کے کوئی تبدیلی نہیں آئی کہ قصر کا جو مرکزی حصہ حفاظت و نگہبانی کے اعتبار سے خلفاء کیلئے مخصوص تھا ہارون بھی وہیں منتقل ہو گیا۔ ہادی کی بیوہ اور بچے ہارون کے اقامتی حصے میں چلے گئے۔

عارج اور میں حسب سابق خلیفہ وقت کے خادموں میں شامل تھے۔ ہادی کی موت سے ہماری ذمے داریاں بدلی نہیں تھیں۔ ہم نے ایوب اور جمیلہ کے انسانی قالبوں میں پناہ لے رکھی تھی۔

ہارون جب موصل میں تھا تو اس کی ملاقات استاد ابراہیم موصلی سے ہوئی تھی۔ یہ شخص بیک وقت دو فنون میں کمال مہارت رکھتا تھا۔ ایک طرف تو وہ اپنے عہد کا نامور موسیقار تھا' دوسری جانب وہ ایک مشہور و ہر دلعزیز شاعر تھا۔ ہارون نے خلیفہ بننے کے بعد بھی استاد ابراہیم موصلی کو یاد رکھا اور اس کیلئے طلبی کا پروانہ موصل بھیج دیا۔

چند ہی روز بعد استاد ابراہیم موصلی دربار خلافت میں حاضر ہوا اور اس نے اپنی خوبصورت آواز میں ترنم کے ساتھ ہارون کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا۔ اس عربی قصیدے کے دو اشعار یہ تھے (ترجمہ)

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ آفتاب بیمار تھا' جب ہارون تخت نشین ہوا تو اس کی روشنی چمک اٹھی۔ دنیا نے اس کے اقتدار سے خوبی کا لباس پہن لیا کیونکہ ہارون اس کا خلیفہ اور یحیٰی اس کا وزیر ہے۔"

اس قصیدے سے خوش ہو کر ہارون نے استاد ابراہیم موصلی کیلئے دس ہزار درہم ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی فنکار کیلئے دربار خلافت سے وظیفہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس سے فنکاروں کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔

ایک ابراہیم تو یہ تھا کہ جسے خلیفہ ہارون الرشید نے عزت بخشی تھی اور دوسرا ابراہیم وہ تھا جو ابراہیم حرانی کہلاتا تھا۔ دیوان الجند (فوج کا محکمہ) کے شعبہ سراغ رسانی کو ابراہیم حرانی کی تلاش تھی۔ مرحوم خلیفہ ہادی کے بچپن کا دوست اور اس کا دست راست' عیار' مفسد اور سازشی ابراہیم حرانی عہدہ وزارت پر فائز تھا۔ ہادی کی دوستی اور چاپلوسی میں وہ اس حد تک آگے بڑھ گیا تھا کہ اس نے ایک غلام سے ہارون پر قاتلانہ حملہ بھی کرایا تھا۔ اس ناکام حملے میں اسے ہادی کی تائید بھی حاصل تھی۔ ہارون سے ابراہیم حرانی کی مخالفت کا علم سبھی کو تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ جس رات خلیفہ ہادی کا انتقال ہوا' وزیر ابراہیم حرانی پراسرار طور پر غائب ہو گیا۔ دوسرے دن صبح محلہ قرافہ میں اس کا محل نما عالی شان مکان خالی پایا گیا۔ وہ اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ یحیٰی بن خالد اور دیگر اہم اراکین سلطنت کی طرح یقیناً ابراہیم حرانی نے بھی ہادی کے انتقال کی خبر سن لی ہو گی۔

ابراہیم حرانی سے زیادہ اس کے اعمال کا علم کسے ہوتا۔ غالباً اسے اندازہ تھا کہ خلیفہ بنتے ہی اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس نے اسی سبب بغداد سے راہ فرار اختیار کر لی تھی۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہ ابراہیم حرانی کہاں گیا ہے؟

جب بھی کوئی نیا حکمران برسر اقتدار آتا ہے تو اس کے خلاف سازشوں اور بغاوتوں کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی وجہ سے ابراہیم حرانی کی روپوشی نہ صرف وزیر یحیٰی بن خالد بلکہ خلیفہ وقت ہارون الرشید کیلئے بھی باعث تشویش تھی۔ میں نے ایک رات اس سلسلے میں عارج سے بات کی۔ "تو جانتا ہے اے عارج کہ کسی آدم زاد کا پتا لگانا ہم جنات کیلئے کوئی مشکل کام نہیں۔ سابق وزیر ابراہیم حرانی کے جسم کی مخصوص بو کے ذریعے اس تک پہنچا جا سکتا

ہے۔"

"لیکن اے دینار! تجھے اس آدم زاد کو پکڑوا کر کتنی رکعت کا ثواب مل جائے گا؟" عارج بولا۔

"کیا تو واقف نہیں کہ ابراہیم حرانی کتنا بڑا فسادی ہے' وہ جہاں بھی جائے گا یا رہے گا تو ہارون کے خلاف فتنہ وفساد برپا کرے گا۔" میں عارج کو سمجھانے لگی۔ "کیا معلوم کہ اب تک اندر ہی اندر اس سازشی آدم زاد نے یہ کھیل کھیلنا شروع بھی کر دیا ہو۔"

"اے دینار! سن کہ ہارون کے خلاف اگر کوئی فتنہ اٹھتا ہے یا بغاوت ہوتی ہے تو اسے ختم کرنے کی ذمے داری ہم پر نہیں۔"

"تیرا کہنا درست ہے اے عارج مگر یہ تو سوچ کہ کسی سازش یا بغاوت سے کیا مسلمانوں کی مملکت کو نقصان نہیں پہنچے گا اور کیا اس کے نتیجے میں خلق خدا کا خون ناحق نہیں بہے گا؟" میں نے پرجوش آواز میں کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" عارج نے میرے خیال سے اتفاق کیا' پھر پوچھنے لگا۔ "اب تو ہی بتا کیا ہو؟"

"ہونا کیا ہے' میں آج ہی رات اس فسادی آدم زاد کو تلاش کر لیتی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کے بعد؟" عارج نے پوچھا۔

"تلاش کا یہ سہرا میں کسی آدم زاد ہی کے سر باندھ دوں گی۔" میں اطمینان سے بولی۔ "وہ آدم زاد دیوان الجند کے شعبہ سراغ رسانی کا کوئی افسر بھی ہو سکتا ہے۔ اگر اس طرح کسی آدم زاد کو ترقی مل جائے تو اچھا ہے نا! میری کوشش ہوگی کہ وہ افسر ذہین اور اہل ہو۔"

"آدم زادوں پر مہربان اے جن زادی! میں تجھے اس نیکی سے تو نہیں روکتا لیکن اتنا دھیان میں رکھیو کہ آدم زاد بڑے ہی محسن کش ہوتے ہیں۔ ان پر جو احسان کرے یہ اسی کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوتے ہیں۔" عارج کہنے لگا۔

"فکر نہ کرو' میں تیری نصیحت گرہ میں باندھ کے رکھوں گی۔ اچھا تو اب میں چلتی ہوں۔ ابراہیم حرانی کے جسم کی مخصوص بو میرے حافظے میں ہے۔ متعدد بار مجھے اس کے قریب جانے کا موقع ملا ہے۔" میں یہ کہتے ہی جمیلہ کے جسم سے باہر آ گئی۔ پھر میں نے جمیلہ پر گہری نیند مسلط کر دی اور عارج کو شوخ لہجے میں مخاطب کیا۔ "دیکھ لے کہ میں تجھ پر کتنا بھروسہ کرتی ہوں' تیرے پاس اس آدم زادی کو تنہا چھوڑے جا رہی ہوں۔"

"میں نے تو تجھ سے بھروسا کرنے کو نہیں کہا' نہ کر بھروسا! میں بھی چلتا ہوں تیرے ساتھ۔" عارج نے کہا۔ "بول چلوں؟"

☆......☆......☆

"بس رہنے دے! تیری پارسائی دیکھ چکی ہوں میں! مغل تاجدار ہمایوں کے عہد کی ایک کنیز دل آرام کو ابھی میں بھولی نہیں ہوں جس پر تو دل و جان سے عاشق ہو گیا تھا۔ اگر میں نے بروقت مداخلت کر کے تجھے شاہم بیگ کے جسم سے......"

"مجھے بھی سب یاد ہے۔" عارج نے میری بات کاٹ دی۔ "پہلے بھی میں تجھے ایک بار بتا چکا ہوں وہ میرا نہیں اس انسانی قالب شاہم بیگ کا قصور تھا جس کا طعنہ تو مجھے دیتی رہتی ہے۔" عارج نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔

میں نے عارج کو "خدا حافظ" کہا اور ابراہیم حرانی کے جسم کی مخصوص بو اپنے حافظے میں تازہ کی۔ اس بو کا تعاقب کرتی ہوئی میں بغداد سے نکلی اور کچھ ہی دیر میں موصل کی طرف ہو لی۔ رات کا ابھی ایک پہر گزرے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اس آدم زاد ابراہیم حرانی کی تلاش میں مجھے اتنا طویل سفر کرنا پڑے گا۔

میرے لئے یہ امر باعث حیرت ہی تھا کہ میں نے ابراہیم حرانی کو موصل کے نئے عامل اسحاق بن محمد کے عالی شان اور وسیع و عریض مکان میں دیکھا۔ مکان کا وہ گوشہ قدرے الگ تھلگ اور مہمانوں کیلئے مخصوص تھا۔

مجھے اپنی پراسرار قوتیں بروئے کار لا کر یہ جاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ ابراہیم اور اسحاق دونوں پرانے دوست ہیں۔ برے وقت میں ابراہیم کو اسحاق ہی یاد آیا تھا۔ جس وقت میں وہاں پہنچی تو مکان کے اس مخصوص حصے کی نشست گاہ میں دونوں دوست نشے کی خاطر نبیذ پی رہے تھے۔ اسی عالم میں ابراہیم کہنے لگا۔ "کاش ہمیں دو ایک روز کی مہلت ہی مل جاتی تو آج حالات مختلف ہوتے۔ جو شخص اس وقت خلیفہ بنا ہوا ہے وہ ہمارا محکوم ہوتا۔"

"اے میرے دوست! مجھے تو ایک اور حیرت ناک خبر ملی تھی۔" اسحاق نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "اپنی جان کے خوف سے میں آج تک یہ بات اپنی زبان پر نہیں لایا۔ اس کے باوجود میرا دل گواہی دیتا ہے کہ خبر سچی ہے۔"

"مجھے بھی تو پتا چلے کہ وہ خبر کیا ہے جو تمہیں معلوم ہے اور میں اس کے بارے میں نہیں جانتا۔" ابراہیم پرتجسس آواز میں بولا۔

"میں نے یہ کب کہا کہ تم اس خبر سے لاعلم ہو گے۔" اسحاق کہنے لگا۔ "میں تو محض

اپنے متعلق بتا رہا تھا۔"

"خیر بحث چھوڑ دو اور وہ خبر بتاؤ جسے تم اب تک زبان پر نہیں لائے۔" ابراہیم نے اصرار کیا۔

"یہ خبر مجھے بغداد ہی میں مل گئی تھی کہ خلیفہ ہادی بیماری کے سبب نہیں مرے بلکہ انہیں قتل کرایا گیا ہے۔" اسحاق کی آواز دھیمی ہو گئی۔

"اور کیا تم یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ خلیفہ کو قتل کرانے والا کون ہو سکتا ہے؟" ابراہیم نے سوال کیا۔ جب اسحاق چپ بیٹھا رہا تو ابراہیم نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔ "قتل وہی کرا سکتا ہے جسے اس سے فائدہ پہنچ سکے۔ اب سمجھے کچھ!"

ابراہیم کا واضح اشارہ ہارون کی طرف تھا' مگر اسحاق مصلحتاً یہ نام زبان پر نہیں لایا اور صرف اتنا کہا۔ "ہاں سمجھ گیا۔"

"اگر سمجھ ہی گئے ہو تو پھر ڈرتے کیوں ہو! اپنی زبان پر ہارون الرشید کا نام کیوں نہیں لاتے۔"

"آہستہ بولو ابراہیم! دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" اسحاق نے اپنے دوست ابراہیم کو تاکید کی۔

"ویسے تم اور میرے دیگر با اختیار دوست اور امراء ساتھ دیں تو اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ خلیفہ ہادی کا بیٹا جعفر زندہ ہے۔ اس حقیقت کی گواہی دینے والے متعدد با اثر افراد مل جائیں گے کہ خلیفہ مرحوم اپنے بیٹے جعفر کو ولی عہد بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ جن امراء اور اراکین سلطنت نے خلیفہ ہادی کے حکم سے جعفر کے ہاتھ پر ولی عہد کی بیعت کر لی تھی انہی میں ایک میں بھی ہوں۔" ابراہیم نے انکشاف کیا۔

"لیکن اے ابراہیم' اگر یہ کوشش جس کا تم نے ذکر کیا' کامیاب ہو بھی گئی تو ہمیں کیا ملے گا؟..... خلیفہ تو ہادی کا بیٹا جعفر ہو گا۔"

"ہاں نام اسی کا ہو گا اور کام' یعنی اقتدار ہمارا۔" ابراہیم کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

"سوچیں گے اس تجویز پر!" اسحاق کے ان الفاظ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہارون کے خلاف اس سازش کا حصہ بننے پر آمادہ تھا۔ خود یہ دیکھنے اور جاننے کے بعد کہ ابراہیم حرانی کہاں پناہ لئے ہوئے ہے میں بغداد لوٹ آئی۔ اس فتنہ پرور آدم زاد کے ارادے بہت خطرناک تھے۔ ایسی صورت میں فوری طور پر اس کا زیر دام آنا ضروری ہو گیا تھا۔

جن انتہائی مطلوب افراد کی حکومت کو تلاش تھی ان میں سر فہرست ابراہیم حرانی کا نام تھا۔ ان مطلوب افراد کے بارے میں خلیفہ ہارون کا یہ حکم تھا کہ جہاں اور جس حال میں پائے جائیں انہیں قتل کر دیا جائے۔ ظاہر ہے اس حکم سے عامل موصل اسحاق بن محمد بھی واقف تھا۔ اس کے باوجود اس نے ابراہیم حرانی کو پناہ دی تھی۔ گویا اس طرح وہ خلیفہ کی نافرمانی کا بھی مرتکب ہوا تھا۔

یہ معاملہ ایسا نہیں تھا کہ جس میں تاخیر کی جاتی۔ دوسرے ہی دن موقع ملتے ہی میں اپنے انسانی قالب سے نکل کر حمزہ کے پاس پہنچ گئی۔ حمزہ دیوان الجند کے شعبہ سراغ رسانی کا نگراں تھا۔ اس کا دفتر بھی دیگر سرکاری محکموں کی طرح قصر خلافت کی حدود میں تھا۔

حمزہ کی عمر تیس برس سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ اس کے چہرے سے ذہانت کا پتا چلتا تھا۔ وہ اپنے عملے سے الگ اندرونی دالان میں اکیلا بیٹھا تھا۔ بغیر طلب کئے کسی کو اس کے پاس جانے کی اجازت نہیں تھی۔

"اے حمزہ!" میں نے اسی کی آواز میں اسے مخاطب کیا تو وہ چونک اٹھا۔

"یہ..... یہ تو میری..... میری ہی آواز ہے۔" حمزہ بڑبڑایا۔

"ہاں میں تیرے ہی باطن کی آواز ہوں۔" میں نے آزمودہ "نسخے" پر عمل کیا' پھر کہا۔ "اگر امیر المومنین تجھ سے ابراہیم حرانی کی بابت سوال کریں تو نے اب تک اسے گرفتار کیوں نہیں کیا تو تیرا جواب کیا ہو گا؟"

"یہی کہ اس کی تلاش جاری ہے اور ابھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔" حمزہ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"لیکن اسے تو امیر المومنین تیری نااہلی تصور کریں گے۔" میں بولی۔

"تو پھر..... پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟" حمزہ کے چہرے سے فکر مندی کا اظہار ہونے لگا۔ "میں نے اسے اس کے تمام عزیز و اقارب میں تلاش کرایا' بغداد میں بھی اور دیگر دوسرے شہروں نجف و کوفہ میں بھی کہ جہاں اس کے رشتے دار رہتے ہیں۔"

"رشتے داروں کے علاوہ کیا تو نے اس کے دوستوں کو بھی ٹٹولا۔ ابراہیم اپنے دوستوں کے پاس بھی تو پناہ لے سکتا ہے۔"

"اس کے صرف ایک دوست اسحاق بن محمد کے سوا سبھی سے تفتیش کی جا چکی ہے۔" حمزہ نے بتایا۔

"کیوں اسحاق بن محمد کو تفتیش سے مستثنیٰ کیوں قرار دیا گیا؟" میں نے دریافت کیا۔

”اس کے کئی اسباب تھے۔“ حمزہ کہنے لگا۔ ”پہلا سبب تو یہ کہ امیر المومنین کی نظر میں اسحاق بن محمد شک و شبے سے بالاتر ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسحاق کو موصل کا عامل بنا کے نہ بھیجا جاتا۔ دوسرا سبب یہ کہ حکومت کے کسی بھی عامل سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی مطلوب و معتوب شخص کو پناہ دے سکتا ہے۔ اگر ابراہیم حرانی اس غرض سے موصل پہنچا تو اسحاق اسے گرفتار کر کے بغداد بھیج دیتا۔“

”اسحاق سے اس لئے بھی تو تفتیش نہیں کی گئی کہ بغداد سے موصل کافی فاصلے پر واقع ہے۔“

”ہاں ایک سبب یہ بھی تھا۔“ حمزہ نے اعتراف کیا۔

”ایسی صورت میں کہ ابراہیم حرانی موصل ہی میں ہوا اور اس کی خبر امیر المومنین کو ہو گئی تو تم کیا کرو گے؟“

میرے سوال نے حمزہ کو مضطرب کر دیا۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگا۔

”میرے حق میں یہ کسی طرح بہتر نہ ہو گا۔“

”تو پھر تمہیں آج ہی بلا تاخیر موصل کیلئے روانہ ہو جانا چاہیے تم اپنے عملے کے بااعتماد افراد کو موصل ساتھ لے جاؤ۔ تمہیں اپنے عملے کے ساتھ بس اچانک ہی عامل موصل کے مکان پر چھاپا مارنا ہو گا تم اپنے شعبے کے نگراں ہو اور تمہیں وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ اس کے علاوہ یقیناً تمہیں یہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ امیر المومنین کیلئے ابراہیم حرانی کا سر کتنا قیمتی ہے!“ میں نے حمزہ کو ترغیب دی۔

میری ترغیب کا اثر حمزہ پر مثبت ہوا ورنہ مجھے دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑتا۔ میں اسے اپنے اثر میں لے کر موصل جانے پر مجبور بھی کر سکتی تھی۔ یہ نوبت نہیں آئی۔ حمزہ اسی روز موصل روانہ ہو گیا۔ مجھے امید بندھ گئی کہ اب ابراہیم حرانی، ہارون الرشید کے خلاف کسی سازش کے تانے بانے نہیں بن سکتا۔ اس سے قبل ہی حمزہ اسے زیر دام لے آئے گا۔

اسی روز رات کو جب میں، عارج کو اپنی کارگزاری سے آگاہ کر چکی تو وہ کہنے لگا۔

”موصل کے ذکر پر یاد آیا اے دینار کہ ان دنوں شہر میں موصل سے ایک بزرگ آیا ہوا ہے شہر بھر میں اس کے کمالات کی بڑی دھوم ہے۔“

”تجھے کس نے اس بزرگ کے بارے میں بتایا؟“ میں نے پوچھا۔

”خادم عبدالرحمٰن کو تو جانتی ہے اس کے کچھ عزیز محلہ کرخ میں رہتے ہیں۔“ عارج نے بتایا۔ ”وہ اپنے عزیزوں سے ملنے گیا تھا تو وہاں اس بزرگ کا نام سنا، وہ بزرگ کچھ عرصہ

سے محلہ کرخ کے ایک مکان میں ٹھہرا ہوا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ بزرگ نے وہ مکان کرائے پر لیا ہے، کچھ کہتے ہیں کہ اس نے مکان خرید لیا ہے اور......“

”کمالات کیا دکھاتا ہے وہ بزرگ؟“ میں نے عارج کی بات کاٹ کر پوچھا۔

”عبدالرحمٰن نے کچھ بتایا۔“

”کہہ رہا تھا کہ اس نے تو اپنی آنکھوں سے بزرگ کا کوئی کمال نہیں دیکھا مگر سنا ہے اس کے قبضے میں جنات ہیں ان جنات سے وہ جو چاہتا ہے، کام لیتا ہے مگر مناسب معاوضہ طے کئے بغیر کسی کا کوئی کام نہیں کرتا۔“ عارج نے جواب دیا۔

”مجھے تو یہ کوئی جعلی بزرگ لگتا ہے جو لوگوں کو ٹھگنے کی غرض سے بغداد آیا ہے۔“ میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ ”جو واقعی بزرگ ہوتے ہیں وہ بلا معاوضہ خلق خدا کی خدمت کرتے ہیں۔“

”میں نے تو تجھے اس لئے یہ بات بتائی ہے کہ اس کے قبضے میں جنات بھی ہیں۔“ عارج نے اس طرح کہا جیسے مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہو لیکن اس کے لہجے سے غیر سنجیدگی جھلک رہی تھی۔ اپنی بات عارج نے جاری رکھی۔ ”اے دینار! کہیں وہ تجھے یا مجھے قبضے میں نہ کر لے۔“

”ٹھیک کہتا ہے تو!“ میں دھیرے سے ہنس دی۔ ”ان آدم زادوں کا کیا بھروسا۔“

”چلیں کسی روز اس بزرگ کا دیدار کرنے؟ صرف دو قیراط ہی تو خرچ ہوں گے۔“ عارج بولا۔

”کیا مطلب؟ دو قیراط کس بات کے؟ کیا وہ ملاقاتیوں سے بھی معاوضہ لیتا ہے؟“

”ہاں“ عارج نے جواب دیا۔ ”عبدالرحمٰن یہی بتا رہا تھا اس کے آستانے میں قدم رکھتے ہی آنے والے کو ایک قیراط دینا پڑتا ہے اگر کوئی ایک قیراط نہ دے تو بزرگ کے خادم اسے اندر نہیں جانے دیتے۔“

پھر عارج کے ضد کرنے پر آئندہ روز بعد نماز عشاء اس بزرگ کے آستانے پر جانے کو آمادہ ہو گئی۔ عارج نے کہا تھا کہ وہ خادم عبدالرحمٰن سے اس بزرگ کے مکان کا پتا معلوم کر لے گا۔ میری رائے یہی تھی کہ وہ کوئی جعلی بزرگ ہے اس نے اپنا ”دھندا“ چلانے اور لوگوں کی جیبیں خالی کرانے کے لئے مشہور کیا ہے کہ اس کے قبضے میں جنات ہیں۔“

عموماً عشاء کے بعد تک ہمارے کام نمٹ جاتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر رات کے وقت دوسرے خادم سے کام لیا جاتا تھا۔ ہم اسی لئے رات کا کھانا کھا کر قصر خلافت سے نکل

گئے۔ دانستہ ہم نے اپنے انسانی قالب چھوڑ دیئے تھے۔ میں اس جعلی بزرگ کو سبق سکھانا چاہتی تھی۔ اس کا اظہار میں نے عارج سے بھی کر دیا تھا۔ اس معاملے میں وہ مجھ سے متفق نہیں تھا۔ عارج کا کہنا یہ تھا کہ وہ آدم زاد' جعلی بزرگ ہو یا اصلی ہم اسے بلاوجہ نہ چھیڑیں۔ میری دلیل یہ تھی کہ خلق خدا کو اس آدم زاد کی جعل سازی اور لوٹ مار سے ہمیں بچانا چاہیے۔

عارج کی یہ بات میں نے بہرحال مان لی تھی کہ پوری طرح حالات کا جائزہ لئے بغیر اس بزرگ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی۔ عبدالرحمٰن کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق بعد نماز عشاء اس بزرگ کے آستانے پر بڑی بھیڑ ہوتی تھی جب عارج کے ساتھ میں وہاں پہنچی تو لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ مکان کے صدر دروازے پر دو موٹے تازے آدم زاد کھڑے تھے جو ہر آنے والے سے ایک قیراط وصول کر رہے تھے۔

مکان کے اندر بڑے سے ایک دلان میں چوکی پر گاؤ تکئے سے ٹیک لگائے ایک آدم زاد بیٹھا تھا۔ اس کا سر اور پیٹ دونوں ہی غیر معمولی طور پر بڑے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں جیسے باہر کو ابلی پڑ رہی تھیں۔ وہ پست قد آدم زاد مجموعی طور پر خاصا مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چوکی پر صرف اتنی جگہ تھی کہ ایک فرد بیٹھ سکے۔ چوکی کے سامنے عورتیں اور مرد بھی بیٹھے تھے۔ باری باری وہ چوکی پر بیٹھے ہوئے مضحکہ خیز آدم زاد کے سامنے جاتے' جو کہنا ہوتا کہتے اور چلے آتے۔ کسی پر وہ بزرگ دم کرتا' کسی پر صرف ہاتھ پھیر دیتا اور کسی کو قریب رکھی صراحی سے ایک گھونٹ پانی پلا دیتا۔ میں نے کوئی ایسا فرد نہیں دیکھا جس سے اس بزرگ نے معاوضہ نہ لیا ہو۔ ابھی تک مجھے اس کا کوئی کمال نظر نہیں آیا تھا۔

معلوم نہیں کیوں اس آدم زاد کو دیکھ کر مجھے بصرہ شہر کا ''حضرت جی'' یاد آنے لگا تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ''حضرت جی'' بھی خلق خدا کو لوٹتا تھا۔ متوسط عمر کی ایک آدم زادی اپنی جگہ سے اٹھ کر چوکی کی طرف بڑھی تو میں آگے پہنچی۔

عارج شاید میرا ارادہ بھانپ گیا اور بولا۔ ''نہیں اے دینار! ایسا نہ کر!''

میں اس وقت تک آدم زادی کے جسم میں اتر چکی تھی۔ وقتی طور پر مجھے گھٹن محسوس ہوئی۔ اسی سبب میرے انسانی قالب کے قدم کسی قدر ڈگمگائے مگر جلد ہی میں نے خود کو سنبھال لیا اور چوکی پر چڑھ گئی۔ اسی لمحے مجھے بدبو کا بھبکا محسوس ہوا اور میں چونک اٹھی۔

بڑے سر اور بڑے پیٹ والے اس بزرگ نے میری طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

''اے بزرگ! تو مجھے ایک جن پکڑ کر دے دے۔'' میں نے کہا۔ ''سنا ہے تیرے قبضے میں بہت سے جنات ہیں۔''

''تو نے ٹھیک سنا ہے مگر وہ جنات میرے ہی قابو میں ہیں تیرے یا کسی اور کے قابو میں نہیں آ سکتے۔'' بزرگ نرمی سے بولا۔

''کیوں میرے قابو میں نہیں آ سکتے؟'' میں دانستہ چیخ اٹھی۔ ''تو نے اگر میری بات نہ مانی تو میں تیری پگڑی اتار لوں گی!''

''یہ عورت شاید پاگل معلوم ہوتی ہے۔'' بزرگ نے بلند آواز میں کہا' پھر حاضرین سے پوچھا۔ ''کوئی اس کے ساتھ ہے؟''

سامنے ہی بیٹھا ہوا ایک باریش بوڑھا اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔ ''حضور! اس کے ساتھ میں ہوں' یہ میری بہن ہے اور اسی طرح بہکی بہکی باتیں کرتی ہے آپ کے پاس میں اسی کا علاج کرانے آیا ہوں۔''

''ہم پاگلوں کا علاج نہیں کرتے۔ اسے یہاں سے لے جاؤ!'' بزرگ کے لہجے میں سختی آ گئی۔

''میں تو نہیں جاتی!'' میں نے یہ کہتے ہوئے اس بزرگ کے سر سے پگڑی کھینچ لی۔

''ارے ارے یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' وہ غصے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پگڑی کے بغیر اس کا بڑا سا گنجا سر مزید نمایاں ہو گیا تھا۔

میرا ارادہ تو وہاں ہنگامہ کرنے کا تھا ہی' سو اس مضحکہ خیز آدم کے کولہے پر لات ماری' وہ چوکی پر گر پڑا' پھر ایک دم اچھل کر میرے سامنے آ گیا۔ اس بار جب وہ بولا تو اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ میں ہی سن سکوں۔

''بہت ہو گیا اے دینار! اب یہاں سے چلی جا اور مزید رنگ میں بھنگ نہ ڈال! میں نے تجھے اس آدم زادی کے جسم میں بھی پہچان لیا ہے۔'' وہ کسی درندے کی طرح غرانے لگا۔ بڑی حد تک اس کی آواز اب غیر انسانی تھی۔

اس کی زبان سے اپنا نام سن کر میں تقریباً اچھل پڑی اور بے اختیار پوچھ بیٹھی۔ ''کون ہے تو؟''

''تو شاید مجھے نہ جانتی ہو' مگر میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں اے سردار اعظم کی بیٹی!'' وہ پھر غیر انسانی آواز میں کہنے لگا۔

''میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک تو مجھے اپنے بارے میں......''

''کیا کرے گی جان کر!'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''میرے وجود کی بدبو سے تجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا؟ میں تو تجھے تیری خوشبو سے پہچان گیا۔''

"ہاں اندازہ کرلیا میں نے کہ تو کوئی کافر جن ہے اور...... اور شاید تیرا تعلق میرے ہی قبیلے سے ہے' مگر......"

"تجھے مجھ سے کچھ اور پوچھنا ہو تو آج نصف شب کو آ جائیو۔ میں اس وقت تیرے ہر سوال کا جواب دوں گا اب چلی جا۔" وہ بول اٹھا۔

اس لمحے عارج میرے قریب آ کر بولا۔ "اس کی بات مان لے اے دینار! ہم رات کو بھی آ سکتے ہیں۔"

اس کے بعد میں نے ضد نہیں کی اور متوسط عمر کی آدم زادی کے جسم سے نکل آئی۔ کچھ تو یہ کہ میں نے جلدی کی کچھ وہ آدم زادی بیمار تھی اس لئے جھٹکا نہ سہہ سکی اور بے ہوش ہو گئی۔ اس کا باریش بھائی "میری بہن" کہتا ہوا آگے بڑھا۔

عارج کے ساتھ میں واپس قصر خلافت پہنچ گئی۔ ہم دونوں ایوب اور جمیلہ کے قالبوں میں اتر گئے۔

محلّہ کرخ میں اس کافر جن زاد سے ملنے کے بعد میرا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ میں اسی وجہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور نیند کو اپنے انسانی پیکر کے ذہن سے جھٹک دیا۔ مجھے دیکھ کر عارج بھی اٹھ بیٹھا اور بولا۔ "کیا ہوا اے دینار! تو مضطرب سی لگتی ہے۔"

"ہاں۔" میں نے اقرار کیا۔ "اے عارج! سوال یہ ہے کہ جب میں اس کافر جن کو نہیں جانتی تو وہ مجھے کیسے جانتا ہے؟"

"تو مجھے ایک بات بتا کہ بابل کے کھنڈرات میں جتنے جنات آباد ہیں کیا ان سب کو جانتی ہے؟" عارج کے سوال کا جواب میں نے انکار میں دیا۔ وہ مزید کہنے لگا۔ "مگر تجھے غالباً سبھی جانتے ہیں' خواہ وہ کافر ہوں یا اہل ایمان! اس کا سبب یہ ہے کہ تو ان کے سردار کی بیٹی ہے۔ اب تیری سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ کافر جن تجھے تیری مخصوص خوشبو سے کس طرح پہچان گیا۔"

"چل تیری یہ بات مان لی میں نے اب میرے اس سوال کا جواب دے کہ جب وہ ایک جن زاد ہے تو حبہ و قیراط اور درہم دینار کی اسے کیا ضرورت پیش آ گئی؟ وہ کیوں آدم زادوں کو لوٹ رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آئی اے دینار!" عارج نے کہا۔ "کسی جن زاد کیلئے مال و دولت کی کیا حیثیت! ...... اسے اگر ہماری طرح آدم زادوں کے درمیان رہنے کا شوق بھی ہے تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ غریبوں اور حاجت مندوں کی جیبیں خالی کرائے۔ اب تو یہ

عقدہ نصف شب کو اس سے مل کر کھل سکتا ہے۔ اس نے ہر سوال کا جواب دینے کا وعدہ کیا ہے۔"

"لیکن یہ نہ بھول اے عارج کہ وہ کافر ہے اور عالم کہتے ہیں' کسی کافر پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔" میں بولی۔

"پھر اس کے جھوٹ سچ کا پتا کیسے چلے گا؟" عارج نے سوال کیا۔

"ہم اس کی نگرانی کریں گے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ کیا سچ ہے' کیا جھوٹ ہے!" میں نے جواب دیا۔

"یہ تو بلاوجہ کی مصیبت پالنا ہے اے دینار!" عارج کے لہجے میں بیزاری تھی۔ "وہ جو چاہے کرے' ہم اس سے الجھیں ہی کیوں۔"

"واہ یہ بھی تو نے خوب کہی!" میں نے کہا۔ "کوئی بھی ہمارے سامنے خلق خدا کو لوٹتا رہے اور ہم خاموش تماشائی بنے رہیں۔"

دیر تک عارج اور میں نے اس مسئلے پر بحث کی۔ عارج کو میں نے بہرحال قائل کر دیا کہ ہمیں چپ نہیں رہنا چاہئے۔

آدھی رات کو ہم اپنے انسانی قالبوں سے باہر آ کر قصر خلافت سے نکلے۔ محلّہ کرخ میں کافر جن زاد کے مکان تک پہنچنے میں ہمیں دیر نہیں لگی۔ اندھیرے مکان میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مکان خاصا بڑا تھا۔ ہم ایک دالان سے دوسرے اور پھر تیسرے دالان میں داخل ہوئے۔ ایک دالان میں ہمیں دو آدم زاد خادم سوتے نظر آئے۔ انہیں ہم گھر کے دروازے پر لوگوں سے قیراط وصول کرتے دیکھ چکے تھے۔

"یہاں تو وہ کہیں بھی دکھائی ہی نہیں دے رہا۔" عارج مجھ سے مخاطب ہوا۔

اسی لمحے تاریک دالان کے ایک گوشے سے آشنا غیر انسانی آواز سنائی دی۔ "اپنی حفاظت کے خیال سے میں نے اندھیرے کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ اپنے مضحکہ خیز انسانی قالب میں ظاہر ہو گیا اور کہنے لگا۔ "اے دینار! یہ اچھا ہوا کہ تو جس آدم زادی کے جسم میں اتری وہ پاگل تھی' سو بات بن گئی۔ مجھے تجھ سے پوچھنا یہ ہے کہ تو نے بھلا کیوں میرے ساتھ ایسا کیا؟...... آدم زادوں کے سامنے مجھے بے عزت کر کے تجھے آخر کیا مل جاتا؟...... یہ کوئی اچھی بات تو نہ ہوئی۔"

"پہلے تو مجھے اپنا نام بتا' باقی باتیں اس کے بعد ہوں گی۔" میں نے پوچھا۔ اس نے اپنا نام مسعر بتایا تو میں بولی۔ "اے مسعر! میں یہاں تیرے سوالوں کے جواب دینے نہیں آئی

بلکہ مجھے جو تجھ سے پوچھنا ہے وہ بتا۔"

"تو پھر پوچھ! میں جواب دوں گا۔" مسعر کہنے لگا۔

"بول اے مسعر کہ تو آدم زادوں کی اس بستی میں کیوں آیا ہے؟" میں نے پہلا سوال کیا۔

"یہی سوال اگر میں تجھ سے کروں اے سردار اخصم کی بیٹی تو تیرے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟" مسعر نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں یہاں آدم زادوں کی خدمت کرنے آئی ہوں۔" میں نے بلا جھجک جواب دیا۔ "اب تو اپنا مقصد بیان کر۔"

"یہاں آنے سے میرا کوئی ایک مقصد نہیں۔" مسعر بولا۔ "تجھے خبر ہے اے دینار کہ یہ شہر بغداد اہل ایمان کی عظیم مملکت کا دارالحکومت ہے۔ یہ بتانے کی بھی تجھے ضرورت نہیں کہ کفر و ایمان میں ازل سے جنگ جاری ہے۔ میری یہاں آمد کا ایک مقصد یہ ہے کہ میں اہل ایمان کے عقائد کو مختلف حیلے بہانوں سے کمزور کردوں۔ وہ شرک میں مبتلا ہو جائیں اور اللہ کے سوا پتھر کی ان مورتیوں کے آگے بھی سر جھکانے لگیں جو میں چوری چھپے ان میں بانٹتا رہا ہوں۔ روحانی نقصان پہنچانے اور انہیں ان کے عقیدے سے بھٹکانے کے علاوہ میں مختلف کاموں کا معاوضہ وصول کر کے انہیں مالی طور پر بھی نقصان پہنچاتا ہوں۔"

"اگر تجھے اس قبیح اور ظالمانہ فعل سے بہ جبر روک دیا جائے اے مسعر؟" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اے دینار! یہ تیرے لئے ممکن نہ ہوگا۔" مسعر کے لہجے میں بڑا اعتماد تھا۔ "تجھے اگر میرے بارے میں مزید حقائق کا علم ہوتا تو یقیناً تو وہ الفاظ نہ کہتی جو کہے۔ تو نہیں جانتی اے دینار کہ تیری طرف کتنا بڑا خطرہ بڑھ رہا ہے۔"

"مجھے یہ کہہ کر تو دھمکانا چاہتا ہے اے مسعر!" میں سخت آواز میں بولی۔

"میں نے تجھے دھمکی نہیں دی بلکہ حقیقت بیان کی ہے۔"

"دیکھ اے مسعر! بات نہ بڑھا۔" عارج نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا۔ "مصلحت سے کام لے اور ہم سے مصالحت کر لے۔ اگر تو نے ہماری بات مان لی تو پھر ہم تیرا پیچھا نہیں کریں گے۔" عارج کا لہجہ مصالحانہ تھا۔

"اے عارج! تو مجھ سے کیا بات منوانا چاہتا ہے؟ یہ معلوم ہو۔" مسعر براہ راست میرے بجائے عارج سے مخاطب ہوا۔

"میں بتاتی ہوں اے مسعر!" میں بول اٹھی۔ "تجھے یہ شہر چھوڑنا پڑے گا۔"

"اور اگر میں تیرا یہ مطالبہ نہ مانوں اے دینار!؟"

"تو تجھے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ تجھے ہم زبردستی اس شہر سے نکال دیں گے۔" میری آواز غصے کے سبب تیز ہوگئی۔ "ہم چاہیں تو ابھی اے مسعر! تجھے یہاں سے اٹھا کر بابل کے کھنڈرات میں پھینک آئیں۔"

"سن اے دینار!" عارج مجھ سے مخاطب ہوا۔ "بہتر یہ ہے کہ اتمام حجت کے طور پر ہم اسے کل رات تک کی مہلت دے دیں۔"

"ٹھیک ہے عارج!" میں مان گئی۔ "کل رات بھی یہ بغداد میں نظر آیا اور اس نے اہل ایمان زادوں کو راہِ راست سے بھٹکایا تو پھر میں اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گی۔"

عارج کے ساتھ میں اس مکان سے نکل آئی۔ واپسی میں عارج مجھے سمجھانے لگا۔

"اے دینار! اتنا غصہ نہ کیا کر۔"

"تو نے اس کافر جن زاد کی باتیں نہیں سنیں۔ کس طرح دھمکیاں دے رہا تھا۔"

"مجھے یہ دھمکیاں بلاوجہ معلوم نہیں ہوتیں۔" عارج کہنے لگا۔ "میں نے اسی لئے اس کافر کو کل تک کی مہلت دلوائی ہے کہ تجھ کو اس خطرے سے آگاہ کر سکوں۔ مسعر! کے پس پشت کوئی اور ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ ہم سے مصالحت پر آمادہ ہو جاتا۔"

"اللہ مالک ہے، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" میں نے عارج کو تسلی دی۔

دوسرے روز عارج کو ساتھ لئے میں قصر خلافت سے نکل کر کرخ پہنچ گئی۔ ہم دونوں ہی اپنے انسانی قالبوں سے باہر تھے۔

"اس کافر جن زاد نے تو آج رات بھی یہاں میلہ لگا رکھا ہے۔" میں یہ کہتی ہوئی غصے میں تیزی سے آگے بڑھی۔ عارج میرے پیچھے لپکا۔ جیسے ہی میں اس مکان کے صدر دروازے پر پہنچی اور اندر داخل ہونا چاہا کسی نادیدہ قوت نے مجھے اٹھا کر دور پھینک دیا۔ یہی حال عارج کا ہوا تھا۔ میرے سارے وجود میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وقتی طور پر میں گھبرا گئی تھی۔ جو واقعہ پیش آیا میرے لئے غیر متوقع تھا۔ عارج کی کیفیت مجھ سے کچھ مختلف نظر نہ آئی۔ زیادہ رنج و افسوس یہ تھا کہ ایک کافر جن زاد مسعر کو ہم نے آج رات تک بغداد چھوڑ دینے کی مہلت دی تھی اور وہ شہر میں موجود تھا، نہ صرف یہ بلکہ ہم نے اس کے مکان میں داخل ہونا چاہا تو ناکام رہے۔

''اے دینار! غم نہ کر اور یہاں سے چل۔'' معاً عارج نے مجھے مخاطب کیا۔
''میں نہیں جاؤں گی یہاں سے!'' میں نے غصے میں کہہ دیا۔ ''آخر وہ کافر جن زاد خود کو سمجھتا کیا ہے۔ میں اسے ضرور مزہ چکھاؤں گی۔''
''میں کب کہتا ہوں کہ تو ایسا نہ کیجیو لیکن اس کیلئے کچھ سوچنا سمجھنا پڑے گا' تو چل تو سہی۔''

عارج کے سمجھانے بجھانے کا یہ اثر ہوا کہ میں وہاں سے چلی آئی۔ وہاں موجود رہنے سے بھی کچھ حاصل نہیں تھا۔ اس کافر جن زاد تک پہنچنے کے بعد ہی تو میں اسے مزہ چکھاتی جو فی الحال ممکن نہیں تھا۔ قصر خلافت کی طرف لوٹتے ہوئے عارج نے مجھے ایک اور معقول مشورہ دیا میں نے اس کا مشورہ قبول کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں ان حالات میں عالم سوما بہتر طور پر ہماری رہنمائی کر سکے گا۔''

ہم نے اپنی پرواز کا رخ تبدیل کر لیا۔ اب ہم بابل کے کھنڈرات کی طرف اڑتے جا رہے تھے۔

جب عارج کو ساتھ لئے میں کھنڈرات کے اس حصے میں پہنچی جہاں عالم سوما کی سکونت تھی تو وہ ہمیں دیکھ کر حیران ہوا۔
''اے میرے بچو! خیریت سے تو ہو!'' عالم سوما نے تشویش آمیز لہجے میں پوچھا۔
''خیریت ہی تو نہیں اے عالم سوما! اے میرے باپ کے دوست!'' میں بول اٹھی۔
پھر عالم سوما کو از اول تا آخر سب کچھ بتا دیا۔ میں نے آخر میں دریافت کیا۔ ''کسی نادیدہ قوت کا ہمیں اٹھا کر دور پھینک دینا سمجھ نہیں آیا۔''
''سن اے دینار! پہلے میں تیری آخری بات کا جواب دیتا ہوں۔'' عالم سوما کہنے لگا۔
''عمل دو طرح کے ہوتے ہیں رحمانی اور شیطانی۔ ہم اہل ایمان رحمانی مگر کفار شیطانی عمل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اکتیس دن کے بعد تو جو عمل کرتی ہے وہ رحمانی ہے وہ عمل کرنے سے تیرے گرد ایک ایسا نادیدہ حصار قائم ہو گیا ہے کہ کوئی عفریت بھی چاہے تو اس حصار میں داخل ہو کر تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ حصار مختلف اقسام اور نوعیت کے ہوتے ہیں' مخصوص وجود کے بجائے کسی مکان کے گرد بھی حصار کھینچا جا سکتا ہے۔ تم دونوں کو جو واقعہ پیش آیا وہ اسی نوع کا لگتا ہے۔ اس کافر جن زاد مسعر نے تم دونوں سے محفوظ رہنے کیلئے اپنے مکان کے گرد حصار کھینچ دیا ہو گا۔ تم یقیناً اسی نادیدہ حصار سے ٹکرا کر دور جا گرے ہو گے۔ یہ تمہارا محض احساس ہے جیسے تمہیں کسی قوت نے اٹھا کر دور پھینک دیا۔ اگر میں نے درست

اندازہ لگایا ہے تو تمہیں اپنے وجود میں بجلیاں سی کوندتی لگی ہوں گی۔''
میرے کچھ بولنے سے پہلے عارج نے عالم سوما کے اندازے کی تصدیق کر دی پھر میں نے بھی تائید کر دی۔
عارج کہنے لگا۔ ''اے سوما! مجھے شک ہے کہ مسعر کے پس پشت کوئی اور ہے اپنے اس شک کا اظہار میں نے دینار سے بھی کیا تھا۔''
''تیرا شک درست بھی ہو سکتا ہے عارج!'' عالم سوما بولا۔ ''تم دونوں کا سراغ لگانے کیلئے عفریت دہموش اس کافر جن زاد مسعر کو اپنا آلہ کار بنا سکتا ہے ممکن ہے مسعر نے تمہاری توجہ حاصل کرنے کیلئے ہی یہ شہرت دی ہو کہ اس کے قبضے میں جنات ہیں۔''
''مسعر نے دینار سے یہ بھی کہا تھا کہ تو نہیں جانتی تیری طرف کتنا بڑا خطرہ بڑھ رہا ہے۔'' عارج نے عالم سوما کو بتایا۔
''اس امکان کو بہر حال رد نہیں کیا جا سکتا کہ مسعر کا اشارہ اسی عفریت کی طرف ہو۔'' عالم سوما نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

☆......☆......☆

"اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ وہ عفریت ہی پس پردہ رہ کر مسعر کے ذریعے یہ کھیل کھیل رہا ہے تو پھر......" میں کچھ کہتے کہتے رک کر مزید بولی۔ "مگر مسعر کو ہمارے ٹھکانے کا علم نہیں۔"

"اے دینار! میں سمجھ رہا ہوں کہ تو کیا کہنا چاہتی ہے۔" عالم سوما نے کہا۔ "مسعر کے ذریعے اس عفریت کو اتنا تو پتہ لگ ہی جائے گا کہ تو بغداد ہی میں ہے' تجھے تو معلوم ہی ہے کہ وہ عفریت بھی کچھ عرصے پہلے بغداد آ چکا ہے۔"

"ہمیں بتا کہ ان حالات میں ہم کیا کریں۔" میں نے سوال کیا۔

"تجھے اور عارج کو اب انتہائی چوکنا اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" عالم سوما نے تاکید کی پھر کہنے لگا۔ "اگر کافر جن زاد مسعر کے ذریعے تجھے پھانسنے کیلئے یہ جال اس عفریت دہموش نے بچھایا ہے تو اس سے دور رہ یعنی مسعر کو بھول جا۔"

"لیکن وہ کافر جن زاد جس طرح اہل ایمان کے عقائد کو مختلف حیلے بہانوں سے کمزور کر رہا ہے انہیں شرک میں مبتلا کر رہا ہے' لوگوں کو غیر اللہ کے آگے سر جھکانے کی ترغیب دے رہا ہے تو کیا اسے یہ ناپاک کھیل کھیلنے دیا جائے' میرے لہجے میں غیر ارادی طور پر تلخی سی آ گئی۔

"یقیناً اس کافر جن زاد کو ایسا کرنے کیلئے آزاد نہیں چھوڑا جائے گا۔" عالم سوما نے یقین دہانی کرائی۔ "وہ شر نہیں پھیلا سکے گا اور خیر ہی کا بول بالا رہے گا مگر اے دینار! یہ تیرے کرنے کا کام نہیں ہے۔ اسے مجھ پر چھوڑ دے...... اور ہاں مطمئن رہ کہ جب تک تیرے گرد نادیدہ حفاظتی حصار موجود ہے عفریت دہموش تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اول تو یہی ضروری نہیں کہ وہ سراغ لگا لے کہ بغداد شہر میں تم کہاں ہو۔ اگر اسے یہ معلوم بھی ہو گیا کہ تم دونوں کی سکونت قصر خلافت میں ہے تو تمہیں کوئی نقصان پہنچانا اس کے بس میں نہ ہو گا۔ پہلے بھی میں تمہیں دلاسا دے چکا ہوں کہ تمہاری طرف سے غافل نہیں رہوں گا۔"

عالم سوما نے مجھے اور عارج کو پوری طرح مطمئن کر دیا۔ ہم بابل کے کھنڈرات سے

بغداد لوٹ آئے لیکن یہ تشویش اپنی جگہ تھی کہ عفریت دہموش ہماری راہ پر لگ گیا ہے۔ اسی تشویش کے پیش نظر عارج اس رات مجھ سے کہنے لگا۔ "اے دینار! موجودہ حالات میں کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم کچھ عرصے کیلئے کسی اور زمانے اور ہی سرزمین پر چلے جائیں۔"

"ابھی ہمارے لئے بغداد میں اس قدر خطرات پیدا نہیں ہوئے کہ ہم یہاں سے فرار ہو جائیں۔" میں نے عارج کو تسلی دی۔ "اگر واقعی خطرات بڑھ گئے تو ہمارے پاس فرار کا راستہ موجود ہے تو کیوں گھبراتا ہے عارج!"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہم کچھ دنوں کیلئے اپنا ٹھکانا تبدیل کر دیں۔" عارج نے ایک اور نئی تجویز پیش کر دی۔

"ٹھکانا تبدیل کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہمیں جمیلہ اور ایوب کے انسانی قالبوں کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔" میں نے وضاحت کی۔

"تو اس میں بھی کیا حرج ہے۔" عارج نے کہا۔

"اگر چند ہی دن کی بات ہے تو پھر موصل چلتے ہیں۔" میں نے رائے دی۔ "وہیں سابق وزیر ابراہیم حرانی کی تلاش میں حمزہ گیا ہے۔ تجھے میں حمزہ کے بارے میں بتا ہی چکی ہوں وہ دیوان الجند (محکمہ فوج) کے شعبہ سراغ رسانی کا سربراہ ہے۔"

"ہاں مجھے یاد ہے تو نے بتایا تھا۔" عارج بولا۔

"تو پھر کیا کہتا ہے چلیں موصل۔" میں نے پوچھا۔

"حمزہ پہنچ گیا ہو گا وہاں؟" عارج نے سوال کیا۔

"کیا خبر۔" میں نے جواب دیا۔ "نہیں پہنچا ہو گا تو پہنچ جائے گا اس طرح اس فسادی آدم زاد ابراہیم حرانی کا انجام بھی ہم دیکھ لیں گے۔"

"تو پھر مناسب یہ ہو گا کہ ہم حمزہ کے پاس پہنچیں۔" عارج نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

میرے اور عارج کے درمیان طے پایا کہ ہم اگلے روز صبح ہوتے ہی جمیلہ اور ایوب کے جسموں کو چھوڑ کر بغداد سے روانہ ہو جائیں گے۔ اس فیصلے کے بعد ہم سکون و اطمینان سے گہری نیند سو گئے۔

دوسرے دن فجر کے وقت میری آنکھ کھلی تو میں نے عارج کو بھی جگا دیا' وہ نیند میں تھا کہنے لگا۔ "سونے دو نا ابھی۔"

میں نے اسے ہڑبڑانے کی خاطر دانستہ کہہ دیا۔ "بوڑھے عفریت سے ملنے نہیں

چلنا۔"

میری توقع کے مطابق وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ "کیا..... تو اس عفریت کے بارے میں کیا کہہ رہی تھی اے دینار؟"

"کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔" میں دھیرے سے ہنس دی۔ "عفریت کا ذکر کر کے تیری نیند بھگانا میرا مقصد تھا۔"

"تو کیا تیرے خیال میں اس بوڑھے عفریت سے میں ڈرتا ہوں۔" عارج نے برا سا منہ بنایا۔

بالکل نہیں ڈرتا اسی لئے تو فی الفور اٹھ کر بیٹھ گیا تو اس عفریت سے ملنے ہی کیلئے بغداد سے روانہ ہو رہا ہے۔"

"طنز نہ کیا کر مجھ پر اے دینار..... یہ نہ بھولا کر میں اب نہ سہی تو ایک نہ ایک دن تیرا شوہر بن ہی جاؤں گا۔"

"تو نے پھر وہی شوہر اور بیوی کا قصہ نکال لیا۔"

"یہ قصہ تو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔"

"تو پھر تو قصہ کہتا رہ میں چلتی ہوں۔" میں یہ کہتے ہوئے جمیلہ کے انسانی قالب سے باہر نکل آئی۔

مجبوراً عارج کو بھی ایوب کا جسم چھوڑنا پڑا۔ ان دونوں کے جسموں کو ہم نے بستروں پر لٹا دیا۔ وہ جاگ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔ ہم انہیں وہاں چھوڑ کر قصر خلافت سے نکل آئے۔

حمزہ کے جسم کی مخصوص خوشبو میرے حافظے میں تھی۔ اسی کے ذریعے میں صحرا میں ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں خیمے نصب تھے۔ عارج میرے ساتھ ساتھ تھا مجھے یہ پتا لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ حمزہ کا قافلہ موصل سے صرف ایک منزل کے فاصلے پر ہے۔ قافلہ روانہ ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی حمزہ روانگی کا حکم دے چکا تھا۔ توقع کے مطابق قافلے میں خدام اور خادمائیں بھی موجود تھیں۔ کام کاج کیلئے ان کی موجودگی ضروری تھی۔ عارج اور مجھے کیونکہ حمزہ کے ساتھ رہنا تھا اسی وجہ سے ہم نے انسانی قالبوں میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ وہاب ایک ادھیڑ عمر خادم تھا' وہ اور ایک خادمہ رحیمہ دونوں ہی حمزہ کی خدمت پر مامور تھے۔ حمزہ سے قریب رہنے کی خاطر میں تو رحیمہ کے جسم میں اتر گئی اور عارج نے وہاب کا انسانی قالب اپنا لیا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ دو جن زاد بھی اس قافلے میں شامل ہو چکے ہیں۔ جلد ہی

خیمے اکھاڑ کر لپیٹ لئے گئے اور انہیں اونٹوں پر لاد دیا گیا۔ قافلے کا دیگر ساز و سامان بھی انہی اونٹوں پر لدا ہوا تھا۔ اونٹ اور گھوڑے دونوں ہی قافلے میں شامل تھے۔ حمزہ اور اس کے عملے والے گھوڑوں پر سوار تھے۔ خدام' خادمائیں اور دیگر ملازمین کو اونٹوں پر جگہ ملی تھی۔ میں ایک اونٹ پر عارج کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس اونٹ پر کوئی اور سوار نہیں تھا۔

"اے بوڑھے وہاب! تجھے اس طرح ایک نوجوان خادمہ سے لگ کر بیٹھے ہوئے کیا ذرا بھی حیا نہیں آ رہی۔" میں نے دھیمی آواز میں عارج کو چھیڑا۔

"تجھے کس نے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا اے رحیمہ کہ تو نوجوان ہے۔ بس جاتی ہوئی بہار کے کچھ آثار ہی تو باقی رہ گئے ہیں۔" عارج نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "یہ بھی تیرا بیان غلط ہے کہ میں تجھ سے لگ کر بیٹھا ہوں حقیقت برعکس ہے۔"

"یعنی میں تجھ سے لگی بیٹھی ہوں۔" میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

راستہ اسی طرح چھیڑ چھاڑ میں کٹ گیا۔ اس وقت دوپہر ہونے والی تھی جب ہم شہر موصل کی حدود میں داخل ہوئے۔ حمزہ کے حکم پر قافلے نے شہر کے بڑے اور مرکزی بازار میں واقع ایک سرائے کا رخ کیا۔ حمزہ اور اس کے عملے نے خود کو سوداگر ظاہر کیا اور سرائے میں قیام کی خاطر اونٹوں پر لدا ہوا اپنا سامان اتارنے لگے۔ حمزہ نے یقیناً راز داری کی غرض سے سرائے میں قیام کو ترجیح دی تھی۔

جب ہم حمزہ کو دوپہر کا کھانا کھلا چکے تو اپنی کوٹھری میں آ کر خود بھی کھانا کھایا اور آرام کرنے کو اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔

"کہاں قصر خلافت اور کہاں موصل کی یہ سرائے۔" میں نے عارج کو مخاطب کیا۔

"ان آدم زادوں کو سمجھائے کون! یہ تو اپنی فانی دنیا کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" میں نے طویل سانس لیا' پھر چند لمحے توقف کے بعد بولی۔ "میں ذرا حمزہ کے پاس جا کر پتا لگاتی ہوں کہ اس کے ارادے کیا ہیں۔ وہ سابق وزیر ابراہیم حرانی کو کب اور کیسے گرفتار کرنا چاہتا ہے؟"

"تجھے بھی چین نہیں کہ دو گھڑی سکون سے میرے ساتھ گزار لے' جا! تجھے کس نے روکا ہے جو میں روکوں گا۔" عارج منہ بنا کر بولا۔

"میں نے مزید کچھ کہے بغیر خادمہ رحیمہ کا جسم چھوڑ دیا' احتیاطاً میں نے اس پر نیند مسلط کر دی تھی۔

برابر والی کوٹھری میں اس وقت حمزہ تنہا نہیں تھا' وہاں اس کے دو ماتحت بھی موجود

تھے۔

''پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ مفرور وزیر ابراہیم حرانی عامل موصل اسحاق بن محمد کے مکان ہی میں پناہ لئے ہوئے ہے ہم اس کے بعد رات کو اچانک چھاپہ مار سکتے ہیں۔'' حمزہ اپنے ماتحتوں سے کہہ رہا تھا۔

''لیکن حضور تصدیق کی کیا صورت ہو۔'' ماتحتوں میں سے ایک نے سوال کیا۔ ''کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے۔''

''اگر میں نے طریقہ کار ہی طے کر لیا ہوتا تو پھر تمہیں مشورے کیلئے بلانے کی کیا ضرورت تھی۔'' حمزہ کے لہجے میں قدرے ناگواری تھی۔

''جس ماتحت نے طریقہ کار کے بارے میں سوال کیا تھا شرمندہ نظر آنے لگا۔ اب حمزہ کی سوالیہ نظریں اپنے دوسرے ماتحت کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ جواباً وہ سٹپٹا کر کہنے لگا بس...... اس کی ایک...... ایک ہی صورت ہے کہ ہم...... ہم میں سے کوئی امیر المومنین کا قاصد بن کر عامل موصل کے مکان پر پہنچے اور کہے کہ...... ابراہیم حرانی کے نام خلیفہ محترم کا پیغام لے کر آیا ہوں' اگر وہاں......

''اور وہ پیغام؟...... پیغام کہاں سے آئے گا؟'' حمزہ نے دوسرے ماتحت کی بات کاٹ دی۔'' کیا تم نہیں جانتے کہ امیر المومنین کے کسی پیغام کیلئے اس پر دیوان الرسائل (پیغام' احکام اور خلیفہ کے فرامین کا محکمہ) کی مہر ضروری ہے۔ اس کے علاوہ دیوان الخاتم (خلیفہ کی مہر کا محکمہ) کی مہر بھی پیغام پر ہونی چاہیے۔ اس دونوں مہروں کی عدم موجودگی کا مطلب یہی ہوگا کہ پیغام جعلی ہے پھر صرف یہ سن کر اس کے نام امیر المومنین کا کوئی پیغام آیا ہے ابراہیم حرانی خود کو ظاہر نہیں کرے گا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ امیر المومنین اسے نہ تو کوئی معافی نامہ بھیجیں گے' نہ محبت آمیز پیغام ارسال کریں گے۔ ایسی صورت میں وہ ہرگز سامنے نہیں آئے گا کوئی اور تدبیر بیان کرو۔''

ماتحت کے چہرے سے فکرمندی جھلکنے لگی۔ وہ زیر لب کہنے لگا۔ ''پھر تو چور بن کر ہی عامل موصل کے مکان میں داخل ہونا پڑے گا۔''

''کیا کہا تو نے...... ذرا بلند آواز میں کہو۔'' حمزہ نے اپنے ماتحت سے کہا۔

''کسی قدر ڈرتے جھجکتے ہوئے ماتحت نے اپنی بات ذرا بلند آواز میں دہرا دی۔

''ہاں یہ تدبیر بہتر معلوم ہوتی ہے۔'' حمزہ بولا۔ ''مگر اس کیلئے کسی کو اپنی جان کا خطرہ مول لینا پڑے گا۔ عامل موصل کے محافظ اول تو کسی کو مکان میں داخل نہیں ہونے دیں گے

اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر وہاں سے بچ کر نکلنا آسان نہیں ہوگا۔''

یہی موقع تھا کہ میں نے مداخلت کی اور حمزہ کے پہلے ماتحت کو میں نے اپنے اثر میں لے لیا اور اس سے کہلوایا۔ ''حضور! یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہمارے عملے کا جو فرد اس مکان میں داخل ہو ہم اسے تحفظ فراہم کریں۔''

''تمہارا مطلب یہ ہے کہ عملے کے بقیہ افراد بھی وہیں موجود رہیں؟'' حمزہ نے وضاحت چاہی۔

''جی ہاں حضور! میرا یہی مطلب ہے۔'' ماتحت نے جواب دیا۔ ''اس طرح یہ ہوگا کہ مکان میں اگر مفرور ابراہیم حرانی موجود ہوا تو ہمارا آدمی ہمیں اس وقت مطلع کر دے گا اور ہم اسے گرفتار کر لیں گے۔''

''پھر تو میری موجودگی بھی وہاں ضروری ہوگی۔'' حمزہ کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ پھر بولا مکان میں داخل ہونے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارا آدمی کمند ڈال کر اندر پہنچے دوسرا طریقہ نقب لگانا ہے۔ کون سا طریقہ آزمایا جائے؟

''نقب لگا کر داخل ہونا زیادہ بہتر ہوگا حضور۔'' پہلے ماتحت نے کہا وہ ابھی تک میرے زیر اثر تھا۔ پھر اس نے وضاحت طلب کئے بغیر مزید بتایا جہاں نقب لگائی جائے گی اس جگہ سے ہمارے عملے کے دوسرے افراد بھی بوقت ضرورت بآسانی اندر جا سکتے ہیں۔

اسی وقت حمزہ کے دوسرے ماتحت نے بولنے کی اجازت چاہی۔ ''ہمارے عملے میں ایک ایسا شخص موجود ہے جو یہ کام بآسانی انجام دے سکتا ہے۔ میری مراد نقب لگانے سے ہے۔ ایک جرائم پیشہ گروہ کے افراد کو پکڑنے کیلئے ہمیں ان کی کمین گاہ میں نقب لگانے کی......''

''بات صرف نقب لگانے کی نہیں۔'' حمزہ بول اٹھا۔ ''ایک تو یہ کہ وہ اندر پہنچ کر ابراہیم حرانی کو تلاش کر سکے' دوسرے......''

مجھے کیونکہ علم تھا کہ ابراہیم حرانی مکان کے کس حصے میں ہے اس لئے حمزہ کے ذہن میں یہ بات ڈال دی۔

حمزہ سمجھا کہ یہ خیال خود اس کے ذہن میں آیا ہے اس نے اسی لئے اپنے ماتحتوں سے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ عامل موصل نے ابراہیم اور اس کے اہل خانہ کو اپنے مکان کے مہمان خانے میں ٹھہرایا ہوگا' کیا کہتے ہو۔''

دونوں ہی ماتحت تائید میں بولے۔ خادم' خادمائیں اور دیگر ملازمین کو چھوڑ کر اس مہم

میں حمزہ سمیت اس کے پورے عملے کو شریک ہونا تھا۔" طے یہ پایا کہ نصف شب کے قریب تمام عملے کو ضروری سامان اور ہتھیار ساتھ لے کر سرائے سے نکل جانا تھا۔ اس کے لئے سرائے کے مالک کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ یہ بات بھی میں نے ہی حمزہ کے دماغ میں ڈالی۔ یہ اس لئے لازمی تھا کہ عموماً نصف شب سے بہت پہلے ہی سراؤں کے صدر دروازے بند کر دیئے جاتے تھے۔ پھر نہ تو کوئی سرائے میں داخل ہو سکتا تھا' نہ کسی کیلئے باہر جانا ممکن ہوتا تھا' حفاظتی نقطہ نظر سے مسافر اس پر اعتراض نہیں کرتے تھے۔

اسی شام میرے ایماء پر حمزہ سرائے کے مالک سے ملا۔ اس نے سرائے کے مالک پر اپنی اصل شخصیت تو ظاہر نہیں کی البتہ یہ واضح کر دیا کہ وہ دارالحکومت بغداد سے آیا ہے اور اس کا تعلق فوج کے محکمے سے ہے۔ یہ بات بھی حمزہ نے اس تاکید کے ساتھ بتائی تھی کہ کسی کو بھی اس حقیقت سے آگاہ نہ کیا جائے۔ بصورت دیگر سرائے کے مالک سے اس سلسلے میں جواب طلبی ہو سکتی تھی۔

سرائے کا مالک بے چارہ سیدھا سادا آدم زاد تھا۔ اس نے ہامی بھر لی کہ رات کو نصف شب سے پہلے وہ خود صدر دروازے پر موجود ہوگا۔ وہ یہ سن کر ڈر گیا تھا کہ حمزہ کا تعلق فوج سے ہے۔ بات نہ بگڑے اس لئے میں بھی اس وقت حمزہ کے قریب ہی موجود تھی مگر میری مداخلت کی ضرورت پیش نہ آئی۔ میں لوٹ کر اپنی کوٹھڑی میں پہنچی تو میری مخصوص خوشبو محسوس کرتے ہی عارج کہنے لگا۔ "یہ تو کہاں اکیلی اڑی پھر رہی ہے۔ لگتا ہے جیسے میں تو تیرے ساتھ آیا ہی نہیں ہوا کیا ہوا کچھ مجھے بھی تو بتا۔"

"ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا' میں بولی۔ "جو ہونا ہے رات ہی کو ہوگا۔" میں نے یہ کہہ کر عارج کو سب کچھ بتا دیا۔

"رات کو بھی اکیلے اکیلے اڑ جائے گی کہ مجھے ساتھ لے چلے گی۔" عارج پوچھنے لگا۔

"تو کبھی کبھی تو بالکل بچہ بن جاتا ہے۔ جیسے ابھی تیری عمر صرف سو سال ہو۔ تجھے منع کس نے کیا ہے' چلنا ساتھ۔" میں بولی۔

اس رات کو مقررہ وقت پر حمزہ اور اس کا تمام عملہ پوری تیاری کے ساتھ اپنی اپنی کوٹھڑی سے نکل آیا۔ عارج اور میں بھی اپنے انسانی قالبوں سے باہر آ گئے تھے۔ سرائے کا مالک وعدے کے مطابق صدر دروازے پر مل گیا۔ اس نے لکڑی کے بڑے پھاٹک میں بنا ہوا چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ حمزہ اور اس کے عملے والے یکے بعد دیگرے دروازے سے نکل آئے۔ احتیاط اور راز داری کے تحت انہیں یہ سفر عالِ موصل کے مکان تک پیدل ہی کرنا تھا۔

اگر وہ گھوڑوں پر سوار ہوتے تو رات کے وقت ٹاپوں کی آوازوں سے لوگ جاگ سکتے تھے۔ پھر بھی انہیں اپنی منزل تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ انہوں نے تیز قدمی سے درمیانی فاصلہ طے کیا تھا۔

موصل پرامن علاقہ تھا۔ اسی بنا پر عالِ موصل نے اپنے مکان کی حفاظت کا کوئی خاص بندوبست نہیں کیا تھا۔ دو پہرے داروں کو قابو کرنا مشکل نہ ہوا۔ انہیں حمزہ کے تربیت یافتہ عملے نے اس طرح پکڑ کر ہوش و حواس سے بیگانہ کیا تھا کہ وہ چیخ بھی نہ سکے تھے۔ کچھ ہی دیر میں عالِ موصل اسحاق بن محمد کے مکان کو حمزہ کے مسلح آدمیوں نے گھیر لیا۔

نقب لگاتے وقت یہ توقع کی جا رہی تھی کہ مکان کے اندر اندھیرا اور خاموشی ہوگی مگر ایسا نہ تھا۔ عارج کو ساتھ لئے ہوئے میں پہلے ہی اندر داخل ہو گئی۔ مہمان خانے میں روشنی دیکھ کر میں ٹھٹک گئی۔

"آ اے عارج! ادھر چل کر دیکھتے ہیں کہ کون اور کیوں جاگ رہا ہے؟" میں نے کہا اور مہمان خانے کی طرف چلی۔

مہمان خانے کے جس دالان میں روشنی ہو رہی تھی میں وہاں پہنچی تو دیکھا ابراہیم حرانی جاگ رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس رات ابراہیم حرانی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ عشاء کے بعد اسحاق بن محمد کا ایک بااعتماد طبیب ابراہیم حرانی کو دیکھ کر گیا تھا۔ اس وقت ابراہیم کو تیز بخار تھا۔ طبیب کی دوا کے اثر سے بخار تو کم ہو گیا تھا مگر ابراہیم کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ دو خادم اس کی تیمارداری کیلئے خواب گاہ میں موجود تھے۔ ذرا سی دیر میں نقب لگانے کی مسلسل آوازیں آنے لگیں۔

میں نے ابراہیم حرانی کو چونک کر بستر پر بیٹھتے ہوئے دیکھا۔

"کیا ہوا حضور!" ایک خادم نے اس سے پوچھا۔

"تم دونوں کیا بہرے ہو۔" ابراہیم حرانی ناگواری سے بولا۔ "کیا تمہیں کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا۔"

"جی..... جی ہاں حضور!" دوسرا خادم چونک کر کہنے لگا۔ "کچھ آوازیں آ تو رہی ہیں جیسے..... جیسے کوئی دیوار پر پتھر مار....."

"یہ دیوار پر پتھر مارنے کی آواز نہیں اے بے وقوف۔" ابراہیم حرانی نے تیز آواز میں کہا۔ دیوار کو کسی اوزار سے توڑا جا رہا ہے..... بلکہ شاید نقب لگائی جا رہی ہے۔ معلوم نہیں پہرے دار کہاں جا کے سو گئے ہیں۔ جاؤ جلدی سے جا کر عالِ موصل کو بتاؤ کہ اس کے مکان

میں کوئی چور نقب لگا کر گھسنے والا ہے...... دوڑو...... جلدی کرو۔"

دونوں خادم یکے بعد دیگرے خواب گاہ سے تقریباً بھاگتے ہوئے نکل گئے۔ ابراہیم حرانی کو اپنے اثر میں لے کر میرے لئے پکڑوا دینا کوئی مشکل نہ تھا مگر مجھے یہ مناسب معلوم نہ ہوا۔ ہر چند کہ ابراہیم سے میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی پھر بھی وہ اپنی بد سیرتی کے سبب مجھے سخت ناپسند تھا۔ اس کے باوجود میں مداخلت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں دشمن کو بھی مدافعت کا حق دینے کی قائل تھی۔

نقب لگانے کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ ان آوازوں کے ساتھ ابراہیم حرانی کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا اظہار ابراہیم حرانی کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ اب وہ بے چینی کے عالم میں بستر سے اٹھ کر ٹہلنے لگا تھا۔ سرہانے رکھی تلوار بھی اس نے نیام سے باہر نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ ذرا دیر ہوئی تھی کہ مکان میں بھاگ دوڑ مچ گئی۔

اسحاق بن محمد بھاگتا ہوا خواب گاہ میں آیا اور ہانپتے ہوئے ابراہیم حرانی کو بتانے لگا۔

"معلوم نہیں کون لوگ ہیں جو نقب لگا کر مکان میں گھس آئے ہیں۔ وہ سب مسلح ہیں۔ گھر میں جتنے بھی خادم ہیں انہیں روکنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر۔ ..."

"مجھے تو یہ کوئی اور ہی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔" ابراہیم حرانی بول اٹھا۔ "تم نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ اس مکان سے نکلنے کا ایک خفیہ راستہ ....."

"لیکن وہ راستہ برسوں استعمال نہیں ہوا۔" اسحاق نے ابراہیم کی بات کاٹ دی۔ "معلوم نہیں وہاں کتنے حشرات الارض ہوں گے۔"

"تم ان کی پرواہ مت کرو اور مجھے فوراً وہاں لے چلو۔" ابراہیم حرانی بولا۔

ابراہیم کی ضد پر اسحاق اسے مہمان خانے ہی کے ایک دالان میں لے گیا۔ روشنی کیلئے اس نے ایک شمع دان ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس دالان کی دائیں دیوار میں لوہے کا ایک کڑا پڑا تھا۔ اسحاق نے شمع دان فرش پر رکھا اور دونوں ہاتھوں سے لوہے کا کڑا پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی اور دیوار میں خلا نمودار ہو گیا۔ اس کے ساتھ بدبو کا بھبکا بھی محسوس ہوا۔

راہ فرار دیکھتے ہی ابراہیم حرانی کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے چند لمحے بھی صبر نہ کیا اور اسحاق سے مخاطب ہوا۔ "اپنے اہل خانہ کو ساتھ لے جانا ان حالات میں میرے لئے ممکن نہیں میری واپسی تک ان کی حفاظت تمہاری ذمہ داری ہے خدا حافظ۔"

پھر ابراہیم حرانی تاریک خلا میں داخل ہو گیا۔ ابھی چند ساعتیں ہی گزری ہوں گی کہ

خلا سے تیز چیخ سنائی دی۔

"سانپ...... سانپ...... مجھے سانپ نے ڈس لیا۔" ابراہیم حرانی چیختا ہوا خلا سے باہر نکلا۔ اس کے ایک بازو پر سانپ لپٹا ہوا تھا۔ وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے سانپ کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ تلوار اس نے ہاتھ سے چھوڑ دی تھی۔

"میں نے کہا تھا نا تم سے ابراہیم مگر تم......" اسحاق کی بات ادھوری رہ گئی۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بہت قریب آ گئی تھیں پھر اسحاق تو دالان سے نکل کر بھاگ گیا اور ابراہیم اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ اس نے ایک نہ سنی۔ عموماً ایسے وقت آدم زاد بہرے ہو جاتے ہیں۔ سن کر بھی کچھ نہیں سنتے۔

حمزہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس دالان میں داخل ہوا تو اس وقت تک ابراہیم حرانی فرش پر گر پڑا تھا۔ اس کے بازو سے لپٹا سانپ تاریک خلا میں گھس کر غائب ہو چکا تھا۔ شمع دان کی دھیمی روشنی میں غالباً حمزہ یہ نہ دیکھ سکا کہ ابراہیم حرانی کا چہرہ نیلا پڑتا جا رہا ہے اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے ہیں۔ حمزہ کے ہاتھ میں شمشیر برہنہ تھی اس نے ایک ہی وار میں ابراہیم حرانی کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا۔ خلیفہ ہارون الرشید کو انتہائی مطلوب افراد میں سے ایک کم ہو گیا تھا۔

حمزہ کے اشارے پر اس کے ایک ماتحت نے ابراہیم حرانی کا کٹا ہوا سر اٹھا لیا۔

جس طرح حمزہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ عامل موصل کے مکان میں داخل ہوا تھا اسی طرح باہر نکل گیا۔ اسحاق کو خبر بھی نہ ہوئی کہ اس کے مکان میں نقب لگا کر داخل ہونے والے لوگ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے۔

دوسرے ہی روز صبح موصل سے حمزہ کا قافلہ بغداد کے لئے روانہ ہو گیا۔ حمزہ نے دانستہ ایک باغی اور حکومت وقت کو انتہائی مطلوب شخص کی مدد کرنے اور اسے پناہ دینے کے جرم میں اسحاق کو گرفتار نہیں کیا تھا۔ اگر وہ خلیفہ کے علم و اطلاع میں لائے بغیر اسحاق کو گرفتار کر لیتا تو یہ اختیارات سے تجاوز ہوتا۔ کسی بھی عامل کو خلیفہ کے حکم ہی سے حراست میں لیا جا سکتا ہے۔ حمزہ کو اس حقیقت کا علم تھا۔

روز و شب کی بساط لپیٹتا اور منزل بہ منزل تیزی سے سفر کرتا ہوا حمزہ کا قافلہ ایک شام بغداد پہنچ گیا۔ اس نے فوری طور پر ہارون سے خلوت میں ملاقات کی اجازت چاہی۔ اجازت مل گئی تو وہ ہارون کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھی۔

"امیر المومنین ایک باغی کا کٹا ہوا سر ملاحظہ فرمانا چاہیں تو غلام....."

ہارون نے حمزہ کی بات کاٹ دی۔ ''ہمیں کٹے ہوئے سر دیکھنے کا شوق نہیں تم صرف اس باغی کا نام بتا دو جس کا سر کاٹ کر لائے ہو ہم تمہاری بات پر یقین کر لیں گے۔ بولو حمزہ! وہ باغی کون ہے جو اب اس دنیا میں نہیں رہا؟''

''اے امیر المومنین اس فسادی و باغی کا نام ابراہیم حرانی ہے۔'' حمزہ نے بتا دیا۔

''ابراہیم حرانی۔'' ہارون چونک اٹھا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''وہ تمہیں کہاں مل گیا؟''

''موصل میں اے امیر المومنین۔'' حمزہ نے جواب دیا۔

''لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ بغداد سے فرار ہو کر وہ کہاں جا کر چھپ گیا ہے؟'' ہارون نے سوال کیا۔

''عامل موصل اسحاق بن محمد کے سوا ابراہیم کے تمام رشتہ داروں اور دوستوں سے پوچھ گچھ کی جا چکی تھی...... '' حمزہ جواب میں وہی سب کچھ بیان کرنے لگا جو میں نے اس کے دماغ میں ڈالا تھا۔ آخر میں اس نے یہ بھی بتایا۔ ''میرا ایک غلام چمڑے کا وہ تھیلا لئے دروازے کے باہر کھڑا ہے جس میں ابراہیم حرانی کا کٹا ہوا سر موجود ہے۔ غلام اس لئے وہ تھیلا اندر نہیں لایا کہ اس سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے ہیں۔''

''اپنے غلام کو اس تھیلے سمیت رخصت کر دو کہ ہمیں تم پر اعتماد ہے۔'' ہارون بولا۔

اس کے حکم کی تعمیل کر کے حمزہ پھر واپس آ گیا۔

ہارون کہنے لگا۔ ''ہمیں تو اسحاق بن محمد پر حیرت ہے اس کی یہ ہمت و جسارت کیسے ہوئی کہ ایک باغی کو پناہ دے دی۔ تم اگر اس جرم میں اسحاق کا سر بھی کاٹ کر لے آتے تو ہم جواب طلبی نہ کرتے' تاہم حدود سے تجاوز نہ کرنے پر ہم تمہیں لائق تحسین سمجھتے ہیں۔''

''شکریہ امیر المومنین!'' حمزہ احتراماً ہارون کے سامنے تھوڑا سا جھک گیا۔

ہارون نے ایک طرف تو حمزہ کو رخصت کیا دوسری جانب اسی وقت وزیر یحیٰ بن خالد کو طلب کر لیا۔ میں اب بھی وہیں تھی۔

''اے یحیٰ! ہمیں بتاؤ کہ کسی باغی کو پناہ دینے کی سزا کیا ہے؟'' ہارون نے اپنے وزیر سے پوچھا۔

''اے امیر المومنین! جو سزا باغی کی وہی اسے پناہ دینے والے کی سزا ہے۔'' یحیٰ نے بلا جھجک جواب دیا۔

پھر مختصراً ہارون نے ابراہیم حرانی کے مارے جانے اور اسحاق کی نافرمانی سے یحیٰ کو

آگاہ کیا۔ آخر میں اس نے کہا' ''عامل موصل اسحاق بن محمد کو ہم اسی وقت معزول کرتے ہیں۔ اسحاق کے نام ہماری طرف سے حکم جاری کیا جائے کہ وہ فوراً دربار میں حاضر ہو۔''

''اور اسحاق کی جگہ اے امیر المومنین کسے موصل کا نیا عامل مقرر کیا جائے؟'' یحیٰ نے نرمی سے سوال کیا۔

''ابوحنیفہ بن قیس کو ہم موصل کا عامل مقرر کرتے ہیں۔''

''امیر المومنین کا فیصلہ قطعی درست ہے۔'' یحیٰ نے کہا۔ شاید اسحاق بن محمد کی تقرری پر بھی اس آدم زاد نے یہی کہا ہو۔ دراصل حکمرانوں کے سامنے بڑے بڑے اہل زبان گونگے بن جاتے ہیں اور ان کے ہر عمل کو درست قرار دیتے ہیں۔ یحیٰ تو یوں بھی حکمران خاندان کا دیرینہ خیر خواہ تھا' اتنے قریبی تعلقات کسی اور خلیفہ وقت کے نہیں تھے۔ یحیٰ بن خالد کا باپ خالد بن برمک تھا۔ خلیفہ منصور نے خالد کو اپنے بیٹے مہدی کا اتالیق بنایا تھا یہی روایت مہدی نے قائم رکھی تھی۔ اسی سبب ہارون کا اتالیق یحیٰ کو مقرر کیا گیا تھا۔

برمکوں سے حکمران خاندانوں کی اس قدر قربت تھی کہ یحیٰ کا بیٹا فضل اور ہارون دودھ شریک بھائی تھے۔ فضل کو ملکہ خیزران نے بھی دودھ پلایا تھا۔ یہ اعزاز کسی اور غیر حکمران خاندان کو حاصل نہیں تھا۔ اسی بنا پر حکمران خاندان کے بعد برمکوں ہی کو فضیلت حاصل تھی۔

موصل سے لوٹ کر آنے کے بعد عارج اور میں نے اپنے اپنے انسانی قالبوں میں پناہ لے لی تھی۔

خلیفہ ہارون الرشید کی طلبی پر جب اسحاق بن محمد دربار میں حاضر ہوا تو اسے یقیناً معلوم نہ تھا کہ یہ اس کی زندگی کا آخری دن ہے۔ ہارون نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ اس حکم سے پہلے اسحاق پر فرد جرم عائد کی گئی تھی۔ اسحاق نے اپنے جرم کا اقرار کر کے معافی کی خاطر درخواست کی۔ ہارون نے درخواست مسترد کرتے ہوئے حکم سنا دیا' حکم کی تعمیل میں اسی روز اسحاق کی گردن اڑا دی گئی۔

اس واقعہ کے تیسرے دن کا ذکر ہے کہ عارج نے مجھ سے پوچھا۔ ''یہ زینب جو نجف سے آئی ہے کیا واقعی تیری بہن ہے۔''

''یہ تو کہاں کی ہانکنے لگا اے عارج! کون زینب اور کس کی بہن۔'' میں بولی۔

''جمیلہ کی بہن زینب اس سے ملنے بغداد آئی ہوئی ہے۔'' ''اب سمجھی کچھ۔'' عارج نے بتایا۔ ''مجھے ابھی یہ اطلاع ملی ہے وہ قصر خلافت کی انتظار گاہ میں تیری منتظر ہے اس نے اپنے بارے میں محافظوں کو یہ بتایا ہے کہ وہ نجف سے آئی ہے۔''

"پتا نہیں کون بے چاری ہے وہ۔" میں نے کہا۔ "کوئی مصیبت پڑی ہوگی تو اسے اپنی بہن یاد آئی ہوگی پہلے تو کبھی اس کا نام نہیں سنا۔"

"کیا خبر تیرا خاندان کتنا بڑا ہو۔" عارج کے لہجے میں شوخی تھی۔ "ابھی تو صرف ایک......"

"موقع محل دیکھ لیا کر۔ ہر وقت شرارت اچھی نہیں لگتی۔" میں یہ کہتی ہوئی اٹھی اور اندرونی دالان سے نکل آئی۔

قصر خلافت کی انتظار گاہ بہت بڑی تھی۔ یہ انتظار گاہ بطور خاص ان افراد سے ملنے کیلئے آنے والوں کی خاطر بنائی گئی تھی جو کسی نہ کسی حیثیت سے قصر خلافت میں ملازمت کرتے تھے اور ان کا قیام بھی وہیں تھا۔ جب تک کوئی ملازم خود اپنے ملنے والے کو قصر میں ساتھ نہ لے جائے کسی کو بھی اندر گھسنے کی اجازت نہیں تھی' حفاظتی نقطہ نظر سے یہ اقدام مناسب بھی تھا۔

عمر میں وہ آدم زادی زینب' میرے انسانی پیکر جمیلہ سے دو چار سال بڑی لگتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دس بارہ سال کا لڑکا بھی تھا۔ مجھے اپنے قریب آتے دیکھ کر وہ کھڑی ہوئی اور پھر لپٹ کر رونے لگی۔ یوں جیسے اسے اپنے جذبات پر قابو نہ رہا ہو۔

زینب کو تسلی دیتے ہوئے میں نے اس کا ذہن پڑھ لیا۔ وہ واقعی جمیلہ کی بہن تھی اپنے ساتھ وہ اکلوتے بیٹے کو لائی تھی۔ جس کا نام ہلال تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "گھبراؤ نہیں میری بہن! تم سے تمہارا حق کوئی بھی نہیں چھین سکتا' چلو میرے ساتھ۔"

وہ دوپہر کا وقت تھا' زینب کہنے لگی۔ "میرا سامان تو سرائے میں پڑا ہے۔"

"کوئی بات نہیں' فکر نہ کرو سامان بھی وہاں سے آ جائے گا۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "تم ساتھ تو چلو۔"

زینب اور اس کے بیٹے ہلال کو میں انتظار گاہ سے اپنی قیام گاہ میں لے آئی۔ وہ جمیلہ کے شوہر ایوب کو بھی پہچانتی تھی۔ اس نے سلام کیا تو عارج کو بھی جواب دینا پڑا۔ زینب سے میں نے کھانے کو پوچھا تو بولی۔ "سرائے ہی میں کھا لیا تھا۔"

پھر عارج کو میں نے زینب کے بیٹے ہلال کے ساتھ بھیج دیا تا کہ وہ سرائے سے سامان اٹھا لائے۔

جمیلہ! تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ تمہارے دولہا بھائی بھی اپنے سوتیلے بھائیوں کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں۔ زینب اپنا دکھڑا سنانے لگی۔ واقعی اس کے ساتھ بڑا ظلم ہو رہا

تھا۔ زینب کا یہ خیال درست ہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کے شوہر بلال پر سوتیلے بھائیوں یا ان کی بیویوں نے سحر کرا دیا تھا۔ حتمی طور پر ابھی میرے لئے کچھ بھی کہنا محال تھا کیوں کہ ابھی میں نے بلال کو نہیں دیکھا تھا۔

"دولہا بھائی بھی انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے اور حالات بھی' گھبرانے کی تمہیں ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہارے دولہا بھائی کی سوتیلی بھابیاں تو مجھے یہ طعنے بھی دیتی تھیں کہ اپنی بہن کے گھمنڈ میں نہ رہنا وہ اگر قصر خلافت میں خادمہ ہے تو نجف کے عامل تک ہماری بھی رسائی ہے۔ میں تو اس خوف سے تمہارے پاس دوڑی چلی آئی کہ...... وہ کم بختیں واقعی مجھے طلاق دلوا کر کہیں بلال کے ابو کی دوسری شادی نہ کرا دیں۔" یہ کہتے ہوئے زینب کی آواز بھرا گئی۔

"اللہ نے چاہا تو ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا میری بہن! تم دل چھوٹا نہ کرو۔" میں نے اسے سمجھایا۔

زینب کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ اندر سے واقعی بہت دکھی تھی۔ قصہ یہ تھا جو مجھے زینب کا ذہن پڑھ کر معلوم ہوا کہ اس کے شوہر بلال کو سوتیلے بھائی دولت و جائیداد سے محروم کر دینا چاہتے تھے۔ اگر اس میں کوئی رکاوٹ تھی تو وہ زینب تھی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ سوتیلے بھائی بلال کو بے وقوف بنا رہے تھے۔ اپنے ارادوں میں زینب کو مزاحم جان کر انہوں نے اس پر طرح طرح کے الزامات لگانا شروع کر دیئے تھے۔ حد تو یہ ہوگئی تھی کہ بلال اب اس پر بھی شک و شبہے کا اظہار کرنے لگا تھا۔ ہلال اسی کا بیٹا تھا' مگر وہ اس پر بھی شک کرنے لگا تھا۔ زینب کیلئے یہ انتہائی تکلیف دہ بات تھی۔ سوتیلے بھائیوں اور ان کی حاسد بیویوں کا مقصد یہ تھا کہ زینب کو طلاق دلوا کر کسی اور سے بلال کی شادی کرا دیں۔ زینب اور جمیلہ یہ اپنے والدین کی اولادیں تھیں۔ ان کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ والدین مر چکے تھے۔ اب یہی دونوں بہنیں ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹ سکتی تھیں۔ پانی جب سر سے اونچا ہونے لگا اور زینب کو یہ اندیشہ ہوا کہ بلال اسے طلاق نہ دے دے تو وہ اپنی چھوٹی بہن جمیلہ کے پاس بغداد چلی آئی۔ مصیبت کے وقت اپنے ہی یاد آتے ہیں اور زینب اپنوں ہی کے پاس آئی تھی۔ اس غریب کو گمان بھی نہ ہوگا کہ جسے وہ اپنی چھوٹی بہن سمجھ رہی ہے ایک جن زادی ہے۔

میرا تو مقصد حیات ہی خلق خدا کی خدمت کرنا تھا اور زینب تو اس کی زیادہ مستحق تھی۔ میں نے جس آدم زادی کے جسم پر قبضہ کر رکھا تھا وہ زینب ہی کی بہن جمیلہ تھی۔ دائم یہ

کہ وہ بہر حال مظلوم تھی۔

"اسی روز شام کو موقع پا کر اس مسئلے پر میں نے خلوت میں عارج سے بات کی تو وہ کہنے لگا۔ "یقیناً اے دینار! ہمیں اس آدم زادی کی ضرور مدد کرنی چاہئے لیکن اس میں مجھے ایک قباحت معلوم ہوتی ہے۔"

"وہ کیا اے عارج؟" میں نے دریافت کیا' سامنے سے کوئی آ رہا تھا تو میں نے عارج کو ستون کی آڑ میں ہونے کا اشارہ کیا۔

ایک غلام ہم سے کچھ فاصلے پر تھا۔ وہ گزر گیا تو عارج نے میرے سوال کا جواب دیا۔

"اس کیلئے ہمیں حالات کا پوری طرح جائزہ لینا پڑے گا۔ یہ معاملہ بڑا نازک ہے جلد بازی میں زینب کا گھر بھی اجڑ سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ اس کی یہی صورت ہے کہ ہم خود نجف جائیں اور حالات کے مطابق جو بھی ضروری قدم ہو اٹھائیں۔"

"اس معاملے میں تو ہم جمیلہ اور ایوب کے انسانی پیکروں کو بھی بغداد میں چھوڑ کر نجف نہیں جا سکتے۔ ہمیں انہی قالبوں میں رہ کر نجف جانا پڑے گا جس طرح حمزہ کے ساتھ ہم موصل گئے اور واپس بغداد آ گئے۔ ایسا اس مرتبہ نہیں ہو پائے گا۔" میں بولی۔ "پھر تو بس ایک ہی راہ باقی رہ جاتی ہے کہ ہم کچھ عرصے کیلئے چھٹی لے لیں۔" عارج نے مشورہ دیا۔

"ہاں۔" میں نے بھی عارج کی تائید میں کہا۔ "لگتا ہے کہ نجف جانے کیلئے چھٹی ہی لینا پڑے گی۔"

ہارون الرشید کے خلیفہ بننے کے بعد متعدد تبادلے اور نئی تقرریاں ہوئی تھیں۔ وہیں محکمہ نظارت (نگہبان) کا نگران اعلیٰ بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ قصر خلافت کے تمام ملازمین کی ذمہ داری اسی پر تھی۔ پہلے بوڑھا موسیٰ بن کعب اس عہدے پر عرصہ دراز تک رہا۔ اب طاہر بن یوسف نگران اعلیٰ تھا۔ مجھے اور ایوب کو چھٹی لینے کی غرض سے اسی کے روبرو پیش ہونا پڑا۔ طاہر قدرے سخت گیر آدمی تھا۔ وہ کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرتا' اپنے اختیارات کا استعمال اسے بخوبی آتا تھا۔

"پورے ایک ماہ کی چھٹی؟" طاہر بن یوسف اپنی عادت کے مطابق رعونت سے بولا۔ "ناممکن۔"

مجھے شرارت سوجھ گئی کہ اس آدم زاد کا اینٹھ مروڑ وقتی طور پر سہی ختم کر دوں۔ میں نے اس لئے چڑانے والا انداز اختیار کیا اور کہا۔ "ایک ماہ تو کیا ایک سال کی چھٹی بھی ممکن ہے۔"

طاہر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ آخر وہ

بلند اور طیش بھری آواز میں بولا۔ "اے خادمہ! کیا تجھے یہ احساس نہیں کہ تو اس وقت محکمہ نظارت کے نگران اعلیٰ کی خدمت میں حاضر ہے۔"

"دراصل امیر المومنین کی خدمت میں رہ کر ہمارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" میں نے طاہر کو مزید چڑایا۔

"یہی لگتا ہے۔" طاہر کے نتھنے پھول گئے۔ "تجھے شاید خبر نہیں کہ ہم بیک جنبش قلم تیری ملازمت ختم کر سکتے ہیں۔ ہمیں یہ اختیار حاصل ہے کہ اسی وقت تجھے اور تیرے شوہر کو برخاست کر سکیں۔ تو نے آخر ہمیں سمجھا کیا ہے؟"

"ایک مجبور و بے بس آدم زاد۔" میں نے اس کے دماغ میں سرگوشی کی۔ میرے لب ساکت ہی رہے۔

طاہر تقریباً اچھل پڑا۔ "کیا کہا تو نے؟"

"میں نے تو کچھ نہیں کہا حضور!" میں بھولی بن گئی۔ پھر دوبارہ اپنی ہی آواز میں سرگوشی کی۔ "چھٹی دے دے طاہر۔"

اس کی نظریں میرے ہی چہرے پر جمی ہوئی تھیں اب وہ انتہائی حیران پریشان نظر آ رہا تھا۔

"یہ چپ بھی ہے اور میرے دماغ میں اس کی آواز بھی گونج رہی ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

"تجھ جیسے غبی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکتی۔" میں بولی اور پھر اسے اپنے اثر میں لے لیا۔

"کیوں نہیں تمہیں ضرور چھٹی ملے گی۔" طاہر کہنے لگا۔ "تمہاری چھٹی ایک ماہ کیلئے منظور کی جاتی ہے۔"

طاہر نے ایک فرد اٹھا کر اس میں چھٹی کا اندراج بھی کر دیا۔ اس وقت میں بول اٹھی۔ "اجازت ہے حضور!" اس نے ہاتھ اٹھا کر ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔ اب سے پہلے میں نے طاہر کی بددماغی اور سخت گیری کے بارے میں سنا ہی سنا تھا۔ مجھے خود اس کا تجربہ نہیں ہوا تھا جو آدم زاد اپنے اختیارات جتانے کیلئے بلاوجہ دوسروں پر سختی کرتے ہیں طاہر بھی انہی میں سے تھا۔ اس طرح شاید اس کی انا کو تسکین ملتی تھی۔ ایسے خودسر و مغرور آدم زادوں کو ذلیل کر کے مجھے خوشی ہوتی تھی۔

زینب کو علم تھا کہ ہم اس کے ساتھ نجف جانے کیلئے چھٹی لینے گئے ہیں۔ ہم لوٹ کر اپنی قیام گاہ میں آئے تو زینب نے متوقع نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے بتا دیا

کہ چھٹی مل گئی ہے۔ وہ خوش ہوگئی۔

دارالحکومت بغداد سے روز ہی مختلف شہروں کیلئے کارواں روانہ ہوتے رہتے تھے۔ یہی صورت کارواں آنے کی تھی۔ زیادہ تر کارواں محلہ کرخ کے بڑے بازار سے روانہ ہوتے تھے۔ میرے ایماء پر عارج ایک کارواں کے میر سے معاملہ طے کر آیا۔ میر کارواں نے اسے بتایا تھا کہ آئندہ روز صبح بعد نماز عصر بغداد سے نجف کیلئے کارواں روانہ ہوگا۔

''بڑا عجیب وقت ہے یہ۔'' میں نے کہا۔ ''عموماً تو کارواں صبح فجر کے بعد روانہ ہوتے ہیں۔''

''جو کارواں کل بعد فجر نجف کیلئے روانہ ہو رہا ہے اس میں جگہ نہیں تھی۔'' عارج بولا۔ ''میں نے اسی لئے شام کو جانے والے کارواں.....''

''چلو ٹھیک ہے۔'' میں بول اٹھی۔ ''ہم جس قدر جلد نجف پہنچ جائیں اچھا ہے۔''

خاصا وقت تھا اس لئے ہم نے بڑے اطمینان سے جانے کی تیاری کر لی۔ دوسرے دن وقت سے کچھ پہلے ہی ہم محلہ کرخ کی کارواں سرائے میں پہنچ گئے۔ ہمارے ساتھ دو اونٹ اور ایک گھوڑا تھا' ایک اونٹ پر زینب اور ہلال بیٹھ گئے اور ان کا سامان بھی اسی پر لاد دیا۔ دوسرے اونٹ پر میں سوار ہوگئی۔ میرے ساتھ بھی ضروری استعمال کا سامان تھا۔ عارج گھوڑے پر سوار تھا۔

روانگی سے قبل میر کارواں نے کارواں کا جائزہ لیا تو پہلی بار اسے میں نے دیکھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ مجھے کوئی بھلا آدمی نہ لگا۔ آدم زادیاں ہوں کہ جن زادیاں ان میں صفت ہوتی ہے کہ وہ صنف مخالف کی نظروں کو بھانپ لیں۔ وقتی طور پر میں نے یہ سوچ کر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا کہ وہ برا ہو یا بھلا مجھے کیا۔ میرا کیا بگاڑ لے گا۔ عارج سے بھی میں نے اس بابت کچھ نہ کہا۔

آخر کار وہ کارواں بغداد سے نجف کیلئے روانہ ہوگیا۔ شہری آبادی سے نکل کر کچھ دیر صحرا میں سفر کرنے کے بعد اندھیرا پھیلنے لگا۔ میر کارواں کے حکم پر کارواں روک دیا گیا۔ کارواں کی دوبارہ روانگی اب صبح سے پہلے ممکن نہیں تھی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم اپنے خیمے میں بستروں پر دراز ہوگئے۔ پھر جانے کب ہماری آنکھ لگ گئی۔

سوتے سوتے اچانک مجھے شدید بو محسوس ہوئی اور پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ پائی کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔

آنکھ کھلی تو عارج کے گھبرائے ہوئے چہرے پر میری نظر پڑی۔ خیمے کے اندر جلنے والے چراغ کی لو ہر چند کہ دھیمی تھی مگر اتنی بھی دھیمی نہیں تھی جو کچھ دکھائی نہ دے۔ زینب اور اس کا بیٹا ہلال اپنے بستروں پر بے خبر سو رہے تھے۔

''تو خیریت سے تو ہے' لیکن تو کیسے جاگ گیا؟'' میں نے قدرے پست آواز میں عارج سے دریافت کیا تاکہ زینب یا اس کا بیٹا بیدار نہ ہو جائے۔ میرے آہستہ بولنے کو عارج نے بھی محسوس کر لیا اور کہنے لگا۔ ''اے دینار! بہتر یہ ہے کہ ہم کچھ دیر کیلئے اپنے انسانی قالبوں سے باہر نکل آئیں۔ اس طرح کسی کو ہماری آوازیں بھی سنائی نہ دیں گی اور ہم خیمے سے باہر بھی جا سکیں گے۔ اپنے پیکروں پر ہم نیند مسلط کر دیتے ہیں۔''

عارج کا مشورہ میں نے فوراً قبول کر لیا۔ کچھ دیر پہلے مجھ پر جو کیفیت گزری تھی' میں اس کی حقیقت جاننا چاہتی تھی۔ معلوم نہیں کیوں مجھے یقین سا تھا کہ عارج پیش آنے والے واقعے سے بے خبر نہیں ہوگا۔ اس یقین کی وجہ شاید عارج کی بیداری تھی۔ سوتے سوتے اچانک شدید بدبو محسوس ہونا اور پھر ذہن تاریکیوں میں ڈوب جانا' واقعی ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اپنے انسانی پیکر سے نکل کر اسے میں نے گہری نیند سلا دیا۔ عارج نے بھی میری تقلید کی۔

وہ قافلہ صحرا میں جہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا ہم اس سے تقریباً ایک فرسخ دور ریت کے ایک ٹیلے کے نیچے اتر گئے۔

''یہاں ہم سکون واطمینان سے ہر بات کر سکیں گے۔'' عارج نے کہا۔

''ہاں۔'' میں بولی۔ ''اے عارج! میں نے تجھ سے جاگنے کی وجہ پوچھی تھی۔''

''شدید بدبو اور گھٹن سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔'' عارج بتانے لگا۔ ''آنکھ کھلتے ہی میرے سارے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے ایک ایسا ہی منظر دیکھا تھا' پھر اس سے پہلے کہ میں اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا۔ ایک عفریت کو تجھ پر جھپٹتے دیکھا۔ شاید وہ بدبو اسی عفریت کے وجود کی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کوئی کافر عفریت ہوگا' وہ عفریت جیسے ہی تیرے قریب پہنچا تجھے بستر سے اٹھانے کیلئے جھکا۔ ایک دم اس کے گرداگرد شعلے بھڑک اٹھے وہ اسی عالم میں خیمے سے نکل گیا۔ میں نے ہمت کی اور خیمے سے باہر آیا تو اس عفریت کو شعلوں میں گھرا دیکھا وہ فضا میں بلند ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ مگر خیمے میں واپس آیا تو گھبرایا ہوا تھا جو کچھ میں نے دیکھا تھا میرے لئے حیران کن

ہی تھا۔ یہ دیکھنے کی خاطر کہ تو کس حال میں ہے میں اب تیرے قریب پہنچا تو تجھے آنکھیں کھولتے دیکھا۔"

"اے عارج! اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔" عارج کی پوری بات سن کر میں بولی۔ "دراصل تو اگر غور کرے تو کم و بیش یہ وہی قصہ ہے جو ہم اپنے بڑوں کی زبانی بچپن سے سنتے آئے ہیں۔ وہی رات کا وقت، وہی صحرا اور وہی آوارہ عفریت! ہمارے بڑے ہمیں رات کے وقت صحرا میں نکلنے سے منع کرتے تھے کہ وہاں عفریت گھومتے ہیں جو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس واقعہ میں فرق صرف یہ ہے کہ ایک عفریت اپنی دانست میں ایک آدم زادی کو اٹھا کر لے جانا چاہتا تھا۔ یقیناً اسے گمان بھی نہ ہو گا کہ اس انسانی قالب میں کوئی جن زادی ہو گی۔ وہ بے خبری میں ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ میرے گرد قائم نادیدہ حصار کی زد میں آ کر وہ غیر متوقع صورتحال سے دوچار ہوا۔ جب وہ شعلوں میں گھر گیا تو راہ فرار ہی اسے غنیمت معلوم ہوئی۔ اس حادثے کا مجھ پر ردعمل ہوا کہ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔"

"تو نے جس قصے کی طرف اشارہ کیا اے دینار! میں بھی بچپن سے سنتا آیا ہوں۔" عارج کہنے لگا۔ "لیکن دوسرے جن زادوں کی طرح میں نے بھی اس پر یقین نہیں کیا۔ میں یہی سمجھا کہ ہمارے بڑے ہمیں ڈرانے کیلئے ایسے قصے سناتے رہتے ہیں۔ آج اندازہ ہوا کہ بڑے غلط نہیں کہتے تھے۔"

"اور عالم سوما کا یہ کہنا قطعی درست نکلا کہ نادیدہ حصار کی موجودگی میں کوئی عفریت بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" میں نے کہا۔

"بس اتنا ہوا کہ کچھ دیر کو ہوش و حواس کھو بیٹھی۔" عارج بولا۔

"اس کی وجہ شاید کافر عفریت کے وجود کی شدید بدبو ہو۔" میں نے خیال آرائی کی۔

"ہو سکتا ہے۔" عارج نے میری تائید میں کہا۔

"اچھا چلو اب واپس چلتے ہیں۔" میں بولی اور فضا میں بلند ہونے لگی۔

عارج نے بھی میرے ساتھ پرواز کرنے میں دیر نہ کی۔ ہم اس جگہ لوٹ آئے جہاں ہمارا کارواں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔

آگے بڑھتے بڑھتے میں ایک دم ٹھٹک کر رک گئی۔ میرے برابر والے خیمے سے ایک دراز قد حبشی نکل رہا تھا۔ ایک نازک سی آدم زادی کے حسین و نوجوان جسم کو اس حبشی نے اپنے بازوؤں میں اٹھا رکھا تھا۔

"آؤ دیکھتے ہیں اے عارج کہ یہ کیا معاملہ ہے۔" میں نے عارج کو مخاطب کیا۔

انسانی قالبوں میں نہ ہونے کے سبب کوئی ہماری آوازیں نہیں سن سکتا تھا۔

عارج خاموشی سے میرے ساتھ ہو لیا۔ اس حبشی کا تعاقب کرتے ہوئے ہم ایک بڑے خیمے کے در تک پہنچ گئے۔

"ارے یہ تو میر کارواں جعفر کا خیمہ ہے۔" عارج نے اظہار حیرت کیا۔

☆......☆......☆

سیاہ فام آدم زاد کو میں نے خیمے کے در پر پڑا ہوا پردہ اٹھا کر اندر جاتے دیکھا۔ خیمے کے اندر تیز روشنی تھی۔

میں بھی دوسرے ہی لمحے اس خیمے میں تھی۔ سامنے ہی میر کارواں کھڑا تھا۔ حبشی اس سے مخاطب ہوا۔ "اے میرے آقا جعفر! میں نے تیرے حکم کی تعمیل کر دی اور اس لڑکی کو اٹھا لیا۔"

"تو نے اس کے باپ کو بھی بے ہوشی کی دوا سنگھا دی تھی نا؟" میر کارواں جعفر نے اپنے حبشی غلام سے پوچھا۔

"ہاں میرے آقا!" حبشی نے جواب دیا۔ "پہلے میں نے اس کے باپ ہی کو بے ہوش کیا تھا۔"

"شاباش!" میر کارواں نے حبشی غلام کی طرف ستائشی نظروں سے دیکھا، پھر بولا۔ "اسے خیمے کے اندرونی حصے میں بچھے بستر پر جا کر لٹا دے۔" سیاہ فام غلام آگے بڑھا اور خیمے کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ ذرا دیر میں واپس آ کر اس نے میر کارواں سے رخصت کی اجازت چاہی۔

"ہاں اب تو جا، مگر صبح ہونے سے پہلے تجھے پھر ایک بار میرے پاس آنا ہے۔" میر کارواں کا لہجہ تاکیدی تھا۔

"مجھے علم ہے میرے آقا کہ اس لڑکی کو واپس اس کے خیمے میں پہنچانا ہے۔" حبشی کہنے لگا۔ پھر خیمے سے نکل گیا۔

میر کارواں جعفر یقیناً شیطان کا آلہ کار تھا۔ میں اس بھٹکے ہوئے آدم زاد کو سبق سکھانا چاہتی تھی۔ عارج سے میں نے اسی لئے کہا۔

"تجھے معلوم ہے کہ میر کارواں کا حبشی غلام کس خیمے سے آدم زادی کو اٹھا کر لایا ہے۔ تو اسے وہیں پہنچا آ!"

"اور تو اے دینار؟...... کیا تو یہیں رہے گی؟" عارج نے پوچھا۔

''میری فکر چھوڑ اور میں نے تجھ سے جو کہا ہے اس پر عمل کر!'' میں نے جواب دیا۔

''عارج نے پھر کچھ نہیں کہا۔ وہ خیمے کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ میر کارواں جعفر کو بھی میں نے اسی طرف قدم بڑھاتے دیکھا۔

پھر اس سے پہلے کہ میر کارواں خیمے کے اندرونی حصے میں پہنچتا۔ عارج اس آدم زادی کو وہاں سے نکال کر لے گیا۔ جس آدم زادی کو لے کر عارج گیا تھا میں نے اس کا خیالی انسانی پیکر اختیار کرنے میں دیر نہیں کی۔ جعفر کی پشت اب میری طرف تھی۔ اس نے جیسے ہی اندرونی حصے میں قدم رکھا اچھل پڑا۔ اس کے سامنے خالی بستر تھا۔ اسے دانستہ مزید بدحواس کرنے کی غرض سے میں بول اٹھی۔ ''اے میر کارواں جعفر! مجھے تم وہاں کہاں تلاش کر رہے ہو...... میں تو یہاں ہوں مڑ کر دیکھ مجھے۔''

جعفر تیزی سے پلٹا۔ اس کے چہرے پر انتہائی حیرت تھی۔ وہ ہکلانے لگا۔ ''م...... مگر تم...... تم تو بے...... بے ہوش تھیں۔''

''مجھے تمہارے ہوش اڑانے کیلئے ہوش میں آنا پڑا۔'' میں یہ کہتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔

میر کارواں مبہوت سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا' پھر بڑبڑایا۔ ''تم...... تم واقعی اس قدر حسین ہو کہ...... کہ کوئی بھی تمہیں دیکھ کر ہوش کھو سکتا ہے۔''

میں اس عرصے میں میر کارواں کے بالکل سامنے پہنچ گئی تھی۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''اے جعفر! اے ہوس کے غلام! میر کارواں رہنما ہوتے ہیں' تمہاری طرح راہزن نہیں۔ تم تو مسافروں کو سیدھی راہ دکھانے کے بجائے انہیں لوٹ لیتے ہو۔ بڑے ہی کمینے ہو تم۔''

''کیا کہا کمینہ!'' میر کارواں چونک کر بولا۔ اسے یقیناً اپنے مرتبے کا خیال آ گیا تھا۔ ''تم ہوش میں تو ہو لڑکی۔'' اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''تو کمینہ ہی نہیں ذلیل بھی ہے۔'' میں نے اسے مزید غصہ دلانے کیلئے کہا۔

غصے کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے مجھے مارنے کیلئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ میرا زوردار طمانچہ اس کے منہ پر پڑا۔ یہ کسی آدم زادی کا نہیں' ایک جن زادی کا طمانچہ تھا۔ میر کارواں اسی سبب لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہو گیا۔

''تو...... تو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا...... میر کارواں جعفر کی بے عزتی کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔'' وہ غصے کی زیادتی سے کانپنے لگا۔

''معاف کرنے یا سزا دینے کا اختیار تجھے نہیں' مجھے ہے اے جعفر! کوئی میر کارواں ہو یا مسافر غلام ہو کہ آقا' انصاف کی نظر میں سب ایک ہیں۔

تو نے مجھے اپنے غلام کے ذریعے اغوا کرا کے جرم کیا ہے۔'' میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

''جھوٹ بولتی ہے تو!'' وہ صاف مکر گیا۔ ''میں نے تجھے اغوا نہیں کرایا بلکہ تو خود چوری کی نیت سے میرے خیمے میں گھس آئی ہے۔'' اس نے مجھ پر الزام لگایا۔ ''میں نے تجھے عین موقع پر دیکھ لیا تو اب تو مجھ پہ تہمت لگا رہی ہے۔''

''یہ کہانی تو کسے سنا رہا ہے اے جعفر! قافلے والے جب تجھ پر ملامت کریں تو یہ جھوٹ بولیو!'' میں ابھی یہی کہہ پائی تھی کہ عارج آ گیا۔ ایک نظر عارج پر ڈالتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ''جرم کی سزا تو ملے گی تجھے!''

''تو کون ہوتی ہے مجھے میرے جرم کی سزا دینے والی! میں ابھی تجھے بتاتا ہوں۔'' جعفر یہ کہتے ہوئے ایک طرف جھپٹا۔

میں نے وہاں چمڑے کا ایک کوڑا پڑا ہوا دیکھا۔ جعفر نے اسے اٹھالیا تو میں نے کہا۔ ''تو نے یہ اچھا کیا اے جعفر کہ اپنی سزا خود تجویز کر لی۔ اب یہی کوڑا تجھے تیرے جرم کی سزا دے گا۔ میں چلتی ہوں۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے خیالی انسانی پیکر ترک کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے جعفر کے ہاتھ سے چمڑے کا کوڑا چھین لیا۔

اچانک مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے غائب ہوتے دیکھ کر جعفر کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے۔ بظاہر اب وہ خیمے میں اکیلا تھا۔ اسی وقت کوڑا حرکت میں آ گیا۔ یقیناً جعفر کو یہی دکھائی دیا ہوگا کہ کوڑا خود بخود اس پر برس رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ خوفزدہ ہو کر چیخنے لگا۔ اس کے حبشی غلام اور دیگر ملازمین کا خیمہ برابر والا ہی تھا۔ میر کارواں کے خیمے سے اس کی چیخ و پکار سن کر وہ لوگ بھی وہیں آ گئے۔

ان آدم زادوں کیلئے وہ انتہائی حیرت انگیز منظر تھا۔ میں کیوں کہ ان کی نظروں سے اوجھل تھی اس لئے انہیں صرف چمڑے کا کوڑا ہی میر کارواں پر برستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پھر انہی میں سے ایک آدم زاد نے ایسا شوشہ چھوڑا جو حقیقت پر مبنی تھا۔

''لگتا ہے میر کارواں کے خیمے میں جنات گھس آئے ہیں۔'' ان الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔ میرے نزدیک یہ الفاظ خطرے کی گھنٹی تھے۔

عارج نے بھی غالباً خطرہ محسوس کر لیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''اے دینار! اب یہاں

سے نکل چل۔"

چمڑے کا کوڑا میں نے میر کارواں جعفر کے قریب پھینک دیا۔ اسی وقت میری نگاہ جعفر کے حبشی غلام پر پڑی۔ وہ حیران حیران سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ شاید حبشی کو اس لڑکی کی تلاش تھی جسے وہ اپنے آقا کیلئے اغوا کر کے لایا تھا۔ صورتحال ایسی تھی کہ وہ اپنے آقا سے بھی کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا۔ ہوس کے اس غلام آدم زاد جعفر کیلئے اتنی سزا کافی تھی۔ میں اسی لئے عارج کے ساتھ اس کے خیمے سے باہر نکل آئی۔

چیخ و پکار کی وجہ سے میر کارواں کے ملازمین ہی نہیں دیگر اہل قافلہ بھی جاگ اٹھے تھے۔ ان سبھی کا رخ میر کارواں کے خیمے کی طرف تھا۔ وہ غالباً حقیقت حال جاننا چاہتے تھے۔ میں نے ان میں ایک باریش خطرناک آدم زاد کو بھی دیکھا۔ اس کی پیشانی پر سجدے کا نشان واضح تھا۔ آدم زادوں کے درمیان رہ کر اب مجھے یہ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ کس وضع قطع اور کس حلئے کے آدم زاد عموماً ہم جنات کیلئے خطرناک ہوتے ہیں۔ میں اس قسم کے آدم زادوں سے دور ہی رہتی تھی۔

"تو نے اس آدم زاد کو دیکھا اے عارج؟" میں نے عارج سے کہا۔ "وہ باریش جو ابھی میر کارواں کے خیمے میں گیا ہے؟"

"ہاں دیکھا۔" عارج نے جواب دیا اور پھر اس آدم زاد کے متعلق میرے خیال کی تائید کر دی۔

"تو نے میر کارواں کے ملازمین میں سے کسی کی زبانی یہ الفاظ تو سن ہی لئے ہوں گے کہ خیمے میں جنات گھس آئے ہیں...... اگر کسی نے پھر یہ ذکر چھیڑ دیا تو ہمارے لئے باریش آدم زاد کی طرف سے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔" میں نے خدشے کا اظہار کیا۔

"جو کچھ ان آدم زادوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسے دیکھ کر اور کیا نتیجہ نکلتا ہے۔" عارج نے کہا "چمڑے کا کوڑا خود بخود کس طرح حرکت میں آ سکتا ہے...... اس سے یہی تو ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی نظر نہ آنے والا وجود اس کوڑے کو حرکت دے رہا ہے۔ یہ حیران کن بات ایسی نہیں جسے وہ آدم زاد نظر انداز کر دیں۔ ابھی ٹھہر جا اے دینار! دیکھتے ہیں کہ اس واقعہ کا آدم زادوں پر کیا ردعمل ہوا ہے۔" عارج نے مشورہ دیا۔

"تو نے ہی تو پہلے نکل چلنے کو کہا تھا۔" میں بولی۔ "اب تو ہی رکنے کو کہہ رہا ہے' مگر یہاں رکنے سے کیا حاصل! خیمے کے اندر چلتے ہیں۔"

ہم اندر پہنچے تو وہاں موجود افراد میں سے کسی نے اس باریش خطرناک آدم زاد کو

پہچان لیا اور کہنے لگا۔ "بابا یاسر آ گئے ہیں' اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ بابا کو آگے آنے کیلئے راستہ دو!" یوں مجھے اس باریش آدم زاد کا نام معلوم ہو گیا۔

اس دوران میں میر کارواں جعفر اپنے خیمے کے اندرونی حصے سے باہر آ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر دہشت برس رہی تھی۔ لوگوں نے یاسر کو میر کارواں تک پہنچنے کیلئے راستہ دے دیا۔ جعفر ہی کے ایک ملازم نے یاسر کا اس سے تعارف کرایا۔ "یاسر بابا ہیں حضور! اللہ کے ایک نیک اور برگزیدہ بندے ہیں۔ اللہ نے انہیں جنات پر قابو پانے اور انہیں مار بھگانے کی قوت و طاقت عطا فرمائی ہے۔"

کہو اے میر کارواں! تم پر کیا گزری؟ میں تمہاری ہی زبانی پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" یاسر نے جعفر کو مخاطب کیا۔

چند لمحے جعفر خاموش رہا پھر سہمی ہوئی سی آواز میں بتانے لگا۔ "میں خیمے کے اندرونی حصے میں سو رہا تھا کہ مجھے خوف زدہ کر دینے والی ایک آواز سنائی دی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔" میر کارواں جعفر من گھڑت کہانی سنا رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ یہ کیسے بتا دیتا کہ اس نے اپنے حبشی غلام کے ذریعے قافلے کی ایک لڑکی کو اغوا کرایا تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ "خیمے کے اندر ہی زمین پر ایک طرف چمڑے کا کوڑا پڑا ہوا تھا۔ اچانک خود بخود اپنی جگہ سے بلند ہوا اور پھر مجھ پر برسنے لگا۔ اسی سبب میرے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں اور لوگ یہاں آ گئے۔"

"اچھی طرح سوچ کر بتاؤ' کوئی ایسی بات تو نہیں جو تم بھول گئے ہو اور نہ بتائی ہو۔" یاسر نے کہا۔

"میں...... نے سب...... سب کچھ بتا دیا ہے۔" جعفر رک رک کر کہنے لگا۔

"سنو! تمہارے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی نادیدہ قوت نے تمہیں زدوکوب کیا ہے۔ نظر نہ آنے والا وہ کوئی جن بھی ہو سکتا ہے' لیکن کسی وجہ کے بغیر وہ ایسا کیوں کرتا...... کسی سے تمہاری دشمنی تو نہیں؟" یاسر نے اپنی بات کے آخر میں پوچھا۔

"نہیں۔" جعفر نے انکار میں سر ہلا دیا' پھر بولا۔ "میں نے سنا ہے کہ کچھ جنات شریر بھی ہوتے ہیں اور وہ کسی وجہ کے بغیر بھی لوگوں کو ستاتے اور پریشان کرتے ہیں۔ کیا خبر مجھ پر کوڑے برسانے والا بھی ایسا ہی کوئی جن ہو۔"

"ممکن ہے' ایسا ہی ہو۔ شریر جنات بھی ہوتے ہیں' تم نے غلط نہیں سنا۔" یاسر نے تائید کی۔ "اس کے باوجود اے میر کارواں! تم ایک بات یاد رکھنا تمہارا بیان جھوٹ ہوا تو

تمہیں بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"وہ...... وہ کیسے؟" میر کارواں نے گھبرا کر دریافت کیا۔

"میں ایک عمل کے ذریعے اس قافلے کے گرد حصار کھینچ دوں گا۔" یاسر نے جواب دیا۔ "اگر قافلے کے ساتھ جنات بھی ہوئے تو پھر وہ حصار کے اندر نہ رہ سکیں گے۔ انہیں یہاں سے فرار ہونا پڑے گا۔ اس کے علاوہ یہ کہ نجف پہنچنے تک یہ حصار قافلے کے گرد قائم رہے گا اور حصار کے اندر جنات داخل نہیں ہو سکیں گے۔ بصورت دیگر اگر تم نے دروغ گوئی سے کام لیا ہو گا تو تمہیں جسمانی اذیت برداشت کرنی ہو گی۔"

"ہرگز نہیں۔" میر کارواں بلند آواز میں بولا۔ "میں تمہیں قافلے کے گرد حصار کھینچنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"لیکن اب تمہارے اجازت دینے نہ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" باریش یاسر نے اطمینان سے کہا۔

"فرق کیوں نہیں پڑتا۔ میں میر کارواں ہوں۔" جعفر کی آواز میں تکبر تھا۔ "میری اجازت کے بغیر تم حصار نہیں کھینچ سکتے۔"

"یہ تمہاری خام خیالی ہے۔" یاسر کہنے لگا۔ "یہ مفاد عامہ کا معاملہ ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں اہل قافلہ کو جنات کے ممکنہ شر سے محفوظ رکھوں۔ انہوں نے جس طرح تمہیں اذیت دی ہے' دوسروں کو بھی تکلیف و پریشانی میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ تمہیں آخر حصار نہ کھینچنے پر کیوں اصرار ہے؟"

"میری مرضی!" میر کارواں خودسری سے بولا۔ "نہیں کھینچنے دیتا میں حصار!"

اس وقت تک میر کارواں کے خیمے میں خاصے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ وہ بھی یاسر کے حق میں بولنے لگے۔ جعفر اس لئے حصار کھینچنے سے اختلاف کر رہا تھا کہ اس کا بیان قطعی غلط تھا۔ اسے یہ فکر تھی کہ کہیں جسمانی اذیت برداشت نہ کرنی پڑے۔ ملازمین کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو جعفر کی طرف ہو۔ انہوں نے یاسر پر زور دیا کہ وہ حصار ضرور کھینچے۔

"تم سب لوگ فوراً میرے خیمے سے نکل جاؤ۔" جعفر نے بات بگڑتے دیکھی تو تقریباً چیخ اٹھا۔

پھر جعفر کے ملازمین کو چھوڑ کر سبھی لوگ یکے بعد دیگر خیمے سے چلے گئے۔ عارج اور میں البتہ وہیں رہے۔

"اب کیا ہو گا اے دینار!؟" عارج نے مجھ سے سوال کیا۔ اس کے لہجے سے

فکر مندی جھلک رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ عارج کے سوال کا میں کوئی جواب دیتی' جعفر اپنے ملازمین سے کہنے لگا۔ "جنات بھگانے والے اس بڑبولے کا خیمہ اکھاڑ کر پھینک دو۔ خیال رکھنا کہ وہ قافلے کے گرد حصار نہ کھینچ سکے۔ سمجھ گئے کہ نہیں۔"

"لیکن میرے آقا! ہمیں کس طرح پتا چلے گا کہ وہ حصار کھینچ رہا ہے؟" جعفر کے حبشی غلام نے پوچھا۔

"بیوقوف غلام!" جعفر نفرت و حقارت سے بولا۔ "وہ حصار کھینچے گا تو اسے قافلے کے گرد چکر لگانا پڑے گا۔ تم لوگ بھی جاؤ۔"

جعفر کے ملازمین خیمے کے در کی طرف بڑھ گئے۔ اسی وقت عارج مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تو نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"پہلے جعفر کے ملازمین کو کوشش کر لینے دو۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ آدم زاد یاسر ان کے قبضے میں نہ آیا تو پھر ہم کوئی قدم اٹھائیں گے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہمیں حالات پر نظر رکھنے کے لئے ابھی اپنے انسانی قالبوں سے باہر ہی رہنا پڑے گا۔" عارج بولا۔

"ظاہر ہے کہ ہم یاسر کی طرف سے غافل تو نہیں رہ سکتے۔ چل ہم بھی یہاں سے چلتے ہیں۔" میں یہ کہتی ہوئی جعفر کے خیمے سے نکل آئی۔ عارج بھی میرے ساتھ ساتھ تھا۔ اسی وقت مجھے جمیلہ کی بڑی بہن زینب کا خیال آیا کہ کہیں چیخ و پکار سن کر وہ نہ جاگ اٹھی ہو۔ اپنے اس خدشے کا اظہار میں نے عارج سے کیا تو اس نے بھی یہی مشورہ دیا کہ "ہمیں پہلے اپنے خیمے کی طرف چلنا چاہئے۔"

میرا خدشہ درست ہی ثابت ہوا۔ خیمے میں پہنچتے ہی میری نظر پریشان حال زینب پر پڑی۔ پھر میں نے اپنے اور عارج کے انسانی پیکروں کو نیند میں جھونکے کھاتے دیکھا۔ زینب ان دونوں کو بار بار جھنجھوڑتے ہوئے روہانسی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "کیا ہو گیا ہے' تم دونوں کو؟..... کب سے جگا رہی ہوں' اٹھتے ہی نہیں .... باہر تو جا کر دیکھو' کیسا شور ہے؟"

زینب کے کسی سوال کا جمیلہ یا ایوب نے کوئی جواب نہیں دیا اور اونگھتے اونگھتے پھر بستروں سے لڑھک گئے۔ زینب کا بیٹا ہلال البتہ اب تک سو رہا تھا۔ موجودہ صورتحال میں فوری طور پر مجھے ایک یہ تدبیر سوجھی اور میں نے اسی پر عمل کیا۔

دراصل عارج اور میں نے اپنے انسانی قالبوں سے نکل کر انہیں گہری نیند سلا دیا تھا۔

وہ اسی لئے زینب کے بار بار جھنجھوڑنے کے باوجود بیدار نہیں ہوئے تھے۔ اپنے انسانی قالبوں میں داخل ہو کے زینب کو مطمئن کرنے میں ہمیں دیر ہو جاتی۔ اسی خیال سے میں نے زینب پر بھی نیند مسلط کر دی۔ میرے زیر اثر وہ اپنے بستر پر لیٹتے ہی بے خبر ہو گئی۔

''اور اے دینار! صبح جب زینب تجھ سے پوچھے گی یا مجھ سے سوال کرے گی کہ ہم رات کو کیوں نہیں جاگے تو کیا جواب دے گی؟'' عارج بولا۔

''صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''فی الحال تو یہاں سے چل جعفر کے ملازمین کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے یاسر سے کیا سلوک کیا۔''

عارج کہنے لگا۔ ''مجھے تو وہ آدم زاد بڑا ڈھیٹ معلوم ہوتا ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ کر کے ہی دم لے گا۔''

اپنے خیمے سے نکل کر قافلے کا جائزہ لینے کیلئے فضا میں ہم تھوڑے سے بلند ہوئے۔

''اے عارج!......وہ دیکھ!......ادھر!......وہاں آدم زادوں کا ہجوم نظر آ رہا ہے۔''

میں نے عارج کو ایک طرف متوجہ کیا۔

''ہاں دیکھ لیا میں نے۔'' عارج نے تصدیق کی۔

''مجھے تو یہ لگتا ہے کہ جعفر کے ملازمین نے اس خطرناک آدم زاد یاسر کا خیمہ اکھاڑ پھینکا ہے۔'' میں یہ کہتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھی۔

''تو نے ٹھیک ہی کہا تھا اے دینار!'' عارج مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''یہ واقعی میر کارواں کے ملازم ہیں۔ ان میں حبشی غلام بھی نظر آ رہا ہے۔''

ہم ہجوم کی جگہ پہنچ گئے تھے۔ وہاں موجود اہل قافلہ نے میر کارواں کے ملازموں کو گھیر رکھا تھا اور ان سے پوچھ رہے تھے کہ انہوں نے یاسر کا خیمہ کیوں اکھاڑ دیا۔ جعفر کے حبشی غلام نے ان سوالوں کا ایک ہی جواب دیا۔ ''یہ میر کارواں کا حکم تھا۔ اسی کے حکم پر ہم نے ایسا کیا ہے۔'' پھر وہ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جعفر کے دیگر ملازمین بھی اسی کے ساتھ چلے گئے۔

یاسر بھی وہیں اپنے اکھڑے ہوئے خیمے اور سامان کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ ہجوم میں سے ایک بوڑھا آدم زاد آگے آیا اور اس نے یاسر کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور نرمی سے کہنے لگا۔ ''اے یاسر! گھبراؤ مت ہم قافلے والے تمہارے ساتھ ہیں اگر میر کارواں کے ملازموں نے تمہارا خیمہ اکھاڑ دیا ہے تو تم اپنا سامان لے کر میرے خیمے میں آ جاؤ یہاں سے میرا خیمہ کچھ ہی فاصلے پر ہے۔''

ایک اور نوجوان آدم زاد بولا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے یہ کسی کے خیمے میں بھی رہ لیں گے مگر میر کارواں نے ایسا کیوں کیا؟''

''اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے۔'' متوسط عمر کا ایک شخص اس نوجوان سے مخاطب ہوا۔ ''میر کارواں نے دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ اس کی مرضی یہ ہے کہ قافلے کے گرد حصار نہ کھینچا جائے۔ اگر ایسا ہوا تو جھوٹ بولنے کے سبب اسے بھی جسمانی اذیت ہو گی۔''

''پھر تو حصار ضرور کھینچا جانا چاہئے۔'' ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

بوڑھے آدم زاد نے بھی تائید کی۔ ''قافلے میں جنات ہوئے تو ہم سب ان سے محفوظ ہو جائیں گے اور اگر اس سلسلے میں میر کارواں کا بیان غلط ہے تو اسے جھوٹ بولنے کی سزا مل جائے گی۔ اس طرح کسی مسافر کا خیمہ اکھاڑ دینا تو ظلم ہے۔''

یاسر سے اہل قافلہ کی ہمدردی ہمارے لئے نقصان دہ ہی تھی لیکن ابھی ہم نے کسی اقدام سے گریز کیا۔ عارج کو بھی میں نے سمجھایا کہ مداخلت کا وقت نہیں آیا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یاسر اسی بوڑھے آدم زاد کے خیمے میں اپنا سامان لے کر آ گیا جس نے پہلے یہ پیشکش کی تھی۔ سامان اٹھا کر لانے میں دوسرے لوگوں نے بھی یاسر کے ساتھ تعاون کیا تھا۔

''اے یاسر! اب تم جو عمل پڑھنا چاہو پڑھو۔'' بوڑھے آدم زاد نے کہا۔ ''اور قافلے کے گرد......''

''پہلے مجھے وضو کیلئے پانی چاہئے۔'' یاسر بول اٹھا۔ ''عمل پڑھنے کیلئے میرا باوضو ہونا ضروری ہے۔''

''ابھی لایا پانی۔'' بوڑھا اٹھ کھڑا ہوا۔

عارج اور میں اسی خیمے میں تھے۔ وہاں ہم نے چھوٹی سی ایک مٹکی میں پانی رکھے دیکھا۔ اس کے قریب مٹی کا ایک برتن رکھا تھا۔ میں لپک کر مٹکی کے پاس پہنچ گئی۔ اس سے پہلے کہ بوڑھا اس مٹکی سے پانی لیتا، میں نے مٹکی پھوڑ دی۔

''ارے ارے! یہ کیا ہوا؟'' بوڑھا پھوٹی ہوئی مٹکی سے پانی بہتے ہوئے دیکھ کر حیرت کے ساتھ بولا۔

بوڑھے کے خیمے میں کئی اور آدم زاد بھی تماشا دیکھنے آ گئے تھے کہ دیکھیں یاسر کیا کرتا ہے۔ انہی میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''بابا تم فکر نہ کرو، میں اپنے خیمے سے وضو کیلئے پانی لے کر آتا ہوں۔''

عارج کو میں نے اس آدم زاد کے پیچھے لپکتے دیکھ کر روک لیا اور بولی۔ ''ہم کتنی

منکیاں اور مٹکے پھوڑیں گے...... یوں بھی اہل قافلہ کو محض ایک شخص کی وجہ سے پانی کی بوند بوند کو ترسا دینا اچھی بات نہیں۔ ہمیں کوئی اور تدبیر کرنی پڑے گی۔''

''تو پھر سوچ اے دینارا!'' عارج کی آواز میں بیزاری تھی۔ ''میری سمجھ میں تو بس ایک ہی تدبیر آرہی ہے۔''

''مجھے بھی تو بتا کیا تدبیر ہے وہ۔'' میں نے عارج سے دریافت کیا۔

''اس خطرناک آدم زاد کو یہاں سے اٹھا کر کہیں بہت دور پھینک آؤں۔'' عارج نے جھنجھلا کر کہا۔

''بات تو ٹھیک ہے تیری۔'' میں سنجیدہ ہوگئی۔ ''کچھ اور نہ بن پڑا تو تیری ہی تدبیر پر عمل کرنا پڑے گا۔''

''پھر دیر کس بات کی ہے؟'' عارج نے سوال کیا۔

''میں پہلے اس تدبیر پر عمل کرنا چاہتی ہوں جو بالکل سامنے کی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں اس آدم زاد کو اپنے اثر میں لینے کی کوشش کرتی ہوں۔ کوشش کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ عموماً ایسے آدم زادوں کو اثر میں لینا نہ صرف مشکل بلکہ خطرناک بھی ہوتا ہے۔''

''اگر اس میں خطرے کی کوئی بات ہے تو ایسا نہ کر اے دینارا!'' عارج نے مجھے سمجھایا۔

''اب تک بڑوں سے یہ بات سنی ہی سنی ہے کبھی اس کا تجربہ نہیں ہوا۔'' میں نے عارج کو بتایا۔ ''ایک دفعہ تجربہ تو کر لینے دے۔''

''سوچ لے اے دینار کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔''

''اللہ مالک ہے۔'' میں نے عارج کی ہمت بندھائی۔

اس عرصے میں وہ آدم زاد واپس آ چکا تھا جو یاسر کیلئے وضو کی غرض سے پانی لینے گیا تھا۔ یاسر خیمے کے در سے باہر نکل کے وضو کرنے لگا۔ میں اس کے قریب پہنچ گئی تو غیر متوقع طور پر اسے چونکتے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اسے وہاں میری موجودگی کا احساس ہو گیا ہے۔ وضو کرتے ہوئے معاً اس کے ہونٹ تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ اسی لمحے میں نے اس کے دماغ پر قبضہ کرنا چاہا۔ مجھے کئی بار کوشش کے بعد کامیابی ہوئی اور میں نے اس کے دماغ میں سرگوشی کی۔ ''اے یاسر! تو قافلے کے گرد حصار نہیں کھینچے گا۔''

میری سرگوشی کے ساتھ ہی یاسر کے ہونٹ اور بھی تیزی کے ساتھ حرکت میں آ گئے۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ یقیناً وہ کوئی عمل پڑھنے میں مصروف تھا۔ میرے لئے یہ سمجھنا بھی دشوار نہیں تھا کہ وہ مجھ سے محفوظ رہنے کی خاطر ہی عمل پڑھ رہا تھا۔ اپنی بات کا جواب نہ پا کر مجھے غصہ آ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے اس کے دماغ کو جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ جو عمل بھی کر رہا تھا ادھورا رہ گیا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

''کیا ہوا اے یاسر؟'' خیمے کے اندر سے بوڑھے آدم زاد کی آواز آئی۔

''میرا سر...... سر پھٹا جا رہا ہے۔'' یاسر نے چیخ کر بتایا۔ ''کوئی...... کوئی میرے دماغ پر...... وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔

خیمے کے اندر جتنے بھی آدم زاد تھے باہر آ گئے۔ کوئی بولا۔ ''ارے یاسر کا چہرہ پیلا پڑ رہا ہے۔''

''مجھ پر...... حملہ...... کسی جن زادی نے حملہ کیا ہے۔'' یاسر نے اٹک اٹک کر بتایا۔

''اس...... اس کی آواز میں...... نے سنی تھی۔''

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں نے آواز بدل کر اس کے دماغ میں سرگوشی نہیں کی تھی۔

''وہ جن زادی تم سے کیا کہہ رہی تھی؟'' بوڑھے آدم زاد نے یاسر سے معلوم کیا۔

''حصار...... نہ...... نہ کھینچنے کو کہہ رہی تھی۔'' یاسر نے بڑی مشکل سے کہا۔

میں نے کچھ سوچ کر اس خطرناک آدم زاد یاسر کو مزید مہلت نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے یاسر کے ذہن کو ایک بار پھر زوردار جھٹکا دیا۔ یہ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ یاسر کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ چیخ بھی نہ سکا اور بے ہوش ہو گیا۔

''یہ...... یہ یاسر کو کیا ہوا؟...... اسے سنبھالو!'' بوڑھے آدم زاد نے وہاں موجود دوسرے لوگوں سے کہا۔

وہ لوگ یاسر کو اٹھا کر خیمے کے اندر لے گئے۔ میں نے عارج کو مخاطب کیا۔ ''اب تیری تدبیر پر عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔''

''تو جو اسے اپنے اثر میں لینا چاہتی تھی کیا اس کوشش میں تجھے کامیابی نہیں ہوئی؟'' عارج نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ پھر تفصیل بیان کر دی۔

''یہ اچھا ہوا کہ تجھے اس کوشش میں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔'' عارج نے اطمینان کا اظہار کیا۔

"ممکن ہے وہ جو عمل پڑھ رہا تھا' پورا ہونے پر مجھے نقصان پہنچ جاتا۔ میں نے اسی لئے اسے مہلت نہیں دی۔" میں بولی۔

"ٹھیک ہی کیا تو نے۔" عارج کہنے لگا۔ "ورنہ تو کیا خبر اونٹ کس کروٹ بیٹھتا اچھا اب یہ بتا...."

عارج کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے اپنے اگلے اقدام سے آگاہ کر دیا۔

چند ہی لمحے بعد وہ شخص جو یاسر کیلئے وضو کا پانی لایا تھا' ذری سی آواز میں وہاں موجود دوسرے لوگوں سے مخاطب ہوا۔ "وہ...... وہ جن زادی اگر یاسر...... یاسر جیسے برگزیدہ اور نیک اعمال بندے پر حملہ کر سکتی ہے تو پھر ہم میں سے کوئی بھی.... اس کا شکار بن سکتا ہے...... مجھے تو یہاں ڈر لگ رہا ہے۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے ذہن پر اپنا خوف مسلط کر دیا تھا۔

وہ شخص خیمے سے نکل کر گیا تو میں نے متوسط عمر والے آدم زاد کے دماغ میں سرگوشی کی۔ "تو بھی اٹھ رہا ہے یا میں تجھے اٹھا کر باہر پھینکوں۔"

"جن زادی....." وہ آدم زاد چیخ اٹھا۔ "ابھی..... ابھی وہ جن زادی میرے دماغ میں بول رہی تھی۔ میں تو چلا۔"

ذرا سی دیر میں صرف بوڑھا آدم زاد وہاں بے ہوش یاسر کے پاس رہ گیا۔ اس کی مجبوری یہ بھی تھی کہ وہ خیمہ اسی کا تھا۔ وہی یاسر کو اپنے خیمے میں لے کر آیا تھا۔ دوسرے لوگوں کے چلے جانے سے بوڑھا بھی خوف زدہ سا لگ رہا تھا۔ وہ زیر لب قرآنی آیات کا ورد کر رہا تھا۔ مجھے اسی لئے اس بوڑھے آدم زاد پر ترس آ گیا۔ دوسرے آدم زادوں کی طرح میں نے ڈرانے کے بجائے اس کے ذہن پر نیند مسلط کر دی۔

بوڑھے نے جمائیاں لیں اور بڑبڑایا۔ "یہ اچانک مجھے اتنی زور کی نیند کیوں آنے لگی۔" پہلے تو اس نے نیند بھگانی چاہی' پھر مجبور ہو کر یاسر کے قریب ہی فرش پر لیٹ گیا۔ اسے سونے میں دیر نہیں لگی۔ میں اسی کی منتظر تھی۔ پھر ہم یاسر اور اس کے سامان کو وہاں سے نکال کر لے آئے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ہوش میں آنے کے بعد سامان پاس نہ ہونے سے یاسر کو پریشانی ہو۔ میرے نزدیک وہ بہر حال بے قصور تھا۔ نادانستگی ہی میں وہ میرے خلاف قدم اٹھانے والا تھا۔ مجھے اس کی منزل معلوم تھی۔ سو اسے سامان سمیت کہیں اور نہیں نجف ہی پہنچا دیا۔ ہوش میں آ کر ظاہر ہے اس پر یاسر کو شدید حیرت ہوتی' مگر یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔

خطرہ ٹل چکا تھا' عارج کے ساتھ میں اسی لئے واپس اپنے پڑاؤ پر آ گئی۔ اب وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اپنے خیمے میں پہنچ کر میں نے جمیلہ کے انسانی قالب میں اور عارج ایوب کے پیکر میں سما گیا۔

دوسرے دن صبح سارے قافلے میں یاسر کی پراسرار گمشدگی موضوع گفتگو بنی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ جنات کے ہاتھوں میر کارواں جعفر کی پٹائی کے بھی چرچے ہو رہے تھے۔ زینب کو رات والا واقعہ یاد تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگی۔ "جمیلہ! رات کو تجھے کیا ہو گیا تھا؟ بھائی ایوب کو بھی میں نے جگانا چاہا مگر تم دونوں ہی نہیں جاگے۔ اٹھ کر بھی ایک بار بیٹھ گئے مگر دوبارہ سو گئے۔"

"اے میری بہن! مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔" میں جان کر انجان بن گئی۔

"اور بھائی ایوب! آپ...... آپ کو تو....."

"نہیں۔" عارج بول اٹھا۔ اس نے بھی صاف انکار کر دیا۔

لوگوں نے ناشتہ کر لیا تو قافلہ روانہ ہو گیا۔ بغداد اور نجف کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ رات ہوتے ہوتے قافلہ نجف پہنچ گیا۔ زینب کی رہنمائی میں ہم اس کے گھر پہنچ گئے۔ گھر کے دروازے پر زینب نے دستک دی۔ اونٹوں اور گھوڑے کو ہم نے کارواں سرائے ہی میں چھوڑ دیا تھا۔

"کون ہے؟" دور سے ایک انسانی آواز آئی۔

"ارے یہ آواز تو یمامہ کی لگتی ہے۔" زینب چونک کر بولی۔ "دروازہ کھولو..... میں زینب ہوں۔"

میں نے زینب کے ذہن پر توجہ دی تو پتا چلا کہ یمامہ اس کی سوتیلی بھابی نائلہ کی غیر شادی شدہ بہن تھی۔ اپنے گھر میں یمامہ کی موجودگی زینب کیلئے حیران کن ہی تھی۔ ذرا سی دیر میں دروازہ کھل گیا اور ایک نوجوان آدم زادی نظر آئی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" زینب نے گھر میں قدم رکھتے ہوئے نوجوان آدم زادی سے سوال کیا۔

"مجھے نائلہ بھابی نے گھر کا کام کرنے کیلئے یہاں بھیجا ہے۔" نیلی آنکھوں والی دوشیزہ یمامہ ہی تھی۔

"تمہاری باجی کو تمہیں یہاں بھیجتے ہوئے ذرا بھی حیا نہ آئی کہ ایک غیر مرد کے پاس....."

زینب کی بات ادھوری رہ گئی۔ صحن کے دوسری طرف سے تیز مردانہ آواز سنائی دی۔

''یمامہ کون آیا ہے؟''

''آنا کون...... میں آئی ہوں اپنے گھر میں۔'' یمامہ کے بجائے زینب نے بلند آواز میں جواب دیا۔

زینب کے ساتھ ساتھ میں اور عارج بھی گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ اندر قدم رکھتے ہی مجھے اپنے اعصاب پر ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ مجھے اس وقت تک علم نہیں تھا کہ عارج کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔

اچانک مجھے سامنے سے بھاری ڈیل ڈول والا ایک آدم زاد آتا دکھائی دیا۔ زینب کے ذہن پر توجہ دے کر مجھے اس آدم زاد کے بارے میں پتا چلا کہ وہی اس کا شوہر بلال ہے۔ اپنے ڈیل ڈول کی طرح آواز بھی بھاری تھی۔

''آخر تم در در کی ٹھوکریں کھا کر واپس آ ہی گئیں۔'' بلال کی آواز میں طنز تھا۔ وہ زینب سے مخاطب تھا۔ ''تمہیں تمہاری بہن جمیلہ نے بھی اپنے گھر میں رکھنا پسند نہیں کیا۔ جمیلہ کو ڈر ہوگا کہ کہیں تم اس کے شوہر پر ڈورے نہ ڈالنے لگو۔ وہ اسی لئے تمہیں یہاں لے آئی۔''

''بس کرو!'' زینب تقریباً چیخ اٹھی۔ ''تم حد سے بڑھ رہے ہو۔''

''اگر حد سے بڑھتا تو تمہیں اس گھر میں قدم ہی نہ رکھنے دیتا۔'' بلال نے حقارت سے کہا۔

''یہ میرا گھر ہے اور مجھے یہاں قدم رکھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔'' زینب تیز آواز میں بولی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی ''آؤ جمیلہ!''

میں اور ایوب زینب کے پیچھے چل دیئے۔ زینب کے ساتھ ہی اس کا بیٹا ہلال بھی تھا۔ دانستہ میں نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی اور مجھے خاموش دیکھ کر عارج بھی چپ تھا۔ زینب کے شوہر بلال نے اخلاقاً بھی مجھے یا عارج کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ حالانکہ ہمارے انسانی قالبوں سے اس کا قریبی رشتہ تھا۔ ہمیں ساتھ لئے زینب گھر کے ایک حصے میں آ گئی۔ وہاں قریب قریب دو دالان بنے ہوئے تھے۔ اس نے ایک دالان میں ہمیں ٹھہرا دیا۔ ہم نے وہاں اپنا سامان رکھا اور بستر بچھا دیئے جو ہم کارواں سرائے سے ساتھ لائے تھے۔ برابر والے دالان میں زینب نے اپنا ڈیرا جما لیا۔ اس نے غسل خانے تک ہماری رہنمائی کی۔ ہم نے ہاتھ منہ دھونے کے بعد لباس تبدیل کر لئے۔ کچھ ہی دیر میں زینب نے ہمارے لئے کھانے کا بندوبست کر دیا۔ مجھے زینب اپنے ہی گھر میں اجنبی سی لگ رہی تھی۔

دن بھر سفر کی وجہ سے تھکے ہوئے تھے اس لئے جلد ہی بستروں پر دراز ہو گئے۔ خلوت میسر آئی تو میں نے عارج سے کہا۔ ''تمہیں اس گھر کا ماحول عجیب عجیب سا محسوس نہیں ہو رہا اے عارج؟''

''ہاں اے دینار!'' عارج نے تصدیق کی۔ پھر خود ہی بتایا ''یہاں آنے کے بعد مجھے اپنے اعصاب پر ایک بوجھ سا بھی لگ رہا ہے۔''

''یہی حال میرا ہے یہاں کچھ نہ کچھ ہے ضرور!'' میں بولی۔

''مگر کیا ہے......؟ میری سمجھ میں تو نہیں آ رہا۔'' عارج کہنے لگا۔

''میری سمجھ میں تو زینب کا شوہر بھی نہیں آیا۔ بڑا بداخلاق معلوم ہوتا ہے۔ ہم سے اس نے بات کرنی بھی پسند نہیں کی۔ بہرحال اب تک حالات کا جائزہ لینے سے ہمیں صرف یہ پتا لگا ہے کہ بلال کی سوتیلی بھابی نائلہ نے کسی خاص مقصد کے حصول کی خاطر اپنی غیر شادی شدہ بہن یمامہ کو یہاں رکھ چھوڑا ہے۔ ممکن ہے زینب کو بلال سے طلاق دلا کے وہ یمامہ ہی سے اس کی شادی کرانا چاہتی ہو۔'' میں نے تجزیہ کیا۔

''پھر تو اے دینار! ایسی صورت میں یہ ضروری ہے کہ کسی بھی طرح یمامہ کو یہاں سے نکال باہر کیا جائے۔'' عارج نے کہا۔

''ابھی تک ہم نے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم حالات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ بہت سی باتیں اب تک ہمارے علم میں نہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کا غیر فطری ماحول بھی میرے لئے ناقابل فہم ہے۔''

''مجھے تو یہ بتا اے دینار! کہ اب کرنا کیا ہے؟'' عارج نے پوچھا۔

''خود تو میں کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں تبھی تجھے کچھ بتاؤں گی نا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، جب تو کوئی نتیجہ اخذ کر لے تو مجھے بتا دیجیو۔ میں اس وقت تک سوتا ہوں۔'' عارج نے یہ کہہ کر آنکھیں موند لیں۔

☆......☆......☆

نیند مجھے بھی آ رہی تھی اس لئے کچھ نہ بولی۔ دالان میں موجود طاق کے اندر رکھے چراغ کی لو میں نے بستر پر لیٹنے سے پہلے ہی کم کر دی تھی۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے میں نے عارج سے کہا۔ ''خدا حافظ..... شب بخیر! انشاء اللہ کل صبح ملاقات ہو گی۔''

''انشاء اللہ..... خدا حافظ!'' عارج بھی جواباً بولا۔

مجھے سوتے ہوئے شاید زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ یوں محسوس ہوا جیسے زمین ہل رہی ہو۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ عارج کو بھی میں نے اٹھتے دیکھا۔ اسی وقت ہیبت ناک آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''اے دینار! یہ آوازیں کیسی ہیں؟..... ایسا لگ رہا ہے درندے آپس میں لڑ رہے ہوں۔'' عارج نے اظہار خیال کیا۔

اس وقت ایک دم خاموشی چھا گئی۔ میں نے کہا۔ ''اے عارج کوئی ایسا ہے جو نہیں چاہتا کہ ہم یہاں رہیں۔ اس کا مقصد ہمیں یہاں سے ڈرا کر بھگا دینا ہے۔ تو خود ہی سمجھ سکتا ہے کہ ایسا کون ہو سکتا ہے۔''

''زینب کا شوہر بلال۔'' عارج بولا۔

''نہیں۔'' میں نے انکار کر دیا۔ ''یہ ان آدم زادوں کی حرکت ہو سکتی ہے جنہوں نے بقول زینب اس کے شوہر بلال پر سحر کرا دیا ہے۔''

''تیرا اشارہ بلال کے سوتیلے بھائیوں کی طرف ہے؟'' عارج نے وضاحت چاہی۔

''حتمی طور پر تو خیر میں کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن امکان یہی ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''میرا قیاس یہ ہے کہ ابھی ہمیں خوفزدہ کرنے کا یہ سلسلہ بند نہیں ہو گا۔ اگر ہم سو بھی گئے تو کچھ دیر بعد ہمیں دوبارہ جاگنا پڑے گا۔''

''حیرت ہے کہ زینب برابر والے دالان میں آرام و اطمینان سے سو رہی ہے۔ وہ نہیں جاگی۔'' عارج نے کہا۔

''کیا خبر زمین ہلنے اور ہیبت ناک آوازیں سن کر اس کی آنکھ بھی کھل گئی ہو۔''

''اگر ایسا ہوتا تو وہ ہمارے پاس ضرور آتی۔ پھر بھی میں اٹھ کر اسے دیکھ لیتا ہوں۔''

عارج یہ کہتے ہوئے بستر سے اٹھا اور دالان کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ ذرا دیر میں اس نے واپس آ کر بتایا۔ ''زینب بے خبر سو رہی ہے۔''

''اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ فی الحال ہم ہی کو اس گھر سے بھگانا مقصود ہے۔ میں بولی۔ ''میرا خیال یہ ہے کہ اے عارج ہمیں دشمن سے نمٹنے کے لئے اسے دھوکا دینا پڑے گا' اس کی چال کامیاب رہی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں اے دینار! تو کیا کہنا چاہتی ہے۔

ابھی میں عارج کو بات کا کوئی جواب نہیں دے سکی تھی کہ زمین دوبارہ ہلنے لگی اور پھر ہیبت ناک آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ میرا یہ اندازہ درست ہی ثابت ہوا تھا کہ ہمیں خوفزدہ کیا جاتا رہے گا۔

زمین ہلنا بند ہوئی اور ہیبت ناک آوازوں کے بعد سناٹا چھا گیا تو میں نے عارج کو مخاطب کیا۔ ''دشمن کو دھوکا دینے سے میرا مقصد یہ تھا کہ وہ جو چاہتا ہے ہم اس پر عمل کریں۔ یعنی بظاہر خوفزدہ ہو کر ہم اس مکان سے چلے جائیں۔''

''اگر ہم نے ایسا کیا تو بے چاری زینب کیا کہے گی جو ہمیں اپنی مدد کیلئے یہاں لے کر آئی ہے۔'' عارج نے اعتراض کیا۔

''اس کیلئے ہمیں زینب کو اعتماد میں لینا پڑے گا۔''

''اور ہم رہیں گے کہاں؟'' عارج نے دریافت کیا۔

''کسی سرائے میں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ دور رہ کر بہتر طور پر زینب کی مدد کی جا سکتی ہے۔''

پھر صبح ہونے تک ہمیں خوفزدہ کیے جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ فجر کے وقت میں نے زینب کو جگایا اور اپنے دالان میں لے آئی۔ اسے میں نے بتایا کہ ہم رات بھر سو نہیں سکے۔ اس کے استفسار پر جب میں نے نہ سونے کی وجہ بتائی تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔

''تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں میری بہن!'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''جب تک حالات اعتدال پر نہیں آ جاتے' ہم یہیں نجف میں رہیں گے۔ تمہیں ہم تمہارا حق دلا کر ہی یہاں سے جائیں گے لیکن اس کیلئے ہمیں وقتی طور پر تم سے دور رہنا ہو گا۔''

''تو..... تو پھر تم کہاں رہو گی جمیلہ؟'' زینب نے پریشان ہو کر پوچھا۔

اس سوال کا جواب میں عارج کو بھی دے چکی تھی زینب کو بھی وہی جواب دے کر مطمئن کر دیا۔

مجھے زینب کا ذہن پڑھ کر پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا شوہر بلال سرکاری ملازم ہے۔ وہ دیوان البرید (ڈاک اور خبر رسانی کا محکمہ) میں ملازمت کرتا تھا۔ وہ اپنے دفتر چلا گیا۔ یمامہ اپنی بہن نائلہ کے گھر چلی گئی۔ نائلہ برابر والے دومنزلہ مکان کی نچلی منزل پر رہتی تھی۔ اوپری منزل میں بلال کے دوسرے سوتیلے بھائی کی سکونت تھی۔ بلال کے دو سوتیلے بھائی تھے۔ وہ دونوں ہی برابر والے مکان میں رہتے تھے۔ ان کی نظریں بلال کے مکان پر تھیں۔ وہ بلال کو وہاں سے نکال کر مکان پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔

ہم اس مکان سے جانے کیلئے اپنا سامان باندھ چکے تھے کہ عارج بولا۔ ''اے دینار! جانے سے پہلے کیوں نہ ہم بھی اپنے دشمنوں کی مزاج پرسی کرتے چلیں...... یہ بڑا ظلم ہے کہ انہوں نے ہمیں رات بھر سونے نہیں دیا۔''

''ان کی خبر لینے کیلئے ہمیں انسانی قالبوں سے نکلنا پڑے گا۔'' میں راضی ہو گئی۔ پھر میں نے اپنے انسانی قالب سے نکلنا چاہا مگر ناکام رہی۔ اسی لمحے مجھے عارج کی آواز سنائی دی۔ اس نے بھی مجھے یہی بتایا۔

اس پر میں نے زودحِس آواز میں کہا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ ہمارے دشمنوں نے ہمیں انسانی قالبوں میں قید کر دیا ہے۔'' ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ کسی معاملے میں مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہو۔ خیر و شر کے درمیان معرکہ آرائی میں پہلے بھی میں ان مراحل سے گزر چکی تھی اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ پسپائی ہمیشہ عارضی ثابت ہوئی پھر بھی جب میں اپنے انسانی قالب سے نہیں نکل سکی اور یہی عارج کے ساتھ ہوا تو میرے ذہن پر خوف چھا گیا۔ اس کے بعد مجھے اپنے اعصاب پر بوجھ کا خیال آیا' اس مکان میں قدم رکھتے ہی مجھے اور عارج کو اعصاب پر یہ بوجھ محسوس ہوا تھا جو ابھی تک برقرار تھا۔ میں نے سوچا یہ بھی تو ممکن ہے کہ بلال کا مکان کسی سحر کے زیر اثر ہو ہم شاید اس مکان کی حدود سے نکل کر اپنے انسانی قالبوں کو چھوڑ سکیں۔ یہی بات میری زبان پر بھی آ گئی۔

''اے دینار! خدا کرے تیرا قیاس درست ثابت ہو۔'' عارج نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس کے لہجے سے مایوسی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''اگر واقعی مکان سحر زدہ ہوا تو اس کی حدود میں زینب کا شوہر بلال بھی سحر کے زیر اثر آ جاتا ہو گا۔'' میں نے کہا۔ ''اسی سبب وہ اپنے سوتیلے بھائیوں کی حمایت کرنے لگتا ہے۔ یوں

گویا وہ خود اپنے ہی خلاف ہو جاتا ہے۔ ہم غالباً اس مکان کی حدود سے باہر ہی بلال کو قابو میں کر سکتے ہیں یہاں تو وہ ہماری پراسرار قوتوں کے اثر میں بھی شاید نہ آ سکے۔''

''گھبراتا کیوں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے عارج کو تسلی دی۔ ''چل سامان اٹھا یہاں سے نکلتے ہیں۔''

میرے ایماء پر عارج نے زینب کو آواز دے کر برابر والے دالان سے بلا لیا۔ وہ گھر کے دروازے تک ہمیں چھوڑنے آئی۔ میں نے اسے ایک بار پھر دلاسا دیا کہ وہ فکر مند نہ ہو ہم انشاء اللہ جلد ہی دوبارہ آئیں گے۔

اسی محلے کے بازار میں ہمیں چھوٹی سی ایک سرائے نظر آ گئی۔ دروازہ بند کرتے ہی میں اپنے انسانی قالب سے باہر آ گئی تو مجھے عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔ عارج نے یہ دیکھا تو وہ بھی اپنے انسانی پیکر سے نکل آیا۔ میرا یہ قیاس قطعی درست ثابت ہوا تھا کہ بلال کا مکان سحر کے اثر میں ہے۔ ہم وہاں اسی لئے اپنے قالبوں سے باہر نہیں آ سکے تھے۔ ہمارے انسانی قالب جمیلہ اور ایوب ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''اے جمیلہ! ایوب نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ ''ہم تو قصر خلافت میں تھے پھر یہاں اس کوٹھری میں کہاں سے آ گئے۔''

''مجھے تو خود حیرت ہے اے ایوب!... معلوم نہیں یہ کون سی جگہ ہے۔'' جمیلہ بھی کہنے لگی۔

اپنے انسانی پیکروں کو ہم کلام دیکھ کر میری توجہ ادھر ہو گئی اور میں عارج سے بولی۔ ''بہتر یہ ہے کہ ہم ان دونوں کو سلا دیں انہیں اگر پتا چل گیا کہ یہ بغداد کے بجائے نجف میں ہیں تو ان پر نہ جانے کیا گزرے۔'' میں اور عارج ہی ایک دوسرے کی آواز سن سکتے تھے۔ ہم چاہتے تو وہ آدم زاد ہماری آوازیں سنتے ورنہ نہیں۔ میرا ارادہ فوری طور پر اپنے انسانی قالب میں واپس جانے کا نہیں تھا۔ میں نے اسی وجہ سے عارج کو انسانی قالبوں پر نیند طاری کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اپنے ارادے سے میں نے عارج کو بھی آگاہ کر دیا پھر جمیلہ کو میں نے اور ایوب کو عارج نے سلا دیا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ ابھی ہم نے اپنا سامان تو کھولا نہیں۔ جمیلہ اور ایوب اسی لئے کوٹھری کے فرش پر دراز ہو گئے تھے۔

جلدی سے ہم نے سامان کھول کر ان دونوں کیلئے بستر بچھائے۔ انہیں بستروں پر لٹانے کے بعد میں نے عارج کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

''چلنا کدھر ہے اے دینار! یہ تو بتا دے۔'' عارج نے پوچھا۔

''یوں سمجھ کہ ہم اپنے دشمنوں کی تلاش میں چل رہے ہیں۔'' میں نے بتایا پھر خود ہی وضاحت کی۔ ''ہمارے دشمن وہی ہیں جو زینب کے دشمن ہیں اور جو نہیں چاہتے کہ ہم بلال کے گھر میں رہیں ان تک ہم یمامہ کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔''

عارج نے میری بات سے اتفاق کیا۔ ہم سرائے سے نکل آئے۔ یمامہ کے جسم کی بو میرے حافظے میں تھی سو اس تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی اسے میں نے اسی جیسے نقوش والی ایک عورت کے پاس بیٹھے دیکھا۔

''تمہیں کیسے یقین ہے نائلہ باجی کہ وہ دونوں گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔'' نیلی آنکھوں والی نوجوان یمامہ نے اس عورت سے دریافت کیا۔

وہ عورت جو یمامہ کی بڑی بہن ہی لگتی تھی کہنے لگی۔ ''میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ کل بعد نماز عشاء شیخ ہمارے یہاں خود تشریف لائے تھے۔''

''تو پھر؟'' یمامہ اب بھی نامطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

''انہیں میں نے موقع غنیمت جان کر سب کچھ بتا دیا تھا۔'' نائلہ نے کہا۔ ''شیخ نے فرمایا تھا کہ زینب کی بہن جمیلہ اور بہنوئی ایوب دو روز بھی اس کے ساتھ نہیں رہ پائیں گے پھر جب زینب اکیلی رہ جائے گی تو اسے یہاں سے نکالنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔''

''پہلے تو تم نے زینب کو طلاق دلوانے کیلئے کہہ رہی تھیں۔'' یمامہ سوالیہ لہجے میں بولی۔

''جلد بازی کیلئے شیخ نے منع کیا ہے اس طرح کام بگڑ بھی سکتا ہے۔'' نائلہ نے اپنی چھوٹی بہن کو سمجھایا۔

اسی وقت میں نے نائلہ کے ذہن کی پرتیں کھولنا شروع کر دیں۔ زینب اور بلال کی ازدواجی زندگی میں زہر گھولنے والی نائلہ ہی تھی۔ اس لالچی آدم زادی نے اپنے شوہر اور دیور کو بلال کیخلاف بھڑکایا تھا۔ نائلہ اور اس کے میکے والے شیخ نصر کے مرید تھے۔ شیخ نصر عملیات کا ماہر تھا۔ اسی کے ذریعے نائلہ نے بلال پر سحر کرایا۔ اس کیلئے بلال کے مکان کو ''کیلنا'' پڑا تھا۔ پڑھی ہوئی چار کیلوں کو مکان کے چاروں کونوں میں ٹھونکنا تھا۔ یہ کام نائلہ نے اپنی چھوٹی بہن یمامہ کے ذریعے کرایا۔ نائلہ جانتی تھی کہ یمامہ کو بلال پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بلال کے گھر اسی سبب یمامہ کا آنا جانا تھا۔ مکان کو ''کیلنے'' جانے کے بعد ہی سے بلال کا رویہ زینب کے ساتھ بدل گیا تھا۔

نائلہ کے کرائے ہوئے سحر کا توڑ مشکل نہیں تھا۔ مکان کے چاروں کونوں سے وہ کیلیں

اکھاڑ کر پھینک دی جاتیں تو سحر ختم ہو جاتا۔ وہ کیلیں کہاں کہاں ٹھونکی گئی تھیں یمامہ اس سے واقف تھی۔ میں نے اسی لئے مزید وقت ضائع کئے بغیر یمامہ کے ذہن کو اپنے قابو میں کر لیا۔

''یمامہ اپنی بہن کے کہنے پر تم نے جہاں جہاں بلال کے مکان میں کیلیں ٹھونکی ہیں انہیں وہاں سے اکھاڑ کر پھینک دو۔'' میں نے حکم دیا۔

میرے حکم پر یمامہ اپنی جگہ سے اٹھی تو نائلہ بولی۔ ''ارے تم کہاں چلیں۔''

''ایک ضروری کام یاد آ گیا ابھی آتی ہوں۔'' یمامہ نے میرے زیر اثر جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔

اسی وقت میں نے نائلہ کے دماغ پر قبضہ کر لیا اور اس سے کہا۔ ''یمامہ کو جانے دو...... اور سنو! آج کے بعد تم بلال کیخلاف کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گی۔'' میں نے اسے ڈرایا۔ ''اگر اب تم نے اپنے شیخ سے کوئی عمل کرایا تو الٹا ہو جائے...... تم بیوہ ہو جاؤ گی۔'' پھر میں نے نائلہ کے دماغ میں جو باتیں بٹھائی تھیں زبانی بھی اس سے کہلوائیں۔ یمامہ پہلے ہی وہاں سے جا چکی تھی۔ کام ہو گیا تو عارج کو میں نے چلنے کا اشارہ کیا۔ عارج کو ساتھ لئے میں دیوان البرید پہنچ گئی۔ بلال اسی سرکاری محکمے میں ملازم تھا۔ اس وقت وہ ڈاک چھانٹ رہا تھا۔ اسے میں نے اپنے زیر اثر لینے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

''تم نے اپنی بیوی زینب پر بڑا ظلم کیا ہے بلال!'' میں نے اس کے دماغ میں سرگوشی کی۔ ''تمہیں زینب سے معافی مانگنی چاہئے اور یمامہ کو اپنے گھر سے نکال دینا چاہئے بولو تم ایسا کرو گے نا۔''

ہاں میں زینب سے معافی مانگ کر یمامہ کو اپنے گھر سے نکال دوں گا۔'' بلال بڑبڑانے لگا۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری نہیں ہوئی کہ گھر کے اندر رہتے ہوئے ہی بلال سحر کے زیر اثر آ جاتا تھا مگر باہر ایسا نہیں تھا۔ گھر کے باہر وہ سحر کے اثر سے آزاد ہوتا تھا اسی بنا پر میں نے اسے بآسانی اپنے اثر میں لے لیا تھا۔

دیوان البرید سے واپسی پر عارج مجھ سے کہنے لگا۔ ''اے دینار! زینب کا مسئلہ تو ایک ہی دن میں حل ہو گیا اور ہم نے قصر خلافت سے پورے ایک ماہ کی چھٹی لی ہے اس سے پہلے ہم وہاں کیسے جائیں گے؟''

اچانک پرواز کرتے کرتے میں نے ایک آشنا آواز سنی تو چونک اٹھی۔

''تم دونوں کو فی الحال قصر خلافت میں جانا بھی نہیں ہے۔'' یہ آشنا آواز عالم سوما کی

تھی۔

''اے میرے باپ کے دوست سوما! تو یہاں نجف میں؟'' میں حیرت زدہ ہو کر بولی۔

''ہاں اے دینار! ان الفاظ کے ساتھ ہی عالم سوما! ظاہر ہو گیا۔ پہلے اس نے اندھیرے کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔'' مجھے تیری اور عارج کی تلاش تھی کہ تمہیں خطرے سے آگاہ کر دوں سنو کہ بوڑھے عفریت دہموش نے تمہارا سراغ پا لیا ہے۔''

''وہ کیسے؟..... اسے ہمارے بارے میں کب اور کس طرح معلوم ہوا کہ ہم کہاں ہیں؟'' میں نے دریافت کیا۔

''تم تک پہنچنے ہی کیلئے اس عیار عفریت نے کافر جن زاد مسعر کو استعمال کیا تھا۔'' عالم سوما نے جواب دیا۔ پھر کہنے لگا۔''بہتر یہ ہے کہ ہم کسی جگہ اتر کر اطمینان سے بات کریں یہ معاملہ پوری توجہ کا طالب ہے اور اس پر تفصیلی گفتگو ضروری ہے۔''

''تو پھر اے سوما! ہمارے ساتھ اس سرائے میں چل جہاں ہمارے انسانی قالب محو خواب ہیں۔'' میں نے تجویز پیش کی۔

یوں عالم سوما کو ساتھ لئے ہم سرائے کی کوٹھری میں آ گئے۔ عالم سوما نے دوبارہ اپنی بات شروع کر دی۔'' جس رات تم دونوں اس کافر جن زاد مسعر سے ملے تھے اس نے تمہارا تعاقب کیا تھا۔ پھر مسعر کو یہ معلوم ہو گیا کہ تم قصر خلافت میں قیام پذیر ہو اس کے علاوہ مسعر کو یہ بھی پتا چل گیا کہ تم دونوں نے جمیلہ اور ایوب کے انسانی قالبوں میں پناہ لے رکھی ہے۔ مسعر کو اب اسی وقت کا انتظار تھا کہ جب عفریت اس سے رابطہ قائم کرتا۔ میں اسے تمہاری خوش بختی ہی کہوں گا کہ مسعر سے وہ عفریت فوری طور پر نہیں ملا۔ میں مسعر پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ آج صبح عفریت دہموش مسعر سے ملنے آیا تو مجھے خبر ہو گئی۔ عفریت اس سے مل کر چلا گیا تو میں بغداد کے اس محلے میں پہنچ گیا جہاں مسعر نے سب کچھ بتا دیا۔ اسے عفریت نے اپنا آلہ کار بنا کر بغداد بھیجا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ اسے مسعر سے تمہارے ٹھکانے کا علم ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اب وہ کسی بھی وقت قصر خلافت کا رخ کر سکتا ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ عفریت آج رات قصر خلافت پہنچے گا۔ وہاں وہ تمہارے انسانی قالبوں کو تلاش کرے گا پھر اسے یہ سراغ لگانے میں دشواری نہ ہو گی کہ تم دونوں نجف میں ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ نادیدہ حفاظتی حصار کی موجودگی میں وہ عفریت تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا پھر بھی میرا مشورہ یہ ہے کہ تم پہلے کی طرح کچھ عرصے کیلئے اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤ تم ماضی یا

مستقبل کے کسی زمانے میں جا سکتے ہو۔'' آخر میں عالم سوما براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''بول اے دینار! کیا کہتی ہے۔''

''اے سوما! تیرا مشورہ بہتر ہے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں تمہاری طرف سے مطمئن ہو جاؤں۔'' عالم سوما نے پوچھا۔

''بالکل میں بولی۔'' ہم آج ہی کہیں کسی زمانے میں نکل جاتے ہیں۔''

ہماری طرف سے اطمینان ہونے کے بعد عالم سوما واپس چلا گیا جمیلہ اور ایوب کے قالب بے حس و حرکت پڑے تھے۔ ان پر ہم نے نیند مسلط کی تھی۔ ان دونوں کو اپنے اثر میں لے کر ضروری باتیں ان کے دماغوں میں ڈال دیں۔ مقصد یہ تھا کہ وہ اس پر حیران نہ ہوں کہ بغداد سے نجف کیوں اور کس لئے پہنچ گئے۔ اب وہ دونوں زینب کے گھر جتنے دن چاہے رہ سکتے تھے۔

سرائے سے نکل کر میں نے عارج کو مخاطب کیا۔''تو ہی بتا کدھر اور کس زمانے میں چلیں۔''

''ہندوستان کی سرزمین مجھے اچھی لگی تھی۔'' عارج کہنے لگا۔'' وہاں صحرا بھی ہیں اور دریا بھی اور پہاڑ بھی۔''

''اور زمانہ۔'' میں نے سوال کیا۔

''اس کا فیصلہ وہاں پہنچ کر کر لیں گے۔'' عارج نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں خوشی جھلک رہی تھی۔ وہ یقیناً کسی اور زمانے میں جانے پر خوش تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔'' ہندوستان کا کوئی ایسا علاقہ ہو جہاں ہم پہلے نہ گئے ہوں تو بہتر ہے۔''

عارج کو ساتھ لئے میں ایک بار پھر مستقبل کے سفر پر نکل گئی۔ اس مرتبہ بھی میں نے سینکڑوں صدیوں آگے کا سفر کیا۔

ہم آدم زادوں کی ایک آبادی کے قریب ٹھہرے تو ایک منظر نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ایک وجیہ و خوبصورت نوجوان آدم زاد کسی حسین آدم زادی کا ہاتھ تھامے اسے اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔''عذرا! یقین کر و اب کی بار میں برہان پور سے لوٹ کر آیا تو تمہیں ہمیشہ کیلئے اپناؤں گا۔''

''اے دینار!'' عارج مجھ سے بولا۔'' مجھے یہ انسانی قالب اچھا لگ رہا ہے میں اسے اپنا لیتا ہوں تو اس آدم زادی کے جسم میں اتر جا یہ دونوں بھی ہماری طرح ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔''

"تو نے پہلے بھی جلد بازی سے کام لیا تھا اے عارج!" میں نے کہا۔ "اس مرتبہ بھی کہیں ایسا نہ ہو کہ تو کسی مصیبت میں......"

"کچھ نہیں ہوگا۔" عارج نے میری بات کاٹ دی۔

"اچھا اگر تجھے جلدی ہے تو یہ انسانی قالب اپنا لے مگر مجھے ابھی حالات کا جائزہ لینے دے۔" میں بولی۔

فی الحال میں نے عارج کے ساتھ ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان دونوں آدم زادوں کی گفتگو سے پتا چل رہا تھا کہ وہ جدا ہونے والے ہیں۔ قریب ہی ایک درخت سے گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ میں نے اس نوجوان آدم زاد کے ذہن پر توجہ دی۔ مجھے اس کے بارے میں سب کچھ پتا چل گیا۔ اس کا نام ہاشم تھا پھر وہ لمحہ آ ہی گیا جب وہ عشق کے مارے جدا ہوئے۔ ان کے چہرے آنسوؤں سے تر تھے۔

ہاشم نے درخت سے بندھا گھوڑا کھولا اور اس پر سوار ہو گیا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تو گھوڑا آگے کو لپکا۔ اس دوران میں عارج اس کے جسم کو اپنا چکا تھا۔ عارج نے گردن گھمائی اور عذرا کو دیکھا۔ عذرا کی گلابی اوڑھنی سر سے ڈھلکی ہوئی تھی۔ ایڑیوں کو چھونے والے گھنے بال شانوں پر پریشان تھے اور وہ دونوں ہتھیلیوں سے اپنا حسین چہرہ چھپائے ہوئے تھی۔ اس کا بدن ہچکیوں سے لرز رہا تھا۔

ہاشم برہان پور کے والی حمید خاں کی سپاہ میں تھا اور اب چھٹیاں گزار کر واپس برہان پور جا رہا تھا۔ وہ حمید خاں کی نظروں میں چڑھا ہوا تھا اور اس کی سپاہ میں پانچ صد سوار کے منصب پر فائز تھا۔ حمید خاں کی حویلی میں بھی اس کا بہت آنا جانا تھا۔ اسے جاننے والے جانتے تھے کہ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک دن اسے دربار میں بلند مقام پر فائز کر دیں گی۔

عارج کے ساتھ میں بھی آخر برہان پور پہنچ گئی۔ فرق صرف یہ تھا کہ عارج ہاشم کے انسانی قالب میں تھا جب کہ میں اپنی اصل پر قائم تھی۔ میں ابھی تک کسی انسانی جسم میں نہیں اتری تھی۔ برہان پور پہنچتے ہی میں نے ضروری معلومات حاصل کر لیں۔ ابھی عارج اپنے حواسوں میں آیا بھی نہ تھا کہ ایک کنیز نے اسے زہرہ خانم کے حضور میں حاضری کا پروانہ پہنچایا۔

عارج یہ حکم سن کر گھبرا گیا اور کہنے لگا۔ "یہ زہرہ خانم کون ہے؟" یہ سوال اس نے مجھ سے کیا تھا۔

"جا کر اس سے ملے گا تبھی تو تجھے معلوم ہوگا کہ برہان پور کی سرزمین پر حمید خاں کی حکمرانی ہے زنان خانے میں اس کی بہن زہرہ خانم کا حکم چلتا ہے۔" میں نے عارج کو بتا دیا۔ "اس کے پیچھے لوگ اسے خانم کے بجائے خونم بھی کہتے ہیں مزاج کی وہ بہت تیز ہے ذرا سی بات پر شوہر کو لات مار کر چلی آئی تھی بعد میں اس نے اپنے شوہر کو اتنا تنگ اور بدنام کیا کہ طلاق ہو گئی۔ طلاق کے بعد اس کے شوہر کا کچھ سراغ نہ ملا کہ کہاں گیا۔ مشہور تھا کہ زہرہ خانم نے اسے قتل کروا کے اس کی لاش بھی غائب کرا دی۔"

"یہ آدم زادی تو بڑی خطرناک لگتی ہے اے دینار!" عارج خوفزدہ سی آواز میں بولا۔ "میں اسی لئے تجھے تاکید کرتی ہوں کہ اس کے سامنے سوچ سمجھ کر بولیو۔" میں نے عارج کو سمجھایا۔

عارج نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ دراصل عارج نے جو انسانی قالب اپنایا تھا مردانہ وجاہت، حسن و خوبصورتی اور دلکشی میں بہت کم مرد اس کی ہمعصری کرتے تھے۔ اس بات کا اندازہ ہاشم کو بھی تھا۔ اس نے کئی حسین عورتوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تھا لیکن اس کیلئے تمام حسن و دل ربا عورتیں اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتی تھیں۔ وہ بچپن سے عذرا کا دیوانہ تھا اب جلد ہی وہ دونوں شادی کے مقدس بندھن میں بندھنے والے تھے۔ عذرا کی طرح ہاشم کو بھی بے چینی سے اس دن کا انتظار تھا۔

نگاہ رو بہ رد کئے عارج اپنے انسانی قالب میں زہرہ خانم کی خلوت گاہ تک پہنچا۔ پہلے تو زہرہ خانم نے ادھر ادھر کی باتیں کیں پھر اچانک پوچھ بیٹھی کہ میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟ عارج تو پہلے ہی گھبرایا ہوا تھا اس غیر متوقع سوال پر اور بھی گھبرا گیا۔

"اچھی لگتی ہیں۔" عارج نے گھبراہٹ میں کہہ دیا۔

زہرہ خانم کے ذہن پر میری توجہ تھی اس نے عارج کے جواب کو رضامندی سمجھا تھا۔ تھوڑی دیر خاطر تواضع کے بعد اس نے ہاشم کو رخصت کر دیا۔ اس کے بعد زہرہ نے ایسی چال چلی کہ بھائی کو بھی خبر ہو جائے حمید خاں کو بڑی خوشی ہوئی کہ چلو اس کی بہن دوسری شادی پر راضی تو ہوئی۔ وہ بھی ہاشم کو پسند کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ہاشم اس رشتے کو اپنی عزت افزائی سمجھے گا اور ہرگز انکار نہ کرے گا۔

میں نے عارج کو تمام باتوں سے آگاہ کر دیا تاکہ وہ بے خبری میں کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھے۔ چند روز بعد حمید خاں نے عارج سے یہ ذکر چھیڑا۔ عارج نے بڑی لجاجت اور خاکساری کے ساتھ نہایت مہذب پیرائے میں انکار کر دیا۔

حمید خاں چپ ہو رہا۔ عارج کا انکار اسے برا تو لگا مگر وہ زبردستی کا قائل نہ تھا۔

زہرہ کو انکار کی خبر لگی تو وہ آگ بگولہ ہو گئی۔ ''اس کی یہ مجال کہ ہمیں ٹھکرا دے۔ اسے شاید نہیں معلوم کہ جو ہمارا نہیں ہو سکتا وہ کسی کا بھی نہیں ہو سکتا۔'' اس کا غصہ دیکھ کر کنیزیں تھر تھر کانپنے لگیں۔ ''جاؤ اسے خبر کرو کہ ہم آخری بار اس سے ملنا چاہتے ہیں۔'' ایک کنیز دوڑی دوڑی گئی اور عارج کو زہرہ کا پیغام پہنچایا۔ عارج کی سٹی گم ہو گئی کنیز نے اسے بتا دیا تھا کہ زہرہ غصے میں بپھری ہوئی ہے۔ کنیز چلی گئی تو عارج نے مجھ سے پوچھا۔ ''اے دینار! اب میں کیا کروں؟''

''کرنا کیا ہے اس آدم زادی سے جا کر مل لے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ تجھے کھا تو نہیں جائے گی، ڈرتا کیوں ہے۔'' چارو ناچار عارج کو حویلی میں جانا ہی پڑا۔ اسے دیکھتے ہی زہرہ آپے سے باہر ہو گئی۔ ''بول تو نے ہماری توہین کی ہمت کیسے کی؟''

''حضور کو یقیناً خادم کی طرف سے غلط فہمی ہو گئی.....''

''خاموش ہو جا۔'' زہرہ درمیان میں چیخ اٹھی۔ ''ہمیں اتنا بتا دے کہ مرنا چاہتا ہے تو یا زندہ رہنے کی خواہش ہے؟ سن کہ ہم نے آج تک جس شے کی آرزو کی وہ ہمارے قدموں میں آ گری تجھے خود پر فخر کرنا چاہئے تھا مگر تو ناشکرا نکلا ہم نے اس وقت تجھے حجت تمام کرنے کو بلایا ہے۔ تیرے اقرار کا مطلب زندگی اور انکار کا مطلب موت ہو گا تجھے کیا منظور ہے؟''

عارج نے اسے لاکھ سمجھایا مگر وہ نہ سمجھی میں نے اس دوران میں یہ بات محسوس کر لی تھی کہ عارج کے انسانی قالب کی عادات اس پر اثر انداز ہونے لگی ہیں۔ مجھے یہ تجربہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔ عارج کے نزدیک زہرہ کو قبول کرنے کا مطلب محبت کی موت ہے۔ اسے ہاشم کی محبت عزیز تھی۔ ہر چند کہ زہرہ بھی حسن میں کم نہ تھی مگر عذرا کی بات ہی کچھ اور تھی۔

وہ حویلی سے لوٹ کر آیا تو میری توجہ اس کے ذہن پر تھی۔ ہاشم کا انسانی قالب اس پر بڑی حد تک حاوی آ چکا تھا۔ اس نے اسی لئے فیصلہ کیا کہ حمید خاں کی ملازمت چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ ہاشم کے باپ نے اتنی زمین چھوڑی تھی کہ اس پر کاشت کر کے با آسانی گزر بسر ہو جاتی۔ میرے لئے یہ امر زیادہ حیران کن نہیں تھا کہ عارج اب ہاشم بن کر سوچنے لگا تھا۔

کوئی موقع دیکھ کر عارج حمید خاں سے بات کرنے ہی والا تھا کہ زہرہ کے انتقام کی آگ اس کے دامن تک پہنچ گئی۔ اس کا لکھا ہوا ایک جعلی خط پکڑا گیا۔ یہ خط اس کی طرف سے عادل شاہ کے ایک مصاحب کے نام تھا۔ خط کی عبارت ایسی تھی کہ ہاشم کو عادل شاہی حکومت کا جاسوس سمجھا جائے۔ زہرہ خانم کے اشارے پر یہ جعلی خط لکھا گیا اور اسی کے ایما پر

پکڑا گیا۔

حمید خاں کو سوتے سے جگا کر یہ جعلی خط پڑھوایا گیا۔ ہاشم کے انکار سے حمید خاں پہلے ہی بددل تھا اس نے معاملے کی تفتیش کرنے کے بجائے فی الفور ہاشم کے قتل کا حکم دے دیا۔ زہرہ بھی چاہتی تھی کہ ہاشم کو صفائی کا موقع نہ ملے۔

پیش آنے والے حالات پر میری پوری طرح نظر تھی۔ ہاشم کے قتل کا مطلب عارج کی موت ہوتی کیوں کہ وہ اسی کے انسانی قالب میں پناہ لئے ہوئے تھا۔ حمید خاں کے حکم پر اسی وقت عارج کو گرفتار کر لیا گیا۔

عارج زنداں میں تھا کہ میں اس سے ملی اور کہا۔ ''میں نہ کہتی تھی کہ تو جلد بازی کر رہا ہے۔ آخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ تجھے اب مجبوراً ہاشم کے انسانی قالب سے نکلنا پڑے گا کیوں کہ صبح کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی اس کی گردن مار دی جائے گی۔''

''یہ تو بہت برا ہوا اے دینار!'' عارج نے اظہار افسوس کیا۔ ''مجھے امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی اس انسانی قالب کو چھوڑنا پڑے گا۔''

''تیری جان تو بچ جائے گی اور ہاشم مارا جائے گا مگر یہ تو سوچ کہ ہاشم کی محبوب عذرا پر یہ خبر سن کر کیا گزرے گی۔'' میں نے کہا۔ ''اب تجھے میرا کہنا ماننا پڑے گا۔ کسی نئے انسانی قالب کو اپنانے میں تجھے جلدی نہیں کرنی۔''

مجھے ہاشم کی محبوبہ عذرا کا خیال تھا سو عارج کے ساتھ اس کی بستی میں پہنچ گئی۔ میرا اندازہ قطعی درست نکلا عذرا کو ہاشم کے قتل کی خبر ملی تو اس پر قیامت گزر گئی جو شخص برہان پور سے خبر لایا تھا اس نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ہاشم بے گناہ مارا گیا ہے۔ وہ بستی ہی کا ایک آدمی تھا اور حمید خاں ہی کا ملازم تھا۔ میں نے اس مظلوم آدم زادی عذرا کے ذہن پر توجہ دی تو مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ واقعی ہاشم کو بے انتہا چاہتی تھی اسے یقین نہیں آیا کہ اس کا محبوب نظام شاہی حکومت سے غداری کر سکتا ہے۔ عذرا کو اس قتل کے پیچھے کوئی سازش معلوم ہوئی۔ اس کا سینہ انتقام کی آگ میں سلگنے لگا۔ اس کیلئے دنیا میں ہاشم کے سوا جیسے کوئی دوسرا مرد موجود ہی نہیں تھا۔ وہ ایک ایسی حوا تھی جسے صرف جنت سے نہیں نکالا گیا تھا بلکہ اس کا آدم بھی اس سے چھین لیا گیا تھا۔ کسی طرح کی بھی تسلی اس کی آتش انتقام کو سرد نہیں کر سکتی تھی۔

''اس آدم زادی کا انتقام میں لوں گی۔'' میں نے عارج کو بتایا۔

''مگر کیسے اے دینار؟'' عارج نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے تفصیل کے ساتھ عارج کو اپنے آئندہ اقدامات سے آگاہ کر دیا۔

ایک روز جب کہ ابھی فجر کی اذان بھی نہیں ہوئی تھی بستی میں نیند بچھی ہوئی تھی۔ اپنی بیوہ ماں کو بستر پر سوتا چھوڑ کر عذرا خاموشی سے باہر نکل گئی۔ میں نے ہی اس پر عذرا کو اکسایا تھا۔ اسے علم تھا کہ اب وہ کبھی گھر واپس نہ آ سکے گی لیکن ہاشم کے قتل کے بعد ''گھر'' بھی محض ایک لفظ رہ گیا تھا۔ وہ گھر سے نکلی اور راستے کی صعوبتیں اٹھاتی ہوئی برہان پور جا پہنچی۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد انتقام تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے محبوب کو حمید خاں کے حکم پر قتل کیا گیا ہے۔ اس کے انتقام کا نشانہ حمید خاں ہی تھا مگر حمید خاں کی حویلی کے برج بہت اونچے تھے۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اس تک عذرا کا پہنچنا آسان نہ تھا۔

میرے ایماء پر عذرا برہان پور آ تو گئی لیکن اپنے مقصد کا حصول اس کیلئے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ اس کی ایک ہی صورت تھی اور میں نے اسی پر عمل کیا۔ میں عذرا کے جسم میں اتر گئی۔

''اے دینار! تو نے اپنا ٹھکانا کر لیا مگر ابھی تک میں کسی انسانی قالب کے بغیر ہی سرگرداں ہوں۔'' عارج کہنے لگا۔

''ابھی صبر کر اے عارج!'' میں بولی۔ تیرے لئے انسانی قالب میں منتخب کروں گی۔ وقت تو آنے دے۔''

برہان پور میں اس شخص کو تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی جو ہاشم کے قتل کی خبر لے کر آیا تھا۔ اس کے جسم کی بو میرے حافظے میں تھی۔ میں اسے ہاشم کی بستی میں دیکھ چکی تھی۔ وہ ہاشم کا دوست تھا۔ اس کے باوجود میرے انسانی قالب کو دیکھ کر اس کے دل میں بدی آ گئی۔ مجھے اس شخص کو اپنے اثر میں لینا پڑا۔ میں پہلے ہی کسی ایسی صورتحال کیلئے تیار تھی۔ آدم زادوں کے درمیان رہ کر میں ان کی نس نس سے واقف ہو چکی تھی۔ ہاشم کا وہ دوست مجھ سے طعام و قیام کی قیمت وصول کرنا چاہتا تھا لیکن میرے زیر اثر بھیگی بلی بن گیا۔ وہ حمید خاں کے ذاتی خدمت گاروں میں تھا اور حویلی کی حدود میں ہی اس کی سکونت تھی۔ یوں مجھے حمید خاں کی حویلی میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔

میں موقع کی تاک میں رہی کہ کس طرح حمید خاں کے سامنے جاؤں۔ میں پر یقین تھی کہ میرے انسانی قالب عذرا کو حمید خاں نے دیکھ لیا تو خود پر قابو نہ رکھ سکے گا۔ اسی دوران میں حویلی کی کنیز کو میں نے اپنی سہیلی بنا لیا۔ وہ کنیز حمید خاں کی بہن زہرہ خانم کی ناک کا بال تھی۔ اس نے مجھ سے زہرہ خانم کا تذکرہ بھی کیا۔ میری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح حویلی کی کنیزوں میں شامل ہو جاؤں۔ اسی غرض سے میں نے اس کنیز پر ڈورے ڈالے۔ کنیز مجھے

زہرہ خانم کے حضور پیش کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ زہرہ خانم نے مجھے اپنی کنیز بنا لیا۔ چند ہی روز کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ زہرہ خانم پر عجیب سے دورے پڑتے ہیں اور وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہتی۔ وہ چیخنے چلانے لگتی ہے۔ ایک رات خود میں نے بھی اس کی چیخ و پکار سنی۔

دو گھڑی رات بیت چکی تھی کہ زہرہ خانم کی خواب گاہ سے چیخیں بلند ہوئیں اور میری آنکھ کھل گئی۔

زہرہ خانم کسی کا نام لے کر چیخ رہی تھی کہ پہلے تو میں بھی سمجھی کہ نیند کے خمار میں مجھ سے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے مگر جب دوبارہ بھی زہرہ ہاشم کا نام لے کر چیخی تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ہاشم میرے انسانی قالب عذرا کا مقتول محبوب تھا۔ اس بات کا علم مجھے پہلے ہی سے تھا کہ ہاشم کی اصل قاتل زہرہ ہے۔ دوسرے دن میں نے کنیزوں کو کریدا تو پتا چلا وہ بھی اس بات سے واقف ہیں۔ ہر چند کہ حمید خاں بھی قابل معافی نہ تھا کیونکہ اسی کے حکم پر ہاشم کا قتل کیا گیا تھا مگر زہرہ اس سے کہیں زیادہ سزا کی مستحق تھی۔ میں نے ان دونوں ہی بہن بھائیوں سے بھیانک انتقام لینے کا عہد کیا۔ مجھ پر بھی عذرا کی فطری صفات غالب آتی جا رہی تھیں۔ انتقام کا عہد اسی کا ثبوت تھا۔

زہرہ بیمار رہنے لگی تھی۔ طبیب اس کا مرض سمجھنے سے قاصر تھے۔ بظاہر اسے کوئی بیماری نہ تھی مگر وہ پلنگ سے لگ گئی تھی۔ اب آئے دن اس پر دورے پڑنے لگے تھے۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ حمید خاں اپنی بہن کی عیادت کیلئے آنے والا ہے۔ اس روز میں نے اپنے انسانی قالب کے بناؤ سنگھار میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

میں طے کر چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میری توقع پوری ہوئی حمید خاں میرے تیر نظر کا شکار ہو گیا۔ بہن کی عیادت کے بہانے وہ دیر تک حویلی کے اس حصے میں رہا۔ میں نے اس کے ذہن پر توجہ دی تو پانی کڑھی میں ابال آنے کا علم ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنی بہن زہرہ سے مجھے مانگ لے مگر ہمت نہ پڑی۔ پھر یہ کہ وہ اپنی بیوی سے بھی ڈرتا تھا۔ میں نے پیش قدمی نہ دیکھی تو خود پہل کی۔ عورت پہل کرے تو بزدل سے بزدل مرد ہمت پکڑ لیتا ہے۔ حمید خاں نے بھی ڈرتے ڈرتے مجھ سے راہ و رسم بڑھانا شروع کر دی۔ میں نے ان ملاقاتوں کے باوجود اپنے اور حمید خاں کے درمیان مناسب فاصلہ رکھا۔ اس کا مقصد اسے تڑپانا بھی تھا۔

حمید خاں میرے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے ناز و ادا سے حمید خاں کا دل اپنی مٹھی میں لے لیا۔ میرے انسانی قالب کے حسن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ حمید خاں اسی لئے مجھے اپنا لینے پر آمادہ ہو گیا۔ دراصل وہ اتنا بدصورت تھا کہ کوئی حسین لڑکی اس کی صورت پر

ٹھوکنا بھی پسند نہ کرتی۔ پھر عمر بھی کافی تھی۔ وہ اس غلط فہمی میں پڑ گیا کہ میں اسے چاہتی ہوں۔ بیوی اسے منہ نہیں لگاتی تھی۔ کنیزیں دور بھگتی تھیں اسی عالم میں میرے اظہار عشق نے اسے جیسے میرا بندہ بے دم بنا دیا۔

یہی وہ مرحلہ تھا کہ جب ایک دن میں نے عارج کو بتایا۔ ''اے عارج! میں نے تیرے لئے ایک انسانی قالب تلاش کر لیا ہے۔''

''کون ہے وہ؟'' عارج نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''حمید خاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میرے نصیب میں وہی حبشی رہ گیا تھا۔''

''مجبوری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تجھے اس کے جسم میں اترنا ہی پڑے گا کیونکہ میرا انسانی قالب اس سے شادی کر رہا ہے۔''

''یہ تو نے کیا کہا اے دینار!'' عارج نے تاسف کا اظہار کیا۔

''حمید خاں سے اسی طرح انتقام لیا جا سکتا ہے۔'' میں بولی۔ ''اسے میں ذلیل اور رسوا کر دینا چاہتی ہوں..... اس طرح کہ وہ سسک سسک کر جیے اور موت کی آرزو کرنے لگے۔ اس کے لئے تجھے میرے اشاروں پر چلنا ہو گا۔''

''یعنی؟'' عارج نے وضاحت چاہی۔

''میں جب اشارہ کروں تو اس کے جسم پر اتر جا اور جب نکلنے کو کہوں نکل جا' میں نے عارج کو بتایا۔'' تجھے ہر وقت اس کے جسم میں نہیں رہنا..... آج رات وہ میرے انسانی پیکر سے شادی کر لے گا۔ تجھے اس کے فوراً بعد اس کے جسم پر قبضہ کر لینا ہے۔''

''اے دینار! میں سمجھ گیا کہ تو کیا چاہتی ہے۔'' عارج نے کہا۔ پھر وہی ہوا جو میرا منشا تھا۔ حمید خاں مجھ پر صدقے واری ہونے لگا۔ عارج عموماً دن کے وقت حمید خاں کے جسم سے میرا اشارہ پا کر نکل جاتا مگر ارد گرد منڈلاتا رہتا تھا کہ مجھے نہ جانے کب اس کی ضرورت پڑ جائے۔

حویلی میں اب میری حیثیت بدل گئی۔ کسی کو میرے ارادوں کا علم نہیں تھا۔

اول اول حویلی کی خواتین نے مجھے قبول نہیں کیا لیکن جلد ہی میں نے اپنے حسن اخلاق سے سب کے دل میں جگہ بنا لی۔ زہرہ تو اٹھتے بیٹھتے میرا دم بھرنے لگی۔ سال بھر ہی میں میں نے ساری حویلی پر اپنا سکہ بٹھا دیا۔ حمید خاں میری زلف گرہ گیر کا ایسا اسیر ہوا کہ میں جو کہتی وہ مان لیتا۔ اب وہ مرحلہ آ گیا تھا کہ میں حمید خاں کی ذلت و رسوائی کا سامان کر سکتی۔

اس کے پیش نظر میں ایک دن حمید خاں سے بولی۔ ''ترقی و مناصب یوں ہی نہیں مل جاتے' اس کیلئے آدمی کو کوشش کرنی پڑتی ہے اور حکمران وقت کا تقرب حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے جو حکمراں سے زیادہ قریب ہوتے ہیں زیادہ ترقی پاتے ہیں۔''

حمید خاں نے کہا۔ ''تمہاری بات سے مجھے اتفاق ہے لیکن حضور نظام الملک کی توجہ کیسے حاصل ہو۔''

میں فوراً بول اٹھی۔ ''مجھے محل میں آنے جانے کی کھلی چھٹی دے دو میں راہ ہموار کر دوں گی۔''

یہ بات سن کر حمید خاں کے چہرے سے حیرت ظاہر ہونے لگی۔ بولا۔ ''کس طرح؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو' میں یہ کہہ کر معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔

حمید خاں نے مجھے اجازت دینے میں تاخیر نہ کی۔ یہی اس کی بد نصیبی کا آغاز تھا مگر میرے عشق نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ محل میں میرا آنا جانا شروع ہو گیا۔ نظام الملک کو میں نے اپنے اثر میں لے کر یہ تاثر دیا جیسے وہ میرا دیوانہ ہو گیا ہے۔ خود میں نے اس بات کو شہرت دی جو قطعی بے حقیقت تھی۔ محل اور اس کے باہر لوگ چہ مگوئیاں کرنے لگے۔

مجھے خبر تھی کہ یہ بات حمید خاں کے کانوں تک بھی پہنچے گی۔ میں یہی چاہتی تھی۔

''عذرا!'' حمید خاں نے مجھے میرے انسانی قالب کے نام سے مخاطب کیا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں جانتی ہوں۔'' میں اطمینان سے بولی۔ ''لوگوں کا کام تو باتیں بنانا ہی ہے۔''

''لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ محض باتیں ہیں یا ان میں کوئی حقیقت ہے؟'' حمید خاں نے استفسار کیا۔ لہجے میں تڑپ تھی۔

''اگر حقیقت بھی ہو تو کیا مضائقہ ہے۔'' میں نے دانستہ اس کے احساس پر ضرب لگائی۔ ''تمہاری ہی خاطر تو میں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔''

معاملہ بہت نازک تھا۔ حمید خاں کو خبر تھی کہ اس نے مجھ پر ذرا بھی سختی کی یا مجھے محل میں آنے جانے سے روکا تو نتیجہ اچھا نہ ہو گا پھر بھی وہ بدنامی کے خوف سے کڑھنے لگا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اب تک وہ کتنا بدنام ہو چکا ہے۔ اس پر بھی میرے انتقام کی آگ سرد نہیں ہوئی تھی۔ میں نے حمید خاں کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ برہان پور کے ہر باحیثیت شخص کو خبر تھی کہ حمید خاں حبشی کی بیوی عذرا کا حکم اب محل میں بھی چلتا ہے۔ نظام الملک اس کی کوئی بات نہیں ٹالتا۔

میں نے نظام الملک کو بھی اسی طرح اپنے قابو میں کر لیا تھا کہ محل کے اندر بس میں ہی مالک و مختار تھی۔ محل کے باہر حمید خاں سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا تھا۔ مغل تاجدار جہانگیر کے عہد حکومت کا یہ آخری زمانہ تھا۔ جگہ جگہ بغاوتیں سر اٹھا رہی تھیں۔ نظام الملک نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ دکن کا جو حصہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا' دوبارہ اسے ہتھیا لیا۔

نظام الملک کی سرکوبی کیلئے دارالحکومت سے بھاری مغل لشکر لے کر خان جہاں لودھی دکن کی طرف آیا۔ حمید خاں حبشی کو حکم ہوا کہ وہ بڑھ کر خان جہاں لودھی کو روکے۔ اس موقع پر میں نے بھی حمید خاں کے ساتھ چلنے کی ضد کی۔ حمید خاں نے مجھے بہت سمجھایا کہ میدان جنگ میں خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے' تم ساتھ نہ چلو مگر میں نہ مانی۔ میرا مقصد حمید خاں کو مزید ذلیل و بدنام کرنا تھا۔

خان جہاں لودھی مغل لشکر ساتھ لئے حمید خاں حبشی کے مقابل آ کر ٹھہر گیا۔ مغل لشکر کی تعداد حمید خاں کے لشکر سے دگنی تھی۔ حمید خاں اسی سبب گھبرایا ہوا تھا۔ سورج ڈوب چکا تھا اس لئے فوری طور پر جنگ نہ چھڑی۔ حمید خاں کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ میں اس کے ساتھ ہوں وہ اسی بنا پر مجھ سے کہنے لگا۔ ''کیا خبر کل کیا ہو تم برہان پور چلی جاؤ میں تمہارے ساتھ ایک دستہ کر دیتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''میری سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آئی کہ تمہیں اتنی گھبراہٹ کیوں ہے' اچھی طرح سن لو کہ میں تمہیں یہاں اکیلا چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گی اگر تمہیں جنگ ہارنے کا ڈر ہے تو صلح کر لو۔''

حمید خاں آہ بھر کر بولا۔ ''یہ اتنا آسان نہیں! خان جہاں لودھی بہت سخت آدمی ہے۔''

''مگر میں نے اس کے بارے میں کچھ اور بھی سنا ہے۔''

حمید خاں نے پوچھا۔ ''کیا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''یہ کہ وہ لالچی آدمی ہے۔''

''ہاں ایسا تو ہے۔'' حمید خاں نے تائید میں کہا۔ ''مگر اس بات سے جنگ کا کیا تعلق؟''

''تعلق ہے۔'' میں پُرزور آواز میں بولی۔ پھر جو کچھ میں نے سوچا تھا حمید خاں کو بتا دیا۔

''تمہاری ہر بات مجھے منظور ہے مگر یہ نہیں کہ تم خود نذرانے اور تحفے لے کر سپاہیوں

کے ساتھ جاؤ۔'' حمید خاں میری پوری بات سن کر بولا۔

''میں اس مغل سردار سے جو گفتگو کر سکتی ہوں کوئی اور نہیں کر سکتا۔'' میں اپنی بات پر اڑی رہی۔ ''اسے معلوم ہو گا کہ حمید خاں کی بیوی خود مصالحت کی گفتگو کرنے آئی ہے تو نرمی سے کام لے گا۔ عورتوں کے ساتھ یوں بھی مرد سختی سے پیش نہیں آتے۔''

حمید خاں کو میری ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ میرے ہی ایما پر اس نے خان جہاں لودھی کے نام مصالحت کا پیغام بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو میں تحفے تحائف اور حمید خاں کا پیغام لے کر سرداران لشکر کے جلو میں روانہ ہو گئی۔ حمید خاں کو یقین نہیں تھا کہ میں کامیاب لوٹوں گی۔ مغل لشکر نصف منزل پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ سفید جھنڈے بلند کئے پانچ گھڑسوار تیز رفتاری سے مغل لشکر کی طرف بڑھے۔ میں بھی انہی میں تھی اور میرے چہرے پر نقاب پڑی ہوئی تھی۔ ہم پانچوں گھوڑے دوڑاتے ہوئے مغل لشکر کے قریب پہنچے تو ہمیں گھیر لیا گیا۔ مجھے دیکھ کر مغل سپاہیوں کے چہروں پر حیرت نظر آئی۔

''کون ہو تم لوگ؟'' مغل سپاہیوں کے ایک سردار نے پوچھا۔ ''تم کہاں سے اور کس ارادے سے آئے ہو؟''

میرے اشارے پر ایک سردار نے جواب دیا۔ ''ہم دکن کے معزز سردار حمید خاں حبشی کے سفیر ہیں اور ان کی طرف سے تمہارے محترم سردار کیلئے ایک پیغام لے کر آئے ہیں تم ہمیں اپنے سردار کے پاس پہنچا دو۔''

اس پر مغل سردار میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ کون ہے؟''

''ادب ملحوظ رکھو!'' حمید خاں کے ایک سردار نے دبنگ آواز میں کہا۔ ''یہ محترم خاتون ہمارے نامور سردار کی زوجہ ہیں۔''

مغل سردار یہ سن کر متاثر نظر آنے لگا۔ سپاہی بھی مرعوب لگ رہے تھے۔ میرے لباس میں جو ہیرے جواہر ٹکے ہوئے تھے ان پر بھی مغل سپاہیوں کی نظر گئی۔ کچھ سپاہی رہنمائی کیلئے ہمارے ساتھ چل دیئے باقی وہیں رہ گئے۔ وہ آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ آج تک ایسا نہیں ہوا کسی سردار نے میدان جنگ میں اپنی عورت کو بھیجا ہو۔ کچھ نے خیال ظاہر کیا کہ دکنی سرداروں نے جھوٹ بولا ہے۔ یہ عورت دراصل کوئی حسین و قیمتی کنیز ہے جو بطور تحفہ خان جہاں کی خدمت میں بھیجی گئی ہے۔ میں نے اپنے بارے میں یہ تبصرے سنے لیکن کسی سے کچھ نہ کہا۔ وہ اپنی محدود عقل کے مطابق ہی تو گفتگو کر سکتے تھے۔

مغل سپاہی کچھ ہی دیر میں ہمیں ساتھ لئے خان جہاں کے خیمے تک پہنچ گئے۔ اس

بڑے خیمے کے باہر مغل پرچم لہرا رہا تھا۔

خان جہان لودھی کو خبر کی گئی۔ وہ سرِ شام سے محفل ناؤ نوش سجائے بیٹھا تھا۔ مغل سپاہیوں کی گفتگو سے یہ بات میرے علم میں آئی۔ ان کا خیال تھا کہ شاید خان جہاں اس وقت ملاقات نہ کرے مگر ایسا نہیں ہوا۔ مجھے اور میرے ساتھی سرداروں کو خیمے کے باہر روک لیا گیا تھا ہم ابھی تک اپنے گھوڑوں پر سوار تھے۔ جب اندر سے طلبی ہوئی تو ہم گھوڑوں سے اتر گئے۔ خان جہاں کے محافظوں نے ہمارے گھوڑوں کی لگامیں تھام لیں۔ اس وقت کچھ مغل سردار بھی خان جہان کی محفل میں موجود تھے۔

میں شاہانہ انداز سے چلتی ہوئی آگے بڑھی اور خیمے کے اندرونی حصے میں داخل ہوتے ہی اپنے رخ سے نقاب ہٹا دی۔ میرے سردار ہاتھ باندھے پیچھے چل رہے تھے۔ خان جہاں کے چہرے سے مرعوبیت جھلکنے لگی۔ یوں جیسے اس کے خیمے میں کوئی ملکہ آ گئی ہو۔

خان جہان کے دماغ پر یقیناً نشے کا بھی کچھ اثر تھا ورنہ وہ یوں سحر زدہ ہو کر اپنی مسند سے نہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ خان جہاں میرے استقبال کیلئے اٹھا تو وہاں بیٹھے ہوئے مغل سردار بھی احتراماً کھڑے ہو گئے۔ میں نے محسوس کر لیا کہ ان پر بھی رعب حسن طاری ہے۔

مجھے خان جہاں نے اپنے قریب مسند پر بٹھایا۔ اس کے سردار مسند کے دائیں طرف دوزانو بیٹھے بوڑھے خان جہاں کو ایک ہی نظر دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اسے رام کرنا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ سب سے پہلے میں نے خان جہاں کو قیمتی تحفے پیش کئے اور غور سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ یہ ایک لالچی آدم زاد کا چہرہ تھا۔ خان جہاں کی آنکھوں میں ایسی ہی چمک تھی اسی وقت میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ اس بوڑھے کو یہ کہہ کر بے وقوف بنایا جا سکتا تھا کہ اس کا چہرہ میرے مرحوم باپ سے بڑی حد تک ملتا ہے۔ میں نے فوری طور پر اس خیال کا اظہار نہیں کیا اور جو تحریری پیغام ساتھ لائی تھی وہ خان جہاں کو پیش کر دیا۔

خان جہاں کے حکم پر یہ پیغام بلند آواز میں پڑھا جانے لگا۔ پیغام کی ابتدائی تین سطریں صرف القاب و آداب پر مشتمل تھیں انہیں سن کر خان جہاں کا سینہ پھول گیا۔ وہ القاب تقریباً بادشاہ کے ہم پلہ تھے۔ خان جہاں کو یقیناً اب سے پہلے ایسے القاب سے کسی نے یاد نہیں کیا ہوگا۔ میں نے خاص طور پر اس کے نفس کیلئے یہ خوراک فراہم کی تھی۔

اس پیغام میں جو اہم بات لکھی گئی تھی وہ یہ تھی کہ جنگ سے پہلے مناسب ہے دونوں سردار خلوت میں مل کر کوئی ایسی راہ تلاش کریں جو خلق خدا کا خون ناحق بہنے کی نوبت نہ آئے۔

☆......☆......☆

تجویز پیش کی گئی کہ دونوں لشکروں کے بیچوں بیچ ایک خیمہ نصب کیا جائے۔ دونوں سردار اور ان کا ایک ایک ساتھی غیر مسلح ہو کر اس خیمے تک پہنچ جائیں گے۔ پیغام میں مذاکرات کے وقت کا تعین خان جہاں پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ جب تک پیغام پڑھا جاتا رہا خاموشی چھائی رہی۔ خان جہاں کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس پیغام سے متاثر ہوا ہے۔ ہر چند کہ وہ پیغام صلح نہیں تھا مگر اس کی عبارت بڑی پر اثر تھی۔ یہ عبارت میں نے ہی لکھوائی تھی۔

''ہم تمہارے شوہر کی اس تجویز پر صاد کرتے ہیں۔'' پیغام سننے کے بعد خان جہاں نے نرم آواز میں کہا۔''کل آفتاب طلوع ہوتے ہی ہمارے آدمی جن کی تعداد پانچ ہو گی تمہارے لشکر تک پہنچ جائیں گے۔ تمہاری طرف سے بھی اتنے ہی آدمی مقررہ وقت تک یہاں آ جانے چاہئیں۔ ہم جاننا چاہیں گے کہ تمہیں یہ منظور ہے؟''

میں نے خوشی خوشی ہامی بھر لی۔ میں نے اپنی دانست میں اپنی کارگزاری سے حمید خاں کو آگاہ کیا تو اسے یقین نہ آیا۔ اس پر میں بولی۔

''جنگ صرف تلواروں سے نہیں ذہن سے بھی لڑی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس بوڑھے گھاگ کو شکست دے دوں گی۔ ابھی تو میرے ترکش میں اور بہت سے تیر ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میری نگاہ حمید خاں کے چہرے پر تھی۔

میری بات سن کر حمید خاں کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کے گزر گیا۔ وہ کچھ اور ہی سمجھا اس لئے سرد سی آواز میں مجھ سے پوچھنے لگا۔

''کیا وہ بوڑھا مغل سردار خان جہاں لودھی تمہیں بدنظر بھی محسوس ہوا؟''

میں ہنس دی' مجھے تو ایسے ہی موقعوں کی تلاش رہتی تھی۔ ایک ادا سے بولی۔'' وہ بوڑھا ایسا لگتا تو نہیں ہے لیکن بدنظر ہو بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کے کردار کی کجی ہمارے لئے سود مند ہو گی۔ پھر وہ زیر دام آنے سے کسی صورت نہیں بچ سکے گا۔ ایک بھی آدمی کا خون بہائے بغیر اتنی بڑی جنگ جیت لینا کوئی معمولی بات نہیں۔'' میں دانستہ ایسے الفاظ استعمال کر رہی تھی جو نشتر بن کر حمید خاں کے دل میں اتر جائیں۔

مجھے بخوبی علم تھا کہ حمید خاں میرے عشق میں دیوانہ ہے۔ اگر میں نے اسے اپنا دیوانہ نہ بنایا ہوتا تو شاید اب تک زندہ نہ ہوتی۔ اس کے باوجود میں حمید خاں کی طرف سے پوری طرح چوکنا اور محتاط رہتی تھی۔ کسی بھی وقت اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو سکتا تھا۔ وہ بھی یقیناً کوئی ایسا ہی لمحہ تھا کہ حمید خاں کی غیرت جاگ اٹھی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے اس کے

ہاتھوں میں پھل والا خنجر نظر آیا۔ وہ وحشت زدہ سا لگ رہا تھا۔ جیسے اپنے حواسوں میں نہ ہو۔ غیر متوقع صورتحال دیکھ کر میں سناٹے میں رہ گئی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی قدم اٹھاتی وہیں موجود عارج نے حمید خاں حبشی کی کلائی پکڑ لی۔ اسی لمحے جیسے مجھے ہوش آ گیا اور میں نے حمید خاں سے خنجر چھین لیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہو گیا کہ حمید خاں مجھ پر حملہ نہیں کر رہا تھا' اس کے خنجر کا رخ خود اسی کے سینے کی طرف تھا۔ گویا وہ خودکشی کرنے والا تھا۔ اس کا سبب مجھ سے بہتر اور کون جانتا۔

''یہ تم کیا کر رہے تھے؟...... کیا تمہیں نہیں معلوم کہ خودکشی کرنا حرام ہے۔'' میں نے حمید خاں کو مخاطب کیا۔

''مجھ سے اب مزید بے عزت ہو کر نہیں جیا جاتا۔'' حمید خاں کے لہجے میں بے بسی تھی۔ ''کوئی تم پر بری نظر ڈالے یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے نزدیک ایسی زندگی سے بہتر عزت کی موت ہے۔''

''سنو حمید خاں! ہم اپنے ارادوں پر تو کسی طرح کے پہرے بٹھا سکتے ہیں لیکن دوسروں کو پابند بنانا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ اگر کوئی کسی کو بری نظر سے دیکھتا ہے تو اسے ایسا کرنے سے کس طرح روکا جا سکتا ہے۔'' میں نے حمید خاں کو سمجھایا۔

میں نے حمید خاں کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کیلئے ہی اسے یہ تاثر دیا تھا کہ میں اس سے بے وفائی کر رہی ہوں حالانکہ یہ حقیقت نہیں تھی۔ اس پر بھی حمید خاں خود کبھی میرے روبرو حرف شکایت زبان پر نہیں لایا تھا۔ یہ الگ بات کہ میری طرف سے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر وہ اندر ہی اندر کھولتا اور کڑھتا رہتا تھا۔ یہ غم اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا کہ نظام الملک کی توجہ حاصل کرنے کی خاطر اس نے بڑی قیمت ادا کی ہے۔ اسے یہ بھی خبر تھی کہ لوگوں کی زبان پر کیا ہے۔ جو تیر کمان سے نکل چکا تھا اس کا واپس آنا محال تھا مگر کبھی کبھی اپنی بے عزتی پر بہت ملال ہوتا' آج اس نے اظہار بھی کر دیا تھا۔ اب سے پہلے اس نے میرے سامنے زبان نہیں کھولی تھی۔

''تمہارے ذہن میں بے عزتی کا جو خیال آیا ہے اسے ذہن سے جھٹک دو۔ چند لمحے خاموش رہ کر میں پھر کہنے لگی۔ ''اب کل صبح کی تیاریوں کا حکم دو۔'' حمید خاں نے اقرار میں سر ہلایا تو میں نے مزید کہا۔ ''دکن کی بہترین شراب اور دیگر لوازم بھی ضروری ہیں۔ یہ محفل عشرت ہو گی۔ ایک یادگار محفل تمہارے ساتھ اس محفل میں جانے والی میں ہوں گی۔'' میں نے یہ کہہ کر حمید خاں کے ذہن پر توجہ دی۔

حمید خاں کو یہ اندازہ پہلے ہی تھا کہ میں اس کے ساتھ جاؤں گی ورنہ سردار کے ساتھ ایک ساتھی کی شرط بھی نہ ہوتی۔ اس وقت حمید خاں کے ذہن میں یہ کھچڑی پک رہی تھی کہ اگر مغل سردار واقعی بدنظر ہوا تو کیا ہو گا؟ حمید خاں نے وہ شب سخت اضطراب اور بے چینی میں گزاری۔ حمید خاں کو میں نے ہی اپنی طرف سے غلط فہمی میں مبتلا کیا تھا لیکن یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ جان دے کر اس عذاب سے نجات پا جائے۔ اسی خیال سے میں نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ اگر میں بے وفا ہوتی تو نظام الملک کے حرم میں ہوتی۔ اسی بنا پر جب دوسرے دن حمید خاں بیدار ہوا تو رات کا کوئی زخم اس کے سینے میں ہرا نہ تھا۔ میں بھلا اس کی سزا کم کیوں ہونے دیتی۔

میں اپنے شکار کو دوبارہ تازہ دم ہوتے دیکھ کر خوش ہوئی۔ اب مزید مشق ستم کی راہ کھل گئی تھی۔ میں کوئی تازہ ستم ایجاد کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جب حمید خاں کو یہ اطلاع دی گئی کہ مغل سردار خان جہاں کے آدمی آ گئے ہیں تو وہ مجھے ساتھ لئے خیمے سے باہر آ گیا۔ میرے اور حمید خاں کے پاس کوئی ہتھیار نہیں' یہ تسلی ہونے پر بھی وہ لوگ وہیں ٹھہرے رہے۔ میں اور حمید خاں گھوڑوں پر سوار ہونے والے تھے۔

اپنے گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے میں نے ان لوگوں کو مخاطب کیا اور رکنے کا سبب پوچھا۔

ان میں سے ایک بولا۔ ''ہمیں خان جہاں نے حکم دیا ہے کہ آپ کے ساتھ ساتھ درمیان میں نصب ہونے والے خیمے تک جائیں۔ پھر اپنے لشکر سے جا ملیں۔ ایسا ہی آپ کے آدمیوں سے بھی کہا جائے گا۔ اگر آپ کو ہمارے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض ہے تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔''

''نہیں۔'' میں فوراً بول اٹھی۔ ''تم لوگ درمیانی خیمے تک ہمارے ساتھ چلو گے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں بلکہ اس سے تو ہم خان جہاں کے فہم و فراست کے قائل ہو گئے۔'' یہ کہہ کر میں اپنے گھوڑے پر چڑھ گئی۔

حمید خاں پہلے ہی گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔ ان لوگوں کی باتیں سن کر میں سمجھ گئی کہ خان جہاں بالکل ہی احمق نہیں ہے۔ درمیانی خیمے تک جاتے جاتے بھی مسلح ہونے کے خیال سے پلٹ کر آیا جا سکتا تھا۔ خان جہاں نے اس امکان کو ختم کر دیا تھا۔

دونوں فوجوں کے درمیان نصب کیا جانے والا وہ عالی شان خیمہ دور ہی سے نظر آ رہا تھا میرے اور حمید خاں کے گھوڑے اسی خیمے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ہمارے پیچھے خان جہاں

کے آدمی اپنے گھوڑوں پر سوار دوڑے چلے آرہے تھے۔

ہم درمیانی خیمے کے قریب پہنچے تو دوسری جانب سے بھی چند گھڑ سوار آتے دکھائی دیئے۔ آگے آگے خان جہاں لودھی کا گھوڑا تھا۔ میں نے اس مغل سردار کو دور ہی سے پہچان لیا۔ میں اور حمید خاں خیمے کے باہر ہی گھوڑوں سے اتر کر کھڑے ہو گئے۔ خان جہاں کے جو آدمی خیمے تک ہمارے ساتھ آئے تھے سیدھے نکلے چلے گئے۔

کچھ ہی دیر میں خان جہاں کی سواری وہاں آکر رکی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان مغل فوجی افسر بھی تھا۔ یہ مغل افسر گزشتہ رات بھی خان جہاں کے خیمے میں موجود تھا۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ حمید خاں اور میں نے بڑھ کر ان دونوں کا استقبال کیا۔ پھر انہیں خیمے کے اندر لے گئے۔ وہاں کوئی خدمت گار نہیں تھا۔ صرف چار افراد تھے۔ میں نے گفتگو شروع ہونے سے پہلے خود کو بطور ساقی پیش کیا اور دور ساغر کیلئے درخواست کی۔

خان جہاں یہ سن کر بولا۔ ”ہر چند کہ ہم دن کے وقت شغل سے گریز کرتے ہیں مگر تم نے جس محبت سے دعوت دی ہے اسے ٹھکرانا کفران نعمت کے برابر سمجھتے ہیں۔ ہم تمہاری دعوت منظور کرتے ہیں۔“

اس پر میں نے خان جہاں کا شکریہ ادا کیا اور اپنے ہاتھ سے ساغر بنا کر خان جہاں اور مغل فوجی افسر کو پیش کئے۔ پھر حمید خاں کیلئے بھی ساغر بنایا۔ شاید خان جہاں کو خیال ہو کہ میں اپنے لئے بھی ساغر بناؤں گی مگر ظاہر ہے مجھ سے یہ گناہ کیسے سرزد ہوتا۔ ایمان والوں میں سے ہونے کے سبب شراب کو میں حرام ہی سمجھتی تھی۔ خان جہاں نے جو کچھ بھی سوچا ہو لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔

گفتگو میں پہل میں نے کی۔ میں ٹھہرے ہوئے پرسکون لہجے میں بولی۔ ”دکن کی زمین پر بڑا خون بہہ چکا ہے۔ اب ہمیں چاہئے کہ اس زمین پر مزید خون نہ بہائیں' خلق خدا کا خون بہانا یوں بھی کون سی اچھی بات ہے۔ یقیناً حضور کو میری رائے سے اتفاق ہوگا۔“

خان جہاں نے ایک دنیا دیکھی تھی۔ وہ اسی لئے سنبھل کر بولا۔ ”تمہاری اس بات سے کون ذی ہوش انکار کرے گا مگر جنگ رکنے کی کوئی صورت تو ہو۔“

میں نے یہ سن کر کہا۔ ”حضور سے چند سوال کرنے کی اجازت چاہتی ہوں۔“ اس کے ساتھ یہ درخواست ہے کہ ان سوالوں کو گستاخی تصور نہ کیا جائے۔ ان کا مقصد محض یہ ہے کہ اصل صورتحال واضح ہو جائے۔“ ہر چند کہ مذاکرات میں دونوں فریقوں کی حیثیت مساوی ہوتی ہے لیکن میں دانستہ خان جہاں کو اہمیت دے رہی تھی۔ اجازت طلب کرنے کا مقصد بھی

یہی تھا کہ میں خان جہاں کو برتر تصور کرتی ہوں۔ خان جہاں پر اس کا اچھا اثر مرتب ہوا۔ اس نے بڑی خوش دلی کے ساتھ مجھے سوال کرنے کی اجازت دے دی۔ میں بولی۔ ”میرا پہلا سوال یہ ہے کہ عرش آشیانی شہنشاہ اکبر سے پہلے اس زمین پر کس کا قبضہ تھا' جس کیلئے جنگ ہو رہی ہے؟“

خان جہاں میرا سوال سن کر ٹپٹا گیا۔ اس نے گول مول سا جواب دیا۔ ”سبھی کو معلوم ہے کہ عرش آشیانی سے پہلے یہاں کس کا قبضہ تھا۔“

”پھر بھی یہ کنیز خود حضور کی زبان سے سننے کی آرزومند ہے۔“

”مگر اس سے تمہارا مقصد کیا ہے؟“ خان جہاں نے سوال کیا۔

”صرف یہ ظاہر کرنا کہ دکن والوں نے کبھی اپنی حدود سے باہر قدم نہیں نکالے' اس کے باوجود ان پر ظلم کیا جاتا رہا۔ انہیں خود انہی کے علاقے میں امن و سکون کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دی گئی اور اب پھر یہی نوبت آ گئی ہے۔“

خان جہاں نے یہ سن کر کہا۔ ”اگر تمہاری یہ حجت تسلیم کر لی جائے تو فتوحات بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔“

”ہاں وہ فتوحات یقیناً بے معنی ہیں جو لوگوں کو امن و سکون سے نہ رہنے دیں۔“ میں بے دھڑک بولی۔ ”بے شک جو لوگ مفسد اور شری ہوں انہیں راہ راست پر لانے کیلئے اقدامات کئے جا سکتے ہیں تاکہ خلق خدا ان مفسدوں کے فساد سے نجات پائے۔“

معلوم نہیں کہ وہ میرا دل نشیں پیرایہ اظہار تھا یا تیز دکنی شراب کا تاثر میری باتوں سے خان جہاں متاثر نظر آنے لگا۔ شروع شروع میں اس نے مزاحمت کی پھر یہ مزاحمت مفاہمت اور تائید میں بدلتی چلی گئی۔ خان جہاں کے ساتھی نوجوان فوجی افسر کا بھی اس میں ہاتھ تھا۔ وہ اب کھلم کھلا میری تائید میں بول رہا تھا۔ ایک جن زادی کی حیثیت سے میرے لئے یہ مشکل نہیں تھا کہ اس بوڑھے مغل سردار کو اپنا ہم نوا بنا لیتی مگر اپنی پراسرار جناتی قوتوں کو میں اسی وقت استعمال کرتی تھی جب کوئی دوسری راہ نہ رہتی۔

”تو گویا حضور نے یہ تسلیم کر لیا کہ اس زمین پر تصرف کا حق دکن والوں کو ہے۔“ میں نے گفتگو کو سمیٹا۔

خان جہاں نے اعتراف کیا۔ ”ہاں اب تک کی گفتگو کا تو یہی حاصل ہے۔“

میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک قدم اور آگے بڑھایا' بولی۔ ”اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو علاقے اب مغل فوج کے قبضے میں ہیں انہیں پہلے ہی کی طرح نظام شاہی

حکومت میں ہونا چاہئے۔"

خان جہاں سنبھلا اور کہا۔" لیکن قبضہ بھی تو کوئی چیز ہے نا پھر اس علاقے پر قبضہ حاصل کرنے کیلئے ہمیں کتنے اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں اس حقیقت کو بھی تو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

میں نے یک اور پانسا پھینکا۔" اگر اخراجات ادا کر دیئے جائیں تو؟"

خان جہاں گھبرا گیا وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔ میرے جال سے نکلنے کیلئے وہ بولا۔
" تو کیا خبر کیا کہا جا سکتا ہے..... ظل سبحانی کو یہ صورت قبول ہو گی یا نہیں اس کا فیصلہ تو وہ بہ نفس نفیس ہی کر سکتے ہیں۔"

اپنے شکار کو جال سے نکلنے کی جدوجہد کرتے دیکھ کر میں نے پھر ڈور کھینچی اور کہا۔
" ہمارے لئے تو حضور ہی سب کچھ ہیں حضور کا فیصلہ ہی ہمارے لئے بادشاہ کا فیصلہ ہے۔
حضور یہاں با اختیار ہیں اور بادشاہی کی طرف سے گویا اس کی نیابت کر رہے ہیں۔"

خان جہاں توقع کے مطابق بانس پر چڑھ گیا اور بولا۔" اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہم ظل سبحانی کی طرف سے کوئی بھی فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں لیکن اپنے دشمنوں سے ڈرتے ہیں۔
وہ یقیناً ظل سبحانی کو ہماری طرف سے ورغلا دیں گے۔"

" اس کی بھی ایک صورت ہے۔" لوہے کو گرم دیکھ کر میں جلدی سے بولی۔" حضور کے خیال میں جو منصفانہ فیصلہ ہو سنا دیں اس پر عملدرآمد بھی ہو جائے مگر حضور اس وقت تک دکن ہی میں ہمارے مہمان رہیں جب تک یقین کامل نہ ہو جائے کہ بادشاہ حضور سے خفا نہیں۔"

خان جہاں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ اگر وہ اخراجات کے نام پر ایک بڑی رقم وصول کر کے دکن کے تمام مفتوحہ علاقے نظام الملک کے حوالے کر دے گا تو بادشاہ اس پر اسے ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ ایسی صورت میں نظام الملک سے ملنے والی بھاری رقم اس کے پاس ہو گی اور وہ نظام الملک کی پناہ میں ہو گا۔ میری توجہ اس کے ذہن پر تھی۔ وہ لالچی آدم زاد یہ سوچ رہا تھا کہ میں کیوں نہ یہیں دکن میں رہ جاؤں؟ اگر میں نظام الملک سے مل گیا تو وہ دو ایک محالات کا محصول بھی میرے نام کر سکتا ہے۔ یوں مستقل آمدنی کی صورت بھی نکل آئے گی۔ اس ادھیڑ بن میں وہ کافی دیر خاموش رہا پھر بولا۔" یہ معاملہ اتنا نازک ہے کہ ہم فوری طور پر اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ ہمیں سوچنے کیلئے کچھ وقت چاہئے' کل صبح پھر یہیں ملاقات ہو گی۔"

" تو گویا یہ طے ہو گیا کہ ہمارے درمیان فی الحال مذاکرات ختم ہونے تک جنگ نہیں ہو گی۔" میں نے تصدیق چاہی۔

" یقیناً!" خان جہاں بولا۔" کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے جنگ کیسے ہو سکتی ہے؟"

میری کوششوں سے میدان رزم' بزم میں تبدیل ہو گیا اور دوستی و موافقت کے رشتے استوار ہونے لگے۔ اس ضمن میں ذکر کے قابل یہ بات تھی کہ مجھے اپنی پراسرار قوتیں استعمال نہیں کرنی پڑی تھیں۔ میں نے خان جہاں کو سوچنے کا وقت دے دیا مگر اسی کے ساتھ بولی۔
" مجھے حضور سے خلوت میں بھی کچھ عرض کرنا ہے۔ اگر حضور اجازت مرحمت فرمائیں تو یہ کنیز حضور کے ساتھ ہی چلے' کل جب حضور یہاں تشریف لائیں گے تو ساتھ ہی یہ بندی بھی آ جائے گی۔"

حمید خاں اس موقع پر خاموش نہ رہ سکا اور مضطرب آواز میں مجھ سے بولا۔" تو کیا تم رات بھی وہیں گزارو گی۔"

میں اس کی بے چینی سے خوش ہوئی اور بھانپ گئی کہ اس کے دل میں کیا کیا وسوسے اٹھ رہے ہوں گے۔

" حضور کے زیر سایہ رہنا تو میرے لئے سعادت ہے۔" میں نے خان جہاں کی طرف اشارہ کیا۔" حضور کے ہوتے مجھے کیا کھٹکا۔"

خان جہاں نے بھی تائید میں کہا۔" یہ ہماری مہمان بن کر رہیں گی۔ ان کی حفاظت کا ذمہ ہم لیتے ہیں۔"

مجھے اندازہ تھا کہ حمید خاں مجبوراً خاموش ہوا ہے ورنہ اس کے اندر طوفان اٹھ رہے ہوں گے۔ میں نے یہی سوچ کر اس کے ذہن پر توجہ دی۔

حمید خاں سوچ رہا تھا کہ دکنی فوج سے یہ بات چھپی نہ رہ سکے گی کہ عذرا بوڑھے مغل سردار کے ساتھ گئی۔ کیا فوجی یہ نہیں سوچیں گے آخر اس کی بیوی نے مغل فوج کے درمیان رات کیوں گزاری؟ پھر صلح ہو جائے گی تو اور بھی افواہیں سر اٹھائیں گی۔

اپنے ماتھے پر کلنک کا وہ ٹیکہ سجانے پر حمید خاں مجبور ہو گیا۔ میں نے اشاروں کی زبان میں عارج کو اس کی نگرانی پر مقرر کر دیا۔ حمید خاں دوبارہ خودکشی کی کوشش کر سکتا تھا۔ حمید خاں بڑی حسرت سے مجھے خان جہاں اور مغل فوجی افسر کے ساتھ جاتے دیکھتا رہا۔ ان دونوں کے درمیان میرا گھوڑا تھا۔ مشکل ہی سے کوئی ایسا دن گزرتا تھا کہ میں حمید خاں کے دل پر کوئی چرکا نہ لگاتی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کسی صورت مجھ سے استفسار کر سکتا۔

خان جہاں کے ساتھ میں اس کے خیمے تک پہنچی اور گھوڑے سے اتر گئی۔ ایک خدمت گار نے میرے گھوڑے کی لگام تھام لی تھی۔ اب میرے چہرے پر نقاب بھی نہیں تھی۔ خان جہاں نے مجھے اپنے ہی خیمے میں ٹھہرایا۔

میں اس بات سے بے خبر نہیں تھی کہ مغل لشکر میں میری آمد پر طرح طرح کی باتیں بنائی جا رہی ہوں گی ممکن ہے سپاہی یہ سمجھ رہے ہوں کہ خان جہاں نے دکنی سردار سے کوئی سودے بازی کر لی ہے۔

خلوت میسر آتے ہی میں نے خان جہاں کو بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''حضور کی شکل میرے مرحوم والد سے بہت ملتی ہے۔ حضور کی صورت دیکھ کر اسی لئے مجھے اپنے مرحوم والد کی یاد آ گئی۔''

توقع کے مطابق خان جہاں متاثر ہو کر بولا۔ ''تم ہمیں اپنے باپ کی جگہ سمجھ سکتی ہو۔''

یوں خان جہاں کو میں نے اپنا منہ بولا باپ بنا لیا اور آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹی کی خواہش ہے کہ باپ اسے چھوڑ کر نہ جائے۔''

''مگر اس کی سبیل کیا ہے؟'' یہ سوال کرتے ہوئے خان جہاں غور سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں جلدی سے بولی۔ ''سبیل میں بتاؤں گی' اس پر عمل کرنا حضور کا کام ہے۔''

''بتاؤ۔'' خان جہاں راضی ہو گیا۔

خان جہاں کو آمادہ پا کر میں نے ہوشیاری سے کہا۔ ''دکن کا جو علاقہ مغلوں کے قبضے میں ہے اسے چھوڑنے کے عوض اخراجات کے نام پر میں نظام الملک سے حضور کو اتنی بڑی رقم دلا دوں گی کہ حضور کی کئی پشتیں دکن میں سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں گی۔ ظاہر ہے کسی مغل قلعہ دار یا حکم کو اتنی ہمت نہیں ہو گی کہ وہ حضور کے حکم سے روگردانی کر سکے۔''

''تمہارا کیا اندازہ ہے نظام الملک ہمیں کتنی رقم دے سکے گا؟'' خان جہاں کے لہجے میں لالچ کا اظہار ہونے لگا۔

پھر کچھ ہی دیر میں میں نے سودا پکا کر لیا۔ مجھے یقین تھا یہ سودا بہت سستا ہے۔ نظام الملک فوراً اس پر راضی ہو جائے گا۔ یہ اس سرزمین کا سودا تھا جس کے حصول کی خاطر مغل تاجدار اکبر اور پھر جہانگیر نے کروڑوں روپیہ خرچ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ہزارہا مغل سپاہی مارے گئے تھے۔ دو مغل بادشاہوں' تین مغل شہزادوں اور متعدد مغل امیروں کی سالہا سال کی

محنت و جان فشانی پر پانی پھر گیا۔ میں نے خان جہاں کو شیشے میں اتار کر یہ سارے علاقے گویا کوڑیوں کے مول خرید لئے۔

صرف پانچ لاکھ ہون اور تین لاکھ کے جواہر میں دکن کا سودا ہو گیا۔ خان جہاں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ واپس نہیں جائے گا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ دکن کے دو محالات کا محصول بھی اس کے نام کر دیا جائے۔ میں نے یہ مطالبہ بھی مان لیا۔ خان جہاں کی باتوں سے مجھے محسوس ہوا کہ اسے یقین نہیں تھا نظام الملک بھی اس سودے پر راضی ہو جائے گا۔

میں نے اسے تسلی دی اور یقین دلایا۔ پھر بولی۔ ''میں آج ہی نظام الملک سے ملنے برہان پور جا رہی ہوں۔''

معاملہ طے ہونے کے بعد مزید ڈھیل دینا میرے نزدیک مصلحت کیخلاف تھا۔ میں اسی خیال سے وہاں نہیں رکی اور سیدھی حمید خاں کے پاس پہنچ گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''تم لوٹ آئیں؟'' حمید خاں کے لہجے سے خوشی جھلک رہی تھی۔ اپنی دانست میں وہ ممکنہ رسوائی سے بچ گیا تھا۔ میں نے مغل لشکر کے درمیان وہ رات نہیں گزاری تھی۔

میں نے حمید خاں کو خوش ہونے کا موقع نہیں دیا اور نشتر زنی کی۔ ''دیکھ لو کہ میں نے اس بوڑھے مغل سردار سے اپنی بات منوا ہی لی اور جنگ جیت لی۔'' یہ کہہ کر میں معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔

حمید خاں کا چہرہ بجھ گیا۔ میں مزید نمک مرچ چھڑک کر اس کے زخموں سے کھیلتی رہی۔ میں نے حمید خاں کو وہ سب کچھ باور کرایا جس میں نام کو بھی حقیقت نہیں تھی۔ مقصد اسے ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا تھا۔

''سوچ کیا رہے ہو! میرے ساتھ برہان پور چلو۔'' میں حمید خاں کو خاموش دیکھ کر بولی۔ ''کیا تمہیں اس بات پر خوشی نہیں کہ تمہاری بیوی نے تن تنہا مغلوں کے بھاری لشکر کو شکست دے دی۔۔۔ بولو۔''

''ہاں میں خوش ہوں۔'' حمید خاں نے سرد آہ بھری۔

پھر اسی روز شام ہونے تک حمید خاں کو ساتھ لے کر میں برہان پور پہنچ گئی۔ نظام الملک کو میں نے خود تمام واقعات سے آگاہ کیا۔ اس وقت حمید خاں بھی وہیں موجود تھا۔ نظام الملک نے خوش ہو کر اپنے گلے سے مروارید کا ایک ہار اتارا اور خود مجھے پہنایا۔

وہ رات برہان پور ہی میں بسر ہوئی۔ رات گئے تک جشن طرب جاری رہا۔ اس جشن میں میں نظام الملک کی ساقی بنی۔ سپہ سالار کفاف اور دیگر متعدد سردار بھی اس جشن میں شریک

تھے۔ جب رات ڈھل گئی تو میں نے بھری محفل میں یہ کہتے ہوئے نظام الملک کا ہاتھ تھام لیا۔
''حضور کو یہ کنیز خواب گاہ تک پہنچائے گی۔''

نظام الملک ہنستا ہوا اٹھا اور میرے ساتھ اپنی خواب گاہ کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ یہ ''حرکت'' میں نے دانستہ حمید خاں کو ذلیل و رسوا کرنے کیلئے کی تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے میں نے دیکھا کہ دکن کے سردار معنی خیز انداز میں حمید خاں کو دیکھ رہے تھے۔ اس کا سر شرم سے جھک گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بھری محفل میں سب کے سامنے میں نے اسے بے آبرو کر دیا تھا۔ احساس ذلت کے سبب وہ کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھے اسی کو روکنے کیلئے غارج اس کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا تھا۔

دوسرے ہی دن خان جہاں کو طے شدہ رقم کی ادائیگی کر دی گئی اور دو محالات کا محصول بھی اس کے نام ہو گیا۔ اس کے بعد خان جہاں کے حکم پر تمام مغل حاکموں نے نظام الملک کے گماشتوں کو اپنے علاقے سپرد کر دیئے اور نظام الملک کی اطاعت قبول کر لی۔ خان جہاں کی اس کارروائی کی مخالفت اگر کسی نے کی تو وہ احمد نگر کا قلعہ دار تھا۔ اس نے خان جہاں کے حکم اور تحریر کو بالکل رد کر دیا اور یہ جواب دیا کہ ظل سبحانی کے حکم کے بغیر قلعے کی چابی کسی کو نہ دوں گا' سمجھو قلعے کی چابی میرے سر سے بندھی ہوئی ہے۔ قلعے کے اطراف کے پرگنے اور تعلقے نظام الملک کے آدمیوں کے قبضے میں آ گئے۔ انہوں نے قلعہ دار کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

نظام الملک کی یہ بہت بڑی فتح تھی۔ اس فتح کا سہرا میرے سر تھا۔ دکن پر اب بالواسطہ میری حکومت تھی۔ نظام الملک میری مٹھی میں تھا۔ اب میری راہ میں صرف ایک امیر کفاف تھا جو تمام امور مملکت انجام دیتا تھا۔ نظام الملک کے ایماء پر میں نے ملک اور فوج کے سارے اختیارات کفاف کے ہاتھ سے اس طرح اپنے قبضے میں کر لئے کہ سب کچھ میرے اشارے سے وابستہ ہو گیا۔

رفتہ رفتہ کچھ ہی دن میں میرا اختیار و اقتدار اس درجہ بڑھ گیا کہ جب میں سواری کیلئے باہر نکلتی تو بڑے بڑے امیر اور سردار میرے ہاتھی کے ساتھ پیدل چلتے۔ یہ امیر اور سردار میرے ہی حضور میں اپنے عریضے یا بادشاہی پروانے پیش کرتے۔ اب میرے سامنے حمید خاں کی حیثیت کچھ نہ رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں اب اتنے اختیارات تھے کہ میں اپنے حکم سے حمید خاں کی زندگی کا چراغ گل کرا سکتی تھی مگر مجھے موقع کا انتظار تھا۔ میں یہ بھولی نہ تھی کہ میرے انسانی قالب عذرا کے محبوب ہاشم کو حمید خاں کے حکم پر کس جرم میں قتل کیا گیا تھا۔ اب حمید

خاں کی حویلی کے بجائے میرا زیادہ تر وقت نظام الملک کے محل میں گزرتا تھا۔

عادل شاہی اور نظام شاہی سلاطین میں ہمیشہ سے عداوت اور فوج کشی رہتی تھی۔ انہی دنوں عادل شاہ نے ایک آراستہ لشکر جنگی ہاتھی اور توپ خانہ لے کر نظام شاہی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ نظام الملک نے اس کے مقابلے میں تیاریاں کیں۔ اس کی ساری توجہ جنگ کی طرف ہو گئی۔ وہ خود ایک بڑا لشکر لے کر عادل شاہ کے مقابلے پر روانہ ہونے والا تھا۔

سرحدوں پر جنگ جاری تھی اور پل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔ مجھے ایک طویل عرصے سے کسی ایسے موقع کی تلاش تھی حمید خاں سے آخری انتقام لینے کیلئے یہی وقت تھا مگر اس سے پہلے میں نے ایک اور چال چلی۔

میں خلوت میں نظام الملک سے ملی اور اس سے کہا۔ ''یقیناً کسی نے غداری کی ہے اور وہ غدار ہم میں سے کوئی ہے۔ اس نے موقع دیکھ کر ہمارے دشمن کو ہم پر حملہ کرنے کیلئے اکسایا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ردعمل جاننے کیلئے میری نظریں نظام الملک کے چہرے پر جمی تھیں۔

''غداری۔'' نظام الملک حیرت سے بولا۔ ''ہمارے درمیان کون غدار ہو سکتا ہے۔''

''مجھے ایک شخص پر شبہ ہے مگر جب تک مجھے اس کے خلاف واضح ثبوت نہیں مل جاتا میں اس کا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ توقع ہے جلد ہی ثبوت مل جائے گا پھر میں خود اس کے قتل کا حکم دوں گی۔ فی الحال تو مجھے حضور سے کچھ عرض کرنا تھا۔''

''ہاں بولو کیا کہنا چاہتی ہو؟'' نظام الملک نے پوچھا۔

''حضور بہ نفس نفیس عادل شاہ کے مقابلے پر جا کر اسے اہمیت نہ دیں۔'' اصل بات کہنے سے پہلے میں نے تمہید باندھی۔

اس پر نظام الملک نے انکار میں سر ہلایا اور بولا۔ ''تمہیں شاید خبر نہیں کہ میدان جنگ سے کتنی ہولناک خبریں آ رہی ہیں' اگر ہم یہیں ٹھہرے رہے تو وہ یہاں تک بڑھ آئے گا۔ یہ بات جنگی حکمت عملی کے خلاف ہے اس طرح دشمن کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔''

''حضور کی جگہ یہ کنیز فوجیں لے کر مقابلے پر جائے گی۔'' میں پرعزم لہجے میں بولی۔

نظام الملک میری بات سن کر حیران رہ گیا۔ بولا۔ ''تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔''

''ممکن ہے جبھی تو کنیز نے عرض کیا۔'' میں نے پرسکون آواز میں کہا۔ ''کنیز کی درخواست ہے کہ اس جنگ کے سارے اختیارات اسے دے دیئے جائیں۔''

نظام الملک نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا تم یہ چاہتی ہو کہ ہم تمہیں شاہی افواج کا سپہ سالار بنا دیں؟"

میں نے اقرار کیا۔ "جی ہاں حضور! کنیز یہی چاہتی ہے اور اس کی ایک خاص وجہ ہے حکم ہو تو کنیز وجہ بیان کرے۔"

"ہاں کہو!" نظام الملک نے جلدی سے کہا۔ اس کے لہجے سے اضطراب جھلک رہا تھا۔

میں کہنے لگی۔ "اگر میں حضور کے اقبال سے دشمن پر غالب آ گئی تو صدیوں تک لوگوں کی زبانوں پر رہے گا کہ نظام الملک کی ایک عورت نے بیجاپور کے بادشاہ سے مقابلہ کر کے اسے بھگا دیا۔ اگر خدانہ کرے قضیہ اس کے برعکس ہوا تو لوگ یہی کہیں گے کہ ایک بادشاہ نے ایک عورت کو مغلوب کر لیا۔ اس کے بعد حضور اس شکست کا بدلہ لینے کا انتظام کر سکتے ہیں۔"

نظام الملک کو میری تجویز پسند آئی۔ وہ کھل اٹھا اس نے مجھے اپنی افواج کا سپہ سالار بنا دیا۔ سارے دکن میں نظام الملک کا یہ حکم حیرت کے ساتھ سنا گیا۔ پہلے یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ خود نظام الملک فوجیں لے کر محاذ جنگ پر جائے گا۔ اب لوگوں کو یہ اطلاع ہوئی کہ میں اس کی جگہ عادل شاہ سے لڑنے جاؤں گی۔ لوگوں کے ردعمل سے میں بے خبر نہ تھی۔

جن سرداروں کی ترقی میری سفارش پر ہوئی تھی انہوں نے بڑے نظم وضبط سے احکام کی تعمیل کی۔ ان کے ساتھ یہ ان کی محسن کی عزت کا سوال بھی تھا۔ وہ میری خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ ہو گئے۔ ان میں سے ہر ایک کو یہی گمان تھا کہ میں اس پر زیادہ مہربان ہوں۔ حمید خاں بھی میرے اشاروں پر ناچا ناچا پھر رہا تھا۔ مجھے سرداروں کی سرگرمی اور جوش دیکھ کر پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ میں کتنی ہر دلعزیز ہوں۔ جو سردار ابھی مجھ سے اپنا کوئی کام نہ نکلوا سکے تھے انہیں میں نے امید پر رکھا اور وہ بھی جان لڑانے پر تیار ہو گئے۔ اس سے قطع نظر میری خوشنودی حاصل کر کے نظام الملک کے قریب بھی ہو سکتے تھے۔

میں نے بڑی تن دہی سے فوجوں کو مرتب کیا۔ عارج بھی میرے ساتھ ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس نے بھی میری بھرپور مدد کی۔ میرے حکم پر جنگی ہاتھیوں کو بھی تیار کیا گیا اور توپ خانے کا بندوبست بھی ہوا۔ مجھے جنگی تجربہ نہیں تھا مگر میرے فوجی سردار منجھے ہوئے تھے۔ حمید خاں حبشی بھی کم نہ تھا۔ اس نے دشمنوں سے بڑے معرکے کئے تھے۔ اب تک آدم زادوں کے درمیان رہ کر میں نے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا مگر مجھے اس بات کا پوری طرح اندازہ تھا

کہ آدم زاد اندر سے کتنے بے رحم اور سفاک ہوتے ہیں۔

دکن میں دستور تھا کہ کوئی اہم معاملہ آ پڑتا تو سونے اور چاندی کے بہت سارے جڑاؤ کڑے بنوا کر سپہ سالار اپنے پاس رکھ لیتا۔ یہ سونے چاندی کے کڑے میدان جنگ ہی میں سپاہیوں کے کارناموں پر انعام میں انہیں دیئے جاتے تھے۔

عین موقع پر کوئی کارنامہ انجام دینے پر قیمتی انعام ملتا تو لڑنے والے اور جی توڑ کر لڑتے۔ تجربے کار سرداروں کے مشورے پر میں نے بھی بے شمار کڑے بنوا کر اپنے پاس رکھ لئے اور اس بات کو بڑی شہرت دی۔ دکن میں یہ بھی دستور تھا کہ توپ خانے کے پیادوں کی تالیف قلب کیلئے مٹھائی بھرے ٹوکرے بھی ساتھ ہوتے تھے۔ میں نے منوں مٹھائی کے ٹوکرے بھی تیار کرا لئے۔

مجھے ہر قیمت پر یہ جنگ جیتنی تھی۔ اس کیلئے میں نے عارج سے بھی مشورہ کیا۔ اس نے کہا۔ "دینار! دشمن کی فوج کے پیر اکھاڑنے کیلئے میں نے ایک تدبیر سوچ رکھی ہے۔"

میرے استفسار پر عارج نے جو کچھ بتایا اسے سن کر میں مطمئن ہو گئی۔ عارج نے غلط نہیں کہا تھا۔ آدم زاد اپنے جیسوں سے تو جنگ کر لیتے مگر کسی جن زادے سے لڑنا ان کے لئے ممکن نہ ہوتا۔

بالآخر فوجوں کی روانگی کا دن آ گیا۔ میں سرداروں کے جلو میں ایک ہاتھی پر سوار ہو کر محل سے نکلی۔ خود نظام الملک نے مجھے الوداع کہا۔

میں بڑی شان سے بنی سنوری ہاتھی کے ہودج میں بیٹھی تھی۔ میرے حسین انسانی قالب پر ہتھیار سجے ہوئے تھے۔ چہرے پر مرصع نقاب پڑی تھی۔ کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں انسانی قالب میں ایک جن زادی شاہی افواج کی قیادت کر رہی ہوں۔ دکن کی یہ پہلی جنگ تھی جس کی سپہ سالار ایک نازک اندام عورت تھی۔ یہ وہ عورت تھی جس نے ایک جنگ ہتھیار اٹھائے بغیر جیتی اور دوسری جنگ میں ہتھیار باندھ کر میدان میں اتری۔ اس سے میں یہ بھی ثابت کرنا چاہتی تھی کہ حوصلے اور بہادری میں مردوں سے پیچھے نہیں۔

میری فوج کوچ پر کوچ کرتی جب محاذ جنگ پر پہنچی تو نظام شاہی فوج پسپا ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے عقب میں بھاری لشکر دیکھا تو پسپا ہوتے ہوتے اس کے قدم پھر جم گئے۔ اس فوج کی کمان کفاف کے ہاتھ میں تھی۔ اسے پہلے ہی حکم مل چکا تھا کہ وہ میرے حکم کی تعمیل کرے۔ میں نے موقع پر پہنچتے ہی اپنے سرداروں کے ایماء پر کفاف کو یہ حکم بھیجا کہ لڑتے ہوئے پیچھے ہٹ آؤ۔ دشمن کو یہ تاثر دو کہ تم جی ہار چکے ہو اور جان بچا کر میدان جنگ سے

بھاگ رہے ہو۔

کفاف کو میرا حکم ملا تو اسے تعمیل کرنی ہی پڑی۔ مجھے علم تھا کہ میرا حکم کفاف کیلئے باعث حیرت ہی ہوگا۔ تازہ کمک آنے کے بعد پسپائی کا کوئی جواز نہیں تھا پھر اس طرح سپاہی بھی ہمت چھوڑ دیتے اور بڑی تعداد میں مارے جاتے۔

چال کارگر ثابت ہوئی' دشمن دھوکہ کھا گیا اور جوش میں اڑتا ہوا آگے بڑھ آیا۔ میری فوج نے دشمن کو تین طرف سے گھیر لیا۔ پھر جو بھرپور حملہ ہوا تو دشمن گھبرا گیا۔ یہی موقع تھا کہ میدان جنگ میں ایک حیران کن منظر دیکھا گیا۔ ایک طاقتور اور غیر معمولی جسامت والے شیر نے حملہ کر کے اس کی صفوں کو الٹ دیا۔ دشمن سپاہی شیر کی دہاڑ سن کر بھاگنے لگے۔ عارج نے بھی اپنے حصے کا کام کر دیا تھا۔ اس نے مجھے یہی تدبیر بتائی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی ہلے میں عادل شاہی فوج سامنے سے بھاگ گئی۔ میرے مردانہ وار حملوں سے غنیم کے ہزار آدمی مارے گئے۔ انہیں راہ فرار نہ مل سکی۔ ہزاروں دشمن سپاہی زندہ گرفتار کر لئے گئے۔

میں فتح و نصرت کے شادیانے بجاتی برہان پور لوٹی۔ نظام الملک کی نظر میں اب میں پہلے سے زیادہ معزز بن گئی۔ اس فتح کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ جشن کی رات میں نے نظام الملک سے کہا۔ ''حضور کو یقیناً یاد ہوگا کہ اس کنیز نے کہا تھا عادل شاہ نے کسی کی شہ پر حملہ کیا ہے' کسی نے غداری کی ہے۔''

نظام الملک تائید میں بولا۔ ''ہاں ہمیں یاد ہے' تمہیں کسی شخص پر غداری کا شبہ بھی تھا۔''

میں بڑے سفاکانہ انداز میں مسکرائی اور کہا۔ ''حضور اس غدار کا نام سنیں گے تو حیرت ہوگی۔ کنیز کو اس پر خود بھی بے حد ملال ہے' خود اپنی زبان سے کچھ کہنے کے بجائے حضور کی خدمت میں کنیز ایک ناقابل تردید ثبوت پیش کرنا چاہتی ہے۔'' پھر میں نے ایک مہر بند خط نظام الملک کے سامنے پیش کیا۔ اس خط پر سردار حمید خاں حبشی کی مہر تھی وہ خط عادل شاہ کے نام تھا۔ نظام الملک وہ خط کھولنے لگا۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا۔

میں نے اس دوران میں مزید کہا۔ ''اس غدار پر بہت دن سے کنیز کی نظر تھی۔ اسی وجہ سے یہ خط کنیز کے ہاتھ لگ گیا۔ یقیناً یہ غداری کا ثبوت ہوگا۔ کنیز کو یقین ہے کہ حضور اس غدار کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں کریں گے۔''

نظام الملک خط کھول کر پڑھنے لگا۔ اس خط میں جو کچھ لکھا تھا مجھے پہلے ہی خبر تھی۔ خط کی عبارت سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ حمید خاں پہلے بھی عادل شاہ سے مراسلت کرتا رہا ہے۔ اس

میں پچھلے خط کا حوالہ بھی دیا گیا تھا کہ فی الفور حملہ کر دیا جائے۔ یہ خط لکھنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ حمید خاں نے گویا عادل شاہ سے یہ اجازت طلب کی تھی کہ فتح و شکست دونوں صورتوں میں وہ بیجاپور آنا چاہتا ہے۔ کیا وہ جنگ کے فوراً بعد بیجاپور آ جائے؟ خط پڑھ کر میری توقع کے مطابق نظام الملک طیش میں بھر گیا۔ اس کا اظہار بڑے سے ہو رہا تھا۔

''وہ غدار بیجاپور نہیں بلکہ ملک عدم سدھارے گا۔'' نظام الملک غصے میں بولا۔ ''ہم اسی وقت اس کی گرفتاری اور قتل کا حکم دیتے ہیں۔''

پھر اس نے ذرا توقف سے اور ٹھہرے ہوئے ستائش لہجے میں کہا۔ ''آفریں ہو تم پر کہ تمہارے دل میں یہ خیال نہ آیا تم اس غدار کی بیوی ہو اور اس رشتے کا تقاضا ہے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دو۔ ہمیں تم پر ناز ہے تم واقعی ہمارے لئے گوہر نایاب ہو۔''

نظام الملک کو ذرا یہ خیال نہ آیا کہ جس شخص کو دولت عزت اور جاہ و نصب کی کوئی کمی نہ تھی وہ بھلا غداری کا مرتکب کیسے ہوتا؟ جو ایک عرصے سے حق نمک ادا کر رہا تھا' نمک حرامی پر کیوں اتر آیا؟ وہ ایک جعلی خط کو سچ سمجھا۔ اس کی یقین دہانی کیلئے صرف یہی کافی ہوا کہ اس خط پر حمید خاں حبشی کی مہر تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ خود سردار حمید خاں کی بیوی یعنی میں اپنے شوہر کی غداری کا ثبوت پیش کر رہی تھی۔ ایک جعلی خط لکھوا لینا اور پھر حمید خاں کی مہر حاصل کرنا میرے لئے کوئی دشوار کام نہ تھا۔ میں نے اس موقع پر نظام الملک سے ایک درخواست اور کی۔ بولی۔ ''کنیز کی خواہش ہے کہ خود اپنے ہاتھوں سے اس غدار کا سر قلم کرے تاکہ ایک لازوال مثال قائم ہو اس کے ساتھ یہ بھی التماس ہے کہ اس غدار کو صفائی کا موقع نہ دیا جائے اور اسے قتل کر دیا جائے۔ قتل کے بعد ہی لوگوں کو اس کی فرد جرم پڑھ کر سنائی جائے۔ یہ طریقہ کنیز کے خیال میں زیادہ موثر ہوگا۔''

نظام الملک نے اس پر کہا۔ ''ہم تمہاری گزارشات منظور کرتے ہیں' تمہیں ہم مکمل اختیار دیتے ہیں کہ اس غدار کو جس طرح چاہو سزا دو۔''

میں اسی وقت شاہی محافظوں کا مخصوص دستہ لے کر محل سے روانہ ہو گئی۔ دو گھڑی رات بیت چکی تھی۔

جس وقت میں حویلی میں پہنچی تو حمید خاں اپنی خواب گاہ میں جا کر سو چکا تھا۔ محافظ جو میرے ساتھ تھے انہیں کچھ معلوم نہ تھا ان کو تو نظام الملک کی طرف سے یہ حکم ملا تھا کہ وہ میرے ہر حکم کی تعمیل کریں۔

حویلی میں داخل ہو کر میں نے محافظوں کو حکم دیا۔ ''خواب گاہ میں گھس جاؤ اور سردار

حمید خاں حبشی کو گرفتار کر کے گھسیٹتے ہوئے زنداں میں لے جا کر ڈال دو۔ خبردار تعمیل حکم میں ذرا سی بھی بے احتیاطی قابل معافی نہیں ہوگی۔" اس کے ساتھ میں نے محافظوں کو تاکید کر دی۔ "حمید خاں اپنی گرفتاری کے بارے میں کچھ پوچھے تو ہرگز نہ بتایا جائے کس کے حکم پر کارروائی کی گئی۔ یہ بھی راز رکھا جائے۔"

میرا حکم پا کر محافظ حمید خاں کی خواب گاہ میں گھس گئے۔ میں نے اپنی چشم تصور کو متحرک کیا اور بند آنکھوں سے خواب گاہ کے اندر کا منظر دیکھنے لگی۔ حمید خاں بستر پر بے خبر سو رہا تھا کہ اچانک محافظوں نے اسے بستر سے گھسیٹ لیا۔

بیدار ہونے کے بعد حمید خاں بہت چیخا چلایا اور اس طرح حراست میں لینے کی وجہ پوچھی مگر محافظوں نے اس کی ایک نہ سنی۔ حویلی میں کہرام مچ گیا۔ حمید خاں کو محافظ اب خواب گاہ کے باہر لے آئے تھے۔ میں ایک ستون کی آڑ میں چھپی ہوئی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ میرے انسانی قالب عذرا کے محبوب ہاشم کو بھی اسی طرح ایک رات بغیر کچھ بتائے حمید خاں کے حکم پر گرفتار کیا گیا ہوگا۔ ہاشم بھی یوں ہی چیخا چلایا ہوگا۔ اس لمحے میں نے اپنے انسانی قالب کی فطری صفات کو خود پر حاوی آتے محسوس کیا۔ اس وجہ سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور سامنے کا منظر دھندلا گیا۔ محافظ حمید خاں کو گھسیٹتے لے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے آنسو پونچھ لئے۔

☆.....☆.....☆

پھر میں نے اسی راہداری میں ننگے سر اور پابرہنہ زہرہ خانم کو بھاگتے دیکھا۔ زہرہ خانم گھبرائی ہوئی اور بدحواس نظر آ رہی تھی۔ شاید کسی خادم نے اسے خبر کر دی تھی کہ اس کے بھائی سردار حمید خاں حبشی کو سپاہی پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔ اس عیار آدم زادی کو دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ حمید خاں کے بعد اب اسی کی باری تھی۔

☆.....☆.....☆

پہرے دار نے زنداں کا دروازہ کھولا اور میں اندر داخل ہو گئی۔ بظاہر مجھے جو کوئی دیکھتا تو اسے چہرے پر اداسی ہی نظر آتی لیکن میری اندرونی کیفیت قطعی مختلف تھی۔ حمید خاں کو میں نے جس حال میں دیکھا اس سے بھی مجھے خوشی ہوئی۔

زنداں میں حمید خاں کو آج تیسرا دن تھا۔ اب تک اسے یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ کیوں اور کس جرم میں قید کیا گیا ہے۔ تین دن میں اسے جو ذہنی اذیت برداشت کرنی پڑی ہوگی اس کا اندازہ کرنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ یہ تین دن شاید اس کی زندگی کے تمام آلام و مصائب پر بھاری تھے۔ اس کے پیروں میں بیڑیاں اور گلے میں طوق تھا۔ دونوں ہاتھ گلے میں پڑے ہوئے طوق سے بندھے ہوئے تھے۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ بے تابی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ زنداں کا سکوت زنجیروں کی جھنکار سے ٹوٹ گیا۔

"عذرا!" حمید خاں نے مجھے میرے انسانی قالب کے نام سے مخاطب کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر چیخ اٹھا۔ بتاؤ..... عذرا بتاؤ..... تمہی بتاؤ عذرا کہ مجھے کس جرم میں پکڑ کر پابہ زنجیر کیا گیا ہے؟..... تمہیں تو معلوم ہوگا۔"

میں آہستہ قدمی سے چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ کر زنداں کے چبوترے پر بیٹھ گئی۔

"بڑی کوشش اور مشکل کے بعد میں آج تم سے ملنے میں کامیاب ہو سکی ہوں۔" میں اداس آواز میں بولی۔ "تم سے ملاقات کی خاطر مجھے زنداں کے محافظوں کو بھی رشوت دینی پڑی ہے۔ سنو! میں تمہیں اس روح فرسا اعلان سے آگاہ کرنے آئی ہوں جو آج تمہارے

متعلق نظام الملک کی طرف سے کیا گیا ہے۔ شاہی ڈھنڈورچی بستی بستی یہ اعلان کرتے پھر رہے ہیں میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہو رہی ہے کہ..... کہ میں تمہیں اس اعلان کے بارے میں کچھ بتا سکوں۔" میں یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ حمید خاں سے میں نے جو کہا غلط نہیں تھا۔

حمید خاں بے چین ہو گیا اور تڑپ کر بولا۔ "مجھے بتاؤ..... بتاؤ عذرا کہ وہ اعلان کیا ہے؟"

"اس اعلان کے مطابق بہت..... بہت جلد تمہارا سر..... سر قلم کر دیا جائے گا اور..... " میں دانستہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"اور کیا؟..... کیا عذرا؟ جلد بتا دو ورنہ میں اپنی موت سے پہلے مر جاؤں گا۔" حمید خاں کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"اور یہ کہ میں..... میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہارا سر قلم کردوں گی۔"

"نہیں۔" حمید خاں چیخ اٹھا۔ "یہ..... یہ سزا بہت..... بہت بڑی سزا ہے مگر میرا جرم کیا ہے..... میں نے کیا جرم کیا ہے؟"

میں اسے شاہی اعلان کی تفصیلات بتانے لگی۔ "اعلان میں کہا گیا ہے کہ تمہاری گردن مارے جانے کے بعد فردِ جرم پڑھ کر سنائی جائے گی۔"

"تو..... تو میں اپنا..... اپنا جرم جانے بغیر ہی مر جاؤں گا..... مجھے..... مجھے اپنی صفائی کا موقع بھی نہیں ملے گا۔" حمید خاں جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھا۔

"میں پوری کوشش کروں گی کہ کسی طرح مجھے آخری وقت تک کچھ معلوم ہو جائے..... اگر مجھے کامیابی ہو گئی تو..... تو یقین کرو کہ..... کہ تمہاری موت سے پہلے میں تمہیں حقیقت سے آگاہ کر دوں گی۔" میں نے کہا۔

"ہاں..... ہاں اس وقت تم..... تم میرے قریب ہو گی..... مجھے بتا سکو گی مگر..... مگر کب تک..... مجھے کب تک قتل کر دیا جائے گا؟"

"تاریخ کا اعلان ابھی نہیں کیا گیا۔" میں نے بتایا۔ "کچھ معلوم نہیں کب یہ سانحہ ہو جائے۔"

مجھے اندازہ تھا کہ حمید خاں کیلئے یہ اور بھی عذاب ناک بات تھی۔ اسے تو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ قتل کیا جانے والا ہے مگر کب؟ اس کا علم نہیں تھا۔ موت سے زیادہ بھیانک موت کا انتظار ہوتا ہے۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے ایک اور تیر چلایا۔ بولی۔ "حمید خاں سنو! مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے قدرت تم سے کوئی انتقام لے رہی ہے۔ یاد کرو کبھی تم نے کسی بے گناہ کو بغیر

تفتیش کے قتل تو نہیں کرا دیا۔ خونِ ناحق کبھی نہ کبھی رنگ ضرور لاتا ہے۔ یہ تو تمہیں بھی پتا ہو گا۔"

"ہاں ہاں عذرا! حمید خاں بھول اٹھا۔" مجھے..... برسوں پہلے کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔"

"کیا ہوا تھا؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"ساری..... ساری زندگی میں بس ایک بار ایسا ہوا ہے عذرا۔" حمید خاں کہنے لگا۔ "میرا دل..... اب گواہی دے رہا ہے کہ..... کہ وہ نوجوان بے گناہ تھا..... اس کیخلاف غالباً کوئی سازش کی گئی تھی۔"

میں سمجھ گئی کہ حمید خاں کس کا ذکر کر رہا ہے مگر دانستہ انجان بن کر بولی۔ "کون تھا وہ؟"

حمید خاں نے سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ "اس نوجوان کا نام ہاشم تھا۔"

"کیا اس نوجوان ہاشم کو تمہارے حکم پر قتل کیا گیا تھا؟" میں نے سوال کیا۔ مقصد اسے ایک ایک بات یاد دلانا تھا۔

"ہاں اس کی گردن میرے حکم پر اڑائی گئی تھی۔" حمید خاں نے اعتراف کیا۔

میں نے پھر دریافت کیا۔ "اس نوجوان کو قتل کئے جانے سے پہلے کیا صفائی کا موقع دیا گیا تھا..... اسے بتایا گیا تھا کہ کس جرم میں اس کی گردن ماری جا رہی ہے؟..... کسی کو یوں ہی تو قتل نہیں کر دیا جاتا۔"

"ٹھیک کہتی ہو تم عذرا! مگر اس..... اسے کچھ نہیں بتایا گیا اور..... اور افسوس کہ..... کہ صفائی کا موقع بھی نہیں دیا گیا..... تمہارا یہ کہنا ٹھیک ہی لگتا ہے کہ قدرت مجھ سے انتقام لے رہی ہے..... خود میرے..... میرے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہو رہا ہے..... مجھے بھی تو......"

"اس نوجوان پر الزام کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"عادل شاہ کے ایک مصاحب کے نام اس کا خط پکڑا گیا تھا۔ خط اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ عادل شاہ حکومت کا جاسوس ہے۔"

میں نے حمید خاں کا جواب سنا اور بولی۔ "اس پر جرم ثابت ہو گیا تھا نا؟" اس کی تحریر ملا کر دیکھی گئی ہو گی۔"

حمید خان نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "افسوس کہ نہیں اور اب..... اب میں سوچ رہا ہوں ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا..... تفتیش ضروری تھی کیا خبر وہ مجرم نہ ہو۔"

"اب افسوس کرنے سے کیا حاصل۔ اب تو وہ نوجوان زندہ نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں اب کیا حاصل۔" حمید خاں پژمردہ لہجے میں بولا۔ پھر کہا "سنو اگر معلوم ہو جائے کہ مجھے کب قتل کیا جائے گا تو ضرور بتا جانا۔"

"ان دنوں جو حالات ہیں ان کے پیش نظر میں حتمی وعدہ تو نہیں کر سکتی ہاں کوشش پوری کروں گی۔"

اس کے بعد میں وہاں مزید نہیں رکی۔ میں جس لئے وہاں آئی تھی وہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ میں نے بڑی خوبصورتی سے اور غیر محسوس طور اسے احساس گناہ میں مبتلا کر دیا تھا۔ حمید خاں کو ذہنی اذیت دینے کی خاطر میں اب تک اس سے نہیں ملی تھی۔ آج میں ملی بھی تو اسے صرف اتنا بتایا کہ وہ قتل کیا جانے والا ہے۔ میری سکونت اب بھی حمید خاں کی حویلی میں تھی۔

☆......☆......☆

حمید خاں اپنے انجام کو پہنچنے والا تھا۔ میں اسے صرف ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کیلئے زندہ رکھے ہوئے تھی۔ حمید خاں کی زندگی گویا میرے اشارہ ابرو سے بندھی ہوئی تھی۔ میں جب چاہتی حمید خاں کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جاتا۔

اپنے ایک دشمن کو لب گور پہنچانے کے بعد مجھے دوسرے دشمن کی فکر ہوئی۔ اب زہرہ خانم سے انتقام لینے کا وقت بھی آ گیا تھا۔ حمید خاں تو محض ایک ذریعہ بنا تھا ورنہ میری نظر میں اصل مجرم حمید خاں کی بہن زہرہ خانم تھی۔ میں اپنے اس دشمن کو بھی تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتی تھی ورنہ میرے انسانی قالب عذرا کے انتقام کی آگ نہ بجھتی۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں ایک نتیجے پر پہنچی۔ اپنے فیصلے پر عمل کرنے کیلئے مجھے کسی منجھے ہوئے تجربے کار اور بااعتماد طبیب کے مشورے کی ضرورت تھی۔ نظام الملک سے قریب ہونے کے سبب دربار شاہی سے وابستہ ہر شخص میری عزت و احترام کرنے لگا تھا۔ انہی میں شاہی طبیب بھی تھا۔ میرا انسانی قالب کچھ ایسے عارضوں میں مبتلا تھا کہ شاہی طبیب سے ربط ضبط بڑھانا ضروری ہو گیا۔ شاہی طبیب مجھے ایسی دوائیں استعمال کرانے لگا کہ میری بیماریاں بڑھ نہ پائیں۔ میں ان دواؤں کی عادی سی ہو گئی تھی۔ زہرہ خانم سے انتقام لینے کی میں نے جو راہ نکالی تو اس موقع پر مشورے کیلئے بھی شاہی طبیب یاد آیا۔ وہ تجربے کار بھی تھا اور میں اس پر اعتماد بھی کر سکتی۔ میں نے طبیب کو بلوا لیا۔

رسمی گفتگو کے بعد میں نے شاہی طبیب سے پوچھا۔ "کیا کوئی ایسا زہر بھی ہے جو بے رنگ اور بے ذائقہ ہو؟"

اس بات کی مجھے توقع تھی کہ شاہی طبیب میری زبان سے زہر کا ذکر سن کر حیران ہو گا۔ سو ایسا ہی ہوا۔ "زہر" طبیب نے اظہار حیرت کیا۔

"ہاں زہر!" میں نے زور دے کر کہا۔ "میں فی الحال تم سے کچھ ضروری معلومات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ میری بات کا جواب دو۔"

شاہی طبیب نے اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ "جی ہاں ایسا زہر ہے مگر قیمتی اور نایاب ہے۔"

میں نے دوسرا سوال کیا۔ "اس زہر کو کھانے میں ملا دیا جائے تو کھانے کی رنگت یا ذائقہ تو نہیں بدلے گا؟" یہ سوال میں نے محض احتیاطاً کیا تھا۔

ہرگز نہیں حضور!" طبیب نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

اب میں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا بولی۔ "کیا ایسا زہر فوراً ہلاک کر دیتا ہے؟"

جی ہاں حضور! زہر کا کام ہی یہ ہے۔ وہ زہر ہی کیا جو ہلاک نہ کرے۔

"دراصل ہمارا مقصد یہ تھا کہ وہ زہر ہلاک تو کرے مگر آہستہ آہستہ!" میری زبان پہ اصل بات آ گئی۔

"ایسا بھی ممکن ہے مگر اس کیلئے زہر میں کچھ دواؤں کی آمیزش کرنی پڑے گی۔ پھر یہ بھی کہ ایسی صورت میں کم از کم ایک ہفتے تک زہر کی ایک خاص مقدار دینی پڑے گی تا کہ وہ فوری ہلاکت کا سبب نہ بن سکے۔" طبیب نے وضاحت سے پوری بات کہی۔

طبیب کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ میں بول اٹھی۔ "جسے زہر دیا جائے گا اسے زہر دیئے جانے کا احساس کتنے دن کے بعد ہو گا؟"

"ایک ہفتے کے بعد۔" طبیب نے بتایا۔ "کیوں کہ زہر اپنی مطلوبہ مقدار میں جسم کے اندر پہنچ چکا ہو گا اس لئے یہ مدت گزرنے کے بعد ہی آٹھویں نویں روز سے زہر کے اثرات ظاہر ہونے لگیں گے۔ مثلاً یہ کہ اس شخص کو غیر معمولی حدت اور گرمی کا احساس ہونے لگے گا پھر یہ حدت ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی اور ناقابل برداشت ہونے لگے گی۔ ممکن ہے کہ زہر کے اثر سے ایسے شخص کا گوشت رفتہ رفتہ گلنا شروع ہو جائے۔ خدا اپنی پناہ میں رکھے حضور کہ کوئی شخص اس کرب ناک موت سے گزرے۔ ایسے شخص کو موت سے ہمکنار ہونے کیلئے کم سے کم چالیس دن اذیت میں گزارنے پڑیں گے۔

طبیب سے یہ سن کر میں کھل اٹھی۔ یقیناً یہ میرا اصل مزاج نہیں تھا بلکہ میرے انسانی قالب کی فطری صفات مجھ پر غالب آ گئی تھیں۔ انہی صفات کے سبب میں سفاکانہ انداز میں

مسکرانے لگی۔ طبیب مجھے یوں مسکراتے دیکھ کر حیران نظر آنے لگا۔ ذرا ہی دیر بعد میں نے طبیب کو مخاطب کیا۔ "تو پھر مجھے ایسا زہر فراہم کردو۔ قیمت کی فکر نہ کرنا۔ جتنی قیمت بتاؤ گے اس سے دگنی ادا کروں گی۔"

میں نے طبیب کو چونکتے محسوس کیا تو اس کے ذہن پر توجہ دی وہ سوچ رہا تھا کہ میں اس سے زہر لے کر کسی کو عبرت ناک موت سے دوچار کروں گی۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ شاہی دربار سے منسلک ہونے کے باوجود اب تک اس کے دامن پر کوئی داغ نہیں تھا۔ طبیب کی نگاہ میں کسی کو قتل کرنے سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں تھا۔ اگر وہ مجھے زہر فراہم کر دیتا تو گویا گناہ میں برابر کا شریک ہوتا۔ میرے لئے یہ بھی مشکل نہیں تھا کہ شاہی طبیب سے زبردستی اپنی بات منوالیتی۔ اس کیلئے مجھے اپنی پراسرار قوتوں کو حرکت میں لانا پڑتا۔ میں خود بھی طب کا علم رکھتی تھی لیکن ایک تو میرے علم کا زیادہ تعلق جنات کی بیماریوں سے تھا' دوسرے میں نے آدم زادوں کی عام بیماریوں کا علاج کیا تھا غرض کہ میرے علم کا رخ مثبت سمت میں تھا۔ زہروں کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات نہیں تھی۔ میری نظریں ابھی تک سوالیہ انداز میں شاہی طبیب کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ لجاجت سے بولا۔ "حضور مجھے اس پر مجبور نہ کریں۔ میں یہ خدمت انجام نہیں دے سکوں گا' معذرت خواہ ہوں۔"

"آخر کیوں؟" میری پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"حضور! کے خادم کو یہ منظور نہیں کہ روز حشر کوئی اس کا دامن گیر ہو۔ خادم اس عظیم گناہ میں حصے دار نہیں بن سکتا۔" طبیب نے جواب دیا۔ پھر میں نے لاکھ کوشش کر لی مگر شاہی طبیب میرے ورغلانے میں نہ آیا۔ اس سلسلے میں بھی میں اپنی جناتی صفات استعمال کرنا نہیں چاہتی تھی ورنہ طبیب انکار نہ کرتا۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ طبیب کہیں یہ راز فاش نہ کر دے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے پینترا بدلا اور ہنس کر کہنے لگی۔ "ہمیں ہرگز ایسا زہر مطلوب نہیں۔ ہم تو یہ دیکھ رہے تھے کہ تم کتنے دین دار ہو۔ تم جا سکتے ہو۔"

"خادم...... خادم کا بھی یہی خیال تھا۔" طبیب خجالت آمیز لہجے میں بولا۔ "بھلا حضور کو ایسے زہر کی کیا ضرورت ہے۔" اس کے لہجے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ حقیقت جان چکا ہے۔ موقع غنیمت جان کر وہ میری خدمت میں تعظیم بجا لایا اور رخصت ہو گیا۔

دربار سے اور بھی طبیب وابستہ تھے۔ آخر ایک لالچی طبیب میری باتوں میں آ ہی گیا۔ اس نے مجھے مطلوبہ زہر فراہم کر دیا۔ اس زہر کو صرف ایک بوند روز کھانے میں ملایا جاتا تھا۔ میں نے اس طبیب سے ایک اور زہر بھی طلب کیا جو فوراً اثر انداز ہو سکے۔ پردہ پوشی کی

خاطر میں ایک اور فیصلہ کر چکی تھی۔ میں نے اسی روز شاہی طبیب کو دعوت پر بلا لیا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ پہلے بھی میں طبیب کو کئی بار مدعو کر چکی تھی۔ طبیب کی دوائیں میں اب بھی باقاعدگی سے استعمال کر رہی تھی۔

اس دعوت کیلئے میں نے اپنے خدمت گاروں کو خاص ہدایات دی تھیں۔ دستر خوان بچھ گیا تو خدمت گاروں نے ہمارے سامنے کھانا چن دیا۔ ایک طشتری خاص طور پر طبیب کے سامنے رکھی گئی جس میں کسی قسم کا حلوہ تھا۔

"یہ حلوہ ہم نے بطور خاص تمہارے لئے اپنے ہاتھ سے تیار کیا ہے۔" میں نے طبیب سے کہا۔ "کھانے کے بعد اسی سے منہ میٹھا کرنا۔"

شاہی طبیب شکر گزاری کے اظہار میں جھک گیا اور بولا۔ "حضور نے خادم کی عزت بڑھا دی۔" کھانے کے بعد طبیب نے حلوہ کھانے کیلئے پلیٹ اپنی طرف بڑھائی۔

حلوے کا پہلا لقمہ کھاتے ہی اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "حضور نے یہ بہت برا کیا ہے۔ میں تو خیر اب نہ بچ سکوں گا کہ حضور نے مجھے جو زہر دیا ہے اس کا تریاق نہیں' مگر حضور بھی نہ بچ سکیں گی۔"

میں چونک اٹھی اور فوراً سوال کیا۔ "وہ کیسے؟"

"یہ خادم حضور کو جو مقوی دوائیں استعمال کراتا رہا ہے' ان کا توڑ بھی کرتا رہا ہے کہ حضور کا جسم ان تیز دواؤں کی گرمی برداشت کر لے۔ یہ دوا میں اتنی مقدار میں حضور کے جسم کا حصہ بن چکی ہیں کہ اب اس خادم کے سوا کوئی طبیب ان کی حدت پر قابو نہیں پا سکتا۔ حضور کی نبض دیکھ کر مطلوبہ مقدار میں ضروری دوائیں دی جاتی ہیں۔ خادم کے خاندان میں یہ نسخے سینہ بہ سینہ چلے آ رہے تھے کسی کو ان کی ہوا بھی نہیں لگی۔ چند ہی روز میں حضور کو خادم کی باتوں پر یقین آ جائے گا۔" شاہی طبیب یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھہرو۔" میں نے طبیب کو روکا۔

"اب کوئی فائدہ نہیں حضور!" اگر خادم وہ نسخہ بتا بھی دے تو لاحاصل ہے۔" طبیب بولا۔

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"حضور کی نبض دیکھ کر ہر مرتبہ نسخے میں ردوبدل کی ضرورت پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میرے بعد کوئی اور طبیب یہ ردوبدل نہیں کر سکتا۔ مجھے جانے دیں تا کہ میں اپنے گھر پہنچ کر مروں اور مرنے سے پہلے اپنے بیوی بچوں کو وصیت کر جاؤں کہ وقت بہت کم ہے۔ میں گھڑی

دو گھڑی سے زیادہ نہ جی سکوں گا۔"

طبیب کے لہجے سے مجھے گمان ہوا کہ اس نے محض مجھ کو خوف میں مبتلا کرنے کی خاطر یہ بات کی ہے۔ یہی سوچ کر میں نے اسے جانے دیا کہ اگر اس کی بات سچ ہوئی تو میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا' اپنا انسانی قالب چھوڑ دوں۔

اسی روز سے حویلی کے مطبخ کا نگراں میری ہدایت پر زہرہ خانم کے کھانے میں زہر کی خاص مقدار ملانے لگا۔ یہ زہر میں نے ہی اسے دیا تھا مگر بتایا نہیں تھا کہ زہر ہے۔ اس رات کے گزرنے کے بعد دوسرے ہی روز صبح مجھے شاہی طبیب کے انتقال کی خبر مل چکی تھی۔

ہفتے بھر کی دوائیں میرے پاس تھیں۔ میں انہیں پابندی سے روزانہ استعمال کرتی رہی۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر جسم میں کوئی غیر معمولی حدت محسوس ہوئی یا کمزوری پائی تو دوسرے طبیب سے رجوع کرلوں گی۔

شاہی طبیب کی دی ہوئی دوائیں ختم ہوئے دوسرا دن تھا کہ مجھے اپنی طبیعت کچھ گری گری سی محسوس ہوئی۔ جسم میں ایک آگ سی لگی تھی۔ میں نے فوراً ایک طبیب کو بلا بھیجا۔ طبیب نے میرا تفصیلی معائنہ کیا اور حیران ہو کر بولا۔ "خادم کو سخت حیرت ہے کہ حضور اب تک زندہ کیسے ہیں؟" مجھے طبیب پر غصہ آ گیا اور طیش میں بولی۔ "تو تمہارے خیال میں کیا ہمیں مر جانا چاہیے تھا؟"

طبیب نے خلاف توقع اقرار میں سر ہلایا اور کہا۔ "جی ہاں حضور! خادم نے آج تک اتنی مقدار میں سنکھیا کھا لینے کے بعد کسی کو زندہ نہیں دیکھا۔"

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ تم میرا علاج نہیں کر سکتے۔"

"خادم واقعی مجبور ہے۔" طبیب کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ "خادم کے حساب سے حضور بہت جی لیں تو دو تین ہفتے جی سکیں گی' وہ بھی بڑی اذیتیں برداشت کر کے۔ عین ممکن ہے میرے منہ میں خاک حضور کا جسم حدت کے سبب گلنا شروع ہو جائے۔"

طبیب کی زبان سے ایسی صاف اور کھری بات سن کر مجھے پہلی مرتبہ یہ خوف محسوس ہوا کہ اب زیادہ عرصے اس انسانی قالب میں رہنا میرے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ اب مجھے یقین آ گیا کہ شاہی طبیب نے غلط نہیں کہا تھا۔ اسے زہر دے کر مجھ سے ایسی ہولناک غلطی ہو چکی تھی جس کا ازالہ کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس کے باوجود اسی دن میں نے کئی مشہور اور تجربے کار طبیبوں سے اپنا معائنہ کرایا اور مجھے مایوسی ہوئی۔

اسی رات کو میں نے عارج سے مشورہ کیا اور بولی۔ "اے عارج! اب تو ہی میری

آخری امید ہے۔ آدم زاد طبیبوں کے پاس تو میرا کوئی علاج نہیں تو میرے انسانی پیکر کا معائنہ کر کے دیکھ۔"

عارج فوراً اس پر راضی ہو گیا۔ وہ خود بھی ایک اچھا طبیب تھا۔ جن زادہانہ بن نیم کے اس شاگرد نے بھی میرا تفصیلی معائنہ کر کے یہی کہا۔ "اے دینار! تیرا انسانی قالب سخت بیمار ہے اور تجھے یہ قالب چھوڑنا ہی پڑے گا۔"

"تو کیا میں زہرہ خانم کو اپنی آنکھوں سے سسک سسک کر مرتے ہوئے نہ دیکھ سکوں گی؟ کیا میں اس سے پہلے مر جاؤں گی؟"

"تو یہ بھول رہی ہے اے دینار! کہ زہرہ خانم سے تیری نہیں' تیرے انسانی پیکر کی دشمنی ہے۔" عارج نے مجھے سمجھایا۔

"معلوم ہے۔" میری آواز میں بے بسی تھی۔ "ابھی تو حمید خاں بھی زندہ ہے۔" دوسرا جملہ ادا کرتے ہوئے میری آواز بہت دھیمی ہو گئی۔

"کیا کہا اے دینار؟" عارج نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے عارج کی بات کا جواب دے کر مزید کہا۔ "تو بھی جانتا ہے اے عارج کہ میں دونوں بہن بھائی کے قتل کا سامان کر چکی ہوں مگر ابھی دونوں ہی زندہ ہیں...... جو ہو سو ہو' میں پہلے اپنے ایک دشمن کو تو خود اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتار دوں۔"

دوسرے ہی دن صبح سے میرے حکم پر شاہی ڈھنڈورچی برہان پور کے گلی کوچوں میں یہ ڈھنڈورا پیٹتے پھر رہے تھے کہ آج بعد نماز ظہر قلعے کے صدر دروازے پر سردار حمید خاں حبشی کا سر قلم کیا جائے گا جو شخص بھی یہ عبرت انگیز نظارہ دیکھنا چاہے مقررہ وقت اور جگہ پر پہنچ جائے۔ میرے ہی ایما پر اعلان میں یہ بھی کہا گیا کہ سردار حمید خاں حبشی کا سر قلم کرنے والی عذرا ہو گی۔

قلعے کے سامنے جو میدان تھا اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ پورا شہر جیسے وہاں امنڈ آیا تھا۔ اعلان سنتے ہی لوگ وہاں جمع ہونے لگے تھے۔ دروازے کے سامنے ذرا فاصلے پر ایک چبوترا تھا۔ اس چبوترے پر حمید خاں پابہ زنجیر کھڑا تھا۔ سامنے ہی لکڑی کا موٹا سا ایک تختہ رکھا تھا جس میں گردن رکھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ حمید خاں کے سپاہی ادھر ادھر برہنہ شمشیریں لئے کھڑے تھے۔ پھر جب لوگوں نے مجھے چہرے پر نقاب ڈالے قلعے کے دروازے سے نکلتے دیکھا تو ان میں ہیجان پیدا ہو گیا۔

سپاہی میرے لئے راستہ بنانے لگے۔ میرے ساتھ شاہی جلاد بھی تھا۔ جسے لوگ

پہچانتے تھے۔ انہیں شک گزرا کہ کہیں میرے بجائے وہ جلاد حمید خاں کا سر قلم نہ کرے۔ عام لوگوں کو یہ علم نہیں تھا کہ جلاد کا کام صرف سر قلم کرنا ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے کی تیاریوں کو بھی دیکھنا ہے۔

شاہی جلاد میرے ساتھ چبوترے پر چڑھ آیا۔

حمید خاں کی گردن میں اب طوق نہیں تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ مجھے کیوں کہ حمید خاں سے بات کر کے اس کے سینے میں آخری خنجر اتارنا تھا اس لئے شاہی جلاد اور سپاہیوں سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑے ہونے کو کہا۔ میں انہیں حکم دے کر آگے بڑھی۔ مجھے قریب آتے دیکھ کر حمید خاں کی متوقع نظریں میری طرف اٹھیں۔

"مجھے معلوم ہو گیا کہ کس جرم میں تمہاری گردن ماری جانے والی ہے لیکن اب کچھ بتانے سے کیا فائدہ؟" حمید خاں کے بالکل قریب پہنچ کر میں نے کہا۔

موت کے خوف سے حمید خاں کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور ہونٹ خشک تھے۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بہ مشکل التجا آمیز لہجے میں بولا۔ "نہیں' مجھے بتا دو...... خدا کیلئے بتا دو ورنہ میری روح کو مر کے بھی چین نصیب نہیں ہو گا۔" یہ کہتے ہی اس نے پانی مانگا۔

ایک سپاہی نے اسے پانی دیا۔ سپاہی تجربے کار تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ قتل کئے جانے والا شخص آخری دم تک پانی مانگتا ہے۔ انہوں نے اسی لئے پہلے ہی پانی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ پانی پلا کے سپاہی دوبارہ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت میں نے دھیمی آواز میں حمید خاں کو مخاطب کیا۔ "زنداں میں تم نے مجھ سے ایک بے گناہ نوجوان ہاشم کا ذکر کیا تھا' اسی بے گناہ کو ناحق قتل کرانے پر تمہارا سر قلم کیا جا رہا ہے۔ وہ جعلی خط تھا جو تمہاری بہن زہرہ نے بطور ثبوت تمہیں دکھایا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ زہرہ کو ہاشم نے قبول نہیں کیا تھا اس لئے ہاشم کے خلاف یہ سازش کی تھی۔ تم کیوں کہ اس سازش کے آلۂ کار تھے اور تمہارے ہی حکم پر ہاشم کو قتل کیا گیا۔ سو تم بھی میرے انتقام کا نشانہ بنے۔"

حمید خاں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "انتقام...... تم...... مگر......"

میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہاشم کا انتقام میں کیوں لے رہی ہوں......" تو سنو کہ ہاشم نے تمہاری مغرور بہن زہرہ کو اس لئے قبول نہیں کیا تھا کہ اس کے دل میں میری محبت تھی۔ وہ میرا محبوب تھا۔"

حمید خاں چند لمحے کچھ نہ بول سکا۔ اس کے ہونٹ پھر خشک ہو گئے۔ ذرا دیر بعد وہ

اٹک اٹک کر بولا۔ "مگر تم...... تم نے...... حضور نظام الملک کو میرے قتل پر کیسے راضی کر لیا......؟ ہاشم کے واقعہ کا تو کوئی...... کوئی ثبوت نہیں کہ...... کہ اسے بے گناہ قتل کیا گیا تھا۔"

میں اس پر مسکرائی اور کہا۔ "تمہاری بہن زہرہ نے جس طرح تمہیں ہاشم کے قتل پر آمادہ کر لیا تھا اسی طرح نظام الملک کو......"

حمید خاں نے مضطرب آواز میں میری بات کاٹ دی۔ "تو...... تو کیا مجھ پر بھی وہی الزام لگایا گیا ہے؟"

میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "بظاہر تو یہی ہے' مگر تمہارے قتل کی اصل وجہ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔"

حمید خاں کو جانے ایک دم کیا سوجھی کہ وہ زور زور سے چیخ کر کہنے لگا۔ "لوگو! نظام الملک کو خبر کر دو کہ میں غدار نہیں ہوں۔ میں عادل شاہ کا جاسوس نہیں۔ وہ خط جعلی ہے جو انہیں دکھایا گیا ہے۔ مجھے یہ مکار اور عیار عورت فریب دے کر قتل کرا رہی ہے۔ میں بے گناہ ہوں...... بے گناہ ہوں۔" حمید خاں چیختا رہا۔

میرے اشارے پر سپاہیوں نے اسے گیلتھ کے بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اسے گھٹنوں کے بل بٹھا کر اس کی گردن تختے پر رکھ دی گئی۔ وہ بار بار گردن اٹھا کر چیخنے لگا تو شاہی جلاد کے کہنے پر ایک سپاہی نے اس کے سر کے بڑے بڑے بال سامنے سے پکڑ کر نیچے کی طرف کھینچ لئے۔ سپاہی کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ اب حمید خاں سر نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس کی گدی صاف نظر آ رہی تھی۔

شاہی جلاد نے اپنی نیام سے ایک آب دار تلوار نکال کر مجھے پیش کی۔ میں آگے بڑھی اور جھک کر آہستہ سے بولی۔ "حمید خاں! میں اپنے محبوب ہاشم کو بے گناہ قتل کرانے کے جرم میں تیرا سر قلم کر رہی ہوں۔ میں' ہاشم کے خون کا قصاص لے رہی ہوں۔" یہ کہتے ہی میں پیچھے ہٹی اور حمید خاں کی گردن پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ حمید خاں کا سر کٹ کر تختے کے دوسری طرف جا پڑا اور گردن سے خون کا فوارہ ابلنے لگا۔

سردار حمید خاں حبشی کے قتل کے پورا ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اس ایک ہفتے کے دوران میں مجھے زہرہ خانم کے متعلق معلوم ہوا کہ زہر نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ زہرہ ہر وقت "آگ آگ" چلاتی رہتی تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت اپنے جسم پر ٹھنڈا پانی ڈالتے ہوئے گزرتا تھا۔ میرے علم میں یہ بات بھی آ چکی تھی کہ زہرہ دکن کے مشہور و معروف طبیبوں سے اپنا معائنہ کرا چکی تھی۔

زہرہ تو خیر زہر کے زیر اثر رفتہ رفتہ موت کے قریب ہوتی ہی جا رہی تھی لیکن میری حالت بھی بہت ابتر تھی۔ میں شدید اذیت میں مبتلا تھی اور اب یوں لگتا تھا جیسے عذرا کے انسانی قالب کو اپنائے رکھنا شاید مزید ممکن نہیں ہوگا۔ مجھے موت کا خوف نہ تھا۔ اگر خواہش تھی تو صرف اس بات کی کہ میرے انسانی قالب کو زہرہ خانم سے پہلے موت نہ آئے۔

میرے انسانی قالب کی تمنا یہ تھی کہ ہاشم کے خون کا مکمل قصاص لینے تک زندہ رہے۔

آخر کار میرا انسانی قالب جیت گیا۔ جیسے ہی میں نے زہرہ خانم کے مرنے کی خبر سنی عذرا کے بیمار اور موت کے قریب جسم سے باہر آ گئی۔ اسی لمحے عذرا کا سر ایک طرف ڈھلک گیا اور آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ ہاشم کا قصاص مکمل ہو گیا تھا۔

ابھی میں حمید خاں کی حویلی ہی میں تھی کہ عارج نے مجھے مخاطب کیا۔ ''اے دینار! مجھے اس حویلی کے در و دیوار سے وحشت سی ہو رہی ہے۔ اب یہاں سے نکل چل! یہاں تو ہر طرف سے بین کرنے کی صدائیں آ رہی ہیں۔''

''تو نے ٹھیک کہا اے عارج! مگر ابھی ہمیں بغداد سے چلے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ بوڑھا عفریت دموش وہاں ہماری تلاش میں ہوگا۔ ایسی صورت میں ہماری بغداد واپسی فی الحال مناسب نہیں۔'' میں نے اعتراض کیا۔

''لیکن میں کب یہ کہتا ہوں کہ تو بغداد ہی واپس چل۔'' عارج نے کہا۔ ''ہم اس زمانے سے کسی اور زمانے بھی تو چل سکتے ہیں۔''

''تیرا مشورہ مجھے اس شرط پر قبول ہے کہ تو کسی آدم زاد کے جسم کو اپنانے میں جلدی نہیں کرے گا۔'' میں بولی۔ ''پہلے ہم کسی بھی زمانے میں جا کر حالات کا جائزہ لیں گے' پھر کسی انسانی قالب میں اترنے کا فیصلہ کریں گے۔''

''تیری شرط مجھے منظور ہے اے دینار!''

''اے عارج! ہندوستان کی یہ سرزمین تجھے بھی پسند ہے اور مجھے بھی۔ سو ہم اسی سرزمین پر کسی اور زمانے میں چلتے ہیں.... مستقبل میں کچھ اور آگے چل کر دیکھتے ہیں۔'' میں یہ کہتی ہوئی عارج کے ساتھ اس حویلی سے نکل آئی۔

عارج کے ساتھ میں نے مستقبل کا سفر شروع کر دیا پھر ہم مغلیہ تاجدار اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں پہنچ گئے۔ اس عہد کے ایک سنسنی خیز منظر نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ ان کے گھٹنوں کا دباؤ گھوڑوں کی پسلیوں پر تھا اس لیے گھوڑے ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ ہاتھوں میں وہ مشعلیں اٹھائے ہوئے تھے اور چہروں پر نقابیں تھیں۔ ان کی تعداد سو سے اوپر لگتی تھی اور وہ سبھی مسلح تھے۔ ان کا رخ اکبر آباد (آگرہ) سے متھرا کی طرف تھا۔ معاً اگلی صف سے ایک گھڑ سوار نے اپنی مشعل بلند کر کے مخصوص انداز میں اسے حرکت دی۔ اسی کے ساتھ ہی وہ سب رک گئے۔

یہی گھڑ سوار نوجوان ان کا رہنما معلوم ہوتا تھا۔ نوجوان نے ان سے کہا۔ ''راستے کے دونوں جانب پیڑوں کی آڑ لے کر کھڑے ہو جاؤ۔''

وہ نوجوان خود بھی ایک پیڑ کی آڑ میں ہو گیا۔ اب مشعلیں بجھا دی گئی تھیں۔ یوں بھی اب مشعلوں کی زیادہ ضرورت نہیں رہی تھی۔ صبح کا دھندلکا ہر طرف پھیلنے لگا تھا۔ نوجوان کی نگاہیں راستے پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ وقت گزرنے پر کافی دور خفیف سی حرکت نظر آئی اور چراغ سے جلتے دکھائی دیئے۔

''ہوشیار!'' نوجوان نے صدا لگائی۔ اسی صدا کے ساتھ تلواریں نیاموں سے باہر آ گئیں۔

جھومتا جھامتا دیو پیکر ہیولا واضح ہو گیا۔ وہ ایک ہاتھی تھا اس کے ہودج پر پردے پڑے ہوئے تھے۔

میری توجہ نوجوان کے ذہن پر تھی۔ اسے میں نے خوش دیکھا۔ نوجوان کے خیال میں اسی ہودج کے اندر وہ اہم قیدی ہو سکتا تھا جس کی رہائی کا بیڑا اس نے اٹھایا تھا۔ اس ہاتھی پر فیل بان آنکس سنبھالے بیٹھا تھا۔ ہاتھی کے اطراف گھڑ سوار سپاہیوں کا ایک دستہ چوکنا چل رہا تھا۔

آگے آگے چلنے والے دونوں گھڑ سواروں کو نوجوان نے پہچان لیا۔ وہ دونوں ہی بادشاہ وقت کے جنگ جو امیروں میں سے تھے۔ ذاتی طور پر وہ نوجوان ان کا مداح تھا مگر یہ وقت اظہار مداحی کا نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ دونوں شاہی امیر اپنے سپاہیوں سمیت نرغے میں آ گئے تو نوجوان چیخ اٹھا۔ ''بزن!'' پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

نوجوان کی آواز سنتے ہی راستے کے دونوں طرف گھات میں کھڑے ہوئے مسلح گھڑ سوار سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے سپاہیوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا مگر سپاہی بڑے آزمودہ کار تھے۔ وہ بھی تلواریں سونت کر مقابلے پر ڈٹ گئے۔ فیل بان نے ہاتھی کو روک دیا اور تلوار نکال لی۔ وہ کبھی سہمی ہوئی نظروں سے ہودج کی طرف دیکھتا اور کبھی ہاتھی کے اطراف

ایک دوسرے پر بڑھ چڑھ کر وار کرنے والوں پر اس کی نظر جاتی۔ اس کے چہرے پر حیرت کی وجہ شاید نقاب پوش حملہ آور تھے۔ غالباً اس کے خیال میں حملہ آوروں کو نقابوں کی ضرورت نہیں تھی۔

تلواروں سے تلواریں ٹکراتی رہیں' گھوڑے ہنہناتے رہے۔ خنجر سینوں میں اترتے رہے اور چیخیں بلند ہوتی رہیں۔ دونوں فریقوں میں سے کوئی بھی میدان چھوڑنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ سپاہیوں کی تعداد کم تھی' مگر وہ مغل سپاہی تھے جنہیں اپنی تعداد نہیں عزت کا خیال رہتا تھا۔ ان میں کم ہی ایسے ہوتے تھے کہ جی چھوڑ بیٹھیں۔ اس کے باوجود انجام ظاہر تھا کہ وہ ہلاک کر دیئے جاتے۔ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچتا کہ ان کے حریف بھی داؤ گھات میں کم نہ تھے۔

نوجوان کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ دونوں شاہی امیروں کو بڑھ چڑھ کر حملے کرنے سے روکنا بہت ضروری ہے۔ وہ دونوں ہی بڑی جی داری سے لڑ رہے تھے۔ سپاہیوں کے حوصلے انہی دونوں کی وجہ سے بڑھے ہوئے تھے۔ نوجوان اپنے چند ساتھیوں کو لے کر ان دونوں کی طرف جھپٹا۔ دونوں ساتھ ساتھ برسرِ پیکار تھے۔ ان کے مقابل جو بھی آتا جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ تیزی سے اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا نوجوان ان دونوں کے سامنے پہنچ گیا۔ اس کے ساتھی پیچھے رہ گئے۔

وہ دونوں پہلے ہی سمجھے ہوں گے کہ ایک نیا شکار اور آیا مگر جب نوجوان کی تلوار بجلی کی طرح کوندی تو وہ سنبھل گئے۔ نوجوان کوئی عام شمشیر زن نہ لگتا تھا۔ اس کے بدن میں بڑا لوچ اور تلوار میں بڑی کاٹ تھی۔ نوجوان نے بیک وقت ان دونوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ بہر حال یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اتنے میں نوجوان کے ساتھی بھی آ گئے۔

اب ان دونوں شاہی امیروں کے مقابل پانچ افراد تھے۔ ان میں وہ نوجوان بھی شامل تھا جس نے آتے ہی انہیں الجھا لیا تھا۔ نوجوان کا پلہ بھاری ہو گیا۔ دونوں امیروں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ان کے گھوڑوں کی زینیں خالی ہو جاتی۔ وہ قتل کر دیئے جاتے۔ انہیں پیچھے ہٹتے ہی مہلت مل گئی۔ وہ تلواریں علم کیے نوجوان اور اس کے ساتھیوں کی طرف لپکے۔ اب انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ بات یوں نہیں بنے گی۔ انہیں جان پر کھیلنا پڑے گا۔ نوجوان نے ان کے تیور بھانپ لئے۔ نوجوان کے ساتھ ہی میری توجہ شاہی امیروں کے ذہنوں پر بھی تھی۔ نوجوان یہ نہیں چاہتا تھا کہ شاہی امیر مارے جائیں۔ شاید اسی لئے نوجوان نے ان کا حملہ تو روک لیا مگر موقع دانستہ نظر انداز کر دیا۔ جب فیصلہ کن لمحہ آ سکتا تھا۔

امیروں نے بھی یہ محسوس کر لیا کہ ان کے ساتھ رعایت کی گئی ہے۔

فیل بان کے بوڑھے چہرے پر اب گھبراہٹ کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ ہاتھی کے گرد سپاہیوں کی تعداد کم تھی۔

ابھی معرکہ جاری ہی تھا کہ فیل بان کی نگاہ شاہی امیروں پر پڑی۔ وہ دونوں لڑتے لڑتے ہاتھی کے بہت قریب آ گئے تھے۔ چار گھڑ سواروں نے انہیں جیسے نرغے میں لے رکھا تھا۔ فیل بان کو خبر نہ تھی کہ امیروں پر ہلا بولنے والے پانچ تھے جن میں سے ایک مارا گیا تھا۔ فیل بان کے اوسان خطا ہونے لگے۔ پھر اس کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

دونوں امیروں نے لڑتے لڑتے چیخ کر سپاہیوں کو پسپائی کا حکم دیا اور پھر خود بھی اپنے گھوڑوں کی راسیں چھوڑ کر کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح نرغے سے نکل گئے۔ فیل بان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ سپاہی لڑتے ہوئے جان بچا کر بھاگنے لگے۔ نوجوان نے اپنے ساتھیوں کو ان کے تعاقب میں جانے سے روک دیا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا ہاتھی کے قریب پہنچ گیا۔

فیل بان نے جو یہ رنگ دیکھا تو ہاتھی کو اسی طرف موڑنے لگا جدھر سے آیا تھا۔ ساتھیوں میں سے ایک نے اس پر تیر چلایا جو گدی میں پیوست ہو کر آر پار ہو گیا اور وہ ہاتھی سے نیچے آ رہا۔

پھر ہاتھی کو قابو کر کے بٹھانے میں دیر نہ لگی۔ نوجوان اپنے گھوڑے سے اتر کر ہاتھی پر چڑھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود تلوار تھی۔ تلوار ہی کی نوک سے اس نے عماری کا پردہ اٹھایا تو دنگ رہ گیا۔ اس میں کوئی نہ تھا۔

ادھر عارج بول اٹھا۔ "اے دینار! آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔"

"سمجھی تو میں بھی نہیں۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیا لیکن یہ عقدہ حل کرنا ہی ہو گا۔"

"اس کا ایک ذریعہ نوجوان بھی بن سکتا ہے اے دینار!" عارج بولا۔ "اگر تیری صلاح ہو تو میں اس کے جسم میں اتر جاؤں۔"

"ذرا ٹھہر جا پہلے میں اس نوجوان کے بارے میں معلوم تو کر لوں کہ یہ کون ہے؟" میں نے کہا اور پھر اس نوجوان کے ذہن پر توجہ مرکوز کر دی۔

پھر جب مجھے اس نوجوان کے متعلق سب کچھ معلوم ہو گیا تو میں نے عارج کو اس کا

قالب اپنانے کی اجازت دے دی۔ میں اس نوجوان کا ذہن پڑھ کر خود اپنے لئے بھی ایک انسانی پیکر کا انتخاب کر چکی تھی۔ عارج اس نوجوان کے جسم میں اتر گیا۔

''ہمیں سخت حیرت ہے کہ عماری خالی تھی حالانکہ آپ نے حتمی طور پر......''

''قطع کلامی کیلئے معذرت! غلام نے بہ گوش ہوش جو کچھ سنا وہی عرض کیا تھا۔ اس وقت یہ غلام عالی مرتبت شہزادے کے حضور میں تھا۔ جب قاصد شاہی پیغام لے کر آیا۔ شہزادے کے حکم پر غلام ہی نے وہ پیغام پڑھا تھا۔ خبر یہی تھی کہ انہیں قلعہ اکبر آباد ہی میں نظر بند رکھا جائے گا۔ اس میں کیا امر مانع آیا اور کیا واقعہ گزرا غلام آج شام تک اس کی وضاحت کر دے گا۔ شاہجہاں آباد (دہلی) سے غلام کے ہرکارے اب تک رخت سفر باندھ چکے ہوں گے۔''

''آج شام ہم باغ نور کی سیر کو نکلیں گے۔ بہار آپ کو ہمارے نظام الاوقات سے مطلع کر دے گی۔ فی الحال ہم رخصت چاہیں گے۔ ہمیں اپنے محل میں پہنچنا ہے۔ خبر ہے کہ آج برادر بزرگ شہزادہ سلطان محمد محلات شاہی کا معائنہ فرمائیں گے۔ ان کے ہمراہ پھوپی جان نواب بادشاہ بیگم بھی ہوں گی۔''

''غلام دیدار حضور کی خاطر باغ نور میں حاضر ہو جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے نوجوان اس سراپا ناز کے حضور میں کسی قدر جھک گیا۔ وہ مڑی اور نوجوان کے دل پر بجلیاں گراتی ہوئی محرابی دروازے کا پردہ اٹھا کر باہر آ گئی۔ محافظ دستے کی کنیزیں اسے دیکھ کر مودب ہو گئیں۔ تمکنت و ناز سے چلتی ہوئی وہ برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچی۔ وہاں کنیز اس کے مشکی گھوڑے کی لگام تھامے کھڑی تھی۔ کنیز نے اسے سہارا دے کر گھوڑے پر چڑھایا۔ اس دوران میں محافظ دستے کی کنیزیں اپنے اپنے گھوڑوں پر تن کر بیٹھ گئی تھیں۔ ان مسلح کنیزوں کے جسموں پر مخصوص وردیاں تھیں۔ ایسی وردیاں پہننے کی اجازت قلعے میں کسی کو نہ تھی۔ شہزادی آسائش بانو کے محافظ دستے کی کنیزیں ہی ایسی وردیاں زیب تن کر سکتی تھیں۔

گھوڑے پر بیٹھ کر اسے ایڑ لگانے سے پہلے شہزادی نے نوجوان کی طرف نگاہ کی جو محرابی دروازے سے نکل کر اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شہزادی کا دل اس کے پہلو میں تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے نوجوان کی طرف سے نظر ہٹا کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

یہی وہ لمحہ تھا جب میں شہزادی آسائش بانو کے جسم میں داخل ہو گئی۔ میں اس کے بارے میں سب کچھ معلوم کر چکی تھی۔ مسلح کنیزوں کے جھرمٹ میں میری سواری آگے بڑھ گئی۔ مگر نوجوان وہیں کھڑا رہا۔ اسی راستے پر نگاہیں جمائے جہاں سے سواری گزری تھی۔

یہ وہی نوجوان تھا جس کے چہرے پر گزشتہ شب نقاب تھی۔ ایرانی ہونے کے باوجود اس کے خدوخال یونانیوں جیسے تھے۔ اس کا قد بھی دراز تھا اور وہ اپنی جسامت کے سبب اصل عمر سے زیادہ لگتا تھا۔ اس کے چہرے سے بھول پن ٹپکتا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اندر سے وہ سخت گیر اور تند خو ہوگا۔ اب اس کے جسم پر عارج کا قبضہ تھا۔

وہ نوجوان جب ایران سے اپنی جان بچا کر ہندوستان بھاگ آیا تو مغل تاجدار شاہجہاں نے اس کی پذیرائی کی۔ شاہجہاں نے اسے ہزاری دو سو سوار کا منصب عطا کیا۔ اس کا تعلق ایران کے شاہی خاندان سے تھا۔ وہ اپنے باپ خواجہ ظاہر نقش بندی سے اجازت لئے بغیر ایران سے چلا آیا تھا۔ وہ یہ قدم نہ اٹھاتا تو بغاوت میں دھر لیا جاتا۔ اس الزام میں کچھ حقیقت بھی تھی۔ ایران کا شاہ عباس اس کا خالہ زاد تھا۔ اس نے اپنے خلاف کسی کو سر اٹھانے کی مہلت نہ دی۔ پھر محمد صالح کو وہ کیسے معاف کر دیتا۔ نوجوان کا نام محمد صالح تھا۔ بچپن ہی سے وہ دلیر اور ذہین تھا۔ اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اسی کی بنا پر حسن پرستی اس کے مزاج کا حصہ بن گئی۔ وہ خود بھی کم وجیہہ اور ایسا نہ تھا کہ دلبران خوش اندام اسے نظر انداز کر دیتیں۔ وہ حسینان ایران کی آنکھ کا تارا بن گیا مگر اسی کے ساتھ اس نے رموز مملکت سے آگاہی حاصل کرنا بھی ضروری سمجھا۔ اس پاداش میں اسے اپنے وطن کو خیر باد کہنا پڑا۔

ہندوستان آئے ہوئے اسے صرف پانچ سال ہوئے تھے اور یہ پانچ سال اس نے میدان جنگ میں گزارے تھے۔ شاہجہاں نے اسے منصب دے کر دکن بھیج دیا تھا جہاں اس کا بیٹا اورنگزیب اپنی تلوار کے جوہر دکھا رہا تھا۔

بہادر اور شجاع صالح اپنی جواں مردی اور بہادری کی وجہ سے اورنگزیب کی نظروں میں چڑھ گیا۔ صالح اور اس کا لشکر جاں بازی میں مشہور ہو گیا۔ دربار سے اسے جاگیریں اور نقد انعام عطا ہوئے۔ اس نے دکن کی خوں ریز لڑائیوں میں داد شجاعت دی اور صلہ پایا۔ شاہجہاں کے عہد میں کوئی امیر شہزادوں کے سوا ہفت ہزاری منصب سے زیادہ نہ پاتا۔ پورے ہندوستان میں صرف چودہ امیر چار ہزاری منصب پر فائز تھے۔ مناصب کا حصول اور ان میں اضافہ آسان نہیں تھا مگر صالح نے صرف پانچ سال کے عرصے میں ایک ہزاری منصب سے سہ ہزاری منصب تک کا سفر طے کر لیا۔ اب اس کا منصب سہ ہزاری دو سو سوار تھا۔ خوفناک معرکوں میں سر دھڑ کی بازی لگا کر اس نے اورنگزیب جیسے شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا جو خود بھی تلوار کا دھنی تھا۔

اورنگ زیب کی صحبت میں رہ کر صالح نے بہت کچھ دیکھا۔ بہت کچھ سیکھا۔

ہندوستان کی بساط سیاست کا اس نے گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ اورنگ زیب اس کا ستالیہ تھا' اسے گمان تھا کہ اس نے اورنگ زیب کو سمجھ لیا ہے مگر یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ خاص طور پر مراد بخش کے باب میں اورنگ زیب کی حکمت عملی سے اسے ذہنی جھٹکا لگا تھا۔ اس ذہنی جھٹکے کا سبب کلام اللہ تھا جسے اورنگ زیب اور مراد بخش نے اپنے عہد و پیماں کے بیچ گواہ ٹھہرایا تھا۔

مراد بخش کو اورنگ زیب نے خط لکھا۔ اس کی عبارت جیسے صالح کے ذہن پر نقش تھی۔ عبارت یہ تھی۔ "مجھے اس دنیائے غدار کے معاملات سے کوئی وابستگی نہیں ہے۔ میرے پیش نظر تو صرف بیت اللہ کا طواف ہے۔ اس برادر بے شکوہ (دارا شکوہ) کی زیادتیوں اور بے انصافیوں کے نتیجے میں دوسرے بھائی جو کچھ سوچ رہے ہیں اور جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ بالکل حق بجانب اور بجا ہے۔ مجھے بھی اپنا شریک کار اور مددگار سمجھا جائے مگر چونکہ والد بزرگوار بھی بہ قید حیات ہیں اس لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ دونوں بھائی والد محترم سے اس بے دین کی خیرہ سری کا تدارک کریں۔ جو بادہ غرور اور نخوت و خود آرائی میں مست ہو رہا ہے۔ اگر تقدیر یاوری کرے تو حضرت والی نعمت (شاہجہاں) کا دیدار کر لیں اور فتنہ فساد کا قلع قمع کر کے اس بھائی (مراد) کے قصور کی معافی طلب کر لیں جو حالت اضطرار میں سرزد ہو گیا ہے (یعنی بادشاہت کا اعلان) سلطنت کا نظم و نسق درست کرنے اور مخالفین کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد حضور والا سے کعبۃ اللہ کی اجازت حاصل کر لوں گا لہٰذا یہ نہایت ضروری ہے کہ جائز ارادے میں تاخیر نہ ہو اور (تم) ایک منظم فوج لے کر اس بے ادب کافر جسونت سنگھ کی تادیب کیلئے کوچ کرو اور سمجھ لو کہ ہم بھی دریائے نربدا کے اس کنارے تک پہنچ چکے ہیں۔ ہمارے ساتھ جولاؤ لشکر اور توپ خانہ ہے اسے تم اپنی فتح یابی کا وسیلہ سمجھو۔ ایک خیر خواہ کے عہدہ پیان کے لئے کلام اللہ کا ضامن جان کر کسی وسوسے کو دل میں جگہ نہ دو۔"

اورنگ زیب نے اس مضمون کا عہد نامہ روانہ کر کے توپ خانے کا اہتمام اور فوجوں کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے مراد بخش کی طرح سکہ اور خطبہ اپنے نام جاری کرنے پر کوئی توجہ نہ کی۔ صالح کا ذہن پڑھ کر بیس اس عہد کے تمام واقعات سے آگاہ ہو چکی تھی۔

یہ 1027 ہجری کا واقعہ ہے۔ اورنگزیب دکن میں تھا۔ بڑا بھائی دارا شکوہ شاہجہاں کے پاس اکبر آباد میں ایک بھائی شجاع بنگال میں اور مراد بخش احمد آباد میں تھا۔ شجاع بنگال کا صوبے دار تھا اور مراد بخش احمد آباد کا۔ یہ دونوں اپنی اپنی خود مختاری اور بادشاہت کا اعلان کر چکے تھے۔ شاہجہاں نے دارا شکوہ کو اپنا ولی عہد نامزد کر دیا تھا۔

سارا فساد دراصل شاہجہاں کی علالت سے شروع ہوا۔ شاہجہاں حبس بول (پیشاب کا رک جانا) کے عارضے میں مبتلا ہو گیا تھا اور اس نے کاروبار حکومت دارا شکوہ کو سونپ دیا۔ تینوں بھائیوں میں سے کسی نے دارا شکوہ کے اقتدار کو پسند نہ کیا۔ ان کے متعلق سرگرمیوں کی اطلاعات اکبر آباد پہنچیں تو دارا شکوہ نے حفظ ماتقدم کے طور پر راجا جسونت سنگھ کو ایک بڑا لشکر دے کر دکن کی طرف بھیجا کہ وہ اورنگ زیب کو راستے ہی میں روک لے۔ ایسی ہی تدبیر اس نے شجاع اور مراد کے باب میں کی۔

اورنگ زیب کا محبت آمیز عہد نامہ پہنچتے ہی مراد بخش نے احمد آباد سے کوچ کیا۔ ادھر اورنگ زیب دکن سے چل چکا تھا۔ دونوں بھائیوں کی ملاقات دیپال پور میں ہوئی۔ دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے اور ایک دوسرے کو ضیافت دی۔ پھر از سر نو عہد و پیماں ہوئے۔ دونوں لشکر آگے بڑھے اور اجین میں قلعہ دھار کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ راجا جسونت سنگھ کا لشکر وہاں سے صرف ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر تھا۔ دوسرے دن 22 رجب (1068 ہجری) کو دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔

دارا شکوہ کا لشکر دو مغل شہزادوں اورنگزیب اور مراد بخش کے مقابلے پر نہ ٹک سکا۔ بڑی خون ریز لڑائی ہوئی۔ خود صالح نے بھی اس جنگ میں اپنی تلوار کا لوہا منوایا۔ وہ اورنگزیب کے ساتھ قلب لشکر میں تھا۔

راجا جسونت سنگھ کی شکست کے بعد سامر گڑھ کی فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ اورنگ زیب اور مراد بخش کے مقابلے پر اب بذات خود دارا شکوہ تھا۔ اس جنگ کا سارا دباؤ مراد بخش کے لشکر پر پڑا۔ اورنگ زیب کی طرف سے پسپا ہو کر دارا شکوہ نے مراد بخش کی طرف رخ کیا۔ دونوں فوجیں صف بہ صف دست بدست لڑنے لگیں۔

دارا شکوہ کا پیش آہنگ ایک امیر خلیل اللہ تھا۔ اس نے ازبک کماں داروں کو ساتھ لے کر مراد بخش کے ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ دونوں اطراف سے تیر برسنے لگے۔ مراد بخش کے لشکر میں ایک قیامت سی برپا ہو گئی۔ بہت سوں کے قدم اکھڑ گئے۔ قریب ہی تھا کہ تیروں کی بوچھاڑ اور گرزوسناں کی ضرب سے مراد بخش کے ہاتھی کا منہ پھر جائے مراد بخش نے حکم دیا ہاتھی کے پیروں میں زنجیریں ڈال دی جائیں۔ اسی دوران میں ایک بہادر راجپوت راجا رام سنگھ آگے بڑھا۔ اس کے سر پر مرداریہ کا سہرا تھا اور کیسریا بانا پہنے ہوئے تھا۔ وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ رجز پڑھتا ہوا مراد بخش کی سواری کے قریب پہنچ گیا اور چیخ کر کہا۔ "تو دارا شکوہ کے مقابلے پر بادشاہی کی ہوس کر رہا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک برچھی مراد بخش کی طرف پھینکی

اور مہاوت سے پٹ کر بولا۔ ”ہاتھی کو بٹھا۔“

☆.....☆.....☆

مراد بخش نے اس کے حملے کو روکا اور پھر ایسا تیر جوڑ کر اس کی پیشانی پر مارا کہ وہ گھوڑے سے الٹ کر گر گیا، اس کے ہمراہ جو راجپوت تھے ان میں سے بیشتر مراد بخش کے ہاتھی کے پیروں تلے کچلے گئے، ہاتھی کے چاروں طرف زمین خون سے گلنار ہو گئی، اورنگزیب کو پل پل کی خبر ملتی رہی مگر وہ اپنی جگہ ڈٹا کھڑا رہا، اس نے مراد بخش کی مدد نہیں کی۔

اس جنگ میں دارا شکوہ بالآخر شکست کھا گیا اور اسے راہ فرار اختیار کرنا پڑی، فاتح اورنگزیب اس کامیابی پر اپنے ہاتھی سے نیچے اتر آیا اور شکرانے کے دو نفل پڑھے، اس کے بعد وہ دارا شکوہ کے خیمے کی طرف گیا، اس وقت تک خیمہ، توپ خانہ اور دوسرا ساز و سامان لوٹ لیا گیا تھا۔ اورنگزیب نے دارا شکوہ کے خیمے ہی میں قیام کیا۔

شہزادوں اور امیروں نے نذر نذرانے گزارے اور تحسین و آفریں سے معزز ہوئے، ان معززین میں صالح بھی تھا، پھر صالح نے جنگ میں شدید زخمی ہو جانے والے بھائی کا سر دوسرے بھائی کے زانو پر دیکھا۔ مراد بخش کے چہرے پر تیروں کے زخم تھے، اورنگزیب نے ماہر جراحوں کو طلب کیا اور مراد بخش کا سر اپنے زانوں پر رکھ کر مرہم لگوایا، اس نے آنسو بہاتے ہوئے اپنی آستین سے بھائی کے رخساروں کا خون صاف کیا۔

اورنگزیب نے اس عماری کا بھی معائنہ کیا جس میں مراد بخش سوار تھا، عماری میں اس کثرت سے تیر لگے تھے کہ اس کی سطح خار پشت کی مانند ہو گئی تھی اور اس کا تختہ نظر نہیں آتا تھا، اورنگزیب نے حکم دیا کہ اس عماری کو اکبر آباد کے قلعے میں بطور یادگار رکھا جائے گا۔

ساموگڑھ سے کوچ کرنے کے بعد اکبر آباد کے قریب چھاؤنی قائم ہوئی، اورنگزیب اس سے پہلے ہی شاہجہاں کو ایک خط لکھ چکا تھا، شاہجہاں کو پانسا پلٹنے کی خبر ہو چکی تھی، اس نے نامہ و پیام کے ذریعے اورنگزیب کو رام کرنا چاہا، مگر تلخی کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی گئی۔

اس دوران میں اپنے بیٹے کا دل جیتنے کیلئے شاہجہاں نے اسے ”عالمگیر“ نامی تلوار بھیجی۔ یہ تلوار شاہجہاں کی پسندیدہ تھی، دور شہزادگی سے اب تک شاہجہاں نے تلوار اپنی کمر سے باندھی تھی اور مختلف معرکوں میں اس کے جوہر دکھائے تھے۔ نکتہ سنجوں نے اسے نیک شگون قرار دیا اور اس مژدہ غیبی کی رعایت سے اورنگزیب کا لقب عالمگیر ہوا۔

تلخ و تند مراسلت کے نتیجے میں اورنگزیب نے اکبر آباد کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اورنگ زیب نے اس قدر سختی کی کہ قلعے کا پانی بند کر دیا۔ محصورین نے تنگ آ کر

اورنگزیب سے مراسلت شروع کر دی، ان میں شاہجہاں کے وفادار امراء بھی شامل تھے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ وہ اورنگزیب کیلئے قلعے کا دروازہ کھول دیں گے، آخر کئی دن بعد امراء کے پیغامات کی تصدیق ہونے پر اورنگزیب نے اپنے بیٹے شہزادہ محمد سلطان کو حکم دیا کہ وہ قلعہ میں داخل ہو جائے اور قلعے کے دروازے پر معتمدوں کو مقرر کر دے، شہزادہ محمد سلطان جوان تھا اور بوڑھے امیروں کی صحبت پسند نہ کرتا تھا اس نے اورنگزیب سے درخواست کی کہ صالح کو اس کے ساتھ کر دیا جائے۔ اورنگزیب نے شہزادے کی درخواست قبول کر لی۔

یوں صالح جنگ کے تپتے ہوئے صحراؤں سے نکل کر دوبارہ زلفوں کی گھنی چھاؤں میں آ گیا۔

اورنگزیب کے حکم پر شاہجہاں کو نظر بند کر دیا گیا اور اختیارات سلب کر لئے گئے۔

سہ ہزاری منصب دار اور اورنگزیب کے جاں نثار نوجوان امیر محمد صالح کے قیام کا بندوبست حدود قلعہ ہی کی ایک حویلی میں کیا گیا، صالح اب تک اسی حویلی میں تھا، قلعے میں آ جانے کے بعد بھی صالح غافل نہ تھا، اس کی نظر بدلتے ہوئے حالات پر تھی، اسے معلوم ہو گیا کہ مراد بخش اور اورنگزیب کے درمیان کیا طے پایا ہے! اورنگزیب نے مراد بخش سے وعدہ کیا کہ دارا شکوہ سے مکمل طور پر نمٹنے کے بعد وہ تمام معاملات حکومت مراد بخش کو سونپ دے گا، اس نے دارا شکوہ کے تعاقب کا فیصلہ کیا۔ دارا شکوہ کے متعلق اطلاعات ملی تھیں کہ وہ لاہور پہنچ چکا ہے۔

شاہجہاں کے تیور دیکھ کر اورنگزیب نے اس سے ملاقات کا ارادہ ملتوی کر دیا، اس نے دارا شکوہ کے تعاقب میں جانے کیلئے ضروری اقدامات کئے، اپنی جگہ اس نے اپنے بیٹے شہزادہ اعظم کو باپ کے پاس بھیجا، محمد صالح اور دیگر چند امیروں کو شہزادہ محمد سلطان کے پاس چھوڑ کر اورنگزیب مراد بخش کے ہمراہ اکبر آباد سے نکل گیا۔

شاہجہاں آباد (دہلی) سے خبر آئی کہ اورنگزیب نے وہاں پہنچ کر مراد بخش کو 26 لاکھ روپے اور 230 گھوڑے تحفے کے طور پر دیئے ہیں، ان گھوڑوں پر طلائی اور مینا کاری کے ساز تھے، اس کے بعد اطلاع ملی کہ اورنگزیب لاہور روانہ ہو گیا اور مراد بخش اب اپنا لشکر لے کر احمد آباد کی طرف جائے گا، کب؟ اس بارے میں کوئی خبر نہ تھی۔

گزشتہ روز ایک تیز رفتار قاصد شاہجہاں آباد کی طرف سے آیا تھا، یہ اورنگزیب کا قاصد تھا، قاصد نے خلوت میں شہزادہ محمد سلطان سے ملاقات کی، قاصد کے رخصت ہوتے ہی شہزادے نے صالح کو طلب کر لیا، صالح کو شہزادے سے معلوم ہوا کہ قاصد کیا پیغام لایا تھا!

شاہجہاں آباد سے چل کر اورنگزیب ایک منزل پر رک گیا تھا۔ اسے مراد بخش کی طرف سے سخت تشویش تھی جو احمد آباد کا رخ کرنے کے بجائے اکبر آباد سے 20 کوس کے فاصلے پر پڑاؤ ڈال چکا تھا، اورنگزیب نے شہزادہ محمد سلطان کو ہوشیار رہنے کی تاکید کے ساتھ جو اہم بات لکھی تھی اسے سن کر صالح کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ اورنگزیب کو نہیں سمجھ سکا، اورنگزیب نے لکھا تھا کہ اب مراد بخش کا قضیہ نمٹانے کا وقت بھی آ گیا ہے کیونکہ اس کے ارادے نیک معلوم نہیں ہوتے۔

اس دن سورج ڈھلے اورنگزیب کے پاس سے ایک اور قاصد آیا، یہ قاصد بھی شہزادہ محمد سلطان سے خلوت میں ملا۔ صالح کو پھر طلب کر لیا گیا، اس بار بڑی دہشت خیز خبر ملی۔

خبر کے مطابق مراد بخش کو گرفتار کر لیا گیا تھا، اس کے لشکر نے اکبر آباد سے 20 کوس کے فاصلے پر متھرا کی منزل پر قیام کیا تھا، پڑاؤ کا یہ پہلا ہی دن تھا، گرفتاری کے بعد مراد کا تمام خزانہ اور ساز و سامان ضبط کر لیا گیا، پیغام میں مطلع کیا گیا تھا کہ مراد بخش کو گرفتار کر کے اکبر آباد بھیجا جا رہا ہے، شہزادے نے اس سلسلے میں صالح کو خصوصی احکام دیئے اور کہا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، صالح شہزادے کے پاس سے اٹھ آیا۔

پیغام میں یہ تفصیل نہیں تھی کہ مراد بخش کو کس طرح گرفتار کر لیا گیا، صالح کے نزدیک یہ بات انتہائی حیران کن تھی، وہ بہت مضطرب تھا اور اس اضطراب کا بڑا سبب مراد بخش کی بیٹی شہزادی آسائش بانو تھی۔ وہ آسائش بانو جس کے رعب حسن نے صالح کو پہلی ہی ملاقات میں ہکلانے پر مجبور کر دیا تھا۔

آسائش بانو اس وقت تیر اندازی کی مشق کر رہی تھی۔ صالح ادھر جا نکلا اور ہدف بن گیا۔

''کون ہو تم؟...... اور بغیر اجازت باغ کے اس حصے میں کیسے داخل ہوئے؟''

تیر انداز نے پوچھا۔

وہ جو کبھی اورنگزیب کے سامنے نہ ہکلایا تھا، جواب دیتے ہوئے اس کی زبان میں کئی بار لکنت آ گئی۔ پھر آسائش بانو سے تیسری ملاقات میں اس کے اندر اتنی ہمت ہوئی کہ اپنا مکمل تعارف کرا سکا۔ اس دوران میں صالح نے آسائش بانو کے بارے میں بہت کچھ جان لیا۔ اسے کچھ کچھ اندازہ تھا مگر یقین نہ تھا کہ دوسری طرف بھی آتش عشق بھڑکنے لگی ہے۔

مراد بخش کے متعلق جب صالح کو حقیقت کا علم ہوا تو اپنے محبوب کی وجہ سے مراد کے ساتھ اسے ایک تعلق خاطر کا خیال آیا، اسے معلوم ہوا تھا کہ آسائش بانو اپنے باپ سے بہت

محبت کرتی ہے جو اس سے ملنے قلعے میں بھی نہ آیا تھا۔ آسائش بانو نے صالح سے بھی اپنے اس دکھ کا اظہار کیا تھا۔ اس کے دل کو بڑی ٹھیس پہنچی تھی۔ اسے اپنے باپ سے یہ توقع نہیں تھی۔

آسائش بانو کے احساسات اور جذبات سے قطع نظر صالح نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا اس کے پیش نظر مراد بخش اس کا سزاوار نہ تھا کہ اسے گرفتار کر لیا جاتا۔ اسے مراد بخش کی گرفتاری پر حیرت ہوئی۔ اس وقت تک صالح کو تفصیلات کا علم نہ تھا کہ شاہین کیسے زیر دام آ گیا! صالح بڑی دیر تک کشمکش کا شکار رہا اور کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔ ایک طرف اورنگزیب تھا، دوسری جانب ایک نوخیز لڑکی تھی۔ وہ لڑکی شہزادی بانو کہلاتی تھی، وہ شہزادی جو نوعمری میں ماں کی محبت سے محروم ہو گئی تھی۔ ماں کی موت کے بعد باپ نے اس کی پرواہ نہیں کی اور عیش کوشی میں مبتلا رہا۔ اسے باپ کی محبت و شفقت بھی نہ ملی۔ خالہ نے اس کی پرورش کی جو اورنگزیب کی بڑی بیوی تھی۔ چچا نے باپ کی محبت کا خلا پر کرنا چاہا اور یہ چچا اورنگزیب تھا مگر خلا پر نہ ہوا۔

صالح خود کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو اس نے فیصلہ آسائش بانو پر چھوڑ دیا۔ وہ خبر جو اکبر آباد میں شہزادہ محمد سلطان اور صالح کے سوا کسی کے علم نہ تھی، آسائش بانو تک بھی پہنچ گئی۔ اس نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ سب کچھ سنا اور سوالیہ نظروں سے صالح کو دیکھا۔ ان نظروں کا سوال صالح نے پڑھ لیا اور فیصلہ ہو گیا۔

وہ بولا۔ ''اگر بانو بیگم اس غلام سے کوئی خدمت لینا چاہیں تو غلام اسے اپنی عزت افزائی سمجھے گا۔''

ہم کچھ زیادہ نہیں بس اتنا چاہتے ہیں کہ وہ زندہ رہیں اور ہماری عمر بھی انہیں لگ جائے۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے شہزادی کی آواز میں لرزش سی آ گئی۔ ذرا توقف سے وہ پھر بولی ''جہاں تک ہمارا قیاس ہے ان کی زندگی کا دار و مدار رہائی پر ہے لیکن اس طرح کہیں آپ غداری کے مرتکب تو نہ ہوں گے؟'' شہزادی کا اشارہ اورنگزیب کی طرف تھا۔ اب اس کی آواز میں لرزش نہیں تھی بلکہ پہلے جیسی تمکنت اور کھنک تھی۔

صالح نے اسے یقین دلایا کہ وہ اورنگزیب کا بے دام غلام ہے، پھر اس نے کہا ''میں اس معاملے میں ہرگز اپنا نام نہ آنے دوں گا اور ہر قیمت پر خدمت انجام دے کر رہوں گا۔''

آسائش بانو سچ اور جھوٹ کو پرکھنے کی اہل تھی، اس نے صالح کی بات پر یقین کر لیا۔

صالح نے اپنے محبوب سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنے ہی کی خاطر اتنا بڑا خطرہ مول لیا

تھا۔ اگر یہ راز کھل جاتا تو اس کی زندگی کا چراغ لمحے بھر میں گل کر دیا جاتا۔

''اورنگزیب...... مراد بخش...... وہ سوچتے سوچتے بڑبڑانے لگا'' عماری خالی...... خالی کیوں تھی؟'' اسی سوال کے جواب کی خاطر اس نے اپنے دو خدمت گاروں کو شاہجہاں آباد (دہلی) بھیجا تھا۔

شہزادہ محمد سلطان بھی بے چین تھا۔ اسے یہ فکر تھی کہ کہیں راستے میں مراد کے بہی خواہوں نے کوئی گڑبڑ نہ پھیلا دی ہو! وہ اس بات کا اظہار صالح سے بھی کر چکا تھا۔ صالح نے اس سے یہ بات نہیں چھپائی کہ اس نے اپنے دو خاص خدمتگاروں کو شاہجہاں آباد بھیج دیا ہے۔ ان خدمت گاروں کی واپسی کا انتظار صالح کو بھی تھا اور شہزادہ محمد سلطان کو بھی! اب ان انتظار کرنے والوں میں آسائش بانو یعنی میرا اضافہ بھی ہو چکا تھا۔

عارج کے انسانی پیکر صالح کے بارے میں مجھے دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی پتہ چلا تھا کہ وہ حسن پرست اور عاشق مزاج ہے۔ یہ فطری صفات عارج پر بھی غالب آ سکتی ہیں، میں نے اسی سبب اپنی کنیز کو عارج کے پاس بھیج کر اپنی چشم تصور کا دائرہ وسیع کر لیا۔ اسی کے ساتھ میری دیگر پراسرار قوتیں بھی بیدار ہو گئیں، اب میں سب کچھ دیکھ اور سن سکتی تھی۔

میری چشم تصور میں عارج کے انسانی قالب صالح کا چہرہ ابھرا اور میں نے اس کے ذہن پر توجہ دی۔ اسے یہ احساس تھا کہ وہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اپنے محبوب یعنی میرے انسانی پیکر آسائش بانو کی نظروں میں سرخ رو نہ ہو سکا۔ وہ اسی تدارک کی فکر میں تھا۔ حقیقت حال جاننے کے بعد وہ ان الفاظ کی شرم رکھنا چاہتا تھا جو اس نے آسائش بانو سے کہے تھے۔ وہ اسی فکر میں غلطاں چہل قدمی کر رہا تھا کہ ایک کنیز نے اندر آنے کی اجازت طلب کی، اس کے استفسار پر کنیز نے بتایا کہ آسائش بانو کے محافظ دستے کی نگران آپ سے ملاقات کی منتظر ہے۔

''اسے یہیں بھیج دو۔'' عارج نے کہا۔

کنیز اس کا حکم سن کر الٹے قدموں واپس چلی گئی۔

عارج نے میری خوبصورت کنیز بہار کو پہلے نہیں دیکھا تھا، اگر دیکھا بھی تو ایک نظر میں کیا کیا دیکھتا! قابل دید تو بہت کچھ تھا، پہلی بار بہار اس کے سامنے آئی تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ گویا ایک شاخ صنوبر اس کے سامنے جھکی کھڑی تھی۔

آداب تسلیمات کے بعد بہار نے عارج کو میرا پیغام دیا کہ عصر اور مغرب کے درمیان میں، باغ نور میں ہوں گی۔ عارج کو اسی دوران میں مجھ سے ملنا تھا، پیغام دے کر

بہار نے اجازت طلب نگاہ اٹھائی۔

میں نے دیکھا کہ عارج کی نظریں گھڑی بھر کو بہار سے مل گئیں۔ عارج بامعنی لہجے میں اس سے بولا'' باغ میں بہار بھی ہو گی نا!'' یہ الفاظ ایسے تھے جن کی توقع مجھے عارج سے نہیں تھی۔ یقیناً یہ اثر عارج کے انسانی پیکر کا تھا، اسے حسینوں سے ہم کلامی کا ہنر آتا تھا۔

بہار کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی، اس نے کہا'' حضور تو خود آگاہ ہیں کہ بہار کے بغیر باغ، باغ نہیں ویرانہ ہوتا ہے۔''

اس لمحے عارج سوچ رہا تھا کہ بہار کو گویا اپنے حسن کا احساس تھا۔ وہ بہار کے برجستہ جواب کی گہرائی تک پہنچ گیا۔

''تمہیں واپسی کی جلدی تو نہیں۔'' عارج نے بہار سے پوچھا؟

بہار نظر شناس تھی سمجھ گئی کہ یہ سوال کیوں کیا گیا ہے! وہ بولی'' حضور اگر اسے جسارت خیال نہ کریں تو کنیز عرض کرے کہ اس عزت افزائی کے لائق نہیں، حضور کی خلوت کنیز کیلئے عزت افزائی کا سبب ہے اور کنیز خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتی۔''

عارج ایسا بن گیا جیسے کچھ سمجھا ہی نہ ہو، اس نے کہا'' ہم نہیں سمجھے کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔''

''گستاخی معاف!...... حضور اگر کچھ نہیں سمجھے تو یہی بہتر ہے، اجازت!'' بہار یہ کہتے ہی چل دی اور مزید وہاں رکی نہیں۔

بہار کے وہاں زیادہ نہ رکنے کا اصل سبب میں تھی۔ میں نے ہی اسے یہ ذہنی ترغیب دی تھی، صالح کی فطری صفات لمحہ بہ لمحہ عارج پر حاوی آتی جا رہی تھیں، اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس کے قدم بہک جاتے۔ بہار لازماً ان کے بہکتے ہوئے قدموں کو نہ روک پاتی۔ یوں بھی کنیزیں ایسے مواقع کی تلاش میں رہتی ہیں کہ کسی بڑے منصب دار کے قریب ہو سکیں۔ سو مجھے اس معاملے میں بہار پر اعتبار نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اسے عارج کے پاس واپس بلا لیا۔ یوں بھی بہار کا شباب چڑھتی ندی کی طرح تھا جو اپنے ساتھ سب کچھ بہا لے جاتی ہے، اس کا سوچ سوچ بدن، وہ بہار مجسم عارج کے وجود کو مہکا سکتی تھی، میں نے اندازہ لگایا تھا کہ بہار کے دامن میں پہلے بھی پھول کھلتے رہے ہیں مگر اس کے باوجود اس کی مہک جدا تھی، رنگ مختلف تھے۔ ایسے رنگ جو آنکھوں میں نہ چبھیں ان پر نظر پڑے تو سکون اور ٹھنڈک کا احساس ہو، ایسی خوشبو جس سے جی نہ بھرے۔ عارج کے پاس بھیجنے سے پہلے ہی میں نے بہار کا ذہن پڑھ لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

شام ہونے سے پہلے پہلے وہ دونوں خدمت گار اکبرآباد (آگرہ) سے لوٹ آئے جنہیں شاہجہاں آباد (دہلی) بھیجا گیا تھا۔

ان خدمت گاروں نے یقیناً بڑی تیز رفتاری کا ثبوت دیا تھا۔ وہ دونوں بڑے گھاگ تھے۔ کسی بات کا کھوج نکالنے میں ان کا جواب نہ تھا وہ اسی کی روٹی کھاتے تھے۔ مجھے پتا چلا کہ انہوں نے عارج کو حقیقت سے آگاہ کردیا ہے۔ انہوں نے جو تفصیلات بیان کیں ان سے عارج کو بھی اورنگزیب کی ذہانت کا علم ہوگیا۔ یہ اقدام بہرحال اسے پسند نہیں آیا تھا۔

اطلاعات کے مطابق مرادبخش کے چند امیروں کو اورنگزیب نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اورنگزیب نے اسے حسن تدبیر کہا، تقدیر بھی موافق تھی کہ وہ اپنے بھائی کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگیا ورنہ مرادبخش پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہ تھا۔ جن امراء نے مرادبخش سے بے وفائی کی وہ بعد میں حاضر خدمت ہوئے اور انعام و اکرام سے نوازے گئے۔ گرفتاری کے فوراً بعد مراد کو پابہ زنجیر کردیا گیا۔ قید و نظربندی کا فرق سمجھنا میرے یا عارج کیلئے مشکل نہ تھا، چار ہاتھیوں پر پردہ دار ہودج بندھوائے گئے، ہر ہاتھی کے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ دو دو نامی گرامی امیروں کے ساتھ مقرر ہوا اور پھر ان ہاتھیوں کو چار مختلف سمتوں میں روانہ کردیا گیا۔ جہاں جہاں وہ ہاتھی بھیجے جانے کا حکم ہوا وہاں وہاں پہلے ہی قاصد خبر کرچکے تھے کہ مرادبخش کو گرفتار کرکے روانہ کیا جارہا ہے۔

اور اس کے دو خاص امیروں کے سوا کم ہی لوگوں کے علم میں یہ بات آسکی کہ مجبور قیدی مرادبخش کس ہاتھی پر اور کس سمت روانہ کیا گیا ہے! یہ سارا بندوبست اس لئے کیا گیا کہ مغل سرداروں اور مراد کے دیگر بہی خواہوں کی توجہ بٹ جائے اور وہ اس ہاتھی پر زیادہ توجہ نہ دے سکیں جس کے ہودج میں وہ خاص قیدی تھا۔

اورنگزیب کے دادا نورالدین محمد جہانگیر نے جو اپنے ایام شہزادگی میں شہزادہ سلیم کے نام سے مشہور تھا، ایک مضبوط و مستحکم قلعہ بنوایا تھا، پرانی دہلی سے ملی ہوئی ایک گڑھی تھی یہیں یہ قلعہ تعمیر ہوا، یہی گڑھی، سلیم گڑھی کہلائی، مرادبخش کو دو امیروں شیخ میر اور دیرخان کے ہمراہ سلیم گڑھ کے قلعے کی طرف بھیجا گیا تھا، خدمت گار یہ تصدیق بھی کر آئے تھے کہ مراد کو واقعی سلیم گڑھ کے قلعے میں قید کیا گیا ہے۔

عارج کی نقل و حرکت پر میں اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے نظر رکھے ہوئے تھی۔ اسے یہ اطلاعات ملیں تو وہ شہزادہ محمد سلطان سے ملنے روانہ ہوگیا، وہ پہلے شہزادے کو ان خبروں

سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ پھر باغ نور کا قصد تھا۔

شہزادے سے مل کر عارج کو معلوم ہوا کہ اورنگزیب اپنے ایک پیغام کے ذریعے پہلے ہی اس صورتحال سے باخبر کرچکا تھا۔

عارج وہاں سے باغ نور کی طرف چل دیا۔ اس کا انسانی قالب صالح کیونکہ اورنگزیب کے جان نثاروں اور شہزادہ محمد سلطان کے خاص معتمدوں میں شمار ہوتا تھا اور اس کا منصب بھی کم نہ تھا اس لئے وہ بے روک ٹوک ہر جگہ آتا جاتا تھا۔ قلعے اور محلات شاہی کے صرف چند ہی حصے ایسے تھے جہاں اس کی پہنچ نہ تھی۔ انہی میں ایک حصہ وہ تھا جہاں شاہجہاں کو قید کیا گیا تھا۔

شاہجہاں سے ملنے کی اجازت محض شاہی خاندان کے افراد کو تھی اور ان میں سے بھی ہر ایک کو نہیں۔ ان افراد کے سوا شاہجہاں سے صرف وہی مل سکتا تھا جسے شہزادہ محمد سلطان کی اجازت حاصل ہو۔ شاہجہاں کو قلعے کے جس حصے میں قید کیا گیا تھا وہاں ہتھیار بند محافظوں کے سوا پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا۔

عموماً شاہی محلات میں آزادی تھی، نامور شہزادیاں اور بیگمات سب مسلح رہتی تھیں۔ ان میں سے اکثر میدان جنگ میں مردوں کے پہلو بہ پہلو رہ چکی تھیں۔ انہیں اس لئے عام خواتین کی طرح قید کرکے نہ رکھا جاتا، یہی حال آسائش بانو کا تھا۔

آسائش بانو پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اسلام نے عورت کیلئے پردے کی جو حدود مقرر کی تھیں وہ ان سے تجاوز نہ کرتی۔ نوجوانی کے باوجود وہ صاحب شعور تھیں۔ وہ باغوں میں سیر کو جاتی شکار بھی کھیلتی اور صنف نازک ہونے کے سبب کسی احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوتی کیونکہ اس کے دل میں کوئی کھوٹ نہ تھا اس لئے وہ بے دھڑک صالح سے ملتی۔ صالح سے اس نے کئی بار تخلیے میں بھی گفتگو کی۔ لیکن ان ملاقاتوں کو اس نے راز رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی، شاہی خاندان کے افراد بھی ان ملاقاتوں سے واقف تھے مگر انہیں آسائش بانو کے مضبوط کردار کا بھی علم تھا اور صالح پر بھی یقین تھا کہ وہ کبھی حد ادب سے نہ گزرے گا، صالح سے میل جول کو ہم عمری کا تقاضا سمجھا گیا، کسی کو گمان بھی نہ گزرا کہ آسائش بانو کے وجود میں کیا پیکار جاری ہے، ان حالات میں صالح اور آسائش بانو کی ملاقات اہل قلعہ کیلئے کوئی عجیب یا غیر معمولی بات نہیں تھی، میں نے آسائش بانو کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرکے ہی اس کا جسم اپنایا تھا۔

باغ نور شہر کی آبادی کے ایک سرے پر تھا۔ قلعے سے اس کی مسافت کم نہ تھی مگر وہ

ایسے رخ پر تھا کہ محلات شاہی کی بالائی منزلوں کے جھروکوں سے صاف نظر آتا تھا۔ اب اکبر آباد کے رہنے والے یہ بھول گئے تھے کہ اسے باغ نور کے نام سے کیوں یاد کیا جاتا تھا! وہاں کچھ بوڑھوں کو اس کا علم ضرور تھا جنہوں نے اپنے پرکھوں سے اس باغ کے قصے سنے تھے۔

بادشاہوں کے بھی الگ الگ مزاج اور شوق ہوتے ہیں، یہ باغ اس مغل تاجدار کے عہد میں باغ نور کہلایا جس نے آگرے کا نام بدل کر اپنے نام پر اکبر آباد رکھ دیا تھا۔ یہ جلال الدین محمد اکبر تھا، اورنگزیب کا پردادا! اکبر ہی کے حکم پر ایسا بندوبست کیا گیا تھا کہ رات کے وقت یہ باغ جگمگ جگمگ کرتا تھا، قلعے سے یہ نظارہ رات کے وقت بھلا لگتا۔ سرِ شام ہی باغ میں فانوس روشن کر دیئے جاتے۔ یہ فانوس باغ میں جگہ جگہ اس طرح نصب تھے کہ بادی النظر میں دکھائی نہ دیتے، اکبر کے بعد جہانگیر کے ابتدائی زمانے تک یہ فانوس روشن کئے جاتے رہے، جہانگیر کو اور بہت سے شوق تھے۔ اس نے اس باغ پر توجہ نہ کی، پھر رفتہ رفتہ باغ تو باقی رہ گیا، روشنی غائب ہوگئی۔ فانوس بھی دیکھ بھال نہ ہونے کے سبب ٹوٹ پھوٹ گئے، ہاں چمن بندی اب تک وہی چلی آتی تھی، روش روش پر پھولوں کے قطعے تھے اور یہ باغ اب تک شاہی تصرف میں تھا۔ اس میں ہر کس و ناکس کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

آسائش بانو کو بھی یہ باغ بہت پسند تھا، وہ اکثر سیر کرنے ادھر آ نکلتی۔ میں نے اسی لئے عارج سے ملاقات کی خاطر اس باغ کو منتخب کیا تھا۔ میرا ارادہ محض باغ کی سیر نہ تھا، حسب معمول میرا محافظ دستہ ساتھ تھا، اس محافظ دستے میں بہار بھی تھی، محافظ دستے کی کنیزوں کو میرے قریب آنے کی اجازت نہ تھی جب تک کہ میں خود انہیں قریب آنے کی اجازت نہ دوں، یہ سب طریق و اطوار آسائش بانو کے تھے جواب میں نے بھی اپنا لئے تھے، کنیزوں کے قریب آنے سے آسائش بانو کی خلوت مجروح ہوتی تھی وہ کچھ زیادہ نازک مزاج اور حساس تھی، سیر کے وقت خاص طور پر حکم تھا کہ کنیزیں فاصلہ قائم رکھیں اور طلبی ہی پر قریب آئیں۔

یہی وجہ تھی کہ اس طویل و عریض باغ میں جب عارج داخل ہوا اور اس حصے تک پہنچا جہاں گلابوں کے تختے لگے تھے تو اسے پہلے بہار ہی نے دیکھا۔ میں اپنی چشم تصور کی پراسرار قوت سے یہ منظر دیکھ رہی تھی، بہار کی نظریں بڑی دیر سے ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں کیونکہ اسے عارج کے آنے کی خبر تھی، عارج کے انسانی قالب صالح کی سج دھج شہزادوں سے کم نہ تھی اور وہ تھا بھی شہزادہ ہی۔ ایک جلاوطن شہزادہ! وقت اور حالات نے اس کا ساتھ نہیں دیا ورنہ وہ اپنا

وطن کبھی نہ چھوڑتا۔

بہار کی نگاہ عارج کی طرف اٹھی تو اٹھی رہ گئی۔ اس کے انداز خرام میں وقار اور شخصیت میں بڑی وجاہت تھی، بہار نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ عارج کی نظروں میں اس کیلئے پسندیدگی ہے، عارج سے پہلے کبھی اس رتبے کے کسی امیر نے اسے قریب نہ آنے دیا تھا۔

جانے کب تک بہار گزری ہوئی ساعتوں کے خواب آنکھوں میں سجائے عارج کی طرف نگراں رہتی کہ قریب ہی کھڑی ہوئی محافظ دستے کی ایک اور کنیز نے اسے چونکا دیا، وہ ایک دم مؤدب ہوگئی، کنیز نے اسے خبردار کیا تھا کہ میرا رخ اس کی طرف ہوگیا ہے اس نے نگاہ نیچی کر لی اور اس وقت تک نگاہ نہ اٹھائی جب تک عارج ان کے قریب سے گزر کر میری طرف نہ بڑھ گیا۔

جب عارج اور میں قدم سے قدم ملائے آگے بڑھ گئے تو بہار نے اپنی جگہ سے حرکت کی وہ بھی محافظ دستے کی کنیزوں کو ساتھ لئے اور فاصلہ برقرار رکھے آگے بڑھتی رہی۔ اسے کچھ کچھ شبہ ہو چلا تھا کہ عارج اور میرے انسانی قالب ایک دوسرے سے دلی وابستگی رکھتے ہیں لیکن اس باب میں زبان پر کوئی حرف لانے کا انجام وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ بہار کے بارے میں ساری باتیں مجھے اس کے ذہن پر توجہ دے کر ہی معلوم ہوئی تھیں جو آدم زادیا آدم زادی میرے قریب تھی اس کی طرف سے میں پوری طرح آگاہ رہنا چاہتی تھی۔

بہار ہر چند میرے انسانی قالب آسائش بانو کو پسند کرتی تھی اور دل سے اس کی وفادار تھی مگر اس کے مزاج میں ایک باغیانہ عنصر بھی شامل تھا، بہار خود بھی اپنے اس مزاج سے خوف کھاتی تھی، اس کے مزاج کی یہ بغاوت صرف آسائش بانو تک محدود نہ تھی، بلکہ اس کا تعلق ان تمام افراد سے تھا جو محلوں ہی میں پیدا ہوتے ہیں اور محلوں میں مرتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ آسائش بانو بھی اسی کی طرح ہے، پھر یہ تخصیص کیسی؟ کئی پشتوں سے ان کے اجداد غلام تھے اور کئی پشتوں سے آسائش بانو کے اجداد آقا!

آقا اور غلام کا فرق کب اور کیوں کس نے قائم کیا؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوال بہار کی روح کو مضطرب کر دیتے، اس کی چھوٹی سی عقل میں ان سوالوں کے جواب نہ آتے۔ جب اس پر ایسے باغیانہ خیالات کا غلبہ ہوتا اور وہ بہت پریشان ہو جاتی تو بیماری کا بہانہ کر کے ایک طرف پڑی رہتی، اس کے فرائض کوئی اور کنیز سنبھال لیتی۔

میں تو عارج کے ساتھ کھلے دل سے گفتگو کر رہی تھی، مگر وہ خود کو چور چور محسوس کر رہا

تھا۔ بات کرتے ہوئے جب بھی اس کی نگاہ بہار کی طرف اٹھ جاتی، ہڑبڑا جاتا، عارج کی اس کیفیت سے میں بے خبر نہیں تھی، بہار میں دلچسپی لینے کے سبب عارج ایک طرح کے احساس گناہ میں مبتلا ہوگیا تھا۔ میں نے اس لئے دھیمی آواز میں اس سے کہا "اے عارج! تو بات کرتے کرتے کہاں کھو جاتا؟"

"تن..... نہیں تو اے دینارا" وہ گھبرا کر اس طرح بولا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

"اچھا ایک بات سن! اورنگزیب کو تجھ پر یا مجھ پر کسی طرح کا شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم مراد بخش کے معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔"

میں نے عارج کو تاکید کی "وہ ہماری توقعات سے بڑھ کر چالاک ہے، ایسے آدم زاد کم ہی میری نظر سے گزرے ہیں۔"

عارج مجھے بتا چکا تھا کہ مراد بخش کو کہاں قید کیا گیا ہے! وہ اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے مرضی جان لینا چاہتا تھا۔

"یہ تو طے ہے اے عارج کہ مراد بخش بے گناہ ہے۔" میں بولی۔

عارج نے میری تائید کی پھر سوال کیا۔ "اے دینارا! اگر اورنگزیب کے کانوں میں بھنک پڑ گئی تو اس کا اثر تجھ پر کیا ہوگا؟... میری مراد تیرے انسانی قالب آسائش بانو سے ہے، مراد بخش کی رہائی کے معاملے میں کس حد تک تیرا آگے بڑھنا مناسب ہوگا؟"

میں اس بات سے متفق تھی کہ مراد بخش کو کسی نہ کسی طرح قید سے نکال لیا جائے، لیکن اس پر آمادہ نہ تھی اورنگزیب کو مجھ پر شک ہو، مراد بخش پر اورنگزیب نے بغاوت کا جو الزام لگایا تھا اس سے اختلاف یا اتفاق کے بجائے میں صرف اپنے انسانی قالب کی حد تک گفتگو کر رہی تھی، گفتگو کے دوران میں نے کہا "ہمیں اس سے کیا کہ دونوں بھائیوں میں کون حق پر ہے، کون نہیں، شواہد سے ظاہر ہے کہ مراد بخش کی زندگی خطرے میں ہے، اس پر جو الزام ہے اسی طرف اشارہ کرتا ہے، شاہجہاں کی نظر بندی اور مراد بخش کی گرفتاری میں فرق ہے۔"

عارج نے میری بات سے پورا اتفاق کیا، پھر بولا "جلد ہی میں کوئی تدبیر نکال لوں گا۔"

"مگر ایک بات کا خیال رکھیو کہ اس تدبیر کی کامیابی کا انحصار میری جناتی صفات پر نہ ہو۔" میں نے اپنی بات پر زور دیا۔

"ہمارے لئے یہ امر انتہائی خطرناک ہوگا کہ کسی کو ہم پر غیر انسانی ہونے کا شبہ ہو۔"

"میں سمجھتا ہوں اے دینار۔" عارج بولا۔ "مراد بخش کی رہائی کیلئے میں جناتی صفات ہرگز استعمال نہیں کروں گا مجھے احساس ہے کہ ایسی صورت میں ہمارا یہاں رہنا مشکل ہو جائے ہمیں کسی اور زمانے میں جانا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے، اب تو جا!" میں نے کہا۔

عارج مجھ سے رخصت ہوگیا، سورج ڈوبنے کو تھا اور مغرب کا وقت دبے پاؤں قریب آ رہا تھا، مجھے علم تھا کہ عموماً آسائش بانو اس وقت تک قلعے کی طرف لوٹ جاتی تھی، لیکن اس روز ایسا نہیں ہوا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اب آسائش بانو کے جسم پر میرا قبضہ تھا، ایک جن زادی کا قبضہ جو آدم زادوں سے نہیں ڈرتی، عارج چلا گیا تو مجھ پر اپنے انسانی قالب کے اثرات ہونے لگے، میں نے اپنی آنکھوں میں نمی سی تیرتی محسوس کی ایک دکھ کا احساس میرے اوپر غالب آنے لگا۔

ابھی میرے انسانی قالب کی عمر ہی کیا تھی۔ اس نے دوسری دہائی کا نصف طے کیا تھا، اتنی مختصر سی عمر میں اس کے معصوم دل پر کئی چرکے لگے تھے۔ پہلی بار وہ اس وقت روئی تھی جب اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔ اس میں اتنی سمجھ تھی کہ کیا حادثہ گزر گیا! ماں کی محبت سے محرومی کے بعد اب اس کی محبت کا رخ باپ کی طرف ہوگیا، وہ اپنے باپ کا رعب اور دبدبہ دیکھتی، آتے جاتے تسلیمات بجالاتی اور موقع کی منتظر رہتی کہ کب اس کا باپ اسے خلوت میں آنے کی اجازت دے مگر ایسا کم ہی ہوتا۔

مراد بخش اپنی بیوی کے غم کو بھلانے کیلئے خوب رو اور کنیزوں کے ہجوم میں گم ہوگیا تھا۔ اسے یہ خیال تک نہ آتا کہ کہیں اسی محل میں ایک معصوم دل اس کی محبت میں دھڑک رہا ہے۔

کسی بھی قسم کی محرومی انسان کو یا تو خاک میں ملا دیتی ہے یا کندن بنا دیتی ہے، محرومی کی اس آگ میں تپ کر آسائش بانو کندن بنتی گئی، وہ بچپن ہی سے ایسی باتیں کرنے لگی جن کی توقع بچوں سے نہیں ہوتی، اسی وجہ سے وہ شاہجہاں کی لاڈلی بن گئی اور اورنگزیب کی چہیتی ہوگئی، خالہ اس پر جان نچھاور کرنے لگی، شاہجہاں نے خاص اپنے اہتمام سے پوتی کی تعلیم کیلئے ایک معلّمہ مقرر کی، یہ معلّمہ کئی علوم و فنون میں مہارت رکھتی تھی۔

آسائش بانو اتنی ذہین طالبہ ثابت ہوئی کہ معلّمہ بھی حیران رہ گئی، چند ہی سال میں وہ عربی اور فارسی زبان روانی سے بولنے کے ساتھ ترکی بھی سیکھ گئی، اس نے قرآن حفظ کر لیا تو محل میں بڑی خوشی منائی گئی، سب نے اسے شاباش دی، مگر مراد بخش نے اس کے سر پر ہاتھ نہ

رکھا، وہ اس وقت غرق بادہ و جام تھا اور اس حالت میں بیٹی ہی کو کیا کسی کو باریابی کی اجازت نہ ملتی تھی، وہ بلانوش تھا اور اسے اپنی بلانوشی کا احساس تھا، وہ اس لئے شاہجہاں کے سامنے زیادہ آنے سے گریز کرتا تھا۔

آسائش بانو اپنے باپ کی بے توجہی کا شکار رہی، مگر باپ کی محبت دل سے نہ گئی وہ انہی حالات میں پروان چڑھتی رہی، پھر اس نے جینے کے بہانے ڈھونڈ لئے، شمشیرزنی، شہسواری، نیزہ بازی، تیراندازی اس نے فنون حرب کا کوئی شعبہ نہ چھوڑا اور اب بھی اس کی مشق جاری تھی، ان مشقوں نے اس کے جسم پر بھی اچھا اثر کیا، نوخیز نوجوانی کے باوجود وہ بھرپور لگتی، بظاہر وہ نازک اندام ہی دکھائی دیتی مگر اس کی کلائی مروڑنا آسان نہ تھا، کنیزیں اسے سنوارتیں تو اس کے حسن و جمال میں کھو جاتیں اور پھر حد ادب سے تجاوز کا خوف ان کی نگاہیں جھکا دیتا، شانوں پر زلفوں کی گھٹائیں جھومتیں اور بادامی آنکھوں میں نشہ سا ڈولتا رہتا مژگان کھولتی تو یوں لگتا کہ در میخانہ باز ہے، بند کر لیتی تو گمان گزرتا کہ ہر نوک مژگان سینے میں اتر جائے گی، ابرو ماہ اول شب کا سماں پیش کرتے، رخساروں کی سرخی و شادابی شفق کو شرماتی، اس کی تیز مزاجی کے باوجود چوڑی پیشانی پر کبھی کبھار ہی کوئی شکن نمودار ہوتی، بالائی ہونٹ پر دائیں جانب ایک تل تھا کہ نظر نہ لگے، لبوں میں وہ نازکی، وہ گداز کہ وا ہوں تو چٹکتے غنچوں کا گمان ہو، مل جائیں تو یوں لگے کہ گلاب کی ایک پنکھڑی پر دوسری پنکھڑی رکھی ہو، رنگ ایسا کہ چھو لو تو میلا ہو، انگ انگ یوں کہ پیمائش کے اعلیٰ معیار پر پورا اترے، صالح نے یوں ہی تو اپنے دیدہ و دل فرش راہ نہیں کر دیئے تھے۔

صالح اور آسائش بانو کی عمر میں تقریباً چھ سال کا فرق تھا مگر یہ فرق زیادہ ظاہر نہ تھا، اس کی وجہ آسائش بانو کی اٹھان تھی۔

جب صالح نے اس سے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں ایران سے آیا ہوں تو آسائش بانو کو اپنی ماں یاد آ گئی، وہ بھی ایرانی النسل تھی، شاہ نواز صفوی کی بیٹی جس کا تعلق ایران کے ایک معزز خاندان سے تھا، صالح سے تعلق خاطر کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی، صالح کیلئے اس کے دل میں جتنی جگہ پیدا ہو گئی تھی اس کا اظہار آسائش بانو کی آنکھوں سے ہوتا تھا، وہ اپنے رویے سے کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیتی تھی، اسے صبر کرنا آتا تھا اور بچپن سے اس نے صبر ہی کیا تھا، وہ خلوت میں تو صالح کے چہرے کو آنکھیں بند کئے دیکھتی رہتی لیکن جب صالح سامنے ہوتا تو اس کی طرف کم ہی نگاہ اٹھاتی، اپنے جذبات کو وہ کبھی بے قابو نہ ہونے دیتی۔

''یقین کرا دے دینا کہ میری اطلاع غلط نہیں۔'' عارج خلوت میں مجھ سے مخاطب تھا، تنہائی کے باوجود اس کی آواز دھیمی تھی۔

''مگر..... مگر مراد بخش کو یہ کیا ہو گیا! اسے اپنے وقار کا کوئی خیال نہیں!'' میرے لہجے میں حیرت تھی، عارج نے خبر ہی ایسی دی تھی۔

میری حیرت کی وجہ سوسن تھی، سوسن مراد بخش کی ایک کنیز کا نام تھا۔ بظاہر تو سوسن ایک کنیز تھی مگر سبھی کو معلوم تھا کہ اس کا درجہ مراد کی محبوبہ ہے، عارج کو شاہجہاں آباد (دہلی) سے خبر ملی تھی کہ مراد نے اورنگزیب کو ایک عریضہ بھیجا ہے، اس نے اورنگزیب سے درخواست کی تھی کہ سوسن کو سلیم گڑھ کے قلعے میں اس کے پاس بھیج دیا جائے۔

اورنگزیب نے مراد کی یہ درخواست قبول کر لی تھی۔

سوسن احمد آباد میں تھی۔ اسے مراد کے پاس پہنچا دیا گیا، مراد کی حالت پر مجھے حیرت کے ساتھ ہی رنج غالباً اس لئے ہوا کہ وہ میرے انسانی پیکر کا باپ تھا۔ عارج اب مجھ سے ملنے کیلئے میرے محل میں بھی آنے جانے لگا تھا۔ اس کا سبب امیر الامراء ذوالفقار علی خان تھا۔

امیر الامراء ذوالفقار علی خان کے بارے میں تمام معلومات میں نے حاصل کر لی تھیں۔ اسے اکبرآباد آئے تین ماہ سے زیادہ گزر چکے تھے۔ وہ عجیب طبیعت و مزاج کا آدمی تھا۔ اسے سمجھنا آسان کام نہیں تھا۔ اس نے اکبرآباد آتے ہی سارے قلعے میں مخبروں کا جال پھیلا دیا۔ وہ اورنگزیب کی خصوصی ہدایات پر شاہجہاں آباد سے اکبرآباد آیا تھا۔

اورنگزیب کو جانے کیوں شاہجہاں کی طرف سے فکر لگی تھی۔ اس کے خیال میں شاہجہاں نظر بند ہونے کے باوجود اس کے اقتدار کو خطرے میں ڈال سکتا تھا۔ نظر بندی کے دوران بھی کم از کم مراسلت کے ذریعے وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر سکتا تھا۔ ذوالفقار علی خان نے انہی امکانات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی دانست میں ضروری کارروائیاں کی تھیں۔ اب قلعے میں موجود ہر اہم شخصیت ذوالفقار علی خان کے مخبروں کی نظر میں تھی۔ ان اہم شخصیات میں عارج اور میرے انسانی قالب بھی تھے۔ اب ہم دونوں مراد کے بارے میں کھلے عام گفتگو سے گریز کرتے تھے، میرے محل میں بھی کوئی کنیز یا غلام مخبری کر سکتا تھا اس لئے وہاں بھی ہم تخلیے کے باوجود دھیمی آواز میں بات کرتے تھے۔ اس وقت بھی عارج میرے محل میں تھا۔ گزشتہ چند مہینوں کے دوران عارج نے بھی شاہجہاں آباد میں اپنے کئی مخبر مقرر کر دیئے تھے اور سلیم گڑھ کے حالات سے بھی وہ بے خبر نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

مراد بخش کو قید سے نکالنے کیلئے ضروری تھا کہ عارج خود کوئی موقع نکال کر سلیم گڑھ جاتا اور رہائی کے امکانات پر غور کرتا۔ اس کے بعد ہی کوئی لائحہ عمل مرتب کر سکتا تھا لیکن اسے پورے دو ماہ بھی اکبر آباد میں نہ گزرے تھے کہ وہاں ذوالفقار علی خان پہنچ گیا۔

اورنگزیب نے پہلی ذیقعد 1028 ہجری کو شاہجہاں آباد (دہلی) میں اپنی تخت نشینی کا پہلا جشن منعقد کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ذوالفقار علی خان کو اکبر آباد روانہ کر دیا تھا۔

اکبر آباد آنے کے کچھ دن بعد ذوالفقار علی خان نے شہزادہ محمد سلطان کو اپنی مٹھی میں لے لیا، شہزادے کا جھکاؤ بھی اس کی طرف ہو گیا۔ اس کا سبب وہ ہدایات تھیں جو اورنگزیب نے ایک پیغام کی شکل میں شہزادے کو بھیجی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صالح کے ساتھ شہزادے کا رویہ بڑی حد تک بدل گیا۔ عملاً شہزادے کے بجائے اب ذوالفقار علی خان کا حکم چلنے لگا تھا اور وہ بڑا سخت گیر آدمی تھا۔ پہلے تو شہزادے سے کوئی بہانہ کر کے صالح شاہجہاں آباد چلا جاتا تھا مگر اب یہ آسان نہ تھا خصوصاً مخبروں کی وجہ سے!

یہی سبب تھا کہ عارج اب تک سلیم گڑھ نہ جا سکا تھا۔ میں بھی ان تمام حالات سے بدلی ہوئی فضاء سے واقف تھی۔

عارج کے انسانی چہرے پر فکر مندی کے آثار دیکھ کر میں نے اسے سمجھایا ''تو زیادہ فکر مند نہ ہو۔ تقدیر کے لکھے کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ اگر مراد بخش نے سوسن کو بلوا لیا ہے تو اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس وقت قلعے کے جو حالات ہیں انہیں مدنظر رکھتے ہوئے تیرا سلیم گڑھ جانا کسی بھی طرح مناسب نہیں بلکہ مصلحت کے خلاف ہے۔''

عارج کو ایک شرارت سوجھ گئی اور گویا صالح بن کر بولا ''بانو بیگم! محبت مصلحت کی غلام نہیں ہوتی۔''

''محبت!'' میں دھیرے سے ہنس دی ''تو کیا تجھے میرے اس انسانی قالب سے محبت ہو گئی ہے؟''

''تو کسی بھی رنگ، کسی بھی جسم میں ظاہر ہو اے دینار، میں تجھ سے محبت کرتا رہوں گا۔'' عارج کہنے لگا۔

''اور بہار!'' میں نے بھی اسے چھیڑا۔ ''وہ...... اس میں بھی تجھے میرا ہی جلوہ نظر آتا ہے؟''

''یہ تو کیسی باتیں کرنے لگی اے دینار!'' عارج سنبھل کر بولا۔ ''تیرا اور بہار کا کیا مقابلہ! کہاں ایک شہزادی، کہاں ایک معمولی کنیز!''

''یوں کہہ کہ کہاں ایک جن زادی، کہاں ایک آدم زادی!'' میں نے گویا تصحیح کی۔

''چل یوں ہی سمجھ لے، ویسے اگر تجھے مجھ پر بھروسا نہیں تو اس آدم زادی کو میرے پاس آئندہ نہ بھیجنا۔'' عارج بولا۔

''سن کہ میں تیرے پاس اسے بھیجتی ہوں تو اس کی نکیل اپنے ہی ہاتھ میں رکھتی ہوں تو اسے بہکا نہیں سکتا۔'' میں نے کہا۔

عارج نے میری بات سن کر ٹھنڈا سانس بھرا۔ وہ یقیناً سمجھ گیا تھا کہ بہار اس کے پاس کیوں نہیں رکی تھی۔ پھر اس نے موضوع گفتگو بدل دیا اور کہنے لگا۔ ''اے دینار! میں کوشش کرتا ہوں کہ کوئی موقع نکال کے خلوت میں شہزادہ سلطان سے مل لوں۔''

''تو شاید اس ملاقات میں شہزادے سے شاہجہاں آباد جانے کی اجازت لینا چاہتا ہے۔'' میں نے اپنے قیاس کا اظہار کیا تو عارج نے تصدیق کر دی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے سوال کیا۔ ''مگر اے عارج، تو شاہجہاں آباد جانے کیلئے شہزادے سے کیا بہانہ کرے گا؟''

''ابھی میں نے اس سلسلے میں کچھ سوچا نہیں۔'' عارج نے جواب دیا۔

''بہر حال بہانہ ایسا ہونا چاہئے کہ بہانہ معلوم نہ ہو۔''

میں نے تاکید کی۔ حسب معمول عارج کی نقل و حرکت پر میں نظر رکھے ہوئے تھی۔ اس نے چند روز بعد موقع غنیمت دیکھ کر شاہجہاں آباد جانے کی بابت اجازت لینے کیلئے شہزادہ محمد سلطان سے ملنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ عارج کا اصل مقصد سلیم گڑھ کے قلعے تک رسائی تھا۔

شہزادے کو امیر الامراء ذوالفقار علی خان ہی کبھی فرصت نہ دیتا تھا۔ اس سے خلوت میں ملنا ضروری تھا ورنہ بات بگڑ جاتی۔ دیرینہ خدمت و تعلق کے پیش نظر عارج کو امید تھی کہ شہزادہ اس کے انسانی قالب سے بے رخی نہ برتے گا۔ پھر وہ شہزادے سے ملا اور اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ منہ بناتے ہوئے شہزادے نے اسے شاہجہاں آباد جانے کی اجازت دے

دی۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔

عارج نے شاہجہاں آباد جانے کیلئے شہزادے سے یہ بہانہ کیا تھا کہ میرا ایک قریبی عزیز ایران سے وہاں آیا ہوا ہے۔ وہ خفیہ طور پر ایران سے شاہجہاں آباد پہنچا ہے۔ میں اس کی تصدیق کرنے شاہجہاں آباد جانا چاہتا ہوں۔ اپنے کسی قریبی عزیز کا قصہ عارج نے اس لئے سنایا تھا کہ بعد میں بوقت ضرورت کہہ سکے، اطلاع غلط تھی۔

صبح عارج، شہزادے سے ملا تھا، دوپہر کے بعد اس نے مجھے یہ مژدہ سنایا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ میں اس کی طرف سے ہر وقت باخبر رہتی ہوں۔ خود میں نے بھی اسے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا۔

"یہ بہت اچھا ہوا اے عارج!" میں نے خوشی کا اظہار کیا۔ "اب تو مراد بخش کی رہائی کیلئے کوئی راہ نکال سکے گا۔"

مجھ سے مل کر جانے کے بعد عارج روانگی کی تیاریاں کر رہا تھا کہ خلاف توقع کافی دن بعد شہزادہ محمد سلطان نے اسے خود طلب کرلیا حالانکہ وہ آج ہی شہزادے سے مل چکا تھا۔ عارج کو اس طلبی پر حیرانی تھی۔

عارج شہزادے کے حضور میں پہنچا تو وہاں امیر الامراء اکبرآباد کے صوبے دار اور دیگر چند منصب داروں کو دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔ ان سبھی کے چہروں پر ایک تناؤ سا تھا۔ عارج تسلیمات بجالانے کے بعد کچھ ذرا سا ایک طرف بیٹھ گیا۔ امیر الامراء ذوالفقار خان کے چہرے سے اس وقت غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں اپنے تصور کی قوت کو بروئے کار لا کر ذوالفقار خان کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار دیکھ کر میں سوچنے لگی کہ کہیں مخبروں کے ذریعے ذوالفقار خان کو عارج کے اصل ارادے کا علم تو نہیں ہوگیا؟

میں ابھی ان وسوسوں کا شکار تھی کہ شہزادہ محمد سلطان نے عارج کو مخاطب کیا۔ میں ہمہ تن گوش ہوکر شہزادے کی بات سننے لگی۔

"...... ہمارے ساتھ تمہیں بھی طلب کرلیا گیا ہے، گزشتہ احکام کو منسوخ جانو۔" شہزادے نے عارج سے کہا۔

شہزادے کے ان الفاظ سے میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ اب عارج، مراد بخش کی رہائی کے سلسلے میں فوری طور پر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ شہزادہ محمد سلطان کو اورنگزیب کی طرف سے طلبی کے احکام اسی روز ملے تھے۔ اورنگزیب نے شہزادہ محمد سلطان، امیر الامراء

ذوالفقار خان اور عارج کے انسانی قالب صالح کو فوراً شاہجہاں آباد پہنچنے کی تاکید کی تھی۔ خود اورنگزیب بھی داراشکوہ کا تعاقب ترک کر کے لاہور سے شاہجہاں آباد پہنچ گیا تھا۔

اورنگزیب کو خبر ملی تھی کہ اس کا بھائی شجاع، بنگال سے نکل کر بنارس تک آ گیا ہے۔ شجاع نے ایک بڑے علاقے کو اپنے قبضے میں کرلیا تھا اور وہ اورنگزیب کے اقتدار کیلئے خطرہ بن گیا تھا۔ اورنگزیب نے داراشکوہ کے تعاقب میں اپنے دو امیروں کو چھوڑا اور خود پلٹ آیا۔ احکام کے مطابق اب اکبرآباد کا قلعہ رعد انداز خان کے سپرد کیا جانا تھا جو وہیں ایک جانب دوزانو بیٹھا تھا۔

شہزادہ محمد سلطان کا ذہن پڑھ کر مجھے تازہ تر حالات کا پورا علم ہوگیا تھا، اب میں سمجھ گئی تھی کہ ذوالفقار خان کے چہرے پر غصہ نظر آنے کی وجہ کیا ہے! اورنگزیب سے وفاداری کا تقاضا یہی تھا کہ وہ مخالفین پر خفگی کا اظہار کرے۔ کشیدہ صورتحال کے سبب مجھے جو غلط فہمی ہوگئی تھی، اب دور ہوگئی۔ عارج کا یہ راز کھلا نہیں تھا کہ وہ مراد بخش کی رہائی کیلئے شاہجہاں آباد جا رہا تھا۔ اورنگزیب کی طرف سے بھی اسے شاہجہاں آباد ہی طلب کیا گیا تھا مگر اب وہ سلیم گڑھ کے قلعے نہ جا پاتا بلکہ اورنگزیب کی نظر میں رہتا، خود شاہجہاں آباد جانے اور اورنگزیب کی طرف سے وہاں طلب کئے جانے میں بڑا فرق تھا۔ عارج کو شاہجہاں آباد پہنچ کر شاید اتنی مہلت نہ ملتی کہ وہ سلیم گڑھ جا سکتا۔ اس سے قطع نظر موجودہ حالات میں عارج کب اکبرآباد آ سکے گا، اس کیلئے یہ بھی ایک مسئلہ ہی تھا۔ جب شہزادے نے عارج کو یہ بتایا کہ آئندہ روز صبح لشکر اکبرآباد سے شاہجہاں آباد کی طرف کوچ کرے گا تو وہ چونک اٹھا۔ وہ بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اکبرآباد واپسی کب ہوگی؟ اسے مجھ سے کب تک جدا رہنا ہوگا؟

کچھ دیر بعد مجلس برخاست ہوگئی۔ عارج اپنی حویلی میں چلا آیا۔ لشکر کی روانگی سے متعلق اسے بھی کچھ کام سونپے گئے تھے مگر فی الحال وہ حالات پر غور کرنا چاہتا تھا۔ یہ وہ صالح نہیں تھا جو ایران سے ہندوستان آیا تھا۔ اب تو اس کے جسم پر عارج کا قبضہ تھا جو مجھ سے دور رہنے پر فکرمند تھا۔ یہ امر بہرحال اس کیلئے تشویش کا باعث تھا کہ وقتی طور پر ہی میں اکبرآباد میں اور وہ شاہجہاں آباد میں رہتا ہے۔ ایسی صورتحال پہلی بار پیش آئی تھی کہ مجھے اور عارج کو دو الگ شہروں میں ایک دوسرے سے دور رہنا تھا۔ عارج سوچ رہا تھا کہ میرے بغیر اسے کیسے قرار آئے گا! وہ دیر تک یہی سوچتا رہا مگر اکبرآباد میں رہنے کی کوئی راہ نظر نہیں آئی۔ عارج ہی کیا خود شہزادہ محمد سلطان بھی اورنگزیب کے احکام ٹالنے کی جسارت نہیں کرسکتا تھا۔

اسی دن عارج مجھ سے ملا اور مجھے حالات سے بے خبر جان کر تی صورتحال سے آگاہ

کیا۔

"اب کیا ہوگا اے دینار؟" عارج نے مجھ سے دریافت کیا۔ تجھ سے بچھڑ کر میں بھلا کیسے رہ سکوں گا!"

یہ بات تو اس طرح کہہ رہا ہے جیسے ہم خدانخواستہ ہمیشہ کیلئے ایک دوسرے سے جدا ہورہے ہیں۔" میں بولی۔

"تو تجھے کوئی فکر نہیں؟" عارج نے حیرت کا اظہار کیا۔

"اس میں فکر کی کیا بات ہے!......تو شاید یہ بھول گیا ہے کہ ہم آدم زاد نہیں جن زاد ہیں اور جن زادوں کیلئے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ تو جب چاہے اپنے انسانی پیکر کو گہری نیند سلا کر میرے پاس آجاؤ۔" میں نے کہا۔

"اے دینار! تو بھی تو میرے پاس آسکتی ہے۔" عارج کہنے لگا۔

"ضرورت محسوس ہوئی تو آجاؤں گی۔ ویسے ہمارے لئے بہتر یہی ہے کہ آدم زادوں کے درمیان رہ کر ہم آدم زاد بن کے ہی رہیں۔" میں نے عارج کو سمجھایا، پھر مزید تسلی دی۔ "فکر نہ کرو، میں تیری طرف سے غافل نہیں رہوں گی۔"

اس پر عارج خوش ہوگیا اور بولا "یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لاکر تو میرے حال سے باخبر رہ سکتی ہے۔"

"اگر تجھے اس دوران میں وقت ملے تو سلیم گڑھ بھی ہو آئیو، مگر کسی کو خبر نہیں ہونی چاہئے۔" میں نے تاکید کی۔

"دیکھتا ہوں کہ وہاں جاکر کیا صورت پیش آتی ہے!"

عارج یہ کہتے ہوئے بولا "ارے میں یہ تو بھول ہی گیا کہ لشکر کی روانگی کیلئے مجھ پر بھی کچھ ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں...... میں چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

دوسرے دن صبح لشکر کی روانگی سے پہلے عارج کچھ دیر کو مجھ سے مل سکا۔ جس وقت وہ مجھ سے رخصت ہورہا تھا تو جانے کیوں میرا دل بیٹھا جارہا تھا! پھر بھی اپنے جذبات و احساسات پر قابو پاتے ہوئے میں نے کہا "اے عارج! تجھے اللہ اپنی حفظ وامان میں رکھے۔"

"اور تجھے بھی اے دینار!" عارج فوراً بولا۔ "خدا حافظ!"

"خدا حافظ۔" میری آواز یہ کہتے ہوئے قدرے بھاری ہوگئی۔ طرح طرح کے اندیشوں اور وسوسوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ ان اندیشوں کا سبب موجودہ حالات تھے جو شجاع کے ساتھ جنگ پر بھی منتج ہوسکتے تھے۔

عارج کا انسانی قالب بہرحال میدان جنگ میں اب تک متعدد مواقع پر داد شجاعت دے چکا تھا، لیکن عارج کو اس کا تجربہ نہیں تھا۔ میدان جنگ میں کیا صورت پیش آئے، اس سلسلے میں قبل از وقت کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کب کس طرف سے آنے والا تیر پیغام قضا بن جائے، پیشگوئی نہیں کی جاسکتی۔ میری تشویش اور فکرمندی کا سبب یہی تھا۔

اپنے محل کی چھت پر چڑھ کر میں نے لشکر کے کوچ کرنے کا منظر دیکھا۔

میں اپنی چشم تصور کی پراسرار قوت کو بروئے کار لاکر ہندوستان کے ایک ایسے شہر کو دیکھ رہی تھی جہاں کبھی گئی نہیں تھی۔ یہ شہر شاہجہاں آباد (دہلی) تھا۔ اس شہر کے گلی کوچے اور بازار دلہن کی طرح سجے ہوئے تھے۔ اس شہر میں جشن (بادشاہ کی سالگرہ کا دن) منایا جارہا تھا۔ اس جشن کے دوران ہی اکبرآباد سے لشکر وہاں پہنچا۔ لشکر میں عارج بھی تھا۔

شہزادہ محمد سلطان اور دیگر امرائے سلطنت کے ساتھ عارج نے بھی جشن میں شرکت کی۔ اس جشن میں اورنگزیب نے دوسرے امراء کے ساتھ عارج کو بھی صالح سمجھ کر انعام و اکرام سے نوازا۔

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر عارج نے اورنگزیب سے کہا۔ "یہ غلام، حضور ظل الٰہی سے خلوت میں ملاقات کا متمنی ہے۔ درخواست ہے کہ غلام کو خلوت میں باریابی کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔"

دھیمی آواز میں ادا کئے ہوئے ان الفاظ کو اورنگزیب نے توجہ سے سنا، پھر بغور عارج کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "یقیناً کوئی ایسی ہی بات ہوگی جس کیلئے خلوت ضروری ہے۔ آج بعد نماز مغرب تم ہم سے مل سکتے ہو۔"

اس پر عارج نے شکریہ ادا کیا۔ اس کے انسانی قالب صالح کی شجاعت و ذہانت کا اورنگزیب معترف تھا۔

وقت مقررہ پر عارج نے اورنگزیب سے ملاقات کی اور وہ بات کہہ دی جو اس کے دل میں تھی۔ شہزادہ محمد سلطان کا بدلا ہوا رویہ عارج کیلئے قابل برداشت نہ تھا۔ اس نے ہمت و جسارت سے کام لے کر دبی زبان میں شہزادے کی شکایت بھی کی۔ اس شکایت پر اورنگزیب نے جو کچھ کہا، وہی عارج کی مرضی تھی۔ فیصلہ اس کے حق میں ہوا۔ اورنگزیب نے کہا تھا کہ اب اسے شہزادہ محمد سلطان کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

اورنگزیب کے ساتھ خود ایک زبردست لشکر تھا اور اب اکبرآباد سے بھی افواج آگئی تھیں۔ چند ہی روز بعد اورنگزیب نے مغل افواج کو شاہجہاں آباد کے مشرق کی طرف کوچ

کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ بذات خود شجاع سے نبرد آزما ہونے کیلئے نکلا تھا۔

اس عرصے میں عارج، سلیم گڑھ ہو آیا تھا جہاں مراد بخش قید تھا۔ عارج کے ذہن پر توجہ دے کر مجھے حقائق پتا چل گئے تھے۔ سلیم گڑھ کے قلعے کا اچھی طرح معائنہ کر کے عارج اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہاں سے مراد بخش کو رہا کرانا زیادہ دشوار نہیں۔ وہ وہاں اپنے مخبروں کو بھی متعین کر آیا تھا اور دیگر ضروری انتظامات بھی کئے تھے تا کہ موقع ملتے ہی وہاں سے مراد بخش کو فرار کرا دے۔

اٹاوہ سے ذرا آگے کھجوہ پر اورنگزیب اور شجاع کے لشکر ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ بڑی زبردست جنگ ہوئی۔ عارج نے بے دلی کے باوجود اس جنگ میں کئی مواقع پر دلیرانہ جرأت کا مظاہرہ کیا۔ جنگ کے دوران میں ایک موقع ایسا آیا کہ شجاع کے لشکر سے ایک امیر تین ہاتھی لے کر نکلا۔ اس نے اورنگزیب کے میسرے پر حملہ کر دیا۔ خوفناک ہاتھیوں اور سادات کے زبردست حملے سے لشکر کا بایاں بازو تقریباً پسپا ہو گیا۔ اس کا اثر قلب لشکر پر بھی پڑا۔ یہاں تک کہ اورنگزیب کی رکاب میں صرف عارج اور اس کے دو ہزار جواں ہمت سپاہی رہ گئے۔ اس موقع پر بھی عارج اور اس کے سپاہیوں نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ اورنگزیب نے خود بھی مخالف لشکر پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھی آگے بڑھایا اور دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ اورنگزیب اور عارج کو مردانہ وار آگے بڑھتے دیکھ کر بھاگتے ہوئے سپاہیوں کے قدم رک گئے۔ ان کی غیرت نے جوش مارا اور وہ پلٹ آئے۔ اورنگزیب کی سواری کے اردگرد جمع ہو کر وہ جان توڑ حملے کرنے لگے۔ سادات بارہہ کی پیش قدمی رک گئی۔ اسی کے ساتھ گھمسان کی لڑائی میں مجھے ایک ایسا منظر دکھائی دیا کہ میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ دائیں جانب سے سنسناتا ہوا ایک تیر آیا اور پھر میں نے عارج کو گھوڑے سے گرتے دیکھا۔

اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ عارج کو صالح کے جسم سے نکلنے کی مہلت نہ ملی۔ میری تشویش کی اصل وجہ یہی تھی۔ یہ حقیقت میرے علم میں تھی کہ کبھی کبھی انسانی قالب ہم جنات کیلئے قید خانہ ثابت ہوتے ہیں۔ انسانی قالبوں میں پھنس کر جنات اپنی جان بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس سے پہلے بھی ایک بار عارج، انسانی قالب میں قتل ہوتے ہوتے بچا تھا۔ یہ انسانی قالب مغلیہ تاجدار ہمایوں کے ایک خادم خاص شاہم بیگ کا تھا۔ اگر میں نے بروقت عارج کو اس انسانی قالب سے نکلنے کی تاکید نہ کی ہوتی تو وہ مارا جاتا۔

میری چشم تصور عارج ہی پر مرکوز تھی جو پشت پر دائیں جانب ایک تیر لگنے کے سبب

گھوڑے سے گر گیا تھا۔ ادھر وہ گھوڑے سے گرا، ادھر اس کے سپاہی اسے میدان کارزار سے اٹھا کر لے گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر سکون محسوس ہوا کہ سپاہیوں نے فوری طور پر پشت میں پیوست تیر نکال کے مرہم پٹی کر دی۔ عارج کو ساتھ لئے وہ خیمہ گاہ میں آ گئے تھے۔

پشت پر تیر لگنے کے علاوہ اس معرکے میں عارج کے انسانی قالب کو کئی اور زخم بھی لگے تھے مگر وہ زخم زیادہ گہرے نہ تھے۔ جنگ کے دوران میں کوئی سپاہی لڑنا نہ بھی چاہے تو اسے کم از کم اپنی جان بچانے کیلئے تو لڑنا ہی پڑتا ہے۔ یہی عارج کے ساتھ ہوا۔ وہ بہرحال بزدل بھی نہیں تھا کہ دوسروں کی طرح میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ جاتا مگر اورنگزیب نے اسے عارج کی دلیری ہی سمجھا۔

شجاع کا لشکر بالآخر پسپا اور منتشر ہونے لگا پھر کچھ ہی دیر میں شجاع کے فرار ہونے کی خوشخبری مل گئی۔ امراء نے اورنگزیب کو مشورہ دیا کہ شجاع کو فرار ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ اورنگزیب نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ شجاع کے تعاقب میں جانے کیلئے شہزادہ محمد سلطان کو حکم ہوا۔ شہزادے کے ہمراہ مغل افواج کے کئی جنگجو امیر تھے مگر ان میں عارج نہ تھا۔ اورنگزیب اپنا یہ وعدہ بھولا نہ تھا کہ اسے شہزادہ محمد سلطان کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا پھر یہ کہ عارج زخمی بھی ہو چکا تھا اور اسے آرام کی ضرورت تھی۔

شجاع کے تعاقب میں جانے اور اس سے نبرد آزما ہونے کے سبب شہزادہ محمد سلطان کو بہت نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اورنگزیب نے اسی لئے ضروری سامان سفر، تین پوشاک والی خلعت، خاصے کی تلوار اور ایک سو گھوڑے شہزادے کو دیئے۔

اس مقام پر اورنگزیب ایک ہفتے تک مقیم رہا۔ اس عرصے میں عارج کے زخم بھر گئے۔ اورنگزیب نے جن امراء کو اعزازات اور نقد انعامات سے نوازا ان میں عارج بھی شامل تھا۔ عارج کو خلعت، ایک مرصع تلوار اور زنجیر مروارید کی دی گئی۔ اس کے علاوہ 2 لاکھ روپے نقد ملے اور منصب میں بھی ایک ہزار کا اضافہ ہوا۔ اب اس کا منصب 4 ہزاری 3 ہزار سوار ہو گیا۔ یہ سب اس شجاعت اور حوصلے کا صلہ تھا جس کا اظہار میدان جنگ میں ہوا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد جب اورنگزیب نے کھجوہ سے اکبر آباد کی طرف کوچ کا حکم دیا تو مجھے زیادہ خوشی نہ ہوئی۔ اس کا سبب ملکی حالات پر میری گہری نظر تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اورنگزیب کا مقصد کیا ہے! وہ اکبر آباد میں چند روز سے زیادہ نہ رکتا۔

کھجوہ کے دوران قیام ہی میں احمد آباد سے اورنگزیب کو خبر مل چکی تھی کہ دارا شکوہ وہاں اپنے قدم جما چکا ہے۔ مراد بخش کو پابہ زنجیر کرتے ہی اورنگزیب نے اپنے خسر شاہ نواز

خان صفوی کو وہاں کا صوبے دار بنا دیا تھا۔ پہلے یہ صوبہ مراد بخش کے زیرنگیں تھا۔ آسائش بانو کا نانا شاہ نواز خان صفوی اورنگزیب سے کچھ زیادہ خوش نہ تھا۔ ایک موقع پر اورنگزیب خود اسے بھی قید کرا چکا تھا۔ ذاتی طور پر شاہ نواز خان، اورنگزیب کے بجائے دارا شکوہ کو حکومت و اقتدار کا اہل سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دارا شکوہ جب لٹا پٹا احمد آباد پہنچا تو شاہ نواز خان اس سے مل گیا۔

یہ وہ اطلاعات تھیں جنہیں سن کر اورنگزیب نے احمد آباد کا قصد کیا۔ وہ چند روز اکبر آباد میں رک کر احمد آباد بڑھ جاتا۔ اسی بنا پر اکبر آباد پہنچ کر اورنگزیب شہر میں داخل نہ ہوا۔ اس نے باغ نور کے قریب قیام کیا۔

عارج کی خواہش تو یہی تھی کہ وہ اکبر آباد ہی میں رک جائے مگر یہ ممکن نہ ہوا۔ صرف پانچ دن مغل لشکر وہاں رکا اور پھر احمد آباد کیلئے کوچ کر گیا۔ اس عرصے میں عارج مجھ سے بس ایک بار مل سکا۔ اس نے کہا ''اے دینار! یہ انسانی قالب تو میرے لئے وبال جان ہو گیا ہے۔ کیوں نہ میں اسے چھوڑ کر کوئی اور انسانی پیکر اپنا لوں تاکہ تیرے ساتھ اکبر آباد میں ہی رہ سکوں۔''

''نہیں اے عارج!'' میں نے انکار کر دیا۔ ''کیا خبر کسی اور انسانی قالب میں تجھے قرار نہ آئے!''

''لیکن میں آخر کیوں اور کب تک تیرا فراق جھیلوں؟'' عارج کہنے لگا۔

''میرا دل کہتا ہے کہ فراق کا یہ موسم جلد گزر جانے والا ہے۔'' میں نے عارج کو تسلی دی۔

عارج نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ وہ سلیم گڑھ ہو آیا ہے اور اب منتظر ہے کہ اسے کب مہلت ملے! میرے ایما پر وہ مراد بخش کو قید سے رہا کرانا چاہتا تھا مگر ابھی اورنگزیب اس کی جان نہیں چھوڑ رہا تھا۔

مغل لشکر پر میری توجہ عارج ہی کی وجہ سے تھی۔ ابھی لشکر اکبر آباد سے نکل کر چند منزلیں طے کر پایا تھا کہ مخبروں نے خبر دی، دارا شکوہ، احمد آباد سے ایک بڑا لشکر لے کر چل دیا ہے۔ اس عرصے میں دارا شکوہ اپنے قدیم امیر نمک خوار راجا جسونت سنگھ سے بھی مراسلت کرتا رہا تھا۔ راجا جسونت سنگھ وہی تھا جو پہلے اورنگزیب سے شکست کھا کر اپنے علاقے میں چلا گیا تھا۔ راجا نے دارا شکوہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ راجپوتانہ آ جائے گا تو بہادر راجپوت اس سے مل جائیں گے۔

اورنگزیب نے دارا شکوہ کی طاقت توڑنے کیلئے راجا جسونت سنگھ کے نام معافی کا فرمان جاری کر دیا۔ راجا جسونت اس لئے دارا شکوہ سے غداری پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے ایک پٹے ہوئے مہرے کے مقابلے میں اورنگزیب کو ترجیح دی۔

راجا جسونت سنگھ کی طرف سے مطمئن ہو کر اورنگزیب نے اجمیر جانے کا فیصلہ کیا۔ ادھر دارا شکوہ، اجمیر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ آخری وقت تک راجا کو رام کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر اس کی مراسلت کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ راجا جسونت سنگھ سے دارا شکوہ کی تمام امیدیں منقطع ہو گئیں۔ اسی دوران میں اورنگزیب کے اجمیر پہنچنے کی اطلاع ملی۔

دارا شکوہ نے مقابلے پر کمر باندھ لی لیکن اورنگزیب اور اس کے لشکر کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ کھلے میدان میں جنگ کرنا دارا شکوہ کیلئے مفید نہ تھا۔ وہ اسی لئے اجمیر کے نواحی کوہستان میں مورچے باندھ کر محصور ہو گیا۔

اورنگزیب نے دارا شکوہ کی مورچہ بندیوں سے نصف کوس کے فاصلے پر لشکر گاہ قائم کی اور مورچہ بندی کا حکم دے دیا۔ یہاں سے بہ آسانی دارا شکوہ کے مورچوں پر گولہ باری کی جا سکتی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ یہ جنگ انتہائی خونریز اور ہلاکت آفریں ہو گی۔ گزشتہ جنگ میں عارج موت کے منہ میں جاتے جاتے بچا تھا۔ اب میں ہرگز ایسا نہیں چاہتی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ جنگ چھڑتی میں نے ایک رات شہزادی آسائش بانو کے جسم کو چھوڑ دیا۔ اکبر آباد سے اجمیر پہنچنا ایک جن زادی کیلئے کون سا مشکل تھا! آسائش بانو کو میں گہری نیند سلا آئی تھی۔

نصف شب سے زیادہ گزر چکی تھی جب میں اورنگزیب کی لشکر گاہ میں پہنچی۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

عارج کا خیمہ اورنگزیب کے خیمے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں وہاں پہنچی اور خیمے میں داخل ہوئی تو عارج کو بے خبر سوتے دیکھا، وہ خیمے کے اندرونی حصے میں تھا۔ اس کے خدمت گار بیرونی حصے میں تھے۔ میں نے اسی لئے عارج کو دھیرے سے جگایا۔

''چل اے عارج، اس جسم سے نکل چل!'' میں دھیمی آواز میں بولی۔

''کہاں اے دینار؟'' عارج نے سوال کیا۔

''جہاں بھی کہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کیا تجھے میرے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض ہے؟''

''نہیں اے دینار!......'' وہ یہ کہتے ہی ضالح کے قالب سے نکل آیا اور اس پر نیند

مسلط کر دی۔

فوری طور پر عارج کو ساتھ لئے ہوئے میں قریبی پہاڑوں کی طرف نکل آئی۔ وہاں میں ایک چٹان کے نیچے بیٹھ گئی۔

"ہاں اب ذرا بتا کر تو اچانک یہاں کیسے آ گئی؟" عارج نے پوچھا۔ وہ بھی میرے پاس بیٹھ چکا تھا۔

مختصراً میں نے عارج کو ممکنہ خطرے سے آگاہ کیا اور بولی۔ "ان حالات میں تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ وقتی طور پر صالح کے انسانی قالب کو چھوڑ دے۔ ضروری نہیں کہ اس قالب سے نکل کر فوراً ہی تو کوئی دوسرا قالب اپنا لے۔"

عارج کیلئے میری بات سمجھنا دشوار نہ ہوا۔ وہ اسی رات میرے ساتھ اکبر آباد آ گیا۔ کسی انسانی قالب میں پناہ لئے بغیر بھی ہم خطرے سے محفوظ رہ سکتے ہیں، مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اسی بنا پر میرے نزدیک عارج کو بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ یوں بھی صالح کے جسم سے نکل آنے کا اقدام عارضی تھا۔ جنگ کے بعد عارج پھر اس انسانی پیکر کو اپنا سکتا تھا۔

ممکنہ جنگ کے بارے میں میرے خدشات اور اندیشے درست ہی ثابت ہوئے۔

اس خونریز معرکے میں دونوں جانب کے بڑے بہادر لڑاکا مارے گئے۔ صالح بھی کئی بار موت کے منہ میں جانے سے بچا۔ وہ اوپر سے لڑھکائے جانے والے ایک بڑے پتھر کی زد میں آتے آتے بچا، مگر لڑائی کے دوران وہ شدید زخمی ہو گیا۔ اسے پچھلی صفوں میں پہنچا دیا گیا کیونکہ وہ اگلی صفوں میں لڑ رہا تھا۔ لڑتے ہوئے جو افراد زخمی ہو جاتے انہیں پچھلی صفوں میں پہنچا دیا جاتا۔ جہاں جراح و طبیب انہیں پوری طبی امداد فراہم کرتے۔ اس میں منصب دار یا کسی عام فوجی کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔

میرے انسانی قالب شہزادی آسائش بانو کا نانا شاہ نواز خان بھی اس جنگ میں بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے مارا گیا۔

دارا شکوہ کو جب شاہ نواز خان کے مارے جانے کی خبر ملی تو اسے شکست کا یقین ہو گیا۔ وہ اپنی بیوی اور چار خواصوں کے ساتھ بہت تھوڑے جواہر اور اشرفیاں لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

دارا شکوہ کا سارا لاؤ لشکر تاخت و تاراج کر دیا گیا۔ اس کے جو امیر زندہ بچ گئے انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔

مغل لشکر جب اجمیر سے دوبارہ اکبر آباد لوٹ کر آیا تو صالح کسی حد تک صحت یاب

ہو چکا تھا، مگر اب بھی اسے علاج اور آرام کی ضرورت تھی۔ عارج تو اس کا منتظر ہی تھا کہ صالح کب اکبر آباد آئے۔ اس نے مجھ سے کہا "اے دینار! اگر تو کہے تو میں دوبارہ صالح کے جسم میں پناہ لے لوں؟"

"سوچ لے، وہ ابھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا۔" میں بولی۔

"بس سوچ لیا۔" عارج کہنے لگا "اس کے جسم میں اتر کر اورنگزیب سے میں، اکبر آباد میں رک جانے کی اجازت لے لوں گا۔"

"اورنگزیب اجازت دے دے گا؟" میں نے سوال کیا۔

"مجھے توقع ہے کہ وہ منع نہیں کرے گا۔" عارج نے جواب دیا۔

پھر وہی ہوا جو عارج نے کہا۔ اورنگزیب نے عارج کے انسانی پیکر صالح کو اکبر آباد میں رکنے کی اجازت دے دی۔ عارج نے اب صالح کے جسم پر قبضہ کر لیا تھا۔ اورنگزیب مزید ایک ماہ اکبر آباد میں قیام کر کے شاہجہان آباد چلا گیا۔

صالح کے قالب میں عارج اب قلعہ اکبر آباد میں تھا۔ اس نے اسی حویلی میں قیام کیا جہاں پہلے رہتا تھا۔ شہزادی آسائش بانو کی حیثیت سے میں نے اس کی عیادت ضروری تھی۔ اب اکبر آباد میں نہ تو شہزادہ محمد سلطان تھا نہ امیر الامراء ذوالفقار خان اس لئے مجھے اور عارج دونوں ہی کو کوئی فکر نہ تھی۔ جب اورنگزیب شاہجہان آباد روانہ ہوا تو عارج کے زخم مندمل ہونے لگے تھے، مگر اس نے مصلحتاً دانستہ بستر نہ چھوڑا۔ میرے ایما پر اس نے یہی شہرت دے رکھی تھی کہ ابھی وہ بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں ہوا۔ مبادا اورنگزیب پھر اسے اپنے ساتھ شاہجہان آباد چلنے کا حکم صادر کرے۔ صحت یاب ہونے کے بعد بھی اس کا ارادہ شاہجہان آباد جانے کا نہ تھا۔ وہ میرے پاس اکبر آباد میں رہنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ میری مرضی یہ تھی کہ وہ مراد بخش کے معاملے کو بھی نمٹا دے۔ میں اس سے یہ اظہار بھی کر چکی تھی۔

میری چشم تصور متحرک تھی۔ فقیروں کے ایک گروہ کو میں قلعے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ان فقیروں کی نظریں قلعے کے پھاٹک پر تھیں۔ عشاء کی نماز کے بعد روز انہیں قلعے سے کھانا ملتا تھا۔ قلعے کا پھاٹک کھلا تو ان کے چہرے پر رونق آ گئی۔ پھاٹک سے چار سپاہی نکلے اور انہیں کھانا تقسیم کر کے چلے گئے۔ وہ ٹکڑیوں میں بٹ کر کھانا کھانے لگے۔ دو ادھیڑ عمر فقیر بقیہ سے ہٹ کر بیٹھے تھے۔ انہی دونوں میں سے ایک اپنے ساتھی کی طرف جھکا اور سرگوشی کی۔ "وہ کب آئیں گے؟"

دوسرے نے مدہم آواز میں جواب دیا "جب نصف شب ہو جائے گی۔"

پہلے فقیر نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور کھانا کھانے لگا۔

یہ سلیم گڑھ کا قلعہ تھا اور یہاں اورنگزیب کا بھائی مراد بخش ایام اسیری گزار رہا تھا۔ اس سے میرا تعلق یہ تھا کہ وہ میرے انسانی قالب آسائش بانو کا باپ تھا۔ مراد بخش کو خورد و نوش کیلئے روزانہ جو خرچ ملتا، اسی میں فقیروں کیلئے کھانا پکتا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ قلعے کے باہر فقیر بیٹھے رہتے ہیں۔ مراد بخش کو جو خرچ ملتا تھا وہ کافی ہوتا تھا۔ اس میں فقیروں کو بھی کھانا کھلایا جا سکتا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ اس پر قلعہ دار اعتراض کرتا۔ فقیروں کو کھانا ملنے لگا۔ اس سے مراد بخش کا منشا صرف اتنا تھا کہ اس کی سخاوت کی دھوم ہو، یہ کہ ایام اسیری میں بھی اس نے خلق خدا کا خیال رکھا۔ اسے یقین تھا کہ جلد یا بدیر رہائی مل جائے گی۔ اورنگزیب اسے زیادہ دن قید نہ رکھ سکے گا۔ اس کے خیال میں اورنگزیب کو کوئی بڑی غلط فہمی ہو گئی تھی۔ اس سے قطع نظر مراد بخش کو اپنے بہی خواہوں اور دیرینہ وفاداروں سے بھی امید تھی کہ وہ اس کی رہائی کیلئے کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکالیں گے۔ سلیم گڑھ کے مضبوط قلعے سے خود مراد بخش کا نکلنا ناممکن تھا۔ جب تک باہر سے کوئی کوشش نہ ہوتی۔ اسے اس قلعے میں قید ہوئے یہ دوسرا سال تھا۔ اس عرصے میں باہر کیا ہوا اسے کچھ خبر نہ تھی۔

قید کے دوران میں مراد بخش نے اورنگزیب سے صرف دو رعایتیں چاہی تھیں۔ اورنگزیب کے حکم پر یہ دونوں رعایتیں مل گئی تھیں۔ شام ہوتے ہی وہ زندان میں اسی طرح محفل سجاتا، بادہ و ساغر بھی ہوتے اور ساقی بھی! غرق مئے ناب ہو کر وہ بھول جانا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا گزر چکی ہے! سوسن اس کی دل بستگی کا پورا خیال رکھتی۔ جب سے سوسن آئی تھی، قید اسے زیادہ گراں معلوم نہ ہوتی تھی۔ مے نوشی ہی کے دوران میں کھانا کھاتا اور پھر مسلح پہرے داروں کی نگرانی میں زندان کی کوٹھری سے نکل کر چہل قدمی کرتا۔ اس کے بعد سوسن کو اور اسے کوٹھری میں بند کر دیا جاتا۔ کوٹھری میں ضرورت کا تمام سامان تھا تا کہ رات کے وقت کسی ضرورت سے اسے باہر نہ نکلنا پڑے۔

رات بھر کوٹھری کے طاق میں چراغ روشن رہتا۔ مراد بخش نے پہلے اس پر اعتراض کیا تھا، پھر اسے روشنی کی عادت ہو گئی تھی۔ ہاں پہرے داروں نے اس کی یہ بات ضرور مان لی تھی کہ رات کے وقت کوئی پہرے دار آہنی سلاخوں والے دروازے کے سامنے آ کر کھڑا نہ ہوتا۔ اس سے مراد بخش کی خلوت پر اثر پڑتا تھا۔ اس رات بھی وہ نصف شب سے کچھ پہلے سو گیا تھا۔ اسے خبر نہ تھی کہ وہ رات اس کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہو سکتی ہے۔

مراد بخش قلعے کے اندر اپنی کوٹھری میں محو خواب تھا اور قلعے کے باہر دو سپاہی آخری

گشت لگانے نکلے تھے۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ قلعہ دار کا حکم تھا کہ نصف شب کے قریب قلعے کے باہر کا جائزہ لیا جائے۔ اگر اس وقت کوئی شخص قلعے کے آس پاس نظر آئے تو اسے ہٹا دیا جائے اور مشتبہ دکھائی دے تو گرفتار کر لیا جائے۔ کھانا کھانے کے بعد فقیر ایک ایک کر کے وہاں سے چلے جاتے تھے، مگر اس رات دو فقیر قلعے کی دیوار کے قریب چادر بچھائے سوئے نظر آئے۔ دونوں سپاہی اپنے ہاتھوں میں مشعلیں اٹھائے ان دونوں کی طرف بڑھ گئے۔ یہ وہی فقیر تھے جو کھانا کھاتے ہوئے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

دور سے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ دونوں قریب قریب چادر بچھائے ہوئے سو رہے ہیں مگر درحقیقت ایسا نہ تھا۔ دونوں فقیر جاگ رہے تھے، سپاہیوں کے قریب پہنچتے ہی وہ دونوں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہی میں سے ایک فقیر نے اپنی گدڑی سے ایک کاغذ نکالا اور ایک سپاہی کو تھما دیا۔ سپاہیوں اور ان فقیروں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ سپاہی لوٹ کر پھر قلعے کی طرف چلے گئے۔ فقیروں نے اٹھ کر اپنی چادریں اور سامان سنبھال لیا اور ایک جانب بڑھنے لگے۔ دونوں سپاہی قلعے کے پھاٹک میں داخل ہو گئے تو فقیر پھر اسی جگہ واپس آ گئے۔ قلعے میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ زیادہ تر پہرے دار اونگھ رہے تھے۔ دونوں سپاہی انہی اونگھتے ہوئے پہرے داروں میں سے ایک کے پاس پہنچے۔ اونگھتا ہوا پہرے دار ایک دم مستعد نظر آنے لگا۔

ایک سپاہی نے اس پہرے دار کو وہ کاغذ تھما دیا جو اسے فقیر نے دیا تھا۔ پہرے دار نے وہ کاغذ جلدی سے اپنی جیب میں سرکا لیا۔ دونوں سپاہی وہاں سے لوٹ گئے۔ سپاہیوں کے قدموں کی چاپ معدوم ہو گئی تو پہرے دار نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا کہ فرش پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ پہرے دار نے اپنے ساتھی کا شانہ پکڑ کر ہلایا تو وہ جاگ اٹھا۔

”کیا وقت ہو گیا ہے؟“ پہرے دار کے ساتھی نے دہشت زدہ آواز میں پوچھا۔

”ہاں، پیغام آ گیا ہے، ہوشیار ہو جاؤ!“ پہرے دار نے سرگوشی کی اور پھر دبے پاؤں کوٹھری کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے کوٹھری کا قفل کھولا کہ زیادہ آواز نہ ہو۔ پھر وہ کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ اس نے چراغ کی روشنی میں کوٹھری کا جائزہ لیا۔ مراد بخش اور سوسن دونوں ہی بے خبر سو رہے تھے۔ پہرے دار، مراد بخش کے بستر کی طرف بڑھا۔

مراد بخش کو پہرے دار نے اس طرح جگایا کہ سوسن کی آنکھ نہ کھلے۔ مراد بخش نے نشے اور نیند سے سرخ آنکھیں سوالیہ انداز میں پہرے دار کی طرف اٹھائیں۔ پہرے دار نے

پیغام نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور خاموشی کے ساتھ دبے پاؤں کوٹھری کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر اس نے کوٹھری کے دروازے کو قفل نہ لگایا بلکہ اسے صرف بھیڑ دیا اور پھر دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔

ابھی تک مراد بخش کا ذہن نشے سے بوجھل تھا۔ کچھ دیر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے! پھر اسے کاغذ کا خیال آیا جو پہرے دار دے گیا تھا۔ وہ اٹھ کر چراغ کے قریب گیا اور اسی عالم میں کاغذ کی تہہ کھول کر عبارت پڑھنے لگا۔

☆......☆......☆

پہلا فقرہ پڑھ کر مراد بخش کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ بغیر القاب و آداب کے لکھا گیا تھا کہ یہ آپ کی رہائی کی رات ہے۔ پھر اس کی نظر تیزی سے بقیہ عبارت پڑھنے لگی۔

"کوٹھری کا دروازہ اس وقت کھلا ہوا ہے۔ آپ کو باہر نکلنے سے روکا نہیں جائے گا۔ آپ کے کچھ وفادار قلعے میں ہیں جو آپ کو ایک کمند تک پہنچا دیں گے۔ کمند قلعے کی فصیل پر لگا دی گئی ہے۔ جیسے ہی آپ کوٹھری سے نکلیں گے، آپ کا یہ وفادار آگے چلنے لگے گا۔ آپ احتیاط اور خاموشی کے ساتھ اس کے پیچھے ہو جائیں۔ قلعے کی فصیل پر جہاں کمند لگائی گئی ہے ایک پہرے دار مشعل لئے کھڑا ہو گا جو آپ کے قریب آتے ہی وہاں سے ہٹ جائے گا۔ آپ خوب واقف ہیں کہ قلعے میں آپ کی حفاظت کا کتنا سخت بندوبست ہے! ذرا سا بھی شور ہونے پر ہر طرف سے مسلح پہرے دار دوڑ پڑیں گے اس لئے درخواست ہے کہ خاموشی اور احتیاط سے کام لیں۔" اس عبارت کے نیچے کسی کا نام درج نہیں تھا۔

مراد بخش اب پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ اس کے چہرے سے دبے دبے جوش کا اظہار ہونے لگا۔ وہ بستر کے قریب آیا اور پیغام کو تکیے کے نیچے رکھ دیا، پھر سوسن کی طرف نگاہ اٹھائی جو اب تک غافل سو رہی تھی۔

میری توجہ مراد بخش کی نقل و حرکت کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن پر بھی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا، میں تنہا فرار ہو گیا تو بے گناہ سوسن پر الزام آئے گا اور یہ قتل کر دی جائے گی۔ پھر اس نے خود ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اب وہ یہ سوچنے لگا کہ کم از کم سوسن کو اس بھید سے آگاہ تو کر دے اور اسے سمجھا دے۔

اس نے سوسن کو جگایا اور ساری بات بتا کر بولا۔ "تم سے پوچھ گچھ ہو تو کہہ دینا تمہیں کچھ خبر نہیں، تم سو رہی تھیں۔"

سوسن ابھی تک نیم غنودگی کے عالم میں تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مراد بخش سچ

کہہ رہا ہے۔ وہ منہ پھاڑے مراد بخش کو دیکھے جا رہی تھی۔ مراد بخش نے اسے پھر مخاطب کیا۔

"اب ہم چلتے ہیں۔ تمہیں ہم نے خدا کے سپرد کیا۔ اگر زندگی نے وفا کی اور تقدیر مددگار ہوئی تو پھر ملیں گے۔" یہ کہتے ہی مراد بخش کھڑا ہو گیا اور چلنے کے لئے پلٹا۔

سوسن نے جو یہ دیکھا کہ واقعی مراد بخش جا رہا ہے تو اس نے ایک چیخ مار کر مراد کا دامن پیچھے سے تھام لیا اور روتے ہوئے کہنے لگی:

"آپ مجھے کس کے سپرد کر کے جا رہے ہیں؟ خدا کے لئے مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلئے!"

مراد رک گیا اور پلٹ کر اسے نزاکت وقت کا احساس دلانے لگا، مگر سوسن اور زیادہ آہ و فغاں کرنے لگی۔

سوسن کی آہ و زاری سے محافظ ہوشیار ہو گئے۔ پھر ہر طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔

ذرا سی دیر میں اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ وہ پہرے دار جس نے مراد کی کوٹھری کا قفل کھول دیا تھا۔ یہ رنگ دیکھ کر جلدی سے جھپٹا اور پھر اس نے دوبارہ قفل لگانے میں دیر نہ کی۔ اسے بہر حال اپنی زندگی عزیز تھی۔ فصیل پر جہاں کمند لگائی گئی تھی، اس کے قریب جو پہرے دار مشعل لئے کھڑا تھا، ہنگامہ ہوتے ہی اپنی جگہ سے بھاگ گیا۔

قلعے کے اندر شور اور ہنگامے کی آوازیں سن کر باہر کھڑے ہوئے دونوں فقیر بھی فرار ہو گئے۔

مراد بخش کو قید سے رہائی دلانے کی کوشش خود اس کی سادہ لوحی کے سبب ناکام ہو گئی۔

دوسرے دن وہ دونوں فقیر عارج کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے، مگر اس وقت ان کے جسموں پر بہترین لباس تھا۔ وہ دونوں عارج کے انسانی پیکر صالح کے وہی خدمت گار تھے جن سے صالح بھی اس نوعیت کے کام لیتا رہتا تھا۔ ان دونوں کا کوئی قصور نہ تھا اور نہ عارج کی غلطی تھی۔ اس نے مراد کی رہائی کا منصوبہ کافی غور و غوض کے بعد بنایا تھا۔ اس میں عارج یا اس کے منصوبے کی کوئی خامی نہ تھی۔ اس کے دونوں خدمت گاروں نے اسی منصوبے پر عمل کیا تھا۔ عارج نے اسی لئے ان سے جواب طلبی نہیں کی اور انہیں نئی ہدایات دیں۔

ادھر شاہجہان آباد میں اورنگ زیب کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ مراد بخش کو فوری طور پر سلیم گڑھ کے قلعے سے نکال کر گوالیار کے قلعے میں محصور کر دیا جائے۔ اس حکم کے ساتھ اس نے بقیہ ہدایات بھی دیں کہ مراد کی منتقلی کو انتہائی راز میں رکھا جائے۔ جو

رعایتیں مراد کو پہلے دی گئی تھیں، وہ بھی واپس لے لی گئیں۔ اسے بیڑیاں پہنانے کا حکم ہوا۔ ساغر و مینا اور ساقی کو بھی اس سے جدا کرنے کی ہدایت ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اورنگ زیب اس معاملے کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتا تھا، قرائن سے یہی پتا چل رہا تھا۔

مجھے اور عارج کو اکبرآباد میں رہتے ہوئے چار سال بیت چکے تھے۔ اس عرصے میں کئی اہم واقعات رونما ہوئے تھے۔ ان واقعات کی وجہ سے اورنگ زیب کا اقتدار مزید مضبوط و مستحکم ہو چکا تھا۔ داراشکوہ کا کانٹا گزشتہ سال ہی نکل گیا تھا۔ دہاندر کے ایک زمیندار ملک جیون نے اس سے غداری کی۔ داراشکوہ کو گرفتار کرلیا گیا۔ پھر شاہجہان آباد پہنچنے پر دوسرے ہی دن اسے اورنگزیب کے حکم پر قتل کر دیا گیا۔

دوسرا بھائی شجاع حکومت و اقتدار سے محروم ہونے کے بعد مفقود الخبر ہو چکا تھا۔ اب صرف مراد زندہ بچا تھا جو گوالیار کے قلعے میں قید تھا۔ اورنگزیب کو داراشکوہ کے معاملے میں بڑی بدنامی اٹھانی پڑی تھی۔ اس نے مراد کو راستے سے ہٹانے کیلئے ایک اور راہ اختیار کی اورنگ زیب نے اس سلسلے میں جس تدبیر پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی سن گن عارج کو بھی ہو گئی۔ اس کے مخبر شاہجہاں آباد سے ایک ایک خبر پہنچا دیتے تھے۔ عارج اس لئے فکر مند ہو گیا۔

مراد کے متعلق عارج کو جو خبریں ملتی تھی اور وہ جو قدم بھی اٹھاتا تھا، میں بھی اس سے بے خبر نہ رہتی تھی۔ عارج مجھے ہر بات بتا دیتا تھا۔ کچھ باتیں میں اپنے طور پر معلوم کر لیتی تھی۔ مراد کے باب میں اورنگ زیب کے احکام پر اتنی رازداری سے عمل ہوا تھا کہ کافی دن بعد عارج کو حالات کا علم ہو سکا۔ گوالیار کے قلعے میں اس قدر سخت انتظامات تھے کہ کئی بار کوشش کے باوجود عارج کے آدمیوں کو ناکامی ہوئی۔ اسی کے پیش نظر ایک روز عارج مجھ سے کہنے لگا۔ ''اے دینار! اب ایسا لگتا ہے کہ خود مجھی کو گوالیار جانا پڑے گا۔''

''اس معاملے میں تجھے زیادہ جلد بازی کرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے تاکید کی۔
''تجھ پر اورنگ زیب کو شک نہیں ہونا چاہئے۔ یہ نہ بھول کہ مراد بخش کو جب سلیم گڑھ کے قلعے میں رکھا گیا تھا تو وہاں بھی تو گیا تھا اور اب گوالیار جانے کی بات کر رہا ہے۔''

''کسے یاد ہوگا کہ میں سلیم گڑھ گیا تھا۔'' عارج بولا۔

''یہ نہ سمجھ! یاد رکھنے والے سب یاد رکھتے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ ابھی کچھ دن اور ٹھہر جا۔'' میں نے سمجھایا۔

عارج مان گیا۔ اس کے چند ہی روز بعد ایک نیا فتنہ کھڑا ہو گیا۔ عارج کو اس کے

مخبروں نے خبر دی تھی کہ شاہجہاں آباد کا ایک نوجوان عرفان بیگ، مراد بخش پر اپنے باپ کے خون کا دعویٰ کرنے والا ہے۔ مخبروں نے اس بارے میں تمام ضروری معلومات فراہم کی تھیں۔

عرفان بیگ ایک شخص علی نقی کا بیٹا تھا۔ مراد بخش جب احمد آباد کا صوبے دار تھا تو یہی علی نقی اس کا دیوان اور مشیر تھا۔ کسی بات پر خفا ہو کر مراد نے اس کے سینے میں برچھی گھونپ دی۔ پھر خواجہ سراؤں نے مراد کے اشارے پر علی نقی کو قتل کر دیا۔ یہ پورا واقعہ کس طرح پیش آیا۔ عارج کے مخبروں نے بھی اس سلسلے میں کچھ نہ لکھا تھا۔ وہ چھان بین کر رہے تھے۔ مخبروں کی اطلاعات کے مطابق شاہجہاں آباد میں ہر طرف یہی خبریں گشت کر رہی تھیں۔ ایک غیر مصدقہ اطلاع یہ بھی تھی کہ اورنگ زیب کے دربار کا ایک امیر کنور رام سنگھ بھی خفیہ طور پر عرفان بیگ سے ملا ہے۔ عارج کو اس آخری اطلاع سے کچھ زیادہ وزن معلوم نہ ہوا۔ میری رائے مختلف تھی، مگر میں نے فی الحال اس کا اظہار نہیں کیا۔ یوں بھی اس اطلاع کی تصدیق نہ ہو سکی۔

''میرا خیال یہ ہے اے دینار کہ اس قتل کے دعوے میں کم از کم اورنگ زیب کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔'' عارج نے رائے زنی کی۔

''تصدیق کے بغیر حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا' لیکن مجھے لگتا ہے اے عارج تو اورنگ زیب کی طرف سے کچھ زیادہ ہی خوش فہمی کا شکار ہے۔ اس کا سبب غالباً تیرا انسانی قالب ہے جو اورنگ زیب کا وفادار ہے۔'' میں نے اپنی بات کہہ ہی دی۔

''اے دینار! حالات کا تقاضا یہ ہے کہ میں خود شاہجہاں آباد جاؤں۔'' عارج کہنے لگا۔ ''اگر شاہ جہاں آباد سے آنے والی اطلاعات درست ہیں تو میں ہر قیمت پر عرفان بیگ کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) عبدالوہاب کی عدالت میں یہ دعویٰ دائر کرنے سے روک دینا چاہتا ہوں۔ میں نے یہ قدم نہ اٹھایا تو مراد بخش کو سزائے موت سنا دی جائے گی۔''

''تیری تمام باتیں درست سہی مگر تو یہ بھول رہا ہے کہ تو چار ہزاری منصب دار ہے کوئی معمولی آدمی نہیں جو تیری غیر حاضری اخفا میں رہ سکے۔ خفیہ طور پر شاہ جہاں آباد جا کر واپس آ جانا ذرا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری نہیں کہ عرفان بیگ دعویٰ نہ کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ میں پھر تجھے یہ تاکید کروں گی کہ حالات کے دباؤ میں آ کر کوئی غیر ذمہ دارانہ قدم نہیں اٹھانا...... کوئی ایسا قدم جو کسی آدم زاد کیلئے اٹھانا ناممکن ہو۔'' میں نے عارج کو اچھی طرح سمجھایا۔

''اللہ مالک ہے۔'' عارج نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''وہی کوئی راہ نکالے گا' تو مطمئن رہ' میں اپنی جناتی صفات بروئے کار نہیں لاؤں گا۔''

دو روز بعد ہی راہ نکل آئی۔ میر سامان فاضل خان سے عارج کی ملاقات ہوگئی۔ عارج جس بہانے کی تلاش میں تھا' اسے ہاتھ آ گیا۔ چند دن پہلے اورنگ زیب نے میر سامان فاضل خان کو حکم بھیجا تھا۔ فاضل خان اس حکم کی تعمیل میں اس دن آخری بار نظر بند شاہ جہاں سے ملا تھا۔ اورنگ زیب کی ہدایت تھی کہ کہ سختی کئے بغیر شاہجہاں سے وہ جواہر' مرواریداور مرصع اشیاء حاصل کر لی جائیں جو اس کے استعمال میں ہیں۔ حکم میں کوئی معیاد مقرر نہیں کی گئی تھی۔

اول اول شاہجہاں گریز کرتا رہا' مگر جب فاضل خان کا تقاضا بڑھتا گیا اور ایک خواجہ سرا ہر وقت اس کے سر پر مسلط رہنے لگا تو وہ جھنجھلا گیا۔ اس نے تمام مطلوبہ اشیاء ان کے حوالے کر دیں۔ اسی ضمن میں اورنگ زیب نے بھی شاہجہاں کو ایک خط لکھا تھا۔ وہ خط بھی میر سامان فاضل خان نے شاہجہاں کو پہنچا دیا تھا۔ اس خط میں اورنگ زیب نے شاہ جہاں کو لکھا تھا کہ ایسے قیمتی تحفے جو ایام سلطنت کی پوشاک سے متعلق ہیں' اس گوشہ نشینی میں اپنے پاس رکھ چھوڑنا تقوے کے خلاف ہے۔

شاہجہاں نے صرف ایک تسبیح اپنے پاس رہنے دی مگر فاضل خان کے مقرر کردہ خواجہ سرا نے اس کا مطالبہ بھی کر دیا۔ یہ تسبیح مروارید کی تھی۔ تسبیح کے سو (100) دانے تمام کے تمام ہم رنگ اور ہم وزن تھے۔ ان دانوں کو بڑی تلاش سے فراہم کیا گیا تھا اور تسبیح کے لئے امام بھی بڑی کوششوں کے بعد دستیاب ہوا تھا۔ اس تسبیح کی مالیت اس زمانے میں چار لاکھ روپے تھی۔ یہ تسبیح شاہ جہاں نے الماس کی ایک آرسی کے ساتھ اپنے گلے میں ڈال رکھی تھی۔ اس نے آرسی تو اتار کر دے دی اور دوسرے جواہر بھی مگر تسبیح نہ دی۔

جب خواجہ سرا نے اس تسبیح کیلئے بھی اصرار کیا تو شاہجہاں کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا' وہ غصے میں بولا۔ ''اس سے وظیفہ پڑھا جاتا ہے' اگر اسے دینا ہی ہوا تو میں ہاون میں کوٹ کر بھجواؤں گا۔''

خواجہ سرا یہ درشت جواب سن کر خاموشی کے ساتھ میر سامان فاضل خان کے پاس لوٹ آیا۔

سختی کرنے کیلئے اورنگ زیب نے منع کیا تھا اس لئے فاضل خان نے بقیہ اشیاء پر صبر کیا جن کی مالیت سولہ لاکھ روپے کے قریب تھی۔ اب فاضل خان یہ تمام مرصع اور قیمتی اشیاء لے کر شاہ جہاں آباد جانے والا تھا۔ شاہ جہاں آباد کو اب اورنگ زیب نے باقاعدہ طور پر اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا۔ اکبر آباد کو اب پہلی سے اہمیت حاصل نہیں رہی تھی۔

عارج نے میر سامان فاضل خاں کو شیشے میں اتار لیا۔ ایک قیمتی تحفے کے عوض میر سامان اس پر راضی ہو گیا کہ مطلوبہ اشیاء کے حصول میں اورنگ زیب کے سامنے عارج کے انسانی پیکر صالح کا نام بھی لے دے۔ میر سامان کو اورنگ زیب کے حضور یہ کہنا تھا کہ اس سلسلے میں صالح نے بڑی کوشش کی ہے اور وہ اورنگ زیب کی قدم بوسی کیلئے ساتھ ہی شاہ جہاں آباد آیا ہے۔ اس طرح اورنگ زیب بھی اس سے خوش ہو جاتا اور اسے شاہجہاں آباد میں عرفان بیگ سے ملنے کا موقع بھی ہاتھ آ جاتا۔

عارج کو یقین تھا کہ وہ اپنی پراسرار جناتی قوتوں کو استعمال کئے بغیر ہر حال میں عرفان بیگ سے اپنی بات منوا لے گا۔ کسی سے اپنی بات منوانے کیلئے بہ حیثیت آدم زاد اس کے پاس دو راستے تھے' انعام و اکرام اور دولت کا لالچ یا پھر طاقت کا استعمال! ضرورت پڑنے پر وہ کوئی بھی راہ اختیار کر سکتا تھا لیکن پہلے اصل معاملے کی تہہ تک پہنچنا ضروری تھا' اس کے بعد وہ کوئی قدم اٹھاتا۔ اس کے لئے دونوں ہی صورتیں آسان تھیں۔ وہ دولت کے ذریعے عرفان بیگ کو خرید سکتا تھا اور ضرورت پڑنے پر اسے قتل بھی کرا سکتا تھا۔ اسے ہر صورت میں اپنا مقصد حاصل کرنا تھا۔ اگر مراد بخش اس مقدمے میں ماخوذ ہو کر مروا دیا جاتا تو اسے ہی نہیں مجھے بھی افسوس ہوتا۔ مراد بخش سے میری دلچسپی اور تعلق کا سبب آسائش بانو کا انسانی قالب تھا۔ اسی قالب کی فطری صفات کے سبب میرے دل میں اس کی عزت اور محبت تھی' وہ محبت جو ایک بیٹی کو اپنے باپ سے ہوتی ہے۔ عارج کو بھی اس کا بخوبی علم تھا۔ شاہجہاں آباد جانے سے پہلے اس لئے عارج نے مجھے یقین دہانی کرائی کہ وہ عرفان بیگ کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لے گا۔

اس پر میں نے کوئی رائے زنی نہیں کی۔ قبل از وقت میرے لئے کچھ کہنا مشکل تھا۔ میں بہرحال عارج کی نقل و حرکت پر نظر رکھے رہی۔ وہ اکبر آباد سے روانہ ہو چکا تھا' پھر میں نے اپنی چشم تصور کی قوت سے اسے شاہجہاں آباد میں دیکھا۔ وہ میر سامان فاضل خان کے ساتھ اورنگ زیب سے ملا۔

اورنگ زیب نے خلاف توقع عارج کو میر سامان کے ساتھ دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ جب میر سامان نے اس سلسلے میں وضاحت کی تو اورنگزیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ بولا۔ ''ہم نے کچھ سوچ کر ہی تو صالح کو اکبر آباد میں چھوڑ رکھا ہے۔''

میر سامان نے مطلوبہ اشیاء اورنگ زیب کے ملاحظے میں پیش کیں۔ اورنگ زیب نے انہیں ملاحظہ کیا اور پھر داروغہ جواہر خانہ کو طلب کر لیا۔ داروغہ جواہر خانہ آ گیا تو اورنگ

زیب کے اشارے پر تمام جواہرات اور دیگر اشیاء اس کے سپرد کر دی گئیں۔

عارج نے اگلے ہی دن واپس اکبر آباد آنا تھا اس لئے عرفان بیگ سے اسی روز ملنا ضروری تھا۔ اسے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ عارج نے اسی دن شاہجہان آباد میں متعین اپنے مخبروں سے رابطہ قائم کر لیا۔ اس دوران میں عارج کے مخبر اور بہت سی باتیں معلوم کر چکے تھے۔ عرفان بیگ کے باپ علی نقی کے قتل کا پورا واقعہ عارج کے علم میں آ گیا۔

یہ واقعہ تقریباً چار سال پہلے کا تھا۔ مراد بخش کے مشیر علی نقی سے مراد کا ایک مقرب خواجہ سرا بہت حسد رکھتا تھا۔ وہ علی نقی کی دشمنی میں لگا رہتا تھا۔ علی نقی دیانت دار اور منتظم شخص تھا مگر نہایت سخت گیر اور سزا دینے میں شدید' ذرا ذرا سے قصور پر علی نقی لوگوں کو قتل کرا دیتا تھا۔ اتفاق سے ایک فقیر کو چوری کے الزام میں علی نقی کے سامنے پیش کیا گیا۔ علی نقی نے اس کے قتل کا حکم دیدیا۔ فقیر نے سزائے موت کا حکم سن کر آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور کہا۔ ''تو مجھے ناحق قتل کرا رہا ہے۔ دیکھنا تو بھی کسی دن ایسی ہی تہمت میں مارا جائے گا۔'' اس پر علی نقی نے فقیر کو ڈانٹ دیا۔

اس واقعے کے چند روز بعد ہی حاسد خواجہ سرا نے علی نقی کی طرف سے دارشکوہ کو ایک جعلی خط لکھوایا۔ طرز تحریر بالکل علی نقی ہی کا سا تھا۔ اس خط میں مراد بخش سے غداری کا مضمون لکھا ہوا تھا۔ خواجہ سرا نے ایسی تدبیر کی کہ وہ خط پکڑا گیا۔ علی نقی کے خلاف خواجہ سرا کی تدبیر کامیاب رہی۔ طلوع آفتاب سے پہلے سویرے سویرے وہ خط مراد بخش کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

خط پڑھتے ہی مراد بخش بھڑک اٹھا۔ اسے علی نقی سے یہ توقع نہ تھی۔ شدت غضب میں مراد نے حکم دیا کہ علی نقی اس وقت جس حالت میں بھی ہو' اسے حاضر کر دیا جائے۔ جس وقت چوبدار پہنچے علی نقی قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔ مراد کے کارندوں نے اسے لباس تبدیل کرنے تک کی مہلت نہ دی۔ علی نقی سمجھا کہ اسے کسی فوری نوعیت کے اہم کام کے سلسلے میں طلب کیا گیا ہے۔ وہ جلدی سے ساتھ چل دیا۔ علی نقی جب مراد بخش کے روبرو پہنچا تو دیکھا کہ وہ ہاتھ میں برچھی لئے بیٹھا ہے۔

مراد نے علی نقی کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ ''جو شخص اپنے ولی نعمت کے ساتھ نمک حرامی کرے' اس کی سزا کیا ہے؟''

علی نقی خود کو خیانت سے پاک سمجھتا تھا اس لئے بولا۔ ''ایسے شخص کو اس کی سخت سزا ملنی چاہیے۔''

یہ سن کر مراد نے وہ جعلی خط علی نقی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

علی نقی کو مراد سے تقرب' عقیدت اور اپنی وفاداری پر بھروسہ تھا۔ اس لئے اپنی صفائی پیش کرنے کے بجائے اس کے لہجے میں گستاخی کا عنصر شامل ہو گیا۔ اس نے بے باکانہ کہا۔ ''آفرین ہے اس دشمن پر جس نے یہ سازش کی اور حضور کی عقل و دانش پر افسوس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور کو عزت عطا کی' اقتدار بخشا مگر حضور اپنے دوستوں اور دشمنوں میں امتیاز نہ فرما سکے۔''

مراد پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا' اس گستاخی پر اور مشتعل ہو گیا۔ اس نے علی نقی کے سینے پر برچھی اتار دی۔ پھر اسی وقت علی نقی کو قتل کر دیا گیا۔ علی نقی کے قتل کا اصل پس منظر یہ تھا جسے مخبروں نے لفظ بہ لفظ تو نہیں مگر صحیح صحیح ضرور بیان کر دیا۔ اپنے مخبروں کی اس کارگزاری پر عارج نے انہیں انعامات دیئے اور پھر مزید کچھ دیر ان سے ضروری معلومات حاصل کرتا رہا۔ اس کے ساتھ عارج نے ان مخبروں کو کچھ ہدایات بھی دیں۔ وہ بہ خوبی صالح کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس کے قول و فعل سے قطعی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ آدم زاد نہیں بلکہ ایک جن زاد ہے جو حیرت انگیز پراسرار قوتوں کا مالک ہے۔ وہ میری ہی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔

رات کے وقت عارج معمولی لباس پہن کر خاموشی کے ساتھ شاہی مہمان خانے سے نکل گیا۔ اس وقت ایک پہر رات گزر چکی تھی۔ عارج چوری چھپے عرفان بیگ کی حویلی میں داخل ہوا۔ اس کے آدمی پہلے ہی تمام بندوبست کر چکے تھے۔

حویلی کا دروازہ توقع کے مطابق اسے کھلا ہوا ملا۔ اب عارج کے چہرے پر سیاہ نقاب تھی۔

اپنی خواب گاہ میں خلاف توقع ایک نقاب پوش کو دیکھ کر عرفان بیگ ڈر گیا۔ فطرتاً وہ بزدل تھا۔ عارج کے مسلح آدمی خواب گاہ کے دروازے پر بھی موجود تھے۔ ان کے چہرے بھی نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔

تلوار سونت کر عارج جب عرفان بیگ کی طرف بڑھا تو وہ لرزتی آواز میں بولا۔ ''تم کون.... کون ہو؟ اور مجھے کیوں قتل.....''

عرفان بیگ کی بات عارج نے کاٹ دی اور قریب پہنچ کر کہا۔ ''تو اس بات سے کوئی غرض نہ رکھ کہ میں کون ہوں صرف یہ دیکھ کہ تجھے قتل کرنا میرے بس میں ہے یا نہیں؟ .....جواب دے!''

عارج کی تلوار کو اپنی گردن کے قریب دیکھ کر عرفان بیگ جلدی سے بولا۔ ''ہاں ہاں

تم... آپ مجھے قتل... قتل کر سکتے ہیں مگر......"

"مگر یہ کہ میں تجھے قتل نہیں کروں گا۔" عارج نے تلوار کو نیام میں ڈال لیا۔

"پھر... پھر؟"

"تجھے اس وقت موت یا زندگی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔" عارج کہنے لگا۔ "اگر تو زندگی چاہے گا تو انعام پائے اور تجھے موت کی تمنا ہوئی تو یہ تمنا بھی پوری کر دی جائے گی۔ بول زندگی چاہتا ہے یا موت؟"

"مجھے انعام نہیں صرف زندگی بخش دیں۔" عرفان بیگ کانپتی آواز میں بولا۔

"کیا تو جانتا ہے کہ ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے؟ کیا تو اپنی زندگی کی قیمت ادا کر سکتا ہے؟"

عارج کے اس سوال نے عرفان بیگ کو الجھن میں ڈال دیا۔ اس کا واضح اظہار عرفان بیگ کے چہرے سے ہو رہا تھا۔

بالآخر وہ کہنے لگا۔

"میرے پاس جو کچھ بھی ہے' میں آپ کی نذر کرنے کو راضی ہوں۔"

یہ سن کر عارج ہنس دیا اور کہا۔ "تو غلط سمجھا' قیمت سے میری مراد یہ تھی' میں تو مراد بخش کا ذکر کرنا چاہتا تھا جس پر تو اپنے باپ کے خون کا دعویٰ کرنے والا ہے۔ تیری زندگی کی قیمت یہی دعویٰ ہے۔ تو اگر دعویٰ دائر نہ کرے تو زندہ چھوڑ دیا جائے گا ورنہ میں آج کی طرح کسی شب تیری گردن اڑانے کہیں بھی پہنچ سکتا ہوں۔ بتا اب کیا فیصلہ ہے تیرا؟"

عرفان بیگ نے عارج کی توقع کے مطابق جواب دیا۔ اسے زندگی عزیز تھی۔ عارج نے ایک قیمتی ہار اپنی جیب سے نکالا اور عرفان بیگ کی طرف اچھال دیا' انعام کا وعدہ اسے یاد تھا۔

عارج کو اکبر آباد سے واپس پہنچے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ شاہجہاں آباد سے ایک بری خبر ملی۔ اس کی کوششوں کے باوجود کھیل بگڑ گیا تھا۔ اب یہ خبر آئی تھی کہ علی نقی کے چھوٹے بیٹے نے باپ کے خون کا دعویٰ کر دیا۔ خبر کے مطابق کسی کو بھی اس وقت تک کچھ معلوم نہ ہوا جب تک کہ معاملہ نمٹ نہ گیا۔

خبر کی بقیہ تفصیلات یہ تھیں کہ اورنگ زیب کے حکم پر مراد بیگ کی حویلی کو حفاظت میں لے لیا گیا ہے۔ شاہی گرز بندوں کے داروغہ اللہ یار خان کا عملہ ہر وقت موجود رہتا۔ کسی کو بھی مراد بیگ سے ملنے کی اجازت نہیں۔ ان دنوں شاہجہاں آباد میں اورنگ زیب کی انصاف

پروری کے چرچے تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اب تک ایسا نہ ہوا تھا۔ کسی بھی بادشاہ نے شریعت کا اتنا خیال نہیں کیا۔ قانون اور انصاف کے تقاضے پورے کرنے کیلئے ہی اورنگ زیب نے اپنے سگے بھائی مراد بخش کی بھی پروا نہ کی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے بھائی پر خون کا دعویٰ کرنے والے کو اپنے تحفظ میں لے لیا تاکہ اس کی جان کو کوئی شخص ضرر نہ پہنچا سکے۔

شاہ جہاں آباد سے ملنے والی یہ خبر یقیناً افسوسناک تھی۔ علی نقی کے قتل کا واقعہ ایسا نہ تھا جسے نظر انداز کیا جا سکتا۔ اس واقعے سے مراد بخش پر جرم ثابت ہو جاتا۔ عارج کی سٹی گم ہو گئی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میں اس پر نظر رکھے ہوں اور مجھے تمام حالات کا علم ہے۔ وہ تو اس فکر میں تھا کہ مجھے کیا منہ دکھائے گا! شاہ جہاں آباد سے آنے کے بعد تو اس نے میرے سامنے بازی جیت لینے کا دعویٰ کیا تھا' مگر بازی الٹ گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟

میں اس حقیقت سے آگاہ تھی کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں عارج کا کوئی قصور نہیں۔ اس نے تو اپنی سی پوری کوشش کر لی تھی۔ اب ضرورت یہ تھی کہ عارج کو احساس ناکامی سے نکالنے کیلئے میں خود اس سے مل لیتی۔ ملاقات ہونے پر وہ لازماً اپنی دانست میں مجھے تازہ ترین بدلے ہوئے حالات کے متعلق بتاتا۔ عارج کی حویلی پہنچ کر میں نے اپنی آمد کی اطلاع کرائی۔

میرے آنے کی خبر پا کر عارج خود ڈیوڑھی تک آیا اور مجھے اندر لے گیا۔ میرا محافظ دستہ حسب معمول باہر ہی رکا رہا۔ اندر پہنچ کر مسند پر بیٹھتے ہی میں نے عارج کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر انتہائی پریشانی کے آثار تھے۔

"اے عارج! تجھے کیا ہوا؟..... تو اس قدر فکرمند کیوں دکھائی دیتا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

جواب میں عارج نے وہ سب کچھ بتا دیا جو پہلے ہی مجھے معلوم تھا۔

"اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ اورنگزیب دہری چال چل رہا ہے۔" میں بولی۔ "ایک طرف وہ عوام کی نظروں میں بھلا بن رہا ہے' دوسری جانب اس بہانے وہ مراد بخش کو اپنی راہ سے ہٹا دینا چاہتا ہے۔"

"ہاں اے دینار! میں بھی اس نتیجے پر پہنچا ہوں..... لیکن اب بھی ایک موقع ہے' زیادہ مایوسی کی ضرورت نہیں۔" عارج نے کہا۔ "بتا تیرے دماغ میں کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

عارج کے ذہن میں جو کچھ تھا' اس نے مجھے بتا دیا۔

"نہیں۔" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "اس میں خطرہ ہے۔ میں تجھے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔"

"وہ کیوں اے دینار؟" عارج نے سوال کیا۔

"اس لئے اے عارج کہ تو شاید اب تک اورنگزیب کو سمجھ نہیں سکا۔" میں نے جواب دیا۔ "اورنگ زیب ابھی تک مراد بخش کو سلیم گڑھ کے قلعے سے فرار کرانے کی سازش کو بھولا نہیں ہوگا۔ اسے اندازہ ہے کہ کچھ نامعلوم لوگ مراد بخش کو رہائی دلانا چاہتے ہیں۔ اس آگہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مراد بخش کے ان نامعلوم ہمدردوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دے۔"

"تیرا کہنا ٹھیک ہے اے دینار، مگر مراد بخش کو قاضی القضاء کی عدالت میں پیش تو کیا ہی جائے گا۔" عارج کہنے لگا۔

"اس کے لئے اسے بہرحال گوالیار سے شاہ جہاں آباد لایا جائے گا اور یہی وہ موقع ہوگا کہ....."

"میں سمجھ گئی کہ تو کیا کہنا چاہتا ہے۔" میں نے عارج کی بات کاٹ دی۔ "ابھی چوتھے سال کے جشن جلوس میں ایک ماہ باقی ہے۔ تیرے منصب کے پیش نظر ظاہر ہے کہ تجھے بھی جشن میں شرکت کی دعوت دی جائے گی۔ میں تجھے جشن میں شرکت سے نہیں روکتی، میرا مقصد محض یہ ہے کہ تو کوئی خطرہ مول نہ لے۔ تو یہ جانتا ہوگا کہ اورنگ زیب کو تجھ پر ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو وہ تجھے معاف نہیں کرے گا۔"

"تو مطمئن رہ اے دینار! میں کوئی غیر محتاط قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ اورنگ زیب میری طرف سے بدگمان ہوا تو مجھے یہ جسم ہمیشہ کے لئے چھوڑنا پڑے گا۔ اللہ نے چاہا تو اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" عارج نے یقین دہانی کرائی۔

پھر میں کچھ نہیں بولی۔ جس مقصد سے میں عارج کے پاس آئی تھی وہ پورا ہو گیا تھا۔

ایک ماہ بعد اورنگ زیب کے دوسرے امراء کی طرح عارج کو بھی صالح کی حیثیت سے تخت نشینی کے جشن میں شرکت کی دعوت ملی۔ وہ مجھ سے مل کر رخصت ہو گیا۔ اس کے باوجود میں نے اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔

عارج تخت نشینی کے جشن میں شریک ہوا۔ قدرت نے اسے شاہجہاں آباد آنے کا جو موقع فراہم کیا تھا، وہ اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا لیکن میری پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ عارج کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا۔

قاضی القضاء (چیف جسٹس) عبدالوہاب کی عدالت میں قتل کا وہ مشہور مقدمہ زیر

سماعت تھا۔ تاریخیں پڑ رہی تھی اور عینی شاہدوں کے بیانات قلم بند کئے جا رہے تھے۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ مراد بخش کو خفیہ طور پر عدالت میں پیش کیا جائے گا، کسی کو علم نہ تھا۔ عارج اس خبر کی تصدیق میں لگا ہوا تھا۔ تصدیق کے بعد ہی وہ مناسب منصوبہ بندی کر سکتا ہے۔ اس خبر کے علاوہ دوسری خبریں اور افواہیں بھی دارالحکومت میں گشت کر رہی تھیں۔ عارج ان سے بھی آگاہ تھا۔

کچھ امراء کا خیال یہ تھا کہ مراد کا بیان صفائی گوالیار کے قلعے ہی میں قلم بند کیا جائے گا۔ ان کے پاس یہ جواز تھا کہ اورنگ زیب، مراد بخش کو شاہجہاں آباد بلوانے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔ خود میں بھی ان امراء کے اس جواز سے متفق تھی۔

جن خواجہ سراؤں کے سامنے مراد بخش نے علی نقی کو برچھی ماری تھی اور جنہوں نے مراد کے حکم پر علی نقی کو قتل کیا تھا، وہ سب بھی زیر حراست تھے۔ اس مقدمے میں اورنگ زیب کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے عارج کی راہیں مسدود ہو گئیں اور وہ ناکام اکبر آباد لوٹا۔ وہ اور اس کے آدمی نہ تو عینی شاہدوں سے مل سکے اور نہ مراد بیگ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

یہ مقدمہ کئی ماہ چلتا رہا۔ اس عرصے میں عارج صرف اتنا کر سکا کہ اس نے گوالیار بھی اپنے خاص آدمی بھیج دیئے۔ ان آدمیوں کو وہاں بھیجنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ مراد کے متعلق ہر خبر بھیجتے رہیں۔ اگر مراد کو گوالیار سے شاہجہاں آباد لایا جاتا تو عارج اسے رہا کرانے کی آخری کوشش ضرور کرتا مگر اورنگ زیب نے ایسا نہ کیا۔ اس نے قاضی القضاء عبدالوہاب کو حکم دیا کہ وہ خود گوالیار جا کر مراد بخش کا بیان صفائی لے۔

اسی حکم کی بنا پر شاہجہاں آباد سے یہ خبر ملی کہ قاضی القضاء گوالیار روانہ ہو چکا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ملزم کا بیان لینے کی غرض سے خود قاضی القضاء کو زنداں کا رخ کرنا پڑا تھا۔

قاضی القضاء جب گوالیار پہنچ کر وہاں کے قلعے میں قید مراد بخش سے ملا تو مراد اسے خاطر میں نہ لایا۔ اس نے اپنے بیان میں اورنگ زیب پر بھی الزامات عائد کیے کہ وہ اپنے عہد سے پھر گیا ہے۔ مراد کے اس بیان کی تشہیر نہیں کی گئی اور اسے اخفا میں رکھا گیا۔ مخبروں نے لکھا کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے مراد کو اب بھی یقین ہے کہ اورنگ زیب اسے رہا کر دے گا۔

گوالیار سے قاضی القضاء عبدالوہاب شاہجہاں آباد واپس آ گیا اور کچھ دن بعد اس نے مقدمے کا فیصلہ توثیق کے لئے اورنگ زیب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بالآخر اورنگ زیب نے اس فیصلے کی توثیق کر دی۔ فیصلہ اس کی مرضی کے مطابق تھا۔ حکم ہوا کہ قتل ثابت

ہو چکا ہے اس لئے قاضی القضاء عبدالوہاب مقتول علی نقی کے وارث مردان بیگ کو ساتھ لے کر مجرم مراد بخش کے پاس گوالیار جائے اور اثبات خون کا اظہار کر کے۔ قاضی القضاء کا فرض ہے کہ وہ حکم شرع کے مطابق قصاص دلوائے۔

تعمیل حکم میں عبدالوہاب، مردان بیگ کے ساتھ گوالیار پہنچ گیا۔

اس وقت سارے ملک میں عجیب عجیب خبریں گرم تھیں۔ کوئی کہتا کہ مردان بیگ، مراد بخش کی بیٹی آسائش بانو، یعنی میرے انسانی قالب سے قصاص میں ایک بڑی دولت قبول کر لے گا اور مراد کو قتل نہ کیا جائے گا۔ کچھ صاف گو اور انصاف پسند لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ مقدمہ دراصل بھائی کے خلاف اورنگ زیب کی سازش ہے۔ اسی کے اشارے پر مردان بیگ نے دعویٰ دائر کیا ہے۔ کوئی اڑاتا کہ مراد بخش کے وفادار امیر آخر وقت میں گوالیار کے قلعے پر یلغار کر کے اسے نکال لے جائیں گے۔ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ ایک گروہ ایسا تھا جو اب بھی اورنگ زیب کو حق پر سمجھتا تھا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے نہ صرف برسر دربار بلکہ باہر بھی مراد بخش کو مجرم کہتا تھا۔ یہ گروہ اورنگ زیب کی طرف داری میں تمام الزامات کی تردید کرتا۔ اورنگزیب کا رعب و دبدبہ اتنا تھا کہ لوگ کھلے عام ایسی گفتگو سے گریز کرتے جو مراد بخش کے حق میں ہوتی۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ بادشاہ وقت کے خلاف زبان کھولنے کے جرم میں ان کی کھالیں بھی کھنچوائی جا سکتی ہیں۔ انہیں کوئی بھیانک سزا بھی دی جا سکتی ہے۔

ادھر گوالیار میں تو مراد بخش کو قتل کرنے کے سامان ہو رہے تھے اور ادھر اکبر آباد کے قلعے پر سوگ طاری تھا۔ شاہجہاں آباد سے خبر پہنچ چکی تھی کہ اورنگ زیب نے کیا حکم دیا ہے۔ مزید یہ کہ موت کے ہرکارے گوالیار روانہ ہو چکے ہیں۔ مجھے جب یہ خبریں ملیں تو میں عارج کے ساتھ اس عماری کے سامنے کھڑی تھی جو مراد بخش کی یادگار تھی۔

آسائش بانو کی درخواست پر اورنگ زیب نے تبھی یہ حکم دیا تھا کہ وہ عماری، آسائش بانو کے محل میں رکھوا دی جائے۔ یہ عماری اس تیموری شہزادے مراد بخش کی بہادری کا منہ بولتا ثبوت تھی جسے میدان جنگ میں داد شجاعت دیتے ہوئے مرنے کی آرزو تھی۔ اس عماری میں اب بھی بے شمار تیر پیوست تھے۔ اس عماری پر سوار ہو کر کبھی وہ شخص، اورنگ زیب کے شانہ بشانہ لڑا تھا جسے اب قتل کی سزا سنائی جا چکی تھی اور جو گوالیار کے قلعے میں موت کی گھڑیاں گن رہا تھا۔

ماہ ربیع الثانی 1072 ہجری میں مراد بخش کو قتل کر دیا گیا۔

اس اندوہناک واقعے کو اب پانچ سال گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں شاہجہاں بھی

سفر آخرت پر روانہ ہو چکا تھا۔ گزشتہ سال شاہجہاں کا انتقال ہوا تھا۔ مروارید کے ہم رنگ دانوں والی قیمتی تسبیح آخر وقت تک اس کے پاس رہی مگر سفر آخرت میں اس تسبیح نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اس سفر میں تو شاہ و گدا سبھی خالی ہاتھ جاتے ہیں۔ سو شاہجہاں بھی خالی ہاتھ گیا۔

اورنگ زیب چند روز اکبر آباد میں ٹھہرا۔ اس عرصے میں داروغہ تخت کو حکم ہوا کہ تخت مرصع (تخت طاؤس) کو نویں جشن جلوس کیلئے دارالحکومت شاہجہاں آباد (دہلی) پہنچا دیا جائے۔ اسی کے ساتھ محلات شاہی کی بعض خواتین کو بھی شاہجہاں آباد بھجوا دیا گیا۔ انہی خواتین میں میرا انسانی قالب بھی شامل تھا۔ عارج اور میں نے جن انسانی پیکروں میں پناہ لی تھی، وہ اس سے قبل بھی جدا ہو چکے تھے۔ میں، اکبر آباد سے شاہجہاں آباد آ گئی تو عارج تنہا رہ گیا۔

یہ بہرحال ممکن نہیں تھا کہ طویل عرصے تک مجھ سے جدا رہ سکتا۔ وہ نویں جشن جلوس میں شرکت کرنے شاہجہاں آباد آیا تو اسی شہر میں مستقل سکونت کی سبیل نکال لی۔ مجھ سے خلوت میں ملنے کی خاطر ایک رات وقتی طور پر اس نے صالح کے جسم کو چھوڑ دیا۔ نصف شب کے قریب جب میں سو چکی تھی تو اس نے مجھے آ کر جگا دیا۔

مجھے معلوم تھا کہ تجھے مجھ سے ملے بغیر چین نہیں آئے گا۔ میں دھیرے سے ہنس کر بولی۔

"سن اے دینارا! میں تجھ سے دور نہیں رہ سکتا۔" عارج نے کہا۔ "میں نے اس شہر میں رہنے کی ایک تدبیر ڈھونڈ لی ہے۔"

میرے استفسار پر عارج نے تدبیر بتائی تو میں بولی۔ "تجھے یقین ہے کہ اورنگ زیب مان جائے گا؟" میں نے یہ سوال اس لئے کیا کہ عارج کا انسانی قالب صالح ایک بڑا منصب دار تھا۔ یہ صاحب حیثیت افراد بادشاہ وقت کی اجازت کے بغیر اپنی مرضی سے کسی بھی شہر میں نہیں رہ سکتے۔ عارج کو بھی یہی مسئلہ درپیش تھا۔

"میرے انسانی قالب کا شمار اورنگ زیب کے جاں نثاروں میں ہوتا ہے۔ کم ہی اس نے اس انسانی پیکر کی کوئی بات رد کی ہے۔" میرے سوال کا عارج نے جواب دیا۔ اس کے لہجے سے یقین کا اظہار ہو رہا تھا۔

پھر عارج کا یقین غلط ثابت نہیں ہوا۔ اس نے اورنگ زیب سے درخواست کی اب وہ اکبر آباد سے شاہجہاں آباد آنے کا آرزو مند ہے۔ درخواست قبول کر لی گئی اور یوں عارج بھی شاہجہاں آباد آ گیا۔

اورنگ زیب اپنی بھتیجی، یعنی میرے انسانی قالب آسائش بانو کو اولاد کی طرح سمجھتا

تھا۔ اپنی بڑی بیوی سے اسے معلوم ہوا تھا کہ آسائش بانو شادی کرنا نہیں چاہتی۔ اورنگ زیب کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ جب تک میں اکبرآباد میں تھی اور شاہجہاں آباد نہیں آئی تھی، اورنگ زیب کو یہ خیال نہیں تھا۔ اس سلسلے میں اورنگ زیب نے اپنی بڑی بیوی سے جو کچھ کہا۔ وہ میرے علم میں بھی آیا۔

"بانو سے کہو کہ اس کا یہ عمل شرع کے خلاف ہے۔ ہم اس کی شادی کسی کم رتبہ شخص سے نہیں بلکہ شہزادہ محمد سلطان سے کرنا چاہتے ہیں۔ یوں وہ اپنے ہی گھر میں رہے گی۔" اورنگ زیب نے کہا تھا۔

میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کبھی ایسی نوبت آسکتی ہے۔ میں اس لئے فکرمند ہوگئی۔ اورنگ زیب ایک ضدی شخص تھا اور اسے انکار سننے کی عادت نہ تھی۔ جب میں نے عارج کو اس معاملے سے آگاہ کیا تو وہ آگ بگولا ہوگیا۔

"وہ ملعون شہزادہ تجھ سے شادی کرے گا۔" عارج نے غصیلی آواز میں کہا۔

"جذباتی نہ ہو، وہ مجھ سے نہیں آسائش بانو سے شادی کرے گا۔" مجھے عارج کے غصے پر پیار آنے لگا۔

"تو کیا تو اس انسانی قالب کو چھوڑ دے گی اے دینار؟" عارج نے پوچھا۔

"یہ بھی ممکن ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن بہتر یہ ہے کہ کوئی ایسی تدبیر نکل آئے جو مجھے یہ جسم نہ چھوڑنا پڑے۔"

"سن! اورنگ زیب یہی تو چاہتا ہے کہ تو شرع کے خلاف عمل نہ کرے اور شادی پر راضی ہو جائے؟" عارج نے سوال کیا۔ "بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اس میں شہزادہ محمد سلطان ہی سے شادی کی شرط نہیں۔"

"تو پھر اے دینار! تو مجھ سے شادی کرلے۔" عارج بول اٹھا۔ "یہ تو نے کیا بکواس شروع کردی!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"یہ بکواس نہیں بلکہ وہ تدبیر ہے جس پر عمل کرکے تو شہزادہ محمد سلطان کی بیوی بننے سے بچ سکتی ہے۔ کیا تو بھول گئی کہ بغداد میں ہم طویل عرصے تک میاں بیوی کی حیثیت سے رہ چکے ہیں۔" عارج سنجیدہ نظر آنے لگا۔

میں نے بھی عارج کی بات پر غور کیا تو اس میں وزن نظر آیا۔ میرے انسانی قالب آسائش بانو کی خالہ اور اورنگ زیب کی بڑی بیوی اپنی بھانجی کو بہت چاہتی تھی۔ اسی نے مجھے اورنگ زیب کے الفاظ سے آگاہ کیا تھا۔ میں نے موقع دیکھتے ہی اسے عارج کے انسانی پیکر

صالح کے ساتھ شادی پر اپنی آمادگی سے مطلع کردیا۔

اورنگ زیب کو جب اپنی بیوی سے یہ خبر ہوئی کہ میں اس کے ایک دیرینہ جاں نثار صالح سے شادی کرنے پر راضی ہوسکتی ہوں اور اب انکار نہیں کروں گی تو وہ خوش ہوگیا۔ اس نے یہ اصرار نہیں کیا کہ میں، شہزادہ محمد سلطان ہی سے شادی کروں۔ صالح کا تعلق یوں بھی ایران کے شاہی خاندان سے تھا اور یہ بات اورنگ زیب کے علم میں بھی تھی۔ اس لئے یہ رشتہ ہوسکتا تھا۔ جب اشاروں کنایوں میں آسائش بانو کی خالہ نے مجھے باور کرادیا کہ اورنگ زیب کو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں تو میرے سر سے جیسے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔ مجھے خبر تھی کہ چودہ سال قبل آغاز جوانی میں جس شخص کے لئے پہلی بار آسائش بانو کا دل جذبات محبت سے دھڑک اٹھا تھا، وہی شخص، وہی صالح اب اس کی عزت و ناموس کا امین ہونے والا تھا۔ عارج اور میں اگر ان انسانی قالبوں کو چھوڑ کر چلے بھی جاتے تو ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہوتی۔

میرے انسانی پیکر آسائش بانو کا شباب عروج پر تھا۔ وہ اپنی عمر کی تیسری دہائی کا سفر ختم کررہی تھی اور عارج کا انسانی قالب صالح چوتھائی دہائی کا نصف حصہ طے کرچکا تھا۔

دوسری جمادی الثانی 1082 ہجری کو میرے اور عارج کے انسانی قالب رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ ہمارا نکاح پڑھانے والا قاضی القضاء عبدالوہاب ہی تھا۔ یہ وہی قاضی تھا جس نے تقریباً دس سال پہلے آسائش بانو کے باپ مراد بخش کو قتل کی سزا سنائی تھی۔

اورنگ زیب نے مجھے جو جہیز دیا، اس سے زیادہ خود اپنی بیٹیوں کو بھی نہیں دیا تھا۔ جہیز میں اس نے عارج کو ایک عربی النسل گھوڑا دیا۔ ایک ہاتھی بھی عارج کو ملا جس کے اوپر سونے کی عماری تھی اس کے علاوہ شاہجہاں آباد کے قریب ایک معقول جاگیر بھی ملی اور منصب میں بھی ایک ہزار کا اضافہ ہوا۔ اب وہ پنج ہزاری منصب دار تھا۔

عارج کی حویلی میں وہ میری پہلی رات تھی اور میں دلہن بنی ہوئی تھی۔

خلوت میسر آتے ہی عارج نے مجھے چھیڑا۔ "اب تو شرعاً میری بیوی بن چکی ہے اس لئے۔"

☆.....☆.....☆

”بکواس نہ کر!“ میں نے عارج کی بات کاٹ دی۔ ”قاضی نے میرا اور تیرا نکاح نہیں، آ سائش بانو اور صالح کا نکاح پڑھایا ہے۔“

اے دینار! میں جب بھی کسی بہانے تجھے اپنی بیوی بناتا ہوں تو مجھ سے دور دور رہنے کی کوئی راہ نکال لیتی ہے۔ بتا تو سہی کہ مجھے یوں.....“

”فضول باتیں چھوڑ اور سونے دے مجھے!“ میں نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

”عارج نے ٹھنڈا سانس بھرا اور میں نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔

جلوس کے سولہویں سال کے آخر میں اورنگزیب نے تو سیاسی مصلحتوں اور بغاوت کے فرد کرنے کی خاطر کابل کا رخ کیا اور ادھر شاہجہان آباد میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ لوگوں کیلئے یہ واقعہ عجیب ہو تو ہو، امیر الامراء ذوالفقار خان کیلئے عجیب نہ تھا۔ اورنگزیب شاہجہان آباد میں شہزادہ محمد سلطان کو اپنا جانشین مقرر کر گیا تھا اور امیر الامراء کو بھی شہزادے کے ساتھ ہی چھوڑ دیا تھا۔

اس سے تقریباً 9 سال پہلے اورنگزیب نے مراد بخش کے قتل کے بعد امیر الامراء کو ایک خدمت سپرد کی تھی۔ امیر الامراء اور اورنگزیب کے سوا کسی کو علم نہ تھا کہ تخلیے میں ان دونوں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں اور امیر الامراء کو کیا خدمت سپرد ہوئی۔ موجودہ واقعہ اسی کا ردعمل تھا۔ ان تمام باتوں کے بارے میں مجھے اس وقت علم ہوا جب مراد بخش کو قتل کیا جا چکا تھا۔

ہوا یہ کہ جب مردان بیگ نے اپنے باپ کے خون کا قصاص لے لیا، مراد بخش کی گردن ماردی گئی تو وہ شاہجہان آباد لوٹ آیا۔ مردان بیگ کے بڑے بھائی عرفان بیگ اور دوسرے ہمدردوں نے اسے مشورہ دیا کہ تم روپوش ہو جاؤ ورنہ مار ڈالے جاؤ گے۔ مردان بیگ نے باپ کی محبت میں نہیں بلکہ دولت کی ہوس میں مراد بخش پر خون کا دعویٰ کیا تھا۔ پھر وہ دولت لئے بغیر شاہجہان آباد سے کیسے ٹل جاتا! امیر الامراء ذوالفقار خان سے وعدے کی

نصف رقم اسے دعویٰ دائر کرتے ہی مل چکی تھی اور نصف ابھی باقی تھی۔ وہ شاہجہان آباد رکا تو لوگوں نے اسے پھر سمجھایا اور نصیحت کی کہ تم ابھی نادان ہو، بادشاہوں کا مزاج نہیں سمجھتے۔ تم جیسے لوگوں کی حیثیت محض مہروں کی ہوتی ہے اور ایسے لوگ کسی بھی صورت زندہ نہیں چھوڑے جاتے۔ مردان بیگ کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ اس نے ایک شب خاموشی سے اپنی ساری دولت سمیٹی اور ایران بھاگ گیا، امیر الامراء سے ملنے والی نصف رقم بھی اتنی تھی کہ وہ ساری زندگی عیش کے ساتھ بسر کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ رقم امیر الامراء ذوالفقار علی خان نے اپنی جیب سے ادا نہیں کی ہوگی۔ اسے یہ رقم فراہم کرنے والا اورنگزیب ہی ہوگا جس کا مقصد اپنے بھائی مراد بخش کو راستے سے ہٹانا تھا۔ اورنگزیب نے اس معاملے میں خود سامنے نہ آ کر امیر الامراء کو آگے کر دیا تھا۔

گیارہ سال کے عرصے ہی میں مردان بیگ نے ساری دولت اڑا دی جو اسے امیر الامراء سے ملی تھی۔ وہ لالچی کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا تو اسے شاہجہاں آباد یاد آیا اور امیر الامراء کا وعدہ بھی! امیر الامراء نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ مراد بخش کو قتل کئے جانے کے بعد بقیہ نصف رقم بھی ادا کر دی جائے گی۔ ادھر امیر الامراء کے آدمی اسے سارے ہندوستان میں ڈھونڈتے پھرے تھے مگر وہ انہیں کہیں بھی نہیں ملا تھا۔ دراصل لوگوں نے مردان بیگ کو اتنا خوف زدہ کر دیا تھا کہ اس نے فرار ہونے سے قبل اپنے بڑے بھائی عرفان بیگ، یہاں تک کہ اپنی بیوی کو بھی نہیں بتایا کہاں جا رہا ہے! اس لئے بچا رہ مگر اس کی قضاء اسے پھر شاہجہان آباد کھینچ لائی۔ شاہجہان آباد آتے ہی وہ امیر الامراء ذوالفقار علی خان سے ملا۔

”ارے تم کہاں تھے!“ ذوالفقار علی خان نے مردان بیگ کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ ”تم نے تو وعدے کے مطابق ہم سے بقیہ نصف رقم بھی وصول نہیں کی۔ ہمارے آدمی اس غرض سے ہندوستان بھر میں تمہیں تلاش کرتے پھرے۔“

امیر الامراء سے یہ سن کر مردان بیگ کھل اٹھا۔ وہ بولا ”خادم ہندوستان میں ہوتا تو حضور کے آدمیوں کو ملتا۔“

”تو پھر؟“ ذوالفقار علی خان کے سوالیہ لہجے میں اب بھی حیرت تھی۔

”حضور کا خادم ایران چلا گیا تھا۔“ مردان بیگ نے جواب دیا۔

اس پر امیر الامراء نے طویل سانس لیا اور کہا ”اب تو تم یہیں آ گئے ہو!“ اس کا انداز تصدیق طلب تھا۔

”جی ہاں حضور!“ مردان بیگ نے بتایا، پھر خوشامدی لہجے میں بولا ”خادم کو خوشی ہے

کہ برسوں گزر جانے کے باوجود حضور کو اپنا وعدہ یاد ہے۔''

امیر الامراء کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ ''ہم تو عرصہ دراز سے تمہاری تلاش میں تھے۔ اچھا ہوا کہ تم خود ہی آ گئے بہت جلد ہم تم سے کیا ہوا وعدہ پورا کریں گے۔ تمہیں اس کی اطلاع مل جائے گی۔''

''بڑی نوازش حضور، بڑی عنایت!'' مردان بیگ نے شکریہ ادا کیا۔

اس وقت مردان بیگ کے ذہن سے لوگوں کی ساری نصیحتیں نکل گئی تھیں۔ لوگوں نے اس سے کہا تھا کہ جن کی حیثیت محض مہروں کی ہوتی ہے وہ زندہ نہیں چھوڑے جاتے۔

یہ بات درست ثابت ہوئی۔ شاہجہان آباد میں مردان بیگ کی وہ پہلی ہی رات تھی جب اپنے کہنے کے مطابق امیر الامراء نے ''وعدہ'' پورا کر دیا۔ مردان بیگ کا قصہ پاک ہو گیا۔

اس واقعہ کا پس منظر لوگوں کے علم میں نہ تھا۔ اس لئے انہیں یہ واقعہ عجیب لگا۔ میرے لئے البتہ اس میں کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ مجھے پہلے یہ سب کچھ معلوم تھا۔ لوگوں کو البتہ بس اتنی خبر ہوئی کہ علی نقی کا بیٹا مردان بیگ بھی اس ہتھیار سے مارا گیا جس سے اس کے باپ کو مراد بخش نے قتل کیا تھا۔ کسی نے سوتے میں مردان بیگ کے سینے میں برچھی اتار دی تھی۔ قاتل کو صرف مردان بیگ ہی دیکھ سکا تھا۔ وہ امیر الامراء ذوالفقار علی خان کا ایک خواجہ سرا تھا لیکن یہ بات بھی لوگوں کے علم میں نہ آ سکی۔ انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ مردان بیگ کو کس نے اور کیوں قتل کر دیا! ہاں اس موقع پر مردان بیگ کے بڑے بھائی عرفان بیگ کو وہ نقاب پوش ضرور یاد آیا جو کبھی اس کی حویلی میں گھس آیا تھا اور اسے مراد بخش پر خون کا دعویٰ کرنے سے روک دیا تھا۔ یہ بات سچ تھی کہ اورنگزیب کا ایک ہندو امیر عرفان بیگ سے ملا تھا اور اسے مراد پر اپنے باپ کے خون کا دعویٰ کرنے کیلئے آمادہ کر لیا تھا۔ بعد میں جب عارج اس سے ملا تو عرفان بیگ نے ہندو امیر کو حقیقت سے آگاہ کئے بغیر دعویٰ دائر کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اورنگزیب کے اشارے پر امیر الامراء ذوالفقار علی خان نے علی نقی کے چھوٹے بیٹے مردان بیگ پر جال پھینکا اور وہ لالچی اس جال میں پھنس گیا۔

چند روز تک قلعے اور شہر میں مردان بیگ کا قتل لوگوں کا موضوع گفتگو بنا رہا اور پھر کچھ ہی دن میں وہ اس واقعہ کو بھول گئے۔ میں اور عارج شاہجہان آباد کے قلعے کی ایک وسیع و عریض حویلی میں سکونت پذیر تھے۔ ہماری زندگی بڑے آرام سے گزر رہی تھی کہ میں نے عارج کے معمولات میں تبدیلی محسوس کی، اس پر صالح کے قالب کی فطرف صفات حاوی آتی

جا رہی تھیں۔ انہیں صفات میں عیش کوشی اور مے نوشی بھی شامل تھیں۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ عارج خوبصورت کنیزوں کے جھرمٹ میں راجا اندر بنا بیٹھا رہتا ہے اور جام سے بھی گردش میں ہوتا ہے۔ ان کنیزوں میں میری ہی ایک کنیز بہار سرفہرست تھی۔

ایک حد تک میں نے عارج کی بے راہ روی کو برداشت کیا پھر اس پر پہلی بار پابندی عائد کر دی کہ وہ جب نشے میں ہو تو مجھ سے نہ ملے۔ حویلی کے ایک حصے کو میں نے اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ اس حصے میں عارج کو بحالت نشہ داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ جب عارج کو پہلی دفعہ میری خلوت میں آنے سے روکا گیا تو اسے میرا حکم گراں گزرا۔ خدمت گاروں نے ڈرتے ڈرتے عارج کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد عارج کے شوق آوارگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

مجبوراً مجھے اپنی خلوت سے نکلنا پڑا۔ میں عارج کو بے راہ ہوتے مزید نہیں دیکھ سکتی تھی وہ بہرحال میرا محبوب تھا۔ میں اسے محفل دلبراں سے اٹھا کر لے جانے کا حق رکھتی تھی۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

اس وقت بھی عارج نشے میں تھا مگر نشہ اتنا زیادہ نہ تھا کہ وہ میری باتیں نہ سمجھ پاتا۔

''دیکھ اے عارج اگر تو نے اپنے معمولات نہ بدلے تو میں تجھے اسی زمانے میں چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤں گی!'' میں نے کہا۔

میری اس دھمکی کا عارج پر خاطر خواہ اثر ہوا، بولا ''نہیں اے دینار! اگر تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا، ذرا یہ بھی تو سوچ کہ مجھے اس حال پر پہنچانے میں تیرا بھی تو ہاتھ ہے۔ تو نے مجھ سے ملنے پر پابندی لگا دی اور ..... اور تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میری بے راہ روی کا اصل سبب میرا انسانی قالب ہے۔ میں کیا کروں کہ اس قالب کی فطرف صفات مجھ پر غالب آنے لگتی ہیں!''

''میں جانتی ہوں تیری مجبوری!'' میں بولی ''تجھے اس کے باوجود ان بری صفات پر قابو پانا ہوگا!''

''کوشش کروں گا میں اے دینار کہ تجھے آئندہ مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔'' عارج نے وعدہ کیا۔

یوں گویا میرے اور عارج کے درمیان مصالحت ہو گئی۔ حالات معمول پر آ گئے تو عارج یہ سمجھا کہ اب میں شاید اس کی سب سے پسندیدہ کنیز بہار کو برداشت کر لوں گی۔ سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ اورنگزیب کابل سے لوٹ کر شاہجہان آباد آ گیا۔ اس کی آمد کا بڑا سبب

شہزادہ محمد سلطان کی شدید اور طویل علالت تھی۔ اس علالت اور طبیبوں کی ہدایت کے باوجود شہزادے نے مے نوشی ترک نہیں کی تھی۔ اورنگزیب کا خیال تھا کہ شہزادہ اس کی موجودگی میں مے نوشی کی جسارت نہیں کرے گا، اس کا یہ خیال غلط ثابت نہ ہوا، لیکن اورنگزیب کو شاہجہان آباد آنے میں دیر ہو چکی تھی۔ طبیبوں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ شہزادے کا ترک مے نوشی کے باوجود اب زیادہ عرصے زندہ رہنا مشکل ہے۔ انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ اچانک سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی۔

میری آنکھ کھلنے کا سبب سینے میں اٹھنے والا شدید درد تھا۔ اس سے پہلے کہ طبیب آتے، میں درد کی شدت سے بے ہوش ہو گئی۔ میرا سارا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہوش آیا تو طبیب میرا معائنہ کر چکے تھے۔ انہوں نے میری مرض کی تشخیص کر دی تھی۔ میرا مرض بلند فشار خون تھا۔ علاج شروع ہو گیا۔ کچھ دنوں تک عارج میری نگہداشت میں لگا رہا پھر اس نے میرے بستر پر پڑ جانے سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ اپنے انسانی قالب کی بیماری میرے لئے تشویشناک تھی۔

عارج کو بہار کم ہی فرصت دیتی تھی کہ وہ میری عیادت یا مزاج پرسی کو آ سکے۔ اسے کچھ ہوش ہی نہ ہوتا جس دن طویل بیماری کے بعد شہزادہ محمد سلطان کا انتقال ہوا اور یہ خبر عارج کو ملی تو نشے کے سبب اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ بیماری کے باوجود عارج کی نقل و حرکت پر میں پوری نظر رکھتی تھی۔

نشے میں ہونے کے سبب عارج، اورنگزیب سے دور ہی دور رہا کیونکہ شراب نوشی پر پابندی لگ چکی تھی۔ ان دنوں امور شرعی اور ان کے نفاذ پر اورنگزیب کا زور تھا۔ وہ ان امور سے سیاسی فوائد اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ اس طرح کا ایک اقدام ایک مشت ڈاڑھی تھا۔ اورنگزیب کی طرف سے حکم جاری ہوا کہ ایک مٹھی برابر داڑھی رکھی جائے اور اس سے زائد بال کاٹ دیئے جائیں۔ دراصل یہ سکھوں کے خلاف ایک سیاسی اقدام تھا۔ اس طرح وہ سکھ جاسوس پکڑے جاتے جو مسلمانوں کے بھیس میں جاسوسی کرتے تھے۔ سکھوں کے عقیدے میں سر یا داڑھی کے بال کاٹنا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ داڑھی کاٹے جانے کے خوف سے انہیں اقرار کرنا پڑتا کہ وہ سکھ ہیں۔ اورنگزیب موسیقی کے فن کو بھی خلاف شرعی سمجھتا تھا۔ سو اس نے موسیقی پر بھی پابندی لگا دی، اس فن سے وابستہ افراد کو نہ صرف مایوس ہونا پڑا بلکہ ان پر معاش کے دروازے بھی بند ہو گئے۔ مغلیہ دربار میں موسیقاروں اور گویوں کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہوتے تھے۔ مسلمان حکمرانوں میں یہ روایت صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ میں اپنی سرگزشت

میں اس سے پہلے ابراہیم موصلی کا ذکر کر چکی ہوں جو شاعر بھی تھا اور اپنے عہد کا سب سے بڑا موسیقار بھی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے دس ہزار درہم ماہانہ اس کا وظیفہ مقرر کیا تھا۔ مسلمان اپنے ابتدائی ادوار ہی سے فنون لطیفہ کی سرپرستی کرتے آئے تھے اس ضمن میں اورنگزیب نے پہلی مرتبہ تنگ نظری اور انتہا پسندی کا ثبوت دیا۔ اس نے دربار سے وابستہ شاعروں کو بھی نکال باہر کیا۔ یوں گویا دو اہم فنون سرکاری سرپرستی سے محروم ہو گئے۔ ایک مطلق العنان اور اورنگزیب جیسے سخت گیر حکمران کے سامنے کون زبان کھولتا!

بادشاہ کے دیدار عام کی ممانعت اور زائچۂ نجوم پر بندش شریعت کے نفاذ ہی کی گویا کڑیاں تھیں۔ قانونی طور پر ''السلام علیکم'' کا حکم، بادشاہ کے خلاف استغاثے کا قانون، ہندوؤں اور دیگر مذہب کے لوگوں سے جزیے کی وصول یابی، سبھی کچھ شرع کے نفاذ کی خاطر ہو رہا تھا مگر بالا! اندر سے نہ امراء بدلے تھے نہ عوام، چوری ہر کام ہوتا، عارج بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں تھا اس لئے اس کی رنگ رلیاں جاری تھیں۔

انہیں دنوں راجپوتوں نے شورش برپا کر دی اور اورنگزیب کی توجہ اس طرف ہو گئی۔ عارج نے اپنی اور میری شدید علالت کا عذر پیش کر کے جان بچائی ورنہ خبریں یہ تھی کہ اس بار اورنگزیب اسے بھی اپنے ساتھ لے جائے گا۔ ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' عارج اسی پر عمل کر رہا تھا اور بہار اس کی معاون تھی۔

عملی طور پر اب میرے بجائے عارج کی حویلی میں بہار کا حکم چلتا تھا۔

بہار کو اس کے ظرف سے زیادہ ملا تو چھلک اٹھی۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا۔ ذرا ذرا سی باتوں پر وہ کنیزوں اور خدمت گاروں کو سخت سزائیں دیتی۔ اقتدار اور شراب کے نشے میں وہ بہکی بہکی پھرتی۔ اب وہ اعلانیہ اپنے باغیانہ خیالات کے اظہار میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتی۔ وہ خود کو شہزادی بھی کہلوانے لگی تھی۔ عارج کے علاوہ جن لوگوں سے اس کی آشنائی رہ چکی تھی وہ بھی حویلی میں آنے جانے لگے تھے۔ بہار اب مجھے بھی خاطر میں نہ لاتی۔ وقت نے آخر اپنی طنابیں کھینچ لیں۔ بہار رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔

اب عارج کو ہوش آ گیا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ بہار کی وجہ سے وہ کس قدر بے عزت ہو چکا ہے!

بہار کو جب عارج کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ نشے میں تھی اور اس پر باغیانہ خیالات کا غلبہ تھا۔ عارج نے اس سے جواب طلبی کی تو وہ بولی ''تم کون ہو مجھ پر پہرے بٹھانے والے! مجھ میں اور تم میں فرق ہی کیا ہے!...... میں تم سے کمتر نہیں ہوں۔ کیا بادشاہ اور کیا فقیر

سب برابر ہیں۔ کوئی کسی سے کم ہے نہ زیادہ!......''

دیر تک بہار اسی طرح کی باتیں کرتی رہی، یہاں تک کہ عارج کی قوت برداشت جواب دے گئی اور وہ چیخ اٹھا ''اسی وقت اور اسی حال میں میری حویلی سے نکل جا! ایسا نہ ہو کہ میں تجھے قتل کر دوں!......''

جواباً بہار گستاخانہ انداز میں زور زور سے ہنسنے لگی۔

''لے جاؤ......اسے لے جاؤ!'' عارج غصے میں چیخنے لگا۔

خدمت گار اس آدم زادی کو وہاں سے کھینچتے ہوئے لے گئے جس نے ایک جن زاد عارج کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ ابھی میں اپنی چشم تصور سے یہ منظر دیکھ رہی تھی کہ اچانک میرے انسانی قالب کا دل انتہائی تیزی سے دھڑکنے لگا پھر چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میں نے دل میں درد محسوس کیا۔ اب تک دو مرتبہ میرے دل میں شدید درد ہو چکا تھا اور میں ہوش کھو بیٹھی تھی۔

طبیبوں کا کہنا یہ تھا کہ اگر تیسری بار اس طرح کا درد اٹھا تو میرے لئے جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ اب میں آسائش بانو کے انسانی قالب سے نکل آتی۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اسی کے ساتھ آسائش بانو پر جاں کنی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ دیکھ کر ایک کنیز، عارج کو یہ خبر دینے دوڑ گئی۔

پھر جب تک عارج وہاں پہنچا اور طبیب آئے آسائش بانو ہمیشہ کیلئے گہری نیند سو چکی تھی۔ عارج کی آمد سے قبل ہی میں نے اندھیرے کی چادر اوڑھ لی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ عارج مجھے نہ دیکھ سکے۔ میں کیونکہ وہاں موجود تھی اس لئے عارج میری خوشبو محسوس کر سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر مجھے شدید الجھن کے آثار نظر آئے۔ اس الجھن کا سبب عارج کی لاعلمی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ شہزادی آسائش بانو کی موت سے پہلے میں نے اس کا جسم چھوڑ دیا تھا یا نہیں! آسائش بانو کے جسم سے نہ نکلنے کا مطلب میری بھی یقینی موت تھا۔ میرے وجود کی مخصوص خوشبو اسی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ میں وہیں ہوں۔ نظر نہ آنے سے عارج وہی نتیجہ اخذ کرتا جو میں چاہتی تھی۔

''نہیں!'' عارج بڑبڑایا۔ ''دینار مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی!...... ایسا نہیں ہو سکتا!''

شدید الجھن کے ساتھ ہی اب عارج کے چہرے سے فکرمندی بھی جھلک رہی تھی، آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ چند لمحے توقف کے بعد عارج کی بھرائی ہوئی آواز پھر ابھری۔ ''اے

دینار! آنکھیں تو کھول!...... کیا تو اپنے گنہگار کا پشیمان چہرہ نہیں دیکھے گی!''

عارج کے ان الفاظ سے یہی ظاہر تھا کہ اسے میری موت کا یقین آ چکا ہے۔

معاً عارج کے چہرے پر مجھے وحشت کے آثار نظر آئے۔ اس سے پہلے کہ اسے کوئی روک سکتا اس نے دیوار سے اپنا سر ٹکرا دیا۔

''جب تو نہیں رہی تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔'' عارج کہنے لگا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ دیوار سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ کنیزیں اور خدمت گار اسے ایسا کرنے سے روکنے لگے، مگر وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے یہی دیکھنا تھا کہ عارج کے وجود میں اب بھی میرے عشق کا شعلہ بھڑک رہا ہے یا نہیں! میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ اگر عارج کو روکا نہ گیا تو وہ جان دے دے گا۔ یہ کام کنیزوں اور خدمت گاروں کے بس کا نہیں تھا۔

''اے عارج! رک جا اور جان نہ دے کہ تیری دینار زندہ ہے۔'' میں نے عارج کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی اور پھر اس پر ظاہر ہوگئی۔ میری آواز صرف عارج ہی سننے کا اہل تھا، اس لئے کسی اور کو کچھ معلوم نہ ہوا۔

''اب تو بھی اپنے انسانی قالب سے نکل آ!'' میں نے عارج سے کہا۔

دوسرے لمحے صالح کے انسانی پیکر سے عارج باہر آ گیا۔ عارج کو ساتھ لئے میں اس حویلی سے نکل آئی۔

''کہاں چل رہی ہے؟'' عارج نے میرے ساتھ ساتھ پرواز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''آدم زادوں کی اس بستی سے کہیں دور!'' میں نے جواب دیا۔

چند ہی لمحوں میں ہم شاہجہان آباد سے باہر آ گئے۔ یہ رات کا وقت تھا۔ ہم ایک گھنے جنگل میں اتر گئے۔

''میں تجھے یہاں اس لئے لے کر آئی ہوں کہ آئندہ کیلئے کوئی فیصلہ کر سکوں۔'' میں نے عارج کو بتایا۔

''یہ باتیں تو خیر ہوتی ہی رہیں گی لیکن......اس کا جواب دے کہ تو نے اپنی موت کا سوانگ رچا کر مجھے بے وقوف کیوں بنایا؟ معلوم ہے تجھے کہ مجھ پر کیا گزر رہی تھی!......اے دینار، تو نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔'' عارج کہنے لگا۔

''تو نے حرکتیں بھی تو ایسی شروع کر دی تھیں کہ تجھے سزا دینا ضروری ہو گیا تھا۔'' میں

بولی۔

"مجھے بخوبی علم ہے کہ قصور میرا نہیں اس انسانی قالب کا تھا جو میں نے اپنایا تھا۔"
عارج نے اپنی صفائی پیش کی۔

"میں نے اسی لئے تو تجھے معاف کر دیا ورنہ سر پھوڑ کے مر جانے دیتی۔" میں ہنس دی۔

"اچھا بتا تو کس فیصلے کی بات کر رہی تھی؟" عارج نے پوچھا۔

"فیصلہ یہ کرنا ہے کہ ہم اسی زمانے میں رہیں یا واپس بغداد چلیں!" میں نے جواب دیا۔

"ایک تیسری صورت بھی تو ہے اے دینار!" عارج نے کہا۔ "وہ یہ کہ ابھی بغداد واپس جانے کے بجائے ہم کسی اور زمانے کی سیر کو نکل چلیں۔ تو شاید یہ بھول گئی ہے کہ ہم خود عراق سے ہندوستان نہیں آئے بلکہ عالم سوما نے ہمیں عراق چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ابھی ہم مزید کچھ عرصے عراق کی طرف نہ پلٹیں۔"

عارج ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے اس کا مشورہ قبول کر لیا۔ کافی دیر بحث مباحثے کے بعد ہمارے درمیان یہ طے پایا کہ ہم فی الحال ہندوستان ہی میں رہیں گے البتہ زمانہ کوئی اور ہوگا۔ کسی ایسے ہی مطلوبہ زمانے کو تلاش کرتے ہوئے ہم اورنگزیب کے عہد سے ماضی کی طرف پلٹے۔

☆.....☆.....☆

یہ 12 ربیع الاول 952 ہجری کی ایک اداس شام تھی۔

ادھر اسے قلعہ کالنجر کے فتح ہونے کی خوشخبری ملی۔ ادھر اس کا طائر روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گیا۔ مرنے والے کا نام فرید خان اور لقب شیر شاہ تھا۔ وہ سہسرام کا ایک معمولی جاگیردار تھا۔ اس نے فاتح مغلوں کو شکست دے کر ہندوستان کی سرحدوں سے نکال دیا تھا اور ایک مضبوط نظام حکومت کی بنیاد رکھی تھی۔ جب تک وہ زندہ رہا مغلوں کو ہمت نہیں ہوئی کہ ہندوستان کا رخ کرتے۔ اس نے 4 سال، 4 ماہ اور 15 روز حکومت کی مگر اس کے عہد حکومت کا یہ مختصر دور بلاشبہ مغلوں کے صدیوں طویل دور حکومت پر بھاری نظر آتا ہے۔ اپنی عمر کے آخری ایام میں شیر شاہ سوری کو بادشاہی ملی تھی۔ وہ خود کہتا تھا۔ "افسوس مجھے اس وقت بادشاہی ملی جب میری زندگی کی شام ہو چکی تھی۔" 74 سال 8 ماہ چند دن اس نے عالم آب و گل میں گزارے تھے۔

اس عہد میں کچھ عرصے قیام کی غرض سے میں تمام ضروری معلومات حاصل کر رہی تھی۔ ان معلومات کے بعد ہی میں کسی آدم زادی کے جسم میں اترنا چاہتی تھی۔ مختلف زمانوں میں سفر کر کے مجھے متوقع خطرات کا اندازہ ہو چکا تھا۔

شیر شاہ سوری نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹے عادل خان کو ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ جب شیر شاہ سوری کا انتقال ہوا تو عادل خان قلعہ رنتھمبور میں مقیم تھا۔ قطب خان اور عیسیٰ خان دربار سوری کے معتبر امیروں میں سے تھے۔ انہوں نے باہم مشورہ کر کے کہ کہیں شیر شاہ کے انتقال سے کوئی فتنہ کھڑا نہ ہو جائے شیر شاہ کے چھوٹے بیٹے جلال خان کو بلوا لیا۔ جلال خان اس وقت پٹنہ کے قریب ٹھہرا ہوا تھا۔ ان دونوں بااثر امیروں نے دوسرے امیروں کو بھی اپنا ہم نوا بنا لیا اور جلال خان کو فوری طور پر تخت نشین کر دیا۔ جلال خان کا خطاب اسلام شاہ رکھا گیا جو پٹھانوں کی زبان پر سلیم شاہ سے بدل گیا۔

سلیم شاہ سوری نے تخت نشین ہوتے ہی قطب خان کو افواج کا سپہ سالار بنا دیا تھا کیونکہ قطب خان کی کوشش ہی سے اسے بادشاہت ملی تھی۔ سلیم شاہ سوری اس کا ممنون احسان تھا۔ فی الحال تمام سیاہ و سفید کا مالک قطب خان تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر عادل خان برسر اقتدار آ گیا تو اسے ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ وہ اسی لئے اب یہ چاہتا تھا کہ شیر شاہ سوری کا چھوٹا بیٹا ہی تخت نشین رہے مگر تخت و تاج کا اصل دعویدار ابھی زندہ تھا اور اسے زیر دام لانا ضروری تھا۔ وہ اسی لئے خلوت میں سلیم شاہ سوری سے ملا اور اس کے سامنے ایک ایسا منصوبہ پیش کیا کہ بڑے بھائی کا کانٹا درمیان سے نکل جائے۔

سلیم شاہ سوری اس پر راضی ہو گیا۔

پھر قطب خان کے ایما پر ہی سلیم شاہ سوری نے بڑے بھائی عادل خان کو معذرت آمیز خط لکھا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔ "امرائے دربار نے مجھے صرف اس لئے تخت پر بٹھا دیا کہ آپ ایک دور دراز مقام پر تھے۔ میں نے بھی ان کی یہ تجویز بحالت مجبوری قبول کر لی۔ اب آپ جلد از جلد تشریف لائیں اور مجھے اپنا فرمانبردار سمجھئے۔"

مندرجہ بالا خط لکھ کر قطب خان کے مشورے پر سلیم شاہ سوری، آگرہ پہنچ گیا اور وہاں سے بھی بھائی کو ایک خط روانہ کیا اور لکھا کہ میں آپ کی تشریف آوری کا بے چینی سے منتظر ہوں۔

قطب خان کا منصوبہ یہ تھا کہ عادل خان کو کسی طرح آگرہ بلا کے گرفتار کر لیا جائے۔

سلیم شاہ سوری کے خطوط ملے تو جواب میں عادل خان نے قطب خان کو ایک خط لکھا اور

دریافت کیا۔ "مجھے آپ لوگ آخر کس مصلحت کی بنا پر بلا رہے ہیں؟" عادل خان نے اس کے ساتھ چھوٹے بھائی سلیم شاہ سوری کو بھی پیغام دیا۔ "جو شکوک وشبہات میرے دل میں پیدا ہو گئے ہیں وہ اسی صورت میں دور ہو سکتے ہیں کہ دربار کے دو چار معتبر امراء آ کر مجھے اطمینان دلا دیں اور اپنے ساتھ لے جائیں۔"

سلیم شاہ سوری سے قطب خان نے کہا کہ حضور یہ شرط تسلیم کر لیں۔ اسی طرح وہ شاہین زیر دام آ سکتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ دربار سے چار امیروں کو عادل خان کے پاس بھیج دیا گیا۔ ان امیروں نے عادل خان سے عہد و پیماں کئے۔ دراصل ان امیروں کو بھی اصل سازش سے لاعلم رکھا گیا تھا۔ انہوں نے عادل خان کو یقین دلا دیا کہ آگرہ پہنچتے ہی آپ کو تخت نشین کر دیا جائے گا اور دوسرے ہی دن سلیم شاہ وہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ سلیم شاہ جس علاقے کو بھی پسند کرے گا وہاں کی جاگیر کا پروانہ اسے دے دیا جائے گا۔ عادل خان نے ان امیروں کی باتوں پر اعتبار کر لیا اور آگرہ کیلئے روانہ ہو گیا۔ عادل خان کے آنے کی خبر سلیم شاہ کو مل چکی تھی۔ وہ بظاہر عادل خان کا استقبال کرنے شہر سے ایک منزل پرے آ کے ٹھہر گیا۔

دونوں بھائیوں کی ملاقات سرراہ ہوئی۔ سلیم شاہ اپنے بڑے بھائی سے انتہائی تپاک کے ساتھ ملا، عذر معذرت کی اور معافیاں طلب کیں۔ جب اس نے بڑے بھائی کو اپنی طرف سے کچھ مطمئن دیکھا تو درخواست کی کہ آپ تکلیف کر کے آگرہ تک تشریف لے چلئے۔

قطب خان نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ سلیم شاہ جب بھائی کو بہلا پھسلا کر کسی طرح آگرہ چلنے پر آمادہ کر لے اور جب وہ چلنے پر تیار ہو جائے تو شہر میں داخل ہوتے وقت کچھ ایسا انتظام کیا جائے کہ عادل خان کے ساتھ دو چار آدمی سے زیادہ اندر نہ آنے پائیں۔ اس طرح آسانی کے ساتھ عادل خان کو گرفتار کیا جا سکتا تھا۔

عادل خان آخر کار اپنے چھوٹے بھائی کی باتوں میں آ کر آگرہ چلنے پر تیار ہو گیا لیکن قطب خان کا منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔ عادل خان کے بہت سے آدمی بھی دھکا پیل کر کے شہر میں داخل ہو گئے۔ یہ صورتحال غیر متوقع تھی۔

دروازہ شہر پر روک ٹوک سے عادل خان اپنے بھائی کی طرف سے بدگمان ہو گیا تھا۔ بھائی کی بدگمانی کو رفع کرنے اور اسے پوری طرح مطمئن کرنے کیلئے سلیم شاہ نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور خوشامدانہ باتیں کیں۔

قطب خان کے اشارے پر سلیم شاہ نے بڑے بھائی سے کہا "میں بڑا مجبور ہو گیا تھا ورنہ کبھی تخت پر نہ بیٹھتا۔ ان پٹھانوں کو میں بمشکل قابو میں کر کے اب تک تخت و تاج کی

حفاظت کر رہا ہوں۔ اب آپ آ گئے ہیں تو یہ آپ کا حق ہے۔ تخت اور لشکر اب آپ سنبھالئے اور مجھے اس ذمے داری سے سبکدوش کر دیجئے۔" یہ کہہ کر اس نے عادل خان کا ہاتھ پکڑا اور اسے زبردستی تخت پر بٹھا دیا۔

عادل خان آرام طلب اور بے جوہر آدمی تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کی سازش کو بھی بھانپ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس وقت میں نے بادشاہت قبول کر لی تو یہ صرف چند روزہ ہو گی کیونکہ امرائے دربار بہرحال سلیم شاہ کے وفادار ہیں۔ وہ اسی لئے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا اور سلیم شاہ کو تخت پر بٹھا کر پہلے خود اسے تعظیم اور مبارکباد دی۔ اس کے بعد تمام امراء نے بھی عادل خان کے کہنے پر مراسم اطاعت بجالائے۔ اس موقع پر عیسیٰ خان اور خواص خان نے سلیم شاہ کے سامنے ایک عرضداشت پیش کی کہ عادل خان کو ایک جاگیر دے دی جائے۔

یہ عرضداشت سلیم شاہ نے منظور کر لی۔

قطب خان کو یہ بھی منظور نہ تھا۔ اس کی سازشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار دونوں بھائیوں میں ٹھن گئی۔ ان کی فوجیں لڑنے کیلئے آمنے سامنے آ گئیں۔ سلیم شاہ کی فوج کا سپہ سالار قطب خان تھا۔ یہی قطب خان تھا کہ جس کی بیٹی مہر النساء کے جسم میں اترنے کا میں فیصلہ کر چکی تھی۔

اپنے لئے انسانی قالب منتخب کرنے کے ساتھ ساتھ عارج کی خاطر بھی میں نے ایک پناہ گاہ ڈھونڈ لی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہم دونوں ایک ساتھ رہ سکیں۔ یہ وہ درمیانی زمانہ تھا جب شیر شاہ سوری کی موت کے بعد اقتدار کی کشمکش جاری تھی۔ دونوں بھائیوں یعنی شیر شاہ سوری کے بیٹوں عادل خان اور سلیم شاہ کی تعداد افواج میں نمایاں فرق تھا۔ ان کی فوجیں مقابل آئیں تو یہ فرق مزید واضح ہو گیا۔ آخر کار وہ لمحہ آ ہی گیا جب جنگ چھڑ گئی۔ عادل خان کی فوج تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے شروع ہی میں حوصلہ ہار بیٹھی۔ قطب خان جو سلیم شاہ کی فوجوں کا سپہ سالار تھا اس نے کثرت تعداد اور موقع سے فائدہ اٹھایا۔ جلد ہی عادل خان کی فوج کے پیر اکھڑ گئے۔ اسے شکست ہوئی۔ صورتحال دیکھ کر عادل خان پہلے ہی سے راہ فرار کا بندوبست کر چکا تھا۔

شکست کھا کر عادل خان پٹنہ کی طرف بھاگ گیا اور پھر اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ عادل خان کے کئی امیر اس سے باغی ہو کر سلیم شاہ سے آ ملے تھے۔ سلیم شاہ نے ان باغی امراء کو انعام و اکرام سے نوازا اور قطب خان کے عہدے میں مزید اضافہ کر دیا۔ اب قطب خان

نائب السلطنت ہوگیا تھا۔ سلیم شاہ کے اس اعلان پر سب سے زیادہ خوشی عیسیٰ خان کو ہوئی تھی۔ وہ قطب خان کا انتہائی قریبی دوست تھا۔ قطب خان کے حامی امراء میں عیسیٰ خان سرفہرست تھا۔ دوسری جانب سلیم شاہ کے اس فیصلے نے خواص خان کو فکرمند کر دیا تھا۔ قطب خان اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔

شیر شاہ سوری کی موت کے بعد سلیم شاہ کو تخت نشین کرنے کے سلسلے میں قطب خان اور خواص خان وقتی طور پر ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے، مگر ان کے اختلافات بہت پرانے تھے۔ خواص خان کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ سلیم شاہ کی تخت نشینی اور عادل خان کی گمشدگی کے بعد قطب خان کس قدر طاقتور ہو چکا ہے۔ قطب خان بظاہر تو نائب السلطنت تھا مگر عملاً اقتدار اعلیٰ اسی کے پاس تھا۔ سلیم شاہ سوری اس کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ خواص خان کو قطب خان کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ اسے ضرور نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ خواص خان نے اسی لئے آج عیسیٰ خان کی دعوت کی تھی کہ عیسیٰ خان، قطب خان کا دست راست اور دوست تھا۔ اسے یقین تھا کہ عیسیٰ خان اسے قطب خان کے دست انتقام سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ عیسیٰ خان سے اس کی دوستی بھی بہت پرانی تھی۔

میں عارج کے ساتھ اس وقت خواص خان کی حویلی ہی میں تھی۔ کسی انسانی قالب میں اترنے سے پہلے میں سلطنت سے وابستہ تمام اہم امراء کے حالات کا جائزہ لے لینا چاہتی تھی۔ خواص خان بھی انہی امراء میں سے ایک تھا۔

اسی دوران میں عارج نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اے دینار! جب تو قطب خان کی بیٹی مہرالنساء کے جسم میں اترنے کا فیصلہ کر ہی چکی ہے تو پھر کیوں ادھر ادھر بھٹکتی پھر رہی ہے اور مجھے بھی بھٹکا رہی ہے!“

اس پر میں ہنس کر بولی۔ ”جہاں تک تیرے بھٹکنے کا سوال ہے، تو مختلف زمانوں کا سفر کر کے خاصا بھٹک چکا ہے۔ تیرے اندر اب مزید بھٹکنے کی گنجائش نہیں رہی۔۔۔ اب رہا فیصلہ تو اسے بدلا بھی جا سکتا ہے۔“

”یعنی تو قطب خان کی بیٹی کا انسانی قالب نہیں اپنائے گی؟“ عارج نے سوال کیا۔

”ضروری نہیں کہ میں اسی کے جسم میں اتروں۔“ میں نے جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔

کھانے کے بعد دونوں دوست خواص خان اور عیسیٰ خان حویلی کے وسیع و عریض

پائیں باغ میں آ بیٹھے اور ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ نیزہ بردار خدام پائیں باغ کے چاروں طرف چوکس کھڑے تھے۔ باغ میں جابجا مشعلیں روشن تھیں۔

اسے حسن اتفاق ہی کہا جائے گا کہ ایک دوسرے کو ناپسند کرنے والے دو امیروں کی بیٹیاں ہم نام تھیں۔ ہاں عمروں میں فرق ضرور تھا۔ قطب خان کی بیٹی مہرالنساء خواص خان کی بیٹی سے کئی سال بڑی تھی۔

اس وقت میزبان امیر خواص خان کی کمسن لڑکی مہرالنساء عیسیٰ خان کے نوعمر بیٹے شہباز کے ساتھ باغ کے ایک گوشے میں کھیل رہی تھی۔ خواص خان بہت دیر تک محویت کے عالم میں دونوں بچوں کو کھیلتے دیکھتا رہا، پھر وہ عیسیٰ خان کی طرف دیکھ کر کسی قدر تذبذب سے بولا۔ ”میرے دوست! میں چاہتا ہوں کہ ہماری دوستی مزید پختہ ہو جائے اور ہماری اگلی نسل تک برقرار رہے۔“

”وہ کیسے خواص خان؟“ عیسیٰ خان نے استفہامیہ نگاہوں سے اپنے میزبان دوست کو دیکھا۔

خواص خان نے ایک بار پھر باغ کے گوشے میں کھیلتے ہوئے بچوں کی جانب دیکھا اور کہنے لگا ”ان دونوں کو دیکھ رہے ہو عیسیٰ خان! کیسی محبت ہے ان دونوں کے درمیان! میں چاہتا ہوں کہ ہم ان کا نکاح کر دیں تاکہ ہماری دوستی رشتے داری میں بدل جائے اور اس طرح یہ دوستی مزید گہری اور پائیدار ہو جائے۔“

عیسیٰ خان نے محبت بھری نگاہ سے خواص خان کی کمسن بیٹی کی طرف دیکھا۔ مہرالنساء اسے بہت اچھی لگی تھی۔ سیاہ گھنے بالوں اور سرخ و سفید رنگت والی اس بچی کے نقوش میں ایسی جاذبیت و کشش تھی کہ ہر دیکھنے والا بے اختیار اسے پیار کرنے پر مجبور ہو جائے۔ گو اس کی عمر 8 برس سے زیادہ نہیں تھی مگر اس کی غیر معمولی اٹھان کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ بہت جلد وہ ایک قیامت خیز حسن کی مالک بن جائے گی۔ عیسیٰ خان کے بیٹے شہباز کی عمر 11 برس کے لگ بھگ تھی۔

اپنے میزبان کی تجویز پر عیسیٰ خان نے چند لمحے غور کیا اور پھر رضامندی ظاہر کر دی۔

یہی وہ لمحہ تھا جب عارج بول اٹھا۔ ”اے دینار! یہ بہت اچھا ہوا۔“

کیوں اے عارج؟..... تیرے لئے اس میں خوشی کا کیا پہلو ہے؟“

”ہم اگر ان دونوں کے انسانی قالبوں کو اپنا لیں تو عرصہ دراز تک ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکیں گے۔“ عارج نے جواب دیا۔ ”یوں بھی ان دونوں کی شادی ہو جائے گی اور یہ

میاں بیوی بن جائیں گے۔"

"بس تیرا سارا زور میاں بننے پر رہتا ہے! کبھی کچھ اور بھی سوچ لیا کر!" میں بولی۔

ہر چند کہ فوری طور پر میں نے عارج کی تجویز قبول نہیں کی لیکن اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں تھا۔ قطب خان کی بیٹی کے بجائے میں خواص خان کی کمسن بیٹی کا جسم بھی اپنا سکتی تھی۔ شہباز کے جسم میں عارج پناہ لے سکتا تھا۔

چند ہی روز کے بعد خواص خان کی حویلی میں جب ایک رنگا رنگ تقریب منعقد ہو رہی تھی تو عارج میرے پیچھے پڑ گیا۔ بولا "اے دینار! اب تو مان جا کہ مہر النساء اور شہباز کا نکاح ہونے والا ہے۔"

"یہ بھی تو ابھی دیکھنا ہے کہ ہم دونوں کو ان کے انسانی پیکر راس بھی آتے ہیں یا نہیں! کیا خبر کہ ہمارے وجود ان کے جسموں میں قرار نہ پا سکیں!" میں نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔ یہ اندیشہ درست بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

"تو پھر دیکھ لیتے ہیں نا، ان کے جسموں میں اتر کے!" عارج نے جلدی سے کہا۔

مہر النساء اور شہباز کی عمریں کیونکہ زیادہ نہیں تھیں اس لئے میں نے ان کے ماضی کے بارے میں کچھ معلوم کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ میرا یہ اندیشہ غلط نکلا تھا کہ مجھے اور عارج کو وہ انسانی قالب راس نہیں آئیں گے۔ اب عارج کو تو شہباز کے جسم میں قرار آ چکا تھا اور میں مہر النساء کے جسم کو اپنا چکی تھی۔ اسی کے کچھ دیر بعد مہر النساء کا نکاح شہباز سے ہو گیا۔

خواص خان یہ رشتہ کر کے بہت مطمئن ہو گیا تھا۔ اسے اب یقین آ چکا تھا کہ کم از کم اس کی زندگی قطب خان کے ہاتھوں سے محفوظ رہے گی۔ مہر النساء کے جسم میں اترنے کے باوجود حالات پر میری پوری نظر تھی۔ اس کیلئے میں بوقت ضرورت اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لاتی رہتی تھی۔ مجھے اسی سبب یہ پتا چلا کہ خواص خان شدید غلط فہمی کا شکار ہے۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ قطب خان مسلسل اس کی مصروفیات پر نگاہ رکھے ہوئے تھا اور موقع کی تلاش میں تھا۔

انسانی قالب اپنانے کے بعد عارج اور میں عموماً رات کے وقت ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ اس کیلئے ہمیں اپنے قالبوں سے باہر آنا پڑتا تھا۔ ہم دونوں دہلی میں ہی تھے مگر الگ الگ حویلیوں میں۔ عارج، عیسیٰ خان کی حویلی میں اور میں خواص خان کی حویلی میں تھی۔

ظاہر ہے کہ نکاح کے باوجود میرے انسانی قالب کی عمر اتنی نہیں تھی کہ اسے رخصت کر دیا جاتا۔ عارج کو یقیناً ایسی کسی صورتحال کا اندازہ نہیں تھا۔ اس لئے مجھ سے الگ رہنے پر جھنجھلایا

ہوا سا رہتا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے کہتا "کوئی ایسی تدبیر نکال اے دینار کہ ہم ایک ساتھ رہ سکیں۔"

میں جواب میں کہہ دیتی کہ خدا کا شکر ادا کر، ہم ایک ہی شہر میں ہیں۔

ممکن ہے عارج کو اور مجھے عرصہ دراز تک الگ رہنا پڑتا مگر حالات کی ایک نئی کروٹ نے ہمیں ملا دیا۔

مہر النساء اور شہباز کی شادی کو ابھی ایک ماہ گزرا تھا کہ ایک رات قطب خان کے ہرکارے، خواص خان کی حویلی پہنچ گئے۔ وہ قطب خان کے حکم پر اسے گرفتار کرنے آئے تھے۔ یہ حکم نائب السلطنت قطب خان کا تھا۔ خواص خان بخوبی جانتا تھا کہ لیت و لعل یا مزاحمت کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ خاموشی کے ساتھ ان ہرکاروں کے جلو میں زندان کی طرف چل دیا۔ اس نے صرف اتنا کیا تھا کہ حویلی سے چلتے وقت اپنے ایک خادم کو امیر عیسیٰ خان کے پاس روانہ کر دیا تھا کہ وہ اسے اس واقعہ کی فوراً اطلاع دے دے۔

اس رات خواص خان کی گرفتاری کے فوراً بعد ہی میں، مہر النساء کے قالب سے نکل آئی اور اسے سلا دیا۔ میں یہ پتا لگانے کیلئے بے چین تھی کہ خواص خان کی قسمت کا کیا فیصلہ ہوتا ہے! مزید یہ کہ اس سلسلے میں عیسیٰ خان نے کیا قدم اٹھایا ہے!

عیسیٰ خان کو جیسے ہی اس واقعہ کی خبر ملی، وہ فوراً نائب السلطنت کے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ قطب خان کے محل پہنچ کر عیسیٰ خان نے اندر خبر کرائی کہ فوری طور پر ملنے کا خواہش مند ہوں۔ میں بھی اس کے ساتھ تھی مگر وہ اس سے لاعلم تھا۔ قطب خان جب عیسیٰ خان سے ملا تو تیوریوں پر بل پڑے ہوئے تھے۔

عیسیٰ خان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی قطب خان بول اٹھا۔

"کیا تمہیں نہیں معلوم کہ یہ میرے آرام کا وقت ہے؟"

"جانتا ہوں۔" عیسیٰ خان نے نرمی اختیار کی اور مزید بولا "معاملہ ہی دراصل کچھ ایسا تھا کہ مجھے اس وقت آنا پڑا۔" یہ کہہ کر اس نے خواص خان کی رہائی کے بارے میں درخواست کی۔

"یہ ناممکن ہے عیسیٰ خان!" قطب خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تم تو اچھی طرح جانتے ہو کہ خواص خان ہمیشہ ہماری مخالفت کرتا رہا ہے۔ مرحوم شاہ کے زمانے ہی سے اس کا شمار ہمارے مخالفین میں ہوتا ہے۔"

"لیکن اب تو وہ آپ کے وفاداروں میں شامل ہے۔" عیسیٰ خان اپنے دوست کی وکالت کرنے لگا۔ "آپ کے علم میں ہے کہ وہ میرا دوست ہونے کے علاوہ اب رشتے دار بھی بن چکا ہے۔ ایسی صورت میں بھلا وہ کس طرح آپ کی مخالفت کر سکتا ہے! اسے میرے اور

آپ کے مراسم و تعلقات کا بھی اچھی طرح اندازہ ہے۔"

"تمہیں بہت سی باتوں کا علم نہیں ہے۔عیسیٰ خان!" قطب خان طویل سانس لے کر بولا" کیا تم یقین کرو گے کہ خواص خان میرے خلاف سلیم شاہ کو اکساتا رہا ہے! وہ اس کوشش میں ہے کہ مجھے معزول کرا کے خود نائب السلطنت بن جائے۔دشمن ہر حال میں دشمن ہوتا ہے۔ دوست نہیں بن سکتا۔اسے زندہ چھوڑ دینا خود اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دینے کے مترادف ہے۔میں یہ غلطی کرنا نہیں چاہتا۔خواص خان کو تہ تیغ کرنا ہی میری سلامتی کی ضمانت ہے۔"

میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ قطب خان، خواص خان کی جان ہی کے در پے ہو جائے گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ قطب خان کو ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ دوسری جانب عیسیٰ خان نے بھی طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے قدیمی دوست اور رشتے دار خواص خان کی زندگی نہ بچا سکا تو خود بھی قطب خان کی دوستی ترک کر دے گا۔رات گئے تک وہ قطب خان کے محل میں موجود رہا اور مسلسل اسے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

اسی موقع پر میں نے مداخلت کی اور قطب خان کو اپنے اثر میں لے کے عیسیٰ خان کی بات ماننے پر مجبور کر دیا۔ میں اگر ایسا نہ کرتی تو خواص خان مارا جاتا۔قطب خان بظاہر بہت سمجھانے بجھانے پر آخر کار خواص خان کی جاں بخشی پر رضامند تو ہو گیا مگر اس نے عیسیٰ خان پر واضح کر دیا کہ خواص خان اب دہلی میں نہیں رہ سکتا۔اسے ہر حال میں سات دن کے اندر اندر اس شہر کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کہنا پڑے گا۔ میں اگر چاہتی تو قطب خان یہ شرط بھی نہ لگا تا لیکن مجھے تو عارج کے ساتھ رہنے کی ایک اور ہی تدبیر سوجھ گئی تھی۔اس تدبیر پر عملدر آمد کی خاطر مجھے عیسیٰ خان کو بھی اپنے اثر میں لینا ہو گا۔ مجھے اس کا احساس تھا۔

رات کے تیسرے پہر عیسیٰ خان اپنے دوست خواص خان کی رہائی کا پروانہ لے کر خود زنداں میں پہنچا۔وہ خواص خان کی رہائی کے بعد اسے اس کی حویلی تک چھوڑنے گیا۔راستے میں اس نے خواص خان پر واضح کر دیا کہ اسے سات دن کے اندر اندر دہلی سے نکل جانا ہو گا۔

خواص خان اپنی جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔اس نے جواباً عیسیٰ خان سے کہا" میں جلد ہی اپنے آبائی شہر سہسرام چلا جاؤں گا اور مناسب وقت کا انتظار کروں گا کہ دوبارہ دہلی لوٹ کر آ سکوں۔"

خواص خان اچھی طرح جانتا تھا کہ اقتدار کی دھوپ چھاؤں کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔اسے یقین تھا کہ قطب خان کے اقتدار کا سورج جو اس وقت نصف النہار پر ہے جلد ہی ڈھل جائے گا۔کوئی بھی بادشاہ کسی ایسے با اثر و با اقتدار امیر کو زیادہ عرصے تک برداشت نہیں

کرتا جو کسی بھی وقت خود اس کے اقتدار کیلئے خطرہ بن سکتا ہے۔

جس روز خواص خان کو دہلی سے روانہ ہونا تھا میں اس سے پہلے ہی عیسیٰ خان کو اپنے اثر میں لے کر ایک بات اس کے دماغ میں بٹھا چکی تھی۔عیسیٰ خان اپنے بیٹے شہباز کے ہمراہ آخری بار اپنے دوست سے ملنے آیا۔شہباز ہی کے جسم پر عارج نے قبضہ کر رکھا تھا۔

الوداعی کلمات کے بعد عیسیٰ خان نے وہ بات کہہ ہی دی جو میں نے اسے سمجھائی تھی۔ اس نے کہا" میرے دوست! میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ تمہارے لئے نہایت مشکل مرحلہ ہے مگر میں تم سے اپنی بیٹی مہر النساء کو مانگنے آیا ہوں۔تم جانتے وہ کہ اب وہ تمہارے پاس میری امانت ہے۔میں نہیں چاہتا کہ وہ بھی تمہارے ساتھ در در کی ٹھوکریں کھائے۔"

میرا خیال تھا کہ خواص خان اس پر تیار نہیں ہو گا اور مجھے اسے بھی اپنے اثر میں لینا پڑے گا مگر اس کی ضرورت خلاف توقع پیش نہیں آئی۔خواص خان فوراً اس پر آمادہ ہو گیا۔میرا مقصد یہی تھا اس لئے میں نے خواص خان کے رویے پر توجہ نہیں دی۔اس نے مجھے بلا کر میرا ہاتھ عیسیٰ خان کے ہاتھ میں دے دیا اور روانگی کی تیاری کرنے لگا۔حیرت انگیز بات یہ تھی کہ خواص خاں کے چہرے سے رنج و ملال کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ اپنی کمسن بیٹی کی جدائی پر وہ غمزدہ نظر نہیں آتا تھا۔اس کی بیوی یعنی مہر النساء کی ماں البتہ مجھ سے جدا ہوتے وقت بہت روئی اور دیر تک مجھے سینے سے چمٹائے پیار کرتی رہی۔ پھر ان کی روانگی کا وقت ہو گیا۔وہ مجھے عیسیٰ خان کے حوالے کر کے دہلی سے رخصت ہو گئے۔

میرے لئے عیسیٰ خان کی حویلی کا ماحول بالکل نیا تھا مگر رفتہ رفتہ میں اس نئے ماحول سے مانوس ہو گئی۔ عارج حویلی میں میری آمد سے بہت خوش تھا۔اب تک میں نے آدم زادوں کے درمیان رہ کر بہت کچھ سیکھا تھا۔آدم زاد کس بات سے خوش کس سے ناخوش ہوتے ہیں انہیں کیا باتیں متاثر کرتی ہیں یہ سارے گر مجھے خوب آتے تھے۔میں اسی لئے اب عیسیٰ خان کو "بابا" کہہ کر پکارتی تھی اور اس سے اس طرح ضد کرتی تھی جیسے کوئی بیٹی اپنے باپ سے ضد کرتی ہے۔عیسیٰ خان بھی مجھے اپنی بیٹی کی طرح عزیز رکھتا تھا اور میری ہر ضد پوری کرتا تھا۔ وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔دن مہینوں میں ڈھلے اور مہینے سال بن گئے۔میرا انسانی قالب اب عمر کے گیارہویں سال میں قدم رکھ چکا تھا اور آغاز شباب کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ میرے قالب کا قد اب پہلے سے کافی لمبا ہو چکا تھا۔لمبے سیاہ بالوں میں گھرے ہوئے سرخ و سفید چہرے میں ایک غیر معمولی کشش تھی۔عیسیٰ خان جب بھی میری طرف دیکھتا تھا مجھے اس

کی آنکھوں میں خوف سا دکھائی دیتا۔ وہ شاید اندازہ کر رہا تھا کہ اس کی بہو بہت جلد ایک قیامت خیز حسینہ بن جائے گی جو بھی اسے دیکھے گا اس کے سحر انگیز حسن کا اسیر ہو کے رہ جائے گا۔ عیسیٰ خان کے خوف کو میں بخوبی سمجھتی تھی۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھ پر کسی کی نظر پڑے۔ اس نے اسی لئے ایک روز مجھے اپنے پاس بلایا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا ''بیٹی! میں نے تمہیں مردانہ لباس پہنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں بیٹوں کی طرح تمہاری پرورش کرنا چاہتا ہوں بولو، میرے اس فیصلے سے تم خوش تو ہو؟''

''جی...... جی بابا!'' میں نے عیسیٰ خان کی توقع کے مطابق بہت خوشی کا اظہار کیا اور بلا تامل اس نے جو بھی کہا تھا اس پر تیار ہو گئی۔

پھر میں نے مردانہ لباس پہننا شروع کر دیا۔ سر کے لامبے بالوں کو میں نے پگڑی میں چھپا لیا تھا۔

نیا لباس پہن کر خود کو میں نے آئینے میں دیکھا تو عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔ میں بالکل ایک نوعمر لڑکا معلوم ہو رہی تھی۔

مجھے مختلف زمانوں میں جا کر شمشیر زنی، نیزہ بازی، تیر اندازی اور گھڑ سواری سبھی کچھ آ گیا تھا۔ اس کے باوجود وقت کا تقاضا بھی میرے پیش نظر تھا۔ اسی کو ملحوظ رکھ کر میں نے عیسیٰ خان سے فنون حرب سیکھنے کیلئے خواہش کی۔

عیسیٰ خان پہلے ہی یہ طے کر چکا تھا کہ وہ میری پرورش بیٹوں کی طرح کرے گا۔ اس لئے فوراً رضامند ہو گیا۔ چاہتا تو وہ یہ تھا کہ یہ سب مردانہ شوق اس کے اپنے بیٹے شہباز کے دل میں پیدا ہوں مگر اسے ان چیزوں سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ میں نے عارج کو سمجھایا تھا کہ ہر زمانے میں اپنی صلاحیتوں کا جواز پیدا کرنا پڑتا ہے۔ اس نے میری بات ٹال دی تھی۔ وہ میری طرح فنون حرب سیکھنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ اس انکار میں عارج کے انسانی قالب کے فطری تقاضوں کو بھی دخل ہے۔ میں یہ جانتی تھی۔ اسی وجہ سے میں نے اصرار نہیں کیا تھا۔ عیسیٰ خان نے اپنی یہ دلی خواہش کہ اس کا بیٹا فنون حرب سیکھے، اس طرح پوری کر لی کہ فن حرب کے بہترین استاد میری تربیت کیلئے مقرر کر دیئے۔ یہ تمام فنون مجھے پہلے سے آتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ میرے انسانی قالب مہر النساء کی ماں قمر النساء بھی ان فنون میں طاق تھی۔ قمر النساء کا تعلق ایک ترکمان قبیلے سے تھا جہاں مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی ان جنگی فنون کی تربیت دی جاتی تھی۔ چند ہی برسوں میں، میں نے یہ ظاہر کر دیا کہ تمام مطلوبہ فنون حاصل کر چکی ہوں۔

مجھے اب عیسیٰ خان کی حویلی میں رہتے ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے۔ میرا انسانی قالب اپنی عمر کے چودھویں سال میں تھا۔ اپنے دراز قد اور قدرتی بڑھوار کی وجہ سے اب میں جوان معلوم ہوتی تھی۔

☆......☆......☆

یوں تو عارج کا انسانی پیکر شہباز بھی اب سترہ برس کا ہو چکا تھا مگر وہ اتنا دبلا پتلا اور نازک اندام تھا کہ مجھ سے چھوٹا لگتا تھا۔ اس میں جوان مردوں کی سی کوئی بات نہیں تھی۔ فطرتاً وہ بزدل تھا۔ اسی لئے فنون حرب سے بھی بھاگتا تھا۔ عارج کے انسانی قالب کے فطری تقاضے اس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس کے لئے میں ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھی۔ مجھے اس کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ شاہم بیگ اور صالح کے انسانی قالبوں کی فطری صفات عارج پر غالب آ گئی تھیں۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ اس میں عارج کا کوئی قصور نہیں کچھ ایسی ہی صورتحال اس زمانے میں بھی پیش آ رہی تھی۔

عارج کا انسانی قالب شہباز دیکھنے میں حسین و پرکشش تھا۔ حویلی کی کنیزوں اور خادماؤں نے اسے بگاڑ دیا تھا۔ اتنی سی عمر میں وہ شاہد و شراب کا رسیا ہو گیا تھا۔ کثرت شراب نوشی پر اسے عیسیٰ خان بھی کئی بار ڈانٹ چکا تھا مگر وہ باز نہیں آتا تھا۔ اس کے اکثر دوست بھی اسی کی طرح تھے وہ اور اس کے دوست شادی کرنے کو پاؤں کی زنجیر کہتے تھے۔ کنیزوں اور خوبصورت خادماؤں کے ہجوم میں رہ کر وہ مجھ سے کچھ کٹا کٹا سا رہتا۔ یوں بھی میں اس کے انسانی قالب کی فطری کمزوریوں کو سمجھ چکی تھی۔ اس لئے اسے نظر انداز کر جاتی۔ اس کے علاوہ میں مردانہ لباس میں رہتی تھی اور کبھی بناؤ سنگار بھی نہیں کرتی تھی۔ عارج کو کسی کے ناز اٹھانے کے بجائے خود اپنے ناز اٹھوانے کی عادت ہو گئی تھی۔ موقع ملنے پر ایک بار میں نے خلوت میں عارج کو سمجھایا:

''اے عارج! مجھے خبر ہے کہ تیری عادات بد کی ذمے داری صرف تجھ پر عائد نہیں ہوتی۔'' میں بولی ''اس کے باوجود میں تجھے تاکید کرتی ہوں کہ خود کو سنبھال! اے نوشی اور آوارگی پر قابو پانے کی کوشش کر!''

''تو ٹھیک کہتی ہے اے دینار!'' عارج نے تسلیم کیا۔ ''مجھے خود بھی اپنے انسانی قالب کی لغزشوں اور کوتاہیوں پر شرمندگی ہے، مگر...... مگر میں کیا کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ معلوم نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے کہ خود پر قابو نہیں رکھ پاتا۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ تیری تاکید پر عمل کر سکوں۔''

پہلے پہل تو مجھے کسی نے یہ احساس نہیں دلایا تھا کہ میں، شہباز کی منکوحہ ہوں، لیکن اب

ایسا نہیں تھا۔ کنیزیں اور خادمائیں مجھے احساس دلانے لگی تھیں کہ میں شادی شدہ ہوں۔ انہوں نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی کہ نارج کا انسانی پیکر شہباز مجھ سے کھنچا کھنچا سا رہتا ہے۔

عیسیٰ خاں کی بیوی، شہباز کے بچپن ہی میں مر گئی تھی اور اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ شہباز اس بنا پر بھی بچپن سے بگڑ گیا تھا۔ عیسیٰ خان اس پر زیادہ توجہ نہ دے سکا تھا، پھر فطرتاً بھی وہ اپنے باپ سے قطعی مختلف تھا۔

ادھر اس عرصے میں اقتدار کے ایوانوں میں کئی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ میں ان کی طرف سے بھی بے خبر نہیں تھی۔ خواص خاں کا اندازہ درست ثابت ہونے لگا تھا۔ قطب خاں کے اقتدار و اختیار کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ سلیم شاہ سوری جو اب مسند شاہی پر پوری طرح اپنے قدم جما چکا تھا۔ اپنے نائب السلطنت سے بدظن ہو گیا تھا۔

قطب خاں کے بیشتر حامی امرا کو سلیم شاہ سوری گرفتار کرا کے داخل زندان کر چکا تھا۔ گو ابھی اس نے قطب خاں پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا لیکن قطب خاں اچھی طرح جانتا تھا کہ جلد یا بدیر یہ مرحلہ آنے والا ہے۔

ایک شب قطب خاں نے انہی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے عیسیٰ خان کو اپنے محل میں بلوایا۔ جب اسے اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ کوئی ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سن سکتا تو اس نے رازدارانہ لہجے میں عیسیٰ خان سے کہا "میرے دوست! تم نے یقینی طور پر اندازہ لگا لیا ہوگا کہ حالات اب ہمارے لئے ناموافق ہوتے جا رہے ہیں۔ شیر شاہ سوری کا وہ بیٹا سلیم شاہ سوری جسے خود ہم نے تخت پر بٹھایا ہمارے دوستوں اور بہی خواہوں کو راہ سے ہٹا چکا ہے۔ اب صرف تم اور میں باقی بچے ہیں۔ کسی بھی وقت ہم دونوں کی باری آ سکتی ہے۔"

"اس سے بچنے کی کوئی صورت آپ کے ذہن میں ہے؟" عیسیٰ خان نے فکرمندی سے پوچھا۔

قطب خاں چند لمحے خلا میں دیکھتے ہوئے کچھ سوچتا رہا، پھر دھیمی آواز میں بولا "ہاں عیسیٰ خاں! میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کل ہم دونوں بادشاہ کے پاس جائیں اور اس سے حج پر جانے کی اجازت طلب کریں۔ جب ہمیں اجازت مل جائے تو بلاتاخیر یہاں سے نکل جائیں۔ جب حالات ہمارے حق میں بہتر ہو جائیں گے تو ہم واپس دہلی آ جائیں گے۔"

عیسیٰ خان نے قطب خاں کی تجویز سے اتفاق کیا۔ ان دونوں کی جان بچنے کی یہی ایک صورت تھی۔ عیسیٰ خاں کا بھی یہی خیال تھا کہ سلیم شاہ سوری حج پر جانے سے نہیں روکے گا۔

اگلے ہی روز وہ دونوں شاہی دربار میں گئے اور سلیم شاہ سوری سے اپنے ارادے کا اظہار کیا۔

سلیم شاہ سوری معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر اس نے قدرے توقف سے آخرکار کہا "یہ معاملہ ایسا ہے کہ ہم اس میں انکار کر کے آخرت کا گناہ مول لینا نہیں چاہتے۔ ہماری جانب سے تم دونوں کو حج پر جانے کی اجازت ہے۔ ہم اس کے ساتھ یہ بھی کہیں گے کہ وہاں ہمارے لئے بھی دعائے خیر کرنا۔"

بظاہر تو سلیم شاہ سوری نے انہیں اجازت دے دی مگر صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان کے حج پر جانے سے رضامند نہیں ہے۔ درباریوں کی موجودگی میں اس نے مصلحت کے پیش نظر انہیں حج پر جانے کی اجازت دی تھی۔

عیسیٰ خاں اور قطب خاں کے چہروں پر رونق آ گئی۔ وہ دونوں خوش خوش دربار سے لوٹے اور سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

اسی رات سلیم شاہ سوری نے عیسیٰ خاں کو اپنے محل میں طلب کر لیا تو ایک بار پھر وہ اندیشوں میں گھر گیا۔ وہ دل ہی دل میں خیریت کی دعائیں مانگتا ہوا شاہی محل کی طرف چل دیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

شاہی محل پہنچ کر عیسیٰ خاں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس اطمینان کا سبب سلیم شاہ سوری کا رویہ تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے عیسیٰ خاں کا استقبال کیا تھا۔ تخلیے میں پہنچ کر سلیم شاہ سوری نے نہایت اپنائیت سے اپنا ہاتھ عیسیٰ خاں کے شانے پر رکھا اور معنی خیز لہجے میں بولا "ہمیں معلوم ہے عیسیٰ خاں کہ تم اور قطب خاں کیوں حج پر جانا چاہتے ہو! مگر اطمینان رکھو ہمیں کم از کم تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم تم سے بہت خوش ہیں اور بہت جلد تمہیں ایک اہم ذمے داری سونپنے والے ہیں۔ ہمیں پوری امید ہے کہ تم ہماری توقعات پر پورے اترو گے اور تمہاری طرف سے مایوسی نہیں ہوگی۔"

"آپ حکم فرمائیں شاہ عالی وقار! میں آپ کے حکم کی تعمیل میں جان دینے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔" عیسیٰ خاں نے مودب لہجے میں کہا۔

سلیم شاہ سوری نے یہ سن کر گہری نظروں سے عیسیٰ خاں کے چہرے کا جائزہ لیا جیسے اس کے چہرے سے جھوٹ اور سچ کا اندازہ لگا رہا ہو۔ پھر وہ رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔ "سنو عیسیٰ خاں! تم قطب خاں کے دوست ہو، مگر تمہیں شاید اس کی اصلیت کا علم نہیں ہے۔ قطب خاں ایک سازشی آدمی ہے اور بددیانت بھی! اس کے مقرر کردہ افسر مال غازی خاں نے شاہی خزانے اور سرکاری مال میں بڑے پیمانے پر خورد برد کی ہے۔ تفتیش سے یہ بات پایہ

ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ خورد برد کیے جانے والے مال کا بڑا حصہ قطب خاں کی تحویل میں جا چکا ہے۔ اب تمہی یہ فیصلہ کرو کہ کیا ایسے بددیانت آدمی پر کسی بھی معاملے میں بھروسا کیا جا سکتا ہے؟...... اور یہ کہ ایسے شخص کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟''

سلیم شاہ سوری کی بات سن کر عیسیٰ خاں حیران رہ گیا۔ وہ بہرحال بددیانت شخص نہیں تھا۔ اس کا دامن صاف تھا۔

جواب میں بولا ''اے شاہ عالی وقار! جو شخص بھی خیانت کا مرتکب ہو وہ چاہے کسی عہدے اور منصب پر ہو یقیناً سخت سے سخت سزا کا مستحق ہے۔ مجھے اس پر شرمندگی ہے کہ میں اس کا دوست ہوں مگر اب ...... اب نہیں رہا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ حضور نے مجھے اس کی اصلیت سے آگاہ کر دیا ورنہ ہو سکتا تھا کہ میں بھی اس کے سبب کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔''

عیسیٰ خاں کا جواب سنا تو سلیم شاہ سوری کی آنکھوں میں آسودہ سی ایک چمک ابھری۔ اس نے گرم جوشی سے عیسیٰ خاں کا شانہ تھپکا اور کہا'' عیسیٰ خاں! ہم سمجھ رہے تھے کہ تم یہی جواب دو گے۔ تم جیسے ایماندار شخص سے ہمیں ایسے ہی جواب کی امید تھی۔ تم اس بات سے بھی خوب آگاہ ہو کہ اس مرحلے پر اگر ہم قطب خاں کو گرفتار کر لیں تو کئی مسائل کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس وقت دارالحکومت میں کوئی فتنہ برپا ہو۔ تم یقیناً ہماری بات سے اختلاف نہیں کرو گے۔''

''پھر حضور کا کیا ارادہ ہے؟'' عیسیٰ خاں نے دریافت کیا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ تم دونوں طے شدہ نظام العمل کے مطابق حج پر روانہ ہو جاؤ مگر جب دارالحکومت سے دور نکل جاؤ تو تمہاری یہ ذمے داری ہو گی کہ قطب خاں کو گرفتار کر لو۔'' سلیم شاہ سوری نے اپنا مدعا ظاہر کیا۔'' تم قطب خاں کو اپنے ساتھ آگرہ لے جا کر قید میں ڈال دو۔ ہمارے خیال میں اس طرح انصاف کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں گے اور ہم کسی ممکنہ خطرے سے بھی بچ جائیں گے۔''

''حضور کے حکم کی تعمیل ہو گی۔'' عیسیٰ خاں نے سلیم شاہ سوری کو یقین دلایا۔ پھر وہ دل ہی دل میں مستقبل کے منصوبے باندھتا شاہی محل سے واپس آ گیا۔ میری توجہ اس کے ذہن ہی پر تھی۔

طے شدہ منصوبے کے مطابق عیسیٰ خاں اور قطب خاں دو دن کے بعد حج کے لئے دارالحکومت سے روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنی چشم تصور کا دائرہ وسیع کر لیا تھا اور سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ دہلی سے نکلنے کے بعد انہوں نے پہلی منزل پر قیام کیا تو شام ہو چکی تھی۔ سفر کی تھکن

کے سبب قطب خاں جلد ہی اپنے خیمے میں جا کر سو گیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد عیسیٰ خاں خاموشی کے ساتھ اپنے خیمے سے باہر نکل آیا اور شاہی سپاہیوں کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

رات گئے بادشاہ کے مسلح سپاہی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے نہایت آسانی سے قطب خاں کو گرفتار کر لیا۔

قطب خاں نے حیرت اور بے یقینی سے پہلے سپاہیوں کی طرف اور پھر عیسیٰ خاں کی جانب دیکھا۔ عیسیٰ خاں سپاہیوں کے ساتھ کسی کے روبرو کھڑا ہوا تھا۔ قطب خاں کی تجربے کار نگاہیں فوراً ہی معاملے کی تہ تک پہنچ گئیں۔ اسے احساس ہو گیا کہ اب سلیم شاہ سوری کے غضب سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی آخری امید کے طور پر اس نے عیسیٰ خاں سے درخواست کی۔'' میرے دوست! مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں، یہ تقدیر کا کھیل ہے۔ کبھی عروج کبھی زوال! تقدیر کے اس کھیل کو نہ میں روک سکتا ہوں نہ تم! مگر پرانی دوستی کے ناطے میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں مجھے امید ہے کہ تم میری درخواست رد نہیں کرو گے۔''

عیسیٰ خاں نے سوالیہ نظروں سے قطب خاں کی طرف دیکھا۔

قطب خاں نے سر جھکا لیا اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ''تم جانتے ہو میرے دوست کہ اب سلیم شاہ سوری مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میری دلی خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے میں حج کی سعادت ضرور حاصل کر لوں۔ ہم دونوں اسی ارادے کے ساتھ گھر سے نکلے تھے۔ میری درخواست ہے کہ تم مجھے اپنے ہمراہ حج پر ضرور لے جاؤ۔ میں یقین دلاتا ہوں تمہیں کہ ہرگز فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گا۔ تمہارے مزید اطمینان کی خاطر اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ تم مجھے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر لے چلو تاکہ میں چاہوں بھی تو نہ بھاگ سکوں۔''

چند لمحے عیسیٰ خاں نے کچھ سوچا اور پھر اس پر رضامند ہو گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ خود اس کے دل میں بھی حج کرنے کی آرزو تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ ابھی اسے سلیم شاہ سوری کی بات پر پوری طرح یقین نہیں آیا تھا۔ سلیم شاہ سوری نے جو الزام اپنے نائب السلطنت قطب خاں پر لگایا تھا وہ محض الزام بھی ہو سکتا تھا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔

بدستور سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کرنے کے بعد عیسیٰ خاں نے سلیم شاہ سوری کے نام ایک خط لکھا۔ خط میں اس نے تمام صورتحال لکھ کر سپاہیوں کو واپس دارالحکومت بھیج دیا، پھر وہ قطب خاں کو پابہ جولاں کر کے حج پر روانہ ہو گیا۔

سلیم شاہ سوری کو عیسیٰ خاں کا خط ملا تو وہ بہت برہم ہوا۔ اس نے اسی وقت عیسیٰ خاں

کو اس کے عہدے سے معزول کر دیا۔ عیسیٰ خاں کی جگہ اس نے ایک اور امیر کو دے دی تھی۔ اب وہ عیسیٰ خاں اور قطب خاں کی حج سے واپسی کا منتظر تھا۔ اسے یہ ملال بھی تھا کہ عیسیٰ خاں پر اعتماد کیوں کر لیا! اب وہ کوئی قدم اسی وقت اٹھاتا جب دونوں امیر حج سے لوٹ آتے۔

میرے انسانی قالب مہر النساء کا باپ خواص خاں ابھی تک اپنے آبائی شہر سہسرام ہی میں مقیم تھا۔ اسے قطب خاں کے زوال کی خبر ملی تو بہت خوش ہوا۔ اس کے خیال میں اب دہلی جانے کا صحیح وقت تھا۔ خطرہ ٹل چکا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے رخت سفر باندھنے کو کہا۔ چند ہی روز بعد وہ خفیہ طور پر دہلی میں داخل ہو گیا۔

خواص خاں کا خیال تھا کہ عیسیٰ خاں سے پرانی دوستی اور رشتے داری کے سبب اسے بادشاہ وقت کی قربت اور خوشنودی حاصل ہو جائے گی۔ اسے یہ علم تھا کہ سلیم شاہ سوری حکم عدولی کی بنا پر عیسیٰ خاں کو برطرف کر چکا ہے۔

مہر النساء کی ماں جس نے پانچ برس سے اپنی بیٹی کی صورت نہیں دیکھی تھی، مجھ سے ملنے کے لئے بے تاب ہو رہی تھی۔ دہلی پہنچتے ہی اس نے اپنے خاوند سے ضد کی کہ وہ اسے لے کر فوراً عیسیٰ خاں کی حویلی میں چلے۔ خواص خاں کا خیال تھا کہ ابھی یہ قدم اٹھانا مصلحت کیخلاف ہے۔ اس کے باوجود بیوی کی ضد سے مجبور ہو کر اسے عیسیٰ خاں کی حویلی میں جانے کی اجازت دے دی۔ وہ خود اپنے ایک دیرینہ دوست کے گھر مقیم رہا۔ وہ کوئی غیر معروف آدمی نہیں تھا۔ اس لئے ابھی دہلی والوں کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔

قمر النساء جب عیسیٰ خاں کی حویلی میں پہنچی تو میں اس وقت پائیں باغ میں شمشیر زنی کی مشق کر رہی تھی۔ میرے جسم پر حسب معمول مردانہ لباس تھا۔ ایک دراز قد وجیہہ نوجوان مجھے تلوار کے داؤ سکھا رہا تھا۔ اس نوجوان کا نام اسحاق تھا جو عیسیٰ خاں کا ایک ماتحت کماں دار تھا۔ عیسیٰ خاں ہی کے حکم پر روزانہ وہ مجھے شمشیر زنی کی مشق کرانے آتا تھا۔ قمر النساء نے فوراً ہی مجھے اپنی بیٹی مہر النساء کی حیثیت سے پہچان لیا اور تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

میری نظر قمر النساء پر پڑی تو میں نے اسحاق کو رخصت کر دیا اور دوڑ کر قمر النساء کے سینے سے لگ گئی۔ میرا یہ فعل غیر ارادی تھا۔ اس کی وجہ مجھے معلوم تھی۔ رفتہ رفتہ میرے انسانی قالب کی فطری صفات مجھ پر غالب آتی جا رہی تھیں۔ انہی صفات کی بنا پر میرے دل میں انجانے جذبوں اور ارمانوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ میرا انسانی قالب جیسے خود بہ خود عارج کے انسانی پیکر شہباز کی طرف کھنچنے لگا تھا۔ میرے لئے یہ احساس بہت عجیب اور حیرت زدہ کر دینے والا تھا کہ اگر کبھی حویلی کی طویل راہداریوں میں عارج سے سامنا ہو جاتا تو مجھے

حجاب آنے لگتا۔ عارج اپنی ہی دھن میں اپنے قالب کی فطری صفات کے زیر اثر مجھے نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ اس کے انداز میں ایک عجیب سی لاتعلقی تھی۔ کبھی کبھی تو میں، عارج کی طرف سے فکر مند ہو جاتی اور سوچتی کہ کہیں عارج نے میرے عشق کو بھلا تو نہیں دیا!''

اپنے قالب سے قمر النساء کے تعلق ہی کی وجہ سے میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ کافی دیر تک میں اور قمر النساء اسی عالم میں کھڑے رہے۔ پھر میں ہی اس کے سینے سے الگ ہوئی اور پوچھا ''ماں! کیا آپ یہاں تنہا آئی ہیں؟ بابا آپ کے ساتھ دہلی نہیں آئے؟''

قمر النساء کی آنکھوں میں اداسی کی ایک پرچھائیں سی لہرائی اور وہ ٹھنڈا سانس لے کر کہنے لگی۔ ''تمہارے بابا بھی دہلی آئے ہیں، مگر بیٹی ابھی ان کا یہاں آنا مصلحت کیخلاف تھا۔ ابھی وہ دہلی میں اپنی آمد کو راز میں رکھنا چاہتے ہیں۔ تم تو جانتی ہو کہ...... کہ دہلی شہر میں ان کے داخلے پر پابندی تھی۔ ابھی وہ حکم واپس نہیں لیا گیا۔''

''رہنے دیں اماں! آپ خواہ مخواہ بابا کی پردہ پوشی کرتی رہتی ہیں۔'' میں بول اٹھی۔ میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا تھا جب برسوں پہلے خواص خاں نے میرا ہاتھ عیسیٰ خاں کے ہاتھ میں دیا تھا۔

''ایسی بات نہیں بیٹی! وہ...... تیرے بابا بھی تجھ سے محبت کرتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے قمر النساء چور سی نظر آنے لگی۔

''اگر انہیں مجھ سے محبت ہوتی تو جس طرح آپ آئی ہیں وہ بھی یہاں آسکتے تھے۔'' میں نے کہا۔ یہی بات میرے دل میں بھی تھی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں مزید بولی۔ ''میں جانتی ہوں انہیں مجھ سے کبھی محبت نہیں رہی۔ وہ ہمیشہ مجھ سے لاتعلق ہی رہے۔ انہوں نے کبھی مجھے اپنی بیٹی سمجھا ہی نہیں ورنہ شاید وہ مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر نہ جاتے۔'' میرے لہجے میں تلخی آ گئی اور قمر النساء کا ہاتھ تھام کر حویلی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگی۔ اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر میں نے انواع و اقسام کے میووں اور مشروبات سے قمر النساء کی تواضع کی۔ میں اگر چاہتی تو خواص خاں کی بے اعتنائی کا سبب بہ آسانی جان سکتی تھی۔ اس کے لئے مجھے قمر النساء کے دماغ کا جائزہ لینا پڑتا۔ بلا ضرورت میں کبھی اپنی پر اسرار قوتوں کو استعمال نہیں کرتی تھی۔ میں نے اسی لئے قمر النساء سے سوال کیا۔ ''اماں! آج میں آپ سے پوچھ کر ہی رہوں گی کہ بابا مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتے؟ مجھے سچ سچ بتائیں۔ کیا میں ان کی بیٹی، ان کا خون نہیں ہوں؟''

قمر النساء حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس نے میری تیز نگاہوں کی تاب نہ لا کر سر جھکا لیا اور دھیمی آواز میں بولی ''میں چاہتی تھی میری بچی کہ...... کہ اس راز کو اپنے

سینے ہی میں لے کر اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں مگر..... مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ اب تم ..... تم سے اس بات کو چھپانا مجھے بہت دشوار محسوس ہوتا ہے۔ میں..... میں تمہیں سب کچھ بتادوں گی میری بچی!"

کچھ دیر قمر النساء خاموش رہی، مگر میں نے اسے مخاطب نہیں کیا اور دوبارہ اس کے بولنے کی منتظر رہی۔

قمر النساء خلا میں دیکھتے ہوئے شکست خوردہ سے لہجے میں کہنے لگی۔ "میں اب سے تیس بتیس برس پہلے ایک مغل سردار کی بیٹی تھی جو ترکستان سے ہندوستان آیا تھا۔ میں جب جوان ہوگئی تو میرے باپ نے میری شادی ایک نوجوان مغل کماں دار یوسف خاں سے کردی۔ یوسف خاں درشت مزاج اور بہت جنگجو شخص تھا۔ شادی کے چند ہفتوں کے بعد ہی یوسف خاں نے مجھ سے کہا کہ ہمارا بچہ لازماً بیٹا ہونا چاہئے۔ اگر تو نے بیٹی کو جنم دیا تو پیدا ہوتے ہی میں اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کردوں گا۔ میں اپنے شوہر سے یہ بات سن کر بہت گھبرائی اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ماں بننے والی تھی۔ میں یہ بھی اچھی طرح جان گئی تھی کہ یوسف خاں جو کہتا تھا اس پر عمل کرتا تھا۔ سخت گیر ہونے کے باوجود وہ زبان کا بہت سچا تھا۔" قمر النساء نے طویل سانس لیا۔

اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ بولنا شروع کردیتی میں نے پوچھا۔ "آپ نے اپنے والد سے ان کی شکایت نہیں کی؟"

"کی تھی شکایت کہ وہ یوسف کو سمجھائیں، مگر انہوں نے میری بات پر کان نہیں دھرا۔" قمر النساء نے جواب دیا۔ "میں سوچنے لگی کہ آنے والے وقت سے کس طرح بچا جائے؟ جیسے جیسے دن گزرتے جارہے تھے۔ میرا خوف بڑھتا جارہا تھا۔ نہ جانے کیوں یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ میرے وجود میں لڑکے کے بجائے لڑکی پرورش پارہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں! انہی دنوں آگرہ میں تاجروں کا ایک قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ قافلہ سامان تجارت لے کر پٹنہ کی طرف جارہا تھا۔ اس قافلے کا سردار ایک عمر رسیدہ شخص تھا جو بظاہر بہت نیک دل معلوم ہوتا تھا۔ ایک رات میں خاموشی کے ساتھ اپنے گھر سے نکلی اور اس قافلے سے جاملی۔ میرا خیال تھا کہ قافلے کے ساتھ کچھ عرصہ دوسرے شہروں میں گزارلوں اور جب ماں بن جاؤں تو حالات کا جائزہ لے کر پھر واپس اپنے گھر آجاؤں۔ اس وقت مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ قافلے کا سردار جو بظاہر نیک سیرت شخص معلوم ہوتا تھا دراصل ایک بردہ فروش تھا۔ قافلے میں میرے شامل ہوتے ہی اس نے کوچ کردیا اور پٹنہ کی طرف روانہ ہوگیا۔"

قمر النساء کی روداد حیات بہت سنسنی خیز اور دلچسپ تھی۔ میں پوری توجہ سے سنتی رہی۔

"میرے علاوہ بھی قافلے میں کئی اور لڑکیاں تھیں جنہیں وہ بیچنے کے لئے اپنے ساتھ لے جارہا تھا۔" قمر النساء کی آپ بیتی جاری تھی۔ "ہمارا قافلہ سہسرام پہنچا تو شہر کے شوقین مزاج امرا اور روسا وہاں پہنچ گئے۔ انہی میں خواص خاں کو بھی میں نے پہلی بار دیکھا۔ قافلے کے لالچی سردار نے بہت مہنگے داموں مجھے خواص خاں کے ہاتھ فروخت کردیا۔ اس نے پہلے ہی محسوس کرلیا تھا کہ خواص خاں مجھ میں دلچسپی لے رہا تھا۔ خواص خاں عمر میں مجھ سے دگنا تھا، مگر فطرتاً وہ ایک اچھا انسان تھا۔ اس نے مجھے خرید کر پہلے تو آزاد کردیا اور پھر مجھ سے باقاعدہ شادی کرلی۔"

"آپ نے انہیں اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" میں نے دریافت کیا۔

"بتایا تھا..... میں نے....."

"تو پھر؟" میں بول اٹھی۔

"خواص خاں کی شرافت نے مجھے متاثر کیا تھا۔" قمر النساء بتانے لگی۔ "کوئی بات میں نے خواص خاں سے نہیں چھپائی اور اسے بلاکم وکاست اپنی سرگزشت سنادی۔ خواص خاں کو میرے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ اس نے اس بات پر کسی ناگواری کا اظہار کیا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ اس کا یہ احساس کیا کم تھا کہ اس نے کسی دوسرے کی اولاد کو اپنی اولاد کی طرح پالنے کا وعدہ کرلیا تھا۔ پھر اس نے جو کچھ کہا تھا اس پر عمل کرکے دکھایا۔ اگر میں اپنے آبائی شہر میں ہوتی تو آج یقیناً تم میرے سامنے زندہ نہ ہوتیں۔" آخری الفاظ اس نے معنی خیز انداز میں ادا کیے۔

میں نے قمر النساء کی پوری بپتا سن کر ٹھنڈا سانس بھرا اور بولی "تو میرا باپ ایک ظالم مغل ہے۔ کاش میں زندگی میں کبھی اسے دیکھ سکوں اور بتا سکوں کہ دیکھو میں تمہاری بیٹی ہوں اور تمہارے سامنے ہوں۔ کاش میں اسے بتا سکوں کہ خدائی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ موت اور زندگی کا اختیار صرف اور صرف خدا کو ہے۔"

قمر النساء کے چہرے پر مجھے خوف کے آثار نظر آنے لگے۔ میری بات سن کر وہ سہم سی گئی اور پھر ڈری ڈری آواز میں کہا "نہیں..... نہیں میری بچی! خدا وہ وقت نہ لائے کہ کبھی تیرا اور اس کا سامنا ہو۔"

"لیکن کیوں ماں؟"

"اس لئے میری بچی کہ یوسف خاں کو تو نہیں جانتی۔" قمر النساء نے جواب دیا۔

''میں جانتی ہوں کہ...... کہ وہ کس قدر ظالم اور بے رحم شخص ہے! میری دعا ہے کہ تجھ پر اس کا سایہ بھی نہ پڑے۔''

قمر النساء کو پریشان اور خوفزدہ دیکھ کر میں نے اسے تسلی دی۔ ''اگر تمہارا یہ کہنا ہے ماں! تم نہیں چاہتیں کہ میں کبھی اپنے باپ سے ملوں تو اس ظالم کا خیال میں اپنے دل سے نکال دوں گی۔''

کہنے کو تو میں نے یہ کہہ دیا مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ میرے دل میں گرہ سی پڑ گئی تھی۔

ابھی میں اور قمر النساء محو گفتگو تھے کہ ایک خادمہ تیزی سے تقریباً دوڑتی ہوئی خواب گاہ کے اندر آ گئی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے خادمہ کو دیکھا۔ ''کیا بات ہے، تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟'' میں نے خادمہ سے پوچھا۔

''معلوم نہیں کیوں شاہی سپاہی تیزی سے حویلی کی طرف بڑھ رہے ہیں!'' خادمہ نے اپنے چڑھے ہوئے سانسوں پر قابو پا کر بتایا۔

''تم نے شہباز کو یہ اطلاع دی؟'' میں نے معلوم کیا۔ میرا اشارہ عارج کی طرف تھا۔

''جی ہاں۔'' خادمہ نے جواب دیا۔ ''مگر وہ ہوش میں نہیں ہیں۔ انہوں نے آج بھی زیادہ پی لی ہے۔''

خادمہ ابھی یہی کہہ پائی تھی کہ ایک کنیز دوڑتی ہوئی وہاں آ گئی۔

''کہو تم کیا خبر لائی ہو؟'' میں نے کنیز کو مخاطب کیا۔

''شاہی سپاہیوں نے حویلی کو گھیرے میں لینا شروع کر دیا ہے۔'' کنیز نے کہا۔

یہ خبر میرے لئے تشویش کا سبب تھی۔ وقتی طور پر میں اسی لئے پریشان ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شاہی سپاہیوں نے کس لئے حویلی کو گھیرے میں لیا ہے!''

ان لمحات میں اگر میری جگہ کوئی مرد بھی ہوتا تو گھبرا جاتا، مگر جلد ہی میں نے خود پر قابو پا لیا۔

معاً میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔ میں اس حقیقت تک پہنچ گئی تھی کہ حویلی کو کس لئے گھیرے میں لیا گیا ہے۔

ان حالات میں جن سے میں گزر رہی تھی، حویلی کے گھیر لئے جانے کی ایک ہی وجہ میرے نزدیک ممکن تھی، میں نے سوچا کہیں مہر النساء کے سوتیلے باپ خواص خاں کی دہلی میں موجودگی کا راز تو نہیں کھل گیا؟ یہ خیال آتے ہی میں قمر النساء کی طرف سے فکرمند ہو گئی، ایسی

صورت میں قمر النساء کو حویلی میں نہیں ہونا چاہئے تھا، قمر النساء خواص خاں کے دوست کے ایک ملازم کو ساتھ لے کر آئی تھی، وہ ملازم مردانے میں موجود تھا، پھر میں نے دیر نہیں کی، میں نے حویلی کے ایک خفیہ راستے سے قمر النساء کو اس ملازم کے ساتھ روانہ کر دیا۔

کچھ ہی دیر میں یہ عقدہ کھل گیا کہ شاہی سپاہی، خواص خاں ہی کی تلاش میں آئے تھے، خواص خاں پر اب بھی یہ پابندی عائد تھی کہ وہ دہلی میں داخل نہیں ہو سکتا، نہ وہاں قیام کرنا اس کے لئے ممکن ہے۔

اس روز خواص خاں کو معلوم ہو گیا کہ شاہی سپاہی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ اسے اپنے دوست کے ذریعے یہ خبر بھی لگ گئی کہ عیسیٰ خاں کو حج سے واپس آنے کے بعد سلیم سوری کے عتاب کا سامنا کرنا پڑے گا، اس صورت حال میں خواص خاں کا اب دہلی میں ٹھہرنا خطرناک تھا وہ اسی لئے خاموشی کے ساتھ جس طرح دہلی میں داخل ہوا تھا اسی طرح وہاں سے اپنی بیوی قمر النساء کے ساتھ سہسرام کی طرف لوٹ گیا۔

میرا انسانی قالب اب عمر کی اس منزل میں پہنچ چکا تھا کہ آدم زاد مردوں کی نظریں انھیں تو نظر انداز نہ کر سکیں، اب یہ قالب تقریباً سولہ برس کا ہو گیا تھا، مگر عارج کے انسانی پیکر کو اس کا احساس نہیں تھا، وہ میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا، ہر چند کہ مجھے اس بے رخی کی وجہ معلوم تھی پھر بھی جانے کیوں خود کو تنہا محسوس کرتی اور اداس ہو جاتی۔

عارج بھی اسی حویلی میں رہتا تھا مگر اس طرح کہ وہاں نہ رہتا ہو، اس کے شب و روز اس کی مصروفیات اور مشاغل قطعی مختلف تھے، اکثر مجھ سے اس کی مڈبھیڑ ہو جاتی مگر مجھے کبھی اس کی آنکھوں میں محبت کا کوئی جذبہ مچلتا نظر نہ آتا، ہاں میرے خوب رو اتالیق اسحاق کی نظریں مجھ سے بہت کچھ کہتی تھیں، یہ ''خاموش زبان'' سمجھنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔

ہر چند کہ اسحاق نے کبھی برملا مجھ سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا تھا مگر وہ جتنی دیر حویلی میں رہتا، اس کی پرشوق نگاہیں والہانہ انداز میں میرے حسین سراپا کا طواف کرتی رہتیں، ان نگاہوں میں محبت و معصومیت تھی، ہوس نہیں، اگر میں ہوس کا شائبہ تک محسوس کر لیتی تو اسحاق کو میرے سامنے نظریں اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی۔

میں نے اس دوران میں پہلی بار ایک حیران کن بات محسوس کی۔ یقیناً مہر النساء کے انسانی قالب ہی کا اثر تھا کہ میں نے پہلی بار کسی آدم زاد کے لئے اپنے دل میں جگہ محسوس کی، جب اسحاق میرے قریب ہوتا تو خود میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو جاتا تھا، اس کے باوجود میں کبھی یہ نہیں بھولتی تھی کہ ایک جن زادی ہوں اور میرا محبوب عارج ہے، اس کے

ساتھ یہ بھی کہ وہ نوجوان آدم زاد اسحاق رتبے میں بھی مجھ سے کم ہے اور عیسیٰ خاں کا ایک ادنیٰ ماتحت ہے، یہی وجہ تھی کہ میں اسحاق کے سامنے اپنا رویہ اتنا محتاط رکھتی تھی کہ اسحاق کو بھی حد سے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی، پراسرار قوتیں حاصل ہونے کے سبب میرے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ اسحاق کے دل و دماغ سے اپنی محبت کے نقوش قطعی طور پر مٹا دیتی، لیکن ایسا کرنا بے رحمی محسوس ہوا، اسحاق کی معصوم محبت میرے عزائم کی راہ میں حائل نہیں تھی۔ عارج کے متعلق حقیقت سے آگاہ ہونے کے باوجود کبھی کبھی اس بات پر ضرور کڑھتی تھی کہ اسے مجھ سے اب کوئی دلچسپی نہیں ہے اور وہ خوبصورت کنیزوں کے ہجوم سے نکل کر حویلی میں میری موجودگی محسوس نہیں کرتا، وہ ہمیشہ اپنی ہی سرگرمیوں میں مگن رہتا تھا، کنیزوں کے علاوہ عارج اپنے دوستوں کی صحبت میں جام و مینا سے دل بہلاتا تھا، اس کے کئی آدم زاد دوست حویلی میں آتے جاتے تھے اور وہ بھی بہتر کردار کے مالک نہیں تھے۔

عارج کے انہی دوستوں میں ایک آدم زاد بہرام خاں بھی تھا، قوی ہیکل اور کھردرے سے خدوخال والے اس آدم زاد کی عمر کم از کم چالیس برس تھی، وہ شاہی افواج کا ایک اعلیٰ عہدیدار تھا، میں کیوں کہ عارج کی نقل و حرکت پر نظر رکھتی تھی اس لئے مجھ سے کچھ چھپا نہ تھا، عارج کے کبھی آدم زاد دوستوں سے میں واقف تھی۔

اسحاق کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ شیر شاہ سوری کے زمانے میں بہرام خاں ایک معمولی کماں دار تھا مگر اب بادشاہ وقت سلیم شاہ سوری کے عہد میں اسکی بن آئی تھی۔ سلیم شاہ سوری اسے اپنے وفاداروں میں شمار کرتا تھا مجھے یہ بدوضع آدم زاد سخت ناپسند تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اسکی غلیظ آنکھوں میں ہر وقت ہوس ناچتی رہتی تھی۔

معمول کے مطابق میں ایک شام حویلی کے باغیچے میں اپنے اتالیق اسحاق کے ساتھ شمشیر زنی کی مشق کر رہی تھی کہ بہرام خاں حویلی میں داخل ہوا، وہ اپنے دوست عارج کی خواب گاہ کی طرف جا رہا تھا، مجھ پر اس کی نظر پڑی تو رک گیا اور پھر آہستہ آہستہ قریب آ گیا، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

"بہت خوب حسینہ!" بہرام خاں نے مجھ سے کہا، اس کی آواز بھی چہرے کی طرح بھونڈی تھی اور لہجے میں سفلا پن تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا "حیرت ہے کہ تم نے تو اسحاق جیسے ماہر شمشیر زن کے چھکے چھڑا دیئے۔"

میں نے ہاتھ روکا اور بہرام خاں کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی "اطمینان رکھو، میں اسی طرح تمہارے بھی چھکے چھڑا سکتی ہوں۔"

"ارے نہیں" بہرام خاں نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری اور تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ "یہ نازک دست و بازو قدرت نے اس مقصد کے لئے نہیں بنائے کہ ان سے شمشیر زنی یا تیر اندازی کی جائے، یہ تو اس لئے بنائے گئے ہیں کہ ...."

"اگر تم مجھے اتنا نازک سمجھ رہے ہو تو آؤ اور اپنا ارمان بھی پورا کر کے دیکھ لو!" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا، مجھے سچ مچ اس کی گستاخانہ گفتگو پر غصہ آ گیا تھا۔

بہرام خاں نے میری بات سن کر قہقہہ لگایا پھر کہنے لگا "میرے ارمان بھی کسی نہ کسی روز پورے ہو ہی جائیں گے دراصل میں جلد بازی کا قائل نہیں ہوں" یہ کہہ کر وہ مڑا اور تیزی کے ساتھ عارج کی خواب گاہ کی طرف چل دیا۔

میں غصے میں پیچ و تاب کھا کے رہ گئی، اسحاق کو بھی بہرام خاں کی یاوہ گوئی پر بہت طیش آیا تھا، مگر اس نے خود پر قابو پا لیا اور خاموش رہا، اس کے غصے کا اندازہ چہرے کے تاثرات سے ہوا، اس کی خاموشی کا سبب بہرام خاں سے واقفیت تھی وہ جانتا تھا کہ بہرام خاں ایک اعلیٰ عہدے دار اور بادشاہ کا منہ چڑھا ہے جب کہ وہ شاہی فوج میں ایک معمولی کماں دار تھا۔ بہرام خاں کے جاتے ہی میں نے پھر شمشیر زنی کی مشق شروع کر دی لیکن میری طبیعت مکدر ہو چکی تھی اسی بنا پر میں نے جلد ہی اسحاق کو رخصت کی اجازت دیدی اور اپنی خلوت گاہ میں آ گئی۔

اس واقعے کے بعد میں نے سوچا کہ مجھے عارج کی طرف سے قطعی لاتعلق نہیں رہنا چاہئے، کسی حد تک میں اب یہ بھی سمجھ چکی تھی کہ عارج مجھے مردانہ لباس میں دیکھنا پسند نہیں کرتا، میں نے سوچا، عارج بہرحال میرا محبوب ہے، مجھے اس کی خوشنودی کا خیال کرنا چاہئے اگر وہ اپنے انسانی قالب کی فطری صفات کے سبب میری طرف متوجہ نہیں ہو رہا تو مجھے یہ کوشش کرنی چاہئے۔

دوسرے روز شام کو میں نے اسحاق کی آمد کا انتظار نہیں کیا اور اپنی خواہ گاہ میں آ گئی، خواب گاہ میں آ کر میں نے مردانہ لباس اتار دیا اور اپنا بہترین لباس زیب تن کیا، پھر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی مجھے خود اپنا ہی انسانی قالب اجنبی اجنبی سا لگا پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں اس جسم میں اتر کر واقعی بے حد حسین لگ رہی ہوں، کسی آرائش اور سنگار کے بغیر ہی میرا چہرہ بڑا پرکشش اور دل آویز معلوم ہو رہا تھا، مجھے حجاب سا محسوس ہوا، یہ احساس بھی میرے لئے نیا اور عجیب تھا، حجاب کا یہ رنگ میرے چہرے پر بھی نظر آیا جس نے میرے پیکر کو اور بھی دل کش بنا دیا میں سوچ رہی تھی کہ عارج مجھے دیکھے گا تو دیکھتا رہ جائے گا پھر میں عارج کی خلوت گاہ کی طرف بڑھنے لگی۔

عارج کی خلوت گاہ میں بے دھڑک داخل ہوگئی، یہ پہلا موقع تھا کہ میں شام کے وقت ادھر آئی تھی، عارج کی خلوت گاہ میں اس وقت دو خوبصورت کنیزیں تھیں ان میں سے ایک کنیز عارج کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی، دوسری کنیز صراحی سے شراب انڈیل رہی تھی، خلاف توقع میری آمد سے عارج اور کنیزیں سب ٹھٹک سے گئے۔

میں نے بھی ان کے ردعمل کو محسوس کرلیا۔ کنیزوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ جو کنیز، عارج کے بالکل پہلو سے لگی بیٹھی تھی، کھسک کر دور ہوگئی۔ دوسری کنیز جو ساغر میں شراب انڈیل رہی تھی، اس سے شراب چھلک گئی۔

''ارے ظالم! یہ کیا کرتی ہے۔'' عارج نشے سے بوجھل آواز میں کہنے لگا۔ ''یوں نہ چھلکا ابھی سے کہ ہم تو طلوع بھی نہیں ہوئے۔''

پھر اچانک شاید عارج کو میرا خیال آ گیا۔ اس کی نظریں میری طرف اٹھیں اور وہ کچھ سہم سا گیا۔

''تم دونوں یہاں سے جاسکتی ہو۔'' میں نے دونوں کنیزوں کو مخاطب کیا۔ میری آواز میں حکم تھا۔

کنیزیں اٹھیں اور فوراً کمرے سے نکل گئیں۔ عارج نے انہیں نہیں روکا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آرہے تھے۔ میں آگے بڑھ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ مجھے عارج کے خوف پر حیرت تھی۔ وہ شاید میری اچانک آمد سے ڈر گیا تھا۔ ''عارج! میں چاہتی ہوں آج ہم دونوں سیر کو چلیں۔'' میں نے نرم آواز میں کہا، پھر بولی۔ ''مجھے خبر ہے کہ تو ہر وقت مجھے مردانہ لباس میں دیکھ کر خوش نہیں ہوتا۔ میں نے اسی لئے محض تیری خاطر مردانہ لباس نہیں پہنا۔'' مجھے اس پر بھی حیرت تھی کہ عارج پر میرے انسانی پیکر کے حسن کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں نے اپنے گلے میں پڑے ہوئے موتیوں کے ہار سے کھیلتے ہوئے ذرا جھجک کر عارج سے پوچھ ہی لیا۔ ''میں اس لباس میں تجھے کیسی لگ رہی ہوں اے عارج؟''

☆.....☆.....☆

عارج کے چہرے سے کسی جذبے کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے سرسری نظر سے میری طرف دیکھا اور سپاٹ سے لہجے میں بولا۔ ''ہاں..... ہاں اے دینار' تو ٹھیک لگ رہی ہے۔''

یہ جواب سن کر میرے جذبات پر جیسے اوس پڑ گئی۔ یہ جذبات درحقیقت میرے انسانی قالب کی فطری صفات کا نتیجہ تھے۔ ایک جن زادی کی حیثیت سے میں کبھی اتنی جذباتی نہیں ہوتی تھی بلکہ معاملہ برعکس تھا۔ عارج ہی جذبات سے مغلوب ہو جاتا تھا۔ عارج کے غیر جذباتی ہونے پر اسے میں نے حیرت سے دیکھا' پھر کہا۔ ''تو میرے ساتھ سیر کو تو چل رہا ہے؟''

''تو کہہ رہی ہے تو..... اے دینار' چلنا ہی پڑے گا۔''

عارج اس طرح بولا جیسے میرا حکم ٹالنا اس کیلئے ممکن نہ ہو۔

میں پہلے ہی تمام تیاریاں مکمل کر چکی تھی۔ عارج کو ساتھ لیے میں باہر آ گئی۔ باغیچے میں ایک خادم ہمارے لئے دو گھوڑوں کی لگامیں تھامے کھڑا تھا۔ اسے ہماری آمد ہی کا انتظار تھا۔ عارج کے ہمراہ میں گھوڑوں کی طرف بڑھی تو اسی لمحے اپنے اتالیق اسحاق کو دیکھا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار حویلی کے صدر دروازے میں داخل ہو رہا تھا۔ اسحاق کو دیکھ کر میں رک گئی اور اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی۔

قریب آ کر اسحاق اپنے گھوڑے سے اترا اور مبہوت سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ آج سے پہلے اس نے مجھے کبھی اس لباس میں نہیں دیکھا تھا۔

میں نے اسحاق کی تحسین آمیز نگاہوں کو محسوس کرلیا اور قدرے محجوب سی ہو کر بولی۔

''آج میں' شہباز کے ساتھ دریا کی طرف جا رہی ہوں اس لیے شمشیر زنی کی مشق ممکن نہیں۔ کل میں تمہیں یہ بتانا بھول گئی تھی۔''

اسحاق اب بھی اسی طرح مبہوت و سحر زدہ سا کھڑا تھا اور والہانہ نگاہوں سے میری

طرف دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے خود پر قابو پا لیا اور خواب آلود سی آواز میں کہنے لگا۔
''میں اگر آج نہ آتا تو بدقسمت ہوتا۔''

میں نے اس کے الفاظ میں چھپے ہوئے مفہوم کو سمجھ لیا تھا۔ یہ بھی عجیب سی بات ہی تھی کہ مجھے اپنے انسانی پیکر کے حسن کی تعریف سن کر خوشی ہوئی تھی جبکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ میرے اصل وجود پر انسانی جذبے غالب تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے حیا محسوس ہوئی اور بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اپنی مسکراہٹ چھپانے کیلئے میں جلدی سے مڑی اور بہ عجلت گھوڑے پر سوار ہو کر عارج کے ہمراہ حویلی کے دروازے سے باہر نکل آئی۔ اسحاق اسی جگہ کھڑا رہا۔ کافی دور پہنچ کر میں نے مڑ کر دیکھا تو اسحاق کو اسی طرف متوجہ پایا۔ وہ شاید اس وقت تک مجھے دیکھنا چاہتا تھا جب تک میں اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔ میرے لیے کسی آدم زاد کی چاہت ایک انوکھا اور نیا تجربہ تھی۔

حویلی سے دریا زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ دریا کے کنارے پہنچ کر عارج اور میں گھوڑوں سے اترے اور انہیں ایک پیڑ سے باندھ دیا۔ وہاں سے ٹہلتے ہوئے ہم دور نکل آئے۔ آج مجھے ایک عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ عارج مجھ سے بہت سی باتیں کرے، میرے حسن کی تعریف کرے اور مستقبل کیلئے اپنے ارادوں کے بارے میں کچھ بتائے مگر وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔ مجھے وہ کسی قدر فکرمند بھی نظر آ رہا تھا۔ میں چاہتی تو اس کے ذہن پر توجہ دے کر اس فکرمندی کی وجہ جان سکتی تھی مگر ان لمحات میں یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔ میرے نزدیک یہ لمحات محبت تھے۔

سورج رفتہ رفتہ مغرب کی طرف جھکتے جھکتے پوری طرح چھپ گیا۔ شفق کی سرخی نے دریا کے نیلگوں پانی کو بھی سرخ کر دیا تھا۔ ان گنت پرندے دریا کے کنارے اونچے درختوں پر غل مچانے لگے تھے۔ کچھ ہی دیر میں رات کی سیاہی شام کے ملگجے اجالے میں گھلنے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے فضا سرد ہو گئی۔

میں نے تیزی سے پھیلتی ہوئی تاریکی کو محسوس کر لیا اور عارج کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تیرا کیا خیال ہے، واپس چلیں؟ تجھے یہاں ڈر تو نہیں لگ رہا ہے؟'' یہ سوال میں نے اس لئے کیا کہ عارج کا انسانی پیکر فطرتاً بزدل تھا۔

اپنی چوری پکڑے جانے پر عارج چونک اٹھا۔ اس کے چہرے پر واقعی خوف کے آثار تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنی بہادری ظاہر کرنے کیلئے بولا۔ ''کیسا ڈر!..... میں..... میں تو نہیں ڈر رہا۔ ابھی زیادہ اندھیرا تو نہیں ہوا۔ کچھ دیر اور سیر کر کے چلیں گے۔'' اس کے لہجے

میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

عارج کے لہجے میں چھپے ہوئے خوف و اضطراب کو میں نے محسوس کر لیا اور تیزی سے بولی۔ ''کیا بات ہے، اے عارج! تو کچھ پریشان سا لگ رہا ہے!''

میری بات سن کر عارج نے چونک کر مجھے دیکھا اور گڑبڑاتے ہوئے کہا۔
''ن..... نہیں تو..... میں..... میں پریشان تو نہیں ہوں۔''

عارج کو پریشان دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو دور مجھے کچھ گرد سی اڑتی نظر آئی۔ میں نے عارج کو مخاطب کیا۔ ''معلوم نہیں کون لوگ ادھر آ رہے ہیں!..... شاید کچھ گھڑسوار ہیں۔ تو غالباً انہی کو ادھر آتے دیکھ کر فکرمند ہے۔ کیا خبر وہ لوگ کس ارادے سے ادھر آ رہے ہیں۔ میں قیمتی زیورات پہنے ہوں اور میرے پاس اس وقت تلوار بھی نہیں ہے۔''

اس پر عارج فوراً بول اٹھا۔ ''اے دینار! تو ناحق خوف کھا رہی ہے۔ کس کی مجال ہے کہ ہمیں کوئی گزند پہنچانے کی سوچ بھی سکے۔ ہم عیسیٰ خان کے بیٹے اور بہو کے انسانی قالبوں میں ہیں۔ پھر تمہارے پاس تلوار نہ سہی میرے پاس تو تلوار ہے!'' عارج کے لہجے میں شیخی اور حماقت کا عنصر شامل تھا۔ اس کے انسانی قالب کی بزدلی اس پر غالب تھی، اس کے باوجود وہ خواہ مخواہ بہادر بن رہا تھا۔

''اے عارج! تیرے پاس تلوار چلانے کا کوئی جواز نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تو نے اس زمانے میں تلوار چلانی سیکھی ہی نہیں۔ ایسی صورت میں تیرا تلوار چلانا آدم زادوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر دے گا۔''

میں چپ ہوئی ہی تھی کہ چند ثانیوں میں چار گھڑسوار ہمارے سروں پر پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر میں چونک اٹھی کہ ان سب کے چہرے سیاہ نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے چاروں طرف سے مجھے اور عارج کو گھیر لیا۔ پھر ان میں سے ایک کڑک کر عارج سے مخاطب ہوا۔ ''اے نوجوان! تو اگر اپنی زندگی چاہتا ہے تو چپ چاپ کسی حیل و حجت کے بغیر اپنی تلوار نیام سے نکال کر زمین پر پھینک دے اور اس ماہ رو دوشیزہ سے دور ہٹ جا!''

مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے یہ آواز پہلے بھی کہیں سنی ہے مگر کہاں، یاد نہ آ سکا۔ وہ یقیناً آواز بدل کر بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ادھر اس قوی ہیکل نقاب پوش کے الفاظ ختم ہوئے ادھر عارج نے کانپتے ہاتھوں کو تلوار کے قبضے کی طرف بڑھایا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ شیخی

بگھار رہا تھا اور اب انتہائی خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ عارج اب نیام سے اپنی تلوار نکال کر اسے زمین پر پھینکنے کیلئے ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ میں نے اسی لمحے برق رفتاری کا ثبوت دیا تھا۔ عارج کی تلوار زمین پر نہیں گری تھی بلکہ اسے میں نے تیزی سے جھپٹ کر درمیان ہی سے اچک لیا تھا۔

یہ صورتحال یقیناً ان نقاب پوشوں کیلئے غیر متوقع تھی۔ پھر جب تک وہ لحہ حیرت سے نکلتے میں قضا بن کر ان میں سے ایک کی طرف جھپٹی۔ نقاب پوش گھڑ سوار گھبرا کر ذرا پیچھے ہٹا اور اپنی نیام سے تلوار نکالنے لگا۔ اگر وہ فوری طور پر گھبرا کر پیچھے نہ ہٹ گیا ہوتا تو شاید ہمیشہ کیلئے اپنی دائیں ٹانگ سے محروم ہو جاتا۔ تلوار کی ضرب گھوڑے کی گردن پر پڑی۔ گھوڑا ہنہنا کر الف ہو گیا اور سوار کو نیچے گرا دیا۔ گھوڑے کی گردن سے خوف بہہ رہا تھا۔ سوار گھوڑے سے گرتے ہی لنگڑاتا ہوا بھاگ اٹھا۔

اسی وقت بقیہ تینوں نقاب پوش اپنے اپنے گھوڑوں سے کود کر تلواریں سونتے میرے مقابلے پر آ گئے۔ میں بہر حال ایک جن زادی تھی اس لئے اپنی پراسرار قوتیں استعمال کرتی تو وہ تین آدم زاد کیا' تین سو بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے مگر آدم زادی کی حیثیت سے بھی مجھ پر ان کا قابو ممکن نہیں تھا۔ اسی بنا پر میں نے ان کے خلاف اپنی جناتی صفات استعمال نہیں کیں۔ یوں بھی میں کسی اور زمانے میں جا کر مصلحتاً ان صفات کے استعمال سے دانستہ گریز کرتی تھی۔ اس کا سبب اپنے پیچھے کوئی ایسی نشانی نہ چھوڑنا تھا کہ عفریت وہوش کو ہمارا کوئی سراغ مل جاتا۔ دوسری وجہ وہ خطرناک آدم زاد تھے جو جنات کی تلاش میں رہتے تھے تاکہ انہیں اپنا غلام بنا لیں۔ ان حالات میں بہتر یہی تھا کہ میں حتی الامکان اپنی جناتی صفات استعمال نہ کرتی اور آدم زادوں کے درمیان رہ کر آدم زادی ہی بنی رہتی۔ میں اسی پر عمل پیرا تھی۔

عارج پر ان کا انسانی قالب غالب تھا۔ وہ اسی لئے ایک طرف کھڑا ہوا کانپ رہا تھا۔ اگر اس میں ہمت ہوتی تو کب کا وہاں سے بھاگ جاتا۔ وہ اگر یہ کوشش بھی کرتا تو شاید چند قدم بھاگ کر ہی زمین پر گر پڑتا۔

ذرا سی دیر میں ان تینوں کو میں نے یہ احساس دلا دیا کہ وہ میرے سامنے طفل مکتب ہیں۔ ان میں سے پہلے قوی ہیکل نقاب پوش کے ہاتھ سے تلوار گری۔ اگر بقیہ دو نقاب پوش فوراً ہی بیک وقت مجھ پر حملہ نہ کر دیتے تو میں قوی ہیکل نقاب پوش کا کام تمام کر دیتی۔ مجھے فوری طور پر حملہ آور نقاب پوشوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا کہ ان کے وار سے بچ سکوں۔ اس کے باوجود بھی قوی ہیکل نقاب پوش زخمی ہونے سے نہ بچ سکا۔ تلوار کا ایک چرکا اس کے بائیں

بازو پر لگا تھا جس سے فوراً خون بہنے لگا تھا۔

میں نے ان دونوں حملہ آوروں کے وار اپنی تلوار پر روکے اور پھر انہیں مہلت نہیں دی کہ وہ دوبارہ حملہ کر سکیں۔ میرے انسانی پیکر پر اب تک معمولی سا چرکا بھی نہیں لگا تھا۔ پھر ان دونوں میں سے شاید ایک کی قضا آ گئی تھی کہ وہ جوش میں ہوش کھو بیٹھا۔ دراصل اسے مجھ پر غصہ آ گیا تھا۔ میں اسے کئی زخم لگا چکی تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھی سے الجھے دیکھ کر یہ گمان کیا کہ میں اس کی طرف سے غافل ہوں حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ جیسے ہی اس نے میرے سر پر سیدھا وار کرنے کیلئے ہاتھ بلند کیا' میں تیزی سے دائیں جانب مڑی اور پھر حملہ آور کا ہاتھ فضا میں بلند ہی رہ گیا۔ میری تلوار نے اس کا سینہ چھید دیا تھا۔ وہ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ اپنے ساتھی کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا دیکھ کر دوسرا نقاب پوش ہمت ہار بیٹھا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور پھر چشم زدن میں ہوا ہو گیا۔ اس دوران میں زخمی اور قوی ہیکل نقاب پوش بھی کافرار ہو چکا تھا۔

میدان خالی دیکھ کر میں خون آلود تلوار لئے عارج کی طرف بڑھی۔ اس وقت عارج کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ تلوار سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ میں نے عارج کے قریب پہنچ کر تلوار اس کی طرف بڑھا دی۔

''لے اب اسے نیام میں رکھ لے!'' میں نے عارج سے کہا۔ ''بزدل بھاگ گئے۔''

عارج ہکلایا۔ ''مم..... مگر اس..... اس پر تو خون..... خون لگا ہوا ہے۔''

میں عارج کی کیفیت کو بخوبی سمجھ رہی تھی۔ اس لئے کچھ کہے بغیر پلٹی اور مرنے والے نقاب پوش کے لباس سے خون آلود تلوار صاف کرنے لگی۔ عارج کی نگاہیں مجھی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ حیرت اور خوف سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

میں لوٹ کر دوبارہ عارج کے قریب آئی تو دیکھا کہ اس کے دونوں پیر کانپ رہے تھے۔

''اے عارج! تیرے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں' اب تک وہ بزدل فرار ہو چکے ہیں۔ اگر پلٹ کر آئے بھی تو منہ کی کھائیں گے۔'' میں پرسکون آواز میں بولی' پھر اسے سمجھانے لگی۔ ''میں اچھی طرح جانتی ہوں اے عارج کہ تو بزدل نہیں ہے بلکہ تیرے انسانی قالب کی فطری صفات تجھ پر غالب آ گئی ہیں۔ تو کوشش کر کہ تجھ پر یہ منفی صفات غالب نہ آ سکیں۔ اس کا واحد ذریعہ قوت ارادی ہے۔ تو اپنی قوت ارادی کو کام میں لا!''

''میں..... میں پوری کوشش کروں گا اے دینار!'' اس نے لرزتی آواز میں وعدہ کیا۔

"درحقیقت تیرے ہاتھوں اس آدم زاد نقاب پوش کو قتل ہوتے دیکھ کر میں ڈر گیا تھا ورنہ تو......"
وہ اپنی بات پوری نہ کرسکا۔

مجھے پہلے ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا کہ عارج کے انسانی قالب میں ایسی کوئی کمزوری ہو گی مگر اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب نئے انسانی قالبوں کو اپنانے کے بعد عارج اور مجھے کیا نئی مشکلات پیش آتیں' کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اس پر مجھے بہرحال رنج ضرور تھا کہ عارج کے حصے میں ایک ایسا انسانی قالب آیا تھا جو فطری طور پر بزدل تھا۔

میں نے ہی سہارا دے کر عارج کو گھوڑے پر سوار کرایا اور اس کے ساتھ میں آبادی کی طرف لوٹی۔

اس واقعے کے دوسرے روز میں نے بہرام خاں کو عارج کے خلوت کدے کی طرف جاتے دیکھا تو چونک اٹھی۔ بہرام خان کی گردن میں ریشمی پٹی پڑی تھی اور اس کا بایاں ہاتھ اس میں پڑا تھا۔

میں سوچنے لگی کہ کہیں بہرام خاں ہی تو وہ قوی ہیکل نقاب پوش نہیں جو میرے ہاتھوں کل شام زخمی ہوا تھا؟ اس خیال کے آتے ہی اور بہت سے سوال میرے ذہن میں پیدا ہونے لگے۔ اسی کے ساتھ میری سماعت میں بہرام خاں کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے ارمان بھی کسی نہ کسی روز پورے ہو جائیں گے۔ یہ الفاظ واضح طور پر دھمکی تھے جنہیں اس وقت میں نے نظرانداز کر دیا تھا۔ عارج کی سرگرمیوں پر میری نظر تو تھی مگر کبھی بھی میں نے وہ باتیں سننے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی جو دوستوں کے درمیان ہوتی تھیں۔ میرے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لا کر میں عارج کے خلوت کدے میں ہونے والی گفتگو سن لیتی یا وہاں جو کچھ ہو رہا تھا مجھے نظر آ جاتا لیکن میری دانست میں اس کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا۔ اسی وجہ سے میرے قدم عارج کے خلوت کدے کی طرف اٹھنے لگے۔ دور ہی سے میں نے دیکھ لیا تھا کہ دو خوبرو کنیزوں کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہو چکا تھا۔

جب عارج کا کوئی دوست اس کے ساتھ ہوتا تھا تو کسی خادم کو وہاں جانے کی اجازت تھی۔ مجھے یہ بات معلوم تھی۔ دروازہ بند دیکھ کر میں دریچے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مجھے دیکھنے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ کوئی بھی خادم آس پاس مجھے نظر نہیں آیا۔

دریچہ بھی مجھے بند ملا تو میں نے اندر ہونے والی گفتگو سننے کیلئے اپنا کان دونوں پٹوں

کی خفیف سی جھری سے لگا دیا۔

☆......☆......☆

چند روز بعد قطب خان کو ساتھ لئے عیسیٰ خان حج کر کے واپس آ گیا۔ بادشاہ وقت سلیم شاہ سوری کے حکم کی تعمیل میں اس نے قطب خاں کو آگرہ کے زنداں میں مقید کرا دیا اور خود دہلی پہنچ گیا۔ یہاں آنے ہی پر اسے اندازہ ہوا کہ حالات کس قدر بدل چکے ہیں۔ اس کا ثبوت عیسیٰ خان کو ملنے میں دیر نہیں لگی۔

اگلے ہی روز سلیم شاہ سوری کے حکم پر عیسیٰ خاں کو گرفتار کر کے دہلی کے زنداں میں ڈال دیا گیا۔

بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے میں بہت فکرمند تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی جناتی صفات بروئے کار نہ لا کے عیسیٰ خان کی رہائی اور اس کے ساتھ سابقہ منصب پر بحالی کیلئے کیا کروں۔ میرا خیال تھا کہ عارج عیسیٰ خاں کی جاں بخشی کی خاطر ضرور کچھ کرے گا۔ عیسیٰ خاں بہرحال اس کے انسانی قالب۔ شہباز کا باپ تھا مگر اسے تو جیسے کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔

میں نے جس روز سے عارج اور بہرام خاں کی گفتگو چھپ کر سنی تھی اس روز سے کبھی عارج کے خلوت کدے کی طرف نہیں گئی تھی لیکن جب عیسیٰ خاں کو گرفتار ہوئے تین دن ہو گئے اور عارج نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا تو میں مجبوراً اس کے خلوت کدے میں چلی گئی۔

اس وقت اتفاق سے عارج کا کوئی دوست اس کے ساتھ نہیں تھا۔ صرف ایک کنیز اس کی خدمت میں تھی۔

میں نے وہاں پہنچتے ہی کنیز کو باہر نکال دیا۔

عارج بستر پر نیم دراز تھا۔ مجھے اپنے سامنے دیکھتے ہی وہ گھبرا کر بستر سے اٹھ گیا۔

"عیسیٰ خاں کی رہائی کیلئے تجھے کچھ کرنا چاہئے اے عارج!" میں اس کے قریب بستر پر بیٹھ گئی۔ "اس سے قطع نظر کہ ہم اسی کی حویلی میں رہ رہے ہیں' تیرے انسانی قالب سے اس کا قریبی رشتہ ہے۔ اگر تو چپ رہا اور کچھ نہ کیا تو لوگ تجھ پر انگلیاں اٹھائیں گے۔"

"مم......مگر میں......میں کر بھی......کیا کر سکتا ہوں میں؟" عارج بولا۔ "ویسے اسے کوئی گزند نہیں پہنچے گا' تو فکر نہ کر اے دینارا!"

"تو کیسے کہہ سکتا ہے یہ بات؟" میں نے سوال کیا۔

عارج کے چہرے کا تاثر بدل سا گیا۔ اس کے دو ہی روپ تھے یا تو وہ بزدل بن جاتا تھا یا پھر شیخی بگھارنے لگتا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر فخریہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''میرا دوست بہرام خاں بادشاہ کا مقرب خاص ہے۔ تجھے شاید پتہ نہیں بہرام خاں سے میرے کتنے گہرے مراسم ہیں!''

''ہاں میں جانتی ہوں۔'' میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔ ''تم دونوں ہی کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تو آج کل اس کی حویلی کے چکر کیوں کاٹنے لگا ہے۔ اس نے کئی خوبصورت کنیزیں خریدی ہیں۔ وہ تجھے اور جواباً تو اسے عیش مہیا کرتا ہے۔''

عارج نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر قدرے سنجیدہ آواز میں بولا۔ ''تجھے یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟ کیا تو میری ٹوہ میں لگی رہتی ہے اے دیار؟''

''مجھے تو اور بھی بہت کچھ معلوم ہے اے عارج!'' میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

حیرت اور بے یقینی کے عالم میں عارج مجھے دیکھا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے طویل سانس لیا اور شکست خوردہ آواز میں کہا۔ ''جب تجھے سب کچھ معلوم ہے تو پھر حیرت کیوں کر رہی ہے!... بہر حال تو اطمینان رکھ عیسیٰ خاں زیادہ دن قید میں نہیں رہے گا۔ لوگوں کو مجھ پر انگلیاں اٹھانے کی مہلت نہیں ملے گی۔ جلد ہی عیسیٰ خاں کو رہا کر دیا جائے گا اور یہ سب کچھ تیری وجہ سے ہوگا۔''

''میری وجہ سے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں تیری وجہ سے اے دیارا!'' عارج نے پرسکون آواز میں جواب دیا پھر تفصیل بتانے لگا۔ ''دراصل میں نے بہرام خاں کو بتا دیا تھا کہ عیسیٰ خاں کی گرفتاری کے سبب تو بھی بہت فکر مند و پریشان ہے۔ تجھے شاید یہ معلوم نہ ہو کہ وہ میری بڑی عزت اور قدر کرتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تو اس کے دوست یعنی میری بیوی ہے۔ چاہے یہ حقیقت نہ ہو مگر دوسرے آدم زادوں کی طرح بہرام خاں بھی تجھے میری بیوی ہی سمجھتا ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر تجھے عیسیٰ خاں کی گرفتاری سے رنج ہوا ہے تو پھر جلد ہی وہ عیسیٰ خاں کو رہا کرا دے گا۔ اس نے مجھ سے وعدہ بھی کیا ہے کہ رہائی کے بعد عیسیٰ خاں کو پٹنہ کا نائب حاکم بنا کر بھیج دیا جائے گا۔''

''مگر اس معاملے سے میرا کیا تعلق؟ تو نے آخر اس سے میرا نام کیوں لیا؟ میری خوشی اور ناخوشی سے بہرام خاں کا کیا واسطہ؟'' میں زہر آلود لہجے میں بولی۔ مجھے یہ بات قطعی پسند نہیں آئی تھی۔

''بہرام خاں کہتا ہے کہ اسے تیری ناخوشی منظور نہیں، وہ مجھے ملول نہیں دیکھ سکتا۔''

''اس کم اصل سے...... اس بدذات سے میرا کیا واسطہ! وہ ہوتا کون ہے میرا!'' میں طیش میں آ کر بولی۔ عارج کی باتیں سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

عارج نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ''بہرام خاں میرا دوست ہے اور مجھ سے اخلاص رکھتا ہے۔ تجھے میری بیوی سمجھنے کی وجہ سے تیرا بھی خیال رکھتا ہے۔ تجھے تو اس کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ تیری خاطر وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے۔''

میں نے حقارت سے عارج کو دیکھ کر کہا۔ ''کہہ دیجو اپنے اس چہیتے دوست سے آئندہ وہ میری خاطر کوئی تکلیف نہ اٹھائے اور نہ ہی اب کبھی اپنی ناپاک زبان پر میرا نام لائے۔ میں اس بدبخت و بدذات کی صورت پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔'' یہ کہہ میں عارج کی خلوت گاہ سے نکلی اور تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

دوسرے دن خلاف توقع عیسیٰ خاں کو رہا کر دیا گیا اور فوراً ہی اسے پٹنہ جانے کا حکم ملا۔ زنداں سے حویلی آتے ہی عیسیٰ خاں نے مجھے اپنے خلوت کدے میں بلوایا۔ میں جب اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے سینے سے لگاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میری بچی! مجھے تم پر فخر ہے۔ تم نے میری خاطر وہ کام کیا جو شاید میرا بیٹا شہباز بھی نہیں کر سکتا تھا۔''

میں عیسیٰ خاں کی بات سمجھ نہ سکی۔ میں نے حیرت سے عیسیٰ خاں کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''مگر بابا میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔''

عیسیٰ خان نے مجھے اپنے قریب بٹھایا اور محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے میری بچی! میں جانتا ہوں کہ تم اپنی زبان سے اس بات کا اقرار کر کے مجھے زیر بار احسان کرنا نہیں چاہتیں مگر بہرام خاں نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''کیا بتایا ہے اس نے؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''یہی کہ میری وجہ سے تم خود اس کی حویلی میں گئی تھیں اور اس سے میری رہائی کیلئے درخواست کی تھی۔'' عیسیٰ خان نے بتایا۔ میں یہ سن کر دنگ رہ گئی۔ یہ بات قطعی جھوٹ تھی لیکن میں عیسیٰ خاں کو حقیقت سے بھی آگاہ نہیں کر سکتی تھی۔ میں یہ بات اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ بہرام خاں کی نیت میرے بارے میں ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بوالہوس اس طرح مجھ پر ڈورے ڈالنا چاہتا ہے۔ عارج پر بھی مجھے غصہ آ رہا تھا۔ وہ ایک ایسے بدنیت شخص سے مراسم رکھتا تھا جو مجھ پر بری نظر رکھتا تھا۔ میں جو اس کی محبت تھی مگر شاید کہ اس زمانے میں آ کر سب کچھ بھول گیا

تھا۔ عارج اس قدر بے وقوف اور احمق تھا کہ غالباً اسے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ بہرام خاں کا مقصد و منشا کیا ہے ورنہ وہ لاکھ بزدل سہی' یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سب کچھ سوچنے کے باوجود میں نے عیسیٰ خاں سے ان باتوں کا اظہار نہیں کیا۔

اگلے ہی روز عیسیٰ خاں کے ساتھ میں بھی دہلی سے پٹنہ جانا چاہتی تھی کہ اب عارج کو میں اس ماحول سے نکالنا چاہتی تھی۔ پٹنہ پہنچ کر خواص خاں اور قمر النسا سے ملاقات کی صورت بھی پیدا ہو سکتی تھی۔ میرے انسانی قالب کا بہر حال ان دونوں سے گہرا تعلق تھا۔ خواص خاں پر صرف دہلی میں داخلے پر پابندی تھی کسی اور شہر میں نہیں۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار عیسیٰ خاں سے کیا بھی تھا۔ جواباً عیسیٰ خاں نے مجھے سمجھایا تھا کہ ابھی چند روز تم یہیں رہو' پٹنہ میں معقول قیام گاہ کا بندوبست ہوتے ہی تمہیں وہاں بلوا لوں گا۔ تمہارا شوہر بھی کچھ ضروری کام کی وجہ سے فی الحال دہلی ہی میں رہنے پر مجبور ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے شوہر کے قریب ہی موجود رہنا چاہیے۔

میں بخوبی جانتی تھی کہ عارج کو دہلی میں کیا ضروری کام ہے اور وہ کیوں دہلی چھوڑنا نہیں چاہتا۔ دہلی میں اس کے بدقماش دوست تھے اور یہاں بہرام خاں بھی تھا جو اس کی عیاشیوں میں برابر کا شریک تھا۔ انہی وجوہ کی بنا پر عارج یہاں رہنے پر مجبور تھا۔

پٹنہ جاتے ہوئے عیسیٰ خاں حویلی کے بیشتر ملازموں اور کنیزوں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اب دہلی کی حویلی میں میرے اور عارج کے علاوہ چند خدام تھے اور کنیزیں تھیں جو عارج کی خدمت پر مامور تھیں۔ ان میں میری خاص کنیز نسترن بھی تھی۔

اسی شب عارج نے ایک خادم کے ذریعے مجھے اپنے خلوت کدے میں بلوایا تو میرے جی میں آئی کہ انکار کر دوں۔ پھر جب میرے دریافت کرنے پر خادم سے پتہ چلا کہ عارج اپنے کمرے میں تنہا ہے تو میں وہاں جانے پر راضی ہو گئی۔ میں بے دلی سے اٹھی اور اس حصے کی طرف چل دی جو عارج کیلئے مخصوص تھا۔

میں جب عارج کے خلوت کدے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ عارج اپنے سامنے ساغر و مینا سجائے بیٹھا تھا۔

''آ..... آ اے دینار! مجھے تیرا ہی انتظار تھا۔'' عارج نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

میں اس کے قریب مسند پر بیٹھ گئی پھر اس سے پوچھا۔ ''تو نے مجھے کیوں بلایا ہے؟''

''آج رات تو ساقی بنے گی۔'' عارج مسکرا کر بولا۔ ''میں تیرے ہاتھ سے پینا چاہتا ہوں۔''

''میں شراب نوشی کو حرام سمجھتی ہوں۔'' میں سخت لہجے میں بولی۔ ''تجھے شراب پلانا تو کجا میں شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔ یہ نہ بھول کہ میں تیری کوئی کنیز نہیں ہوں جو تیرے اشاروں پر ناچنے لگوں۔''

''مگر بی..... بیوی..... دنیا کی نظر ہی میں سہی بیوی تو ہے اور بیوی پر شوہر کا پورا حق ہوتا ہے۔ فضول باتیں چھوڑ اور میری بات مان لے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج..... ابھی کچھ ہی دیر میں بہرام خاں بھی یہاں آنے والا ہے۔ یقین کر کہ جب میں اس کی حویلی میں جاتا ہوں تو اس کی بیوی بھی ساقی بن جاتی ہے اور اپنے ہاتھ سے ہم دونوں کیلئے جام.....''

''لعنت ہو تجھ پر اور تیرے دوست بہرام خاں پر! میں جا رہی ہوں۔'' یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے نزدیک اب عارج سمجھانے بجھانے کی حد سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ میں نے اسی لئے یہ کوشش نہیں کی۔

''ٹھہر اے دینار! میں چاہتا ہوں کہ آج جب بہرام خاں آئے تو میرے ساتھ تو بھی اس کی پذیرائی کیلئے یہاں موجود ہو۔'' یہ کہہ کر عارج ایک لمحے کو رکا پھر نرمی سے بولا۔ ''دیکھ اے دینار! تو اچھی طرح جانتی ہے کہ عیسیٰ خاں کی رہائی محض بہرام خاں کی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔ وہ ہمارا محسن ہے۔ اس کی عزت و توقیر کرنا ہم پر فرض ہے۔ اس کے علاوہ وہ بادشاہ کا مقرب خاص بھی ہے۔ تجھے اس کے اختیار و اقتدار کا شاید صحیح اندازہ.....''

''میں اس کے اختیار و اقتدار سے نہیں ڈرتی!'' میں نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔ ''میں اس کی لونڈی یا کنیز نہیں ہوں کہ اس کی خدمت کروں۔ تو اگر مجھ سے اس کی پذیرائی کیلئے کہہ رہا ہے تو بے غیرت' بزدل اور بے وقوف ہے!'' میں طیش کے عالم میں کہہ گئی۔ اب سے پہلے میں نے عارج کو کبھی اتنا برا بھلا نہیں کہا تھا مگر عارج نے تو جیسے میری کوئی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہیں ہوا تھا۔

عارج بدستور پرسکون لہجے میں کہنے لگا۔ ''دیکھ ضد نہ کر اور اپنا یہ مردانہ لباس بدل کر آجا' تیرے جسم پر زنانہ لباس ہی بھلا لگتا ہے..... جلدی کر کہ بہرام خاں اب آتا ہی ہو گا۔''

ابھی عارج کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ ایک خادم دروازے پر نظر آیا۔ اس نے بہرام خاں کی آمد کے بارے میں بتایا۔

''انہیں یہیں لے کر آ جاؤ!'' عارج نے خادم سے کہا۔ خادم کے جاتے ہی وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''جا' اب مزید وقت ضائع نہ کر' جلدی سے لباس تبدیل کر کے آ جا!'' اس بار

عارج کی آواز میں تختی آ گئی تھی۔

''میں جا رہی ہوں لیکن کان کھول کر سن لے میں اس کمینے کی خواہش ہرگز پوری نہیں کروں گی۔ مجھے معلوم ہے اس نے اسی وجہ سے اپنی بیوی کے ہاتھوں سے تیرے لئے جام بنوائے ہوں گے کہ جواباً تو بھی ایسا کرے۔ سن لے کہ اب میں لوٹ کر نہیں آؤں گی۔''

پھر میں وہاں رکی نہیں اور اپنے خلوت کدے میں آ کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ مجھے عارج کی بے غیرتی پر بہت رنج تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کوئی عاشق اس حد تک احمق ہو سکتا ہے کہ اپنی محبوبہ کو کسی دوسرے کی خدمت و پذیرائی پر آمادہ کرنے لگے۔

کچھ ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے فوراً تندی سے پوچھا ''کون ہے؟''

''میں ہوں' دروازہ کھولو!'' باہر سے عارج کی آواز سنائی دی۔

میں سمجھ گئی کہ عیسیٰ خاں کے دہلی سے چلے جانے کے سبب بہرام خاں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا ہے۔ وہ یقیناً اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اس نے اسی لئے عارج کو بھی شیشے میں اتار لیا ہے اور عارج اتنا بے وقوف ہے کہ کچھ سمجھ ہی نہیں رہا۔ جواب میں جب میں کچھ نہ بولی تو عارج نے ایک بار پھر دروازہ کھولنے کو کہا۔

باہر سے آنے والی آوازوں سے میں اندازہ کر چکی تھی کہ بہرام خاں بھی عارج کے ساتھ ہے۔ میں نے اسی کے پیش نظر دانستہ بلند آواز میں کہا۔ ''جب تک تمہارا ملعون و بدذات دوست اس حویلی سے چلا نہیں جائے گا میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔''

''میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ دروازہ کھول دو ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔'' عارج کی غصیلی آواز پھر سنائی دی۔

اس مرتبہ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہر چند کہ بہرام خاں سے نمٹنا میرے لئے زیادہ مشکل نہیں تھا مگر ایک تو میں بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی' دوسرے اس طرح رسوائی کا خطرہ بھی تھا۔

دروازے کے باہر سے کچھ سرگوشیاں سی سنائی دیں' پھر خاموشی چھا گئی۔ میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ چلو اچھا ہوا بلا ٹل گئی مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ اس وقت مجھے خبر نہ تھی کہ بہرام خاں اپنے منصوبے کے مطابق عارج کے ساتھ خلوت کدے میں مصروف مے نوشی تھا۔ اس نے عارج کو یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ خود برائے نام پی رہا تھا اور عارج کو پلائے جا رہا تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے بعد میں پتہ چلیں۔

اپنے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کیلئے بہرام خاں نے حویلی کی ایک کنیز کو بھی انعام کا لالچ دے کر ہموار کر لیا تھا۔ یہ کنیز نسترن تھی۔

میرا معمول تھا کہ میں رات کے وقت سونے سے پہلے دودھ ضرور پیتی تھی اور تاریخی کتب کا مطالعہ بھی کرتی تھی۔ اس شب بھی میری خاص کنیز نسترن ایک نقشین کٹورے میں میرے لئے دودھ لے کر آئی اور مسہری کے قریب رکھ کر چلی گئی۔ جاتے ہوئے نسترن دروازہ بھی بھیڑ گئی تھی۔ میں نے کتاب پڑھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر دودھ کا کٹورا اٹھایا اور چند لمحوں میں اسے خالی کر دیا۔ پھر میں مطالعے میں محو ہو گئی مگر خلاف توقع اچانک میرے ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

میں فوری طور پر اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنے کیلئے اٹھی مگر مجھے محسوس ہوا جیسے میرے اعضاء یکلخت بے جان ہو گئے ہیں۔ در و دیوار مجھے گھومتے محسوس ہوئے۔ میں وہیں فرش پر بیٹھ گئی کہ کہیں چکرا کے نہ گر پڑوں۔ چند لمحوں بعد میں ہوش کھو بیٹھی تھی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی کمرے میں' ایک اجنبی بستر پر پایا۔ مجھے یہاں کون لے کر آیا اور کیوں؟ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور بگولے سے رقص کر رہے تھے۔

میں نے اپنے ذہن پر زور دیا تو مجھے یاد آ گیا کہ سونے سے پہلے دودھ پیا تھا۔ دودھ پینے کے کچھ ہی دیر بعد مجھ پر مدہوشی طاری ہو گئی تھی۔ مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ دودھ میں بیہوشی کی دوا ملا دی گئی ہو گی۔ مجھے حیرت تھی کہ میری پرانی خادمہ کس طرح دشمن کی آلہ کار بن گئی تھی۔ ابھی میں انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔

دروازہ کھلتے ہی جو شخص اندر آیا تھا اس پر نظر پڑتے ہی میرا خون کھول اٹھا تھا۔ آنے والا بہرام خاں تھا۔ اس کے بھدے اور موٹے ہونٹوں پر بڑی کراہت انگیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

''آخر کو تم زیر دام آ ہی گئیں' بہت ہوشیار سمجھتی تھیں اپنے آپ کو!'' بہرام خاں نے مضحکہ اڑانے والے لہجے میں مجھ سے کہا۔

میں ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی اور غصے میں بولی۔

''کیا تو سمجھتا ہے کہ اس طرح مجھ پر قابو پا لے گا۔''

''قابو تو خیر میں پا ہی چکا ہوں۔'' وہ ہنس کر کہنے لگا۔ پھر قدم بہ قدم میری طرف بڑھنے لگا۔

میں چند قدم پیچھے ہٹ گئی اور سخت لہجے میں کہا۔ ''وہیں ٹھہر جا اے بدبخت! میرے قریب آنے کی جرأت نہ کرنا!''

''یہ قدم جب ایک بار اٹھ جائیں تو پھر رکتے نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اپنی سرکشی اور ضد چھوڑ دو!''

''شاید تو مجھے نہتا دیکھ کر اتنا شیر ہو رہا ہے۔'' میں دانت پیس کر بولی۔ ''مگر میں خالی ہاتھوں بھی تیرا خون پی سکتی ہوں کمینے!'' یہ کہہ کر میں ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور بہرام خان کے نزدیک آنے کا انتظار کرنے لگی۔ پھر جیسے ہی بہرام خاں مجھ سے ایک قدم کے فاصلہ پر پہنچا' میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔

بہرام خاں بہرحال ایک سپاہی تھا۔ وہ میری توقع سے بڑھ کر طاقتور اور چوکنا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور پھر کسی پھول کی طرح مجھے اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔

اس کے باوجود کہ میں شدید طیش کے عالم میں تھی' ہوش کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ میں دیکھ چکی تھی کہ بہرام خاں کی کمر سے تلوار بندھی ہوئی تھی۔ اچانک میں مچھلی کی طرح تڑپ کر بہرام خاں کی گرفت سے نکل گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ میرے قدم فرش تکتے میں انتہائی پھرتی سے بہرام خاں کی تلوار اس کی نیام سے نکال چکی تھی۔

☆......☆......☆

ایک دم بازی پلٹ جائے گی اس کا اندازہ یقیناً بہرام خاں کو نہیں ہوگا۔ وہ اسی لئے بھونچکا رہ گیا لیکن جلد ہی اسے صورتحال کی سنگینی کا احساس ہو گیا۔ اس کا یقین مجھے بہرام خان کے چہرے پر پھیلتی زردی سے ہوا جو خوف کی علامت تھی۔ میرے تیور بہت جارحانہ تھے' میں شمشیر براں لئے مضبوط قدموں سے بہرام خاں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ موت کو سامنے دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھی۔

تیزی سے آگے بڑھ کر میں نے تلوار کی نوک بہرام خاں کے سینے پر رکھ دی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''بتا اے رذیل انسان! کیا دریا کے کنارے تو ہی تھا جس نے مجھے اغوا کرنا چاہا تھا؟ بول کیا تو میرے ہی ہاتھوں زخمی ہوا تھا؟ سن لے کہ اگر تو نے جھوٹ بولا تو میں یہ تلوار تیرے سینے میں اتار دوں گی!''

فطرتاً بہرام خان کم ہمت اور بزدل آدمی تھا۔ وہ میری جرأت اور مہارت اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ جھوٹ بولنے کا نہ تو موقع تھا نہ گنجائش' وہ ہکلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ہاں......وہ......وہ میں ہی تھا مگر...... مگر میری بات پر یقین کرو کہ...... کہ میرا کوئی...... برا

ارادہ نہیں تھا مجھے تم...... تم سے محبت ہے اور...... اور میں تم سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔''

''کیا تجھے یہ خبر نہیں تھی کہ میں شادی شدہ ہوں؟'' میں اس پر برس پڑی۔

بہرام خاں نے سہم کر میری طرف دیکھا اور لرزتی آواز میں بولا۔ ''م...... میں نے تمہارے شوہر شہباز کو آمادہ کر لیا تھا کہ...... کہ وہ...... وہ تمہیں طلاق دے دے گا...... ظاہر ہے کہ طلاق کے بعد......'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تو اس سازش میں شہباز بھی شامل تھا۔'' میں نے بے یقینی سے کہا' مجھے اس بات پر دکھ ہوا تھا۔

''نہیں'' بہرام خان بول اٹھا۔ ''شہباز کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میں تمہیں اغوا کرنے والا ہوں اور...... اور آج رات بھی وہ میرے ارادہ سے بے خبر تھا' دراصل وہ...... وہ تمہیں پسند نہیں کرتا۔ اس نے مجھ سے یہ اعتراف کر لیا تھا' مجھے جب اس کی زبان سے یہ بات معلوم ہوئی تو میں نے اس سے بات کر لی کہ وہ تمہیں طلاق دے دے...... اور وہ راضی ہو گیا۔''

''لیکن تمہیں اور شہباز کو یہ حق کس نے دیا کہ تم میری تقدیر کا فیصلہ کرو۔ میں انسان ہوں کوئی بھیڑ بکری نہیں اور نہ شہباز کی کوئی زرخرید لونڈی ہوں کہ وہ جسے چاہے اس کی خدمت میں پیش کر دے۔'' مجھے اب بہرام خان سے بھی زیادہ غصہ عارج پر آ رہا تھا۔ اگر وہ بہرام خان کی ہمت افزائی نہ کرتا تو بہرام خان کی کبھی یہ جرأت نہ ہوتی کہ مجھے اغوا کر لیتا۔ میں نے تلوار کی نوک بہرام خاں کے سینے میں چبھوئی اور قہر آلود لہجے میں بولی۔ ''تم محبت کا جھوٹا ڈھونگ رچا کر مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے۔ میں تم جیسے لوگوں' تم جیسے ابوالہوسوں کی محبت کو خوب جانتی ہوں۔ کان کھول کر سن لو کہ مجھے تم سے شدید نفرت ہے۔''

پھر میرے استفسار پر بہرام خاں نے یہ بھی بتا دیا کہ عارج کو اس نے ایک خوبصورت کنیز کا لالچ دیا تھا جو اس کے تصرف میں تھی۔

''تو اس طرح تم نے میرا سودا کر لیا تھا۔'' میں غرائی' پھر بولی۔ ''تم نے آج میرے ساتھ جو ناشائستہ اور مجرمانہ حرکت کی ہے اس کے جرم میں بطور سزا......'' میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور تلوار کی نوک کا دباؤ بڑھا دیا۔

موت کے خوف سے بہرام خان کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ گھگھیاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''مجھے معاف کر دو مہرالنسا!...... میں اپنے جرم پر شرمندہ ہوں اور تم سے سچے دل کے ساتھ نہایت خلوص سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد تمہیں اپنی چھوٹی بہن سمجھوں گا۔''

میں بہرحال سنگ دل نہیں تھی۔ پھر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ بہرام خاں اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ میری عزت و آبرو محفوظ تھی۔ اسی سبب مجھے بہرام خاں پر رحم آ گیا۔ میں نے بہرام خاں کے سینے سے تلوار ہٹا لی مگر اس کے باوجود تلوار اپنے ہاتھ ہی میں رکھی اور الٹے قدموں کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ پھر میں نے جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھولا دو مسلح پہرے دار میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ میرے لئے یہ خلاف توقع صورتحال تھی۔

عین اسی وقت بہرام خاں چیخ اٹھا۔ ''اسے گرفتار کر لو' اسے پکڑ لو' اس حرافہ کو' یہ بچ کر نہ جانے پائے۔''

دونوں پہریداروں نے پیچھے ہٹ کر اپنی تلواریں نکال لیں اور پھر مجھ پر جھپٹ پڑے۔

میں پہلے ہی چوکنا ہو چکی تھی۔ ان دونوں کے وار میں نے اپنی تلوار پر روک لئے اور بہرام خاں سے مخاطب ہوئی۔ ''اے مکار شخص! اپنی چھوٹی بہن کو حرافہ کہہ رہا ہے' ابھی چند لمحے پہلے کہے ہوئے الفاظ تو بھول گیا۔''

جواب میں بہرام خاں بے حیائی سے قہقہے لگاتا ہوا دروازے سے باہر آ گیا اور کہنے لگا۔ ''تو بھی کس قدر بھولی ہے مہرالنسا کہ تجھے نہیں معلوم منہ سے بہن کہہ دینے سے کوئی عورت بہن نہیں بن جاتی۔''

میں کچھ نہ بولی۔ میری تمام تر توجہ پہریداروں کی طرف تھی۔ میں پہریداروں سے بھڑی ہوئی تھی۔ آن کی آن میں ایک پہریدار کا دایاں ہاتھ کٹ کر دور جا گرا اور دوسرے پہریدار کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔

پھر اس سے پہلے کہ میں بہرام خاں پر جھپٹتی وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ عمارت کے اندرونی حصے کی طرف تھا۔ اس کے پیروں میں جیسے پر لگ گئے تھے۔ میں اسے چھوڑ کر بیرونی دروازے کی طرف چلی۔

بیرونی دروازے کے قریب ہی مجھے اصطبل نظر آیا۔ میں اس میں گھس گئی اور جھپٹ کر ایک گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ پھر صدر دروازے کی طرف بڑھی۔ صدر دروازے پر جو پہریدار مقرر تھا وہ میرے ہاتھ میں خون آلود تلوار دیکھ کر پہلے ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اگلے ہی لمحے اس عمارت سے باہر آ گئی۔

اس وقت نصف شب سے زیادہ گزر چکی تھی اس لئے تمام راستے سنسان تھے۔ ہر

طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میرے بجائے اگر کوئی آدم زادی ہوتی تو اس وقت گھر سے باہر نکلنے کا تصور بھی نہ کرتی مگر میں ایک غیر معمولی وجود یعنی جن زادی تھی۔ میں تیزی سے گھوڑا دوڑاتی ہوئی اپنی حویلی کی طرف بڑھتی رہی۔ میرے گھوڑے کی ٹاپیں دور تک گونج رہی تھیں۔

جب میں حویلی پہنچی تو عارج کے خلوت کدے کا رخ کیا۔ مجھے وہ نشے میں دھت پڑا ہوا ملا۔ میں نے اسے جھنجھوڑ کر جگانا چاہا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ عارج کے کمرے سے نکل کر میں نسترن کو تلاش کرنے لگی۔ یہی وہ خادمہ تھی جس نے مجھے دودھ میں بیہوشی کی دوا ملا کر دی تھی۔ ساری حویلی میں اسے تلاش کر کے میں مایوس ہو گئی۔ میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ تھا کہ نسترن نے مجھے حویلی میں داخل ہوتے دیکھ لیا ہو گا۔ میرے ہاتھ میں خون آلود تلوار دیکھ کر غالباً وہ سمجھ گئی تھی کہ اب خیر نہیں ہے' اس لئے وہ فرار ہو گئی تھی۔

نسترن میرے نزدیک اتنی اہم نہیں تھی کہ اسے بہرحال تلاش کرنا ضروری ہوتا اور میں اس کیلئے اپنی پراسرار قوتیں استعمال کرتی' میں نے اس لئے اسے اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

اس رات بڑی دیر تک میں بستر پر کروٹیں بدلتی رہی اور مجھے نیند نہیں آئی' پھر معلوم نہیں کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

صبح بیدار ہوتے ہی میں نے عارج کی خلوت گاہ کا رخ کیا۔ وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگا دیا۔ آنکھ کھولتے ہی عارج کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ گھبرا سا گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اس وقت بھی میرے ہاتھ میں رات والی خون آلود تلوار تھی جسے میں دانستہ اپنے ساتھ لائی تھی۔

میں نے حقارت آمیز آواز میں عارج کو مخاطب کیا۔ ''اے عارج! پڑھ کر اس تلوار پر خون سے کیا تحریر لکھی ہے؟''

عارج نے سہمی ہوئی نظروں سے خون آلود تلوار کو دیکھا' جس پر خون جم چکا تھا۔ پھر وہ ہکلاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ''اے...... دی...... دینارا...... کک...... کیا تو...... تو نے بہرام خاں کو مار ڈالا؟''

''یقیناً مار ڈالتی مگر وہ بزدل رات کو کسی چوہے کی طرح چھپ گیا۔ پھر مجبوراً مجھے اس کی حویلی سے اسے قتل کیے بغیر ہی واپس آنا پڑا لیکن اب وہ میرے انتقام سے نہیں بچ سکتا۔''

''تو...... یہ...... یہ تل...... تلوار تو اپنے ہاتھ سے رکھ دے۔'' عارج ایک بار پھر ہکلایا۔

''کیوں؟...... کیا تجھے ڈر لگ رہا ہے تلوار سے؟'' میرا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔

''ہاں...... ہاں مجھے ایسی...... ایسی باتوں سے ڈر لگتا ہے۔'' عارج بستر سے اٹھ کر

پیچھے کھسکتے ہوئے کہنے لگا۔

عارج پر اس کا انسانی قالب پوری طرح غالب تھا۔ پھر بھی مجھے اس پر ترس نہیں آیا اور قہر آلود لہجے میں بولی۔ ''تجھے تلوار سے تو خوف آتا ہے مگر خدا سے ڈر نہیں لگتا!...... یہ لے۔'' میں نے تلوار ہاتھ سے پھینک دی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تو نے بہرام خاں کے ساتھ میرا جو سودا کیا تھا اس کے بارے میں مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچ چکی ہوں کہ تو میری محبت کا مستحق نہیں ہے۔ تیرے ساتھ میں نے بہت رعایت کر لی۔ اب مزید رعایت میرے بس میں نہیں تو یقیناً اس قابل بھی نہیں کہ میرا شوہر کہلائے۔'' یہ کہہ میں ایک لمحے کو رکی پھر دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ ''اچھی طرح سن لے اگر اب وہ تیرا ذلیل دوست اس حویلی میں داخل ہوا تو میں نہ صرف اس کا خون کر دوں گی بلکہ تو بھی......'' میں غصے میں مزید کچھ کہنے سے باز رہی اور اپنی خفگی کا ہدف بہرام خاں ہی کو بنائے رہی۔ ''اپنے اس چہیتے دوست بہرام خاں سے کہہ دیجو کہ اگر اسے اپنی زندگی عزیز ہے تو آئندہ یہاں اپنے ناپاک قدم نہ رکھے۔'' یہ کہہ کر میں مزید وہاں نہیں رکی۔

بہرام خاں نے اس دن کے بعد سے حویلی میں آنے کی ہمت نہیں کی۔ عارج نے اس تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اب مجھ سے عارج بھی کترانے لگا تھا۔ جب بھی نادانستہ مجھ سے اس کا سامنا ہو جاتا تو وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوفزدہ نظر آنے لگتا۔

میں بہت محتاط ہو چکی تھی۔ کھانے پینے کی اشیاء اب میں پہلے خادموں یا کنیزوں کو چکھاتی پھر خود استعمال کرتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ بہرام خاں اپنے مطلب نکالنے کیلئے کسی بھی کنیز یا خادم کو خرید سکتا ہے۔ پہلے بھی ایک بار ایسا کر چکا تھا ایسی صورت میں یہ کام اور بھی آسان تھا کہ عارج بہرام خاں سے ملا ہوا تھا۔

حویلی میں بہرام خاں کا آنا جانا بند ہو گیا تو عارج غائب رہنے لگا۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ عارج کا بیشتر وقت کہاں گزرتا ہے۔ اکثر عارج راتوں کو بھی اب بہرام خاں کی حویلی میں رہ جاتا تھا۔

ان حالات میں اب میں کچھ اور ہی سوچنے لگی تھی۔ عارج پر غصے سے قطع نظر بار بار یہ حقیقت سامنے آ جاتی کہ قصوروار اس کا انسانی قالب ہے وہ خود نہیں۔ میں سنجیدگی سے اس امکان پر غور کرنے لگی کہ عارج اب مزید اس انسانی قالب میں نہ رہے۔ تو پھر؟ یہ سوال مجھے پریشان کرنے لگا اور ایک دن میں جواب تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

مستقبل کا واضح نظام العمل ابھی پوری طرح میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ اگر

عارج شہباز کے جسم میں نہ رہتا تو مجھے بہرحال اس سے علیحدگی اختیار کرنی پڑتی۔ ظاہر ہے کہ میں اس آوارہ و بدکردار آدم زاد شہباز کی بیوی بن کر تو نہیں رہ سکتی تھی۔ میں اکثر یہ بھی سوچتی تھی کہ شہباز سے علیحدگی اختیار کر کے کہاں جاؤں گی؟

مجھے اپنے انسانی پیکر مہرالنسا کے سوتیلے باپ خواص خاں کے پاس سسرام جانے کا بھی خیال آیا۔ پھر انہی دنوں مجھے مہرالنسا کی ماں قمرالنساء کے انتقال کی خبر مل گئی۔ اس خبر سے مجھے رنج ہوا اور اپنے انسانی قالب کی بنا پر قمرالنسا سے میرا گہرا تعلق تھا۔ وہ مہرالنسا کی ماں تھی اس خبر کے بعد میں نے سسرام جانے کا خیال بھی دل سے نکال دیا۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ خواص خاں کو مجھ سے قطعی محبت نہیں ہے۔

مستقبل کا جو خاکہ میں نے اپنے ذہن میں مرتب کیا تھا اس کا دارومدار میرے خوبرو اور وجیہہ اتالیق اسحاق پر تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اسحاق کے دل میں میری محبت پوشیدہ ہے۔ خود میرے دل میں بھی اسحاق کیلئے جگہ تھی۔ اس کے باوجود میں اسحاق کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ عارج کے انسانی قالب کیلئے میں نے اسحاق ہی کو منتخب کر لیا تھا لیکن اس پر عملدرآمد فوری طور پر بوجوہ ممکن نہیں تھا۔ پہلا مرحلہ تو میرے نزدیک اسحاق کی رضامندی تھی اس کے علاوہ یہ کہ اسحاق بہرحال ایک معمولی کماں دار تھا وہ بھلا عیسیٰ خاں اور بہرام خاں کی مخالفت مول لے کر مجھے کس طرح اپنا سکتا تھا۔ عارج کے انسانی پیکر شہباز سے میری علیحدگی کا مطلب عیسیٰ خاں کی مخالفت مول لینا بھی ہوتا۔ عیسیٰ خاں اپنی یہ بے عزتی کس طرح برداشت کر لیتا کہ اس کے بیٹے کی بیوی اس کے گھر کی عزت ایک ادنیٰ کماں دار سے شادی کر لے۔

انہی خیالوں اور وسوسوں میں کچھ دن اور گزر گئے۔ اسحاق معمول کے مطابق ہر شام شمشیرزنی کی مشق کرانے حویلی میں آتا تھا۔ میری پریشانی اس سے چھپی نہ رہ سکی کیونکہ اب میں مشق میں پہلے جیسی دلچسپی نہیں لیتی تھی اور چپ چپ سی بھی رہتی تھی۔

ایک دن ہمت کر کے اسحاق نے مجھ سے میری پریشانی کا سبب پوچھ ہی لیا۔

اسحاق کے لہجے میں کچھ ایسی محبت تھی ایسا خلوص تھا کہ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اچانک اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے بعد وہ جذبات سے مرتعش آواز میں مجھ سے کہنے لگا۔ ''بخدا...... وہ...... وہ شخص شہباز بہت ہی بدقسمت ہے۔ کاش...... کاش میں آپ کیلئے کچھ کر سکتا۔''

میں نے ایک بار اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر اسحاق نے ہلکا سا دباؤ اور بڑھا دیا۔

اسحاق کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے اس سے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اسحاق! میں بہت پریشان ہوں' خدا کیلئے کچھ کرو۔''

اسحاق کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ میں نے آج پہلی بار اس پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ اسے اپنا سمجھ کر کچھ کہا تھا' اس روز اندھیر پھیلنے تک میں پائیں باغ کے پرسکون گوشے میں اسحاق سے راز و نیاز کرتی رہی۔ عارج حسب معمول بہرام خاں کی حویلی میں تھا اور خدام اندرونی حصے میں تھے۔ یوں بھی جب میں شمشیر زنی کی مشق کر رہی ہوتی تو ملازم ادھر نہیں آتے تھے۔

معاً اسحاق مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''بس ایک ہی صورت ہے کہ..... کہ کسی طرح آپ شہباز سے علیحدگی اختیار کر لیں۔''

''تمہارا مطلب یقیناً طلاق لینے سے ہے مگر وہ..... وہ مجھے طلاق نہیں دے گا..... اس کے علاوہ یہ کہ اگر اس نے مجھے طلاق دے بھی دی تو..... تو پھر..... پھر میں کہاں جاؤں گی؟'' میں نے دانستہ اور مصلحتاً یہ الفاظ استعمال کیے۔

''مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہیں مگر.....'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

کچھ دیر میں اس کے بولنے کی منتظر رہی' پھر پوچھا۔ ''مگر کیا؟''

''یہ..... یہ کہ..... میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔''

اسحاق نے جواب دیا۔ ''میری شادی ہو چکی ہے اور..... اور میں ایک بچے کا باپ ہوں..... آپ یقیناً ایسی صورت میں مجھے قبول نہیں کریں گی۔''

مجھے یہ سن کر دھچکا سا لگا کہ اسحاق شادی شدہ تھا مگر یہ صرف وقتی ردعمل تھا' جلد ہی میں پرسکون ہو گئی اور بولی۔ ''لیکن شادی شدہ تو میں بھی ہوں..... اور..... اور پھر تم دوسری شادی بھی تو کر سکتے ہو۔ تمہاری بیوی کو اس پر کوئی اعتراض.....''

''وہ تو کئی سال پہلے مر چکی ہے۔ میرے بیٹے الیاس کو جنم دیتے ہی وہ چل بسی تھی۔'' اسحاق بول اٹھا۔

میں نے یہ سن کر طویل سانس لیا۔ پھر میرے استفسار پر اسحاق نے اپنے بارے میں سب کچھ بیان کر دیا۔

اسحاق اور میں دیر تک موجودہ صورتحال سے نکلنے کی ترکیبوں پر غور کرتے رہے مگر ہمیں کوئی تدبیر قابل عمل نظر نہیں آئی۔

''یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دونوں یہ ملک چھوڑ دیں' کہیں کسی اور ملک میں جا بسیں۔'' آخر کار اسحاق نے ایک راہ نکالی۔

میں نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور بولی۔ ''یہ راہ بدنامی کی ہے جو مجھے پسند نہیں کیونکہ نہ ہم اس سلسلے میں عدالت سے رجوع کریں۔ شہباز کی بدکرداریوں کے کئی ثبوت عدالت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے قاضی علیحدگی کی اجازت دے دے گا۔''

''یہ آپ کا خیال خام ہے۔'' اسحاق نے بے تکلفی سے کہا۔ ''کیا آپ نہیں جانتیں کہ بہرام خاں کتنا بااثر امیر ہے' فیصلہ ہمارے خلاف ہو گا۔''

میں سوچ میں پڑ گئی۔ عارج کے انسانی قالب شہباز سے شرعی طور پر علیحدگی اختیار کیے بغیر یہ ممکن نہیں تھا کہ میں کسی اور شخص کو اپنا لیتی۔ کچھ دن اسحاق اور میرے درمیان اس مسئلے پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر کار مجھے سحاق کی ایک تجویز قبول کرنی ہی پڑی۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ جلد از جلد دہلی سے نکل کر آگرہ چلے جائیں گے۔ آگرہ میں اسحاق کے والدین' رشتے دار اور کچھ مخلص دوست تھے اسحاق کو یقین تھا کہ وہ سب اس کیلئے ہر معاملے میں مددگار ثابت ہوں گے۔

میں ہر قدم بہت محتاط انداز سے اٹھا رہی تھی تاکہ میرا دشمن بہرام خاں چوکنا نہ ہو جائے۔ بہرام خاں کو ابھی میں اندھیرے ہی میں رکھنا چاہتی تھی اس لئے عارج کے انسانی قالب شہباز سے دانستہ طلاق نہیں لی۔

دو تین روز تک اسحاق اور میں رازداری کے ساتھ ضروری تیاریوں میں مصروف رہے۔

اب عارج سے فیصلہ کن بات کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ ایک شام جب وہ تیار ہو کر بہرام خاں کی حویلی جانے والا تھا تو میں نے اس کا راستہ روک لیا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا وہ سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''اپنے خلوت کدے میں واپس چل اے عارج! مجھے تجھ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

عارج کچھ کہے بغیر واپسی کیلئے مڑ گیا۔ اندر پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا۔ ''اے دینارا! مجھے خبر ہے کہ تو مجھ سے بہت خفا ہے اور..... اور میں اس کی وجہ بھی جانتا ہوں مگر..... مگر تو ہی بتا کہ میں کیا کروں؟..... قصور اس انسانی قالب کا ہے اور سزا مجھے بھگتنی پڑ رہی ہے۔ میں..... میں تجھ سے سخت شرمندہ ہوں۔''

"میں تیری مجبوری سمجھتی ہوں اے عارج!" میں پرسکون آواز میں بولی۔ "میں تیری اس مجبوری کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیسے اے دینار!" عارج نے حیران کن آواز میں پوچھا۔

"اس کی ایک ہی تدبیر ہے کہ تو یہ جسم چھوڑ دے..... بدکردار شہباز کے انسانی قالب سے نکل آ۔" میں نے اسے بتایا۔

"تو کیا تو یہ چاہتی ہے کہ میں کسی انسانی قالب میں نہ رہوں؟..... مگر اس طرح کیا میرے لئے خطرہ....."

"تیرے لئے میں نے ایک اور انسانی قالب تلاش کر لیا ہے۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"کون ہے وہ؟" عارج نے سوال کیا۔

جواب میں عارج کو میں نے سب کچھ تفصیل کے ساتھ بتا دیا۔ عارج نے میری توقع کے مطابق آمادگی کا اظہار کر دیا۔

"اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ مجھے اسحاق کے قالب میں قرار بھی آتا ہے یا نہیں۔" عارج کہنے لگا۔

عارج کی یہ تشویش بھی اسی رات ختم ہو گئی۔ میرے ایما پر اس نے شہباز کا قالب چھوڑ دیا اور اسحاق کے جسم میں اتر گیا۔

پھر اسی رات ہم دونوں چپ چاپ دہلی سے نکل گئے اور آگرہ جا پہنچے۔ اسحاق کا جسم اپنا کر عارج بہت خوش تھا۔

تقدیر ہم پر مہربان تھی آگرہ پہنچنے کے چند روز بعد ہمیں ایک ایسی اطلاع ملی کہ دونوں خوش ہو گئے۔

ہوا یوں کہ جس رات ہم دہلی سے نکلے اسی رات بادشاہ سلیم شاہ سوری کے حکم پر شاہی افواج کے سپہ سالار امیر احمد خان کو برطرف کر کے قتل کر دیا گیا۔ اس کے خلاف یہ الزام تھا کہ وہ ہندوستان سے فرار ہو جانے والے مغل تاجدار ہمایوں سے خط و کتابت کرتا ہے اور ہمایوں کو اس نے دوبارہ ہندوستان آنے کی دعوت دی ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ واقعی سپہ سالار اس سازش میں ملوث تھا یا اس کے بدخواہوں نے اسے پھنسوا دیا تھا۔

گزشتہ مقتول سپہ سالار امیر احمد خان کی جگہ ایک ایسا شخص عطا محمد افواج شاہی کا نیا سربراہ بنا جو عیسیٰ خاں کے علاوہ بہرام خاں کا بھی پرانا دشمن تھا۔ اس نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی

عیسیٰ خاں کو پٹنہ میں گرفتار کروا کر زنداں میں ڈلوا دیا۔ دہلی میں جن امراء کی گرفتاریاں نئے سپہ سالار عطا محمد کے حکم پر عمل میں آئی ان میں بہرام خاں بھی شامل تھا۔ یہ تمام ہی بدقماش امراء سابق سپہ سالار امیر احمد خاں کے مقربین میں شامل تھے۔

عارج نے جب یہ خبر مجھے سنائی تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ "تو کیوں اتنا خوش ہے اے عارج؟" میں نے جان کر انجان بن کے پوچھا۔

"کیا مجھے اس پر خوش نہیں ہونا چاہیے کہ ایک بار پھر تو میری بیوی بن جائے گی اے دینار!..... تو بھول گئی کیا؟..... تو نے ہی تو کہا تھا کہ میرے اس نئے انسانی پیکر اسحاق سے شادی کر لے گی۔"

"لیکن مجھے ابھی تیرے پچھلے انسانی قالب شہباز سے نجات تو نہیں ملی..... جب تک شرعی طور پر اس سے میری علیحدگی نہ ہو جائے میں تجھ سے کس طرح شادی کر سکتی ہوں؟..... نکاح پر نکاح تو ممکن نہیں۔" میں نے عارج کو سمجھایا۔

"میں اس کا حل بھی سوچ چکا ہوں اے دینار!" عارج نے کہا۔

"وہ کیا..... مجھے بھی تو بتا۔" میں بولی۔

"تو عدالت میں شہباز کیخلاف دعویٰ دائر کر دے اے دینار!" عارج نے بتایا۔

"مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا تو یہی کہے گا۔" میں مسکرا دی۔

اگلے ہی روز میں نے آگرہ کی عدالت میں شہباز کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔ عدالتوں پر اب عیسیٰ خاں کا کوئی اثر نہیں رہا تھا نہ بہرام خاں کا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے شہباز سے آزادی حاصل ہو گئی۔ اس فیصلے کے چند روز بعد مصلحتاً میں اور عارج ازدواجی بندھن میں بندھ گئے۔ شادی کی تقریب بہت سادہ تھی۔ تقریب میں اسحاق کے دوست اور صرف اس کے والدین شریک تھے۔

میرے لئے اس زمانے میں گویا یہ ایک نئی زندگی تھی۔ عارج کے پہلے انسانی قالب شہباز کی وجہ سے میں جس ذہنی اذیت کا شکار تھی وہ ختم ہو گئی۔ میرے شب و روز اتنے حسین اتنے سہانے ہو گئے تھے کہ دہلی میں گزرے ہوئے دن اب بھولا بسرا خواب محسوس ہوتے تھے۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک روز اسحاق کے والدین ہمارے گھر آئے۔ ان کے ساتھ ہی اسحاق کا چار سالہ معصوم بیٹا الیاس بھی تھا۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ اسحاق کی ماں اب اکثر بیمار رہنے لگی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ الیاس کی پرورش اب میں کروں۔ بڑی بی کا یہ کہنا کچھ

حملہ بھی نہیں تھا۔ انسانی قالب کے ناطے میں بہر حال الیاس کی سوتیلی ماں تھی۔

الیاس مجھے بہت بھولا بھالا اور پیارا سا بچہ لگا۔ آدم زادوں کے درمیان رہ کر اب تک میں نے ماں کا کردار نہیں کیا تھا سو الیاس کی وجہ سے یہ کمی بھی پوری ہو گئی۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی کہ عارج بھی الیاس سے محبت کرنے لگا غالباً یہ اس کے انسانی پیکر کا فطری تقاضا تھا۔ گھر میں الیاس کی آمد سے جیسے بہار سی آ گئی۔

اسحاق آگرہ کے حاکم کی محافظ سپاہ کا کماں دار تھا۔ ایک طرح سے اب بھی وہ بادشاہ سلیم شاہ سوری کے ملازموں میں شامل تھا۔ اس اسحاق کا جسم اب عارج کے تصرف میں تھا۔ فطری طور پر اسحاق ایک نیک آدم زاد تھا اس لئے عارج کی عادات سے مجھے اب کوئی شکایت نہیں تھی۔ حالات سے اب میں پوری طرح مطمئن تھی پھر بھی دارالحکومت دہلی سے غافل نہیں رہتی تھی۔

دہلی سے انہی دنوں ایک خبر آئی کہ سلیم شاہ سوری سخت بیمار ہو گیا۔ چند ہی روز بعد اس کے انتقال کی خبر بھی آگرہ پہنچ گئی۔

اپنی زندگی میں سلیم شاہ سوری اکثر اپنی بیوی بی بی بائی سے کہا کرتا تھا اگر تجھے اپنے بیٹے فیروز خاں کی جان پیاری ہے تو مجھے اجازت دے کہ میں تیرے بھائی مبارز خاں کا کام تمام کر دوں۔ اگر بھائی کی محبت غالب ہے تو تیری مرضی جو کچھ ہونا ہے تیرے سامنے آئے گا۔

بی بی بائی کا بھائی مبارز خاں شیر شاہ سوری کا بھتیجا ہوتا تھا۔ اس کے انداز بتاتے تھے کہ وہ سلطنت کا خواہش مند ہے۔ سلیم شاہ سوری سے بھی یہ بات چھپی ہوئی نہیں تھی۔ بی بی بائی ان باتوں کو بدگمانی پر محمول کر کے اپنے بھائی کی پاس داری کرتی رہتی تھی۔

جب سلیم شاہ سوری کا انتقال ہو گیا تو امیروں نے فیروز خاں کو تخت پر بٹھا دیا کیونکہ یہ جانشین اور ولی عہد تھا۔ فیروز خاں کی تخت نشینی کے تیسرے دن مبارز خاں اپنے آدمیوں کو لے کر فیروز خاں کے قتل کا ارادہ کر کے محل میں گھس آیا۔

فیروز خاں کی ماں بی بی بائی کو جب یہ معلوم ہوا تو دوڑتی ہوئی بھائی کے پاس آئی اور روتے ہوئے اپنے بیٹے کی جان بخشی کیلئے فریاد کرنے لگی۔ اس نے مبارز خاں سے کہا۔ ''مجھے اور میرے بیٹے فیروز خاں کو تم کسی دور دراز ملک چلا جانے دو یا پھر قید خانے میں ڈلوا دو۔''

مبارز خان ان سنگدل آدم زادوں میں سے تھا جن کے نزدیک کوئی رشتہ محترم نہیں ہوتا۔ اس پر بہن کی التجاؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بی بی بائی اس قدر روئی کہ ظالم مبارز خاں کا

دامن آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ اسے اپنے مرحوم شوہر سلیم شاہ سوری کی باتیں یاد آ رہی تھیں جو مبارز خاں کو ناپسند کرتا تھا اور مستقبل کیلئے خطرہ سمجھتا تھا۔

''میرا دامن چھوڑ دے بی بی بائی!'' مبارز خاں نے سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھٹکا دیا۔

بی بی بائی دور جا گری۔ اسی وقت مبارز خاں کے آدمی فیروز خاں کو پکڑ لائے۔ پھر مبارز خاں نے دیر نہیں کی اور اپنے سگے بھانجے کا سر قلم کر دیا۔ بیٹے کے اس انجام کو بی بی بائی نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جیسے پتھر کی ہو گئی۔

اس واقعے کے بعد مبارز خاں محمد شاہ عادل کے خطاب سے تخت دہلی پر بیٹھ گیا۔ دہلی کے عوام نے اس کے خطاب عادل کو بدل کر عدلی شاہ کر دیا کیونکہ کسی عادل سے بے گناہ خون ممکن نہیں۔ مبارز خاں اسی نام سے مشہور ہوا۔

عارج اور میرے لئے اقتدار کی اس تبدیلی میں ایک بات تشویشناک تھی۔ عدلی شاہ نے برسر اقتدار آتے ہی جن امراء کو زنداں سے نکال کر اپنی مجلس مشاورت میں شامل کیا تھا اور انہیں مختلف ذمہ داریاں سونپی تھیں ان میں عیسیٰ خاں اور بہرام خاں بھی تھے۔ بہرام خاں کا دوبارہ اقتدار میں آ جانا عارج اور میرے لئے باعث تشویش تھا۔

اب ہمیں ہر لحہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ بہرام خاں ہمارے خلاف کوئی انتقامی کارروائی ضرور کرے گا مگر خلاف توقع ایسا نہیں ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد ہم دونوں یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ بہرام خاں ہمیں بھول چکا ہو گا۔

عدلی شاہ کو عنان حکومت سنبھالے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ جو فتنے دب گئے تھے از سر نو اٹھ کھڑے ہوئے۔ شیر شاہ سوری کے بیٹے عادل خاں کے برادر نسبتی ابراہیم خاں نے بھی بغاوت کر دی۔ وہ لشکر فراہم کر کے بیانہ کی طرف چلا گیا۔ بیانہ پر اس کی موروثی حکومت تھی اس لئے بیانہ کو اس نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا اور اطراف میں لوٹ مار کرنے لگا۔ اس اطلاع پر عدلی شاہ نے ہیموں کی سرکردگی میں ایک لشکر بیانہ روانہ کیا۔

عارج کے انسانی پیکر اسحاق کیلئے بھی حکم ہوا کہ وہ شاہی سپاہ کے ساتھ جائے۔ جب عارج نے مجھے یہ خبر دی تو میں فکر مند ہو گئی۔ جنگ بہر حال جنگ ہوتی ہے عارج کو کوئی بھی خطرہ پیش آ سکتا تھا ماضی میں بھی ایسی صورت پیش آ چکی تھی۔

''میری مان اے عارج!'' تو کچھ عرصے کیلئے اس جسم سے نکل آ'' میں نے مشورہ دیا۔

"اے دینار! تو بلا وجہ گھبرا رہی ہے۔" عارج کہنے لگا۔ "کوئی خطرہ دیکھا تو میں اسحاق کے انسانی قالب کو چھوڑ دوں گا۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ مجھے تیری اور الیاس کی بہت یاد آئے گی۔" عارج کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ..... کہ میں... الیاس کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤں؟"

میں نے بے یقینی اور حیرت سے عارج کو دیکھا اور بولی۔ "میدان جنگ میں بھلا بچوں کا کیا کام؟"

عارج نے جواباً کہا۔ "تو فکر مند نہ ہو اے دینار! میں الیاس کا پورا خیال رکھوں گا۔ تجھے خبر ہے کہ میں اسے کتنا چاہتا ہوں۔ الیاس میرے پاس ہو گا تو مجھے تیرا فراق بھی گراں نہیں گزرے گا۔" پھر عارج نے مجھے یقین دلایا۔ "میں اپنی جان سے بڑھ کر الیاس کی خبر گیری رکھوں گا' خادموں کی نگرانی میں الیاس خیمے کے اندر رہے گا' اسے میدان جنگ میں نہیں لے جاؤں گا۔"

میں دل سے اس بات پر آمادہ نہیں تھی مگر مجھے عارج کے انسانی قالب اسحاق اور الیاس کے رشتے کا بھی علم تھا۔ یہ محبت فطری تھی جس پر پابندی لگانا مجھے بے رحمی محسوس ہوا۔ خود میں بھی الیاس کی عادی سی ہو گئی تھی پھر بھی دل پر پتھر رکھ کر اس کی جدائی سہنے کو تیار ہو گئی جس دن الیاس کی پیشانی پر بوسہ دے کر میں اسے رخصت کر رہی تھی تو میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

آخری بار میں نے عارج کو منع کیا کہ الیاس کو اپنے ساتھ نہ لے جائے مگر وہ نہیں مانا۔ اس نے مجھے دلاسا دیا اور رخصت ہو گیا۔ میں بالائی منزل پر کھڑی نم آلود آنکھوں سے عارج اور الیاس کو دور تک جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ میں اس وقت تک وہیں کھڑی رہی جب تک ان کے گھوڑوں کی گرد بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ عارج کے ساتھ اس کے خادم بھی تھے۔

آنے والے دن میرے لئے بہت کٹھن اور اداس تھے۔ میں شب و روز عارج اور الیاس کی سلامتی کیلئے دعائیں مانگتی اور بے تابی سے ان کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ میں دانستہ اپنے تصور کی قوت کو بروئے کار نہیں لا رہی تھی۔ میں اگر ایسا کرتی تو میری بے چینی میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

کچھ دن بعد خبر آئی کہ شاہی فوجوں نے باغیوں کو شکست دے دی اور ابراہیم خاں مقابلے سے فرار ہو گیا۔ اس خبر سے مجھے اطمینان ہوا۔ پھر بھی ایک عجیب سی بے چینی تھی جو

ہمہ وقت میرے دل و دماغ کو پریشان کیے رہتی تھی۔

میں ہر روز چھت پر چڑھ کر دور سے آنے والے قافلوں کی راہ تکا کرتی تھی لیکن کافی دن گزر جانے کے بعد بھی عارج اور الیاس لوٹ کر نہ آئے۔ مجبوراً مجھے اپنے تصور کی قوت استعمال کرنی پڑی اور اس پر بہت پچھتائی۔ میں نے عارج کے انسانی قالب اسحاق کا پہلے تصور کیا' خلاف توقع مجھے اس میں ناکامی ہوئی۔ میری چشم تصور اسے نہ دیکھ سکی۔ پھر آنکھیں دوبارہ بند کر کے میں نے الیاس کے خدوخال اپنے ذہن میں تشکیل دیئے۔ اس بار بھی سناٹا اور اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا تو میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

میرے تصور کی قوت ناکام ہونے کا ایک ہی سبب ممکن تھا کہ میں جن کو دیکھنا چاہتی ہوں وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ یہ سوچنا بھی میرے لئے بہت روح فرسا تھا۔ ہو سکتا ہے میرے تصور کی پراسرار قوت کسی وجہ سے کام نہ کر رہی ہو' میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

میں اسی بے چینی کے عالم میں تھی کہ آخر ایک روز عارج کے ساتھ جانے والے دونوں خادم زخمی حالت میں واپس آ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں ننگے پاؤں چھت سے دوڑتی ہوئی نیچے آئی اور ان خادموں کے سامنے پہنچ گئی۔

"تمہارا آقا کہاں ہے؟" میں نے پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان ان سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟..... اور الیاس..... وہ کہاں ہے؟"

خادموں نے سر جھکا لیا۔ ان میں سے ایک کا نام رحمان تھا۔ وہ غمزدہ آواز میں بولا۔ "ہمیں افسوس ہے مالکہ کہ....."

مجھ پر یہ سنتے ہی سکتہ طاری ہو گیا۔ میں دیر تک وحشت کے عالم میں خادموں کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر جانے کیسے یہ الفاظ میری زبان پر آ سکے۔ "کیا وہ جنگ میں....."

خادموں نے نفی میں سر ہلا دیا اور نگاہیں جھکا لیں۔

آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسوؤں کو میں نے بمشکل روکا اور چیختے ہوئی بولی۔ "پھر کیا ہوا؟ کس نے مارا انہیں؟..... مجھے بتاؤ کہ کس بدبخت نے انہیں مجھ سے چھین لیا؟"

غم سے بوجھل آواز میں خادموں نے جو واقعہ بیان کیا وہ یہ تھا کہ فتح کے بعد جب ایک رات جشن منا کر شاہی سپاہ بے خبر سو رہی تھی۔ خادموں نے عارج کے خیمے سے کسی کے چیخنے کی آواز سنی۔ وہ فوراً اٹھ کر عارج کے خیمے میں پہنچے تو دیکھا کہ کچھ مسلح افراد ان کے آقا کو زمین پر گرا کر ذبح کر رہے تھے۔ کمسن الیاس عارج کو بچانے کیلئے اس سے لپٹ گیا تو ظالموں نے اس بھی برچھیوں سے چھید دیا۔ خادموں نے مقابلے کی کوشش کی مگر حملہ آور تعداد میں

بہت زیادہ تھے وہ اپنے آقا اور آقا زادے کو نہ بچا سکے۔ حملہ آور جن میں سے بیشتر اپنے چہروں پر نقاب چڑھائے ہوئے تھے رات کے اندھیرے میں فرار ہو گئے۔ خادموں نے یہ بھی بتایا کہ وہ ان حملہ آوروں کو پہچانتے ہیں وہ سب بہرام خاں کے دستے کے سپاہی تھے۔

☆......☆......☆

بہرام خاں کا نام سنتے ہی میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے پرعزم لہجے میں کہا۔ ''بہرام خاں! اب تو مجھ سے نہیں بچ سکے گا!...... میں تجھ سے انتقام ضرور لوں گی اور تجھے اپنے ہاتھوں سے ذبح کروں گی۔''

کچھ دیر سے مجھے ایک آشنا و مانوس مخصوص خوشبو اپنے قریب محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر ذہن سے کئی بار جھٹک دیا کیونکہ میرے نزدیک ایسا ممکن نہیں تھا۔ پھر جب نوجوان خادم رحمان نے مجھے ایک اشارہ کیا تو میں نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ اشاروں کی یہ زبان عارج اور میری ہی وضع کردہ تھی۔ کوئی تیسری ہستی اس سے واقف نہیں تھی۔ جب عارج اور میں عفریت وہموش کی قید میں تھے تو ہم نے اشاروں کی یہی زبان استعمال کی تھی۔

پھر دوسرے خادم کو تو میں نے رخصت کر دیا اور نوجوان رحمان کو روک لیا اب نشست گاہ میں اس کے اور میرے سوا کوئی نہیں تھا۔

''خدا کا شکر ہے اے عارج کہ تو زندہ ہے۔'' میں نے نوجوان رحمان کو مخاطب کیا۔ ''مجھے تیرے وجود کی مخصوص خوشبو خاصی دیر سے محسوس ہو رہی تھی مگر میں اسے اپنا وہم سمجھ رہی تھی...... یہ بتا کہ تو نے اشارہ کرنے میں اتنی دیر کیوں کی؟''

''مجھے پورا یقین تھا اے دینار کہ تو میرے وجود کی خوشبو پہچان لے گی۔ جب ایسا نہیں ہوا تو مجبوراً میں نے اشاروں کی زبان استعمال کی۔ تو شاید شدید صدمے کے اثر میں تھی۔'' عارج نے کہا جو اب نوجوان خادم رحمان کے جسم میں تھا پھر اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتی عارج اداس آواز میں کہنے لگا۔ ''مجھے بڑا رنج ہے اے دینار کہ اپنی جان بچاتے ہوئے میں معصوم الیاس کو نہ بچا سکا۔''

''ہوا کیا تھا؟ مجھے تفصیل سے بتا۔'' میں بولی۔

''اے دینار! اس واقعے کے بعد ایک بات تو واضح ہو چکی ہے کہ ہم غلط فہمی کا شکار تھے۔'' عارج نے کہا۔ ''ہم اپنے دشمن بہرام خان کی طرف سے غافل ہو گئے لیکن وہ ہمیں

نہیں بھولا۔ اس نے ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھی اور موقع ملتے ہی وار کر دیا' خیر...... اب اس نے ہمیں اپنی جانب سے چوکنا کر دیا ہے...... اس رات جو کچھ ہوا اس کی وجہ بے خبری تھی' خدا کو میری زندگی بچانی تھی اس لئے میں خفیف سے کھٹکے سے بیدار ہو گیا ورنہ خیمے کے اندر گھس آنے والے مسلح افراد نیند کی حالت ہی میں مجھے ذبح کر دیتے۔ آنکھ کھلتے ہی میری نظر حملہ آوروں پر پڑی تو میں اچھل کر کھڑا ہو گیا مگر انہوں نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ چاروں طرف سے مجھے گھیر کر انہوں نے زمین پر گرا لیا' وہ مجھے ذبح کرنا چاہتے تھے۔ یہی وہ سنسنی خیز لمحات تھے کہ جب میں نے اسحاق کے انسانی قالب کو چھوڑ دیا۔ اسحاق کے جسم سے نکلتے ہی میری پہلی نظر خیمے میں داخل ہونے والے خادموں پر پڑی۔ فوری طور پر میں نوجوان خادم رحمان کے جسم میں اتر گیا۔ اسی دوران میں حملہ آوروں نے الیاس اور اسحاق دونوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ مجھے رحمان کے جسم میں قرار آ گیا تو میں نے اسی کے اندر رہنے کا فیصلہ کر لیا۔"

عارج خاموش ہوا تو میں بولی۔" بہرام خاں اپنی چال چل چکا اور اب میری باری ہے۔"

" تو کیا کرے گی اے دینار؟" عارج نے دریافت کیا۔

" تجھے خود معلوم ہو جائے گا۔" نے جواب دیا۔

☆......☆......☆

ہر طرف سکوت اور اندھیرے کا راج تھا۔ میرے جسم پر سیاہ لباس تھا جو اندھیرے کا حصہ بنا ہوا تھا۔ میں خاموشی کے ساتھ بہرام خاں کی حویلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ حویلی کے عقب میں پہنچ کر میں نے عقبی دیوار کے ایک کنگورے پر کمند ڈالی۔ میں پہلی ہی کوشش میں کامیاب ہو گئی اور پھر کمند کی مدد سے اوپر چڑھنے لگی۔ چھت پر پہنچ کر میں ایک زینے کے ذریعے نچلی منزل پر آ گئی۔ میں بہت چوکنا اور مستعد تھی' اب میں نے نیام سے تلوار بھی نکال کر ہاتھ میں لے لی تھی۔

ستونوں کی آڑ لیتی ہوئی میں آگے ہی بڑھتی رہی۔ وہاں مجھے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ حویلی کے پہریدار غالباً عمارت سے باہر تھے اور شاید خواب غفلت میں تھے۔ میں ایک دروازے پر پہنچ کر رک گئی اور سن گن لینے لگی۔ اندر سے مدھم سرگوشیاں سنائی دے رہی تھی اور روشنی تھی۔ میں کان لگا کر یہ سرگوشیاں سننے لگی۔

" خدا کیلئے۔ مجھے چھوڑ دیجئے۔" یہ ایک نسوانی آواز تھی۔" مجھ پر رحم کیجئے۔" اس آواز میں خوف بھی تھا اور التجا بھی۔

جواب میں مجھے جانی پہچانی ہنسی کی آواز سنائی دی' پھر کہا گیا۔" جتنی چاہو چیخو چلاؤ' تمہیں یہاں بچانے کوئی نہیں آئے گا۔"

میں نے اسی وقت دروازے پر دباؤ ڈالا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں قریبی دریچے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ دریچے میں تھوڑی سی جھری تھی' اسے بند نہیں کیا گیا تھا۔ میں ایک ہی جست میں دریچے پر چڑھ گئی اور پھر اندر کودنے میں دیر نہیں کی۔ اندر کا منظر دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خون اتر آیا' وہاں میں نے سہمی ہوئی ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا' یقیناً یہ وہی تھی' میں نے جس کی التجا آمیز سرگوشیاں سنی تھیں۔ میں کمرے میں کودی تو بہرام خاں تیزی سے میری طرف مڑا۔

" کون...... کون ہو تم؟" بہرام خاں بمشکل بولا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ اسے میرے ہاتھ میں شمشیر برہنہ نظر آ گئی تھی' اس کی نظریں تلوار پر جمی ہوئی تھیں۔

" میں تمہاری موت ہوں بہرام خاں۔" میری آواز میں بلا کی تلخی تھی۔

" مہرالنسا!" بہرام خاں میری آواز پہچان کر چیخ اٹھا۔ میرا چہرہ نقاب کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔

" ہاں مہرالنسا!...... تمہاری موت!...... مگر میں تمہیں آسانی سے نہیں مرنے دوں گی' تڑپا تڑپا کر ماروں گی۔ تمہارے جسم کا میں ایک ایک عضو کاٹوں گی' وہ بھی ایک ساتھ یا ایک وقت میں نہیں۔"

" نہیں" بہرام خاں مجھے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر ہاتھ اٹھا کے چیخا۔" خدا کیلئے میری جان بخش دو۔"

" ابھی یہ مظلوم لڑکی بھی تم سے رحم کی التجا کر رہی تھی' تمہیں خدا کا واسطہ دے رہی تھی' کیا تم نے اس کی آواز پر کان دھرے۔" میری آواز میں بڑی چبھن تھی' اب بھی میں قدم قدم بہرام خاں کی طرف بڑھ رہی تھی۔

" میں اس لڑکی کو رہا...... آزاد کر دوں گا مگر تم...... تم میری دشمن کیوں بن گئی ہو۔"

" یہ سوال اپنے آپ سے کر بزدل شخص!" میں اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔" سن میں تجھ سے معصوم الیاس اور بیگناہ اسحاق کا انتقام لینے آئی ہوں جنہیں ایک رات تو نے اپنے سپاہیوں سے قتل کرا دیا تھا۔"

" تمہیں...... مہرالنسا...... تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے' میں...... میں نے انہیں قتل نہیں کرایا۔"

"جھوٹ بولتا ہے کمینے!" میں بولی۔ اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ بلند ہوا اور بہرام خاں چیخ اٹھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ تلوار کی ضرب سے بچنے کیلئے بلند کر دیئے' اگر میرے ارادوں کا علم ہوتا تو شاید ایسا نہ کرتا۔

پھر چشم زدن میں بہرام خاں کا بایاں ہاتھ کٹ کر الگ جا گرا۔ اس کے بازو سے خون کا فوارہ چھوٹنے لگا۔

بہرام خاں چیخ مار کر گرا اور بیہوش ہو گیا' نوجوان لڑکی اب تک سہمی ہوئی اور دہشت زدہ سی ایک طرف کھڑی تھی۔ میں نے تلوار نیام میں رکھی اور لڑکی سے مخاطب ہوئی۔ "ادھر آؤ..... خود کو سنبھالو' تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔"

ابھی میری بات ختم ہوئی تھی کہ بہت سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگی۔ وہ آوازیں لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ یہ اس حویلی کے پہریدار ہی ہو سکتے تھے۔

پہریداروں نے یقیناً بہرام خاں کی تیز چیخ سن لی تھی۔

اب اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس حواس باختہ لڑکی کے قریب آنے کا انتظار کرتی۔ میں نے اس کے پیر کانپتے دیکھ لئے تھے' اس نے اپنی جگہ سے ذرا سی حرکت بھی نہیں کی تھی۔

اس لڑکی کو نظر انداز کر کے میں تیزی سے دریچے کی طرف لپکی اور دوسری طرف کود گئی۔

باہر آتے ہی مجھے ایک طرف سے بہت سے پہریدار آتے دکھائی دیئے' ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں اور وہ سب مسلح تھے' زینے تک پہنچنا اب ممکن نہیں تھا۔ میں انتہائی سرعت سے ایک ستون کی آڑ میں ہو گئی پھر جب پہریدار بھاگتے ہوئے میرے قریب سے گزر گئے تو میں ستون کی آڑ سے نکلی اور تیزی سے اس جانب لپکی جدھر زینہ تھا۔

میں نے پوری کوشش کی تھی کہ میرے قدموں کی چاپ سنائی نہ دے پھر بھی نہ جانے کیسے کسی نے مجھے دیکھ لیا۔

"وہ ادھر کوئی بھاگ رہا ہے۔" مجھے دیکھنے والا پہریدار چیخا۔

اس پہریدار کے الفاظ سنتے ہی میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اب پہریدار میرا تعاقب کر رہے تھے۔ میں پوری قوت سے زینے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ پہریداروں کے اپنے قریب آنے تک میں زینے تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔

پھر جب تک پہریدار مجھ تک پہنچتے میں زینے تک پہنچ گئی۔ زینے کی سیڑھیاں چڑھ

کر میں نے چھت پر پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ اوپر پہنچتے ہی میں نے نہایت ہوشیاری سے زینے کے دونوں پٹ بھیڑ کر زنجیر لگا دی۔ اس کے بعد میں دوڑتی ہوئی اس دیوار کے اس کنگورے تک پہنچی جس پر کمند ڈالی تھی۔

اب مجھے اس حویلی کے پہریداروں کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ زینے کا دروازہ بہت مضبوط تھا۔ اسے توڑنا آسان نہ تھا۔ میں بہت اطمینان سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ میں نے بہرام خاں سے انتقام کی پہلی قسط وصول کر لی تھی۔

میں اچھی طرح جانتی تھی کہ بہرام خاں جوابی کارروائی ضرور کرے گا۔ اس بنا پر میں نے اسحاق کے گھر کو ایک روز پہلے ہی خیر باد کہہ دیا تھا۔ عارج نے مجھے بالکل صحیح مشورہ دیا تھا۔ وہ میرے ایک وفادار نوجوان خادم رحمان کے انسانی قالب میں پناہ لے چکا تھا۔ جب میں نے اس سے اسحاق کے گھر میں خطرے کا اظہار کیا تو وہ بولا۔ "اے دینار! تیری سکونت کیلئے اب میرے انسانی قالب رحمان کا گھر مناسب و محفوظ رہے گا اور یوں میں تیرے ساتھ بھی رہ سکوں گا۔"

"تیرا مشورہ درست ہے اے عارج!" میں راضی ہو گئی۔

دوسرے ہی دن مجھے یہ خبر مل گئی کہ بہرام خاں کے سپاہیوں نے اسحاق کے مکان پر دھاوا بول دیا تھا۔ وہاں سے میں ہر قیمتی شے ہٹا چکی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ سپاہیوں نے میری تلاش میں ناکام ہونے پر مکان کو آگ لگا دی تھی۔ اس سے شاید ان کا مقصد یہ تھا کہ میرے لئے کوئی جائے پناہ نہ رہے' پھر وہ بآسانی مجھے ختم کر سکیں۔

بہرام خاں عدلی شاہ کے معتبر امیروں میں سے ایک تھا اس لئے مجھے سرکاری طور پر مفرور ملزمہ قرار دے دیا گیا۔ اس کے ساتھ یہ اعلان بھی کرایا گیا کہ جو بھی مجھے گرفتار کرائے گا یا میرے بارے میں کوئی اطلاع دے گا اسے انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ یہ انعام اتنا غیر معمولی اور بڑی رقم کا تھا کہ کوئی بھی شخص لالچ میں آ سکتا تھا مگر میرے خادم نمک حرام نہیں تھے۔ انہوں نے حق نمک ادا کیا اور میری مدد کرتے رہے۔ انہی کے ذریعے مجھے بہرام خاں کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ اب میں آگرہ سے دہلی آ چکی تھی۔

چند ہفتوں کے بعد مجھے خبر ملی کہ بہرام خاں صحت یاب ہو چکا ہے گو وہ ایک ہاتھ سے محروم ہو چکا تھا مگر حسب معمول پھر دربار میں جانے لگا ہے۔ مجھے جب یہ اطلاع ملی تو میں نے خلوت میسر آتے ہی عارج سے کہا۔ "اب وقت آ گیا ہے اے عارج کہ میں بہرام خاں سے اپنے انتقام کی دوسری قسط وصول کروں۔" یہ کہہ کر میں رازدارانہ لہجے میں عارج کو مختلف

ہدایات دینے لگی۔

"ایسے معاملات میں تیرا دماغ بہت چلتا ہے اے دینار!" عارج کہنے لگا۔

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے گلے سے ایک ہار اتارا اور عارج کے حوالے کر دیا۔ اس ہار میں بہت قیمتی سوتی جڑے ہوئے تھے۔ میری ہدایات کے مطابق عارج اسی روز بہرام خاں کی حویلی کے محافظ اعلیٰ سے ملا۔ مجھے پتہ تھا کہ اب میں دوبارہ بآسانی بہرام خاں کی حویلی میں داخل نہیں ہو سکتی اس لئے ضروری تھا کہ حویلی کے نگران کو اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔

حسب توقع نگران ایک لالچی آدم زاد نکلا۔ میرا ہار اتنا کم قیمت نہ تھا کہ وہ اسے نظر انداز کر دیتا۔ میں نے عارج کو وہ ہار اسی غرض سے دیا تھا۔ عارج نے واپس آ کر مجھے کامیابی کی نوید دی۔

یہ اسی رات کا واقعہ ہے۔ رات گئے اچانک بہرام خاں کی حویلی کے بائیں باغ میں چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق حویلی کا نگران تمام محافظوں کو اپنے ساتھ لے کر اس طرف چلا گیا

ہنگامہ کرنے والے میرے ہی بھیجے ہوئے خدام تھے جو محافظوں کو ادھر آتا دیکھ کر فرار ہو گئے۔

یہی وہ وقت تھا جب میں خاموشی سے بہرام خاں کی حویلی میں داخل ہو گئی۔ میں وہاں پہلے سے موجود تھی اور اسی وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ حویلی کے اندر کوئی محافظ نہیں۔ یہ اطمینان میرے لئے کافی تھا۔ میں تیزی کے ساتھ بہرام خاں کی خوابگاہ کی طرف بڑھی۔ مجھے توقع تھی کہ بائیں باغ میں ہونے والی چیخ و پکار اور ہنگامے سے بہرام خاں کی آنکھ بھی کھل گئی ہو گی۔ حویلی کے نگران سے عارج کو پتہ چلا تھا کہ بہرام خاں اب اپنی خواب گاہ کے سارے دریچے اور دروازے بند کر کے سوتا ہے خواب گاہ سے اس کے باہر آنے کی دو ہی صورتیں ممکن تھا۔ ایک صورت یہ کہ وہ خود حقیقت حال جاننے کی خاطر خواب گاہ کا دروازہ کھول کر باہر آ جاتا۔ دوسری صورت یہ کہ خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی جاتی ایسی صورت میں بھی وہ دروازہ ضرور کھولتا کہ دیکھے دستک دینے والا کون ہے۔

مجھے بہر حال دستک دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بہرام خاں خود ہی تجسس سے مجبور ہو گیا اور دروازہ کھول کے باہر آ گیا۔ میں قریب ہی ایک ستون کی آڑ میں چھپی ہوئی تھی۔ جیسے ہی بہرام خاں باہر آیا میں ستون کی اوٹ سے نکلی اور اس پر جھپٹ پڑی۔ یہ میرا حملہ

بہرام خاں کیلئے اتنا غیر متوقع تھا کہ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ حواس باختہ ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ آج رات بھی میرے جسم پر سیاہ لباس تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک آب دار خنجر چمک رہا تھا۔

"آج میں تجھ سے انتقام کی دوسری قسط وصول کرنے آئی ہوں بہرام خاں!" میں نے بلند آواز سے کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ بہرام خاں میرا انداز بھانپتا میں نے چشم زدن میں خنجر اس کی آنکھ میں اتار دیا۔ بہرام خاں چیخ مار کر فرش پر گر گیا اور کرب اور اذیت سے تڑپنے لگا۔ میں نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور زینے کی سمت بڑھتے ہوئے اونچی آواز میں بولی۔ "میں پھر آؤں گی بہرام خاں! میرا انتظار کرنا۔"

حویلی کے عقب میں عارج میرے لئے کمند ڈال چکا تھا۔ منصوبے کے مطابق اب حویلی کا نگراں محافظوں کو ساتھ لئے حویلی کے اندر چلا آیا تھا۔ اس نے محافظوں سے کہا تھا کہ شاید حملہ آور حویلی کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ اس نے بہرام خاں کی چیخ سن کر یقیناً یہ اندازہ لگا لیا ہو گا کہ میں اپنا کام کر چکی ہوں۔ محافظوں کو بھی اس نے بہرام خاں کی چیخ کی طرف متوجہ کیا تھا۔ جب حویلی کا نگران اور محافظ بہرام خاں کی خواب گاہ کی جانب دوڑ رہے تھے تو میں حویلی کی چھت پر پہنچنے کے لئے زینے پر چڑھ رہی تھی۔ بہرام خاں کی حویلی سے نکلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ حویلی سے نکل کر میں تیزی سے اپنی خفیہ پناہ گاہ کی جانب روانہ ہو گئی۔

حویلی کے نگران کے ذریعے میں اپنے دشمن بہرام خاں کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ عارج اس سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھا۔ ایک ہاتھ اور ایک آنکھ سے محروم ہونے کے بعد بہرام خاں کے دل میں میری دہشت بیٹھ چکی تھی۔ وہ اچھی طرح جان چکا تھا کہ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ بچاؤ کی صورت اسے یہی نظر آ رہی تھی کہ کچھ عرصے کیلئے روپوش ہو جائے۔

"میں نے پتہ لگانے کی کوشش کی ہے اے دینار کہ بہرام خاں دہلی سے کہاں جانے والا ہے مگر ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہوا۔"

میرے استفسار پر عارج نے مجھے بتایا۔ پھر مزید یہ کہا۔ "بہرام خاں اپنے نگران پر بڑا بھروسہ کرتا ہے لیکن اسے بھی ابھی کچھ نہیں بتایا۔"

"اے عارج! اگر وہ کہیں روپوش ہو گیا تو اسے تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا۔ میں اسے تلاش کرنے کیلئے اپنی جناتی صفات استعمال کرنا نہیں چاہتی۔ تو جانتا ہے کہ اس طرح

بوڑھا عفریت دہموش میری راہ پر لگ سکتا ہے۔" میں بولی۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ ایک رات بہرام خاں خاموشی کے ساتھ دہلی سے نکل گیا۔ دوسرے دن اس کی حویلی خالی پائی گئی۔ اس کے بارے میں کسی کو خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں گیا ہے۔

بہرام خاں کی روپوشی کے متعلق مجھے عارج ہی نے بتایا تو میں نے کہا۔ "میں تو اس کی صحت یابی کا انتظار کر رہی تھی تاکہ اس سے اپنے انتقام کی تیسری قسط وصول کر سکوں اور وہ فرار ہو گیا۔" میری آواز میں تاسف تھا۔ "دیکھتی ہوں کہ وہ مجھ سے کہاں بھاگ کر جائے گا۔ میں نے بھی طے کر رکھا ہے کہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔"

پھر میں نے اپنے تمام خادموں کو اس کام پر مامور کر دیا کہ وہ بہرام خاں کے موجودہ ٹھکانے کا سراغ لگائیں۔ اس کے علاوہ میں خود بھی بھیس بدل کر بہرام خاں کے جاننے والوں سے اس بات کی ٹوہ لیتی رہی کہ وہ بزدل شخص کہاں روپوش ہوا ہے۔ میں ہر قیمت پر بہرام خاں کا سراغ لگانا چاہتی تھی۔ وہ بہرحال اسحاق اور معصوم الیاس کا قاتل تھا۔

کئی مہینوں کی صبر آزما دوڑ دھوپ کے بعد مجھے علم ہو گیا کہ بہرام خاں میرے انتقام سے ڈر کر ہندوستان کے ایک دور دراز علاقے کی طرف فرار ہوا ہے۔ ایک دو مرتبہ مجھے یہ خیال آیا کہ میں انتقام کا ارادہ ترک کر دوں لیکن اسحاق اور کمسن الیاس کی خون میں ڈوبی ہوئی تصویریں میرے تصور میں آ موجود ہوتیں اور میرا جذبۂ انتقام پہلے سے کہیں زیادہ شدید ہو جاتا ہے۔

آخرکار میں نے عارج کو بہرام خاں کے تعاقب میں سندھ کی جانب روانہ کر دیا۔ بہرام خاں کے بارے میں بھی خبر ملی تھی کہ وہ سندھ گیا ہے۔ عارج کو روانہ کر کے خود بھی طویل سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔

اسی دوران میں مجھے اپنے انسانی قالب مہرالنسا کے سوتیلے باپ خواص خاں کے انتقال کی خبر ملی۔ میں بہ وجود سسرام روانہ ہو گئی۔ مہرالنسا کے سوا خواص خاں کی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اس نے تمام تر جائیداد مہرالنسا کے نام کی تھی۔

سسرام پہنچ کر میں نے خواص خاں کی ساری جائیداد زمین اور باغات فروخت کر دیئے پھر دہلی واپس آ گئی۔ اب میرے پاس اتنی دولت جمع ہو چکی تھی کہ میں بڑی سہولت کے ساتھ ایک مدت دراز تک نہ صرف عیش و عشرت سے اپنی زندگی بسر کر سکتی تھی بلکہ بہرام خاں کے تعاقب میں دور دراز علاقوں کا سفر بھی میرے لئے ممکن تھا۔

کچھ عرصے کے بعد عارج بھی سندھ سے واپس آ گیا جسے میں نے بہرام خاں کے تعاقب میں روانہ کیا تھا۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی کہ عارج ناکام نہیں لوٹا تھا۔ عارج نے مجھے بتایا کہ بہرام خاں سندھ کے ایک ساحلی شہر بھنبور میں چھپا ہوا ہے۔ عارج کو یہ سراغ لگانے میں یوں بھی آسانی ہوئی تھی کہ اس چھوٹی سی بستی میں بہرام خاں ہی باہر کا آدمی تھا۔ بہرام خاں دہلی سے اپنے ساتھ بہت مال و متاع اور خادموں کی بڑی تعداد کو لے کر سندھ گیا تھا۔ سندھ کے باشندے اسی لئے اسے کوئی جلاوطن شہزادہ سمجھتے تھے۔

میں نے عارج کی گفتگو سن کر اطمینان کا سانس لیا اور پرعزم لہجے میں کہا۔ "شاید اس بدبخت کو یہ گمان ہو گا کہ میں دور دراز بستی تک نہیں پہنچ سکوں گی۔ میں بھی دیکھوں گی کہ وہ کب تک اور کہاں تک اپنی موت سے بھاگتا ہے۔"

اگلے ہی روز میں نے عارج اور تین چار جاں نثار خادموں کو ساتھ لیا اور دہلی سے روانہ ہو گئی۔ میرے جسم پر مردانہ لباس ہی تھا۔ مجھے دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ میں ایک نوجوان ہوں جس کی مسیں ابھی بھیگ رہی ہیں۔ یہ لباس میں نے اس لئے بھی پہنا تھا کہ راستے میں ابوالہوس طالع آزماؤں کے دست برد سے محفوظ رہوں۔

دور دراز کا وہ پر مصائب سفر ایک عرصے تک جاری رہا۔ سفر میں مجھے اتنی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں کہ میری جگہ اگر کوئی آدم زادی ہوتی تو ہمت ہار جاتی مگر میں ایک جن زادی تھی۔ میرے سینے میں انتقام کا الاؤ روشن تھا۔ یہی روشن الاؤ مجھے راہ کی صعوبتیں برداشت کرنے اور پیہم آگے بڑھتے رہنے پر اکساتا رہتا۔

میں آخرکار سندھ کی اس ساحلی بستی بھنبور تک پہنچ گئی۔ مجھے یقین تھا کہ بہرام خاں اب میرے انتقام سے نہیں بچ سکے گا۔

اگرچہ بھنبور سندھ کی ایک چھوٹی سی بستی تھی مگر تاجروں کی آمد و رفت کی وجہ سے وہاں رونق رہتی تھی۔ عرب، فارس، روم اور مشرق بعید سے ہندوستان کی بیشتر تجارت اسی راستے سے ہوتی تھی۔ میں بھی وہاں ایک تاجر کے بھیس میں وارد ہوئی تھی مگر مجھے یہ جان کر بہت مایوسی ہوئی کہ بہرام خاں وہاں میری آمد سے پہلے ہی کہیں فرار ہو چکا تھا شاید اسے کسی طرح میری آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔ پھر بھی میں نے حوصلہ رکھا اور مایوسی کو غالب نہ آنے دیا۔

معلوم نہیں کیوں مجھے یہ گمان تھا کہ بہرام خاں وقتی طور پر اس بستی سے فرار ہوا ہے اور دوبارہ یہاں آئے گا۔ اس گمان کی وجہ وہ بڑی عمارت تھی جہاں بہرام خاں رہتا تھا۔ وہ اس عمارت کو بیچ کر نہیں گیا تھا اس کی وجہ یہ بھی ممکن تھی کہ اسے عمارت فروخت کرنے کا وقت

ہی نہ ملا ہو۔ بہرام خاں کے معاملے سے قطع نظر مجھے کہیں نہ کہیں تو قیام کرنا ہی تھا اس کیلئے مجھے سندھ کی وہ ساحلی بستی پسند آئی۔ عارج نے بھی میرے خیال سے اتفاق کیا۔ میں نے اسی لئے بھنبھور میں ایک عالیشان مکان خرید لیا اور عارج کے ساتھ ساتھ اپنے خادموں کو ہندوستان کے اندرونی شہروں کی طرف روانہ کر دیا کہ وہ بہرام خاں کو تلاش کریں۔ اس کے علاوہ میں نے عارج کے مشورے پر زر و جواہر کے عوض کئی مقامی افراد کی خدمات بھی حاصل کر لی تھیں اور انہیں بہرام خاں کا مکمل حلیہ بتا کر ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیا تھا۔

میری کوششیں بالآخر بارآور ثابت ہوئیں۔ چند ہی روز کے بعد عارج واپس آ گیا۔ وہ اندرون سندھ گیا ہوا تھا۔ عارج ہی نے اطلاع دی کہ بہرام خاں ملتان میں ہے۔ (ملتان اس زمانے میں سندھ ہی کا حصہ تھا (مصنف)

عارج ہی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ بہرام خاں نے بھیس بدل لیا ہے۔ اب اس کے جسم پر فقیروں اور درویشوں کا سا لباس رہتا ہے۔ اس کے خادم اور محافظ بھی فقیرانہ لباس میں مگر مسلح اس کے اطراف منڈلاتے رہتے تھے۔

"مگر وہ تجھے نظر کہاں آیا تھا؟" میں نے بے تابی کے ساتھ عارج سے پوچھا۔

"ملتان میں ایک بہت بڑے بزرگ شاہ رکن عالمؒ کا مزار ہے اے دینار!" عارج نے جواب دیا۔ "بہرام خاں اپنے وفاداروں کے ساتھ اس مقبرے کے قریب ایک سرائے میں قیام پذیر ہے۔"

میں یہ سن کر سوچ میں ڈوب گئی۔ عارج کے علاوہ میرے بقیہ جاں نثار خادم بھی سندھ سے واپس آ گئے۔ وہ میرے اگلے اقدام کے منتظر تھے۔ یہی جاننے کیلئے اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ انہیں بھی میں آگاہ کر چکی تھی کہ بہرام خاں کا سراغ مل گیا ہے اور وہ ملتان میں ہے۔

"میں تنہا ملتان جاؤں گی اور تم سب یہیں رہو گے۔" میں نے دھیمی آواز میں ان سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے میری نقل و حرکت پر بہرام خاں کی نظر ہے ورنہ وہ یوں اچانک بھنبھور سے فرار نہ ہوتا تم لوگ یہیں پڑاؤ ڈالے رہو گے تو اس کے جاسوس اسی دھوکے میں رہیں گے کہ میرا قیام ابھی یہیں ہے۔ میں آج ہی رات یہاں سے خاموشی کے ساتھ نکل جاؤں گی۔"

"مگر ہمیں آپ کی خبر کیسے ملے گی؟" عارج نے وہاں خادموں کی موجودگی کے سبب مؤدب زبان و الفاظ میں مجھ سے پوچھا۔

"تم لوگ یہاں سے دو ہفتے بعد ملتان کیلئے روانہ ہو جانا۔ میں تمہیں انہی بزرگ شاہ

رکن عالمؒ کے مزار پر ملوں گی۔" میں یہ کہہ کر عارج اور خادموں کو ضروری ہدایات دینے لگی اور پھر سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔

تنہائی ملتے ہی عارج مجھ سے بولا۔ "اے دینار! تو کم سے کم مجھے تو اپنے ساتھ لے چل کیا کیا خبر تجھے وہاں کیا خطرہ پیش آ جائے۔"

"نہیں" میں نے انکار کر دیا۔ "کیا اپنے کیا پرائے سب جانتے ہیں کہ تو میرا خاص وفادار خادم ہے، دشمن کے جاسوسوں کو دھوکے میں رکھنے کیلئے تیری یہاں موجودگی ضروری ہے۔"

میری دلیل میں وزن تھا اس لئے عارج نے مزید کچھ نہیں کہا۔

اسی رات اندھیرا پھیلتے ہی میں نہایت خاموشی سے تن تنہا ملتان روانہ ہو گئی۔ بھنبھور سے نکلتے ہی میں نے فقیرانہ لباس پہن لیا تھا۔ اب میرے سر پر پگڑی اور حسین و نازک جسم پر ڈھیلا ڈھالا گیروے رنگ کا لبادہ نظر آ رہا تھا۔ ہاتھوں میں آہنی کڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں ایک گھوڑے پر سوار کاندھے سے چمڑے کی تھیلی لٹکائے تیزی کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اپنی تلوار، تیر کمان اور خنجر میں نے اسی چمڑے کی تھیلی میں چھپا لئے تھے۔ رکے بغیر میں رات بھر سفر کرتی رہی۔ صبح کے وقت ایک منزل پر میں نے گھڑی بھر کو آرام کیا اور پھر آگے روانہ ہو گئی۔

تیسرے روز شام کے وقت میں ملتان کے قریب پہنچ چکی تھی۔ شہر ابھی آٹھ فرسخ دور تھا مگر دور ہی سے مجھے ایک بلند اور عظیم الشان گنبد چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شاید یہی حضرت شاہ رکن عالمؒ کا مزار تھا۔ یہیں میرا بزدل دشمن چھپا ہوا تھا۔ میں نے کچھ فاصلہ اور طے کیا تو مجھے مزار کے ستون بھی دکھائی دینے لگے۔

میں جب شہر میں داخل ہوئی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ شفق کے پس منظر میں شہر کے حسین و جمیل مقابر، خانقاہوں کے فلک بوس قبے اور بلند و بالا مینار عجیب پرجلال منظر پیش کر رہے تھے۔ پہلی نظر میں مجھے اس شہر کی عظمت نے متاثر کر لیا۔

مقبرہ کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ گرد و پیش مسافروں کیلئے سرائیں بنی ہوئی تھیں۔ میں سمجھ گئی کہ انہی سراؤں میں کہیں بہرام خاں مقیم ہوگا۔ اگر میں طویل سفر کی وجہ سے بہت زیادہ تھکی نہ ہوتی تو شاید اسی وقت اپنے دشمن کی تلاش شروع کر دیتی۔ میں نے بھی ایک سرائے میں قیام کیا اور کھانا کھا کے گہری نیند سو گئی۔

اگلے روز منہ اندھیرے میری آنکھ کھل گئی۔ آرام کے بعد میں نے خود کو تر و تازہ

محسوس کیا۔

میں اپنی کوٹھڑی سے نکلی تو بہت سے فقیر اور ملنگ مزار کی طرف جا رہے تھے۔ فقیروں اور ملنگوں کے علاوہ دوسرے زائرین بھی تھے۔ میں بھی ان آدم زادوں کے ہمراہ مزار پر پہنچی' فاتحہ پڑھی اور مزار کے احاطے میں ان فقیروں کی طرف بڑھ گئی جو ایک حلقے کی صورت میں گردش کر رہے تھے۔ وہ "الا اللہ" کی صدائیں لگا رہے تھے۔ میں ان کے قریب پہنچی تو ایک فقیر کو دیکھ کر چونک اٹھی۔ اس یک چشم اور ایک ہاتھ سے محروم شخص کو میں ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔ میں بھی اس حلقے میں شامل ہو گئی اور اس ایک آنکھ والے کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگی۔ اپنے دشمن کو آخر میں نے ڈھونڈ ہی لیا تھا۔

اچانک اسی لمحے مجھے اپنے دل کی کیفیت بدلی محسوس ہوئی۔ نقارے پر پڑنے والی ضرب کے ساتھ جب "الا اللہ" کی صدائیں بلند ہوتی تو مجھے یوں لگتا جیسے میرا وجود اس انسانی قالب کے پنجرے سے آزاد ہو کر کسی غیر ارضی وادی کی طرف پرواز کر رہا ہے۔ چند ہی لمحوں میں خود میں بھی ان فقیروں کی طرح گردن کو دائیں بائیں جھٹک کر "الا اللہ" کی صدائیں لگا رہی تھی۔ ایک عجیب سا کیف میری نس نس میں سما گیا تھا۔ دنیا کی ساری تفرقیں' سب منتقمانہ جذبے میرے ذہن سے محو ہو چکے تھے۔

بہت دیر کے بعد جب سما نقارہ خاموش ہوا تو میں اس کیفیت سے نکلی' حلقہ ختم ہو چکا تھا۔ میں نے بہرام خاں کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا مگر میرا دشمن نہ جانے کب وہاں سے جا چکا تھا۔ میں فوراً مزار کے احاطے کی طرف نکل آئی اور سرائے کی کوٹھڑیوں کی طرف چل دی۔ پھر دن بھر میں ان کوٹھڑیوں کے آس پاس منڈلاتی رہی لیکن بہرام خاں مجھے دوبارہ نظر نہ آیا۔

جب سارے فقیر لنگر حاصل کرنے مزار کی جانب جا رہے تھے تو بس اچانک ہی مجھے بہرام خاں دکھائی دے گیا۔ وہ دو تین فقیروں کے ہمراہ ایک کوٹھڑی سے نکل رہا تھا۔ میں ایک ستون کی آڑ میں چھپ گئی اور ان کی طرف دیکھنے لگی۔

بہرام خاں کے ساتھ جو فقیر تھے وہ یقیناً اس کے جان نثار محافظ تھے۔ وہ بہرام خاں کو حلقے میں لئے چوکنا نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ اگر مجھے دیکھ بھی لیں تو پہچان نہیں پائیں گے۔ میں ان لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ جب وہ سب مزار کے احاطے میں چلے گئے تو میں اس کوٹھڑی کی طرف بڑھ گئی جس سے بہرام خاں نکلا تھا۔

اس کوٹھڑی کا دروازہ مقفل تھا۔ میں ایک لمبا چکر کاٹ کر کوٹھڑی کے عقب میں پہنچی

اور پھر مجھے جو توقع تھی پوری ہو گئی۔ کوٹھڑی میں ہوا کے گزر کی غرض سے عقبی سمت ایک دریچہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ ایسا ہی دریچہ اس کوٹھڑی میں بھی تھا جہاں خود میں ٹھہری ہوئی تھی۔ عقبی دریچے کا خیال مجھے اس لئے آیا تھا۔

وہ دریچہ ذرا چھوٹا تھا اس لئے میں بڑی دقت سے اس کے ذریعے کوٹھڑی کے اندر کودنے میں کامیاب ہوئی۔ اس کوشش میں میرے بازو اور کہنیاں بھی چھل گئیں مگر اس وقت مجھے تکلیف کا ذرا احساس نہیں تھا۔

کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ میں ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھی پھر جب میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں تو میں کوٹھڑی کے ایک گوشے میں پڑے ہوئے سامان کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی۔ اپنے ڈھیلے ڈھالے لبادے میں چھپی ہوئی تلوار نکال کر میں نے ہاتھ میں تھام لی اور بہرام خاں کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

بہرام خاں کچھ ہی دیر میں واپس آ گیا مگر مجھے یہی محسوس ہوا کہ وہ جیسے بہت دیر میں لوٹا ہو۔

کوٹھڑی کا دروازہ کھلتے ہی مجھے بہرام خاں کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ مہرالنسا جھنبور سے غائب ہو چکی ہے؟..... حیرت ہے کہ وہ کب وہاں سے نکل گئی۔"

"حضور! میں نے جو کچھ عرض کیا ہے قطعی درست ہے اور مجھے اس پر پورا یقین ہے۔" جواب میں دوسری آواز آئی۔ "وہ دن بھر اپنے مکان سے نہیں نکلی تو مجھے شبہ ہوا۔ پھر رات کے وقت میں خود اس کے مکان میں داخل ہو گیا وہاں صرف مہرالنساء کے خادم تھے اور خود وہاں موجود نہیں تھی۔ پھر جب میں نے چھپ کر خادموں کی گفتگو سنی تو مجھ پر سارا بھید کھل گیا۔"

پھر بہرام خاں کی آواز ابھری تو اس سے بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔

"کیسا بھید؟ جلدی بتاؤ!" بہرام خاں نے پوچھا۔ وہ کوٹھڑی کے دروازے پر کھڑا ہوا کسی سے دھیمی آواز میں گفتگو کر رہا تھا۔

"ان خادموں کی گفتگو سے مجھے یہ معلوم ہوا حضور کہ مہرالنسا تن تنہا ایک رات پہلے ملتان کیلئے روانہ ہو چکی ہے۔ بس یہ سنتے ہی میں وہاں سے نکلا اور حضور کو خبر دینے کی خاطر ملتان روانہ ہو گیا۔ میں نے صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔" خادم نے بتایا۔

میں سمجھ گئی کہ یہ ان خادموں میں سے ایک ہو گا بہرام خاں جنہیں جھنبور میں میری

نگرانی کیلئے چھوڑ گیا تھا۔

"یہ...... یہ تو بہت برا ہوا! ہمیں آج ہی رات یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" بہرام خاں کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "مگر حضور! وہ اکیلی ہے آخر ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہے۔" خادم بولا۔

"اگر تم اسے اچھی طرح جانتے تو ایسا نہ کہتے احمق آدمی! جاؤ اور جلد از جلد یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔ اپنے تمام ساتھیوں کو بھی مطلع کر دو کہ ہم آج ہی رات یہاں سے لاہور کیلئے روانہ ہو رہے ہیں۔ اب یہاں ایک رات بھی گزارنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

بہرام خاں نے خادم کو حکم دیا۔ "تم سے جو کہا جائے اسی پر عمل کرو۔"

"بہتر حضور!"

پھر میں نے دور ہوتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ اس کے بعد بہرام خاں نے کوٹھڑی میں داخل ہو کر تیزی سے دروازے کی زنجیر چڑھا دی۔ اب کوٹھڑی میں گہری تاریکی چھا گئی تھی۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کوٹھڑی میں مدھم سی روشنی پھیل گئی۔ بہرام خاں نے طاقچے میں رکھا ہوا چراغ روشن کر دیا تھا' اس کی پشت میری طرف تھی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر بہرام خاں جیسے ہی مڑا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی اور بے ساختہ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ بدلے ہوئے حلیے کے باوجود وہ مجھے قریب سے دیکھ کر پہچان گیا تھا۔ میرے ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

"بزدل! دیکھ لے کہ میں تری قضا بن کر تجھ تک پہنچ گئی۔" میں نے آگے بڑھ کر تضحیک آمیز لہجے میں بہرام خاں سے کہا۔ "بول اے بزدل شخص! کیا کوئی اپنی موت سے بھاگ سکتا ہے جو تو اس کوشش میں ہے۔"

بہرام خاں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ "مجھ پر رحم کرو مہر النسا! مجھے قتل کر کے تمہیں کیا مل جائے گا۔"

"اطمینان رکھو بہرام خاں! میں تمہیں ابھی قتل نہیں کروں گی۔ آج تو میں تمہیں صرف لنگڑا کرنے آئی ہوں۔" میں نے کہا۔

"نہیں" بہرام خاں خوفزدہ آواز میں چیخ اٹھا۔

مجھ پر اس کے چیخنے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور پرسکون آواز میں بولی۔ "کیا تو بھول گیا میں نے کہا تھا کہ تیرا ایک ایک عضو کاٹ کر تجھے ہلاک کروں گی۔ ابھی تو تیرے مکروہ اور ناپاک جسم کے کئی عضو سلامت ہیں۔"

"خدا کیلئے مجھ پر رحم کرو مہر النسا!...... کیا تمہیں یاد نہیں کہ میں...... میں تم... تم کو اپنی چھوٹی بہن بنا چکا ہوں...... کیا تمہیں اس کا بھی پاس نہیں۔" بہرام خاں گڑگڑانے لگا۔

"مجھے تو سب یاد ہے...... سب کچھ یاد ہے' اے عیار شخص! ہاں تو یہ بھول گیا ہے کہ تو نے مجھے بہن کہہ کر میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور کیا کہا تھا...... یاد کر کہ تو نے کہا تھا کسی عورت کو بہن کہہ دینے سے وہ بہن نہیں بن جاتی۔ اب تو پھر اس بات کو دہرا رہا ہے' شرم آنی چاہیے تجھے یہ کہتے ہوئے۔ تجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ بہن کہنے کے چند ہی لمحے بعد تو نے اپنے محافظوں سے مجھے گرفتار کرنے کیلئے کہا تھا۔" یہ کہہ میں دانت پیستی ہوئی آگے بڑھی اور قہر آلود لہجے میں بولی۔ "تو قابل رحم ہرگز نہیں ہے کمینے!"

پھر میں برق بے اماں کی طرح تڑپ کر ایک ہی جست میں بہرام خاں کے سر پر پہنچ گئی۔ دوسرے ہی لمحے میری تلوار کا بھرپور وار بہرام خاں کی بائیں ٹانگ کو گھٹنے کے قریب سے کاٹ گیا۔ بہرام خاں چیختا ہوا منہ کے بل زمین پر گرا اور بری طرح تڑپنے لگا۔ اسی وقت باہر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ کچھ لوگ کوٹھڑی کی طرف ہی دوڑ رہے تھے۔

میں جھپٹ کر دروازے کی طرف بڑھی اور زنجیر کھول کر باہر تاریکی میں گم ہو گئی۔

اس واقعے کے بعد میں بہت دنوں تک ملتان میں مقیم رہی۔ اس دوران میں میرے خادم بھی بھلجور سے آ کر مجھ سے آ ملے۔ ان کے ساتھ عارج بھی تھا۔ میں نے ملتان میں بھی چھوٹا سا ایک مکان خرید لیا تھا۔

دن بھر میں ملتان کی سیر کرتی اور بزرگان دین کے مزاروں پر حاضری دیتی۔ میرے خادم بہرام خاں کی نگرانی میں مصروف رہتے۔ بہرام خاں اس قدر بیمار پڑ گیا تھا کہ کئی ہفتوں تک بستر ہی سے نہ اٹھ سکا۔ میرے خادم اس کی طرف سے کسی قدر مطمئن اور بے فکر ہو چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بہرام خاں اس حالت میں کہیں فرار نہیں ہو سکے گا لیکن وہ اس بار بھی انہیں جل دینے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک رات وہ چپکے سے اپنے خادموں کے ساتھ سرائے سے نکلا اور کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں اپنے شکار کو نظر میں رکھنا چاہتی تھی کہ کہیں ایک بار پھر اسے تلاش نہ کرنا پڑے لیکن اپنے خدام کی بے پروائی سے اس مقصد میں ناکام رہی۔ زیادہ شکایت مجھے عارج سے تھی اسے اور خدام کو میں نے بہت برا بھلا کہا مگر اب سانپ نکل چکا تھا اور لکیر پیٹنا لاحاصل تھا۔ میں بہت دنوں تک بہرام خاں کی تلاش میں رہی' بہت جدوجہد کے بعد یہ معلوم ہو سکا کہ

بہرام خاں ملتان سے فرار ہو کر لاہور پہنچ گیا ہے۔ میں نے بھی رخت سفر باندھا اور عارج کے ساتھ اپنے خادموں کو بھی لے کر لاہور پہنچ گئی۔

بھنبھور اور ملتان کی طرح میں نے لاہور میں بھی ایک مکان خریدا اور شہر بھر میں بہرام خاں کی تلاش شروع کر دی۔ مختلف شہروں میں مکان خریدنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آئندہ کبھی ان شہروں میں آنا ہو تو قیام کیلئے دشواری نہ ہو۔ کئی روز کی دوڑ دھوپ کے باوجود مجھے اور میرے خادموں کو کامیابی نہ ہو سکی۔ ایسا لگتا تھا کہ بہرام خاں میری آمد سے پہلے ہی لاہور سے فرار ہو چکا ہے۔

ایک روز میں داتا صاحب کے مزار مبارک پر فاتحہ پڑھ کر واپس آ رہی تھی کہ اچانک پشت سے کسی نے مجھ پر خنجر سے حملہ کیا' میں لڑکھڑا کر گری مگر فوراً ہی سنبھل گئی اور خود ہی اپنے شانے میں پیوست خنجر نکالنے لگی۔ اس دوران میں عارج اور میرے خدام نے جو مجھ سے چند قدم پیچھے چلے آ رہے تھے' دوڑ کر حملہ آور کو پکڑ لیا۔ پھر راہگیروں کے ہمراہ میں' عارج اور خدام اپنے مکان تک پہنچ گئے۔ راہگیروں کا اصرار تھا کہ ہم ابھی کوتوال شہر کے پاس جائیں اور اس بدبخت حملہ آور کو داخل زنداں کرا دیں۔

میں نے بمشکل ان راہگیروں کو سمجھا بجھا کر رخصت کیا اور پھر عارج کی مدد سے اپنے زخم کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی۔

مرہم پٹی سے فارغ ہو کر میں نے حملہ آور کو بلوایا جسے خدام نے مکان کے ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ جب خدام اس شخص کو میرے پاس لے کر آئے تو میں اسے دیکھتے ہی پہچان گئی۔ میں اسے بہت پہلے بہرام خاں کی حویلی میں دیکھ چکی تھی۔

''سنو! میں نے تمہیں پہچان لیا ہے کہ تم بہرام خاں کے خادم ہو۔'' میں نے حملہ آور کو مخاطب کیا۔ ''تمہاری جاں بخشی کی اب ایک ہی صورت ہے کہ تم اپنے بزدل آقا کے ٹھکانے کا پتہ بتا دو' ہر چند کہ تم نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا مگر میں تمہیں قصوروار نہیں سمجھتی۔ میں اس پر خوش ہوں کہ تم اپنے بزدل آقا کے وفادار ہو۔ اگر تم نے سب کچھ ٹھیک ٹھاک بتا دیا تو تمہیں انعام سے بھی نوازا جائے گا۔ بولو تم اس پر تیار ہو یا میں اپنے خادموں کو تمہاری گردن اڑانے کا حکم دے دوں۔''

بہرام خاں کا خادم مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دشمنوں کیلئے میں کس قدر سفاک اور بے رحم ہوں۔ اس نے چند لمحے کچھ سوچا اور پھر مجھے اپنے آقا کے بارے میں مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔ خادم کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ بہرام خاں میری آمد سے پہلے

ہی لاہور چھوڑ چکا تھا۔ لاہور سے فرار ہو کر وہ شیر شاہ سوری کے بنوائے ہوئے قلعے رہتاس میں پناہ لے چکا تھا۔ رہتاس کا قلعہ دار نعمت اللہ بہرام خاں کا پرانا دوست تھا۔ بہرام خاں نے اس خادم کو میرے قتل پر مقرر کیا تھا کیونکہ وہ مجھے پہچانتا تھا۔ میرے قتل کے بعد اس خادم کو بھی رہتاس ہی پہنچنا تھا۔

میں نے اس خادم سے قلعے کا تمام محل وقوع معلوم کیا اور اسے ذہن نشین کر لیا۔ وہ خادم ایک بار پہلے بھی بہرام خاں کے ساتھ اس قلعے میں جا چکا تھا۔ پھر میں نے اس خادم کی خواہش پر اسے اپنے ایک خادم کی نگرانی میں دہلی جانے کی اجازت دے دی۔ حسب وعدہ میں نے خادم کی جاں بخشی کر دی تھی مگر اس کی نگرانی ضروری تھی کہ وہ بہرام خاں کے پاس نہ جا سکے۔

اگلے ہی روز میں' عارج اور اپنے باقی ماندہ خادموں کو ساتھ لے کر رہتاس کی طرف روانہ ہو گئی۔

میں جانتی تھی کہ بہرام خاں قلعہ رہتاس میں مطمئن اور بے فکر ہو گا۔ اسے یقین ہو گا کہ جس خادم کو اس نے لاہور میں میرے قتل کیلئے چھوڑا ہے وہ مجھے زندہ نہیں رہنے دے گا۔ وہ خادم میرے قتل کی خبر لے کر رہتاس پہنچنے ہی والا ہو گا۔

یہ علم مجھے بعد میں ہوا کہ بہرام خاں نے اپنے دوست قلعہ دار نعمت اللہ کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ بہرام خاں نے اس کے سامنے میرے حسن کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ ادھیڑ عمر قلعہ دار بھی میرا نادیدہ پرستار ہو گیا تھا۔

''خدا کرے بہرام خاں کہ مہرالنسا تمہاری تلاش میں یہاں تک آ پہنچے۔'' قلعہ دار نعمت اللہ نے بے تابی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا تھا۔

''خدانخواستہ اگر وہ یہاں آ گئی تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔'' بہرام خاں کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

نعمت اللہ نے اس کی حالت دیکھ کر قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''تم تو خوامخواہ ڈر رہے ہو' بے فکر ہو جاؤ کہ تم اب اپنے دوست نعمت اللہ کی پناہ میں ہو۔ وہ اگر یہاں آئی تو اسے ہر قیمت پر گرفتار کر لیا جائے گا اور...... پھر میں اس سے نکاح کر لوں گا۔''

بہرام خاں اس کے بعد کچھ نہ بولا مگر میرا خوف اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔

راستے میں کہیں رکے بغیر میں رہتاس پہنچ گئی۔ قلعے تک پہنچنا میرے لئے چنداں

مشکل ثابت نہیں ہوا۔ عارج اور اپنے خادموں کے ساتھ قلعہ سے کچھ دور بنی ہوئی ایک سرائے میں مقیم تھی اور قلعے کے اندر داخل ہونے کی ترکیبوں پر غور کر رہی تھی کہ میں شام ہوتے ہوتے وہاں پہنچی تھی۔ نصف شب کے قریب میں جاگ اٹھی اور عارج کو بھی جگا دیا۔ ''سن اے عارج! جو حالات پیش آنے والے ہیں ان کی بابت پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' میں نے عارج سے کہا۔ ''تجھے میں یہ تاکید کرنا چاہتی ہوں کہ کچھ بھی ہو جائے تو اپنی جناتی صفات استعمال نہیں کرے گا کہ اس میں خطرہ ہے۔ اگر کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو میں ہی خود اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لاؤں گی۔''

عارج نے یقین دہانی کرائی۔ ''اے دینار! میں وہی کروں گا جو تو کہے گی۔''

پھر عارج اور خادموں کو ساتھ لئے ہوئے میں سرائے سے نکل آئی۔ اس کے بعد بہت جلد میں قلعے کی جنوبی دیوار کے نیچے پہنچ گئی۔ خادموں اور عارج کو وہیں رکنے اور انتظار کرنے کا حکم دے کر میں نے فصیل پر ماہرانہ انداز میں کمند ڈالی۔ میں رات کی تاریکی میں کمند کے ذریعے قلعے کی دیوار پر چڑھنے لگی۔ اس وقت مجھے یہ علم نہیں تھا کہ قلعہ دار نعمت اللہ کے حکم پر قلعے کے سپاہی ہر لحہ کس قدر چوکنا اور مستعد رہتے ہیں انہیں کسی ایسے ہی موقع کیلئے پہلے سے تیار رہنے کی ہدایات مل چکی تھیں۔

جیسے ہی میں اوپر پہنچی خلاف توقع مجھے ایک طرف مشعل کی روشنی نظر آئی پھر یکے بعد دیگرے اندھیرے میں کئی اور مشعلیں نمودار ہو گئیں۔ مجھے یوں لگا گویا سپاہی میرے ہی منتظر تھے۔

میں تذبذب کا شکار ہو گئی اور فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ اس دوران میں مشعل بردار سپاہی قریب آ گئے پھر سپاہیوں نے دیر نہیں کی اور تلواریں سونت کر مجھ پر حملہ آور ہو گئے۔ تعداد میں وہ چار تھے اور بیک وقت مجھ پر حملہ آور ہوئے تھے۔ میں نے پھرتی سے جھکائی دے کر ان کے وار کو روکا اور چشم زدن میں اپنی تلوار ایک سپاہی کے سینے میں اتار دی۔ وہ سپاہی لڑکھڑایا اور چیختا ہوا فصیل سے نیچے جا گرا۔ باقی سپاہی سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔

☆......☆......☆

میں تلوار لہراتی ہوئی تیزی سے ان تینوں سپاہیوں کی طرف بڑھی مگر اس وقت سپاہیوں کا ایک غول فصیل پر پہنچ گیا۔ شاید وہ نیچے گرنے والے سپاہی کی چیخ سن چکے تھے۔ ان سپاہیوں کے غول نے چاروں طرف سے بڑھ کر ایک حلقہ بنا لیا اور اپنی تلواریں سونت کر قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگے۔ میری نظریں انہی پر جمی ہوئی تھیں۔

''اپنے ہاتھ سے تلوار پھینک دو اے اجنبی!'' ایک قوی ہیکل سپاہی نے مجھے مخاطب کیا۔

میں کسی خوف کا اظہار کیے بغیر بولی۔ ''میں اسی صورت میں اپنے ہاتھ سے تلوار پھینکوں گی جب تم میں سے کوئی مجھے زیر کر لے گا۔ اگر تم میں ہمت ہے تو مقابلے پر آ جاؤ۔''

قوی ہیکل سپاہی میری نسوانی آواز سن کر اچھل پڑا۔ میرے جسم پر کیونکہ حسب معمول مردانہ لباس تھا اس لئے وہ مجھے کوئی مرد ہی سمجھ رہا تھا۔ قلعہ دار نعمت اللہ کیونکہ مجھ سے نکاح کا خواہش مند تھا اس لئے سپاہیوں کو تاکید تھی کہ اگر کوئی عورت مردانہ لباس میں قلعے کے اندر داخل ہو تو کسی صورت اسے ہلاک نہ کیا جائے اور ہر قیمت پر اسے زندہ ہی گرفتار کیا جائے۔ گرفتاری کے بعد فوراً اس عورت کو اس کے حضور پیش کر دیا جائے۔ قلعہ دار کی اس تاکید کا علم بھی مجھے بعد میں ہوا۔

وہ سپاہی جو مجھے گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت میں چونک اٹھی جب مجھے حلقے کے سپاہیوں کے ہاتھوں میں رسی کے پھندے نظر آئے۔ یہ سپاہی پھندا پھینکنے میں ماہر تھے۔

میری دعوت مبارزت کا قوی ہیکل سپاہی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

پھر میں نے اپنی طرف پھینکے جانے والے ان پھندوں سے بچنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ رسی کا ایک پھندا میرے بازوؤں کے پاس آ کر سخت ہو ہی گیا اور میں بالکل بے بس ہو کر رہ گئی۔

اگلے ہی لمحے ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔ اس کے بعد وہ سپاہی مجھے قلعے میں لے گئے۔ قوی ہیکل سپاہی مجھے فوراً قلعہ دار نعمت اللہ کے روبرو پیش کرنا چاہتا تھا مگر نیچے پہنچ کر معلوم ہوا کہ قلعہ دار اس وقت قلعے کے کماں دار کے ساتھ مشاورت میں مصروف ہے۔ اس نے اسی لئے مجھے قلعے کے اندر بنے ہوئے زنداں میں لے جا کر ڈال دیا۔

ایک سپاہی نے اجلاس کے دوران ہی میں قلعہ دار نعمت اللہ کے کان میں میری گرفتاری کے متعلق بتایا۔ قلعہ دار نے سپاہی کو جھڑک دیا اور دوبارہ کماں داروں سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

قلعہ دار اس وقت ایسی صورتحال سے دوچار تھا کہ کسی دوسرے مسئلے کے بارے میں اسے سوچنے کی مہلت نہ تھی۔ مجھے بھی ان واقعات کا بہت بعد میں پتہ چلا۔ دراصل قلعہ دار

کے جاسوسوں نے اطلاع دی تھی کہ مغل بادشاہ ہمایوں طویل عرصے کے بعد ہندوستان میں داخل ہو چکا ہے اور پنجاب پہنچنے ہی والا ہے۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ ہمایوں پنجاب میں داخل ہو کر اب کوئی دم میں قلعہ رہتاس پر حملہ کرنے والا ہے۔ یہ 962 ہجری کا واقعہ ہے۔

ہمایوں کی آمد کا شہرہ ہر طرف پہلے ہی تھا۔ ہمایوں کے آنے کی خبر سے ہندوستان کا سارا نقشہ درہم برہم ہو گیا تھا۔ اب کوئی شیر شاہ سوری نہیں تھا جو مغل تاجدار کے مقابلے پر آ سکتا' ہر طرف فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ پنجاب کے حاکم احمد خاں سوری نے بھی خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ عدلی شاہ کا بہنوئی تھا۔ اس نے سکندر شاہ سوری کے لقب سے اپنی علیحدہ بادشاہت قائم کر لی تھی اور دس ہزار سواروں کا لشکر لے کر لاہور سے آگرہ کی تسخیر کیلئے روانہ ہو گیا تھا۔

بنگال کا حاکم محمد خاں سوری بھی ملک گیری کا دعویٰ لے کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس نے عدلی شاہ پر حملہ کر دیا تھا۔ اس خبر کے ملتے ہی عدلی شاہ کا سپہ سالار ہیموں جو بیانہ میں تھا محمد خاں سوری کے مقابلے پر چلا گیا تھا۔

یہ صورتحال قلعہ دار نعمت اللہ کیلئے تشویشناک تھی۔ قلعہ دار اپنے کماں داروں کو اس خطرناک وقت میں ہمایوں کے متوقع حملے سے نمٹنے کیلئے ہدایات دے رہا تھا اور جنگی حکمت عملی کی ترتیب میں مصروف تھا۔

دوسری جانب میں قلعے کے زنداں کی ایک کوٹھری میں قید تھی اور بہرام خاں کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت تک مجھے ہندوستان میں ہمایوں کی آمد کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ مجھے یہ دلچسپی بھی نہیں تھی کہ برسر اقتدار کون ہے کون نہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ بہرام خاں اسی قلعے میں مجھ سے کچھ ہی دور موجود ہے اب تک یقیناً اسے میری گرفتاری کا علم ہو جانا چاہئے تھا لیکن بہت دیر گزر جانے کے باوجود بھی کوئی میری کوٹھڑی کی طرف نہیں آیا۔ رات کے تیسرے پہر کے قریب آخرکار میری آنکھ لگ گئی۔

اچانک زوردار دھماکوں کی آوازیں سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی' باہر دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور ہر طرف بارود کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ مسلسل دھماکوں کے ساتھ لوگوں کے ادھر ادھر دوڑنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

ہر دھماکے کے ساتھ قلعے کی دیواریں لرز اٹھتیں اور بارود کی تیز بو نتھنوں میں گھسنے لگتی۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ قلعے پر حملہ ہو چکا ہے اور باہر گھمسان کی جنگ جاری ہے۔ میں نے کوٹھڑی کی سلاخوں کے باہر دوڑتے ہوئے سپاہیوں سے حقیقت حال کے بارے میں

پوچھنے کی کوشش کی مگر کسی کے پاس میری بات سننے کی فرصت نہ تھی۔

مغل بادشاہ ہمایوں کے سپہ سالار بیرم خاں کے ساتھ سپاہیوں کی زیادہ تعداد نہیں تھی مگر اس نے قلعہ رہتاس کا محاصرہ کرنے کے بعد ایسی حکمت عملی اختیار کی کہ قلعے کے محافظ زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکے' قلعہ دار نعمت اللہ فرار ہو گیا۔ دوپہر ہونے سے پہلے پہلے قلعے پر قبضہ ہو چکا تھا۔ رہتاس سے ایک منزل دور ہمایوں بقیہ فوجیں لئے مستعد کھڑا تھا کہ اگر کمک کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ خود رہتاس پہنچ جائے' خود بیرم خاں کی درخواست پر ہمایوں نے اسے چند ہزار فوج کے ساتھ آگے بھیج دیا تھا۔ ہمایوں کے پاس کل فوج تقریباً 15 ہزار تھی۔ اس میں سے نصف کو بیرم خاں ہمایوں کے پاس چھوڑ گیا تھا۔

بیرم خاں اور دوسرے مغل سردار اپنی نشستوں پر براجمان تھے جہاں گزشتہ رات قلعہ دار نعمت اللہ اپنے کماں داروں کے ساتھ مشاورت میں مصروف تھا۔ اس وقت قلعے کے محافظ پابہ زنجیر بیرم خاں کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے۔ بیرم خاں کے ساتھ ہی قریبی نشست پر اس کا قدیمی دوست اور مغل فوج کا ایک سردار یوسف خاں بیٹھا ہوا تھا۔

یوسف خاں اور دوسرے مغل سرداروں کے مشورے سے قلعے کے نگران اعلیٰ تاتار خاں اور دوسرے قیدیوں کو زنداں میں ڈالنے کا حکم دے دیا گیا۔ پہلے سے اسیر افراد کو رہا کرنے اور انہیں اپنے سامنے پیش کرنے کا حکم بھی بیرم خاں نے اسی کے ساتھ دیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد مغل سپاہیوں نے قلعے کے زنداں میں موجود تمام قیدیوں کو بیرم خاں کے روبرو پیش کر دیا۔

قید کے دوران میں مجھے پہننے کیلئے زنانہ لباس دے دیا گیا تھا۔ دوسرے قیدیوں کے ساتھ جب میں بیرم خاں کے سامنے پہنچی تو قیدیوں میں واحد عورت تھی۔ بیرم خاں مجھے دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔

''اس عورت کو میرے قریب لاؤ۔'' بیرم خاں نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔

سپاہیوں نے فوراً تعمیل حکم کی اور مجھے بیرم خاں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی جانے کیوں بیرم خاں کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ میرے انسانی قالب کے خدوخال بڑی حد تک مغل عورتوں سے ملتے جلتے تھے۔

''شائستہ......شائستہ بیگم!'' معاً بیرم خاں کے ہونٹ حرکت کرنے لگے۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ''مگر یہ...... یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ مرنے والے واپس تو نہیں آتے۔''

بیرم خاں کی بڑبڑاہٹ سے میں اتنا تو سمجھ گئی کہ میرا چہرہ کسی شائستہ بیگم سے ملتا ہے جو مر چکی ہے' مرنے والی سے بیرم خاں کا کیا تعلق تھا فوری طور پر میں نہ جان سکی۔

میں سخت حیران تھی کہ مغل سپہ سالار بیرم خاں مجھے سحر زدگی کے عالم میں کیوں دیکھے جا رہا ہے۔

مجھے سپاہیوں کی زبانی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ قلعہ رہتاس کا قلعہ دار نعمت اللہ شکست کھا کر فرار ہو چکا ہے اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس وقت بیرم خاں کے سامنے کھڑی ہوں۔

کچھ دیر بعد آخرکار بیرم خاں نے سکوت توڑا اور بہت نرمی کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔

''اے عورت! کون ہے تو؟''

میں نے فوراً جواب دیا۔ ''میں ایک مظلوم عورت ہوں اور مجھے ناحق قید میں ڈالا گیا تھا۔''

بیرم خاں نے حکم دیا کہ مجھے نہایت عزت و احترام کے ساتھ قلعے میں موجود اس محل میں رکھا جائے جو پہلے قلعہ دار کے تصرف میں تھا۔ مجھ سے تفصیلی گفتگو کر کے بیرم خاں میرا حال جاننا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں کوئی مغل عورت ہوں جسے قلعہ دار نے اغوا کر کے قید میں ڈال رکھا تھا۔

اسی روز شام کو مغل بادشاہ ہمایوں لشکر رہتاس کے قلعے میں پہنچ گیا۔ اس دوران میں بیرم خاں محل میں آ کر مجھ سے ملا اور بولا۔ ''میں تجھے اس محل سے ایک حویلی میں منتقل کر رہا ہوں جو میرے تصرف میں آ چکی ہے۔ محل میں اب ظل الٰہی بادشاہ سلامت قیام فرمائیں گے۔ وہ جلد ہی یہاں تشریف لانے والے ہیں۔''

میں اب تک اس تجسس میں تھی کہ آخر بیرم خاں میرے ساتھ اتنا حسن سلوک کیوں کر رہا ہے؟ اس کے علاوہ یہ کہ شائستہ بیگم کون ہے؟ ابھی میں اس ضمن میں کچھ کہنے والی تھی کہ بیرم خاں بول اٹھا۔ ''اس وقت میں بہت مصروف ہوں' تجھ سے تفصیلی ملاقات رات کو ہوگی۔''

''آپ سے ایک گزارش تھی۔'' میں جلدی بولی۔

''ہاں بول۔'' بیرم خاں نے معلوم کیا۔

''میرے خادم رہتاس کی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ میری طرف سے فکرمند ہوں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ انہیں بھی یہیں قلعے میں بلوا.....''

''ٹھیک ہے۔'' بیرم خاں نے میری بات کاٹ دی۔ ''میں اپنے ملازمین سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ تیرے حکم کی تعمیل کریں۔''

میں نے بیرم خاں کا شکریہ ادا کیا۔ اسے واقعی جانے کی جلدی تھی اس لئے فوراً چلا گیا۔

بیرم خاں کے جاتے ہی اس کے ملازمین آ گئے۔ مجھے انہوں نے اس حویلی میں پہنچا دیا جہاں بیرم خاں کا قیام تھا۔ بیرم خاں کے ایک خادم کو میں نے رہتاس کی سرائے بھیج دیا۔ اسے عارج اور میرے خادموں کو ساتھ لے کر حویلی آنا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ گزشتہ رات کو میری واپسی کا انتظار کر کے عارج اور خادم واپس سرائے چلے گئے ہوں گے۔ انہیں سرائے ہی میں ہونا چاہئے تھا۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ قلعے پر مغل فوج کا حملہ ہوتے ہی عارج خادموں کو لے کر وہاں سے نکل گیا۔ بیرم خاں کا خادم بآسانی عارج اور میرے خدام کو سرائے میں تلاش کر لیا' اس کیلئے اسے میں نے عارج کے انسانی قالب کا نام رحمان بتا دیا تھا۔

رہتاس کی سرائے سے بیرم خان کا خام واپس آیا تو اس کے ساتھ عارج اور میرے خادم بھی تھے۔ ان کے قیام کا بندوبست بھی میرے ایما پر حویلی کے ایک حصہ میں کر دیا گیا۔ میں محسوس کر چکی تھی کہ عارج مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسی لئے کچھ دیر بعد ہی ایک خادم کے ذریعے عارج کو بلوا لیا۔ پھر خادم کو رخصت کر دیا۔

اس کمرے میں عارج اب میرے ساتھ اکیلا تھا۔ میرے استفسار پر پہلے عارج نے قلعے سے سرائے واپس جانے کے بارے میں بتایا' پھر کہنے لگا۔ ''اے دینار! یقین کر کہ ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ اگر تو نے تاکید نہ کی ہوتی کہ میں اپنی جناتی صفات استعمال نہ کروں تو یقیناً تجھے تلاش کرنے کیلئے میں ایسا ہی کرتا۔ خیر..... ان باتوں کو چھوڑ اور یہ بتا کہ تجھ پر کیا گزری؟''

میں نے مختصر ساری روداد بیان کر دی۔

ابتدا میں عارج کے انسانی چہرے پر اطمینان نظر آیا مگر جب اس روداد میں بیرم خان کا ذکر آیا تو وہ قدرے فکرمند دکھائی دیا۔ جب میں خاموش ہو گئی تو عارج نے کہا۔ ''تیرے ساتھ اس آدم زاد بیرم خاں کا سلوک میری سمجھ میں نہیں آیا اے دینار!''

''حیران تو میں بھی ہوں۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''آج رات وہ مجھ سے تفصیلی گفتگو کرے گا تو سب کچھ پتہ چل جائے گا۔'' یہ کہہ کر میں نے عارج کو رخصت کر دیا۔ وہ بہرحال میرے ایک خادم رحمان کے جسم میں تھا۔ بیرم خاں کے خادموں کو میں کسی قسم کے شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

رات ہونے تک مجھے بیرم خاں کے خادموں کی گفتگو سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بیرم

خاں کو اب ہمایوں قلعہ رہتاس فتح ہو جانے کے بعد دیپال پور بھیجنا چاہتا ہے۔ اسی شب بیرم خاں مجھ سے ملا۔

"کیا تیرا کوئی تعلق مغلوں سے ہے؟" بیرم خاں نے سوال کیا۔

میں بلا جھجک بولی۔ "ہاں میری رگوں میں ایک مغل سپاہی کا ہی خون دوڑ رہا ہے مگر حضور سے یہ میری درخواست ہے کہ فی الحال اس بات کو راز میں رکھا جائے' جب تک میں اپنے باپ کو تلاش نہ کرلوں۔"

بیرم خاں نے دریافت کیا۔ "تیری درخواست تو قبول کر لیتا ہوں لیکن مجھے اپنے باپ کا نام بتا دے۔ ممکن ہے میں اسے جانتا ہوں۔"

میں نے اپنے انسانی قالب مہرالنسا کی ماں قمرالنسا سے جو کچھ اس ضمن میں سنا تھا' بیرم خاں کو بتا دیا۔

"اگر تیری ماں کی شادی آگرہ ہی میں ہوئی تھی اور وہ اس وقت کماں دار تھا تو یقیناً وہ میرا دوست اور مغل سردار یوسف خاں ہے تو یقیناً اس کی بیٹی ہے مگر اس کے اہل و عیال میں تو میں نے تجھے کبھی نہیں دیکھا۔" بیرم خاں بولا۔

"مجھے تو خود میرے باپ نے بھی کبھی نہیں دیکھا' پھر آپ مجھ کو کیسے دیکھ سکتے تھے۔"

میں نے پھر بیرم خاں کے استفسار پر مہرالنسا کی ساری روداد بیان کر دی' وہ روداد جو میں نے قمرالنسا سے سنی تھی اور وہ بھی جو بعد میں گزری تھی۔

بیرم خاں کو میرے عزم و حوصلے پر بڑی حیرانی ہوئی۔ مہرالنسا کی سرگزشت میری زبانی سن کر کچھ دیر وہ خاموش رہا پھر نرمی سے کہنے لگا۔ "تو اپنے باپ سے ملنا چاہتی ہے؟"

"نہیں ابھی نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "میں پہلے بہرام خاں سے انتقام لینا چاہتی ہوں۔"

"یقیناً تجھے اس ملعون سے انتقام لینا چاہیے۔" بیرم خاں بولا۔ "تو نے بتایا تھا کہ وہ قلعہ دار نعمت اللہ کے ساتھ اس قلعے میں مقیم تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ابھی قیدیوں میں شامل ہو گا۔ میں تیرے ساتھ خود زنداں تک چلتا ہوں۔ اگر وہ وہاں موجود ہوا تو بلاشبہ تو اس سے اپنا حساب بے باک کرلیجیو مگر میں چاہتا ہوں کہ اب اس معاملے کو زیادہ طول دینے کے بجائے تو اپنے انتقام کی ساری قسطیں بیک وقت وصول کر لے۔" یہ کہہ کر بیرم خاں نے میرا بازو تھاما اور مجھے قلعے کے زنداں کی طرف لے گیا۔

پھر بہت دیر تک ہم قلعے کے زنداں کی ایک ایک کوٹھڑی کا جائزہ لیتے مگر بہرام خاں

ہمیں کہیں نظر نہ آیا۔ قلعہ دار نعمت اللہ کے بیٹے کا نام احمد اللہ تھا۔ وہ بھی قیدیوں میں شامل تھا۔ اسی کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ بہرام خان صبح سویرے ہی قلعے سے نکل گیا تھا۔ اسے میری گرفتاری کا علم ہو گیا تھا اور یہ بھی پتہ چل چکا تھا کہ ہمایوں قلعے پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس نے احمد اللہ کو بتایا تھا کہ وہ دہلی جا رہا ہے۔

میں یہ جان کر قدرے مایوس ہو گئی اور پھر بیرم خاں کے ساتھ واپس اس کی حویلی میں آ گئی۔

حویلی پہنچتے ہی بیرم خاں نے مجھ سے پوچھا۔ "مہرالنسا! کیا تجھے یہ دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی کہ جب تجھے میرے سامنے پیش کیا گیا تو میں تجھ کو دیکھتا رہ گیا۔ تو اس کی وجہ یقیناً نہیں سمجھ سکی ہو گی۔"

"جی حضور! میں نہیں سمجھ سکی تھی۔" میں نے اعتراف کیا۔

"سن مہرالنسا کہ تجھ پر نظر پڑتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میری مرحومہ بیوی شائستہ بیگم قبر سے اٹھ کر میرے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ تیری صورت میری مرحومہ بیوی سے بہت مشابہ ہے جس سے مجھے بے پناہ محبت تھی۔"

بیرم خان کے یہ الفاظ سن کر میرے لئے یہ اندازہ لگانا دشوار نہ ہوا کہ وہ مجھے کن نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس خیال سے میرے چہرے پر حجاب سا آ گیا اور میرا سر جیسے خود بخود جھک گیا۔

کچھ ہی دیر میں اپنی مرحومہ بیوی کا ذکر کرتے ہوئے بیرم خاں نے مجھ سے شادی کی پیشکش کر دی۔

بیرم خاں نے کچھ اس طرح اپنی مرحومہ بیوی کا تذکرہ کیا تھا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اسی لمحے میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح کوند گیا تھا کہ بیرم خاں کے جسم میں عارج بھی پناہ لے سکتا ہے۔ بیرم خاں یقیناً اپنی مرحومہ بیوی سے بہت محبت کرتا تھا اور اسی محبت کے سبب وہ مجھے اپنانا چاہتا تھا۔ اگر عارج اس کے جسم پر قبضہ کر لیتا تو یہ سودا مہنگا نہ تھا۔ بیرم خاں کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ وہ مغل افواج کا سربراہ تھا۔ ہمایوں سے پہلے وہ بابر کے ساتھ رہ چکا تھا۔ مغلوں میں اس کی بڑی عزت تھی۔ پھر ذاتی طور پر بھی وہ باکردار' ذہین اور بہادر شخص تھا۔

ہر چند کہ میرے انسانی قالب اور بیرم خاں کی عمر میں خاصا فرق تھا مگر میں اس سے متاثر ہو چکی تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ بیرم خاں دوسرے مغلوں کے برعکس عیاش و آوارہ

مزاج نہیں۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ عارج اس کے جسم کو اپنا لے گا۔ ایسی صورت میں بیرم خاں کی پیشکش قبول کی جا سکتی تھی۔

ابھی میں نے ایک حتمی فیصلہ کیا ہی تھا کہ بیرم خاں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سن مہرالنسا کہ میں محبت میں کسی جبر یا زبردستی کا قائل نہیں۔ تجھے میں یہ اختیار دیتا ہوں کہ تو چاہے تو میری پیشکش رد کر دے۔"

یقیناً یہ الفاظ بیرم خاں کی اعلیٰ ظرفی اور شرافت نفس کا ثبوت تھے۔ با اختیار ہو کر کسی کمزور و بے اختیار سے اپنی بات زبردستی نہ منوانا یا اپنا اختیار استعمال نہ کرنا لازماً بڑائی ہے۔ میں اسی بنا پر بیرم خاں کی پیشکش رد نہ کر سکی لیکن اس سے یہ بھی صاف صاف کہہ دیا کہ پہلے بہرام خاں کو تلاش کر کے انتقام لینا چاہتی ہوں۔

بیرم خاں اس پر رضامند ہو گیا۔ اس نے اگلے ہی روز میری دہلی روانگی کا بندوبست کر دیا۔ موقع نکال کر میں نے عارج کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو اس کی فطری شوخی عود کر آئی اور وہ بولا۔ "اے دینار! یہ بتا کہ سچ سچ تو میری بیوی کب تک بن سکے گی؟...... مجھے معلوم ہے کہ آدم زادوں کے شوق آوارگی سے بچنے کی خاطر تو مجھے اپنا شوہر بنا لیتی ہے۔"

"بکواس نہ کر!...... چلنے کی تیاری کر!...... ہمیں یہاں سے دہلی جانا ہے۔" میں نے یہ کہہ کر عارج کو تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

دراصل بیرم خاں نے اپنے محافظ دستے سے بہترین سپاہیوں کو منتخب کیا تھا۔ ان منتخب سپاہیوں کو ایک دستے کی صورت میں میرے ساتھ دہلی جانا تھا۔ انہی سپاہیوں کے ساتھ میں نے عارج کو بھی شامل کر دیا۔ اپنے خادموں کو میں نے رہتاس ہی میں چھوڑ دیا۔

منتخب سپاہیوں کے دستے کو جن میں عارج بھی تھا بیرم خاں نے میرے ساتھ دہلی روانہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "وہاں ہمارا انتظار کرنا' انشاء اللہ جلد مغل فوجیں دہلی میں داخل ہو جائیں گی۔"

میرے ساتھ مغل سپاہی' خدام' محافظ اور ملازمین کی صورت میں تھے۔ ان سب کے جسموں پر سادہ لباس تھا کیونکہ دہلی پر ابھی بہرحال مغلوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے بھی ایک بار پھر مردانہ لباس پہن لیا تھا۔ اس مرتبہ میں ایک تاجر کے بھیس میں دہلی جا رہی تھی۔ طویل سفر کے بعد جب میں دہلی میں پہنچی تو مجھے بہرام خاں کے بارے میں بآسانی معلوم ہو گیا۔ بہرام خاں کوئی غیر معروف آدمی نہیں تھا۔ لوگوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ جب بہرام خاں دہلی پہنچا تو اس کے چند ہی روز بعد اسے قید کر کے آگرہ کے زنداں میں منتقل کر دیا گیا

تھا کیونکہ دہلی پر اب عدلی شاہ حکومت نہیں رہی تھی۔

دہلی پر سکندر شاہ سوری کی حکومت تھی جو عدلی شاہ کا حریف تھا۔ بہرام خاں کیونکہ عدلی شاہ کے وفاداروں میں شمار ہوتا تھا اس لئے کچھ بااثر امیروں کے ایما پر دھر لیا گیا تھا۔ حقیقت حال جاننے کے بعد بہرام خاں دہلی سے فرار ہو جانا چاہتا تھا مگر اسے موقع نہیں مل سکا۔ عارج نے تو نہیں لیکن مغل سپاہیوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں بہرام خاں کا خیال ترک کر دوں اور واپس پنجاب چلوں یا دہلی میں رک کر مغل فوجوں کی آمد کا انتظار کروں۔

میں نے یہ مشورہ قبول نہ کیا۔ سپاہیوں کو میں نے رخت سفر باندھنے کا حکم دیا اور پھر آگرہ روانہ ہو گئی۔ آگرہ پہنچ کر میں ابھی بہرام خاں تک پہنچنے کی ترکیبیں سوچ رہی تھی کہ قدرت کی طرف سے اس کا انتظام ہو گیا۔ ہوا یوں کہ میرے آگرہ پہنچنے سے پہلے ہی دہلی میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ عدلی شاہ اور سکندر شاہ کے حامی ایک دوسرے سے نبرد آزمائی کرنے لگے تھے۔ آناً فاناً یہ خبر آگرہ پہنچ گئی۔

آگرہ کے زنداں میں کچھ ایسے امراء بھی قید تھے جو اپنے نیک اعمال اور خدا ترسی کی وجہ سے عوام میں بہت مقبول تھے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ عوام نے ان امراء کی رہائی کیلئے زنداں پر حملہ بول دیا۔

اس موقع سے میں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ان بلوائیوں میں اپنے سپاہیوں سمیت خود بھی شامل ہو گئی۔ قید خانے کے محافظ بلوائیوں کے سامنے نہ ٹک سکے۔ کچھ محافظ تو مارے گئے کچھ فرار ہو گئے۔ اسی افراتفری میں میں اس کوٹھڑی تک پہنچ گئی جہاں بہرام خاں تھا۔ وہ شاید یہ سوچ کر خوش دکھائی دے رہا تھا کہ اب وہ بھی دوسرے امراء کے ساتھ رہا ہو جائے گا یقیناً اسے بغاوت کا علم ہو گیا تھا ورنہ یوں خوش نہ ہوتا۔

یہی وجہ تھی کہ جب بہرام خاں کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تو وہ اپنی بیساکھی اٹھا کر چیخا۔ "سنو! میں امیر بہرام خاں ہوں' میں بھاگ نہیں سکتا۔ مجھے سہارا دے کر یہاں سے نکال لے چلو۔"

بہرام خاں فوری طور پر یقیناً مجھے نہیں پہچان سکا تھا۔ میں تلوار سیدھی کر کے اس کی طرف بڑھی اور سفاک لہجے میں بولی۔ "ہاں اے بہرام خاں! مجھے معلوم ہے تو نہیں بھاگ سکتا۔ تو مجھ سے اپنی موت سے نہیں بھاگ سکتا۔"

میری آواز سنتے ہی بہرام خاں ایک قدم پیچھے ہٹا اور لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں اور موت کی زردی چہرے پر پھیل گئی۔ وہ حیرت اور

بے یقینی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں ہی اس کے سامنے ہوں جسے وہ پنجاب کے قلعے رہتاس میں قید چھوڑ آیا تھا۔

میں قدم بہ قدم بہرام خاں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بہرام خاں نے ہاتھ اٹھا کر مجھ سے رحم کی درخواست کی۔ میں نے پہلا ہی وار اسی اٹھے ہوئے ہاتھ پر کیا' پھر دوسرے وار میں اس کی دوسری ٹانگ کاٹ دی۔ میرے محافظ مغل سپاہی چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوئے یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ عارج بھی تھا مگر اس کے چہرے پر حیرانی نہیں تھی۔ درندگی و سفاک میں مغل سپاہی خود بھی کم نہیں تھے مگر وہ شاید اس پر حیران تھے کہ ایک عورت ہونے کے باوجود ایسی بے رحمی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ بہرام خاں کے خون کے چھینٹے زنداں کی دیواروں پر پڑ رہے تھے۔ مجھ پر کچھ ایسی جنونی سی کیفیت طاری تھی کہ بہرام خاں کا جسم تڑپ تڑپ کر بے حرکت ہو گیا مگر میرا ہاتھ نہیں رکا۔ تلوار کی نوک سے میں نے بہرام خاں کی آنکھ نکالی اور اسے پیروں سے کچل دیا۔ اس کے بعد میں نے بہرام خاں کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ عارج کی آواز مجھے اسی دوران میں سنائی دی۔ وہ دبی دبی زبان میں مجھ سے واپس چلنے کو کہہ رہا تھا۔ اس وقت میری آنکھوں میں اسحاق اور اس کے معصوم بیٹے الیاس کے چہرے گھوم رہے تھے جنہیں بہرام خاں ہی نے قتل کرایا تھا۔

بہت دیر کے بعد جب میں اپنے محافظوں اور عارج کے ساتھ قید خانے سے نکلی تو میرے کپڑے خون آلود ہو رہے تھے مگر میں ایک نوع کی آسودگی سے سرشار تھی۔ میں نے بہرام خاں سے انتقام لے لیا تھا۔ بیرم خاں کے ایما پر میں نے انتقام کی بقیہ تمام قسطیں ایک ساتھ وصول کر لی تھیں۔ آگرہ میں اب مزید رکنا لا حاصل تھا' سو میں دہلی روانہ ہو گئی۔

دہلی آ کر میں نے بیرم خاں کا انتظار شروع کر دی۔

بیرم خاں نے جو کچھ کہا تھا سچ ثابت ہوا۔ مغل افواج اپنے حریفوں کو شکست دے کر فاتحانہ دہلی میں داخل ہو گئیں۔ یہ ماہ رمضان 992 ہجری کا واقعہ ہے۔ سکندر شاہ سوری مغلوں سے شکست کھا کر فرار ہو چکا تھا۔

کچھ ہی روز بعد بڑی دھوم دھام سے میری شادی خان خاناں بیرم خاں سے ہو گئی۔ میں اس سے قبل ہی عارج کو بیرم خاں کے جسم پر قبضہ کرنے کیلئے کہہ چکی تھی۔ ادھر بیرم خاں سے میرا نکاح ہوا ادھر میں نے عارج کی سرگوشی سنی۔ یہ سرگوشی کسی آدم زاد کو سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ عارج مجھ سے مخاطب تھا۔ "اے دینارا! میں تین بار اس آدم زاد بیرم خاں کے جسم میں اتر چکا ہوں مگر ہر بار مجھے باہر نکلنا پڑا۔ اس آدم زاد کے قالب میں میرے وجود کو قرار نہیں

آ رہا۔ مجھے اس کے اندر اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا ہے۔"

میرے لئے یہ صورتحال غیر متوقع اور انتہائی پریشان کن تھی۔ ظاہر ہے کہ میں بیرم خاں کی بیوی بن کر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس سے بچنے کا بس ایک ہی راستہ تھا کہ میں مہرالنسا کا قالب چھوڑ دیتی۔ پھر بھی میں نے اشاروں کی زبان میں عارج کو تاکید کی کہ وہ پھر کوشش کرے اور جلد گھبرا کر بیرم خاں کے جسم سے باہر نہ آ جائے۔

میرے انسانی قالب مہرالنسا کا باپ یوسف خاں بھی اس تقریب میں موجود تھا مگر اسے یہ خبر نہیں تھی کہ بیرم خاں کی شادی خود اسی کی بیٹی سے ہوئی ہے۔ شادی کی تقریب کے بعد بیرم خاں جب حجلۂ عروسی کی طرف چلا تو یوسف خاں کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ یوسف خاں اس بات پر حیران تھا کہ بیرم خاں اسے کیوں ساتھ لے جا رہا ہے۔

میں اس وقت سیج پر بیٹھی ہوئی تھی۔ عارج کو میں نے ایک بار پھر بیرم خاں کے جسم میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔

اب وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ فیصلہ کن لمحات آ پہنچے تھے۔ اسی وقت مجھے بیرم خاں کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے دوست سے کہہ رہا تھا۔ "یوسف خاں! دلہن کے قریب جاؤ' وہ تمہاری بیٹی ہے۔ اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعا دو۔"

"بیٹی؟" یوسف خاں نے حیرانی سے کہا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

میں بھی گھونگھٹ میں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے پرسکون آواز میں کہا۔ "ہاں بابا! میں تمہاری بیٹی مہرالنسا ہوں' تمہاری بیوی قمرالنسا کی کوکھ سے میں نے جنم لیا ہے۔ میں وہی ہوں جسے تم پیدا ہوتے ہی مار ڈالنا چاہتے تھے۔"

یوسف خاں کچھ دیر تک آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھتا رہا' پھر تیزی سے آگے بڑھا اور میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"مجھے معاف کر دو میری بچی!" یوسف خاں کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے یقیناً اس نے اپنے لہو کی خوشبو کو پہچان لیا تھا۔ "میں غلطی پر تھا۔" یوسف خاں نے اعتراف کیا۔ پھر وہ مجھے دعائیں دیتا ہوا حجلۂ عروسی سے باہر چلا گیا۔

عارج کی وہ آخری کوشش بھی ناکام رہی اور وہ بیرم خاں کے جسم سے نکل آیا۔

مجھے پہلے سے اگر موجودہ صورتحال کا اندازہ ہوتا تو ہرگز بیرم خان سے شادی کی ہامی نہ بھرتی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک جن زاد اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ایک آدم زاد کے جسم کو اپنا ٹھکانا نہیں بنا سکا تھا۔

پھر مجھے مجبوراً اپنے انسانی قالب کو چھوڑنا پڑا۔ میں عارج کے ساتھ بیرم خاں کی حویلی سے باہر آ گئی۔

شہری آبادی سے نکل کر ہم ایک جگہ دریائے جنا کے کنارے اتر گئے۔

''اے دینار!'' عارج مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ہمیں بغداد سے چلے عرصہ دراز ہو گیا ہے کیوں نہ اب واپس چلیں ...... اب تو بوڑھا عفریت وہموش بھی ہماری طرف سے مایوس ہو......''

''مجھے یہ خوش گمانی نہیں کہ اس عیار عفریت نے ہمیں بھلا دیا ہوگا۔'' میں بول اٹھی۔

''تو کیا ہم کبھی بغداد واپس نہیں جا سکیں گے اے دینار؟''

''میں نے یہ کب کہا'' میں بولی۔ ''پھر تو یہ بھی یاد رکھ اے عارج کہ ہم عالم سوما کے مشورے اور ایما پر عراق سے ہندوستان کے اس عہد میں آئے ہیں۔ مجھے بغداد واپس چلنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن کبھی کبھی ایک بات ضرور سوچتی ہوں۔ وہ یہ کہ ہمیں آدم زادوں کے درمیان ہی رہنا ہے تو کیا ضروری ہے بغداد یا عراق ہی کے کسی شہر میں رہیں۔''

''تیرا کہنا ٹھیک ہے اے دینار! مگر بغداد میں رہنے کی ایک وجہ ہے۔'' عارج کہنے لگا۔ ''بغداد سے بابل کے کھنڈرات زیادہ دور نہیں اور انہیں کھنڈرات میں ہم جنات کا قبیلہ آباد ہے۔ یوں سمجھ کہ عراق ہمارا وطن ہے۔ ہم وہیں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے ہیں۔''

''جہاں تک اپنے وطن یا جائے پیدائش و پرورش کا تعلق ہے' تیرے خیال سے مجھے اتفاق ہے لیکن تو اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف ہے کہ ہم جنات کیلئے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔'' میں کہنے لگی۔ ''کہیں سے بھی کتنا ہی فاصلہ کیوں نہ ہو ہم دوسرے ہی لمحے بابل کے کھنڈرات تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہندوستان اور عراق دونوں ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر واقع ہیں پھر یہ کہ زمانہ بھی مختلف ہے مگر اس پر بھی کیا ہم پلک جھپکتے بابل نہیں پہنچ سکتے؟...... بول غلط کہہ رہی ہوں میں؟''

''تو غلط نہیں کہہ رہی پھر بھی جانے کیوں بغداد و بابل کی بہت یاد آتی ہے...... بتا کیا تو عراق کے صحراؤں کو بھلا سکتی ہے؟'' عارج بولا۔ عارج نے بڑے متاثر کن انداز میں یہ بات کہی۔ مجھے بھی یوں لگا جیسے صحرا پکار رہے ہوں اے دینار! کب واپس آئے گی۔ میں اسی بنا پر عراق واپس چلنے پر آمادہ ہو گئی۔

''ہم پہلے بابل کے کھنڈرات میں چل کر عالم سوما سے ملیں گے اس کے بعد بغداد جائیں گے اے عارج!'' میں نے کہا۔

اس پر عارج راضی ہو گیا۔ وہ واپسی کے فیصلے سے خوش تھا۔

170 ہجری میں خلیفہ ہارون الرشید برسر اقتدار آیا تھا اور اسی سال ہم عراق کے شہر نجف سے چلے تھے۔ ہم پورے 20 برس کے بعد 170 ہجری کے زمانے میں واپس آئے۔

اس وقت تک خلیفہ ہارون الرشید کو حکومت کرتے ہوئے دو دہائیاں بیت چکی تھیں۔

گزشتہ بیس برس کے دوران میں کیا اہم واقعات پیش آئے یہ جاننا میرے اور عارج کیلئے ضروری تھا۔ ہمیں کیونکہ اب دارالحکومت بغداد ہی میں رہنا تھا اس لئے لاعلمی سے کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔

عراق کی حدود میں داخل ہوتے ہی ہم نے اپنی پراسرار قوتوں کو متحرک کر لیا۔ اب ہم کسی اور زمانے میں نہیں تھے جو ان قوتوں کو بروئے کار لانے میں احتیاط اور گریز سے کام لیتے۔

اقتدار میں آنے کے پانچ سال بعد 175 ہجری میں ہارون نے اپنے بیٹے امین کو ولی عہد مقرر کیا۔ خلیفہ کے حکم پر امین کے ہاتھ پر ولی عہدی کیلئے بیعت لی گئی۔ امین کی عمر اس وقت صرف پانچ سال تھی۔ پھر 182 ہجری میں ہارون نے اپنے ایک اور بیٹے عبداللہ کی ولی عہدی کی خاطر بیعت لی کہ امین کے بعد تخت خلافت کا یہ وارث ہوگا۔ ہارون نے عبداللہ کو المامون کا لقب عطا کیا۔

یہ واقعہ 186 ہجری کا ہے۔ خلیفہ ہارون نے اعیان سے بہ قصد حج مکہ معظمہ کا سفر اختیار کیا۔ خلیفہ کے ساتھ محمد امین' عبداللہ مامون اور قاسم دونوں بیٹے تھے۔ اس نے روانگی سے قبل ولی عہدی کی تجدید کیلئے بیعت کر لی۔ سب سے پہلے امین کی بیعت لی گئی۔ ہارون نے امین کو عراق' شام اور بقیہ تمام عرب علاقوں کی حکومت عطا کی۔ اس کے بعد مامون کو ولی عہد مقرر کیا۔ مامون کو خراسان اور ہمدان کے صوبہ جات تا انتہائے مشرق دیئے۔ مامون کے بعد ہارون نے اپنے تیسرے بیٹے قاسم کی ولی عہدی کیلئے بیعت لی۔ قاسم کو اس نے موتمن کا لقب دیا۔ ہارون نے اسی کے ساتھ مامون کو یہ اختیار دیا تھا کہ قاسم کے نالائق ہونے کی صورت میں اسے معزول کر سکتا تھا۔ قاسم کو جزیرہ ثغور اور عواصم کی حکومت ملی۔

یوں خلیفہ ہارون نے اپنی زندگی ہی میں ولی عہدی کا معاملہ طے کر دیا۔ پہلے امین' پھر مامون اس کے بعد قاسم کو اقتدار سنبھالنا تھا لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ اپنی مخلوق کو خالق کل نے مکمل طور پر بااختیار نہیں بنایا۔ یہی سبب ہے کہ آئندہ حالات و واقعات اسی طرح پیش نہیں آئے جن کا اندازہ خلیفہ ہارون الرشید نے کیا تھا۔ ان واقعات کا تفصیلی ذکر میری

سرگزشت میں آگے آئے گا۔ فی الحال تو میں ہارون کے سفرِ حج کا ذکر کر رہی ہوں اور اس ذکر کی بھی ایک خاص وجہ ہے جس کا تعلق ولی عہدی کے عہد نامے سے ہے۔

مدینہ منورہ پہنچ کر خلیفہ ہارون الرشید نے اہل مدینہ کو انعامات دیئے اور مستحقین میں خیرات تقسیم کی۔ امین، مامون اور اپنی طرف سے ہارون نے ایک کروڑ 5 لاکھ دینار راہ خدا میں صرف کیے۔ اسی طرح مکہ معظمہ میں خلیفہ نے داد و دہش سے کام لیا۔ ہارون نے فقہاء، قضاۃ اور سرداران لشکر کو طلب کر کے دونوں خلیفہ زادوں کی طرف سے جدا جدا عہد نامے لکھوائے۔ ان میں سے ایک عہد نامہ امین کی طرف سے مامون کے ساتھ وفا کرنے کا تھا۔ دوسرا عہد نامہ مامون کی جانب سے امین کے ساتھ ایفائے عہد کا تھا۔ ان دستاویزات کو شہادتوں سے مکمل کر کے خلیفہ نے خانہ کعبہ میں آویزاں کرا دیا۔

خلیفہ ہارون الرشید کے گزشتہ 20 برس کے دور حکومت میں سب سے اہم واقعہ خاندان برامکہ کا زوال ہے۔

خاندان برامکہ میں جو سب سے پہلے عہدہ وزارت پر فائز کیا گیا وہ خالد برمکی تھا۔ اس کے اجداد آتش کدہ نوبہار کے متولی تھے۔ اس آتش کدے کو بادشاہ فارس منوچہر نے ماہتاب کے نام پر بنوایا تھا۔ مشہور آتش کدوں میں یہ درجہ چہارم پر تھا۔ جب عہد خلافت حضرت عثمانؓ میں خراساں فتح ہوا اور اسلامی حکومت تمام اطراف میں پھیل گئی۔ اس وقت یہ آتش کدہ بھی جو عہد منوچہر سے آباد چلا آتا تھا، ویران ہو گیا اور خاندان برامکہ رنج و مصیبت میں پھنس گیا۔ پھر عہد خلافت ولید بن عبدالملک اموی میں قتیبہ بن مسلم، حجاج کی طرف سے خراسان کا عامل (گورنر) ہو کر خراسان پہنچا۔ اس نے ایک بڑی فوج مرتب کر کے مرو پر فوج کشی کر دی۔ اس لڑائی میں جہاں اور مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا وہاں عورتیں بھی گرفتار ہو کر آئی تھیں جنہیں لونڈیاں بنا لیا گیا تھا۔ ان میں ایک عورت برمک کی تھی۔ مال غنیمت کی تقسیم کے وقت یہ عورت عبداللہ بن مسلم (برادر قتیبہ) کے حصے میں آئی۔

چند روز کے بعد اہل بلخ سے صلح ہوئی تو قتیبہ کے حکم سے لونڈیاں واپس ہوئیں۔ مجبوراً عبداللہ نے اس برمکی عورت کو بھی برمک کے پاس واپس کر دیا۔ وہ عورت ماں بننے والی تھی۔ اسی بنا پر یہ شرط قرار پائی کہ اگر بیٹا پیدا ہوا تو ہمارا ہے۔ سو بیٹا ہی پیدا ہوا اور اسے مسلمانوں کے حوالے کر دیا گیا۔ اسی کا نام خالد رکھا گیا جو بعد میں خالد برمکی کہلایا۔

خالد برمکی کا عروج 132 ہجری عہد خلافت سفاح سے شروع ہوتا ہے۔ سفاح ہی نے اسے وزارت کا معزز عہدہ عطا کیا۔ سفاح کے مرنے تک خالد نے وزارت کی۔ خلیفہ المنصور

خلافت کی مسند پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے بھی خالد کو وزارت ہی کے عہدے پر رکھا۔ ایک سال ایک مہینے کے بعد ابو ایوب موریانی کی حکمت عملی سے خلیفہ منصور نے خالد کو بغاوت اکراد فرو کرنے کیلئے فارس بھیج دیا۔ خالد چلا گیا تو ابو ایوب موریانی کو قلمدان وزارت کا مالک بنا دیا گیا۔ اگرچہ پھر خالد کو عہدہ وزارت نصیب نہیں ہوا لیکن بڑی بڑی ذمہ داریوں کے کام اس کے سپرد رہے۔ زمانہ ولی عہدی میں وہ خلیفہ مہدی کا اتالیق بھی رہا۔ موصل کی حکومت اس کے سپرد کی گئی۔ غرض وہ جب تک زندہ رہتا ممتاز عہدوں سے سرفراز رہا۔ خالد ہی کا بیٹا یحییٰ برمکی تھا جس کا ذکر میری سرگزشت میں آ چکا ہے۔

☆......☆......☆

یحییٰ برمکی ہشام بن عبدالملک اموی کے زمانہ خلافت میں پیدا ہوا۔ جب اس کے شباب کا زمانہ آیا تو اس کا نامور باپ خالد برمکی دولت عباسیہ کے اراکین سلطنت میں شمار کیا جاتا تھا۔ خالد کی کارگزاریوں اور یحییٰ کی قابلیت پر نظر کر کے یحییٰ کو خلیفہ مہدی نے ہارون الرشید کا اتالیق مقرر کر دیا۔ ہارون نے اسی کی آغوش تربیت اور نگرانی میں تعلیم پائی۔ جب ہارون کو خلیفہ مہدی نے حدود مغرب' آذربائیجان اور ارمینیہ کا عامل بنایا تو منجملہ اور خاص خاص آدمیوں کے جو ہارون کے ہمراہ بھیجے گئے یحییٰ برمکی بھی تھا۔

جس وقت خلیفہ ہادی نے ہارون کو خلافت و سلطنت سے محروم کرنے کیلئے مختلف تدبیریں کی تھیں۔ یحییٰ نے ان تدبیروں کو قبول نہیں کیا تھا۔ اس کی پاداش میں اسے سزائے قید جھیلنا پڑی تھی۔ یہ تفصیلی بیان پہلے آ چکا ہے۔

ہارون نے تخت خلافت پر متمکن ہوتے ہی یحییٰ برمکی کو امور سلطنت میں سیاہ و سفید کا اختیار دے دیا تھا۔

بیس برس کے اسی عرصے میں مادر ملکہ خیزران (ہارون کی ماں) کا انتقال بھی ہو چکا تھا۔ خیزران کی موت کے بعد یحییٰ برمکی کا قدم استقلال مزید مستحکم کے ساتھ سلطنت میں جم گیا۔ اس کا خاندان بہت بڑا تھا۔ حقیقی اور چچازاد نیز بھتیجے کثرت سے تھے۔ اس کے بیٹے جعفر' فضل اور محمد اپنے باپ کی طرح امور سلطنت میں دخیل تھے۔ خلیفہ کے ورثاء کا ان کو بہت بڑا حصہ ملا تھا۔ خلیفہ سے ان کو خاص نسبت تھی۔ فضل تو خلیفہ ہارون کا دودھ شریک بھائی تھا۔ فضل کی ماں نے ہارون کو اور ہارون کی ماں خیزران نے فضل کو دودھ پلایا تھا چونکہ ہارون نے یحییٰ کی گود میں پرورش پائی تھی اس وجہ سے ادب کے ساتھ یحییٰ کو باپ کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ یحییٰ کے معمر ہو جانے پر فضل اور جعفر کو عہدہ وزارت پر سرفراز کیا تھا۔ مامون کی ولی عہدی کے بعد ہی جعفر برمکی کو اتالیقی کی خدمت سپرد کی گئی تھی۔ ان تمام مہمات' انتظامات اور ملکی خدمات کو اس خاندان کے افراد نے نہایت حسن و خوبی سے سرانجام دیا۔ رعایا سے خلیفہ تک سبھی ان کے مداح تھے مگر ہمیشہ وقت ایک سا نہیں رہتا۔ ہر عروج کو زوال ہے۔ یہی اس خاندان کے ساتھ ہوا۔

ہوا یہ کہ رفتہ رفتہ خاندان برامکہ کا اقتدار اور جاہ و جلال حکومت و سلطنت میں اس درجہ بڑھ گیا کہ خلیفہ کا نام ہی نام رہ گیا۔ امور سلطنت میں سیاہ و سفید کے یہی مالک تھے۔ اس بنا پر امرائے دولت کو اس خاندان کے افراد سے حسد پیدا ہوا اور وہ موقع پا کر خلیفہ سے ان کی شکایتیں کرنے لگے۔ کثرت سے شکایات کے سبب خلیفہ کو بھی اس امر کا احساس ہوا کہ برامکہ کے نام ہی کا ڈنکا ہر طرف سنائی دیتا ہے۔ خاص طور پر جعفر برمکی کی طرف سے خلیفہ ہارون قدرے خفا ہو گیا۔ اس خفگی کا اظہار اس طرح ہوا کہ ہارون چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور فروگزاشتوں کو ان آنکھوں سے دیکھنے لگا جن سے سنگین اور ناقابل معافی جرائم دیکھے جاتے تھے۔

خلیفہ ہارون کی برہمی کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس نے یحییٰ بن عبداللہ کو جعفر برمکی کی تحویل میں بغرض نظر بندی دیا تھا۔ جعفر برمکی نے خلیفہ کی اجازت و اطلاع کے بغیر رہا کر دیا۔ فضل بن ربیع نے خلیفہ کو اس واقعے سے مطلع کر دیا۔ اس پر خلیفہ نے جعفر سے استفسار کیا۔ جعفر نے اس خبر کی تصدیق کر دی۔

خلیفہ کو جعفر کی اس خودرائی اور ایسے باغی ملزم کے رہا کر دینے سے کشیدگی پیدا ہوئی۔ وقتاً فوقتاً لوگوں کی شکایتوں سے یہ کشیدگی بڑھتی گئی۔ نتیجہ یہ کہ خلیفہ صاف طور پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے لگا۔ بات بات پر اعتراض کرنے کو بھی خلیفہ نے اپنا وطیرہ بنا لیا۔

اسی عرصے میں ایک روز یحییٰ برمکی حسب دستور قدیم خلیفہ ہارون کی خدمت میں بلا اطلاع حاضر ہوا۔ اس وقت شاہی طبیب جبرئیل بن بخت یشوع بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ خلیفہ ہارون نے اسے مخاطب کیا۔ "کیوں جبرئیل تمہارے گھر میں بھی یوں ہی بلا اطلاع لوگ آ جاتے ہیں؟"

عیسائی طبیب جبرئیل نے عرض کیا۔ "اے امیر المومنین یہ کیونکر ممکن ہے۔"

یہ جواب سن کر خلیفہ ہارون یحییٰ برمکی کی طرف متوجہ ہوا۔ یحییٰ بولا۔ "اے امیر المومنین! یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں ہمیشہ بلا اجازت ہی حاضر ہوتا تھا۔ اگر پہلے سے مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میری اس طرح حاضری مزاج ہمایوں کو ناگوار خاطر ہوتی ہے تو میں خود کو اسی طبقے میں رکھتا جس کے افراد اجازت کے پابند ہیں۔"

خلیفہ ہارون یہ سن کر شرمندہ سا ہو گیا۔ اس نے گردن جھکا کر کہا۔ "تم اپنے دل میں

کچھ خیال نہ کریں میں نے تو یوں ہی ایک بات کہہ دی۔"

ہمیشہ کا دستور تھا کہ جب یحییٰ برمکی دربار خلافت میں آتا تو حاجب، دربان اور خدام اسے تعظیم دینے کی خاطر اٹھ کھڑے ہوتے تھے لیکن شکر رنجی کے بعد خلیفہ ہارون کے ایما پر اس کے خادم خاص سرور نے یحییٰ برمکی کو تعظیم دینے کی ممانعت کر دی۔ جس وقت یحییٰ برمکی دربار خلافت میں حاضری کی غرض سے آتا تو دربان منہ پھیر لیتے تھے۔ اسی سبب یحییٰ نے دربار میں جانا کم کر دیا۔ یوں ہارون کو ایک اور بہانہ مل گیا۔

دراصل حکومت و اختیارات کے بارے میں برامکہ اپنا ایک الگ نقطہ نظر رکھتے تھے۔ اسی پر انہوں نے عمل کیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر کسی کو کوئی عہدہ دے دیا جائے تو پھر اس سے جواب طلبی نہ ہو۔ کسی بھی سطح پر اس کے اختیارات میں مداخلت مناسب نہیں۔

یحییٰ برمکی کی عمر زیادہ ہو گئی تو اسی کے مشورے سے جعفر برمکی کو خلیفہ ہارون نے عہدہ وزارت پر مقرر کر دیا۔ جعفر برمکی بھی اپنے باپ کی طرح خود کو مختار کل سمجھتا تھا۔ وہ جو چاہتا کرتا اور خلیفہ ہارون کی اجازت یا مرضی معلوم کرنے کو ضروری نہ سمجھتا۔ اسی وجہ سے خلیفہ اور اس کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوتا گیا۔

بدخواہوں کو موقع مل گیا تو انہوں نے خلیفہ کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ امرائے دربار میں سے ایک نے خلیفہ ہارون سے قسم کھا کر بتایا کہ جعفر برمکی اب یہ کہنے لگا ہے کہ میں کسی کو بھی اپنے امور میں جواب دہ نہیں خواہ وہ امیر المومنین ہی کیوں نہ ہوں۔

جو کچھ کہا گیا حقیقت پر مبنی تھا۔ جعفر برمکی نے واقعی یہی کہا تھا۔ پھر سازشیوں نے ایسا بندوبست کیا کہ خلیفہ ہارون خود اپنے کانوں سے یہ الفاظ سن لے۔

ایک درباری کی کسی بات کے جواب میں جعفر برمکی نے برملا کہا۔ "نہ صرف مجھے بلکہ خاندان برامکہ کے کسی بھی صاحب منصب کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے طور پر کوئی فیصلہ کر لے۔ اس کیلئے اسے امیر المومنین کی بھی اجازت کی ضرورت نہیں۔" یہ وہ الفاظ تھے جو گویا نشتر بن کر خلیفہ ہارون الرشید کی سماعت میں اتر گئے۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا۔

187 ہجری میں خاندان برامکہ زوال پذیر ہوا۔ اس وقت خلیفہ ہارون الرشید حج سے واپسی کے بعد انبار میں مقیم تھا۔ جعفر برمکی بھی اس کے ساتھ تھا جس رات خلیفہ نے چھپ کر جعفر برمکی کے باغیانہ الفاظ سنے اسی رات کو اس نے ایک سخت فیصلہ کر لیا۔ خلیفہ نے اپنے خادم خاص مسرور کو گرز برداروں کی ایک جماعت کے ساتھ طلب کیا اور حکم دیا۔

"اسی وقت جعفر کے خیمے میں جاؤ اور اسے خیمے کے در پر بلا کر اس کا سر اتار لاؤ۔"

مسرور یہ سن کر کانپ اٹھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے خلیفہ کی خدمت میں عرض کیا۔

"حضور امیر المومنین اپنے حکم پر نظر ثانی فرمالیں۔"

خلیفہ نے اپنے خادم خاص کو ڈانٹ دیا۔ "تجھے ہمارے حکم کی تعمیل کرنی ہے جو سوچنا تھا ہم سوچ چکے۔"

مسرور تذبذب کا شکار رہے۔ اس کا سبب خاندان برامکہ کا اقتدار تھا۔ اسے حقیقت کا علم نہیں تھا کہ خلیفہ کیوں اس قدر برہم ہے۔ "تو ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔" خلیفہ کا لہجہ اب جواب طلبی کا تھا۔ "حکم کی تعمیل کر ورنہ تیری خیر نہیں۔"

مسرور نے جب یہ دیکھا کہ خلیفہ ہارون کا غصہ لحظہ بہ لحظہ بڑھتا ہی جا رہا ہے تو تعمیل حکم ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ وہ گرز برداروں کو ساتھ لے گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد خلیفہ کے سامنے جعفر برمکی کا کٹا ہوا سر پیش کر دیا گیا۔ اسی شب ہارون نے فضل برمکی کو بھی گرفتار کرا کے قید میں ڈلوا دیا۔ اسی کے ساتھ یحییٰ برمکی اور خاندان کے دیگر تمام افراد کے بارے میں فرمان جاری کر دیا۔

فرمان کے مطابق اس خاندان کے تمام افراد کی جاگیریں، مکانات، خدام اور مال و اسباب ضبط کیا جانا تھا۔ یہ گشتی فرمان تمام ممالک میں بھیج دیا گیا۔ خاندان برامکہ کے سبھی چھوٹے بڑے پکڑے گئے۔ عتاب خلیفہ سے صرف محمد برامکی محفوظ رہا۔

اگلے دن جعفر برمکی کی لاش خلیفہ ہارون کے حکم سے بغداد روانہ کر دی گئی۔ خلیفہ کے حکم میں یہ الفاظ بھی شامل تھے کہ جعفر برمکی کی لاش کے دو ٹکڑے کر کے پل پر نصف نصف دونوں جانب آویزاں کر دیئے جائیں۔ یہ وہ پل تھا جو عمال حکومت کیلئے مخصوص تھا۔

میں 190 ہجری میں عراق پہنچی تھی۔ چند روز قبل ہی شہر کوفہ کے زنداں میں یحییٰ برمکی کا انتقال ہوا تھا۔ یحییٰ کے زمانہ وزارت میں دربار خلافت اہل علم و اہل کمال سے بھرا رہتا تھا۔ اس کے عہد میں علوم و فنون کے عربی تراجم کو ترقی ہوئی۔ یحییٰ بہت فیاض، رحیم، کریم اور رقیق القلب آدم زاد تھا۔ اس کی معلومات وسیع تھیں۔ وہ شاعر بھی تھا اور علم نجوم میں اسے خاص مہارت حاصل تھی۔ اس کے آٹھ بیٹے تھے ان میں جعفر اور فضل زیادہ مشہور ہوئے۔ انہی دونوں کے اقتدار اور جاہ و جلال کے افسانے عہد خلافت ہارون الرشید میں ہر ایک کی زبان پر آئے۔

جعفر قتل کیا جا چکا تھا۔ یحییٰ کی وفات ہو گئی تھی۔ اب خاندان برامکہ کا محض ایک قابل ذکر شخص اور خلیفہ کا دودھ شریک بھائی فضل برمکی زندہ بچا تھا۔ وہ رقہ کے زنداں میں قید تھا۔

علوم و فنون کو ترقی دینے میں فضل برمکی کا بھی بڑا حصہ تھا۔ کاغذ بنانے کا کارخانہ اسی نے لگوایا تھا۔ ہارون کے بیٹے مامون کا اتالیق فضل برمکی ہی تھا۔

بیان کردہ واقعات کے علاوہ گزشتہ بیس برس کے ابتدائی ایام میں میری اور عارج کی نسبت سے ایک اور اہم واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ میں اور عارج قصر خلافت میں ایک عرصے تک رہے تھے۔ اس کیلئے ہم نے ایک آدم زادی جمیلہ اور ایک آدم زاد ایوب کے قالبوں کا سہارا لیا تھا۔ یہ دونوں ہی خلیفہ وقت کے خاص خادموں میں سے تھے۔

ان دونوں کے بارے میں پتہ یہ چلا تھا کہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ایک دن پراسرار طور پر وہ اپنی قیام گاہ میں مردہ پائے گئے تھے۔ نجف سے بغداد آئے انہیں دوسرا ہی دن تھا۔ ایوب و جمیلہ کی موت کے متعلق یقینی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا البتہ قیاس اغلب یہی تھا کہ انہیں عفریت وہموش نے قتل کیا ہوگا۔ اس طرح وہ قصر خلافت میں ہمارے ٹھکانے ختم کرنا چاہتا ہوگا۔ اس سے وقتی طور ہی سہی ہم پریشان ضرور ہو گئے تھے۔ اب ہمیں نئے انسانی قالب تلاش کرنے پڑتے۔ ضروری نہیں تھا ہمیں ایسے انسانی پیکر مل جاتے کہ ہم ساتھ رہ سکتے۔

یہی سوال مجھ سے عارج نے بھی کر دیا تو میں نے جواب دیا۔ "اللہ مالک ہے' وہی ہمارے لئے کوئی راہ نکال دے گا۔ پہلے تو ہمیں عالم سوما سے ملنا ہے' اس کے بعد ہی ہمارے لئے کوئی فیصلہ کرنا ممکن ہوگا۔"

یہ رات کا وقت تھا۔ عارج اور میں ریت کے ایک ٹیلے کے نیچے صحرا میں بیٹھے تھے۔ دراصل ہم اس وقت بابل کے کھنڈرات میں پہنچنا چاہتے تھے کہ فوری طور پر عالم سوما سے ہماری ملاقات ہو سکے۔ اس کیلئے عشاء کے بعد کا وقت ہی مناسب تھا۔ صحرا میں ٹھہر کر ہم یہی انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے اندازے کے مطابق جب وقت ہو چکا تو ہم وہاں سے بابل کیلئے چل پڑے۔ صحرا میں رکنے کا ایک مقصد گزشتہ بیس برسوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا بھی تھا۔

عارج کے ساتھ جب میں بابل کے کھنڈرات میں پہنچی تو صورتحال میری توقع کے خلاف تھی۔ ہم کھنڈرات کے اس حصے میں تھے جہاں عالم سوما سکونت پذیر تھا۔

میری پہلی نظر اپنے قبیلے کے طبیب ہامہ بن ہیم پر پڑی۔ پھر میں نے عالم سوما کو ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے نیچے پڑے دیکھا۔ وہ مجھے بے ہوش معلوم ہوا تو میں نے طبیب سے پوچھا۔ "اے ہامہ! یہ عالم سوما کو کیا ہوا؟"

"کمزوری کی وجہ سے اس پر غفلت طاری ہو گئی ہے لیکن فکر کی کوئی بات نہیں' میں نے اسے دوا سنگھا دی ہے مگر فوری طور پر یہ ہوش میں نہیں آئے گا' ممکن ہے ہوش میں آتے آتے نصف شب ہو جائے۔" طبیب ہامہ نے بتایا۔

"لیکن اے طبیب! اسے بیماری کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اے میری بچی! خود بڑھاپا ایک بیماری ہے۔" طبیب ہامہ نے جواب دیا۔ "سوما کو میں نے تاکید کی تھی کہ رات رات بھر عبادت کی مشقت نہ اٹھایا کرے کہ اب اس کا وجود اس کا متحمل نہیں رہا مگر وہ نہیں مانا۔ نتیجہ سامنے ہے' خیر...... تو بتا اے دینار! کہاں اور کس حال میں ہے؟ اور...... اور یہ عارج...... اس نے تو شاید مجھے بھلا ہی دیا ہے۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی عارج بول اٹھا۔ "اے ہامہ! یہ بھلا کس طرح ممکن ہے کہ میں تجھے بھول جاؤں۔"

"تو مجھے یاد رکھتا ہے اسی لئے تو برسوں گزر جانے پر بھی کبھی ملنے نہیں آتا۔" ہامہ کی آواز میں چبھن تھی۔

"میں درحقیقت یہاں عراق میں نہیں تھا۔" عارج اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

"تم دونوں ساتھ ہی رہتے ہو تو شادی کیوں نہیں کر لیتے۔" اس مرتبہ طبیب ہامہ مجھ سے بھی مخاطب تھا۔

"میں تو دینار سے کئی بار یہ کہہ چکا ہوں مگر......" عارج کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے میرے غصے کو محسوس کر لیا تھا۔

"اگر سردار اخضم کو راضی کرنا ہے تو میں اس سے بات......"

"نہیں اے ہامہ!" میں بول اٹھی۔ "ابھی میں یہ ذمہ داری خود ہی قبول نہیں کرنا چاہتی۔"

"تیری مرضی" ہامہ نے کہا اور پھر وہ نہیں رکا۔

ہامہ کے جاتے ہی میں نے عارج کی خبر لی۔ "تو کیا کہہ رہا تھا ہامہ کے سامنے؟"

"تو نے کچھ کہنے کہاں دیا اے دینار!" عارج حسرت بھرے لہجے میں بولا۔

"ہر ایک کے سامنے بکواس نہ کیا کر...... سن! میں اپنے ماں باپ اور بھائی سے مل کر آتی ہوں تو یہیں ٹھہر...... لگتا ہے عالم سوما کو جلد ہوش نہیں آئے گا۔ ہامہ نے کہا تھا کہ آدھی رات بھی ہو سکتی ہے۔" میں یہ کہہ کر وہاں سے چل دی۔

اپنے بھائی یوسف سے تو میری ملاقات نہیں ہو سکی ہاں ماں باپ سے ضرور مل لی۔ ان

دونوں ہی نے مجھے چمٹا لیا۔

''اب تو برسوں بعد ملنے آیا کرے گی اے دینار!'' ماں نے شکایت کی۔

''اے میری ماں! میں ہندوستان گئی ہوئی تھی۔''

''اور عارج'' میرے باپ نے سوال کیا۔

''وہ بھی میرے ساتھ تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

دیر تک میں اپنے ماں باپ سے باتیں کرتی رہی اور پھر عالم سوما کے پاس آ گئی۔ اسے ہوش آ چکا تھا۔ عارج کو میں نے اس سے باتیں کرتے دیکھا۔ میں پہنچی تو عالم سوما میری طرف متوجہ ہو گیا۔

''تو ٹھیک تو ہے اے دینار! اے میری بچی!'' عالم سوما کہنے لگا۔

''میں تو ٹھیک ہوں اے میرے باپ کے دوست! مگر تو ٹھیک نہیں لگتا۔''

''ہو جاؤں گا ٹھیک..... فکر نہ کر تو..... یہ عارج ابھی مجھے بتا رہا تھا کہ تیرا ارادہ اب دوبارہ بغداد میں رہنے کا ہے۔''

''ہاں اے عالم سوما! اس نے تجھ سے ٹھیک ہی کہا ہے۔'' میں بولی۔

''فی الحال تم دونوں کا بغداد میں رہنا قطعی ممکن نہیں۔'' عالم سوما نے کہا۔

''وہ کیوں اے سوما؟ ہم بغداد میں کیوں نہیں رہ سکتے؟..... کیا ابھی تک اس بوڑھے عفریت دہموش کا خطرہ ٹلا نہیں؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''بیس برس پہلے تیرے ایما پر ہم اس عفریت کے خطرے کی وجہ سے عراق چھوڑ کر گئے تھے' کیا اب بھی یہاں ہمارے لئے خطرہ ہے؟''

''اب اس خطرے کی نوعیت بدل گئی ہے لیکن خطرہ بہر حال موجود ہے۔'' عالم سوما نے میرے سوال کا جواب دیا' پھر وضاحت کرنے لگا۔

''دراصل عفریت دہموش تمہیں بھولا نہیں ہے اور اسے یقین ہے کہ تم دونوں ایک نہ ایک دن لوٹ کر بغداد ضرور آؤ گی۔ نجف سے جب تمہارے انسانی قالب ایوب اور جمیلہ بغداد پہنچے تو دہموش کو معلوم ہوا کہ تم ان جسموں سے نکل کر راہ فرار اختیار کر چکے ہو' میں اس پر نظر رکھے ہوئے تھا' اس نے غصے اور جھنجھلاہٹ میں ایوب اور جمیلہ کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ پھر وہ کافی عرصے تک تمہیں بغداد' نجف' موصل وغیرہ کے علاوہ عراق کے دوسرے شہروں میں بھی تلاش کرتا رہا۔ اسے تمہارا کہیں سراغ نہیں ملا تو بغداد میں سکونت اختیار کر لی۔ شمالی بغداد کے پہاڑوں میں اس کا ٹھکانہ تھا۔ وہی جگہ تھی یہ جہاں اس کی حبشی کنیز سارہ تجھے اغوا کر کے

لے گئی تھی اے دینار! یاد آیا تجھے؟''

''ہاں اے عالم سوما! مجھے یاد ہے۔'' میں نے تصدیق کی پھر بولی۔ ''تو تھک گیا ہو گا' کچھ سستا لے۔''

''میری فکر نہ کر اے دینار! میں ٹھیک ہوں۔'' عالم سوما نے یہ کہہ کر دوبارہ عفریت دہموش کا ذکر چھیڑ دیا۔ ''معلوم یہ ہوا کہ عراق کی طرح مصر اور زمین پر آباد دوسرے ملکوں میں بھی دہموش کے ٹھکانے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے کہ جب میں بیمار نہیں ہوا تھا' وہ عفریت بغداد سے مصر کے شہر قاہرہ چلا گیا۔ کچھ خبر نہیں کہ وہ وہاں کب تک رہے لیکن قیاس یہی ہے کہ جلد بغداد واپس نہیں آئے گا۔ یہ اندازہ میں نے اس مخصوص حصار سے لگایا جو صرف تمہارے اور عارج کیلئے بغداد کے گرداگرد کھینچا گیا ہے۔ عارج یا تو جیسے ہی اس حصار کو عبور کرے گی تو دہموش کی حبشی کنیز سارہ کو اس کا پتہ چل جائے گا اور پھر دہموش کو اس سے آگاہ کر دے گی۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے قبیلے کے کچھ کافر جنات کو بھی حصار کی نگرانی پر متعین کیا گیا ہے۔ یہ وہ کافر جنات ہیں جو تم دونوں کے وجود کی خوشبو سے تمہیں پہچان سکتے ہیں' انہی حالات کے پیش نظر میں نے کہا تھا کہ تم دونوں کا بغداد میں رہنا فی الحال قطعی ممکن نہیں۔''

''فی الحال!'' میں نے کہا۔ میرے نزدیک یہ لفظ بہت اہم تھا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ ہم بغداد میں رہ سکتے ہیں۔''

''اے دینار! مجھے امید تھی کہ تو لفظ فی الحال کو نظر انداز نہیں کرے گی۔'' عالم سوما بولا۔ ''ہاں یہ پابندی عارضی ہے یعنی فی الحال..... صرف اس وقت تک کہ بغداد کے گرداگرد حصار کو میں توڑ نہ دوں' اس حصار کو توڑنے کیلئے مجھے چالیس دن تک ایک عمل کرنا پڑے گا' رہے کافر جنات تو انہیں مار بھگانا کون سا مشکل ہے۔''

''مگر اے سوما! کیا حصار کے توڑے جانے سے وہ عفریت چوکنا نہیں ہو جائے گا؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں' اسے حصار ٹوٹنے کا علم نہیں ہو سکے گا۔'' عالم سوما نے جواب دیا۔ ''مگر ابھی کیونکہ میں بیمار ہوں اس لئے مطلوبہ عمل کرنا......''

''میں سمجھتی ہوں اے میرے باپ کے دوست!'' میں بول اٹھی۔ ''تو آرام و علاج کر' جب صحت یاب ہو جائے تو حصار توڑنے کیلئے عمل کر لینا۔ اتنے میں عارج کو لے کر کچھ عرصے کیلئے کسی اور زمانے میں چلی جاتی ہوں۔''

''اس مرتبہ کی طرح لوٹنے میں بیس برس نہ لگا دیجو' اے دینار!'' عالم سوما نے

کہا۔

"تجھ سے ایک بات اور پوچھنی تھی اے سوما!" میں بولی۔ "کسی اور زمانے میں جا کر کیا انسانی قالبوں میں ہمارا روپوش رہنا بھی ضروری ہے؟...... یہ عارج کوئی انسانی جسم اپنانے پر بہت بضد رہتا ہے۔"

"ضروری تو نہیں لیکن مزید احتیاط کے طور پر تم دونوں انسانی قالبوں ہی میں رہو تو بہتر ہے۔" عالم سوما نے جواب دیا۔ میں نے یہ بات عالم سوما سے اس لئے بھی پوچھی تھی کہ کبھی کبھار انسانی قالبوں کی فطری صفات ہم پر غالب آنے لگتی تھیں۔ اس کا تلخ تجربہ عارج کے سلسلے میں مجھے دو مرتبہ ہو چکا تھا۔

وہ رات ہم نے بابل کے کھنڈرات ہی میں گزاری اور صبح دم ایک بار پھر عراق سے روانہ ہو گئے۔ اس مرتبہ بھی ہماری منزل ہندوستان ہی کی سرزمین تھی۔ ہندوستان کی آب و ہوا سے ہم خاصی حد تک مانوس ہو چکے تھے۔ عارج نے وہیں چلنے پر اصرار کیا تھا۔

190 ہجری سے ہم سینکڑوں صدیوں آگے نکل آئے۔ یہ مغل تاج دار ابوالمظفر نورالدین محمد جہانگیر کا عہد تھا۔ جہانگیر کو ہندوستان پر حکومت کرتے ہوئے 6 سال گزر چکے تھے اب 1021 ہجری تھی یوں گویا مستقبل میں ہم 831 سال آگے پہنچ گئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ بابر کی شجاعت' ہمایوں کی علم دوستی اور اکبر کا تدبر تیموری تخت پر جہانگیر کی شکل میں مجسم ہو گیا تھا مگر وہ ایک صاحب دل بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی عظیم الشان سلطنت حسن کے قدموں پر نچھاور کر دی۔ وہ ہندوستان کا شہنشاہ تھا لیکن اس کے دل پر ایک عورت حکمراں تھی جس کے اشارۂ چشم پر قسمتوں کے فیصلے ہوتے رہتے تھے۔ محبت اور سیاست کی اس آنکھ مچولی نے ہندوستان کو ہنستے بولتے زندگی گزارنے کا راز سکھایا۔

190 ہجری سے ہم 16 محرم 1021 ہجری میں پہنچے تھے۔ جلوس کا یہ ساتواں سال اور جشن نوروز تھا۔ اس سال کا یہ اہم واقعہ ہے کہ نوروز کے موقع پر ملکہ نور جہاں کی ماں کی خدمت میں عطر گلاب پیش کیا جو خود اس کی ایجاد تھی۔ بادشاہ نے اسے بہت پسند کیا اور اس کا نام "عطر جہانگیری" رکھا۔ نور جہاں کی ماں کو بادشاہ نے مروارید کا ایک ہار انعام میں عطا کیا۔ ہار کی قیمت 30 ہزار روپے تھی۔ یہ ایجاد واقعی حیرت انگیز تھی کہ کوئی خوشبو اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی مہک اتنی مست کن تھی کہ آدم زاد تو آدم زاد ہم جنات کو بھی بے خود کر دے۔

ہم ہندوستان کے جس علاقے میں اترے پہلے اس کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کیں۔

حاصل معلومات یہ تھا جہانگیر نے ایام شہزادگی میں اپنے باپ اکبر کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اکبر کے نورتنوں میں سے ایک رتن شیخ ابوالفضل کو جہانگیر ہی نے قتل کرایا تھا' جو شخص ابوالفضل کا سر کاٹ کر لایا اور اسے جہانگیر کے قدموں میں ڈال دیا اس کا نام نرسنگھ راؤ تھا۔ اکبر کی وفات کے بعد جب جہانگیر ہندوستان کے تخت پر بیٹھا تو اس نے نرسنگھ راؤ کو نظر انداز نہ کیا۔

شیخ ابوالفضل کے قاتل نرسنگھ راؤ کو مغلیہ دربار سے راجہ کا خطاب ملا اور گوالیار کے قریب ایک بڑا علاقہ بھی اس کی جاگیر میں شامل کر دیا گیا۔ نرسنگھ راؤ اسی علاقے کا تھا۔ یہ سارا علاقہ خاردار جنگلوں اور دشوار گزار گھاٹیوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس علاقے میں بسنے والے راجپوت بڑے جیالے اور عزت آن والے تھے۔ اکثریت راجپوتوں کی تھی اور مسلمان گھرانے برائے نام تھے۔ ان راجپوتوں کا پیشہ ایک زمانے سے سپہ گیری تھا۔ یہاں سے مغل فوج میں بھرتی ہونے والوں کی تعداد خاصی تھی۔ علاقے کا صدر مقام شاہ پور تھا۔

شاہ پور کے ایک بڑے اور معزز خاندان کا ایک فرد امر سنگھ بھی یہیں سے آگرہ گیا تھا۔ آگرہ اس وقت دارالحکومت تھا۔ یہ بات جہانگیر کے باپ اکبر کے زمانے کی ہے۔ اس زمانے میں شیخ سلیم الدین چشتی کی بہت شہرت تھی۔ امر سنگھ ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہو گیا۔ جب وہ شاہ پور لوٹ کر آیا تو اس کی بیوی اور بیٹوں نے بھی اسلام قبول کر لیا تبھی سے وہ راجپوت خاندان دو حصوں میں بٹ گیا۔ امر سنگھ کا کوئی بھائی مسلمان نہ ہوا مگر خاندانی تعلق برقرار رہا۔ مسلمان ہو کر امر سنگھ نے اپنا نام حسن علی رکھ لیا تھا وہ پوتوں والا ہو کر مر گیا۔ اس نومسلم حسن علی کا ایک پوتا دلاور علی تھا۔

یہی وہ دلاور علی تھا کہ عارج نے اس کے جسم میں رہنا پسند کیا۔ اسے دلاور علی کے جسم میں اتر کر قرار آ گیا تھا۔

"اے عارج! تو بھی اس آدم زاد نوجوان دلاور علی کے جسم کو اپنا مستقل ٹھکانا نہ جان۔" میں نے عارج کو تاکید کی۔

"وہ کیوں اے دینار؟" عارج نے دریافت کیا۔

"میں پہلے اس آدم زاد کی فطری صفات کے بارے میں جان لینا چاہتی ہوں۔ اب میں گزشتہ تلخ تجربات کا اعادہ نہیں چاہتی۔ تیری قوت ارادی مضبوط نہیں اے عارج کہ تو کسی انسانی قالب کی فطری صفات کو اپنے اوپر غالب نہ آنے دے۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں اے دینار! تو اپنی تسلی کر لے۔" عارج بولا اور دلاور علی کے

جسم سے باہر آ گیا۔

پھر میں نے دلاور کے بارے میں جو معلومات حاصل کیں وہ اطمینان بخش ہی تھیں۔ اس کے کردار میں کجی نہیں تھی۔

بچپن ہی سے دلاور علی ذہین اور نڈر تھا۔ کیوں کہ دادا کے ہاتھوں اس کی تربیت ہوئی تھی اس لئے عقائد کے معاملے میں بھی وہ بہت مضبوط تھا۔ اسے بزرگان دین کی بڑی حکایتیں یاد تھیں۔

ہر جاگیر اور تعلقے کی طرح شاہ پور میں بھی ایک سالانہ جشن ہوتا۔ دلاور علی اس میں باقاعدگی سے حصہ لیتا تھا۔

منعقد ہونے والے سالانہ جشن میں جواں مردی اور بہادری کے مظاہرے کیے جاتے۔ راجا نرسنگھ راؤ جیتنے والے بہادروں کو انعامات دیتا۔ ان میں سب سے بڑا انعام ویر چکر تھا جسے بھی یہ اعزاز ملتا وہ سارے علاقے کا ویر (بہادر) کہلاتا۔ گزشتہ کئی برسوں سے یہ اعزاز کسی کو نہیں ملا تھا۔ اور اس کی وجہ تھی۔

ویر چکر کیلئے ہمیشہ دو نام سامنے آتے۔ پہلا نام راجہ نرسنگھ راؤ کے بیٹے جھجار سنگھ کا ہوتا اور دوسرا نام دلاور علی کا۔ ویر چکر حاصل کرنے کیلئے آخری مقابلہ انہی دونوں کے درمیان ہوتا۔ گھڑسواری، نیزہ بازی، شمشیر زنی اور تیر اندازی میں وہ دونوں ہم پلہ ٹھہرتے اور مقابلہ برابر رہتا۔ دونوں کیونکہ ایک ہی اعزاز حاصل کرنے کی خاطر کئی سال سے لڑ رہے تھے اس لئے اندر اندر ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے رہتے تھے۔ جھجار سنگھ کو راجہ کا بیٹا ہونے پر ناز تھا تو دلاور علی کو اپنے معزز خاندان پر فخر تھا۔ دونوں ہی نوجوان تھے۔ ان کی عمریں اٹھارہ بیس سال سے زیادہ نہ تھیں۔ وہ اسی لئے بڑے پرجوش نظر آتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خاطر جدوجہد کرتے۔ بڑے بڑے بالوں والے وجیہہ و خوبصورت دلاور کو قدرت نے صرف بہادری کا جوہر ہی عطا نہیں کیا تھا بلکہ اس میں عشق کا جوہر بھی تھا۔ اس کی فطرت میں ہوس کا شائبہ تک نہ تھا۔

دلاور علی کی فطری صفات کو اچھی طرح پرکھ لینے کے بعد ہی عارج کو میں نے اس کا جسم اپنا لینے کی اجازت دی۔

اس دوران میں خود عارج نے بھی دلاور علی کے متعلق بہت سی باتیں معلوم کر لی تھیں۔ انہی کی روشنی میں عارج مجھ سے کہنے لگا۔ ''اے دینار! اب تو پاربتی کے جسم میں اتر جا۔''

میں مسکرائی اور بولی۔ ''یہ تو اس لئے کہہ رہا ہے کہ پاربتی تیرے انسانی قالب دلاور علی کی محبوبہ ہے لیکن تو کچھ باتیں بھول رہا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ابھی مجھے پاربتی کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ دوم یہ کہ ضروری نہیں مجھے اس کے جسم میں اتر کر قرار آ ہی جائے۔ سب سے اہم اور آخری بات یہ کہ وہ غیر مذہب کی ہے۔ کیا خبر دلاور اور پاربتی کا ملاپ ہو بھی سکے یا نہیں۔''

''تو پھر پاربتی کے متعلق معلوم کر اور دیر نہ لگا۔'' عارج نے جلدی سے کہا۔ ''تو کسی بھی زمانے میں چل، رہوں گا میں تیرے ساتھ ہی۔''

''بس رہنے دے، میں تجھے اچھی طرح جانتی ہوں تو بڑا ہی بے وفا ہے۔ جب میں تجھ سے گلہ کرتی ہوں تو الزام انسانی قالب پر لگا دیتا ہے...... خیر تو کہتا ہے تو اس پاربتی کو بھی دیکھے لیتی ہوں۔'' میں نے عارج کو یقین دہانی کرائی۔

دلاور ہی کے خاندان کی دوسری شاخ سے پاربتی کا تعلق تھا۔ اسے گھر سے کم ہی نکلنے دیا جاتا تھا۔ اس کا سبب نوجوان دوشیزہ پاربتی کا بلاخیز حسن تھا۔ گھر والے اسے تنہا باہر بھیجتے ہوئے ڈرتے۔ اس کا حسن دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتا جس نے بھی اسے ایک بار دیکھا بھول نہ سکا۔ بڑے بوڑھے اسے دیکھ کر کہتے کہ صدیوں بعد اس علاقے میں ایسی حسین لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ دراز قد، چھریرا جسم، ہاتھ پاؤں اگرچہ کسی قدر چوڑے چکلے مگر موزونیت میں بے مثل، رنگ خوب کھلتا ہوا گندم گوں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی مستانہ آنکھیں، باریک اور نہایت خوبصورتی کے ساتھ بل کھاتی ہوئی بھنویں اور سیاہ لمبے گھنے بال، حسین رخساروں میں باریک باریک نیلی رگیں۔ یہ تھی وہ دوشیزہ پاربتی جو دلاور علی ہی نہیں عارج کو بھی پسند آ گئی تھی۔ میری نظر سے بھی ایسی آدم زادیاں کم ہی گزری تھیں۔ دلاور علی کو جانے کیوں یہ گمان تھا کہ مذہب کی دیوار پاربتی اور اس کے درمیان حائل نہیں ہوگی۔

بچپن ہی سے دلاور اور پاربتی ساتھ کھیلے کودے اور جوان ہوئے تھے۔ راجپوت اور مغل گھرانوں میں عورتیں اور لڑکیاں بھی باقاعدہ منجھے ہوئے استادوں سے فن حرب و ضرب سیکھتیں تاکہ وقت پڑنے پر اپنے مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ لڑ سکیں۔ سو پاربتی کو بھی بچپن سے یہ تربیت دی گئی۔ عورتیں اور لڑکیاں تربیت حاصل تو کر لیتیں مگر عموماً انہیں گھرداری میں زیادہ دلچسپی ہوتی۔ اسی وجہ سے سینکڑوں ہزاروں میں کوئی لڑکی یا عورت ایسی نکلتی جو اپنی تلوار کا لوہا مردوں سے بھی منوا لیتی۔ پاربتی بھی ایسی ہی لڑکیوں میں تھی۔ خاندان بھر میں دلاور کے سوا کوئی اس کے مقابل نہ ٹھہرتا اور کبھی کبھی تو وہ دلاور سے بھی کوڑی بلوا لیتی۔

ایسے وقت دلاور کی توجہ تلوار کے بجائے پاربتی کے چہرے پر ہوتی۔ وہ جیسے تلوار چلانا بھول جاتا۔

"بچو دلاور!" پاربتی کہتی اور دلاور دانستہ تلوار پھینک دیتا۔

"تم ہار گئے۔" وہ خوش ہوتی اور اس کا چہرہ گل و گلزار ہو جاتا۔

"ہاں میں ہار گیا پارو!" دلاور کہتا۔ "تم سے ہارنے میں بھی میری جیت ہے۔"

پاربتی جب دلاور کی ان باتوں کا مفہوم کچھ کچھ سمجھنے لگی تو اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑنے لگی۔ دلاور پیار میں اسے پاربتی کے بجائے پارو کہتا۔ دلاور کے سوا اسے کوئی اور پارو نہیں کہتا تھا۔ اس کی وجہ سے پاربتی کی زندگی میں کیا بڑی تبدیلی پیدا ہوئی میں یہ ذکر بعد میں کروں گی۔ پہلے میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ پاربتی کے جسم میں اتر کر مجھ پر کیا گزری۔

واقعہ یہ ہے کہ پاربتی کے جسم سے پہلے میں کبھی کسی کافر آدم زادی کے اندر نہیں اتری تھی۔

پاربتی کے جسم میں داخل ہوتے ہی مجھے گھپ اندھیرے اور گھٹن کا احساس ہوا۔ پھر بھی میں باہر نہیں نکلی اور اپنی قوت برداشت کا مظاہرہ کیا۔ کافی تگ و دو اور پوری کوشش و جدوجہد کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ اس آدم زادی کے جسم میں ایک دن یا ایک رات سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔ مجھے اس کے جسم کو چھوڑنا پڑے گا۔ پھر دو چار گھڑی گزر جانے پر ہی میں دوبارہ پاربتی کے جسم کو اپنا سکتی ہوں۔ اس حقیقت سے میں نے عارج کو بھی بے خبر نہیں رکھا۔

"اے دینار! تجھے اس طرح مستقل نہیں عارضی ٹھکانہ تو مل ہی جائے گا۔" عارج کہنے لگا۔

اس پر میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ میں نے سوچا تھا کہ اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہوگی۔ کسی انسانی قالب میں مستقل طور پر نہ رہنے کا تجربہ میں پہلے بھی کر چکی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب میں ہندوستان ہی کے ایک علاقے میں حبشی حمید خاں کی بیوی بن کر رہی تھی۔ رات کے وقت اکثر میں حمید خاں کی بیوی کا قالب بوجوہ چھوڑ دیتی تھی۔ انسانی قالب سے باہر رکھنے کی اس مدت میں اضافہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اس طرح میرے وجود کو کوئی خطرہ تو پیش نہیں آتا۔ اسی احساس کے پیش نظر میں نے عالم سوا کی رائے معلوم کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ کسی اور زمانے میں جا کر انسانی قالب کے اندر رہنا ضروری نہیں احتیاطاً البتہ یہ قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ دن کے وقت فی الحال پاربتی کے جسم میں رہا کروں گی۔ سو اسی روز میں پاربتی کے جسم میں اتر گئی۔

واقعہ اسی دن کا ہے راجہ کے بیٹے جھجار سنگھ نے مجھے پارو کہا۔ اس کے لہجے سے سفلے پن کا اظہار ہو رہا تھا جو مجھے گراں ہوا۔

دلاور علی کے انسانی قالب میں عارج بھی وہیں موجود تھا۔

جھجار سنگھ سے میں نے کہا۔ "اب سے مجھے پارو نہ کہنا تم۔"

"کیوں؟" جھجار سنگھ اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"بس کہہ دیا کہ نہ کہنا" میں نے وجہ نہ بتائی کہ ایسا کہتے ہوئے وہ مجھے گھٹیا لگا تھا۔

اسی وقت عارج نے مجھے مخاطب کیا۔ "چلو پارو! اب گھر چلتے ہیں۔"

"سمجھا!" جھجار سنگھ نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا پھر مزید بولا۔ "پارو کہنے کا حق تم نے شاید دلاور کو دے رکھا ہے۔" "جھجار سنگھ!" عارج نے مداخلت کی۔ "اس سے پہلے کہ مجھے غصہ آ جائے تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"برا مان گئے" جھجار سنگھ بے حیائی سے ہنسا۔ پھر کہنے لگا۔ "میں راجہ نرسنگھ راؤ کا بیٹا ہوں دلاور! یہ نہ بھولا کرو میں نے اگر اسے پارو کہہ دیا ہے تو پھر اب سے یہ میرے لئے پارو ہی رہے گی۔ ہاں اگر میں چاہوں تو تم اسے پارو نہ کہہ سکو گے۔"

بات بڑھ جاتی مگر میں نے بیچ بچاؤ کرا دیا اور عارج کے ساتھ سیر کر کے گھر لوٹ آئی۔

عارج کو اور خود مجھے بھی خبر نہ تھی کہ جھجار سنگھ نے جو کہہ دیا ہے کر بھی دکھائے گا۔ ہم نے جھجار سنگھ کی بات کو گیدڑ بھبکی سمجھ کر بھلا دیا۔ حقائق کا علم مجھے اس وقت ہوا جب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔

ہوا یہ کہ جس دن جھجار سنگھ سے پارو کہنے پر میری اور عارج کی تکرار ہوئی تھی اسی دن اس نے اپنی ماں سے بات کی۔ ماں نے جھجار سنگھ کو سمجھایا کہ وہ ایسی چھوٹی بات نہ کرے۔ اس کیلئے کوئی بھی راجہ اپنی بیٹی دے سکتا ہے۔

جھجار سنگھ سرکش، خودسر اور ضدی تھا۔ وہ اپنی ضد پر اڑ گیا۔ مجبوراً اس کی ماں نے اپنے شوہر سے یہ ذکر کیا۔

نرسنگھ راؤ بھی اس رشتے پر راضی نہ تھا مگر وہ بیٹے کی خودسری سے بھی واقف تھا۔ اس نے پاربتی کے باپ کو بلا کر رشتے کی بات کی۔ پاربتی کے باپ نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ اس کی بیٹی اتنے بڑے گھر کی بہو بنے گی اور راجہ نرسنگھ راؤ اس کا سمدھی ہو جائے گا۔ اس نے خاندان والوں سے مشورہ کیے بغیر اسی وقت رشتہ منظور کر لیا۔ اسے یقین تھا کہ جب خاندان والوں کو

اس بات کی خبر ہو گی تو سبھی اس کے فیصلے کی تائید کریں گے جو دوست ہوں گے انہیں خوشی ہو گی اور دشمن جلیں گے۔ پاربتی کے باپ کا اندازہ غلط ثابت نہ ہوا۔ پھر یہ کہ ہمت بھی کس میں تھی کہ راجہ نرسنگھ راؤ کے خلاف زبان کھول سکتا۔ خاندان بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

ذہنی طور پر پاربتی ابھی بلوغت کی اس منزل پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ اپنے لئے درست یا نادرست کا فیصلہ کر سکے۔ اسی بنا پر جب اسے اپنے رشتے کا علم ہوا تو بس یہ خیال آیا کہ دلاور اسے پسند نہیں کرے گا۔ وجہ یہ کہ دلاور اور جھجار سنگھ ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ مختلف اوقات میں دلاور کی باتوں سے پاربتی کو یہ اندازہ بھی ہوا تھا کہ دلاور اسے پسند کرتا ہے۔ اسے بھی دلاور اچھا لگتا تھا مگر دونوں میں سے کسی نے اپنے جذبوں کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پاربتی عمر کی اس منزل میں تھی کہ عشق کی گہرائی اور اس کے رموز و نکات سمجھنا آسان نہ تھا۔ اس نے اپنے والدین اور خاندان والوں کی بے پناہ خوشی کے آگے اپنے جذبات کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ پاربتی کے ردعمل کو جاننے کیلئے میں نے اس کا جسم چھوڑ دیا تھا۔

☆......☆......☆

پاربتی کو یہ خیال بھی تھا کہ دلاور اور اس کے درمیان مذہب کی دیوار حائل ہے جسے گرا دینا ممکن نہیں۔ وہ بڑے شوق کے ساتھ دلاور سے بزرگانِ دین کے قصے اور حکایتیں سنتی اور ان سے متاثر بھی ہوتی مگر اسے علم تھا اس کے والدین ہرگز اجازت نہیں دیں گے کہ وہ مسلمان ہو جائے یا دلاور کو اپنا لے۔ عقائد مختلف ہونے کے باوجود خاندان والے ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا خیال رکھتے تھے۔ وہ کبھی نہ ایک دوسرے کے عقائد کو زیر بحث لاتے' نہ تنقید کرتے اسی لئے وہ خاندان اب تک رشتوں ناتوں میں بندھا ہوا تھا اور ان کے درمیان اختلافات نہیں تھے۔

اس واقعے کے بعد جب عارج پہلی بار مجھ سے ملا تو بے حد اداس تھا۔ اس کے حریف جھجار سنگھ نے عشق کے محاذ پر اسے شکست دے دی تھی جس کا زخم بھرنا محال تھا۔

''اے عارج! تو اتنا کھویا کھویا سا کیوں ہے؟'' جب بہت دیر عارج چپ رہا تو میں نے اسے مخاطب کیا۔

''یہ تو پوچھ رہی ہے اے دینار!'' عارج کی آواز میں کڑواہٹ تھی۔ ''کیا تجھے خبر نہیں کہ تو اس حویلی کو چھوڑ کر اونچے برجوں والے قلعے میں جانے والی ہے...... وہ بھی جھجار سنگھ کی بیوی بن کر۔''

''ہاں خبر ہے۔'' میں نے کہا۔ مجھے عارج کے لہجے کی تلخی پسند نہیں آئی تھی۔ میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولی۔ ''تو شاید بھول رہا ہے کہ جھجار سنگھ کا رشتہ مجھ سے طے نہیں ہوا۔ اس کی بیوی میں نہیں پاربتی بنے گی...... مجھے معلوم تھا عارج کہ تو اس پر خوش نہیں ہوگا' پر ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔ ہونی کو کس نے ٹالا ہے۔''

''مگر میں اسے انہونی سمجھتا ہوں۔'' عارج کی آواز سے غصہ جھلکنے لگا۔ غالباً اسے توقع نہیں تھی کہ مجھے بھی اس رشتے پر اعتراض نہ ہوگا۔ میرے نزدیک عارج کا غصہ اس کے انسانی قالب کے سبب تھا۔ اس کا انسانی قالب پاربتی کو بے پناہ چاہتا تھا۔ پھر بھی عارج

ہونے کی حیثیت سے اسے اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔ اسی وجہ سے میں بھی غصے میں کہنے لگی۔ ''تو اسے اگر انہونی سمجھتا ہے' سمجھا کر' مجھے کیا۔''

''تجھے کیا۔'' عارج نے بدستور غصے میں کہا۔ ''ٹھیک کہا تو نے اے دینار!...... تجھے کیا...... میں جانتا ہوں تو چاہتی تو یہ رشتہ ہرگز نہ ہو پاتا...... لیکن تو میرے پاس رہنا کب چاہتی ہے۔ تو نے کبھی جھجار سنگھ کو بھی غور سے دیکھا ہے۔ وہ صورت ہی سے چمار معلوم ہوتا ہے۔''

''عارج!'' میرا پارہ چڑھ گیا۔ ''اپنی حد میں رہ عارج!'' پھر دانستہ اسے چڑانے کی خاطر میں بولی۔ ''تو اس شخص کو برا بھلا کہہ رہا ہے جو میرے انسانی قالب کا منگیتر ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔''

''کیا ہے وہ؟ بتا'' عارج خفگی سے بولا۔

''راجہ نرسنگھ کے بعد وہی راج سنگھاسن پر بیٹھے گا۔ پھر کیا تو کیا میں دونوں ہی اس کی رعایا کہلائیں گے اور وہ راجہ!'' میں نے کہا۔

اس پر عارج نے طنز کیا۔ ''تو رعایا میں کب ہو گی' تجھے تو سب رانی کہیں گے اے دینار!''

''ہاں کہیں گے رانی پھر؟'' میں غصے میں آ کر اسے اور بھی چڑانے لگی۔ ''جھجار سنگھ نسلی اور اصلی راجپوت ہے۔ اس کے پرکھوں نے اپنے مذہب کو نہیں بدلا جس طرح کہ تیرے انسانی قالب دلاور علی کے......''

''مگر تیرے انسانی پیکر کے پرکھے بھی تو وہی تھے جو میرے تھے۔'' عارج بول اٹھا۔ ''بول کیا تو اس بات سے انکار کر سکتی ہے کہ تیرے اور میرے انسانی قالبوں کے دادا سگے بھائی تھے۔''

''مجھے اس سے کیا لینا' ہوں گے۔'' میں نے بے رخی سے کہا۔

پھر اس دن کے بعد سے میرے اور عارج کے درمیان تلخی بڑھتی گئی۔ میں عموماً پاربتی کے جسم سے نکل آتی اور تماشہ دیکھتی۔ نوخیز و نوجوان پاربتی کو اس وقت یہ احساس نہ تھا کہ اس نے کوئی شیشہ دل توڑ دیا ہے۔ اس کی چاہت جیسے کچے دھاگے سے بندھی ہوئی تھی جو ایک ہی جھٹکے میں ٹوٹ گئی۔ اس کے برعکس اپنے انسانی قالب کے زیر اثر عارج تمام تر تلخیوں کے باوجود اپنے عشق میں سچا تھا۔ وہ سچا تھا اسی لئے رقابت کا زہر اس پر اثر کر چکا تھا۔ اسی زہر کا اثر تھا کہ اس نے مجھے بھی خفا کر لیا ورنہ عام حالات میں ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں

اکثر اسے شاہ پور کے قلعے اور اس کے اونچے برجوں کو حسرت سے تکتے دیکھتی۔ اسے شاید نہ اپنی قسمت سے گلہ تھا نہ حالات سے۔ رنج تھا تو غالباً یہ کہ جسے اس نے کبھی غیر نہ سمجھا' وہی بدل گئی۔ وہ محبت کے دو بول ہی کہہ دیتی' آنسو ہی بہا دیتی' یہی تسلیم کر لیتی کہ جھجار سنگھ واقعی اس کے انسانی قالب کے قابل نہیں ہے تو ممکن ہے عارج کو چین آ جاتا مگر میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا' کچھ بھی نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

میرا اپنا نقطہ تھا کہ زمانہ بدل جانے سے محبت نہیں بدل جاتی۔ سو عارج کو بھی نہیں بدلنا چاہیے تھا۔

عارج نے اب اس حویلی میں آنا چھوڑ دیا تھا جہاں میں پاربتی کے قالب میں رہتی تھی۔ پہلے ایسا نہیں تھا۔ مجھے دیکھے بغیر وہ بے کل سا رہتا تھا۔ بے کلی تو خیر اسے اب بھی تھی مگر اس نے اپنے دل کو مار لیا تھا۔ گویا اب اس گلی میں جانا کیا' اب اس کوچے میں خاک اڑانا کیا جہاں اس کے ارمانوں کا خون بہا ہے' شاید عارج یہی سوچتا ہو اور اس کے قدم رک جاتے ہوں۔

کئی دن ہو گئے اور عارج نہ آیا تو میں خود ہی اس سے ملنے پہنچ گئی۔ شام کا وقت تھا اور عارج گھر کے اوپر والے دالان میں پڑا ہوا غالباً اپنے خوابوں کا ماتم کر رہا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لئے اور پلنگ پر لیٹے لیٹے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ لازماً مجھ پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ میرے بغیر اس کی زندگی بالکل بے رنگ ہو گئی ہے۔

''آ اے دینار!'' اس نے یوں مسکرا کر کہا جیسے کوئی بات نہ ہو۔

میں اس کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''تیرا غصہ شاید ابھی اترا نہیں۔''

''نہیں مجھے تو کوئی غصہ نہیں' میں کیوں غصہ ہوتا۔''

''پھر مجھ سے غیروں کی طرح بات کیوں کر رہا ہے؟''

عارج نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہنے لگا۔ ''اپنا تو کسی اور کو تو نے بنا لیا ہے اے دینار!''

''دیکھ عارج' تو نے پھر وہی بات چھیڑ دی۔ آخر تجھے جھجار سنگھ سے اتنی نفرت کیوں ہے؟''

''اس لئے کہ وہ اسی قابل ہے۔'' عارج طیش میں آنے لگا یقیناً میری زبان سے اپنے رقیب کا نام سن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ وہ مزید بولا۔ ''اس نے صرف میری دشمنی میں تجھے اپنایا ہے۔ وہ کمینہ اور بزدل ہے۔''

''اس نے مجھے یعنی دینار کو نہیں پاربتی کو اپنایا ہے۔'' میں بولی۔

''ایک ہی بات ہے۔'' وہ منہ بگاڑ کر کہنے لگا۔

''نہیں ہے ایک بات'' میں نے تردید کی۔ ''اور اگر تو اسے ایک ہی بات سمجھتا ہے تو کیا تجھے یہ خیال نہیں کہ تو میرے ہی منہ پر میرے منگیتر کو برا بھلا کہہ رہا ہے۔'' میری آواز میں بھی اب تیزی آ گئی۔

''وہ تیرا منگیتر ہوا کرے لیکن میں اسے اپنا دشمن سمجھتا ہوں۔'' عارج کا لہجہ یہ کہتے ہوئے مزید سخت ہو گیا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اس نے مزید کہا۔ ''مجھے جب بھی موقع ملا اسے ذلیل کروں گا۔''

''تیرے انسانی قالب کو برسوں تو ہو گئے اس سے لڑتے ہوئے کسی نے آج تک نہیں سنا کہ دلاور علی اپنے مدمقابل جھجار سنگھ کے ہاتھ سے تلوار گرا سکا ہو۔ دلاور اس برس بھی جشن میں یہی کہہ گیا تھا کہ اپنے حریف کو ذلیل کرے گا۔ پھر کیا ہوا؟ دلاور کو کامیابی ہوئی؟''

میں بھی جواباً نشتر زنی کرنے لگی۔

''تو اب تو میرے مقابلے پر اس کی حمایت کرے گی۔'' غصے کی زیادتی سے عارج کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ ''وہ جسے تیرا انسانی قالب بھالو اور ریچھ کہتا ہے' وہی تجھے اتنا عزیز ہو گیا' تو جلد ہی میرے ہاتھوں اس کا حشر دیکھ لے گی۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکے گا؟''

''جھجار سنگھ کو چھوڑ اے عارج! تو مجھ سے بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

''تجھ سے مقابلہ اے دینار!'' عارج اس طرح بولا جیسے اس کے سینے میں کوئی نشتر ٹوٹ گیا ہو۔ ''تو...... تو لڑے گی مجھ سے۔''

''کیوں' اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ میں تجھے ہر میدان میں شکست دے سکتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا میں اپنے انسانی قالب کے زیر اثر سب کچھ کہہ رہی ہوں۔ پارتی کے مزاج میں بڑی ضد تھی۔

میں نے عارج کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو یوں لگا کہ اس کی قوت برداشت جواب دینے لگی ہو۔ اسے مقابلے کی دعوت میں دے رہی تھی۔ میں جسے اس نے چاہا تھا' ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ وہ اسی پر تو خفا تھا کہ اب مجھ پر جھجار سنگھ اپنا حق جتا رہا تھا۔

میرے بجائے کوئی آدم زادی ہوتی یا جن زادی' عارج شاید اس سے مقابلے کا فیصلہ نہ کرتا۔ صنف نازک سے لڑنا وہ اپنی مردانگی کے خلاف سمجھتا لیکن میری اور بات تھی۔ نہ میں کوئی آدم زادی تھی نہ کوئی معمولی جن زادی۔ اس کے علاوہ میں نے جس آدم زادی پارتی

کے جسم پر قبضہ کیا تھا وہ بھی کوئی ایسی عام لڑکی نہیں تھی جس نے خاندانی روایت برقرار رکھنے کیلئے بس یوں ہی تلوار چلانا سیکھ لیا ہو۔ پارتی کو بھی شکست دینا آسان نہ ہوتا میری بات تو خیر الگ ہی تھی۔

''اے دینار! تیری ہی طرح میں بھی جنات میں سے ہوں۔'' عارج پر جوش آواز میں بولا۔ ''تو آگ سے بنی ہے تو میں بھی آگ سے پیدا کیا گیا ہوں۔ ہاں مجھے یہ ندامت ضرور ہو گی کہ میں نے ایک جن زادی سے نبرد آزمائی کی۔''

''مجھے صنف نازک ہونے کا طعنہ نہ دے اے عارج! میں جن زادوں کے منہ پھیر دینے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔'' میں نے بھی کسی جھجک کے بغیر ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ میری آواز میں جوش تھا۔ ''سن عارج! اگر تو مجھ سے ہار گیا تو پھر کبھی جھجار سنگھ کے خلاف تلوار نہیں اٹھائیو۔''

''اور تجھے شکست ہو گئی پھر؟'' عارج کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی۔ ''تو کیا جھجار سنگھ کو ٹھکرا دے گی؟ ہے اتنی ہمت''

''ہے ہمت!'' میں غصے میں بولی۔ اپنے انسانی قالب کے زیر اثر مجھے غصہ آئے جا رہا تھا۔ غصے پر قابو پانا میرے لئے مشکل تھا۔ بات بڑھتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ میں نے غصے میں ایک ایسی بات کہہ دی جو عارج کیلئے بھی حیران کن تھی۔

عارج کو یقیناً یہ گمان نہ ہو گا کہ میں اتنی بڑی بات کہہ دوں گی۔ وہ اسی لئے بولا۔

''تجھے احساس بھی ہے تو کیا کہہ رہی ہے۔''

''ہاں مجھے معلوم ہے۔'' میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔ ''میں زبان سے نہیں پھر سکتی' چاہے میری جان چلی جائے۔''

وہ بڑی بات یہ تھی کہ میں اپنے انسانی قالب پارتی کو اس صورت میں مسلمان ہونے پر مجبور کر دوں گی کہ عارج اگر مجھے شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔ مزید یہ کہ میں پارتی سے کہلوا دوں گی کہ وہ جھجار سنگھ سے شادی نہیں کرے گی۔

پھر میرے اور عارج کے درمیان مقابلے کی تفصیلات طے ہوئیں۔

سورج ڈوبنے سے پہلے ہی میں عارج کے ساتھ شاہ پور کے گھنے خاردار جنگل کی طرف نکل گئی۔ ہم دونوں گھوڑوں پر سوار تھے اور ہمارے جسموں پر ہتھیار سجے ہوئے تھے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی کہ بستی والے ہماری طرف متوجہ ہوتے۔ دلاور علی اور پارتی ہتھیار سجا کر ادھر جاتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ ہم دونوں انہی کے قالبوں میں تھے۔ انہوں نے بہت دن

جنگل میں مشقیں کی تھیں۔

ذرا دور جا کر جنگل میں ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہم تماشہ بنے بغیر اپنے حوصلے نکال سکتے۔ راستے میں ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ میری طرح عارج کی تیوریوں پر بھی بل پڑے ہوئے تھے۔ تلوار ڈھال نیزہ، خنجر اور تیر کمان، ہر ہتھیار ہم اپنے ساتھ لائے تھے۔ جب ہم مقابلے کی جگہ پہنچ گئے تو پہل عارج نے کی۔

پہلا مقابلہ تیراندازی کا ہونا تھا۔ عارج نے اپنے شانے سے لٹکی ہوئی کمان اتاری اور دو تیر ترکش سے نکال کر ہاتھ میں لے لئے۔ شرائط کے مطابق اسے گھوڑے سے نہیں اترنا تھا۔ سو وہ گھوڑے ہی پر بیٹھا رہا۔ میں بھی گھوڑے سے نہیں اتری تھی۔ عارج کے ہاتھ میں دو تیر دیکھ کر میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا "کمال" دکھانے والا ہے۔ میرے ہونٹوں پر اسی لئے استہزائیہ مسکراہٹ آ گئی جسے عارج نہیں دیکھ سکا۔ وہ میری طرف متوجہ نہ تھا۔

کمان میں تیر جوڑ کر عارج اسے اوپر فضا میں بلند کر رہا تھا۔ پھر اس نے کمان کھینچ کر تیر چھوڑ دیا۔

ابھی وہ پہلا تیر نیچے آ رہا تھا کہ عارج نے بڑی سرعت سے دوسرا تیر چھوڑ دیا۔ دوسرے تیر کا پھل، پہلے تیر کے دنبالے میں جا کر لگ گیا اور پھر دونوں تیر اسی طرح نیچے آ گرے۔ تیراندازی کا یہ وہ کمال تھا جو عارج کے انسانی قالب دلاور علی کو اپنے اجداد سے ورثے میں ملا تھا لیکن وہ یہ بھول گیا تھا کہ میرے انسانی قالب پارسی اور دلاور کے اجداد ایک تھے۔

اب میری باری تھی۔ جب میں نے پہلا تیر چھوڑا تو میرے قالب کا حسین و نازک جسم بھی کسی کمان کی طرح تن گیا۔ ابھی میرے ہاتھ میں دو تیر اور تھے۔ میں نے فضا میں چھوڑے ہوئے پہلے تیر کو بالکل عارج ہی کی طرح نشانہ بنایا۔ میرے چھوڑے ہوئے دونوں تیر یکے بعد دیگرے پہلے تیر کے دنبالے میں لگے۔

اس طرح گویا میں نے یہ ثابت کر دیا کہ تیراندازی میں عارج سے ایک قدم آگے ہوں۔ تیراندازی کی مشقوں کے دوران میں پارسی نے کبھی یہ مظاہرہ نہیں کیا ہو گا کیونکہ یہ میری اختراع تھی۔ عارج کو بہرحال یہ ضرور معلوم تھا کہ میرا نشانہ بہت سچا ہے۔ عارج بھی اگر یہ کوشش کرتا کہ ایک تیر کے بجائے دو تیر پہلے تیر کے دنبالے میں پیوست کر دے تو شاید ناکام نہ رہتا مگر اب وقت گزر چکا تھا۔ وہ اپنی شکست پر ملول سا دکھائی دیا لیکن ابھی اور مقابلے بھی تھے۔

مکمل ہار جیت کا فیصلہ ابھی باقی تھا۔ یہ فیصلہ اس وقت ہوتا جب گھڑسواری، نیزہ بازی اور شمشیرزنی کے مقابلے ختم ہو جاتے۔ جیت اس کی ہوتی جو زیادہ مقابلوں میں اپنی برتری تسلیم کرا لیتا۔ چار مقابلوں میں سے ابھی ایک ہی کا فیصلہ ہوا تھا۔ عارج اگر بقیہ تینوں مقابلوں میں مجھے ہرا دیتا تو شرائط کے مطابق جیتا ہوا قرار پاتا۔

تیراندازی کے بعد نیزہ بازی کا مقابلہ ہونا تھا۔ عارج نے غالباً پہلی شکست کے پیش نظر مجھ سے پہل کرنے کو کہا۔ "نہیں" میں بولی۔ "یہ بات ہمارے درمیان طے نہیں ہوئی تھی کہ ایک بار تو پہل کرے گا اور دوسری مرتبہ مجھے پہل کرنی ہو گی۔"

"تو اب؟"

"اب یہ کہ میں اپنا خنجر کسی درخت کے تنے میں گاڑے آتی ہوں تو اس کا نشانہ لے۔" پھر میں نے عارج کو مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

تیزی سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے میں نے وہ چھوٹا سا میدان عبور کیا اور اپنی پیٹی سے خنجر کھینچ کر ایک درخت کے تنے میں گاڑ دیا۔ پھر میں جس تیزی سے گئی تھی، اسی تیزی سے لوٹ آئی۔

میں نے آتے ہی عارج کو مخاطب کیا۔ "اگر تمہیں یاد نہ ہو تو پھر بتا دوں کہ خنجر کو نشانہ بنا کر درخت کے تنے سے نیچے گرانا ہے اور..." "اور اس طرح کہ میرا نیزہ درخت کے تنے میں پیوست نہ ہو۔" عارج نے میری بات پوری کر دی۔ "مجھے سب کچھ یاد ہے۔" عارج سپاٹ لہجے میں بولا اور نیزہ اپنے ہاتھوں میں تولنے لگا۔

عارج کی نگاہ دور اس درخت پر جمی ہوئی تھی جس کے تنے میں خنجر کا پھل پیوست تھا۔ وہ اسی لئے یہ نہ دیکھ پایا کہ میرے ہاتھ میں بھی نیزہ ہے۔ عارج نے نیزہ بلند کیا اور پھر نشانہ لے کر اسے ذرا ترچھا ہدف کی طرف پھینک دیا۔ نیزے نے ابھی نصف فاصلہ طے کیا تھا کہ چھناکا سا ہوا۔ عارج کا پھینکا ہوا نیزہ زمین پر آ رہا۔

عارج نے مجھے غصیلی نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "یہ بات شرائط کے قطعی خلاف ہے۔"

"کیا بات؟" میں جان کر انجان بن گئی۔

"تو نے میرے پھینکے ہوئے نیزے کو کیوں نشانہ بنایا؟"

"میں اپنا نشانہ آزما رہی تھی۔ میرا نیزہ غلطی سے تیرے نیزے سے ٹکرا گیا۔" میں نے بات تو بنا دی لیکن میرے لہجے سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ میں جھوٹ بول رہی

ہوں اور میں نے دانستہ عارج کو چڑانے کیلئے ایسا کیا ہے۔ دراصل یہ بھی میرا ایک حربہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عارج کو غصہ آ جائے اور وہ جذباتی ہیجان کا شکار ہو کر صحیح نشانہ نہ لے سکے۔ میں نے اسی غرض سے استہزائیہ انداز اختیار کیا اور مزید بولی۔ ''اپنا نیزہ اٹھالا اور دوبارہ کوشش کر کے دیکھ لے۔''

عارج نے غالباً اندازہ لگا لیا کہ اسے دانستہ غصہ دلانا چاہتی ہوں ورنہ میں یہ حرکت نہ کرتی۔ وہ اس لئے اپنا غصہ پی گیا اور کچھ کہے بغیر اپنا نیزہ اٹھالیا۔ مجھے اپنا حربہ ناکام ہوتا دکھائی دیا۔

پھر اس سے پہلے کہ عارج دوبارہ نیزہ پھینکتا میں بول اٹھی۔ ''میرے پاس ایک نیزہ اور بھی ہے۔''

''تو؟'' عارج اپنا نیزہ بلند کرتے ہوئے رک گیا۔ ''تو کیا کہنا چاہتی ہے؟''

''یہ کہ اگر میں چاہوں تو اس مرتبہ بھی تیرے نیزے کو درخت تک نہ پہنچنے دوں۔ جب تو اپنا نیزہ اٹھانے گیا تو تجھے میرا نیزہ بھی اٹھا کر لانا چاہیے تھا۔'' میں دانستہ اس سے الجھ رہی تھی۔

''کوئی زبردستی ہے؟''

''ہاں ہے تو'' میں اسے ہر ممکن طور پر غصہ دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''میں تجھ سے زبردست تو ہوں ابھی پہلے مقابلے میں میرا یہ دعویٰ ثابت بھی ہو چکا ہے۔''

''میں کسی قیمت پر تیرا نیزہ اٹھا کر نہیں لاؤں گا۔'' عارج کو آخر غصہ آ ہی گیا۔

میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تو جلدی سے بولی۔ ''اگر تو اس پر بضد ہو تو میں خو......''

''نہیں'' عارج نے میری بات کاٹ دی۔ ''اب یہ مقابلہ بعد میں ہوگا۔ پہلے میں تجھ سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہوں۔'' عارج کا ہاتھ تلوار کے قبضے پر چلا گیا۔ نیزہ اب اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔

جو مقابلے پہلے نسبتاً دوستانہ فضا میں ہو رہے تھے اب اور ہی رنگ اختیار کر گئے۔ عارج کے تیور دیکھ کر میں نے اپنے گھوڑے کو پیچھے ہٹا لیا اور اسی کے ساتھ نیام سے تلوار کھینچ لی۔ عارج بھی اپنے گھوڑے کو دور لے گیا۔

چند ہی لمحوں بعد ہم دونوں کے گھوڑے مخالف سمتوں سے بڑے وحشیانہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دوڑے۔ ہم دونوں ہی تلواریں علم کیے ہوئے تھے۔ گھوڑے قریب آ

گئے تو ہندی تلواریں بجلی کی طرح کوندنے لگیں۔ تلواروں کی جھنکار سے جنگل گونجنے لگا۔ دل کے ہاتھوں عارج پہلے ہی اپنی عزت نفس کو بہت مجروح کر چکا تھا اس لئے وہ میرے چہرے کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا یقیناً اسے اپنی کمزوری کا علم تھا۔ دیر تک ہم دونوں کی تلواریں آپس میں ٹکراتی رہیں مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ہم دونوں کو معمولی چرکے لگے۔

ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہوئے ہم دونوں ہی نے یہ خیال رکھا تھا کہ مقابلہ ہار جیت کے فیصلے کی خاطر ہے کسی کو نقصان پہنچانے کیلئے نہیں۔

ابھی ہمارے درمیان مقابلہ جاری ہی تھا کہ جانے کدھر سے جھجار سنگھ اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

''شرم کر!'' جھجار سنگھ چیخ کر عارج سے بولا۔ ''مرد ہو کر عورت سے مقابلہ کرتا ہے۔ اگر تو رشتے میں میرا ہونے والا سالا نہ ہوتا تو ابھی تیرا سر اڑا دیتا۔'' جھجار سنگھ کو غالباً خبر نہیں تھی کہ جو بات اس نے محض عارج کو غصہ دلانے کیلئے کہی وہ سچ بھی ہوگی۔ درحقیقت میرے اور عارج کے انسانی قالبوں میں خاندان کی طرف سے یہی رشتہ تھا۔ دلاور علی رشتے میں پارتی کا بھائی ہی لگتا تھا۔

بات کا زخم تلوار کے زخم سے کاری ہوتا ہے۔ عارج تلملا گیا۔ اس نے تیزی سے اپنا گھوڑا جھجار سنگھ کی طرف موڑا۔ یہ دیکھ کر جھجار سنگھ نے بھی اپنی تلوار سونت لی۔ ہر چند کہ عارج کافی تھک چکا تھا لیکن اس نے پہلے ہی ہلے میں جھجار سنگھ کے چھکے چھڑا دیے۔ اس کے حریف جھجار سنگھ کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ میں نے مداخلت نہیں کی حالانکہ جھجار سنگھ میرے انسانی قالب کا منگیتر تھا مگر اس کے پیچھے ہٹنے پر مجھے خوشی ہی محسوس ہوئی۔ ظاہر ہے عارج اس پر حاوی آ گیا تھا اور یہ بات بحیثیت دینار میرے لئے باعث مسرت ہی تھی۔ سیدھی سی بات تھی کہ میرے دل میں جھجار سنگھ کیلئے نہیں عارج کیلئے جگہ تھی۔

عارج بہت جوش میں تھا۔ وہ اپنے حریف کو سنبھلنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں جھجار سنگھ صرف اس کے حملوں سے بچاؤ پر مجبور ہو گیا۔ جھجار سنگھ اور عارج کے درمیان ہونے والا یہ مقابلہ شاہ پور میں ہر سال منعقد ہونے والے مقابلوں سے قطعی مختلف تھا۔ یہ مقابلے دلاور علی اور جھجار سنگھ کے درمیان ہوتے تھے۔

اس وقت عارج اور جھجار سنگھ دونوں ہی قواعد و ضوابط سے ہٹ کر لڑ رہے تھے۔ وقت بھی محدود نہ تھا کہ یہ مقابلہ رک جاتا۔ سالانہ مقابلوں میں وقت کی قید بھی ہوتی تھی۔ اسی قید کی وجہ سے دلاور علی اب تک اپنے حریف کو زیر نہ کر سکا تھا۔ اس مقابلے میں ایسی کوئی پابندی

نہ تھی۔ عارج وہ خطرناک داؤ بھی آزما رہا تھا مقابلوں میں جن کی ممانعت ہوتی تھی۔ مجھ سے لڑتے ہوئے اس نے ایسا نہیں کیا تھا کیونکہ میں بہرحال اس کی محبوبہ تھی۔

عورت کیلئے آدم زادوں میں ہمیشہ سے جنگ ہوتی آئی ہے مگر یہ جنگ ذرا مختلف تھی۔ اس جنگ کا ایک فریق پہلے ہی ہار چکا تھا اور ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔ اگر عارج اپنے حریف اپنے رقیب کو مقابلے سے بھاگنے پر بھی مجبور کر دیتا تو بھی میں اسے نہ ملتی۔

لڑتے لڑتے جھجار سنگھ نے ذرا سنبھالا لیا۔ عارج کے وار روکنے کے ساتھ ساتھ اب وہ خود بھی وار کرنے لگا۔ یہ الگ بات کہ جھجار سنگھ کے حملوں کی رفتار تیز نہ تھی مگر اس کے حملے تھے بہت خطرناک۔ میں پوری طرح مستعد و چوکنا تھی کہ جھجار سنگھ کا کوئی بھی وار عارج کیلئے جان لیوا ثابت نہ ہو سکے۔ دونوں ہی لڑاکا تھے۔ جب تک ان دونوں میں سے کوئی ایک گھوڑے سے نہ گر جاتا' مقابلہ جاری رہتا۔ ان دونوں ہی کے انداز حرب و ضرب سے اب واضح طور پر یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ میں نے جب یہ خطرہ محسوس کیا تو مداخلت کرنی چاہی۔

جب میں درمیان میں آ گئی تو دونوں ہی کو رکنا پڑا۔ ایک کی میں محبوبہ تھی' دوسرے کی گویا منگیتر' پھر بھلا چلتی ہوئی تلواریں کیسے نہ رک جاتیں۔

پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی' جھجار سنگھ کسی زخمی شیر کی طرح دہاڑا۔ "الگ ہٹ جا پاروا...... بیچ میں نہ آ۔ یہ مردوں کا کھیل ہے' موت اور زندگی کا کھیل' یہ کھیل مردوں ہی کو سجتا ہے۔"

مجھے جھجار سنگھ کی یہ بات بری لگی اور میں نے اپنا گھوڑا پیچھے ہٹا لیا۔ اگر یہ مقابلہ کسی طرح رک جاتا تو جھجار سنگھ ہی کیلئے بہتر ہوتا۔ وہ کئی زخم کھا چکا تھا اور ایک بار تو مرتے مرتے بچا تھا۔ اس کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر لگا ہوا زخم سب سے زیادہ مہلک تھا۔ اگر وہ تیزی سے اپنی ڈھال چہرے کے آگے نہ کر لیتا تو عارج کے دوسرے وار میں گھوڑے سے نیچے گر چکا ہوتا۔ زخمی عارج بھی تھا مگر اس قدر نہیں۔

درمیان سے میرے ہٹتے ہی اور جھجار سنگھ کو ذرا سا غافل پا کر عارج اپنی تلوار علم کیے اس کی طرف لپکا۔ میں سمجھ گئی کہ عارج کا یہ وار انتہائی خطرناک اور فیصلہ کن ثابت ہو گا۔

اگر اب میں بھی چاہتی تو جھجار سنگھ کو عارج کے وار سے نہ بچا پاتی۔ اس خطرناک وار سے جھجار سنگھ تو کسی طرح گھوڑے کی پشت پر لیٹ کر بچ گیا مگر اس کے گھوڑے کی ایک ٹانگ تقریباً آدھی کٹ گئی۔ نتیجہ یہ کہ گھوڑا ہنہنا کر الف ہو گیا اور جھجار سنگھ کو اپنی پشت سے نیچے گرا

کر ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔

جھجار سنگھ سر کے بل زمین پر گرا تو پھر اٹھ نہ سکا۔ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ عارج اپنے گھوڑے سے کود کر اس کی طرف جھپٹا۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ جھجار سنگھ کا کام تمام کر دینا چاہتا تھا۔ لڑائی کے جوش میں لازماً عارج کو یہ ہوش نہ رہا کہ جھجار سنگھ اب زمین سے اٹھنے کے قابل نہیں ہے۔ اسی وقت میں نے تیزی سے اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر عارج کا راستہ روک لیا۔ اسی دوران میں اپنی تلوار بھی نیام میں کر چکی تھی اور تلوار اب عارج کے سر سے زیادہ دور نہیں تھی۔

"آگے بڑھ کر بزدلی کا ثبوت نہ دے عارج!" میں نے بلند آواز میں کہا۔ مجھے یہ خدشہ نہیں تھا کہ کوئی میری آواز سن لے گا۔ وہاں عارج' جھجار سنگھ اور میرے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ جھجار سنگھ بیہوش تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں مزید بولی۔ "جو ہوش کھو بیٹھا ہو اس پر تلوار اٹھانا بہادروں کا شیوہ نہیں' سو تو بھی ایسا نہ کر۔"

میری بات سن کر عارج کی تلوار جھک گئی' اس کے چہرے سے سنجیدگی جھلک رہی تھی۔

"تو اگر اپنی زندگی...... میری مراد تیرے انسانی قالب سے ہے' تو یہاں سے بھاگ جا۔" میں نے عارج کو پھر مخاطب کیا۔ "یقین کر کہ یہ بات راز ہی رہے گی کہ میں نے تجھے...... یعنی پاربتی نے دلاور علی کو فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔ اگر کسی کو خبر ہو گئی کہ تو نے اس علاقے کے راجہ نرسنگھ راؤ کے جوان بیٹے کی یہ حالت بنا دی ہے تو تیرا زندہ بچنا مشکل ہے۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ تو مارا جائے۔"

"مگر کیوں؟ ...... کیوں اے دینار...... تو مجھے کیوں زندہ دیکھنا چاہتی ہے۔" عارج نے میرے چہرے کی طرف نگاہ اٹھائی۔

"تو...... تو اے عارج! اس...... اس کی وجہ اچھی طرح جانتا ہے۔ تیرے دل میں اگر ...... اگر ذرا بھی میرے لئے جگہ باقی ہے تو...... تو پھر میری بات مان لے۔" میرا لہجہ قدرے جذباتی ہو گیا۔ اب سے پہلے کبھی میں نے اپنی کوئی بات عارج سے منوانے کیلئے ایسا لہجہ اختیار نہیں کیا تھا۔ یقیناً یہ پاربتی کے قالب کا اثر تھا۔ پاربتی کے دل میں کہیں نہ کہیں دلاور کیلئے ضرور چاہت پوشیدہ تھی۔ اسی سبب سے میرے انسانی قالب کا چہرہ اور لہجہ بہت کچھ کہہ رہا تھا' وہ جو اس نے اب تک دلاور سے نہیں کہا تھا اور وہ جسے سننے کی دلاور کو آرزو تھی' عرصہ دراز سے دلاور اسی کا منتظر تھا۔

"اے دینار! کیا میں اس طرح تجھ سے بچھڑ جاؤں گا؟...... تو مجھے خود سے دور

کیوں کر رہی ہے؟...... میں ایسا کیوں نہ کروں کہ...... کہ تیرے ساتھ رہنے کیلئے دلاور علی کا قالب چھوڑ کر جھجار سنگھ کے جسم میں گھس جاؤں۔'' عارج کہنے لگا۔

''مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں اے عارج! لیکن شاید ایسا ممکن نہیں ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔

اس پر عارج نے مجھ سے وضاحت چاہی۔

''فوری طور پر تو ایسا اس لئے نہیں ہو سکتا کہ جھجار سنگھ بے ہوش ہے۔'' اس کے جسم میں اتر کر تجھ پر بھی بیہوشی طاری ہو جائے گی۔

''جھجار سنگھ کو ہوش میں بھی لایا جا سکتا ہے اے دینار!...... یا اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کیا جا......''

''اے عارج!'' میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھی۔ ''تو اس معاملے کی نزاکت کو سمجھ نہیں رہا۔'' میں بولی۔

''تو پھر مجھے تو ہی سمجھا دے۔'' عارج نے کہا۔

''دیکھ! اگر تو جھجار سنگھ کو ہوش میں لا کر اس کے جسم میں اتر گیا مگر تیرے وجود کو قرار نہ آیا تو مجبوراً تجھے جھجار سنگھ کا جسم چھوڑنا پڑے گا۔'' میں عارج کو سمجھانے لگی۔ ''ایسی صورت میں تیرے لئے ایک ہی راستہ رہ جائے گا کہ دلاور کے قالب ہی کو دوبارہ اپنا لے۔ اگر ایسا ہوا تو تجھے فرار ہونے کیلئے بہت کم وقت مل سکے گا۔''

''کوئی ضروری نہیں اے دینار کہ مجھے جھجار سنگھ کے جسم میں قرار نہ آئے۔'' عارج بحث کرنے لگا۔ ''میں یہ کوشش ضرور کروں گا۔''

''اگر تو میرا مشورہ نہیں مانتا تو پھر تیری مرضی جو تیرے جی میں آئے کر۔''

میری بات سن کر عارج نے تلوار اپنی نیام میں رکھی۔ عارج بہت جلد جھجار سنگھ کو ہوش میں لے آیا۔ اسے میں نے جھجار سنگھ کے جسم میں داخل ہوتے دیکھا لیکن ذرا ہی دیر میں وہ باہر نکل آیا۔ اس نے باہر آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ دوبارہ جھجار سنگھ کو بیہوش کر دیا۔

''کیوں' کیا ہوا اے عارج؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔ وہ ایک بار پھر دلاور علی کے قالب میں اتر چکا تھا۔

''اے دینار! اس کافر آدم زاد کے اندر تو بے انتہا اندھیرا اور گھٹن ہے۔'' عارج بتانے لگا۔ ''اگر میں فوراً ہی باہر نہ آ جاتا تو میرا دم گھٹ جاتا۔ تو ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔''

''مجھے بھی پاربتی کے جسم میں اترے خاصی دیر ہو چکی ہے۔'' میں نے عارج کو بتایا۔

''اب میرا دم بھی گھٹنے لگا ہے' مجھے اس آدم زادی کا جسم چھوڑنا پڑے گا۔ سن! تجھے اب مجھ سے جدا رہنے کی عادت بھی ڈالنی ہوگی۔ ہم اس طرح اپنے دشمن اس بوڑھے عفریت دہموش کو دھوکہ دینے میں زیادہ کامیاب رہیں گے۔ وہ یہی سمجھے گا کہ ہم دونوں ساتھ ہوں گے جبکہ یہ حقیقت نہیں ہوگی۔''

''تجھ سے الگ رہنے کی میں کوشش کروں گا اے دینار!'' عارج نے وعدہ کیا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ آخری بار اس نے بڑی حسرت کے ساتھ میری طرف دیکھا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ عارج کو میں نے اپنے اس ارادے سے آگاہ نہیں کیا کہ اب طویل عرصے کیلئے پاربتی کا جسم چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ پاربتی کا جسم چھوڑ کر اب میں کسی اور آدم زادی کا جسم اپنانا نہیں چاہتی تھی۔ کسی انسانی قالب میں رہنے کے بجائے میں نے عارج کے ساتھ ہی شاہ پور سے روانگی کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اس طرح کہ عارج کو اس کا پتہ نہ چل سکے۔ مجھے اس کیلئے ایک تو اندھیرے کی چادر اوڑھنی پڑی' دوسرے عارج سے قدرے فاصلے پر رہنا پڑتا تا کہ وہ میرے وجود کی خوشبو محسوس نہ کر لے۔ میں اس سے یہ اندازہ بھی لگانا چاہتی تھی کہ اگر میرے بغیر عارج کو کبھی ماضی یا مستقبل کا سفر کرنا پڑے تو وہ کامیاب ہوگا کہ نہیں۔

راتوں رات سفر کرتا ہوا عارج گوالیار پہنچا۔ اسے میں نے احساس ہی نہ ہونے دیا کہ میں اس کے ساتھ ہوں۔ وہ گوالیار میں بھی نہیں رکا۔ اسے راجہ نرسنگھ کی طاقت اور اقتدار کا اندازہ تھا۔ میری توجہ عارج کے ذہن پر بھی تھی کہ اس کے آئندہ اقدامات سے باخبر رہ سکوں۔ اگر وہ کوئی غلط قدم اٹھانے والا ہو تو اسے روک سکوں اس کیلئے بھی مجھے سامنے نہ آنا پڑتا۔ میں اس کے ذہن کو مناسب قدم اٹھانے کی ترغیب دیتی اور وہ یہی سمجھتا کہ اس نے خود یہ بات سوچی ہے۔ میرے نزدیک یہ بڑا دلچسپ کھیل تھا۔ مجھے اس میں مزہ آ رہا تھا کہ عارج کے ساتھ ساتھ تھی اور وہ بھی لاعلم تھا۔

اس بات کا عارج کو پورا احساس تھا کہ جہانگیر کا وہ منہ چڑھا مصاحب نرسنگھ راؤ مشکل ہی سے اسے کہیں چین کا سانس لینے دیتا۔ عارج کو یہ فکر بھی تھی کہ کہیں اس کے ''جرم'' کی سزا دلاور علی کے گھر والوں کو نہ بھگتنی پڑے جس کے قالب میں اس نے پناہ لے رکھی تھی۔ دلاور علی کے باپ نے عارج سے اپنے کسی دوست کا ذکر کیا تھا جو لاہور میں بخشی کے عہدے پر فائز تھا۔ یہ عہدہ اس لحاظ سے اہم تھا کہ بخشی کا کام فوج کی تنخواہ تقسیم کرنا اور حساب کتاب رکھنا تھا۔

لاہوراس علاقے شاہ پور سے اتنی دور تھا کہ وہاں تک نرسنگھ راؤ کے ہاتھ نہ پہنچتے۔ بستی بستی شہروں شہروں خاک چھانتا ہوا عارج ایک مدت میں لاہور پہنچ سکا۔

قلعہ لاہور میں بخشی وزیر خان کی تلاش عارج کیلئے زیادہ پریشانی کا سبب تو نہ بنی مگر بخشی تک رسائی حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کیلئے عارج کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ وزیر خان بڑا اکھڑ مزاج مشہور تھا۔

''لڑکے! مجھے بتایا گیا ہے کہ تو شاہ پور سے آیا ہے اور مجھ سے اپنی شناسائی کا دعویٰ کرتا ہے۔'' وزیر خاں نے عارج کو دیکھتے ہی سپاٹ سے لہجے میں کہا۔ ''مگر میں نے تجھے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

جواب میں عارج نے دلاور علی کے باپ کا نام لیا اور بولا۔ ''میں فن حرب و ضرب سے واقف ہوں۔ اگر آپ کی عنایت ہو جائے تو میں فوج میں بھرتی کر لیا جاؤں۔''

وزیر خاں نے اسے غور سے دیکھا اور کہنے لگا۔ ''تیرے باپ کو تو میں پہچان گیا مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تو گھر سے بھاگ کر نہیں آیا؟''

اس بات پر عارج چکرا گیا' اسے یہ امید نہ تھی کہ بخشی وزیر خاں اس سے اتنا بحث و مباحثہ کرے گا۔ اس نے سوچا یہ بوڑھا خبطی میرے کسی کام نہیں آ سکتا اور پھر بلا جھجک کہا۔ ''معاف کیجئے گا بزرگ! مجھے یہ غلط فہمی تھی کہ آپ واقعی میرے باپ کے دوست ہیں کیونکہ انہوں نے بڑی محبت سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ میں اجازت چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ واپس چلنے کیلئے مڑا۔

''رک جا لڑکے!'' وزیر خاں زور سے بولا۔ ''میں تیرے باپ کا دوست ہوں اسی لئے تجھ سے اتنی پوچھ گچھ کر رہا تھا ورنہ بھگا دیتا۔''

عارج رک گیا اور مڑ کر کہا۔ ''میں آپ کے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا' اسے آپ گستاخی کے بجائے میری مجبوری سمجھیں۔''

بخشی وزیر خاں اپنے ہی ڈھب کا آدمی تھا۔ عارج اپنی دانست میں اس سے مل کر مشکل میں پھنس گیا تھا۔ بوڑھا اسے زبردستی اپنے گھر لے گیا' پھر کہنے لگا۔ ''اگر تو یہاں سے بھاگا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' بوڑھے کی آواز میں سختی تھی۔ ''تجھ میں اگر واقعی صلاحیت ہوئی تو میں تجھے اچھی جگہ دلوا سکتا ہوں جیسا کہ تو کہتا ہے۔ یہاں کا قلعہ دار بھی بخشی وزیر خاں کی بات نہیں ٹال سکتا' مگر پہلے میں اس بات کی تصدیق کر لوں کہ تو کہیں میرے دوست کے دل پر کوئی داغ لگا کر تو نہیں بھاگ آیا...... تجھے شاید اس بات کا اندازہ نہیں کہ جوان اولاد بچھڑ

جائے یا گھر سے بھاگ جائے تو باپ کے دل پر کیا گزرتی ہے۔''

وزیر خاں کی بات سن کر عارج فکر مند ہو گیا۔ اس نے بوڑھے کے رویے سے یہ اندازہ تو لگا لیا کہ وہ مخلص اور وضع دار آدمی ہے مگر یہ خلوص اسے مہنگا پڑ سکتا تھا۔ اگر کسی طرح راجہ نرسنگھ راؤ یا جھجار سنگھ کے کانوں میں یہ بھنک پڑ جاتی کہ وہ کہاں ہے تو پھر بات بگڑ جاتی۔ راجہ نرسنگھ راؤ اپنا اثر و رسوخ کام میں لا کر دلاور علی کے قالب سے اس نے نکلنے پر مجبور کر دیتا۔ ظاہر ہے کہ جب نرسنگھ راؤ' دلاور علی کی کھال کھنچواتا تو عارج کو اپنا انسانی قالب چھوڑنا ہی پڑتا۔

''کیا سوچنے لگا؟'' بوڑھے وزیر خاں نے عارج کو سوچ میں کھویا ہوا دیکھ کر پوچھا۔

☆......☆......☆

"میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کو سب کچھ بتا دوں۔" عارج نے جواب دیا۔

"دیکھ تو چاہے کچھ نہ بتا مگر ایک بات اچھی طرح سے سمجھ لے اگر تو واقعی گھر سے بھاگ کر آیا ہے تو میں تیری ایک نہیں سنوں گا میں تجھے بندھوا کر یہاں سے زبردستی شاہ پور بھجوا دوں گا۔" وزیر خاں نے گویا عارج کو دھمکی دی۔

"میں شاہ پور سے بھاگ کر تو آیا ہوں مگر اس کی وجہ کچھ اور ہے۔" عارج نے اعتراف کر لیا۔ پھر بوڑھے کو ساری بات بتا دی۔ بوڑھے نے پہلے تو عارج کو بہت ڈانٹ پلائی پھر بولا۔ "ان حالات میں تو یہ اور ضروری ہو گیا ہے کہ میں اپنے کسی خاص آدمی کو شاہ پور بھیجوں۔ معلوم نہیں تیرے باپ اور تیری ماں کا کیا حال ہوگا۔ کم سے کم انہیں یہ تو معلوم ہو جائے کہ تو میرے پاس پہنچ گیا ہے اور بخیریت ہے اب فکر کی کوئی بات نہیں۔"

لاہور میں بخشی وزیر خاں صاحب حیثیت اور بااثر آدمی تھا۔ اس کا بڑا سبب بخشی کا عہدہ تھا۔ تمام ہی سرکاری کارندوں کو اس سے کوئی نہ کوئی کام پڑتا رہتا تھا۔ وہ اصولی آدمی تھا اس لئے کبھی کسی کی ناجائز بات نہ مانتا مگر جائز کام میں روڑے بھی نہ اٹکاتا۔ مغل حکومت کا وہ پرانا نمک خوار تھا۔ ایک ایک پائی کا وہ پورا حساب رکھتا اور اپنے نائبوں کو حرام روزی نہ کھانے دیتا۔ اس کیلئے یہ مشکل نہ ہوا کہ اپنے خرچ پر کسی کو شاہ پور بھیج دے۔

وزیر خاں نے دلاور علی کے باپ کو ایک خط لکھا اس نے اپنے آدمی کو جو خط دیا اس میں وہ ساری باتیں لکھ دیں جو اسے عارج سے معلوم ہوئی تھیں۔ پھر دلاور علی کی طرف سے کوئی فکر نہ کرنے کو لکھا۔ وزیر خاں نے اپنے بھیجے ہوئے آدمی کو یہ تاکید بھی کر دی کہ میرا خط دلاور علی کے باپ ہی کو دینا اور خط کا جواب بھی لے کر آنا۔ اپنے خط میں اس نے ایک ایسی بات بھی لکھی جس کا علم عارج کو نہیں تھا۔

لاہور کے قلعے میں ہی وزیر خاں کی سکونت تھی۔ اس کی حویلی خاصی بڑی اور ہوا کے رخ پر تھی۔ بوڑھا وزیر خاں پانچ وقت کا نمازی تھا مگر اس کے باوجود صاحب دل مشہور تھا۔

جب قدرے رات ڈھل جاتی تو گویا وہ طلوع ہوتا۔

پھر بوڑھا وزیر خاں ہوتا اور نوجوان حسین کنیزیں ایسے میں کسی کو اس کے پاس جانے کی اجازت نہ ہوتی۔ وزیر خاں خود بھی اپنی خلوت سے نہ نکلتا۔ خوبصورت کنیزوں کو حویلی میں دیکھ کر عارج کو کچھ کچھ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ بوڑھا وزیر خاں واقعی صاحب دل ہے اور محض زاہد خشک نہیں۔ ایک مرتبہ اتفاق سے عارج نے وزیر خاں کو رات کے وقت دیکھ لیا تو اس پر ایک اور ہی راز کھلا اور وہ حیران رہ گیا۔ اس نے وزیر خاں کی صرف ایک ہی جھلک دیکھی تھی وزیر خاں کے جسم پر زنانہ لباس تھا۔

بظاہر عارج کو وزیر خاں کی حویلی میں کوئی تکلیف نہ تھی لیکن چند روز بعد وزیر خاں کا اصل چہرہ سامنے آیا تو وہ پریشان ہو گیا۔ پھر بھی اس نے صبر و تحمل سے کام لیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بوڑھے نے ابھی براہ راست عارج کو نہیں چھیڑا تھا۔

پہلے دن ہی بوڑھے وزیر خاں نے اپنی بوڑھی بیوی اور نوجوان بیٹی کو یہ تاکید کر دی تھی کہ دلاور علی سے پردہ نہ کیا جائے اور اسے گھر کا ہی فرد سمجھا جائے۔ بوڑھے کی بس ایک ہی بیٹی تھی جو عمر میں عارج کے انسانی قالب دلاور علی کے برابر تھی۔ داجبی صورت کی وہ لڑکی بے حد شوخ اور آفت کی پرکالہ تھی۔ اس کا نام نسترن تھا۔ وہ دو چار دن میں ہی عارج سے بے تکلف ہو گئی۔ شوخ اور چلبلی نسترن کی وجہ سے حویلی میں عارج کا دل لگ گیا تھا۔

وزیر خاں عارج پر کڑی نظر رکھتا اور کم ہی اسے حویلی سے باہر جانے کی اجازت دیتا۔ اس نے عارج سے کہا تھا کہ جب تیرے بیان کی تصدیق ہو جائے گی تو یہ پابندیاں نرم کر دی جائیں گی اور پھر اس کے بعد ہی ملازمت کا بندوبست کیا جائے گا۔

عارج نے بوڑھے کی بات مان لی تھی کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ مستقبل کیلئے اس نے جو فیصلہ کیا تھا اس فیصلے پر اسی طرح عملدرآمد ممکن تھا۔ اسے خود پر پورا اعتماد تھا کہ اس نے جو کچھ سوچا ہے ایک نہ ایک دن ضرور پورا ہو گا۔ اپنے رقیب جھجھار سنگھ کو وہ بھولا نہیں تھا جس کی وجہ سے اپنی دانست میں مجھ سے بچھڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے سینے میں انتقام کے شعلے بجھے نہ تھے۔

اس عرصے میں عارج نے وزیر خاں کے بارے میں یہ اندازہ لگایا تھا کہ اس کے کردار میں کجی ہے۔ یہ بات عملاً بھی ایک شب درست ثابت ہو گئی۔ وزیر خاں نے عارج کو ایک خاص کام کے بہانے اس رات اپنے خلوت خانے میں بلوا لیا تھا جہاں طلب کئے بغیر عشا کے بعد کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ بعد عشا وزیر خاں کے خاص خدمت گار اور کنیزیں

ہی وہاں آتی جاتی دکھائی دیتی تھیں۔ جب عارج اندر پہنچا تو بارلیش وزیر خاں کو دیکھ کر حیرت میں رہ گیا۔

وزیر خاں کے جسم پر اس رات بھی زنانہ لباس تھا اور اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کے سامنے ساغر و مینا سجے ہوئے تھے۔

''آج رات ہمارے ساقی بنو گے تم؟'' وزیر خاں عجیب سے خمار آلود لہجے میں عارج سے کہنے لگا۔

''آپ شاید یہ بھول گئے ہیں کہ میرے والد کے دوست اور قابل احترام ہیں لیکن کچھ لوگوں کو عزت راس نہیں آتی۔ آپ بھی مجھے انہی میں سے لگتے ہیں۔'' عارج برا بھلا کہتا ہوا اٹھا اور خلوت خانے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ اسے باہر سے بند ملا۔

''تم یہاں سے جا نہیں سکتے۔'' بوڑھا اس کی بے بسی پر لہرا کر بولا۔

''خبیث بوڑھے! کیا تو سمجھتا ہے کہ اس طرح مجھ سے اپنی بات منوا لے گا۔ نہ میں خود شراب پیتا ہوں اور نہ کسی کو شراب پلا سکتا ہوں۔'' عارج غصے سے بے قابو ہونے لگا۔

''میں کل ہی تیری حویلی چھوڑ کر چلا جاؤں گا' مجھے خبر نہیں تھی کہ تو اندر سے اتنا مکروہ ہوگا۔''

حویلی چھوڑ کر چلے جانے کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور بوڑھا شیطان راہ راست پر آ گیا' وہ ایک دم پلٹا کھا گیا۔ وہ کچھ کہے سنے بغیر اندرونی دالان میں جا کر لباس بدل آیا۔

''دلاور بیٹے!'' وزیر خاں آتے ہی بولا۔ ''مبارک ہو تجھے کہ تو میرے امتحان پر پورا اترا ہے۔ تو نے جو گستاخی کی میں نے اسے معاف کیا' مجھ سے تو نے جو کچھ کہا نہ کہتا تو امتحان میں ناکام ہوتا' بیٹھ جا کہ واقعی میں تجھ سے ایک اہم بات کرنا چاہتا تھا اور اسی لئے تیرا امتحان لیا تھا۔'' یہ کہہ کر وزیر خاں دروازے کی طرف بڑھ گیا اور وہاں پہنچ کر مخصوص انداز میں دستک دی۔ دروازہ کھل گیا' دروازے کے باہر بوڑھے کا کوئی خدمت گار ضرور موجود تھا۔ بوڑھے کے کہنے پر عارج مسند پر بیٹھ تو گیا مگر امتحان کے ڈھونگ پر اسے یقین نہ آیا۔ عارج کو اس پر کوئی شک نہ تھا کہ بوڑھے وزیر خاں نے اسے بدکتے دیکھ کر یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ پھر کچھ ہی دیر کے بعد وزیر خاں نے جو گفتگو کی تو وہ چکرا گیا۔ عارج کو یہ سمجھنے پر مجبور ہونا پڑا کہ بوڑھے نے اس کا امتحان ہی لیا ہوگا۔ کوئی اپنے ہونے والے داماد کو بھلا کس طرح برے راستے پر ڈال سکتا ہے۔

وزیر خاں اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ ''دراصل میں تجھے اپنی فرزندی

میں لینا چاہتا ہوں۔ مجھے تیرے باپ کے جواب کا انتظار ہے مگر میں تیری مرضی بھی جاننا چاہتا ہوں' بتا تجھے میری بیٹی نسترن پسند ہے؟''

یہی وہ بات تھی جو وزیر خاں نے عارج کو نہیں بتائی تھی۔ وزیر خان نے دلاور علی کے باپ کو جو خط بھیجا تھا اس میں یہ ذکر بھی کر دیا تھا' عارج کے خیال میں یہ بھی بڑی بے حیائی کی بات تھی کہ وہ بوڑھا اپنی بیٹی کے بارے میں اس سے ایسی بات کر رہا تھا۔ اس کا سوچنا کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا کیونکہ عموماً آدم زادوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ ایک خیال عارج کو یہ بھی آیا کہ شاید اس طرح بوڑھا ہمیشہ کیلئے اسے اپنے جال میں پھانسنا چاہتا ہے۔ اسی خیال سے اس نے بوڑھے کی پیشکش بالکل رد کر دی۔ یوں بھی اگر میں نے نسترن کا جسم اپنا لیا ہوتا تو عارج اس پیشکش کو قبول کر سکتا تھا۔

''لڑکے! تجھے شاید یہ خبر نہیں کہ یہ بات تیرے لئے کتنے بڑے اعزاز کی ہوگی۔'' وزیر خاں نے کہا۔ ''میں تجھے اس وقت تک سوچنے کا موقع دیتا ہوں جب تک تیرے باپ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آ جاتا۔'' یہ کہہ کر وزیر خاں نے عارج کو اپنے خلوت خانے سے جانے کی اجازت دے دی۔ عارج مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھ آیا۔

پھر یہ بھی اسی رات کا واقعہ ہے کہ نسترن نے پچھلے پہر عارج کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

نسترن کی آواز پہچان کر عارج نے دروازہ کھول دیا۔ نسترن کے ساتھ ایک نوجوان تھا جس کے چہرے سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ عارج نے سوالیہ نظروں سے نسترن کی طرف دیکھا۔

سوالیہ نظروں کے جواب میں نسترن جلدی سے بولی۔ ''دلاور! تمہیں...... نہیں تم...... تم انہیں اپنے کمرے میں سلا لو۔ ممکن ہے ابی بھی ادھر آ جائیں۔ ان سے کہہ دینا' یہاں تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہی نسترن نے اس نوجوان کو کمرے میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ نوجوان کچھ جھجکتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ نسترن اسی وقت جانے کیلئے مڑ گئی۔ نسترن کی بات سے صاف ظاہر تھا کہ نوجوان سے اس کا کیا تعلق ہوگا اور اس کی نوعیت کیا رہی ہوگی۔

وزیر خاں نے اپنی دانست میں عارج کو کچھ دن کیلئے ڈھیل دے دی تھی' وہ ایسے بن گیا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ عارج کو اس شخص کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا جو وزیر خاں کا خط لے کر شاہ پور گیا تھا۔

پھر خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور وہ شخص لوٹ آیا۔ دلاور کے باپ نے عارج کو بھی اپنا بیٹا سمجھ کر خط لکھا تھا۔ دلاور کے باپ کا خط پڑھ کر عارج کو اس کی سادگی اور بھولپن پر بڑی ہنسی آئی۔ اس نے لکھا تھا کہ تم وزیر خاں کو میری جگہ سمجھو اور ان کے کسی حکم سے سرتابی نہ کرو فی الحال لاہور ہی میں رہو شاہ پور کے حالات تمہارے لئے ٹھیک نہیں۔

زبانی بھی عارج نے اس شخص سے کئی کام کی باتیں معلوم کرلیں۔ وہ شخص اس وقت شاہ پور ہی میں تھا جب راجہ نرسنگھ راؤ نے اپنے بیٹے جھجار سنگھ کی شادی بہت دھوم دھام سے پاربتی کے ساتھ کی۔ راجہ کی اس خوشی میں پورا شاہ پور شریک ہوا۔ دلاور علی کے والدین نے بھی اس شادی میں شرکت کی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ راجہ نے اس کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ اپنے رقیب کی مکمل کامیابی پر عارج کو بڑا ملال ہوا۔ خلوت میں وہ خودکلامی کرنے لگا۔ ''اے دینار! تو نے اس زمانے میں آ کر مجھ سے وفا نہ کی اور...... اور میرے دشمن کی بیوی ہوگئی...... اس کے تصرف میں آ گئی۔''

یہی وہ لمحات تھے کہ جب میں نے عارج ہی کی آواز بنا کر اس کے دماغ میں سرگوشی کی۔ ''مگر وہ دینار تو نہیں...... وہ تو پاربتی ہے۔ جھجار سنگھ کی بیوی دینار نہیں پاربتی ہے۔ دینار تو دن کے وقت پاربتی کے جسم میں رہتی ہے۔ اس سے زیادہ دیر تک رہنا تو ممکن ہی نہیں۔''

''ہاں میں ٹھیک ہی تو سوچ رہا ہوں۔'' عارج پھر بڑبڑانے لگا۔ ''دینار مجھ سے بے وفائی نہیں کرسکتی۔''

میرا جو مقصد تھا پورا ہوگیا۔ عارج کو یقین آیا کہ میں اس کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔

اسی روز بخشی وزیر خاں نے عارج کو پھر خلوت میں بلوالیا۔ بوڑھا اس سے بولا۔ ''تم چاہو تو خود بھی وہ خط پڑھ سکتے ہو جو تمہارے باپ نے میرے خط کے جواب میں لکھا ہے۔ اس نے تمہارے اوپر مجھے مکمل اختیار دے دیا ہے۔'' بوڑھا کچھ دن سے عارج کے ساتھ شائستگی اور تہذیب سے گفتگو کرنے لگا تھا۔

''مجھے نہیں پڑھنا وہ خط' عارج بے رخی سے کہنے لگا۔ ''مجھے تو آپ یہ بتائیں کہ مکمل اختیار مل جانے کے بعد کیا ارادہ ہے؟'' دوسرا جملہ اس نے چبھتی ہوئی آواز میں ادا کیا۔

''بس وہی ارادہ ہے جو پہلے تھا۔'' وزیر خاں مسکرایا۔

''کیا ارادہ ہے، کچھ بتائیں تو سہی!''

''تم تو بات بات پر بدکنے لگتے ہو یہ نہیں سوچتے کہ میں تمہیں کس قدر چاہتا ہوں۔''

''ضرور سوچتا' اگر مجھے آپ کی چاہت کا سبب معلوم نہ ہوتا۔'' عارج نے بلاجھجک کہہ دیا۔

''ارے تمہیں تو ناحق میری طرف سے غلط فہمی ہوگئی ہے۔'' بوڑھے نے ہنس کر کہا۔ ''تم شاید اس امتحان کی وجہ سے......''

''یہ ذکر دوبارہ نہ چھیڑیں تو بہتر ہے۔'' بوڑھے وزیر خاں کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی عارج بول اٹھا۔ ''آپ کو اور کچھ نہ کہنا ہو تو میں جاؤں۔ میں اپنا اور آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔''

''اور کچھ نہ سہی تو گھڑی دو گھڑی کو میرے پاس بیٹھ ہی جایا کرو۔'' بوڑھے نے عارج کی طرف دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''وقت کو میں نے کبھی تم سے زیادہ قیمتی نہیں سمجھا۔'' بوڑھا یہ کہہ کر کچھ دیر خاموش رہا پھر عارج اٹھنے لگا تو اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔ ''سنو تو' مجھے تم سے ایک ضروری اور اہم بات کرنی ہے۔''

''کہئے وہ بات!'' عارج بولا۔

''بات دراصل یہ ہے دلاور کہ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ تم بھی اس سے واقف ہو۔ میں تمہیں بیٹا بنانا چاہتا ہوں۔ تمہارے باپ نے مجھے یہ اجازت بھی دے دی ہے کہ میں نسترن کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دوں۔'' بوڑھے نے پھر پانسہ پلٹا۔

''میں اس سلسلے میں اسی وقت کوئی فیصلہ کرسکتا ہوں جب خود اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں۔ ابھی تو خود میں ہی آپ کی روٹیوں پر پڑا ہوں۔'' عارج نے بھی میری ذہنی ترغیب کے سبب موقع دیکھ کر داؤ آزمایا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس بوڑھے عیار سے بآسانی گلوخلاصی ممکن نہیں ہے۔ میں نے بھی خود یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔ بوڑھا پل پل رنگ بدلنے لگتا تھا۔ اس کا توڑ یہی تھا کہ عارج بھی کسی بات پر قائم نہ رہے۔

''تم صاف جواب دو مجھے' میں ہیر پھیر کا قائل نہیں ہو...... اور سنو! اگر تم نے انکار بھی کر دیا تو میں زبردستی اپنی بات نہیں منواؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ تمہیں ملازمت دلوا دوں گا۔'' وزیر خاں نے عارج کو متوقع نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

عارج کیوں کہ نسترن کی بے راہ روی سے واقف تھا' دوم میرے سوا کسی سے اس کی شادی ممکن بھی نہیں تھی اس لئے بغیر لاگ لپیٹ کے اس نے دوٹوک کی بات کہہ دی۔ ''میں کسی قیمت پر نسترن سے شادی نہیں کروں گا۔''

''یہ ہوئی نا مردوں والی بات' میں تمہارے انکار پر ناراض نہیں ہوا۔ تم سے بس مجھے

ایک بات اور کہنی ہے۔ اس کا بھی مجھے صاف جواب ہی چاہیے۔ ملازمت مل جانے کے بعد اگر تم یہیں میری حویلی میں رہو تو مجھے خوشی ہو گی۔ تمہیں یہاں پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ جبراً میں تم سے یہاں رہنے کو نہیں کہوں گا۔"

وقتی طور پر میری ذاتی ترغیب کے تحت عارج نے یہ وعدہ کر لینے میں حرج نہ سمجھا۔ بوڑھا وزیر خاں بہر حال عارج کی مرضی کے خلاف اس سے کوئی بات نہیں منوا سکتا تھا۔ اس کا احساس یقیناً وزیر خاں کو بھی تھا۔

پھر وزیر خاں نے اپنے وعدے کے مطابق عارج کو مغل فوج میں بھرتی کرا دیا۔ اس کیلئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

اپنی ذہانت اور لیاقت کے سبب عارج نے چند ہی دن میں افسران کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

بوڑھے وزیر خاں کو شیطان نے ایک بار پھر بہکایا اور اس نے عارج کو اپنی راہ پر لگانا چاہا۔ اس کے بعد وزیر خاں کا نہ تو کوئی لالچ عارج کو روک سکا اور نہ کوئی دھمکی کارگر ہوئی۔ عارج ہی کیا کوئی بھی آنکھ دیکھے مکھی نہیں کھاتا۔ پھر بھلا وہ کس طرح وزیر خاں کی بیٹی نسترن کو اپنانے کی حامی بھر لیتا۔

عارج اور وزیر خاں کے اختلاف کا آخر یہ نتیجہ نکلا کہ عارج نے الگ سکونت اختیار کر لی۔ اب وہ برسر روزگار اور اس کیلئے ایسا ممکن تھا کہ الگ رہ سکے۔ وزیر خاں برا آدمی ہونے کے باوجود منتقم مزاج نہ تھا اس لئے عارج کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

آہستہ آہستہ عارج ترقی کرتا گیا اور یوں ہی کئی برس بیت گئے۔ ان برسوں میں وہ شاہ پور کی طرف سے غافل نہیں رہا تھا۔ اب وہ خود اس حیثیت میں تھا کہ لوگوں کو ملازم رکھ سکے۔ اس کے ذاتی خدمت گاروں کی تعداد بھی نصف درجن سے زیادہ تھی' کنیزیں اس کے علاوہ تھیں۔ خدمت گاروں ہی میں سے ایک کو وہ کئی بار خصوصی ہدایات دے کر شاہ پور بھیج چکا تھا۔ یہ خصوصی ہدایات شاہ پور کے راجہ نرسنگھ راؤ اور اس کے اہل خاندان سے متعلق ہوتیں۔ اسے ملنے والی آخری اطلاع کے مطابق جھجار سنگھ مجھے ساتھ لے کر آگرہ روانہ ہو چکا تھا حالانکہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ جھجار سنگھ مجھے نہیں پاربتی کو ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے تو پاربتی کا جسم بہت پہلے چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت تک پاربتی کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔

خود میں بھی جھجار سنگھ اور پاربتی کی طرف سے بے خبر نہیں تھی۔ پاربتی اب دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔

عارج نے کچھ سوچ کر اپنے اسی خدمت گار کو جھجار سنگھ کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کیلئے آگرہ بھیج دیا۔ کوشش کے باوجود وہ ابھی تک پاربتی کو بھلا نہیں سکا تھا۔ اس کی دو وجوہ تھیں' پہلی وجہ تو عارج کے انسانی قالب دلاور علی کا پاربتی سے عشق تھا' دوسرا سبب یہ تھا کہ میں نے پاربتی کے قالب ہی میں پناہ لی تھی۔ عارج کو یہ غلط فہمی تھی کہ میں ابھی تک پاربتی کے جسم میں ہوں۔ میرے سوا وہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اس لئے کوئی آدم زادی اس کی زندگی میں کیسے آ سکتی تھی۔ یہاں میں یہ بتاتی چلوں کہ اکثر جن زاد آدم زادیوں سے شادی کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہی معاملہ جن زادیوں کے ساتھ ہے۔ ان میں سے بیشتر کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کسی آدم زاد کی بیوی بن جائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ عارج یا مجھے یہ "شوق" نہیں تھا۔

ان دنوں عارج پر اس کے انسانی قالب دلاور علی کی فطری صفات غالب تھیں۔ وہ اسی لئے پہروں جاگتا اور پہروں پاربتی کے خیالوں میں کھویا رہتا۔ ایک صورت تھی جو دل میں سما گئی تھی۔ ایک چہرہ تھا جو نہیں بھولتا تھا۔ ایک خواب تھا کہ بکھر کر بھی پوری طرح نہیں بکھرا تھا۔ رات کے پچھلے پہر اس کافر ادا کی یاد دبے پاؤں دل میں اتر آتی اور عارج کی پلکوں پر ستارے جھلملانے لگتے۔ کچھ باتیں آدمی ہی کیا جنات کے اختیار سے بھی باہر ہوتی ہیں۔ پاربتی کو بھلا دینا بھی عارج کے اختیار میں نہ تھا۔ عارج نے سوچا تھا کہ وہ یوں ہی ساری عمر پاربتی کی یاد کے سہارے گزار دے گا۔ اب تک اس کی تمام تر جدوجہد اسی رخ پر تھی۔ وہ اس حیثیت اور مرتبے تک پہنچنے کی کوشش میں تھا کہ شاہ پور کا راجہ نرسنگھ راؤ اس کے مقابلے میں اپنا اثر و قدر استعمال نہ کر سکے مگر شاید ابھی اس کی منزل دور تھی۔ اسے مزید انتظار کرنا تھا۔ ابھی اپنی محبوبہ کا حصول اس کیلئے مشکل تھا۔

عارج نے اپنے جس خدمت گار کو آگرہ بھیجا تھا' وہ کامیاب لوٹ کر آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ جھجار سنگھ مغل فوج میں افسر ہو گیا ہے۔ جھجار سنگھ نے شاہ پور کیوں چھوڑا اس کی وجہ عارج کو پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی۔

شاہ پور میں جھجار سنگھ سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ یہ بات شاہ پور میں چھپائے نہیں چھپ سکی تھی کہ دلاور علی کے ہاتھ جھجار سنگھ کو شکست ہو چکی ہے۔ شکست کھا جانے ہی کی شرمندگی اور ذلت نے جھجار سنگھ کو زیادہ دن شاہ پور میں نہیں ٹکنے دیا تھا۔ جھجار سنگھ کو اپنے باپ کی سفارش پر مغل فوج میں افسری مل گئی تھی۔ اس کے برعکس عارج اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر آگے بڑھا تھا۔ عارج چاہتا تو خاموشی سے جھجار سنگھ کو ٹھکانے لگوا دیتا مگر یہ

بزدلی ہوتی اور وہ بہر حال بزدل نہیں تھا' اپنی جنگ وہ خود لڑنا چاہتا تھا۔

پھر اسی طرح کئی برس اور گزر گئے۔ عارج کی جدوجہد جاری رہی۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جس کا اسے انتظار تھا۔ اسی دوران میں مغل بادشاہ جہانگیر کا ستارہ گردش میں آنے لگا۔ جہانگیر کی چہیتی ملکہ نور جہاں اور ولی عہد شہزادہ خرم کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ یہی شہزادہ خرم بعد میں شاہجہاں کے لقب سے مشہور ہوا۔ یہ نور جہاں کا سوتیلا بیٹا تھا۔ سوتیلی ماں اور بیٹے کے درمیان کشمکش کی وجہ سے حکومت میں ابتری پیدا ہو گئی۔ جہانگیر ان پیچیدہ معاملات کو سلجھانے میں اس قدر محو تھا کہ اسے یہ احساس نہ ہو سکا کہ سارا ملک بغاوتوں کا دنگل بنا ہوا تھا۔ راجہ نرسنگھ راؤ نے اس موقع پر فائدہ اٹھایا اور حکومت وقت سے بغاوت کر دی۔

راجہ نرسنگھ راؤ نے اپنے تمام علاقے کا انتظام خود سنبھال کر شاہی کارندوں کو بے دخل کر دیا۔ مطلق العنان راجہ ہونے کا اعلان کرنے کے ساتھ ہی اس نے دوسرے علاقوں پر بھی دھاوے بولنے شروع کر دیے اور بڑی دولت اکٹھی کر لی۔ اس نے بڑی تیزی سے اردگرد کے تمام تعلقوں میں بھی بغاوت کے شعلے بھڑکا دیے۔ اس کا بیٹا جھجار سنگھ اب بھی آگرہ ہی میں تھا اور بظاہر حکومت کا وفادار تھا۔ آگرہ ہی اس وقت تک دارالحکومت تھا اور اکبر آباد کہلاتا تھا۔

کہتے ہیں کہ آدمی کی مٹی جہاں کی ہوتی ہے وہ خود اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ کشمیر میں قیام کے دوران جہانگیر سخت علیل ہو گیا اور صاف نظر آنے لگا کہ اب اس کے چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے۔ اسی حالت میں اس نے کشمیر سے لاہور کی طرف کوچ کر دیا۔ کھانے پینے کی تمام چیزوں حتیٰ کہ افیون' سے بھی جہانگیر کو نفرت ہو گئی تھی جو برسوں سے اس کی رفیق تھی۔

جہانگیر کو بجز چند پیالے شراب کے کسی چیز سے رغبت نہیں رہی تھی۔ کشمیر سے واپسی میں راجور کی منزل پر پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا گیا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے جہانگیر نے راستے ہی میں شراب کا ایک پیالہ مانگا۔ پیالہ آیا تو اس نے منہ سے لگا لیا مگر شراب حلق سے اتر نہ سکی اس لئے کلی کر دی۔

راجور میں دولت خانے تک جاتے جاتے جہانگیر پر نزع کا عالم طاری ہو گیا۔ پھر چاشت کے وقت ہندوستان کا وہ مغل تاجدار سفر آخرت پر روانہ ہو گیا۔ ملکہ نور جہاں کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ وہ روتی دھوتی اور ماتم کرتی ہوئی اپنے رفیق حیات کے جنازے کو لے کر لاہور آئی اور وہاں اسے اپنے باغ میں دفن کر دیا۔

نور جہاں کا داماد اور سوتیلا بیٹا شہریار اس وقت لاہور میں تھا۔ اسے یہ خبر ملی تو اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ عارج بھی قلعہ لاہور میں تھا اور اب وہ دلاور علی کی حیثیت سے نمایاں مغل سرداروں میں شمار ہوتا تھا۔ شہزادہ شہریار نے امراء اور مغل سرداروں کو انعام و اکرام سے نوازا تو عارج کو بھی خلعت ملی۔ ادھر یمین الدولہ آصف خان' شہریار کے مقابل تھا۔ وہ دراصل شہزادہ خرم (شاہجہان) کا حامی تھا۔ یہ موقع ایسا تھا کہ عارج سے درست فیصلہ کرنے میں غلطی ہو جاتی تو مارا جاتا۔ میں نے اسی لئے غیر محسوس طور پر عارج کو صحیح فیصلہ کرنے میں مدد دی۔

بہادر اور لائق مغل سرداروں کو اپنا ہمنوا بنانے کیلئے آصف خان سرگرم تھا۔

بخشی وزیر خاں پرانا گھاگ اور جہاندیدہ آدمی تھا۔ اس مرتبہ میں نے اسے استعمال کیا۔ وزیر خاں نے عارج کو مشورہ دیا کہ تم آصف خاں سے مل جاؤ' فائدے میں رہو گے۔ شہریار کی بادشاہت چند روزہ ثابت ہو گی۔ خود وزیر خاں نے بھی یہی راستہ اختیار کیا۔

وزیر خاں لاکھ برا آدمی سہی مگر اس نے عارج کو کبھی غلط مشورہ نہیں دیا تھا۔ عارج نے اسی لئے کسی بحث و مباحثے کے بغیر اس کا مشورہ قبول کر لیا۔ یہ نوبت نہیں آئی کہ مجھے عارج کو ذاتی ترغیب دینی پڑتی۔

پھر میرا قیاس قطعی درست ثابت ہوا۔ شہریار کی فرمانروائی دو ہفتے سے زیادہ نہ رہی۔ اسے آصف خاں کے مقابلے پر شکست ہوئی۔ آصف خاں نے شہریار کو اندھا کرا کے قید خانے میں ڈلوا دیا۔

کچھ ہی دن بعد نئے بادشاہ شاہجہان کے حکم پر شہریار کو قتل کر دیا گیا۔ اس پر بغاوت کا الزام تھا۔

لاہور پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں بھی عارج نے اپنی روایت برقرار رکھی تھی اور بڑی جی داری سے لڑا تھا۔ آصف خاں نے اس کے جوہر دیکھ کر اسے اپنے ساتھ آگرہ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ الگ بات کہ ایسا میری ہی ترغیب پر ہوا تھا۔

لاہور سے آگرہ جانے میں عارج کے ارادے کو نہیں میرے اور حالات دونوں ہی کا دخل تھا۔ آصف خان کا حکم ٹالنا عارج کے بس کی بات نہیں تھی۔ آگرہ پہنچنے کے بعد جب شاہجہاں نے آصف خاں کو وکالت اور وزارت عظمیٰ کا عہدہ دیا تو اسی کی سفارش پر عارج کو "خان" کا خطاب اور ایک ہزاری امیر کا منصب ملا۔ مغلوں میں اکبر بادشاہ کے زمانے سے یہ قانون چلا آ رہا تھا کہ سوائے اس شخص کے کوئی اپنے نام کے ساتھ "خان" کا اضافہ نہیں کر

سکتا جیسے دربار سے یہ خطاب ملا ہو۔ تو یوں یہ خطاب عارج کے انسانی قالب کے نام کا حصہ بن گیا اور اب وہ دلاور علی خاں کہلانے لگا۔

دارالحکومت آگرہ آ کر عارج کے سارے زخم جیسے پھر سے ہرے ہو گئے' وہ اس کی محبوبہ یعنی میں اب اس کی دانست میں ایک ہی شہر میں تھے۔ اب سے تقریباً 12 سال پہلے وہ میرے کہنے پر شاہ پور سے فرار ہوا تھا۔ 12 سال میں وہ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اسے 12 سال پہلے شاہ پور میں جن لوگوں نے دیکھا تھا اب مشکل ہی سے پہچانتے۔ اب اس کا انسانی قالب پہلے سے کہیں بھاری اور مضبوط تھا' چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں' جھجار سنگھ شاید اسی لئے اسے نہ پہچان سکا مگر عارج اپنے رقیب کو پہچان چکا تھا۔ اس کے قریب اور اس کی حیثیت میں اب کوئی فرق نہیں تھا۔

اب عارج کے انسانی قالب دلاور اور جھجار کے درمیان شاہ پور قلعے کی اونچی فصیلیں نہیں تھیں۔ وقت نے اونچ نیچ کا فرق مٹا دیا تھا۔ اس سے قطع نظر یہ کہ جب سے جھجار کے باپ نرسنگھ راؤ نے مغل حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی وہ ایک ہزاری منصب دار ہونے کے باوجود حکومت کی نظر میں تھا۔ اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کیلئے جاسوس مقرر تھے۔ اب وہ وقت آ چکا تھا جس کا عارج نے طویل عرصے سے انتظار کیا تھا وہ اب جھجار سنگھ سے اپنی محرومیوں کا انتقام لے سکتا تھا۔

عارج کے سینے میں انتقام کے شعلے بھڑکنے کے ساتھ ساتھ میرے انسانی قالب پاربتی کی دید کی آرزو بھی کروٹیں لینے لگیں۔ اس کا خیال تھا کہ میں ابھی تک پاربتی کے قالب میں ہوں۔ اس نے سوچا کہ ایک بار پاربتی کو دیکھ تو لے۔ کیا اب بھی اسے ایک نظر دیکھ کر میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھے گا؟ کیا وہ ابھی تک اتنی ہی حسین ہو گی؟ کیا وہ مجھے پہچان لے گی؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات عارج کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔

پھر عارج نے بالا بالا سب کچھ معلوم کرا لیا۔ پاربتی اب کہاں رہتی ہے؟ صبح ہی صبح مندر جانے کیلئے کس راہ سے گزرتی ہے؟ اور یہ کہ اس کا شوہر جھجار سنگھ کس وقت گھر پر نہیں ہوتا؟ اس جستجو اور کشش و پنج میں کافی دن گزر گئے۔

عارج کو اپنے سارے سوالوں کے جواب مل گئے تو ایک دن وہ مندر کے راستے پر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے پاربتی کو آتے دیکھا تو بس دیکھتے رہ گیا۔ میں پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

عارج حیران تھا کہ بارہ سال گزر جانے کے باوجود پاربتی ذرا نہیں بدلی تھی۔ بارہ

سال پہلے بہار کی آمد آمد تھی اور اب وہ مجسم بہار بن چکی تھی۔ اس روز کوشش کے باوجود عارج اسے مخاطب نہ کر سکا۔ اس وقت تک میں پاربتی کے جسم میں اتر چکی تھی۔ پاربتی کے قالب میں بالکل بیگانوں کی طرح میں اس پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر مندر کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے یہ تاثر دیا تھا کہ جیسے جھجار سنگھ کی طرح عارج کے انسانی قالب کو نہیں پہچان پائی۔ میرا منشا یہ تھا کہ خود عارج مجھ سے مخاطب ہو تو میں اس سے بات کروں۔

پھر کئی روز بعد عارج نے اپنے اندر ہمت پیدا کی کہ مجھے آواز دے سکے۔

اس دن بھی میں نے پاربتی کے جسم پر قبضہ کر لیا تھا۔ میں قریب آ گئی تو عارج نے آہستہ سے کہا۔ "اے دینار! سن" میں چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی اور اسے سخت نظروں سے دیکھتے ہوئے دانستہ بولی۔ "کون ہے تو؟...... میرا نام وہ نہیں جو تو نے لیا ہے۔" مصلحت کے تحت میں نے غلط بیانی سے کام لیا۔

"پھر کیا نام ہے تیرا؟" عارج نے پوچھا۔

"تجھے اس سے کیا۔"

عارج نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں اور کہنے لگا۔ "بارہ سال کا عرصہ اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ تیرے وجود کی خوشبو حافظے میں نہ رہے' کیا تو واقعی مجھے نہیں پہچانی' میں...... میں عارج ہوں۔"

"عارج!" میں نے جان کر حیرت کا تاثر دیا۔

"ہاں اے دینار! میں تیرا عارج ہوں۔"

"میں تجھے پہچان گئی' تو وہی ہے نا جو موت کے ڈر سے شاہ پور چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔" مجھ پر پاربتی کا قالب غالب آنے لگا۔

خلاف توقع میری بات سن کر عارج تیز آواز میں بولا۔ "میں خود نہیں بھاگا تھا بلکہ تو نے مجھے بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔"

"چل یہی سہی' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"پڑتا ہے فرق" عارج کو غصہ آنے لگا۔

"پڑتا ہو گا۔" نہ چاہنے کے باوجود میں عارج سے بے اعتنائی برت رہی تھی۔ "فرق پڑنے نہ پڑنے سے مجھے بھلا کیا لینا مگر اس وقت تو میری راہ کیوں کھوٹی کر رہا ہے۔"

"کوئی کسی کی راہ روکتا ہے تو سوچ سمجھ کر ہی روکتا ہے۔ میں تجھے یہ بتاتا......"

"ابھی اس آدمی نے اس زمین پر جنم نہیں لیا اے عارج! جو میری راہ روک لے۔"

عارج کی بات میں نے کاٹ دی۔ پھر مزید بولی۔ ''اور تجھے تو اس بات کا اچھی طرح تجربہ ہے' اگر برسوں پہلے کا وہ تجربہ بھول گیا ہو تو اسے ایک بار پھر دہرایا جا سکتا ہے۔ میں آج بھی انہی شرائط پر تجھ سے لڑنے کو تیار ہوں۔''

عارج سے میں جو کچھ کہہ رہی تھی' غیر ارادی ہی تھا۔ مجھ پر پاربتی کا قالب پوری طرح حاوی تھا' میری رگوں میں دوڑتا ہوا انسانی خون خود بخود ہی جوش کھا رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ برسوں گزر جانے پر بھی پاربتی بالکل نہیں بدلی تھی۔

وہ دونوں انسانی قالب دلاور علی اور پاربتی راجپوت تھے۔ اس کے علاوہ ان کا تعلق ایک ہی راجپوت خاندان سے تھا۔ اگر ان میں سے کوئی دوسرے خاندان کا ہوتا تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔

عارج نے کہا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں اے دینار! کہ تو اس مرتبہ بھی جھجار سنگھ کو میرے انتقام سے بچانا چاہتی ہے مگر ایسا نہیں ہوگا۔ تجھے بھی نیچا دیکھنا پڑے گا اور میں جھجار سنگھ کے غرور کو بھی خاک میں ملا دوں گا۔''

غصے میں ڈوبی ہوئی یہ سخت آواز بھی مجھے عارج کی معلوم نہیں ہو رہی تھی یقیناً اس پر دلاور علی کی فطری صفات غالب تھیں۔ اس راستے سے صرف اکا دکا راہگیر آ رہا تھا اور یوں بھی صبح کا دھندلکا ابھی پوری طرح چھٹا نہیں تھا اس لئے کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ باتیں کرتے کرتے ہم راستے کے ایک طرف ہو گئے۔

عارج کے دعوے پر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ مجھے' دینار کو نیچا دکھانے کی بات کر رہا تھا۔ اگر اس کا دعویٰ جھجار سنگھ تک محدود ہوتا تو غالباً میں اتنی چراغ پا نہ ہوتی۔

''مجھے نیچا دکھائے گا تو!'' میں تقریباً چیخ اٹھی۔ ''پھر ہو ہی جائے تجھ سے مقابلہ۔''

اس پر عارج کہنے لگا۔ ''پہلے مقابلے کی شرائط تو طے کر لے اے دینار!''

''مجھے تیری ہر شرط منظور ہے۔'' میں تیزی سے بولی۔

''پھر بھی سن لے تاکہ تجھے بعد میں ملال نہ ہو۔''

اس کے بعد عارج نے مجھے یکے بعد دیگرے تمام شرائط سے آگاہ کیا۔ میں اس کے الفاظ پر غور کیے بغیر ہر شرط سن کر ''منظور'' کہتی رہی۔ مجھے عارج کے مقابلے میں اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں عارج کی پیش کردہ شرائط پر ضرور غور کرتی۔ عارج کی پہلی شرط یہ تھی کہ میں ہار گئی تو اپنے انسانی قالب پاربتی کو مسلمان ہونے پر مجبور کر دوں گی۔ یہ شرط پہلے مقابلے میں بھی شامل تھی جو عارج اور میرے درمیان شاہ پور میں ہوا تھا مگر جھجار سنگھ کی

مداخلت کے سبب کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تھا۔

''تو پھر سوچ لے اے دینار!'' عارج کی آواز میں چبھن تھی۔ ''تجھے شاید علم نہ ہو کہ تیرے انسانی قالب کے اسلام قبول کرنے کی صورت میں کسی کافر کے گھر رہنا تجھ پر حرام ہو جائے گا..... تجھے جھجار سنگھ کو چھوڑنا پڑے گا۔''

''تو یہ تیری ایک اور شرط ہے۔'' میں نے عارج کو گھورتے ہوئے کہا۔

''نہیں'' عارج نے جواب دیا۔ ''مگر تو چاہے تو اسے بھی شرط سمجھ سکتی ہے۔ میں تجھے صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ مسلمان ہونے کی شرط قبول کرنے کا مطلب کیا ہے۔''

''میں کہہ چکی ہوں کہ مجھے تیری تمام شرطیں منظور ہیں اور میری طرف سے.....''

عارج نے میری بات کاٹ دی اور بولا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تو مجھ سے جھجار سنگھ کی زندگی کی بھیک مانگنا چاہتی ہے۔''

''تو بھیک دے گا مجھے!'' میری آواز غصے سے کانپنے لگی۔ ''تو کیا جھجار سنگھ کو مٹی کا بنا ہوا سمجھتا ہے' وہ بھی تیرے انسانی قالب کی طرح راجپوت ہے۔ اگر تجھے یہ گمان ہے کہ پہلے کی طرح اب بھی تو اسے شکست دے سکتا ہے تو یہ تیری بھول ہے۔ جھجار سنگھ آج رات تک دہلی سے لوٹ آئے گا۔ کل صبح تو جہاں کہے میں اسے بھیج دوں۔ وہ تیری تلوار کی دھار دیکھنے آ جائے گا۔ پہلے تو اپنا یہی ارمان پورا کر لے کہ تجھے کوئی گلہ نہ رہے' پھر مجھ سے مقابلہ کر لینا۔''

یہ بات عارج کے علم میں بھی تھی کہ ان دنوں جھجار سنگھ کسی کام سے دہلی گیا ہوا تھا مگر واپسی کب ہو گی' یہ مجھ سے اسے معلوم ہوا۔ پاربتی کے جسم میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اس کا ذہن پڑھ لیا تھا۔

عارج کو شاید یہ اندازہ نہ تھا کہ برسوں گزر جانے کے باوجود میرا وہی طنطنہ ہو گا اور بات بڑھ جائے گی۔ اس کی اصل جنگ جھجار سنگھ ہی سے تھی' مجھ سے نہیں۔ میں تو گویا خوامخواہ درمیان میں آ گئی تھی۔ میں نے اسے جب خود ہی جھجار سنگھ سے لڑنے کا موقع دے دیا کہ وہ پہلے اپنے انتقام کی آگ بجھا سکے تو وہ فوراً راضی ہو گیا۔

''جھجار سنگھ کو کہیں آنے کی ضرورت نہیں۔'' عارج نے کہا۔ ''کل صبح خود میں ہی تیری حویلی پر پہنچ جاؤں گا۔''

''میں اور جھجار تیرا انتظار کریں گے۔'' یہ کہتے ہی میں تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

میں کیونکہ آج رات کا کچھ ابتدائی حصہ بھی پاربتی کے جسم ہی میں رہ کر گزارنا چاہتی تھی اس لئے پاربتی کے جسم کو چھوڑ دیا۔ بات یہ تھی کہ جھجار سنگھ نے پاربتی کو بھی یہ نہیں بتایا تھا'

سرکاری کام کی آڑ لے کر وہ دراصل کس غرض سے دہلی گیا تھا۔ میں یہی معلوم کرنا چاہتی تھی۔

اس دن شام ہی کو میں نے ایک بار پھر پاربتی کے جسم پر قبضہ کرلیا۔

جھجار سنگھ سورج نکلنے سے پہلے ہی آگرہ لوٹ آیا تھا۔ میں جب پاربتی کے جسم میں اتری اور جھجار سنگھ کے ذہن پر توجہ دی تو مجھے سب کچھ معلوم ہوگیا۔ درحقیقت آگرہ میں جھجار سنگھ پر بڑی پابندیاں تھیں اس کیلئے آگرہ میں اپنے باپ نرسنگھ راؤ کے بھیجے ہوئے آدمی سے ملنا خطرناک تھا۔ وہ کافی دن سے اپنے باپ کے ساتھ رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ اسے موقع کی تلاش تھی۔ باپ کی طرف سے اشارہ ملتے ہی شاہ پور کیلئے روانہ ہو جاتا۔

☆......☆......☆

بالا بالا جھجار سنگھ تمام تیاریاں مکمل کر چکا تھا پاربتی کو خبر نہیں ہونے دی تھی۔ مجھے اس سبب پاربتی کا ذہن پڑھ کر ان باتوں کا پتہ نہیں چل سکا تھا۔ جھجار سنگھ کو امید تھی کہ اس بار شاہ پور سے جو آدمی آئے گا وہ یہی پیغام لائے گا کہ فوراً چلے آؤ۔ اس کی وجہ نرسنگھ راؤ کی علالت تھی۔ مہینے بھر پہلے وہ سخت بیمار ہوگیا تھا۔ شاہ پور سے پیغام رساں تو آیا لیکن یہ وہ پیغام نہیں تھا جس کا جھجار سنگھ کو بے چینی کے ساتھ انتظار تھا۔

شاہ پور سے آنے والے نے راجہ نرسنگھ راؤ کے مرنے کی اطلاع دی تھی۔ اسی اطلاع کے ساتھ باقی راجپوت سرداروں کے پیغام تھے۔ انہوں نے جھجار سنگھ سے جلد از جلد شاہ پور پہنچنے کی درخواست کی تھی۔ نرسنگھ راؤ کی موت کو اس وقت تک کیلئے چھپالیا گیا تھا جب تک جھجار سنگھ شاہ پور نہ پہنچ جاتا۔ راجپوت سردار اب جھجار سنگھ کو اپنا راجہ بنانا چاہتے تھے۔

اگر یہ خبر پھیل جاتی کہ نرسنگھ راؤ مر چکا ہے تو راجپوتوں کے حوصلے جواب دے جاتے اور پھر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مغل فوجیں بھی باغی علاقے میں بے دھڑک داخل ہو جاتیں۔ راجپوت سرداروں نے اس خبر کو چھپا کر بہت عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ انہوں نے جھجار سنگھ کو لکھا تھا کہ تمہارے باپ اور ہمارے راجہ نرسنگھ راؤ نے اس قدر زر و جواہر اور پیسہ جمع کرلیا تھا کہ خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ ان خزانوں کے علاوہ دفینے بھی ہیں۔ سورگ باشی راجہ نے مرنے سے پہلے ان کے ٹھکانے بھی ہمیں بتا دیئے ہیں۔ تم آ جاؤ کہ سب کچھ اب تمہارا ہے۔ سپاہیوں کی تنخواہیں بھی اب تک وقت پر ادا کی جاتی رہی ہیں۔

جھجار سنگھ جب حویلی میں پہنچا تو اس کے کچھ ہی دیر بعد میں نے پاربتی کا قالب اپنا لیا تھا۔ اس کے چہرے سے غیر معمولی جوش کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کا اندازہ میں نے پہلی ہی نظر میں کرلیا تھا۔

میرا ہاتھ پکڑ کر جھجار سنگھ مجھے حویلی کے اندر والے دالان میں لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ملازموں کو یہ تاکید کردی کہ کسی کو بھی ادھر نہ آنے دیا جائے۔ پاربتی کا بیٹا بکرماجیت اب گیارہ سال کا ہوگیا تھا۔

باپ کی ڈانٹ کھا کر وہ بھی میرے پیچھے نہ آیا۔ خود میں بھی جھجار سنگھ سے خلوت میں بات کرنا چاہتی تھی۔ میں اسے عارج کے انسانی قالب دلاور علی کے بارے میں بتاتی۔ دالان میں پہنچتے ہی جھجار سنگھ نے وہ پیغام میرے ہاتھ میں تھما دیا جو راجپوت سرداروں کی طرف سے اسے ملا تھا۔

پیغام کے بارے میں مجھے پہلے ہی جھجار سنگھ کا ذہن پڑھ کر پتہ چل چکا تھا مگر ظاہر ہے کہ میں جھجار سنگھ کو یہ کیسے بتا دیتی اور اسی بنا پر میں نے وہ پیغام پڑھ کر حیرت سے کہا۔ ''یہ پیغام لے کر کون آیا؟''

''اس کو چھوڑو۔'' جھجار سنگھ بولا۔ ''ہمیں آج ہی رات آگرے سے نکل جانا ہے۔''

''مگر کیسے؟'' میرے لہجے میں اب بھی حیرت تھی۔

جواب میں مجھے جھجار سنگھ نے وہ سب کچھ بتا دیا جو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔

''تم نے مجھ سے یہ باتیں کیوں چھپائیں؟ کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہ تھا؟'' میں بولی۔

''پارو! یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ تم صرف وہ سامان باندھ لو جسے ساتھ لے جانا بہت ضروری ہے۔ میں اتنے میں قلعے سے ہو کر آتا ہوں۔ تمہیں تو خبر ہے کہ ہم پر جاسوس مقرر ہیں۔ ان کا بھی بندوبست کرنا ہے۔ میں پہلے ہی راستہ ہموار کر چکا ہوں' بس وعدے کے مطابق انہیں رقم کی ادائیگی کرنی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا تو ہم یہاں سے فرار نہیں ہو سکیں گے۔'' یہ کہہ کر جھجار سنگھ نے مجھ سے تجوری کی چابیاں مانگیں۔

''ہم یہاں سے آج رات نہیں' کل رات نکلیں گے جھجار سنگھ!'' میں نے کہا۔

''وہ کیوں؟'' جھجار سنگھ نے پوچھا۔

''ہم آج رات یہاں سے چلے گئے تو دونوں بزدل کہلائیں گے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''اس میں بزدلی کی کیا بات ہے پارو! ہم......''

''تم سمجھے نہیں' میں کچھ اور کہنا چاہتی ہوں۔'' میں بول اٹھی۔

''تو بولو بھی نا۔'' جھجار سنگھ کی آواز میں اس بار قدرے جھلاہٹ اور بیزاری تھی۔

"تو سنو کہ تمہارا پرانا دشمن دلاور علی آگرے پہنچ چکا ہے اور میں نے اسے کل صبح اپنا حوصلہ نکالنے کیلئے یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔"

"دلاور علی!...... یہاں؟" جھجار سنگھ کیلئے یہ اطلاع خلاف توقع ہی تھی۔ وہ اسی لئے دنگ رہ گیا پھر جب اس کی حیرت کسی قدر کم ہوئی تو اس نے مجھ سے تفصیلات معلوم کیں۔ اس کے بعد وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "یقین کرو کہ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو میں اپنے دشمن سے فیصلہ کیے بغیر یہاں سے نہ ٹلتا لیکن صرف اس کی خاطر تمہارے اور اپنے مستقبل کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ ہمیں ہر قیمت پر آج ہی رات آگرے سے روانہ ہونا ہے۔"

"کچھ بھی ہو جھجار سنگھ! مگر یہ تو قطعی بزدلی ہے۔" میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔

"یہ بزدلی نہیں عقل کی بات ہے پارو!" جھجار سنگھ اپنی بات پر اڑا رہا۔ "اگر کسی طرح پتا جی کے سورگ باش ہونے کی خبر عام ہو گئی تو پھر ہم آگرے سے فرار نہیں ہو سکیں گے۔ اس کمینے کی وجہ سے میں یہاں نہیں رک سکتا، تم اسے میرا آخری فیصلہ جانو۔"

پھر میں نے بہت کوشش کی کہ جھجار سنگھ میری بات مان لے مگر ناکام رہی۔ جھجار سنگھ ایک رات بھی آگرہ میں رہنے پر راضی نہ ہوا۔ اسی دوران میں میرے اور جھجار سنگھ کے درمیان تلخ کلامی بھی ہو گئی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

"میں زبان دے چکی ہوں اور زبان دے کر پھر جانا آن کے خلاف ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔

"یہ کیوں بھول جاتی ہو پارو کہ تم عورت ہو مرد نہیں اور زبان مرد کی ہوتی ہے عورت کی نہیں۔ اگر میں نے اسے زبان دی ہوتی تو اور بات تھی۔" جھجار سنگھ اپنی مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔

مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ میں یہ توہین برداشت نہ کر سکی اور جھجار سنگھ پر برس پڑی۔ پھر جھجار سنگھ نے بڑی منت سماجت کر کے میرا غصہ ٹھنڈا کیا اور بات ختم ہوئی۔

میں اگر اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لاتی تو جھجار سنگھ سے اپنی بات منوا لینا مشکل نہ ہوتا لیکن اسے ضروری نہیں سمجھا۔ مصلحتاً میں نے جھجار سنگھ کو ان شرائط سے آگاہ نہیں کیا تھا جو عارج اور میرے درمیان طے ہوئی تھیں ورنہ شاید جھگڑا اور بڑھ جاتا۔ مجبوراً اسی رات پاربتی اپنے شوہر کے ساتھ آگرہ سے فرار ہو گئی۔ میں اس سے قبل ہی پاربتی کے جسم سے نکل آئی تھی۔

دوسرے دن صبح جب عارج جھجار سنگھ کی حویلی پہنچا تو حویلی ویران پڑی تھی۔ اس

کے نزدیک یہ بات ناممکن تھی کہ میرا جیسا مزاج رکھنے والی جن زادی مقابلے سے بھاگ جائے گی۔

ابھی عارج وہیں کھڑا تھا کہ میں نے اپنے طے شدہ منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ اس کیلئے میں ایک آدم زاد گھڑ سوار کو پہلے ہی اپنے اثر میں لے چکی تھی۔ گھڑ سوار آدم زاد کو معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

ہوا یہ کہ ایک جانب سے ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور عارج کے قریب سے گزر گیا۔ وہ تیر حویلی کے دروازے میں پیوست ہو گیا تھا۔ عارج تیزی سے مڑا تو اس نے کافی فاصلے پر ایک گھڑ سوار کو دیکھا جو تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ وہ تیر اسی گھڑ سوار نے چلایا تھا جس سے ایک پیغام بندھا ہوا تھا۔

گھڑ سوار کا تعاقب کرنے کے بجائے عارج نے اس پیغام کو دیکھنا زیادہ ضروری سمجھا جو اسی کیلئے ہو سکتا تھا۔ تھا بھی ایسا ہی، میں اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے سے تیر کھینچ لیا اور مہر بند پیغام اس سے جدا کر کے تیر ایک طرف پھینک دیا۔

وہ مہر بند پیغام میری طرف سے عارج کیلئے ہی تھا۔ عارج نے سوچا کہ پیغام پہنچانے والا گھڑ سوار پاربتی کا کوئی ملازم ہو گا حالانکہ ایسا نہ تھا۔ عارج کو غالباً یاد نہیں رہا تھا کہ میں ایک جن زادی ہوں اور یہ معمولی کام کسی بھی آدم زاد سے لے سکتی ہوں۔

عارج توجہ سے میرا پیغام پڑھنے لگا، لکھا تھا۔ "مجھے نہ پا کر یہ نہ سمجھ لینا کہ میں اپنی زبان سے پھر گئی ہوں۔ میں آخری سانس تک اپنے کہے ہوئے الفاظ پر قائم رہوں گی۔ میں یہاں سے کہاں اور کیوں جا رہی ہوں جلد ہی تجھے اس سوال کا جواب مل جائے گا تو اگر وہاں آ سکے اور تیرے اندر اتنی ہمت ہو تو وہاں ضرور آنا۔ میں تیرا انتظار کروں گی۔" اس پیغام کے شروع اور آخر میں دانستہ میں نے بطور احتیاط عارج اور اپنے نام نہیں لکھے تھے۔ مجھے اس سلسلے میں تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ آدم زادوں کو ہم جنات کے نام معلوم ہونا کبھی کبھی خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

جنات کو اپنا غلام بنانے کیلئے آدم زاد جو وظیفے کرتے ہیں ان کیلئے ہمارا نام جاننا ضروری ہوتا ہے۔

پھر چند ہی دن گزرے تھے کہ عارج کو معلوم ہو گیا کہ میں کہاں ہوں حالانکہ یہ بات غلط تھی۔ اسے میرے بارے میں نہیں پاربتی کے متعلق پتہ چلا تھا۔ میں تو اس کے ساتھ آگرہ ہی میں تھی۔

یہ حقیقت سامنے آنے پر کہ جھجار سنگھ دارالحکومت سے فرار ہو گیا ہے ان جاسوسوں کو سخت سزائیں دی گئیں جنہیں جھجار سنگھ کی نگرانی پر مقرر کیا گیا تھا۔ غداری کے صلے میں انہیں جھجار سنگھ سے جو زر و جواہر اور نقد رقم ملی تھی وہ بھی نکلوالی گئی۔

باغی راجہ نرسنگھ راؤ مر چکا ہے اور اس کی جگہ جھجار سنگھ نے لے لی ہے یہ خبر پا کر مغل افواج کے سپہ سالار خان خاناں مہابت خاں کو بھی بہت رنج ہوا۔ باغی جھجار سنگھ کو اب تک اسی کی پشت پناہی حاصل رہی تھی ورنہ باپ کے باغی ہونے کے بعد اسے گرفتار کر لیا جاتا۔ یوں فرار ہو کر جھجار سنگھ نے اس کے اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچائی تھی۔

مہابت خاں اکثر کہا کرتا تھا کہ ضروری نہیں جیسا باپ ہو ویسا ہی بیٹا بھی ہو۔ سبھی کو خبر تھی کہ جھجار سنگھ کس کا پروردہ ہے نتیجے کے طور پر جھجار سنگھ کی سرکوبی کیلئے سب سے پہلے مہابت خاں ہی نے آواز اٹھائی۔ اس طرح وہ اپنے دامن پر لگنے والے داغ کو دھو دینا چاہتا تھا۔

شاہجہان کو برسر اقتدار آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس کیلئے بھی یہ ضروری تھا کہ اپنا رعب اور اقتدار قائم کرنے کی خاطر اس فتنے کا سر کچل دے۔ عارج کو جب معلوم ہوا کہ مہابت خاں کا کیا ارادہ ہے تو اس نے وکیل سلطنت (وزیراعظم) آصف خاں سے اس سلسلے میں ملاقات کی۔ آصف خاں سے عارج بہت قریب تھا۔

آصف خاں ہی ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ جھجار سنگھ کی سرکوبی کیلئے جو فوج بھیجی جائے اس میں عارج بھی شامل ہو۔

کسی مصلحت کے پیش نظر آصف خان عارج کو مہابت خاں کے ساتھ بھیجنے پر راضی نہ ہوا مگر اس نے ایک اور راہ نکال لی۔

اس بغاوت کو ختم کرنے کیلئے بادشاہ کے سامنے مہابت خاں کے علاوہ آصف خاں نے بھی سرگرمی اور دلچسپی کا اظہار کیا۔

اس کے بعد ہی شاہجہان نے وسیع فوجی کارروائی کا حکم دیا۔

سپہ سالار مہابت خاں کو دس ہزار سوار' پانچ ہزار بندوقچیوں' پانچ سو نیل داروں اور تبرداروں کے ساتھ گوالیار کے راستے باغی جھجار سنگھ پر حملے کا حکم ملا۔ اس کیلئے مہابت خاں کو سرکاری خزانے سے ایک لاکھ روپیہ دیا گیا اور دوسرے امراء کو بھی اسی طرح شاہانہ عنایات سے نوازا گیا۔ ان امراء میں عارج بھی تھا۔

عارج کو مہابت خاں سے الگ آصف خاں کی ایک معیت پر کماں دار مقرر کیا گیا

تھا۔ صوبیدار مالوہ خان جہاں لودھی کے نام بھی حکم جاری کیا گیا کہ وہ اپنے امرائیوں اور امدادی فوج کے ساتھ مہابت خاں کے ساتھ آ ملے۔ باغی علاقے پر چاروں طرف سے بھرپور یورش کی خاطر قریبی علاقوں کے امیروں کو بھی پیغام بھیجے گئے۔

جب یہ تمام انتظامات ہو گئے تو خود بادشاہ وقت شاہجہاں بھی اپنے ساتھ ایک بڑی فوج لے کر دارالحکومت آگرہ سے نکلا۔ شکار کی شہرت دے کر وہ آہستگی کے ساتھ گوالیار کی طرف بڑھنے لگا۔ شاہجہان نے اپنے اصل مقصد کو مصلحتاً راز میں رکھا۔ ابتداء ہی میں اس کیلئے یہ شہرت اچھی نہ ہوتی کہ ایک معمولی باغی کی سرکوبی کیلئے خود اسے بھی حرکت میں آنا پڑا مگر وہ راجپوتوں کے طرز جنگ اور ان کی بہادری سے خوب واقف تھا۔

شاہجہاں کو علم تھا کہ باغی راجپوتوں پر غلبہ پانا آسان نہیں ہو گا۔ وہ محاذ جنگ سے قریب ہوتا تو اس کی فوجوں کی ہمت بندھی رہتی اور دشمن کے حوصلے بھی پست ہو جاتے۔ پھر اگر وہ باغی مہابت خاں کے قبضے میں نہ آتے یا اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتے تو خود شاہجہاں تازہ دم فوج کے ساتھ میدان میں آ جاتا اور اس طرح فتح یقینی ہو جاتی۔

بادشاہ وقت تو یہ منصوبے بنا رہا تھا دوسری جانب جھجار سنگھ نے نئی حکمت عملی اختیار کی۔ اس نے شاہ پور کو اپنا مرکز بنانے کے بجائے اسی علاقے کے ایک مضبوط قلعے ایرج کو اپنا مستقر حکومت بنا لیا۔ ایرج کا قلعہ اس پورے باغی علاقے کا سب سے مضبوط قلعہ تھا اور جنگی نقطہ نظر سے بھی بہتر تھا۔

میں یوں تو عارج کے ساتھ تھی لیکن جھجار سنگھ کی نقل و حرکت پر بھی نظر رکھے ہوئے تھی۔

مغل افواج منزلوں پر منزلیں مارتی ہوئی باغی علاقے میں داخل ہو گئیں۔ انہوں نے تیزی سے پیش قدمی کر کے قلعہ ایرج کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ قلعہ کافی بلندی پر تھا اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ دشوار گزار تھا۔

عارج حملہ آور فوجوں کے ہراول دستے میں تھا۔ وہ بڑی ترتیب اور نظم کے ساتھ اپنی فوج کو اوپر چڑھا لے گیا۔ عارج اور اس کے سپاہی تقریباً دو فرسنگ تک اوپر چڑھتے چلے گئے۔ قلعہ ایرج اب زیادہ دور نہیں تھا۔

جھجار سنگھ نے پہلے ہی سے کچھ فوج کمین گاہوں میں بٹھا رکھی تھی۔ یہی فوج دفعتاً اپنی کمین گاہوں سے نکل کر عارج کی فوج پر ٹوٹ پڑی۔ اسی وقت میں نے قلعے کا دروازہ کھلتے دیکھا۔ عارج بھی اس طرف متوجہ ہو گیا۔ جھجار سنگھ قلعے سے ایک بڑا لشکر لے کر نکلا۔ عارج

نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ جھجار سنگھ کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر آگے آگے کون ہے۔

ہر چند کہ عارج کی فوج دو طرف سے گھر چکی تھی مگر وہ ہمت نہ ہارا۔ جھجار سنگھ کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر پاربتی کو سوار دیکھ کر عارج کا خون کھول اٹھا تھا۔ اسے یہ غلط فہمی تھی کہ اب بھی پدمنی پاربتی کے جسم میں ہوں۔ اس نے بہادری کے ساتھ آگے بڑھ کر قلعے سے نکلنے والی راجپوتوں کی فوج پر حملہ کر دیا۔

ادھر نشیب میں بھی جنگ چھڑ چکی تھی۔ جھجار سنگھ نے یقیناً پہلے ہی سے تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں اور دانستہ مغل فوج کو آگے بڑھنے کا موقع دیا تھا۔ نشیب میں مہابت خاں کے ساتھ جو فوج اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی اس پر بھی راجپوتوں نے عقب سے حملہ کیا تھا۔

راجپوتوں کے اچانک حملے سے اوپر نیچے ہر طرف ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔

عارج کا لشکر دونوں جانب سے راجپوتوں کے نرغے میں آ گیا تو لشکر میں بڑی بے ترتیبی اور ابتری پھیل گئی۔ وہ سنبھالے نہ سنبھلا۔ لشکر کے قدم اکھڑنے لگے مگر عارج مٹھی بھر جیالوں کے ساتھ دشمن کے مقابلے پر ڈٹا رہا۔

دشمن کی جانب سے پاربتی اپنی شجاعت کے بے مثل نمونے دکھا رہی تھی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح عارج کے انسانی قالب دلاور علی تک پہنچ جائے کیونکہ وہ بھی اسے دیکھ چکی تھی۔

ادھر عارج اپنے قالب دلاور علی کے دیرینہ رقیب و حریف جھجار سنگھ کے مقابل جما ہوا تھا۔ وہ بڑی بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ اسے یوں مردانہ وار لڑتے دیکھ کر اس کے سپاہیوں کی ہمت بھی کچھ بندھی اور وہ پسپا ہوتے ہوتے ایک بار پھر سنبھل گئے۔ عارج کے سپاہی ادھر ادھر سے جمع ہو کر اس کے قریب آ گئے اور جم کر لڑنے لگے۔

دشمن کے حملے روکنے میں عارج کو اتنی مہلت نہ مل سکی کہ مزید آگے بڑھ سکے۔

یہ خونریز معرکہ ابھی اپنی پوری شدت کے ساتھ جاری تھا کہ شاہجہان کے گوالیار پہنچنے کی خبر سارے مغل لشکر میں پھیل گئی۔ اس خبر نے مغل لشکر میں جیسے دلیری کی تازہ روح پھونک دی۔ دوسری طرف اسی خبر نے جھجار سنگھ اور راجپوت سرداروں میں تہلکہ ڈال دیا۔

جھجار سنگھ اپنی فوجوں کو معرکہ جنگ سے ہٹا لایا اور قلعہ ایرج میں محصور ہو گیا۔

زخمی ہونے کے باوجود عارج آخر وقت تک بڑی دلیری سے لڑا تھا۔ اس کا سارا جسم جیسے زخموں سے سجا ہوا تھا۔ زخموں سے اتنا خون بہہ چکا تھا کہ اس پر نقاہت سی طاری ہو گئی تھی۔

ادھر وہ خونریز معرکہ دن بھر کی جنگ کے بعد ختم ہوا ادھر عارج زخموں کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گیا۔ اسے فوراً لشکر کی پچھلی صفوں میں منتقل کر دیا گیا۔ میں اس کی طرف سے پوری طرح چوکنا اور محتاط تھی۔ اسے میں نے ہی بے ہوش کیا تھا تا کہ اس کے زخموں کی مرہم پٹی ہو جائے۔ اسی کے ساتھ وہ آرام بھی کر لے۔ میری توقع کے مطابق جراح اور طبیب اس کی نگرانی پر مامور ہو گئے۔

ایک تیر کا پیکان (پھل) عارج کے انسانی قالب کے سینے کی دائیں جانب پسلیوں میں پھنسا ہوا تھا جسے بڑی مشکل سے نکالا گیا۔

سپہ سالار مہابت خاں اور دوسرے امراء عارج کی عیادت کیلئے اس کے خیمے میں آئے اور طبیبوں سے بھی اس کا حال پوچھا۔ عارج اب تک بے ہوش تھا۔ طبیبوں نے کہا تھا کہ اگر صبح تک اسے ہوش نہ آیا تو اس کا بچنا مشکل ہے۔

وہ رات عارج پر بہت بھاری گزری لیکن طبیبوں کے ساتھ ساتھ میری کوشش سے اسے صبح تک ہوش آ ہی گیا۔ صبح ہوتے ہی عارج کے لشکر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ طبیبوں کے منع کرنے کے باوجود عارج دو خدمتگاروں کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے خیمے کے در تک آیا۔ خیمے کے باہر ہجوم تھا جس نے عارج کو دیکھ کر خوشی سے نعرے لگائے۔ پھر عارج دوبارہ بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ اسی وقت اسے قلعہ ایرج کے فتح ہونے کی خوشخبری سنائی گئی۔

''کب؟'' عارج نے شدید حیرت سے پوچھا۔

''رات کے اولین حصے میں۔'' عارج کو بتایا گیا۔ ''شب خون مارا گیا تھا۔''

پھر عارج کو دیگر تفصیلات کا علم ہوا۔ بھرت سنگھ اور مغل فوج کے دو امیروں نے قلعہ ایرج کو شب خون مار کر فتح کیا تھا۔ محصورین میں سے تین ہزار کو قتل کر دیا گیا تھا اور باقی نے ہتھیار ڈال کر اطاعت قبول کر لی تھی۔

اب تک عارج کو جو تفصیلات بتائی گئی تھیں ان میں جھجار سنگھ اور پاربتی کا ذکر نہیں آیا تھا۔ عارج نے اس سلسلے میں استفسار کیا تو اسے پتہ چلا کہ وہ دونوں ہاتھ نہیں آ سکے۔ شاید وہ قلعے کی سرنگ کے ذریعے نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ سرنگ کا سراغ لگا لیا گیا تھا۔ حلقہ اطاعت میں آ جانے والے راجپوت سرداروں میں سے ایک نے سرنگ کی نشاندہی کی تھی۔

عارج کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ وہاں سے کوچ کر سکتا۔ وہ اپنا لشکر لئے سات دن تک وہیں پڑا رہا۔ سپہ سالار مہابت خاں اور دوسرے امراء اپنی فوجوں کے ساتھ گوالیار پہنچ

چکے تھے۔

اس عرصے میں عارج کو گوالیار سے مختلف خبریں موصول ہوتی رہیں۔ پہلی خبر یہ تھی کہ محصور ہوتے ہی ججھار سنگھ نے خطا بخشی کیلئے ایک راجپوت سردار کو اپنا وکیل بنا کر شاہجہان کے پاس گوالیار بھیجا تھا۔ وہ راجپوت سردار یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ ججھار سنگھ دست بستہ عرض کرتا ہے حضور اس سیاہ کار کے صفحۂ اعمال کو عفو کے پانی سے دھو دیں تو پھر تاعمر حضور کی نافرمانی کی جرأت نہ کرے۔ کبھی اطاعت اور فرماں برداری کے دائرے سے باہر قدم نہ رکھے۔ اسی اثنا میں ایک شاہی ہرکارے نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ قلعہ ایرج کو فتح کر لیا گیا ہے اور پھر بقیہ تفصیلات بیان کیں۔

دوسری خبر عارج کو یہ ملی کہ جب چوتھے روز شاہی لشکر فتح و کامرانی کے بعد گوالیار میں واپس آ کر ٹھہرا تو وہ امراء دربار جو دولت مغلیہ کے قدیم خیر خواہ اور سچے جاں نثار تھے اپنی جاں بازیوں کے صلے میں عنایات شاہانہ اور مناصب جلیلہ سے ممتاز و معزز ہوئے۔ تمام فوجی افسروں کی گودیاں زر و نقد سے لبریز کر دی گئیں۔

آخری خبر اس روز عارج کو ملی جب وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ گھوڑے پر بیٹھ سکے۔ یہ خبر اس کیلئے سب سے اہم تھی۔ سپہ سالار مہابت خاں اور دیگر کئی امیروں کی سفارش پر جو مہابت خاں کے زیر اثر تھے ججھار سنگھ کو معاف کر دیا گیا تھا۔ مہابت خاں کے ساتھ ججھار سنگھ اب دکن روانہ ہو چکا تھا۔

اس اہم خبر کی تفصیلات یہ تھیں کہ جب ججھار سنگھ دست بستہ شاہجہاں کے حضور میں پیش کیا گیا تو بادشاہ نے خود اپنے ہاتھ سے اس کے سر پر معافی کا تاج رکھا۔ ججھار سنگھ نے ہزار اشرفیاں پندرہ لاکھ روپے اور چالیس ہاتھی اس خطائے بے جا کے جرمانے میں بادشاہ کے نذر کیے جو اس سے سرزد ہوئی تھی۔ بادشاہ نے چار ہزار سوار ججھار سنگھ کی ماتحتی میں دے کر اسے اس کی آبائی جاگیر پر قبضہ دے دیا۔ پھر اس کیلئے حکم ہوا کہ وہ فوراً سپہ سالار خان خاناں مہابت خاں کے ساتھ دکن روانہ ہو گئے۔ ہر چند کہ طبیبوں نے ابھی عارج کو سفر کی اجازت نہیں دی تھی مگر اس نے اپنی فوج کو گوالیار کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔ یوں بھی اب وہاں رکھا ہی کیا تھا۔ عارج کا جی اس لئے بھی وہاں بولانے لگا تھا کہ پاربتی گویا اس کی دانست میں پھر ایک بار اس سے بہت دور چلی گئی تھی اور وہ ابھی تک اپنے رقیب ججھار سنگھ سے انتقام بھی نہ لے سکا تھا۔ بادشاہ وقت مغل تاجدار شاہجہاں نے تو اس باغی کو معاف کر دیا تھا لیکن عارج اسے کیسے معاف کر دیتا۔

گوالیار میں عارج سے پہلے اس کی جواں مردی کے قصے پہنچ چکے تھے۔ شاہجہان نے اسے بھی خلعت فاخرہ عطا کی اور منصب میں بھی اضافہ کیا۔ اب وہ تین ہزاری منصب دار بنا دیا گیا تھا۔

عارج کو ابھی طویل عرصے آرام اور علاج کی ضرورت تھی۔ یمین الدولہ آصف خاں کے اصرار پر جو بادشاہ کے ساتھ گوالیار آ گیا تھا عارج اپنے انسانی قالب دلاور علی کے آبائی وطن شاہ پور جانے پر راضی ہو گیا۔ عارج مزید چند روز گوالیار ہی میں رک کر اپنے خدمت گاروں اور طبیبوں کے ہمراہ شاہ پور روانہ ہو گیا۔ وہ بے خبر تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ ہوں۔

برسوں بعد وہ شاہ پور پہنچا تو دلاور علی کے والدین اور گھر والوں کی جیسے عید ہو گئی۔ شاہ پور کے قلعہ دار نے اس سے درخواست کی کہ وہ قلعے میں قیام کرے مگر اس نے دلاور علی کی آبائی حویلی ہی میں رہنا پسند کیا۔

مکمل صحت یاب ہوتے ہوتے عارج کے انسانی قالب کو کئی ماہ لگ گئے۔ پھر شاہ پور میں مزید قیام اس کیلئے مشکل ہو گیا۔ وہ جس راہ سے گزرتا اسے پاربتی کی شکل میں گویا میری یاد آتی۔ دلاور علی کے والدین نے لاکھ چاہا کہ عارج کی شادی کر دیں مگر ظاہر ہے وہ کس طرح اس پر راضی ہو سکتا تھا۔ وہ تو ایک جن زاد تھا اور اس کے دل میں ایک جن زادی سمائی ہوئی تھی۔ اس نے اسی لئے شادی سے صاف انکار کر دیا۔ اگر اس کی شادی کسی ایسی آدم زادی سے کرائی جاتی' میں جس کے جسم پر قابض ہوتی تو یقیناً وہ آمادہ ہو جاتا۔ اس بات سے بھلا آدم زاد کس طرح واقف ہو سکتے تھے۔ عارج کا انسانی قالب اب نوعمر و نوجوان بھی نہیں رہا تھا کہ دلاور علی کے والدین زبردستی کرتے۔

اب تو عارج کو بس یہ لگی ہوئی تھی کہ جلد از جلد آگرہ پہنچ کر کوئی ایسی راہ نکالے کہ دکن جا سکے۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ سرکاری تقرری کے بجائے اپنے طور پر دکن چلا جائے لیکن اسے یہ بات خلاف مصلحت معلوم ہوئی۔ اب وہ غیر معروف و غیر اہم نہیں رہا تھا کہ یہ بات راز میں رہ سکتی۔ وہ شاہی امراء میں شامل تھا۔ اس طرح اس کے دکن پہنچنے کو کچھ سے کچھ معنی پہنائے جاتے۔ بادشاہ کی اجازت حاصل کیے بغیر اس کا دکن جانا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ نتیجے کے طور پر وہ کچھ ہی دن بعد آگرہ روانہ ہو گیا۔

وہ آگرہ پہنچا تو اسے کچھ ایسی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں کہ اسے طویل عرصے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی بالآخر اس نے آصف خاں سے بات کی جو اس پر ہمیشہ سے مہربان تھا۔ آصف خاں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ جشن نوروز منعقد ہونے کے بعد دکن میں اس کا

تقرر ہو جائے گا۔ شاہجہاں یہی جشن برپا کرنے لاہور سے آگرہ پہنچا تھا۔ شاہجہاں کو تخت حکومت پر جلوس کیے یہ آٹھواں سال تھا۔ اس کا اقتدار مضبوط و مستحکم تھا۔

جشن نوروز میں عارج نے بھی شرکت کی۔ جب تک وہ جشن برپا رہا عارج کا خیال کسی طرف نہ گیا۔

پوری محفل زریں فرش فروش اور رنگین آئینہ بندی سے جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔ در و دیوار سے طلائی شعاعیں پھوٹتی معلوم ہو رہی تھیں۔ اس محفل کی تمام تر رونق تخت طاؤس سے تھی۔ اسے پہلی بار دیکھ کر میں بھی مبہوت سی ہو گئی۔ اس تخت طاؤس پر ہندوستان کا مغل بادشاہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس زمانے میں یہ تخت سات سال کی مدت میں ایک کروڑ روپے کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔ اس میں چودہ لاکھ روپے کا تو سونا ہی لگا تھا اور باقی رقم کے بیش قیمت جواہر لگائے گئے تھے۔

مغل تاجدار شاہجہاں جب تخت طاؤس پر بیٹھا تو موسیقاروں نے راگ چھیڑ دیئے اور رقاصاؤں نے رقص کے کمال دکھانے شروع کیے۔ پھر امراء سلطنت مراسم تہنیت و تسلیمات بجالائے۔ عارج بھی ان امراء میں شامل تھا۔

بزرگوں شاعروں اور ارباب طلب کے دامن زرد جواہر سے بھر دیئے گئے۔

تخت طاؤس کی تعریف میں مشہور شاعر محمد جان قدسی نے جو اشعار اس محفل میں پڑھے۔ ان میں سے دو شعر یہ تھے۔

زہے فرخندہ تخت بادشاہی
کہ شد ساماں بہ تائید الٰہی
فلک روزی کہ کردش مکمل
زر خورشید را بگداخت اول

اس جشن کے انیس دنوں میں شاہجہاں نے دل کھول کر انعام اور بخشش دی۔ کوئی محتاج ایسا نہ رہا جو غنی نہ بن گیا ہو۔ لوگوں نے اس داد و دہش کے طفیل برسوں کا سامان جوڑ لیا۔

جشن کے بعد آصف خاں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ خان خاناں مہابت خاں ان دنوں برہان پور کی مہم میں مصروف تھا۔ عارج کیلئے حکم ہوا کہ وہ اپنے ساتھ کچھ تازہ دم فوج لے کر خان خاناں کی مدد کو پہنچ جائے اور اپنے جوہر دکھائے۔ عارج کے دل کی مراد پوری ہوئی۔ برہان پور دکن ہی کے صوبے میں تھا اور اس کا رقیب جھجھار سنگھ بھی وہیں تھا۔

عارج اسی ماہ کے آخر تک فوج کو ساتھ لے کر دکن روانہ ہو گیا۔ پاربتی کی صورت میں گویا مجھے دیکھے اسے کئی برس گزر گئے تھے۔ میری یاد نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ دلچسپ حقیقت یہ تھی کہ میں اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

ایک دفعہ مجھے خیال آیا کہ عارج واقعی میرے لئے بے چین ہے یا اپنے انسانی قالب دلاور علی کے زیر اثر پاربتی کی یاد اسے مضطرب کیے ہوئے ہے؟ سوال کا جواب مجھے مل تو سکتا تھا مگر اس کیلئے ضروری تھا کہ میں عارج پر خود کو ظاہر کر دیتی۔ ایسی صورت میں چوری چھپے کا وہ لطف ختم ہو جاتا جو مجھے سرشار کیے ہوئے تھا۔ میں نے اسی لئے حالات کو جوں کے توں رہنے دیا اور ان میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی۔

برہان پور پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں عارج کو ایک ایسی خبر ملی کہ اس کا دل بجھ گیا۔ اس خبر کے مطابق جھجھار سنگھ خان خاناں مہابت خاں سے رخصت لے کر اپنے وطن شاہ پور پہنچ چکا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے ایک بار پھر سرکشی اختیار کر لی تھی اور سارے علاقے میں بغاوت کے شعلے بھڑکا دیئے تھے۔

افتاں و خیزاں عارج برہان پور پہنچا تو بقیہ تفصیلات کا علم ہوا۔ جھجھار سنگھ نے اپنے علاقے میں پہنچنے کے بعد ایک شاہی تعلقہ دار بھیم نرائن کو حیلے سے شاہ پور بلایا۔ جب بھیم نرائن شاہ پور پہنچا تو جھجھار سنگھ نے اسے ہمراہیوں سمیت قتل کر ڈالا۔

اس کے بعد جھجھار سنگھ نے تعلقے کے خزانے اور قلعے کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

پاربتی کو جھجھار سنگھ اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا مگر مہابت خاں کو دھوکے میں رکھنے کیلئے اپنے نوجوان بیٹے بکرماجیت کو اس کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ مہابت خاں اسی لئے یہ دھوکہ کھا گیا کہ جھجھار سنگھ کوئی غلط قدم نہیں اٹھائے گا۔ جھجھار سنگھ کیونکہ پہلے ہی اپنے بیٹے کو پٹی پڑھا گیا تھا اس لئے موقع ملتے ہی وہ بھی باپ کے پیچھے پیچھے دکن سے فرار ہو گیا اور جان بچا کر شاہ پور پہنچ گیا۔

17 سالہ بکرماجیت کے ساتھ راجپوتوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ ان راجپوتوں کو جھجھار سنگھ نے پہلے ہی سانٹ لیا تھا۔ جب برہان پور میں مہابت خاں کو یہ اطلاع ملی تو اس نے مالوے تک برماجیت کا تعاقب کیا۔ مہابت خاں جلدی میں اپنے ساتھ زیادہ فوج نہیں لے جا سکا تھا۔ جب سرکاری فوج باغی راجپوتوں کے سر پر پہنچ گئی تو بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں خاصے راجپوت مارے گئے مگر ان کا ایک گروہ بکرماجیت کو مغل فوج کے نرغے سے نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ برماجیت کو بھی اس لڑائی میں دو زخم لگے تھے۔

برماجیت جب بچ کر نکل گیا تو بقیہ راجپوت منتشر ہو گئے جن میں سے اکثر کو مغل فوجیوں نے پکڑ کر قتل کر دیا۔

مہابت خاں ابھی تک مالوہ میں تھا۔ عارج کو کیونکہ اسی کے پاس بھیجا گیا تھا اس لئے وہ برہان پور میں رکنے کے بجائے اپنا لشکر لے کر خود بھی مالوہ پہنچ گیا۔ مالوہ سے اسے یہ خبر مل گئی تھی کہ جب تک دارالحکومت آگرہ سے مہابت خاں کیلئے کوئی نیا حکم نہیں آ جائے گا وہ کدھر کا رخ کرے۔ مالوہ ہی میں رکا رہے گا۔ اس نے اپنی بقیہ فوجوں کو بھی مالوہ میں بلوا لیا تھا۔

ادھر عارج اپنا لشکر لے کر مالوہ پہنچا۔ ادھر آگرہ سے احکام آ گئے۔ سپہ سالار مہابت خاں کو باغی علاقے پر فوج کشی کا حکم دیا گیا تھا۔ آگرہ سے جو احکام آئے انہی میں ایک حکم عارج کیلئے تھا۔ اس کی گزشتہ خدمات اور کارگزاریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے حکم ملا تھا کہ تم بھی لشکر کے ساتھ مہابت خاں کی مدد کرو۔ تم کیوں کہ اسی علاقے کے ہو اور پہلے بھی وہاں اپنے جوہر دکھا چکے ہو اس لئے تمہیں آگے ہراول میں رہنا ہے۔ اسی حکم کے بعد میں جھجار سنگھ کے حالات معلوم کرنے باغی علاقے میں پہنچ گئی۔

ادھر جھجار سنگھ کو اپنے مخبروں سے شاہ پور میں بادشاہی لشکر کے مقرر ہونے کی اطلاع مل گئی۔ اس نے پاربتی سے مشورہ کیا جو شروع ہی سے بغاوت کے خلاف تھی۔ اس وقت نوجوان بکرماجیت بھی وہاں موجود تھا جو بالکل اپنے باپ جھجار سنگھ پر گیا تھا۔

پاربتی نے اپنے شوہر سے کہا۔ "ابھی تم پورے علاقے کا صحیح طرح بندوبست بھی نہیں کر سکے ہو۔ ایسے میں مغل فوج سے لڑنا کسی طرح مناسب نہیں ہوگا۔ اگر تم میری مانو تو بادشاہ سے اپنے قصوروں کی معافی مانگ لو۔ وہ......"

بکرماجیت جو باپ کی صحبت میں رہ کر خراب ہو گیا تھا اس نے منہ بگاڑ کر اپنی ماں کی بات کاٹ دی۔ "ماں! تو یہ کیوں بھول جاتی ہے کہ ہم راجپوت ہیں۔ کسی سے معافی مانگنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ تو بزدلی کی باتیں نہ کیا کر۔"

"یہ بزدلی نہیں عقل مندی ہے' تو چپ بیٹھا رہ' تجھے ابھی کچھ خبر نہیں تو بچہ ہے۔" پاربتی نے اس خودسر کو ڈانٹ دیا۔

بکرماجیت ناراض ہو کر وہاں سے پیر پٹختا ہوا چلا گیا۔

"پارو! یہ بری بات ہے۔ جوان اولاد کو اس طرح نہیں ڈانٹا کرتے۔" جھجار سنگھ بولا۔

"تم نے اسے بھی اپنی طرح بے لگام کر دیا ہے۔ وہ میرا بالکل ادب نہیں کرتا۔"

پاربتی نے شکایت کی۔

"خیر اسے چھوڑو' میں تو تمہاری تجویز پر غور کر رہا ہوں۔" جھجار سنگھ کہنے لگا۔

"پھر کسی نتیجے پر بھی پہنچے کہ نہیں؟" پاربتی نے پوچھا۔

"تم نے جو مشورہ دیا ہے وہ ہمارے لئے بہت مناسب ہے۔" جھجار سنگھ کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔

"فی الحال سے تمہاری کیا مراد ہے؟" پاربتی نے وضاحت چاہی۔

"مطلب یہ کہ اس طرح ہمیں وقت مل جائے گا۔ بادشاہ اس طرح یہی سمجھے گا کہ ہم فرماں برداری پر آمادہ ہیں۔" جھجار سنگھ نے جواب دیا۔

پاربتی حیرت سے بولی۔ "تو کیا سچ مچ تمہارا یہ ارادہ نہیں؟"

"بالکل نہیں" جھجار سنگھ نے انکار میں سر ہلایا۔ "یہ تو بس جھانسہ ہوگا' میں اس عرصے میں سارے علاقے کا بندوبست کر لوں گا۔"

"افسوس ہے تم پر اور تمہاری عقل پر جھجار سنگھ!" پاربتی نے پرتاسف لہجے میں کہا۔ "تمہارے دماغ میں اتنی سی بات نہیں آتی کہ ہم مغل فوجوں سے آخر کب تک مقابلہ کر سکیں گے۔ لڑاکا راجپوت تو ان کے ساتھ بھی ہیں' پر مغل خود ہی لڑنے میں پیچھے نہیں۔"

اس پر جھجار سنگھ بگڑ گیا اور کہنے لگا۔ "تم نے مجھے کبھی ٹھیک مشورہ نہیں دیا۔ تم ہمیشہ دشمنوں سے ڈراتی رہتی ہو۔"

"مگر دشمنی تو تم خود مول لیتے رہتے ہو۔ اس کے باوجود بھی مغل بادشاہ ایک مرتبہ تمہیں معاف کر چکا ہے۔ اب بھی وقت ہے جھجار سنگھ! اپنی سرشت سے باز آ جاؤ ورنہ تمہارا انجام مجھے اچھا نظر نہیں آتا۔" پاربتی کی آواز بھی جواباً بلند ہو گئی۔

"مجھے تمہاری نصیحت کی کوئی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر جھجار غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر اسی روز جھجار سنگھ نے بادشاہ شاہجہاں کے نام ایک اطاعت آمیز پیغام لکھوایا۔

جھجار سنگھ نے اس پرفریب پیغام میں خان خاناں مہابت خاں اور آصف خاں کو اپنا سفارشی بنا کر درخواست کی کہ بادشاہ سلامت دربار کے کسی بھی آدمی کو مقرر کر دیں جو میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ خطا کار کو خطاپوش بارگاہ میں لے جائے۔

میں اس منافقانہ پیغام کا ردعمل دیکھنے کی خاطر جھجار سنگھ کے وکیل ہی کے ساتھ دارالحکومت آگرہ جا پہنچی۔ یہ شہر اب میرے لئے اجنبی نہیں رہا تھا۔ دربار میں جب جھجار سنگھ کا وکیل پیغام لے کر حاضر ہوا۔

پیغام پڑھے جانے کے بعد شاہجہاں نے ارکان دولت کی طرف دیکھا اور انہیں مخاطب کیا۔ ''کیا رائے ہے؟''

سب نے متفق ہو کر کہا کہ ایسے باغی کی سزا قتل ہے۔ اس کے برعکس وزیر اعظم آصف خاں نے برگشتہ بخت جھجار سنگھ کی سفارش کرتے ہوئے کہا۔ ''جہاں پناہ! تاریخ میں بکثرت ایسی مثالیں موجود ہیں کہ بغاوت کے جرم میں قتل کی سزا دی گئی ہے لیکن جھجار سنگھ کے اس جرم سے اغماض فرما کر حضور اسے بخش دیں تو حضور کی فیاضی اور رحم دلی کی نظیر پچھلی تاریخوں میں بھی کہیں نہیں ملے گی۔'' آصف خاں کی آواز میں نرمی تھی اور ایک نوع کی درخواست بھی۔

بادشاہ نے آصف خاں کی بات سن کر سر جھکا لیا اور پھر قدرے توقف سے بولا۔ ''تم نے جو کچھ کہا بے شک سچ ہے لیکن تاوقتیکہ..... دشمنان دولت اپنے جرائم اور بدعنوانیوں کی کافی سزا نہ پائیں اور ان کی بغاوت کے بھڑکتے ہوئے شعلے آب شمشیر سے نہ بجھائے جائیں ملک میں امن و امان قائم رہنا مشکل اور سخت مشکل ہے۔'' یہ کہہ کر بادشاہ دربار عام سے اٹھ کھڑا ہوا اور حرم سرا میں جلوہ آرا ہو کر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

پایہ تخت کا ایک بڑا نامور اور مشہور ہندی شاعر سندر کب نامی تھا۔ وہ جھجار سنگھ سے قریبی تعلق رکھتا تھا۔ دوسرے دن شاہجہاں نے اس شاعر کو فوج کا ایک زبردست دستہ دے کر جھجار سنگھ کے پاس بھیجا۔ بادشاہ نے سندر کب کے ذریعے جھجار سنگھ سے یہ کہلا کر بھیجا کہ اگر جھجار سنگھ وہ تیس لاکھ روپے جو اس نے سرکاری تعلقے داروں سے بہ جبر وصول کیے ہیں شاہی خدام کے حوالے کر دے اور اپنے بیٹے بکرماجیت کو لے کر بدستور سابق خان خاناں مہابت خاں کے پاس چلا جائے تو میں اسے اس کے قصوروں کو معاف کر دوں گا۔ جھجار سنگھ کو دربار میں پیش ہونے کی ضرورت نہیں۔

بادشاہ وقت کا یہ پیغام لے کر شاعر سندر کب آندھی اور طوفان کی طرح شاہی لشکر سے بہت پہلے جھجار سنگھ کے پاس پہنچ گیا۔ سندر کب خود بھی راجپوت تھا۔ اس وقت تک جھجار سنگھ کو مطلوبہ مہلت مل گئی تھی۔ اس نے تمام باغی علاقے کا بندوبست سنبھال لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سرکش جھجار سنگھ کو بادشاہ کی طرف سے تیس لاکھ روپے کا مطالبہ بھی گراں گزرا تھا۔ وہ لالچی اس رقم کی واپسی پر آمادہ نہیں تھا۔ شاعر سندر کب نے قومی ہمدردی اور قدیم تعلق کا لحاظ کرتے ہوئے جھجار سنگھ کو بہت سمجھایا اور بغاوت کے برے نتائج اس پر واضح کیے مگر وہ فتنہ انگیز نہ مانا۔ وہ اپنے تمول کی کثرت پر اس درجہ مغرور اور خاردار درختوں سے بھرے ہوئے جنگلوں پیچ در پیچ گھاٹیوں پر ایسا مطمئن تھا کہ سندر کب کی کسی بات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

سندر کب کی ساری کوششیں رائیگاں ہوئیں۔

اس موقع پر پاربتی نے ایک بار پھر جھجار سنگھ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔

''تم مجھے یہ بتاؤ کہ ہمیں مغل حکومت کے ساتھ رہنے میں بھی کیا پریشانی ہے؟'' پاربتی نے نرمی سے کہا۔

''تمہارے سوال کا میں کیا جواب دوں' تمہیں آزادی اور غلامی کا فرق ہی نہیں معلوم۔'' جھجار سنگھ منہ بگاڑ کر بولا۔

"مگر ہم مغلوں کے غلام تو نہیں ہیں۔" پارتی نے بحث کی۔

"تم اس معاملے میں مداخلت نہ کرو تو زیادہ بہتر ہوگا۔" جھجار سنگھ نے یہ کہہ کر پارتی کو خاموش کر دیا۔

سندر کب مایوس ہو کر لوٹ گیا۔ آگرہ پہنچ کر اس نے دربار میں تمام واقعہ بیان کر دیا۔ مغل تاجدار شاہجہاں کو کم ہی غصے کی حالت میں دیکھا جاتا تھا مگر اس روز اہل دربار نے اس کے چہرے کو غصے سے سرخ ہوتے دیکھا۔ پھر شاہجہاں کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔

اس وقت دربار میں سکوت طاری تھا' جب مغل تاجدار شاہجہاں کی سخت آواز سنائی دی۔ "اس راجپوت جھجار سنگھ کو شاید معلوم نہیں کہ ہم عفو و درگزر کے ساتھ ساتھ باغیوں کو کیفر کردار تک پہنچانا بھی جانتے ہیں۔" چند لمحے خاموشی کے بعد شاہجہاں نے کہا۔ "ہم شہزادہ محمد اورنگزیب کی بابت اپنا سابقہ حکم منسوخ کرتے ہیں۔ ہمارے نئے حکم کا انتظار کیا جائے۔ اللہ گواہ ہے کہ ہم نے حجت تمام کی مگر اس بدبخت باغی نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اب ہم اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کریں گے۔"

شہزادہ محمد اورنگزیب کو شاہجہاں ایک بڑا لشکر دے کر دکن بھیجنے والا تھا' اسے روک دیا گیا۔ پھر اگلے روز شاہجہاں نے نیا حکم جاری کیا۔ نئے حکم کے مطابق شہزادہ اورنگزیب کو تمام مغل افواج کا سپہ سالار مقرر کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ بادشاہ کی طرف سے شہزادے کیلئے حکم ہوا کہ وہ بلا تاخیر اپنے ہمراہ زبردست لشکر لے کر باغی جھجار سنگھ کے قلع قمع کی خاطر آگرہ سے روانہ ہو جائے۔ مغل فوج پہلے ہی سے کوچ کیلئے تیار تھی البتہ اب اس کی منزل بدل گئی تھی اور تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ دو روز کے بعد ہی لشکر آگرہ روانہ ہو گیا۔ کئی نامور امراء اورنگزیب کی رکاب میں تھے۔ یہ فوج بھی بڑے اہتمام سے جھجار سنگھ کے علاقے کی طرف بڑھی۔ جو حالات و واقعات پیش آ رہے تھے ان پر میری پوری نظر تھی۔ مغل افواج کی نقل و حرکت کے ساتھ ہی میں جھجار سنگھ کی جنگی حکمت عملی سے بھی بے خبر نہیں تھی۔ اب مجھے آدم زادوں کے ان معاملات میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ جنات اس طرح فتنہ و فساد برپا نہیں کرتے اور نہ اپنے ہم جنسوں سے یوں جینے کا حق چھینتے ہیں۔ بلاشبہ آدم زاد بڑے فسادی ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں ہم جنات ان کے مقابلے کچھ بھی نہیں۔

باغی علاقے میں پہلا مضبوط قلعہ آوند چہ کا تھا۔ جھجار سنگھ نے پہلی بار مغل فوج کو بلا روک ٹوک اندر آنے دیا تھا مگر اس مرتبہ پارتی کے مشورے پر اس نے مغل فوجوں کو پہلے ہی مورچے پر روکنے کا فیصلہ کیا۔ اس قلعے تک پہنچنے کیلئے مبارزت کی صورت میں مغل فوجوں کو

بڑی دشواری ہوتی۔ راستے میں گھنے خاردار درختوں کے جھنڈ تھے۔ ان میں آسانی راجپوت سپاہ کو چھپایا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ راستے بھی بے حد دشوار گزار اور ناہموار تھے۔ پھر ہزاروں خونخوار راجپوتوں کو راستے میں دائیں بائیں گھاٹیوں اور گنجان درختوں کی کمین گاہوں میں بٹھا دیا گیا کہ جس وقت مغل فوجیں اس طرف سے گزریں یہ لوگ سد راہ ہو کر کمین گاہوں سے تیر و تفنگ کی بارش کر دیں۔ اس کے بعد جب مغل سپاہی سراسیمگی اور بے سروسامانی کے عالم میں بھاگنے لگیں تو راجپوت کمین گاہوں سے نکل کر ان پر ٹوٹ پڑیں۔ ان تمام تیاریوں کے بعد خود جھجار سنگھ پانچ ہزار لڑاکا راجپوتوں کو ساتھ لے کر قلعہ آوند چہ میں محصور ہو گیا۔

خان خاناں کا خیال یہ تھا کہ جھجار سنگھ اس بار بھی قلعہ ایرج کو اپنی پناہ گاہ بنائے گا اور مغل فوجوں کو راستے میں نہیں روکا جائے گا۔ امراء میں صرف عارج اس خیال سے متفق نہیں تھا جس نے مغل امیر دلاور علی کے جسم پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اسی غرض سے اس نے مخبروں کو پہلے ہی آگے روانہ کر دیا تھا۔

سب سے آگے ہراول میں عارج اور اس کا ہی لشکر تھا۔ تیز رفتار مخبروں نے جب عارج کے خیال کی تصدیق کر دی تو وہ مہابت خاں سے ملا۔ مہابت خاں خود بھی اس سے مشورہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ یہ علاقہ عارج کے انسانی قالب دلاور علی ہی کا تھا۔ باغی علاقے میں ابھی مغل لشکر داخل نہیں ہوا تھا۔ اس علاقے سے ایک منزل دور پڑاؤ ڈال دیا گیا تھا۔

جب عارج مہابت خاں کے خیمے میں داخل ہوا تو اس نے شاہی ہرکارہ کو دیکھا جو باہر نکل رہا تھا۔

عارج جیسے ہی اندر پہنچا مہابت خاں نے اسے مبارکباد دی۔ عارج نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ کل صبح تک شہزادہ اورنگزیب بھی ایک بڑا لشکر لے کر یہاں پہنچنے والے ہیں۔ انہی کو جہاں پناہ نے اس مہم کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ اب سرکش و باغی جھجار سنگھ کسی طرح نہیں بچ سکے گا۔ وہاں جو امراء موجود تھے انہوں نے بھی مہابت خاں کی رائے سے اتفاق کیا۔

"حکم آیا ہے کہ اب اسی وقت پیش قدمی کی جائے جب شہزادہ حضور یہاں پہنچ جائیں۔" مہابت خاں نے مزید بتایا۔ "اب ہم قلعہ ایرج پہنچ کر ہی دم لیں گے۔ وہاں تک پہنچنے سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔"

مہابت خاں کچھ زیادہ ہی خوش فہم نظر آ رہا تھا۔ اس نے عارج کی آمد کو بھی زیادہ اہمیت نہ دی۔ جب اس نے قلعہ ایرج پہنچ کر دم لینے کا ذکر کیا تو عارج خاموش نہ رہ سکا اور بولا۔ "حضور! میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

''ہاں ضرور!'' مہابت خاں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''ہم تو خود تمہاری رائے جاننا چاہتے تھے۔ اول تو یہ کہ اس علاقے سے تم بہت اچھی طرح واقف ہو' دوم ہم نے سنا ہے کہ تم نے اپنے کچھ مخبروں کو بھی آگے بھیجا تھا۔''

''آپ نے درست سنا تھا۔'' عارج بولا۔ پھر بتانے لگا۔ ''مخبروں کی اطلاعات کے مطابق جھجار سنگھ اس مرتبہ ہمیں آسانی سے اندر نہیں گھسنے دے گا۔'' پھر عارج نے مخبروں سے ملنے والی اطلاعات کا ذکر کرنے کے بعد کہا۔ ''قلعہ آدندچہ اس علاقے کی سرحد سے زیادہ دور نہیں ہے لیکن اس طرف رخ کرنے کی صورت میں ہماری فوجوں کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر ہمارا مقصد قلعہ ایرج پہنچنے کا ہوتا تو ہمیں اس دشوار گزار راستے سے گزرنے کی ضرورت نہ ہوتی مگر اب ہمیں بہرحال اسی راستے پر جانا ہے۔''

عارج ابھی کچھ اور بھی کہتا کہ مہابت خاں بول اٹھا۔ ''یہ بتاؤ کہ اس علاقے میں ہماری فوجوں کو کیا دشواریاں پیش آ سکتی ہیں؟''

''عرض کرتا ہوں۔'' عارج نے جواب دیا۔ پھر وہ اس دشوار گزار راستے کی تفصیلات بیان کرنے لگا۔ ''ہمیں اس راستے سے قلعہ آدندچہ پہنچنے کیلئے گنجان خاردار درختوں کے ہزاروں جھنڈ' صدہا غار اور کھنڈر طے کرنے پڑیں گے جو نہایت ہی پرخطر اور ہولناک ہیں۔ یہاں با آسانی ہزاروں سپاہیوں کو گھات میں بٹھایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے جھجار سنگھ نے اسی لئے یہ میدان منتخب کیا ہے۔''

''تم نے بڑی تشویشناک تصویر کھینچ کر ہمیں فکرمند کر دیا۔'' مہابت خاں نے کہا' پھر بولا۔ ''یہ کہو کہ پھر تدبیر کیا ہو؟''

''اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ ہماری فوجیں درختوں کے جھنڈ کاٹتی ہوئی آگے بڑھیں' اسی کے ساتھ دشوار گزار راہوں کو بھی ہموار کریں۔ اس کام کیلئے فوج کا ایک حصہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح بقیہ افواج کو آگے بڑھنے میں دقت نہیں ہو گی۔ دوسرا فائدہ اس سے یہ ہو گا کہ اگر دشمن کے سپاہی وہاں چھپے ہوں گے تو بھاگ نکلیں گے۔'' عارج نے تفصیل کے ساتھ مہابت خاں کے سوال کا جواب دیا۔

''یہ تو تم نے بہت لمبا کام بتا دیا۔'' مہابت خاں انکار میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ پھر اس نے وہاں موجود دوسرے امراء کی رائے لی۔

مہابت خاں کی مرضی نہ دیکھ کر سارے ہی امراء نے عارج کی اس تجویز سے اختلاف کیا۔ مہابت خاں نے اس معاملے کو دوسرے دن صبح پر یہ کہہ کر ٹال دیا کہ شہزادہ

اورنگزیب کی آمد ہی پر اب کوئی قطعی فیصلہ ہو گا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح اورنگزیب ایک بڑے لشکر کو ساتھ لئے اس منزل پر پہنچ گیا۔ آگرہ سے روانگی کے وقت اس نے عارج کے انسانی قالب دلاور کا نام سنا تھا۔ اس کے علاوہ وزیراعظم آصف خاں نے بھی اورنگزیب سے کہا تھا کہ کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے سے پہلے شہزادہ حضور دلاور کی رائے بھی معلوم کر لیں۔ اورنگزیب کی شخصیت اجنبی نہیں تھی۔ ہم ایک اور عہد میں بھی اس سے مل چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب خود اورنگزیب اقتدار سنبھال چکا تھا۔ میں اس کا تفصیلی ذکر اپنی سرگزشت میں پہلے کر چکی ہوں۔

اورنگزیب کو عارج نے تمام صورتحال سے آگاہ کر دیا تو وہ بولا۔ ''آفریں ہو تم پر کہ ہم نے جیسا سنا تھا تمہیں ویسا ہی پایا تھا۔ تمہاری تجویز نہایت معقول ہے' ہم ابھی خان خاناں کو بلا کر انہیں تمہاری تجویز سے مطلع کرتے ہیں اور اس پر عملدرآمد کا حکم دیتے ہیں۔''

''خادم ان کے حضور میں یہ عرض گزار چکا ہے۔'' عارج نے دبی زبان میں کہا۔

''پھر تو وہ یقیناً تمہاری تجویز سے متفق ہوں گے۔''

''افسوس کہ نہیں شہزادہ عالی وقار!'' عارج نے جواب دیا۔

اورنگزیب کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور اس نے کہا۔ ''سخت تعجب ہوا ہمیں!...... تم فی الحال جاؤ' ہم خان خاناں سے گفتگو کر کے ہی تمہیں کوئی قطعی حکم دیں گے۔''

''بہتر ہے شہزادہ محترم!'' عارج یہ کہتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر اسی دن اورنگزیب نے عارج کو دوبارہ بلایا اور تجویز پر عمل کرنے کی ذمہ داری اسی پر ڈال دی۔

اس کے بعد ہزاروں بیل دار اور تبردار خاردار درختوں کے گھنے جھنڈ کاٹنے اور راستوں کو ہموار کرنے کیلئے مقرر ہو گئے۔ پھر اورنگزیب نے عارج کو پیش قدمی کا حکم دیا اور خود مہابت خاں کو ساتھ لئے قلب لشکر میں رہا۔ مغل فوجوں کی اب اورنگزیب خود کمان کر رہا تھا۔ ہراول پر پہلے ہی سے عارج تھا۔ اس نے حکم ملتے ہی پیش قدمی کر دی۔

ادھر تو یہ صورتحال تھی' دوسری جانب جب جھجار سنگھ کو اپنے مخبروں کے ذریعے پیش قدمی اور عارج کی تجویز کا علم ہوا تو وہ گھبرا گیا۔ اسی گھبراہٹ میں وہ کوئی حکم دینے والا تھا کہ میرے انسانی پیکر پاربتی کو یہ خبر ہو گئی اور وہ جھجار سنگھ کے پاس پہنچ گئی۔ میں اس وقت وہاں موجود تو تھی مگر پاربتی کے جسم میں نہیں تھی۔

جھجار سنگھ نے راجپوت سرداروں کو طلب کر لیا تھا اور ان سے مشورے کر رہا تھا۔ کبھی

راجپوت سرداروں کی متفقہ رائے یہ تھی کہ علاقے کی سرحد سے قلعہ آوندچہ تک پھیلے ہوئے ہزاروں راجپوت سپاہیوں کو یکجا کر لیا جائے۔ جھجار سنگھ بھی انہی کے حق میں معلوم ہو رہا تھا۔ جب اس نے کوئی رائے نہیں لی تو وہ خود ہی بول اٹھی۔ ''یہ بالکل مناسب نہیں۔''

پاربتی کی طرف پلٹتے ہوئے جھجار سنگھ نے سوال کیا۔ ''کیوں رانی؟...... تم اس تجویز کے خلاف کیوں ہو؟'' جب سے جھجار سنگھ نے بغاوت کی تھی خود کو راجہ کہلوانے لگا تھا اور پاربتی کو دوسرے کے سامنے رانی کہنے لگا تھا۔

جھجار سنگھ کے سوال کا پاربتی نے جواب دیا۔ ''اگر ہم نے دشمنوں کا راستہ روکنے والے سپاہیوں کو بھی یہاں بلا لیا تو وہ ہمارے سر پر آ جائیں گے۔ مانا کہ اس طرح ہمارے وہ سپاہی زیادہ تعداد میں مارے جائیں گے جو متفرق ہو کر جگہ جگہ چھپے ہوئے ہیں لیکن یہ سوچو کہ ان سے لڑتی بھڑتی مغل فوج جب یہاں تک پہنچے گی تو کس حال میں ہو گی...... یقیناً وہ تھکی ہوئی اور پریشان حال ہو گی اور ایسی صورت میں ہم اسے کاٹ کے رکھ دیں گے۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے پاربتی پرجوش نظر آنے لگی۔

کچھ دیر کو راجپوت سرداروں کی اس مجلس پر سکوت سا طاری ہو گیا۔ پاربتی کی رائے سب سے مختلف ہونے کے باوجود پرزور تھی۔ پھر جھجار سنگھ ہی نے اس خاموشی کو توڑا اور بولا۔

''یہ تو بہت بڑی قیمت ہے اگر ہمارے جوان اسی طرح اور اتنی بڑی تعداد میں کاٹ دیئے گئے تو پھر آئندہ ہم کسی لڑائی میں کیسے ان کا سامنا کریں گے' ہماری تو کمر ٹوٹ جائے گی۔''

جھجار سنگھ کا یہ کہنا تھا کہ سبھی سردار باری باری اس کے حق میں بولنے لگے۔ کافی دیر بحث مباحثے کے بعد ایک راہ نکل ہی آئی۔ ہر چند کہ پاربتی اس پر بھی پوری طرح متفق نہ تھی مگر جھجار سنگھ کی بوکھلاہٹ اور کمزوری کو دیکھ کر اس نے مزید ضد نہ کی اور اتفاق کر لیا۔

طے یہ پایا کہ قلعہ آوندچہ سے ایک منزل دور سارے راجپوت سپاہیوں کو سمٹ آنے کا حکم دے دیا جائے۔ وہاں بھی گھنا جنگل تھا۔ اس طرح راجپوت سپاہی قلعے سے زیادہ لمبی مسافت پر نہ ہوتے اور بالکل منتشر حالت میں بھی نہ رہتے۔ جھجار سنگھ نے یہ فیصلہ ہوتے ہی فوراً حکم جاری کر دیا۔

جو حکم دیا گیا اس پر نہایت تیزی سے عمل کیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ باغی علاقے میں داخل ہونے کے باوجود مغل فوج کو مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ عارج کی نگرانی میں فوج کا ہراول انتہائی مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرتا رہا۔ ہزاروں بیل دار اور تبر دار حکم کے مطابق راستے کو صاف اور ہموار کرتے جا رہے تھے۔ اسی بنا پر مغل فوج کو پیش قدمی میں کوئی

دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

جب قلعہ آوندچہ صرف ایک منزل پر رہ گیا تو اورنگزیب نے فوجوں کو رک جانے کا حکم دیا۔ عارج نے جن خطرات کا اظہار کیا تھا وہ اب تک پیش نہیں آئے تھے۔ اس وجہ سے مہابت خاں کی بن آئی تھی۔ اسے بہرحال یہ بات گراں گزری تھی کہ شہزادہ اورنگزیب نے عارج کو اس پر ترجیح دی تھی۔ اورنگزیب نے عارج کی تجویز قبول کر لی تھی اور مہابت خاں کے خیال کو رد کر دیا تھا۔

اس وقت شام ہونے والی تھی۔ اورنگزیب کا خیال تھا کہ رات کو وہیں قیام کر کے صبح پیش قدمی کی جائے۔ جہاں تک مغل فوجیں بڑھ آئی تھیں وہاں تک تو جنگل کا صفایا ہو چکا تھا لیکن سامنے گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ وہاں پڑاؤ ڈالنے کی صورت میں لشکر کو خطرے کا سامنا رہتا۔ عارج کے ذہن میں یہی بات تھی۔

متوقع خدشات اور خطرات کو خود تک محدود رکھنے کے بجائے عارج نے اورنگزیب سے ان کا اظہار کر دیا۔ اورنگزیب نے مشورہ طلب نظروں سے مہابت خاں کی طرف دیکھا۔

''حضور والا! خادم کے نزدیک اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہمیں قلعے تک مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔'' مہابت خاں بولا۔ اس پر اورنگزیب نے کہا۔ ''لیکن اطمینان کر لینے میں کیا مضائقہ ہے۔'' چند لمحے توقف کے بعد اس نے عارج کو حکم دیا۔ ''تم اپنے ساتھ کچھ فوج لے جاؤ اور جنگل میں کچھ دیر دور جا کر لوٹ آؤ۔ اس طرح مجھے یہ اطمینان ہو جائے گا کہ یہاں پڑاؤ ڈالنے میں خطرہ نہیں۔''

عارج کے ساتھ ہی اورنگزیب نے راجہ دیبی سنگھ کو بھی کر دیا جو قلعہ آوندچہ کی وراثت کا دعویدار تھا۔

ابھی دن ڈھلا نہیں تھا' مگر جنگل میں اندھیرا سا پھیلنے لگا تھا۔ عارج کے حکم پر سپاہیوں نے مشعلیں روشن کر لیں۔ میری توجہ عارج کے ذہن پر بھی تھی۔ اسے جھجار سنگھ کے مزاحمت نہ کرنے پر شدید حیرت تھی۔ اس کے خیال میں جھجار سنگھ نے اس دشوار گزار علاقے میں پناہ لینے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔

مختصری مغل فوج کچھ دور تک جنگل میں بڑھتی گئی تو اچانک کمین گاہوں میں چھپے ہوئے راجپوت سپاہیوں نے عقب سے چھاپہ مارا۔ عارج نے بزدلوں کے اس حملے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر رفتہ رفتہ راجپوتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ مغل فوج کو اب چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

عارج کو تو دشمنوں سے برسرِ پیکار ہونے میں کچھ اور سوچنے کی مہلت نہ مل سکی لیکن راجہ دیبی سنگھ نے ایک قاصد کو اورنگزیب کے پاس دوڑا دیا کہ اس واقعے کی خبر کر دے۔

راجپوتوں کے گھیرے سے نکلنے کیلئے قاصد کو بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ اس کا جسم زخموں سے بچ گیا مگر وہ نیم جاں حالت میں بھی اورنگزیب تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اورنگزیب یہ خبر سن کر طیش میں آ گیا۔ بالآخر عارج کا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا۔ اس نے فوراً یلغار کا حکم دے دیا۔ جب اورنگزیب مغل افواج کو لے کر جنگل میں اس جگہ پہنچا جہاں معرکہ گرم تھا اس نے دیکھا کہ عارج مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ دشمن کے نرغے میں پھنسا ہوا ہے اور بہت بے جگری سے لڑ رہا ہے۔

اورنگزیب کے حملے کی تاب نہ لا کر راجپوتوں کے پیر اکھڑ گئے۔ وہ بھاگ اٹھے اور اس طرح مغلوں کے ہاتھوں بڑی تعداد میں مارے گئے جو سپاہی زندہ بچ گئے وہ قریبی پہاڑوں کی تیرہ و تاریک گھاٹیوں میں جا چھپے۔ اس موقع پر اورنگزیب نے منادی کرا دی کہ جو لوگ حلقہ اطاعت میں آ جائیں اور ہتھیار ڈال دیں انہیں فوراً امان دی جائے اور جو اطاعت قبول نہ کریں بلا تاخیر قتل کر دیئے جائیں۔ بڑی شدت اور سختی سے ان احکام کی تعمیل ہوئی۔

ہزاروں راجپوتوں کو خون کے دریا میں نہلا دیا گیا۔ جو راجپوت سپاہی پہاڑوں کی گھاٹیوں اور کمین گاہوں میں چھپے ہوئے اب بھی تیروں کی بارش کر رہے تھے۔ ان سے اگرچہ مغل فوج کو کچھ نقصان پہنچا مگر اس کی پیش قدمی نہ رکی۔ چھپے ہوئے دشمنوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیا جاتا رہا۔ جس طرف سے کوئی تیر آتا مغل سپاہی اسی جانب بلہ بول دیتے۔

زندہ بچ جانے والے سپاہی کیونکہ قدم قدم پر مزاحمت کر رہے تھے اس لئے مغل فوج کی پیش قدمی بہت سست رفتار تھی۔ جنگل اور گھاٹیوں کی پرخطر مسافت طے کرنے میں جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ان سے بڑے بڑے تجربے کار مغل سردار گھبرا گئے مگر عارج اسی طرح تازہ دم اور برسرِ پیکار نظر آتا تھا۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ اس پورے لشکر میں آدم زادوں کے ساتھ ہی ایک جن زاد بھی موجود ہے۔ وہی جن زاد ایسا تھا جو ہر قیمت پر دشمن کے قلعے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کا سبب صرف مجھے معلوم تھا۔ عارج کے سینے میں آگ ہی ایسی لگی تھی جو دشمن کو زیر کیے بغیر کسی طرح نہ بجھتی۔ وہ دشمن 'وہ جھجار سنگھ اس کا رقیب بھی تو تھا۔ اب تک عارج اسی غلط فہمی کا شکار تھا کہ میں نے پاربتی کے جسم میں مستقلاً پناہ لے رکھی ہے اور جھجار سنگھ کی بیوی بن کر اس سے بے وفائی کر چکی ہوں۔

میں نے دانستہ عارج کی غلط فہمی کو دور نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ عارج کے عشق کی

شدت کا اندازہ کرنا بھی تھا۔

بالآخر گھنا جنگل عبور کر کے مغل فوجیں ایک کھلے میدان میں پہنچ گئیں۔ وہاں سے قلعہ آوندچہ تقریباً تین میل کی مسافت پر تھا۔

یہاں راجپوتوں نے بڑی دلیری سے مغل فوجوں کا مقابلہ کیا۔ وہ سب طرف سے سمٹ سمٹا کر مغل فوج کی راہ میں دیوار بن گئے لیکن حوصلوں اور ولولوں نے اس دیوار میں شگاف ڈال دیا۔ اس خون ریز معرکے میں بہت سی مغل فوج ضائع ہوئی اسی کے ساتھ کئی مشہور مغل سردار مارے گئے مگر آگے بڑھتے ہوئے قدم نہ رکے۔

مغل لشکر باغیوں کو زیر و زبر کرتا ہوا اس مقام تک پہنچ گیا جہاں سے قلعہ آوندچہ صرف ڈیڑھ میل کے فاصلے پر رہ گیا۔ وہاں لشکر نے پڑاؤ ڈال دیا۔ منزل کو اس قدر قریب دیکھ کر عارج اپنے جوش کو نہ دبا سکا۔ اس نے اورنگزیب سے قلعے کا محاصرہ کرنے کی اجازت لے لی۔ اورنگزیب نے اس موقع پر بھی راجہ دیبی سنگھ کو عارج کے ساتھ کر دیا۔

عارج نے بڑی جرأت اور دلیری کے ساتھ قلعے کی طرف یلغار کر دی۔ وہ پہلے ہی حملے میں جھجار سنگھ کے بہت سے مورچے فتح کر کے قلعے کی دیوار کے نیچے پہنچ گیا۔ پھر اس نے تین طرف سے محاصرہ کر کے باقاعدہ فوج متعین کر دی۔ عام گزرگاہوں پر عارج نے پہرا بٹھا دیا اور حکم دیا کہ باہر سے رسد کی کوئی چیز نہ آنے پائے۔ جھجار سنگھ اپنے پانچ ہزار ہمراہیوں کو لئے ہوئے قلعے کی فصیل پر موجود تھا۔ عارج کی فوج پر وہ ہر طرف سے تیروں اور آتش بار گولوں کی بارش کر رہا تھا۔ رانی پاربتی بھی منہ پر نقاب ڈالے اور بدن پر ہتھیار سجائے ہوئے جھجار سنگھ کے پہلو میں موجود تھی۔

یہی وہ لمحات تھے جب میں نے خاصے عرصے کے بعد ایک مرتبہ پھر رانی پاربتی کے جسم میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ عارج ہی تھا۔ کافی مدت کے بعد وہ پاربتی کے مقابل آیا تھا۔

پاربتی کے جسم میں اترنے اور قرار پانے کے بعد میں نے پوری توجہ انہماک اور سرگرمی سے عارج کے پرزور حملوں کو روکنا شروع کر دیا۔ عارج کے حکم پر نیچے سے توپیں سرکی جا رہی تھیں اور جواباً تیر بھی چلائے جا رہے تھے۔

اورنگزیب کو یقیناً اندازہ نہ تھا کہ عارج ایک دم اتنی سرگرمی دکھائے گا اور میدان کارزار گرم کر دے گا۔ اسے ایک ایک پل کی خبر ملتی رہتی تھی۔ یہ بات مجھے معلوم تھی۔ میدان جنگ میں اورنگزیب بھی حالات سے غافل نہیں رہتا تھا۔ اسی بنا پر اورنگزیب نے عارج کی

مدد کو مہابت خاں کے ساتھ مزید فوج آگے بھیج دی۔

عارج کو میں اور مجھے عارج دیکھ چکا تھا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے انسانی قالبوں کو پہچانتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ عارج مستقل طور پر دلاور علی کے جسم پر قابض تھا جبکہ میرے ساتھ بوجوہ ایسا نہیں تھا۔ جب ضرورت محسوس کرتی میں پاربتی کے جسم پر اتر جاتی۔

مہابت خاں جب مزید فوج لے کر عارج کی مدد کو پہنچا تو سورج ڈوب چکا تھا۔ اندھیرا پھیل جانے کے سبب دونوں ہی طرف سے جنگ میں شدت نہیں رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ دیر بعد جنگ بالکل رک جائے گی اور پھر یہی ہوا۔

عارج مسلسل مستعد و سرگرم تھا۔ گھڑی بھر آرام کیے بغیر وہ لڑتا رہا تھا اسی وجہ سے کافی تھک گیا تھا۔ اس نے نہ صرف اپنی فوج کو لڑوایا تھا بلکہ عملاً خود بھی اس کے ساتھ شانہ بشانہ لڑا تھا۔ اس کے چلائے ہوئے تیر صحیح نشانے کے سبب راجپوت باغیوں کے سینوں میں ترازو ہوتے رہے تھے۔ مہابت خاں نے بھی یہ بچشم خود دیکھ لیا کہ عارج تھکن سے چور ہے۔ اس نے اسی لئے عارج کو آرام کا مشورہ دیا۔ عارج نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور مہابت خاں نے اس کی جگہ سنبھال لیا۔

مہابت خاں کی آمد کے بعد ہی میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اب عارج آرام کرے گا۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں ایک منصوبہ تشکیل پانے لگا تھا۔ مجھے علم تھا کہ اگر میں نے جھجار سنگھ کو اپنے منصوبے کے متعلق بتایا تو وہ اس سے اتفاق نہیں کرے گا۔ میرے نزدیک یہ بات قطعی طے شدہ تھی کہ فتح آخر کار مغلوں ہی کو ہوگی اور راجپوت مغلوب ہوں گے۔ میں بس وقتی طور پر بھی عارج کو زچ کرنا چاہتی تھی۔ میں ابھی فصیل ہی پر تھی کہ جھجار سنگھ نے مجھے وہاں سے جانے اور آرام کرنے کیلئے ضد کی۔

ہر چند کہ یہ میرے منصوبے کے خلاف تھی مگر مصلحتاً اور وقتی طور پر میں نے جھجار سنگھ کی بات مان لی۔ مجھے یقین تھا کہ خود جھجار سنگھ بھی کچھ دیر میں اپنی جگہ راجپوت سرداروں کو متعین کر کے سو رہے گا تاکہ صبح تازہ دم ہو کر اپنے دشمن کے مقابل آ سکے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ ابھی ایک پہر رات بیتی ہوگی کہ میں بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے جھجار سنگھ کو بے خبر گہری نیند سوتے دیکھا۔ میں نے جلدی جلدی مگر خاموشی اور احتیاط کے ساتھ اپنے انسانی پیکر پر ہتھیار سجائے اور باہر نکل گئی۔

جب میں کچھ ہی دیر کے بعد دوبارہ قلعے کی فصیل پر پہنچی تو راجپوت سردار مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے تو خود مجھے سونے کیلئے جاتے دیکھا تھا اور اس وقت مجھے سونا ہی

چاہیے تھا۔

کئی سردار میرے ساتھ ہو لئے کیونکہ فصیل پر میں کہیں رکی نہیں۔ چہل قدمی کرتے ہوئے میں گہری نظروں سے نیچے کا جائزہ لے رہی تھی۔ معاً میں نے ایک راجپوت سردار کو مخاطب کیا۔ ”دیکھو ہمارا دشمن اس وقت کیسا بے خبر ہے!..... ہے نا؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”ہاں رانی!“ راجپوت سردار نے میری تائید میں کہا۔ ”بظاہر کوئی سرگرمی معلوم نہیں ہوتی۔“

”اگر ایسے میں شب خون مارا جائے تو دشمن کے ہوش اڑ جائیں۔“ میری آواز پرجوش ہو گئی۔ میرا منصوبہ شب خون مارنا ہی تھا۔

”مگر رانی..... “ ایک راجپوت سردار نے کچھ کہنا چاہا۔

”نہیں آرام کرو۔“ میں نے سخت آواز میں کہا۔ ”یہ میرا حکم ہے‘ رانی پاربتی کا حکم‘ شب خون ضرور مارا جائے گا۔ تم میں سے جسے اپنی جان کا خوف ہو‘ میرے ساتھ نہ آئے۔“

پھر کسی کی مجال نہ ہوئی کہ پاربتی کے سامنے دم مار سکتا۔ میں گھوڑے پر سوار ہوئی اور پھر قلعے کا دروازہ کھلوایا۔ میرے ساتھ دلیر راجپوتوں کا غول تھا۔ قلعے کا دروازہ کھلتے ہی میرا گھوڑا کمان سے چھوٹے ہوئے کسی تیر کی طرح تیزی کے ساتھ آگے بڑھا۔ اسی کے ساتھ میرے ساتھیوں نے بھی باگیں چھوڑ دیں۔ میری آنکھوں میں ایک طرف تو عارج کے انسانی پیکر کا چہرہ گھوم رہا تھا کہ جب اسے شب خون کا علم ہوگا تو اس پر کیا گزرے گی۔ دوسری جانب میں مغلوں کی یہ غلط فہمی دور کر دینا چاہتی تھی کہ ہمیشہ میدان جنگ میں انہی کا پلہ بھاری رہتا ہے۔

کسی کو یہ توقع نہیں رہی ہوگی کہ راجپوت مغلوں کے مقابلے میں انتہائی کم تعداد کے باوجود ان پر شب خون مارنے کی ہمت کر سکیں گے۔ محاصرہ کیے جانے کے باوجود قلعے کا دروازہ کھول کر باہر آ جانا بڑے عزم و حوصلے کی بات تھی۔

میں نے مغل فوج پر ایسا حملہ کیا کہ افراتفری مچ گئی۔ میری نظریں عارج کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کا خیمہ تلاش کرنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ چیخ و پکار سے یقیناً اس کی آنکھ کھل جانی چاہیے تھی۔ میری یہ توقع بھی پوری ہوئی۔

خیمے کے باہر مغل فوج کا پرچم لہرا تھا مگر وہاں مجھے کوئی محافظ نظر نہ آیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ محافظ خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے ہوں گے۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میں نے

خیمے کے پردے کو جنبش کرتے دیکھا۔

"کوئی اس پر تیر نہیں چلائے گا۔" میں نے چیخ کر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "وہ میرا شکار ہے اور میں ہی اسے نشانہ بناؤں گی۔" ظاہر ہے میرے ساتھ جو راجپوت سپاہی تھے ان میں سے کسی کا چلایا ہوا تیر بھی عارج کیلئے موت کا پیغام ثابت ہو سکتا تھا۔ میں بھلا عارج کی موت کیسے گوارا کر سکتی تھی۔

اسی اثنا عارج اپنے انسانی پیکر پر ہتھیار سجائے خیمے سے نکلا۔ اس وقت مغل فوج راجپوتوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں میں پامال ہو رہی تھی۔ ان کا قتل عام جاری تھا۔

یہ بڑا نازک اور خطرناک وقت تھا۔ اگر میں اپنے سپاہیوں کو عارج پر حملہ کرنے سے نہ روک دیتی تو لازماً اس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ صورتحال دیکھ کر عارج نے اپنے گھوڑے پر سوار ہونے میں دیر نہیں کی۔ اس کا گھوڑا خیمے کے در سے بندھا ہوا تھا۔

عارج اور میں نے تقریباً ایک ساتھ اپنے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی۔ میں نے دانستہ عارج کو نکل جانے دیا۔ عارج نے بھاگتے ہوئے مغل سپاہیوں کو للکار کر روکا۔ اسے دیکھ کر سپاہیوں کی ہمت غالباً بندھی۔ وہ اسی لئے اس کے اردگرد اکٹھے ہونے لگے۔ اچانک ایک جانب سے شور اٹھا اور میں ادھر متوجہ ہو گئی۔ مہابت خاں نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ میں اس سے برسرِ پیکار ہو گئی۔ ابھی ذرا دیر ہوئی تھی کہ عارج بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں جو مغل سپاہیوں کیلئے پیغامِ اجل بنی ہوئی تھی۔ عارج نے اپنا گھوڑا میری طرف دوڑا دیا۔

میرا عالم اس وقت یہ تھا کہ گھڑی بھر میں کہیں ہوتی، گھڑی میں کہیں۔ شب خون کا یہ آخری مرحلہ تھا۔ پھر جب تک عارج میرے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوا، میں نے تیزی سے اپنے گھوڑے کا رخ موڑ دیا اور ہاتھ اٹھا کر دائرے کی صورت میں گھمایا۔ راجپوت سپاہیوں کیلئے یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ لڑتے بھڑتے قلعے میں واپس آ جائیں۔

ممکن ہے کہ عارج مجھے روکنے میں کامیاب ہو جاتا کہ درمیان میں کئی راجپوت سپاہی آ گئے۔ عارج کو مجبوراً ان سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس اثنا میں میں کافی دور نکل آئی۔ عارج یقیناً مجھ سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا تھا مگر اس کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

یہ لڑائی مسلسل تین روز تک جاری رہی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اب خود اورنگزیب مقابل پر آ چکا تھا۔ اس نے اگلے مورچوں کی کمان سنبھال لی تھی۔ اس کے ایک جانب عارج اور دوسری جانب مہابت خاں تھا۔

تین دن تک میں حملہ آور مغل فوج پر مسلسل گولہ باری کراتی رہی۔ جھجار سنگھ اب میری کوئی بات نہیں ٹال رہا تھا عملاً اب میں ہی جھجار سنگھ کے بجائے راجپوت سپاہ کو لڑوا رہی تھی۔

تیسرا دن گزر گیا تو پھر پاربتی کی کمان میں راجپوتوں نے شب خون مارا۔ میں اب پاربتی کے جسم سے نکل آئی تھی کیونکہ اس شب خون کے حق میں نہیں تھی۔ اس مرتبہ پاربتی کے ساتھ جھجار سنگھ بھی تھا اب مغل فوج غافل نہیں تھی۔

دراصل میں نے جو پہلا شب خون مارا تھا اس کی کامیابی کے بعد جھجار سنگھ غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہی غلط فہمی اسے لے ڈوبی۔ میں بذاتِ خود اس شب خون کو غلط سمجھ رہی تھی۔ جھجار سنگھ کو میں نے اسی لئے پہلے یہ بتا دیا تھا کہ اب صورتحال بدل چکی ہے، شب خون مارنا خودکشی کے مترادف ہے اس لئے کہ مغل چوکنا ہیں۔

شب خون مارے جانے سے پہلے میں نے دیر تک فصیل پر چڑھ کر اطراف کا جائزہ لیا تھا اور پھر جھجار سنگھ کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ سرخود جھجار سنگھ نے میرا مشورہ قبول نہ کیا تو مجبوراً مجھے اس کی بیوی پاربتی کا جسم چھوڑنا پڑا۔

اس شب خون کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کے پہلے ہی جوابی حملے سے راجپوتوں کے پیر اکھڑ گئے۔ سخت معرکے کے بعد جھجار سنگھ کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اب میری نظر دونوں ہی نبرد آزما لشکروں پر تھی۔

اس معرکے میں کافی مغل فوج کام آئی لیکن اب دو بدو لڑائی نے گویا جنگ کا فیصلہ کر دیا۔ اگر جھجار سنگھ مزید کچھ دیر میدان میں ڈٹا رہتا تو جنگ کا آخری فیصلہ اسی رات ہو جاتا لیکن پاربتی کے بروقت اصرار پر وہ فوراً قلعہ بند ہو گیا اور یوں مقابلے سے اپنی جان بچا کر لے گیا۔ پاربتی ہی نے اسے مغل سپاہیوں کے نرغے سے نکلنے میں مدد دی تھی۔

اس قلعے میں بھی قلعہ ایرج کی طرح کسی آڑے وقت کیلئے ایک خفیہ سرنگ موجود تھی۔ جھجار سنگھ اب جی چھوڑ بیٹھا تھا۔ شب خون میں تقریباً تین ہزار سے زیادہ راجپوت مارے گئے تھے۔

جھجار سنگھ نے اسی رات اپنی جگہ ایک راجپوت سردار کو متعین کر دیا اور قلعے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ نقد و جواہر کے خزانوں میں سے جس قدر سات خچروں پر لادا جا سکا اس نے لادا اور پھر پاربتی کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔

پاربتی فرار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس پر جھجار سنگھ اور پاربتی کے درمیان تلخ کلامی ہو گئی۔

”تم آخر کیوں یہیں رہنے پر بضد ہو؟“ جھجار سنگھ نے قدرے سخت لہجے میں سوال کیا۔

”تمہیں خود اس کی وجہ معلوم ہے۔“ پاربتی نے جواب دیا۔

”مگر میں تمہاری زبان سے وجہ سننا چاہتا ہوں۔“ جھجار سنگھ زور دے کر بولا۔

”سننا ہی چاہتے ہو تو سنو کہ اس طرح راجپوت سپاہیوں کو مغلوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار ہو جانا سخت بزدلی ہے۔“ پاربتی نے بلا جھجک کہہ دیا۔ اس پر پاربتی کے بیٹے نے اپنے باپ کی حمایت لی اور پاربتی نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”بکرماجیت! تو چپ رہ۔“ کافی تو تکار کے بعد آخر پاربتی کو بھی جھجار سنگھ کے ساتھ وہاں سے فرار ہونا پڑا۔ صرف چند راجپوت سرداروں کو یہ خبر ہو سکی کہ جھجار سنگھ وہاں سے فرار ہو کر کہاں گیا ہے۔

صبح جب قلعے میں یہ خبر عام ہوئی تو راجپوت سپاہی جی ہار گئے۔ نتیجے کے طور پر دوپہر سے کچھ پہلے ہی انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اورنگزیب قلعے کے مشرقی دروازے سے لشکر کے ساتھ قلعے میں داخل ہوا۔ اس کی رکاب میں عارج بھی تھا۔ پاربتی اور جھجار سنگھ کے فرار کی خبر اس سے بھی نہ چھپ سکی تھی۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ منزل قریب آتے آتے اس سے دور ہو گئی تھی۔ پھر جو کچھ بھی ہوا عارج نے اس میں زیادہ دلچسپی نہ لی۔

قلعے کے جنوبی دروازے پر فتح کا پرچم نصب کیا گیا اور فصیل پر اورنگزیب کے حکم سے اذان دی گئی۔ جن راجپوت سرداروں نے ہتھیار ڈال کر امان طلب کی تھی انہی میں سے ایک نے یہ راز کھول دیا کہ جھجار سنگھ وہاں سے فرار ہو کر دھاسونی گیا ہے۔

اورنگزیب نے قلعے کا انتظام کر کے اسے راجہ دیبی سنگھ کے سپرد کیا اور لشکر کو فوری طور پر قلعہ دھاسونی کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔ یہ حکم سن کر عارج کو بہت خوشی ہوئی۔ وہ جو بجھ سا گیا تھا ایک بار پھر پرجوش نظر آنے لگا۔

مغل فوج دو دن میں دھاسونی پہنچی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ وہاں بھی راجپوتوں کی خاصی تعداد تھی۔ سپاہی وہاں پہنچتے ہی مورچے کھودنے اور نقبیں لگانے میں بڑی سرگرمی کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ وہاں کی زمین اتنی پتھریلی اور سخت تھی کہ فولاد بھی اس کے آگے کند پڑ جاتا تھا تاہم بہادروں نے ہمت نہ ہاری اور یہ کام کر لیا۔

دھاسونی کے اس مضبوط قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا۔ یہ قلعہ جھجار سنگھ کے باپ نرسنگھ راؤ نے اپنے دور اقتدار میں تعمیر کرایا تھا۔ جب قلعے کو مغل فوجوں نے گھیر لیا تو جھجار سنگھ نے توپ بندوق اور آتشیں ہتھیاروں کے استعمال میں کمی نہ کی۔ منجنیقوں کے ذریعے بہت بھاری

بھاری پتھر بھی مغل فوج کی طرف پھینکے گئے۔ دلبرداشتہ اور ہر طرف سے مایوس ہونے کے باوجود راجپوتوں نے مغل سپاہیوں کو زیادہ قریب نہ آنے دیا۔ وہ مغلوں پر مسلسل تیر برساتے رہے، پتھر پھینکتے رہے اور گولہ باری کرتے رہے۔ یہ حال بدستور رہا اور سینکڑوں مغل سپاہی مارے گئے تو اورنگزیب نے امراء کا اجلاس طلب کر لیا۔

☆....☆....☆

اس اجلاس میں عارج بھی ایک امیر کی حیثیت سے شریک تھا۔

حالات نے کچھ ایسی صورتحال اختیار کر لی تھی کہ عارج کی ذاتی ”جنگ“ مغلوں اور راجپوتوں کی جنگ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ خود وہ بھی اس جنگ میں ایک فریق کی طرف تھا۔ میں نے اس کے دل و دماغ پر توجہ کی تو پتہ چلا وہ جو دعا کر رہا تھا بڑی عجیب سی تھی اور وہی یہ دعا کر سکتا تھا کہ اس جنگ میں اس کا دشمن نہ مارا جائے۔ جھجار سنگھ سے خود اسے آخری معرکہ کرنا تھا۔ اس نے تو جیسے اپنی زندگی کا یہی مقصد بنا لیا تھا ورنہ اتنی طویل جدوجہد کیوں کرتا۔ اس نے بڑے طویل عرصے صبر کیا تھا اور اب اسے صبر کا یارانہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے امراء کے اجلاس میں ایک ایسی خطرناک تجویز پیش کی سب حیران رہ گئے۔ یہ تجویز اس کی جواں مردی اور بہادری کا ثبوت بھی تھی۔

عارج کی تجویز پر صرف اورنگزیب کو حیرت نہ ہوئی کیونکہ اب وہ عارج کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ امراء کو اس وقت اور بھی حیرانی ہوئی جب اورنگزیب نے عارج کی تجویز منظور کر لی اور باقی امراء کی تجویزوں کو قطعی رد کر دیا۔

پھر اسی روز عارج کی تجویز پر عمل کرنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ہوش ربا کمندیں اور آسمان پا سیڑھیاں تیار کیے جانے لگے۔ عارج کی تجویز یہ تھی کہ سنگ باری اور گولہ باری کے باوجود جس طرح بن پڑے قلعے پر چڑھا جانا چاہیے اور ایک دم یورش کر دینی چاہیے۔

جھجار سنگھ کی نقل و حرکت اور اس کے ردعمل پر بھی میں نگاہ رکھے ہوئے تھی۔ اس نے اب اپنے خلاف یہ سامان فراہم ہوتے دیکھا تو اس کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ اس نے خوفزدہ ہو کر اورنگزیب کو صلح کا پیغام بھیجا۔

ابھی صلح کی یہ گفتگو شروع نہ ہوئی تھی کہ عارج کے لشکریوں اور بہادر روہیلوں کی جمعیت نے قلعے کی جنوبی سمت سے کمندوں کے ذریعے چڑھائی شروع کر دی۔ پھر انہوں نے قلعے کے اندر پہنچ کر قلعے کے دروازے کو آگ لگا دی۔ بہت سے جان باز مغل سردار قلعے میں گھس گئے۔ عارج ان میں پیش پیش تھا۔

جھجار سنگھ پاربتی اور اپنے اہل و عیال کو لے کر انتہائی یاس اور سراسیمگی کے عالم میں قلعے سے باہر نکل آیا۔ پھر وہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف کو بھاگ اٹھا۔

ابھی مغل فوج کو جھجار سنگھ کے فرار کی خبر نہ تھی۔ طے یہ پایا کہ صبح ہونے کے بعد فوج قلعے میں داخل ہو گی مگر عارج سے کہاں صبر ہوتا۔ عارج کی دیکھا دیکھی وہ لوگ بھی قلعے میں گھس پڑے جو لوٹ مار اور غارت گری کیلئے بے چین تھے۔ انہیں جس طرف سے بھی راستہ ملا قلعے میں داخل ہو گئے۔

جب یہ خبر خان خاناں مہابت خاں کو ملی تو وہ قلعے میں آیا اور لوگوں کو سختی کے ساتھ لوٹ مار کرنے سے روک دیا۔ اس نے جگہ جگہ سخت گیر آدمی مقرر کر دیئے کہ وہ نگرانی کرتے رہیں۔

اسی دوران میں عارج شمشیر برہنہ لئے سارے قلعے میں چکراتا رہا مگر اسے اپنے دشمن کا سراغ نہ مل سکا نہ ہی کہیں پاربتی نظر آئی۔ اس کی بے خبری پر مجھے ہنسی آنے لگی۔ یہ عقدہ دوسرے دن صبح کھلا کہ جھجار سنگھ اور پاربتی دونوں رات ہی کو فرار ہو گئے تھے۔

دوسرے روز صبح خان خاناں مہابت خاں نے مال و اسباب کی ضبطی اور مدفون خزانوں کی تلاش کیلئے عارج کو مقرر کیا۔ دلبرداشتہ عارج کو بہ مجبوری یہ کام انجام دینا پڑا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے مخبروں کو شاہ پور روانہ کر دیا۔ اب اس کے خیال میں وہی ایک ایسا قلعہ رہ گیا تھا جہاں جھجار سنگھ پناہ لے سکتا تھا۔

عارج نے اپنے جن آدمیوں کو مدفون خزانوں کی تلاش پر مامور کیا تھا وہ خبر لے کر آئے کہ جنگل میں ایک کنویں کے اندر سونے کے سکے اور چاندی کے برتن بھرے ہوئے پائے گئے ہیں۔ عارج نے یہ اطلاع خان خاناں کو دی۔

خان خاناں خود جنگل میں موجود اس کنویں پر پہنچا اور مزید کنوؤں کی تلاش پر بھی آدمی مقرر کیے۔ دو تین اور کنوؤں میں بھی جو غلہ ذخیرہ کرنے کیلئے بنائے جاتے ہیں سونے کے دفینے ملے۔

ابھی دفینوں کی تلاش جاری تھی اور کام ختم نہ ہوا تھا کہ عارج کے بھیجے ہوئے مخبر شاہ پور سے واپس آ گئے۔ انہوں نے انتہائی تیز رفتاری کا ثبوت دیا تھا۔ عارج کا اندازہ قطعی درست ثابت ہوا۔ جھجار سنگھ شاہ پور ہی گیا تھا۔ عارج نے یہ خبر فوراً اورنگزیب کو پہنچائی۔

لشکر دشمن کے خیال سے اورنگزیب نے فی الحال وہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے حکم دیا کہ مہابت خاں اور عارج اپنے اپنے لشکروں کو لے کر فوراً روانہ ہو جائیں۔ وہ بھی پیچھے

پیچھے آتا ہے۔ اورنگزیب نے ایک اور تجربے کار امیر کو بھی ان دونوں کے ساتھ جانے کا حکم دیا۔ مغل افواج کے یہ تینوں لشکر شاہ پور کی طرف روانہ ہو گئے۔

ادھر جھجار سنگھ میں اب قطعی یہ ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ مزید مقابلہ کر سکتا اور نہ ہی وہ اس غرض سے شاہ پور گیا تھا۔ شاہ پور سے وہ برار کے علاقے میں گونڈوانہ اور دیوگڑھ کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یوں بھی شاہ پور میں صرف دو ہزار سپاہی تھے جو ظاہر ہے کہ مغل فوجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

جھجار سنگھ کی بدقسمتی سے انہی دنوں گونڈوانہ کا زمیندار فوت ہو گیا تھا۔ وہ زمیندار جھجار سنگھ کا دوست تھا۔ اس کے مرنے اور مغل فوج کے شاہ پور کی حدود میں داخل ہونے کی خبر جھجار سنگھ کو ایک ساتھ ملی۔

جھجار سنگھ یہ صورتحال دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا' ناچار اس نے قلعے کی توپوں کو توڑ کر ناکارہ بنا دیا۔ عمارتوں کو بارود سے اڑا دیا اور جس ساز و سامان کو ساتھ لے جانا محال تھا اسے آگ لگا دی پھر اس نے جواہر' قیمتی مال و اسباب' نقد روپیہ' سونے چاندی کے برتن اور دیگر اشیاء ہاتھیوں' اونٹوں پر بار کرا دیں۔ آخر میں وہ پاربتی اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ گھوڑوں پر سوار ہوا۔ یہ رات کا وقت تھا' جھجار سنگھ نے وہاں راجپوت سپاہیوں کو بھی نہ چھوڑا اور انہیں بھی اپنے ساتھ لے لیا کہ کسی آڑے وقت کام آ سکیں۔ وہ رات ہی کے وقت شاہ پور سے دیوگڑھ روانہ ہو گیا۔

صبح ہوتے ہوتے مغل فوجیں شاہ پور کی بستی میں داخل ہو گئیں اور اس پر قبضہ کر لیا۔

ایک بار پھر جھجار سنگھ غوطہ دے گیا تھا' عارج نے دور دور تک مخبروں کو دوڑایا اس مرتبہ جھجار سنگھ نے اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا کہ وہ کدھر گیا ہے۔ عارج کے روانہ کردہ مخبر دو ہفتے کے بعد اس کا پتہ لگا پائے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ جھجار سنگھ روزانہ سات آٹھ کوس سے زیادہ مسافت طے نہیں کر سکتا ہے۔ اس کے اور مغل فوج کے درمیان اب پندرہ روز کا فرق پڑ گیا تھا پھر بھی عارج نے اس ضمن میں مہابت خاں سے بات کی کہ تعاقب کیا جائے۔

مہابت خاں نے عارج کی بات مان لی اور تعاقب پر راضی ہو گیا۔ اسی دن فوج کو کوچ کا حکم دے دیا گیا پھر یہ فوج شہر بہ شہر اور قصبہ بہ قصبہ مکمل پندرہ روز تک رات دن جھجار سنگھ کے تعاقب میں آگے بڑھتی رہی۔

آخر کار ایک روز عین غروب آفتاب کے وقت جھجار سنگھ مغل فوج کے نرغے میں آ گیا۔ جب تک درمیان میں کچھ فاصلہ رہا دونوں فوجوں کے درمیان تیروں اور نیزوں کا تبادلہ

ہوتا رہا۔ جب فاصلہ ختم ہوگیا تو دونوں نے تلواریں علم کرلیں اس کے ساتھ سخت گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی۔ اس آخری مقابلے میں عارج سے میں بالکل قریب تھی کوئی بھی لمحہ عارج کی زندگی کا آخری لمحہ ثابت ہوسکتا تھا ہر چند کہ مغل فوج کا پلہ بھاری تھا اور اس کی تعداد بھی راجپوتوں سے بہت زیادہ تھی لیکن جنگ بہر حال جنگ ہوتی ہے۔ اگر مغل لشکر جیت جاتا اور عارج کو اس فتح کی قیمت اپنی زندگی دے کر ادا کرنی پڑتی تو میرے نزدیک یہ شکست ہی ہوتی۔

مجھے سب سے زیادہ خطرہ پاربتی کی طرف سے تھا وہ راجپوت عورت بلاشبہ شجاعت اور بہادری کے قابل تعریف جوہر دکھا رہی تھی۔ اس مردانہ ہمت عورت نے وہ تیغ زنی کی جو کسی بہتر سے بہتر شجاع مرد سے ممکن نہ تھی' وہ جس طرف تلوار چلاتی تھی ایک دو سر ضرور زمین پر گرتے نظر آتے تھے غرض کہ اسی ہنگامے میں رات ہوگئی مگر جنگ نہ رکی۔

میری خود غرضی بار بار مجھے اس پر اکسا رہی تھی کہ میں بھی اس جنگ میں شریک ہو جاؤں۔ اس کا راستہ یہ تھا کہ میں اس دلیر و بہادر راجپوت عورت پاربتی کے جسم میں اتر جاتی یوں میں اپنے محبوب عارج کا دفاع کرسکتی تھی۔ یقیناً یہ دشمن کو فریب دینا ہوتا' میری طبیعت اس فریب پر آمادہ نہ ہوئی میرے نزدیک یہ بزدلانہ اقدام تھا۔

دوسری ایک صورت اور بھی تھی کہ عارج کی جان خطرے میں نہ پڑتی' میں اسے دلاور علی کے انسانی قالب سے باہر نکلنے پر مجبور کردیتی۔ اس میں بس ایک اندیشہ تھا کہ عارج اپنے انسانی قالب کے زیر اثر اسے اپنی توہین تصور نہ کرتا ایسی صورت میں ظاہر ہے وہ دلاور علی کا جسم چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ ابھی میں اسی تذبذب کا شکار تھی کہ میری نظر عارج پر پڑی اس وقت تک وہ جھجار سنگھ اور پاربتی کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ راجپوتوں نے ان دونوں کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا جسے توڑنے میں عارج کو پسینے آگئے' لڑتے لڑتے وہ اپنے لشکر سے کٹ کر رہ گیا تھا۔

عارج پہلے اپنی تلوار بلند کیے جھجار سنگھ کی طرف لپکا مگر پاربتی اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر فوراً درمیان میں آگئی اور بلند آواز سے عارج کو اس کے انسانی قالب کے نام سے مخاطب کیا۔ ''دلاور! ابھی میں زندہ ہوں اور اپنا عہد نہیں بھولی۔''

مجبوراً عارج کو پاربتی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ان دونوں کی تلواریں آپس میں ٹکرائیں۔ پہلا وار پاربتی نے کیا تھا جسے عارج نے تیزی سے پہلو بدل کر اپنی تلوار پر روک لیا تھا۔

ادھر تو عارج اور پاربتی ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوئے ادھر جھجار سنگھ موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے بیٹے بکرماجیت کو ساتھ لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ ان دونوں کو فرار ہوتے دیکھ کر عارج کچھ بھی نہ کرسکا۔ وہ پاربتی کے وار روکنے میں مصروف تھا جو بڑے جان لیوا تھے مقابلہ کیونکہ برابر تھا اس لئے میں نے مداخلت نہیں کی اس وقت ان دونوں کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔

پاربتی کو ابھی خبر نہ تھی کہ اس کا بے غیرت شوہر لڑنے کے بجائے اپنی جان بچا کر فرار ہو چکا ہے۔ اسے جھجار سنگھ سے ایسی بزدلی کی توقع نہیں تھی کہ اس کو تنہا چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

پھر عارج نے چیخ کر پاربتی سے کہا۔ ''اے دینار! تو نے آج پھر......''

عارج اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ میں پاربتی کے جسم میں ہوں اس نے اسی لئے پاربتی کو میرے نام سے مخاطب کیا تھا۔ پاربتی نے اسی بنا پر عارج کی بات کاٹ دی۔ ''کون دینار؟ ...... تو کس کا نام لے رہا ہے دلاور؟''

''تو...... تو کیا تو...... تو دینار نہیں ہے؟'' عارج حیرت سے بولا۔

عین اسی لمحے میں نے عارج سے سرگوشی کی۔ ''پاربتی ٹھیک کہتی ہے اے عارج! میں وہاں نہیں یہاں ہوں' تیرے پاس!'' ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے اندھیرے کی چادر اپنے وجود سے الگ کردی۔ اب عارج مجھے بآسانی دیکھ سکتا تھا اور میری آواز تو وہ سن ہی رہا تھا مگر کوئی آدم زاد نہ تو میری آواز سن سکتا تھا نہ اس کیلئے مجھے دیکھنا ممکن تھا۔

میرے بارے میں حقیقت کا علم ہونے کے بعد عارج نے اپنی حیرت پر بمشکل قابو پایا۔ اس عرصے میں وہ پاربتی کے وار بھی روکتا رہا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو پاربتی اسے موقع سے فائدہ اٹھا کے ٹھکانے لگا دیتی۔

معاً عارج کو ایک وار سے بچتے دیکھ کر پاربتی کہنے لگی۔ ''لگتا ہے دلاور علی! کہ تو موت کو اپنے سامنے دیکھ کر حواس کھو بیٹھا ہے اور تجھے میرا نام بھی یاد نہیں رہا' میں پاربتی ہوں کوئی اور نہیں!...... پاربتی تیری موت!''

''پاربتی! میری موت نہ تیرے ہاتھوں لکھی ہے نہ اس بزدل کے ہاتھوں جو تجھے اکیلا چھوڑ کر فرار ہوگیا ہے مگر میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' عارج نے بتایا۔ ''تو نے درمیان میں آ کر آج پھر اسے میرے ہاتھ سے بچا لیا۔''

اس انکشاف کے بعد کہ جھجار سنگھ فرار ہو چکا ہے خلاف توقع پاربتی نے اپنے ہاتھ

سے تلوار پھینک دی' عارج ہی نہیں میں بھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ تلوار پھینکنے کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنی شکست قبول کر لی ہے۔ اپنے ہاتھ سے تلوار پھینکتے ہی پاربتی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا اور سسکیاں لینے لگی تھی۔ جنگل کے اس حصے میں اب صرف عارج اور پاربتی ہی تھے یا پھر میں تھی جو خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی۔ مجھے اس آدم زادی پاربتی پر ترس آ رہا تھا جس کے شوہر نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا تھا۔

مغل فوج منتشر ہو کر بھاگنے والے راجپوت سپاہیوں کے تعاقب میں جنگل کے اندر گھس گئی اور چن چن کر انہیں قتل کر رہی تھی۔

عارج نے اپنی تلوار نیام کر لی اور گھوڑے سے کود گیا۔ پھر آگے بڑھ کر اس نے پاربتی کے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ میری توجہ عارج پر تھی اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے پاربتی کو آواز دی اور گھوڑے سے اتر آنے کو کہا۔

''میں...... آج ہار گئی دلاور!'' پاربتی سسکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''وہ...... وہ واقعی بزدل نکلا...... جھجار سنگھ بزدل...... ہاں وہ بزدل تھا...... اور میں نے اسے...... اسے اپنا کر غلطی کی۔''

عارج نے اسے سہارا دے کر گھوڑے سے اتارا۔ رقت کے سبب پاربتی کے سارے جسم پر رعشہ طاری تھا۔ وہ دلیر راجپوت عورت تھی جسے کسی نے آج تک روتے نہیں دیکھا تھا' زار وقطار رو رہی تھی۔

''اے عارج! اسے سنبھال ورنہ یہ گر پڑے گی۔'' میں بول اٹھی۔

عارج نے میرے کہنے پر پاربتی کو گرنے سے بچانے کیلئے سہارا دیا تو وہ اچانک عارج کے سینے سے لگ گئی۔ میرے لئے یہ صورتحال توقع کے خلاف تھی مگر میں نے مداخلت نہیں کی۔ غالباً اس کی وجہ اس آدم زادی سے میری ہمدردی تھی اور یہ بھی کہ میں اس کے جسم میں بھی رہ چکی تھی۔

پاربتی کے بجائے اگر کوئی اور آدم زادی اس طرح عارج کے سینے سے لگی ہوتی تو شاید میں برداشت نہ کر پاتی۔

پھر جب پاربتی کا جی کچھ ہلکا ہو گیا اور طبیعت قدرے سنبھل گئی تو عارج اسے اپنے گھوڑے پر بٹھا کر جنگل سے نکل آیا۔

اس وقت تک مغل فوج کے بیشتر سپاہی بھی جنگل سے باہر آ کر ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ انہی کے درمیان مہابت خاں نظر آ رہا تھا جو عارج کی طرف سے بہت فکرمند تھا۔ اس

نے عارج کو ادھر آتے دیکھا تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ پھر اس کی نظر پاربتی پر پڑی جس کا سر جھکا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔

جب عارج نے مہابت خاں کو جھجار سنگھ اور بکرماجیت کے فرار ہونے کی خبر دی تو مہابت خاں نے سخت افسوس کا اظہار کیا۔ اب گھوڑوں اور سپاہیوں کی حالت اس قابل نہ تھی کہ مزید آگے بڑھا جاتا مجبوراً مہابت خاں نے ایک وسیع تالاب کے کنارے فوج کو پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔

ابھی آخری فتح باقی تھی۔ عارج اسی وجہ سے مجھے مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ خیمے لگائے جا چکے تھے اور عارج پاربتی کو اپنے خیمے میں لے آیا تھا۔ پاربتی تو خیر مجھے دیکھنے کی اہل نہیں تھی مگر عارج مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ خیمے سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

''پاربتی! تم آرام کرو میں ابھی آتا ہوں۔'' عارج نے میرے ساتھ خیمے کے در کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''آرام!'' پاربتی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

عارج اپنے خیمے سے باہر آ گیا تو میں بولی۔ ''اپنا گھوڑا کھول لے کہ تجھے اس پر سواری کرنی ہے۔''

گھوڑا خیمے کے در پر بندھا ہوا تھا۔ عارج نے کچھ کہے بغیر گھوڑا کھولا اور اس پر سوار ہو گیا۔

''آ میرے ساتھ اے عارج!'' میں نے کہا۔

''تو مجھے اپنے ساتھ کدھر لے جا رہی ہے اے دینارا!'' عارج نے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے سوال کیا۔

''کسی کو بھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تو کہاں جا رہا ہے۔'' میں نے تاکید کی کیونکہ وہ ابھی پڑاؤ سے باہر نہیں نکلا تھا۔ کوئی بھی شناسا راستے میں اس سے پوچھ سکتا تھا کہ وہ کدھر جانے کا قصد رکھتا ہے۔

''مجھے خود کچھ معلوم نہیں تو کسی اور کو کیا بتاؤں گا اے دینارا! تو بھی کبھی کبھی لطیفے کہنے لگتی ہے۔'' عارج بولا' پھر کہنے لگا۔ ''ویسے تجھے یہ بتا دوں کہ میں تجھ سے سخت ناراض ہوں۔''

''جانتی ہوں میں اور اس ناراضگی کا سبب بھی مجھے معلوم ہے۔ تجھے میری بابت جو غلط فہمی ہے ابھی کچھ دیر بعد دور ہو جائے گی۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''تو یہی تو سمجھتا ہے کہ میں تیرے بجائے اس کافر آدم زاد جھجار سنگھ کے عشق میں گرفتار ہوں؟''

"ہاں اور کیا!" عارج بول اٹھا۔ "ہاں تو نے اب تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ کس طرف سے لے جا رہی ہے۔"

"ذرا اس پڑاؤ سے باہر نکل آ پھر بتاتی ہوں۔" میں نے جواب دیا پھر جب ذرا ہی دیر بعد جب عارج اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا پڑاؤ کو پیچھے چھوڑ آیا تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تو نے جھجار سنگھ کو فرار ہوتے دیکھا تھا کہ وہ کس طرف گیا ہے۔"

"نہیں اے دینار!" عارج نے جواب دیا۔ "میں پارتی سے نبرد آزما تھا۔"

"میں نے دیکھا تھا اور میں تجھے ادھر ہی لے جا رہی ہوں۔" جھجار سنگھ کدھر گیا ہے اس سے میں ہی واقف تھی۔ اس بدقسمت آدم زاد پر فرار ہونے کے بعد کیا گزری۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا لیکن واقعات کے تسلسل کی خاطر اس واقعے کو دانستہ پہلے بیان کر رہی ہوں۔

بدبخت جھجار سنگھ پر یہ گزری کہ کچھ ہی دور جا کر اسے اس علاقے کے گونڈوں نے گھیر لیا۔ جب انہیں جھجار سنگھ کا حال احوال معلوم ہوا تو اسے مزید آگے بڑھنے سے روک دیا اور لوٹ جانے پر اصرار کیا۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک باغی شخص ان کے علاقے میں پناہ لے اور وہ اس کی وجہ سے مغل فوج کے عتاب کا شکار ہوں۔

میں جب عارج کے ہمراہ وہاں پہنچی تو یہی تکرار جاری تھی۔ جھجار سنگھ نے عارج کو دیکھا تو اس نے تیزی سے اپنے گھوڑے کو موڑا اور سامنے آ گیا' بکرما جیت بھی اس کے ساتھ تھا۔

گونڈوں نے عارج کے لباس سے پہچان لیا کہ وہ کوئی مغل سردار ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنی دانست میں عارج کی مدد کو آگے بڑھے۔

عارج نے بلند آواز میں انہیں آگے بڑھنے سے منع کیا اور مداخلت نہ کرنے کیلئے تاکید کی۔ ان لوگوں کے قدم رک گئے۔

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر نوجوان بکرماجیت نے تیزی سے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور پہلو سے عارج پر وار کرنا چاہا اسی وقت میں بول اٹھی۔ "اے عارج! سنبھل" میں نے عارج کو بکرماجیت کی طرف سے چوکنا کر دیا۔

عارج نے سنبھل کر بکرماجیت کا وار روکا اور پھر خود بھرپور وار کیا۔ پھر اس سے پہلے کہ بیٹے کی مدد کو باپ آگے بڑھ سکتا۔ عارج کی تلوار بجلی کی طرح کوندی اور ناتجربہ کار بکرماجیت کا سر کٹ کر دور جا گرا۔

اسی دوران میں جھجار سنگھ نے عارج پر حملہ کر دیا۔ کوشش کے باوجود عارج خود کو زخمی

ہونے سے نہ بچا سکا۔ اس کے بائیں شانے پر گہرا زخم لگا مگر اسے سنبھلنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اس نے جھجار سنگھ کا دوسرا وار اپنی تلوار پر روک کر تیزی سے اپنے گھوڑے کو پیچھے ہٹا لیا۔ جھجار سنگھ بغیر توقف کیے اس پر جھپٹا۔ اسی وقت ذرا سی مہلت پا کر عارج نے اس کی طرف پوری قوت سے نیزہ پھینکا وہ اسی لئے پیچھے ہٹا تھا۔ نیزہ نشانے پر بیٹھا کہ اسے ایک سچے نشانے باز نے پھینکا تھا۔

جھجار سنگھ کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کا زور لگا کر اپنے سینے میں پیوست نیزے کو نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ عارج نے جھپٹ کر اس کی گردن پر وار کیا۔ باغی جھجار سنگھ کا سر کٹ کر زمین پر آ رہا اور دھڑ گھوڑے کی پشت پر لڑھک گیا۔ وہ انتقام کی آگ جو عارج کے انسانی قالب دلاور علی کے سینے میں عرصہ دراز سے بھڑک رہی تھی ہمیشہ کیلئے سرد ہو گئی۔

پھر گونڈوں کے اس گروہ نے عارج کے زخم کی مرہم پٹی کی اور خاطر مدارات میں لگ گئے۔ بے چارے غریب آدم زاد ہر زمانے ہی میں صاحب اقتدار طبقے کے افراد سے حسن سلوک کرتے ہیں خواہ انہیں جواب میں کچھ نہ ملے مگر اس وقت ان غریبوں نے ایک جن زاد کے ساتھ یہ رویہ اپنایا تھا۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ اگر وہ لوگ جھجار سنگھ کو آگے بڑھنے سے روک نہ دیتے تو شاید عارج اتنی جلد انتقام کی آگ نہ بجھا پاتا بہر اعتبار جھجار سنگھ اس کا رقیب تھا۔

یہی وجہ تھی کہ عارج نے آدم زادوں کی خدمت کا وہ صلہ دیا جو یقیناً کوئی اور مغل سردار نہ دے پاتا۔ عارج نے ان میں سے کچھ سرکردہ افراد کو بلا کر مخصوص ہدایات دیں اور پھر خاموشی سے لوٹ آیا۔

دوسرے دن صبح عارج کی ہدایات کے مطابق یہ لوگ جھجار سنگھ اور بکرماجیت کے سر لے کر مہابت خاں کے حضور حاضر ہوئے اور بیان کیا کہ ہم نے ان دونوں باغی باپ بیٹے کو قتل کیا ہے۔

مہابت خاں نے ان گونڈوں کو خلعت' نقد روپیہ اور گھوڑے دے کر رخصت کیا۔ وہ دل ہی دل میں عارج کو دعائیں دیتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ لازماً یہ بڑے ظرف اور حوصلے کی بات تھی کہ عارج نے اپنی کارکردگی ان غریب آدم زادوں سے منسوب کرا دی تھی۔

جھجار سنگھ اور بکرماجیت کے سروں کو شاہجہاں کے ملاحظے کی غرض سے ایک عرضداشت کے ساتھ آگرے بھیج دیا گیا۔

عارج اپنے لشکر اور جنگی قیدیوں کو لے کر جب آگرہ پہنچا تو جشن کی مجلس مرتب تھی۔ باغی جھجار سنگھ اور اس کے بیٹے بکرما جیت کے سروں کی تشہیر کرا کے انہیں قلعے کے دروازے پر لٹکوا دیا گیا تھا۔

قلعے کے دروازے سے جب پاربتی اندر داخل ہو رہی تھی تو میں بھی اس کے قریب ہی تھی۔ پاربتی کی نگاہ ان سروں کی طرف اٹھی تو اس کے منہ سے بے اختیار ایک سسکی نکل گئی۔ پھر اس نے ادھر سے نگاہ ہٹالی' اسے بزدل جھجار سنگھ کے متوقع انجام پر تو زیادہ ملال معلوم نہیں ہوتا تھا البتہ نوجوان و نافرمان بیٹے بکرما جیت کی موت نے یقیناً اس کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ اولاد خواہ نافرمان ہی کیوں نہ ہو ایک ماں اس کی موت کا دکھ برداشت نہیں کر سکتی۔

عارج نے جب پاربتی اور راجپوت قیدیوں کو بادشاہ کے حضور پیش کیا تو میں بھی وہیں موجود تھی۔ شاہجہاں کے مزاج میں اس وقت نرمی تھی اور وہ عفو و درگزر پر آمادہ تھا۔ یوں بھی وہ خواتین کے معاملے میں زیادہ سختی کا قائل نہیں تھا۔ سارا دربار ہمہ تن گوش تھا کہ دیکھیں شاہجہاں ان باغیوں خصوصاً پاربتی کے بارے میں کیا فیصلہ سناتا ہے۔

ان مجرموں کی صف میں پاربتی بھی سب سے آگے سر جھکائے کھڑی تھی۔ پورے دربار میں شاہجہاں کے فیصلے کا سب سے زیادہ منتظر عارج تھا۔ عارج نے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا کہ ایک باغی کی بیوی ہونے اور اس کی باغیانہ سرگرمیوں میں آخری وقت تک حصہ لینے کے سبب پاربتی کیلئے سزائے موت کا حکم ہو سکتا ہے۔ شاہجہاں اگر یہ حکم دے بھی دیتا تو کچھ عجیب یا انصاف سے بعید نہ ہوتا۔ اس کا یہ حکم انصاف کا تقاضہ سمجھا جاتا کیونکہ وہ عورت جو اس کے روبرو کھڑی تھی جانے کتنے مغل سپاہیوں کو اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار چکی تھی۔ شاہجہاں اس بات سے بے خبر نہیں تھا مگر جب شاہجہاں نے سب سے پہلے اسی عورت کو قبول اسلام کی دعوت دی تو سارے درباری ششدر رہ گئے۔

''جہاں پناہ! میں تو اسی وقت کلمہ پڑھ چکی تھی جب میں نے حضور کے ایک جواں مرد منصب دار دلاور علی خان کے آگے اپنی تلوار پھینک کر شکست قبول کر لی تھی۔'' پاربتی نے یہ کہتے ہوئے اپنا سر اٹھا کر پہلے بادشاہ پھر عارج کی طرف دیکھا۔

بادشاہ نے پاربتی کو انعام و اکرام سے نوازا اور شاہی مہمان خانے کا ایک حصہ اس کیلئے مخصوص کر دیا۔

سارا دربار ''مرحبا مرحبا'' کی صداؤں سے گونج اٹھا۔ پھر شاہجہاں نے اس شرط پر ان باغی راجپوتوں کے قصور بھی معاف کر دیے کہ ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا ان

کی جاں بخشی کر دی جائے گی۔

باغی راجپوتوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ تھی ان میں سے صرف چند سرکشوں نے جن کی تعداد سو کے قریب تھی اسلام قبول کرنے کے بجائے موت کو ترجیح دی اور باقی سبھی مسلمان ہو گئے۔

عارج کو اس بات کا اندازہ تھا کہ پاربتی کو نوجوان بیٹے کی موت کا کس قدر صدمہ ہو گا اس نے اسی لئے مناسب یہی سمجھا کہ پاربتی ابھی کچھ دن شاہی محل ہی میں رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب دربار برخاست ہوا تو وہ پاربتی سے نگاہ ملائے بغیر دربار سے نکل گیا۔

چند روز بعد عارج نے شاہی محل کے اس حصے کا رخ کیا جہاں شاہجہاں کے معزز مہمان ٹھہرائے جاتے تھے تو میں بھی ساتھ تھی۔ میں نے دانستہ عارج کی نگاہوں سے اوجھل ہونے کی خاطر اندھیرے کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس کا سبب یہ دیکھنا بھی تھا کہ عارج پر اس کے انسانی قالب کے اثرات کس قدر ہیں اور کس حد تک پاربتی کی چاہت میں مبتلا ہے' اس کا اندازہ لگا سکوں۔

خدمت گاروں نے پاربتی کو عارج کے آنے کی خبر دی۔ پاربتی نے حاضری کا اذن دیا۔ عارج دھڑکتے دل اور لرزتے ہوئے قدموں سے پاربتی کے سامنے پہنچا' اسے سامنے دیکھ کر پاربتی نے کنیزوں کو خلوت کا اشارہ کیا۔ چند ہی لمحوں بعد اس آراستہ و پیراستہ کمرے میں وہ دونوں اپنی دانست میں تنہا اور آمنے سامنے تھے۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ میں بھی وہاں موجود ہوں۔

''پارو! میں تمہیں تمہارے شوہر اور بیٹے کا پرسا دینے آیا ہوں۔'' عارج نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات پوری کی۔

''میرا شوہر بزدل تھا اور راجپوتوں میں بزدل کا پرسا نہیں ہوتا' رہا بیٹا تو وہ نادان تھا اور اس نے نادانی کی سزا پائی۔ میں بہر حال ایک ماں ہوں اس کیلئے میرا دل ہمیشہ خون کے آنسو روتا رہے گا۔'' پاربتی کی پلکوں پر میں نے ستارے جھلملاتے دیکھے۔

عارج خاموش کھڑا رہا' شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے' کیسے کہے۔

''تم یوں کیوں کھڑے ہو؟۔۔۔ آؤ میرے پہلو میں بیٹھو مجھے فتح کرنے میں تمہیں برسوں لگے لیکن تم نے آخر مجھے فتح کر ہی لیا۔''

عارج اس کے برابر جا بیٹھا۔۔۔۔ وہ ہونٹ کاٹتی رہی۔ اس کے حسین اور نازک نتھنے شدت ضبط سے پھڑکتے رہے۔ پھر یقیناً ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ عارج کے

بازوؤں پر سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔ عارج نے اس کے سر کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چھوا اور پھر اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ شاید یہ خوشی کے آنسو تھے۔ ایک طویل ہجر اور محرومیوں کے ختم ہونے کے آنسو تھے مگر یہ ہجر اور یہ محرومیاں عارج کی نہیں اس کے انسانی قالب دلاور علی کی تھیں۔

میرے نزدیک فیصلہ کن لمحات آ چکے تھے میں اسی لئے بلا تاخیر پارتی کے جسم میں اتر گئی۔

"پارو!" عارج کی بھرائی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ارے عارج! ہوش میں آ" میں بول اٹھی۔ "تو نے اتنی دیر سے یہ کیا پارو پارو کی رٹ لگا رکھی ہے۔ میں پارو نہیں دینار ہوں۔"

"پاگل ہے تو مجھے پاگل کر دے گی اے دینار!" عارج نے چونک کر خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"پاگل تو اسے کیا جاتا ہے جو پہلے سے پاگل نہ ہو۔" میں نے عارج پر فقرہ چست کیا۔

"یعنی تو مجھے پاگل سمجھتی ہے؟"

"اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ تو کب اس آدم زادی پارتی کے جسم میں اتر جاتی ہے اور کب اسے چھوڑ کر چل دیتی ہے۔"

"اچھا ان فضول باتوں کو چھوڑ اور کام کی بات کر۔" میں بولی۔

"میں تیرا مطلب سمجھ گیا اے دینار!" عارج سنجیدہ ہو گیا۔ "اب ہم دونوں کے ساتھ رہنے کی راہ ہموار ہو چکی ہے۔ تیرا انسانی قالب کلمہ پڑھ چکا ہے' ہم شادی کر کے آسانی ان انسانی قالبوں میں ساتھ ساتھ رہ سکتے ہیں۔"

"تو نے ٹھیک کہا اے عارج! لیکن تجھے یقیناً ایک بات یاد نہیں رہی۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا ہے اے دینار!" عارج نے پوچھا۔

"پچھلی بار ہم ہندوستان سے پورے بیس برس بعد عراق لوٹے تھے۔" میں بتانے لگی۔ "اس پر عالم سوما نے مجھ سے کہا تھا کہ اس مرتبہ کی طرح لوٹنے میں بیس برس نہ لگا دینا' پھر تو یہ بھی بھلا بیٹھا کہ جب ہم عراق سے ہندوستان کیلئے چلے تھے تو عالم سوما بیمار تھا۔"

"ہاں.... مگر ہمیں.... ہمیں تو اس دفعہ بھی عراق سے چلے عرصہ دراز ہو گیا ہے۔

غالباً اس عہد میں آنے کے بعد ہم نے تقریباً 25 برس گزار دیئے ہیں' یہ.... یہ تو اچھا.... کچھ اچھا نہیں ہوا اے دینار!" عارج کی آواز سے فکرمندی کی جھلک رہی تھی۔

عارج کے بھولپن اور غفلت پر مجھے ہنسی آ گئی۔

"لے مجھے فکر میں مبتلا کر کے ہنس رہی ہے تو؟.... یہ بھی خوب رہی۔"

"اب تجھے فکر میں نہیں بلکہ پارتی کے عشق ہی میں مبتلا رہنے کی ضرورت ہے۔" میں نے اسے چھیڑا۔ "اور لڑا اس سے عشق!"

"مجھے پارتی سے نہیں تجھ سے عشق تھا اور ہے۔ پارتی کا جسم تو محض ایک ذریعہ تھا کیونکہ اس کے جسم میں تو ہی تھی۔" عارج اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ پھر اس نے مجھ سے شکوہ کیا کہ میں نے جھجار سنگھ کو اس پر ترجیح کیوں دی۔

"وہ ترجیح میں نے نہیں خود پارتی نے دی تھی۔" میں نے وضاحت کی۔ "میں تو پارتی کے جسم میں بہت ہی کم رہی ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے عارج کو حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ یہ حقیقت اس کیلئے حیران کن ہی تھی۔

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولا۔ "اے دینار! اب تو یہ بتا کہ کیا کرنا ہے؟"

"تو دراصل آدم زادوں کے درمیان اور ان کے جسموں میں رہ کر خاصا غبی ہو گیا ہے اے عارج! ورنہ مجھ سے آئندہ اقدام کے بارے میں نہ پوچھتا اور نہ تجھے یہ فکر لاحق ہوتی کہ ہم نے اس زمانے میں رہتے ہوئے تقریباً پچیس برس بتا دیئے ہیں۔ اس بات کو بہرحال یاد رکھا کر کہ تو کوئی آدم زاد نہیں بلکہ حیرت انگیز پراسرار قوتوں کا مالک ایک جن زاد ہے تو یقیناً یہ بات بھول گیا ہے کہ ہم جب بھی چاہیں ماضی یا مستقبل کے کسی بھی زمانے میں جا سکتے ہیں۔ پھر ایسی صورت میں کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم اس عہد میں عرصہ دراز سے مقیم ہیں۔"

"واقعی اے دینار! میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی۔" عارج نے اعتراف کیا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اب تو تجھے عقل آ گئی' یہ بتا پہلے ہم کس دور کے عراق میں گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے' وہ ایک سو نوے ہجری (190ھ) کا زمانہ تھا۔" عارج نے جواب دیا۔

"تجھے ٹھیک یاد ہے۔" میں بولی۔ "پھر بتا' اس مرتبہ یہ مناسب رہے گا کہ ہم دو سال بعد یعنی ایک سو بانوے ہجری (192ھ) کے زمانے میں عراق پہنچیں تیرا کیا مشورہ ہے اے عارج!"

"یہ مدت زیادہ نہیں۔" عارج نے پھر تائید کی' پھر کہنے لگا۔ "ہمیں کیونکہ اب واپس عراق جانا ہے اس لئے یہ انسانی قالب چھوڑنے ہی پڑیں گے' موقع ملا تو ہم پھر کبھی ہندوستان آئیں گے۔"

عارج کے لہجے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے فوری طور پر ہندوستان چھوڑنے کے سبب رنج ہو شاید اس کی وجہ پاربتی اور دلاور کے عشق کا منطقی انجام تک پہنچنا تھا۔ عارج کا انسانی قالب غالباً پاربتی کو اپنانا چاہتا تھا۔ اس میں بظاہر اب کوئی دشواری بھی نہیں رہی تھی کیونکہ پاربتی مسلمان ہو چکی تھی۔ بحیثیت مہمان محل کے ایک حصے میں رہتے ہوئے شاہجہاں کے ایما پر باقاعدہ اسے مسلمان بنالیا گیا تھا اب اس کا نام پاربتی نہیں رشیدہ تھا۔

ہمارے انسانی قالبوں کو بہر حال ہمیشہ کیلئے ایک ہونا تھا۔ اسی بنا پر میں نے عارج کی خوشنودی کیلئے کہا سنو یہ تو ہم نے طے کر ہی لیا ہے کہ ہمیں کس زمانے اور کس سرزمین پر واپس جانا ہے ایسی صورت میں اگر چند روز اور رکنا پڑ جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

عارج فوراً ہی میری بات کی گہرائی تک پہنچ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا۔ "اچھا ہے دینار! اس طرح میں ایک بار پھر تجھے اپنی بیوی بنے ہوئے عروسی جوڑے میں دیکھ لوں گا۔"

"قطعی نہیں" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "تو مجھے نہیں پاربتی عرف رشیدہ کو دلہن بنے دیکھے گا۔"

"لیکن رشیدہ کے جسم میں تو تو ہی ہو گی۔"

"اچھا اب زیادہ کٹ حجتی نہ کرو ورنہ اسی وقت تجھے یہاں چھوڑ کر عراق چلی جاؤں گی۔" میں بولی۔

عارج ہنس پڑا اور کہا۔ "عراق جانے کی دھمکی تو اس طرح دے رہی ہے جس طرح آدم زادیاں اپنے شوہروں کو میکے جانے کی دھمکیاں دیتی ہیں۔" پھر اس سے پہلے کہ جواب میں کچھ کہتی عارج بول اٹھا۔ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔ "اے رشیدہ بیگم! تمہارا عاشق' تمہارا سودائی دلاور علی خاں تمہیں اپنے عقد میں لینا چاہتا ہے' تمہیں قبول ہے؟"

"اور مہر کی رقم تو ہضم ہی کر گیا' عشق کا جھانسہ دے کر' مجھے بھی شرارت سوجھ گئی۔

"چلو اپنا بھاؤ تم خود ہی لگا دو رشیدہ بیگم!"

"میں کوئی بکاؤ مال نہیں جو تو بھاؤ کی بات کر رہا ہے۔"

تھوڑی دیر تک ہم دونوں کے درمیان اسی طرح نوک جھونک ہوتی رہی اور پھر عارج میرے پاس سے چلا گیا۔

دلاور علی خاں کی حیثیت سے عارج کوئی معمولی امیر نہیں تھا۔ یہ بات بھی سب کے علم میں تھی کہ دلاور علی خاں نے اب تک شادی نہیں کی حالانکہ اس کی عمر پچاس برس سے زیادہ ہو رہی تھی۔ میرے انسانی قالب کی عمر بھی تقریباً پچاس برس تھی۔

دو ایک روز بعد ہی عارج نے موقع دیکھ کر خلوت میں بادشاہ وقت شاہجہاں سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ نومسلم رشیدہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس پر شاہجہاں نے بے انتہا خوشی کا اظہار کیا اور بولا۔ "ہم اسے اپنی بیٹی کی طرح اس محل سے رخصت کریں گے۔"

پھر شاہجہاں نے حقیقتاً اپنے لفظوں کی لاج رکھی' اس نے بیٹی کی حیثیت سے خاصا جہیز دیا۔

جس روز یہ شادی ہوئی ہندوستان میں میری اور عارج کی آخری رات تھی۔ ہم دونوں ان انسانی قالبوں سے باہر نکل آئے جنہیں رہنے کیلئے خاصا عرصے استعمال کیا تھا۔ دلاور علی اور پاربتی کے عشق کو منزل مل گئی تھی۔

اس رات کو نصف شب سے کافی پہلے ہم 192 ہجری کے عراق میں پہنچ گئے۔ جب ہم بابل کے کھنڈرات میں داخل ہوئے تو وہاں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ عالم سوما نے ان کھنڈرات میں اپنی سکونت کیلئے جو حصہ مخصوص کر رکھا تھا وہ ہمیں وہیں ملا' ہم نے اسے صحت مند دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

☆......☆......☆

ہاں یہ سب اللہ کا کرم ہے کہ اس نے طبیب ہامہ کی کوششوں کو بار آور کیا۔ اللہ اسے خوش رکھے اور میری اس خدمت کا اجر عطا کرے۔ عالم سوما بولا۔ پھر اس نے ہمارے پوچھے بغیر بتایا۔ "وہ حصار جو اس ظالم عفریت نے تم دونوں کیلئے بغداد کے گرد کھینچ رکھا تھا اسے میں نے اپنے عمل کے ذریعے بیکار بنا دیا ہے۔ اب عفریت وہموش اسی غلط فہمی کا شکار رہے گا کہ جب تم بغداد میں داخل ہونے کی کوشش کرو گے اسے خبر ہو جائے گی۔"

"اور وہ کافر جنات جو حصار کی نگرانی پر مامور تھے اے سوما!" میں نے سوال کیا۔

"سردار قبیلہ ہونے کی حیثیت سے میرے ایما پر تیرے باپ اضحم نے ان پر پابندی لگا دی ہے کہ وہ بغداد اور اس کے گرد و نواح میں نظر نہ آئیں۔ حکم کی خلاف ورزی کی صورت میں انہیں سخت سزائیں مل سکتی ہیں۔" عالم سوما نے جواب تفصیل سے دیا۔ "اس حکم کو نافذ ہوئے بھی تقریباً سال ہو رہا ہے' کافر جنات اب بغداد کا پہرا نہیں دے رہے۔"

"پھر تو ہم اب بغداد میں رہ سکتے ہیں۔" عارج بول اٹھا۔

"بالکل!..... لیکن اس کیلئے اب تمہیں نئے انسانی قالب اپنانے ہوں گے۔ تمہیں خبر ہی ہے کہ تمہارے پہلے انسانی قالبوں ایوب اور جمیلہ کو عفریت وہموش قتل کر چکا ہے۔ یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ اب بھی قصر خلافت ہی میں رہو یا کہیں اور۔"

"اے سوما! ہم جس مقصد سے آدم زادوں کے درمیان رہنا چاہتے ہیں وہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ہم وہاں رہیں جہاں آدم زادوں کی قسمت کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔" میں بولی۔

"تیرا کہنا درست ہے اے دینار!" عالم سوما نے کہا۔ "میں نے پہلے بھی تجھے قصر خلافت میں سکونت پر چوکنا رہنے کی تاکید کی تھی اور اب بھی تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ با اختیار آدم زادوں سے بچ کے رہنا۔"

"پہلے کی طرح میں اب بھی تیری نصیحت پر عمل کروں گی۔" میں نے عالم سوما کو یقین دہانی کرائی۔

وہ رات عارج کے ساتھ میں نے بابل کے کھنڈرات ہی میں گزاری۔ پچھلی بار میری ملاقات اپنے بڑے بھائی یوسف سے نہیں ہو سکی تھی۔ اس مرتبہ اپنے والدین کے علاوہ میں بڑے بھائی سے بھی ملی میں صبح ہی صبح ان سے ملنے پہنچ گئی۔

بابل کے کھنڈرات سے عارج کے ساتھ عرصہ دراز کے بعد میں بغداد کیلئے روانہ ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ وہ رجب کا مہینہ تھا اور ہجری 192 تھی۔ بغداد پہنچ کر ہم نے پہلے حالات کا جائزہ لیا اور انسانی قالبوں میں اترنے کی جلدی نہیں کی۔

خلیفہ وقت ہارون الرشید کا بچپن اور جوانی دونوں ہی میں دیکھ چکی تھی اور اب اس کا بڑھاپا میرے لئے حیران کن تھا۔ پتہ نہیں یہ آدم زاد اتنی جلد بوڑھے کیوں ہو جاتے ہیں۔ جنات میں ایک سو سال تک تو بچوں کے کھیلنے کودنے کے دن ہوتے ہیں مگر اول تو کم ہی آدم زاد اس عمر تک پہنچتے ہیں۔ اگر وہ سو سال کے ہو بھی جائیں تو معذور نظر آنے لگتے ہیں۔ جیسے زندگی ان پر تہمت ہو۔ ہارون الرشید کو تو ابھی سو سال کی عمر پانے میں کئی دہائیاں باقی تھیں۔ اس کی عمر تو پچاس برس بھی نہیں ہوئی تھی۔

بغداد آئے ہوئے ہارون الرشید کو چند ہی دن ہوئے تھے۔ اس کے بارے میں پہلی تشویشناک خبر مجھے یہ ملی کہ وہ علیل ہے۔ بغداد آمد سے قبل رقہ ہی سے اس کی علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ رقہ میں اس نے اپنے بیٹے قاسم کو اپنا نائب مقرر کیا اور خزیمہ بن خازم کو قاسم کے پاس چھوڑ کر وہ دارالخلافہ بغداد پہنچ گیا۔ اس نے اپنے آئندہ اقدام سے کسی کو بھی آگاہ نہیں کیا تھا۔ خود میں نے بھی یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کی وجہ ہارون کی علالت تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس حالت میں بھی نچلا نہیں بیٹھے گا۔ اپنی وسیع و عریض مملکت پر وہ اپنی گرفت مضبوط رکھنا چاہتا تھا۔ کسی کی ذرا سی بھی نافرمانی برداشت کرنا اس کے مزاج سے قطعی مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

خلیفہ کے فیصلے ہی عوام پر اثر انداز ہوتے تھے اس لئے حسب سابق عارج کے ساتھ میں نے خلیفہ کے قریب ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ حسب سابق میں نے خلیفہ کے خاص خدمت گاروں میں ایک جوڑے کو تلاش کر لیا۔ اس جوڑے کی سکونت قصر خلافت ہی میں تھی۔

آدم زادوں کے اس جوڑے غفار اور سعدیہ میں اگر کوئی خرابی تھی تو بس یہ کہ وہ ادھیڑ عمر تھے۔ خوبی یہ تھی کہ ان دونوں ہی کو ہارون بہت پسند کرتا تھا اور ان کی خدمت سے خوش

تھا۔

میں نے جب عارج کو اس بارے میں بتایا تو وہ کہنے لگا۔ ''ارے لاحول پڑھ ان دونوں پر۔''

''آخر کیوں؟ کوئی وجہ تو بتا۔'' میں بولی۔

''ذرا سوچ اے دینارا! تو اس بوڑھی سعدیہ کا جسم اپنائے گی!...... تجھے کیا ہو گیا ہے۔'' عارج نے کہا۔

''ضروری تو نہیں کہ ہم جو انسانی قالب اپنائیں وہ حسین و نوجوان ہی ہوں...... تو یوں کیوں نہیں کہتا تجھے غفار کا بوڑھا جسم پسند نہیں آیا اور تو اس کے اندر نہیں رہنا چاہتا۔''

''یہ بات نہیں!'' عارج نے انکار کیا۔ ''مجھے غفار کا جسم اپنانے پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ میں تجھے اس بوڑھی آدم زادی......''

''اب وہ اتنی بوڑھی اور بدصورت بھی نہیں اگر ایسا ہی ہے تو کوئی اور جوڑا تو ڈھونڈ لے۔'' میں بول اٹھی۔

اس پر عارج راضی ہو گیا۔ اگلے ہی دن اس نے میرے لئے ایک خادمہ حسین کی نوجوان بیٹی کلثوم کا انسانی پیکر منتخب کر لیا اور مجھے اس کے متعلق بتا کر کہنے لگا۔ ''تو آدم زادی کے جسم میں اتر کر دیکھ لے۔''

''اور اگر مجھے اس کے جسم میں قرار نہ آیا تو؟'' میں نے سوال کیا۔

''اسی لئے تو پہلے آزمائش کو کہہ رہا ہوں۔'' عارج نے جواب دیا۔

''لیکن تو ایک بات بھول گیا کہ کلثوم ابھی غیر شادی شدہ ہے۔'' میں نے اعتراض کیا۔

''میں نے اس کا حل بھی سوچ رکھا ہے' پہلے تو ہاں تو کرا دے دینارا!'' عارج بولا۔ ''تو فکر نہ کر ہم دونوں ساتھ ہی رہیں گے۔''

''جب تک تو مجھے یہ نہیں بتائے گا کہ تو نے کیا سوچا ہے اور کلثوم کا تیرے ساتھ رہنا کس طرح ممکن ہے میں کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی۔''

''کلثوم کا رشتہ ایک اور خادمہ کے بیٹے اسحاق سے ہو چکا ہے۔'' عارج نے بتایا۔ ''میں نے اسحاق کے جسم میں اتر کر دیکھ لیا ہے۔ میں اس کے جسم میں رہ سکتا ہوں' اب تیری سمجھ میں آئی پوری بات۔''

''مگر جب ان دونوں کی شادی ہو جائے گی تبھی تو وہ ساتھ رہ سکیں گے کیا خبر کب ان

کی شادی......''

''کیا کلثوم اور اسحاق کے والدین کو ان دونوں کی فوری شادی پر آمادہ کرنا تیرے لئے کوئی مشکل کام ہے۔'' عارج نے یہ کہہ کر مجھے لاجواب کر دیا' پھر خود ہی بولا۔ ''اب تو اور بھی سوال کرے گی کہ وہ دونوں خلیفہ کے خدمت گاروں میں کس طرح شامل ہوں گے ہے نا؟''

''نہیں'' میں نے جواب دیا۔ ''اس لئے کہ اپنی مطلب براری کی خاطر ہم اپنی جناتی صفات استعمال کریں گے۔''

کلثوم مشکل سے بیس برس کی ہو گی اب تک اس کا رشتہ کبھی کا ہو جاتا مگر اس کی ماں بڑی بضد تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی چہیتی بیٹی کو نظروں سے اوجھل نہیں کرے گی۔ اس کی بس ایک ہی صورت تھی کہ وہ قصر خلافت میں ہی سکونت پذیر کسی نوجوان سے بیٹی کی شادی کرتی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے عمر زیادہ ہونے کے باوجود اسحاق کو پسند کر لیا تھا۔ اسحاق کی پہلی بیوی مر چکی تھی اور وہ بے اولاد تھا۔ میں نے ہر بات پہلے ہی معلوم کر لی تھی۔ کلثوم اتنی خوبصورت تھی مگر ماں کی ضد کے آگے کلثوم کا باپ بھی مجبور ہو گیا اور اس نے اسحاق کا رشتہ قبول کر لیا۔

اسحاق کو اپنی پہلی بیوی سے محبت تھی لیکن اپنے ماں باپ کے اصرار پر وہ کلثوم کو دیکھ کر اور برسوں تنہا رہ کے اپنا گھر بسانے کو آمادہ ہو گیا۔ تمام معلومات حاصل کر کے میں ایک شب کلثوم کے جسم میں داخل ہو گئی۔ خلاف توقع مجھے معمولی سی گھٹن کا احساس بھی نہ ہوا۔ اس آدم زادی کے جسم میں بڑی نزاکت و لطافت تھی۔ میرے لئے اس نوع کا پہلا تجربہ تھا۔ اس کے بعد ایک ہفتے کے اندر ہی اندر سب کچھ ہو گیا۔ اسحاق اور کلثوم کی شادی ہو گئی۔ ظاہر ہے مجھے اس کیلئے جناتی صفات کو بروئے کار لانا پڑا۔ میں نے کلثوم کی ماں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ اس کا وقت آ گیا ہے اور وہ بہت جلد مرنے والی ہے۔ اس کیلئے مجھے وقتی طور پر اسے بیمار بھی کرنا پڑا۔

کلثوم اور اسحاق کے انسانی قالبوں پر میں اور عارج نے قبضہ کر لیا۔ اب ہمارے پیش نظر دیگر مسائل تھے مجھے اور عارج کو کم ہی خلوت نصیب ہوتی تھی کیونکہ اسحاق کا کنبہ بہت بڑا تھا۔ اس کے سات بھائی اور پانچ بہنیں تھیں۔ صرف ایک بہن کی شادی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ تین چھوٹے بھائی شادی شدہ اور بچوں والے تھے۔ یہ آدم زاد اس قدر شریر تھے کہ ہر وقت گویا میری ناک میں نکیل ڈالے رہتے تھے' تائی اماں کی رٹ لگائے رہتے۔ ان کی مائیں کچھ نہ کہتیں اور کم بختیں مجھے پریشان کر کے خوش ہوتی رہتیں۔

ایک شب خلوت میسر آنے پر میں نے عارج سے کہا۔ ''یہ تو نے مجھے کس جنجال میں پھنسا دیا۔ اس گھر میں رہنا تو عذاب ہے میرے لئے۔ اسحاق کے چھوٹے بھائیوں کی ظالم بیویوں نے سارا گھر کا کام کاج مجھی پر ڈال دیا ہے' دن بھر سر اٹھانے کی مہلت نہیں ملتی۔''

''اس کی تدبیر سوچ لی ہے میں نے۔'' عارج پرسکون آواز میں بولا۔ ''فکر نہ کر اے دینار! دو ایک دن کی بات ہے' تیری جان کے عذاب ٹل جائیں گے۔ تو الگ گھر میں میرے ساتھ سکون سے رہے گی' میں نے ڈول ڈال دیا ہے۔''

''لیکن مجھے بھی تو کچھ بتا!'' میں نے کہا۔

''پہلے کام تو ہو جانے دے۔''

''مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اسحاق کے بھائیوں کی بھوندل اور بدصورت بیویاں میرے انسانی قلب کی خوبصورتی دیکھ کر جلن میں مبتلا ہو گئی ہیں۔''

''کہا نا میں نے کہ'' ایک دن صبر کر لے۔'' عارج نے مجھے پھر تسلی دی۔

پھر وہی ہوا جو عارج نے کہا تھا۔ قصر خلافت کے نگران نے مجھے اور عارج کو بوڑھے خلیفہ کی خدمت پر مامور کر دیا۔ غفار اور سعدیہ کو ادھیڑ عمری کے سبب خلیفہ کی خدمت سے ہٹا دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہمیں خلیفہ وقت کی خدمت کا فریضہ انجام دینے پر الگ سکونت فراہم کر دی گئی تھی۔

اسحاق کے گھر والوں سے جان چھوٹنے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں چاہتی تو حاسد آدم زادوں کے خلاف جوابی کارروائی بھی کر سکتی تھی مگر مجھے یہ مناسب معلوم نہ ہوا۔ پہلے دن خلیفہ کے روبرو میری اور عارج کی طلبی ہوئی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ہمیں گہری نظروں سے دیکھا وہ اپنے بستر پر نیم دراز تھا۔ اس کے چہرے سے بیماری جھلک رہی تھی۔

خلیفہ نے ہم دونوں سے زیادہ بات نہیں کی اور مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔

''تم دونوں کو ہم اپنی خدمت میں قبول کرتے ہیں۔'' خلیفہ ہارون نے نقاہت آمیز آواز میں کہا۔

اس پر ہم نے قاعدے کے مطابق تعظیماً جھک کر شکریہ ادا کیا۔ خلیفہ نے رخصت کا اشارہ کیا تو ہم وہاں سے چلے آئے۔

کسی خلیفہ کی خدمت گاری کا ہمارے لئے یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ ہم تمام ادب و آداب سے واقف تھے۔ اسی سبب قصر خلافت کے نگران نے ہماری تربیت کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہم نے اس کے ہر سوال کا اطمینان بخش جواب دیا تھا اور اس کی ہر آزمائش پر

پورے اترے تھے۔

اس پہلی ہی ملاقات میں خلیفہ ہارون کے ذہن پر میں نے پوری توجہ دی تھی۔ اس بنا پر مجھے بہت سی نئی باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ خلیفہ زیادہ عرصے بغداد میں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ طبیبوں نے ابھی اسے مزید سفر نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا مگر عموماً مطلق العنان حکمران کم ہی کسی کا مشورہ قبول کرتے ہیں۔ یہی صورتحال خلیفہ ہارون کی تھی فی الحال وہ ہر قیمت پر رافع بن لیث کی سرکوبی کرنا چاہتا تھا جو خراسان میں تھا۔ رافع کے علاوہ اس نے ہرثمہ کی گرفتاری کے احکام بھی جاری کر دیئے تھے کیونکہ ہرثمہ ہی کی سازش کے سبب زیر حراست رافع کو سمرقند کے قید خانے سے فرار ہونے کا موقع ملا تھا۔

خلیفہ کا ذہن پڑھ کر ہی مجھے رافع کے بارے میں تفصیل معلوم ہوئی تھی۔ یہ تفصیل عجیب اور دلچسپ تھی۔

دراصل رافع بن لیث ایک حسین ترین آدم زادی ریطہ کے عشق میں مبتلا ہونے کی وجہ سے خلیفہ وقت کی نظروں میں قابل سزا ٹھہرا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ یحییٰ بن اشعث اور رافع کے درمیان دوستی تھی۔ یحییٰ بھی خلیفہ کے بااعتماد سرداروں میں سے ایک تھا۔ خلیفہ ہارون نے یحییٰ کو بھی سمرقند میں رافع کی مدد کیلئے متعین کیا تھا۔ یحییٰ کی حیثیت معاون و مشیر کی تھی۔ سمرقند کا عامل رافع ہی تھا۔ مگر خلیفہ نے اسے اہم اقدامات کیلئے یحییٰ سے مشورے کا پابند کر دیا تھا۔ یوں گویا یحییٰ اور رافع کی حیثیت تقریباً مساوی تھی۔ رافع اور یحییٰ کی دوستی اس قدر بڑھی کہ ان کے درمیان گھریلو تعلقات استوار ہو گئے۔ دونوں دوستوں کی بیویوں نے ایک دوسرے سے پردہ کرنا چھوڑ دیا۔ درحقیقت یہ تجویز یحییٰ کو رافع ہی نے دی تھی۔ اس کا سبب یحییٰ کی بیوی ریطہ تھی۔ ایک روز رافع نے ریطہ کی جھلک دیکھ لی تھی اور تبھی سے اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ خلیفہ کا ذہن پڑھنے کے ساتھ ہی اس قصہ عشق کی تفصیل جاننے کیلئے میں نے اپنی جناتی صفات بھی استعمال کیں۔ یحییٰ کے کہنے پر ریطہ نے پردہ ختم کر دیا تو جیسے رافع کی عید ہو گئی۔ ریطہ کو بھی اپنے حسن کا احساس تھا مگر یحییٰ کبھی اس کی تعریف نہیں کرتا تھا۔ اس کے برعکس رافع نے پہلی بار ہی جب خلوت میسر آئی تو ریطہ کے حسن کا قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔

ریطہ کے حسن کی تعریف رافع نے جن الفاظ میں کی وہ الفاظ ریطہ کے دل میں اتر گئے۔

''ریطہ! تمہاری دراز زلفیں گھٹاؤں کی طرح ہیں' تمہاری پیشانی ہے کہ چاند کا زرپاش ہلال' ابرو ہیں کہ کمان' آنکھیں ہیں کہ دو ساغر چھلکے چھلکے' رخسار ہیں کہ سرخ سیبوں کی طرح'

لب ہیں کہ گلاب کی پنکھڑیاں اور جسم ہے کہ بستر دیبا و حریر' تمہارے جسم کی جنبش ہے کہ جنبش شاخ' جب تم چلتی ہو تو لگتا ہے زمانہ تمہاری ٹھوکروں میں ہے' ربطہ تم چلتا پھرتا میخانہ ہو۔''

خلوت میں ہونے والی یہ پہلی ملاقات ہی کام کر گئی۔ یحییٰ بیرون شہر گیا ہوا تھا۔ بیوی اور محبوبہ میں فرق ہوتا ہے اور یہ احساس چند ہی ملاقاتوں میں ربطہ کو ہو گیا۔ وہ اپنے بے مثال حسن کے سبب اپنے شوہر یحییٰ سے جس تعریف و ستائش کی متمنی تھی اس کمی کو رافع نے پورا کر دیا۔

نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک روز ربطہ نے بھی جواباً رافع سے اظہار عشق کر دیا اور بولی۔ ''میں یحییٰ سے علیحدگی چاہتی ہوں تاکہ تمہیں اپنا سکوں' یہ بتاؤ رافع کیا ایسا ممکن ہے؟''

''مشکل تو ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔'' رافع نے جواب دیا۔ ''میں تمہیں کوئی تدبیر سوچ کر بتاؤں گا۔''

پھر چند ہی روز بعد رافع کے ذہن میں ایک تدبیر آ گئی۔

رافع نے موقع ملتے ہی ربطہ سے کہا۔ ''یحییٰ لاکھ تمہاری قدر نہ کرتا ہو لیکن تمہیں ہرگز طلاق نہیں دے گا۔ اس سے علیحدگی کی بس ایک یہ صورت ہے وہ یہ کہ تم دو افراد سے اپنے ارتداد و کفر کی شہادت دلا دو تو تمہاری گلو خلاصی ہو جائے گی اور یحییٰ سے تمہارا نکاح ٹوٹ جائے گا۔ بعد میں تم توبہ کر کے پھر مسلمان ہو جانا' میں تم سے شرعی طور پر عقد کر لوں گا۔''

ربطہ نے رافع کے مشورے پر ایسا ہی کیا اور رافع سے اس نے عقد بھی کر لیا۔

یحییٰ کو اس پر بڑا دکھ ہوا۔ اس نے خلیفہ ہارون کے کان تک یہ شکایت پہنچا دی۔ ربطہ اور رافع کے عقد کی وجہ سے یحییٰ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ اب اس پر ہر بات واضح ہو گئی تھی کہ اس کی حسین بیوی ربطہ کو ہتھیانے کیلئے کیا چال چلی گئی ہے۔ اس نے اصل واقعہ لفظ بہ لفظ خلیفہ ہارون سے عرض کر دیا۔

خلیفہ ہارون نے اپنے طور پر اس واقعے کی تفتیش کرائی اور اسے صحیح پانے پر علی بن عیسیٰ کو سمرقند کا عامل مقرر کر دیا۔ اسی حکم کے تحت رافع اب سمرقند کا عامل نہیں رہا تھا۔ خلیفہ نے نئے عامل علی بن عیسیٰ کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ رافع کی ربطہ سے علیحدگی کرا کے رافع پر حد شرعی جاری کی جائے۔ رافع کو شہر سمرقند میں گدھے پر زیر حراست سوار کرا کے تشہیر کی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔

خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں رافع کو ربطہ سے علیحدہ کر کے قید میں ڈال دیا۔

قید کے دوران ہی میں رافع کو یہ معلوم ہوا کہ علی بن عیسیٰ کی جگہ خلیفہ نے ہرثمہ کو

سمرقند کا عامل مقرر کر کے علی کو بلخ کا عامل بنا دیا ہے۔ رافع کو قید میں چند ماہ گزر چکے تھے' وہ بااثر و بارسوخ شخص تھا۔ قید میں رہتے ہوئے بھی ربطہ کی طرف سے وہ غافل نہیں تھا۔ ہرثمہ بھی اس کے دوستوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے ہرثمہ کو ایک خفیہ پیغام بھجوایا۔

چند روز بعد قید خانے میں رافع کو عامل سمرقند ہرثمہ کا جو جواب ملا' اسے پڑھ کر رافع کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ہرثمہ نے اپنے جوابی پیغام میں صرف چند ہی الفاظ لکھے تھے مگر یہ الفاظ بہت معنی خیز تھی۔ ''یقین کرو رافع! کہ میں یہ نہیں بھولا' تم میرے دوست ہو۔''

اپنی دوستی کی لاج رکھنے کیلئے ہرثمہ نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ رافع کی محبوبہ ربطہ سے اس کی ملاقات کا بندوبست کر دیا۔ اس عرصے میں ہرثمہ کو رافع کے قصہ عشق سے واقفیت ہو چکی تھی۔ عامل سمرقند ہونے کے سبب ہرثمہ کیلئے رافع سے ربطہ کی ملاقات کرانا مشکل نہیں تھا۔ اس ملاقات میں رافع نے اپنی محبوبہ کو تسلی دی کہ اب میں زیادہ دن قید نہیں رہوں گا۔ ربطہ کو یہی یقین دہانی عامل سمرقند ہرثمہ نے کرائی تھی۔ وہ اسی لئے اپنے محبوب و شوہر رافع کی طرف سے مطمئن ہو گئی۔

ہرثمہ نے رافع کی رہائی کیلئے جو منصوبہ بنایا تھا۔ اس سے مختصراً ایک خفیہ پیغام کے ذریعے رافع کو آگاہ کر دیا۔ ہرثمہ کو اس وقت یہ اندازہ نہ تھا کہ آئندہ حالات کیا رخ اختیار کر جائیں گے۔ رافع نے قید کے دوران ہی میں اپنے بھائی بشیر سے بھی خفیہ مراسلت جاری رکھی تھی۔ یہ عزائم ہرثمہ کے منصوبے سے الگ تھے۔ رافع کے عزائم محض آزادی تک محدود نہیں تھے' ان عزائم سے بشیر بخوبی آگاہ تھا۔

چند ہی روز بعد ایک فوجی سردار داؤد کو سمرقند میں اپنا نائب مقرر کر کے ہرثمہ آس پاس کے علاقوں کا دورہ کرنے نکل گیا۔ اپنی روانگی سے قبل وہ داؤد کو قید خانہ سمرقند کے بارے میں ضروری ہدایات دے گیا تھا۔ اس نے داؤد سے کہا تھا کہ ضروری نہیں سابق عامل سمرقند رافع بن لیث ہمیشہ ہی خلیفہ وقت کا معتوب رہے۔ بہتر یہ ہو گا کہ اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھا جائے' تم خود رافع سے مل کر پتہ لگانا کہ زنداں میں اسے کوئی تکلیف یا شکایت تو نہیں لیکن تمہاری اور رافع کی گفتگو کا کسی کو علم نہ ہو' تم کو اس سے ملتے وقت تنہا ہونا چاہیے۔

پھر ادھر تو ہرثمہ سمرقند سے روانہ ہوا۔ ادھر داؤد نے قید خانے جا کر رافع سے ملنا ضروری سمجھا۔ داؤد کو ہرثمہ اور رافع کی دوستی کا علم بھی تھا اس نے اسی لئے کسی قسم کی تاخیر یا بے پروائی سے کام نہیں لیا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ رافع خود اس کا منتظر ہے۔

رافع کو قید خانے کے اندر ایک کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا۔ ہرثمہ کی ہدایت کے مطابق

داؤد تن تنہا اس کوٹھڑی تک گیا اور اس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا پھر جیسے ہی وہ رافع کے قریب پہنچا' اچانک قطعی خلاف توقع رافع نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے نہایت تیزی سے داؤد کی کمر کے گرد بندھی پٹی سے خنجر کھینچ لیا' پیچھے سے خنجر داؤد کی گردن پر رکھ کر رافع نے اسے کوٹھڑی سے نکلنے کا حکم دیا۔ اچانک حملے کی بنا پر داؤد کے حواس بجا نہ رہے اور وہ آسانی سے یرغمال بن گیا۔ رافع نے اس کی تلوار بھی نیام سے کھینچ کر اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ زندان کے محافظ بے بسی سے دیکھتے رہ گئے اور داؤد کو یرغمال بنا کر رافع وہاں سے نکل آیا۔

شام ہو چلی تھی' قید خانے کے باہر رافع کا بھائی بشیر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھا۔ طویل عرصے تک رافع سمرقند کا عامل رہ چکا تھا وہاں کے سرکاری افسران پر اس کا اثر تھا۔ بشیر پہلے ہی راہ ہموار کر چکا تھا' نتیجہ یہ کہ قید خانے سے نکلتے ہی رافع نے داؤد کے گلے پر خنجر پھیر دیا۔ پھر اسی رات قلعہ سمرقند پر رافع کا قبضہ ہو گیا۔

خلیفہ ہارون بھی ہرثمہ اور رافع کے قریبی تعلقات سے آگاہ تھا۔ اس نے یہی اندازہ لگایا کہ ہرثمہ نے خود رافع کو فرار اور سمرقند پر قبضے کا موقع دیا ہے۔ ابتدائی تفتیش سے بھی کچھ ایسی ہی صورتحال سامنے آئی کہ ہرثمہ نے کوئی سازش کی ہے۔ خلیفہ نے اسی کے پیش نظر ہرثمہ کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔

کئی واقعات ایک ساتھ رونما ہوئے۔ ایک طرف تو ہرثمہ کے خلاف تفتیش ہو رہی تھی' دوسری جانب علی بن عیسیٰ نے یہ خبر پا کر کہ رافع نے بغاوت کر دی ہے اور سمرقند پر قابض ہو گیا ہے' اپنے بیٹے کو فوج دے کر رافع سے جنگ کی خاطر روانہ کیا۔ رافع نے اسے شکست فاش دی۔ وہ فرار ہونا چاہتا تھا مگر اسے یہ موقع بھی نہ ملا اور مار ڈالا گیا۔

علی بن عیسیٰ کو جب یہ خبر ملی تو پریشان ہو گیا' اپنے جوان بیٹے کی موت کا بھی اسے صدمہ تھا۔ اس کے باوجود وہ رافع سے جنگ کیلئے لشکر کی آراستگی اور سامان جنگ کی درستی میں مصروف ہو گیا۔ اس خیال سے کہیں رافع مرو پر قبضہ نہ کر لے' وہ بلخ سے مرو چلا آیا۔

خلیفہ وقت کو اطلاع دیئے بغیر علی بن عیسیٰ نے خود اپنی صوابدید پر حالت پریشانی میں یہ قدم اٹھایا۔ خلیفہ کے علم و اطلاع اور اجازت کے بغیر یہ اقدام بہرحال نافرمانی پر محمول کیا گیا۔ اسی کے نتیجے میں علی بن عیسیٰ کو معزول کر دیا گیا۔

دوسری جانب ہرثمہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اسے جب اپنی گرفتاری کے احکام کا علم ہوا تو فوراً خلیفہ سے معافی مانگ لی۔

خلیفہ ہارون نے ہرثمہ کو معاف کر دیا مگر اس شرط پر کہ وہ تاخیر کے بغیر سمرقند پر حملہ کر

دے' اسی صورت میں اسے خلیفہ کا وفادار سمجھا جائے گا۔ ہرثمہ کے پاس اپنی جان بچانے کا یہ بہت اچھا موقع تھا۔ اس نے فوراً خلیفہ کی شرط قبول کر لی' ویسے بھی اس کے دوست رافع نے دوستی نہیں نبھائی تھی۔ رافع نے تجاوز کیا تھا ورنہ ہرثمہ کا منصوبہ اس کی رہائی تک محدود تھا۔ اس منصوبے میں نہ تو ہرثمہ کے نائب داؤد کو قتل کرنا شامل تھا نہ حکومت وقت سے بغاوت کر کے سمرقند پر قابض ہونا تھا۔ بلاشبہ ہرثمہ کے اعتماد کو رافع نے غیر ضروری و غیر ذمہ دارانہ اقدامات کر کے ٹھیس پہنچائی تھی' وہ اسی لیے دل شکستہ تھا۔

رافع کے ہمراہ نامور فوجی سردار تھے مگر انہوں نے جب ہرثمہ کو مقابل دیکھا تو ان میں سے اکثر اسے چھوڑ کر ہرثمہ سے جا ملے۔ ہرثمہ نے رافع کا سمرقند میں محاصرہ کر لیا اور نہایت سختی سے ایک مدت دراز تک محاصرہ کیے رہا۔ اسی اثنا میں ہرثمہ نے طاہر بن حسین کو خراسان سے طلب کر لیا۔ ایک دوست دوسرے دوست کے مقابل آ گیا۔

سمرقند میں رافع کے محاصرے کا ابھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا کہ حمزہ خارجی نے اطراف خراسان کو شاہی لشکر سے خالی پا کر رافع کی شہ پر سر اٹھایا۔ ہرات و سجستان کے عمال سے بھی رافع کے دوستانہ مراسم تھے' انہوں نے بھی نمک حرامی پر کمر باندھ لی۔ ان عمال نے رافع کے ایما پر بہت سامان حمزہ خارجی کو بھیج دیا۔

یہ خبریں ہرثمہ کو بھی ملیں اور اس نے رافع پر دباؤ بڑھا دیا' دونوں دوستوں کے مابین لڑائی میں فتح و کامیابی ہرثمہ کو حاصل ہوئی لیکن مختصر سی فوج کے ساتھ رافع جان بچا کر فرار ہو گیا۔ رافع کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ سمرقند سے فرار ہو کر رافع خراسان پہنچ گیا۔ خراسان میں حمزہ خارجی نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے خراسان رافع کے حوالے کر دیا اور خود اس کا نائب بن گیا۔ اسی بغاوت کو ختم کرنے اور رافع کی سرکوبی کیلئے خلیفہ ہارون خراسان جانے کا قصد رکھتا تھا۔ اگر وہ بیمار نہ پڑ گیا ہوتا تو اب تک اپنے ارادے پر عمل کر چکا ہوتا۔

یہی وہ حالات تھے جب میں عارج کو ساتھ لئے بغداد پہنچی اور ایک بار پھر قصر خلافت میں داخل ہوئی۔ ہم نے اسحاق اور کلثوم کے انسانی قالبوں پر قبضہ کر لیا تھا اور خلیفہ ہارون الرشید کے خدمت گاروں میں شامل ہو گئے تھے۔

ابھی ہمیں قصر خلافت میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ صبح ہی صبح غیر معمولی ہلچل دکھائی دی۔

میں نے ہارون الرشید کے طبیب خاص جبرئیل بخت یشوع کو تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے قصر کے اس حلقے کی طرف جاتے دیکھا جو خلیفہ کیلئے مخصوص تھا۔ میرا اور عارج کا شمار

کیونکہ ہارون کے خاص خدمت گاروں میں ہوتا تھا اس لئے مخصوص حصے میں جانے پر ہمارے لئے کوئی پابندی نہیں تھی۔ مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ ہارون کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ ہارون کا عیسائی طبیب خاص جبرئیل مجھے اس لئے کچھ گھبرایا ہوا لگا تھا۔

"اے دینار! چل کر دیکھتے ہیں کہ کیا معاملہ ہے؟" عارج دھیمی آواز سے مجھ سے مخاطب ہوا۔

اسی وقت خلیفہ کے مخصوص حصے کی طرف سے ایک کنیز سلمہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں اسے آواز دے کر روک لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھ کر میں چونک اٹھی اور پوچھا۔ "کیا ہوا اے سلمہ! تمہاری آنکھوں میں آنسو؟"

چند لمحے سلمہ میری بات کا جواب نہ دے سکی۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ "کنیز ہیلانہ کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"تو وہ...... وہ طبیب خاص......"

"تت...... تم شاید کچھ غلط...... غلط سمجھ رہی ہو کلثوم!" سلمہ رک رک کر بولی۔ "طبیب خاص وہاں ہیلانہ کے مرنے کی تصدیق کرنے نہیں گئے' وہ تو امیر المومنین کو دیکھنے گئے ہیں جن کی طبیعت ہیلانہ کے انتقال کی خبر سن کر بگڑ گئی ہے۔"

میں نے یہ سن کر ٹھنڈا سانس بھرا' مجھے یہ تو معلوم تھا کہ ہارون حسن پرست واقع ہوا ہے اور اس کے حرم میں متعدد حسین ترین اور قیمتی کنیزیں ہیں لیکن کسی کنیز سے اس کے اتنے زیادہ لگاؤ کا پتہ نہ تھا۔

سلمہ چلی گئی تو عارج آہستہ آواز میں کہنے لگا۔ "مجھے تو اس آدم زادی کی بات پر یقین نہیں آیا' ہارون تو پہلے ہی سے بیمار ہے' کسی کنیز کے مر جانے سے وہ اپنے دل پر اتنا اثر نہیں لے سکتا ہے۔ یقیناً یہ سلمہ کی خام خیالی ہے۔"

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے اے عارج!" میں تائید میں بولی۔

دو ایک روز میں ہارون کی طبیعت سنبھل گئی مگر میرا اور عارج کا خیال غلط ثابت ہوا۔ ہارون کی طبیعت اچانک بگڑ جانے کی وجہ اس کی چہیتی کنیز ہیلانہ ہی تھی۔ کنیز سے اس کی جذباتی وابستگی کا ثبوت وہ مرثیہ تھا جس نے بہت شہرت پائی۔ خلیفہ ہارون علم و فن کا شیدائی ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی ایک اچھا شاعر تھا۔ مجھے ہارون کے اس دردانگیز مرثیے کے کچھ اشعار اب بھی یاد ہیں۔

"جب ہیلانہ کو موت آئی تو مجھے بڑا درد اور رنج ہوا' وہ مجھ سے جدا ہو گئی تو میرا عیش جاتا رہا' میں جیسا تھا ویسا نہ رہا۔ دنیا میں بہت سے انسان ہیں مگر تیری موت کے بعد میں نے تجھ سا کوئی نہیں دیکھا۔ واللہ! میں تجھے اس وقت تک نہیں بھولوں گا جب تک ہوا ٹہنیوں کو حرکت دیتی رہے گی۔"

ہارون کو برسوں پہلے میں نے اس وقت جوانی میں دیکھا جب وہ ولی عہد تھا لیکن اب وہ بہت بدل گیا تھا۔ مجھے اس کی شخصیت مختلف تضادات کا پیکر محسوس ہوئی۔ اسی ضمن میں مجھے ہارون کا ایک اور واقعہ یاد ہے۔ ایک مرتبہ وہ اپنی ایک محبوب کنیز سے کسی بات پر ناراض ہو گیا۔ اس خوبصورت کنیز کو ہارون نے ایک لاکھ درہم میں خریدا تھا۔ ناراضگی کے سبب ہارون نے اس کنیز کو اپنی خلوت میں حاضر ہونے سے روک دیا لیکن اسی کے فراق میں اشعار بھی لکھے۔ ہارون کی ایسی ہی حرکتوں سے کبھی کبھی مجھے یوں لگتا جیسے وہ خود اپنے ہی زخموں کو کرید کے لذت محسوس کرتا ہو۔

ایک طرف اس کے حرم میں حسین ترین کنیزیں تھیں اور وہ عیش و نشاط کا دلدادہ تھا۔ اپنے بڑے بھائی ہادی کی طرح اسے بھی نشے کا چسکا لگ چکا تھا جس نے اس کی صحت تباہ کر دی تھی۔ ابھی وہ 44 برس کا تھا کہ بوڑھا دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ نشے سے بھی لطف اندوز ہوتا اور نشہ حسن بھی اسے سرشار رکھتا۔

دوسری جانب ہارون کی شخصیت کا ایک اور بھی رخ تھا۔ اس کے دربار میں قاضی ابو یوسف جیسے عالم' فضل بن عیاض اور ابن سماک جیسے عابد و زاہد اور سفیان ثوری جیسے محدث شامل تھے۔

یہ میرے ہی سامنے کا واقعہ ہے کہ ہارون نے ایک نابینا عالم ابو معاویہ ضریر کو دعوت دی' میں ایک برتن لے کر اس کے ہاتھ دھلانے کو آگے بڑھی تو ہارون نے اشارے سے مجھے روک دیا۔ پھر اس نے سلفچی میرے ہاتھ سے لے لی اور خود ابو معاویہ کے ہاتھ دھلائے۔ جب وہ ہاتھ دھو چکے تو ہارون نے ان سے پوچھا۔ "آپ کے ہاتھ کس نے دھلوائے ہیں؟"

"مجھے خبر نہیں۔" ابو معاویہ نے جواب دیا۔

"محض تعظیم علم کیلئے میں نے خود آپ کے ہاتھ دھلائے ہیں۔" ہارون نے بتایا۔

یہ حقیقت ہے کہ ہارون نے علم و فن کی بڑی پذیرائی کی۔ اس نے اپنے دور حکومت میں تالیف و ترجمے کا ایک باقاعدہ محکمہ بیت الحکمت کے نام سے قائم کیا اور تراجم کا جو کام خلیفہ منصور کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا اسے منظم کیا۔ اسی کے عہد میں یونانی' ایرانی اور

سنسکرت کی کتابوں کے تراجم کرنے کی غرض سے مترجمین کو معقول تنخواہوں پر مقرر کیا گیا جن علوم کی اشاعت پر ہارون کے عہد میں خاص طور پر توجہ دی گئی وہ طب' نجوم' ہیئت' موسیقی' تاریخ' شاعری اور ادب تھے۔

میں نے ہارون کو ابن سماک کی بڑی عزت کرتے دیکھا۔ وہ اکثر ابن سماک سے نصیحت کرنے کی فرمائش کا خواہاں رہتا تھا۔ ایک مرتبہ ابن سماک نے سلطنت و دولت کو بے ثبات قرار دیا۔ پھر خلیفہ کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں امیرالمومنین کے چہرے پر سوال پڑھ رہا ہوں۔''

اسی دوران میں ہارون کو پیاس لگی اور وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''پانی لاؤ!''

میں تعمیل حکم میں پانی لے آئی اور منقش کٹورا ہارون کی خدمت میں پیش کر دیا۔

ہارون پانی پینا چاہتا تھا کہ ابن سماک نے کہا۔ ''ذرا ٹھہریے! اگر آپ کو شدت کی پیاس لگی ہو اور کہیں پانی نہ ملے تو آپ صرف ایک پیالہ پانی کتنے میں خرید سکتے ہیں' میری مراد زیادہ سے زیادہ قیمت سے ہے۔''

''نصف سلطنت میں۔'' ہارون نے جواب دیا۔

ابن سماک نے کہا۔ ''اچھا اب آپ پانی پی لیجئے۔'' جب ہارون نے پانی پی لیا تو ابن سماک نے پھر پوچھا۔ ''یہ پانی جو آپ نے پیا ہے' پیٹ ہی میں رہ جائے تو اس کے اخراج کی غرض سے کیا خرچ کر سکتے ہیں؟''

ہارون بلاتردد بولا۔ ''اپنی پوری سلطنت!''

ابن سماک نے تب کہا۔ ''بس ثابت یہ ہوا کہ سلطنت و دولت کی کوئی حیثیت نہیں' ایک پیالہ پانی کے برابر بھی نہیں۔ ایک ذہین و فہیم شخص کیلئے اس طرف رغبت کرنا محض حماقت ہے۔''

اس وقت میں نے ہارون کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔ لازماً اس کا دل بہت گداز تھا مگر اسی کے ساتھ اتنا سخت بھی کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس کی سخت گیری کے یوں تو متعدد واقعات ہیں لیکن میری آنکھوں دیکھا ایک ایسا واقعہ ہے جسے پڑھ کر یقیناً آدم زادوں کے دل دہل جائیں گے۔ یہ واقعہ ہارون کی وفات سے چند روز پہلے کا ہے' جب وہ شدید علیل تھا' اس کا ذکر آگے آئے گا۔

میں نے عارج کے ساتھ کس لئے آدم زادوں کے درمیان سکونت اختیار کی ہے اور اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا' دوبارہ قصر خلافت میں سکونت اختیار کرنے

کے بعد ابھی خدمت خلق کی غرض سے میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکی تھی۔ میں نے ایک شب اس بات کا ذکر عارج سے کیا تو وہ بھی کہنے لگا۔ ''اے دینار! تیرا یہ سوچنا غلط نہیں' ہمیں آدم زادوں خصوصاً مظلوموں کی فلاح و بہبود کیلئے کچھ کرنا چاہیے۔''

''مگر کیا؟ یہ بھی تو بتا اے عارج!'' میں نے سوال کیا۔

عارج سوچ میں ڈوب گیا اور خود میں بھی یہی سوچنے لگی۔

معاً میں نے عارج کو مخاطب کیا۔ ''عمال حکومت اور سرکاری افسران کا رعایا کے ساتھ برتاؤ کیا' تیرے خیال میں منصفانہ ہے؟''

''نہیں'' عارج نے جواب دیا۔ ''مگر ہم ان تمام کے اس برتاؤ کو کس طرح بدل سکتے ہیں؟''

''یہ سوچنے کی بات ہے کہ اس سلسلے میں کیا قدم اٹھایا جائے۔''

میں نے کہا۔ ''فی الحال تو ہم رعایا کو درپیش مسائل پر غور کر رہے ہیں۔ اگر اس معاملے کی تہ تک پہنچا جائے کہ عوام کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کا سبب کیا ہے تو اصل بات سامنے آ جائے گی۔''

''وہ کیا اے دینار؟'' عارج نے دریافت کیا۔

''یہ کہ ناانصافی کے پیچھے عمال و افسران کی ناجائز آمدنی ہے۔ اس ناجائز آمدنی کو روک دیا جائے تو ناانصافی کا بڑی حد تک خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ناجائز آمدنی روکنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ جو عمال و افسران مقرر کیے جائیں وہ امین' دیانتدار اور معتبر ہوں اور رعایا پر ظلم و تشدد نہ کریں تو میری بات سمجھ رہا ہے اے عارج!''

''ہاں سمجھ رہا ہوں اے دینار!'' عارج نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''لیکن تو ایک بات بھول رہی ہے کہ مسلمانوں کی یہ سلطنت کس قدر وسیع و عریض ہے۔ خلیفہ کو اپنے عمال و افسران کی کارکردگی کا پتہ کس طرح چلے گا؟''

فوری طور پر مجھے عارج کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں سوجھا مگر جلد ہی ایک راہ نظر آ گئی۔ میں بولی۔ ''اس کیلئے خبر رسانی کے محکمے کو بہتر بنایا جا سکتا ہے تاکہ خلیفہ کو صحیح خبریں ملتی رہیں۔''

''بات پھر وہیں آ جاتی ہے اے دینار! کہ ہم آدم زادوں کی فلاح کیلئے جو کچھ سوچ رہے ہیں اس پر عملدرآمد کیسے ہو؟''

''اس کیلئے پہلے ضرورت تو خلیفہ ہارون کو یہ احساس دلانے کی ہے کہ رعایا کے ساتھ

انصاف نہیں ہو رہا اور اس کے ذمے دار عمال و افسران ہیں جو ناجائز آمدنی کیلئے ایسا کر رہے ہیں۔" میں نے بتایا۔

پھر میرے اور عارج کے درمیان مزید کچھ دیر تک اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ ہم نے اس ضمن میں کچھ باتیں طے کیں اور پھر سو گئے۔

اگلے ہی روز مجھے ہارون الرشید کے ذہن پر اثر انداز ہونے کا موقع مل گیا' میں نے اس کے ذہن میں ساری باتیں اس طرح بٹھائی تھیں جیسے خود یہ سب اس کے دماغ میں آیا ہو۔

"اس کیلئے تحریری اصول وضوابط ضروری ہیں تاکہ ان کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔" ہارون سوچنے لگا۔ "اگر کوئی خلاف ورزی کرے تو اسے ضوابط کے مطابق گرفت میں لیا جا سکے لیکن یہ کام کون کرے؟ میری طبیعت ٹھیک ہوتی تو میں خود یہ اہم کام انجام دے سکتا تھا۔"

عین اسی لمحے میرے ذہن میں ایک نام آیا اور میں نے ہارون کے دماغ میں سرگوشی کی۔ "قاضی ابو یوسف سے بھی تو یہ کام لینا ممکن ہے۔"

"ہاں یقیناً' یہ انتہائی مناسب رہے گا۔" ہارون بے خیالی میں بڑبڑایا اور پھر اسی وقت قاضی ابو یوسف کو طلب کر لیا۔

قاضی ابو یوسف نے اس پر بے حد خوشی کا اظہار کیا اور کہا۔ "امیر المومنین کو اللہ تعالیٰ اس کی جزا دے گا' میں ہر ممکن طور پر جلد از جلد اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ انشاء اللہ!"

☆.....☆.....☆

پھر وہی ہوا جو قاضی ابو یوسف نے کہا تھا۔ اس نیک آدم زاد نے شب و روز ایک کر دیئے' نتیجہ یہ نکلا کہ اس قدر بڑا اور اہم کام صرف ایک مہینے کی مختصر مدت میں ہو گیا۔ رعایا کی فلاح کیلئے جو تجاویز میں نے سوچی تھیں وہ بھی قاضی کے ذہن میں ڈال دیا۔

اصلاحات مفید پر مبنی ایک کتاب کا نام "الخراج" رکھا گیا۔ اس کتاب کے آغاز میں قاضی نے لکھا۔ "امیر المومنین نے رعایا سے ظلم کے ازالے اور اس کی فلاح و بہبود کیلئے خراج' عشور' صدقات اور جزیے پر ایک جامع کتاب لکھنے کا حکم دیا۔ اسی حکم کی تعمیل میں یہ کتاب لکھی گئی۔"

قاضی ابو یوسف نے اپنی اس کتاب میں ہارون الرشید کو مشورہ دیا کہ محکمہ خراج میں جو عمال مقرر کیے جائیں وہ دیانت دار ہوں اور ان میں خوف خدا ہو اور وہ رعایا پر ظلم و تشدد نہ

کریں۔ خبر رسانی کے محکمے سے متعلق میری تجویز بھی اس کتاب میں موجود تھی۔ میں نے اپنی دانست میں آدم زادوں کیلئے ایک ایسا کام کیا جو ثواب جاریہ کے ضمن میں آتا تھا۔ ہارون نے بظاہر قاضی ابو یوسف کے مشوروں پر ہی عمل کیا تھا' اسے کیا خبر تھی کہ ان مشوروں کے پیچھے ایک جن زادی کا ہاتھ ہے۔ غالباً آدم زاد اپنے لئے ہم جنات سے کسی خیر کی توقع نہیں رکھتے۔ آدم زادوں کی طرح نمود و نمائش کا شوق ہم جنات میں عموماً نہیں ہوتا۔ سو اگر میں نے آدم زادوں کیلئے کار خیر کیا تو مجھے نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پروا بہر حال آئندہ وقت نے ثابت کر دیا کہ پہلے رعایا کے ساتھ جو ناانصافیاں روا تھیں' ختم ہو گئیں۔ مسلمانوں کی اس عظیم الشان سلطنت میں عدل و انصاف قائم ہو گیا۔ ہارون نے خراج کی وصولی میں سختی کو ختم کر دیا اور ظالم عمال کو سزائیں دیں۔

اپنے کئی اہم عاملوں کو ہارون نے ظلم و تشدد کی بنا پر معزول کیا۔ ہارون نے اپنے ایک عامل کو جو خط لکھا تھا اور جو میری نظر سے بھی گزرا اس سے ہارون کی رعایا پروری کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس جانب ہارون کے ذہن کو میں نے ہی متوجہ کیا تھا جو خط میں نے پڑھا' اس کا ایک اقتباس یہ ہے۔ ہارون نے اپنے عامل (گورنر) کو لکھا تھا۔ "میں نے تجھے عزت اور شہرت دی مگر تو نے میرے اس احسان کا یہ بدلہ لیا کہ میرے حکم اور صریح ہدایات کی خلاف ورزی کر کے تو نے اپنے علاقے میں ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ میری رعایا پر تو نے ظلم کیا' اپنے طرز عمل کی خرابی' بے جا حرص نیز کھلی ہوئی خیانت مجرمانہ سے اللہ اور اس کے خلیفہ کو تو نے ناراض کیا۔ میں نے اب تیری جگہ جو عامل مقرر کیا ہے اسے حکم دیا ہے کہ وہ تجھ سے' تیری اولاد سے' تیرے اہل کاروں اور عہدیداروں سے نہایت سخت مواخذہ کرے جس مسلمان یا ذمی کا کوئی مطالبہ تیرے ذمے واجب الادا ہو وہ تجھ سے پورا کرائے۔"

ہارون الرشید کی شخصیت کا مثبت رخ تو یہ تھا جو ابھی میں نے بیان کیا اور مزید بیان آئندہ آئے گا مگر منفی رخ یہ تھا کہ وہ کوشش کے باوجود نشہ مے اور نشہ حسن سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عیش و عشرت' کثرت مے نوشی اور جنگی مہمات نے ہارون کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔

یہ بات شاید میں پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ ہارون کی شخصیت میں عجیب و غریب تضاد تھا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ اس نے نو مرتبہ حج کیا اور متعدد بار معرکہ جہاد میں شریک ہوا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی زندگی رنگینیوں سے بھی بھری ہوئی تھی۔ اس کی کثرت مے نوشی کے قصے عام تھے۔ اس کا حرم کافی وسیع تھا اور وہ خوبصورت کنیزوں کا بڑا قدر دان تھا۔ ایک

طرف اگر وہ رحم دل' فیاض اور فراخ دل تھا تو دوسری طرف ظلم کرنے اور انتقام لینے کا بھی عادی تھا۔ برامکہ کے ساتھ اس کا برتاؤ اس کی متضاد طبیعت کو نمایاں طور پر ظاہر کرتا ہے جس کا بیان میری سرگزشت میں پہلے آ چکا ہے۔

چند ماہ بغداد میں آرام کرنے اور مسلسل علاج و قدرے پرہیز سے ہارون کی طبیعت پہلے کی نسبت خاصی سنبھل گئی تھی۔ اس کے آئندہ عزائم سے اب تک میرے سوا کوئی واقف نہ تھا لیکن جب اس نے سامان جنگ اور سفر کیلئے انتظامات کا حکم دیا تو بغداد میں کھلبلی مچ گئی۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ اس حکم کی وجہ کیا ہے اور ہارون کدھر کا قصد رکھتا ہے۔

خلیفہ منصور کے آزاد کردہ غلام ربیع کا بیٹا فضل خلیفہ کے بہت قریب تھا۔ اس نے ایک روز ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔ "اے امیر المومنین! اگر مناسب خیال فرمائیں تو اپنے جانثاروں کو آگاہ فرما دیں' سامان جنگ و سفر درست کرنے کے حکم سے حضور کی کیا مراد ہے۔"

اس پر ہارون مسکرایا اور بولا۔ "اے ربیع کے بیٹے! کیا تجھے نہیں معلوم کہ خراسان میں بغاوت ہو چکی ہے۔ ایسے میں کیا ہم پر لازم نہیں کہ باغی و سرکش رافع بن لیث کو اس کے کیے کی سزا دیں۔"

"آپ نے بالکل بجا فرمایا اے امیر المومنین!" فضل بن ربیع نے کہا۔ "یقیناً رافع کی سرکوبی ضروری ہے۔"

اس دن کے بعد سے سبھی اہل دربار کو حقیقت کا علم ہو گیا۔ طبیب خاص کے کانوں تک بھی یہ خبر ہو گئی تو وہ فکر مند ہو گیا۔ وہ خلیفہ سے ملا اور عرض کیا۔ "اے امیر المومنین! ابھی مزید کچھ عرصے آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

"جبرئیل! ہم نے بہت آرام کر لیا' اب ہمیں سلطنت کے کام کرنے دو۔ ہم ضرورتاً ہی سفر کر رہے ہیں۔" ہارون کہنے لگا۔ "پھر یہ کہ تم بھی اس سے واقف ہو کہ بغداد کی آب و ہوا ہمیں زیادہ راس نہیں۔ ہم اسی لئے عموماً بغداد کے بجائے اب تک بیماری کے دوران میں یہاں سے دور رہے ہیں۔ ہم نے رقہ میں رہنا پسند کیا ممکن ہے تبدیلی آب و ہوا سے ہماری طبیعت مزید بہتر ہو جائے۔"

عیسائی طبیب خاص نے پھر زیادہ بحث نہیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہارون اس کی بات نہیں مانے گا۔

خادموں کی حیثیت سے مجھے اور عارج کو بھی ہارون کے ساتھ جانے کا حکم مل چکا تھا۔ اس سے قبل عارج اور میں خلیفہ مہدی اور ہارون کے بڑے بھائی خلیفہ ہادی کے ساتھ بھی سفر

کر چکے تھے۔ کسی خلیفہ کے ساتھ سفر کرنے کا ہمارے لئے یہ تیسرا موقع تھا۔

"دیکھ اے دینارا! اس بار کیا گزرتی ہے۔" عارج نے روانگی سے چند روز پہلے ایک رات مجھ سے کہا۔

"خیر جو گزرے گی' وہ تو گزر ہی جائے گی لیکن میں تجھ سے ایک اور بات کہنا چاہتی ہوں اے عارج!"

"ہاں بول!" عارج بولا۔ وہ قریب ہی دوسرے بستر پر لیٹا تھا۔ اس نے میری طرف کروٹ لے لی۔

"تو سن! اہل دربار' عمال اور اراکین سلطنت میرے خیال میں واضح طور پر دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں اے دینارا! تیرا مقصد دو گروہوں سے کیا ہے اور وہ دو گروہ کون ہیں؟"

"تو اگر اپنے انسانی قالب کی آنکھیں اور کان کھلے رکھتا تو یقیناً تجھے مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش نہ آتی اے عارج!"

"تیری آنکھیں اور کان تو کھلے رہتے ہیں!.....تو ہی کچھ بتا دے۔" عارج کی آواز میں چبھن تھی۔

"اگر تو اس لہجے میں بات کرے گا تو میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔" میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

"ڈرا کیوں رہی ہوں' تو جیسے کہے گی بولوں گا۔" عارج ہنس پڑا۔ "آخر ایک روز تجھ سے اپنا نکاح بھی تو پڑھوانا ہے۔"

"تو اس لالچ میں فرمانبردار بن رہا ہے۔" مجھے بھی ہنسی آ گئی۔

"اچھا! اب اصل بات بتائے گی کہ ہنستی ہی رہے گی!.....تو کن دو گروہوں کی بات کر رہی تھی؟" عارج نے معلوم کیا۔

مجھے سنجیدہ ہونا پڑا اور پھر میں نے اس کی بات کا جواب دیا۔

"عربی اور عجمی گروہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہارون نے جن پہلے دو ولی عہدوں کا اعلان کیا ہے اور ان کیلئے بیعت لی ہے ان میں سے ایک کی ماں زبیدہ عربی اور دوسرے کی ماں عجمی یعنی ایرانی النسل ہے۔ اس کے علاوہ اس معاملے میں ایک اور بھی پیچیدگی ہے۔"

عارج ٹھنڈا سانس بھر کے بولا۔ "چل وہ بھی بتا دے۔"

''لگتا ہے تو میری بات میں دلچسپی نہیں لے رہا اے عارج!''

''اگر دلچسپی نہیں لوں گا تو پھر تو میری بیوی......''

''فضول بات نہیں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تو پھر تو کام کی بات کر' میں نے کب روکا ہے تجھے۔''

میرے سخت سست کہنے پر عارج پھر راہ پر آ گیا تو میں نے کہا۔ ''ہارون نے اپنی دانست میں ولی عہدی کے مسئلے کو حل کر دیا ہے' یعنی پہلے امین خلیفہ بنے گا' پھر مامون' اس کے بعد موتمن مگر لگتا ہے کہ تاریخ شاید پھر ایک بار خود کو دہرانے والی ہے۔''

''وہ کیسے؟'' عارج نے مجھ سے وضاحت چاہی۔

''تجھے یاد ہو گا کہ خلیفہ مہدی نے پہلے اپنے بڑے بیٹے ہادی ہی کو ولی عہد نامزد کیا تھا مگر بعد میں اس کی رائے بدل گئی تھی۔ وہ ہارون کو اپنے بعد خلافت کا حقدار تصور کرتا تھا۔ اپنی عمر کے آخری حصے میں اس یہ کوشش کی بھی تھی مگر اسے زہر دے کر مار ڈالا گیا تو اور میں ہم دونوں ہی ہارون کے حق میں تھے اس لئے کہ وہ ہادی سے زیادہ لائق اور ذہین تھا۔''

''ہاں یہ سب کچھ یاد ہے مجھے۔'' عارج بولا۔ ''تو آگے کہہ۔''

''کہنا یہ ہے کہ مامون اور امین میں سے تجھے زیادہ لائق کون لگتا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ویسے تو مامون لائق ہے مگر کیونکہ نسلاً میں بھی عرب ہوں اس لئے بوجوہ امین کے حق میں رائے دوں گا۔''

''اس کی وجہ بیان کر۔''

''ایک وجہ تو خود ہی تجھے سمجھ لینی چاہیے کہ امین اپنی ماں اور باپ دونوں کی طرف سے عرب ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ زبیدہ خلیفہ کی بیوی ہے جبکہ مراجل' یعنی مامون کی ماں مر چکی ہے' ایک ایرانی کنیز تھی۔ گویا مامون ایک کنیز زادہ ہے۔ شرفائے بن عباس اسی بنا پر امین کے حق میں ہیں۔ اے دینار! تو نے دو گروہوں کی بالکل درست نشاندہی کی ہے۔'' عارج نے تفصیل سے میری بات کا جواب دیا۔

''لیکن میرے خیال میں یہ سب اچھا نہیں ہو رہا۔ یہ گروہ بندی مستقبل میں سلطنت بنو عباس کیلئے نہ سہی تو امین و مامون کیلئے انتہائی خطرناک ثابت ہو گی۔'' میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''ہمارے چاہنے نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہو گا اے دینار!'' عارج بولا۔ ''ہو گا وہی جو

رب چاہے گا اس لئے یہ غم چھوڑ اور لمبی تان کر سو۔''

''تجھے شاید نیند آ رہی ہے' اچھا شب بخیر! انشاء اللہ کل صبح ملاقات ہو گی۔'' میں نے یہ کہہ کر چادر چہرے پر ڈال لی۔

یہ واقعہ دوسرے ہی دن کا ہے کہ ہارون نے اپنے چھوٹے بیٹے مامون کو بڑے سوتیلے بیٹے امین کے ساتھ بغداد ہی میں رہنے کا حکم صادر کیا۔ میرے نزدیک مامون کا امین کے ساتھ بغداد میں رہنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے یہ بات مامون کے ایک بہی خواہ سردار فضل بن عباس کے دماغ میں ڈال دیا۔ فضل نے مامون کو خطرے کا احساس دلایا۔ مامون بھی خطرہ بھانپ گیا اور فضل کی بات مان لی۔ پھر اس نے خلیفہ ہارون سے درخواست کی کہ اسے بھی اپنے ساتھ خراسان لے جائے۔

ہارون نے مامون کی درخواست قبول کر لی۔ یوں بھی وہ اپنے اس نوجوان بیٹے کو زیادہ چاہتا تھا جس کا سبب بچپن ہی سے اس کی ذہانت و لیاقت تھی۔ امین کو اپنا ولی عہد مقرر کرنے کی غلطی کا اسے پورا احساس تھا۔ دراصل امین کی ولی عہدی کا اعلان اسی وقت ہو گیا جب اس کی عمر صرف پانچ سال تھی۔

امین کیونکہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے خاندان بنو عباس سے تعلق رکھتا تھا اس لئے برسر اقتدار خاندان کے تمام ہی با اثر افراد یہ چاہتے تھے کہ ہارون اسے اپنا ولی عہد نامزد کرے۔ زبیدہ اور اس کے بھائی عیسیٰ بن جعفر نے اس معاملے میں فضل بن یحییٰ برمکی کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ یوں بھی فضل برمکی ہی امین کا اتالیق تھا۔ اس کے علاوہ دربار خلافت میں بھی فضل برمکی کا اثر بڑھ رہا تھا۔ فضل نے 175 ہجری میں خراسان کی مہم کے دوران میں ولی عہدی کے مسئلے پر توجہ کی اور افسران فوج سے مشورے کیے یہ وہ زمانہ تھا جب خاندان برامکہ' بنو عباس پر چھایا ہوا تھا۔ اسی زعم میں فضل برمکی نے خلیفہ ہارون کی اجازت لئے بغیر امین کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا' پھر سرداران فوج سے امین کیلئے بیعت لے لی۔

ہارون کو جب اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو اسے تعجب ہوا لیکن زبیدہ اور دیگر افراد بنو عباس کے دباؤ سے اس نے امین کی ولی عہدی کو قبول کر لیا اور اس کی بیعت کیلئے تمام سلطنت میں احکام نافذ کر دیئے۔ اسی طرح کمسنی میں ہی امین کی ولی عہدی کا اعلان ہو گیا۔

دوسری جانب ایک ایرانی کنیز کا بیٹا ہونے کے باوجود مامون بچپن ہی سے ذہین تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت جعفر برمکی کے سپرد تھی جیسے جیسے مامون بڑا ہوتا گیا اس کی صلاحیتیں ہارون پر ظاہر ہوتی گئیں۔ ہارون کو یقین ہو گیا کہ امین کے مقابلے میں مامون خلافت کیلئے موزوں

رہے گا واقعہ بھی یہی تھا کہ امین کو ولی عہد مقرر کر کے ہارون نے غلطی کی تھی خود اسے بھی یہ احساس تھا۔ وہ اسی لئے اس غلطی کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ بعض امرائے سلطنت بھی امین کی ولی عہدی کے حق میں نہیں تھے۔

جب 180 ہجری میں جعفر برمکی کو عہدہ وزارت پر نامزد کیا گیا تو اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ولی عہدی کے مسئلے کا حل تلاش کیا جائے۔ جعفر برمکی اور دیگر امراء کے مشوروں سے ہارون نے 182 ہجری میں حج سے واپس آنے کے بعد مامون کو امین کے بعد اپنا ولی عہد نامزد کیا اس کیلئے ہارون نے امراء اور فوج کے سرداروں سے بیعت لی۔ مامون کا اصل نام شہزادہ عبداللہ تھا۔ ہارون ہی نے اسے مامون کا لقب دیا تھا۔ اسی کے ساتھ ہارون نے مامون کو خراسان اور اس کے ملحقہ صوبوں کا عامل (گورنر) بنا دیا تھا۔ مامون کی عمر اس وقت بارہ سال تھی۔ 186 ہجری میں ہارون کے بعض درباریوں نے جن میں عبدالملک بن صالح پیش پیش تھا یہ مشورہ دیا کہ ہارون اپنے تیسرے بیٹے قاسم کو بھی اپنا ولی عہد نامزد کر دے۔ ہارون نے یہ مشورہ بھی قبول کر لیا' اس نے قاسم کیلئے بھی بیعت لی اور اس کا لقب موتمن قرار دیا۔

یوں ہارون نے اپنے بعد تین جانشین نامزد کیے جن کی بنا پر لوگوں میں اختلاف رائے ہوا۔ بعضوں کے نزدیک یہ نامزدگیاں استحکام سلطنت کا باعث تھیں جبکہ دیگر لوگوں کا خیال یہ تھا کہ یہ خانہ جنگی کا سبب ہوں گی۔

میرے نزدیک ان نامزدگیوں میں سب سے نازک معاملہ نسلی امتیاز کا تھا۔ عربی اور عجمی کی تفریق کسی بھی وقت فساد کی وجہ بن سکتی تھی پھر مامون کا ایک کنیز کی اولاد ہونا بھی رنگ لا سکتا تھا جبکہ ملکہ زبیدہ ہارون کے چچا کی بیٹی تھی۔ اسے ہارون کی پہلی بیوی ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ ہارون کی چھ بیویاں اور بیس کنیزیں تھیں۔ ان سے ہارون کے بارہ بیٹے اور چودہ بیٹیاں ہوئیں۔ بیٹوں میں چار زیادہ مشہور ہوئے یعنی امین' مامون' موتمن اور معتصم۔

192 ہجری شعبان کی وہ آخری تاریخیں تھیں۔ جب خلیفہ ہارون الرشید نے بغداد سے کوچ کیا' خاص خدمت گاروں کی حیثیت سے عارج اور میں بھی اس کے ساتھ تھے۔

دارالخلافہ بغداد سے خلیفہ ہارون بقصد خراسان روانہ ہو کر ماہ صفر 193 ہجری میں جرجان پہنچا۔ اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ آب و ہوا کی تبدیلی صحت پر بہتر اثرات مرتب کرے گی اس کے برعکس تکلیف دہ سفر کے سبب اس کی علالت کا سلسلہ طول کھینچ گیا۔ اسی وجہ سے اسے جرجان میں رکنا پڑا۔ اس نے خود رک کر مامون کو خراسان کے دارالحکومت مرو روانہ

کر دیا۔ پھر وہ خود بھی جرجان میں نہ رکا اور وہاں سے طوس جا پہنچا۔ اس مرتبہ بھی ہارون نے سفر کے معاملے میں طبیب خاص کے مشورے کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روز بروز اس کی علالت زور پکڑتی گئی اور وہ نقل و حرکت سے بھی مجبور ہو گیا۔ جب ضرورت ہوتی تو عارج اور میں ہارون کو سہارا دے کر بستر سے اٹھاتے' واقعی وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔

ہارون کی نقل و حرکت محدود ہو گئی تو افواہ سازوں نے اس کے مرنے کی افواہ پھیلا دی۔ ہارون کو اس کا بڑا رنج ہوا' وہ ایک روز مجھ سے کہنے لگا۔ ''تو نے کچھ سنا اے کلثوم کہ بدخواہوں نے تیرے امیرالمومنین کو جیتے جی اپنی دانست میں مار ڈالا ہے مگر ہم اپنے عمل سے انہیں جھوٹا ثابت کر دیں گے۔''

''یقیناً اے امیرالمومنین!'' میں نے اسے دلاسا دیا۔ وہ شخص' وہ آدم زاد جو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا مطلق العنان حکمران تھا اور جس کا ہر حکم قانون کا درجہ رکھتا تھا مجھے اس کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ آدمی خواہ ساری دنیا فتح کر لے ہر شے پر قابو پا لے مگر موت کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ ہارون بھی مجھے کچھ ایسی ہی بے بسی کا شکار معلوم ہونے لگا تھا۔

گزشتہ روز شام کو ہارون نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا' میں بھولی نہیں تھی مگر یہ خبر نہ تھی کہ وہ اپنے کس عمل سے افواہ سازوں کو جھوٹا ثابت کرے گا؟ دوسرے دن دوپہر کو مجھے اس سوال کا جواب مل گیا۔

ہارون نے مجھے اور عارج کو طلب کر لیا تھا۔ اس وقت تک مجھے ہارون کے ارادے کا پتہ نہ تھا۔

''ہمیں سہارا دے کر اٹھاؤ اور محل کے بیرونی دروازے تک لے چلو۔'' ہارون نے ہمیں حکم دیا۔ بیماری کے باوجود اس کے چہرے پر عجیب جوش کا اظہار ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں اس کی وجہ نہ آ سکی۔

''بہتر ہے اے امیرالمومنین!'' میں یہ کہتے ہوئے ایک طرف سے جھکی۔

دوسری جانب سے عارج تھا' وہ بھی ہارون کو سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

''ہاں شاباش کلثوم!'' ہارون نے میری حوصلہ افزائی کی اور کہنی پر زور دیا۔

میرے ہاتھوں میں سے ایک ہارون کی گردن میں اور دوسرا ہاتھ پشت پر تھا۔ ہارون کی جگہ مجھے یوں لگا کہ میں ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کو اٹھا رہی ہوں۔ میری اور عارج کی

کوشش سے ہارون بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

اسی وقت وزیر سلطنت فضل بن ربیع آ گیا اور تسلیمات بجالایا۔

ہارون نے ربیع کو مخاطب کیا۔ ''تو نے ہمارے حکم کی تعمیل کرادی؟''

''جی امیر المومنین! کل شب ہی منادی کرادی گئی تھی کہ خلیفۃ المسلمین آج طوس کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کریں گے۔ اس ضمن میں تمام ضروری انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔'' وزیر سلطنت فضل بن ربیع نے جواب دیا۔

فضل کا جواب سن کر میں حیران رہ گئی۔ میرے خیال میں ہارون کی حالت ہرگز اس قابل نہ تھی کہ وہ طوس کے قلعے سے نکل کر شہر کی جامع مسجد تک جا سکتا اور وہاں نماز جمعہ پڑھ سکتا۔ اگر اعلان کے باوجود ہارون نماز پڑھنے کیلئے نہ جا پاتا تو بدخواہوں کو ایک اور موقع مل جاتا۔ میرا ذہن اس وقت بہت تیزی سے کام کر رہا تھا کہ اس مسئلے کا کیا حل ہو؟

''ہمیں اٹھا کے کھڑا کرو!'' ہارون نے مجھے اور عارج کو حکم دیا۔

ہم ہارون کو بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھانے لگے۔

اسی لمحے فضل نے ہمیں بتایا۔ ''میں نے ایسا بندوبست کیا ہے کہ امیر المومنین کو زیادہ نہ چلنا پڑے۔ اس خواب گاہ سے نکل کر بس چھوٹی سی ایک راہداری عبور کرنی ہے۔ راہداری کے اختتام پر امیر المومنین کیلئے سواری موجود ہے اور محافظ دستہ بھی تعینات ہے۔''

تمام تیاریاں اپنی جگہ مگر ہارون کے جسم کی نقاہت و کمزوری دور کرنا کسی کے بس میں نہ تھا۔

ہارون کو ہم نے سہارا دے کے کھڑا کر دیا وہ آہستہ قدمی سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

یہی وہ لمحہ تھا جب اس مسئلے کا ایک حل میری سمجھ میں آ گیا۔ عارج کو اس حل سے آگاہ کرنا ضروری تھا کیونکہ اسی کو اس سلسلے میں بنیادی کردار ادا کرنا تھا اس کیلئے میں نے اشاروں کی زبان استعمال کی۔

''اے عارج! تجھے ہارون کے بیمار جسم میں اترنا ہے۔'' میں نے اشاروں کی زبانی میں عارج کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

''مگر مجھے ہارون کے جسم میں قرار نہ آیا تو!'' عارج نے سوال کیا۔

''تو اللہ مالک ہے' کچھ اور سوچیں گے۔ تجھ سے میں نے جو کہا ہے اس پر عمل کر۔'' میں نے جواب دیا۔

ہارون اپنے جسم کا سارا بوجھ عارج اور مجھ پر ڈالے ہوئے تھا۔ خدا خدا کر کے ہم اسے خواب گاہ سے باہر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ باہر راہداری میں آ کر وہ کہنے لگا۔ ''ذرا...... ذرا رک جاؤ کہ......ہم اپنا سانس درست کرلیں۔''

''جی بہتر ہے اے امیر المومنین!'' اس مرتبہ عارج بولا۔

اب ہمیں چھوٹی سی راہداری عبور کرنی تھی' کچھ دیر رک کر ہم اسے طے کرنے لگے۔

''دیر نہ کر اب اے عارج!'' میں نے اشاروں کی زبان میں عارج کو تاکید کی۔ ''اتر جا ہارون کے جسم میں۔''

عارج میرا اشارہ سمجھتے ہی اسحاق کے قالب سے نکل کر بلا تاخیر ہارون کے جسم میں گھس گیا۔ میں نے اسی لمحے ہارون کے جسم کو ہلکا سا جھٹکا لگتے محسوس کیا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ عارج ہارون کے جسم میں داخل ہوگا تو کیا صورت پیش آئے گی۔ میں بہرحال تشویش میں مبتلا تھی اور میری یہ تشویش غلط ثابت نہ ہوئی۔

ہارون کے بیمار جسم میں عارج کو قرار نہ آ سکا اور وہ گھبرا کر باہر نکل آیا۔

کسی آدم زاد کے جسم میں داخل ہونے اور باہر نکلنے سے جنات پر تو خیر کوئی اثر نہیں ہوتا مگر کمزور یا بیمار آدم زاد کے جسم اسے برداشت نہیں کر پاتے۔ ہارون بھی کمزور اور بیمار تھا سو برداشت نہ کر سکا اس پر بیہوشی طاری ہو گئی اور وہ ہمارے بازوؤں پر جھول گیا' فوری طور پر دیگر خادموں کو بلایا گیا اور ہارون کو اٹھا کر دوبارہ خواب گاہ میں لے آیا گیا۔

طبیب خاص جبرئیل کو اطلاع کی گئی تو وہ دوڑا دوڑا چلا آیا۔ اس نے ہارون کا معائنہ کیا اور اس کی نقل و حرکت پر پابندی لگا دی۔ پھر وہ کچھ ادویات دے گیا جو مقررہ وقت پر ہارون کو کھلائی اور پلائی تھیں۔

اس واقعے کو دو روز ہی گزرے تھے کہ ہارون کی دل بستگی اور خوشی کا سامان طوس پہنچ گیا۔

ہرثمہ بن ایمن اور رافع کے درمیان سمرقند میں جب لڑائی ہوئی تھی تو اس میں بشیر بھی شامل تھا۔ رافع تو جان بچا کر خراسان پہنچ گیا تھا مگر اس کے بھائی بشیر کی کوئی خبر نہ لگی تھی کہ وہ کہاں گیا۔ رافع ہی کی طرح بشیر پر بھی خلیفہ ہارون کے بہت احسانات تھے مگر بھائی کی محبت میں وہ محسن کشی پر آمادہ ہو گیا تھا۔

بشیر کو ہرثمہ کے سپاہیوں نے سمرقند میں ہی ایک نواحی بستی سے گرفتار کیا تھا جہاں وہ بھیس بدل کر رہ رہا تھا۔ داڑھی اس نے منڈا دی تھی وہ اپنے رشتے داروں کی مخبری پر پکڑا گیا

تھا۔

خلیفہ کی نظر میں اپنا درجہ بلند کرنے کی خاطر ہی ہرثمہ نے بشیر کو پابہ زنجیر طوس پہنچایا تھا۔

بشیر کے پکڑے جانے اور طوس آنے کی اطلاع پا کر ہارون کا چہرہ جیسے کھل اٹھا یہ گویا ایک اور ہی چہرہ تھا۔ ایک منتقم آدم زاد کا چہرہ' ہارون نے بشیر کو اپنے روبرو پیش کرنے کا حکم دیا۔

پھر ہارون ہی کے حکم پر میرے دیکھتے دیکھتے وہ خواب گاہ ایک مقتل میں تبدیل کی جانے لگی۔

''اے اسحاق!'' ہارون نے بلند آواز میں عارج کو مخاطب کیا۔ ''نطع (جس پر آدمی کو قتل کیا جاتا ہے) یہاں بچھا۔'' اس نے اپنے بستر کے قریب اشارہ دیا۔ عارج نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ فضل بن ربیع بھی وہیں تھا۔ ہارون اس سے کہنے لگا۔ ''تو دیکھے گا اے ربیع! آج تک کسی کو اس طرح سے قتل نہ کیا گیا ہو گا جس طرح باغی و محسن کش بشیر کو ہمارے حکم پر مارا جائے گا۔ محض دعویٰ نہیں ابھی تو اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لے گا۔''

اسی لمحے زنجیر کھڑکنے کی آواز سنائی دی۔ خواب گاہ کے دروازے سے ہاتھوں میں برہنہ شمشیریں لئے محافظ اندر داخل ہوئے بشیر انہی کے نرغے میں تھا۔

ان محافظوں کو آتے دیکھ کر میں ایک طرف ہو گئی۔ عارج میرے قریب ہی تھا۔ خلیفہ ہارون الرشید کی تمام تر توجہ بشیر پر مرکوز تھی۔ پھر جب اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی اور وہ بولا تو یوں لگا جیسے اسے کوئی بیماری لاحق نہ ہو۔ اس نے بشیر کو مخاطب کیا۔ ''اے بشیر! اے احسان فراموش! اے سگ آوارہ! سن کہ تو نے خود ہمارے غضب کو دعوت دی ہے۔'' ہارون سانس لینے کو رکا۔

بشیر یقیناً سمجھ چکا تھا کہ اس کی موت قریب ہے' ہارون اسے زندہ نہ چھوڑے گا۔ غالباً اس نے ہارون سے رحم کی درخواست کرنی چاہی تھی۔ میں نے اسے منہ کھولتے دیکھا تھا۔ یا تو یہ ہوا کہ خوف مرگ سے اس کا گلا خشک ہو گیا اور آواز نہ نکل سکی یا پھر ہارون کی آواز نے اس کی ہمت پست کر دی بہرصورت وہ کچھ بول نہ سکا۔

ہارون کی صدا کسی تازیانے کی طرح بلند ہوئی۔ ''یقین کر' اگر میری موت کے آنے میں اس قدر بھی وقفہ ہوتا کہ میں اپنے لبوں کو حرکت دے سکوں تو یہی حکم دیتا تجھے مار ڈالا جائے۔''

اس کے بعد ہارون نے کسی جلاد کے بجائے قصاب کو طلب کیا تو میں چونک اٹھی۔

تعمیل حکم میں قصاب کو ہارون کے روبرو پیش کیا گیا۔

''اس کا عضو عضو کاٹ کر علیحدہ کر دے۔'' ہارون نے قصاب کو حکم دیا۔

قصاب بطور تعظیم ہارون کے سامنے جھکا' وہ بھی ڈرا ڈرا سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے ہارون یا وہاں موجود فضل بن ربیع سے تو کچھ نہ کہا البتہ اسے میں نے ایک محافظ سے سرگوشی کرتے سنا۔ وہ بشیر کی زنجیریں کھولنے کیلئے کہہ رہا تھا۔ اس وقت مجھے وہ آدم زاد بشیر قربانی کی غرض سے لایا جانے والا کوئی جانور محسوس ہوا۔ اس کی زنجیریں کھول دی گئیں۔ کسی آدم زاد اور ایک جانور میں اتنا ہی تو فرق ہے کہ ان میں سے ایک بے زبان ہوتا ہے۔ سو بشیر کی زبان کھل ہی گئی' مگر لاحاصل تب تک اس کے گلے پر چھری پھیرنے کیلئے اسے پچھاڑا جا چکا تھا۔

''نہیں!'' ہارون کی تیز آواز خواب گاہ میں گونج اٹھی۔

اس آواز کے ساتھ ہی قصاب اور وہ محافظ جو بشیر کو پکڑے ہوئے تھے ایک دم ساکت ہو گئے۔ قصاب کے ہاتھ میں جو چھری تھی' بشیر سے اس کی گردن کا فاصلہ خاصا کم رہ گیا تھا۔ اگر ہارون اسے روک نہ دیتا تو بشیر کی گردن کٹ چکی ہوتی۔

''یہ آدمی ہے' اسے جانور کی طرح نہ مارو۔'' ہارون نے اپنے حکم کی وضاحت میں مزید کہا۔ ''ہم نے اس کا عضو عضو کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ گردن ہی تو عضو نہیں ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء بھی تو ہیں۔''

با اختیار آدم زاد بے اختیار یا مجبور آدم زادوں کے ساتھ یہی کھیل کھیلتے آئے ہیں۔ میری آنکھوں نے دہشت و بربریت کے جو مناظر اب تک دیکھے تھے' ان میں ایک اور ہولناک منظر کا اضافہ ہو گیا۔ بشیر زندہ رہا اور قصاب اس کے جسم سے گوشت کے پارچے اتارتا رہا۔ اسی حالت میں اس نے دم توڑ دیا' مگر اس سے پہلے قصاب نے ہارون کے اشارے پر بشیر کی گردن کاٹ کر ایک طرف رکھ دی تھی۔

اس واقعے کے بعد حیرت انگیز طور پر ہارون کی طبیعت کچھ سنبھل سی گئی۔ وہ خود زور لگا کر اٹھنے بیٹھنے لگا۔ عارج کو اور مجھے پھر بھی اس کے ساتھ رہنا پڑتا تھا کہ کہیں وہ گر نہ پڑے۔ طبیب خاص جبرئیل کی طرف سے ملاقاتوں پر پابندی کو مسترد کر دیا تھا۔

''تو بھلا کون ہے ہم پر پابندی لگانے والا۔'' ہارون کے یہ الفاظ سن کر جبرئیل سہم سا گیا تھا۔ اس نے بلاتاخیر معافی مانگ لی تھی۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ رات کے وقت عارج اور میں اپنے اپنے انسانی قالبوں سے نکل آئے۔ ہمارے لئے یہ کوئی غیر معمولی بات

نہیں تھی۔ اکثر ہم سیر سپاٹے کیلئے شہر طوس کے گلی کوچوں یا صحرا کی طرف ہو لیتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم لشکر گاہ کا چکر لگا آتے جو محل سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس رات بھی ہم لشکر گاہ کے گرد گھوم رہے تھے کہ ایک آدم زاد کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ایک خیمے سے نکلتے دیکھا۔

"اے عارج! کیا تجھے یہ آدم زاد کچھ چور چور سا نہیں لگتا؟" میں بولی۔ "لگتا تو ہے' لیکن چھوڑو ہمیں کیا۔" عارج کی آواز میں لاتعلقی کا عنصر تھا۔

"ٹھہر جا' نا! تجھے تو روز صحرا میں سگذے بھرنے کی لگی رہتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے میری نظریں اوسط قد والے اس آدم زاد پر لگی ہوئی تھیں۔

اس کا رخ اب قریب ہی موجود ایک اور خیمے کی طرف تھا۔ رات کے وقت اس کی یہ سرگرمی مجھے شک میں ڈالنے کیلئے کافی تھی۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضروری ہے' میں نے سوچا اور عارج کو ساتھ لئے اس آدم زاد کی طرف بڑھی۔ تب تک وہ خیمے کے در پر پڑا ہوا پردہ اٹھا کر اندر جا چکا تھا۔

"میرا نام بکر بن المعتمر ہے اور میں بغداد سے آیا ہوں' اپنے آقا کو جا کر بتا دو۔" اس آدم زاد کی دھیمی آواز مجھے سنائی دی۔

"آقا تو سو..... سو چکے ہیں' دوسری گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ "مگر آ..... آپ بغ..... بغداد سے تشریف لائے ہیں اس لئے....."

میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوا کہ اس کے خیمے میں فوج کا کوئی بڑا سردار قیام پذیر ہے۔ یوں بھی لشکر گاہ کا یہ حصہ فوج کے سرداروں کیلئے مخصوص تھا۔ یہ بڑے بڑے خیمے کئی حصوں میں تقسیم ہوتے تھے۔ اس کا پہلا حصہ غلاموں اور خادموں کے علاوہ ذاتی یا نجی محافظوں کی سکونت کی خاطر مخصوص ہوتا تھا۔ خلیفہ اور اس کے اہل خاندان عموماً علاقے میں واقع کسی محل کے اندر رہتے تھے۔ وزیر سلطنت کو بھی فوج ہی کے ساتھ ٹھہرنا پڑتا تھا۔ یہی صورت طوس میں تھی۔ خلیفہ ہارون الرشید اور اس کا ایک بیٹا صالح محل میں قیام پذیر تھے۔ وزیر سلطنت فضل بن ربیع لشکر گاہ میں تھا۔ خیموں کی اس عارضی بستی میں جو دور تک پھیلی ہوئی تھی' وہاں وزیر سلطنت فضل کا قیام کہاں تھا' میں اس سے بے خبر تھی۔ میں نے اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ خیمہ جہاں بکر بن المعتمر گیا تھا فضل ہی کا خیمہ تھا۔ فضل کی آواز بھی میں نے پہچان لی۔

میں بے دھڑک فضل کے خیمے میں داخل ہو گئی تھی۔ عارج میرے پیچھے آ رہا تھا۔

ظاہر ہے کہ ہم جنات کے نادیدہ وجود کسی آدم زاد کو کس طرح نظر آ سکتے تھے۔ اسی سبب ہمارے واسطے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ناوقت خادم کے جگانے پر فضل نے خفگی کا اظہار کیا تھا تو میں نے اس کی آواز سنی تھی۔

"کیا ہے؟..... کون آیا ہے اس وقت؟" فضل کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔ جب خادم نے بغداد کا نام لیا تو فضل کی خمار آلود آواز غائب ہو گئی اور وہ بولا۔ "آنے والے کو بٹھا' میں آتا ہوں۔"

☆....☆.....☆

خادم الٹے پاؤں لوٹ گیا۔ میں نے فضل کے دماغ کو ٹٹولا تو بس اتنا ہی جان سکی کہ بغداد سے آنے والا بکر اس کیلئے اجنبی نہیں۔ ہارون کے بیٹے محمد امین کا وہ قاصد تھا۔ ممکن ہے کہ مجھے کچھ اور کام کی باتیں معلوم ہو جاتیں مگر اسی لمحے عارج بولا۔ ''اے دینار! کیا تو آج ساری رات یہیں گنوا دے گی؟... چلنا نہیں؟''

''کچھ دیر رک جا' ابھی چلتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ عارج چپ ہو رہا۔ ہماری آوازیں بھی آدم زادوں کیلئے اس وقت تک سن لینا ممکن نہیں جب تک کہ ہم خود ہی یہ نہ چاہیں۔ سو فضل وہاں اپنی موجودگی کے باوجود کچھ نہ سن سکا اور ہم دونوں اطمینان سے اس کی نقل و حرکت دیکھتے رہے۔

لباس تبدیل کر کے فضل خیمے کے بیرونی حصے میں پہنچا تو بکر نے اٹھ کر اسے تعظیم دی' پھر ایک سربند پیغام پیش کیا۔

''تو کوئی زبانی پیغام بھی لایا ہے؟'' فضل نے بکر سے پوچھا۔

بکر نے جواب دیا۔ ''ہر محکمے کے اعلیٰ افسران کو ان کے عہدوں پر حسب سابق برقرار رکھا جائے گا۔''

''اور کس کس کیلئے بغداد سے پیغام لایا ہے اے بکر!'' فضل کے لہجے میں معنی خیزی کے ساتھ نرمی بھی آ گئی۔

''گستاخی کی معافی چاہتا ہوں اے حضور محترم! خادم کو اس بارے میں زبان کھولنے سے منع کیا گیا ہے۔'' بکر نے بلا جھجک کہہ دیا۔

اس پر فضل کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ قاصد کا یوں راز داری برتنا اسے ناگوار ہوا تھا۔ اس نے محض اتنا کہا۔ ''تیری فرض شناسی پر خوشی ہوئی لیکن... خیر تو جا' مجھے اب کچھ معلوم نہیں کرنا۔''

شہزادہ محمد امین کا قاصد خاص ایک مرتبہ پھر معافی مانگ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اب خیمے کے اس حصے میں فضل تنہا تھا' یعنی وہاں کوئی اور آدم زاد نہیں تھا۔ بکر کے جاتے ہی اس نے سربند پیغام کھولا اور شمع دان کے قریب جا کر اسے پڑھنے لگا۔ وہ اس بات سے ناواقف تھا کہ ایک جن زادی بھی وہ خفیہ پیغام پڑھ رہی ہے۔ عارج کو وقت ضائع ہونے پر ملال تھا' سو خفیہ پیغام پڑھنے میں اس نے دلچسپی نہیں لی۔ وہ تو دور کھڑا بس اس انتظار میں تھا کہ میں کب اس ''فضول'' کام سے فرصت پاتی ہوں۔ ات کے وقت ہارون کی خدمت گزاری پر دوسرے خدام و غلام مامور ہوتے تھے' یوں ہمیں گھومنے پھرنے کی مہلت مل جاتی تھی۔ ولی عہد شہزادہ امین کا پیغام فضل کے نام پڑھ کر مجھے دھچکا سا لگا۔ مجھے اس سے یہ توقع نہیں تھی۔ اقتدار و حکومت حاصل کرنے کی خاطر آدم زاد واقعی بڑے خود غرض ہو جاتے ہیں۔

دور کھڑے عارج کے پاس پہنچ کر میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''چل اب۔''

''کہاں؟''

''کہیں بھی۔'' میں نے کہا۔ ''وہاں چل کہ جہاں ہمارے سوا کوئی نہ ہو۔''

''اور اگر وہ تیرا عاشق صادق عفریت داسوش کہیں مل گیا تو؟''

''دیکھ اے عارج! میں ڈرنے والی نہیں ہوں۔ تو یہ نہ بھولا کر کہ عالم سوما نے ہماری حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ اب تک وہ کئی بار تجھے اور مجھے بچا چکا ہے۔ جانتے بوجھتے تو اس عفریت کا نام لے کر مجھے چھیڑتا ہے' میں خوب جانتی ہوں۔''

عارج ہنس دیا اور پھر کہنے لگا۔ ''اے دینار! تو نے ہی تو مجھے مختلف جہانوں اور زمانوں کی سیر کرا کر اس قدر بے باک بنا دیا ہے ورنہ میں تیرا بڑا ہی فرمانبردار شوہر... انہیں... برہم نہ ہو!... میری مراد ہونے والے شوہر سے ہے۔''

''یہ وقت شوخی کا نہیں' چل کر کہیں بیٹھتے ہیں۔ یاد رکھ کہ ہم دونوں کے گرد حفاظتی حصار... نادیدہ حفاظتی حصار بھی قائم ہے' جس کی موجودگی میں وہ شیطان کہ تو جسے میرا عاشق صادق کہہ رہا تھا' ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یوں بھی وہ ان دنوں مصر میں ہے۔ مجھے تجھ سے اکیلے میں کچھ بات کرنی ہے۔'' میں سنجیدگی سے بولی۔

''میں سمجھ گیا اے دینار! اکیلے میں تو مجھ سے کیا بات کرے گی۔''

''بڑا ہی قابل ہے تو' معلوم ہے مجھے... صرف باتیں حماقت آمیز کرتا ہے۔'' میں نے چٹکی لی۔

''اب اگر تو میری قابلیت پر شک کرنے لگی تو ہو گیا میرا کام تمام۔''

''فکر کیوں کرتا ہے' اگر تو اسی طرح حالات سے غافل رہا تو نہ صرف تیرا بلکہ کسی روز

میرا بھی کام تمام ہو جائے گا۔"

"یعنی خلیفہ ہارون اس جہان فانی سے جاتے جاتے بھی قصاب کو بلوا کر ہمارے انسانی قالبوں کو......"

"زیادہ نہ بن اے عارج!"

"تو کم بن لیتا ہوں' تو بس حکم دے دیا کر مجھے!... انشاء اللہ مجھے ہمیشہ اپنا تابع فرمان پائے گی۔"

یہی نوک جھونک کرتے ہوئے ہم دونوں لشکر گاہ سے دور نکل آئے تھے۔ پھر ہمیں ایک نخلستان تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی جو شہر طوس کے قریب نہیں' خاصی دور تھا۔ عارج ایک درخت پر چڑھ گیا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔

"ہاں اے دینار! اب کہہ تو کیا بات کرنے والی تھی اور..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "بھکنے کی ضرورت نہیں ......یہ......"

"کس معاملے میں بھکنے کی ضرورت نہیں' یہ تو بتا دے اے دینار!" عارج بول اٹھا۔

"کچھ دیر خاموش رہ کر میری بات سن ہر وقت فقرے بازی ٹھیک نہیں ہوتی۔"

"تو پھر کیا ٹھیک......"

"پھر بولا تو۔"

"اچھا اب نہیں بولوں گا' پکا وعدہ!"

"بولنے کو نہیں' میں بے سرا بولنے کو منع کر رہی ہوں' میں نے کہا اور اسے اسی کی کہی ہوئی ایک بات یاد دلائی۔"

"تو میں کیوں بھلا دوں کہ عرب ہوں اور مامون آدھا عرب ہے؟" عارج بحث کرنے لگا۔ "تجھے آخر اس آدم سے کس لئے اتنا انس ہے؟"

"انس ونس کچھ نہیں ہے' مجھے اس آدم زاد مامون سے۔" میں نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔ "عصبیت کا مطلب بھی معلوم ہے تجھے؟"

"ہاں معلوم ہے مجھے!... تو یہی تو کہے گا کہ اس کا مطلب استواری' رگ دے کی شراکت اور رشتے داری ہے یعنی اسے قرابت' اپنا پن اور شناخت یا اپنی پہچان بھی کہا جا سکتا ہے' لیکن یہ پہچان بھلائی کی طرف ہونی چاہیے برائی کیلئے نہیں تو مجھے پڑھانے کی کوشش نہ کیا کر اب سن وہ بات کہ جو مجھے تجھ سے کہنی..... میرے نزدیک خلیفہ ہارون الرشید کے بعد امین کے مقابلے میں مامون خلافت یا یوں کہہ لے کہ اقتدار کیلئے زیادہ اہل ہے' تخت خلافت پر

مامون کو بیٹھنا چاہیے امین کو نہیں۔"

"اے دینار! کیا تو مجھے اپنی رائے سے اختلاف کا حق دے گی؟"

"بول" میں نے کہا۔

"تو اسے میرے تعصب کا نام دے یا کچھ اور میری رائے امین کے حق میں ہے۔" عارج کہنے لگا۔

کچھ دیر کو میں خاموش رہی اور حالات پر غور کرنے لگی۔ ہارون الرشید نے رفع شر کی خاطر پوری سلطنت کو ایک طرح سے تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا تاکہ بھائیوں کے درمیان جھگڑا نہ ہو۔ ان تینوں حصوں کا مرکز بغداد ہی تھا۔ تینوں علاقے اپنی اپنی جگہ خود مختار ہونے کے باوجود مرکز کے پابند تھے۔ مامون' امین اور موتمن ان تینوں بھائیوں میں سلطنت بانٹی گئی تھی۔ ہارون نے ان تینوں ہی کو یکے بعد دیگرے اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا حالانکہ اس کے اور بیٹے بھی تھے مثلاً شہزادہ معتصم' شہزادہ صالح' شہزادہ سلیمان وغیرہ' بوجوہ ولی عہد میں امین کو ترجیح مل گئی تھی یعنی مرکز میں وہ ہوتا' خلیفہ وقت وہ کہلاتا حالانکہ عمر میں بھی وہ مامون سے ایک سال چھوٹا تھا۔ اپنی زندگی میں ہارون نے امین کو عراق' شام اور عرب کی حکومت دی تھی' مامون کو خراسان اور ہمدان کے صوبے دیئے تھے۔ ان علاقوں کا دارالحکومت مرد موتمن کو جس کا اصل نام قاسم تھا' ہارون نے جزیرہ سے لے کر بازنطینی سرحدوں تک کے علاقے کا حکمران بنایا تھا۔ ہارون ہی نے موتمن کے بارے میں امین کو یہ اختیار دیا تھا کہ نالائق ثابت ہونے کی صورت میں امین اسے ولی عہدی سے خارج کر سکتا ہے۔ ہارون کی حدود سلطنت کے متعلق پہلے بھی میں بتا چکی ہوں' اپنی عمر کی آخری منزل تک آتے آتے اس کی سلطنت کا دائرہ مزید وسیع ہو چکا تھا' اب اس کی سلطنت عراق سے لے کر شام' افریقہ' ایشیائے کوچک (وسط ایشیائی ممالک)' روم' ترک' تاتار اور سندھ (ہندوستان) تک پھیلی ہوئی تھی۔

ایک جبر آدم زادوں کا ہوتا ہے اور ایک تاریخ کا جبر' میں سمجھتی ہوں کہ پہلے جبر سے تو نجات ممکن ہے لیکن تاریخ کے جبر سے مفر نہیں۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہی ہوں' مامون مرد میں تھا اور امین بغداد میں' جب عوام تک یہ بات جان گئے تھے کہ ہارون کا چل چلاؤ ہے تو بھلا خاندان والوں سے یہ "راز" کیسے چھپا رہ سکتا تھا اور بہت سی باتوں کے علاوہ بغداد سے میری محبت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ بابل کے کھنڈرات وہاں سے بہت قریب تھے' جس طرح آدم زاد اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں' ہم جنات میں بھی یہ چیز موجود ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ کہ وہ مسلمان آدم زادوں کی وسیع و عریض سلطنت تھی اور میں بھی

مسلمان تھی لیکن اس سلطنت کے حکمران کا ظاہر و باطن مجھ پر عیاں تھا' سو میرے بیان کو اگر کوئی داستان طرازی سمجھتا ہے تو سمجھا کرے' میں نے جو دیکھا اور محسوس کیا' جو میرے تجربے اور مشاہدے میں آیا اسی کو بیان کیا۔ کبھی میں نے کسی کو مجبور نہیں کیا کہ وہ میری بات مان ہی لے تفنن طبع کی تو خیر اور بات ہے عارج کو بھی عام طور پر میں اپنی مرضی کا پابند نہیں کرتی تھی۔ وہ امین کا طرفدار تھا اور میری رائے مامون کے حق میں تھی۔

میں گزشتہ برسوں میں ہندوستان کے مختلف شہروں اور علاقوں میں رہی تھی۔ عارج کی طرح مجھے بھی بغداد یاد آتا تھا' بس یہ کہ منہ سے کچھ نہیں کہتی تھی۔ ایک تو یہ وجہ دوسرا سبب یہ کہ مامون اس وقت بغداد کے بجائے مرو میں تھا' سوئم عارج کا بھی مجھے خیال تھا' اسی بنا پر میں نے فی الحال بغداد ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا' احسان البتہ عارج پہ دھر دیا۔

"چل یہی سہی اے دینار! تو نے میری کوئی بات مانی تو" عارج بولا۔

اس کی آواز میں شوخی میں نے محسوس کر لی اور کہا۔ "حد میں رہا کر ورنہ کسی دن....."

"خود بھی جل جائے گی اور مجھے بھی جلا ڈالے گی۔" عارج بول اٹھا۔

برجستہ گوئی پر مجھے ہنسی آ گئی' وہ بھی ہنس دیا۔ وزیر سلطنت فضل بن ربیع کے نام امین کا قاصد بکر کیا پیغام لے کر آیا تھا نہ عارج نے پوچھا نہ میں نے بتایا۔ اس کے باوجود آدم زادوں کی خودغرضی اور اقتدار کی ہوس پر مجھے غصہ ضرور تھا۔ جاہ و حشم اور دولت و اقتدار کی خاطر آدم زادہ کچھ نہیں دیکھتے یا پھر جان کر انجان بن جاتے ہیں' کبھی باپ بیٹوں کو مروا ڈالتا ہے تو کبھی بیٹے باپ کو ہلاک کرا دیتے ہیں' انہیں ہم جنات کے مقابلے میں ذرا سی عمر ملتی ہے۔ مختصر عرصے میں بھی یہ ایک سے ایک نیا طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہارون تھا۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا مگر دنیا کے معاملات نمٹانے میں لگا ہوا تھا۔ رافع کے بھائی بشیر کے بے رحمانہ قتل کو میں بھولی نہیں تھی۔ بظاہر یہ امر عجیب سا لگتا ہے لیکن یہی ہے کہ اس واقعے کے بعد ہارون کی طبیعت سنبھل سی گئی تھی۔

ہر چند کہ میں نے بغداد میں قیام کا فیصلہ کر لیا تھا پھر بھی امین کی کم ظرفی مجھے گوارا نہ ہوئی۔ دوسرے دن ہارون کو اپنے اثر میں لے کر میں نے اسے بکر کی آمد سے آگاہ کر دیا۔

"بکر.....کون بکر!" ہارون بڑبڑانے لگا۔ "مجھے یاد کیوں نہیں آ رہا کہ یہ کون ہے۔"

"شہزادہ امین کا خاص قاصد بکر المعتمر!" میں نے ہارون کے دماغ میں سرگوشی کی۔

"مگر مجھے.....مجھے بکر کے آنے کی خبر کیسے ہوئی؟"

"اپنے ایک جاسوس کے ذریعے۔"

"ہاں..... ایسا ہی ہوگا' میں بھول گیا ہوں شاید" ہارون کی بڑبڑاہٹ اب بھی جاری تھی۔

ہارون سے بظاہر میں دور تھی لیکن اس کے الفاظ واضح طور پر سن رہی تھی۔ اپنی سماعت کا دائرہ میں نے کچھ وسیع کر لیا تھا۔

"کلثوم!" معاً مجھے ہارون نے میرے انسانی قالب کے نام سے پکارا۔

میں لپک کر اس کے قریب گئی۔ اس کی خواب گاہ میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔

"جی امیرالمومنین!" میں مؤدب لہجے میں ہارون سے مخاطب ہوئی۔

"تیرا شوہر اسحاق کہاں ہے؟" ہارون نے مجھ سے پوچھا۔

"کچھ دیر پہلے ہی خود حضور ہی نے تو اسے لشکر گاہ کی طرف بھیجا ہے۔" میں نے عارج کے انسانی پیکر کی بابت بات بنا دی۔

"یہ ہمارے حافظے کو کیا ہوتا جا رہا ہے!....." ہارون میرا سہارا لئے بغیر خود ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "ہمیں تو یاد نہیں کہ اسحاق کو ہم نے کہیں بھیجا ہے۔"

میں دراصل عارج کو سوتا چھوڑ کر ہارون کے پاس دانستہ چلی آئی تھی تاکہ اپنا مقصد پورا کر سکوں' اس کا ایک سبب اور بھی تھا صبح ہی صبح محل کے اس حصے کی طرف آتے ہوئے بکر کی جھلک نظر آ گئی تھی۔ وہ شہزادہ صالح کی خواب گاہ سے نکل کر محل سے باہر جا رہا تھا' ان حالات کا تقاضا یہی تھا کہ میں ہارون کو باخبر کر دوں' میں نے یہی کیا۔

"اچھا تو کسی اور خادم کو بلا!" ہارون دوبارہ مجھ سے بولا۔ میں نے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں کی۔

خادم آ گیا تو ہارون نے اس سے کہا۔ "لشکر گاہ میں جا اور فضل کو ساتھ لے آ!"

احتراماً خادم جھکا اور پھر الٹے قدموں خواب گاہ سے نکل گیا' اسی وقت عارج دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا۔

"ارے اسحاق! تجھے ہم نے کس لئے لشکر گاہ بھیجا تھا؟" ہارون نے عارج کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

عارج پہلے تو سٹپٹا گیا مگر وہ بھی آخر جن زاد تھا' تاڑ گیا کہ میں نے کوئی شرارت کی ہے' جواب میں بولا۔ "امیرالمومنین نے اس غلام کو وزیر سلطنت فضل بن ربیع کو دیکھنے بھیجا تھا کہ وہ اپنے خیمے میں موجود ہیں یا نہیں۔"

"ہمیں یاد آ گیا" ہارون نے کہا۔

میں نے مسکرا کر عارج کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی وہی تدبیر کی تھی یعنی ہارون کو زیراثر لے لیا تھا جب حقیقتاً ایسا نہیں تھا تو پھر ہارون کو کیا یاد آتا۔ وہ بھی کیا کرتا' دو دو جن اس کی خواب گاہ میں تھے اور وہ ان کی وہاں موجودگی سے بے خبر تھا۔

فضل آیا تو ہارون نے اسے بھی آڑے ہاتھوں لیا' بولا۔ ''تو کچھ خبر بھی رکھتا ہے کہ تیرے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔''

اس پر فضل چونک اٹھا' وہ بھی ایک ہی کائیاں تھا' جواب میں کہنے لگا۔ ''اے امیرالمومنین! کیوں نہیں' مجھے معلوم ہوا ہے کہ شہزادہ محترم اور ولی عہد سلطنت کا قاصد خاص لشکر گاہ میں دیکھا گیا ہے۔''

''طویل کلام سے گریز کیا کر۔'' ہارون نے فضل کو ڈانٹ دیا' پھر بکر المعتمر کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔

غرض کہ بکر کو جب ہارون کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

''تو کس لئے بغداد سے یہاں طوس آیا ہے؟'' ہارون نے بارعب آواز میں بکر سے دریافت کیا۔

''اے امیرالمومنین! مجھے شہزادہ عالی...... انہوں نے حضور کی مزاج پرسی کیلئے بھیجا تھا'' بکر نے رک رک کر جواب دیا۔

''اور تو ہماری خدمت میں حاضر ہونے کے بجائے لشکریوں سے ہماری خیریت پوچھتا پھر رہا تھا۔'' ہارون کے لہجے میں طنز تھا۔

بکر کے پسینے چھوٹ گئے' بڑی مشکل سے بول سکا۔ ''لشکر میں میرا ایک عزیز بھی ہے اے امیرالمومنین! غلام سے غلطی ہو گئی کہ......''

ہارون نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کوئی خط لایا ہے میرے نام؟...... یا شہزادے نے زبانی مزاج پرسی کا تجھے حکم دیا ہے؟''

''زبا...... زبانی اے امیرالمومنین!'' بکر جان کے خوف سے ہکلایا۔

''جھوٹا ہے یہ۔'' ہارون وہاں موجود فضل سے مخاطب ہوا۔

فضل اشارہ سمجھ گیا اور خواب گاہ کے دروازے پر متعین محافظ دستے کے سپاہیوں کو طلب کر لیا۔

''درے لگاؤ اسے!'' ہارون نے حکم دیا۔

سپاہیوں نے حکم پر عمل کیا۔ بکر ہوش کھو بیٹھا۔

''اسے فی الوقت زندان میں ڈلوا دو۔'' ہارون نے محافظوں سے کہا' وہ بکر کو وہاں سے اٹھا کر لے گئے۔

ہارون کے ''فی الوقت'' کہنے سے میں نے یہی مطلب نکالا کہ ابھی وہ اس قاصد کو مزید سزا دینی چاہتا ہو گا۔ تقدیر خود اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلنے والی ہے وہ اس سے بے خبر تھا۔ بہرطور اسے یہ احساس ہو ہی گیا کہ وقت کی لگامیں کھینچ رہی ہیں' یہ وہ زمانہ تھا جب ہارون کا زیادہ وقت مطالعے میں صرف ہوتا تھا۔ سفر میں وہ اپنا ذاتی کتب خانہ ساتھ رکھتا' جب وہ بغداد سے چلا تھا تو اٹھارہ صندوقوں میں اس کی کتابیں رکھی گئی تھیں۔ دنیا بھر کی کئی زبانوں سے عربی زبان میں کتابوں کے جو ترجمے کیے گئے تھے ان میں کتب یونان کی تعداد خاصی تھی۔ بغداد شہر کی بنیاد رکھنے والے خلیفہ منصور کے زمانے سے ترجموں کا کام باقاعدہ شروع ہوا تھا' ہارون نے اسی کام کو مزید عروج پر پہنچایا' مدینۃ الحکمت کے دارالترجمہ میں عیسائی' یہودی' ہندو' مسلمان وغیرہ سبھی شامل تھے۔ ہارون کی شخصیت کا یہ دوسرا رخ تھا۔ ''علم کے شہر'' میں اور کیا کیا کارنامے انجام دیئے گئے یہ بیان کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہارون کا دل مطالعے سے بھی اچاٹ ہونے لگا' اس کا عیسائی طبیب خاص جبرئیل اب پھر سے فکرمند دکھائی دیتا' اب تک اس راز سے میں ہی واقف تھی کہ امین نے اپنے چھوٹے بھائی صالح' فضل اور دیگر اہم افراد کے نام خطوط میں کیا لکھا تھا' ہارون کو اس کی خبر نہیں تھی۔

جمادی الاول 193 ہجری کے وہ آخری دن تھے کہ جب ایک صبح میں ہارون کے پاس پہنچی تو وہ سخت مضطرب تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کہنے لگا۔ ''اے کلثوم! جلد سرور کو بلواؤ۔''

عارج میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ میں نے اسے اشارہ کر دیا۔ عارج خواب گاہ کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

سرور کا نام سن کر میں کھٹک گئی۔ یہ وہی تھا جس نے ہارون کے حکم پر جعفر برمکی کا سر قلم کیا تھا۔ یہی سرور محافظ دستے کا نگران تھا۔ میں سمجھی کہ آج کسی آدم زاد کی خیریت نہیں' مگر معاملہ مختلف نکلا۔

''غلام حاضر ہے اے امیرالمومنین!'' سرور آ کر بولا۔

''تو نے شہر طوس اچھی طرح گھوم پھر کے دیکھا ہے؟'' ہارون نے دھیمی آواز میں سرور سے معلوم کیا۔

”جی ہاں اے امیر المومنین! حکم فرمائیے' یہ غلام کیا خدمت بجالائے؟“

”یہاں کوئی ایسی جگہ دیکھ جہاں باغ ہو...... اور اس باغ میں اتنی گنجائش ہو کہ ایک قبر کھودی جاسکے۔“ ہارون نے رک رک کر کہا۔ اس کے لہجے سے اداسی جھلک رہی تھی۔ ”ہمیں آج ہی آ کر جلد جواب دے' اب جا!“

اقرار میں سر ہلا کر سرور بطور تعظیم ہارون کے سامنے جھکا اور چلا گیا۔

اسی روز شام کو سرور پھر حاضر ہوا اور ہارون کو مطلوبہ باغ کے بارے میں آ کر بتایا۔ وہ باغ شہر کی آبادی کے باہر تھا۔ اگلے ہی دن صبح ایک مرتبہ مزید سرور کی طلبی ہوئی۔ وزیر سلطنت فضل بھی موجود تھا۔ ہارون نے فضل اور سرور دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پست آواز میں کہا۔ ”سنو تم دونوں' ہم نے وہ قبر اپنے لئے کھدوائی ہے وہاں قرآن پڑھواؤ' ہم اپنی قبر دیکھنے جائیں گے۔“

”لیکن اے امیر المومنین! ابھی قبر نہیں کھودی گئی۔“ سرور ہمت کر کے بولا۔

”تو کھدوا قبر۔“ ہارون نے سرور سے کہا' پھر فضل سے مخاطب ہوا۔ ”آج ہی دوپہر تک ہم اونٹ پر بیٹھ کر وہاں جانا چاہتے ہیں۔“

فضل اور سرور دونوں چلے گئے تو میں سوچنے لگی۔ کیا یہ آدم زاد ہارون اپنی آنکھوں سے اپنی قبر دیکھ سکے گا؟ مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا تھا۔ جب اس نے شہر طوس کی جامع مسجد میں نماز کی ادائیگی کا اعلان کرایا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار نہ ہو پایا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا' میرا سوچنا غلط ہے۔ عارج اس کے جسم میں میرے ایما پر داخل ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے ہارون پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ عارج کو ہارون کے قالب میں قرار نہیں آیا تھا۔

اس بار میں نے ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ہارون راہداری عبور کر کے اونٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

ظہر کے وقت سے پہلے ہی تمام انتظامات مکمل کر لئے گئے۔ ہارون کے خادمان خاص' غلام اور محافظ دستے کے سپاہی ساتھ تھے۔ ان افراد کے سوا عوام کو کچھ خبر نہیں تھی کہ خلیفہ وقت ہارون الرشید کہاں اور کیوں جا رہا ہے۔ ہارون کے خاص خادموں میں عارج کے ساتھ میں بھی تھی۔ خلیفہ کی گزرگاہ کا تعین پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ جب یہ مختصر سا قافلہ گزر رہا تھا تو راستے سنسان تھے۔ ایسا پردہ پوشی کی خاطر کیا گیا۔ اس موقع پر مجھے ہارون کی بیوی زبیدہ خاتون یاد آئی۔ ہارون اسے رقہ ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ رقہ سے ہارون بغداد آیا' وہاں سے طوس اور اب گویا یہاں سے اس کا کہیں اور جانا ممکن نہیں رہا تھا۔

ہارون کے پیچھے جو اونٹ تھا اس پر عارج اور دو خادموں کے ساتھ میں سوار تھی۔

آخر کار دھیمی رفتار سے چلتا ہوا وہ قافلہ اپنی منزل تک پہنچ ہی گیا۔ رفتار اس لئے دھیمی رکھی گئی کہ ہارون شدید علیل تھا۔

باغ کے ایک کنارے پر قدرے اندر کی جانب قبر کھودی گئی تھی تاکہ اونٹ پر بیٹھے بیٹھے ہارون کو اپنی قبر دکھائی دی جائے۔ اسے اونٹ کے اوپر سے نہ اترنا پڑے۔ وہ بڑا اداس کر دینے والا منظر تھا۔ ہارون بڑی حسرت سے اپنی قبر کو دیکھے جا رہا تھا۔

چند ساعتیں اسی طرح گزریں' پھر میں نے ہارون کی نحیف آواز سنی۔ ”اے ابن آدم! تیری جگہ یہ ہے۔“

وہاں سے واپسی پر محل آنے کے بعد ہارون نے اپنے سپاہیوں اور ملازمین میں رقم تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ یہ ساری باتیں اسی جانب اشارہ کر رہی تھیں کہ ہارون کو اپنی موت کا یقین ہو چکا ہے۔

پھر ہوا بھی یہی چند روز بعد رات کے وقت محل میں چیخ و پکار سن کر میں ٹھٹھک کر رک گئی۔ عارج اور میں اپنے اپنے قالبوں سے نکلنے ہی والے تھے' ہم حسب معمول ”شوق آوارگی“ پورا کرنا چاہتے تھے۔ یہ 3 جمادی الثانی 193 ہجری کا واقعہ ہے۔

سارے محل میں ہلچل مچ گئی' میں نے حقیقت حال معلوم کر لی' خلیفہ ہارون سفر آخرت پر روانہ ہو چکا تھا۔ اس وقت ہارون کی عمر 45 سال تھی' اس نے 23 برس ایک ماہ حکومت کی' دوسرے دن صبح شہزادہ صالح نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور اسے مقررہ جگہ دفن کر دیا گیا۔ یہ آدم زاد بھی کتنی تھوڑی ... لاتے ہیں!

ہر چند کہ میری سرگزشت میں ہارون الرشید کا ذکر جگہ جگہ آیا ہے لیکن بہتر یہ ہو گا کہ جو باتیں میں اس کے بارے میں اب تک بیان نہیں کر سکی' وہ بھی مختصراً بیان کر دوں یوں آنے والے زمانوں کے تاریخ لکھنے والے بھی حقائق سے آگاہ ہو سکیں گے۔

بلاشبہ ہارون الرشید دور وسطیٰ کے عظیم حکمرانوں میں سے تھا' اس کا 23 سالہ دور ملکی امن و امان' بیرونی فتوحات' علوم و فنون کی ترقی' دولت کی فراوانی' حکومت کی شان و شوکت اور رفاہ عامہ کے کاموں کی شہرت کے سبب بنو عباس کی تاریخ میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ مطلق العنان حکمرانوں کے قصوں میں ہارون الرشید کا نام نمایاں خصوصیت کا حامل ہے۔ ہارون جس سلطنت کا وارث ہوا تھا اس کی بنیادیں مضبوط ہو چکی تھیں' اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ ہارون نے بھی ایک فرض شناس' مستعد اور باہمت حکمران کی طرح اقتدار سنبھالا اور اپنے

دور حکومت کو عباسی خلافت کا عہد زریں بنا دیا۔

ہارون کی فیاضی، علم دوستی، تحسین پرستی اور رعایا پروری کے واقعات فسانہ معلوم ہوتے تھے حالانکہ حقیقت یہ ہیں۔

انتظام سلطنت کو بہتر بنانے، بغاوتوں کو ختم کرنے، رعایا کی شکایات دور کرنے اور اپنی ذمے داریاں پوری کرنے کیلئے ہارون نے جس فرض شناسی کا ثبوت دیا اس کی مثال صرف خلیفہ منصور کے عہد میں ملتی ہے۔ سلطنت کے معاملات میں سوائے خرچ کے ہارون نے اپنے دادا منصور کے نقش قدم پر چلنا چاہا، یہ وہی آدم زاد خلیفہ منصور ہے جس نے بغداد کی بنیاد رکھی تھی، منصور خرچ کے معاملے میں بہت محتاط تھا جبکہ ہارون کی فیاضی ضرب المثل تھی۔

ہارون کے عہد میں حکومت کی آمدن بڑھ گئی تھی، اس نے اسی اعتبار سے دولت کو خرچ بھی کیا، ہارون کے دور میں محلات، مسجدیں، مدرسے، کارواں سرائے، سڑکیں، پل، نہریں اور اسپتال بڑے پیمانے پر تعمیر کیے گئے۔

ہارون اپنے عمال کی کارگزاریوں کی قدر بھی کرتا تھا اور ان کی خدمت کے صلے میں انہیں انعام و اکرام سے بھی نوازتا تھا۔ اس کے زمانے میں حکومت کا بڑا وقار تھا، دنیا کے بڑے حصے سے خراج آتا تھا، ہارون کے دربار میں جتنے علماء، فقہاء، قضاۃ، کاتب، ندیم اور گلوکار جمع ہوئے وہ کسی خلیفہ کے دربار میں نہ تھے، وہ ان میں سے ہر ایک کو انعام دیتا اور بڑے بڑے مدارج پر پہنچاتا، وہ خود بھی بڑا فاضل، شاعر، اخبار و آثار و اشعار کا راوی اور صحیح المذاق تھا، خواص اور عوام سب کے دلوں میں اس کی ہیبت تھی۔ سلطنت اور بیرون سلطنت سے صاحبان فن اس کے دربار میں کھنچے چلے آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہارون کے عہد میں دنیا کا اہم ترین شہر اور علم و ادب کا مرکز بغداد ہی کہلایا۔

دنیا کی دیگر زبانوں سے ترجموں کا کام جو منصور کے زمانے میں شروع ہوا، ہارون نے اسے منظم کیا۔ یونانی، ایرانی، اور سنسکرت کی کتابوں کے تراجم کیلئے علماء اور ترجمہ کرنے والوں کو معقول تنخواہوں پر مقرر کیا گیا، جن علوم کی اشاعت پر ہارون کے عہد میں خاص توجہ دی گئی وہ طب، نجوم، ہیئت، موسیقی، تاریخ اور شعر و ادب تھے۔ علم ہیئت میں یونانیوں کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔ یونانی عالم بطلیموس کی کتاب عربی میں ترجمہ ہو کر مقبول ہوئی وہ ''مجسطی'' تھی۔ اس کتاب کا مترجم ابوحسان تھا، اس ترجمے کو مستند قرار دیا گیا، اس کے بعد مسلمانوں نے وقت کا صحیح تعین کیا اور مختلف سیاروں کے فاصلوں کو دریافت کیا۔

ہارون الرشید کے عہد کی سب سے مشہور کتاب ''الف لیلہ'' ہے جس کی بنا پر کہانی

لکھنے کا فن انتہائی عروج تک پہنچ گیا۔ فارسی میں اس کتاب کا نام ''ہزار افسانہ'' تھا۔ اسے عربی میں علامہ اصمعی نے منتقل کیا اور مزید اضافے کیے۔

علامہ اصمعی نے ہارون الرشید، جعفر برمکی اور سرور کو ''الف لیلہ'' کے کرداروں میں شامل کر دیا۔ اس طرح ہارون کے عہد کو الف لیلوی رنگ دے دیا گیا۔ کہانیوں کی دیگر کتابوں کا بھی فارسی زبان سے ترجمہ کیا گیا۔ ان کتابوں کو پڑھ کر اور افسانہ نویسی کے فن سے واقف ہو کر مسلمانوں نے طبع زاد افسانے لکھنے شروع کر دیئے جو فارسی کے ترجموں سے زیادہ اہم ثابت ہوئے۔

علم و ادب کے ساتھ ساتھ ہارون کے زمانے میں موسیقی کو بحیثیت فن کمال تک پہنچا دیا گیا۔ مسلمانوں نے یہ فن یونانیوں اور ایرانیوں سے حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے خود بھی راگ، لے اور تان میں ایجادات کی تھیں اور موسیقی کے آلات بنائے تھے۔ ابراہیم موصلی اور اس کے بیٹے اسحاق موصلی نے موسیقی کے فن میں شہرت دوام حاصل کی۔ اسحاق موصلی صرف مغنی ہی نہیں بلند پایہ عالم بھی نکلا۔ اس نے فن موسیقی پر جو کتاب لکھی وہ اس فن پر سب سے بہتر تسلیم کی گئی۔ اس میں نغمات کو ریاضی کے اصولوں پر تقسیم کیا گیا۔

اس علم پروری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہارون کی سلطنت میں جگہ جگہ کتب خانے قائم ہو گئے۔ سرکاری کتب خانوں کے علاوہ ذاتی کتب خانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ امراء بڑی بڑی قیمتوں پر کتابیں خریدتے اور اپنے کتب خانوں کی زینت بناتے۔ ہارون اور یحییٰ برمکی کے ذاتی کتب خانوں میں کتابوں کے کئی کئی نسخے ہوتے۔ یحییٰ کا کتب خانہ بھی ضبط کر لئے اور اپنے کتب خانے میں شامل کر دیئے۔

بدقسمتی سے آدم زادوں میں یہ خرابی عام ہے کہ وہ زور زبردستی بھی کر لیتے ہیں۔ سو ہارون بھی اس سے مبرا نہ تھا۔

ہر مطلق العنان حکمران جب دنیا سے جاتا ہے تو اس کے تاج و تخت پر قبضہ کرنے کیلئے زور آزمائی شروع ہو جاتی ہے۔ ہارون کے بعد بھی ایسا ہی ہوا۔ ولی عہد سلطنت محمد امین نے تو ہارون کی زندگی ہی میں یہ بیج بو دیا تھا۔

4 جمادی الثانی 193 ہجری کو لشکر میں امین کی بیعت لی جانے لگی۔

عارج اس پر مجھ سے کہنے لگا۔ ''دیکھ لیا تو نے اے دینار کہ لوگ کس کے ساتھ ہیں؟''

''ہاں دیکھ لیا، مگر تجھے حقیقت کا علم نہیں۔'' میں بولی۔ ''یہ ایک سازش ہے جس کے

تحت امین کیلئے بیعت لی جارہی ہے۔"

"سازش؟" عارج نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں سازش!" میں نے زور دے کر کہا۔ "اس سازش کی ابتدا ہارون کے جیتے جی ہوگئی تھی۔"

"اے دینار! تو مجھے بڑی پہنچی ہوئی لگتی ہے اس کے ساتھ تھوڑی گھنی بھی ہے۔"

"تو مجھے جو چاہے کہہ... لیکن حقیقت اپنی جگہ برقرار رہے گی اے عارج!"

"وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں اے جن زادی!"

"آہستہ بول! کسی آدم زاد نے سن لیا تو بیہوش ہو جائے گا۔" میں دھیرے سے ہنس دی۔

"میری بات کو ہنسی میں نہ اڑا اور جو پوچھ رہا ہوں بتا دے۔"

"بے صبرا نہ ہو بتا دوں گی۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بغداد میں اب کیا صورتحال ہو سکتی ہے۔"

"وہی ہو گا جو اب تک ہوتا آیا ہے۔" عارج بولا۔ "وہی مار دھاڑ اور محلاتی سازشیں۔"

"اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں سوچنے کی ہیں۔"

"مثلاً؟" عارج نے پوچھا۔

"تجھے شاید یاد ہو کہ جب ہارون نے سپاہیوں اور اپنے ملازمین میں رقم بانٹنے کا حکم دیا تھا تو کیا کہا تھا۔"

"تو ہی بتا دے اے دینار! میں ایسی فضول باتیں یاد نہیں رکھتا۔"

"اور اس پر تو مجھ سے سب کچھ پوچھ لینا چاہتا ہے!.... ہم جنات کو دولت کی طلب نہیں مگر آدم زادوں کو ہے۔"

"جانتا ہوں میں۔ دولت ان کی طلب ہی نہیں ضرورت بھی ہے پھر؟" آخر میں عارج نے سوال کیا۔

"پھر یہ کہ ہارون کے ساتھ جو خزانہ بغداد سے یہاں طوس آیا اس کیلئے ہارون نے وصیت کی تھی یاد آیا کچھ!" میں نے جواب دیا۔

"ہاں یاد آ گیا اس خزانے کے بارے میں ہارون کی وصیت یہ تھی کہ اسے مامون کے پاس مرو بھیج دیا جائے۔" عارج نے کہا۔

"مگر وزیر سلطنت بن ربیع نے ہارون کی اس وصیت کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اب یہ خزانہ بغداد جانے والا ہے۔"

میری تشویش پر عارج مسکرا کر بولا۔ "تو اچھا ہے نا!"

"اے عارج! تو یہی بات تو نہیں سمجھ رہا کہ یہ اچھا نہیں ہو رہا۔"

"کیسے؟"

"ایسے کہ اس سے جھگڑے کی بنیاد پڑ جائے گی۔ مامون سے یہ بات چھپی نہ رہ سکے گی کہ امین نے اس کا حق مار لیا ہے۔" میں نے بتایا۔

"میرے علم و اطلاع کے مطابق ہارون نے بیت المال میں نوے کروڑ دینار چھوڑے ہیں۔ ان میں سے کتنے مامون کو اور کتنے امین کو ملنے چاہئیں یہ ہمارا دردسر نہیں ہے۔ یوں بھی اصل خزانہ رقہ میں ہارون کی بیوہ زبیدہ کے پاس ہے۔ تجھے خبر ہی نہیں ہے کہ یہ سگے سوتیلے کا چکر ہے۔ وہ آدم زادی زبیدہ خاتون کبھی یہ نہ چاہے گی کہ اس کا سگا بیٹا امین تو مال و دولت کو ترسے اور سوتیلا بیٹا مامون عیش کرے۔"

عارج کی زبانی یہ باتیں سن کر میں چونک اٹھی۔ وہ بھی حالات سے بڑی حد تک واقف تھا۔

"تجھے ایک بات اور بتانی تھی اے عارج کہ آج صبح جب شہزادہ صالح اپنے باپ ہارون کی نماز جنازہ پڑھا کر واپس آیا تو مجھ سے بولا اے کلثوم! تجھے اور تیرے شوہر اسحاق کو طوس سے بغداد واپس چلنا ہے۔"

"وہ تو خیر تو بغداد چلنے کا فیصلہ کر ہی چکی ہے اے دینار!" عارج نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "مجھے تو یوں لگتا ہے کہ اسی طرح شہروں شہروں آتے جاتے اور مختلف زمانوں کا سفر کرتے ہوئے میری عمر گزر جائے گی۔"

"سبھی کی عمر گزرتی ہے تیری عمر کیا انوکھی ہے۔" میں تڑخ کر بولی۔ "غریب آدم زادوں کو تو دیکھ کہ ادھر دنیا میں آئے ادھر گئے۔"

"مگر اس مختصر عرصے میں بھی ایک ایک آدم زاد کئی کئی بیویاں اور کنیزیں چھوڑ جاتا ہے۔"

"تجھے کس نے روکا ہے تو بھی آدم زادوں کی روش اپنا لے۔"

"کاش میں ایسا کر سکتا اے دینار!..... مگر میں کوئی آدم زاد نہیں ایک شریف جن زاد ہوں۔"

"دیکھ چکی ہوں میں تیری شرافت' منہ نہ کھلوا میرا۔"

"یہ تو ہمیشہ لڑاکا ڈولی کیوں بنی رہتی ہے' کبھی نرمی اور محبت سے بھی بات کر لے تو کیا مضائقہ ہے۔"

عارج اور میں اس وقت محل کے ایک مخصوص حصے میں تھے۔ یہ حصہ غلاموں' خدمت گاروں' کنیزوں اور لونڈیوں کیلئے تھا۔ ہم کیونکہ خلیفہ ہارون کے خاص خدمت گاروں میں تھے اس لئے ہماری سکونت الگ تھی۔ اسی بنا پر ہم آزادانہ گفتگو کر رہے تھے۔ جس خلیفہ کی خدمت پر ہمیں مامور کیا گیا تھا وہ نہیں رہا تھا۔ وفادار غلاموں اور خدمت گاروں کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ انہیں بھی گویا سرمایہ تصور کیا جاتا۔ ہماری حیثیت بھی ایسی ہی تھی۔ یہ خدمت گار و غلام کسی فرد سے زیادہ خاندان کے وفادار ہوتے۔

اب دن کے وقت بھی ہمارے واسطے کوئی کام نہیں تھا سو اپنے اقامتی حصے میں آ گئے تھے۔ ہم نے دانستہ محل میں غیر ضروری نقل و حرکت سے گریز کیا۔ مجھے معلوم تھا اور عارج کو بھی احساس تھا کہ اس طرح کے حالات میں کیا ہوتا ہے۔ بلاوجہ آدم زاد ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ خدمت گاروں اور غلاموں پر تو خاص نظر رکھی جاتی ہے۔ حکمران خاندان کے کسی فرد یا اس کے کسی قریبی منصب دار کو کسی خدمت گار یا غلام پر شک ہو جائے کہ وہ بے وفائی کر سکتا ہے تو اس کا سر قلم کرنے میں دیر نہیں کی جاتی۔ خود وہ بے وفائی کا حق "محفوظ" رکھتے تھے۔

"یہ تو کہاں کھو گئی اے دینار! بات کیوں نہیں کرتی؟" عارج نے مجھے ٹوکا۔

☆......☆......☆

"کیا بات کروں تجھ سے، گھڑی بھر میں پٹڑی سے اتر جاتا ہے۔"

"اچھا اب پٹڑی ہی پہ رہوں گا، یہ بتا دے کہ وہ سازش کیا ہے جس کا تو ابھی ذکر کر رہی تھی؟" عارج نے مجھ سے پوچھا۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ عارج کو سازش کا علم نہیں، میں اسی لئے جواب میں بولی۔ "تجھے وہ رات تو یاد ہو گی جب خلیفہ زادے امین کے قاصد بکر بن معتمر کو ہم نے لشکر گاہ میں دیکھا تھا؟"

"ہاں اے دینار!" عارج نے جواب دیا۔ "میں یہ بھی نہیں بھولا کہ بکر، وزیر سلطنت فضل بن ربیع کے لئے کوئی پیغام لایا تھا۔"

"اب میں تجھے بتاتی ہوں کہ فضل، امین کے چھوٹے بھائی صالح اور لشکر و حکومت

کے دیگر سرداروں امراء کو امین نے ہارون ہی کی زندگی میں اپنی بیعت لینے کے لئے لکھا تھا۔" میں بتانے لگی۔ "بکر تین خط لے کر آیا تھا، ان میں سے پہلے خط کا تعلق بیعت عام سے تھا، امین نے بکر کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ فوج کے سرداروں اور امرائے سلطنت سے امین کی بیعت لے۔ دوسرا خط اس نے صالح کو لکھا تھا کہ لشکر، خزانے اور مال و اسباب کے ساتھ حتی الامکان طور پر جلد بغداد چلے آؤ اس کے لئے امین نے اسے فضل سے مشورے کا پابند کیا تھا۔ امین کا تیسرا خط فضل کے نام تھا جو میں نے تیری ہی موجودگی میں پڑھا تھا تو اس وقت دور کھڑا تھا۔ یہ خط مال و اسباب اور خزانے کی حفاظت سے متعلق تھا اس خط میں بھی فضل کو ترغیب دی گئی تھی کہ وہ بغداد پہنچے......"

عارج نے ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا اور بولا۔ "اے دینار! میری ایک بات سن۔"

"نہیں سنوں گی۔" میں نے زور دے کر کہا پھر بولی۔ "افسوسناک امر یہ ہے کہ ان خطوط میں امین نے اپنے باپ ہارون الرشید سے متعلق کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ کیا ایک بیٹے کو یہ زیب دیتا ہے؟"

"میں یہی تو وضاحت کرنے والا تھا۔" عارج بول اٹھا۔ "ممکن ہے امین کا مقصد کچھ اور ہو۔ طوس اور بغداد میں خاصہ فاصلہ ہے نا؟"

"ہاں ہے، پھر؟"

"پھر یہ کہ قاصد کو بھیجتے وقت امین کو یقین ہو کہ تب تک اس کا باپ مر چکا ہو گا۔"

"بات تو یہی ہوئی نا کہ امین اقتدار کا بھوکا ہے۔" میں نے جرح کی۔ "اور دقتی طور پر ہی سہی اسے اقتدار مل گیا ہے۔"

"خواہ ابھی وہ اس سے آگاہ نہ ہو۔" عارج کہنے لگا۔ "تیری یہ بات بہر حال حقیقت پر مبنی ہے کہ اسے خود غرضی اور سازش ہی کہا جائے گا۔" عارج سنجیدہ لگ رہا تھا۔ "اس کے علاوہ تو نے جن خدشات کا اظہار کیا ہے، وہ بھی درست معلوم ہوتے ہیں۔ خیر...... بغداد پہنچیں گے تو دیکھیں گے کہ کیا صورت رہتی ہے، وقت سے پہلے حتمی طور پر کیا کہا جا سکتا ہے۔"

"وقت کی بات نہ کر کہ ہم جب چاہیں وقت کی لگامیں کھینچ سکتے ہیں لیکن ابھی ماضی یا مستقبل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو حال کی فکر ہے۔ دیکھنا ہے کہ یہاں طوس میں کیا ہو رہا ہے! تو یہیں رہ، میں آتی ہوں ابھی۔"

"کہاں جائے گی، بتا کر تو جا!" عارج نے اصرار کیا۔

میں اس عرصے میں اپنے انسانی قالب سے باہر آ چکی تھی، اپنے خاکی پیکر کو میں نے گہری نیند سلا دیا تھا۔

"تجھے میں اسی لئے یہاں چھوڑے جا رہی ہوں کہ کوئی گڑ بڑ ہو تو سنبھال لے۔" میں بولی۔

پھر عارج "ارے ارے" کہتا رہ گیا اور میں "خدا حافظ" کہہ کر وہاں سے چمپت ہوگئی۔ فوری طور پر مجھے خیال آیا تھا کہ حمویہ کی خبر لوں۔ وہ دیوان البرید (ڈاک اور خبر رسانی کا محکمہ) کا ناظم اعلیٰ تھا جس طرح فضل کا باپ ربیع، خلیفہ منصور کا آزاد کردہ غلام تھا اسی طرح مہدی کا آزاد کردہ غلام حمویہ تھا۔ ہارون الرشید جب بھی سفر کرتا تو ہر محکمے کا سربراہ اس کے ساتھ ہوتا۔ سو یوں حمویہ بھی جلوس میں تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ لشکر میں حمویہ کا خیمہ کہاں ہے! میں وہاں پہنچ گئی۔ خیمے کے اندرونی حصے میں حمویہ موجود تھا، آس پاس اسی کے محکمے سے وابستہ آدم زادوں کے خیمے تھے۔ میں نے فوری طور پر اسے چھیڑنا بہتر نہ سمجھا اور اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ چہروں پر بھی تو بہت کچھ لکھا ہوتا ہے! مجھے وہ کسی خیال میں کھویا ہوا لگا جب اس نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کیا تو میں جان گئی اسے کسی کی آمد کا انتظار ہے۔ کوئی جلدی تو تھی نہیں، میں اس لئے اطمینان سے ایک طرف کھڑی رہی جب تک میں نہ چاہتی، حمویہ وہاں میری موجودگی سے واقف نہ ہوتا۔

معاً مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں ادھر متوجہ ہوگئی۔

"وہ آ گیا ہے حضور!" اندرونی خیمے کے باہر سے ایک آواز آئی جو دھیمی تھی۔

"اسے اندر بھیج دو۔" جواب میں حمویہ بولا۔

چند لمحے بعد ہی ایک لمبے قد والا آدم زاد اندرونی خیمے میں داخل ہوا، میرے لئے وہ قطعی اجنبی تھا۔

"ادھر آ!... میرے قریب" حمویہ نے لمبے آدمی عتاہیہ سے مزید کہا۔ "تو اگر چاہے تو رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

"یہی مناسب رہے گا حضور کہ میں رات کو کسی وقت لشکر سے بغداد کے لئے روانہ ہو جاؤں۔"

"ہاں کسی کو اس کی بن گن نہیں ہونی چاہئے۔" حمویہ نے تاکید کی۔

"ایسا ہی ہوگا حضور!" عتاہیہ نے یقین دہانی کرائی۔

"بغداد میں تجھے یہ پیغام میرے نائب سلام ابن مسلم کو پہنچانا ہے۔" حمویہ نے یہ بات آگے بڑھائی۔

"اور حضور وہ پیغام مجھے کب ملے گا؟" عتاہیہ نے سوال کیا۔

"ابھی" حمویہ نے کہا اور ایک طرف رکھی ہوئی چوکی کی طرف بڑھا اس چوکی پر قلم دان اور کاغذ بھی رکھا تھا، وہ چوکی کے سامنے بیٹھ گیا۔

دوسرے ہی لمحے میں، حمویہ کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ قلم دان کھول کر حمویہ نے اپنے نائب سلام کے لئے مختصر پیغام لکھا پھر اسے ایک اور کاغذ میں لپیٹ کر اس پر اپنی مہر لگا دی اسی وقت مجھے ایک شرارت سوجھی۔

"مبارک ہو... مبارک ہو!" میں یہ کہتی ہوئی حمویہ سے دور چلی گئی۔

میری غیر انسانی آواز سن کر حمویہ اچھل پڑا، دوات کا ڈھکنا اس نے بند نہیں کیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ سیاہی اس کے لباس پر گر پڑی۔

"تت... تو نے کوئی آواز... عجیب گھبراتی سی آواز سنی اے عتاہیہ؟" حمویہ ڈر گیا۔

"جی... جی حضور! سنی" عتاہیہ نے بتایا "کو... کک... کوئی... مبارک ہو، مبارک ہو کہہ رہا تھا۔"

"تو یہ میرا وہم نہیں تھا۔" حمویہ بڑبڑایا۔

"حضور نے غلام سے کچھ کہا؟" عتاہیہ بول اٹھا۔

"نہیں!... چپ کھڑا رہ۔" حمویہ نے اپنا غصہ عتاہیہ پر اتار دیا اس سے اسے یہ فائدہ ہوا کہ خوف پر غصہ غالب آ گیا۔

میں دور کھڑی یہ تماشہ دیکھتی رہی، دانستہ میں نے حمویہ کو اپنی آواز سنائی تھی اس کے علاوہ وہ دو الفاظ "مبارک ہو" بھی بے معنی نہیں تھے، وہ پیغام جو حمویہ اپنے نائب کو بھیج رہا تھا اس میں ہارون کے انتقال کی خبر کے ساتھ ہی امین کو خلافت کی مبارک باد دینے کے لئے تاکید تھی۔ حمویہ نے لکھا تھا۔ "اے سلام! خلیفہ مرحوم کے ولی عہد کو سب سے پہلے تو جا کر مبارکباد دے! اس سلسلے میں تجھے میرا نام بھی لینا ہے کہ میں نے تجھے یہ خبر دی اور خبر رسانی کا فرض ادا کیا۔" اس چند لفظی پیغام کے آخر میں حمویہ کی مہر اور دستخط تھے، دوسرے کاغذ میں یہ پیغام لپیٹ کر بھی اس نے پھر اپنی مہر لگائی تھی اب وہ پیغام رسانی یا خبر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے کی خاطر کتنی احتیاط برتی جاتی تھی، یہ احتیاط اپنی جگہ لیکن حمویہ کا مقصد امین کی نظروں میں سرخ

رو ہونا بھی تھا۔

جو بھی کسی طرح اقتدار حاصل کر لیتا ہے اسے حمویہ جیسے لوگ مل ہی جاتے ہیں۔ یہ دوڑ شروع ہو جاتی ہے کہ حکمران وقت کا کون زیادہ وفادار ہے۔ اس آدم زاد حمویہ کی اس چاپلوسی کو محسوس کر کے میں نے اسے ''سزا'' دی اسی بنا پر جب وہ غصے کی حالت میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو لباس کی سیاہی بہہ کر نیچے بچھے ہوئے قالین پر گری۔ حمویہ اور چراغ پا ہو گیا اگر اسے رازداری کا خیال نہ ہوتا تو لازماً چیخ اٹھتا، شدید غصے کا پتہ اس کے چہرے کی سرخی سے ہو رہا تھا یہاں میں یہ بتاتی چلوں کہ بیعت کے لفظی معنی بھی وفاداری و فرماں برداری کے ہیں۔

''لے یہ پیغام اور دفع ہو جا'' حمویہ نے اپنے عملے کے قاصد یا خبر رساں عتابیہ کو ایک بار پھر غصے کا نشانہ بنایا اور پیغام اسے تھما دیا۔

''اور اگر عتابیہ والی نے عین نہ ہوتو؟'' میں پھر بول اٹھی کہ حمویہ میری غیر انسانی آواز سن لے۔

وہ تو غصے میں تھا ہی اس لئے سوچے سمجھے بغیر گویا مجھ پر برس پڑا ''کون ہے تو سامنے آ۔''

''میں اگر تیرے سامنے آ گئی تو پھر تو اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکے گا۔''

''سمجھ گیا میں تو میرے کسی مخالف کی کنیز یا لونڈی ہے اور میرے خیمے کے کسی حصے میں آ کے چھپ گئی ہے۔'' حمویہ نے ہوا میں تیر چلایا۔

میں نے یہ سوچ کر کہ عتابیہ وہاں سے چلا جائے، دانستہ خاموشی اختیار کر لی عموماً چھوٹے یا کم حیثیت آدم زادوں کو ستانے سے میں گریز کرتی تھی، تھوڑی تنخواہیں پانے والے ان غریبوں کا قصور محض یہ تھا کہ وہ کسی بڑے قصر میں پیدا نہیں ہوئے۔

''تو نے دیکھا عتابیہ، سچ بات سن کر اس لونڈی کو کیسی چپ لگ گئی۔'' حمویہ کی باچھیں کھل گئیں۔

عتابیہ غریب ہاں میں ہاں ملانے کے سوا کیا کرتا۔ موقع غنیمت جان کر حمویہ نے اسے رخصت کر دیا جب خیمے کے اندرونی حصے میں حمویہ اکیلا رہ گیا تو اسے میں نے ایک مرتبہ اور اچھلنے پر مجبور کر دیا۔

''سن اے بے عقلے آدم زاد! میں کوئی لونڈی نہیں، ایک جن زادی ہوں۔'' میرے یہ کہتے ہی حمویہ اچھل پڑا تھا۔

''ج ... جن ...... جن زادی ......'' حمویہ ہکلانے لگا اس کی ساری اکڑفوں ختم ہو گئی۔

میں نے اس خیال سے کہ وہ دہشت کھا کے بے ہوش نہ ہو جائے وہاں مزید رکنا مناسب نہ سمجھا۔ میں جس وجہ سے یہاں آئی تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ اب وہاں نہ رکوں۔ یوں بھی حمویہ ''چھوٹی چڑیا'' تھا اور میں ایک بڑے ''مردار خور پرندے'' کی تلاش میں تھی۔ سو میں نے لشکر گاہ سے واپس محل کا رخ کیا۔ میرے اندازے کے مطابق فضل کو صالح کے پاس ہی ہونا چاہیے تھا۔

اسی روز صبح خلیفہ ہارون الرشید کی تدفین ہوئی تھی لیکن محل میں مجھے کوئی آدم زاد سوگوار نہ لگا۔ انہوں نے اپنے چہروں پر منافقانہ اداسی کو بھی ضروری نہیں جانا۔ گویا رات گئی بات گئی۔ یہی حال صالح اور فضل کا تھا۔ میں پہنچی تو وہ راز و نیاز میں مصروف تھے۔

''اے محترم خلیفہ زادے! بکر کو اب رہا کر دینا چاہیے۔'' فضل بولا۔ اس کے چہرے سے ریاکاری جھلک رہی تھی۔

لاکھ ضبط کرنے کے باوجود مجھے فضل پر غصہ آ گیا، میں نے اس کے باپ ربیع کو بھی دیکھا تھا مگر وہ عیار نہیں تھا۔

وہاں کیوں کہ صالح بھی موجود تھا اس لئے میں نے فضل کے دماغ میں سرگوشی کی۔

''کیا بکر کی جگہ تجھے قید خانے میں ڈلوا دیا جائے؟''

''بالکل نہیں ..... بالکل نہیں!'' فضل بے اختیار بول اٹھا۔ ''لیکن ابھی تو تم بکر کو رہا کر دینے کی بات کر رہے تھے؟'' صالح نے فضل کو مخاطب کیا۔

''جی ..... جی ہاں خلیفہ زادے!'' فضل نے سنبھل کر کہا مگر میں اسے کیسے سنبھلنے دیتی۔

''تم جو مناسب سمجھو، کرو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' صالح بولا۔

''تو آپ کی طرف سے مجھے بکر کو رہا کرنے کا اختیار ہے؟'' فضل نے اپنی دانست میں صالح پر ذمہ داری ڈال دی۔

''ہاں!'' صالح نے اقرار میں سر ہلایا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے فضل کو دوبارہ ''پکڑا'' دیا۔

''صالح تو شریف بچہ ہے، تیری بات مان گیا مگر میں نہیں مانوں گی۔''

''تو ہے کون؟'' فضل کے منہ سے نکل گیا، اسے بوکھلاہٹ میں یاد ہی نہیں رہا کس کے روبرو بیٹھا ہے! ''یہ تم نے کیا کہا اے فضل!'' صالح نے جواب طلبی کی۔

فضل بغلیں جھانکنے لگا، کسی خلیفے زادے کو ''تو'' کہہ دینے کی جسارت بے جا کے

انجام سے یقیناً وہ آگاہ تھا۔ اس نے فوراً سپر ڈال دی اور بولا۔ ''میں معافی کا خواستگار ہوں اے خلیفہ زادے!''

جواباً صالح کچھ دیر خاموش رہا پھر کہنے لگا۔ ''اصل بات کرو! بردار بزرگ کا خط مل گیا تمہیں؟''

''جی خلیفہ زادے!''

''یہ بتاؤ یہاں سے بغداد کے لئے لشکر کب تک روانہ ہو سکتا ہے؟''

''اس کا تعین فی الحال مشکل ہے۔'' فضل نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' صالح نے پوچھا۔

''آپ کے والد محترم نے اس لشکر اور خزانے کے لئے جو حکم دیا تھا، غالباً آپ کو یاد ہوگا۔ فضل کہنے لگا۔

''یہی نا کہ لشکر اور اس کے ساتھ جو خزانہ ہے، اسے مرو جانا تھا...... لیکن اب تو وہ بات ختم ہو گئی۔''

''بات اس وقت ختم ہو گی خلیفہ زادے کہ امرائے سلطنت اور فوج کے سردار بھی ہم سے متفق ہو جائیں۔''

''تو ان سے کہو، متفق ہونے کے لئے!'' صالح نے کہا۔

''بہتر ہوگا کہ آج بعد مغرب امراء اور فوج کے بڑے عہدے داروں کو یہیں محل میں طلب کر لیا جائے۔'' فضل نے تجویز دی۔

''نہیں!'' صالح نے انکار کر دیا اور بولا ''تم خود ہی ان سے بات کر لو، ایک جگہ جمع ہو کر لوگ طرح طرح کی بولیاں بولنے لگتے ہیں، تم الگ الگ سب سے بات کرو اس طرح انہیں ہموار کرنا آسان ہوگا۔

''اگر خلیفہ زادے کا حکم یہی ہے تو......''

''اسے حکم نہیں، میری رائے تصور کرو!'' صالح نے فضل کی بات کاٹ دی۔ ''بس اتنا سمجھ لو کہ اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔''

''میں آج...... بلکہ ابھی لشکر گاہ میں جا کر باری باری انہیں اپنے خیمے میں بلواتا ہوں، ممکن ہے اس میں دیر لگ جائے سو اگر میں آج رات حاضر خدمت نہ ہو سکا تو کل صبح ضرور آؤں گا۔'' فضل نے یہ کہہ کر رخصت کی اجازت چاہی۔

''تم جا سکتے ہو مگر خیال رکھنا کہ انہیں بہر حال راضی کرنا ہے۔'' صالح نے تاکید کی۔

''میں پوری کوشش کروں گا، خلیفہ زادے!'' فضل نے یقین دہانی کرائی۔ ''مجھے امید ہے میری بات ٹالی نہیں جائے گی۔'' فضل نے جب محل کے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھائے تو میں بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ یہ موقع اچھا تھا کہ میں اس عیار آدم زاد کی درگت بنا سکتی۔ امین نے اپنے بھائی مامون کے خلاف جو سازش کی تھی، اس کا مرکزی کردار فضل ہی تھا، وہ عرب کی نسل سے تھا اسی لئے امین کو برسر اقتدار لانا چاہتا تھا۔ میرے نزدیک فضل نے ہارون الرشید کا حکم نہ مان کر گویا غداری کی تھی، کچھ اور نہیں تو اس آدم زاد کو میں وقتی طور پر ''نیچا'' دکھا دیتی اور میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ تیز تیز چلا جا رہا تھا کہ پیچھے سے میں نے دھکا دے دیا۔ غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ محل میں موجود محافظ ادھر دوڑ پڑے، وہ ''بدبخت'' گرتے گرتے سنبھل گیا، کوئی کوئی آدمی بڑا ہی ڈھیٹ ہوتا ہے۔ فضل بھی بڑی ''ڈھیٹ ہڈی'' تھا اسے اس نوع کے جتنے بھی القاب دیئے جائیں کم ہیں۔ محافظ اس کے قریب پہنچے تو ٹھٹک گئے۔

''کیوں آئے ہو ادھر؟'' فضل نے ان سے گویا جواب طلب کیا۔

''حضور! ہم نے ادھر سے کسی کے چیخنے کی آواز سنی تھی۔'' ایک محافظ ہمت کر کے بولا۔

''تیرے کان بجے ہوں گے!'' فضل کہنے لگا۔ ''چلو جاؤ یہاں سے۔''

وہ کوئی معمولی شخص نہیں، وزیر سلطنت تھا، سو محافظ اپنی جان بچانے کی فکر کرنے لگے۔

''چیخنا تو پڑے گا تجھے۔'' میں نے فضل کے قریب جا کر سرگوشی کی پھر ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر جڑ دیا۔

محافظ حیرت سے منہ پھاڑے کھڑے رہ گئے۔ انہوں نے فضل کو چیختے اور طمانچہ کھانے کے بعد خوف زدہ ہوتے دیکھا تھا۔

فضل کو ذلیل کرنے کے لئے فی الحال اتنا ہی کافی تھا۔ وہ محافظوں کے سامنے ''چور'' سا بن کے کھڑا تھا۔ اس نے ایک نظر محافظوں پر ڈالی اور ان سے مزید کچھ کہے بغیر چل دیا۔ میں نے اس کے دماغ کو ٹٹولا، وہ سوچ رہا تھا، آخر یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کہیں کسی نے میرے خلاف کوئی ''عمل'' تو نہیں کرا دیا؟

''ہاں اے فضل، یہی بات ہے۔ تم پر جادو کیا گیا ہے۔'' میں نے اسی کی آواز میں اس سے کہا۔

''تو یہ بات ہے۔'' وہ چونک کر بولا۔

"اور کیا! ورنہ تم تو وزیر سلطنت اور بااختیار ہو، تمہیں بھلا کون نیچا دکھا سکتا ہے۔"

"مگر وہ ہے کون جس نے مجھ پر جادو کرایا ہے؟" اس نے گویا خود سے سوال کیا۔

مجھے کیا پڑی تھی کہ جواب دیتی! میرا مقصد پورا ہو گیا۔ اسے میں نے اس وہم میں مبتلا کر دیا کہ اس پر کسی نے جادو کرا دیا ہے۔ آدم زاد بڑی جلدی ایسی باتیں قبول کر لیتے ہیں جن کا "سر پیر" نہیں ہوتا۔

لشکر گاہ میں پہنچتے ہی فضل نے باری باری امرائے سلطنت اور فوج کے سرداروں کو اپنے خیمے میں بلانا شروع کیا تو میں خاموشی کے ساتھ سارا تماشا دیکھتی رہی۔

"تم اہل بغداد ہو اور تمہیں اسی طرف لوٹنا ہے۔" فضل اپنے خیمے کے بیرونی حصے میں فوج کے دو سرداروں سے مخاطب تھا۔

"کیا تمہیں اپنے وطن جانے کی تمنا نہیں؟"

"کیوں..... کیوں نہیں!..... مم..... مگر خلیفہ مرحوم....."

فضل نے اس فوجی سردار کی بات کاٹ دی۔ "خلیفہ مرحوم اب اپنی قبر سے اٹھ کر جواب طلبی کو نہیں آئیں گے۔"

"درست..... حضور کا فرمانا قطعی درست ہے۔"

"حضور" تو یہی سننا چاہتے تھے، سو دانت نکال دیئے۔ یلّو کہیں کے! میں نے سوچا، ہارون الرشید کی آنکھیں بند ہوتے ہی انہوں نے اس کے حکم کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

یہاں میں چند باتیں مزید بیان کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔ ان باتوں کا تعلق اس دور کے معاشی حالات سے ہے۔

حکومت کی آمدنی کا اندازہ چند مثالوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ کچھ علاقوں سے خراج وصول کیے جانے کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سندھ سے وصول کیا جانے والا خراج ایک کروڑ پندرہ لاکھ درہم تھا۔ عود ہندی ڈیڑھ سو رطل، مکران چار لاکھ درہم، کرمان بیالیس لاکھ درہم، یمن کے تھان پانچ سو، کھجوریں بیس ہزار رطل، فارس (ایران) دو کروڑ ستر لاکھ درہم، گلاب تیس ہزار بوتل، زیرہ سیاہ بیس ہزار رطل، خراسان دو کروڑ اسی (80) لاکھ درہم، چار ہزار گھوڑے ایک ہزار غلام، بیس ہزار تھان، تیس ہزار رطل، بصرہ: ایک کروڑ سات لاکھ درہم، موصل دو کروڑ چالیس لاکھ درہم، شہد سفید دو کروڑ رطل، جزیرہ: تین کروڑ چالیس لاکھ درہم، غلام ایک ہزار، شہد بارہ ہزار مشک، دمشق: چار لاکھ بیس ہزار دینار، اردن: ستانوے ہزار دینار، فلسطین تین لاکھ دس ہزار دینار، زیتون: تین لاکھ رطل، مصر: انیس لاکھ بیس ہزار دینار، افریقا: ایک کروڑ تیس لاکھ درہم، یمن: تین لاکھ ستر ہزار دینار، حجاز تین لاکھ دینار (عربی زبان میں رطل آدھے سیر وزن کے پیمانے کو کہتے ہیں۔ مصنف)

خراج کی مد سے وصول ہونے والی یہ چند مثالیں ہیں۔ بیت المال یعنی خزانے میں داخل کی جانے والی آمدنی کی چار قسمیں تھیں: خراج، عشر، جزیہ، زکوٰۃ۔

زمین کے محصول کو خراج کہا جاتا۔ عشر صرف زرعی زمین پر تھا۔ (اس کا مطلب کسی چیز میں سے دسواں حصہ لینا ہے) جزیہ محصول کی ایک متعین مقدار جو ہر سال کافر ذمی سے لی جاتی۔ (ذمی: اہل کتاب جن کو مسلمانوں کے ملک میں پناہ دی گئی ہو) جزیہ دینے والوں کا تعلق غیر مذاہب کے آدم زادوں سے تھا۔ زکوٰۃ سے محتاج، اپاہج، نادار، مسافروں اور اسی قبیل کے درماندہ لوگوں کی اعانت کی جاتی تھی۔ زکوٰۃ میں یہ قید تھی کہ صرف مسلمانوں پر صرف ہو، لیکن اور کسی قسم کے صدقات میں جو مسلمانوں سے لیے جاتے تھے، کوئی تخصیص نہ تھی۔ ان سے غیر مذاہب والے بھی بہرہ مند ہوتے تھے۔

صدقات محض مسکینوں کے لئے تھے۔ (مساکین سے مراد عیسائی اور یہودی ہیں)

خراج، عشر اور جزیہ عوامی کاموں یعنی سڑک، پل، چوکیداری، تعلیم وغیرہ کے لئے خاص تھے۔ فوج کا صرفہ بھی اسی آمدنی سے دیا جاتا تھا۔ سلطنت کے ہر حصے میں معذور، محتاج، بیواؤں اور یتیموں سب کے روزینے مقرر تھے جو بیت المال (خزانے) سے معین وقت پر انہیں ملا کرتے تھے۔

یہ بات سلطنت کے ضروری قوانین میں داخل تھی کہ جو شخص نقر و فاقے کا شاکی ہو، مراد غریب آدمی سے ہے، اس مقام کا حاکم اسے کوئی کام دے یا بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دے۔ یوں گویا روزی روٹی کی ذمہ داری حکومت پر عائد تھی جو بھی بے روزگار ہوتا اسے روزگار فراہم کیا جاتا۔

ہارون الرشید کے اس زمانے کو اس اعتبار سے مثالی کہا جائے تو غلط نہیں کہ اسے تھوڑی سی مدت ملی اور اس نے زیادہ بہتری کے اقدامات کیے۔ ان اقدامات کو فضل جیسے آدم زادوں نے نسلی تعصب کی بھینٹ چڑھا دیا۔ فضل کے پاس سے لوٹ کر میں جب محل میں عارج کے پاس پہنچی تو شمع دان روشن کیے جا چکے تھے۔

"اے دینار! تو نے بہت دیر لگا دی، کہاں گئی تھی؟" عارج نے پوچھا۔

"لشکر گاہ سے آ رہی ہوں۔" میں نے بتایا۔

"کچھ پتا چلا کہ بغداد کے لئے کب روانگی ہوگی؟"

"مجھے تو لگتا ہے کہ فضل گھڑی کی چوتھائی میں بغداد پہنچ جانا چاہتا ہے۔" میں یہ کہہ کر اپنے انسانی قالب میں داخل ہوگئی واپس آنے کے بعد کلثوم کو میں نے محو خواب ہی پایا تھا۔ کلثوم کے بدن میں اترتے ہی میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ "اے عارج! ایک بات بتا، کیا ضروری ہے کہ ہم دونوں بھی لشکر کے ساتھ ہی بغداد پہنچیں!"

"پھر!" عارج نے حیرت کا اظہار کیا۔

"سن! جب ہمارے انسانی پیکر لشکر کے ساتھ بغداد پہنچیں گے تو ہم ان میں داخل ہو جائیں گے۔"

"تیری تجویز تو ٹھیک ہے اے دینار! یہاں طوس پر پڑے پڑے ہم کیا کریں گے!" عارج خوش ہوگیا۔ "ایسا کرتے ہیں کہ ہم آج رات یہاں سے نکل لیتے ہیں۔"

"اور آج رات ہی کو عتابیہ بھی بغداد کے لئے روانہ ہوگا۔"

"یہ عتابیہ کون ہے؟" عارج نے چونک کر پوچھا۔

"اگر تو اس طرح چونک کر مجھ سے عتابیہ کے بارے میں نہ پوچھتا تو شاید بتا بھی دیتی مگر اب ہرگز نہیں بتاؤں گی۔ تو آخر خود کو سمجھتا کیا ہے؟ ..... مجھے تو اپنی پابند بنا کے رکھنا چاہتا ہے؟"

"لے تو باقاعدہ لڑنے لگی مجھ سے!"

"بے قاعدہ لڑنا کیا ہوتا ہے؟" میں بول اٹھی۔

"ہوگا کچھ، مجھے نہیں معلوم اور نہ معلوم کرنے کا شوق ہے۔" عارج نے بیزاری کا اظہار کیا۔

"تو پھر میں تجھے اپنے ساتھ بغداد نہیں لے جاؤں گی۔" میں نے اسے چڑایا۔

"تو مجھے اپنے ساتھ بغداد لے جارہی ہے یا میرے ساتھ بغداد چل رہی ہے؟ دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔"

"اور یہ فرق تو ہی مجھے بتائے گا۔ مجھے تو جیسے کچھ خبر ہی نہیں۔"

"بات یہ ہے کہ تجھے تو لڑنے کا شوق ہے اے دینار!"

"یہ تو آج شوق کی جان کو کیوں آگیا؟"

"اس لئے اے دینار کہ اسی نے تو مجھے دربدر کر رکھا ہے۔"

"بڑا ہی مظلوم ہے تو اے عارج!" میں آہستہ سے ہنس دی۔

"اور بڑی ہی ظالم ہے تو اے دینار!" عارج بھی ترکی بہ ترکی بولا۔

انسانی قالبوں میں رہ کر عموماً ہم جنات وقت اور فاصلوں کے قیدی بن کر رہ جاتے ہیں۔ میں نے اسی لئے یہ تجویز رکھی تھی کہ بغداد چلا جائے۔ ہمارے درمیان ہونے والی پیار بھری نوک جھونک سے قطع نظر ذہنی ہم آہنگی بہرحال تھی۔ ہم دونوں ہی کے مزاج میں تغیر تھا نہ ہم زیادہ عرصے تک انسانی پیکروں میں رہتے نہ دیگر جنات کی طرح آزاد پھرتے۔ کبھی ہجر کبھی وصال، کبھی غم اور کبھی خوشی، ہم دونوں اسے پسند کرتے۔ ملنا بچھڑنا ہمارے نزدیک کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

ہم نے اسی رات اسحاق اور کلثوم کے انسانی پیکروں کو چھوڑ دیا جو کچھ گزر چکا تھا، ان دونوں کے ذہنوں میں ہم نے بٹھا دیا تھا۔

نصف شب سے زیادہ ہو چکی تھی جب عارج کو ساتھ لئے ہوئے میں طوس سے چلی اور بغداد پہنچ گئی۔ شہر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہم دریائے دجلہ کے کنارے ایک جگہ اتر گئے۔ اس شہر کے باسیوں کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ ان کا خلیفہ ہارون الرشید مر چکا ہے۔

"اے عارج! تو نے اس بات پر غور کیا کہ بغداد اب کتنا بدل گیا ہے!" میں نے قصر خلافت اور اس کے اردگرد بننے والی نئی عمارتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں دیکھ رہا ہوں اے دینار، تیرا کہنا غلط نہیں۔" عارج نے میرے خیال سے اتفاق کیا۔

وہ رات ہم نے بغداد اور اس کے گردونواح میں گھومتے پھرتے گزار دی۔ پھر بابل کے کھنڈرات کا رخ کیا۔ میں اپنے ماں باپ اور بھائی سے ملی۔ وہ خوش ہوگئے۔ میں عالم سوما کے پاس پہنچی تو وہ بھی پہلے کی نسبت صحت مند و تندرست نظر آیا۔ اس عرصے میں عارج، طبیب ہامہ بن ہیم اور دیگر جنات سے مل آیا۔

عالم سوما کو میں نے اب تک پیش آنے والے واقعات سے مختصراً آگاہ کردیا۔

"اے میری بچی، اے دینار! تو آدم زادوں کے معاملات میں زیادہ ..... میرا مطلب حد سے زیادہ دلچسپی نہ لیا کر!" سوما نے نصیحت کی۔

"اے میرے باپ کے دوست، اے عالم سوما! میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ حد سے تجاوز نہ کروں۔ یوں تو آدم زاد ہیں جو حد سے گزر جاتے ہیں اور اپنی اس غلطی کو تسلیم بھی نہیں کرتے۔"

"ہاں آدم زادوں میں یہ خرابی ہے کہ وہ اپنی غلطی نہیں مانتے۔" عالم سوما نے تسلیم

کیا' پھر مجھ سے پوچھا۔ ''تیرا ارادہ خراسان جانے کا ہے یا یہیں بغداد میں رہے گی؟''۔

''فی الحال تو بغداد ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے''۔ عارج بول اٹھا' میں چپ رہی۔

عالم سوما نے مزید کوئی سوال نہ کیا اور ہم اس کے پاس سے اٹھ آئے کیونکہ یہ اس کی عبادت کا وقت تھا۔

تقریباً دو ہفتے ہم نے سیر سپاٹے اور حالات کا جائزہ لینے میں گزار دیئے۔ عارج کے ساتھ اس میں میری مرضی بھی شامل تھی۔ کسی ایک سے موسم اور ایک ہی فضا میں رہنا خود مجھے بھی پسند نہ تھا۔ اسی دوران میں ایک روز عتاہیہ بغداد پہنچ گیا۔ اس نے فوری طور پر قصر خلد کا رخ کیا۔ شام کا وقت تھا اور میں اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ مجھے یہ دیکھنا تھا کہ اپنے باپ ہارون کے انتقال کی خبر سن کر امین پر کیا ردعمل ہوتا ہے! اس علاقے کا نام ''خلد'' رکھ دیا گیا تھا۔ جہاں نئی عمارتیں بنائی گئی تھیں۔ اسی بنا پر جو قصر امین کے تصرف میں تھا۔ اس کا نام قصر خلد پڑ گیا تھا۔

عارج اس وقت میرے ساتھ نہ تھا اور نہ میں کسی انسانی قالب میں تھی۔

قصر خلد میں نے پہلی بار دیکھا' مگر قصر خلافت کی شان ہی اور تھی۔ قاصد کے آنے کی خبر پاتے ہی امین نے اسے اپنی خلوت میں بلوا لیا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ قاصد طوس سے آیا ہے عتاہیہ تنہا نہیں تھا' نہ اس کی یہ جسارت تھی کہ وہ براہ راست امین سے مل سکتا۔ سلام ابن مسلم اسے اپنے ساتھ بطور گواہ لے گیا تھا۔

محکمۂ ڈاک اور خبر رسانی کے سربراہ حمویہ نے بغداد میں موجود اپنے نائب سلام کو عتاہیہ کے ذریعے وہ پیغام بھیجا تھا جس کا ذکر آ چکا ہے۔ امین نے پہلے قاصد پر اور پھر سلام پر نگاہ ڈالی۔ اس کے ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ موزوں اندام' کشیدہ قامت' خوبرو اور قوی تن امین کی پریشانی پر بل دیکھ کر سلام فوراً بول اٹھا۔ ''یہ غلام اس قاصد کو اپنے ساتھ لایا ہے۔ اے امیر المومنین! آپ کے قابل احترام والد بزرگوار خلیفہ ہارون الرشید کا انتقال ہو چکا ہے اور.....''

''اے سلام! کیا تیرے پاس اس خبر کا کوئی ثبوت ہے؟''

امین نے سلام کی بات کاٹ دی۔ اس کے سرخ و سفید چہرے سے دبے دبے سے جوش کا اظہار ہو رہا تھا۔ مجھے یہی توقع بھی تھی۔ اس پر مجھے بہر حال افسوس ضرور ہوا۔

''جی ہاں اے امیر المومنین!'' سلام نے فوراً جواب دیا۔

''حضور اس قاصد سے تصدیق کر سکتے ہیں''۔

قاصد عتاہیہ کی طرف امین کی نظریں اٹھیں۔ اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ اس نے ہارون کی موت کا منظر گویا لفظوں میں کھینچ دیا۔ اس عرصے میں عتاہیہ کی نظریں جھکی رہی تھیں۔

جب عتاہیہ بول چکا تو سلام نے امین کی اجازت سے کہنا شروع کیا۔ وہی سب کچھ جس کی ہدایت اسے حمویہ نے کی تھی۔ امین کو خلافت کی مبارکباد دینے والا پہلا آدم زاد اسلام ابن مسلم ہی تھا۔

''تجھے ہمارے بھائی صالح کے حال کی بھی کچھ خبر ہے؟''

امین نے سلام سے دریافت کیا۔

اس پر سلام بغلیں جھانکنے لگا اور فوری طور پر کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے بجائے وہ بولا ''اے امیر المومنین! میرے افسر محترم حمویہ نے مجھے وہ خبر دی ہے جو میں نے بیان کی''۔

کچھ کہنے کے بجائے امین نے ہاتھ سے رخصت کا اشارہ کر دیا۔

ادھر قصر خلد سے سلام اور عتاہیہ نکلے' ادھر امین کے ایک غلام نے طوس سے صالح کے خادم رجاء کی آمد سے مطلع کیا۔

میں ابھی وہیں موجود تھی۔ اس غلام کا نام کوثر تھا۔

''اسے جلد ہمارے پاس لے کر آ!'' امین نے کہا۔

''جی میرے آقا!'' غلام نے جھک کر امین کو تعظیم دی اور چلا گیا۔

ذرا ہی دیر بعد اوسط قد رکھنے والا ایک آدم زاد غلام کے ساتھ حاضر ہوا۔ وہ خالی ہاتھ نہ تھا۔

''اے رجاء! جلد بتا' کیا خبر لایا ہے؟'' امین نے اوسط قد والے آدم زاد رجاء کو مخاطب کیا۔

جواب میں رجاء نے امین کو پہلے ایک خط دیا۔ میں نے اس خط پر بھی ایک نظر ڈالی۔ خط میں صالح نے امین کو خلافت کی مبارکباد کے ساتھ ہی ہارون کے انتقال کی خبر دی تھی۔

''تیرے پاس ہمارے لئے کچھ اور بھی تو ہے!'' امین اپنے چھوٹے بھائی کا خط پڑھ کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''جی ہاں اے امیر المومنین!'' رجاء بولا اور پھر وہ انگوٹھی جو ہارون پہنتا تھا ایک عصا (لاٹھی) اور ایک چادر جو ہارون اوڑھتا تھا۔ امین کی خدمت میں پیش کر دی۔ یہ گویا خلافت کی نشانیاں تھیں۔

غلام ابھی تک ہاتھ باندھے اپنی جگہ کھڑا تھا۔ امین اس سے مخاطب ہوا۔ ''کل کیا دن

ہے اے کوثر؟''

''جمعہ ہے اے میرے آقا!'' غلام نے جواب دیا۔

''یہ دن مبارک دن ہے۔ ہم کل ہی قصرِ خلد سے قصرِ خلافت جائیں گے''۔ امین کا لہجہ بدل گیا تھا۔

میرا جی چاہا کہ اس آدم زاد امین کو اپنا کوئی ''کرتب'' دکھا دوں مگر صبر کر کے وہاں سے چلی آئی۔ میں نے اب وہاں مزید رکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

دوسرے دن صبح امین' قصرِ خلد سے قصرِ خلافت میں آ گیا۔ یہ وہی قصرِ خلافت تھا جہاں میں نے خلیفہ منصور' خلیفہ مہدی' خلیفہ ہادی اور خلیفہ ہارون کو دیکھا تھا۔ اب اسی قصرِ خلافت میں ایک نا اہل آدم زاد امین آیا تھا۔ ابھی صرف چند آدم زادوں کو یہ بات معلوم تھی کہ ہارون کی وفات ہو چکی ہے۔ بغداد والے اس سے واقف نہ تھے۔ روزِ اول ہی سے مجھے امین پسند نہیں آیا۔ میری پسند و ناپسند سے قطع نظر زبردستی اقتدار پر قبضہ کرنے والوں کو لوگ عموماً پسند نہیں کرتے۔

قصرِ خلافت میں وہ مجھے اترا کر چلتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے ہنسی آ گئی جب کوئی توی الجثہ آدم زاد اس طرح چلتا ہے تو شاید اسے خود یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ کس قدر مضحکہ خیز لگ رہا ہے۔

ہم جنات کی طرح آدم زادوں کی بھی الگ الگ قسمیں ہیں۔ اسی طرح ان کے نشست و برخاست کے انداز بھی علیحدہ ہوتے ہیں۔ کوئی کندھے جھوڑ کر چلتا ہے تو کوئی مٹکتا ہے۔ کسی کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ جدھر کی ہوا ہے ادھر ہی کو اڑ جائے گا۔ کوئی آدم زاد اس طرح قدم جما جما کر آگے بڑھتا ہے جیسے زمین اس کے پیروں سے چپکی ہو۔ امین اسی طرح چلنے کی ناکام کوشش کرتا۔ ایسے موقعوں پر عارج نے مجھ سے پوچھا۔ ''اے دینار! تو اتنے غور سے اس آدم زاد کو کیوں دیکھ رہی ہے؟''

''میری مرضی''۔ میں کہہ دیتی اور عارج اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔

غنیمت یہ تھی کہ اس روز وہ قصرِ خلافت میں نہیں تھا۔ ورنہ مجھے ''پکا'' دیتا۔ اسے غالباً یہ اندازہ تھا کہ کسی آدم زاد کے جسم میں اتر گیا تو پھر سکندر سے بھرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ مجھے تو یہ بھی خبر نہ تھی کہ وہ بغداد میں ہے یا نہیں! پل بھر میں ہم جنات کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں اور دور دور کی خبر لے آتے ہیں۔

اس روز نماز جمعہ امین نے پڑھائی۔ امین نے نماز کے بعد بغداد والوں کو ہارون کی

وفات سے آگاہ کیا اور اپنی خلافت کے لئے بیعت لی۔ اس نے بغداد کی جامع مسجد میں لوگوں سے حسن سلوک کا وعدہ کیا۔ نماز پڑھ کے وہ قصرِ خلافت میں چلا آیا۔ یہاں آ کر اس نے خاندان والوں سے بیعت لینے کے بعد سلیمان بن المنصور کو بلوایا۔ خلیفہ منصور کا بیٹا سلیمان' مامون اور امین کی ماں زبیدہ کا چچا تھا۔ اس رشتے سے وہ گویا امین کا دادا ہوا۔

جب امین جامع مسجد میں بیعت لے رہا تھا تو اس کے ایک درباری نے سرگوشی کی تھی۔ ''اے امیر المومنین! ابھی مامون کا خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ ایسے میں آپ اس طرح مجمع عام میں بیعت نہ لیں''۔

چند ہی لوگ بیعت کر پائے تھے یعنی امین کو اپنی فرماں برداری کا یقین دلا پائے تھے کہ خطرہ محسوس کر کے وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے محافظ دستے نے حلقہ بنا لیا تھا۔ وہ اسی حلقے میں جامع مسجد سے نکل کر قصرِ خلافت میں پہنچا۔

یہ ساری باتیں میں نے اس لئے بتائیں کہ امین کی بزدلی کا اندازہ ہو سکے۔ ظالم عام طور پر بزدل ہی ہوتے ہیں! میری مراد ظالم آدم زادوں سے ہے۔ جنات سے ہرگز نہیں۔

منصور کا بیٹا سلیمان قصرِ خلافت میں آیا تو امین نے اس کی بزرگی کا خیال بھی نہ کیا اور گردن اکڑائے اپنی مسند پر سچ مچ کا خلیفہ بنا بیٹھا رہا۔ وہ اپنے دادا سے کہنے لگا۔ ''اے سلیمان! آپ کو فوج کے سرداروں اور عوام سے میری بیعت لینی ہے''۔

☆......☆......☆

"دادا صاحب" بڑی بہاریں آتے جاتے دیکھ چکے تھے۔ انہیں خبر تھی کہ وہ ان کا پوتا نہیں' اقتدار بول رہا ہے جو بڑے بڑوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے۔ وہ اقرار میں سر ہلا کر چلتے بنے۔

ان دادا جی سلیمان کے جاتے ہی امین نے فوجیوں کو دو سال کی پیشگی تنخواہ دینے کا اعلان کیا۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں! فوجیوں' ان کے سرداروں اور سالاروں سبھی نے پیشگی تنخواہ کا بھرپور "خیر مقدم" کیا۔ انہوں نے دھڑا دھڑ سلیمان کے ہاتھ پر امین کے لئے بیعت شروع کر دی۔ غرض کہ امین خلیفہ زادے سے بذات خود خلیفہ بن گیا۔ سو یوں بغداد میں خلیفہ محمد امین کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔

یہ آدم زاد بھی ڈنکا بجانے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ ان سے کچھ اور بجے نہ بجے ڈنکا ضرور بجا لیتے ہیں۔ کسی کے نام کا ڈنکا بجاتے وقت یہ بالکل نہیں سوچتے کہ جس کا ڈنکا بجا رہے ہیں کبھی اس کا ڈنکا یا باجا بھی بجا سکتا ہے! میں نے تو یہی دیکھا' سنا اور محسوس کیا۔ کسی جن زاد یا جن زادی کو کوئی اور "تجربہ" ہو تو ہوا کرے' اس سے میری "صحت" پر اثر نہیں پڑتا۔

امورِ سلطنت سے بے پروائی اور تفریحی مشغلوں سے امین کی دلچسپی کا اندازہ سیانے آدم زادوں کو دوسرے ہی دن ہو گیا۔ مسندِ خلافت پر بیٹھے ابھی امین کو ایک ہی دن گزرا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ قصرِ ابو جعفر کے گرد چوگان اور دوسرے کھیل تماشوں کے لئے میدان بنایا جائے۔

ذاتی طور پر مجھے کھیل تماشے پسند ہیں مگر آدم زادوں کو اگر کھیل نہیں تو تماشے مہنگے بھی پڑ جاتے ہیں اور وہ خود تماشا بن جاتے ہیں۔ تماشائی کا سوانگ بھرنے سے کچھ نہیں ہوتا' سودائی بن جانا پڑتا ہے۔ سودائی دیوانے کو کہتے ہیں۔ شاعر آدم زاد خود کو دیوانہ یعنی پاگل کہہ کر خوش ہوتے ہیں۔ میں بھلا ان دیوانوں کا کیا بگاڑ سکتی ہوں! پاگل پن کو اگر کوئی عاشقی کہتا ہے

تو مجھے کیا! یہ الگ بات کہ ان معنوں میں تھوڑی تھوڑی "پاگل" میں بھی تھی۔ شاید عشق اور دیوانگی ایک دوسرے کے لئے ضروری ہیں جیسے عارج اور میں لازم و ملزوم ہیں۔ میں سودائی سہی' لیکن خلیفہ امین "سودائی" نہیں تھا! نہ سودائی' نہ شاعر!

میں نے تو اسے بچپن سے دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ ناموزوں شعر ہی کہتا تھا۔ اس ضمن میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آ رہا تھا۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے کہ جب ہارون زندہ تھا۔

ابونواس اس عہد کا ایک اہم شاعر تھا۔ ہارون نے اسے نوازنے کیلئے امین کا استاد مقرر کر دیا۔ ایک دفعہ ابونواس نے اپنی جان چھڑانے کے لئے ہمت کر کے امین سے کہہ دیا۔

"اے خلیفہ زادے! آپ نے ابھی جو اشعار سنائے' ناموزوں ہیں"۔

بس پھر کیا تھا' امین بھڑک اٹھا۔ اس نے ابونواس کو قید خانے میں ڈلوا دیا۔ میرے علم میں یہ واقعہ تھا' سو میں نے ہارون کو "سنکارا" دیا۔ ہارون نے پتا کرایا تو "خبر" صحیح نکلی۔ اس نے خود کو "باخبر" ظاہر کرنے کے لئے امین کو طلب کیا' ہی کے ساتھ ابونواس کو قید خانے سے نکلوا کر قصرِ خلافت میں بلوا لیا۔

"امین شعر سناؤ!" ہارون بولا۔

تعمیلِ حکم کی غرض سے امین نے کہا "اے امیر المومنین! ابھی شعر عرض کرتا ہوں"۔

امین نے ابھی ایک ہی ناموزوں شعر پڑھا تھا کہ ابونواس اپنی جگہ سے اٹھنے لگا۔

"کہاں چلے ابونواس؟" ہارون نے پوچھا۔

"قید خانے"۔ ابونواس نے جواب دیا۔

یہ وہ امین تھا کہ جس کا باپ ہارون' ماں زبیدہ اور سوتیلا بھائی مامون سبھی موزوں شعر کہتے تھے۔ ان میں سے کوئی "بے بحرا" نہ تھا' مگر امین "بے بحرا" اور "بے بہرہ" دونوں ہی تھا۔ شعر بحر میں نہ کہتا' یوں گویا وہ شاعری سے بے بہرہ ہی تھا۔ اس کے باوجود اسے وہ سارے شوق تھے جو خلیفہ ہونے کے لئے اس وقت لازم سمجھے جاتے تھے۔ غالباً اسی "ٹھرک" میں امین نے مختلف علاقوں میں فرامین بھیجے کہ اربابِ نشاط جہاں جہاں ہوں ان کی تنخواہیں مقرر کر دی جائیں اور انہیں دارالخلافہ بغداد روانہ کیا جائے۔

اس پر مجھے شرارت سوجھ گئی۔ عارج سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا تو بھی اربابِ نشاط میں شامل ہو جا!"

"وہ تو میں پہلے سے ہوں اے دینارا!" عارج بولا۔

"اب تک تو کہاں ڈولتا پھر رہا تھا؟ کہاں سے آ رہا ہے؟"

میں نے موضوع گفتگو بدل دیا۔

''خراسان کے دارالحکومت مرو سے سیدھا چلا آ رہا ہوں''۔ عارج نے جواب دیا۔

میں چونک اٹھی کیونکہ مامون مرو ہی میں تھا۔

اب مجھے کسی طرح عارج کو شیشے میں اتار کے مامون کا حال احوال معلوم کرنا تھا میں جانتی تھی کہ وہ سیدھے سبھاؤ کچھ نہیں بتائے گا۔ اس کو سوچ کے میں نرمی سے بولی! اے عارج! تیرے بغیر یہاں میرا جی ہی نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے بغداد سونا سونا معلوم ہوتا تھا''۔

''اے دینار! کاش تو سچ بول رہی ہوتی!''۔

''اچھا تو مجھے جھوٹا سمجھ رہا ہے!''۔ میں نے عارج کو دوسری طرح گھیرنا چاہا۔

''میں کچھ نہیں سمجھ رہا' تو گھڑی گھڑی رنگ نہ بدل''۔ عارج نے کہا۔

''ایک شرط ہے اس کی'' میں نے پھر پینترا بدلا۔ ''تو مجھے اپنے غائب رہنے کی پوری روداد سنا دے، ٹھیک ٹھیک بتا دے کہ مرو میں کس جن زادی کے ساتھ وقت گزارا؟''

''مجھ پر یہ الزام لگاتے ہوئے کچھ خدا کا خوف کر اے دینار! میں تو صرف اور صرف تیرا تابعدار ہوں، قسم لے لے کہ تیرے سوا کبھی کسی جن زادی کو آنکھ اٹھا کر دیکھا ہو۔ میرے مرو جانے کا مقصد تو کچھ اور ہی تھا۔''

''وہی تو میں جاننا چاہتی ہوں۔''

''اچھا بتاتا ہوں۔'' عارج راضی ہوگیا۔ ہم دونوں دریائے دجلہ کے کنارے ایسی جگہ بیٹھے تھے جہاں آدم زادوں کی آمدورفت نہیں تھی۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد عارج کہنے لگا۔ ''تجھے ایک لطیفہ سناؤں اے دینار!...... ایک فضل اگر یہاں بغداد میں ہے اور امین کا ہم نوا ہے تو وہاں مرو میں بھی مامون کے ساتھ دوسرا فضل موجود ہے۔ یہاں والے کا نام فضل بن ربیع ہے اور وہاں والا فضل بن سہل کہلاتا ہے۔''

''اے عارج! تو نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ لطیفے میں ہنسنے کا مقام کون سا تھا!'' میں بولی۔ ''عرب آدم زادوں میں بھی نسب چلتا ہے اگر ایک اللہ کا بندہ ہو، یعنی عبداللہ تو جسے دیکھو اسی پر اصرار کرے گا کہ وہ بھی اللہ کا بندہ۔ یہی سبب ہے کہ عرب عام طور پر اپنے باپ کا نام ساتھ لگاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مامون ہی کو دیکھ لے، عبداللہ ہی نام ہے نا اس کا!...... بن، ابن یا بن ال یہ سب درمیان کے پیوند ہیں تجھے تو خبر ہے کہ عرب سے باہر ہندوستان وغیرہ میں یہ شوق نہیں پایا جاتا یا یوں کہہ لے کہ آئندہ نہیں پایا جائے گا انہی بن اور ابن سے بچنے کا ایک اور طریقہ بھی عربوں ہی نے نکالا ہے، یعنی کنیت اور لقب!...... مامون بھی لقب

ہی تو ہے۔ اس حد تک تیری بات ماننے والی ہے کہ ایک سے ناموں سے الجھن ضرور ہوتی ہے۔ ابھی خبر آئی کہ گویا ایوب مارا گیا، ابھی اطلاع ملی کہ ایوب نے کسی کو مار ڈالا۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی آدم زاد قاتل اور مقتول نہیں ہو سکتا، وہ بھی بیک وقت!...... اب ان عرب آدم زادوں کو کون سمجھائے کہ اذنی کی عمر کے مطابق تو اس کے درجنوں نام رکھ دیں گے مگر جب اپنی باری آئے گی تو ہر پھر کے ایک ناموں کا گھوٹا لگاتے رہیں گے۔ خیر ہم جنات کو کیا۔ آدم زاد ٹھہرے اشرف المخلوقات اور ہم...... ہاں یہ بتا کہ مامون کا کیا حال ہے؟''

''بے حال ہے۔'' عارج نے جواب دیا۔ ''حکومت پر اصل قبضہ فضل بن سہل کا ہے۔ مامون نے سارے اختیارات اسی کو دے رکھے ہیں۔''

''پھر تو اس کی خیر نہیں اے عارج! ہارون کو جب خلافت ملی تھی، یاد ہے تجھے کہ اس نے یحییٰ برمکی سے بھی یہی سلوک کیا تھا۔ کیا نتیجہ نکلا اس کا تو جانتا ہی ہے...... ہاں مجھے برامکہ کے ذکر پر ایک اور فضل یاد آ گیا...... فضل برمکی، وہی جو ہارون کا دودھ شریک بھائی ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ وہ بھی اللہ کو پیارا ہو چکا ہے؟''

''کب اے دینار؟...... اس کی عمر ہی کیا تھی؟'' عارج بولا۔

''عمر کو چھوڑ...... فضل برمکی، ہارون سے بھی چھ ماہ چھوٹا نکلا۔ محرم کے مہینے میں، اسی سال (193 ہجری) تو مرا ہے۔

وہ؟ یوں ہارون سے عمر میں کم ہوا، نا!...... رقہ کے قید خانے میں اس کی زندگی کے آخری ایام گزرے کہ جسے ہارون اپنا بھائی کہتا تھا۔ بھلا بھائیوں کو کوئی یوں سزا دیتا ہے!...... فضل بن سہل کی بات کر رہا تھا تو اس کا کوئی لقب بھی ہوگا۔''

''ذوالریاستین لقب ہے۔'' عارج نے جواب دیا۔

''تو گھال میل سے بچنے کے لئے مامون کے وزیر سلطنت فضل کو تو آئندہ اس کے لقب ہی سے پکاریو اے عارج!''

''اور کوئی حکم اے ملکہ جنات!'' عارج نے یہ الفاظ اس طرح ادا کیے کہ میں نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ میں نے کہا۔ ''سن اے بے خبر! ہم ملکہ ولکہ کچھ نہیں، سردار زادی ہیں اور یہی رہنا چاہتی ہیں۔ تیرے لئے سردار اعظم کی بیٹی کا حکم اب یہ ہے کہ مرو کا حال بیان کر!''

''غلام عرض کرتا ہے اے سردار زادی!''

اس وقت عارج اور میں ''آدم زاد'' کھیل رہے تھے جب ہم ہنس بول چکے تو پھر

اصل موضوع پر آ گئے۔

''فارس والے مامون کو اپنا بھانجا کہنے لگے ہیں اے دینار!''

''ٹھیک تو کہتے ہیں۔ مامون کی ماں ایرانی نسل سے ہی تھی، مراجل۔ یہ بتا اے عارج کہ جب مامون کو حالات کی خبر ملی تو اس نے کیا کیا؟'' میں نے معلوم کیا۔

''اس نے وہی کیا جو ایسے موقعوں پر آدم زاد کرتے ہیں، یعنی فوج کے سرداروں اور امرا کا اجلاس بلالیا۔'' عارج بتانے لگا۔ یہ وہ سرداران لشکر تھے جنہیں ہارون نے مامون کے ساتھ کیا تھا۔ مثلاً عبداللہ بن مالک، یحییٰ بن معاذ، شعیب بن حمید، علاء موالی وغیرہ۔ فضل...... میرا مطلب ہے ذوالریاستین تو وہاں تھا ہی۔''

''اس اجلاس کی کارروائی سنا۔''

''سب کچھ بتادوں تجھے!..... ناراض نہ ہو، میں نے جو دیکھا بتاتا ہوں۔ مامون نے اس اجلاس میں جمع کیے جانے والوں سے صلاح پوچھی۔ سبھی سوائے ذوالریاستین کے ایک زبان ہوکر بولے، دو ہزار سوار ساتھ ہوں تو ہم اس فوج کو واپس لا سکتے ہیں جو طوس میں آپ کے محترم والد کے ساتھ تھی اور جس کے بارے میں پتا لگا ہے، بغداد کوچ کررہی ہے اس پر مامون نے ذوالریاستین کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وزیر سلطنت نے ایک مخصوص اشارہ کیا۔ اس اشارے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اجلاس میں نہیں خلوت میں بات کرے گا۔ مامون نے اشارہ ملتے ہی اجلاس کسی فیصلے کے بغیر برخاست کردیا۔ امرا و سردار چلے گئے تو تنہائی میں ذوالریاستین بولا، ابھی ہمارے لشکر اور بغداد کے لشکر کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ مرحوم خلیفہ ہارون الرشید کے ساتھ بہت بڑا لشکر تھا، اسے دیکھتے ہوئے ہمارے پاس گنتی کے آدمی ہیں۔ یہ سردار جو ابھی اجلاس میں ڈینگیں مار رہے تھے، جب ان کا مقابلہ لشکر بغداد سے ہوگا تو چوکڑی بھول جائیں گے۔ جب یہ شکست کھا کر اپنی جان سے ناامید ہوں گے تو حضور کو امین کے حوالے کردیں گے کہ اس کارگزاری کے صلے میں اپنی جانیں بچالیں۔ اگر حضور کو یہی منظور ہے تو پہلے بغداد کی طرف کوچ کرنے والے لشکریوں کے سرداروں کا ارادہ معلوم کرلیا جائے۔ یہ سن کر مامون چپ ہورہا اور ''تم جانو'' کہہ کر اندر محل میں چلا گیا۔''

عارج کے خاموش ہوتے ہی میں بول اٹھی۔ ''گویا مرو سے کوئی قاصد بغداد آنے والا ہے؟''

''نہیں۔''

''تو پھر؟'' اس نے سوال کیا۔

''تو یہ بھول جاتی ہے کہ لشکر کا ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا کس قدر مشکل ہوتا ہے!''

''اچھا تو طوس سے جو لشکر بغداد کے لئے روانہ ہوا وہ کہاں ہے؟'' میں کسی قدر جھلا گئی۔

''''نیشاپور پہنچنے والا ہے۔'' عارج نے جواب دیا۔ ''اگر تو کہے تو نیشاپور چلتے ہیں۔''

''مجھے اپنا دم چھلا نہ بنا اور ایسا کر کہ تو وہاں کی خیر خبر رکھ، میں یہاں بغداد میں رہتی ہوں۔ اس طرح تیرے شوق آوارگی کو بھی تسکین ملتی رہے گی۔'' میں نے تجویز پیش کی۔

''اے دینارا!'' تیرے بغیر آوارگی میں بھلا کیا خاک مزہ آئے گا، مگر تیرے بے حد اصرار پر......''

''اپنی طرف سے باتیں نہ جوڑ! میں نے تجویز پیش کی ہے، تجھ سے بے حد اصرار نہیں کیا۔''

''ایک ہی بات ہے۔'' عارج شرارت پر آمادہ ہوتے ہوتے سنبھل گیا اور بولا۔ ''میں تجھے ایک اہم بات بتانا تو بھول ہی گیا۔''

''بول!''

''مامون نے رافع اور ہرثمہ کے قصور معاف کردیے ہیں وہ مامون کے وفادار بن گئے ہیں دیکھ اے دینار کہ وقت کا پہیہ کس طرح الٹا گھومنے لگتا ہے اور سن! علی بن عیسیٰ جسے ہارون نے معزول کردیا تھا، وہ بھی اب مامون کے وفاداروں میں ہے اسے مامون نے دوبارہ بحال کردیا ہے۔ یہ سارا قصہ دراصل مامون کا نہیں، اس کے بااختیار وزیر سلطنت ذوالریاستین کا ہے۔ مامون کا تو صرف نام استعمال کیا جارہا ہے۔'' عارج یہ کہہ کر رخصت ہوگیا۔ اسے نیشاپور پہنچنا تھا۔

ریاست کی جمع ریاستیں اور ذوالریاستین کا مطلب دو ریاستوں والا ہے۔ وزیر سلطنت کو اس لقب سے پکارے جانے میں بھی سیاست تھی اس طرح گویا مامون، امین کی حدود مملکت پر بھی اپنا دعویٰ جتا رہا تھا یعنی اس کا وزیر سلطنت یا وزیر اعظم (سب سے بڑا وزیر دو ریاستوں کا منتظم اعلیٰ تھا۔ وزارت سب سے بڑا منصب کہلاتا۔ وزیر اعظم عموماً اس کوشش میں رہتا کہ خلیفہ کو اپنا آلہ کار بنالے۔ یہی کوشش فضل بن سہل (ذوالریاستین)) کررہا تھا۔

وزارت کے مختلف درجے تھے۔ ہر محکمے کے وزیر الگ الگ مقرر تھے، مثلاً وزیر الحرب (وزیر دفاع یا وزیر جنگ)، وزیر الخراج (وزیر خزانہ)، ان سب سے بالاتر وزارت

اعظم کا منصب تھا عموماً وزارت حرب کا قلم دان، وزیر اعظم خود اپنے پاس رکھتا تھا۔ یوں اسی کو سپہ سالار اعظم بھی کہا جاتا۔ افواج کی کمان وہی کرتا کیوں کہ فضل بن سہل کو دو ریاستوں کی وزارت کا لقب ملا تھا اس نے اسی سبب بعد میں اپنے خیمے کے سامنے نصب کئے جانے والے پرچم کی خاطر ایسا نیزہ بنوایا جس کے دو پھل تھے۔ آدم زاد خود کو دوسرے آدم زادوں سے نمایاں کرنے کے لئے سر کے بل کھڑے ہونے میں بھی کوئی عار نہیں سمجھتے۔

فضل بن سہل کے بارے میں مجھے ایک بات اور بھی معلوم ہوئی کہ وہ مجوسی تھا۔ مجوسی، مجوس کا واحد ہے۔ یہ لفظ جمع ہے۔ اس آدم زاد کو مجوسی کہتے ہیں جو آتش پرست (زردشت کا تابع، پارسی) ہو۔

ہارون کے دربار میں کیونکہ ہر مذہب و ملت کے لوگ تھے اس لئے ایک مجوسی (فضل بن سہل) کو بھی موقع مل گیا۔ مسلمان صرف صلاحیت دیکھتے تھے۔ بندہ اہل ہونا چاہئے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ خاص طور پر ہارون کے زمانے میں اس رجحان کو بڑی تقویت ملی۔

190 ہجری میں جب کہ ہارون زندہ تھا، پہلی بار اسے فضل بن سہل کی بابت بتایا گیا کہ بڑا لائق ہے۔ اسی کے ساتھ یہ تجویز بھی ہارون کو دی گئی کہ اس مجوسی کو مامون کا مصاحب بنا دیا جائے۔

بہ طور امتحان ہارون نے فضل مجوسی کو دربار میں طلب کیا۔ اس پر ہارون الرشید کے دربار کی عظمت و جلال کا ایسا اثر ہوا کہ ہکا بکا رہ گیا۔ آداب و سلام کے معمولی الفاظ بھی اس سے ادا نہ ہوئے۔

اس پر ہارون نے اپنے وزیر سلطنت کی طرف دیکھا جو ربیع کا بیٹا فضل تھا۔

"اے امیر المومنین! غلام کی سعادت کی یہ بڑی دلیل ہے کہ آقا کی ہیبت سے اس کی زبان گنگ ہو جائے۔" ابن ربیع نے آگے بڑھ کر ادب سے کہا۔

ہارون پھڑک اٹھا اور ابن ربیع کے انتخاب کو پسند کیا۔

یوں فضل مجوسی (ذوالریاستین)، مامون کا ندیم خاص رہا۔ اسی بنا پر مامون نے ابتدا میں اسی کو اپنا بااختیار وزیر سلطنت بنایا۔ اس سے قطع نظر کہ اس کا مذہب کیا تھا، وہ ایک لائق آدم زاد تھا۔

اس کا ذکر چھڑ گیا تو میں کچھ اور بھی بتا دوں تا کہ تصویر کے دونوں رخ سامنے آ جائیں۔

فضل (مامون کا وزیر سلطنت) علم نجوم کا بہت بڑا ماہر تھا۔ علم نجوم صحیح ہو یا غلط، مگر فضل

کی کچھ پیش گوئیاں قطعی درست ثابت ہوئیں۔ اس نے اپنی بابت بھی پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں آگ اور پانی کے درمیان اڑتالیس (48) برس کی عمر میں قتل کیا جاؤں گا۔ عجب سا لگتا ہے کہ اس آدم زاد کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ چونکہ وہ حمام میں مارا گیا تھا اس لئے اس کی یہ پیش گوئی پورے طور پر تسلیم کی گئی۔ فضل کے قتل کا واقعہ اپنے مقام پر عرض کیا جائے گا۔ ابھی تو میں 193 ہجری کے وسط سے آگے نہیں بڑھی۔

خود پرستی ذوالریاستین (فضل) کے مزاج میں داخل رہی۔ اگر اس عیب کو درگزر کر دیا جائے تو اس میں بڑی خوبیاں بھی تھیں ورنہ ہارون اسے اپنے عزیز از جان بیٹے مامون کے قریب پھٹکنے بھی نہ دیتا۔ فیاض، مدبر، فرزانہ، علم دوست یہ صفات اس آدم زاد کی ہیں جو مامون کی حدود مملکت میں سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ اس نے اپنے بھائی حسن بن سہل کو بھی ساتھ لگا رکھا تھا۔ اپنی پراسرار داستان کو میں نے فضل مجوسی کے ذکر سے پہلے جہاں چھوڑا تھا، وہیں سے جوڑتی ہوں۔

دوسرے دن عارج، نیشاپور سے بغداد لوٹ آیا۔ بغداد کی طرف کوچ کرنے والا لشکر طوس سے گزشتہ رات ہی کو نیشاپور پہنچا تھا۔ صبح ہوئی تو مرو سے روانہ کئے گئے وہ قاصد صاعد اور نوفل ربیع کے بیٹے فضل سے ملے۔ یہ دونوں قاصد، مامون کے خادموں میں شامل تھے۔ ان کا انتخاب ذوالریاستین نے کیا تھا۔

عارج نے سارا نقشہ اپنے الفاظ میں یوں کھینچا کہ مجھے لگا، خود سب کچھ دیکھا ہو۔

بہ قول عارج ہوا یہ کہ مرو سے مامون کے دونوں خادم جب فضل بن ربیع سے ملے تو وہ عیار آدم زاد کہنے لگا۔ "میں ہی اکیلا کیا اس لشکر میں ہوں جو مامون نے مجھے خط لکھا ہے!"

فضل بن ربیع کے علاوہ فوج کے دیگر اہم سرداروں کے نام بھی مامون کے خط، صاعد اور نوفل کے پاس تھے۔ ان میں سے ایک عبدالرحمٰن تھا۔ غریب ساعد جب عبدالرحمٰن کے پاس پہنچا تو گھبرا گیا۔ عبدالرحمٰن نے ساعد کو گھسیٹ کر زمین پر گرا لیا اور نیزہ مارنے کا قصد کیا، پھر جانے کیا سوچ کر ایسا نہیں کیا۔ اس نے ساعد کے سینے پر پاؤں رکھ دیا اور نیزے کا پھل دکھا کر بولا۔ "اگر تیرا آقا (مامون) یہاں ہوتا اور مجھ سے اپنی فرماں برداری کے لئے کہتا تو اس کے سینے پر پاؤں کے بجائے اپنا نیزہ رکھ دیتا۔" یہ کہہ کر عبدالرحمٰن، مامون کو گالیاں بکنے لگا۔

اس پرخطر "واردات" کے بعد دونوں خادموں میں کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ دیگر سرداران فوج سے ملتے اور انہیں مامون کے خطوط پہنچاتے۔ وہ بہ ہزار خرابی اپنی جان بچا کر لشکر سے نکل گئے۔

جب عارج یہ سب کچھ بیان کر چکا تو مجھ سے پوچھا "جاؤں!...... تاکہ نت نئی خبر لاؤں؟"

"جا مگر نت نئی خبر کے بہانے کہیں اور نہ کھسک لیجیو!"

"تجھے اگر مجھ پر بھروسا نہیں تو نہ بھیج! خود ہی تو کہہ رہی تھی کہ......" "اچھا بھروسا ہے بس!" میں بول اٹھی۔

پھر "خدا حافظ" کہتے ہی عارج چپت ہو گیا۔ میں اترا کر چلنے والے امین کے پاس جا پہنچی۔ اس نے قصر خلافت میں اودھم مچا رکھا تھا۔ گویا اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی تھی یا یوں کہہ لیں کہ بندر کے ہاتھ ادرک! اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ جانے کیا سے کیا کر بیٹھتا۔ آج رقہ سے اس کی ماں زبیدہ خاتون نے پیغام بھیجا تھا کہ وہ جلد بغداد پہنچ رہی ہے۔ اس بیوہ آدم زادی زبیدہ ہی کے پاس سارا خزانہ تھا جسے ساتھ لئے وہ بغداد آنے والی تھی۔

امین کی خوشی کا اصل سبب یہ خزانہ ہی تھا۔ فوجیوں سے دو سال کی پیشگی تنخواہ کا وعدہ پورا ہو جاتا، اگر خزانہ بغداد تک حفاظت کے ساتھ پہنچ جاتا۔

ہارون کی بیوی زبیدہ بڑی ہوشیار، ذہین اور مصلحت وقت کا صحیح اندازہ لگانے والی آدم زادی تھی۔ امین کی ماں ہونے کے باوجود اس میں عقل تھی۔ وہ بھلا خزانے کی حفاظت سے کیسے غافل ہو جاتی! غرض کہ وہ سابق دارالحکومت انبار تک پہنچ گئی اور امین اس کے استقبال کو وہاں پہلے ہی پہنچ گیا۔

زبیدہ بغداد آئی تو گویا امین کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنی "امی حضور قبلہ" کو ساتھ لیے قصر خلافت میں یوں داخل ہوا جیسے پوری دنیا کو فتح کر کے آ رہا ہو۔ میں قصر خلافت ہی میں تھی مگر کسی آدم زادی کا جسم نہیں اپنایا تھا۔ ابھی کچھ خبر نہ تھی کہ نیشاپور سے لشکر کب تک بغداد پہنچے گا۔ عارج دو روز سے غائب تھا۔ میں اس کی تلاش میں جانے ہی والی تھی کہ وہ "ٹپک" پڑا۔

"اب تو کہیں نہیں جائے گا، یہیں بغداد میں میرے ساتھ رہے گا!" میں نے غصے میں کہہ دیا۔

"آگ سے بنی ہوئی اے جن زادی! تیرے غصے سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔" عارج شوخ آواز میں بولا۔ "اگر تیرا یہی حکم ہے تو یہ جن زادہ اب تیرا فراق نہیں جھیلے گا۔"

اس کے بعد چند روز اور گزرے ہوں گے کہ طوس سے لشکر بغداد پہنچ گیا۔ عارج اور میرے انسانی قالب، یعنی اسحاق و کلثوم بھی بغداد آ گئے۔ چند روز کے لئے مجھے آدم زادیوں

کے جسموں میں قید ہونے سے نجات ملی تو فوری طور پر دوبارہ پابندی کو جی نہ چاہا۔ عارج تو پہلے سے تنگ تھا۔ میں نے اس سے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو کھل اٹھا۔

"اے دینار! تو بہت اچھی ہے۔"

"یہ تو مجھے کوئی اطلاع دے رہا ہے؟"

"نہیں۔ میں تو کہہ رہا تھا کہ کسی آدم زاد یا آدم زادی کے بدن پر قبضہ کئے بغیر بھی ہم اپنا کام چلا سکتے ہیں نہ" عارج نے کہا۔ جواباً میں کچھ نہیں بولی کہ عارج مزید نہ "پھیلنے" لگے۔ ہم جب چاہتے قصر خلافت میں جا گھستے اور جب جی میں آتی وہاں سے نکل آتے۔ اب ہمیں عفریت وہوش کی طرف سے خطرہ نہ تھا۔ عالم سوما ہماری پشت پناہی کے لئے مستور تھا۔

کسی انسانی پیکر میں "بند" نہ ہونے کا ایک فائدہ مجھے یہ ہوا کہ مامون کے حالات سے بھی واقف رہی۔ عارج کی جو حیثیت اس سے قبل تھی، گویا بحال ہو گئی۔ وہ اور بھی میرا "عاشق صادق" ہو گیا۔ اس پر میں نے ایک دن عارج کے وجود کو "موم کی ناک" سے تشبیہ دے دی تو "پھکا" گیا، بولا۔ "میں موم ووم بالکل نہیں، تیری ہی طرح آگ سے بنا ہوں۔"

"میں تو یہ بات بھول ہی گئی تھی۔" میں ہنس دی تو وہ بھی "قہقیانے" لگا۔

ہنسی ہنسی میں ایک دن امین کے میں نے چپت جڑ دی۔ وہ اچھل کر ادھر ادھر دیکھ کر ڈر گیا۔ اس کے پاس غلام کوثر کے سوا کوئی نہ تھا۔ امین کو اس سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اسے "چپتیا" دے گا، سو ہڑبڑا کے رہ گیا۔

"کیا ہوا میرے آقا؟" کوثر بولا۔

"کچھ نہیں، چپ رہ!"

دراصل میں نے بلاوجہ امین کو نہیں "ستایا" تھا۔ اس نے فضل بن ربیع کو طلب کیا تھا۔ اس کے دماغ میں جو کھچڑی پک رہی تھی، مجھے معلوم تھی۔ فضل کچھ ہی دیر میں حاضر خدمت ہو گیا۔

"اے امیر المومنین! حکم فرمایئے۔" فضل تعظیم بجالا کے کہنے لگا۔

"تمہیں خبر ہے کہ ہمیں دریا میں سیر کا بہت شوق ہے، پھر تم نے اب تک ہمارے لئے کشتیاں کیوں نہیں بنوائیں؟"

جواب طلبی پر فضل چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔ "امیر المومنین نے اس غلام کو اب تک اپنی پسند سے آگاہ نہیں کیا۔"

"پسند سے کیا مطلب ہے تمہارا؟" امین نے سوال کیا۔

”طرح طرح کی کشتیاں بنائی جاتی ہیں اے امیر المومنین!...... حضور کس وضع......“

امین نے فضل کی بات کاٹ دی۔”معلوم ہے ہمیں...... ہاتھی، عقاب، سانپ، شیر اور گھوڑے سے ملتی ہوئی کشتیاں بنواؤ!“

فضل جھٹ سے بول اٹھا۔”امیر المومنین کے حکم کی تعمیل ہوگی۔“

امین نے اسے رخصت کا اشارہ کردیا۔ میں سوچنے لگی، امین اگر فضل سے کہتا کہ”ہم تمہاری پیٹھ پر بیٹھ کر دریا کی سیر کریں گے“ تو شاید فضل اپنی جان بچانے کے لئے اس پر بھی آمادہ ہو جاتا۔ آدم زاد بڑی جلدی سنک جاتے ہیں، خصوصاً حکمراں! جب امین کے حکم پر مطلوبہ کشتیاں بن کر تیار ہوگئیں تو وہ ان میں بیٹھ کر پانی کی سیر کو جانے لگا۔ عموماً وہ شیر سے مشابہ کشتی میں بیٹھتا اور یہ نہ سوچتا کہ درندہ نہیں آدم زاد ہے۔ ان صحبتوں میں اسے مامون کا خیال تک نہ رہا، لیکن فضل بن ربیع چوکنا دکھائی دیتا۔ اسی نے امین کو اس بات پر آمادہ کیا کہ بحیثیت خلیفہ، مامون کو معزول کردے، مگر امین نے انکار کردیا۔

فضل کو ڈر یہ تھا کہ مامون کو اقتدار مل گیا تو اس کی خیر نہیں۔ اس نے اسی لئے امین سے کہا۔”اے امیر المومنین! جو بیعت تمام ملک سے لی گئی وہ آپ کے لئے تھی۔ ایسی صورت میں خلیفہ مرحوم ہارون الرشید کو اس میں کسی تبدیلی کا اختیار نہ تھا۔“

یہ بات امین کے دل میں اتر گئی۔ فضل سے خلوت میں ملاقات کے بعد اگلے روز اس نے دربار میں اظہار کیا۔”آج سے مامون کو معزول کرتے ہیں۔ ہمارا ولی عہد زادہ موسیٰ بن امین ہوگا۔“

دربار میں اگرچہ زیادہ تر وہی لوگ تھے جو امین کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے، پھر بھی میں نے ایک درباری عبداللہ بن حازم پر”کام“ دکھادیا۔ وہ میرے زیر اثر دربار میں بڑی بے باکی سے بولا۔”آج تک کسی نے عہد شکنی نہیں کی اے امیر المومنین!...... آپ یاد رکھیں کہ یہ روایت آپ قائم کررہے ہیں۔“

اس پر امین خفا ہوکر بولا۔”عبدالملک تجھ سے زیادہ عقل والا تھا۔ اس کا قول ہے کہ جنگل میں دو شیر نہیں رہ سکتے۔“

فضل بھی دربار میں موجود تھا، امین سے کہنے لگا۔”اے امیر المومنین! بہتر یہ ہوگا کہ فوج کے افسران کو بھی طلب کرلیا جائے۔“

امین نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

اہم افسران فوج دربار میں آگئے تو خزیمہ کو میں نے اپنا ہدف بنایا۔ اس نے صاف

الفاظ میں کہا۔”امیر المومنین اگر مامون سے کیا گیا عہد توڑتے ہیں تو ہم فوجی افسروں سے بھی اپنی نسبت کچھ امید نہ رکھیے۔“

وقتی طور پر امین اپنے ارادے سے باز رہا، لیکن فضل کا”جادو“ کیسے بے اثر جاتا۔

چند ہی روز بعد پوری مملکت میں احکام بھیج دیئے گئے کہ خطبوں میں مامون کے بجائے موسیٰ بن امین کا نام پڑھا جائے۔ خود کو تاریخ کس طرح دہراتی ہے، موسیٰ بن امین کی ولی عہدی کا اعلان اسی کا ثبوت تھا۔ یہی کوشش ہارون کے بڑے بھائی ہادی نے بھی کی تھی۔ ہادی کا بیٹا بھی کم عمر تھا اور یہی معاملہ موسیٰ بن امین کے ساتھ تھا۔

مامون دھیرے دھیرے قوت پکڑ رہا تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اپنے وزیر مملکت فضل مجوسی کے جال سے نکل جائے۔ فضل مجوسی کے ایما پر مامون نے اعلانیہ اس کی مخالفت شروع کردی۔ خراسان والے اس کے ساتھ تھے۔

امین نے بنو عباس ہی کے ایک شہزادے کو مامون کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا کہ مامون، اس کے بیٹے کو ولی عہد تسلیم کرے۔ مامون نے صاف انکار کردیا، اس کے باوجود امین ملک گیری کی ہوس میں مبتلا رہا، اس نے بغداد سے مرو تک قاصدوں کا تانتا باندھ دیا، اپنی ماں زبیدہ کی طرف سے بھی امین کو شہ تھی۔

قاصدوں کے ذریعے بھیجے گئے پیغامات میں سے ایک پیغام میں امین نے خراسان کے بعض اضلاع طلب کیے۔ اس پیغام کو پڑھ کر مامون کو غصہ تو آیا مگر پی گیا، وقت کا یہی تقاضا تھا۔

”امین کو اس طرح کی خواہشوں سے باز آنا چاہیے۔“

میں سمجھ رہی تھی کہ یہ کارروائیاں جنگ کا دیباچہ ہیں۔

اسی بنا پر مامون نے احتیاطاً اپنی حدود مملکت میں فرامین بھیجے کہ کوئی شخص جب تک سند اجازت نہ رکھتا ہو یا مشہور تاجر نہ ہو ممالک محروسہ میں داخل نہیں ہوسکتا اس نے فوجی افسروں کو تاکید لکھی کہ سرحدی مقامات پر معمول سے زیادہ فوج اور سامان جنگ تیار رہے، طاہر بن حسنی ایک جنگ جو افسر تھا اسے حکم ملا کہ جس قدر جلد ممکن ہو فوج اپنے ساتھ لے کر دشمن کو روکے، آدم زاد طاہر یک چشم تھا، اس وجہ سے کبھی کبھار اپنے ساتھیوں کے مذاق کا نشانہ بھی بنتا رہتا۔

”ہمارا دوست طاہر سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے، انصاف تو ختم ہے اس پر“ کوئی کہتا، اسی بات کو دوسرا دوست دوسرے لفظوں میں کہہ دیتا اور طاہر جل بھن کر رہ جاتا۔

ایسے موقعوں پر عموماً ایک فرضی قصہ سناتا جس سے آنکھ کا ضائع ہونا اور بہادری دونوں ہی کا اظہار ہوتا۔ طاہر بن حسین کا کہنا اپنی جگہ لیکن اس فطری محرومی نے ایک نئی شکل اختیار کرلی۔ ''میں کچھ بن کے دکھاؤں گا۔'' اسے بچپن ہی سے یہ ''جنون'' تھا۔ فضل مجوسی کو اس ''جنون'' کی خبر تھی۔ سو اس نے مامون کو طاہر کا نام تجویز کیا۔

امین تو کسی بہانے کی تلاش میں تھا۔ مخبروں نے جب یہ خبریں پہنچائیں کہ سرحد پر مامون کی فوج نقل و حرکت کر رہی ہے تو بھڑک اٹھا۔

''یہ تو سراسر گستاخی ہے۔ کیوں فضل؟''

ربیع کا بیٹا تو گویا اس پر تلا بیٹھا رہتا تھا کہ کب امین کی تائید کا موقع ملے، وہ مفسد بولا ''جی امیر المومنین! آپ کو مامون کی گستاخیاں برداشت نہیں کرنی چاہئیں اس موقع پر یہ غلام ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہے۔''

''اجازت ہے'' امین نے اکڑ کر کہا۔

جب اہل دربار متوجہ ہوگئے تو فضل بلند آواز میں بولا۔ ''امیر المومنین کے اس غلام نے اپنے دیرینہ رفیق علی بن عیسیٰ کو راضی کرلیا ہے کہ وہ مامون کا ساتھ چھوڑ کر بغداد آجائے۔''

امین بڑا بے صبرا تھا، فوراً بول اٹھا۔ ''ہم علی بن عیسیٰ کو اپنی فوج کا سالار عظیم (سپہ سالار) مقرر کرتے ہیں۔''

''مرحبا..... مرحبا!..... سبحان اللہ، سبحان اللہ'' سے دربار گونج اٹھا۔ یہ وہ درباری تھے جنہیں فضل نے پہلے ہی استوار کرلیا تھا۔

امین تو خیر غافل تھا اور دوسروں کو بھی خبر نہیں تھی کہ علی بن عیسیٰ ایک رات پہلے ہی فضل کے محل نما گھر میں آچکا ہے، میں البتہ واقف تھی۔ مجھے یہ خبر دینے والا عارج تھا۔ یہ وہی محل نما گھر تھا جسے کبھی باغی فوجیوں نے جلا ڈالا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب فضل کا باپ ربیع وزیر سلطنت تھا۔ وہ فوجیوں سے تنخواہوں کی ادائیگی کا وعدہ کرکے محل کے خفیہ راستے سے مع اہل خاندان کے فرار ہوگیا تھا، ہارون ہادی کی ماں ملکہ خیزران زندہ تھی اس نے ربیع کو تلاش کرکے قصر خلافت میں بلوالیا اور صورتحال کو مزید بگڑنے سے روک لیا، بغداد میں ہارون الرشید نہیں تھا، اس کی آمد تک باغی فوجی خاصا نقصان کرچکے تھے۔ غرض کہ جلائے جانے والے اس محل نما گھر کو فضل نے دوبارہ تعمیر کرالیا تھا اس گھر میں علی بن عیسیٰ مرو سے آکر ٹھہرا ہوا تھا۔ دربار ختم ہوتے ہی فضل ''لپک جھپک'' اپنے گھر آیا اور علی بن عیسیٰ کو یہ خوشخبری

سنائی۔

وہ علی بن عیسیٰ جو گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں ماہر تھا اور جسے امین کے باپ ہارون نے معزول کردیا تھا اس کی دال مرو میں نہ گلی تو بغداد آگیا، مرو میں ''دال گلانے والا'' فضل مجوسی اس سے خوش نہ ہوا۔

علاقائی سازشیں عروج پر تھیں جن کا بانی مبانی ربیع کا بیٹا فضل تھا مگر خود امین بھی کم نہ تھا۔

اس عرصے میں امین نے وہ دستاویزیں جو معاہدہ بیعت کی نسبت سے لکھی گئی تھیں مکہ معظمہ سے منگوا کر چاک کر ڈالیں اس کے ساتھ ہی امین نے اپنے بیٹے موسیٰ کو ناطق بالحق کا خطاب دیا۔

فضل بن ربیع نے جب دربار میں علی بن عیسیٰ کو پیش کیا تو امین نے اس کے لئے دو لاکھ دینار انعام کا اعلان کیا، پھر امین نے سات ہزار مغرق (جگمگاتی) خلعتیں معمولی فوجی افسروں تک کو پیش کیں، مقصد فوجیوں کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔

کوچ کے دن فوج اس سروسامان سے آراستہ ہوکر نکلی کہ بغداد کے بڑے بڑے معمر اور سن رسیدہ جو فوجی جاہ و حشم کے ہزاروں تماشے دیکھ چکے تھے، حیرت زدہ رہ گئے۔

علی بن عیسیٰ روانگی کے وقت زبیدہ خاتون سے رخصت ہونے قصر خلافت میں آیا۔

مجھے وہ آدم زادی زبیدہ (امین کی ماں) اچھی نہ لگی، مامون لاکھ سوتیلا بیٹا سہی مگر ایسے سلوک کا مستحق نہ تھا جو زبیدہ نے اس کے ساتھ کیا، میں جن زادی اس پر افسوس ہی کرسکی۔

زبیدہ نے علی بن عیسیٰ کو چاندی کی ایک زنجیر منگوا کر دی اور بولی ''مامون پکڑا جائے تو اسے چاندی کی اس زنجیر سے باندھ کر بغداد لانا!'' پھر وہ کہنے لگی ''امین اگرچہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے تاہم مامون کو بھی مجھ پر بہت کچھ حق ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ کس کا بیٹا ہے اور کس کا بھائی ہے! پاس ادب ملحوظ رکھنا، سخت سست کہے تو برداشت کرنا، راہ میں اس کے گھوڑے کی رکاب تھام کر چلنا، تب جب کہ بغداد میں داخل ہو اسے کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے پائے، تم اچھی طرح جانتے ہو مامون کا مرتبہ کیا ہے، یاد رکھو کہ تم کسی صورت اس کے ہمسر نہیں ہوسکتے۔''

یہ وہ زبیدہ تھی کہ جس کی ایجاد پسند طبیعت نے زیب و زینت کو نئے زاویے دیئے۔ ہارون ہی نہیں دوسرے آدم زادوں نے بھی اس کی اختراعات و ایجادات پسند کیں۔ عنبر کی

شمعیں پہلے پہل اس کے شبستان عیش میں جلائی گئیں، آبنوس وصندل (آبنوس: ایک قسم کا درخت جس کی لکڑی نہایت سیاہ، وزنی ومضبوط ہوتی ہے، صندل: ایک طرح کی سفید خوشبودار لکڑی) کے تھیے اسی آدم زادی نے سب سے پہلے تیار کروائے، سفید وسیاہ کا امتزاج زبیدہ کے مزاج کی عکاسی کرتا ہے، وہ اپنے شوہر ہارون کو لگی تھی، یوں بھی ہارون کے چچا جعفر کی بیٹی تھی، ان حسابوں اس نے بھی جب اس آب وگل میں آنکھ کھولی تو ہر طرف "ہرا ہی ہرا" تھا، کپڑوں کی تراش خراش بھی پیدائشی طور پر دولت مند اس آدم زادی نے نئے نئے انداز نکالے۔ سوتیلے بیٹے مامون کے لئے چاندی کی زنجیر بنوانا اس جیسی کے دماغ میں آسکتا تھا۔

علی بن عیسیٰ پچاس ہزار فوج لے کر بغداد سے نکلا تو عارج مجھ سے بولا۔ "اے دینار! ہم بھی کیوں نہ اس آدم زاد علی بن عیسیٰ کے ساتھ چلیں!"

"کس لئے؟" میں نے کہا "کہیں تیری یہ منشا تو نہیں کہ یہ غدار بے وفا علی بن عیسیٰ جیت جائے؟...... یہ نہ ہارون کا ہوا نہ اس نے مامون سے وفا کی، یہ تو منافق ہے۔"

"یوں زور زور سے بول کر مجھے رعب میں تو نہ لے اے دینار۔"

"میں زور سے بولوں یا آہستہ، رعب میں تو ہے تو میرے!"

"تجھے غلط فہمی ہے اور میں...... میں تیری یہ غلط فہمی دور کرنا نہیں چاہتا۔"

"ڈال دیئے نا ہتھیار!" میں ہنسی۔

☆......☆......☆

"تیرے آگے ہتھیار ڈالنے ہی میں امن چین ہے ورنہ تو بغداد کی آدم زادیاں ہی نہیں جن زادیاں بھی میری جان کو لاگو ہو جائیں گی۔ میں اس برے وقت سے بچنا چاہتا ہوں۔"

"تو اس لیے بچ جائے گا کہ میرے ساتھ ہے مگر یہ تیرا خلیفہ وقت مسمی محمد امین مجھے بچتا ہوا نہیں لگتا۔"

"کیوں اس غریب کی جان کو پڑی ہے اے دینار!"

"وہ غریب نہیں خلیفہ ہے، کبھی تو نے اسے قریب سے دیکھا ہے۔"

"میں اس موئے کو کیوں دیکھوں! اگر دیکھنا ہی ہوگا تو کسی آدم زادی کو قریب سے دیکھوں گا۔"

"اور پٹوں گا...... یہ بھی تو کہہ۔"

"اس یک چشم آدم زاد طاہر کو تو دیکھ آنے دے جو تیرے مامون کی طرف سے لڑنے

آرہا ہے۔"

"تجھے کسی نہ کسی بہانے سے گھومنا ہے کہیں نہ کہیں، اچھا چل...... چلتے ہیں۔" میں راضی ہوگئی۔

علی بن عیسیٰ پچاس ہزار فوج لے کر "رے" کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راہ میں اسے جو قافلے ملتے وہ مختلف "کہانیاں" سناتے۔ ان "قصوں" کا حاصل یہ تھا کہ طاہر مقام رے میں بڑی تیاریاں کر رہا ہے مگر علی کثرت فوج پر اتنا مغرور تھا کہ اسے مطلق پروانہ تھی وہ آگے بڑھتا ہوا رے کی حد تک پہنچ گیا۔

طاہر کو لوگوں نے رائے دی کہ شہر میں رہ کر علی کا مقابلہ کیا جائے کیوں کہ مختصر فوج میدان میں کام نہیں دے سکتی، طاہر نے کہا اگر دشمن کی فوجیں شہر پناہ تک پہنچ گئیں تو ظاہری غلبہ دیکھ کر شہر والے ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔

صرف چار ہزار فوج لے کر طاہر باہر نکلا۔ علی بھی قریب پہنچ گیا تھا۔

دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں۔ علی کی فوج نہایت ترتیب سے آگے بڑھی سب سے آگے زرہ پوشوں کا رسالہ تھا۔ پیچھے سو سو قدم کے فاصلے پر دس علم تھے اور ہر علم کے نیچے سو (100) سوار تھے۔ علموں کے پیچھے خاص گارد (گارڈ کا بگڑا ہوا لفظ، سنتری، پہرے دار، محافظ، چوکیدار، پیش رو) تھا۔ اس کے قلب میں علی تھا اور پہلو میں بڑے بڑے تجربے کار تھے۔ طاہر کی فوج گو مختصر تھی مگر اس کی تقریروں نے سپاہیوں میں جوش بھر دیا تھا، اسے خطابت آتی تھی۔ تقریر کی اس صفت نے دشمن کی کثرت فوج کا خیال ان کے دماغ سے نکال دیا، مجھے اعتراف ہے کہ اس میں کچھ میری بھی "کارستانی" تھی۔ اس پر عارج نے اعتراض بھی کیا مگر میں ان سنی کر گئی۔ سننے والا اگر جان بوجھ کر سننا نہ چاہے تو اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے، میں نے بس اتنا کیا تھا کہ طاہر کی مختصر فوج کی کمان کرنے والوں کے ذہنوں سے موت کے خوف کو جھٹک دیا تھا۔

سب سے پہلے جس آدم زادے نے صف میں سے نکل کر لڑائی شروع کی، وہ علی کی فوج کا ایک نامور بہادر تھا۔ حاتم نامی اس آدمی کا مقابلہ کرنے کی غرض سے طاہر نے یہ انتظار نہ کیا کہ اسی کے رتبے کا کوئی سوار مقابل آئے، طاہر کو صرف اپنے زور بازو پر اعتماد تھا سو خود مقابلے کو نکلا، اس نے جوش غضب میں آ کر دونوں ہاتھوں سے اپنی تلوار کا قبضہ پکڑا اور اس زور سے وار کیا کہ ایک ہی ضرب نے حاتم کا فیصلہ کر دیا۔

اب عام لڑائی شروع ہوئی۔ علی کی فوج نے طاہر کے میمنے اور میسرے پر حملہ کیا، حملہ

شدید تھا' مگر جنہیں موت کا خوف نہ ہو انہیں کون پیچھے ہٹا سکتا ہے! نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے علم برداروں کی صفیں الٹ دیں۔

میں اس موقع کی انتظار میں تھی' طرح طرح کی دہشت ناک آوازیں نکال کر میں نے علی کی فوج میں ابتری پھیلا دی۔ اس ہنگامے کے دوران میں ایک اور "کام" بن گیا' وہ علی بن عیسیٰ کہ جو میرے نزدیک "گرگٹ" سے کم نہیں تھا میرے سامنے آ گیا' اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں' اس کا غرور خود اس کے سامنے خاک میں مل رہا تھا۔ میں نے مڑ کر یک چشم طاہر کے ایک کماں دار کو دیکھا' علی اور اس کے کماں دار کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ تھا۔

"اپنی کمان میں تیر جوڑ اور علی بن عیسیٰ کا کام تمام کر دے۔" میں نے سرگوشی کی۔

دوسرے ہی لمحے فضا میں سنسناتا ہوا تیر' علی کی گردن میں ترازو ہو گیا۔ کماں دار نے لپک کر علی بن عیسیٰ کا سر کاٹ لیا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا طاہر کے پاس پہنچ گیا۔

طاہر یک چشم کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔

عارج مجھ سے بولا۔ "اے دینار! بڑے رنج کی بات ہے کہ تو نے عرب ہو کر ایک نصف عرب' یعنی مامون کا ساتھ دیا۔"

"تو رنج کرتا رہ' میں چلی۔" میں نے جواباً کہا اسی روز طاہر نے مختصر لفظوں میں مامون کو نامہ فتح لکھا' کتابی الی امیر المومنین ورأس علی بن یدی و خاتمہ فی اصبعی و جندہ مصرفون تحت امروی' یعنی میں امیر المومنین کو خط لکھ رہا ہوں اور علی کا سر میرے سامنے ہے' اس کی انگوٹھی میری انگلی میں ہے اور اس کی فوج میری کمان میں ہے۔

قاصدوں نے مرو سے موتک کی مسافت جو ڈھائی سو فرلانگ سے کم نہ تھی تین دن میں طے کی اور چوتھے دن مامون کے دربار میں داخل ہوئے۔ دو دن کے بعد علی بن عیسیٰ کا سر پہنچا' بہ نظیر عبرت تمام خراسان میں اس کی تشہیر کی گئی۔

عارج کو ساتھ لیے میں' مرو سے بغداد لوٹ آئی۔

قصر خلافت میں بنے ہوئے ایک حوض کے کنارے خلیفہ محمد امین اپنے غلام کوثر کے ساتھ مچھلیوں کا "شکار" کھیل رہا تھا۔ حوض میں رنگ برنگ کی مچھلیاں پڑی تھیں۔ ان مچھلیوں کو سونے کی نتھنیاں پہنائی گئی تھیں' نتھنیوں میں بیش قیمت موتی جڑے ہوئے تھے کہ جس کے شکار میں جو مچھلی آئے موتی بھی اسی کو ملے' کنیزوں اور غلاموں کو خوش کرنے کا یہ بھی ایک بہانہ تھا۔

امین اکثر اپنی خوبصورت لونڈیوں کے ساتھ اس حوض کے کنارے شکار کھیلتا تھا' آج

بھی وہ اسی شغل میں تھا کہ دفعتہ مسرور وہاں آ پہنچا۔ ہارون کے محافظ دستے کا نگراں مسرور اب امین کے لیے فرائض انجام دیتا تھا۔

مسرور نے فوج کی شکست اور علی بن عیسیٰ کے مارے جانے کی خبر سنائی۔

امین نے چلا کر کہا۔ "خاموش! کوثر دو مچھلیاں پکڑ چکا ہے اور مجھے صبح سے اب تک ایک بھی نہیں ملی۔"

میرا جی چاہا کہ اس سونے آدم زاد امین کو حوض میں دھکیل دوں' مگر عارج نے مجھے روک لیا۔

"اے دینار! تو ان آدم زادوں کے معاملے میں اتنی جذباتی کیوں ہو جاتی ہے! عالم سوما کی نصیحت نہ بھولا کر۔"

عارج کے سمجھانے پر امین کو میں نے کوئی سزا دیے بغیر چھوڑ دیا۔

امین شکار سے فارغ ہوا تو فضل بن ربیع کو طلب کر لیا۔ علی بن عیسیٰ کو اسی کی سفارش پر سپہ سالار بنایا گیا تھا۔ فضل کو بھی خبر ہو چکی تھی کہ علی بن عیسیٰ "خرچ" ہو گیا' وہ اپنے مخبران "صادق" کے ذریعے حالات سے باخبر رہتا تھا' طلبی ہوئی تو وہ سمجھ گیا کہ "ملبہ" مجھ پر گرنے والا ہے۔ سو وہ پہلے ہی تیاری کر کے قصر خلافت میں پہنچا' امین نے اسے خلوت میں بلوا لیا جو خلوت سے زیادہ جلوت معلوم ہوتی تھی' حسین کنیزیں' امین کو گھیرے ہوئے تھیں۔

"بولو فضل' تمہارے علی بن عیسیٰ کا کیا حشر ہوا!" امین بولا "امیر المومنین کا یہ غلام کبھی غافل نہیں رہتا۔" فضل نے شیخی بگھاری "مجھے اطلاع مل چکی ہے۔"

"تو پھر تم نے کیا کیا؟" امین کے لہجے سے غصہ جھلکنے لگا۔

"غلام وہی عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے حضور۔"

"دے دی اجازت! کچھ کہو بھی!" امین اپنے عیش میں خلل پڑ جانے پر کبیدہ خاطر اور جھنجھلایا ہوا تھا۔

"مامون کا وکیل بغداد میں رہتا ہے' اسے......"

امین نے فضل کی بات کاٹ دی "اس شکست کا مامون کے وکیل سے کیا تعلق؟ تم یہ کیا بے پر کی چھوڑے جا رہے ہو' بولو کوئی تعلق ہے؟"

"حضور! براہ راست تو کوئی تعلق نہیں' لیکن......"

"پھر وہی رٹ لگا رہے ہو!...... تعلق نہیں تو اس کا ذکر کیوں کیے جا رہے ہو؟"

"غلام نے بلا سبب مامون کے وکیل کا ذکر نہیں چھیڑا۔" فضل نے ہمت کر کے کہہ ہی

دیا۔

امین نے اس پر قہر آلود نظروں سے فضل کو دیکھا۔ فضل کا چہرہ فق پڑ گیا اس کی آنکھوں میں موت ناچنے لگی۔ دراصل امین کو اتنا غصہ نہ آتا اگر میں اسے "سرکا" نہ دیتی۔

عارج نے مجھ سے کہا۔ "اے دینار! اس آدم زاد فضل کو معاف کر دے۔"

"تیری سفارش مان تو لیتی ہوں میں لیکن یہ کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائے گا۔"

"جب یہ کوئی گل کھلائے گا تو دیکھ لیں گے اسے۔" عارج بولا میرا اندازہ درست ہی نکلا' فضل بن ربیع نے شکست کی تلافی کے لیے مامون کے وکیل کو حراست میں لے لیا۔ وہ بغداد میں ہی مقیم تھا۔ اس بے چارے آدم زاد وکیل کا مال و اسباب فضل کے حکم پر ضبط کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ فضل نے اس سے دس لاکھ درہم بھی وصول کیے۔

امین نے ایک اور فوج تیار کی۔ اس فوج کی تعداد بیس ہزار سے کم نہ تھی' سپہ سالار عبدالرحمٰن مقرر ہوا اس زمانے میں طاہر ہمدان کے قریب ٹھہرا ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن وہاں تک جا پہنچا' اس نے ہمدان کو صدر مقام قرار دیا اور اپنی دانست میں جنگ کے اعتبار سے جو اہم مقامات تھے' وہاں سوار و پیادے مقرر کیے۔ میں کیوں کہ امین سے نالاں تھی' سو طاہر کو "اشکا" دیا' اس نے گویا میری شہ پر شہر کا محاصرہ کر لیا' عارج کو میری اس کارگزاری کی خبر لگی تو "بمک گیا' بولا۔" "اے دینار! یہ تو ناانصافی ہے تو مامون کی حمایت لے رہی ہے۔"

"میں نے کب حمایت لینے سے انکار کیا ہے!...... ویسے تجھے چپکے سے یہ بتا دوں کہ آدم زاد مامون سے میری کوئی رشتہ داری نہیں ہے' میرا مقصد تو فی الحال فقط یہ ہے کہ بغداد کو ایک نااہل آدم زاد امین سے نجات مل جائے' سمجھا!"

عارج نے برجستہ کہا۔ "کیا خبر مامون بھی نااہل نکلے؟"

"ہو سکتا ہے۔" میں ہنسی۔

"تو پھر تجھے امین سے اللہ واسطے کا بیر کیوں ہے؟"

"میری مرضی! تو کون قاضی کہ ملا!" میں نے مذاق میں بات اڑا دی اور خود وہاں سے اڑ گئی۔

مہینوں طاہر شہر ہمدان کا محاصرہ کیے رہا' آخر عبدالرحمٰن نے طاہر سے امان طلب کر لی جس کی مدد ایک جن زادی کر رہی ہو اسے دو چار عبدالرحمٰن بھی مل کر نہیں ہرا سکتے۔

امین کے سپہ سالار کو ہمدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

فتح ہمدان کے بعد طاہر کو میں نے قزوین کی راہ سجھائی' میں قزوین پہنچی وہاں کا عامل

(گورنر) کثیر تھا۔ یہ آدم زاد ڈرپوک نکلا' اسے میں نے مزید ڈرا دیا۔ "بھاگ لے کسی پتلی گلی سے ورنہ مارا جائے گا۔"

میری آواز کو کثیر نے اپنے باطن کی آواز سمجھا اور قزوین سے "پھوٹ" لیا۔

قزوین پر تو طاہر کا قبضہ ہو گیا لیکن دوسری جانب عارج نے "کام دکھا دیا۔" عبدالرحمٰن جو ہمدان سے بھاگ چکا تھا اسے ایک مرتبہ پھر طاہر کے مقابلے پر لے آیا' اب یہ "جنگ" (سرد جنگ) میرے اور عارج کے درمیان چھڑ گئی۔

موقع ملتے ہی میں نے عارج کو آڑے ہاتھوں لیا' بولی۔ "باز آ جاؤ ورنہ تو خواہ مخواہ بھی میں آ جائے گا تجھے آخر کیا پڑی تھی عبدالرحمٰن سے طاہر پر حملہ کرانے کی؟"

"اس کا مطلب یہ ہوا اے دینار کہ تو میری سراغ رسانی کرتی ہے۔"

"کچھ بھی مطلب نکال' مگر اتنا سن لے کہ مجھ سے جھگڑا کیا تو......"

"تجھ سے لڑ کر مجھے مرنا ہے کیا!" عارج میری "تڑی" میں آ گیا وہ گویا غیر جانبدار ہو گیا۔

عبدالرحمٰن نے اچانک حملہ کیا' طاہر کے لشکری ہتھیار بھی نہ سنبھال پائے' صرف پیادوں کی جماعت مسلح تھی' وہ نہایت ثابت قدمی سے لڑی' اگر وہ پیادہ (پیدل) فوج نہ لڑتی تو کرتی بھی کیا! میں جو اس کے عقب سے خوفناک آوازیں نکال رہی تھی اسے اپنے پیچھے اور آگے "ہرا ہی ہرا" دکھائی دیا اتنی فرصت پا کر طاہر کی گھڑ سوار فوج نے بھی ہتھیار سنبھال لیے اور سخت معرکہ ہوا عارج پر میری نظر تھی کہ وہ اپنی "غیر جانبداری" سے "دست بردار" نہ ہو جائے آدمیوں کی طرح جن زادوں کو بھی "بگڑتے" دیر نہیں لگتی۔

قصہ مختصر یہ کہ عبدالرحمٰن کی فوج نے شکست کھائی "کھانے" کو اور بچا بھی کیا تھا! پھر بھی "ڈھیٹ" عبدالرحمٰن ثابت قدم رہا اس کے ساتھیوں نے کہا کہ اب لڑنا بے سود ہے' بھاگ چلئے۔

اس پر "اینٹھو" عبدالرحمٰن اور اینٹھ گیا' کہنے لگا۔ "خلیفہ معظم محمد امین کو میں اپنا ہارا ہوا چہرہ دکھانا نہیں چاہتا۔"

وہ آدم زاد عبدالرحمٰن بہت بہادری سے لڑا لیکن اکیلا چنا کب تک بھاڑ کے اندر "چرمر" کر سکتا ہے! "غریب" مارا گیا' اسی عبدالرحمٰن نے واقعی غریب قاصد صاعد کو پچھاڑ کر اس کے سینے پر نیزہ رکھ دیا تھا' صاعد خراسان سے بغداد آیا تھا' صاعد و نوفل یہ دونوں تو جان بچا کر بغداد سے بھاگ لیے مگر عبدالرحمٰن نے اپنا شکست کھایا ہوا چہرہ امین کو نہیں دکھایا بس یوں

چپ چپاتے "تیں" ہوگیا کیا آدم زاد کیا ہم بھی جنات سبھی کو ایک دن "تیں" ہونا یقینی حتی میں
منہ چھپانا ہے یہ سوچتے ہوئے میں بھول گئی کہ میری تخلیق آگ سے ہوئی ہے آدم زادوں کے
درمیان رہ کر میرا حافظہ درست نہیں رہا۔

میں نے با آواز بلند "لاحول" پڑھی تو عارج بولا۔ "کہیں تو مجھے تو شیطان نہیں سمجھ
رہی ہے دینار!"

"تو کیا کسی شیطان سے کم ہے۔" میں بولی

وہ کہنے لگا۔ "حالانکہ میں نے کبھی تیرے ساتھ کوئی شیطانی نہیں کی ..... ہاں یہ
حسرت ضرور ہے۔"

"اور تو یہی حسرت لیے اس دنیا سے چلا جائے گا اے عارج! کس قدر افسوس کی
بات ہے۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ میں قزوین میں تھی' عارج حسب معمول میرے
ساتھ تھا۔ قزوین کی فتح نے دور دور تک طاہر کا سکہ بٹھا دیا جبل کے تمام علاقے اب اس کے
قبضے میں تھے۔

میں نے بغداد کی راہ لی کہ دیکھوں وہاں کیا صورت ہے۔ امین تو "بانگڑو" تھا ہی
شکستیں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں' اس نے عبرت پکڑنے کے بجائے ایک بڑی فوج آراستہ کی
اس فوج کی تعداد کم و بیش چالیس ہزار تھی۔ فوج کے دو سپہ سالار مقرر کیے گئے یہ دونوں دولت
عباسیہ کے مشہور نامور افسر احمد بن زید اور عبدالرحمٰن بن حمید تھے۔

عارج مجھ سے بولا۔ "بتا اب تو کیا کرے گی اے دینار!..... ایک چشم آدم زاد
طاہر اس بار نہیں بچ پائے گا۔"

میں نے مصلحت کے تحت عارج کی بات کے جواب میں کہا۔

"طاہر یقیناً ان دونوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔"

"اللہ تجھے صبر دے۔" عارج نے مجھ پر فقرہ لگایا۔

"اے عارج اب تیل دیکھ' تیل کی دھار دیکھ۔"

"یعنی؟" اس نے وضاحت چاہی۔

"یہ میں تجھے نہیں بتاؤں گی۔"

"اچھا نہ بتا' اس سے میری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔"
عارج بولا۔ "میں ہوں نا تیرے ساتھ۔"

"ہاں عارج! مجھ سے پیچھا چھڑانا تو مشکل ہے۔" میں ہنس دی۔ میرے خیال میں

اب تلوار کے بدلے تدبیر کی ضرورت تھی' دونوں سپہ سالار بیس بیس ہزار فوج پر مقرر تھے جو
آگے پیچھے بغداد سے نکلے انہیں بغداد سے یوں جاتے دیکھ کر میں نے جو کچھ سوچا' عارج کو بتا
دیا۔

"تو بڑی ہی فسادی ہے اے دینار!"

"وہ تو میں ہوں' اس "مہم" میں تجھے اور مجھے ساتھ رہنا ہے۔"

"اور بعد میں؟" عارج بول اٹھا۔

"یہ وعدے وعید کا وقت نہیں' میرے میرے سنگ۔"

"کہاں لے جا رہی ہے؟"

"بس یونہی گھمانے پھرانے۔" میں نے کہا۔

میرا مقصد بات ٹالنا تھا سو عارج کو ٹچہ دے دیا۔

جعلی قاصدوں اور خطوط کے ذریعے میں نے امین کے دونوں فوجی افسروں میں
پھوٹ ڈال دی' نوبت یہاں تک پہنچی کہ احمد بن زید اور عبدالرحمٰن بن حمید آپس میں لڑ گئے'
مدت دراز تک وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں "شجاعت جوہر" دکھاتے رہے اور بغداد
واپس آ گئے۔

طاہر کی ان "فتوحات" نے جو میری رہین منت تھیں مامون کی امیدوں کو وسیع کر دیا'
وہ آدم زاد ہارون کا بیٹا مامون خود ہی خلیفہ بن بیٹھا اور امیرالمومنین کہلانے لگا۔ اپنے
درباریوں کو اس نے بڑے بڑے عہدے دیئے' فضل مجوسی کو اس نے تمام علاقوں کا والی مقرر
کیا جو طول میں ہمدان سے تبت تک اور عرض میں بحر فارس سے جرجان وغیرہ تک تھے۔
مامون نے فضل مجوسی کی ماہانہ تنخواہ تیس لاکھ درہم مقرر کی' اس طرح فضل مجوسی کے بھائی حسن
بن سہل کو اس نے وزیرالخراج بنایا۔

اہواز' بصرہ' بحرین' عمان وغیرہ طاہر فتح کرتا چلا گیا' کوفہ' موصل اور دیگر کئی علاقوں
کے عمال نے طاہر کے پاس اطاعت کے خطوط بھیجے۔ اس اطاعت کے پیچھے بھی میرا ہی ہاتھ
تھا ورنہ تو وہ یک چشم کسی نہ کسی معرکے میں مارا جاتا۔ کوئی اس کا نام لیوا بھی نہ ہوتا' آدم زاد
اسی طرح مرنے والوں کو بھلا دیتے ہیں۔

ان فتوحات کی شہرت ہوتی جاتی تھی اور مامون کا اقتدار بڑھتا جاتا تھا۔ 182 ہجری
تک طاہر کی معرکہ آرائیوں سے بغداد اور اس کے متعلقات بچ رہے تھے۔

حرمین میں بھی مامون کا سکہ' خطبہ جاری ہوگیا' داؤد جو مکہ معظمہ کا حاکم تھا اس نے

تمام داعیان عرب کو جمع کیا اور مجمع عام میں ایک پراثر تقریر کی۔ "سنو! یہ وہی امین ہے جس نے حرمت حرم کا بھی خیال نہ کیا جن معاہدوں کی تصدیق صحن کعبہ میں ہوئی تھی انہیں چاک کر کے آگ میں جلا دیا۔" تقریر کرتے ہوئے داؤد منبر پر چڑھ گیا اور سر سے ٹوپی اتار کر پھینک دی' بولا۔ "اسی طرح میں امین کو خاک پر پھینکتا ہوں۔"

سب نے غائبانہ مامون کے لیے بیعت کی۔

مامون کو جب یہ خبر پہنچی تو بطور نذر کے داؤد کو پانچ لاکھ درہم بھیجے حکومت مکہ اس کے سوا تھی۔

چند روز بعد یمن وغیرہ کے عمال نے بھی طاہر کی اطاعت قبول کر لی' امین کی حکومت بغداد کی حد تک رہ گئی' اس پر ایک دن عارج مجھ سے کہنے لگا۔ "اے دینار! بس بھی کر اب۔"

"یہ بتا کہ میں نے کیا ہی کیا ہے جو بس کر دوں۔"

"جانتا ہوں میں کہ تو بڑی بھولی ہے۔"

"اور کیا تیری طرح چالاک ہوں۔" میں نے کہا۔

"تو اگر چالاک نہ ہوتی تو پھر کسی آدم زادی کے جسم میں قید ہو جاتی اور اتنی باخبر بھی نہ ہوتی جتنی ہے۔"

"تیری ان باتوں سے مجھے ایسا لگتا ہے کہ تو مستقل طور پر جن زادی بنا رہنا چاہتا ہے۔"

"ارادہ تو یہی ہے مگر تو ٹھہری ایک جن زادی' وہ بھی غصے کی تیز! ایسی صورت میں میری مرضی کب چل سکتی ہے۔"

"اے عارج! کبھی کبھی جب تو سچ بولتا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔"

"شکر کا مقام ہے اے دینار کہ تو نے کسی بہانے مجھے اچھا تو کہا۔"

"اچھا زیادہ باتیں نہ بنا' قصر خلافت میں چلتے ہیں...... امین بے چارہ پریشان ہو گا۔"

"منافقت نہیں اے دینار! مجھے خبر ہے تیرے نزدیک امین نہ مظلوم ہے' نہ بے چارہ! وہ اس حال کو تو پہنچ گیا' اب......"

میں نے عارج کی بات کاٹ دی۔ "رہنے دے بس! اس موٹو آدم زاد کا زیادہ ہمدرد نہ بن۔"

"ہمدرد تو ہوں میں اس کا! وہ بھی عرب ہے اور میں بھی! فرق صرف جن اور آدمی کا ہے اگر ایک عرب دوسرے عرب کے کام نہیں آئے گا تو کیا کوئی عجمی کام آئے گا۔"

"پہلی بات تو یہ سن کہ میرے انداز میں نہ بولا کر!...... دوئم یہ کہ وقت آنے پر پتہ چل جائے گا تو امین کا کتنا بڑا ہمدرد ہے۔" میں نے کہا اور دریائے دجلہ پر پرواز کرتی ہوئی قصر خلافت کی طرف بڑھی' عارج ساتھ تھا۔

میں جب قصر خلافت میں پہنچی تو ہارون کی بیوی زبیدہ کو فکر مند دیکھا۔ یہ صبح کا وقت تھا امین بھی اپنی ماں کے سامنے تھا' زبیدہ بولی۔ "تم نے دیکھا کہ وہ غلام زادہ فضل بغداد سے خاموشی کے ساتھ فرار ہو گیا۔" زبیدہ کا اشارہ فضل بن ربیع کی طرف تھا۔

"مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ابھی ہمارے وفاداروں کی کمی نہیں' ہم نے ایوان خاص میں اجلاس طلب کیا ہے اس اجلاس میں علی بن محمد بھی آ رہا ہے۔" امین نے بتایا۔

"تمہیں یقیناً یہ احساس ہو گا کہ ہم دہرے خطرے میں گھرے ہوئے ہیں ایک طرف تو یک چشم طاہر بن حسین ہماری زندگی کے درپے ہے دوسری جانب ہرثمہ بن اعین بڑھا چلا آ رہا ہے۔ ہرثمہ ہر چند کے بوڑھا ہو گیا ہے مگر اس کا دماغ ابھی بھی بہت تیز چلتا ہے۔ یہ ہرثمہ خلیفہ مرحوم یعنی تمہارے والد بزرگوار کا بھی نہایت وفادار تھا ہاں موجودہ صورتحال میں بھی وہ خبیث پلٹا کھا گیا ہے اسے مامون سے نہیں اقتدار اور مال و دولت کی طمع ہے۔" زبیدہ کہتی رہی۔ "فضل مجوسی کے مقابلے میں ہرثمہ اپنی دال گلانا چاہتا ہے یہ الگ بات ہے کہ آتش پرست فضل اسے ایسا نہ کرنے دے۔ ہرثمہ کی بابت ہم نے جو کچھ کہا درست ہے لیکن قدیم نمک خوار ہونے کی وجہ سے برے وقت میں اگر کوئی تمہارے کام آ سکتا ہے تو یہی بوڑھا ہرثمہ ہے۔"

امین نے اپنی ماں کی بات سنی ضرور مگر یوں جیسے کچھ نہ سنا ہو' اس وقت غلام کوثر نے آ کر امین کو اطلاع دی کہ طلب کردہ افراد ایوان خاص میں جمع ہو چکے ہیں۔ زبیدہ نے ہاتھ کے اشارے سے امین کو رخصت کی اجازت دیدی۔ ابھی تک زبیدہ یہ بھولی نہیں تھی کہ اس کا تعلق کس خاندان سے ہے مگر اس کے بیٹے امین کو کچھ یاد نہ تھا' وہ زبیدہ کے پاس سے اٹھ کر جب ایوان خاص کی طرف چلا تو گردن اکڑی ہوئی تھی اپنی عادت کے مطابق وہ کج کلاہ قدم جما جما کر چل رہا تھا اس کے سر پر بندھی سیاہ پگڑی کو میں نے ہلکا سا جھٹکا دیا تو وہ چلتے چلتے ایک دم رک گیا (کیوں کہ سادات کا پسندیدہ رنگ سبز تھا اس لیے بنو عباس نے اپنے لیے سیاہ رنگ کو علامت بنایا' اس سے قبل یہی سیاہ رنگ اداسی اور رنج کی نشانی تھا اور اب بھی ہے مختلف زمانوں میں آدم زاد رنگ بدلتے رہے ہیں میں اس چکر میں نہیں پڑتی' پل پل رنگ بدلنا تو یوں بھی ان آدم زادوں کی فطرت ہے) اس نے اپنی پگڑی پھر سر پہ جمائی اور ادھر ادھر چور

نظروں سے دیکھتا ہوا قصر خلافت کے ایوان خاص میں داخل ہوا تمام فوجی افسران امین کے احترام میں اٹھ کھڑے ہوگئے اور اسے تعظیم دی۔

اس اجلاس میں منتخب فوجی افسر تھے' امین بڑی سی چوکی پر جا بیٹھا جس پر دبیز قالین بچھا تھا۔

اپنی ماں زبیدہ کی نصیحت کو پس پشت ڈال کر خود سر امین نے اس اہم اجلاس میں موجود علی بن محمد کو ہرثمہ سے جنگ کرنے کا حکم دیا چار سو افسران فوج علی بن محمد کی ماتحتی میں دیئے گئے۔

امین کی یہ آخری کوشش تھی کہ کسی طرح مامون کو کہیں تو نیچا دکھا دے' ہرثمہ اور طاہر دونوں ہی مامون کی طرف سے امین کا حلقہ تنگ کر رہے تھے۔ رمضان 192 ہجری میں بہ مقام نہروان دونوں فوجیں مقابل ہوئیں ہرثمہ تجربے کار لڑاکا تھا اس نے اپنی فوج کو بڑے منظم انداز میں آگے بڑھایا' اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ علی بن محمد نے نہ صرف شکست کھائی بلکہ زندہ گرفتار ہوا۔ یہ خبر بغداد پہنچی تو امین کے چھکے اور اٹھے سب ایک ساتھ چھوٹ گئے۔

زبیدہ تو پہلے ہی اس سے خوش نہ تھی کہ ہرثمہ کو دشمن بنایا جائے۔ اس نے امین کو سخت سست کہا۔

''اے مادر محترمہ! آپ کیوں خفا ہوتی ہیں' اپنے بیٹے سے مایوس نہ ہوں۔ امین کہنے لگا۔''ہم نے ایک تدبیر سوچی ہے وہ یہ کہ طاہر کے ساتھ جو فوجی لڑ رہے ہیں انہیں توڑ لیا جائے۔''

''کس طرح۔'' زبیدہ نے پوچھا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ اس آدم زاد کے ماتھے پر پڑنے والے بل کم ہوگئے تھے۔

امین بولا۔''مال و زر کا لالچ دے کر ہم نے خفیہ طور پر طاہر کے فوجی افسروں کو خطوط لکھ دیئے ہیں۔''

زبیدہ مطمئن نظر آنے لگی۔

امین کے خزانے میں ہارون کے زمانے کا اب بھی بہت اندوختہ موجود تھا جو اس موقع پر تیغ و خنجر سے زیادہ کام آیا تقریباً پانچ ہزار آدمی اس طمع میں طاہر کا ساتھ چھوڑ کر دارالخلافہ بغداد پہنچ گئے' خطوط میں امین نے جو وعدے کیے تھے اس سے بھی زیادہ ان آدمیوں کو انعام و صلہ دیا اور ان کی داڑھیاں مشک سے رنگوائیں۔

''کیا کہتا ہے اے عارج! یہ مشکی گھوڑے' امین کو بچا لیں گے؟'' میں نے اس موقع پر

عارج کو چھیڑا۔

''تو ان آدم زادوں کا مذاق کیوں اڑا رہی ہے اے دینار!..... انہوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟''

''میرا تو انہوں نے کچھ نہیں بگاڑا البتہ تیرے امین کی مٹی ضرور کرکری کرا دیں گے۔ یہ بکاؤ مال ہیں آج انہیں امین نے خرید لیا تو کل کسی اور کی جھولی میں جا گریں گے۔''

میری بات سن کر عارج بولا۔''لیکن پانچ ہزار آدم زادوں کے علاوہ بغداد کی بھی فوج ہے جو طاہر سے لڑے گی۔''

''تو لڑا کرے' نتیجہ وہ نکلے گا جو میں تجھے بتا چکی ہوں۔''

بغداد شہر کے رہنے والے عجب تذبذب کا شکار تھے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا اور ''اونٹ'' تھا کہ بیٹھنے کو تیار ہی نہ تھا یہاں اونٹ سے میری ہرگز مراد امین سے نہیں کیونکہ اونٹ بڑا کارآمد جانور ہے۔

بکاؤ آدم زاد اور بغداد میں بچے کھچے سپاہی جب شہر سے گزرنے لگے تو ان ''نمونوں'' کو دیکھنے کے لیے اژدحام ہو گیا (عربی زبان میں اژدحام کا مطلب لوگوں کا انبوہ ہے' بھیڑ' آدمیوں کا ایک جگہ جمع ہونا' اژدہام لکھنا غلط ہے۔ (مصنف)

پھر وہی ہوا جو میں نے عارج سے کہا تھا۔ جو آدم زاد طاہر کے ساتھ دغا کر چکے تھے وہ امین کے وفادار کیسے رہتے غرض کہ طاہر جیت گیا بے شمار مال غنیمت اس کے ہاتھ آیا اب طاہر کو میری مدد کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں نے اس معرکے میں اس لیے طاہر کی مدد سے گریز کیا میں بغداد ہی میں رہی اور آدم زادوں کا تماشا دیکھتی رہی' اس عرصے میں امین نے ایک اور فوج تیار کرلی اس فوج میں حوالی بغداد کے عوام بھرتی تھے (حوالی بھی عربی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں گرداگرد کسی چیز کا' یہاں بغداد کے آس پاس رہنے والوں سے مراد ہے یہی لفظ عربی سے فارسی میں گیا' مثلاً فارسی زبان میں حوالی شہر کا مطلب شہر کا نواح یعنی شہر کے گرداگرد کی زمین ہے۔ (مصنف)

انہی حوالی بغداد میں سے فوجی افسران مقرر ہوئے کہ یہ امین کا حکم تھا' امین نے ان گنوار آدم زادوں میں سے ایک' ایک کو گراں بہا انعامات سے مالا مال کر دیا' قدیم افسران فوج جو ان ''نیاضیوں'' سے محروم رہے ناراض ہوگئے میں نے صرف اتنا کیا کہ یہ خبر طاہر تک پہنچا دی وہ یک چشم اس خیال کو اپنی عقل مندی سمجھا حالانکہ وہ عقل مند سے زیادہ ''عقل بند'' تھا۔ پھر بھی اس نے ان ناراض فوجی افسروں سے خط و کتابت شروع کردی اس کا یہ اثر ہوا کہ وہ

اعلانیہ باغی ہو گئے۔

امین کو ابھی تک یہ غلط فہمی تھی کہ ''اصل خلیفہ'' وہی ہے۔ اس بنا پر قصر خلافت میں وہ باقاعدہ دربار لگانے کا شوق بھی کبھی کبھار پورا کرتا رہتا۔ پرانے فوجی افسر باغی ہو گئے تو درباریوں نے عرض کیا کہ انعام و صلے کا لالچ دے کر امیرالمومنین بغاوت پر کمربستہ پرانے فوجیوں کو قابو میں لا سکتے ہیں۔

اپنی نو آزمودہ فوج پر امین کو اس قدر ناز تھا کہ اس نے قدیم تجربے کار لشکر کی پروانہ کی اس نے بڑی حکمت کے ساتھ ان نو آزمودہ کو حکم دیا' باغیوں کو گرفتار کر لاؤ!

ادھر تو امین کی پرانی اور نئی فوجیں باہم معرکہ آرا تھیں ادھر طاہر بے روک ٹوک بڑھتا چلا آیا' ذوالحجہ **192** ہجری میں طاہر نے باب الانبار پہنچ کر ایک باغ کے قریب پڑاؤ ڈال دیا' امین کے بہت سے افسر اس کے پاس حاضر ہو گئے اور انہوں نے بڑے بڑے انعام و اکرام حاصل کیے۔

اگرچہ امین کی تمام قوت صرف ہو چکی تھی اور بظاہر بغداد میں کوئی آدم طاہر کا راستہ روکنے والا نہ تھا' تاہم اسے میں نے احتیاط کا مشورہ دیا۔ رات کا وقت تھا طاہر اپنے خیمے میں سو رہا تھا کہ میں نے اس کے کانوں میں اپنے لفظ انڈیلنے شروع کر دیئے' وہ میری سرگوشیوں کو ''سچا خواب'' سمجھا۔

پہلے اس کا ارادہ بغداد پر حملہ کرنے کا تھا' ''سچا خواب'' دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا۔

بغداد ایک مدت سے خلفائے عباسیہ کا پایہ تخت اور ان کی طاقت کا اصل مرکز تھا' صرف شہر کی آبادی دس لاکھ سے کم نہ تھی' اس آبادی کی اکثریت مسلمانوں کی تھی جو سپہ گری کا فطری جوہر رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے بغداد پر قبضہ کرنا کچھ آسان کام نہ تھا میں اسی لیے طاہر کی ناک میں نکیل ڈالے رہی۔ مختصر یہ کہ وہ میرے اشاروں پر ناچتا رہا' یوں بھی آدم زادوں کو نچانا ہم جنات کی سرشت میں شامل ہے۔

میرے ایماء پر طاہر نے اپنے نامور فوجی افسروں کو خاص خاص حصوں پر متعین کیا اس نے حکم دیا کہ جو لوگ حلقہ اطاعت میں آئیں اور جنگ نہ کریں انہیں امان دی جائے۔

پھر منجنیقوں کے ذریعے بغداد پر آگ اور پتھر برسائے گئے یک چشم آدم زاد طاہر خود بھی ''عیب دار'' تھا لیکن اس سے بھی دو جوتے آگے سفاک فوجی افسران تھے عیب دار جانور کی تو قربانی بھی جائز نہیں لیکن ابھی عیب دار آدم زاد کا وقت نہیں آیا تھا۔ قدرت اسے ڈھیل دے رہی تھی۔

اپنی نو آزمودہ فوج پر امین کو اس قدر ناز تھا کہ اس نے قدیم تجربے کار لشکر کی پروانہ کی اس نے بڑی حکمت کے ساتھ ان نو آزمودہ کو حکم دیا' باغیوں کو گرفتار کر لاؤ!

ادھر تو امین کی پرانی اور نئی فوجیں باہم معرکہ آرا تھیں ادھر طاہر بے روک ٹوک بڑھتا چلا آیا' ذوالحجہ **192** ہجری میں طاہر نے باب الانبار پہنچ کر ایک باغ کے قریب پڑاؤ ڈال دیا' امین کے بہت سے افسر اس کے پاس حاضر ہو گئے اور انہوں نے بڑے بڑے انعام و اکرام حاصل کیے۔

اگرچہ امین کی تمام قوت صرف ہو چکی تھی اور بظاہر بغداد میں کوئی آدم طاہر کا راستہ روکنے والا نہ تھا' تاہم اسے میں نے احتیاط کا مشورہ دیا۔ رات کا وقت تھا طاہر اپنے خیمے میں سو رہا تھا کہ میں نے اس کے کانوں میں اپنے لفظ انڈیلنے شروع کر دیئے' وہ میری سرگوشیوں کو ''سچا خواب'' سمجھا۔

پہلے اس کا ارادہ بغداد پر حملہ کرنے کا تھا' ''سچا خواب'' دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا۔

بغداد ایک مدت سے خلفائے عباسیہ کا پایہ تخت اور ان کی طاقت کا اصل مرکز تھا' صرف شہر کی آبادی دس لاکھ سے کم نہ تھی' اس آبادی کی اکثریت مسلمانوں کی تھی جو سپہ گری کا فطری جوہر رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے بغداد پر قبضہ کرنا کچھ آسان کام نہ تھا میں اسی لیے طاہر کی ناک میں نکیل ڈالے رہی۔ مختصر یہ کہ وہ میرے اشاروں پر ناچتا رہا' یوں بھی آدم زادوں کو نچانا ہم جنات کی سرشت میں شامل ہے۔

میرے ایماء پر طاہر نے اپنے نامور فوجی افسروں کو خاص خاص حصوں پر متعین کیا اس نے حکم دیا کہ جو لوگ حلقہ اطاعت میں آئیں اور جنگ نہ کریں انہیں امان دی جائے۔

پھر منجنیقوں کے ذریعے بغداد پر آگ اور پتھر برسائے گئے یک چشم آدم زاد طاہر خود بھی ''عیب دار'' تھا لیکن اس نے بھی دو جوتے آگے سفاک فوجی افسران تھے عیب دار جانور کی تو قربانی بھی جائز نہیں لیکن ابھی عیب دار آدم زاد کا وقت نہیں آیا تھا۔ قدرت اسے ڈھیل دے رہی تھی۔

طاہر کے حواریوں نے بغداد کو تقریباً تباہ کر ڈالا۔ انہوں نے نہایت سفاکی و بے رحمی سے طاہر کے احکام پر عمل کیا۔ ہزاروں عالی شان مکان برباد کیے گئے محلے کے محلے غارت ہو گئے امین کے کچھ وفادار بڑی دلیری سے لڑے مگر عاجز ہو کر انہوں نے امان طلب کر لی' ارکان خلافت نے بھی اطاعت میں عافیت جانی' صرف شہر کے اوباش و عیار باقی رہ گئے جو

طاہر کے سدِراہ تھے انہیں زیر کرنے میں طاہر نے جو دقتیں اٹھائیں بڑے بڑے معرکوں میں نہیں اٹھائی تھیں۔

امین کے چھوٹے بھائی نے اپنے لیے الگ قصر بنوالیا تھا اس کا نام صالح تھا' اس نے خلیفہ ہارون الرشید کی نماز جنازہ پڑھائی تھی' قصر صالح اس کا تھا جس پر طاہر کے فوجیوں نے قبضہ کرلیا۔ شہر کے انہی لچے لفنگے آدم زادوں نے قصر صالح پر اس طرح حملہ کیا کہ طاہر کی بہت سی فوج ضائع ہوگئی۔ چند مشہور افسر بھی مارے گئے۔

اس شکست کے انتقام پر طاہر نے حکم دیا کہ دجلہ سے الرقیق تک اور باب الشام سے باب الکوفہ تک جس قدر آبادی ہے کلیتہً ختم کردی جائے اس پر بھی جب بغداد کے باشندے مطیع نہ ہوئے تو گزرگاہوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے تاکہ باہر سے خوراک یا ہتھیار شہر میں نہ آ سکیں' بغداد والوں کی مدد کو کوئی نہ آ سکے' اس پر بھی عیار آدم زاد زیر نہ ہوئے ان کا مسئلہ صرف لوٹ مار تھا وہ اپنوں ہی کو مار رہے تھے' سو میں تماشائی نہ بنی رہتی تو کیا کرتی! ہاں یہ ضرور ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا سو ایسا ہوتا ہے جنگوں میں بے گناہ بھی مارے جاتے ہیں۔

قصر شماسہ پر طاہر نے اپنے ایک فوجی افسر عبداللہ کو متعین کیا تھا "عیاروں" نے اسے شکست دی جب طاہر کی طرف سے ہرثمہ مدد کو آیا تو عیاروں نے اسے بھی زندہ پکڑنا چاہا مگر ناکام رہے۔

قصہ مختصر یہ کہ بغداد ایک ویرانے سے بدتر ہوگیا' امین کے عالی شان قصر جو تقریباً دو کروڑ درہم کے صرف سے تیار ہوئے تھے ان کے محض کھنڈر باقی رہ گئے' شہر والوں پر جو سختیاں گزریں ان کا اندازہ کون کرسکتا ہے! یہ سب کچھ ایک بے وقوف آدم زاد امین کی وجہ سے ہوا جسے اقتدار کی ہوس تھی' سینکڑوں گھرانے برباد ہوئے ہزاروں بچے یتیم ہوگئے' ہر گلی کوچے سے دردناک آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ابن رومی کا ایک مرثیہ جو ایک سو پندرہ اشعار پر مشتمل ہے اس قیامت انگیز واقعے کی پوری تصویر ہے۔ بغداد اس قدر تباہ ہو چکا تھا تاہم طاہر کو شہر میں داخل ہونے کی ہمت نہ تھی۔

☆......☆......☆

خزیمہ جو امین کے درباریوں میں سے ایک تھا' وہ بااثر آدم زاد اگر طاہر کا ساتھ نہ دیتا تو بغداد کی فتح میں شاید بہت زیادہ دیر لگتی' 22 محرم 198 ہجری کو خزیمہ مشرقی دروازے سے بغداد میں داخل ہوا' اس نے دریائے دجلہ کے کنارے علم نصب کر کے اعلان کیا کہ خلیفہ امین معزول کردیا گیا۔ اس اعلان کے بعد شہر کا مشرقی حصہ گویا پوری طرح فتح ہوگیا۔

دوسرے دن طاہر نے مغربی حصے پر حملہ کیا' بازار کرخ کے متصل سخت معرکہ ہوا طاہر نے قصر الوضاع پر تھوڑی سی فوج تعینات کی اور بذات خود مدینہ المنصور' قصر زبیدہ اور قصر خلد کا محاصرہ کیا' یہ عالی شان ایوانات جو خلفائے عباسیہ کی یادگار تھے بجائے خود ایک شہر تھے اور ان کے گرد جدا جدا شہر پناہ تھی۔

اس محاصرے کے دوران میں ابراہیم بن المہدی جو ہارون الرشید کا بھائی اور فن موسیقی میں یگانہ روزگار تھا امین کے ساتھ تھا' خارج اور میں ان دونوں سے زیادہ دور نہیں تھے' یہ رات کا وقت تھا۔

امین دل بہلانے کے لیے قصر خلافت کے اس خطے سے باہر آیا جہاں اس کی سکونت تھی (رہنے سے ہندی والوں نے فارسی قواعد کے مطابق رہائش یا رہائش بنالیا ہے جو غلط ہے اس کی جگہ سکونت' مسکن' قیام' بود و باش وغیرہ الفاظ موجود ہیں' لفظ رہائش' عوام کی زبانوں پر چڑھ گیا اس لیے پڑھے لکھے نام نہاد ادیب و شعراء بھی یہ لفظ لکھنے لگے ہیں۔ (مصنف)

وہ اپنے چچا ابراہیم سے مخاطب ہوا۔ "کیا سہانی رات ہے' چاند کیسا صاف اور روشن ہے' دجلہ پر اس کا عکس پڑتا ہے جو کیسا خوش نما معلوم ہوتا ہے بتایئے ایسے پر لطف وقت میں کیا چیز ضروری ہے؟"

"شراب؟" ابراہیم نے جواب دیا۔

قصر خلافت میں وہ جگہ بڑی پرفضا تھی۔ وہاں سے دور دور تک کا نظارہ ممکن تھا۔ امین و ابراہیم کے غلاموں نے مسندیں لگا دیں غرض شراب آئی امین نے ابراہیم کی طرف پیالہ

بڑھایا۔

نشہ مئے سے سرشار ہو کر ابراہیم نے چند اشعار گائے۔

امین بولا۔ ''نغمہ ہے تو ساز بھی ہونا چاہیے۔''

حسب الطلب ایک کنیز کو امین کے سامنے پیش کیا گیا جو گانا بھی جانتی تھی۔ اس سے پہلے کہ عارج مجھے روکتا میں بہ وجوہ اس کنیز کے جسم میں اتر گئی' اس کا جسم لطیف تھا' سو مجھے قرار آ گیا۔

معاً مجھے امین کی تیز اور غصیلی آواز سنائی دی۔ ''بولتی کیوں نہیں' کیا نام ہے تیرا؟''

''ضعف'' میں دانستہ صرف ایک ہی لفظ بولی' بظاہر وہ توانا آدم زاد اندر سے بہت کمزور تھا اس لیے میں نے ضعف کا لفظ استعمال کیا یہ کسی آدم زادی کا نام نہیں ہو سکتا' امین کو یہ خیال بھی نہ آیا' میری توجہ اس کے ذہن پر تھی وہ وحشت زدہ سا نظر آ رہا تھا۔

''ہمیں کچھ شعر سنا!'' امین نے مجھ سے فرمائش کی۔

میں نے جو پہلا شعر پڑھا' اس کے ساتھ ہی ساز بجانے لگی شعر کے معنی یہ تھے۔

''اپنی عمر کی قسم' کلیب کے مددگار زیادہ تھے اور وہ تجھ سے زیادہ مدبر و عاقل بھی تھا تاہم خون میں نہلایا گیا۔''

امین اور بھی مکدر ہوا' اس نے مجھ سے کہا ''رک جا...... اور اچھے شعر گا کہ ہمارا جی بہلے۔''

میں نے عربی ہی کا ایک اور شعر گایا' اس کا مطلب یہ تھا۔ ''ان لوگوں کے فراق نے میری آنکھوں کو رلایا اور نیند کھو دی' جدائی دوستوں کو سخت رلانے والی چیز ہے۔''

اس پر امین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ چیخ اٹھا۔ ''کم بخت تجھے ایسے شعر کے سوا اور بھی کچھ گانا آتا ہے؟''

میں بولی۔ ''کنیز نے وہی شعر گائے کہ حضور جن کو سن کر خوش ہوں۔'' پھر میں نے اور چند شعر گائے۔

امین غصے میں آ گیا اور کہا۔ ''ملعونہ! دور ہو۔''

اپنا کام دکھا کر میں اس کنیز کے جسم سے باہر آ گئی' میرا مقصد اس بے نوش عاقل آدم زاد کو آنے والے وقت کا اشارہ دینا تھا۔ امین نے ایک مرتبہ پھر کنیز کو ڈانٹا' وہ یہ نہ جانتا کہ اس کنیز کے جسم میں داخل ہو کر ایک جن زادی یعنی میں باہر آ چکی ہوں' وہ کنیز بھی نہ سمجھی کہ امین کس لیے اس پر خفا ہو رہا ہے۔

''اٹھ جا یہاں سے۔'' امین ہنکارا۔

کنیز ہڑبڑا کر اٹھی تو بلور کے ایک خوبصورت پیالے سے ٹکرا کے گری' امین اس پیالے کو زب زباج کہا کرتا تھا۔

پیالہ ٹوٹ گیا اور کنیز بھی چلی گئی تو امین نے اپنے چچا ابراہیم کو مخاطب کیا۔ ''آپ دیکھتے ہیں' آج کیا کیا باتیں پیش آ رہی ہیں' غالباً میرا وقت پورا ہو گیا۔''

ابراہیم اسے دلاسے دینے لگا' نشے میں امین اسی پر مصر تھا کہ اب زندہ نہیں بچے گا۔

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ میں نے امین سے سرگوشی کی۔ ''قضی الامر الذی فیہ تستفتیان'' یعنی جس امر میں تم دونوں بحث کرتے ہو طے ہو گیا۔

سرگوشی پر امین نے ابراہیم سے پوچھا۔ ''کچھ سنا بھی؟''

''مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیا۔'' ابراہیم نے جواب دیا۔

ہمت کر کے وہ بھاری تن و توش والا آدم زاد امین اپنی جگہ سے اٹھا اور آس پاس کا جائزہ لیا اس کے بعد وہ ابراہیم سے باتوں میں مشغول ہو گیا دوبارہ دور ساغر چلنے لگا۔

میں تو اس محفل عیش میں بھڑ رنگ پھیلانا چاہتی تھی سو ایک مرتبہ پھر امین کو موت کی یاد دلا دی۔

اب امین کی قوت برداشت جواب دے گئی وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا۔

عارج مجھ سے کہنے لگا۔ ''اے دینار! تو خلاف ورزی کر رہی ہے۔''

''کیسی خلاف ورزی؟''

''تو اس کنیز کے قالب میں کیوں اتری؟''

''تو مجھ سے یہ جواب طلب کرنے والا کون؟...... تیرا بھی جب جی چاہے کسی آدم زاد کے قالب میں گھس جائیو۔''

میرا جواب سن کر گویا عارج اپنا سا منہ لے کے رہ گیا۔ اس یاس و ناامیدی پر امین کو اپنے سوتیلے بھائی مامون کی یاد آئی جس کے بھیجے ہوئے ایک فوجی افسر نے اس کا ناطقہ بند کر دیا تھا سو اس نے یک چشم طاہر کو ایک خط لکھا۔ اس خط کی دلچسپ عبارت یہ تھی۔ ''آپس کی خانہ جنگیوں سے یہ نوبت پہنچی کہ اب عزت اور ناموس کی طرف سے بھی اندیشہ ہے' مجھ کو ڈر ہے کہ یہ موقع دیکھ کر غیروں کو خلافت کی ہوس نہ ہو بہرنو میں اس پر راضی ہوں کہ تو مجھ کو امان دے' میں چاہتا ہوں کہ اپنے بھائی مامون کے پاس چلا جاؤں' اگر اس نے عنایت کی تو اس کے رحم اور فیاض دلی سے مجھے بڑی توقع ہے۔ اگر اس نے مجھے قتل کرا دیا تو ایک زور نے

دوسرے زور کو توڑا اور تلوار نے تلوار کو کاٹا' اگر شیر پھاڑ ڈالے' اس سے اچھا ہے مجھ کو کتا نوچ کھائے۔"

امین کے خط کا آخری فقرہ بڑا معنی خیز تھا' اس نے اپنے سوتیلے بھائی مامون کو شیر اور طاہر کو کتا کہا تھا۔

ممکن ہے کہ امین اگر مامون تک پہنچ جاتا تو شاید اس کو امان مل جاتی اگر اسے تخت خلافت کی عزت نہ ملتی تو کم سے کم جان ضرور بچ جاتی میں نے صرف اتنا کیا کہ سرگوشیوں میں طاہر کو خط کے آخری فقرے کا مطلب اچھی طرح پڑھوایا اور پھر اس نے امان کی درخواست مسترد کر دی۔

طاہر کے پیہم حملوں نے امین کے طرفداروں کو یقین دلا دیا کہ ان حملوں کو روکنے کی کوشش تقریباً بے سود ہے محمد بن حاظم اور محمد ابن اغلب افریقی کی پامردی سے طاہر اب تک امین پر دسترس نہیں پا سکا تھا' انہی دونوں کے مشورے پر ایک شب خاموشی سے امینؔ قصر خلافت سے دوبارہ قصر خلد میں اٹھ آیا تھا' زبیدہ بھی اسی رات قصر خلافت چھوڑ کر اپنے قصر (قصر زبیدہ) میں چلی گئی تھی' روز بہ روز بگڑتی ہوئی صورتحال دیکھ کر ابن حاتم اور ابن اغلب دونوں ہی ہمت ہار گئے "عقل سے پیدل" ایک آدم زاد حکمران کو وہ کب تک بچاتے انہوں نے آخری کوشش کے طور پر امین سے جا کر بات کی۔

"اے امیر المومنین! نمک خواروں نے حق نمک ادا نہیں کیا۔" ابن حاتم بولا۔

ابن اغلب نے بتایا۔ "میرے علم و اطلاع کے مطابق قصر خلافت کا محاصرہ کر لیا گیا ہے۔ حضور عالی مرتبت!"

"تو پھر بتاؤ کہ ہم کیا کریں؟" امین نے سوال کیا

میرا جی چاہا کہ کہہ دوں' ڈوب مر! مگر خاموش رہی۔ امین کے دونوں وفاداروں نے یہ تجویز دی کہ اب ایک ہی تدبیر ہے' رفیقوں میں سے سات ہزار جاں نثار منتخب کر لیے جائیں' اصطبل میں گھوڑوں کی اتنی ہی تعداد ہے انہی سات ہزار سواروں کی حفاظت میں حضور عراق سے شام کا قصد کریں' وہاں اس قدر خزانہ و مال موجود ہے کہ ہم اپنی قوت کافی حد تک بڑھا سکتے ہیں' پھر دشمن کے حملوں کا بھی خوف نہیں ہوگا۔ امین نے یہ تجویز قبول کر لی وہ بغداد چھوڑ کر کسی بھی طرف جانے کو آمادہ ہو گیا۔

میں نے طاہر کو یہ خبر پہنچا دی' اس نے سلیمان بن منصور (وہی جس نے امین کی طرف سے بیعت لی تھی) محمد بن عیسیٰ وغیرہ کو بلا بھیجا' یہ آدم زاد ظاہر میں امین کے ساتھ تھے اور اس

کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے لیکن جان کے خوف سے طاہر کے خلاف کوئی بات نہیں کر سکتے تھے وہ آ گئے تو طاہر نے ان سے کہا۔ "اگر امین بچ کر نکل گیا تو تم لوگ زندہ نہیں بچو گے' جس طرح بنے امین کو بغداد سے فرار ہونے کے ارادے سے باز رکھو۔"

مجبوراً یہ لوگ امین کے پاس حاضر ہو گئے اور بولے کہ جن لوگوں نے حضور کو بغداد سے فرار ہونے کی رائے دی وہ خود غرض ہیں۔

"وہ کیسے؟ ہمیں بتایا جائے!" امین نے یہ کہتے ہوئے مسند پر پہلو بدلا۔

"طاہر کے مقابلے میں ابن حاتم اور بن اغلب افریقی ہی نے زیادہ سرگرمی دکھائی" سلیمان بن منصور کہنے لگا۔ "انہیں یقین ہے کہ طاہر نے فتح پائی تو پہلے انہی کی خبر لے گا وہ اسی لیے یہ چاہتے ہیں کہ جب آپ عراق سے شام کی طرف روانہ ہوں تو گرفتار کر لیے جائیں وہ خود ہی آپ کو حراست میں لے کر طاہر کے حوالے کر دیں گے' اس کارگزاری کے صلے میں وہ خود کو مرنے سے بچا لیں گے' بہتر یہ ہے کہ آپ تخت خلافت سے الگ ہو جائیں اور خود کو طاہر کے حوالے کر دیں وہ آپ کا ادب ملحوظ رکھے گا اور مامون سے تو پوری امید ہے کہ برادرانہ سلوک کرے گا۔"

امین تو تھالی کا گھامڑ آدم زاد اس نے یہ رائے مان لی اور بات کی تہ کو نہ پہنچ سکا' اس نے بس اتنا کہا۔ "طاہر کے بجائے ہم ہرثمہ کو اس معاملے میں ترجیح دیں گے" یوں شاید وہ بے اختیار ہو کر بھی خود کو با اختیار ثابت کر رہا تھا۔

ابن حاتم اور ابن اغلب کو جب امین کے ارادے کا علم ہوا تو وہ امین کے پاس آئے' وہ بولے کہ حضور نے ہم خیر خواہوں کا کہنا نہ مانا اور خود غرضوں کی رائے قبول کی' اس سے تو بہتر یہ ہے کہ طاہر سے براہ راست معاملہ کیا جائے۔

اس پر امین نے ایک اور "سچا خواب" سنانا شروع کیا' "یہ سچا خواب" میں نے ہی اسے اپنے اثر میں لے کر دکھایا تھا' مقصد اسے طاہر سے ڈرانا اور بغداد سے بھگانا تھا مگر اس کا "حمق" قدم قدم پر نئے رنگ میں ظاہر ہو رہا تھا۔

"میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔" امین کہنے لگا۔ "اس وقت سے طاہر کا نام سن کر مجھے دہشت ہوتی ہے' میں نے دیکھا کہ ایک بڑی لمبی چوڑی دیوار ہے جو بہت بلند ہے' میں اس دیوار پر لباس فاخرہ پہنے تلوار کمر سے باندھے کھڑا ہوں' دیوار کے بالکل نیچے طاہر موجود ہے وہ دیوار کی بنیادیں کھود رہا ہے' آخر کار طاہر نے وہ دیوار گرا دی دیوار کے ساتھ میں بھی نیچے آیا اور تاج خلافت میرے سر سے گر گیا' تب سے میں طاہر کی طرف سے چوکنا ہوں' اس

کے برعکس ہرثمہ ہمارے خاندان کا قدیم پروردہ ہے' میں اس کو خلیفہ مرحوم ہارون الرشید کے برابر سمجھتا ہوں۔"

میں نے سنا ہے اور شاید ٹھیک ہی سنا ہے کہ وقت پڑنے پر آدم زاد گدھے تک کو اپنے باپ کے برابر درجہ دینے پر "آمادہ" ہو جاتے ہیں' کم عقل امین یہ بھول گیا تھا کہ اس ہرثمہ کو ایک بار ہارون نے معزول کر دیا تھا' امین کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ہارون کی موت کے بعد ہرثمہ اس کے بجائے مامون کا طرف دار بن گیا تھا۔

دراصل آدم زادوں کو سب کچھ یاد رہتا ہے البتہ ان کی خود غرضی حافظے کو "کمزور" کر دیتی ہے یہی معاملہ امین کے ساتھ تھا' وہ اتنا بھولا اور مظلوم نہیں بلکہ چالاک اور ظالم تھا' جس قدر نظر آتا تھا اس کی گردن پر ہزاروں بے گناہوں کا خون تھا' مطلق العنان حکمرانوں کے دامن پر لہو کے دھبے صاف دکھائی دیتے ہیں' کچھ ایسے آدم زاد حکمرانوں کو اسی دنیا میں سزا مل جاتی ہے اور کچھ کا حساب کتاب آخرت پر ٹل جاتا ہے' بہرصورت وہ سزا سے نہیں بچتے۔

امین کو آخرت کی نہیں دنیا کی سزا کا خوف تھا۔ اس نے اسی لیے ہرثمہ سے امان طلب کی' مقام عبرت ہی تو ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید کا بیٹا امان طلب کر رہا تھا۔

جواب میں ہرثمہ نے خفیہ پیغام میں لکھا۔ "آپ مطمئن رہیں' کوئی بھی آپ کا بال بیکا نہیں کر سکتا' خود مامون نے بھی اگر کچھ برا ارادہ کیا تو میں سینہ سپر ہوں گا اور جب تک دم میں دم ہے ساتھ دوں گا۔"

ظاہر ہے یہ خفیہ پیغام مجھ جن زادی سے کس طرح "خفیہ" رہ جاتا۔

اپنی لگائی بجھائی کی عادت یا مصلحت کے مطابق میں نے یہ "خفیہ پیغام" بھی طاہر تک پہنچا دیا' وہ یک چشم آدم زاد اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ گویا ہونے والی بات اسے پہلے سے پتا لگ جاتی ہے۔

وہ طیش میں آ گیا اور کہا۔ "یہ کبھی نہیں ہو سکتا! آج تک میں نے تمام معرکوں میں اپنی جان کی بازی لگائی' اب امین کا ہاتھ آنا جو خاتمہ فتح ہے ہرثمہ کو کیسے نصیب ہو سکتی ہے!...... ہرگز نہیں۔ میں کسی قیمت پر ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" اس کا لہجہ قطعی تھا۔

"امین کا سر انشاء اللہ میں ہی امیر المومنین مامون کی خدمت میں پیش کروں گا۔"

ادھر تو یک چشم آدم زاد طاہر یہ منصوبے بنا رہا تھا' ادھر عمائدین بنی ہاشم سر جوڑ کے بیٹھے تھے۔ انہیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ہارون الرشید کے بیٹے امین کو کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ امین بذات خود ہرثمہ کے پاس چلا جائے' عصا' چادر اور انگشتری جو خلافت کی

نشانیاں ہیں طاہر کے پاس بھیج دی جائیں۔

آدم زاد اپنے لیے جو فیصلے کرتے ہیں عموماً ان میں اپنے مفاد کو نظر انداز نہیں کرتے' امین کے معاملے میں سب اپنی اپنی حشر بھنانے کو تیار تھے۔ ہرثمہ نسباً ہاشمی تھا اس لیے بنی ہاشم نے خیال کیا کہ وہ دغا نہ کرے گا۔ ہارون کی بیوی زبیدہ بھی ہرثمہ کے حق میں تھی۔ خود امین بھی اس سے زیادہ مانوس تھا۔

ان حقائق سے قطع نظر اب تک کی بیشتر فتوحات کا سہرا طاہر کے سر تھا۔ اسے خفا کرنا حماقت ہوتی لیکن امین تو گویا حماقت کا پتلا تھا۔ اس نے بنی ہاشم کے پورے فیصلے کو قبول نہیں کیا۔

وہ لوگ جو پہلے امین کے دست راست تھے اب طاہر سے مل گئے تھے۔ انہوں نے اپنا تقرب بڑھانے کے لیے طاہر سے کہا کہ آپ کو دھوکہ دیا گیا ہے۔ مخالفین نے بندوبست کر لیا ہے کہ امین کے ساتھ علامات خلافت بھی ہرثمہ کے ہاتھ آ جائیں۔

مجھے اب زیادہ سرگرمی دکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ امین نے خود اپنے لیے کانٹے بو لیے تھے۔ اگر وہ ایسا نہ بھی کرتا تو طاہر اسے مشکل ہی سے زندہ چھوڑتا۔ میں خاموش تماشائی بنی رہی مگر ایک حد تک! جہاں ضرورت پڑتی مداخلت "چاد بے جا" کرنے سے باز نہ آتی۔ ایک بار کوئی چسکا لگ جائے تو چھوٹنا محال ہوتا ہے۔

عارج اور میں قصر خلد سے گزر رہے تھے کہ میں رک گئی۔

"کیا ہوا تجھے اے دینار؟" عارج نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔ میرے ساتھ آ!" میں یہ کہنے کے بعد آگے بڑھ گئی۔

"ایک تو تیرے ساتھ یہ مصیبت ہے کہ بتاتی نہیں بات کیا ہے؟"

عارج کی بات کو میں نے ان سنی کر دیا۔ وہ تیر اندازوں کا ایک دستہ تھا جو قصر خلد کی نگرانی کر رہا تھا۔ طاہر نے اس دستے کے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ امین نکل کر نہ جانے پائے۔

25 محرم 198 ہجری کو بروز ہفتہ بہ وقت رات بعد نماز عشاء (تقریباً دس بجے) امین نے ہرثمہ کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ ہرثمہ نے کہلوایا کہ دریائے دجلہ پر طاہر نے فوج متعین کر دی ہے۔ آج کی رات حضور اور توقف فرمائیں تو کل میں فوج و حشم سے تیار ہوں۔ اگر طاہر سے مقابلے کی نوبت آئی تو سینہ سپر ہو کر لڑوں گا۔

امین ایسے اضطراب و خوف کی حالت میں تھا کہ بغداد میں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا اس کو

گراں تھا۔ اس نے ہرثمہ کے قاصد سے کہا اس اضطراب میں کس طرح سے رات کٹ سکتی ہے۔ بلائے یا نہ بلائے میں تو اسی وقت ہرثمہ کے پاس جاتا ہوں۔

یہ امین کا آخری ''دربار'' تھا۔ وہ قصر خلد سے رخصت ہوتے وقت صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا' چند خدام اس کے سر پر گرز لیے کھڑے ہوئے اس نے اپنے دونوں بیٹوں موسیٰ و عبداللہ کو بلایا اور سینے سے لپٹا کر پیار کیا۔ ان کی پیشانی اور گالوں پر بوسے دیئے۔ پھر انہیں گلے سے لگا کر خوب رویا اور نہایت حسرت کے ساتھ یہ کہہ کر رخصت کیا کہ جاؤ خدا کو سونپا۔ اپنی بیوی اور پسندیدہ کنیزوں سے وہ پہلے ہی مل چکا تھا۔ جب وہ قصر خلافت سے قصر خلد میں آیا تو اپنے ''حرم'' کو بھی ساتھ لایا' (حرم عربی زبان کا لفظ ہے اس کے کئی معنی ہیں۔ (1) کعبے کی چار دیواری (احاطہ)' (2) اندرون خانہ' اشراف کے گھر کی عورتیں (3) منکوحہ' گھر میں ڈالی ہوئی باندی' وہ کنیز جس سے صحبت کی ہو (4) لونڈی' خادمہ۔

اس سے قبل امین جب بھی سفر کرتا تو ہزاروں زریں کمر غلام ہوتے' ان غلاموں کی زرق برق پوشاکیں' چمکتے ہوئے مرصع ہتھیار دور سے دکھائی دیتے۔ آج وہ اس حال میں چلا کہ خادم کے ہاتھ میں صرف ایک شمع تھی جو راستہ دکھانے کو قصر خلد سے ساتھ لی گئی تھی۔

امین قصر خلد سے نکلا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ تیر اندازوں کا وہ دستہ محو خواب تھا جو قصر خلد کی نگرانی پر مامور تھا۔

اس موقع پر میں نے اچانک امین کے جسم کو جھٹکا کھاتے دیکھا' میں سمجھ گئی کہ کیا واقعہ ہوا ہے! عارج میرے ساتھ نہیں تھا۔

اس آدم زاد امین پر رحم مجھے بھی آیا مگر اب عارج چاہتا بھی تو اسے شاید نہ بچا پاتا۔ امین کے جسم میں عارج کے گھس جانے سے صورتحال میں کوئی تبدیلی نہ آتی' پھر مجھے ایک اور تماشا دکھائی دیا۔ عارج کو امین کے قالب میں قرار نہ آیا' یقیناً اس آدمی امین کے اندر اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا۔ گھٹن سے عارج گھبرا گیا۔ میں نے فوراً اندھیرے کی چادر اوڑھ لی کہ عارج کو نظر نہ آؤں' چلتے چلتے امین پھر لہرایا' اس وقت ایک طرف سے کوئی امین کی جانب لپکا' اس نے امین کو زمین پر نہ گرنے دیا۔

''کون ہے تو؟'' اس عالم میں بھی امین کی بھرائی ہوئی آواز سخت تھی۔

''حضور کا نمک خوار غلام' احمد بن سالم' ناظم فوج داری تھا' کبھی' اب کچھ بھی نہیں' غلام کو اندازہ تھا کہ حضور پر برا وقت پڑا ہے اسے میں نمک حلال ہی....'' وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا اس کی وجہ عارج تھا۔ امین کے قالب سے نکل کر اب وہ احمد کے انسانی پیکر میں داخل ہوگیا

تھا' میں احمد پر نگاہ رکھے ہوئے تھی۔

''چل...... آ جا! ہمیں واقعی اس وقت اپنے وفاداروں کی ضرورت ہے۔'' امین بولا

میں ان دونوں آدمیوں کو شمع اٹھانے والے خادم کے قریب ہی تھی۔ مجھے یہ دیکھنا تھا کہ عارج کو احمد کے پیکر میں قرار آتا ہے یا نہیں! اس مرتبہ عارج کامیاب رہا' اسے احمد کا جسم نہیں چھوڑنا پڑا۔

امین کو سنبھالے عارج آگے بڑھا' وہ دجلہ کے کنارے پہنچا تو ہرثمہ اسے لینے کو موجود تھا۔ دریا کنارے حراقہ کھڑی تھی۔ (حراق اس جنگی کشتی کو کہتے تھے جس میں آتش باری کا سامان ہوتا تھا۔ اس کے ذریعے دشمنوں پر آگ برسائی جاتی تھی۔ (مصنف)

ہرثمہ اور اس کے سپاہی کشتی (حراق) پر سوار تھے' امین نے شمع بردار خادم کو واپس بھیج دیا۔ عارج کے انسانی قالب نے امین کو کشتی پر سوار کرایا۔ سب سپاہیوں نے امین کو تعظیم دی۔ ہرثمہ کو کیوں کہ نقرس کی شکایت تھی اس لیے امین کے احترام میں اٹھ نہ سکا۔ (نقرس ایک درد شدید کا نام ہے جو پیروں کی انگلیوں سے اٹھتا ہے) یہ بیماری صرف آدمیوں کو ہوتی ہے۔ درد کے باوجود ہرثمہ کوشش کر کے گھٹنوں کے بل کھڑا ہوگیا اور بولا۔ ''اے امیر المومنین! یہ غلام سو عباس معافی مانگتا ہے کہ حضور کے احترام میں اٹھ کر کھڑا نہ ہو سکا' بیماری کی وجہ سے غلام معذور ہے۔''

''اے ہرثمہ بن امین! تم ہرگز غلا...... غلام نن... نہیں۔'' امین ہکلانے لگا مگر اس نے سچ ہی کہا۔ ''تم امرائے عرب میں...... میں سے ہو.... ہمیں...... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

ہرثمہ نے امین کو اپنی آغوش میں لے لیا' اس کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسے دیئے۔

''میرے آقا...... میرے مالک...... میرے سردار!'' ہرثمہ جیسے ہارون کے اس نااہل بیٹے پر محض اس لیے قربان ہوا جا رہا تھا کہ وہ اہل عرب میں سے تھا۔ خود کو عرب (زبان والے) اور دوسروں کو عجمی (بے زبان' گونگے) کہنے والے ناجائز فخر میں مبتلا تھے۔ وہ یہ بھول گئے تھے یہ سبق انہیں یاد نہیں رہا تھا کہ کسی عرب کو عجمی پر اور گورے کو کالے پر فوقیت حاصل نہیں' حضور سرور کائنات رسول آخر الزمان نے اپنے آخری خطبہ حج میں یہی تو کہا تھا۔ اپنے باپ اخضم سے میں نے یہی سنا تھا۔

پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ طاہر نے دہرا بندوبست کیا تھا' ایک طرف تو اس نے قصر خلد کی نگرانی پر تیر اندازوں کا ایک دستہ تعینات کیا' دوسری جانب دریائے دجلہ پر خفیہ پہرا بٹھا دیا۔ ادھر ہرثمہ نے حراق کے ناخدا کو آگے بڑھنے کا حکم دیا' ادھر طاہر کے سپاہیوں نے حراق کو

گھیرے میں لے لیا۔ ان میں غوطہ خور بھی تھے۔ طاہر کے سپاہی جنگی کشتیوں میں سوار تھے۔ حراقہ کا محاصرہ کر کے طاہر کے فوجیوں نے لڑائی شروع کر دی، جنگی کشتیوں کے بیڑے سے لڑنا بھلا کیسے ممکن تھا! ہرثمہ گھبرا گیا' عارج کے انسانی قالب احمد کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میرا یہ اندازہ غلط نکلا کہ عارج اب احمد کے جسم سے باہر آ جائے گا۔

حراقہ پر اتنے تیر اور پتھر برسائے گئے کہ اس کے تختے سلامت نہ رہے' غوطہ زنوں نے حراقہ کے پیندے میں سوراخ کر دیا تھوڑی دیر میں حراقہ پانی سے لبریز ہو کر ڈوب گئی۔

مجھے عارج کی طرف سے فکر ہوئی کہ کہیں وہ احمد کے قالب میں رہ کر نہ مارا جائے میں سطح آب پر نظر رکھے ہوئے تھی' حراقہ کا ناخدا بھی تیرنا جانتا تھا وہ ہرثمہ کو نکال لے گیا۔ میں نے عارج کو کنارے کی طرف تیرتے دیکھ لیا تو قدرے میرا اضطراب کم ہوا۔ عارج سے ایک حماقت اور سرزد ہوئی وہ امین کو سہارا دیئے رہا کہ ڈوب نہ پائے۔ بہرصورت عارج اور امین دونوں ہی کنارے تک پہنچ گئے۔ حراقہ پر ہرثمہ کے جو سپاہی سوار تھے ان میں سے چند ہی مارے گئے' باقی کو طاہر کے بحری بیڑے نے دریا سے نکال کر حراست میں لے لیا' انہی میں ہارون کا نالائق بیٹا امین بھی تھا۔ اسے کوئی نہ پہچانا' اس نے ہوشیاری یہ کی کہ پانی ہی میں تیرتے ہوئے جو کچھ پاس بچے تھا دریا میں پھینک دیا' تیرتے ہوئے بوجھ کم سے کم ہونا چاہیے امین کو اپنے استادوں کی یہ تاکید یاد تھی۔

میرے لیے امین کے بجائے عارج اہم تھا۔ میں چاہتی تو اسے رہا کرا لیتی مگر ابھی نوبت یہاں تک نہیں آئی تھی۔

طاہر کا قیام اب تک باب الانبار کے قریب تھا' پاس ہی باغ میں اس کے محافظ چوکنا رہتے وہ اس امید پر جاگ رہا تھا کہ کوئی ''خوش خبری'' سن لے تو اطمینان سے پاؤں پھیلا کر سوئے۔

اپنی کارکردگی دکھانے کی غرض سے سپاہی' عارج کو پکڑ کر طاہر کے پاس لے گئے انہوں نے طاہر کو ساری روداد سنا دی۔

''وہ امین کہاں ہے۔'' طاہر گویا گرجا۔

''ان..... اس..... کی تلاش جاری ہے۔'' سالار دستہ فوج نے ٹپٹا کر جواب دیا۔

''اور تو کون ہے؟'' طاہر نے عارج سے کڑک کر پوچھا عارج نے اپنے انسانی قالب احمد بن سالم کا حسب نسب بتا دیا۔ لازماً موقع ملتے ہی عارج نے یہ ضروری معلومات حاصل کی ہوں گی پھر طاہر نے امین کا حال معلوم کیا۔

''وہ دریا میں گرتے ہی ڈوب گیا تھا۔'' عارج نے غلط جواب دیا۔

جھوٹا کہیں کا! میں نے سوچا' یہ سمجھ رہا ہے کہ اس طرح ''کرینٹ'' آدم زاد طاہر کو دھوکا دے سکتا ہے اسے جھوٹ بولنے اور امین کو بچانے کی تھوڑی بہت سزا تو ملنی ہی چاہیے۔

طاہر کے حکم سے عارج کو بغداد شہر کے ایک بوسیدہ مکان میں قید کر دیا گیا۔ وہ بھی ایک ہی ضدی جن زاد تھا' ہمت نہ ہارا۔ ادھر طاہر اس لالچ میں تھا کہ ناظم فوج داری سے منال منال ''اینچ'' لے۔ اس نے دباؤ ڈالنے کے لیے عارج سے کہلوایا کہ اسے قتل کیا جانے والا ہے' کچھ دیر کو عارج چکرایا کہ اب کیا کرے! ''بھاگ'' لے کہ احمد کے قالب میں نکلے۔

آخر عارج نے ایک مناسب فیصلہ کر ہی لیا' احمد بن سالم کے سارے مال و اسباب کے بدلے عارج نے اپنی جان بچالی' طاہر کو ''زرتاوان'' مل گیا تو فی الفور اسی رات کو ایک اور حکم دیا اس حکم کے تحت بھی عارج نے قید سے رہائی نہ پائی۔ عارج کو اس بوسیدہ مکان سے نکال کر قصر خلافت کے زنداں میں لے جایا گیا' اسی زمین دوز قید خانے میں ان تمام آدمیوں کو رکھا گیا تھا جو زندہ ہاتھ آ گئے تھے۔ انہی میں امین بھی تھا۔

امین کی حالت قابل رحم تھی۔ عمامہ اب بھی اس کے سر پر تھا' اسی عمامے کے کپڑے سے امین اپنا نصف چہرہ چھپائے ہوئے تھا اس کے علاوہ امین صرف ایک پاجامہ پہنے تھا' قمیض یا جسم پر کوئی اور کپڑا مجھے نظر نہ آیا (صحیح لفظ قمیص ہی ہے' ص سے)

قید خانے میں موجود آدم زاد ڈرے ڈرے اور سہمے ہوئے تھے اس وقت تک کسی کو خبر نہ تھی کہ امین زندہ ہے' مرا نہیں۔ اسی سبب عارج کو قید خانے کے اسی حجرے میں بند کیا گیا جہاں امین پہلے سے موجود تھا۔

دور جلتی ہوئی مشعل کی روشنی اس حجرے کے اندر تک آ رہی تھی دروازے کے باہر ذرا فاصلے پر مسلح دربان موجود تھے' اس زمین دوز قید خانے میں اتنی روشنی تھی کہ سوئی بھی گر جائے تو نظر آ جائے انہیں تاکید کی گئی تھی کہ احتیاط رکھیں۔

امین نے عارج کے انسانی قالب احمد کو پہچان لیا اور بے ساختہ رو پڑا اور چہرے سے کپڑا ہٹا دیا۔

''خود پر قابو رکھیں حضور' ورنہ۔''

''انا للہ وانا الیہ راجعون'' امین بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اے احمد بن سالم تمہیں میں نے پہچان لیا ہے۔''

''جی ہاں میں حضور کا غلام ہوں۔'' عارج نے کہا

"بھائی غلامی کیسی! اس وقت تم میرے قوت بازو ہو مجھے ذرا اپنے سے لگا لو سخت وحشت ہو رہی ہے۔"

عارج نے اسے لپٹا لیا تو کانپنا کسی قدر کم ہوا۔

"تمہیں مامون کا کچھ حال معلوم ہے۔" امین نے دھیمی آواز میں عارج سے سوال کیا۔

"وہ زندہ ہے۔"

"خدا پرچہ نویسوں کا برا کرے، کم بختوں نے خبر دی تھی کہ مامون مر گیا۔" امین بھولا بن گیا۔

"خدا آپ کے وزیروں کا برا کرے۔"

"وزیروں کو کچھ نہ کہو احمد! ان کا کیا گناہ ایک میں ہی پہلا شخص نہیں ہوں جو اپنے ارادے پورے نہ کر سکا۔" امین کہنے لگا پھر کچھ توقف سے پوچھا۔ "کیوں احمد، لوگ مجھے قتل کر ڈالیں گے یا اپنے عہد پر قائم رہیں گے؟"

عارج نے اسے جھوٹی تسلی دی۔ "وہ سارے آپ کے امرائے دولت جو طاہر سے جا ملے ہیں دراصل آپ ہی کے وفادار ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے عہد کی پاس داری کریں گے آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔"

یہ سن کر امین کے چہرے پر اطمینان دکھائی دیا۔

ان دنوں بغداد میں شدت کی سردی پڑ رہی تھی، امین پانی میں بھیگا ہوا تھا عارج نے اسے اپنا شلوکہ اتار کر دیا اور بولا۔ "آپ اسے پہن لیجئے، سردی لگ رہی ہوگی۔"

امین نے شکر گزاری کا اظہار کیا اور کہا۔ "ہر چند کہ اس شلوکے سے تمہارے بدن کی بو آتی ہے مگر بھائی! اس موقع پر تو یہ بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔"

عارج نے امین کو سونے کا مشورہ دیا۔ کچھ کہے بغیر امین حجرے کے فرش پر "تکی" بن کر پڑ رہا۔ خود عارج نے بھی دروازے کی طرف پیٹھ کی اور آنکھیں بند کر لیں۔

صبح ہونے والی تھی، مجھے معلوم تھا کہ "تاوان" وصول کر کے طاہر وعدہ خلافی نہ کرے گا۔ اگر عارج کے انسانی قالب احمد بن سالم کو مارنا ہی ہوتا تو شہر کے ایک تباہ حال ادھ جلے مکان سے قصر خلافت کے تہ خانے میں نہ رکھا جاتا۔

واقعہ یہ تھا کہ جب تک امین کا سراغ نہ لگ جاتا وہ زندہ ہے یا مردہ؟ کسی قیدی کو رہا کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

کچھ ہاتھ پیر خود طاہر کو بھی مارنے چاہئیں، میں نے یہ سوچ کر مزید مداخلت نہیں کی۔ قصر خلافت کے اس زنداں سے میں نکل آئی۔

دوسرے دن طاہر کے حکم پر صبح ہی سے بغداد کی ناکہ بندی کر دی گئی، ہرثمہ اپنے سپاہیوں سے جا ملا جو بغداد کے باہر موجود تھے۔

امین اگر جلد بازی سے کام نہ لیتا، ہرثمہ کا کہنا مان کے مزید ایک رات رک جاتا تو غالباً دشمن کی قید میں نہ ہوتا۔ یہ الگ بات کہ "بغل میں بچہ، شہر میں ڈھونڈورا" کے مصداق طاہر کو پتا نہ تھا، امین کو پکڑا جا چکا ہے اور اسی کی قید میں ہے۔

صورتحال سے میں لطف اندوز ہو رہی تھی۔ طاہر جھنجھلایا ہوا اپنی ایک آنکھ کو بار بار مل رہا تھا، نیند پوری نہ ہونے کے سبب آنکھ میں پانی آ جاتا اور کھجلی بھی ہوتی، اسی عالم میں دن بھر وہ "اونگھے بونگے" احکام جاری کرتا رہا۔

آدھی رات کا وقت ہوگا کہ محمد بن حمید طاہری مجھے سرگرم نظر آیا، قصر خلافت میں داخل ہوا اور پھر زمین دوز قید خانے میں جا پہنچا۔ قیدیوں کے حجروں میں جھانکتا ہوا آخر کار وہ عارج وامین کے حجرے تک پہنچ گیا۔ دور سے اس نے امین کو پہچان لیا، امین اس اطمینان میں تھا کہ بچ گیا ہے۔ عارج کی تاکید کے باوجود اس نے چہرہ نہ چھپایا۔ وہ بے وقوف تو اس صورتحال سے مزہ لے رہا تھا، اسے خبر بھی نہ تھی کہ کوئی اسے شناخت کر کے جا چکا ہے۔

امین اب تک نہ خود سویا نہ عارج کو سونے دیا۔ اس نے عارج سے بالکل بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔ "تم دیکھنا احمد کہ طاہر مجھے نہ ڈھونڈ پائے گا جس طرح کل کی رات سکون سے گزر گئی آج بھی صبح ہو جائے گی یہ بھی ممکن ہے کہ نئے دن کا سورج میرے وفاداروں کی غیرت کو جگا دے۔"

عارج نے گویا جان چھڑانے کو کہہ دیا۔ "ہاں حضور! انشاء اللہ تعالیٰ۔"

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ بھاری قدموں کی چاپ گونجی۔ امین اچھل پڑا، عارج تاڑ گیا کہ کیا ماجرا پیش آنے والا ہے، وہ احمد بن سالم کے جسم کو چھوڑ کر باہر آنے لگا تو میں اندھیرے کی چادر میں چھپ گئی۔

احمد پر عارج نے گہری نیند مسلط کر دی کہ اس ہنگامہ مرگ میں کہیں وہ کام نہ آ جائے پھر عارج وہاں رکا نہیں اور تیزی کے ساتھ زنداں سے نکل گیا ذرا سی دیر ہوئی تھی کہ "بھاری قدم" حجرہ امین کے سامنے رک گئے، اشارہ ملتے ہی دربانوں نے حجرے کا دروازہ کھول دیا۔ عجمیوں کا وہ گروہ دروازے پر آ کے ٹھہر گیا۔ انہوں نے احمد کو سوتے پایا تو پلٹ کر دربانوں

سے اسے اٹھا کر لے جانے کو کہا' اب حجرے میں امین اکیلا کھڑا کانپ رہا تھا۔ آنے والے عجمیوں کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی تلواریں تھیں۔

کانپنے والے امین کی خود غرضی کے سبب بغداد پر تباہی آئی تھی۔ سو مجھے اس پر رحم نہ آیا اس نے خود اپنے آپ پر رحم نہ کیا تو کوئی اور اس پہ رحم کیوں کھاتا! عوام مر رہے ہوں اور حکمران عیش و عشرت میں مبتلا ہو تو اسے سفلا پن اور خود پر رحم نہ کرنا ہی کہا جائے گا۔ معلوم نہیں کیوں آدمی اپنی موت کو بھول جاتا ہے۔

امین کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا نتیجہ یہ کہ اب تھر تھر کانپتے ہوئے اپنے ممکنہ قاتلوں سے مخاطب تھا۔ ''م...... میں...... ہارون الرشید کا...... فرزند ہوں...... ما...... مامون کا بھا...... بھائی ہوں...... میرا خون کسی طرح حلال نہیں۔''

اس کی ہکلاہٹ نام و نسب اور فریاد کچھ کام نہ آیا۔ وقعتہً آنے والے عجمیوں کا گروہ اس پر ٹوٹ پڑا۔ (دفعتہً کو الف سے لکھنا درست نہیں۔ (مصنف) ایک شخص نے کمر پر تلوار ماری' پھر سب نے مل کر اسے پچھاڑا' اس کا منہ زمین کی طرف تھا' اسے اسی حالت میں الٹی طرف سے ذبح کیا گیا۔ تلوار کی تیز دھار نے چند لمحوں میں سر کو تن سے جدا کر دیا۔

امین کا کٹا ہوا سر تصدیق قتل کی خاطر طاہر کے پاس لے جایا گیا۔

''اسے قصر خلافت کے کسی برج پر لٹکا دیا جائے۔'' طاہر نے حکم دیا۔

صبح ہوئی تو زمین دوز قید خانے سے امین کی سر بریدہ لاش بھی اٹھوالی گئی جسے بازار کرخ میں لٹکوا دیا گیا۔

عوام کو یہ نظارہ طاہر نے اپنی دانست میں اس لیے کرایا کہ داد پائے' لوگ عبرت پکڑیں کہ معزول خلیفہ کی بیعت نہیں کرنی چاہیے۔ امین کی ماں' ہارون کی بیوہ زبیدہ اپنے قصر میں تھی۔ اسے ایک خواص نے آ کر بتایا۔ ''امیر المومنین قتل کر دیئے گئے۔'' زبیدہ اس پر کچھ نہ بولی' ایسے میں بھلا تاب گویائی کہاں ہوتی ہے۔

کسی ماں کو جوان بیٹے کے مرنے کی خبر ملے تو اس کے دل پر جو گزر سکتی ہے وہی زبیدہ پر گزری وہ آدم زادی گم صم بیٹھی رہی (گم صم کو عموماً گم سم لکھ دیا جاتا ہے جو غلط ہے۔ صم کا مطلب نہ سننا جبکہ سم گھوڑے' گدھے وغیرہ کے کھروں کو کہتے ہیں۔ (مصنف) زبیدہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ امین کا خون کر دیا گیا اور وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ اس نے اگر کیا تو یہ کہ امین کے قتل کی راہ نادانستگی اور دانستہ سوتیلے پن سے ہموار کر دی۔

زبیدہ خاتون پر جو گزری اس نے اشعار کی صورت میں مامون کو لکھ بھیجا۔ ان عربی

اشعار کا مطلب شعر بہ شعر یہ ہے:

ام جعفر کی طرف سے خلیفہ مامون کے نام جو کہ اگلوں کے علم و فہم کا وارث ہے۔

اے ابن عم! میں تجھ کو لکھ رہی ہوں اور میری آنکھیں پلکوں سے خون برساتی ہیں۔

مجھ کو ذلت اور اذیت و رنج پہنچا اور فکر نے میری آنکھوں کو بے خواب کر دیا۔

یہ طاہر کو کیا ہوا ہے جس کو خدا طاہر (پاک) نہ کرے اور جو کچھ اس نے کیا اس کے الزام سے پاک نہیں ہو سکتا۔

☆......☆......☆

زبیدہ کے آخری اشعار یہ تھے۔ اس نے مجھ کو برہنہ سر اور بے پردہ کیا' گھر (قصر زبیدہ) سے نکالا اور میرا مال لوٹ لیا اور مکانات برباد کئے۔ اس ایک چشم ناقص الخلقت کے ہاتھ سے جو مجھ پر گزرا ہارون ہوتا تو اس پر بھی گراں گزرتا۔

طاہر نے جو کچھ کیا' اگر تیرے حکم سے کیا تو خدا کی طرف سے مقدر سمجھ کر قبول کرتی ہوں۔

مجھے عارج نے بتایا کہ مامون اپنی سوتیلی ماں زبیدہ کے اشعار پڑھ کر رویا اور کہا۔ ''واللہ میں خود اپنے بھائی کے خون کا عوض لوں گا۔'' تصویر کا دوسرا رخ یہ تھا کہ جب مو میں تسخیر بغداد کے بعد امین کا سر پہنچا تو اس غیر متوقع فتح کی خوشی منائی گئی۔ مامون نے سجدہ شکر ادا کیا۔ یہ واقعہ ذرا تفصیل کا تقاضا کرتا ہے۔

طاہر نے مامون کو ان دلچسپ اور مختصر الفاظ میں نامہ فتح لکھا۔ ''میں امیر المومنین کے حضور میں دنیا اور دین' دونوں پیشکش بھیجتا ہوں۔'' دنیا سے امین کا سر مراد تھا اور دین سے لاٹھی' اور خلافت کی انگوٹھی' حقیقت یہ ہے کہ بن عباس نے اپنی مطلق العنانی برقرار رکھنے کیلئے دین کو ڈھال بنا رکھا تھا ورنہ تو دین (مذہب) سے آمریت کا کیا تعلق۔ یہ آدم زاد اپنے ظلم پر کس کس طرح پردے ڈالتے ہیں۔

امین کا سر' فضل مجوسی نے ایک سپر میں رکھ کر مامون کے سامنے پیش کیا تھا۔

مامون نے قاصد کو مژدہ فتح کے صلے میں دس لاکھ درہم انعام دیئے۔ اسی تقریب میں ایک بڑا دربار منعقد کیا گیا۔ تمام اراکین دولت و افسران فوج مبارک باد دینے کو حاضر ہوئے۔ فضل مجوسی نے دربار عام میں نامہ فتح پڑھا اور ہر طرف سے ''مبارک مبارک'' کا غل اٹھا۔

اگرچہ اس وقت اتنی خوشی منائی گئی مگر اس خمار کے اترتے ہی مامون کو جیسے ہوش آ

گیا۔ امین و مامون کی مائیں الگ سہی' باپ تو ایک ہی تھا۔ وہ دونوں ہی ہارون الرشید کے بیٹے تھے۔ خون تو جوش مارتا ہی ہے۔ مامون کو اس فتح کا نہایت افسوس ہوا۔ طاہر کی تمام کوششیں اس کی نظر میں بے توقیر ہو گئیں۔ وہ مامون کے نزدیک امین کا قاتل ٹھہرا۔

امین کا قتل 25 محرم الحرام کو ہوا۔ اس کی عمر 28 برس تھی۔ 4 برس 7 مہینے 18 دن اس نے خلافت کی۔

24 محرم 198 ہجری بروز ہفتہ اہل بغداد نے عموماً مامون کیلئے بیعت کی۔ اس کی مستقل خلافت اسی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ بنو عباس میں امین پہلا خلیفہ تھا جسے معزولی کے بعد قتل کیا گیا۔

طاہر نے امین کو قتل کرا کے امان کی منادی کرا دی۔ (یہ 25 محرم جمعہ کا دن تھا) بغداد شہر میں طاہر اپنی فتح کا پرچم لہراتا ہوا داخل ہوا۔ جامع مسجد میں اس نے نماز جمعہ ادا کی۔ مامون کے نام کا خطبہ پڑھا اور امین کی برائیاں بیان کیں۔

بغداد میں جس قدر بھی بڑے بڑے قصر تھے طاہر کے آدمیوں نے سب کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس موقع پر زبیدہ امین کے اہل حرم اور دونوں بیٹوں موسیٰ و عبداللہ کو شہر بدر کر دیا گیا۔ طاہر نے انہیں بالائی زاب کے شہروں کی طرف بھیجا۔ چند دنوں کے بعد موسیٰ و عبداللہ کو مامون کے پاس طاہر ہی نے روانہ کیا۔

قتل امین کے بعد بغداد میں موجود سپاہیان قدیم تیز طاہر کی فوج کو اپنے کئے پر پشیمانی ہوئی مگر اب اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔ فوجیوں نے طاہر سے روزینہ طلب کیا' وہاں کیا تھا' حیلے سے فوجوں کو ٹال دیا۔ لشکریوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ اشتعال اس قدر بڑھا کہ قتل امین کے پانچویں روز لشکریوں نے بلوہ کر دیا۔ طاہر اپنے وفادار سالاروں کے ساتھ بغداد سے ایک جگہ عقرقوبا کی طرف بھاگ لیا۔

بغداد کے علاوہ عراق کے دوسرے شہروں میں بھی باغی سر اٹھانے لگے۔

ایک دن عارج مجھ سے پوچھنے لگا۔ "اب کیا ہوگا اے دینارا!"

"اے عارج اس بات کا جواب تجھے آنے والا وقت دے گا۔"

"تو پھر تو کس مرض کی دوا ہے؟" عارج جھنجلا گیا۔

"اپنے حواسوں میں رہ۔" میں سخت آواز میں بولی۔ "جن زادیوں سے گفتگو کا سلیقہ سیکھ۔"

"تیرے ساتھ رہا یا تو نے مجھے اپنے قریب رہنے دیا تو بات کرنی بھی آ جائے گی۔

بول قریب آنے دے گی مجھے؟"

"قریب تو ہے۔" میں نے کہا۔ "اس سے آگے حد ادب لازم ہے۔"

"اس غلام کو ملکہ جنات سے یہی توقع تھی۔"

"غلام کو حکم دیا جاتا ہے کہ پھوٹ لے۔"

"پھوٹ لیا اے ملکہ' اے دینارا!" یہ کہتے ہی عارج غائب ہو گیا۔

میں سمجھ گئی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر عارج مرو میں مامون کی خیر خبر لینے گیا ہے۔

ایک حکمراں کی حیثیت سے امین کی ناکامی اور قتل کوئی منفرد واقعہ نہیں لیکن اہم ضرور ہے۔ تاریخ آدم زاد میں ایسے متعدد واقعات پیش آتے رہتے ہیں' میں جو واقعات بیان کر رہی ہوں ان سے عرب اور عجم کی کشمکش کے نقطہ عروج کا پتہ چلتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شخصی حکومت کے سامنے کسی اصول' کسی مذہبی معاہدے اور کسی خونی رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

امین کے پاس دولت اور فوج کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن شعور بہر حال برائے نام تھا۔ اگر وہ کم عقل نہ ہوتا تو طاہر کی فتوحات کے سیلاب کو روکنا آسان تھا۔ میں ایک جن زادی بھی اس کے خلاف نہ ہوتی۔

ان دو عوامل کے علاوہ امین کی ناکامی کے اور بھی اسباب تھے۔ پہلا سبب خود اس کی معاہدہ شکنی تھا۔ اس کی وجہ سے سپاہیوں اور افسروں کا اعتبار اس پر سے اٹھ گیا تھا۔ وہ امین کی پریشانی سے ہر ممکن فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ تنخواہوں اور مدد معاش میں اضافے کے مطالبات برابر بڑھتے رہتے تھے۔ اس کے برخلاف خراسانی فوجوں کے سامنے عربوں کا فوجی اقتدار ختم کرنا مقصد تھا۔ وہ اسی لئے جنگ میں بڑی مستعدی سے لڑتی تھیں۔ طاہر کی کامیابی دراصل اسی مقصد کی کامیابی تھی۔

یہ بات بہت عجیب سہی مگر سچ ہے کہ بحیثیت خلیفہ امین خود کو قطعی محفوظ سمجھتا تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ کسی عباسی خلیفہ کو جان کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ جو قوم حضرت عثمانؓ' حضرت علیؓ' اور امام حسینؓ کو شہید کر سکتی ہے اس کے افراد عباسی خلیفہ کی حرمت کو بھی خاک میں ملا سکتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ باغیوں کو اپنے مفادات سے مطلب تھا۔ انہیں نہ امین سے دلچسپی کہ وہ مارا گیا اور نہ مامون سے۔ انہی باغیوں میں سے ایک آدم زاد ابو عبداللہ محمد تھا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے علم بغاوت بلند کیا۔ اس کا نسب اور تقدس عوام کی توجہ حاصل کرنے کو کافی تھا مگر

ملکی نظم و نسق کیلئے ایک مدبر کی ضرورت تھی۔ یہ ضرورت ایک مجہول النسب دیو السرایا نے پوری کی۔ ابو عبداللہ محمد' ابن طباطبا کے نام سے مشہور تھا۔ ابو السرایا کی شرکت سے سیاسی بازو بھی قوی ہو گیا۔

یہ شخص ابو السرایا اگرچہ ابتداء میں نہایت ذلت و خواری سے گزر بسر کرتا تھا اور کرائے پر گدھے چلاتا تھا لیکن اس میں شجاعت تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے بڑا اقتدار حاصل کر لیا۔ امین قتل کر دیا گیا تو ایک مدت تک یہ غارت گری کرتا رہا۔ اس نے عمال کو شکستیں دیں اور خزانے لوٹ لئے۔

یہی ابو السرایا رقہ پہنچا تو ابن طباطبا سے ملاقات ہوئی جو خلافت کا دعوے دار بن کے اٹھا تھا۔ وہ السرایا کو بھی مشغلہ ہاتھ آیا اس نے ابن طباطبا کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اس سے کہا۔ "آپ دریا کی راہ سے شہر کوفہ کی طرف بڑھئے میں بھی خشکی کی راہ سے آتا ہوں۔"

کوفہ پہنچ کر پہلے ابو السرایا نے قصر العباس لوٹا' یہ والیان کوفہ کا صدر مقام تھا۔ تمام مال و خزانہ دفتر یہیں رہتا تھا۔ اس لوٹ میں بے شمار نقد و اسباب ہاتھ آیا جو ایک مدت سے جمع ہوتا آیا تھا۔ شہر پر پورا قبضہ ہو گیا۔

اطراف سے بھی جوق در جوق لوگ آئے اور ابن طباطبا کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حسین بن سہیل یعنی فضل مجوسی کے بھائی نے زبیر کو دس ہزار کی جمعیت سے ابن طباطبا کے مقابلے پر بھیجا۔

دونوں فوجیں معرکہ آرا ہوگئیں۔ زبیر کو شکست ہوئی۔ ابو السرایا کے حکم سے جس قدر مال و اسباب زبیر کی فوج میں تھا لوٹ لیا گیا۔ ابن طباطبا نے اس لوٹ مار کو ناپسند کیا اور لوگوں کو بے رحمی سے منع کیا۔

ابو السرایا نے یہ دیکھ کر ابن طباطبا کے سبب میری آزادی میں فرق آتا ہے دوسرے ہی دن اسے زہر دلوا دیا۔ اس نے ایک کم سن لڑکے کو جو آل ہاشم ہونے کی حیثیت سے ابن طباطبا کا ہم پلہ تھا خلیفہ قرار دیا۔ اس خلیفہ کا نام محمد محمد بن زید تھا۔

اب حسن بن سہیل نے عبدالقدوس نامی ایک سالار کو چار ہزار سوار کے ساتھ اس مہم پر بھیجا مگر وہ بھی ناکام رہا۔ سالار عبدالقدوس قتل ہوا اور باقی اہل لشکر کچھ لڑائی میں مارے گئے کچھ زندہ گرفتار ہوئے۔

اس نمایاں فتح کے بعد ابو السرایا نے کوفے میں اپنا سکہ و خطبہ جاری کیا اور بصرہ واسط' اہواز' یمن' فارس و مدائن پر فوجیں و افسر بھیجے جو اکثر کامیاب ہوئے۔

حسن بن سہیل کو اب سخت مشکل کا سامنا تھا۔ جتنے نامور افسر تھے سب نے ابو السرایا کے مقابلے میں شکست کھائی یا عین معرکہ جنگ میں لڑ کر مارے گئے۔ طاہر و ہرثمہ دو ایسے لڑاکا تھے جو ابو السرایا کا زور توڑ سکتے تھے۔ طاہر اس وقت رقہ میں گویا محصور تھا۔ ہرثمہ خود حسن بن سہیل سے ناراض ہو کر خراسان کو روانہ ہو چکا تھا۔ حسن کو ہرثمہ سے طالب اعانت ہونا موجب عار تھا' پھر بھی مجبوری ایسی آن پڑی کہ ہرثمہ سے اعانت مانگتے ہی بنی۔ خراسان کی طرف جاتے جاتے ہرثمہ واپس پھرا اور کوفے کو روانہ ہوا۔ قصر بن ہبیرہ کے قریب ابو السرایا سے ہرثمہ کا مقابلہ ہوا۔ اس معرکے میں ہرثمہ نے مکمل فتح پائی۔ ابو السرایا بھاگتا ہوا شہر کوفہ پہنچا جو لوگ اس کے ساتھ تھے ہرثمہ سے شکست کھا کر انتقام کے جوش میں تھے۔

شہر کوفہ میں جس قدر آل عباس اور ان کے ہامی تھے سب کے مکانات آگ لگا کر برباد کر دیئے گئے۔ جاگیریں لوٹ لی گئیں اور دل کھول کر غارت گری کی گئی (ہامی اور حامی دو زبانوں ہندی اور عربی کے الفاظ ہیں' ہامی کا مطلب ہاں کہنے والا' اقرار کرنے والا مثلاً ہامی بھرنا' اقرار کرنا جبکہ حامی: عربی لفظ ہے جس کے معنی محافظ اور نگہبان کے ہیں۔) (مصنف)

ہرثمہ نے ایک عرصے تک کوفے کا محاصرہ کیا۔ یہاں تک کہ ابو السرایا کوفہ چھوڑ کر بھاگ لیا۔ وہ خورستان میں جا کے رکا۔ خبر سن کر ہرثمہ خورستان واپس آیا' چونکہ ہرثمہ خونریزی سے گریز کرنا چاہتا تھا اس لئے ابو السرایا کے پاس پیغام بھیجا کہ ہمارا علاقہ چھوڑ کر جدھر چاہو چلے جاؤ' ابو السرایا نے اس پیغام کو دلیل عجز قرار دیا اور کہلا بھیجا کہ میں نے جس حق سے اس مقام پر قبضہ کیا ہے اس کا ثبوت تلوار دے سکتی ہے۔

جب لڑائی کی نوبت آئی تو جنگ کا فیصلہ ابو السرایا کے خلاف ہوا۔ اس کی تمام فوج غارت گئی۔ وہ خود بھی زخمی حالت میں میدان جنگ سے فرار ہوا۔ اس کا تعاقب کیا گیا' گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔ یہ فتنہ یوں فرو ہوا۔

ابو السرایا کے علاوہ اور بھی باغی تہ تیغ ہوئے لیکن حدود مملکت میں عام ناراضگی روز بروز بڑھتی گئی۔ عرب کا گروہ جو حکومت کا شریک غالب تھا۔ خراسان کا دار الخلافہ ہونا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے زیادہ یہ کہ وزارت عظمٰی اور دیگر معزز منصبوں پر فضل و حسن ممتاز تھے جو عجمی النسل تھے۔ اہل عرب کو صاف نظر آ رہا تھا کہ تمام اسلامی دنیا اور خود سرزمین عرب انہی دونوں کے ہاتھوں میں ہے۔ مامون اس وقت تک ایک بااختیار حکمران کی حیثیت سے بالکل گویا معطل تھا۔ سیاہ و سفید کا مالک فضل آتش پرست (مجوسی) تھا۔ اس نے دانستہ خراسان کو

بغداد پر ترجیح دی تھی کیوں کہ کسی غیر عرب کو عرب والوں کا تسلیم کر لینا آسان کام نہ تھا۔ مملکت میں یہ برہمی پھیلی ہوئی تھی لیکن فضل نے مامون کو ان حالات کی خبر تک نہ ہونے دی۔

افسران فوج میں ہرثمہ ایک نامور اور مشہور افسر تھا۔ پرزور بغاوتوں کا جس نے خاتمہ کر دیا وہ بھی ہرثمہ تھا۔ خلافت عباسیہ پر اس کے اور بہت سے حقوق تھے اسی بنا اور اعتماد پر اس نے یہ جرأت کی کہ مامون کے پاس حاضر ہو کر فضل کی سازشوں کا طلسم توڑ دے۔ اس نے خراسان جانے کا ارادہ کیا۔

فضل نے جب یہ خبر سنی تو مامون کے کئی فرمان اس کے نام بھجوائے کہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ شام و حجاز انتظام طلب ہیں ادھر کا قصد کرو۔ ہرثمہ جسے اپنے حقوق خدمت پر ناز تھا ان احکام کا کچھ لحاظ نہ کیا اور سیدھا خراسان کو چلا۔

اس پر فضل نے مامون سے کہا۔ ''حضور امیر المومنین نے دیکھا' ہرثمہ کو احکام کا مطلق پاس نہیں ہے۔ امیر المومنین خود خیال فرمائیں مملکت کے دیگر نمک خواروں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔''

''اے فضل! ہم بات سمجھتے ہیں۔'' مامون بولا۔ ''تم دیکھو گے کہ ہم اس نافرمان کے ساتھ کس طرح پیش آتے ہیں۔''

عارج کی ضد پر میں بھی بغداد سے مرو آ گئی تھی اور مامون کے بہت قریب تھی۔ جب چاہتی میں بغداد چلی جاتی۔

مامون کا رنگ سرخی مائل سفید تھا' آنکھیں بڑی' داڑھی لمبی مگر پتلی تھی۔ پیشانی تنگ اور چہرے پر ایک نمایاں تل تھا۔ وہ موزوں اندام و خوش رو تھا۔

آخر ہرثمہ خراسان کے دارالحکومت مرو پہنچ ہی گیا۔ اس نے یہ خیال کر کے شاید اس کے آنے کی خبر مامون سے مخفی رکھی جائے نقارہ بجانے کا حکم دیا۔

اس وقت مامون دربار سجائے بیٹھا تھا۔ اس نے درباریوں سے پوچھا۔ ''یہ کیسا غل ہے؟''

جواب فضل نے دیا۔ ''اے امیر المومنین! نافرمان ہرثمہ گرجتا ہوا آ رہا ہے۔''

''ہم حکم دیتے ہیں کہ ہرثمہ کو دربار میں فوراً پیش کیا جائے۔'' مامون کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔

مامون کے حکم کی تعمیل میں ہرکارے دوڑے گئے۔

ہرثمہ نے مامون کو تعظیم دی' پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا مامون اس پر برس پڑا۔

آخر میں بولا۔ ''کچھ کہنا ہے؟''

''اے امیر المومنین! کہوں تو کیا کہوں آپ نے اس مجوسی کو سر چڑھا رکھا ہے۔ یہ بھلا کب مجھے حقیقت سے پردہ اٹھانے دے گا۔'' ہرثمہ نے فضل کی طرف انگلی اٹھائی۔

''یہ نہ بھول اے ہرثمہ کہ خود ہم نے فضل کو اس عہدے پر رکھا ہے۔ تجھے حفظ و مراتب کا بھی خیال نہ رہا۔'' مامون نے یہ کہہ کر بڑی ذلت کے ساتھ ہرثمہ کو دربار سے نکلوا دیا اور حکم دیا کہ اسے قید رکھا جائے۔

میں بغداد آ گئی تو چند روز کے بعد عارج نے بتایا۔ ''اے دینار! ہرثمہ اس دنیا سے چلا گیا۔''

''مگر مامون نے تو اسے قید رکھنے کا حکم دیا تھا۔''

عارج نے جواب دیا۔ ''ہرثمہ کو قید ہی کے دوران میں فضل آتش پرست نے قتل کرا دیا۔''

''اور اس پر مامون نے فضل سے جواب طلبی نہیں کی اے عارج؟''

''فضل نے پہلے ہی مامون سے کہہ دیا کہ ہرثمہ اپنی موت مر گیا۔''

ہرثمہ کے قتل کی خبر سے بغداد میں جب کہرام مچ گیا' لوگ پہلے سے بھرے بیٹھے تھے اس سوزش انگیز اطلاع نے سارے شہر میں ایک نئی ہلچل ڈال دی۔ محمد بن ابی خالد ہرثمہ کا جانشین بنا۔ بغداد والوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ حسن بن سہل جو بغداد کا عامل (گورنر) تھا۔ واسط میں مقیم تھا۔ اسے معلوم ہوا تو دیر ہو چکی تھی۔ مامون کے حکام برطرف کر دیئے اور محمد بن ابی خالد حسن سے مقابلے کیلئے بغداد سے روانہ ہوا۔ قصہ مختصر یہ کہ کئی معرکے ہوئے کچھ تک محمد کا پلہ بھاری رہا مگر آخری مقابلے میں محمد شدید زخمی ہو گیا۔ مجبوراً وہ بغداد کی طرف پلٹا۔ حسن برابر اس کا تعاقب کرتا رہا۔ محمد کے زخم شدت پکڑتے گئے آخر بغداد پہنچ کر اس نے انتقال کیا۔

محمد کا بیٹا عیسیٰ اپنے باپ کا جانشین بنا اور اہل بغداد سے کہا۔ ''اگر میرا باپ نہیں رہا تو میں اس کا نعم البدل موجود ہوں' اگر خدا نے چاہا تو میں بغداد کو حسن کی حکومت سے آزاد کرا دوں گا۔''

بغداد والوں نے نہایت خوشی سے اس کی حکومت کو قبول کیا۔ اگرچہ حسن کی قاہر فوجوں نے عیسیٰ اور اس کے بھائی ابوزنبیل کو فاش شکستیں دیں مگر یہ صدا بار بار عوام بلند کرتے رہے کہ ایک آتش پرست ہم پر حکومت نہیں کر سکتا۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ بالعموم اہل عراق اور بالخصوص بغداد کے باشندوں نے اپنی مرضی کیخلاف کسی قوت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ خراسان کے حالات کی وجہ سے اب اہل بغداد نے ایک نئے خلیفہ کی تلاش شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خاص آل عباس نے خفیہ طور پر ابراہیم بن المہدی کے ہاتھ بیعت کی جو مامون الرشید کا چچا تھا۔

اس پر عارج مجھ سے کہنے لگا۔ "مزہ تو جب آئے اے دینار کہ یہ معاملہ خفیہ نہ رہے اور تمام بغداد والے برسر عام اس عرب آدم زاد ابراہیم کے ہاتھ پر بیعت کریں۔"

"تو شاید مزے میں موت تک کو بھول رہا ہے' آخر تجھے ابراہیم کو مروا کے کیا مل جائے گا۔"

"کوئی ضروری تو نہیں کہ ابراہیم ہی مارا جائے۔" عارج نے بحث کی۔

"اس مملکت کا خلیفہ ہونا اس قدر آسان نہیں جتنا تو نے سمجھ رکھا ہے۔ صرف بغداد والے اگر کسی کو حکمران وقت مان بھی لیں تو بات نہیں بنے گی۔" میں نے عارج کو سمجھایا۔

"تیری مرضی کیا ہے' میں خوب جانتا ہوں اے دینار!"

"اگر جانتا ہے تو پھر اڑی کیوں کرتا ہے۔"

"یہ میری مرضی ہے' کیا مجھے تو اتنا حق بھی نہیں دے گی کہ تجھ سے اختلاف کر سکوں۔"

"کر اختلاف! بنوا دے ابراہیم کو بغداد کا خلیفہ۔"

"طنز نہ کر... ہ تو نے مجھے چڑایا تو پھر ابراہیم ہی کے ہاتھ پر بغداد والے بیعت کریں گے۔ اس میں آخر خرابی کیا ہے؟ وہ بھی تو ہارون الرشید کا بھائی ہے۔"

میں کچھ نہ بولی۔ حالات پر بہرحال نظر رکھی۔

وہ جمعہ کا دن تھا۔ نماز سے پہلے ایک شخص اٹھ کر کھڑا ہو گیا بولا۔ "اے لوگو! ہم مامون کے بعد ابراہیم کو ولی عہد خلافت قرار دینا چاہتے ہیں۔"

پہلے آدمی کے برابر ہی سے دوسرا اٹھا اس نے کہا۔ "مامون تو معزول ہو چکا ہے' خلیفہ وقت ابراہیم ہے۔"

اس پر جامع مسجد میں ایک دم شور ہونے لگا۔ میں سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

ایک جن زادی کی پراسرار داستان ابھی جاری ہے

بقیہ واقعات کے لئے جلد سوئم (آخری) مطالعہ کریں

ایک جن زادی کی پراسرار داستان
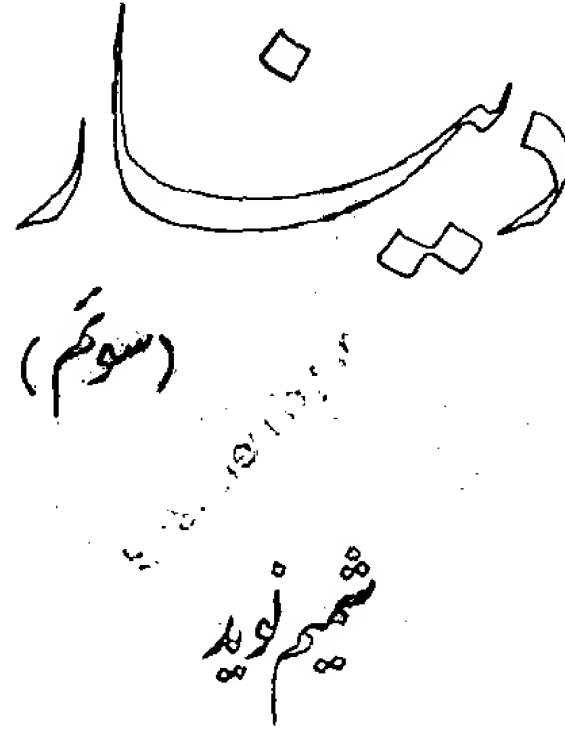
ناشر:-
مکتبہ القریش ۞ سرکلر روڈ
اردو بازار، لاہور۔۲۔ فون:7668958
E.mail: al_quraish@hotmail.com

اس شور میں کچھ دیر کو کان پڑی آواز سنائی نہ دی۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق بغداد کی جامع مسجد میں یہ سب ہوا۔ دنیا دکھاوا بھی تو کوئی چیز ہے! مجھے یہ عارج کی کارستانی لگی۔ جنات، آدم زادوں کے ساتھ اسی طرح ''کھیلتے'' ہیں۔ ان غریبوں کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ انہیں گویا ''الو'' بنایا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آدمی بڑا بے خبر ہے!

یوں ہارون کا بھائی ابراہیم خلیفہ بنا اور ولی عہد خلافت اسحاق بن الہادی۔ اسحاق اسی ہادی کا بیٹا تھا جس نے اپنے باپ مہدی کو زہر دلوایا اور چھوٹے بھائی ہارون پر قاتلانہ حملہ کرایا۔ وقت یوں بھی کیا کیا کروٹیں بدلتا ہے! کبھی جو زمین پر خدا کا سایہ کہلاتے ہیں، کڑی دھوپ میں جلائے جاتے ہیں، وہ جن کی پرستش ہوتی ہے، زمین کی آغوش میں جاتے ہی بھلا دیئے جاتے ہیں۔ کوئی کسی کو یاد نہیں رکھتا۔ اور یاد بھی کیوں رکھے۔ یہ دنیا روز ازل سے ایسی ہی ہے۔ آدمی پیدا ہو رہے ہیں اور مر رہے ہیں۔ پرانوں کی جگہ نئے آدمی آ جاتے ہیں۔ دنیا کا کوئی کام نہیں رکتا۔ ہم جنات کا معاملہ آدم زادوں سے ذرا مختلف ہے جس کی اصل وجہ ہماری عمریں ہیں۔

عمر ابراہیم کی بھی زیادہ نہیں تھی۔ ہارون سے خاصا چھوٹا تھا۔ امین بھتیجا اور ابراہیم چچا تھا، اس کے باوجود دونوں کی عمروں میں زیادہ فرق نہ تھا۔ وہ دونوں اسی لئے ہم پیالہ و ہم نوالہ بھی رہے۔

ابراہیم کے ہاتھ پر لوگوں سے بیعت کرا کے اس طریقے سے عباسیوں نے رضامندی عام کا اظہار کیا۔

یکم محرم 202 ہجری کو ابراہیم منصب خلافت پر بیٹھا اور ''مبارک'' لقب اختیار کیا۔ حالانکہ وہ بغداد والوں کے لئے انتہائی نامبارک تھا۔ عارج کو میں اس حقیقت کا احساس نہ دلا پائی۔ ابراہیم کے خلیفہ بن جانے پر وہ بہت خوش تھا۔

معیاری اور خوبصورت کتابیں

باہتمام: محمد علی قریشی

بار اول ———— 2005ء
مطبع ———— نیر اسد پریس
سرورق ———— ذاکر
کمپوزنگ ———— وسیم احمد قریشی
قیمت ———— 250/- روپے

مجھ سے کہنے لگا۔ ''اے دینار! دیکھا تو نے، میں نے جو کہا تھا کر دکھایا۔''

''ہاں واقعی... تو بڑا بہادر ہے۔'' میں نے اس کا مذاق اڑایا۔ ''ویسے ابھی تیل دیکھو پھر تیل کی دھار دیکھو۔''

''تیرا حال ان نجومیوں کا سا ہے جو اس امید پر دس پیشگوئیاں کرتے ہیں کہ ان میں سے ایک نہ ایک تو سچی نکل ہی آئے گی۔'' عارج بھی ترکی بہ ترکی بولا۔

''تو ایک جن زاد ہو کر یہ کیا بے وقوفی کی باتیں کرنے لگا؟''

''اچھا اگر میں تیری نظر میں بے وقوف ہوں تو بے وقوف ہی بھلا۔'' عارج اپنی جان چھڑا کر چلا گیا۔

وہ مجھ سے اپنی سرگرمیوں کو چھپاتا بھی کیسے! عین موقع پر میں رفو چکر ہو جاتی یا اندھیرے کی چادر اوڑھ لیتی۔ میرے پاس کئی ''ہنر'' تھے کہ عارج کو میری ہوا نہ لگے۔ میں اپنی تاک پر چوکس رہی۔ عارج کا تعاقب کرتی ہوئی میں دو آدمیوں تک پہنچ گئی۔ ان کے نام سعید اور ابو البط تھے۔ یہ دونوں حمید بن الحمید کے ماتحت فوجی افسر تھے اور حمید بغداد میں حسن بن سہل کا نمائندہ تھا۔ قصر بن ہبیرہ کو حمید نے اپنا فوجی مرکز بنایا اور اسی پر قابض تھا۔ ان فوجی افسروں نے عارج کے زیر اثر حسن کے پاس خطوط بھیجے کہ حمید آپ کے خلاف ابراہیم سے ملا ہوا ہے۔ انہوں نے ایک طرف تو حسن کو حمید کے خلاف اکسایا، دوسری جانب ابراہیم سے درخواست کی کہ حضور کا کوئی افسر آئے تو ہم قصر بن ہبیرہ پر قبضہ کرا دیں۔

حسن بھی ایک ہی کائیاں تھا۔ پھر بھی میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کے نہ بیٹھی، چپکے سے ''کام'' دکھایا۔ نتیجہ یہ کہ حسن نے بغداد سے بھیجے والے خطوط پر اعتبار نہ کیا۔ پھر بھی اسے شبہ پیدا ہوا اور اطمینان کے لئے حمید کو اپنے پاس واسط بلا لیا۔

ابراہیم نے موقع پا کر عیسیٰ بن محمد کو بھیجا جس نے قصر ہبیرہ پر قبضہ کر لیا۔ اس نے حمید کا اسباب و خزانہ لوٹا جس میں سونا بھی تھا۔ حمید کو یہ خبر ہوئی تو واسط سے کوفے آیا کہ بغداد جانے کی کوئی تدبیر کرے مگر ناکام رہا۔ ابراہیم نے پاؤں پھیلائے، وہ کوفے اور اطراف کوفہ پر بھی قابض ہو گیا۔ اس کی ہمت اتنی بڑھی کہ واسط پر بھی چڑھائی کر دی۔ اس لشکر کا سالار بھی عیسیٰ بن محمد تھا۔

چند بار عیسیٰ حملے کی غرض سے حسن کی لشکر گاہ تک بھی گیا لیکن حسن مقابلے پر نہ آیا۔ اس نے بالکل خاموشی اختیار کر لی اور حکم دیا کہ لشکر کا کوئی شخص قلعے سے باہر نہ جائے۔

میں ایک روز قلعے میں گھس گئی۔ حسن دوپہر کا کھانا کھا کے آرام کر رہا تھا۔

''اے حسن! کیا تو ڈرتا ہے اس لونڈے سے؟''

اپنی ہی آواز سن کر حسن گھبرا گیا۔ اس کے لئے یہ پہلا تجربہ تھا کہ کوئی جن زادی اسے غچہ دے رہی تھی۔

میں نے آزمودہ داؤ کے تحت کہا۔ ''پریشان نہ ہو اور اپنے اندر کی آواز کو پہچان! ہمت کر۔ تو نے حملہ کیا تو عیسیٰ ٹک نہ پائے گا۔ دیکھ لینا، وہ کسی بے لگام گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑے گا مگر پیچھے کی طرف!''

اتنا کافی رہا۔ حسن کے حکم سے فوج عیسیٰ کے لشکر پر حملہ آور ہوئی۔ دوسرے دن صبح سے دوپہر تک قیامت خیز معرکہ ہوا۔ عیسیٰ نے شکست کھائی اور ایک مقام طرنایا پہنچ کر دم لیا۔

اگر مصلحت وقت پیش نہ ہوتی تو میں ہرگز حسن کو ''بہادر'' نہ بناتی۔

تاریخی تسلسل برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ وقتاً فوقتاً عارج کے ذریعے از خود مرد جا کر مجھے مامون کا جو حال معلوم ہوا، بتاتی چلوں۔ ابراہیم تھک ہار کر انہی علاقوں پر صبر کئے رہا جو قبضے میں آ گئے تھے۔

صورتحال دلچسپ تھی۔ ایک ہی مملکت میں گویا ایک اور مملکت پیدا ہو گئی۔ مسخرا آدم زاد ابراہیم سچ سمجھ بیٹھا کہ وہ ''امیر المومنین'' بن گیا ہے۔ ادھر مامون خواب غفلت سے جاگنے لگا۔ جس تاریخ سے وہ تخت نشین ہوا تھا وہ ایک دن بھی خون ریزیوں سے خالی نہ گیا تاہم اسے پتہ نہ چل سکا کہ پوری مملکت بغاوتوں کا دنگل بن رہی ہے۔

اس موقع پر بھی مجھ ہی کو پیش قدمی کرنا پڑی۔

''سن اے ہارون کے بیٹے مامون! جب سے تیرے سوتیلے بھائی امین کو قتل کیا گیا ہے مملکت کو امن نصیب نہیں ہوا۔ اہل بغداد نے تیرے نااہل چچا ابراہیم کو خلیفہ قرار دیا ہے۔''

اس رات خلوت میں میری آواز سن کر مامون دیر تک دنگ رہا۔ صبح ہوتے ہی اس نے فضل مجوسی (وزیر اعظم) کو طلب کر لیا اور بولا۔

''ہمیں معلوم ہوا کہ بغداد میں ہمارے خلاف بغاوت ہو گئی ہے۔ ابراہیم اس بغاوت کا

سرغنہ ہے۔"

اس پر فضل مجوسی چونک اٹھا، اس نے تعجب و انکار کے ساتھ یقین دلایا کہ سب جھوٹ ہے۔

"کیا بغداد والوں نے اس باغی کو اپنا خلیفہ نہیں مانا؟" مامون نے سوال کیا

فضل نے بات بنائی۔ "حضور کا یہ غلام غافل نہیں ابراہیم خلیفہ نہیں ہے بلکہ لوگوں نے انتظاماً اسے نائب الریاست بنا رکھا ہے۔ حسن سے بھی میں پوچھ چکا ہوں۔"

میں نے مامون سے سرگوشی کی، اس طرح کہ صرف وہی سن سکے۔ "اس مجوسی نے تیری آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ یہ جھوٹا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم حسن سے لڑ رہا ہے..... بلکہ لڑ چکا ہے۔"

پھر مامون نے میرے ایماء پر اپنے کئی خاص درباریوں کو بلوایا۔ فضل مجوسی کو وہ پہلے ہی رخصت کر چکا تھا۔

فضل کے ڈر سے کسی کو سچ بولنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"ہم تمہاری زندگی کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ فضل تمہیں کوئی ضرر نہ پہنچائے گا۔" مامون نے کہا اور اسی مضمون کی ایک دستاویز بھی لکھ کر دے دی۔ اس سے زیادہ اور کیا یقین دہانی کراتا۔

درباریوں نے سارے حالات بیان کر دیئے اور کہا کہ ہر شخص یہی عرض کرنے کے لئے حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تھا مگر فضل نے ایسے جال بچھا کر حضور کی نگاہ میں دشمن بنا دیا اور اس کی تمام امیدیں خاک میں ملا دیں۔

ان لوگوں نے مامون کو یہ بھی بتا دیا کہ اگر جلد تلافی نہیں کی جاتی تو خلافت کی بنیاد ہل جائے گی۔ انہوں نے مامون کو یہ بھی رائے دی کہ حضور کا دارالخلافہ بغداد میں تشریف رکھنا ان سب مشکلوں کو حل کر دے گا۔

مامون نے بغداد جانے کا قصد کر لیا۔ فضل کو اس ارادے کی اطلاع ہوئی تو اس نے با آسانی معلوم کر لیا کہ مامون کے کانوں میں کوئی نئی صدا پڑی ہے۔ اس نے اپنے مخبروں کے ذریعے تمام درباریوں کے نام معلوم کر لئے جنہوں نے سچ بولا تھا۔

فضل نے ان میں سے ہر ایک کو مختلف قسم کی اذیتیں پہنچائیں۔ کسی کو قید کیا، کسی کو

کوڑے لگوائے، کسی کے چہرے کے بال نچوائے۔ اس کے باوجود مامون اپنے وزیر مملکت سے کچھ باز پرس نہ کر سکا۔ اسے خبر تھی کہ مملکت میں فضل کی جڑیں کتنی گہری ہیں۔ خاندان برامکہ کا انجام مجھے یاد آ گیا۔

میرا جو کام تھا، وہ میں نے کر دیا۔ عارج کو خبر لگی تو ایک شب فلوجہ کے قریبی صحرا میں مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

"ہاں بول، مجھ سے تجھے کیا بات کرنی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تیری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں اے دینار!" پھر اسے مجھ سے جو شکایت تھی، بیان کی۔

"کسی آدم زاد کا کوئی بھی عقیدہ ہو اور وہ کسی مذہب کا ماننے والا ہو، ہمیں کیا لینا دینا۔ یہ معاملات اور ہیں۔ فضل اگر آتش پرست ہے تو ہوا کرے، سیدھی سیدھی بات سن! مسئلہ صرف حکمرانی اور اقتدار ہے۔ ہاں، زر نے ان آدم زادوں کی بینائی چھین لی ہے۔ یہ دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے، سن کر بھی نہیں سنتے۔" میں نے پُر جوش انداز میں عارج کو سمجھایا۔

"تم سچ مان گیا کہ تو اچھی تقریر کر لیتی ہے۔"

"ہاں تم یاد رکھتی ہوں کہ جنات کے ایک قبیلے کے سردار اخضم کی بیٹی ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے۔"

"لیکن مجھے تو کب فخر کا موقع دے گی کہ....."

"آخر آیا نا گھٹیا پن پر!"

"عشق کرنا اگر کوئی برا کام ہے تو میں ضرور برا ہوں۔"

"وہ دیکھ صحرا کی ریت چاندنی میں کیسی چمک رہی ہے اے عارج!"

"چاندنی؟ آج تو چاند نکلا ہی نہیں۔" عارج نے حیرت کا اظہار کیا۔

میں نے اسے آسمان کی طرف متوجہ پایا تو وہاں سے غائب ہو گئی۔ مجھے مامون کے بارے میں معلوم کرنا تھا کہ مرو سے نکل کر کہاں پہنچا۔

2 شعبان 202 ہجری کو فضل قتل کر دیا گیا، مامون صوبہ خراسان ہی کے ایک شہر سرخس تک پہنچا تھا کہ یہ واقعہ پیش آ گیا۔ مجھے یاد ہے، 2 شعبان کو جمعرات کا دن تھا۔

ہوا یوں کہ ایک آدمی خالد مسعودی اپنے ساتھیوں کو لے کر حمام میں جا گھسا، ان سبھی

نے اپنے اپنے خنجروں کی پیاس فضل کے لہو سے بجھائی۔ ان قاتلوں میں مختلف علاقوں کے لوگ تھے، ایسا اس لئے کیا جاتا تھا کہ کسی ایک علاقے سے انتقام نہ لیا جائے۔ یہ آدم زاد بڑے چالاک ہوتے ہیں۔

سرخس کے بازاروں میں مامون کے ڈھنڈورچیوں نے اعلان کیا۔ ''جو شخص، فضل کے قاتلوں کو گرفتار کر کے لائے گا، اسے دس ہزار دینار سرخ ملیں گے۔''

ایک آدمی عباس الہیثم نے یہ انعام حاصل کیا۔

خالد مسعودی اور اس کے ساتھیوں کو مامون کے سامنے حاضر کیا گیا اور پوچھا گیا کہ کس کے ایما سے تم نے ایسا کیا؟

اس نے خود مامون کا نام لیا۔

اس بے باکی پر یا اس جرم کی پاداش میں مامون کے حکم سے وہ بھی قتل کر دیئے گئے۔

اس کے بعد چند اور افراد جن پر شبہ تھا کہ حقیقت سے واقف ہیں انہیں بلوایا گیا۔

''اس واقعے سے متعلق اے عبدالعزیز! تو کچھ جانتا ہے؟'' ان میں سے ایک کو مامون نے مخاطب کیا۔

عبدالعزیز سمیت سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا۔ مامون نے انہیں بھی مروا دیا۔

گو تمام واقعات شہادت دے رہے تھے کہ فضل کا قتل مامون کے ایماء سے ہوا مگر مامون نے اپنے مختلف اقدامات سے اس یقین کو شبے میں بدل دیا۔ مامون اب گہری نیند سے جاگ اٹھا تھا۔ سوئے ہوئے ''شیر'' کو چھیڑ کر فضل نے اچھا نہیں کیا۔ نہ وہ جھوٹ بولتا نہ مارا جاتا۔ ویسے یہ ایک الگ قصہ ہے کہ اکثر آدم زاد سچ بول کر مارے جاتے ہیں۔ اس پر بھی ان آدم زادوں کو یہی مشورہ دوں گی کہ سچ بولا کریں۔

مامون بھی کیونکہ ایک آدمی ہی تھا اس لئے مصلحت کے تحت جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں سرگرم ہو گیا۔ اس نے قاتلوں کے سر فضل کے بھائی حسن کو بھجوائے۔ نامہ تعزیت میں اس نے رنج و غم ظاہر کیا اور لکھا کہ تم اپنے بھائی کی جگہ منصب وزارت پر مقرر کئے جاتے ہو۔ وہ فضل کی ماں کے پاس بھی تعزیت کرنے کو گیا اور اسے تسلی دے کر کہا کہ آپ صبر کریں۔ بجائے فضل کے میں آپ کا مطیع بیٹا ہوں۔ ان موثر الفاظ نے فضل کی ماں کو اور بھی بے تاب کر دیا، وہ رو کر بولی کہ ایسے بیٹے کا کیوں نہ غم کروں جس نے میرے لئے تم

جیسا فرزند چھوڑا۔

جس زمانے میں مامون بغداد روانہ ہوا تھا تو ابراہیم شہر مدائن میں موجود تھا اور عیسیٰ بن محمد نیز مطلب بن عبداللہ وغیرہ افسران فوج اس کے ساتھ تھے۔ یہ لوگ اس وقت تک اگرچہ نہایت ثابت قدم رہے مگر اس بات کا سب کو یقین تھا کہ ابراہیم کی خلافت اسی وقت تک ہے جہاں تک مامون بغداد سے دور ہے۔ جب مامون کے مرو سے چلنے کی خبر مشہور ہوئی تو لوگ ابراہیم کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ مطلب بیماری کا بہانہ کر کے مدائن سے چلا آیا۔

میں نے عارج سے جو کچھ کہا، سچ ثابت ہوتا جا رہا تھا۔

''اے عارج! تو اپنی سی کر چکا، اب میری باری ہے۔'' عارج سے میں بولی۔

''ہاں اے دیبار! ابراہیم واقعی بہت بودا نکلا۔'' عارج نے اعتراف کیا۔

یہ وہ دن تھا جب مطلب بغداد آیا۔ میں نے اسے راہ سجھائی کہ اگر جان پیاری ہے تو خفیہ طور پر لوگوں سے مامون کے لئے بیعت لینا شروع کر دے۔ اس کی کیا مجال تھی کہ ایک جن زادی کی بات نہ مانتا۔

''ابتدا کہاں سے کروں اے نیک روح؟'' مطلب نے مجھ سے سوال کیا۔

میں اس کے سامنے نہیں آئی، اسے صرف اپنی آواز سنائی اور گویا ''نیک روح'' بن گئی۔

''ابراہیم ہی کے بھائی منصور بن المہدی سے بیعت کا آغاز کر۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا وہ اپنے بھائی کے خلاف مامون کے لئے بیعت پر آمادہ ہو جائے گا؟''

''تو سوال بہت کرتا ہے اے مطلب! تجھے جو حکم دیا گیا ہے وہی کر۔'' میں نے اپنی آواز سخت کر لی۔

وہ ڈر گیا کہ کہیں میں ناراض نہ ہو جاؤں!

پھر وہی ہوا جو میں چاہتی تھی۔

ابراہیم کو جب ان حالات کا علم ہوا تو ڈرانے لگا۔ اس نے خفیہ بیعت کرنے والوں کو طلب کر لیا۔ مگر مطلب میرے ایماء پر بغداد ہی میں رہا۔ اس کے خاندان والوں کو بھی میں نے بھڑکا دیا۔ وہ بولے کہ اپنی بات پر قائم رہنا چاہئے۔

مطلب ''حاضر خدمت'' نہ ہوا تو ابراہیم نے حکم دیا کہ اس کا گھر بار لوٹ لیا جائے۔

بغداد پر اب بھی اسی کا حکم چلتا تھا۔ مگر کب تک؟ ایک دن تک متعین تھا اور اس میں اب

زیادہ دیر نہیں تھی۔ اس کے لئے وقت کی طنابیں کھینچنے والی تھیں۔ اور تو اور ابراہیم کا نامور افسر فوج عیسیٰ بن محمد بھی حسن بن سہل سے مل گیا۔ اس نے اعلان کیا کہ میں اس معاملے پر دونوں فریقوں سے الگ رہوں گا اور حمید نے بھی اس بات کو منظور کر لیا۔ حمید نے مدائن سے ابراہیم کو بھگا کر اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس دوران میں ابراہیم زندرود پہنچ گیا تھا۔ یہاں آ کر اس نے ابراہیم کو بلوانے کے لئے متعدد قاصد بھیجے۔ آخر حمید کو اس پر ترس آ ہی گیا۔ اس کے ساتھ حمید کے دماغ میں یہ کھچڑی بھی پک رہی تھی کہ ابراہیم بہرحال بنو عباس سے ہے، کہیں وہ رگڑے میں نہ آ جائے۔ اس خیال سے وہ ابراہیم کی طرف سے طلبی پر زندرد چلا آیا۔

حمید پر ابراہیم بہت برہم ہوا اور اس کی معذرت بھی قبول نہیں کی۔ غیظ میں آ کر ابراہیم نے حمید کو قید خانے بھیج دیا اور جن فوجی افسروں نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا انہیں اور ان کے عزیزوں کو بھی سزا دی۔ اس موقع پر حمید نے چالاکی دکھائی، قید خانے سے ابراہیم کو ایک بار پھر تحریری معافی نامہ بھیجا اور اپنے ''قصوروں'' سے درگزر کے لئے درخواست کی۔

ابراہیم جھانسے میں آ گیا۔ حمید نکل بھاگا اور مدائن میں پہنچ کر فوج جمع کی، پھر تیزی سے بغداد تک پہنچا۔ اب وہ ابراہیم کا کھلا مخالف بن چکا تھا اس کے باوجود ابراہیم باز نہ آیا، اس نے بوکھلاہٹ میں عیسیٰ بن محمد کو گرفتار کر لیا۔ عیسیٰ معزز رتبے کا آدمی تھا، اس کی حراست نے بہت سے فوجی افسروں کو ابراہیم کی طرف سے بددل کر دیا۔ عیسیٰ کے نائب عمی بن ہشام نے اپنی پُرجوش تقریروں سے تمام بغداد کو ابراہیم کا مخالف بنا دیا۔ ابراہیم کے افسران انتظام میں سے کئی کو بغداد سے نکال دیا گیا۔

اسی اثناء میں حمید بغداد کے باہر تک آ گیا۔ فوجی سالاروں نے شہر سے نکل کر اس کا استقبال کیا۔ اس ملاقات میں طے یہ پایا کہ جمعے کے دن مقام یاسریہ میں مامون کا خطبہ پڑھا جائے اور ابراہیم معزول کر دیا جائے۔ حمید نے اہل فوج کو پچاس پچاس درہم دینے کا وعدہ بھی کیا۔ مدائن کا خزانہ اس کے ہاتھ لگ چکا تھا۔ اس سے پہلے ایک واقعہ ہو چکا تھا۔ ایک اور بڑے فوجی افسر نے بھی اہل فوج کو پچاس درہم دینے کا اعلان کیا تھا جو نہ مل سکے تھے۔ اسی بناء پر سپاہیوں نے پچاس کے عدد کو منحوس بتایا۔ وہ بولے کہ ہمیں چالیس درہم دلائے جائیں تاکہ پچاس کا منحوس عدد باعث رنج نہ ٹھہرے۔ حمید نے فیاضی دکھائی۔ گویا

مال مفت دل بے رحم! خزانہ بنو عباس کا تھا، بانٹ وہ رہا تھا۔ اس نے پچاس کے عدد کو بڑھا کر ساٹھ کیا۔ اس سے نحوست کا شبہ بھی رفع ہو گیا۔

⚙......⚙

اس مشکل وقت میں ابراہیم نے عیسیٰ کو قید سے رہائی دے کر حکم دیا کہ حمید کے مقابلے پر جائے۔ عیسیٰ کو میں پہلے ہی ''سانٹ'' چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے میری ہدایات پر مکمل عمل کیا۔ ''نیک روح'' کا سوانگ یہاں بھی کام آیا۔

عیسیٰ نے ایک ''سازشی'' حملہ کیا اور وسط فوج میں گھس گیا۔ اس سے ظاہر میں یہ دکھانا مقصود تھا کہ ابراہیم کی وفاداری میں اس نے جان تک کی پرواہ نہ کی۔ حمید کی فوج نے عیسیٰ کی دلی خواہش کے مطابق اسے زندہ گرفتار کر لیا۔

ابراہیم نے باقی ماندہ فوج سے حمید کا مقابلہ کیا۔ یہ اس کی آخری کوشش تھی، لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوئی۔ ذیقعد 203 ہجری میں جو معرکہ ہوا، اس نے ابراہیم کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ ذی الحجہ کی 17 تاریخ بدھ کی رات 203 ہجری ابراہیم کی تاریخ حکومت کا آخری صفحہ تھا۔ اس نے لباس تبدیل کیا کہ پہچانا نہ جائے۔ جب وہ فرار ہوا تو اس کے جسم پر ایک معمولی آدمی کا لباس تھا۔

ابراہیم کی خلافت نے کل ایک برس گیارہ مہینے اور بارہ دن کی عمر پائی۔

مامون رجب 202 ہجری میں مرو سے روانہ ہوا اور صفر 204 ہجری میں بغداد پہنچا۔ ایک اعتبار سے مامون کا یہ سفر مملکت کے بڑے حصے کا دورہ تھا۔ اس دورے میں مامون نے حالات سے بہت کچھ واقفیت پیدا کی اور مختلف شہروں میں مناسب انتظامات کئے۔ وہ نہروان پہنچا تو بغداد کے تمام عمائدین، امرائے عرب اور فوجی افسران بڑے جوش سے اس کے استقبال کو گئے۔ طاہر یک چشم جو بغداد سے بھاگ لیا تھا اور اس وقت رقہ میں تھا، یہیں نہروان میں ''باریاب حضور'' ہوا۔ نہروان میں آٹھ دن قیام کر کے مامون بغداد کو چلا اور 5 صفر 204 ہجری کو بڑی شان و شوکت سے دارالخلافہ میں داخل ہوا جہاں ایک مدت سے ہزاروں نگاہیں اس کی منتظر تھیں۔

مامون اور اس کے تمام افسر سبز لباس میں تھے۔ پہلا دربار لگا اور قصر خلافت صحیح معنوں میں آباد ہوا۔

اہل بغداد بھی اس پہلے دربار میں آئے مگر انہوں نے مامون کی موجودہ روش کو پسند نہ کیا۔ لوگ آرزومند تھے کہ ان کی آنکھیں عباسیہ حکومت کو اس کے اصل لباس میں دیکھیں۔

دربار میں ایک آنکھ والا آدم زاد طاہر بھی موجود تھا۔ مامون نے طاہر کو اس کی کارگزاریوں کا صلہ دینا چاہا اور ایک مطلق العنان حکمران کے لہجے میں بولا۔

''اے طاہر! تجھے جو مانگنا ہو مانگ۔''

''آل عباس کی یہ آرزو پوری کر دی جائے کہ حضور امیر المومنین بھی خلفائے بنو عباس کی طرح سر پر سیاہ پگڑی باندھیں۔'' اس سے طاہر کا مقصد بنو عباس کی ہمدردی حاصل کرنا تھا۔ ورنہ تو وہ عجمی (غیر عرب) تھا۔ اسے بنو عباس سے دلچسپی نہ تھی۔

''تیری درخواست قبول کی جاتی ہے۔'' مامون گویا ہوا۔

پھر بھرے دربار سے اٹھ کر مامون قصر خلافت کے سکونتی حصے میں گیا اور لباس تبدیل کیا۔ اب اس کے سر پر سیاہ پگڑی تھی۔ جب وہ دربار میں لوٹ کر آیا تو لوگوں کے چہرے کھل اٹھے۔ یہ آدم زاد ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہل جاتے ہیں جبکہ ان کے اصل مسائل کچھ اور ہوتے ہیں۔ حکمران بڑی آسانی سے عام آدمیوں کو ان چکروں میں پھانس کر اپنی مٹر بھناتے رہتے ہیں۔ بلاشبہ مامون بھی ایسے ہی حکمرانوں میں سے تھا جو اندر سے بڑے بے رحم اور خود غرض ہوتے ہیں۔ ایسے حکمرانوں کو دراصل اپنے مفادات عزیز ہوتے ہیں۔ انہیں عام آدمیوں کی روزی روٹی کی فکر نہیں ہوتی۔ یہ خود اپنے وفادار ہوتے ہیں، کسی سے وفا کرنا یا عہد نبھانا ان کی سرشت میں داخل نہیں ہوتا۔ ان سے تو ہم جنات لاکھ درجے بہتر ہیں۔

پچھلی ''بہاریں'' پھر لوٹ آئی تھیں۔ میں نے اسی لئے مامون کا ساتھ دیا تھا۔ اب تمام حدود مملکت میں آل عباس کی حکومت تھی۔ ذاتی یا شخصی اعتبار سے مامون اپنے باپ ہارون الرشید کو گیا تھا۔ اس میں بڑی صلاحیتیں تھیں۔ امین تو ناموزوں اور بے وزن شعر کہتا مگر مامون سچ مچ کا شاعر تھا۔ میں مسلمان آدم زادوں کے اس خلیفہ کے چند شعر سناتی ہوں۔

ان عربی اشعار کا ترجمہ یہ ہے۔ مامون لکھتا ہے۔

میری زبان تمہارے رازوں کو چھپاتی ہے
لیکن آنسو غماز ہیں اور میرے راز کو فاش کر دیتے ہیں

اگر آنسو نہ ہوتے تو میں عشق کو چھپا سکتا
اور اگر عشق نہ ہوتا تو آنسو ہی کیوں ہوتے
میں مامون ہوں اور عظیم الشان خلیفہ ہوں
لیکن تیرے عشق میں سرگشتہ ہوں
کیا تجھ کو پسند ہے کہ میں تیرے عشق میں مر جاؤں
اور دنیا ایک رہنما سے محروم ہو جائے

مامون کے کچھ عشقیہ شعر یہ ہیں۔ (ترجمہ)

میں نے تجھ کو محبوب کی تلاش میں بھیجا تو اس کے دیدار میں کامیاب ہوا
اور مجھے بھول گیا جس سے مجھ کو تیری نسبت بدگمانی ہوئی
میرے محبوب سے تو نے سرگوشی کی اور اس وقت میں دور تھا
ہائے محبوب سے تیرا قرب میرے کس کام آیا
کاش میں ہی قاصد ہوتا اور تو بجائے میرے ہوتا
بلاشبہ تیری آنکھوں نے اس کی آنکھوں سے حسن لے لیا

یہ واقعہ بھی 204 ہجری ہی کا ہے، جب مامون بغداد آیا۔ اس نے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) یحییٰ بن اکثم کو حکم دیا کہ علماء و فضلاء میں سے بیس شخص انتخاب کئے جائیں جو علمی مجلسوں میں شریک ہوا کریں۔ اس نے فرامین بھیج کر ہر جگہ سے شاعر، ادیب، فقیہہ، متکلم اور حکیم طلب کئے۔ جب یہ لوگ بغداد پہنچ گئے تو ان کی معقول تنخواہیں مقرر کیں۔

آدم زادوں کو اب تک میں جو سمجھی تو یہ کہ وہ خیر و شر کا مجموعہ ہیں۔ مامون بھی اس سے مبرا نہ تھا۔ اب مامون کے ''کارناموں'' کا ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو بتاتی چلوں کہ اس کے عہد خلافت کی ایک بڑی یادگار یہ ہے کہ فارسی شاعری کی ابتدا اسی زمانے میں ہوئی۔ گو فارس (ایران) میں اسلام سے پہلے سخن وری کمال کو پہنچ گئی تھی۔ لیکن فتوحات عرب کے سیلاب میں وہ دفتر جانے کہاں بہہ گئے! فارسی ادب پر خلافت مامون کا یہ ابدی احسان ہے کہ اس مردہ شاعری نے دوبارہ جنم لیا۔ خود مامون کی مادری زبان فارسی ہی تھی۔ اس کا ابتدائی زمانہ بھی خراسان میں بسر ہوا۔

مامون کو بغداد میں آسانی سے قبول نہیں کیا گیا۔ امین کے قتل کو شہر والے ابھی بھولے

نہ تھے۔

ایک شاعر حسین بن ضحاک، امین کا ندیم تھا۔ اس نے امین کے قتل پر جاں گداز مرثیہ لکھا۔ مرثیے میں اس نے مامون کو برا بھلا کہہ کر دل کے پھپھولے پھوڑے تھے۔ مامون نے جب یہ اشعار سنے تو صرف یہ حکم دیا کہ شاعروں کے ساتھ حسین بن ضحاک کے دربار میں نہ آئے۔ چند دن بعد مامون نے اسے بلایا اور پوچھا۔

''سچ بتاؤ! بھائی امین کے قتل اور بغداد کی فتح کے دن تو نے کسی ہاشمی عورت کو مارے جاتے اور ذلیل ہوتے دیکھا تھا؟''

حسین بولا۔ ''کسی کو نہیں اے امیر المومنین!''

''اے حسین! میں نے لوگوں سے تیرے شعر سنے ہیں۔''

یہ سن کر حسین کہنے لگا۔ ''اے امیر المومنین! وہ ایک جوش تھا جسے میں دبا نہ سکا۔ امین کے غم میں صحیح اور غلط کی کس کو تمیز تھی۔ خلیفہ مرحوم کا ماتم جن لفظوں میں ہو سکا، ادا کیا۔ حضور اس پر مواخذہ کریں تو یہ حق ہے اور بخش دیں تو فیاضی ہے۔''

مامون نے اسی وقت حکم دیا۔ ''حسین بن ضحاک کی تنخواہ بحال کر دی جائے۔''

دربار میں نہ آنے سے اس کی تنخواہ روک دی گئی تھی۔ یہ جو آدم زادوں میں حکمران وقت ہوتے ہیں پہلا حملہ عام آدمی کے رزق پر ہی کرتے ہیں۔ کسی کے ہاتھ سے روٹی چھین کر اسے بڑی آسانی سے رام کر لیا جاتا ہے۔

حسین بن ضحاک نے چند روز بعد ایک قصیدہ لکھ کر حاجب کو دیا۔ (حاجب، دربار کا ایک بڑا عہدے دار۔ وہ خلیفہ کی خدمت میں مختلف تحریریں پیش کرتا تھا) قصیدہ شاعری کے لحاظ سے بہت عمدہ تھا۔ مامون نے سخن وری کی داد دی مگر حاجب سے کہا کہ سن! اسی حسین نے یہ شعر بھی کہا تھا، خدا کرے مامون، امین کے بعد بھی سلطنت سے لذت نہ اٹھائے اور ہمیشہ دنیا میں خوار اور مردود رہے۔ (ترجمہ) سو مدح اور ذم مل کر برابر ہو گئی۔ اب شاعر کو صلے کا کوئی حق نہیں۔''

''مگر اس سے حضور کی عفو و درگزر کی عادت.....''

مامون نے حاجب کی بات کاٹ دی اور بول اٹھا۔ ''حسین کو انعام دیا جائے!''

حسین نے امین پر جو مرثیہ لکھا تھا اور جس کا حوالہ مامون نے دیا، بڑا درد انگیز تھا۔ اس

کے ایک بند کا ترجمہ سن لیں۔

''بغداد تباہ کیا جا رہا ہے۔ آل ہاشم کی نازک اور گل اندام عورتیں، غارت گردوں کے بے رحم ہاتھوں سے اپنی ناموس کو نہیں بچا سکتیں۔'' اسی پر مامون نے حسین سے سوالاً جواباً کا کھیل کھیلا تھا۔

کچھ کھیل مامون نے میرے ایما پر بھی کھیلے۔ مجھے یک چشم طاہر ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ میں اس فکر میں تھی کہ کسی طرح اسے خوار کراؤں۔ عارج بھی اس معاملے میں مجھ سے متفق تھا۔

قصہ یہ ہوا کہ طاہر کو اپنے ''کارہائے نمایاں'' کا مناسب صلہ ملا۔ وہ کل شرقی حکومت پر نائب السلطنت مقرر ہوا۔ یہ حکومت بغداد سے شروع ہو کر سندھ (ہندوستان) تک پھیلی ہوئی تھی۔ بس میں نے مامون کو اس کے خلاف کر دیا۔

اسی شب طاہر، مامون کی بزم عیش میں حاضر ہوا۔ مامون بادہ نوشی کے مزے لے رہا تھا۔ بے تکلفی میں اس نے طاہر کو بھی دو پیالے بھر کے دیئے اور اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دی۔

طاہر اپنی اوقات جانتا تھا، سو باادب عرض کیا۔ ''میرا منصب اس عزت کا مستحق نہیں ہے۔''

مامون نے کہا۔ ''یہ پابندیاں دربار عام کے لئے مخصوص ہیں، بے تکلفی کی محفلوں میں یہ پابندیاں ضروری نہیں۔''

طاہر آداب بجا لا کر بیٹھ گیا۔ مامون نے اس کی طرف نگاہ کی تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ''اب کیا آرزو باقی رہی ہے جس کا حضور کو رنج ہے؟'' طاہر کی نظریں مامون کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''کچھ ایسی ہی بات ہے کہ جس کے پوشیدہ رکھنے میں تکلیف اور ظاہر کرنے میں ذلت ہے۔'' مامون نے جواب دیا۔ طاہر اس وقت تو خاموش رہا مگر دل میں خلش پیدا ہوئی کہ آخر بات کیا ہے۔ یعقوب نامی نوجوان، مامون کا ساقی اور ندیم خاص تھا۔ طاہر نے اسے دو لاکھ درہم نذر بھیجے اور درخواست کی کہ اس شب کے واقعے کا سبب دریافت کر دے۔

یعقوب نے موقع پا کر اس بارے میں مامون سے پوچھا۔ مامون نے کہا۔

"اگر یہ بات آگے بڑھی تو تیرا سر اڑا دوں گا۔ سچ یہ ہے کہ جب طاہر میرے سامنے آتا ہے تو ذلت و بے کسی کی حالت میں بھائی امین کا مارا جانا یاد آتا ہے۔ میرے ہاتھ سے طاہر کو کسی دن ضرور ضرر پہنچے گا۔"

بات آئی گئی ہوئی۔ فوری طور پر جان کے خوف سے یعقوب نے طاہر کو کچھ نہ بتایا اور انتظار کرنے کو کہا۔

اسی اثناء میں حسن بن سہل کے متعلق ماموں کو بتایا گیا کہ وزیر مملکت ہونے کے باوجود خوش نہیں۔ اسے اپنے بھائی فضل کی موت کا بڑا رنج تھا۔ اس پر ماموں سوچ میں پڑ گیا۔

"اے ماموں! اب تو ہی سلطنت کا مالک و مختار ہے۔ فضل مجوسی ماضی کا حصہ بن چکا۔ اب اس کا بھائی حسن رہ گیا ہے۔ کہیں وہ تیرے لئے کوئی نیا مسئلہ نہ کھڑا کر دے۔" میں نے خلوت میں سرگوشی کی۔

ماموں اسے اپنی ہی آواز سمجھا اور بڑبڑایا۔ "تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

میں نے ماموں کو اپنے اثر میں لے کر جو ترغیب دی، اسی پر عمل ہوا۔

حسن بن سہل کو ماموں نے خلوت میں طلب کر لیا اور بولا۔ "ہم نے سنا ہے تیری بیٹی بوران بہت قابل اور تعلیم یافتہ ہے۔"

"جی ..... جی امیر المومنین!" حسن بہ مشکل کہہ سکا۔ اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔

"تو ہمیں خبط الحواس معلوم ہوتا ہے اے حسن! تجھے شاید فضل کے قتل پر دکھ ہے۔ ہم تجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی ایک تدبیر ہم نے سوچی ہے کہ تیری بیٹی بوران کو اپنے عقد میں لے لیں۔" ماموں نے کہہ دیا۔

عقد میں لینے کا مطلب حسن آتش پرست بہ خوبی سمجھتا تھا۔ اس کے حواس پر ایک اور تازیانہ لگا۔ پھر بھی انکار کی جرأت اس میں نہ تھی۔ ایک آتش پرست کی بیٹی کو مسلمان ہونا پڑا۔

غرض کہ ماموں مع اپنے خاندان، ارکانِ دولت، فوجی افسران و خدام، حسن کا مہمان ہوا۔

حسن نے برابر انیس (19) دن تک اس عظیم الشان برات کی مہمان داری کی، یوں کہ گویا ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی نے چند روز کے لئے ہی سہی، امیرانہ زندگی بسر کر لی۔ اس بہانے

وزیر مملکت حسن بن سہل نے جو خزانہ جمع کیا تھا، پانی کی طرح بہہ گیا۔ آدم زاد شاید اسی کو ایک پنتھ دو کاج کہتے ہیں۔

بہتر ہو گا کہ میں اس شادی کی تفصیل بتا دوں۔

خلیفہ ماموں کے خاندان والوں اور سلطنت کے تمام عہدے داروں پر مشک و عنبر کی ہزاروں گولیاں نثار کی گئیں۔ عام لوٹ کے لئے حسن کا حکم تھا کہ جس کے حصے میں جو گولی آئے اور اس پر چڑھے کاغذ پہ جو رقم لکھی ہو، اس کا وکیل ادا کرے۔ حسن کو یہ پٹی میں نے ہی پڑھائی تھی تاکہ غریب آدمیوں کا بھی کچھ بھلا ہو۔ مشک و عنبر کی گولیوں کے علاوہ عوام پر دراہم و دینار بھی نثار کئے گئے۔ یوں حسن بن سہل نے گویا گھر پھونک کر تماشا دیکھا۔

ماموں کے لئے مکلف فرش بچھایا گیا جو سونے کے تاروں سے بنایا گیا تھا اور گوہر و یاقوت سے مرصع تھا۔ ماموں جب اس فرش پر "جلوہ افروز" ہوا تو بیش قیمت موتی اس پر نچھاور کئے گئے۔ یہ موتی زمین پر گر کر بڑا دل آویز سماں دکھاتے تھے۔ ماموں نے ابونواس کا مشہور شعر پڑھا اور کہا کہ ابونواس نے جو لکھا گویا یہ سماں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لکھا۔ شعر کا ترجمہ یہ ہے۔

جام شراب سے چھوٹے بڑے بلبلے اٹھتے ہوئے ایسے لگتے ہیں
کہ گویا سونے کی زمین پر موتیوں کے دانے ہیں

اپنی بیٹی بوران سے بچھڑ کر اور فضل کا غم اپنے دل میں لئے حسن بن سہل چند ہی دن میں اس دنیا سے سدھار گیا۔ ماموں نے اس طرح دونوں بھائیوں سے جان چھڑا لی۔ نیا وزیر اعظم احمد بن ابی خالد الاحوال بنا۔

طاہر اب تک بغداد ہی میں تھا۔ ماموں سے ابھی کہیں جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ حالات نے پلٹا کھایا اور کچھ وقت گزر گیا تو ماموں کے ندیم خاص نے دو لاکھ درہم طاہر سے لینے کا حق ادا کر دیا۔ اس نے طاہر کو یہ حقیقت بتا دی کہ ماموں شاید اسے امین کو قتل کرانے کے "جرم" میں زندہ نہیں چھوڑے گا۔

حواس باختہ طاہر نئے وزیر اعظم احمد بن ابی خالد سے ملا۔ طاہر کے اس سے دیرینہ مراسم تھے۔

"تم جانتے ہو احمد کہ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔" طاہر بولا۔ "میرے ساتھ

بھلائی کرنا فائدے سے خالی نہیں ہے۔ میں تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مامون کی آنکھوں سے دور رہو۔" احمد بن ابی خالد نے اس کا ذمہ لیا اور دوسرے ہی دن صبح کے وقت مامون کے پاس پہنچ گیا۔

چونکہ احمد کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی اس لئے مامون نے پوچھا۔

"کیوں..... کیا کوئی نئی بات ہے؟"

"حضور! مجھے تو ساری رات نیند نہیں آئی۔"

"آخر اس کی کوئی وجہ؟"

"میں نے سنا کہ حضور نے خراسان کی حکومت غسان کو دی ہے۔ اس کے ساتھ مٹھی بھر آدمی سے زیادہ نہیں ہیں۔ اگر سرحد کے ترکوں نے حملہ کیا تو غسان انہیں روک سکے گا؟"

مامون بولا۔ "یہ خیال تو ہمیں بھی تھا۔ اچھا تم کس کو تجویز کرتے ہو؟"

"خراسان کے لئے طاہر سے بہتر کون شخص ہو سکتا ہے؟"

"اس کے خیالات تو باغیانہ ہیں۔ ہمارے مخبران صادق نے خبر دی ہے کہ وہ نقض بیعت پر آمادہ ہے۔"

"اس کا میں ذمے دار ہوں۔"

"اچھا تم اپنی ذمے داری پر اسے مقرر کر دو۔" مامون نے اپنی بلا احمد کے سر ڈال دی۔

طاہر طلب ہوا۔ سند حکومت کے ساتھ اسے ایک کروڑ درہم بھی عطا ہوئے۔ اتنی رقم خراسان کے ہر عامل کو ملتی تھی۔ ایک مہینے میں طاہر نے ساز و سامان سفر درست کیا اور 29 ذیقعدہ 205 ہجری کو خراسان روانہ ہوا۔

میں نے بہرحال طاہر کو بغداد میں ٹکنے نہ دیا۔ لیکن ابھی اور بہت کچھ باقی تھا۔ ابھی تو ہارون کا بھائی ابراہیم زندہ تھا۔ وہ بھاگ کر کہاں گیا؟ اس پر کیا گزری؟ عارج اور مجھے دونوں ہی کو یہ تجسس تھا۔ ہم جنات کے لئے یہ معلوم کرنا مشکل نہ ہوا۔

ابراہیم جس نے بغداد میں "علم بغاوت" یا علم خلافت بلند کیا تھا۔ مدت سے روپوش ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود اس کے قدیم رفقا اب بھی اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ابراہیم کو دوبارہ تخت خلافت پر بٹھائیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ اس میں ان کا مفاد تھا۔ ابراہیم پھر سے خلیفہ بن جاتا تو پہلے انہیں نوازتا۔

بغداد بہت لٹ پٹ چکا تھا۔ عرصہ دراز کے بعد گلی کوچے اور بازاروں میں رونق دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے اسی بنا پر یہ گوارا نہ ہوا کہ یہ شہر ایک مرتبہ پھر سازشوں کا گڑھ بن جائے۔ سو میں نے "چپکے" سے مامون کو خبر کر دی۔ کسی سازش کی بھنک مل جائے تو حکمران وقت ایک دم سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ پہلی فرصت میں ان لوگوں کا "دھڑن تختہ" کر دیتے ہیں جو اقتدار کے لئے خطرہ ہوں۔ مامون نے بھی ایسا ہی کیا۔ ابراہیم کے "ہمدردوں" کو دھر دبوچا۔ صفر 210 ہجری میں یہ سب گرفتار کر لئے گئے۔

ابن عائشہ اور مالک تالی دو آدم زاد باغیوں کی جماعت کے سرغنہ تھے۔ انہوں نے ایک بڑی فہرست تیار کر کے مامون کو بھیجی کہ اور لوگ بھی ہمارے ساتھ ہیں۔

میں نے عارج کو اس کام پر لگا دیا کہ معلوم کرے سچ کیا ہے۔ میں قصر خلافت کی طرف روانہ ہو گئی۔

عارج نے دیر نہ کی اور آ کر مجھے بتایا۔ "اے دینار! یہ دونوں آدم زاد جھوٹے ہیں۔ انہوں نے اپنے دشمنوں کے نام لکھ کر مامون کو دے دیئے ہیں۔ ان فسادیوں کا مقصد اس طرح اپنے دشمنوں سے انتقام لینا ہے۔"

"تو نے مجھے جو کچھ بتایا ہے، مامون کے کان میں ڈال دے۔" میں نے عارج سے کہا۔

"کیوں..... تجھے کیا ہوا؟ تو نے تو مجھے اپنا شوہر بنانے کی بجائے خادم بنا لیا ہے۔"

"کوئی جن ہو یا بشر خادم ہی سے مخدوم بنتا ہے۔ اے عارج! کیا تجھے مخدوم نہیں بننا؟"

"صرف تیرا شوہر بننا اور تجھے اپنی بیوی بنانا میری زندگی کا مقصد ہے۔"

"سبحان اللہ! تو نے اپنی زندگی کے لئے کیا اعلیٰ مقصد منتخب کیا ہے۔" میں نے عارج کا مذاق اڑایا۔

"کر لے طنز۔ مگر میں اپنے مقصد حیات سے ہرگز پیچھے ہٹنے والا نہیں۔ میں کوئی آدمی نہیں جن زاد ہوں۔"

"اور میں بھی جن زادی ہوں۔ تجھے فی الحال گھاس نہیں ڈالوں گی۔"

"کیا کہا؟..... گھاس! تو نے مجھے گدھا گھوڑا سمجھ رکھا ہے کیا؟"

میرے منصوبے کے مطابق عارج "ٹھرک" گیا۔ یعنی ناراض ہو کر چلا گیا۔ اسے پھر

سے منالینا میرے لئے مشکل نہ ہوتا۔

میں نے خلیفۂ وقت مامون کو حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ باغی قید خانے میں بھیج دیئے گئے مگر وہاں بھی چین سے نہ بیٹھے۔ میں ان پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ انہوں نے ایک دن اندر سے چاروں طرف کے کواڑ بند کر دیئے اور چاہا کہ دیوار توڑ کر نکل جائیں۔ میرے ذریعے مامون کو خبر ہوئی تو خود قید خانے پہنچ کے ابن عائشہ کے سوا سب کو قتل کرا دیا۔

ابن عائشہ ہاشمی تھا اس لئے یہ ''امتیاز'' رکھا گیا کہ بجائے قتل کے اس کو سولی دی گئی۔ اس کے ساتھ یہ قاعدہ ٹوٹ گیا کہ اب تک کسی ہاشمی نے پھانسی پانے کی ذلت نہیں اٹھائی۔

''یہ واقعہ جو میں نے بیان کیا، ابراہیم کی گرفتاری کا دیباچہ تھا۔ قید کے دوران میں مجھے کوئی ''نیک روح'' سمجھ کر ابراہیم نے اپنی روداد جن الفاظ میں سنائی، وہ یہ تھی۔

''جب مامون عراق پہنچا تو لاکھ درہم کے انعام پر اس نے میری گرفتاری کا اشتہار دیا۔ میں نے خیال کیا کہ اب جان کی خیر نہیں۔ گرمی کے دن تھے اور ٹھیک دوپہر تھی کہ میں گھر سے نکل کھڑا ہوا مگر یہ کون بتا سکتا تھا کہ کہاں جاؤں گا؟''

''اے ابراہیم! کیا تو نے فرار ہونے سے پہلے یہ بھی نہ سوچا کہ پناہ کہاں مل سکتی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔ ''تو نے یہ تو بڑی حماقت کی!..... خیر بول کہ پھر تجھ پر کیا گزری؟''

ابراہیم کچھ دیر خاموش رہا، پھر مجھ سے اپنی حمایت کا اعتراف کیا اور اپنی بقیہ ''روداد غم'' سنانے لگا۔

''میں اس وقت تک بغداد ہی میں تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اس شہر سے نکل جاؤں، مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اپنے گھر سے نکل کر میں جس گلی میں گھسا، دوسری طرف سے بند تھی۔ بوکھلاہٹ میں اس گلی کے اندر گھس کر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اب میں نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ الٹا پھر سکتا تھا۔

اسی اضطراب میں ایک مکان پر نظر پڑی جس کے دروازے پر حبشی غلام کھڑا تھا۔ میں نے بڑھ کر اس سے التجا آمیز انداز میں سوال کیا۔ ''ذرا دیر کے لئے مجھے اپنے مکان میں جگہ دے سکتے ہو؟''

اس نے بڑی خوشی سے میری درخواست قبول کر لی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ مکان میں لے گیا اور ایک کمرے میں لے جا کر بٹھایا۔ کمرا عمدہ اور بیش بہا ساز و سامان سے مزین تھا۔

اے نیک روح! مجھ پر یہ وقت بھی آنا تھا کہ مجھے ہارون الرشید کا بھائی ہونے کے باوجود ایک غلام کے مکان میں پناہ لینی پڑی۔ بہرحال وہ غلام کمرے سے چلا گیا۔ جاتے جاتے وہ کواڑ بند کرتا گیا۔ میری تازہ امیدیں پھر یاس میں بدل گئیں۔ میں نے سوچا کہ وہ غلام مجھے گرفتار کرانے کو کسی شرطے (پولیس والے) کے پاس گیا ہے۔

میں انہی خیالوں اور پیچ و تاب میں تھا کہ اسی غلام نے کواڑ کھولے اور ایک مزدور کے ساتھ مکان میں داخل ہوا۔ میں نے مسرت آمیز تعجب سے دیکھا کہ وہ گوشت، دیگچی، کورے پیالے اور تمام ضروری اشیا اپنے ساتھ لایا ہے۔

اس نے مزدور کو رخصت کیا، پھر جو سامان لایا تھا، میرے سامنے رکھ کر بولا۔ ''میں ذات کا حجام ہوں۔ میری جرأت نہیں کہ اپنے گھر کا پکا ہوا کھانا حضور کی دعوت میں حاضر کروں اس لئے بازار سے سب نئی چیزیں مول لایا ہوں۔ حضور جو پسند فرمائیں۔''

میں نے خود کھانا تیار کیا اور خوب سیر ہو کر کھایا۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھ کر شراب حاضر کی۔

''اگر اجازت ہو تو میں ایک کنارے بیٹھ جاؤں اور حضور کی تفریح خاطر کے لئے دور ہی دور سے شراب میں شریک رہوں۔'' غلام نے مؤدب آواز میں کہا۔

وہ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

شراب کا دور چلتا رہا۔ ذرا دیر کے بعد وہ ایک نے ''بانسری'' اٹھا لایا اور دست بستہ بولا۔ ''میرا منصب نہیں کہ حضور سے گانے کے لئے عرض کروں، لیکن حضور کا فیاض اخلاق میری آرزو کو پورا کر سکتا ہے۔''

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''تم نے کیسے جان لیا کہ میں اس لطیف فن سے واقف ہوں؟''

''سبحان اللہ! کیا حضور چھپائے چھپ سکتے ہیں؟ کیا حضور کا اسم مبارک ابراہیم نہیں ہے؟ کیا بغداد کے تخت نے حضور کے قدموں سے عزت حاصل نہیں کی؟ مامون الرشید نے کس کے لئے لاکھ درہم انعام کا اعلان کرایا ہے۔''

اس غلام سے یہ سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ یہ غلام بھی خدا کی عجب قدرتوں کا نمونہ ہے۔ ایسے فیاض میزبان کو رنجیدہ کرنا مجھے اچھا نہ لگا اور

لے کے ساتھ حسب حال کچھ شعر گائے۔

غلام بدست ہو گیا۔ اُس نے مزے میں آ کر خود بھی گانا شروع کر دیا اور اس درد سے گایا کہ در و دیوار بول اٹھے۔ میں تمام خطرات کو یک لخت بھول گیا اور فرمائش کی کہ کچھ گاؤ۔ اس نے نہایت دل کش آواز میں یہ شعر گائے۔ (ترجمہ)

وہ ہم کو عیب لگاتی ہے کہ ہمارا شمار کم ہے
ہم نے اُس سے کہا کہ بڑے لوگ کم ہوتے ہیں
آباد کرنے والے برباد ہونے کو عیب سمجھتے ہیں
لیکن ہم ایسا نہیں سمجھتے

ان پُر اثر شعروں نے میرے ہوش و حواس بالکل کھو دیے اور میں غفلت زدہ ہو کر سو گیا۔ جاگا تو شام ہو چکی تھی۔ میں نے جیب سے ایک تھیلی نکالی اور غلام کو یہ کہہ کر دینی چاہی کہ لو خدا حافظ۔ سرِ دست یہ حقیر پیشکش قبول کرو۔ خدا نے اگر وہ دن دکھایا کہ میری بدقسمتی، اقبال مندی سے بدلی تو میں تمہارے احسان کا کافی صلہ دے سکوں گا۔

غلام نے بہت رنجیدہ ہو کر کہا۔ "افسوس غریب آدمی آپ لوگوں کی نگاہ میں حقیر مخلوق ہے۔ مجھے حضور کی ذرہ نوازی سے جو عزت ملی کیا میں اسے درہم و دینار کے عوض بیچ سکتا ہوں؟ خدا کی قسم یہ الفاظ دوبارہ سننے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اگر آپ فرمائیں گے تو یہ غلام اپنی حقیر زندگی آپ پر قربان کر دے گا۔"

میں نے ندامت کے ساتھ اپنا بے موقع عطیہ واپس لیا اور چاہا کہ غلام سے رخصت لوں۔

اس نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ "میرے آقا! آپ یہاں زیادہ امن و امان سے رہ سکیں گے۔ کچھ دن اور صبر کیجئے، یہ فتنہ فرو ہو لے تو حضور کو اختیار ہے۔"

میں چند روز اُس کے مکان میں مقیم رہا لیکن اس خیال سے کہ میرا میزبان میرے مصارف کی وجہ سے گراں بار ہوا جاتا ہے، چپکے سے نکل کھڑا ہوا۔ اخفائے حال کے لئے میں نے مکان میں موجود زنانہ لباس پہن لیا۔ اس کے باوجود راہ میں ایک فوجی سوار نے مجھے پہچان لیا اور چیخ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ "لینا یہ اشتہاری مجرم جانے نہ پائے۔"

پوری قوت صرف کر کے میں نے اُسے دور دھکیل دیا۔ وہ ایک گڑھے میں جا پڑا۔ بازار کے آدمی شور و غوغا سن کر ہر طرف سے دوڑ پڑے۔ میں مہلت پا کر سڑک عبور کر گیا۔ ایک عورت اپنے مکان کے دروازے پر کھڑی تھی۔ میں نے اس سے درخواست کی۔ "میری جان بچا لے" عورت نے میری درخواست قبول کر لی۔ مگر بدقسمتی میرے ساتھ تھی۔ یہ نیک دل عورت اُسی سوار کی بیوی نکلی جس نے میرا پردہ فاش کرنا چاہا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ بے رحم سوار آ پہنچا۔

مکان میں گھستے ہی اُس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ بیوی کو الگ لے جا کر اُس نے ساری داستان سنائی۔ اس کی آواز جوش کی وجہ سے اتنی بلند تھی کہ میں نے ایک ایک لفظ سن لیا۔ اس پر بھی نیک دل عورت نے مجھ کو آ کر تسکین دی کہ جب تک میں ہوں، آپ کو کوئی ضرر نہ پہنچے گا۔ میں تین دن تک اُس کا مہمان رہا۔

اپنے شوہر کی جانب سے کیونکہ عورت کو اطمینان نہ تھا اس لئے چوتھے دن مجھ سے بولی۔ "افسوس میں آپ کی حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتی۔" سو یوں مجبوراً وہاں سے نکلنا پڑا۔

اس اضطراب میں مجھے اپنی کنیز خاص یاد آئی۔ میں سیدھا اُس کے مکان پر گیا۔

مجھے دیکھ کر وہ کنیز باہر آئی اور زار و قطار آنسو بہانے لگی۔ پھر وہ مجھے اپنے مکان میں لے گئی۔ اُس نے مجھ سے غم خواری کی باتیں کیں، پھر باہر چلی گئی۔ میں نے بغیر کسی تردد کے خیال کیا کہ میری دعوت کے اہتمام میں جاتی ہے۔ یہ میرا خیال خام نکلا۔ کچھ دیر بعد جو تحفہ وہ میرے لئے بازار سے لائی، وہ خونخوار شُرطے تھے۔

سوائے نیک روح! یوں مجھے اُن شُرطوں نے یہاں لا کر قید کر دیا۔ شاید کل صبح یہ مجھے مامون کے دربار میں پیش کریں گے۔"

میں بولی۔ "اے ابراہیم! نہ ڈر۔" مجھے اُس آدم زاد پر ترس آ گیا۔ اس کا سبب میری متلون مزاجی بھی ہے۔ اگر اُس آدم زاد کی گردن ماری جاتی تو مجھے کیا مل جاتا۔ اسی خیال سے میں نے اپنی دانست میں اُسے بہتر مشورہ دیا اور وہاں سے چلی آئی۔

دوسرے دن صبح بدبخت شُرطوں نے زنانہ لباس ہی میں ابراہیم کو برسرِ دربار حاضر کیا۔

مامون کے روبرو پہنچ کر ابراہیم نے اُسے تعظیم دی۔

مامون بولا۔ "خدا تیرا برا کرے۔"

ابراہیم نے میرا پڑھایا ہوا سبق دہرانا شروع کر دیا۔ "اے امیر المومنین! مجھے کچھ عرض

کرنے کی اجازت عطا فرمائیں۔''

مامون نے چونک کر ابراہیم کو دیکھا اور سر کے اشارے سے بولنے کی اجازت دے دی۔

''بے شک میرا گناہ ہر گناہ سے بڑھ کر ہے حضور!'' ابراہیم کہنے لگا۔ ''اس پر حضور امیر المومنین کو سزا دینے کا حق ہے۔ مگر بخش دیں تو نوازش ہے۔'' پھر ابراہیم نے جو شعر پڑھے، اُن کا ترجمہ یہ ہے:

میرا گناہ بڑا ہے لیکن تُو اُس سے بالاتر ہے
یا اپنا حق لے یا اپنے حلم کی وجہ سے درگزر
اگر میرے کام شریفانہ نہیں تو تیرے ہونے چاہئیں

مامون الرشید خود اچھا شاعر تھا اور شعر کی زبان کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ شعر سن کر اس نے ابراہیم کی طرف محبت کی نظر سے دیکھا، پھر ارکانِ دولت سے مخاطب ہوا۔ ''کیا رائے ہے؟''

ہر رکن نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''قتل!''

مامون نے سر جھکا لیا اور شعر پڑھا۔ (ترجمہ)

میرے بھائی امین کو میری قوم نے قتل کیا
میں اگر ان پر تیر چلاؤں تو مجھی کو لگے گا

ابراہیم جواب تک چادر اوڑھے ہوئے تھا، اپنے چہرے سے چادر ہٹا کے زور سے بولا۔ ''اللہ اکبر۔ خدا کی قسم، امیر المومنین نے بخش دیا۔'' اس پر درباری حیران ہی تھے کہ انہوں نے مامون کو اٹھتے دیکھا۔

یہ وہی مامون الرشید تھا جس نے امین کا سر دیکھ کر سجدۂ شکر ادا کیا تھا۔ آج بھی اس نے سجدہ کیا مگر یہ سجدہ مختلف تھا۔ سجدہ کر کے وہ پھر اپنی جگہ آ بیٹھا اور ابراہیم کو مخاطب کیا۔

''اے میرے چچا ابراہیم! تجھے خبر ہے، میں نے کیوں سجدہ کیا؟''

''شاید میری اطاعت پر اے امیر المومنین!'' ابراہیم نے جواب دیا۔

مامون نے کہا۔ ''نہیں، بلکہ اس بات پر کہ خدا نے مجھے عفو کی توفیق دی۔'' (عفو: خطا کا معاف کر دینا، قدرت ہونے کے باوجود کسی سے بدلہ اور عوض نہ لینا۔ مصنف)

پھر مامون نے ابراہیم کی ساری ''کتھا کہانی'' سنی۔ غلام، نیک دل عورت اور ''غدار'' کنیز کو فوری طور پر دربار میں طلب کیا گیا۔ برے وقت میں ابراہیم کی ڈھارس بندھانے، خاطر کرنے اور پناہ دینے پر مامون نے غریب غلام کا وظیفہ ایک ہزار دینار مقرر کیا۔ نیک دل عورت کو بھی انعام ملا۔ لیکن ابراہیم کی کنیز خاص کو مامون کی خیر خواہی کے باوجود اُلٹی سزا ہوئی۔ غالباً مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت مامون میرے اثر میں تھا۔

اپنے ہی اثر میں لے کر مامون سے میں ایک اور ''بھلا'' کام لے چکی تھی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے کہ جب یک چشم طاہر، خراسان ایسے بڑے صوبے کا عامل بن کر بغداد سے جانے والا تھا۔

طاہر جب خراسان کے لئے جا رہا تھا تو مامون سے رخصت ہونے گیا۔ مامون نے اپنا ایک خاص غلام، طاہر کے ساتھ کر دیا۔ اُس غلام کی نسبت مامون نے طاہر کو یقین دلایا کہ یہ اُس کی کارگزاریوں کا صلہ ہے۔ در پردہ صورت حال میرے علم میں تھی۔

مامون نے اس غلام کو ہدایت کی تھی کہ اگر طاہر کے خیالات بغاوت کی طرف مائل دیکھے تو اُسے زہر دے دے۔ مجھے عارج سے معلوم ہوا کہ خراسان پہنچ کر طاہر نے بغاوت کا ارادہ کیا۔ میں ہی عارج کو اِدھر اُدھر دوڑاتی رہتی تھی۔ وہ بھی ''ڈولو'' تھا۔ سو ایسے کام اُسے بہت پسند آتے۔ میں عموماً بغداد میں رہنے ہی کو ترجیح دیتی، مگر باخبر رہتی۔

طاہر کے باغی ہو جانے کا کھلا ثبوت یہ تھا کہ مرو کی جامع مسجد میں ایک جمعے کو اُس نے خطبہ پڑھا تو مامون کا نام نہ لیا۔ خراسان کا پرچہ نویس کلثوم بن ثابت بھی اس موقع پر موجود تھا۔ عارج نے اُسے اپنا آلۂ کار بنا لیا۔

پرچہ نویس نے گھر آ کر غسل کیا اور کفن پہن کر مامون کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ کلثوم بن ثابت کو یقین تھا کہ طاہر کو بھی کسی ذریعے سے پتہ چل جائے گا، اس کی مخبری کس نے کی ہے اور وہ اُسے زندہ نہ چھوڑے گا۔

پرچہ نویس کو خبر نہ تھی کہ جنات کبھی کبھی عجب کام کر دکھاتے ہیں۔ وہ اس سے بھی لاعلم تھا کہ کوئی جن زادی اس پر حاوی ہے۔ مامون نے عرضی پڑھی تو احمد بن ابی خالد کو بلا بھیجا اور کہا، اسی وقت خراسان روانہ ہو جا۔

احمد جواب وزیر مملکت کے عہدے پر فائز تھا اور اسی نے طاہر کا ذمہ لیا تھا، گھبرا گیا۔

اس نے بڑے اصرار سے رات بھر کی مہلت لی۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا پرچہ پہنچا کہ طاہر نے دفعتہً انتقال کیا۔ یوں احمد کا خراسان جانا ملتوی ہو گیا۔ پرچہ نویس نے لکھا تھا۔ ''طاہر کو بروز جمعہ بخار چڑھا۔ ہفتے کی صبح لوگ عیادت کے لئے گئے تو دربانوں سے معلوم ہوا کہ آج خلافِ معمول عاملِ خراسان ابھی تک خواب گاہ میں ہے۔ زیادہ دیر ہوئی تو لوگ اندر گئے۔ طاہر سر سے پاؤں تک کپڑے میں لپٹا ہوا مُردہ پڑا تھا۔ بعضوں کا بیان ہے کہ طاہر کی پلکوں میں کچھ عارضہ پیدا ہوا جس سے وہ اچانک گر پڑا اور مر گیا۔

مامون جب یہ پرچہ پڑھ رہا تھا تو میں اس کے قریب ہی تھی۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر اطمینان کی مسکراہٹ دیکھی۔

''خدا کا شکر ہے جس نے طاہر کو مجھ سے پہلے بلایا۔'' مامون کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ اس وقت وہ خلوت میں تھا۔

''کیوں جھوٹ بولتا ہے اے مامون!'' میں نے سرگوشی کی۔ ''کیا تو نے ہی طاہر کے ساتھ اس کی موت کو خراسان نہیں بھیجا تھا؟''

''ہاں مجھے اپنا غلامِ خاص یاد ہے۔'' مامون نے اقرار کیا۔ پھر بولا۔ ''میں نے اسے اس لئے زہر دلوا دیا کہ وہ میرے بھائی امین کا قاتل تھا۔''

مامون الرشید کی اس بات پر میں ہنس دی۔ وہ بطخ کے بچوں کو تیرنا سکھا رہا تھا۔ اس نے اپنی ''کارروائی'' پر پردہ ڈالنے کے لئے آزمودہ نسخہ اپنایا۔ طاہر ہی کے بیٹے طلحہ کو خراسان کی حکومت دے دی گئی۔ اقتدار واقعی بڑی ظالم شے ہے، آدمی خونی رشتوں کو بھی بھول جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یک چشم طاہر کو زہر دیا گیا اور خود مامون نے زہر دلوایا۔ لیکن وہ کیا کرتا؟ یہ سوال مامون کی حمایت میں نہیں کیا گیا بلکہ اظہارِ حقیقت ہے۔ میں تو خیر ایک جن زادی ٹھہری، کسی دیانت دار آدم سے پوچھ لیا جائے کہ اگر وہ مامون کی جگہ ہوتا تو کیا قدم اٹھاتا؟ میں پوچھتی ہوں، مامون کے باپ ہارون نے کیا نہیں کیا؟ اس نے خاندان برامکہ کو ختم نہیں کرایا؟ واقعہ یہ ہے، ہر آمر کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے۔ اسے اپنا پرایا کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ کسی احسان کی قیمت ادا کرنا نہیں جانتا۔ جاننا ہی تو عذاب ہے۔ جنہیں کچھ معلوم نہیں بڑے ثواب میں ہیں۔

❂......❂

عذاب و ثواب کے اسی سلسلے کی ایک کڑی بنو عباس کا زمانہ تھا۔ مجھ سے جس حد تک ممکن ہوا اپنے بیان میں توازن برقرار رکھا ہے۔ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہا ہے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں جن زادی ہوں۔

سچ یہ بھی ہے کہ دولت عباسیہ کے امن و انتظام اور ترقی و وسعت کا عہد زریں بلکہ مسلمانوں کا عہد زریں ہارون اور مامون ہی کا دور ہے۔ ہارون و مامون ہی کے عہد حکومت نے اس خاندان کو یہ ناموری دی ہے۔

ان دونوں کے زمانے میں تجارتیں آزاد تھیں۔ نئے نئے شہر آباد ہوتے جاتے تھے۔ ایک ایک قصبے بلکہ ایک ایک گاؤں میں چشمے اور نہریں جاری تھیں۔ پانی کی قدر ہم عرب ہی خوب جانتے ہیں۔ ہم جنات آگ سے بنے ہیں، سو ہمیں بھی اپنے حواس میں رہنے کے لئے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ جنات تو پانی میں ہی رہتے ہیں۔ یہ غواصو کہلاتے ہیں۔ (غواص عربی لفظ ہے اس کے معنی غوطہ خور اور موتیوں کے لئے غوطہ لگانے والے کے ہیں۔ غواصی یعنی غوطہ خوری، غواص ہی سے بنا ہے۔ پانی میں رہنے والے جنات کو غواصوں کہا جاتا ہے۔ اس سبب قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ مصنف) ان کا تفصیلی ذکر ضرورت کے مطابق آئے گا۔ اس وقت تو میں جنات کا نہیں آدم زادوں کا ذکر خیر و شر کر رہی ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی آدمی نہ خیر ہی خیر ہے نہ شر ہی شر! اللہ تعالیٰ نے آدمی کو خیر و شر کا مجموعہ بنایا ہے۔ اللہ کے نبی، رسول، پیغمبر، بزرگانِ دین البتہ خیر مجسم ہیں۔ میں ایک معمولی جن زادی اس قابل نہیں کہ ان معاملات پر فتویٰ (شرعی فیصلہ) دوں۔ یہ منصب کسی مفتی (فتویٰ دینے والا) کا ہے، میرا نہیں۔ ذکر مامون کے عہد کا ہے جب زراعت کو ترقی ہو رہی تھی۔ مامون الرشید کے عہد کو بجا طور پر دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

ایک حصہ وہ تھا جب مامون، خراسان میں تھا۔ دوسرا حصہ اس زمانے سے شروع ہوتا

ہے جب مامون بغداد آیا۔

مامون نے خراسان کے زمانہ حکومت میں غفلت کی تھی۔ اس کا خمیازہ اسے مدت دراز تک بھگتنا پڑا۔ اسی بنا پر بغداد میں آکر اس کا طرز حکومت بالکل بدل گیا۔

دارالخلافہ ہونے کے سبب بغداد کی بڑی اہمیت تھی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ یہی شہر سازشوں کا گڑھ تھا۔ سازشیں اقتدار کے مرکز ہی تو ہوتی ہیں۔ وہ حکمران کامیاب رہتا ہے جو باخبر رہے۔ بے خبری میں بہت سے مارے جاتے ہیں۔ مامون کو ابھی زندگی عزیز تھی۔ اس نے اسی لئے میرا مشورہ قبول کرلیا اور بڑبڑانے لگا۔ "ہاں یہی بہتر ہے۔ میرے دماغ میں بڑے کام کی بات آئی ہے۔ اس کے لئے عجوزہ عورتیں ہی مناسب رہیں گی۔" (عجوزہ: عمر رسیدہ، بوڑھی)

"یہ عورتیں تمام دن شہر میں پھریں گی۔" میں بول اٹھی۔ "شہر کا تمام کچا چٹھا تجھے ان عورتوں سے معلوم ہوتا رہے گا۔" مامون کو اسی کی آواز میں مجھے مخاطب کرنا پڑ رہا تھا۔ اسے میں نے تاکید کی۔ "اے مامون! یاد رکھیو، کسی کو ان عورتوں کی اطلاع نہ ہو۔ ہر محکمے پر جداگانہ خفیہ نویس اور واقعہ نگار مقرر ہونے چاہئیں۔"

میں نے مامون کے دماغ کو ٹٹولا۔ اسے بہت خوش پایا۔ یوں جیسے اس کو کسی مسئلے کا اچانک حل مل گیا ہو۔

میری نصیحت و تاکید پر مامون نے پورا پورا عمل کیا۔ اس نئے محکمے نے رعایا کے حق میں عجیب عجیب فیاضیاں دکھائیں۔ میں یہ کیوں بتا دوں کہ میں نے ہی "عجوزہ" عورتوں کو آدمیوں کی مدد کا چسکا لگایا تھا۔ آدم زادوں کے درمیان رہ کر خدمت خلق ہی تو میرا مقصد تھا اور میں اپنے مقصد کو بھولی نہیں تھی۔ اس ضمن میں کچھ دلچسپ واقعات سن لیں۔

ایک دن کسی سپاہی نے ایک شخص کو بیگار میں پکڑا۔ وہ غریب آدمی اپنی روزی کی تلاش میں نکلا تھا، سو چیخ اٹھا کہ بچاؤ، مجھے بچاؤ ان شرطوں سے۔ ورنہ میرے بیوی بچے بھوکے مر جائیں گے۔

مامون کو ایک "عجوزہ" نے یہ خبر دی تو اس نے غریب آدمی کو طلب کرلیا۔ نمود و نمائش کا یہ بڑا اچھا موقع تھا جو مامون نے نہیں گنوایا۔ حکمران ایسے معاملات میں بڑے "چنٹ" (ہوشیار) ہوتے ہیں۔ ایک تاثر حکمران یہ بھی دیتے ہیں کہ وہ بڑے "باخبر" ہیں اور گویا ہر

بات انہیں "جادو" سے معلوم ہو جاتی ہے۔ اس کا مقصد عوام کو "الو" اور خود کو "قابل" ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ اصل کہانی کچھ اور ہوتی ہے جو عموماً بور میں یا پھر کبھی سامنے نہیں آتی۔ آدم زاد، خصوصاً مجرمانہ ذہن رکھنے والے آدم زاد ہر ثبوت، "ہر گواہی" کو ختم کرتے جاتے ہیں۔

جو واقعہ پیش آیا اس کو غلط ثابت کرنے کے لئے شرطہ آداب بجا لا کر بولا۔ "اے امیر المومنین! گستاخی کی معافی اور جان کی امان کے بعد یہ غلام اپنے حق میں گواہی دلواتا......"

"منہ بند رکھ!" مامون نے اسے ڈانٹ دیا۔ "اپنی اوقات پہچان کر تو ہم سے کلام کر رہا ہے۔"

شرطے کے چہرے پر زردی پھیل گئی اور پھر اس کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ ممکن ہے مامون اس شرطے کو کم سزا دیتا لیکن وہ زبان کھول بیٹھا تھا جب کہ جھوٹا تھا اس لئے لمبی سزا دی۔ غریب آدمی کو انعام سے نوازا گیا۔ ہر چند کہ یہ انعام محض ایک سو قیراط تھا اور اس سے صرف ایک مہینے تک وہ غریب آدم زاد جمن کی جنسری بجا سکتا تھا۔ پھر بھی خوش ہو گیا۔ (قیراط، ایک سکہ۔ یہ درہم سے بھی کم قیمت ہوتا ہے۔ ایک سو قیراط = ایک درہم۔ قیراط عربی لفظ ہے جو بعد میں وزن کے لئے بھی استعمال ہوا۔ اس وزن کا اندازہ 4 جو کے برابر ہے۔ فارس والے فارسی میں اسے دانگ کہتے ہیں۔ دانگ بھی وزن ہے۔ دانگ = 6 رتی۔ اس کا دوسرا مطلب: اطراف، سمت، جانب۔ (3) کسی چیز کا چھٹا حصہ اور چوتھے معنی ٹکڑا یا حصہ کے ہیں۔ انگریزی میں "کیرٹس" اس قیراط سے لیا گیا ہے۔ مصنف)

ایک بار ایک شخص نے عرضی دی کہ بیت المال سے کچھ وظیفہ مقرر کیا جائے۔ مامون نے اسے بلوالیا اور پوچھا، کتنے بچے ہیں؟ اس نے زیادہ تعداد بتائی۔ "عجوزائیں" پہلے ہی ضروری معلومات مامون تک پہنچا چکی تھیں، سو اس کا جھوٹ نہ چل سکا۔ دوسری بار اس نے پھر عرضی لکھی اور جتنے بچے تھے ان کی صحیح تعداد بتا دی۔ مامون نے اب عرضی پر لکھ دیا، اس کا روزینہ مقرر کر دیا جائے۔

اتوار کے دن عموماً صبح سے ظہر کے وقت تک مامون دربار عام کرتا تھا۔ یہاں خاص و عام کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ یہاں کوئی بے وسیلہ و غریب کمزور آدمی بھی اپنے حق کیلئے آواز بلند کرسکتا تھا۔

ایک دن ایک شکستہ حال بڑھیا نے دربار میں آ کر یہ شکایت پیش کی کہ ایک ظالم نے میری جائیداد چھین لی ہے۔ اس زبانی شکایت پر مامون نے پوچھا۔ ''کس نے؟''

بڑھیا نے اشارے سے بتایا کہ آپ کے پہلو میں جو بیٹھا ہے اس نے۔

مامون نے دیکھا تو خود اس کا بیٹا عباس تھا۔ اس نے وزیر سلطنت کو حکم دیا کہ خلیفہ زادے کو بڑھیا کے برابر میں کھڑا کر دے۔ مامون نے دونوں کے اظہار سنے۔ عباس رک رک کر آہستہ آہستہ گفتگو کرتا تھا، لیکن بڑھیا کی آواز بیان کے ساتھ بلند ہوتی جاتی تھی۔ اس پر وزیر سلطنت نے بڑھیا کو روکا کہ خلیفہ وقت کے سامنے اونچی آواز میں بات کرنا ادب کے خلاف ہے۔

''نہیں......'' مامون بول اٹھا۔ ''جس طرح یہ چاہے اسے آزادی سے کہنے دیا جائے۔'' لمبے بھر توقف کے بعد مامون نے مزید کہا۔ ''سچائی نے اس کی زبان تیز کر دی ہے اور عباس کو گونگا بنا دیا ہے۔''

اس مقدمے کا فیصلہ آخر بڑھیا کے حق میں ہوا اور اس کی جائیداد واپس دلا دی گئی۔

ایک مرتبہ خود مامون پر ایک شخص نے تیس ہزار دینار کا دعویٰ دائر کیا۔ اسے میں نے ہی ایسا کرنے پر اکسایا تھا۔ اس پر عارج کو حیرت ہوئی، بولا۔ ''اے دینار! یہ کیا قصہ ہے؟''

''تعجب نہ کر اور مجھے مامون کا طرفدار بھی نہ سمجھ۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ایک آمر کے سامنے دوسرے عامر کو بھی تو کھڑا ہونا ہے۔ الف سے آمر حکم دینے والے اور گویا بہر حال اپنی بات منوانے والا ہے، یعنی زبردستی! جب کہ دوسرے عامر کا مطلب آباد کرنے والا ہے۔''

''یہ تو میری بات کا جواب نہ ہوا اے دینار! تو لفظوں سے کھیلتی اور ان آدم زادوں کے لئے ناحق دکھ جھیلتی ہے۔''

''حق کیا ہے اور ناحق کیا، تو ابھی نہیں سمجھ پائے گا۔''

اس پر عارج چڑ گیا اور بولا۔ ''کیوں، کیا ابھی بھی میں بڑا نہیں ہوا؟''

''بڑائی صرف ایک ذات کے لئے ہے۔ سو بڑا ہونے کا دعویٰ نہ کیا کر اے عارج!''

''تجھ سے شاید میں کبھی نہیں جیت سکتا۔ بات کچھ ہوتی ہے اور تو اسے کچھ بلکہ اور کچھ بنا دیتی ہے۔''

''بنانا بگاڑنا بھی اسی کی طرف سے ہے۔''

''اللہ کے واسطے معاف کر دے مجھے اے دینار!''

''جا معاف کیا۔ تو بھی کیا یاد کرے گا کہ کسی جن زادی سے پالا پڑا تھا۔'' میں نے مزید کہا۔ ''خیر تو نے خود ہی معافی مانگ لی ہے تو بتا دیتی ہوں، آدم زاد عامر مقروض اور ضرورتمند ہے۔ اسے مامون کے خزانے سے اگر تیس ہزار دینار مل جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ اس مقدمے میں ایک چنتھ کئی کاج ہیں۔ تو بس دیکھتا رہ!''

مذکورہ مقدمہ قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم کی عدالت میں پیش ہوا۔ مامون جو ایک مطلق العنان حکمران تھا جواب دہی کے لئے اسے دار القضاۃ میں داخل ہونا پڑا۔

خدام نے قالین لا کر بچھایا کہ مامون اس پر بیٹھے۔

معاً یحییٰ بن اکثم بولا۔ ''اے امیر المومنین! یہاں آپ اور مدعی دونوں برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔''

مامون نے کچھ برا نہ مانا بلکہ اس کے صلے میں یحییٰ بن اکثم کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔

میرے زیر اثر ایک آمر نے دوسرے عامر کو تیس ہزار دینار ادا کر دیئے۔

اکثر و بیشتر میرے زیر اثر رہنے سے مامون کا رحم و انصاف اعتدال سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ مامون نے اپنے ذاتی حقوق کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا۔

بدزبان شعراء ہجوئیں لکھتے تھے۔ مامون ان سے کچھ نہ کہتا تھا۔ ہجو گوئی میں اس زمانے کے ایک مشہور شاعر دعبل نے ہجو لکھی تو مامون کی نسبت لکھا۔ ''میری قوم نے تیرے نام کو جو بالکل بجھا ہوا تھا شہرت دے دی اور تجھ کو پستی سے نکال کر بلندی پر بٹھا دیا۔'' (عربی اشعار کا ترجمہ)

مامون نے اپنے ایک غلام کی زبانی یہ ہجو سنی تو بولا۔ ''اے یعقوب! مجھے یہ بتاؤ دعبل کو ایسی غلط بات کہتے ذرا شرم نہ آئی۔ میں گمنام کس دن تھا! بیدار ہوا تو خلافت کی آغوش میں، پرورش بھی پائی تو یہیں!''

غلام یعقوب کو ہاں میں ہاں تو ملانی تھی۔ سو اس نے ایسا ہی کیا۔ لیکن مامون نے دعبل کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

اس کے چند روز بعد ابراہیم شاکی ہوا کہ دعبل کی بدزبانیاں حد سے گزر گئی ہیں۔ میری

ایسی ہجو لکھی ہے جو درگزر کے قابل نہیں۔ ابراہیم نے اپنے بھتیجے مامون کو اس ہجو کے کچھ اشعار سنائے۔ (یہ وہی ہارون الرشید کا بھائی ہے جو خلیفہ وقت بن گیا تھا) "دعبل نے میری ہجو اس سے بڑھ کر لکھی ہے۔" میں نے درگزر سے کام لیا۔ سو چچا کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔ مامون نے کہا۔

بظاہر مامون کی ہمدردی میں ابوسعید مخزومی نے کئی بار اسے بھڑکایا کہ آخر درگزر کہاں تک؟

مامون کہنے لگا۔ "اچھا اگر بدلہ ہی لینا ہے تو پھر اے ابوسعید تو بھی اس کی ہجو لکھ مگر صرف یہ کہ دعبل لوگوں کی ہجو میں جو کچھ کہتا ہے قطعی غلط ہے۔"

ابوسعید کو خاموش ہونا پڑا۔

عبارت آرائی میں بھی مامون کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کا نمونہ مامون کی تحریریں ہیں۔ (ترجمہ)

شریف کی پہچان ہے کہ اپنے سے بڑے کو دبائے اور چھوٹے سے خوب دب جائے۔ تم کن میں سے ہو؟ (ابن ہشام کو لکھا)

اے ابوعباد! حق اور باطل میں کچھ نہیں ہے۔ (ایک عرضی حاشیہ)

اے حمید! مجھ سے قربت پر نہ پھول! حق میں تو اور کمینہ غلام دونوں برابر ہیں۔ (ایک ہدایت)

تیرا بے تمیز اور درشت خو ہونا تو میں نے گوارا کیا لیکن رعایا پر ظلم کرنا میں برداشت نہیں کر سکتا۔ (ابن الفضل طوسی کو لکھا جانے والا ایک پیغام)

اے عمرو! اپنی دولت کو عدل سے آباد کر ظلم تو اس کو ڈھا دینے والا ہے (عمرو بن مسعد کے لئے ایک حکم)

مامون عہد کے مترجم، زبان دان ہونے کے علاوہ حکیم اور اپنے فن میں مجتہد الفن بھی تھے۔ یعقوب کندی جو مامون کے دربار کا بڑا مترجم تھا، مسلمانوں میں ارسطو کا ہم پلہ تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ کندی کا درجہ ایک فلسفی کا تھا۔ وہ طب، حساب، منطق، موسیقی، ہندسہ، طبائع، اعداد، نجوم وغیرہ کا بڑا ماہر تھا۔ ویسے اسے بھی میں مامون ہی کی خوبیوں میں گنتی ہوں کہ اس نے اہل کمال کو بغداد میں جمع کر لیا تھا۔ مامون کے دربار کا

دوسرا مترجم حسین بن اسحٰق تھا۔ اس کی نشوونما مامون کے عہد ہی میں ہوئی۔ ترجمے کا یہ نامور آدمی تھا۔ خلیل بن احمد بصری ایک اور بڑا نام ہے جو لغات عرب کا پہلا مدون اور فن عروض کا موجد ہے۔

خلیل بن احمد نے یونانی زبان بھی سیکھی۔ یہ ہارون کے زمانے میں رفتہ رفتہ رسائی حاصل کرتا ہوا دربار خلافت تک پہنچا۔ مامون نے اسے ترجمے کے کام پر مامور کیا اور زرد مال سے مالا مال کر دیا۔ مشاہرے (تنخواہ) کے علاوہ صلہ و انعامات کی کوئی حد نہ تھی۔ سارے بغداد میں یہ بات مشہور تھی اور تمام حدود سلطنت میں بھی کہ مامون خود ہر کتاب کے ترجمے کے عوض سونا تول کر دیتا ہے۔ دراصل آدم زاد جس بات کو چاہیں مشہور کر دیں ان کا کیا جاتا ہے)

یونان کا سارا علم ترجموں ہی کے ذریعے عربی زبان میں منتقل ہوا۔ علم کے زور پر ہی ان مسلمان حکمرانوں کو عزت ملی اور ان کے نام کا ڈنکا بجا۔ ساری دنیا پر یہ چھا گئے۔ یونان نے فلسفے کو بڑی اہمیت دی۔ مامون جس قدر فلسفے کے دلچسپ مسائل سے آگاہ ہوتا گیا اس کا شوق اور بڑھتا گیا۔ یوں وہ تحقیق و تجربے پر مائل ہوا۔

علم جبر و مقابلہ پر جو پہلی کتاب لکھی گئی وہ مامونی عہد کے ایک مشہور عالم محمد بن موسیٰ خوارزمی نے مامون کی فرمائش پر لکھی۔

دولت اسلامی میں سب سے پہلے جس نے رسد خانے کی بنیاد ڈالی اور بیش بہا آلات رصدیہ مہیا کئے وہ ہارون الرشید کا بیٹا مامون الرشید ہے، اس کام کے لئے مامون نے اپنے دربار میں موجود عالموں کے علاوہ پوری سلطنت سے ہند و سندھ سے کے ماہرین فن طلب کئے۔ ۲۱۴ ہجری میں بہ مقام شماسیہ مامون کے حکم پر عظیم الشان رسد گاہ قائم کی گئی۔

مامون کے زمانے تک ستاروں کے علم (علم فلکیات) پر جو کام ہوا تھا اس کا سہرا محمد بن ابراہیم کے سر تھا، اس کی زیج پر اعتماد کیا جاتا تھا مگر نئی تحقیقات کے بعد مامون کے دربار سے وابستہ ایک بڑے منجم ابوجعفر نے جو زیج ترتیب دی اس کی شہرت و مقبولیت نے اوروں کا نام مٹا دیا۔ یہ زیج دنیا کی تمام مستند زیجوں سے ماخوذ تھی۔ (زیج: نجومیوں کی کتاب جس میں سیاروں کی حرکت، ستاروں کے نقشوں میں لکھی ہوتی ہے۔ مصنف)

فرا کو علم نحو (اعراب کا علم) کے ارکان میں شامل کیا گیا ہے۔ مامون نے اسے حکم دیا

کہ نحو پر ایک جامع کتاب لکھے۔ یہ ضرورت اسے یوں محسوس ہوئی کہ غیر عرب بھی عربی زبان کا درست تلفظ کر سکیں۔ اس غرض سے قصر خلافت میں فرا کی سکونت کا بندوبست کیا گیا۔ اس کے لئے خدام ملازم مقرر ہوئے تاکہ اسے کسی ضرورت کے لئے کچھ کہنا نہ پڑے۔ صرف نماز کے وقت آدمی اطلاع کرتا تھا کہ وقت ہو گیا۔ بہت سے کاتب اور نقل نویس معین ہوئے کہ جو کچھ فرا بتاتا جائے وہ لکھتے جائیں۔ نحو کی اس کتاب کا نام "الحدود" ہے۔ اس کے بعد فرا نے کتاب المعانی تقریروں کے ذریعے لکھوائی۔ علم نحو سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد خاصی تھی، جو فرا کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ میں نے صرف قاضیوں (منصفوں) کو شمار کیا تو ان کی تعداد ایک سو کے قریب تھی۔

مامون اہل علم کی قدر کرتا کیونکہ وہ خود صاحب علم تھا۔ مامون کا پہلا استاد یزیدی تھا۔ کتاب النوادر اسی کی تصنیف ہے۔ خلیل بن احمد بصری بھی اس کے استادوں میں رہا، کسائی کا شمار علم نحو کے مجتہدین میں ہوتا ہے۔ وہ بھی مامون کے اہم استادوں میں ہے۔

سخن وری کے لحاظ سے مامون ایک بلند رتبہ شاعر تھا۔ جی چاہتا ہے کہ میں اس کے کچھ اور منتخب شعر سناتی چلوں مگر پھر کبھی سہی۔ اس وقت مامون کے کچھ اقوال سن لیں۔ یہ اقوال زریں ہیں یا غیر زریں، اس سے مجھے کوئی بحث نہیں۔

میں ٹھہری ایک جن زادی، آدم زادوں پر حکم لگانے کا بھلا مجھے کیا حق! مامون سے میں نے جو سنا لکھ دیا، وہ کہتا ہے۔

"میں دلیل سے غالب ہونے کی بہ نسبت زور (طاقت) سے غالب ہونے کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔"

یہ بھی مامون ہی کا قول ہے۔ "آدمی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن کی ہر وقت ضرورت ہے، بعض دوا کی طرح ہیں کہ خاص وقتوں میں ان کی ضرورت پڑتی ہے اور بعض تو ایسے ہیں کہ بیماری کے مانند کسی حال میں پسند نہیں۔"

مامون کا ایک اور قول۔ "حکمران کو عاجزی نازیبا ہے اور اس سے زیادہ یہ نازیبا ہے کہ قاضی (منصف) فریق کی تسکین نہ کر سکے، گھبرا جائے۔ ان سب سے زیادہ ناموزوں بوڑھوں کی ظرافت، جوانوں کی کاہلی اور سپاہیوں کی بزدلی ہے۔"

ایک بار میں نے مامون سے یہ الفاظ سنے۔ "سب سے عمدہ مجلس وہ ہے جس میں

لوگوں کے حالات سے واقفیت ہو۔"

مامون شطرنج کا بڑا شائق تھا۔ اسی بناء پر وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ "اتنی بڑی سلطنت کا بندوبست کرتا ہوں مگر دو بالشت کا انتظام نہیں کر سکتا۔"

اس کے برعکس وہ علمی محافل کا انتظام بہت اچھی طرح کرتا، علم اور عالموں سے اسے خصوصی شغف تھا۔ یوں تو مامون کی عام مجلسیں بھی علمی تذکروں سے خالی نہیں ہوتی تھیں، لیکن ایک دن مناظرہ کے لئے مخصوص تھا۔

صبح کچھ دن چڑھے ہر مذہب و ملت کے علماء اور ماہرین فن دربار میں حاضر ہوتے۔ ایک پر تکلف ایوان پہلے سے مرتب رہتا۔ سب بے تکلفی سے وہاں بیٹھ جاتے۔ خادم ان کی خدمت کو مستعد رہتے اور کہتے، بے تکلفی سے تشریف رکھئے اور چاہیں تو موزے بھی اتار ڈالئے۔ پھر دسترخوان بچھایا جاتا اور اس پر مختلف اقسام کے کھانے اور مشروبات رکھے جاتے۔ کھانے سے فارغ ہو کر جنہیں وضو کی حاجت ہوتی وضو کرتے، عود و لوبان کی انگیٹھیاں آتیں اور ہر طرف خوشبو ہی خوشبو پھیل جاتی۔

آنے والے خوب معطر ہو کر دارالمناظرہ میں حاضر ہوتے اور مامون کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھتے۔ اس کے بعد مناظرہ شروع ہو جاتا اور مامون خود ایک فریق بنتا۔ یہاں سب کو آزادانہ گفتگو کا حق تھا، یوں لگتا تھا کہ مجلس میں خلیفہ وقت موجود ہی نہیں۔ دوپہر تک یہ محفل جمی رہتی، زوال آفتاب کے بعد لوگوں کو پھر کھانا پیش کیا جاتا اور مدعو کئے جانے والے کھا پی کر رخصت ہوتے۔ ان محفلوں میں بعض اوقات اہل مناظرہ اعتدال کی حد سے گزر جاتے مگر مامون بڑے حلم و متانت سے سب کچھ برداشت کرتا۔

ایک دن ایک مجوسی المذہب سے مامون کی نہایت لطیف بحث ہوئی (مجوسی المذہب، پارسیوں یا آتش پرستوں ہی کو کہتے ہیں۔ یہ دو خداؤں پر یقین رکھتے ہیں یعنی یزداں اور اہرمن۔ یزداں خدا تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے نیز وہ فرشتہ جسے پارسیوں نے فاعل خیر مان رکھا ہے ان کے نزدیک اس سے کبھی شر نہیں ہوتا۔ یہ لوگ آفرینندۂ خیر کو یزداں اور آفرینندۂ شر کو اہرمن، یعنی شیطان کہتے ہیں اور اسی طرح آفرینندۂ نور کو یزداں، آفرینندۂ ظلمت کو شر مانتے ہیں۔ شعراء خدائے باطل کو اہرمن اور خدائے حق کو یزداں کہتے ہیں، (آفرینندہ کا مطلب پیدا کرنے والا ہے۔ مصنف)

مامون نے اس ثنوی المذہب سے پوچھا۔ ''انسان برا کام کرنے کے بعد شرمندہ ہو سکتا ہے؟''

ثنوی بولا۔ ''ہاں، کیوں نہیں؟''

''گناہ پر نادم ہونا اچھا ہے یا برا؟'' مامون نے دوسرا سوال کیا۔

''اچھا ہے۔'' ثنوی نے جواب دیا۔

''جو شخص نادم ہو، گناہ اس سے سرزد ہوا یا کسی دوسرے سے؟''

''اسی سے۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک شخص سے گناہ بھی ہوا اور ثواب بھی؟''

ثنوی گھبرا گیا اور کہا۔ ''نہیں، میں یہ کہوں گا کہ جو نادم ہوا اس نے گناہ نہیں کیا تھا۔''

''تو اس کو اپنے گناہ پر ندامت ہے یا دوسرے کو؟''

مامون کے اس سوال کا جواب ثنوی سے نہ بن پڑا اور وہ چپ ہو گیا۔ اس بحث کا مقصد خدائے برحق کی وحدانیت تھا۔

اسی مناظر کی محفل یا مجلس کا ایک اور آنکھوں دیکھا واقعہ مجھے یاد ہے جس سے مامون کی ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔

ہوا یہ کہ محفل جمی ہوئی تھی۔ چوبدار نے اطلاع کی کہ ایک اجنبی شخص دروازے پر کھڑا ہے اور حضور سے بحث کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔ مامون نے حکم دیا کہ بلا لو۔ اجنبی آیا تو اس کا حلیہ عجب تھا۔ جوتے ہاتھ میں اور پائینچے چڑھے ہوئے، لوگوں نے جہاں اپنے اپنے جوتے اتارے تھے وہیں سے وہ اجنبی چیخ کر بولا۔

''السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔''

مامون نے سلام کا جواب دیا اور اسے اجازت دی کہ قریب آ کر بیٹھے۔

اس اجنبی نے مامون سے سوال کیا۔ ''خلافت آپ نے بزور بازو حاصل کی ہے یا دنیا کے تمام مسلمانوں نے اتفاق رائے سے آپ کو اپنا خلیفہ منتخب کیا ہے؟''

مامون نے بلا توقف اس اجنبی کے سوال کا تفصیلی جواب دیا۔ ''میں نے خلافت نہ زور بازو سے حاصل کی، نہ اتفاق رائے سے۔ بات یہ ہے کہ مجھ سے پہلے جو حکمران وقت تھا، لوگ جبراً یا طوعاً اسکی اطاعت کرتے تھے۔ اس نے ولی عہدی کے لئے عام بیعت کر لی۔

اس وقت جو لوگ اہم مانے جاتے تھے، ان سب نے معاہدہ بیعت پر دستخط کئے۔ اس کے انتقال پر میں نے خیال کیا، جس پر دنیا کے تمام مسلمانوں کا اتفاق ہو، وہ خلیفہ بنے۔ لیکن ایسا شخص نہ مل سکا۔ ادھر ملک کے نظم ونسق کے لئے کسی کی ضرورت تھی ورنہ امن وامان میں خلل آتا اور عظمت اسلامی کے تمام اجزا متفرق ہو جاتے۔ سو یوں مجبوراً سردست یہ بار میں نے اپنے سر لیا اور منتظر بیٹھا ہوں کہ جب دنیا کے تمام مسلمان اتفاق رائے سے ایک شخص کا انتخاب کر لیں تو میں عنان حکومت اس کے ہاتھ میں دے کر الگ ہو جاؤں۔ میں تم کو اپنا وکیل کرتا ہوں، ایسا موقع ہو تو فوراً مجھے خبر کرنا۔''

اس پر وہ اجنبی اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

ایک اور واقعہ قابل بیان ہے جس سے معلوم ہوتا ہے مامون کس قدر انصاف پسند تھا۔

قصر خلافت کے عقب میں وسیع وعریض باغ تھا۔ مامون کبھی تنہا کبھی کسی دوسرے آدمی کے ساتھ وہاں ٹہلا کرتا۔ محافظ دستے کے سپاہیوں کو قریب آنے کی اجازت نہ ہوتی۔ اپنے مزاج کے مطابق مامون کھلی فضا کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ ایک روز قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم سے گفتگو کرتے ہوئے مامون اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''چلیں باقی گفتگو باغ میں ہو گی۔''

''بہتر ہے اے امیر المومنین!'' قاضی یحییٰ بھی کھڑا ہو گیا۔

یہ شام کا وقت تھا مگر سورج ابھی پوری طرح غروب نہ ہوا تھا۔

باغ میں ٹہلتے ہوئے مامون نے قاضی یحییٰ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جاتے ہوئے دھوپ کا رخ قاضی یحییٰ کی طرف تھا۔ ادھر سے واپس آتے وقت مامون کی طرف ہو گیا۔ قاضی یحییٰ نے چاہا کہ خود کو دھوپ ہو جائے اور مامون سائے میں رہے۔

مامون کو یہ گوارا نہ ہوا اور کہا۔ ''یہ انصاف سے بالکل بعید ہے۔ پہلے میں سائے میں تھا، اب واپسی کے وقت تمہارا حق ہے۔''

ابتدا ہی سے عارج کو مامون پسند نہ تھا۔ وہ کوئی نہ کوئی موقع اب بھی ایسا نکال ہی لیتا کہ مامون کی برائی کر سکے۔

اس روز عارج میرے ساتھ بغداد سے نکل کر قریبی آبادی فلوجہ سے متصل صحرا میں آ گیا۔ میں اسے دانستہ چڑانے کے لئے مامون کی تعریف کرنے لگی۔

"ہاں مجھے بھی خبر ہے اے دینار! کہ مامون کتنا ذہین، انصاف پسند، نیک اور پرہیزگار ہے۔" عارج کی آواز میں طنز تھا۔

"پرہیزگار تو ہے مامون!" میں زور دے کر بولی۔

"اے دینار! کیا تو چاہتی ہے کہ میں اس آدم زاد کی بزم عیش کا نقشہ کھینچوں۔ تو نے اگر مامون کو قریب سے دیکھا ہے تو میں بھی چشم دید واقعات بیان کر سکتا ہوں۔"

"میں نے تجھے کبھی نہیں روکا اے عارج! بیان کر۔"

"جیسے تجھے کچھ خبر نہیں۔" عارج بھی مجھے تپانے پر اتر آیا۔

"کیوں، کہاں گئی مامون کی بزم عیش؟...... تجھے معلوم کچھ ہوتا نہیں یوں ہی اِدھر اُدھر کی اُڑاتا ہے۔"

"چل ابھی میرے ساتھ۔ تجھے دکھاتا ہوں کہ تیرا چہیتا آدم زاد مامون اس وقت کیا کر رہا ہے۔"

"تو یہ بات اس طرح کہہ رہا ہے جیسے مامون اس وقت کوئی گناہ کر رہا ہو۔" میں بولی اور عارج کے ہمراہ بغداد کی طرف چل دی۔

آدم زادوں اور ہم جنات کے درمیان نمایاں فرق یہ ہے کہ ہم جب اور جہاں چاہیں پہنچ سکتے ہیں۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ میں چشم زدن میں فلوجہ سے بغداد پہنچ گئی۔ عارج نے مامون کے بارے میں جو کچھ کہا مجھے بھی معلوم تھا۔ میرے لئے مامون کی "بزم عیش" کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ مجھے بغداد لوٹنا تھا۔ عارج کا کوئی بھروسہ نہیں تھا کہ اس صحرا میں رات سے صبح کر دیتا یا پھر عراق سے کہیں دور چلنے کو کہنے لگتا۔ میں اسے "چکر" دے کر بغداد لے آئی تھی، قصر خلافت کا رخ کرنا پڑا۔

قصر خلافت کا وہ حصہ کہ جس میں مامون اور اس کے خاندان والے رہتے تھے خاصا وسیع و عریض تھا۔ اس میں اب ایسے خلوت کدے بھی تھے جہاں پرندہ پر نہ مار سکے، حکمران وقت کی بات اور ہے۔ یہ خلوت کدے انہی کے لئے تو تھے۔

ان میں سے ایک خلوت کدہ اس وقت آباد تھا۔ عارج مجھے وہیں لے آیا اور اپنی "زبان دانی" کے جوہر دکھانے لگا۔ اس کی آواز سننے کی صرف میں ہی اہل تھی۔ "دیکھ اے دینار! یہ ہے تیرے مامون کی بزم عیش! بے تکلف اور رنگین طبع احباب جمع ہیں۔ پری پیکر

نازنینوں کا جھرمٹ ہے۔ دور شراب چل رہا ہے، ساز چھیڑا جا رہا ہے، گل اندام کنیزیں نغمہ سرا ہیں اور یاران باصفا بدمست ہوئے جا رہے ہیں، دور ہا مامون جو...."

"ارے واہ!" میں بول اٹھی۔ "تیرا کوئی جواب ہی نہیں۔ لگتا ہے تو ابھی سیدھا خراسان سے آ رہا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟ کیا میں بے وقوف ہوں؟" عارج بولا۔

"اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔"

"میں جا رہا ہوں اے دینار۔ روکنا ہے تو روک لے۔"

مجھے ہنسی آ گئی اور عارج کو جانے سے روک لیا۔

دراصل خود آدم زادوں نے شخصیت پرستی کا آغاز کیا اور اس کے لئے مذہب کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ ہر مسلمان حکمران کو انہوں نے "آدمی" کی بجائے گویا "فرشتہ" بنا دیا، آدمی کو آدمی نہ رہنے دیا۔ کتنا بڑا ظلم ہے؟ مگر یہ ظلم ہر عہد میں کیا گیا، مامون بھی ایک آدمی ہی تھا، کوئی آسمان سے نہیں اترا تھا۔

اگر ہم مامون کے زمانے پر نظر کریں تو صرف وہی نہیں دیگر آدم زاد بھی اسی رنگ میں ڈوبے دکھائی دیں گے۔ امن، اطمینان زر و مال، مسلمانوں کو سب کچھ میسر تھا۔ پھر وہ زاہد خشک کیوں بن جاتے۔ لونڈیوں کی عام اجازت نے عیاشی کے سب حوصلے پورے کر دیئے تھے۔ نغمہ و سرود تو علمی قابلیت کے بڑے جزو سمجھے جاتے تھے۔

بنو امیہ اور عباسیہ میں ایک بھی خلیفہ ایسا نہیں گزرا جو اس فن میں مناسب درس گاہ نہ رکھتا ہو۔ بڑے بڑے مذہبی علماء بھی اس چیز سے خالی نہ تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز بہت سے سُروں کے موجد ہیں۔ مجھے اپنے باپ اخضم سے یہ بات سن کر حیرت ہوئی تھی۔

(صاحب آغانی نے جہاں خلفاء کی ایجادات موسیقی کا ذکر کیا، حضرت عمر بن عبدالعزیز کا نام بھی لیا ہے۔ مصنف)

مامون کے دربار میں مغنیوں کا ایک بڑا گروہ موجود تھا جنہوں نے علمی اصول و قواعد کے موافق موسیقی کو معراج کمال تک پہنچایا۔

میں موصل کے ابراہیم کا ذکر کر چکی ہوں۔ خلیفہ ہارون الرشید نے اس کا ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ وہ موسیقی کا مشہور استاد تھا۔ اسحٰق اسی کا بیٹا، مامون کے زمانے میں نام ور

ہوا۔ اس نے ادب، انساب، روایات، فقہ، نحو میں مجتہدانہ کمال حاصل کیا۔ (مجتہدانہ کا مطلب کسی معاملے میں اجتہاد کرنا ہے، اجتہاد کے معنی (1) جہد، کوشش، سعی (2) غور و فکر کر کے کوئی نئی بات نکالنا (3) کسی مذہبی امر میں تاویلات اور ذاتی تحقیقات سے کام لینا۔ مصنف) یہ عبرت کا مقام ہے کہ وہ محض موسیقی کی وجہ سے دیگر تمام معزز خطابوں سے محروم کر دیا گیا۔ اسے عالم ہونے کے باوجود (مغنی) کا حقیر لقب ملا جس کی شہرت کو وہ کسی طرح دبا نہ سکا۔ وہ اس لقب سے نفرت کرتا تھا مگر قبول عام پر کس کا زور ہے!

مامون کو بھی اس بات کا افسوس رہا کہ اسحٰق منصب قضا (عدلیہ) کے قابل تھا مگر شہرت غنا نے اسے اس بلند درجے تک نہ پہنچنے دیا۔ اس کے باوجود مامون کو اسحٰق کی عظمت کا اتنا پاس تھا کہ دربار میں اسحٰق کو ندیموں کے زمرے میں جگہ ملی تھی۔ اس سے زیادہ یہ اعزاز حاصل تھا کہ اسے دربار میں فقہا کا لباس پہن کر آنے کی اجازت تھی۔ وہ اس پر بھی قانع نہ ہوا اور مامون سے درخواست کی کہ جمعے کے دن مقصورہ میں داخل ہو سکے (بغداد کی جامع مسجد میں جہاں خلیفہ نماز ادا کرتا تھا، وہ ایک مخصوص حصہ تھا۔ اسے عربی میں مقصورہ کہتے ہیں۔ مقصورہ کا مطلب چھوٹا حجرہ، چھوٹی چوکی اور مسجد میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔ مصنف)

اسحٰق کی یہ درخواست مامون نے قبول نہیں کی اور مسکرا کر بولا۔ "اسحٰق! یہ ممکن نہیں، لیکن میں یہ درخواست لاکھ درہم میں خرید لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر حکم دیا، لاکھ درہم اس کے گھر پہنچا دیئے جائیں۔

مرد مغنیوں کے علاوہ ایک طائفہ بھی تھا جس سے مامون کی محفلیں گرم رہتیں۔ جنگوں میں جو حسین لڑکیاں پکڑی جاتیں، دلال انہیں سستے داموں خرید لیتے۔ انہیں موسیقی، شاعری، ظرافت، ادب، خوش نویسی اور حاضر جوابی کی تعلیم دی جاتی۔ ان فنون میں کامل ہو کر وہ گراں قیمت پر بازار میں بکتیں۔

مامون کے شبستان عیش میں ان حور وشوں کا ایک جھرمٹ رہتا۔ ان کی خریداری اور مزید تربیت سے خزانے پر بڑا بوجھ پڑتا۔ یہی رقم اگر مملکت کے غریبوں، ناداروں، یتیموں، بیواؤں وغیرہ پر خرچ کی جاتی تو کتنا اچھا ہوتا! میں سوچتی اور سوچتی رہ جاتی کہ اے دینار تو ایک جن زادی ہے، آدم زادوں کے معاملات میں زیادہ مداخلت نہ کر ورنہ کوئی سر پھرا آدم

زاد تجھے بھی اپنی کنیز بنا سکتا ہے۔

ایک بار ایک کنیز بکنے آئی جس کے فضل و کمال، فصاحت، ادبیت اور سخن وری کی قیمت بیچنے والے نے دو ہزار دینار طلب کی۔ خریدار مامون تھا، اس نے کہا۔ "ایک شعر پڑھتا ہوں، اگر یہ لونڈی فی البدیہہ اس کے جواب میں دوسرا شعر کہے تو اصل قیمت سے زیادہ ادا کروں گا۔"

کنیز اس امتحان پر پوری اتری اور اسے مامون نے ڈھائی ہزار دینار میں خرید لیا۔

عریب نامی ایک کنیز علم و فن میں یکتا تھی اور لاکھ درہم اس کی خریداری میں صرف کئے گئے تھے۔ مامون کی محبوبہ خاص تھی۔ اس نے کئی راگ ایجاد کئے، کسی بات پر خفا ہو کر ایک مرتبہ اس عریب نے مامون سے ملنا چھوڑ دیا۔ قاضی احمد بن ابی داؤد سے مامون نے التجا کی آپ بیچ میں پڑ کر صلح کرا دیجئے۔

جب عریب نے یہ سنا تو پردے سے بول اٹھی، اس موقع پر عریب نے جو شعر پڑھا اس کا ترجمہ یہ ہے:

وصال میں ہم ہجر کو ملا دیتے ہیں، لیکن صلح کرانے کے لئے ہمارے بیچ میں کوئی غیر شخص نہیں پڑ سکتا۔

مامون کی ایک اور مشہور کنیز کا نام بذل تھا۔ وہ فن موسیقی میں کمال رکھتی تھی، اسے استادوں کا درجہ حاصل تھا۔

خود مامون سخن سنج اور موسیقی کا بڑا ماہر تھا تو یاران محفل بھی عموماً نازک خیال اور نکتہ شناس تھے۔ بات بات پر شاعرانہ لطیفے ایجاد ہوتے۔ کبھی موسیقی پر بحث چھڑ جاتی، کسی وقت مامون کے فی البدیہہ مصرعوں یا شعروں پر شعراء کی طبع آزمائیوں کا امتحان ہوتا۔ ایک دن بزم عیش آراستہ تھی۔ بادہ و جام کا دورہ تھا، بیس عیسائی کنیزیں دیبائے رومی کے لباس پہنے، گردنوں میں سونے کی صلیبیں، کمر میں زریں زنار، گل دستے لئے ہوئے بزم میں جلوہ آرا تھیں۔ یہ سماں ایسا نہ تھا کہ مامون دل پر قابو رکھ سکتا، بے ساختہ اس کی زبان سے چند اشعار نکلے۔

"سبحان اللہ...... سبحان اللہ!" حاضرین محفل نے داد دی۔

مامون نے ایک مغنی احمد بن صدقہ کو طلب کیا اور جو شعر کہے تھے انہیں گانے کی فرمائش

کی۔

احمد کی نغمہ سرائی کے ساتھ کنیزیں رقص کرنے کھڑی ہوگئیں۔ ان کی مخمور آنکھیں اور جام شراب مامون کو بدمست کرنے میں یکساں کام دے رہے تھے۔ وہ بالکل سرشار ہوگیا اور حکم دیا کہ ان نازنینوں پر تین ہزار دینار سرخ نچھاور کیے جائیں۔ مامون کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔

میں بڑی حد تک مامون کے زمانے میں جو عہدے تھے، بیان کر چکی ہوں۔ غالباً ایک عہدے کا ذکر ابھی نہیں آیا۔ یہ عہدہ عدلیہ سے متعلق تھا، اس عہدے پر فائز آدمی کو محتسب کہتے تھے جس کا مطلب حساب کرنے والا ہے۔ محتسب اس حاکم کو بھی کہتے ہیں جو خلاف شرع باتوں سے روکے، شرع کے معنی راہ راست ہیں، وہ راہ جس پر چلنے کا حکم حق تعالیٰ نے دیا۔ سو محتسب کا کام آدمیوں کو سیدھی راہ پر چلانا تھا۔

محتسب کو ان باتوں کی خبر گیری رکھنی پڑتی تھی جو اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کہلائیں، مثلاً بازاروں اور مجمعوں میں کوئی امر خلاف شرع نہ ہونے پائے۔ جانوروں پر اُن کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ لادا جائے۔ کشتی میں سوار زیادہ نہ ہونے پائیں۔ راستے میں اگر قدیم و بوسیدہ مکان ہوں اور ان کے کسی بھی وقت گرنے کا اندیشہ ہو تو مالکان سے کہہ کر ایسے مکانوں کو گروا دے۔ جو معلمین لڑکوں پر زیادہ سختی کرتے ہوں، ان کو سزا دے، کوئی شخص ترازو یا پیمانہ وزن سے کم نہ رکھنے پائے، محتسب کے ساتھ بہت سے سرکاری پیادے ہوتے ہیں، وہ بازاروں اور گلی کوچوں میں گشت کرتا رہتا۔ اس کی جو ذمے داری تھی وہ پوری کرتا، لوگوں کو عمل کرنے پر بھی مجبور کرتا، خود وہ بھی باعمل آدمی ہوتا اس بندوبست کو بغداد یا عراق کے شہروں تک ہی نہیں رکھا گیا بلکہ پوری مملکت میں یہی بندوبست تھا، عدل اس تمام بندوبست کی بنیاد تھا۔ قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم سے عمال خوف کھاتے۔

قاضی یحییٰ کے چہرے ہی سے درشتی و سخت گیری کا پتہ چلتا تھا، اس آدم زاد کی تقرری میرے ہی سامنے ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے قاضی بنوانے میں بھی مجھ جن زادی کا ہاتھ تھا ورنہ مامون شاید ایسا نہ کرتا۔

ہوا یہ کہ مامون نے ایک خالی شدہ عہدۂ قضا پر کسی کو مقرر کرنا چاہا۔ امیدواروں میں یحییٰ بن اکثم بھی تھا، مامون نے اسے دیکھا تو اس کے چہرے سے حقارت جھلکنے لگی۔ میں

اس عرصے میں یحییٰ کے دماغ کو ٹٹول چکی تھی۔ مجھے وہ لائق آدمی لگا۔ میں نے سوچا انصاف اور منصب لازم و ملزوم ہیں، اس آدم زاد کو اگر یہ عہدہ مل گیا تو خلق خدا کو فیض پہنچے گا۔

یحییٰ بن اکثم میرے زیر اثر بلا جھجک بولا۔ ''اے امیر المومنین! اگر میری صورت سے غرض ہے تو خیر ورنہ لیاقت کا حال امتحان سے معلوم ہو سکتا ہے۔''

مامون نے بطور امتحان پوچھا۔ ''ایک میت نے والدین اور دو بیٹیاں چھوڑیں، پھر ایک بیٹی مری اور وہی پہلے ورثا، باقی رہے۔ ترکہ کیوں کر تقسیم ہوگا؟''

یحییٰ نے کہا۔ ''میت مرد ہے یا عورت؟''

مامون اس سوال ہی سے سمجھ گیا کہ یحییٰ نے اصل مسئلہ سمجھ لیا ہے۔ یوں یحییٰ کا تقرر ہوا، پھر وہ اپنی لیاقت کے بل پر تیزی سے ترقی کرتا گیا۔ مامون 204 ہجری میں بغداد پہنچا اور اسی برس یحییٰ بن اکثم صرف قاضی سے قاضی القضاۃ بنا دیا گیا۔

اس بلند منصب پر یکے بعد دیگرے دو آدمی ممتاز ہوئے یحییٰ بن اکثم اور احمد بن ابی داؤد۔ حکومت کی عزم و جاہ کے ساتھ ان دونوں کو مذہبی پیشوا بھی تسلیم کیا گیا۔ ان کی جلالت و شان کے لئے یہ کافی ہے کہ امام بخاری و ترمذی فن حدیث میں ان کے شاگرد تھے۔ قاضی یحییٰ کے ذاتی کمال اور سیاسی لیاقت نے اسے وزیر مملکت کا ہم پلہ بنا دیا تھا۔ دفتر وزارت کے تمام کاغذات پہلے یحییٰ کی نظر سے گزرتے تھے تب سند قبول پاتے تھے۔

جیسا کہ پہلے بھی میں کہہ چکی ہوں، آدمی کے اندر خیر و شر کی پیکار جاری رہتی ہے، اگر ایسا نہ ہو تو وہ آدمی ہی نہ رہے، سو قاضی یحییٰ بھی آدمی ہی تھا، اسی بنا پر اسے حُسن پرستی کا بھی چسکا تھا۔

ایک بار مامون نے امتحاناً چند خوبصورت اور پری پیکر غلاموں کو حکم دیا کہ جب میں اٹھ جاؤں تو تم لوگ قاضی صاحب کو چھیڑو۔ مامون چلا گیا تو غلام شوخیاں کرنے لگے۔ قاضی یحییٰ نے ان کی طرف حسرت آمیز نگاہ سے دیکھا اور کہا۔ ''ظالمو! تم نہ ہوتے تو ہم لوگ پکے مسلمان ہوتے۔''

احمد بن داؤد کو یحییٰ بن اکثم کے بعد قاضی القضاۃ بنایا گیا، قاضی احمد کو یحییٰ ہی کے ذریعے مامون تک پہنچنا نصیب ہوا۔

ایک دن قاضی یحیٰی کے ہاں فقہا اور علماء کا مجمع تھا۔ احمد بن داؤد اس مجمع میں تھا۔ یہ آدم زاد بھی بہت ہی خوبیوں کا مالک تھا۔ ابھی نشست ختم نہیں ہوئی تھی کہ مامون کا ایک چوبدار آیا اور بولا۔ ''امیر المومنین نے قاضی صاحب کو مع تمام حاضرین دربار میں طلب کیا ہے۔''

یہ پہلا موقع تھا کہ احمد کو دربار میں رسائی ہوئی۔

مامون نے بلائے جانے والوں سے علمی بحثیں کیں۔ احمد کی باری آئی تو اس کی برجستہ گوئی اور طباعی سے متعجب ہو کر مامون نے نام و نسب پوچھا۔ جواب سننے پر مامون نے حکم دیا کہ آج سے علمی مجلسوں میں احمد بن داؤد کو بھی شریک کیا جائے۔

احمد بن داؤد کے قاضی القضاۃ بننے سے پہلے دربار کا یہ آئین تھا کہ جب تک خلیفہ خود کوئی بات نہ چھیڑے، کوئی شخص گفتگو کا مجاز نہیں۔ قاضی احمد وہ پہلا آدمی تھا جس نے اس جابرانہ قاعدے کو توڑا۔ سچ یہ ہے کہ احمد جس آزادی اور دلیری سے اپنے فرائض ادا کرتا، شخصی حکومت میں اس کی مثالیں کم ہیں۔

مامون بھی ایک شخص ہی تھا مگر ایسا شخص کہ قدرت نے اسے بڑی خوبیوں سے نوازا تھا۔ انہی خوبیوں میں سے اس کی ایک فطری خوبی حافظہ تھی۔ وہ جس سے ایک بار مل لیتا، اسے نہ بھولتا۔ جو بات وہ ایک مرتبہ سن لیتا اسے یاد ہو جاتی مگر کام کی بات! غیر ضروری معلومات کا خزانہ اس کا دماغ نہیں تھا۔ ایک مرتبہ شہر کوفہ میں مامون نے عبداللہ بن ادریس سے سو (100) حدیثوں کا سبق لیا اور فوراً ہی وہ احادیث استاد کو سنا دیں۔ عبداللہ بن ادریس اس کے حافظے کی قوت کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ قاضی یحیٰی نے ایک دن مامون کی بڑی تعریف کی۔

''انسان کو اس کی عقل کی وجہ سے فضیلت حاصل ہوتی ہے ورنہ گوشت پوست سب کے ہوتا ہے۔'' مامون نے کہا۔

اپنی اس فضیلت کی بناء پر جب تک وہ زندہ رہا، مملکت کو مثالی کہا گیا۔

یہ واقعہ 218 ہجری کا ہے کہ مامون نے اپنے بھائی ابو اسحٰق معتصم کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ وہ اس وقت بیمار تھا۔ بیماری کی حالت ہی میں وہ روم سے عراق کی طرف لوٹا تھا۔

18 رجب 218 ہجری کو مامون الرشید کی بڑی اور خوبصورت آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند

ہو گئیں۔ اس وقت وہ طرطوس میں تھا۔ مامون نے 48 سال کی عمر پائی۔ اس کی مدت خلافت بیس برس اور پانچ ماہ ہے۔ تدفین کے بعد اس کی قبر کی حفاظت کے لئے سو (100) محافظ مقرر کیے گئے۔

ہر چند کہ عارج نے مامون کی بڑی مخالفت کی لیکن جب وہ مرا تو عارج بھی اداس ہو گیا۔

میں بولی۔ ''تجھے کیا ہوا اے عارج؟ یہ آدم زاد تو اس طرح جلدی جلدی مرتے رہتے ہیں، اگر تو جن زادی ہو جائے کوئی آدم زاد ہوتا تو جانے کتنی دیر پہلے مر چکا ہوتا۔''

''اے دینار! بات جلدی یا لمبی عمر پا کر مرنے کی نہیں۔''

''پھر؟''

''مرنے سے کچھ نہیں ہوتا، جنات ہوں یا آدم زاد، دیکھنا یہ چاہیے کہ اس کے اعمال کیسے تھے۔'' عارج نے جواب دیا۔

''میں آج سے تیرا نام مولوی عارج اللہ رکھ دیتی ہوں۔'' میں ہنس کر بولی۔

مامون کی موت پر دکھ تو مجھے بھی ہوا لیکن اس دکھ کو میں نے جان کا آزار نہیں بنایا۔ عارج سے ہنسنے بولنے کا مقصد بھی یہی تھا۔

''اے عارج آجکل کہیں گھومنے پھرتے ہیں۔'' میں نے تجویز دی۔

''تو پھر طرطوس چلتے ہیں اے دینار!''

میں سمجھ گئی کہ عارج طرطوس ہی کیوں جانا چاہتا ہے۔ پھر بھی میں نے کچھ نہیں کہا۔

عارج اور میں، طرطوس ہی سے بغداد آئے تھے۔ طرطوس میں ہارون الرشید کو دفن کیا گیا اور اس کا بیٹا مامون، طرطوس میں ابدی نیند سویا۔ (اسی شہر طرطوس کو بعد میں طرسوس بھی کہا گیا۔ مصنف)

بہتر یہ ہو گا کہ میں ابو اسحٰق محمد معتصم کی خلافت کے ذکر سے پہلے وہ پس منظر بھی بیان کر دوں جو اس کے خلیفہ بننے اور مامون کے انتقال کے سبب ہوا۔

عارج کی تو عادت تھی کہ وہ کہیں ٹک کر نہ بیٹھتا۔ مجھے بھی وہ ''ورغلا'' کر بغداد سے باہر لے گیا۔ کہنے لگا۔ ''تیرا چہیتا مامون کیسا معرکے سر کر رہا ہے، دیکھتے ہیں۔''

ان دنوں مامون، شہنشاہ روم کی قوت کو قطعی طور پر توڑ دینا چاہتا تھا۔ بار بار وہ بدعہدی

کرتا۔ نوفل اس کا نام تھا، اسے سبق سکھانے کے لئے ہی مامون بغداد سے چلا تھا۔

شروع 218 ہجری میں مامون روم سے لوٹا۔ اس نے اپنے بیٹے عباس کو فوجی نقطہ نظر سے ایک نیا شہر بسانے کا حکم دیا تاکہ دشمن سہمے رہیں۔ اس شہر کا نام طوانہ رکھا گیا۔ عباس نے طوانہ کو ایک مربع میل میں آباد کیا۔ چاروں سمت ایک ایک دروازہ رکھا اور تکمیل کے بعد لوگوں کو مختلف شہروں سے لا کر یہاں آباد کیا۔ مامون کچھ روز یہاں رہا، پھر طرطوس کی طرف بڑھ گیا۔ ابواسحٰق محمد معتصم اس کے ساتھ تھا۔

طوس اور طرطوس کا درمیانی فاصلہ زیادہ نہیں (آج کے حساب سے تقریباً 20 میل ہو گا۔ مصنف) میں جب عارج کے ساتھ طرطوس پہنچی تو مامون اپنے بھائی معتصم کے ساتھ سیر کو گیا تھا، ہم دونوں اس کے پاس پہنچ گئے۔ شہری آبادی سے باہر ایک نہر بذندوں تھی، مامون ہمیں وہیں ملا۔ نہر کا پانی بہت صاف تھا اور چمکتی ہوئی لہروں کی حرکت عجیب دل فریب سماں دکھا رہی تھی۔ دونوں بھائی مامون و معتصم ایک کنارے زمین پر بیٹھے تھے۔ محافظ دستے کے سپاہی وہاں سے دور تھے، انہیں قریب آنے کی اجازت نہ تھی۔ صرف ایک خادم سعد، مامون کے ساتھ تھا۔

مامون نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کیوں اے سعد، ایسا سرد اور صاف پانی تو نے کہیں اور بھی دیکھا ہے؟''

اس پر سعد نے تھوڑا سا پانی نہر سے لے کر پیا اور بولا۔ ''یہ پانی حقیقت میں بے نظیر ہے اے امیر المومنین!''

''اس پانی پر غذا کیا ہو؟''

''حضور خود اس سوال کا عمدہ جواب دے سکتے ہیں۔'' سعد نے کچھ کہنے سے گریز کیا۔ غالباً یہ سوچ کر کہ مامون کے دماغ میں جانے کیا ہو۔ اگر اس نے غلط جواب دیا تو خوامخواہ مصیبت گلے پڑ جائے گی۔

''ازاذ کی کھجوریں ہوں تو لطف آ جائے۔'' مامون بولا۔

اسی لمحے دور سے گھوڑے دوڑنے کی آواز آئی، مامون کے استفسار پر اشارے سے قریب بلانے کے بعد محافظ دستے کے نگران نے بتایا کہ ڈاک آئی ہے۔ مامون جہاں بھی ہوتا پابندی سے اور فوراً ڈاک اسے پہنچائی جاتی۔

''اے دینار! تو کہاں چلی؟'' عارج نے مجھے جاتے دیکھ کر پوچھا۔

''ابھی آئی۔'' میں نے جواب دیا۔

میں دوسرے ہی لمحے ازاذ پہنچ گئی اور وہاں سے کچھ کھجوریں لے آئی۔ جب مامون کی خدمت میں ڈاک پیش کی گئی تو اس کے ساتھ ازاذ کی کھجوریں بھی تھیں۔ کسی جن زادی کے لئے ہی یہ ممکن تھا کہ ایک آدم زاد کی آرزو پوری کر دے۔

''حیرت ہے اے امیر المومنین!'' ابو اسحاق محمد معتصم پہلی بار بولا۔ ''آپ نے ابھی فرمایا اور ابھی کھجوریں آ گئیں۔''

دونوں بھائیوں، سعد اور محافظ دستے کے سپاہیوں نے وہ کھجوریں بڑے شوق سے کھائیں اور نہر کا ٹھنڈا پانی پیا۔

مامون وہاں سے اٹھا تو اسے حرارت محسوس ہوئی۔

طرطوس کے قلعے میں مامون کا قیام تھا، عارج اور میں نے بھی اس قلعے میں عارضی سکونت اختیار کر لی۔

مرنے سے چند روز پہلے جب مامون کی زندگی سے بالکل مایوس ہو گئی تو پوری مملکت میں فرامین روانہ کئے، ان فرامین میں مامون نے اپنے بھائی ابو اسحٰق کو ولی عہد نامزد کیا، اگرچہ خلیفہ زادہ عباس بھی ولی عہد ہو سکتا تھا لیکن مصلحت وقت محبت پدری پر غالب آ گئی حالانکہ خود ہارون الرشید اپنی زندگی میں ابو اسحٰق کو خلافت کے آئندہ استحقاق سے محروم کر چکا تھا مگر مامون نے رفع شر کی خاطر ایسا نہ کیا۔ اسے اندازہ تو تھا کہ اقتدار کی چاہت رشتوں کی حرمت کا خیال نہیں رکھتی پھر بھی یہی مناسب جانا۔ اس کے سامنے ابو العباس سفاح کی مثال موجود تھی جس نے اپنے بھائی منصور کو ولی عہد بنایا۔ مامون کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ ہر معاملے میں اپنے اجداد اور بہ طور خاص خلیفہ منصور کا اتباع (پیروی) کرے۔ منصور اس کے لئے ایک مثالی تھا (بغداد شہر کی بنیاد رکھنے والا بھی منصور ہی تھا)

مامون نے اپنی موت سے پہلے تمام افسران فوج، علماء، قضاۃ اور اہل خاندان کو جمع کیا اور نہایت موثر الفاظ میں وصیت کی۔ یہ بھی خلیفہ منصور کی پیروی تھی، وہ بھی جب مرا تو بڑی پُراثر وصیت کی، وصیت یہ تھی:

مجھ کو اپنے گناہوں کا اقرار ہے، امید و بیم دونوں مجھ پر حاوی ہو رہے ہیں، لیکن جب

میں خدا کے عفو کا خیال کرتا ہوں تو امید کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے۔ میں جب مر جاؤں تو مجھ کو اچھی طرح غسل دو اور وضو کراؤ۔ کفن بھی اچھا ہو۔ پھر خدا کی حمد و ثنا پڑھ کر مجھ کو میت کی چارپائی پر لٹاؤ اور جہاں تک ممکن ہو تدفین میں جلدی کرو۔ جو شخص کبیر السن (زیادہ عمر کا) اور رشتے میں مجھ سے قریب تر ہو، وہ میری نماز جنازہ پڑھائے۔ قبر میں وہ شخص اتارے جس کا رشتہ مجھ سے زیادہ ہو اور مجھ سے محبت کرتا ہو۔ قبر میں میرا منہ قبلے کی طرف رہے اور سر نیز پاؤں پر سے کفن ہٹا دیا جائے۔ پھر قبر کو برابر کر کے لوگ چلے جائیں اور مجھ کو میرے اعمال کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ کیوں کہ تم سب لوگ مل کر بھی نہ مجھ کو کچھ آرام پہنچا سکتے ہو اور نہ مجھ سے کوئی تکلیف رفع کر سکتے ہو۔ ممکن ہو تو بھلائی سے میرا نام لو ورنہ چپ رہو۔ کیونکہ برا کہنے پر تمہارا بھی مواخذہ ہوگا۔ مجھ پر کوئی شخص چیخ کر نہ روئے۔ شاید میں بھی اس کے ساتھ مواخذے میں آؤں۔

تعریف کے قابل صرف خدا کی ذات ہے، جس نے سب کی قسمت میں مرنا لکھ دیا اور بقا میں خود یگانہ رہا۔ دیکھو میں کس اوج کا تاجدار تھا، مگر حکم الٰہی کے سامنے کچھ زور نہ چل سکا بلکہ حکومت و اقتدار نے میری آئندہ زندگی اور پرخطر کر دی۔ اے کاش عبداللہ (مامون کا اصل نام) نہ پیدا ہوتا، اے ابو اسحٰق! میرے سامنے اور میرے حال سے عبرت پذیر ہو۔ خدا نے خلافت کا طوق تیری گردن میں ڈالا ہے، تجھ کو اس کی طرح رہنا چاہئے جو مواخذہ الٰہی سے ہر وقت ڈرتا رہتا ہے، رعایا کی بھلائی کا جو کام ہو اسے تم سب کاموں پر مقدم رکھنا، زبردست، عاجزوں کو ستانے نہ پائیں، ضعیفوں سے ہمیشہ محبت اور آشتی کے ساتھ پیش آنا۔ جو لوگ تمہارے ساتھ ہیں ان کی خطاؤں سے اغماض کرنا۔ سب کے روزینے اور تنخواہیں بر... قرار...... ر...... رہیں۔''

میں محسوس کر چکی تھی کہ مامون سے بولا نہیں جا رہا اور اس پر نزع کا عالم طاری ہے۔ اس کے سرہانے ہی عارج اور میں کھڑے تھے۔ ظاہر ہے وہاں ہم جنات کی موجودگی کون محسوس کرتا، وہ سب دنیادار لوگ تھے۔ ولی عہد ابو اسحٰق سمیت ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جسے مامون کی موت کا انتظار نہ ہو۔ یہ آدم زاد ایسے ہی خود غرض ہوتے ہیں۔ خدا ان کی لالچی طبیعت سے جنات کو محفوظ رکھے۔

چند لمحے بعد مامون کی حالت قدرے سنبھلی، اس نے قرآن مجید کی کچھ آیتیں پڑھیں

کہ غش سا آ گیا۔ حاضرین میں سے کسی نے کلمہ توحید پڑھنے کو کہا۔

ایک نصرانی حکیم نے اس پر حیرت کا اظہار کیا۔ اس کا نام ابن ماسویہ تھا، (نصرانی عربی لفظ ہے، اس سے مراد وہ شخص ہے جو نصارا ہو یا مذہب عیسوی رکھتا ہو، (چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام قریہ ناصریہ میں پیدا ہونے کے سبب ناصری بھی تھا، اسی وجہ سے ان کی قوم اور امت کو نصرانی یا نصارا بھی کہتے ہیں۔ مصنف)

ابن ماسویہ اس فوجی افسر سے مخاطب ہوا جس نے کلمہ توحید پڑھنے کی تلقین کی تھی۔ نصرانی حکیم کہنے لگا۔ ''تم اپنی ہدایت رہنے دو۔''

اس نصرانی کے لہجے میں حقارت پر میں تپ گئی۔ عین ممکن تھا کہ میں اس متعصب آدم زاد کو کوئی سخت سزا دیتی کہ مامون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مامون ایک دم چونک پڑا۔ وہ اس قدر غضب ناک ہوا کہ اس کا جسم کانپنے لگا۔ چہرہ جو پہلے ہی سرخ تھا، مزید سرخ ہو گیا اور آنکھیں جیسے ابل پڑیں۔ یہ تمام کیفیات شدید غصے کی تھیں۔ اس نے چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر ابن ماسویہ کو پکڑ لے اور اس بدگمانی کی پوری سزا دے۔ مگر اعضا قابو میں نہ تھے، منہ سے مامون نے کچھ کہنا چاہا، زبان نے ساتھ نہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اسی حالت میں خدا نے مامون کی زبان کھول دی۔ وہ خدا کی طرف مخاطب ہوا اور کہا۔ ''اے وہ جس کی سلطنت کبھی نہ زائل ہو گی، اس پر رحم کر جس کی سلطنت زائل ہو رہی ہے۔'' انہی الفاظ کے ساتھ مامون کی آواز آنا بند ہو گئی۔

''اے دینارا! میں اس خبیث نصرانی حکیم ابن ماسویہ کو نہیں چھوڑوں گا'' عارج غصے میں بولا۔

کھیل ختم ہو چکا تھا۔ مامون کو اب کسی حکیم کی ضرورت نہیں تھی۔ سو ابن ماسویہ قلعے کے اس حصے سے نکل آیا۔ عارج اور میں اس کے تعاقب میں تھے۔ میں نے اس کے ذہن پر توجہ دی تو پتہ چلا وہ تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہے پھر اس کا ارادہ نئے خلیفہ ابو اسحٰق محمد معتصم پر ڈورے ڈالنے کا تھا، نصرانی قلعہ طرطوس میں جہاں معتصم تھا، وہاں آ گیا۔ حجرے میں کوئی اور نہ تھا۔

قلعے میں ہر طرف بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ ایسے میں بھلا کون نصرانی حکیم کی طرف توجہ دیتا۔

سعا میں بول اٹھی۔ ''اے ابن ماسویہ! کیا تو کلمہ توحید نہیں پڑھے گا؟'' اپنی غیر انسانی کھرکھراتی آواز اسے میں نے دانستہ سنائی۔

وہ اچھل پڑا، اس کے چہرے پر دہشت تھی۔ وہ چاروں طرف دیکھنے لگا۔

''ادھر دیکھ میری طرف! میں تجھے کلمہ پڑھواتی ہوں۔''

''ن...... نہیں!''

اسی لمحے عارج نے اپنے منہ سے خوف ناک آواز نکالی۔ نصرانی کا چہرہ سفید پڑنے لگا۔ میں بھی ایک خالی پیکر اپنا کر ظاہر ہو گئی۔ یہ پیکر ایک شیرنی کا تھا۔ نصرانی حکیم اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ زمین پر گرا ہوا میری ہی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھے جا رہا تھا۔

میں نے حملہ کرنے کے انداز میں اپنے خیالی پیکر کو سمیٹا اور گویا ابن ماسویہ پر چھلانگ لگا دی۔

نتیجہ یہ کہ شدید خوف کے سبب ابن ماسویہ کے دل کی حرکت خود ہی بند ہو گئی۔ ابن ماسویہ موت کی نیند سو گیا۔

عارج کو ساتھ لئے ہوئے میں طرطوس سے بغداد آ گئی۔

ہاں میں یہ بتانا بھول گئی کہ مامون سترہ بیٹوں کا باپ تھا۔ ان کے نام یہ ہیں:

''محمد اکبر، محمد اصغر، عباس، علی، حسن، اسماعیل، فضل، موسیٰ، ابراہیم، یعقوب، حسن، سلیمان، جعفر، اسحاق، احمد، ہارون، عیسیٰ، بیٹیاں دو، ام حبیب اور ام الفضل تھیں۔ بہتر ہے میں اس موقع کو غنیمت جان کر سلسان آدم زاد کے نئے خلیفہ ابو اسحٰق محمد معتصم کے بارے میں مختصر بتا دوں کہ وہ کون تھا۔ یہ ہارون کا منجھلا بیٹا تھا اور ایک ام الولد ماردہ کے بطن سے پیدا ہوا تھا جو شہر کوفہ کی رہنے والی تھی۔ (ام الولد اس لونڈی کو کہتے ہیں جس نے اپنے مالک کے نطفے سے کوئی اولاد جنی ہو۔ ایسی لونڈی اپنے مالک کی وفات کے بعد خود بخود آزاد ہو جاتی ہے۔ مصنف) حالانکہ ابو اسحٰق ہمت والا، قوی اور شجیع تھا لیکن اسے پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اسی بناء پر ہارون نے امین اور مامون کے بعد اسے اپنا ولی عہد نامزد نہیں کیا تھا بلکہ موتمن کی نامزدگی کی تھی۔ امین نے اپنے مختصر عہد خلافت میں مامون اور موتمن دونوں کو ولی عہدی سے خارج کر دیا تھا۔

مامون نے پہلے تو امام علی رضا کو اپنا ولی عہد نامزد کیا، جب امام علی رضا کا انتقال ہو گیا تو وہ کافی عرصے تک اپنے جانشین کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔ (یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مامون خراسان میں تھا، دینار نے اس سے قبل امام علی رضا کا ذکر غالباً اس لئے نہیں کیا کہ اس کی توجہ کا مرکز بغداد تھا۔ امام علی رضا کا انتقال بھی طرطوس ہی میں ہوا تھا۔ وہیں ان کا مزار مبارک ہے۔ وہ خراسان سے مامون کے ساتھ بغداد جا رہے تھے، مامون نے اپنی بیٹی کی شادی بھی ان سے کی تھی۔ تواریخ میں بیٹی کا نام ام حبیب لکھا ہے۔ مصنف) مامون کا بیٹا عباس بھی متعدد صلاحیتوں کا مالک تھا۔ لیکن اس نے بہ وجوہ ابو اسحٰق کو ترجیح دی تا کہ بنو عباس میں تفرقہ نہ پڑے اور سلطنت کا وہ لائحہ عمل برقرار رہے جسے مامون نے ترتیب دیا تھا۔

عارج کے اصرار پر جب میں دوبارہ طرطوس پہنچی تو ابو اسحٰق محمد معتصم وہاں سے بغداد کے لئے چل چکا تھا، وہ ہمیں طرطوس کے سرحدی مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ملا۔ وہیں اس نے خلافت کی بیعت لینے کا آغاز کیا۔

میں نے لشکریوں کی باتیں سنیں، بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ حکمران بدل جائے اور سپاہی خاموش بیٹھ جائیں۔

''اے دینار! تو مجھے کہاں ان خیموں کے درمیان گھمائے پھر رہی ہے۔'' عارج مجھ سے کہنے لگا۔

''تیرا ارادہ کہیں نکلنا بھی ہے یا نہیں! تجھے آخر کہاں پہنچنے کی جلدی ہے؟...... خود ہی مجھے بغداد سے یہاں لے کر آیا اور اب الٹا مجھی پر گھمائے پھرنے کا الزام لگا رہا ہے۔ تو جن زاد ہے یا آدم زاد؟ بھروسہ ہی نہیں تیری کسی بات کا۔''

''میں تو ادھر چلنے کو کہہ رہا تھا۔'' عارج نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ادھر خلیفہ ابو اسحٰق محمد کا عظیم الشان خیمہ لگا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مستقبل میں سفر کرتے ہوئے مغل تاجداروں کی شاہی خیمہ گاہ کا نقشہ کھینچ چکی ہوں۔ یوں سمجھ لیں کہ مغل بادشاہوں کی ساری شان و شوکت خلفائے بنو عباس کے سامنے ہیچ تھی۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

ترجمہ: ''خاک کو پاک دنیا سے کیا نسبت'' عرب ہونے کے ناتے یہ میرا تعصب یا

تفاخر نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ یوں بھی مغلوں کی حکومت چھوٹے سے علاقے پر تھی۔ ہندو سندھ تو بنو عباس کے معمولی عاملوں (گورنرز) کے پاس ہوتے تھے۔ وقت وقت کی بات ہے اور یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ اس دنیا میں سدا کسی کو نہیں رہنا۔ اسے بھی جو خلیفہ وقت بنا بیٹھا تھا۔ عارج اسی کے خیمے میں چلنے کو کہہ رہا تھا۔

''وقت اور حالات دیکھ لیا کر اے عارج!'' میں بولی۔ ''ضروری نہیں کہ ہم ہمیشہ حکمرانوں اور بلند ایوانوں کے گرد ہی چکر لگاتے رہیں۔''

''میں تو تجھ سے خود کہتا ہوں کہ باہر بھی نکلا کر۔ مگر تو سنتی کب ہے! اپنی ہی چلاتی ہے۔''

''فضول باتیں نہیں!...... ذرا سن کہ یہ سپاہی کیا گھبڑی پکار رہے ہیں؟''

''یہ حال تو سارے لشکر کا ہے۔ جگہ جگہ فوجی ٹکڑیوں میں بٹے ہیں اور ادھر ابو اسحٰق محمد بیعت لے رہا ہے۔''

''لیکن ان آدم زادوں کی گفتگو بھی تو سنی چاہیے۔'' میں اپنی بات پر قائم رہی، عارج مان گیا۔

فوجی یہ شور مچا رہے تھے کہ مامون کے بیٹے عباس کو مسند خلافت پر بٹھایا جائے۔

یہ خبر معتصم کو بھی ہو گئی۔ اس کی کنیت (لقب) ابو اسحٰق تھی اور نام محمد تھا۔ وہ جاہل ہونے کے باوجود اب خلیفہ وقت تھا۔ سو اس نے مامون کے بیٹے عباس کو طلب کر لیا۔ عباس نے اس وقت اپنے باپ کی وصیت کا پاس کرتے ہوئے بیعت کر لی۔ معتصم باللہ کہلانا اس نے پسند کیا۔ اس کا مطلب اللہ سے پناہ لینے والا یا مدد مانگنے والا ہے۔ اپنے اچھے اچھے نام خود ہی رکھ لینا آدم زادوں کی عادت ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ معتصم کے ساتھ بھی تھا۔ وہ سخت گیر، تند خو، اکھڑ، لڑاکا اور شان و شوکت کا رسیا تھا۔

معتصم اپنے چہرے اور قد کاٹھ سے بہت بارعب لگتا البتہ بولتا تو سارا بھید کھل جاتا۔ اسے محفل آرائی کی بجائے میدانِ جنگ مرغوب تھا، اس کی ایک نمایاں مثال طوانہ کو مسمار کرایا جانا تھا۔ یہ شہر مامون کے حکم پر عباس نے بسایا تھا۔ عباس نے بیعت کر لی۔ اس کے باوجود معتصم نے حکم دیا کہ طوانہ کو ڈھا دیا جائے۔ خلیفہ بننے کے بعد یہ اس کا پہلا حکم تھا۔

معتصم کے حکم میں یہ بات بھی شامل تھی کہ طوانہ میں بسنے والے جس قدر سامان و

اسباب اٹھا سکیں لے جائیں، جو سامان لوگ نہ لے جا پائیں اس میں آگ لگا دی جائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بسا بسایا شہر صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، محض انتقام کی خاطر!

اڑتیس برس کا یہ نیا حکمران معتصم خود کو عقل کل سمجھ بیٹھا، اس نے سرحدی علاقوں سے فوجوں کی واپسی کا حکم دیا۔ سپاہیوں، اسلحہ اور ساز و سامان کے ہمراہ وہ بغداد کے لئے روانہ ہوا۔

یکم رمضان 218 ہجری کو معتصم بغداد میں داخل ہوا جہاں اس کے لئے عام بیعت لی گئی۔ اس کا دورِ خلافت زیادہ طویل نہیں لیکن وہ بنو عباس کے زوال کا موجب ضرور بنا۔ ترکی نسل، عجمی نسل، امراء کے عروج و زوال اور دیگر مسائل کافی ہنگامہ خیز ہیں۔

میں صرف یہ چاہتی تھی کہ آدم زاد مسلمانوں کی یہ عظیم مملکت قائم و دائم رہے۔ عارج کا یہ مسئلہ نہیں تھا۔ وہ کبھی تو میری ہاں میں ہاں ملا دیتا اور کبھی مخالف سمت میں دوڑ لگانے لگتا۔ میں ان کی ان ''حرکتوں'' کو قابل گرفت سمجھتی۔

قابل گرفت تو وہ آدم زاد بھی تھے جو اس مملکت کو دانستہ یا نادانستہ نقصان پہنچا رہے تھے۔ اس مملکت سے پہلی بغاوت باوجود محمد بن قاسم نے کی جو ناکام ہوئی۔ محمد بن قاسم کو روپوش ہونا پڑا۔

دوسری بغاوت چند ماہ بعد زط (جاٹوں) نے کی۔ یہ جاٹ قبائل ہندوستان سے عراق آ کر دریائے دجلہ کے کنارے شہر بصرہ میں آ بسے تھے۔ ان کی اکثریت مسلمان تھی۔ انہوں نے بصرہ کے راستے پر قبضہ کر لیا اور مسافروں کے علاوہ تاجروں کو بھی لوٹنے لگے۔

جب معتصم کو ان جاٹوں کی شورش کا علم ہوا تو اس نے اپنے ایک سالار عجیف بن عنبسہ کو ایک عظیم لشکر کے ہمراہ ان کے خلاف روانہ کیا۔ جاٹوں کی قوت اتنی بڑھ گئی تھی کہ عجیف کو بڑی مشکل پیش آئی۔ محمد بن عثمان ان جاٹوں کا سربراہ یا سردار اور اسحاق نامی ایک آدمی ان کے کاموں کا منتظم تھا۔

عجیف گھبرانے والا نہ تھا۔ اس نے پہلے ہی معرکے میں تین سو آدمیوں کو قتل اور پانچ سو کو گرفتار کر لیا۔ مقتولوں کے سروں کو اس نے دارالخلافہ روانہ کر دیا۔ اس کے بعد سات مہینے تک مسلسل زط کے ساتھ معرکہ آرائیوں میں مصروف رہا۔ آخر کار جن زادی نے ان عثمان اور اسحاق کو اپنے اثر میں لے لیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ الٹے سیدھے احکام دینے لگے۔

میں نے زط کو امان کی درخواست پر بھی مجبور کیا۔ وہ اگر شر پسند و مفسد نہ ہوتے تو شاید میں ان آدم زادوں سے ایسا سلوک نہ کرتی، جب انہوں نے ہتھیار ڈالے تو ان کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ مع عورتوں اور بچوں کے وہ سترہ (17) ہزار تھے۔ ان میں لڑنے والے بارہ ہزار زندہ بچے تھے، وہ امان پا کر خوش ہوئے۔ عجیف نے میرا مشورہ قبول کرتے ہوئے ان سب کو اسی ہیئت و صورت میں جس طرح کہ وہ میدانِ جنگ میں آئے تھے، کشتیوں میں سوار کرایا اور بغداد پہنچایا۔ یہ 10 محرم 220 ہجری کا واقعہ ہے کہ خلیفہ معتصم زط کو دیکھنے ایک کشتی پر سوار ہو کر شماسیہ کی جانب آیا۔ اس نے معائنے کے بعد انہیں عین زربہ کی طرف جلاوطن کر دیا۔ رومیوں نے موقع پا کر ان پر شب خون مارا۔ سو ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔

عارج کب خاموش رہنے والا تھا، بولا۔ ''اے دینار! کیا یہ جدِ خلیفان آدم زادوں کو کسی اور علاقے میں آباد نہیں کرا سکتا تھا؟ جس طرح بنو عباس خود کو مسلمان کہتے ہیں اسی طرح یہ جاٹ قبائل بھی تو مسلمان تھے۔ بول کیا نہیں؟''

''تو مجھے گھیرنے کی کوشش نہ کر اے عارج!...... اگر یہ جاٹ اتنے ہی معصوم ہوتے تو لوٹ مار نہ کرتے۔ تیرا یہ کہنا کہ انہیں خلیفہ کہیں اور بسا دیتا، فضول بات ہے۔ بصرے میں بھی تو یہ آ کر بسے تھے۔ شرافت سے رہتے تو کیوں برباد ہوتے۔ پھر کسی دوسری جگہ بسانے کا کیا جواز ہے؟''

جو واقعہ میں نے اپنی سرگزشت کا تسلسل برقرار رکھنے کی غرض سے آخر تک بیان کر دیا، اسی دوران میں ایک اور اہم واقعہ 219 ہجری میں پیش آیا۔ یہ بابک خرمی کا قصہ ہے۔ اسے بھی از اول تا آخر بیان کروں گی۔

جاویداں ایک مجوسی (پارسی) تھا۔ وہ ایک نئے فرقے کا بانی ہوا اور بہت جلد شہرت حاصل کی۔ وہ مر گیا تو ایک آدمی نے دعویٰ کیا کہ جاویداں کی روح میرے جسم میں آ گئی۔ 201 ہجری میں اس نے بڑی قوت حاصل کر لی اور مسلمانوں کی مملکت کے زوال کے درپے ہوا۔ اس سال عیسیٰ کو اس کے مقابلے پر بھیجا گیا۔ عیسیٰ، آذربائیجان اور آرمینیا کا عامل (گورنر) تھا، اس نے شکست کھائی اور اس فسادی کا نام بابک خرمی تھا۔ جاویداں یا جاوداں کے معنی دائم و قائم کے ہیں اور خرم کا مطلب شادمانی ہے یوں یہ اپنے نام کے

ساتھ خرمی لگاتا تھا۔

209 ہجری میں مامون کو بغداد آئے پانچ سال ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے سالار ابوسعید محمد کو بڑے ساز و سامان سے روانہ کیا۔ وہ بغداد سے چلا اور بڑے بڑے میدان تیز دشوار گزار گھاٹیاں طے کرتا ہوا بابک کے مستقرِ حکومت تک پہنچ گیا۔ (مستقر: جائے قرار، ٹھہرنے کی جگہ) مقام ہشتادسر کے آگے پہاڑوں کا ایک وسیع سلسلہ ہے۔ بابک نے یہیں ایک محفوظ اور بلند مقام پر اپنا مرکز قائم کر رکھا تھا۔ محمد نے بڑی ترتیب سے فوج کو اوپر چڑھایا، قلب فوج پر اپنے نائب اور میمنہ و میسرہ پر سورہ عباس کو متعین کیا، خود عقب میں رہا کہ ہر طرف دیکھ بھال رکھے۔ بابک نے پہلے سے اپنی کچھ فوج کمین گاہوں میں چھپا رکھی تھی۔

محمد کی فوج تقریباً تین فرسنگ تک اوپر چڑھتی چلی گئی۔ (فرسنگ یا فرسخ تقریباً ڈھائی اور تین میل کے درمیان ہوتا تھا، ابتداء میں ایک فرسنگ یا فرسخ تین میل کا تھا۔ مغلوں کے عہد تک آتے آتے ایک فرسخ ڈھائی میل کے برابر رہ گیا۔ فرسخ عربی اور فرسنگ فارسی لفظ ہے۔ مصنف) بابک کا صدر مقام بالکل قریب آ گیا تھا کہ دفعتاً اس کے آدمی کمین گاہوں سے نکل کر محمد کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ ادھر بابک بھی ایک کثیر جماعت لے کر بڑھا۔ محمد کا لشکر دونوں طرف سے بیچ میں آ گیا اور سخت ابتری پڑ گئی۔ ابوسعید نے بہت کچھ سنبھالا مگر فوج نہ سنبھل سکی۔ محمد تنہا رہ گیا۔ چونکہ وہ لڑائی کے مرکز سے دور پڑ گیا تھا اس لئے چاہا کہ کسی طرف نکل جائے۔ اس ارادے سے وہ چند قدم چلا تھا کہ سامنے وہ فوج نظر آئی جسے لے کر وہ بغداد سے چلا تھا۔ اس فوج کو بابک کی فوج پامال کئے دے رہی تھی۔

فطری شجاعت کے جوش کو محمد ضبط نہ کر سکا اور الٹا پھرا۔ ایک بہادر افسر بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں بابک پر حملہ آور ہوئے اور نہایت جاں بازی کے ساتھ لڑ کر مر گئے۔ اس سے قبل محمد بابک کو شکست دے چکا تھا۔ مقتولوں کے سر اور قیدیوں کو اس نے بغداد بھیج دیا تھا۔

مامون الرشید 218 ہجری تک زندہ رہا مگر اس کی زندگی تک بابک کا فتنہ فرو نہ ہوا۔

میں نے اوپر جو واقعات بیان کئے ان کا راوی میرا پسندیدہ عارج ہے۔

خلیفہ معتصم کو اقتدار سنبھالے ایک سال ہوا تھا۔ بابک نے مازندران کے پہاڑی

علاقے میں بغاوت برپا کر رکھی تھی۔ قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ مسلمان آدم زادوں کے لئے بابک سخت مصیبت اور عذاب بن گیا تھا۔ ایک سال کے اندر اندر بابک کے اثرات اور زیادہ بڑھ گئے۔ اصفہان، ہمدان وغیرہ کے لوگ اس کے عقیدے پر عمل کرنے لگے مگر اسے آخر کار شکست کھانی پڑی۔

بابک کو پہلی شکست ابوسعید محمد نے دی اور وہ خود بھی مارا گیا۔ دوسری شکست محمد بن بعیث کے ذریعے ہوئی۔

آذربائیجان کے ایک قلعے میں ان دنوں محمد بن بعیث رہتا تھا۔ یہ قلعہ اس نے ابو داؤد سے لیا تھا۔ ابن داؤد اس کا معین و مددگار تھا۔ وہ بابک کی فوجوں کے لئے رسد رسانی کا کام دیتا تھا۔

یہی وہ صورتحال تھی کہ میں نے بابک خرمی کے فتنے کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

قلعے دار محمد بن بعیث کو میں نے ذریعہ بنایا تا کہ وہ دوہرا کھیل آئندہ نہ کھیل سکے۔ وہ ایک طرف خلیفہ معتصم کا وفادار بنا ہوا تھا دوسری جانب بابک خرمی سے ملا ہوا تھا۔ میں آذربائیجان پہنچی تو محمد بن بعیث کو اپنے قابو میں کرلیا۔ وہ ایک جن زادی کو کیسے نچو دیتا۔

''اے قلعہ دار! کسی ایک طرف ہو جا۔'' اپنی غیر انسانی آواز میں محمد بن بعیث کو میں نے مخاطب کیا۔

''کس طرف اے جن زادی؟'' محمد بن بعیث نے میرے زیر اثر خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

''اس طرف اے قلعہ دار کہ جس طرف حق ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ قلعہ دار محمد بن بعیث نے اقرار میں سر ہلایا تو میں مزید بولی۔ ''سن کہ مجھے اب سے صرف اور صرف خلیفہ معتصم کا وفادار رہنا ہے۔ تجھے یہ بات یاد نہیں رہے گی کہ حکم دینے والی ایک جن زادی تھی۔''

''ہاں......م......میں بھول جاؤں......گا......اور یاد رکھوں گا...... کہ......کہ صرف خلی......خلیفہ معتصم کا وفا......وفادار رہوں گا۔'' وہ بڑبڑانے لگا۔

اسی لمحے میں نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔

ایک واقعے کے بعد بابک خرمی کا ایک سالار عصمت نامی قلعے کی طرف سے گزرا۔ محمد بن بعیث نے اسے پیغام بھیجا کہ کچھ دیر قلعے میں آرام کر لے۔ یہ کوئی نئی یا غیر متوقع بات نہیں تھی۔ عصمت کے لئے قلعے دار ''اپنا ہی آدمی'' تھا۔ وہ رک کر قلعے میں آ گیا۔ اسے کیا کسی کو بھی اندازہ نہ تھا کہ قلعے دار اندر سے بدل چکا ہے۔ عصمت کو محمد بن بعیث نے عزت واحترام سے ٹھہرایا۔ جو لوگ عصمت کے ساتھ تھے وہ بھی خاطر مدارت سے بہت خوش ہوئے۔

رات ہوئی تو حالت غفلت میں عصمت کو گرفتار کر لیا گیا۔ قلعے دار کے آدمیوں نے عصمت کے ساتھیوں کو مار ڈالا وہ گویا سوتے کے سوتے رہ گئے۔ اس شب آذربائیجان میں بڑی تند و تیز ہوا چلی، حشر ساماں ہوا!

قیدی سالار عصمت کو محمد بن بعیث نے بغداد بھیج دیا، وہاں میں پہلے سے موجود تھی۔ میں ایک بار پھر اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لے آئی۔ خلیفہ معتصم نے میرے زیر اثر عصمت سے خود ملاقات کی۔

''اے عصمت! یقیناً تو بھی دیگر جانداروں کی طرح زندہ رہنا چاہے گا۔'' معتصم اپنی بھاری آواز میں سالار عصمت سے مخاطب ہوا۔

سالار عصمت اشارہ سمجھ گیا، کہنے لگا۔ ''اے امیر المومنین! یہ غلام جان کی امان چاہتا ہے۔''

''امان دی گئی۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ تجھ سے بابک کے بارے میں جو بھی پوچھا جائے گا، تو بتا دے گا۔''

عصمت رہائی کی امید پر آمادہ ہو گیا حالانکہ معتصم نے رہائی کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ ان آدم زادوں کو خوش گمانی سے کون روک سکا ہے جو میں روکتی۔ اور ان فریبوں سے تو میں ویسے بھی بچی ہوئی تھی۔ اس نے بابک خرمی کے تمام قلعوں اور شہروں کے اسرار بتا دیئے۔

سالار عصمت جیسے کوئی سبق سا سنا کر چپ ہو گیا۔ یہ ''سبق'' معتصم نے یاد کر لیا۔

دور پردوں کے پیچھے جو محافظ چھپے ہوئے تھے معتصم نے انہیں بلند آواز میں مخاطب کیا۔

''اسے لے جاؤ۔ اور داخل زنداں کر دو!''

عصمت کی کیا مجال تھی کہ ''چوں'' بھی کر سکتا۔ محافظ اسے لے گئے۔

پھر معتصم نے افشین حیدر بن کاؤس کو طلب کیا۔ افشین کو معتصم نے جبال (پہاڑی علاقے) کا عامل (گورنر) بنا دیا۔ معتصم نے اسے بابک کے خلاف پوری تیاریوں کے ساتھ روانہ کیا۔ افشین، اشروسنہ کے بادشاہ کاؤس کا بیٹا تھا۔ مامون کے عہد میں کاؤس اور

اس کے بیٹے نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ افشین کا اسلامی نام حیدر رکھا گیا تھا۔ حیدر کو مامون نے کاؤس کا قائم مقام تسلیم کر لیا اور وہ دربار خلافت سے وابستہ ہو گیا تھا۔

معتصم نے عباسی فوج میں ترکوں کو بھی شامل کرنے کی ابتداء کی۔ اسی بناء پر افشین کو عباسی فوج کا سالار مقرر کیا۔

افشین نے پہاڑی علاقوں پر رسد پہنچانے کا انتظام کیا اور بابک کے قلعوں کی طرف کوچ کر دیا۔

خلیفہ معتصم نے مزید فوجی امداد، سامان رسد اور یومیہ اخراجات کے لئے کثیر رقم کی فراہمی کا بندوبست کیا۔ افشین کو بغداد سے برابر امداد بھیجی جاتی رہی۔

بابک کو جب ان تیاریوں کا علم ہوا تو اس نے سامان رسد کو لوٹنے کا ارادہ کیا۔ پہاڑوں میں اس نے اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے۔ ان جاسوسوں کو بھلا میں کیسے نظر آتی۔ سو ان میں سے بہت پہاڑوں سے نیچے لڑھک گئے۔ کچھ کو ایسی "معلومات" ملیں کہ گھبرا کر بھاگ اٹھے۔ دشمن کو غلط معلومات فراہم کرنا بھی عباسیوں کا ایک ہتھیار تھا، میں نے ہی انہیں اس راہ پر لگایا تھا۔ دوسری جانب میں عباسی افواج کو درست معلومات بہم پہنچاتی۔ اس جنگ میں بھی یہی ہوا۔

بابک نے پہاڑوں کے اندر بنی ہوئی اپنی خفیہ پناہ گاہ سے نکل کر امدادی فوج پر حملہ کیا لیکن افشین کو بابک کے اس ارادے کا علم ہو گیا۔ کس طرح؟ یہ میں کیوں بتاؤں! اس نے عقب سے بابک کی فوج پر حملہ کر دیا۔ بابک کو میدان جنگ سے بھاگ کر اپنے مضبوط قلعے بذ میں پناہ لینی پڑی۔ افشین نے آگے بڑھ کر بعض اہم مورچوں پر قبضہ کر لیا۔ (بذ کا مطلب غلبہ کرنا ہے۔ مصنف)

امدادی فوج کا سالار بغا الکبیر بھی بذ کے نزدیک پہنچ گیا۔ افشین اور بغا نے مل کر بذ کا محاصرہ کیا لیکن پہاڑی علاقوں کی دشوار گزاریوں اور سردیوں کی شدت کے سبب عباسی فوجوں کو مورچوں سے ہٹنا پڑا۔

✿......✿

222 ہجری میں معتصم نے دوسری امدادی فوج جعفر خیاط (درزی) کی ماتحتی میں کثیر مصارف جنگ کے ہمراہ روانہ کی۔ اس فوجی امداد سے افشین کی قوت بڑھ گئی اور پھر اس نے پیش قدمی کر کے پہاڑی علاقوں میں مورچے سنبھال لئے۔ آہستہ آہستہ وہ بذ کی طرف بڑھنے لگا۔

بابک کی طاقت اور صلاحیتوں سے افشین واقف ہو چکا تھا وہ اسی لئے اپنی فوجوں کو ایک دم بابک کے مقابلے پر لانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے برعکس امدادی فوجیں یہ چاہتی تھیں کہ بڑھ کر بذ کے قلعے پر حملہ کر دیا جائے۔ جنگ کا فیصلہ تو ہو۔ اکثر اوقات ان امدادی فوجوں کے خود سر سپاہی، افشین کے حکم کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھتے اور منہ کی کھاتے۔ ان سرکشوں اور نافرمانوں کی میں نے کوئی مدد نہیں کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں پسپا ہونا پڑتا۔

افشین کے طریقہ جنگ سے بابک گھبرا گیا۔

اپنی افواج کو آخر کار افشین نے چار حصوں میں تقسیم کیا اور چاروں طرف سے بذ پر یورش کی۔

بابک نے فتح سے ناامید ہو کر افشین کو صلح کا پیغام بھیجا۔ اسی اثناء میں خبر آئی کہ دوسری سمت سے مسلمان قلعے میں داخل ہو گئے ہیں۔ مع اہل و عیال کے بابک قلعے سے بھاگ نکلا۔ افشین نے بذ پر قبضہ کیا اور بابک کے محلات میں آگ لگا دی۔ بابک کے سپاہیوں کو بڑی تعداد میں قتل کروا دیا گیا تاکہ وہ دوبارہ بابک سے نہ جا ملیں۔

بذ سے نکل کر بابک آرمینیہ کی سمت بھاگا۔ افشین نے اپنے آدمی اس کے تعاقب میں روانہ کئے۔ بابک نے آرمینیہ کے جنگلات میں پناہ لی۔ مگر میں اسے کیسے وہاں پناہ لینے دیتی! میں نے کیا یہ کہ وہاں کے قلعے دار سہل بن ساباط کو خبر کر دی، بابک کہاں چھپا ہوا ہے۔ قلعے دار اسے دھوکا دے کر ساتھ لے آیا اور افشین کو مطلع کر دیا۔ میں چاہتی تو براہ

راست افشین تک بھی یہ اطلاع پہنچا سکتی تھی۔ ایسا کیوں نہیں کیا؟ اس کی وجہ ہے۔ دراصل کسی ایک ہی آدم زاد کی مدد کئے جاؤ تو اس کا دماغ خراب ہونے لگتا ہے۔ بہرحال قصہ مختصر یہ کہ افشین کے آدمیوں نے نشے میں مست بابک خرمی کو پکڑ لیا۔ پھر افشین کے پاس لے آئے۔

افشین نے خلیفہ معتصم کو اپنی کامیابی کی اطلاع بھیجی۔

خلیفہ معتصم نے افشین اور بابک دونوں کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ معتصم کا حکم تھا کہ ہر منزل پر افشین کا استقبال کیا جائے اور اسے خلعت فاخرہ عطا ہو۔ آدم زاد عموماً فخر کرنے ہی پر مارے جاتے ہیں۔ افشین نے بھی فخر کیا اور بعد میں اس کا خمیازہ بھگتا۔ ابھی یہ ذکر دور ہے۔ سو افشین کو فخر کرنے دیتے ہیں۔

جب افشین اپنے قیدی بابک خرمی کو ساتھ لئے سامرہ (نئے دارالخلافہ) کے قریب پہنچا تو معتصم کے بیٹے واثق نے اس کے استقبال میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ واثق کے ہمراہ سرداران و اراکین سلطنت تھے۔

معتصم نے افشین کو ہاتھی پر چڑھایا۔ افشین کے سر پر تاج رکھا گیا اور بیس لاکھ درہم بطور انعام اسے دیئے گئے۔ شاعروں سے افشین کی شان میں قصیدے لکھوائے گئے، ان آدم زاد شاعروں کا مسئلہ صرف روزی روٹی ہوتا ہے۔ رقم ملے تو یہ اپنے دشمن کا قصیدہ بھی لکھنے کو تیار ہو جائیں۔ مگر سب شاعر ایسے نہیں ہوتے، ان میں باضمیر بھی پائے جاتے ہیں۔

شاعروں کے ذکر سے قطع نظر بابک خرمی کو قید میں ڈال دیا گیا۔

چند روز بعد بابک خرمی کو دیکھنے کے لئے خلیفہ معتصم قید خانے میں آیا پھر اس نے حکم دیا کہ اگلے دن بابک کو ہاتھی پر سوار کرا کے پورے شہر میں پھروایا جائے، پھر اس کے بعد دربار میں لایا جائے۔ ہاتھی ہندوستان سے منگوائے جاتے تھے۔

بابک باغی جب دربار پہنچا تو ''خرمی'' نہیں، کسی اداس بلبل کی طرح تھا۔

معتصم کے حکم پر بابک کو برسر دربار پچھاڑا گیا اور ذبح کر دیا گیا۔ ذبح کئے جانے والے کسی جانور کی طرح بابک کی گردن، دھڑ سے الگ نہیں کی گئی۔ اس کی لاش کو ایک چوراہے پر لٹکا دیا گیا۔ معتصم جیسے مطلق العنان حکمران معلوم نہیں کیوں اپنے دشمنوں کی لاشوں کو سڑوانے کے لئے عام گزرگاہوں پر لٹکوا دیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ بدبو سے

عوام کا کیا حال ہوگا۔ یہ سب عبرت دلانے کے چکر میں کیا جاتا ہے لیکن خود حکمران عبرت نہیں پکڑتے۔

بہرصورت بابک نشانِ عبرت بن گیا۔ چوبیس برس تک وہ مسلمانوں کے لئے مصیبت بنا رہا (201 سے 222 ہجری تک) اس دوران میں بابک نے تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کو قتل کیا۔ یحییٰ بن معاذ، عیسیٰ بن خالد اور محمد بن حمید طوسی جیسے سالاروں کو شکست دی۔

قلعہ بذ پر جب افشین نے قبضہ کیا اس وقت بابک کی قید میں ساٹھ ہزار مسلمان تھے جنہیں پھر سے زندگی اور آزادی حاصل ہوئی۔

اس دوران جبکہ بابک خرمی کے خلاف مہمات جاری تھیں، 220 ہجری میں دارالخلافہ بغداد کے بجائے سامرہ بنا دیا گیا۔ یہ بہت اہم واقعہ ہے اور اس کی تفصیل ضروری ہے (حرمین، یعنی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک شہر کا نام سامرہ تھا۔ سامری جادوگر اسی شہر کا رہنے والا تھا جو بعض نشانیوں سے حضرت جبرئیل کو پہچان لیا کرتا تھا۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت کے ایک بڑے گروہ کو گمراہ کیا۔ دینار کی پراسرار داستان میں جس شہر سامرہ کا ذکر ہے عراق میں تھا مگر یہ دوسرا سامرہ، سرمن رائے سے بگڑ کر بنا ہے۔ سرمن رائے کے معنی ہیں جس نے دیکھا پسند کیا۔ مصنف)

اس زمانہ میں مامون عباسی کی فوج میں ایرانیوں کا زور بڑھ گیا تھا۔ وہ عربوں پر سبقت لے گئے تھے۔ جب معتصم خلیفہ ہوا تو اس نے ایرانیوں کو عربوں کی جگہ ترکوں کو فوقیت دینی چاہی۔ اسی غرض سے سمرقند، اشروسنہ، فرغانہ وغیرہ سے ہزاروں غلام منگوائے تھے۔ ان غلاموں کو فراغنہ کا لقب دے کر فوج میں شامل کیا گیا۔ اسی طرح مصر سے بھی غلام خریدے گئے جو مطاربہ کے نام سے موسوم ہوئے۔

چونکہ ترک غلاموں کی تعداد بھی زیادہ تھی اور انہی میں سے سرداران فوج بھی منتخب کئے گئے تھے اس لئے عباسی فوج پر ترکوں کا اثر نمایاں ہو گیا۔ اس سے ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا ہوا۔ ان ترک سواروں پر معتصم نے بڑا مال خرچ کیا۔ یہ ریشمی لباس اور سونے کے زیورات پہنتے تھے اور شان و شوکت کے ساتھ بغداد کے بازاروں میں گھومتے تھے۔ یہ لوگ کیونکہ بالکل جاہل اور اجڈ تھے اس لئے انہیں بغداد کے عوام کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

اسی بنا پر ایک روز عارج مجھ سے بولا۔ ''یہ تیرے خلیفہ نے.....''

''پہلے تو یہ سن لو، وہ میرا خلیفہ نہیں، آدم زادوں کا خلیفہ ہے۔'' میں نے عارج کی بات کاٹ دی۔

''مان لیا۔ مگر معتصم نے یہ کیا سونے بغداد میں چھوڑ دیئے ہیں؟ اے دینار! بتا، کیا معتصم نے یہ اچھا کیا؟''

''بالکل نہیں۔'' میں نے دوٹوک جواب دیا۔ ''معتصم نے یہ بڑی بھیانک غلطی کی ہے۔ اس غلطی کی سزا اسے کبھی نہ کبھی بھگتنی ہوگی۔

''لیکن اس وقت تو بغداد والے سزا بھگت رہے ہیں اے دینار!''

''ہاں، مگر میں اس سزا کو طویل نہیں ہونے دوں گی۔''

''کیا کرے گی تو؟''

''تجھے معلوم ہے اے عارج! کہ وقت سے پہلے میں کچھ نہیں بتاتی۔''

''نہیں بتاتی تو نہ بتا۔ مجھے بھی تجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔''

عارج کی خفگی پر میں ہنس دی۔ وہ لو دو گیارہ ہو گیا۔ میں سوچنے لگی، عوام کو ان اجڈ غلاموں کے شر سے بچانے کی کیا صورت ہو؟

ان غلاموں کے گھوڑوں کی زد میں آ کر اکثر عورتیں اور بچے کچل جاتے تھے۔ اہل بغداد کو ان ترک سواروں سے اذیت پہنچنے لگی اور مجھ سے یہ دیکھا نہ گیا۔ میں نے بغداد والوں کو ان غلام ترک کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ ایک بار تو بازار کرخ میں خود میں ''مظلوم'' بن گئی۔ اس کے لئے مجھے ایک آدم زادی کے جسم میں اترنا پڑا۔

ایک ترک غلام اپنا گھوڑا دوڑاتا آ رہا تھا۔ میں دانستہ اس کے سامنے آ گئی۔ نتیجہ ظاہر ہے میں لہولہان ہو کر چیخنے لگی۔ بازار والوں نے اس غلام کو گھیر لیا اور نکلنے نہ دیا۔ میں چیخی۔

''مار ڈالو اس کمینے کو!''

ایک عورت کی ''فریاد'' رائیگاں نہ گئی۔ لوگوں نے اس ریشمی لباس والے غلام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ کچھ لفنگے زیورات لے کر چمپت ہو گئے۔ بغداد والوں کے ہاتھ ایک نیا مشغلہ آ گیا۔ ایسے ''حادثات'' اکثر ہونے لگے۔ اگر کوئی ترک غلام تنہا مل جاتا تو اسے ''چٹنی'' بنا لیا جاتا۔ گھوڑا اور زیورات منافع میں ملتے۔ کسی درزی نے لوگوں کو سمجھایا کہ ریشمی لباس بھی قیمتی ہے۔ سو ریشمی لباس پہلے اتار لیا جاتا۔

بغداد شہر کے گلی کوچوں میں باہر سے آنے والوں کو روز ہی ''تخریج'' کیا جانے لگا۔

مجھے اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہوتی رہی تھی۔ اور اب آخری ضرب لگانی باقی تھی۔ اسی دوران میں شہر والوں کا ایک وفد حکمران وقت سے ملا۔ اس وفد میں شہر بغداد کے عزت دار لوگ شامل تھے۔ ان ''عزت داروں'' کو میں نے ہی گھیر کر قصر خلافت تک پہنچایا تھا ورنہ وہ اتنی ہمت شاید نہ کرتے۔ انہوں نے ترک غلاموں کے خلاف معتصم سے شکایات کی۔

عموماً ''خلیفہ لوگ'' ایسے مواقع پر اکثر لوگوں کو سر دربار پٹوا کر بے عزت کرتے اور خوش ہوتے تھے۔ عہد قدیم سے یہی دستور چلا آتا تھا۔ مگر اس دن یہ نہ ہوا۔ میں معتصم کی ناک میں گویا نکیل ڈالے رہی۔ اسے بے قابو نہ ہونے دیا۔ اس کا چہرہ تو غصے سے سرخ ہوا لیکن کچھ بولا نہیں۔ بغداد کے وہ ''عزت دار'' کھسک لئے جو دراصل ''سرمایہ دار'' تھے۔ آدم زادوں میں سرمایہ ہی تو ''عزت'' کا ذریعہ بنتا ہے جس کے پاس جتنا زیادہ سرمایہ ہوگا وہ اتنا ہی بڑا ''عزت دار'' سمجھا جائے گا۔ غالباً اسی لئے آدم زاد سرمائے کی ہوس میں مبتلا رہتے ہیں۔

پھر آخری ضرب لگانے کی رات بھی آ ہی گئی۔ خلیفہ معتصم جھومتا جھامتا اپنی خواب گاہ میں سونے آ گیا۔ محافظ دستے کے سپاہیوں نے خواب گاہ کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ اب خلیفہ سے کوئی بھی نہیں مل سکتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے خاندان والوں اور بیویوں، لونڈیوں نیز بچوں کو بھی ملنے کی اجازت نہ تھی۔ معتصم اس قصر خلافت کے بہت سے ''اندوہ ناک'' قصے سن چکا تھا سو وہ چوکنا رہتا۔

یہ تمام پابندیاں آدم زادوں کے لئے تھیں۔ مجھ جن زادی کو بھلا کون روکتا! اگر روکنے کی ناکام کوشش کرتا بھی تو منہ کی کھاتا۔ مجھے کوئی عمل پڑھنے والا ہی روک سکتا تھا مگر قصر خلافت میں رہنے اور آنے جانے والے ''عقل کے دیوانے'' تھے۔

اچھا موقع ہے۔ میں ان ''دیوانوں'' کا قصہ بھی سناتی چلوں۔ ان ''عقل والوں'' میں خود خلیفہ معتصم بھی شامل تھا۔

اس قصے کی ابتدا مامون کے زمانے سے ہوئی۔ یونانیوں کا زور عقل پر تھا۔ ہر شے کو وہ عقل کی کسوٹی پر پرکھتے۔ ان کے سوچنے اور غور کرنے والوں کی کتابیں جب عربی زبان

میں ترجمہ ہوئیں تو عرب بھی مال عرب پیش عرب کے علاوہ غور وفکر کا سوانگ بھرنے لگے۔ مامون نے یہ سوانگ کچھ زیادہ ہی بھرا۔ اس کی دیکھا دیکھی تمام اراکین سلطنت کو یہ ''بیماری'' لاحق ہوگئی۔ خود مامون کے عقائد ایک طرح سے ''معجون مرکب'' تھے۔ بس اسے ہر معاملے یہاں تک کہ دینی معاملات میں بھی عقل بھڑانے کی عادت ہوگئی۔ اس زمانے کے موقع پرست اور نام نہاد درباری عالموں نے بھی اپنا منہ بھنانا شروع کر دی۔ ان میں پیش پیش قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) احمد بن داؤد تھا۔ یہ ''درباری عالم'' اس حد تک خود سر ہو گئے کہ انہوں نے مامون کی شہ پا کر قرآن مجید کو بھی مخلوق کہنا شروع کر دیا۔ (نعوذ باللہ) مامون بھی ان بحثوں میں حصہ لیتا۔ وہ گروہ صریحاً بھٹکا ہوا تھا۔ مامون کو انہوں نے اپنا آلہ کار بنا لیا حالانکہ وہ حافظ قرآن بھی تھا۔ مختلف الخیال درباری عالموں کی صحبت نے مامون کو آزاد و مشرب بنا دیا تھا۔ وہ اعتزال کا پیرو ہو گیا تھا۔ (اعتزال عربی لفظ ہے۔ اس کے معنی گوشہ نشینی اور الگ ہونے کے ہیں۔ معتزلہ اسی سے بنا ہے جس کے معنی الگ بیٹھنے والوں کے ہیں۔ مصنف)

سب سے الگ ہونا بھی تو ایک فخر کی بات ہے۔ سو ان آدم زادوں نے فخر کیا اور مذہبی عقیدوں کو ٹھیس پہنچانی شروع کر دی۔ ان کو معتزلہ کہا گیا۔ یہ گروہ مذہبی عقائد کو عقل کی ''روشنی'' میں دیکھتا، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، کلام الٰہی، مسئلہ تقدیر، جبر و اختیار وغیرہ کے متعلق بحث و تکرار کرتا۔ انہوں نے دین میں فلسفہ شامل کر دیا۔

یہ آدم زاد خود کو ''روشن خیال'' تصور کرتے اور آزادی رائے کا احترام کرنے والے مانے جاتے۔

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد تک معتزلہ کو کوئی خاص عروج حاصل نہیں ہوا اور ان کے عقائد کی اشاعت محدود رہی، لیکن مامون کے برسر اقتدار آنے کے بعد اور فلسفہ یونان کی اشاعت کے بعد معتزلہ عقائد تیزی سے پھیلنے لگے۔

اس زمانے میں معتزلہ اور محدثین کے درمیان خلق قرآن کے مسئلے پر زبردست مخالفت کا آغاز ہو چکا تھا۔ حالانکہ اس بحث کا آغاز علمی اور فلسفیانہ انداز میں ہوا، مگر درباری عالموں نے اسے کفر و ایمان کا معیار بنا دیا۔

محدثین کا یہ عقیدہ تھا کہ قرآن مجید خدا کی طرح قدیم ہے۔ اسے خدا نے خلق نہیں کیا بلکہ اس کی ذات کے ساتھ وہ ہمیشہ سے موجود ہے۔ معتزلہ کا کہنا یہ تھا کہ خدا نے قرآن کو خلق کیا ہے اس لئے وہ اس کی مخلوق ہے۔

اس عقیدے سے قرآن کریم کی عظمت و جلالت پر حرف آتا تھا اور اس کے کلام الٰہی ہونے کا عقیدہ کمزور پڑ رہا تھا۔ (نعوذ باللہ)

مامون کے عہد میں جن علماء اور محدثین نے معتزلہ عقائد کے خلاف آواز بلند کی ان میں امام احمد بن حنبلؒ کا نام سب سے آگے ہے۔ مامون چونکہ معتزلی عقائد کا قائل ہو گیا تھا لہٰذا اس نے خلق قرآن کے مسئلے پر (218 ہجری میں) میں جب وہ شام کے اضلاع کا دورہ کر رہا تھا، بغداد کے عامل (گورنر) اسحٰق خزاعی کے نام یہ فرمان بھیجا۔ میں اس فرمان کے الفاظ کو مختصراً بیان کرتی ہوں۔

''امیر المومنین کو معلوم ہوا ہے کہ عموماً تمام مسلمان جو شریعت کی باریکیوں کو نہیں سمجھتے، قرآن کے قدوم کے قائل ہیں۔ حالانکہ قرآن کی متعدد آیتوں سے اس کے خلاف ثابت ہے (اللہ محفوظ رکھے) یہ لوگ بدترین امم اور خدا کے دشمن ہیں (خدا بچائے) بغداد کے تمام قاضیوں (منصفوں) کو جمع کر کے یہ فرمان سنا دیا جائے اور جس کو انکار ہو عدالت میں اس کی گواہی قبول نہ کی جائے۔''

(اللہ دین میں تفرقہ ڈالنے والوں سے محفوظ رکھے)

مامون کے اس فرمان سے اندازہ ہوتا ہے کہ معتزلہ جس ''روشن خیالی'' کا دعویٰ کرتے تھے، ختم ہو گئی تھی اور وہ مذہبی جبر و تشدد کے قائل ہو گئے تھے۔ (نعوذ باللہ)

بغداد کے بعض علماء کو مامون نے بلا کر خلق قرآن کے متعلق ان کا امتحان لیا۔ انہوں نے جان جانے کے خوف سے معتزلی عقیدے کو مان لیا۔ اس کے بعد مامون نے ایک فرمان پوری مملکت کے علماء کے نام لکھا اور اس مسئلے پر ان کی رائے معلوم کی۔

جن علماء نے مامون کے عقیدے سے اختلاف کیا، ان پر رشوت، چوری، دروغ گوئی (جھوٹ بولنے) اور بے علمی کے الزامات لگائے گئے اور انہیں پابہ زنجیر دربار میں حاضر ہونے کے احکام بھیجے گئے۔

ان دنوں مامون بلاد روم کی مہمات سے فارغ ہو کر طرطوس میں مقیم تھا۔ (یہاں بلاد روم سے مراد ایشیائے کوچک کے شہر ہیں۔ مصنف) جو علماء گرفتار کر کے مامون کے پاس

پابہ زنجیر بھیجے گئے، ان میں امام احمد بن حنبلؒ، محمد بن نوح اور شام کے علماء شامل تھے۔ ابھی یہ آدم زاد مامون کے پاس طرطوس پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ مامون مر گیا۔ یوں وقتی طور پر محدثین وقت کو معتزلی جبر و تشدد سے نجات مل گئی۔

معتزلی عقائد میں جس شدت کا اظہار مامون نے کیا اور ان عقائد کو نہ ماننے والوں کے ساتھ جس ظلم و زیادتی کو اس نے روا رکھا، وہ اس کے عام کردار کے منافی تھا۔ اس میں ذہین نوجوان آدم زادوں کی عجلت پسندی اور مطلق العنان فرماں رواؤں کی ضد دونوں جمع تھیں۔ اس کے دربار اور مزاج پر درحقیقت معتزلہ حاوی ہو گئے تھے۔ وہ اسی لئے اپنی عمر کے آخری حصے میں تنگ نظری اور تعصب کا شکار ہو گیا تھا۔ جہاں مامون ایک طرف تقدس حدیث کی باتیں کرتا تھا، مذہبی عقائد میں جنون کی حد تک پہنچ جاتا تھا اور اہل دل کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتا تھا، دوسری طرف وہ عیش و نشاط کی محفلیں بھی سجاتا تھا۔ نازنینوں کے جھرمٹ میں رندانہ وضع اختیار کرتا تھا۔ شاعری اور موسیقی سے اپنا دل بہلاتا تھا۔

مامون جس عہد میں پیدا ہوا اس میں مسلمانوں نے میاشی کو فن بنا لیا۔

ہارون کے زمانے سے موسیقی بام عروج کو چھونے لگی تھی۔ مامون نے بھی اس طرف خاصی توجہ دی۔ اس نے بھی شاعروں اور موسیقی کے استادوں کا حوصلہ بڑھایا، ان کی عزت افزائی کی۔ وہ خود بہت اچھا شاعر تھا اس لئے حسن، موسیقی اور شراب کا دلدادہ تھا۔

معتزلہ کا یہ پورا قصہ میں نے یوں ہی بیان نہیں کیا بلکہ اس کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کا سبب مامون کا جاہل بھائی خلیفہ معتصم ہے جو اس قصر خلافت میں رات کے وقت اسی سے کوڑی بلوانے آئی ہوں۔

خلیفہ معتصم پڑھا لکھا تو تھا نہیں، سو اس نے جہل کے توسط مامون کے عقیدے کو قبول کر لیا۔ مامون کا دل پھر گداز تھا مگر اس آدم زاد کے سینے میں تو جیسے دل کی جگہ پتھر کا ٹکڑا رکھا تھا۔ اس نے جو اقدامات کئے وہ معتزلی عقائد پر مزید سختی سے کاربند رہنے کے لئے کئے۔ بندر کے ہاتھ جیسے ادرک لگ گئی تھی۔ اقتدار کا پھل تو گویا خود بخود اس کی گود میں آ گرا تھا۔ پھر بھلا وہ کیوں نہ اتراتا!

وہ سونے ہی والا تھا کہ میں نے اس کو مخاطب کیا۔ ''اے محمد کہ یہی تیرا اصل نام ہے، سن! اب تجھے بغداد چھوڑنا پڑے گا۔''

معتصم کا چہرہ فق ہو گیا۔ میں اسے زیادہ ڈرا کر مارنا نہیں چاہتی تھی، سو اتنا ہی کافی جانا۔ پھر میں نے اس کے دماغ پر توجہ دی۔ وہ نئے دارالخلافہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کہاں بنایا جائے؟ میری ترغیب پر آخر اس نے اپنی دانست میں فیصلہ کر ہی لیا۔

بغداد سے کچھ دور ایک علاقہ تھا۔ اس کا نام قاطول تھا۔ وہاں ہارون الرشید ایک شہر تعمیر کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی تکمیل نہ ہو سکی تھی۔ میرے ایما پر معتصم نے اس جگہ کو دارالخلافہ کے لئے پسند کیا۔ وہ اپنے بیٹے واثق کو بغداد میں اپنا نائب مقرر کر کے قاطول چلا گیا اور نئے شہر کی تعمیر شروع کرا دی۔ اسی شہر کو بعد میں سامرہ کہا جانے لگا۔ 220 ہجری میں اس شہر کی تعمیر مکمل ہوئی۔ تب تک معتصم کے حامی سوالی اہل بغداد کا خون پیتے رہے۔

انہی خون پینے والوں میں معتصم کا وزیر ابن زیارت تھا۔

معتصم کے عہد حکومت میں ترکوں کے علاوہ جن آدمیوں کو عروج حاصل ہوا ان میں وزیر ابن زیارت اور قاضی احمد بن داؤد شامل تھے۔ ابن زیارت کا شمار علمائے عصر میں ہوتا تھا لیکن اس کے ساتھ وہ نہایت مغرور اور ظالم بھی تھا۔ لوگوں کو سزا دینے کے لئے اس نے ایک تنور بنوایا تھا۔ اس تنور میں چاروں طرف میخیں لگی ہوئی تھیں۔ سزا یافتہ افراد کو اس تنور میں ڈال دیا جاتا۔ ذرا سی حرکت کرنے پر کیلیں چبھنے لگتیں۔ اگر کوئی رحم کی درخواست کرتا تو ابن زیارت کہتا، رحم ایک طرح کی کمزوری ہے۔

رہا قاضی احمد تو وہ قاضی القضاۃ ہونے کے علاوہ معتزلہ فرقے کا سربراہ بھی تھا۔ اس کا اثر مامون کے زمانے سے قائم تھا۔ معتزلہ عقائد کی اشاعت میں قاضی احمد کی رائے کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ مذہبی معاملات میں وہ خلیفہ معتصم کا مشیر خاص تھا۔

اسی مشیر خاص نے سامرہ جا کر اس کے گل کھلائے۔ میں اس سے تپی ہوئی تھی۔ دوسری جانب عارج مجھ سے پڑا ہوا تھا۔ اس کی تپش کا ایک سبب تو یہ تھا کہ اسے اعتماد میں لئے بغیر میں نے خلیفہ معتصم کو بغداد چھوڑ کے جانے پر مجبور کر دیا تھا، دوسری وجہ یہ تھی کہ جب اس نے سامرہ کی سیر کو جانے کے لئے کہا تو میں راضی نہ ہوئی۔ کچھ دن سے وہ مجھ سے الگ الگ اکھڑا اکھڑا رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مجھ سے عشق میں ہجر گوارا نہیں ہوتا۔ اس بات سے میں نے عارج کو کبھی آگاہ نہیں کیا ورنہ وہ شیر ہو جاتا۔ عارج کی طرف سے مجھے ایک خطرہ اور بھی لاحق ہوتا

جا رہا تھا کہ مجھے جلانے ہی کی خاطر سہی، وہ کسی اور جن زادی کے ساتھ نہ "اڑنے" لگے۔ اسی بنا پر میں بغداد سے نکل کر عارج کی تلاش میں چل دی۔ یہ شام کا وقت تھا اور ابھی مغرب نہیں ہوئی تھی۔

عارج مجھے سامرہ میں ملا۔ میں اس سے بولی۔ "یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"اے دینار! میں بھی تجھ سے پوچھتا ہوں کہ تو کہاں جا رہی ہے، کیا کر رہی ہے؟"

"مگر میں ضرور پوچھوں گی۔" میں نے زور دے کر کہا۔

کچھ دیر بحث مباحثے کے بعد عارج راہ پر آ گیا اور میں نے اس سے "صلح" کر لی۔

سامرہ میں نہ صرف معتصم کے محلات تھے بلکہ ڈھائی لاکھ فوج اور ڈیڑھ لاکھ سواروں کی سکونت کے لئے تعمیرات بھی کی گئی تھیں۔ خلیفہ نے ترک افسران کے لئے عالی شان مکانات بنوائے تھے۔ شہر کے بجائے سامرہ ایک بڑی فوجی چھاؤنی معلوم ہوتا تھا۔ قصر خلافت کی طرز پر یہاں بھی ایک بڑی عمارت بنوائی گئی تھی۔ کچھ عمارتیں ابھی خالی پڑی تھیں۔

"چند روز میں یہ ایک بارونق شہر بن جائے گا اے دینار!" عارج بولا۔ "اس کا اثر بغداد پر بھی پڑے گا۔ اصل مسئلہ آدم زادوں کے معاش کا ہے۔ روزی کی تلاش میں لوگ یہاں آ کر بس جائیں گے۔ تو بھی جانتی ہے کہ آدم زاد، حکمرانوں کے قریب رہنا چاہتے ہیں۔"

عارج کی رائے غلط نہیں تھی، لیکن میں نے یہی کہا۔ "بغداد کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ دارالخلافہ یہاں لے آیا گیا ہے تو......"

"بس رہنے دے۔" عارج نے میری بات کاٹ دی۔ "یہ بتا خلیفہ معتصم کو کس نے بغداد سے بھاگنے پر مجبور کیا؟"

"اس کے اعمال نے۔" میں برجستہ بولی۔

"لڑائی" کے بعد "صلح" ہوئی تھی اس لئے عارج نے چپ سادھ لی۔

دارالخلافہ کی تبدیلی کے بعد بغداد والے، ترک غلاموں سے محفوظ ہو گئے۔

ترک سرداروں میں افشین نے معتصم کی قربت حاصل کر لی تھی۔ معتصم نے اسے اپنی فوج کا خاص امیر مقرر کر دیا تھا۔ افشین کے علاوہ اشناس، ایتاخ اور عجیف بھی ترک ہی

تھے۔ فوج کے سالاروں میں انہی چاروں کا سکہ چلتا تھا۔ رومیوں کے خلاف بھی انہوں نے جنگیں لڑیں۔ یہ واقعہ 223 ہجری کا ہے کہ والیء روم توفل بن میخائیل نے اسلامی مملکت کی طرف اپنے ناپاک قدم بڑھائے۔ اسی کو تھیوفیلس بھی کہا جاتا تھا۔ اسے شہ دینے والا دراصل بابک خرمی تھا جو اپنے انجام کو پہنچا۔

والیء روم نے موقع غنیمت جان کر ایک سرحدی علاقے زبطرہ پر چڑھائی کر دی۔ زبطرہ میں رومیوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ مردوں کو ان بدذاتوں نے مار ڈالا، عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا۔ زبطرہ کو تباہ کرنے کے بعد تھیوفیلس نے ایک اور شہر ملطیہ کا رخ کیا۔ اس نے ملطیہ والوں سے بھی وہی سلوک روا رکھا جو اہل زبطرہ سے کیا تھا۔

خلیفہ معتصم اپنے نئے دارالخلافہ میں عیش کر رہا تھا۔ غافل حکمرانوں کی سزا عوام کو بھگتنی پڑتی تھی۔ معتصم بھی غافل ہی تھا جب اسے میں نے یہ خبر دی۔ وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔

"اپنی ماں ماردہ اور باپ ہارون کی قسم، ہم تھیوفیلس سے انتقام لیں گے۔" خلیفہ معتصم نے یہ کہتے ہوئے اپنی گھنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ اس کا رنگ مامون کی طرح گورا اور سرخی مائل تھا، قد اوسط تھا۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود اس کی مجموعی شخصیت بارعب معلوم ہوتی تھی۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی اس نے سامرہ کے قصرِ خلافت میں دربار لگایا۔

"امیر المومنین یہ جاننا چاہتے ہیں کہ زبطرہ اور ملطیہ میں کیا ہوا؟" خلیفہ معتصم کی بھاری آواز دربار میں گونجی۔ وہ اپنے ہی منہ سے خود کو امیر المومنین کہتے ہوئے ذرا نہیں جھجکتا تھا۔ آدم زاد ایسے ہی بڑ بولے اور شیخی خورے ہوتے ہیں۔

ایک درباری ہمت کر کے بولا۔ "اے امیر المومنین! اس غلام تک یہ اطلاع پہنچی ہے کہ زبطرہ میں بنو ہاشم کی ایک عورت کو رومی کشاں کشاں لئے جاتے تھے۔ وہ عورت مدد کے لئے امیر المومنین کو پکار رہی تھی۔"

"بے شک...... بے شک۔" کہتا ہوا خلیفہ معتصم مسند خلافت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے مزید کہا۔ "قصرِ خلافت میں کوچ کی منادی کرا دی جائے۔"

دربار برخاست کر کے معتصم، قصرِ خلافت سے نکلا اور گھوڑے پر سوار ہوا۔ محافظ دستہ

اسے گھیرے میں لئے ہوئے تھا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دارالعوام کی طرف چل دیا۔ گزشتہ تین سال کے دوران میں سامرہ واقعی ایک بارونق شہر بن گیا تھا۔ میں اب اکثر بغداد سے یہاں آتی رہتی تھی اور عارج بھی میرے ساتھ ہوتا تھا۔

دارالعوام، یعنی عوام کا گھر قصرِ خلافت سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ الگ بات کہ نام تو عوام کا تھا کام یہاں حکمران وقت کرتا تھا۔ اس "عوامی گھر" یا "عوامی مرکز" کی توجیہہ یہ تھی کہ خلیفہ اپنی دانست میں یہاں عوام کو درپیش مسائل حل کرتا تھا۔ حکمران اسی طرح اپنے مسائل کو عوام کے مسائل کا نام دے دیتے ہیں۔

خلیفہ معتصم کا مسئلہ اس وقت صرف یہ تھا کہ اگر وہ جنگ میں مارا جائے تو اس کا مال و متاع رائیگاں نہ جائے۔

"اے عارج! اس موقع سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔" میں بولی۔

عارج نے کہا۔ "کیسا فائدہ اے دینار؟"

میں نے وضاحت کی۔ "خلیفہ اپنا مال بانٹنے والا ہے۔ اس کے دماغ میں یہ ہے کہ سب کچھ اپنی اولاد کو بانٹ دے۔"

"اور تو کیا چاہتی ہے؟" عارج نے پوچھا۔

"مال کے تین حصے ہونے چاہئیں۔" میں نے جواب دیا۔ "پہلا حصہ اولاد کے لئے، دوسرا خادموں کے لئے اور تیسرا حصہ راہِ خدا میں خرچ ہو۔ اس سے غریب آدم زادوں کا بھلا ہوگا۔"

عارج نے مجھ سے اتفاق کیا اور میں نے خلیفہ معتصم کو پٹی پڑھادی۔

دارالعوام میں آ کر معتصم نے امرائے لشکر کو جمع کیا۔ کوئی اہم قدم اٹھانے سے پہلے معتصم بڑے عہدوں والے فوجی افسران سے ضرور مشورہ کرتا تھا۔ ایک فوجی افسر کہنے لگا۔

"اے امیر المومنین! یہ وقت علماء، صلحاء (صالح کی جمع) اور قاضیوں کو اعتماد میں لینے کا ہے۔"

"انہیں اپنے امیر المومنین پر کیا اعتماد نہیں رہا؟" خلیفہ معتصم کی تیز آواز سے غصے کا اظہار ہونے لگا۔ "عالم اور قاضی ہمیں اپنی وفاداری کا یقین دلائیں۔ اعتماد میں وہ ہمیں لیں، نہ کہ ہم!"

"امیر المومنین نے بجا فرمایا۔" فوجی افسر گڑبڑا گیا۔ "غلام کا مقصد یہ تھا کہ قاضی بغداد

عبدالرحمٰن بن اسحاق اور شعبہ بن سہل کو معززین بغداد اور علماء و صلحاء کے ساتھ حضور یہاں طلب کریں۔"

معتصم کے چہرے کا تناؤ ختم ہو گیا۔ اس کے حکم پر مطلوبہ افراد کی جو فہرست بنائی گئی، اس میں تین سو تیس آدم زادوں کے نام تھے۔ اس کے ساتھ معتصم نے اپنے تمام مال و اسباب کی فہرست بھی بنوائی۔

خبر یہ تھی کہ تھیوفیلس اپنے ساتھ ایک لاکھ سے زیادہ سپاہی لے کر آیا ہے، مزید کمک اسے پہنچنے والی ہے۔

بنو عباس عرصہ دراز سے روم کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرتے آئے تھے۔ سو معتصم کا بھی یہی عزم تھا۔

اگلے روز وہ افراد آ گئے جنہیں طلب کیا گیا تھا۔ ان سب کی موجودگی میں خلیفہ معتصم نے تقسیم کی دستاویز لکھوائی کہ وہ گواہ رہیں۔ بطور گواہ دستاویز پر منتخب عالموں اور قاضیوں نے دستخط کئے۔

معتصم نے میرے ہی ایماء پر اپنا مال و متاع اسی طرح بانٹا جیسا میں چاہتی تھی۔

دوسری جمادی الاول 223 ہجری کو خلیفہ معتصم نے غربی دجلہ کی طرف کوچ کیا۔

بہت تھوڑی مدت میں معاوضے کے بغیر لڑنے والوں اور باقاعدہ تنخواہ دار فوجیوں کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا۔ (جم غفیر اتنا بڑا گروہ جس کی انتہا دکھائی نہ دے۔ جم بہ معنی گروہ۔ مصنف)

روانگی سے قبل معتصم نے سالار عجیف اور عمر فرغانی کو اہل زبطرہ کی امداد کے لئے روانہ کر دیا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ لشکر کے بڑے لڑاکا افسران تھے۔ یہ دونوں زبطرہ میں اس وقت داخل ہوئے جب رومی اس شہر کو ویران و غارت کر کے آگے بڑھ چکے تھے۔ عجیف و عمر کے پاس اب یہی راستہ تھا کہ وہاں ٹھہر کر خلیفہ کے حکم ثانی کا انتظار کریں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

زبطرہ والے رومیوں کے طوفان بدتمیزی فرو ہونے اور مسلمان فوج کی آمد کے بعد رفتہ رفتہ زبطرہ میں آ کر آباد ہونے لگے۔ ادھر سامرہ سے چل کر خلیفہ معتصم نے پہلا پڑاؤ ڈالا۔ زبطرہ بھیجی جانے والی فوج کو اس اثناء میں معتصم نے واپس بلا لیا تھا۔

ایک بڑے خیمے کے اندر خلیفہ وقت نے دربار لگایا کہ اس کے بغیر اسے چین کیسے آ جاتا۔ خودنمائی کا اس سے بہتر اظہار اور کہاں ہوتا!

معتصم نے اپنے درباریوں سے سوال کیا۔ "رومیوں کے نزدیک کون سا شہر عمدہ اور عالی شان ہے؟"

"اے امیر المومنین! وہ شہر عالی شان عموریہ ہے۔" ایک درباری نے بتایا۔

"تو پھر ہم بہت جلد...... اس شہر کو فتح کریں گے!" معتصم بارعب آواز میں بولا۔ "ایک بھرپور جنگ کی تیاری کی جائے۔"

خلیفہ معتصم کے ساتھ دو لاکھ سے زیادہ فوج تھی، اس پر بھی وہ مطمئن نہ تھا۔ رومیوں پر وہ ایسی ضرب لگانا چاہتا تھا کہ پھر اٹھ نہ سکیں۔ اس سے قبل کسی جنگ میں اس قدر ساز و سامان اور آلاتِ حرب مہیا نہیں کئے گئے تھے۔

طرطوس کے قریب پہنچ کر معتصم نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا اور تین مختلف سمتوں سے رومیوں پر حملے کی تدابیر اختیار کیں۔ ایک فوج کی سالاری اس نے افشین کے سپرد کی، دوسری فوج پر اشناس کو مقرر کیا اور تیسری فوج اپنی نگرانی میں رکھی۔

افشین و اشناس کو مختلف سمتوں سے معتصم نے انگورہ (انقرہ) پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ افشین کو سرحد حرث سے اور اشناس کو طرطوس کی طرف سے بھیجا۔ اشناس کو معتصم نے ہدایت کر دی کہ مقام صف صاف تک پہنچ کے رک جائے اور خلیفہ کا انتظار کرے۔ تقسیم کی بازی گاہ اس کی نہ سہی میدانِ جنگ کو وہ اپنا سمجھتا تھا۔

عارج اور میں دونوں ہی سرگرم تھے۔ ہمارا واحد مقصد محض یہ تھا کہ مسلمانوں کو شکست کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ اس کے لئے تھیوفیلس کی نقل و حرکت پر میری نظر تھی۔ میں نے ایک شب اس کو جاگتے دیکھا۔ اس کے لشکر میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی دی۔ مجھے کچھ ہی دیر میں اس کی وجہ معلوم ہو گئی۔ تھیوفیلس کے خیمے میں رومی سالار جمع ہو چکے تھے۔ اس اجلاس میں جو جنگی حکمت عملی رومیوں نے طے کی اسے بغور سن کر میں واپس خلیفہ معتصم کے لشکر میں آ گئی۔ اس وقت نصف شب ہو رہی تھی۔

بے خبر معتصم کو میں نے جگا دیا اور پھر اسے رومیوں کی جنگی حکمت عملی سے آگاہ کر دیا۔

"سن! اول تو کسی میں اتنا دم نہیں کہ تجھ سے پوچھ سکے، سب کچھ کیسے معلوم ہوا۔ پھر

بھی کوئی سوال کرے تو کہہ دیجو تیرے خاص الخاص جاسوسوں نے یہ خبر دی ہے۔" میں نے خلیفہ معتصم کے کان میں سرگوشی کی۔ اسے بھی میں نے مصلحت کے تحت "نیک روح" ہونے کا جھانسہ دیا تھا۔

پھر خلیفہ معتصم نے جو اقدامات کئے میرے ہی زیرِ اثر رہ کر کئے۔ اس نے اشناس کو لکھ بھیجا کہ تمہیں جس مقام پر فرمان ہذا ملے اسی مقام پر تین دن کے لئے رک جانا۔ ہم اس عرصے میں تمہارے پاس آ پہنچیں گے۔

مندرجہ بالا فرمان کے بعد ایک دوسرا فرمان اشناس کو اس مضمون کا بھیجا گیا۔ "تم اپنے لشکر کے سالاروں میں سے کسی ہوشیار سالار کو ایک دستہ فوج کے ساتھ والئی روم اور رومی لشکر کے حالات دریافت کرنے پر مامور کر دو۔"

عارج نے مجھے بتایا کہ دوسرے فرمان پر کیا عمل ہوا۔

اشناس نے عمر فرغانی کو دو سو سواروں کی جمعیت کے ساتھ خلیفہ کے حکم کی تعمیل پر مقرر کیا۔ عمر فرغانی نے انگورہ (انقرہ) پہنچ کر اپنے ہمراہیوں کو رومیوں کی جستجو میں پھیلا دیا۔ فوج کے اس دستے میں بہترین لڑاکا سوار تھے۔ ان کی ایک خصوصیت سراغ رسانی بھی تھی۔ دو سو سراغ رساں بہت ہوتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد رومیوں کی ایک جماعت عمر فرغانی کے سامنے پیش کر دی گئی۔ ان میں سے بعض رومی لشکر کے ملازم تھے اور بعض انقرہ کے قرب و جوار میں رہنے والے تھے۔

پکڑ کر لائے جانے والوں نے بیان کیا کہ والئی روم ایک مہینے سے مسلمان فوج کے ہر اول دستوں کے انتظار میں پڑاؤ کئے ہوئے تھا۔ تیسرے دن کا ذکر ہے کہ تھیوفیلس یہ خبر پا کر عساکر اسلامیہ (یعنی افشین کا لشکر) بلاد آرمینیہ کی جانب سے مملکتِ روم میں داخل ہو گیا ہے تو وہ اپنے ماموں زاد کو لشکر پر مقرر کر کے آرمینیہ کی جانب کوچ کر گیا۔

عمر فرغانی ان رومیوں کو اشناس کے پاس لے آیا۔ اشناس نے انہیں براہِ راست خلیفہ معتصم کے پاس بھیج دیا۔

خلیفہ معتصم نے ایک خط افشین کے نام اس مضمون کا لکھا۔

"تم ہمارا حکم ثانی ملنے تک قیام کرو۔ بادشاہ روم تم پر حملہ کرنے کی غرض سے تمہاری طرف بڑھ رہا ہے۔"

معتصم نے افشین تک یہ خط پہنچا دینے کا دس ہزار درہم صلہ مقرر کیا۔
یہ خط افشین تک اس لئے نہ پہنچ سکا کہ وہ مملکت روم کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔
دوسرا پیغام معتصم نے اشناس کے نام حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔
اشناس نے اس حکم کی فوراً تعمیل کی۔ خلیفہ معتصم اپنا لشکر ظفر پیکر لئے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

جب انقرہ (قدیم نام: انگورہ) تین منزل کی دوری پر رہ گیا تو اشناس نے عیسائیوں پر مسلمانوں کی دہشت بٹھانے کے لئے انہیں قتل کرنا شروع کیا۔ جن آدم زادوں کو قتل کرنے کی غرض سے ایک جگہ جمع کیا گیا ان میں سے ایک بوڑھے عیسائی نے دست بستہ عرض کیا۔
''تم میرے قتل سے کیا فائدہ اٹھاؤ گے؟'' اس وقت تم اور تمہارا لشکر رسد و غلہ نہ پہنچنے سے ایک مصیبت میں گرفتار ہے۔ تم مجھے رہا کر دو تو میں تمہیں ایک ایسے گروہ کا پتہ بتا دوں گا جو انگورہ سے بہ خوف جنگ بھاگ گیا ہے۔ اس گروہ کے پاس کافی غلہ ہے۔''
اشناس نے مالک بن کرد کو پانچ سو سواروں کے ساتھ اس بوڑھے عیسائی کے ہمراہ روانہ کر دیا اور اسے یہ ہدایت کر دی کہ جب یہ بوڑھا عیسائی انگورہ سے فرار ہونے والے گروہ کا پتہ صحیح صحیح بتا دے تو اسے رہا کر دیا جائے۔
بوڑھے عیسائی نے بہ امید رہائی مالک بن کرد کو انقرہ کے مطلوبہ گروہ کے سر پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔
مالک بن کرد نے اس گروہ پر اچانک حملہ کیا۔ وہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ عرصہ جنگ میں دشمنوں پر رحم نہیں کیا جاتا۔ رحم کا مطلب خود کو موت کے دہانے میں دھکیلنے کے مترادف ہوتا ہے۔ سو مالک بن کرد نے بھی ان عیسائیوں پر رحم نہ کیا اور ان کے پاس جو کچھ غلہ و اسباب تھا، لوٹ لیا۔
اس گروہ کے ساتھ وہ بھی زخمی تھے جو تھیوفیلس کے ہمراہ افشین کے ساتھ جنگ میں شریک تھے۔ ان زخمی فوجیوں نے پوچھنے پر بیان کیا کہ ہم لوگ بادشاہ روم کی رکاب میں تھے۔ جس وقت یہ خبر پہنچی کہ مسلمان فوجیں اطراف آرمینیہ سے مملکت روم میں داخل ہو گئی ہیں تو بادشاہ روم نے اپنے ماموں زاد کو نصف فوج کے ساتھ وہیں چھوڑا اور بقیہ نصف فوج کو ساتھ لے کر آرمینیہ کی طرف کر دیا۔ ہم لوگ بھی بادشاہ کے ساتھ ساتھ تھے۔ ہم لوگوں

نے اس وقت مسلمانوں کو جا کر گھیر لیا جب کہ وہ نماز صبح ادا کرنے میں مشغول تھے۔ ہم نے لڑ کر انہیں پسپا کر دیا، ان کے جنگ آوروں کو قتل کر ڈالا اور ہماری فوج باقی ماندہ کے تعاقب میں پھیل گئی۔ ظہر کے وقت مسلمان پھر واپس آئے۔ لڑائی ہوئی اور وہ ہم پر غالب آئے۔ انہوں نے ہمارے مورچوں پر قبضہ کر لیا اور ہمارے خیموں میں آگ لگا دی۔ ہمارا بادشاہ تھیوفیلس ہم سے جدا ہو گیا۔ اسے میدان جنگ سے بھاگ کر اپنی جان بچانی پڑی۔ ہم ٹھوکریں کھاتے ہوئے اس پڑاؤ کی طرف آئے جہاں نصف فوج چھوڑی گئی تھی۔ یہاں یہ گل کھلا ہوا تھا کہ لشکری اپنے سردار تھیوفیلس کے ماموں زاد سے بگڑ گئے تھے۔ لشکر میں چاروں طرف ایک طوفان بدتمیزی برپا تھا۔ اگلے دن وہاں ہمارا بادشاہ بھی آ پہنچا۔ ہنگامہ فرو ہو گیا۔ بادشاہ روم نے بہ الزام بغاوت اپنے نائب اور ماموں زاد کو سزائے قتل دی۔ پھر اس نے انقرہ کو بچانے کے لئے تمام مملکت میں احکام جاری کئے مگر لا حاصل! انقرہ کے باشندے مسلمانوں سے خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے۔ ہمارے بادشاہ نے اپنے سرداروں کو عموریہ کی طرف کوچ کا حکم دیا۔ ہم موقع ملتے ہی لشکر سے فرار ہو گئے۔ ہمیں راستے میں یہ لوگ مل گئے جو انقرہ سے فرار ہوئے تھے۔
یہ پورا قصہ سن کر مالک بن کرد باغ باغ ہو گیا۔ یہ بہت بڑی خبر تھی کہ انقرہ کو فتح کر لیا گیا ہے۔ مال غنیمت اور قیدیوں کو لئے ہوئے وہ اشناس کے پاس آیا۔ اشناس نے بوڑھے عیسائی کو حسب وعدہ رہا کر دیا اور خلیفہ معتصم کو ان واقعات کی اطلاع دی۔
میں نے ابھی جو واقعہ بیان کیا ہے ماہ شعبان کی 25 تاریخ کا ہے۔ دوسرے دن خلیفہ معتصم مفتوحہ علاقے میں پہنچ گیا۔ انقرہ پر اب مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ تیسرے دن معتصم نے بہ قصد جنگ انقرہ سے کوچ کیا۔ میمنہ پر افشین اور میسرہ پر اشناس کو مقرر کیا۔ خود خلیفہ قلب لشکر میں رہا۔ پوری فوج کو معتصم نے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہر حصہ دوسرے سے دو دو کوس کے فاصلے پر رکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ ہدایت کر دی گئی کہ مابین انقرہ عموریہ جس قدر قصبات و دیہات ملیں انہیں ویران و مسمار کر دیا جائے۔
افواج کو مختلف راستوں سے عموریہ کی طرف بڑھنے کا حکم ملا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ہونے والی متوقع خوفناک جنگ میں عمارج نے اہم کردار ادا کیا۔
ابھی لڑائی شروع نہیں ہوئی تھی اور مسلمان افواج نے عموریہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ دشمن

قلعہ بند ہو گیا۔ خلیفہ معتصم نے صورتحال کا جائزہ لیا اور ہر ایک سمت کو اپنے سالاروں پر تقسیم کر دیا۔

میں، خلیفہ معتصم کے ساتھ ساتھ تھی کہ ضرورت پڑنے پر اسے اپنے اثر میں لے سکوں۔ معاً مجھے عارج کے وجود کی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی تو میں چونک اٹھی۔ سامنے سے میں نے متوسط عمر کے ایک آدم زاد کو آتے دیکھا۔ محافظ دستے کا نگران اس آدمی کے ساتھ تھا۔

اس اجنبی آدم زاد کو معتصم کے حضور پیش کیا گیا۔ یہ واقعہ نماز عشاء کے بعد کا ہے۔

اس سے پہلے کہ معتصم سوال کرتا کہ وہ آدم زاد کون ہے، عارج میرے قریب آ گیا۔

''اے عارج! یہ اجنبی کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ وہ ہے..... وہ مسلمان آدم زاد کہ جسے زبردستی عیسائی بنا لیا گیا تھا۔'' عارج نے جواب دیا۔

''تجھے یہ کہاں مل گیا؟''

''اسے میں ہی تو قلعے کے اندر سے نکال کر لایا ہوں۔ اب اے دینار، تو سوال کرے گی کہ کیوں؟ تو میں پہلے کیوں نہ بتا دوں کہ مجھے تیرے ہی نقش قدم پر چلنے کا شوق ہو گیا ہے..... کام اس طرح دکھاؤ کہ آدم زادوں کو خبر نہ ہو، جنات ان کے ساتھ ہیں۔ وہ جو بھی قدم اٹھائیں اسے اپنی ہی کوششوں کا نتیجہ سمجھیں۔'' عارج مجھے تفصیل سے بتانے لگا۔ میں نے قلعے کو گھوم پھر کر دیکھا تو پتہ چلا کہ اس کی دیواریں بہت مضبوط ہیں، اسے فتح کرنا سخت مشکل ہو گا۔ سو آسانی کی خاطر میں باطیس کے پاس پہنچ گیا۔ بادشاہ روم تھیوفیلس کی طرف سے باطیس ہی اس قلعے کی حفاظت پر مامور تھا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جو اس قلعے کی فتح میں مددگار ثابت ہو..... اور وہ بات، مجھے معلوم ہو گئی۔ قلعے کی ایک دیوار کے لئے باطیس نے خاص طور پر حکم دیا کہ اس کی سخت نگرانی ہونی چاہئے۔ وجہ یہ کہ وہ دیوار دوسری دیواروں کے مقابلے میں کمزور ہے۔ جن سپاہیوں کو اس کمزور دیوار کی حفاظت پر مقرر کیا گیا ان میں ایک یہ آدمی بھی تھا جسے میں قلعے سے باہر لے آیا۔ اب تو خود ہی سن لے کہ وہ خلیفہ معتصم سے کیا کہہ رہا ہے!'' عارج یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

زبردستی عیسائی بنائے جانے والا مسلمان خلیفہ معتصم سے اپنی روداد بیان کر رہا تھا۔

''اے امیر المومنین! میں کیا کرتا کہ جب میری بیٹی اور بیوی کو وہ ظالم اٹھا کر لے گئے؟ ان کی جان بخشی کے لئے انہوں نے شرط لگائی کہ میں عیسائی ہو جاؤں۔ اگر صرف میری زندگی کا معاملہ ہوتا تو یقیناً میں اپنی جان دے دیتا اور ہرگز اپنا مذہب نہ چھوڑتا، لیکن.....''

''طولانی کلام سے گریز کر!'' معتصم نے تاکید کی۔

پھر اس آدم زاد نے جلدی جلدی وہ سب کچھ کہہ دیا جو عارج مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا۔

معتصم نے اس کمزور دیوار کے سامنے منجنیقیں نصب کرا دیں اور سنگ باری کا حکم دے دیا۔

دیوار کے ٹوٹتے ہی مسلمانوں نے قلعے پر حملہ کر دیا۔ شدید جنگ ہوئی جس میں ہزارہا عیسائی کام آئے۔ قلعہ دار باطیس نے مجبور ہو کر خلیفہ معتصم سے امان طلب کی اور مسلمان فوج نے بڑھ کر قلعے پر قبضہ کر لیا۔

معتصم نے خود اس جنگ میں حصہ لیا تھا اور اپنے حفاظتی دستے کے ساتھ عیسائیوں پر حملے کئے تھے۔

عموریہ پر قبضے کے وقت جو مال و اسباب، غلام اور کنیزیں مسلمانوں کے ہاتھ لگیں ان میں سے غلاموں اور کنیزوں کو معتصم کے حکم پر نیلام کیا گیا۔ یہ آدم زاد اپنے ہی جیسوں کی بولیاں لگواتے اور اشرف المخلوقات کہلواتے ہیں۔ ہم جنات لاکھ برے سہی مگر ایک دوسرے کو سر بازار یوں رسوا نہیں کرتے۔

اسی اثناء میں فاتح آدم زادوں، یعنی مسلمانوں نے قلعے میں موجود مفتوحوں کو رگیدنا شروع کر دیا۔ ایک ایک مسلمان سپاہی پانچ پانچ دس دس قیدیوں کو ہانکے ہوئے لاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں قیدیوں کی بھیڑ لگ گئی۔ اس سے قبل وہ کلیسا میں گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے دعائیں مانگ رہے تھے کہ اے خداوند خدا ہمیں مسلمانوں کی یلغار سے بچا لے، وہ ہم پر اگنی بان (آگ کے تیر) پھینکتے ہیں اور ہمارے مضبوط قلعوں میں آگ لگا دیتے ہیں۔

وہ منظر میں نے خود دیکھا۔ بے عمل عیسائیوں کو ان کی عبادت گاہوں میں روتے، گڑگڑاتے اور دعائیں مانگتے سنا۔ میں گواہ ہوں ان ساعتوں کی اور کہے گئے ان لفظوں کی جو اب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔

میں نے ایک پادری کی عبرت اثر دعا سنی، اس کی داڑھی کے بال آنسوؤں سے بھیگے

ہوئے تھے اور وہ کہہ رہا تھا:

''اے خداوند خدا!

وہ ہماری بستیوں میں گھس آئے ہیں

ہماری کنواریوں اور بیاہیوں نے ان کے لئے اپنے دروازے کھول دیئے ہیں

ان کے ریشمی لبادے شانوں سے پھسل رہے ہیں

اے خداوند!

تو نے ہی تو ان کے اور ان کے گھوڑوں کے نتھنوں میں ایسی طاقت کا دم پھونکا ہے

کیا تو انہیں طوفانوں کی طرح بڑھنے سے روک نہیں سکتا

اگنی بان ہماری طرف لپکتے ہیں

اور ہمارے گھوڑے ہمیں ہی کچلنے کو لوٹ پڑتے ہیں

اے خداوند!

کیا تو انہیں نہیں دیکھتا کہ وہ تیز آندھیوں کی طرح آتے ہیں اور ہم پر چھا جاتے ہیں

اور ان کا لہو ایڑیوں پر نہیں ان کے پنجوں پر گرتا ہے

اے خداوند!

ہمیں پناہ دے

اے خداوند!

ہمیں ان کے قہر سے بچا لے

مگر ہوا کیا؟ یہ سوال بڑا روح فرسا ہے۔ خدا نے ان عیسائیوں کو مسلمانوں کی یلغار سے نہیں بچایا۔ وجہ؟ اس لئے کہ مسلمان اس دور کے مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں دیگر تمام اقوام عالم سے افضل و برتر تھے۔ فن حرب و ضرب میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس کے برعکس دوسری قومیں پسماندہ اور کم علم تھیں۔ فتح ہمیشہ علم کی ہوتی ہے، جہل کی نہیں!

نتیجہ کیا ہوا؟ جن بڑے مال داروں، رئیسوں اور معمولی عیسائی آدم زادوں نے عموریہ کے سب سے بڑے کلیسا میں پناہ لے لی تھی، اس کلیسا سے انہیں نکلنے پر مجبور کر دیا گیا۔

ان قید ہونے والوں میں جو شریف اور بے گناہ تھے، میں نے ان کی نشاندہی کر دی۔ خلیفہ معتصم کے حکم پر ان آدم زاد عیسائیوں کو الگ کر دیا بقیہ کے قتل کا حکم دے دیا گیا۔

اس دوران میں ایک روز بعض لشکریوں نے مال غنیمت کو لوٹنا شروع کر دیا۔ میں نے خلیفہ کو یہ خبر پہنچا دی۔ ''نیک روح کی سرگوشیاں'' خلیفہ معتصم کے لئے گویا پتھر کی لکیر تھیں۔ وہ فوری طور پر مطلوبہ مقام تک پہنچا۔ لشکریوں نے جیسے ہی معتصم کو وہاں دیکھا مزید لوٹ مار سے باز آ گئے۔ اس نے اپنی بھاری آواز میں حکم دیا۔

''اس قلعے کو منہدم کر کے جلا دیا جائے۔''

پھر وہ اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا اپنی خیمہ گاہ کی طرف پلٹ آیا۔ یہ خیمہ گاہ قلعے سے باہر تھی۔ معتصم کے حکم پر اس مضبوط و مستحکم قلعے کو مسمار کر کے جلا دیا گیا۔

عموریہ کی جنگ پچاس دن تک جاری رہی۔ اس عرصے میں تھیوفیلس، عموریہ والوں کی مدد کے لئے کوئی کمک روانہ نہ کر سکا۔ عموریہ کی فتح نے تھیوفیلس پر معتصم کی برتری ثابت کر دی اور اس نے یہی مناسب سمجھا کہ معتصم سے صلح کر لی جائے۔

جنگ کا رسیا امن یا صلح کی بات سننے کا روادار نہیں تھا، لیکن میرا نقطہ نظر معتصم سے قطعی مختلف تھا۔ جنگوں میں آدم زادوں نے ایک دوسرے کا بہت خون بہایا ہے۔ سو اگر ممکن ہو تو جنگ سے گریز کرنا چاہئے۔ میں نے خلیفہ معتصم کے دماغ میں یہ بات ڈال دی کہ وہ تھیوفیلس سے صلح کر لے۔ وہ بھلا ایک ''نیک روح'' کی بات کیسے ٹال دیتا۔ اسے جنگ کی بجائے صلح پر آمادہ ہونا پڑا۔

معتصم اور تھیوفیلس کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کی رو سے دونوں حکمران آدم زادوں نے امن و امان برقرار رکھنے کی ذمے داری لی۔ معتصم نے اس معاہدے کے بعد اپنے دارالخلافہ سامرہ کے لئے سفر اختیار کیا۔

واپسی کے سفر میں پڑاؤ پر رات کے وقت میں اور عارج بس یوں ہی شاہی لشکر گاہ کا چکر لگا رہے تھے۔ نصف شب قریب تھی۔ عارج مجھے سمرا کی طرف لے جانے کے لئے ''پھسلا'' رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ خود میں بھی اب معتصم کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ سامرہ کی بجائے میرا ارادہ بغداد جانے کا تھا۔ یہ اسی رات کا ذکر ہے کہ عارج آگے بڑھتے ہوئے ٹھٹک کر رک گیا۔

اس سے پہلے کہ میں عارج سے کچھ پوچھتی وہ کہنے لگا۔ ''اے دینار! یہ آدھی رات کو اس خیمے سے چیخ و پکار کی آوازیں کیوں آ رہی ہیں، دیکھتے ہیں۔''

"چھوڑ بھی اے عارج، ہم کیا کیا دیکھیں گے۔ یہ آدم زاد تو ہیں ہی فسادی۔" میں بولی۔

"ٹھیک کہتی ہے تو۔" عارج بے وجہ فوراً راضی ہو گیا۔ اس کی خواہش نے لفظوں کا پیرہن اختیار کر لیا، بولا۔ "تو صحرا کی طرف چلتے ہیں۔"

"بالکل نہیں۔" میں فوراً پلٹا کھا گئی۔ مقصد عارج کو ستانا تھا۔

"آدم زادوں کی خیر خبر لینے نہیں دے گی۔ صحرا میں میرے ساتھ چلے گی نہیں۔ آخر تو چاہتی کیا ہے؟"

"وہی جو تو نہیں چاہتا۔"

"میں کیا نہیں چاہتا؟"

"میں کیوں بتاؤں؟"

"دیکھ اے دینار! تو نے مجھے زیادہ ستایا تو جدھر جی میں آئی نکل جاؤں گا۔ پھر تو مجھے ڈھونڈتی پھریو۔"

"مجھے غرض نہیں جو تجھے ڈھونڈتی پھروں۔"

"تو بول، چلا جاؤں میں؟"

"تجھے جانا ہوتا تو اب تک چلا گیا ہوتا۔ یوں بھی جانے والے پوچھ کر نہیں جاتے۔ خیر......" اس وقت میری نگاہ سامنے والے خیمے کی طرف پڑی اور میں چونک اٹھی۔ وہ خیمہ سابق خلیفہ مامون الرشید کے بیٹے عباس کا تھا، میری حیرت کا سبب یہ تھا کہ اس خیمے سے معتصم کا ایک اہم سالار اشناس نکل رہا تھا۔ یہ بات میرے علم میں پہلے سے تھی کہ عباس بن مامون بھی لشکر کے ساتھ ہے۔ اس بے وقوف نوجوان کو میں نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی، میں ہی کیا خود مامون کے نزدیک عباس ابھی اس قابل نہیں تھا کہ بارِ خلافت اٹھا سکے۔ عباس ہی کیا، مامون کی اولاد میں سے کوئی عمر کے اعتبار سے خلیفہ بننے کے اہل نہ تھا۔ اسی بنا پر اس نے اولاد پر اپنے بھائی کو ترجیح دی تھی۔ عارج نے جسے "چیخ پکار" کہا وہ محض تیز آوازیں تھیں جو عباس کے خیمے سے ہی سنائی دی تھیں۔

"تو نے اپنی بات پوری نہیں کی اے دینار!" عارج نے مجھے ٹوکا۔

"ہاں...... تیرا تجسس درست تھا۔"

"کیسا تجسس؟"

"یہی کہ اس وقت سامنے نظر آنے والے خیمے میں کیا ہو رہا ہے!" میں نے وضاحت کی۔

"تیرا بھی کوئی جواب نہیں اے دینار! کبھی کچھ کہتی ہے کبھی کچھ!"

"تو ٹھہر، میں آئی دیکھ کر کہ کیا معاملہ ہے!"

"مجھے کیا تو نے پاگل سمجھا کہ یہاں ٹھہرا رہوں؟"

"پھر تو بھی ساتھ چل!... مگر میرے کسی کام میں مداخلت نہ کرنا۔" میں نے تاکید کی۔

"اگر یہ شرط ہے ساتھ چلنے کی تو میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

یہ سنتے ہی میں نے فضا میں غوطہ کھایا۔ دوسرے ہی لمحے میں عباس کے خیمے میں تھی۔

"اے محترم المقام خلیفہ زادے! یہ جو سالار اشناس ہے، بے عقل ہے۔ اس کی باتوں پر کان نہ دھریں۔"

یہ آواز میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ بولنے والا ایک عرب سردار عجیف بن عنبسہ تھا۔ معتصم اپنے اس سالار عجیف پر بڑا بھروسہ کرتا تھا۔

ذرا توقف سے عجیف کی آواز پھر آئی۔ "آپ نے خلیفہ مامون کی وفات پر بڑی غلطی کی اور ناحق خاموشی اختیار کئے رہے۔ میرے ہی نزدیک نہیں بلکہ تمام عرب سردار و سالار کے نزدیک آپ مستحق خلافت ہیں۔ اگر اس وقت آپ ذرا سا اشارہ کرتے تو لوگ آپ ہی کی بیعت کرتے۔ خلیفہ معتصم کی ترک نوازی سے تمام عرب سرداران بدظن ہیں، یقین کریں وہ آپ کی خلافت کے متمنی ہیں۔"

"ہمیں بھی اس کا اندازہ ہے۔" عباس بے وقوف اس طرح بولا جیسے خلیفہ بن گیا ہو، اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اس نے مزید کہا۔ "مسئلہ یہ نہیں کہ ہم خلافت کے اہل ہیں، مسئلہ دراصل یہ ہے کہ ہم اپنا حق کیسے وصول کریں۔"

"ہم عرب سرداروں نے عموریہ کی فتح کے بعد ہی اس مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا تھا۔" عجیف پراسرار انداز میں مسکرایا۔

"مگر ہمیں اس سے آگاہ کیوں نہیں کیا گیا؟" نوجوان آدم زاد عباس نے گویا جواب

طلب کیا۔

''اے خلیفہ زادے! کچھ باتوں کا زبان پر نہ لانا ہی بہتر ہوتا ہے۔''

''نہیں!'' عباس کی آواز تیز ہوگئی۔ ''ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ ہمیں حقائق سے فوراً آگاہ کیا جائے۔ یاد رکھو کہ کل ہم امیر المومنین ہوں گے۔''

''کل کیا، ہم تو آج بھی آپ ہی کو امیر المومنین خیال کرتے ہیں۔'' عجیف نے کہا۔

''اگر واقعی ایسا ہے تو ہمارے حکم کی تعمیل کرو۔''

''ہم عرب سرداروں نے طے کیا ہے کہ..... '' عجیف کی آواز دھیمی ہوگئی۔ ''خلیفہ معتصم اور دیگر ترک سرداروں کو موقع ملتے ہی قتل کر دیا جائے گا۔''

شمع دان کی مدہم روشنی میں عباس کا چہرہ مجھے ایک مطلبی اور احمق کا چہرہ معلوم ہوا۔ جیسے تیسے تو معتصم نے اپنی دھاک عیسائیوں پر بٹھائی تھی۔ اب اگر عباس جیسا ناتجربہ کار نوجوان خلیفہ وقت بن جاتا تو مسلمانوں کی تباہی لازمی تھی۔

ذاتی طور پر مجھے کبھی کسی مسلمان حکمران سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ وہ حکمرانی کرے نہ کرے، میری بلا سے! کوئی بھی خلیفہ بن جائے یا نہ بن سکے مجھ جن زادی کو اس سے کیا! میرا منشا و مقصود تو یہی رہا کہ خلق خدا خوش رہے، عوام کے دُکھ درد دور ہوسکیں۔ یہ کوئی تعلّی یعنی خودستائی نہیں، حقیقت ہے کہ میں نے متعدد ایسے کام کئے جو ثواب جاریہ کے زمرے میں آتے ہیں۔

موجودہ صورت حال ایسی تھی کہ خلیفہ معتصم کی طرف داری کرنی پڑی۔

درحقیقت اشناس اور دیگر دوکم رتبہ سالاروں عمر فرغانی نیز احمد بن کیل میں ان بن ہوگئی تھی۔ اس معاملے میں وہ عباس بن مامون کی حمایت حاصل کرنے گیا تھا، عباس نے اسے ٹرخا دیا۔ اس پر اشناس خفا ہوگیا اور اپنی اوقات بھول کر خلیفہ زادے عباس بن مامون کو دھمکی دی کہ خلیفہ معتصم کی نظروں میں آپ کو گرادوں گا۔ عباس کو یہ فخر تھا کہ وہ مامون کا بیٹا ہے۔ دوئم اس کے مداح سرائوں اور حمایتیوں کی کمی نہیں تھی، وہ اسی لئے بے وقوفی کر بیٹھا۔ اس نے اشناس کو اپنے خیمے سے نکل جانے کا حکم دیا اور یہ حکم تند و تیز آواز میں دیا گیا۔ عجیف بھی عباس کے پاس موجود تھا وہ کچھ نہ بولا۔ عجیف کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ اسے افشین کا بڑھتا ہوا اقتدار بہت ناپسند تھا۔ (یہ وہی ترک نژاد افشین ہے جس نے بابک خرمی جیسے باغی

کو نیچا دکھایا تھا) ایک افشین ہی پر کیا منحصر معتصم کی فوج میں ترکوں ہی کو برتری حاصل تھی۔ ہم عرب بھی عجیب ہیں۔ اپنے سوا ہم کسی کو قبول ہی نہیں کرتے۔ مامون الرشید کے زمانے میں بھی یہ فتنہ اٹھ چکا تھا جس پر بڑی مشکل سے قابو پایا گیا۔ اب پھر عرب و عجم کی جنگ چھڑنے کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ عربوں اور ترکوں کے اس جھگڑے میں مسلمان دشمن عیسائیوں کو سنبھل کر وار کرنے کا موقع مل جاتا۔

''میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گی۔'' میں بڑبڑانے لگی۔ اور پھر میں نے ایک ممکنہ تباہی کو روک لیا۔ ہزاروں بے گناہ آدم زادوں کا خون بہنے سے یہ کہیں بہتر تھا کہ چند اقتدار کے حریصوں کی قربانی دے دی جائے۔

عباس کے خیمے سے لوٹ کر آنے کے بعد عارج کے استفسار پر اسے مختصراً میں نے حالات سے آگاہ کر دیا۔

''اب تُو کیا کرے گی اے دینار؟'' عارج نے سوال کیا۔

''اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو بتانا نہیں چاہ رہی۔''

''تجھے یہ خیال ہے تو ایسا ہی سمجھ لے۔'' میں بات کو ٹال گئی۔

''وہ جو تو بغداد واپس چلنے کو کہہ رہی تھی؟''

''فی الحال نہیں۔'' میں نے انکار کر دیا۔ ''بغداد میں کیا رکھا ہے، اصل مورچہ تو یہاں لگا ہے۔''

عارج کیا کہتا، چپ ہو رہا۔ اس نے البتہ صحرا کی سیر کا مطالبہ ضرور کیا۔

''وقت موقع دیکھ لیا کر! تجھے سیر کی پڑی ہے اور یہاں حکمران وقت کو قتل کرنے کے سامان ہو رہے ہیں۔''

''لگتا یوں ہے اے دینار! کہ جیسے پوری مسلمان مملکت کا بوجھ تو نے ہی اٹھا رکھا ہے۔'' عارج نے چڑ کر مجھے بھی چڑایا۔

''ہاں اٹھا رکھا ہے بوجھ! تجھے اس پر کوئی اعتراض ہے؟''

''بالکل نہیں۔ تو آدم زادوں کے غم میں دبلی ہوتی رہ، مجھے یہ شوق نہیں۔''

''اے عارج! تو مجھے اس وقت کھسیانی بلی معلوم ہو رہا ہے۔''

''بلی تُو ہوگی۔ میں تو بلا ہوں۔''

''اسی بہانے تُو جن سے جانور تو بنا۔'' میں یہ کہہ کر زور سے ہنس پڑی۔

اس کے بعد عارج نے چپ سادھ لی۔ میں ہنستی ہوئی ایک طرف پرواز کرنے لگی۔ پلٹ کر دیکھا تو عارج میرے پیچھے پیچھے تھا۔ یہ علاقہ صف صاف کہلاتا تھا۔ یہیں خلیفہ معتصم نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ میں اس علاقے میں رکی نہیں اور عراق کی ایک آبادی فلوجہ کی طرف بڑھ گئی۔ بغداد اور فلوجہ کے درمیان جو صحرا تھا، وہیں ایک ویران جگہ پر میں اتر گئی۔

''اے دینار! تو کتنی اچھی ہے۔'' عارج بھی میرے قریب آ بیٹھا۔

''میں اچھی ہوں، تجھے یہ خبر اتنی جلدی کیسے مل گئی؟''

''سوال جواب چھوڑ! یہ بتا کہ تجھے میری بات ماننی ہی تھی تو مجھے کیوں سلگا رہی تھی؟''

''تجھے سلگتا دیکھتی ہوں تو مجھے مزہ آتا ہے۔''

''یعنی تُو اپنے مزے کی خاطر مجھ پر جبر کرتی ہے۔''

میں کچھ نہ بولی۔ فضا کا سحر مجھ پر طاری ہو رہا تھا۔ عارج اور میں دیر تک خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ خاموشی کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کچھ نہ کہنا بھی بہت کچھ کہنے کے مترادف ہوتا ہے۔ صبح ہونے سے کچھ پہلے ہم اس کیفیت سے نکلے اور صف صاف کی راہ لی۔

یہ واقعہ صف صاف ہی کا ہے کہ فرغانی نے اپنے ایک نوجوان عزیز حبیب کو اپنے خیمے میں بلایا۔ میں اس پر بھی نظر رکھے ہوئے تھی۔ خلیفہ معتصم کے ممکنہ قتل کی سازش میں فرغانی بھی شامل تھا۔

فرغانی نے میرے سامنے حبیب کو تاکید کی۔ ''سنو صاحبزادے! تم اکثر اپنے خیمے میں رہا کرو۔ امیر المومنین کی خدمت میں کم حاضر ہوا کرو۔ اگر کسی وقت تم شور و غوغا سنو تو گھبرا کر اپنے خیمے سے نہ نکل آنا۔ یہ نصیحت میں نے تمہیں اس لئے کی ہے کہ ابھی تم لڑکے اور سادہ لوح ہو، تمہاری عمر مشکل سے سولہ سال ہوگی۔

حبیب کی عمر واقعی کم تھی، اس کے باوجود وہ خوبصورت اور دراز قد تھا۔ خلیفہ معتصم کے خادموں میں وہ سب سے کم عمر تھا۔ معتصم اکثر اسے اپنی خلوت میں طلب کرتا رہتا تھا اور یہ بات فرغانی کو معلوم تھی۔ حبیب کا خیمہ دیگر خادموں، غلاموں اور کنیزوں سے الگ تھا۔

اسے معتصم کے خاص ندیموں اور خدمت گزاروں میں شمار کیا جاتا تھا۔

فرغانی نے عزیز داری کی بنا پر حبیب کو ''خطرے'' سے آگاہ کر دیا۔ وہ نوجوان صحبت یافتہ اور ذہین تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں دشواری نہ ہوئی کہ کوئی غیر معمولی بات پیش آنے والی ہے۔ میرے لئے حبیب اہمیت اختیار کر گیا۔ میں اسے با آسانی جب چاہتی اپنا آلۂ کار بنا سکتی تھی۔

اسی روز اشناس نے معتصم سے مل کر فرغانی اور احمد بن خلیل کی شکایت کر دی۔ معتصم نے دونوں کو طلب کر لیا۔ جب فرغانی اور احمد بن خلیل طلب کئے جانے پر آ گئے تو انہیں بہ غرض تنبیہ اشناس کے حوالے کر دیا۔ اشناس نے انہیں قیدی بنا لیا۔

اب آخری ضرب لگانے کا وقت آ گیا تھا۔ کیونکہ اس اثناء میں عرب سرداروں نے عباس بن مامون کے ہاتھ پر بیعت شروع کر دی تھی۔ کوئی بھی رات معتصم کے لئے زندگی کی آخری رات ہو سکتی تھی۔ میرے علم میں یہ بھی تھا کہ معتصم اگلے دن صبح صف صاف سے کوچ کا اعلان کرنے والا ہے۔ وہ طرطوس اور پھر وہاں سے اپنے دارالخلافہ سامرہ جانے کا قصد رکھتا تھا۔

اسی رات معتصم نے حبیب کو اپنے پاس خلوت میں بلایا تو حبیب میرے زیر اثر تھا۔ حبیب نے معتصم سے وہی سب کہا جو میں چاہتی تھی۔ اپنے قتل کی سازش کا انکشاف ہونے پر معتصم کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

پھر معتصم نے حبیب کو تو رخصت کر دیا اور اپنے محافظ دستے کے نگران کو طلب کر لیا۔ معتصم نے اشناس سے کہلوایا کہ فرغانی اور احمد بن خلیل کو ساتھ لے کر فوراً امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔

رات کا وقت تھا اور لشکر گاہ پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اسی سبب محافظ دستے کی غیر معمولی نقل و حرکت مخصوص لوگوں کے سوا کسی کے علم میں نہ آ سکی۔ فرغانی کے دل میں چور تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہاں جانا ہے تو اس نے بے ہوشی کا سوانگ رچا لیا۔ اشناس کو معاملے کی نزاکت کا پتہ نہ تھا۔ سو وہ صرف احمد بن خلیل کو اپنے ساتھ لے گیا۔

خلیفہ معتصم کے سخت اصرار پر احمد بن خلیل نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس نے حرث سمرقندی کا نام بھی نہیں چھپایا جو اس وقت معرقۃ الجیش (لشکر کا قلب، وسط کہ جہاں فوج

کی کمان کرنے کے لئے خود خلیفہ یا اس کا نامزد سالار ہوتا تھا) میں تھا۔

حرث کی طلبی ہوئی تو اس نے کل واقعات از اول تا آخر بیان کر دیئے۔ خلیفہ معتصم نے سچ بولنے پر اس کی جان بخش دی۔ دراصل حرث ہی سے معتصم کو ان تمام عرب سرداروں اور سالاروں کے نام معلوم ہوئے تھے جنہوں نے عباس بن مامون کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور اسے خلیفہ تسلیم کیا تھا۔ اس وقت خلیفہ معتصم بہت جوش میں تھا مگر میں اسے ہوش میں لے آئی۔

"اے معتصم حماقت نہ کر۔" میں نے سرگوشی کی۔ "ایک روح تیرے ساتھ ہے تُو اسی کے مشوروں پر عمل کر!...... اس میں کوئی برائی نہیں کہ تُو مامون کے بیٹے عباس اور دو چار سازشیوں کو قید کرا دے، تجھے جن پر زیادہ ہی غصہ ہو آج ہی رات یا آئندہ انہیں مروا ڈال۔ مگر فوج کے اہم سرداروں اور سالاروں کو فی الحال نہ چھیڑ۔ تُو نے ایسا کیا تو گویا اپنے ہی خلاف قدم اٹھائے گا۔ ان سازشیوں کو یکے بعد دیگرے راستے سے ہٹاتا جا۔ تیرا اقتدار اسی صورت میں قائم رہے گا۔"

"بے شک!" معتصم بے اختیار بول اٹھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ اپنے خیمے میں اکیلا نہیں ہے۔

"اس غلام سے امیر المومنین نے کچھ فرمایا؟" محافظ دستے کا نگران پوچھنے لگا۔

"ہاں بے شک...... بے شک اسے اب آزاد نہیں رہنا چاہئے۔" میرے زیر اثر معتصم نے بات بنا دی، پھر مزید بولا۔ "جا ابھی اور اسی وقت ہمارے بھتیجے عباس بن مامون کو پکڑ لا۔"

"امیر المومنین کے حکم کی تعمیل ہو گی۔" نگران ادب سے جھکا اور پھر خیمے سے باہر نکل گیا۔

معتصم نے اپنے خادم خاص کو طلب کر کے افشین کے لئے حکم دیا۔ افشین سے کہہ کر اسی وقت حاضر خدمت ہو۔

اہم افراد کے خیمے، خلیفہ کے خیمے سے دور نہیں تھے۔ یہ اراکین سلطنت کسی بھی وقت طلبی کے لئے تیار رہتے تھے۔ سو عباس و افشین جلد ہی خلیفہ معتصم کے خیمے میں پہنچ گئے۔

"اے میرے بھائی مامون کے بیٹے عباس!" معتصم کی بھاری آواز خیمے میں گونجی۔

"صاف صاف بتا دے کہ ہمارے قتل کی سازش میں کون کون پیش پیش تھا؟ ...تو سچ بولے تو شاید ہم تجھے معاف کر دیں۔ یہ بھی بیان کر دے کہ تیرے ہاتھ پر کس نے اب تک بیعت کی ہے؟"

جواب میں اس امید پر کہ جان بچ جائے، عباس بن مامون نے تمام حالات بیان کر دیئے۔

معتصم نے بڑے صبر و ضبط کے ساتھ سب کچھ سنا، پھر افشین سے مخاطب ہوا۔ "سن اے افشین! یہ معاملہ تجھ سے متعلق ہے۔ تو ترک ہے اور عرب تیرے خلاف ہیں۔ سو ہم عباس کو تیری قید میں دیتے ہیں، یہ تیری نگرانی میں رہے گا۔"

"اے امیر المومنین!...... غلام اپنا فرض ادا کرے گا۔" افشین نے یقین دہانی کرائی۔

اس کے بعد معتصم پنجے جھاڑ کر سپہ سالاروں کے پیچھے پڑ گیا۔ کسی کو اس نے قید کیا، کسی کو قتل کرایا۔ منجملہ ان لوگوں نے سب سے پہلے معتصم نے مشار بن سہیل کو سزائے موت دی۔ اس دوران میں لشکر اپنی طے شدہ منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ میری ہدایت کے مطابق خلیفہ وقت ٹھنڈا کر کے کھا رہا تھا۔

ایک پڑاؤ پر عباس بن مامون نے کھانا مانگا۔ کیونکہ وہ کئی وقتوں کا بھوکا تھا۔ معتصم کو اس کے متعلق پل پل کی خبر دی جا رہی تھی۔

"اے معتصم! اب یہ کھیل ختم کر دے۔" میں نے اس موقع پر سرگوشی کی اور خلیفہ معتصم کو اپنے اثر سے وقتی طور پر آزاد کر دیا۔

میں نے معتصم کو بلاوجہ آزادی نہیں دی تھی۔ وہ تو کب کا بھرا بیٹھا تھا کہ عباس کو ٹھکانے لگوا دے۔ آخر وہ خلیفہ ہارون الرشید کا بیٹا تھا۔ ہارون تو پھر بھی پڑھا لکھا تھا اور اس کے پہلو میں ایک شاعر کا دل بھی تھا۔ معتصم تو نرا اجڈ تھا۔

نوجوان بھتیجے عباس کی بابت معتصم نے جو حکم دیا، اسی کے ذہن کی اختراع تھی، کسی کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے لئے یہ ضروری تو نہیں کہ اسے انتہائی اذیت دی جائے۔

غرض کہ عباس کو کھانا دیا گیا۔ بھوک امیر و فقیر کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتی۔ عباس کھانے پر گویا پل پڑا۔ میں اسے...... اس آدم زاد کو دیکھ رہی تھی جو کبھی خلیفہ وقت تھا، کسی کو گمان بھی نہ آتا کہ وہی خلیفہ زادہ مربھکوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے کھانا کھا سکتا ہے! اور

اپنی موت سے بے خبر اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ اتارتا رہا۔ اس عرصے میں اس نے کئی بار پانی مانگا مگر دانستہ معتصم کے حکم پر اسے پانی نہیں دیا گیا۔

عباس جب اپنی بھوک سے زیادہ کھانا کھا چکا اور پانی کے بغیر ہچکیاں لینے لگا تو محافظ (یا موت کے فرشتے) آگے بڑھے، حلق تک کھانا ٹھنسا ہوا تھا اور عباس کی حالت غیر تھی۔ ہچکیوں کے وقفے میں بمشکل وہ "پا...... پ...... پا ... پانی" کہتا۔ وہ یہی رٹ لگائے رہا اور محافظوں نے اسے ایک بوری میں ٹھونس دیا۔ عباس کیونکہ ابھی زندہ تھا اس لئے بوری کا منہ بند کرنے اور اسے سینے میں محافظوں کو بڑی دقت ہوئی۔ عباس نے زور لگا کر اِدھر اُدھر ہلنا جلنا شروع کئے تو محافظوں نے اسے ڈنڈوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔

بوری میں بند وہ نوجوان آدم زاد عباس بن مامون یوں اپنی حماقتوں اور ہوسِ اقتدار میں دم گھٹنے سے مارا گیا۔ یہی حال عجیف کا ہوا، اسے بھی بوری میں بند ہونا پڑا۔

نصیبین میں پہنچ کر خلیفہ معتصم کے حکم پر ایک گڑھا کھودا گیا، اب عمر فرغانی کی باری تھی۔

"اس غدار کو زندہ دفن کر دیا جائے!" خلیفہ معتصم کے اس حکم کو سن کر بڑے بڑے فوجی سالار بھی سہم گئے۔

سو عمر فرغانی کو گہرے گڑھے میں دھکا دے دیا گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر گڑھے کے کناروں کو پکڑنا چاہا مگر ایسا ممکن نہ ہوا۔

اسی اثناء میں فرغانی پر مٹی ڈالی جانے لگی۔ وہ آخری دم تک "رحم ...... رحم......" چیختا رہا، مگر آدم زاد کب کسی دوسرے آدم زاد پر ترس کھاتے ہیں جو فرغانی کی آخری صدائیں ان پر اثر انداز ہوتیں۔ کسی کو فرغانی پر رحم نہ آیا۔

عراق کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے معتصم اور بے باک ہو گیا۔ اب اس کا قیام موصل میں تھا۔ یہاں وہ چند روز ٹھہرا اور اس نے رفتہ رفتہ کل سپہ سالاروں کو جنہوں نے عباس بن مامون کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، قتل کر ڈالا۔ عباس بن مامون کو اب وہ عباس لعین کے لقب سے یاد کرنے لگا۔

موصل سے جب معتصم اپنے دارالخلافہ سامرہ پہنچا تو اس نے مامون الرشید کی نسل کا قصہ تمام کر دیا۔ اس نے مامون کی بقیہ اولاد کو گرفتار کرا کے ایک مکان میں قید کر دیا۔ یہاں

تک کہ وہ سب مر گئے۔

یہ حقیقت ہے کہ موت معتصم کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ وہ اپنے دشمنوں کی طرف سے بہت چوکنا رہتا اور گویا اپنے سائے پر بھی شک کرتا۔ اسے معلوم تھا کہ سازش کرنے والے ہمیشہ بہت قریب ہوتے ہیں۔ مامون کے خاندان کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر وہ اور زیادہ بھڑک گیا۔ اپنے اندر کی اس آگ کو سرد کرنے کے لئے اس نے دیگر ذرائع اختیار کئے۔ اس کی خلوتوں میں اب حبیب زیادہ نظر آنے لگا۔ بے راہ روی کی یہ ایک بھیانک شکل تھی۔ اس کے علاوہ معتصم کا مذہبی جنون بھی بڑھ گیا۔ یہ موقع ابن الوقت سرکاری علماء کے لئے بڑا غنیمت ثابت ہوا۔ انہوں نے ایک بار پھر پوری شد و مد سے خلقِ قرآن کا مسئلہ اٹھایا۔ ان میں معتصم کا وزیرِ اعظم ابن زیارت اور قاضی القضاۃ احمد بن داؤد، دونوں پیش پیش تھے۔ ابن زیات کا شمار علمائے عصر میں ہوتا تھا، کج بحثی اس پر گویا ختم تھی، بحث و مباحثے کی بہترین صلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ نہایت مغرور اور ظالم بھی تھا۔

لوگوں کو سزا دینے کے لئے ابن زیارت نے ایک تنور بنوایا تھا، جس میں چاروں طرف کیلیں لگی ہوئی تھیں۔ اس تنور میں سزا یافتہ آدم زادوں کو ڈال دیا جاتا۔ ذرا سی حرکت پر کیلیں چبھنے لگتیں۔ اگر کوئی شخص رحم کی درخواست کرتا تو ابن زیارت کہتا کہ رحم ایک طرح کی کمزوری ہے۔ اسے میں نے نظر میں رکھا۔ وقت آنے پر خلقِ خدا پر ظلم ڈھانے والے اس آدم زاد کو میں تصویرِ عبرت بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

دوسرا ظالم احمد بن داؤد تھا۔ وہ قاضی القضاۃ ہونے کے ساتھ معتزلہ فرقے کا سربراہ بھی تھا۔ اس کا اثر مامون کے زمانے سے قائم تھا۔ معتزلہ عقائد کی اشاعت میں اس کی رائے کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ مذہبی معاملات میں وہ معتصم کا مشیرِ خاص تھا، اس کی وجہ سے بھی خلقِ خدا پر بہت عذاب ٹوٹے۔ پھر اسے میں کس طرح نظر انداز کر دیتی۔ انتقام کی غرض سے مجھے مناسب وقت کا انتظار تھا۔

ایک مجھ ہی کو وقت کا انتظار نہ تھا، معتصم کے اریب قریب کے لوگ بھی ابن الوقتی میں "بے مثل" تھے۔ اس ابن الوقتی کا بڑا سبب زیادہ سے زیادہ اختیارات اور دولت کی ہوس بھی تھی۔ ان میں افشین صیدر بن کاؤس (ترک نژاد) بھی شامل تھا۔ اشروسنہ کے بادشاہ کاؤس کا یہ بیٹا دلی خواہش رکھتا تھا کہ اسے خراسان کی امارت حاصل ہو جائے۔ اپنی اسی

خواہش کی تکمیل کے لئے اس نے طبرستان کے حاکم مازیار کو بغاوت پر اکسایا۔ میں نے "نیک روح" بن کر معتصم کو اس سے مطلع کر دیا۔ اس کے علاوہ افشین کے ایک عزیز منکور نے معتصم کے خلاف بغاوت کر دی۔ وہ آذر بائیجان کا حاکم تھا۔ اس بنا پر بھی معتصم، افشین سے مزید بدظن ہو گیا۔ ان تمام حرکات میں سب سے خراب حرکت میرے نزدیک یہ تھی کہ وہ عرب کا مال عجم بھیج رہا تھا۔

میں نے اسی لئے ایک روز خلیفہ معتصم کے کان بھر دیئے۔ "افشین مال غنیمت اور دیگر رقوم اپنے آبائی وطن اشر وسنہ منتقل کرتا رہتا ہے۔ اے معتصم! اسے اب زیادہ ڈھیل نہ دے۔"

معتصم نے میرے ہی ایما پر پہلے تو افشین کو فوج کی سالاری سے الگ کیا، پھر دوسرا قدم اٹھایا۔ فوج سے علیحدگی کے بعد بڑے بڑے سالار اپنی قوت کھو بیٹھتے ہیں۔ ان کی اصل طاقت فوجی عہدہ ہوتا ہے جسے وہ چھوڑنا نہیں چاہتے۔

جب مازیار گرفتار ہو کر سامرہ پہنچا تو اس نے اپنی اور افشین کی خط و کتابت کا اقرار کیا۔ نتیجہ یہ کہ افشین کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ واقعہ 226 ہجری کا ہے کہ خلیفہ معتصم نے افشین حیدر کے مقدمے کی سماعت کے لئے ایک بااختیار گروہ (کمیشن) متعین کیا۔ اس جماعت میں وزیر سلطنت ابن زیارت، قاضی القضاۃ احمد بن داؤد، اسحاق بن ابراہیم، اراکین دولت عباسیہ اور سپہ سالاران لشکر شریک تھے۔ معتصم چاہتا تو افشین حیدر کو بھی چپ چپاتے مروا ڈالتا مگر یہ معاملہ قدرے مختلف تھا۔ کسی بااختیار ترک سالار کو جو اشروسنہ کے بادشاہ کا بیٹا بھی تھا، اسے خاموشی کے ساتھ اور بغیر مقدمہ چلائے قتل کرا دینے سے ترک اس کے خلاف ہو جاتے۔ عربوں کو تو وہ پہلے ہی خفا کر چکا تھا اور اہل فارس (ایرانی) بھی اس کے ساتھ نہ تھے۔ ان اہل فارس کو بھی معتصم نے خاندان مامون کا پشت پناہ جان کر فوج سے بڑی تعداد میں نکالا تھا، ایسی صورت میں ترک ہی اس کی طاقت تھے۔ وہ ترکوں کو بھی خفا کر دیتا تو کہیں کا نہ رہتا۔ افشین پر انہی تمام وجوہ کی بنا پر باقاعدہ مقدمہ قائم کیا گیا تاکہ الزام خلیفہ معتصم پر نہ آ سکے۔

O.....O

یہ مقدمہ مختلف الزامات کے تحت قائم کیا گیا۔ اس کی سماعت ابن زیات کے روبرو ہوئی۔ معتصم کی طرف سے متعین کردہ جماعت (کمیشن) کے ارکان اور گواہان سبھی وہاں موجود تھے۔ ان میں ایک مسجد کے امام اور مؤذن بھی شامل تھے۔ وہ بطور گواہ حاضر ہوئے تھے۔ میرے علاوہ عارج بھی اس مقدمے کی کارروائی سننے آیا تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔

"اے دینار! جس مقدمے کا فیصلہ پہلے ہی طے ہے، اس کا انجام معلوم ہے تو پھر کارروائی کیوں دیکھی اور سنی جائے؟"

"جو مقدمات حاکمان وقت کی مرضی و ایما پر قائم کئے جاتے ہیں، عموماً ان کے فیصلے پہلے ہو جاتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اپنے مخالفین کو حکمران اسی طرح ٹھکانے لگاتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اور یہ عدالتیں اور انصاف کرنے والے؟"

"یہ سب حکمرانوں کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ تجھے میں یہی دکھانے تو یہاں لائی ہوں کہ یہ آدم زاد کیا کیا رنگ بدلتے ہیں۔"

"تو کہتی ہے تو یہ تماشہ بھی دیکھ لیتا ہوں۔" عارج نے کہا اور پھر نہ بولا۔

وزیر سلطنت ابن زیارت، مدعیوں سے مخاطب ہوا۔ "کیوں، تمہارا کیا دعویٰ ہے؟"

مؤذن و امام مسجد کا تعلق صغد کے علاقے ہی سے تھا۔ ان دونوں نے اپنی عبائیں اتار دیں اور کہنے لگا، ملاحظہ فرمایئے! افشین نے ہم لوگوں کو بے جرم و گناہ کوڑوں سے اس قدر پٹوایا ہے کہ ہمارے جسم میں گوشت باقی نہیں رہا۔ ہمارے جسموں پر زخم اس کا ثبوت ہیں۔

"کیوں افشین، تم انہیں پہچانتے ہو؟" ابن زیارت نے سوال کیا۔

"جی ہاں حضور!" افشین نے جواب دیا۔ "میں ان کو جانتا ہوں۔"

"تم نے ان لوگوں کو اس قدر کیوں پٹوایا؟"

''اس لئے کہ بادشاہ صغد اور میرے درمیان یہ معاہدہ تھا کہ کسی قوم کے مذہب سے تعرض نہ کیا جائے۔ ہر شخص اپنے مذہب وملت پر چھوڑ دیا جائے۔ چونکہ ان دونوں نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اہل صغد کے بت خانوں میں گھس کر بتوں کو توڑ ڈالا اور بت خانے کو بت بنالیا۔ لہٰذا میں نے ان کو اس جرم کی سزا دی۔'' افشین حیدر اپنی صفائی میں بولا۔

''تم اپنے اس بیان کی تائید شہادت پیش کر سکتے ہو؟''

افشین نے وزیر سلطنت کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ اس کے پاس کوئی گواہ نہیں تھا۔

''وہ کتاب کس مضمون پر ہے جو سونے اور چاندی کی جلد میں محفوظ ہے اور تمہارے پاس رہتی ہے؟ اس میں جواہر بھی لگے ہوئے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اس میں کلمات کفریہ بھی ہیں۔'' ابن زیات نے افشین کو گھور کر جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

''وہ کتاب میرے آباؤ اجداد سے مجھ تک پہنچی ہے۔ آپ اسے ورثہ کہہ لیجئے۔ اس میں عجم کے آداب لکھے ہیں۔ میرے بزرگ باپ نے اس کے آداب سیکھنے کی مجھے وصیت فرمائی تھی۔ میں اس سے آداب سیکھ لیتا ہوں اور کفریات چھوڑ دیتا ہوں۔''

''تم اس کتاب کی اتنی عزت کیوں کرتے ہو؟'' ابن زیات کی آواز میں چبھن تھی۔

افشین نے اس سوال کا بھی تفصیلی جواب دیا۔ ''ہاں...... وہ کتاب میرے نزدیک قابل احترام ہے۔ اسی بناء پر میں نے اس کتاب پر سے سونا، چاندی اور جواہر اتارنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ ان باتوں سے میرے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا......'' وہ کہتا رہا۔

ابن زیات جیسے سن کر بھی کچھ نہیں سن رہا تھا۔ تھوڑی دیر سکوت کے بعد اس نے ایک اور دعویدار موبد کو اشارہ کیا۔

موبد نے دست بستہ کھڑے ہو کر افشین کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ شخص افشین گردن مار دیئے جانے کے قابل ہے۔ کیونکہ یہ اسلام سے پھر گیا ہے۔ حضور محترم! یہ گردن مروڑے ہوئے جانوروں کا گوشت کھاتا ہے۔ یہ مجھے بھی ایسا ہی گوشت کھانے پر مجبور کرتا اور کہتا کہ گردن مروڑے ہوئے جانوروں کا گوشت ذبح کئے ہوئے جانوروں کے گوشت سے

زیادہ لذیذ اور مزیدار ہوتا ہے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ یہ اپنی مجلس میں بیٹھا ہوا علانیہ کہہ رہا تھا کہ اس کم بخت قوم یعنی مسلمان قوم میں داخل ہو کر مجھے ہر مکروہ اور نامطبوع (جس کی طرف رغبت نہ ہو) چیز کا سامنا کرنا پڑا۔ زیتون میں نے کھایا، اونٹ اور خچر پر سوار ہوا، مگر شکر ہے کہ اسلام کی بہت سی باتوں اور احکام پر اب تک عمل نہیں کیا۔''

موبد نے افشین کے بارے میں یہ بھی بتایا کہ وہ غیر مختون (جس کا ختنہ نہ کیا گیا ہو) ہونے پر فخر کرتا ہے۔

اس پر افشین طیش میں آ کر ابن زیات سے بولا۔ ''کیا یہ مجوسی (پارسی) آپ کے نزدیک ثقہ (اعتبار کے قابل) ہے؟''

''نہیں......'' ابن زیات نے خلاف توقع بات کی۔ مگر اس کے لہجے سے عیاری ظاہر تھی۔

''پھر میرے مقابلے میں اس کے بیان کو کیوں قبول کیا جا رہا ہے؟'' افشین نے کہا، پھر موبد سے مخاطب ہوا۔ ''کیوں موبد! تو نے یہ بھی کہا ہے کہ میں تجھ سے اپنے راز کہتا تھا۔ جب تُو نے میرے روز کو افشا کر دیا تو رازداری کی شرط پر پورا نہ اترا۔ ایسی صورت میں تُو اپنے دین کے اعتبار سے نہ ثقہ رہا اور نہ اپنے عہد پر قائم رہا۔ پھر تیری شہادت...... تیرا دعویٰ میرے مقابل کیوں قبول کیا جائے۔''

''بس بس!'' ابن زیات نے افشین کی بات کاٹ دی اور مزید بولا۔ ''تمہارے بولنے کی صلاحیت بہت بڑھی ہوئی ہے، خاموش ہو جاؤ اور شہادت پیش ہونے دو۔ شہادت ختم ہونے کے بعد بحث ومباحثہ کرنا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک اور آدم زاد مرزبان کو مخاطب کیا۔

''کیوں مرزبان، تم افشین کے معاملے میں کیا جانتے ہو؟''

''اے افشین! اہل اشروسنہ اپنے خطوط میں تمہیں کیا لکھتے ہیں؟'' مرزبان نے دریافت کیا۔

''مجھے اس وقت یاد نہیں۔'' افشین نے جواباً کہا۔

''کیا وہ تمہیں اپنی تحریروں میں ایسے القاب سے مخاطب نہیں کرتے، مثلاً خدائے خدایگاں؟'' مرزبان نے یاد دلایا۔

''ہاں...... اب یاد آیا، عالباً یہی لکھتے ہیں۔'' افشین نے اقرار کیا۔

اسی وقت ابن زیات بول اٹھا۔ ”پھر تجھ میں اور فراعنہ مصر (فرعون کی جمع) میں کیا فرق ہوا؟“

افشیں نے بلا تامل صفائی پیش کی۔ ”حضور! وہ لوگ ہمیشہ سے میرے آباؤ اجداد کو اور اسلام لانے سے قبل مجھ کو بھی انہی القاب سے اپنی تحریروں میں مخاطب کیا کرتے تھے۔ اگر اسلام لانے کے بعد میں انہیں ایسے القاب لکھنے سے منع کرتا تو وہ لوگ میری اطاعت سے منحرف اور مجھ سے باغی و سرکش ہو جاتے۔“

اب ابن زیات نے مازیار کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”افشیں! تم نے اس سے بھی کبھی خط و کتابت کی ہے؟“

”میں نے اس سے کبھی کوئی خط و کتابت نہیں کی۔“ یہ جواب دیتے ہوئے افشیں کے چہرے پر گھبراہٹ عیاں تھی۔

”کیوں مازیار، اس نے......“ ابن زیات نے افشیں کی طرف اشارہ کیا۔ ”تمہیں کوئی خط لکھا تھا؟“

”جی ہاں حضور!...... اس نے مجھے نہیں بلکہ...... اس کے بھائی نے میرے بھائی تو ہیار کو خط لکھا تھا۔ حضور اجازت دیں تو وہ خط پڑھ دوں؟“

”اجازت ہے۔“ ابن زیات نے مازیار کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

مازیار نے جو خط پڑھا، اس کا مختصر مضمون یہ ہے۔ ”اس دین کا کوئی ناصر و مددگار میرے یا تمہارے اور ایک بابک کے سوا نہیں۔ مگر بدنصیب بابک نے اپنی حماقت کی وجہ سے خود کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اس مصیبت میں نہ پھنسا ہو۔ ان حالات میں اگر تم علم بغاوت بلند کر دو تو تمہارے مقابلے پر یہ لوگ میرے سوا کسی دوسرے کو مامور نہیں کریں گے۔ اس وقت میری رکاب میں کار آزمودہ فوجیں اور سپہ سالار ہیں۔ میں اگر تم سے مل جاؤں تو سمجھ لو ہمارے مقابلے پر سوائے عربی یا مغربی اور ترکی لشکروں کے اور کوئی نہ آئے گا۔ عربوں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ پیٹ کے بندے ہیں۔ کتوں کی طرح ایک لقمہ ان کے سامنے ڈال دو اور پھر اطمینان سے ان کے سروں کو پتھروں سے کچل دو۔ مغربی فوجیں ایک تو خود قلیل ہیں جن کا شمار انگلیوں پر ہو سکتا ہے، دوسرے ان کی گوشمالی کے لئے ہماری فوج کا ایک دستہ کافی ہے۔ باقی رہے ترک تو ان کا جوش دودھ کا سا اُبال ہے، اٹھا

اور فرد ہو گیا۔ تھوڑی سی ہمت کی تو ان کا قلع قمع ہو جائے گا۔ پھر دین و مذہب جیسا کہ ملوک عجم کے عہد حکومت میں تھا ویسا ہی دوبارہ ہو جائے گا۔ دیکھو اس موقع کو غنیمت جانو۔ ہاتھ سے نہ جانے دو......“

ابھی مازیار اتنی ہی عبارت پڑھ سکا تھا کہ افشیں چیخ اٹھا۔ ”یہ سب جھوٹ ہے۔ میرا اس سازش سے کوئی تعلق نہیں۔“ ابن زیات نے افشیں کو ڈانٹ کے خاموش رہنے کو کہا، مگر وہ نہ مانا تو بولا۔ ”ٹھیک ہے، بول! فیصلہ تو ہمی کو کرنا ہے۔“

”اس شخص مازیار کا تو یہ دعویٰ ہے کہ میرے بھائی نے اس کے بھائی کو مذکورہ مضمون کا خط لکھا تھا۔“ افشیں نے بحث کی۔ ”اس میں مجھ پر کیا الزام عائد ہوا۔ اگر میں اس قسم کا خط لکھتا تو ضرور اپنے کسی معتمد کی معرفت اس کے پاس روانہ کرتا اور یہ امر امیر المومنین سے پوشیدہ نہ رہتا۔ طاہر بن حسین کا بیٹا عبداللہ تو خراسان میں موجود ہی تھا۔“

معاً عارج بول اٹھا۔ ”اے دینار! کیا یہ اسی طاہر کا ذکر ہے جو یک چشم تھا؟“

”ہاں......“ میں نے جواب دیا۔ ”یک چشم طاہر کو تو مامون نے مروا دیا تھا لیکن اس کے بیٹے عبداللہ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ مامون کا وفادار نکلا۔ خیر...... وہ دیکھ احمد بن ابی داؤد، افشیں کی بات سن کر کتنا برا چہرہ بنا رہا ہے۔“

اسی لیے قاضی القضاۃ احمد بن داؤد نے افشیں کو ڈانٹ پلائی۔ ابن زیارت نے بھی افشیں کو تیز نگاہوں سے دیکھا اور اشارے سے خاموشی کا حکم دیا۔ احمد اور ابن زیات کی یہ کوشش تھی کہ افشیں اپنی صفائی میں کچھ نہ کہہ سکے۔

افشیں خاموش نہ رہا۔ اس نے قاضی احمد کو نہیں بخشا، بولا۔ ”آپ مجھے ڈانٹ رہے ہیں...... مجھ پر قتل، بغاوت اور سازش کے الزامات لگا رہے ہیں...... کیا عجب مذاق ہے کہ آپ جیسے لوگ انصاف کی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ دنیا جانتی ہے قاضی القضاۃ صاحب کہ جب آپ عبا و قبا پہن کر اپنے عالیشان محل سے نکلتے ہیں تو ایک جماعت کو بغیر قتل کرائے نہ اپنے محل واپس جاتے ہیں اور نہ عبا و قبا اتارتے ہیں۔ آپ بھی عجب شے ہیں۔“

یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ ایک ملزم، قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کو کھری کھری سنا رہا تھا۔ اسے یعنی افشیں کو یہ اندازہ ہو گیا تھا شاید کہ وزیر سلطنت اور قاضی ایلی سی کر کے رہیں گے۔ پھر رعایت کیوں کی جائے۔

پھر یہی ہوا۔ ابن زیات کا اصل چہرہ سامنے آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''بس بس..... زیادہ تیزی اچھی نہیں ہوتی اے نمک حرام! بدتمیز شخص، دائرہ تہذیب سے باہر قدم نہ رکھ۔'' یہ کہہ کر ابن زیات نے قاضی احمد کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''اس پر جرم ثابت ہے۔'' قاضی احمد نے فیصلہ سنا دیا۔

ابن زیات نے بغا کبیر نامی آدم زاد کو اشارہ کیا۔ وہ افشین کو مارتا ہوا وہاں سے لے گیا۔

افشین وہاں سے چلا گیا تو ابن زیات نے مازیار کو چار سو درے مارنے کا حکم دیا۔

اس حکم کے مطابق مازیار کو شکنجے میں کس دیا گیا۔ ابن زیات نے بذات خود اس سزا پر عمل درآمد کرایا۔

قصر ابن زیات کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا اور مازیار پر درے برسائے جا رہے تھے۔

''اے دینار! اس سے تو اچھا تھا کہ ابن زیات اس آدم زاد کی گردن مارنے کا حکم دیتا۔'' عارج بولا۔

''ہاں..... مگر اس طرح ابن زیات کے اندر چھپے ہوئے درندے کو کس طرح تسکین ہوتی۔ کسی کی موت کو آسان بنا دینا ان ظالموں کا شیوہ نہیں۔ ابن زیات کو خود بھی علم ہو گا کہ مازیار یا کوئی بھی شخص اتنی اذیت نہیں سہہ سکتا۔ اپنے ہی جیسے دوسرے آدمیوں کو تڑپا تڑپا کر مارنے میں انہیں جو مزہ آتا ہے، وہ گردن مارنے میں کہاں!'' میں نے تلخ آواز میں کہا اور اس دیو قامت شرطے کو دیکھنے لگی جو درے کو تیزی سے گردش دیتا ہوا شکنجے میں کسے ہوئے مازیار کی طرف بڑھ رہا تھا۔

نتیجہ وہی ہوا جو متوقع تھا۔ مازیار سزا پوری ہونے سے پہلے ہی مر گیا۔ ابن زیات کے حکم پر بقیہ درے اس کی لاش پر برسائے گئے۔ افشین کے ساتھ یہ ہوا کہ خلیفہ معتصم کے حکم پر اسے بھوکا رکھا گیا، یہاں تک کہ بھوک اور پیاس نے اس کی جان لے لی۔ جب وہ زندہ نہ رہا تو اس کی لاش کو ایک صلیب پر لٹکا دیا گیا۔ یہ صلیب باب عامہ کے سامنے زمین میں گاڑی گئی۔ یہ سب ''عبرت'' دلانے کے نام پر ہوا کہ جو خلیفہ وقت سے غداری کرے گا، اس کا یہی انجام ہو گا۔ یہ واقعہ شعبان 242 ہجری کا ہے۔

معتصم کے زمانے ہی سے ترکوں اور عربوں کی کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ اسے یہ احساس

ہو گیا تھا کہ ترکوں کو افضلیت دے کر اس نے خلافت کے حق میں کوئی مفید کام انجام نہیں دیا۔ اس بنا پر ایک دن اس نے اپنے معتمد اسحاق بن ابراہیم سے کہا کہ میں نے جن چار ترک سالاروں پر بھروسہ کیا ان میں سے ایک بھی کام کا نہ نکلا۔

معتصم کا اشارہ افشین، اشناس، ایتاخ اور وصیف کی طرف تھا۔ اس کے برعکس مامون نے جن آدمیوں پر اعتماد کیا، وہ اپنی وفاداری میں پورے اترے۔

اس پر اسحاق بن ابراہیم نے جواب دیا۔ ''آپ کے بھائی نے اصول کو دیکھا، اس سے کام لیا، اس کا پھل اچھا نکلا۔ آپ نے محض فروع سے کام لیا اور ایسے لوگوں پر اعتماد کیا جو شریف النسل نہ تھے اس لئے وہ بارآور نہ ہو سکے۔

یہ صائب جواب سن کر معتصم نے کہا۔ ''اس تمام مدت میں جو تکلیف اس خیال سے مجھے ہوئی ہے، وہ بخدا تمہارے اس جواب سے میرے لئے سہل تھی۔''

انہی دنوں سامرہ کے قصر خلافت میں طبیبوں کا آنا جانا زیادہ ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ معتصم کی بے راہ روی رنگ لا رہی ہے۔ طبیبوں کی سمجھ میں کچھ آیا بھی تو انہوں نے جان جانے کے خوف سے کچھ نہ کہا۔ چند ہی دنوں میں ''پراسرار'' مہلک بیماری کے بارے میں لوگوں کو پتہ لگ گیا۔ ''خلیفہ وقت امیر المومنین ایک ناقابل فہم بیماری میں مبتلا ہیں۔'' یہ بات عام ہونے لگی۔

طبیبوں کا کہنا یہ تھا کہ معتصم کے جسم کی قوت مدافعت ختم ہو گئی ہے، یعنی چھوٹی سے چھوٹی بیماری بھی اس پر غالب آ جاتی ہے (اس زمانے میں جنسی بے راہ روی کو آج کی طرح کوئی نام نہیں دیا جا سکا ہو گا۔ اب ہم ایڈز سے اچھی طرح واقف ہیں جو لاعلاج ہے۔ مصنف)

مذکورہ بیماری کا نتیجہ یہ نکلا کہ 15 ربیع الاول 227 ہجری کو خلیفہ معتصم اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

معتصم کی زندگی میں 8 کا ہندسہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ بنو عباس کا وہ 8 واں خلیفہ تھا، خلیفہ ہارون الرشید کی 8 ویں اولاد تھا۔ اس نے 8 برس 8 ماہ حکومت کی۔ اس کی اولاد میں 8 لڑکے اور 8 لڑکیاں تھیں۔ وہ شعبان 180 ہجری میں پیدا ہوا، خلیفہ بنا تو اس کی عمر 38 سال تھی۔ انتقال کے وقت معتصم کی عمر تقریباً 48 سال تھی۔ اس نے 8 فتوحات کیں۔

جب معتصم مرا تو کیا صورت پیش آئی، اس سے پہلے بہتر ہو گا کہ میں اس کے عہد سے متعلق چند اہم باتوں کا ذکر کر دوں۔ ان میں پہلی بات کا تعلق غلط عقائد سے ہے۔ مامون نے معتصم کو اسی لئے اپنے بعد خلیفہ نامزد کیا کہ وہ مامون کے غلط عقائد پر سختی سے عمل درآمد کرا سکے۔ اسی سبب معتصم نے خلیفہ ہونے کے بعد علماء پر مزید سختیاں شروع کر دی تھیں۔ اس کے دور حکومت میں امام احمد بن حنبلؒ کو بڑی اذیتیں دی گئیں۔ انہیں کوڑوں سے پیٹا گیا اور قید و بند کی مصیبتوں میں مبتلا رکھا گیا۔

معتصم نے صرف علماء پر سختی اور ظلم کو ہی روا نہیں رکھا بلکہ سلطنت میں خلق قرآن کا اقرار کرانے کے لئے فرمان جاری کر دیے۔ معلمین کو حکم دیا گیا کہ وہ طلباء کو اسی کی تعلیم دیں۔

غرض کہ معتصم کا دور خلافت عام مسلمانوں کے لئے آزمائش کا دور تھا۔ اس کی جہالت اور مزاج کی سختی نے اس آزمائش کو اور سخت کر دیا تھا۔ اسے جب غصہ آتا تھا تو کسی کو قتل کر دینا یا سخت سے سخت سزا دینا اس کے نزدیک بہت معمولی بات ہوتی تھی۔ مزاج کی اسی درشتی کی بنا پر اسے جنگوں سے زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ اپنی فوجوں اور مہمات پر بے دریغ خرچ کرتا تھا۔ اپنے ترک سپاہیوں کو وہ شہزادوں کی طرح رکھتا تھا۔

مزاج کی اس سختی کے باوجود معتصم رعایا کی اقتصادی فلاح کا بھی خیال رکھتا۔ وہ زراعت کی ترقی کے لئے بھی کوشاں رہتا۔ اس کے حکم سے متعدد نہریں کھدوائی گئیں۔ غیر آباد زمین کو آباد کیا گیا۔ اس نے سلطنت کے قدرتی ذرائع کو آمدنی بڑھانے کے لئے استعمال کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ زمین کی آبادی میں بہت سے فائدے ہیں۔ اسی سے مخلوق کی زندگی قائم ہے، خراج و محصولات بڑھتے ہیں، سلطنت کی دولت میں اضافہ ہوتا ہے اور معاش میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

دیگر خلفائے بنو عباس کی طرح معتصم بھی انعامات و اکرامات میں کثیر رقم خرچ کرتا تھا۔ معتصم نے ابن ابوداؤد کے ذریعے صقات و انعامات میں ایک کروڑ درہم خرچ کئے۔ بنو عباس میں معتصم پہلا خلیفہ تھا جس کے باورچی خانے کا خرچ بڑھتے بڑھتے روزانہ ایک ہزار دینار ہو گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا دستر خوان نہایت وسیع تھا اور وہ بہت متواضع میزبان تھا۔

معتصم کی وفات کے بعد 16 ربیع الاول 227 ہجری کو اس کے لڑکے ابو جعفر ہارون کے لئے بیعت لی گئی۔ وہ ایک رومی ام الولد کنیز قراطیس کے بطن سے تھا۔ اس نے واثق باللہ کا لقب اختیار کیا۔ (واثق باللہ کا مطلب اللہ پر بھروسہ کرنے والا ہے۔ مصنف) برسر اقتدار آنے کے وقت واثق کی عمر 31 سال تھی۔ وہ شعبان 196 ہجری کو پیدا ہوا۔

واثق خوب صورت اور صحت مند تھا۔ بنو عباس میں اس کا شمار فاضل خلفا میں ہوتا ہے۔ تخت نشین ہوتے ہی اسے کئی شورشوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان شورشوں میں فلسطین کے ایک یمنی سردار مبرقع کی شورش بھی تھی۔ واثق نے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے رجاء بن ایوب کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ رملہ کے مقام پر مبرقع اور رجاء کا مقابلہ ہوا تو فلسطینیوں کو شکست ہوئی۔ مبرقع کو گرفتار کر کے سامرہ بھیج دیا گیا۔

خلق قرآن کے مسئلے سے واثق کا عہد بھی خالی نہیں۔ 231 ہجری میں اس نے حاکم بصرہ کے نام ایک فرمان بھیجا جس کی رو سے مسجدوں کے اماموں اور موذنوں کے امتحان لئے گئے۔ جس نے خلق قرآن سے انکار کیا اسے اس کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔

مسئلہ خلق قرآن کی وجہ سے علماء اور محدث کہنے والے، بنو عباس کے دشمن ہو گئے۔ یہ مخالفت مامون کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔

واثق کے دور میں ایک آدم زاد احمد بن نصر نے معتزلی عقائد کی کھلم کھلا مخالفت کی۔ احمد بن نصر بغداد کا ایک عالم اور محدث تھا۔ اس کی تحریک میں کافی لوگ شامل ہو گئے اور عام بغاوت کے لئے ایک دن مقرر ہو گیا۔

[illegible] مامون نے جاسوسی کا بڑا اچھا نظام قائم کیا تھا۔ معتصم کے زمانے میں بھی بڑی حد تک یہ نظام برقرار رہا۔ واثق کو گویا ورثے میں جاسوسی کا یہ نظام ملا۔ جو بھی بغاوت سر اٹھاتی اس کا مرکز کسی نہ کسی طرح بغداد ہوتا۔ سو بغداد میں جاسوسوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ انہی جاسوسوں کے ذریعے کوتوال شہر کو احمد بن نصر کی بغاوت کا علم ہو گیا۔ کوتوال بغداد نے ایک رات اچانک احمد بن نصر کے گھر پر چھاپہ مارا۔ اس کے ساتھ احمد بن نصر کے حامیوں کو بھی گرفتار کر لیا۔ اس نے اپنی دانست میں بغاوت کے سرغنہ احمد بن نصر کو سامرہ بھیج دیا۔

واثق نے احمد بن نصر کے عقائد کا امتحان لینے کے لئے معتزلی علما کی ایک مجلس منعقد کی

جس نے احمد بن نصر کے خلاف اس کی موت اور قتل کا فتویٰ دے دیا۔ واثق نے تلوار منگوا کر اپنے ہاتھ سے احمد بن نصر کو قتل کیا۔ اس کے جسم کو سامرہ میں اور سر کو بغداد میں سرِ عام لٹکوا دیا گیا۔ بغداد میں جہاں احمد بن نصر کا سر لٹکایا گیا، وہ مقام راس احمد بن نصر کے نام سے بعد میں مشہور ہوا۔

قاضی احمد بن داؤد کا اثر واثق پر بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ وہی واثق کو تشدد پر آمادہ کرتا اور لوگوں کو خلقِ قرآن کی دعوت دیتا تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے مختصر دورِ حکومت کے آخری ایام میں واثق خلقِ قرآن کا قائل نہیں رہا۔

ہوا یہ کہ ایک آدم زاد عالم ابو عبداللہ ازدی گرفتار ہو کر واثق کے سامنے پیش ہوا۔ میں نے بے وجود ازدی کو اپنے اثر میں لے لیا پھر جو کچھ ازدی نے کہا میرے منہ سے نکلا میں نے ادا کر کہا۔ اس وقت احمد بن داؤد بھی موجود تھا۔

ازدی بے دھڑک واثق سے بولا۔ ''جس مسئلے کی طرف لوگوں کو تم بلاتے ہو، کیا اس کا علم رسول اللہ کو بھی تھا؟...... اور اگر حضورِ سرورِ کائنات کو اس مسئلے کا علم تھا تو انہوں نے اسے جائز کیوں نہ سمجھا؟''

ان سوالوں کے جواب نہ واثق دے سکا، نہ قاضی احمد بن داؤد، نہ کوئی دوسرا معتزلی۔

واثق کو کہنا پڑا۔ ''اس معاملے میں رسولِ اکرم نے خاموشی اختیار کی، ہم اس پر تشدد کر رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے عبداللہ ازدی کو رہا کر دیا۔ اس کے بعد واثق نے کسی کا امتحان نہیں لیا اور میں یہی چاہتی تھی۔

معتصم کی طرح واثق نے بھی ترکوں پر عنایات کیں۔ انہیں عربوں اور ایرانیوں سے بلند تر بنانا چاہا۔ اس کے عہد میں ترکوں کو اہم عہدوں پر فائز کیا گیا۔ اس نے ترکی النسل سالار اشناس پر بڑی عنایت کی۔ اشناس کو زر و جواہر کے ہار پہنائے گئے اور اسے نائب السلطنت کا عہدہ دیا گیا۔ واثق پہلا عباسی حکمران تھا جس نے نائب السلطنت کا عہدہ قائم کیا۔ اشناس کو وسیع اختیارات حاصل ہو گئے۔ اس ترک نوازی نے عربوں اور ترکوں کی کشمکش کو اور زیادہ فروغ دیا جو بنو عباس کی حکومت پر اثر انداز ہوئی۔

229 ہجری کا واقعہ ہے کہ مجھے عارج نے ایک اہم معاملے کی طرف متوجہ کیا، کہنے لگا۔

''اے دینارا! کیا تجھے یہ کاتب (سیکرٹری) نظر نہیں آتے جو ناجائز طریقوں سے اپنی آمدنی

بڑھا رہے ہیں؟ یہ بدعنوان آدم زاد ایک طرف تو دربارِ خلافت سے منسلک ہیں، دوسری طرف ہر وزیر اور امیر اپنے اپنے کاتب الگ رکھتا ہے۔ یہ کتاب (بیوروکریٹ) خلقِ خدا سے تحفے اور رشوتیں وصول کرتے ہیں اور اس طرح اپنی خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں تو ان پہ خزانوں کا بھی تو کوئی بندوبست کر!''

عارج کی زبانی سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

''نہیں تو مجھ سے اسی طرح خوش رہا کر اے دینارا!''

''مگر یہ ضروری نہیں کہ جواباً میں بھی تجھے خوش کروں۔'' میں ترکی بہ ترکی بولی۔

''بڑی ہی تنگ دل ہے تو۔''

''تنگ دل میں نہیں، وہ آدم زاد ہیں جن کی طرف تو نے دھیان دلایا ہے۔ انہیں سزا ملنی چاہیے۔''

''سزا وزا کے اس چکر میں مجھے نہ پھنسا جائیو!'' عارج نے کہا۔

میں مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے سیدھی قصرِ خلافت کی طرف چل دی۔

اگلے ہی روز واثق نے تمام اہم کاتبوں (تقریباً سبھی وزارتوں کے سیکرٹریز) کو گرفتار کرا لیا اور ان پر جرمانے کر کے دس لاکھ دینار کے قریب رقم وصول کی۔ کاتبوں کے اثاثوں کی چھان بین کا حکم بھی واثق نے دے دیا۔

ان بدعنوان آدم زادوں کا تعلق حکمران طبقے سے تھا۔ خلیفہ بدل جاتے مگر عموماً یہ اپنے عہدوں پر برقرار رہتے اور مال بناتے۔ پہلی بار ان کی پکڑ دھکڑ ہوئی تو انہیں اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ بے عزت الگ ہوئے۔ کئی سال تک ان بدعنوان آدم زادوں کی ناک میں نکیل پڑی رہی۔ یہ بڑی حد تک سیدھے ہو گئے، لیکن وہ آدم زاد ہی کیا جو توبہ کر کے پھر نہ توڑ دے۔ بعد میں واثق باللہ کے چل چلاؤ کا زمانہ قریب آتا دکھائی دیا، ادھر ان بدذات کتاب نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ (کاتب، یعنی سیکرٹری کی جمع یہ کتے کی جمع ہرگز نہیں۔ کیونکہ کتا ہندی لفظ ہے، عربی قاعدہ اس پر لاگو نہیں ہوتا۔ کاتب عربی لفظ ہے۔ لفظ کاتب کا لفظی مطلب، لکھنے والا یا محرر ہے۔ اسی اعتبار سے کتاب جمع تکسیر کاتب کی ہے۔ وزیر اور امیر جو حکم دیتے، کاتب یعنی ان کے سیکرٹری انہیں لکھ لیتے اور اس پر عمل درآمد کراتے۔ خلیفہ مامون الرشید کے دربار میں لوگ اس معزز منصب پر مقرر

ہوئے۔ یہ لوگ اپنے فن میں بے مثل اور یگانۂ روزگار تھے۔ امر بن مسعد 215 ہجری میں بڑا نامور و فاضل تسلیم کیا گیا ہے۔ بڑے سے بڑے مضمون کو وہ مختصر لفظوں میں اس خوبصورتی سے ادا کرتا تھا کہ مضمون کا اصل اثر اور پورا زور قائم رہتا تھا۔ خلیفۂ وقت اور وزارت کے وزیر کے لئے یہ لوگ لازمی ہو گئے تھے کیونکہ ان کی وجہ سے خلیفہ، وزیر اور امیر کا وقت بچتا تھا۔ مصنف)

ذی الحجہ 232 ہجری میں خلیفہ واثق ایک بیماری میں مبتلا ہوا۔ ان آدم زاد حکمرانوں کو یہ عجب عجب اور نئی نئی بیماریاں اس لئے لگتی تھیں کہ بے راہ روی میں بھی یہ حد سے گزرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کیا کوئی حکمران اور کیا کوئی اور با اختیار آدم زاد، اللہ کی پکڑ سے نہیں بچتا۔ آدمی کا سارا کروفر، ساری اکڑ دم بھر میں نکل جاتی ہے۔

واثق بیمار پڑا تو چوکڑی بھول گیا۔ طبیبوں نے اس کی بیماری کا یہ علاج تجویز کیا کہ اسے تنور میں بٹھا کر بھاپ دی جائے۔ پہلے دن تو خیریت ہوئی۔ دوسرے دن تنور زیادہ گرم ہو گیا اور "جناب امیر المومنین، خلیفہ واثق باللہ گویا چرمر ہو گئے۔"

موت کے وقت واثق کی عمر 36 سال کی تھی۔ مدت خلافت 5 سال اور چند ماہ۔

واثق بذات خود بھی عالم تھا۔ علم و ادب اور فنون کا سرپرست بھی تھا۔ اس کا مقابلہ مامون کی علمیت سے کیا جاتا تھا۔ وہ عربی ادب و شعر کا ماہر تھا، خود ایک عمدہ شاعر تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔ اس نے تقریباً ایک سو نئی طرزیں ایجاد کی تھیں۔ عود بجانے میں اسے استاد مانا جاتا تھا۔ خلفائے بنو عباس میں واثق کو سب سے زیادہ اشعار یاد تھے۔ وہ شعراء اور علماء کا بڑا قدردان تھا اور انہیں انعام و اکرام سے نوازتا رہتا تھا۔

حجاز میں امن و امان قائم کرنے کے بعد واثق نے یہاں کے لوگوں کی حتیٰ الامکان خدمت کی۔ یہاں تک کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کوئی سائل باقی نہیں رہا۔ جب اس کے مرنے کی خبر وہاں پہنچی تو لوگ مدتوں اسے یاد کر کے روتے رہے اور اس کے لئے دعائیں مانگی جاتی رہیں۔ جو حکمران بھی اپنے لوگوں کو روزی روٹی کی فکر سے آزاد کر دیتا ہے، اسے یہی صلہ ملتا ہے اور یہ صلہ کم نہیں کہ لوگ اس کے لئے دعا کریں۔

خلیفہ واثق یوں چٹاپٹ ہو گیا کہ اپنی موت سے قبل کسی کو جانشیں نامزد نہ کر سکا۔ بعض امراء نے واثق کی وفات کے بعد اس کے نوعمر لڑکے محمد کو خلیفہ بنانا چاہا، لیکن قاضی احمد بن

داؤد نے ایسا نہ ہونے دیا۔ وہ بوڑھا اب بھی بہت بااثر تھا۔ سو امرائے سلطنت نے اس کا مشورہ مان لیا۔ اس مشورے کے مطابق واثق کے چھوٹے بھائی جعفر بن معتصم کو خلیفہ تسلیم کیا گیا۔ بنو عباس اور امرائے سلطنت نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس نے متوکل علی اللہ کا لقب اختیار کیا (متوکل علی اللہ کا مطلب خدا پر توکل کرنے والا ہے۔ مصنف) تخت نشینی کے وقت متوکل کی عمر 25 سال تھی۔ وہ 207 ہجری میں پیدا ہوا اور 232 ہجری میں خلیفہ بنا۔ وہ واثق سے گیارہ سال چھوٹا تھا۔ ایک ام الولد کنیز شجاع، متوکل کی ماں تھی۔

متوکل کا دور حکومت بنو عباس کا آخری اہم دور ہے۔ اس کے بعد عباسی خلفاء مستقل طور پر امراء کے زیر اثر آ گئے اور اسی بنا پر رفتہ رفتہ ان خلفاء کا سیاسی اقتدار بالکل ماند پڑ گیا۔ متوکل کے دور میں جو بن عباس کے زوال کی سرحدوں سے ملتا ہے، بغاوتوں اور فتوحات کے ساتھ ساتھ احیائے سنت کی کاوشیں اور امراء کے بڑھتے ہوئے اثرات کو ختم کرنے کی کوششیں بھی ملتی ہیں۔ اس کے باوجود جس کمزوری کا آغاز معتصم سے ہو چکا تھا، اسے متوکل ختم نہ کر سکا اور اس کو خود ترک امراء کی ہوس اقتدار کا شکار ہونا پڑا۔

متوکل کے برسر اقتدار آنے تک امراء کا اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ معتصم و واثق کی ترک نوازی اور معتزلی عقائد کی حمایت نے امراء کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا تھا جو اقتدار حکومت میں خود کو خلفا کا شریک سمجھتا تھا۔ ان امرا میں قاضی ابو داؤد اور اس کا خاندان، وزیر ابن زیات، ترک امیر ایتاخ، عمرو بن فرج خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دو سابق خلفاء کے زمانوں سے ان کے اثرات بڑھ رہے تھے۔

میں تو خاصے عرصے سے صبر کئے بیٹھی تھی کہ ظالم آدم زادوں سے خلق خدا پر مظالم کا بدلہ لے سکوں۔ سو متوکل کے کانوں میں بھی میری سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ "اے متوکل! میں تیرے ہی ضمیر کی آواز ہوں، مجھ پر دھیان دے۔ ان امراء کا اقتدار ختم کر دے جو تیرے نزدیک خلافت بن عباس کے دشمن ہیں...... ان میں سب سے بڑا دشمن ابن زیات ہے۔"

"اور دوسرے دشمن؟" متوکل بڑبڑایا۔

"ایتاخ اور قاضی احمد بن داؤد۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر تجھے باری باری ان دشمنوں سے نمٹنا ہے۔"

"یقیناً!..... پہلے ابن زیات ہی سہی۔"

پھر وہی ہوا جو میری مرضی تھی۔ وزیر سلطنت ابن زیات پر خلیفہ متوکل کا عذاب نازل ہوا۔ اسے معتصم کے زمانے سے عروج ملا تھا۔ وہ تبھی سے وزیر اعظم کا عہدہ دابے بیٹھا تھا۔ بڑھا کھوسٹ ہونے کے باوجود وہ کرسی چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ گردن کی کھال تک لٹک گئی تھی۔ پھر بھی اکڑفوں پہلے جیسی تھی۔ اس نے آدمیوں کو سزا دینے کے لئے ایک تنور بنوایا تھا جس کا میں ذکر کر چکی ہوں۔

واثق اور متوکل سوتیلے بھائی تھے۔ یوں واثق موقع بے موقع متوکل کو نیچا دکھاتا رہتا تھا۔ حالانکہ مامون و معتصم کی مائیں بھی دو تھیں مگر ان میں سوتیلا پن نہیں تھا۔ سوتیلے ہونے کے باوجود دونوں بھائیوں میں محبت تھی۔ یہاں معاملہ مختلف تھا۔ واثق کے حکم پر ابن زیات نے متوکل کے سر کے بال کٹوا دیے۔ ابن زیات نے اسی پر اکتفا نہ کیا۔ اس نے کئی بار برسر محفل متوکل کو ذلیل کیا۔

یہی وجہ تھی کہ ابن زیات، متوکل کی خلافت کے حق میں نہیں تھا۔ واثق کی موت کے بعد ابن زیات اس کے نوعمر لڑکے کو خلیفہ بنانا چاہتا تھا۔ جب اس کی تجویز امراء کی اکثریت نے رد کر دی تو اسے اپنا انجام نظر آنے لگا۔ وہ بوڑھا گیدڑ فرار ہونے کے چکر میں تھا۔ جان بچانے کی خاطر وہ دولت و جائیداد بھی چھوڑ دیتا، مگر میں بھلا اسے ایسا کیسے کرنے دیتی۔

ابھی متوکل کو خلیفہ بنے صرف ایک مہینہ ہوا تھا کہ اس نے امیر ایتاخ کو حکم دیا کہ ابن زیات کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا جائے۔ اس کے ساتھ خلیفہ وقت کا یہ حکم بھی تھا کہ ابن زیات کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا جائے۔

خلیفہ متوکل کے احکام (حکم کی جمع احکام۔ اس کی جمع الجمع یعنی احکامات بنانا غلط ہے۔ مصنف) کی تکمیل میں تاخیر نہیں ہوئی۔ ابن زیات کو میرے کہنے پر اسی تنور میں زندہ ڈال دیا گیا جو اس نے دوسروں کے لئے بنوایا تھا اور جس کے اندر آہنی کیلیں تھیں۔

چند ہی روز میں ابن زیات تڑپ کر مر گیا۔ وہ چند روز بھی یوں زندہ رہا کہ تنور میں کھانا اور پانی ڈال دیا جاتا۔ ابن زیات جانوروں کی طرح منہ پھاڑ دیتا، مگر کب تک؟ تنور سے بدبو کے بھبکے اٹھنے لگے۔ ایک دن ابن زیات ہی کے ایک غلام نے خبر دی کہ اب وہ منہ نہیں پھاڑ رہا۔ وہی غلام، ابن زیات کو "دانہ پانی" فراہم کرنے پر مقرر تھا۔

متوکل نے دو سال صبر کے ساتھ گزار دیے۔ اسے میں نے عجلت سے کام نہ لینے دیا۔ کسی ترک سالار (جنرل) کو چھیڑنا آسان بات نہ تھی، اصل طور پر ایسی صورت میں جب کہ وہ فوجی ہونے کے ساتھ دیگر انتظامی عہدے بھی سنبھالے ہو۔ ایتاخ کے ساتھ ایسا ہی تھا۔ فوج کی سربراہی کے علاوہ وہی انتظامی سربراہ بھی تھا۔ اسی کے ساتھ دیگر اہم عہدے بھی ایتاخ کے پاس تھے۔ ان میں مالیات کا عہدہ بھی ایتاخ کی نگرانی میں آ چکا تھا۔ یہی حال دوسرے ترک امراء کا تھا۔ تمام دربار حکومت پر وہی چھائے ہوئے تھے۔ متوکل کو ان با اختیار ترک امراء خصوصاً ایتاخ کی طرف سے ہشکاہی چکی تھی۔ سو وہ ان ترک امراء کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ ایتاخ سے متوکل نے کس طرح جان چھڑائی، یہ بڑا دلچسپ واقعہ ہے جو 234 ہجری میں پیش آیا۔ خلیفہ متوکل دارالخلافہ سامرہ کے نواح میں سیر و تفریح کے لئے نکلا۔ اس کے ہمراہ ایتاخ بھی تھا۔ رات کو دونوں نے مے نوشی کی۔ نشے کی حالت میں متوکل نے ایتاخ کے ساتھ ناشائستہ مذاق کیا۔ ایتاخ کو بھی چڑھ چکی تھی۔ اسے غصہ آ گیا اور اس نے متوکل کو قتل کرنے کے لئے تلوار کھینچ لی۔ غلاموں نے دوڑ کر ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ صبح جب ایتاخ کا نشہ اترا تو اسے رات کی گستاخی پر بڑی ندامت ہوئی۔ اس نے متوکل سے معافی مانگ لی۔ متوکل نے بظاہر تو اسے معاف کر دیا لیکن حقیقتاً اس کی جان کے درپے ہو گئے۔ ایتاخ نے بھی مناسب سمجھا کہ کچھ عرصے کے لئے متوکل کے سامنے نہ آئے۔ اس نے حج کی اجازت مانگی جو مل گئی۔ عزت و احترام کے ساتھ اسے حج پر روانہ کیا گیا۔

جب 235 ہجری میں ایتاخ حج سے واپس ہوا تو متوکل نے بغداد کے والی اسحق بن ابراہیم کو لکھا کہ ایتاخ کو بغداد میں روک کر کسی بہانے گرفتار کر لیا جائے۔ اسحق نے ایتاخ کو لکھا: امیر المومنین کا حکم ہے کہ پہلے آپ بغداد تشریف لائیں۔ وزیر اعظم کی حیثیت نیز نائب السلطنت ہونے کے ناتے یہاں بغداد میں دربار منعقد کریں اور لوگوں کو انعام و اکرام سے نوازیں۔

بے جا مدح سرائی آدم زادوں کا دماغ خراب کر دیتی ہے اور وہ سر اٹھا کر بڑے فخر و شان سے چلتا ہے۔ سر جھکانا بھول جاتا ہے۔ ترک سالار ایتاخ کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ سو وہ جھانسے میں آ گیا۔ وہ بغداد پہنچا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔

اسحٰق پہلے ہی ساری منصوبہ بندی کر چکا تھا کہ ایتاخ کو کیسے زیرِ دام لایا جائے۔ اسی منصوبے کے مطابق اس نے ایتاخ کو خزیمہ کے محل میں ٹھہرایا اور ایتاخ کے ساتھ جو سپاہی تھے انہوں نے باہر ہی روک دیا۔ محل کے دروازوں پر پہرے لگا دیئے۔ جب ایتاخ کو اس سازش کا علم ہوا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اسے خلیفہ متوکل کی طرف سے پہلے ہی خطرہ تھا، اس کی زبان پر اسی لئے یہ الفاظ آئے۔ "آخر کر گزرے!"

بہرحال ایتاخ کو قید کر لیا گیا۔ ترک افواج کی بڑی تعداد دارالخلافہ سامرہ میں تھی۔ اسی بناء پر ایتاخ کو بغداد میں پکڑا گیا تا کہ فوری طور پر افواج میں شورش نہ ہو۔ آمرزادوں کا یہ مزاج ہے کہ وقتی طور پر وہ سخت ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ بشرطیکہ انہیں کوئی بات معلوم ہو جائے۔ کچھ وقت گزر جانے پر وہ بڑے سے بڑا واقعہ بھول جاتے ہیں۔ حکمران حضرات عوام کے اسی مزاج سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کسی اہم شخص کو قتل بھی کرنا ہو تو اسے کچھ دن قید رکھتے ہیں۔ اس دوران میں عوام کا غم و غصہ بڑی حد تک ختم ہو جاتا ہے۔ یوں معتوب شخص کا خاتمہ بہت آسان ہو جاتا ہے۔ ٹھنڈا کر کے کھانے میں حکمرانوں کی یہی مصلحت ہوتی ہے۔

ادھر بغداد میں تو ایتاخ داخلِ زنداں کیا جا چکا تھا اور اس پر سختیاں کی جا رہی تھیں۔ ادھر سامرہ میں کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی کہ ایتاخ پر کیا گزر رہی ہے۔ اس پر اتنی سختی کی گئی کہ وہ بھوک اور پیاس کی شدت سے آخر ایک رات مر گیا۔ میں اسے قتل ہی شمار کرتی ہوں۔

ایتاخ ٹھکانے لگا تو خلیفہ متوکل نے وصیف کو اس کی جگہ دی۔ ایک ترک سالار (جنرل) گیا اور اس کی جگہ دوسرا آ گیا۔ اس سبب فوج میں شورش نہیں ہوئی۔ میں نے متوکل کو یہ سمجھایا کہ کسی عہدے پر زیادہ عرصے ایک ہی شخص کو نہ رہنے دے۔ متوکل نے اسی پر عمل شروع کر دیا۔

مکافاتِ عمل کا دائرہ اب ایک اور بوڑھے گھاگ قاضی احمد بن ابی داؤد کے گرد تنگ ہو رہا تھا۔ مامون، معتصم اور واثق کے زمانوں میں علماء اور محدثین پر جو طرح طرح کے مظالم ہوئے ان میں قاضی ابی داؤد کا بڑا ہاتھ تھا۔ معتزلی عقائد میں قاضی احمد کا فیصلہ آخری سمجھا جاتا تھا۔ اس مذہبی اقتدار کی وجہ سے قاضی کا اثر وزراء اور امراء سے بھی زیادہ تھا۔ ویسے بھی وہ عرصہ دراز سے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے عہدے پر فائز تھا۔ یہی اثر تھا کہ

واثق مر گیا تو قاضی احمد نے خلافت کے لئے متوکل کا نام تجویز کیا تو کسی کی مخالفت کی جرأت نہیں ہوئی۔ یقیناً اس وقت قاضی احمد کو گمان بھی نہ تھا کہ متوکل کی خلافت کے معنی اس کی تباہی اور اس کے عقائد کی بربادی ہوں گے۔

متوکل عقیدے کے لحاظ سے اہلِ سنت کا قائل تھا اور امام شافعی کا پیرو تھا۔ وہ معتزلی عقائد کے خلاف تھا۔ اسی کے ساتھ وہ علویوں کو بھی ناپسند کرتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ علوی خلافت پر اپنا حق جتاتے۔ ماضی میں ایسے کئی واقعات پیش آ چکے تھے کہ علویوں نے خود کو حضور اکرم ﷺ خصوصاً حضرت علیؓ سے خصوصی نسبت کی بناء پر خلیفہ وقت ہونے کا دعویٰ کیا۔

اپنے عقائد کا اظہار متوکل نے خلیفہ بننے کے کچھ ہی دنوں کے اندر کر دیا تھا۔ معتزلی عقائد کی اس وقت تک بیخ کنی (بنیاد سے اکھاڑنا) نہیں ہو سکتی تھی جب تک قاضی احمد بن داؤد کے اثرات موجود تھے۔ 237 ہجری میں قاضی احمد آخر کار زیرِ عتاب آ ہی گیا۔ اس کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی۔ اس کے بیٹے ابوالولید کو گرفتار کر لیا گیا۔ قاضی احمد نے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ درہم دے کر اپنی اولاد اور دیگر افرادِ خاندان کو رہا کرایا۔

اب قاضی احمد کے پاس کچھ نہ رہا۔ وہ جو خود کو روزی رساں خیال کرتا تھا، روٹی کے ٹکڑوں کو ترس گیا۔ اسے اور اس کے خاندان والوں کو سامرہ سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ یہ گویا مرے پر سو دُرے تھے۔ قاضی احمد اور اس کے بیٹے ابوالولید نے نہایت کسمپرسی کی حالت میں انتقال کیا۔

متوکل نے جس طرح قاضی احمد اور اس کے بیٹے سے جاں بخشی کا "تاوان" وصول کیا اور لاکھوں درہم وصول کئے اس سے ایک بڑی خرابی پیدا ہوئی۔ خلیفہ جس امیر کو چاہتا گرفتار کر لیتا اور اس سے رہائی کے عوض بڑی رقم وصول کرتا۔ برسرِ اقتدار آنے سے قبل ہی عمرو بن فرج سے متوکل ناراض تھا۔ عمرو نے بھی ایک کروڑ درہم دے کر رہائی حاصل کی۔ اس طرح قاضی احمد کے بعد یحییٰ بن اکثم کو قضاۃ کا عہدہ سپرد کیا گیا۔ مگر تین سال بعد اسے گرفتار کروا دیا گیا۔ اس کی رہائی کے بدلے 75 ہزار دینار وصول کیے گئے۔ اس طرح متوکل نے اپنے عمال پر جو سختیاں روا رکھیں ان کا لازمی اثر اس کی خلافت کے استحکام پر پڑا۔ خود متوکل نے بھی اس کا نتیجہ بھگتا۔

اپنی عاجلانہ اور غیر دانشمندانہ اقدامات کے باوجود یہ ضرور ہوا کہ معتزلی عقائد پر کاری ضرب پڑی۔ سلطنت کے مختلف حصوں سے محدثین کو سامرہ میں مدعو کیا گیا اور انہیں ہدایات کی گئیں کہ وہ احادیث کی تدریس کو عام کریں۔

بغداد میں ابوبکر بن ابی شیبہ اور اس کے بھائی عثمان کے درس حدیث میں روزانہ تقریباً تیس تیس ہزار آدمی جمع ہونے لگے۔

سرکاری احکام کی تعمیل میں جمع ہو جانے والے آدمی ہر زمانے میں موجود رہتے ہیں۔ اس سے عموماً حکمران بڑی غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انہیں یاد نہیں رہتا کہ وہ سدا اقتدار پر قابض نہیں رہیں گے۔ اقتدار کے ان دیوانوں کی مخالفت خود ان کے گھر سے شروع ہوتی ہے۔ متوکل کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ منتصر اسی کا بیٹا تھا جو اس کے خلاف ہو گیا۔ اس مخالفت کی وجہ متوکل کی سخت گیری اور منتصر کی ہوس اقتدار تھی۔ امرائے سلطنت کو بھی منتصر نے اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ امراء خوفزدہ تھے کہ ان کے ساتھ بھی متوکل ویسا ہی سلوک نہ کرے جو معتوب امراء کے ساتھ کر چکا ہے۔

عارج کی مخالفت اور بحث کے باوجود میں نے اپنی سی کوشش ضرور کی کہ متوکل راہ راست پر آ جائے مگر وہ اقتدار کے نشے میں تھا۔ نشے اور نشۂ اقتدار دونوں مل کر دو آتشہ ہو گئے۔ متوکل کو میں نے باخبر کر دیا کہ منتصر در پردہ اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ اس پر بھی اس آدم زاد کی آنکھیں نہ کھلیں۔ باخبر ہونے کا اس پر الٹا اثر ہوا۔ وہ اعلانیہ منتصر کی بے عزتی کرنے لگا۔

ہوا یہ کہ ایک دن نشے کی حالت میں متوکل نے منتصر کو سر دربار اپنے ایک معتمد (جس پر اعتماد ہو) امیر فتح بن خاقان سے پٹوایا اور منہ پر طمانچے لگوائے۔ پھر متوکل اپنے بیٹے سے بولا "میں نے تیرا نام منتصر رکھا تھا۔ لوگوں نے تیری حماقت کی وجہ سے تیرا نام منتظر رکھ دیا اور اب تو مستعجل (عجلت کرنے والا) ہو گیا۔" اس کے بعد متوکل نے باآواز بلند درباریوں کو مخاطب کیا۔ "گواہ رہنا کہ ہم نے مستعجل کو اپنی ولی عہدی سے خارج کر دیا۔"

اپنی اس بے عزتی کے جواب میں منتصر نے کہا۔ "اے امیر المومنین! اگر آپ میری گردن مارنے کا حکم دیتے تو اس طرز عمل سے زیادہ آسان ہوتا۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ منتصر اپنے باپ متوکل سے مزید نالاں ہو گیا۔ قبیح صورت اور گندمی رنگ

کا وہ نوجوان خلیفہ زادہ منتصر دارالخلافہ سامرہ ہی میں تقریباً پچیس برس پہلے ایک رومی کنیز حبشیہ کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ وہ اب خلیفہ بننے کا راستہ ہموار کر رہا تھا۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ متوکل کو راستے سے ہٹا دیا جاتا۔ دربار کے کئی اہم امراء بھی اس سازش میں شریک تھے۔ بغا شرابدار اور ترک امیر وصیف بہ وجوہ متوکل سے ناراض ہو گئے۔ وصیف کا معاملہ یہ تھا کہ اسے ہٹا کر متوکل نے فتح بن خاقان کو وزیر اعظم بنا دیا تھا۔ بغا شرابدار، وصیف کا حامی تھا۔ سو اس نے سازش پر عمل درآمد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

4 شوال 247 ہجری کی رات کو اس سازش پر عمل کیا گیا۔

اس موقع پر عارج نے مجھے طعنہ دیا۔ "اے دینار، اے جن زادی! کیا تو اس آدم زاد متوکل کو قتل ہونے سے نہ بچائے گی؟"

"مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اس آدم زاد کو مرنے سے بچاؤں جو خود ہی اپنے قتل کا سامان کر چکا ہے۔" میں ترش ہو کر بولی۔

اور میں نے غلط نہیں کہا۔ بے خبر متوکل اس رات فتح بن خاقان اور دیگر امراء کے ساتھ مشغول۔ مے نوشی میں مصروف تھا۔ جب متوکل پیتے پیتے نشے میں "غیر" ہو گیا اور اس کے مصاحبین ایک ایک کر کے چلے گئے تو اچانک خلوت کدے میں دو آدم زاد گھس آئے جو اس کے قتل پر مامور کیے گئے تھے۔

اس وقت متوکل کے پاس صرف فتح بن خاقان تھا۔ فتح، متوکل کو بچانے آگے بڑھا لیکن بغا ابدار نے اس کے پیٹ میں تلوار گھسا دی۔ پھر متوکل پر ایک ساتھ کئی شمشیر بدست آدمیوں نے حملہ کیا۔ تلواریں بلند ہوئیں اور پست حوصلہ متوکل قتل کر دیا گیا۔

سامرہ کے قصر خلافت میں دو زخم زخم لاشیں پڑی تھیں اور قاتل فرار ہو چکے تھے۔ متوکل کو قتل کرنے کے وقت اس کا بیٹا منتصر بھی قصر خلافت ہی میں تھا۔ وہ منتظر تھا کہ قاتل کب اسے "خوش خبری" سناتے ہیں!

قاتلوں نے اسی رات قصر خلافت میں منتصر کے ہاتھ پر بیعت کی۔ منتصر اپنے باپ کے قتل پر اتنا خوش ہوا کہ اس نے صبح ہونے کا انتظار نہیں کیا۔ رات ہی کو اس نے امرائے سلطنت سے بھی بیعت لی۔ اپنے باپ کے قتل کا الزام اس نے فتح بن خاقان پر لگایا اور یوں ایک تیر سے دو شکار کیے۔ رات گزری تو نئے خلیفہ منتصر نے متوکل اور فتح بن خاقان

کے دفن کیے جانے کا حکم دیا۔

متوکل کے مارے جانے کی خبر عام ہوئی تو لشکریوں میں ایک شورش سی پیدا ہو گئی۔ بازاری اور اوباش، ان لشکریوں کے پیچھے ہو لیے۔ یہ سب شور مچاتے ہوئے قصرِ خلافت کے سامنے مظاہرہ کرنے لگے۔

''انتقام۔۔۔انتقام'' کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہونے لگیں۔

نئے اراکینِ سلطنت میں احمد بن خصیب کو قلم دانِ وزارت دیا گیا تھا۔ مظاہرین کا شور سن کر وہی قصرِ خلافت سے باہر آیا۔

''تم لوگ کس سے انتقام لینا چاہتے ہو؟'' وزیرِ اعظم احمد بن خصیب نے تیز آواز میں پوچھا۔

''امیر المومنین کے قاتلوں سے ہم انتقام لیں گے۔'' کئی آوازیں ہجوم سے آئیں۔

''امیر المومنین مقتول خلیفہ متوکل کا قاتل سابق وزیرِ سلطنت فتح بن خاقان تھا۔ ہم نے اسے ٹھکانے لگا دیا اور۔۔۔''

احمد بن خصیب کی بات ادھوری رہ گئی۔ ''تم جھوٹے ہو، فتح بن خاقان قاتل نہیں، خلیفہ مقتول کا جاں نثار تھا۔'' لوگ چیخنے لگے۔

وزیرِ اعظم کو اپنی جان کا خطرہ محسوس ہوا تو تیزی سے پلٹ گیا۔

''بزدل، بزدل احمد بزدل!'' مظاہرین نعرے لگانے لگے۔

ان نعروں کی آوازیں نوجوان خلیفہ منتصر نے بھی سنیں اور اسے غصہ آ گیا۔ اس وقت وحمد بن خصیب اندر پہنچا اور ساری روداد بیان کر دی۔ منتصر بولا۔ ''یہ کھلی بغاوت ہے، ہم خود ان بلوائیوں کا دماغ درست کریں گے۔''

منتصر نے قصرِ خلافت میں موجود محافظ دستے اور ان فوجیوں کو طلب کر لیا جو صبح ہی سے کسی ایسے ردِ عمل کو دبانے کے لئے مستعد تھے۔ ان کے گھیرے میں نیا خلیفہ قصرِ خلافت کے ایک چبوترے پر چڑھ گیا۔ اس نے ہجوم کی تعداد کا اندازہ کر لیا اور فوجیوں کو اشارہ کیا۔

فوجی قصرِ خلافت کے صدر دروازے سے نکلتے ہی مظاہرین پر ٹوٹ پڑے۔ اس سے ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔ چھ مظاہرین مارے گئے۔

قتل کے وقت متوکل کی عمر چالیس برس تھی۔ 14 برس 10 مہینے 3 دن اس نے خلافت

کی۔ متوکل کے حسرت ناک انجام نے اس کے ان سیاسی کاموں کو پسِ پشت ڈال دیا جو حکومت کے استحکام کی خاطر اس نے انجام دیئے تھے، حالانکہ وہ بنو عباس کا آخری بڑا حکمران ثابت ہوا لیکن اس تنزل کو نہیں روک سکا جس کی ابتداء معتصم کے عہد سے ہو چکی تھی۔

میں جانبداری سے کام نہیں لے رہی مگر یہ سچ ہے کہ متوکل کا عہد جہاں سیاسی اعتبار سے قابلِ اعتبار ہے وہاں معاشی اور معاشرتی لحاظ سے بھی کم نہیں۔ متوکل کے بعد ایک دھند سی ہے۔ اس دھند میں وزراء اور امراء کے وہ خاندان دکھائی دیتے ہیں جو برسرِ اقتدار آئے اور بنو عباس کے لئے مستقل خطرہ بنے رہے۔ اقتدار ان خاندانوں کے پاس تھا اور خلفاء یرغمالی تھے۔

حالانکہ علمی اعتبار سے متوکل کوئی مقام حاصل نہ کر سکا لیکن وہ علماء اور شعراء کا قدر دان تھا۔ اس کے دربار میں جن علماء کو جگہ ملی ان میں احمد بن معذل اور ذوالنون مصری خاص طور پر اہم ہیں۔ ذوالنون مصری کو متوکل، صلحا (صالح کی جمع) میں سمجھتا اور عقیدت رکھتا۔ اسے علمِ حدیث کو عام کرنے میں بڑی دلچسپی تھی۔ اس نے سلطنت کے مختلف شہروں میں احادیث کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا۔ اس کے لئے مسجدوں میں محدثوں کے تقرر کیے گئے تاکہ ان کے درس میں عام مسلمان بھی شریک ہو سکیں۔

شاعروں سے متوکل اپنی مدح میں اشعار لکھواتا۔ اکثر شاعر خود ہی اس امید پر مدح سرائی کرتے کہ انعام ملے گا۔ یہ میرے سامنے کی بات ہے کہ متوکل نے مروان ابی الجنوب کو ایک قصیدے کے انعام میں پچاس ہزار درہم دیئے۔

مروان نے بطور شکر یہ جو شعر پڑھا، اس کا ترجمہ یہ ہے۔

بس اپنے ہاتھوں کی بخشش کو مجھ سے روک دیجئے اور زیادہ بخشش نہ کیجئے
کیوں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ میں سرکش اور متکبر نہ ہو جاؤں

یہ شعر سن کر متوکل بولا۔ ''نہیں، خدا کی قسم نہیں روکوں گا جب تک کہ تُو میری سخاوت کو نہ جان لے۔''

متوکل کو عمارتوں کی تعمیر کا بھی شوق تھا۔ اس نے سامرہ میں جو محلات بنوائے ان کا نام جعفریہ رکھا۔ ان محلات کی تعمیر پر بیس لاکھ دینار سے بھی زائد خرچ ہوئے۔ جعفریہ میں نہر

کھودنے کے لئے متوکل نے بارہ ہزار مزدوروں کو مقرر کیا تھا۔ اس کے قتل کے بعد یہ کام ادھورا رہ گیا، نہر برباد ہوگئی۔ کچھ ہی عرصے میں یہ علاقہ منہدم و ویران ہو گیا۔

ذاتی طور پر متوکل کی زندگی عیش و طرب سے عبارت تھی۔ اس کے پاس دولت کی کمی نہ تھی جو اس نے مے نوشی اور حسین عورتوں پر لٹا دی۔ خوبصورت آدم زادیوں نے متوکل کے دور میں بڑے مزے کئے۔

مزہ تو متوکل کے بیٹے نوجوان خلیفہ منتصر نے بھی کیا لیکن اس مزے کی مدت تھوڑی تھی۔ اپنی تخت نشینی کے چھٹے مہینے 5 ربیع الاول 248 ہجری میں وہ اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ اس نے 25 برس 6 ماہ عمر پائی۔ جو طبیب قصر خلافت سے وابستہ تھے انہی میں سے ایک طبیب نے مخالفوں کی شہ پر منتصر کو زہر آلود مجمہ لگا دیا۔ اسی سے اس کی موت واقع ہوئی۔ (مجمہ عربی لفظ ہے، اس کے معنی جونک ہیں۔ جونک جسم کے کسی حصے میں پنجے گاڑ دے تو اسے سینگی لگا کر مارتے اور گندا خون نکالتے ہیں۔ جسم سے گندا خون نکالنے کے لئے بھی طبیب، مریض کو جونک لگاتے تھے۔ جونک کے پنجوں کو جو گوشت میں گڑ جاتے ہیں انہیں زہر آلود کیا جا سکتا ہے۔ تاریخی شواہد یہی ہیں کہ منتصر کو اسی طرح مارا گیا۔ مصنف)

منتصر نے اپنے باپ کو قتل کرایا اور اسے ''انتقام...... انتقام'' کی صداؤں نے ہلاکت میں ڈالا۔ مظاہرے میں جو چھ آدمی مارے گئے، ان میں ایک آوارہ گرد عبید اللہ تھا۔ یہ آدمی بری صحبت میں بگڑ گیا۔ اس کا بڑا بھائی حمید اللہ قصر خلافت میں بہ حیثیت طبیب ملازم تھا۔ اس نے عبید اللہ کو ایک فوجی کے ہاتھوں مرتے دیکھا تو عہد کیا کہ خلیفہ منتصر کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ حمید اللہ کو منتصر کے مخالفوں نے بھی شہ دی۔ غیر فطری اموات جیسے بنو عباس کی قسمت میں لکھ دی گئی تھیں۔

منتصر کے بعد احمد بن محمد کو امرائے سلطنت نے خلیفہ بنایا۔ انہوں نے دانستہ متوکل کی اولاد میں سے کسی کو خلافت نہ سونپی۔ اس کا بڑا سبب رفع شر بھی تھا۔ احمد کا باپ محمد، خلیفہ معتصم کا بیٹا تھا۔ یہ گویا بنو عباس کی ایک اور شاخ تھی۔ امراء نے احمد بن محمد کو مستعین باللہ کا خطاب دے دیا (مستعین باللہ کا مطلب اللہ سے مدد مانگنے والا ہے۔ مصنف)

عربوں اور ترکوں کی چپقلش ایک مدت سے چلی آ رہی تھی۔ بغداد کے بعد پہلی بار پوری شدت سے سامرہ میں اس فتنے نے سر اٹھایا۔ یہ مستعین ہی کا دور تھا۔ مجھے موقع مل

گیا، میرے خیال میں اب دارالخلافہ سامرہ سے بغداد منتقل ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کا اظہار عارج سے کیا تو وہ کہنے لگا۔ ''اے دینار! ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔''

''کہیں تو مستقبل کی خبر تو نہیں لے آیا اے عارج؟'' میں نے اسے گھورا۔

''یہی سمجھ لے۔'' عارج نے گول مول جواب دیا۔

میں اب بنو عباس سے خاصی حد تک مایوس تھی۔ سو عارج سے بحث نہ کی۔ میرے نزدیک دور زوال قریب آ چکا تھا۔ میں غالباً بتا چکی ہوں کہ ہم جنات میں وقت کا تصور وہ نہیں جو آدم زادوں میں ہے۔ پانچ صدیاں ہمارے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ ان پانچ سو برس کی بات میں نے اس وجہ سے کی کہ بنو عباس کی خلافت تقریباً اتنے ہی عرصے قائم رہی۔

خلیفہ متوکل کے بعد سے المستعصم تک مزید 27 خلفاء برسر اقتدار آئے۔ انہی کے زمانے میں دارالخلافہ ایک بار پھر بغداد منتقل ہو گیا۔ ان میں سے بعض خلفاء کا دور حکومت 20 سال سے بھی زیادہ رہا۔ القدر باللہ نے چالیس برس اور القائم باللہ نے 44 سال حکومت کی۔

مستعین باللہ نے 248 ہجری سے 251 ہجری اور معتز باللہ نے 251 تا 255 ہجری برائے نام حکومت کی تھی۔

کسی خلیفہ کی حکومت مختصر ہو یا طویل مگر اقتدار بنو عباس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ یہ ان امراء کے رحم و کرم پر تھے جنہوں نے بادشاہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ امراء جسے چاہتے تخت پر بٹھاتے اور جسے چاہتے معزول کر دیتے۔ خلافت، خود غرض اور موقع پرست امراء کی ہوس اقتدار کا آلہ کار بن کے رہ گئی۔ بنو عباس نے جس طرز حکومت کی بنیاد ڈالی تھی وہ مطلق العنان شہنشاہیت تھی اور بنو امیہ کی حکومت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔

وقت کا پہیہ بڑی تیزی سے گھوما۔ اب میں اور عارج آخری عباسی خلیفہ مستعصم کے دور میں تھے۔ یہ 640 ہجری کا بغداد تھا جب ہلاکو خان نے ایران میں قدم جما لئے تھے اور عراق کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ وحشی منگول ساری دنیا پر چھا جانا چاہتے تھے۔

اس حد تک نوبت کیسے پہنچی؟ وہ سلطنت جس کی طرف بری نظر ڈالنے والوں کی آنکھیں

نکلوائی جاتی تھیں، منگولوں کے مقابلے پر کیوں نہ ٹک سکی؟ آخر مسلمانوں کا وہ فوجی نظام کیا ہوا جو حضرت عمرؓ نے قائم کیا تھا؟ اموی اور عباسی خلفاء تو خود اپنی فوج کی کمان کرتے تھے، پھر بعد میں کیا ہوا کہ بساط اُلٹ گئی؟ ان تمام سوالوں کے جواب موقع محل کی مناسبت سے میں دیتی رہوں گی۔ فی الحال میں فوجی نظام و تنظیم، تنخواہیں اور روزینے، افواج کی تعداد، صوبائی نظام، فوجی خبر رسانی، بحری طاقت، اہم شعبے، صوبائی حکام، انتظام سلطنت، عباسی معاشرے، خلافتِ عباسیہ کے علمی و تمدنی کارناموں، جغرافیہ، تاریخ، فلسفہ، حدیث و فقہ، شعر و ادب وغیرہ کا مختصراً ذکر کروں گی۔ اس کی وجہ یہ کہ ماضی سے کٹ کر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا، خواہ ہم جنات ہوں یا آدم زاد، دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ ہے۔ اس کے بعد 640 ہجری کے عراق خصوصاً شہروں کے شہر بغداد کی سیر کراؤں گی۔

۞.....۞
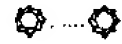
مسلمانوں میں باقاعدہ فوجی نظام حضرت عمرؓ نے قائم کیا۔ انہی کے دور میں سپاہیوں کی تنخواہیں اور روزینے مقرر کیے گئے۔ مستقل سپاہیوں (مرتزقہ) اور ضرورت کے وقت فوجی خدمت انجام دینے والوں (مطوعہ) میں تفریق کی گئی۔ فوج کے مختلف حصوں پر افسران مقرر ہوئے اور فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔ اس فوجی نظام کو حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے برقرار رکھا۔ بنو امیہ نے اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کی۔ ان کے دور میں فوجوں اور فوجی چھاؤنیوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ بحری فوج کا قیام بھی عمل میں آیا۔ بنو امیہ ضرورت پڑنے پر جبری بھرتی سے بھی گریز نہ کرتے۔ عباسیوں کو بھی یہی فوجی نظام ورثے میں ملا لیکن کچھ عرصے بعد ہی عباسی عہد کی خصوصیات اس نظام میں بھی نمایاں ہونے لگیں۔ اموی دور تک فوج صرف عرب سپاہیوں پر مشتمل ہوتی تھی، مگر عباسی کے زمانے میں اہل فارس (ایران والے) بھی اس میں شامل ہو گئے۔ خلیفہ منصور نے عرب افواج کو دو حصوں میں (مصری اور یمنی سپاہ) تقسیم کیا۔ فوج کے تیسرے حصے کو جس میں ایرانی اور دیگر غیر عرب قبائل بھرتی کیے گئے شاۃ کے نام سے موسوم کیا۔ رفتہ رفتہ عباسی فوج میں عرب اثرات کم ہونے لگے۔ ان کی جگہ ایرانی اور پھر ترکی عناصر غالب آ گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ عباسیوں کی فوجی طاقت بھی کم ہو گئی۔ وہ اپنی فوجوں پر قابو نہ رکھ سکے۔

اموی خلفاء کی طرح عباسی خلفاء بھی اپنی فوج کی کمان خود کرتے۔ جنگ میں اگر کوئی

خلیفہ خود شریک نہ ہوتا تو کسی کو بھی اپنا نائب مقرر کر دیتا۔ سپہ سالاری کا عہدہ مستقل نہیں تھا۔ اکثر وزیروں کو بھی یہ فرض ادا کرنا پڑتا۔ بعض سالار اپنی فوجی صلاحیتوں کی بناء پر دوسروں سے ممتاز ہوتے۔ اگر کسی مہم میں کوئی آزمودہ کار شریک ہوتا تو افواج کی کمان وہی کرتا۔

عام طور پر ایک فوج دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اس فوج کو دس دستوں میں تقسیم کیا جاتا۔ فوج کا سالار امیر کہلاتا۔ دستے کے سالار کو قائد کہتے۔ سو سپاہیوں کے سردار کو نقیب اور دس سپاہیوں کے سردار کو عارف کہا جاتا۔ اس طرح دس سپاہیوں سے لے کر دس ہزار سپاہیوں تک فوجی تنظیم قائم ہوتی اور عہدیدار مقرر کیے جاتے۔

عباسی دور میں سپاہیوں کی تنخواہیں کم ہو گئی تھیں۔ مامون الرشید کے عہد میں سوار کو چالیس درہم اور پیدل کو بیس درہم ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ مہم کے موقعوں پر البتہ سپاہیوں کو کئی ماہ کی تنخواہیں پیشگی بھی مل جاتی تھیں۔ متفرق اخراجات کے لئے الگ رقم رکھی جاتی۔ یہ رقم سالار خرچ کرتے۔ مالِ غنیمت میں بھی سپاہیوں کو حصہ ملتا۔ اشیائے خورد ونوش بھی سستی تھیں۔ (خورد و نوش کے معنی کھانا پینا اور دانہ پانی ہیں۔ یہ اسم مؤنث، فارسی ہے۔ اس کی جگہ خوردو نوش لکھنا غلط ہے۔ اصل میں اس سے املا میں قریب تر الفاظ و تراکیب سے ناواقفیت کے سبب غلط املا لکھا جانے لگا ہے، مثلاً خورد، صفت، فارسی۔ بزرگ کی ضد، چھوٹا، کم عمر، عمر میں کم، کم جسامت۔ اسی سے "خوردبین" بنا ہے۔ دوسری مثال خورد برد کی ہے۔ اسم مؤنث، فارسی، معنی کھانا کھانا، غبن، خیانت، بدیانتی، بالائی یافت، رشوت، خورد برد کرنا، فعل متعدی، اردو یعنی غبن کرنا، کھا جانا، خورندہ بھی فارسی، اسم مذکر۔ اس کا مطلب ہے کھانے والا، چیز، جانور، یعنی فضول خرچ۔ مصنف) اس اعتبار سے سپاہیوں کی تنخواہوں کو کم نہیں کہا جا سکتا۔ انہیں سلطنت کے دیگر محکموں کے ملازمین سے زیادہ ہی ملتا۔

عباسیوں کے عہد میں سپاہیوں کی تعداد بھی خاصی بڑھ گئی۔ اموی دور میں ساٹھ ہزار سپاہیوں سے زائد نے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ اس کے برعکس ہارون الرشید کے عہد میں باقاعدہ سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ 35 ہزار ہو گئی۔ امین اور مامون کی خانہ جنگی کے زمانے میں دو لاکھ سے زائد سپاہیوں نے دونوں طرف سے شرکت کی۔ ان فوجوں میں سلطنت کے مختلف علاقوں کے لوگ بھرتی کیے جاتے، ان کی تربیت ہوتی، پھر انہیں مختلف

دستوں سے منسلک کر دیا جاتا۔ خلیفہ اور محلات کے حفاظتی دستے الگ ہوتے، انہیں عام
افواج سے علیحدہ رکھا جاتا، خصوصی مراعات کے بھی یہی مستحق ٹھہرتے۔ گویا جسے چاہے،
وہی سابق! ان مستقل سپاہیوں کے علاوہ مطوعہ (والنٹیرز، رضا کار) سپاہیوں کی بھی کثرت
تھی۔ یہ رضا کار مہمات کے موقعوں پر فوج میں شامل ہوتے، روزینے کے علاوہ یہ رضا کار
مال غنیمت سے بھی اپنا حصہ وصول کرتے۔

فوج میں بڑی تعداد پیادہ سپاہیوں کی ہوتی جو تلوار، نیزہ اور ڈھال استعمال کرتے، تیر
اندازوں کے دستے علیحدہ ہوتے۔ سوار بھی تلواروں اور نیزوں سے لڑتے۔ ریگستانی
علاقوں کے لئے شتر (اونٹ) سوار متعین کئے جاتے، جب فوج روانہ کی جاتی تو تمام فوجی
ضروریات کا خیال رکھا جاتا، سپاہیوں کے ساتھ ساتھ ان کی خدمت کرنے اور ضروریات
مہیا کرنے والے بھی شامل ہوتے۔ اس طرح لشکر میں ان افراد کی تعداد بھی خاصی ہوتی جو
جنگ میں شریک تو نہ ہوتے لیکن فوجیوں کو مستعد رکھنے کے لئے ان کی خدمات ضروری
ہوتیں۔ ان میں مزدور، باورچی، سائیس، جراح اور طبیب بھی شامل ہوتے۔

مضبوط قلعوں کو فتح کرنے کے لئے منجنیقیں، دباب اور کبش استعمال ہوتے۔ (کبش:
ترکی) یہ آلات مختلف دھاتوں اور لکڑی کے بنائے جاتے۔ منجنیق سے بڑے بڑے پتھر
پھینکے جاتے اور قلعوں کی دیواروں کو منہدم کیا جاتا۔ دبابہ اور کبش متحرک برج (رتھ) کا
کام دیتے۔ ان میں بیٹھ کر سپاہی حملوں سے محفوظ ہو جاتے اور دشمنوں کی صفوں میں گھس
جاتے۔ ان آلات کو استعمال کرنے اور انہیں درست حالت میں رکھنے کے لئے ماہرین
مقرر ہوتے جنہیں منجنیقی (انجینئر) کہا جاتا۔

عباسی حکومت کا قیام فوجی فتوحات کی بناء پر ہی عمل میں آیا۔ اسی سبب عباسیوں نے
فوجوں کی تنظیم پر زور دیا۔ اموی عہد میں بصرہ اور کوفہ کی اہمیت کم ہو گئی تھی اور دمشق میں
بھی فوجی چھاؤنی قائم نہیں ہو سکی تھی۔

خلیفہ منصور نے امویوں کی اس کمزوری کو محسوس کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ بغداد کو فوجی
ضرورت کے لحاظ سے تعمیر کیا گیا۔

بغداد کی حفاظت کے لئے صرف قلعے تعمیر نہیں کئے گئے بلکہ دریائے دجلہ سے اس طرح
نہریں نکالی گئیں کہ ان سے بھی شہر کی حفاظت کا بندوبست ہو سکا۔ بغداد کے علاوہ سلطنت

کے مختلف حصوں میں ضرورت کے مطابق فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔ بصرہ اور کوفہ پرانی
چھاؤنیوں کو ازسرنو تعمیر کیا گیا۔ سرحدی قلعے بھی بنوائے گئے۔

مامون اور معتصم نے بھی چھاؤنیوں اور قلعوں کی تعمیر و مرمت سے غفلت نہیں برتی۔
انہوں نے سرحدی مہمات پر توجہ دی۔ گرمیوں میں سرحدی مقامات پر فوج کشی کو صائفہ کہا
جاتا اور جاڑوں کی فوج کشی کو شاتیہ کہتے۔ پھر بھی مجموعی طور پر عباسی عہد میں مسلم مقبوضات
میں قابل قدر اضافہ نہیں ہوا۔ اس کی کئی وجوہ میں سے ایک اہم وجہ یہ ہے کہ عباسیوں نے
حفاظتی تدابیر پر زیادہ زور دیا تھا۔ انہوں نے فوجی پیش قدمی کو تقریباً روک دیا۔ ان کا زمانہ
جنگی فتوحات کا نہیں بلکہ استحکام سلطنت کا زمانہ تھا۔ اس میں وہ کامیاب تھے۔

عباسی فوج میں خبر رسانی کے محکمے کی بھی باقاعدہ تنظیم تھی جو بنو امیہ کے زمانے میں مکمل
ہو چکا تھا۔ اس محکمے کے سپرد نہ صرف دشمن افواج سے متعلق خبروں کی فراہمی کا کام تھا بلکہ
راستوں، میدانوں اور دیگر مقامات کے نقشے بھی اس محکمے کے افراد بناتے تھے۔ یوں گویا
فتح یا شکست میں محکمہ خبر رسانی کے ملازمین کی دماغی صلاحیتوں کو کافی دخل ہوتا۔ کبھی کبھار
ضرورت پڑتی تو ممی بھی خبر رسانی کا کام اپنے مخصوص انداز میں انجام دیتی۔ خلیفہ متوکل کا
قتل ہوا تو جہاں تمام نظام حکومت درہم برہم ہو گیا وہاں فوجی تنظیم پر بھی اس کا اثر پڑا۔ پھر
فوجی لحاظ سے بنو عباس کمتر ہوتے چلے گئے۔

عباسیوں کے ابتدائی دور میں بحری افواج کو منظم کرنے کی طرف بھی توجہ دی گئی۔

بنو عباس جب برسر اقتدار آئے تو مسلم سلطنت کی وسعت اپنی انتہا تک پہنچ گئی تھی۔
ایشیاء میں چینی ترکستان تک، یورپ میں فرانس کی جنوبی سرحدوں تک اور افریقہ میں شمالی
ساحل کی آخری حدود تک مسلمان قابض ہو چکے تھے۔ اندلس (اسپین) کا علاقہ ہاتھ سے
نکل جانے کے بعد عباسیوں کی سلطنت صرف 13 انتظامی صوبوں پر مشتمل رہی۔ ان
میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

حجاز میں مکہ مدینہ، یمن اور عمان کے علاقے شامل تھے۔ 2۔ عراق۔ کوفہ، بصرہ، واسط
اور حلوان اس کے اہم مقامات تھے۔ بغداد کی الگ ایک حیثیت تھی کیونکہ وہ دارالخلافہ تھا۔
3۔ جزیرہ۔ یہ دجلہ اور فرات کے درمیان کا علاقہ تھا۔ 4 شام۔ اس میں قنسرین، حمص،
دمشق اور فلسطین شامل ہے۔ 5۔ مصر۔ یہ سات ضلعوں پر مشتمل تھا۔ 6۔ المغرب۔ یہ شمالی

افریقہ کا ساحلی علاقہ تھا۔ 7۔خراسان۔ یہ صوبہ بہت وسیع تھا۔ اس میں ماوراالنہر کا علاقہ بھی شامل تھا۔

ان صوبوں کے علاوہ 6 صوبے اور تھے۔ آرمینہ، جبل، خوزستان، فارس، کرمان اور آخری صوبہ سندھ۔ اس آخری صوبے میں مکران، منصورہ اور ملتان کے علاقے تھے۔

صوبائی نظام میں والی سب سے اہم عہدے دار ہوتا۔ وہ اپنے صوبے میں خلیفہ کی نیابت کرتا۔ اسے عامل اور حاکم بھی کہا جاتا۔ صوبے کے عدالتی نظام میں بھی والی کو کافی دخل تھا۔ حالانکہ عدالتیں قاضیوں کے ماتحت تھیں لیکن قاضی صرف فیصلہ سنانے کا اختیار رکھتا۔ فیصلے پر عمل کراتا کیونکہ وہی صوبائی انتظامیہ کا سربراہ ہوتا۔ خلیفہ کے احکام پر بھی عمل کرانے کی ذمہ داری اسی پر تھی۔

بغداد کی بنیاد رکھنے والے خلیفہ منصور نے بنو عباس کی دینی سیادت (پیشوائی) پر بھی اتنا ہی زور دیا جتنا دنیوی قیادت پر دیا۔ اس کے نزدیک خلافت خدا کا انعام تھی جس کی حفاظت کرنا خلیفہ کا فرض تھا۔ خلیفہ کی مخالفت کے معنی دین کی مخالفت کے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سفاح اور منصور کے زمانوں میں بنو عباس کے مخالفین نہایت سفاکی سے ختم کر دیے گئے۔ بنو عباس کی دینی برتری کا نظریہ نہ صرف ان کے دورِ عروج میں قائم رہا بلکہ دورِ زوال میں بھی برقرار رہا۔ سیاسی اقتدار سے محرومی کے باوجود وہ مشرق کے مسلمانوں کے پیشوا سمجھے جاتے رہے۔

عباسی حکمرانوں نے اپنی خلافت کی بنیاد قرابت رسول پر رکھی۔ انہوں نے مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دی کہ بنو عباس کی خلافت کے ساتھ ہی اسلام کی عظمت اور بقاء وابستہ ہے۔ شریعت کی تشریح کا حق بھی خلیفہ کو حاصل تھا۔

عباسی دور کا معاشرہ چار حصوں میں تقسیم تھا۔ (1) خلیفہ اور اس کے درباری (2) متمول طبقہ (3) عام رعایا (4) غلام۔

تجارتی لحاظ سے دارالخلافہ بغداد نہایت موزوں جگہ آباد کیا گیا۔ بصرہ، کوفہ، موصل، بحرین، خراسان، آذربائیجان، چین، ہندوستان اور مصر کے تجارتی قافلے یہاں با آسانی پہنچ جاتے۔ عرصہ دراز تک بغداد ساری دنیا کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بنا رہا۔

بغداد کے علاوہ کوفہ، بصرہ، موصل، دمشق، حمص، سمرقند، اسکندریہ وغیرہ میں بھی تجارتی منڈیاں قائم ہو گئیں۔ یہاں اقتصادی سرگرمیاں بڑے پیمانے پر جاری رہتیں۔

سلطنت کے تمام اہم شہروں کے درمیان آمد و رفت کا مناسب انتظام تھا۔ بغداد تک دنیا کے اہم تجارتی مراکز سے سڑکیں آتی تھیں۔ اس کا نتیجہ تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی تھا۔ تجارتی اشیاء پر محصول (ٹیکس) عائد کیے جاتے۔ سلطنت کی آمدنی کا بڑا حصہ ان محاصل پر مبنی تھا۔ ہارون الرشید کے عہد میں سلطنت کی آمدنی چالیس کروڑ درہم سالانہ سے زائد تھی۔ اس میں خراج کے بعد آمدنی کا بڑا ذریعہ عشور تھا جو تجارتی مال سے وصول کیا جاتا۔

بغداد کے معمولی تاجروں کا سالانہ منافع دس لاکھ درہم سے زیادہ ہوتا تھا جس سے اس متمول طبقے کی دولت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہی حال جاگیرداروں کا تھا۔ زیادہ تر جاگیریں انعام کی شکل میں ملتیں، لیکن خرید کر بھی جاگیریں بنائی جاتیں۔

منصور، ہارون، مامون اور واثق نے خراج نیز دیگر محاصل میں خاصی کمی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں خوش حالی عام ہو گئی اور متمول طبقے کی اقتصادی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔

انہی ادوار میں صنعت کاروں نے سلطنت کی معاشی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مختلف صنعتیں قائم کیں۔

خراسان، ایران، ماوراالنہر اور لبنان کے علاقوں میں سونا، چاندی، ہیرے، جواہر اور لوہے کی کانیں تھیں۔ ان سے معدنی دولت میں اضافہ ہو گیا۔ بغداد میں جواہر بنانے اور ہیرے تراشنے کے متعدد کارخانے تھے۔ عراق اور ایران کے مختلف شہروں میں سوتی اور ریشمی کپڑا اتنی کثیر تعداد میں تیار کیا جاتا کہ اسے یورپ اور دیگر بیرونی ممالک کو برآمد کرنا پڑتا۔ کوفہ، خوزستان، شیراز اور بخارا میں پارچہ جات اور قالین بنانے کے متعدد کارخانے تھے۔ ان کی تیار کردہ اشیاء ساری دنیا میں مشہور تھیں۔

عباسی عہد میں مسلمانوں نے ایک اہم صنعت کی طرف توجہ دی۔ یہ کاغذ سازی کی صنعت تھی۔ مسلمانوں نے اس صنعت کو چینیوں سے حاصل کیا۔ ہارون الرشید کے دور میں کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ قائم ہوا۔

اس کے کچھ عرصے بعد سلطنت کے اہم شہروں میں کاغذ سازی کی صنعت کو فروغ ہوا اور کارخانے قائم ہوئے۔

سلطنت کے ہر اہم شہر میں کسی نہ کسی صنعت کو ترقی ملی۔ اس سے صنعت کاروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو اقتصادی ترقی کا لازمی جزو بنا۔ تاجروں، جاگیرداروں اور صنعت کاروں کے علاوہ متمول طبقے میں اصحاب علم کا بھی شمار ہوتا تھا۔

علماء یا تو خلیفہ کے دربار سے وابستہ ہوتے یا انہیں امراء کی سرپرستی حاصل ہوتی۔ عباسی عہد میں تحصیل علم کی طرف خاص توجہ دی جانے لگی۔ مدرسوں کی تعداد مستقل طور پر بڑھتی رہی جن میں علماء اور فضلاء (فاضل کی جمع) درس دیتے۔ ان صاحبان کو نہ صرف سرکاری خزانے سے اعلیٰ تنخواہیں ملتیں بلکہ یہ انعام و اکرام سے بھی نوازے جاتے۔ معاشرے میں معاشی اعتبار سے بھی ان کی الگ حیثیت تھی۔ اصحاب علم میں صرف درباری یا علماء مدرسوں اور مساجد کے نگراں ہی شامل نہیں تھے بلکہ وہ تمام آدمی شامل تھے جو علم کے ذریعے متمول زندگی بسر کرتے تھے۔ سلطنت کے مختلف محکموں میں ان کی ضرورت ہوتی تھی۔ (متمول کا مطلب دولت مند ہے)

عباسی معاشرے کا تیسرا طبقہ رعایا پر مشتمل تھا۔ اس میں کاشتکار (کسان) مزدور اور سپاہی سب شامل تھے۔ فوجی ملازمت کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا کیونکہ اس میں ترقی کے امکانات زیادہ ہوتے۔ اس طبقے میں موالی بھی تھے۔ جب کوئی غیر مسلم، اسلام قبول کرتا تو اسے کسی عرب قبیلے کی حمایت حاصل کرنی پڑتی اور وہ نومسلم اس عرب قبیلے کا موالی ہو جاتا۔ موالی بھی فوج میں بھرتی ہو کر فوجی طاقت میں اضافے کا باعث ہوتے۔ معاشرے کا چوتھا طبقہ غلاموں کا تھا۔ ان کی جداگانہ حیثیت تھی۔ انہیں عام افراد میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ خلفاء اور امراء کے غلاموں کو سلطنت کے معاملات میں دخل دینے تک کا موقع مل جاتا۔ اسی سبب اکثر غلام وزارت کے عہدے تک پہنچ گئے۔ غلام عام طور پر آقاؤں کے وفادار ہوتے اور ان کے سپرد جو خدمت کی جاتی اسے ہر ممکن طور پر انجام دیتے۔

عباسیوں کے دور عروج میں عورتوں کو خاص آزادی حاصل ہوتی۔ وہ مردوں کے دوش بہ دوش روزمرہ کاموں میں حصہ لیتیں۔ جب ضرورت پڑتی تو جنگوں میں بھی مردوں کے ساتھ ہوتیں۔ اس کے علاوہ عورتیں سلطنت کے انتظامی معاملات میں بھی دخل دیتیں۔ خلیفہ مہدی کی بیوی خیرزان (اسے خزران بھی کہا جاتا تھا) ہارون کی بیوی زبیدہ اور مامون

کی بیوی بوران نے ملکی سیاست میں حصہ لیا۔

عباسی خلافت میں مسلمانوں کی معاشرتی زندگی فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے اثرات سے نہ بچ سکی۔ یہی اختلافات آخرکار اس معاشرے کی تباہی کا باعث ہوئے۔

یہاں اگر میں مسلمان آدم زادوں کی علمی و تمدنی کارناموں کا ذکر بھی کر دوں تو وہ لفظی تصویر نمایاں ہو جائے گی جو دکھانی مقصود ہے۔ جس وقت مسلمانوں نے اپنی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا تو انہیں ایک سے زائد متمدن اقوام سے مقابلہ کرنا پڑا۔ فوجی مہمات میں عربوں کی کامیابیاں تہذیب و تمدن کی غارت گری کا سبب نہیں بنیں بلکہ دم توڑتے ہوئے ایرانی اور یونانی تمدن و حکومت کے لئے بقا کا پیغام لائیں۔ یہ کامیابیاں ایک ایسے تمدن کے فروغ کا باعث ہوئیں جس میں عربوں کی تڑپ، ایرانیوں کی نفاست اور یونانیوں کی تحقیق و جستجو مدغم ہو گئی۔ عباسی عہد میں لوگ آرام و اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے تو علمی اور تمدنی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ انہوں نے عربی، ایرانی، ہندی اور یونانی ذخائر علوم کو سلطنت میں عام کر دیا۔ ان کے اسی کارنامے نے انہیں شہرت دوام بخشی۔ اس وجہ سے ان کا دور حکومت مسلمانوں کی علمی و تمدنی ترقی کے انتہائی عروج کا زمانہ قرار پایا۔

مسلمان آدم زادوں کی فتوحات کے سلسلے میں تین خصوصیات نظر آتی ہیں۔ پہلی خصوصیت تو یہ تھی کہ عام طور پر مفتوحہ لوگوں پر ظلم و تشدد روا نہیں رکھا گیا۔ اس کے برعکس انہیں مراعات دی گئیں اور ان کے حقوق کی حفاظت سے گریز نہ کیا گیا۔ دوسری خصوصیت جو اس برتاؤ کا نتیجہ تھی اس سے مفتوحہ علاقوں کے لوگوں نے خود اپنی مرضی کے مطابق اسلام قبول کیا۔ اسلام صرف عربوں کا نہیں غیر عربوں کا بھی مذہب بن گیا۔ عباسی عہد میں عربی زبان دنیا کی اہم ترین زبان بنی۔ تمام اہم علمی اور تحقیقاتی کارنامے اس زبان میں منتقل کرا دیئے گئے۔

خلفائے بنو عباس نے رفاہ عامہ کے جو کام میرے ایماء پر انجام دیئے ان میں شفاخانوں کا قیام بہت اہم ہے جہاں تربیت یافتہ طبیب رکھے جاتے۔ عباسی عہد میں طب کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا گیا۔ صرف انہی طبیبوں کو اس پیشے میں داخل ہونے کی اجازت ملتی جو ایک خاص امتحان میں کامیاب ہو جاتے۔ چوتھی صدی ہجری میں صرف بغداد کے اندر سند یافتہ طبیبوں کی تعداد 900 (نو سو) کے قریب تھی۔ جن مسلمان طبیبوں نے عباسی

عہد میں شہرت دوام حاصل کی ان میں علی الطبری، ابوبکر محمد بن زکریا رازی اور بوعلی سینا کے نام بہت اہم ہیں۔

مسلمانوں نے جن علوم وفنون کو درجہ کمال تک پہنچایا ان میں جغرافیہ، تاریخ، فلسفہ، حدیث و فقہ اور شعر و ادب شامل ہیں۔ طول کلام سے اجتناب کرتے ہوئے یہاں شعر و ادب کا ذکر کروں گی۔

رسول اکرم ﷺ کی پیدائش سے کئی صدی پہلے سے عربوں میں شاعری کا بڑے پیمانے پر رواج ہو گیا تھا۔ عکاظ کے میلے میں مشاعرے ہوتے تھے۔ اسلام نے دور جاہلیت کی شاعری پر کچھ پابندیاں عائد کیں اور بے محابہ جذبات کو روکنا چاہا لیکن رفتہ رفتہ یہ پابندیاں خود ہی کم ہو گئیں۔ عباسی عہد میں زندگی کی آسائشوں اور سامان عیش کی فراوانی نے شعر و سخن کی محفلیں گرم کر دیں۔ ایسے شاعر عدم سے وجود میں آ گئے جن کا مقابلہ آغاز اسلام کے عرب شعراء سے کیا جا سکتا۔ اکثر عباسی خلفاء سخن فہم ہی نہیں سخن گو بھی تھے۔ اس بناء پر سلطنت میں شعر و سخن کا چرچا عام ہو گیا۔ ہر بڑا شاعر خود کو دربار خلافت سے وابستہ کرنا چاہتا۔

خلیفہ منصور اپنی پارسائی کے وصف اور مزاج کی سختی کے باوجود شعر و ادب کا دلدادہ تھا۔ اسے عرب شعراء کے بیشتر اشعار یاد تھے۔ منصور کے بعد خلافت کا عابدانہ زاہدانہ مزاج تبدیل ہو گیا۔ خلیفہ مہدی نے جس عیش و عشرت کا آغاز کیا اسے ہارون اور مامون نے عروج تک پہنچا دیا۔ شاعری اس قدر عام ہو گئی کہ عورتیں بھی اس میں مہارت حاصل کرنے لگیں۔

وہ کنیزیں زیادہ قیمت پر فروخت ہوتیں جو خوبصورت ہونے کے علاوہ شعر فہم بھی ہوتیں۔

جن شعراء نے عباسی عہد میں یعنی میرے سامنے شہرت حاصل کی ان میں ابو نواس، ابوالعتاہیہ، ابو تمام، متنبی، اور العلا معری بھی شامل ہیں۔ ابو نواس، ہارون کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ وہ نہایت پُر گو شاعر تھا۔ اس کے دیوان میں غزلات، قصائد، مرثیے، ہجویں وغیرہ سب ہیں، لیکن اس کی شہرت غزل اور خمریات کے باعث ہے۔ ان دو اصناف سخن میں ابو نواس اور دوسروں سے ممتاز ہے۔ ابو العتاہیہ نے اپنی شاعری میں حزن و ملال کو

فلسفیانہ رنگ کے ساتھ پیش کیا ہے جب کہ متنبی نے زور بیان، شوکت الفاظ اور تشبیہات کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ متنبی اپنے قصائد کی بناء پر عرب شاعری میں اہم ترین مقام کا حامل ہے۔ ابو تمام نے رزمیہ شاعری میں وہ درجہ حاصل کیا کہ بعد کے شعراء کو صرف اسی کی تقلید کرنی پڑی۔ ابو العلا معری کی شاعری میں فلسفہ، اخلاق اور حزن و یاس کا حسین امتزاج ہے۔ بلاشبہ وہ عباسی عہد کا آخری بڑا شاعر ہے۔

شاعری کے ساتھ عربوں نے نثر نگاری کی طرف بھی توجہ دی۔ اس سے قصص و حکایات کو بھی اہم مقام حاصل ہو گیا۔

الف لیلہ کا بیشتر حصہ اگرچہ ترجمہ ہے لیکن اس میں مزید اضافوں کے ساتھ کہانیوں میں نئے کردار شامل کئے گئے۔ الف لیلہ کو بجا طور پر عرب افسانہ نگاری کا کمال کہا جا سکتا ہے۔

یہ تھی وہ لفظی تصویر جو آپ نے دیکھی اور میں نے دکھائی۔ اب میں حسب وعدہ آپ کو 240 ہجری کے بغداد میں لئے چلتی ہوں۔

O......O

یہ وہی بغداد ہے کہ جس کا سنگ بنیاد کئی صدی پہلے میرے سامنے رکھا گیا تھا۔ کوئی یقین کرے نہ کرے مگر یہ حقیقت ہے کہ گزری ہوئی صدیوں کے دوران میں بڑے حشر اٹھے۔ ان کی بنیاد وہ تھی جس کی ابتداء خلیفہ منصور سے ہوئی۔ حکمران اپنے اقتدار کو قائم رکھنے اور اسے طول دینے کی خاطر لوگوں کے مذہبی جذبات سے کھیلتے رہے۔ ہر ابتداء کی انتہا ضرور ہوتی ہے۔ خلیفہ عبداللہ ابو احمد جس نے معتصم باللہ کا لقب اختیار کیا، اس کا دور اس ابتداء کی انتہا ہے۔

یہاں میں ایک اور وضاحت کرنا چاہتی ہوں۔ اس وضاحت کا تعلق زبان سے ہے۔ میں بتا چکی ہوں کہ مجھے زمین کے ہر حصے پر بولی جانے والی زبانوں پر عبور حاصل ہو گیا تھا۔ ایک جن زادی کی حیثیت سے میں نے ماضی اور مستقبل کا سفر کیا اور آنے والے زمانوں میں جو زبانیں پروان چڑھیں وہ بھی میں نے سیکھ لیں۔ ان زبانوں کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور وہ تمام زبانیں شامل ہیں جو آئندہ آٹھ صدیوں میں آدم زادوں نے بولیں اور سمجھیں۔

اب تک میں نے جو کچھ بیان کیا اس میں صرف قدیم زبانوں کے الفاظ ہی استعمال کئے

لیکن اب ممکن ہے یہ احتیاط نہ برت سکوں، اس کی وجہ دنیا کی متعدد زبانوں سے میری واقفیت ہے۔

گزرے ہوئے زمانوں کا حال سناتے وقت مجھے تاریخ بھی بولنی پڑی۔ اس سے میری داستان بوجھل ضرور ہوئی لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ تاریخ کی گردن پر آدم زاد تو چھری پھیر سکتے ہیں ہم جنات نہیں۔

مجھے ایک اور اہم بات یہ کہنی ہے کہ میری سرگزشت کے مرکزی کردار آدم زاد ہیں۔ ان آدم زادوں میں حکمران ٹولا میری توجہ کا محور ہے کہ اسی ٹولے نے خلقِ خدا کو خون میں نہلایا۔ مختلف فرقوں اور گروہوں میں بانٹ دیا۔ انہوں نے اپنے ہی جیسے آدم زادوں پر حکومت کے لئے انہیں آپس میں لڑایا۔ ایک اللہ، ایک رسولؐ، ایک کتاب، اس پر ہم جنات کا بھی ایمان ہے اور آدم زادوں کا بھی! پھر نفرتوں کی فصل کس نے بوئی؟ آدمیوں کو انسان بننا کیوں نصیب نہ ہوا؟ آدم زاد ایک دوسرے کا خون بہانے پر کیسے راضی ہو گئے؟ ان سوالوں کا جواب کیا ہے؟ حکمران ٹولے نے یہ سب اپنے اقتدار کی خاطر کیا۔ مختلف زمانوں اور مختلف جہانوں میں ایسا ہی ہوا۔

اور ایسا ہی اس نادان آدم زاد خلیفہ مستعصم نے بھی کیا۔ اپنی زندگی عیش سے گزارنے کے لئے اس نے تمام اختیارات ایک عیار آدم زاد ابن علقمی کو دے دیئے۔ فتنہ پرور ابن علقمی نے دولت کی ہوس اور اقتدار کی چاہت میں آدم زادوں کے منہ پر کالک مل دی۔ اس ظالم نے بھی مذہب کو آڑ بنایا اور مسلمانوں کا مستقبل بہت سستے داموں ایک غیر مہذب وحشی منگول ہلاکو خاں کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہ بڑے دردانگیز اور الم ناک واقعات ہیں۔ ہر چند کہ میں ایک جن زادی ہوں پھر بھی آدم زادوں کی اس تباہی پر میرا وجود لرز اٹھا۔

میری ایسی ہی باتیں سن کر اکثر عارج میرا مذاق اُڑاتا اور کہتا۔ ”اے دینار! تو ان آدم زادوں کے لئے کیوں کڑھتی رہتی ہے؟ کیا تیرے کڑھنے سے یہ سیدھی راہ پر آ جائیں گے؟ تجھے شاید یہ گمان ہے کہ تُو بھی قابل ہے۔ سن! یہ آدم زاد خود کو ہم جنات سے زیادہ قابل سمجھتے ہیں اور اگر وہ واقعی ایسا سمجھتے ہیں تو......“

میں عارج کی بات کاٹ دیتی اور کہتی۔ ”صدیوں سے تُو یہی بکواس کرتا آیا ہے۔ میں تیری دھونس میں نہیں آتی۔ میں کڑھوں یا جلوں تجھے کیا؟ رہا گمان تو ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ

گمان نہیں واقعہ ہے کہ میں قابل ہوں۔“

صدیوں گزر جانے کے باوجود نہ میں بدلی تھی، نہ عارج! وہی نوک جھونک، وہی بات بات پر تکرار اور وہی پیار! ہاں بغداد یقیناً بہت بدل گیا تھا۔ اب شہر میں ہر طرف محل ہی محل نظر آتے۔ عالی شان قصر دکھائی دیتے۔

ایک رات عارج کے ساتھ میں حسبِ معمول سیر کر رہی تھی۔ شہر نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ بغداد کے باسی بے خبر تھے کہ خلیفہ وقت مستعصم کے کیا ارادے ہیں! دریائے دجلہ سے ایک نہر کاٹ کر شہر میں لائی گئی تھی۔ اسی نہر کے کنارے مجھے کچھ غیر معمولی سرگرمی محسوس ہوئی۔ نہر کے کنارے چند آدم زاد اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔

”اے عارج! یہ کون لوگ ہیں اور یہاں رات کے وقت کیا کر رہے ہیں؟“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

”تجھے نہیں معلوم اے دینار کہ اس نہر کے کنارے خلیفہ کے حکم پر حوض بنائے گئے ہیں۔ یہ حوض اس قدر مضبوط ہیں کہ انہیں کدالوں اور ہتھوڑوں سے بھی توڑا جائے تو مہینوں لگ جائیں۔“ عارج نے جواب دیا۔

”حوض...؟ کیا کہہ رہا ہے تُو؟ حوض میں تو پانی بھرا جاتا ہے......نہر کے کنارے حوض؟ کیا تک ہوئی؟“

”حوض سے میری مراد تھی، حاشیے کے اندر کا میدان!......حوض کے یہ معنی بھی تو ہیں۔“

”ہیں تو سہی یہ معنی۔ مگر اس بات کو آسان لفظوں میں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ حاشیہ کھینچ کر نہر کے کنارے کھدائی کی گئی اور پھر کھودے جانے والے گڑھوں کو پختہ کر دیا گیا۔ کسی ایسے حوض کی طرح جس میں پانی نہ ہو......بغیر پانی کے حوض یا بے آب حوض کہہ لے۔“

”تُو کچھ بھی کہہ لے اے دینار! میں تو انہیں حوض ہی کہوں گا۔ میں تیری طرح بال کی کھال نہیں نکالتا۔“ عارج چیخنے لگ گیا۔

ایسے موقعوں پر مجھے ہنسی آ جاتی تھی، لیکن اس وقت میں نے ضبط سے کام لیا ورنہ عارج مجھے ان بے آب حوضوں کے بارے میں کچھ بھی نہ بتاتا۔ مجھے عارج سے معلوم ہوا کہ وہ بے پانی کے حوض دیکھنے کے لئے خلیفہ بھی اکثر آتا رہتا تھا۔ خلیفہ کے سوا کسی کو پتہ نہ تھا کہ

وہ "حوض" کس لئے بنوائے گئے ہیں۔ یہ عجیب سی بات تھی کہ "حوض" دہرے تھے۔ یعنی ایک حصہ نیچے تھا، تہ خانے کی طرح! اس حصے پر چھت ڈال دی گئی تھی۔ دوسرے حصے یعنی پردے والے کو پاٹا جانا تھا۔ آج کی رات اسی اوپری حصے کو پاٹے جانے کے انتظامات ہو رہے تھے۔ کام کیونکہ تھوڑا رہ گیا تھا اس لئے زیادہ تر مزدور ہٹا دئیے گئے تھے۔ صرف اتنے کاریگر رکھے گئے تھے جو رات کے چند گھنٹوں میں یہ کام ختم کر لیں۔

ان "حوضوں" کو بنانے والے، انہیں بنوانے والے اور کام کی نگرانی کرنے والے بھی حیران تھے کہ آخر یہ "حوض" کیوں تعمیر کئے جا رہے ہیں! خلیفہ مستعصم نے انہیں تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا اور وہ تعمیر کر دیئے گئے تھے۔

اور تو اور خلیفہ کے مشیرانِ خاص بھی نہیں جانتے تھے کہ ان "حوضوں" کی تعمیر کا کیا مقصد ہے! انہیں اس سلسلے میں خلیفہ سے بھی کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

میں ان "پراسرار حوضوں" کی تعمیر سے اس لئے آگاہ نہ ہو سکی کہ بغداد میں تھی ہی نہیں۔ کچھ عرصہ میں نے بابل کے کھنڈرات میں اپنے ماں باپ کے ساتھ گزارا۔ میرا باپ اعظم اب بھی جنات کے قبیلے کا سردار تھا۔ عالم سوما اور نسیم باسر بھی زندہ تھے۔ ان پر بڑھاپا ضرور آ گیا تھا۔ بوڑھے والدین عموماً اپنے بچوں کو پاس رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی معاملہ میرے ماں باپ کا تھا۔ میرا بڑا بھائی یوسف مدتوں بابل کے کھنڈرات کی طرف نہیں پلٹا تھا۔ اس نے مصر کی ایک جن زادی سے شادی کر لی تھی اور وہیں بس رہا تھا۔

اس عرصے میں عارج معلوم نہیں کہاں کہاں کے سفر کرتا رہا!

بابل کے کھنڈرات سے میں اسی روز بغداد آئی تھی۔

عارج کو گویا بہلا پھسلا کر میں نے سب کچھ پوچھ لیا۔ میرے لئے ان "حوضوں" کا راز جاننا مشکل نہ ہوتا مگر میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ مجھے غیر ضروری معلومات جمع کرنے کا شوق کبھی نہیں رہا۔ ایک وجہ تو یہ تھی۔ دوسرا سبب سسنی پسندی تھا۔ آدم زادوں کے درمیان رہ کر ہیجان اور سسنی کی لذت سے میں آشنا ہو گئی تھی۔ کچھ نہ جاننے میں بھی کبھی کبھی بڑا مزہ آتا ہے۔

مجھے وہاں رکتے اور ان "حوضوں" میں دلچسپی لیتے دیکھ کر عارج بدمزہ ہو گیا۔ بولا۔

"میں چلا اے دینار!"

"خدا حافظ!" میں نے فوراً ہی کہہ دیا۔

پھر کیا تھا، عارج لمحہ بھر نہ رکا، یہ جا وہ جا! عارج روٹھ جاتا تو میں اسے منا لیتی اور جب چاہتی اس قدر تپا دیتی کہ وہ میرے قریب ٹھہرنا بھی پسند نہ کرتا۔ وہ نکاح پڑھوانے کی کہتا تو میں نہ مانتی اور صاف کہہ دیتی۔ "مجھے اپنے عشق کی موت قبول نہیں۔"

عارج ٹھنڈا سانس بھرتا اور کہتا۔ "تو اے دینار! تجھے میری موت کو قبول کرنا پڑے گا۔"

"او جھلّے! نہ ہو اداس عارج! میں جانتی ہوں تو میرے بغیر مر بھی نہیں سکتا۔"

وہ زچ ہو کر رہ جاتا اور جو میں کہتی وہی کرتا۔

❁ ❁

اس رات بہ وجوہ عارج کو میں نے "خدا حافظ" کہہ دیا تھا تاکہ حقیقت حال جان سکوں۔ عارج ساتھ ہوتا تو "چل ... چل تا!" کی رٹ لگائے رہتا۔ عارج چلا گیا تو نہر کے اوپر پرواز کرتے ہوئے میں نے اردگرد کا جائزہ لیا اور پھر زمین پر اتر گئی۔

میں نے دیکھا، نہر کے دونوں طرف اور قصرِ خلافت سے پیادہ رو (فٹ پاتھ) تک فوجی پہرا لگا ہوا تھا۔ بغداد کے بے فکر نہر کے کنارے کنارے دور تک کی پیادہ رو پر آ بیٹھتے اور رات گئے تک وہاں سے اٹھتے۔ یہ پہرا انہی کے لئے تھا۔

فوجیوں نے اتنے علاقے کو گھیر لیا تھا کہ نہر کے اندر سے نقل و حرکت کو نہ دیکھا جا سکے۔

ذرا دیر ہوئی تھی کہ "حوضوں" پر کام کرنے والے کاریگروں کو بھی ہٹا دیا گیا۔ پھر "شاہی" گاڑیوں کی آمد شروع ہوگئی۔ ان گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ سے مجھے یہ خیال ہوا کہ قصرِ خلافت میں رہنے والی آدم زادیاں شاید "حوضوں" میں نہانے آ رہی ہیں۔

میں ایک خاموش تماشائی کی طرح سب دیکھتی رہی۔ اگر ان آدم زادیوں کو پتہ چل جاتا کہ ایک جن زادی بھی ان کے درمیان موجود ہے تو ان کی ہوا کھسک جاتی۔ پھر شاید وہاں سے وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ لیتے۔

اگرچہ رات چاندنی تھی۔ لیکن ابر بھی چھایا ہوا تھا۔ بادلوں کے پارے تیر رہے تھے۔ جب چاند پر بادل آ جاتا تو اندھیرا پھیل جاتا اور جب بادل ہٹ جاتا تو چاندنی چھٹک جاتی۔ ہر شے گویا نور میں نہا جاتی۔

قصرِ خلافت سے ان "حوضوں" یا "حوض" تک برابر گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔

اس عرصے میں ایک آدم زاد پر میری نظر پڑی۔ اس کے لباس کو دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ وہ بھی حکمران خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ فوجیوں نے اس نوجوان آدم زاد کو بھی آگے بڑھنے سے روک دیا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ دور تک فوجی حلقہ کئے کھڑے تھے۔

اس نوجوان نے کچھ دور چل کر پھر اس کی طرف بڑھنا چاہا جس پر پہرا تھا۔ اسے دور ہی سے ایک فوجی نے ٹوکا، بولا۔ "معزز نوجوان! اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو، واپس چلے جاؤ! اس حصار کے اندر جانا موت کو دعوت دینا ہے۔"

نوجوان بڑھ کر فوجی کے پاس پہنچا اور کہا۔ "میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ گاڑیاں کہاں جا رہی ہیں؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔" فوجی نے جواب دیا۔

"اگر تم مجھے آگے جانے دو تو میں یہ بات معلوم کر سکتا ہوں۔"

"نہیں، میں تمہیں یہ اجازت نہیں دوں گا۔ تم آخر کیوں موت کے حصار میں داخل ہونا چاہتے ہو؟" نوجوان مصر رہا تو فوجی نے صاف انکار کر دیا۔

اس پر بھی نوجوان واپس نہ آیا، بولا۔ "مجھے اپنی موت کی پرواہ نہیں۔"

"شاید اس لئے کہ تمہیں کسی سے عشق ہے...... تم کسی پر فدا اور زندگی سے تنگ آ گئے ہو۔"

"تم نے بالکل ٹھیک سمجھا۔" نوجوان نے بات بنائی۔ اس کے لہجے سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے نوجوان نے مزید کہا۔

"دراصل مجھے یہ خوف ہے کہ میری محبوبہ تو کسی کے ظلم کا شکار نہیں ہو رہی!"

فوجی نے حیرت سے نوجوان پر نگاہ ڈالی اور کہنے لگا۔ "تمہاری محبوبہ...... کیا وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے؟"

نوجوان نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ (خلافت برائے نام رہ گئی تھی جسے بادشاہت کہنا مناسب ہے۔ اسی بنا پر حکمران خاندان کے افراد کو "شاہی" خاندان کے افراد کہا جاتا تھا۔ یعنی عوام میں الفاظ شاہی، شہزادے، شہزادیاں وغیرہ رائج تھے۔ خلیفہ کو البتہ "خلیفہ" ہی کہا جاتا تھا "بادشاہ" نہیں۔ خلافت سے قدیم نسبت کے سبب کچھ الفاظ بول چال میں اب بھی مستعمل تھے۔ مصنف)

"مجھے تم سے ہمدردی ہے۔" فوجی بولا۔ "مگر میں تمہیں آگے نہیں جانے دوں گا۔ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ دیکھو...... وہ ادھر!...... نظر آیا کچھ؟...... کوئی فوجی افسر اس طرف آ رہا ہے، کہیں وہ تمہیں گرفتار نہ کر لے۔"

"ہاں..... کوئی آ تو رہا ہے ادھر۔" نوجوان نے فوجی کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھا۔

اس وقت چاند پر ہلکا بادل آ گیا۔ چاندنی پھیکی پڑ گئی۔ پھر بھی اتنا اجالا تھا کہ چند قدم کی چیز صاف نظر آتی تھی۔ واقعی کوئی فوجی افسر سامنے سے آ رہا تھا۔ نوجوان اس جگہ سے ہٹ گیا۔

میں نے اس فوجی افسر اور فوجی کی باتیں سنیں۔ افسر نے پوچھا۔ "کون تھا وہ شخص جو تم سے باتیں کر رہا تھا؟"

"کوئی معزز نوجوان تھا۔ وہ سڑک تک جانا چاہتا تھا۔ میں نے سمجھا دیا، واپس چلا گیا۔" فوجی نے جواب دیا۔

"احتیاط رکھو، کسی کو اندر نہ جانے دو۔ ورنہ خلیفہ کے عتاب سے نہ بچ سکو گے۔"

"میں اپنے فرضِ منصبی کو خوب سمجھتا ہوں جناب!"

فوجی افسر اور فوجی کے درمیان یہ گفتگو جاری تھی کہ میں اس نوجوان کے پاس پہنچ گئی۔

اس دوران میں مطلع ابر آلود ہو گیا، گھٹا چھائی، چاند چھپ گیا، چاندنی غائب ہو گئی، اندھیرا پھیل گیا اور اندھیرا بھی ایسا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ اس کے باوجود مجھے سب نظر آ رہا تھا۔ نوجوان نے اپنا ڈھیلا ڈھالا لباس سمیٹ کر باندھ لیا اور کسی چوپائے کی طرح چاروں ہاتھ پیر سے بڑی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس احتیاط کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی فوجی کی نظر اس پر نہ پڑی اور وہ فوجیوں کے حصار سے آگے نکل گیا۔

معاً بوندا باندی ہونے لگی۔ نوجوان اب تیزی سے سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک مرتبہ بجلی چمکی تو نوجوان نے رک کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہ فوجیوں سے بہت آگے آ چکا تھا۔ غالباً اسی لئے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور "حوضوں" کی طرف چل دیا۔

گاڑیوں کی آمد و رفت اب بند ہو گئی تھی۔ جب وہ نوجوان نہر کے قریب پہنچا تو میں اس کے قریب ہی تھی۔ میں نے "کھٹ کھٹ" کی آوازیں سنیں تو سمجھ گئی کہ چھت کی ڈاٹیں بند کی جا رہی ہیں۔ انہی آوازوں کے درمیان مجھے ایک آشنا آواز سنائی دی اور میں چونک اٹھی۔ یہ آواز بنو عباس کے 37 ویں خلیفہ عبداللہ بن مستنصر کی تھی۔ اس نے مستعصم باللہ کا لقب اختیار کیا تھا۔ پہلا عباسی خلیفہ ابوالعباس سفاح ہوا۔ منصور اسی کا بھائی تھا جس نے بغداد کی بنیاد رکھی اور اسے دارالخلافہ بنایا۔

بغداد وہی تھا اور عباسی خلافت بھی قائم تھی۔ مگر صدیوں کے نشیب و فراز نے اس شہر کو کچھ سے کچھ بنا دیا تھا۔ منصور، ہارون، مامون اسی خاندان سے تھے اور اسی خاندان کا ایک فرد موجودہ خلیفہ مستعصم بھی تھا۔ مستعصم اپنے باپ مستنصر کی موت کے بعد خلیفہ بنا۔ درمیانہ قد، رخسار قدرے پھولے ہوئے، آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور گول، رنگت سرخی مائل سفید، جسم موٹاپے کی طرف مائل، سر پر پگڑی مخصوص قسم کی، پگڑی میں ہیرے اور جواہر ٹنکے ہوئے، پگڑی کا رنگ سیاہ، جو لباس بدن پر وہ بھی مخصوص تھا۔ یہ تھا مستعصم باللہ جس کی آواز میں نے سنی۔ میں اس کی آگے متوجہ ہو گئی۔

آگے کو نکلے ہوئے پیٹ پر قبا کو درست کرتے ہوئے معتصم کسی سے کہہ رہا تھا۔ "خدا کا شکر ہے کہ کام مکمل ہو گیا۔ مٹی بھی پڑ گئی۔ اب دور دور تک ریت پھیلا دو!" معتصم کے انہی الفاظ کے ساتھ بڑی بڑی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ یہ دیکھ کر وہ بولا۔ "اچھا اب کام بند کر دو، تیز بارش ہونے والی ہے۔" حکم دے کر مستعصم ایک گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی اس نوجوان کے قریب سے گزر گئی جو وہیں چھپا ہوا تھا۔

ذرا دیر ہوئی تھی کہ زور و شور سے بارش ہونے لگی۔ نوجوان شرابور ہو گیا۔ وہ بارش میں بھیگتا ہوا آہستہ آہستہ واپس چل دیا۔ یہ واقعہ 255 ہجری کا ہے۔ مستعصم کو خلیفہ بنے اس وقت 15 سال ہو چکے تھے۔

دیگر عباسی خلفا کی طرح (ہارون، امین وغیرہ کو چھوڑ کر) معتصم بھی ایک کنیز ہاجرہ کے بطن سے تھا۔ جب تک علمائے کرام کی صحبت میں رہا ٹھیک راہ پر چلا۔ مگر جب مشیر اس پر حاوی آ گئے تو وہ بھٹک گیا۔

تختِ خلافت پر بیٹھنے کے بعد اس نے اپنے اجداد کی رواجوں کو برقرار رکھا۔ دربار خاص کے علاوہ دربار عام بھی وہ منعقد کرتا۔ ہر آدمی بلا روک ٹوک دربار عام میں آ کے فریاد کر سکتا تھا۔ وہ فریادیوں کی فریادیں سنتا، مظلوم کا حق ظالم سے دلاتا اور عدل و انصاف سے کام لیتا، جمعے کی نماز پڑھتا، جمعہ مسجد میں اسی شان سے جاتا جس طرح اس کے پیش رو خلیفہ جایا کرتے تھے۔

خلفائے عباسیہ جمعے کے روز مسجد میں جاتے تو محافظ دستہ ساتھ ہوتا۔ اس دستے کی وردی زرق برق ہوتی، ان کی قطاریں بڑی خوش نما معلوم ہوتیں۔ عباسی علم لہراتا ہوا یہ دستہ

جمعہ مسجد کی طرف بڑھتا۔

خلیفہ وقت اپنا مخصوص لباس زیب تن کئے سفید گھوڑے پر سوار محافظ دستے کے بیچ میں ہوتا۔ خلیفہ کا مخصوص لباس یہ تھا: وہ سیاہ رنگ کی قبا پہنے ہوتا، کمر مرصع پٹکے سے کھنچی ہوتی، کندھے پر سیاہ دوشالا لٹکا ہوتا، سر پر پگڑی کی بجائے اکثر قلنسوہ (چوٹی دار ٹوپی) ہوتی جس میں ایک بڑا ہیرا جڑا ہوتا۔

خلیفہ کے پیچھے شہزادوں کی سواریاں ہوتیں۔ اس شان سے خلیفہ جمعہ مسجد میں داخل ہوتا اور خود ہی عموماً امامت کرتا۔

کئی سال تک خلیفہ مستعصم باللہ بھی اپنے بزرگوں کی اس سنت پر عمل کرتا رہا (سنت عربی لفظ ہے۔ اس کے معنی راہ، روش، عادت ہیں۔ فقہ کی اصطلاح میں اس سے مراد وہ امر ہے جس کو حضرت رسالت مآب ﷺ نے ہمیشہ کیا ہو۔ یہاں سنت کا مطلب روش ہے۔ مصنف) جب معتصم نے علماء کی صحبت چھوڑ دی اور ایسے آدمیوں کی صحبت اپنائی جو سیدھے راستے پر نہ تھے تو نماز پنج وقت کے ساتھ ہی جمعہ مسجد میں جانا بھی چھوڑ دیا۔

معتصم کی دیکھا دیکھی شہزادوں، شہزادیوں، شاہی خاندان کے مردوں اور عورتوں نے بھی نماز ترک کر دی۔ پہلے کوچہ کوچہ، محلہ محلہ اور گھر گھر علماء کے وعظ ہوتے تھے۔ اب وعظ کی جگہ راگ رنگ نے لے لی تھی۔

پہلے وعظ و نصیحت کی مجلسیں ہوتی تھیں اب رقص و سرود کی محفلیں جمنے لگیں۔

خلیفہ کا اثر شہزادوں پر بھی ہوا۔ شہزادوں کا اثر امیروں اور رئیسوں نے قبول کیا اور ان سے عوام متاثر ہوئے۔ پہلے ہر نماز کے وقت مسجدیں نمازیوں سے بھر جاتی تھیں۔ اب بہت کم نمازی نظر آتے۔ یہ نمازی بھی ایسے ہوتے جو کسی پریشانی یا تکلیف میں مبتلا ہوتے اور خدا سے اپنی پریشانیوں اور تکلیفوں کے دور ہونے کی دعائیں مانگا کرتے۔ جو آدم زاد فارغ البال و خوش حال تھے وہ مسجدوں کی طرف جھانکتے بھی نہیں تھے۔ اس دور کے مسلمان خدا سے منحرف ہو گئے تھے، اسے بھول بیٹھے تھے۔ ان حالات کے باوجود کچھ لوگ بغداد میں اب بھی ایسے تھے جن کے دل خوف خدا سے خالی نہ تھے۔ وہ نوجوان جسے میں نے گزشتہ رات کو دیکھا تھا، وہ ایسے ہی کمیاب آدم زادوں میں سے تھا۔

دوسری صبح وہی نوجوان مجھے نہر کی پٹڑی پر کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ جہاں نوجوان کھڑا تھا، وہ

جگہ کھدی ہوئی لگتی تھی۔ رات کو بارش ہوئی تھی اس لئے مٹی دب گئی تھی۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ "حوض" کہاں بنائے گئے تھے اور کس مقام پر مٹی سے دبا دیئے گئے ہیں۔

یہ نہر دریائے دجلہ سے کاٹ کر لائی گئی تھی۔ رمنوں (شکار گاہوں) اور باغچوں سے گزر کر شاہی محل قصر الخلد (قصر خلافت کا نیا نام) میں داخل ہو گئی تھی۔ (صحیح لفظ باغیچہ نہیں باغچہ ہے۔ ہندی والوں نے یہ غلطی کی ہے جو اب رائج یا غلط العوام ہے۔ ورنہ تو جیسے کتاب سے کتابچہ ہے اسی طرح باغ سے باغچہ درست ہے۔ مصنف)

وہ نوجوان نہر کے کنارے دریا کی طرف چل پڑا۔ اس وقت دھوپ اچھی طرح پھیل گئی تھی۔ دن نکلے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ جن باغچوں کے درمیان سے ہو کر نوجوان گزر رہا تھا، ان میں سے یا تو قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں یا گانوں کی پُرکیف صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ان آوازوں میں نسوانی آوازیں بھی شامل تھیں۔ گویا ان باغچوں میں آدم زادوں کے ساتھ آدم زادیاں بھی تھیں۔ کسی دھن میں وہ نوجوان آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ دریائے دجلہ کے کنارے آ نکلا۔

ابھی تک میں نے اس نوجوان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کیا تھا کہ وہ کون ہے؟ گزشتہ رات اس نے جس طرح فوجیوں کو دھوکا دیا تھا میں بھولی نہیں تھی۔ یہ تو پتہ لگ چکا تھا کہ اس کا تعلق بھی حکمران خاندان سے ہے، پھر وہ کیوں چوری چھپے فوجیوں کے حصار میں داخل ہوا؟ اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور تھا۔ میں اسی فکر میں تھی۔ دریائے دجلہ کی لہریں میری فکر کو جیسے مہمیز کر رہی تھیں۔

دریائے دجلہ اتنا گہرا اور چوڑا دریا تھا کہ اس میں چھوٹے چھوٹے جہاز چلتے تھے۔ اس کے دونوں کناروں پر شہر بغداد آباد تھا۔ انہی کناروں کے ساتھ ساتھ عوام کے لئے تفریح گاہیں تھیں، چمن اور باغچے تھے۔ ان سے ملحق امیروں اور اہل ثروت کے محلات تھے، نہایت عالی شان قصر تھے۔ دریا کے کنارے پر دونوں طرف میلوں لمبے رقبے میں کنارے سے پانی تک سنگ مرمر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر شہر والے، مرد اور عورتیں صبح سے شام تک آتے جاتے جا رہے تھے۔ نیلگوں پانی پر سفید سنگ مرمر کی سیڑھیاں بڑی دل فریب معلوم ہوتی تھیں۔ ان سیڑھیوں سے ملے ہوئے گھاٹ تھے۔ گھاٹوں پر چھوٹی بڑی کشتیاں اور جہاز دور تک پھیلے رہتے تھے۔ یہ گھاٹ کئی میل لمبے

تھے۔ جب بجرے پری چہرہ شہزادیوں، امیر زادیوں اور وزیر زادیوں کو لے کر چلتے تھے تو منظر اور بھی حسین ہو جاتا تھا۔ بجرے نہایت آراستہ و پیراستہ ہوتے تھے۔ وہ نوجوان کہ میں جس کا پیچھا کرتی ہوئی یہاں پہنچی تھی، اس جگہ رک گیا۔ اس وقت بھی کشتیاں اور بجرے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر جا رہے تھے۔ نوجوان کی نظریں انہی بجروں پر مرکوز تھیں۔

''احمر!'' قریب ہی سے کسی نے اس نوجوان کو صدا لگائی۔

نوجوان چونکا یوں مجھے اس کا نام معلوم ہوا۔ اسی کی عمر کا ایک اور نوجوان قدم بہ قدم چلتا ہوا قریب آ رہا تھا۔

''اچھا تو بھائی احمد ابوالقاسم ہیں!'' احمر بولا۔

احمر اور احمد بن ابوالقاسم دونوں آدم زادوں نے عباسی شہزادوں کا سا لباس پہن رکھا تھا یعنی گھٹنوں تک سیاہ رنگ کی قبائیں تھیں جو بدن پر چست تھیں اور گردن کے قریب ذرا کھلی ہوئی تھیں۔ سروں پر چوٹی دار ٹوپیاں تھیں۔

''میں صبح سے تمہیں تلاش کر رہا تھا۔ تم ملے نہیں۔ نجمہ رات کو اپنی ایک سہیلی کے یہاں گئی تھی، وہ اب آنے والی ہے۔'' احمد ابوالقاسم جلدی جلدی یہ سب کچھ کہہ گیا۔

احمر کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرنے جیسے اس کی پریشانی دور ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے احمد! کہ اس نہر کی پٹری پر خلیفہ نے چند حوض تعمیر کرائے ہیں؟''

''میں نے سنا تھا، دیکھے نہیں ہیں۔'' احمد نے جواب دیا۔

''میں نے دیکھے تھے۔'' احمر نے بتایا۔ ''لیکن رات کو انہیں پاٹ کر زمین میں دفن کر دیا گیا ہے۔ خدا معلوم حوض کیوں بنائے گئے اور کس لئے دفن کر دیئے گئے۔''

''میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اس تجسس میں نہ رہو احمر! اس بات کو اپنے ذہن سے جھٹک دو ورنہ کسی بلا میں گرفتار ہو جاؤ گے۔''

''میں احتیاط رکھوں گا۔'' احمر نے یقین دہانی کرائی، پھر بولا۔ ''اچھا ہوا تم مجھے مل گئے۔ نجمہ کا کیا ذکر کر رہے تھے؟''

اس پر احمد ابوالقاسم ہنس دیا اور کہا۔ ''سو رہے تھے یا مدہوش تھے؟''

''کچھ اور سوچ رہا تھا میں۔''

''نجمہ رات کو اپنی سہیلی سعیدہ کے یہاں گئی تھی۔ میں اسے لینے آیا ہوں۔ اس کا بجرا اب آتا ہی ہوگا۔'' احمد بولا۔

''تم بجرے کے ساتھ نہیں گئے تھے؟'' احمر نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''تمہارے سامنے نجمہ بجرے میں سوار ہو کر چلی گئی؟''

''ہاں ہاں..... دیکھو وہ اس کا بجرا آ رہا ہے۔'' احمد نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

سامنے سے ایک خوبصورت بجرا آ رہا تھا۔ (بجرا انگریزی لفظ ہے۔ یہ مخصوص وضع کی بنی ہوئی گول اور حسین کشتی ہوتی ہے۔ ایسی کشتیاں صرف مال دار آدم زادے استعمال کرتے تھے) احمر اور احمد اس بجرے کو دیکھنے لگے۔ میں ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو باتیں جناتی قوتیں استعمال کئے بغیر معلوم ہو جائیں، میں ان کے لئے اپنی پراسرار قوتوں کو حرکت میں نہیں لاتی تھی۔ اس وقت بھی ایسا ہی تھا۔

دیکھتے دیکھتے بجرا کنارے پر آ لگا۔ اس میں سے ایک آدم زادی بصد ناز اتر کر سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ وہ نوجوان آدم زادی بے نقاب تھی۔ وہ حسین آدم زادی سیاہ ریشمی لباس اور مرصع زیورات پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ لباس میں اس کی صورت چاند کی طرح دمک رہی تھی۔ جلد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ اس آدم زادی کا نام نجمہ تھا اور وہ احمد ابوالقاسم کی بہن تھی۔ میں نے بہت سی خوب صورت آدم زادیاں دیکھی تھیں لیکن نجمہ کی بات ہی کچھ اور تھی۔ سرخ و سفید رنگت والی وہ آدم زادی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تو یوں لگ رہا تھا کہ اس کے گرد اگرد روشنی سی ہو۔ میری توجہ اسی پر تھی اور اس کی توجہ کا مرکز احمر تھا۔ احمر کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

جب نجمہ اپنے بھائی احمد ابوالقاسم کے پاس آئی تو اس نے دریافت کیا۔ ''تمہاری سہیلی نہیں آئی تمہارے ساتھ؟''

''نہیں، وہ شام کو آئے گی۔'' نجمہ نے جواب دیا۔

احمد کہنے لگا۔ ''میرا ارادہ بجرے میں بیٹھ کے سیر کرنے کا تھا۔ خیال یہ تھا کہ تمہارے ساتھ تمہاری سہیلی بھی ہوگی۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے..... سیر کرتے ہیں مگر.....'' نجمہ کہتے کہتے رک گئی۔

"مگر کیا؟" احمد نے پوچھا۔

"نہ گانے والی کنیزیں ہیں، نہ پیشہ ور رقاصائیں۔"

"ممکن ہے دریا کی سیر کرتے ہوئے رقاصاؤں کا کوئی بجرا مل جائے۔" احمد بولا۔

"لیکن تمہیں یہ بھی خبر ہے کہ تمہارے ساتھ ایک ملاحی بھی ہیں۔" نجمہ نے یہ کہہ کر شوخ نظروں سے احمر کو دیکھا۔ احمر نے ہنس کر کہا۔ "ارے یہ نرے ملاحی نہیں ہیں، چوری چھپے عیش ونشاط کی محفلوں میں بھی شریک ہو جاتے ہیں۔"

"تو یہ کہو، چھپے رستم ہیں۔"

یہ سن کر احمر نے نجمہ سے کہا۔ "تمہیں تو میں کیا کہوں، لیکن یہ احمد ..."

"بڑے رند ہیں۔" احمد نے بات کاٹ دی۔

"رند تو تمہیں نہیں کہہ سکتا البتہ ظریف ضرور ہو۔" احمر بولا۔ (ظریف کا مطلب، زیرک، عقل مند اور خوش طبع ہے۔ مصنف)

نجمہ ہنس دی۔ اس کے احمریں لب کھلے تو سفید موتیوں جیسے دانتوں کی لڑیاں نظر آنے لگیں۔ وہ کہنے لگی۔ "غنیمت ہے کہ ظریف ہی کہا انہوں نے ورنہ یہ شریر کہنے والے تھے۔"

"یہ جو کچھ بھی کہیں، بجا ہے۔" احمد نے کہا۔

"میں کیا کہوں، اس بات کو ہر شخص جانتا ہے کہ اس دور مسلمان عیش وعشرت میں مبتلا ہو کر خدا کو بھول گئے ہیں۔" احمر کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ "مجھے خوف ہے، کہیں ہیبت ناک قہر خداوندی نازل نہ ہو جائے۔"

"تم اطمینان رکھو، خدا ہم پر قہر نازل نہیں کرے گا۔" احمد نے کہا۔

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔" احمد بولا۔

احمر کی طرف دیکھتے ہوئے نجمہ نے کہا۔ "اگر خدا کا قہر ہم پر نازل بھی ہوا تو مجھے یقین ہے، تم پر آنچ نہیں آئے گی۔ قہر وغضب کی باتیں ہی کیوں......"

"تم شاید غلط سمجھ رہی ہو۔" احمر بول اٹھا۔ "میں تو خدا سے رحم وکرم کی دعائیں مانگتا ہوں، قہر وغضب کی نہیں..... لیکن جب میں مسلمانوں کی بد اعمالیوں کو دیکھتا ہوں تو لرز جاتا ہوں۔"

"اچھا ملاحی، ہمارے ساتھ چلو، راستہ کھوٹا نہ کرو۔" وہ سنجیدہ نہیں ہوا تھا۔

احمر مسکرایا اور سوال کیا۔ "کیا کہیں سفر پر جانا ہے؟"

"سفر ہی سمجھو۔" احمد نے جواب دیا۔ "آج بجرے میں شہر کے باہر تک چلیں گے۔"

"انہیں کیا انکار ہو سکتا ہے۔" نجمہ نے ایک ادا سے احمر کی طرف دیکھا۔ میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔

"یہ انکار کر بھی نہیں سکتے۔" احمد بولا۔ "آؤ بھائی احمر!"

احمر نے آمادگی ظاہر کر دی۔ وہ تینوں سیڑھیاں اتر کر بجرے میں جا بیٹھے۔ ملاحوں نے چوار سنبھالے اور بجرا چل دیا۔ میں بھی اس بجرے پر سوار ہو گئی۔ اس بجرے میں کئی چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ کمروں کے سامنے راہداری تھی۔ راہداری کے سامنے صحن تھا۔ کمروں کی دیواریں لکڑی کی تھیں۔ ان میں سونے چاندی کے باریک تاروں سے پھول پتیاں بنی تھیں۔ ہر کمرے کے باہر راہداری اور صحن میں پُرتکلف صوفے تھے۔ صوفوں پر پھول دار ریشم کے کپڑے منڈھے ہوئے تھے۔ غرض بجرے کی ہر چیز شاہانہ ٹھاٹ باٹ کی تھی، خوب صورت، سبک اور دیدہ زیب!

وہ تینوں صحن میں بیٹھ گئے۔ بجرا بڑی سبک روی سے چلا جا رہا تھا۔ دریا میں چھوٹی کشتیاں اور بجرے جیسے بکھرے پڑے تھے۔ کچھ تو ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف جا رہے تھے، کچھ ادھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔

ہر کشتی اور ہر بجرے میں خوش پوش مرد اور عورتیں سوار تھے۔ امیر وغریب سبھی ان میں شامل تھے۔ عورتیں بے نقاب اور بے حجاب تھیں۔ بعض شوہروں، بعض باپوں اور بعض آدم زادیاں محض شناساؤں ہی کے ساتھ تھیں۔

مرد، عورتیں اور بچے سبھی خوش تھے۔ خوشی ان کے چہروں سے ظاہر تھی۔ خدا نے انہیں ہر قسم کی نعمتیں دی تھیں۔ فارغ البالی دی تھی، دولت دی تھی، بے فکری دی تھی اور خوشی دی تھی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ خدا کی بخشی ہوئی ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے لیکن وہ ناشکرے بن گئے تھے۔ دولت نے انہیں غم وفکر سے بے نیاز کر دیا تھا۔ پھر انہیں خدا کیوں یاد آتا!

نجمہ کا بجرا چلا جا رہا تھا۔ دریا کے دونوں کناروں پر بنی سنگ مرمر کی سیڑھیاں بجرے میں بیٹھ کر بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ ایک بجرا سامنے سے آ رہا تھا۔ اس میں سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ ان تینوں نے اس طرف دیکھا۔

"مجھے نوبت الاتون بہت پسند ہے۔" نجمہ کہنے لگی۔ (نوبت الاتون اس گانے کو کہتے تھے جو کئی عورتیں یا لڑکیاں مل کر گاتی تھیں۔ اکثر شہزادیاں، وزیرزادیاں اور امیرزادیاں مل کر گایا کرتی تھیں۔ ایسے گانے بہت پسند کئے جاتے تھے۔ فی زمانہ اسے کورس کہتے ہیں۔ مصنف)

"یہ بجرا شاید وزیرزادی کا ہے" احمر نے قیاس آرائی کی۔

"جی ہاں۔" نجمہ نے تصدیق کی۔ یہ ہاجرہ کا بجرا ہے۔ وہ اور اس کے خاندان کی لڑکیاں گا رہی ہیں۔

"ان کی آوازوں میں تو بڑا گداز ہے۔" احمر نے تبصرہ کیا۔

نجمہ نے بتایا۔ "انہوں نے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔" (اس زمانے میں شہزادیاں اور بیگمات باقاعدہ گانے کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ مصنف)

"ہاجرہ بھی تو تمہاری سہیلی ہے۔" احمر نے نجمہ کو مخاطب کیا۔

"یہ بھی تو کہو کہ حسین بھی ہے۔" نجمہ یہ کہتے ہوئے ہنسنے لگی۔

"ہاں حسین تو ہے۔" احمر نے تائید کی۔

اس وقت تک سامنے سے آنے والا بجرا ان کے برابر آ گیا۔ اس میں وزیرزادی ہاجرہ بیٹھی تھی۔ وہ اور اس کی کئی سہیلیاں مل کر گا رہی تھیں۔ ہاجرہ کے حسن سے احمر مسحور سا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اتفاق سے دونوں بجروں کے چپوار سے پانی کی چھینٹیں اڑیں۔ ادھر ہاجرہ اور اس کی سہیلیاں، ادھر نجمہ، احمر اور احمد پانی میں بھیگ گئے۔ ہاجرہ اور اس کی سہیلیوں نے قہقہہ لگایا۔ نجمہ مسکرائی۔ اس کے گلابی رخساروں پر پانی کی بوندیں ایسے معلوم ہونے لگیں جیسے گلاب کی پتیوں پر شبنم کے قطرے۔ احمر نے کہا۔ "بے وقوف مجھے بھگو گئیں۔"

"وہ بھی تو بھیگ گئی ہیں۔" احمد کہنے لگا۔

گانے کی آواز اب بھی آ رہی تھی اور احمر اسی طرف متوجہ تھا۔

بجرا آگے بڑھتے بڑھتے گودی میں پہنچ گیا۔ یہاں جنگی بحری جہاز کھڑے کئے جاتے تھے۔ ان جہازوں پر عباسی علم لہرا رہے تھے۔ جہازوں کے چاروں طرف شرطوں (پولیس والوں) کی کشتیاں گشت کر رہی تھیں۔ یہ شرطے جنگی جہازوں کی حفاظت پر مامور تھے۔

ایک جہاز سے فوجی اتر رہے تھے۔ ان کی زرق برق وردیاں اور ہتھیار چمک رہے تھے۔ بجرا ان کشتیوں اور جہازوں سے بچتا چلا جا رہا تھا۔

اس بجرے نے دس میل سے زیادہ سفر طے کر لیا تھا مگر ابھی شہری حدود ختم نہیں ہوئی تھی۔

احمد بولا۔ "بس اب واپس چلنا چاہئے۔"

"کیوں، کیا تھک گئے؟" احمر نے پوچھا۔

"تھکنے کی بات نہیں ہے۔ اب اس طرف سے نہ کوئی بجرا آ رہا ہے اور نہ کشتی۔" احمد نے جواب دیا۔

اس پر نجمہ نے فقرہ چست کیا۔ "اور وزیرزادی کا بجرا نکل ہی گیا ہے۔"

"اگر تم اس وقت اپنا بجرا رکوا دیتیں تو میں ہاجرہ کو شام کے کھانے پر مدعو کر دیتا۔"

"حالانکہ وہ شام کو کھانا میرے ساتھ کھائے گی۔" نجمہ بولی، پھر احمد سے مخاطب ہوئی۔ "ملاجی! میں تمہیں بھی دعوت دیتی ہوں۔"

احمد نے شکریہ ادا کیا، بولا۔ "یہ تو میرے لئے بڑے اعزاز کی بات ہے۔"

"بجرا واپس لے چلو۔" احمر نے نجمہ سے کہا۔

نجمہ نے بجرے کی واپسی کا حکم دے دیا۔ ذرا ہی دیر میں واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ بجرا جب گودی سے آگے نکل آیا تو احمد اپنی نشست سے اٹھ کر بجرے کے کنارے کھڑا ہو گیا۔

احمر نے نجمہ کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں اسے مخاطب کیا۔ "کل خلیفہ تم سے کچھ خفا ہو گئے تھے۔ میں رات بھر پریشان رہا۔"

"تمہارے جاتے ہی ان کی خفگی دور ہو گئی تھی۔"

"خلیفہ نے جو حوض بنوائے تھے......"

نجمہ نے بات کاٹ دی۔ "حوضوں کا ذکر نہ کرو۔"

پھر اس سلسلے میں احمر نے کوئی بات نہیں کی۔ سفر تمام ہوا تو وہ تینوں بجرے سے اتر گئے۔

میرے لئے اب تک یہ بات راز تھی کہ ان "حوضوں" کی تعمیر کا کیا قصہ ہے۔ مجبوراً مجھے احمر، نجمہ اور احمد ابوالقاسم کے ذہنوں کو ٹٹولنا پڑا۔ یہ حقیقت باعث حیرت ہی تھی کہ ان تینوں میں سے کسی کو "حوضوں" کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔

ایک جن زادی کے لئے یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ ''حوضوں'' کے معمے کو حل کر لیتی۔ میں نے یہ معمہ اس وقت نہ سہی بعد میں حل کر بھی لیا۔ سیدھی سی بات تھی کہ جس آدم زاد، یعنی خلیفہ معتصم نے ''حوض'' بنوائے تھے، اس کا ذہن پڑھ لیتی۔ سو میں نے یہی کیا۔ مگر کاش میں ایسا نہ کرتی۔ وجہ یہ کہ اس معاملے کی تہہ تک پہنچ کر مجھے بڑا دُکھ ہوا۔ آدم زاد واقعی بڑے خودغرض ہوتے ہیں۔

احمر کے بارے میں بھی میں نے جان لیا۔ وہ بھی شہزادہ تھا۔ وہ موجودہ خلیفہ کا چچازاد تھا۔ اس کا محل قصر الخلد (قصر خلافت) کے قریب ہی تھا۔ اس کے محل سے متصل احمد ابوالقاسم کا محل تھا۔ یہ دونوں محلوں کے درمیان ایک رمنہ (چراگاہ، وہ مقام جہاں ہرن وغیرہ چرتے پھرتے ہیں) تھا۔ رمنہ کے قریب باغ تھا جس میں چشمہ جاری تھا۔ دونوں محلوں میں بڑے خوش نما باغیچے تھے۔ ہر باغیچے میں کئی کئی فوارے تھے۔

شہزادی نجمہ نے احمر کو شام کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ میں بھی پہنچ گئی۔ وہ دن چھپتے ہی مغرب کی نماز پڑھ کر احمر، احمد کے محل میں داخل ہوا۔ چونکہ دن چھپ گیا تھا اس لئے سارے محل میں روشنی ہو گئی تھی۔ روشنی کا یہ عالم تھا کہ کہیں اندھیرے کا نام نہ تھا۔ حتیٰ کہ باغیچے میں بھی کافی روشنی تھی۔ فواروں پر تو اتنی روشنی تھی کہ دن نکلا ہوا لگتا تھا۔

احمر باغیچے کو طے کر کے، میدان سے گزرتا چبوترے پر چڑھا۔ چبوترے پر سفید استر کاری ہو رہی تھی۔ سامنے عمارتیں تھیں جو روشنی میں گویا نہائی ہوئی تھیں۔ چبوترے کو عبور کر کے وہ عمارت کے اندر داخل ہوا۔ میں اس کے ساتھ چل رہی تھی مگر اسے احساس نہ تھا۔ اس محل میں، میں پہلی بار ہی آئی تھی۔ یوں بھی مجھے آدم زادوں کے ان پُرتعیش محلوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ احمر کے وہاں آنے سے کچھ ہی دیر پہلے میں نے اس محل میں قدم رکھا تھا۔ ان محلوں دو محلوں کی بنیاد میں کتنے غریبوں کا خون پسینہ شامل تھا، میں جانتی تھی۔

سبھی کچھ تو میرا آنکھوں دیکھا تھا۔ میں نے شہر بغداد کا عروج بھی دیکھا اور اب زوال بھی دیکھ رہی تھی۔ قدرت بھی کیا کیا دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے! سو میں احمر کو دیکھ رہی تھی جو اس عالیشان محل کے ایک کمرے سے دوسرے میں داخل ہو رہا تھا۔

ہر کمرے کے دروازوں پر بھاری ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ قالینوں کا فرش تھا، زربفت کی چھت گیریاں تھیں۔ دیواروں پر سفید، سنہرا، سبز اور آسمانی رنگ تھا۔ ہر کمرے کی

دیواروں کا رنگ الگ تھا۔ اسی رنگ کی مناسبت سے پردے تھے۔ تمام کمرے خوبصورت میزوں، چینی کے گلدانوں اور سونے چاندی کی چیزوں سے آراستہ تھے کہ نگار خانہ چین معلوم ہوتے تھے۔ ہر کمرے میں روشنی کا اس قدر اہتمام تھا کہ بال سے باریک چیز بھی صاف نظر آ جاتی تھی۔

اس محل میں کافی کنیزیں تھیں جو اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ ایک کمرے میں احمر داخل ہوا تو وہاں اسے نجمہ بیٹھی ہوئی ملی۔ اس کے سر پر قبہ نما ٹوپی تھی جس میں جواہر ٹکے ہوئے تھے۔ نجمہ سیاہ رنگ کے ریشم کا لباس اور حسین گلے میں بڑے موتیوں کی مالائیں پہنے تھی۔ روشنی کی شعاعیں اس کے آئینہ جیسے رخساروں پر بجلی کی طرح تڑپ رہی تھیں۔

نجمہ نے بڑی بڑی حسین آنکھیں اٹھا کر احمر کو دیکھا اور مسکرا کر اس کا خیر مقدم کیا۔

جب احمر دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا تو نجمہ نے شوخی سے کہا۔ ''بھوک لگ آئی تمہیں؟''

''جی نہیں، بھوک یہاں کھینچ کر نہیں لائی بلکہ شہزادی کا شوقِ دید کھینچ لایا ہے۔''

''اگر بھوک والی سچ بات کہہ دیتے تو اس تاویل سے اچھا تھا۔''

''حالانکہ میں نے سچ بات کہی تھی۔ اگر تم میرے سامنے رہو تو کھانے پینے کا ہوش ہی نہ رہے۔'' احمر کی آواز خواب آلود سی ہو گئی۔ یہ سن کر نجمہ کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ بات کا رخ بدلنے کے لئے وہ بولی۔

''میری سہیلی ہاجرہ اب آنے ہی والی ہے۔''

''تم ہاجرہ سے زیادہ ربط نہ بڑھاؤ۔ وہ ابن علقمی کی بیٹی ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ابن علقمی فرقہ پرست ہے۔ وہ مسلمانوں کو فرقوں میں بانٹ کر، انہیں آپس میں لڑا کر وزارت کی کرسی پر چپکا رہنا چاہتا ہے۔'' احمر نے نجمہ کو سمجھایا۔

''میں جانتی ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ابن علقمی کچھ اچھا آدمی نہیں ہے۔ لیکن ہاجرہ بہت نیک لڑکی ہے۔''

''میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ ابن علقمی اپنی ہاجرہ کو شاہی محلوں میں یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجتا ہے کہ اس کے خلاف کہیں کوئی سازش تو نہیں ہو رہی؟''

''ہاجرہ اپنے باپ کے لئے جاسوسی نہیں کرتی البتہ ابن علقمی یہ ضرور چاہتا ہے کہ شہزادہ ابوبکر سے نجمہ کی شادی ہو جائے۔'' میں واقف تھی کہ ابوبکر، خلیفہ معتصم کا نوجوان بیٹا ہے۔

''ہاجرہ کو ایک دو مرتبہ میں نے دیکھا ہے۔ کافی حسین ہے وہ۔ ممکن ہے ابوبکر اسے پسند کرلیں۔'' احمر نے رائے زنی کی۔

''مگر ہاجرہ تو بھائی جان ابوالقاسم کو پسند کرتی ہے۔'' نجمہ نے گویا انکشاف کیا۔

''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابن علقمی، احمد سے ہاجرہ کی شادی کرنے پر تیار نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن علقمی جانتا ہے کہ اگر ہاجرہ سے ابوبکر کی شادی ہوگئی تو ایک دن وہ ملکہ بن جائے گی۔''

''یہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ لیکن خلیفہ شاید اس رشتے کو پسند نہ کریں۔''

''خلیفہ تو عجیب مزاج کے آدمی ہیں۔ انہوں نے ہوش ''

نجمہ پریشان سی ہوکر بول اٹھی۔ ''خدا کے لئے موضوں کا ذکر نہ کرو۔''

''معاف کرنا کہ اس ذکر سے تمہیں تکلیف ہوئی۔ اب انشاء اللہ میں موضوں کا ذکر نہیں کروں گا۔''

اسی وقت ہاجرہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بیش قیمت لباس اور خوش نما زیورات پہنے تھی۔ حسن وخوبصورتی میں وہ بھی نجمہ سے کم نہیں تھی۔ اس نے احمر کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے کہا۔

''بڑے عرصے کے بعد ملاقات ہوئی۔''

''وہ بھی اتفاقیہ اور نجمہ کے طفیل۔'' احمر بولا۔

''انہیں بہت دیر سے بھوک لگ رہی ہے۔'' نجمہ نے ہاجرہ کو بتایا۔

ہاجرہ نے ہنس کر بے تکلفی سے کہا۔ ''بھئی بھوک تو مجھے بھی معلوم ہو رہی ہے۔''

''بھائی جان کا اور انتظار ہے۔'' نجمہ کا اشارہ احمد ابوالقاسم کی طرف تھا۔ اتنے میں احمد بھی کمرے میں داخل ہوا۔

''آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی بھائی جان۔'' نجمہ کے لہجے میں شکایت تھی۔

''ہاں مجھے دیر ہوگئی۔'' احمد نے اعتراف کیا، پھر بتایا۔ ''آج شہر میں ایک افسوس ناک واقعہ ہوگیا...... بلکہ اسے حادثہ کہنا زیادہ بہتر ہے۔''

''کیسا حادثہ؟'' نجمہ نے معلوم کیا۔

احمد نے احمر کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کیا کہوں کیسا حادثہ، ہاجرہ بیٹھی ہے

شاید انہیں برا معلوم ہو۔''

''میں نے بھی اس حادثے کا ذکر سنا ہے۔ دو فرقوں کے درمیان مناقشہ ہوگیا ہے۔'' ہاجرہ بولی۔ (مناقشہ: نزاع، جھگڑا، لڑائی)

اس پر احمد کہنے لگا۔ ''اس مناقشے نے فساد کی صورت اختیار کرلی ہے۔''

''حقیقت یہ ہے کہ ایک فرقے والے یہ سمجھ کر کہ ابو (ابن علقمی) ان کی پشت پر ہیں، تعدیوں پر اتر آئے ہیں۔ یہ بات مجھے اچھی نہیں۔'' ہاجرہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ (تعدی: ظلم، ستم، حد سے بڑھ جانا۔ تعدیوں اس کی جمع ہے)

''اتفاق سے میں موقع پر پہنچ گیا۔'' احمد بتانے لگا۔ ''اس وقت تک جھگڑے نے فساد کی شکل اختیار کرلی تھی۔ میں نے دونوں فریقوں کو سمجھا بجھا کر امن قائم کیا۔ اگر میں ذرا دیر اور نہ پہنچتا تو بڑا ہنگامہ ہو جاتا۔''

نجمہ نے دکھ اور افسوس کیا، بولی۔ ''یہ نے کیا ہوگیا ہے مسلمانوں کو۔ آپس ہی میں لڑ لڑ کر مرے جاتے ہیں۔''

''میں جھوٹ نہیں بولوں گی، آج کا فتنہ میرے ہی فرقے والوں نے شروع کیا تھا۔ میں نے ابو سے بہت کہہ سنا۔ انہوں نے وعدہ تو کیا ہے کہ وہ اپنے ہم عقیدہ لوگوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کریں گے۔'' ہاجرہ نے بتایا۔ ''اگر وہ چاہیں تو کوئی فتنہ نہ اٹھے۔'' احمد نے بھی بے جھجک کہہ دیا۔

احمر جو خاموش تھا، اس نے بھی لب کشائی کی۔ ''اب اگر میں کچھ کہوں تو ہاجرہ کی دل شکنی کا خیال ہے اس لئے نہ کہنا ہی اچھا ہے۔''

''نہیں ضرور کہئے۔ مجھے خاں نہ ہوگا۔''

ہاجرہ کی بات ختم ہوئی تھی کہ چند کنیزوں نے کھانا چن دیئے جانے کی اطلاع دی۔ وہ چاروں اٹھ کر کھانے کے کمرے میں آگئے۔ یہ بہت وسیع کمرہ تھا۔ اس کی دیواریں سرخ تھیں۔ دروازوں کے پردے اور چھت گیری بھی سرخ تھی۔ صوفوں کے سامنے میزیں لگی تھیں۔ ان پر سرخ دستر خوان بچھے تھے۔ دستر خوانوں پر چاندی کے خوان سفید، خوان پوشوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ہر صوفے پر کئی کئی سفید تولیے لٹکے تھے۔

کئی کنیزیں سلفچیاں اور آفتابے لائیں۔ انہوں نے سب کے ہاتھ دھلائے اور خوانوں

پر سے خوان پوش اٹھا دیئے۔ چاروں نے کھانا شروع کیا۔ ان کے سامنے کئی قسم کا لذیذ کھانا تھا۔

کھانا کھا کر وہ ایک بڑے کمرے میں آ بیٹھے۔ وہاں کئی کمسن اور شکیل کنیزیں بنی سنوری ساز لئے بیٹھی تھیں۔ ان کے آتے ہی ساز جاگ اٹھے اور کنیزوں نے گانا شروع کر دیا۔

احمر نے اجازت چاہی۔ احمد نے اجازت نہیں دی۔ اس پر احمر بولا۔ ''اچھا میں نماز پڑھ لوں۔''

نجمہ نے شوخ لہجے میں مسکرا کر کہا۔ ''بہت اچھا ملا جی۔''

جب احمر نماز پڑھ کر اس کمرے میں واپس آیا تو ساز آواز کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

کھانا ختم ہوا تو احمد نے فرمائش کی۔ ''اچھا اب نوبت الخاتون (کورس) ہو جائے۔''

نجمہ اور ہاجرہ تیار ہو گئیں۔ دونوں ہی حسین اور خوش آواز تھیں۔ سماں بندھ گیا۔ احمد جھومنے لگا۔ کچھ دیر تک وہ دونوں کنیزوں کے ساتھ نوبت الخاتون گاتی رہیں۔ پھر صرف کنیزیں نغمہ سرائی کرنے لگیں۔

موسیقی کا زیر و بم مجھ پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا اور میں جھوم رہی تھی۔ اسی عالم میں ایک آشنا آواز سن کر میں چونک اٹھی۔ دیکھا تو وہ عارج تھا۔ ''تو کب چپکے سے یہاں آ گیا؟'' میں نے حیران ہو کر عارج سے پوچھا۔

''اے دینار! میں تو بہت دیر سے یہاں ہوں مگر تجھے آدم زادوں کے جھگڑوں سے فرصت ملے تو میرا دھیان آئے۔'' عارج بولا۔

''اس قدر چڑچڑا کیوں ہو رہا ہے۔ تجھ پر موسیقی ذرا اثر نہیں کرتی؟''

''کیوں نہیں کرتی اثر! لیکن ابھی کھانے سے پہلے جو گفتگو یہ آدم زاد کر رہے تھے، اس نے مجھ پر زیادہ اثر کیا۔'' عارج کہنے لگا۔

''یعنی؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

''تو بھی سب کچھ جانتی ہے اے دینار!'' عارج کی آواز میں دکھ تھا۔ ''سب ہی تو ہمارا آنکھوں دیکھا ہے۔''

''لگتا ہے اے عارج! کہ تو تاریخ بولنے پر اتارو ہے۔ چل یہاں سے چلتے ہیں۔ ان آدم زادوں کو سن گن نہیں ہونی چاہئے کہ ان کے علاوہ یہاں ہم جنات بھی ہیں۔'' میں بولی اور عارج کے ساتھ نجمہ کے محل سے نکل آئی۔

ہماری پسندیدہ جگہ صحرا تھی۔ سو ہم بغداد شہر سے نکل آئے۔

ایک جگہ صحرائی ٹیلے کی آڑ میں ہم بیٹھ گئے۔ عارج اس وقت مجھے کچھ ملول اور سنجیدہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا عموماً کم ہی ہوتا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''یہ بتا اے عارج کہ تو کس وجہ سے دکھی ہے؟''

''یہی کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔'' عارج نے جواب دیا۔

''بنے ہوئے ہیں یا انہیں ایسا بنا دیا گیا ہے؟'' میں نے بڑا چبھتا ہوا سوال کیا۔

''یقیناً انہیں ایسا بنا دیا گیا ہے۔ یاد کر معز الدولہ بن بویہ دیلمی کو!...... وہ جو ابو شجاع بن بویہ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں 334 ہجری کا واقعہ ہے جب بن بویہ نے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے مسلمانوں کے درمیان نفرت کا بیج بویا۔ تجھے یاد ہوگا کہ اس نے بغداد پر قبضہ کر لیا تھا۔''

''ہاں یاد ہے۔'' میں نے تصدیق کی۔ ''بن بویہ نے عباسی خلیفہ مستکفی باللہ کی آنکھیں نکلوا کر اسے قید خانے میں ڈلوا دیا تھا۔ اس کے بعد ابوالقاسم فضل بن مقتدر باللہ کو تخت نشین کر کے مطیع اللہ کا خطاب دیا اور اس کی تنخواہ مقرر کر دی۔ بڑا عجیب سا لگتا ہے مگر واقعہ یہی ہے کہ عباسی خلیفہ بن بویہ کا تنخواہ دار تھا۔ بن بویہ نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں رکھی اور اپنے نام کا سکہ جاری کر دیا۔ جب بن بویہ بغداد میں طاقت پکڑ گیا تو اس نے ...... اس ظالم نے مسلمانوں کو دو فرقوں میں بانٹ دیا۔ وہ بڑا ظالم و جابر تھا۔ ذرا ذرا سی خطا پر لوگوں کو سخت سزائیں دیتا تھا۔ اس کے جور و ستم سے لوگ مرعوب ہو گئے تھے۔ اس سے اور اس کی حکومت و سیاست سے ڈرنے لگے تھے۔ معز الدولہ کا نام احمد تھا۔ اس نے اپنے ہم عقیدہ آدم زادوں کو نوازنا شروع کر دیا۔ اس کی شہرت ہوئی تو دور دور سے، یعنی خراسان وغیرہ سے بن بویہ کے ہم عقیدہ لوگ دوڑ دوڑ کر بغداد میں آنے اور آباد ہونے لگے۔ اس طرح ان کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ وہ معز الدولہ کے حکم پر چلتے اور اس کے کہنے پر عمل کرتے۔

دولتِ دنیا نے انہیں گمراہ کر دیا اور انہوں نے معز الدولہ کے مذہبی طریق کو اختیار کر لیا۔ یوں سمجھ کہ جس طرح اپنے اقتدار کو عباسیوں نے مذہب کا نام لے کر یا آڑ بنا کر دوام بخشا، وہی تدبیر بن بویہ نے آزمائی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل درست! لیکن اے دینار، تیرا کہنا تھا کہ میں تاریخ بولنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ تُو خود تاریخ بولنے لگی۔" عارج نے کہا۔

"مجھے اس سے انکار نہیں اے عارج! تاریخی شعور کے بغیر معاملات کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھا اور سمجھا نہیں جا سکتا۔ تاریخ ہی سے تو پتہ چلے گا کہ آدم زادوں نے اپنی سلطنت کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لئے مسلمانوں میں تفرقہ ڈال دیا۔ تُو بھی جانتا ہو گا کہ معز الدولہ اس قدر قابو یافتہ ہو گیا تھا کہ 385 ہجری میں جب وہ مرا تو مرنے سے پہلے بیٹے بختیار کو اپنا ولی عہد مقرر کر گیا۔ اسی کے زمانے سے بغداد میں موقع پرستوں کا زور ہوا اور اسلام میں دو فرقے ہو کر دونوں میں کدورت کی بنیاد پڑ گئی۔"

"میری طرف سے آج تجھے بولنے کی پوری آزادی ہے اے عارج! تُو بھی کبھار اُداس ہوتا ہے۔" میں سنجیدہ رہی کہ عارج پٹڑی سے نہ اترے۔

"بنی بویہ کی حکومت 334 ہجری میں قائم ہوئی اور 447 ہجری میں ختم ہو گئی۔ میں اگر کچھ بھول جاؤں تو ٹوک دینا۔ سوا سو سال کا یہ زمانہ مسلمانوں میں افتراق و نفاق کا گزرا۔ اس دوران میں مسلمانوں کے دونوں فرقے آپس میں لڑتے رہے۔ یوں دونوں کے درمیان نفاق کی خلیج وسیع ہوتی رہی۔ بویہ ایک ماہی گیر کی اولاد تھا۔ اس نے اسلام قبول کیا، مگر ابتدا ہی سے فرقہ پرستی میں پڑ گیا۔ بنی بویہ نے یہاں تک ترقی کی کہ بادشاہ یا مطلق العنان حکمرانوں کی حیثیت اختیار کر لی۔ انہوں نے مسلمانوں کے دو مستقل فرقے بنا دیئے۔ ان کا مقصد محض یہ تھا کہ مسلمان آپس میں دست و گریباں رہیں اور ان کی حکومت قائم رہے۔ مسلمانوں کی سادہ لوحی سے انہوں نے فائدہ اٹھایا اور طویل عرصے ان پر مسلط رہے۔ نتیجہ یہ کہ خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ بنی بویہ میں خود نفاق پیدا ہو گیا۔ اس خانہ جنگی نے انہیں تباہ کر کے ان کی سلطنت کا نہیں بلکہ خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے باوجود مسلمانوں میں انہوں نے جو نفاق کی بنیاد ڈالی وہ قائم رہی۔ ایک فرقے والے اپنی اکثریت کی اینٹھ میں دوسرے فرقے والوں سے آمادہ فساد رہتے۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی یہی صورت حال ہے۔ تُو ہی بتا اے دینار! کیا یہ رنج دینے والی باتیں نہیں؟" حقیقتِ ماضی کے احوال بیان کر کے عارج خاموش ہو گیا۔

عارج بھی میری ہی طرح صدیوں آدم زادوں کے درمیان رہا تھا۔ وہ آدم زاد نہ سہی جن زاد سہی۔ مگر مسلمان ہونے کے ناتے ان باتوں پر وہ بھی کڑھتا تھا۔ میں نے دانستہ عارج کی کہی ہوئی ساری باتیں اس لئے بیان کی ہیں کہ میری پراسرار داستان اپنے درست خدوخال کے ساتھ سامنے آ سکے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب موجودہ خلیفہ عبداللہ ابو احمد خلیفہ بنا اور اس نے مستعصم باللہ کا لقب اختیار کیا تو عراق والوں کو خیال ہوا کہ شاید عباسی خلافت کا ہلتا ہوا قصر پھر سے قائم و مضبوط ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ خلیفہ نہایت ہی پست ہمت، کم عقل اور بد اندیش ثابت ہوا۔ اس نے مویدالدین بن علقمی کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ ابن علقمی فرقہ پرست تھا۔ بہت ہوشیار و چالاک! وہ بھی بن بویہ کی طرح اقتدار میں آنے کے خواب دیکھتا۔ اسی غرض سے وہ اپنی بیٹی ہاجرہ تک کو خلیفہ زادے ابوبکر کے عقد میں دینے پر آمادہ تھا۔ اس نے خلیفہ پر اپنا اثر اس حد تک قائم کر لیا کہ خلیفہ وقت نے اسے حکومت کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔

اب صورت یہ ہو گئی کہ خلیفہ محض نام کا خلیفہ رہ گیا اور ابن علقمی حکمرانی کرنے لگا۔ بنی بویہ نے 125 سال حکمرانی کی تھی۔ اس حکمرانی کا راز وہ سمجھتا تھا۔ ابن علقمی کا خیال تھا کہ اس کا اقتدار اسی وقت تک ہے جب تک فتنے سر ابھارتے رہیں تاکہ امیر اور درباری ان فتنوں کو دبانے میں لگے رہیں۔ کوئی اس طرف توجہ ہی نہ کرے کہ وہ وزیر اعظم ہے اور حکومت کر رہا ہے۔ وہ اسی لئے اپنے ہم عقیدہ فرقے کی طرف داری کرتا جس کی آبادی نہ صرف بغداد میں زیادہ تھی بلکہ پورے عراق میں اسی کی اکثریت تھی۔ یوں گویا ابن علقمی کی اپنی دانست میں اکثریت کا بزعم خود رہنما و پیشوا تھا۔ میں یہاں یہ حقیقت بھی بیان کر دوں کہ دونوں فرقوں کے عوام ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہتے۔ بردبار اور سمجھ دار آدمی دونوں فرقوں میں تھے جو لڑنے کے روادار نہیں تھے۔ یہ سنجیدہ آدم زاد اپنے اپنے فرقے والوں کو سمجھاتے رہتے لیکن ان کی کوئی نہ سنتا۔ پھر بھی وہ آپس میں مل کر بیٹھتے اور گھنٹوں اپنے ہم قوموں کی حالت پر افسوس کرتے۔

ہر دو طرف انتہا پسند اور فتنہ جو آدم زاد موجود تھے مگر ان کی تعداد برائے نام تھی۔

ایک مسلمان جن زادی ہونے کے سبب میری خواہش تھی کہ مسلمان آدم زادوں کی یہ بچی کھچی سلطنت کسی طرح قائم رہے۔ اپنی اس خواہش کی صورت گری کی خاطر میں نے اپنی سی کی۔ پھر بھی رضائے الٰہی کو بدلنا کیسے ممکن تھا! سزا و جزا کا اختیار تو اسی ذات واحد کو ہے۔ نافرمان اقوام کو اس نے نیست و نابود کر دیا۔ میرے نزدیک اب اہلِ عراق بھی اللہ کی پکڑ میں آنے والے تھے۔ ابن علقمی جیسے مفسد وقتی طور پر قوموں پر حاوی آ جاتے ہیں اور اپنے انجام سے بے خبر رہتے ہیں۔

ابنِ علقمی کھلے عام اپنے ہم عقیدہ فرقے کی حمایت کرتا، انہیں فساد پر اُکساتا اور دوسرے فرقے والوں کو سخت سزائیں دیتا۔ اس کی جانب داری کسی سے چھپی نہیں تھی۔ المیہ یہ کہ خلیفۂ وقت کا تعلق دوسرے فرقے سے تھا کہ جس کے ساتھ ناانصافی ہو رہی تھی۔

فرقہ وارانہ فسادات ابن علقمی ہی کے ایماء پر ہوتے۔ فسادات کی آگ بھڑکانے کے لئے ابن علقمی نے شرپسندوں اور غنڈوں کو پال رکھا تھا۔ بغداد میں فساد ہوتا تو پورا عراق اس کی لپیٹ میں آ جاتا۔ دراصل ابن علقمی، عراق کو دھیرے دھیرے خانہ جنگی کی طرف لے جا رہا تھا۔ ملی کھائی نہیں تو اوندھا دیتی ہے۔ یہی ابن علقمی کا حال تھا۔

بغداد کے اہلِ دانش درست ہی کہتے کہ خانہ جنگی سے قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

حالات سے باخبر رہنے کی غرض سے میں اور عارج حکمران طبقے کے اردگرد منڈلاتے رہتے۔ ہم نے ابھی تک انسانی جسموں میں اترنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ احمر مجھے نیک و شریف آدم زاد لگا تھا اور وہ بھی حکمران خاندان ہی کا فرد تھا۔ میں اسی لئے اکثر اس کے محل میں پہنچ جاتی۔

ایک روز میں اس کے محل میں گئی تو ولی عہد خلیفہ زادہ ابوبکر بھی اس کے پاس بیٹھا تھا۔ میں خاموشی سے ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے لگی۔ ابوبکر نوجوان ہی تھا، جسم قدرے بھاری بھرکم! اس کے چہرے سے شجاعت و فراست کے آثار ظاہر تھے۔

''کیا سوچ رہے ہو طاجی؟'' ابوبکر نے احمر کو ٹوکا۔ احمر بات کرتے کرتے ایک دم چپ ہو گیا تھا۔ روزہ نماز کی پابندی کرنے کی وجہ سے شاہی خاندان کے تمام افراد احمر کو خوش مزاجی کی بنا پر ''ملاجی'' ہی کہتے تھے۔ اس میں طنز یا تضحیک کا کوئی پہلو نہ ہوتا۔ احمر اسی لئے کچھ نہ کہتا۔

ابوبکر نے سوال کیا تو احمر جواباً بولا۔ ''اس وقت میں یہ سوچ رہا ہوں کہ نہر کے کنارے..... میری مراد اس نہر سے ہے جو دریا سے کاٹ کر لائی گئی ہے اور اس کا فاصلہ قصر الخلد (قصر خلافت) سے زیادہ نہیں۔ نہر کے کنارے حوض کیوں بنائے گئے اور پھر انہیں دفن کیوں کر دیا گیا؟''

جواب دیتے ہوئے احمر کی نظر ولی عہد ابوبکر کے چہرے پر تھی۔

''حوضوں'' کے ذکر پر ابوبکر کچھ پریشان سا ہو گیا اور بولا۔ ''خدا کے لئے اس بات کو بھول جاؤ کہ حوض تعمیر ہوئے تھے۔''

''کیا ان حوضوں سے کوئی راز وابستہ ہے؟'' احمر نے اظہار حیرت کیا۔

''میں کہہ رہا ہوں نا تم سے کہ حوضوں کا ذکر نہ کرو۔ کوئی نہیں جانتا کہ خلیفہ نے انہیں کیوں تعمیر کرایا تھا۔ جب تک حوض تعمیر ہوتے رہے کسی کو اس طرف سے نہیں گزرنے دیا گیا۔ عوام کو اسی لئے معلوم نہیں کہ حوض تعمیر کئے گئے تھے۔''

''عجیب سی بات ہے یہ۔'' احمر نے کہا۔

''عجیب سی بات ہو یا عجیب تر، تم زبان بند رکھو۔ خود شاہی خاندان کے کم ہی لوگوں کو ان حوضوں کی تعمیر کا علم ہے۔ جنہیں معلوم ہے، انہیں اعلیٰ حضرت خلیفۃ المسلمین نے ہدایت کر دی ہے کہ وہ یہ ذکر زبان پر نہ لائیں۔ تم بھی محتاط رہو۔''

''محتاط رہوں گا۔ یہی کہہ سکتا ہوں لیکن......''

ابوبکر نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ کہنے سے روک دیا اور بولا۔ ''میں دراصل تم سے ایک بات کہنے آیا تھا، تم نے اور ہی قصہ چھیڑ دیا۔''

''فرمائیے۔'' احمر متجسس نظر آنے لگا۔

اس پر ولی عہد ابوبکر نے رازدارانہ لہجے میں بتایا۔ ''مجھے وزیر اعظم ابن علقمی پر اعتماد نہیں ہے۔''

''کیا آپ نے اس کے متعلق کچھ سنا ہے؟''

''ہاں، وہ کوئی گہری سازش کر رہا ہے۔'' ابوبکر نے گویا انکشاف کیا۔

''سازش؟''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

"محض خیال ہی ہے؟" احمر نے معلوم کیا۔

"ہے تو خیر خیال ہی..... مگر رفتہ رفتہ یہ خیال یقین کے درجے پر پہنچ گیا ہے۔"

"یہ خیال آپ کے ذہن میں پیدا کیسے ہوا؟"

"مجھے مخبرانِ صادق نے اطلاع دی ہے کہ ابن علقمی نے چند اوباش قسم کے نوجوان فتنہ و فساد برپا کرنے پر مامور کر رکھے ہیں۔ یہ شرپسند نوجوان جو خود کو ابن علقمی کے ہم عقیدہ بتاتے ہیں، بلاوجہ چھیڑ خانی کرتے ہیں اور دونوں فرقوں میں تصادم کرا دیتے ہیں۔"

"لیکن اس کا ثبوت کیا ہے؟" احمر نے سوال کیا۔

"سنا ہے کل ایک ایسے ہی فتنہ جو نے جس کا نام شفیق بتایا جاتا ہے، بلاوجہ ہنگامہ کھڑا کر دیا۔" ولی عہد ابوبکر بتانے لگا۔ "ہوا یہ کہ وہاں ابن علقمی بھی آ گیا۔ اس نے فتنہ جو شفیق کی طرف داری کی۔ غرض کہ بڑی اشتعال انگیز باتیں کیں۔ اس بدبخت نے یہاں تک کہہ دیا کہ جو دوسرے فرقے والے ہیں، یعنی ہم..... تو ہمارے گھروں کو آگ لگا دینا چاہئے۔ جتنے ہمارے ہم عقیدہ مسلمان وہاں جمع ہو گئے تھے، ابن علقمی کے اشارے پر انہیں حراست میں لے لیا گیا۔ وہ سب اب قید کاٹ رہے ہیں۔"

"سچ یہ ہے کہ آپ درست نتیجے پر پہنچے ہیں۔" احمر بولا۔ "اس میں دونوں فرقے بے قصور ہیں۔ اصل قصوروار عیار و حریص ابن علقمی ہے۔ اس نے بغداد شہر میں اپنے غنڈے چھوڑ رکھے ہیں..... اور مجھے تو یہ بھی پتہ چلا ہے کہ یہی شرپسندوں کی جماعتیں ادھر ادھر بغداد سے باہر بھی بھیجے جاتے ہیں تاکہ وہاں بھی بدامنی کا راج ہو۔ یوں بھی دارالخلافہ میں فساد کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔ بغداد میں کوئی ہنگامہ ہو جائے تو اس کا اثر پوری سلطنت پر پڑتا ہے۔"

"تمہارا تجزیہ غلط نہیں۔" ولی عہد ابوبکر نے تائید کی، پھر کہنے لگا۔ "میں نے چند مرتبہ پہلے بھی موید الدین ابن علقمی کی شکایتیں سنی تھیں۔ ان شکایتوں کا تعلق اس کی فرقہ پرستی سے تھا۔"

"پھر؟ کیا آپ نے کوئی توجہ نہیں دی؟ اگر توجہ نہیں فرمائی تو کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی۔"

"وجہ تھی۔ ابن علقمی کی شکایتیں کرنے والے ہمارے ہم عقیدہ تھے۔ میں نے یہ سمجھا کہ چونکہ وزیراعظم کا تعلق دوسرے فرقے یا عقائد سے ہے اس لئے شکایتیں کی جا رہی

ہیں..... لیکن رات کو مجھ سے احسن اسعد ملنے آئے۔ تم جانتے ہو کہ وہ ابن علقمی ہی کے ہم عقیدہ ہیں، یعنی وہ ہم میں سے نہیں۔ پھر بھی دونوں فرقوں والے ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ یوں بھی وہ بزرگ آدمی ہیں اور اہل بغداد کی نظر میں قابل عزت ہیں..... تو حسن اسعد نے مجھے شفیق کی فتنہ پروری اور ابن علقمی کے ظلم کا واقعہ سنایا۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ میں نے ابن علقمی سے شفیق کی فتنہ انگیزی کا حال بیان کیا تو مجھے اس نے جھڑک دیا۔"

ابوبکر یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

کچھ دیر کو خاموشی چھا گئی۔ احمر بھی کچھ نہ بولا۔ میں ابھی وہاں مزید ٹھہرنا چاہتی تھی کہ شاید کوئی اور کام کی بات معلوم ہو جائے۔ مگر مجھے عارج کے وجود کی مانوس خوشبو محسوس ہوئی۔

"تو آ گیا یہاں بھی؟" میں بولی۔

"تیرے بغیر مجھے قرار کہاں؟ ..... اب تو میری بات مان جا اے ریتارا! مجھ سے نکاح پڑھوا لے۔ میں بھی کیا یاد کروں گا کہ کسی حسین زادی سے پالا پڑا تھا..... بول چلیں قاضی لطف اللہ کے پاس؟"

"قاضی لطف اللہ کون ہے؟"

"کوئی نہیں، بس یونہی کہہ دیا، تجھے ستانے کے لئے۔" یہ کہہ کر عارج ہنس پڑا۔ "خیر چھوڑ ان باتوں کو، کہیں گھومتے ہیں۔"

میں نے صاف انکار کر دیا۔ پھر جب عارج کو احمر اور ولی عہد ابوبکر کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتے میں نے آگاہ کیا تو جب تک وہ بھی وہیں رک گیا۔ احمر، وزیرزادی ہاجرہ کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"اب تم اسے ہماری زبان کہو یا کچھ اور۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ بغداد میں ایک منظم سازش کے تحت دونوں فرقوں کو آپس میں لڑایا جا رہا ہے۔" احمر کہہ رہا تھا۔ "میرے سامنے خود ہاجرہ نے اعتراف کیا ہے کہ ایک روز چند غنڈوں نے فتنہ شروع کیا تھا۔ عقائد کے اعتبار سے وہ غنڈے خود کو ابن علقمی کا ہم نوا بتاتے تھے۔ اس پر....."

"شرپسندوں، غنڈوں، تخریب کاروں اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑا پیدا کرنے والوں کا کوئی عقیدہ، کوئی مذہب نہیں ہوتا۔" ولی عہد ابوبکر نے احمر کی بات کاٹ دی۔ "بہتر

یہ ہوگا احمر! کہ تم ان مفسدوں کو ابن علقمی کے ساتھ کہو..... ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم..... کہو!"

"آپ نے اچھا کیا مجھے ٹوک دیا، آئندہ میں احتیاط برتوں گا۔" احمر بولا۔ "واقعہ یہی ہے کہ ہم سبھی مسلمان ہیں، ہمارے درمیان تفرقہ ڈالنے والے ہم میں سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ہمیں اپنی کتاب کے ذریعے یہی بتایا ہے۔ ارشاد الٰہی کی روشنی میں نفاق پیدا کرنے والوں کی حیثیت کا تعین ہمارے لئے آسان ہو جاتا ہے۔"

"احمر! تمہارے بارے میں لوگ غلط نہیں کہتے۔" ابوبکر مسکرایا۔ "یہ کہ تم ملا جی ہو۔"

"دین سے لگاؤ رکھنے والے کو اگر کوئی ملا جی کہتا ہے تو مجھے ملا جی کہے جانے کی خوشی ہے۔" احمر کہنے لگا۔ "ویسے مجھے پارسائی کا دعویٰ بہرحال نہیں۔" احمر ابھی یہ کہہ پایا تھا کہ ابوبکر نے اسے یاد دلایا، وہ ہاجرہ کے متعلق کچھ بتا رہا تھا۔ جس پر احمر نے دوبارہ موضوع گفتگو پر آتے ہوئے کہا۔ "ان غنڈوں کے بارے میں ہاجرہ نے اپنے باپ سے شکایت کی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ ابن علقمی کو دوبارہ سمجھائے گی۔"

"ہاجرہ نیک لڑکی ہے۔" ابوبکر نے اعتراف کیا۔ "مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ ابن علقمی میرے ساتھ اس کا نکاح کرنا چاہتا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ لڑکی حسین اور نیک ہے مگر مجھے معلوم ہے وہ بھائی ابوالقاسم سے محبت کرتی ہے اور احمر ابوالقاسم بھی اسے چاہتے ہیں اس لئے میں ہاجرہ کو اپنی بہن سمجھنے لگا ہوں۔"

"آپ بہت معاملہ فہم ہیں۔ شہزادی نجمہ بھی آپ کی تعریف کر رہی تھیں۔"

ابوبکر نے مسکرا کر احمر کو دیکھا اور بولا۔ "مجھے معلوم ہے کہ نجمہ کا جھکاؤ تمہاری طرف ہے، تم بڑے خوش قسمت ہو۔ وہ تمہیں چاہتی ہے اور....."

احمر نے بات کاٹ دی۔ "صاف بات یہ ہے کہ مجھے بھی نجمہ سے بے پناہ محبت ہے۔ آپ بھی تو کسی کو چاہتے ہوں گے۔"

"کیوں نہیں..... لیکن وہ کوئی شہزادی نہیں، معمولی گھرانے کی ایک لڑکی ہے۔" ولی عہد ابوبکر نے بتایا۔

"آپ نے اسے کہاں دیکھا؟" احمر نے پوچھا۔

ابوبکر نے جواب دیا۔ "ایک روز رات کو میں دریا کے کنارے کھڑا تھا۔ چاندنی رات تھی۔ فانوسوں کی روشنی اور چاندنی نے دن کا سا اجالا کر رکھا تھا۔ سامنے سے ایک بجرا آ کر کنارے پر لگا۔ اس میں سے ایک لڑکی اتری، نہایت حسین!..... اس کا حسن و جمال دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ میں نے اسے دیکھا اور اس نے مجھے۔ اس کی نظروں کے تیر میرے سینے میں گڑ گئے۔ وہ قیامت کو بیدار کرتی چلی گئی۔ قریب ہی اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ اس میں سوار ہو کر چلی گئی۔ مجھے رات بھر اس پری زاد کا خیال ستاتا رہا۔ چند روز کے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ میں دریا کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا، معاً مجھے ایک باغیچے سے نقرئی قہقہے کی آواز آئی۔ میں باغیچے کے دروازے پر پہنچ چکا تھا....."

احمر ہمہ تن گوش ہو کر ولی عہد ابوبکر کا قصہ عشق سن رہا تھا۔ اس عرصے میں وہ دانستہ چپ رہا۔

ابوبکر کا بیان محبت جاری رہا۔ "دفعتاً کوئی مجھ پر آ پڑا۔ دیکھا تو وہی مہ جمال ہے جس نے میری راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔ میں نے اسے سنبھالا۔ اس نے ہوشربا نگاہوں سے مجھے دیکھا اور نقرئی لہجے میں کہا: "شکریہ!" مجھے یوں لگا جیسے فردوسی حور میرے سامنے آ گئی۔ اس نے مجھ سے باتیں شروع کر دیں، پوچھنے لگی کہ تم کون ہو؟ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ ولی عہد سلطنت ہوں۔ میرے پوچھنے پر اس نے اپنا نام فردوس بتایا۔ وہ ایک جاگیردار کی بیٹی ہے۔ میں نے اس کا گھر بھی معلوم کر لیا ہے۔ اس سے کئی ملاقاتیں بھی ہو چکی ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے اسے بتا دوں کہ میں کون ہوں مگر عجیب بات ہے جرأت نہیں ہوتی۔"

"آپ کسی روز اسے اپنے قصر میں مدعو کر لیں۔" احمر نے مشورہ دیا۔

"اگر تم مجھ کو میرا اعزاز بتا دو تو اس گل رخ کو لے آئے۔" ابوبکر نے پُر امید نظروں سے احمر کی طرف دیکھا۔

اسی لئے عارج بول اٹھا۔ "اے دینار! کیا تو نے مجھے ان آدم زادوں کے عشق کی داستانیں سنوانے کے لئے یہاں روکا تھا؟"

"تو اتنی جلدی مجھ سے اکتا جاتا ہے۔" میں بولی۔ "تجھے بھی خبر ہے کہ میں کیا سنوانا چاہتی تھی۔ اصل قصہ ابن علقمی سے متعلق تھا۔"

"مگر وہ قصہ ختم ہوئے تو کئی برس ہو گئے۔"

"کیا کر رہا ہے اے عارج! اس قدر بھی نہیں۔" (غلو: مبالغہ، کسی بات کو بڑھا چڑھا

کے بیان کرنا۔ مصنف)

''اچھا چل کئی برس نہیں تو کئی گھنٹے...... منت سہی! مگر وقت تو ضائع ہوا...... یہ الگ بات ہے کہ عاشق میں بھی ہوں لیکن بھلا کون میرا عشق سنے گا!...... یہ قصہ تو صدیوں پر محیط ہے۔ اے دینار! تُو اگر برا نہ مانے تو میں بھی شروع ہو جاؤں اور ان آدم زادوں کو بتا دوں، سنو! کبھی کسی جن زادی سے عشق نہ کرنا ورنہ......''

''عارج!'' میں تقریباً چیخ اٹھی۔ ''تُو نے اگر یہ حرکت کی تو......''

''تُو مجھے کچا چبا جائے گی، مجھے معلوم ہے۔ اسی لئے آدم زادوں سے کچھ نہ کہوں گا۔ اب تو خوش ہے تُو؟'' عارج کی بات کا میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ مزید بولا۔ ''تو پتے اے دینار! ان قصوں میں الگ سے ایک مزہ ہے...... اور مزے کی خاطر میں تیرے ساتھ یہاں رات بھر رکنے کو تیار ہوں۔''

''رکا رہ، مگر بک بک نہیں۔'' میں نے کہہ دیا۔

''تجھ سے ایک بات اور بھی پوچھنی تھی۔''

''کچھ نہیں، پوچھنی ہے بول!...... ماضی اور حال میں فرق ہوتا ہے۔''

''زیادہ علامی نہ بنا کر! تُو بھی درجنوں لفظ غلط بولتی ہے، میں تو ٹوکتا ہوں تجھے؟''

''ٹوک دیا کر!...... ہاں کیا پوچھ رہا تھا؟''

''احمر کا جسم بہت اچھا لگتا ہے مجھے۔''

''تو پھر؟''

''فرض کر اگر میں احمر کے جسم میں اتر جاؤں اور......''

''اتر جا!''

''پھر تجھے بھی نجمہ کا جسم اپنانا پڑے گا۔''

''وہ کس خوشی میں؟'' میں جان کر انجان بن گئی۔

''عشق کیا ہے ناں ہم نے بھی!'' عارج زور دے کر بولا۔

''مگر اس عشق کا آدم زادوں سے کیا تعلق؟''

''تعلق تو پیدا ہو ہی جائے گا...... اس سے پہلے کیا ایسا نہیں ہوا؟ کئی دفعہ تُو میری بیوی نہیں بنی؟...... مطلب یہ کہ آدم زادی کے جسم میں اتر کر!''

''اس پر بھی تیری تسلی نہیں ہوئی؟''

''تھوڑی بہت ہوئی، پوری نہیں۔'' عارج نے جواب دیا۔ اسی وقت نجمہ اور احمد وہاں آ گئے۔ عارج نے نجمہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''جب تُو اس آدم زادی کے بدن میں اتر جائے گی تو پیار بھی [illegible] گی۔''

''تیری تجویز پر سوچوں گی۔ فی الحال چپ رہ۔''

احمر اور ابوبکر دونوں ہی نے آنے والوں کا استقبال کیا۔

نجمہ کا حسن واقعی تکلیف دہ تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے احمر بولا۔ ''کیا حسن اتفاق ہے، ہم دونوں ابھی تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔''

ابوبکر نے کہا۔ ''لگتا ہے نجمہ بہن کو یقین نہیں آیا۔''

''اگر حضور فرما رہے ہیں تو یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔'' نجمہ مسکرا کے بولی۔

احمد ابوالقاسم ہنس پڑا اور کہا۔ ''معافی مانگو تم بھائی احمر سے۔ تم نے بڑی توہین کی ہے ان کی۔''

نجمہ بھی بے ساختہ ہنس دی اور بولی۔ ''یہ بات ہے تو میں ان سے معافی چاہتی ہوں۔''

''تم نے کچھ ایسے انداز دل ربایانہ سے یہ الفاظ ادا کئے کہ احمر 'صدقے واری' ہونے لگا۔

''تم بڑی خوش ہو نجمہ!'' احمر نے کہا۔

اس پر ابوبکر بولا۔ ''مروت تقاضا ہے بھائی احمر! کیا معاف کر دیا تم نے؟''

''زبردستی کی معافی مانگی جا رہی ہے۔'' احمر مسکرایا۔ ''اس لئے معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' پھر اس نے چونک کر کہا۔ ''معافی تو مجھے مانگنی چاہئے کہ اب تک خورد و نوش کی خبر ہی نہیں لی۔ میوہ سے تو شغل کرنا ہی چاہئے تھا...... مجھ سے بھول ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ محترم ولی عہد نے تشریف لاتے ہی باتوں کا ایسا سلسلہ شروع کیا کہ کچھ یاد ہی نہ آ سکا۔ نجمہ اور بھائی احمد کو بھی میں نے اسی لئے مدعو کیا تھا۔'' یہ کہہ کر احمر نے کنیزوں کو طلب کر لیا اور انہیں کچھ حکم دے کے رخصت کر دیا۔ تھوڑی دیر میں ایک کنیز آئی اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ احمر نے سب کو مخاطب کیا۔ ''آیئے۔''

سب اٹھ کر احمر کے ساتھ ایک اور کمرے میں پہنچ گئے۔ عارج مجھ سے بولا۔ ''اے دینار! میں بھی میوہ کھا لوں؟''

"کوئی شرارت نہیں۔" میں نے تاکید کی۔ "ان آدم زادوں کو شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم جنات بھی یہاں ہیں۔"

"تو کہتی ہے تو میوہ سے ہی نہیں نجمہ سے بھی دست بردار ہو جاتا ہوں، ویسے یہ آدم زادی ہے زوردار!"

"اور مجھے احمر زوردار لگتا ہے۔" میں بولی۔

"میں جانتا ہوں، احمر کا نام لے کر تو مجھے چڑا رہی ہے۔ سو میں چڑنے والا نہیں۔"

"تم جیسے جن زادوں کو ڈھیٹ بندر کہتے ہیں۔"

"میں اگر ڈھیٹ بندر ہوں تو پھر تو ڈھیٹ بندریا....."

"چپ!" میں نے عارج کو جھڑک دیا اور اس کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

یہ کمرا پہلے سے بڑا تھا، پرتکلف اور آراستہ! ہر کرسی کے سامنے ایک میز تھی۔ میزوں پر سفید اور خوش نما میز پوش پڑے تھے۔ ہر کرسی پر ایک تولیہ تھا۔ دو کنیزیں سلفچی اور آفتابہ لے کر آئیں اور ان کے ہاتھ دھلائے۔

میزوں پر طرح طرح کے میوے اور پھل تھے۔ سب نے کھانا شروع کیا۔

احمر نے کہا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ شفیق نامی کوئی شخص ہے۔ اس نے آج کسی محلے میں آگ لگانے کی کوشش کی۔"

ابوبکر بولا۔ "میں نے سنا ہے ابن علقمی نے شفیق اور اس کے ساتھی فتنہ پردازوں کو فساد انگیزی پر مامور کر رکھا ہے۔ ضرور اس فسادی نے ایسی حرکت کی ہوگی۔"

"میں اس لئے بھائی احمر کی دعوت پر یہاں آیا ہوں کہ ہم دونوں مل کر اعلیٰ حضرت خلیفہ معظم کے گوش گزار یہ واقعات کریں۔ اتفاق سے یہاں آپ بھی مل گئے۔" احمد ولی عہد ابوبکر سے ہم کلام تھا۔ "کیا آپ ہماری رہنمائی کریں گے؟"

"ضرور!" ابوبکر نے فوراً جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ ابن علقمی مسلمانوں کو عقائد اور مسلک کی بنیاد پر آپس میں لڑا کر کوئی خاص مطلب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ سازش کامیاب نہیں ہونی چاہئے۔ میں کئی بزرگ عالموں سے ملا ہوں جن کا مسلک و فقہ مختلف ہے۔ وہ بھی اس فتنہ انگیزی کو اچھا نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں، اس سے حکومت کمزور ہو جائے گی۔ انہوں نے اس خدشے کا اظہار بھی کیا کہ اگر مسلمان ایک دوسرے سے برسر پیکار ہو

گئے تو تاتاریوں کا طوفان بھی اسی طرف رُخ کر سکتا ہے۔" (اہل بغداد مغلوں کو تاتاری کہتے تھے۔ منگولیا کی رہنے والی اس وحشی قوم کو منگول اور مغل بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وحشی سورج کی پرستش کرتے تھے۔ اسی قوم سے تیمور لنگ اور پھر ہندوستان پر حکومت کرنے والا پہلا مغل تاجدار ظہیر الدین بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں وغیرہ مشہور زمانہ ہوئے۔ مصنف)

ابوبکر نے احمر سے بھی اتفاق کیا، بولا۔ "ان کا خیال صحیح ہے۔ آج کل مغل ایران میں اپنے پاؤں جما رہے ہیں۔ اگر انہیں ہماری خانہ جنگی کا علم ہو گیا تو یقیناً بغداد پر چڑھ دوڑیں گے۔ وہ ایسی وحشی قوم ہے کہ اس کے مقابلے کی قوت عباسی خلافت میں نہیں ہے۔ نہ معلوم مغل یہاں آ کر کیا قیامت برپا کریں۔"

"یہی بات ہے۔ اس لئے خلیفہ محترم کو ان واقعات سے خبردار کرنا ضروری ہے۔" احمر نے اپنی بات دہرائی۔

"میں تم لوگوں کی رہنمائی کو تیار ہوں۔" ولی عہد ابوبکر نے یقین دہانی کرائی۔

غرض یہ طے پا گیا کہ ابوبکر، احمر اور احمد تینوں خلیفہ سے واقعات بیان کر دیں۔ یہ آدم زاد باتیں بھی کرتے رہے اور میوہ پھل سے بھی "شغل" جاری رہا۔ ادھر ان کی باتیں ختم ہوئیں ادھر انہوں نے "پھل خوری" سے ہاتھ کھینچ لیا۔ کنیزوں نے بڑھ کر ہاتھ دھلائے۔ تولیوں سے انہوں نے ہاتھ صاف کئے۔

اس کمرے سے اٹھ کر وہ سب ایک فوارے پر جا بیٹھے۔ فوارہ حوض میں تھا۔ حوض کی چار دیواری سنگ مرمر کی تھی جو اتنی چوڑی تھی کہ اس پر آرام سے بیٹھ کر حوض کا نظارہ ممکن تھا۔

بڑے فوارے سے ننھی ننھی بوندیں برس کر حوض کے پانی میں دائرے بنا رہی تھیں۔ حوض کے چاروں طرف کثرت سے پھولوں کے تختے تھے۔ صنوبر کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ غرض کہ نہایت دل کش منظر تھا۔

مجھے اندازہ ہو چلا تھا کہ عارج کو آدم زادی نجمہ کا بدن پسند آ گیا ہے۔ وہ اسی لئے چاہتا ہے کہ میں، نجمہ کے جسم میں اتر جاؤں۔ میں کوئی تنگ نظر جن زادی نہیں تھی کہ نجمہ سے حسد کرنے لگتی یا اسے نقصان پہنچاتی۔ ہم جنات میں عموماً ایسا "جلاپا" نہیں ہوتا۔ آدم

زادوں کی نسبت ہمیں خاصی آزادی حاصل ہے۔ یہ الگ بات ہے جو اہلِ ایمان ہیں اس آزادی کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتے۔ نجمہ کے بدن کی لطافت سے ابھی میں ناآشنا تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ مجھے اس کے جسم میں قرار آ ہی جاتا۔ فی الحال میں اس کے جسم میں قید ہو کے اپنی آزادی سے ہاتھ دھونے کی روادار نہیں تھی، مگر عارج کو یہ بات نہیں بتائی۔

میرے علم میں تھا کہ وہاں نجمہ کی موجودگی کے سبب عارج وہاں سے ٹلے گا نہیں۔ میں نے اسی لئے اس سے کہا۔ ''چلتے ہیں اب یہاں سے۔''

''ابھی تو یہ آدم زاد مزید گفتگو کریں گے۔ کیا خبر کیا نئی بات سامنے آ جائے، اے دینارا!'' عارج نے رکنے کے لئے بہانہ بنایا۔

''اب کیا نئی بات رہ گئی ہے۔ طے تو ہو گیا ہے کہ یہ لوگ خلیفہ سے ملیں گے۔''

''اگر بات ختم ہو گئی ہے تو انہیں نہیں رکنا چاہئے۔'' عارج نے گویا دلیل دی۔

''اے عارج! تو آخر سیدھی طرح سے یہ کیوں نہیں کہہ دیتا کہ آدم زادی نجمہ کے دیدار سے ابھی تجھے تسلی نہیں ہوئی۔'' میں نے چٹکی لی۔

''میں...... فضول...... میں کیوں اس کا دیدار کرتا...... یہ بھی کوئی بات ہوئی...... تُو ناحق مجھ پر تہمت لگا رہی ہے...... تُو نے یہ تہمت لگا دی ہے مجھ پر تو ٹھیک ہے۔ میں نہیں جاتا یہاں سے۔'' عارج نے بوکھلاہٹ کے باوجود وہاں رکنے کا جواز ڈھونڈ لیا۔

میں ہنس دی اور ولی عہد ابوبکر کی طرف دیکھنے لگی جو احمد کا ہاتھ پکڑ کر ایک جانب لے جا رہا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ ابوبکر اور احمد نے احمر کو موقع دیا ہے کہ وہ نجمہ سے اس کی داستان بیان کر کے اسے ہمراز بنا لے۔

ابوبکر و احمد کے جاتے ہی احمر نے کہا۔ ''نجمہ! تمہیں یقین نہیں آیا تھا کہ میں اور ولی عہد تمہاری آمد سے پہلے تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے؟''

''کیا ذکر ہو رہا تھا میرا؟'' نجمہ نے پوچھا۔

''ولی عہد ایک لڑکی کے معاملے میں تم سے مدد چاہتے ہیں۔'' احمر نے بتایا۔

''کون ہے وہ لڑکی؟''

''میں تمہیں ولی عہد کی پوری داستان سناتا ہوں۔'' احمر نے یہ کہہ کر ابوبکر اور فردوس کی داستان نجمہ کو سنا دی۔ نجمہ بڑی توجہ سے سنتی رہی، احمر نے مزید کہا۔ ''ولی عہد یہ چاہتے ہیں

کہ تم فردوس کو اپنے ساتھ لے آؤ۔''

''ولی عہد نے اچھا ہی کیا کہ اس پر اپنی شخصیت واضح نہیں کی، مگر مجھے فردوس کا مکان کون بتائے گا؟'' آخر میں نجمہ نے دریافت کیا۔

''تمہیں کسی روز ولی عہد اس کا مکان دکھا دیں گے۔'' احمر نے جواب دیا۔

''میں ولی عہد کی مدد کروں گی۔'' نجمہ نے وعدہ کر لیا۔

اسی وقت قدموں کی چاپ ابھری۔ ابوبکر اور احمد آ رہے تھے۔

''اب میں اجازت چاہتا ہوں۔'' احمد نے کہا اور نجمہ کو ساتھ لے کر چلا گیا۔

احمر نے ولی عہد ابوبکر کو بتا دیا کہ اس نے نجمہ کو داستانِ محبت سنا دی ہے اور نجمہ تعاون کرنے کو تیار ہو گئی ہے۔ پھر ابوبکر بھی چلا گیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو عارج غائب تھا۔ اب وہ اکثر مجھ سے کچھ کہے سنے بغیر ''اڑن چھو'' ہو جاتا تھا۔ ویسے صدیاں گزر جانے کے بعد ہم دونوں کے درمیان بڑی حد تک رکی تکلفات ختم ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ ہم دونوں ہی جب چاہتے ایک دوسرے تک پہنچ سکتے تھے۔ ہمارے وجود کی خوشبو رہنمائی کے لئے کافی تھی۔ مجھے عارج کے غائب ہو جانے پر کوئی تشویش نہیں تھی اس بنا پر اسے نہیں ڈھونڈا۔

یہاں میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتی ہوں کہ حکمران خاندان خاصا بڑا تھا۔ خلیفہ معتصم خود ایک کنیز کے بطن سے تھا۔ یہی صورت اس کے بقیہ خاندان کی تھی۔ حکمران میں اصل عرب اب کم ہی تھے۔ کہیں نہ کہیں کوئی ''ٹانکا'' ضرور تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ خلیفہ کی بھی متعدد بیویاں اور کنیزیں تھیں۔ کوئی خلیفہ زادہ کسی کنیز سے اور کوئی کسی بیوی کے بطن سے تھا۔ وہ آپس میں بھائی تو تھے مگر سوتیلے! مزید یہ کہ کوئی خالہ زاد، کوئی ماموں زاد اور کوئی چچا زاد تھا۔ یہی معاملہ آدم زادیوں کا تھا۔ اس وضاحت سے میری مراد محض یہ ہے کہ حکمران خاندان کا تعلق یا سگے رشتے آپس میں بہرصورت قابلِ اعتراض یا خلافِ شرع نہیں تھے۔ خالہ زاد، چچا زاد یا ماموں زاد بھی آپس میں بھائی ہی کہلائیں گے۔

✿......✿

نجمہ نے جس روز ابوبکر کی داستان سنی، اس کے چند روز بعد بگھی میں بیٹھی جا رہی تھی۔ میں نے اس کے ذہن کو ٹٹولا تو پتہ چلا کہ اسے ابوبکر کی داستانِ عشق پر حیرت ہے۔ اس

حیرانی کی وجہ یہ تھی کہ ولی عہد سلطنت ابوبکر، شہزادیوں کو چھوڑ کر ایک معمولی جاگیردار کی لڑکی پر مرمٹا تھا۔ اس نے وزیرزادی ہاجرہ کو بھی قبول نہیں کیا جب کہ ابن علقمی کی بیٹی حسن سے مالا مال تھی۔ اسے یہ بات بھی یاد آئی کہ ابوبکر کے متعلق شاہی محلوں میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ وہ عورتوں کو اچھا نہیں سمجھتا۔ وہ اپنی ہم عمر شہزادیوں سے بھی ہنس کر باتیں نہیں کرتا تھا۔

موقع غنیمت جان کر میں نے نجمہ کے بارے میں اور بہت سی معلومات حاصل کر لیں اور پھر اس کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔

"یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟" نجمہ کے گداز لب حرکت میں آئے اور آواز پست سی تھی۔ میں اس کے سامنے والی خالی نشست پر آرام سے بیٹھی اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔

بگھی کے آگے چار اور چار سوار پیچھے چل رہے تھے۔ ایک راستہ (نہر کا) سے بگھی گزر رہی تھی۔ تھوڑی دور چل کر سڑک کے کنارے ایک باغیچہ آ گیا۔ نجمہ نے بگھی رکوائی اور باغیچے میں چلی گئی۔ شاید وہ اس سے پہلے بھی باغیچے میں آتی رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ تھی۔

باغیچہ بہت ہرا بھرا تھا۔ اس میں گھاس کے کئی میدان تھے۔ روشوں کے دونوں طرف صنوبر کے درختوں کی قطاریں اس طرح کھڑی تھیں جیسے وہ پہرے دار ہوں اور خاموش کھڑے اپنی پاسبانی کا فرض ادا کر رہے ہوں۔ صنوبر کے درختوں کے درمیان پھولوں کے پودے تھے، ان پر پھول کھل رہے تھے۔ پھولوں کے کئی تختے الگ تھے اور جس تختے میں تھے وہ بالکل گل پوش تھا، کئی فوارے جگہ جگہ تھے۔

نجمہ ابھی چند قدم ہی چلی تھی کہ مجھے ایک چیخ سنائی دی۔ میں اس طرف لپکی۔ نجمہ میرے عقب میں تھی۔ سامنے قد آدم سے اونچی مہندی کی باڑ دکھائی دی تھی۔ اس کے عقب میں مجھے ایک خوب رو اور نازک سی آدم زادی نظر آئی۔ کوئی آدم زاد اس پر دست درازی کر رہا تھا۔ میں نے معاملے کو سمجھے بغیر مداخلت سے گریز کیا۔ پھر یہ کہ وہاں حکمران خاندان کی ایک شہزادی، یعنی نجمہ بھی موجود تھی۔ وہ یقیناً مداخلت کرتی۔

"ہٹ جا بدمعاش!" لڑکی اس بھاری جسم والے آدم زاد کی گرفت سے نکلنے کے لئے جدوجہد کرنے لگی۔

"کیسے ہٹ جاؤں!...... آج تو موقع ملا ہے...... میں تجھے ایک عرصے سے چاہتا ہوں۔" شیطانی چہرے والا مرد بولا۔

"میں تجھ سے نفرت کرتی ہوں۔"

"مگر میں تجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہوں اور آج......"

"شیطان! دور ہٹ کر بات کر۔"

"جانِ جاں! سن تو سہی۔ میرا نام شفیق ہے۔ تجھے پانے کی خاطر ہی میں نے بغداد میں فتنہ و فساد کی ابتدا کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کسی روز عام بلوا ہو جائے اور میں تجھے اٹھا کر لے جاؤں۔"

میں اس آدم زاد کا نام سن کر چونک اٹھی۔ یہ وہی فسادی تھا جس کا ذکر میں نے احمر، ولی عہد ابوبکر وغیرہ سے سنا تھا۔

شفیق کی بات سن کر لڑکی بولی۔ "تو جھوٹا ہے۔ وزیراعظم کو خوش کرنے کے لئے تو فتنے کی آگ کو ہوا دے رہا ہے۔"

"تم نے غلط نہیں کہا میری بلبل! یہ بات بھی درست ہے۔ میں ایک تیر سے دو شکار کروں گا۔ تمہیں بھی اٹھا لے جاؤں گا اور وزیراعظم بھی بغداد میں فساد...... ایک بڑے فرقہ وارانہ فساد سے خوش ہو جائے گا۔"

مرد کے بارے میں تو مجھے پتہ چل گیا تھا کہ کون ہے البتہ لڑکی ابھی میرے لئے اجنبی تھی۔ نجمہ مہندی کی ایک باڑ کی آڑ میں کھڑی تھی۔ وہ اب تک شفیق اور لڑکی کی باتیں سننے پر اکتفا کر رہی تھی۔

ایک مرتبہ پھر شفیق نے لڑکی کو سمجھایا، بولا۔ "سنو اے میری زندگی! اگر تم میرے ساتھ چلنے پر تیار ہو جاؤ تو بغداد تباہ ہونے سے بچ جائے۔ فتنہ و فساد کا بانی میں ہوں۔ میں نے ہی نوجوانوں کے ایک گروہ کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ ابن علقمی دولت خرچ کرتا ہے اور ہم اس کے ایماء پر فتنہ برپا کرتے ہیں۔ جب تم میری ہو جاؤ گی تو میں فتنہ انگیزی چھوڑ دوں گا۔ بتاؤ تم میری ہونا منظور کرتی ہو یا...... پھر اس شہر بغداد کو تباہ دیکھنا چاہتی ہو؟"

لڑکی جذباتی ہو گئی۔ وہ محب وطن ثابت ہوئی، اس نے کہا۔ "اگر میری قربانی بغداد کو تباہی سے بچا سکتی ہے تو میں اپنی جان کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں، یہ میرا شہر ہے...... میرا بغداد ہے۔"

"مجھے معلوم ہے تو بڑی ضدی ہے، مانے گی نہیں سیدھی طرح! جان دینے کو آمادہ ہے مگر میں جو طلب کر رہا ہوں، اس سے انکاری ہے۔" یہ کہتے ہی بدسرشت شفیق دوبارہ دست درازی پر اتر آیا۔

میں ابھی اس کمینے آدم زاد شفیق کو ٹانگ پکڑ کر گھسیٹنے ہی والی تھی کہ نجمہ کی تیز آواز گونجی۔

"خبردار!" مہندی کی باڑ میں ایک شگاف تھا۔ نجمہ اسی کے ذریعے اس طرف آ گئی تھی۔

شفیق نے نجمہ کی طرف دیکھا، اس پر نجمہ کی ڈپٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا، البتہ اس نے دست درازی بند کر دی۔ لڑکی نے کیونکہ اپنے بچاؤ کی کوشش کی تھی اس لئے وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اس کا سانس پھول رہا تھا اور سینہ زور زور سے سانس لینے کی وجہ سے بہت زیادہ ابھر ابھر کر دب رہا تھا۔

نجمہ کو شفیق نے مخاطب کیا۔ "میرے معاملے میں دخل دے کر تم پچھتاؤ گی۔"

اس پر نجمہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ بہرحال شہزادی تھی۔ نجمہ کی کمر سے جو چمڑے کی پٹی بندھی تھی اس میں خنجر اڑسا ہوا تھا، اس نے جلدی سے خنجر کھینچا اور تیزی سے آگے بڑھی۔

حسن نیمروز کو جوش و طیش میں دیکھ کر شفیق سٹپٹا گیا۔ اسی وقت میں نے دیکھا، شفیق کی دائیں آنکھ میں پھلی تھی۔ گویا وہ بھی طاہر کی چشم کی طرح عیب دار تھا۔

نجمہ جھپٹ کر اس کے پاس پہنچی اور بولی۔ "زندگی عزیز ہے تو بھاگ جا۔ ورنہ یہ خنجر تیرے سینے میں تیرتا نظر آئے گا۔"

شفیق نے یہ جسارت کی کہ خنجر چھیننے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ نجمہ نے بڑی پھرتی سے وار کیا۔ خنجر کی نوک شفیق کی ہتھیلی کو چیر گئی۔ وہ بھنا کر بھاگ نکلا۔ میں خاموشی سے یہ سب دیکھتی رہی۔ اگر وہ کمینہ اور عیب دار آدم زاد نجمہ کے قابو میں نہ آتا یا اس پر بھاری پڑتا تو میں تماشائی نہ بنی رہتی۔ بھاگتے ہوئے بزدل کو نجمہ نے للکارا۔

"ٹھہر..... کہاں جاتا ہے۔ شاہی سپاہی آ رہے ہیں۔"

اس پر بھی شفیق نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس کی ہتھیلی سے خون جاری تھا اور وہ اس طرح مہندی کی باڑ کو چیرتا ہوا دوڑ رہا تھا جیسے موت اس کے تعاقب میں ہو۔

اب نجمہ اجنبی لڑکی سے مخاطب ہوئی جس کا سانس اب تک پھولا ہوا تھا اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے مشکورانہ نظروں سے نجمہ کو دیکھا اور کہا۔ "تم نے عین وقت پر آ کر مجھے بے عزت ہونے سے بچا لیا۔ میں تمہاری شکر گزار ہوں۔"

"شکریے کی ضرورت نہیں ہے..... میں تو اس پر حیران ہوں تم اس فتنہ کے ساتھ یہاں کیسے آ گئیں؟" نجمہ نے اظہار حیرت کیا۔

لڑکی نے جواب دیا۔ "میں اس کے ساتھ نہیں آئی بلکہ یہ میرے پیچھے لگا چلا آیا۔"

"کیا یہ باغیچہ تمہارا ہے؟"

"جی نہیں، میری ایک سہیلی کا ہے۔ مجھے یہ باغیچہ بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ میں اکثر سیر کرنے یہاں آ جاتی ہوں۔ کبھی اپنی سہیلی کے ساتھ اور کبھی تنہا۔ آج بھی میں سیر کرنے آئی تھی، مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ شریر میرے پیچھے لگا آ رہا ہے۔" لڑکی بتانے لگی۔ "جب میں مہندی کی ان باڑوں میں آئی تو دفعتہً میرے سامنے آ گیا۔"

"کیا اس نے پہلے بھی تم سے کوئی بات کی ہے؟" نجمہ نے پوچھا۔

"جی ہاں، چند مرتبہ یہ اتفاقیہ میرے سامنے آ گیا۔ لیکن اب میں یہ سمجھی ہوں کہ یہ قصداً سامنے آتا تھا۔"

"تم کس کی بیٹی ہو؟"

"میں یعقوب جاگیردار کی بیٹی ہوں۔"

"آؤ کسی فوارے پر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

دونوں وہاں سے چل دیں۔ اس عرصے میں مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ لڑکی کون ہو سکتی ہے۔ میں نے سوچا کہ ابھی تصدیق ہو جائے گی اور ان دونوں کے ساتھ چل دی۔ ظاہر ہے کہ وہ اس سے بے خبر تھیں کہ ایک جن زادی بھی ساتھ ساتھ ہے۔

کئی روشوں سے ہو کر وہ ایک فوارے پر جا بیٹھیں۔ پانی کی بوندیں اچھل رہی تھیں جو کبھی کبھی ہوا کے زور سے ان پر بھی آ پڑتیں۔ ان کے گلابی رخساروں پر پانی کی ننھی ننھی بوندیں ایسی معلوم ہوتیں جیسے گلاب کی پتیوں پر سچے موتی بکھر گئے ہوں۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" نجمہ نے اس پیکر جمال سے دریافت کیا۔

"میرا نام فردوس ہے۔" لڑکی کے اس جواب سے میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔

نجمہ حیرت سے بولی۔ "فردوس نام ہے تمہارا؟"

"ہاں، میرا نام یہی ہے ....مگر تمہیں کیوں حیرت ہوئی؟"

"تمہارا ذکر سنا تھا میں نے۔"

"میرا ذکر؟....کس سے؟"

"بتا دوں گی۔" نجمہ نے جواب دیا، پھر پوچھا۔ "تم کس سواری میں آئی تھیں؟"

"میری سواری چلی گئی ہے۔"

"آؤ میرے ساتھ، میری سواری موجود ہے۔"

"دونوں اٹھیں اور پھر باغیچے سے باہر آ گئیں۔ فردوس سواروں کو دیکھ کر متعجب ہوئی اور نجمہ سے پوچھا۔ "کیا تم شہزادی ہو؟"

"تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا، میں کون ہوں!"

"ابھی بتا دیجئے۔" فردوس ضد کرنے لگی۔

"تم بیٹھو تو گاڑی میں۔" نجمہ نے کہا۔

دونوں سوار ہوئیں اور گاڑی چل پڑی۔

٭....٭

احمد، احمر اور ابوبکر نے یہ طے کیا تھا کہ وہ خلیفہ مستعصم کے حضور میں حاضر ہو کر ابن علقمی کی حرکتوں سے اُسے آگاہ کریں۔ میں اس دن کے انتظار میں تھی۔ جب ایک روز وہ تینوں خلیفہ کے حضور میں باریاب ہونے چلے تو میں بھی ان کے قدم بہ قدم تھی۔

تینوں گھوڑوں پر سوار تھے جبکہ مجھے کسی سواری کی ضرورت نہ تھی۔

وہ قصر خلافت (قصرِ خلد) کے عالیشان پھاٹک پر پہنچے تو محافظوں نے انہیں سلامی دی۔ اس پھاٹک پر اڑھائی سو سواروں کا پہرا ہر وقت رہتا تھا۔ تینوں پھاٹک سے گزر کر ایک چوڑی سڑک پر آ گئے۔ قصر خلافت اب ایک ایسے وسیع محل میں تبدیل ہو چکا تھا کہ کوئی مضبوط قلعہ معلوم ہوتا۔ اس قصر کے اندر کئی رمنے (چراگاہیں) تھے۔ کئی چمن زار تھے۔ اس کے چپے چپے پر پانی کی نالیاں بہہ رہی تھیں جو رمنوں، باغوں اور باغیچوں کو سیراب کرتی تھیں۔ ایک طرف چڑیا گھر تھا جو کئی فرلانگ اراضی پر واقع تھا۔ اس چڑیا گھر میں چیتے، بھیڑیے، چرخ، شیر وغیرہ بھی تھے۔

تقریباً ایک میل چلنے کے بعد ایک اور دروازہ آیا۔ یہ دروازہ پہلے دروازے سے زیادہ خوش نما اور عالی شان تھا۔ اس پر اڑھائی سو سپاہیوں کا پہرا تھا۔ اس دروازے کے محافظوں نے بھی ان تینوں شہزادوں کو سلام کیا اور تعظیم دی۔ یہ آگے بڑھے اور دروازے کو عبور کر کے چمن زار میں داخل ہو گئے۔ اس چمن زار کی تختہ بندی بڑے سلیقے سے کی گئی تھی۔ اس میں کئی فوارے تھے، سنگ مرمر کی بڑی بڑی نالیاں تھیں جن میں صاف پانی بہہ رہا تھا۔ چمن دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس سے ملا ہوا ایک باغیچہ تھا جس میں پھلواری بھی تھی اور پھل دار درخت بھی تھے۔

چمن کو طے کر کے تینوں آدم زاد نوجوان ایک چبوترے پر چڑھے۔ سنگ مرمر کی سیڑھیاں اور سنگ مرمر ہی کا چبوترا تھا۔ سامنے جو عمارت دور تک پھیلتی چلی گئی تھی وہ بھی

اسی سفید پتھر کی تھی۔

یہ گویا شاہی محل تھا جہاں کنیزوں کی کثرت تھی۔ محل کے گوشے گوشے میں نازک اندام کنیزیں اِدھر سے اُدھر آتی جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ خوش لباس، خوش گفتار، خوش قامت، خوش رو اور خوشبو میں بسی وہ کنیزیں جیسے محل کی جان تھیں۔ ولی عہد ابوبکر پر نظر پڑتے ہی کنیزیں مؤدب ہو جاتیں اور ایک خاص ادا سے سرخم کرتیں۔

اس محل کا ہر کمرا نگار خانہ چین بنا ہوا تھا، کسی دُلہن کی طرح آراستہ خوش نما ریشمی پردے دروازوں پر پڑے تھے جن میں کلابتوں کی ڈوریاں لگی ہوئی تھیں۔ چھت گیریاں زربفت کی تھیں۔ خوش نما قالینوں کے فرش تھے۔ عمدہ قسم کی میزیں تھیں۔ میزوں پر پُرتکلف میز پوش تھے۔ ان پر سونے چاندی کے گلدان اور دوسری چیزیں تھیں۔

تینوں آرام زاد، کنیزوں کے ساتھ خلیفہ کے پاس چل دیئے۔ کئی کمروں سے گزر کر وہ ایک ایسے کمرے میں پہنچے جس کی ہر چیز سنہری تھی۔ دروازوں پر سنہرے پردے تھے۔ چھت گیری سنہری تھی۔ قالین سنہرے تھے۔ میز پوش، گلدان سنہرے تھے۔ اس کمرے کے بیچ میں ایک حوض تھا۔ حوض کی دیواریں سنہری تھیں۔ اس میں جو فوارہ چل رہا تھا وہ بھی سنہرا تھا اور حوض میں جو مچھلیاں تیر رہی تھیں وہ بھی سنہری تھیں۔ اور تو اور جو کنیزیں خدمت پر مامور تھیں اور جو ناچنے گانے والی حسین لڑکیاں تھیں ان کے جسموں پر بھی سنہرے رنگ کے لباس تھے۔

اس سنہری فضا میں البتہ خلیفہ ابو احمد عبداللہ مستعصم باللہ اپنے مخصوص قومی لباس میں جو سیاہ رنگ کا تھا، پہنے ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے صوفے کے پیچھے کھڑی کنیزیں پنکھے جھل رہی تھیں۔

کنیزوں، گانے والیوں اور پیش خدمتوں کے لباس معطر تھے۔ خود خلیفہ ایسا لگتا تھا جیسے عطر میں ڈوبا ہوا ہے۔ تمام کمرہ خوشبو سے مہک رہا تھا۔

ان تینوں شہزادوں نے بڑھ کر خلیفہ کو سلام کیا۔ خلیفہ نے سلام کا جواب دے کر ان کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس وقت اسے ان کا آنا سخت ناگوار گزرا ہو۔ اس ناگواری کی وجہ میرے لئے سمجھنا مشکل نہ تھا، محفلِ عشرت جمی تھی۔ حسین دل ربائیں ناچ گا رہی تھیں پر شہزادوں کی آمد سے گویا رنگ میں بھنگ ہو گیا تھا۔

خلیفہ نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ (لفظ صوفہ، عربی زبان کے ''صوف'' سے بنا ہے۔ صوف کے معنی اُون، نمدہ، ایک قسم کا دبیز جامہ، پشینہ بھی ہیں۔ صوفے میں کیونکہ اُون، نمدہ، نرم اور ریشمی کپڑا بھرا جاتا ہے، سوا سے صوفہ کہا جانے لگا۔ بعد میں یہی لفظ انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی استعمال ہونے لگا۔ مصنف) لڑکیوں نے گانا شروع کیا۔ ان کی آواز میں بڑی مٹھاس تھی۔

کچھ دیر بعد جب لڑکیوں نے گانا بند کیا تو ابوبکر نے کہا۔ ''اعلیٰ حضرت! مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔''

''کہو!'' خلیفہ بولا۔

''ہم خلوت میں عرض کرنا چاہتے ہیں۔''

خلیفہ نے کنیزوں اور دوسری لڑکیوں کو اشارہ کیا۔ وہ ایک ایک کر کے چلی گئیں۔

''اب کہو، کیا کہنے آئے ہو؟'' خلیفہ، ابوبکر سے مخاطب ہوا۔

ابوبکر نے عرض کیا۔ ''بھائی احمد کچھ واقعات گوش گزار کرنا چاہتے ہیں۔''

خلیفہ نے احمد کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ''ہم بندگانِ عالی، کچھ ایسے واقعات اعلیٰ حضرت کے علم میں لانے کے خواہاں ہیں جن سے بغداد کا امن خاک میں ملا جا رہا ہے۔ چند شورش پسند جنہیں خود ان کے بزرگ بھی اچھا نہیں سمجھتے، فتنہ و فساد کے درپے ہیں۔ کئی واقعے ایسے ہو چکے ہیں اگر انہیں دبایا نہ جاتا تو فرقہ وارانہ شورش بڑھ جاتی۔''

''ہمارے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ چند اوباش قسم کے نوجوان مسلک و فقہ کی بنیاد پر دوسرے فرقے والوں سے برسرِ پرخاش ہیں اور دراصل وہی فتنہ برپا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ شر پسند خود کو ہمارے مسلک کا بتاتے ہیں۔'' خلیفہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''غالباً یہ بات وزیراعظم نے اعلیٰ حضرت کے گوش گزار کی ہوگی۔''

''ہاں......'' خلیفہ نے اقرار کیا۔

''لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔'' احمد بلا جھجک بولا۔ ''سچ یہ ہے کہ شورش پسندوں کا ہمارے مسلک سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا سرغنہ ایک زبان دراز اور فتنہ جو شفیق نامی نوجوان ہے۔ وہی بغداد میں بدامنی پھیلانے کا باعث بن رہا ہے۔ ان فتنہ پردازوں کی پشت پر وزیراعظم ہیں۔''

خلیفہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے اور اس نے کہا۔ ''مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ بعض لوگوں کو یہ بات ناگوار ہے کہ عباسی خلافت کا وزیر اعظم ان کے مسلک کا نہیں۔ اسی بنا پر ہمارے ہم عقیدہ لوگوں میں ایک نامناسب جذبہ پیدا ہو گیا ہے، وہ شورش پر اتر آئے ہیں۔''

''حالانکہ یہ بات نہیں۔'' احمد اپنی بات پر جما رہا۔ ''ہمارے لوگ خاموش ہیں اور وزیر اعظم سے کسی کو کوئی عناد نہیں ہے۔ ہاں وہ یہ ضرور چاہتے ہیں کہ شہر میں امن و امان رہے، دارالخلافہ کا اثر پوری سلطنت پر پڑ رہا ہے۔ وہاں بھی فرقہ وارانہ فساد کی چنگاری بھڑک رہی ہے جو کسی وقت بھی شعلوں میں تبدیل ہو سکتی ہے۔''

''تم شاید افواہوں پر کان دھرتے ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو وزیر اعظم ابن علقمی ہمیں ضرور آگاہ کرتا۔'' خلیفہ بھی بضد رہا۔ ''سنو! ابن علقمی ایک نیک شخص ہے، وہ امن و امان قائم رکھنے کے لئے دن رات کوشش کر رہا ہے۔''

''اعلیٰ حضرت! اگر یہ بات ہوتی تو کوئی شکایت ہی نہ ہوتی۔'' ولی عہد ابوبکر خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ ابن علقمی کوئی سازش کر رہا ہے۔ وہ بدامنی کرانا چاہتا ہے۔ ابھی چند روز کی بات ہے جب شفیق نے جو بڑا فتنہ جو ہے، سر بازار ہمارے ہم مسلک افراد کو برا بھلا کہا، اس سے شورش ہو گئی۔ حسن اسد جو دوسرے مسلک سے ہیں اور بزرگ و قابل تکریم ہیں، انہوں نے شفیق کو سمجھایا۔ شفیق نے ان کی بزرگی کا بھی خیال نہیں کیا اور انہیں جھڑک دیا۔ ابن علقمی بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے بڑی اشتعال انگیز باتیں کیں۔ وہ ہمارے مسلک والوں کو ذلت سے کھینچتے ہوئے لے گئے اور انہیں قید کر دیا۔ وزیر اعظم نے ہمارے مسلک والوں کو فتنہ پرداز کہا۔ سب جانتے ہیں انہوں نے ہمارے ہم عقیدہ لوگوں کے بارے میں زبان درازی کی کہ جب تک ان کے گھر نہ جلائے جائیں گے، یہ نہیں مانیں گے۔ گویا درپردہ انہوں نے مفسدوں کو شہہ دی کہ وہ ہمارے لوگوں کے گھروں میں آگ لگا دیں۔''

ابوبکر کے پُرجوش الفاظ کا خلیفہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ چکنا گھڑا بنا رہا، بولا۔ ''ابن علقمی ایسا نہیں کہہ سکتا۔''

''میں دوسرے مسلک والوں کی گواہی سے یہ بات ثابت کر سکتا ہوں۔'' ابوبکر نے

یوں کہا۔ ''اس کے علاوہ یہ کہ جو لوگ قید کر دیئے گئے ہیں اگر ان پر مقدمہ چلایا جائے تو تمام واقعات ظاہر ہو جائیں۔''

''اچھا، ہم اس کی تحقیقات کریں گے۔'' خلیفہ نے وعدہ کیا، مگر لہجہ ٹالنے والا تھا۔

''اور بے گناہ قیدیوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟'' ابوبکر نے پوچھا۔

''اگر تم انہیں بے گناہ سمجھتے ہو تو رہا کر دو۔'' خلیفہ بولا۔ ابوبکر نے اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ پوچھنے لگا۔ ''اور کچھ کہنا ہے؟''

''صرف یہ عرض کرتا ہے کہ ابن علقمی سے ہوشیار رہئے۔ خفیہ طور پر اس کے متعلق تحقیقات کرائیے۔''

''اچھا۔'' خلیفہ نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

وہ تینوں خلیفہ کو رخصتی سلام کر کے وہاں سے اٹھ آئے۔

میں نے مستعصم کے قصر خلافت کی سیر تو کرا دی لیکن اس کے عہد کا بغداد کیسا تھا، یہ بیان کرنا باقی ہے۔

بغداد کے کوچہ و بازار میں پھلواری تھی، سبزہ تھا۔ ہر چھوٹی بڑی سڑک کے دونوں آخری کناروں پر سبزے کا حاشیہ ہوتا۔ اس حاشیے میں طرح طرح کی قطاریں ہوتیں جن سے سڑک خوش نما لگتی۔ بازاروں کے بیچ سے ایک چھوٹی نہر گزرتی جو سنگ مرمر کی تھی۔ نہر کے دونوں کناروں پر خوشبودار پھولوں کے تختے تھے۔ ان نہروں کا پانی ہر سڑک اور ہر گلی میں نالیوں کے ذریعے جاتا جن سے سبزے کے اور پھولوں کے تختے سیراب ہوتے۔

شاہی محلات میں بڑی بڑی نہریں، امیروں اور رئیسوں کے محلوں میں چھوٹی نہریں اور عوام کے گھروں میں بڑی بڑی صاف، پانی کی ہر وقت بہتی رہتیں۔ اس پانی سے باغ، باغیچے اور چمن سیراب ہوتے۔ یہی پانی کھانے پینے میں استعمال ہوتا۔ تمام شہر میں چھوٹی بڑی نہروں اور بڑی نالیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اس سے گھر گھر پانی کی افراط تھی۔

شاہی محلوں، امیروں کے مکانوں اور اوسط درجے کے لوگوں کے گھروں میں تہ خانے تھے۔ یہ تہ خانے اس طرح بنائے جاتے کہ ان میں ہوا اور روشنی پہنچتی۔ گرمی کے موسم میں عام طور پر لوگ دن بھر تہ خانوں میں پڑے رہتے۔ تہ خانوں میں ٹھنڈک رہتی۔ حسین و نوجوان آدم زادیاں، عورتیں اور لڑکیاں گرم موسم میں کچھ دن چڑھے ہی تہ خانوں میں گھس جاتیں

اور عصر کی نماز کے بعد باہر نکلتیں۔

بغداد کے بازار نہایت خوش نما اور دکانیں بڑی شاندار فراخ تھیں۔ چونکہ بغداد کے باشندے دولت مند تھے، اس لئے دور دراز ملکوں سے سوداگر قیمتی مال اسباب لاتے جو منڈیوں میں نیلام ہو کر بازار میں پہنچ جاتا۔ بازار دن بھر اور رات کے دو بجے تک کھلے رہتے۔ ہر وقت بازاروں میں خوش پوش عورتوں اور مردوں کا ہجوم رہتا۔ عام طور پر آدم زادیاں ٹوپیاں اوڑھتیں۔ شاہی خاندان اور امیروں کی عورتیں جو تیے نما ٹوپی پہنتی تھیں، ان کے بالائی حصے پر ہیرے لگے ہوتے، نیچے کے حصے پر سنہری لیس لگی ہوتی۔ اس ٹوپی کو خلیفہ ہارون الرشید کی سوتیلی بہن عولیہ نے ایجاد کیا تھا۔ متوسط طبقے کی عورتیں گول ٹوپی پہنتیں جو موتیوں اور زمردوں سے مزین ہوتیں۔ ان میں چینی سنہری لیس لگی ہوتی۔

میں خلیفہ معتصم کے عہد کا ذکر کر رہی ہوں۔ اس زمانے میں جوان عورتیں اور نوخیز لڑکیاں بے محابا منہ کھولے، بہترین لباس زیب تن کئے اور زیورات سے لدی پھندی اداو ناز سے چل کھاتی کوچہ و بازار سے گزرتی رہتی تھیں۔ دعوتِ نظارہ عام تھی۔ نوجوان، حسین عورتوں اور لڑکیوں کو گھورتے رہتے۔ یہی نہیں بلکہ انہیں چھیڑنے کا موقع مل جاتا تو نہ چوکتے۔

بغداد میں کئی مذاہب کے لوگ آباد تھے۔ اس کے علاوہ مختلف مسالک کے ماننے والے بھی تھے۔ بظاہر ان میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ چاروں فرقوں یا مسلکوں والے مل جل کر رہتے۔ لیکن بعض فرقوں کے محلے الگ تھے۔ حنیف مسلک کے ماننے والے تمام شہر میں آباد تھے۔

تعلیم البتہ عام تھی۔ محلہ محلہ بے شمار مدرسے تھے۔ دس کالج تھے۔ ہر کالج سے متعلق ایک کتب خانہ تھا۔ کئی بڑی لائبریریاں تھیں۔ ایک لائبریری مستنصر باللہ نے تعمیر کرائی تھی جو چھ سال کی مدت میں بن کر تیار ہوئی تھی۔ ابتدا اس لائبریری میں جو کتابیں رکھی گئیں وہ ساٹھ اونٹوں پر لاد کر لائی گئی تھیں۔ پھر کتابوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ بالآخر کتابوں کی تعداد اتنی ہو گئی کہ ان کی فہرست ساٹھ ضخیم جلدوں میں سما سکی۔

اس لائبریری کے اخراجات کی خاطر معتصم نے کئی گاؤں وقف کر دیئے۔

غیر سرکاری حمام بھی دونوں طرح کے تھے۔ وہ غسل کرانے کی اجرت لیتے۔ سرکاری

حمام ہوں یا غیر سرکاری، دن بھر لوگ ان میں نہاتے رہتے۔ لوگ اپنے گھروں میں کم نہاتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس طرح حمامی انہیں غسل کراتے گھر پر ممکن نہ ہوتا۔

حمام کے درجے بہ تدریج گرم رکھے جاتے۔ آخری درجے میں پہنچ کر میل اگر ہوتا تو پھول جاتا۔ اس سے غسل کرنے والے کو بڑا آرام ملتا اور جب حمامی مل مل کر نہلاتے اور بدن صاف کرتے تو جسم بڑا ہلکا ہو جاتا (اہل مغرب نے بھاپ سے غسل کرنے کا تصور مسلمانوں ہی سے لیا ہے۔ مصنف) لوگ دریا میں بھی نہاتے۔ سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر نہانے کی سخت ممانعت تھی۔

زمانہ میں مشاطائیں بھی ہوتیں جو غسل کرنے کے بعد عورتوں اور لڑکیوں کا سنگھار کر دیتیں۔ (اس وقت کا بغداد آج کے لندن، پیرس اور نیویارک سے ہر معاملے میں بڑھا ہوا تھا۔ مصنف)

٭……٭

اسی بغداد کے ایک محلے میں ولی عہد ابوبکر کی ''پسند'' فردوس رہتی تھی۔ نجمہ نے اس عرصے میں فردوس کا گھر بھی دیکھ لیا تھا۔ میں اس پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ اس کے ساتھ عارج کی عاشق مزاجی نے بھی مجھے اس پر مجبور کیا کہ نجمہ کی خیر خبر لیتی رہوں۔

صبح کا وقت تھا کہ میں نجمہ کے محل میں داخل ہوئی۔ توقع کے مطابق عارج مجھے محل کے ایک گوشے میں مل گیا۔

''تو یہاں کیا کر رہا ہے اے عارج؟'' میں اس کے قریب پہنچ کر بولی۔

''وہی جو تو یہاں کرنے آئی ہے۔''

''میں تو تیری تلاش میں آئی ہوں۔''

''اے دینار! تو عمر کے اس حصے میں تو سچ بولنا سیکھ لے۔ مجھے معلوم ہے کہ تو نجمہ کی ٹوہ میں رہتی ہے۔''

''کس لئے؟ یہ بھی سوچا تو نے؟'' میں نے کہا۔

''مجھے فضول باتیں سوچنے کی……''

اسی وقت میں بول اٹھی۔ ''یہ تو نے میری عمر کے بارے میں کیا کہا؟……عمر کے اس حصے سے تیری کیا مراد ہے؟''

"اگر تُو سننا چاہتی ہے تو سن! تیری عمر کی جن زادیاں نانیاں، دادیاں بن چکی ہیں۔۔۔"

"تو پھر؟۔۔۔ بن جاؤ تم بھی نانا، دادا۔ روکا ہے میں نے تجھے؟"

"میری یہ کمزوری تو عذاب جاں بنی ہوئی ہے۔ نہ تجھ سے عشق کرتا نہ آج تک کنوارا پھرتا۔"

"منہ نہ کھلوا میرا۔ تُو کتنا کنوارا ہے، میں خوب جانتی ہوں۔ دعویٰ مجھ سے عشق کا ہے اور اس آدم زادی نجمہ کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔"

"لعنت بھیجتا ہوں میں اس آدم زادی پر! میں تو تیرے لئے کوئی انسانی قالب ڈھونڈ رہا تھا۔" عارج یہ کہتے ہی گویا خفا ہو کر وہاں سے چلا گیا۔

میں نے دانستہ عارج کا پیچھا نہیں کیا اور محل کے اس حصے میں پہنچ گئی جہاں ایک مشاطہ نجمہ کا سنگھار کر رہی تھی۔

کچھ دیر میں سنگھار سے فارغ ہو کر اس نے کپڑے بدلے۔ وہ بھی اور شہزادیوں کی طرح دن میں تین مرتبہ کپڑے بدلتی تھی، صبح، دوپہر اور شام کے وقت۔ کپڑے بدل کر نجمہ نے ناشتہ کیا اور کہیں جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اس کا پتہ مجھے یوں لگا کہ اس نے گاڑی تیار کرائی۔ پھر وہ جیسے ہی اٹھ کر چلی تو احمر اور ابوبکر آ گئے۔

"کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" احمر نے پوچھا۔

نجمہ نے مسکرا کر کہا۔ "آج صبح ہی صبح کیسے آنا ہو گیا؟" یہ سوال اس نے ولی عہد ابوبکر سے کیا تھا۔

"بھائی احمر لے کر آئے ہیں۔" ابوبکر نے جواب دیا۔

"تشریف رکھئے۔ کھڑے کب تک باتیں کریں گے؟" نجمہ نے کہا۔ وہ دونوں صوفوں پر بیٹھ گئے تو نجمہ بھی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

"میں دراصل اس لئے آیا ہوں کہ تمہیں فردوس کا گھر دکھا دوں۔" ابوبکر بولا۔

"فردوس سے میں مل چکی ہوں۔" نجمہ نے یہ کہہ کر ملاقات کا سارا حال بیان کر دیا۔

ابوبکر نے دانت پیس کر کہا۔ "بدذات شفیق۔۔۔ میں اسے عبرت ناک سزا دوں گا۔"

"میرے خیال میں یہ بات مناسب نہیں ہو گی۔" احمر نے اختلاف کیا۔ "وہ مفسد ہے۔ اگر آپ نے اسے سزا دی تو اس کے ساتھی ہنگامہ کر دیں گے۔ وہ اس معاملے کو جواز بنا کر

شہر میں فرقہ وارانہ شورش بھی برپا کر سکتے ہیں۔ عام لوگوں کو حقیقت کا علم نہیں ہو گا اور نہ آپ اس واقعے کو کسی کے سامنے بیان کر سکیں گے کہ شفیق نے فردوس پر دست درازی کی ہے۔ ولی عہد نے ایک معمولی جاگیردار یعقوب کی بیٹی کے لئے کیوں قدم اٹھایا؟۔۔ فردوس اور ولی عہد کے درمیان کیا تعلق ہے؟۔۔۔ آپ ان سوالوں کے جواب دینے کے پابند نہیں، لیکن فسادی تو یہ سوالات اٹھا سکتے ہیں!"

اس پر نجمہ نے بھی کہا۔ "ان حالات میں مناسب یہی ہو گا کہ شفیق سے کچھ نہ کہا جائے۔"

ولی عہد ابوبکر نے طویل سانس لیا اور بولا۔ "ٹھیک ہے، میں اس سے کچھ نہیں کہوں گا۔" پھر اس نے نجمہ سے دریافت کیا۔ "تم کیا فردوس کے یہاں جانے کی تیاری کر رہی تھیں؟"

"نہیں۔" نجمہ نے جواب دیا۔ "آپ کو فردوس سے ملنے کی خوشخبری سنانے جا رہی تھی۔"

ابوبکر نے شکریہ ادا کیا۔

"خالی پیلی شکریہ!۔۔۔ نہ دعوت، نہ مٹھائی، کچھ بھی نہیں۔"

"چلو تمہارا منہ موتیوں سے بھر دوں گا۔" ابوبکر جذباتی نظر آنے لگا۔

"صرف موتیوں سے؟۔۔۔ لعل اور ہیروں سے نہیں؟"

"جب وہ۔۔۔ وہ دلہن بن کر آئے گی تب تمہاری ٹوپی ہیروں سے بھر دوں گا۔" ولی عہد نے وعدہ کیا۔ "اب کب لاؤ گی تم اسے؟"

"آپ جب کہیں۔"

"آج کسی وقت لے آؤ۔"

"مگر آپ نے اسے اپنے بارے میں کیا بتایا ہے؟" نجمہ نے سوال کیا۔

"یہ۔۔۔ یہ کہ میں ایک امیر زادہ ہوں۔ میں اس سے ملا تو میرے جسم پر ایسا ہی لباس تھا۔"

"کہاں ملیں گے فردوس سے؟"

"یہیں، تمہارے قصر میں۔" ابوبکر نے بلا تامل جواب دیا۔

"وہ کہے گی نہیں کہ یہاں کیسے آئے آپ؟" نجمہ نے اعتراض کیا۔

"کہہ دوں گا کہ میں اس قصر کا شحنہ ہوں۔ (شحنہ عربی لفظ ہے جس کا مطلب کوتوال ہے۔ کوتوال، ہندی زبان سے فارسی میں گیا۔ ہندی زبان میں اس کی اصل کوتوال تھی۔ اس کے معنی صاحب قلعہ، محافظ قلعہ اور نگہبان نکل ہیں۔ مصنف)"

"آپ اس سے اپنی شخصیت کیوں چھپا رہے ہیں؟" نجمہ نے معلوم کیا۔

"مجھے ڈر ہے، یہ جان کر کہ میں ولی عہد سلطنت ہوں، فردوس مجھ سے ملنا جلنا ہی نہ چھوڑ دے۔" ابوبکر نے جواب دیا۔

"جیسی آپ کی مرضی۔" نجمہ بولی۔ "میں اسے لے کر آتی ہوں۔"

احمر اور ابوبکر چلے گئے۔ نجمہ گاڑی میں سوار ہو کر فردوس کے گھر پہنچی۔ فردوس کی ماں زبیدہ نے اسے نجمہ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ نجمہ نے زبیدہ سے کہا تھا کہ وہ فردوس کو آئندہ روز خود پہنچا جائے گی۔

فردوس کو نجمہ اپنے قصر میں لے آئی۔ دوپہر کو ان دونوں نے آرام کیا۔ دونوں خواب گاہ میں تھیں کہ ایک کنیز نے حاضر ہو کر ولی عہد ابوبکر کے آنے کی اطلاع دی۔ نجمہ نے فردوس سے کہا۔ "میں ابھی آئی۔"

"ان کا نام سنتے ہی اٹھ بیٹھیں، آخر معاملہ کیا ہے؟" فردوس نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

"معاملہ کیا ہوتا، آج وہ ولی عہد ہیں، ایک دن خلیفہ ہو جائیں گے۔ اس لئے احترام تو....."

"اور تم ملکہ بن جاؤ گی۔"

"دیکھتے ہیں، کون ملکہ بنتی ہے!" نجمہ کا لہجہ معنی خیز تھا

"کیوں، کیا کوئی اور بھی ملکہ بننے کی خواستگار ہے؟"

"ہاں ایک لڑکی ہے۔" نجمہ مسکرائی۔ "وہ پھولوں سے زیادہ نازک اور چاند سے زیادہ حسین ہے۔ مگر وہ ملکہ بننے کی خواستگار نہیں بلکہ ولی عہد اسے چاہنے لگے ہیں۔"

"لڑکی بھی ان سے محبت کرتی ہو گی۔"

"ہاں بہت زیادہ ..... مگر..... پھر بتاؤں گی۔ دیر ہو رہی ہے۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔" یہ کہہ کر نجمہ طرارہ بھر کر چلی گئی۔ دوسرے کمرے میں ابوبکر اس کا منتظر تھا۔ نجمہ اس

سے بولی۔ "آ گئی آپ کی فردوس۔"

"خدا کا شکر ہے۔" ابوبکر کی آواز سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ جذباتی ہے۔ بولا۔ "اچھا تو جلدی سے چلو۔"

"اس طرح ملاقات مناسب نہیں ہو گی۔ میں اسے تھوڑی دیر بعد باغ میں لے جاؤں گی۔ آپ بھی وہاں آ جائیں۔ میں ٹل جاؤں گی۔ آپ اس سے مل لیجئے گا۔" نجمہ نے کہا۔

ابوبکر راضی ہو گیا۔ نجمہ دوبارہ فردوس کے پاس آ گئی۔

ذاتی طور پر مجھے ان آدم زادوں کی معصوم محبت بھلی لگ رہی تھی، سو وہیں گردش کرتی رہی۔

نجمہ نے بہانہ بنا دیا کہ ابوبکر واپس چلا گیا۔ اس پر فردوس بولی۔ "ولی عہد یہاں سے قصر الخلد ہی گئے ہوں گے؟"

"ہاں، لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"اس لئے کہ مجھے قصر الخلد دیکھنے کا بہت اشتیاق ہے۔" فردوس نے جواب دیا۔

"انشاء اللہ کسی روز دکھاؤں گی۔ قصر الخلد کو قصر خلافت بھی کہتے ہیں۔" نجمہ بولی۔ "آؤ باغیچے میں سیر کریں گے۔ شام ہو رہی ہے۔"

فردوس اس کے ساتھ چل پڑی۔ دونوں باغیچے میں پہنچیں، کچھ دیر سیر کرتی رہیں، پھولوں کے تختوں میں گھومیں اور پھر فوارے پر آ بیٹھیں۔ ابھی انہیں وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ احمر آ گیا۔

احمر کو فردوس نے بھی دیکھ لیا اور نجمہ سے پوچھا۔ "یہ بزرگ کون آ رہے ہیں؟"

"یہ بزرگ تو خیر نہیں، نوجوان ہیں۔ البتہ اپنے حلیے سے زیادہ عمر کے لگتے ہیں۔" نجمہ نے بتایا۔ "شاہی محلات میں یہ ملاجی کے نام سے مشہور ہیں۔ روزے نماز کے بڑے پابند ہیں۔ ان کا نام شہزادہ احمر ہے۔"

اسی اثنا میں احمر ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ نجمہ سے مخاطب ہوا۔ "معاف کرنا بغیر اطلاع کے چلا آیا۔ میں نے سنا ہے یہاں ہاجرہ آئی ہوئی ہے۔"

"جی نہیں۔"

"ذرا معلوم کر لیتیں۔" احمر بولا۔

نجمہ کہنے لگی۔ ''چلو میں تمہارے ساتھ ہی چل کر معلوم کئے لیتی ہوں۔'' نجمہ یہ کہہ کر فردوس سے بولی۔ ''میں تھوڑی دیر کی غیر حاضری کے لئے معافی.....''

''ارے اس میں معافی کی کیا بات ہے۔ میں بیٹھی ہوں یہاں۔'' فردوس بول اٹھی۔

احمر کے ساتھ نجمہ چلی گئی۔ میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ فردوس کو دانستہ کیوں تنہا چھوڑا گیا ہے۔

فردوس فوارے سے پانی گرنے کا تماشا دیکھنے لگی۔ حوض میں صاف پانی بھرا ہوا تھا۔ تہ تک نظر آ رہی تھی۔ معاً قدموں کی چاپ سنائی دی تو فردوس نے مڑ کر دیکھا، ابوبکر سادہ لباس میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ''تم..... ہیثم!''

''ہاں میں، مگر تم یہاں کیسے؟'' ابوبکر نے سوال کیا۔

''میں تو یہاں شہزادی نجمہ کے ساتھ آ گئی تھی۔ لیکن تم کیسے آئے؟''

''میں اس قصر کے محافظوں کا افسر ہوں۔''

''تم نے پہلے تو یہ بات نہیں بتائی تھی۔''

''اس بات کو میں تم سے کیا کہتا؟''

''کیا یہ کوئی معمولی عہدہ ہے؟'' فردوس نے بھولپن سے دریافت کیا۔

''معمولی تو نہیں، پھر بھی کوئی خاص عہدہ نہیں ہے۔''

''میں سمجھتی تھی کہ تم کوئی جاگیردار ہو۔ مگر تم تو عہدیدار ہو ہیثم!''

ابوبکر نے فردوس کو اپنا نام ہیثم بتا رکھا تھا، فردوس اسی نام سے ابوبکر کو مخاطب کرتی تھی۔

''کیا جاگیردار سے شحنہ کا عہدہ اچھا ہے؟'' ابوبکر نے فردوس سے سوال کیا۔

''کہیں اچھا ہے۔'' جواباً فردوس بولی۔

''میرا ارادہ تھا کہ یہ عہدہ چھوڑ دوں۔ مگر تمہیں اچھا لگتا ہے میرا عہدے دار ہونا تو قبول!'' ابوبکر نے خواب ناک سے لہجے میں کہا۔ ''بھلا تمہارا حکم ٹالنے کی مجھ میں ہمت کہاں۔''

''پھر تم نے ایسی باتیں شروع کر دیں جن سے.....'' فردوس کی نظریں جھک گئیں، اس کے چہرے پر حیا کی سرخی تھی۔

''جب تم شرماتی ہو تو اور بھی حسین لگتی ہو..... مجھ پر تو تم نے جادو کیا ہے..... تمہیں دیکھ کر میرے حواس گم ہو جاتے ہیں۔''

فردوس یہ سن کر ہنسی، اس کا چہرہ گویا گلاب کا پھول بن گیا۔ اس نے کہا۔ ''مجھے تو تم حواس میں لگتے ہو۔''

''کہاں ہوں حواس میں!..... یہ بدحواسی نہیں تو کیا ہے کہ یہاں کھڑا تم سے بات کر رہا ہوں۔ اگر شہزادی نجمہ آ جائیں تو ضرور خفا ہوں۔''

''وہ کسی ملاجی کے ساتھ گئی ہیں..... ان کا نام شہزادہ احمر بتایا تھا۔ کیا وہ شہزادی کے منگیتر ہیں؟''

''منگیتر ونگیتر تو نہیں مگر ممکن ہے منگنی ہو جائے۔'' ابوبکر نے بتایا۔

''اسی لئے شہزادی نجمہ ان کی بات ٹال نہیں سکیں۔ انہوں نے کسی لڑکی ہاجرہ کو پوچھا تھا۔ کون ہے ہاجرہ؟''

ابوبکر نے جواب دیا۔ ''ہاجرہ، وزیراعظم ابن علقمی کی بیٹی ہے، شاید وہ آئی ہو گی۔'' کچھ توقف سے ابوبکر نے فردوس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے مزید کہا۔ ''ایک بات بتاؤ فردوس! اگر میں ترقی کر کے کسی بڑے..... بہت بڑے عہدے پر پہنچ جاؤں تو تم مجھ سے ڈرو گی تو نہیں؟''

''تم کتنے ہی بڑے عہدے دار بن جاؤ، میں کیوں ڈرنے لگی!'' فردوس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ اسی وقت اس کی نظر نجمہ پر پڑی جو ادھر ہی آ رہی تھی، بولی۔ ''شہزادی آ رہی ہے۔''

ابوبکر گویا ''چونک'' اٹھا اور تیز قدمی کے ساتھ ایک طرف بڑھ گیا۔

اسی لمحے عارج کے وجود کی مخصوص خوشبو مجھے محسوس ہوئی۔ وہ میرے قریب آ کر کہنے لگا۔ ''اے دینار! کیا تیرا ارادہ اسی محل میں سکونت اختیار کرنے کا ہے؟..... صبح سے یہ وقت ہو گیا، مگر تو یہیں منڈلا رہی ہے۔''

''میں جن زادی ہوں کوئی پرندہ نہیں کہ منڈلاؤں۔'' میں بولی۔ ''صحیح الفاظ بولا کر۔''

''لفظوں کی اصلاح کے چکر میں اصل بات گول نہ کر!..... یہ بتا کہ میرے ساتھ چلنا ہے یا نہیں؟''

''کہاں لے جانا چاہتا ہے مجھے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس آدم زادے کے قصر میں جو سارے فساد کی جڑ ہے۔'' عارج نے کہا۔ وہ اس وقت قطعی سنجیدہ تھا۔ ''عشق و عاشقی کے قصے ہی نہ سنا۔ یہ بھی دیکھتی رہ کہ جو آدم زادوں کے اس خوبصورت شہر کو تباہی کے کنارے پر پہنچانے کا سامان کر رہا ہے، اس کے ارادے کیا ہیں؟''

''تیری مراد یقیناً ابن علقمی سے ہے، تو نے بالکل درست کہا اے عارج!'' میں یہ کہہ کر عارج کے ساتھ چل دی۔

ابن علقمی کا قصر، شاہی محل کی طرح بڑا فراخ اور عالی شان تھا اور شاہی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔

میں جب ابن علقمی کے قصر میں عارج کے ساتھ پہنچی تو ہاجرہ اپنے باپ سے کہہ رہی تھی۔ ''کیا سوچ رہے ہیں ابا جان؟''

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ''میں سوچ رہا ہوں خلیفہ کے اختیارات کیسے محدود ہوں؟''

''خلیفہ ہمارے ولی نعمت ہیں، ان کے متعلق ایسا نہ سوچئے۔'' ہاجرہ بولی۔

''بیٹی! ہمارے خاندان کی بھلائی اسی میں ہے۔''

''خدا کے فضل اور آپ کی کوششوں سے ہمارا خاندان عروج پر پہنچ گیا ہے۔''

''جس عروج پر میں پہنچانا چاہتا ہوں، اس پر ابھی نہیں پہنچا۔'' ابن علقمی نے کہا۔ ''میں دراصل یہ چاہتا ہوں کہ سلطنت ہمارے خاندان میں منتقل ہو جائے اور خلیفہ ہمارے اشارے پر چلے۔''

''لیکن کیا خلیفہ کے عقیدت مند اس بات کو گوارا کر لیں گے؟'' ہاجرہ نے سوال کیا۔

''حکومت کے خوف سے عوام سب کچھ گوارا کر لیتے ہیں۔ کوئی بھی حکومت سے ٹکرانے کی ہمت نہیں کرتا، خواہ وہ کسی سے بھی عقیدت رکھتا ہو اور پھر یہ کوئی نئی بات بھی نہیں۔ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔ عباسی خلیفہ بنی بویہ کے تنخواہ دار ہوتے تھے۔'' ابن علقمی اپنے دل کی بات زبان پر لے آیا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''مجھے تو یہ افسوس ہے کہ ہمارے مسلک والے نہیں سمجھتے، میں کیا چاہتا ہوں۔''

''اگر وہ سمجھ بھی جائیں تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا؟''

''فرق تو لازماً پڑے گا!'' ابن علقمی زور دے کر بولا۔ ''وہ میری مدد کریں گے۔ میرے اقتدار میں انہی کی برتری ہوگی..... مسئلہ صرف ایک ہے۔ ہمارے ہم عقیدہ افراد اس شہر میں اب بھی کم ہیں۔ اس کے برعکس خلیفہ کے ہم مسلک زیادہ ہیں۔ جب فساد ہوگا تو ظاہر ہے ہمارے لوگ نقصان اٹھائیں گے۔ اگر ہمارے ہم عقیدہ ساتھ دیں تو صورتحال مختلف ہو جائے گی۔ دوسرے مسلک والوں پر میں سختیاں کر کے انہیں خوفزدہ کر دوں گا، یوں میرا مقصد پورا ہو جائے گا اور حکومت میرے خاندان میں منتقل ہو جائے گی۔''

ہاجرہ کی باتوں سے میں اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ اپنے باپ کے مخفی ارادوں کو ظاہر کرانا چاہتی ہے۔ اسی غرض سے اس نے کہا۔ ''لیکن آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ اگر فساد میں ہمارے لوگوں کو ایسا نقصان پہنچ گیا جس سے ان میں سکت ہی نہ رہی اور مخالف کامیاب ہوئے تو کیا آپ کی وزارت باقی رہ جائے گی؟..... یا ہمارا خاندان بغداد میں رہ سکے گا؟''

ابن علقمی نے ہاجرہ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تیرا کیا خیال ہے؟''

''میں تو یہ جانتی ہوں کہ جو رتبہ آپ نے حاصل کر لیا ہے اسی پر قناعت کیجئے اور فساد کا خیال ترک کر دیجئے۔''

''پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔'' ابن علقمی بولا۔ ''میں چاہتا تھا کہ ولی عہد ابوبکر سے تیری شادی ہو جائے۔ اس طرح حکومت ہمارے خاندان میں آ جائے۔ لیکن اس میں بڑی طوالت ہے۔ اب میں نے یہ خیال ترک کر دیا ہے۔ ایک مفسد وحشی نوجوان شفیق میرے ہاتھ آ گیا ہے۔ وہ شر و فساد کی آگ بھڑکائے گا اور یوں مجھے میری منزل مل جائے گی۔''

''آپ مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں مگر یہ طریقہ فائدہ مند نہیں ہوگا۔ شہزادوں میں بھی چہ میگوئیاں شروع ہو گئی ہیں۔''

''مجھے ان کی کچھ پرواہ نہیں۔ میں ان کی ناک میں بھی نکیل ڈال دوں گا۔'' ہاجرہ کا باپ اپنی گول گول آنکھیں گھما کر بولا جس سے عیاری ظاہر تھی۔

''وہ کس طرح؟'' ہاجرہ نے وضاحت چاہی۔

''خلیفہ میرے اثر میں ہے۔'' ابن علقمی بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ یوں لگا جیسے اسے کوئی کام یاد آ گیا ہو۔

وہ کمرا جہاں باپ بیٹی بیٹھے تھے چند لمحے بعد ہی خالی ہو گیا۔ کیونکہ ہاجرہ بھی وہاں سے

اٹھ کر اندر چلی گئی۔

(لفظ کیمرا لاطینی زبان کا ہے۔ camera کیمرا اسی کا اصل ہے جو اردو میں آ کر کیمرا ہو گیا۔ اس لفظ کو "ق" سے کیمرہ لکھنا قطعی غلط ہے۔ فارسی والے بھی اسے الف ہی سے لکھتے ہیں۔ جن لوگوں نے اس لفظ کو پرتگالی قرار دیا وہ غلطی پر ہیں۔ مصنف)

عارج اور میں کمرے میں اکیلے رہ گئے۔

"بول اے دینار! اب تو کیا کہتی ہے؟" عارج نے مجھے مخاطب کیا۔ "کس کا ساتھ دے گی تو؟ ایک آدم زاد سازشی اور عیار ہے، دوسرا بے وقوف اور لالچی ہے۔"

"کبھی کبھی تیری عقل بھی گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔" میں بگڑ کر بولی۔ "کیا تو نے کبھی مجھے بدسرشت آدم زادوں کا ساتھ دیتے دیکھا ہے؟.. ہاں انہوں نے سزائیں ضرور دی ہیں، لیکن یہ معاملہ مختلف ہے...... میں مستقبل میں جھانک کر دیکھ آئی ہوں۔ سو مجھے زیادہ مداخلت کی ضرورت نہیں، قدرت کا نظام آدم زادوں یا ہم جن زادوں کے لئے کافی ہے۔ ہم جو فصل بوئیں گے وہی کاٹیں گے...... رہا خلیفہ، تو جو خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہا ہو اسے کون بچا سکتا ہے!..... ویسے بھی مجھے اس "چپنو" سے کوئی ہمدردی نہیں۔ اتنا کھاتا ہے کہ توند نکل آئی ہے۔"

"آج بڑی گول مول باتیں کر رہی ہے تو اے دینار!" عارج نے کہا۔

"یوں سمجھ کہ ہم جنات کو ان آدم زادوں سے تعلق بھی رکھنا ہے اور لاتعلق بھی رہنا ہے۔" میں نے عارج کو سمجھایا۔ "ہاں تیرا یہ کہنا درست ہے کہ میں، ابن علقمی پر بھی نظر رکھوں۔"

پھر میں نے ابن علقمی سے بھی اس روز کے بعد غفلت نہیں برتی۔

ابن علقمی یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح بغداد میں فرقہ وارانہ فساد ہو جائے لیکن دونوں فرقوں کے سمجھ دار آدم زاد فساد نہیں ہونے دیتے تھے۔ شفیق برابر فتنہ انگیزی کر رہا تھا۔ وہ روزانہ کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتا رہتا۔ اس سے دونوں فرقوں میں کشیدگی تو ہو جاتی مگر ایسا کوئی بڑا واقعہ نہ ہوتا کہ بغداد کا امن تباہ ہو جائے۔ موید الدین ابن علقمی جو چاہتا وہ نہ ہوتا۔ عوام آپس میں نہ لڑتے۔

یہ بات ابن علقمی کی سمجھ میں آ گئی کہ اس کے ہم عقیدہ سربرآوردہ افراد فساد نہیں ہونے

دیتے۔ آخر اس نے ان لوگوں کو ایک دن اپنے قصر میں جمع کر لیا اور تقریر شروع کر دی۔

میں بھی اس اجلاس میں موجود تھی۔

"ہمارے مخالفین کی جسارت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔" ابن علقمی نے کہنا شروع کیا۔ "ہم ان سے دبتے جا رہے ہیں اور افسوس کہ تم لوگ انہی کی طرف داری کرتے ہو۔ یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔"

اس پر ایک ضعیف العمر آدم زاد بولا۔ "ہم میں سے جو با عقل ہیں اور جنہیں آپ نے مخالفین کہا ہے ان کے باشعور افراد بھی ایک دوسرے کو برا نہیں کہتے۔ البتہ بعض اوباش فتنہ کھڑا کرنا چاہتے ہیں، ہم شہر میں فساد کو پسند نہیں کرتے اس لئے انہیں سمجھا دیتے ہیں۔"

ابن علقمی نے بگڑ کر کہا۔ "کیا تم چاہتے ہو ہمارے فرقے والوں کی تذلیل ہوتی رہے؟"

ایک اور سن رسیدہ آدم زاد بولا۔ "یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ سچ وہی ہے جو ابھی کہا گیا۔ ہمارے ہی اوباش نوجوان دوسرے فرقے والوں کو برا بھلا کہہ کر انہیں اشتعال دلاتے رہتے ہیں۔ پھر بھی وہ طرح دے جاتے ہیں۔"

"تم لوگ بہت سیدھے ہو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ تم جن کی حمایت لے رہے ہو، وہ ایک عام بلوے کی تیاری کر رہے ہیں۔ وہ موقع کے منتظر ہیں۔"

ابن علقمی کی بات سن کر سن رسیدہ آدم زاد نے کہا۔ "ہم بھی بغداد ہی میں رہتے ہیں۔ کوئی ایسی بات ہم نے نہیں سنی۔"

وزیر اعظم ابن علقمی نے پیچ و تاب تو بہت کھایا مگر اس کی ایک نہ چلی۔

"تم لوگ اس طرح نہیں سمجھو گے۔" وہ غصیلی آواز میں بولا۔ "آنے والا وقت ہی تمہاری آنکھیں کھولے گا۔" یہ کہہ کر ابن علقمی نے اجلاس کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

لوگ اٹھ کر چلے گئے مگر میں وہیں رہی۔ اس ناکامی کے بعد میں اس عیار آدم زاد کا ردعمل جاننا چاہتی تھی۔ سو میں نے اس کے ذہن پر توجہ دی، ابن علقمی سوچ رہا تھا کہ جب تک میرے ہم عقیدہ لوگوں پر کوئی آفت نہ آئے گی اس وقت تک وہ دوسرے فرقے والوں کی مخالفت پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ جب تک یہ تمام لوگ میرا ساتھ نہیں دیں گے میرا مقصد پورا نہ ہوگا۔

خاصی دیر تک سوچ بچار کے باوجود اس عیار آدم زاد ابنِ علقمی کی سمجھ میں کوئی ایسی تدبیر نہ آئی کہ اس کے مسلک والے مشتعل ہو جائیں۔ لے دے کے اسے شفیق ہی ایک سہارا معلوم ہوا جس کا پورا نام حسن شفیق تھا۔ ابنِ علقمی کو خبر تھی کہ شفیق بڑا ضدی ہے، اسے امید تھی کہ شفیق کسی روز ایسا جھگڑا کھڑا کر دے گا جس سے بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فساد ہو جائے گا۔ یہی سوچ کر اس نے شفیق کو اپنے قصر میں طلب کر لیا۔

اس سے قبل شفیق کبھی وزیرِاعظم کے قصر میں نہیں آیا۔ قصر کی وسعت اور تزئین کو دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرانی تھی۔ ابنِ علقمی کے قصر میں دو سو کنیزیں تھیں۔ ان میں ادھیڑ عمر کی بھی تھیں اور نوعمر و نوخیز لڑکیاں بھی۔ شفیق انہیں حیرت سے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔

شفیق کو قصر کے اس حصے میں لایا گیا جہاں ابنِ علقمی منتظر تھا۔ اس نے شفیق کا استقبال اس طرح کیا جیسے بڑے آدمیوں کی پذیرائی کی جاتی ہے۔ اس فتنہ پرور کو ایسے صوفے پر بٹھایا گیا جس میں وہ گویا دھنس گیا۔

حسن شفیق کا تعلق ادنیٰ طبقے سے تھا اس لئے وہ آؤ بھگت سے پھول گیا۔

"کہو شہر کی کیا خبریں ہیں۔" وزیرِاعظم ابنِ علقمی نے شفیق سے پوچھا۔

"لوگ عیش کر رہے ہیں۔" شفیق نے جواب دیا۔ "یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کب دن نکلا اور کب رات ہو گئی۔"

"کیا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا؟"

"بات یہ ہے کہ خدا بغداد والوں پر مہربان ہے، دولت کی فراوانی ہے، فارغ البالی ہے۔ چین ہی چین ہے۔"

"مگر تمہارے وعدے؟" ابنِ علقمی نے سوال کیا۔

"میں اپنے وعدے ضرور پورے کروں گا۔" شفیق نے یقین دہانی کرائی۔ "ایک مرتبہ تو میں شہر کا امن و امان خاک میں ملا ہی دوں گا۔ پھر خود بخود شہر والے آپس میں لڑتے رہیں گے۔ مشکل یہ پیش آ رہی ہے کہ میرے ہی ہم عقیدہ لوگ مجھ سے بدظن ہیں۔"

"بدقسمتی تو یہی ہے۔" ابنِ علقمی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "کمبخت یہ نہیں سمجھتے کہ تم اور میں جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ انہی کی بھلائی میں ہے۔ اگر میں بادشاہ ہو جاؤں تو اس سے سبھی کو تو فائدہ ہو گا۔ ہمارا طوطی بولنے لگے گا اور دوسرے فرقے والوں کا زور ٹوٹ جائے گا۔"

"ہمارے بوڑھے اور امیر لوگ بڑے ہی بے وقوف اور بزدل ہیں۔" شفیق منہ بنا کر بولا۔ "جب میں بھی کوئی فتنہ کھڑا کرتا ہوں وہ کوشش کر کے دبا دیتے ہیں، میری ساری محنت وہ غارت کر دیتے ہیں۔"

"امیر اور خوشحال افراد بزدل ہی ہوتے ہیں۔ وہ فساد سے بچتے ہیں۔" ابنِ علقمی نے قابلیت بگھاری، پھر مزید کہا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہارے حامیوں کی تعداد میں کمی آ گئی ہے۔"

شفیق نے اس سے انکار کیا اور بتایا۔ "محلہ کرخ کے کافی نوجوان میرے ساتھ ہیں۔ مگر وہ کیا کریں۔ اسی محلے کے بااثر لوگ انہیں ڈپٹتے اور دباتے رہتے ہیں۔"

محلہ کرخ میں ابنِ علقمی کے ہم مسلک آدم زاد آباد تھے۔ یہ قدیم ترین محلہ چھوٹا سا پُر رونق شہر تھا۔ اسی محلے میں کئی امیر و جاگیردار اور دولت مند لوگ رہتے تھے جو عموماً تاجر تھے۔ وہ بڑے بڑے مکانوں میں رہتے جن سے ان کی امارت کا پتہ چلتا۔ ان مکانوں میں باغیچے تھے اور پانی بھی بہ کثرت تھا۔ اس محلے کا ذکر میں نے اس وقت بھی کیا تھا جب بغداد شہر کی تعمیر ہوئی تھی۔

ابنِ علقمی کچھ دیر چپ رہ کر شفیق سے مخاطب ہوا۔ "تم کوئی ایسی تدبیر کیوں نہیں کرتے جس سے ان بااثر بڑے آدمیوں کی کوئی نہ سنے؟"

"ایسی ہی تو میں ہر تدبیر کر رہا ہوں۔"

"سنو شفیق! تم شاید خلیفہ سے ڈرتے ہو۔ تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ میرے بس میں ہیں اور میں تمہاری پشت پر ہوں۔ پولیس اور فوج پر میرا اختیار ہے۔ (قاضی) مجسٹریٹ اور مفتی (جج) میری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے، پھر تمہیں کیا ڈر ہے؟"

"نہیں، میں ڈرتا نہیں ہوں۔ مگر...... مال خرچ کئے بغیر کام نہیں چلتا۔"

"میں نے کب ہاتھ روکا ہے۔ جس قدر مال چاہیے لے جاؤ۔"

"لوگوں کو نڈر بنانے کے لئے خرچ تو کرنا پڑے گا۔"

"جتنا چاہے خرچ کرو، میری طرف سے اجازت ہے۔" ابنِ علقمی نے لالچ دیا۔

"میں تمہیں آج ہی پانچ ہزار دینار بھیج دوں گا۔"

''پانچ ہزار نہیں، دس ہزار دینار بھیجئے۔''

''چلو دس ہزار دینار سہی۔ دولت کی میرے پاس کمی نہیں، کام ہو جانا چاہئے۔'' ابن علقمی بولا۔ اس نے یہ بات سچ کہی تھی۔ اس کے پاس واقعی بہت دولت تھی، چونکہ وہ حکومت کے سیاہ و سفید کا مالک تھا اس لئے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہا تھا۔ خلیفہ کو کچھ خبر نہیں تھی کہ ابن علقمی کیا کر رہا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ اسے نازک اندام کنیزوں ہی سے فرصت نہیں تھی۔

''دولت سے سب کچھ ہوتا ہے۔'' شفیق نے کہا۔ ''جب میں اپنے دوستوں میں دینار سرخ (اشرفیاں) تقسیم کروں گا تو وہ بے نیاز ہو کر امیروں اور بااثر لوگوں کا کہا نہیں مانیں گے۔''

''یہ کام جلد ہونا چاہئے۔'' ابن علقمی نے تاکید کی۔

''جلد ہی ہوگا۔''

''اگر آگ لگانے سے اس کی ابتدا کرو تو اچھا ہوگا۔'' ابن علقمی نے مشورہ دیا۔

''آپ اس کے لئے مجھے تحریری حکم دیں تو میں تیار ہوں۔'' شفیق نے چالاکی دکھائی۔

''ابھی لکھے دیتا ہوں۔'' ابن علقمی نے کہہ دیا۔ پھر اس نے حکم لکھا۔

''جو لوگ سرکش ہیں، امن قائم رکھنے کے لئے ان کے گھروں کو جلا دیا جائے۔''

اس نے یہ تحریر شفیق کے حوالے کر دی اور کہا۔ ''اگر ضرورت سمجھو تو اس کی ابتدا اپنے لوگوں کے گھروں سے کرو اور الزام دوسرے مسلک والوں پر لگا دو۔ اس سے افراتفری پھیل جائے گی۔''

''میں نے بھی یہی سوچا ہے۔'' شفیق نے تائید کی۔

''میں ایسی تدبیر بھی کرنے والا ہوں جس سے فوجی شہر میں بدامنی پھیلا دیں۔'' ابن علقمی نے بتایا۔

''یہ خیال رکھئے گا کہ اس سے میرے ساتھیوں کو نقصان نہ پہنچے۔'' شفیق پہلو بدل کر بولا۔

''تم مطمئن رہو، ہرگز ایسا نہ ہوگا۔ میں ذمے دار ہوں۔'' ابن علقمی نے یقین دلایا۔ ''مجھے شہزادوں کی طرف سے کھٹکا ہے، خصوصاً ولی عہد سے۔ وہ اکثر شہر میں گشت

کرتے رہتے ہیں۔''

''تم کسی سے نہ ڈرو۔ حکومت کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں ہے۔''

پھر شفیق رخصت ہو کر چلا۔ جب وہ باغیچے میں گزر رہا تھا تو فوارے کے قریب اس نے وزیر زادی ہاجرہ کو بیٹھے دیکھا۔ وہ کچھ گنگنا رہی تھی۔ شفیق کے ساتھ میں بھی قصر کے آقا کے حجے سے نکل آئی تھی۔ اب وہاں میرا مزید رکنا فضول ہی تھا۔ مجھے جو معلوم کرنا تھا، معلوم کر چکی تھی۔ ایک بات میں نے پہلے بھی بتائی ہے اور پھر بیان کر رہی ہوں کہ تقدیر الٰہی کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ عمل سے تقدیر کا تعلق تو ہے مگر ایک حد تک۔ تمام مخلوقات ایک طے شدہ اور متعینہ نظام کے تحت پیدا و نابود ہو رہی ہیں۔ یہ ایک خودکارانہ سائکل ہے جسے روکنا ممکن نہیں۔ ہم جنات بھی اللہ ہی کی مخلوق ہیں۔ ہمیں بھی یہ اختیار حاصل نہیں کہ جو ہوتا ہے اسے روک دیں یا پھر کسی آدم زاد کی تقدیر کو بدل دیں۔ عمل اور ردِعمل کی اس آویزش میں ہم اپنی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ ہماری تمام تر پراسراریت اپنی جگہ اور نظامِ قدرت اپنی جگہ۔

میں نے یہ وضاحت اس لئے ضروری جانی کہ مجھ پر یہ الزام عائد نہ ہو، سب کچھ جانتے بوجھتے خاموش رہی۔ بغداد کو تباہ و برباد ہونے سے نہ بچا سکی۔ عیار و سازشی آدم زادوں کو عبرت ناک سزائیں نہیں دیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ خدائے عزوجل نے ہم جنات پر آدم زادوں کو فوقیت دی ہے۔ اشرف المخلوقات ہم نہیں، آدم زاد ہیں۔ سو وہ اگر خطا کریں تو اس کی سزا دینے والا خدا ہے۔ ہم بھلا کون! ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنی حدود میں رہتے ہوئے آدم زادوں کو ہم ناکوں چنے چبواتے رہیں۔ اس کا انحصار بھی حالات و واقعات پر ہے۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ فتنہ جو شفیق سے بہت زیادہ تپی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا اگر کچھ اور نہیں تو اس بدبخت کو وزیر زادی ہاجرہ سے پٹوا دوں۔ موقع بھی تھا اور میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔

میرے شہ دینے پر شفیق دبے پاؤں ہاجرہ کے قریب پہنچ گیا۔ ہاجرہ کو اس نے مخاطب کیا۔ ''اے پری جمال! تیرے حسنِ جہاں سوز نے میرے دل میں آگ لگا دی ہے۔ تیری ترنم ریز آواز نے مجھے بے خود بنا دیا ہے۔''

ہاجرہ نے نگاہیں اٹھا کر شفیق کو دیکھا اور کہا۔ ''کون ہے تُو گستاخ!'' یہ کہتے ہی وہ کھڑی

ہو گئی۔

''جانِ من!......''

شفیق اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ہاجرہ کو گویا جلال آ گیا۔ اس نے چٹاخ سے شفیق کے گال پر طمانچہ رسید کر دیا۔ شفیق بھنا گیا مگر اسے اپنی اوقات کا بھی اندازہ تھا، سو رخسار سہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ہاجرہ اسے دیکھتی اور غصے سے پیچ و تاب کھاتی رہی۔

❁......❁
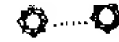
''آگ... آگ... ...'' ایک دم آگ کا شور بلند ہوا۔ میں اس وقت فسادی شفیق کی تلاش میں محلہ کرخ آئی تھی۔

''تو کھیل شروع ہو گیا!'' میں بڑبڑائی اور ان آدم زادوں کو دیکھنے لگی جو اِدھر سے اُدھر جھپٹ جھپٹ کر آ رہے تھے۔

ایک مکان سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔

صبح کا وقت تھا اور گرمی کا موسم۔ آگ بڑھتی جا رہی تھی۔ مکان والا گلا پھاڑ پھاڑ کر وہاں جمع ہونے والوں کو بتا رہا تھا کہ آگ لگانے والے دوسرے فرقے کے لوگ ہیں۔ وہ ہمیں بغداد سے نکالنا چاہتے ہیں۔ انہیں غرور ہے کہ خلافت ان کے پاس ہے۔''

ایک عمر رسیدہ آدم زاد ابوجعفر وہاں دیر سے موجود تھا۔ اس نے مالک مکان بختیار سے کہا۔ ''ایسی باتیں نہ ہوں جن سے فتنے کی بو آئے۔''

بختیار نے سر پیٹ لیا اور کہنے لگا۔ ''میرے مکان کو انہوں نے آگ لگا دی اور میں کچھ بھی نہیں!''

''آگ کس نے لگائی، یہ بات تو ظاہر ہو جائے گی لیکن کیسے لگی اسے میں جانتا ہوں۔'' ابوجعفر بولا۔

وہاں کئی نوجوان کھڑے تھے۔ وہ بگڑ گئے۔ ان میں سے کئی نے کہا کہ وہ ہمارے مکانوں کو جلائیں، ہمارے محلے میں گھس آئیں اور ہمارے ہی بزرگ خود ہم پر الزام لگائیں۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے! یہ سب وہی نوجوان تھے جنہیں شفیق نے مال کھلایا تھا۔

ایک اور آدم زاد نے گرج کر کہا۔ ''خلیفہ کے ان چہیتوں کی جسارت حد سے بڑھ گئی ہے۔ اب وہ ہمارے گھروں میں بھی آگ لگانے والے ہوں گے کیا ہم ان سے کم ہیں؟...... انہوں نے ہمارے ایک بھائی کے گھر میں آگ لگائی ہے۔ ہم ان کے محلوں کو

پھاٹک ڈالیں گے۔"

"کیوں اشتعال پھیلاتے ہو!" ایک اور بزرگ آدم زاد بولا، پھر اس نے دلیل دی۔ "ہمارا کوئی دشمن یہاں صبح ہی صبح کیسے آسکتا ہے؟ ابھی تو اس محلے کا پھاٹک بھی نہیں کھلا۔"

"پھر کیا جنات آگ لگا گئے؟" بختیار نے بحث کی۔

"میں بتاتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔" ابوجعفر نے کہا۔

"تم دشمنوں سے ملے ہوئے ہو۔" ایک نوجوان نے ابوجعفر پر الزام لگایا۔

دوسرا نوجوان بولا۔ "لعنت ہے اس پر جو دشمنوں کی طرف داری کرے۔"

یہ سن کر ابوجعفر نے کہا۔ "تم فتنہ کھڑا کرنا چاہتے ہو، لیکن اس کا انجام بہت برا ہوگا۔"

"بھائیو!" ایک زرخرید نوجوان بلند آواز میں کہنے لگا۔ "ہمارے بزرگ چاہتے ہیں کہ دشمن ہمیں جلائیں اور ہم جل جل کر مر جائیں۔"

اس عرصے میں کافی مجمع ہوگیا۔ لوگ مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔ "ہم جلانے والوں کو جلا ڈالیں گے۔ چلو دشمنوں کے گھروں میں آگ لگائیں۔"

"پہلے اپنے گھر کی آگ تو بجھالو۔" ایک بزرگ آدم زاد بولا۔

"اب کیا رہا ہے جو آگ بجھانے سے بچ جائے گا۔ سب کچھ جل چکا ہے۔" بختیار نے کہا۔

"اسی وقت میری نظریں اس فتنہ پرور شفیق پر پڑیں جس کی تلاش میں یہاں آئی تھی۔ میں دراصل یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وزیراعظم ابن علقمی کی ہدایت پر وہ کس طرح عملدرآمد کرنے والا ہے۔ میرا مقصد اس سازش کو حتی الامکان ناکام بنانا تھا۔

شفیق اس جگہ پہنچ گیا جہاں لوگ جمع تھے۔ وہ خبیث انجان بن کر پوچھنے لگا۔ "یہ کیا ہوا؟ آگ کیسے لگی؟"

"دشمنوں نے میرا گھر جلا ڈالا بھیا!" بختیار نے "بھولا بادشاہ" بن کر بتایا۔

"میں جانتا تھا کہ دشمن ہمیں چین سے نہ بیٹھنے دیں گے۔" شفیق زہر اگلنے لگا۔ "وہ ہمیں بغداد سے نکالنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ میں تم لوگوں کو پہلے ہی تاکید کر رہا تھا کہ دشمن کی طرف سے چوکنا رہو۔ وہ کسی بھی وقت وار کرسکتا ہے..... مگر میرے ہی بزرگ مجھے جھٹلاتے تھے..... مجھے مفسد بتاتے تھے۔ اب خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں، کیا اب بھی

دشمنوں کی سازش کا یقین نہیں آئے گا!" شفیق کی آواز بلند ہوتی گئی۔ وہ پُرجوش آواز میں کہہ رہا تھا۔ "بزرگو اور بھائیو! ہمارے درمیان ایسے بزدل اور کم عقل بھی موجود ہیں جو حقیقت کو سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہتے۔ ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ ان کے کہنے میں نہ آؤ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ تمہیں نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ دشمنوں نے ہمارا ایک گھر جلایا ہے۔ تم ان کے محلے جلا دو!"

ہر طرف سے "چلو چلو" کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگوں میں شفیق کی باتیں سن کر زبردست اشتعال پیدا ہوگیا۔ اس محلے کے بزرگ ایک جانب کھڑے تھے۔ ان میں ابوجعفر بھی تھا۔

"میں جب ادھر سے گزر رہا تھا تو گھر کے اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے چھت جلنے لگی۔" ابوجعفر دوسروں کو بتا رہا تھا۔

"مگر یہ مکان تو پختہ ہے۔" ایک سن رسیدہ آدم زاد کہنے لگا۔ "باہر سے آگ کیسے لگائی جاسکتی ہے؟ اگر پھونس کا مکان ہوتا تو ممکن بھی تھا۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔" دوسرے بزرگ نے پہلے کی تائید میں کہا۔ "یہ کوئی گہری سازش تیار کی گئی ہے۔ لیکن نوجوان آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہیں۔"

"نوجوانوں کو مشتعل کیا جا رہا ہے۔" ابوجعفر نے حقیقت بیان کی۔

اس وقت تک میں سازش کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔ میرے لئے اس سازش کو ناکام بنانا مشکل نہیں تھا۔ سو میں سرگرم ہوگئی۔ فی الحال بغداد کو ایک بڑے فساد سے بچانا ممکن تھا۔

ان لوگوں کے قریب چند بچے کھڑے تھے۔ میں نے ایک بچے کو تاڑ لیا۔ اس سے سچ بلوانا آسان تھا۔ یوں بھی آدم زادوں کے بچے بہت بھولے اور معصوم ہوتے ہیں۔ اس بچے نے میرے زیر اثر زبان کھول دی، بولا۔ "رات ابو کہہ رہے تھے، صبح ہمارا گھر جل جائے گا اور پھر بہت اچھا مکان بنے گا۔"

سب اس بچے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ابوجعفر نے بچے سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے اور تم کس کے بیٹے ہو؟"

"میرا نام قاسم ہے اور ابو کا نام بختیار ہے۔" بچے نے جواب دیا۔

ابوجعفر نے دوسرا سوال کیا۔ "آگ کس نے لگائی بیٹا؟"

''پہلے تو ابو نے چھت پر تیل پھینکا، پھر آگ لگائی۔'' قاسم نے بلا جھجک بتا دیا۔

لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اسی وقت ابن علقمی وہاں آ گیا۔ اس کے ساتھ سواروں کا ایک دستہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی بختیار نے خاک اپنے سر پر ڈالی اور سینہ کوٹ کر کہا۔ ''میرے آقا! میں برباد کر دیا گیا...... دشمنوں نے میرا مکان جلا ڈالا۔''

''یہ تمہارا ہی مکان ہے جو جل رہا ہے؟'' ابن علقمی نے اپنے گول گول دیدے گھمائے۔

''جی ہاں...... یہ مکان مجھی بدبخت کا ہے۔''

ابن علقمی نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اسے ایک طرف سن رسیدہ اپنے ہم مسلک کھڑے نظر آئے۔ ان میں کئی وہ لوگ بھی تھے جنہیں اس نے اپنے قصر میں بلوا کر دوسرے مسلک والوں کے خلاف بھڑکانا چاہا تھا۔ ابن علقمی ان کے قریب پہنچ گیا۔

''میں نے تم لوگوں سے کہا تھا نا کہ تمہارے مخالفین بلوے کی تیاری کر رہے ہیں۔ انہوں نے چھیڑ خانی شروع کر دی ہے۔'' ابن علقمی زہر افشانی کرنے لگا۔ ''ان کا مقصد یہ ہے کہ تم بغداد میں نہ رہنے پاؤ۔ تم نے ان کی جرأت دیکھی۔ اب وہ تمہارے گھر جلانے لگے ہیں۔''

''اگر آپ تحقیقات کریں گے کہ آگ کیسے لگی تو آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔'' ابوجعفر بولا۔

''اب بھی کوئی شک رہ گیا ہے تمہیں؟''

اس پر ایک بزرگ نے کہا۔ ''آگ اس وقت لگی ہے جب کہ محلے کا پھاٹک نہیں کھلا تھا۔ جب پھاٹک نہیں کھلا تو ہمارے مخالفین یہاں کیسے آ گئے۔''

دلیل بڑی مضبوط تھی، مگر ابن علقمی بھی ایک کائیاں تھا، بولا۔ ''یہ کوئی بات نہیں ہے۔ رات کو کوئی دشمن آ کر یہاں چھپ گیا ہوگا یا پھاٹک کے چوکیدار کو رشوت دے کر صبح ہی صبح آ گیا ہوگا۔''

''ممکن تو خیر سب کچھ ہے۔'' ایک اور سن رسیدہ آدم زاد نے بحث کی۔ ''اس حقیقت کو بھی نظر میں رکھئے کہ یہ مکان پختہ ہے اور کسی پختہ مکان میں باہر سے آگ لگانا مشکل ہے۔''

''کوئی مشکل نہیں۔'' ابن علقمی بولا۔ ''روغن نفت چھڑک کر آگ لگائی جا سکتی ہے۔''

بوڑھے آدم زاد بھی ہار ماننے والے نہیں تھے۔ ان میں سے ایک نے ابن علقمی کو لاجواب کرنے کے لئے کہا۔ ''اگر روغن نفت چھڑکا جاتا تو وہ دیواروں پر پڑتا اور پہلے دیواریں جلنی شروع ہوتیں۔ لیکن دیواریں بدستور موجود ہیں اور چھت جل رہی ہے۔''

ابن علقمی چڑ گیا اور بگڑ کر بولا۔ ''تو کیا مالک مکان نے خود اپنا گھر جلا ڈالا؟''

''ایسا ہی ہوا ہے۔'' ابوجعفر بول اٹھا۔

اس بار ابن علقمی طیش میں آ کر کہنے لگا۔ ''بکواس کرتے ہو یا پھر مخالفین سے ڈرتے ہو یا ان سے مال کھا لیا ہے اور ان کی طرف داری کر رہے ہو۔''

ابوجعفر معزز آدمی تھا۔ اسے الزام تراشی پر طرارہ آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''ہم مخالفین سے نہیں ڈرتے، ہاں خدا سے ضرور ڈرتے ہیں۔ بغداد میں کچھ لوگ مفسد پیدا ہو گئے ہیں اور وہ شہر کے امن کو خاک میں ملانا چاہتے ہیں۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔'' عیار ابن علقمی جلدی سے بولا۔ ''ہمارے دشمنوں نے فساد پر کمر باندھ لی ہے۔''

''یہ بات نہیں ہے۔'' ابوجعفر نے انکار کیا۔ ''اگرچہ ہمارے حریفوں میں بھی مفسد ہیں...... وہ جنہیں آپ حریف، مخالف یا دشمن کہتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ہم عقیدہ...... ہمارے درمیان رہنے، بسنے والے فتنہ پرور فساد کرانا چاہتے ہیں۔ میں اس بات کا ثبوت بھی پیش کر سکتا ہوں۔''

''تو کرو نا ثبوت پیش!...... روکا کس نے ہے تمہیں۔'' ابن علقمی نے ابوجعفر کو گھور کر دیکھا۔ وہ یقیناً اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ ابوجعفر کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکے گا۔ اسے کیا خبر تھی کہ میں اس سازش کو ناکام بنا چکی ہوں۔

ابوجعفر بلا جھجک بولا۔ ''یہ مکان بختیار کا ہے اور یہ بچہ، بختیار کا بیٹا ہے۔ سنئے یہ کیا کہتا ہے۔''

سب لوگ چپ ہو گئے۔ بختیار بھی قاسم کو دیکھنے لگا۔

''ہاں بیٹا! بتاؤ تمہارے ابو رات کو کیا کہہ رہے تھے؟'' ابوجعفر نے قاسم سے سوال کیا۔

''کہہ رہے تھے، صبح ہمارا گھر جل جائے گا اور پھر اچھا سا نیا مکان بنے گا۔'' قاسم نے بھولپن سے کہہ دیا۔

"بیٹا! آگ کس نے لگائی ہے؟" ابوجعفر نے مزید پوچھا۔

"ابو نے۔" قاسم نے جواب دیا۔ "انہوں نے پہلے چھت پر تیل پھینکا اور پھر آگ لگائی۔"

جو آدم زاد نوجوان مشتعل ہو رہے تھے، وہ بچے کی بات سن کر پشیمان نظر آنے لگے۔ ابن علقمی بھی نادم ہوا، مگر شفیق کہنے لگا۔ "بچے کو یہ باتیں سکھائی گئی ہیں۔"

اسی وقت وہاں حسن اسد بھی آ گیا۔ اس نے شفیق سے کہا۔ "مفسد نوجوان، یہ حرکت تمہاری ہے۔ تم نے بختیار کو اپنا مکان جلانے پر آمادہ کیا۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" شفیق نے برہمی دکھائی۔

حسن اسد چونکہ قابل عزت آدم زاد تھا، لوگ اس کا احترام کرتے تھے اس لئے بہت سے افراد بگڑ گئے۔ انہوں نے شفیق کو برا بھلا کہا۔ ابن علقمی نے لوگوں کو مشکل سے ٹھنڈا کیا ورنہ وہ شفیق کو مارنے پر "اترو" ہو گئے تھے۔ بہرحال یہ فتنہ سر ابھارنے سے پہلے ہی دب گیا۔ اس کے باوجود شفیق فساد کرنے پر تلا ہوا تھا، وہ اور اس کے یار غار بڑی کوشش کر رہے تھے۔ میں ان فسادیوں کی کئی سازشیں ناکام بنا چکی تھی۔ وہ اس پر حیران تھے کہ آخر کیا بات ہے جو ہر مرتبہ فساد ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے اور انہیں منہ کی کھانی پڑتی ہے۔

ابن علقمی کی خواہش تھی کہ جلد سے جلد بغداد میں فساد ہو جائے۔ وہ اسی بنا پر شفیق کی جا و بے جا طرفداری کرتا، مگر امن پسند عوام کی وجہ سے اور کچھ میری "حرکتوں" کے سبب فساد نہ ہونے پاتا۔

شفیق محض ابن علقمی کی وجہ سے فتنے کی آگ کو ہوا نہیں دے رہا تھا بلکہ اس میں خود ان کی غرض بھی شامل تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ فساد ایسی صورت اختیار کرے جس سے عام بلوا ہو جائے اور وہ فردوس کو لے اڑے۔

فردوس وہی تھی جس سے ولی عہد ابوبکر کو محبت تھی۔ اسی فردوس کے ساتھ دست درازی پر نجمہ نے ایک بار شفیق کو خنجر سے زخمی کر دیا تھا۔ شہزادی نجمہ، ابوبکر اور فردوس دونوں کی رازدار تھی۔ اس دوران میں نجمہ نے کئی بار ان دونوں کی ملاقاتیں بھی کرائی تھیں۔ فردوس کو ابھی تک ابوبکر کے بارے میں اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ وہ کسی باعزت خاندان کا فرد ہے اور اس خاندان سے شاہی خاندان کے گہرے مراسم تھے۔ نجمہ اور فردوس کے درمیان اتنی

دوستی ہو چکی تھی کہ فردوس کئی کئی روز نجمہ کے محل میں آ کر رہتی۔ فردوس کے والد یعقوب اور اس کی والدہ زبیدہ کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ دونوں اس پر خوش تھے کہ ایک شہزادی ان کی بیٹی پر مہربان ہے۔ نجمہ ہی کے محل میں فردوس، وزیرزادی ہاجرہ سے بھی مل چکی تھی۔

شفیق اس بات سے آگاہ تھا کہ وہ ایک معمولی آدمی ہے۔ اس کی کوئی عزت نہیں۔ بغداد شہر میں آباد دونوں ہی بڑے فرقوں کے لوگ اسے برا سمجھتے ہیں۔ نہ اس کی عزت اپنوں میں تھی نہ غیروں میں۔ اس کے برعکس فردوس بہرحال ایک جاگیردار کی بیٹی تھی۔ اس کے حسن و جمال کی شہرت تھی۔ بڑے بڑے خاندانی لوگ اس کے خواستگار تھے۔ ایسے میں شفیق کی دال کیسے گل جاتی! وہ اسی لئے پوری تگ و دو کر رہا تھا کہ شہر میں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فساد ہو جائے۔

میں اس فسادی آدم زاد کی طرف سے پوری طرح چوکنا تھی کہ اسی اثناء میں مجھے عارج "بہلا پھسلا" کر عراق سے ایران لے آیا۔ عرصہ دراز سے میں بغداد سے باہر نہیں نکلی تھی اس لئے عارج کے "بہلانے پھسلانے" میں آ گئی۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عارج مجھ سے خفا خفا سا رہنے لگا تھا۔ ظاہر ہے میں اس کی خفگی کیسے برداشت کر لیتی! وہ جیسا بھی تھا، میرا تھا۔ ہمارا عشق صدیوں پر محیط تھا۔ اس بات کا عین امکان تھا کہ اگر میں بغداد میں ہوتی تو شاید کوئی ایسی تدبیر نکال ہی لیتی کہ جو کچھ میری غیر موجودگی میں ہوا وہ نہ ہوتا۔ ہاں عارج مجھ سے ضرور خوش ہو گیا اور اس خوشی کی "قیمت" بغداد کے بے گناہ آدم زادوں کو ادا کرنی پڑی۔ چند روز عارج کے ساتھ سیر سپاٹے کے بعد جب میں بغداد لوٹی تو حقیقت حال کا علم ہوا۔ میرے لئے حال سے ماضی اور ماضی سے مستقبل میں جانا مشکل نہ تھا۔ سو میں چند روز پہلے کے بغداد میں پہنچ گئی۔ یہ وہی دن تھا کہ جب میں، عارج کے ساتھ ایران گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ شفیق اپنے ساتھیوں کو ہدایت دے رہا تھا کہ وہ دوسرے فرقے والوں کے مکانوں کو آگ لگا دیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے لوگ بھڑک اٹھیں گے اور فساد شروع ہو جائے گا۔ ابن علقمی نے بھی در پردہ اسے یہی تاکید کی تھی۔

شفیق کے ساتھی، دوسرے فرقے والوں کے محلوں میں جا کر اس طرح کی حرکت سے ہچکچاتے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں سب سے پہلے انہی پر ہاتھ صاف نہ ہو جائے۔ فتنہ

کھڑا ہونے سے پہلے ہی وہ مارے نہ جائیں! وہ مرنے سے ڈرتے تھے۔ پھر بھی مال و زر پانے کی امید میں لالچی آدم زاد خطرناک سے خطرناک کام کر گزرتے ہیں۔ وہ اپنی موت اور زندگی کی پروا نہیں کرتے۔ (پروا ہندی کا لفظ ہے جو الف ہی سے لکھا جاتا ہے۔ اس لئے لاپروائی یا لاپرواہی لکھنا قطعی غلط ہے۔ لا کے معنی "بغیر" ہیں اور یہ عربی لفظ ہے۔ عربی اور ہندی لفظ کو اس طرح جوڑا نہیں جا سکتا۔ سو یوں بے پروا یا بے پروائی لکھنا درست ہے۔ مصنف) مال و زر انہیں پیشگی مل رہا تھا اس لئے وہ یہ خطرناک کام کرنے کو تیار ہو گئے۔ شفیق نے سوچا کہ اگر یعقوب جاگیردار کا مکان پہلے جلایا جائے تو ممکن ہے ہڑبونگ کی صورت میں فردوس کو نکال لے جانے کا موقع مل جائے۔ اس نے اسی لئے یہ طے کیا کہ یعقوب اور اس کے آس پاس والے لوگوں کے مکانوں کو آگ لگائی جائے۔ اپنے ساتھیوں کو اس نے سمجھا دیا کہ جب شعلے بلند ہوں اور فتنہ سر ابھارے، وہ فردوس کو بھگا لے جانے کی کوشش کریں۔

فردوس کو شفیق کے سبھی ساتھی جانتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس فردوس بہ داماں کے حسن سے متاثر نہ ہو۔ سب اسے چاہتے تھے۔ وہ اسے اُڑا لے جانے پر صرف شفیق کی وجہ سے تیار نہ تھے بلکہ خود ان کی غرض بھی اس میں شامل تھی۔

آگ لگانے کے لئے کوئی بہانہ ضروری تھا۔ سوچا جانے لگا کہ کیا بہانہ کیا جائے؟ بڑی خیال آرائیاں ہوئیں مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر شفیق ہی ایک دم اچھل کر بولا۔ "آ گئی ایک بات ذہن میں۔"

اس کے ساتھی متوجہ ہو گئے اور انہوں نے پوچھا۔ "کیا بات ذہن میں آئی؟ ہمیں بھی تو معلوم ہو۔"

"حسن محمود اپنے ساتھ دو تین آدمیوں کو لے جائے۔" شفیق اپنے ایک ساتھی کا نام لے کر بتانے لگا۔ "یہ لوگ میری طرف سے یعقوب کو اس کی بیٹی فردوس کے لئے پیغام دیں۔ یعقوب غیور اور تیز مزاج آدمی ہے، بگڑ جائے گا۔ حسن محمود اس طرح زور زور سے بات کرے جیسے جھگڑا ہو رہا ہے، پھر چلانے لگے کہ مار ڈالا، مار ڈالا۔ میں اور دوسرے لوگ قریب ہی ہوں گے۔ ہم شور سن کر دوڑ پڑیں گے اور جاتے ہی یعقوب نیز وہاں جمع ہو جانے والوں پر پل پڑیں گے۔ اس سے ہنگامہ شروع ہو جائے گا۔ چری کپیوں میں بند کر کے ہم روغن نفت لے چلیں گے۔ ہمارے کچھ ساتھی یہ روغن مکانوں پر چھڑک دیں گے اور میں آگ لگا دوں گا۔ حسن محمود اس عرصے میں لڑتا جھگڑتا رہے گا۔ جب آگ بھڑک اٹھے گی تو فساد لازمی ہے۔ کون ہے بھلا جو اپنا گھر جلائے جانے پر خاموش رہے!"

اس تدبیر کو سن کر سب پھڑک اٹھے۔ حسن محمود بولا۔ "یہ ایسی تدبیر ہے جو ناکام نہیں ہو سکتی۔"

غرض یہی رائے قرار پا گئی۔ تاریخ اور دن بھی طے ہو گیا۔ اس کے لئے دوپہر کا وقت مقرر ہوا۔ چونکہ یہ لوگ عام بلوا کرنا چاہتے تھے اس لئے اپنے ہم خیال افراد کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ بھی اس گلی میں چکر لگاتے رہیں جس میں یعقوب کا مکان ہے اور جب شور سنائی دے تو سب جمع ہو جائیں اور فتنہ کھڑا کر دیں۔

ان تیاریوں کے بعد تاریخ مقررہ پر عین دوپہر کے وقت حسن محمود چار پانچ آدمیوں کو لے کر یعقوب کے مکان پر پہنچ گیا۔ جب یہ لوگ پہنچے تو فردوس کہیں باہر سے آئی۔ وہ قیمتی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے غلط انداز نگاہوں سے ان لوگوں کو دیکھا۔ اس پر حسن محمود نے کہا۔

"اے ملکۂ حُسن! ہم تمہاری خواستگاری کے لئے آئے ہیں۔"

فردوس کو اس کی یہ ہرزہ سرائی سخت ناگوار گزری، مگر وہ بولی نہیں، بڑھتی چلی گئی۔

حسن محمود نے یعقوب کو آوازیں دیں۔ وہ باہر آیا۔ اس کی پیشانی پر بل تھے۔ معلوم ہوتا تھا، برہم ہے شاید اس سے فردوس نے کچھ کہہ دیا تھا۔ کوئی بھی شریف اور باعزت آدم زاد اپنی بیٹی کے معاملے میں بہت حساس ہوتا ہے۔

"کیا بات ہے؟ کیوں شور کر رہے ہو؟" یعقوب نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"ہم آپ کی خدمت میں شفیق کا پیغام لے کر آئے ہیں۔" حسن محمود یہ کہتے ہوئے غیر شریفانہ انداز میں مسکرایا، پھر مزید بولا۔ "فردوس جوان ہو چکی ہے۔"

یعقوب یہ سن کر اور بھی برافروختہ ہو گیا۔ کیونکہ جس طرح پیغام دیا گیا، وہ ہتک آمیز اور چڑانے والا تھا۔ پھر بھی یعقوب نے شرافت سے کام لیا اور خود پر قابو پاتے ہوئے دریافت کیا۔ "کون شفیق؟"

حسن محمود نے ہنس کر کہا۔ "آپ شفیق کو نہیں جانتے، حیرت ہے! حالانکہ تمام بغداد

والے اور آس پاس علاقے کے لوگ ان سے خوب واقف ہیں۔ وہ بڑے خاندانی ہیں۔ محلہ کرخ کے ذی عزت لوگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔" طنزیہ انداز میں حسن محمود کا ہنستا یعقوب کو مشتعل کرتا تھا۔ اس کا جادو چل گیا۔

"وہی شفیق جو فتنہ گر ہے، اوباش اور لفنگا ہے؟ بغداد والے جسے شیطان کی حیثیت سے جانتے ہیں؟" یعقوب نے بھی طنز کیا۔

"کیا بک رہے ہو تم؟" حسن محمود اونچی اور گستاخانہ آواز میں بولا۔ اس کا تو مقصد ہی جھگڑا کرنا تھا۔

یعقوب اس کی جرأت پر حیران رہ گیا۔ آج تک کسی نے اس طرح اس کی توہین نہیں کی تھی۔ اس نے آنے والے ان لوگوں کے تیور سے کسی قدر اندازہ کر لیا کہ وہ جھگڑا کرنے آئے ہیں۔ جھگڑے سے ہر باعزت و باشعور آدمی گریز کرتا ہے۔ یعقوب بھی ایسے ہی لوگوں میں تھا۔ اس نے مصلحتاً نرمی اختیار کی اور کہا۔ "معاف کرنا مجھ سے غلطی ہو گئی۔"

"گویا تم نے شفیق کا پیغام اپنی بیٹی کے لئے قبول کر لیا؟" حسن محمود نے ایک بار پھر زہر افشانی کی۔

یعقوب کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کی ملائمت سے بولا۔ "نہیں، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔"

"تم رشتہ منظور کر چکے ہو اور اب انکار نہیں کر سکتے۔" حسن محمود کی آواز تیز ہوتی گئی۔

حسن محمود کے ساتھی اصرار کرنے لگے، "تاریخ بتائیں، تاریخ!..... برات کب لے کے آئیں؟ (برات کو عموماً بارات لکھ دیا جاتا ہے جو غلط ہے۔ صحیح املا برات ہے۔ مصنف)

آخر کب تک یعقوب صبر سے کام لیتا۔ اس کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ بولا۔ "میرے پاس فضول باتوں کے لئے وقت نہیں۔"

یعقوب ان لفنگوں سے اپنی دانست میں پیچھا چھڑا کر مکان کے اندر چلا گیا۔ اس کے اندر جاتے ہی دو آدمیوں نے روغن نفت چھڑکا اور ایک آدمی نے آگ لگا دی۔

آگ جلدی ہی بھڑک اٹھی۔ حسن محمود اور اس کے اوباش ساتھی وہاں سے بھاگ لئے۔ محلے والوں نے یعقوب کے گھر میں آگ لگی دیکھ کر شور مچا دیا۔ یعقوب گھبرا کر باہر نکلا، دیکھا تو مکان جل رہا تھا۔ اس نے اہل محلہ کے ساتھ مل کر آگ بجھانے کی کوشش شروع کر دی۔ آگ پر پانی پھینکا جانے لگا لیکن لوگ جتنا پانی پھینکتے آگ مزید تیز ہو جاتی۔ روغن نفت کی یہی خاصیت ہے۔ اس کی آگ، پانی سے بھڑکتی ہے۔ یہ آگ صرف ریت سے بجھ سکتی ہے۔

لوگ آگ بجھانے کی کوشش کرنے کے ساتھ یہ بھی پوچھ رہے تھے کہ آگ کس نے لگائی؟

یعقوب نے انہیں بتایا کہ شفیق کے اوباش ساتھی آئے تھے۔ انہوں نے آگ لگائی ہے۔ دو آدمیوں نے انہیں آگ لگاتے دیکھا بھی تھا۔ آگ برابر بڑھ رہی تھی۔ محلے کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ وہ شور بھی کر رہے تھے اور آگ بھی بجھا رہے تھے۔ اس کے باوجود آگ کسی طرح قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ لوگوں نے یعقوب کو مشورہ دیا کہ وہ گھر کا سامان نکال ڈالے۔ عورتوں کو بھی نکال لے۔ چونکہ مکان تقریباً آدھا جل چکا تھا، باقی آدھے میں بھی آگ پہنچ گئی تھی اس لئے ضروری ہو گیا تھا کہ سامان نکالا جائے اور عورتوں کو بھی بچایا جائے۔ فوراً ہی جلتے ہوئے مکان سے سامان نکالا جانے لگا۔

یہی وقت تھا کہ جب ولی عہد ابوبکر پچاس سواروں کی معیت میں وہاں آ گیا۔ وہ شہر کے گشت پر تھا۔ یعقوب کے مکان کو جلتے دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔ اس نے لوگوں سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ یہاں آگ کیسے لگی؟"

جواب یعقوب نے دیا۔ اس نے حسن محمود اور اس کے ساتھیوں کی آمد، فردوس کے لئے شفیق کا پیغام دینے اور آگ لگانے تک کے تمام حالات بیان کر دیئے۔

ولی عہد ابوبکر کو یہ سن کر بڑا طیش آیا۔ اس نے دانت پیس کر کہا۔ "اب یہ لفنگے اس قدر شرارت پر اتر آئے ہیں! ان کی سرکوبی ضروری ہو گئی ہے۔" اس نے یہ کہہ کر سواروں میں سے چند کو آگ بجھانے پر مامور کیا اور چند کو سامان نکالنے پر مقرر کر دیا۔ اس عرصے میں آگ زنان خانے تک جا پہنچی۔ یعقوب کہنے لگا: "اب عورتوں کو کیسے نکالا جا سکے گا؟" وہ پریشان اور رنجیدہ تھا۔

"بالکل نہ گھبراؤ" ابوبکر نے تسلی دی۔ "میں عورتوں کو نکال کر لاتا ہوں۔"

پھر ابوبکر نے دیر نہیں کی۔ وہ آگ کے شعلوں سے بچتا بچاتا زنان خانے میں پہنچا۔ فردوس، زبیدہ، خادمائیں اور مشاطائیں آگ دیکھ کر سہم رہی تھیں۔

''تم؟'' فردوس نے ابوبکر پر نظر پڑتے ہی کہا۔

''بات کرنے کا وقت نہیں ہے، میرے ساتھ چلو۔'' ابوبکر جلدی سے بولا اور عورتوں کو لے کر تیزی سے چلا۔

بڑی کوشش اور تگ و دو کے بعد ابوبکر جلتے ہوئے مکان سے عورتوں کو نکال کر لے آیا۔ اس پر آگ نے ایسا اثر کیا کہ نیم بے ہوش ہو گیا۔ یہی کیفیت عورتوں کی ہوئی۔ لیکن تازہ ہوا لگنے سے انہیں جلد ہوش آ گیا۔ محلے والے اور سپاہی مکان سے سامان نکالنے لگے۔

جب سامان نکالا جا چکا تو ابوبکر نے یعقوب سے پوچھا۔ ''کیا کوئی اور مکان ہے جس میں فی الحال تم رہ سکو؟''

''جی نہیں۔'' یعقوب نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ''بدقسمتی سے یہ میرا ایک ہی مکان تھا جو اوباشوں نے آگ کی نذر کر دیا۔''

فردوس، ابوبکر کو دیکھنے لگی۔ اس نے یعقوب سے کہا۔ ''میرا ایک مکان ہے، اگر تم اس میں رہنا پسند کرو۔''

''آپ کو تکلیف ہو گی۔''

ابوبکر بولا۔ ''میں اس مکان میں نہیں رہتا۔ میرے ملازم رہتے ہیں۔ انہیں میں دوسری جگہ بھیج دوں گا۔''

''مجھے کہیں نہ کہیں تو رہنا ہی ہے، وہیں سہی۔ میں آپ کا ممنون ہوں۔'' یعقوب نے ابوبکر کی پیشکش قبول کر لی۔

''اس میں ممنون ہونے کی کوئی بات نہیں۔'' ابوبکر نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ لفنگوں نے تمہیں اذیت پہنچائی۔ خدا کو منظور ہے تو اس مکان سے بہتر تمہارا مکان بنوایا جائے گا اور اوباشوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔''

ابوبکر نے چند گاڑیاں منگوائیں۔ ان میں یعقوب کا سامان لدوایا، پھر ایک بگھی میں یعقوب، زبیدہ، فردوس وغیرہ کو سوار کرایا اور وہاں سے چل دیا۔ شاہی محلوں کے قریب ایک شاندار محل تھا، اس میں ابوبکر نے یعقوب اور اس کے گھر والوں کو ٹھہرایا۔ اس محل میں امیرانہ ساز و سامان موجود تھا۔ یعقوب کا سامان اس کے سامنے ہیچ تھا۔

''یہ سب سامان تمہارے لئے ہے۔ تم اسے استعمال کرنے میں بالکل نہ جھجکنا۔'' ابوبکر

نے یعقوب سے کہا۔

یعقوب یہ سن کر حیران ہوا اور اتنا ہی کہہ سکا۔ ''آپ......''

''میں خلیفہ کے حضور جا رہا ہوں۔'' ابوبکر جواباً بولا اور چل دیا۔

یعقوب اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ تم کون ہو؟ اس نے پہلے کبھی ولی عہد کو دیکھا نہ تھا، خود ابوبکر بھی عموماً اس بات کو چھپاتا تھا کہ ولی عہد ہے۔ اس بنا پر اس نے یعقوب کو بھی اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں کیا۔

ابوبکر کو افسوس تھا کہ یعقوب کو روحانی اذیت برداشت کرنی پڑی۔ وہ سوچنے لگا، شفیق اور اس کے اوباش ساتھیوں کی شرارتیں حد سے بڑھ گئی ہیں۔ حسن محمود نے فردوس کے لئے شفیق کا پیغام دیا تھا۔ کیا واقعی فردوس کو شفیق چاہتا ہے؟ اسے یاد آ گیا کہ وہ شفیق ہی تھا جس نے فردوس پر دست درازی کی تھی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ کہیں یعقوب، شفیق سے ڈر کر اس کا پیغام منظور نہ کر لے۔

وہ قصر خلافت کی طرف جا رہا تھا۔ جب وہ اس دروازے پر پہنچا جو باب الذہب (سونے کا دروازہ) کے نام سے مشہور تھا تو سپاہیوں نے اسے سلامی دی۔ اس پورے دروازے پر سونے کا کام بنا ہوا تھا جو دھوپ میں کندن کی طرح چمکتا تھا۔ وہ دروازے سے داخل ہوا۔ یہ قصر نہایت ہی عالی شان تھا۔ اس کے کئی باغ تھے، کئی باغیچے اور سبزہ زار تھے اور عمارت سنگ مرمر کی تھی۔ میں اس کا تفصیلی ذکر کر چکی ہوں۔ قصر کے اندر پہنچ کر ابوبکر نے ایک کنیز سے خلیفہ کو دریافت کیا۔ اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ حقیقت یہ ہے کہ کنیزیں اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ خلیفہ کہاں ہو گا۔

داروغۂ قصر ایک جوان العمر آدم زادی تھی۔ وہی کنیزوں کی افسر تھی۔ کئی کمرے اس کے تصرف میں رہتے تھے۔ ابوبکر اس کے پاس گیا۔ اس نے بڑے تپاک سے ابوبکر کا خیر مقدم کیا۔ ابوبکر نے اس سے بھی خلیفہ کے بارے میں پوچھا۔

''اس وقت وہ برجی فوارے پر ہیں۔ مجھے امید نہیں کہ وہ آپ سے مل سکیں گے۔ پھر بھی میں اطلاع کراتی ہوں۔'' آدم زادی بولی۔ ابوبکر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے ایک کنیز کو خلیفہ کے حضور میں ولی عہد کے آنے کی اطلاع دے کر بھیجا، پھر ابوبکر سے کہنے لگی۔

''اعلیٰ حضرت آپ کی شادی کے متعلق فرما رہے تھے۔''

''انہیں میری شادی کی فکر ہے مگر تیار نہیں۔'' ابوبکر نے جواب دیا۔

''برا نہ منائیں تو ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھیے۔''

''کیا کوئی لڑکی پسند آ گئی ہے؟''

''تم یہ کیا کہنے لگیں؟...... کیا تمہیں اس سلسلے میں میرے خیالات کا علم نہیں؟''

''میں نے تو حضور سے وہی عرض کیا ہے جس کا ان دنوں قصر الخلافہ میں چرچا ہے۔'' نگران قصر نے کہا۔

ابوبکر نے سوال کیا۔ ''یہ بتاؤ، کیا اعلیٰ حضرت نے کوئی لڑکی پسند کر لی ہے؟''

''ہاں...... اور وہ لڑکی ہے احمد ابوالقاسم کی بہن نجمہ۔'' نگران نے یہ کہتے ہوئے غور سے ابوبکر کے چہرے کو دیکھا۔ ابوبکر کے چہرے سے کوئی بات ظاہر نہ ہوئی تو اس نے پوچھا۔ ''کیا وہ شہزادی آپ کو پسند نہیں؟''

''نجمہ اچھی لڑکی ہے مگر......''

''آپ انہیں شریکِ حیات بنانا پسند نہیں کرتے؟''

''دراصل ابھی میں شادی ہی کرنا نہیں چاہتا۔''

''ایک بات سن لیجیے۔'' نگران کہنے لگی۔ ''شہزادی نجمہ اس قدر حسین پُرکشش ہیں کہ شاہی محلوں میں انہی کے حُسن کی شہرت ہے۔ ان جیسی کوئی اور شہزادی نہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔''

''تو پھر آپ اس مسئلے پر غور کیجیے۔''

اس سے قبل کہ ابوبکر کچھ اور کہتا، کنیز واپس آ گئی۔ اس نے بتایا۔ ''خلیفہ محترم، ولی عہد کو یاد فرما رہے ہیں۔''

ابوبکر کو معلوم تھا کہ قصرِ خلافت پر برنجی فوارہ کہاں واقع ہے۔ وہ اس طرف چل دیا۔ مذکورہ فوارہ ایک باغیچے میں تھا۔ اس فوارے کا حوض بہشت پہلو سنگِ مرمر کا تھا۔ اس کے چاروں طرف سدا بہار بیلوں نے گھونگھٹ کر رکھا تھا۔ حوض اور بیلوں کے درمیان کئی وسیع تختے تھے۔ ان تختوں کی ترتیب اس طرح تھی کہ ایک تختہ سبز گھاس سے لدا ہوا تھا تو دوسرا گل

پوش تھا۔ دونوں تختوں کو سرو و صنوبر کی قطاریں الگ کرتی تھیں۔ بیلوں کے اس طرف حسین و جوان کنیزوں کے پرے تھے۔ ابوبکر کو دیکھتے ہی کنیزیں سروں کو خم کر کے کھڑی ہو گئیں۔ ابوبکر ان کے درمیان سے نکلتا چلا گیا اور بیلوں میں جو چھوٹا دروازہ تھا اس میں گزر کر دوسری طرف پہنچا۔

خلیفہ مستعصم باللہ زردوزی سائبان کے سائے میں قالینوں کے فرش پر بیٹھا تھا۔ ابوبکر نے خلیفہ کو ادب سے سلام کیا۔ خلیفہ نے دعا کی اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ابوبکر بیٹھ گیا۔

''آج بے وقت کیسے آنا ہوا تمہارا؟'' خلیفہ نے ولی عہد کو مخاطب کیا۔

''ایک اہم بات گوش گزار کرنے اور اس کے متعلق مناسب حکم حاصل کرنے حاضر ہوا ہوں۔'' ابوبکر نے عرض مدعا بیان کر دیا۔

''کہو، کیا اہم بات ہے؟''

''کچھ شورہ پشت فتنہ برپا کرنے پر تلے ہوئے ہیں حالانکہ ان کے ہم مسلک بھی ان سے نالاں ہیں۔'' ولی عہد ابوبکر نے کہنا شروع کیا۔ ''ابھی چند روز ہوئے جب ایک حنفی شخص بختیار نے اپنے مکان کو آگ لگا دی اور واویلا کر کے ہمارے ہم عقیدہ افراد پر اس کا الزام لگا دیا، لیکن خود اسی کے ہم مسلکوں...... انصاف پسند افراد نے ان کی پول کھول دی۔ آج انہی شوریدہ سروں کی ایک جماعت نے یعقوب جاگیردار کا مکان جلا دیا۔ حکومت خاموش ہے اور حکمران کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہیں۔ اس سے اندیشہ ہے کہ کسی روز ایسا فتنہ نہ اٹھ کھڑا ہو جس سے دارالخلافہ بغداد کا امن تباہ ہو جائے۔ یہ وضاحت کر دوں کہ حکمرانوں سے میری مراد وہ ذمے دار لوگ ہیں جنہیں اعلیٰ حضرت نے یہ فرض سونپا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن یہ لوگ فتنہ بپا کرنا کیوں چاہتے ہیں؟'' خلیفہ مستعصم نے سوال کیا۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ ابن علقمی کوئی گہری سازش کر رہا ہے۔ اس کی شہ پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔'' ابوبکر نے جواب دیا۔

''تم اس غریب کو کیوں بدنام کرتے ہو؟'' مستعصم کہنے لگا۔ ''ابنِ علقمی تو بڑا نیک آدمی ہے۔ حکومت کا وفادار ہے وہ۔''

ابوبکر نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔ ''اس نے چاپلوسی سے اعلیٰ حضرت کو یہ یقین دلا

دکھا ہے کہ وہ نیک اور سیدھا ہے۔ اگر خفیہ والے ہوتے تو اس کی حرکتیں ظل اللہ پر روشن کر دیتے۔ آپ اگر خود اس کے متعلق تحقیق کریں تو اصلیت معلوم ہو جائے گی۔"

"تم اور جو کچھ کہو میں سننے کو تیار ہوں، لیکن ابن علقمی کے خلاف مجھے کچھ نہیں سننا۔" خلیفہ نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

"افسوس یہ ہے کہ میرے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں جس سے اعلیٰ حضرت کو یقین دلا سکوں۔" ابوبکر کی آواز میں بے بسی تھی۔

"اور ہمیں یقین ہے کہ تم اس کے خلاف آئندہ بھی کوئی ثبوت فراہم نہ کر سکو گے۔"

"اگر ظل اللہ اس کی بیٹی ہاجرہ سے پوچھیں تو وہ بہت کچھ بتا سکے گی۔" ابوبکر نے ایک اور پانسہ پھینکا۔

"ہرگز نہ بتا سکے گی۔" خلیفہ دوٹوک لہجے میں بولا۔ "ہم جانتے ہیں ہاجرہ بہت بھولی اور نیک ہے۔"

"اچھا ان مفسدوں کے بارے میں کیا حکم ہے جنہوں نے یعقوب کے مکان کو آگ لگائی ہے؟"

"کیا ان کے متعلق تمہیں کچھ تحقیق ہوا ہے؟" خلیفہ نے پوچھا۔

"جب مکان جل رہا تھا، میں اس وقت وہاں پہنچ گیا تھا اور مفسد بھاگ گئے تھے۔" ابوبکر نے بتایا۔

"اگر انہوں نے قانون شکنی کی ہے تو میں تمہیں اختیار دیتا ہوں کہ انہیں گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلاؤ۔"

"لیکن ابن علقمی، اعلیٰ حضرت سے ان کی سفارش اور میری شکایت کرے گا۔" ابوبکر نے خدشے کا اظہار کیا۔

"ہم مجرموں کے بارے میں کچھ نہیں سنیں گے۔"

"مجھے اعلیٰ حضرت کی انصاف پسند طبیعت سے یہی امید تھی۔"

"لیکن ایک خیال رہے، کسی غلط جذبے کے تحت کوئی گرفتاری عمل میں نہ آئے۔"

"انشاء اللہ کوئی ایک بے گناہ شخص بھی ستایا نہیں جائے گا۔" ابوبکر نے یقین دہانی کرائی اور خلیفہ سے رخصت کی اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

دوسرے روز کچھ دن چڑھے ابوبکر نے کوتوال شہر کو بلایا، جوان شرطے ساتھ لئے اور محلہ کرخ کی طرف چل دیا۔

ابوبکر کے ساتھ شرطوں (پولیس والوں) کی نفری خاصی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ محلہ کرخ پہنچا تو وہاں خوف و ہراس پھیل گیا۔ محلے کے بہت سے امیر و کبیر لوگ ابوبکر کو جانتے پہچانتے تھے۔ وہ اس کے پاس چلے آئے کہ حقیقتِ حال معلوم کر سکیں۔

ابوبکر بولا۔ "مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ چند اوباش نوجوان شہر کے امن کو خاک میں ملانے پر تلے ہوئے ہیں اور ان کی چیرہ دستیاں حد سے گزر گئی ہیں جنہیں اب ہرگز برداشت نہیں کیا جا سکتا۔"

اس پر ایک معزز شخص نے کہا۔ "ہمیں ندامت ہے کہ چند مفسد ہنگامہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سمجھ گئے ہیں کہ آپ ان کی گرفتاری کے لئے آئے ہیں۔ ہمیں اعتراض نہیں کہ آپ انہیں گرفتار کر لیں...... بس ایک عرض ہے کہ بے گناہوں کا خیال رکھئے گا۔"

"ضرور......" ابوبکر نے جواب دیا۔ "جن لوگوں کو آپ نیک اور بے قصور سمجھتے ہوں اگر ان کی گرفتاری عمل میں آ جائے تو بتا دیں۔ ایسے افراد کو چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ بتایئے حسن محمود کیسا آدمی ہے؟"

"وہ شفیق کا ساتھی ہے، کچھ اچھا آدمی نہیں ہے۔"

"یہ شخص اپنے بہت سے ساتھیوں کو لے کر یعقوب جاگیردار کے مکان پر پہنچا اور ان سے نازیبا باتیں کیں۔ ایسی باتوں کو کوئی بھی شریف و عزت دار آدمی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پھر بھی یعقوب نے صبر سے کام لیا۔ اس پر شر پسندوں کو اور بھی شہ ملی اور انہوں نے یعقوب کی شرافت کو کمزوری پر محمول کیا اور ان کے گھر کو آگ لگا دی۔"

"یقیناً حسن محمود نے برا کیا۔" محلے کے ایک اور باریش آدم زاد نے کہا۔ "آپ اسے گرفتار کریں یا جو چاہے سزا دیں۔"

یہ سن کر ابوبکر نے کوتوال شہر کو حکم دیا کہ وہ حسن محمود کو گرفتار کر لائے۔ کوتوال اس علاقے میں متعین سپاہیوں کو ساتھ لے کر گیا اور حسن محمود کو پکڑ لایا۔ وہی حسن محمود جو کل بہت دلیر بنا ہوا تھا، یعقوب کو جس نے فردوس کے لئے نہایت ہتک آمیز انداز میں پیغام دیا تھا، اسے برا بھلا کہا تھا، آج بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔

''جو لوگ تمہارے ساتھ یعقوب کے مکان پر گئے تھے، ان سب کے نام بتا دو۔'' ابوبکر نے حسن محمود کو ڈپٹ کر کہا۔

مفسد بہادر نہیں ہوتے۔ حسن محمود شرطوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے اپنے تمام ساتھی نوجوانوں کے نام بتا دیئے۔ شرطوں نے انہیں بھی گرفتار کر کے ولی عہد ابوبکر کے سامنے پیش کر دیا۔ حسن محمود نے دو ایسے نوجوانوں کے نام بھی بتائے جو اس ہنگامے اور سازش میں شریک نہیں تھے۔ حسن محمود کی ان نوجوانوں سے ذاتی رنجش تھی، سو موقع غنیمت جان کر انہیں بھی پھنسوا دیا۔

محلے کے معزز افراد نے گواہی دی کہ وہ دونوں بے گناہ ہیں اور فسادی نہیں۔ ان کا مفسدوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ابوبکر نے انہیں رہا کر دیا اور ان شرپسندوں کی طرف متوجہ ہو گیا جو اب بھی شرطوں کی حراست میں تھے۔

''آگ لگانے کے لئے تم سے کس نے کہا تھا؟'' ابوبکر نے دریافت کیا۔

شرپسند نوجوان بہت ہی زیادہ ڈر گئے تھے۔ انہوں نے سچ بول دیا کہ حسن محمود اور شفیق نے ان سے یعقوب کے گھر کو آگ لگانے کے لئے کہا تھا۔ یہ سنتے ہی حسن محمود بول اٹھا۔ ''یہ جھوٹے ہیں، میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ البتہ شفیق نے ضرور کہا تھا۔''

زیر حراست دو نوجوان کہنے لگے۔ ''نہیں حضور! یہ جھوٹا ہے۔ اس نے ہمیں درہم دیئے اور ہم نے اس کے کہنے سے آگ لگائی۔ بہرحال یہ درست ہے کہ شفیق ہم سب کا سرغنہ ہے۔

ابوبکر نے شفیق کی گرفتاری کا حکم بھی دے دیا۔

محلے کے ایک معزز فرد نے کہا۔ ''وہ بڑا شخص ہے اور اس کا گروہ بھی بڑا ہے۔ کہیں اس کی گرفتاری سے ہنگامہ نہ ہو جائے۔''

ابوبکر بولا۔ ''میں نے فوج کا ایک دستہ طلب کر لیا ہے۔ وہ بھی آنے والا ہے۔ میں آج یہاں مفسدوں کی سرکوبی کے لئے آیا ہوں۔ کسی فتنہ پرور کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

ایک اور ادھیڑ عمر آدم زاد نے کہا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ ہم ان کی شوریدہ سری سے عاجز آ

گئے ہیں۔ لیکن اپنی عزت سنبھالے ہوئے ہیں۔ کچھ کہہ نہیں سکتے۔''

اتنے میں شفیق آ گیا۔ ابوبکر نے گھور کر شفیق کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم نے اس محلے کے ایک شخص کو ورغلا کر اس سے اپنا گھر جلوایا اور پھر یعقوب جاگیردار کے مکان کو آگ لگوائی۔ تم اور تمہارے ساتھی ہر وقت فساد پر تیار رہتے ہیں۔ تمہیں اب اس کا خمیازہ بھگتنا ہی پڑے گا۔ اپنے شرپسند ساتھیوں سمیت اب قید خانے کی ہوا کھانا۔

''تم مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو!'' شفیق برف خانے کے چھار کی طرف اٹھنے لگا۔

اس پر ابوبکر کو غصہ آ گیا۔ اس نے شفیق کے منہ پر اتنا زوردار طمانچہ مارا کہ منہ بھر گیا۔

محلہ کرخ میں ایسے آدم زادوں کی بھی کمی نہ تھی جن کے ذہنوں میں فرقہ واریت کا زہر سرایت کر چکا تھا۔ شرپسند نوجوانوں کو ان کی حمایت حاصل تھی۔ وہی شفیق کے ساتھ آئے تھے۔ انہوں نے جو اپنے ''ہیرو'' کو پٹتے دیکھا تو ہنگامہ کرنا چاہا۔ شرطوں نے انہیں بھی حراست میں لے لیا۔ اس سے مفسدوں میں عام ناراضگی پھیل گئی۔ (لفظ ناراض ہی سے ناراضگی بنتا ہے اور فارسی والے ناراضگی ہی لکھتے ہیں۔ اس طرح موجود سے موجودگی۔ سو یوں ناراض سے ناراضی اور موجود سے موجودی لکھنا فارسی قواعد کے قطعی غلط ہے۔ موجودی کا مطلب موجود سے ہوا موجودگی نہیں۔ مثلاً سنجیدہ سے سنجیدگی ہی لکھا جائے گا۔ مصنف)

شرطوں نے انہی نوجوانوں کو گرفتار کیا تھا جو کچھ زیادہ ہی ''نقشے بازی'' دکھا رہے تھے۔ ان کے پکڑے جانے پر انتہا پسند افراد، شرطوں پر حملہ کرنے کو تیار ہو گئے۔ اسی وقت طلب کردہ فوجی دستہ آ گیا۔

ابوبکر نے انتہا پسندوں کو مخاطب کیا۔ ''اگر تم میں سے کسی نے بھی خلاف قانون کوئی حرکت کی تو تمہاری گردنیں اڑا دی جائیں گی۔''

لوگ، فوجی دستے دیکھتے ہی ڈر گئے۔ شفیق نے اپنے ہم مشیروں اور ہم خیالوں کو تسلی دی۔ ''پرواہ مت کرو۔ ابن علقمی مجھے اور میرے ساتھیوں کو بہت جلد رہا کرا لیں گے۔''

ابوبکر نے لوگوں کو منتشر ہونے کو کہا۔ وہ سب خاموشی سے چلے گئے۔

ماضی سے حال میں آ کر سب سے پہلے مجھے یہ فکر ہوئی کہ کیا ابن علقمی اپنے حمایت یافتہ شرپسندوں کو رہائی دلا سکا ہے؟

✿.....✿

شر پسند ٹولے کی گرفتاری سے بغداد میں امن ہو گیا۔ ان مفسدوں کی وجہ سے اور لوگ بھی شورش پر آمادہ ہو گئے تھے۔ لیکن جب وہ گرفتار کر لئے گئے تو اور لوگوں کے سروں سے بھی فرقہ واریت کا بھوت اتر گیا۔

میں اب ابن علقمی کی جستجو میں تھی، سو سرگرم ہو گئی۔

ابن علقمی کو اپنے پروردہ تخریب کاروں کے گرفتار ہونے کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی، مگر فوری طور پر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ کیا قدم اٹھائے! اس کا سبب ولی عہد ابو بکر تھا۔ اس کے گرگوں کو خود ابو بکر نے پکڑا تھا اور وہ سب قید خانے میں تھے۔ یہ وہی ابو بکر تھا جسے ابن علقمی حکومت و اقتدار پر قبضے کی خاطر اپنا داماد بنانے پر بھی آمادہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی ہاجرہ کو ولی عہد ابو بکر کے عقد میں دینے کی غرض سے خاصے عرصے کوشاں رہا مگر بات بنی نہیں۔ اس میں بڑی رکاوٹ خود ابو بکر تھا۔ وہ شادی کرنے ہی پر راضی نہ تھا۔

بہرصورت اپنے گماشتوں کے زیر دام آ جانے پر ابن علقمی کے دل پر سانپ لوٹ گیا۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ ابو بکر، شفیق کو گرفتار کر لے گا۔ وہ جانتا تھا کہ پوری سلطنت میں بحیثیت وزیر اعظم اس کا طوطی بول رہا ہے۔ کوئی بھی بڑے سے بڑا افسر خواہ اس کا تعلق کسی محکمے سے ہو، ابن علقمی کی اجازت کے بغیر کسی کو گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔ موجودہ معاملہ قدرے مختلف نوعیت کا تھا۔ ولی عہد ابو بکر نے اس کے پٹھوؤں کو گرفتار کر کے اس کی ساری منصوبہ بندی کو خاک میں ملا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابن علقمی زخم کھائے ہوئے کسی سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا، اسے ابو بکر پر بڑا غصہ آیا۔ چونکہ وہ سمجھتا تھا کہ خلیفہ اس کے کہنے اور قابو میں ہے اس لئے طے کیا کہ شر پسندوں کو رہا کرا کے ابو بکر کو قید کرا دے گا۔

ابن علقمی ایسے لئے اپنی عقل کے مطابق "گھوڑے" دوڑانے لگا۔ بعض آدم زاد خیالی گھوڑے دوڑانے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ عیار ابن علقمی بھی ایسے ہی "ماہرین" میں سے تھا۔ اس نے سوچا کہ ولی عہد ابو بکر پر بڑی آسانی سے خلیفہ مستعصم کے خلاف بغاوت کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے جھوٹے گواہوں کی پوری کھیپ "خریدی" جا سکتی ہے۔ پھر بھی یہ بعد کی بات تھی۔ ابن علقمی کے نزدیک پہلی ترجیح شر پسندوں کی رہائی تھی۔

کئی روز سوچ بچار کے بعد اس نے خلیفہ مستعصم سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

چونکہ خلیفہ، ابن علقمی کی عزت کرتا تھا، اسے حکومت کے سیاہ و سفید کا مالک بنا رکھا تھا اس لئے سبھی اس سے ڈرتے اور اس کی تعظیم کرتے تھے۔ اس زمانے میں بیوقوف کو بیوقوف کہنے کا چلن نہیں تھا، اسی بنا پر خلیفہ کی طرف کوئی انگلی نہ اٹھاتا۔ وہ لاکھ کھامڑ اور بے عقل سہی، تھا تو خلیفہ! اگر ایسا نہ ہوتا تو عیار و فسادی ابن علقمی کو اپنا وزیر اعظم نہ بناتا۔ اگر اس سے یہ غلطی سرزد ہو بھی گئی تھی تو ازالہ کون سا مشکل تھا۔ ابن علقمی کو برطرف کر دیتا اور کسی اہل شخص کو اس عہدے پر لے آتا۔ لیکن نا اہلوں کو کبھی اہل افراد کی تلاش نہیں ہوتی۔ وہ محض وقتی مفاد پر نظر رکھتے ہیں۔

خلیفہ مستعصم کی "حماقت مآبی" ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ محلات شاہی، خصوصاً قصر خلافت جو قصر خلد بھی کہلاتا، وہاں کے محافظ، غلام اور کنیزیں سب ابن علقمی کے کہنے میں رہتے اور اس بدسرشت کے اشاروں پر چلتے۔

یہی سبب تھا کہ جب ابن علقمی قصر خلافت کے صدر دروازے پر پہنچا تو خلیفہ کے محافظ دستے نے اسے سلامی دی۔ وہ مختلف دروازوں سے گزرتا ہوا جب قصر خلافت کی عمارت میں داخل ہوا تو کنیزیں اس کے استقبال کو دوڑیں۔ قصر کی داروغہ بھی آ گئی۔ اس نے ابن علقمی کو دیکھا، وہ کچھ برہم معلوم ہوتا تھا۔ وہ پوچھنے لگی۔

"خیر تو ہے، آج پیشانی پر بل کیوں ہیں؟"

ابن علقمی نے جواب دیا۔ "آج میں بہت اداس ہوں۔ میرے دل کو بڑی اذیت پہنچی ہے۔ میرے بھولے اور بہی خواہ چند بے گناہ نوجوانوں اور دیگر افراد کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

قصر کی نگراں کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ وجہ یہ کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی، حکومت کے تمام تر اختیارات ابن علقمی کے ہاتھ میں ہیں۔

ابن علقمی کے حکم ہی سے کسی کو گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ کہ ابن علقمی کے بہی خواہوں کو کس نے گرفتار کیا؟

"یہ جرأت کس نے کی؟" نگراں نے سوال کیا۔

"ولی عہد نے۔ جن کی میں بڑی عزت کرتا ہوں۔" ابن علقمی نے جواب دیا۔

"مگر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟"

"اسے تو وہی جان سکتے ہیں۔ تم فوراً اعلیٰ حضرت کو میری آمد کی اطلاع کرو۔" ابن علقمی بولا۔

"میں نے پہلے ہی اطلاع کرا دی ہے۔"

ذرا ہی دیر بعد ایک کنیز نے آ کر اطلاع دی۔ "ظل اللہ یاد فرما رہے ہیں۔" حسین کنیز، ابنِ علقمی سے مخاطب تھی۔

ابنِ علقمی اس کنیز کے ساتھ چل دیا۔ ان خاص کنیزوں ہی کو خبر ہوتی تھی کہ خلیفہ، قصرِ خلافت کے کس حصے میں ہے!

ان خاص کنیزوں کے لئے حُسن و نوجوانی کی شرط تھی۔ خلیفہ مستعصم کو عمر رسیدہ اور بدصورت کنیزیں پسند نہیں تھیں۔ قصرِ خلافت میں مشہور تھا کہ خلیفہ جیسا حُسن شناس روئے زمین پر کوئی اور دوسرا نہیں۔

میں سوچ رہی تھی کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ابنِ علقمی، خلیفہ کو شیشے میں اتار سکے گا یا نہیں؟"

اس وقت خلیفہ مستعصم اپنے خلوت کدے میں تھا۔ عام حالات میں وہ کسی کو بھی وہاں طلب نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ اسے یہ بتایا گیا وزیرِ اعظم ابنِ علقمی آیا ہے اس لئے اسے بلوا لیا۔ خلیفہ کو معلوم تھا کہ ابنِ علقمی کسی انتہائی ضروری کام کے بغیر قصرِ خلافت کا رُخ نہیں کرتا۔

ابنِ علقمی خلوت کدے کے خاص کمرے میں داخل ہوا۔ خلیفہ سامنے ہی ایک مسند پر بیٹھا تھا۔ کئی نوجوان و حسین کنیزیں پشت کی طرف کھڑی تھیں۔ خلیفہ کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ابنِ علقمی آداب بجالایا۔ خلیفہ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔

خلیفہ پھر مطالعے میں مشغول ہو گیا۔ ابنِ علقمی اور خلیفہ مستعصم دونوں ہی کے ذہنوں پر میری توجہ تھی۔ خلیفہ کو دراصل ابنِ علقمی کی بے وقت آمد گراں گزری تھی۔ یہی ظاہر کرنے کی غرض سے اس نے مطالعے کا بہانہ کیا۔ ورنہ تو کتابوں سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

دوسری جانب ابنِ علقمی بھی خلیفہ کے رویے پر اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ وہ اپنی دانست میں اتنا بڑا آدمی بن گیا تھا جس سے خلیفہ کو بھی دبنا چاہئے تھا۔ عموماً ابنِ علقمی جب آتا، خلیفہ فوراً ہی آنے کی وجہ پوچھتا، اس کی باتوں کو غور سے سنتا اور ان پر عمل کرتا۔ اس کے باوجود ابنِ علقمی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خود خلیفہ کو مخاطب کر سکتا۔ وہ کڑھتا رہا مگر بولا کچھ نہیں۔

کچھ دیر بعد خلیفہ نے کتاب ہاتھ سے رکھ دی اور ابنِ علقمی سے مخاطب ہوا۔ "کہیے، کیا بات ہے؟"

ابنِ علقمی تو بھرا بیٹھا تھا، پُرجوش آواز میں بولا۔ "بغداد میں فساد کی بارود بچھا دی گئی ہے۔ نہ معلوم کس وقت یہ بارود بھک سے اُڑ جائے اور شعلے بلند ہونے لگیں۔"

خلیفہ نے پوچھا۔ "یہ بارود کس نے بچھائی ہے؟"

"میں کیا عرض کروں، اعلیٰ حضرت خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

"زرومت! صاف صاف کہو۔"

"گستاخی معاف، محترم ولی عہد نے یہ بارود بچھائی ہے۔" ابنِ علقمی نے بتایا۔

"ابوبکر نے؟" خلیفہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

"جی ہاں۔"

"کیسے؟" خلیفہ نے سوال کیا۔

"انہوں نے سوتے شیروں کو جگا دیا ہے۔ میری مراد اپنے ہم عقیدہ لوگوں سے ہے۔"

"ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ابوبکر نے کیا، کیا؟"

"انہوں نے بلاوجہ محلہ کرخ کے کچھ نوجوانوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ اس سے میرے فرقے والے برافروختہ ہو رہے ہیں۔"

"مگر ابوبکر نے ایسا کیوں کیا؟ ابوبکر کوئی بچہ نہیں ہے۔ اس نے کوئی تو بات دیکھی ہو گی۔"

"بات کوئی ہوتی تو دیکھتے۔ میرا خیال ہے کہ ان کا مقصد ایک فرقے والوں کو مشتعل کرنا تھا۔"

"اس سے ابوبکر کو کیا فائدہ تھا؟"

"وہ غالباً شہر میں فرقہ وارانہ فساد کرانا چاہتے ہیں۔" ابنِ علقمی نے دیدہ دلیری دکھائی۔

"لیکن کیوں؟" خلیفہ نے جان کر بحث کی۔ حالانکہ ابوبکر اسے سب کچھ بتا چکا تھا۔

"اب اگر میں صاف بات عرض کروں گا تو شاید اسے اعلیٰ حضرت شکایت پر محمول کریں گے۔" ابنِ علقمی نے اصل بات کہنے کے لئے تمہید باندھی، اس کا انداز گفتگو رفتہ رفتہ بدلتا جا رہا تھا۔

"شکایت کا خوف نہ کرو، ہم سمجھتے ہیں کہ تم ہمارے اور ہماری حکومت کے خیر خواہ ہو۔"

ابنِ علقمی نے وہ جال پھینکا جو اکثر حکومت کے دشمن اور غرض کے بندے پھینکتے ہیں۔

اس طرح حکمرانِ وقت اور ولی عہد کے درمیان نفاق و دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر حکمران کو بھڑکا کر ولی عہد کو قید یا قتل کرا دیا جاتا ہے۔ اس سے حکومت دشمن عناصر اپنا مطلب پورا کر لیتے ہیں۔ آدم زادوں کے ان ہتھکنڈوں سے میں بخوبی آگاہ تھی۔ حکمران اگر حکومت دشمنوں کے کہنے میں نہ آتا تو وہ ولی عہد کو حکومت کے سبز باغ دکھا کر بغاوت کرا دیتے ہیں اور پھر جس کا پلہ بھاری دیکھتے ہیں اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔

ممکن ہے کہ میں وہاں موجود نہ ہوتی تو خلیفہ مستعصم پر ابنِ علقمی کا جادو چل جاتا۔ خلیفہ مستعصم پست امت اور عاقبت نااندیش تھا۔ لیکن میں نے اسے مشتعل نہ ہونے دیا۔ پھر یہ کہ وہ ابوبکر کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے ابوبکر پر اعتماد تھا۔

''تم نے یہ بات کب سنی؟'' خلیفہ نے ابنِ علقمی سے دریافت کیا۔

ابنِ علقمی نے بے پر کی اُڑائی۔ ''بہت عرصہ ہوا جب سنی تھی۔''

''تم اسی وقت ہمارے علم میں یہ بات کیوں نہیں لائے؟''

''میں نے ولی عہد کو سمجھایا تھا۔'' ابنِ علقمی نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے سفید جھوٹ بولا۔ ''میرا خیال تھا کہ وہ سمجھ جائیں گے اور تاج و تخت کی حرص ان کے دماغ سے نکل جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ بڑھتے رہے اور اپنے موافقوں کی تعداد بڑھاتے رہے۔ اب جب کہ ان کی طاقت بڑھ گئی ہے تو انہوں نے ہاتھ پیر نکالے ہیں۔''

''ہمیں بڑا افسوس ہے کہ تم نے اس بات کو جس پر ہماری حکومت ہی کا نہیں بلکہ زندگی کا بھی انحصار ہے، چھپائے رکھی۔'' خلیفہ نے کہا۔

''میں نہیں چاہتا تھا کہ اعلیٰ حضرت اور ولی عہد میں کشیدگی ہو۔'' ابنِ علقمی نے عذر پیش کیا۔

''اگر ایسا ہی تھا تو اب بھی نہ کہتے۔''

''اب پانی سر سے گزر گیا تو کہنا پڑا۔''

یہی وہ لمحہ تھا جب ابنِ علقمی کے پھیلائے ہوئے جال کو توڑنے کے لئے میں نے ایک اور تدبیر کی۔ میرے زیرِ اثر خلیفہ مستعصم بولا۔ ''ہم ابوبکر کو ابھی بلواتے ہیں۔'' یہ ایسی دھمکی تھی کہ ابنِ علقمی کی ''چیں'' بول جاتا اور ایسا ہی ہوا۔

میری توقع کے مطابق ابنِ علقمی پریشان ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ خلیفہ ایک دم بھڑک

اٹھے گا اور ولی عہد ابوبکر کے قید کرنے یا فوری طور پر قتل کرنے کا حکم دے گا۔ یوں اس کی بن آئے گی اور جس کانٹے کو وہ اپنی راہ میں حائل سمجھتا ہے، نکل جائے گا۔ خلیفہ نے بھڑک اٹھنے کی بجائے اس کی تمناؤں کا خون کر دیا۔ ابنِ علقمی جانتا تھا کہ ابوبکر کو اس کی حرکتوں کا علم ہے۔ اگر وہ اس کے سامنے آ گیا تو خلیفہ کو اس سے بدظن کر دے گا۔ یہی سوچ کر اس نے کہا۔

''یہ مناسب نہیں ہے کہ اعلیٰ حضرت، ولی عہد کو اپنے سامنے بلوائیں۔''

''کیوں مناسب نہیں ہے؟''

''اس لئے کہ ولی عہد گستاخی پر نہ اتر آئیں۔'' ابنِ علقمی نے جواب دیا۔

خلیفہ آخر کار کسی قدر جوش میں آ ہی گیا اور بولا۔ ''اگر اس نے ذرا بھی گستاخی کی تو میرا خنجر اس کے سینے میں پیوست ہو گا۔''

''یہ بات میرے لئے بڑی صبر آزما ہو گی۔ میں نے ولی عہد کو اپنی گود میں کھلایا ہے۔'' ابنِ علقمی نے جھوٹی ہمدردی جتائی۔

''لیکن کیا میں نے اسے اسی لئے ناز و نعم سے پالا تھا کہ وہ میرے ہی خلاف ہو جائے!؟''

''ابھی ولی عہد کی عمر ہی کیا ہے، سمجھ جائیں گے۔'' ان الفاظ سے اور ابوبکر کی حمایت لے کر ابنِ علقمی کا مقصد خلیفہ کو مزید غصہ دلانا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ابوبکر سے اس کا آمنا سامنا خلیفہ کے روبرو ہو۔ خلیفہ سمجھ چکا تھا کہ ابنِ علقمی اسے ابوبکر کی طرف سے بہکا رہا ہے۔ مصلحتاً اس نے ابوبکر کو بلوانے پر اصرار نہیں کیا۔ ابنِ علقمی کہنے لگا۔

''محلہ کرخ کے لوگوں میں بڑا اشتعال ہے۔ اعلیٰ حضرت ان نوجوانوں کی رہائی کا حکم دیں جنہیں ولی عہد نے گرفتار کر لیا ہے۔''

آخر وہ مرحلہ آ ہی گیا، مجھے جس کا انتظار تھا۔ خلیفہ سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ ابنِ علقمی کی بات مان لیتا۔ سو میں نے اسے اپنے اثر میں رکھا۔

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ہم مسلک کچھ مفسد نوجوان فساد کرنا چاہتے ہیں۔'' خلیفہ واضح الفاظ میں بولا۔ ''ان فتنہ پردازوں نے کئی بار ایسی حرکتیں کیں جن سے فساد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ان مفسدوں کا سرغنہ شفیق ہے۔ اس نے حسن محمود اور مزید کئی نوجوانوں کے ذریعے جاگیردار یعقوب کا گھر جلا ڈالا۔ خود تمہارے ہم عقیدہ لوگ ان

حقیوں سے نالاں ہیں۔ ابوبکر نے ہم سے اجازت لے کر انہیں گرفتار کیا ہے۔''

خلیفہ معتصم کی اس گفتگو سے ابن علقمی پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ ابوبکر نے خلیفہ کو اس کے متعلق بہت کچھ بتا رکھا ہے۔ اسے یہ یقین تھا وہ خلیفہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرے گا۔ اس کا یقین خاک میں مل گیا۔ اس کے دل میں عداوت نے اس قدر شعلہ مارا کہ وہ خلیفہ کا دشمن ہو گیا۔ اس نے بات ٹالنے کو کہہ دیا۔ ''اعلیٰ حضرت کے حکم سے گرفتاری ہوئی ہے تو ٹھیک ہے۔''

مختصر یہ کہ ابن علقمی ناکام و نامراد قصر خلافت سے واپس ہوا۔ اس کے چہرے پر غصے اور ملال کی ملی جلی کیفیت تھی۔

دراصل مفسدوں کو ابن علقمی پر پورا بھروسہ تھا کہ اس کی وجہ سے کوئی انہیں میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے گا۔ گرفتاری کا تو کبھی انہیں خیال بھی نہ آیا تھا۔ گرفتار ہونے پر انہیں اطمینان تھا کہ ابن علقمی ان کو رہا کرا لے گا۔

ابن علقمی کو بھی یقین تھا کہ اس کے ہوتے کوتوال یا اور کوئی اس کے پٹھوؤں کو کچھ نہ کہے گا۔ جب اس نے سنا تھا کہ ابوبکر نے انہیں گرفتار کر لیا ہے تو اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ اس نے طے کیا تھا کہ پہلے قیدیوں کو رہا کرا لے، پھر ولی عہد سے سمجھ لے گا۔ پھر جب وہ خلیفہ معتصم سے ملنے گیا تو اس کا خیال بدل گیا۔ اس نے شہزادے کی شکایت کر کے اسے راستے ہی سے ہٹانے کا سوچا۔

مجھے ان تمام باتوں کا علم ابن علقمی کا ذہن پڑھ کر ہوا۔ اسے اطمینان تھا کہ خلیفہ بزدل قسم کا آدمی ہے، جب وہ دیکھے گا کہ اس کے ہم مسلکوں میں شورش پیدا ہو گئی ہے تو خلیفہ بلا تاخیر قیدیوں کی رہائی کا حکم دے دے گا۔ پھر جب خلیفہ نے نہ ولی عہد کے خلاف کچھ سنا نہ قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا تو اسے سخت ملال ہوا۔ یہی ملال جوش غصے میں تبدیل ہو گیا۔ میں اس کے تعاقب میں تھی کہ دیکھوں اب وہ کیا کرتا ہے۔ قصر خلافت سے پیچ و تاب کھاتا ہوا وہ اپنے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں اسے جو بھی اپنا ہم عقیدہ ملا اس سے آنکھیں چرا لیں۔ اپنے محل پہنچتے پہنچتے اس کا غصہ اور بڑھ گیا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ ولی عہد ابوبکر اور خلیفہ معتصم دونوں کو شارع عام پر پھانسی دے دیتا اور تخت و تاج حاصل کرنے کے لئے مفسدوں کو قید سے رہائی دلا دیتا تاکہ شہر میں فساد ہو سکے۔ اس عیار

آدم زاد کے سارے منافقانہ منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

ابن علقمی نے اپنے محل نما قصر میں پہنچ کر خلوت کی خاطر اپنے کمرے کا رخ کیا۔ ابھی وہ سنبھل کر بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ ہاجرہ آ گئی۔ ہاجرہ نے اپنے باپ کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور سمجھ گئی کہ کوئی ایسی بات ہے جس نے اسے پریشان کر دیا ہے۔ یوں بھی جب کسی کینہ پرور آدم زاد کو غصہ آتا ہے تو اس کی صورت بڑی کریہہ ہو جاتی ہے۔ ابن علقمی کا چہرہ بھی بگڑ گیا تھا۔

ہاجرہ نے ابن علقمی کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ آپ غصے میں کیوں ہیں؟''

''آج مجھے بڑا بھاری صدمہ ہوا ہے۔'' ابن علقمی نے اپنے دل کا غبار نکالنا شروع کیا۔ ''جن کی سلامتی کے لئے میں نے اپنی جان تک کی بازی لگا دی، جن کی حکومت کے استحکام کی غرض سے میں نے وہ کچھ کیا جو مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا، جنہیں بے فکر رکھنے کے لئے میں ہمیشہ فکر مند رہا...... آج انہوں نے میری توہین کی۔ سخت توہین!''

ہاجرہ نے دریافت کیا۔ ''کس نے توہین کی؟...... کیا توہین کی؟''

''میری بچی! خلیفہ نے میری بات نہیں مانی۔'' ابن علقمی نے یہ کہہ کر نگاہ اٹھائی اور مزید کہنے لگا۔ ''میں سمجھتا تھا کہ عنان حکومت میرے ہاتھ میں ہے، خلیفہ نے مجھے حکمرانی کے پورے اختیارات دے رکھے ہیں۔ میری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا...... لیکن آج......'' ابن علقمی نے ٹھنڈا سانس ابھرا۔ ''آج معلوم ہو گیا کہ میں کچھ بھی نہیں...... میرے اختیارات بھی کچھ نہیں۔ مجھے...... مجھے یہ احساس دلا کر ذلیل ہی تو کیا گیا ہے۔''

''کچھ بتایئے تو...... تفصیل سے بتایئے تو سمجھ میں آئے کیا ہوا ہے۔'' ہاجرہ بولی۔

''ہوا یہ کہ ابوبکر نے شفیق اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا تھا۔'' ابن علقمی بتانے لگا۔ ''کئی دن سوچ بچار کے بعد میں نے اپنی دانست میں ایک راہ نکالی اور خلیفہ سے ملا۔ میں نے خلیفہ کو ابوبکر کے خلاف بھڑکایا۔ انہیں خوف دلایا کہ ولی عہد ابوبکر بغاوت پر آمادہ ہیں۔ خلیفہ کو جیسے میری بات پر یقین ہی نہ آیا۔ جب میں نے اپنے ہم عقیدہ افراد کے مشتعل ہو جانے کا ذکر کیا اور قیدیوں کی رہائی کے لئے سفارش کی تو بھی انہوں نے کوئی خاص اثر نہیں لیا۔ انہوں نے تو یہ کہا کہ ابوبکر نے ان کے حکم سے شفیق وغیرہ کو پکڑا ہے۔''

یہ سن کر ہاجرہ نے قیاس آرائی کی۔ "شاید خلیفہ محترم کو شفیق اور اس کے ساتھیوں کی فتنہ پردازی کا پتہ چل گیا ہوگا۔"

"معلوم نہیں، ان شریف و نیک نوجوانوں کے خلاف خلیفہ کے کان کس نے بھرے ہیں۔"

"شفیق اچھا آدمی نہیں ہے۔" ہاجرہ نے اپنے باپ کے خیال سے اتفاق نہیں کیا اور مزید بولی۔ "وہ لفنگا ہے، اوباش ہے۔ دوسرے فرقے والے تو اسے برا سمجھتے ہی ہیں لیکن ہمارے ہم عقیدہ بھی اسے خبطی اور مفسد جانتے ہیں۔ شہزادوں کو اس کی اور اس کے ساتھیوں کی ایک ایک حرکت معلوم ہے۔ انہوں نے خلیفہ کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔"

ابن علقمی نے کہا۔ "یہ حرکت ابوبکر کی ہے..... اس ابوبکر کی حرکت جس کی میں بڑی عزت کرتا تھا، جسے میں بیٹے کی طرح چاہتا تھا اور جسے اپنی فرزندی میں لینے کو تیار تھا، اسی نے خلیفہ کے کان بھرے۔ اب مجھے ابوبکر اور خلیفہ سے نفرت ہوگئی ہے۔"

"ایسا نہ سوچئے ابو!" ہاجرہ نے اپنے باپ کو سمجھایا۔ "خلیفہ ہمارے ولی نعمت ہیں اور خلیفہ زادے ہمارے آقا ہیں۔ آپ وزیر اعظم ہیں۔ یہ عہدہ خلیفہ کے بعد سب سے بڑا ہے۔ سچ پوچھیں تو خلیفہ برائے نام ہیں۔ حکومت آپ کر رہے ہیں..... حکومت ہمارے گھر میں ہے۔ ہمیں اور کیا چاہئے!"

"بیٹی!" ابن علقمی نے پھر آہ بھری۔ "خلیفہ کے برتاؤ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ انہوں نے میرا کہا نہیں مانا، شفیق اور اس کے ساتھیوں کو رہا نہیں کیا۔ میں نے شفیق کو یہ اطمینان دلایا تھا کہ کوئی اس پر ہاتھ نہیں رکھ سکتا۔ وہ قید خانے میں امید لگائے بیٹھا ہوگا کہ میں اسے رہائی دلانے آؤں گا..... بلکہ آ ہی رہا ہوں گا..... مگر اب اس کی امید نہیں رہی۔ اپنے ہم عقیدہ لوگوں کو میں کیا منہ دکھاؤں گا۔"

"شفیق اور اس کے ساتھی رہا ہو سکتے ہیں ابو!" ہاجرہ بول اٹھی۔

ابن علقمی نے حیرت سے ہاجرہ کو دیکھا اور سوال کیا۔ "کیسے؟"

"اگر خلیفہ زادے ابوبکر کو یہ یقین دلایا جائے کہ شفیق اور اس کے ساتھی آئندہ کوئی نامناسب حرکت نہیں کریں گے تو وہ انہیں لازماً رہا کر دیں گے۔" ہاجرہ نے جواب دیا۔

"گویا میں، ابوبکر کی خوشامد کروں؟"

"آپ کیوں خوشامد کریں ابا..... میں خود ان سے کہوں گی۔"

"تیری بات مان لیں گے وہ؟"

"مجھے یقین ہے مان لیں گے۔" ہاجرہ کے لہجے میں اعتماد تھا۔

"مگر بات وہی ہوئی کہ ہم ان کی طرف دیکھیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں وہ ہماری طرف دیکھیں۔"

"اور وہ آپ ہی کی طرف دیکھتے ہیں۔" ہاجرہ نے کہا۔ "میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ جو عروج ہمارے خاندان کو حاصل ہوگیا ہے وہ بہت ہے، حقیقت میں آپ حکمران ہیں۔"

"آج تک میں بھی اسی مغالطے میں رہا مگر اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ میں نے طے کرلیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے!"

"کیا طے کیا ہے آپ نے؟" ہاجرہ نے وضاحت چاہی۔

"آج کل تاتاریوں کا دور ہے۔" ابن علقمی کے ذہن میں جو تھا، بتانے لگا۔ "تاتاریوں کا سیلاب جس ملک کا رخ کرتا ہے اسے تباہ کر دیتا ہے۔ اس وقت چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں، تاتاریوں کا سردار ہے۔ میں اسے عراق پر حملے کی دعوت دوں گا۔"

اپنے باپ کی بات سن کر ہاجرہ کانپ گئی۔ اس نے تاتاریوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ انہیں بے رحم و وحشی سمجھتی تھی۔ اسی بنا پر وہ بولی۔ "ایسا نہ سوچئے، خدانخواستہ وحشی تاتاری، عراق پر چڑھ دوڑے تو سارا ملک تباہ ہو جائے گا، پھر کچھ بھی نہیں بچے گا۔ ہماری تہذیب مٹ جائے گی اور مسلمان خطرے میں پڑ جائیں گے۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز یہی تو ہیں۔ کیا ہم خود ہی تباہی کو آواز دیں اور کیا خود ہی اپنے پیروں پر کلہاڑی ماریں؟"

ہاجرہ کی مدلل باتوں کا ابن علقمی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ہاجرہ پُر جوش تھی۔ سو وہ بھی جوش میں آ کر کہنے لگا۔ "ملک میں انقلاب آئے، خون کی ندیاں بہہ جائیں، عراق برباد ہو جائے، مسلمانوں کا یہاں نام و نشان مٹ جائے، ہماری تہذیب پامال کر دی جائے، مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں..... مجھے اس سے کیا! میں اپنی توہین کا بدلہ لوں گا۔ میرا نام مؤید الدین ہے اور میں علقمی کا بیٹا ہوں، میں ہر بات گوارا کرسکتا ہوں لیکن اپنی ذلت برداشت نہیں کرسکتا!"

''اس وقت آپ غصے اور جوش میں کہہ رہے ہیں نہیں کہنا چاہئے۔'' ہاجرہ نے اپنے عیار باپ کو سمجھایا۔ ''اگر عراق کو تباہ کر دیا گیا، بغداد نہ رہا، یہاں رہنے بسنے والے برباد ہو گئے، مارے گئے تو کیا ہم بچ جائیں گے؟''

ابن علقمی بولا۔ ''میں تاتاریوں سے معاہدہ کر لوں گا، میرا خاندان بچ جائے گا اور میں عراق کا بادشاہ بن جاؤں گا۔''

ہاجرہ نے بحث کی۔ ''یہ کس طرح ممکن ہے! جب تاتاری تلوار کے زور سے عراق فتح کریں گے تو اسے آپ کے سپرد کیسے کر دیں گے؟''

''میں تجھے بتا تو چکا ہوں کہ ان سے پہلے ہی اس سلسلے میں معاہدہ کر لوں گا، ان سے عہد لے لوں گا۔''

''وحشیوں کے عہد و اقرار کا اعتبار ہی کیا۔ اگر وہ اپنے عہد سے پھر گئے تو انہیں عہد کی پاسداری پر کون مجبور کرے گا؟''

اس پر ابن علقمی نے کہا۔ ''اول تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے عہد پر قائم رہیں گے اور اگر انہوں نے عہد شکنی کی تو میں انہیں بھی نیست و نابود کر دوں گا۔''

''یہ مشکل ہوگا ابا! مجھے اندیشہ ہے کہ وہ ملک پر قبضہ کر لینے کے بعد آپ کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہ کریں گے۔''

''بیٹی! تو میری طبیعت سے واقف نہیں ہے، اگر وہ ذرا بھی بے رخی کریں گے تو میں عراق میں ان کی قبریں بنوا دوں گا۔ عراق ان حملہ آور تاتاریوں کا قبرستان بن جائے گا۔'' ابن علقمی ڈینگیں مارتا رہا۔

''نہیں، ایسا سوچئے بھی مت۔ عراق اور عراقی دونوں عذاب میں گرفتار ہو جائیں گے، عرب قوم کو نقصان پہنچے گا۔''

''جب قوم نے میرے کہنے پر عمل نہیں کرنا تو مجھے اس سے کیا ہمدردی۔ تباہ ہوتی ہے تو ہو جانے دو۔''

''آپ اس قدر سخت مزاج کیوں ہو گئے ہیں؟''

''اس لئے کہ انقلاب ہی سے تقدیریں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ بغداد والوں نے انقلاب نہیں دیکھا، انہیں دیکھنا چاہیے۔!...... مگر تو نہیں چاہتی تو...... تو میں بھی کوئی قدم نہیں اٹھاتا، جلدی نہیں کرتا۔''

''ہاں ابو، میں نہیں چاہتی...... ایسا انقلاب نہیں چاہتی جو ہیبت ناک ہو۔''

''اطمینان رکھ، میں ابھی کچھ نہیں کروں گا۔'' ابن علقمی نے ہاجرہ کو یقین دلایا۔ اگر اس کی کوئی کمزوری تھی تو ہاجرہ ہی تھی۔ وہ ہاجرہ کو بہت چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے وقتی طور پر ہی سہی، ہاجرہ کی بات مان لی۔ میری توجہ اس کے ذہن پر تھی۔ وہ عیار آدم زاد دہری چال چل رہا تھا۔ ایک طرف اس نے اپنی بیٹی کو مطمئن کر دیا، دوسری جانب وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے یہ باتیں ہاجرہ کے سامنے نہیں کرنی تھیں۔ اس نے ہاجرہ کو جھوٹی تسلی دی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہاجرہ اس کے خیالات کا کسی سے اظہار نہ کر دے۔ جو کچھ اس نے ہاجرہ سے کہا، وہی سچ تھا۔ ہاں ہاجرہ ضرور مطمئن ہوگئی کہ اس کا باپ تاتاریوں کی صورت میں عراق کو تباہی سے دوچار نہیں کرے گا۔ آدم زادیاں بڑی جلدی بہل جاتی ہیں۔

اس رات ابن علقمی کو نیند نہ آئی۔ میں اس کی نگرانی اس لئے کر رہی تھی کہ اگر ممکن ہو تو اسے کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے روک دوں۔ وہ رات بھر پیچ و تاب کھاتا رہا، سوچتا رہا کہ خلیفہ مستعصم، ولی عہد ابوبکر اور دوسرے شہزادوں کو کس طرح فنا کے گھاٹ اتارے۔ اپنے ہم مسلکوں کو کیا سزا دے جنہوں نے اس کا کہا نہیں مانا اور فساد میں حصہ نہیں لیا۔ اس کے خیال میں بڑے پیمانے پر اس وقت فرقہ وارانہ فساد ہو سکتا تھا جب یعقوب جاگیردار کے گھر کو آگ لگائی گئی تھی۔

سوچتے سوچتے وہ اسی نتیجے پر پہنچا کہ تاتاریوں کو عراق پر حملہ کرنے کی دعوت دے۔ تاتاریوں نے خراسان (ایران) پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ بڑے وحشی، سنگ دل اور بے رحم تھے۔ کچھ دن پہلے جب میں عارج کے ساتھ ایران گئی تھی تو میری خواہش تھی کہ ہلاکو خاں کو قریب سے دیکھوں، مگر عارج نے ایسا نہ ہونے دیا۔ اس کی مرضی تو یہ تھی کہ میں آدم زادوں کے کسی چکر میں نہ پڑوں۔ یوں گویا وہ مجھے صرف سیر و سیاحت تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔

عارج نے سفر ایران ہی کے دوران مجھ سے کہا تھا، اے دینارا تو اب اس حد تک ان آدم زادوں کے معاملات میں دلچسپی لینے لگی ہے کہ مجھے اندیشہ ہے، کہیں انہی کی ہو کے نہ

رہ جائے اور میں تاپا ہی رہ جاؤں۔“

بہر حال مجھے عارج کی خوشی عزیز تھی۔ اسی سبب آدم زادوں کی بستیوں کا رخ نہیں کیا۔ اس کے باوجود تاتاریوں کے بارے میں مجھے بہت کچھ معلوم تھا۔ قتل و غارت گری ان کی سرشت میں تھی۔ ہلاکو خاں ظالم و جابر آدم زاد تھا۔ وہ آدمیوں کو مٹی کے ایسے کھلونے سمجھتا تھا جنہیں کسی بھی وقت توڑا جا سکتا تھا۔ خون ریزی اور تباہی سے وہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ ہلاکو خاں کی سفاکی و بے رحمی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب وہ کسی بات پر ملول ہوتا تو اسے خوش کرنے کے لئے انسانی جانوں کی قربانی دی جاتی۔ دشمن قیدیوں کو اس کے سامنے لایا جاتا اور ان کے سر قلم کر دیئے جاتے۔ آدم زادوں کی کٹی ہوئی گردنیں جب زمین پر گر کر اچھلتیں تو ہلاکو خاں یہ ہولناک منظر دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگتا۔

جو لوگ بے رحم و سفاک ہوتے ہیں، وہ بے مروت اور بد عہد بھی ہوتے ہیں۔ ظالم تاتاریوں کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ ان میں نہ مروت تھی نہ عہد کی پاسداری۔ وہ حسن اور دولت کے بھوکے تھے۔ ان کے حصول کی خاطر وہ ہر انسانی قدر پامال کر دیتے۔ ان تمام باتوں کے باوجود عربوں کا لوہا مانتے تھے اور مسلمانوں سے ڈرتے تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے عراق کا رخ نہیں کیا تھا۔ ابن علقمی نے عباسی خلیفہ مستعصم سے انتقام لینے کے لئے انہی تاتاریوں کو منتخب کیا تھا۔

رات بھر جاگنے کے بعد صبح جب وہ سو کر اٹھا تو اس کے چہرے کی نحوست میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی الو جیسی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ ضروریات سے فارغ ہوا تو ہاجرہ آ گئی۔

”لگتا ہے کہ رات کو آپ سوئے نہیں، کچھ تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔ کیا بات ہے؟“ ہاجرہ نے پوچھا۔

”کوئی خاص بات نہیں۔“ ابن علقمی نے جواب دیا، پھر کہنے لگا۔ ”آج تو جلدی کیسے اٹھ گئی؟ تو تو ایک پہر دن چڑھے تک سوتی ہے۔“

”دراصل ایک ہولناک خواب دیکھ کر فرط خوف سے میری چیخ نکل گئی۔“ ہاجرہ نے بتایا۔ ”چیخ کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو صبح ہو چکی تھی۔ میں کچھ دیر لیٹی رہی مگر دوبارہ نیند نہیں آئی۔ آخر اٹھ بیٹھی۔“

ابن علقمی نے سوال کیا۔ ”کیا خواب دیکھا ہے تو نے؟“

”میں نے دیکھا کہ کچھ عجیب شکل و صورت کے لوگ فصیل شہر کے باہر جمع ہیں۔“ ہاجرہ بیان کرنے لگی۔ اس کی آواز میں خوف کا تاثر تھا۔ ”دور دور تک پھیلے ہوئے یہ عجیب چہروں والے شہر میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بغداد کے باشندے پریشان ہیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اجنبی فصیل پر چڑھ آئے اور شہر میں کود گئے انہوں نے اک سرے سے قتل عام شروع کر دیا۔ مردوں، عورتوں اور بچوں سب کو وہ مارنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ اسی وقت خون کا دریا موجیں لیتا ہوا بڑھا اور میں اس میں گر گئی۔ میں مدد کے لئے چلائی، آپ مجھے خون کے دریا میں ڈبکیاں لگاتے نظر آئے اور...... اور......“

”آگے بتا، تو نے اور کیا دیکھا؟ خوابوں سے ڈرتے نہیں۔“ ابن علقمی بول اٹھا۔

”میں نے مدد کے لئے آپ کو پکارا۔“ ہاجرہ اپنے باپ کی حوصلہ افزائی پر کہنے لگی۔ ”میری آواز سن کر آپ میری طرف چلے لیکن ایک موج نے آپ کو مجھ سے دور پھینک دیا...... پھر ایک خوفناک صورت آدمی میری طرف بڑھا۔ اسے دیکھ کر میرا رواں رواں کانپنے لگا۔ بے اختیار میری چیخ نکل گئی اور میں جاگ اٹھی۔ میں کانپ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میرا دل قابو میں آیا۔“

اس پر ابن علقمی ہنس کر بولا۔ ”خواب ایک قسم کا خیال ہوتا ہے۔ تو نے کل مجھ سے تاتاریوں کے بارے میں باتیں سنی تھیں، تجھے انہی کا خیال رہا اور خیال رات کو خواب بن کر نظر آ گیا۔“

”کیا تاتاری خوفناک صورت کے آدمی ہیں؟“ ہاجرہ نے ابن علقمی سے معلوم کیا۔

”نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ وہ بھی ہماری طرح ہیں البتہ وحشی اور سفاک ضرور ہیں۔“

”مجھے خوف ہے ابو کہ بغداد میں خون کا دریا نہ بہہ جائے۔“

”ایسا نہیں ہو گا بیٹی!“ ابن علقمی نے ہاجرہ کو خوفزدہ دیکھ کر جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔ ”تو بالکل نہ گھبرا، میں ہرگز تاتاریوں کو عراق پر حملے کی دعوت نہیں دوں گا، مجھے گوارا نہیں کہ میرا وطن تباہ ہو۔“

ہاجرہ اپنی ہی کیفیت بیان کرتی رہی۔ ”جب سے میں نے خواب دیکھا ہے، میرا دل ہول رہا ہے۔“

"خوف نہ کر میری بچی، جب تک میں ہوں کچھ نہ ہوگا...... اچھا آج تو مجھے اپنا گانا تو سنا!" ابن علقمی نے بات کا رُخ بدل دیا۔ اپنی کنیزوں کو طلب کر کے ساز لانے کا حکم دیا۔ کنیزیں حکم سن کر چلی گئیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب رقص و موسیقی بغداد کی تہذیب کا حصہ تھی۔ گانے بجانے کو معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ ہر طبقے کی آدم زادیاں باقاعدہ ناچ گانے کی تربیت حاصل کرتیں۔ رقص و سرود کی محفلیں جمتیں اور اسی میں شب و روز گزرتے رہتے۔ امیروں، رئیسوں اور وزیروں کی بیگمات اور لڑکیاں بھی ناچ گانے میں طاق ہوتیں۔ گھر گھر محفلِ نشاط منعقد ہوتی۔ بغداد ہی نہیں بلکہ تمام عراق سرمستی اور عیش میں مبتلا تھا۔ حکمرانِ وقت بھی تو اسی رنگ میں رنگا تھا، پھر عام آدمیوں پر اس کا اثر کیسے نہ ہوتا۔ وزیرزادی ہاجرہ بھی اسی ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ سو وہ بھی نغمہ سوز آشنا تھی۔ بڑوں کے سامنے ناچنے گانے کو عورتیں اور لڑکیاں برا خیال نہ کرتی تھیں، بلکہ بزرگ ان کے اس "مہذب شوق" کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ابن علقمی بھی ایسے ہی "بزرگوں" میں شامل تھا۔

یہ سب کچھ ایک دن میں نہیں ہو گیا تھا بلکہ اس میں صدیاں لگی تھیں۔ ساری خرابی حدود میں نہ رہنے کی ہے اور حد سے گزر جانا تو آدم زادوں کی فطرت ہے۔ انتہا پسندی نے انہیں کہیں کا نہ رکھا حالانکہ دینِ فطرت اسلام نے ان آدم زادوں کو اعتدال کی راہ اپنانے کا سبق دیا تھا مگر انہوں نے یہ سبق بھلا دیا۔ جو قومیں بھول جانے کے مرض میں مبتلا ہو جاتی ہیں انہیں دنیا بھی بھلا دیتی ہے۔ میں وعظ نہیں کہہ رہی، مگر حقیقت یہی ہے۔"

تھوڑی دیر میں کئی کنیزیں ساز لے کر آ گئیں۔ انہوں نے ساز درست کیے، سُر ملائے اور ہاجرہ نے گانا شروع کیا۔ اس کی آواز نہایت سریلی اور میٹھی تھی۔ گاتے گاتے معاً وہ کھڑے ہو کر رقص کرنے لگی۔ بے غیرت ابن علقمی دیکھتا اور داد دیتا رہا۔

ہاجرہ کے بعد ایک نوخیز کنیز نے گانا شروع کیا۔ ابن علقمی کو نیند آنے لگی۔ وہ صوفے میں گویا سما گیا اور کچھ دیر میں سو گیا۔ ہاجرہ اور کنیزیں آہستہ سے اٹھ کر چلی گئیں۔ میں اسی کے قصر میں رہی۔ مجھے اس عرصے میں ولی عہد ابوبکر اور اس کی محبوب فردوس کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ ان کی بھی خیر خبر لے لوں، پھر واپس یہیں آ جاؤں گی۔

بغداد پر جو کچھ گزرنے والی تھی، اس مصیبت کا تعلق ابن علقمی سے تھا۔ میرا قیاس یہ تھا

کہ ابن علقمی خاموش بیٹھنے والا نہیں۔

یہاں میں ایک اور بات واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ اپنی تمام تر جناتی صفات اور پراسرار قوتوں کے باوجود میری بھی کچھ حدود تھیں۔ میرے لئے ان حدود سے تجاوز ممکن نہیں تھا۔ عالم سوما نے مجھے یہی نصیحت کی تھی۔

عالم سوما نے کئی صدی پہلے مجھ سے کہا تھا۔ "اے دینار! تو اس بات کو گرہ سے باندھ لے کہ آدم زادوں کو ہم جنات پر برتری حاصل ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ کوئی آدم زاد تجھ سے تیری تمام تر جناتی صفات اور پراسرار قوتیں چھین لے۔ تجھے اپنا مطیع بنا لے۔ سو آدم زادوں کے درمیان رہتے ہوئے حدود سے تجاوز نہ کر...... میں تجھے بتاتا ہوں کہ تیری حدود کہاں تک ہیں!"

دیر تک عالم سوما مجھے سمجھاتا رہا اور میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سنتی رہی۔

"جو کچھ ہوتا ہے، تو اسے نہیں بدل سکتی۔ سو بہتر ہے کہ مستقبل میں جھانک لیا کر...... تو اس طرح اپنی حدود سے واقف ہوتی رہے گی کہ تیرے اختیار میں کیا ہے اور کہاں تک تو بے اختیار ہے!...... میں تجھے اس کی مثالیں دیتا ہوں...... یہ بڑا نازک معاملہ ہے۔ اسے جنات تو کیا بہت سے آدم زاد بھی نہیں سمجھتے، تو سن پہلی مثال......" عالم سوما کہتا رہا۔

جب وہ خاموش ہوا تو اس سے میں نے عہد کیا کہ کبھی اپنی حدود سے تجاوز نہیں کروں گی۔ عالم سوما سے میں نے جو عہد کیا تھا، اب بھی اسی پر قائم تھی۔ اس نے میری ہی بھلائی اور بہتری میں مجھے سمجھایا تھا۔

✿......✿

ولی عہد ابوبکر کے اس قصر کا مجھے علم تھا جہاں اس نے اپنی محبوبہ فردوس کو ٹھہرایا تھا۔ اس کے ساتھ فردوس کا باپ یعقوب جاگیردار اور ماں زبیدہ بھی تھی۔ ابوبکر نے اب تک فردوس کو اپنی اصلیت سے آگاہ نہیں کیا تھا، اس خوف سے کہ کہیں فردوس اس کی حیثیت اور مرتبے کی وجہ سے بدک نہ جائے۔ فردوس اسے ہیثم کے نام ہی سے جانتی پہچانتی تھی۔

فردوس کو وہ قصر جو ابوبکر نے اسے رہنے کو دیا تھا، بہت پسند آیا۔ وہ قصر بہت کشادہ اور وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس میں دو باغیچے تھے۔ ایک باغ تھا، دونوں باغیچوں میں دو فوارے تھے اور ایک فوارہ عمارت کے بڑے صحن میں تھا۔

اس بات سے فردوس بہت خوش تھی کہ اس کے والدین نے بھی ہیثم (ابوبکر) کو پسند کر لیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ہیثم جلدی سے پیغام دے دے۔ اس روز جب میں وہاں پہنچا تو فردوس ایک باغیچے کے فوارے کے پاس مجھے کھڑی دکھائی دی۔ چہرے سے اس کی اندرونی مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ معاً میں چونک اٹھی۔ میرے چونک اٹھنے کی وجہ عارج کے وجود کی مخصوص خوشبو تھی۔

''اے دینار! تو کہاں ہے؟'' عارج مجھ سے مخاطب ہوا۔

''جہاں تُو ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لگتا ہے کہ شاید یہاں نجمہ آنے والی ہے یا آ چکی ہے۔''

''تو کیا ہوا؟...... آنے دے۔''

''ہوا تو کچھ نہیں، لیکن میں اب یہ سوچنے لگی ہوں کہ تُو اس آدم زادی پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو گیا ہے، کہیں تیرا ارادہ......''

عارج نے میری بات کاٹ دی۔ ''میرا ارادہ صرف اتنا ہے کہ تُو نجمہ کے جسم میں اتر جا اور میں، احمر کا قالب اپنا لوں۔ تُو نے مجھ سے خود ہی تو وعدہ کیا تھا کہ کوئی مناسب موقع اور

وقت دیکھ کر نجمہ کا قالب اپنا لے گی۔''

''پہلی بات تو یہ سن کہ ابھی نہ اس کا موقع ہے نہ وقت۔ دوسرے یہ کہ اس سے نی ایسا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں اگر نجمہ کے جسم کو اپنا بھی لوں تو ہم دونوں الگ ہی الگ رہنے پر مجبور ہوں گے۔'' میں نے عارج کو سمجھایا۔

''کیوں، کیا ہم ایسے حالات پیدا نہیں کر سکتے کہ نجمہ اور احمر کی شادی ہو جائے؟''

''اے عارج! تُو بڑا بے خبر ہے۔ تجھے نہیں معلوم کہ خلیفہ معتصم کیا چاہتا ہے۔''

''خلیفہ کیا چاہتا ہے، اس کا نجمہ سے کیا تعلق؟''

''نجمہ کا تعلق حکمران عباسی خاندان سے ہے۔ تجھے یہ تو پتہ ہے، مگر غالباً اس کا اندازہ نہیں کہ حکمران خاندان کے تمام ایسے فیصلوں کا اختیار صرف خلیفہ کو ہے۔'' میں نے عارج کو بتایا۔ ''خلیفہ اپنے ولی عہد ابوبکر کی شادی نجمہ سے کرنے کے حق میں ہے۔''

''تو کیا ابوبکر اس پر راضی ہے؟'' عارج نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وجہ فردوس کی صورت میں تیرے سامنے ہے۔''

''یہ تو بڑی مشکل میں پھنس گیا میں!...... تجھ سے آخر کب تک دور دور رہوں؟...... مجھے اکثر وہ زمانے یاد آتے ہیں جب ہم دونوں انسانی قالبوں میں رہتے تھے اور...... اور تُو وقتی طور پر ہی سہی میری بیوی بن جاتی تھی۔''

''بھول جا ان زمانوں کو اے عارج! یہ اور زمانہ ہے، مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ عباسی خلافت کا یہ آخری دور ہے۔ اب چل چلاؤ ہے۔ تُو بھی جانتا ہے اور میں بھی کہ وہ سلطنت جو زمین کے بڑے حصے پر پھیلی ہوئی تھی، اب سمٹ سمٹا کر صرف اس خطہ ارض عراق تک رہ گئی ہے...... اور عراق تو کیا، عباسی خلیفہ معتصم کو دارالخلافہ بغداد تک کے بارے میں پتہ نہیں کہ یہاں کیا سازشیں ہو رہی ہیں۔ ہے نا یہ رنج کی بات؟''

''تیرے لئے رنج کی بات ہوگی، میرے لئے نہیں۔'' عارج نے بلا جھجک کہہ دیا۔

''کیوں؟''

''اس لئے اے دینار کہ یہ سب ان آدم زادوں ہی کے اعمال کا نتیجہ ہے۔''

''ہاں یہ تُو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ روز بہ روز بغداد کے حالات بگڑتے جا رہے ہیں۔'' میں بولی۔ (بہ کیونکہ فارسی ہے اور دن ہندی لفظ ہے اس لئے روز بہ روز لکھنا ہی درست

ہے۔ دن بہ دن لکھنا غلط ہے۔ مصنف)

"چھوڑ اے دینار، آدم زادوں کے ان قصوں کو۔" عارج کہنے لگا۔ "اللہ کی زمین بہت بڑی ہے، ہم کہیں بھی رہ بس لیں گے۔ ضروری تو نہیں کہ ہم بغداد ہی میں رہیں!"

"میں ہرگز تیرے ورغلانے میں نہیں آؤں گی۔" میں نے کہا۔ "تو مجھے بہلا پھسلا کر ایران (خراسان) لے گیا اور یہاں فرقہ وارانہ فساد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ فردوس کا گھر جلا دیا گیا۔"

"تو بغداد میں ہوتی تو کیا اس آدم زادی فردوس کے گھر کو جلانے والے شر پسندوں سے نمٹ لیتی؟..... روک دیتی انہیں؟"

"کچھ تو کرتی۔"

"اچھا ایک بات بتا۔"

"پوچھ۔"

"یہ جو آدم زادی ہمارے سامنے مست و بے خودی کھڑی ہے، تجھے کیسی لگتی ہے؟" عارج نے سوال کیا۔

"فردوس کے بارے میں پوچھ رہا ہے تُو؟..... اچھی ہے۔ لیکن تُو یہ بات کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"حُسن و جمال، نزاکت اور جلوہ نمائی میں یہ آدم زادی بھی مجھے نجمہ سے کسی طرح کم دکھائی نہیں دیتی۔"

"تو بڑا ہی چلتو ہے اے عارج!" میں ہنس پڑی۔ "پہلے تُو نجمہ کے قصیدے پڑھتا تھا اور اب....."

"اس کا سبب ہے اے دینار!" عارج نے کہا۔ "نجمہ کا معاملہ تو کھٹائی میں پڑ گیا، مگر مجھے ابوبکر اور اس کے مہ وش کا عشق رنگ لاتا معلوم ہوتا ہے۔ نجمہ کی بجائے اگر تُو فردوس کا پیکر بھی اپنا لے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"یعنی تُو اس طرح ولی عہد سلطنت بننے کے خواب دیکھ رہا ہے؟"

"کیا مضائقہ ہے؟..... اگر ولی عہد ابوبکر کی شادی فردوس کے ساتھ ہو جائے تو ہمارا مسئلہ بھی حل ہو جائے۔ اسی طرح ہم دونوں صدیوں بعد پھر سے ایک دوسرے کے ساتھ

رہنے لگیں گے..... میاں بیوی بن کر!"

"لیکن میں اس کے لئے اپنی آزادی کا سودا نہیں کروں گی۔"

"یعنی؟..... بتا مجھے کہ تُو کیا چاہتی ہے؟"

"تُو مجھے مستقلاً فردوس کے قالب میں رہنے کو مجبور نہیں کرے گا۔"

"چل منظور!" عارج فوراً راضی ہو گیا۔ "کر بسم اللہ!..... اُتر جا اس حسین پیکر میں!"

"ابھی؟..... اسی وقت؟"

"ہاں، یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ تجھے اس آدم زادی کے قالب میں قرار بھی آتا ہے یا نہیں!"

عرصہ دراز سے میں نے کوئی انسانی پیکر نہیں اپنایا تھا اور فردوس کا جسم تھا بہت خوبصورت۔ اس تغیر پر آمادہ ہو گئی۔ عارج کو چھوڑ کر میں، فردوس کے پاس پہنچ گئی جو اس وقت گنگنا رہی تھی۔ میں دوسرے ہی لمحے فردوس کے قالب میں اتر گئی۔ وہ بس چند ہی لمحے تھے کہ جب مجھے قدرے گھٹن کا احساس ہوا، پھر میں اعتدال پر آ گئی۔

"کیا ہوا اے دینار! تو خیریت سے تو ہے نا؟" عارج نے میرے پاس آ کر پوچھا۔

"کیسی خیریت؟ میں تو اس قالب میں قید ہو گئی۔ کوشش کر رہی ہوں کہ اس سے باہر آ جاؤں، مگر یہ ممکن نہیں لگتا۔" میں نے دانستہ غلط بیانی کی۔ مقصد عارج کا ردعمل دیکھنا تھا۔

"یہ..... یہ تو بہت برا ہوا اے دینار!" عارج فکرمند ہو گیا۔ "میں ابھی بابل کے کھنڈرات میں عالم سوما سے جا کر ملتا ہوں۔ وہ..... وہ یقیناً اس مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ضرور....."

میں نے اس مذاق کو زیادہ طول نہ دیا اور ہنس پڑی۔ "میری تو جان نکال دی تُو نے..... اور اب دانت نکال رہی ہے!..... اب اگر کبھی تُو واقعی کسی ابتلا میں مبتلا ہو گئی تو میں یہی سمجھوں گا کہ ٹھٹھول کر رہی ہے۔" عارج کہنے لگا۔ "اچھا میں چلا۔"

"کہاں؟"

"ولی عہد ابوبکر کی تلاش میں۔ مجھے بھی تو اس کے قالب کو اپنا گھر بنانا ہے۔" عارج نے جواب دیا۔

"اور اگر تیرے وجود کو ابوبکر کے پیکر میں قرار نہ آیا تو؟"

"تو پھر تجھے بھی فردوس کے قالب کو چھوڑنا پڑے گا۔" عارج نے شرط لگائی۔

"کوئی زبردستی ہے کیا!..... میں کسی بھی انسانی پیکر میں رہوں!"

''ٹھیک ہے، رہ!..... میں کسی بھی رات کو جب تُو محوِ خواب ہو، تجھے اٹھا کر لے جاؤں گا۔ تیری آنکھ کھلے گی تو پوچھے گی، ارے یہ میں کہاں آ گئی؟......اور تجھے اس مقبرے سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملے گا۔''

''یہ تُو کیا بکواس کرنے لگا؟..... یہ مقبرہ کہاں سے آ ٹپکا؟''

''میں نے سنا ہے سرزمین مصر پر فراعنہ کے کچھ ایسے مقبرے بھی ہیں جن میں کوئی بھی داخل ہو جائے تو نکل نہیں سکتا۔ خواہ وہ جنات ہی کیوں نہ ہوں! جب تُو ساتھ ہو گی اے دینار، تو پھر باہر نکلنے کی ضرورت ہی نہ ہو گی۔''

مصر کے ذکر پر مجھے عفریت دہموش یاد آ گیا۔ وہ بغداد سے مصر ہی کے کسی شہر میں گیا تھا اور پھر نہیں پلٹا۔ معلوم نہیں وہ مجھے اب تک بھولا تھا یا نہیں۔ اس بنا پر مجھے ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود اس عفریت کی طرف سے کھٹکا سا لگا رہتا تھا۔ اس عفریت کے ساتھ ہی مجھے اپنے بڑے بھائی یوسف کی بھی یاد آئی۔ وہ بھی مصر ہی میں جا بسا تھا اور وہیں کسی جن زادی سے شادی کر لی تھی۔

''کن خیالوں میں کھو گئی تُو؟..... بول، چلے گی میرے ساتھ مصر؟''

''تُو شاید اس عفریت کو بھول گیا ہے اے عارج جو تیری جان لینا چاہتا تھا۔ دوستوں کو تو بھلا بھی دیا جاتا ہے مگر دشمنوں کو کوئی نہیں بھولتا۔ وہ ظالم و طاقتور عفریت تیرا ہی نہیں، میرا بھی دشمن تھا۔''

''اس بدبخت کا ذکر چھیڑ کر مجھے تُو کیوں ڈرا رہی ہے! اب تو مر مرا گیا ہو گا وہ!...... صدیاں گزر گئیں۔''

''اس غلط فہمی میں نہ رہ عارج! ہم زندہ ہیں تو وہ کیوں زندہ نہ ہو گا'' یہ کہتے ہوئے جانے کیوں میرے وجود میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔

اسی لمحے میں نے اپنے عقب میں کسی کے قدموں کی چاپ سنی مگر دانستہ مڑ کر نہیں دیکھا۔ عارج بھی غائب ہو گیا۔ وہ مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ ولی عہد ابوبکر کی تلاش میں جا رہا ہے۔ لیکن یوں بات ادھوری چھوڑ کر جانے کی وجہ اور تھی۔ ذرا ہی دیر میں یہ ''وجہ'' بلکہ حسین ''وجہ'' میرے سامنے بھی آ گئی۔ اس نے پیچھے سے میرے انسانی قالب فردوس کی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے تھے۔ میں نے ان نازک ہاتھوں کو ٹٹولا۔ اس آدم زادی کو

میں پہچان تو گئی تھی، مگر کہا یہی۔ ''میں نہیں بتا سکتی تم کون ہو؟''

اس نے میری آنکھوں سے ہاتھ اٹھا لئے اور میں نے گھوم کر دیکھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ نجمہ ہی تھی۔ اس کی آمد پر میں نے بحیثیت فردوس خوشی کا اظہار کیا۔ نجمہ بہرحال ایک شہزادی اور فردوس ایک جاگیردار کی بیٹی تھی۔ دونوں کے درمیان بڑا فرق تھا۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ نجمہ نے بے وجوہ فردوس کو اپنی سہیلی بنا لیا۔ (وجہ کی جمع وجوہ ہے اور وجوہات جمع الجمع ہے۔ سو جمع کی جگہ جمع الجمع لکھنا غلط ہے۔ اسی طرح کئی دیگر الفاظ کی جمع بھی غلط لکھی جاتی ہے، مثلاً حکم کی جمع احکام ہے، احکامات لکھنا درست نہیں۔ جوہر کی جمع جواہر اور نادر کی جمع نوادر ہے۔ اس کی بجائے علی الترتیب جواہرات اور نوادرات بطور جمع نہیں لکھنا چاہئے۔ مصنف)

''کیا بات ہے جو تم اس قدر خوش نظر آ رہی ہو؟'' نجمہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

اس کا صحیح جواب مجھے معلوم تھا، مگر دانستہ گریز کیا اور بولی۔ ''کوئی خاص بات نہیں، ٹھنڈی ہوا اور فرحت افزا فضا نے میری طبیعت کو مسرور کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قصر میں آ کر دنیا مجھے کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہے۔''

''دنیا تو خیر وہی ہے البتہ تم ضرور بدل گئی ہو۔'' نجمہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اور تم کہو تو میں اس تبدیلی کا سبب بتا دوں؟''

''ہاں بتاؤ۔'' میں نے کہہ دیا۔

''ہیثم نے تمہارے خاندان سے جو ہمدردی کی ہے اس سے تمہارے والدین تمہیں اس کے پلے باندھنے پر تیار ہو گئے ہیں۔ تمہاری خوشی کی وجہ یہی ہے...... مجھے معلوم ہے کہ تم اس بات پر حیران ہو، میں اتنی باخبر کیسے ہوں!..... آؤ حوض پر بیٹھیں۔'' نجمہ بولی۔ نجمہ کے ساتھ میں حوض پر بیٹھ گئی تو وہ مجھ سے پھر مخاطب ہوئی۔ ''اگر میں یہ کہوں کہ ہیثم نے دھوکا دیا ہے تو؟''

''دھوکا؟'' میں نے صرف اتنا ہی کہا۔ حالانکہ مجھے حقیقت کا علم تھا کہ ولی عہد ابوبکر نے فردوس کو اپنا نام ہیثم ہی بتایا تھا۔ یہ ایسی بات تھی کہ فردوس کی حیثیت سے مجھے اس پر پریشانی کا اظہار کرنا چاہئے تھا، سو میں نے ایسا ہی کیا۔

''تم نہ معلوم کیا سمجھ گئیں۔'' نجمہ میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہنے لگی۔ ''دھوکے

سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ انہوں نے تم سے بے وفائی کی ہے، ایسا سوچنا بھی نہیں۔ وہ تمہارے پجاری ہیں۔ ان کی رگ رگ میں تمہاری محبت سما چکی ہے۔ وہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر کسی روز تم ان سے خفا ہو گئیں تو وہ ان کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔"

"خدا نہ کرے۔ انہیں میری زندگی بھی لگ جائے۔" میں نے محبت کرنے والی ایک مشرقی لڑکی کا کردار ادا کیا۔ "وہ سلامت رہیں۔"

نجمہ یہ سن کر مسکرائی اور پھر ہنس کر کہا۔ "ان کی سلامتی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ وہ اب تک تمہاری خواستگاری کر بھی چکے ہوتے لیکن دو سبب سے رکے ہوئے ہیں۔ پہلا سبب تو یہ کہ انہوں نے تم سے کچھ غلط بیانی کی ہے۔ جب تک تمہیں اصلیت معلوم نہ ہو جائے اور تم انہیں معاف نہ کر دو اس وقت تک وہ اس بات کی جرأت نہیں کر سکتے۔ دوسرا سبب یہ کہ جب تم انہیں معاف کر دو تو وہ خلیفہ سے اجازت لے لیں۔"

میں دانستہ حیران ہو کر بولی۔ "خلیفہ سے اجازت؟"

"ہاں۔" نجمہ نے جواب دیا۔ "کیا تمہیں خبر نہیں کہ بڑے خاندان کے لڑکے اور لڑکیوں کی شادیاں خلیفہ کی منظوری سے ہوتی ہیں؟"

"مجھے اس کا علم نہیں ہے۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے۔" نجمہ کا لہجہ سمجھانے والا تھا۔ "بہر حال اس سے تمہارا تعلق نہیں، مگر پہلا سبب......"

میں بول اٹھی۔ "انہوں نے کیا غلط بیانی کی ہے؟... کیا دھوکا دیا ہے مجھے؟"

"تم سے انہوں نے اپنی شخصیت چھپائی اور نام بھی غلط بتایا۔ کیا تم اس پر انہیں معاف کر دو گی؟"

میں نے شرارت بھری نظروں سے نجمہ کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا تم سفارش کرنے آئی ہو؟"

"ایسا ہی سمجھو۔"

"اگر میں معاف نہ کروں؟"

"اپنے دل سے پوچھو اس سوال کا جواب۔"

"خیر نجمہ! تم سفارش کرنے آئی ہو تو معاف کرنا ہی پڑے گا۔" میں بولی۔ "مگر ان کا اصل نام اور شخصیت کے بارے میں تو بتاؤ۔"

"ان کا نام ابوبکر ہے اور وہ اس مملکت کے ولی عہد ہیں۔"

"لیکن انہوں نے مجھ سے اپنا نام اور شخصیت کیوں چھپائی؟"

"اس لئے کہ اگر وہ تمہیں روز اول ہی بتا دیتے، کون ہیں تو تم جھجک جاتیں، ان کی شخصیت کی وجہ سے شاید ملنا پسند نہ کرتیں۔"

نجمہ وہی سب کچھ بتانے لگی جو پہلے سے میرے علم میں تھا۔

"لیکن سوچو نجمہ، میں کہاں وہ کہاں۔ ان سے کہہ دینا......"

نجمہ نے میری بات کاٹ دی۔ "میں ان سے کچھ کہنے والی کون!...... وہ یہاں آ گئے ہیں۔ یا تو وہ تمہیں منا لیں گے یا نہ منا سکے تو تمہارے قدموں پر نثار ہو جائیں گے۔ اگر تم نے انہیں معاف کر دیا تو خلیفہ کو میں راضی کر لوں گی۔ اب میں چلی، کیونکہ وہ آتے ہی ہوں گے۔"

یہ ایک ایسی صورت حال تھی کہ مجھے فردوس کے جسم سے باہر نکلنا ہی تھا تاکہ میں نے نجمہ سے جو باتیں کی ہیں، فردوس کے دماغ میں بٹھا سکوں۔ یوں بھی میں فی الحال فردوس کے پیکر میں اس بنا پر عارضی طور پر داخل ہوئی تھی کہ اس کا جسم میرے لئے قابل قبول ہے یا نہیں! یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے اس کے جسم میں قرار نہ آتا۔ اس کے علاوہ مجھے فردوس کا دماغ بھی پڑھنا تھا۔ تبھی میں بہتر طور پر اس کا کردار ادا کر پاتی۔ پھر میں نے فردوس کے جسم سے باہر آنے میں دیر نہیں کی۔ اس سے فردوس کے جسم کو خفیف سا جھٹکا ضرور لگا مگر میں نے اسے سنبھال لیا اور اس کے دماغ پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ ذرا ہی دیر میں میرا مقصد پورا ہو گیا۔

اب مجھے عارج کی فکر تھی کہ وہ ولی عہد ابوبکر کے جسم میں اتر سکا یا نہیں۔

اس سے قبل کہ عارج، ابوبکر کے انسانی قالب میں وہاں آتا، میں نے مصلحتاً اندھیرے کی چادر اوڑھ لی۔ اب میں عارج کو نظر نہ آتی۔ اس کے باوجود احتیاط میں فردوس کے پاس سے ہٹ گئی۔ عارج تو وقت اور موقع دیکھ کر مجھے "ستاتا" ہی رہتا تھا، آج میں نے اسے "ستانے" کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کسی قدر فوارے سے دور آ جانے کے بعد میں نے اپنی

بصارت اور سماعت کا دائرہ وسیع کر لیا۔

اس احتیاط کا سبب یہ تھا کہ قریب رہنے کی وجہ سے عارج میرے وجود کی مخصوص خوشبو محسوس نہ کر لے۔

ولی عہد ابوبکر کی آمد کا مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ فردوس اور ابوبکر فاصلے کے باوجود مجھے واضح نظر آرہے تھے۔ میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی صاف سننے کی اہل تھی۔ عارج مجھے فردوس کے قالب ہی میں چھوڑ کر گیا تھا اس لئے آتے ہی بولا۔ ''اے دینار! میں......''

''کون دینار؟'' فردوس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ ولی عہد ابوبکر کے انسانی پیکر میں اب عارج ہے۔

''تو مجھے پاگل نہیں بنا سکتی۔ میں تجھے خوب جانتا ہوں۔'' عارج نے اصرار سے ہنس کر کہا۔

''یہ تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو؟ پہلے تو تم نے مجھ سے کبھی اس طرح اب تک نہیں کی!...... کیا ولی عہد اسی طرح گفتگو کرتے ہیں؟'' یہ کہتے ہوئے فردوس کی حسین پیشانی پر بل پڑ گئے۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''میں جا رہی ہوں۔ شہزادی تجھ سے پوچھے گی کہ آخر میرا کیا قصور ہے۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز قدرے بھاری ہو گئی۔

ابوبکر کے پیکر میں عارج مجھے ہونق نظر آنے لگا۔ یقیناً اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ اب میں، فردوس کے قالب میں نہیں ہوں۔

دوسرے ہی لمحے میں نے ابوبکر کے قالب کو جھٹکا کھاتے دیکھا۔ میں سمجھ گئی کہ عارج بھی ابوبکر کے پیکر سے نکل آیا ہے۔

وہاں سے بھاگنا بیکار تھا کیونکہ میں جہاں بھی چلی جاتی، عارج میرے وجود کی خوشبو کے سہارے وہاں پہنچ جاتا۔ پھر یہی ہوا۔ مجھ تک آتے ہی وہ برس پڑا۔ ''اے دینار! یہ کیا حرکت کی تو نے؟''

''اسے حرکت نہیں، شرارت کہتے ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے اندھیرے کی چادر اپنے اوپر سے اتار دی۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ''مجھے اندازہ تھا اے عارج! کہ تو یہی حماقت کرے گا۔''

''لیکن میں تو تجھے فردوس کے جسم میں چھوڑ گیا تھا۔''

''میں نے تجھ سے کب کہا تھا کہ فردوس ہی کے قالب میں رہوں گی۔''

عارج لاجواب ہو گیا، پھر بھی جھینپ مٹانے کو بولا۔ ''تو مجھے بتا تو دیتی۔''

''اس وقت بتا دیتی؟ تو کیا مجھے کسی سینگ کی طرح اچانک غائب ہو گیا۔''

''اچھا اب چپ چاپ چھوڑ اور سن کہ ولی عہد ابوبکر کے جسم کو میں اپنے لئے پسند کر چکا ہوں۔ اس کے قالب میں مجھے قرار آ گیا تھا۔ اب صرف تیری مکمل رضامندی کی دیر ہے۔ باقی سب کچھ میں سنبھال لوں گا۔''

''تو کیا سنبھالے گا؟''

''سنبھالنے سے میرا مطلب یہ ہے اے دینار! کہ ہم دونوں کے انسانی قالبوں کے ملن کی راہ ہموار ہو جائے۔''

''اچھا اب میں تو چلی۔ قصہ ہو کر اٹھ چکا ہو گا۔ تو چاہے تو چل میرے ساتھ۔''

''کہاں جا رہی ہے؟ قصے سے تیری مراد ابن علقمی تو نہیں؟''

''ہاں وہی مراد ہے۔'' میں نے بتایا۔

''مجھے اس کے پاس جانے کا کوئی شوق نہیں۔ تو جا! تو نے جو بات بگاڑی ہے، وہ بھی تو بنانی ہے۔ یہاں سے فرصت کے بعد تیرے پاس آ جاؤں گا۔ تجھ سے اور کئی باتیں کرنی ہیں۔''

''اگر تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میں پوچھوں گی، کیا باتیں ہیں وہ؟..... تو مجھے بھی ان باتوں کو جاننے کا کوئی شوق نہیں۔ خدا حافظ!'' میں یہ کہتے ہی وہاں سے ''غائب'' ہو گئی۔

میں ابن علقمی کے قصر میں پہنچی تو دن ڈھل چکا تھا۔ ابن علقمی سو کر اٹھ گیا تھا۔ اس کے ذہن پر میری توجہ تھی۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر ہلاکو خاں کو خط لکھنے لگا۔ القاب و آداب اور چند رسمی باتوں کے بعد اس نے لکھا۔

''عباسی خلافت آخری سانس لے رہی ہے۔ اس حکومت میں مقابلے کی قوت بالکل باقی نہیں ہے۔ عوام عباسی خلیفہ اور ان کی حکومت سے نالاں ہیں۔ میں اب دم توڑتی سلطنت کا وزیر اعظم ہوں۔ میرے

دم سے ہی عراق اور دارالخلافہ بغداد میں امن و امان ہے۔ میری ہی کوششوں سے یہ حکومت اب تک باقی ہے۔ میں آپ کا ہمدرد اور ہوا خواہ ہوں۔ یہ موقع غنیمت ہے کہ آپ عراق پر حملہ کر دیں۔ عراق کے باشندے آپ کا استقبال کرنے کے لئے بے چین ہیں۔

میں ہوں آپ کا مخلص ہمدرد۔
موید الدین ابن علقمی
وزیر معتصم عراق۔

اپنے لکھے ہوئے خط کو اس محسن کش آدم زاد نے کئی مرتبہ پڑھا۔ اسے اپنی تحریر بہت ہی اچھی اور پر اثر معلوم ہوئی۔ ہلاکو خاں کو لکھے جانے والے اس پیغام کو اس نے مہر بند کیا، پھر اٹھ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ میری توجہ اس کے ذہن پر بھی تھی اور میں اس کی نقل و حرکت کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ اس نے ایک ملازم کو آواز دے کر بلوایا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابن علقمی کیا چاہتا ہے!

ملازم کے ذریعے اس نے اپنے ایک معتمد کو طلب کیا تھا جو کچھ ہی دیر میں حاضر ہو گیا۔ وہ بھی ابن علقمی جیسا ہی لالچی آدم زاد تھا۔

اس کے باوجود ابن علقمی نے پہلے اسے اپنا ہمراز بنایا، تمام باتیں بتائیں، پھر بھاری انعام کا لالچ دیا۔

''تم آج ہی خراسان کے لئے روانہ ہو جاؤ۔'' ابن علقمی نے اسے حکم دیا۔ مہر بند پیغام و پیشگی انعام وہ پہلے ہی اپنے معتمد کے حوالے کر چکا تھا۔ معتمد نے ادب سے سر جھکا کر آمادگی ظاہر کی اور ابن علقمی کی اجازت سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ادھر وہ معتمد روانہ ہوا ادھر میں نے ابن علقمی کے دماغ میں سرگوشی کی۔ ''اے بے وقوف شخص! یہ تو نے کیا، کیا؟''

میری توقع کے مطابق ابن علقمی یہی سمجھا کہ میری سرگوشی خود اسی کے ذہن میں پیدا ہونے والا خیال ہے۔

''کیا ہوا؟ ... میں نے کیا غلط کر دیا؟'' ابن علقمی بڑبڑایا۔

''تو نے استخارہ تو کیا ہی نہیں!'' میں اس کے دماغ میں بولی۔ (استخارہ کے معنی، خیر کی طلب، فال نیک، کسی کام کے نیک انجام کی غرض سے فال نکالنا، کسی بات کے کرنے نہ کرنے میں ایک خاص عمل کے ذریعے سے تائید الٰہی کا اشارہ چاہنا۔ مصنف)

''ہاں، مجھ سے یہ بڑی بھول ہو گئی۔'' ابن علقمی کے لہجے میں یہ تاسف تھا۔ ''مجھے استخارہ... مگر اب...... اب کیا ہو سکتا ہے! جو قدم اٹھانے سے پہلے استخارہ ضروری تھا وہ... وہ قدم تو میں اٹھا چکا ہوں۔''

ابن علقمی نے کوئی نیک کام نہیں کیا تھا کہ خیر کی طلب کرتا۔ وہ تو مجسم بدی تھا۔ میں نے اسے یہ احساس اس لئے دلایا کہ وہ ذہنی طور پر پریشان رہے، کڑھتا رہے۔ میرا مقصد پورا ہو گیا۔ وقت گزر جانے پر بھی اس نے جوش اور غصے کے عالم میں استخارہ کیا جو موافق نہیں آیا۔ اس کے چہرے پر مجھے جھنجلاہٹ نظر آئی۔

''میں نے غلطی کی جو استخارہ کیا۔ جو ہونا ہے، وہ ہو گا۔'' وہ عیار آدم زاد بڑبڑانے لگا اور میں اس کے قصر سے نکل آئی۔

ہلاکو خاں کو لکھے جانے والے خط کا توڑ کیا ہو؟ میں سوچنے لگی۔ اپنی حدود سے تجاوز کئے بغیر میں کیا کر سکتی ہوں؟

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ عارج میرے قریب آ گیا۔

''اے دلدارا آؤ ہم بغداد شہر سے نکل کر کہیں دریا کے کنارے بیٹھیں گے۔'' عارج نے پیشکش کی۔

''میری جان کب چھوڑنے والا ہے اے عارج! چلو چلتی ہوں۔''

ہم شہری آبادی سے نکل کر دریائے دجلہ کے کنارے آ بیٹھے۔

''یہ بتا کہ تو کیوں ابوبکر کے جسم سے نکل بھاگا؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے اپنی زبان سنبھال! یہ نکل بھاگا سے کیا مطلب ہے تیرا؟ کیا میں کوئی چور اچکا ہوں؟'' عارج نے کچھ اس طرح یہ الفاظ ادا کئے کہ مجھے ہنسی آ گئی اور میرے ہنسنے پر وہ اور چڑ گیا، بولا۔ ''ہر وقت...... بات بے بات نہ ہنسا کر!''

''تو کیا روؤں تیری عقل پر؟'' میں نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

''تجھ سے تو زیادہ ہی عقل ہے مجھ میں۔''

''وہ تو تیری حرکتوں سے صاف ظاہر ہے۔''

"کیا حرکت کی ہے میں نے؟ بول!" عارج پوچھنے لگا۔ "میں تیری طرح نہیں کہ چپکے سے کسی کا جسم چھوڑ بھاگوں۔" عارج کا اشارہ فردوس کی طرف تھا۔ اس نے اپنی دانست میں مجھ سے "بدلہ" لے لیا تھا۔

میں نے بات کو ٹالنے کی خاطر اس سے پوچھا۔ "فردوس سے تیرا عشق کس منزل پر پہنچا؟"

"میں اس آدم زادی کا نہیں، تیرا عاشق ہوں۔ وہ تو محض ایک ذریعہ ہے۔" عارج نے جواب دیا۔

"کبھی کبھی تجھ جیسے آوارہ گرد ذریعے ہی کو منزل سمجھ بیٹھتے ہیں۔"

"میں ان میں سے نہیں۔"

"یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا اے عارج! کہ تُو کتنا پارسا ہے!"

"میں نے کب تجھ سے پارسائی کا دعویٰ کیا ہے، ہاں تجھ سے عشق کا دعوے دار ضرور ہوں۔"

"دعویٰ کسی دلیل و ثبوت کے بغیر باطل ہوتا ہے۔"

"تُو مجھ سے کیا ثبوت چاہتی ہے؟..... کیا تجھے اس سے بڑا بھی کوئی ثبوت چاہئے کہ میں اب تک کنوارا پھر رہا ہوں؟..... اگر تیرے عشق نے مجھے دیوانہ بنا کے نہ رکھا ہوتا تو ایک نہیں کئی کئی جن زادیاں میرے آگے پیچھے اُڑتی پھر رہی ہوتیں۔"

"روکا کس نے ہے تجھے! اب اپنی حسرت پوری کر لے۔"

"اب تو بس ایک ہی حسرت ہے....." یہ کہتے ہوئے عارج مجھ سے قریب تر ہو گیا۔ "تُو کہے تو بتا دوں اے دینار؟"

"ہاں بتا دے" معلوم نہیں میں نے کس رو میں کہہ دیا۔

جذبوں کی اپنی ایک الگ زبان ہوتی ہے۔ عارج اسی زبان میں بات کرنے لگا۔ کچھ دیر کو میں جیسے سب کچھ بھول گئی۔ عشق کی آگ تو میرے وجود میں بھی روشن تھی، سو خود فراموشی و بے خودی سے کیسے بچی رہتی!

جلد ہی میں ان لمحوں کے سحر سے نکل آئی تو عارج نے مجھے حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ فردوس کو اس نے منا لیا تھا، اسی کے ساتھ اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کا عاشق صادق کوئی

اور نہیں، ولی عہد ابوبکر ہے۔ یہ سچائی فردوس نے قبول کر لی تھی۔

پوری بات سن کر عارج سے میں نے دریافت کیا۔ "اب تیرا کیا ارادہ ہے؟"

"وہی جو پہلے تھا۔" عارج نے جواب دیا۔

"یعنی؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"یہ کہ فردوس اور ابوبکر کی شادی ہو گی۔"

"مگر کیسے؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ ابھی میں نہیں سوچ سکا۔ تُو بتا کیا تدبیر ہو؟"

"اس کی ایک ہی تدبیر ہے۔" میں بولی۔ "تُو پہلے تو ایسا کر کہ ابوبکر کے قالب میں اتر جا اور اسی میں رہ، پھر نجمہ کو ابوبکر کی حیثیت سے اس پر آمادہ کر کہ وہ خلیفہ مستعصم سے اس رشتے کے لئے بات....."

"لیکن تُو نے ہی تو کہا تھا کہ خلیفہ نے نجمہ کو ولی عہد ابوبکر کے لئے پسند کر لیا ہے۔ پھر خلیفہ کیسے نجمہ کی بات مان لے گا؟" عارج بول اٹھا۔

"تُو بھی تو نہیں سمجھا اے عارج!" میں نے اسے سمجھایا۔ اسی کو تو ایک تیر سے دو شکار کرنا کہتے ہیں۔ خلیفہ سے نجمہ اس رشتے کی بات کرے گی تو مطلب یہ ہو گا کہ وہ خود ابوبکر سے شادی پر آمادہ نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس طرح خلیفہ کو پتہ چل جائے گا، اس کا ولی عہد کسی کو مستقبل کی ملکہ بنانا چاہتا ہے۔"

"تیرا کیا خیال ہے، خلیفہ مان جائے گا؟"

"نہیں مانے گا تو میں اس سے منوالوں گی۔ یہ تو کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔" میں نے یہ بات خوب سوچ کر کی تھی۔ یہ معاملہ حدود سے تجاوز کرنے کا نہیں تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ "جب بھی میں نے ضرورت محسوس کی تو فردوس کے قالب کو اپنا لوں گی۔ فی الحال تُو پیش قدمی کر!..... اور ہاں، تُو نے ابوبکر کے شب و روز کا جائزہ تو لے لیا ہے؟..... تُو اس کا کردار بھی ٹھیک طرح ادا کر سکے گا یا نہیں؟..... ساتھ ہی یہ بھی بتا دے تُو بہکے گا تو نہیں؟..... یہ میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ تُو نجمہ کے حُسن کی تعریفیں کرتا رہا ہے۔"

"اے دینار! ایک تو شک بہت کرتی ہے تُو مجھ پر۔ کیا تجھے اب تک میری وفا پر یقین

نہیں آیا؟''

''کر لیتی ہوں یقین کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ یہ دھیان رکھیو کہ میں تیرے آس پاس ہی رہوں گی۔''

''رہ لینا۔ مجھے کوئی خوف نہیں۔ ڈرے تو وہ جس کے دل میں چور ہو..... تو نے ابوبکر کے بارے میں جو پوچھا ہے تو میں بہت دن سے اس کے متعلق ضروری معلومات اکٹھی کر رہا ہوں کہ کیا خبر کب ضرورت پڑ جائے۔''

''پھر ٹھیک ہے..... ایسی صورت میں تجھے اس کا کردار ادا کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔'' میں نے اطمینان کا اظہار کیا۔

اس کے بعد عارج نے میرے ہی مشورے پر عمل کیا۔ وہ ولی عہد ابوبکر کے جسم میں اتر گیا۔ میں نے البتہ فوری طور پر فردوس کا قالب اپنانا ضروری نہیں سمجھا، سو میں انسانی پیکر میں قید نہ ہوئی۔ کوئی کچھ بھی کہے، آدم زادیاں ہوں کہ ہم جن زادیاں اپنے عشق میں کسی کی شراکت قبول نہیں کرتیں۔ عارج نے مجھے لاکھ اپنی وفا کا یقین دلایا تھا، پھر بھی میں اسے فی الحال ''بے نکیل'' چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ میں اسی لئے نجمہ کے قصر میں پہنچ گئی۔ میرے اندازے کے مطابق عارج کو ابوبکر کے انسانی پیکر میں وہیں ہونا چاہئے تھا۔ عارج وہاں میری موجودگی سے چوکنا نہ ہو جائے، میں اسی سبب دور دور رہی۔

اس وقت تک عارج نے نجمہ کو آمادہ کر لیا تھا کہ وہ ابوبکر اور فردوس کی محبت سے خلیفہ کو آگاہ کر دے اور خلیفہ سے شادی کی منظوری لے لے۔ اس کا پتہ مجھے ان دونوں کی گفتگو سے ہوا۔ یہ کام بہر حال معمولی نہیں تھا۔ کیونکہ ابوبکر ولی عہد تھا اور فردوس ایک معمولی جاگیردار کی بیٹی۔ خلیفہ کو اس رشتے پر رضامند کرنا دشوار تھا۔

اگرچہ یہ بات نہیں تھی کہ عباسی شہزادوں یا شہزادیوں کی شادیاں معمولی گھرانوں میں نہیں ہوئی تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا رہا تھا لیکن خلیفہ مستعصم اس کے حق میں نہیں تھا۔ نجمہ کو خلیفہ سے اس رشتے کا ذکر کرتے ہوئے کچھ پس و پیش ہوا۔

اس پر عارج کہنے لگا۔ ''نجمہ! یہ کام تمہی کر سکتی ہو۔ اعلیٰ حضرت کو تم سے بڑی محبت ہے۔ وہ اور شہزادیوں کے مقابلے میں تمہاری بات مانتے ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ تم ہوشیار بھی ہو، طریقے سے گفتگو کرو گی، سلیقے سے اعلیٰ حضرت کو سمجھا دو گی۔ میرا خیال ہے وہ مان

جائیں گے۔'' عارج بالکل ابوبکر کے لب و لہجے میں بات کر رہا تھا۔ مجھے اس سے خوشی ہوئی۔

''اور اگر وہ بگڑ بیٹھے تو کیا ہوگا؟'' نجمہ نے اندیشے کا اظہار کیا۔

''یہ ممکن ہے کہ اعلیٰ حضرت تم سے بگڑ جائیں۔''

''کہیں تم مجھے معتوب نہ کرا دینا۔'' نجمہ بولی۔ خلوت کی بنا پر نجمہ بے تکلفی سے بات کر رہی تھی۔

''معتوب تو خیر نہیں ہوگی تم، البتہ اعلیٰ حضرت اس رشتے پر راضی نہ ہوئے تو تمہیں سمجھا دیں گے۔'' عارج نے کہا۔

''تمہارے لئے میں یہ خطرہ مول لے لوں گی۔''

''کتنی اچھی ہو تم!''

''اب لگے تعریف کرنے۔'' نجمہ مسکرائی۔

''اس میں تعریف کی کوئی بات نہیں۔ آج تم میرا کام کر رہی ہو، کل میں تمہارے کام آؤں گا۔'' عارج معنی خیز لہجے میں بولا۔

''میرا کیا کام کرو گے تم؟''

''جو کام تم میرا کر رہی ہو۔ میں، اعلیٰ حضرت سے کہہ کے احمر سے تمہارا رشتہ پکا کرا دوں گا۔'' عارج نے جواب دیا۔

نجمہ نے شرمیلی نظروں سے عارج کو دیکھ کر کہا۔ ''لگے دون کی لینے۔''

''دون کی نہیں یہ۔ ادھر میرا کام ہوا، ادھر میں نے تمہارا کام کیا۔''

''اچھا تو پھر نہ میں تمہارا کام کروں نہ تم میرا.....''

عارج بول اٹھا۔ ''کہیں ایسا غضب نہ کرنا! میرا کام نہ ہوا تو میری جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ بولو کیا مرضی ہے؟''

''بس رہنے دو۔'' نجمہ اٹھلائی۔

''میں صرف تمہارا ذکر کروں گا اعلیٰ حضرت سے۔ احمر بے وقوف ہے، اس کا نام نہیں لوں گا۔''

''پیٹھ پیچھے کسی کو برا نہیں کہتے۔''

"نہیں کہتا کچھ اختر کو! یہ بتاؤ تم کب قصر الخلد (قصر خلافت) جاؤ گی؟" عارج پھر مطلب کی بات پر آ گیا۔

"میں آج شام کے وقت اعلیٰ حضرت کے سلام کو جاؤں گی۔ اگر موقع ہوا تو آج ہی ذکر کر دوں گی۔"

"ذکر کرو گی؟ اور وہ بھی موقع ہوا تو؟..... کیوں تڑپا رہی ہو مجھے!"

"تم تو ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہو۔" نجمہ بولی، پھر ہنسنے لگی۔

"تمہیں اپنی صلاحیت کا اندازہ نہیں۔ تم ہتھیلی پر سرسوں جما سکتی ہو۔"

"اچھا بابا، اچھا! اطمینان رکھو، میں آج ہی بات کر لوں گی۔ کتنی بار تمہیں یقین دلاؤں!"

"چلو آ گیا یقین، یہ بتاؤ کب آؤں؟" عارج نے پوچھا۔

"رات کو آ جانا۔" نجمہ نے جواب دیا۔

عارج وہاں سے اٹھ آیا۔ میں اس کے سامنے ظاہر نہیں ہوئی۔ وہ ولی عہد ابوبکر کے قصر کی طرف چلا گیا۔

اسی روز شام کو جب خلیفہ مستعصم سے نجمہ ملی تو میں بھی اس کے ساتھ تھی۔ خلیفہ کے "حمق" سے میں واقف تھی۔ وہ اپنی ضد پر اڑ سکتا تھا۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ خلیفہ کوئی حماقت نہ کرے۔ اس کے لئے اسے میں نے کچھ دیر کو اپنے اثر میں لیا۔ بس اتنا ہی کافی ہوا۔

میں چاہتی تو عارج کو اس بات سے آگاہ کر دیتی۔ مگر دانستہ ایسا نہیں کیا۔

دن چھپتے ہی ابوبکر کے قالب میں عارج، نجمہ کے قصر میں پہنچ گیا۔ میں پہلے ہی وہاں موجود تھی۔

"کیا رہا نجمہ؟" عارج نے بیٹھتے ہی سوال کیا۔ میں دور ہٹ گئی۔

"معاملہ خلاف توقع بنتا نظر آ رہا ہے۔" نجمہ نے بتایا۔ "میں نے جب اعلیٰ حضرت سے تمہارا اور فردوس کا ذکر کیا تو وہ ہنس پڑے۔ کہنے لگے، اچھا یہ وجہ تھی ان کے شادی سے انکار کرنے کی۔ میں نے عرض کیا، یہ بات نہیں جہاں پناہ! بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ مجرد ہی رہنا چاہتے تھے لیکن فردوس ان کی زندگی میں داخل ہو گئی اور ان کا ارادہ بدل گیا۔ یہ سن کر اعلیٰ حضرت نے فرمایا، اچھا تم کل صبح ابوبکر کو میرے پاس بھیجنا۔"

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ جب حکمران عباسی خاندان کے تمام افراد قصر خلافت ہی کے مختلف حصوں میں رہتے تھے لیکن اب وقت اور تھا۔ قصر خلافت صرف خلیفہ، اس کی بیویوں، کنیزوں، غلاموں اور دیگر متعلقہ عملے کے لئے مخصوص تھا۔ حکمران خاندان کے تقریباً تمام ہی افراد کے اپنے اپنے محل اور قصر تھے۔ ولی عہد ہونے کے باوجود ابوبکر کو بھی قصر خلافت میں رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ حکمرانِ وقت اپنے سائے تک پر شک کرنے لگا تھا۔ اس سے قطع نظر مستعصم باللہ کا معاملہ تو اور بھی مختلف تھا۔ وہ حریص و لالچی آدم زاد اپنی جان کے لئے کوئی روگ پالنے کو تیار نہ تھا۔ اسے یہ غلط فہمی تھی کہ قدرت نے اس کی قسمت میں عیش ہی عیش لکھا ہے۔ وہ دنیا میں اسی لئے آیا ہے۔ اس نے اسی سبب کاروبار سلطنت میں بھی کبھی دلچسپی نہیں لی۔ وہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا تھا۔ ابن علقمی جیسے عیار و غدار کی اس لئے بن آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے بھی مستعصم سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اس کی سلطنت رہتی یا چلی جاتی، اس کے اعمال کا نتیجہ ہوتی۔ اگر مجھے اس غبی عباسی خلیفہ مستعصم سے ہمدردی ہوتی تو شاید اپنی حدود میں رہتے ہوئے اس کی ہر ممکن مدد کرتی۔ میں پہلے بھی عباسی خلفاء کی حکومت و سلطنت بچانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اپنی پسند و ناپسند کو پس پشت ڈال کر میں نے محض یہ سوچا کہ مسلمانوں کی یہ عظیم سلطنت کسی نہ کسی طرح قائم رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے اعمال سے عباسی حکمرانوں نے اس سلطنت کو اب اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ اس پر "عظیم" ہونے کی تہمت لگائی جا سکے۔

جن زادی ہونے کے باوجود آدم زادوں کے لئے شاید میں کچھ زیادہ ہی جذباتی بن رہی ہوں۔ غالباً اس کا ایک سبب تو خود میرا مسلمان ہونا ہے، دوسری وجہ صدیوں آدم زادوں کے ساتھ رہنا ہے۔

خیر میں یہ بیان کر رہی تھی کہ عارج نے خلیفہ کے سامنے طلبی کے جواب میں کیا کہا۔ وہ ابوبکر کے کردار کو بڑی خوبی سے نبھا رہا تھا، سو کہنے لگا۔ "بس یہی برا ہوا، اعلیٰ حضرت کے سامنے میری زبان کیسے کھلے گی؟"

نجمہ بولی۔ "زبان کھولنے کی ضرورت نہیں۔ وہ شاید تم سے یہ تصدیق چاہتے ہیں کہ تمہیں واقعی فردوس سے محبت ہے۔"

''تمہارے نزدیک کیا اس کا جواب آسان ہے؟''

''مشکل بھی کیا ہے!''

''اگر اعلیٰ حضرت تم سے یہ دریافت کریں کہ کیا واقعی تمہیں احمر سے محبت ہے تو کیا جواب دو گی؟''

''میری بات چھوڑو اور ہمت سے کام لو، کام بنا بنایا ہے۔'' نجمہ نے اپنی دانست میں عارج کو ابوبکر سمجھ کر اس کا حوصلہ بڑھایا۔

اب نجمہ کے قصر میں عارج کے مزید بیٹھنے کی نہ تو ضرورت تھی نہ جواز۔ سو اس نے رخصت ہونا چاہا۔ نجمہ نے اسے رات کے کھانے کے لئے روک لیا۔ کچھ ہی دیر میں احمر بھی آ گیا۔ نجمہ نے اس سے بھی تمام واقعہ بیان کر دیا۔

''تو یوں کہو کہ کام ہو گیا۔'' احمر نے کہا۔ وہ نجمہ سے مخاطب تھا۔

''ابھی کچھ بھی نہیں ہوا۔'' عارج بول اٹھا۔

''کام تو ہو ہی جانا ہے، دعوت کب کھلائیں گے؟'' نجمہ بولی۔ ''کل تک کی تو بات ہے!''

''تو کل ہی نشاط کی دعوت بھی ہو گی۔'' عارج نے یہ کہہ کر جان چھڑا لی۔

''کھانے کا وقت ہو گیا تو احمر اور عارج نے نجمہ کے ساتھ کھانا کھایا اور پھر اس کے قصر سے اٹھ کر چلے گئے۔ ان دونوں نے اپنے اپنے محلوں کی راہ لی تھی۔ ولی عہد ابوبکر کے پیکر میں عارج مجھے تشویش و تذبذب کا شکار دکھائی دیا مگر اسے میں نے نہیں چھیڑا۔

دوسرے دن صبح ناشتا (درست املا یہی ہے۔ اس لفظ کے آخر میں ہ نہیں ہے۔ مصنف) کرتے ہی عارج قصرِ خلافت جا پہنچا۔

داروغۂ قصر جیسے اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے عارج کا استقبال کیا اور مسکرا کر بولی۔ ''کون سی حورِ بغداد ہمارے عالی مرتبت ولی عہد نے پسند کی ہے؟''

''تم نے کس سے سنا یہ؟'' عارج نے حیران ہو کر پوچھا۔

''خود اعلیٰ حضرت فرما رہے تھے۔''

''کیا کچھ خفا تھے وہ؟'' عارج نے معلوم کیا۔

''خفا تو نہیں البتہ متعجب ضرور تھے۔ چلئے وہ آپ ہی کے منتظر ہیں۔''

عارج قصر کی نگراں کے ہمراہ خلیفہ معتصم کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت عارج نے انتہائی احتیاط کا ثبوت دیا۔ وہ پہلی بار ولی عہد ابوبکر کے انسانی قالب میں خلیفہ سے مل رہا تھا۔ ذرا سی بھی بے پروائی اس کا بھانڈا پھوڑ سکتی تھی۔ یہ گویا عارج کے لئے ''امتحانی پرچہ'' تھا۔ میں بھی پوری طرح ہوشیار اور چوکنا تھی کہ کوئی گڑبڑ ہو جائے تو معاملے کو سنبھال لوں۔

عارج نے ادب سے جھک کر خلیفہ کو سلام کیا۔

خلیفہ نے سلام کا جواب دے کر خندہ پیشانی سے کہا۔ ''آؤ بیٹھو قرۃ العین۔'' (قرۃ العین، وہ چیز جس سے آنکھوں میں تراوت ہو اور ٹھنڈک ہو، پیارا بیٹا، نورِ چشم، راحت جاں) عارج سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ کچھ وقفے کے بعد خلیفہ نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

''کل نجمہ نے فردوس کا ذکر کیا تھا۔ کیا تم اس لڑکی کو پسند کرتے ہو؟''

عارج نے نیک اور شرمیلے جوان بیٹے کا کردار ادا کیا اور فوری طور پر کچھ نہ بولا، نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔

''بھئی شرماؤ مت، جواب دو!'' خلیفہ نے اسے ٹوکا۔

''جی ہاں اعلیٰ حضرت!'' عارج نے دبی زبان سے اقرارِ محبت کر لیا۔

''تم نے شہزادیوں پر فردوس کو ترجیح دی۔ ہم اس کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔'' خلیفہ معتصم بولا۔ ''بلا جھجک بتاؤ۔''

''وہ لڑکی نہایت حسین ہے اعلیٰ حضرت!''

''ہم اپنی ہونے والی بہو کو دیکھنا چاہتے ہیں۔'' خلیفہ نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

عارج نے محتاط انداز اختیار کیا، بولا۔ ''شہزادی نجمہ اسے قصر میں لا سکتی ہے۔''

''تم کیوں نہیں لا سکتے؟''

آخر کب تک عارج اپنی آتشی فطرت سے باز رہتا، اس نے کہہ ہی دیا۔ ''خوف ہے کہیں وہ آہوئے رمیدہ بھڑک نہ جائے۔''

خلیفہ یہ الفاظ سن کر مسکرایا، پھر کہا۔ ''اچھا نجمہ سے کہنا کہ وہ کل اس عروسِ عراق کو یہاں لے کر آئے۔''

''بہت اچھا اعلیٰ حضرت!''

''ہمیں یہ خوشی ہوئی کہ تم نے کسی کو پسند تو کیا۔''

''مجھے تو خود اس پر حیرت ہے کہ وہ میری زندگی میں داخل ہو گئی۔''

عارج کی بات پر خلیفہ ہنس دیا۔ رخصتی سلام کر کے عارج وہاں سے اٹھ آیا۔ اسے یقین تھا کہ خلیفہ مستعصم، فردوس کو دیکھتے ہی پسند کر لے گا۔ لیکن فردوس کو قصرِ خلافت میں لے جانا آسان نہیں تھا۔

فردوس جب ابوبکر سے ملی تھی تو اس نے ابوبکر کے بارے میں یہ گمان بھی نہیں کیا تھا کہ وہ ولی عہد ہوگا۔ اپنی حیثیت کا فردوس کو پوری طرح احساس تھا۔ نجمہ سے بھی اس نے بڑی مشکل کے بعد رشتہ دوستی استوار کیا تھا۔ اس میں زیادہ دخل نجمہ کی دانستہ کوششوں کو تھا۔ وہ رفتہ رفتہ فردوس کو گھاٹ پر لے آئی تھی۔

حسن و زیبائی میں کسی شہزادی سے کم نہ ہونے پر بھی فردوس کو علم تھا کہ وہ ایک جاگیردار کی بیٹی ہے۔ کہاں ایک جاگیردار اور کہاں حکمران خاندان کے شہزادے اور شہزادیاں! یہ طبقاتی شعور فردوس کی نظر میں تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی سچ تھا کہ وہ اپنے حسن کی رعنائیوں اور دلربائیوں سے واقف نہیں تھی۔

ان حقائق سے میں ہی نہیں عارج بھی واقف تھا۔ وہ مجھے اسی لئے فکر مند سا لگا۔

میرے نزدیک اس مسئلے کا ایک ہی حل تھا۔ میں نے اسی پر عمل کیا تاکہ عارج کو مزید پریشانی نہ ہو۔ فردوس کے جسم کی مخصوص بو پر میں اس تک پہنچ گئی۔ اس وقت وہ نجمہ کے قصر میں تھی۔ اسے میں نے فوارے کے پاس باغیچے میں کھڑے دیکھا۔ عارج بھی مجھے نجمہ کے قصر میں نظر آیا۔ یقیناً وہ اس معاملے میں نجمہ کی مدد لینے آیا تھا۔

موسم کے تیور دیکھ کر میرے وجود میں بھی جیسے خوشبو رقص کرنے لگی۔ عرب کے صحراؤں میں کالی کالی گھٹائیں روز روز نظر نہیں آتیں۔ گھٹا کے ساتھ پرکیف ہوا نے موسم کو خوشگوار بنا دیا۔ فردوس کی اوڑھنی کا پلو لہرانے لگا۔ اس کے سیاہ گیسو خوبصورت گورے رخساروں پر رات اور دن کے مناظر دکھانے لگے۔ وہ عجب شانِ دلربائی کے ساتھ کھڑی تھی۔ معاً اس نے انگڑائی لینے کے لئے ہاتھ اٹھائے۔

یہی وہ لمحہ تھا کہ جب میں فردوس کے جسم پر قابض ہو گئی۔ ابھی مجھے اس آدم زادی کے قالب میں قرار آیا ہی تھا کہ میری نظر عارج کے انسانی قالب پر پڑی۔ ہم جنات اگر

چاہیں تو آدم زادوں کے جسموں پر قبضہ کر کے خود کو ایک دوسرے سے پوشیدہ رکھ سکتے ہیں۔ مجھے تو معلوم ہی تھا کہ ابوبکر کے خاکی پیکر میں عارج ہے، مگر عارج بے خبر تھا کہ میں فردوس کے قالب میں اتر چکی ہوں۔ میں نے وقتی طور پر ہی سہی، عارج کی اس بے خبری سے فائدہ اٹھایا۔ میرا مقصد عارج سے صرف لطف لینا تھا۔

پھر میں نے ہی پہل کی اور عارج سے بولی۔ ''تم کہاں سے آ گئے؟''

وہ مجھے فردوس ہی سمجھا اور جواباً کہا۔ ''میں خلیفہ کے حضور سے آیا ہوں۔ وہاں تمہارا تذکرہ کیا تھا۔''

''میرا تذکرہ کس نے کیا وہاں؟'' میں نے دانستہ عارج کو ''الّو'' یعنی بے وقوف بنانے کے لئے سخت لہجہ اختیار کیا۔

عارج گڑبڑا کر بولا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ......''

''کچھ نہیں سننا مجھے!'' میں نے عارج کی بات کاٹ دی۔ ''مجھے تم نے آخر سمجھا کیا ہے!...... میں ایک غیر معمولی جاگیردار کی بیٹی ضرور ہوں، لیکن بکاؤ مال نہیں کہ میرے تذکرے قصرِ خلافت میں ہوں۔''

''فردوس! تمہیں یقیناً کو...... کوئی غلط فہمی ہو...... ہو گئی ہے۔'' عارج بات بگڑتی دیکھ کر ہکلانے لگا۔ ''قصرِ خلافت میں تمہارے حسن...... حسن کی تعریف ہو رہی تھی اور اس کی وجہ یہ......''

''مجھے نہیں پوچھنی وجہ۔'' میں بول اٹھی۔ ''میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ قصرِ خلافت کے لئے حسین کنیزیں ہی خریدی جاتی ہیں! اسی لئے تو میں ابھی کہہ رہی تھی کہ تمہیں کوئی خرید رہا ہے! تمہیں تو ملکہ بنا کے رکھا جائے گا۔''

''تو یہ بات تجھے پہلے کہنی چاہیے تھی اے عارج!'' میں یہ کہتے ہی زور سے ہنس پڑی۔

''تو اے دینار!'' عارج ''ہڑبڑ چلو'' دیکھنے لگا۔

''ہاں میں...... مجھے علم تھا کہ فردوس تیرے یا نجمہ کے ساتھ قصرِ خلافت میں جاتے ہوئے نخرے کرے گی۔ میں اس سبب......''

''لیکن اس کے لئے مجھے بے وقوف بنانے کی کیا ضرورت تھی؟'' عارج کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

''کیا لڑنا چاہتا ہے مجھ سے؟'' میں نے کہا۔ ''بنے بنائے کو مزید بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

''یہ سمجھ لے اے دینار، تُو اس طرح کی بات کر کے مجھے چڑا رہی ہے۔''

''ہاں چڑا رہی ہوں، پھر؟ کیا کر لے گا تُو میرا؟...... کچھ بگاڑ سکتا ہے تو بگاڑ لے۔''

''یہی تو مصیبت ہے کہ میں تیرے سامنے بول نہیں پاتا ورنہ کوئی اور جن زادی تیری جگہ ہوتو مزا چکھا دوں اسے۔''

کچھ دیر ''تیزم تازی'' کے بعد ہم دونوں ہی راہ پر آ گئے۔ میں، فردوس کے جسم سے نکل آئی۔ تھوڑی بہت ''بک بک، جھک جھک'' کے بغیر ہمیں لطف بھی نہیں آتا تھا۔ یکساں اور سپاٹ زندگی بھی کوئی زندگی ہے! معلوم نہیں یہ ''خلیفہ لوگ'' کیسے ہر وقت عیش کرتے رہتے ہیں! میری سمجھ میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ ان کا دل نہیں اوبتا!

عارج کے ایما پر فردوس کو میں نے اس کا مطیع بنا دیا۔ اب وہ نجمہ کے ساتھ قصرِ خلافت جانے میں نہ ہچکچاتی۔

''سن اے عارج! فردوس کو تیرا مطیع تو بنا دیا ہے مگر! نے کمر ٹھونے اس موقع سے ناجائز فائدہ اٹھانے......''

عارج سے میری ''الزام تراشی'' برداشت نہ ہوئی۔ وہ ''بھنک'' اٹھا۔ فردوس میرے زیرِ اثر غنودگی کی حالت میں تھی، مگر اس طرح کہ کوئی دور سے دیکھتا تو وہ بیٹھی نظر آتی۔ میں اسے سہارا دیئے ہوئے تھی۔

''اَب اسے اپنے اثر سے آزاد تو کر اے دینار!'' عارج مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''میں اسے کھا نہیں جاؤں گا۔''

''ہاں یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تُو آدم خور نہیں۔'' میں اس طرح سے بولی جیسے کسی بات کی تصدیق مقصود ہو۔

عارج کو میں نے خاصا تپا لیا تھا اس لئے اسے ''خدا حافظ'' کہہ دیا۔ وہ ''سن تو اے دینار!'' ہی کہتا رہ گیا۔

میرا ارادہ اب خراسان جانے کا تھا جہاں سنگدل حکمراں ہلاکو خاں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ خراسان (ایران) اسی کے قبضے میں تھا اور خراسان کی سرحدیں عراق سے ملی ہوئی تھیں۔ ہلاکو خاں کو عراق پر حملہ کرنے میں دشواری نہ ہوتی۔ وہ اور ہی عوامل تھے جو اس وحشی منگول کو عرب پر اب تک حملے سے روکے ہوئے تھے۔ ان عوامل کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

وہ شام کا وقت تھا کہ جب میں بغداد شہر کے اوپر دھیمی رفتار سے پرواز کرتی ہوئی خراسان کی سمت بڑھ رہی تھی۔

بس اچانک ہی میرے حواس پر زبردست جھٹکا سا ہوا۔

''اے دینار!...... اے دینار! واپس آجا!'' کوئی مجھے پکار رہا تھا اور یہ ''پکار'' میرے لئے آشنا تھی۔

میں نے فضا میں غوطہ لگایا اور بابل کے کھنڈرات تک پہنچ گئی۔ مجھے پکارنے والا انہی کھنڈرات میں گیا تھا۔

اس جن زاد کو میں پہچان گئی تھی۔ وہ میرا بڑا بھائی یوسف تھا۔ یوسف کے بارے میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ وہ عراق سے مصر چلا گیا تھا اور وہیں ایک جن زادی سے شادی کر لی تھی۔ یہ واقعہ صدیوں قبل کا ہے۔ اس کی اچانک عراق آمد اسی سبب حیران کن تھی۔

بابل کے کھنڈرات وسیع و عریض علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ انہی میں میرا قبیلہ آباد تھا۔ جنات کے اس قبیلے کو میرے باپ کے نام پر اب قبیلہ اخضم کہا جانے لگا تھا۔ میری ماں طرطبہ اور باپ اخضم دونوں ہی ابھی زندہ تھے۔ بڑھاپے کے باوجود میرے باپ اخضم نے قبیلے کی سرداری نہیں چھوڑی تھی۔ قبیلے والے اس پر آمادہ نہیں تھے کہ میرے باپ کی زندگی میں کسی اور کو اپنا سردار بنا لیں۔

جب میں کھنڈرات میں داخل ہوئی تو یوسف مجھے ٹوٹی ہوئی ایک دیوار کے قریب نظر آیا۔ یہ وہ حصہ نہیں تھا جہاں میرے والدین کی سکونت تھی۔ میں نے سوچا، یوسف شاید تنہائی میں مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔

ہم دونوں بہن بھائی صدیوں بعد ملے تھے، سو اس کے پاس پہنچ کر میں نے گلہ کیا۔

''اے میرے بھائی یوسف! کیا تُو اپنی بہن دینار کو بھول گیا تھا جو اتنے طویل عرصے کے بعد پلٹا ہے؟''

''یہ وقت شکوے شکایت کا نہیں اے دینار! ہمیں پہلے اپنی طرف بڑھتے ہوئے

خطرے کا تدارک کرتا ہے۔'' یوسف کہنے لگا۔

''خطرہ؟...... کیسا خطرہ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''آ...... اِدھر آ! میرے ساتھ اس منڈیر پر بیٹھ جا۔ میں تجھے تفصیل سے بتاتا ہوں کہ کیا معاملہ ہے!'' یوسف بولا۔

میں اس کے ساتھ نیم شکستہ منڈیر پر بیٹھ گئی اور کہا۔ ''ہاں بتا، کیا بات ہے؟''

''اس خطرے کا نام عکب ہے اور وہ غیلان میں سے ہے۔'' یوسف نے بتایا۔ ''وہ کسی بھی وقت تیری تلاش میں عراق پہنچ سکتا ہے۔''

جنات میں جادوگر بھی ہوتے ہیں، جنہیں غیلان کہا جاتا ہے۔''

''مگر میں تو کسی عکب کو نہیں جانتی، تُو پوری بات بتا کہ اس غیلان سے مجھے کیا خطرہ ہے؟'' میں نے معلوم کیا۔

''ایک بات تو یہ سن کہ عکب، جنات کی اس قسم میں سے ہے جس کو ہم عفریت کہتے ہیں، خطرناک عفریت ہونے کے علاوہ اس ظالم کو جادو بھی آتا ہے۔ تجھے یقیناً یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ اسی عکب کی وجہ سے مجھے مصر چھوڑنا پڑا۔''

''تو پھر تیرے ساتھ تیری بیوی اور بچے بھی آئے ہوں گے اے یوسف!'' میں پوچھ بیٹھی۔

''میری کوئی اولاد نہیں، ہاں میری بیوی خرقاء ضرور ساتھ آئی ہے۔ میں اسے خطرے میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔''

''تیری بیوی خرقاء سے تو میں اب مل ہی لوں گی، یہ بتا کہ خطرے کی نوعیت کیا ہے اور وہ عفریت عکب میری تلاش میں کیوں ہے؟...... وہ مجھے کیسے جانتا ہے؟ یہ تو بڑی عجیب سی باتیں کر رہا ہے تُو!'' میں نے اپنی اُلجھن کا اظہار کیا۔

''ہاں یہ بڑا عجیب اور ناقابلِ یقین سا واقعہ ہے۔ تجھے میں شروع سے سارا قصہ سناتا ہوں، ہوا یہ کہ......''

پھر میرے بھائی یوسف نے مجھ سے جو واقعہ بیان کیا، اسے سن کر میں بھی دنگ رہ گئی۔ یہ چند روز قبل ہی کی تو بات تھی کہ جب یوں ہی باتوں باتوں میں عارج نے مصر کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ اس ذکر پر مجھے عفریت دہموش یاد آ گیا تھا۔ عراق ہی سے دہموش مصر چلا

گیا تھا اور واپس نہیں آیا تھا۔ عفریت دہموش کے ساتھ ہی مجھے یوسف کی یاد آئی تھی۔ وہ بھی مصر ہی میں تھا۔ دہموش کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے میرے وجود میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود دہموش کی طرف سے مجھے کھٹکا سا لگا رہتا تھا۔ میں ان روح فرسا واقعات کو بھولی نہیں تھی جب اس خطرناک عفریت نے مجھے اغوا کر لیا تھا۔ میری محبت میں عارج نے بھی اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ اگر عالم سوما کے ایماء پر عارج نے حوصلہ نہ کیا ہوتا تو شاید آج میں اپنی پراسرار داستان سنانے کے لئے زندہ نہ ہوتی۔ وہ بدبخت عفریت دہموش مجھے اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا، مگر میں اس کے چنگل سے نکل آئی۔ اسی وجہ سے وہ میرا جانی دشمن ہو گیا اور عارج کو بھی اس نے مار ڈالنا چاہا۔ سوما نے قدم قدم پر میری اور عارج کی مدد کی۔ دہموش سے اس معرکہ آرائی کا ذکر میں تفصیل سے کر چکی ہوں۔ یہاں میرا مقصد یاد دہانی ہے، وہ بھی اس لئے کہ میرے بھائی یوسف پر جو گزری اس کی جڑ بنیاد ملعون دہموش ہی تھا۔

اپنے بڑے بھائی یوسف سے مجھے اس شام جو کچھ معلوم ہوا وہ میں اختصار کے ساتھ بیان کر رہی ہوں۔

عفریت دہموش مجھے مصر جا کر بھی بھول نہ سکا۔ اس کی سکونت فراعنہ مصر میں سے ایک فرعون کے مقبرے میں تھی۔ اسی مقبرے میں دہموش کا دوست عکب بھی رہتا تھا۔ اپنی موت سے کچھ پہلے دہموش نے عکب کو میرے بارے میں بتایا۔ میرے حُسن کی تعریف بھی دہموش نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ نتیجہ یہ کہ دہموش سے میرے قصے سن سن کر مجھے دیکھنے کی خواہش نے اس کی فطری شیطنت کو بیدار کر دیا۔ دہموش تو مر گیا مگر عکب نے فیصلہ کر لیا کہ ہر قیمت پر مجھے حاصل کر کے رہے گا۔ وہ کیونکہ غیلان بھی تھا اس لئے اور بھی مغرور تھا۔ مجھ تک پہنچنے اور میرے متعلق ضروری و مطلوبہ تفصیل جاننے کی غرض سے عکب نے سحر و افسوں کا سہارا لیا۔ تبھی اسے پتہ چلا کہ میرا بڑا بھائی یوسف بھی قاہرہ ہی میں ہے۔ عکب نے یوسف کو اغوا کر لیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یوسف پر دباؤ ڈال کر مجھ تک پہنچنے کی راہ ہموار کر لے۔ یوسف اس کے دباؤ میں نہ آیا اور تشدد و اذیت سہتا رہا۔ اسی دوران میں عکب نے یوسف کو بتا دیا کہ اس کا دوست دہموش مر چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے باقی ساری باتیں بھی یوسف کو بتا دیں کہ اس کی مرضی کیا ہے اور اسے کس طرح

میرے بارے میں پتہ چلا۔

ایک غیرت مند بھائی خواہ وہ جن زاد ہو یا آدم زاد کسی صورت یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی بہن پر ذرا سی بھی آنچ آئے۔ وہ مرنا قبول کر لے گا مگر اپنی عزت و ناموس کا سودا نہیں کرے گا۔ سو میرے بھائی یوسف نے بھی ایسا ہی کیا۔ عکب نے اس پر ظلم کی انتہا کر دی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا۔ اس عرصے میں ایک رات عکب نے یوسف سے کہا کہ اے یوسف! اب تیری زندگی کی مہلت صرف تین دن رہ گئی ہے۔ اس کے بعد مجھے تیری ضرورت نہیں رہے گی۔ میں، دینار کے متعلق مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کی خاطر جو عمل کر رہا ہوں وہ آئندہ تین روز میں پورا ہو جائے گا۔ پھر کوئی بھی طاقت مجھے دینار تک پہنچنے سے نہیں روک سکے گی۔ عمل پورا ہوتے ہی میں تجھے مار ڈالوں گا۔ مجھے اب تیری زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

ادھر تو یوسف کا یہ حال تھا، ادھر یوسف کی بیوی خرقاء اور اس کے قبیلے والے سخت پریشان تھے۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ اچانک یوسف کچھ کہے سنے بغیر کہاں چلا گیا۔ چند روز تو انہوں نے یوسف کی واپسی کا انتظار کیا، پھر خرقاء کے اصرار پر قبیلے کے سردار سیوط سے ملے۔ خرقاء کا قبیلہ بھی اہل ایمان میں سے تھا۔ سردار قبیلہ سیوط نے قبیلے کے عالم دغال ابیض کو طلب کر لیا۔ عالم ابیض نے ایک عمل کر کے یوسف کا سراغ لگا لیا کہ اسے کہاں اور کس نے قید کر رکھا ہے۔ یوسف کی رہائی کے لئے قبیلے والوں کو ابیض نے ایک عمل تعلیم کیا۔ قبیلے میں خرقاء کے عزیز و اقارب اور دیگر ہمدرد جنات بھی تھے۔ انہوں نے یوسف کو عفریت عکب کی قید سے آزاد کرانے کا عزم کیا۔ ہر چند کہ یہ جان کو بازی لگانے کا کام تھا مگر خرقاء کی مدد پر آمادہ ہو گئے۔ اگر کسی طرح ظالم عکب کو ان جنات کی بابت معلوم ہو جاتا تو وہ انہیں زندہ نہ چھوڑتا۔

سردار سیوط نے ان جنات کو ہدایت کی کہ وہ بے حد چوکنا رہیں، حتی الامکان اپنی جان بچانے کی کوشش کریں، دانستہ اپنی زندگی کو خطرے میں نہ ڈالیں۔

عالم ابیض کی اطلاع کے مطابق عکب نے یوسف کو کرہ ارض پر نہیں، کرہ ہوا میں قید کیا تھا، اس کے لئے عکب نے یوسف کے گرداگرد ایک حصار کھینچ دیا تھا۔ اس حصار میں عکب کے سوا کوئی اور جن زادہ داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ عالم ابیض ان باتوں کا پتہ لگا چکا تھا۔ اس

نے یوسف کو رہا کرانے کی خاطر جو عمل تعلیم کیا، وہ حصار شکن ہی تھا، عمل کے الفاظ پڑھنے سے حصار ٹوٹ جاتا۔ مقررہ مقام تک پہنچنے کے لئے جنات نے آدھی رات (زوال کا وقت) کا تعین کیا۔ ان جنات کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں عفریت حصار کی نگرانی نہ کر رہا ہو۔ ایسی صورت میں انہیں اپنی زندگی بچانا دشوار ہو جاتا۔ اس کے لئے انہوں نے خود کو دو ٹکڑیوں میں بانٹ لیا۔ یوں وہ زیادہ محفوظ رہتے۔ مقابلہ یا فرار، دونوں ہی صورتوں میں ان کی کامیابی کا امکان تھا۔ یوسف کی بیوی خرقاء بھی اپنے بہی خواہوں کے ساتھ جانے پر بضد ہوئی مگر سردار قبیلہ سیوط نے اسے اجازت نہیں دی۔

طے شدہ منصوبے کے مطابق جنات کی وہ دونوں ٹکڑیاں فضا میں بلند ہوتی گئیں۔ انہوں نے ابوالہول کے مجسمے کو نشانی بنایا اور آسمان کی طرف اسی کی سیدھ میں آگے بڑھتے گئے۔ غرور کرنے والوں کو اپنی طاقت پر کچھ زیادہ ہی زعم ہوتا ہے۔ عکب بھی مغرور تھا۔ اسے یقیناً یہ غلط فہمی ہوگی کہ کوئی اس مقام تک نہیں پہنچ سکے گا جہاں اس نے خلاء میں یوسف کو قید کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا پر یقین رکھنے والے جنات کو کامیابی ہوئی۔ انہیں کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جب حصار ٹوٹا تو یوسف نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ قبیلہ سیوط کے جنات نے اسے سنبھال لیا اور تیزی کے ساتھ قاہرہ کے نواح میں زمین پر اتر گئے۔ یہیں ان کا پورا قبیلہ آباد تھا۔

جنات جہاں جتھوں، گروہوں یا قبیلوں کی صورت میں ایک ساتھ رہتے ہیں وہاں خطرناک سے خطرناک عفریت نہیں جاتے۔ وہ کسی ایک کمزور جن زادی پر تو قابو پا سکتے ہیں یا ان جیسی کمزوروں کو موت کے گھاٹ اتارنے پر قادر ہیں لیکن کسی قبیلے سے لڑنے کی کبھی ہمت نہیں کرتے۔ کمزور خواہ جن زاد ہوں یا آدم زاد، اگر متحد ہو جائیں تو بڑی سے بڑی طاقت ان کے سامنے کچھ نہیں۔

جس رات یہ واقعہ پیش آیا، اس کی صبح عکب کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے والی تھی۔ بہر صورت یوسف زندہ بچ گیا۔ اس نے پوری طرح صحت یاب ہونے کے بعد اپنی بیوی خرقاء کو ساتھ لیا اور مصر سے عراق آ گیا۔

بابل کے کھنڈرات میں پناہ لئے اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی، میرے باپ اخضم کے حکم پر وہ فوراً میری تلاش میں چل دیا، مجھے ڈھونڈنے میں اسے مشکل نہ ہوئی۔ میرے وجود

کی خوشبو نے اسے راستہ دکھایا اور وہ مجھ تک پہنچ گیا۔ مجھے صدا لگا کر اس نے کھنڈرات کی راہ لی کہ تفصیلی گفتگو کے لئے یہی سب سے محفوظ جگہ تھی۔

یوسف کا پورا قصہ سن کر کئی باتیں بہ یک وقت میرے ذہن میں آئیں، انہی کی بنا پر میں نے یوسف سے دریافت کیا۔ ''اے میرے بھائی! عکب کی قید سے آزاد ہونے کے بعد تجھے صحت یابی میں کتنے دن لگے؟''

''مشکل سے ایک ہفتہ لگا ہوگا۔'' یوسف نے جواب دیا۔ ''تو یہ کیوں پوچھ رہی ہے اے میری بہن دینار؟''

''اس کی وجہ ہے۔'' میں بولی۔ ''تجھ سے یا تو عکب نے جھوٹ بولا کہ میرے متعلق مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے لئے وہ جو عمل کر رہا ہے، تین دن میں پورا ہو جائے گا یا پھر کسی سبب وہ فوری طور پر عراق نہیں آسکا۔''

''اے دینار! مجھے تیری دوسری بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔ اس نے عمل کی مدت تو بتائی تھی مگر عراق آنے کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں کیا تھا۔ ہمیں اس خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے کہ اگر وہ گزشتہ ایک ہفتے میں یہاں نہیں آیا تو آئندہ بھی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ مجھے زیادہ فکر تیری طرف سے تھی کیونکہ تو قبیلے والوں کے ساتھ ان کھنڈرات میں نہیں رہتی..... خیر اب یہ سوچ، کیا ہو؟ خطرے سے کس طرح بچا جائے؟''

میں کچھ دیر چپ رہی اور ممکنہ خطرے کا جائزہ لیا۔ ہر چند کہ میں براہ راست خطرے کی زد میں تھی لیکن میرے لئے اپنا دفاع کرنا ممکن تھا، یہی صورت عارج کے ساتھ بھی تھی۔ یوسف کا معاملہ اب تک ہم دونوں سے مختلف تھا۔ وہ ہماری طرح نہ تو عالم سوما کی ہدایات پر عمل پیرا رہا تھا، نہ اسے وظائف و عملیات سے کوئی دلچسپی تھی۔

برسوں پہلے تک عارج اور میں، عفریت وہوش کی نظروں سے چھپے رہنے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کئے رہتے تھے، کبھی ہم آنے والے زمانوں کی طرف نکل جاتے کبھی ماضی کا سفر اختیار کرتے۔ اس کے علاوہ آدم زاد اور آدم زادیوں کے جسموں کو گویا اپنا ''گھر'' بنا لیتے۔ آدم زادوں کے درمیان بغداد ہی میں رہنے کی خاطر نیز وہوش سے بچنے کے لئے عالم سوما نے مجھے اور عارج کو ایک عمل تعلیم کیا تھا۔ اس عمل کی خاصیت یہ تھی کہ ہم دونوں کے گرد الگ الگ نادیدہ حصار قائم ہو جاتے، ان حصاروں میں رہتے ہوئے ہمیں

عفریت وہوش کی طرف سے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ وہ ہمیں دیکھ لے گا۔ ہر مرتبہ چالیس دن گزرنے کے بعد یہ عمل کرنا پڑتا۔ عرصہ دراز سے ہم نے اس مشق کو ترک کر دیا تھا۔ اس کاذ عفریت وہوش کو جیسے ہم بھول ہی گئے تھے۔ یوں بھی وہوش سے دشمنی کو صدیاں گزر چکی تھیں اور اس کی طرف سے کوئی ''چھیڑ چھاڑ'' نہیں ہوئی تھی۔

اب اچانک ہی صورتحال بدل گئی تو مجھے سوچنا پڑا۔ ایک دشمن کی جگہ دوسرے خطرناک دشمن نے لے لی تھی۔ کافی غور وخوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ عالم سوما سے رہنمائی حاصل کرنی چاہئے۔ اسی کا اظہار میں نے یوسف سے کر دیا۔

''تو مل لے اس سے، اس بوڑھے کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ وہ جو مشورہ دے، تو مجھے بتا دینا۔'' یوسف نے کہا۔ اس کے لہجے میں کسی قدر بے زاری تھی۔ میں یہ بھول ہی گئی تھی کہ میرا بڑا بھائی، عالم سوما کے وعظ کہنے اور نصیحت کرنے کو پسند نہیں کرتا۔ سینکڑوں برس گزرنے کے بعد اتنی اتنی سی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں۔

''اے یوسف! بہتر یہ ہوتا کہ تو بھی میرے ساتھ چلتا۔'' میں نرمی سے بولی۔ ''اس معاملے سے براہ راست اب تیرا بھی تو تعلق ہے۔''

''مجھے اس تعلق سے انکار نہیں ہے اے دینار، مگر..... مگر وہ.....سوما یہ سمجھے گا کہ مطلب پڑا تو آ گیا ورنہ کبھی جھانکا بھی نہیں اور.....''

میں بول اٹھی۔ ''وہ عالم ہے اور عالم ایسی باتیں نہیں سوچتے۔ اعلیٰ ظرف والے ہوتے ہیں اے یوسف۔''

''ہوں بڑے ظرف والے۔ مجھے کیا لینا۔'' یوسف کے لہجے کی بیزاری برقرار رہی۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں ہی عالم سوما سے مل لیتی ہوں، مجھے امید ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکال لے گا۔''

یوسف میری بات سن کر کچھ نہ بولا تو میں منڈیر سے اتر آئی اور کھنڈرات کے اس حصے کی طرف بڑھنے لگی جہاں عالم سوما کی سکونت تھی۔ کافی عرصے کے بعد میں ان کھنڈرات میں آئی تھی، مگر سب کچھ پہلے جیسا تھا۔

پیچھے سے یوسف کی صدا آئی۔ ''میں، خرقاء کے پاس جا رہا ہوں، وہ تیرے اور میرے باپ کے ساتھ ہے۔''

میں نے مڑ کر اسے دیکھا اور آگے چل دی، اس وقت تک اجالا رخصت ہو چکا تھا۔ کھنڈرات میں اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

خلاف توقع عالم سوما مجھے پہلے کی نسبت زیادہ تندرست و توانا دکھائی دیا۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ کر اٹھا تھا، مجھے دیکھ کر اس نے خوشی کا اظہار کیا اور بولا۔ ''اے میری بچی، اے دینار کیسی ہے تو؟''

''تجھے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے اے میرے باپ کے دوست!'' میں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا، پھر بولی۔ ''ایک معاملے میں تیری رہنمائی کے لئے آئی ہوں، میں جانتی ہوں تو مجھے مایوس نہیں کرے گا۔''

''آ میرے پاس بیٹھ! تیری صورت دیکھنے کو تو میں ترس گیا۔'' عالم سوما نے کہا۔ پھر جب میں اس کے قریب جا بیٹھی تو وہ مزید بولا۔ ''بول اور بلا جھجک بول کہ تو کس مشکل میں ہے؟...... اپنی عبادات کے سبب کچھ عرصے میں تیری خبر نہ رکھ سکا۔ انہی اوراد و وظائف کی وجہ سے بہت سی بیماریوں نے میرا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔ اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے ...... تجھے کچھ فرق نظر آ رہا ہے؟...... خیر تو اپنی کہہ!''

میں نے وہ ساری روداد بیان کر دی جو یوسف کے توسط سے مجھے معلوم ہوئی تھی۔

عالم سوما نے بڑی توجہ سے تمام قصہ سنا، پھر کہنے لگا۔ ''یہ جان کر تو خوشی ہوئی کہ کافر عفریت دہموش مر گیا۔ مگر وہ لعنتی عکب کو اپنے پیچھے چھوڑ گیا، تجھے ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں اے دینار! ابھی تیرے باپ کا دوست سوما زندہ ہے۔'' اس نے میرا حوصلہ بڑھایا اور اپنی بات جاری رکھی۔ وہ مجھے اس عمل کی یاد دلانے لگا جو کبھی عفریت دہموش کے شر سے محفوظ رہنے کی خاطر تعلیم کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سحر و افسوں کا توڑ بھی بتایا۔ اس طرح مجھ پر عکب کا جادو نہ چلتا۔ وہ کچھ قرآنی آیات تھیں جن کا مجھے ورد کرنا تھا، لیکن اس وقت کہ جب جادو کا کوئی اثر ظاہر ہونے لگے یا جادو کا شبہ ہو۔ عالم سوما نے مجھے مذکورہ عمل کرنے کا مشورہ دیا، آخر میں وہ بولا۔ ''اور تو سب کچھ ٹھیک ہے البتہ ایک خطرہ بدستور رہے گا۔''

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''جادو ایک طرح سے اندھیرے کا تیر ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں قبل از وقت کوئی اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کون، کب اور کہاں تیرے لئے کوئی جادوئی عمل کر رہا ہے، یہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ جادو کا توڑ اسی وقت ممکن ہے جب اس کا یقین ہو جائے اور اس کی علامات ظاہر ہونے لگیں یا جادو کا اندیشہ ہو، اس خطرے سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اے دینار! تجھے ہر وقت چوکنا رہنا ہوگا۔''

''عمل کے بعد قائم ہونے والے نادیدہ حصار کے باوجود جادو اثر کر سکتا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں......'' عالم سوما نے جواب دیا۔ ''نادیدہ حصار سے جادو کا کوئی تعلق نہیں۔ اس حصار میں رہ کر تو کسی بھی عفریت کی غیر معمولی قوت، طاقت اور ظلم سے تو محفوظ رہ سکتی ہے لیکن اس کے سحر و افسوں سے نہیں۔ جادو کے ذریعے وہ تیرے حواس کو فریب دے سکتا ہے، مثلاً تجھے جو نظر آئے درحقیقت ویسا نہ ہو...... یوں سمجھ کہ فریب نظر اور فریب سماعت میں بھی وہ تجھے مبتلا کر سکتا ہے۔ کافروں کا اور کام بھی کیا ہے، وہ دھوکا ہی تو دیتے ہیں!...... اے دینار! تو مجھے کچھ فکر مند سی لگ رہی ہے، میں تجھے ابھی سمجھا چکا ہوں کہ خوفزدہ نہ ہو، اب میں خود اس معاملے میں تیری خبر گیری رکھوں گا۔''

عالم سوما کے آخری الفاظ نے بڑی حد تک میری فکر و تشویش کو ختم کر دیا۔ پہلے بھی عفریت دہموش سے معرکہ آرائی کے دوران میں بھی وہ بروقت میری مدد کرتا رہا تھا۔ اس سے قطع نظر میرے ذہن میں کچھ اور نئے سوالات پیدا ہونے لگے۔ ان سوالات کا تعلق مجھ سے نہیں میرے لواحقین سے تھا۔ سو میں نے عالم سوما سے پہلا سوال کیا۔

''یہ بتا کہ میرے بڑے بھائی یوسف کو اپنی حفاظت کے لئے کیا کرنا چاہئے؟ اسے تو عفریت عکب اپنی قید میں رکھ چکا ہے!''

''میں جانتا ہوں اے دینار کہ تیرا بھائی میرے پاس آنے سے کتراتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی میرے دوست اعظم کی اولاد ہے اور میں اسے تیری ہی طرح عزیز رکھتا ہوں، سو میں تجھ سے یہ نہیں کہوں گا کہ اسے میرے پاس بھیج دے، خیر...... تو نے جو سوال کیا اس کا جواب سن! عفریت عکب کے مزید ظلم سے یوسف محفوظ رہے، اس کی بہترین صورت تو یہ ہے کہ وہ قبیلے والوں کے ساتھ انہی کھنڈرات میں رہے۔ یہاں عکب داخل نہیں ہو گا۔ اگر وہ مصر ہی واپس جانے پر بضد ہو تو اسے قبیلہ سیوط میں رہنا پڑے گا، جس قبیلے سے اس کی

بیوی خرقاء کا تعلق ہے۔'' عالم سوما نے تفصیل سے میرے سوال کا جواب دیا۔

''مگر اے عالم سوما، اس طرح تو وہ محدود ہو کے رہ جائے گی'' میں بولی۔

''تو نے درست کہا اے دینار! وہ چاہے بابل کے کھنڈرات میں رہے خواہ قاہرہ کے نواحی علاقے میں، اس کی نقل و حرکت محدود ہو جائے گی۔'' عالم سوما نے میرے خیال سے اتفاق کیا۔

''کیا یہ ممکن نہیں کہ تو نے مجھے جو عمل تعلیم کیا ہے، میں اپنے بھائی کو بھی بتا دوں؟ اس طرح وہ آزادی سے جہاں چاہے آ اور جا سکے گا۔'' میں نے پُر امید لہجے میں عالم سوما سے کہا۔

''بالکل ممکن ہے، یوسف بھی یہ عمل کر سکتا ہے لیکن اسے ہر چالیس دن کے بعد یہ عمل کرنا ہوگا، ایک دن کی بھول بھی ہو گئی تو عمل بے اثر ہو سکتا ہے، جو یہ حصار تو چالیس دن ختم ہوتے ہی خود بخود ٹوٹ جائے گا، اس حصار کو قائم رکھنے اور دشمن کے کسی نقصان سے بچنے کی یہی تدبیر ہے کہ ادھر وقت پورا ہو اُدھر دوبارہ عمل کر لیا جائے۔ تو نے طویل عرصے تک خود یہ عمل کیا ہے اس لئے بہتر طور پر یوسف کو سمجھا سکے گی۔''

''ہاں عالم سوما!'' میں نے اقرار کیا، پھر پوچھا۔ ''میرے ماں باپ کے لئے تو یہ عمل ضروری نہیں؟''

''تو یہ کیوں بھول گئی اے دینار کہ میرا دوست اور تیرا باپ اخضم اسی قبیلے کا سردار ہے! میں تو عالم کہلاتا ہوں مگر تیرا باپ تو عمل کرنے والا بھی ہے۔ اسما ء اللہ کا خاص کرم ہے۔ علم و عمل کی یک جائی معمولی بات نہیں۔''

''میں نے یہ بات محض اس لئے پوچھی کہ اگر اس کافر عفریت غلب نے کسی شیطانی عمل کے ذریعے میرے متعلق سب کچھ معلوم کر لیا تو ماں باپ سے بھی انتقام لے سکتا ہے گا۔'' میں نے وضاحت کی۔

''تیرا اندیشہ اپنی جگہ غلط نہیں۔ مگر تیرے ماں باپ اللہ کی پناہ میں ہیں۔ کوئی بھی عفریت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

عالم سوما کی بات سن کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور پھر اس سے دعائیں لے کر وہاں سے اٹھ آئی۔ اب مجھے اپنے بھائی یوسف کی بیوی خرقاء کو دیکھنے کی جلدی تھی۔

میں کھنڈرات کے اس حصے میں پہنچی جہاں میرے ماں باپ رہتے تھے تو میری ماں طرطبہ مجھ سے لپٹ گئی۔

''تو آخر کب ہمارے پاس آ کے رہے گی میری بچی؟'' یہ کہتے ہوئے ماں کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''اپنا گھر کیوں نہیں بسا لیتی؟''

''اے میری ماں! تم نے ایک ساتھ دو باتیں کی ہیں، یا تو میں تیرے پاس رہ سکتی ہوں یا پھر اپنا گھر بسا سکتی ہوں۔'' میں نے دانستہ شگفتہ لہجہ اختیار کیا، یہ غنیمت تھا کہ اس ٹوٹے ہوئے دالان میں میری ماں اس وقت اکیلی ہی تھی۔

''اچھا تو پھر تو اپنا گھر بسا لے اے دینار!'' میری ماں نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

''یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، مجھے بتا اے ماں کہ تیری بہو خرقاء کہاں ہے؟'' میں نے معلوم کیا۔

''اسی قریبی حجرے میں کہ جہاں پہلے تیرا بھائی یوسف رہتا تھا'' ماں نے بتایا۔

برابر والا دالان میرے باپ اخضم کے لئے مخصوص تھا۔ اس کی دائیں جانب وہ حجرہ، یعنی شکستہ کوٹھری تھی جہاں یوسف کی سکونت تھی۔ میں نے ماں سے پوچھا۔ ''اپنی بہو کیسی لگی؟''

ماں جواب میں بولی۔ ''یوں تو ٹھیک ہے مگر......'' اس کی آواز سرگوشی کی حد تک دھیمی ہو گئی۔ ''کاش وہ صاحب اولاد بھی ہوتی۔''

بعض جن زادیاں بھی آدم زادیوں کی طرح بانجھ ہوتی ہیں، ہر ماں کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کے بچے بھی اولاد والے ہوں۔ اس اعتبار سے میری ماں کی خواہش فطری تھی۔ عموماً جنات کثیر الاولاد ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی آدم زادی کا ایک تو جن زادی کے 9 بچے ہوتے ہیں، میرے خاندان کے ساتھ معاملہ برعکس ہوا۔ میری ماں کی دو ہی اولادیں ہوئیں، ایک یوسف دوسری میں۔ اس پر یہ ستم ہوا کہ یوسف نے جس جن زادی کو اپنی بیوی بنایا، بانجھ نکلی۔ میں نے اب تک شادی نہیں کی۔ سو یوں اپنی ماں طرطبہ کا دکھ سمجھنا میرے لئے مشکل نہ تھا۔

میرا اندازہ یہ تھا کہ یوسف اپنی بیوی خرقاء سے محبت کرتا ہوگا اور محبت دوئی برداشت نہیں کرتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یوسف کسی اور جن زادی کو بھی اولاد کی خاطر اپنی بیوی بنا لیتا۔

اپنی ماں کی بات کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے خیال میں موضوع گفتگو بدلنا زیادہ مناسب تھا۔ میں نے اسی وجہ سے اپنے باپ اخضم کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ کہاں ہے؟

"تیرا باپ طبیب حامہ بن ہیم سے دوا لینے گیا ہے، بس آتا ہی ہوگا۔" ماں نے جواب دیا۔

"میں اتنے میں یوسف کی بیوی سے مل لیتی ہوں۔"

"ہاں مل لے۔" ماں بولی۔ "مگر وہیں سے چلی نہ جائیو۔"

ماں کو تسلی دے کر کہ ابھی نہیں جا رہی، میں نے یوسف کے حجرے کا رخ کیا۔

میں وہاں پہنچی تو میری پہلی نظر خرقاء پر پڑی۔ اسے دیکھ کر میں مبہوت سی رہ گئی، کم جن زادیاں اتنی حسین ہوتی ہیں۔ میرے بھائی یوسف کا انتخاب واقعی بے مثل تھا۔

"یہی ہے میری چھوٹی بہن دینار کہ میں جس کا انتظار کر رہا تھا۔" یوسف نے اپنی بیوی خرقاء سے میرا تعارف کرایا۔

"میں اس کے آتے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ دینار ہے۔ اسکی خوبصورت بھلا اور کون ہو سکتی ہے!" خرقاء نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور مجھے اپنے پاس بٹھا کے باتیں کرنے لگی۔ جان بوجھ کر میں نے کچھ دیر صبر سے کام لیا۔

"اے خرقاء! میں پھر کبھی تیرے پاس فرصت سے آؤں گی۔ ابھی مجھے تیرے شوہر سے بھی کچھ ضروری گفتگو کرنی ہے۔ اپنے باپ اخضم سے ملنا ہے اور پھر واپس بغداد بھی پہنچنا ہے۔" میں یہ کہتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو آدم زادوں ہی کے درمیان کیوں رہتی ہے اے دینار؟" خرقاء نے سوال کیا۔

"یہ بڑی طویل داستان ہے اے خرقاء، پھر کبھی سناؤں گی۔" میں نے یہ کہتے ہی یوسف کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

میں اور یوسف اس حجرے سے نکل کر نسبتاً کھلی جگہ میں آ گئے۔ اسے میں نے وہ ساری باتیں بتا دیں جو عالم سوما نے مجھ سے کہی تھیں۔

"یہ تو ٹھیک ہے اے دینار!" میری توقع کے برعکس یوسف نے کہا۔ "میں اس طرح جہاں چاہوں گا آ جا سکوں گا۔"

"تیرا ارادہ کیا ہے، یہیں رہے گا یا واپس مصر چلا جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں رہنے کا انحصار خرقاء پر ہے، اگر اس کا جی یہاں لگ گیا تو مصر واپس جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تو دراصل تیری وجہ سے یہاں آیا تھا۔" یوسف نے جواباً کہا۔

"تجھے ایک ممکنہ خطرے سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔"

میں نے اسے اس عمل کے الفاظ بتا دیئے جو مجھے عالم سوما نے تعلیم کئے تھے۔ اسی کے ساتھ چالیس دن کی تاکید بھی کر دی۔

"تو اطمینان رکھ اے دینار، میں دنوں کا خیال رکھوں گا۔" یوسف نے یقین دہانی کرائی، پھر مجھ سے معلوم کیا۔ "تیرا کیا ارادہ ہے، تو یہیں رہے گی کہ بغداد جائے گی؟"

اس موقع پر یوسف نے عارج کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔

"مجھے بغداد ہی واپس جانا ہے کیوں کہ......" میں، عارج کا نام لیتے لیتے رک گئی۔

"وہاں کئی کام ادھورے چھوڑ آئی ہوں۔" اپنے اور عارج کے تعلقات کو میں زیر بحث لانا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ میرا بھائی، عارج کے ساتھ میرے رہنے کو پسند نہیں کرتا۔ اس پر میرے اور یوسف کے درمیان ایک مرتبہ تلخ کلامی بھی ہو چکی تھی۔

یوسف کہنے لگا۔ "پھر بھی آتی جاتی رہیو، اس سے خرقاء خوش ہوگی۔"

"کوشش کروں گی۔" میں نے کہہ دیا۔

میں نے اس دوران میں اپنے باپ اخضم کو کچھ فاصلے سے گزرتے دیکھا۔ یوسف کو بھی میں نے بتایا کہ ابھی اپنے باپ سے نہیں ملی۔ وہ اپنے حجرے کی طرف واپس ہو گیا۔

پھر اپنے والدین کے ساتھ میں زیادہ دیر نہیں رکی۔ روانگی سے قبل میں نے عمل کے الفاظ دہرا لئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے عارج کی فکر تھی، نئی صورتحال سے اسے بھی مطلع کرنا وقت کا تقاضا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ عفریت وہموش نے میری روداد سناتے ہوئے علب سے عارج کا ذکر بھی کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ خود علب نے میرے متعلق جو معلومات حاصل کی ہوں گی ان سے بھی وہ عارج کے بارے میں سب کچھ جان گیا ہوگا، فی الحال یہ مفروضات تھے لیکن یہی حقیقت بھی بن سکتے تھے۔

✿......✿

بغداد پہنچتے ہی میں سیدھی ولی عہد ابوبکر کے قصر کی طرف گئی۔ عارج کو ابوبکر ہی کے انسانی قالب میں ہونا چاہیے تھا۔ آج ہی شام سے پہلے تو میں اس سے ملی تھی۔ خراسان (ایران) جا کر ابنِ علقمی کی سازش کو ناکام بنانا میں بھولی نہیں تھی۔ لیکن عفریت عکب کا معاملہ ترجیح طلب تھا۔ بغداد سے خراسان پہنچتے میں ابھی ابنِ علقمی کے معتمد خاص سلمان کو خاصا وقت لگتا۔ میں اس عرصے میں کسی ایسی تدبیر پر عمل پیرا ہو سکتی تھی کہ ہلاکو خاں، سازشی وزیراعظم ابنِ علقمی کے مکتوب کا کوئی اثر نہ لے اور عراق پر حملہ نہ کرے، میرے لئے آج رات بھی یہ اہم کام انجام دینا ممکن تھا۔

میں یہی سوچتی ہوئی ولی عہد ابوبکر کے قصر میں داخل ہوئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ ”ولی عہد بہادر“ اپنے خلوت کدے میں ہیں۔ ”خلوت“ کا مطلب میں خوب جان گئی تھی۔ حکمران طبقے سے تعلق رکھنے والے خلوت میں جلوت کے مزے لوٹتے تھے۔ اس ”خلوت“ میں ان کے پاس نوجوان و حسین کنیزیں ہوتیں۔ جام و مینا اور ساز و آواز کی سنگت میں وہ جب سرشار ہو جاتے تو خلوت کدے سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں آ جاتے۔ ایسے میں دو تین حسین کنیزیں انہیں سہارا دیئے ہوتیں۔ خلوت کدے میں جانے کے بعد ان سے کوئی نہیں مل سکتا تھا۔ اسی سبب میرے وجود میں شعلے سے بھڑک اٹھے عارج کو ابھی سے ہوا لگ گئی کہ ”خلوت کدہ“ سجانے لگا۔

اندھیرے کی چادر اوڑھ کر میں خلوت کدے میں داخل ہوئی تو میرے وجود کو جھٹکا سا لگا۔ ابوبکر کے پیکر میں عارج وہاں اکیلا تھا، وہ مجھے کسی سوچ میں گم دکھائی دیا۔

”کیا بات ہے اے عارج، کیوں گم صم بیٹھا ہے؟“ میں نے اچانک اسے مخاطب کیا۔

وہ چونک کر بولا۔ ”تو اے دینار!...... مگر نظر کیوں نہیں آ رہی؟“

میں نے اندھیرے کی چادر اتار دی اور اس سے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہا تھا؟“

”یہ کہ تُو آخر بابل کے کھنڈرات سے کب واپس آئے گی۔“ اس کے لہجے میں اُداسی کی خفیف سی لہر تھی۔

”تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں وہاں گئی تھی؟“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

”تُو اگر چھپ کر میری نگرانی کر سکتی ہے تو میں بھی تیری نقل و حرکت پر نظر رکھ سکتا ہوں، لیکن...... لیکن مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ عارج کے لہجے میں سنجیدگی اور اس کے انسانی قالب کی پیشانی پر سلوٹیں تھیں۔

”بتا تو سہی، کیوں اُداس بلبل بنا ہوا ہے؟ تجھے تو میں، فردوس کے پاس نجمہ کے قصر میں چھوڑ کر گئی تھی!“

عارج نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولا۔ ”ہاں اے دینار! میں تجھے روکتا رہ گیا تھا مگر تُو چلی گئی تھی۔ مجھے اس وقت یوں لگا جیسے تجھے کہیں جانے کی جلدی ہو۔ میرے اندر تجسس پیدا ہوا۔ فردوس کو غنودگی کی حالت سے نکال کر میں ہوش میں لایا، اسی کے ساتھ ابوبکر کے قالب سے باہر آ گیا۔ مجھے اب تیری فکر تھی کہ تُو کہاں گئی ہے! کچھ ہی دیر میں تُو مجھے بغداد شہر پر دھیمی پرواز کرتی نظر آئی، پھر دوسرے ہی لمحے مجھے تیرا بڑا بھائی یوسف دکھائی دیا جو تجھے پکار رہا تھا۔ تُو پلٹی اور فضا میں غوطہ لگا کر یوسف کے پیچھے پیچھے بابل کے کھنڈرات میں داخل ہو گئی۔ مجھے دُکھ یہ ہے اے دینار کہ تُو نے اپنے بڑے بھائی کی آمد سے بے خبر رکھا...... بول مت، ٹھہر جا! پہلے میری بات سن لے!...... میں سمجھ گیا کہ تیرے بھائی نے مصر سے عراق آ کر کوئی فتنہ پھر سے کھڑا کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ میں واپس ابوبکر کے پیکر میں لوٹ آیا۔ فردوس کو تُو عارضی طور پر میرا مطیع بنا ہی چکی تھی۔ وہ نجمہ کے ساتھ قصر خلافت جانے پر آمادہ ہو گئی۔ میں دن ڈھلے یہاں ابوبکر کے قصر میں آ گیا۔ اس قصر میں دل بستگی کے لئے بہت کچھ ہے مگر نہ تو ابوبکر ان تعیشات کا عادی ہے نہ مجھے کوئی لگاؤ ہے...... خیر اس ذکر کو چھوڑ اور یہ بتا پہلے کی طرح یوسف کے مقابلے میں تیرے ماں باپ نے تیرا ساتھ دیا یا نہیں؟“

میں نے عارج کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہی۔

خاصی دیر ہو گئی تو عارج نے مجھے ٹوکا۔ ”تُو بولتی کیوں نہیں اے دینار؟...... کیا نکاح کے بغیر میرے ساتھ رہنے پر یوسف نے پھر اعتراض کیا ہے؟...... اگر واقعی ایسی کوئی بات ہے، تجھ پر تیرے گھر والوں کا دباؤ ہے تو پھر......“

"مجھ سے نکاح کر لے۔" میں بول اٹھی۔ "تُو یہی کہنا چاہتا ہے نا؟...... ویسے آج یہ طے ہو گیا کہ تُو رائی کا پہاڑ بنانے میں جواب نہیں رکھتا۔"

"یہ کیا بات ہوئی! تُو آنکھوں دیکھا جھٹلا رہی ہے۔ بول، کیا تیرا بھائی یوسف تجھے آواز دے کر بابل کے کھنڈرات میں نہیں لے گیا؟ کہہ دے کہ جھوٹ ہے یہ!...اور یہ بھی کہ..."

"تُو نرا گاؤدی اور بے عقل ہے۔" میں نے گویا اس کی بات پوری کر دی۔

"اگر مجھ میں عقل نہیں اور تُو ہی عقل کی پکی ہے تو پھر بتا دے نا کہ حقیقت کیا ہے!"

"میں نے حقیقت بیان کر دی تو اچھل پڑے گا تُو!...... ہوا سنٹ ہو جائے گی تیری۔"

پھر مزید وقت ضائع کئے بغیر عارج کو میں نے از اول تا آخر سب کچھ بتا دیا۔

"یہ تو بہت ہی برا ہوا اے دینار! جیسے تیسے اس کمینے عفریت وہموش سے پیچھا چھوٹا تھا، اب یہ کمبخت علکب جان کا لاگو ہو گیا۔" عارج سارا قصہ سن کر پُرتشویش آواز میں کہنے لگا۔

"اللہ مالک ہے اے عارج! جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ یہ نہ بھول کہ ہماری پشت پناہی کے لئے عالم سوما موجود ہے۔" میں نے تسلی دی، پھر بولی۔ "تُو پہلا کام یہ کر کہ تعلیم کردہ عمل کے الفاظ دہرا لے تا کہ میری طرح تیرے وجود کے گرد بھی کم از کم چالیس روز کے لئے نادیدہ حفاظتی حصار قائم ہو جائے۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔"

میرے مشورے پر عارج نے فوراً عمل کیا، پھر مجھ سے معذرت بھی کی۔ "میں اس پر نادم ہوں اے دینار کہ تجھے غلط سمجھا، میرے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی کہ ایک اجنبی عفریت ہمارا دشمن ہو سکتا ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "اے عارج! یاد رکھیو، تُو نے میرے سامنے نادم ہونے کا اقرار کیا ہے۔"

وہ بھی ہنس دیا اور بولا۔ "اگر نہ یاد رکھوں تو؟"

"تو میں، فردوس کے جسم کو نہیں اپناؤں گی۔ بول اب کیا کہتا ہے!"

کچھ دیر خوش گپیوں کے بعد میں، ابوبکر کے قصر سے چلی آئی۔ ابھی دوسرا ہی پہر تھا اور نصف شب ہونے میں بہت دیر تھی۔ سو میں پلک جھپکتے خراسان (ایران) پہنچ گئی۔

ہلاکو خاں کا وزیر نصیر الدین طوسی اس وقت تک سویا نہیں تھا۔ عارضی طور پر ہی سہی میں نے اسے اپنے اثر میں لے کر "کام" دکھا دیا۔ وہاں مزید رکے بغیر میں بغداد لوٹ آئی۔

اس دوران میں مجھے نصیر طوسی کے بارے میں پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ ماہر نجوم بھی ہے۔ میں نے سوچا، مزید معلومات کے حصول کی غرض سے پھر کبھی خراسان جاؤں گی۔ کسی ایسے وقت کہ جب ہلاکو خاں کا دربار لگا ہو۔

اب مجھے فردوس کے جسم میں اترنا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ آئندہ روز فردوس کو نجمہ کے ساتھ خلیفہ مستعصم سے ملنے قصر خلافت جانا ہے۔ فردوس مجھے رات کے وقت بھی نجمہ کے قصر ہی میں ملی۔ وہ نجمہ سے رخصت کی اجازت لے رہی تھی کہ میں پہنچ گئی۔

"میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔" نجمہ نے کہا۔ "کل قصر خلد میں نوبت الخاتون ہے۔ سننے چلیں گے۔"

"مجھے کون گھسنے دے گا قصر خلد میں!" فردوس جان کر انجان بن گئی۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ قصر خلافت جانا ہے۔

فردوس کی بات سن کر نجمہ کہنے لگی۔ "کس کی مجال ہے کہ تم سے آنکھیں ملائے۔ تم ولی عہد کی بیگم بننے والی ہو۔"

فردوس چپ ہو گئی اور پھر اس نے جانے پر اصرار نہیں کیا۔ وہ نجمہ کے ساتھ بستر پر سونے کے لئے لیٹی تو میں اس کے جسم میں اتر گئی۔

آدم زادیوں کے جسموں کا کچھ کچھ اثر ہم جن زادیوں پر بھی پڑتا ہے۔ اس کے قالب کو نیند آ رہی تھی، خود میں بھی خاصی تھکی ہوئی تھی، سو گہری نیند سو گئی۔ فردوس کے والدین مطمئن تھے کہ وہ نجمہ کے پاس ہے۔

دن چڑھے میری آنکھ کھلی تو نجمہ محو خواب ہی تھی۔ میں نے اسے جگایا اور پوچھا۔ "کیا قصر خلد نہیں چلنا؟"

"کیوں نہیں!" نجمہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "چلو پہلے تم غسل کر لو۔" نجمہ مجھ سے مخاطب تھی۔

کچھ ہی دیر میں جب میں غسل کر کے باہر آئی تو مشاطاؤں نے میرا سنگھار کیا اور کنیزوں نے کپڑے بدلوا دیئے۔

نجمہ بھی جلدی [illegible] ہو گئی۔ ہم نے ناشتہ کیا اور بگھی میں سوار ہو کر قصر خلافت کی طرف چل دیئے۔ راستہ چلتے لوگ منہ اٹھا اٹھا کر ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ حکمران طبقے کی

آدم زادیاں عموماً پردے سے گریز کرتی تھیں تاکہ ان کی زیب و زینت کو دیکھنے والے بلا جھجک اور روک ٹوک دیکھ سکیں۔ اکثر آدم زاد اپنے سے اوپر والوں کو دیکھتے اور ان کا اثر قبول کرتے ہیں، سو یہی صورت اس زمانے کے عراق کی تھی۔ اس نمود و نمائش سے شاید آدم زادیوں کو تسکین ملتی تھی۔

ہماری سواری قصرِ خلافت میں پہنچی تو قصر کی نگراں نے ہمارا استقبال کیا۔ وہ میرے انسانی قالب کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ اس نے کہا۔ "جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ ولی عہد حضور واقعی خوش بخت ہیں کہ ان جیسی حُسن کی دولت ہاتھ آ گئی۔" وہ نجمہ سے مخاطب تھی۔

قصر کی نگراں ہمیں اس محفل میں لے گئی جہاں شہزادیاں اور بیگمات ستارہ حُسن بنی بیٹھی تھیں۔ ہم دونوں گویا حُسن کے چاند بن کر وہاں پہنچ گئیں۔ ان سبھی نے ہماری پذیرائی کی۔ سب کی نظریں مجھی پر جمی ہوئی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر میں نغمہ سرائی شروع ہو گئی۔ کئی بیگموں اور شہزادیوں نے اپنی آواز کا جادو جگایا۔ اس کے بعد نوبت الخاتون (کورس) کا آغاز ہوا۔ سب شہزادیاں اور بیگمات مل کر گانے لگیں۔

میں خوب سمجھ رہی تھی کہ یہ تقریب قصرِ خلافت میں بہ وجوہ منعقد کی گئی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اس تقریب کے بہانے خلیفہ اپنے ولی عہد کی پسند کو دیکھ لے۔

ابھی نوبت الخاتون کے ختم ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ چند کنیزیں دوڑتی ہوئی آئیں۔ انہوں نے بتایا، ظل اللہ تشریف لا رہے ہیں۔

اس اطلاع پر ساز و آواز کا کھیل روک دیا گیا اور خلیفہ کے استقبال کی تیاری ہونے لگی۔ ذرا ہی دیر میں خلیفہ آ گیا۔ آداب و تسلیمات کے بعد وہ خالی مسند پر بیٹھ گیا۔ سب اسے تعظیم دینے کھڑے ہو گئے تھے۔ سو اس نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انہی میں وہ خود بھی شامل تھی۔ خلیفہ کی دائیں جانب نجمہ بیٹھی تھی اور میں اسی کے قرب میں تھی۔

خلیفہ نے سرسری نظر سے سب کو دیکھا اور اس کی نگاہ میرے قالب کے چہرے پر آ کر رک گئی۔

"یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟" خلیفہ نے نجمہ سے پوچھا۔

نجمہ نے ادب سے جواب دیا۔ "یہ میری سہیلی فردوس ہیں۔"

اس پر خلیفہ مسکرایا اور کہا۔ "ابوبکر کا انتخاب بہت خوب ہے۔"

میں نے شرما کے سر جھکانے کو ضروری خیال کیا کہ ایسے مواقع پر آدم زادیوں کا ردعمل یہی ہوتا ہے۔ مجھے دیکھ کر نجمہ مسکرانے لگی۔

چند لمحے توقف کے بعد خلیفہ پھر بولا۔ "اے نجمہ، میری بچی! تم ابوبکر سے کہہ دینا، ہم نے اس کے لئے فردوس کو پسند کر لیا ہے۔"

اس کے بعد پھر ساز و آواز جاگ اٹھے۔ دوپہر تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ دوپہر ڈھلے سب نے شاہی دسترخوان پر کھانا کھایا۔ سہ پہر ہو گئی تو نجمہ مجھے قصرِ خلافت سے اپنے ساتھ لے کر نکلی۔ اس نے مجھے قصر پر بگھی سے اتار دیا اور شام کو آنے کا کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ نجمہ شام کو کس لئے آئے گی۔ میرا قیاس درست ہی نکلا۔

مجھے نجمہ کی آمد کا پتہ چل گیا، مگر وہ پہلے مجھ سے ملنے میرے کمرے میں نہ آئی۔ اپنے اندازے کو یقین میں بدلنے کے لئے میں نے بصارت اور سماعت کے دائرے وسیع کر لئے۔ میں اب فاصلے کے باوجود سب کچھ دیکھ اور سن سکتی تھی۔

نجمہ فردوس کی ماں زبیدہ سے کہہ رہی تھی۔ "آج میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آئی ہوں۔ درخواست کرنے سے پہلے مجھے یہ عرض کرنا ہے، کیا آپ ہاشم کو جانتی ہیں؟"

"اچھی طرح۔ وہ بڑا شریف نوجوان ہے۔" زبیدہ نے جواب دیا۔

"آپ شاید یہ نہیں جانتیں کہ وہ کون ہیں اور ان کا اصل نام کیا ہے!..... میں بتاتی ہوں آپ کو کہ وہ ولی عہد سلطنت ہیں اور ان کا نام ابوبکر ہے۔ انہوں نے اپنی اصل شخصیت اس لئے آپ پر ظاہر نہیں کی کہ انہیں دیکھ اور پرکھ لیں۔ درخواست یہ ہے کہ آپ ابوبکر کو اپنی فرزندی میں قبول کر لیجئے۔" نجمہ نے مطلب کی بات کہہ ہی دی۔

فردوس کی ماں زبیدہ کچھ دیر تصویرِ حیرت بنی رہی، پھر بڑی مشکل سے رک رک کر بولی۔ "ولی..... ولی عہد ہیں وہ!..... مجھے تب..... تو یقین..... اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آ رہا..... پھر..... پھر بھی..... مجھے تو یہ رشتہ قبول ہے۔ لیکن ابھی کئی باتیں ہیں جو دو..... دو ٹوک جواب..... جواب دینا میرے لئے مشکل ہے۔ فردوس کے ابو سے مشورہ کرنا ہے، پھر فردوس سے پوچھنا ہے..... اور ہاں پیغام اعلیٰ حضرت خلیفہ محترم کی طرف سے ہونا

چاہئے۔ ہمارے خان..... خاندان میں یہی ہوتا آیا ہے کہ لڑکے کا باپ، ماں یا اس کا کوئی بزرگ پیغام لے کر آئے..... تم برا نہ ماننا بیٹی!''

نجمہ نے کہا۔ ''میں اعلیٰ حضرت کی منظوری لے کر آئی ہوں، لیکن ان کی طرف سے بھی پیغام آ جائے گا۔ فردوس کو میں رضامند کر لوں گی، البتہ ابو سے آپ مشورہ کر لیں۔'' یہ کہہ کر نجمہ اٹھ آئی اور میرے کمرے کی طرف قدم بڑھانے لگی۔

مجھے تو پہلے ہی سب کچھ پتہ تھا اس لئے نجمہ کی باتوں پر ''ہوں، ہاں'' کرتی رہی۔ کچھ دیر ٹھہر کر وہ چلی گئی۔

یہ اسی رات کا ذکر ہے کہ سونے سے پہلے مجھے ابن علقمی کا خیال آیا۔ فردوس کے جسم سے نکل کر میں نے اس پر نیند مسلط کر دی اور سازشی آدم زاد ابن علقمی کے قصر میں پہنچ گئی۔ میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کہیں کسی سازش کا جال تو نہیں بُن رہا! ابن علقمی کی خاص نشست گاہ کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے مگر اندر روشنی تھی۔ میں اندر داخل ہوئی تو ابن علقمی کے ساتھ ایک بھاری بھرکم شخص کو بیٹھے دیکھا۔ ابن علقمی اس سے کہہ رہا تھا۔

''اے ابن الصلایا! تم یہ بات کیسے کہہ رہے ہو کہ مجھے براہ راست ہلاکو خاں کو پیغام نہیں بھیجنا چاہئے تھا؟''

''اس کی وجہ ہے حضورِ محترم!'' بھاری بھرکم آدم زاد بولا۔

''ہم وہی وجہ تو جاننا چاہتے ہیں!'' ابن علقمی نے زور دے کر کہا۔ ''بتاؤ تو سہی کہ ہمیں عراق پر حملے کے لئے براہِ راست منگول حکمراں ہلاکو خاں کو کیوں خط نہیں لکھنا چاہئے تھا؟'' ابن علقمی کے چہرے پر کسی قدر ناگواری کے اثرات تھے۔ میں اس کے قریب ہی تھی۔

تنومند آدم زاد نے پہلو بدلا۔ اسی کو ابن علقمی نے ابن الصلایا کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ اس کی ناک طوطے جیسی اور ہونٹ پتلے تھے۔ رخساروں کی ہڈیاں مٹاپے کی بناء پر تقریباً غائب تھیں۔ وہ بولا تو اس کی آواز بھی بھاری تھی۔

''حضور کا غلام عرض کرتا ہے۔''

''تم ہمارے غلام نہیں، ہم نے تمہیں اربل کا حاکم بنایا ہے۔'' ابن علقمی بول اٹھا۔ ''کہو، کیا کہہ رہے ہو؟''

''حضورِ گرامی! منگول حکمراں ہلاکو خاں کے بارے میں اس خادم کو بھی کچھ معلومات

ہیں۔'' ابن الصلایا نے بات شروع کی۔ ''ہلاکو خاں کسی پر بھی بھروسہ نہیں کرتا۔ اجنبی تو اجنبی اس ضمن میں خود منگول سردار اس سے نالاں رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے وزیر نصیر الدین پر اعتماد نہیں کرتا۔ حضور تو اس کے لئے پھر اجنبی ہیں۔''

''تمہارے خیال میں کیا ہم اتنے گمنام ہیں؟'' ابن علقمی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ''کیا ہلاکو خاں یہ نہ جانتا ہوگا کہ موجودہ خلیفہ مستعصم باللہ کا وزیر اعظم کون ہے؟ کیا منگول حکمراں کو خبر نہ ہوگی کہ اب ہمی سیاہ و سفید کے مالک ہیں؟..... اور یہ بھی کہ خلافت بنو عباس ہمارے ہاتھ میں ہے؟''

''گستاخی معاف حضور! اس خادم کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ..... کہ ہلاکو خاں، بندہ پرور سے واقف ہوگا۔ میں تو محض یہ عرض کر رہا تھا کہ بھروسا کرنا ہلاکو خاں کی سرشت میں شامل نہیں۔'' ابن الصلایا نے وضاحت کی۔

(بھروسا ہندی لفظ ہے، اسے ہ سے نہیں الف ہی سے لکھنا چاہئے کہ اس کا صحیح املا یہی ہے۔ یہ اسم مذکر ہے۔ اس کے معنی ہیں امید، توکل، اعتبار، توقع، آسرا اور اعتماد۔ قابلِ بھروسا لکھنا قطعاً غلط ہے کیونکہ لفظ قابل عربی ہے۔ قواعد کے اعتبار سے ہندی اور عربی الفاظ کے ساتھ عطف و اضافت، یعنی واؤ اور زیر نہیں لگتا۔ قابلِ بھروسا کی جگہ قابلِ اعتماد لکھنا چاہئے کیونکہ قابل اور اعتماد دونوں ہی عربی الفاظ ہیں۔ مصنف)

ابن الصلایا کی بات سن کر کچھ دیر ابن علقمی خاموش رہا، پھر ایک دم بولا۔ ''ہلاکو خاں کے بارے میں تمہیں یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں؟'' سوال کرتے ہوئے اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے ابن الصلایا کو دیکھا۔

حاکم اربل ابن الصلایا کچھ گھبرا سا گیا۔ اس کے چہرے سے میں نے یہی اندازہ لگایا۔

''در..... دراصل..... موصل کا حاکم بدر الدین لؤلؤ میرا دوست ہے۔'' ابن الصلایا ہکلانے لگا۔ اسے یقیناً ابن علقمی کے لامحدود اختیارات کا اندازہ ہو گیا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے ابن الصلایا نے مزید بتایا۔ ''ایک بار بد..... بدر الدین ہی نے مجھ سے منگول حکمراں ہلاکو خاں کے متعلق کچھ باتیں بتائی تھیں جو..... جو میرے ذہن میں رہ گئیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ موصل کے حاکم بدر الدین سے تمہاری ملاقات ہوتی رہتی ہے؟'' ابن علقمی کے لہجے اور نظروں میں چبھن برقرار رہی۔ ''کہیں تم لوگ آپس میں مل کر

کوئی کھیل تو نہیں کھیل رہے؟"

"خدا نہ کرے حضور!" ابن العلایا جلدی سے بولا۔ "میں اور بدرالدین ہم دونوں ہی حضور کے نمک خوار ہیں۔"

"تمہارا کیا اندازہ ہے، ہلاکو خاں میرے پیغام کا مثبت جواب دے گا؟" یہ سوال کر کے ابنِ علقمی نے ابن العلایا کو پھر امتحان میں ڈال دیا۔ اس کا احساس خود اسے بھی تھا، سو کہنے لگا۔ "جھجکو نہیں، جو دل میں ہو کہہ دو۔"

"حضور والا! حتمی طور پر تو کچھ کہنا ممکن نہیں لیکن خادم کا قیاس یہی ہے کہ وہ عراق پر حملے...... کی دعوت...... شاید قبول نہ کرے۔ سبب یہ خادم پہلے ہی بیان کر چکا ہے۔"

"خیر پہلے جواب آنے دو، پھر کچھ سوچیں گے۔" ابنِ علقمی یہ کہتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

حاکم اربل ابن العلایا کو ابنِ علقمی نے رخصت کر دیا۔ میں اس عرصے میں ابن العلایا کے دماغ کو ٹٹول چکی تھی۔ ہلاکو خاں کے وزیر نصیر الدین طوسی کو وہ بخوبی جانتا تھا اور یہی صورت حاکم موصل بدرالدین کے ساتھ بھی تھی۔ دونوں ہی ابن الوقت اور موقع شناس تھے۔ حالات اور وقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان دونوں ہی نے نصیر الدین طوسی سے مراسم بڑھانے شروع کر دیئے تھے۔ اس کا آغاز انہوں نے تحفے تحائف بھیجنے سے کیا تھا۔ اگر ابن علقمی اس وقت ابن العلایا سے ناپسندیدہ لہجے میں گفتگو نہ کرتا تو ممکن تھا، ابن العلایا اظہار حقیقت سے کام لیتا۔ اس کے برعکس ابنِ علقمی نے ابن العلایا پر شک کیا تو بات نہ بنی۔

موصل سے لے کر بغداد تک سازش کا جال پھیلا ہوا ہے، مجھ پر یہ بات اسی رات منکشف ہوئی۔

اس بات کا بھی قوی امکان تھا کہ اب نہیں تو آئندہ ابنِ علقمی کی نظروں میں اپنی توقیر بڑھانے کے لئے ابن العلایا اور بدرالدین، نصیر الدین طوسی سے اپنے مراسم کا اعتراف کر لیتے، پھر غالباً ابنِ علقمی کو ہلاکو خاں سے مراسلت میں آسانی ہو جاتی اور نصیر الدین طوسی کے توسط سے ابنِ علقمی کو قابل اعتماد بھی سمجھ لیا جاتا۔

نصیر الدین طوسی کے متعلق ابن العلایا کا خیال درست نہیں تھا کہ ہلاکو خاں کو اپنے وزیر پر بھی اعتماد نہیں تھا۔ یہ اس کی محض قیاس آرائی تھی، اس کے علاوہ اپنے دعوے کے حق

میں دلیل فراہم کرنا بھی مقصد تھا۔

ابنِ علقمی اپنی خواب گاہ میں چلا گیا تو میں بھی وہاں مزید نہیں رکی۔

ہلاکو خاں عموماً تمام ہی معاملات میں اپنے وزیر نصیر الدین طوسی کی رائے کو اہمیت دیتا تھا، میں نے اس لئے اسے اپنا آلۂ کار بنایا تھا۔ میرا "ٹھکانا" فی الحال فردوس کا جسم تھا اس لئے ابنِ علقمی کے قصر سے واپس وہیں آ گئی۔ فردوس کے خوابیدہ انسانی قالب میں داخل ہو کر مجھے بھی نیند آنے لگی۔

دوسرے دن شام کو خلیفہ مستعصم کی طرف سے اس کا حاجب (پرائیویٹ سیکرٹری) فردوس کے باپ یعقوب سے ملنے آیا۔ نجمہ مجھے دوپہر ہی کو آ کر بتا چکی تھی کہ اس نے خلیفہ سے بات کر لی ہے۔ خلیفہ اپنے حاجب کو پیغام کے لئے بھیجے گا۔ فردوس کی ماں زبیدہ پہلے ہی اپنے شوہر یعقوب سے بات کر چکی تھی۔ اس سبب یعقوب نے بلا حیل و حجت کے پیغام منظور کر لیا۔ اس نے حاجب سے کہہ دیا۔

"میں خلیفہ معظم کا ادنیٰ جاں نثار ہوں۔ بہ صد فخر میں یہ پیغام قبول کرتا ہوں۔"

اس کے چند روز بعد منگنی ہو گئی۔ عارج اس پر بہت خوش تھا۔ اسی خوشی میں وہ ایک رات ولی عہد ابوبکر کے جسم سے نکل کر میرے پاس آ گیا۔ اس وقت تک میں سونے کے لئے بستر پر دراز ہو گئی تھی۔ میرے سوا کمرے میں کوئی اور نہیں تھا۔ میرے ہی اصرار پر فردوس کی ماں زبیدہ نے مجھے الگ کمرے میں سونے کی اجازت دے دی تھی ورنہ فردوس کو تو وہ اپنی ہی خواب گاہ میں سلاتی تھی۔ آدم زادیاں اپنی جوان بیٹیوں کو عموماً "بے نکیل" نہیں چھوڑتیں اور ان پر پوری نظر رکھتی ہیں۔ اس کے باوجود کوئی "بٹیا رانی" اپنی "اماں جانی" کو ہاتھ دکھا جاتی ہے۔ ہم جنات میں "بہو بیٹیوں" پر اتنی پابندیاں نہیں لگائی جاتیں۔ اس کی وجہ ہماری فطری سرکشی و آتش مزاجی ہے۔ پابندیاں قبول کرنا ہم جنات کو پسند نہیں۔ میں ایک جن زادی ہوں۔ اس لئے کسی حد تک پابندیاں برداشت کر لیتی تھی کہ مجھے آدم زادوں کے درمیان ہی رہنا تھا۔ جب میں کسی انسانی پیکر میں ہوتی تو مجھے یہ پابندیاں اور بھی گراں گزرتیں۔ زبیدہ اپنی بیٹی فردوس کو بہت چاہتی تھی اس لئے میری بات مان گئی ورنہ شاید عارج میرے پاس آنے کی ہمت نہ کرتا یا اگر کسی ضرورت سے آتا بھی تو مجھے اپنے ساتھ کہیں اور لے جاتا۔ مجھے اس کے لئے فردوس کا جسم چھوڑنا پڑتا، مگر

موجودہ صورتحال میں اس کی حاجت نہ تھی۔

عارج کے وجود کی مخصوص خوشبو محسوس کرتے ہی میں چونک اٹھی۔

"اے عارج! تو اپنی آوارگی سے باز نہیں آئے گا؟" میں قدرے سخت لہجے میں بولی۔ "تجھے کیا پڑی تھی کہ ابوبکر کے قالب سے نکل کر یہاں آ گیا؟...... اگر کسی کو ولی عہد ابوبکر سے کوئی کام پڑ گیا تو؟" میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کوئی اسے لاکھ اٹھاتا رہے، وہ اٹھے گا ہی نہیں۔ میں اس پر گہری نیند مسلط کر آیا ہوں۔" عارج نے خوش مزاجی سے کہا۔ "اے دینارا! مجھے تو افسوس یہ ہے کہ تجھے سخت آواز میں بات کرنا یا غصہ دکھانا بھی نہیں آتا۔ دراصل تُو اب بڑھیا ہو گئی ہے۔ کیا کرے تُو بھی کہ یہ عمر کا تقاضا ہے، اس میں تیرا کوئی قصور نہیں۔"

"تجھ سے تو سینکڑوں سال چھوٹی ہوں میں!...... فضول باتیں نہ کیا کر!...... میری بات کا جواب دے، تُو نے ابوبکر کے جسم سے نکلنے کا خطرہ مول کیوں لیا؟" میں بولی۔ اس کے ساتھ فقرہ چست کیا۔ "بڑا کب ہو گا تُو؟"

"گویا ابھی میں چھوٹا ہوں۔ چل تُو نے خود ہی تسلیم کر لیا۔" عارج میرے قریب آ بیٹھا۔ کہنے لگا۔ "کبھی کبھی تُو بڑی بے تکی باتیں کرتی ہے، ایسے وقت میں مجھے شک ہونے لگتا ہے کہ جب عقل بٹ رہی تھی تو وہاں تھی بھی یا نہیں!...... اس وقت تقریباً آدھی رات ہونے والی ہے، بغداد کے قصہ گو بھی اب اپنے اپنے قصے سناتے ہوئے نیند کی مہربان آغوش میں جانا چاہتے ہوں گے۔ سرایوں اور محل سراؤں میں سناٹا چھانے لگا ہے، شہر پر سکوت کا پہرا ہے۔ ایسے میں کسی سر پھرے کو ولی عہد ابوبکر سے ملنے کی خواہش ہو گی؟...... چل مان لیا کہ کسی کے دماغ میں کیڑا کلبلایا بھی تو کیا ضروری ہے، ابوبکر اسے ملنے پر آمادہ ہو ہی جائے۔ اس سے قطع نظر یہ کہ جب خلیفہ، ولی عہد یا حکمراں خاندان کے افراد اپنی اپنی خواب گاہوں میں چلے جاتے ہیں تو نہ کوئی ان سے ملتا ہے، نہ وہ کسی سے ملتے ہیں اور......"

"اور یہ کہ چپ ہو جا!" میں بول اٹھی۔ "ذرا سی بات پر تُو نے اتنی لمبی چوڑی تقریر کیوں کر ڈالی؟"

"تاکہ میری بات تیری کھوپڑی...... میرا مطلب تیری انسانی کھوپڑی سے ہے، یعنی تیری کھوپڑی میں میری بات بیٹھ جائے۔"

"اور اگر پھر بھی نہ بیٹھے تو؟"

"تو نہ بیٹھے، لیٹ جائے! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" عارج یہ کہہ کر خود ہی ہنس پڑا۔

"بے تکی بات کر کے خود ہنس پڑنا تجھے خوب آتا ہے!...... بتایا تو نہیں تُو کس لئے آیا ہے؟"

"اس لئے کہ آج جمعرات ہے۔" عارج نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

"تو کیا ہوا؟"

"لے تجھے اتنی اہم بات معلوم نہیں کہ ہم جنات کو آج کے روز پیدا کیا گیا تھا!"

"اب تُو یہ بھی بتائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بدھ کے دن اور حضرت آدمؑ کو جمعے کے دن پیدا کیا تھا!" میں بولی۔

"نہیں بتاؤں گا۔ اس لئے کہ تجھے پہلے ہی یہ باتیں پتہ ہیں۔" عارج کہے چلا گیا۔ "سن اے دینارا! کب کسے پیدا کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے جنت کو دوزخ سے پہلے، اپنی رحمت کو غضب سے پہلے، آسمان کو زمین سے پہلے، سورج اور چاند کو ستاروں سے پہلے، دن کو رات سے پہلے، سمندر کو خشکی سے پہلے، زمین ہموار کو پہاڑوں سے پہلے، فرشتوں کو ہم جنات سے پہلے، جنات کو انسانوں سے پہلے اور نر کو مادہ سے پہلے پیدا کیا۔"

"اے عارج! تُو یہ سب کچھ کہہ کر کیا جتانا چاہتا ہے؟...... یہی نا کہ تُو بہت قابل ہو گیا ہے اور علم تجھ سے ہضم نہیں ہو رہا، روا روی میں تجھے یہ یاد ہی نہیں رہا کہ تُو نے ابھی جو الفاظ تڑا تڑ ادا کئے، وہ تیرے ساتھ میں نے بھی عالم سوما کی زبانی ایک وعظ میں سنے تھے۔"

"کسی اچھی یا معلوماتی بات کو تو آگے بڑھانا ہی چاہئے۔ اس میں آخر برائی کیا ہے؟" عارج کٹ حجتی پر اتر آیا۔

"اگر ثواب ہی کمانے کا شوق ہے تو کسی ایسے یا ایسی کے سامنے اپنی معلومات کا پٹارا کھول جو کچھ نہ جانتا ہو۔" پھر میں نے اس کا مذاق اڑایا۔ "تیرے لئے بہتر یہ ہو گا اے عارج کہ تُو وعظ کہنا شروع کر دے، اس طرح تجھ میں ایک اضافی صلاحیت پیدا ہو جائے گی اور کسی بندے کی صلاحیت کبھی رائیگاں نہیں جاتی، وقت پڑنے پر کام آ ہی جاتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تُو مجھے واعظ یا ملا بنانا چاہتی ہے، میں جان گیا، تُو اس طرح

یقیناً ملانی بننے کے خواب دیکھ رہی ہے!" عارج نے بھی اپنی دانست میں مجھ پر فقرے بازی شروع کر دی۔

"اگر تجھے کوئی خاص بات نہیں کرنی تو چلتا پھرتا نظر آ اور مجھے سونے دے۔"

"تو کیا اب میں تجھ سے کوئی خاص بات کرنے ہی کو ملا کروں! کچھ تو خوف خدا کر اے دینارا! تو میری آدھی بیوی تو بن ہی چکی ہے اور اللہ نے چاہا تو وہ دن بھی دور نہیں کہ جب تو میری پوری بیوی بن جائے گی۔" عارج چہکنے لگا۔ "نکاح پڑھوانے سے پہلے یہ چوری چھپے کی ملاقاتیں آدم زادیوں کو تو بڑی اچھی لگتی ہیں۔ کیا حرج ہے اگر ہم بھی......"

"بکتا ہے تو بکتا ہی چلا جاتا ہے۔" میں نے عارج کی بات کاٹ دی۔ "تیری میری نہیں، ابوبکر اور فردوس کی شادی ہونے والی ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔" عارج ڈھٹائی سے بولا۔ "کسی طرح تو پیا ملن ہوا"

"منہ دھو رکھ...... اور آہستہ بول۔ اس پر نہ اترا کہ کوئی آدم زاد تجھے نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے بدانستہ موضوع گفتگو بدل دیا تاکہ وہ اور زیادہ "بے سرا" نہ ہو، میں نے کہا۔ "تجھے ایک عجیب بات بتاؤں اے عارج!"

میرے لہجے کی پراسراریت سے وہ غچہ کھا گیا اور پوچھ بیٹھا۔ "ہاں بتا۔"

"یہ تو طے ہے کہ مسلمان ہونے کے ناتے ہم جنت میں جائیں گے۔"

"تو نے یہ کون سی عجیب اور نئی بات بتا دی۔" عارج بول اٹھا۔

"پہلے میری پوری بات تو سن لے، بیچ میں نہ بول۔" پھر میں نے جو کچھ کہا وہ مصدقہ تھا۔ "جس طرح دنیا میں آدم زاد ہمیں نہیں دیکھ سکتے، جنت میں انسان، ہم جنات کو دیکھ سکیں گے اور ہمیں انسان نظر نہیں آئیں گے۔ وہاں دنیا کے برعکس معاملہ ہو گا۔"

"یہ تو بے پر کی تو نے اڑائی ہے یا کسی اور نے؟" عارج ہنس دیا۔

"میں نے یہ بات عالم سوما کی زبانی سنی تھی، تو اسے مذاق نہ سمجھ۔"

عالم سوما کا نام سن کر عارج سنجیدہ ہو گیا، میرا مقصد بھی یہی تھا، اسے مزید "بڑبڑانے" کے لئے میں نے علب کا ذکر چھیڑ دیا۔

"اب ذرا تو مت مجھے اے دینارا!"

"ڈرا نہیں رہی بلکہ تجھے سکڑے بھرنے سے روک رہی ہوں۔"

"تیرے اور میرے گرد نادیدہ حصار بھی تو قائم ہیں۔ اس حصار کی موجودگی میں وہ کافر عفریت ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے!"

"اور تو یہ بھی بھول گیا کہ اسے جادو بھی آتا ہے!...... یاد نہیں کہ جب عفریت وہموش سے بچنے کے لئے ہم مستقبل میں چلے گئے تھے تو تیرا کیا حال تھا! تو بدحواس ہو کر ایک آوارہ نوجوان کے قالب میں چھپ گیا تھا۔"

"یاد کیوں نہیں مجھے!" عارج فوراً بولا۔ "وہ مغل تاجدار ہمایوں کا زمانہ تھا، لیکن......"

"لیکن یہ کہ ہم نسبتاً زیادہ محفوظ ہیں۔" میں نے عارج کی بات کاٹ دی۔

"تو چلا میں!...... کوشش کرتا ہوں کہ جلد سے جلد تو میری بیوی بن جائے تاکہ مجھے ابوبکر کے قالب سے باہر ہی نہ آنا پڑے۔" یہ کہتے ہی عارج میری کوئی بات سنے بغیر رفو چکر ہو گیا۔

عارج کو "بڑبڑاتے" سے قطع نظر عفریت علب کی طرف سے بہرحال خطرہ لاحق تھا۔ میں تو خیر اس خطرے سے کسی نہ کسی صورت نمٹ ہی لیتی مگر شاید عارج کے لئے یہ ممکن نہ ہوتا۔ یوں بھی میں اسے کسی خطرے سے دوچار نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ میرا عشق جو تھا! عشق میں عاشق و معشوق ایک دوسرے کے حصے کا دکھ خود برداشت کر لینا چاہتے ہیں۔

قوت برداشت نہ ہونا البتہ بڑا عذاب ہے۔ ابن علقمی کے ساتھ یہی تو ہوا تھا۔ وہ خلیفہ وقت کے اختیار کو برداشت نہ کر سکا، جن شر پسندوں کو ولی عہد ابوبکر نے گرفتار کیا تھا اور جنہیں ابن علقمی کی پشت پناہی حاصل تھی، انہیں رہائی نہیں مل سکی تھی۔

ابن علقمی نے اسے اپنی توہین سمجھا۔ گویا اسے اپنی "بے عزتی" برداشت نہ ہوئی۔ وہ بڑا چالاک، خودغرض، مکار، ابن الوقت، لالچی، بدطینت، کینہ پرور اور سفاک آدم زاد تھا۔ بڑا زودرنج تھا۔ اگرچہ عملاً عنان حکومت اسی کے ہاتھ میں تھی، لیکن وہ اس پر قانع نہ تھا۔ وہ اس فکر میں تھا کہ حکومت اس کے خاندان میں منتقل ہو جائے۔ اسی خیال خام کے تحت اس نے سازشیں کر رکھی تھیں۔

اول تو اس نے بغداد اور عراق کے دوسرے شہروں میں فرقہ وارانہ فساد کرانے چاہے، مگر خود اسی کے ہم عقیدہ لوگوں نے اس کی ایک نہ سنی۔ دوئم جب اس کے پٹھو قید خانے میں ڈال دیئے گئے تو وہ انہیں رہائی نہ دلا سکا۔ پھر غصہ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا اور

اس نے منگولوں کو عراق پر حملے کی دعوت دی۔

اس نے یہ بالکل نہ سوچا کہ وحشی منگول اپنے جلو میں تباہی و بربادی لے کر چلتے ہیں۔ جس طرح آگ خشک و تر کو نہیں دیکھتی، اسی طرح منگول، دوست دشمن کو نہیں دیکھتے۔ جوش، غصے اور برداشت کی کمی کے سبب اس نے ایسی نامناسب حرکت کی جسے کمینگی، نمک حرامی اور محسن کشی پر محمول کیا جائے گا۔

میں اس غدار پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ کبھی تو میں فردوس کے انسانی قالب سے نکل کر اس کی خبر لیتی اور کبھی اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لا کر اپنی چشم تصور اور قوت سماعت کے پھیلاؤ سے کام لیتی۔ یوں دور رہ کر بھی میں سب کچھ دیکھ اور سن لیتی مگر تنہائی کا موقع ملنے ہی پر یہ میرے لئے ممکن ہوتا۔ میرا زیادہ وقت فردوس کے جسم میں گزرتا۔ اس احتیاط کی وجہ عکب تھا۔

اس دوران میں یہ ہوا کہ عارج کی کوشش رنگ لائی، خلیفہ نے اپنے ولی عہد ابوبکر کی بات نہ ٹالی حالانکہ ابوبکر کے قالب میں عارج تھا۔ مگر کسے شبہ ہوتا کہ آدمی کے جسم میں کوئی جن زاد گھسا بیٹھا ہے! غرض کہ شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ گویا ادھر منگنی ہوئی ادھر شادی کا مرحلہ آ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ابن علقمی نے خلیفہ مستعصم کو بلانوشی پر مائل کر دیا تھا۔

صدیوں پہلے عباسی خلفاء کے زمانے میں علماء نے نبیذ کو مباح قرار دے دیا تھا۔ (نبیذ ایک قسم کی شراب ہی ہوتی تھی جو کھجوروں سے بنائی جاتی تھی، اس میں شراب جیسا نشہ تو نہیں ہوتا تھا، پھر بھی سرور ہو جاتا تھا۔ کچھ لغت نویسوں نے اس کو نبیذ بھی لکھا ہے اور اس کے معنی بتائے ہیں، وہ شراب جو خرما یعنی چھوہارے اور جو سے بنائی جائے، اس عربی لفظ کا استعمال فارسی والوں نے دال ہی سے کیا ہے، یعنی نبیذ دال مہملہ سے بھی صحیح ہے۔ بعض تحقیق کرنے والوں نے اسے تاڑی بھی لکھا ہے، لیکن یہ اہل ہند کی تحقیق ہے جسے عرب و ایران کے محقق نہیں مانتے۔ اکثریت کی رائے یہی ہے کہ نبیذ ایک طرح کی ہلکی شراب ہے جسے انگریزی میں بیئر جسے جو سے کشید کیا جاتا ہے۔ ہندوستان والے اسے ہندی میں بوزہ بھی کہتے ہیں، بوزہ کے معنی بھی کم نشے والی شراب کے ہیں۔ مصنف) خلفائے عباسیہ کے دور ہی میں کچھ آدم زاد شراب کا شغل بھی کرتے۔ وہ خالص انگور سے کشید کردہ شراب پیتے۔ خلیفہ مستعصم نے البتہ اپنے ابتدائی دور اقتدار میں شراب نہیں پی۔ بدذات ابن علقمی

ہی نے اسے یہ چسکا لگا دیا۔ ابن علقمی نے دلیل دی کہ یہ انگور کا عرق ہی تو ہے، تازہ نہیں باسی سہی۔"

آدمی کا شیطان، آدمی ہوتا ہے۔ مستعصم ان باتوں میں آ گیا۔ وہ تھا بھی کم عقل، سو بہک گیا۔ وہ چاہتا تو اس ضمن میں علماء سے دریافت کر سکتا تھا، مگر منہ کو لگی کیسے چھوٹتی! اس نے شراب نوشی شروع کی تو اور عقل ماری گئی۔ شراب پی کر وہ بالکل بدھو لگتا، خلیفہ کو غرق مئے ناب کر کے اور ہمہ دم محفل عیش و نشاط میں مصروف رکھ کر ابن علقمی نے اپنا الو سیدھا کر لیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ سارے اختیارات اس کے پاس آ گئے۔ وہ بلا جھجک اور کسی روک ٹوک کے بغیر حکومت کرنے لگا۔

ہلاکو خاں کو خط لکھتے ہی ابن علقمی نے خلیفہ مستعصم کو کئی قیمتی اور حسین و نوخیز غیر ملکی کنیزیں پیش کیں جو پہلے کسی کے تصرف میں نہیں آئی تھیں۔ عیار ابن علقمی واقف تھا کہ ایسی کنیزیں، خلیفہ کو بہت مرغوب ہیں۔ کچھ عرصہ خلیفہ کے شب و روز صرف انہی کنیزوں کی صحبت میں گزرتے، ایسے میں وہ کم ہی کسی سے ملتا تھا۔

ان دنوں ابن علقمی نے خلیفہ کو اس لئے بھی مصروف رکھا کہ کہیں اسے ہلاکو خاں سے خط و کتابت کی بھنک نہ پڑ جائے۔ خود اس کا کوئی راز دار کسی بڑے انعام کی لالچ میں خلیفہ کو حقیقت سے آگاہ نہ کر دے۔

جس روز فردوس اور ولی عہد ابوبکر کی شادی کے لئے تاریخ مقرر ہوئی، اس کے دوسرے ہی دن ابن علقمی کا معتمد خاص سلیمان بغداد پہنچ گیا۔ جواب دینے کی غرض سے اسے خراسان میں روک لیا گیا تھا۔

ابن علقمی کو بڑی بے چینی سے سلیمان کی واپسی کا انتظار تھا مگر ہلاکو خاں کا جواب پڑھ کر اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔

میں نے بھی وہ خط پڑھا جو میری ہی کوششوں کا نتیجہ تھا، ہلاکو خاں نے جواب میں لکھا تھا۔

"عربوں کی جنگ جوئی مشہور ہے۔ ہماری اطلاع کے مطابق بغداد اور اس کے مضافات میں کافی فوجیں موجود ہیں، عراق کے طول و عرض میں بھی جگہ جگہ فوجی چھاؤنیاں قائم ہیں، ان کی موجودگی میں عراق پر حملہ کرنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔"

ابنِ علقمی کو ہلاکو خاں کا یہ جواب بہت شاق گزرا، وہ بڑبڑایا۔ ''بزدل..... خیر میں اس کا انتظام بھی کرلوں گا۔''

اس بڑبولے نے منگول حکمران ہلاکو خاں کو بزدل کہا تھا، مجھے اس لئے اس پر ہنسی آنے لگی۔ میں اسی سبب اس کے قصر سے چلی آئی اور واپس فردوس کے جسم میں اتر گئی۔ اسی آدم زادی کا جسم میری پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔

مجھے علم تھا کہ اب ابنِ علقمی سازشوں کے نئے جال بُننے میں مشغول ہو جائے گا۔ میں اسی بناء پر اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہی تھی۔ اس کے معتمد خاص پر بھی میری نظر تھی، دوسرے ہی دن اسے میں نے ابنِ علقمی کے قصر میں داخل ہوتے دیکھا، یہ رات کا وقت تھا، فردوس کے ماں باپ سو چکے تھے۔ سو میں نے فردوس کو بھی سلا دیا اور ابنِ علقمی کے قصر میں جا پہنچی۔

یہ بڑا وسیع و عریض قصر تھا اور اس میں کئی نشست گاہیں تھیں۔ ابنِ علقمی لوگوں کی حیثیت اور ضرورت کے مطابق ان نشست گاہوں کو استعمال کرتا، اس کی خاص نشست گاہ اس قصر کے بالکل الگ تھلگ حصے میں تھی۔ طلب کئے بغیر وہاں کسی غلام یا کنیز تک کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ اس کی چہیتی بیٹی ہاجرہ بھی ادھر کا رخ نہ کرتی۔ اس خاص نشست گاہ کو گویا ابنِ علقمی کے خلوت کدے کی حیثیت حاصل تھی۔

سلیمان کو میں نے ابنِ علقمی کے ساتھ اسی ''خلوت کدے'' میں دیکھا، آج بھی ابنِ علقمی نے ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کر رکھے تھے۔ یہ بندش صرف آدم زادوں کے لئے تھی۔ ہم جنات کو بھلا کہیں جانے سے کون روک سکتا ہے!

یہ وہی آدم زاد سلیمان تھا جسے ابنِ علقمی نے ہلاکو خاں کے پاس پیغام لے کر بھیجا تھا۔ اس پر ابنِ علقمی کو بہت بھروسا تھا، سلیمان کے ساتھ وہ اچھا سلوک کرتا رہتا تھا۔

ابنِ علقمی کے سامنے سلیمان مؤدب بیٹھا توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔

''میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ کسی سے یہ ذکر نہیں آنا چاہئے کہ تم تاتاریوں (منگولوں) کے پاس گئے تھے۔'' ابنِ علقمی نے تاکید کی۔

سلیمان نے کہا۔ ''یہ بات تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جب آپ نے مجھے خراسان بھیجا تھا۔ کسی کو یہ معلوم نہیں ہے کہ میں کہاں اور کیوں گیا تھا اور..... اور نہ میری زندگی میں کسی کو یہ بات معلوم ہو سکتی ہے۔''

''شاباش! تم سے مجھے یہی امید تھی۔'' ابنِ علقمی بولا، پھر کچھ توقف سے کہنے لگا۔ ''تم نہیں جانتے کہ میں کس فکر میں ہوں!''

''اگر آپ مجھے قابلِ اعتبار سمجھتے ہیں تو بتا دیں، آپ کو کیا فکر لاحق ہے؟''

''مجھے تم پر اعتماد نہ ہوتا تو تمہیں اپنی خاص نشست گاہ میں نہ بلاتا۔ دراصل تمہیں تاریخ سے شغف رہا ہے اس لئے تم میری بات اچھی طرح سمجھنے کے اہل ہو۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ علویوں نے امویوں کی مخالفت کی تھی، اس مخالفت میں عباسی، علویوں کے ساتھ ہو گئے تھے۔'' ابنِ علقمی نے سوالیہ نظروں سے سلیمان کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں..... مجھے معلوم ہے، یہ اس وقت کا ذکر ہے جب امویوں کی حکومت تھی۔''

''ہاں اسی وقت کا ذکر ہے۔ مروان اس وقت خلیفہ تھا، یہ 132 ہجری کا واقعہ ہے، اس وقت عباسیوں اور علویوں نے مل کر بنو امیہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا، علوی سیدھے لوگ تھے، وہ عباسیوں کی چال کو نہیں سمجھ سکے، نتیجہ یہ ہوا کہ جب مروان مارا گیا تو عباسیوں نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ علوی منہ تکتے رہ گئے۔'' ابنِ علقمی اپنے نقطۂ نظر سے گویا تاریخ بولتا رہا۔ ''حق داروں کو پھر ان کے حق سے محروم کر دیا گیا۔''

ابنِ علقمی کے ذہن کو میں کئی بار اچھی طرح پڑھ چکی تھی۔ وہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، علویوں سے اسے قطعی ہمدردی نہیں تھی۔ درحقیقت وہ علویوں سے ہمدردی جتا کر اپنی شخصی حکومت کی راہ ہموار کر رہا تھا، عباسیوں کی مخالفت کا بنیادی سبب یہی تھا۔

سلیمان بھی اپنے ''ولی نعمت'' کا مزاج آشنا تھا، سو بولا۔ ''میرا خاندان اسی لئے عباسیوں کی مخالفت کرتا چلا آیا ہے۔''

''میں بھی عباسیوں کا مخالف ہوں۔'' ابنِ علقمی نے اعتراف کیا، پھر اپنے مطلب پر آ گیا۔ ''آج تک علویوں کی حکومت قائم نہیں ہو سکی، میری کوشش ہے اب اقتدار انہیں مل جائے، جب تک عباسی خلیفہ موجود ہے اور عباسی خلافت میں جان ہے، اس وقت تک علویوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے تاتاریوں کو اسی لئے عراق پر حملے کی دعوت دی تھی کہ وہ آ جائیں تو عباسیوں کا زور ٹوٹ جائے اور علویوں کو حکومت مل جائے، لیکن تاتاری بڑے ہی بزدل ہیں، وہ عربوں سے ڈرتے ہیں، کیسی عجیب اور مضحکہ خیز بات

ہے کہ دنیا اس وقت تاتاریوں کے خوف میں مبتلا ہے اور تاتاریوں پر عربوں کی دہشت بیٹھی ہوئی ہے! خیر...... تم نے منگول قوم کے سپاہیوں کو دیکھا ہو گا، کیسے ہیں وہ؟" اپنی بات کے آخر میں ابنِ علقمی نے سوال کیا۔

سلیمان نے جواب دیا۔ "دیکھا ہے، اس قوم کے جنگجو بڑے ہی خوفناک اور وحشی ہیں۔ یوں لگا مجھے کہ جیسے وہ تہذیب و انسانیت سے واقف نہ ہوں، وہ خوں خوار اور سفاک ہیں، اے میرے آقا! وہ ایسی اجڈ قوم ہے جو رحم اور مہربانی کو نہیں جانتی...... تباہی و بربادی کو یہ اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ میں بڑے ادب کے ساتھ آپ سے درخواست کروں گا ایسے وحشیوں کو عراق پر حملے کی دعوت نہ دیجئے۔ اگر انہوں نے اس سرزمین پر قدم رکھ دیا تو...... خدا جانے کتنا بڑا طوفان آ جائے۔ وہ...... وہ اگر آ گئے تو خون کے دریا بہا دیں گے ......تہذیب و شائستگی کا نام مٹا دیں گے۔"

ابنِ علقمی نے بہت غور سے سلیمان کے چہرے کا جائزہ لیا، پھر کہنے لگا۔ "تم اطمینان رکھو، میں انہیں ایسا نہ کرنے دوں گا۔ میں تو انہیں صرف عباسیوں کی قوت توڑنے کے لئے بلا رہا ہوں، میں جانتا ہوں کہ تاتاری دولت کے بھوکے ہیں، یہ تمہیں بھی معلوم ہے کہ خلیفہ مستعصم باللہ کنجوس ہے، اس نے بڑی دولت جمع کر رکھی ہے، خلیفہ سے یہ دولت چھین کر تاتاریوں کو دے دی جائے گی اور وہ لوٹ لئے جائیں گے اور ہم علوی خلافت قائم کر لیں گے۔"

اس پر سلیمان بولا۔ "گستاخی معاف حضور! میرا خیال ہے کہ تاتاری عراق سے واپس نہیں جائیں گے۔"

"کوئی دلیل؟" ابنِ علقمی نے دریافت کیا۔

"دلیل یہ ہے میرے آقا کہ جب انہیں اس خطے میں بھی دولت و حکومت کی چاٹ پڑ جائے گی تو کیوں جانے لگے یہاں سے!"

"تم دراصل بات کو سمجھ نہیں رہے۔" ابنِ علقمی نے کہا۔ "میں تاتاریوں سے پہلے یہ سب کچھ طے کر لوں گا کہ انہیں یہاں سے واپس جانا پڑے گا۔ تم یہ فکر نہ کرو، ایک اہم بات تم سے پوچھنی تھی، تمہاری ملاقات ہلاکو کے وزیر سے بھی ہوئی؟"

"آپ کی مراد یقیناً نصیر الدین طوسی سے ہے، مجھے پہلے انہی کے سامنے تو پیش کیا گیا

تھا، انہیں میں نے بہت مہربان اور نیک پایا۔" سلیمان احساسِ تفاخر کے ساتھ بتانے لگا۔ "ایک بار وزیرِ محترم نے مجھے خلوت میں ملاقات کا موقع بھی دیا، اسی ملاقات میں ذاتی سطح پر ان سے جو گفتگو ہوئی اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ہمارے مسلک سے بہت قریب ہیں، انہی کے......"

"تم بھی عجیب بے وقوف آدمی ہو سلیمان!" ابنِ علقمی نے بات کاٹ دی، اس کے لہجے میں تاسف تھا۔

"مجھ سے کیا غلطی ہو گئی میرے آقا؟" سلیمان نے سہم کر پوچھا۔

"سب سے اہم اور کام کی بات تم نے سب سے آخر میں بتائی ہے۔" ابنِ علقمی یہ کہتے ہوئے گویا کھلا پڑ رہا تھا۔ "ارے یوں سمجھ لو کہ ہم نے آدھی جنگ جیت لی، اب کام بن جائے گا۔ میں آئندہ اسی سے رابطہ قائم کروں گا، اگر واقعی تمہارا قیاس درست ہے تو واضح طور پر نصیر الدین طوسی کو لکھا جا سکتا ہے کہ عراق میں ہم علویوں کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں...... تم کچھ کہنا......"

سلیمان فوراً بول اٹھا۔ "انہوں نے اپنی گفتگو میں علویوں کی حمایت کی تو اس سے میں نے یہ قیاس کیا کہ وہ ہمارے مسلک کے قریب تر ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ عباسیوں کی مخالفت کے ساتھ علویوں کی حمایت نہ کرتے، انہوں نے مجھے علویوں کی طرفداری کی ترغیب بھی دی تھی، مجھے اب وہ ساری باتیں یاد آ رہی ہیں، انہی کے حکم پر میں خراسان میں رکا رہا۔"

"سلیمان! تم نے اپنے یا میرے عقائد کے بارے میں نصیر الدین طوسی کو کچھ نہیں بتایا؟" ابنِ علقمی نے مضطرب لہجے میں معلوم کیا۔

"جی نہیں حضور!" سلیمان نے جواب دیا۔ "میں نے اس بات کو مصلحت کے خلاف سمجھا، آپ نے مجھے اپنا قاصد بنا کر خراسان بھیجا تھا، سفیر بنا کے نہیں۔ مجھے اپنی حدود کا اندازہ تھا، حدود سے تجاوز کرنے والوں کو آپ کبھی پسند نہیں کرتے، میں جانتا ہوں۔"

"کاش تم یہ بات نہ جانتے ہوتے اور کاش حدود سے تجاوز کر کے نصیر الدین طوسی کو میری حقیقت بتا دی ہوتی!" ابنِ علقمی افسوس کرنے لگا۔ چند لمحے خاموش رہ کر ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے اس نے مزید کہا۔ "چلو جو ہوا سو ہوا، اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اب میں نصیر

الدین طوسی کو لکھوں گا کہ عباسی حکومت کو ختم کر کے علویوں کی خلافت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ اس کام میں میری مدد کرے گا، ہلاکو خاں کو بغداد پر حملے کی ترغیب دے گا..... اصل قصہ تو بغداد ہی کا ہے، اگر بغداد پر ہلاکو خاں نے قبضہ کر لیا، وہ یہاں تک پہنچ گیا تو پھر عراق کے دیگر شہروں کی کیا حیثیت ہے! دارالخلافہ فتح کر لیا گیا تو سمجھو عراق فتح ہو گیا۔ پھر ہلاکو خاں کو عراق کے کسی بھی شہر میں مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑیگا۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھو کہ ہمیں بغداد کے زوال سے اصل دلچسپی ہے۔ اس شہر کا زوال ہی ہمارے عروج کا آغاز ہوگا۔ پھر یہ کہ ہلاکو خاں کے ساتھ نصیر الدین طوسی بھی یہاں آ جائے گا تو سارے کام ٹھیک ہو جائیں گے۔'' اب اس کی آواز سے خوشی چھلکی پڑ رہی تھی، اپنی سازش کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے اسے ایک راہ مل گئی تھی۔ اس نے سلیمان کو مخاطب کیا۔ ''تمہیں ایک مرتبہ پھر خراسان جانا ہوگا۔''

''آقا! میں وحشی تاتاریوں سے ڈرنے لگا ہوں۔ وہ غول بیابانی ہیں، اپنی کہتے ہیں دوسرے کی بات نہیں سمجھتے۔ جب وہ کوئی بات نہیں سمجھتے تو انہیں غصہ آ جاتا ہے، پھر وہ تلوار کی نوک سے بات کرتے ہیں۔''

یہ سن کر ابنِ علقمی ہنس دیا اور بولا۔ ''تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے! تم قاصد ہو اور قاصد کو وہ اذیت نہیں دیتے۔''

''مگر آپ یہ مہذب قوموں والی بات کر رہے ہیں اور وہ غیر مہذب، غیر شائستہ، وحشی لوگ ہیں۔ ہر اس شخص کو جسے وہ نہیں جانتے جاسوس سمجھتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہیں وہ مجھ کو جاسوس نہ سمجھ لیں، جاسوسوں کو وہ آگ میں..... بھڑکتی ہوئی آگ میں زندہ جلا ڈالتے ہیں۔ حضور! ان..... ان وحشیوں سے کچھ بعید نہیں۔'' سلیمان نے اپنے خوف کا اظہار کیا۔

میں نے ان دونوں کی باتوں میں کوئی مداخلت نہیں کی، خاموشی سے سب کچھ دیکھتی اور سنتی رہی کہ یہی میرا مقصد تھا۔ ابنِ علقمی اپنے معتمد کو سمجھانے لگا۔ ''تم مطلق خوف نہ کرو، نصیر الدین طوسی وہاں موجود ہے۔ تم اس سے مل چکے ہو، سیدھے اس کے پاس چلے جانا، وہ تمہیں اپنی حفاظت میں لے لے گا۔'' (معتمد: جس پر اعتماد کیا گیا ہو، انگریزی میں اس عربی لفظ کی جگہ سیکرٹری استعمال کیا جاتا ہے۔ مصنف) ابنِ علقمی کے اور بھی کئی معتمد تھے جن میں سلیمان کو خصوصی حیثیت حاصل تھی۔

اس نے یہ وجوہ وضاحت کی۔ ''وزیر اعظم نصیر الدین طوسی تک رسائی آسان نہیں، یہی تو پریشانی ہے حضور!..... پہلے جب میں گیا تھا تو وحشی منگول سپاہیوں نے مجھے پکڑ لیا تھا، یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ان میں ایک ایسا شخص موجود تھا جو عربی زبان تھوڑی بہت جانتا اور سمجھتا تھا، میں نے اسے جیسے تیسے بتایا کہ قاصد ہوں اور ان کے حکمران ہلاکو خاں کے نام ایک پیغام لایا ہوں، عربی جاننے والے سپاہی نے کہا کہ جب تک تمہارے بیان کی تصدیق نہ ہو جائے تمہیں حراست میں رہنا ہوگا۔ کیا خبر عرب خلیفہ کی طرف سے تم ہماری جاسوسی کرنے آئے ہو، میں اسے پہلے یہ بتا چکا تھا کہ عراق کے دارالخلافہ بغداد سے آیا ہوں، اسی سپاہی نے میرا خون یہ کہہ کے اور خشک کر دیا کہ جاسوس ہونے کی صورت میں تمہیں باندھ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی آگ میں زندہ ڈال دیا جائے گا۔ میری منت سماجت کرنے اور پوچھنے پر سپاہی نے بتایا، تم جاسوس نہیں قاصد ہو اس کی تصدیق ایک ہی شخص کر سکتا ہے، اس کے بعد پہلی مرتبہ میں نے نصیر الدین طوسی کا نام سنا۔ مجھے بتایا گیا کہ وزیر اعظم کو جب فرصت ہوگی طلب کر لیں گے، وہ رات میں نے ان وحشیوں کی قید میں گزاری اور ساری رات خدا سے دعا کرتا رہا کہ میری زندگی بچا لے۔ دوسرے دن دوپہر کے بعد مجھے نصیر الدین طوسی کے سامنے پیش کیا گیا۔ جب وزیر اعظم نے مجھ سے عربی میں گفتگو کر کے اور آپ کا خط دیکھ کر تصدیق کی کہ میں جاسوس نہیں، قاصد ہوں تو میری جان چھوٹی ورنہ تو مجھے اپنی زندگی کی امید نہیں رہی تھی۔''

ابنِ علقمی پر اس روداد کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ان آدم زادوں میں سے تھا جو ہر حال میں اپنے ہی مطلب کی بات کرتے ہیں۔ دوسرا کچھ بھی کہتا رہے یہ وہ سن کر بھی نہیں سنتے، سو اُس مطلبی نے سلیمان سے کہا۔ ''پہلی مرتبہ تمہیں کوئی جانتا نہیں تھا اس لئے دقت پیش آئی، لیکن اب لوگ تم سے واقف ہو گئے ہیں، اب تمہیں پہلے جیسا تلخ تجربہ نہیں ہوگا، ڈرو مت سلیمان! جو لوگ بہادر ہوتے ہیں وہ خطروں سے کھیلتے اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ مرد بنو، مرد!''

سلیمان غریب کیا کرتا، بہرحال نوکر تھا، چپ رہا۔ اس نے حجت تمام کر دی تھی۔ سلیمان میں ایک بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ لالچی تھا۔ ہوسِ زر کسی بھی لالچی آدم زاد کو جان کی بازی لگانے کے لئے مجبور کر دیتی ہے۔ ابنِ علقمی اُس کی اس کمزوری سے اچھی طرح

واقف تھا، سو اُس نے اشرفیوں (دینار سرخ) کی ایک تھیلی سلیمان کی طرف بڑھا دی۔

''لو سلیمان! زادِ راہ کے لئے یہ دینار اپنے پاس رکھ لو!'' ابن علقمی بولا۔

لالچی سلیمان کی آنکھیں چمک اٹھیں، اس نے تھیلی لے لی اور شکریہ ادا کر کے کہنے لگا۔

''حضور! میرا اونٹ بھی بیمار ہو گیا ہے۔''

''تمہیں سفر کے لئے اعلیٰ درجے کا اونٹ دیا جائے گا۔'' ابن علقمی نے دریا دلی دکھائی، پھر فوراً ہی مطلب نکالنے پر آ گیا، بولا۔

''جاؤ سفر کی تیاری کرو، میں آج رات ہی خطوط لکھ لوں گا، کل آ کر لے جانا اور پھر روانگی میں دیر نہ کرنا۔''

سلیمان نے فرمانبرداری کے اظہار میں گردن جھکائی اور اشارہ پاتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

ابن علقمی نے خود نشست گاہ کا دروازہ کھولا اور سلیمان کو رخصت کر دیا۔

میں وہیں موجود رہی تاکہ دیکھ سکوں کہ ابن علقمی کسے اور کیا لکھتا ہے!

پہلا خط اُس نے پھر ہلاکو خاں ہی کو لکھا، رسمی القاب و آداب کے علاوہ خط کی اصل عبارت یہ تھی:

''آپ قطعی اندیشہ نہ کریں، عربوں نے عیش و عشرت میں پڑ کر بہادری کا جوہر کھو دیا ہے۔ آپ کی تھوڑی سی فوج، عراق اور دارالخلافہ بغداد کو فتح کر لے گی۔ یہ موقع ہے، فوراً چڑھائی کر دیجئے۔''

دوسرا مراسلہ ابن علقمی نے نصیر الدین طوسی کو لکھا، بہت کچھ لکھنے کے بعد اس نے آخر میں تحریر کیا:

''میں عباسی خلافت کا خاتمہ کر کے عراق میں علوی خلافت قائم کرنے کا آرزومند ہوں، آپ ہلاکو خاں کو عراق پر حملہ کرنے کی ترغیب دیں، دولت اور کامیابی آپ کا اور ان کا انتظار کر رہی ہے۔''

اب ابن علقمی کے قصر میں میرا رُکنا ضروری نہیں تھا، سو میں وہاں سے چل دی۔

مجھے راستے میں عارج کا خیال آیا، اس سے ملاقات ہوئے کئی دن گزر چکے تھے۔ وہ ولی عہد ابوبکر کے قالب میں ایک طرح سے قید ہو کر رہ گیا تھا۔ اس پر مجھے ترس بھی آتا مگر کیا کرتی! عکب کی طرف سے ممکنہ خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ میں تو اس سے بھی لاعلم تھی کہ ابھی

وہ عفریت مصر ہی میں ہے یا عراق پہنچ گیا ہے۔

ولی عہد ابوبکر کا محل، قصرِ خلافت سے زیادہ دور نہیں تھا۔ درمیان میں صرف بغداد کی جامع مسجد تھی جہاں خلیفہ وقت اب صرف عید بقرعید کی نماز پڑھنے آتا تھا، میں اسی طرف سے گزر رہی تھی۔

رات خاصی بیت چکی تھی، میں جب ولی عہد کے محل میں پہنچی تو وہاں سکوت کا پہرا تھا، محافظ البتہ بیدار تھے۔

ابوبکر کے قالب میں مجھے عارج محوِ خواب دکھائی دیا تو میں اس کی خواب گاہ سے نکل آئی، اسے جگانا مجھے کچھ اچھا نہ لگا۔ یوں بھی اب فردوس اور ابوبکر کی شادی میں گنتی کے چند ہی روز رہ گئے تھے۔ پھر عارج مجھ سے جدا نہ رہتا۔

فردوس کو میں جہاں اور جس حال میں چھوڑ گئی تھی، وہیں اور ویسی ہی ملی۔ کمرے کی کنڈی میں اندر سے بند کر گئی تھی، وہ بھی بند ہی ملی، کھڑکیاں میں رات کو بستر پر دراز ہونے سے پہلے ہی بند کر دیتی تھی۔ یہ تمام احتیاطیں اس لئے تھیں کہ کہیں کوئی غیر متوقع واقعہ پیش نہ آ جائے، کسی کو شبہ نہ ہو جائے کہ فردوس کے انسانی قالب میں اب کوئی جن زادی رہنے لگی ہے۔

عارج کو بڑی تمنا تھی کہ میں اور وہ انسانی پیکروں میں پھر سے ایک ساتھ رہنے لگیں۔ ہم نے اسی لئے فردوس اور ابوبکر کے قالب اپنا لئے تھے، اب گویا ہماری نہیں تو ہمارے انسانی قالبوں کی شادی ہونے والی تھی۔ اس شادی کی تیاریاں ہر دو طرف بڑے زور و شور سے جاری تھیں۔ فردوس کے باپ یعقوب جاگیردار کو طبقہ امراء میں شامل کر لیا گیا، امراء کے لئے یہ ضروری تھا کہ خلیفہ وقت جب بھی دربار لگائے وہ حاضر ہوں۔ عموماً سال میں چار چھ دفعہ ہی خلیفہ مستعصم کو دربار لگانے کی فرصت ملتی یا خیال آتا۔ اس کے ولی عہد کی شادی ہو رہی تھی، اس خوشی میں دربار لگانے کا اعلان کرا دیا۔

جاگیردار یعقوب پہلی بار خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوا اور اسے مالا مال کر دیا گیا۔ دربار لگانے سے خلیفہ کا مقصد یہی تھا کہ لوگ اس کی فیاضی کا اعتراف کریں اور جان لیں کہ اس شادی کا سارا خرچ خود اسی نے اٹھایا ہے۔ یعقوب سے مجھے اس دربار کی روداد کا علم ہوا۔ وہ میرے سامنے بڑے فخر سے اپنی بیوی زبیدہ کو سارا حال احوال سنا رہا تھا۔

دربار کے لئے بھی قصرِ خلافت کا ایک حصہ مخصوص تھا، سو یوں خلیفہ کو باہر نہ جانا پڑتا، اس کی دنیا جیسے قصرِ خلافت تک محدود تھی، وہیں اسے سب کچھ مل جاتا، ہر نعمت میسر آ جاتی۔

قصرِ خلافت کے آس پاس ہی بڑے رقبے پر بڑے بڑے محل اور قصر بنے ہوئے تھے، انہی میں سے ایک قصر ولی عہد ابوبکر نے یعقوب کو دے دیا تھا، اس کا ذکر میں کر چکی ہوں، یہ قصر اتنا بڑا تھا کہ یہاں برات کو ٹھہرایا جا سکتا تھا۔

آخر وہ دن آ ہی گیا کہ جب میرے انسانی قالب فردوس کو دلہن بنایا گیا۔ میں نے دانستہ اس شادی سے پہلے کی رسمیں بیان نہیں کیں۔ آدم زادوں کی ان رسوم کی تفصیل سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔

ابوبکر کی برات بڑی شان و شوکت کے ساتھ آئی، اس کا سبب یہ تھا کہ خلیفہ مستعصم باللہ بھی برات کے ساتھ آیا تھا، شاہی کروفر کے ساتھ عصر اور مغرب کے درمیان نکاح ہو گیا۔ برات میں شہزادیاں اور بیگمات بھی تھیں۔

رات بھر ناچ گانا ہوتا رہا، خلیفہ بھی اس محفلِ نشاط میں موجود تھا۔

دوسرے روز رخصتی کی تیاری ہوئی۔ شاہی مشاطاؤں نے میرے انسانی پیکر کا سنگار کیا۔ (صحیح املا سنگار ہے، سنگھار لکھنا غلط ہے، اس میں ھ نہیں ہے۔ مصنف)

دوپہر کا کھانا کھلائے جانے کے بعد رخصتی ہو گئی۔ یعقوب نے جہیز میں بہت کچھ دیا۔ زبیدہ کو بڑی خوشی ہوئی کہ اس کی بیٹی ولی عہد کی بیوی بن گئی۔ رخصت کے وقت یعقوب اور زبیدہ دونوں ہی مجھے اس طرح گلے لگائے روئے کہ میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ رونے یا ہنسنے کا تعلق ماحول سے زیادہ ہے۔

رخصتی کے بعد پہلے مجھے قصرِ خلافت ہی میں لے جایا گیا۔ وہاں ابوبکر کی والدہ یعنی ملکہ نے مجھے منہ دکھائی میں قیمتی ہیروں کا ہار دیا، نجمہ نے موتیوں کی مالا پہنائی، دیگر شہزادیوں اور بیگمات نے بھی مجھے ہیرے جواہر سے لاد دیا۔ مغرب کے وقت تک منہ دکھائی کا سلسلہ چلتا رہا، اس عرصے میں کئی دفعہ میرا جی چاہا کہ اس آدم زادی فردوس کا جسم چھوڑ بھاگوں، مگر صبر کیا۔ دراصل آدم زاد جن اشیاء کو بہت قیمتی سمجھتے ہیں ہم جنات کی نظر میں ان کی کوئی حیثیت نہیں، مجھے اسی بنا پر بےزاری محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے تحفے تحائف دینے کی آڑ میں اکثر آدم زادیاں نمود و نمائش کا شکار تھیں۔

ہماری رات کی دعوت قصرِ خلافت میں ہوئی اور پھر ہم نے اپنے محل کا رخ کیا۔ اب ہماری باری تھی کہ غلاموں، کنیزوں اور محل کے دیگر ملازمین کو انعامات سے نوازیں۔ یہ حکمراں طبقہ نہیں، غریب لوگ تھے۔ عارج اور میں نے انہیں کھلے دل اور کھلے ہاتھ سے درہم و دینار دیئے۔ انہی لوگوں نے میری اور عارج کی خواب گاہ کو دلہن کی طرح سجایا تھا۔

خلوت میسر آتے ہی عارج نے مجھے چھیڑنا شروع کر دیا۔ ''اے دینار! آخر کار تو میری بیوی بن ہی گئی۔'' ابھی وہ یہی کہہ پایا تھا کہ اچانک اس کے منہ سے چیخ نکل گئی، پھر وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا..... چند لمحوں کو میں جیسے پتھر کی ہو گئی۔ میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ ایک دم کیا ہو گیا!

''اے دینار! میرا دل..... میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔'' عارج تڑپتے ہوئے رک رک کر مجھ سے مخاطب ہوا۔

عارج کے ان الفاظ کے ساتھ ہی مجھے جیسے ہوش آ گیا۔ میں بولی۔ ''ابوبکر کے اس انسانی قالب سے نکل آ اے عارج!''

''میں..... م..... میں کو..... کوشش تو کر رہا..... ہوں مگر یہ..... یہ ممکن نہیں ہو رہا۔'' یہ کہتے ہوئے عارج کی حالت بگڑنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے میں میرے ہونٹ تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ میں ان آیات کا ورد کرنے لگی جو سحر و افسوں کے توڑ کی خاطر عالم سوما نے مجھے بتائی تھیں۔ پھر ادھر میں نے عارج کے انسانی قالب پر دم کیا، ادھر اس کا تڑپنا بند ہو گیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ اٹھ بیٹھا۔ ابھی میں، عارج سے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ چونک اٹھی۔ میں نے عالم سوما کے وجود کی مخصوص و آشنا خوشبو محسوس کی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سوما کی آواز سنائی دی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''اے دینار! یہاں بغداد میں تم دونوں کی زندگی کو شدید خطرہ ہے۔ ان انسانی پیکروں کو چھوڑ دو اور میرے ساتھ بابل کے کھنڈرات میں چلو۔''

یہ سنتے ہی میں فوراً فردوس کے جسم سے باہر آ گئی۔ عارج کو بھی اب ابوبکر کا انسانی قالب چھوڑنے میں دشواری نہ ہوئی۔ ہم بغداد سے بابل کے کھنڈرات میں آ گئے تو میں نے عالم سوما سے خطرے کی نوعیت دریافت کی۔

''میرے خدا نے مجھے عام جنات کی نسبت جو اضافی صفات عطا کی ہیں، ان کے

ذریعے پتہ چلا ہے کہ عفریت عکب بغداد میں داخل ہو چکا ہے۔'' عالم سوما نے بتایا۔

''میرا بھی یہی اندازہ ہے اے سوما!'' میں بولی اور پھر عارج کو جو واقعہ پیش آیا تھا، بتا دیا۔

''اے دینار! قیاس غلط نہیں لگتا۔'' عالم سوما نے تصدیق کی۔ ''عارج کا ٹھیک ہو جانا اس کا ثبوت ہے۔ تجھے میں نے جو آیات تعلیم کی تھیں، ان سے ہر طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔''

''لیکن اے میرے باپ کے دوست! اس کافر ذات عفریت نے میرے بجائے عارج پر حملہ کیوں کیا؟''

''اس کا جواب بالکل سیدھا ہے اے دینار! عکب نے پہلے عارج ہی کو اپنے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ محض آدم زادوں ہی کے درمیان تو رقابت نہیں ہوتی۔ اگر تُو نے تعلیم کردہ قرآنی آیات کا ورد کر کے عارج پر دم نہ کیا ہوتا تو شاید یہ اس حملے میں زندہ نہ بچتا۔ یوں تُو اکیلی رہ جاتی اور وہ اپنی دانست میں تجھ پر قابو پا لیتا۔'' عالم سوما نے جواب دیا۔

مجھے ''فی الحال'' کہنے پر کچھ امید بندھی تو پوچھا۔ ''ہمیں کتنے دن تک اپنی حفاظت کے لئے یہیں رہنا ہوگا؟''

''جب تک میں اس کافر عفریت عکب کو بغداد چھوڑ کے جانے پر مجبور نہ کر دوں اے دینار!''

''کیا ایسا ممکن ہے اے عالم سوما؟'' میری آواز پُرجوش ہو گئی۔

''ہاں میری بچی! اس کا انحصار میرے عمل کی کامیابی پر ہے۔''

''اپنے عمل کی کامیابی پر کیا تجھے کوئی شک ہے؟'' میں نے معلوم کیا۔

''مذکورہ عمل کیونکہ اس کافر عفریت کو زیر کرنے اور بغداد سے بھگانے کے لئے ہوگا۔ سو وہ اس میں کسی طرح کی رکاوٹ ڈال سکتا ہے۔ وہ یہی چاہے گا کہ میں عمل پورا نہ کر سکوں۔''

''پہلی بات تُو یہ بتا اے سوما کہ ان کھنڈرات میں رہتے ہوئے بھی تجھے عکب کی طرف خطرہ کیوں ہے؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

''عمل میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے اس کا ان کھنڈرات کے اندر آنا ضروری نہیں۔ اپنے اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ اپنی عفریتی پراسرار قوتیں استعمال کر سکتا ہے۔ اب

دوسری بات پوچھ اے دینار!'' عالم سوما نے میری طرف نظر اٹھائی۔

''ہاں اے سوما! مجھے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ عکب کو تیرے عمل کا کیسے پتہ چلے گا؟'' میں نے بلا جھجک دوسرا سوال کر دیا۔

''یہ عمل میں اس کے نام سے کروں گا۔ عمل شروع ہوتے ہی وہ اذیت میں مبتلا ہو جائے گا۔ پھر اس کے لئے یہ سراغ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ کون اس کے خلاف عمل کر رہا ہے۔''

عالم سوما کی بات فوراً میری سمجھ میں آ گئی۔ میں خود اس تجربے سے گزر چکی تھی۔ مجھے بصرہ شہر کا ''حضرت جی'' یاد آ گیا۔ وہ بھی مجھے اپنے قابو میں کرنے کے لئے عمل کا سہارا لے رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ میں نے اس کا عمل پورا نہیں ہونے دیا۔

''اے عالم سوما!'' معاً عارج بول اٹھا۔ ''تُو نے اگر اس کافر عفریت کو ایک بار بغداد سے بھگا بھی دیا تو کیا وہ دوبارہ یہاں نہیں آ سکے گا؟... اس کی طرف سے خطرہ تو بہر صورت برقرار رہے گا۔''

''ہاں..... اس بات کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ عکب پھر کبھی بغداد نہیں لوٹے گا۔'' عالم سوما نے واضح جواب دیا، پھر کہنے لگا۔ ''عموماً ایسا ہوتا نہیں۔ جس جگہ کسی جن زاد کو..... خواہ وہ عفریت ہی کیوں نہ ہو، کوئی تلخ تجربہ ہو جائے دوسری بار وہاں نہیں جاتا۔ جان بوجھ کر بھلا کون جان خطرے میں ڈالتا ہے!''

عارج کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تو میں نے پوچھا۔ ''تیرے عمل کی مدت کتنی ہے اے سوما؟''

''زیادہ نہیں، صرف تین دن اور تین رات مجھے مصروفِ عمل رہنا ہے۔'' عالم سوما نے بتایا۔

یہ سن کر میں قدرے مطمئن ہو گئی۔ کیونکہ عمل کا عرصہ زیادہ نہیں تھا۔

عالم سوما مجھ پر بہت مہربان تھا۔ اس نے اسی رات سے عمل شروع کر دیا۔

وہ تین دن عارج اور میں نے کھنڈرات ہی میں گزارے۔ اس عرصے میں کئی بار میری ملاقات اپنے بھائی یوسف کی بیوی خرقاء سے ہوئی۔ وہ میری آمد پر خوش تھی۔ میں نے دانستہ اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ کھنڈرات میں میرا قیام عارضی ہے۔

اسے میں اپنی خوش نصیبی اور عالم سوما کی ریاضت کا نتیجہ یہ کہوں گی کہ عمل کامیاب رہا۔ عکب نے کئی مرتبہ عمل میں رکاوٹیں ڈالنی چاہیں مگر اسے ناکامی ہوئی۔ اس کا علم ہمیں عالم سوما ہی سے ہوا۔ اس نے ہمیں یہ خوشخبری دی کہ کافر عفریت عکب، بغداد سے فرار ہو چکا ہے۔ خطرہ ٹل گیا تو ہم دوسرے دن صبح ہی بغداد پہنچ گئے۔ میں نے فردوس اور عارج نے ولی عہد ابوبکر کے قالبوں میں پناہ لے لی۔

میں نے اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لا کر یہ پتہ لگا لیا کہ تین دن کے دوران میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ یعنی آدم زاد ابن علقمی کو اپنے معتمد خاص سلیمان کی واپسی کا انتظار تھا۔ سلیمان کو اس نے خراسان بھیجا تھا۔ اسے یقین تھا کہ منگول حکمران ہلاکو خاں کو نصیر الدین طوسی، عراق پر حملے کے لئے آمادہ کر لے گا۔ ابوبکر نے فردوس سے شادی کر لی تھی، اس سے بھی اسے اذیت پہنچی تھی۔ وہ اپنی بیٹی ہاجرہ کی شادی ابوبکر سے کرنا چاہتا تھا، بعد میں اس کی رائے بدل گئی تھی۔ ابوبکر نے جب شفیق اور اس کے دیگر شر پسند ساتھیوں کو گرفتار کر لیا تھا تو اسی وقت سے ابن علقمی اس کا دشمن بن گیا تھا۔

بابل کے کھنڈرات سے بغداد لوٹ کر آنے کے بعد وہ پہلی رات تھی کہ نصف شب کے قریب میں نے عارج کو مخاطب کیا۔

"ہر چند کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں، پھر بھی تجھے محتاط و چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ میں اس آدم زادی فردوس کا جسم تیرے پاس چھوڑ کر جا رہی ہوں لیکن جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔"

"کہاں جا رہی ہے تُو اے دینار؟" عارج نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا تُو بھی میرے ساتھ چلے گا؟"

"نیکی اور پوچھ پوچھ!" عارج بولا اور میرے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔

ہم دونوں ہی اپنے اپنے انسانی قالبوں سے باہر آ گئے۔ خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند تھا اور کوئی کھڑکی بھی کھلی نہ تھی۔

خراسان کی طرف پرواز کرتے ہوئے عارج مجھ سے کہنے لگا۔ "اے دینار! یہ تُو نے کیا روگ اپنی جان کو لگا لیا ہے!..... میں جانتا ہوں کہ تُو چاہتی ہے، عراق پر حملہ نہ ہو، آدم زادوں کا خون نہ بہے۔ لیکن شاید یہ ممکن نہیں۔"

"مجھے بھی معلوم ہے اے عارج!" میں نے کہا۔ "اس کے باوجود اپنی حدود میں رہتے ہوئے میں حتیٰ الامکان عراق پر حملے کو ٹالتی رہوں گی۔"

اس مرتبہ بھی حصولِ مقصد کے لئے ہلاکو خاں کے وزیر نصیر الدین طوسی ہی کو میں نے ذریعہ بنایا۔

ابن علقمی کی چال کو میں نے ایک بار پھر ناکام کر دیا تھا۔ ابھی اس کا معتمد خاص سلیمان، خراسان نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس سے پہلے ہی میں نے کام دکھا دیا۔ نصیر الدین طوسی کے دماغ میں یہ بات میں نے بٹھا دی تھی کہ ابھی عراق پر حملہ کرنا دانش مندی نہیں۔ میرے نزدیک اتنا کافی تھا۔ بعد میں جو ہوتا دیکھا جاتا۔

یہ واقعہ دوسرے دن شام کا ہے کہ ابن علقمی کی نوجوان و حسین بیٹی ہاجرہ میرے انسانی پیکر فردوس سے ملنے آ گئی۔ میں نے بڑی خوش اخلاقی سے اس کا استقبال کیا۔ وہ اپنے سازشی باپ سے قطعی مختلف تھی۔

جان بوجھ کر میں نے ہاجرہ سے احمد ابوالقاسم کا ذکر چھیڑ دیا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ احمد ابوالقاسم، شہزادی نجمہ کا بھائی تھا۔ نجمہ سے ہاجرہ کی گہری دوستی تھی۔ وہ اکثر نجمہ کے محل میں جاتی رہتی تھی اور وہیں احمد سے اس کی ملاقات ہو جاتی تھی۔ ہاجرہ شکل صورت کی تو اچھی تھی ہی، اس کی آواز بھی بڑی پیاری تھی۔ وہ خوب گاتی تھی۔ رقص میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔

میری زبانی احمد کے ذکر پر ہاجرہ شرما سی گئی۔

دیر تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ باتوں باتوں میں اس کے باپ ابن علقمی کی بابت میں نے بہت کچھ معلوم کر لیا۔ ان باتوں کا تعلق ابن علقمی کے عادات و اطوار سے تھا۔ ہاجرہ کو میں نے رات کا کھانا کھائے بغیر نہ جانے دیا۔

اب مجھے بڑی بے چینی سے اس دن کا انتظار تھا کہ جب ابن علقمی کا معتمد خاص خراسان سے لوٹ آئے۔ کیا ہونا ہے، اس کا علم تو مجھے تھا لیکن جواب میں کیا لکھا گیا ہے، یہ میں بہرحال جاننا چاہتی تھی۔

یہاں میں ایک بار پھر یہ بیان کر دینا چاہتی ہوں کہ مستعصم کا دورِ حکومت 640 ہجری سے 656 ہجری ہے۔ اس نے 16 سال حکومت کی۔ جو واقعات میں سنا رہی ہوں، ان کا

تعلق خلیفہ مستعصم باللہ کی حکومت کے آخری برسوں سے ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب ابن علقمی عراق پر ہلاکو خاں کے حملے کی راہ ہموار کر رہا تھا۔

آخر میرا انتظار ختم ہو گیا۔ میں اپنے تصور اور سماعت کی قوتوں کو بیدار کر کے ابن علقمی سے دور رہ کر بھی سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ میں نے ابن علقمی کے چہرے پر پھٹکار برستے دیکھی۔ اس کا معتمد خاص خراسان سے لوٹ آیا تھا۔ وہ ابن علقمی کو بتا رہا تھا۔

"تاتاریوں پر عربوں کی ہیبت اس قدر طاری ہے میرے آقا کہ وہ عراق پر حملے کو تیار نہیں۔"

"لعنت ہو ان پر!" ابن علقمی منہ بنا کر بولا۔ پھر سخت آواز میں اپنے معتمد سلیمان کو گویا حکم دیا "زبانی باتیں چھوڑ! تو مجھے وہ خطوط دے جو جواب میں انہوں نے لکھے ہیں۔"

سلیمان نے ہلاکو خاں اور نصیر الدین طوسی کے جوابی خطوط ابن علقمی کے حوالے کر دیئے۔

"اب تو جا! تیرا کام پورا ہو گیا۔" ابن علقمی نے کہا۔ غالباً وہ سلیمان کی موجودگی میں ان خطوط کو پڑھنا نہیں چاہتا تھا۔

سلیمان اٹھ کر چلا گیا تو ابن علقمی نے نشست گاہ کا دروازہ اندر سے لگایا اور پھر پہلا خط کھولا۔ یہ خط منگول حکمراں ہلاکو خاں کی طرف سے تھا۔ اس خط کا خلاصہ یہ تھا۔

"عراق کے مسلمان عباسی خلیفہ سے عقیدت رکھتے ہیں اور خلیفہ کے پاس فوج کی بڑی تعداد ہے۔ ایسی صورت میں عراق پر حملہ کرنا خود کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ اگر تم فوج کو علیحدہ کرا دو گے تو میں حملہ کر سکوں گا۔"

ابن علقمی غصے میں بڑبڑانے لگا "ساری دنیا بس فضول ہی ان منگولوں سے ڈرتی ہے، یہ تو بڑے ڈرپوک ہیں!"

کسی قدر توقف کے بعد اس نے دوسرا خط کھولا۔ یہ خط اسے ہلاکو خاں کے وزیر نصیر الدین طوسی نے لکھا تھا۔ خط کی عبارت رکی جملوں سے قطع نظر مندرجہ ذیل تھی۔

"ہلاکو خاں بہت محتاط آدمی ہے۔ وہ عربوں سے ڈرتا ہے۔ اگر واقعی تم علوی حکومت قائم کرنا چاہتے ہو تو فوجوں میں تخفیف کر دو اور کوئی ایسا طریقہ اختیار کرو جس سے عوام، حکومت سے ناخوش ہو جائیں۔ جب ایسی صورت حال پیدا ہو جائے گی تو میں، ہلاکو خاں کو عراق پر حملے کی ترغیب دوں گا۔ اس

وقت، ہلاکو خاں یقیناً حملہ کر دے گا۔"

ابن علقمی کے چہرے سے مایوسی کا اظہار ہونے لگا۔ اس کے باوجود وہ بڑبڑایا۔

"تاتاری بے وقوف اور بزدل ہیں جو عراق پر حملہ کرنے سے خوف کھا رہے ہیں۔ ہلاکو خاں بھی ایسا نکلا... مگر میں اس کے لئے راستہ صاف کر دوں گا۔ مجھے بہرحال خلیفہ مستعصم باللہ اور دونوں فرقوں کے ان سرکشوں سے انتقام لینا ہے جنہوں نے میری بات نہیں مانی اور مجھے حقیر جانا۔" بڑبڑاتے ہوئے اس کی آنکھوں سے گویا انتقام کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

میں اس پر مطمئن تھی کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ ہلاکو خاں ابھی عراق پر حملہ نہیں کر رہا تھا۔

ابوبکر کے محل میں آ کر اور فردوس کا قالب اپنا کر مجھے بڑی آسانی ہو گئی۔ سازشی ابن علقمی پر میرے لئے نظر رکھنا دشوار نہیں تھا۔ محل کی کنیزیں، خواصیں، نوکرانیاں، غلام اور دیگر عملہ چند ہی روز میں جان گیا تھا کہ مجھے خلوت پسند ہے اور عموماً اکیلی رہتی ہوں یا پھر انسانی پیکر میں عارج میرے ساتھ ہوتا ہے۔ اس پر بھی میں نے سب سے کہہ رکھا تھا کہ طلب کئے بغیر کوئی میرے خلوت کدے میں قدم نہ رکھے۔ میرے انسانی قالب فردوس سے ملنے والے بھی زیادہ نہیں تھے۔ ایک تو فردوس کے والدین آتے رہتے، ان کے علاوہ حکمراں خاندان کی کچھ خواتین تھیں۔ ان میں نجمہ پیش پیش تھی۔ پھر بھی اکثر دن ایسے گزرتے کہ کوئی نہ آتا۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ ولی عہد ابوبکر کے انسانی پیکر میں عارج میرے پاس ہی بیٹھا تھا۔

جیسے ہی میں نے آنکھیں بند کیں، عارج بولا۔ "کیا اس خبیث آدم زاد ابن علقمی کا چہرہ اتنا پرکشش اور خوب صورت ہے جس کو دیکھنے کے لئے تو اس قدر بے چین رہتی ہے اے دینار!..... سامنے جو موجود ہے، وہ تجھے دکھائی ہی نہیں دیتا اور جب ذرا سی مہلت ملتی ہے تو آنکھیں بند کر لیتی ہے۔" عارج کو معلوم تھا کہ اس طرح میں اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لا کر ابن علقمی پر نظر رکھتی ہوں۔

میں نے دانستہ عارج کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں ایک دفعہ بول اٹھی تو وہ جان کو آ جائے گا۔

میری جناتی صفات بیدار ہو گئیں تو میں نے ابنِ علقمی کا تصور کیا۔ اسی کے ساتھ میں گویا قصرِ خلافت میں پہنچ گئی۔ ابنِ علقمی وہیں خلیفہ وقت مستعصم باللہ کے رو برو بیٹھا تھا۔ خلیفہ کی آنکھوں میں نشے کے سبب لال لال ڈورے پڑے ہوئے تھے۔

''اعلیٰ حضرت!'' ابنِ علقمی، خلیفہ سے مخاطب تھا۔ ''حضور کا اتنا رعب و داب ہے کہ پاس پڑوس کی حکومتیں اور فرمارواں ڈرتے ہیں اور اپنی نیاز مندی کا اظہار کرنے کے لئے تحائف بھیجتے رہتے ہیں۔''

سازشی ابنِ علقمی کس لئے یہ تمہید باندھ رہا تھا، میں سمجھ رہی تھی۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ خلیفہ مستعصم انتہائی کنجوس ہے۔ اسے دولت جمع کرنے کا بڑا شوق ہے۔ وہ کم سے کم خرچ کرنا چاہتا تھا۔

نشے سے بوجھل آواز میں خلیفہ نے ابنِ علقمی کی بات سن کر کہا۔ ''ہم جانتے ہیں، ہماری حکومت کا رعب بہت زیادہ ہے۔''

''ایسے خلیفہ بہت کم ہوئے ہیں جن کا ذاتی رعب و داب ہو۔ اعلیٰ حضرت کے جلال سے سب مرعوب ہیں۔''

ابنِ علقمی نے خلیفہ کو بانس پر چڑھایا تو وہ تصدیق میں کہنے لگا۔ ''ہاں، ہمیں اس بات کا اعتراف ہے۔''

''بعض اخراجات ایسے ہیں کہ اگر کم کر دیئے جائیں تو خزانہ لبریز ہو جائے اور اس سے کوئی نقصان نہ ہو۔''

خلیفہ نے ابنِ علقمی کی طرف دیکھا۔ وہ عیار آدم زاد بڑے ادب سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ خلیفہ اس سے کہنے لگا۔ ''بھلے آدمی، تم نے اس کا ذکر پہلے سے کیوں نہیں کیا؟''

''میں غور کر رہا تھا۔'' ابنِ علقمی کے لہجے میں ریاکاری تھی۔ ''ایک عرصے کے سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اخراجات کم کئے جا سکتے ہیں۔'' وہ کن انکھیوں سے خلیفہ کے حریص چہرے کا بھی جائزہ لیتا جا رہا تھا۔

☆.....☆

''کون سے اخراجات ہیں، بتاؤ تو سہی۔'' خلیفہ پُرتجسس آواز میں بولا۔

''فوج کے اخراجات ہیں اعلیٰ حضرت!'' ابنِ علقمی مطلب کی بات پر آ گیا۔ ''ہزاروں سپاہی اور افسر مفت کی تنخواہیں لے رہے ہیں۔ برسوں سے کوئی جنگ ہوئی، نہ اس کی توقع ہے۔ ایسی صورت میں لاکھوں درہم و دینار جو فوجی افسروں اور سپاہیوں پر خرچ ہو رہے ہیں، کیوں خرچ کیے جائیں؟''

''واقعی سچ کہہ رہے ہو۔'' خلیفہ نے فوراً اقرار میں سر ہلایا۔ ''ہم نے بیکار یہ خرچ بڑھا رکھا ہے۔''

ابنِ علقمی کا چہرہ کھل اٹھا، بولا۔ ''صرف اتنے سپاہی کافی ہیں جو اعلیٰ حضرت کے جلو میں چلیں یا شہزادوں کی سواریوں کے ساتھ رہیں۔ کچھ شہر کے انتظام کی خاطر بھی رکھ لئے جائیں۔ باقی سپاہی جو چھاؤنیوں میں پڑے آرام کرتے ہیں اور مفت کا مال کھا کھا کر موٹے ہو گئے ہیں، انہیں علیحدہ کر دیا جائے۔''

''یہ بتاؤ کہ سپاہیوں اور افسروں کی تخفیف سے کتنی بچت ہو گی؟'' بے عقل اور لالچی خلیفہ نے پوچھا۔

''کم سے کم ایک کروڑ دینار سالانہ کی بچت ہو گی۔'' ابنِ علقمی نے انگل ماری۔ اسے خبر تھی کہ وہ جو کچھ کہہ دے گا، خلیفہ سوچے سمجھے بغیر اسے درست مان لے گا۔

خلیفہ مستعصم کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نظر آئے۔ اس نے کہا۔ ''ایک کروڑ دینار سالانہ کی یہ بچت اگر ہو سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیکار ہی یہ صرفہ اب تک کیا جاتا رہا۔''

''میں تو یہی سمجھتا ہوں حضور!''

"کس قدر بڑی غلطی کی ہے ہم نے۔" خلیفہ اظہار افسوس کرنے لگا۔ "خیر، تم فوج میں تخفیف کر دو۔"

"ایک اندیشہ ہے اعلیٰ حضرت! شاید ولی عہد بہادر اور دوسرے شہزادے اس بات کو پسند نہ کریں۔" ابنِ علقمی نے ابھی سے پیش بندی کی۔ اسے اندازہ تھا کہ ولی عہد اور شہزادے، خلیفہ کی طرح بے وقوف نہیں ہیں۔

"کیا وہ ایسے احمق ہیں کہ اس نیک کام کی مخالفت کریں گے؟"

"ابھی وہ ناسمجھ ہیں، ممکن ہے مخالفت کریں اور حسب عادت اعلیٰ حضرت سے میری شکایت کرنے لگیں۔"

"ہم ان کی کچھ نہ سنیں گے!" خلیفہ کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ "تم ہمارے خیر خواہ ہو، بے کھٹکے فوج میں کمی کر دو۔"

اس پر ابنِ علقمی نے مزید چالاکی دکھائی، بولا۔ "اچھا تو حضور ایک فرمان میرے نام لکھ دیں تاکہ میں شہزادوں کو دکھا سکوں۔"

"اچھا۔" خلیفہ نے کہا اور پھر اپنے حاجب کو بلا کر حکم دیا۔ "ہماری طرف سے وزیر اعظم کے نام ایک فرمان لکھو کہ وہ فوج میں تخفیف کر دیں۔ ہمارے فرمان کی تعمیل میں تاخیر سے کام نہ لیا جائے۔"

حاجب نے فرمان لکھ کر اس پر شاہی مہر لگائی، خلیفہ کے دستخط کرائے اور فرمان وزیر اعظم ابنِ علقمی کے حوالے کر دیا۔

"حضور کے اس خادم کو ایک بات اور عرض کرنی ہے۔" ابنِ علقمی نے ایک اور چال چلی۔

یہ پُرفریب چال ایک نئے جھگڑے کی بنیاد بن سکتی ہے۔ میں سوچنے لگی۔ بعد میں میرا قیاس درست ثابت ہو گیا۔ ابنِ علقمی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔

"جو سپاہی اور افسر باقی رکھے جائیں، ان کی تنخواہ کا بار بھی شاہی خزانے پر نہ ڈالا جائے اور......"

خلیفہ بے تاب سا ہو کر بول اٹھا۔ "اس سے اور کتنی بچت ہو جائے گی؟"

"پچاس لاکھ دینار سالانہ اس سے بھی بچ جائیں گے۔" ابنِ علقمی نے بتایا۔ وہ خلیفہ کی دریں مزاجی سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔

"ان سپاہیوں کو تنخواہ کون دے گا؟" خلیفہ نے معلوم کیا۔

"اعلیٰ حضرت! اب تک تاجروں پر کوئی محصول نہیں ہے۔" ابنِ علقمی نے فساد کا بیج بو دیا۔ "فوج کے ہر کمان دار کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ مال کی درآمد و برآمد پر محصول لگا کے وصول کرے۔ اسی محصول سے تمام کمان دار اپنے اپنے ماتحت سپاہیوں کی تنخواہیں دیا کریں۔"

خلیفہ بہت خوش دکھائی دیا۔ اس نے کہا۔ "ہمیں آج اس حقیقت کا صحیح اندازہ ہوا کہ تم حکومت کے کس قدر ہمدرد ہو۔ تم نے کیسی اچھی تجویز سوچی ہے۔ اس طرح فوج پر ہمارا ایک حصہ بھی خرچ نہیں ہوگا۔"

"بالکل نہیں اعلیٰ حضرت۔" ابنِ علقمی نے جلدی سے تائید کی۔ "مجھے قوی یقین ہے کہ تاجر اور کاروباری طبقے بڑی خوشی سے مجوزہ محصول ادا کیا کریں گے۔ اس طرح بقیہ فوج کی تنخواہ باہر ہی سے نکل آیا کرے گی۔"

کم عقل خلیفہ مستعصم باللہ نے بلا سوچے سمجھے ابنِ علقمی کی وہ دونوں تجویزیں مان لیں جو حکومت و سلطنت کو سخت نقصان پہنچانے والی تھیں اور ایک حکمراں کے شایانِ شان نہیں تھیں۔

ابنِ علقمی قصرِ خلافت سے اٹھ کر چلا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

"شکر ہے اے دینارہ تیری آنکھیں تو کھلیں۔" عارج نے مجھ پر فقرہ چست کیا۔ وہ ابھی تک میرے خلوت کدے میں تھا۔

"تُو نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں! جو بھی ہو، تیری بلا سے۔" میں بولی۔

"میں تجھ سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ مجھے آدم زادوں کے جھمیلوں میں پڑنے کا شوق نہیں۔ جیسا کریں گے، بھریں گے۔"

"یہ نہ بھولا کر اے عارج! کہ تُو نے ولی عہد سلطنت ابوبکر کے جسم پر قبضہ کر رکھا ہے۔ سو تُو چاہے بھی تو ملکی معاملات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔" میں نے کہا۔

"تُو بے فکر رہ...... کام چلاؤ معلومات رکھتا ہوں میں۔ یہ بھی نہ رکھوں تو بھانڈا پھوٹ سکتا ہے کہ ولی عہد کے جسم میں کوئی جن زاد گھس گیا ہے۔ خیر تُو بتا، سازشی ابنِ علقمی کس

حال میں ہے اور ان دنوں خلیفہ کو کیا پٹی پڑھا رہا ہے؟" عارج نے پوچھا۔

"جب تجھے ان باتوں سے کوئی مطلب ہی نہیں تو کیوں بتاؤں تجھے!"

"اچھا نہ بتا، ضرورت پڑی تو میں خود معلوم کر لوں گا۔" عارج اینٹھ گیا تو میں ہنس پڑی۔

"چل، تُو بھی کیا یاد کرے گا کہ ایک جن زادی تجھ پر مہربان تھی!" میں نے یہ کہہ کر عارج کو ساری بات بتا دی۔

"اُم دینار! یہ تو اس مملکت عراق کے ساتھ بہت ہی برا ہو رہا ہے۔" عارج نے اظہار افسوس کیا۔

"مزید برائی خود خلیفہ وقت کی بے شعوری ہے۔" میں بولی۔ "جتنا قصور وار ابنِ علقمی ہے، خلیفہ بھی اس سے کم نہیں۔"

عارج اور میں نے دیر تک عراق کے سیاسی حالات پر گفتگو کی جو ہر گزرتے دن کے ساتھ بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔

اس روز کے بعد بھی ابنِ علقمی کی نقل و حرکت پر میری نظر رہی۔

فوج میں تخفیف کے اختیارات ملنے سے گویا ابنِ علقمی کی مراد بر آ گئی تھی۔ وہ ہلاکو خاں اور اس کے وزیر نصیر الدین طوسی کے مشوروں پر عمل کر رہا تھا۔ اسے کوئی روکنے والا نہ تھا۔ اس نے چن چن کر ان سپاہیوں اور افسروں کو فوج سے نکال دیا جنہیں وہ ملک و قوم، خلیفہ یا شہزادوں کا ہمدرد سمجھتا تھا۔

اس تخفیف سے ایک چیخ پکار شروع ہو گئی۔ جن آدم زادوں کو فوج سے نکالا گیا، ان کا ایک نمائندہ وفد خلیفہ سے ملا۔ وفد میں فوج کے بڑے بڑے آزمودہ کار افسران تھے۔

"اعلیٰ حضرت!..... محترم وزیر اعظم نے جو قدم اٹھایا ہے، وہ بہت خطرناک ہے۔" وفد کے سربراہ مصعب نے بات شروع کی۔ "حضور کے علم میں ہو گا کہ وحشی تاتاری حکمران ہلاکو خاں، خراسان تک آ پہنچا ہے۔ ایسے میں تخفیفِ فوج....."

خلیفہ مستعصم نے مصعب کی بات کاٹ دی اور منہ بگاڑ کر بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ تم بڑے ہی کم عقل ہو، تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم۔"

"خادم کو اپنی کم علمی و بے عقلی کا اعتراف ہے خلیفہ معظم! آپ ہی فرما دیں کہ یہ اقدام

کیوں کیا گیا ہے؟"

"جو کچھ بھی ہوا یا ہو رہا ہے اس میں ہماری مرضی شامل ہے۔" خلیفہ نے جواب دیا۔ "اس سلسلے میں ابنِ علقمی پر الزام تراشی بے سود ہے۔ فوج میں کمی سے ابنِ علقمی کو نہیں، خود ہمیں فائدہ ہے۔"

"اعلیٰ حضرت جسے فائدہ سمجھ رہے ہیں، وہ قطعی طور پر نقصان ہے۔" مصعب نے بلا جھجک کہہ دیا۔

"یعنی ہمیں اپنے نقصان فائدہ کی تمیز نہیں؟" یہ کہتے ہوئے خلیفہ کے تیور بدل گئے۔

"خادم کا مقصد ہرگز یہ نہیں بلکہ ملکی سلامتی و استحکام کے لئے فوج کی ضرورت بیان کرنا ہے۔"

"تو کرو بیان، ہم سن رہے ہیں۔" مستعصم بے اعتنائی سے بولا۔ "ضروری نہیں کہ تم جو کہو ہم اسے مان ہی لیں۔"

خلیفہ کی بیزاری اور بے پروائی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ سنے گا نہیں۔ پھر بھی مصعب نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے اپنی دانست میں خلیفہ کو سمجھایا۔ "دنیا کا کوئی ایسا ملک نہیں جو اپنی حفاظت کی خاطر فوج نہ رکھتا ہو۔"

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ ہم فوج ہی ختم کر رہے ہیں؟ جتنے سپاہیوں کی ضرورت ہو گی رکھے جائیں گے۔" خلیفہ پھر بول اٹھا۔

خادم کے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے خلیفہ محترم کہ فوجی قوت سے کمی پر دشمنوں کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔" مصعب نے کہا۔

اس پر مستعصم احمقانہ انداز میں دھیرے سے ہنس دیا، پھر بولا۔ "تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ دشمن ہم سے خوف کھاتے ہیں۔"

یہ موقع بڑا غنیمت تھا کہ اہم فوجی افسران کے سمجھانے بجھانے سے غبی اور بے عقل خلیفہ مزید حماقت کا ثبوت نہ دیتا، مگر ایسا نہ ہوا۔ خلیفہ پر لالچ غالب آ گیا۔ ان فوجی افسران سے بھی ملنے پر خلیفہ نے بڑی مشکل سے آمادگی ظاہر کی تھی۔ بہرحال انہیں قصرِ خلافت سے مایوس و ناکام واپس آنا پڑا۔ بہ مجبوری ان فوجی افسران اور دیگر لائق و تجربے کار سپاہیوں نے مصر اور دوسرے ملکوں میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ پیٹ تو روٹی مانگتا ہے! وہ کب تک

عراق میں پڑے رہتے۔

جو فوج باقی رہ گئی، اس کی تنخواہ بھی شاہی خزانے سے ملنی بند ہو گئی۔ انہیں یہ حکم مل گیا کہ وہ تاجروں اور کاروباری لوگوں سے محصول وصول کریں اور اسے اپنی تنخواہ میں مجرا کر لیں۔ محصول کی جو رقم تنخواہوں کے بعد باقی بچے وہ قصر لخلد (قصر خلافت) کے شحنہ (نگراں) کو دے دیا کریں۔

فوجیوں کی اکثریت اجڈ تھی۔ انہوں نے محصول لگانے اور اسے وصول کرنے میں سختی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاجروں، سوداگروں، کاروباری لوگوں اور فوجیوں کے درمیان جھگڑے شروع ہو گئے۔ ان جھگڑوں نے رفتہ رفتہ جھڑپوں کی شکل اختیار کر لی۔ اس کا اندازہ میں پہلے ہی کر چکی تھی۔ ابن علقمی نے نقضِ امن کی بنیاد رکھ دی تھی۔

جب تاجر طبقہ تنگ آ گیا تو اس کے نمائندہ افراد نے وزیراعظم ابن علقمی سے شکایت کی۔ اس خبیث ہی نے تو یہ بیج بویا تھا، سو غور سے بظاہر ساری باتیں سنیں، پھر سمجھا دیا۔

''میں فوجیوں کو سمجھا دوں گا کہ وہ نرمی سے کام لیں۔''

ابن علقمی نے وعدہ تو کر لیا مگر اسے وفا نہ کیا۔

فوجی افسروں کو بلا کر ابن علقمی نے برعکس بات کی۔ ''یہ کاروباری لوگ بہت شریر ہیں، محصول ادا کرنے میں حیل و حجت سے کام لیتے ہیں۔ تم ان سے نرمی نہ کرو، سختی کرو۔ اسی سے فوج اور حکومت کا دبدبہ قائم رہے گا۔''

یہ شہ پا کر فوجی اور بھی شیر ہو گئے۔ انہوں نے سختی میں اضافہ کر دیا۔ لوگوں کو وہ ناقابل برداشت اذیت دینے لگے۔

تاجر طبقے نے دوبارہ ابن علقمی سے فریاد کی اور تمام سختیاں بیان کیں جو فوجیوں نے تاجروں اور کاروباری لوگوں پر کی تھیں۔ اس پر عیار آدم زاد ابن علقمی نے افسوس کا اظہار کیا اور کہا۔ ''میں نے ان بدبختوں کو سمجھایا تھا لیکن وہ نہیں مانے۔ خیر...... میں پھر انہیں سمجھاؤں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ فوجی اجڈ اور غیر مہذب ہیں۔ نامعلوم وہ اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگے ہیں!...... میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر سختی کا جواب سختی سے دیا جائے تو ان کے ہوش درست ہو جائیں۔ آپ لوگ بہر حال معزز ہیں، مالدار بھی ہیں۔ ان جیسوں کو تو آپ کھڑے کھڑے خرید سکتے ہیں۔''

میں خوب سمجھ رہی تھی کہ وہ آدم زاد کیوں دوغلے پن کا ثبوت دے رہا ہے! اس کا مقصد بغداد میں ہنگامہ کرانا تھا۔ شہر کے پُر امن حالات سے وہ خوش نہیں تھا۔ ناساز گار حالات ہی اس کے لئے سود مند ثابت ہوتے۔ درپردہ ابن علقمی کاروباری حلقے کو فوجیوں کا مقابلہ کرنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ تاجروں اور کاروباری لوگوں میں ذہین اور باشعور افراد بھی تھے۔ انہی میں سے ایک تاجر کہنے لگا۔

''آپ نے ٹھیک کہا، ہم بھی غنڈوں اور بدمعاشوں کو نوکر رکھ سکتے ہیں تاکہ وہ فوجیوں سے لڑ سکیں، لیکن یہ مناسب نہیں۔'' ابن علقمی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

ایک اور کاروباری آدم زاد بول اٹھا۔ ''ہم سختی کا جواب سختی سے دے سکتے ہیں۔ لیکن ڈرتے ہیں کہیں حکومت ہمارے خلاف نہ ہو جائے!''

''حکومت کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔'' ابن علقمی نے یہ کہہ کر گویا فساد کے لئے چھوٹ دے دی اور مزید بولا۔ ''میں نے اعلیٰ حضرت سے عرض کیا تھا کہ وہ فوجیوں کو محصول کی وصولی پر مقرر نہ کریں، لیکن انہوں نے میری بات نہیں سنی۔ میں جانتا تھا فوجی بدو (گنوار) قسم کے ہوتے ہیں۔ آپ معززین کو تنگ کریں گے۔''

ابن علقمی ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرف انہیں فوجیوں کے خلاف بھڑکا رہا تھا دوسری طرف خلیفہ سے بدظنی پیدا کر رہا تھا۔ اسی سبب بغداد شہر کا ایک سوداگر کہنے لگا۔ ''ہمیں خلیفہ سے بڑی شکایت ہے۔ اول تو اس قسم کا محصول کبھی نہیں لگایا گیا، پھر بھی اگر محصول ہی لگانا تھا تو اس کی وصولی فوجیوں کے ذریعے نہ ہوتی۔''

''سچ یہ ہے کہ میری نظر میں اس طرح کا کوئی محصول ہی ناجائز ہے۔'' عیار آدم زاد گویا دانستہ پلٹا کھا گیا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ خلیفہ پر دولت جمع کرنے کا بھوت سوار ہے۔ انہوں نے اسی سبب سے محصول سے فوجیوں کی تنخواہیں دیئے جانے کا حکم دیا ہے۔ یہ شکر کرو کہ فوج میں تخفیف کر دی گئی۔ جگہ جگہ جو چھاؤنیاں قائم تھیں، اب نہیں رہیں۔ صرف دارالخلافہ اور اس کے اطراف ضروری فوج رکھی گئی ہے۔ اگر ساری فوج ہوتی تو تم لوگوں سے اس قدر محصول وصول کیا جاتا کہ تجارت اور کاروبار کے لئے تمہارے پاس کچھ نہ بچتا۔ تمہاری دکانیں، گودام وغیرہ بھی نیلام ہو جاتے۔''

''اس وقت تو شاید ہم بھی محصول ادا نہ کرتے۔'' تاجروں کے وفد کا سربراہ بولا۔

''آپ تو ہم فریادیوں کو کوئی ایسی تدبیر بتائیں حضور کہ ان فوجیوں سے ہمیں چھٹکارا مل جائے۔''

''تم جانتے ہو کہ نرمی سے کوئی نہیں مانتا۔'' ابنِ علقمی نے شہ دی۔ ''وہ سختی کریں، تم بھی سخت ہو جاؤ۔ پھر وہ خود ہی نرم پڑ جائیں گے۔''

تاجروں اور کاروباری لوگوں کا وفد ابنِ علقمی کے قصر سے اٹھ آیا۔ وہ بھولے آدم زادے ابنِ علقمی کی ''نیکی'' اور ''شرافت'' کی تعریف کرنے لگے۔ خلیفہ کو وہ برا بھلا کہہ رہے تھے حالانکہ کیا خلیفہ اور کیا اس کا وزیر ایک اعتبار سے دونوں ہی ایک تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ کاروباری لوگوں نے طے کر لیا کہ اگر اب فوجی ان پر سختی کریں گے تو وہ بھی سختی کا جواب سختی سے دیں گے۔

محصول روز ہی وصول کیا جاتا تھا۔ اس روز بھی فوجیوں نے سختی کی۔ نتیجہ یہ کہ بازار والے تمام ہی کاروباری اور تجارت پیشہ افراد مقابلے پر آ گئے۔ وہ اس دھوکے میں تھے کہ وزیرِ اعظم ابنِ علقمی ان کے ساتھ ہے۔ انہوں نے کئی فوجیوں کی پٹائی کر دی۔ اس پر سپاہیوں کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے بازار والوں پر حملہ کر دیا۔ تلواریں سب ہی کے پاس تھیں۔ تلوار کا جواب تلوار سے دیا جانے لگا۔ ردِ عمل کے طور پر فساد برپا ہو گیا۔ کئی بازار والے اور کئی سپاہی زخمی ہوئے۔

میں خود اس موقع پر موجود تھی۔ فردوس کا انسانی قالب چھوڑنے سے پہلے میں نے عارج کو صورتحال سے آگاہ کر دیا تھا۔ اسی کے ساتھ اسے موقعِ واردات پر پہنچنے کی تاکید بھی کر دی تھی۔ انسانی پیکر میں وہ بہرحال ولی عہدِ سلطنت کا کردار ادا کر رہا تھا۔

ابوبکر کے قالب میں وہاں پہنچ کر عارج نے حیرانی کا اظہار کیا۔ اسے وہاں دیکھ کر فوجیوں کے ہاتھ بھی رک گئے اور بازار والوں نے بھی اپنی تلواریں زیرِ نیام کر لیں... یہ غنیمت تھا کہ لوگ، ولی عہد سے خوش تھے۔ خلیفہ کی حرکتوں سے البتہ عوام اس سے بدظن ہو گئے تھے۔ اس سے قطع نظر وہ ابوبکر کا بڑا پاس کرتے تھے۔

''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟'' عارج نے ابوبکر کی آواز میں ان آدم زادوں کو مخاطب کیا۔ ''مقامِ حیرت ہے کہ فوجی اور کاروباری لوگ دست بہ گریباں ہیں حالانکہ فوج حفاظت کے لئے ہے اور کاروباری حضرات کو امن کی ضرورت ہے۔ بدامنی میں کاروبار کیسے ممکن ہے!''

''اے شہزادہ عالی!'' ایک فوجی افسر، عارج سے کہنے لگا۔ ''ہمیں محصول کی وصولی پر مقرر کیا گیا ہے۔ ان لوگوں نے وصولی میں مزاحمت کی، اسی وجہ سے جھگڑا بڑھا۔''

عارج نے ایک ادھیڑ عمر تاجر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بول اٹھا۔ ''فوجی افسر اور سپاہی وحشی ہیں۔ محصول وصول کرنے میں اس قدر ظلم ڈھاتے ہیں جو ناقابلِ بیان ہے۔ انہیں ہمیں پہنچنے والی اذیت کا ذرا بھی خیال نہیں۔''

''فوجی اور محصول وصول کرتے ہیں!'' عارج نے سب کچھ جانتے بوجھتے حیرت کا اظہار کیا۔

''جی ہاں شہزادے!'' ایک سوداگر بولا۔ ''پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔''

''تم کس کے حکم سے محصول کی وصولی کرتے ہو؟'' عارج نے فوجی افسر سے پوچھا۔ وہ ایک ''انجان شہزادے'' کا کردار خوب ادا کر رہا تھا۔

''وزیرِ اعظم کے حکم سے شہزادہ محترم!'' فوجی افسر نے جواب دیا۔

وزیرِ اعظم کے ذکر پر بازار والوں کے چہروں پر حیرت دکھائی دی۔ انہیں یہ بات پہلی بار معلوم ہوئی تھی۔

''انہوں نے تمہیں کیا حکم دیا ہے؟'' عارج نے جان بوجھ کر معلوم کیا۔

''وزیرِ اعظم کا حکم ہے کہ ہم روزانہ محصول وصول کیا کریں اور فوج کی تنخواہ میں......''

فوجی افسر نے وہی کچھ بتایا جو ابنِ علقمی کا حکم تھا۔

''عجیب بات ہے..... لیکن محصول کی وصولی میں تم سختی کیوں کرتے ہو؟'' عارج نے دریافت کیا۔

''یہ لوگ ہمیں تنگ کرتے ہیں، آسانی سے محصول نہیں دیتے۔ مجبور ہیں کہ ہمیں سختی کرنی پڑتی ہے۔'' فوجی افسر نے جواب دیا۔

''سختی کرنے کا حکم تمہیں کس نے دیا ہے؟'' عارج نے یہ سوال بھی دانستہ کیا تاکہ ابنِ علقمی کا اصل چہرہ سامنے آ جائے۔

''یہ حکم بھی وزیرِ اعظم ہی کا ہے۔'' فوجی افسر نے جواب دیا۔

''میرا بھی یہی خیال تھا۔'' عارج بولا، پھر بازار والوں سے مخاطب ہوا۔ ''تم محصول

کیوں ادا نہیں کرتے؟''

''پہلی بات تو یہ ہے حضور کہ محصول ناجائز ہے۔'' تاجروں کی نمائندگی کرتے ہوئے ایک بوڑھے آدم زاد نے کہنا شروع کیا۔ ''اس طرح کا محصول پہلے کبھی تاجر برادری سے نہیں لیا گیا۔ دوسرے یہ کہ ہم اس کے باوجود حکومت کا احترام کرتے ہیں اور محصول دینے کو تیار ہیں، لیکن محصول کا کوئی معیار و اصول ہی نہیں ہے۔ یعنی کتنے مال کی خرید و فروخت یا درآمد پر کتنا اور کس حساب سے محصول لگے گا۔ یہ فوجی جس قدر چاہتے ہیں، محصول مقرر کر دیتے ہیں۔ بکری ہو نہ ہو، یہ محصول وصول کرتے ہیں، لوگوں کو مارتے ہیں۔ ہم ہر روز کی اس پریشانی سے تنگ آ گئے ہیں۔''

''یہ محصول لگایا کس نے؟...... جب کہ پہلے نہیں لیا جاتا تھا'' عارج نے وضاحت چاہی۔

''وزیراعظم نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ محصول اعلیٰ حضرت نے مقرر کیا ہے۔'' بوڑھے تاجر نے کہا۔

''اعلیٰ حضرت اس قسم کا محصول مقرر نہیں کر سکتے۔ تم لوگوں نے خلیفہ معظم سے فریاد نہیں کی؟'' عارج نے پوچھا۔

''ہم وزیراعظم کے پاس گئے تھے، انہوں نے ہم سے کہا کہ ان کے منع کرنے پر بھی خلیفہ نے محصول لگا دیا اور یہ بھی کہا، فوجی سختی کریں تو تم سختی کا جواب سختی سے دو۔'' دوسرے تاجر نے بتایا۔

''یہ ہرگز نہیں ہو سکتا!'' فوجی افسر بولا۔ ''وزیراعظم نے خود ہم سے کہا تھا کہ کاروباری لوگ بہت شریر ہیں۔ اگر وہ محصول ادا کرنے میں حجت کی راہ اپنائیں تو تم ان پر سختی کرو۔''

''اور ہم سے انہوں نے یہ کہا تھا کہ فوجی گنوار ہیں، ان کی سختی کا جواب ہم سختی سے دیں۔''

''ضرور کہا ہو گا۔'' عارج نے گویا اس بحث کا خاتمہ کر دیا۔ ''وزیراعظم فساد کرانا چاہتے ہیں۔ حیرت ہے کہ تم لوگ ان کے کہنے میں آ گئے۔ تمہیں عقل و ہوش سے کام لینا چاہئے۔ فساد سے شہر کا امن و امان تباہ ہو جائے گا۔''

میں نے عارج کو وہاں جس مقصد سے بھیجا تھا، وہ پورا ہو گیا۔ اس نے فساد کو بڑھنے نہ

دیا۔ دوسرے ابن علقمی کا چہرہ بھی بے نقاب کر دیا۔ عارج کے انسانی قالب میں رہنے سے پہلی بار میں نے فائدہ اٹھایا تھا۔

''شہزادہ محترم! محصول کے جائز یا ناجائز ہونے سے قطع نظر ہم اس کی ادائیگی پر آمادہ ہیں تاکہ ہمارے کاروبار چلتے رہیں، جھگڑے فساد نہ ہوں، لیکن یہ پیشکش مشروط ہے۔'' بوڑھے تاجر نے عارج سے کہا۔

''اپنی شرائط بیان کرو۔'' عارج بولا۔

''ایک تو یہی کہ محصول کا معیار مقرر کیا جائے۔ دوسرے کسی اور فوجی افسر کو شہر کے اس مرکزی بازار میں وصولی کے لئے بھیجا جائے۔''

''تمہاری دونوں شرائط مناسب ہیں، میں خلیفہ معظم تک تمہاری بات پہنچا دوں گا۔'' عارج یہ کہہ کر فوجیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ فوجیوں کو اس نے سمجھا بجھا کر وہاں سے ہٹا دیا۔ جھگڑے میں جو آدم زاد زخمی ہو گئے تھے، انہیں پہلے ہی مرہم پٹی کے لئے روانہ کر دیا گیا تھا۔

''اے عارج! اب تو بغداد کی فوجی چھاؤنی کا دورہ بھی کر لے۔'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''وہ کس لئے؟'' اس نے اپنا گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے دھیرے سے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''تاکہ تجھے بہ حیثیت ولی عہد سلطنت صورتحال کا صحیح اندازہ ہو سکے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اے دینار! تو خواہ مخواہ مجھے خوار کر رہی ہے۔'' عارج بڑبڑایا۔

''اس سے میرا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ بغداد میں جو فوج باقی رہ گئی تھی تجھے اس کی حمایت حاصل ہو جائے۔'' میں نے عارج کو بتایا، پھر عارج نے مزید ''اڑی'' نہیں کی اور فوجی چھاؤنی پہنچ گیا جو تقریباً خالی پڑی تھی۔ جہاں سپاہیوں کی گہما گہمی سے راستہ چلنا دشوار ہوتا تھا، وہ گویا الّو بول رہا تھا۔ کبھی کوئی اکا دکا سپاہی یا افسر آتا جاتا دکھائی دے جاتا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے فوج کو کسی محاذ پر بھیج دیا گیا ہو۔ میں بھی عارج کے ساتھ ساتھ فوجی چھاؤنی کا جائزہ لے رہی تھی۔

عارج کو ابوبکر کے انسانی قالب میں وہاں دیکھ کر کئی فوجی قریب آ گئے۔ وہ گھوڑے سے اتر گیا۔

''تمہیں معلوم ہے، فوج میں کس قدر تخفیف کی گئی ہے؟'' عارج نے ایک فوجی افسر سے سوال کیا۔

افسر نے جواب دیا۔ ''جی ہاں شہزادے، معلوم ہے۔ فوج میں تین چوتھائی تخفیف کر دی گئی ہے۔ اب صرف ایک چوتھائی فوج باقی ہے۔''

''صرف ایک چوتھائی؟'' عارج حیرت سے بولا۔

''جی ہاں محترم ولی عہد! اور اس میں بھی کمی کا سلسلہ جاری ہے۔ کسی افسر اور سپاہی کو بھی اس بات کا یقین نہیں کہ وہ کب تک فوج کی ملازمت میں رہے گا اور کب اسے نکال باہر کیا جائے گا۔ عجیب بے یقینی کی کیفیت ہے۔'' اس فوجی افسر نے اپنے اور اپنے ساتھی فوجیوں کی ترجمانی کی جس سے عارج ہم کلام تھا۔

''یہ سب وزیراعظم کر رہا ہے۔'' عارج ان فوجی افسروں سے مخاطب تھا جو اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

''شہزادہ محترم! ہم نے بھی یہی سنا ہے۔''

''معلوم نہیں اس سے وزیراعظم کا کیا منشا ہے۔ ملک و قوم پر وہ کیا تباہی لانا چاہتا ہے!'' عارج نے میری شہ پر کہا۔

''جب سے فوج میں تخفیف شروع ہوئی ہے اس وقت سے عام سپاہیوں کی وفاداری میں بھی بڑا فرق آ گیا ہے۔'' فوجی افسر صاف گوئی سے بتانے لگا، پھر عارج کو ولی عہد ابوبکر جان کر درخواست کی۔ ''اب حضور ہی سے ہمیں دستگیری کی توقع ہے۔ اگر آپ آج یہاں خود تشریف نہ لاتے تو ہم فوجی افسران وفد کی صورت میں حاضرِ خدمت ہوتے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ اگر خلیفہ محترم سے ہماری سفارش کریں گے تو ہمارا کام بن جائے گا۔ ہم صرف روزی روٹی کا تحفظ چاہتے ہیں، محض اتنا یقین ہمیں مطلوب ہے کہ فوج میں اب مزید کمی نہیں ہوگی۔''

''اے عارج! ان بیچاروں کی بات مان لے۔'' میں نے سرگوشی کی۔ ''کیا خبر خلیفہ تیری بات مان ہی لے۔''

میرے ایما پر عارج نے حامی بھر لی۔ اب وہ فوجی چھاؤنی سے نکل کر قصرِ خلافت کی طرف گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھی۔ اپنا اصل مقصد میں نے عارج سے بیان کر دیا۔ فوجیوں کی سفارش تو بس ایک بہانہ تھی۔

اس میں شک نہیں کہ عراق کی تباہی و بربادی کے سامان ہو چکے تھے۔ دارالخلافہ بغداد کو خاک و خون میں نہلانے کی راہیں ہموار کر دی گئی تھیں، پھر بھی میں حجت تمام کرنا چاہتی تھی۔ خلیفہ وقت مستعصم باللہ سے فوجی افسران کے وفد کی ملاقات اور ولی عہد سلطنت ابوبکر کے ملنے میں بڑا فرق تھا۔ اس امکان کو میں نے نظر انداز نہیں کیا کہ شاید ولی عہد یا حکمراں خاندان کے دیگر افراد کی بات خلیفہ مان لے اور فوج میں کمی نہ کرے۔ میرے نزدیک فوج میں کمی اور اس سے متعلقہ دوسرے اقدامات سراسر خودکشی کے مترادف تھے، عارج میری ان تمام باتوں سے متفق تھا۔ وہ اسی لئے میرے ایماء پر خلیفہ سے ملنے پر آمادہ ہو گیا۔

ابوبکر کے انسانی قالب میں جب عارج اس علاقے میں پہنچا جہاں بڑے بڑے قصر اور محلات تھے تو اس کی ملاقات احمر سے ہو گئی۔ احمر نے اس سے پوچھا۔ ''شہزادہ عالی! اس طرف کہاں سے آ رہے ہیں؟''

احمر کا تعلق بھی حکمراں خاندان سے تھا، میں پہلے اس کا تفصیلی ذکر کر چکی ہوں۔ عارج نے احمر کے سوال میں حقیقت بیان کر دی۔ ''میں فوجی چھاؤنی گیا تھا۔ وزیراعظم نے تقریباً تمام فوج علیحدہ کر دی ہے، اب صرف فوج کا چوتھائی حصہ باقی رہ گیا ہے اور وہ اس میں بھی تخفیف کر رہا ہے۔ اس نے کاروباری اور تاجر برادری پر ایک نیا محصول (ٹیکس) لگا دیا ہے۔ فوجیوں سے وہ اس محصول کو وصول کراتا ہے، اسی اقدام کے سبب فتنے سر ابھارنے لگے ہیں، آج تو ہنگامہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔''

''کیا ہوا؟'' احمر نے معلوم کیا۔

جواب میں عارج نے تمام واقعہ سنا دیا۔

اس پر احمر نے تبصرہ کیا۔ ''معلوم ہوتا ہے وزیراعظم کوئی بہت بڑی تبدیلی لانا چاہتا ہے۔''

''یہی میرا خیال ہے۔'' عارج نے تصدیق کی۔

اسی لمحے میں نے عارج سے سرگوشی کی: "اے عارج! اس آدم زاد شہزادے کو بھی اپنے ساتھ لے چل، تو جس مقصد کے تحت قصرِ خلافت جا رہا ہے اس میں احمر سے تجھے مدد ہی ملے گی۔"

عارج کیونکہ ایک آدم زاد کے قالب میں تھا اس لئے جواب میں کچھ نہ کہہ سکا، بحث کیے بغیر میرا کہا ماننا گویا اس کی مجبوری تھی، سو وہ احمر سے مخاطب ہوا۔ "میں خلیفہ معظم کے حضور میں جا رہا ہوں، تم بھی چلو میرے ساتھ۔"

"ضرور...." احمر فوراً راضی ہو گیا۔

عارج نے احمر کو بھی اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا۔ وہاں سے قصرِ خلافت زیادہ دور نہیں تھا۔ جلد ہی وہ دونوں وہاں پہنچ گئے، جس قصر کی حفاظت اور پہرے پر ہر وقت پانچ سو سپاہی رہتے تھے اب وہاں مشکل سے سو (100) سپاہی تھے۔

"ہر قصر پر سپاہی کم کر دیئے گئے ہیں۔" عارج نے احمر کو بتایا۔

"جی ہاں۔" احمر نے تائید کی۔ "جب میرے قصر کے سپاہی کم ہوئے تو میں نے یہ خیال کیا کہ شاید رخصت پر چلے گئے ہیں..... ادھر تو شیطان وزیرِ اعظم ابنِ علقمی نے خلیفہ محترم کو مے نوشی میں مشغول کر دیا گیا، اُدھر فوج میں تخفیف کر دی..... مجھے تو یہ لگتا ہے کہ وہ عراق پر کوئی بلائے ناگہانی لانے والا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" عارج نے کہا۔

باتیں کرتے ہوئے وہ قصرِ خلافت کے اندر پہنچ گئے۔ دونوں یکے بعد دیگرے گھوڑے سے اتر گئے تو وہاں موجود کنیزوں میں سے ایک کنیز نے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ وہ آگے بڑھے تو داروغہ قصر نے ان کا استقبال کیا، ان دونوں کو کچھ ہی دیر میں خلیفہ کے پاس پہنچا دیا گیا، آداب و تسلیمات کے بعد وہ خلیفہ کے اشارے پر اس کی مسند کے سامنے بیٹھ گئے۔

خلیفہ نے معنی خیز نظروں سے احمر کو دیکھا، وہ کہنے لگا۔ "دلہن فردوس نے ہمیں بتایا ہے کہ احمر شہزادی نجمہ سے عقد کرنا چاہتے ہیں۔"

احمر نے شرم سے سر جھکا لیا تو عارج بولا۔ "جی ہاں اعلیٰ حضرت!"

"بھئی سچ تو یہ ہے کہ احمر کو نجمہ سے بہتر رفیقِ زندگی نہیں مل سکتی۔" خلیفہ معتصم کہنے لگا۔ "صورت اور سیرت دونوں ہی میں نجمہ بے مثل ہے۔" یہ کہہ کر ذرا توقف سے اس نے

عارج کو ابو بکر سمجھ کر پوچھا۔ "کیا تم احمر کے متعلق کچھ کہنے آئے ہو؟"

"جی نہیں۔" عارج نے انکار کیا، پھر بولا۔ "میں یہ عرض کرنے آیا تھا کہ قریب تمام فوج علیحدہ کر دی گئی ہے۔"

"ہمیں اس کا علم ہے۔" خلیفہ نے تصدیق کی۔ "ہمارے ہی حکم سے فوج کا کچھ حصہ تخفیف کر دیا گیا ہے۔"

"کچھ حصہ نہیں اعلیٰ حضرت بلکہ تین چوتھائی فوج تخفیف کر دی گئی ہے اور باقی جو فوج بچی ہے اس میں بھی کمی کی جا رہی ہے۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" خلیفہ بے پروائی سے بولا۔ "بلاوجہ فوجوں پر کروڑوں دینار سالانہ صرف کیا جا رہا ہے۔ وہ تو خدا بھلا کرے ابنِ علقمی کا، اس نے ہمیں بتایا کہ یہ صرفہ بیکار ہے، اس کے کہنے سے ہماری آنکھیں بھی کھلیں، ہماری سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی کہ واقعی کروڑوں دینار بلاوجہ خرچ ہو رہے ہیں۔ اگر یہ خرچہ نہ ہوتا تو خزانہ دینار سرخ سے لبریز ہو جاتا۔"

"لیکن اعلیٰ حضرت! گستاخی معاف، فوج سے ملک کے اندر امن و امان قائم رکھا جاتا ہے اور بیرونی حملہ آور کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔" عارج میرا مقصد بہ خوبی پورا کر رہا تھا، اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "جب فوج نہ ہو گی تو ملک میں امن و امان کیسے باقی رہے گا اور اگر خدانخواستہ کسی دشمن نے حملہ کر دیا تو مقابلہ کیسے کیا جا سکے گا؟"

"ہمیں تختِ خلافت پر بیٹھے ہوئے چودہ (14) برس سے کچھ زیادہ ہی ہو رہے ہیں۔" خلیفہ معتصم کی آواز سے کسی قدر غرور جھلکنے لگا۔ "اس عرصے میں نہ تو ملک کے اندر کوئی گڑبڑ ہوئی اور نہ کسی دشمن کو عراق پر حملہ کرنے کا حوصلہ ہوا۔"

"اس کی وجہ سے اعلیٰ حضرت!" عارج نے حدِ ادب میں رہتے ہوئے معتصم سے بحث کی۔ "سب کو..... ساری دنیا کو معلوم تھا کہ عباسی سلطنت میں بے شمار فوجیں ہیں، یہ فوجیں ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی میں حرکت کرتی رہتی ہیں۔ اس سے ملک کے اندر اوباش و فتنہ گر خوفزدہ رہتے تھے اور باہر کے دشمنوں پر بھی ہماری سلطنت و حکومت کا رعب رہتا تھا۔ لیکن..... لیکن جب مفسدوں دشمنوں کو معلوم ہو گا کہ فوجیں علیحدہ کر دی گئی ہیں تو وہ سر ابھارنے لگیں گے۔"

یہ سن کر مستعصم ہنس دیا، یوں جیسے عارج نے کوئی بچکانہ بات کہہ دی ہو۔ پھر بولا۔
"بیٹا! ابھی تم بچے ہو، اس بات کو نہیں جانتے کہ ہر فرماں روا کا ذاتی رعب و داب بھی ہوتا ہے۔ اس کے رعب کی وجہ سے مفسد اور دشمن دم بہ خود رہتے ہیں، تمہیں یقیناً اندازہ نہیں، ہمارے عظمت و جلال کی اس قدر ہیبت ہے کہ کسی کو ہماری سلطنت کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔"

ایک آدم زاد کی احمقانہ باتوں کا بھلا ایک جن زاد پر کیا اثر ہوتا۔ وہ اگر واقعی ولی عہد ابوبکر ہوتا تو ممکن ہے اپنے باپ سے اتنی بحث نہ کرتا، مگر اس کے اندر تو کوئی اور ہی مخلوق تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت کا رعب و جلال بہت زیادہ ہے۔" عارج نرم آواز میں کہنے لگا۔ اس نے اعتراف کر کے کہا۔ "خلیفہ معظم کا یہ رعب و جلال اتنا ہی زیادہ ہو گا جتنی طاقت و قوت زیادہ ہو گی اور قوت و طاقت فوج کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جب فوجیں نہ رہیں گی تو قوت و طاقت بھی نہیں رہے گی۔ پھر حضور کا رعب و داب کیسے قائم رہے گا؟"
یہ ایسا سوال تھا کہ کسی باشعور آدم زاد کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوتا، مگر وہ خلیفہ مستعصم باللہ تھا۔

"اگر فوج ہی پر رعب و داب کا انحصار ہے تو فوجیں ہیں تو سہی؟" مستعصم کے لہجے میں اب ایک نوع کی بیزاری سی تھی۔ پھر اس نے اپنے ولی عہد کو مطمئن کرنے کے لئے کہا۔ "اور سنو! جو سپاہی اس وقت علیحدہ کر دیئے گئے ہیں ضرورت کے وقت انہیں دوبارہ فوج میں بھرتی کر لیا جائے گا، اس طرح ہم فضول اخراجات سے بچ جائیں گے۔"
"غالباً اعلیٰ حضرت کے علم میں یہ بات نہیں لائی گئی کہ اس کمی اور غیر یقینی حالات سے فوجیوں کی وفاداری میں فرق آ گیا ہے، اگر وہ روزی روٹی کے تحفظ کی درخواست کریں تو بے جا نہیں۔ آدمی کا یہ بنیادی حق ہے!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے عارج کی آواز قدرے پُرجوش ہو گئی۔ اسے میں نے یہ احساس بروقت دلایا تو اس نے خود کو سنبھال لیا۔
"تم سے بہتر اس بات کو ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کس وقت کیا اقدام کرنا چاہئے۔" خلیفہ نے یہ کہہ کر تائید طلب نظروں سے احمر کی طرف دیکھا، پھر گویا ہوا۔ "ولی عہد کو شاید اندازہ نہیں کہ فوج میں اس کمی سے کروڑوں دینار کی بچت ہو گئی ہے۔"

احمر اب تک پوری توجہ سے تمام گفتگو سنتا رہا تھا، اس نے مہذب و نرم لہجے میں عارج کے خیالات سے مکمل اتفاق کیا۔
جواباً خلیفہ فوری طور پر کچھ نہ بولا۔ اس موقع سے عارج نے فائدہ اٹھایا، اس نے کہا۔
"تاجر برادری پر ایک نیا محصول لگا دیا گیا ہے جس کی وصولی فوج کر رہی ہے۔ اعلیٰ حضرت! کیا فوج سے یہ کام لیا جانا درست ہے؟"
"دراصل کیا بات درست ہے اور کیا نادرست، اس کا فیصلہ وقت اور حالات کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔" خلیفہ نے قابلیت بگھاری، عموماً کم عقل آدم زاد ہی ایسی باتیں کرتے ہیں۔
"مگر اعلیٰ حضرت، نہ تو وقت بدلا ہے، نہ حالات۔" اس مرتبہ احمر بول اٹھا۔
"درحقیقت تم لوگ تجربہ نہ ہونے کے سبب، جوانی کے جوش میں اس طرح کی گفتگو کر کے حقائق کو پس پشت ڈال دیتے ہو۔ تمہاری جگہ اگر کوئی بڑی عمر کا آدمی ہو تو حقائق کو نہ بھولے۔ اس کی بہترین مثال ہمارا وزیراعظم ابن علقمی ہے۔ ولی عہد نے جس کی بابت درست ہونے کا سوال کیا تو یہ تجویز بھی ابن علقمی کی ہے، جو فوج باقی رہ گئی ہے، وزیراعظم نے اس کے اخراجات کاروباری طبقے پر ڈال دیئے ہیں۔ اس طرح فوج کے تمام اخراجات باہر کی آمدنی سے ادا ہو جائیں گے۔" خلیفہ نے قدرے تفصیل سے بتایا۔
"اعلیٰ حضرت کو شاید یہ نہیں معلوم کہ اس بدتدبیری سے فوجیوں اور کاروباری حلقے کے درمیان ہنگامے شروع ہو گئے ہیں، اندیشہ ہے کہ کسی روز بڑے پیمانے پر خوں ریزی نہ ہو جائے۔" عارج نے خدشات کا اظہار کیا۔
"یہ تاجر، سوداگر اور کاروباری لوگ ضرور سرکشی کرتے ہوں گے۔" خلیفہ بگڑ کر بولا۔ "سرکشوں کی سرکوبی کو ہم ضروری سمجھتے ہیں۔"
میں سمجھ گئی کہ وہ لالچی آدم زاد مستعصم نہیں سدھرے گا۔ مجھے اپنی اس کوشش کے رائیگاں جانے پر ملال ہونے لگا، پھر بھی ہم جنات، آدمیوں کی طرح جلد ہمت نہیں ہارتے۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ ابن علقمی نے پہلے ہی سے خلیفہ کو خاصا بھر رکھا ہے۔
عارج نے یہ بھی کہہ دیا۔ "مجھے تو شک ہے اعلیٰ حضرت کہ ابن علقمی ملک میں کوئی ناگوار تبدیلی لانے والا ہے۔"
اس موقع پر بھی احمر، عارج کی حمایت میں بولا۔ کیونکہ پہلے اسی نے عارج کو ابوبکر

جان کر اس خیال کا اظہار کیا تھا۔

خلیفہ مستعصم ایک بار پھر بے وقوفوں کی طرح ہنس کر کہنے لگا۔ ''اس بے چارے ابن علقمی کو پہلے ہی یہ اندیشہ تھا کہ تم لوگ اس کی اچھی تجویزوں کی بھی مخالفت کرو گے، ہمارے پاس شکایتیں لاؤ گے۔ وہ اسی لئے ان تجویزوں پر عمل درآمد کرتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ خود ہم نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور اطمینان دلایا کہ ہم اس معاملے میں کسی کی شکایت نہیں سنیں گے۔ تم لوگ کہتے ہو کہ وہ کوئی انقلاب لانے والا ہے، ہم کہتے ہیں وہ بڑا وفادار اور جاں نثار ہے، ایسے وفادار وزیر بہت کم ہوتے ہوں گے۔ وہ جو کچھ بھی سوچتا ہے اور جو کرتا ہے ہمارے ہی فائدہ میں ہے۔ ہمیں یقین ہے وہ اسی سال میں خزانہ بھر کر دکھا دے گا۔''

''خدا بہتر کرے۔'' احمر نے دعا دی۔

''دولت سے ہر کام ہو جاتا ہے...... تم دونوں ہماری عمر کو پہنچو گے تو تمہیں دولت کی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا، طاقت فوج سے نہیں دولت سے ہے۔ جتنی زیادہ دولت ہو گی طاقت اتنی ہی بڑھ جائے گی۔''

خلیفہ کی بات سن کر عارج کو میں نے وہ وعدہ یاد دلایا جو اس نے تاجر برادری سے کیا تھا۔

''اچھا اعلیٰ حضرت! ایک کام تو کر ہی دیجئے، بازار والوں سے فوجی محصول وصول نہ کیا کریں بلکہ کسی اور افسر سے یہ کام لیا جائے، پھر یہ کہ محصول کا کوئی معیار بھی مقرر ہونا چاہئے۔'' عارج نے خلیفہ سے وہ مطالبہ بھی کر دیا جو دراصل سارے جھگڑے کی بنیاد تھا۔ تاجر برادری یہ چاہتی تھی کہ شہر کے اس مرکزی بازار میں کسی اور فوجی افسر کو وصولی کی خاطر نہ بھیجا جائے۔

''محصول کتنے مال پر لگے گا، یہ تو حساب کتاب کی بات ہے۔ ہم ابن علقمی سے کہیں گے کہ وہ متعلقہ وزارت سے رجوع کریں، یہ انتظام ہم کر دیں گے کہ فوجیوں کی بجائے دیگر سرکاری افسران محصول کی وصولی پر مامور ہوں۔'' خلیفہ نے وعدہ کر لیا۔

مجھے خلیفہ مستعصم کے رویئے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ مزید کوئی بات نہیں مانے گا۔ میرے نزدیک اس کا یہ وعدہ بھی کسی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ محصول کی وصولی کا کام

دوسرے سرکاری افسران کو دے دیا جائے گا۔ دراصل اس وقت خلیفہ کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ اپنی دانست میں وہ ولی عہد ابوبکر اور احمر کو ٹالنا چاہتا تھا۔

''اے عارج! اب اٹھ جا...... یہ اس وقت سن کر بھی کچھ نہ سنے گا۔'' میں نے سرگوشی کی۔ ''جو محل روانہ ہو۔ میں اس عیار ابن علقمی کی طرف سے ہو کر آتی ہوں۔ آج بغداد میں مجھے ایک جھلک حاکم اربل ابن الصلایا کی بھی دکھائی دی تھی، میرا قیاس یہی ہے کہ اسے ابن علقمی ہی نے طلب کیا ہو گا۔''

میری سرگوشی سننے کا اہل صرف عارج ہی تھا۔ کسی آدم زاد کو میری سرگوشی اس وقت تک سنائی نہیں دے سکتی تھی جب تک خود میں ہی ایسا نہ چاہوں۔ سو مجھے احمر کی فکر نہ تھی کہ وہ میری آواز سن لے گا، نہ ہی خلیفہ مستعصم یا کسی اور آدم زاد کی طرف سے اندیشہ تھا۔

ظاہر ہے میری بات کے جواب میں عارج کیا کہتا، خاموش ہی رہا اور میں قصر خلافت سے روانہ ہو گئی۔

اپنے انسانی قالب فردوس اور میرے درمیان بڑی حد تک ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ اب عموماً مجھے یہ ضرورت پیش نہ آتی کہ میں فردوس کے جسم سے باہر نکلتے ہی اس پر گہری نیند مسلط کر دیتی اس کی بجائے میں نے دوسرا طریقہ اپنایا، اسے زیر اثر لے کر وہ ساری باتیں اس کے دماغ میں بٹھا دیتی جو ضروری ہوتیں، اس طرح وہ تمام حالات سے واقف رہتی۔ مجھے یہ بھانڈا پھوٹ جانے کا خوف نہ رہتا کہ ایک جن زادی اس کے جسم پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ دن ہوتا یا رات، میں جب چاہتی اس کا جسم چھوڑ دیتی۔ بس اتنا ضرور ہوتا کہ چند لمحوں کو اسے زیر اثر لینا پڑتا۔ کسی انسانی پیکر میں داخل ہونے اور اس سے نکلتے وقت جو خفیف سا جھٹکا لگتا ہے، رفتہ رفتہ فردوس کا جسم اسے بھی برداشت کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔

اس پر بھی اگر میرے آتشی مزاج کو بے چینی لگی رہتی تو اس کی وجہ صرف ایک تھی، وہ وجہ یہ کہ فردوس اور ابوبکر ایک دوسرے کی محبت تھے۔ عارج تو خیر کم ہی ولی عہد کے جسم سے باہر آتا لیکن میں اکثر فردوس کے قالب کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی، ایسی صورت میں ابوبکر کے پیکر میں عارج، فردوس کے پاس رہتا۔ عشق ایک دوسرے پر اعتماد کرنا سکھاتا ہے اور اعتماد کرنا بھی چاہئے۔ لیکن یہ کلیہ آدم زادوں کے لئے تو ہو سکتا ہے ہم جنات کے لئے نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ عارج کو مجھ پر اعتماد تھا یا نہیں مگر گزشتہ کچھ تلخ تجربات سے عارج

کے معاملے میں میرا اعتماد ضرور مجروح ہو گیا تھا۔ واضح الفاظ میں یہ کہ مجھے عارج پر مکمل بھروسا نہیں تھا۔ میں اسی لئے اس کی طرف سے چوکنا رہتی۔ آدم زادوں کا یہ محاورہ مجھ پر منطبق ہوتا تھا کہ دودھ کا جلا چھاچھ (مٹھا) کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ عارج کے بارے میں اگر میں اپنے دل کو کسی طرح یہ سمجھا بھی لیتی کہ وہ مجھ سے بے وفائی نہیں کر سکتا تو فردوس کو کیسے قابو میں رکھتی! اپنے عاشق ابوبکر کے لئے اس کی وارفتگی نہ تو اب ناجائز تھی نہ غیر فطری۔ فردوس اور ابوبکر میاں بیوی تھے۔ اس مسئلے سے میں اس روز بھی دوچار ہوئی۔ ابوبکر کے لئے فردوس کی وارفتگی دیکھ کر میرے وجود میں بجلیاں سی دوڑنے لگیں۔ یہ محض ایک اتفاق تھا۔ لیکن اس اتفاق نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا، اس واقعے کا ذکر آگے آئے گا۔ پہلے مجھے ابن علقمی کی بابت کچھ بتانا ہے۔

قصرِ خلافت سے میں جب ابن علقمی کے محل پہنچی تو اس عیار آدم زاد کی تلاش میں دشواری نہ ہوئی۔ میری توقع کے مطابق وہ اپنی خاص نشست گاہ ہی میں تھا۔ وہ تنہا اس طرح بے چینی سے ٹہل رہا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ اس کے ذہن پر توجہ دے کر میرے قیاس کی تصدیق ہو گئی۔ اس کے ساتھ یہ بھی مجھے پتہ چل گیا کہ ابن الصلایا کو ابن علقمی نے بغداد نہیں بلایا تھا۔ اس وقت ابن علقمی کو یہ الجھن تھی کہ ابن الصلایا اس سے کیوں ملنے آ رہا ہے؟ ملاقات کی درخواست خود ابن الصلایا نے کی تھی، کچھ ہی عرصہ پہلے ابن الصلایا اس سے ملا تھا، پھر اب اسے کیا ضرورت پیش آ گئی؟ شکی اور سازشی آدم زاد اسی طرح کی باتیں سوچتے ہیں۔ میں وہاں اس لئے رک گئی کہ ان دونوں آدم زادوں کی باتیں سن سکوں۔

ذرا ہی دیر میں ابن علقمی کے خادمِ خاص نے آ کر اسے ابن الصلایا کی آمد کے بارے میں بتایا۔

"اسے فوراً یہاں لے آؤ" ابن علقمی نے حکم دیا اور خادم خاص اُلٹے قدموں لوٹ گیا۔

خادم جب دوبارہ آیا تو اس کے ساتھ ابن الصلایا بھی تھا۔

"اب تم جاؤ اور ادھر نہ آنا نہ کسی دوسرے کو آنے دینا!" ابن علقمی نے اپنے خادم خاص کو مخاطب کیا۔

"بہتر ہے عالی مرتبت! حکم کی تعمیل ہو گی۔" خادم ادب سے جھکا اور پھر ابن علقمی کے

اشارے پر دروازہ بھیڑ گیا۔

ابن علقمی ابھی تک ابن الصلایا کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ اس عرصے میں ابن الصلایا دو مرتبہ جھک کر تسلیمات بجا لا چکا تھا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ ابن علقمی نے پہلے نشست گاہ کا دروازہ اندر سے کنڈی لگا کر بند کیا، پھر دریچوں کو بھی کھلا نہ چھوڑا۔

جب وہ اپنی مسند پر آ کر بیٹھ گیا تو ابن الصلایا تیسری بار تسلیمات کو جھکا۔ ابن علقمی نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا مگر بیٹھنے کے لئے نہ کہا۔ ابن الصلایا کھڑا ہی رہا کہ خود بیٹھ جانا ادب کے خلاف تھا۔

"کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ میں تمہارے لئے ہی پیدا کیا گیا ہوں؟" ابن علقمی غصے میں ابن الصلایا سے مخاطب ہوا۔

"نن...... نہیں...... نہیں تو حضور!" ابن الصلایا گھبرا گیا۔

"پھر تمہاری اتنی ہمت کیسے ہوئی کہ میرے طلب کئے بغیر ہی بغداد آ گئے؟...... اس پر دیدہ دلیری کا یہ عالم کہ ملاقات کے لئے درخواست بھجوا دی!...... دنیا میں کیا مجھے کوئی اور کام نہیں؟" ابن علقمی برہم ہی رہا۔

"حضور محترم!...... اگر آ...... آپ سے فوری ملاقات ضروری نہ ہوتی تو...... تو اس غلام سے ہرگز یہ گستاخی......"

ابن علقمی نے سخت لہجے میں بات کاٹ دی۔ "کیوں ضروری تھی ملاقات؟"

"عرض...... ابھی عرض کرتا ہوں کہ کک...... کہ ہلاکو خاں سے...... براہِ راست خط و کتابت کی سبیل ہو گئی ہے۔" ابن الصلایا نے ہکلاتے ہوئے اپنی بات ہمت کر کے کہہ ہی دی۔

اس پر ابن علقمی نے چونک کر ابن الصلایا کی طرف دیکھا، پھر بولا۔ "بیٹھ جاؤ اور تفصیل سے بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

ابن الصلایا کی جان میں جان آئی۔ وہ طویل سانس لے کر مسند کے سامنے مؤدب بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ "عزت مآب اس سے تو واقف ہیں کہ موصل کا حاکم بدرالدین میرا دوست ہے، مجھے اسی کا ایک خفیہ پیغام ملا تھا کہ اگر حضور کا حکم ہو تو ہلاکو خاں سے بات کی جائے؟...... بدرالدین کی مراد عراق پر حملے سے تھی۔"

"حاکمِ موصل کو کس طرح معلوم ہوا کہ ہم عراق پر ہلاکو خاں سے حملہ کرانا چاہتے ہیں؟" ابنِ علقمی کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"میں نے ہی اسے بتایا تھا۔" ابن الصلایا نے اعتراف کر لیا۔

"اس حماقت پر اگر ہم تمہاری کھال کھنچوا دیں تو؟" ابنِ علقمی کی آواز تیز اور سخت ہو گئی۔

"حضور مالک و مختار ہیں، لیکن...... بعد میں اس پر افسوس بھی کریں گے۔"

"تم یہ بتاؤ کہ راز افشا کیوں کیا؟...... جو بات تمہارے اور میرے درمیان تھی، بدر الدین کو تم نے کیوں بتائی؟"

"محترم وزیر اعظم اگر میری پوری بات ایک بار سن لیں، پھر مجھے ہر سزا قبول ہو گی۔" ابن الصلایا خوشامد کی لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔" ابنِ علقمی نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ "کہو!"

"ہوا یہ کہ بدر الدین مجھ سے ملنے موصل سے خود اربل آیا۔" ابن الصلایا بتانے لگا۔ "اربل آنے کی وجہ مجھے بھی یہ مشورہ دینا تھا کہ اس کی طرح میں بھی ہلاکو خاں کے وزیر نصیر الدین طوسی کو تحفے تحائف بھیج کر مراسم بڑھالوں۔"

"تو کیا بدر الدین بالا ہی بالا ہلاکو خاں کے وزیر سے دوستی کر چکا ہے؟" ابنِ علقمی خاموش نہ رہ سکا۔

"جی ہاں، حضور قطعی درست سمجھے۔ اور...... اور اب تو حضور کا یہ غلام بھی نصیر الدین طوسی کا دوست بن چکا ہے۔"

ابنِ علقمی یہ سن کر حیرت زدہ سا دکھائی دیا۔

"یہ تو بتاؤ ابن الصلایا کہ تمہارے دوست نے جو قدم اٹھایا اس کی وجہ کیا تھی؟" ابنِ علقمی نے سوال کیا۔

ابن الصلایا بولا۔ "حضور والا! میں نے یہ سوال بدر الدین سے کیا تھا، جواب میں اس نے کہا تھا کہ وقت اور حالات کا تقاضا یہی ہے۔ اسی بناء پر میں نے بھی اس کا مشورہ قبول کر لیا تھا۔"

"یعنی اب اگر ہم تمہیں یا بدر الدین کو خراسان بھیج دیں تو گویا کام بن جائے گا۔" ابنِ

علقمی کا انداز خود کلامی کا تھا۔

"یقیناً حضورِ محترم!" ابن الصلایا بول اٹھا۔

"تو پھر اب تمہی ہلاکو خاں اور نصیر الدین طوسی کے پاس ہمارے خطوط لے کر جاؤ گے۔" ابنِ علقمی نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

"غلام اسے اپنی عزت افزائی سمجھے گا۔" ابن الصلایا نے بڑے فخریہ لہجے میں کہا۔

"ہمارا خیال ہے کہ مزید تاخیر مناسب نہیں، تم کل ہی صبح آ جاؤ۔ رات کو ہم خط لکھ رکھیں گے۔" ابنِ علقمی کا لہجہ بدل گیا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ ابتدا میں ہم تم سے درشت آواز میں ہمکلام ہوئے۔"

"خادم کو تو بس حضور کی خوشنودی مقصود ہے۔ آپ کچھ بھی فرمائیں، اسے میں اپنی عزت افزائی ہی سمجھوں گا۔" ابن الصلایا بولا۔

"فرمانبردار ماتحت ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور ہمیں تمہاری فرمانبرداری پر ناز ہے۔" موقع محل اور گفتگو کے رخ کو دیکھ کر ابنِ علقمی گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتا تھا۔ اسی طرح وہ کبھی اپنے لئے "میں" اور کبھی "ہم" کا استعمال کرنے لگتا تھا۔

جب ابنِ علقمی نے ابن الصلایا کو رخصت کر دیا تو میں بھی وہاں نہیں رکی۔ یہ دن کا وقت تھا، عصر کی اذان ہونے والی تھی۔

رات ہوئی تو میں نے کئی بار اپنی چشمِ تصور کو بیدار کیا مگر کامیابی نہ ملی۔ رازداری اور احتیاط برتنے کی خاطر عیار آدم زاد ابنِ علقمی نے نصف شب گزر جانے کے بعد خطوط لکھے جو اس مرتبہ ابن الصلایا کو خراسان لے کر جانے تھے۔

القاب و آداب اور رسمی جملوں کے علاوہ ان خطوط کی عبارت مندرجہ ذیل تھی۔

ہلاکو خاں کے نام ابنِ علقمی کا یہ تیسرا خط تھا۔ اس عیار و سازشی آدم زاد نے منگول حکمراں کو لکھا تھا۔

"میں نے آپ کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے، جگہ جگہ پوری سلطنتِ عراق میں جو فوجی چھاؤنیاں تھیں، میں نے ختم کر دی ہیں۔ بغداد تک آنے کے لئے اب آپ کو روکنے والا کوئی نہیں۔ آپ نے جو لکھا تھا اس کے مطابق تین چوتھائی سے زیادہ فوج کو نکال دیا گیا ہے۔ دارالخلافہ

میں بھی خاصی کم فوج رکھی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایسی تدبیر کر دی ہے کہ جو فوج بغداد میں باقی بچ گئی ہے اس کے اور عوام کے درمیان ہنگامے ہوتے رہتے ہیں، میں آپ کے لئے جو کر سکتا تھا، وہ کر دیا۔ عراق کی حکومت اور بے شمار دولت آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ عراق پر حملے کے لئے اس سے زیادہ مناسب وقت نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ عراق میں اب مزاحمت کرنے والا کوئی نہیں۔"

نصیر الدین طوسی کو بھی اسی خط کے ساتھ ابن علقمی نے لکھا۔

"آپ کا جو حکم تھا اس کے پیش نظر فوجوں میں تخفیف کر دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ایسی تدبیر بھی اختیار کی گئی ہے کہ جس سے بغداد میں فسادات شروع ہو جائیں۔ عوام بھی حکومت اور خلیفہ سے نفرت کرنے لگیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ ہلاکو خاں کو عراق پر حملے کی ترغیب دیں، علوی حکومت قائم کرنے کا اس سے بہتر موقع اور وقت نہیں ہو سکتا۔ آپ قطعی تردد نہ کریں۔"

یہ دونوں خطوط سربمہر کر کے ابن علقمی نے احتیاط سے رکھ دیئے۔

میں نے سوچا کہ اگر یہ خطوط غائب بھی کر دیئے جائیں تو بات نہیں بنے گی۔ ابن علقمی دوبارہ خطوط لکھ لے گا۔ مجھے اس کے تدارک کی ایک ہی صورت نظر آئی، اس طرح منگول حکمراں کا حوصلہ پست ہو جاتا، میرے ذہن میں جو تدبیر آئی اس پر عمل کرنے کے لئے مجھے آنے والے حالات کا انتظار تھا، عراق پر حملہ رکوانے کے لئے اپنی حدود میں رہتے ہوئے میں جو تدبیر دو مرتبہ اختیار کر چکی تھی، وہ موجودہ حالات میں کارگر نہ ہوتی۔ اس کی بڑی وجہ بغداد میں منگولوں کے جاسوسوں کی موجودگی تھی۔ ان جاسوسوں کو ابن علقمی کا پہلا خط ملنے کے بعد نصیر الدین طوسی نے تعینات کر دیا تھا۔ یہ جاسوس اپنے ساتھیوں کے ذریعے نصیر الدین طوسی کو حالات سے باخبر رکھے ہوئے تھے۔

ابھی ابن الصلایا جب نصیر الدین طوسی کے پاس پہنچا تو میری چشم تصور کے احاطے میں تھے۔ اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لا کر میں بغداد میں ہونے کے باوجود بھی سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔

پھر جو کچھ نصیر الدین طوسی کو عراق اور اس کے دارالخلافہ بغداد کے متعلق ابن الصلایا

سے معلوم ہوا، جاسوس پہلے ہی خبر دے چکے تھے۔ ابن الصلایا نے دونوں خطوط نصیر الدین طوسی کے حوالے کر دیئے۔

"بغداد شہر کی عام حالت اس وقت کیا تھی جب تم وہاں سے چلے تھے؟" نصیر الدین طوسی نے احتیاطاً ابن الصلایا سے معلوم کیا۔

"دارالخلافہ میں بدامنی ہے۔" ابن الصلایا نے جواب دیا۔

"یہ اچھا ہے۔ کیونکہ جہاں امن و امان ہو وہاں بیرونی حملہ آور عموماً ناکام رہتے ہیں۔" نصیر الدین طوسی نے تبصرہ کیا، پھر تفصیل پوچھی۔

"بدامنی کی اصل وجہ کاروباری حلقے اور فوجیوں کے درمیان ہونے والے ہنگامے ہیں۔ عوام کی اکثریت خلیفہ اور حکومت سے بدظن ہو گئی ہے۔"

"حکمراں اور حکومت سے بدظنی رنگ تو لاتی ہے...... لگتا ہے کہ اب وہ موقع آ گیا ہے، ہم جس کی تلاش میں تھے۔" نصیر الدین طوسی نے کہا۔

اس نے اپنے ایک معاون کو طلب کر کے ابن الصلایا کے قیام کا بندوبست کیا اور اسی وقت ہلاکو خاں سے ملنے روانہ ہو گیا۔ میرے تصور کی آنکھ نصیر الدین طوسی کے ساتھ حرکت کرتی رہی۔ ہلاکو خاں کو میں بہ چشم خود دیکھنا چاہتی تھی۔

میری خواہش جلد ہی اس وقت پوری ہو گئی جب نصیر الدین طوسی، ہلاکو خاں کے پاس پہنچا۔

منگول حکمراں ہلاکو خاں کو دیکھ کر میرا پہلا احساس یہ تھا کہ کاش میں نے اسے دیکھنے کی خواہش نہ کی ہوتی۔ ہم جنات میں بھی بعض بعض انتہائی کریہہ، بدہیئت اور بدشکل ہوتے ہیں۔ لیکن اس لعنتی آدم زاد ہلاکو نے انہیں بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا، یہ حقیقت ہے کہ وہ مجھے آدمی کم جانور زیادہ معلوم ہوا، اس کے چہرے سے خشونت اور درشتی کے آثار ظاہر تھے۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور چہرہ ہیبت ناک تھا، نصیر الدین طوسی نے ابن علقمی کا مراسلہ اس کے سامنے پیش کیا۔

ہلاکو خاں نے مراسلے پر ایک نگاہ ڈالی جو عربی زبان میں لکھا ہوا تھا۔ ہلاکو خاں کو عربی نہیں آتی تھی۔ مراسلہ اس نے نصیر الدین طوسی کو اس حکم کے ساتھ واپس کر دیا کہ پڑھ کر سنائے۔ وہ بولا تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی درندہ غرایا ہو۔

نصیر الدین طوسی نے ابن علقمی کا خط پڑھ کر سنا دیا تو ہلاکو خاں نے اس سے پوچھا۔ "اس شخص نے جو کچھ لکھا ہے، تمہارے جاسوسوں نے بھی تصدیق کر دی ہے؟"

"جی ہاں، یہ ساری باتیں درست ہیں جو خط میں لکھی گئی ہیں۔" نصیر الدین طوسی نے جواب دیا۔ "ہمارے جاسوس پہلے ہی اس کی تصدیق کر چکے ہیں، ابن علقمی کا یہ خط لے کر آنے والا بھی کوئی قاصد نہیں بلکہ حاکم اربل ابن الصلایا ہے۔ عرصہ دراز سے اس کے ساتھ میرے مراسم ہیں، اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اس سے بھی عراق اور خاص طور پر دارالخلافہ بغداد کے تازہ ترین حالات معلوم کئے تو یہی پتہ چلا جو خلیفہ مستعصم باللہ کے وزیر ابن علقمی نے اپنے خط میں لکھے ہیں۔"

"ہمیں یہ بتاؤ اے طوسی، کیا وقت پڑنے پر حاکم اربل ہمارے ساتھ آ ملے گا؟"

"یقیناً میرے آقا...... نہ صرف حاکم اربل ابن الصلایا ہمارا ساتھ دے گا بلکہ حاکم موصل بدر الدین لولو اپنی فوج کو میدان جنگ سے لے کر ہٹ جائے گا۔"

"تمہیں ان دونوں میں سے زیادہ بھروسا کس پر ہے؟" ہلاکو خاں نے سوال کیا۔

"دونوں ہی قابل اعتماد ہیں میرے آقا!"

"عراق پر ان حالات میں کس طرف سے حملہ آور ہونا ٹھیک ہے؟" ہلاکو خاں نے دریافت کیا۔ اس کے دربار میں سوغونچاق اور باجو خاں بھی اس وقت موجود تھے۔ ان دونوں منگول سرداروں کو وحشت و بربریت کے سبب ہلاکو خاں بہت پسند کرتا تھا۔

پہلے سوغونچاق اپنی بھاری آواز میں بولا۔ "اربل کا حاکم ابن الصلایا یہاں آیا ہوا ہے اور محترم وزیر کو اس پر اعتماد ہے تو پھر اربل کے راستے ہی بغداد کی طرف بڑھا جائے میرے آقا!" ہلاکو خاں خود کو آقا کہلوانا پسند کرتا تھا۔

ہلاکو خاں کی سوالیہ نظریں جوجی خاں کی طرف اٹھیں تو اس نے کہا۔ "اے میرے آقا، سوغونچاق نے ٹھیک ہی کہا، مگر تکریت کو فراموش نہ کیا جائے۔ یہ بڑا اہم مقام ہے، اس کے بعد دریائے دجلہ کو مغربی جانب سے عبور کر کے شہر انبار کی طرف پیش قدمی ہونی چاہئے۔ تکریت اور انبار کے درمیان کسی بھی مقام پر موصل کا حاکم بدر الدین ہم سے اپنی مسلمان فوج سمیت آ مل سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ بدر الدین میدان جنگ ہی میں ہم سے وفاداری اور خلیفہ مستعصم سے غداری کا ثبوت فراہم کرے۔"

دربار میں ہلاکو خاں کا نوجوان بیٹا اباقا بھی موجود تھا، وہ صورت شکل میں اپنے باپ ہی کو گیا تھا۔ وہ اس دوران میں کئی بار پہلو بدل چکا تھا، ہلاکو خاں کی نظر اس پر پڑی تو کہا۔ "اے اباقا! چاہو تو تم بھی اس گفتگو میں شریک ہو جاؤ۔"

دوسرے درباریوں اور بڑے عہدوں والوں کی طرح اباقا بھی اپنے باپ کو آقا ہی کہتا تھا، سو بولا۔ "اے میرے آقا! اب تک جو بھی باتیں ہوئیں ان سے یہ تو پتہ چل گیا کہ عباسی خلیفہ کا وزیر عراق پر ہمیں حملے کی دعوت دے رہا ہے، لیکن ایک اہم عہدیدار کا ذکر اب تک نہیں آیا۔ عباسیوں کی فوج کا سپہ سالار کون ہے؟ دوسرے یہ کہ کیا وہ بھی عراق پر حملے کی صورت میں ہمارا ہی ساتھ دے گا اور مزاحمت نہیں کرے گا؟" نوجوان ہونے کے باوجود اباقا کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ذہین ہے۔

ہلاکو خاں نے اپنے بیٹے اباقا کے سوالوں کا جواب دینے کے لئے نصیر الدین طوسی کو اشارہ کیا۔

"میرے آقا کے نوجوان اور قابل قدر بیٹے اباقا نے بڑے توجہ طلب اور اہم سوال اٹھائے ہیں۔" نصیر الدین طوسی بھرے دربار میں بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "عباسی فوج کے سپہ سالار کا نام ایبک دوادار ہے، اس کے متعلق ابھی تک معلومات حاصل نہیں کی گئیں کہ وہ بھی ابن علقمی کے ساتھ ہے کہ نہیں!...... یہ تو جاسوسوں کے ذریعے معلوم کر لیا جائے گا، مگر اے میرے آقا! ہمیں یہ امر نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ تین چوتھائی فوج کو نکال دیا گیا ہے، ایسی صورت میں صرف ایک چوتھائی فوج باقی رہ جاتی ہے۔ اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ عباسی فوج کا سپہ سالار ایبک دوادار، خلیفہ کا وفادار ہے، ابن علقمی سے ملا ہوا نہیں تو بھی اس سے خطرے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ جب فوج کی تعداد ہی نام کو ہو گی تو وہ لڑائے گا کیسے اور ہم سے لڑے گا کیسے!"

نصیر الدین طوسی نے بڑی مضبوط دلیل دی تھی اس لئے اس موضوع پر مزید کوئی بھی کچھ نہ بولا۔

چند لمحے خاموشی کے بعد معاً ہلاکو خاں نے نصیر الدین طوسی کو مخاطب کیا۔ "ایک بات کی اب تک وضاحت نہیں ہوئی کہ عباسی خلافت کا وزیر اعظم آخر ہمیں اپنی ہی سلطنت یعنی عراق پر حملے کی دعوت کیوں دے رہا ہے؟ اس کی کوئی تو وجہ ہو گی۔"

"بالکل میرے آقا!" نصیر الدین طوسی فوراً بولا۔ "دراصل ابن علقمی کو یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ ہم عراق کو فتح کر کے اس کی جھولی میں ڈال دیں گے۔ وہ چاہتا ہے کہ عباسی خلافت کا خاتمہ ہو جائے اور وہ علوی حکومت قائم کر سکے۔"

اس پر ہلاکو خاں بے اختیار ہنس پڑا اور کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ ابن علقمی بہت ہی بڑا احمق ہے یا پھر وہ ہمیں بے عقل سمجھتا ہے کہ اپنی قوت بازو سے عراق کو فتح کریں اور اس کے حوالے کر دیں، ان دونوں میں سے کون سی بات درست ہے؟"

"اے میرے آقا! پہلی ہی بات درست ہے، واقعی ابن علقمی بڑا بے وقوف ہے۔" نصیر الدین طوسی نے جواب دیا۔

"لیکن اس کی حماقت اور اس موقع سے یقیناً فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔" ہلاکو خاں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بلاشبہ میرے آقا!" نصیر الدین طوسی نے تائید کی۔ "یہ انتہائی مناسب وقت ہے اور اسی کا ہمیں انتظار ہے، جو حالات ہیں انہیں مدنظر رکھتے ہوئے ہم اب آسانی سے عراق پر قبضہ کر لیں گے۔"

"گویا عراق پر حملہ کرنے کے لئے راستہ اب بالکل صاف ہو گیا ہے؟" ہلاکو خاں نے آخری سوال بڑی سنجیدگی سے کیا۔

"جی ہاں میرے آقا!" نصیر الدین طوسی نے یقین دہانی کرائی۔

اس پر ہلاکو خاں نے آخر کہہ ہی دیا۔ "اچھا تو پھر فوجوں میں اعلان کرا دو کہ عراق پر حملے کے لئے تیار ہو جائیں۔"

"آقا کے حکم کی تعمیل ہوگی۔" یہ کہتے ہوئے نصیر الدین طوسی کی آواز سے خوشی جھلک رہی تھی۔

ہلاکو خاں نے دربار برخاست کر دیا۔

❁......❁
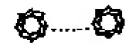
اپنی چشم تصور کو میں نے ابھی کھلا ہی رکھا۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ نصیر الدین طوسی اب کیا قدم اٹھاتا ہے اور غدار و سازشی ابن علقمی کو کیا جواب لکھتا ہے! میری تمام تر توجہ اسی پر مرکوز تھی۔

دربار سے واپس آتے ہی اس نے ابن الصلایا کو بلوایا اور پھر ابن علقمی کے نام خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اس کے خط کی عبارت کا خلاصہ یہ تھا۔

"تمہاری آرزو پوری ہوگئی۔ ہلاکو خاں نے عراق پر حملے کی اجازت دے دی ہے۔ منگول فوجیں بہت جلد کسی تند و تیز آندھی اور طوفان کی طرح عراق پہنچنے والی ہیں۔"

نصیر الدین طوسی کو خط لکھے اور اسے سربمہر کئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اس کے ایک خادم نے ابن الصلایا کے آنے کی اطلاع دی۔ ہلاکو خاں کے وزیر کا چہرہ اس وقت عجیب سے تاثرات کی عکاسی کر رہا تھا، ان تاثرات سے ندامت کے ساتھ اس کی مجبوری بھی شامل تھی۔ اس کے عقائد خواہ ابن علقمی سے قریب تر سہی مگر وہ بہرحال ہلاکو خاں کا وفادار تھا۔

ابن الصلایا کو اس نے اپنی نشست گاہ میں بلوا لیا۔

"مبارک ہو تمہیں اے ابن الصلایا کہ تم جس مقصد سے یہاں آئے تھے اس میں کامیاب ہوئے۔" نصیر الدین طوسی کا انداز ایسا تھا جیسے ابن الصلایا کو کوئی بڑی خوشخبری دے رہا ہو۔

اتنا سنتے ہی ابن الصلایا گویا کھل اٹھا۔ وہ پُرجوش و پُرمسرت لہجے پوچھنے لگا۔ "پھر..... پھر تو عراق میں اب ہماری حکومت ہوگی۔" جذبات کی شدت کے سبب ابن الصلایا سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

اس کے الفاظ پر نصیر الدین طوسی نے کوئی تبصرہ یقیناً دانستہ نہیں کیا۔ پھر اسے ابن علقمی کے نام لکھا ہوا سربمہر پیغام دے کر کہا۔ "یہ خیال رکھنا اے ابن الصلایا کہ تمہیں جلد از جلد بغداد پہنچ کر ہمارا خط ابن علقمی کے حوالے کرنا ہے۔"

ابن الصلایا اسی روز بغداد کے لئے روانہ ہو گیا۔

❁......❁

چند ہی روز خیریت سے گزرے ہوں گے کہ عراق کے سرحدی علاقوں سے ہولناک خبریں دارالحکومت بغداد پہنچنے لگیں۔ حالات پر میری پوری نظر تھی۔ منگولوں نے عراق پر حملہ کر دیا تھا، سرحدوں پر انہیں روکنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ فوجی چھاؤنیاں تو ملک کے طول و عرض سے پہلے ہی بڑے پیمانے پر ختم کی جا چکی تھیں۔

یہ بات میرے علم میں تھی کہ جب سے منگول، ایران آئے تھے اس وقت سے ان کی

شہرت ہو گئی تھی۔ مسلمان ان کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ وہ غیر مہذب اور وحشی ہیں۔ بربریت وسفاکی میں اپنی نظیر آپ ہیں۔

جب عراق کے سرحدی علاقوں پر حملے کی خبر عام ہوئی تو عراق کے مسلمان سخت پریشان ہوئے۔ وہ وحشی منگولوں کے خوف کی بناء پر جگہ جگہ سے نقل مکانی کرنے لگے۔ اپنی بستیاں چھوڑ چھوڑ کر وہ اِدھر سے اُدھر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے سوا اُن کے بس میں اور تھا بھی کیا! پھر یہ کہ ان کا خوف بے جا بھی نہیں تھا۔ جن بستیوں میں وحشی منگولوں کا لشکر گزرا، ہلاکت اور تباہی پھیلاتا چلا گیا۔ نہ انہوں نے ان بستیوں میں رہ جانے والے کسی آدم زاد کو چھوڑا، نہ مویشی چھوڑے۔ جو کچھ ہاتھ لگا انہوں نے سب لوٹ لیا اور اس لوٹ مار کے بعد بستیوں کو آگ لگا دی۔

میری ہی طرح عارج بھی ان حالات سے بہت فکرمند تھا، وہ خود بھی لاعلم نہ رہتا اور میں بھی اسے باخبر رکھتی۔ اس عرصے میں عارج کے اندر میں نے ایک خفیف سی تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ اس کی وجہ دلی عہد ابوبکر کا انسانی قالب تھا۔ اس قالب کے اثرات کسی حد تک عارج میں نمایاں ہونے لگے تھے۔ وہ ابوبکر کا انسانی پیکر ہی تو اپنائے ہوئے تھا۔

جب منگول فوجیں عراق میں داخل ہو چکی تھیں تو ایک رات خلوت میں عارج مجھ سے کہنے لگا۔ ''اے دینار! ہم آخر کب تک یہ تماشا دیکھتے رہیں گے؟ کیا...... کیا عباسی خلافت کو اسی...... اسی طرح ختم ہونے دیا جائے؟''

''تو پھر تُو ہی بتا، ہمیں کیا کرنا چاہیے اے عارج؟ کیا تُو نے عالم سوما کی ہدایات کو بھلا دیا ہے؟ کیا تجھے یاد نہیں رہا کہ جنات کی بھی حدود مقرر ہیں؟ اور ان تمام باتوں کے علاوہ قانونِ قدرت سے نہ آدم زادوں کو مفر ہے، نہ ہم جنات کو!''

''قانونِ قدرت سے تیری کیا مراد ہے؟'' عارج نے وضاحت چاہی۔ وہ بدستور جذباتی رہا۔

''مکافاتِ عمل۔'' میں نے جواب دیا۔ ''عباسیوں نے جو بویا ہے، وہی کاٹیں گے۔''

''اس وقت تیری یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں اے دینار!'' عارج زچ ہو گیا۔

''میں بتاتی ہوں تجھے۔'' میں بولی۔ ''تُو جن کے لئے اس قدر جذباتی ہو رہا ہے، اس کا حال بھی تو سن کہ عراق پر حملے کا اثر انہوں نے کیا قبول کیا!...... سن اے عارج! بغداد بھاگ کر آنے والوں میں منگولوں کے حملے کی اطلاع شہر والوں کو دی، لیکن وہ گویا بہرے ہو گئے۔ انہوں نے سن کر بھی کچھ نہیں سنا، وہ بھلا اپنے عیش و عشرت کو کیسے چھوڑ دیں! انہوں نے تو بغداد آنے والوں کا مذاق تک اڑایا اور ان مظلوموں سے کہنے لگے، بڑے بزدل ہو تم لوگ! منگولوں سے ڈر کر بھاگ آئے!...... تمہیں تو چاہئے تھا کہ ان سے ڈٹ کر مقابلہ کرتے اور عراق کی سرحدوں سے انہیں پسپا کر کے بھگا دیتے۔ اس پر جان بچا کر آنے والوں نے اہل بغداد کو بتایا کہ وہ منگولوں کا لشکر نہیں جو آگے بڑھ رہا ہے...... وہ تو قہر خداوندی ہے۔ ہم بھی دیکھیں گے کہ اس خدائی قہر کا مقابلہ کون کرتا ہے!...... تیرا کیا خیال ہے اے عارج؟ میں تو سمجھتی ہوں، مظلوم آدم زادوں نے ٹھیک ہی کہا۔ واقعی قہر خداوندی عراق کی طرف بڑھ رہا ہے۔ رنج تو یہ ہے کہ اب بھی آدم زادوں کو خدا یاد نہیں آ رہا۔''

''یہ تُو ٹھیک کہتی ہے اے دینار!'' عارج کے لہجے میں شکست خوردگی سی تھی۔ ''عراق میں بسنے والے آدم زادوں کو چاہئے کہ وہ خدا کے سامنے جھک جائیں...... اس کی عبادت کریں...... ممکن ہے خدا ان پر مہربان ہو جائے اور وہ خدائی قہر و غضب سے بچ جائیں، مگر...... مگر شاید ایسا نہ ہو۔''

''کیوں اے عارج؟'' میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔ پُرجوش ہونے کے بعد اب وہ اداس ہو گیا تھا۔ میری گفتگو سے کچھ اداسی ہی کم ہوتی۔

عارج نے جواب دیا۔ ''ان آدم زادوں کی سرکشی انہیں خدا کے سامنے سرنگوں نہ ہونے دے گی۔ نغمہ و رقص کی محفلیں اسی طرح سرگرم رہیں گی۔ دورِ ساغر بھی یونہی چلتا رہے گا۔''

میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''کاش ہم جنات ان آدم زادوں کو راہ راست پر لا سکتے!''

۞......۞

دوسرے ہی روز سب سے پہلے احمر نے مسجد میں نمازیوں سے یہ خبر سنی، اسے معلوم ہوا کہ کچھ لوگ سرحدی علاقے سے بھاگ کر بغداد آئے ہیں۔ بغداد ایسا شہر نہ تھا جس میں باہر سے آنے والوں کا فوراً پتہ لگ جاتا، احمر تلاش میں رہا۔ آخر اسے دو آدمی مل گئے۔ ان سے منگولوں کے حملے کی تصدیق ہو گئی۔

احمر سیدھا ہمارے محل میں چلا آیا جہاں احمد ابوالقاسم بھی بیٹھا تھا۔ یہ بھی حکمران

خاندان کے فرد تھے اور میں بھی اب اپنے انسانی قالب فردوس کی وجہ سے اسی خاندان کا حصہ تھی۔ ظاہر ہے کہ شہزادے مجھے ولی عہد ابوبکر کی بیوی ہی سمجھتے تھے۔ ان کے میرے درمیان پردہ نہیں تھا۔ جس وقت احمر آیا تو عارج اور میں اپنے اپنے انسانی پیکروں ابوبکر اور فردوس کا بہروپ بھرے احمد ابوالقاسم کے ساتھ بیٹھے تھے۔

احمر نے آتے ہی کہا۔ ''غضب ہو گیا..... منگولوں نے حملہ کر دیا۔''

عارج انجان بن کر بولا۔ ''منگولوں نے حملہ کر دیا!..... کس سے سنا تم نے؟'' اس نے دانستہ حیرت کا اظہار کیا۔

''کئی روز ہوئے جب میں نے مسجد میں سنا تھا۔'' احمر بتانے لگا۔ ''مجھے معلوم ہوا کہ کچھ لوگ سرحد سے بھاگ کر آئے ہیں، آج انہی لوگوں سے میری ملاقات ہو گئی۔ جو کچھ میں نے سنا تھا اس کی تصدیق ان افراد نے کر دی۔''

''اب وہ سازش سمجھ میں آ گئی جو ابنِ علقمی کر رہا تھا۔''

''ابنِ علقمی نے منگولوں کو حملے کی ترغیب دی اور یہاں فوجیں کم کر دیں۔ اب ملک و قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔''

''میرے خیال میں اعلیٰ حضرت کو اس حملے کی اطلاع نہیں ہے۔'' احمر نے رائے زنی کی۔ اس کا اشارہ خلیفہ مستعصم کی طرف تھا۔

عارج ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اگر انہیں خبر مل بھی گئی ہو گی تو کچھ نہ ہو گا۔'' عارج کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ''وہ ابنِ علقمی کے کہنے میں ہیں، یہ ذات وزیر اعظم کوئی بات گھڑ دے گا۔''

''مگر ہمیں اپنی طرف سے تو کوشش کر لینی چاہیے۔'' احمد ابوالقاسم نے پُرزور الفاظ میں مشورہ دیا۔

مزید کچھ دیر گفتگو کے بعد صورتحال کچھ ایسی بن گئی کہ عارج کو احمر اور احمد کے ساتھ قصرِ خلافت جانے پر آمادہ ہونا پڑا۔

میری اور عارج کی متفقہ رائے یہ تھی کہ خلیفہ مستعصم اس ضمن میں حماقت کا ثبوت ہی دے گا۔ اس وجہ سے ہم نے کوئی ایسی کوشش نہیں کی کہ خلیفہ کو حالات کا علم ہو جائے۔ خلیفہ کو حالات سے آگاہ کرنا ہمارے لئے کون سا مشکل تھا! اس کے باوجود عارج کو

دونوں شہزادوں کے ساتھ جانا پڑا۔ ادھر وہ لوگ رخصت ہوئے ادھر میں نشست گاہ سے اٹھ کر اپنے ''خلوت کدے'' میں آ گئی۔

شہزادوں سے خلیفہ کی ملاقات کا حال میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا، اپنی پراسرار طاقتوں کو متحرک کر کے میں نے اپنی بصارت و سماعت کا دائرہ وسیع کر لیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں عارج اور دونوں شہزادوں کو میں نے قصرِ خلافت کے اندر دیکھا۔

خلیفہ مستعصم حسبِ معمول محفلِ نشاط میں تھا۔ ساقیانِ باہوش اسے جام بھر بھر کے دے رہی تھیں۔

یہ غنیمت تھا کہ احمر کا سب لحاظ کرتے تھے۔ اسے آتے دیکھ کر وہاں آلاتِ مے نوشی جام و صراحی ہٹا دیئے گئے۔

ان تینوں نے خلیفہ کو سلام کیا۔ عارج نے کنیزوں کو اشارہ کیا، وہ چلی گئیں۔

''اعلیٰ حضرت نے کچھ سنا؟'' عارج نے ولی عہد ابوبکر کی حیثیت سے گفتگو شروع کی۔

''کیا؟'' خلیفہ نے عارج کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

عارج نے بتایا۔ ''منگولوں نے ہماری مملکت پر حملہ کر دیا ہے۔''

''کیا بات کہی تم نے بھی!'' خلیفہ ہنس دیا۔ ''منگولوں کو ہماری سلطنت پر حملہ کرنے کی جرأت ہو سکتی ہے؟''

''جب کہ فوجیں علیحدہ کر دی گئی ہیں، چھاؤنیاں خالی پڑی ہیں تو انہیں حملہ کرنے سے کون روک سکتا ہے؟''

''ہمارا رعب و جلال۔'' خلیفہ نے بڑے غرور و تکبر کے لہجے میں جواب دیا۔

''میں نے عرض کیا تھا کہ رعب و جلال کا انحصار قوت و طاقت پر ہے اور قوت و طاقت کا مدار فوج پر ہے۔'' عارج دلائل دیتا رہا۔

''اندیشہ نہ کرو، ہمارے پاس کافی فوج ہے۔'' خلیفہ نے عارج کو کسی بچے کی طرح بہلانا چاہا۔

اسی وقت احمر بول اٹھا۔ ''اعلیٰ حضرت! بہتر یہ ہے کہ کچھ فوج اور بھرتی کر لی جائے۔''

''کیا فائدہ ہے اس کا؟'' مستعصم نے برا سا منہ بنایا۔

''معلوم یہ ہوا ہے کہ منگولوں نے اپنی پوری قوت کے ساتھ حملہ کیا ہے۔'' عارج نے کہا۔ ''اس لئے فوج کی بھرتی ضروری ہے۔''

''ابوبکر! تم ہمیشہ اخراجات کی بات سوچتے ہو، کبھی تم نے کفایت شعاری اور بچت کی بات نہیں بتائی۔'' خلیفہ نے اعتراض کیا۔

''دولت کو جان و آبرو پر قربان کر دیا جاتا ہے اعلیٰ حضرت!'' عارج زور دے کر بولا۔ ''اس وقت جانوں اور عفت پہ آ بنی ہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' خلیفہ نے سر ہلایا۔ ''ابن علقمی کو بلا کر ابھی سب انتظام کیے دیتے ہیں۔''

''خدا جانے آپ ابن علقمی کو کیا سمجھتے ہیں!'' عارج نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ ''مجھے یقین ہے منگولوں نے اسی کے ایماء پر حملہ کیا ہے۔''

''تمہیں تو ابن علقمی سے بدظنی ہے۔'' خلیفہ کہنے لگا۔ ''اسی لئے تمہیں اس کی ہر بات میں برائی نظر آتی ہے..... بلکہ جو فعل اس کا نہیں ہے اسے بھی تم اس کے نام کر دیتے ہو۔ یہ بات فہم و فراست کے خلاف ہے۔ منگولوں کے حملے کا اس سے کیا تعلق؟''

عارج نے ایک اور مضبوط دلیل دی جو حقیقت پر مبنی تھی۔ وہ بولا۔ ''اعلیٰ حضرت! اگر واقعات کی کڑیاں جوڑی جائیں تو حقیقت خود بہ خود واضح ہو جائے گی۔ ادھر یہاں فوجوں میں کمی کی گئی اُدھر وحشی منگولوں نے ہماری مملکت پر حملہ کر دیا۔ جب تک لشکر میں تخفیف نہیں کی گئی، منگولوں کو حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔''

''یہ اتفاق کی بات ہے۔'' مستعصم ہٹ دھرمی پر اڑا رہا۔ ''ابن علقمی غدار، بے وفا اور نمک حرام نہیں ہے۔''

''اس بات کو تو خدا ہی جانتا ہے۔'' احمر نے گفتگو میں پھر حصہ لیا۔

''ہم بھی جانتے ہیں کہ ابن علقمی ہمارا بہی خواہ ہے۔'' خلیفہ کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

احمد ابوالقاسم اب تک خاموش رہا تھا وہ بھی خلیفہ سے مخاطب ہوا۔ ''مناسب یہی ہے کہ فوجیں بھرتی کی جائیں اور پوری طاقت کے ساتھ منگول وحشیوں کا مقابلہ کیا جائے، پھر آئندہ اس طرف نگاہ اٹھانے کی انہیں ہمت نہیں ہو گی۔''

''خاطر جمع رکھو، مقابلہ پوری طرح کیا جائے گا۔'' خلیفہ نے اس بار احمد ابوالقاسم کو اپنی

دانست میں اطمینان دلایا۔

''اعلیٰ حضرت! میں ایک بات کہنے پر مجبور ہوں۔'' احمر نے مستعصم کو مخاطب کیا۔ ''جو بات تمام بغداد میں گشت کر رہی ہے، کیا وزیر اعظم نہیں سنی ہو گی؟..... اگر انہوں نے ایسا سنا تو کیا ان کا فرض نہیں تھا کہ وہ اعلیٰ حضرت کے گوش گزار کرتے؟ اسی کے ساتھ فوراً جوابی کارروائی کی تیاری کرتے، اس سے یہ شبہ تقویت پاتا ہے کہ وہ اس سازش میں شریک ہیں۔''

''تمہارا یہ کہنا درست تو معلوم ہوتا ہے مگر ممکن ہے وہ جوابی کارروائی میں مشغول ہوں۔'' خلیفہ کسی بھی دلیل سے قائل ہونے کو تیار نہیں تھا۔

اسی وقت ایک خادم نے وزیر اعظم ابن علقمی کے آنے کی خبر دی۔ خلیفہ نے بلا تاخیر اسے بلوا لیا۔

ابن علقمی نے آتے ہی شہزادوں پر نگاہ ڈالی۔ شہزادوں کو وہاں دیکھ کر ابن علقمی سمجھ گیا کہ اس کی شکایت کی جا رہی ہو گی۔ اس نے خلیفہ اور شہزادوں کو سلام کیا اور ادب سے ایک طرف بیٹھ گیا۔

''کہو، کوئی نئی خبر؟'' خلیفہ مستعصم نے سوال کیا۔

دراصل ابن علقمی یہی دیکھنے آیا تھا کہ منگولوں کے حملوں کی اطلاع خلیفہ کو تو نہیں ہو گئی۔ خلیفہ کے اس سوال نے اسے یقین دلا دیا کہ اسے حملے کی اطلاع ہو گئی ہے، سو ابن علقمی نے جواب دیا۔

''اعلیٰ حضرت! نئی خبر یہ ہے کہ منگولوں نے حملہ کر دیا ہے۔''

''تم نے کیا انتظام کیا؟'' خلیفہ نے پوچھا۔

''میں نے فوجوں کو تیار رہنے کا حکم دے دیا ہے۔'' ابن علقمی نے بتایا۔ ''اس وقت اعلیٰ حضرت سے لشکر کی روانگی کے لئے اجازت لینے آیا ہوں۔''

خلیفہ مستعصم نے اس انداز سے عارج اور بقیہ شہزادوں کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، ہم نہ کہتے تھے کہ وزیر اعظم دفاع کی تدبیر کر رہے ہوں گے۔ پھر خلیفہ نے ابن علقمی سے دریافت کیا۔ ''کیا موجودہ فوجیں منگولوں کا مقابلہ کر سکیں گی؟''

''کیوں نہیں اعلیٰ حضرت!'' ابن علقمی فوراً ہی بول اٹھا۔ ''اعلیٰ حضرت کے اقبال سے

ہمارا موجودہ لشکر منگولوں کو شکست فاش دے کر نہ صرف عراق بلکہ ایران سے بھی نکال دے گا۔''

خلیفہ نے ایک بار پھر شہزادوں کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، گویا کہہ رہا ہو، ہم نہ کہتے تھے ہمارے پاس کافی فوج ہے۔

''کس قدر لشکر میدان جنگ میں جانے کو تیار ہے؟'' خلیفہ نے ابنِ علقمی سے پوچھا۔

''دس ہزار۔'' ابنِ علقمی نے بتایا۔ ''دو تجربہ کار بہادر افسروں فتح الدین داؤد اور مجاہد الدین ایبک کی سرکردگی میں یہ لشکر بھیجا جائے گا۔''

''مناسب ہے۔'' خلیفہ نے گویا اجازت دے دی۔

اب وہاں عارج اور دونوں شہزادوں کا بیٹھنا لاحاصل تھا۔ سو انہوں نے خلیفہ سے اجازت لی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں نے قصرِ خلافت سے عارج کے اٹھتے ہی آنکھیں کھول دیں۔

عارج اور دو شہزادوں کے جانے سے اتنا ضرور ہوا کہ ابنِ علقمی کو منگولوں کے مقابلے کی خاطر فوج بھیجنی پڑی۔

چند ہی روز میں فتح الدین داؤد اور مجاہد الدین ایبک دس ہزار لشکر لے کر منگولوں کے مقابلے کی غرض سے روانہ ہو گئے۔

مجھے بہ خوبی علم تھا کہ منگولوں اور عراقیوں کے لشکر کی تعداد میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہ فرق معمولی نہیں بلکہ پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھا۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ اس مہم پر فتح الدین داؤد کو کیوں بھیجا گیا ہے!

دراصل فتح الدین داؤد نہایت ہوشیار اور تجربے کار جنگ جو سالار تھا۔ وہ کئی معرکوں میں شریک ہو چکا تھا۔ ابنِ علقمی اس سے ڈرتا تھا، فتح الدین داؤد کو وہ فوج سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ وہ فوج میں ہر دلعزیز تھا، دوسرے یہ کہ شہزادے اور خلیفہ اس کا لحاظ کرتے تھے۔

اب اس خطرناک جنگی مہم پر سالار فتح الدین کو اس لئے بھیجا تھا کہ وہ منگولوں کا مقابلہ کرے اور مارا جائے۔ ابنِ علقمی کو یہ بالکل یقین تھا کہ بغداد سے جو لشکر منگولوں کے مقابلے پر گیا ہے ضرور فنا کے گھاٹ اتر جائے گا۔ اسے جو اطلاعات ملی تھیں ان کے مطابق

منگول حکمراں ہلاکو خاں بہت بڑا لشکر لے کر بڑھا چلا آ رہا تھا۔

فتح الدین داؤد اور مجاہد الدین ایبک منزل بہ منزل چلے جا رہے تھے۔ ان دونوں ہی پہ میں نگاہ رکھے ہوئے تھی۔

منگولوں کے لشکر کی خبر لانے کے لئے فتح الدین نے کچھ جاسوس آگے بھیج دیئے تھے۔ انہی جاسوسوں میں سے ایک نے آ کر بتایا کہ منگول لشکر قریب پہنچ چکا ہے اور اس کی تعداد ساٹھ ہزار سے زیادہ ہے۔ لیکن منگولوں پر عربوں کی ہیبت بیٹھی ہوئی ہے، وہ عربوں سے خوفزدہ ہیں اور بڑے چوکنے ہو کر بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔

یہ جان کر فتح الدین کو بڑی فکر ہوئی۔ کیونکہ اس کے ساتھ کل دس ہزار سپاہ تھی۔ وہ ان آدمزادوں میں سے نہیں تھا جو کسی غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں اور خود کو ناقابلِ شکست خیال کرتے ہیں، جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنا اس کا شیوہ نہیں تھا، وہ عملی آدمی تھا لیکن انہی حقائق کے ساتھ ساتھ اس نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا۔

فتح الدین کو دارالخلافہ بغداد کی صورتحال کا پوری طرح اندازہ تھا، وہاں سے اسے مزید لشکر آنے کی امید نہیں تھی۔ لشکر آتا ہی کہاں سے، جب تھا ہی نہیں۔ فتح الدین نے اس کے باوجود ہمت سے کام لیا، وہ فوج کی تعداد دشمن کے مقابلے میں کم ہونے پر بھی آگے بڑھتا رہا۔

آخر کار دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ میں خود اس وقت وہاں موجود تھی، اپنی موجودگی میں نے بہ وجوہ وہاں ضروری سمجھی۔ فردوس کے انسانی پیکر کو چھوڑ کر باہر آتے ہی عارج کو میں نے ضروری باتوں سے آگاہ کر دیا تھا۔

''تو کہے اے دینار، تو میں بھی تیرے ساتھ محاذِ جنگ پر چلوں؟'' عارج نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''نہیں اے عارج! تیرا بغداد میں رہنا زیادہ ضروری ہے۔ مجھے لوٹنے میں دیر ہو جائے، یعنی کئی روز گزر جائیں تو فکر نہ کرو۔''

یہ کہہ کر میں بغداد میں رکی نہیں اور سیدھی اس جگہ پہنچ گئی جہاں کی مٹی میں آدم زادوں کا خون جذب ہونا تھا۔

شام قریب تھی اس لئے مصلحت کے تحت منگولوں نے حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی۔

منگول لشکر ایک وسیع میدان میں فروکش ہو گیا۔ مسلمانوں کی فوج نے بھی کچھ فاصلے پر پڑاؤ ڈال لیا۔

شب خون کا جو اندیشہ عباسی فوج کو تھا، وہ منگولوں کو بھی پیدا ہوا۔ انہوں نے بھی ایک دستہ لشکر کی حفاظت پر مامور کیا اور وہ دستہ منگول فوج کے گرد گردش کرتا رہا۔

دونوں میں سے کسی فریق نے رات کے وقت ایک دوسرے پر حملہ نہیں کیا۔ یہ اسی رات کا واقعہ ہے کہ جب منگول حکمران ہلاکو خاں اپنے خیمے میں سونے چلا گیا تو میں بھی وہاں داخل ہو گئی۔ عارج سے میں نے جو وعدہ کیا تھا، بھولی نہیں تھی۔ یہی وہ موقع تھا کہ مجھے جس کا انتظار تھا۔

منگول حکمران ہلاکو خاں لاکھ بے رحم، سنگ دل و ظالم سہی مگر عربوں کا خوف اس کے دل میں بہرحال موجود تھا۔ اس کے وزیر نصیر الدین طوسی نے اسے عربوں اور بطور خاص عباسی خلفا کے شاندار ماضی سے آگاہ کیا تھا، تبھی سے ہلاکو خاں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ عربوں سے نہیں لڑے گا۔ اگر اب بھی عباسی خلفا کے غدار وزیر اعظم ابن علقمی نے اس کا مشورہ قبول نہ کیا ہوتا اور فوج کی بڑی تعداد کو نکال نہ دیتا تو وہ عراق پر ہرگز حملہ نہ کرتا۔

ہلاکو خاں کے ذہن میں موجود اسی خفیف سے خوف کا اس رات میں نے پورا فائدہ اٹھایا۔

ابھی ہلاکو خاں سویا نہیں تھا کہ میں نے اس کے دماغ میں سرگوشی کی۔ ''اے چنگیز خاں کے پوتے اور تولی کے بیٹے تجھے دھوکہ دیا گیا ہے۔ تُو نے اس سرزمین پر قدم رکھ کر غلطی کی ہے، تُو عربوں سے نہیں جیت سکے گا۔''

''میرے اندر یہ کون بول رہا ہے؟'' ہلاکو خاں بڑبڑایا۔

مجھے معلوم تھا کہ ہلاکو خاں کا عقیدہ کمزور ہے، سو میں پھر اس کے دماغ میں بولی۔ ''میں نیلے آسمان کی روح ہوں اور تیری رہنمائی کرنے آئی ہوں۔ جان لے کہ کل تیری شکست کا دن ہے!''

''مگر کیسے اے نیلے آسمان کی روح؟'' ہلاکو خاں پھر بڑبڑانے لگا۔ اس کمزور عقیدے والے آدم زاد نے اپنے کمزور عقیدے کے سبب مجھے گویا ''نیلے آسمانوں کی روح'' تسلیم کر لیا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ ''عربوں کی تعداد تو بہت ہی کم ہے۔ میری فوج تو اسے روند ڈالے گی۔ ایک بھی عرب زندہ بچ کر یہاں سے نہیں جا پائے گا..... اور ہاں، تُو نے دھوکے کی کیا بات کہی؟''

میں نے ہلاکو خاں کے دماغ میں کہا۔ ''ابن علقمی نے تجھے عراق بلا کر دھوکا ہی تو دیا ہے!''

''تیرا کہنا یہ ہے اے عظیم روح کہ ہلاکو خاں، عربوں سے جیت نہیں سکے گا؟'' ہلاکو خاں کے اندر چھپا ہوا درندہ دھیرے دھیرے بیدار ہو رہا تھا۔ میں پہلے ہی سے یہ جانتی تھی، مگر میرا مقصد اسے جنگ سے روکنے کی بجائے کچھ اور ہی تھا۔

ہلاکو خاں کا کریہہ چہرہ مجھے مزید کریہہ نظر آنے لگا۔ پھر جب میں نے اس کے دماغ پر توجہ دی تو خوش ہو گئی۔ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اس کا حوصلہ ممکنہ حد تک پست کرنا ہی تو میرا مقصد تھا۔

○....○

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں اس کے دماغ میں جھانک چکی تھی کہ وہ کیا قدم اٹھانے والا ہے!

ذرا ہی دیر کے بعد خیمے کے بیرونی حصے میں طلب کردہ آدم زاد حاضر ہو گئے۔ طلب کیے جانے والوں میں نصیر الدین طوسی اور منگول لشکر کے بڑے بڑے سردار تھے۔ ان سبھی کے چہروں پر حیرت کے آثار نظر آرہے تھے۔

ہلاکو خاں نے بات شروع کی۔ ''بچپن سے میں نے یہی سنا ہے کہ نیلے آسمانوں کی روح نے کبھی کوئی غلط بات نہیں کی۔''

وہاں موجود منگول سرداروں نے ہلاکو خاں کی بات سے اتفاق کیا۔ کیونکہ وہ بھی اپنے حکمراں کی طرح کمزور عقیدے کے لوگ تھے۔

نصیر الدین طوسی چپ رہا تو ہلاکو خاں نے اس سے استفسار کیا۔ وہ بولا۔ ''اے میرے آقا! یہ تو پتہ چلے کہ آخر ہوا کیا ہے؟''

''میرے پاس ابھی نیلے آسمانوں کی عظیم روح آئی تھی۔'' ہلاکو خاں نے پورا واقعہ بیان کر دیا۔

منگول سردار تذبذب کا شکار ہو گئے کہ عربوں سے جنگ کی جائے یا نہیں؟ کچھ نے اس کا اظہار بھی کیا۔ میں یہی چاہتی تھی کہ جنگ سے پہلے ہی منگول حوصلہ ہار جائیں۔ نصیر الدین طوسی ہی وہاں ایک ایسا آدم زاد تھا جسے ''نیلے آسمانوں کی عظیم روح'' پر یقین نہیں تھا۔ وہ پُرجوش آواز میں ہلاکو خاں سے بولا۔

''اے میرے آقا! ہماری اس سے بڑی توہین اور بزدلی کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ ہم جنگ کیے بغیر عربوں کے مقابلے سے بھاگ جائیں۔''

''اور اے طوسی! کیا تم نے منگول سرداروں کی باتیں نہیں سنیں؟'' ہلاکو خاں نے اپنے

وزیر نصیر الدین طوسی کو مخاطب کیا۔

''سن لیں اے میرے آقا!'' نصیر الدین طوسی نے جواب دیا، پھر کہنے لگا۔ ''اگر ہم آج عربوں سے بلاوجہ ڈر گئے ان سے نہیں لڑے اور پیچھے ہٹ گئے تو ہمیں ایران میں بھی سکون نہیں مل سکے گا۔ عرب وہاں تک ہمارا پیچھا کریں گے اور ہمیں اپنے علاقوں میں بھی نہ ٹکنے دیں گے۔''

چند لمحے کو سناٹا سا چھا گیا۔ نصیر الدین طوسی نے جن خطرناک حالات کی نشاندہی مدلل انداز میں کی تھی ان کے احساس نے منگول سرداروں کی زبانوں پر جیسے تالے ڈال دیے تھے۔

پھر اس موت کی سی خاموشی کو ہلاکو خاں کی آواز ہی نے توڑا۔ اس نے اپنی سرشت کے مطابق فیصلہ سنا دیا۔ ''ہم لڑتے ہوئے مارے جائیں یا زندہ رہیں، ہماری جیت ہو کہ ہار، عربوں سے جنگ ضرور ہوگی!...... میں ہلاکو خاں، چنگیز خاں کا پوتا اپنی توہین برداشت نہیں کروں گا! میں لڑے بغیر فرار ہو جانے اور بزدل کہلانے پر موت کو ترجیح دوں گا۔''

کوئی اور معاملہ ہوتا یا عقائد درمیان میں نہ آتے تو یقیناً منگول سردار، ہلاکو خاں کی پُرجوش باتوں سے فوراً اظہار اتفاق کرتے، سو ایسا نہ ہوا ''نیلے آسمان کی عظیم روح'' سے بھلا وہ اختلاف کی جرأت کیسے کرتے۔ کچھ سردار حق میں بولے بھی تو صرف خانہ پری کے لیے۔ سچ یہ ہے کہ ان کی آواز میں جذبوں کی حرارت نہیں تھی۔

ہلاکو خاں یہ صورت حال دیکھ کر جھنجھلا گیا اور اجلاس برخاست کر دیا۔

مجھے یہ علم ہو چکا تھا کہ منگول یا عباسی لشکروں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر شب خون نہیں مارے گا، جو بھی ہوتا اب آئندہ روز صبح ہی ہوتا۔ سو میں نصف شب گزرنے سے کچھ پہلے ہی محاذ جنگ سے واپس بغداد آ گئی۔

وہ رات ولی عہد ابوبکر کے محل میں گزار کر میں صبح ہی صبح بغداد سے روانہ ہو گئی۔

میں دونوں لشکروں کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک جن زادی کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں منگول حکمراں ہلاکو خاں اپنے خیمے سے باہر آیا اور اس نے اپنے سپاہیوں کو مسلح کرنے کا حکم دیا۔

سالار فتح الدین نے بھی عباسی لشکر کو ہتھیار بندی کی تاکید کر دی۔ گزشتہ رات فوج کے

سرداروں کو اس نے صف بندی کے جو احکام دیئے تھے، انہی پر عملدرآمد ہونے لگا۔

سورج طلوع ہوا تو منگول سجدہ ریز ہو گئے۔ وہ سورج ہی کی پرستش کرتے تھے۔ عموماً ان کی عبادات کے دو وقت ہوتے تھے، ایک سورج نکلتے وقت، دوسرے غروب ہوتے وقت۔

سجدہ کر کے منگول دستے میدان میں نکلنے لگے۔ ان کی جمعیت بڑی بھاری تھی۔ میں نے اس دوران میں انہیں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے سنا۔ ان سرگوشیوں کا مرکز و محور "نیلے آسمان کی روح" تھا۔ ان وحشیوں کے لہجے میں خوف کا عنصر دیکھ کر میں بہت خوش ہوئی۔ میں سمجھ گئی کہ گزری ہوئی رات کو ہلاکو خاں نے اپنی فوج کے سرداروں کو جو باتیں بتائی تھیں وہ راز نہیں رہ سکی تھیں۔

دور تک میدان میں منگولوں کا لشکر پھیل گیا۔ میمنہ اور میسرہ قائم ہو گئے۔ یہ طریق جنگ انہوں نے مسلمانوں ہی سے سیکھا تھا۔ ہلاکو خاں قلب لشکر میں رہا، نصیر الدین طوسی اس کے ساتھ تھا۔ عام منگول سپاہیوں اور سرداروں کی نسبت وہ مجھے بے خوف سا دکھائی دیا۔

عباسی لشکر بھی اپنی صف بندی برقرار رکھتے ہوئے میدان میں نکلنے اور پھیلنے لگا۔ اس لشکر کی تعداد منگولوں سے کافی کم تھی۔ مگر سالار فتح الدین داؤد نے اسے اس طرح پھیلا دیا کہ وہ اپنی اصل تعداد سے دو گنے معلوم ہونے لگے۔

تھوڑی دیر میں جنگ شروع ہو گئی۔

منگول سیاہ طوفان کی طرح بڑھے۔ عباسی لشکر نے بھی پیش قدمی شروع کر دی، یہاں تک کہ دونوں فوجیں ٹکرا گئیں۔

تلواریں نیاموں سے نکل آئیں، ڈھالیں بلند ہونے لگیں۔ نیزوں سے نیزے ٹکرانے لگے۔ خون ریزی شروع ہو گئی۔ سر، جسموں سے کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ سینے میں تلواریں اترنے لگیں۔ ہر طرف گویا موت کا رقص شروع ہو گیا۔

جیسے جیسے جنگ کی آگ تیز ہوتی جا رہی تھی، دونوں فریق بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے پر حملہ کر رہے تھے۔ سروں کو ہلاکو کٹ کر زمین پر گرتے دیکھتا تو اپنی وحشیانہ سرشت کے مطابق قہقہے لگاتا، سروں کو زمین پر اچھلتے دیکھ کر خوش ہوتا۔ چیخ و پکار کے باوجود ہلاکو خاں کے قہقہے دور دور تک گونجتے سنائی دیتے۔ اسے علم تھا کہ عباسی لشکر کی تعداد بہت کم ہے، وہ اسی لئے اسے جلد ختم کر دینے کے در پے تھا۔ اسی بنا پر منگولوں کے حملوں میں بڑی تیزی تھی۔

عباسی لشکر کی تعداد کم ضرور تھی مگر حوصلہ بڑا تھا۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ انہوں نے ذرا بھی پہلو تہی کی تو ان کا خاتمہ ہے۔ ایک مسلمان کو بھی منگول زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ جب مرنا ہی ہے تو دلیروں کی موت کیوں نہ مریں! عباسی لشکر کے سرداروں کے دماغوں میں یہ باتیں میں نے ہی ڈالی تھیں، وہ اسی سبب نہ صرف دشمن کے مقابلے پر ڈٹے ہوئے تھے بلکہ ان پر مردانہ وار حملے کر رہے تھے۔

ہلاکو خاں کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ اپنی فوج زیادہ ہونے کی وجہ سے عباسی سپاہیوں کو بہت جلد مغلوب کر لے گا مگر وہ ایک بات بھول گیا تھا، جنگیں فوج کی کثرت سے نہیں، عزم و حوصلے سے جیتی جاتی ہیں۔ اس میں یقیناً تعداد کو بھی دخل ہے مگر یہ پوری نہیں ادھوری سچائی ہے۔ منگول سپاہی تو پہلے ہی سے "نیلے آسمان کی روح" کی پیش گوئی سن چکے تھے سن ان میں حوصلہ نہ تھا، وہ اپنے حریف پر حملے تو کرتے مگر حکم کی تعمیل میں اور بے دلی کے ساتھ۔

پہلے سے خوف کھائے ہوئے منگول آدم زاد اپنے سرداروں کے کہنے پر آگے بڑھتے لیکن موت کو سامنے دیکھ کر ڈھیر ہو جاتے۔ میں نے منگول سرداروں کو یہ سمجھایا تھا کہ عباسی لشکر سے جنگ کرنا موت کو دعوت دینا ہے، لوہے کے چنے چبانا ہے، اس کے باوجود وہ اپنے حکمراں ہلاکو خاں کے حکم پر میدان میں جمے ہوئے تھے۔ منگولوں کے طریق جنگ میں بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ حملوں میں پہل کر رہے تھے۔ اس کی انہیں بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی۔ عباسی لشکر مدافعتی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس پر حملہ ہوتا تو وہ اسے روکتا اور بلا تاخیر جوابی حملہ کر دیتا۔ یوں حملہ آور منگولوں کی اکثریت ماری جاتی۔ یہی عمل بار بار دہرایا جاتا رہا اور منگول غصے میں آ کر اپنے ہی لہو میں نہاتے رہے۔

حقیقت میں عباسی فوجی، منگولوں کے لئے موت کا فرشتہ بن گئے تھے۔ ان کی تلواریں جن کے سروں پر پڑتی تھیں ان کی پھانکیں کھول دیتی تھیں۔ جن کے سینوں پر پڑتی تھیں پسلیوں تک اتر جاتی تھیں۔ ان کے سر اڑا دیتی تھیں۔ ان کے حملوں سے منگولوں کو پناہ نہیں ملتی تھی۔ حالانکہ یہ حملے محض جوابی ہوتے تھے۔

جب منگول فوج پیچھے ہٹنے لگی تو میرے ایما پر سالار فتح الدین نے جنگی حکمت عملی

تبدیل کر دی۔ اب یہ ضرورت تھی کہ عباسی لشکر اس موقع سے فائدہ اٹھاتا۔ جنگ کے آغاز میں حملہ کرنے والی فوج کو زیادہ جانی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس طرح عموماً مقابل فوج کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملتا، لیکن جنگ جب آخری مرحلے میں داخل ہو جائے تو صورت حال مختلف ہوتی ہے، لڑتے لڑتے اگر حریف پسپائی اختیار کرنے لگے تو اس پر حملے بلکہ تابڑ توڑ حملے انتہائی کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

یوں تو سالار لشکر فتح الدین خود بھی جنگی مہارت میں کسی سے کم نہ تھا لیکن میدان جنگ میں آدمی کو بہت سی باتیں یاد نہیں آتیں، میں نے اسی لئے فتح الدین کو منگولوں پر حملوں کی بروقت ترغیب دی۔

عباسی فوج مزاحمت کرتے کرتے اپنے امیر (سالار) کے حکم سے جارحیت پر اتر آئی۔ اس نے منگولوں پر بڑی تیزی و مستعدی سے حملے شروع کر دیئے۔ عباسی سپاہی بے حد بہادری کا ثبوت دیتے ہوئے دشمن منگولوں کو مار رہے تھے۔ وہ صفوں پر صفیں الٹ دیتے تھے۔ منگول پسپا ہونے کے باوجود اپنی جان بچانے کی مقدور بھر کوشش کر رہے تھے مگر عباسی لشکر کے حملے روکے نہیں رک رہے تھے۔ وہ کسی تند و تیز آندھی کی طرح بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ منگولوں کے پیچھے ہٹنے سے ان کے حوصلے اور بڑھ گئے تھے۔

ایسا نہیں تھا کہ جنگ میں صرف منگول ہی مارے جا رہے تھے اور عباسی لشکر کے سپاہی جاں بحق نہیں ہو رہے تھے۔ انہیں بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے، مگر دشمن کے مقابلے میں ان کی تعداد کم تھی، اگر دس منگول مرتے تھے تو ایک مسلمان جاں بحق ہوتا تھا۔ منگولوں کے پیر اکھڑنے اکھاڑنے میں اس امر کو زیادہ دخل تھا کہ ایک مسلمان سپاہی مارا جاتا تو اس کے بدلے دس بارہ منگولوں کے سر قلم کر دیئے جاتے۔ کچھ تو یہ کیفیت دیکھ کر اور کچھ قبل از وقت ہمت ہار جانے سے منگولوں کی یقینی فتح، شکست میں بدلتی نظر آنے لگی۔ واضح طور پر اب یہ پتہ چل رہا تھا کہ منگول گھبرا گئے ہیں، وہ حملوں اور جوابی حملوں میں سستی کرنے لگے۔ عباسی لشکر نے اور بھی تیزی اور تندی سے حملے کیے۔ آخر کار منگولوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ پوری طرح پسپا ہونے لگے۔

یہ بڑی عجیب اور حیران کن جنگ تھی۔ ایسی جنگ کہ جس میں دشمن کی تعداد چوگنا تھی۔ عربوں نے ان وحشی منگولوں پر اپنی برتری ثابت کر دی جن سے ایک دنیا خوفزدہ تھی، کانپتی

تھی!

ہلاکو خاں نے اپنی فوج کو پسپا ہوتے دیکھا تو بڑی کوشش کی کہ ایسا نہ ہو، اس کے سپاہی جم کے لڑیں مگر منگولوں کے اکھڑے ہوئے پیر نہ جم سکے۔ وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے کچھ تو ایسے بدحواس ہو کے بھاگے کہ اپنے ہی لوگوں کو روندنے لگے۔ جو منگول سپاہی زخمی ہو کر گر گئے تھے اور انہیں طبی امداد فراہم کر کے بچایا جا سکتا تھا وہ بھی اس "بھگی" میں جان سے گئے۔ اس سے منگول لشکر میں بڑی ابتری پھیل گئی۔ منگولوں کی اس پسپائی میں یہ جملہ کلیدی حیثیت کا حامل تھا۔ "نیلے آسمان کی عظیم روح نے سچ کہا تھا۔"

کریہہ چہرے والے اس آدم زاد ہلاکو خاں کو میدان جنگ سے بھاگتے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی، ایک ایسی خوشی کہ جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ یقیناً ایک ناقابل یقین معرکہ تھا جس میں منگولوں کو شکست فاش ہوئی اور عباسی لشکر فتح یاب ہوا۔

منگول اس طرح بے اوسان ہو کر بھاگے کہ انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ رد میں دوڑتے ہوئے وہ اپنے پڑاؤ سے بھی آگے نکل گئے۔ سالار فتح الدین نے لشکر کو واپسی کا اشارہ دیا ہی تھا کہ اس کا ہم پلہ عباسی فوج ہی کا ایک سردار مجاہد الدین ایبک گھوڑا دوڑاتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ امیر لشکر یا سالار تو فتح الدین ہی تھا لیکن مجاہد الدین کی حیثیت بھی کم نہ تھی۔

میں اس لئے مزید وہاں رک گئی کہ دونوں سرداروں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن سکوں۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سردار مجاہد کے بارے میں مجھے علم تھا کہ وہ سازشی وزیر اعظم ابن علقمی کے قریبی آدمیوں میں سے ہے۔

سردار مجاہد الدین ایبک نے فتح الدین کو مخاطب کیا۔ "یہ تم کیا غضب کر رہے ہو؟"

"کیوں، کیا ہوا؟" فتح الدین نے سوال کیا۔ "اس میں غضب کی کیا بات ہے؟"

"پہلے لشکر کو واپس ہونے سے روکو، پھر میں اپنی بات کی وضاحت کروں گا۔" سردار مجاہد نے زور دے کر کہا۔

چند لمحے کچھ سوچ کر سالار فتح الدین نے لشکر کو رک جانے کا اشارہ کیا، پھر سردار مجاہد سے بولا۔ "ہاں، اب کہو، تم کیا کہنا چاہتے تھے؟ میں کچھ نہیں پایا کہ تم نے لشکر کو واپسی سے کیوں رکوایا ہے!...... ہمیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ خون خوار منگول شکست کھا کر

بھاگ گئے۔''

''مجھے تم پر حیرت ہے اے فتح الدین!'' سردار مجاہد کہنے لگا۔ ''تا تمام فتح پر تم خدا کا شکر ادا کر رہے ہو!''

''تو پھر تمہارے خیال میں مجھے اور کیا کرنا چاہیے؟'' فتح الدین کے لہجے میں قدرے تلخی آ گئی تھی۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے!.... اگر میں تمہاری جگہ امیر لشکر ہوتا تو پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے بڑھتا۔''

''تم خوب جانتے ہو اے مجاہد! کہ میں نے آج اور اس سے پہلے بھی کئی مواقع پر امیر لشکر بننے پر فخر نہیں کیا۔ میں عباسی لشکر کے ہر سردار کو اپنے برابر درجہ دیتا ہوں۔ ان سرداروں میں خود تم بھی شامل ہو۔'' فتح الدین نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کر لی اور سمجھانے والے انداز میں مزید بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ موقع آگے بڑھنے کا نہیں ہے۔ منگول بھاگ رہے ہیں۔ انہیں بھاگ جانے دو۔''

''جس طرح تم نے اپنا خیال ظاہر کیا تو بقول تمہارے برابری کی بنیاد پر مجھے بھی یہ حق حاصل ہے۔''

''یقیناً!'' فتح الدین نے کہا۔

''تو پھر سنو کہ مجھے تمہارے خیال سے قطعی اتفاق نہیں۔'' سردار مجاہد نے بلا جھجک کہہ دیا۔ اس کی آواز میں غرور کی جھلک تھی۔ ''میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ یہاں سے واپس ہونے کی غلطی نہ کرو، منگولوں کے پیر اکھڑ گئے ہیں، ان پر سراسیمگی طاری ہو گئی ہے، لوہا تپ گیا ہے، جھپٹ کر ایک اور ضرب لگاؤ۔ اگر تم نے میرے مشورے پر عمل کیا تو پھر کبھی منگولوں کو عراق پر حملے کا حوصلہ نہ ہوگا۔''

''یہ غلطی ہوگی۔'' فتح الدین کا لہجہ دو ٹوک تھا۔ ''تم بھول رہے ہو کہ ہماری تعداد کم ہے اور منگولوں کی تعداد زیادہ۔ اگر ہم ان کا تعاقب کریں گے تو اندیشہ ہے کہ کہیں وہ پلٹ کر حملہ نہ کر دیں۔''

''یہ خیال عبث ہے۔'' سردار مجاہد نے پھر اختلاف کیا۔

میں سوچنے لگی کہ آخر سردار مجاہد الدین ایک لا حاصل بحث مباحثہ کیوں کر رہا ہے؟ یوں بھی

ابن علقمی کا آدمی ہونے کے سبب وہ میری نظر میں قابل اعتماد نہیں تھا۔ اسی غرض سے میں نے اس کے ذہن میں جھانکا تو چونک اٹھی۔ وہ بدبخت آدم زاد سردار مجاہد الدین عباسی لشکر کی اس فتح کو کسی بھی طرح شکست میں بدل دینا چاہتا تھا۔ مجھے اس کے دماغ کو ٹٹول کر کچھ اور بھی باتوں کا پتہ چلا کہ اس کا منصوبہ کیا ہے۔

یہ بھلا میں کس طرح قبول کر لیتی کہ جس فتح کے لئے اتنی تگ و دو کی تھی، وہ شکست میں بدل جاتی، اسی خیال کے تحت میں نے سردار مجاہد کو اپنی پراسرار قوتوں کے زیر اثر لانا چاہا، عین اسی لمحے میرے وجود کو زوردار جھٹکا لگا۔ اس کے ساتھ مجھے ایک اجنبی غیر انسانی آواز سنائی دی۔

''اے دینار! ہرچند کہ میں تجھے دیکھنے سے قاصر ہوں لیکن یہاں مجھے تیری موجودگی کا علم ہو گیا ہے۔ تُو مجھے ممکن ہے نہ جانتی ہو مگر میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''کون ہے تُو؟'' بے ساختہ میں نے پوچھ لیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ کون ہو سکتا ہے مگر حفاظتی نادیدہ حصار میں ہونے کے سبب میں خوفزدہ نہیں تھی۔

''تیرا عاشق، تیرا شیدائی، تیرا دیوانہ عکب.... عفریت عکب!.... وہی عکب کہ جس کی قید سے تیرا بڑا بھائی یوسف بھاگ نکلا.... ہاں میں وہی عکب ہوں کہ تجھے جس کی عراق آمد کا انتظار تھا۔ سو میں، عراق آ گیا ہوں، مجھ سے سودا کر لے، فائدے میں رہے گی۔''

''کیسا سودا؟'' میں نے دانستہ اس کافر عفریت عکب کے ارادے جاننے کی خاطر یہ سوال کیا، وہ اپنی خوفناک ہیبت کے ساتھ مجھے واضح طور پر نظر آ رہا تھا البتہ خود مجھے دیکھنے یا کوئی نقصان پہنچانے کا اہل نہیں تھا۔

میرا سوال سن کر عکب وحشیانہ انداز میں ہنس پڑا، پھر بولا۔ ''تو مجھے کیا یہ بھی بتانا پڑے گا کہ ایک سودائی کیا سودا کر سکتا ہے!''

''صاف بات کر اے عکب! کہ تیرا منشا کیا ہے؟'' میں نے بلا جھجک پوچھ لیا۔

''اگر سچ پوچھتی ہے تو میرا منشا، میرا مقصد، میری تمنا، میری خواہش صرف اور صرف تجھے حاصل کرنا ہے۔ میں تجھ سے یہی سودا کرنا چاہتا ہوں۔'' عکب نے جواب دیا۔ ''تجھ سے یہ سودا کرنے کے لئے میں ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔''

''اب دوسری بات سن کہ شاید اس وجہ سے تُو مجھے اپنا دشمن نہ بنانا چاہے۔ تُو مسلمان

ہے نا؟"

"ہاں....." میں نے جواب دیا۔ "اور مجھے اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے۔"

"اور غالباً تُو اپنے اس فخر کو برقرار بھی رکھنا چاہے گی؟" عکب کا لہجہ سخت تیز ہو گیا۔ "بہ حیثیت مسلمان تجھے آدم زاد مسلمانوں سے بھی ہمدردی ہونی چاہیے..... تو ہرگز مسلمانوں کی شکست و تباہی اور کافر آدم زادوں کو فتح یاب دیکھنا پسند نہیں کرے گی۔ بول میرا اندازہ درست ہے؟..... نہ جواب دے کہ مجھے خبر ہے، منگولوں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والی جنگ میں تُو نے کیا کردار ادا کیا ہے!..... سو اگر تُو چاہتی ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ فتح برقرار رہے اور انہیں شکست کا منہ نہ دیکھنا پڑے تو مجھ سے صلح کر لے..... تُو نے دیکھ لیا کہ آدم زاد سردار مجاہد کو اپنے اثر میں نہیں لے سکی۔ تجھے معلوم ہی ہو گا کہ میں کافر ہوں، مسلمان نہیں، ایسی صورت میں تُو ہی بتا، کیا میں کافروں کا ساتھ نہ دوں؟..... تُو نے صلح کر لی تو دوسری بات ہے۔"

"گویا یہ تیری دوسری دھمکی ہے!" میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا اور اپنی بات جاری رکھی۔ "اے عکب! خیر و شر کی جنگ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ میں بہ قید ہوش و حواس تیری ہر پیشکش کو مسترد کرتی ہوں۔"

"تو پھر اے دینار! تیرے اور میرے درمیان آج سے کھلی جنگ ہے۔ تُو اپنوں کے ساتھ رہ اور میں اپنوں کی مدد پر رہوں گا۔"

"اور وہ مہلت جس کا تُو نے ابھی ذکر کیا تھا؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"وہ مہلت برقرار رہے گی۔ کیونکہ اس کا تعلق صرف تجھ سے ہے، یہ معاملہ تیرے اور میرے درمیان ہے۔ کیا خبر کب تُو میری طرف پلٹ آئے اور اپنے عاشق عارج کو چھوڑ دے۔"

"یہ محض تمہاری خام خیالی ہے۔"

"اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔" عکب کی آواز معدوم ہوتی چلی گئی۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ وقتی طور پر ہی سہی، اس کافر عفریت نے میرے وجود کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ عکب اچانک عراق پہنچ جائے گا اور میری ساری محنت پر پانی پھیر دے گا۔ اس کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری۔ ایک بار پھر میں نے عباسی لشکر کے سردار مجاہد الدین کو اپنے اثر میں لینا چاہا مگر ناکام رہی۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر میں سالار فتح الدین داؤد کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کے دماغ میں سرگوشی کی۔ "سردار مجاہد کی بات نہ مان اور....."

ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ اس سے میرا ذہنی رابطہ منقطع ہو گیا۔ ظاہر ہے یہ رابطہ توڑنے والا عفریت عکب کے سوا اور کون ہوتا!..... کچھ دیر کو جیسے وقت ٹھہر سا گیا تھا اور مجھے اس پر حیرانی تھی۔ عباسی فوج کے دونوں اہم افسران ابھی تک ایک دوسرے سے بحث کئے جا رہے تھے۔

فتح الدین بول رہا تھا۔ "منگولوں کی عادت ہے کہ اگر مقابلہ سخت ہو تو میدان میں نہیں ٹھہرتے، بھاگ نکلتے ہیں اور بھاگے ہی چلے جاتے ہیں۔ اگر ان کا تعاقب کیا جائے تو وہ پلٹ پڑتے ہیں، ان کی غیرت جاگ اٹھتی ہے تو وہ موت کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔ یہ غیرت انہیں مارنے یا مر جانے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ ان حالات میں ہمیں ان کا تعاقب نہیں کرنا چاہئے، اس کے بجائے یہ ممکن ہے کہ ہم یہیں قیام کریں اور دیکھیں کہ وہ اگلا قدم کیا اٹھاتے ہیں!..... آیا وہ سیدھے خراسان جا کر رکتے ہیں یا ٹھہر کے دوبارہ ہم سے مقابلے کی تیاری کرتے ہیں۔"

یہ سن کر سردار مجاہد کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور اس کا لہجہ بھی بدل گیا۔ وہ کہنے لگا۔ "اگر تم منگولوں سے ڈر گئے ہو تو اور بات ہے، تم ان پر حملہ کرنا نہیں چاہتے تو نہ کرو لیکن میں اس سنہری موقع کو نہیں چھوڑ سکتا۔ تم بغداد واپس چلے جاؤ۔ میں حملہ کروں گا۔"

چند لمحے سکوت طاری رہا۔ اس عرصے میں میری نگاہ فتح الدین کے چہرے پر جمی رہی۔ لمحہ بہ لمحہ میں نے اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔ میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ کافر عفریت عکب نے اپنا آپ دکھا دیا ہے۔

معاً فتح الدین بول اٹھا۔ "تم نہیں مانتے، غلطی ہی کرنا چاہتے ہو تو..... تو اس غلطی میں تمہارے ساتھ میں بھی ہوں۔ میں قریش کی عورتوں کو یہ کہنے کا موقع نہیں دوں گا کہ اپنی جان بچا لی اور اپنے ایک بھائی کو موت کی آگ میں جھونک دیا۔ اس دن سے میں ڈرتا ہوں جب مجھے بزدلی کا طعنہ دیا جائے۔ میری قوم کو میری شجاعت پر فخر ہے اور میں بدنامی نہیں نیک نامی کے ساتھ مرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ ہماری موت ہمیں کشاں

کشاں منگولوں کے مقابل لے جا رہی ہے لیکن انسان مقصد کا تابع ہے۔ تقدیر سے مفر نہیں، چلو میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''خدا کا شکر ہے، تم مان گئے۔'' سردار مجاہد الدین نے یہ کہہ کر طویل سانس لیا، یوں جیسے اس کے سینے سے کوئی بوجھ ہٹ گیا ہو۔

فتح الدین نے لشکر کے امیر کی حیثیت سے سپاہیوں کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔

جب ان دونوں سرداروں کے درمیان بحث جاری تھی، جاں بحق ہونے والوں کی تدفین کر دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ زخمیوں کی مرہم پٹی بھی ہو چکی تھی۔ طبی عملہ جنگ کے دوران میں بھی اپنے فرائض پوری ذمے داری سے ادا کرتا رہا تھا۔

چند سو سپاہیوں کے مارے جانے سے عباسی لشکر کی تعداد پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا تھا۔

ذرا ہی دیر میں لشکر نے وہاں سے کوچ کیا اور ممکنہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ میں بھی لشکر کے ساتھ ساتھ تھی کہ عاقبت نااندیشی کا انجام دیکھ سکوں۔ بغداد واپسی کا ارادہ فی الحال میں نے ملتوی کر دیا تھا۔

چند میل سفر کرنے کے بعد عباسی لشکر کو غبار نظر آیا۔ میں حقیقت حال سے واقف تھی اس لئے ایک اور کوشش سے گریز نہ کیا، سالار فتح الدین کو میں نے آگاہ کر دیا کہ غبار کے پیچھے کیا ہے۔ اس کے دماغ سے میرا رابطہ چند لمحوں سے زیادہ قائم نہ رہ سکا تھا۔

''اے مجاہد! اس غبار کے دامن میں منگول سپاہ ہے۔'' سالار فتح الدین نے اپنے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلنے والے دوسرے گھڑ سوار سردار کو مخاطب کیا۔ ''منگولوں کی فوج واپس جا رہی ہے، اب بھی موقع ہے کہ ہم ان کا پیچھا نہ کریں۔''

اس پر سردار مجاہد بگڑ کر بولا۔ ''تو پھر کیا کریں؟''

''واپس چلیں اور منگولوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔'' فتح الدین نے وہی جواب دیا جو میں نے اسے سمجھایا تھا۔

''تم نے پھر وہی بحث شروع کر دی!'' سردار مجاہد قدرے تلخی سے کہنے لگا۔ ''میں کہتا ہوں، یہی ضرب لگانے کا وقت ہے۔''

اسی لمحے کہیں دور سے مجھے عفریت عکب کے ہنسنے کی آواز آئی اور میں اس ہنسی کا مطلب سمجھ گئی۔ عکب مجھے دکھائی نہیں دیتا تھا وہ تو پھر عفریت تھا، مجھ سے طاقت و قوت

میں کہیں زیادہ، جب میں دور رہنے کے باوجود اپنی پراسرار جناتی صفات سے کام لے سکتی تھی تو اس عفریت کے لئے یہ کیا مشکل تھا! اس موقع پر اس کی موجودگی ضروری نہیں تھی۔

سالار فتح الدین کو آخر کہنا ہی پڑا۔ ''چلو یا مقدر یا نصیب۔''

یہ آدم زاد چلتے رہے، یہاں تک کہ منگول لشکر کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں منگولوں نے بھی سنیں اور پلٹ کر انہیں دیکھا، اسی وقت ایک غیر انسانی آواز سنائی دی۔ میں اس آواز کو پہچان گئی۔ یہ عکب کی آواز تھی۔ اس نے منگولوں کو بلند آواز میں آگاہ کیا۔ ''مسلمان تمہارے تعاقب میں چلے آ رہے ہیں!''

منگول سرداروں نے اس پر غور نہیں کیا کہ انہیں تعاقب سے مطلع کرنے والی آواز کس کی تھی، انہوں نے صرف تصدیق کی اور پھر اپنے فوجیوں کو مخاطب کیا کہ اے آل تموچن (چنگیز خان کا اصل نام تموچن ہی تھا) مسلمان یہ سمجھ کر کہ ہم بھاگے جا رہے ہیں ہمارے تعاقب میں آ نے ہیں۔ ہمارے لئے یہ بڑی ذلت کی بات ہوگی کہ ہم مسلمانوں اور موت کے خوف سے بھاگ جائیں۔ اس ذلت سے تو مر جانا اچھا ہے۔ طبل جنگ بجاؤ!''

اپنے سرداروں سے یہ سنتے ہی منگول سپاہیوں نے طبل جنگ بجا دیا۔ یہ آواز سننے کے ساتھ منگول رک گئے۔ تمام لشکر ایک دم مسلمانوں کی طرف گھوم گیا۔

میں نے منگولوں کے لشکر میں ہلاکو خاں کو تلاش کیا۔ وہ لشکر کے درمیان میں تھا۔ وہ طبل جنگ کی آواز سن کر کہنے لگا۔

''معلوم ہوتا ہے مسلمان تعاقب میں آ رہے ہیں!'' وہ نصیر الدین طوسی سے مخاطب تھا جو قریبی گھوڑے پر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

ہلاکو خاں کے وزیر نصیر الدین طوسی نے ہرکاروں کو بھیج کر فوری تصدیق کرائی۔

حقیقت حال واضح ہوتے ہی ہلاکو خان کے چہرے پر تناؤ پیدا ہو گیا اور وہ پُر جوش آواز میں بولا۔ ''ہم بھگوڑے نہیں کہلائیں گے۔ اس بے عزتی سے بہتر موت ہے۔ تموچن کی اولاد یہ رسوائی مول نہیں لے گی۔'' پھر اس نے مزید بلند آواز میں اپنے سپاہیوں کو مخاطب کیا۔ ''اے وہ منگول قوم جو ڈرنا نہیں جانتی جو مارنا اور مرنا ہی جانتی ہے، موت کی پرواہ کئے بغیر لڑنے کو تیار ہو جا!...... اے منگولو! آج تمہاری ناموری خاک میں ملی جا رہی ہے، یاد کرو کہ تم اپنے مویشیوں کے لئے چراگاہوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ پھر

ٹیلے آسمان کی مقدس روح نے تمہارے دن پھیر دیئے۔ سورج دیوتا تم پر مہربان ہو گیا، اس نے تمہیں سرسبز زمینیں دیں، نہروں والی زمینیں تمہیں ملیں، تمہیں دولت ملی، کیا تم یہ سب چھوڑ کر پھر سے پہاڑوں میں پناہ لو گے؟..... نہیں، ہرگز نہیں! دشمنوں کے سروں کی فصل کاٹ دو، ان کی لاشیں بچھا دو..... حملہ کرو، حملہ!"

جواب میں منگول سپاہیوں نے زبردست نعرے لگائے۔ ہلاکو خان کے الفاظ نے ان کے حوصلے بلند کر دیئے۔

کچھ ہی دیر میں وحشی منگول بھوکے بھیڑیوں کی طرح مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ اپنے منہ سے عباسی سپاہیوں کو مرعوب کرنے کے لئے وہ بھیانک آواز نکال رہے تھے۔ یہ ان کا قدیم اور آزمودہ حربہ تھا۔

انہوں نے مسلمانوں کو تلواروں کی باڑھ پر رکھ لیا اور پہلے ہی حملے میں عباسی لشکر کی پہلی صف کو ختم کر دیا۔ ان میں یہ عزم، یہ ولولہ، یہ ہمت کیسے پیدا ہو گئی، اس کی کوئی ایک وجہ نہیں تھی۔ انہی وجوہ میں شر کی ایک پراسرار قوت بھی شامل تھی، اس نے مسلمانوں کے حوصلوں کو پست اور کافروں کو ان پر غالب آنے میں بڑی مدد کی۔ یہ مجسم شر کافر عفریت عکب تھا جسے میں نے میدانِ جنگ میں تیزی کے ساتھ اِدھر سے اُدھر آتے جاتے اور مسلمانوں کو ڈرانے کے لئے دہشت ناک آوازیں نکالتے سنا اور دیکھا۔

میرا یہ دیکھنا عبرت کا مقام ہی تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ عباسی سپاہی گھبرائے ہوئے تھے، ناگہانی حملے سے ان کے حواس جیسے قابو میں نہ رہے۔ یہ وہی تھے جنہوں نے منگولوں کو شکست فاش دی تھی۔ کچھ دیر کو یوں لگا کہ عباسی لشکر کے سپاہی ہمت ہار دیں گے، مگر وہ جلد ہی سنبھل گئے۔ وہ اپنے ہی ساتھیوں کی لاشوں کے اوپر سے گزرتے ہوئے منگولوں پر پل پڑے۔ اس جوابی حملے میں متعدد منگول سپاہی مارے گئے۔ اس کے بعد باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔

تلواریں بجلیوں کی طرح کوندنے لگیں اور آدم زاد ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے لگے۔ ہر ہتھیار استعمال ہوا، سب حربوں کو آزمایا گیا، دھڑوں سے سر جدا ہونے لگے اور گویا خون کی بارش ہونے لگی، سرفروش خون سے ہولی کھیلنے لگے۔

میرا تجزیہ درست تھا اور سالار فتح الدین نے بھی ٹھیک ہی کہا تھا، منگول اس ننگ کو برداشت نہ کر سکے کہ مسلمانوں کے تعاقب کرنے سے ڈر کے بھاگ جائیں۔ اسی سبب وہ پلٹ کر بڑی شدت سے حملہ آور ہوئے۔ انہوں نے طے کر لیا کہ یا تو فتح حاصل کرنی ہے یا مر جانا ہے۔ رفتہ رفتہ ان کے حملے اس قدر سخت ہوئے کہ عباسی فوجیوں کے قدم نہ جم سکے۔ وہ پیچھے ہٹے اور پھر انہوں نے پسپائی اختیار کر لی۔

سردار مجاہد الدین کی آرزو پوری ہونے کا وقت قریب آ گیا۔ ابن علقمی کا پروردہ یہی تو چاہتا تھا، لیکن ابھی سالار فتح الدین زندہ تھا، منگول بڑھتے چلے آ رہے تھے اور عباسی سپاہی پیچھے ہٹ رہے تھے۔

فتح الدین واقعی ایک جری آدم زاد تھا، اسے اپنے سپاہیوں کو پسپا ہوتے دیکھ کر جوش آ گیا۔ اس نے منگولوں پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔ اس کے ارد گرد چند سپاہی تھے، جنہیں وحشی منگولوں نے اپنی تلواروں اور نیزوں سے چھید ڈالا۔ نتیجہ یہ کہ فتح الدین تن تنہا رہ گیا۔ لیکن موت کو بے حقیقت جاننے والے جان کی بازی اتنی جلدی نہیں ہارتے۔

اکیلا ہونے اور دشمنوں کے نرغے میں آ جانے کے باوجود فتح الدین اپنی دلیری کے جوہر دکھاتا رہا۔ اس نے کئی منگول افسران کو مار ڈالا، مگر خود بھی زخمی ہو گیا۔ کئی زخم گہرے تھے جن سے خون بہنے لگا۔ اس پر بھی فتح الدین زخموں کی پروا کئے بغیر لڑتا رہا۔ جب وہ ایک منگول سردار سے بھڑا ہوا تھا تو دشمنوں نے ایک ساتھ چاروں طرف سے ہلہ بول دیا۔ فتح الدین نے اس منگول سردار کو تو ٹھکانے لگا دیا مگر خود بھی زندہ نہ رہ سکا، کئی تلواریں اور کئی نیزے بیک وقت اس کے جسم میں اتر گئے۔

میدانِ جنگ میں ایک مرتبہ پھر ایک غیر انسانی آواز گونجنے لگی۔ "مسلمانوں کا امیر لشکر فتح الدین داؤد مارا گیا.....!"

یہ صدا کس نے کیوں لگائی مجھے معلوم تھا۔ کافر عفریت عکب اپنے مقصد میں کامیاب رہا، مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ سردار مجاہد بھاگنے والوں میں سب سے آگے تھا۔

منگولوں نے تعاقب کر کے بہت سے عباسی سپاہیوں کو موت کی نیند سلا دیا، سو یوں عباسی لشکر کی فتح شکست میں بدل گئی۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر لے جا سکے۔ میرے نزدیک فتح الدین کو منگولوں نے نہیں، اس کی شرافت نے مارا تھا۔

اس وقت سورج غروب ہونے کے قریب تھا کہ جب میں نے اپنے زخم زخم وجود کو سمیٹا اور بغداد کی طرف پرواز کرنے لگی۔ شدید ملال کی کیفیت کے سبب میری رفتار پرواز بہت دھیمی تھی۔

میں بصرہ شہر کے اوپر سے گزر رہی تھی کہ چونک اٹھی، اچانک ہی مجھے عفریت عکب کی آواز سنائی دی۔ "اے دینار! تو نے جو کچھ دیکھا، کم دیکھا۔ مسلمان آدم زادوں کا اتنا خون بہے گا کہ تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہ تباہی رک سکتی ہے اگر تو مجھے اپنا دشمن بنانے کی بجائے دوست بنالے۔"

"اے عکب! اے ظالم اور اے کافر عفریت! میں تجھ پر لعنت بھیجتی ہوں۔" میں تقریباً چیخ اٹھی۔

"تو پھر ادھر دیکھ اے دینار!"

جس طرف سے عکب کی آواز آئی تھی، میں نے ادھر نگاہ کی تو مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے عفریت عکب کی گرفت میں عارج کو دیکھا۔

اسی لمحے ایک آشنا آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ یہ شفیق و مہرباں آواز عالم سوما کی تھی۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"اے میری بچی، اے دینار! تو جو کچھ دیکھ رہی ہے، نظر کا دھوکا ہے۔ اس منظر کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ کافر عفریت عکب نے اپنی سحر وافسوں کی قوتوں کو بروئے کار لا کر وقتی طور پر تجھے فریب نظر میں مبتلا کر دیا ہے۔ عارج ہرگز اس کی گرفت میں نہیں۔ وہ بہ خیریت بغداد میں ہے۔ تجھے میں نے جادو کے توڑ کی خاطر جو قرآنی آیات تعلیم کی تھیں، انہیں پڑھ! عکب کی دھمکیوں میں نہ آ۔"

عالم سوما کی آواز سن کر میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا مگر عالم سوما مجھے نظر نہ آیا۔ میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ عالم سوما نے اپنی جناتی صفات کے ذریعے مجھ تک صرف اپنی آواز پہنچائی ہے۔ اس کی آواز سن کر مجھے یہ اطمینان بھی ہوا کہ وہ میری طرف سے غافل نہیں ہے۔ وہ منظر جو ابھی تک فضا میں موجود تھا اس کی اصلیت مجھ پر واضح ہو چکی تھی۔ سو میرے اعصاب قابو میں آ گئے۔ اسی بناء پر میں نے فوری طور پر اس جادو کا توڑ بھی نہ کیا جس پر عکب اترا رہا تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کافر عفریت

مجھے مزید دھمکانے کے لئے اور کیا قدم اٹھاتا ہے! مجھے یہ بھی یقین تھا کہ عالم سوما کی آواز کافر عفریت نے نہیں سنی ہوگی۔

میں نادیدہ حصار میں تھی۔ عکب اس لئے نہ تو مجھے کوئی نقصان پہنچا سکتا تھا نہ میرے وجود کو دیکھنے کا اہل تھا۔ اس کے برعکس میں اسے دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں کے توقف سے عکب نے مجھے پھر مخاطب کیا۔ "بول اے دینار! میں تیرے اس عاشق عارج کو مار ڈالوں؟"

ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے عارج کی چیخ سنی۔ اس مرتبہ مجھے قطعی گھبراہٹ نہیں ہوئی۔ فریب نظر کے ساتھ عکب میری سماعت کو بھی دھوکا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ بے خبری یا حقیقت کا علم نہ ہونے پر صورت حال دوسری ہوتی۔

"مجھے اس عفریت سے بچالے اے دینار!" عارج کی آواز بھی مجھے سنائی دی۔ "تو اس کی ہو جا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

ظاہر ہے عارج مرتے مر جاتا مگر یہ الفاظ کبھی ادا نہ کرتا۔ فریب سماعت کا یہ کھیل عفریت عکب ہی کھیل رہا تھا۔

"تو اپنے عاشق کی آواز سن رہی ہے اے دینار؟" عکب مجھ سے مخاطب ہوا۔ اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ اب تیرے ہاتھ ہے۔"

"تو پھر میں فیصلہ کئے دیتی ہوں۔" میں نے جواب دیا اور تعلیم کردہ قرآنی آیات پڑھنا شروع کر دیں۔

مجھے اس سے قبل یہ پتہ نہیں تھا کہ قرآنی آیات پڑھنے کا اس کافر عفریت پر کیا ردعمل ہوگا؟ ذرا ہی دیر کے بعد اسے میں نے شعلوں میں گھرے دیکھا اور وہ دردناک انداز سے چیخنے لگا۔ پھر اسے میں نے آسمان کی طرف بھاگتے اور تیزی سے بلند ہوتے دیکھا۔ شعلے اب بھی اس کے تعاقب میں تھے۔ عارج کا اب کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ عکب کا جادو بے اثر ہو چکا تھا۔

ہم جنات کا خمیر ہرچند کہ آگ ہی سے اٹھا ہے لیکن آگ ہمیں جلاتی ہے۔ عکب شعلوں میں گھر کے اسی لئے چیختا ہوا بھاگا تھا۔ اس کی واضح مثال آدم زاد ہیں۔ ان آدم زادوں کو مٹی سے بنایا گیا ہے مگر سخت اور ٹھوس مٹی کے ڈھیلے، مٹی ہی سے بنے آدم زادوں پر برسائے جائیں تو یقیناً انہیں شدید اذیت ہوگی۔ اس طرح ان کی زندگی خطرے میں بھی

پڑسکتی ہے۔ سو عکب نے اپنی زندگی کے لئے خطرہ محسوس کیا تو فرار کی راہ اپنائی۔ مجھے اس نے جو دھمکی دی تھی، اسے میری طرف سے اس دھمکی کا عملاً جواب مل گیا تھا۔

ابھی جو واقعہ پیش آیا، اس سے مجھ پر یہ عقدہ بھی کھلا کہ جادو کے توڑ سے جادو کرنے والے کو نقصان ہوتا ہے۔ سحر دانسوں کے ذریعے مخلوقِ خدا کو آزار پہنچانے والا خود بھی زد میں آسکتا ہے۔

صبح سویرے میں بغداد سے چلی تھی اور اب ہر طرف تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ شہر بصرہ سے بغداد پہنچتے ہی میں نے ولی عہد ابوبکر کے محل کا رخ کیا۔ ابوبکر کے انسانی قالب میں عارج میرا ہی منتظر تھا۔ اس کا اندازہ مجھے عارج کے چونک اٹھنے سے ہوا۔ لازماً اس نے میرے وجود کی مخصوص خوشبو محسوس کر لی تھی۔ فردوس کو میں نے عارج کے ساتھ ہی بیٹھے دیکھا۔ کسی تاخیر کے بغیر فوراً ہی میں، فردوس کے جسم میں اتر گئی۔ ابوبکر اور فردوس کے انسانی پیکروں کے سوا وہاں صرف چند کنیزیں تھیں جو ان دونوں کا ہر حکم بجا لانے کے لئے مستعد تھیں۔ فردوس کے قالب میں داخل ہو کر جیسے ہی مجھے قرار آیا میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ عارج نے بھی میری تقلید کی۔ ہم دونوں محل کے مخصوص حصے میں آ گئے۔ وہاں ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کوئی نہ سن پاتا۔

تنہائی میسر آتے ہی عارج نے مجھ سے بے چین آواز میں پوچھا۔ ”ہمارا عباسی لشکر جیت گیا نا اے دینار؟“

”ہاں جیت گیا...“ میں نے یہ کہہ کر جنگ کے پہلے حصے کی پوری روداد بیان کر دی۔ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ عارج کو ایک تو پوری بات کا پتہ چل جائے، دوم فوری طور پر صدمہ نہ ہو۔ اس کی جذباتی وابستگی سے میں آگاہ تھی۔ اس کا سبب عارج کا انسانی قالب تھا۔

میں ذرا دیر کو چپ ہوئی تھی کہ عارج پُرجوش آواز میں کہنے لگا۔ ”مجھے خبر تھی اے دینار کہ تیری جدوجہد رائیگاں نہیں جائے گی۔ ہماری فوج کو فتح حاصل ہوگی اور منگول ہار جائیں گے۔“

”کاش اے عارج، ایسا ہی ہوتا۔“ میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”تو... کیا مطلب اے دینار؟“ وہ مجسم سوال نظر آنے لگا۔ ”تو نے ہی تو بتایا ہے ابھی

کہ ہلاکو خاں شکست کھا کر بھاگ گیا، پھر؟“

”پھر کیا ہوا؟ ... یہ بڑی ہی دردناک کہانی ہے۔ پہلے تو عباسی لشکر کی فتح کو شکست میں بدلنے کا ماجرا سن لے، پھر میں تجھے اور بہت کچھ بتاؤں گی۔“ میں نے عارج کو ہمہ تن گوش دیکھ کر بات شروع کر دی۔ دانستہ اس پورے واقعے میں عفریت عکب کے ذکر سے میں نے گریز کیا۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ عارج کے اعصاب پر ایک دم بوجھ ڈالنا میرے نزدیک مناسب نہیں تھا۔ وہ الجھ کے رہ جاتا اور پھر نہ جانے کیا صورت بنتی! اس کے ہونٹوں سے ہنسی تو جیسے پہلے ہی روٹھ گئی تھی۔

عارج نے میری پوری بات سن کر توقع کے مطابق سوال کیا۔ ”لیکن اے دینار! تو نے مداخلت کیوں نہیں کی؟ تو اپنی پراسرار جناتی قوتوں کو بروئے کار لا کر سردار مجاہد الدین ایبک کو غلط قدم اٹھانے سے روک دیتی۔ پھر یہ کہ امیر لشکر تو سالار فتح الدین داؤد تھا۔ اس نے اپنے اختیارات کے استعمال سے گریز کیوں کیا؟“ عارج کے لہجے میں تشویش کے ساتھ گہرے دکھ کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔

”تیرے دوسرے سوال کا جواب میں پہلے دوں گی اے عارج!“ میں بولی۔ ”کچھ آدم زاد انتہائی نیک اور شریف ہوتے ہیں۔ سالار فتح الدین بھی انہی میں سے تھا۔ عموماً ایسا مزاج رکھنے والے زبردستی اپنی رائے کسی پر مسلط نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ ایسے افراد تفریق سے بھی بچتے ہیں۔ سالار فتح الدین نے دلائل کے ذریعے سردار مجاہد کو کس کس طرح قائل کرنا چاہا، تجھے میں بتا چکی ہوں۔ غالباً اس نے اپنی شرافت کے سبب اور اس خیال سے کہ عباسی لشکر میں پھوٹ نہ پڑے، سردار مجاہد کی بات مان لی۔ اپنے اختیارات اس نے اسی لئے استعمال نہیں کئے۔ کسی کے پاس اختیار ہو اور وہ اپنی دانست میں کسی نیک مقصد کی خاطر اختیار استعمال نہ کرے، یہی شاید کردار کی بڑائی ہے۔“

”مگر کردار کی اس بڑائی کا انجام کیا ہوا اے دینار، یہ بھی تو دیکھ!“ عارج زخمی آواز میں کہنے لگا۔

”اب وہ باتیں بھی سن اے عارج کہ جو بہ وجوہ میں نے اب تک تجھ سے کہیں۔“ میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”تیرا یہ خیال غلط ہے کہ میں نے مداخلت نہیں کی۔“ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے میری نظر عارج کے انسانی قالب کے چہرے پر تھی۔

عارج کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار ابھرے اور پھر میرے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔ "تُو نے مداخلت کی تھی!..... یہ تو بڑی ہی حیران کن بات ہے کہ پھر بھی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔"

"اے عارج! اس کی وجہ سنے گا تو اچھل پڑے گا۔" میں نے تمہید باندھی۔ پھر میں نے رفتہ رفتہ کافر عفریت عکب کے بارے میں عارج کو سب کچھ تفصیل کے ساتھ بتا دیا۔ وہ تصویرِ حیرت بنا بیٹھا رہا۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد عارج کی زبان کھلی۔ "پھر تو اے دینار، تیرا کوئی قصور نہیں۔"

خلافِ توقع عارج نے خود کو بہت جلد سنبھال لیا۔ پھر بھی اس کے انسانی قالب کا اثر نمایاں تھا۔ مجھے اس کا ایک ہی حل نظر آیا اور میں نے عارج سے کہا۔

"کیوں نہ ہم چند روز بابل کے کھنڈرات میں رہیں؟..... کچھ دن انسانی قالبوں کو چھوڑ دیں تو اچھا ہے۔"

"ہاں ممکن تو ہے اے دینار!" عارج نے طویل سانس لیا۔ "غالباً اس طرح کافر عفریت کے سحر و افسوں سے تُو محفوظ رہنا چاہتی ہے۔"

"یہ بھی ہے اور اس کے علاوہ ایک اور اہم وجہ ہے۔" میں بولی۔

"وہ کیا؟" عارج نے پوچھا۔

عارج سے میں نے حقیقت نہیں چھپائی اور صاف بات کی۔ "کچھ دن سے میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ تجھ پر تیرے انسانی قالب ابوبکر کی صفات غالب آتی جا رہی ہیں۔ میں اسے بہتر نہیں سمجھتی۔ چند روز تُو اس انسانی قالب سے دور رہے گا تو امکان ہے تیری فطری خوش مزاجی لوٹ آئے اور تُو آدم زادوں کے معاملات میں زیادہ ملوث نہ ہو۔"

"تو پھر کیا ضروری ہے اے دینار کہ ہم بابل کے کھنڈرات ہی میں رہیں؟ کسی اور زمانے میں کیوں نہ چلیں؟"

"بغداد کے حالات ان دنوں اسی کا تقاضا کرتے ہیں اے عارج کہ ہم طویل عرصے کے لئے کہیں نہ جائیں۔ چند روز کی بات اور ہے۔"

"پھر یہ بھی نہ بھول کہ ہمارے لئے ان کھنڈرات سے زیادہ محفوظ جگہ اور کوئی نہیں۔"

عارج میری بات مان گیا۔ ہم دونوں اسی رات بغداد سے بابل کے کھنڈرات میں پہنچ

گئے۔ وقتی طور پر ہم نے اپنے انسانی قالب چھوڑ دیئے تھے۔ ہمیں کتنے دن کھنڈرات میں گزارنے تھے، میں اس کا تعین بھی کر چکی تھی۔

عارج نے طبیب ہاسہ بن ہیم کی قیام گاہ کا رخ کیا اور میں نے اپنے والدین کی سکونت گاہ کو دھیان میں رکھا۔ دوسرے ہی پل میں اپنی ماں طرطبہ کے سامنے تھی۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

"میری بچی..... میری دینار!" کہہ کر وہ مجھے پیار کرنے لگی۔

ایسی راحت، ایسا سکون میں نے کبھی اور کہیں محسوس نہیں کیا جیسا سکون مجھے اپنی ماں کی آغوش میں ملا۔

اپنے والد اقصم سے میں نے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھا، وہ بھی وہیں موجود تھا۔ پہلے کی نسبت مجھے وہ کسی قدر کمزور لگا۔ "میں ٹھیک ہوں میری بیٹی!" اس نے مجھے اطمینان دلایا۔ "اللہ کا کرم ہے کہ اب تک جس نے تیرے باپ کو کسی کا محتاج نہیں کیا۔ اب تک اپنے سارے کام میں خود ہی کرتا ہوں۔ پہلے جب تُو آئی تھی تو طبیب ہاسہ کی دوا چل رہی تھی لیکن اب افاقہ ہے۔"

عشاء کا وقت ہو رہا تھا، سو میرا باپ نماز پڑھنے چلا گیا۔

"یوسف کی بیوی خرتاء سے مل کر میں ابھی آتی ہوں اے ماں!" میں جانے کے لئے اٹھی۔

"وہ تجھے شاید ہی ملے۔" ماں نے بتایا۔

"کیوں، اے ماں؟" میں نے دریافت کیا۔

"آج کل اس کا زیادہ تر وقت اسی قبیلے کی ایک کافر جن زادی آتون کے ساتھ گزرتا ہے۔" ماں نے جواب دیا۔

"پھر بھی دیکھ لینے میں کیا مضائقہ ہے۔" میں بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

خرتاء مجھے اپنے سکونتی حصے میں نہیں ملی البتہ اپنے بڑے بھائی یوسف سے میری ملاقات ہو گئی۔

"یہ آتون کون ہے اے میرے بھائی یوسف؟" میں نے سوال کیا۔

"تو ماں نے تجھے بھی اس کے متعلق بتا دیا!" یوسف کے لہجے میں قدرے تلخی تھی۔

"ماں تو یہ چاہتی ہے کہ خرقاء کہیں نہ آئے جائے، کسی سے بھی نہ ملے جلے۔ بڑی مشکل سے تو خرقاء کا یہاں دل لگا ہے۔ کیا میں اس پر پابندیاں لگا کر بڑی اچاٹ کر دوں؟...... آتون ایک جن زادی ہی ہے جو کھنڈرات کے مغربی حصے میں رہتی ہے۔ خرقاء اکثر اسی سے ملنے چلی جاتی ہے یا آتون ادھر نکل آتی ہے۔ تجھے تو معلوم ہے کہ ہمارے قبیلے میں کافر جنات بھی ہیں۔ ماں کو دراصل یہی اعتراض ہے کہ آتون ایمان والوں میں سے نہیں، پھر بھی خرقاء سے ملتی ہے۔"

میں نے یوسف کو عکب کے بارے میں بتایا تو وہ پریشان ہو گیا۔

"ان حالات میں تو خرقاء کا کھنڈرات کی حدود سے باہر نکل کر گھومنا پھرنا قطعی مناسب نہیں۔" یوسف کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"تو کیا تیری بیوی نے اپنے گرد نادیدہ حفاظتی حصار نہیں کھینچا؟" میں نے معلوم کیا۔

"کہا تو تھا میں نے اس سے۔" یوسف نے جواب دیا۔ "لیکن اس نے کوئی خاص پروا نہیں کی۔ اسے اب میں حصار کھینچنے کی تاکید کر دوں گا۔ جب میں اسے بتاؤں گا کہ عفریت عکب، عراق آ چکا ہے تو وہ خود محتاط ہو جائے گی۔"

مزید کچھ دیر اپنے بڑے بھائی سے گفتگو کر کے میں اپنی ماں کے پاس واپس آ گئی۔

دوسرے دن صبح خلافِ توقع یوسف کی تیز آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ وہ ماں سے کہہ رہا تھا۔ "اے ماں! میں تجھے بتا تو چکا ہوں کہ خرقاء نے مجھ سے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے میں یہ نتیجہ نکالتا، وہ رات کو نہیں لوٹے گی۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ یوسف مجھے فکر مند نظر آیا۔ بات بھی فکر کی تھی۔ میں نے اس سے براہِ راست سوال کیا۔ "خرقاء رات کو نہیں لوٹی؟"

"نہیں۔" یوسف نے بتایا۔ "خاصی رات تک تیرے آنے کے بعد اس کا میں نے انتظار کیا، پھر میری آنکھ لگ گئی۔"

"تجھ سے وہ کہہ کر گئی تھی کہ کہاں جا رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہ میں نے جاتے وقت اس سے کچھ پوچھا، نہ اس نے بتایا۔" یوسف نے جواب دیا۔ "وہ بس آتون کے پاس آتی جاتی تھی۔"

"تُو نے آتون سے جا کر معلوم کیا، خرقاء کے بارے میں؟" میں نے سوال کیا۔

"اس کا بھی کل رات سے کچھ پتہ نہیں۔" یوسف بولا۔ "کھنڈرات میں خرقاء اور آتون کو میں تلاش کر چکا ہوں۔ وہ دونوں یہاں نہیں ہیں۔ اب اس کی ایک ہی صورت ہے کہ خرقاء کو باہر ڈھونڈا جائے۔ اس سلسلے میں خرقاء کے وجود کی مخصوص خوشبو میری......"

"نہیں اے میرے بھائی یوسف!" میں بول اٹھی۔ "تُو خرقاء کو ڈھونڈنے کھنڈرات سے باہر نہیں جائے گا۔ اسے میں تلاش کروں گی۔ اس کی وجہ بھی میں تجھ سے نہیں چھپاؤں گی۔ آ میرے ساتھ!"

ماں نے ہمیں ٹوکا۔ "کیا بات ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہو؟"

"کوئی ایسی خاص بات نہیں اے میری ماں!" میں نے اسے سمجھایا۔ "آتی ہوں میں ابھی!" یہ کہہ کر میں کھنڈرات کے اس حصے میں نکل آئی۔ غنیمت یہ تھا کہ میرا باپ اخضم فجر کی نماز پڑھنے گیا تھا ورنہ اسے مطمئن کرنا میرے لئے مشکل ہو جاتا۔

ٹوٹی ہوئی ایک دیوار کی آڑ میں کھڑے ہو کر یوسف مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہاں اے دینار، تُو مجھے کیا بتا رہی تھی؟"

"اے یوسف! اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ تیری بیوی خرقاء کی گمشدگی میں عفریت عکب کا ہاتھ ہو۔ کافر جن زادی آتون کے ذریعے وہ یہ کھیل بہ آسانی کھیل سکتا ہے۔"

"تُو نے تو یہ خدشہ ظاہر کر کے مجھے اور بھی ڈرا دیا اے دینار!"

"ڈرنے یا خوف کھانے کی اس میں کوئی بات نہیں۔" میں نے یوسف کو دلاسا دیا۔ "تیری بیوی خرقاء کہیں بھی ہوئی ان شاء اللہ میں اسے ڈھونڈ لاؤں گی۔ تجھے میں اس لئے باہر جانے سے روک رہی ہوں کہ تُو بھی عکب کے ممکنہ جال میں نہ پھنس جائے۔ کیا پتہ وہ اس طرح تجھے بھی اس محفوظ پناہ گاہ سے باہر نکالنا چاہتا ہو۔"

"لیکن اے دینار، جو خطرات میرے لئے ہیں تجھے بھی تو پیش آ سکتے ہیں۔"

"میرا معاملہ تجھ سے بہت مختلف ہے اے یوسف! مجھے ان شیطانی قوتوں سے نمٹنے کا خاصا تجربہ ہے۔"

تھوڑی سی بحث و تکرار کے بعد یوسف نے میری بات مان لی۔ میرے حافظے میں خرقاء کے وجود کی خوشبو محفوظ تھی۔ سو میں فوری طور پر بابل کے کھنڈرات سے روانہ ہو گئی۔ مجھے

خرقاء تک پہنچنے کی اتنی جلدی تھی کہ عازج کو بھی کچھ نہ بتا سکی۔

اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے خرقاء کو بغداد کے قدیم قبرستان میں دیکھا۔ وہ کسی بچے کی قبر کے پاس کھڑی کچھ پڑھ رہی تھی۔ قبر کی مٹی سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ قبر نئی بنی ہے۔ خرقاء کے ساتھ ہی ایک جن زادی بھی تھی۔ اسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا اس کے باوجود اندازہ لگالیا کہ وہ کافر جن زادی آتون ہی ہوسکتی ہے۔ میں نے اندھیرے کی چادر اوڑھ رکھی تھی تاکہ کسی کو دکھائی نہ دوں۔

کچھ ہی فاصلے پر قبرستان کا دروازہ تھا۔ اس طرف چند قدم آدم زاد ادھر آتے دکھائی دیئے تو کافر جن زادی چونکی۔

"اے خرقاء! بس کر، ہمارے پاس عمل پورا کرنے کے لئے ابھی دو راتیں اور باقی ہیں۔ چٹکی بھر قبر کی مٹی اٹھالے اور چل یہاں سے۔ کیونکہ آنے والے آدم زادوں کا رخ اسی جانب ہے۔"

خرقاء کچھ پڑھتے پڑھتے رک گئی اور پھر کافر جن زادی کے ساتھ فضا میں بلند ہوگئی۔ اس سے پہلے خرقاء نے تازہ قبر سے چٹکی بھر مٹی اٹھالی تھی۔ خرقاء اور اس کافر جن زادی کا رخ کیونکہ بابل کے کھنڈرات ہی کی طرف تھا اس لئے خود کو میں نے ظاہر کرنا ضروری سمجھا۔ میرا جو مقصد تھا، خود بہ خود پورا ہو رہا تھا۔

بابل کے کھنڈرات میں داخل ہو کر جب کافر جن زادی رخصت ہوگئی تو میں نے اپنے اوپر سے اندھیرے کی چادر اتار دی۔ "اے دینار! تُو؟" خرقاء چونک اٹھی۔

"ہاں میں، اے میرے بھائی کی بیوی! ذرا ادھر کچھ دیر کو رک جا!" میں نے ایک شکستہ دالان کی طرف اشارہ کیا۔ "مجھے تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں..... یہاں..... یہاں..... ادھر آجا!"

خرقاء میرے کہنے پر اس شکستہ دالان میں آگئی جہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔

"اے خرقاء!" میں نے بات شروع کی۔ مجھے معاملے کی تہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ "مجھے یہ بتا کہ تجھے کس نے اس بات پر اکسایا کہ تُو اپنے شوہر کو بھی نہ بتائے، کہاں جارہی ہے؟"

"تُو اس قصے میں نہ پڑ اے دینار!" خرقاء کہنے لگی۔ "کوئی ایسی ہی وجہ تھی کہ....."

میں نے خرقاء کی بات کاٹ دی۔ "تجھے خدشہ ہوگا کہ یوسف تجھے وہ عمل کرنے سے روک دے گا جس کا آغاز تُو نے آج رات سے بغداد کے قدیم قبرستان میں کیا ہے۔ وہاں تُو ایک بچے کی تازہ قبر کے پاس کھڑی عمل ہی تو پڑھ رہی تھی اور..... اور تیرے ساتھ کافر جن زادی آتون بھی تھی۔" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ "آتون ہی نے تجھے اس عمل کی ترغیب دی تھی!"

"تجھے..... تو سب..... سب کچھ معلوم ہے اے دینار!" خرقاء گھبرا سی گئی، پھر معذرت خواہانہ لہجے میں کہنے لگی۔ "مگر..... اگر تجھے ہر بات کا علم ہو ہی گیا ہے تو..... یہ بھی پتہ چل گیا ہوگا کہ میں نے یہ عمل کیوں شروع کیا!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

خرقاء کی بھرائی ہوئی آواز نے میرے قیاس کو یقین میں بدل دیا۔ "ہاں جانتی ہوں اے خرقاء! تُو بھی صاحب اولاد ہونے کی تمنا رکھتی ہے۔ لیکن تُو نے جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ غلط ہے۔"

"مجھے آتون نے منع کر دیا تھا کہ عمل کے بارے میں اپنے شوہر یوسف کو بھی کچھ نہ بتاؤں۔" خرقاء نے حقیقت قبول کر لی۔

پھر خرقاء نے مجھے جو باتیں بتائیں، خلاف شرع ہی نہیں بلکہ کفر کی حدود میں داخل تھیں۔ تازہ قبر کی چٹکی بھر مٹی تین روز تک میرے بھائی یوسف کو کھلائی جانی تھی۔ عمل کی آخری رات کو قبر سے بچے کی لاش نکال کر دریا میں پھینکنی تھی۔ ایک معصوم بچے کی قبر سے اس کی لاش نکال کر دریا میں پھینک دینا میرے نزدیک گناہ کے مترادف تھا۔

اس کے علاوہ عمل کے الفاظ بھی کفر کے زمرے میں آتے تھے۔

"اے خرقاء! تُو نے بہت اچھا کیا جو مجھے سب کچھ بتا دیا۔" میں اسے سمجھانے لگی۔ "عملیات دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک رحمانی، دوسرا شیطانی۔ ظاہر ہے تجھے اس عمل کی ترغیب دینے والی ایک کافر جن زادی ہے، سو یہ عمل شیطانی ہے۔ تجھ سے جو غلطی ہوگئی اس کی اللہ سے معافی مانگ لے کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ اپنی مخلوق کے لئے توبہ کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھتا ہے۔"

میری باتوں کا خرقاء پر اتنا اثر ہوا کہ رونے لگی، پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بھاری آواز

میں کہنے لگی۔ "اے دینار! اب تیرے دھیان دلانے پر مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہو گئی ہے! مجھے یقیناً آتون کی باتوں میں نہیں آنا چاہئے تھا اور یوسف کو بتا دینا چاہئے تھا کہ کہاں جا رہی ہوں! معلوم نہیں وہ کیا سوچے گا کہ میں رات بھر اسے بتائے بغیر کہاں رہی!"

"تو یوسف کی فکر نہ کر اے خرقاء! اپنے بھائی کو میں سمجھا لوں گی۔ آ چل میرے ساتھ۔"

پھر میں نے خرقاء سے جو وعدہ کیا تھا، اس کے لئے مجھے یوسف کو منانا پڑا۔

خرقاء نے یوسف سے اپنی غلطی کی معافی مانگ لی۔

"میں تجھے معاف کرتا ہوں اے خرقاء، مگر میری بھی ایک شرط ہے۔" یوسف اپنی بیوی سے کہنے لگا۔

"مجھے تیری ہر شرط منظور ہے اے یوسف!" خرقاء بولی۔

"تو پھر آج کے بعد تُو اس کافر جن زادی آتون سے نہیں ملے گی۔" یوسف نے شرط بیان کر دی۔

خرقاء نے آتون سے آئندہ نہ ملنے کی حامی بھر لی۔ میری بھی یہی مرضی تھی جو پوری ہو گئی۔

اسی روز رات کو میں نے عالم سوما سے معلوم کیا۔ "اے میرے باپ کے دوست! کیا کوئی ایسا عمل نہیں جو کسی بانجھ جن زادی کا بانجھ پن ختم کر دے؟"

"نہیں اے دینار، عمل تو کوئی ایسا نہیں، مگر دُعا میں بڑی طاقت ہے۔" عالم سوما نے کہا۔ "تو غالباً اپنے بھائی کی بیوی خرقاء کے لئے فکرمند ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو خرقاء سے کہہ کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھ کے اللہ سے دعا کرے۔"

"تو نے ٹھیک اندازہ لگایا اے عالم سوما!" میں نے تائید کی۔ "اس بات کا تعلق خرقاء ہی سے ہے۔ میں تیری نصیحت اس تک پہنچا دوں گی۔"

اس کے بعد سے خرقاء میں بڑی تبدیلی آ گئی۔ وہ پانچوں وقت نماز پڑھنے لگی اور اس نے کافر جن زادی آتون سے ملنا بھی چھوڑ دیا۔ بابل کے کھنڈرات میں میری آمد سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا ورنہ عین ممکن تھا کہ میرے بڑے بھائی کی بیوی، صاحب اولاد بننے کی خواہش میں سیدھے راستے سے بھٹک جاتی۔ راہِ راست سے تو خلیفۂ وقت معتصم باللہ

بھٹک گیا تھا۔ بابل کے کھنڈرات میں رہتے ہوئے اس پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ خلیفہ معتصم کے علاوہ بھٹکے ہوئے آدم زادوں میں سے ایک عباسی لشکر کا سردار مجاہد الدین ایبک بھی تھا۔ اسے بھی میں بھولی نہیں تھی۔ وہ میدانِ جنگ سے ایسا خوفزدہ ہو کر بھاگا کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ کچھ سپاہ تو میدانِ جنگ میں کام آئی، کچھ سردار مجاہد کے ساتھ بھاگی چلی گئی۔ کچھ سپاہی جو غیرت مند تھے، وہ شکست کی ندامت سے اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔

سالار فتح الدین کی رائے ٹھیک تھی۔ اگر منگولوں کا تعاقب نہ کیا جاتا تو وہ عراق سے نکل جاتے اور خراسان پہنچ کر ہی دم لیتے۔ فتح الدین کی رائے پر عمل کیوں نہ ہو سکا۔ میں اس کی بنیادی وجوہ بیان کر چکی ہوں۔ بڑی وجہ تو درحقیقت عفریت عکب تھا۔ اگر وہ مداخلت نہ کرتا تو میں سردار مجاہد کو اپنے اثر میں لے لیتی۔ پھر وہ فتح الدین سے اختلاف و بحث نہ کرتا۔ کافر عفریت کی مداخلت سے پہلے مجاہد اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر اڑا ہوا تھا۔ منگولوں کا پیچھا نہ کیا جاتا تو عباسی لشکر کی فتح، شکست میں نہ بدلتی۔

آخر وہ دن آ ہی گیا کہ مجھے جس کا انتظار تھا۔ بغداد سے ایک منزل دور عباسی لشکر نے پڑاؤ کیا۔ کیونکہ اب اندھیرا پھیل چکا تھا۔ انتہائی ہنگامی حالات کے سوا عموماً رات کے وقت سفر کرنے سے فوجیں گریزاں رہتی ہیں۔ عباسی لشکر اب اگلے دن صبح ہی وہاں سے کوچ کرتا۔ عباسی لشکر کی نقل و حرکت پر کئی دن سے میری نگاہ تھی۔ ان کے لئے میں اپنے تصور کی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لا رہی تھی۔ عارج کو بھی میں نے حالات سے باخبر رکھا تھا۔ ابوبکر کے جسم سے باہر نکل آنے کے بعد اب وہ حسب سابق عباسی خلیفہ یا حکومت کے بارے میں جذباتی نہیں رہا تھا۔

ایک رات میں، عارج سے ملی تو اسے صورتحال سے آگاہ کرنے کے بعد پوچھا۔ "ہم آج ہی رات بغداد چلیں یا کل صبح؟"

"اگر ہم آج رات یا پھر کل صبح بغداد نہ بھی جائیں تو کیا فرق پڑ جائے گا!" عارج اپنی فطری عادت کے مطابق بے پروائی سے بولا۔ پھر اس کے لہجے میں روایتی شوخی آ گئی۔ "اے دینار! تو کتنی ہی کوشش کر لے، خلیفہ کی حماقت و بے عقلی میں کمی نہ آئے گی۔ یہ جو تیرا سردار مجاہد الدین ہے، خلیفہ کو جو پٹی پڑھائے گا، اس پر یقین کر لیا جائے گا۔"

"ہاں یہ تو ہے اے عارج!" میں نے اقرار کیا۔

''تو پھر چھوڑ بغداد جانے کو۔ یہیں آرام سے رہتے ہیں۔ آدم زادوں کے درمیان رہنے میں لاکھ جھمیلے ہیں۔ ہمیں تکلیف کیا ہے جوان جھمیلوں میں پڑیں!..... اور اب تو وہ بدبخت کافر عفریت بھی یہاں آ گیا ہے۔'' عارج کہنے لگا۔

''کیوں، کیا تُو ڈرتا ہے اس عفریت سے؟'' میں نے اسے جوش دلایا۔

''میں ڈرتا ورتا نہیں اس عکب وکیب سے۔'' عارج نے میری توقع کے مطابق جواب دیا۔ ''ویسے بھی اس نادیدہ حصار کی موجودگی میں وہ عفریت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا!..... تُو کہے تو ابھی چلوں بغداد؟''

''ابھی تو خیر رہنے دے، کل چلیں گے۔'' میں نے اسے راضی دیکھ کر کہا۔

دوسرے دن عباسی لشکر جب بغداد میں داخل ہو رہا تھا تو ہم بابل کے کھنڈرات سے چلے۔ دوسرے ہی لمحے عارج اور میں، ولی عہد ابوبکر کے محل میں تھے۔ میں تو فرد اس کے جسم میں اور عارج، ابوبکر کے انسانی قالب میں اتر گیا۔

''اب دیکھنا یہ ہے اے عارج! کہ سردار مجاہد پہلے خلیفہ سے ملتا ہے یا وزیر اعظم ابن علقمی سے۔'' میں نے عارج کو مخاطب کیا۔ اس وقت ہم دونوں کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ کنیزوں اور دیگر ملازمین کو میں نے ہاتھ کے اشارے سے دور ہٹا دیا تھا۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ کوئی آدم زاد ہماری باتیں نہ سن سکے۔ پھر بھی بطور احتیاط میں نے اپنی آواز دھیمی ہی رکھی تھی۔

عارج نے بھی میری بات کا جواب دیتے ہوئے اسی احتیاط کا ثبوت دیا اور کہنے لگا۔
''شاید تُو نے ہی مجھے بتایا تھا اے دیار کہ سردار مجاہد، ابن علقمی کا پروردہ و وفادار ہے۔ ایسی صورت میں اسے پہلے وزیر اعظم ہی سے ملنا چاہئے۔''

''یہ امکان بھی ہے کہ خود کو خلیفہ مستعصم کا جاں نثار ثابت کرنے کے لئے، یعنی خلیفہ کو دھوکا دینے کی غرض سے سردار مجاہد کو ترجیح دے۔'' میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

کچھ دیر گزری ہوگی کہ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسی کے ساتھ میرے ارادے کے زیر اثر میری جناتی صفات متحرک ہو گئیں۔ اب میں اپنی بند آنکھوں سے قصرِ خلافت کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں مجھے خلیفہ مستعصم کے روبرو عیار آدم زاد سردار مجاہد نظر آیا۔

اس وقت سردار مجاہد اپنی بہادری کی ڈینگیں مار رہا تھا۔ ''اعلیٰ حضرت کا یہ غلام جس

طرف نکل جاتا، صفیں کی صفیں الٹ دیتا۔ منگول سپاہی مجھ پر نظر پڑتے ہی جانیں بچانے کے لئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگتے۔''

''سبحان اللہ!..... تم سے ہمیں یہی امید تھی۔'' خلیفہ مستعصم نے اس نالائق سردار کو گویا بانس پر چڑھا دیا۔

''بس یہ سب اعلیٰ حضرت سے غلام کی خصوصی نسبت کا نتیجہ ہے۔'' سردار مجاہد اور بھی اینٹھ گیا۔

''اور وہ سالار فتح الدین داؤد کے بارے میں تم نے کچھ نہیں بتایا!'' خلیفہ مستعصم نے یاد دہانی کرائی۔

''معاف کیجئے گا اعلیٰ حضرت، فتح الدین اس کے اہل نہ تھے کہ انہیں امیر لشکر بنایا جاتا۔ انہوں نے ابتدا ہی سے غلط جنگی حکمت عملی اختیار کی۔ اگر میں ان کے ساتھ نہ ہوتا تو عباسی لشکر محض ان کی رہنمائی میں نہ لڑ پاتا اور اسے فتح نصیب نہ ہوتی۔''

ممکن ہے کہ سردار مجاہد ابھی کچھ اور بھی کہتا کہ خلیفہ مستعصم پُرجوش آواز میں بول اٹھا۔
''مبارک..... منگولوں پر فتح مبارک!''

''اعلیٰ حضرت کو بھی فتح مبارک ہو..... لیکن غلام کو ابھی اور بھی کچھ عرض کرنا ہے۔'' سردار مجاہد نظریں چرانے لگا۔

''ہاں ہاں..... کہو، ہم سن رہے ہیں۔'' خلیفہ مستعصم نے اس مرتبہ قدرے پُرسکون آواز میں کہا۔

''سچ تو یہ ہے اعلیٰ حضرت کہ آپ کے اس غلام ہی کی دلیری اور بہادری سے فتح ہوئی۔'' سردار مجاہد صاف صاف جھوٹ بولنے لگا۔ ''منگولوں پر میری اور میرے سپاہیوں کی ہیبت طاری ہو گئی اور وہ بھاگ اٹھے۔ امیر لشکر ہونے کی حیثیت سے فتح الدین نے مغلوب سپاہیوں کے تعاقب سے مجھے منع کیا۔ میرے نزدیک یہ بزدلی تھی۔ سو میں نے فتح الدین سے بحث کی۔ نہایت مشکل اور بڑی بے دلی کے ساتھ انہوں نے میری بات مانی۔ اسی بدنظمی و بے دلی کا نتیجہ فتح الدین کی مرگِ ناگہانی کی صورت میں نکلا۔ فتح الدین ہی کی وجہ سے عباسی لشکر نے لڑنے میں سستی کی۔ میرے مشورے کے مطابق اگر ہلاکو خاں کی فوج پر عباسی لشکر ایک ساتھ اور یک دم حملہ آور ہوتا تو بات کچھ اور ہوتی۔ فتح الدین کی موت کے

بعد اس غلام نے عباسی لشکر کی بھرپور قیادت و رہنمائی کی، لیکن ہلاکو خاں کی فوج نے اچانک ہم پر حملہ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عباسی لشکر کو ہزیمت ہوئی۔"

خلیفہ مستعصم میں اول تو عقل تھی ہی تھی اور اگر تھوڑی بہت تھی بھی تو وہ شراب کی نذر ہو گئی تھی۔ اس نے اسی لئے سردار مجاہد کو مخاطب کیا۔ "خیر کوئی بات نہیں۔ تمہیں مبارک ہو کہ تمہاری جان تو بچ گئی......"

میں اس سے زیادہ کچھ اور نہ سن سکی اور آنکھیں کھول دیں۔ قصرِ خلافت سے میرا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"تو نے کیا دیکھا اور کیا سنا اے دینار؟" عارج نے مجھ سے پوچھا۔ اب ہم دونوں "خلوت کدے" میں تھے۔

مختصراً میں نے عارج کو ساری بات بتا دی، پھر بولی۔ "کیا ستم ہے کہ خلیفہ وقت میدانِ جنگ سے فرار ہو کر آنے والے کو مبارکباد دے رہا ہے!......اسے تو فوری طور پر منگولوں کے مقابلے کی غرض سے مزید لشکر بھیجنا چاہئے۔ ہلاکو خاں کو بغداد آنے سے پہلے ہی روکنا چاہیے!"

"تو درست ہی کہتی ہے اے دینار!" عارج نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "کاش ایسا ہوتا!"

یہ بات تمام بغداد میں مشہور ہو گئی کہ عباسی لشکر، منگولوں کے مقابلے سے شکست کھا کر آیا ہے۔ میں شہر والوں کے حالات سے بے خبر نہیں تھی۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں ہلاکو خاں آگے بڑھتے بڑھتے دارالخلافہ بغداد کا محاصرہ نہ کر لے! یہ سب جانتے تھے کہ بغداد میں اتنی فوج نہیں تھی جو کسی دشمن کا مقابلہ کر سکے۔ فوج کا بڑا حصہ الگ کر دیا گیا تھا اور برائے نام سپاہی باقی تھے۔

اس ملال کے سوا میں ایک جن زادی اور کیا کرتی! اگر وہ لوگ، وہ آدم زاد عیش و نشاط چھوڑ دیتے، خدا کے حضور جھک جاتے، اس ذاتِ برحق کی عبادت کرنے لگتے، ہمت سے کام لیتے اور نوجوان آدم زاد رضاکارانہ فوجی خدمات انجام دینے پر آمادہ ہو جاتے تو یقیناً وہ تباہی نہ آتی جس کے آثار واضح تھے۔ انہوں نے سنا سب کچھ لیکن ان پر اثر نہ ہوا۔ ان آدم زادوں کی آنکھیں نہ کھلیں۔ وہ حسبِ سابق غرقِ نشاط و عشرت رہے۔ رنگین ہنگاموں، رومانی دلچسپیوں اور رقص و سرود کی محفلوں میں کمی نہ ہوئی۔ شب و روز بغداد کے در و دیوار

قہقہوں اور زمزمہ سنجیوں سے گونجتے رہتے تھے۔

اہلِ بغداد متمول تھے، فارغ البال تھے، نہ فکرِ معاش نہ روزی کی فکر۔ خدا نے انہیں ہر نعمت دے رکھی تھی۔ حیران کن امر یہ تھا کہ نعمت خداوندی نے انہیں خدا ہی سے منحرف کر دیا تھا۔ وہ اسی لئے خدا کو بھول بیٹھے تھے۔ نہ وہ خدا کا نام لیتے نہ اسے یاد کرتے۔

احمر اور احمد ابوالقاسم سے بھلا یہ بات کیسے چھپی رہتی! انہیں بھی پتہ چل گیا کہ منگولوں نے عباسی لشکر کو ہزیمت دے کر بھگا دیا۔

دونوں شہزادے سمجھ گئے کہ اب منگولوں کے حوصلے بڑھ گئے ہوں گے اور اب وہ بغداد ہی آ کر دم لیں گے۔

شام ہونے سے کچھ پہلے وہ ولی عہد ابوبکر کے محل پہنچ گئے۔ انہوں نے خبر کرائی تو میں نے عارج سے کہا۔ "انہیں یہیں بلوا لے۔"

ذرا ہی دیر میں دونوں شہزادے ہماری خاص نشست گاہ میں آ گئے۔ میں بھی وہیں موجود رہی۔

احمد نے بیٹھتے ہی عارج کو مخاطب کیا۔ عارج کو وہ ولی عہد ابوبکر ہی سمجھ رہا تھا، بولا۔ "اب بغداد میں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔" عارج نے ابوبکر کی آواز میں جواب دیا۔ "سوچنا تو یہ ہے کہ ہم کیا کریں؟ کیا خلیفہ معظم کو چھوڑ کر کہیں چلے جائیں؟"

"اگر نہ جائیں تو کیا صورت ہو!" احمد بول اٹھا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی کڑواہٹ تھی۔ "معاف کرنا خلیفہ محترم کی آنکھیں بند ہیں۔ سچ یہ ہے کہ وہ وزیراعظم ابنِ علقمی کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے ہیں، اپنی عقل سے کام ہی نہیں لیتے۔"

عارج بولا۔ "تمہارا جوش اور غصہ حالات کا تقاضا اور حق بجانب ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم ابنِ علقمی سے ہار مان گئے۔ مت بھولو کہ ابنِ علقمی اکیلا ہے اور ہم کئی ہیں۔ ہمیں تو اسے ہار ماننے پر مجبور کرنا چاہئے۔"

"یہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔" احمد نے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ "ہم میں سے کوئی بھی عہدے دار نہیں ہے۔ آپ ولی عہد ضرور ہیں لیکن حکومت کے کسی شعبے میں آپ کو دخل دینے کا اختیار نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ابنِ علقمی وزیراعظم ہے۔ عنانِ حکومت اس کے

ہاتھ میں ہے اس لئے اسی کی چلتی ہے، ہماری نہیں چلتی۔ اس نے فوجیں برطرف کر دیں۔ خلیفہ عالی اس سے ناراض ہونے کی بجائے خوش ہوئے۔ انہوں نے اس خوشی کا اظہار بھی کیا۔ کسی حکومت یا حکمراں کا رعب و داب کیا بغیر فوجوں کے قائم رہ سکتا ہے؟"

"اب منگولوں نے حملہ کر دیا ہے اور یہاں یہ صورت ہے کہ فوجیں ہی نہیں۔ مقابلہ کیسے ہوگا؟"

"خلیفہ محترم ہر اس بات کو مان لیں گے جس میں خرچ نہ ہو یا دولت ملتی ہو" احمر کہنے لگا۔ "میری صاف گوئی کو معاف کرنا، خلیفہ معظم بڑے حریص ہو گئے ہیں۔ دولت جمع کرنا ان کا بہترین مشغلہ ہو گیا ہے۔ فوجوں کو بھرتی کرنے میں خرچ ہوگا اس لئے وہ یہ تجویز نہیں مانیں گے۔"

"تمہارا خیال ایک حد تک ٹھیک ہے لیکن ہمیں کوشش تو کرنی چاہئے۔" عارج نے دونوں شہزادوں کو سمجھایا۔ "خلیفہ معظم کو ہم صورت حال سے آگاہ تو کریں۔" میری توجہ عارج پر تھی۔ وہ اپنے انسانی قالب ولی عہد ابوبکر کے زیر اثر پر امید تھا کہ خلیفہ سے اپنی بات منوا لے گا۔

دونوں شہزادے احمد و احمر، عارج کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئے۔ انہیں قصر خلافت روانگی میں دیر نہ ہوئی۔ میں سوچنے لگی، کیا خبر خلیفہ اپنے ولی عہد اور دونوں شہزادوں کی بات مان ہی لے!

ولی عہد ابوبکر کے انسانی پیکر میں عارج کے علاوہ دونوں شہزادے احمر اور احمد، خلیفہ مستعصم کے سامنے بیٹھے تھے۔ مستعصم نے انہیں مخاطب کیا۔ "تمہارے چہروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم کچھ کہنے آئے ہو۔"

میں سمجھ گئی کہ گفتگو شروع ہوئے غالباً زیادہ وقت نہیں گزرا۔

"جی ہاں اعلیٰ حضرت!" عارج نے بات کرنے میں پہل کی۔ "خلیفہ معظم نے سن ہی لیا ہوگا کہ ہمارے لشکر کو شکست ہوئی ہے۔"

"ہاں، ہم نے سن لیا۔" مستعصم نے احمقوں کی طرح اقرار میں سر ہلایا۔ یوں جیسے یہ کوئی خاص بات نہ ہو۔ اپنی بات اس نے جاری رکھی۔ "مجاہد الدین ایبک نے تمام واقعات ہمیں سنا دیئے ہیں۔ ہم نے ابن علقمی سے اس بارے میں پوچھا تھا۔ اس کا کہنا

ہے کہ ہلاکو خاں اپنا لشکر ساتھ لے کر واپس چلا گیا ہے۔ اس پر عباسی فوج کی ہیبت طاری ہو گئی تھی۔"

"وزیر اعظم ابن علقمی نے اگر ایسا کہا ہے تو یقیناً حضور والا سے اصلیت کو چھپایا ہے۔" عارج بتانے لگا۔ "حقیقت یہ نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ منگولوں کے حوصلے بڑھ گئے ہیں اور وہ بغداد کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔"

یہ سن کر بھی مستعصم کے چہرے سے کسی نوع کی فکرمندی کا اظہار نہیں ہوا، بولا۔ "ہو سکتا ہے تمہیں یہ اطلاع غلط ملی ہو۔"

احمر نے اس موقع پر پہلو بدل کر کہا۔ "اعلیٰ حضرت سے جاں بخشی کی توقع پر عرض کرتا ہوں کہ ابن علقمی نے آج تک جو باتیں کہی ہیں یا کی ہیں، وہ غلط ہیں۔ ان کا فوجوں میں تخفیف کرنا، فوجیوں کو محصول کی وصولی پر مامور کرنا ایک ایسی سازش ہے جس کا تعلق، وحشی تاتاریوں کے حملے سے ہے۔ دراصل ہلاکو خاں کو عراق پر حملے کی دعوت دی گئی ہے۔"

"دعوت؟" خلیفہ مستعصم نے حیرانی کا اظہار کیا۔ "منگول حکمراں کو کس نے دعوت دی ہے؟"

مستعصم کے اس سوال کا جواب احمد ابوالقاسم نے دیا۔ "ابن علقمی کے سوا اور کون ہو سکتا ہے خلیفہ محترم!"

"نہ معلوم تم لوگ اس بے چارے پر کیوں الزام تراشی کرتے رہتے ہو۔" مستعصم نے منہ بنایا۔ گویا اسے ابن علقمی کی شکایت ناگوار گزری ہو۔ پھر اس نے یقین دہانی کرائی۔ "ابن علقمی ہرگز ایسی نمک حرامی نہیں کر سکتا۔"

"عالی جاہ! وہ بے چارہ نہیں ہے، بڑا شقی ہے۔" عارج بول اٹھا۔ "اس نے پہلے دارالخلافہ بغداد کے ساتھ ساتھ پورے عراق میں فرقہ وارانہ فساد کرانا چاہا۔ جب اسے ادھر سے ناکامی ہوئی تو فوجوں میں کمی کر دی۔ پوری مملکت میں جگہ جگہ قائم ہماری فوجی چھاؤنیاں ویران ہو گئیں۔ کاروباری طبقے سے محصول کی وصولی پر اس لئے فوجیوں کو مقرر کیا کہ شورش ہو اور ایسا ہی ہوا۔ اس ضمن میں حضور سے میں پہلے ہی گزارشات کر چکا ہوں۔ فوجی تخفیف کے فوراً بعد منگولوں کا حملہ انہی باتوں کا ثبوت ہے۔ ابن علقمی کی نمک حرامی صاف ظاہر ہے خلیفہ معظم!" عارج کی آواز میں تیزی آ گئی۔

خلیفہ مستعصم معقول رویہ اختیار کرنے کی بجائے گرم ہو کر کہنے لگا۔ ''تم بہت آگے بڑھتے جا رہے ہو ابوبکر!'' وہ عارج سے مخاطب تھا۔ ''تم کوئی بات کہنے سے پہلے سوچ بھی لیا کرو کہ کیا کہہ رہے ہو! مجھے بتاؤ تمہارے پاس ابن علقمی کی نمک حرامی کا ثبوت کیا ہے؟''

''افسوس تو یہی ہے اعلیٰ حضرت کہ ثبوت کوئی نہیں ہے۔'' عارج کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔

''دعویٰ بلا دلیل کے غلط ہوتا ہے۔'' مستعصم بولا۔ ''ہم ابھی ابن علقمی کو بلاتے ہیں۔''

طلبی کے حکم پر ابن علقمی نے آنے میں دیر نہیں کی۔

ابن علقمی ایک عیار آدم زاد تھا۔ اس نے بڑے معنی خیز انداز میں عارج اور دونوں شہزادوں کو دیکھا۔ اسی لمحے خلیفہ مستعصم نے ابن علقمی سے سوال کیا۔ ''کیا منگولوں کا لشکر واپس چلا گیا؟''

''جی ہاں۔'' ابن علقمی نے فوراً جواب دیا۔ ''اعلیٰ حضرت کے اقبال سے تاتاری لشکر اب ہماری حدودِ مملکت میں نہیں۔''

''مگر ہمیں تو اس کے برعکس اطلاع ملی ہے۔'' خلیفہ مستعصم نے بتایا۔ ''پتہ چلا ہے کہ منگول بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ جن علاقوں اور بستیوں سے گزرتے ہیں انہیں تباہ کر دیتے ہیں۔''

ابن علقمی صاف مکر گیا، کہنے لگا۔ ''مجھے ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بات میں کوئی صداقت نہیں۔''

عارج خاموش نہ رہا، بولا۔ ''صداقت اس وقت معلوم ہو جائے گی جب منگول، بغداد کا محاصرہ کر لیں گے۔''

''اطمینان رکھئے ولی عہد سلطنت! ایسا نہ ہوگا'' ابن علقمی نے اپنی دانست میں عارج کو سمجھایا۔

اس پر احمر نے کہا۔ ''مجھ تو اس بات کا یقین نہیں۔ منگول ایک بار یلغار کر کے لوٹنے والے نہیں ہیں۔''

''تو پھر کیا ہو؟'' خلیفہ مستعصم بولا تو اس کی آواز جھنجھلاہٹ تھی۔

''ان کا مقابلہ کرنے کے لئے فوجیں بھرتی کی جائیں۔'' احمر نے خلیفہ کی ناراضگی کو

خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہہ دیا۔

ابن علقمی نے فوراً کہا۔ ''جب کوئی خطرہ ہی نہیں ہے تو بلا سبب فوجیں بھرتی کرنے سے کیا فائدہ!''

خلیفہ مستعصم کو شہ مل گئی۔ وہ بول اٹھا۔ ''یہ لوگ چاہتے ہیں کہ بلاوجہ دولت خرچ کی جائے۔''

عارج نے یقیناً مستعصم کے لہجے میں طنز کو محسوس کر لیا، سو اس نے وضاحت کی۔ ''اے خلیفہ معظم! بلاوجہ نہیں بلکہ مسلمانوں کی جانیں اور اسلامی ناموس کو بچانے کے لئے دولت خرچ کیجئے۔''

مستعصم چڑ کر بولا۔ ''اگر مسلمانوں کو کوئی خطرہ ہے تو وہ خود دولت خرچ کریں۔''

آخر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ خلیفہ کو اب سمجھانا یا اس سے مزید کچھ کہنا سننا بیکار تھا۔ دولت کے سامنے اسے اپنے عوام کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ زندہ رہیں یا مر جائیں۔ احمر، احمد اور عارج اپنے مقصد میں ناکام رہے اور خلیفہ کے پاس سے اٹھ آئے۔ خلیفہ مستعصم نے اس طرح انہیں جانے کی اجازت دی جیسے اس کی جان کسی عذاب سے چھوٹ گئی ہے۔

ابن علقمی نے خلیفہ مستعصم سے قطعی غلط بیانی کی تھی کہ ہلاکو خاں واپس چلا گیا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ عباسی فوج کے شکست کھا کر بھاگ آنے سے منگولوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ انہوں نے پیش قدمی جاری رکھی۔ سرحدی علاقوں سے آگے بڑھتے ہوئے اب تک ہلاکو خاں نے جس قدر فاصلہ طے کیا اور اس کی راہ میں جو بستیاں آئی تھیں، انہیں تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہلاکو خاں نے وہ بہیمانہ بربریت اور وحشیانہ سفاکی کی جو اس کی سرشت میں داخل تھی۔ اس نے اپنے لشکریوں کو حکم دیا کہ جس بستی میں پہنچو وہاں کے مرد و زن کو قتل کر ڈالو، نقد و جنس لوٹ لو اور بستی کو آگ لگا کر راکھ کا ڈھیر بنا دو۔

جن بستیوں کو منگولوں نے برباد کر ڈالا تھا، ان میں بسنے والے کچھ آدم زاد بھاگ کر دور سے شہروں اور قصبوں میں پہنچے تھے۔ انہوں نے وہاں کے اکثر باشندوں کو رو رو کر اپنی تباہی کی درد انگیز داستانیں سنائی تھیں۔ ان تباہ حالوں کی داستانوں سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ ان شہروں اور قصبوں میں جو دانا تھے وہ سارا ساز و سامان، نقد اور جنس چھوڑ کر

اپنی جانیں اور ناموس بچانے کے لئے وہاں سے فرار ہو گئے تھے۔ اپنے اہل وعیال کو بھی انہوں نے ساتھ رکھا تھا اور ملک شام کے علاوہ مصر جا پہنچے تھے۔

عراق کے سرحدی علاقوں سے عرب مسلمانوں کی یہ ہجرت خاصے بڑے پیمانے پر ہوئی۔ جن آدم زادوں نے اپنی آنکھوں سے تباہی کا سامنا کرنے والوں کو دیکھ کر عبرت نہ پکڑی وہ گھاٹے میں رہے۔ ان میں سے اکثریت دولت مند آدم زادوں کی تھی۔ دولت ان کے پیروں کی زنجیر بن گئی۔ وہ اپنی جائیداد اور سامان کے چکر میں رہے کہ انہیں کیسے چھوڑ دیں یا ان کے تحفظ کا کیا انتظام کریں جو منگولوں سے محفوظ رہیں! یہ آدم زاد اپنے گھر بار کو خیر باد نہ کہہ سکے۔ اس کے علاوہ جو نکل گئے، وہ بچ گئے۔ جو لالچ کے چکر میں پڑے، وہیں رہے۔ یہ سبھی آدمی مارے گئے۔ ان کی ناموس کی دھجیاں اڑ گئیں۔

ہر بستی جو منگولوں کی راہ میں آئی، اسے گویا صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ وحشی منگولوں نے ان بستیوں کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو بڑی بے رحمی سے مار ڈالا۔

میں نے اتنے بڑے پیمانے پر آدم زادوں کو قتل ہوتے نہ دیکھا تھا۔ ایک تو ہلاکو خاں اور اس کے لشکری فطری طور پر ہی انتہائی سنگ دل تھے، دوسرے کافر عفریت عکب نے انہیں آدمی سے ''درندہ'' بنا دیا تھا۔ کاش میں عرب مسلمانوں کے اس قتل عام کو روک سکتی! اس سلسلے میں بار بار ناکامی کے باوجود میں نے ابھی اپنی کوششیں ترک نہیں کی تھیں کہ کیا خبر مجھے کب ہلاکو خاں پر غالب آنے کا موقع مل جائے! کبھی تو میں دور رہ کر اپنی جناتی صفات کے ذریعے حالات پر نظر رکھتی اور کبھی اپنے انسانی پیکر سے نکل کر مطلوبہ مقام پر پہنچ جاتی۔ دو ایک بار عارج بھی بہ ضد ہو کر میرے ساتھ بغداد سے نکلا۔

اس روز بھی عارج میرے ساتھ تھا۔ ہم دونوں ولی عہد ابوبکر اور فردوس کے قالبوں سے نکل آئے تھے۔

بصرہ شہر کی وہ ایک نواحی بستی تھی جہاں منگولوں نے اپنی وحشت و درندگی کا ہولناک تماشا دکھایا۔ عارج اور میں اس وقت وہاں پہنچے جب یہ خونیں کھیل اپنے آخری مرحلے میں تھا۔ جن آدمیوں پر منگولوں کو یہ شبہ تھا کہ انہوں نے اپنی دولت کہیں چھپا دی ہے، انہیں قتل نہیں کیا تھا۔ جب ان بے گناہوں پر منگولوں نے تشدد شروع کیا تو ساری بستی چیخوں سے گونجنے لگی۔

ان چیخوں میں ہلاکو خاں کے وحشیانہ قہقہے بھی شامل تھے۔

ایک آدم زاد کو لوہے کی گرم سلاخ سے داغنے کے لئے جب ایک منگول آگے بڑھا تو عارج سے برداشت نہ ہوا۔ وہ جھپٹ کر آگے بڑھا اور دیو ہیکل منگول سے سلاخ چھین لی۔ پھر وہاں بڑا عجیب تماشا آدم زادوں نے دیکھا۔ دہکتی سلاخ گویا فضا میں بلند ہوئی اور تیزی سے منگول کے جسم کو اس نے داغ دیا۔ منگول سپاہی یوں داغے جانے پر چیخنے لگا۔ گرم سلاخ سے عارج اس منگول کے جسم کو اس وقت تک داغتا رہا جب تک کہ وہ زمین پر نہ گر گیا۔

یہ ''پراسرار'' منظر دیکھ کر وقتی طور پر منگولوں نے اپنا دست ستم روک لیا۔ ظاہر ہے عارج انہیں نظر نہیں آیا تھا۔ وہ تو بس اتنا ہی سمجھ سکے کہ گرم آہنی سلاخ نے خود فضا میں بلند ہو کر منگول سپاہی کے جسم کو جگہ جگہ سے داغ دیا۔

میں نے عارج کو مخاطب کیا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس وقت کافر عفریت عکب، منگولوں کے ساتھ نہیں ہے۔''

''تجھے اس بات کا یقین کس طرح ہے اے دینار؟'' عارج نے پوچھا۔

''اگر عکب یہاں موجود ہوتا تو ہرگز کافر منگول کے جسم کو آہنی سلاخ سے نہ داغنے دیتا۔'' میں نے جواب دیا۔

عین اسی لمحے میری نگاہ ایک نوجوان آدم زادی پر پڑی۔ اسے دو منگول سپاہی کھینچتے ہوئے ایک کڑھاؤ کی طرف لے جا رہے تھے۔ کڑھاؤ میں پانی ابل رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ اس نوجوان لڑکی کے لواحقین کی زبان کھلوانے کے لئے یہ سب کیا جا رہا ہے۔ کچھ ہی فاصلے پر چند مرد اور عورتوں کو رسیوں سے باندھ کر زمین پر ڈال دیا گیا تھا۔

نوجوان آدم زادی کی عمر بیس یا اکیس برس کے قریب ہو گی۔ خوف و دہشت کے سبب اس کا چہرہ زرد پڑ رہا تھا۔

جو مرد و زن زمین پر بندھے ہوئے تھے، ان میں سے ایک منگول فوجی افسر کہنے لگا۔ ''تمہاری بیٹی کو ہم کھولتے ہوئے پانی میں ابال دیں گے ورنہ بتا دو کہ تم نے اپنی دولت کہاں چھپائی ہے!'' یہ الفاظ اس نے ٹوٹی پھوٹی عربی زبان میں ادا کئے تھے مگر مفہوم سمجھ لیا گیا۔

"ہمارے پاس دولت نہیں! ہم غریب ہیں۔" بندھے ہوئے آدم زادوں میں سے ایک بولا۔

"اگر تم سچ بول رہے ہو اور واقعی غریب ہو تو پھر تمہیں زندہ رہنے کا بھی کوئی حق نہیں!" منگول فوجی افسر نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں ابھی کچھ ہی دیر میں زندگی کی قید سے رہائی مل جائے گی مگر پہلے اپنی بیٹی کو اس کڑھاؤ میں ابلتے ہوئے دیکھو!" یہ کہتے ہی اس منگول فوجی افسر نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ "اس لڑکی کو کڑھاؤ میں ڈال دو۔"

اس اطمینان کے سبب کہ کافر عفریت عکب وہاں موجود نہیں، میں حرکت میں آ گئی۔

منگول وحشیوں نے پھر ایک عجیب اور حیران کن منظر دیکھا۔ جو منگول سپاہی اس نوجوان آدم زادی کو گھسیٹتے ہوئے کڑھاؤ کی طرف لے جا رہے تھے، انہیں میں نے اپنے اثر میں لے لیا۔ انہوں نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور پھر دوسرے ہی لمحے نیاموں سے اپنی تلواریں نکال کر چلنے۔ اس سے پہلے کہ کوئی سمجھ پاتا، ان سپاہیوں نے اپنے فوجی افسر پر حملہ کر دیا۔ ایک سپاہی کی تلوار فوجی افسر کی گردن پر پڑی۔ فوجی افسر کا سر کٹ کر زمین پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں سپاہی بھاگتے ہوئے کڑھاؤ تک پہنچے اور اس میں کود گئے۔

چند لمحوں کو سناٹا سا چھا گیا۔ پھر اسی سناٹے میں مجھے کافر عفریت عکب کی آواز سنائی دی۔ "اب تیرا کھیل ختم ہو گیا اے دینار! دیکھ کہ میں کیا کرتا ہوں۔ اب میری باری ہے۔"

یہ دوسرا موقع تھا کہ عکب کو میں نے دیکھا۔ وہ انتہائی غضب ناک نظر آ رہا تھا۔

معاً مجھے عارج کا خیال آیا۔ میں نے سوچا، عارج کو اب یہاں نہیں ہونا چاہئے۔ سو اس سے مخاطب ہوئی۔ "اے عارج! تو اس نوجوان آدم زادی کو اٹھا کر لے جا اور کسی محفوظ مقام پر پہنچا دے۔"

"اور تو اے دینار؟" عارج نے سوال کیا۔

"میری فکر نہ کر! میں جلد ہی تجھ تک پہنچ جاؤں گی۔" میں نے جواب دیا۔ "تجھے اب ادھر نہیں آنا!"

میرے اصرار پر عارج اس نوجوان آدم زادی کو اٹھا کر وہاں سے نکل گیا۔

اسی وقت میں نے منگول حکمران ہلاکو خاں کو گھوڑا دوڑاتے ہوئے ادھر آتے دیکھا۔ عکب اس کے قریب تھا۔

ہلاکو خاں کو اس کے لشکری پیش آنے والے حیران کن واقعات بتانے لگے۔ وہ ابھی اپنی پوری بات نہ کر سکے تھے کہ ہلاکو خاں نے انہیں ڈانٹ دیا۔ پھر ہلاکو خاں کے حکم پر بندھے ہوئے آدم زادوں کو باری باری کھولا گیا اور ان کے جسموں سے کھال کھینچی جانے لگی۔ ان کی چیخیں بڑی دردناک تھیں۔ ان چیخوں کو سن کر ہلاکو خاں زور زور سے ہنسنے لگا۔

اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ میں درندگی کے اس خوفناک تماشے کو روک دیتی، سو وہاں سے چلنے کا قصد کیا۔ مجھے عارج کی فکر بھی تھی۔ اس مرتبہ عکب نے مجھ پر حملہ نہیں کیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کافر، مسلمانوں کو قتل کرا رہا تھا۔ عکب نے مجھ پر کیوں سحر کا جال نہیں پھینکا، اس کا سبب یہ بھی ممکن تھا کہ اسے گزشتہ تلخ تجربہ یاد ہو گا۔ وہ مجھ پر حملے کے بعد شعلوں میں گھر گیا تھا۔

بغداد سے کچھ پہلے میں فلوجہ تک پہنچی تھی کہ عارج مجھے نظر آ گیا۔

"تو لوٹ آئی اے دینار، اچھا کیا ورنہ شاید تیری تلاش میں مجھے تجھ تک پہنچنا پڑتا۔" عارج میرے قریب آ کر کہنے لگا۔

"اس کے باوجود کہ میں نے تجھے پلٹ کر نہ آنے کو کہا تھا؟"

"تو کیا میں تجھے اس کافر عفریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا؟..... اگر تجھے کچھ ہو جاتا....."

"مجھے کچھ نہ ہوتا اور دیکھ لے کہ کچھ نہیں ہوا۔" میں بولی۔

اس وقت ہم بغداد اور فلوجہ کے درمیان واقع صحرا کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔ عارج کے ضد کرنے پر مجھے اس صحرا میں اترنا پڑا۔ ریت کے ایک ٹیلے کے قریب ہم دونوں جا بیٹھے۔

"اے دینار! منگولوں کی اس یلغار کا نتیجہ کیا ہو گا؟" عارج نے مجھ سے پوچھا۔

"تباہی و بربادی کے سوا اور کیا ممکن ہے!" میں نے جواب دیا۔ "پھر بھی ہم اپنی سی کوشش کرتے رہیں گے، آگے اللہ کو اختیار ہے۔"

عارج کی دل دہی کے لئے کچھ دیر صحرا میں رہی، پھر اسے ساتھ لئے بغداد آ گئی۔

اگلے روز شام کو میں نے اپنی چشم تصور سے ہلاکو خاں اور اس کے لشکر کو بصرہ شہر میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہاں کے بیشتر باشندے، منگولوں کے خوف سے شہر چھوڑ کر بھاگ

چکے تھے۔ پھر بھی یہاں خاصی آبادی تھی۔

ہلاکو خاں کے حکم پر بصرے میں قتل عام شروع ہو گیا۔ میرے لئے المناک بات یہ تھی کہ منگول سپاہی، معصوم بچوں تک کو بڑی بے دردی سے قتل کر رہے تھے۔ ان درندوں کو نہ تو بچوں کے آنسوؤں پر ترس آیا، نہ ان کی ماؤں کی آہ و فریاد نے اثر کیا۔ منگول وحشیوں کی تلواروں نے بچوں کو بھی ذبح کر ڈالا اور ان کی ماؤں کے سر بھی اڑا دیئے۔

اسی شام میرے وجود پر ایک اور ضرب لگی۔ یہ ضرب لگانے والا کافر عفریت عکب ہی تھا۔ اس خبیث نے منگول سپاہیوں کو بدکاری کی راہ پر ڈال دیا۔ بصرہ کی خوب صورت عورتوں اور جوان لڑکیوں کو فوری طور پر قتل نہ کیا گیا۔ ایسا ہلاکو خاں کے حکم پر ہوا۔ عکب ہی نے اس سے یہ حکم دلوایا تھا۔ حسین و پری جمال آدم زادیوں کی بے حرمتی کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتارا جانے لگا۔ اکثر عرب آدم زادیوں نے اپنی عصمت پر جانیں قربان کر دیں۔

بصرہ میں خوں ریزی اور لوٹ مار کے بعد دوسرے دن شہر کو آگ لگا دی گئی۔ منگول جب اس شہر سے نکلے تو ان کے پیچھے آگ اور دھواں تھا۔ دو ہی دن میں منگولوں نے وہ بسا بسایا شہر اجاڑ دیا۔

بصرہ شہر کی تباہی پر مجھے بڑا رنج ہوا اور میں نے اس کا اظہار عارج سے بھی کیا۔ اس طرح شاید میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ ہم دونوں ابوبکر اور فردوس کے قالبوں میں تھے۔ ہمارے اردگرد اس وقت کوئی نہیں تھا۔

میری بات سن کر عارج کہنے لگا۔ ''اے سویزرا! ابھی تو ہمیں اور بہت کچھ دیکھنا ہے۔'' پھر اس نے خلاف توقع مجھے دلاسا دیا۔ عارج اور میں دیر تک متوقع و ممکنہ صورتحال پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔

منگولوں کو روکنے والا تو کوئی تھا ہی نہیں، وہ اسی لئے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

ایک روز دوپہر ہونے سے کچھ پہلے میں نے اپنی چشم تصور سے منگول لشکر کو ایک بستی کی طرف بڑھتے دیکھا۔ یہ اطلاع جب میں نے عارج کو دی تو وہ بولا۔ ''کیوں نہ ہم دونوں وہاں چلیں! کیا پتہ ہماری وہاں موجودگی ان بستی والوں کو بچا لے۔''

''تیرا کہنا درست ہے اے عارج، مگر میں تجھے وہاں اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گی۔''

''کیوں؟'' عارج نے پوچھا۔

''وجوہ تو کئی ہیں، لیکن بڑی وجہ کافر عفریت عکب ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''وہ بھی اگر وہاں ہوا تو تیرا ساتھ میرے لئے مسئلہ بن جائے گا۔''

''وہ کیسے؟'' عارج بحث کرنے لگا۔

''تیرے ساتھ ہونے سے میرا دھیان بٹ جائے گا۔ میں تجھے عفریت کے ممکنہ حملے سے بچانے میں لگ جاؤں گی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مجھ سے آدم زادوں کی کیا مدد ہو گی!'' میں نے کہا۔ ''اے عارج! تو مجھے اکیلا ہی جانے دے۔''

تھوڑی دیر مزید بحث مباحثے کے بعد عارج راضی ہو گیا اور میں، فردوس کے جسم سے باہر آ گئی۔

مطلوبہ بستی تک پہنچنے میں مجھے دیر نہ لگی۔ منگولوں کا لشکر ابھی بستی سے دور ہی تھا۔ پہلے میں نے یہ جائزہ لینا ضروری سمجھا کہ ہلاکو خاں کے ساتھ کافر عفریت عکب تو نہیں! عکب کو منگولوں کے ساتھ نہ دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ مجھے امید بندھ گئی کہ شاید میں اس بستی کو تباہ و برباد ہونے سے بچا سکوں۔ اس کے باوجود چوکنا تھی۔ عکب کسی بھی وقت وہاں آ سکتا تھا۔ پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ منگول لشکر کے بعد میں نے بستی کا بھی ایک پھیرا لگایا۔

یہ امر میرے لئے امید افزا تھا کہ بستی کی ''شہر پناہ'' تھی۔

میری ترغیب پر بستی والوں نے پھاٹک بند کر لئے۔ فوری طور پر منگولوں کے حملے سے بچنے کی یہی واحد صورت تھی۔

منگولوں کا لشکر آخر بستی کے سامنے پہنچ ہی گیا۔ اس بستی کے چند ''بڑوں'' نے میرے ہی ایما پر ہلاکو خاں سے امن طلب کرنے کے لئے ایک قاصد بھیجا۔ میں بھی اس قاصد کے ساتھ تھی جسے فوراً ہلاکو خاں کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

قاصد نے جب اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا تو ہلاکو خاں نے کہا۔ ''واپس جا کر مسلمانوں سے کہہ دو کہ تمہارے لئے امان ہے۔'' ہلاکو خاں جب اپنی سرشت کے خلاف یہ الفاظ ادا کر رہا تھا تو میرے زیر اثر تھا۔ اس نے بات جاری رکھی اور مزید بولا۔ ''اپنے بستی والوں سے کہنا کہ وہ اپنے ساتھ کوئی چیز یا سامان نہ لے جائیں۔ نہ انہیں بستی میں رہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ بستی کے سب چھوٹے بڑے، مرد، عورتیں اور بچے باہر نکل آئیں اور جہاں چاہیں چلے جائیں۔''

میرا مقصد محض یہ تھا کہ اس بستی کے آدم زادوں کی جان بچ جائے۔ مگر اپنی بے خبری
کے سبب وہ کچھ اور ہی سوچ بیٹھے تھے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ہلاکو خاں کا کسی کو امان
دے دینا کتنی بڑی بات تھی!

قاصد نے واپس جا کر بستی والوں کو ہلاکو خاں کا پیغام سنا دیا۔

بستی والے اس پر افسوس کرنے لگے کہ جب انہیں جلا وطن ہی ہونا تھا تو منگولوں کی آمد
سے پہلے ہی بستی چھوڑ کر چلے جاتے۔ اس طرح انہیں کچھ تو اپنا مال و اسباب ساتھ لے
جانے کا موقع مل جاتا۔ اب وہ اپنے ساتھ کچھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ نہ ان میں مقابلے کی
قوت تھی، نہ عباسی فوج کے آنے کی امید۔ ایک زمانہ تھا جب وہاں کچھ فوج رہتی تھی، لیکن
ابنِ علقمی کے حکم پر جب فوجوں میں کمی کی جا رہی تھی تو اس بستی کی فوجی چھاؤنی بند کر دی گئی
تھی۔ اب وہاں ایک فوجی بھی نہیں تھا۔ بستی والوں کے پاس اب ہلاکو خاں کا حکم ماننے کے
سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

جس وقت بستی کے مرد و زن اور بچے پھاٹک کھول کر باہر نکل رہے تھے تو میں چونک
اٹھی۔

بدبخت و کافر عفریت عکب وہاں پہنچ گیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اے دینار! مجھے
معلوم ہے کہ تُو یہاں موجود ہے۔ لیکن تُو یہ نہ جانتی ہو گی کہ میں بھی ہلاکو خاں کے ساتھ
ہوں۔"

"تو پھر اے لعنتی عکب، تو مجھے نظر کیوں نہیں آیا؟" میں نے حقارت آمیز لہجے میں اس
سے پوچھا۔

"جب تُو میری نظروں سے چھپے رہنے کے لیے اپنے گرد نادیدہ حصار کھینچ سکتی ہے تو
کیا میں تجھے حیرت زدہ کرنے کے لیے اندھیرے کی چادر نہیں اوڑھ سکتا!...... سن! تُو جس
وقت ہلاکو خاں کو اپنے اثر میں لے رہی تھی تو دانستہ میں نے مداخلت نہیں کی۔" عفریت
عکب کہتا رہا۔ "اگر واقعی تُو ان آدم زادوں کو قتل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی تو میری شرط......"

"مجھے تیری کوئی شرط منظور نہیں!" میں بول اٹھی۔

"سوچ لے اے دینار، یہاں بڑی قتل و غارت ہو گی۔" عکب نے مجھے ڈرایا، پھر کہنے
لگا۔ "افسوس ہے تجھ پر کہ تُو میری شرط مان کر ان آدم زادوں کی زندگی بچا سکتی ہے مگر دانستہ

انہیں موت کے منہ میں دھکیل رہی ہے۔"

"اے عکب! تُو مجھے دھمکی دے رہا ہے؟"

"یہ دھمکی نہیں، اس کا اندازہ تجھے ابھی ہو جائے گا اے دینار۔"

"لیکن منگول حکمراں ہلاکو خاں، بستی والوں کو امان دے چکا ہے۔" میں بولی۔

اس پر عکب زور سے ہنس دیا، پھر کہا۔ "وہی ہلاکو خاں جس نے امان دی ہے، دیکھ کہ
اب بستی والوں کے ساتھ کیا کرتا ہے!"

عکب کو میں نے ہلاکو خاں کی طرف لپکتے دیکھا۔ اس لعنتی عفریت نے میرے سارے
کیے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ میں نے ذرا ہی دیر بعد ہلاکو خاں کو بستی والوں کی سمت گھوڑا
دوڑاتے ہوئے دیکھا۔ ہلاکو خاں کے ساتھ خوں خوار منگولوں کا ایک دستہ بھی تھا۔ بدنصیب
بستی والوں کے قریب پہنچ کر ہلاکو خاں نے منگول سپاہیوں کو حکم دیا۔

"ان کا قتلِ عام شروع کر دو!"

ہلاکو خاں کے حکم کی تعمیل ہونے لگی۔ مظلوموں کے جسموں سے سر جدا ہونے لگے۔ یہ
بدعہدی دیکھ کر مسلمان حیرت زدہ رہ گئے۔

بستی والے یقیناً لاعلم تھے کہ آدم زادوں کی اس جنگ میں جنات بھی شامل ہیں۔ انہیں
بھلا کیسے خبر ہوتی کہ ہلاکو خاں جیسے سفاک آدمی نے انہیں کس طرح امان دے دی اور پھر
کیوں اپنے عہد سے پھر گیا! ان میں سے چند معزز لوگ آگے بڑھ کر ہلاکو خاں کے
پاس پہنچ گئے اور اس سے بڑی عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ وہ خوں ریزی بند کرا
دے۔ بستی والوں نے تو اسی کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اس پر ہلاکو خاں ہنس پڑا اور بولا۔

"میں تمہیں اس لیے زندہ چھوڑ دوں کہ آئندہ میرا مقابلہ کرو۔ کیا کبھی مسلمانوں نے
اپنے دشمنوں پر رحم کیا ہے جو میں یہ حماقت کروں؟"

ہلاکو خاں اور بستی والوں کے درمیان نصیر الدین طوسی ترجمان بنا ہوا تھا۔

ایک ادھیڑ عمر آدم زاد نے عرض کیا۔ "اگر آپ کو یہی اندیشہ ہے کہ ہم مقابلہ پر آ جائیں
گے تو مردوں کو قتل کر ڈالیں، مگر عورتوں اور بچوں کو چھوڑ دیں۔"

جب یہ گفتگو جاری تھی تو ہلاکو خاں کے اشارے پر بستی والوں کا قتلِ عام عارضی طور پر
روک دیا گیا تھا۔ اپنے وزیر نصیر الدین طوسی کے توسط سے بستی والوں کی یہ پیشکش ہلاکو خاں

نے سنی تو طنزیہ انداز میں مسکرا کر بولا۔

"سانپ کو مارنا اور سانپ کے بچوں کو چھوڑ دینا کہاں کی عقل مندی ہے!"

ایک اور آدمی نے کہا۔ "لیکن آپ نے تو ہمیں امان دی تھی؟"

"یہ تو تمہیں بستی سے نکالنے کا بہانہ تھا۔" ہلاکو خاں نے ڈھٹائی سے کہہ دیا۔ یہ کہتے ہی ہلاکو خاں نے اپنے سپاہیوں کو ایک مرتبہ پھر اشارہ کیا۔ یہ مخصوص اشارہ موت کی علامت تھا۔

ہلاکو خاں کے سپاہی دوبارہ نہتے مسلمانوں کو ذبح کرنے لگے۔ عورتوں نے بچوں کو گودوں میں چھپا لیا، مگر ان کی گودیں ایسی پناہ گاہیں تو نہیں تھیں کہ بچوں کو وہاں تحفظ مل جاتا۔ بے رحم منگولوں نے ان کی گودوں سے معصوم بچوں کو چھین چھین کر قتل کر دیا۔ معصوم اور بھولے بچے خوفزدہ نگاہوں سے تلواریں دیکھتے تھے اور سہم جاتے تھے۔ وہ رونا تک بھول گئے تھے۔

قتل عام کرتے ہوئے منگول سپاہیوں نے صرف حسین و مہ جمال عورتوں اور لڑکیوں کا خیال رکھا تھا۔ انہیں وہ ایک طرف کھڑا کرتے جا رہے تھے۔ وحشی منگول سپاہی جب اپنی تلواریں نیام کر چکے تو خوبرو آدم زادیوں کی طرف متوجہ ہو گئے اور انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ آدم زادیوں کی حرمت پامال کی جانی تھی۔ میں کچھ اور تو نہ کر سکی مگر ان آدم زادیوں کو مشتعل کر دیا۔ عام حالات میں شاید یہ تصور بھی محال ہوتا کہ عورتیں ان منگول درندوں کے مقابل آ تیں، لیکن اس دن یہی ہوا۔ اشتعال میں آ کر ان آدم زادیوں نے منگول سپاہیوں ہی سے ان کے ہتھیار چھینے اور انہی پر ٹوٹ پڑیں۔

اچانک میری سماعت میں عفریت عکب کی آواز گونجی، یہ آواز عقب سے آئی تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا، عکب کہہ رہا تھا۔ "اے دینار! کیا تو اتنی ہی کم عقل ہے کہ سمجھتی ہے کہ ان آدم زادیوں کو بچا لے گی؟"

"اے مردود عکب! میں نے یہ دعویٰ کب کیا؟...... پھر بھی تو دیکھتا رہ کہ میں انہیں کیسے بچاتی ہوں!" میں نے جواب دیا۔

"تو کہتی ہے تو یہ بھی دیکھ لیتا ہوں!...... ویسے جب تو مجھے برا بھلا کہتی ہے تو تیری آواز مزید حسین ہو جاتی ہے۔"

ان مشتعل و غضب ناک آدم زادیوں کے ہاتھوں کئی منگولوں کی گردنیں اُڑ گئیں۔ منگولوں کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ وہ نازک اندام حسینائیں ان سے مقابلہ کرنے پر اتر آئیں گی۔ انہیں اسی لئے سنبھلنے میں تھوڑی دیر لگی۔ پھر ان وحشیوں نے کچھ لحاظ نہ کیا اور ان آدم زادیوں کے سر کاٹنے لگے۔ ان کے حسین جسموں میں نیزے اتارنے لگے۔ منگول وحشیوں نے ان عورتوں اور خوب صورت نوجوان لڑکیوں کو چاروں طرف سے گھیر کر مار ڈالا۔

"اے دینار!" عکب نے مجھے پھر پکارا۔ "میں جانتا ہوں کہ تو ابھی یہاں سے گئی نہیں۔ دیکھا تو نے کہ آدم زادیوں کو کس طرح قتل......"

"یہ بہادری نہیں بزدلی ہے اے عکب!"

"لیکن تیرا کہنا تو یہ تھا کہ انہیں بچا لے گی!" عکب نے مجھ پر طنز کیا۔

"میں نے انہیں بچا تو لیا ہے...... ان کو بے حرمت ہونے سے بچا تو لیا اے ملعون عکب!" میں یہ کہتے ہی وہاں سے چل دی۔

اپنے عقب میں مجھے عکب کے طنز آمیز قہقہے سنائی دیتے رہے، مگر میں رکی نہیں۔

بغداد کی طرف پرواز کرتے ہوئے میں نے فیصلہ کر لیا کہ چند روز کے لئے عارج کو ولی عہد ابوبکر کے قالب میں اترنا چاہئے۔ میں نے یہ بات عارج کو بتا دی اور بولا۔ "اس طرح ہم حالات سے زیادہ باخبر رہ سکیں گے۔"

"یقیناً......" عارج دھیرے سے ہنس دیا۔ "بس فرق یہ پڑے گا کہ تو میری بیوی بن کر نہ رہ سکے گی۔" اس کے لہجے میں شوخی واپس آ گئی۔

عارج کی خوش مزاجی پر مجھے خوشی ہوئی، اسے میں نے سمجھا دیا تھا کہ عکب کا سامنا ہو تو رکے نہیں۔

"رقیب اگر تگڑا ہو تو کمزور عاشق راہِ فرار اختیار کرنے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہے۔" عارج ہنس کر بولا۔

"تو نے اس بہانے ہی سہی، اپنی کمزوری کا اعتراف تو کیا۔" میں نے اس پر فقرہ چست کیا۔

"تیری اس بات کا جواب تو ہے میرے پاس بھی دینار، مگر تو شرما جائے گی۔ تجھے خوب معلوم ہے کہ......"

''بس کر!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تو جو کہے گا، خبر ہے مجھے!''

یہی باتیں کرتے ہوئے ہم بغداد شہر کی حدود میں داخل ہو گئے۔

''اے دینار! وہ دیکھو لوگ مسجد سے نکل نکل کر باہر جمع ہو رہے ہیں۔'' عارج نے مجھے ایک طرف متوجہ کیا۔

وہ بغداد کی جامع مسجد تھی جس کے باہر بھیڑ دکھائی دے رہی تھی۔ یقیناً یہ آدم زاد فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تھے۔ عارج کو ساتھ لئے ہوئے میں بھی آدم زادوں کی اس بھیڑ میں شامل ہو گئی۔

''اے لوگو! میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ قہر الٰہی اب دارالخلافہ بغداد سے زیادہ دور نہیں۔'' ایک دراز قد آدم زاد وہاں موجود لوگوں سے مخاطب تھا۔ ''میں نے بستیوں کو ویرانوں میں بدلتے دیکھا ہے۔ اس سے پہلے کہ بغداد کا بھی یہی حشر ہو اور تم سب قتل کر دیئے جاؤ، اپنی جانیں بچا کر یہاں سے نکل جاؤ!......'' وہ آدم زاد شہر والوں کو منگولوں سے ڈراتا رہا۔

میں چونک اٹھی۔ کیونکہ وہ آواز غیر انسانی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہلاکو خاں اپنا لشکر ساتھ لئے آندھی طوفان کی طرح بغداد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ بات بھی سچ تھی کہ منگولوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جس علاقے سے گزریں گے وہاں ایک مسلمان کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے، کھیتوں کو برباد کر دیں گے اور آبادی کو ویرانہ بنا دیں گے۔ ہلاکو خاں کا لشکر زرخیز علاقے کو کن میدان بناتا چلا آ رہا تھا۔ ان تمام حقائق کے باوجود اس ''غیر انسانی آواز'' کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ سو میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر عارج کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

پھر عارج نے اسی پر عمل کیا جو میں نے اس سے کہا تھا۔ وہ قریب ہی کھڑے ایک آدم زاد کے جسم میں داخل ہو گیا۔

''اے شہر والو!'' عارج نے دبنگ مردانہ آواز میں وہاں موجود آدم زادوں کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ''یہ شخص، ہلاکو خاں کا مخبر ہے اور ہمیں ڈرا کر بغداد سے نکال دینا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ ہم جنگ لڑنے سے پہلے ہی ہار جائیں۔''

میں اس عرصے میں کئی آدم زادوں کو اپنے زیر اثر لے چکی تھی۔ سو وہ بھی چیخ اٹھے۔ ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں، یہ شخص جھوٹا ہے، ہلاکو خاں کا مخبر ہے! اتنا سننا تھا کہ مجمع بے قابو ہو گیا۔ دراز قد آدم زاد پر انہوں نے ہلا بول دیا۔ پھر وہ سبھی حیرت زدہ رہ گئے۔ دراز قد شخص پراسرار طور پر غائب ہو چکا تھا۔

اچانک میں نے فضا میں شعلہ سا لپکتا دیکھا اور اسے پہچان گئی۔ میرا قیاس قطعی درست نکلا۔ وہ کافر عفریت عکب ہی تھا۔ اس نے لوگوں کو ورغلانے اور اپنا مقصد نکالنے کے لئے ایک آدم زاد کا خیالی پیکر اپنا لیا تھا۔

میں دانستہ آدم زادوں کے اس مجمع سے الگ ہو گئی۔ مجھے ڈر تھا کہ میری وجہ سے کہیں بے گناہ آدم زاد زد میں نہ آ جائیں۔ ذلت و رسوائی اور اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد عفریت انتقاماً کوئی ایسی کارروائی کر سکتا تھا کہ میرے اردگرد موجود آدمیوں کو نقصان پہنچ جاتا۔ میں جیسے ہی فضا میں بلند ہوئی، عکب غوطہ لگا کر میرے قریب آ گیا۔

''اے دینارا!'' عکب مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''تو آخر کب تک ان مسلمانوں کو کافر منگولوں کی تلواروں سے بچاتی رہے گی؟...... سن لے کہ وہ دن اب زیادہ دور نہیں، جب بغداد کے گلی کوچوں اور بازاروں میں قتل عام ہو گیا تو...... ہاں اے دینار، تو اگر چاہے تو اب بھی اس یقینی تباہی و بربادی کو روکا جا سکتا ہے۔''

''اے لعنتی! اللہ نے جو بھی جس کا مقدر کر دیا اسے کوئی نہیں روک سکتا۔'' میں نے عفریت عکب کی بات کا بلا جھجک جواب دیا۔ ''اگر اس شہر کی قسمت میں تباہ ہونا لکھا ہے...... اگر بغداد والوں کا خون زمین پر بہنا ہے، یہی ان کا مقدر ہے تو اسے کون بدل سکتا ہے! طاقت کے نشے میں یہ نہ بھول اے عکب کہ تجھے بھی ایک دن موت آنی ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔''

معاً عکب کے وجود کو میں نے غائب ہوتے دیکھا۔ میرے گرد اگرد خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ فوری طور پر مجھے عارج کا خیال آیا۔ عکب اس پر اپنے سحر و افسوں کا وار کر سکتا تھا۔ عارج کے وجود کی مخصوص خوشبو کے ذریعے میں دوسرے ہی لمحے اس تک پہنچ گئی۔ وہ جس آدم زاد کے جسم میں داخل ہوا تھا، اس سے نکل ہی رہا تھا کہ چیخ اٹھا۔ اسے میں نے زمین پر گر کر تڑپتے دیکھا۔

❁...❁

میں نے سوچا، عکب نے وار کر ہی دیا۔ سحر کا توڑ کرنے میں مجھے جتنی دیر لگی اتنی دیر تک عارج کو انتہائی اذیت سے گزرنا پڑا۔

عارج کے وجود کا نصف حصہ آدم زاد کے جسم میں تھا اور نصف باہر۔ عکب نے اسے اسی حالت میں غیر متحرک کر دیا تھا۔

سحر کا اثر ختم ہوا تو عارج جھٹکا کھا کر آدم زاد کے جسم سے پوری طرح باہر آ گیا۔ اسی کے ساتھ میں نے عکب کی چیخ سنی۔ مگر میری توجہ عارج پر تھی۔ میں اسے سہارا دے کر وہاں سے لے اُڑی۔ ابھی اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ میں اسے شہر سے باہر صحرا میں لے آئی۔ ریت کے ایک ٹیلے کے پیچھے میں نے عارج کو لٹا دیا۔ وہ دھیرے دھیرے اعتدال پر آ گیا۔

عکب کی چیخ کا مطلب یہی تھا کہ اس مرتبہ بھی اپنے سحر کی ناکامی پر اسے سزا بھگتنی پڑی تھی۔

''اے عارج! کام ہو جانے کے بعد تُو اس آدم زاد کے جسم سے نکلا کیوں نہیں؟'' میں نے عارج سے دریافت کیا۔

''تُو جو مجھ سے کچھ کہے بغیر غائب ہو گئی! میں اس چکر میں رہا کہ تُو خود بتائے گی کب اس آدم زاد کے جسم سے باہر آنا ہے!'' عارج نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ پوری طرح اپنے حواس میں آ چکا تھا۔

''کیا تجھ میں اتنی سمجھ نہیں کہ کس وقت کیا کرنا چاہیے!... اگر مجھے چند لمحے بھی تاخیر ہو جاتی اور تجھ تک نہ پہنچ پاتی تو اس بدذات عکب نے تیرا کام تمام کر ہی دیا ہوتا۔ آئندہ تجھے بہت احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔'' میں نے عارج کو سمجھایا۔

''وہ تو خیر میں احتیاط کرلوں گا، مگر یہ بتا کہ اچانک تُو کہاں غائب ہو گئی؟''

میں نے جواب میں عارج کو ساری روداد سنا دی۔

عارج نے میری باتیں پوری توجہ سے سنیں، پھر کہنے لگا۔ ''یہ عفریت عکب تو بڑا ہی فریبی اور کمینہ ثابت ہوا اے دینار!''

''تُو نے کبھی کوئی شریف عفریت بھی دیکھا ہے؟'' میں بولی۔ ''عفریت تو کمینے ہی ہوتے ہیں۔''

''لے، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔'' عارج برجستہ بول اٹھا۔

''نہ خود پاگل بن، نہ مجھے بنا!''

''تُو تو پہلے ہی سے بنی ہوئی ہے۔'' عارج شرارت سے باز نہ آیا۔ مجھے ہنسی آ گئی تو وہ کہنے لگا۔ ''تُو ہنستے ہوئے کتنی اچھی لگتی ہے۔''

شہر کے حالات اس قدر کشیدہ ہونے اور عکب کے ساحرانہ حملے کے باوجود عارج کی خوش مزاجی برقرار تھی۔ یہی اس کا فطری مزاج تھا۔ اگر وہ ولی عہد ابوبکر کے انسانی قالب میں ہوتا تو یقیناً اس طرح نہ چہکتا۔

عفریت عکب نے تو خیر اس مقصد کے تحت کہ بغداد کے باشندے حوصلہ ہار جائیں، لیکن حقیقت بہرحال اپنی جگہ تھی۔ تباہ شدہ علاقوں سے لوگ واقعی بھاگ بھاگ کر بغداد آ رہے تھے۔ انہوں نے منگولوں کی سفاکی اور بربریت کے جو حالات شہر والوں کو سنائے وہ ایسے لرزا دینے والے تھے کہ ان کے دل دہل گئے۔ تمام بغداد میں وحشی منگولوں کے آگے بڑھتے چلے آنے اور لوگوں پر ہولناک مظالم ڈھانے کی داستانیں زبان زد عام ہو گئیں۔ لوگ خوف و دہشت سے کانپ اٹھے اور کہنے لگے کہ دیکھیں خدا کو کیا منظور ہے۔

خدا تو انہیں یاد آ گیا لیکن اس کے سامنے اب بھی نہیں جھکے۔ جو بری علتیں اور عادتیں ان میں پڑ گئی تھیں، انہیں اس عالم میں بھی نہیں چھوڑا۔ جو اطلاعات دارالخلافہ بغداد تک پہنچ رہی تھیں، عوام سے گزر کر امیروں، رئیسوں، وزیروں، شہزادوں اور خلیفہ سب کو معلوم ہو گئیں۔ اس موقع پر عارج نے مجھے اپنی دانست میں ایک بہتر مشورہ دیا۔

''اے دینار! اگر ایسے میں معزز شہریوں کا وفد خلیفہ سے ملے تو شاید اس غافل کی آنکھیں کھل جائیں۔'' عارج نے کہا۔

''مشکل ہے اے عارج کہ وہ لالچی، بے عقل اور غفلت شعار سنبھل جائے۔''

''کوشش کر کے دیکھنے میں کیا مضائقہ ہے!''

میں راضی ہوگئی۔ ہمارے بس میں اور تھا بھی کیا! یہی کہ دشمن کے خلاف کوشش کیے جائیں۔

میری کوشش کے نتیجے میں دوسرے ہی دن امیروں اور شہر کے معزز آدم زادوں کا ایک وفد قصرِ خلافت پہنچا مگر اس وفد کو بھی ناکامی اٹھانی پڑی۔ اس کے بعد میں نے ایک اور تدبیر سوچی اور اس پر عمل شروع کر دیا۔

یوں بھی اس کے لئے فضا سازگار تھی۔ وفد کے خلیفہ سے ملنے اور ناکام واپس آنے کی خبر عوام کو بھی پتہ لگ چکی تھی۔ وہ اسی بنا پر انتہائی بے چین تھے۔ کبھی تو بغداد کے باسیوں کو اپنی جناتی صفات کے اثر میں لے کر اور کبھی مختلف قالب اپنا کر عارج اور میں نے انہیں ایک ہی راہ دکھائی۔

آخر کار ہماری تدبیر کارگر ہوئی۔ بغداد کی جامع مسجد کے سامنے لوگ جمع ہونے لگے۔ اس وقت تک ظہر کی نماز ہو چکی تھی۔ میرے ایما پر عارج نے تو ایک عالم کا انسانی قالب اپنا رکھا تھا۔ مطلقاً میں نے کسی انسانی جسم میں قید ہونا پسند نہ کیا۔ اگر مجبوری نہ ہوتی تو عارج کو بھی میں ایسا نہ کرنے دیتی۔ دراصل ایسے مواقع پر آدم زادوں کو یکجا کرنے کے لئے کسی رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغداد میں عالم ہارون بن سلمان کی بڑی عزت تھی۔ وہ مقرر بھی اچھا تھا۔ عارج نے اسی کے جسم میں اتر کر جگہ جگہ پورے بغداد میں ایسی تقریریں کی تھیں جنہوں نے آگ لگا دی تھی۔ انہی تقریروں میں اس نے آج کے دن کو فیصلے کا دن قرار دیا تھا۔

اس نے آج بعد نماز ظہر جامع مسجد کے سامنے جمع ہونے کو کہا تھا۔

ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ وہاں سر ہی سر نظر آنے لگے۔ انسانی پیکر میں عارج اب تک جامع مسجد کے اندر ہی تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ جب آدم زادوں کی مناسب تعداد مسجد کے باہر جمع ہو جائے گی، مطلع کر دوں گی۔ تب تک تُو نفل پڑھتا رہ! عارج کے انسانی قالب ہارون کی شخصیت بڑی پُرکشش تھی۔ دارالخلافہ میں ہارون واحد ایسا عالم تھا جس کو دونوں ہی بڑے فرقوں والے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس قدر و منزلت کی وجہ یہ تھی کہ ہارون ہمیشہ اپنی تقریروں میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی بات کرتا تھا۔ اس کے برعکس

دوسرے عالم سستی شہرت و مقبولیت کی خاطر خود کو برتر اور دوسروں کو کمتر کہتے، طنز کرتے اور نفاق کے بیج بوتے۔ اتفاق اور اخوت کی باتیں گویا ہارون کا حصہ تھیں۔ میں نے خوب سوچ سمجھ کر ہارون کا جسم استعمال کیا تھا اور عارج کو اس میں اترنے کے لئے کہا تھا۔

بغداد کی جامع مسجد کے سامنے جب آدم زادوں کی مطلوبہ تعداد نظر آنے لگی تو میں مسجد میں داخل ہوگئی۔ پھر عارج نے جیسے ہی سلام پھیرا لپک کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ میں نے سرگوشی کی۔ ''اے عارج! اب دعا مانگ کر تُو باہر آجا، خلقِ خدا تیری منتظر ہے۔''

عارج نے اقرار میں سر ہلایا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

میں نے دراصل یہ تدبیر اختیار کی تھی کہ خلیفہ سے اپنی بات منوانے اور اس پر ضروری دباؤ ڈالنے کے لئے عوام کی طاقت کو استعمال کیا جائے۔ بڑے سے بڑا حکمراں بھی عوام کو نظر انداز نہیں کر سکتا، میرا یہی تجربہ مشاہدہ تھا۔

کچھ ہی دیر میں ''ہارون'' جامع مسجد کے صدر دروازے سے نکلا تو لوگ پُرجوش دکھائی دیئے۔ وہ ''ہارون'' کی حمایت میں نعرے لگانے لگے۔ عارج کو آدم زادوں کا وہ مجمع عالم ہارون ہی سمجھ رہا تھا۔ انہیں یہ علم ہوتا بھی کیسے کہ عالم ہارون کے جسم پر ایک جن زاد نے قبضہ کر لیا ہے! عارج نے استقبالیہ نعروں کے جواب میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ وہ لوگوں کو دور سے بھی نظر آتا رہے اس لئے سیڑھیوں سے نیچے نہیں اترا۔

عارج نے موقع کی مناسبت سے تلاوت کی، پھر تقریر شروع کر دی۔

''اے لوگو! آج فیصلے کا دن ہے۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وحشی و کافر منگولوں سے مقابلہ کیا جائے یا حوصلہ ہار دیں۔ مقابلے کی بس ایک ہی صورت ہے کہ خلیفہ محترم اپنے وزیر ابن علقمی کے مشوروں پر عمل نہ کریں اور فوری طور پر فوجوں کی بھرتی کا حکم دے دیں۔ بولو، تم لوگوں کو کیا قبول ہے، مقابلہ یا پسپائی؟ ... مجھے اپنے سوال کا جواب چاہئے!''

''مقابلہ ... مقابلہ!'' ہر طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔

عارج نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو خاموش کیا، پھر بلند آواز میں کہنے لگا۔ ''جواب مل گیا مجھے! ..... سو طے پایا کہ ہم کافر منگولوں کا مقابلہ کریں گے۔ ہم مسلمان ہیں اور ہمارا بھروسا اللہ پر ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ہم نے سیدھی راہ پکڑ لی تو اللہ ہماری مدد کرے گا۔ ظاہر ہے مقابلے کے لئے فوجیں چاہئیں اور فوجوں کی بھرتی کا حکم خلیفہ معظم ہی دے سکتے ہیں۔

دشمن سے جنگ کرنا عوام کا نہیں، فوج کا کام ہے۔ ہمارے پاس اب خلیفہ محترم تک اپنی بات پہنچانے کا ایک ہی ذریعہ ہے، وہ یہ کہ ہم ابھی اور اسی وقت قصرِ خلافت کے سامنے مظاہرہ کریں۔ اعلیٰ حضرت کو معلوم تو ہو کہ ہم عوام کیا چاہتے ہیں!.... خلقِ خدا کی مرضی کیا ہے!''

عارج نے اپنی پُر اثر تقریر میں وہی سب کچھ کہا جو میں اسے بتا چکی تھی۔ نتیجہ میری توقع کے مطابق ہی نکلا۔

''چلو چلو، قصرِ خلافت چلو۔'' لوگ چیخ اٹھے۔

پھر وہ ہجوم عارج کی رہنمائی میں قصرِ خلافت کے لئے روانہ ہو گیا جو قصر الخلد بھی کہلاتا تھا۔

مجھے خلیفہ مستعصم کے معمولات کا بخوبی علم تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر خلیفہ آرام کرتا تھا۔ گویا یہ اس کے سونے کا وقت تھا۔

اس ہجوم کے قصرِ خلافت پہنچنے سے پہلے ہی میں وہاں پہنچ گئی۔ خلیفہ مستعصم مجھے اپنی خواب گاہ میں سوتا ہوا ملا۔ کسی کی ہمت نہیں تھی جو خلیفہ کو جگا سکتا۔ وہاں اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ ہجوم اب قصرِ خلافت تک پہنچنے ہی والا تھا۔

''اٹھ اے خلیفہ مستعصم!'' میں اس کے سرہانے پہنچ کر زور سے بولی۔

مستعصم ہڑبڑا کر جاگ اٹھا اور حیران و پریشان سا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ حیرت کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر غصے کے آثار بھی تھے.... اس نے قدرے سخت آواز میں کہا۔ ''کس بے ادب و گستاخ نے ہمیں جگایا ہے؟''

''تجھے میں نے جگایا ہے اے مستعصم!'' میں نے اسی کی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

وہ چونک اٹھا اور پھر خوفزدہ سی آواز میں بڑبڑایا۔ ''یہ.... یہ تو خود میری.... میری آواز ہے۔''

''ہاں اے مستعصم! میں تیرے ہی ضمیر کی آواز ہوں۔'' میں نے اسے مطمئن کرنے کی خاطر کہا۔ ''سن اے غافل!.... اے خلیفہ مستعصم! خلقِ خدا کی آواز سن!.... سنائی دے رہا ہے تجھے کچھ؟''

''مجھ.... مجھے نعرے.... لوگوں کی چیخ و پکار کی آواز سنائی دے رہی ہے.... یہ کیا ماجرا

ہے؟''

''باہر نکل کر دیکھ! دارالخلافہ بغداد کے رہنے والے تیرے قصر کے باہر ہجوم کئے ہوئے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ.... وہ کیا.... مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' مستعصم نے سوال کیا۔ وہ اب اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔

''تجھے یہ سوال مجھ سے نہیں، خلقِ خدا سے کرنا چاہئے۔''

اس کے بعد مستعصم میرے زیرِ اثر اپنی خواب گاہ سے نکلا۔ اسے لباس تبدیل کر کے اپنے غلاموں اور محافظ دستے کے ساتھ قصرِ خلافت کے صدر دروازے تک آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ ایک بلند جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے دور تک لوگوں کا ہجوم تھا۔

مستعصم کے ایما پر ایک غلام نے بآوازِ بلند ہجوم کو مخاطب کیا۔ ''اعلیٰ حضرت خلیفہ معظم پوچھ رہے ہیں، تم لوگ کیا چاہتے ہو؟''

''خلیفہ محترم کے سوال کا جواب دینے محترم ہارون بن سلمان اور ان کے کچھ ساتھی اندر آنا چاہتے ہیں۔ محافظوں کو حکم دیا جائے کہ ان معزز افراد کو خلیفہ معظم تک پہنچنے دیا جائے۔'' مجمع میں سے ایک آدم زاد زور سے بولا۔

مستعصم اب تک میرے زیرِ اثر تھا۔ اس نے فوراً ہجوم کا مطالبہ مان لیا۔

یوں عارج اپنے ساتھ بغداد کے کچھ معززین کو لے کر خلیفہ مستعصم کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے کسی توقف کے بغیر کہنا شروع کیا۔ ''اے خلیفہ معظم! بغداد والوں کو حضور سے یہ عرض کرنا ہے کہ فوجیں بھرتی کر کے وحشی منگولوں کے مقابلے کی تیاری کی جائے۔''

خلیفہ مستعصم کو اب اپنے اثر میں رکھنے کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔ اسے میں نے وہ سبق پڑھا دیا تھا جو پہلے ہی سے یاد رکھنے کی ضرورت تھی۔ اس کے باوجود میری توجہ اس کے ذہن پر تھی۔ عوام کے اس مظاہرے سے خلیفہ کی آنکھیں کچھ کھلیں اور اس نے یہ سمجھا کہ منگولوں کے حملے کی اصلیت کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ پھر بھی اپنی فطرت کے مطابق اس نے کہا۔ ''ہم اس معاملے میں ابنِ علقمی سے آج ہی بات کریں گے۔''

''گستاخی معاف خلیفہ معظم! وزیرِ اعظم کو حضور اسی وقت طلب فرمالیں۔'' عارج بلا جھجک بولا۔

"ٹھیک ہے اے ہارون!" خلیفہ، عارج کے انسانی پیکر کو ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اس نے ابن علقمی کی طلبی کا حکم دے دیا۔

دوسرے ہی لمحے خلیفہ کے حکم کی بجا آوری کے لئے محافظ دستے کے دو گھڑ سوار، ابن علقمی کو ساتھ لانے کی خاطر دوڑ گئے۔

ابن علقمی کا محل، قصرِ خلافت سے دور نہیں تھا۔ سو وہ ذرا سی دیر میں پہنچ گیا۔

ابن علقمی کی اس ہجوم کے درمیان سے گزرا تو ہر طرف سے صدائیں آنے لگیں۔ "غدار وزیر اعظم مردہ باد! ابن علقمی کی بربادی!"

صدائے غلق سن کر عیار ابن علقمی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے نعرہ زن لوگوں کو بہت کچھ گھورا لیکن کسی ایک آدمی پر بھی اس کا رعب نہیں پڑا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ابن علقمی جب خلیفہ مستعصم کے سامنے پہنچا تو خلیفہ نے اس سے کہا۔

"یہ مظاہرین کیا کر رہے ہیں؟"

"مُردہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں اعلیٰ حضرت!" ابن علقمی نے مُردہ سی آواز میں جواب دیا۔

"یہ کسے مُردہ باد کہہ رہے ہیں؟" مستعصم نے دریافت کیا۔

"آپ کے اس وفادار خادم کو۔" ابن علقمی نے بتایا۔

"یہ تو ان کی کوئی معقول بات نہیں۔" خلیفہ کا "احمق" بیدار ہونے لگا۔ مگر میں اس پر اثر انداز نہیں ہوئی اور تماشا دیکھتی رہی۔ مستعصم کی بات سن کر ابن علقمی ڈھٹائی سے بولا۔

"کہنے دیجئے جو لوگ یہ کہیں۔ اعلیٰ حضرت فرمائیں کہ اس جاں نثار کو کس لئے یاد فرمایا ہے؟ حضور کا ہر حکم بجالانا اس خادم کا فرض ہے۔"

"تم تو کہتے تھے کہ ہلاکو خاں، عراق سے واپس چلا گیا؟" مستعصم نے بات شروع کی۔

"خادم نے سچ عرض کیا تھا اعلیٰ حضرت!" ابن علقمی کہنے لگا۔ "مگر اب یہ معلوم ہے کہ کسی نے انہیں حملے کی دعوت دی ہے۔"

ابن علقمی نے اپنی بلا کسی اور کے سر تھوپ دی تو خلیفہ طیش میں آ گیا اور پوچھا۔ "کون ہے وہ کمینہ؟"

"حضور کا خادم پتہ لگا رہا ہے کہ کس نے غداری کی ہے!" عیار آدم زاد ابن علقمی سنبھل کر بولا "جب اس خادم کو حقیقت کا علم ہو جائے گا تو بلاتاخیر حضور کو اس سے آگاہ کر دے گا۔" ایک غدار اپنی غداری پر لفظوں کا پردہ ڈال رہا تھا۔

"یہ بتاؤ، کیا ہلاکو خاں اپنا لشکر ساتھ لئے بغداد کی طرف واقعی بڑھا چلا آ رہا ہے؟" مستعصم نے سوال کیا۔

اس "سوالاً جواباً" کے دوران میں عارج اور دیگر معزز آدم زاد خاموش کھڑے رہے۔ میں نے بھی ابھی مداخلت ضروری نہیں سمجھی۔

ابن علقمی نے اعتراف کیا۔ "جی ہاں اعلیٰ حضرت! میں نے بھی یہی سنا ہے۔"

"کیا ہوگا اب؟" مستعصم نے پوچھا۔

"اعلیٰ حضرت کے اقبال سے کچھ نہ ہوگا" ابن علقمی نے مستعصم کو فریب دیا۔ وہ عیار آدم زاد اچھی طرح جانتا تھا کہ خلیفہ مستعصم کی انا ایسی ہی باتوں سے مطمئن ہوتی تھی۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ "یقین رکھیں خلیفہ معظم کہ منگولوں کو ہزیمت اٹھا کر جانا پڑے گا۔"

"مگر کب تک؟" مستعصم نے معلوم کیا۔ "اور فوجیں بھی تو کم ہیں۔ سامانِ حرب بھی نہیں ہے۔"

"میں سامانِ جنگ فراہم کر رہا ہوں، فوجیں بھی بھرتی کر لی جائیں گی۔" ابن علقمی کے دماغ پر میری توجہ تھی۔ اس کا مقصد عارضی طور پر خلیفہ مستعصم اور بغداد کے معززین کو مطمئن کرنا تھا، اس کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس لئے "بہت جلد فوجیں بھرتی کر لی جائیں گی۔"

"لیکن فوجوں کے لئے اخراجات کہاں سے آئیں گے؟" لالچی خلیفہ نے اپنی عادت و فطرت کے مطابق دریافت کیا۔

"یہی میں سوچ رہا ہوں اعلیٰ حضرت!" یہ کہہ کر عیار ابن علقمی نے ایک نئی چال چلی۔ "لڑائی کا خرچ عوام سے وصول کیا جائے۔"

خلیفہ مستعصم کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ وہ کہنے لگا۔ "اس سے قبل بغداد کے معززین کا ایک وفد ہمارے پاس آیا تھا۔ ہم نے اس وفد سے بھی یہی کہا تھا کہ شہر والے چندہ کر

لیں۔"

"بالکل درست فرمایا حضور نے۔" ابن علقمی نے گویا گرہ پر گرہ لگائی۔

پھر خلیفہ مستعصم نے عارج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابن علقمی کو مخاطب کیا۔ "تم یقیناً ہارون بن سلمان کو جانتے ہوگے۔ یہ اور ان کے ساتھی اپنے ہمراہ مظاہرین کو لے کر آئے ہیں۔ تم ہی انہیں اطمینان دلاؤ اور سمجھاؤ...... خود مظاہرین کے پاس جا کر ان کو یقین دلاؤ کہ منگولوں سے مقابلے کی تیاری کی جا رہی ہے، گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

ابن علقمی کی یہ چاہتا تھا کہ ہلاکو خاں کے بغداد پہنچنے تک وقت کو کسی طرح ٹالتا رہے۔ سو وہ مظاہرین سے خار کھانے کے باوجود ان کے پاس جانے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے خلیفہ کے ایما پر عارج اور اس کے ساتھ موجود دیگر شہر والوں کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس نے مظاہرین سے کچھ فاصلے پر قصرِ خلافت کے صدر دروازے سے متصل چبوترے پر چڑھ کر بلند آواز میں کہا۔

"اے بغداد والو! خلیفہ معظم نے فرمایا ہے کہ منگولوں سے مقابلہ کی تیاری بڑے پیمانے پر کی جائے۔ تم لوگ اطمینان رکھو۔"

مذکورہ چبوترے کے نیچے ہی عارج، ہارون کے انسانی قالب میں کھڑا تھا۔ اس نے واضح اور تیز آواز میں گویا بغداد کے باسیوں کی نمائندگی کی۔ وہ بولا۔ "ہمیں تمہاری بات پر یقین نہیں ہے۔"

ہجوم نے بھی عارج کی تائید میں ابن علقمی پر عدم اعتماد کا اظہار کیا۔ اس پر ابن علقمی نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی غرض سے کہا۔ "لوگو! یہ میں نہیں کہہ رہا، تمہارے خلیفہ کا حکم ہے۔"

عارج نے میرے ایما پر مطالبہ کیا۔ "خلیفہ محترم خود یہاں آ کر مظاہرین کو اطمینان دلائیں۔"

بہ مجبوری ابن علقمی کو اس چبوترے سے اتر کر خلیفہ مستعصم کے پاس جانا پڑا۔ میں حجت تمام کر دینا چاہتی تھی، سو خلیفہ کو اپنے اثر میں لے کر مظاہرین کے درمیان آنے پر مجبور کر دیا۔

مستعصم اپنے محافظ دستے کے ہمراہ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر صدر دروازے تک آ گیا۔ محافظ دستے کے سپاہیوں نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ لوگوں نے خود خلیفہ وقت کو اپنے درمیان دیکھا تو خاموش ہو گئے۔

"اے لوگو!" خلیفہ نے ہجوم کو مخاطب کیا۔ "ہم نے جنگی تیاری کا حکم دے دیا ہے۔ فوجیں بھرتی ہوں گی اور سامانِ جنگ فراہم کیا جائے گا۔"

میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میں نے اسی لئے عارج کے قریب جا کر سرگوشی کی۔ "تو اب اس جسم سے نکل آ!"

عارج نے عالم ہارون کا انسانی قالب چھوڑ دیا۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں ابن علقمی کے گھر پہنچ گئے۔ وزیر اعظم ابن علقمی بھی خلیفہ اور دیگر امرائے سلطنت کی طرح دوپہر سے شام تک سونے کا عادی تھا۔ آج دوپہر خلاف توقع اپنی طلبی کے سبب وہ سو نہیں سکا تھا۔ قصرِ خلافت سے آنے کے بعد وہ اپنی نیند پوری کر رہا تھا کہ عارج کے ساتھ میں اس کی خواب گاہ میں داخل ہوگئی۔ مجھے جو تدبیر سوجھی تھی، اس کا تعلق ابن علقمی ہی سے تھا۔

میری طرح عارج بھی اس عیار و غدار آدم زاد سے تپا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے سوتے ہوئے ابن علقمی کی ایک ٹانگ پکڑ کر اسے بستر سے نیچے گھسیٹ لیا۔ اس افتاد پر ابن علقمی چیخنے ہی والا تھا کہ میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔

"اے ابن علقمی! تو اگر چیخا چلایا تو میں تجھے مار ڈالوں گی!" میں نے سرگوشی کی اور اس کی گردن چھوڑ دی۔

وہ زمین پر پڑا آنکھیں پھاڑے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بڑبڑانے لگا۔ "یہاں...... یہاں تو کوئی نہیں۔ شاید...... شاید میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے اور...... اور بستر سے نیچے آ گرا ہوں۔"

"اے حقیر و قابلِ نفرت آدمی!" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "تو خود بستر سے نہیں گرا بلکہ تجھے گرایا گیا ہے۔"

میری غیر انسانی آواز سن کر ابن علقمی کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے۔ پھر وہ ہمت کر کے پوچھ ہی بیٹھا۔ "تم...... تم کون ہو؟"

''تیرے خیال میں کون ہوں؟'' میں اس کے خوفزدہ ہونے سے خوش ہو گئی۔

''مجھے نہیں...... نہیں معلوم۔'' وہ ہکلانے لگا۔

پھر میں نے دیر نہیں لگائی اور اسے اپنے اثر میں لے لیا۔

''سن اے ابنِ علقمی! تُو نے خلیفہ کے ایما پر بغداد والوں سے جو وعدہ کیا ہے، اسے پورا کرنا تیرا فرض ہے۔ تجھے فوری طور پر فوج بھرتی شروع کرنی ہے۔'' میں نے ابنِ علقمی سے سرگوشی کی۔ ''اور پھر فوجیوں کو سامانِ جنگ بھی فراہم کرنا ہے۔''

''اگر میں ایسا نہ کروں تو؟'' خلافِ توقع ابنِ علقمی کی زبان پر یہ الفاظ آئے تو میں چونک اٹھی۔

معلوم نہیں ابنِ علقمی کیسے میرے اثر سے آزاد ہو گیا تھا! یہ جان کر بھی میں نے اسے ڈرایا۔ ''تُو نے میرا حکم نہ مانا تو میں تجھے مار ڈالوں گی۔''

''نہیں اے دینار!'' اچانک میرے سامنے ایک شعلہ سا لہرایا۔ وہ کافر عفریت عکب تھا جو مجھ سے کہہ رہا تھا۔ ''جب تک عکب زندہ ہے تُو اس آدم زاد کو نہیں مار سکے گی۔ مجھے خبر تھی کہ تُو مایوس ہو کر ادھر ہی کا رخ کرے گی۔ میں اسی لئے اس آدم زاد کی نگرانی کر رہا تھا۔ یہ کافروں کا ساتھ دے رہا ہے، سو اس کی حفاظت ضروری ہے تاکہ تُو اسے ورغلا نہ سکے۔''

عکب کے ظاہر ہوتے ہی میں نے عارج کو مخصوص اشارہ کر دیا تھا۔ اس اشارے کا مطلب تھا کہ وہ بلاتاخیر فرار ہو جائے۔ عارج نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔ میں اسی سبب مطمئن تھی۔ میرے اور عکب کے درمیان ہونے والی گفتگو ابنِ علقمی نہیں سن سکا۔ آدم زاد اسی وقت ہم جنات کی آواز سن سکتے ہیں جب ہم خود انہیں اپنی آواز سنانا چاہیں۔

عکب کی بات کا جواب دینا میرے نزدیک ضروری نہیں تھا، پھر بھی غصے، جھنجھلاہٹ اور اپنے مقصد میں ناکامی کی وجہ سے بول ہی اٹھی۔

''اے کافر عفریت عکب! مجھے بھی یہ اندیشہ تھا کہ تُو اس آدم زاد کی مدد کرنے آ سکتا ہے۔''

''جھگڑا چھوڑ اے دینار! صلح کر لے مجھ سے۔'' عکب نے ''پرانا راگ'' گانا شروع کر دیا۔ ''صلح کے بعد وہی ہوگا جو تُو چاہے گی؟''

''ورنہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''تیری اور میری جنگ جاری رہے گی۔'' عکب جیسے کسی درندے کی طرح غرایا۔ ''اور اس جنگ میں آدم زادوں کا قتلِ عام ہوتا رہے گا۔''

''تُو کب سے آدم زادوں کا ہمدرد بن گیا؟'' میری آواز میں چبھن تھی۔

''جب سے تجھے آدم زادوں کے درمیان دیکھا اے دینار!'' عکب زور سے ہنس دیا، پھر کہنے لگا۔ ''ایک مرتبہ...... صرف ایک بار مجھے اپنی صورت دکھا دے تو اس کی جو قیمت مانگے گی، میں ادا کر دوں گا۔ میں بھی تو دیکھوں کہ میرے دوست دہوش نے مرنے سے پہلے تیرے بارے میں جو کچھ کہا، وہ سچ تھا...... اے دینار! اگر تُو میری یہ تمنا پوری کر دے تو میں اس آدم زاد ابنِ علقمی کو تیرے رحم و کرم پر چھوڑ دوں گا۔ میں اس کی مدد نہیں کروں گا...... جواب دے اے دینار!

''اب میرے ہنسنے کی باری ہے اے کافر اور اے فریب دینے والے عفریت!'' میں یہ کہہ کر واقعی ہنس دی۔ پھر بولی۔ ''مجھے معلوم نہیں تھا اے عکب کہ تُو اتنا بڑا بے وقوف ہوگا! تُو دراصل یہ چاہتا ہے کہ تیری نظروں سے چھپنے اور تیرے حملوں سے بچنے کے لئے میں نے اپنے وجود کے گرد جو نادیدہ حصار کھینچا ہے، اسے توڑ کر باہر آ جاؤں۔ ظاہر ہے اس حصار سے نکل کر ہی میں تجھے نظر آ سکتی ہوں۔ جب حصار ٹوٹ جائے گا تو پھر مجھے قابو میں کرنا تیرے لئے مشکل نہیں ہوگا۔ تیری ایک اور حماقت یہ ہے کہ......'' میں نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اس لئے کہ اچانک عکب میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ عفریت، عارج کو نقصان نہ پہنچا دے!

ابنِ علقمی کے محل سے میں نکلی ہی تھی کہ عکب کی آواز آئی۔ ''کیوں، ڈر گئی اے دینار؟''

''نہیں، میں کیوں ڈرتی تجھ سے اے لعنتی!'' میں نے حقارت سے جواب دیا۔

''میں نے گھڑی بھر کو اندھیرے کی چادر اوڑھ لی تھی کہ تجھے ڈرا دوں۔ تُو مان نہ مان، تیرا دھیان اپنے عاشق عارج کی طرف گیا ہوگا، جو ایک بار میری وجہ سے مرتے مرتے بچا ہے۔ اچھا اب میں چلا، مجھے ہلاکو خاں کو کچھ نئی ہدایات دینی ہیں۔''

عکب جیسے فریبی سے یہ بعید نہیں تھا کہ وہ مجھے دھوکا دے کر عارج تک پہنچ جاتا۔ اسی لئے وہاں ایک لمحے بھی نہیں رکی۔ عارج مجھے نجف اشرف کے نواح میں مل گیا۔ میرا قیاس غلط ثابت ہوا۔ عارج بخیریت تھا۔

"تُو نے یہ اچھا کیا اے عارج کہ بغداد شہر میں نہیں رکا۔" میں نے عارج کو مخاطب کیا۔

"اے دینار! تُو نے مجھے بھگوڑا جن زاد بنا دیا ہے۔" عارج میرے ساتھ اڑتے ہوئے کہنے لگا۔ میرا رخ اب بغداد ہی کی طرف تھا۔

"میری نظر میں یہ کوئی بہادری نہیں کہ مقابلے کی طاقت نہ ہونے کے باوجود..."

"بس...... اور زیادہ ذلیل نہ کر مجھے۔" عارج نے میری بات کاٹ دی۔ "معلوم ہے مجھے کہ کافر عفریت مجھ سے بہت زیادہ طاقتور ہے۔"

"برا نہ مان جایا کر اے عارج!" میں نے اسے سمجھایا۔

اسی وقت میری نگاہ نیچے زمین پر پڑی اور میں رک گئی۔ میں نے ایک ایسا ہی منظر دیکھا تھا۔ عارج نے بھی میری تقلید کی۔ وحشی منگولوں کا ایک گروہ گھوڑوں پر سوار ہو کر آدم زادیوں کو بھاگنے پر مجبور کر کے قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ عرب عورتیں یقیناً کسی ایسی بستی سے فرار ہوئی تھیں جس پر منگولوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ بھاگتے ہوئے وہ آدم زادیاں چیخ رہی تھیں۔ خوف کے علاوہ چیخنے کی وجہ منگول گھڑسواروں کے نیزے تھے۔ نیزوں کی نوکیں ان عورتوں کے جسموں میں اتارتے ہوئے منگول سپاہی ذرا رحم نہ کھاتے۔

مجھ سے یہ لرزا دینے والا منظر نہ دیکھا گیا۔ میں نے غوطہ لگایا اور ایک منگول کا نیزہ چھین کر خود اسی کے سینے میں اتار دیا۔ اس کے بعد میں دوسرے منگول سپاہی کے سینے میں نیزہ اتارنے والی تھی کہ خلاف توقع عارج نے مجھ سے نیزہ چھین لیا اور میں حیران رہ گئی۔

"اے دینار! یہ تُو کیا کر رہی ہے؟" عارج نے مجھے مخاطب کیا۔ "تُو ان مظلوم آدم زادوں کو کیوں مارے ڈال رہی ہے؟"

"تیرا دماغ تو درست ہے اے عارج!" میری آواز میں خفگی تھی۔ "تجھے یہ منگول سپاہی مظلوم نظر آ رہے ہیں؟" یہ کہتے ہوئے میرے وجود میں کوندا سا لپکا۔ مجھے یاد آ گیا کہ عفریت عکب نے جس طرح میرے اوپر سحر کر دیا تھا اور میں فریب نظر کا شکار ہو گئی تھی، عارج کے ساتھ بھی ایسا ہی کر سکتا ہے۔ اسی خیال کے تحت میں نے عارج کو صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ سحر کا ایک توڑ اذان دینا بھی ہے۔ عارج کو میں نے اسی لئے اذان دینے کو کہا۔ میری تاکید پر عمل کرنے میں عارج نے دیر نہ لگائی۔

دوسرے ہی لمحے مجھے کافر عفریت کی بھیانک چیخ سنائی دی۔ اس ظالم کو سحر ٹوٹنے کی سزا بھگتنی پڑی تھی۔ اس کے وجود کا شعلہ مجھے بہت دور فضا میں بلند ہوتا دکھائی دیا۔ اس نے مجھ سے چھپے رہنے کے لئے یقیناً اندھیرے کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس چادر کو اذان کی آواز نے تار تار کر دیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے عکب غائب ہو گیا۔

"اے عارج! اب عکب کے جلد پلٹ آنے کی توقع نہیں۔" میں بولی۔ "اب ہم بڑی آسانی سے ان وحشی منگول سپاہیوں کو ان کے کرتوتوں کی سزا دے سکتے ہیں۔" یہ کہتے ہی میں نے اس منگول سپاہی پر حملہ کر دیا جو ایک آدم زادی کو رسی کے پھندے میں جکڑ کر گھسیٹ رہا تھا۔ میں نے اسے گھوڑے سے گرا دیا اور اس کے ہاتھ سے رسی چھوٹ گئی۔

پھر وہ حیران کن "تماشا" ہوا جسے اگر آدم زاد دیکھ لیتے تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا۔ ان مظلوم عرب آدم زادیوں کو میں نے اور عارج نے اپنے اثر میں لے لیا۔ وہ اپنی موت سے بے پرواہ ہو کر بھوکی شیرنیوں کی طرح وحشی منگولوں پر ٹوٹ پڑیں۔ انہوں نے منگول سپاہیوں سے ان کے ہتھیار چھین لئے تھے۔ آدم زادیاں گھوڑوں پر سوار ہو کر بھاگتے ہوئے منگول سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں صحرا کی ریت پر دور دور تک منگول سپاہیوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔

اس جگہ سے قریب ہی ایک بستی تھی جس پر ابھی تک منگولوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے ان آدم زادیوں کو اسی طرف جانے کی ترغیب دی۔ وہ گھوڑے دوڑاتی ہوئی اسی جانب نکل گئیں۔

ان آدم زادیوں کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی عارج نے مجھ سے سوال کیا۔ "اس کی وجہ کیا ہے اے دینار کہ منگول جس علاقے پر قبضہ کر لیتے ہیں، وہاں کے مسلمان آدم زادوں کو زندہ کیوں نہیں چھوڑتے؟"

"اس کا بنیادی سبب خوف ہے اے عارج!" میں نے جواب دیا۔

"خوف؟" عارج نے حیرت کا اظہار کیا۔

"منگولوں کے اس قدر سفاک ہونے کی وجہ خوف ہی ہے۔" میں نے وضاحت کی۔ "حملہ آور منگولوں کو یہ خوف ہے کہ انہوں نے اگر مسلمانوں کو زندہ چھوڑ دیا تو وہ یا تو بغاوت کریں گے یا بھاگ کر بغداد جا پہنچیں گے اور وہاں جمع ہو کر ان کا مقابلہ کریں گے۔"

ہلاکو خاں نے اسی لئے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا ہے کہ وہ کسی مسلمان کو زندہ نہ چھوڑیں۔ عورتوں اور بچوں تک کو قتل کر دیں۔ اس طرح منگول حکمران، مسلمانوں پر اپنی دہشت بٹھانا چاہتا ہے اور..... اور بدقسمتی سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔"

"تاریخ بھی کیا کیا تماشے دکھاتی ہے اے دینار!" عارج کی آواز میں سنجیدگی تھی۔ "کل بھی مسلمان ساری دنیا پر حکومت کرتے تھے جو آج سمٹ سمٹا کر عراق پر حکمرانی کے بھی اہل نہیں رہے۔ وہ جو فاتح تھے، اب مفتوح ہیں۔"

"ہاں یہ بڑا المیہ ہے۔" میں نے تائید کی۔ "یہ بھی بڑی تلخ حقیقت ہے کہ کوئی بھی فاتح، مفتوحوں پر رحم نہیں کرتا۔ رحم نہ کرنے کا وہ بھی جواز دیتا ہے جو منگول عملاً دے رہے ہیں۔"

"اگر کافر عفریت علب ہماری راہ میں روڑے نہ اٹکائے اے دینار، تو..... تو شاید ہم مسلمان آدم زادوں کو قتل عام سے بچا سکیں۔" عارج پُر تاسف لہجے میں کہنے لگا۔

"یہ محض تیرا گمان ہے اے عارج! بدی تو ہمیشہ سے نیکی کے مقابل رہی ہے اور یہ بھی نہ بھول کہ جو تقدیر ہو چکا ہے اسے کوئی نہیں بدل سکتا۔ بول کہ جب علب، عراق میں نہیں آیا تھا تو ہم نے کیا کر لیا؟"

"اس وقت تُو حدود میں رہنے کی تلقین کرتی رہتی تھی اے دینار!" عارج بولا۔

"تجھے بھی خبر ہے کہ مجھے حد سے تجاوز نہ کرنے کی تلقین کرنے والا عالم سوما تھا۔" میں نے یاد دلایا۔

میری اس بات پر عارج لاجواب سا ہو گیا۔ نجف اشرف کے نواح سے چل کر اب ہم بغداد کی نواح میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ وہی دارالخلافہ بغداد تھا کہ جس کے در و بام پر مسلمانوں کی عظمت کے نشان ثبت تھے۔ اسی شہر میں جب عراق کے مختلف علاقوں سے لوگ آتے اور اپنی بپتا سناتے تو ٹھہرے ہوئے پانی میں جیسے کچھ دیر طوفان سا اٹھنے لگتا۔ ادھر ادھر سے بھاگ کر آنے والے منگولوں کی سفاکی و بے رحمی کے قصے کہتے اور اپنی تباہی و بربادی پر روتے۔ ان کی کیفیت دیکھ کر اور حالات سن کر بغداد والوں پر بڑا اثر ہوتا۔ غم و غصے کے سبب وہ جوش میں آجاتے۔

میں سوچتی، کاش ان مسلمان آدم زادوں کے جوش سے کوئی کام لینے والا ہوتا۔ پھر شاید

بغداد کو وہ دن نہ دیکھنا پڑتا جس کے امکانات روز بروز اب واضح ہوتے جا رہے تھے۔ خلیفہ مستعصم باللہ کی نا اہلی اور وزیر اعظم ابن علقمی کی غداری ایک ایسے طوفان کو بغداد کی جانب کھینچے لا رہی تھی جس کے دامن میں تباہی اور بربادی تھی۔

آخر وہ دن آ ہی گیا جو خدا کی طرف سے مقرر تھا۔ مجھے یہ اطلاع عارج نے دی۔

"اے دینار! منگولوں کا لشکر بغداد کے سامنے آ پہنچا ہے۔" عارج نے بتایا۔ "اس بھاری لشکر کو دیکھ کر مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے ہیں۔ ان پر خوف و ہراس طاری ہو گیا ہے۔"

"بہت دنوں تُو اے عارج! اپنے انسانی قالب سے الگ رہ لیا، اب وقت کا تقاضا کچھ اور ہے۔"

میں ابھی کچھ اور کہتی کہ عارج بول اٹھا۔ "تُو غالباً یہ چاہتی ہے اے دینار کہ میں، ولی عہد ابوبکر کے جسم میں اتر جاؤں۔"

"ہاں اے عارج!" میں نے تصدیق کی۔ "یہ ضروری ہے۔"

"اور تُو؟" عارج نے پوچھا۔

"فی الحال مجھے کم از کم اپنی حد تک یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔" میں نے جواب دیا۔ "جب، میرا انسانی پیکر اپنانا ناگزیر ہوا تو میں، ہلا تا خیر فردوس کے قالب میں سما جاؤں گی، لیکن تیرا معاملہ مختلف ہے۔ تجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہونی چاہئے کہ عیار آدم زاد ابن علقمی کی مرضی کیا ہوگی!"

عارج نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں اے دینار! وہ غدار آدم زاد ابن علقمی یہ چاہے گا کہ شہر پناہ کے پھاٹک کھلے رہیں اور منگول دراتہ بغداد میں گھس آئیں اور اس پر قبضہ کر لیں اور..... اور ابن علقمی کو عراق کا عامل مقرر کر دیں۔"

"تُو نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا اے عارج!" میں نے یہ کہہ کر اسے کچھ ہدایات دیں۔

میری ہی ہدایات پر عمل کرنے کے لئے عارج فوراً ولی عہد ابوبکر کے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

احمر اور ابوالقاسم بھی حالات سے بے خبر نہیں تھے۔ ادھر عارج نے ابوبکر کے قالب میں

مجھے تاکید کی۔ ''اے دینار! تیرے لئے بہتر ہوگا کہ تُو سلیمان کی راہ کھوٹی نہ کرے۔ اگر تُو نے ایسا کیا تو میں خود بھی ابن علقمی کا پیغام ہلاکو خاں تک پہنچا سکتا ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے اے کافر عکب!'' میں یہ کہہ کر وہاں رکی نہیں۔

بغداد کے محاصرے کو کئی روز ہو چکے تھے۔ میں فصیلِ شہر سے ہلاکو خاں کے لشکر کا جائزہ لے رہی تھی کہ چونک اٹھی۔ لشکر گاہ سے میں نے ہلاکو خاں کو باہر آتے دیکھا۔ وہ منحوس چہرے والا منگول حکمراں گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے دائیں بائیں اور پیچھے دوسرے گھڑ سوار بھی تھے۔ یہ سبھی ہلاکو خاں کی فوج کے سردار تھے۔

ان سب کو میں نے گھوڑے دوڑاتے ہوئے فصیلِ شہر کی طرف آتے دیکھا تو مجھے حیرانی ہوئی۔ میری حیرت زیادہ دیر برقرار نہ رہی کیونکہ میں نے ہلاکو خاں کے دماغ پر توجہ دے کر مطلوبہ معلومات حاصل کر لیں۔

ابن علقمی نے اپنے پیغام میں جو کچھ لکھا تھا، ہلاکو خاں آج اسی کی تصدیق کرنے آیا تھا۔ اس نے فصیل پر سپاہیوں کو نہ دیکھ کر یہ اندازہ کر لیا کہ واقعی شہر میں فوج بہت کم ہے، ابن علقمی کی اطلاع درست ہے۔

میں ہلاکو خاں کے ساتھ ساتھ ہی تھی۔ معاً سے میں نے ایک جگہ گھوڑا روکتے دیکھا اور بڑبڑانے لگا۔ ''یہ فصیل تو بے حد مضبوط ہے، اسے توڑنا ممکن نہیں..... اور اس پر چڑھنا بھی مشکل ہے۔''

موقع دیکھ کر میں نے ہلاکو خاں کے کان میں سرگوشی کی۔ ''اس مضبوط فصیل کی حفاظت کے لئے جو تھوڑی فوج معمول ہے، وہ کافی ہے۔'' دانستہ میں، ہلاکو خاں ہی کی آواز میں بولی تھی تاکہ وہ میرے الفاظ کو اپنے الفاظ سمجھے۔

غرض کہ جب ہلاکو خاں اپنی لشکر گاہ کی طرف واپس جا رہا تھا تو خاصا بددل تھا۔ میں نے اس کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ بغداد کو فتح کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہلاکو خاں کو اس طرح مایوس و بددل کر کے میں واپس خراسان بھیج دینا چاہتی تھی۔ مگر کافر عفریت عکب پھر آڑے آ گیا۔ اس رات عکب نے مجھے خود ہی ہلاکو خاں کی لشکر گاہ میں مدعو کیا تھا۔

''اے دینار! تُو اپنی سی کوشش کر چکی، اب میرا کمال دیکھ!'' عکب مجھ سے مخاطب ہوا۔

ہلاکو خاں سونے کے لئے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اچانک مجھے عکب کی آواز سنائی دی، وہ منگول حکمراں ہلاکو خاں سے ہم کلام تھا۔ ''کیا تُو یہاں تک آ کر واپس چلا جائے گا؟''

''ہاں.....'' ہلاکو خاں کے موٹے اور بھدے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ ''بغداد کا محاصرہ کئے رہنے سے کچھ حاصل نہیں۔''

''کیا تُو بھول گیا کہ بغداد میں بے شمار دولت ہے؟'' عکب نے ہلاکو خاں کی لالچی طبیعت کو ہوا دی۔ ''بغداد میں ایک شخص بھی مفلس اور محتاج نہیں ہے۔ گھر گھر قیمتی سامان، زیورات اور دوسری چیزیں موجود ہیں۔ تمام فارس اور خراساں کی دولت ایک طرف اور بغداد کی دولت ایک طرف! تجھے معلوم ہے کہ وزیراعظم اور خلیفہ کے پاس کتنی دولت ہے؟''

''نہیں معلوم۔'' ہلاکو خاں نے کسی سحر زدہ شخص کی طرح غنودہ آواز میں جواب دیا۔ حقیقتاً وہ عکب کے اثر میں تھا۔ اسے یہ تک ہوش نہ تھا کہ وہ کس سے اور کیوں گفتگو کر رہا ہے! بظاہر وہ اپنے خیمے کے اندرونی حصے میں اکیلا تھا۔

''اے ہلاکو خاں! تجھے میں بتاتا ہوں۔'' عکب کی آواز پھر ابھری۔ ''ابن علقمی کے پاس اتنی دولت ہے کہ اس سے ایک بڑا علاقہ خریدا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ خلیفہ کے پاس جو دولت ہے، وہ اتنی ہے کہ اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بول! ایسی صورت میں کیا تجھے یہاں سے خالی ہاتھ واپس چلا جانا چاہیے؟'' عکب نے اسے رکنے کی ترغیب دی۔

میں یہ خوب سمجھ رہی تھی کہ عکب رفتہ رفتہ ہلاکو خاں کے دماغ سے ان باتوں کو محو کر رہا تھا جو میں نے بٹھائی تھیں۔ آدم زادوں کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے ہم جنات کو بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ بصورت دیگر آدم زاد کا دماغ پلٹ بھی سکتا ہے۔ پاگل ہو جانے کے بعد ظاہر ہے ہلاکو خاں، عکب کے کسی کام کا نہ رہتا۔

ہلاکو خاں کے چہرے کو میں نے متغیر ہوتے دیکھا اور پھر وہ خودکلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگا۔ ''میں..... میں یہاں سے ہرگز خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا..... کچھ بھی ہو جائے، مجھے بغداد کو فتح کرنا ہے۔''

''اور اس لئے بھی فتح کرنا ہے کہ.....'' عکب نے ''گرہ'' لگائی۔ ''بے قیاس دولت کے علاوہ بغداد میں حُسن کی بھی افراط ہے۔ اس شہر میں بے شمار دوشیزائیں اور ایسی حسین و دل

رہا عورتیں موجود ہیں جن کے حُسنِ جاں افروز کو دیکھ کر لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔

منگول دولت اور حسین عورتوں کے بڑے حریص تھے۔ عکب نے ہلاکو خاں کی انہی کمزور رگوں پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس لعنتی عفریت نے میرے سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا تھا۔ اس کے باوجود بغداد پر قبضہ کرنا آسان نہیں تھا۔

مضبوط اور بلند فصیلِ شہر کے علاوہ عباسی فوج بھی منگولوں کے ارادے میں مزاحم تھی۔

اس رات کافر عفریت عکب کی ترغیب کے بعد ہلاکو خاں چاہتا تو یہی تھا کہ فوراً حملہ کر کے بغداد شہر میں گھس جائے، دولت اور حُسن سے مالا مال دارالخلافہ پر قبضہ کر لے، لیکن اس نے بہ وجوہ ایسا نہیں کیا۔ ان وجوہ میں سے ایک وجہ میں بھی تھی۔ عکب کی کوشش کے باوجود یہ بات ہلاکو خاں کے دماغ سے نہیں نکل سکی کہ بغداد پر حملہ کرنا پہاڑ سے سر ٹکرانا ہے۔ ہلاکو خاں نے اسی لئے بغداد پر حملے سے فی الحال گریز کیا۔ وہ کسی اور ہی تدبیر کی تلاش میں تھا جو خود اس پر بھی واضح نہیں تھی۔

دوسری جانب میرے ایما پر ولی عہد ابوبکر کے قالب میں موجود عارج، احمد اور احمر تینوں رات اور دن فصیل پر گشت کرتے رہتے تھے۔ خلیفہ مستعصم باللہ کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ منگولوں نے بغداد کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اس کے باوجود مستعصم کی آنکھیں اب بھی نہیں کھلیں۔ میرے لئے یہ صورتحال انتہائی تکلیف دہ تھی۔ سو ایک شب قصرِ خلافت میں پہنچ گئی۔

مستعصم کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میں نے اس پر اثر انداز ہونے کے لئے ایسے وقت کا انتخاب کیا تھا کہ وہ ''خرافات'' سے فارغ ہو جائے۔ دو نوجوان و حسین کنیزیں اس کی خواب گاہ سے نکلی ہی تھیں کہ میں وہاں داخل ہو گئی۔

خلیفہ بدمست ہو کر سونے والا تھا کہ معاً میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''اٹھ اے مستعصم... یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔''

''کک... کون؟... کون ہے تُو؟'' مستعصم خوفزدہ آواز میں بڑبڑایا۔

''کیا تیری سماعت کام نہیں کر رہی؟... تُو خود اپنی آواز کو نہیں پہچان رہا؟'' میں اسی کی آواز میں بولی۔

''ہاں... یہ... یہ تو میری آواز ہے... میں اپنی ہی آواز سن رہا ہوں۔'' مستعصم

نے تصدیق کی۔ اس کی آواز میں اب بھی خوف تھا۔

''مجھ سے نہ ڈر اے مستعصم کہ میں تیرے ہی ضمیر کی آواز ہوں۔'' میں نے مزید وضاحت کی، پھر کہنے لگی۔ ''سن! اگر تُو اب بھی تدبر، دلیری اور جرأت و استقلال سے کام لے تو یقین ہے، بغداد اور اس کے باشندوں کو ہلاکت و تباہی سے بچا سکتا ہے۔ تجھے اس کے لئے اپنے خزانے کا منہ کھولنا پڑے گا... مال خرچ کرنا ہوگا۔''

''مم... مگر خزانہ تو خالی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''جھوٹ نہ بول!'' میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ مجھے جلد از جلد مطلوبہ مقصد حاصل کرنا تھا۔ اس اندیشے کو بہر حال میں نظر انداز نہ کر سکی کہ کافر عفریت عکب مجھ پر نگاہ رکھے ہوئے ہے اور کسی بھی لمحے مداخلت کر سکتا ہے۔

''مال خرچ کئے بغیر کام چل جائے گا۔'' مستعصم ہٹ دھرمی پر قائم رہا۔ ''ابن علقمی اپنے حسنِ فراست سے اس بلا کو ٹال دے گا۔''

''خلیفہ مستعصم بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے اے دینار!'' عفریت عکب کی آواز سن کر میرے وجود کو جھٹکا سا لگا۔ میرا اندیشہ درست نکلا کہ وہ مجھے ایسا نہیں کرنے دے گا۔ عکب بولا۔ ''اے دینار! تُو خلیفہ کو قطعی اپنی مقصد براری کے لئے استعمال نہیں کر سکے گی۔ سو اسے راہ پر لانے کی کوئی اور تدبیر سوچ۔''

اب قصرِ خلافت میں میرا مزید رکنا لاحاصل ہی تھا، سو وہاں سے نکل آئی۔ عفریت عکب کے طنزیہ قہقہے میرے تعاقب میں تھے۔ کوئی اور تدبیر کیا ہو سکتی ہے؟ میں نے غور کیا۔ خلیفہ مستعصم کو کس طرح سمجھانا ممکن ہے؟ پھر مجھے عارج کا خیال آیا۔ کیا خبر وہ اس ضمن میں کوئی بہتر مشورہ دے سکے۔ میں نے ولی عہد ابوبکر کا رخ کیا۔

عارج ابھی تک جاگ رہا تھا، فردوس البتہ سو چکی تھی۔ بہ طور احتیاط میں نے فردوس پر مزید گہری نیند مسلط کر دی تاکہ وہ میرے اور عارج کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سن سکے۔

میری موجودگی عارج نے فوراً محسوس کر لی اور بول اٹھا۔ ''تُو آ گئی اے دینار! مجھے تو بالکل اکیلا ہی چھوڑ دیا تُو نے۔''

''اے عارج! تجھے اس کا سبب معلوم ہے۔'' میں بولی۔ ''میں کوئی ایسی راہ نکالنا چاہتی

ہوں کہ ہلاکو خاں، بغداد پر حملہ نہ کر سکے۔ اگر حملہ کرے بھی تو اس کا مقابلہ کر لیا جائے۔ لیکن......"

عارج نے میری بات کاٹ دی۔ "لیکن کافر عفریت عکب ہر بار تیری کوشش کو ناکام بنا دیتا ہے۔"

"تو نے ٹھیک سمجھا۔" میں نے کہا۔

"دیکھ اے دینار! اب اس طرح کام نہیں چلے گا۔ ہمیں خلیفہ مستعصم کو ہلاکو خاں سے مقابلے پر مجبور کرنا ہی پڑے گا۔"

"تو کیا تیرے خیال میں مستعصم اس پر آمادہ ہو جائے گا؟" میں نے سوال کیا۔

"اسے راضی ہونا پڑے گا!" عارج نے پُر جوش آواز میں کہا۔ "اب پہلے جیسے حالات نہیں رہے کہ مستعصم خطرے سے انکار کر دے۔ خطرہ تو اب اس شہر کے دروازے تک آ پہنچا ہے۔"

"تو بتا تو سہی اے عارج کہ تیرے دماغ میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں ولی عہد سلطنت کی حیثیت سے احمر و احمد، دونوں کو اپنے ساتھ قصر خلد (قصر خلافت) لے جانا چاہتا ہوں۔ خلیفہ کسی اور کی کوئی بات سنے نہ سنے، اپنے خاندان والوں کی رائے کو پس پشت نہیں ڈال سکتا!"

مجھے توقع تو نہیں تھی کہ عارج کی تجویز کارگر ثابت ہو سکتی ہے، مگر ایسے میں نے بد دل نہ کیا۔

"تو پھر میں کل صبح ہی خلیفہ مستعصم سے ملتا ہوں۔" عارج مجھے رضامند دیکھ کر بولا۔

اگلے روز جب عارج، احمد اور احمر کو ساتھ لے کر خلیفہ مستعصم سے ملا تو میں بھی وہاں موجود تھی۔

عارج کے اشارے پر احمر نے بات شروع کی۔ "اعلیٰ حضرت! ہم سخت خطرے میں گھر گئے ہیں۔ حضور کو علم ہے کہ وحشی منگولوں نے بغداد کا محاصرہ کر لیا ہے، ہم نے حضور سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ......"

"ہمیں معلوم ہے، تم جو کہنا چاہتے ہو۔" خلیفہ مستعصم بول اٹھا۔ "ہم پُر یقین ہیں کہ ابن علقمی جلد ہی کوئی ایسی تدبیر کرے گا کہ ہلاکو خاں محاصرہ اٹھا کر یہاں سے چلا جائے گا۔"

"گستاخی معاف خلیفہ معظم!" احمد بولا۔ "یہ بلا ابن علقمی ہی کی لائی ہوئی ہے۔ منگولوں نے عراق کی سینکڑوں بستیوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ انہوں نے لاکھوں مسلمانوں کو ذبح کر ڈالا ہے۔ وہ بغداد میں بھی خون کے دریا بہا دیں گے...... اعلیٰ حضرت! اب بھی موقع ہے، فوج بھرتی کیجئے اور ابن علقمی پر بھروسہ نہ کر کے خود مقابلہ کے لئے تیار ہو جائیے۔"

"فوج بھرتی کرنے کے لئے رقم چاہیئے اور اس کا بندوبست ہمارے پاس نہیں۔" مستعصم جیسے رٹا رٹایا سبق سنانے لگا۔ "ہم تمہیں پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ سرکاری خزانہ خالی ہے۔ ہاں اس کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ بغداد والے اگر منگولوں کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو ہماری طرف نہ دیکھیں، خود فوج بھرتی کر لیں۔ اگر شہر پر حملہ ہوا تو سب سے زیادہ تباہی شہر والوں ہی پر آئے گی۔"

احمر اور احمد کے چہروں سے مایوسی کا اظہار ہونے لگا۔

"اب بغداد میں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔" احمد نے احمر کو مخاطب کیا۔ "ہمیں بغداد سے نکل جانا چاہئے۔"

احمد کی بات کو عارج نے فی الوقت نظر انداز کر دیا اور پُر عزم و پُر جوش آواز میں خلیفہ مستعصم کو سمجھانے لگا۔ یہاں تک کہ خلیفہ کا چہرہ متغیر ہونے لگا۔ اس نے عارج کو اپنا ولی عہد سمجھ کر کہا۔ "اے ابوبکر! ہمیں سوچنے دو کہ کوئی راستہ نکل آئے۔"

"ایک ہی راستہ ہے اعلیٰ حضرت!...... منگولوں سے مقابلہ!...... اور اس کے لئے فوج کی بھرتی۔" عارج نے زور دے کر کہا۔

"ہم تمہیں خود ہی طلب کر لیں گے اے ابوبکر! تم فکر نہ کرو۔" مستعصم نے گویا دلاسا دیا۔ ان الفاظ کا مقصد یہی تھا کہ خلیفہ اب اس موضوع پر مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"میں اعلیٰ حضرت کی طرف سے جلد ہی طلب کئے جانے کا منتظر رہوں گا۔" عارج نے یہ کہہ کر رخصت کی اجازت چاہی۔

میرے لئے یہ سمجھنا دشوار ہوا کہ عارج پر پھر ایک مرتبہ اس کے انسانی قالب کی صفات کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے۔ ابوبکر کا قالب بہر صورت خلیفہ مستعصم کا ولی عہد تھا۔ اسی وجہ سے وہ آخر کار خلیفہ کے دم دلاسے میں آ گیا۔

عارج دونوں شہزادوں کو اپنے محل میں لے آیا اور پھر احمد سے پوچھا۔ "اے احمد! تم

بغداد سے نکل جانے کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟"

احمر نے اپنی بات دہرائی تو احمد نے کہا۔"مگر ہم شہزادہ ابوبکر کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔"

اس پر عارج اپنے انسانی قالب کے زیر اثر کہنے لگا۔"میری قسمت تو اعلیٰ حضرت کی قسمت سے وابستہ ہے۔ میرا انجام وہی ہوگا جو خلیفہ معتصم کا ہونے والا ہے۔ میں تم سے درخواست کروں گا احمر کہ تم احمد، شاہی خاندان کی عورتوں اور لڑکیوں کو لے کر بغداد سے نکل جاؤ۔ ابھی موقع ہے، ممکن ہے پھر ایسا وقت نہ آئے۔"

"ہم تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے اے ابوبکر!" احمر کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔"جو تمہارا حشر ہوگا، وہی ہمارا بھی ہوگا۔"

عارج نے پھر کچھ نہ کہا۔ وہ تینوں محل سے اٹھ کر فصیل پر پہنچے۔ سورج کافی چڑھ گیا تھا۔ انہوں نے منگولوں کے لشکر کی نقل و حرکت دیکھی۔ فوجی دستے لشکر گاہ سے باہر نکل نکل کر میدانوں میں پھیلنے لگے۔

"معلوم ہوتا ہے، آج منگول، بغداد پر حملہ کرنے والے ہیں۔" عارج نے قیاس آرائی کی۔

"یقیناً..." احمر نے تائید کی۔"فوجی دستوں کا میدان میں نکلنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ دھاوا بولنے والے ہیں۔"

"ہم تین ہیں۔ فصیل کے تین طرف پھیل جائیں۔" عارج نے تجویز دی۔"ہمیں سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے تاکہ وہ حملہ آور منگولوں پر اس قدر تیر اور پتھر برسائیں کہ وہ فصیل کے قریب تک نہ پھٹک سکیں۔"

"نہایت مناسب تجویز ہے۔" احمد فوراً بولا۔"وقت کو باتوں میں ضائع نہ کیجئے۔"

پھر وہ تینوں فصیل پر تین طرف پھیل گئے۔ انہوں نے سپاہیوں کو ہوشیار کر دیا۔ فصیل پر جگہ جگہ تیروں کے گٹھے اور پتھروں کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ہر طرف منجنیقیں بھی موجود تھیں۔ یہ ایسی چوبی کلیں تھیں، جن سے بڑے بڑے پتھر دشمنوں پر پھینکے جا سکتے تھے۔ ان تینوں کی وجہ سے ہر طرف فصیل پر سپاہی ہوشیار اور مستعد ہو گئے۔ انہوں نے منجنیقوں کو دیکھ لیا کہ وہ ٹھیک ہیں یا نہیں! وقت پر دھوکا تو نہیں دے جائیں گی!

منجنیقیں درست حالت میں تھیں۔

مسلمان سپاہی چوکنا ہو کر کافر منگولوں کو دیکھنے لگے۔

منگول فوجی دستے برابر میدان میں پھیل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہلاکو خاں نے پورے لشکر کے ساتھ حملے کا ارادہ کر لیا ہے۔ میں نے تھوڑی ہی دیر میں منگول سپاہیوں کو تیزی سے فصیل شہر کی طرف بڑھتے دیکھا۔ ان کے نیزے فضا میں بلند تھے۔ وہ انہیں لہراتے ہوئے منہ سے وحشت ناک آوازیں نکالتے ہوئے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ ان آوازوں میں ڈھول پیٹے جانے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

وحشی منگول چاروں طرف سے یلغار کر رہے تھے۔ زور زور سے ڈھول پیٹتے، شور وغل کرتے، بڑے جوش کے ساتھ بڑھے۔ انہوں نے دور ہی سے اپنے بھاری تیروں کی باڑیں مارنی شروع کر دیں۔

منگولوں کے تیر لمبے اور وزنی ہوتے تھے۔ ان کی کمانیں بھی بھاری ہوتی تھیں۔ کیونکہ منگول شہ زور ہوتے تھے اس لئے بھاری کمانوں سے وزنی تیر چلانا انہیں مشکل نہ ہوتا تھا۔ چونکہ وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتے تھے اور شکار پر ان کی بسر اوقات تھی اسی بنا پر وہ ایک ہی تیر سے ہرن کو مار لیتے تھے۔ کبھی کبھی شیر اور دوسرے درندوں کو بھی تیروں سے مار گراتے تھے۔

میں بڑی دلچسپی کے ساتھ ان وحشیوں کی حماقت کا جائزہ لے رہی تھی۔ میری دانست میں وہ اپنی طاقت بلاوجہ ضائع کر رہے تھے۔ ان کے بھاری تیر فصیل تک نہ پہنچ سکے۔ ایک تو فاصلہ زیادہ تھا، دوسرے فصیل بہت اونچی تھی۔ ان کے تیر ہوا کو چیرتے ہوئے فضا میں بلند ہوتے اور فصیل سے پہلے ہی زمین پر گر جاتے۔

مسلمان ان کی تیر باری دیکھ رہے تھے۔ ابھی تک انہوں نے جوابی کارروائی ضروری نہیں سمجھی تھی۔

منگولوں کا لشکر اسی شان سے حملہ آور ہوا تھا کہ گویا زمین ہچکولے کھانے لگی تھی۔ ان کے گھوڑوں کے سموں کی آوازیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اتنے زبردست لشکر کو حملہ آور دیکھ کر ان عباسی سپاہیوں پر ہیبت طاری ہو رہی تھی۔ شہزادوں کی نظریں بھی منگول سپاہیوں کی نقل و حرکت پر جمی تھیں۔

وحشی منگول سپاہ شور کرتی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اس شور کا مقصد مسلمانوں کو خوفزدہ کرنا تھا۔ اس اعتبار سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ فصیل کے نیچے پہنچ کر ہی دم لیں گے۔ یا تو وہ فصیل کو ڈھا دیں گے یا فصیل کے دروازوں کو توڑ ڈالیں گے اور شہر میں گھس کے لرزہ انداز خوں ریزی شروع کر دیں گے۔

عباسی سپاہیوں پر کیونکہ منگولوں کا خوف بیٹھ گیا تھا اس لئے میں لپک کر عارج کے پاس پہنچی۔

''اے عارج! اس وقت مسلمان سپاہیوں کا حوصلہ بلند کرنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے عارج سے سرگوشی کی۔

عارج نے میری بات کا جواب اشاروں میں دیا۔ ''ہاں اے دینارا! میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں۔''

پھر میرے ایما پر عارج نے مختصر پُر جوش تقریر کی۔

''اے مسلمانو! ابھی تم کافروں سے مغلوب نہیں ہوئے۔'' عارج نے کہنا شروع کیا۔ ''یہ فیصلے کی گھڑی ہے۔ مر جاؤ یا ان وحشی منگولوں کو مار بھگاؤ۔ ان کی کثرت سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں ......''

عارج کی تقریر بروقت اور مناسب تھی۔ اس کا ردِعمل ہوا۔ وقتی طور پر مسلمان سپاہی، منگولوں کی تعداد دیکھ کر حوصلہ ہار بیٹھے تھے، مگر ان کے چہرے جوش سے دمکنے لگے۔

مسلمان سپاہی اپنے اپنے افسروں کی طرف دیکھ رہے تھے، گویا حکم کے منتظر ہوں۔ ترکش ان کی پشت پر پڑے تھے اور کمانیں شانوں پر لٹک رہی تھیں۔ منجنیقیں ان کے سامنے تھیں۔ منجنیقوں سے کچھ فاصلے پر پتھروں کے ڈھیر تھے۔

منگول بہ دستور تیر باری کرتے آگے بڑھ رہے تھے، چونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں نے اب تک کوئی جوابی کارروائی نہیں کی اس لئے وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ مسلمانوں پر ان کا رعب طاری ہو گیا ہے، پھر وہ اور بھی تیزی سے بڑھنے لگے۔

جب منگول سپاہی بالکل ان کی زد پر آ گئے تو عباسی فوج کے افسروں نے مسلمان سپاہیوں کو منجنیقیں چلانے کا حکم دیا۔ فوری طور پر ہر طرف منجنیقیں حرکت میں آ گئیں۔

سپاہیوں نے بھاری بھاری پتھر ان میں رکھے۔ منجنیقیں چلانے والوں نے کلوں کو حرکت دی۔ ایک دم پتھر بڑی تیزی سے لپکے اور منگولوں پر جا گرے۔

جن منگول سپاہیوں کو یہ پتھر لگے، ان کی ہڈیوں کے ٹکڑے ہو گئے۔ کھوپڑیاں اڑ گئیں۔ سینے پچک گئے اور بازو ٹوٹ گئے۔

اس پر منگولوں کو جوش آ گیا۔ انہوں نے تیروں کی باڑ ماری۔ کچھ تو برجوں اور فصیل کے کنگروں سے ٹکرا ٹکرا کر گر پڑے، کچھ پہنچ گئے۔ عباسی فوج کا سپہ سالار ایک دوادار بھی اس معرکے میں شامل تھا۔ بدقسمتی سے ایک تیر اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ زخم اتنا کاری تھا کہ ذرا سی دیر میں اس نے دم توڑ دیا۔

حالیہ معرکے میں جاں بحق ہونے والا یہ پہلا مسلمان تھا۔ کچھ سپاہی زخمی بھی ہوئے۔

اپنے سپہ سالار ایبک دوادار کو جان دیتے دیکھ کر مسلمان سپاہیوں کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے منجنیقوں کے ذریعے کافروں پر پتھروں کی بارش کر دی۔ جواباً منگول بھی تیر برسانے لگے۔ یوں گویا جنگ کی ابتدا ہو گئی۔

منگولوں نے بڑے جوش و خروش سے حملہ کیا تھا۔ ان کے حملہ کرنے کا انداز ایسا تھا کہ جیسے انہیں کوئی روک نہیں سکے گا۔ وہ فصیل شہر تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ مسلمانوں نے ایسی سختی سے مقابلہ کیا اور اس شدت سے پتھر برسائے، تیر چلائے کہ منگولوں کے لئے آگے بڑھنا مشکل ہو گیا۔ ان کا سیلاب رک گیا۔ وہ اس کثرت سے تیر چلا رہے تھے جیسے سورج کے آگے کوئی آہنی کالی گھٹا چھا گئی ہو۔ مسلمانوں کو مرعوب کرنے کی غرض سے منگول ہیبت ناک آوازیں بھی منہ سے نکال رہے تھے۔ ڈھول پیٹنا بھی جاری تھا۔ منگولوں کے شور اور ڈھولوں کی آوازوں سے میدانِ جنگ گونج رہا تھا۔

ان وحشی منگولوں سے خوفزدہ ہوئے بغیر مسلمان سپاہی نہایت اطمینان اور بڑی پھرتی سے تیر اور پتھر برسا رہے تھے۔ ان کی نظریں منگول سپاہیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ دشمن آگے نہ بڑھنے پائے۔ انہوں نے منگولوں کو بڑھنے سے روک دیا تھا۔

جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ منگولوں کا آگے بڑھتا ہوا سیلاب تھمنے لگا ہے تو میں نے فصیل شہر سے نیچے غوطہ لگایا۔ میں اب اس موقع کی تلاش میں تھی کہ منگول حکمراں ہلاکو خاں کو اپنے زیرِ اثر لے لوں۔ اس کے حکم پر یہ جنگ رک سکتی تھی۔

کافر عفریت عکب کو میں بھولی نہیں تھی۔ وہ بھی کسی لمحے رنگ میں بھنگ ملا سکتا تھا۔ جس طرح میں، مسلمان سپاہیوں کو جوش دلا رہی تھی، عکب کافر منگولوں کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔

نیچے غوطہ کھاتے ہی عکب کو میں نے منگولوں کو آگے بڑھنے پر اکساتے دیکھا۔ میں اس سے خاصے فاصلے پر ہلاکو خاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔ ہلاکو خاں ایک طرف ایک بلند ٹیلے پر گھوڑے پر سوار میدان جنگ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ سخت غضب ناک معلوم ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ بھیانک معلوم ہو رہا تھا، آنکھیں غصے سے سرخ تھیں۔

ہلاکو خاں کے قریب ہی دوسرے گھوڑے پر اس کا وزیراعظم نصیر الدین طوسی کھڑا تھا۔ وہ کبھی میدان جنگ کی طرف دیکھ لیتا تھا اور کبھی اپنے وحشی آقا پر نظر ڈال لیتا تھا۔ میں نے پہلے نصیر الدین طوسی کے ذہن پر توجہ دی۔

نصیر الدین طوسی جانتا تھا کہ اس کا آقا ہلاکو خاں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کا بس نہیں ہے ورنہ وہ مسلمانوں کو پیس ڈالے۔

طوسی نے ہلاکو خاں کو "پھنکارے" مارتے سنا تو مزید ڈر گیا۔ وہ اس وقت سوچ رہا تھا کہ ہلاکو خاں غیظ و غضب کی حالت میں کہیں اس کا سر نہ اڑا دے۔ اس کے خوف کی وجہ یہ تھی کہ موید الدین ابن علقمی کی تحریک پر اس نے ہلاکو خاں کو بغداد پر حملے کی ترغیب دی تھی۔ ہلاکو خاں کو طوسی نے یقین دلایا تھا کہ کسی بھی مقام پر اس کا مقابلہ نہیں ہوگا اور بغداد کے سامنے پہنچتے ہی شہر پناہ کے پھاٹک کھل جائیں گے۔ ابن علقمی نے نصیر الدین طوسی کو بھی لکھا تھا کہ بغداد کے دروازے منگولوں کو کھلے ملیں گے۔ لیکن یہ بات غلط نکلی۔ شہر کے دروازے بند ملے۔ اور اب صورت حال یہ تھی کہ منگولوں کا استقبال تیروں اور پتھروں سے ہو رہا تھا۔ طوسی کو اسی لئے خوف ہوا کہ کہیں ہلاکو خاں غصے میں آ کر اس کا ہی خاتمہ نہ کر ڈالے۔

میری نظر میں نصیر الدین طوسی بھی قابل معافی نہ تھا۔ اس کے ذہن سے توجہ ہٹا کر میں نے بلا تاخیر ہلاکو خاں کو اپنے اثر میں لے لیا۔

دوسرے ہی لمحے ہلاکو خاں نے نصیر الدین طوسی کو غصے کے تیوروں میں دیکھا۔

"جی...... جی میرے آقا؟" نصیر الدین طوسی فوراً بول اٹھا۔

"ہمیں دھوکا دیا گیا ہے۔" ہلاکو خاں نے یہ کہہ کر نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

طوسی پریشان ہو گیا کہ کیا جواب دے۔ لیکن غضب ناک وحشی کو جواب دینا بھی ضروری تھا۔ سو اس نے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا۔ "اے عظیم المرتبت شہنشاہ! میرا خیال ہے کہ ابن علقمی معمولی مقابلہ اس لئے کر رہا ہے کہ اس پر طرف داری کا الزام نہ آئے۔"

"معمولی مقابلہ!" ہلاکو خاں نے گویا کسی سانپ کی طرح پھنکار ماری۔ "تمہاری نظر میں یہ معمولی مقابلہ ہے جس میں سینکڑوں منگول خاک و خون میں نہا چکے ہیں۔ ہم پر پتھر اور تیر برسائے جا رہے ہیں۔ ہمیں ہلاک کیا جا رہا ہے!"

"اے میرے آقا! غلام اپنے الفاظ واپس لیتا ہے۔ یقیناً یہ کوئی معمولی مقابلہ نہیں۔" نصیر الدین طوسی نے فوراً پینترا بدلا۔

ہلاکو خاں نے شعلہ بار نظریں اپنے وزیراعظم طوسی پر ڈالیں اور کہنے لگا۔ "غدار تو غدار ہی ہوتے ہیں۔ ممکن ہے غدار ابن علقمی کو عباسی خلیفہ نے پرچا لیا ہو۔ شاید ابن علقمی اسی وجہ سے اب ہمارے ساتھ غداری پر آمادہ ہو گیا ہے۔"

"ابن علقمی ایسا نہیں ہے بندہ پرور!" طوسی نے اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا۔

"ایسے نمک حراموں کا اعتبار کیا ہے!" ہلاکو خاں منہ بنا کر بولا۔ "جو نمک حرام اپنے آقا سے غداری کر سکتا ہے، وہ دوسروں کا وفادار کیسے ہو سکتا ہے۔ کسی دوسرے کو فریب دینا اس کے لئے کیا مشکل ہوگا!"

"یقیناً اے میرے آقا، ایسا شخص قابل اعتبار نہیں ہوتا۔ لیکن ابن علقمی ان میں سے نہیں ہے۔" طوسی اپنی بات پر قائم رہا۔ "ابن علقمی جو بات ایک مرتبہ طے کر لیتا ہے، اسے ضرور کرتا ہے۔ اے میرے آقا! لازماً شہر بغداد کے دروازے حضور کے لئے کھول دے گا۔ تاخیر کا سبب غلام پہلے ہی عرض کر چکا ہے۔"

"اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو پھر یہ مقابلہ کیوں ہو رہا ہے؟" ہلاکو خاں نے سوال کیا۔

"کسی مجبوری کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے اے میرے آقا!" نصیر الدین طوسی نے نرمی سے جواب دیا۔ "یہ بات ہمیں معلوم ہو جائے گی۔"

"اس وقت جب ہم ہزیمت اٹھا کر یہاں سے بھاگنے لگیں گے!" ہلاکو خاں کی آواز میں تلخی تھی۔

''ایسا نہیں ہوگا میرے آقا!'' نصیر الدین طوسی نے یقین دہانی کرائی۔
''مجھے نمک حرام ابن علقمی پر سخت غصہ آ رہا ہے۔ اگر اس نے غداری کی، پورے طور جواب دہی نہ کی تو میں اس کے اور اس کے خاندان والوں کے ٹکڑے کتوں کو کھلا دوں گا۔''
ہلاکو خاں کو میں نے یہی پٹی پڑھائی تھی کہ ابن علقمی قابل اعتماد نہیں ہے۔
''بالکل ایسا ہی ہونا چاہیے میرے آقا!'' نصیر الدین طوسی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ ''یہ سزا عین انصاف کے مطابق ہوگی۔ اگر وہ عظیم شہنشاہ کو مطمئن کر سکا تو .....''
ہلاکو خاں نے طوسی کی بات کاٹ دی۔ ''تو وہ معاف کر دیا جائے گا۔''
''اور اس کا صلہ؟'' طوسی نے موقع غنیمت جان کر پوچھ لیا۔
''جس صلے کا وہ مستحق ہوگا، دیا جائے گا'' ہلاکو خاں کا لہجہ معنی خیز تھا۔
میں نے اسی لمحے ہلاکو خاں کے دماغ میں سرگوشی کی۔ ''غدار اور نمک حرام ابن علقمی صرف اور صرف موت کا مستحق ہے۔''
ہمیں معلوم ہے۔ ہلاکو خاں نے سوچا۔ یہ میری بڑی فتح تھی۔ سو وقتی طور پر میں نے ہلاکو خاں کو اپنے اثر سے آزاد کر دیا۔
جنگ اب بھی جاری تھی۔ منگول کثرت سے تیر چلا رہے تھے اور مسلمان منجنیقوں سے ان پر پتھر برسا رہے تھے۔ منگولوں کے تیر عباسی فوجیوں کو بہت کم نقصان پہنچا رہے تھے۔ کلوں سے نکلے ہوئے نوکیلے پتھر جس منگول کے جس عضو پر پڑ رہے تھے، اسے توڑ ڈالتے تھے، کھوپڑیاں توڑ کر بھیجے اُڑا دیتے تھے۔ اس پر منگولوں کو بڑا غصہ آ رہا تھا۔ وہ جوش و طیش میں آگے بڑھتے تھے اور اس ارادے سے آگے بڑھتے تھے کہ فصیل شہر کے نیچے جا رکیں گے۔ لیکن پتھروں کی بارش ان کے حوصلے پست کر دیتی تھی۔ اسی بناء پر وہ جس تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے اس سے زیادہ تیزی سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جاتے۔
اس جنگ میں منگولوں کا کھلا نقصان ہوا۔ اسی سبب ہلاکو خاں کو اپنے اثر میں لے کر بھی میں نے اپنا گزشتہ ارادہ بدل دیا اور جنگ نہیں رکوائی۔ منگول سپاہیوں کے سروں پر جیسے موت منڈلا رہی تھی۔ عفریت عکب انہیں بڑی بے رحمی سے مروا رہا تھا۔
مسلمان اطمینان و استقلال سے اپنے کام میں مصروف تھے۔ جب منگولوں کے تیر کثرت سے فصیل پر آنے لگے تو انہوں نے ڈھالوں کی دیوار قائم کر لی۔ اب تیر ڈھالوں پر پڑنے لگے۔ جو سپاہی منجنیقیں چلا رہے تھے اور جو ان میں پتھر رکھ رہے تھے ان کی حفاظت دوسرے لوگ کر رہے تھے۔ وہ اسی وجہ سے محفوظ تھے اور اطمینان سے منجنیقوں کے ذریعے پتھر پھینک رہے تھے۔
اگرچہ منگولوں نے دیکھ لیا تھا کہ ان کے تیر ضائع جا رہے ہیں لیکن اس پر بھی وہ برابر تیر برسا رہے تھے۔ وہ اس زعم میں کبھی کبھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے کہ مسلمانوں کے دم خم ختم ہو گئے ہیں۔ انہوں نے ڈھالوں کے پیچھے پناہ لے لی ہے، اس مرتبہ وہ ضرور پہنچ جائیں گے۔ انہیں دراصل اس غلط فہمی میں مبتلا کرنے والا کافر عفریت عکب تھا۔ اس کی مرضی یہ تھی کہ منگول پیچھے نہ ہٹیں اور مقابلے پر ڈٹے رہیں۔
جنگ پوری شدت پر تھی اور مسلمان، کافر منگولوں کی یلغار روکے ہوئے تھے کہ معاً جیسے میرا وجود سلگ اٹھا۔
مجھے نظر آنے والا چہرہ عیار و غدار ابن علقمی کا تھا۔ اس کے ساتھ خلیفہ مستعصم بھی مجھے فصیل شہر پر دکھائی دیا۔
''اے علقمی، اے غدار آدم زاد! آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی!'' میں یہ کہتی ہوئی شدید غصے میں ابن علقمی کی طرف جھپٹی۔ میرا ارادہ تھا کہ ابن علقمی کو فصیل شہر سے نیچے پھینک دوں گی۔
ارادے تو آدم زاد اور ہم جنات دونوں ہی کرتے ہیں لیکن ان ارادوں کی تکمیل کا انحصار کسی اور ہی ذات کی مرضی پر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت میں نے غدار ابن علقمی کو دیکھا تو مجھے شدید غصہ آ گیا۔ میں نے سوچا کہ ابن علقمی کو فصیل سے نیچے پھینک کر یہ قصہ ہی ختم کیوں نہ کر دوں۔ اسی ارادے سے میں، ابن علقمی کی طرف جھپٹی تھی۔ میں غصے میں یہ بھول ہی گئی کہ وہاں کافر عفریت عکب بھی موجود ہے۔ اس سے پہلے کہ میں، ابن علقمی کو اپنی گرفت میں لیتی، عکب درمیان میں آ گیا۔
''پیچھے ہٹ جا اے دینارا!'' عکب نے مجھے مخاطب کیا۔ ''تو میرا کھیل نہیں بگاڑ سکتی! میں کبھی اس عیار و غدار آدم زاد کی طرف سے غافل نہیں رہتا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ابن علقمی کو یہاں دیکھ کر تو بے قابو ہو جائے گی۔ سو ایسا ہی ہوا۔''

"اے لعنتی عفریت! آخر تُو کب تک اس غدار کو بچائے گا!" میں سخت آواز میں بولی۔

"بغداد کا زوال ہونے تک..... اس شہر کے گلی کوچوں کو خون میں نہلائے جانے تک..... یہاں قتلِ عام ہونے تک!" عکب نے جواب دیا، پھر کہنے لگا۔ "میں یہ اندیشہ ہی ختم کیوں نہ کر دوں کہ کہیں تُو وقت سے پہلے ہی ابنِ علقمی کو نہ مار ڈالے۔"

"وہ کیسے؟" بے اختیار میں پوچھ بیٹھی۔

"دیکھ ایسے، اے دیبارا!" عکب نے یہ کہتے ہی ابنِ علقمی کے گرد چکر کاٹا۔

میں نے ابنِ علقمی کے گرد شعلوں کا ایک حصار دیکھا اور چونک اٹھی۔

"یہ حصار..... شعلوں کا یہ حصار جنات کو تو دکھائی دے سکتا ہے، کسی آدم زاد کو نہیں۔ اب تُو اس غدار کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی اے دیبارا!" عکب مجھے بتانے لگا۔ "اگر تُو نے یہ کوشش کی اور اس کے قریب جانا چاہا تو تیرا وجود شعلوں میں گھر جائے گا اور..... اور پھر تیرا زندہ بچنا شاید محال ہو۔ تُو نے بھی اپنے گرد مجھ سے بچنے کے لئے نادیدہ حصار کھینچ رکھا ہے!" عکب یہ کہہ کر وہاں رکا نہیں۔ اسے میں نے ایک بار پھر میدانِ جنگ کی طرف جاتے دیکھا۔

میں سوچنے لگی، عکب مجھے فریبِ نظر میں مبتلا کر کے دھوکا بھی دے سکتا ہے۔ کیا خبر ابنِ علقمی کے گرد شعلوں کا حصار قائم نہ ہو۔ ایسا اسی صورت میں ممکن تھا کہ عکب نے سحر سے کام لیا ہو۔ اسی خیال سے میں نے ان آیات کا ورد کیا جو سحر کا توڑ تھیں۔ تعلیم کردہ آیات پڑھنے کے باوجود ابنِ علقمی کے گرد شعلوں کا حصار قائم رہا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ فریبِ نظر نہیں بلکہ واقعی عفریت عکب نے اس عیار آدم زاد کو میرے کسی متوقع حملے سے آئندہ کے لئے بچا لیا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس پر میں نے خود کو بہت بے بس محسوس کیا۔ ابنِ علقمی میرے سامنے تھا لیکن میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ معاً اس منحوس کی آواز مجھے سنائی دی۔

"اے خلیفہ معظم!" ابنِ علقمی خلیفہ مستعصم سے کہہ رہا تھا۔ "منگولوں کے اس بے پناہ لشکر کو دیکھیے۔ اس کی کثرت نے بغداد کے چاروں طرف کے میدان ڈھک لئے ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جب ہم میں مقابلے کی قوت ہی نہیں تو بیکار مقابلہ کر کے منگولوں کو غضب ناک کیوں کریں۔ میں نے سنا ہے منگول غضب ناک ہو کر اور بھی خطرناک ہو جاتے ہیں۔"

خلیفہ مستعصم نے منگولوں کے لشکر کی طرف نظریں اٹھائیں تو چہرے سے صاف پتہ چل گیا کہ اس پر ہیبت چھا گئی ہے۔ یقیناً اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ منگول اتنا بھاری لشکر لے کر آ جائیں گے۔ وہ کہنے لگا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو ابنِ علقمی! ہم اس ٹڈی دل کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتے۔" مستعصم اتنا بڑا احمق تھا کہ اس نے ابنِ علقمی سے یہ نہیں پوچھا کہ تم تو کہتے تھے، منگول واپس چلے گئے۔ وہ تو اتنا بھاری لشکر لیکر بڑھتے چلے آئے اور تمہیں خبر بھی نہ ہوئی۔ اگر تمہیں معلوم تھا کہ دشمن کا بے شمار لشکر آ رہا ہے تو تم نے مدافعت کا سامان کیوں نہیں کیا؟ یہ سب کہنے کی بجائے مستعصم نے بزدلی اور پست ہمتی سے کہا۔

"اے ابنِ علقمی! اب یہ بتاؤ کہ کیا قدم اٹھایا جائے؟"

"اگر منگولوں کا مقابلہ نہ کیا جائے تو میں حکمت عملی سے انہیں ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں۔" ابنِ علقمی نے جواب دیا۔

"پھر تو جنگ بند ہونی چاہیئے۔" بے عقل خلیفہ مستعصم، ابنِ علقمی کی چال میں آ گیا۔

"جی ہاں خلیفہ محترم!" ابنِ علقمی جلدی سے تائید میں بولا۔

خلیفہ مستعصم نے عارج کو ولی عہد ابوبکر سمجھ کر بلوایا اور اس سے کہا۔ "منگولوں کا مقابلہ کر کے انہیں جوش نہ دلاؤ۔ جنگ بند کر دو۔"

"جنگ بند کرتے ہی منگول، کمندیں ڈال کر فصیل پر چڑھ آئیں گے اور پھر شہر پناہ کے سارے دروازے کھول دیں گے۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت، وہ شہر میں گھس کے قتلِ عام شروع کر دیں گے۔" عارج نے خلیفہ کو سمجھایا۔

"ابنِ علقمی کہتے ہیں کہ وہ منگولوں کو حکمت عملی سے ٹال دیں گے۔" خلیفہ نے بتایا۔

اس پر عارج کو غصہ آ گیا اور اس نے تیز آواز میں کہا۔ "یہ غدار ہے، جھوٹ بولتا ہے۔ یہ بلا اسی کی لائی ہوئی ہے۔ اسی نمک حرام نے منگولوں کو عراق پر حملے کی دعوت دی ہے۔ اب ہماری ساری سلطنت پر منگولوں کا قبضہ ہے۔ ہم صرف بغداد میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس غدار کا مقصد یہ ہے کہ دارالخلافہ پر بھی منگول قابض ہو جائیں اور ہماری سلطنت کا نام و نشان مٹ جائے۔"

عارج کے تیور دیکھ کر خلیفہ مستعصم ڈر گیا اور بولا۔ "اچھا، ہم تمہارے کام میں مداخلت

نہیں کرنا چاہئے۔ جو تم مناسب سمجھتے ہو کرو۔"

خلیفہ، ابن علقمی کو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے چلا گیا۔ عیار ابن علقمی جو امید لے کر آیا تھا، وہ پوری نہ ہوئی۔ اسے یقیناً یہ غلط فہمی ہوگی کہ خلیفہ معتصم کے کہنے سے جنگ بند ہو جائے گی اور وہ ہلاکو خاں کے سامنے سرخرو ہو جائے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔

مسلمان برابر کافر منگولوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ نہایت سختی سے ان کے حملوں کا جواب دیتے رہے۔ جب دوپہر ہوگئی تو منگولوں نے بڑے جوش و خروش سے حملہ کیا۔ عباسی فوجیوں نے کثرت سے تیر اور پتھر برسا کر انہیں واپس ہونے پر مجبور کیا۔

منگول سخت نقصان اٹھا کر واپس ہوئے۔

نصیر الدین طوسی کو یہ امید تھی کہ ابن علقمی اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کے جنگ بند کرا دے گا مگر جب جنگ بند نہ ہوئی تو اس نے ہلاکو خاں سے کہا۔ "مصلحت کا تقاضا یہ ہے میرے آقا کہ لشکر واپس کرلیا جائے اور محاصرہ سخت کر دیا جائے۔"

ہلاکو خاں نے طوسی کی یہ بات مان لی۔ منگول ناکام واپس ہو گئے۔

اس روز کے بعد سے منگولوں نے محاصرہ اور سخت کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان محاصرے سے تنگ آ کر شہر ان کے حوالے کر دیں گے۔ یہ بات ممکن بھی تھی۔ لیکن جن بستیوں کو منگولوں نے تباہ و برباد کیا تھا، ان کے کچھ لوگ کسی طرح جان بچا کر بغداد آ گئے تھے۔ ان میں جو جوان تھے، وہ رضا کاروں کے زمرے میں بھرتی ہو کر مدافعت کے لئے فصیل پر پہنچ گئے تھے۔ ان جوانوں نے منگولوں کی بدعہدی اور مظالم کی داستانیں عباسی فوجیوں کو سنائیں۔ انہی دل دوز سچے واقعات کو سن کر مسلمانوں نے یہ طے کیا کہ وہ لڑتے ہوئے مر جائیں گے لیکن منگولوں کی اطاعت قبول نہیں کریں گے۔ ان کے اس فیصلے میں کسی قدر میرا ہاتھ بھی تھا۔ میں نے ان کے دماغوں میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ منگولوں کے قول و قرار پر وہ ہرگز اعتبار نہ کریں۔ وہ اسی لئے ہر وقت جنگ کے لئے تیار تھے مگر مصالحت یا اطاعت پر بالکل آمادہ نہ تھے۔

یہ حقیقت لاکھ روح فرسا سہی مگر بساط اب الٹ چکی تھی۔ وہ جو کبھی غالب تھے، اپنے ہی اعمال کے نتیجے میں مغلوب ہو چکے تھے۔ وہ جو ساری دنیا پر کبھی حکومت کرتے تھے، سمٹتے سمٹتے ایک شہر تک محدود ہو گئے تھے۔

صدیوں پہلے میں نے مسلمانوں کے حریفوں کو ان کی عبادت گاہوں میں روتے اور گڑگڑاتے دیکھا تھا۔ وہ اپنے "خداوند خدا" سے دعا کرتے تھے کہ انہیں مسلمانوں کی یلغار سے بچا لے۔ آج ان کی جگہ مسلمانوں نے لے لی تھی۔

میں نے بغداد کی جامع مسجد کے پیش امام کو با آواز بلند دعا مانگتے دیکھا اور سنا تو لرز گئی۔ صدیوں پہلے دیکھا ہوا منظر مجھے یاد آ گیا۔ بوڑھے پیش امام کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی اور وہ دعا مانگ رہا تھا۔

اے خدا!

وہ ہمارے شہر کے دروازے تک آ گئے ہیں

انہوں نے ہماری سرحدوں میں

بستی بستی، آنگن آنگن، ہرے درختوں کے نیچے

مظلوموں کی چیخوں کے بیچوں بیچ

اپنی فتح کے پرچم گاڑ دیئے ہیں

اے خدا!

کیا تو انہیں ہلاکت خیز وبا کی صورت زمین پر پھیلنے اور بڑھنے سے نہیں روکے گا!

ان کا لہو پیچھے نہیں آگے روشنی پھیلاتا ہے

اے خدائے ذوالجلال!

انہوں نے ہمارے ساتھ بہت برا کیا۔

وہ ہماری روحوں کو دیمک کی طرح چاٹ گئے ہیں

انہوں نے ہمیں ہمارے اندر تک فتح کر لیا ہے

اے خدائے بزرگ و برتر!

پناہ!

ہمیں ان کی ان دیکھی اور دیکھی یلغار سے پناہ دے!

ایک مسلمان ہی کیا، صدیوں سے دنیا بھر کی مختلف قومیں دورِ ابتلا میں ذاتِ برحق سے ایسی ہی دعائیں مانگتی آئی ہیں مگر ان دعاؤں کو قبولیت نہیں ملی۔ بے عمل و غفلت شعار قوموں پر خدا بھی رحم نہیں کرتا۔ کچھ ایسی ہی صورت مسلمانوں کے ساتھ تھی۔ مکافاتِ عمل سے بچنا

اب ان کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔

منگولوں پر بھی میں نظر رکھے ہوئے تھی کہ اب وہ کیا قدم اٹھاتے ہیں۔

پہلے ہی دن کی یورش میں منگولوں کا کافی نقصان ہو چکا تھا۔ انہیں دوبارہ حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ محاصرے نے طول کھینچا تو اجڈ منگول سپاہی اکتانے اور گھبرانے لگے۔ وہ تو خوں ریزی اور لوٹ مار کے عادی تھے۔

ہلاکو خاں کو رہ رہ کر ابنِ علقمی پر غصہ آ رہا تھا۔ ابنِ علقمی نے جو پیغامات اس کے پاس بھیجے تھے ان میں اطمینان دلایا تھا کہ مسلمان، منگولوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ بغداد شہر کے دروازے انہیں کھلے ملیں گے لیکن مسلمان مقابلہ کر رہے تھے۔ شہر کے دروازے بند تھے۔ ہلاکو خاں اور اس کا لشکر شہر سے باہر گویا خاک پھانک رہا تھا۔ مسلمان انہیں فصیل کے کسی بھی در تک نہ آنے دیتے تھے۔ وہ جانتا تھا، مسلمان کٹ مرنے والی قوم ہے، آسانی سے دارالسلطنت پر قبضہ نہ ہونے دے گی۔ ہلاکو خاں اسی لئے حملہ کرنے میں متامل تھا، لیکن ایک طرف ابنِ علقمی کی تحریروں نے اور دوسری طرف اس کے وزیرِ اعظم نصیر الدین طوسی کی ترغیبوں نے اسے یہاں لا ڈالا تھا۔

اس نے چند مرتبہ اور بھی پُرزور حملے کئے۔ بڑے جوش کے ساتھ منگول بڑھے۔ بڑی پھرتی سے انہوں نے تیر برسائے لیکن مسلمانوں نے سختی سے مدافعت کی۔ تیروں اور پتھروں کی بارش کر کے انہوں نے منگولوں کا جوش ٹھنڈا کر دیا۔ آخر ہر مرتبہ منگول نقصان اٹھا اٹھا کر لوٹنے پر مجبور ہوئے۔ اس پیہم ناکامی سے ہلاکو خاں کا غصہ اور بڑھ گیا۔

محاصرے کو اب پچاس روز گزر چکے تھے۔ اس دن بھی میں، ہلاکو خاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔

ہلاکو خاں نے نصیر الدین طوسی کو طلب کیا۔ چہرے سے سخت برہمی ظاہر تھی۔ طوسی آ گیا مگر ہلاکو خاں نے اسے بیٹھنے کی اجازت نہیں دی اور اس سے گرج کر کہا۔ "کیا بدمعاش ابنِ علقمی کے یہی وعدے تھے؟"

طوسی اسے غضب ناک دیکھ کر خوف و دہشت سے کانپنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ آج جان کی خیر نہیں۔

"اے میرے آقا" طوسی عاجزی سے بولا۔ "معلوم نہیں کہ ابنِ علقمی نے بے وفائی کی یا اسے کوئی مجبوری لاحق ہو گئی۔"

ہلاکو خاں یہ سن کر چیخ اٹھا۔ "مجبوری کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس نے ہمیں دھوکا دیا ہے اور تم بھی اس کے دھوکے میں شریک تھے۔"

"میرے آقا! میں تو آپ کا ادنیٰ خادم ہوں اور خادم بھی وفادار!" طوسی کانپتے ہوئے اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ "مجھے معلوم ہے کہ بغداد میں بے قیاس دولت ہے اور لاثانی حسینائیں ہیں۔ میں نے اسی لئے عظیم شہنشاہ کو حملے کی ترغیب دی تھی۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے کس بل نکل چکے ہیں۔ ان پر فاقوں کی نوبت آ گئی ہے اور وہ مجبور ہو کے شہر کو شہنشاہ کے حوالے کرنے والے ہیں۔"

ہلاکو خاں دولت اور حُسن، دونوں کا حریص تھا۔ ان دونوں کا نام آتے ہی اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ ایسا ہی اس وقت ہوا۔ اس کا غصہ دھیما پڑ گیا۔ وہ بولا۔ "مگر اے طوسی، یہ دولت اور مہ جبیں دل ربائیں ہمارے ہاتھ کب آئیں گی؟"

"بہت جلد میرے آقا!" طوسی نے جلدی سے کہا۔ اس کے چہرے پر اب خوف کا تاثر کم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ہلاکو خاں کا مزاج شناس تھا، سو اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ شہزادی نجمہ اس قدر حسین و نازنین ہے کہ چشمِ آفتاب نے بھی ایسی دل ربا نہ دیکھی ہو گی۔ اور خود ابنِ علقمی کی بیٹی ماجدہ پری چہرہ مہ جبیں ہے۔ بغداد میں بے شمار لڑکیاں ایسی مست شباب اور پیکر جمال ہیں کہ انہیں دیکھ کر دیکھنے والوں کے حواس رخصت ہونے لگتے ہیں۔ یہ سب آہو چشم دل ربائیں بہت جلد عظیم المرتبت شہنشاہ کی آغوش کی زینت بننے والی ہیں۔"

"کیا تم نے ستاروں کی چال دیکھی ہے؟ ستارے بھی یہی کہتے ہیں؟" ہلاکو خاں نے پوچھا۔ اسے علم تھا کہ نصیر الدین طوسی منجم ہے۔ راتوں کو وہ اکثر ستاروں پر نظریں جمائے رہتا ہے۔

ہلاکو خاں کی بات سے طوسی کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ اس نے جواب دیا۔ "ہاں میرے آقا! ستارے یہی کہتے ہیں۔"

"تم نے ان کے پاس کوئی پیغام نہیں بھیجا؟" ہلاکو خاں پھر مطلب کی بات پر آ گیا۔

"اب تک مجھے کوئی قابلِ اعتماد آدمی نہیں ملا۔ اتفاق سے آج بھروسے کا ایک آدمی

ہاتھ آ گیا ہے۔" طوسی بتانے لگا۔ "کل میں اسی آدمی کے ذریعے ابنِ علقمی کو مفصل پیغام بھیجوں گا۔"

"ہاں، اسے پیغام بھیجو اور ہماری طرف سے لکھ دو کہ اگر وہ ہماری خوشنودی چاہتا ہے تو اپنی بیٹی ہاجرہ کو لے کر ہمارے پاس آ جائے۔" ہلاکو خاں نے کہا۔ اسے آج ہی ہاجرہ کے بارے میں طوسی نے بتایا تھا سو اس نے نام یاد رکھا تھا۔

"بہت اچھا میرے آقا!" طوسی ن یقین دہانی کرائی۔

نصیر الدین طوسی، ہلاکو خاں سے اجازت لے کر اس کے خیمے سے نکل آیا۔ میری توجہ اس کے دماغ پر تھی۔ وہ پچھتا رہا تھا کہ اس نے اور لڑکیوں کے ساتھ ہاجرہ کا ذکر وحشی منگول حکمراں سے کیوں کر دیا۔ زبان سے نکلی بات اور کمان سے نکلا تیر واپس نہیں آتے۔ اب اس کا پچھتانا لا حاصل تھا۔ طوسی نے یہ سچ کہا تھا کہ ایک معتبر شخص اسی روز صبح اس کے پاس آیا تھا۔ وہ ابنِ علقمی کا قاصد تھا۔ میں پہلے ہی سے باخبر تھی کہ عفریت عکب نے ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ ابنِ علقمی کے قاصدوں کو بغداد سے نکلنے اور واپس جانے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ ابنِ علقمی کے اس معتمد خاص سلیمان کا ذکر میں پہلے بھی کر چکی ہوں۔ وہ ابنِ علقمی کا یہ پیغام لایا تھا۔ "میں بہت جلد شہر پر منگولوں کا قبضہ کرانے والا ہوں۔"

جواب میں نصیر الدین طوسی نے ایک مفصل تحریر لکھ کر سلیمان کے حوالے کی۔ طوسی نے ابنِ علقمی کو لکھا۔ "محاصرہ طول پکڑتا جا رہا ہے۔ ہلاکو خاں اس پر سخت ناراض ہو رہا ہے۔ وہ بڑا وحشی ہے۔ اگر کسی طرح اس نے تمہاری مدد کے بغیر بغداد پر قبضہ کر لیا تو تمہیں ہرگز زندہ نہ چھوڑے گا۔ اگر تم اس کی خوشنودی چاہتے ہو تو جلد بغداد پر قبضہ کرا دو۔ ممکن ہو تو تم خود کسی صورت یہاں آ کر ہلاکو خاں کا اطمینان کر جاؤ۔ ایک بات اور بھی ہے۔ اگر تم غور کرو گے تو تمہارے لئے یہ بات بڑی منفعت بخش ثابت ہو گی۔ وہ بات یہ ہے کہ ہلاکو خاں نے ہاجرہ کے حُسن کی تعریف سنی ہے۔ اگر وہ منگول حکمراں کے حرم میں داخل ہو گئی تو دولت، عزت اور حکومت تمہارے قدم چومے گی۔"

رات کو سلیمان، ہلاکو خاں کے لشکر سے نکل کر فصیلِ شہر کے ایک دروازے پر پہنچا۔ محافظوں نے اسے پہچانتے ہی دروازہ کھول دیا۔ سلیمان کی نقل و حرکت پر میری نگاہ تھی۔ وہ شہر میں داخل ہوا اور سیدھا ابنِ علقمی کے پاس پہنچا۔

غدار ابنِ علقمی اپنے معتمد خاص سلیمان ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ سلیمان کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ سلیمان نے اسے نصیر الدین طوسی کا خط دیا۔ ابنِ علقمی نے سلیمان کو رخصت ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنی خاص نشست گاہ میں اکیلا تھا۔ اس نے خط پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے وہ خط پڑھتا جا رہا تھا، اس کا چہرہ پژمردہ ہوتا جاتا تھا۔ جب اس نے خط کے آخری فقرے پڑھے تو کچھ سوچ میں پڑ گیا، مگر فوراً ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ چند لمحے بعد ہی وہ بڑبڑایا۔ "میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔"

میری توجہ ابنِ علقمی کے ذہن پر ہی تھی۔ میں اس کے ارادے سے واقف ہو گئی۔ شعلوں کا حصار اسے جسمانی ضرر سے بچانے کے لئے تھا۔

دوسرے روز جب وہ عیار آدم زاد، خلیفہ مستعصم سے ملا تو میں بھی قصرِ خلافت میں موجود تھی۔

"اعلیٰ حضرت!" ابنِ علقمی، مستعصم سے ہم کلام ہوا۔ "منگولوں کے محاصرے کو عرصہ ہو گیا ہے۔ ان کا لشکر بے شمار ہے، یہ خود بہ چشم خود ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ رسد اور سامانِ جنگ بھی ان کے پاس کافی ہے۔ وہ یقیناً بغداد کو فتح کر لیں گے۔ اگر انہوں نے تلوار کے زور سے بغداد کو فتح کیا تو نہ معلوم وہ شہر والوں کا اور ہمارا کیا حشر کریں اس لئے خادم کے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے، اجازت ہو تو......"

"اجازت ہے۔" خلیفہ مستعصم فوراً بول اٹھا۔

"خادم چاہتا ہے اعلیٰ حضرت کہ منگولوں سے صلح کے لئے بات شروع کی جائے۔" ابنِ علقمی نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

مستعصم میں عقل تو تھی نہیں اور آنکھوں پر بھی پردہ پڑا ہوا تھا، سو بولا۔ "یہی بات ہمارے ذہن میں آئی ہے۔"

"میرے خیال میں قاصدوں کو بھیجنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔ اگر اعلیٰ حضرت خلیفہ معظم اجازت مرحمت فرمائیں تو ان کا یہ خادم خود جا کر منگولوں سے تمام معاملات طے کر لے۔" ابنِ علقمی نے چالاکی سے کہا۔

"یہ نہایت ہی مناسب ہو گا۔" خلیفہ مستعصم نے تائید کر دی۔

"مگر ولی عہد اور دوسرے شہزادے شاید اس کی مخالفت کریں۔" ابنِ علقمی نے اپنا راستہ

صاف کرنے کے لئے اندیشہ کا اظہار کیا۔

"ان کی مخالفت سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ صلح یا جنگ کا فیصلہ انہیں نہیں ہمیں کرنا ہے۔ تم ان کی پروا نہ کرو!"

خلیفہ مستعصم کو ہموار کر کے ابن علقمی اپنے محل میں آیا۔ روانگی کی تیاری میں اس نے دیر نہیں لگائی۔ کچھ فاصلے سے میں اس عیار آدم زاد کے تعاقب میں تھی۔ یہ فاصلہ بھی میں نے بہ وجہ برقرار رکھا تھا کہ شعلوں کے حصار کی زد میں نہ آ جاؤں۔

ابن علقمی بہر حال وزیر اعظم تھا۔ اس کے لئے دروازۂ شہر کھول دیا گیا۔ گھوڑے پر سوار وہ تیزی سے منگولوں کی لشکر گاہ نظر میں رکھے آگے بڑھ رہا تھا۔ سفید پرچم اس کے ہاتھ میں لہرا رہا تھا۔

گشت پر موجود سپاہیوں نے تعارف ہوتے ہی ابن علقمی کو اس کے ہم منصب نصیر الدین طوسی کے خیمے میں پہنچا دیا۔

طوسی نے اس غدار کو دیکھا تو خوشی کا اظہار کیا، پھر پوچھا: "تم تنہا آئے ہو؟ ہاجرہ کو نہیں لائے اپنے ساتھ؟"

"حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے فی الحال میں اکیلا ہی آیا ہوں۔" ابن علقمی نے جواب دیا۔

"کس ارادے سے آئے ہو؟" طوسی نے دریافت کیا۔

"اپنا وعدہ پورا کرنے۔" ابن علقمی کا لہجہ معنی خیز تھا۔ "میں خلیفہ مستعصم باللہ کو ہلاکو خاں کے قبضے میں کرا دوں گا۔ آگے وہ جانیں اور ان کا کام۔ خلیفہ قیدی بنا لیا گیا تو پھر......"

"مجھے اندازہ ہے۔" طوسی جوش میں آ کر بول اٹھا۔ "اگر خلیفہ ہمارے قبضے میں آ گیا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"جب میں آ گیا ہوں تو سمجھ لیجئے کہ خلیفہ بھی آ جائے گا، لیکن پہلے آپ میرے اور میرے خاندان والوں کے لئے امان دلا دیجئے۔"

"ابھی لو، چلو میرے ساتھ!" طوسی راضی ہو گیا۔

ابن علقمی کو ساتھ لے کر طوسی اسی وقت ہلاکو خاں کے پاس پہنچا۔

"اے میرے آقا! عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کا وزیر اعظم ابن علقمی آپ کی خدمت میں

حاضر ہے اور آداب بجا لاتا ہے۔" نصیر الدین طوسی نے ہلاکو خاں سے غدار آدم زاد کا تعارف کرایا۔

ابن علقمی نے جھک کر بڑے ادب سے ہلاکو خاں کو سلام کیا۔

طوسی سمجھتا تھا کہ ہلاکو خاں، ابن علقمی سے سخت ناخوش ہے۔ وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جس سے ابن علقمی کھٹک جائے۔ کہیں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آ جائے۔ طوسی اسی لئے جلدی سے بولا۔ "یہ اپنا وعدہ پورا کرنے آئے ہیں۔ خلیفہ کو یہ حضور کے قبضے میں کرا دیں گے۔"

"اگر خلیفہ ہمارے قبضے میں آ گیا تو شہر بغداد کی کنجیاں میرے پیروں میں پڑی ہوں گی۔" ہلاکو خاں نے تکبر سے کہا۔

"اور بغداد کی بے شمار دولت کے علاوہ حسین نازنینائیں شہر بھی آپ کے قبضے میں ہوں گی۔" طوسی نے لالچ دیا۔

"اچھا کب یہ کام ہو جائے گا؟" ہلاکو خاں نے طوسی کے توسط سے معلوم کیا۔

⚙......⚙

بجائے کہ ابنِ علقمی کے دلیرانہ اقدام کی تعریف کرتے، اس پر غداری اور بے وفائی کا الزام لگا رہے ہو۔ کس قدر عجیب بات ہے!"

جواب میں عارج قدرے جذباتی ہو کر بولا۔ "ہمیں پچاس روز، رات اور دن جاگتے اور دشمن کا مقابلہ کرتے گزر گئے لیکن ابنِ علقمی کو وفادار و ہمدرد ہونے کے باوجود یہ توفیق کبھی نہ ہوئی کہ فصیل پر آ کر ہماری ہمت بندھاتا، سامانِ جنگ دیکھتا، جنگ کے لئے مفید مشورے دیتا اور خود بھی سپاہیوں کے ساتھ مل کر ان کا ہاتھ بٹاتا۔ اس سے سپاہیوں کے حوصلے بڑھتے۔"

"وہ جنگ کے حق میں نہیں ہے۔" خلیفہ مستعصم نے کہا۔ "پھر بھی اس نے تمہیں پورا موقع دیا کہ تم لڑ کر اپنے دلوں کے حوصلے نکال لو اور اگر ممکن ہو تو منگولوں کو بھگا دو، مگر تم انہیں نہیں بھگا سکے۔ اب صلح کے سوا اور کیا بات رہ جاتی ہے۔ وہ اسی لئے گیا ہے۔"

عارج کو یہ بھی معلوم تھا کہ ابنِ علقمی، ہلاکو خاں سے مل کر بغداد واپس آ چکا ہے مگر ظاہر نہ کیا۔ وہ خلیفہ مستعصم سے کہنے لگا۔ "ابنِ علقمی کا جنگ کی موافقت نہ کرنا ہی اس کی نیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس نے اسی لئے فوجیں پہلے ہی سے علیحدہ کر دیں تاکہ دشمن کا راستہ صاف ہو جائے، کوئی روکنے والا نہ ہو۔ مجھے یقین ہے، وہ اپنے لئے ہلاکو خاں سے امان حاصل کرنے گیا ہے۔"

اس پر خلیفہ مستعصم کے ماتھے کی شکنوں میں اضافہ ہو گیا۔ کسی قدر خفگی کے انداز میں اس نے کہا۔ "ہمیں تمہاری باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ تم ہمارے ایک وفادار پر غداری کا الزام لگاتے ہو۔ اسلام میں بدظنی روا نہیں ہے۔ تمہیں یہ چاہئے کہ تم نے اپنی نادانستگی میں جو ایک وفاشعار پر الزام لگایا ہے، ایک بار نہیں کئی مرتبہ اس کے لئے تم اس سے معافی چاہو۔"

"میں اعلیٰ حضرت کا غلام ہوں۔ اگر حضور مجھے حکم دیں گے تو ابنِ علقمی سے معافی چاہ لوں گا۔" عارج کو کہنا ہی پڑا۔

"یہ ہمارا حکم نہیں ہے بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم اسلامی روایات برقرار رکھو اور ابنِ علقمی سے معافی مانگ لو۔"

اسی وقت خلیفہ مستعصم کو احمر اور احجد کے آنے کی اطلاع ملی۔ اس نے دونوں شہزادوں

کو بھی بلوایا۔

ابھی گفتگو جاری ہی تھی کہ ایک غلام نے ابنِ علقمی کی آمد کے بارے میں خلیفہ کو آگاہ کیا۔

خلیفہ نے اسے بھی وہیں بلوا لیا۔ اس کے چہرے سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر خلیفہ مستعصم کہنے لگا۔ "ہمیں لگتا ہے کہ تم کامیاب ہوئے ہو۔ ہم تفصیل جاننا چاہیں گے کہ منگولوں سے تمہاری کیا گفتگو ہوئی۔"

"اعلیٰ حضرت کا قیاس واقعی درست ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ کے خادم کو کامیابی ہوئی۔" ابنِ علقمی نے بتایا تو خلیفہ مستعصم کا چہرہ بھی گویا کھل اٹھا۔ اس نے عارج اور دونوں شہزادوں کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، دیکھا تم نے!

تینوں چپ ہی رہے۔ ابنِ علقمی نے تفصیل بیان کرنا شروع کی۔ "حضورِ محترم! میں، نصیر الدین طوسی کی وساطت سے منگول حکمراں ہلاکو خاں تک پہنچا۔ ہلاکو خاں سے میں نے کہا، بغداد شہر میں لاکھوں آدمی ہیں۔ ان میں جو جوان ہیں، فوج میں بھرتی ہو گئے ہیں، کچھ فوجیں آ رہی ہیں۔ جب وہ فوجیں دوسرے شہروں سے دارالخلافہ پہنچ جائیں گی تو شہر میں موجود سپاہ باہر نکل کر حملہ کر دے گی۔ اگر آپ باعزت صلح کر کے واپس چلے جائیں تو بہت اچھا ہو گا۔" ابنِ علقمی صاف جھوٹ بول رہا تھا۔ میرا بس چلتا تو اس کی گردن دبوچ لیتی، سوختی رہی اور وہ شیخی بگھارتا رہا۔ "ہلاکو خاں میری بات سن کر گھبرا گیا۔ اس نے کہا، میں صلح کے لئے تیار ہوں۔ میں بولا، کن شرائط پر آپ صلح کرنا چاہتے ہیں؟ اس نے جواب دیا، خلیفہ مجھے سالانہ خراج ادا کریں۔ میں نے اسے بتایا کہ خلیفہ محترم اس بات کو گوارا نہ کریں گے۔ اس پر وہ کچھ دیر سوچ کر کہنے لگا، اچھا خلیفہ چار لاکھ دینار ادا کریں اور یہ اقرار کریں کہ کسی وقت بھی وہ منگول سلطنت پر حملہ نہ کریں گے۔ میں نے کہا، چار لاکھ دینار بہت زیادہ ہیں۔ غرض بہت کچھ رد و کد کے بعد ایک لاکھ دینار پر معاملہ ہو گیا ہے۔"

اس پر خلیفہ مستعصم نے اظہارِ خوشی کیا اور بولا۔ "یہ تم نے خوب کیا۔"

ابنِ علقمی اس کے بعد گویا مطلب کی بات پر آ گیا اور کہا۔ "اعلیٰ حضرت سے ہلاکو خاں اس بات کا اقرار لینا چاہتا ہے کہ عباسی سلطنت، منگول حکومت پر حملہ نہیں کرے گی۔ وہ

سے چلا نہ تھا۔ اس نے شہزادوں کے استفسار پر انہیں بتایا کہ خلیفہ خاصی دیر پہلے جا چکا ہے۔ احمر نے طوسی کا مراسلہ اُسے دکھایا۔ عارج کو پہلے ہی تمام باتوں کا علم تھا۔ پھر بھی اُس نے افسوس کا اظہار کیا۔ اُس کے انسانی قالب کے اعصاب یاسیت کا شکار تھے۔ وہ افسردہ آواز میں کہنے لگا۔

"بدقسمتی سے خلیفہ معظم نے ہماری باتوں پر توجہ نہ دی اور ابن علقمی کی سازش کامیاب ہوئی۔ اُس نے اعلیٰ حضرت کو منگولوں کے چنگل میں پھنسا دیا۔"

عارج مجھے شدید صدمے کی کیفیت میں لگا۔ احمر نے بھی یہ اندازہ کر لیا۔ اُس نے کہا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔"

"ہاں۔" عارج نے مُردہ سی آواز میں جواب دیا۔ "مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرے پیروں میں جان نہیں رہی۔"

پھر دونوں شہزادوں نے عارج کو ابوبکر کے محل تک پہنچا دیا۔ فردوس اُس کی جانب دیکھ کر کانپ گئی اور پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"فردوس! وہ ہو گیا جس کا اندیشہ تھا۔" عارج نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "اب ہماری زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔"

مختصراً احمر نے فردوس کو حالات سے آگاہ کر دیا۔ فردوس کہنے لگی۔ "ابن علقمی کس قدر کمینہ ہے! افسوس کہ وہ اپنی بیٹی کو منگول حکمراں کے حرم میں داخل کرنے پر بھی آمادہ ہو گیا۔"

میں خلیفہ کا ماجرا دیکھنے وہاں پہنچ گئی۔ غدار و عیار آدم زاد ابن علقمی اُس کے ساتھ تھا۔ ابن علقمی نے مستعصم کو یہ بتایا تھا کہ منگول اُس کے استقبال کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ جب وہ منگول لشکر کے قریب پہنچ گیا اور کوئی بھی اُس کے استقبال کو نہ آیا تو آنکھیں کھلیں۔ اُس وقت اُسے پتہ چلا کہ فریب دیا گیا ہے۔ میری توجہ خلیفہ کے ذہن پر تھی۔

"اے عزیز من!" خلیفہ مستعصم اپنے غدار وزیراعظم سے مخاطب ہوا۔ "تم تو کہتے تھے کہ منگول ہمارے استقبال کی تیاری کر رہے ہیں۔ لیکن وہ تو اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ کیا وجہ ہے؟"

ابن علقمی نے فریب کا چولا اُتار پھینکا۔ اب اس کی ضرورت بھی نہیں تھی، بولا۔ "تم جیسے شخص کو انہوں نے استقبال کے قابل نہ سمجھا ہوگا۔"

اگر مستعصم باللہ کو کچھ شک و شبہ تھا تو ابن علقمی کے اس گستاخانہ جواب سے رفع ہو گیا۔ اُس وقت اُسے اپنے ولی عہد ابوبکر اور احمر واحمہ، دونوں شہزادوں کی وہ تمام باتیں ایک ایک کر کے یاد آ گئیں جو وہ غدار ابن علقمی کے متعلق کہا کرتے تھے۔ اُسے افسوس ہوا کہ وہ اس نمک حرام کی نمک حرامی سے پہلے ہی کیوں واقف نہ ہو گیا۔ کیوں اس نے شہزادوں کی مخالفت کی اور ایک غدار کی حمایت سے گریز نہ کیا! مستعصم سمجھ گیا کہ ابن علقمی نے اُسے منگول حکمراں ہلاکو خاں کے چنگل میں پھنسا دیا، لیکن اب افسوس کرنا اور پچھتانا لاحاصل تھا۔ اُس غدار و نمک حرام سے کچھ کہنا بھی بے سود تھا۔

ابن علقمی سیدھا ہلاکو خاں کے خیمے تک پہنچ گیا۔ منگول وحشی سپاہی، خلیفہ مستعصم کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔

"میں اسی قابل ہوں کہ دنیا میری بے وقوفی پر ہنسے۔" مستعصم بڑبڑانے لگا۔ اپنا مذاق اُڑائے جانے پر اُسے سخت صدمہ ہوا تھا۔ "میں وہ ہوں جس نے سانپ کو سانپ نہ سمجھا بلکہ کم ظرف کو عالی ظرف، غدار کو جاں نثار، بے ایمان کو ایمان دار اور نمک حرام کو وفادار جانا..... ہاں میں اسی کا مستحق ہوں کہ دنیا مجھ پر ہنسے۔"

ہلاکو خاں کو خبر کی گئی تو اُس نے مستعصم اور ابن علقمی کو فوراً اپنے خیمے میں بلوا لیا۔ اُن کے ساتھ جو خدام و غلام آئے تھے، وہ خیمے کے باہر ہی رہے۔ ہلاکو خاں نے انہیں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ ان کی ترجمانی کے لئے ہلاکو خاں نے اپنے وزیراعظم نصیرالدین طوسی کو طلب کر لیا۔ اس کے آتے ہی ابن علقمی نے ہلاکو خاں کو مخاطب کیا۔

"میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو آپ کے خیمے میں پہنچا دیا۔"

طوسی کی زبانی ہلاکو خاں نے ابن علقمی کے یہ الفاظ سن کر استہزا کے طور پر کہا۔ "میں، عباسی خلیفہ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ حکمراں زیرک و دانا ہوتے ہیں، لیکن آج معلوم ہوا کہ ایسے بے وقوف حکمراں بھی ہوتے ہیں جو دوست دشمن کی پہچان نہیں کر سکتے۔ ایسے ہی کم عقل بغیر کسی عہد و اقرار کے دشمن کے لشکر میں بلا جھجک چلے آتے ہیں۔"

خلیفہ مستعصم نے طوسی کی وساطت سے یہ بات سنی، مگر کیا جواب دے۔ وہ اس دوست نما دشمن کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا جو اُس کا بدترین حریف تھا۔ پھر بھی مستعصم بولا۔

"انسان ہی غلطی کرتا ہے۔ میری غلطی یہ ہے کہ میں نے ایک غدار کو وفادار جانا، لیکن غدار کو بھی غداری کی سزا ضرور ملتی ہے اور وہ اسی کی غلطیوں کا خمیازہ ہوتا ہے۔"

ہلاکو خاں کو طوسی نے بتایا کہ خلیفہ مستعصم کیا کہہ رہا ہے! اُسی کے ذریعے یہ گفتگو جاری رہی۔

"معاف کیجئے، میں نے تو بس ایک حقیقت بیان کی تھی۔" ہلاکو خاں طنزیہ لہجے میں بولا۔ "مطمئن رکھئے، میں آپ کے رتبے کے خلاف کوئی بات نہ کروں گا۔ آپ عباسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ بنو عباس تو مسلمانوں کے محافظ رہے ہیں۔"

یہ دوسری چوٹ تھی جو ہلاکو خاں نے مستعصم باللہ پر کی۔ کئی عباسی خلیفہ ایسے گزر چکے تھے جنہوں نے مظلوم مسلم عورتوں کی فریاد پر لبیک کہی تھی اور ظالموں سے مظلوموں کا انتقام لیا تھا۔ لیکن مستعصم نے ابن علقمی کے کہنے میں آ کر مسلمانوں کی حفاظت سے چشم پوشی کر لی تھی۔ اس پر مستعصم نے اعتراف کیا۔

"بے شک میرے بزرگ، مسلمانوں کے محافظ تھے۔ لیکن میں نے مسلمانوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہ بھی اس غلطی کے باعث ہوا کہ نمک حرام کو جاں نثار جانا۔"

"فکر نہ کیجئے۔ میں مسلمانوں کی تادیب کے لئے آیا ہوں، اُن پر حکومت کرنے نہیں۔ کہئے آپ کیا چاہتے ہیں؟" ہلاکو خاں نے پوچھا۔

"میں آپ کے قبضے میں ہوں، اس لئے میرے کچھ چاہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" مستعصم نے جواب دیا، پھر ہلاکو خاں کے اصرار پر اُسے اپنی مرضی بتانی ہی پڑی اور کہا۔ "مصالحت چاہتا ہوں۔"

"کن شرطوں پر؟"

"آپ فاتح کی حیثیت سے شرطیں پیش کیجئے۔"

ہلاکو خاں بولا۔ "نہیں، شرطیں آپ پیش کیجئے، میں انہیں مان لوں گا۔ لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ شرطیں مناسب ہونی چاہئیں۔ اچھا یہ ہے کہ آپ اپنے علماء، مشیروں اور شہزادوں کو بھی مشورے میں شامل کر لیں۔ مجھے کچھ عذر نہیں کہ آپ شہر میں جا کر مشورہ کریں۔ لیکن میرے سپاہی یہاں پڑے پڑے اُکتا گئے ہیں۔ میں بہت جلد یہاں سے واپس جانا چاہتا ہوں۔ اس لئے آپ سب کو یہیں بلا لیں۔" ہلاکو خاں بڑی چالاکی سے بولا۔

مستعصم اب بھی نہ سمجھا کہ اس سے ہلاکو خاں کا اصل منشا کیا ہے۔ اُس بے عقل نے ہلاکو خاں کی بات پر یقین کر لیا اور کہا۔ "میں اُن سب کو یہیں بلائے لیتا ہوں۔"

پھر خلیفہ مستعصم نے اپنے خادموں میں سے ایک وفادار خادم کو روانہ کیا۔ خادم کو اُس نے اُن لوگوں کے نام بتا دیئے جنہیں بلانا چاہتا تھا۔ اسی وقت میں نے عارج کو مخاطب کیا۔ "چل اب شہر چلتے ہیں کہ خادم بھی وہیں گیا ہے۔ اور سن لے اے عارج کہ اب تجھے ولی عہد ابوبکر کے قالب میں اترنے کی ضرورت نہیں۔"

"وہ کیوں اے دینار؟" عارج نے سوال کیا۔

"کیا تیرے خیال میں ہلاکو خاں نے ولی عہد، شہزادوں اور شہر کے دیگر معززین کو یہاں ضیافت کے لئے بلایا ہے؟ جن لوگوں کو خلیفہ نے بلوایا ہے، ان میں سرفہرست ولی عہد ابوبکر ہی کا نام ہے۔ منگول لشکر میں آنے کا مطلب کیا ہے، یہ تجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔"

"ہاں میں سمجھتا ہوں۔ یہاں آنے کا مطلب یقینی موت ہے۔" عارج نے کہا۔ "لیکن ہم ان لوگوں کو یہاں آنے سے روک بھی تو سکتے ہیں۔"

"کیا خلیفہ مستعصم کو ہم نے روک لیا؟ ..... تُو کا فر عفریت ملکب کو نہ بھول جایا کر!" میں بولی۔

"تُو ٹھیک کہتی ہے اے دینار!" عارج نے اعتراف کیا۔ "عفریت ملکب اُن لوگوں کو بغداد شہر میں رکنے نہ دے گا۔"

اس کے بعد عارج کو ساتھ لئے میں، ولی عہد ابوبکر کے محل میں آ گئی۔ ہمیں محل میں کچھ دیر ہوئی تھی کہ خلیفہ مستعصم کا خادم ولی عہد ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اُس نے ابوبکر کو خلیفہ کا پیغام سنایا۔

ابوبکر نے خادم کو رخصت کر دیا پھر احمد، احمر اور نجمہ کو بلا بھیجا۔ وہ آ گئے تو ابوبکر نے ان سے کہا۔ "تم سبھی سے میری درخواست ہے کہ بغداد سے باہر چلے جاؤ۔ یہ میری آخری استدعا ہے۔ مجھے یقین ہے بغداد میں عظیم خوں ریزی ہو گی۔ ہمارا خاندان مٹایا جائے گا۔ تم خاندان کو مٹنے سے بچا لو۔" یہ کہتے کہتے اس کا گلا رُندھ گیا۔ کچھ توقف سے اُس نے خادم کے آنے اور پیغام کے متعلق بھی انہیں بتا دیا اور پھر کہنے لگا۔ "ہماری قضا ہمیں شہر

سے باہر لے جا رہی ہے۔ میں ہرگز شہر سے نہ جاتا اگر اعلیٰ حضرت وہاں نہ ہوتے۔ بولو، تمہیں میری درخواست منظور ہے؟'' جب ابوبکر کو جواب اثبات میں ملا تو وہ خوش ہو گیا، بولا۔ ''آج مجھے معلوم ہوا کہ تم میرا کس قدر احترام کرتے ہو! تم سفر کی تیاری کرو اور میں شہر سے باہر جانے کی تیاری کرتا ہوں۔''

جس عرصے میں ابوبکر تیار ہوا، احمد اور احمر بھی تیار ہو کر آ گئے۔ فردوس بھی آ گئی۔ وہ اُس وقت بہت غمزدہ تھی۔

ابوبکر اُسے سمجھانے لگا۔ ''تمہاری رگوں میں عربی خون ہے۔ عرب عورتوں نے ہمیشہ قابل فخر کارنامے انجام دیئے ہیں۔ انہوں نے بیٹیوں، بھائیوں اور شوہروں کو خوشی سے جہاد پر بھیجا ہے۔ زخمیوں کی نگہداشت اور تیمارداری کی ہے، میدان جنگ میں جا کر سپاہیوں کو پانی پلایا ہے، ضرورت کے وقت وہ لڑائی میں بھی شریک ہوئی ہیں۔ انہوں نے کبھی غم کو پاس نہیں آنے دیا۔ تم بھی غم نہ کرو۔ میری بات مانو، تم بھی نجمہ کے ساتھ چلی جاؤ۔''

''میں بزدل نہیں ہوں۔ اپنی جان بچانے کے لئے ہرگز کہیں نہ جاؤں گی۔'' فردوس فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ''نجمہ اور دوسری شہزادیاں شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا بغداد سے چلا جانا مناسب ہی نہیں ضروری ہے۔ میری قسمت آپ سے وابستہ ہے۔ میں کہیں نہ جاؤں گی۔''

''جب وحشی منگولوں کا سیلاب شہر میں داخل ہو گا اور ہر گھر میں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ عورتوں کی عزت خطرے میں پڑ جائے گی، اُس وقت تم کیا کرو گی؟'' ابوبکر نے فردوس سے سوال کیا۔

''میں اس وقت وہی کروں گی جو ایک عرب عورت کے شایانِ شان ہے۔ اپنی بہنوں کی حفاظت کرتے ہوئے ماری جاؤں گی۔'' فردوس نے جواب دیا۔ ابوبکر نے کچھ اور کہنا مناسب نہیں سمجھا اور فردوس کو خدا حافظ کہہ کر محل سے نکل آیا۔

محل کے باہر بڑے بڑے علماء و فقہا جن کے علم و فضل اور بزرگی و دینداری کی شہرت تھی، گھوڑوں پر سوار کھڑے تھے۔ اُن کے ساتھ دیگر معززینِ شہر بھی تھے۔ قاضی القضاۃ بھی موجود تھا۔ اُس نے ابوبکر سے کہا۔

''اے ولی عہد سلطنت! میرا دل کہتا ہے کہ ہم سب مقتل کی طرف جا رہے ہیں۔''

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' ابوبکر نے قاضی کی تائید کی۔ ''منگول حکمراں کا ہم لوگوں کو بلانا خالی از علت نہیں ہے۔ ابن علقمی وہاں موجود ہے۔ وہ ہم سب کا بدترین دشمن ہے۔ یقیناً اس نے ہمیں قتل کرانے کے لئے ہی بلوایا ہے۔ خلیفہ محترم سے مشاورت تو محض ایک بہانہ ہے۔ اس کے باوجود ہمارے پاس کوئی اور چارہ نہیں۔ ہمیں وہاں جانا ہی پڑے گا۔''

اس کے بعد کوئی کچھ نہ بولا اور وہ سب ابوبکر کے ساتھ چل دیئے۔

''اے عارج! اگر تُو ولی عہد کے انسانی پیکر میں ہوتا تو تجھ پر کیا گزرتی یہ ابھی کچھ ہی دیر میں تجھے معلوم ہو جائے گا۔'' میں نے کہا۔

عارج اور میں پہلے سے وہاں موجود تھے جب ابوبکر اور بغداد کے معززین، ہلاکو خاں کے خیمے تک پہنچے۔ اس وقت ہلاکو خاں اپنے خیمے کے سامنے سائبان کے نیچے بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ منگول سردار بیٹھے تھے۔ ان کے علاوہ وزیرِ اعظم نصیر الدین طوسی بھی تھا۔ ایک طرف ابنِ علقمی بیٹھا تھا۔ خلیفہ مستعصم بھی قریب ہی ایک صوفے پر موجود تھا۔

ہلاکو خاں نے ابنِ علقمی سے طوسی کے ذریعے کہا۔ ''ان لوگوں کا تعارف کراؤ۔''

ابنِ علقمی اٹھ کھڑا ہوا اور آنے والوں کا تعارف کرانے لگا۔ ''یہ ولی عہد ابوبکر ہیں اور یہ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ہیں۔ یہ بڑے عالم ہیں۔ یہ شیخ ہیں۔ یہ عمائدین سلطنت ہیں۔ اس نے تمام آنے والوں کا فرداً فرداً نام و مقام بتا دیا۔

ہلاکو خاں نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔ ''اور شہزادے کہاں ہیں؟''

طوسی نے عربی زبان میں یہی سوال دہرا دیا تو ابوبکر نے جواب دیا۔ ''اور شہزادے شہر میں ہیں۔ وہ یہاں اس لئے نہیں آئے کہ انہیں سلطنت و حکومت میں کوئی دخل نہیں تھا۔ نہ انہیں مشورے میں شریک کیا جاتا تھا اس لئے وہ نہیں لائے گئے۔''

''فتنہ و فساد کے تمہی بانی ہو؟'' ہلاکو خاں جیسے غرایا۔

ہلاکو خاں نے طوسی کے ذریعے ابنِ علقمی سے کہا۔ ''اس بدخصلت شہزادے کے جرائم سے اسے آگاہ کرو۔''

ابنِ علقمی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بولنا شروع کیا۔ ''شہزادے نے مفسدوں کو قید سے چھڑایا اور بے گناہوں کو قید کرایا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ منگول حکمراں کے مقابلے میں لشکر

بھیجا۔ جب منگولوں نے بغداد کا محاصرہ کر لیا تو شہزادے ہی نے لوگوں کو مقابلے کی ترغیب دی۔ حملے کے وقت منگول حکمراں کا مقابلہ کیا۔" ابن علقمی جو کچھ کہہ رہا تھا، طوسی ہلاکو خاں کو بتاتا جا رہا تھا۔

"تم نے سن لی اپنے جرائم کی فہرست؟" ہلاکو خاں نے طوسی کے توسط سے ابوبکر کو مخاطب کیا۔

"سن لی۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ وزیراعظم کے حکم ہی سے سب کچھ ہوتا تھا اور ہوا۔" ابوبکر نے ابن علقمی کو مجرم ثابت کرنا چاہا۔ وہ بڑے جوش اور بے باکی کے ساتھ بول رہا تھا کہ ہلاکو خاں کے حکم پر اسے مزید بولنے سے روک دیا گیا۔

"یہ بڑا ہی چرب زبان ہے میرے آقا!" ابن علقمی اپنے اوپر الزام آتے دیکھ کر بول اٹھا۔ طوسی کی تقلید میں اس نے بھی ہلاکو خاں کو آقا کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ سا تھا۔

"ہم سمجھ گئے کہ شہزادہ تم پر ناحق الزام لگا رہا ہے۔" ہلاکو خاں نے کہا۔ "مگر اسے نہیں معلوم کہ اس طرح سزا میں کمی نہیں ہوگی۔" پھر ہلاکو خاں نے ابوبکر کی قسمت کا فیصلہ سنا ہی دیا۔ "اے ولی عہد ابوبکر! تمہاری سزا قتل ہے۔"

"یہ میں جانتا تھا کہ مجھے قتل ہی کی سزا ملے گی۔" ابوبکر کی آواز پُرسکون تھی۔ "مجھے اپنے لئے کچھ نہیں کہنا۔ میں عباسی شہزادہ ہوں۔ بزدلی میرا شیوہ نہیں ہے۔ میں مرد ہوں۔ مردانہ موت مرنے کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔ لیکن صرف یہ درخواست ہے تم سے کہ علماء کو قتل نہ کرانا۔ مسلمانوں کے لئے ان کی حیثیت قیمتی سرمائے کی ہے۔"

ہلاکو خاں نے ایک وحشی اور خوں خوار فوجی افسر کو اشارہ کیا۔ اس نے اٹھ کر ابوبکر کی گردن پر ایسی تلوار ماری کہ ابوبکر کا سر اُڑ گیا۔ خلیفہ مستعصم نے اپنا منہ پھیر لیا۔ یہ بات تو میری سمجھ میں آ گئی، مگر عارج کے رویے پر مجھے حیرانی ہوئی۔ میں نے اسے اچانک غائب ہوتے دیکھا۔ میں اس کے وجود کی خوشبو کے سہارے دوسرے ہی لمحے اس تک پہنچ گئی۔ وہ بغداد سے نکل کر قطوبہ کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔

"سن اے عارج!" میں نے اسے پکارا۔

عارج رک گیا۔ پھر میرے استفسار پر اس نے گلوگیر آواز میں بتایا۔ "اپنے انسانی

قالب سے مجھے محبت ہو گئی تھی اے دینار! یقین کر کہ جب ہلاکو خاں کے فوجی افسر نے ابوبکر کی گردن پر تلوار کا وار کیا تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرا سر قلم کر رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اپنے انسانی پیکر کو تڑپتے ہوئے نہ دیکھ سکوں گا۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہوگا سو میں اسی لئے وہاں سے چلا آیا۔"

ان جذبات کو سمجھنا میرے لئے مشکل نہ تھا جن کا اظہار عارج نے کیا۔ میں کچھ ہی دیر میں اسے معمول پر لے آئی۔ پھر بغداد کی طرف لوٹ آئی۔ جب میں عارج کو ساتھ لئے دوبارہ ہلاکو خاں کے لشکر میں پہنچی تو ہلاکو خاں کے سامنے قاضی القضاۃ کو پیش کیا گیا۔ ولی عہد ابوبکر کی لاش وہاں سے اٹھوائی جا چکی تھی۔ ترجمان کے فرائض نصیر الدین طوسی ہی ادا کر رہا تھا۔

ہلاکو خاں نے قاضی القضاۃ سے پوچھا۔ "تم ہمیں کافر کہتے ہو؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "خالق کو چھوڑ کر جو مخلوق کو خدا مانتا ہے، اسے پوجتا ہے، وہ کافر ہے۔ تم بھی سورج کی عبادت کرتے ہو اس لئے کافر....."

"خاموش!" ہلاکو چیخ اٹھا۔

پھر ہلاکو خاں کے حکم پر قاضی القضاۃ اور تمام راست گو علما کے سر قلم کر دیئے گئے۔ عمائدین سلطنت پر ہلاکو خاں نے یہ الزام لگایا کہ انہوں نے منگولوں کے مقابلے میں شرکت کی۔ سو انہیں بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

خلیفہ دم بخود بیٹھا منگولوں کی سفاکی دیکھ رہا تھا۔ ہلاکو خاں نے اس سے کہا۔ "اپنے سپاہیوں کو حکم بھیجو کہ وہ غیر مسلح ہو کر شہر سے باہر نکل آئیں۔"

مستعصم مجبور تھا۔ اسے ہلاکو خاں کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔

خلیفہ مستعصم کا قاصد ایک دروازے سے جب شہر میں داخل ہو رہا تھا تو دوسرے دروازے سے احمد، احمد، نجم اور حکمراں خاندان کے تمام مرد و زن باہر نکل رہے تھے۔ قاصد کو معلوم تھا کہ ولی عہد ابوبکر اور اس کے ساتھ جانے والوں کی گردنیں مار دی گئی ہیں۔ مگر ہلاکو خاں نے یہ ہدایت کر دی تھی کہ ان کے مارے جانے کا ذکر شہر میں کسی سے نہ کرے۔ اسے ڈرا دیا کہ اس نے اس واقعے کا ذرا بھی اشارہ کیا تو اس کی اور اس کے گھر والوں کی خیر نہیں۔ قاصد نے شہر میں موجود فوجیوں کی کمان کرنے والے افسر تک خلیفہ

خوفناک صورتوں والے منگولوں کو دیکھ کر عورتیں لرز جاتیں اور معصوم بچے سہم جاتے۔ وحشی منگول پہلے بچوں ہی کو قتل کرتے اور ان کی مائیں تڑپتی رہ جاتیں۔ وہ چیخنی چلاتیں اور بے ہوش ہو کر گر پڑتیں۔ منگولوں کی تلواریں ان کا خاتمہ کر دیتیں۔

جب کافی خون ریزی ہو چکی تو منگولوں نے حسین عورتوں اور پری چہرہ لڑکیوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ جن آدم زادوں نے تہ خانوں میں پناہ لے لی تھی، بس وہی زندہ بچ گئے تھے۔ اس خون ریزی میں جو متواتر تین روز تک جاری رہی، صرف شہر بغداد کے اندر سولہ لاکھ مسلمان مارے گئے۔ اس قیامتِ صغریٰ کا آغاز آٹھویں صفر 656 ہجری کو جمعرات کے روز ہوا۔ دس صفر تک بغداد میں قتلِ عام جاری رہا۔

ان تین دنوں کے دوران میں مسلمانوں نے جہاں بھی پناہ لی، انہیں مار ڈالا گیا۔ مسلمانوں نے دارالشفا (شفا خانہ) میں پناہ لی تو منگول وہاں جا گھسے اور انہیں قتل کر دیا، پھر شفا خانے کو آگ لگا دی۔ شفا خانے میں جو لوگ بیمار تھے، وہ بھی ذبح کر ڈالے گئے۔ (شہر بغداد میں اُس وقت تیس کے قریب شفا خانے تھے۔ ہر شفا خانے میں بڑے ماہر طبیب علاج کے لئے مقرر تھے۔ وہاں بلا تخصیص امیر و غریب سب کا علاج ہوتا تھا۔ شفا خانوں میں آرام دہ بستر تھے۔ مریضوں کو پوشاکیں ملتی تھیں، دودھ، گھی، پھل اور ہر قسم کا دوسرا کھانا ملتا تھا۔ گھروں سے زیادہ آرام لوگوں کو شفا خانوں میں ملتا تھا۔ مریضوں سے کسی قسم کا معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا۔ مصنف) ان شفا خانوں کے علاوہ مسلمان جان بچانے کے لئے کسی درس گاہ میں داخل ہو جاتے تو منگول وہاں بھی انہیں نہ چھوڑتے۔ وہ درس گاہوں کو بھی جلا دیتے۔ بغداد میں پچیس بڑی درس گاہیں (کالج اور یونیورسٹیاں) تھیں۔ ان میں سے چند حکومت نے بنوائی تھیں، باقی امیروں اور رئیسوں نے تعمیر کرائی تھیں۔ ان کے اخراجات کے لئے انہوں نے بڑی بڑی جائیدادیں وقف کر دی تھیں۔

ہر درس گاہ کی عمارت سنگِ مرمر کی بنی ہوئی تھی۔ انہی سے متعلق کتب خانے (لائبریری) تھے۔ کتابیں سنگِ مرمر کی ایسی الماریوں میں رکھی جاتی تھیں جن کے کواڑ شیشے چڑھے ہوتے تھے۔

وحشی منگول ان درس گاہوں میں گھس گئے۔ انہوں نے پہلے تو وہاں موجود لوگوں کو قتل کیا، پھر کتابوں کی الماریوں کو توڑ ڈالا اور بے نظیر علمی ذخیرے کو آگ لگا دی۔ درس گاہوں

کو گرا کر خاک کا ڈھیر بنا دیا یا آگ لگا کر جلا دیا۔

باغات اور چمن زار تباہ کر دیئے گئے۔ فوارے اکھاڑ ڈالے، بھاری تعداد میں مسجدیں جلا ڈالیں۔ زیادہ تر گھروں کو منگولوں نے آگ لگا دی۔ تقریباً چالیس نہایت شاندار عمارت کے کتب خانے شہر بھر میں تھے جن میں ہر علم و فن کی کتابیں بڑی جاں کاہی سے فراہم کر کے بہت احتیاط سے رکھی ہوئی تھیں۔ یہ کتب خانے، درس گاہ۔ اِن میں موجود کتب خانوں سے الگ تھے اور ان میں بے شمار کتابیں تھیں۔ دنیا بھر کی کتابوں کے تراجم عربی میں موجود تھے۔ مسلمانوں نے یہ علمی خزانہ صدیوں میں جمع کیا تھا جو چند لمحوں میں پامال کر دیا گیا۔ تشنہ کامانِ علم اِن کتابوں کے مطالعے سے اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے، وحشی منگولوں نے اِس علمی بے بہا خزانے کو دریائے دجلہ میں پھینک دیا۔ ان کتابوں کی سیاہی سے دریائے دجلہ کا وہ پانی جو خون کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا، سیاہی مائل ہو گیا۔ منگولوں نے ہلاکو خاں کے حکم کی پوری تعمیل کی اور تمام کتب خانے جلا ڈالے۔

بغداد میں مزارات کی بھی کمی نہ تھی۔ اُن کے کلس خالص سونے کے تھے۔ ان مزاروں کو منگولوں نے برباد کر دیا یا جلا ڈالا یا مسمار کر دیا۔ امیروں اور رئیسوں کے محلوں کے ساتھ ہی شاہی محلات کو بھی سخت نقصان پہنچایا گیا۔ کئی محلوں کا تو نام و نشان مٹ گیا۔ ہر مسجد، ہر مزار، ہر عمارت کو گرا کر وحشی منگول سونے کے کلس اتار لیتے اور جواہرات کو کھرچ لیتے۔

شہر بغداد کی اس تاراجی و بربادی کے ساتھ خوں ریزی بھی ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کو بھیڑوں کی طرح ذبح کیا جا رہا تھا۔

تین روز کے قتل عام اور بربادی نے بغداد کو جیسے کھنڈر بنا دیا تھا۔ ہلاکو خاں کو جب یہ اطلاع دی گئی تو اس نے خوں ریزی بند کرنے کا حکم دے دیا۔ پھر وہ خلیفہ مستعصم باللہ کو ساتھ لے کر شہر میں داخل ہوا۔ مستعصم جب بغداد سے باہر گیا تھا تو شہر کو آباد، بارونق اور جنت نظیر چھوڑ گیا تھا، لیکن تین روز کے بعد وہ شہر میں واپس آیا تو اُسے خاک کا ڈھیر پایا۔ تمام اُونچی اُونچی اور شاندار عمارتیں یا تو جلا ڈالی گئی تھیں یا گرا کر خاک کا ڈھیر بنا دی گئی تھیں۔ شہر ویران اور تباہ ہو گیا تھا، باغیچے اُجڑ گئے تھے۔ باغ کاٹ دیئے گئے تھے۔ عمارتوں سے اب تک دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ خلیفہ مستعصم کو بغداد کی تباہی کا

بڑا رنج ہوا۔ ہلاکو خاں اُسے قصرِ خلافت میں لے آیا۔ ابنِ علقمی اور دیگر منگول سردار بھی ہلاکو خاں کے ساتھ تھے۔

قصرِ خلافت خالی پڑا تھا۔ ہلاکو خاں اس پر برہم ہوا کہ حکمران خاندان کے مرد و زن فرار ہو گئے۔ یہ بات صرف میرے علم میں تھی کہ وہ لوگ شام سے ہو کر مصر کی طرف گئے تھے۔ ہلاکو خاں کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو اُس نے خلیفہ مستعصم سے سرکاری خزانے کے بارے میں پوچھا۔ مستعصم اُسے اور اُس کے ہمراہیوں کو قصرِ خلافت کے ایک حصے میں لے آیا۔

سرکاری خزانے میں دس ہزار دینار سرخ (اشرفیاں)، دو ہزار نفیس پوشاکیں اور چند مرصع زیورات تھے۔ خلیفہ نے وہ سب ہلاکو خاں کی نذر کر دیے۔ ہلاکو خاں نے یہ ساری دولت اپنے ہمراہیوں میں تقسیم کر دی۔

''یہ چیزیں اگر تم نہ بھی دیتے تو ہم لے لیتے۔'' ہلاکو خاں نے طوسی کے توسط سے خلیفہ مستعصم کو مخاطب کیا۔ ''ہمیں تو وہ خزانہ چاہیے جو تم نے جمع کر کے چھپا رکھا ہے۔''

''ایسا کوئی خزانہ نہیں ہے۔'' خلیفہ مستعصم نے دروغ گوئی سے کام لیا۔

اس پر ابنِ علقمی بول اٹھا۔ ''غلط کیوں کہتے ہو۔ ان حوضوں کے بارے میں بتاؤں جنہیں رات میں تیار کرا کے اور خزانہ بھر کر چھپایا ہے۔''

اب مستعصم کیا کہتا۔ اُس کا نمک خوار وزیرِ اعظم سب کچھ بتا رہا تھا۔ وہ ہلاکو خاں کو نہر کے کنارے لے گیا اور اُن حوضوں کی نشان دہی کر دی جو رات کو زمین میں دفن کیے گئے تھے۔ انہی کا راز معلوم کرنے کے لئے اخر کئی روز پریشان رہا تھا۔ ان کے متعلق خلیفہ مستعصم نے ہدایت کر دی تھی کہ کوئی ان کا ذکر نہ کرے۔

ان حوضوں کو کھودا گیا۔ وہ اشرفیوں (دینارِ سرخ) اور جواہر سے لبریز تھے۔ ان میں اتنی دولت تھی کہ جس سے کئی سلطنتیں خریدی جا سکتی تھیں۔ ہلاکو خاں نے اس تمام دولت پر قبضہ کر لیا۔

''ایک بات بتاؤ، یہ دولت تم نے کیوں جمع کی تھی؟'' ہلاکو خاں نے اپنے وزیرِ اعظم و ترجمان نصیر الدین طوسی کے ذریعے خلیفہ سے سوال کیا۔

''ہر بادشاہ یا حکمراں کو خزانے کی ضرورت ہوتی ہے۔'' طوسی کی زبانی ہلاکو خاں کا

سوال سن کر خلیفہ نے جواب دیا۔ ''بغیر دولت کے کوئی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی۔ سب حکمراں دولت جمع کرتے ہیں۔ میں نے بھی جمع کی تھی۔''

''تم نے درست کہا۔'' ہلاکو خاں بولا۔ ''دولت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اسے دفن کرا دیا جائے۔'' اس کی آواز میں طنز تھا۔

''نہیں، بلکہ اس لئے محفوظ رکھا جائے کہ آڑے وقت پر کام آئے۔'' خلیفہ مستعصم نے وضاحت کی۔

''آڑا وقت کون سا ہو سکتا ہے؟'' ہلاکو خاں نے دریافت کیا۔ ''یا تو اس وقت یہ دولت خرچ کی جائے جب دشمن، ملک پر حملہ کرے یا اپنی جان کے فدیے میں دے دی جائے۔'' خلیفہ نے کہا۔ ''تمہارے ملک پر ہم نے حملہ کیا مگر تم نے ہمارے مقابلے کے لئے نہ فوجیں جمع کیں نہ سامانِ جنگ فراہم کیا۔''

یہ سن کے خلیفہ لاجواب ہو گیا اور سر کھجانے لگا۔ اس نے سوچا، اگر میں اپنے بہی خواہ شہزادوں کی بات مان لیتا تو ہلاکو خاں کے قبضے میں نہ ہوتا۔ نہ اُس کے قبضے میں وہ بے شمار دولت جاتی جس کا تھوڑا حصہ بھی منگولوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی ہوتا۔ آج دولت اُس کے قبضے سے نکل چکی تھی اور جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

''بولو، تم نے اس قدر دولت پاس ہونے پر بھی ہمارے مقابلے کی تیاری کیوں نہیں کی؟'' ہلاکو خاں نے معلوم کیا۔

''مجھے ابنِ علقمی نے غلط اطلاعیں دیں اور غلط راستے پر ڈال دیا۔'' مستعصم نے جواب دیا۔

''تم میں حکومت کی قابلیت ہی نہ تھی۔ تم نے ابنِ علقمی کو نہیں پہچانا۔ کیوں اِس کے کہنے پر چلے؟ کیوں اپنی عقل سے کام نہ لیا؟''

خلیفہ مستعصم کیا جواب دیتا، خاموش رہا۔ ہلاکو خاں نے مزید کہا۔ ''اِن اعمال تمہیں قید کی سزا دی جاتی ہے۔''

ہلاکو خاں نے خلیفہ مستعصم کو قید کر کے اُس کا کھانا پانی بند کر دیا۔ آدم زاد اناج کا کیڑا ہے، کھائے پیئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بھوک ہر احساس پر غالب آ جاتی ہے۔ جب خلیفہ کو کئی وقت کھانا اور پانی نہ ملا تو اُس نے ہلاکو خاں کو بلا کر بھوک اور پیاس کی شکایت کی۔

جانے کب آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ سفرِ آخرت پر روانہ ہو گیا۔ جب ابنِ علقمی کو یقین ہو گیا کہ خلیفہ اب زندہ نہ بچا ہو گا تو مزید تصدیق اور اس کی لاش دیکھنے کے لئے نمدے کو کھلوایا گیا۔ مستعصم کا چہرہ اور پورا جسم اس بری طرح کچلا ہوا تھا کہ اسے پہچاننا مشکل تھا۔

بدقسمت مستعصم باللہ عباسی خاندان کا آخری خلیفہ تھا۔ وہ 37 واں خلیفہ تھا۔ اس کی موت کے بعد عباسی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ ابنِ علقمی کو مستعصم کی موت اور بغداد کی تباہی سے بڑی خوشی ہوئی۔ وہ شہر والوں سے بھی ناراض تھا اور خلیفہ سے بھی۔ شہر میں خون کی ندیاں بہہ گئیں اور خلیفہ مارا گیا۔ اب ابنِ علقمی کو یہ امید ہو چلی کہ ہلاکو خاں اس کی بات مان لے گا اور اسے عراق کی حکومت سپرد کر کے واپس چلا جائے گا۔ اس نے وزیرِ اعظم نصیر الدین طوسی سے اس بات کا ذکر کیا۔

"تم عراق میں علوی خلافت ہی قائم کرنا چاہتے تھے۔" طوسی نے کہا۔

"میں تو اس کے لئے تیار ہوں مگر خود علوی تیار نہیں ہیں۔" ابنِ علقمی چالاکی سے بولا۔

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم نے یہ سب کچھ اپنی شخصی حکومت قائم کرنے کے لئے کیا ہے!" طوسی کی آواز میں طنز تھا۔

ابنِ علقمی نے اعتراف کر لیا کہ اس کی یہی مرضی تھی۔ پھر عاجزی سے کہنے لگا۔ "اگر آپ چاہیں تو میری یہ آرزو پوری ہو جائے۔"

طوسی دراصل ابنِ علقمی کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھا جو اس روز دور ہو گئی۔ وہ ابنِ علقمی سے ناراض ہو گیا، مگر اس کا اظہار نہ کیا۔ ابنِ علقمی اب تک کسی کتے کی طرح ہلاکو خاں کے پیچھے دم ہلاتا پھرتا رہا تھا۔ پہلی بار اسے اپنے محل اور بیٹی ہاجرہ کا خیال آیا۔ جب وہ اپنے محل پہنچا تو اسے کچھ دیر اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا۔

ابنِ علقمی کے محل کا بڑا حصہ بھی جلا کر خاک کا ڈھیر بنایا جا چکا تھا۔ جو تباہی ابنِ علقمی شہر والوں پر لایا تھا اس سے خود بھی نہ بچ سکا تھا۔ اسے وحشی منگولوں پر بڑا غصہ آیا کہ انہوں نے اس کا خیال بھی نہ کیا۔

جب وہ محل کے اندر داخل ہوا تو اس نے وہاں اپنے غلاموں اور کنیزوں کی لاشیں پڑی دیکھیں۔ اس نے ہاجرہ کو آوازیں دیں۔ وہاں ہاجرہ کہاں تھی جو اس کی آواز کا جواب

دیتی۔ تمام محل لٹا ہوا تھا، کوئی متنفس بھی وہاں نہیں تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے شہر کو تباہ دیکھا، شہر والوں کی لاشیں دیکھیں، معصوم بچوں کو سسکتے دیکھا، حسین پری چہرہ عرب خواتین کو وحشی منگولوں کے ہاتھوں میں گرفتار دیکھا۔ اس کے پتھر دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لیکن اپنے محل کو برباد دیکھا اور ہاجرہ کو غائب پایا تو پہلی ٹھیس دل کو لگی۔

"آہ میری مظلوم بچی!" ابنِ علقمی کراہتے ہوئے بولا۔ "نہ معلوم تیرا کیا حشر ہوا!...... تو نے مجھے کس کس طرح سمجھایا تھا کہ میں وحشی منگولوں کو حملوں کی دعوت نہ دوں۔ مگر میری آنکھوں پر خود غرضی نے تعصب حرص کی پٹی باندھ دی۔ حکومت کی ہوس نے میری عقل کھو دی اور میں بھی اوروں کی طرح برباد ہو کر رہ گیا۔ اگر میں تیری بات مان لیتا تو آج نہ بغداد برباد ہوتا نہ میں تباہ ہوتا۔ تو نے سچ کہا تھا کہ میں منگولوں کو بغداد سے دفع نہ کر سکوں گا۔ واقعی اب مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ وحشی، بدمعاش، ظالم اور سفاک منگولوں کو بغداد سے نکال سکوں۔" غم و قلق سے ابنِ علقمی کی آواز بھرا گئی اور وہ نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑا۔

تھوڑی دیر میں اسے بھوک محسوس ہوئی۔ محل میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو اس کے پیٹ کی آگ بجھا سکے۔ اس کے پاس اب بھی کافی دولت تھی جو اس نے خلیفہ مستعصم باللہ کی طرح چھپا رکھی تھی لیکن دولت سے پیٹ نہیں بھرا جا سکتا تھا۔ وہ ایک صوفے پر جا پڑا۔ دن چھپ گیا وہ پڑا رہا۔ نہ روشنی کا کوئی انتظام ہو سکا نہ کھانے کو کچھ ملا۔ وہ رات اس نے بڑے کرب اور بے چینی سے گزار دی۔ اس کے ولی نعمت خلیفہ مستعصم کو ہلاکو خاں نے بھوکا رکھا تھا۔ قدرت نے اس نمک حرام کو بھوکا رکھا۔ اب اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اسے احساس ہو گیا کہ اس نے برا کیا۔ ابھی تھوڑا سا دن چڑھا تھا کہ وحشی منگول اس کے محل میں گھس گئے۔ اسے بتایا کہ ہلاکو خاں نے یاد کیا ہے۔

میری توجہ ابنِ علقمی پر ہی تھی۔ اب اس کے گرد شعلوں کا وہ حصار نہیں تھا جو میرے کسی ممکنہ حملے سے اسے بچانے کی غرض سے عفریت عکب نے قائم کیا تھا۔ مجھے اب ابنِ علقمی پر حملے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ رہا بھی کیا تھا کہ میں جسے بچانے کی کوشش کرتی۔ یوں بھی وہ عیار و غدار آدم زاد میرے اندازے کے مطابق اپنے انجام کو پہنچنے والا تھا۔ ہلاکو خاں کی طرف سے اس کی طلبی بلا سبب نہیں تھی مگر وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ طلبی پر اسے

خیال ہوا کہ شاید نصیر الدین طوسی نے ہلاکو خاں سے اس کی سفارش کی ہے۔ ہلاکو خاں نے اسے عراق کی حکومت دینے کے لئے طلب کیا ہے۔ وہ منگول سپاہیوں کے ساتھ قصرِ خلافت پہنچ گیا۔ ہلاکو خاں کی سکونت وہیں تھی۔

منگول حکمراں کے پاس اس وقت مشیر، نصیر الدین طوسی اور فوجی افسر بیٹھے تھے۔ ابنِ علقمی بیٹھ گیا تو ہلاکو خاں نے اس سے پوچھا۔ ''تم کس صلے کے مستحق ہو ابنِ علقمی؟''

ہلاکو خاں اور ابنِ علقمی کے مابین یہ گفتگو طوسی ہی کے توسط سے ہو رہی تھی۔

ابنِ علقمی عاجزی سے بولا۔ ''اے میرے آقا! میں نے آپ کو لکھا تھا کہ بغداد کی بے شمار دولت اور مہ جبیں دل ربائیں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ آپ آئے اور آپ کو وہ سب کچھ مل گیا جس کی آپ کو تمنا تھی۔ میری بھی ایک آرزو تھی جو میں نے آپ کے وزیرِ اعظم سے عرض کی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ میری وہ آرزو پوری کی جائے گی۔''

ہلاکو خاں زور سے ہنس پڑا، پھر بولا۔ ''یعنی تمہیں عراق کی حکومت دے دی جائے۔''

ابنِ علقمی گڑگڑایا۔ ''جی ہاں میرے آقا!''

دوسرے ہی لمحے ہلاکو خاں کے تیور بدل گئے اور اس نے کڑک کر کہا۔ ''غدار! اے بے ایمان! نمک حرام! خلیفہ مستعصم باللہ نے تیرے ساتھ کیا برائی کی تھی؟ تجھے خاک سے اٹھا کر پاک کیا۔ عنانِ حکومت تیرے ہاتھ میں دے دی۔ دولت، عزت، حشمت، ثروت، سب کچھ تجھے دیا۔ تُو نے ان احسانوں کا یہ بدلہ دے دیا کہ عباسی سلطنت کا خاتمہ کرا دیا۔ عراق اور بغداد کو برباد کرایا۔ خلیفہ کی دولت چھنوا دی۔ اپنے ولی نعمت کو لاتوں سے کچلوایا۔ تجھ جیسے ایمان فروش اور محسن کش سے کیا امید ہو سکتی ہے!''

ہلاکو خاں کی باتیں سن کر ابنِ علقمی کانپ گیا۔ اس نے بڑی عاجزی کی، بہت گڑگڑایا اور درخواست کی کہ اسے کوئی عہدہ دے دیا جائے لیکن ہلاکو خاں نے اسے کتے کی طرح دھتکار دیا۔

''یہ غداری، یہ ایمان فروشی، یہ محسن کشی اور یہ نمک حرامی تُو نے اس لئے کی کہ تیرے پاس بڑی دولت جمع ہو گئی تھی۔ دولت کی افراط سے تُو حکومت کے خواب دیکھنے لگا۔ وہ دولت ہمارے سامنے حاضر کر!'' ہلاکو خاں سخت آواز میں بولا۔

ابنِ علقمی پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اس نے بڑی خوشامد کی، بہت رویا مگر ہلاکو خاں نے

اس پر سختی کی۔ اپنے محل میں اس نے جہاں جہاں دولت چھپا رکھی تھی سب کی نشاندہی کر دی، ہلاکو خاں نے ساری دولت ہتھیا لی۔

''اب یہ بتا کہ تیری بیٹی ہاجرہ کہاں ہے؟'' ہلاکو خاں نے پوچھا۔

نہ اسے ہاجرہ کا پتہ تھا نہ وہ بتا سکا۔ اب وہ ہلاکو خاں کی قید میں تھا۔ ہلاکو خاں نے ہاجرہ کو تلاش کرایا لیکن وہ نہیں ملی۔ قید کے دوران میں ابنِ علقمی کے جسم کا ست ہی نکل گیا۔ جس دولت پر اسے بھروسہ تھا اور جس کے زعم میں اس نے تمام عراق کو تباہ کرایا (منگولوں کے اس حملے سے عراق میں ایک کروڑ چھ لاکھ مسلمان مارے گئے۔ مصنف) وہ دولت ہی اس سے چھن گئی۔ اب اسے اگر کوئی فکر تھی تو یہ کہ ہلاکو خاں نے اسے کیوں قید کر رکھا ہے؟ اس نے ہلاکو خاں سے کہلوایا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔

ہلاکو خاں نے اس کی درخواست قبول کر لی۔ اسے ہلاکو خاں کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

اپنے وزیرِ اعظم طوسی کے ذریعے ہلاکو خاں نے اس سے پوچھا۔ ''بول، کیا چاہتا ہے؟''

''رہائی۔'' ابنِ علقمی نے جواب دیا۔ ''میں آپ کا وفادار غلام رہوں گا۔''

''تُو نے جب اپنے مقتول آقا سے وفا نہیں کی تو ہمارا وفادار کیسے ہو سکتا ہے۔ تیرہ تین روز بعد تجھے رہائی مل جائے گی۔'' ہلاکو خاں بولا۔ ابنِ علقمی خوش ہو گیا۔ لیکن اس روز کے بعد اسے کھانے یا پینے کو کچھ نہیں دیا گیا۔ ہلاکو خاں نے اپنے وعدے کے مطابق تین دن کے بعد اس سے کہلوایا کہ آج رہائی کا دن ہے۔ ہرچند کہ بھوک پیاس سے برا حال تھا پھر بھی وہ لڑکھڑاتا ہوا قید خانے سے نکل آیا۔ دو منگول سپاہی اسے سہارا دیتے ہلاکو خاں کے سامنے لے آئے۔

''اس غدار اور نمک حرام کی سزا کیا ہے؟'' ہلاکو خاں نے منگول سرداروں سے سوال کیا۔

''اسے زندگی کی قید سے رہائی دے دی جائے۔'' ایک منگول سردار نے بقیہ کی نمائندگی کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اور یہ رہائی اسی طرح عمل میں لائی جائے جس طرح اس نے اپنے آقا خلیفہ مستعصم باللہ کو رہائی دی۔'' ہلاکو خاں نے فیصلہ سنا دیا۔ پھر ابنِ علقمی کو نمدے میں لپیٹ کر ایک

ستون سے باندھ دیا گیا۔ جب اس کی چیخیں رک گئیں تو نیم مردہ جسم کو گھوڑوں سے روند ڈالا۔ سعا عارج مجھ سے مخاطب ہوا۔

"اے دینار! اب اس شہر سے واپس چل۔ یہاں کچھ نہیں رکھا۔"

"ہاں اے عارج، آدم زادوں کے درمیان رہتے رہتے میں بھی اب بیزاری سی محسوس کرتی ہوں۔ چل اب ہم بابل کے کھنڈرات ہی میں رہیں گے۔ مجھے عالم سوما سے عفریت عکب کے بارے میں بھی معلوم کرنا ہے۔" میں بولی۔

عارج کو ساتھ لئے میں اسی روز بغداد سے نکل آئی۔ عالم سوما نے اپنی غیر معمولی جناتی صفات کے ذریعے پتہ لگا لیا کہ عفریت عکب اب عراق میں نہیں۔ وہ واپس مصر چلا گیا۔ اس ملاقات میں عالم سوما نے مجھ سے اپنی ایک خواہش کا اظہار کیا۔ پھر کہا۔ "اے میری بچی، اے دینار! مجھے یقین ہے کہ تو انکار نہ کرے گی۔"

اور میں واقعی انکار نہ کر سکی۔ عارج سے میرا نکاح خود عالم سوما نے پڑھایا۔ کھنڈرات میں اسی روز جیسے جشن کا سماں تھا۔ میرا باپ اخضم، ماں طرطبہ، بھائی یوسف، بھابھی خرقا سبھی خوش تھے۔ میری رضامندی سے عالم سوما نے اعلان کیا۔

"دینار اب آدم زادوں کے درمیان نہیں، ہم جنات کے ساتھ ہی رہے گی۔"

(ختم شد)